رہنمائے اساتذہ

مطالعۂ قرآنِ حکیم

برائے طلباء وطالبات

حصّہ پنجم

اس رہنمائے اساتذہ میں کیا موجود ہے۔۔۔۔!!!

عمومی معاونتی و معلوماتی مواد:

- اساتذہ کے لئے عمومی تدریسی ہدایات
- تلاوت اور ترجمہ قرآن کے چند آداب
- رہنمائے اساتذہ سے بھرپور استفادہ کے لئے چند اہم ہدایات
- اسباق کی منصوبہ بندی (Lesson Planning)
- معروف علماء کرام اور ماہرینِ تعلیم کے تاثرات
- جائزہ فارم (Course Coverage Form)

خصوصی تدریسی و تربیتی مواد:

- آیت بہ آیت سوالاً جواباً تشریحی نکات
- ربطِ سورت
- سائنسی تحقیق اور تاریخی پس منظر
- قرآن حکیم کی آیات اور احادیث مبارکہ کے ذریعہ وضاحت
- یومیہ اسباق کا طریقۂ تدریس
- مشقوں کے جوابات
- قرآنِ حکیم کے علمی، عملی اور فکری پہلو
- مقاصدِ مطالعہ
- عملی سرگرمیاں
- آیات کا شانِ نزول

COPYRIGHTS © RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION. SALE OF THIS BOOK WOULD ENTAIL CIVIL & CRIMINAL ACTION.

"رہنمائے اساتذہ برائے مطالعہ ٔقرآنِ حکیم" کے شائع شُدہ حصّوں کی اشاعت کی تفصیلات:

- حصّہ اوّل .... طبع اوّل تا پنجم۔ ۲۰۱۵ء تا ۲۰۱۸ء۔ کل تعداد: ۲۷۰۰۰
- طبع جدید .... جولائی ۲۰۱۹ء۔ تعداد: ۵۰۰۰
- حصّہ دوم .... طبع اوّل تا چہارم۔ ۲۰۱۵ء تا ۲۰۱۹ء۔ کل تعداد: ۹۰۰۰
- طبع جدید .... جولائی ۲۰۱۹ء۔ تعداد: ۵۰۰۰
- حصّہ سوم .... طبع اوّل تا سوم۔ ۲۰۱۵ء تا ۲۰۱۹ء۔ کل تعداد: ۶۰۰۰
- طبع جدید .... جولائی ۲۰۱۹ء۔ تعداد: ۴۰۰۰
- حصّہ چہارم .... طبع اوّل تا دوم۔ ۲۰۱۸ء تا ۲۰۱۹ء۔ کل تعداد: ۴۰۰۰
- طبع جدید .... جولائی ۲۰۱۹ء۔ تعداد: ۱۰۰۰
- حصّہ پنجم .... طبع اوّل۔ جولائی ۲۰۱۹ء۔ کل تعداد: ۳۰۰۰

زیرِ اہتمام .... شعبہ تصنیف و تالیف۔ قرآن پروگرام (دی علم فاؤنڈیشن)

پتہ .... ۶۳/ ۳، بلاک نمبر ۳، دہلی مرکنٹائل کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی،

پوسٹ کوڈ ۷۴۸۰۰، کراچی، پاکستان

فون نمبر .... ۳۴۳۰۴۴۵۰، ۳۴۳۰۴۴۵۱ (۲۱-۹۲+)

موبائل نمبر ۰۳۳۵-۳۳۹۹۹۲۹

ای میل .... tif1430@gmail.com /info@tif.edu.pk

ویب سائٹ .... www.tif.edu.pk

عرضِ ناشر

اللہ ﷻ کے فضل و کرم سے انتہائی ذمہ داری کے ساتھ ہر ممکن کوشش کی گئی ہے کہ مطالعہ ٔقرآنِ حکیم کے نصاب کی تمام تر کوتاہیوں سے پاک بہترین اشاعت کا اہتمام ہو۔ تاہم خدانخواستہ دورانِ طباعت اعراب، جلد بندی یا دیگر کوئی کوتاہی جو سہواً ہوگئی ہو آپ کی نظر سے گزرے تو ادارہ کو مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ کی اشاعت میں اسے درست کیا جاسکے۔

یہ کتاب رضائے الٰہی کی خاطر بلاہدیہ فراہم کی جاتی ہے۔

COPYRIGHTS © RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION. SALE OF THIS BOOK WOULD ENTAIL CRIMINAL ACTION.

نصاب "مطالعۂ قرآنِ حکیم" کے بارے میں معروف علماء کرام اور ماہرین تعلیم کے تاثرات سے اقتباسات

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب (نائب صدر جامعہ دارالعلوم کراچی، چیئرمین شریعہ کونسل بحرین)

اس کتاب کا مقصد اسکول کے بچوں اور بچیوں کو قرآن کریم سے مناسبت پیدا کرنا اور اس کی بنیادی تعلیمات اور واقعات آسان زبان اور اسلوب میں پیش کرنا ہے، کتاب کی ورق گردانی سے اندازہ ہوا کہ بحیثیتِ مجموعی یہ کتاب اس مقصد میں کامیاب ہے، اور بچوں کی ذہنی سطح کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں مفید معلومات آسانی کے ساتھ فراہم کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو بچوں کیلئے نافع بنائے۔

مفتی منیب الرحمٰن صاحب (صدر تنظیم المدارس، مہتمم دارالعلوم نعیمیہ کراچی)

ان کتابوں میں منتخب انبیاءِ کرام علیہم السلام کی سوانح کو دل نشین اور سہل انداز میں ترتیب دیا گیا ہے۔ طلبہ میں اصلاحِ نفس (Self-Reform) اور احتسابِ ذات (Self-Accountability) کا شعور پیدا کرنے کے لئے "ہم نے کیا سمجھا؟" کے عنوان سے خود اپنا جائزہ لینے کے لئے تربیت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ بحیثیتِ مجموعی یہ ایک قابلِ قدر اور قابلِ تحسین کاوش ہے۔ یہ سارا سلسلہ ادارے کے مؤسسین کے اخلاص اور دینی جذبے کا مظہر ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو ماجور فرمائے، اِس کے فیض کو دوام اور قبولِ عام نصیب فرمائے۔

مولانا محمد اسماعیل صاحب (چیئرمین متحدہ علماء بورڈ، چیف خطیب خیبر پختونخوا)

عموماً قرآن کا ترجمہ، تفسیر لکھنا یا بیان کرنا اپنی حساسیت (Sensitivity) کے باوجود نسبتاً آسان کام ہے، لیکن اس سے کورس کی کتاب بنانا اور ٹیکسٹ بک کی شکل دینا بڑا دل گردے کا اور کٹھن کام ہے اور یہی مشکل کام دی علم فاؤنڈیشن کراچی نے انجام دیا ہے کہ پورے قرآن کو مختلف سیریز میں تقسیم کرکے طلبہ کی صلاحیتوں کے مطابق اسے مرتب کیا ہے اور پھر اسے نصاب کی کتاب بنا کر اسکولوں کے طلبہ کے لئے انتہائی آسان کر دیا گیا ہے۔

اس لئے بجاطور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ نصاب اپنی مثال آپ ہے۔ یہ بات انتہائی اطمینان کا باعث ہے کہ اس کے تیار کرنے میں تمام مکاتبِ فکر کے جیّد علماء اور مفسرین کرام کی کاوشوں سے بھرپور مدد لی گئی ہے اور یوں اسے تمام مکاتبِ فکر کے لئے قابلِ قبول بنا دیا گیا ہے۔ اس نصاب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کہیں بھی فرقہ واریت یا کسی قسم کی عصبیت کی بُو تک نہیں پائی جاتی بلکہ قرآن کی آفاقی دعوت کو محور بنایا گیا ہے۔ اس سے یہ اُمید پیدا ہوگئی ہے کہ ہمارے بچے اور بچیاں اس نصاب کو پڑھ کر ہر قسم کے لسانی، گروہی، نسلی، قومی، علاقائی اور مذہبی فرقہ بندیوں سے آزاد ہو کر خالص قرآن وسنت کے ذریعے اپنے آفاقی دین "اسلام" کا فہم حاصل کر سکیں گے۔ گویا یہ نصاب فرقوں اور گروہوں میں تقسیم اس اُمت کو ایک بار پھر واحد بنانے کے لئے واحد اُمید کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا محمد مظفر شیرازی صاحب (فاضل اسلامک یونیورسٹی مدینہ منورہ، وائس چانسلر جامعہ عمر بن عبد العزیز الاسلامیہ سیالکوٹ)

یہ نصاب سلیس اور سہل ہے۔ چھوٹی عمر کے طلبہ کے لئے نہایت مفید اور آسان ہے۔ بعض آیات کے ساتھ دیئے ہوئے نقشہ جات کی وجہ سے طلبہ کے لئے انتہائی دلچسپ ہے۔ طلبہ کی ذہنی استعداد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ترتیب دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہستی پاک قرآنِ کریم کے لئے آپ کی خدماتِ جلیلہ کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور آپ کی اس عمدہ کاوش کو دنیا میں باعثِ برکت اور آخرت میں باعثِ نجات بنائے۔ آمین

ڈاکٹر محمد محسن نقوی صاحب (ماہر تعلیم)

الحمدللہ! زیرِ نظر سلسلۂ کتب ہمارے برادرانِ دینی علماء وفضلاء نے ترتیب دیا ہے۔ جدید اسلوب کے ذریعہ قرآنِ مجید کے مختلف مقامات کا مطالعہ، اس کی زبان و بیان کی تشریح، حلِّ مطالب، تمرینات، شگفتہ بیانی نیز تعقید سے پاک اسلوب اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ اس سلسلۂ کتب کے مصنفین، مرتبین، حسن افزائی کے ذمہ دار حضرات اور ناشرین کی مساعیٔ جمیلہ کو قبول فرمائے اور طالبانِ قرآن کو اس سلسلۂ کتب سے بھرپور استفادے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

مولانا محمد سیف البر سکر گاہی صاحب (فاضل وفاق المدارس العربیہ، مرکزی ناظم اعلیٰ ٹرسٹ جمیعت تعلیم القرآن)

دی علم فاؤنڈیشن نے اکابرین کی تفاسیر و تراجم کو سامنے رکھتے ہوئے خاص طور پر اسکولز کے طلبہ کیلئے جو نصاب ترتیب دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اسباق کا حاصل، تمارین اور گھریلو سرگرمیاں وغیرہ متعلمین و متعلمات کیلئے انتہائی مفید ثابت ہونگی ان شاء اللہ۔ امید واثق ہے کہ یہ نصاب فہمِ قرآن حکیم کیلئے انتہائی مؤثر کردار ادا کریگا۔ اس میں سب سے زیادہ خاص بات یہ ہے کہ جملہ نصاب میں ان اُمور اور تشریحات کو بیان کرنے کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے جن میں عموماً سب کا اتفاق پایا جاتا ہے۔ جس سے بچوں کا یہ ذہن بنے گا کہ ہمارا دین اختلافات کا مجموعہ نہیں ہے اس طرح قربتوں کو فروغ ملے گا اور جو فاصلے بلکہ خلیجیں مسلمانوں کے درمیان پیدا ہو گئی ہیں وہ رفتہ رفتہ کم ہو جائیں گی (ان شاء اللہ تعالیٰ) دل و جان سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دی علم فاؤنڈیشن کے جملہ ذمہ داران کی خدمات اور کاوشوں کو قبول فرمائے اور دنیا اور آخرت کی کامیابیوں سے ہمکنار فرمائے اور ادارے کو خوب ترقی عطا فرمائے۔ (آمین)

مولانا حکیم محمد مظہر صاحب (مہتمم جامعہ اشرف المدارس کراچی)

اس کتاب میں بچوں کی ذہنی سطح کو سامنے رکھتے ہوئے قرآنی آیات کا ترجمہ عام فہم انداز میں پیش کیا گیا ہے، مجموعی لحاظ سے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ اس کتاب کا مقصد اسکول کے بچوں اور بچیوں کو قرآن کریم سے مناسبت پیدا کرنا اور اس کی بنیادی تعلیم سے آگاہ کرنا ہے۔ یہ اپنے مقصد میں کامیاب ثابت ہو گی ان شاء اللہ۔

شیخ الحدیث مولانا مفتی عطاء الرحمن صاحب (مہتمم جامعہ مدنیہ بہاولپور)

قرآنِ کریم ہی مسلمانوں کی دنیاوی اور اخروی فلاح و بہبود کا واحد ضامن ہے۔ افسوسناک صورت حال یہ ہے کہ جس قوم کو یہ کتاب عطا کی گئی وہی آج اس کتاب سے بیگانہ اور انجان نظر آتی ہے۔ دین بیزاری اور مغربیت کی چکاچوند کے اس دور میں بعض اہل دل ایسے بھی ہیں جو قرآنِ کریم کی تعلیمات کو سہل سے سہل انداز میں ڈھال کر گھر گھر پہنچانے کی سعی کر رہے ہیں۔ انہی باہمت لوگوں میں دی علم فاؤنڈیشن کے اصحاب بھی ہیں۔ جنہوں نے ماشاء اللہ علماء کرام کی زیرِ نگرانی سکول اور کالج کی درس گاہوں کے لئے انتہائی آسان اور جدید طرزِ تدریس سے ہم آہنگ مطالعۂ قرآن حکیم کا نصاب تشکیل دیا ہے۔ مجموعی طور پر نصاب اپنی ترتیب اور انتخابِ مضامین کے لحاظ سے بہترین ہے۔ دی علم فاؤنڈیشن کے تمام رفقاء کار اس خدمت کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اللہ ﷻ ان حضرات کی مساعی کو قبولیت سے نوازے اور امت کو تادیر ان سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

جسٹس دوست محمد خان صاحب (جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان)

"مطالعہ قرآن حکیم برائے طلباء و طالبات" کا نصاب اسلامی اقدار کی نشوونما میں گراں قدر خدمت ہے جو قابل ستائش ہے کیونکہ قرآنی علوم اوج ثریا اور دل بینا عطا کرتے ہیں۔ دی علم فاؤنڈیشن کی طرف سے یہ کوشش دوسرے تدریسی اداروں کو بھی رہنمائی مہیا کرے گی۔ اس کا مطالعہ جاں گداز ہے۔ بصارت کے ساتھ بصیرت کو اجاگر کرنے والا ہے تاکہ قوم کے معماروں کا مستقبل تاریکی سے پرے رہے۔ اللہ آپ کو سلامت اور خوش رکھے۔

مولانا ڈاکٹر قاری محمد ضیاء الرحمٰن صاحب (چیئرمین القرآن ایجوکیشن ٹرسٹ، انچارج فیصل مسجد اسلام آباد)

دی علم فاؤنڈیشن کا مرتب کردہ نصاب مطالعۂ قرآن حکیم برائے طلباء و طالبات پاکستان کے لاکھوں عصری و دینی تعلیمی اداروں کے طلبہ کے علم و عمل، کردار و اخلاق اور فکری نشوونما کے لئے سنگ میل کا کام دے گا۔ جس کے ذریعہ ہم نہ صرف اپنی کھوئی ہوئی اخلاق قدروں اور گم کردہ قائدانہ مقام سے آشنا ہوں گے بلکہ پورے عالم انسانیت کے لئے مؤثر اور مفید ثابت ہونگے، مطالعۂ قرآن حکیم کورس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر طرح کی فرقہ ورانہ سوچ سے بلند تر اور اتحاد امت کا ترجمان ہے۔

ونگ کمانڈر ڈاکٹر مولانا ضمیر اختر خان صاحب (ڈائریکٹر شعبہ امورِ دینیہ۔ پاکستان فضائیہ، فاضل علوم اسلامیہ)

دی علم فاؤنڈیشن نے عصری تعلیمی اداروں کے لئے مطالعۂ قرآن حکیم کا نصاب ترتیب دے کر ملت اسلامیہ پاکستان کی خاص طور پر اور امت مسلمہ کی عام طور پر خدمت کا عظیم فریضہ ادا کیا ہے۔ دی علم فاؤنڈیشن کا بڑا کارنامہ (Herculean Task) پورے قرآن مجید فرقان حمید پر محیط ان کتب کی ترتیب و تدوین ہے۔

Prof. Dr. Masoom Yasinzai (Rector International Islamic University-Islamabad)

Its very impressive work on Quranic teachings 'Mutalae Quran-e- Hakeem'.I am greatly impressed by the ILM Foundation approach for introducing Quranic teaching with the help of stories of prophets and from the grass root level. Surely, ILM Foundation work will make a sustainable impact on the lives of future generations in their personal lives as practicing Muslims and in the society at large.

دی سیٹیزن فاؤنڈیشن (شعبۂ نصاب)

مختلف رنگوں کا استعمال بچوں کے لئے بہت interactive ہے اور قرآن فہمی میں معاون ہے۔ اس کتاب کی مشقیں بہت اچھی ہیں۔ اس نصاب میں کوئی ایسا مواد نہیں جس سے طلباء وطالبات میں انتہا پسندی پیدا ہو رہی ہو۔ نصابِ قرآن بچوں کی اخلاقی تربیت میں بھی بہت معاون ہے۔ بحیثیت مجموعی بہت اچھی کاوش ہے یقیناً اس کے اچھے نتائج سامنے آئیں گے۔

مفتی محمد قمر الحسن صاحب (استاد الحدیث جامعہ حمادیہ، شرعیہ ایڈوائزر ٹرسٹ جمعیت تعلیم القرآن، ایڈوکیٹ ہائی کورٹ)

طلباو طالبات میں اسلامی کردار و تشخص اور ایمانی جذبہ و قوت پیدا کرنے کے لئے اس میں جو محنت کی گئی ہے اس کو دیکھ کر بے اختیار زبان سے آفرین کے الفاظ نکل گئے۔ ہر سورت کے شروع میں اس کا مقصد اور جاندار خلاصہ کا پیش کرنا بڑا مفید ہے۔ "علم و عمل کی باتیں" کے عنوان قرآنِ حکیم کی فکری اور عملی ہدایت سے آگاہی دلانے کا طریقہ بھی نہایت مؤثر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو دین کی اشاعت اور جذبہ ایمانی کا ذریعہ بنادیا ہے۔

قاری سید علی عابد نقوی صاحب (اعزازی مشیر اسلامی نظریاتی کونسل، منتظم اعلیٰ امامیہ دار التجوید، بین الاقوامی قصر قرآنِ پروجیکٹ اسلام آباد)

مجھے انتہائی خوشی ہوئی کہ ادارہ نے مسلکی اختلافات سے پرہیز کرتے ہوئے طلباء وطالبات میں حقیقی قرآنی روح سے آگاہ کرنے کا بہترین اہتمام کیا ہے۔ میں اس عمل کو قابل تحسین قرار دیتا ہوں۔ وزارتِ مذہبی امور سے چالیس سال سے مربوط ہوں۔ علم فاؤنڈیشن کے افراد ادارہ میں ملازمت نہیں بلکہ نظریاتی بنیادوں پر کام کررہے ہیں۔ موجودہ پر آشوب دور میں علم فاؤنڈیشن کا قرآنی حوالے سے کام بہت بلند ہے۔ جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

مفتی محمد منظور علی خان قادری حنفی صاحب (فاضل علوم شرقیہ، خطیب اعلیٰ غوثیہ مسجد، گلشن حدید کراچی)

پانچویں کلاس سے دسویں کلاس کے بچوں کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام کے قرآنی واقعات پر مشتمل جو نصاب پیش کیا گیا ہے یہ بچوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔ اس ترجمہ میں کسی مقام پر مجھے کوئی غلطی یا بے ادبی نظر نہیں آئی۔ یہ ترجمہ مسلک اہلسنت کے مطابق بالکل درست ہے۔ اس وقت اس کام کے لئے جو لوگ جانی اور مالی تعاون کررہے ہیں وہ لائق تحسین ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائے۔

Muhammad Rafique Tahir (Joint Education Adviser, Ministry of Federal Education Govt of Pakistan)

The ILM Foundation has devised the Holy Quran Urdu translation books / course consists of seven parts. The Ministry of Federal Education & Professional Training has constituted a committee which consist of representatives of Ittehad Tanzeemat-ul-Madaris Pakistan to reach consensus regarding translation of the Holy Quran and Teachers Guide. The process of review is going on successfully. The council of Islamic Ideology has also highly appreciated this effort and suggested to form an Ulema Committee for providing guidelines.
The Ministry of Federal Education and Professional Training too appreciate the efforts of The ILM Foundation and term it as an excellent support towards the implementation of Compulsory Teaching of the Holy Quran Act 2017.

نوٹ: الحمد للہ مذکورہ بالا علماء کرام اور معزز شخصیات کے علاوہ بھی دیگر تعلیمی اداروں کے سربراہان، علماء کرام اور ماہرین تعلیم نے اپنے قیمتی تاثرات سے نوازا ہے۔

تلاوت اور ترجمہ قرآن کے چند آداب

۱۔ پاک صاف اور باوضو ہو کر قرآنِ حکیم کی تلاوت کرنی چاہیئے۔

۲۔ تلاوت شروع کرنے سے پہلے تعوذ (اَعُوْذُ بِاللّٰہِ) اور تسمیہ (بِسْمِ اللّٰہِ) پڑھنی چاہیئے۔

۳۔ تجوید کے ساتھ تلاوت کی کوشش کرنی چاہیئے۔

۴۔ تلاوت کرتے ہوئے رب العالمین اور اس کے کلام کی عظمت بھی دل میں موجود ہونی چاہیئے۔

۵۔ تلاوت آہستہ اور بلند آواز سے کی جاسکتی ہے۔ البتہ یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ بلند آواز تلاوت سے کسی کے کام یا آرام میں خلل نہ ہو۔

۶۔ سجدۂ تلاوت والی آیت پر سجدہ ادا کرنا چاہیئے۔

۷۔ جب کوئی دوسرا تلاوت کر رہا ہو تو اسے خاموشی اور توجہ سے سننا چاہیئے۔

۸۔ ترجمہ اور تشریحات کے مطالعہ کے وقت خوب غور و فکر کرنا چاہیئے تاکہ آیات کا مفہوم اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔

۹۔ اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت و اطاعت کے جذبہ سے سرشار ہو کر احکام دین سیکھنے اور ان پر عمل کرنے کی نیت سے قرآنِ حکیم کا بغور مطالعہ کرنا چاہیئے۔

۱۰۔ اللہ ﷻ اور رسول اللہ ﷺ کی عظمت و رفعت اور جنت و خوشخبری والی آیات کا ترجمہ پڑھتے وقت اظہار خوشی اور شکر کے ساتھ اللہ ﷻ سے جنت کی دعا مانگنی چاہیئے۔

۱۱۔ اللہ ﷻ کے غضب، جہنم اور اس کے عذاب والی آیات کا ترجمہ پڑھتے وقت اللہ ﷻ کا خوف رکھتے ہوئے جہنم کے عذاب سے نجات کی دعا مانگنی چاہیئے۔

۱۲۔ تلاوت کے آخر میں اپنی، اپنے والدین، اساتذہ، مرحومین اور پوری امت مسلمہ کی سلامتی، بھلائی اور مغفرت کے لئے دعا مانگنی چاہیئے۔

طلبہ کے لئے اہم ہدایات

تمام طلباء و طالبات اس نصاب کے مطالعہ کے دوران درج ذیل باتوں کو خاص طور پر ذہن نشین رکھیں۔

۱۔ مطالعۂ قرآنِ حکیم کی کتاب کے ادب اور حفاظت کا بھرپور انتظام کریں اور اس کی جلد بندی بھی کروائیں یہ خیال کرتے ہوئے کہ آپ آئندہ بھی اس سے استفادہ کرتے رہیں گے۔

۲۔ مطالعۂ قرآنِ حکیم میں پیش کیئے گئے ترجمہ کا انتخاب بہت سے علماء کرام اور بزرگانِ دین کے معروف تراجم سے کیا گیا ہے۔ اس حوالہ سے ان معزز شخصیات کی عظیم جدوجہد اور بے لوث خدمات کی ہمیں قدر کرنی چاہیئے اور انہیں اپنا محسن سمجھنا چاہیئے اور ان حضرات کو بھی خراج تحسین پیش کرنا چاہئے جنھوں نے اس نصاب کو خوب سے خوب تر بنانے کے لئے محض اخلاص کی بنیاد پر یہ کام کیا۔

۳۔ اس نصاب میں قرآنِ حکیم کے ترجمہ اور اس کی بنیادی تعلیمات سے آگاہی فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دینی مسائل اور قرآنِ حکیم کے احکامات کی تفصیل جاننے کے لئے علماء کرام سے رجوع کرنا چاہیئے۔

۴۔ اس نصاب کا ایک اہم مقصد قرآنِ حکیم کے بنیادی پیغام اور ہدایات سے طلبہ کو واقف کرانا ہے۔ البتہ اس مطالعہ کے نتیجہ میں اپنے آپ کو اس قابل سمجھنا کہ ہم خود قرآنِ حکیم سے مسائل اور احکامات اخذ کر سکتے ہیں اور ہمیں اہل علم سے کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں، ہرگز صحیح نہیں ہے۔

۵۔ قرآنِ حکیم کے مطالعہ کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی احادیث مبارکہ اور سیرت النبی ﷺ کا مطالعہ بھی بہت ضروری ہے کیونکہ قرآنی احکامات اور تعلیمات کی وضاحت آپ ﷺ نے اپنے قول اور عمل کے ذریعہ فرمائی۔ گویا قرآنِ حکیم کی عملی وضاحت آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے میسر آئے گی۔ اس سلسلہ میں اپنے اساتذہ کرام اور اہل علم سے رہنمائی لیتے رہیں۔

COPYRIGHTS ® RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION. SALE OF THIS BOOK WOULD ENTAIL CRIMINAL ACTION.

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست مضامین

نمبر شمار	سبق	صفحہ نمبر
۱	ابتدائی کلمات	۸
۲	”رہنمائے اساتذہ برائے مطالعہ قرآنِ حکیم“ کی خصوصیات	۱۰
۳	اساتذہ کے لئے عمومی تدریسی ہدایات	۱۱
۴	اسباق کی منصوبہ بندی (Lesson Planning)	۱۳
۵	نصاب کا جائزہ فارم (Course Coverage Form)	۱۹
۶	سُوۡرَۃُ الۡاَنۡعَام	۲۰
۷	سُوۡرَۃُ الۡاَعۡرَاف	۸۳
۸	سُوۡرَۃُ یُوۡنُس	۱۲۴
۹	سُوۡرَۃُ هُوۡد	۱۶۲
۱۰	سُوۡرَۃُ الرَّعۡد	۱۸۹
۱۱	سُوۡرَۃُ اِبۡرٰهِیۡم	۲۱۳
۱۲	سُوۡرَۃُ الۡحِجۡر	۲۳۶
۱۳	سُوۡرَۃُ النَّحۡل	۲۶۴
۱۴	سُوۡرَۃُ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡل	۳۲۳
۱۵	سُوۡرَۃُ الۡکَهۡف	۳۹۳
۱۶	سُوۡرَۃُ الۡمُؤۡمِنُوۡن	۴۵۷
۱۷	سُوۡرَۃُ الزُّمَر	۵۱۱
۱۸	سُوۡرَۃُ الۡمُؤۡمِن	۵۵۲
۱۹	سُوۡرَۃُ حٰمٓ السَّجۡدَۃ	۵۹۸
۲۰	سُوۡرَۃُ الشُّوۡرٰی	۶۳۱
۲۱	مطالعہ قرآنِ حکیم حصہ پنجم میں شامل سورتوں (سُوۡرَۃُ الۡاَنۡعَام تا سُوۡرَۃُ الشُّوۡرٰی) کے مشقوں کے جوابات	۶۶۹
۲۲	مطالعہ قرآنِ حکیم حصہ پنجم میں شامل سورتوں (سُوۡرَۃُ الۡاَنۡعَام تا سُوۡرَۃُ الشُّوۡرٰی) کے مقاصدِ مطالعہ	۶۹۳

COPYRIGHTS ® RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION. SALE OF THIS BOOK WOULD ENTAIL CIVIL & CRIMINAL ACTION.

ابتدائی کلمات

الحمدللہ "دی علم فاؤنڈیشن" کے زیرِ اہتمام طلبہ کی قرآنی تعلیمات سے آگاہی کے لئے ۲۰۱۰ء سے ایک جامع نصاب "مطالعۂ قرآنِ حکیم برائے طلباء و طالبات" مرتب کیا گیا ہے۔ اس نصاب سے سینکڑوں تعلیمی اداروں میں دو لاکھ سے زائد طلبہ استفادہ کر رہے ہیں جن کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ "مطالعہ قرآنِ حکیم" کے بارے میں الحمدللہ پاکستان بھر کے مختلف تعلیمی اداروں سے بہت حوصلہ افزا نتائج موصول ہو رہے ہیں جو محض اللہ ﷻ کا فضل اور اساتذہ کرام کے اخلاص اور محنت کا نتیجہ ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا "مجھے معلّم بنا کر بھیجا گیا ہے۔" (سنن دارمی) اس حدیثِ مبارکہ کے مطابق وہ تمام اساتذہ قابلِ صد افتخار ہیں جو تدریس سے وابستہ ہیں۔ انہیں نبی کریم ﷺ سے اس منصب کی نسبت حاصل ہے جس کا ذکر نبی کریم ﷺ نے خود فرمایا۔ پھر یہ منصب اور زیادہ عزت و افتخار کا باعث ہو جاتا ہے جب یہ تدریس قرآنِ حکیم کے حوالہ سے ہو۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے بہترین وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں۔" (صحیح بخاری) ایک اور حدیث مبارکہ میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "اللہ ﷻ تمہارے ہاتھ پر (یعنی تمہارے ذریعہ) کسی ایک آدمی کو بھی ہدایت دے دیں، تو یہ تمہارے لئے اس ساری کائنات سے بہتر ہے، جس پر آفتاب طلوع اور غروب ہوتا ہے۔" (طبرانی)

تاہم جہاں فریضہ تدریس کے فضائل و درجات بلند ہیں وہیں اس کی ذمّہ داری اور حساسیت بھی بہت زیادہ ہے۔ پھر "مطالعۂ قرآنِ حکیم" کے حوالہ سے یہ ذمّہ داری اور حساسیت مزید بڑھ جاتی ہے کیوں کہ قرآنِ حکیم ایک مکمل ضابطۂ حیات عطا کرتا ہے اور اس نصاب کا طلبہ کی کردار سازی سے بھی گہرا تعلق ہے۔ پھر خود اساتذہ کرام طلبہ کے لئے عملی نمونے بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا اساتذہ کے لئے بہت ضروری ہے کہ وہ خود بھی قرآنِ حکیم، احادیث مبارکہ، سیرت النبی ﷺ اور دینی اسلامی کتب کا باقاعدہ مطالعہ کریں۔ نیز خود اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ بن کر طلبہ کی تربیت اور کردار سازی کے اہم فریضہ کو سرانجام دے کر اجرِ عظیم کی سعادت حاصل کریں۔

"مطالعۂ قرآنِ حکیم برائے طلباء و طالبات" کی مؤثر تدریس کے حوالہ سے ہر حصّہ کے لئے انتہائی تحقیق کے ساتھ ۳۰ سے زائد تراجم و تفاسیر کی روشنی میں "رہنمائے اساتذہ برائے مطالعۂ قرآنِ حکیم" مرتب کیا گیا ہے۔ اساتذہ "مطالعۂ قرآنِ حکیم" کی تدریس کے دوران اس سے ضرور استفادہ کریں اور دورانِ تدریس مندرجہ ذیل باتوں کو پیشِ نظر رکھیں تاکہ "رہنمائے اساتذہ برائے مطالعہ قرآن حکیم" سے بھرپور معاونت حاصل کر کے مؤثر انداز سے "مطالعہ قرآن حکیم" کی تدریس کا اہتمام ہو سکے۔

"مطالعۂ قرآنِ حکیم" اور "رہنمائے اساتذہ" موصول ہونے کے بعد دونوں کتب کا مکمل جائزہ لے لیں تاکہ اس نصاب کی ضرورت، اہمیت اور مقصد واضح ہو جائے۔ آئندہ کی تمام منصوبہ بندی اور تدریسی عمل میں یہ جائزہ معاون ہو گا۔ ان شاءاللہ

- رہنمائے اساتذہ میں دی گئی "عمومی تدریسی ہدایات" اور "عمومی پوچھے جانے والے سوالات" کے ایک ایک نکتہ کا بغور مطالعہ فرمائیں اوراگر اس ضمن میں مزید کوئی سوال ہوتو اسے نوٹ فرما کر ادارہ سے رابطہ فرمائیں۔
- اسباق کی منصوبہ بندی کا جائزہ لینے کے بعد اپنی سہولت کے مطابق اپنے اسکول کے نظام الاوقات کو مد نظر رکھتے ہوئے سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ بنیاد کے ساتھ ساتھ روزانہ کے سبق کی بھی منصوبہ بندی کر لیں کہ کسی مکمل یا جزوی سبق کے لئے کتنا وقت دستیاب ہوگا۔
- ہر سبق کو پڑھانے سے پہلے اس سے متعلقہ مواد کو ضرور پڑھ لیں۔ مثلاً قرآنی متن کی تلاوت اور درست ادائیگی کی مشق وغیرہ۔ املا اور تلفظ کی اصلاح کے لئے لغت (ڈکشنری) سے استفادہ کریں۔
- دورانِ تدریس ہر سبق کے متعین کردہ "مقاصدِ مطالعہ" کو خاص طور پر پیش نظر رکھیں تا کہ سبق کے اختتام پر طلبہ کو اس سبق کا وہ فہم حاصل ہو جس کا "مقاصدِ مطالعہ" میں ذکر کیا گیا ہے۔
- ہر سبق سے متعلقہ آیات کی تشریحات اور وضاحت "رہنمائے اساتذہ" میں دیئے گئے نکات تک ہی محدود رکھیں جو کہ الحمدللہ کئی معروف تفاسیر سے ماخوذ ہیں۔
- سورتوں کا باہمی ربط اچھی طرح جان لیں۔ اس میں کوئی مزید نکتہ شامل کرنا ہو تو وہ بھی پہلے سے نوٹ کر کے رکھیں تا کہ وقت کا ضیاع نہ ہو اور تدریسی عمل کی روانی برقرار رہے۔
- ہر سورت یا قصہ کی تدریس سے قبل طلبہ سے سوال و جواب کے ذریعہ متعلقہ سبق کے بارے میں بحیثیت مجموعی معلومات اور فہم کا جائزہ ضرور لے لیں تا کہ ان کی ذہنی سطح اور فہم کو سامنے رکھتے ہوئے بہتر انداز میں اس سبق کی مزید وضاحت ان کے سامنے کی جاسکے۔
- آیات کی تشریحات میں دیئے گئے سوالات طلبہ سے خود کریں۔ اگر وہ مطلوبہ جواب نہ دے سکیں تو "رہنمائے اساتذہ" میں دیئے گئے جواب انہیں بتائیں۔ سوال و جواب کمرۂ جماعت میں طلبہ کے سامنے "رہنمائے اساتذہ" سے پڑھنے سے بچنے کا اہتمام کریں اور متعلقہ سبق کی آیات کے سوالات و جوابات کا پہلے سے مطالعہ فرمائیں۔
- مشقوں کے جوابات طلبہ ہی سے حل کرائیں جائیں نہ کہ خود ہی سوالوں کے جوابات پہلے سے دے دیئے جائیں۔
- تمام اسباق کے اختتام پر دلچسپ عملی سرگرمیاں دی گئی ہیں۔ سرگرمیوں کے حل کے لئے کچھ معاون نکات بھی دیئے گئے ہیں تا کہ اساتذہ کے لئے آسانی رہے۔ ان سرگرمیوں میں طلبہ سے کرائے گئے کاموں کو نمایاں کریں تا کہ ان کی حوصلہ افزائی ہو۔

ہم امید کرتے ہیں کہ "مطالعۂ قرآنِ حکیم" کی موثر تدریس میں یہ "رہنمائے اساتذہ" بہت معاون ثابت ہوگا اور اس کے حوصلہ افزا نتائج سامنے آئیں گے۔ ان شاء اللہ

COPYRIGHTS ® RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION. SALE OF THIS BOOK WOULD ENTAIL CIVIL & CRIMINAL ACTION.

"رہنمائے اساتذہ برائے مطالعۂ قرآنِ حکیم" کی خصوصیات

۱۔ اساتذہ کی تدریسی معاونت کے لئے **"عمومی تدریسی ہدایات"** وضاحت کے ساتھ دی گئی ہیں۔ جن کی ویڈیو ریکارڈنگ بھی موجود ہے۔

۲۔ اساتذہ کی سہولت کے لئے مطالعۂ قرآنِ حکیم کے ہر حصّہ کے **"اسباق کی منصوبہ بندی"** (Lesson Planning) کی گئی ہے۔

۳۔ نصاب کی تدریس کا وقتاً فوقتاً جائزہ لینے اور مشاورت کے لئے **"نصاب کا جائزہ فارم"** (Course Coverage Form) بھی دیا گیا ہے۔

۴۔ ہر قصہ اور سورت کی تدریس کے حوالہ سے اسباق کی وضاحت کے لئے **"طریقہ تدریس"** بتایا گیا ہے تاکہ اساتذہ کو روزانہ کی بنیاد پر اسباق کے تعین میں کوئی دشواری نہ ہو۔

۵۔ قصّوں اور سورتوں کے مطالعہ کے بعد متعلقہ اسباق کے بارے میں طلبہ کے فہم اور استعداد کا جائزہ لینے کے لئے اسباق کے **"مقاصدِ مطالعہ"** متعین کیئے گئے ہیں۔

۶۔ سورتوں کے مضامین کے مطابق **"ربطِ سورت"** کے نام سے سورتوں کا باہمی ربط بھی بیان کیا گیا ہے تاکہ سورتوں کا باہمی تعلق اور تسلسل سمجھنا آسان ہو۔

۷۔ ہر قصّہ اور سورت کے **"آیت بہ آیت تشریحی نکات"** سوال وجواب کی صورت میں دیئے گئے ہیں۔

۸۔ آیات کے مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے ان سے حاصل ہونے والی عملی باتوں کو **"عملی پہلو"** کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔

۹۔ آیات کی تشریحات میں **"قرآنِ حکیم کے دیگر مقامات"** کے حوالہ جات بھی دیئے گئے تاکہ متعلقہ بات قرآنِ حکیم کی روشنی میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہو جائے۔

۱۰۔ آیات کی وضاحت میں **"احادیث مبارکہ"** کے حوالہ جات بھی دیئے گئے ہیں تاکہ قرآنِ حکیم کے ساتھ ساتھ حدیث مبارکہ کی ضرورت واہمیت بھی واضح ہو اور قرآنی احکامات کی عملی شکل بھی واضح ہو سکے۔

۱۱۔ آیاتِ قرآنی میں بیان کی گئی تاریخی، سائنسی، معاشی، معاشرتی اور علمی باتوں کو **"نوٹ"** کے عنوان سے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں مزید مطالعہ کے لئے **"انٹرنیٹ کے لنکس"** بھی دیئے گئے ہیں۔

۱۲۔ آیاتِ قرآنی کے مضامین کے مطابق بعض عنوانات پر **"خصوصی نوٹ"** بھی دیئے گئے ہیں۔ مثلاً زمین، بادل، بارش، میٹھا پانی وغیرہ

۱۳۔ اساتذہ کی آسانی کے لئے **"مشقوں کے جوابات"** بھی دیئے گئے ہیں۔

۱۴۔ طلبہ کی ذہنی سطح اور دلچسپی کو مدّ نظر رکھتے ہوئے ہر سورت اور قصہ کے متعلق مزید **"عملی سرگرمیاں"** بھی دی گئی ہیں۔

۱۵۔ نصاب مطالعۂ قرآنِ حکیم کے حوالہ سے **"عمومی پوچھے جانے والے سوالات"** (FAQs) کے تسلی بخش جوابات دیئے گئے ہیں۔ الحمدللہ ان کی ویڈیو ریکارڈنگ بھی موجود ہے۔

۱۶۔ اساتذہ کی معاونت کے لئے مطالعۂ قرآنِ حکیم برائے طلباء وطالبات کے سالانہ امتحان کے لئے **"ماڈل پیپر"** بھی دیا گیا ہے۔

۱۷۔ "رہنمائے اساتذہ برائے مطالعۂ قرآنِ حکیم" کو مرتب کرنے میں خصوصی طور پر اہتمام کیا گیا ہے کہ **مسلکی اختلافات کے بیان سے گریز** کیا جائے اور ان ہی اُمور اور تشریحات کو بیان کیا جائے جن پر عموماً سب کا اتفاق پایا جاتا ہے۔

۱۸۔ "رہنمائے اساتذہ" کو مرتب کرنے میں **علماء کرام، حفّاظِ کرام، اساتذہ کرام اور والدین کی مشاورت** اور نظر ثانی سے استفادہ کیا گیا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اساتذہ کی رہنمائی کے لئے تدریسی ہدایات

تدریسی ہدایات کا مقصد

الحمد للہ دی علم فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام طلباء و طالبات کے لئے مطالعۂ قرآن حکیم کا جو نصاب تیار کیا گیا ہے اس کی تدریس کے حوالے سے کچھ گزارشات اور ہدایات اساتذہ کرام کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں۔ اگر اساتذہ کرام ان ہدایات کا خیال رکھیں گے تو ان شاء اللہ بہت بہتر طریقے پر اس نصاب کی تدریس کا عمل آگے بڑھ سکے گا۔ امید ہے اس طرح اس نصاب کے بنیادی مقاصد بھی حاصل ہو سکیں گے یعنی قرآنی تعلیمات کو سمجھنا، یاد رکھنا اور عملی زندگی میں قرآنی ہدایات پر عمل کرنا آسان ہو جائے گا، ان شاء اللہ۔

اساتذہ کرام تدریس کے دوران مندرجہ ذیل باتوں کو مدّ نظر رکھیں۔

1. سبق کے دوران عربی متن ضرور پڑھایا جائے لیکن یہ یاد رہے کہ یہ نصاب فہمِ قرآن کے حوالہ سے تیار کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس نصاب کے مطالعہ کے دوران فہمِ قرآن ہی پر توجہ دی جائے۔ اس نصاب کے لئے مختص کیا ہوا وقت تجوید کے قواعد سکھانے، مشق کروانے وغیرہ میں نہ صرف کیا جائے۔
2. اس نصاب کو رٹانا مقصود نہیں بلکہ ذہن نشین کرانا مقصود ہے۔
3. عربی متن کے ساتھ ترجمہ پڑھایا جائے۔ اور ترجمہ پر خاص توجہ دیتے ہوئے اسے بار بار دہرایا جائے۔ تاکہ بچوں کو اس سے زیادہ سے زیادہ آگاہی حاصل ہو اور وہ اس کو سمجھ سکیں۔
4. عربی متن کی تلاوت کے دوران یہ خیال رکھا جائے کہ الفاظ کی ادائیگی درست ہو اور اگر اساتذہ کی اس لحاظ سے کوئی کمزوری ہے تو ایسے طلباء و طالبات سے تلاوت کرائی جائے جن کی تجوید درست ہو۔
5. رنگوں کے استعمال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جو رنگ عربی متن کا ہے اتنا ہی ترجمہ پڑھایا جائے تاکہ طلباء کسی حد تک عربی سے بھی واقفیت حاصل کر سکیں اور اس کا ذوق و شوق پیدا ہو۔ لیکن یہ ذہن میں رہے کہ عربی گرامر سکھانا اس نصاب کا مقصود نہیں۔
6. جہاں تک ممکن ہو سکے اساتذہ خود بھی باوضو ہوں اور طلباء کو بھی اس کا پابند بنائیں تاکہ پاکیزگی اور طہارت کے ساتھ اس فریضہ کو سرانجام دیا جائے اور روحانی برکات کا حصول بھی ہو۔
7. خواتین اساتذہ کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ مخصوص ایام میں مکمل آیت کی تلاوت کرنے کے بجائے الفاظ کو توڑ توڑ کر علیحدہ علیحدہ پڑھیں کیونکہ اس کی گنجائش دی گئی ہے۔ مثلاً اَلۡحَمۡدُ۔۔۔ لِلّٰہِ۔۔۔ رَبِّ۔۔۔ الۡعٰلَمِیۡنَ
8. ”نکات برائے اساتذہ“ میں بعض مقامات پر آیات کی تشریح میں اضافی مواد صرف اساتذہ کی معلومات کے لئے دیا گیا ہے لہٰذا وہ طلباء کی ذہنی سطح کو مدّ نظر رکھتے ہوئے صرف ضروری تشریحات ہی انہیں سمجھائیں۔
9. رہنمائے اساتذہ میں دیئے گئے نکات سادہ صفحات پر بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق درج کروائیں۔
10. مطالعۂ قرآنِ حکیم کے نصاب کے ”اسباق کی منصوبہ بندی“ عمومی انداز میں اس طرح کی گئی ہے کہ حصہ اول کے لئے ایک کلاس میں عربی متن والا ایک صفحہ تجویز کیا گیا ہے اور ایک کلاس ”علم و عمل کی باتوں اور مشق“ کے لئے رکھی گئی ہے۔ لیکن اساتذہ اپنے اسکول کے نظام الاوقات، اپنی مرضی اور سہولت کے مطابق اسباق کی ترتیب اور مقدار میں تبدیلی لا سکتے ہیں۔

11. حصہ اول کے لئے ہفتہ وار کم سے کم دو اور دیگر حصوں کے لئے کم سے کم تین کلاس رکھ دی جائیں تو بہت ہی آسانی سے یہ نصاب مکمل ہو سکتا ہے۔
12. بعض سورتوں میں ہو سکتا ہے کم وقت درکار ہو لہذا جہاں مناسب سمجھیں وہ وقت دوسری سورتوں اور قصوں میں زیادہ استعمال کر سکتے ہیں۔ لہذا پہلے سے اس کی منصوبہ بندی کر لیں۔
13. فقہی بحثوں اور اختلافی مسائل کے بیان سے خود بھی گریز کریں اور بچوں کو بھی اس سے دور رکھیں تاکہ ان میں الجھنے اور وقت ضائع کرنے کے بجائے بامقصد باتوں کی طرف توجہ ہو۔
14. اختلافی مسائل کے بیان سے کیسے گریز کیا جائے جبکہ طلباء پوچھ رہے ہوں؟
15. "علم و عمل کی باتیں" وضاحت کے ساتھ بچوں کو سمجھائی جائیں اور مذاکرہ کے ذریعے ان کو ذہن نشین کرائی جائیں۔
16. بچوں کو اخلاقیات کیسے سکھائیں؟
17. انبیاء کرام علیہم السلام کے قصّوں کو عام فہم انداز میں کہانی کی صورت میں پڑھایا جائے تاکہ بچوں میں دلچسپی پیدا ہو۔
18. طلباء سے مختلف سوالات، کوئز پروگرام اور مقابلوں کے ذریعے ان میں قرآن فہمی کی دلچسپی پیدا کی جا سکتی ہے۔
19. "سمجھیں اور حل کریں" بچوں کو گھر کے کام (Homework) کے طور پر دیں تاکہ ان کی قرآن فہمی کا اندازہ ہو اور بعد میں کلاس میں خود حل کرائیں۔
20. اساتذہ آیات کی تشریحات رہنمائے اساتذہ میں دیئے گئے نکات تک محدود رکھیں یا پھر معتبر تفاسیر سے رجوع کریں۔ غیر مصدقہ مواد سے پرہیز کریں۔
21. "مطالعۂ قرآن حکیم" کی تدریس کے دوران بچوں کی عملی تربیت پر خصوصی توجہ دی جائے اور وقتاً فوقتاً اس کا جائزہ لیتے رہیں۔
22. تدریس کے دوران پیش آنے والے تجربات اور مفید باتوں کو نوٹ فرمائیں اور دی علم فاؤنڈیشن کو آگاہ فرمائیں۔
23. اگرچہ مشکل الفاظ سے حتی الامکان اجتناب کیا گیا ہے تاہم اگر دورانِ تدریس طلباء کو کوئی لفظ مشکل لگے یا اساتذہ کوئی متبادل لفظ تجویز کرنا چاہیں تو اس کی نشاندہی فرمائیں۔
24. تدریس کے دوران پیش آنے والے مسائل اور مشکلات کے حل کے لئے دی علم فاؤنڈیشن سے رابطہ کریں۔
25. اساتذہ کی سالانہ کارکردگی کو جانچنے کے بعد حوصلہ افزائی کی جائے گی۔
26. تمام اساتذہ ڈیمو کلاس اور تعارفی ویڈیو بھی ضرور دیکھیں۔
27. FAQs (عمومی پوچھے جانے والے سوالات) پر مبنی ویڈیو بھی ضرور دیکھیں۔
28. تمام اساتذہ ماہانہ کارکردگی کا فارم ہر مہینے کے اختتام پر پُر کر کے رکھیں تاکہ رابطہ کرنے پر آسانی رہے۔
29. اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے خصوصی دعا اور اخلاص نیت کا اہتمام کریں۔

نوٹ: مندرجہ بالا نکات کی تفصیلی وضاحت حصہ اوّل کے رہنمائے اساتذہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ یا ہماری ویب سائٹ www.tif.edu.pk سے ڈاؤن لوڈ کر لیں۔

COPYRIGHTS © RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION. SALE OF THIS BOOK WOULD ENTAIL CIVIL & CRIMINAL ACTION.

نوٹ: "اسباق کی منصوبہ بندی" عمومی انداز میں اس طرح کی گئی ہے کہ ایک کلاس میں عربی متن والے دو صفحات تجویز کیئے گئے ہیں اور ایک کلاس **"علم و عمل کی باتوں اور مشق"** کے لئے رکھی گئی ہے۔ لیکن اساتذہ اپنے اسکول کے نظام الاوقات، اپنی مرضی اور سہولت کے مطابق اسباق کی ترتیب اور مقدار میں تبدیلی لا سکتے ہیں۔

اسباق کی منصوبہ بندی (Lesson Planning)

نمبر شمار	عنوان سبق	تفصیل	صفحہ نمبر
سبق نمبر ۱	سُوْرَۃُ الْاَنْعَام (حصّہ اوّل)	شانِ نزول اور تعارف، قرآنی متن اور ترجمہ	۱۴،۱۳
سبق نمبر ۲	سُوْرَۃُ الْاَنْعَام (حصّہ اوّل)	قرآنی متن اور ترجمہ	۱۶تا۱۸
سبق نمبر ۳	سُوْرَۃُ الْاَنْعَام (حصّہ اوّل)	قرآنی متن اور ترجمہ	۲۰تا۲۲
سبق نمبر ۴	سُوْرَۃُ الْاَنْعَام (حصّہ اوّل)	قرآنی متن اور ترجمہ	۲۴،۲۳
سبق نمبر ۵	سُوْرَۃُ الْاَنْعَام (حصّہ اوّل)	علم و عمل کی باتیں اور ہم نے کیا سمجھا؟	۲۵تا۲۷
سبق نمبر ۶	سُوْرَۃُ الْاَنْعَام (حصّہ دوم)	قرآنی متن اور ترجمہ	۲۸تا۳۰
سبق نمبر ۷	سُوْرَۃُ الْاَنْعَام (حصّہ دوم)	قرآنی متن اور ترجمہ	۳۳،۳۲
سبق نمبر ۸	سُوْرَۃُ الْاَنْعَام (حصّہ دوم)	قرآنی متن اور ترجمہ	۳۴تا۳۶
سبق نمبر ۹	سُوْرَۃُ الْاَنْعَام (حصّہ دوم)	قرآنی متن اور ترجمہ	۳۷تا۳۸
سبق نمبر ۱۰	سُوْرَۃُ الْاَنْعَام (حصّہ دوم)	قرآنی متن اور ترجمہ	۴۰تا۴۲
سبق نمبر ۱۱	سُوْرَۃُ الْاَنْعَام (حصّہ دوم)	قرآنی متن اور ترجمہ	۴۱،۴۲
سبق نمبر ۱۲	سُوْرَۃُ الْاَنْعَام (حصّہ دوم)	علم و عمل کی باتیں اور ہم نے کیا سمجھا؟	۴۴تا۴۶
سبق نمبر ۱۳	سُوْرَۃُ الْاَعْرَاف (حصّہ اوّل)	شانِ نزول اور تعارف، قرآنی متن اور ترجمہ	۴۸،۴۷
سبق نمبر ۱۴	سُوْرَۃُ الْاَعْرَاف (حصّہ اوّل)	قرآنی متن اور ترجمہ	۵۰تا۵۲
سبق نمبر ۱۵	سُوْرَۃُ الْاَعْرَاف (حصّہ اوّل)	قرآنی متن اور ترجمہ	۵۵،۵۴
سبق نمبر ۱۶	سُوْرَۃُ الْاَعْرَاف (حصّہ اوّل)	علم و عمل کی باتیں اور ہم نے کیا سمجھا؟	۵۶تا۵۸
سبق نمبر ۱۷	قصّہ اصحاب سبت	مختصر خلاصہ	۶۰تا۶۲
سبق نمبر ۱۸	سُوْرَۃُ الْاَعْرَاف (حصّہ دوم)	قرآنی متن اور ترجمہ	۶۳،۶۴
سبق نمبر ۱۹	سُوْرَۃُ الْاَعْرَاف (حصّہ دوم)	قرآنی متن اور ترجمہ	۶۷،۶۶

سبق نمبر ۲۰	سُوْرَۃُ الْاَعْرَاف (حصّہ دوم)	قرآنی متن اور ترجمہ	۶۸تا۷۰
سبق نمبر ۲۱	سُوْرَۃُ الْاَعْرَاف (حصّہ دوم)	قرآنی متن اور ترجمہ	۷۱، ۷۲
سبق نمبر ۲۲	سُوْرَۃُ الْاَعْرَاف (حصّہ دوم)	علم و عمل کی باتیں اور ہم نے کیا سمجھا؟	۷۳تا۷۵
سبق نمبر ۲۳	سُوْرَۃُ یُوْنُس (حصّہ اوّل)	شانِ نزول اور تعارف، قرآنی متن اور ترجمہ	۷۶تا۷۸
سبق نمبر ۲۴	سُوْرَۃُ یُوْنُس (حصّہ اوّل)	قرآنی متن اور ترجمہ	۷۹، ۸۰
سبق نمبر ۲۵	سُوْرَۃُ یُوْنُس (حصّہ اوّل)	قرآنی متن اور ترجمہ	۸۲، ۸۳
سبق نمبر ۲۶	سُوْرَۃُ یُوْنُس (حصّہ اوّل)	قرآنی متن اور ترجمہ	۸۴تا۸۶
سبق نمبر ۲۷	سُوْرَۃُ یُوْنُس (حصّہ اوّل)	علم و عمل کی باتیں اور ہم نے کیا سمجھا؟	۸۷تا۸۹
سبق نمبر ۲۸	سُوْرَۃُ یُوْنُس (حصّہ دوم)	قرآنی متن اور ترجمہ	۹۰، ۹۱
سبق نمبر ۲۹	سُوْرَۃُ یُوْنُس (حصّہ دوم)	قرآنی متن اور ترجمہ	۹۲تا۹۴
سبق نمبر ۳۰	سُوْرَۃُ یُوْنُس (حصّہ دوم)	قرآنی متن اور ترجمہ	۹۵، ۹۶
سبق نمبر ۳۱	سُوْرَۃُ یُوْنُس (حصّہ دوم)	علم و عمل کی باتیں اور ہم نے کیا سمجھا؟	۹۸تا۱۰۰
سبق نمبر ۳۲	سُوْرَۃُ ھُوْد	شانِ نزول اور تعارف، قرآنی متن اور ترجمہ	۱۰۱، ۱۰۴
سبق نمبر ۳۳	سُوْرَۃُ ھُوْد	قرآنی متن اور ترجمہ	۱۰۵، ۱۰۶
سبق نمبر ۳۴	سُوْرَۃُ ھُوْد	قرآنی متن اور ترجمہ	۱۰۸، ۱۱۰
سبق نمبر ۳۵	سُوْرَۃُ ھُوْد	علم و عمل کی باتیں اور ہم نے کیا سمجھا؟	۱۱۱تا۱۱۳
سبق نمبر ۳۶	سُوْرَۃُ الرَّعْد	شانِ نزول اور تعارف، قرآنی متن اور ترجمہ	۱۱۴تا۱۱۶
سبق نمبر ۳۷	سُوْرَۃُ الرَّعْد	قرآنی متن اور ترجمہ	۱۱۷، ۱۲۰
سبق نمبر ۳۸	سُوْرَۃُ الرَّعْد	قرآنی متن اور ترجمہ	۱۲۱، ۱۲۳
سبق نمبر ۳۹	سُوْرَۃُ الرَّعْد	علم و عمل کی باتیں اور ہم نے کیا سمجھا؟	۱۲۴تا۱۲۶
سبق نمبر ۴۰	سُوْرَۃُ اِبْرٰھِیْم	شانِ نزول اور تعارف، قرآنی متن اور ترجمہ	۱۲۷تا۱۲۹
سبق نمبر ۴۱	سُوْرَۃُ اِبْرٰھِیْم	قرآنی متن اور ترجمہ	۱۳۰، ۱۳۱
سبق نمبر ۴۲	سُوْرَۃُ اِبْرٰھِیْم	قرآنی متن اور ترجمہ	۱۳۲تا۱۳۵
سبق نمبر ۴۳	سُوْرَۃُ اِبْرٰھِیْم	علم و عمل کی باتیں اور ہم نے کیا سمجھا؟	۱۳۶تا۱۳۸

COPYRIGHTS © RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION. SALE OF THIS BOOK WOULD ENTAIL CIVIL & CRIMINAL ACTION.

سبق نمبر ۴۴	سُوْرَۃُ الْحِجْر	شانِ نزول اور تعارف، قرآنی متن اور ترجمہ	۱۳۹ تا ۱۴۲
سبق نمبر ۴۵	سُوْرَۃُ الْحِجْر	قرآنی متن اور ترجمہ	۱۴۳، ۱۴۴
سبق نمبر ۴۶	سُوْرَۃُ الْحِجْر	قرآنی متن اور ترجمہ	۱۴۶
سبق نمبر ۴۷	سُوْرَۃُ الْحِجْر	علم و عمل کی باتیں اور ہم نے کیا سمجھا؟	۱۴۷ تا ۱۴۹
سبق نمبر ۴۸	سُوْرَۃُ النَّحْل (حصّہ اوّل)	شانِ نزول اور تعارف، قرآنی متن اور ترجمہ	۱۵۰ تا ۱۵۲
سبق نمبر ۴۹	سُوْرَۃُ النَّحْل (حصّہ اوّل)	قرآنی متن اور ترجمہ	۱۵۳ تا ۱۵۶
سبق نمبر ۵۰	سُوْرَۃُ النَّحْل (حصّہ اوّل)	قرآنی متن اور ترجمہ	۱۵۷ تا ۱۵۹
سبق نمبر ۵۱	سُوْرَۃُ النَّحْل (حصّہ اوّل)	علم و عمل کی باتیں اور ہم نے کیا سمجھا؟	۱۶۰ تا ۱۶۲
سبق نمبر ۵۲	سُوْرَۃُ النَّحْل (حصّہ دوم)	قرآنی متن اور ترجمہ	۱۶۳، ۱۶۴
سبق نمبر ۵۳	سُوْرَۃُ النَّحْل (حصّہ دوم)	قرآنی متن اور ترجمہ	۱۶۶، ۱۶۷
سبق نمبر ۵۴	سُوْرَۃُ النَّحْل (حصّہ دوم)	قرآنی متن اور ترجمہ	۱۶۸ تا ۱۷۰
سبق نمبر ۵۵	سُوْرَۃُ النَّحْل (حصّہ دوم)	قرآنی متن اور ترجمہ	۱۷۱، ۱۷۲
سبق نمبر ۵۶	سُوْرَۃُ النَّحْل (حصّہ دوم)	علم و عمل کی باتیں اور ہم نے کیا سمجھا؟	۱۷۴ تا ۱۷۶
سبق نمبر ۵۷	واقعۂ معراج	مختصر خلاصہ	۱۷۷ تا ۱۷۹
سبق نمبر ۵۸	واقعۂ معراج	مختصر خلاصہ	۱۸۰، ۱۸۱
سبق نمبر ۵۹	واقعۂ معراج	مختصر خلاصہ	۱۸۲
سبق نمبر ۶۰	تاریخِ بنی اسرائیل	مختصر خلاصہ	۱۸۴ تا ۱۸۶
سبق نمبر ۶۱	تاریخِ بنی اسرائیل	مختصر خلاصہ	۱۸۸، ۱۸۷
سبق نمبر ۶۲	سُوْرَۃُ بَنِیٓ اِسْرَآءِیْل (حصّہ اوّل)	شانِ نزول اور تعارف، قرآنی متن اور ترجمہ	۱۸۹، ۱۹۰
سبق نمبر ۶۳	سُوْرَۃُ بَنِیٓ اِسْرَآءِیْل (حصّہ اوّل)	قرآنی متن اور ترجمہ	۱۹۲ تا ۱۹۳
سبق نمبر ۶۴	سُوْرَۃُ بَنِیٓ اِسْرَآءِیْل (حصّہ اوّل)	قرآنی متن اور ترجمہ	۱۹۴ تا ۱۹۶
سبق نمبر ۶۵	سُوْرَۃُ بَنِیٓ اِسْرَآءِیْل (حصّہ اوّل)	علم و عمل کی باتیں اور ہم نے کیا سمجھا؟	۱۹۷ تا ۲۰۰
سبق نمبر ۶۶	سُوْرَۃُ بَنِیٓ اِسْرَآءِیْل (حصّہ دوم)	قرآنی متن اور ترجمہ	۲۰۱، ۲۰۲
سبق نمبر ۶۷	سُوْرَۃُ بَنِیٓ اِسْرَآءِیْل (حصّہ دوم)	قرآنی متن اور ترجمہ	۲۰۴ تا ۲۰۷

COPYRIGHTS ® RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION. SALE OF THIS BOOK WOULD ENTAIL CIVIL & CRIMINAL ACTION

سبق نمبر ۶۸	سُوْرَۃُ بَنِیٓ اِسْرَآءِیْل (حصّہ دوم)	قرآنی متن اور ترجمہ	۲۰۸، ۲۰۹
سبق نمبر ۶۹	سُوْرَۃُ بَنِیٓ اِسْرَآءِیْل (حصّہ دوم)	علم و عمل کی باتیں اور ہم نے کیا سمجھا؟	۲۱۰ تا ۲۱۲
سبق نمبر ۷۰	قصّہ اصحابِ کہف	مختصر خلاصہ	۲۱۳، ۲۱۴
سبق نمبر ۷۱	قصّہ اصحابِ کہف	مختصر خلاصہ	۲۱۵، ۲۱۶
سبق نمبر ۷۲	باغ والے کا قصّہ	مختصر خلاصہ	۲۱۷، ۲۱۸
سبق نمبر ۷۳	سُوْرَۃُ الْکَھْف (حصّہ اوّل)	شانِ نزول اور تعارف، قرآنی متن اور ترجمہ	۲۱۹، ۲۲۰
سبق نمبر ۷۴	سُوْرَۃُ الْکَھْف (حصّہ اوّل)	قرآنی متن اور ترجمہ	۲۲۲ تا ۲۲۴
سبق نمبر ۷۵	سُوْرَۃُ الْکَھْف (حصّہ اوّل)	قرآنی متن اور ترجمہ	۲۲۶، ۲۲۷
سبق نمبر ۷۶	سُوْرَۃُ الْکَھْف (حصّہ اوّل)	قرآنی متن اور ترجمہ	۲۲۸، ۲۲۹
سبق نمبر ۷۷	سُوْرَۃُ الْکَھْف (حصّہ اوّل)	علم و عمل کی باتیں اور ہم نے کیا سمجھا؟	۲۳۰ تا ۲۳۳
سبق نمبر ۷۸	قصّہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام	مختصر خلاصہ	۲۳۴، ۲۳۵
سبق نمبر ۷۹	قصّہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام	مختصر خلاصہ	۲۳۶، ۲۳۷
سبق نمبر ۸۰	قصّہ ذوالقرنین	مختصر خلاصہ	۲۳۸ تا ۲۴۰
سبق نمبر ۸۱	سُوْرَۃُ الْکَھْف (حصّہ دوم)	قرآنی متن اور ترجمہ	۲۴۱، ۲۴۲
سبق نمبر ۸۲	سُوْرَۃُ الْکَھْف (حصّہ دوم)	قرآنی متن اور ترجمہ	۲۴۴، ۲۴۵
سبق نمبر ۸۳	سُوْرَۃُ الْکَھْف (حصّہ دوم)	قرآنی متن اور ترجمہ	۲۴۶
سبق نمبر ۸۴	سُوْرَۃُ الْکَھْف (حصّہ دوم)	علم و عمل کی باتیں اور ہم نے کیا سمجھا؟	۲۴۸ تا ۲۵۱
سبق نمبر ۸۵	سُوْرَۃُ الْمُؤْمِنُوْن	شانِ نزول اور تعارف، قرآنی متن اور ترجمہ	۲۵۲ تا ۲۵۴
سبق نمبر ۸۶	سُوْرَۃُ الْمُؤْمِنُوْن	قرآنی متن اور ترجمہ	۲۵۵، ۲۵۶
سبق نمبر ۸۷	سُوْرَۃُ الْمُؤْمِنُوْن	قرآنی متن اور ترجمہ	۲۵۸، ۲۵۹
سبق نمبر ۸۸	سُوْرَۃُ الْمُؤْمِنُوْن	قرآنی متن اور ترجمہ	۲۶۰ تا ۲۶۳
سبق نمبر ۸۹	سُوْرَۃُ الْمُؤْمِنُوْن	علم و عمل کی باتیں اور ہم نے کیا سمجھا؟	۲۶۴ تا ۲۶۶
سبق نمبر ۹۰	سُوْرَۃُ الزُّمَر	شانِ نزول اور تعارف، قرآنی متن اور ترجمہ	۲۶۷، ۲۶۸
سبق نمبر ۹۱	سُوْرَۃُ الزُّمَر	قرآنی متن اور ترجمہ	۲۷۰ تا ۲۷۲

COPYRIGHTS ® RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION. SALE OF THIS BOOK IS A CRIMINAL ACTION

سبق نمبر ۹۲	سُوْرَةُ الزُّمَر	قرآنی متن اور ترجمہ	۲۷۴تا۲۷۶
سبق نمبر ۹۳	سُوْرَةُ الزُّمَر	قرآنی متن اور ترجمہ	۲۷۸
سبق نمبر ۹۴	سُوْرَةُ الزُّمَر	علم و عمل کی باتیں اور ہم نے کیا سمجھا؟	۲۷۹تا۲۸۱
سبق نمبر ۹۵	سُوْرَةُ الْمُؤْمِن	شانِ نزول اور تعارف، قرآنی متن اور ترجمہ	۲۸۲تا۲۸۴
سبق نمبر ۹۶	سُوْرَةُ الْمُؤْمِن	قرآنی متن اور ترجمہ	۲۸۵،۲۸۶
سبق نمبر ۹۷	سُوْرَةُ الْمُؤْمِن	قرآنی متن اور ترجمہ	۲۸۸تا۲۹۰
سبق نمبر ۹۸	سُوْرَةُ الْمُؤْمِن	قرآنی متن اور ترجمہ	۱۲۹تا۲۹۴
سبق نمبر ۹۹	سُوْرَةُ الْمُؤْمِن	علم و عمل کی باتیں اور ہم نے کیا سمجھا؟	۲۹۵تا۲۹۷
سبق نمبر ۱۰۰	سُوْرَةُ حٰمٓ السَّجْدَة	شانِ نزول اور تعارف، قرآنی متن اور ترجمہ	۲۹۸تا۳۰۰
سبق نمبر ۱۰۱	سُوْرَةُ حٰمٓ السَّجْدَة	قرآنی متن اور ترجمہ	۳۰۱،۳۰۴
سبق نمبر ۱۰۲	سُوْرَةُ حٰمٓ السَّجْدَة	قرآنی متن اور ترجمہ	۳۰۵،۳۰۶
سبق نمبر ۱۰۳	سُوْرَةُ حٰمٓ السَّجْدَة	علم و عمل کی باتیں اور ہم نے کیا سمجھا؟	۳۰۷تا۳۰۹
سبق نمبر ۱۰۴	سُوْرَةُ الشُّوْرٰی	شانِ نزول اور تعارف، قرآنی متن اور ترجمہ	۳۱۲،۳۱۰
سبق نمبر ۱۰۵	سُوْرَةُ الشُّوْرٰی	قرآنی متن اور ترجمہ	۳۱۴،۳۱۳
سبق نمبر ۱۰۶	سُوْرَةُ الشُّوْرٰی	قرآنی متن اور ترجمہ	۳۱۶،۳۱۷
سبق نمبر ۱۰۷	سُوْرَةُ الشُّوْرٰی	قرآنی متن اور ترجمہ	۳۱۸
سبق نمبر ۱۰۸	سُوْرَةُ الشُّوْرٰی	علم و عمل کی باتیں اور ہم نے کیا سمجھا؟	۳۱۹تا۳۲۱

The ILM Foundation (TIF)

Lesson Planning for Mutalae Quran-e-Hakeem Part-5

Chapter #	Chapter Name	Lessons Required	سبق
1	Surah Al-Anaam (Part-1)	5	سُوْرَةُ الْاَنْعَام (حصہ اوّل)
2	Surah Al-Anaam (Part-2)	7	سُوْرَةُ الْاَنْعَام (حصہ دوم)
3	Surah Al-Aaraaf (Part-1)	4	سُوْرَةُ الْاَعْرَاف (حصہ اوّل)
4	Story of "Ashab-e-Sabt"	1	قصہ اصحابِ سبت
5	Surah Al-Aaraaf (Part-2)	5	سُوْرَةُ الْاَعْرَاف (حصہ دوم)
6	Surah Yunus (Part-1)	5	سُوْرَةُ يُوْنُس (حصہ اوّل)
7	Surah Yunus (Part-2)	4	سُوْرَةُ يُوْنُس (حصہ دوم)
8	Surah Hud	4	سُوْرَةُ هُوْد
9	Surah Ar-Raad	4	سُوْرَةُ الرَّعْد
10	Surah Ibrahim	4	سُوْرَةُ اِبْرٰهِيْم
11	Surah Al-Hijr	4	سُوْرَةُ الْحِجْر
12	Surah An-Nahl (Part-1)	4	سُوْرَةُ النَّحْل (حصہ اوّل)
13	Surah An-Nahl (Part-2)	5	سُوْرَةُ النَّحْل (حصہ دوم)
14	Story of "Mi'raj"	3	واقعۂ معراج
15	History of Bani Israil	2	تاریخ بنی اسرائیل
16	Surah Bani Israel (Part-1)	4	سُوْرَةُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْل (حصہ اوّل)
17	Surah Bani Israel (Part-2)	4	سُوْرَةُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْل (حصہ دوم)
18	Story of "Ashab-e-Kahf"	2	قصہ اصحابِ کہف
19	Story of "The People of the Garden"	1	باغ والے کا قصہ
20	Surah Al-Kahf (Part-1)	5	سُوْرَةُ الْكَهْف (حصہ اوّل)
21	Story of "Prophet Musa علیہ السلام & Khizr علیہ السلام"	2	قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام
22	Story of "Zul Qarnain"	1	قصہ ذوالقرنین
23	Surah Al-Kahf (Part-2)	4	سُوْرَةُ الْكَهْف (حصہ دوم)
24	Surah Al-Muminun	5	سُوْرَةُ الْمُؤْمِنُوْن
25	Surah Az-Zumar	5	سُوْرَةُ الزُّمَر
26	Surah Al-Mumin	5	سُوْرَةُ الْمُؤْمِن
27	Surah Hameem Sajda	4	سُوْرَةُ حٰمٓ السَّجْدَة
28	Surah Ash-Shuraa	5	سُوْرَةُ الشُّوْرٰى
Total Lessons		108	کُل اسباق

COPYRIGHTS © RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION. SALE OF THIS BOOK WOULD ENTAIL CIVIL & CRIMINAL ACTION.

The ILM Foundation (TIF) دی علم فاؤنڈیشن

Course Coverage Form نصاب کی تکمیل کا جائزہ کا فارم

Mutalae Quran-e-Hakeem Part-5 مطالعہ قرآنِ حکیم۔ حصہ پنجم

School: ______________ **Address:** ______________ **Branch:** ________ **Date:** ____________

Month: ________

نوٹ: راہنمائے اساتذہ میں دی گئی "Lesson Planning" کے مطابق پڑھائے گئے اسباق کی تعداد نیچے درج کیجیے۔

Chapter Nos.	Chapter	Classes								سبق
		III	IV	V	VI	VII	VIII	IX	X	
	No. of Students									طلباء و طالبات کی تعداد
1	Surah Al-Anaam (Part-1)									سُوْرَةُ الْاَنْعَام (حصہ اوّل)
2	Surah Al-Anaam (Part-2)									سُوْرَةُ الْاَنْعَام (حصہ دوم)
3	Surah Al-Aaraaf (Part-1)									سُوْرَةُ الْاَعْرَاف (حصہ اوّل)
4	Story of "Ashab-e-Sabt"									قصہ اصحابِ سبت
5	Surah Al-Aaraaf (Part-2)									سُوْرَةُ الْاَعْرَاف (حصہ دوم)
6	Surah Yunus (Part-1)									سُوْرَةُ یُوْنُس (حصہ اوّل)
7	Surah Yunus (Part-2)									سُوْرَةُ یُوْنُس (حصہ دوم)
8	Surah Hud									سُوْرَةُ هُوْد
9	Surah Ar-Raad									سُوْرَةُ الرَّعْد
10	Surah Ibrahim									سُوْرَةُ اِبْرَاهِیْم
11	Surah Al-Hijr									سُوْرَةُ الْحِجْر
12	Surah An-Nahl (Part-1)									سُوْرَةُ النَّحْل (حصہ اوّل)
13	Surah An-Nahl (Part-2)									سُوْرَةُ النَّحْل (حصہ دوم)
14	Story of "Mi'raj"									واقعۂ معراج
15	History of Bani Israil									تاریخِ بنی اسرائیل
16	Surah Bani Israel (Part-1)									سُوْرَةُ بَنِیْ اِسْرَآءِیْل (حصہ اوّل)
17	Surah Bani Israel (Part-2)									سُوْرَةُ بَنِیْ اِسْرَآءِیْل (حصہ دوم)
18	Story of "Ashab-e-Kahf"									قصہ اصحابِ کہف
19	Story of "The People of the Garden"									باغ والے کا قصہ
20	Surah Al-Kahf (Part-1)									سُوْرَةُ الْکَهْف (حصہ اوّل)
21	Story of "Prophet Mosa علیہ السلام & Khizr علیہ السلام"									قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام
22	Story of "Zul Qarnain"									قصہ ذوالقرنین
23	Surah Al-Kahf (Part-2)									سُوْرَةُ الْکَهْف (حصہ دوم)
24	Surah Al-Muminun									سُوْرَةُ الْمُؤْمِنُوْن
25	Surah Az-Zumar									سُوْرَةُ الزُّمَر
26	Surah Al-Mumin									سُوْرَةُ الْمُؤْمِن
27	Surah Hameem Sajda									سُوْرَةُ حٰمٓ السَّجْدَة
28	Surah Ash-Shuraa									سُوْرَةُ الشُّوْرٰی

Principal's Signature: ______________ **For Office Use:** ______________

COPYRIGHTS ® RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION. SALE OF THIS BOOK WOULD ENTAIL CIVIL & CRIMINAL ACTION.

سُوْرَةُ الْاَنْعَام

مقاصد مطالعہ:

اس سورت کے مطالعہ کے بعد طلبہ وطالبات میں اتنی استعداد پیدا ہوجائے کہ وہ مندرجہ ذیل مضامین سے آگاہی حاصل کر سکیں:

ا۔ صفات باری تعالیٰ۔ ۲۔ مشرکین مکہ کا بار بار معجزات کا مطالبہ۔ ۳۔ اللہ ﷻ کی طرف سے قرآن حکیم ہی کو معجزہ کے طور پر پیش کیئے جانے کا بیان۔ ۴۔ مشرکین کے مطالبہ پر نبی کریم ﷺ کی دلجوئی۔ ۵۔ مشرکین کے شرکیہ عقائد واعمال کا رد۔ ۶۔ دعوتِ انبیاء کرام علیہم السلام۔ ۷۔ مشرکین مکہ پر اتمام حجت۔ ۸۔ مشرکین کی قیادت کا مکر وفریب اور غرور۔ ۹۔ قریش کے مَن پسند فیصلے اور باطل رسومات۔ ۱۰۔ توحید ودعوت کا خلاصہ اور رد شرک۔

ربط سورت:

سورۃ المائدہ میں یہود و نصاریٰ کے باطل عقائد، اسلامی شریعت سے فرار اوران پر اتمام حجت کا تذکرہ ہے اور سورۃ الانعام میں مشرکین مکہ کے شرکیہ عقائد کا بیان اور ان پر اتمام حجت کا ذکر ہے۔

سورۃ الانعام کی فضیلت:

ا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: "سورۃ الانعام قرآن کی افضل سورتوں میں سے ایک سورت ہے۔" (سنن دارمی)

۲۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: "سورۃ الانعام مکمل ایک ہی رات میں نازل ہوئی۔ ستر ہزار فرشتے اللہ ﷻ کی تسبیح کرتے ہوئے اِسے لے کر نازل ہوئے"۔ (طبرانی)

علمی بات: اس سورت میں "انعام" یعنی چوپاؤں کے بعض احکام بیان فرمائے گئے ہیں اس لئے یہ سورت "الانعام" کہلاتی ہے۔ اس سورت میں احکام کا بیان کم ہے زیادہ تر توحید کے اصول اور دلائل بیان فرمائے گئے ہیں۔

آیت نمبر ا: اس آیت کا موضوع عقیدۂ توحید ہے۔ اس سورت میں اللہ ﷻ کی حمد اور صفتِ تخلیق کا بیان ہے اوراس کا آغاز کلمۂ حمد یعنی "الحمدللہ" سے کیا گیا ہے۔

علمی بات: حمد کا معنی تعریف بھی ہوسکتا ہے اور شکر بھی۔ تعریف (حمد) عام ہے اور شکر خاص۔ حمد کا تعلق قابل تعریف کارناموں سے ہے۔ مثلاً اللہ ﷻ نے زمین و آسمان، شمس و قمر اور ستاروں کی حرکت غرض تمام کائنات کا اس قدر مربوط اور منظم نظام بنادیا ہے جسے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس پر اللہ ﷻ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اور شکر کا تعلق ان انعامات سے ہوتا ہے۔ جو کسی خاص ذات سے متعلق ہوں مثلاً اللہ ﷻ کا انسان کو بہترین صورت میں پیدا کرنا، صحت اور رزق کی فراوانیوں سے مالامال کرنا وغیرہ۔ ایسی نعمتوں کے اعتراف کو شکر کہا جاتا ہے۔

عملی پہلو: مخلوق میں سے کوئی شخص کوئی قابل تعریف کارنامہ سرانجام دے اور اس پر اس کی تعریف کی جائے تو وہ بھی حقیقتاً اللہ ﷻ ہی کی تعریف ہوگی۔ کیونکہ قابل تعریف کام کرنے کی صلاحیت اور توفیق بھی اللہ ﷻ ہی کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ اس طرح ہر قسم کی تعریف کا مستحق اللہ ﷻ ہی قرار پاتا ہے۔

نوٹ: قرآنِ حکیم کی پانچ سورتوں کا آغاز "الحمدللہ" سے کیا گیا ہے۔ i۔ سورۃ الفاتحہ۔ ii۔ سورۃ الانعام۔ iii۔ سورۃ الکہف۔ iv۔ سورۃ سبا۔ v۔ سورۃ فاطر۔ اس آیت میں اللہ ﷻ کی صفتِ تخلیق کا بیان ہے کہ اللہ ﷻ نے ہی آسمان وزمین اور اندھیرا اور روشنی پیدا کئے۔

علمی بات: ا۔ خلق کے معنی عدم سے وجود میں لانے کے آتے ہیں یعنی ایک چیز کا کوئی وجود نہ تھا پھر اس کی تخلیق کر کے وجود عطا کیا گیا اور خلق کے معنیٰ پہلے سے موجود اجزا باہم ملا کر کوئی نئی چیز بنانے کے بھی آتے ہیں۔ یہاں عدم سے وجود بخشنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ لفظ خلق کی نسبت

ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف حقیقی ہے اور بندوں کی طرف اس کی نسبت مجازی ہے ہر چیز کا خالق حقیقی اللہ ﷻ ہے اور مخصوص اجزاء کو ملا دینے سے جو نئی شکل وصورت حاصل ہوگی اس کی نسبت بندوں کی طرف کرنا نسبتِ مجازی کہلائی گی۔

۲۔ ظلمات یعنی اندھیروں سے رات کی تاریکی اور نور سے دن کی روشنی یا اس سے کفر کی تاریکی اور ایمان کی روشنی مراد ہے۔ ظلمت کی تعبیر غلط اور گمراہی کے راستہ کی ہے جو کہ بہت سارے ہیں۔ اس لئے جمع کا لفظ ظلمات ذکر کیا۔ نور کی تعبیر سیدھے اور ہدایت کے راستہ کی ہے جو ایک ہے۔ اس لئے واحد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ظلمت میں کفر، شرک، نفاق اور ہر طرح کے گناہ شامل ہیں۔ خواہ وہ گناہ عقیدے کے ہوں یا عمل کے، سب ظلمات یعنی اندھیرے ہیں۔

۳۔ شرک پر تعجب کے اظہار کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ جب ساری چیزوں کا خالق اللہ ﷻ ہی ہے تو پھر شرک کی گنجائش کہاں سے آنکلی؟ اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کائنات کی چیزوں میں بظاہر جو تضاد نظر آتا ہے، مثلاً زمین و آسمان، روشنی و تاریکی، سردی و گرمی، تو اس تضاد کے اندر اس کائنات اور اس میں بسنے والی مخلوقات کی بقا کے لئے ایسی حیرت انگیز کارسازی نظر آتی ہے کہ کوئی عاقل تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ان میں سے ہر ایک کا خالق جُدا جُدا ہے۔ بلکہ ہر ذی عقل یہ ماننے پر مجبور ہے کہ پوری کائنات ایک ہی کارفرما کے ارادے اور مشیت کے تحت حرکت کر رہی ہے۔ خواہ زبان سے اس کا اقرار کرے یا نہ کرے۔

آیت نمبر ۲: اس آیت میں اللہ ﷻ کی صفت قدرت کا بیان ہے۔ مٹی سے انسان کی تخلیق اور مرنے کے بعد دوبارہ زندگی کا بیان ہے۔ مٹی سے تخلیق فرمانے سے مراد یہ ہے کہ تمہارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا فرمایا، جو تمہاری اصل ہیں۔ اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے تم جو غذائیں کھاتے ہو، سب زمین کی مٹی سے پیدا ہوتی ہیں اور انہیں غذاؤں سے نطفہ بنتا ہے جو رحمِ مادر میں ٹھہر کر تخلیق انسانی کا سبب بنتا ہے۔ اس لحاظ سے تمہاری پیدائش مٹی سے ہوئی۔

علمی بات: پہلی ”اَجَلِ“ سے مراد پیدائش سے لے کر موت تک کا عرصہ ہے اور دوسری مدت ”اَجَلِ مُّسَمًّى“ سے انسان کی موت سے لے کر وقوعِ قیامت تک کی مدت مراد ہے۔ یعنی جیسے ہر فرد کا وقت اجل متعین ہے ایسے ہی عالَمِ دنیا کے خاتمے کے لئے بھی ایک وقت متعین ہے۔ جس طرح ایک وقت معین پر کسی فرد کی موت واقع ہو جاتی ہے اس طرح ایک وقت معین پر قیامت برپا ہوگی۔ نظامِ دنیا ختم کر دیا جائے گا اور اُخروی زندگی کا آغاز ہو جائے گا۔

آیت نمبر ۳: اس آیت میں اللہ ﷻ کی صفتِ علم کا بیان ہے کہ اللہ ﷻ انسان کے ظاہر و باطن سے واقف ہے۔ اللہ ﷻ کا آسمان اور زمین کے معبود برحق ہونے کا بیان ہے یعنی صرف وہی عبادت کا حق دار ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کے زمین و آسمان میں ہونے سے مراد یہ ہے کہ اللہ ﷻ خود تو عرش پر جلوہ فرما ہے۔ جس طرح اس کی شان کے لائق ہے۔ البتہ اس کے علم و احاطہ سے کوئی چیز باہر نہیں، وہ تمام مخلوقات کے ظاہری اور پوشیدہ کاموں سے باخبر ہے۔ اس سے کوئی چیز مخفی نہیں، نیز اس سے یہ بھی ہے کہ آسمانوں اور زمینوں میں معبودِ برحق وہی ہے لہٰذا صرف اسی کی عبادت کی جائے۔ آیت کے آخر میں اللہ ﷻ کے علم کا ذکر ہے کہ وہ ہر شے سے اتنا واقف اور اتنا باخبر ہے کہ کوئی چیز اس کے علم سے پوشیدہ نہیں۔ ہمارے دلوں کے پوشیدہ احساسات، ہماری زبانوں سے نکلے ہوئے کلمات اور ہماری چھوٹی بڑی نیکیاں اور بُرائیاں اس کے احاطہ علم میں ہیں۔

آیت نمبر ۴: ا۔ اس آیت میں حق سے اعراض کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے یعنی توحید کے واضح دلائل اور کھلی نشانیوں کے باوجود منکرین کا حق سے منہ پھیرنے کا بیان ہے۔ نیز یہ بھی بتایا گیا کہ جانتے بوجھتے نہ ماننے کی ٹھان لینے والوں کے لئے کوئی نشانی کارگر ثابت نہیں ہوتی۔

علمی بات: ان نشانیوں سے مراد وہ احکام بھی ہیں جو آیات کی صورت میں انبیاء کرام علیہم السلام پر اترتے رہے اور وہ معجزات بھی ہیں جو نبوت کی دلیل کے طور پر اللہ ﷻ نے عطا کیئے، اسی طرح کائنات میں پھیلی ہوئی اللہ ﷻ کے جلال و کبریائی اور قدرت کی بے شمار نشانیاں ہیں جو اللہ ﷻ کے وجود اور

اس کی وحدانیت کی دلیل ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری ناگہانی آفتیں مثلاً زلزلہ، کڑک، قحط، وَبا، نافرمان قوموں پر عذاب وغیرہ سب اللہ ﷻ کی نشانیاں ہیں۔ ان ساری نشانیوں کی تفصیل قرآنِ حکیم میں جگہ جگہ ذکر کی گئی ہیں۔ جیسے کہ سورۃ الروم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے پیدا فرمایا پھر اب تم انسان ہو کر (زمین میں) پھیل رہے ہو۔ اور اسی کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے جوڑے پیدا فرمائے تاکہ تم ان کے پاس سکون پاؤ اور اُس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا فرمادی یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ اور اسی کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا فرمانا اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا یقیناً اس میں نشانیاں ہیں علم والوں کے لئے۔ اور اسی کی نشانیوں میں سے ہے تمہارا رات اور دن کو سونا اور تمہارا اُس کے فضل (یعنی رزق) کو تلاش کرنا یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو (غور سے) سنتے ہیں۔ اور اسی کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ تمہیں بجلی دکھاتا ہے ڈرانے اور امید دلانے کے لئے اور وہی آسمان سے پانی نازل فرماتا ہے تو اسی سے زمین کو اس کے مُردہ (یعنی خشک) ہو جانے کے بعد زندہ فرماتا ہے یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں۔ اور اسی کی نشانیوں میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں پھر جب وہ تمہیں ایک بار پکارے گا زمین سے (تو) تم اُسی وقت (اپنی قبروں سے) نکل پڑو گے۔" (سورۃ الروم ۳۰، آیات: ۲۰ تا ۲۵)۔

آیت نمبر ۵: اس آیت میں حق سے مراد قرآنِ حکیم اور صاحبِ قرآن یعنی نبی کریم ﷺ دونوں ہیں۔ خبر کے لئے "انباء" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ انباء جمع ہے نباء کی۔ جس کا معنی ہے اہم اور اثر انگیز خبر، حقیقی و یقینی خبر۔ یہاں اس سے مراد عذاب الٰہی ہے۔ جو پے در پے شکستوں اور ناکامیوں کی صورت میں دیا گیا اور جو عذاب آخرت میں کفار و مشرکین کو دیا جائے گا۔

علمی بات: آیات ۴، اور ۵ میں اللہ ﷻ نے مشرکین مکہ کے انکار اور کفر کے تین احوال بیان فرمائے ہیں۔ پہلے انہوں نے اللہ ﷻ کی نشانیوں سے منہ موڑا۔ پھر اس کے بعد انہوں نے ان نشانیوں کو جھٹلایا اور سب سے آخر میں انہوں نے ان نشانیوں کا مذاق اڑایا اور یہ ان کے کفر اور انکار کی انتہاء تھی۔

علمی بات: مشرکین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ دین کی باتوں کا مذاق اُڑانا اور اُن کے جھٹلانے کا انجام عنقریب اُن کے سامنے آجائے گا۔ ایسے لوگوں کے انجام کے بارے میں مفسرین کرام کی دو آراء ہیں:

۱۔ اس سے مراد دنیا کا عذاب بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ جنگ بدر میں مشرکین مکہ کو شکستِ فاش ہوئی اور ان کو اپنی عددی برتری اور طاقت کا جو گھمنڈ تھا وہ خاک میں مل گیا۔ ۲۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد قیامت یعنی آخرت کی دائمی جزا و سزا ہو۔

آیت نمبر ۶: اس آیت میں مشرکین کو گرد و پیش کے حالات اور گزشتہ اقوام سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ان کفار سے پہلے کئی بڑی قومیں گزری ہیں جن کی نافرمانی کی وجہ سے ان پر اللہ ﷻ کا عذاب نازل ہوا۔ مثلاً، قوم نوح علیہ السلام، قوم عاد، قوم ثمود، قومِ لوط علیہ السلام، قومِ شعیب علیہ السلام اور آلِ فرعون وغیرہ۔ ان اقوام کا ذکر سورۃ الاعراف میں کیا گیا ہے جو سورۃ الانعام کے بعد ہے۔

مشرکین کو سابقہ گمراہ قوموں کے عبرتناک انجام کے ذکر کے ذریعے خبر دار کیا جارہا ہے کہ یہ عاد و ثمود کی ویران بستیاں جن کو تم بار ہا دیکھ چکے ہو یہاں کے بسنے والے تم سے زیادہ خوشحال تھے، مال و دولت کی فراوانی تھی، انہیں وسیع و عریض خطہ زمین پر اختیار حاصل تھا۔ ان کے ملک میں ٹھنڈے اور میٹھے پانی کی نہروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ان کے کھیت نہایت سرسبز و شاداب تھے اور ان کے گھر بہت ہی مضبوط بنے ہوئے تھے۔ لیکن جب انہوں نے دعوتِ توحید کو ٹھکرا کر اللہ ﷻ کی حدوں کو پامال کرنا شروع کیا تو ان کے گناہوں کی وجہ سے ایسا عذاب آیا جس نے ان کو نیست و نابود کر کے نشانِ عبرت بنا دیا۔

علمی بات: ۱۔ کسی قوم کی محض مادی ترقی اور خوش حالی سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ بہت کامیاب و کامران ہے۔ دراصل یہ بطور امتحان اللہ ﷻ قوموں کو عطا فرماتا ہے اور ان کی سرکشی کے باوجود ڈھیل دیتا ہے۔ لیکن جب توبہ کی مہلت بھی ختم ہو جاتی ہے تو پھر یہ ترقی اور خوش حالی انہیں اللہ ﷻ کے عذاب سے بچا نہیں سکتی۔ سابقہ قوموں کو پیغمبروں کی تکذیب اور نافرمانیوں کی پاداش میں ہلاک کر دیا گیا۔

عملی پہلو: ا۔ سابقہ قوموں کے احوال ہمارے لئے درس عبرت ہیں۔ جنہیں قوت و دولت اور کثرت مال و عیال کے باوجود کفر و سرکشی کی وجہ سے ہلاک کر دیا گیا۔ اس میں ہمارے لئے بھی یہ سبق ہے کہ جب تک ہم احکام الٰہیہ کے پابند رہیں گے اور ہماری صلاحیتیں خیر کے کاموں میں صرف ہوں گی۔ تب تک ہم عزت و اقتدار کے مستحق رہیں گے اور جب بھی ہم مال و دولت، اقتدار اور عیش و عشرت کے دلدادہ بن گئے تو پھر ذلت و پستی ہمارا مقدر ٹھہرے گی۔

آیت نمبر ۷: شانِ نزول: مشرکین مکہ میں عبداللہ بن ابی امیہ اور نضر بن حارث اور نوفل بن خویلد وغیرہ نے کہا اے محمد! (ﷺ) ہم آپ پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ آپ ہمارے پاس اللہ ﷻ کے پاس سے کتاب نہ لائیں اور اس کتاب کے ساتھ چار فرشتے ہوں جو یہ گواہی دیں کہ یہ کتاب اللہ ﷻ کی جانب سے ہے اور آپ ﷺ اللہ ﷻ کے رسول ہیں۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔

علمی بات: ا۔ مشرکین مکّہ نے قرآنِ حکیم کو کتابی صورت میں نازل فرمانے کی فرمائش کی۔ کفار کی ہٹ دھرمی کا بیان ہے کہ آسمان سے کتاب اتار بھی دی جائے اور وہ اسے چھو بھی لیں تب بھی یہ لوگ اسے نظر بندی یا جادو قرار دیں گے۔ (معاذ اللہ)

۲۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوتِ توحید اور پیغام اسلام کو مسترد کرنے والے دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو عیش و آرام کے دلدادہ تھے اور ان کو اپنی قوت و حشمت پر گھمنڈ تھا۔ ان کا ذکر اس سے پہلی آیتوں میں آچکا ہے۔ دوسری قسم کے لوگ وہ تھے جو نبی کریم ﷺ کے پیش کیئے ہوئے معجزات کو کھلا ہوا جادو قرار دیتے تھے۔ ان کا ذکر اس آیت میں ہے۔

۳۔ حقیقت میں کفار کے انکار اور تکذیب کی وجہ یہ تھی کہ وہ اللہ ﷻ کی نشانیوں سے اعراض کرتے تھے اور عناد و تکبر کی وجہ سے ان میں غور و فکر نہیں کرتے تھے۔ اس لئے اگر اللہ ﷻ ایک لکھی ہوئی کتاب نازل کر دیتا اور یہ لوگ اس کو چھو کر دیکھ بھی لیتے، پھر بھی کہتے کہ یہ کھلا جادو ہے اور ایمان نہ لاتے۔ ہاتھ سے چھونے کا اس لئے ذکر فرمایا کہ کبھی دیکھی ہوئی چیز کی بہ نسبت ہاتھوں سے چھوئی ہوئی چیز زیادہ یقینی ہوتی ہے، کیونکہ مشاہدہ میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ نظر نے دھوکا کھایا ہو یا نظر بندی کی گئی ہو۔ لیکن ہاتھ سے چھونے کے بعد یہ احتمال بھی ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ ایسے ضدی اور ہٹ دھرم لوگ ہیں کہ یہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر ان کی اسی ہٹ دھرمی کو یوں بیان کیا گیا: "اور اگر ہم ان کے لئے آسمان میں کوئی دروازہ کھول دیں اور یہ اس میں (دن بھر) چڑھتے رہیں (تو پھر بھی) یہ لوگ یقیناً یہی کہیں گے کہ محض ہماری نظر بندی کی گئی ہے، بلکہ ہم لوگوں پر جادو کیا ہوا ہے۔" (سورۃ الحجر ۱۵، آیات: ۱۴، ۱۵)

آیت نمبر ۸: اس آیت میں مشرکین مکہ کا رسول ﷺ سے فرشتوں کے ان کی اصلی شکل میں اُتارے جانے کے مطالبہ کا بیان ہے۔ مشرکین کو فرشتوں کے نزول کے بعد انکار پر مہلت ختم ہو جانے کی تنبیہ کی گئی ہے۔

علمی بات: فرشتوں کو نہ بھیجنے کی حکمت یہ ہے کہ اللہ ﷻ کی سنت ہے کہ جب کوئی غیبی حقیقت آنکھوں سے دکھا دی جائے تو اس کے بعد ایمان لانا معتبر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص موت کے فرشتوں کو دیکھ کر ایمان لائے تو اس کا ایمان قابل قبول نہیں، لہٰذا فرشتے کو دیکھ لینے کے بعد ان کا ایمان معتبر نہیں ہو گا اور پھر انہیں اتنی مہلت نہیں ملے گی کہ یہ ایمان لا سکیں۔ نیز یہ بھی قانونِ الٰہی ہے کہ جب کوئی قوم کسی نشانی کا مطالبہ کرے بعد ازاں اس مطالبہ پر وہ نشانی بھیج دی جائے پھر بھی وہ ایمان نہ لائیں تو اللہ ﷻ اس قوم کو فی الفور ہلاک کر دیتا ہے۔ اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر اللہ ﷻ فرشتے کو ان کے پاس رسول بنا کر بھیجتا تو اگر وہ اپنی اصل صورت میں ان کے پاس آتا تو وہ نہ اس کو دیکھ سکتے نہ اس کا کلام سن سکتے اور نہ ہی اس کی عبادات اور معمولات ان کے لئے قابلِ عمل اور حجت ہوتے۔ کیونکہ دونوں جنس کے اعتبار سے الگ ہیں اور اگر وہ فرشتہ انسانی شکل میں آتا تو اس سے کہتے کہ تم کوئی فرشتہ نہیں ہو بلکہ ہماری ہی طرح انسان ہو اور پھر ان کا وہی مطالبہ اور اعتراض پلٹ آتا۔

علمی بات: انبیاء کرام علیہم السلام کے پاس بھی فرشتے بعض اوقات انسانی شکل میں آتے تھے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کے پاس فرشتے انسانی صورتوں میں آئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام۔ البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ان کی اصل شکل میں بھی دیکھا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ان کی اصل صورت میں دیکھا تھا جن کے چھ سو پر تھے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی)

آیت نمبر ۹: اس آیت میں قریش مکہ کا فرشتہ کو رسول بنا کر نہ بھیجے جانے پر اعتراض کا بیان ہے۔ ان کے اعتراض کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کسی فرشتے ہی کو پیغمبر علیہ السلام بنا کر بھیجتا، یا پیغمبر علیہ السلام کی تصدیق کے لئے لوگوں کے سامنے کسی فرشتے کو بھیجتا تب بھی اس کو انسانی شکل ہی میں بھیجا جاتا کیونکہ کسی انسان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ کسی فرشتے کو دیکھ سکے۔ اس صورت میں پھر یہ کافر لوگ وہی اعتراض دہراتے کہ یہ تو ہم جیسا ہی آدمی ہے اس کو ہم پیغمبر کیسے مان لیں۔

نوٹ: اگر فرشتوں کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ رسول بنا کر بھیجتا تو ان کے معاملات واحساسات اور معمولاتِ زندگی انسانوں سے مختلف ہوتے۔ ایسی صورت میں انسانوں کی رہنمائی کی ذمہ داری اُٹھانا اور لوگوں کے لئے عملی نمونہ بننا ممکن نہ ہوتا۔ اس لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا انسانوں پر ایک بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے انسانوں کو ہی نبی اور رسول بنایا۔ چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اسے بطور احسان کے قرآنِ حکیم میں ذکر فرمایا ہے" یقیناً اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مومنوں پر احسان فرمایا کہ ان لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھیجا۔" (سورۃ اٰلِ عمران ۳، آیت: ۱۶۴)

علمی بات: حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کے پاس جو مہمان آئے تھے وہ انسانی شکل وصورت میں آئے تھے، حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بھی حضرت جبرائیل علیہ السلام انسانی شکل وصورت میں آئے تھے، اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام انسانی شکل میں آتے تھے جیسا کہ ایک طویل حدیث میں بھی حضرت جبرائیل علیہ السلام کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کا ذکر ہے جو "حدیثِ جبرائیل علیہ السلام" کے نام سے مشہور ہے۔ البتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ان کی اصلی شکل میں بھی دیکھا۔ یہ صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت اور فضائل میں سے ہے۔

آیت نمبر ۱۰: اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دل جوئی فرمائی گئی ہے کہ کفار مکہ کے بار بار مطالبہ کی وجہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دین کی دعوت دینا ہی چھوڑ دیں۔ اگر یہ نہیں مان رہے تو پہلے بھی بہت سے لوگوں نے نہیں مانا اور جنہوں نے پیغمبر علیہ السلام کی بات نہیں مانی وہ ہلاک کیئے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تسلی رکھیں کہ جو نہیں مانے گا وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔ یعنی سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کی قوموں نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا تھا۔ جیسے آج مشرکین مکہ ہٹ دھرمی کر کے حق سے اعراض کر رہے ہیں، ایسے ہی پہلے بھی انبیاء کرام علیہم السلام کی بات سے اعراض کیا گیا۔ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پچھلے واقعات بیان کر کے تسلی دی جارہی ہے۔

علمی بات: ا۔ معجزات کے حوالے سے پہلی اقوام کے لوگ بھی انبیاء کرام علیہم السلام سے ایسے ہی مطالبات کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے حضرت صالح علیہ السلام سے پہاڑ سے زندہ اُونٹنی نکالنے کا مطالبہ کیا، جب قوم کے مطالبہ پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے پہاڑ سے ایک زندہ اونٹنی نکال کر دکھادی تو قوم کے لوگوں نے اس اُونٹنی کی ٹانگیں کاٹ کر اُسے ہلاک کر دیا۔

۲۔ کفار مکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف معجزات طلب کرتے تھے جن کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل کی آیات ۹۰ تا ۹۳ میں ہے "اور انہوں نے کہا ہم ہرگز آپ کی بات نہ مانیں گے یہاں تک کہ آپ ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ جاری کردیں۔ یا آپ کے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو پھر آپ اس کے درمیان بہت سی نہریں جاری کر دیں۔ یا آپ آسمان کو ہم پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرا دیں جیسا کہ آپ کا خیال ہے یا آپ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو اور فرشتوں کو (ہمارے) سامنے لے آئیں۔ یا آپ کے لئے سونے کا ایک گھر ہو یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور ہم آپ کے چڑھنے کو بھی نہ مانیں گے یہاں تک کہ آپ ایک کتاب اُتار لائیں جسے ہم خود پڑھیں، آپ فرما دیجئے میرا رب پاک ہے میں تو ایک انسان (اور) رسول ہوں۔"

۳۔ نبی کریم ﷺ کو مزید یہ تسلّی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مذاق اڑانے والے عنقریب اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئیں گے۔

آیت نمبر ۱۱: اس آیت میں مشرکین کو تباہ شدہ اقوام کے کھنڈرات نگاہ عبرت سے دیکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یعنی جو قومیں تباہ ہو گئیں ان کے کچھ کھنڈرات باقی ہیں اور مشرکین مکّہ کے تجارتی سفر کے دوران راستے میں وہ علاقے بھی آتے تھے۔ لہٰذا ان کے مقامات کو دیکھ کر عبرت حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانے والوں کا انجام صاف اور کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ مشرکین کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ جو کوئی دعوت حق کو جھٹلائے گا تو بالآخر ایسے لوگوں کا انجام سابقہ جھٹلانے والی قوموں جیسا ہی ہوگا۔

آیت ۱۲ نمبر: اس آیت میں توحید کے دلائل اور قیامت کے دن اٹھائے جانے کا بیان ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے مالک حقیقی ہونے اور اس کی صفت رحمت کا بیان ہے۔

علمی بات: ا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا معنی یہ ہے کہ وہ نیکی کی توفیق کے بعد اس پر ثواب عطا فرما کر اپنے بندے کو راحت عطا فرمائے اور اللہ تعالیٰ کے غضب کا معنی یہ ہے کہ وہ فاسقوں اور نافرمانوں کو عذاب میں مبتلا کر کے مصیبت سے دوچار کرے۔

۲۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عمومی رحمت کا نتیجہ ہے کہ ہم سب زندہ ہیں ورنہ ہمارے اخلاق و اعمال اتنے بُرے اور نافرمانیاں اس قدر حد سے بڑھی ہوئی ہیں کہ ایک لمحہ بھی زندہ رہنے کے قابل نہیں ہیں۔ دنیا میں ایسی مجرم قومیں بھی موجود ہیں جو سرے سے رب کے وجود کا انکار کرتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ انہیں رزق دیتا ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی عمومی رحمت کا نتیجہ ہے۔

فرمان نبوی ﷺ: حدیث قدسی ہے: "بے شک میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے" (صحیح مسلم، صحیح بخاری، مسند احمد، سنن ابن ماجہ) اس طرح ایک اور حدیث مبارک میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کو سو حصّوں میں تقسیم فرما دیا ہے جس میں سے ننانوے اس کے پاس ہیں اور ایک حصہ اس نے زمین پر اُتارا ہے، اسی ایک حصے کی وجہ سے مخلوق ایک دوسرے سے اچھائی سے پیش آتی ہے یہاں تک کہ گھوڑا اپنے بچے پر پاؤں نہیں مارتا اس اندیشے کے تحت کہ اسے کوئی نقصان نہ ہو جائے۔ (صحیح بخاری، سنن دارمی)

علمی بات: یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ اس دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سوویں حصّے میں سے مسلمانوں کو اسلام، ایمان، قرآنِ حکیم، نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے ذریعے شریعت مطہرہ حاصل ہوئی اور مسلمانوں کے دلوں میں رحم کا جذبہ، نیکی، صلہ رحمی اور غریب پروری اس ایک حصّہ کی مرہونِ منّت ہے تو بقیہ ننانوے رحمتوں کی وسعت اور گہرائی کے متعلق کوئی شخص تصور بھی کر سکتا ہے؟ جو رحمتیں آخرت میں حاصل ہوں گی اور ہمیشہ کے لئے ہوں گی۔ رحمت کا بھرپور اور کامل ظہور فرماں برداروں کے لئے آخرت میں ہوگا۔ یعنی دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عمومی کی وجہ سے کافروں کو بھی مل رہا ہے لیکن رحمتِ خاصّہ کا ظہور فقط ایمان والوں کے لئے آخرت میں ہوگا۔

فرمان نبوی ﷺ: حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں قیدی پیش کیئے گئے قیدیوں میں سے ایک عورت کسی کو تلاش کر رہی تھی۔ اچانک اس نے قیدیوں میں اپنے بچہ کو دیکھا، اس نے بچے کو اپنے پیٹ سے چمٹا لیا اور اس کو دودھ پلایا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ہم سے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا یہ عورت اپنے بچہ کو آگ میں ڈال دے گی؟ ہم نے کہا نہیں، اللہ کی قسم اگر آگ میں ڈالنا اس کے لئے مقدر ہوا تو یہ اپنے بچہ کو کبھی آگ میں نہیں ڈالے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ اپنے بچہ پر جس قدر رحم کرنے والی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ رحم فرمانے والا ہے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

علمی بات: اللہ تعالیٰ سب اولین و آخرین کو قیامت کے دن زندہ کر کے جمع فرما دیں گے۔ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کی رحمت سے وہ لوگ محروم ہوں گے جنہوں نے کفر اختیار کیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت تو سب کے لئے تھی لیکن کفار و مشرکین رحمتِ خاصّہ سے اپنے کفر کی وجہ سے محروم ہوئے۔ خسارے

میں وہ بدنصیب لوگ مبتلا ہوتے ہیں جو اپنی فطرت اسلام اور عقل سلیم سے کام نہیں لیتے اور بغض وعناد اور تعصب وہٹ دھرمی کی پٹی باندھے گمراہی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ گویا وہ نور ایمان سے محروم ہو کر اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیتے ہیں۔

آیت نمبر ۱۳: **شانِ نزول:** کفار نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ علیہ السلام نادار ہیں۔ مال و دولت جمع کرنے کے لئے آپ علیہ السلام نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ جس سے ہر گھر میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک گئی ہے (معاذ اللہ)۔ اس لئے آپ علیہ السلام جس قدر دولت چاہیں ہم آپ علیہ السلام کے قدموں میں لا کر ڈھیر کر دیں گے۔ آپ علیہ السلام اپنے دین کی تبلیغ سے باز آجائیں اور ہمارے آباؤ اجداد کی طرح بتوں کی پوجا کریں تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ رات اور دن میں جو چیز بھی متحرک ہے یا ساکن، یا جو چیز بھی سکونت پذیر ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہے۔

اس آیت میں توحید کے دلائل کا بیان ہے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ دن اور رات میں جو کچھ بھی متحرک یا غیر متحرک ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت اور اسی کے قانون کے تابع ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر امر سے بخوبی واقف ہے۔

عملی پہلو: یہ چیزیں گزشتہ آیت میں شامل الفاظ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کے تحت داخل ہیں لیکن پھر بھی الگ سے ان کا ذکر فرمایا گیا ہے کیونکہ یہ چیزیں ہر وقت مخاطبین کے سامنے ہیں اور خود مخاطبین بھی اس میں شامل ہیں جو کچھ نظر کے سامنے ہو اس کو دیکھ کر زیادہ مشاہدہ اور عبرت حاصل ہوتی ہے۔

علمی بات: رات اور دن کے ذکر میں غالباً اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان اوقات میں جب لوگ سو کر بیدار ہوتے ہیں تو سونے کی حالت میں انسان دنیا سے بے خبر اور لاتعلق ہو جاتا ہے اور اس پر چھوٹی موت طاری ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اسے بیداری کی دنیا میں واپس لے آتا ہے۔ اسی طرح جب اصل موت آئے گی تب بھی انسان اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہوگا اور وہ قیامت میں جب چاہے گا اسے دوبارہ زندگی دے کر یوم حساب کی طرف لے جائے گا۔

آیت نمبر ۱۴: ا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو کارساز بنانے کی نفی کی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے اے نبی ﷺ! آپ فرما دیجئے کہ کیا میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر کو اپنا والی یعنی مددگار اور معبود بناؤں یقیناً ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔

علمی بات: بعض علماء لغت کے نزدیک فاطر کے معنی کسی نمونہ و مثال کے بغیر کسی چیز کو پیدا کرنا ہے، مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمانوں کی تخلیق کسی مادی اسباب کے بغیر کی ہے۔

آیت نمبر ۱۵: بڑے دن سے قیامت کا دن مراد ہے۔ نبی کریم ﷺ کے ذریعہ اُن لوگوں کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اگر انہوں نے گناہوں کی روش نہ چھوڑی تو وہ روز قیامت اللہ تعالیٰ کے عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ آپ ﷺ کو مخاطب فرما کر امت کو خطاب کرنے میں یہ حکمت ہے کہ جب نبی کریم ﷺ جو معصوم عن الخطاء ہیں جن کی شفاعت کی وجہ سے گنہگار بخشے جائیں گے جب وہ بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے پر عذاب سے ڈرتے ہیں تو عام مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ سے کتنا زیادہ ڈرنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۱۶: اس آیت میں کفر و شرک کی غلاظتوں سے بچنے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار بن جانے کی تلقین کی گئی ہے۔

علمی بات: مغفرت، نجات اور دخول جنت کا سبب اللہ تعالیٰ کا فضل ہے نہ کہ محض اعمال کیونکہ اعمال صالحہ کی توفیق بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہی ملتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل کے حوالہ سے چند احادیث نبوی ﷺ: ا۔ تم میں سے کسی شخص کو اس کا عمل جنت میں ہرگز داخل نہیں کرے گا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا یا رسول اللہ (ﷺ)! آپ کو بھی نہیں؟ فرمایا مجھ کو بھی نہیں سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے فضل اور رحمت سے ڈھانپ لے۔ (صحیح مسلم، صحیح بخاری، سنن ابن ماجہ، مسند احمد)

۲۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کچھ لوگوں کو ان کے گناہوں کی سزا دینے کے لئے جہنم میں ڈال دیا جائے گا، ان کے جسموں پر آگ کے نشان ہوں گے، پھر اللہ ﷻ اپنے فضل اور رحمت سے ان کو جنت میں داخل کر دے گا، ان کو جہنمیین کہا جائے گا۔ (صحیح بخاری، مسند احمد)

۳۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس مسلمان کے بھی تین نابالغ بچے فوت ہو جائیں، اس مسلمان کو اللہ ﷻ اپنے فضل اور رحمت سے جنت میں داخل کر دیں گے۔ (صحیح بخاری، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مسند احمد)

علمی بات: بلند مقام حاصل کرنا تو بہت بڑی بات ہے، اگر کسی سے آخرت کا عذاب ہی ٹل جائے تو اپنی جگہ یہی بات کافی ہے۔ لیکن سب سے بڑی کامیابی آخرت کے خسارہ سے بچ جانا اور دائمی نفع حاصل کرنا ہے۔ یعنی اصل کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے۔ دُنیا کی بڑی سے بڑی کامیابیاں اس دن کی کامیابی کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ اس کامیابی کے سامنے دنیوی دولت، عزت، شہرت اور اقتدار وغیرہ ساری چیزیں کمتر اور فانی ہیں۔

آیت نمبر ۱۷: اللہ ﷻ کے سوا کوئی کسی کو نہ معمولی نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی معمولی نقصان۔ اللہ ﷻ اپنے بندوں پر قادر ہے اور سب اس کے ماتحت ہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: رسول اللہ ﷺ فرض نماز کے بعد یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ "اے اللہ! جو کچھ تو عطا فرمائے اس کا کوئی روکنے والا نہیں اور جو کچھ تو روک لے اس کا کوئی دینے والا نہیں اور کسی مالدار کو اس کی مالداری تیرے مقابلہ میں نفع نہیں دے سکتی۔" (صحیح مسلم)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں ایک دن رسول اللہ ﷺ کے پیچھے تھا آپ ﷺ نے فرمایا اے لڑکے! اس کا یقین رکھ کہ اگر ساری امت اس مقصد کے لئے جمع ہو جائے کہ تجھے کچھ نفع پہنچا دے تو اس کے سوا کچھ نفع نہیں پہنچا سکتی جو اللہ ﷻ نے تیرے لئے لکھ دیا ہے اور اگر ساری امت اس مقصد کے لئے جمع ہو جائے کہ تجھے کچھ ضرر پہنچا دے تو اس کے سوا کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتی جو اللہ ﷻ نے تیرے لئے لکھ دیا ہے۔ (جامع ترمذی، سنن ابو داؤد)

عملی پہلو: ہمیں اپنی ہر مشکل و پریشانی، بیماری و تنگی میں اللہ ﷻ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے کیونکہ اس کے سوا کوئی بھی تکلیف دور کرنے والا نہیں۔

آیت نمبر ۱۸: اللہ ﷻ بندوں کے حالات سے خوب آگاہ ہے۔ وہ ہر چیز پر غالب ہے اور تمام کائنات اسی کی مطیع اور فرماں بردار ہے۔

علمی بات: قہر سے مُراد یہاں پر ظلم و زیادتی نہیں، جیسا کہ محاورۃً بولا اور سمجھا جاتا ہے بلکہ قہر سے مراد یہاں غلبہ و کامل اختیار ہے وہ اپنے بندوں پر پوری طرح غالب و حاوی اور ان پر مکمل اختیار رکھنے والا ہے۔

نوٹ: لفظ "قاہر" سے اللہ ﷻ کی قدرت کاملہ کا اور لفظ "حکیم" سے اس کے تمام افعال کا مبنی بر حکمت ہونا اور خبیر سے علم محیط کا بیان کیا گیا۔ ان صفات کے ذکر سے بتلانا یہ مقصود ہے کہ یہ صفات اللہ ﷻ کے کمال علم و قدرت کا مظہر ہیں۔ اللہ ﷻ غلبہ و تسلط رکھنے کے باوجود اپنی مخلوق کے معاملے میں حکمت کاملہ کا اظہار فرماتا ہے کیونکہ حکیم کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

آیت نمبر ۱۹: اللہ ﷻ ہی معبودِ حقیقی ہے اور ہر قسم کے شرک سے پاک ہے۔ نبی کریم ﷺ کے رسول برحق ہونے کا سب سے بڑا گواہ خود اللہ ﷻ ہے۔ اللہ ﷻ کی گواہی سے مراد وہ آیات، بیّنات اور معجزات ہیں جو رسول ﷺ کے برحق ہونے کے لئے بطور ثبوت عطا فرمائے گئے۔ نزولِ قرآن حکیم کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ اس کی تعلیمات اور احکام ہر اس شخص تک پہنچے جو آپ ﷺ کی اُمّت میں شامل ہے۔ اب یہ ذمہ داری تمام اُمّتِ مسلمہ کی ہے۔ جیسا کہ سورہ آل عمران ۳، آیت: ۱۱۰ میں بتایا گیا کہ "تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے بھیجی گئی ہو (یعنی پیدا کی گئی ہو)، تم اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو، اور اللہ ﷻ پر ایمان لاتے ہو۔"

شانِ نزول: ایک مرتبہ اہل مکہ کا ایک وفد نبی کریم ﷺ کے پاس آیا، اور کہنے لگا کہ آپ جو "اللہ کے رسول" ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس پر آپ کا گواہ کون ہے ؟ کیونکہ ہمیں کوئی آدمی ایسا نہیں ملا جو آپ کی تصدیق کرتا ہو، حالانکہ ہم نے یہود و نصاریٰ سے اس کی تحقیق میں پوری کوشش صرف کی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

علمی بات: حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جس شخص کو قرآنِ حکیم پہنچ گیا وہ ایسا ہو گیا جیسے اس نے محمد ﷺ کی زیارت کرلی اور ایک حدیث مبارک میں ہے کہ جس شخص کو قرآنِ حکیم پہنچ گیا میں اس کا نذیر ہوں۔

فرمان نبوی ﷺ: ۱۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے اس امت میں سے جس کسی کو میرے نبی ہونے کی خبر پہنچے گی خواہ وہ یہودی یا نصرانی ہو اور وہ اس دین پر ایمان لائے بغیر مر گیا جو دین دے کر میں بھیجا گیا ہوں تو وہ ضرور دوزخ والوں میں سے ہو گا، خواہ یہودی ہو یا نصرانی۔ (صحیح مسلم)

۲۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو تروتازہ اور صحت مند رکھے جس نے میری کوئی بات سنی پھر اس کو یاد رکھا پھر اس کو امت تک پہنچا دیا، کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی خود کسی کلام کے مفہوم کو اتنا نہیں سمجھ پاتا جتنا بعد میں آنے والا سمجھتا ہے جس کو یہ کلام اس نے پہنچایا ہے۔

۳۔ رسول کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تاکید فرمائی یعنی میرے احکام و تعلیمات لوگوں تک پہنچاؤ اگرچہ ایک ہی آیت ہو۔ (سنن دارمی، جامع ترمذی)

۴۔ حجۃ الوداع کے موقع پر تقریباً سوا لاکھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب کرتے ہوئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا سنو! جو لوگ یہاں موجود ہیں انہیں چاہیئے کہ یہ باتیں غائبین تک پہنچا دیں کیونکہ بسا اوقات کوئی غیر موجود شخص تم سے زیادہ سمجھنے اور محفوظ رکھنے والا ہو سکتا ہے۔ بہر حال میں نے یہ امانت تم تک پہنچا دی ہے، اس کو آگے پہنچانا اب تمہاری ذمہ داری ہے۔ (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۲۰: اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی صداقت کا ثبوت ہے کہ اہل کتاب کی کتابوں میں موجود آخری نبی ﷺ کی تمام نشانیاں آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکت میں مکمل طور پائی گئیں اسی وجہ سے اہلِ کتاب آپ ﷺ کی رسالت کو اپنے سگے بیٹے کی طرح پہچانتے تھے۔ اہل کتاب نے رسول اللہ ﷺ کو پہچاننے کے باوجود حسد کے مارے آپ ﷺ کی رسالت کا انکار کیا اور دنیا میں ذلیل و رسوا ہو کر آخرت کے دائمی خسارے میں پڑ گئے۔

علمی بات: حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے بعد یہود آپ ﷺ کے پاس آئے۔ ان سے رسول اللہ ﷺ نے پوچھا عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ تم میں کیسے آدمی ہیں؟ انہوں نے کہا وہ ہم میں سب سے بڑے عالم ہیں اور سب سے بڑے عالم کے بیٹے ہیں اور ہم میں سب سے افضل ہیں اور سب سے افضل کے بیٹے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بتلاؤ اگر عبد اللہ رضی اللہ عنہ اسلام لے آئیں تو! انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ اس کو اس سے پناہ میں رکھے۔ تب حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ان کے سامنے آئے اور کہا "اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" تو انہوں نے کہا یہ ہم میں سب سے بدتر شخص ہے اور سب سے بدتر شخص کا بیٹا ہے (معاذ اللہ)۔ (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۲۱: اس آیت میں مشرکین کے دو سنگین ترین جرائم بیان کئے گئے ہیں: ۱۔ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانا یعنی سیدنا محمد ﷺ کی نبوت کے ثبوت پر اللہ تعالیٰ نے جو معجزات ظاہر فرمائے کفار و مشرکین نے ان کو جھٹلا دیا اور قرآنِ حکیم جو نبی کریم ﷺ کی نبوت پر سب سے بڑا معجزہ ہے، باوجود اس کے کہ وہ اس قرآن حکیم کے مقابلے میں ایک آیت بھی نہ لا سکے پھر بھی قرآنِ حکیم کو کھلا جادو کہا، کبھی شعر و شاعری سے تعبیر کیا اور کبھی گزرے ہوئے لوگوں کی قصے اور کہانیوں سے اور کبھی کہا یہ محض ان کے فکری تخیلات ہیں (معاذ اللہ)۔ انہوں نے اس کے کلام الٰہی ہونے کا انکار کیا اور آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان نہیں لائے۔ ۲۔ کوئی شے خود گھڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا یعنی اپنے کاموں کی تاویل کرتے ہوئے یہ کہتے کہ فلاں حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے جبکہ وہ حکم ہر گز اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ نہیں ہوتا تھا۔

علمی بات: کفارِ مکہ اللہ تعالیٰ پر بہتان لگاتے تھے یہ کہہ کر کہ یہ بُت اللہ تعالیٰ کے شریک ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت کرنے اور ان کے ذریعہ تقرب حاصل کرنے کا حکم دیا ہے، نیز کفارِ مکہ کہتے تھے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ یہود و نصاریٰ بھی اللہ تعالیٰ پر بہتان لگاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ان کی شریعتیں غیر منسوخ ہیں اور ان کے نبیوں کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور خصوصاً یہود یہ کہتے تھے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں اور دوزخ کی آگ ہمیں صرف چند دن جلائے گی اور ان میں سے بعض جہلاء یہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں اور نصاریٰ کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ تین میں کا تیسرا ہے اور یہ عقیدہ تثلیث کہلاتا ہے۔ اور یہود و نصاریٰ ان دونوں میں سے ہر ایک اس بات کا دعوے دار تھا کہ ان کے سوا اور کوئی جنت میں نہیں جائے گا اور یہ تمام باتیں اللہ تعالیٰ پر افتراء اور بہتان ہیں یعنی خود سے بنا کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا اور اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے۔

عملی پہلو: اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے والا سب سے بڑا ظالم ہے۔ ایسے مجرمین کے لئے نجات نہیں ہے۔ شریعت کی نظر میں جھوٹ بولنا انتہائی قبیح گناہ ہے۔ اس جرم کی سنگینی میں اس وقت بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے جب کوئی شخص اپنے باطل نظریات کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے اسے حق ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ ایسا شخص نہ صرف پرلے درجے کا کذّاب شمار ہوتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین ظالم سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ ذاتِ حق پر جھوٹ بول کر لوگوں کو گمراہی کا راستہ دکھانا انتہائی سنگین جرم ہے۔ ایسے ظالم آخرت میں ہر قسم کی مدد سے محروم ہوں گے اور دنیا میں بھی ناکامی اور ذلّت و رسوائی ان کا مقدر ٹھہرے گی۔

آیت نمبر ۲۲: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ روزِ قیامت مشرکین سے ان کے باطل معبودوں کے بارے میں سوال ہو گا۔

علمی بات: محشر میں جمع ہونے کے بعد فوراً ہی سوال جواب نہیں ہو گا، بلکہ عرصہ دراز تک اس کے شروع ہونے کے انتظار میں کھڑے رہیں گے، ایک مدّت کے بعد تمام اُمّتوں کے حساب کتاب شروع ہوں گے۔ ایک حدیث مبارک میں رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس وقت تمہارا کیا حال ہو گا جب کہ اللہ تعالیٰ تم کو میدانِ حشر میں اس طرح جمع کر دیں گے جیسے تیروں کو ترکش میں جمع کر دیا جاتا ہے، اور تم پچاس ہزار سال اسی طرح رہو گے، اور ایک روایت میں ہے کہ قیامت کے روز ایک ہزار سال سب اندھیرے میں رہیں گے۔ آپس میں بات چیت بھی نہ کر سکیں گے (مستدرک الحاکم، بیہقی)

آیت نمبر ۲۳: اس آیت میں مشرکین کا معذرت پیش کر کے چھٹکارا حاصل کرنے کی بے فائدہ کوشش کا بیان ہے۔ "فتنہ" کے معنی حجت، معذرت، آزمائش وغیرہ کے ہیں۔ ایک رائے کے مطابق یہاں فتنہ کے معنی عذر اور بہانہ کے ہیں۔ باطل معبودوں کی سفارش کا اعتقاد رکھنے والے مشرک اپنے شرک سے روزِ قیامت مکر جائیں گے اور جھوٹ بولیں گے۔

نوٹ: جب میدانِ حشر میں مالکِ حقیقی کے دربار میں انہیں پیش کیا جائے گا اور وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا مشاہدہ کریں گے اور ان کے بتوں، معبودوں اور دیوی دیوتاؤں کا کہیں نام تک نہ ہو گا۔ تو جب ان سے سابقہ سوال پوچھا جائے گا تو مارے تعجب و حیرت کے کوئی جواب نہ بن پڑے گا۔ اس وقت وہ انکار اور جھوٹ کا سہارا لیں گے۔

علمی بات: مشرکین جب وہاں کا عذاب دیکھیں گے تو جھوٹ بول کر عذاب سے بچنے کی کوشش کریں گے جیسا کہ دنیا میں بعض مرتبہ اپنے افعال و اعمال کا انکار کر کے دنیاوی سزا سے چھٹکارا پا لیتے تھے۔ آخرت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے ان کا جھوٹ نہ چل سکے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ذات ہے لیکن یہ پھر بھی اپنی ہٹ دھرمی سے اپنے قصور کا انکار کر دیں گے۔

آیت نمبر ۲۴: قیامت کے دن کی دہشت اور اپنی بے بسی پر مشرکین جھوٹ بولیں گے۔ مگر قیامت کے دن ان مشرکین کے تمام غلط عقائد بیکار ثابت ہو جائیں گے اور وہ بے بسی اور لاچاری کی تصویر بنے کھڑے ہوں گے۔

آیت نمبر ۲۵: اس آیت میں قریش کے سرداروں کی سازش کا بیان ہے۔ مشرکین قرآنِ حکیم کو بظاہر سنتے مگر حقیقتاً اس سے اعراض کرتے ہیں۔ اس ضد، اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے قبول حق سے محروم کر دیئے گئے۔ سرداران قریش کا قرآن حکیم کو (معاذ اللہ) پُرانے قصے کہانیاں قرار دے کر منہ موڑ لینے کا بیان ہے۔

شانِ نزول: ایک مرتبہ ابو سفیان، ابو جہل، ولید بن مغیرہ، نضر بن حارث، عتبہ، شیبہ بن ربیعہ، حارث بن عامر، ابی بن خلف اور امیہ بن خلف نبی کریم ﷺ کے پاس جمع ہوئے۔ آپ ﷺ اس وقت قرآنِ حکیم کی تلاوت فرمارہے تھے ان لوگوں نے آپ ﷺ سے قرآنِ حکیم سنا پھر سب نے نضر بن حارث سے پوچھا کہ اے ابو قتیلہ کچھ سمجھ میں آتا ہے کہ محمد (ﷺ) کیا کہتے ہیں نضر نے کہا میں نہیں جانتا کہ کیا کہتے ہیں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنی زبان کو ہلاتے ہیں اور پچھلے لوگوں کی کہانیاں بیان کرتے ہیں جیسے میں تمہیں گزشتہ لوگوں (یعنی رستم، اسفند یار اور اہل فارس وغیرہ) کے قصے سناتا ہوں ابو سفیان نے کہا میرے خیال میں اس کی بعض باتیں سچی معلوم ہوتی ہیں ابو جہل نے کہا ہرگز نہیں تو اس کی کسی بات کے سچا ہونے کا اقرار نہ کر، ہمیں مرنا قبول ہے مگر اس پر ایمان لانا قبول نہیں اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

عملی پہلو: جو لوگ اپنی بداعمالیوں کے سبب قابل ہدایت نہیں رہتے اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمت و شفقت کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔ اسی کو دلوں پر پردہ ڈالنے اور مہر لگانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی سنّت ہے کہ جو اس کی ہدایت حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں ان کو ہدایت سے نوازتا ہے: "اور جن لوگوں نے ہمارے (راستے کے) لئے کوشش کی ہم ان کو ضرور اپنے راستے دکھادیں گے" (سورۃ العنکبوت ۲۹، آیت:۶۹) اور تزکیہ نفس کے ساتھ نجات و کامیابی ممکن ہے: "یقیناً جس نے اس (نفس) کو پاک کر لیا وہ کامیاب ہو گیا" (سورۃ الشمس ۹۱، آیت:۹) اس کے برخلاف جن لوگوں نے ضد اور تعصّب کی بنا پر انکار کیا وہ تمام نشانیاں دیکھ بھی لیں تب بھی ایمان نہیں لاتے۔

نوٹ: قرآن حکیم نے ہدایت پانے کا یہ اصول بیان کیا ہے کہ سننے والا پورے دھیان، دل کی توجہ اور حق بات قبول کرنے کی نیّت سے بات سنے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اسے ہدایت سے بہرہ مند کرتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "یقیناً اس میں نصیحت ہے اس شخص کے لئے جو دل رکھتا ہو یا کان لگا کر سنتا ہو اور وہ حاضر ہو (دل و دماغ سے)۔" (سورۂ ق ۵۰، آیت:۳۷) لیکن منکرین حق کی شروع سے ہی یہ بری عادت ہے کہ سچی بات قبول کرنا تو در کنار اس کا سننا ہی ان کے لئے گرانی کا باعث ہوا کرتا ہے۔

علمی بات: مشرکوں کے شرک اور منافقوں کے نفاق کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو سمجھنے اور حق بات سننے کے بجائے کہتے ہیں کہ یہ ہماری سماعت پر ایک بوجھ ہے اور ہم اسے پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں سمجھتے ہیں۔ ضد اور تعصب انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتا ہے۔ پھر حالت یہ ہوتی ہے کہ ایسا انسان حق بات سننا اور سمجھنا ہی نہیں چاہتا۔

آیت نمبر ۲۶: سرداران قریش قبول حق سے دوسروں کو روکتے تھے اور خود بھی پہلو تہی کرتے تھے۔ یوں وہ دوہرے جرم کے مرتکب ہو رہے تھے۔ حق سے روکنے اور خود رکنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے انجام سے بے خبر اپنے ہی ہاتھوں اپنی تباہی و بربادی کا سامان کر رہا ہوتا ہے۔

عملی پہلو: بدترین لوگ وہ ہیں جو خود بھی ہدایت سے محروم رہتے ہیں اور دوسروں کو ہدایت سے محروم رکھنے کی مذموم کوشش کرتے ہیں۔

آیت نمبر ۲۷: قیامت کے دن کفار دنیا میں لوٹائے جانے کی حسرت کریں گے۔ اس روز کفار کو دنیا کی بے ثباتی اور اپنی بدعقیدگی کی قباحت کا شدت سے احساس ہوگا۔

فرمان نبوی ﷺ: "بے شک اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی توبہ قبول فرماتا رہتا ہے جب تک نزع کا عالم طاری نہ ہو۔" (سنن ابن ماجہ)

عملی پہلو: انسان مصیبت اور عذاب کو دیکھ کر توبہ کرتا ہے لیکن جب وہ عذاب اور مصیبت ٹل جائے تو پھر دوبارہ گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

علمی بات: اسلام کے تین بنیادی اصول ہیں: عقیدۂ توحید، رسالت اور آخرت، باقی سب عقائد انہی تین کے تحت داخل ہیں، کیونکہ اللہ ﷻ پر ایمان لانے اور آپ ﷺ کی رسالت کی تصدیق کے بعد عقیدۂ آخرت اور اس میں حساب وکتاب اور جزاء وسزاء، ایک ایسا عقیدہ ہے جو انسان کے ہر عمل کو ایک خاص سمت فراہم کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم کے تمام مضامین انہی تین کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔

عملی پہلو: **قیامت کے دن کافروں کے عذاب کی کیفیت:** قرآنِ حکیم میں وقوف کا لفظ ہے یعنی ان کافروں کا جب جہنم پر وقوف ہوگا۔ اس کا معنی قیام بھی ہے اور جاننا بھی، اس صورت میں اس آیت کے کئی معنی ہیں۔

۱۔ وہ جہنم کے پاس کھڑے ہوں اور دوزخ کا مشاہدہ کر رہے ہوں۔

۲۔ جہنم کے اوپر جو پل صراط ہے، وہ اس کے اوپر کھڑے ہوئے جہنم کو دیکھ رہے ہوں۔

۳۔ وہ جہنم کے عذاب پر واقف اور مطلع ہوں۔

۴۔ ان کو دوزخ میں ڈال دیا گیا ہو اور وہ اس حال میں دوزخ میں کھڑے ہوئے ہوں کہ وہ ہر طرف سے آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں ہوں۔

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب فرشتے کافروں کو دوزخ کے پاس کھڑا کر دیں گے تو وہ بے پناہ حسرت ویاس اور خوف ودہشت کے عالم میں ہوں گے۔ اس وقت یہ کافر ندامت کے ساتھ تمنا کریں گے کہ کاش ہمیں پھر دنیا میں لوٹا دیا جائے اور ہم اپنے رب کی ان نشانیوں اور دلیلوں کی تکذیب نہ کریں جو اس کی وحدانیت اور اس کے رسولوں کی تصدیق کرتی ہیں اور اللہ ﷻ پر، قیامت پر، فرشتوں پر، کتابوں پر اور رسولوں پر ایمان لائیں اور گناہوں سے توبہ کریں اور نیک عمل کریں۔ چنانچہ اللہ ﷻ ان کا رد فرماتا ہے کہ اب یہ ممکن نہیں۔

آیت نمبر ۲۸: اس آیت میں کفار کی جھوٹی تمنّا کے رد کا بیان ہے۔ دنیا میں حق واضح ہونے کے باوجود ان کے بغض وعناد اور تکبّر کی وجہ سے ان پر غفلت اور گمراہی کے پردے پڑے رہے جس کے سبب وہ حق سے انکاری رہے اور بتلا دیا گیا کہ واپس دنیا میں بھیجے جانے پر بھی دنیا کی محبت پھر انہیں اسی راستے پر ڈال دے گی۔

عملی پہلو: جو لوگ خود اپنی بداعمالیوں کے نتیجے میں اپنی فطرت مسخ کر لیتے ہیں وہ بارہا مواقع ملنے کے باوجود ہدایت سے محروم رہتے ہیں۔

علمی بات: ۱۔ مفسرین کی ایک رائے کے مطابق یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے جو جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے نفاق کو چھپایا کرتے تھے، یا پھر اس سے کفار کے سردار مراد ہیں جو قرآنِ حکیم اور رسول اللہ ﷺ کا سچا ہونا جانتے تھے، مگر اپنے پیروکاروں سے چھپاتے تھے۔ قیامت کے دن یہ حقیقت ان کے پیروکاروں پر کھل جائے گی اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ ہمیں دھوکا دیتے رہے ہیں۔

علمی اشکال:۔ ۲۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوگا کہ قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے، پھر حساب وکتاب اور جزاء وسزا سب آنکھوں سے دیکھنے کے بعد کیسے ممکن ہوگا کہ پھر دوبارہ دنیا میں آ کر اس کا انکار کر دیں؟۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انکار کرنے کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ ان کو تمام حقائق کا یقین نہ رہے گا بلکہ جس طرح آج بہت سے کفار ومشرکین اسلامی حقائق کا پورا یقین رکھنے کے باوجود بغض وعناد کی وجہ سے انکار وتکذیب پر جمے ہوئے ہیں، اسی طرح یہ لوگ دنیا میں واپس آنے کے بعد قیامت کے قائم ہونے، دوبارہ زندہ کئے جانے اور آخرت کے تمام حالات کا پورا یقین رکھنے کے باوجود اسی بغض وعناد اور دنیاوی دھوکے کا شکار ہو کر پھر تکذیب پر اتر آئیں گے جیسا کہ قرآنِ حکیم نے اسی موجودہ زندگی میں بعض کفار کے متعلق ارشاد فرمایا ہے: "انہوں نے ان کا انکار کر دیا حالانکہ ان کے دل ان (نشانیوں) کا یقین کر چکے تھے۔" (سورۃ النمل ۲۷، آیت: ۱۴) جیسے یہود کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ "وہ (خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفی ﷺ) کو اس طرح پہچانتے ہیں جیسے لوگ اپنے بیٹوں کو پہچانا کرتے ہیں۔" (سورۃ البقرہ ۲، آیت: ۱۴۶) مگر اس کے باوجود آپ ﷺ کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں۔

عملی پہلو: کفار و مشرکین کا حال یہ ہے کہ آنکھوں دیکھے عذاب پر بھی ان کی توبہ پکّی نہیں بلکہ محض جان بچانے کی خاطر ہے۔ پس اگر دنیا میں واپس بھیج دیئے جائیں تو بدی اور شرارت کی جو قوتیں ان میں ہیں پھر انہی کو کام میں لائیں گے اور جس مصیبت سے گھبرا کر واپس جانے کی تمنا کر رہے ہیں اسے خواب و خیال کی طرح فراموش کر دیں گے جیسا کہ بسا اوقات دنیوی مصائب میں پھنس کر آدمی توبہ کرلیتا ہے پھر جہاں چند روز گزرے اور مصیبت ٹل گئی تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔

آیت نمبر ۲۹: مشرکین کے دنیا میں باطل عقائد پر اڑے رہنے کے اسباب مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔ انہیں قیامت، جزاو سزا اور جنت و دوزخ پر ایمان نہ تھا۔

۲۔ ان کے نزدیک زندگی بس یہی دنیوی زندگی تھی۔

۳۔ وہ موت کے بعد کی زندگی کے قائل نہ تھے یوں وہ اعمال کی جواب دہی کے منکر تھے اور بے فکر ہو کر اپنی گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔

علمی بات: آج کل کفر و الحاد کے مختلف shades ہیں، اس زمانے میں بھی ایسا ہی تھا۔ آج ایسے لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں جو اللہ ﷻ کو تو مانتے ہیں۔ آخرت کو نہیں مانتے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ ﷻ اور آخرت کو مانتے ہیں 'لیکن رسالت کو نہیں مانتے ہیں۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو بالکل ملحد اور مادہ پرست ہیں اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ہم خود ہی پیدا ہوتے ہیں اور خود ہی اپنی طبعی موت مر جاتے ہیں 'اور ہماری صرف یہی زندگی ہے 'مرنے کے بعد جی اٹھنے کا کوئی معاملہ نہیں۔ اسی طرح اُس دور میں بھی کفر و شرک کے مختلف shades موجود تھے۔ قریش کے اکثر لوگ اور عرب کے بیشتر مشرکین اللہ ﷻ کو مانتے تھے، آخرت کو مانتے تھے 'بعث بعد الموت کو بھی مانتے تھے 'لیکن اس کے ساتھ وہ بُتوں کی عبادت بھی کرتے تھے اور ان کی سفارش اور شفاعت کے قائل تھے۔

عملی پہلو: یہ بعث بعد الموت (مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے) کا انکار ہے جو ہر کافر کرتا ہے اور اس حقیقت سے انکار ہی دراصل ان کے کفر و عصیان کی سب سے بڑی وجہ ہے ورنہ اگر انسان کے دل میں عقیدہ آخرت کی صداقت راسخ ہو جائے تو کفر و معصیت کے راستے سے فوراً تائب ہو جائے گا۔ گویا دنیا میں شر اور فساد کی بنیادی وجہ آخرت کا انکار ہے۔

آیت نمبر ۳۰: آخرت میں کفار پر فردِ جرم عائد ہوگا اور انہیں سزا بھی دی جائے گی۔ روز قیامت بعث بعد الموت کا اعتراف انہیں کوئی نفع نہ دے گا۔ قبر سے اٹھنے کے بعد میدان حشر میں جب لوگ اپنے رب کی بارگاہ میں پیش ہوں گے تو ان سے سوال کیا جائے گا کہ کیا مرنے کے بعد اٹھ کر حشر کے میدان میں رب کی بارگاہ میں حاضر ہونا حق ہے؟ تو انسان بے ساختہ پکار اٹھیں گے کیوں نہیں ہم نے قدم قدم پر اپنے رب کا وعدہ سچا پایا مگر اس دن کا اقرار کفار کے لئے مفید نہ ہو گا۔

علمی بات: اللہ ﷻ ان سے بلاواسطہ کلام نہیں فرمائے گا اور اس آیت میں جس کلام فرمانے کا ذکر ہے وہ فرشتوں کے واسطے سے ہے، یا اللہ ﷻ ان سے رحمت کے ساتھ کلام نہیں فرمائے گا اور یہ کلام غضب کے ساتھ ہے۔ پھر اللہ ﷻ فرشتے کے واسطے سے ان سے فرمائے گا کہ کیا یہ مر کر دوبارہ اٹھنا حق نہیں ہے 'جس کا تم انکار کرتے ہو۔ وہ قسم کھا کر کہیں گے کہ یہ بالکل حق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے 'پھر اللہ ﷻ فرمائے گا اب تم اپنے کفر اور تکذیب کی وجہ سے عذاب کا مزہ چکھو۔

آیت نمبر ۳۱: اللہ ﷻ سے ملاقات کو جھٹلانے والے ابدی خسارے میں ہوں گے۔ اُن پر اچانک قیامت برپا ہو گی، وہ روز قیامت اپنی حسرت اور ندامت کا اظہار کریں گے اور گناہوں کا بدترین بوجھ اُٹھائے ہوئے ہوں گے جس کی سزا سے بچنے کا کوئی راستہ نہ ہو گا۔

COPYRIGHTS ® RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION. SALE OF THIS BOOK WOULD ENTAIL CRIMINAL ACTION.

علمی بات: اس دن مجرم دہائی دیں گے اے ہمارے رب! آج ہمیں یقین ہو گیا کہ آپ کا فرمان سچا اور آپ کی ملاقات برحق تھی لیکن ان کا اعتراف اور معذرت کسی کام نہیں آئے گی۔ حکم ہو گا کہ اب عذاب کی سختیاں اور جہنم کی اذیتیں چکھتے رہو کیونکہ بار بار سمجھانے کے باوجود تم کفر ہی کرتے رہے تھے۔ تم نے اپنے رب کی ملاقات کو جھٹلائے رکھا یہاں تک کہ قیامت برپا ہو گئی۔

آیت نمبر ۳۲: دنیوی زندگی کے عارضی ہونے اور بہت جلد ختم ہونے کے اعتبار سے اسے لہو و لعب فرمایا گیا ہے۔ کھیل تماشہ کی طرح دنیا کی لذتیں بھی عارضی ہیں جب کہ آخرت کی لذتیں حقیقی اور دائمی ہیں۔

نوٹ: دنیا کی زندگی کو لہو و لعب قرار دینے کی وجوہات حسب ذیل ہیں:

i۔ لہو و لعب کی مدت کم ہوتی ہے اور بہت جلد ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دنیا کی زندگی بھی کم ہے اور جلد ختم ہو جاتی ہے۔

ii۔ لہو و لعب عموماً کسی فریب پر مبنی ہوتا ہے' اسی طرح انسان بھی دنیاوی زندگی کسی فریب کے سہارے گزارتا ہے۔

iii۔ عموماً بچے، نادان اور غافل لوگ لہو و لعب میں مشغول رہتے ہیں اور سنجیدہ اور ذی فہم لوگ لہو و لعب سے اجتناب برتتے ہیں۔ اسی طرح دنیا کی لذتوں اور دلفریبیوں میں بھی جاہل اور غافل لوگ مشغول رہتے ہیں اور جو لوگ عقل مند اور زیرک ہوتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ دنیا اور اس کی تمام لذتیں فانی اور جلد ختم ہو جانے والی ہیں۔ لہٰذا وہ فانی نعمتوں کے مقابلے میں ابدی نعمتوں کے حصول کی جدوجہد میں مشغول رہتے ہیں۔

فرمان نبوی ﷺ: "دنیا مومن کے لئے قید خانہ ہے اور کافر کے لئے جنت ہے۔" (صحیح مسلم، جامع ترمذی)

علمی بات: آخرت کی ابدی زندگی کے مقابلے میں چند روز کی دنیوی زندگی، جسے کافر سب کچھ سمجھ رہے ہیں کھیل تماشے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پرواکئے بغیر دنیا میں زندگی گزارتے ہیں تو جس عیش و آرام کو وہ اپنا مقصد زندگی بناتے ہیں، آخرت میں جا کر ان کو پتہ چلے گا کہ اس کی حیثیت کھیل تماشے کی سی تھی۔ ہاں! جو لوگ دنیا کو آخرت کی کھیتی بنا کر زندگی گزارتے ہیں۔ ان کیلئے دنیوی زندگی بھی بڑی نعمت ہے۔ جو ابدی نعمتوں کے حصول کا سبب ہے۔

فرمان نبوی ﷺ: دنیا کے بے وقعت ہونے کے متعلق احادیثِ مبارکہ میں بھی بتایا گیا ہے۔ ۱۔ حضرت مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سواروں کی ایک جماعت میں جا رہا تھا، اچانک آپ ﷺ ایک جگہ سے گزرے جہاں بکری کا (مردہ) بچہ پڑا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے کہ جب اس کے مالکوں نے اس کو پھینکا ہو گا تو یہ ان کے نزدیک بے وقعت ہو گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا اس کے بے وقعت ہونے کی وجہ سے ہی انہوں نے اس کو پھینک دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے۔ جس قدر یہ بکری کا مردہ بچہ اپنے مالکوں کے نزدیک بے وقعت ہے' اللہ تعالیٰ عزوجل کے نزدیک دنیا اس سے بھی زیادہ بے وقعت ہے۔ (صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، مسند احمد)

۲۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنی دنیا سے محبت کرے گا وہ اپنی آخرت کو نقصان پہنچائے گا اور جو شخص اپنی آخرت سے محبت کرے گا' وہ اپنی دنیا کو نقصان پہنچائے گا۔ سو تم باقی رہنے والی چیز کو فانی ہونے والی چیز پر ترجیح دو۔ (مسند احمد)

۳۔ حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی قسم مجھے تم پر فقر کا خوف نہیں ہے' لیکن مجھے تم پر یہ خوف ہے کہ تم پر دنیا اس طرح کشادہ کر دی جائے گی جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر کشادہ کر دی گئی تھی' سو تم دنیا سے اس طرح رغبت کرو گے جس طرح انہوں نے رغبت کی اور تم اسی طرح ہلاک ہو جاؤ گے جس طرح وہ ہلاک ہو گئے تھے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابن ماجہ)

آیت نمبر ۳۳: رسول اللہ ﷺ کو کفار کی مخالفانہ باتوں پر تسلی دی گئی ہے کہ مشرکین آپ ﷺ کے سچے ہونے کا یقین رکھتے ہیں لیکن ان کی ظاہری تکذیب کا باعث ان کا بغض و عناد ہے۔ یہ مشرکین مکہ رسول اللہ ﷺ کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلاتے ہیں۔

نوٹ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ابو جہل نے نبی کریم ﷺ کے سامنے کہا: "ہم آپ کو جھوٹا نہیں کہتے بلکہ ہم اس شریعت کو جھوٹا کہتے ہیں جو آپ لے کر آئے ہیں۔" (جامع ترمذی)۔

شانِ نزول: جنگ بدر کے دن اخنس بن شریق اور ابو جہل کی ملاقات ہوئی، اخنس ابو جہل کو اس جگہ لے گیا جہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے ابو جہل سے کہا اے ابو الحکم (یعنی ابو جہل) مجھے یہ بتاؤ کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) صادق ہیں یا کاذب؟ کیونکہ یہاں پر میرے اور تمہارے سوا قریش کا اور کوئی فرد نہیں ہے جو ہماری باتیں سن رہا ہو۔ ابو جہل نے کہا تم پر افسوس ہے، بخدا (سیدنا) محمد (ﷺ) البتہ ضرور صادق ہیں اور (سیدنا) محمد (ﷺ) نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، لیکن جھنڈا، کعبہ کی دربانی اور بئر زمزم پہلے ہی بنو قصی کے پاس ہیں۔ اگر نبوت بھی وہ لے گئے تو قریش کے پاس کیا باقی بچے گا، تب یہ آیت نازل ہوئی (ابن جریر)۔

آیت نمبر ۳۴: رسول اللہ ﷺ کو صبر کی تلقین فرمائی گئی ہے، کہ گزشتہ قوموں نے بھی آپ ﷺ سے پہلے بھیجے گئے رسولوں کی تکذیب کی تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ کی مدد جیسے سابقہ رسولوں کو پہنچی اسی طرح آپ ﷺ کو بھی پہنچے گی اور آپ ﷺ کامیاب ہوں گے۔

علمی بات: ۱۔ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ: اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی توجہ دعوت الٰہی کی تاریخ اور اس میں رائج سنت الٰہی کی طرف دلائی کہ تاریخ انبیاء کرام علیہم السلام میں آپ ﷺ کی تکذیب پہلا واقعہ نہیں بلکہ دیگر رسولوں کی بھی تکذیب ہوئی ہے۔

۲۔ فَصَبَرُوْا: اس تکذیب پر صبر سے کام لیا۔ جو لوگ صدق واخلاص کی آخری منزل پر فائز ہوں، ان کو جھٹلایا جائے تو یہ بات نہایت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ رسولوں نے اس تکلیف کا صبر سے مقابلہ کیا۔

۳۔ وَاُوْذُوْا: صرف تکذیب نہیں کی بلکہ اس کے بعد اذیت بھی دی گئی۔ یہاں صبر کا دوبارہ ذکر نہیں کیا، چونکہ صبر کی منزل پر اذیت پہنچنے سے پہلے ہی فائز تھے۔

۴۔ اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا: اب اللہ تعالیٰ کی نصرت کا مرحلہ آتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی مدد، تکذیب اور اذیت پر صبر و تحمل کے بعد آتی ہے۔

۵۔ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ: اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو بدلنے والا کوئی نہیں ہے۔ یعنی تکذیب واذیت پر صبر کے بعد اللہ تعالیٰ کی مدد آنا یقینی و حتمی ہے جس میں کسی قسم کی تبدیلی کا امکان نہیں ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: اور یقیناً ہمارے بھیجے ہوئے بندوں (یعنی رسولوں) سے ہمارا یہ وعدہ ہو چکا ہے۔ یقیناً وہ مدد کیے جانے والے ہیں۔ (سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷، آیات: ۱۷۱، ۱۷۲) یعنی اس کی نصرت کے وعدے مومنین کے حق میں اور عذاب کی وعیدیں منکرین کے حق میں پوری ہو کر رہیں گی، چنانچہ "اللہ کے کلمات" پورے ہو کر رہے، اسلام کی دعوت مشرق سے مغرب تک پھیلی اور مشرکین ذلیل و خوار ہوئے۔

عملی پہلو: ۱۔ وَلَقَدْ جَآءَكَ: رسولوں کی تاریخ اور سرگزشت، آپ ﷺ کے سامنے ہے کہ ان کو کن صبر آزما مراحل سے گزارا گیا اور آخر میں ہمیشہ وہی فاتح رہے، اسی طرح آپ علیہ السلام بھی فتح یاب ہوں گے۔

۲۔ اس آیت میں ہمارے لئے سبق یہ ہے کہ تبلیغ حق کے راستہ میں مشکلات آتی ہیں جیسا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی آئیں مگر جو ان مشکلات پر صبر اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے مشن کو جاری رکھتے ہیں وہ ایک دن اللہ تعالیٰ کی مدد سے اپنے مقصد کو پالیتے ہیں۔ دعوت اور اصلاح کے کام میں صبر بہت ضروری ہے۔ صبر کے بعد ہی اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت نازل ہوتی ہے۔

علمی بات: اہل حق کی مخالفت کا ہونا تعجب انگیز نہیں بلکہ نہ ہونا باعثِ تعجب ہے۔

آیت نمبر ۳۵: نبی اکرم ﷺ کو مزید تسلی و تشفی فرمائی گئی ہے کہ دنیا کے تمام انسان سچائی پر اکٹھے نہیں ہوا کرتے۔ آپ ﷺ صبح و شام اس کوشش میں رہتے کہ کسی طرح کفار ہدایت سے بہرہ مند ہو جائیں۔ مگر بتایا گیا ہے کہ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کر دینا اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف

COPYRIGHTS © RESERVED ... THE ILM FOUNDATION ... SALE OF THIS BOOK ... EMAIL ...

ہے۔ کیونکہ اصل مقصود امتحان ہے ،چنانچہ حق وباطل کو بالکل واضح طور پر بیان کر کے دونوں میں سے کسی بھی راہ پر گامزن ہونے کا اختیار انسان کو دے دیا گیا۔

عملی بات: کفار آپ ﷺ سے مختلف قسم کے دنیاوی فوائد پر مشتمل ظاہری وحسی معجزات کا مطالبہ اور فرمائش کرتے تھے۔ حضور اکرم ﷺ کی بہت خواہش تھی کہ سب لوگ مسلمان ہو جائیں، لہٰذا جب کفار اس قسم کے معجزات کا مطالبہ کرتے اور راہ حق سے روگردانی کرتے تو ان کا یہ فعل حضور اکرم ﷺ پر گراں گزرتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پیارے نبی ﷺ! اگر آپ زمین کی تہ میں سرنگ کھود کر یا آسمان کی بلندیوں میں سیڑھی لگا کر ان کے فرمائشی معجزات ظاہر کردیں تب بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ وہ پہلے کئی معجزات (جیسے شق قمر، درختوں اور پتھروں کی گواہی وغیرہ) دیکھ چکے ہیں اور صرف تعصب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے انکار کرتے ہیں تو جو شخص متعصب اور ضدی ہو اسے کسی عقلی یا نقلی دلیل سے مطمئن نہیں کیا جاسکتا۔ نیز اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اگر وہ چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا اور کوئی بھی کافر نہ ہوتا مگر اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ کسی کو مجبور نہ کیا جائے تاکہ لوگوں کی آزمائش ہو جائے کہ کون اپنے اختیار سے حق کو قبول کرتا ہے اور کون جان بوجھ کر اس سے روگردانی کرتا ہے، آپ ﷺ کو اس کے بارے میں غمگین ہونے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ یہ حکمتِ خداوندی ہے۔

آیت نمبر ۳۶: دعوتِ حق پر لبیک کہنے والے وہ ہیں جو حق بات توجہ اور طلب ہدایت کی نیت سے سننے والے ہیں جبکہ کفار کی مثال مُردوں جیسی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتوں کو حق سننے، سمجھنے اور قبول کرنے کے لئے استعمال نہ کیا یہ بالآخر روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوں گے۔

علمی بات: جو لوگ حق بات غور سے سنتے ہیں وہ تو ہدایت قبول کر لیتے ہیں لیکن جو روگردانی کرتے ہیں وہ دراصل مُردوں کی طرح ہیں۔ کافروں کو جانداروں جیسی زندگی تو ملی ہے، لیکن ان کے دل فاسد عقائد اور اخلاقِ رذیلہ کے زہر سے بھر چکے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی غور و فکر کی صلاحیتیں مردہ ہو گئیں اور انہیں اپنی اس کوتاہی کا احساس اس وقت ہوگا جب انہیں قبروں سے اٹھا کر اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا، اس وقت انہیں حسرت ویاس ہوگی مگر اس وقت کا احساس بے سود ہوگا۔ ہمیں بھی حق بات دل وجان سے مان کر اُس کے تقاضوں پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔

عملی پہلو: حق کی دعوت وہی قبول کریں گے جو حق کے متلاشی اور طلبِ حق کی نیت سے سننے والے ہوں گے اور جو لوگ ضد اور عناد میں آخری حد تک پہنچے ہوئے ہیں ان کے دل مردہ ہیں وہ کبھی حق بات کو نہیں پاسکتے وہ ہدایت سے محروم ہی رہتے ہیں۔

آیت نمبر ۳۷: کفار کی ایک اور ناروا بات پر ان کو تنبیہ کی گئی ہے کہ فرمائشی معجزہ دیکھ کر بھی نہ ماننے والے عذاب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ فطری طریقہ کے مطابق لوگ عقل وفہم کو استعمال کر کے پیغمبر کی دعوت کو قبول کریں اور ایمان کی راہ اختیار کریں۔

علمی بات: ۱۔ معجزہ ایک غیر معمولی اور خلافِ عادت چیز ہوتی ہے جو کسی نبی علیہ السلام سے نبوت کے دعویٰ کے بعد اس کی صداقت کے لئے ظاہر ہوتا ہے مخلوق میں ہر ایک اس کے مقابلے میں بے بس ہو جاتا ہے۔ معجزہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف پیغمبروں کو ہی عطا فرمایا جاتا ہے تاکہ لوگ ان کی نبوت کی تصدیق کے بعد احکامِ الٰہی میں ان کی اطاعت کریں۔

۲۔ نبی علیہ السلام کی نبوت کی اصل دلیل تو نبی علیہ السلام کی ذات، صفات اور تعلیمات ہوتی ہیں انہی کو دیکھ کر سلیم الفطرت اور عقل مند لوگ ایمان لے آتے ہیں۔ مگر عوام الناس میں جو ظاہری اور حسی نشانیوں سے متاثر ہوتے ہیں ان کے لئے اللہ تعالیٰ معجزات عطا فرماتا ہے اور جن کی ضد اور بداعمالیوں کے سبب ان کے مقدر میں سوائے محرومی کے اور کچھ نہیں ہوتا وہ معجزات دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے۔

۳۔ معجزات صرف پیغمبروں کو عطا ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو جھوٹے نبی سے بچانے کے لئے کسی جھوٹے مدعی نبوت کو کوئی معجزہ نہیں دیا، اور نہ ہی اس کی کوئی پیشن گوئی پوری ہونے دی یہی وجہ ہے کہ مرزا قادیانی ملعون کی کوئی پیشن گوئی سچی ثابت نہیں ہوئی بلکہ وہ خود بھی عبرتناک موت

سے دوچار ہوا، دجال کے ہاتھوں اللہ ﷻ کئی خرق عادت کام ظاہر فرمائے گا لیکن وہ نبوت کا دعویٰ نہیں کرے گا بلکہ خدائی کا دعویٰ کرے گا اور کانے یعنی عیب زدہ شخص کے خدائی کے دعوے کی حقیقت ہر انسان خوب جانتا ہے۔

۴۔ معجزہ وَہبی یعنی عطا کیا ہوا ہوتا ہے کَسبی یعنی اپنی محنت سے کمایا ہوا نہیں ہوتا۔ معجزہ کسی نبی اور رسول علیہ السلام کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتا کہ جب چاہیں اسے ظاہر کر دیں بلکہ اللہ ﷻ کے اختیار میں ہوتا ہے جب اللہ ﷻ چاہتا ہے اور جو معجزہ چاہتا ہے نبی علیہ السلام کے ہاتھوں ظاہر فرما دیتا ہے۔ اللہ ﷻ نے بعض مرتبہ کفار کے مطالبے کے عین مطابق نبی علیہ السلام کے ہاتھ پر معجزہ ظاہر فرمایا اور بسا اوقات کافروں کی طرف سے کسی خاص معجزے کے بار بار مطالبے اور اصرار کے باوجود بھی پورا نہیں فرمایا کیونکہ اس سے پہلے کتنے ہی معجزات دیکھنے پر وہ انکار کر بیٹھے تھے اور ایمان نہیں لائے تھے۔

نوٹ: مخصوص معجزات نہ دکھائے جانے کی وجوہات: پہلی وجہ یہ ہے کہ کفار کی طرف سے مخصوص قسم کے معجزات کا مطالبہ در حقیقت ضد اور عناد کی بنیاد پر تھا۔ نہ کہ ان کا مقصد ان کے ذریعے قبولِ ہدایت تھا۔ اس لئے عام طور پر انبیا کرام علیہم السلام کو فرمائشی معجزات عطا نہیں کیئے جاتے۔ وگرنہ اللہ ﷻ ہر قسم کے معجزات ظاہر کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ دوسرا اگر کوئی قوم فرمائشی معجزہ دیکھنے کے باوجود ایمان قبول نہ کرے تو اس پر اللہ ﷻ کا عذاب نازل ہو کر رہتا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم جیسے بے مثال معجزہ کی موجودگی میں کسی حسی اور مادی معجزہ کی ضرورت نہیں۔

عملی پہلو: جن لوگوں نے خود ہی اپنے لئے اندھیروں میں بھٹکنے کا سامان کر دیا ہے اور اپنی آنکھوں پر کفر اور گمراہی کی پٹی باندھ رکھی ہو وہ ایمان کی روشنی کے باوجود ہدایت اور صراطِ مستقیم نہیں پا سکتے۔ جو لوگ (معاذ اللہ) قرآنِ حکیم کو جادو کہہ کر ٹھکرا سکتے ہیں وہ کسی بھی دوسرے معجزے کو جادو قرار دینے سے باز نہیں آئیں گے۔

علمی بات: معجزات پر ایمان لانے کا حکم: انبیاء کرام علیہم السلام کے جو معجزات دلائل قطعیہ سے ثابت ہیں ان پر ایمان لانا فرض ہے، ایسے قطعی معجزات میں سے کسی ایک کے انکار سے بھی انسان دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، مثلاً کشتی نوح علیہ السلام کا معجزہ حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا معجزہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آگ کو گلزار بنانے کا معجزہ، حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے لوہے کو موم کی طرح نرم کرنے کا معجزہ، حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے چرند پرند کی بولیاں سمجھنے کا معجزہ، انسانوں اور جنوں کو ان کے تابع کرنے کا معجزہ، مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے کرنے کا معجزہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے عصا اور ید بیضاء کا معجزہ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ پیدا کرنے کا معجزہ، پیدائش کے فوراً بعد کلام کرنے کا معجزہ، مٹی کے پرندے بنا کر انہیں زندہ کر کے اڑانے کا معجزہ، اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرنے اور مردوں کو زندہ کرنے کا معجزہ، آنحضرت ﷺ کے لئے قرآنِ حکیم کا معجزہ کہ تقریباً سوا چودہ سال گزرنے کے بعد بھی کوئی اس کی نظیر پیش نہیں کر سکا، واقعہ اسراء کا معجزہ، آپ ﷺ کے مبارک ہاتھوں سے پھینکی جانے والی مٹی کو کافروں کی آنکھوں تک پہنچا دینے کا معجزہ وغیرہ انبیاء کرام علیہم السلام کے وہ برحق معجزات جو قطعی دلائل سے ثابت ہیں، ان کا انکار ضلالت و گمراہی ہے۔

نوٹ: مشرکین کے خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ سے معجزات کے مطالبات: "اور انہوں نے کہا ہم ہرگز آپ کی بات نہ مانیں گے یہاں تک کہ آپ ﷺ ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ جاری کر دیں۔ یا آپ کے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو پھر آپ اس کے درمیان بہت سی نہریں جاری کر دیں۔ یا آپ آسمان کو ہم پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرا دیں جیسا کہ آپ کا خیال ہے یا آپ اللہ ﷻ کو اور فرشتوں کو (ہمارے) سامنے لے آئیں۔ یا آپ کے لئے سونے کا ایک گھر ہو یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور ہم آپ کے چڑھنے کو بھی نہ مانیں گے یہاں تک کہ آپ ایک کتاب اُتار لائیں جسے ہم خود پڑھیں آپ فرما دیجیے میرا رب پاک ہے میں تو ایک انسان (اور) رسول ہوں۔" (بنی اسرائیل: ۹۰ تا ۹۳)

نوٹ: حضرت سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی سے معجزہ کا مطالبہ کرنا: سید حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ خاتم النبیین ہیں آپ ﷺ کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا۔ محمد رسول ﷺ کو آخری نبی ماننے کے بعد بھی کوئی شخص کسی جھوٹے مدعی نبوت سے دلیل یا معجزے کا مطالبہ کرے تو

اس کا بھی اسلام سے قطعاً کوئی تعلق باقی نہ رہے گا کیونکہ یہ مطالبہ عقیدہ ختم نبوت کی نفی کرنے والا ہے اور جب عقیدہ ختم نبوت (جو کہ اسلام کا بنیادی نظریہ ہے) باقی نہ رہا تو ایسا شخص کیسے مسلمان کہلا سکتا ہے۔

علمی بات: جو خرق عادت کام نبی کی نبوت سے پہلے ظاہر ہو اس کو ارہاص کہا جاتا ہے، جیسا کہ واقعہ فیل کو نبی کریم ﷺ کے ارہاصات میں شمار کیا گیا ہے۔ لفظ معجزہ دراصل علم العقائد والوں کی اصطلاح ہے کیونکہ انسان اس کے مقابلے اور نظیر پیش کرنے سے عاجز ہوتے ہیں ورنہ قرآن و حدیث میں معجزہ آیت، برہان، علامت اور دلیل سے تعبیر کیا گیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے "اور وہ کہتے ہیں کہ اس کے رب کی طرف سے اس پر کوئی نشانی کیوں نہیں نازل کی گئی۔" (سورۃ الانعام ۶، آیت: ۳۷)

"اے لوگو! تمہارے پاس پروردگار کی طرف سے کھلی دلیل آچکی ہے۔" (سورۃ النساء ۴، آیت: ۱۷۴)

آیت نمبر ۳۸: اس آیت میں اللہ ﷻ کی قدرت اور علم کا بیان فرمایا گیا ہے کہ مخلوقات میں موجود نظم و ضبط اور ترتیب اللہ ﷻ کی قدرت کا شاہکار ہے۔ نیز یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن سب ہی کو اللہ ﷻ کے حضور جمع ہو کر حساب و کتاب دینا ہے۔

علمی بات: ۱۔ <u>قانون ہدایت کی ہمہ گیری:</u> آیت کا مقصد یہ ہے کہ قانون ہدایت و ترہیب ہمہ گیر ہے کائنات میں کوئی جاندار چیز اس سے مستثنیٰ نہیں۔ سب پرندے اور سب حیوان اللہ ﷻ کی جانب سے ہدایت حاصل کرتے ہیں، اور اس فطری ہدایت کی وجہ سے زندہ ہیں، چڑیا سے لے کر چیونٹی تک کے لئے مقررہ قانون ہیں، جن سے سرتابی کرنا ان کے لئے ناممکن ہے، اسی طرح حضرت انسان اپنی پوری زندگی بسر کرنے کے لئے اللہ ﷻ کی ہدایت کا محتاج ہے۔

۲۔ اللہ ﷻ ہی کی قدرت ہے کہ اس نے تمام جانوروں اور پرندوں کو مختلف جماعتوں میں تقسیم کر کے ان کے مزاج کے موافق ان کی غذا کا انتظام فرما دیا ہے۔ ان کی ضروریات کے مطابق ان کے اعضاء جسمانی تخلیق فرمادیئے ہیں۔ جس خطہ زمین اور آب و ہوا میں انہیں زندگی بسر کرنی ہے ان کا گوشت پوست اور جسمانی ساخت اسی کے موافق ڈھال دی ہے۔ پھر ہر ایک کی ذمہ داری کے بقدر اسے شعور اور سمجھ عطا کی گئی ہے۔

نوٹ: کفار کو متنبہ کیا گیا ہے کہ جب اللہ ﷻ زمین کے کسی جانور یا پرندے کے حالات سے ناواقف نہیں ہے اور اس کا نامہ اعمال محفوظ ہے اور اس کا بدلہ بھی اسے ملے گا تو تم اپنے بارے میں یہ کیوں سمجھ رہے ہو کہ تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ نہیں دیا جائے گا۔

علمی بات: ۱۔ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ مرنے کے بعد دوسری زندگی صرف انسانوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ بعض جانوروں کو بھی حشر کے دن زندہ کر کے اٹھایا جائے گا، تاکہ ان سے بدلہ لیا جائے، جیسا کہ حدیث مبارکہ میں مذکور ہے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ضرور بالضرور تم سے قیامت کے دن حق داروں کے حقوق ادا کرائے جائیں گے، حتیٰ کہ بے سینگ بکری کا بدلہ سینگ والی بکری سے لیا جائے گا۔ (صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ) یہاں اس حقیقت کو بیان فرمانے کا مقصد بظاہر یہ ہے کہ کفارِ عرب مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو ناممکن قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ سارے کے سارے انسان جو مر کر مٹی ہو چکے ہوں گے، ان کو دوبارہ کیسے زندہ کر کے جمع کیا جا سکتا ہے، اللہ ﷻ نے یہاں یہ فرمایا ہے کہ صرف انسانوں ہی کو نہیں بلکہ جانوروں کو بھی زندہ کیا جائے گا، حالانکہ جانوروں کی تعداد انسانوں سے کہیں زیادہ ہے، رہا یہ معاملہ کہ دنیا کی ابتداء سے انتہا تک کے بیشمار انسانوں اور جانوروں کے گلے سڑے اجزاء کا کیسے پتہ لگایا جائے گا تو اس کا جواب اگلے جملے میں یہ دیا گیا ہے کہ لوح محفوظ میں ہر بات درج ہے اور یہ ایسا ریکارڈ ہے جس میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی ہے، لہٰذا انسانوں کو جمع کرنا اللہ ﷻ کے لئے کچھ مشکل ہے نہ جانوروں کا۔

۲۔ "الکتٰب" سے مراد لوح محفوظ ہے۔ جس میں تمام مخلوقات کے بارے میں ہر ایک چیز درج ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کتاب سے مراد وہ کتاب ہے جو اللہ ﷻ کے پاس ہے جس میں وہ سب کچھ درج ہے جس کا وقوع ہو گیا اور جو آئندہ ہو گا اور وہ (کتاب) لوح محفوظ ہے۔

فرمان نبوی ﷺ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے روز سب اہل حقوق کے حق ادا کیئے جائیں گے یہاں تک کہ بے سینگ بکری کا انتقام سینگ والی بکری سے لیا جائے گا۔ (بیہقی)

عملی پہلو: اسلام میں حقوق العباد کی ادائیگی پر بہت زور دیا گیا ہے۔ روز محشر میں جانوروں کا انتقام ان کے مکلف ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ رب العالمین کے انتہائی درجہ عدل و انصاف کی وجہ سے ہے کہ ایک جاندار کسی جاندار پر کوئی ظلم کرے تو اس کا بدلہ دلوایا جائے گا باقی ان کے کسی اور عمل پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں باہمی حقوق کی ادائیگی کا معاملہ اتنا سنگین ہے کہ غیر مکلف جانوروں کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا، مگر افسوس ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگ اس میں غفلت برتتے ہیں۔

آیت نمبر ۳۹: اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب کرنے والے اپنے کانوں سے حق بات نہ سننے کی وجہ سے بہرے ہیں، اپنی زبانوں سے حق بات نہ بولنے کی وجہ سے گونگے ہیں اور کفر وضلالت کی تاریکیوں میں گھرے رہنے کی وجہ سے انہیں کوئی چیز نظر نہیں آتی جس سے ان کی اصلاح احوال ہو سکے۔

نوٹ: جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں اور جھٹلاتے ہیں وہ تو ایسے ہیں جیسے بہرے اور گونگے جو مختلف قسم کی تاریکیوں اور اندھیروں میں پڑے ہوئے ہیں یعنی نہ حق بات کو سنتے ہیں نہ حق کہتے ہیں اور ان کی حالت یہ ہے کہ کفر وشرک کے اندھیروں میں گرفتار ہو کر رہ بھٹک رہے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانے والے کفر و شرک اور نفس کی بے جا خواہشوں کے اندھیروں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ایسا آدمی کبھی بھی سیدھی راہ نہیں پا سکتا اور تاریکیوں سے کبھی بھی نہیں نکل سکتا، اللہ تعالیٰ نے قرانِ حکیم میں اہل کفر کے لئے یہ تشبیہ بہت سی آیتوں میں بیان کی ہے تا کہ معلوم ہو جائے کہ وہ جہالت میں پورے طور پر ڈوبے ہوئے ہیں اور فہم وادراک کے تمام راستے ان کی بد اعمالیوں کی باداش میں ان کے لئے کلی طور پر بند ہیں۔ مثلاً سورۃ بقرہ، آیت: ۱۷، ۱۸ اور سورۃ النور، آیت: ۴۶ میں بیان ہوا ہے۔

علمی بات: ۱۔ یہ آیت کریمہ اس امر کی دلیل ہے کہ خالق تو اللہ تعالیٰ ہے مگر خیر و شر کا فاعل وکاسب بندہ خود ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے سمجھانے کے بعد اختیار دے دیا ہے۔

۲۔ ظلمات میں پڑے رہنے سے مراد کفر، جہالت، عناد اور آباء پرستی کے اندھیروں میں پڑے رہنا ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانے والوں کو گونگا اور بہرا کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جیسے گونگا، بہرا راہ نہیں پا سکتا کہ اندھے پن کی وجہ سے آنکھیں دیکھنے سے عاری ہو گئیں اور گونگا اور بہرا ہونے کی وجہ سے وہ نہ خود بول سکتا ہے اور نہ کسی کی سن سکتا ہے۔ یہی حال ایسے لوگوں کا ہو جاتا ہے۔

۴۔ ہدایت اور گمراہی دونوں کا اختیار اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے راہ راست سے دور کر کے گمراہی میں ڈال دے اور جس کو چاہے راہ راست پر ڈال دے۔ مگر وہ گمراہ اُن ہی کو کرتا ہے جو اپنی صلاحیتوں کو صحیح استعمال نہیں کرتے۔ جیسے (سورۃ البقرہ ۲، آیات: ۲۶، ۲۷) اور (سورۃ الاعراف ۷، آیت: ۱۷۶) میں ذکر ہے اور ہدایت اُن ہی کو دیتا ہے جو اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال کرتے ہوئے، اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جیسے (سورۃ شوریٰ ۴۲، آیت: ۱۱) میں ذکر ہے۔

آیت نمبر ۴۰: کفار پر جب مصیبت پڑتی ہے تو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس وقت باطل معبودوں کو بھول جاتے ہیں۔ کفار کو یہ کہہ کر جھنجھوڑا جا رہا ہے کہ اگر تم سچے ہوتے کہ معبودان باطل کی عبادت سے نفع پہنچتا ہے تو مشکل وقت میں ان کو چھوڑ کر صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف کیوں متوجہ ہوتے ہو، معلوم ہوا کہ یہ جھوٹے معبود جو تم نے بنا رکھے ہیں کسی بھی نفع اور نقصان کے مالک نہیں پھر ان کو پکارنا اور ان کی عبادت محض حماقت نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

علمی بات: پہلے اللہ تعالیٰ نے کفار کی جاہلیت کو آشکارا کرنے کے بعد یہ بتایا کہ تمام کائنات میں اللہ تعالیٰ کا علم محیط ہے اور اس کائنات میں وہی حقیقی اختیار رکھنے والا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرما دیا ہے کہ جب ان کافروں پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو پھر یہ اللہ تعالیٰ ہی کی پناہ میں آتے ہیں اور

اس کی اطاعت سے سرکشی اختیار نہیں کرتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کی فطرت کا بھی یہی تقاضا ہے کہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سوا کسی کو مشکل کشا اور حاجت روانہ مانیں کیونکہ مصیبتوں اور تکلیفوں میں وہی واحد نجات دینے والا اور کارساز ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسان کی فطرت میں اپنے خالق کی معرفت رکھی ہے اور اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کرے اور اسی کو پکارے۔ اس لئے انسان پر جب کوئی سخت مصیبت اور پریشانی آتی ہے تو اس کی نگاہ اس کے سوا کسی اور کی طرف نہیں اٹھتی۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "پس آپ اپنا رُخ یکسوئی کے ساتھ دین پر قائم رکھیں (یہی) اللہ کی وہ فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا فرمایا اور اللہ کی بنائی ہوئی (فطرت) میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔" (سورۃ الروم ۳۰، آیت: ۳۰)

آیت نمبر ۴۱: انسانی فطرت میں توحید کا تعارف موجود ہے۔ جب انسان کسی بڑی مصیبت میں پھنس جاتا ہے تو اس وقت اسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی یاد آتا ہے۔

اس آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے از خود اس سوال کا جواب دیا ہے جو پچھلی آیت کے آخر میں مشرکین اور منکرین سے کیا گیا۔

اور بتا دیا کہ سختی، مصیبت اور تنگی میں تم صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کو پکارتے ہو' تاکہ تمہاری مصیبتیں اور تکلیفیں دور ہو جائیں۔ پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی حکمت اور مشیت کے مطابق اگر چاہے تو تم سے وہ تکلیف دور فرما دیتا ہے اور ایسے وقت میں تم اپنے بتوں کو بھول جاتے ہو اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سوا تم کو کوئی یاد نہیں آتا۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے: "آپ پوچھیے تمہیں خشکی اور سمندر کی تاریکیوں سے کون نجات دیتا ہے؟ جس کو تم عاجزی سے اور چپکے چپکے پکارتے ہو۔ کہ اگر وہ ہمیں اس (مصیبت سے) سے بچالے تو ہم ضرور اس کے شکر گزار بن جائیں گے، آپ کہئے اللہ ہی تم کو اس (مصیبت) سے اور ہر مصیبت سے نجات دیتا ہے پھر (بھی) تم شرک کرتے ہو۔" (سورۃ الانعام ٦، آیات: ٦٤ تا ٦٣) دوسری جگہ ارشاد فرمایا "پس جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں (تو) صرف اللہ ہی کو پکارتے ہیں اس کے لئے دین کو خالص کرتے ہوئے پس جب وہ انہیں خشکی کی طرف نجات عطا فرماتا ہے (تو) اسی وقت وہ شرک کرنے لگتے ہیں۔" (سورۃ العنکبوت ۲۹، آیت: ٦۵)

آیت نمبر ۴۲: دنیا میں عذاب سے متعلق اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قانون بیان فرمایا گیا ہے کہ آزمائشیں قوموں کے لئے مہلت ہوتی ہیں تاکہ وہ سنبھل جائیں۔ نیز مشرکین کو دعوت فکر دی گئی ہے کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور اپنے کفر و شرک سے باز آئیں۔

عملی بات: ا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مشرکین مکہ کی عبرت کے لئے سابقہ امتوں کی مثال دی اور یہ بتلایا کہ اپنے بندوں کو مشکلات اور سختیوں میں مبتلا کرنا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی سنت جاریہ ہے تاکہ وہ گمراہی اور کفر سے ہدایت اور ایمان کی طرف رجوع کریں۔ اس لئے فرمایا کہ ہم نے آپ سے پہلے کئی امتوں کی طرف رسول بھیجے جنہوں نے اپنی اپنی قوموں کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی توحید اور اس کی عبادت کی دعوت دی۔ سو انہوں نے اپنے پیغمبروں کی دعوت کو قبول نہیں کیا تو ہم نے ان کو فقر اور معاش کی تنگی میں اور بیماریوں اور تکلیفوں میں مبتلا کر دیا تاکہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے ڈریں اور گڑ گڑا کر اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا کریں' کیونکہ سختیاں جھیلنے سے انسان کندن بن جاتا ہے یعنی اس کی فطری صلاحیتوں میں نکھار آجاتا ہے۔ مشرکین مکہ کو یہ اس لئے بتایا ہے کہ وہ بھی پچھلی امتوں کے کافروں کی طرح عذاب الٰہی کے منتظر تھے اور نبی کریم ﷺ کی مخالفت کرتے تھے۔

۲۔ "باسا" اس تکلیف کو کہتے ہیں جو انسان کے بدن سے باہر ہو، بیرونی طور پر پیش آئے مثلاً سیلاب آجائے یا دشمن کا خطرہ لاحق ہو جائے قحط سالی ہو جائے یا مالی پریشانی ہو جائے یا اشیائے ضرورت مہنگی ہو جائیں وغیرہ اور "ضراء" اس تکلیف کو کہتے ہیں جو بدن کے اندر ہوتی ہے۔

فرمان نبوی ﷺ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جسے اچھا لگے (اور پسند آئے) کہ مصائب و مشکلات (اور تکلیف دہ حالات) میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس کی دعائیں قبول فرمائے تو اسے کشادگی و فراخی کی حالت میں کثرت سے دعائیں مانگتے رہنا چاہیئے۔" (جامع ترمذی) جب کہ عام طور پر معاملہ اس کے برعکس ہے لوگ خوشی میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو بھول جاتے ہیں۔ حالانکہ خوشی کے موقع پر ہمیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا زیادہ شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اے رب! تیرا شکر ہے کہ تو نے ہمیں

خوشی کا یہ دن نصیب فرمایا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اب ناشکری ایک عام عادت سی بنتی جا رہی ہے کہ دولت نصیب ہو جائے تو لوگ برے اور غلط کاموں پر خرچ کرتے ہیں اچھے کاموں کے لئے کہا جائے تو پیشانی پہ بل پڑ جاتے ہیں اور کنی کتراتے ہیں۔

آیت نمبر ۴۳: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ گناہوں کی کثرت اور عدم توبہ کی وجہ سے قوموں کے دلوں میں سختی پیدا ہوتی ہے۔ نیز شیطان ان کے بُرے کاموں کو خوشنما بنا کر پیش کرتا ہے اور ان پر کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ مصائب میں مبتلا ہونے کے باوجود بھی ان کو تنبیہ نہ ہوئی اور نہ ہی انہوں نے اپنے اعمال کو ہی قابل اصلاح سمجھا۔ یہ توبہ سے روکنے والے اسباب کا بیان ہے اور اس بات کا اظہار ہے کہ دل کی سختی اور شیطان کے ورغلانے نے ان کو توبہ سے روک دیا تھا۔

عملی پہلو: ہمیں سوچنا چاہیئے کہ کیا کہیں آج ہمارا بھی یہی حال تو نہیں ہو گیا کہ جب کوئی جنگ، سیلاب، قحط یا زلزلہ یا کوئی آفت ہم پر نازل ہوتی ہے تو ہم اسے محض مادی اسباب کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اسے اللہ ﷻ کی طرف سے تنبیہ اور سزا سمجھنے کو جہالت اور بے وقوفی قرار دیتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ ایسی ہی صورت ہے تو ہمیں فوراً توبہ واستغفار کرتے ہوئے اللہ ﷻ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۴۴: اس آیت میں گناہوں کی پاداش میں قوموں کو عذاب میں مبتلا کرنے کا بیان ہے۔ کہ ان پر دنیا کی مادی نعمتوں، راحتوں اور کامیابیوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ پھر یکدم ایسا سخت عذاب آتا ہے جو اس قوم کو صفحہ ہستی سے مٹا دیتا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کا قانون یہ ہے کہ کوئی قوم اس وقت تک تباہ نہیں ہوتی، جب تک برائیاں کثرت کے ساتھ ان میں نہ پھیل جائیں، اور معصیت میں وہ اس قدر نہ ڈوب جائیں کہ ان کے نزدیک گناہ، گناہ ہی نہ رہے اور ان کے دل سے گناہ کا احساس تک ختم ہو جائے تو ایسے لوگ اللہ ﷻ کی پکڑ سے غافل ہو جاتے ہیں، تو اللہ ﷻ کی طرف سے ایسے لوگوں پر عذاب بھیج کر نیست و نابود کر دیا جاتا ہے۔

عملی پہلو: عقل مند آدمی کو چاہیئے کہ جب سختی اور مصیبت آئے تو اسے اللہ ﷻ کی طرف سے تنبیہ سمجھ کر بُرے کاموں سے توبہ کرے ورنہ غفلت میں ڈوب گیا تو کہیں اچانک ایسی سخت پکڑ نہ ہو جائے کہ توبہ کا موقع بھی نہ مل سکے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب تم کسی ایسے آدمی کو دیکھو جسے اس کی نافرمانیوں کے باوجود اللہ ﷻ ہر چیز دے رہا ہے جسے وہ پسند کرتا ہے تو سمجھو کہ اللہ ﷻ اسے ڈھیل دے رہا ہے پھر نبی کریم ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ (مسند احمد)

علمی بات: اس آیت میں عام انسانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ دنیا میں کسی شخص یا قوم پر عیش و عشرت کی فراوانی دیکھ کر یہ دھوکہ نہ کھائیں، کہ یہ لوگ صحیح راہ پر ہیں اور بڑی کامیاب زندگی گزار رہے ہیں، بلکہ اکثر اوقات یہ حالت ان نافرمانوں کی بھی ہوتی ہے، جن کو سخت سزا میں اچانک پکڑنے کا فیصلہ کیا جا چکا ہوتا ہے۔

آیت نمبر ۴۵: اس آیت میں نافرمانوں کو عذاب کے نتیجہ میں صفحہ ہستی سے مٹا دینے کا ذکر ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ظالم اور حق سے ناآشنا طبقے کا دنیا سے مٹ جانا ہی باقی دنیا کے لئے مفید ہے، کیونکہ جس طرح جسمانی بیماریاں تباہ کن اور متعدی ہوتی ہیں، اسی طرح روحانی امراض بھی ہولناک صورت اختیار کر لیتے ہیں اور اگر ان کو باقی رہنے دیا جائے، تو تمام قوم میں اخلاقی بگاڑ کا خطرہ بڑھ جاتا ہے، اس لئے اللہ ﷻ ان کو دنیا میں مٹا دیتا ہے، تا کہ ان کے مفاسد اور ان کا نقصان ان تک محدود رہے۔

ظالموں کی ہلاکت لوگوں کے لئے اللہ ﷻ کا بڑا احسان ہے چنانچہ معاشرہ مفسدین سے پاک ہونے پر اللہ ﷻ کا شکر واجب ہے۔ ظالموں کو تباہ و برباد کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے نعمتوں پر شکر کرنے کے بجائے ناشکری کی اور خوشی میں اطاعت الٰہی بجالانے کے بجائے گناہ کیئے۔ چنانچہ کفار کی تباہی و بربادی سے بقیہ اہل ایمان کو چھٹکارا نصیب ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ ان کے عقائد و اعمال کی نحوست سے پریشان ہوتے ہیں تو ایسوں کو تباہ و برباد کر دینا بھی اللہ ﷻ کی ایک نعمت ہے اور ہر نعمت پر شکر واجب ہے۔

عملی پہلو: قرآنِ حکیم کی آیت اور حدیث نبوی ﷺ سے معلوم ہوا کہ محض دنیاوی ترقی اور خوشحالی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ جس فرد یا قوم کو یہ حاصل ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہے جیسا کہ بعض لوگ ایسا سمجھتے ہیں بلکہ بعض تو ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان "ہمارے نیک بندے زمین کے وارث ہوں گے۔" (سورۃ الانبیاء ۲۱، آیت: ۱۰۵) کا مصداق قرار دے کر انہیں اللہ تعالیٰ کے نیک بندے تک قرار دیتے ہیں، ایسا سمجھنا اور کہنا غلط ہے۔ گمراہ قوموں یا افراد کی دنیاوی خوش حالی و مہلت آزمائش کے طور پر ہے اور یہ رب کی ناراضگی کی دلیل ہے۔

آیت نمبر ۴۶: **علمی بات:** ا۔ اللہ تعالیٰ ہی نے کان آنکھ اور دل عطا فرمائے ہیں۔ اگر وہ ان نعمتوں کو سلب کر لے تو اس کے سوا نہیں کوئی لوٹا نہیں سکتا۔ انسان کے اشرف الاعضاء کان آنکھیں اور دل ہیں۔ اگر ان اعضاء کی صفات زائل ہو جائیں تو انسان کے حواس اور اس کی کارکردگی کا نظام فاسد ہو جائے گا اور وہ دین و دنیا کے فوائد حاصل کرنے سے محروم ہو جائے گا۔ معلوم ہوا کہ جس ذات نے ان قوتوں کو پیدا کیا اور ان کو زائل ہونے سے محفوظ رکھا ہے 'وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں ہے اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ ان عالی قدر نعمتوں کا دینے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے تو پھر قابل تعظیم اور عبادت کا مستحق بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

۲۔ اس آیت میں فرمایا ہے اگر وہ تمہارے دلوں پر مہر لگا دے مفسرین نے کئی معانی بیان کئے ہیں۔ اس کا ایک معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کے دلوں پر مہر لگا دے جس سے وہ ہدایت کو نہ سمجھ سکیں اور اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی عقلوں کو بالکل زائل کر دے اور وہ پاگلوں اور مجنونوں کی طرح ہو جائیں اور اس کا تیسرا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو مردہ کر دے۔ کوئی بھی معنی مراد لیا جائے یہ سب ان کی بداعمالیوں کے سبب ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کبھی ہم انہیں اپنی نعمتیں یاد دلا کر ان کو ایمان لانے کی ترغیب دیتے ہیں اور کبھی انہیں پچھلی امتوں کا عذاب یاد دلا کر ڈراتے ہیں اور کبھی اس بات سے ڈراتے ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو تمہارے اشرف الاعضاء کو معطل اور بے کار کر دیں اور کبھی اپنی الوہیت قدرت اور توحید پر دلائل پیش کرتے ہیں کہ تم ان دلائل سے متاثر ہو کر ایمان لے آؤ۔ مگر مشرکین کا حال یہ ہے کہ حسد اور غرور کی وجہ سے غور نہیں کرتے اور حق کو قبول نہیں کرتے۔

آیت نمبر ۴۷: اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے اشرف اعضاء کو زائل کرنے کی وعید سنائی تھی اور اس آیت میں عمومی عذاب کی وعید سنائی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عذاب خواہ کسی قسم کا ہو 'اللہ تعالیٰ کے سوا اس عذاب کو کوئی دور کرنے والا نہیں ہے اسی طرح خواہ کسی قسم کی خیر اور بھلائی ہو اللہ تعالیٰ کے سوا اس کا کوئی عطا کرنے والا نہیں ہے۔ اس آیت میں عذاب کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ اچانک اور کھلم کھلا کیونکہ یا تو عذاب سے پہلے اس کی علامتیں نمودار ہوں گی یا عذاب کی نشانیوں کے بغیر اچانک عذاب آئے گا۔ پہلا عذاب اس کی علامتیں ظاہر ہونے کے بعد اور دوسرا عذاب اچانک آنے والا ہے اول الذکر کو کھلم کھلا اس لئے فرمایا کہ اس عذاب کی علامتیں پہلے نمودار ہو چکی تھیں حتیٰ کہ اگر وہ اس عذاب سے بچنا چاہتے تو وہ کفر اور سرکشی سے توبہ کر کے بچ سکتے تھے۔ اس آیت میں فرمایا ہے کہ اگر یہ عذاب آجائے تو ظالم لوگوں کے لئے ہلاکت سے بچنے کا کوئی راستہ نہ ہو گا۔

علمی بات: یہاں ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ جب عمومی عذاب آئے گا تو پھر نیک اور بد کی تمیز نہیں رہے گی اور کافروں کے ساتھ مومن بھی ہلاک ہو جائیں گے؟ ایک جواب مفسرین نے یہ دیا ہے کہ اگرچہ بظاہر کچھ مومن بھی اس سے متاثر ہوں گے لیکن حقیقت میں ہلاکت صرف کفار کے لئے ہو گی اور مومنوں کے لئے یہ ضرر عظیم ثواب اور بلند درجات کا سبب ہو گا اس لئے ان کے حق میں یہ ہلاکت نہیں ہے۔ اس کا ایک جواب یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے کہ جب وہ کسی علاقہ کے کافروں پر عمومی عذاب نازل فرماتا ہے تو ایمان والوں کو وہاں سے نکال دیتا ہے 'جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی قوموں پر جب عذاب نازل فرمایا تو ایمان والوں کو وہاں سے نکال لیا۔

نوٹ: پیغمبروں کو جھٹلانے والی قوموں پر عذاب حجت تمام ہونے کے بعد آتا ہے جیسا کہ سورۃ بنی اسرائیل ۱۷: آیت ۱۵ میں ذکر ہے "اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ ہم رسول نہ بھیج دیں۔"

آیت نمبر ۴۸: انبیاء رسل علیہم السلام لوگوں کو امن و سلامتی اور اللہ ﷻ کی طرف بلاتے ہیں، جنت کی خوش خبری دیتے ہیں اور جہنم سے ڈراتے ہیں۔ رسولوں کی اتباع کرنے والوں اور ان پر ایمان لانے والوں کا ٹھکانا جنت ہو گا۔ ایسے لوگوں کو نہ ماضی کا کوئی غم ہو گا اور نہ مستقبل کا کوئی خوف ہو گا۔

انبیاء کرام علیہم السلام کا مقرر شدہ کام: اس آیت کا معنی ہے کہ اللہ ﷻ رسولوں کو ترغیب دینے اور ڈرانے کے لئے بھیجتے ہیں۔ جیسے ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: "اگر بستیوں والے ایمان لے آتے اور ڈرتے رہتے تو ہم ضرور ان پر آسمان اور زمین سے برکتیں کھول دیتے، لیکن انہوں نے (رسولوں کی) تکذیب کی تو ہم نے ان کے کرتوتوں کی وجہ سے ان کو گرفت میں لے لیا، کیا بستیوں والے اس سے بے خوف ہیں کہ راتوں رات ان پر عذاب آجائے درآنحالیکہ وہ سو رہے ہوں"۔ (سورۃ الاعراف ۷، آیت: ۹۶،۹۷) اللہ ﷻ نے رسولوں کو اس لئے بھیجا ہے کہ وہ خوشخبری سنائیں اور خبر دار کریں۔ اس لئے نہیں بھیجا کہ کفار ان سے من مانے اور فرضی معجزات طلب کریں۔ انبیاء کرام علیہم السلام صرف ان ہی معجزات کو پیش کرتے ہیں جن کی اللہ ﷻ کی طرف سے اجازت ہوتی ہے اور کسی انسان کی تسلی اور اطمینان کے لئے جس قدر معجزات کی ضرورت ہوتی ہے وہ اللہ ﷻ انبیاء کرام علیہم السلام کو عطا فرما دیتا ہے اور جو شخص ان معجزات کی وجہ سے انبیاء کرام علیہم السلام کی تصدیق کرتا ہے اور نیک اعمال کرتا ہے وہ آخرت میں عذاب سے بے خوف ہو گا اور جن لوگوں نے ان معجزات کے باوجود انبیاء کرام علیہم السلام کی تکذیب کی اور اللہ ﷻ کی نافرمانی کی ان کو آخرت میں عذاب ہو گا۔

آیت نمبر ۴۹: انبیاء و رسل علیہم السلام کی تکذیب کرنے والوں کے بارے میں ذکر ہے کہ وہ اپنی نافرمانیوں کی پاداش میں سزا بھگت کر رہیں گے۔ یعنی جس نے انبیاء کرام علیہم السلام کی باتوں پر یقین کیا اور اعتقاداً اور عملاً اپنی حالت درست کر لی تو اس کو حقیقی امن اور چین نصیب ہوا۔ اور جس نے اللہ ﷻ کی آیات کو جھٹلا کر ہدایت الٰہی سے روگردانی کی وہ نافرمانی اور بغاوت کی وجہ سے سخت تباہی اور عذاب عظیم میں گرفتار ہوا۔

آیت نمبر ۵۰: اس آیت میں کفار کے عجیب و غریب معجزے دکھانے کے مطالبوں کا جواب دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے یہ کہلوایا گیا ہے کہ نہ وہ فرشتہ ہیں اور نہ ہی وہ خود سے معجزات دکھا سکتے ہیں۔ آپ ﷺ نے منصبِ رسالت کے ساتھ پیغامِ حق پیش فرمادیا ہے اور آپ ﷺ وحی کے مطابق احکام کی پیروی کرتے ہیں۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت پر لبیک کہنے والے بینا ہوتے ہیں جو ان کو نابینا سے ممتاز کرتے ہیں یعنی اندھا اور بینا گمراہ اور ہدایت یافتہ اور مومن اور کافر برابر نہیں ہو سکتے۔

علمی بات: نبی کریم ﷺ کے حوالہ سے اس معاملہ میں کسی مسلمان کو کلام نہیں ہو سکتا کہ اللہ ﷻ نے نبی کریم ﷺ کو بذریعہ وحی تمام فرشتوں اور اولین و آخرین کو جتنا علم دیا گیا ہے، ان سب سے زیادہ حضور ﷺ کو علم عطا فرمایا گیا ہے۔ اور مخلوقات میں سب سے زیادہ علم عطا فرمایا اور آپ علیہ السلام کو قربِ خداوندی کا وہ مقام نصیب ہوا جو کسی نبی رسول اور مقرب فرشتے کو عطا نہیں کیا گیا یہی پوری امت کا عقیدہ ہے۔ ہاں اس کے ساتھ ہی قرآن و سنت کی بے شمار تصریحات کے مطابق تمام ائمہ سلف و خلف کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ تمام کائنات کا علم محیط صرف اللہ ﷻ کی مخصوص صفت ہے۔ جس طرح اس کے خالق و رزاق، قادر مطلق ہونے میں کوئی فرشتہ یا رسول اس کے برابر نہیں ہو سکتا، اسی طرح اس کے علم محیط میں بھی کوئی اس کے برابر نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے اللہ ﷻ کے سوا کسی فرشتہ یا پیغمبر کو لاکھوں چیزیں معلوم ہونے کے باوجود عالم الغیب نہیں کہا جا سکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ سرورِ کائنات سید الرسل امام الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ کے کمالات کے بارے میں بڑا جامع جملہ یہ ہے کہ "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"۔ کمالات علمی میں بھی یہی ہے کہ اللہ ﷻ کے بعد تمام فرشتوں اور انبیاء و رسل علیہم السلام سے آپ ﷺ کا علم بڑھا ہوا ہے، مگر اللہ ﷻ کے برابر نہیں جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے۔ آیت کے آخر میں یہ ارشاد فرمایا کہ اندھا اور بینا برابر نہیں ہو سکتے، مطلب یہ ہے کہ نفسانی خواہشات، ضد و عناد کو چھوڑ کر حقیقت کو مانو تا کہ تمہارا شمار اندھوں میں نہ رہے، تم صاحب بصیرت اور بینا ہو جاؤ اور یہ بینائی تمہیں اللہ ﷻ کی آیات میں غور و فکر سے حاصل ہو سکتی ہے۔

آیت نمبر ۵۱: تمام رسول خوش خبری سنانے اور خبردار کرنے کے لئے آتے رہے ہیں۔ اس آیت میں بتایا جارہا ہے یہ فریضہ منصب رسالت قرآنِ حکیم کے ذریعے سے سرانجام دیا جائے۔

علمی بات: ا۔ اس آیت میں نبی کریم ﷺ کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ ان واضح آیات کے بعد بھی اگر یہ لوگ اپنی ضد سے باز نہ آئیں تو ان سے بحث و مباحثہ کو موقوف کر دیجئے اور اصلی فریضہ رسالت، تبلیغ دین اس میں مشغول ہو جائیے، اور اسی دعوت کا رخ ان لوگوں کی طرف پھیر دیجئے، جو قیامت میں اللہ ﷻ کے سامنے پیشی اور حساب کتاب کا عقیدہ رکھتے ہیں، جیسے مسلمان یا وہ جو کم از کم اس کے منکر نہیں، بطور احتمال کے ہی سہی، کم از کم ان کو خطرہ تو ہے کہ شاید ہمارے اعمال کا ہم سے حساب لیا جائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کے متعلق تین طرح کے آدمی ہیں، ایک وہ جو یقینی طور پر اس کے معتقد ہیں، دوسرے وہ جو متردد ہیں، تیسرے وہ جو بالکل منکر ہیں، اور دین کی تبلیغ کا حکم انبیاء کرام علیہم السلام کو اگرچہ ان تینوں طبقوں کے لئے عام ہے، جیسا کہ بہت سے ارشادات قرآنی سے واضح ہے، لیکن پہلے دو طبقوں میں چونکہ اثر قبول کرنے کی توقع زیادہ ہے، اس لئے اس آیت میں خاص طور پر ان کی طرف توجہ کرنے کی ہدایت فرمائی گئی "وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ"۔

۲۔ اس آیت میں مشرکین کے اس عقیدے کی تردید ہے کہ وہ اپنے دیوتاؤں کو سفارشی سمجھتے تھے، لہٰذا اس سے آنحضرت ﷺ کی اس شفاعت کی تردید نہیں ہوتی جو آپ اللہ ﷻ کی اجازت سے مومنوں کے لئے کریں گے کیونکہ دوسری آیتوں میں مذکور ہے کہ اللہ ﷻ کی اجازت سے شفاعت ممکن ہے۔ (مثلاً سورۃ البقرہ ۲، آیت: ۲۵۵) جب کہ مشرکین کا گمان یہ تھا کہ براہ راست اللہ ﷻ سے مدد طلب کرنے کے بجائے اگر ہم ان بتوں کا واسطہ وذریعہ بنائیں گے تب ہماری مطلب براری ہوگی۔

قرآن سمجھنے اور سمجھانے کی فضیلت: ۳۔ قرآن حکیم کو سمجھنا اور پھر آگے سمجھانا بہت بڑی بات ہے اللہ ﷻ نے اس کو جہاد کبیر فرمایا ہے۔ چنانچہ سورۃ الفرقان ۲۵، آیت: ۵۲ میں ہے۔ "اور آپ اس (قرآن) کے ذریعے ان سے بڑا جہاد کریں۔" تو یہاں جہاد کبیر سے مراد قرآن حکیم کی تعلیم ہے اور اس کا سمجھانا مراد ہے، قرآنِ حکیم کی نشر واشاعت کرنا مراد ہے نیز اس کے پیغام کو عام کرنا اس کی آیات کے ذریعہ سے باطل عقائد و نظریات کا رد کرنا مراد ہے۔

آیت نمبر ۵۲ : شانِ نزول: آپ ﷺ کی مجلس میں غرباء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیٹھے رہتے تھے جن کی اپنی کوئی جائیداد تھی نہ کاروبار، صاحب حیثیت اللہ ﷻ کے نیک بندے ان کے طعام کا انتظام کرتے تھے اور یہ صرف آپ ﷺ کی خدمت میں رہا کرتے تھے جیسے حضرت بلال رضی اللہ عنہ، حضرت صہیب رضی اللہ عنہ، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ، حضرت عمار رضی اللہ عنہ، حضرت یاسر رضی اللہ عنہ، بعض مالی اعتبار سے کمزور تھے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔ قریش مکہ کے کچھ سرداروں نے یہ کہا تھا کہ آنحضرت ﷺ کی مجلس میں اکثر کم حیثیت کے لوگ رہتے ہیں، ان کی موجودگی میں آپ کی مجلس میں بیٹھنا ہماری توہین ہے، اگر آپ ان لوگوں کو اپنی مجلس سے اٹھا دیں تو ہم آپ کی بات سننے کے لئے آسکتے ہیں اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔

نوٹ: اللہ ﷻ نے ان لوگوں کی رعایت و دلجوئی کا حکم فرمایا جو دین اسلام قبول کرکے اپنے رب سے لو لگائے رہتے ہیں۔ اور مکہ کے رؤسا کی درخواست رد فرمادی۔ اس سے جہاں ان حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت معلوم ہوئی جن کو غریبی کی وجہ سے رؤساعرب نے حقیر سمجھا تھا۔ وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ اسلام قبول کر چکے ہوں ان کی رعایت اور دلجوئی ان لوگوں سے مقدم ہے جو ابھی تک منکرین اسلام ہیں۔

عملی پہلو: ا۔ سچے اہل ایمان کی یہ شان بیان ہوئی کہ وہ صبح شام اللہ ﷻ کو پکارتے ہیں اور صرف اللہ ﷻ کی رضا ان کا مقصود و مطلوب اور مطمع نظر ہوا کرتی ہے۔

۲۔ متکبرین کی سزا اور مال و دولت پر گھمنڈ کرنے والوں پر تنبیہ کی گئی ہے کہ جن لوگوں کے پاس مال و دولت ہو، یا کسی منصب پر فائز ہوں۔ ان میں ایک بڑا مرض یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ غریبوں اور مسکینوں کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔ انہیں اس لائق بھی نہیں سمجھتے کہ وہ پاس بیٹھیں حتیٰ کہ وہ سلام بھی

کریں تو سلام کا جواب دینے میں عار اور ذلت محسوس کرتے ہیں یہ تکبر ہے اور تکبر بدترین خصلت ہے۔ یہ صفت انسان کو حق قبول کرنے سے اور کفر کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہونے سے روکتی ہے اور آخرت میں اس کا بڑا عذاب ہے۔

۳۔ ہر شخص اپنے اعمال کا خود جواب دہ ہے لہٰذا ہمیں اپنی آخرت اور نجات کے لئے خود فکر مند ہونا چاہیئے اور ایمان اور یقین کی دولت سے بہرہ مند ہونے کے بعد اعمال صالحہ کا اہتمام کرنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۵۳: غنیٰ اور فقر انسان کی آزمائش کے لئے ہے۔ اللہ ﷻ نے بعض کو بعض کے ذریعے آزمائش میں ڈالا ہے جو غنی ہیں وہ فقیر کو حقیر سمجھتے ہیں۔ نیز یہ بھی آزمائش ہے کہ نادار مسلمان کفار کی باتوں پر کس حد تک صبر کرتے ہیں۔ اس آیت میں غریب اہل ایمان کا مذاق اُڑانے والے کفار و مشرکین کا ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ ایک آزمائش ہے جن لوگوں کو کسی طرح کی برتری حاصل ہے وہ نعمت عطا کرنے والے کا شکر ادا کرنے کے بجائے متکبر بن کر ان لوگوں کی طرف دیکھتے ہیں جو اس نعمت سے محروم ہیں حالانکہ وہ اپنے سے کمزور لوگوں کو دیکھ کر اللہ ﷻ کے فضل کا احساس کرتے تو ضرور شکر بجالاتے۔ لیکن مال و دولت اور اختیار و اقتدار کے نشہ میں دوسروں کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں اور اس طرح امتحان میں ناکام ہو جاتے ہیں۔

علمی بات: ا۔ سورۃ الاحقاف میں فرمایا" اور کافر ایمان والوں کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ (دین) کچھ بہتر ہوتا تو یہ لوگ اسے قبول کرنے میں ہم سے آگے نہ بڑھتے اور جب انہوں (یعنی کافروں) نے اس سے ہدایت حاصل نہ کی تو اب یہ کہیں گے کہ یہ پرانا جھوٹ ہے۔" (سورۃ الاحقاف ۴۶، آیت: ۱۱) اللہ ﷻ نے جسے مال و دولت عطا فرمایا ہے اُسے چاہیئے کہ وہ غریبوں کو حقیر جاننے کی بجائے منعم حقیقی کی طرف رجوع کرے اور وہ طریقہ تلاش کرے جو اس کے رب کو پسند ہے اور ناشکری و نافرمانی سے پرہیز کرے اور جب حق بات پہنچ جائے تو اسے فوراً قبول کرے۔ اور اس خیال سے حق بات کو بہتر نہ سمجھنا کہ غریبوں نے اس حق کو قبول کر لیا ہے اس لئے ہم اسے قبول نہیں کرتے ان کا یہ خیال تکبر اور حماقت پر مبنی ہے لہٰذا ہمیں اس سے واضح طور پر یہ پتا چلا کہ سمجھداری و ذہانت کا امیری و غریبی سے کوئی تعلق نہیں۔

۲۔ عہد نبوت میں ایسے متکبر لوگ بھی تھے جن کا ذکر آیت شریفہ میں ہوا۔ آج بھی ایسے لوگ ہیں جو اپنے مال و دولت کے نشہ میں دین سے وابستہ رہنے والوں کو حقیر سمجھتے ہیں یہ لوگ اسلام کے دعویدار بھی ہیں لیکن اسلام پر چلنے والوں اور نیک اعمال اختیار کرنے والوں کو حقیر جانتے ہیں کہ ان کے کپڑے پھٹے پرانے، رہنے کا کچا مکان، بھوک پیاس کے ستائے ہوئے ہیں۔ مالداری اور غریبی اللہ ﷻ کے نزدیک مقبول ہونے کا پیمانہ نہیں ہے بلکہ اصل پیمانہ تقویٰ ہے۔ اللہ ﷻ کا قرب اور اللہ ﷻ کے ہاں درجات کی بلندی تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ جس طرح بہت سے مال دار اللہ ﷻ کی یاد سے غافل ہیں۔ تارک فرائض و واجبات ہیں اسی طرح بہت سے غریبوں اور مسکینوں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ عبادت سے غافل اور مالداروں سے حسد کا شکار ہیں اور ان میں اکثر اللہ ﷻ پر اعتراض کرتے ہیں کہ اللہ ﷻ نے ان کو دیا اور ہم کو نہیں دیا۔ ایسی غریبی وبال اور باعث مؤاخذہ و عذاب ہے امیر ہو یا غریب سب پر لازم ہے کہ شریعت کے احکام کی پابندی کریں اچھے اخلاق اختیار کریں گناہوں سے بچیں اور متقی بنیں۔

عملی پہلو: رسول اللہ ﷺ نے سب کو زندگی گزارنے کا ایک طریقہ بتایا ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص ایسے شخص کو دیکھے جو مال میں اور شکل و صورت میں اس سے بڑھ کر ہے تو اسے چاہیئے کہ اپنے سے نیچے والے کو بھی دیکھ لے۔ (صحیح مسلم) دنیاوی چیزوں میں اپنے سے نیچے کو دیکھا جائے تاکہ عبرت اور جذبہ شکر پیدا ہو اور یہ سمجھ میں آئے کہ اللہ ﷻ نے ہمیں ہزاروں لاکھوں افراد سے بہتر بنایا ہے اور بہت زیادہ دیا ہے اور دین میں اپنے سے اوپر والے کو دیکھا جائے جو دین میں ہم سے آگے ہیں، جو لوگ اللہ ﷻ کی یاد و تقویٰ میں لگے رہتے ہیں ان کی برابری بلکہ ان سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔

نوٹ: مساکین صالحین کی فضیلت: غریب مسلمانوں کو ایمان اور اعمال صالحہ کی وجہ سے فضیلت حاصل ہے۔ قیامت میں اس کا یہ فائدہ پہنچے گا کہ مالداروں سے پہلے جنت میں چلے جائیں گے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں ایک مرتبہ ضعفاء مہاجرین کے پاس بیٹھ گیا (جن کے

پاس مال نہ تھا اور کپڑوں کی اس قدر کمی تھی کہ) ان میں سے بعض بعض کے ذریعہ آپس میں پردہ کرتے تھے۔ (یعنی اس ترتیب سے بیٹھے تھے کہ ستر چھپانے کے بعد بقیہ بدن پر ایک دوسرے کی نظر نہ پڑے) ایک صاحب ان میں سے قرآنِ حکیم پڑھ رہے تھے وہ اسی حال میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے آپ ﷺ قریب میں تشریف لا کر کھڑے ہوگئے آپ ﷺ کے تشریف لانے پر قاری خاموش ہوگئے۔ آپ ﷺ نے سلام کیا۔ پھر فرمایا تم کیا کر رہے تھے ہم نے عرض کیا کہ ہم کان لگا کر اللہ ﷻ کی کتاب سن رہے تھے آپ ﷺ نے فرمایا: ”کہ سب تعریف اللہ ﷻ کے لئے ہے جس نے میری امت میں ایسے افراد بنا دیئے جن کے ساتھ مجھے جم کر بیٹھنے کا حکم دیا گیا۔“ اس کے بعد آپ ﷺ نے اشارہ فرمایا جس پر حاضرین نے حلقہ بنا لیا اور سب ہمہ تن آپ ﷺ کی طرف متوجہ ہوگئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے مہاجرین و مساکین! تم اس بات کی خوشخبری قبول کرلو کہ تمہیں قیامت کے دن مکمل نور عطا کیا جائے گا اور تم مالداروں سے آدھے دن پہلے جنت میں داخل ہوگے اور یہ آدھا دن پانچ سو سال کا ہوگا۔ (سنن ابو داوٗد)

آیت نمبر ۵۴: اہلِ ایمان کی دلجوئی کے لئے نبی کریم ﷺ کے طرف سے سلامتی کی دعائیں اور رحمت کی بشارت کا ذکر ہے کہ لاعلمی میں گناہ ہو جانے پر توبہ، اصلاحِ احوال کرنے پر کامیابی کی بشارت ہے نیز اللہ ﷻ کی شانِ رحمت اور غفاری کا بیان ہے کہ وہ گناہوں کو بخش دینے اور انتہائی رحم فرمانے والا ہے۔

شانِ نزول: i- حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ یہ آیت ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی ہے جو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اسلام لانے سے پہلے ہم سے بڑے بڑے گناہ سرزد ہوگئے ہیں رسول اللہ ﷺ خاموش رہے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

ii- حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے اشارۃً یہ کہا تھا کہ مالدار کافروں کی دلجوئی کے لئے مسکین کافروں کو موخر کر دیجئے اور جب یہ آیت نازل ہوئی اور (ان مسکین مسلمانوں کو) دور نہ کیجئے جو صبح و شام اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے اس مشورہ پر معذرت کرتے ہوئے اور استغفار کرتے ہوئے آئے تب یہ آیت نازل ہوئی۔

علمی بات: آپ ﷺ کو خطاب کر کے ہدایت فرمائی گئی کہ جب آپ ﷺ کے پاس ہمارے یہ بندے آئیں جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں تو آپ ﷺ سلامتی اور رحمت کی دعا کے ساتھ انہیں خوش آمدید کہا کریں اور ان کو ہماری طرف سے یہ خوشخبری سنا دیں کہ اللہ ﷻ نے اپنے فضل سے ایمان والوں پر رحمت کو اپنے اوپر واجب کر رکھا ہے، یہاں حقیقی قدر و قیمت ایمان و یقین کی دولت کی ہے جس سے یہ حضرات متصف ہیں، پس وہ ان کو اپنی رحمت سے ضرور نوازے گا اسی رحمت میں سے ہے کہ اگر انہی میں سے کسی سے نادانی کی بناء پر کوئی غلطی صادر ہو جائے اور اسکے بعد وہ توبہ اور اصلاحِ احوال کرے تو اللہ ﷻ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔

نوٹ: سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب اللہ ﷻ نے مخلوق کو پیدا کیا تو اپنی کتاب میں لکھا اور وہ کتاب اس کے پاس عرش پر موجود ہے کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب آگئی ہے۔“ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

آیت نمبر ۵۵: اللہ ﷻ آیات تفصیل سے بیان فرماتا ہے تاکہ حق کھل کر واضح ہو جائے اور طالبِ حق کے لئے قبولِ حق آسان ہو جائے اور مجرموں کا راستہ بھی واضح ہو جائے تاکہ خیر کے طلبگار اُس بُرے انجام سے بچیں جو کفار کے لئے مقرر ہے اور عنقریب انہیں اس سے دوچار ہونا ہے۔

علمی بات: __مجرمین کی صفات:__ ایسے مجرموں کے حالات کچھ تو پہلے بیان ہو چکے ہیں یعنی ایسے لوگ ایمان لانے کے قریب تو آتے نہیں مگر مطالبات اور اعتراضات کیئے جاتے ہیں مثلاً ہمیں فلاں معجزہ لا کر دکھا دو یا فلاں بات کا پتہ دو تو تب ہم ایمان لائیں گے اور کبھی یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر حقیر قسم کے لوگ آپ اپنی مجلس سے نکال دیں تو تب ہی ہم آپ کی مجلس میں آسکتے ہیں۔ کچھ بری صفات تو ان مجرموں کی سابقہ آیات میں مذکور ہو چکیں اور کچھ آگے ذکر ہو رہی ہیں۔ اللہ ﷻ کا فرمان ہے کہ یہ تفصیلات اس لئے بیان کی جا رہی ہیں تاکہ ایسے ہٹ دھرم لوگوں کی بری صفات کھل کر سامنے آجائیں۔

آیت نمبر ۵۶: مشرکین کی پیشکش کا ذکر ہو رہا ہے کہ ایک معین عرصے تک ان کے بتوں کی پوجا کی جائے اور بدلے میں وہ اتنے ہی عرصہ خالصتاً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت کرلیں گے۔ مشرکین مکہ یہ چاہتے تھے کہ کوئی درمیانی راہ نکل آئے۔ تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے معبودوں کی توہین نہ کریں اور ہم انہیں کچھ نہ کہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم یہ تھی کہ یہ بت نہ کسی کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں اور نہ سنوار سکتے ہیں اور ان کے گمان کے مطابق اس توحید کی دعوت سے نہ صرف ان کے بتوں کی توہین ہوتی تھی بلکہ وہ اس میں اپنی اور اپنے آباؤاجداد کی بھی توہین سمجھتے تھے اسی لئے وہ سٹپٹاتے تھے چنانچہ اس بات کے جواب میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ نہ میں تمہاری اس خواہش کو پورا کر سکتا ہوں نہ ہی ان باطل معبودوں کی تعظیم کر سکتا ہوں میں تو مامور ہی اس بات پر ہوں کہ لوگوں کا تعلق ان جھوٹے معبودوں سے توڑ کر اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے جوڑ دوں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھلے الفاظ میں اعلان کر دیں کہ میں تمہارے جھوٹے خداؤں کی عبادت ہرگز نہیں کروں گا اس خام خیالی کو ہمیشہ کے لئے اپنے ذہنوں سے نکال دو۔ کیونکہ نہ عقل سلیم اس کی اجازت دیتی ہے کہ خالق دوجہان کو چھوڑ کر کسی غیر کی عبادت کی جائے اور نہ توحید کی روشن دلیلوں نے اس کے لئے کوئی گنجائش چھوڑی ہے۔ اس لئے عقل و نقل کے خلاف ایک صریح باطل کو کیوں کر اختیار کیا جا سکتا ہے۔

علمی بات: یعنی نزول قرآنِ حکیم سے پہلے فطری طور پر اور نزول قرآنِ حکیم کے بعد شرعی طور پر رب نے مجھے بت پرستی سے منع فرمادیا ہے۔ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی بھی بت پرستی نہ کی اور کسی نافرمانی کے کام کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا حتیٰ کہ کبھی غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور نہیں کھایا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت عبادت، تقویٰ، پرہیز گاری نبوت کے ملنے پر موقوف نہ تھی بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبوت ملنے سے قبل بھی صادق و امین تھے اور ہر قسم کی برائیوں سے دور تھے۔

آیت نمبر ۵۷: مشرکین کی ہٹ دھرمی کا ذکر ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عذاب کا مطالبہ کرتے تھے۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے وضاحت کی گئی ہے کہ عذاب دینے کا اختیار بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ہے۔

علمی بات: مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں ڈرایا کرتے تھے کہ اگر تم نے شرک نہ چھوڑا تو عذاب الٰہی آئے گا اور تم نیست و نابود کر دیئے جاؤ گے۔ وہ بطور مذاق کہتے کہ ہم آپ کا دین قبول نہیں کرتے پھر ہم پر جلدی عذاب اتاریئے بلکہ وہ تو یہ دعا بھی مانگا کرتے کہ اے اللہ سبحانہ وتعالیٰ! اگر یہ دین سچا ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش کر۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کی اس بات کے رد میں اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ جواب دینے کی ہدایت فرما رہے ہیں کہ اے کفار! جس عذاب کے لئے تم جلد بازی کر رہے ہو۔ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے دست قدرت میں ہے۔ جب چاہے گا اتارے گا اور اس وقت اس کے غضب سے تمہیں کوئی نہ بچا سکے گا۔ جیسا کہ سورۃ الانفال ۸، آیات: ۳۲، ۳۳ میں بیان ہوا ہے۔

آیت نمبر ۵۸: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشرکین کو بتا دیجئے کہ جس چیز (یعنی عذاب) کو تم جلدی طلب کر رہے ہو اس کو لانے کا اختیار میرے پاس نہیں ہے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ فرما دیجئے! اگر میرے پاس وہ چیز ہوتی جس کو تم جلدی طلب کر رہے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان (کب کا) فیصلہ ہو چکا ہوتا۔

اس آیت سے مراد یہ ہے کہ اس عذاب کو نازل کرنا صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت اور اس کے اختیار میں ہے۔ وہ اگر چاہے گا تو عذاب نازل فرمائے گا اور اگر وہ اپنی کسی حکمت کی بنا پر عذاب نازل نہ کرنا چاہے تو نہیں فرمائے گا ' مجھے اس عذاب کے نازل کرنے یا اسے مقدم و مؤخر کرنے پر قدرت نہیں ہے ' اور اگر بالفرض یہ معاملہ میرے اختیار میں ہوتا تو میں تمہارے مطالبہ پر عذاب لا چکا ہوتا۔

آیت نمبر ۵۹: اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم کی وسعت کا بیان ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہر شی کے کل و جز، اصل و فرع کے ساتھ ساتھ تمام تر جزئیات سے بھی واقف ہے۔ یعنی ہر بڑی اور چھوٹی بات اس کے علم میں ہے۔

علمی بات: ا۔حضرت ابن عباس رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ نے فرمایا کہ "رطب" سے مراد وہ ہے جو اگتا ہے اور "یابس" سے مراد وہ ہے جو نہیں اگتا۔ بعض علماء نے فرمایا کہ رطب ویابس سے تمام اجسام مراد ہیں اس لئے کہ اجسام کی دو قسمیں ہیں یعنی رطب اور یابس، اور ایک قول یہ بھی ہے کہ رطب سے "حی" یعنی زندہ اور یابس سے "بے جان" چیزیں مراد ہیں۔ مفسرین کی ایک جماعت نے "کتاب مبین" سے لوح محفوظ کو مراد لیا ہے۔ "کتاب مبین"۔ ایک اصطلاح ہے، جو تعبیر ہے علم الٰہی سے یعنی خدا کے علم میں کائنات کی تمام تفصیلات موجود ہیں، وہ بحر وبر کی وسعتوں سے آگاہ ہے، پتے پتے سے واقف ہے، زمین کی تاریکیوں میں جو کچھ بھی ہے، اسے علم ہے، اللہ تعالیٰ کا علم ازلی ہے اور ابدی ہے اسے جاننے یاد رکھنے کے لئے کسی کتاب کی ضرورت نہیں لوح محفوظ میں لکھنے کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ جو کچھ وجود میں آتا رہے فرشتوں کو اس کا علم ہوتا رہے کہ یہ سب معلومات الٰہیہ میں سے ہے اور مخلوقات الٰہیہ میں سے ہے اور ایک یہ حکمت بھی ہے کہ جو لوگ مکلف (یعنی احکامات پر عمل کرنے کے پابند) ہیں وہ یہ یقین کرلیں کہ ہمارے اعمال میں سے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو لکھنے سے رہ گئی ہو۔ اس کتاب کو لوح محفوظ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ تحریف سے اور شیاطین کے وہاں تک پہنچنے سے محفوظ ہے کوئی اس میں ردوبدل نہیں کرسکتا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ اپنی صفات میں ایسا کامل ہے کہ کوئی مخلوق کسی صفت میں اس کے برابر نہیں ہوسکتی، پھر ان صفات میں بھی دو صفتیں سب سے زیادہ ممتاز ہیں، ایک علم دوسری قدرت، اس کا علم بھی تمام موجود وغیر موجود، ظاہر اور مخفی، بڑے اور چھوٹے ہر ذرہ ذرہ پر حاوی اور محیط ہے، اور اس کی قدرت بھی ان سب پر پوری طرح غالب اور حاوی ہے۔

آیت نمبر ۶۰: اس آیت میں نیند کو موت سے اور نیند کے بعد بیداری کو دوبارہ جی اٹھنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نیند اور اس کے بعد بیداری کی مثال پیش فرما کر پورے عالم کی موت اور پھر دوبارہ زندگی کے متعلق تنبیہ کی گئی ہے۔ نیز روز قیامت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیشی اور اعمال کا حساب وکتاب بیان فرمایا گیا۔ سونا اور جاگنا، کام اور آرام 'دن اور رات' زندگی اور موت کا ایک سلسلہ ہے جو ہر انسان کے ساتھ لگا ہوا ہے تاکہ انسان ان تغیرات اور انقلابات سے عبرت حاصل کرسکے۔ وہ لوگ جو آئندہ جی اٹھنے پر یقین نہیں کرتے وہ اس پر غور کریں کہ کس طرح نیند انہیں ہر روز مغلوب کردیتی ہے۔ وہ نیند پر قابو نہیں پاسکتے۔ اسی طرح موت ان پر قابو پالے گی اور وہ موت پر قابو نہیں پاسکیں گے۔ کس طرح وہ ہر نیند کے بعد جاگ اٹھتے ہیں۔ اسی طرح وہ موت کی نیند کے بعد بھی جاگ اٹھیں گے اور حساب وکتاب کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کردیئے جائیں گے۔ اور قیامت کے دن جب دوسرا صور پھونکا جائے گا 'سارے مردے اپنی اپنی قبروں سے نکل پڑیں گے۔ پہلا جملہ جو وہ کہیں گے یہی ہوگا "ہمیں کس نے نیند سے بیدار کردیا؟"۔

علمی بات: یہاں "تَوَفّٰی" کا لفظ نیند کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس کا حقیقی معنی ہے کسی چیز کو پورا پورا لے لینا۔ کیونکہ نیند کے وقت انسان کا عقل وشعور معطل ہوجاتا ہے۔ چلنے پھرنے، دیکھنے سننے وغیرہ کی قوتیں بےکار ہوجاتی ہیں۔ اس بناپر "تَوَفّٰی" کا لفظ استعمال ہوا۔ اور موت کے وقت بھی مرنے والا شخص چونکہ اپنے مقررہ دن پورے گزار چکا ہوتا ہے اس لئے وہاں بھی "تَوَفّٰی" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ "تَوَفّٰی" کا یہ مفہوم خوب ذہن نشین رہنا چاہیئے۔ تاکہ کوئی بھی شخص توفی کا معنی اور مراد فقط موت قرار دے کر حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کی حیات سے انکار نہ کرسکے جو کہ قرآن وحدیث سے واضح طور پر ثابت ہے۔

عملی پہلو: جو اللہ تعالیٰ نیند کے بعد اُٹھاتا ہے وہی موت کے بعد زندگی عطا فرمائے گا اور پھر اس کے حضور حاضری ہے اور وہاں لوگوں کے تمام اعمال پیش ہوں گے۔

آیت نمبر ۶۱: اللہ تعالیٰ اپنے سب بندوں پر پرزور قوت رکھتا ہے۔ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ لوگوں کو زندہ فرمائے گا تو فرشتے ان کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کریں گے جو ان کا حقیقی مالک ہے۔ اس دنیا میں تو نمرود اور فرعون جیسے کئی ظالم لوگ ناحق حاکم بن کر اپنا حکم چلاتے رہے ہیں اور حقیقی مالک کو تسلیم نہیں کیا مگر قیامت کے دن ہر خاص وعام اور کافر ومومن کو مشاہدہ ہوجائے گا کہ حقیقی مالک تو صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اس دن صرف اسی کے حکم کے مطابق فیصلے ہوں گے اور اس کا کوئی فیصلہ عدل وانصاف کے خلاف نہ ہوگا۔

علمی پہلو: ا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے پاس رات اور دن کے فرشتے ڈیوٹیاں بدل کر آتے جاتے ہیں اور فجر اور عصر کی نماز میں ان کا اجتماع ہو جاتا ہے پھر وہ فرشتے جو رات کو تمہارے پاس رہے تھے اوپر چلے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے دریافت فرماتا ہے حالانکہ وہ اپنے بندوں کو اچھی طرح جانتا ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟ وہ جواب میں عرض کرتے ہیں کہ ہم نے ان کو نماز پڑھتے ہوئے چھوڑا اور جب ہم ان کے پاس گئے تو اس وقت بھی نماز پڑھ رہے تھے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

۲۔ حضرات مفسرین کرام فرماتے ہیں فرشتے اپنے کام کے اعتبار سے تین اقسام پر مشتمل ہیں:

i۔ وہ فرشتے جو انسانی حفاظت پر مامور ہیں اور ان کو مضرتوں سے بچاتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الرعد ۱۳، آیت: ۱۱ میں فرمایا گیا ہے۔ "اس کے پہرے دار (مقرر) ہیں اس (انسان) کے آگے بھی اور پیچھے بھی وہ اللہ کے حکم سے اُس کی حفاظت کرتے ہیں"۔

ii۔ وہ فرشتے جو انسان کی حفاظت اور اس کے احوال تحریر کرتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الانفطار ۸۲، آیت: ۱۱، ۱۰ میں فرمایا گیا ہے "اور یقیناً تم پر محافظ (فرشتے) مقرر ہیں۔ بہت معزز (تمہارے اعمال) لکھنے والے ہیں"۔

iii۔ وہ فرشتے جو انسان کی روح نکالنے کے لئے مقرر کیئے گئے ہیں اس قسم کے فرشتوں کے سردار حضرت عزرائیل علیہ السلام ہیں، باقی ان کے مددگار و معاون ہیں، قرآنِ حکیم میں ایک مقام پر موت کی نسبت ملک الموت کی طرف ہے اور ایک مقام پر دیگر فرشتوں کی طرف ہے اور ایک مقام پر اللہ تعالیٰ کی طرف ہے کسی میں کوئی تعارض نہیں حقیقت میں سب کو موت دینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

۳۔ سیدنا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ملک الموت کا تسلط زمین کی تمام چیزوں پر اسی طرح ہے جس طرح اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چیز پر ہوتا ہے، تمام روحوں کو وہ خود ہی قبض کرتے ہیں مگر ان کے ساتھ رحمت اور عذاب کے فرشتے ہوتے ہیں پاک روح کو قبض کرنے کے بعد رحمت کے فرشتوں کے حوالے کر دیتے ہیں اور ناپاک روح کو عذاب کے فرشتوں کے سپرد فرما دیتے ہیں۔

علمی بات: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا مومن بندے کا جب دنیا سے تعلق ختم ہوتا ہے اور آخرت سامنے آرہی ہوتی ہے تو سورج جیسے چمکدار اور روشن چہروں والے فرشتے اس کے پاس اتر کر آتے ہیں جنت کا کفن اور خوشبو ان کے پاس ہوتی ہے وہ حد نگاہ کے فاصلہ پر بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت آکر مرنے والے کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے اے پاکیزہ روح اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رضا مندی کی طرف نکل کر چل روح فوراً اس طرح بہتی نکل آتی ہے جس طرح مشک کے اندر سے پانی کا قطرہ نکل آتا ہے۔ موت کا فرشتہ اس کو لے کر فوراً اوپر والے فرشتوں کے سپرد کر دیتا ہے پل بھر بھی اپنے ہاتھ میں نہیں روکتا فرشتے اسی بہشتی کفن اور خوشبو میں روح کو لپیٹ دیتے ہیں، اسی حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کافر کے متعلق ارشاد فرمایا کہ سیاہ ملائکہ ٹاٹ لئے حد نگاہ کے فاصلہ پر آکر بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت آکر اس کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور روح کو قبض کر کے فوراً عذاب کے سیاہ رو فرشتوں کے سپرد کر دیتا ہے پل بھر بھی اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتا۔ (مسند احمد)

آیت نمبر ۶۲: اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کا مولیٰ ومالکِ حقیقی ہونے کا بیان ہے۔ نیز یہ بھی بتایا گیا ہے کہ موت کے بعد روح انسانی کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹایا جائے گا۔ ہر انسان اپنے اعمال کا خود جواب دہ ہو گا۔

علمی بات: **ا۔ موت کے بعد کے احوال اور قبر میں سوال وجواب:** اس بارے میں بہت سی احادیث وارد ہیں۔ اُن کا حاصل یہ ہے کہ جب فرشتے انسان کی روح قبض کرنے آتے ہیں تو فرشتوں کے رویہ سے ہی مرنے والے کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اہل جنت میں سے ہے یا اہل دوزخ میں سے۔ جنتی کی روح کو ریشم کے کپڑوں میں لپیٹ کر آسمان کی طرف جاتے ہیں وہاں اس روح کی خوب پذیرائی ہوتی ہے چنانچہ آسمان کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے پھر اسے عزت و اکرام سے واپس بھیج دیا جاتا ہے اور یہ روح اپنی میت کے ساتھ ساتھ رہتی ہے اور پکارتی رہتی ہے کہ مجھے جلدی جلدی تدفین کے لئے لے چلو۔ پھر تدفین کے بعد قبر میں جب سوال وجواب ہونے کے بعد اسے مقام علیین پہنچا دیا جاتا ہے اور دوزخی کی روح کو فرشتے بدبودار کپڑوں میں لپیٹ کر آسمان کی طرف

لے جاتے ہیں تو اس کے لئے دروازہ ہی نہیں کھلتا پھر اسے وہاں سے اپنی میت کی طرف پھینک دیا جاتا ہے اور وہ پکار پکار کر کہتی ہے کہ مجھے تدفین کے لئے نہ لے جاؤ۔ پھر جب تدفین کے بعد قبر میں سوال وجواب ہوتے ہیں اور وہ اس امتحان میں ناکام رہتا ہے تو مقام سجین میں قیامت تک کے لئے قید کر دیا جاتا ہے۔ یعنی عذاب وثواب کا سلسلہ مرنے کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے پھر قبر میں جنتی کے لئے جنت کی ایک کھڑکی کھول دی جاتی ہے اور وہ قیامت تک ایسے اکرام کے ساتھ مسرت کی نیند سوتا ہے جیسے کوئی دلہن سوتی ہے اور دوزخی کے لئے دوزخ کی طرف کھڑکی کھول دی جاتی ہے جس کی وجہ سے اسے طرح طرح کا عذاب شروع ہو جاتا ہے اور یہ عذاب قیامت کے عذاب کی نسبت بہت کم درجے کا ہوتا ہے۔ قیامت کا عذاب اس سے شدید تر ہوگا۔ اسی طرح جنتی پر جو انعامات آخرت میں ہوں گے وہ قبر کے انعام سے بہت زیادہ ہوں گے۔

۲۔ اللہ ﷻ جلد حساب لینے والا ہے: قیامت کے دن اللہ ﷻ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ یہاں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک آنے والے بیشمار انسانوں کا حساب وکتاب اور پھر ہر انسان کی زندگی کا پورا ریکارڈ چیک کرنا، اس کے لئے تو لمبا عرصہ درکار ہے۔ مگر اللہ ﷻ کے کاموں کو اپنے کاموں پر قیاس کرنا جہالت ہے۔ وہ قادر مطلق ہے اور ایک انسان سے حساب لیتے وقت دوسرے انسانوں سے غافل نہیں ہوتا۔ جس طرح سورج جو کہ اللہ ﷻ کی مخلوق ہے، ایک وقت میں دنیا کی ہر چیز کو اپنی روشنی سے منور کرتا ہے اسی طرح اللہ ﷻ بھی ایک وقت میں دنیا کے ہر انسان کو اپنی رحمت اور توجہ سے فیض یاب کرتا ہے۔ جب ملک الموت کو دنیا کے مختلف حصوں سے روحیں قبض کرنے میں کوئی وقت نہیں لگتا تو اللہ ﷻ جو ملک الموت کا خالق ہے وہ تمام دنیا کا حساب لینے میں کسی وقت کا محتاج نہیں ہے۔ زمان ومکان کی وسعتیں اس کی قدرت کے سامنے سمٹ جاتی ہیں اور جب وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو وہ صرف اتنا فرماتا ہے کہ "ہوجا" تو وہ ہو جاتا ہے۔ (سورۃ یٰسٓ ۳۶، آیت: ۸۲) حدیث میں آتا ہے کہ اللہ ﷻ تمام مخلوق کا حساب دنیا کے دنوں میں سے نصف دن کی مقدار میں لے لے گا۔ دوسری حدیث میں ہے کہ اللہ ﷻ تمام مخلوق کا حساب اتنی دیر میں لے لے گا جتنی دیر میں بکری کا دودھ دوہا جاتا ہے۔ ان احادیث میں اللہ ﷻ کی اپنی مشیت اور ارادہ کا اظہار ہے وگرنہ وہ کسی وقت کا محتاج نہیں ہے جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ ایک وقت میں اللہ ﷻ تمام لوگوں کا حساب کیسے لے گا؟ آپ نے فرمایا: جس طرح اللہ ﷻ ایک وقت میں سب انسانوں کو رزق دیتا ہے اسی طرح وہ ایک وقت میں ان کا حساب بھی لے سکتا ہے۔

آیت نمبر ۶۳: اس سورت میں اللہ ﷻ کی آفاقی نشانیوں پر غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ توحید باری تعالیٰ کا تعارف خود فطرت انسانی میں موجود ہے اس حوالہ سے فرمایا گیا ہے کہ خشکی اور سمندر کی مشکلات وحوادثات سے نجات دینے والا صرف اللہ ﷻ ہی ہے۔ سختیوں میں مبتلا ہونے پر مشرکین بھی جھوٹے معبودوں کو بھول کر اللہ ﷻ ہی کو پکارتے ہیں۔

علمی بات: مشرکین عرب کا معاملہ بڑا عجیب تھا، ایک طرف تو وہ بتوں کو خدا کا شریک بناتے اور ان کی پوجا کرتے لیکن دوسری طرف جب خشکی یا سمندر کی تاریکیوں اور مصیبتوں اور طوفانوں میں گھر جاتے اور جب سارے مادی سہارے ٹوٹ جاتے اور موت سامنے نظر آتی تو بتوں کو بھول جاتے اور بڑی عاجزی کے ساتھ خالق حقیقی کو مدد کے لئے پکارتے کہ اگر وہ انہیں اس مصیبت سے نجات دے دے تو وہ اللہ ﷻ کی نافرمانی سے باز آجائیں گے اور ہمیشہ اس کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے۔ چنانچہ ان دو آیات میں اللہ ﷻ نے حضور اکرم ﷺ کو فرمایا کہ ان ناقدروں کو ان کا وعدہ یاد دلایئے اور ان سے پوچھیے کہ جب تمہیں ہلاکت کا خطرہ ہو تو اللہ ﷻ کو پکارتے ہو اور جب اللہ ﷻ تمہیں اس مصیبت سے نجات دے دے تو پھر تم دوبارہ شرک کی طرف لوٹ جاتے ہو۔ یہ تو وعدہ خلافی ہے کہ تم نے عہد کیا اور اس سے مکر گئے اور ایسے ہو گئے جیسے کوئی عہد ہی نہ تھا۔

عملی پہلو: اس آیت سے معلوم ہوا کہ مصیبت کے وقت بعض کافر بھی صدق دل سے عاجزی کرتے ہوئے گڑ گڑا کر اللہ ﷻ کو پکارتے ہیں، مگر مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ ہر حال میں خوشی ہو یا غم اللہ ﷻ کو یاد رکھیں اور اس کے ساتھ کیئے ہوئے وعدے پورے کریں۔ یاد رکھیں! ہر مسلمان کا اللہ ﷻ سے پہلا وعدہ یہ ہے کہ وہ صرف اللہ ﷻ کی عبادت کرے گا اور کسی کو شریک نہیں ٹھہرائے گا اور اپنی زندگی اس کے احکام کے مطابق

گزارے گا۔ اسی بات کو ہم سورۃ الفاتحہ کی تلاوت کرتے ہوئے بار بار دہراتے ہیں کہ "(اے اللہ!) ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔" (سورۃ الفاتحہ ۱، آیت:۴)

آیت نمبر ۶۴: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ ﷻ کُل نفع و نقصان کا مالک ہے اور وہی مشکلات کو دور کرتا ہے اور سختیوں سے نجات دلاتا ہے۔ مگر مشرکین کا حال یہ ہے کہ مصیبت ٹل جانے پر اللہ ﷻ کو بھول کر جھوٹے معبودوں کی پرستش میں لگ جاتے ہیں۔

آیت نمبر ۶۵: عذاب کی تین اقسام کا بیان: اس آیت میں عذاب کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ i۔ اوپر سے عذاب جیسے بارش کی کثرت، تیز آندھی یا پتھروں کے ذریعے عذاب جیسے پرندوں کی چھوٹی چھوٹی کنکریوں نے ابرہہ کی فوج اور ہاتھیوں کو تہس نہس کر دیا، ظالم امراء اور حُکام کو مسلط کرنا۔ ii۔ نیچے سے عذاب جیسے زمین میں دھنسایا جانا، طوفان اور سیلاب اور قارون کو اس کے خزانوں سمیت زمین میں دفن کر دینا۔ فرعون اور اس کے لشکر کو پانی کی لہروں کے ذریعے غرق کرنا۔ iii۔ مختلف فرقوں میں بٹ جانا ہو اور قتل و غارت کا عام ہونا کہ قاتل کو پتہ نہ ہو کیوں قتل کیا اور نہ مقتول کو پتہ ہو کہ کس جرم میں قتل ہوا۔

علمی بات: امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ روایت کرتے ہیں:

حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ بہت لمبی نماز پڑھی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ نے ایسی نماز پڑھی ہے جو آپ عام طور پر نہیں پڑھتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! اللہ ﷻ سے رغبت اور اس سے خوف کی نماز تھی، میں نے اللہ ﷻ سے تین چیزوں کا سوال کیا، اس نے مجھے دو چیزیں عطا کر دیں، اور ایک سے منع فرما دیا۔ میں نے اللہ ﷻ سے سوال کیا کہ میری امت کو قحط میں ہلاک نہ کرنا تو اللہ ﷻ نے مجھے یہ عطا کر دیا، اور میں نے سوال کیا کہ میری امت پر ان کے مخالف کو مسلط نہ کرنا تو مجھے عطا کر دیا اور میں نے سوال کیا کہ میری امت کے بعض، بعض سے جنگ نہ کریں تو مجھے اس سے منع فرما دیا۔ (جامع ترمذی)

نیز حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ قبیلہ بنی معاویہ کی مسجد پر گذرے، وہاں آپ نے دو رکعت نماز پڑھی اور ہم نے بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھی آپ نے لمبی دعا کی اور اس کے بعد فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے تین چیزوں کا سوال کیا مجھے دو چیزیں عطا فرما دیں اور ایک کی قبولیت سے منع فرمایا۔ میں نے اپنے رب سے سوال کیا کہ میری امت کو قحط سے ہلاک نہ فرمانا دعا قبول ہو گئی اور میں نے یہ سوال کیا کہ میری امت کو غرق کر کے ہلاک نہ فرمانا، میری یہ دعا بھی قبول ہو گئی اور میں نے سوال کیا کہ آپس میں ان کی لڑائی نہ ہو تو اس بات کو قبول کرنے سے منع فرما دیا۔ (مشکوۃ)

عملی پہلو: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ کی دعا سے پہلی امتوں کی طرح اب مسلمانوں پر آسمان و زمین سے کوئی ایسا عذاب نہیں آئے گا جو پوری امت مسلمہ کو صفحہ ہستی سے مٹا دے۔ اگر بعض مقامات میں جزوی طور زلزلہ یا آندھی یا سیلاب آنے سے ان کی نفی نہیں ہے، لیکن گروہ بندی، فرقہ بندی اور آپس کے لڑائی جھگڑے عذاب کی ایسی صورتیں ہیں جو ہمارے گناہوں کی وجہ سے ہم پر مسلط کی گئی ہیں اور جب تک ہم ان گناہوں سے سچی توبہ کر کے اصلاح احوال نہیں کرینگے تو ہمارا حال اور مستقبل یونہی انحطاط کا شکار اور زوال پذیر رہے گا۔ بقول اقبال رحمۃ اللہ علیہ

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

آیت نمبر ۶۶: مشرکین مکہ کے وقوع شدہ احوال کو واقعی بیان کیا جا رہا ہے اور نبی کریم ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ ﷺ کی قوم نے قرآنِ حکیم کو جھٹلا دیا، حالانکہ وہ برحق ہے اور اس میں بیان شدہ ہر بات سچی ہے۔ آپ ﷺ ان سے فرما دیجئے کہ میں تمہارا (ایمان قبول کرنے کا) ذمہ دار نہیں

ہوں، بلکہ میرا کام تمہیں حق پہنچا دینا ہے۔ ارشاد فرمایا "اور فرما دیجئے کہ یہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے، پھر جو چاہے سو ایمان لے آئے اور جو چاہے سو کفر کرے۔" (سورۃ الکہف ۱۸، آیت: ۲۹)

علمی بات: اس آیت میں فرمایا ہے یہی حق ہے تمہارے ربّ کی طرف سے اس میں کس چیز کو حق فرمایا ہے اس میں حسب ذیل اقوال ہیں:

1۔ کفار نے اس عذاب الٰہی کا انکار کیا' حالانکہ اس کا نزول حق ہے۔

2۔ کفار نے اس قرآنِ حکیم کا انکار کیا' حالانکہ یہ قرآنِ حکیم حق ہے۔

3۔ اللہ ﷻ نے الوہیت اور توحید پر بطور دلیل جو آیات نازل کی ہیں کفار نے ان دلائل کا انکار کیا' حالانکہ یہ دلائل حق ہیں۔

اس کے بعد فرمایا آپ ﷺ کہیئے کہ میں تمہارا ذمہ دار نہیں ہوں' یعنی اگر تم ان دلائل سے اعراض کرتے ہو اور حق کا انکار کرتے ہو تو میں تمہارا ذمہ دار نہیں ہوں' یعنی نہ میں تم پر جبر کر کے نہ تمہیں مومن بنا سکتا ہوں اور نہ انکار کی صورت میں تمہیں سزا دے سکتا ہوں۔ میں تو تمہیں صرف آخرت کے عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔ اس نہج پر قرآنِ حکیم میں اور بھی آیات ہیں: ہمیں خوب معلوم ہے جو یہ کہتے ہیں اور آپ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہیں پس آپ نصیحت کیجئے قرآنِ حکیم کے ذریعے اُسے جو میرے (عذاب کے) وعدہ سے ڈرتا ہے۔ (سورۃ ق ۵۰، آیت: ۴۵) اور سورۃ الغاشیہ ۸۸، آیات: ۲۲،۲۱ میں فرمایا گیا: پس آپ (ﷺ) نصیحت فرماتے رہیں بے شک آپ (ﷺ) تو نصیحت ہی فرمانے والے ہیں۔ آپ (ﷺ) ان پر کوئی ذمہ دار نہیں ہیں۔

آیت نمبر ۶۷: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ ہر فیصلے کے ظہور کا ایک وقت مقرر ہے اور کفار کے لئے تنبیہ ہے کہ نافرمان عذاب کا شکار ہو کر رہیں گے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے فرمایا ہر خبر کا ایک وقت مقرر ہے' اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ ﷻ نے جو بھی خبر دی ہے اس کا ایک وقت متعین ہے اور اس وقت میں یقیناً اس خبر کا ظہور ہو گا اور اس میں کوئی تقدیم و تاخیر نہیں ہو گی۔ اس سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ اللہ ﷻ نے کفار کے لئے عذاب آخرت کی جو خبر دی ہے وہ عذاب یقیناً نازل ہو گا۔ اور اس سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ اللہ ﷻ نے جو یہ خبر دی ہے کہ کفار کے ساتھ جنگ میں مسلمان کافروں پر غالب ہوں گے تو بغیر شک وشبہ کے اس خبر کا ظہور ہو گا۔ یہ اللہ ﷻ کی طرف سے کفار کے لئے وعید ہے۔ کیونکہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کا انکار کرتے تھے اور دنیا میں بھی ان کے لئے وعید ہے جیسا کہ بدر وغیرہ میں وہ شکست سے دوچار ہوئے اس آیت میں مسلمانوں کے لئے عبرت اور سبق ہے اگر انہوں نے قرآنِ حکیم کے احکام پر عمل نہیں کیا بلکہ قرآنِ حکیم کے احکام کی خلاف ورزی کی تو یہ قرآنِ حکیم کے عملی انکار کے مترادف ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم پر اللہ ﷻ کی ناراضگی کی وجہ سے اس کا عتاب نازل نہ ہو جائے۔

آیت نمبر ۶۸: اس آیت میں ان مجلسوں میں بیٹھنے کی ممانعت کی جا رہی ہے جن میں اسلام کا مذاق بنایا جا رہا ہو۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ مسلمان اور مشرکین ایک جگہ بیٹھتے تھے۔ مشرکین کو قرآنِ حکیم کا احترام نہ تھا۔ بیٹھے بیٹھے اہل ایمان کے سامنے قرآنِ حکیم کا مذاق بنانے لگتے تھے اور امور دین پر طعن کرنے لگتے تھے۔ اللہ ﷻ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ جب تم ان ظالموں کی اس حرکت کو دیکھو تو ان سے اعراض کرو اور کنارہ کشی اختیار کرو۔ ہاں جب وہ اپنی اس بُری حرکت کو چھوڑ دیں اور دوسری باتوں میں مشغول ہو جائیں تو پھر ان کے ساتھ بیٹھ سکتے ہو۔ اگر اس استہزاء اور تمسخر کے وقت تم بھولے سے ان کے پاس بیٹھے ہو تو یاد آنے پر فوراً اٹھ جاؤ اور ظالموں کے ساتھ نہ بیٹھو۔ یہ مضمون سورۃ النسآء میں بھی گزرا ہے۔ وہاں اس آیت کا حوالہ دے کر فرمایا ہے۔ "اور اس نے کتاب میں تم پر یہ حکم نازل کیا ہے کہ جب تم اللہ ﷻ کی آیتوں کو سنو کہ ان کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو ایسے لوگوں کے ساتھ اس وقت تک مت بیٹھو جب تک وہ کسی اور بات میں مشغول نہ ہو جائیں۔" (سورۃ النسآء، آیت: ۱۴۰)

عملی پہلو: شیطان بھلا دے، یعنی بھول کر اُس مجلس میں شریک ہو گئے بایں طور کہ ایسی مجلس میں شریک ہونے کی ممانعت یاد نہ رہی، تو لہٰذا جس وقت بھی یاد آجائے کہ یہ لوگ اپنی مجلس میں اللہ ﷻ کی آیات کا انکار اور قرآنِ حکیم کا مذاق اُڑاتے ہیں تو فوراً اسی وقت اس مجلس سے اٹھ جانا چاہیئے، یاد آجانے کے بعد وہاں بیٹھے رہنا گناہ ہے، ایک دوسری آیت میں بھی اس کی وضاحت ہے کہ اگر تم وہاں بیٹھے رہے تو تم بھی انہی جیسے شمار

ہو گے۔(سورۃ النساء ۴، آیت: ۱۴۰)۔ اس آیت کا اصل منشاء یہ ہے کہ ایسی مجلس اور مجلس والوں سے اعراض اور کنارہ کشی کی بہتر صورت تو یہی ہے کہ وہاں سے اٹھ جائے لیکن اگر وہ یہ موضوع چھوڑ کر کسی دوسرے شغل میں لگ جائیں، تب بیٹھنے کی گنجائش ہے مگر خواص جن کی دین میں اقتداء کی جاتی ہے ان کے لئے وہاں سے بہر حال اٹھ جانا ہی بہتر ہے۔

تاہم واضح رہے کہ یہ حکم جہاں تعلیم امت کے لئے ہے وہاں اس میں تسلی بھی ہے چونکہ سورۂ انعام مکہ میں نازل ہوئی وہاں مذاق اڑانے والے قریش مکہ یعنی کفار تھے اور سورۃ النساء مدینہ منورہ میں نازل ہوئی وہاں مذاق اڑانے والے یہود یعنی اہل کتاب اور منافقین تھے اور آج کل بے دین امراء، فیشن ایبل اور مغربی تہذیب کے دلدادہ لوگوں کی مجلسوں میں دین اور دین داروں کا مذاق اڑانا بالعموم ہوتا ہے لہذا مومنین کو اس طرز عمل سے دل برداشتہ یا متاثر ہونے کے بجائے اس مجلس کا موضوع بدلنے اور قرآن وسنت کی حقانیت کی دعوت دینے کی بھرپور کوشش کی جائے۔

آیت نمبر ۶۹: جب سابقہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ اگر ان کی مجلس میں جانے کی مطلقاً ممانعت رہی تو ہم مسجد حرام میں نماز اور طواف سے بھی محروم ہو جائیں گے، کیونکہ وہ لوگ تو ہمیشہ وہاں بیٹھے رہتے ہیں، (یہ واقعہ ہجرت اور فتح مکہ سے پہلے کا ہے) اور ان کا مشغلہ ہی عیب جوئی اور بدگوئی ہے، اس پر اس کے بعد یہ والی آیت نازل ہوئی: وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ یعنی جو لوگ احتیاط برتنے والے ہیں وہ اگر اپنے کام سے مسجد حرام (بیت اللہ) میں جائیں تو ان کے بُرے اعمال کی ان پر کوئی ذمہ داری نہیں، ہاں اتنی بات ان کے ذمہ ہے کہ حق بات ان تک پہنچادیں کہ شاید وہ اس سے نصیحت حاصل کر کے صحیح راستہ پر آجائیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر مسلمانوں نے قرآنِ حکیم، نبی کریم ﷺ اور دین اسلام کا تمسخر اُڑانے اور اس پر اعتراض کرنے والوں کے پاس بیٹھنے سے اجتناب کیا تو ان کے اعتراضات اور تمسخر کی مسلمانوں سے باز پرس نہیں ہو گی اور مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ ان لوگوں کو برابر نصیحت کرتے رہیں ہو سکتا ہے یہ لوگ اپنی اسلام دشمنی سے باز آجائیں۔

عملی پہلو: بعض مفسرین فرماتے ہیں جب یہ لوگ دین اسلام اور نبی کریم ﷺ کے خلاف ہرزہ سرائی کریں تو اس وقت مسلمانوں کا ان کی مجلس سے اٹھنا اس پر دلالت کرے گا کہ مسلمانوں کو مشرکین کی یہ باتیں ناگوار گزریں ہیں۔ اور مسلمانوں کے اس طرز عمل سے ان مشرکوں کو حیا آئے اور وہ آئندہ کے لئے مسلمانوں کے سامنے ان دل آزار باتوں سے رُکے رہیں۔

آیت نمبر ۷۰: اس آیت میں مشرکین کا دین کو کھیل تماشہ بنانے کا بیان ہے یعنی دین حق کا مذاق اڑانا اور من چاہی باتوں کو دین سمجھنا۔ اس بے باکی کی بنیادی وجہ دنیا میں مگن رہنا اور آخرت کو بھلا دینا ہے۔ قرآنِ حکیم کے ذریعہ اُن لوگوں کو نصیحت اور آخرت کی حقیقت بیان فرمائی گئی ہے۔ نیز اہل باطل کے لئے دردناک عذاب کی وعید سنائی گئی ہے اور حمایتی اور سفارش کرنے والوں کی یکسر نفی کی گئی ہے۔ آیت کے آخر میں ان کا انجام بیان کیا گیا ہے کہ کفر کے بدلہ جہنم میں کھولتا ہوا مشروب ان کا مقدر ہو گا۔

علمی بات: ۱۔ آپ ﷺ سے ارشاد فرمایا گیا کہ ان لوگوں کو چھوڑ دیجیے جنہوں نے اپنے دین کو لہو ولعب یعنی مشغلہ اور کھیل بنا رکھا ہے، اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ جو دین حق یعنی اسلام ان کے لئے بھیجا گیا ہے، اس کو لہو ولعب بنا رکھا ہے، اس کا استہزاء و تمسخر کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ انہوں نے اصلی دین کو چھوڑ کر اپنا دین و مذہب ہی لہو ولعب کو بنا لیا ہے، دونوں معنی کا حاصل تقریباً ایک ہی ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا ان کو دنیا کی چندروزہ زندگی نے دھوکہ میں ڈالا ہوا ہے، یہ ان کے مرض کا اصلی سبب بیان فرمایا کہ ان کی اس ساری سرکشی اور نافرمانی کی وجہ دنیا کی چندروزہ زندگی کو ہی سب کچھ سمجھتے ہوئے آخرت کو بھلا بیٹھنا ہے، اگر آخرت اور قیامت کا اعتقاد ہوتا تو ہرگز وہ یہ روش اختیار نہ کرتے۔

۲۔ اس آیت میں نبی کریم ﷺ اور عام مسلمانوں کو دو حکم دیئے گئے ہیں، اول یہ کہ ایسے لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کریں جس کا بیان مذکورہ جملہ میں آچکا ہے، دوسرے یہ کہ صرف ان لوگوں سے کنارہ کشی اور اعراض بھی کافی نہیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ قرآنِ حکیم کے ذریعہ ان کو نصیحت بھی

کرتے رہیں اور اللہ ﷻ کے عذاب سے ڈراتے بھی رہیں۔ آخر آیت میں اس عذاب کی تفصیل اس طرح بیان فرمائی کہ اگر ان کی یہی حالت رہی تو یہ اپنے کردارِ بد کے جال میں خود پھنس جائیں گے، آیت میں اس جگہ "اَنْ تُبْسَلَ" کا لفظ استعمال فرمایا ہے، جس کے معنی قید ہو جانے اور پھنس جانے کے ہیں۔

عملی پہلو: ا۔ چونکہ دنیا میں انسان کسی غلطی یا ظلم پر اس کی سزا سے بچنے کے لئے تین قسم کے ذرائع اختیار کرتا ہے، کبھی اپنی جماعت اور جتھے کا زور اس کے خلاف استعمال کر کے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر اس سے عاجز ہو گیا تو بڑے لوگوں کی سفارش سے کام لیتا ہے اور اگر اس سے بھی کام نہ بنے تو پھر کوشش ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو سزا سے بچانے کے لئے کچھ مال خرچ کرے۔ اللہ ﷻ نے اس آیت میں بتلا دیا کہ اللہ ﷻ کے مجرم کے لئے سزا سے بچانے والا نہ کوئی دوست عزیز ہو سکتا ہے، نہ کسی کی سفارش اللہ ﷻ کی اجازت کے بغیر چل سکتی ہے، اور نہ کوئی مال قبول کیا جا سکتا ہے، بلکہ اگر سارے جہان کا مال بھی اس کے قبضہ میں ہو اور وہ اس سب مال کو سزا کے طور پر دے تب بھی یہ فدیہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا۔ آخر آیت میں فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے برے اعمال کی سزا میں پکڑے گئے ہیں، ان کو پینے کے لئے جہنم کا کھولتا ہوا پانی ملے گا، جس کے متعلق دوسری آیت میں ہے کہ وہ ان کی انتڑیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کاٹ ڈالے گا (سورۃ الحج ۲۲، آیت: ۲۰) اور اس پانی کے علاوہ دوسرے بھی دردناک قسم کے عذاب ہوں گے جو ان کے کفر وانکار کے بدلے میں اُن کو دیئے جائیں گے۔

۲۔ آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ آخرت سے غافل صرف دنیا کی زندگی میں مگن ہیں، ان کی صحبت بھی انسان کے لئے مہلک اور مضر ہے، اس کا انجام یہ ہے کہ ان کی صحبت میں رہنے والا بھی کہیں ان جیسا بن کر اس عذاب کا شکار نہ ہو جائے۔

۳۔ بُرے ماحول اور بُری صحبت سے بچنا ضروری ہے جو انسان کے لئے زہر قاتل ہے، قرآن وحدیث کی بیشمار نصوص کے ساتھ مشاہدہ اور تجربہ سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ تمام برائیوں اور جرائم کی جڑ اصل بُری سوسائٹی اور بُرا ماحول ہے جس میں پھنسنے کے بعد اوّلاً انسان تو اپنے ضمیر کے خلاف جرائم کا ارتکاب کرتا ہے اور پھر جب عادت پڑ جاتی ہے تو برائی کا احساس بھی ختم ہو جاتا ہے۔

آیت نمبر ۷۱: اس آیت میں غیر اللہ کو پکارنے کی ممانعت وحرمت کا بیان ہے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ اہل ایمان اللہ ﷻ کے سوا کسی اور کی عبادت نہیں کرتے وہ اللہ ﷻ ہی کو نفع اور نقصان کا مالک مانتے ہیں۔ اہل ایمان اللہ ﷻ ہی کے راستہ پر یقین رکھتے ہیں اور اسی پر چلتے رہتے ہیں اور اللہ ﷻ ہی کی فرماں برداری اختیار کرتے ہیں۔

علمی بات: گمراہی میں بھٹکنے والے شخص کی مثال: اللہ ﷻ نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا کہ آپ ﷺ ان مشرکوں سے کہیئے کہ اللہ ﷻ بزرگ و برتر جو نفع اور نقصان کا مالک ہے، کیا اس کو چھوڑ کر ہم ان بتوں کی پرستش کریں جو ہمیں نفع دینے یا نقصان پہنچانے پر قدرت نہیں رکھتے اور ہم الٹے پیر شرک اور کفر کی طرف لوٹا دیئے جائیں، جب کہ اللہ ﷻ ہمیں اس کفر سے نجات دے کر اسلام کی طرف ہماری رہنمائی کر چکا ہے۔ پھر ہماری مثال اس شخص کی طرح ہو گی جس کو کسی جنگل یا صحراء میں شیاطین جنات نے راستہ سے بھٹکا دیا ہو اور اس کی عقل کام نہ کر رہی ہو کہ وہ کدھر جائے، وہ حیران و پریشان پھر رہا ہو اور اس کے دوست اور ساتھی اس کو بلا رہے ہوں کہ ہماری طرف آؤ ادھر سیدھا راستہ ہے۔

نوٹ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ ﷻ نے بتوں کی اور اللہ ﷻ کی طرف دعوت دینے والوں کی یہ مثال بیان فرمائی ہے، جیسے ایک شخص راستہ سے بھٹک گیا ہو اور اسے کوئی شخص پکارے کہ اس طرف آؤ اور اس کے خیر خواہ بھی ہوں جو اس کو بلائیں کہ اس راستہ پر آؤ تو اگر وہ پہلے بلانے والے کی پکار پر چلا جائے تو وہ اس کو ہلاکت وتباہی کے گڑھے میں گرا دے گا اور اگر وہ ہدایت کی دعوت دینے والے کے پاس چلا جائے تو سیدھا راستہ پا جائے گا اور یہ صحرا یا جنگل میں بلانے والے شیاطین جنات ہیں۔

عملی پہلو: اچھی صحبت اور اچھی مجالس کی یہ برکت ہے کہ نیک ساتھی انسان کی راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتے رہتے ہیں اور خیر کی تلقین اور بدی سے روکتے رہتے ہیں۔ ہمیں بھی نیک لوگوں اور نیک ماحول سے جُڑے رہنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۷۲: اقامت صلوٰۃ اور تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اقامت صلوٰۃ اس کے مسائل کا علم، ظاہری و باطنی آداب کی رعایت، وقت کی پابندی اور جماعت کے ساتھ نماز کی ادائیگی ان سب کو شامل ہے۔ نماز تقویٰ کے حصول کا بھی ذریعہ ہے جیسا کہ سورۃ العنکبوت ۲۹، آیت:۴۵ میں فرمایا گیا ہے کہ ”بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔“ تقویٰ کا مطلب اللہ ﷻ کا خوف رکھنا بھی ہے اور گناہوں سے بچنا بھی۔

علمی بات: بندۂ مومن کو ہمیشہ اسی بات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ میرا معاملہ میرے خالق ومالک کے ساتھ کیسا ہے اور وہ ہر اس کام سے بچنے کی فکر و کوشش کرے جو اس کی ناراضگی اور پکڑ کا باعث ہو۔ سب کو بہر حال اللہ ﷻ کے حضور حاضر ہونا ہے تا کہ نیک وبد میں تمیز ہو سکے۔ نیک کاروں کو جنت کی ابدی اور عظیم الشان نعمتوں سے سرفرازی نصیب ہو اور بدکاروں کو ان کی زندگی بھر کی بدکاریوں کی سزا مل سکے۔ پس ہر کوئی ہمیشہ اسی بات کو پیش نظر رکھے کہ وہاں میرا معاملہ کیسا رہے گا اور اس بڑے دن کیا چیز کام آسکتی ہے۔

آیت نمبر ۷۳: اللہ ﷻ نے آسمانوں اور زمین کو کامل حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے نہ کہ کھیل تماشہ کے لئے۔ اللہ ﷻ زمین و آسمان اور ان میں موجود تمام مخلوقات کا مالک و منتظم ہے جس طرح کائنات کی تخلیق بامقصد ہے اسی طرح انسانوں کو بھی اللہ ﷻ نے ایک مقصد کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ جیسا کہ سورۃ الذاریات ۵۱، آیت:۵۶ میں بیان فرمایا گیا ہے کہ ”اور ہم نے جنات اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا فرمایا ہے۔“ اللہ ﷻ قیامت کے دن انہیں میدان محشر میں کلمہ ”کُن“ کے ذریعے جمع کرنے پر قادر ہے۔ انسان کی خواہش اس کے امر کو مؤخر نہیں کر سکتی۔ اس کا قول و حکم بہر حال نافذ اور واقع ہو گا۔ اس کے بعد اللہ ﷻ نے فرمایا کہ جس دن قیامت کا صور پھونکا جائے گا اس دن اسی کی بادشاہت ہو گی اور وہ اپنے مطیع و فرماں بردار اور عاصی و گناہ گار بندوں کے ساتھ ان کے اعمال کے مطابق برتاؤ کرے گا۔ دنیا دار العمل اور آخرت دار الجزاء ہے اور اللہ ﷻ بندوں کے ظاہر و باطن کی ہر بات سے واقف ہے۔

نوٹ: دنیا میں مجازی طور پر جن کو بادشاہ کہا جاتا تھا ان کی بادشاہت بھی ختم ہو جائے گی، جیسا کہ ارشاد فرمایا: ”جس دن وہ صاف ظاہر ہوں گے، ان کی کوئی چیز اللہ پر چھپی نہ ہو گی۔ آج کس کی بادشاہی ہے؟ اللہ ہی کی جو ایک ہے، بہت دبدبے والا ہے۔“ (سورۃ المؤمن ۲۳، آیت:۱۶)

علمی بات: ۱۔ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک دیہاتی آیا اور اس نے عرض کی، اے اللہ کے رسول ﷺ! صور کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس سے مراد وہ سینگ ہے جس میں پھونکا جائے گا۔“ (مسند احمد، جامع ترمذی)

۲۔ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”قیامت کے دن اللہ ﷻ فرمائے گا، آج وہ لوگ کہاں ہیں جو دنیا میں اپنی حکومت اور بادشاہت کے دعوے دار تھے۔“ (صحیح مسلم)۔

نوٹ: اس صورت کی آیات ۷۴ تا ۹۰ کی وضاحت رہنمائے اساتذہ برائے مطالعہ قرآن حکیم حصہ دوم میں قصہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تحت ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

آیت نمبر ۹۱: علمائے یہود سے خطاب فرمایا گیا ہے جو حسد اور تعصّب کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے منکر ہو گئے۔ اس کے بعد ان کا قول نقل کیا گیا ہے کہ اللہ ﷻ نے کسی انسان پر کوئی کتاب نازل نہیں فرمائی۔ اس کے بعد اللہ ﷻ نے فرمایا کہ تورات بھی اللہ ﷻ ہی نے نازل فرمائی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی انسان تھے۔ نیز علمائے یہود کی خیانت کا بیان ہے کہ وہ حق چھپاتے تھے حالانکہ تورات میں نبی کریم ﷺ کے بارے میں بشارتیں موجود تھیں۔ آیت کے آخر میں ہٹ دھرمی پر قائم رہنے والوں سے اعراض کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

شانِ نزول: سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مالک بن صیف نام کا ایک یہودی نبی کریم ﷺ کے ساتھ بحث کر رہا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں تمہیں اس ذات کی قسم دیتا ہوں جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات کو نازل فرمایا، کیا تم نے تورات میں یہ نہیں پڑھا کہ اللہ ﷻ ایسے عالم کو

ناپسند کرتا ہے جس کا پیٹ بڑھا ہوا ہو اور اس کا پیٹ بڑھا ہوا تھا اس پر وہ غضب ناک ہو گیا اس نے کہا اللہ کی قسم! اللہ ﷻ نے کسی بشر پر کوئی چیز نازل نہیں کی۔ تب اللہ ﷻ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (ابن جریر)

علمی بات: یہود اگرچہ نبوت ورسالت کے قائل تھے مگر بعض یہودیوں نے نبی کریم ﷺ کی نبوت کا انکار کیا اور بغض وعناد میں یہ تک کہہ دیا کہ اللہ ﷻ نے کسی بشر پر کوئی کتاب نازل نہیں کی اور نزول کتاب کے حوالہ سے اللہ ﷻ کی ناقدری کی۔ اس لئے فرمایا جو شخص انبیاء کرام علیہم السلام پر نزول کتاب کا قائل نہیں وہ اللہ ﷻ کا قدر شناس نہیں اور وہ اللہ ﷻ کی حقیقی معرفت سے محروم ہے۔

نوٹ: علماءِ یہود سے جب ان کے عوام کچھ بات پوچھنے کے لئے آتے تھے تو صندوق وغیرہ میں ہاتھ ڈال کر کوئی سا بھی ایک ورق نکال لیتے تھے اور سائل کے مطلب کے مطابق پڑھ کر سنا دیتے تھے۔ تاکہ اس سے کچھ مال مل جائے نیز تورات میں جو حضور اقدس ﷺ کی صفات بیان کی گئی تھیں جسے وہ جانتے تھے مگر عام یہودیوں سے اس کو چھپاتے تھے۔ تورات میں موجود احکام بھی اُن سے چھپاتے تھے اور ان کے بجائے دوسرا حکم بتا دیتے تھے۔

علمی بات: "قَرَاطِيْسَ" جمع ہے "قِرْطَاسٌ" کی۔ جس کے معنی ہیں ورق اور کاغذ، یعنی یہودی تورات کو ایک کتاب کی طرح جمع کرنے کے بجائے الگ الگ ورقوں کی صورت میں رکھتے تھے اور اپنے مطلب کا ورق نکال کر دکھا دیتے تھے۔

عملی پہلو: جاہ ومال کی محبّت میں مبتلا اور اس کے طلبگار اہل علم جان بوجھ کر صحیح مسئلہ بتانے سے گریز کرتے ہیں اور اہل حق سے مناظرہ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں اور اپنے باطل دعوے کو جاننے کے باوجود بھی حجت بازی کرتے تاکہ عوام کی خوش فہمی اور اعتقاد قائم کریں اور قرآن و حدیث میں اپنے معانی و مطالب کے موافق تحریف کر کے استدلال کر لیتے ہیں۔

آیت نمبر ۹۲: علمی بات: ۱۔ قرآن حکیم کا سابقہ آسمانی کتابوں کا مُصَدِّق ہونا: ا۔ یہ برکت والی کتاب ہے۔ قرآنِ حکیم کی بنیادی تعلیمات وہی ہیں جو سابقہ آسمانی کتابوں میں ہیں۔ اس آیت میں فرمایا ہے کہ یہ کتاب سابقہ آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ اس تصدیق کی تفصیل یہ ہے کہ آسمانی کتابوں میں دو چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ اصول اور فروع اصول سے مراد ہیں عقائد مثلاً اللہ ﷻ کی ذات وصفات توحید رسالت ملائکہ تقدیر قیامت مرنے کے بعد اٹھنا 'جزاء وسزا اور جنت ودوزخ وغیرہ۔ اور ظاہر ہے کہ زمان ومکان کی تبدیلی اور انبیاء کرام علیہم السلام کے فرق سے ان عقائد میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ تورات 'زبور اور انجیل میں جو عقائد تھے 'وہی عقائد قرآنِ حکیم میں ہیں، اس لحاظ سے قرآنِ حکیم ان سابقہ کتابوں کا مُصَدِّق ہے اور فروع سے مراد ہیں وہ احکام شریعت جو اکثر انبیاء کرام علیہم السلام کے مخصوص حالت وواقعات رسم ورواج اور تہذیب وتمدن کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں اور یوں تو اکثر انبیاء کرام علیہم السلام کے احکام شریعت ایک دوسرے سے مختلف ہیں 'لیکن نفس عبادت اور اطاعت رسول علیہم السلام اور اتباع شریعت میں تمام آسمانی کتابیں متفق ہیں اور اس چیز میں قرآنِ حکیم ان کا مُصَدِّق ہے۔ نیز ان تمام سابقہ آسمانی کتابوں میں یہ لکھا ہوا تھا کہ آخری زمانہ میں نبی آخر سیدنا محمد ﷺ کو مبعوث کیا جائے گا جو سابقہ شریعتوں کو منسوخ کر دیں گے اور سب لوگوں پر صرف ان کی شریعت کی اتباع لازم ہو گی اور جب ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ مبعوث ہو گئے اور قرآنِ حکیم کے ذریعہ آپ ﷺ کی شریعت نافذ ہو گئی تو سابقہ آسمانی کتابوں کی یہ بشارت پوری ہو گئی 'اس لحاظ سے قرآنِ حکیم تمام سابقہ آسمانی کتابوں کا مُصَدِّق ہے۔

۲۔ مکہ مکرمہ کا اُمُّ القریٰ ہونا: اس آیت میں مکہ مکرمہ کو اللہ ﷻ نے اُمُّ القریٰ فرمایا ہے 'اُمُّ القریٰ کا لفظی معنیٰ ہے شہروں کی ماں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا مکہ مکرمہ کو اُمُّ القریٰ اس لئے فرمایا ہے کہ تمام زمینیں اس کے نیچے سے نکال کر پھیلائی گئی ہیں۔ تو گویا یہی اصل ہے اور باقی تمام شہر اور قصبات اس کے تابع ہیں۔ نیز تمام دنیا کے مسلمانوں کی ہر دور میں مرکزی عبادت حج ہے اور حج مکہ مکرمہ میں ہوتا ہے اور اس وجہ سے تمام مخلوق مکہ مکرمہ سے جمع ہوتی ہے 'جیسے بچے ماں کے گرد جمع ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کو اُمُّ القریٰ فرمایا 'نیز حج کی وجہ سے مکہ مکرمہ میں مختلف انواع

واقسام کی تجارت ہوتی ہے اور اس شہر میں کسب معاش کے ذرائع دوسرے شہروں کی بہ نسبت زیادہ ہیں، اس لئے اس کو اُمُّ القریٰ فرمایا اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ ﷻ کی عبادت کا پہلا گھر مکہ مکرمہ میں بنایا گیا، اس لئے اس کو اُمُّ القریٰ فرمایا۔

۳۔ غافل لوگوں کو بُرے انجام سے خبردار کرنا: قرآنِ حکیم کا ایک اہم مقصد غفلت میں پڑے لوگوں کو بُرے انجام سے ڈرانا ہے۔ اس کتاب سے ہدایت صرف وہ لوگ پائیں گے جو آخرت پر ایمان رکھتے ہوں۔ اس میں یہود اور مشرکین کی ایک مشترک بیماری پر تنبیہ کی گئی ہے اور وہ ہے اللہ ﷻ کی آیات اور دلائل میں غور و فکر نہ کرنا، یہ اس مرض کا اثر ہے کہ وہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اگر وہ دلائل میں غور کریں، اور حق بات کو قبول کرنے میں جاہلانہ، آبائی رسوم و رواج کی پروا نہ کریں۔ تو اس بُرے انجام سے بچ سکتے ہیں۔

۴۔ تمام عبادات میں نماز کی اہمیت: اس آیت میں فرمایا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان لاتے ہیں وہ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں یعنی صاحب ایمان شخص کی نشانی یہ ہے کہ ایسے لوگ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس جگہ یہ سوال ہوتا ہے کہ آخرت پر ایمان لانے والے تمام نیک اعمال کی حفاظت کرتے ہیں اور تمام بُرے کاموں سے بچتے ہیں تو اس آیت میں نماز کا خصوصیت کے ساتھ کیوں ذکر فرمایا ؟ اس کا جواب ہے کہ اس سے اس بات پر توجہ دلائی ہے کہ ایمان لانے کے بعد سب سے افضل اور اشرف عبادت نماز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں نماز پر ایمان کا اطلاق فرمایا ہے: "وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ "۔ (سورۃ البقرہ ۲، آیت: ۱۴۳) ترجمہ: اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ تمہارا ایمان (نماز) ضائع کردے۔

نوٹ: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ ﷻ نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ جس شخص نے ان نمازوں کے لئے اچھی طرح وضو کیا اور ان کو اپنے اوقات میں پڑھا اور ان کا پورا پورا رکوع اور خشوع کیا تو اللہ ﷻ نے (از راہ کرم) اس کی مغفرت کرنے کا ذمہ لیا ہے اور جس نے ایسا نہیں کیا تو اللہ ﷻ پر اس کا کوئی ذمہ نہیں ہے ' اگر وہ چاہے تو اس کو بخش دے اور وہ چاہے تو اس کو عذاب دے۔ (سنن ابو داوٗد، سنن النسائی، سنن ابن ماجہ)

آیت نمبر ۹۳: سب سے زیادہ ظالم کون ہے ؟: اس سے پہلی آیت میں قرآنِ حکیم اور نبی کریم ﷺ کی صفات بیان فرمائی تھیں اور اس آیت میں سب سے بڑے ظالموں کی تین اقسام بیان فرمائی ہیں ایک وہ جس نے کوئی بات خود تراشی ہو اور اللہ ﷻ کے ذمے لگا دے کہ یہ اللہ ﷻ کا حکم ہے۔ اس میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو شرک و بدعات کی مختلف اقسام کو ایجاد تو خود کرتے ہیں پھر انہیں شریعت سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس طرح ان رسوم و بدعات پر مذہبی تقدس کا خول چڑھا دیتے ہیں اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اللہ ﷻ کی آیات کا غلط مطلب نکال کر اور ان کی غلط تاویل کر کے اس کے عوض عارضی فوائد حاصل کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جھوٹے نبی جنہوں نے آپ کے بعد اپنی نبوت کا دعویٰ کیا ہے یا کریں گے حالانکہ آپ خاتم النبیین ہیں جیسے مسیلمہ کذاب، اسود عنسی، مرزا غلام احمد قادیانی اور ایسے ہی دوسرے لوگ اور آپ نے فرمایا ہے کہ میرے بعد تیس کے لگ بھگ ایسے کذاب اور دجال پیدا ہوں گے جو اپنی نبوت کا دعویٰ کریں گے (صحیح مسلم۔ کتاب الفتن۔ باب قولہ ان بین یدی الساعۃ کذابین قریبا من ثلاثین) اور تیسرے وہ لوگ جو یہ دعویٰ کریں کہ ہم بھی قرآن جیسی چیز بنا سکتے ہیں۔ جیسا کہ ایک دفعہ کفار مکہ نے بھی کہا تھا کہ (لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ 31) 8۔ الانفال: 31) حالانکہ جب قرآن حکیم نے ان کو ایسی ایک ہی سورت بنالانے کا چیلنج کیا تو وہ اپنی بھرپور اور اجتماعی کوششوں کے باوجود اس کی نظیر لانے پر قادر نہ ہو سکے تھے۔

علمی بات: ۲۔ ظالموں کی تین اقسام کا بیان : i۔ جس نے کوئی بات خود گھڑی ہو اور کہے کہ یہ اللہ ﷻ کا حکم ہے۔

ii۔ نبوت کا جھوٹا دعوے کرنے والا۔ iii۔ جو شخص یہ دعویٰ کرے میں بھی قرآن کی طرح کچھ نازل کر سکتا ہوں (معاذ اللہ)۔

ظالموں کی غلط بیانی اور تکبر کی پاداش میں فرشتوں کا سختی سے ان کی روحوں کو قبض کرنے کا بیان ہے۔

۳۔ عذاب جہنم سے پہلے عذاب کا ذکر عذاب برزخ کی دلیل ہے: آج سے مراد وہ دن ہے جس میں ان کی روح قبض کی جائے گی اور عذاب قبر کی ابتدا ہو گی۔ اس آیت میں عذاب قبر کی طرف واضح اشارہ ہے، کیونکہ قیامت تو جب اللہ ﷻ چاہے گا قائم ہو گی، درمیان کا وقفہ یعنی برزخ ہم سے پردے میں ہے۔ انسان کا کوئی جز کسی بھی جگہ میں ہو یا راکھ بن جائے، وہی اس کی قبر ہے اسے اسی جگہ وہی عذاب قبر ہو گا۔

آیت نمبر ۹۴: میدان حشر کے منظر کا بیان ہے لوگوں کو اللہ ﷻ کے سامنے اکیلے اور خالی ہاتھ پیش ہونا ہو گا جیسا کہ سورۃ مریم ۱۹، آیت: ۹۵ میں بھی فرمایا کہ "ان میں سے ہر ایک قیامت کے دن اس کے پاس اکیلا آئے گا"۔

نوٹ: ۱۔ پہلی تخلیق سے مراد عالم ارواح میں روحوں کا پیدا کیا جانا۔ جیسا کہ سورۃ الاعراف ۷، آیت: ۱۷۲ میں ذکر ہے۔

۲۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہر انسان کے ساتھ قبر تک تین چیزیں جاتی ہیں، مال، اولاد اور عمل، اولاد اور مال تو اس کو قبر تک چھوڑ کر لوٹ آنے والی چیزیں ہیں، سوا کیلا عمل ہی اس کے ساتھ رہنے والی چیز ہے۔" (صحیح بخاری)

۳۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دنیا اس کا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہیں اور اس کا مال ہے جس کا کوئی مال نہیں اور دنیا کے لئے وہ شخص جمع کرتا ہے جس کو عقل نہیں۔ (مسند احمد، بیہقی)

علمی بات: روز قیامت شرک کرنے والوں کو ان کے خود ساختہ معبودوں کی سفارش اور موجودگی کی نفی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ ظالم جو خود نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ایسی وحی تو ہم بھی اتار سکتے ہیں ان کی حالت قیامت کے دن دیکھنے کے قابل ہو گی۔ تن تنہا بے یار و مددگار بارگاہ رب ذوالجلال میں پیش کیئے جائیں گے اور وہ جھوٹے خدا جن کی وہ عمر بھر پرستش کرتے رہے ان کا وہاں نام و نشان تک نہ ہو گا وہ گہری وابستگی، عقیدت اور بڑی بڑی توقعات سب ختم ہو کر رہ جائیں گی۔

آیت نمبر ۹۵: اللہ ﷻ کی قدرت کاملہ کے وہ کرشمے جن کا ہم ہر وقت مشاہدہ کرتے ہیں ان میں غور و فکر کی دعوت دی جا رہی ہے اور پوچھا جا رہا ہے کہ اے عقل کے دشمنو! یہ بتاؤ کہ عبادت کے لائق وہ ذات ہے جس کی قدرت کے یہ کرشمے ہیں کہ وہ خشک دانے اور سخت گٹھلی کو چیر کر اس سے سرسبز پودے اور بلند و بالا درخت اگاتا ہے۔ یا وہ بے جان پتھر کے بے بس بُت جنہیں اپنی بھی خبر نہیں۔ گندم کے دانے کا دل چیر کر کس طرح گندم کا پودا نکلتا ہے جس کی کئی بالیاں ہوتی ہیں اور ہر بال پر الگ الگ خوشہ ہوتا ہے جس میں سینکڑوں دانے مضبوط غلافوں میں لپٹے ہوئے کس نے پیدا کیئے۔ یہ اس چھوٹے سے دانے میں سے سینکڑوں کئی دانے کس نے بنا کر نکالے۔ آم کی چھوٹی سی گٹھلی سے اتنا تناور درخت کس نے بنایا۔ اگر انسان اسی میں غور و فکر کرے تو حقیقت روشن اور عیاں ہو جاتی ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے فرمایا وہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ نطفہ سے زندہ بشر پیدا فرماتا ہے اور زندہ بشر سے نطفہ پیدا کرتا ہے 'اسی طرح بے جان انڈے سے چوزہ نکالتا ہے اور مرغی سے بے جان انڈا نکالتا ہے اور متضاد چیزوں کا باہم خروج دعوتِ غور و فکر دے رہا ہے کہ یہ سب کچھ محض طبعی تقاضوں سے نہیں ہو رہا' بلکہ ایک زبردست مدبر اور علیم کی قدرت سے ہو رہا ہے۔ اس کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ ایک بے جان بیج سے سرسبز کونپل نکل آتی ہے 'اور سرسبز درخت سے بے جان بیج نکل آتے ہیں 'اسی طرح کافر کے ہاں مومن اور مومن کے ہاں کافر پیدا ہوتا ہے 'اور عالم کے ہاں جاہل اور جاہل کے ہاں عالم پیدا ہوتا ہے۔

نوٹ: سیدنا ابو رزین عقیلی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! اللہ ﷻ مردوں کو دوبارہ کس طرح زندہ کرے گا؟ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: "کیا تم کبھی بنجر زمین سے گزرے ہو؟" ابو رزین رضی اللہ عنہ نے عرض کی، جی! آپ ﷺ نے دوبارہ دریافت فرمایا: "پھر کبھی اسے سرسبز و شاداب بھی دیکھا ہے؟" ابو رزین رضی اللہ عنہ نے کہا، جی! تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اسی طرح اللہ ﷻ موت کے بعد زندہ کرے گا۔" (سنن ابو داؤد)

آیت نمبر ۹۶: علمی بات: ۱۔ اللہ ﷻ ہی ہے جو رات کی تاریکی کا پردہ سمیٹ کر صبح کا دلفریب منظر ظاہر فرماتا ہے۔ رات کا وقت آرام و راحت کے لئے متعین ہونا ایک مستقل نعمتِ خداوندی ہے مگر یہ نعمت روزانہ بے مانگے مل جاتی ہے، اس لئے انسان کا دھیان بھی کبھی نہیں جاتا کہ یہ کتنا بڑا احسان وانعام ہے، غور کیجئے کہ اگر ہر شخص اپنے اختیار و ارادہ سے اپنے آرام کا وقت معین کرتا تو کوئی صبح آٹھ بجے سونے کا ارادہ کرتا، تو کوئی رات کو آٹھ بجے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ کاروبار زندگی معطل ہو جاتا اور انسان کے آرام میں بھی خلل آتا اور کام کرنے والوں کے کام میں بھی، اللہ ﷻ کی حکیمانہ قدرت قاہرہ نے صرف انسان پر نہیں بلکہ ہر جان دار پر رات کے وقت نیند کا غلبہ مسلط کر دیا کہ وہ ہر کام چھوڑ کر سو جانے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے، شام ہوتے ہی انسان، چرند پرندہ، درندہ، اور چوپائے اپنے اپنے گھر اور ٹھکانے کا رخ کرتے ہیں، اور تمام انسان پر کام چھوڑ کر آرام کرنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں، پوری دنیا میں ایک سناٹا چھا جاتا ہے، رات کی تاریکی نیند اور آرام میں معین و مددگار ثابت ہوتی ہے، کیونکہ عام طور پر روشنی میں نیند نہیں آتی۔ غور کیجئے کہ اگر ساری دنیا کی حکومتیں اور عوام مل کر بین الاقوامی معاہدوں کے ذریعہ سونے کا کوئی ایک وقت مقرر کرنا چاہتے تو اولاً اس میں دشواریاں کتنی ہوتیں، ثانیاً اگر سارے انسان کسی معاہدہ کے پابند ہو کر ایک معین وقت سویا کرتے تو جانوروں کو اس معاہدہ کا پابند کون بناتا اور وہ کھلے پھرتے تو سونے والے انسانوں اور ان کے سامانوں کا کیا حشر ہوتا؟ یہ اللہ ﷻ ہی کی حکیم ذات ہے جس نے ہر جان دار پر ایک معین وقت میں نیند مسلط کر کے ان بین الاقوامی معاہدوں کی ضرورت سے بے نیاز کر دیا۔

۲۔ سورج اور چاند کے ذریعہ دنوں مہینوں اور سالوں کا حساب کتاب اللہ ﷻ کی حیرت انگیز قدرت کا مظہر ہے۔ یعنی سورج اور چاند کی گردش کے لئے ایک سالانہ اور ماہانہ نصاب مقرر کر دیا ہے۔ گرمیوں میں دن کا بڑا ہونا اور سردیوں میں دن کا چھوٹا ہونا اسی مقررہ نصاب اور نظامِ حکمت کی وجہ سے وجود میں آتا ہے اور سورج کے طلوع اور غروب میں اور زوال کے بعد ڈھل جانے میں نمازوں کے اوقات، ماہِ رمضان میں سحری و افطاری کے اوقات ہیں اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کی علامتوں سے مہینوں کا تعین، نیز ماہِ رمضان عید الفطر عید الاضحیٰ اور حج کی عبادات انجام دی جاتی ہیں۔ اس آیت میں اللہ ﷻ نے تین نشانیاں بیان فرمائی ہیں۔ i۔ رات کو چیر کر صبح کو پیدا کیا۔ ii۔ رات کو آرام کے لئے بنایا۔ iii۔ سورج اور چاند کو حساب کے لئے بنایا۔

۳۔ حدیثِ مبارک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اللہ ﷻ کی ان صفات کے ساتھ ثناء کر کے دعا کی ہے۔ اے اللہ (رات کی تاریکی سے) صبح کو چیر کر نکالنے والے اور رات کو آرام کے لئے بنانے والے سورج اور چاند کو حساب کے لئے بنانے والے میری طرف سے قرض کو ادا کر دے اور مجھے فقر سے غنی کر دے اور میری سماعت اور بصارت اور میری طاقت سے مجھے اپنے راستہ میں نفع عطا فرما۔ (موطا امام مالک)

آیت نمبر ۹۷: اس آیت میں ستاروں کے فوائد ذکر کیئے جا رہے ہیں کہ بحری و بری سفر کے دوران سمتوں کے تعین میں ان سے مدد ملتی ہے۔ ان میں اللہ ﷻ کے قدرت کے حسن و جمیل بھی نظارے موجود ہیں۔ اللہ ﷻ نے ستاروں کو پیدا کیا جن کے ذریعے مسافر رات کی تاریکیوں میں راستہ پہچانتے ہیں۔ ستاروں کی تخلیق کا ایک مقصد تو یہ ہے جو یہاں بیان ہوا تاہم، اس کے علاوہ ان کے دو مقصد اور ہیں جو دوسرے مقام پر بیان کیئے گئے، یعنی آسمان کی زینت اور شیطانوں کو مار بھگانا جس کا ذکر سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷، آیات: ۶ تا ۱۰ میں ہے۔ ستاروں کے ان تین فوائد کے علاوہ اگر کوئی شخص ان کے بارے میں ایسی بات کہے جس کا تعلق ایمان و عقیدہ اور انسانی تقدیر سے ہو تو وہ گمراہی پر ہے اور اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھتا ہے۔

آیت نمبر ۹۸: نفس واحد سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں جن سے تمام نسل انسانی وجود میں آئی۔ سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ نے آدم علیہ السلام کو مٹھی بھر مٹی سے پیدا کیا، جو ساری زمین سے لی گئی تھی، اسی لئے بنی آدم کی زمین کی طرح مختلف قسمیں ہیں، (رنگت کے اعتبار سے) کوئی سرخی مائل، کوئی گورا اور کوئی کالا ہے اور اسی طرح (طبیعت کے اعتبار سے) کوئی خوش مزاج، کوئی اکھڑ مزاج اور کوئی برا اور کوئی اچھا ہے۔" (جامع ترمذی، سنن ابو داؤد)

نوٹ: سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی پشت سے ان روحوں کو نکالا جو قیامت تک پیدا ہونے والی ہیں اور وہ روحیں آدم علیہ السلام کو دکھا کر فرمایا کہ یہ تمہاری وہ اولاد ہیں جو سلسلہ در سلسلہ قیامت تک پیدا ہوں گی۔" (جامع ترمذی) **علمی بات: مستقر اور مستودع کے بارے میں مفسرین کے اقوال:** ماں کا بطن، دنیاوی زندگی، قبر، عارضی ٹھکانہ ہیں۔ انسان کا مستقل ٹھکانا آخرت ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ کہ مستقر آخرت ہے اور مستودع دنیا ہے۔ دنیا میں جو وقت ہم گزار رہے ہیں یہ آخرت کے مقابلے میں بہت ہی قلیل ہے۔

نوٹ: تمام دلائل کھول کر بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ عقل وفہم رکھنے والے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور وفکر کے بعد اللہ تعالیٰ کو پہچانیں اور اس کی وحدانیت اور قدرتِ کاملہ کا اقرار کریں۔

آیت نمبر ۹۹: اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نظاروں کا بیان کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ بارش کے ذریعے اناج پیدا فرماتا ہے جس کے دانے تہ بہ تہ ہیں۔ اسی بارش کے پانی سے کھجوریں پیدا فرماتا ہے جن کے گچھے لٹک رہے ہوتے ہیں۔ اسی نے انگوروں کے باغات، زیتون اور انار پیدا فرمائے ہیں۔ پھل ایسے پیدا فرمائے ہیں جو ملتے جلتے ہیں اور ایسے پھل بھی جو مختلف ہیں۔ ایمان والے ان نشانیوں سے اللہ تعالیٰ کو پہچانتے ہیں اور ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔

نوٹ: پھل اپنے خواص، رنگ، مٹھاس، ذائقہ اور لذت وغیرہ میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک ہی زمین میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایک ہی پانی سے ان سب کو سیراب کیا جاتا ہے۔ سب کے لئے آب وہوا بھی ایک ہی ہے۔ ایک ہی سورج کی شعاعیں پڑنے کے باوجود یہ اختلاف اور تنوع آخر کس کی قدرت وحکمت کا نتیجہ ہے؟ سو وہی ہے اللہ تعالیٰ جو اس ساری کائنات کا خالق ومالک اور اس میں حاکم و متصرف ہے۔ پس وہی اللہ تعالیٰ معبود برحق ہے اور اس کی عبادت وبندگی میں کسی اور کو شریک کرنا شرک ہے جو کہ ظلم عظیم ہے۔

آیت ۱۰۰: عرب میں بعض گروہ ایسے بھی تھے جو جنات اور خبیث شیطانوں کی عبادت کرتے تھے اور مصیبت کے وقت ان کے نام کی دہائی دیتے اور کائنات میں ان کا تصرف مانتے تھے۔ ان سب کی اس آیت میں تردید فرمائی کہ بغیر سمجھ بوجھ کے انہوں نے جنوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرا لیا اور اس کے لئے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لیں۔ عرب کے مشرکین فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہا کرتے تھے۔ فرمایا، اللہ تعالیٰ ان گھڑی ہوئی باتوں سے پاک ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ آیت مجوسیوں کے بارے میں نازل ہوئی جو اللہ تعالیٰ کو انسانوں، جانوروں اور ہر اچھی چیز کا خالق سمجھتے اور اسے "یزداں" کہتے تھے اور شیطان (ابلیس) کو درندوں، سانپوں اور ہر قسم کے شر کا خالق سمجھتے تھے اور اسے "اہرمن" کہتے تھے اور ان دونوں کو کائنات کے پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کا شریک بناتے تھے، حالانکہ ان سمیت ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

آیت نمبر ۱۰۱: "بدیع" کے معنی عدم سے وجود میں لانے والا ہے۔ بدیع اس پیدا کرنے والے کو کہا جاتا ہے جس نے کوئی نمونہ سامنے رکھے بغیر کسی چیز کو پیدا کیا ہو اور یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کیونکہ اسی نے آسمان اور زمین کو بغیر کسی سابقہ مثال اور نمونہ کے تخلیق فرمایا۔ وہ ہر چیز کا خالق ہے اور ہر چیز اس کی مخلوق ہے۔ خالق اور مخلوق کے درمیان صرف عبودیت اور بندگی کا ہی رشتہ ہے۔ فرزندی یا قرابت کا کوئی رشتہ نہیں۔ کیوں کہ جس نے محض اپنی قدرت سے زمین اور آسمان کو پیدا کر دیا وہ صمد ذات ہے جو بیٹوں اور رشتہ داروں سے بے نیاز ہے اور اگر تم اپنی جہالت کی وجہ سے اولاد بنانے پر مصر ہو تو پہلے یہ بتاؤ کہ اس کی بیوی کون ہے جس کے بطن سے اس کی یہ اولاد ہوئی اور جب اس کی بیوی ہی نہیں تو اولاد کہاں سے آ گئی۔ اس طرح مشرکین کے ساتھ یہود ونصاریٰ کے عقائد کا بھی رد کیا گیا ہے۔

آیت نمبر ۱۰۲: اس کائنات کا کارساز مطلق اور مقتدر اعلیٰ ایک اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک ہے۔ اگر اس کائنات کے صانع اور مدبر دو یا دو سے زائد ہوتے تو اس کا نظام بھی فاسد ہو جاتا اور جس طرح کسی مملکت کے دو صدر نہیں ہو سکتے، کیونکہ دونوں صدور کے باہمی اختلاف کی صورت میں اُس ملک میں

انتشار اور فساد پھیلے گا اسی طرح اس کائنات کے دو خالق نہیں ہو سکتے ورنہ ایک بارش کا حکم دیتا تو دوسرا روک دیتا وغیرہ وغیرہ اور نظامِ کائنات درہم برہم ہو جاتا۔ بہر حال ہر چیز کا خالق اللہ ﷻ ہی ہے اور معبودِ حقیقی بھی وہی ہے اور ہر قسم کی فعلی، قولی اور بدنی عبادت کے لائق بھی وہی ہے۔

آیت نمبر ۱۰۳: ساری کائنات میں کسی بھی مخلوق کی نگاہ اللہ ﷻ کی ذات کا احاطہ نہیں کر سکتی جبکہ اللہ ﷻ کی نظر ساری کائنات پر محیط ہے، کائنات کا کوئی ذرہ اس کی نظر سے چھپا ہوا نہیں۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر جہان کے سارے انسان، جنّات، فرشتے اور شیطان جب سے پیدا ہوئے اور جب تک پیدا ہوتے رہیں گے وہ سب کے سب مل کر ایک صف میں کھڑے ہو جائیں تو سب مل کر بھی اس کی ذات کا اپنی نگاہ میں احاطہ نہیں کر سکتے۔ (ابن ابی حاتم)

نوٹ: ۱۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب اہلِ جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ ﷻ ان سے فرمائیں گے کہ جو نعمتیں جنت میں مل چکی ہوں ان سے زائد اور کچھ چاہیے تو بتلاؤ کہ ہم وہ بھی دیدیں، یہ لوگ عرض کریں گے، یا اللہ! آپ نے ہمیں دوزخ سے نجات دی، جنت میں داخل فرمایا، اس سے زیادہ ہم اور کیا چاہیں؟ اس وقت حجاب درمیان سے اٹھا دیا جائے گا اور سب کو اللہ ﷻ کی زیارت ہو گی اور جنت کی ساری نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت ہو گی۔ (صحیح مسلم)۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ ایک رات چاند کی چاندنی میں تشریف فرما تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مجمع تھا، آپ ﷺ نے چاند کی طرف نظر فرمائی اور پھر فرمایا کہ (آخرت میں) تم اپنے رب کو اسی طرح سامنے سے دیکھو گے جیسے اس چاند کو دیکھ رہے ہو۔ (صحیح بخاری)

۳۔ اللہ ﷻ جن لوگوں کو جنت میں خاص درجہ عطا فرمائیں گے ان کو روزانہ صبح و شام اللہ ﷻ کی زیارت نصیب ہو گی۔ (جامع ترمذی، مسند احمد)

آیت نمبر ۱۰۴: آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان لوگوں کی طرف نبی کریم ﷺ کے ذریعے دین اور نشانیاں بھیجی ہیں جو ان کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہیں اور جنہوں نے انہیں دیکھ کر دینِ حق قبول کیا تو اُس کا فائدہ اسی کو ہو گا اور جو جان بوجھ کر اندھا بن گیا تو اس کا نقصان اسے ہی ہو گا۔ اللہ ﷻ کا اس میں کوئی نقصان نہیں ہے اور یہ کہ دینِ حق کو قبول کرنے پر میں تم پر نگہبان اور ذمّہ دار نہیں ہوں کیونکہ میں تو صرف رہنما ہوں ہدایت دینا اللہ ﷻ کا کام ہے۔

نوٹ: نبی کریم ﷺ پر یہ ذمہ داری نہیں کہ ان لوگوں کو جبراً حق اور اس کی اتباع پر مجبور کر دیں اور ناشائستہ کاموں سے روک ہی دیں، جیسے نگران اور محافظ کا کام ہوتا ہے، بلکہ رسول کا منصبی فریضہ صرف احکام کا پہنچا دینا اور سمجھا دینا ہے، پھر کوئی بھی اپنے اختیار سے ان کی اتباع کرے گا تو اس کو فائدہ پہنچے گا اور جو انکار کرے گا اس کا وبال اسی پر ہو گا۔

آیت نمبر ۱۰۵: اللہ ﷻ کا توحید کے دلائل کو مختلف طریقوں سے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ:

i۔ جامع اور واضح دلائل سن کر مشرکین ازراہ تعصب یہ کہیں کہ رسول ﷺ نے یہ سب کس سے سیکھا؟

ii۔ ایمان والوں کو ایمان میں مزید تقویت نصیب ہو۔

علمی بات: ۱۔ اگر ہم اپنی توحید کے دلائل کو صرف ایک ہی بار بیان کرتے تو کوئی سنتا کوئی نہ سنتا، کوئی سمجھتا اور کوئی نہ سمجھتا اور ایک ہی آیت کے بار بار تکرار سے اُکتاہٹ ہو جاتی اس لئے ہم ان دلائل کو مختلف اسلوب اور طریقوں سے بیان کرتے ہیں تاکہ آپ ﷺ کے مخاطب یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں کہ واقعی آپ ﷺ جو دلائل مختلف طریقوں سے بار بار ہمیں بتا اور سنا رہے ہیں کسی کے سکھانے سے آپ ﷺ نے سیکھے ہیں۔

۲۔ ہٹ دھرم قسم کے کافروں کو بھی یہ کہتے ہوئے شرم آتی تھی کہ یہ کلام خود نبی کریم ﷺ نے گھڑ لیا ہے کیونکہ وہ آپ ﷺ کے اسلوبِ بیان سے اچھی طرح واقف تھے اور انہیں علم تھا کہ آپ ﷺ اُمی ہیں اور کسی کتاب سے خود پڑھ کر یہ کلام نہیں بنا سکتے، لہٰذا وہ قرآنِ حکیم کے بارے میں

یہ کہا کرتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ کلام کسی سے سیکھا ہے اور اسے اللہ ﷻ کا کلام قرار دے کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ (معاذ اللہ) لیکن کس سے سیکھا ہے وہ بھی نہیں بتا سکتے تھے۔

آیت نمبر ۱۰۶: رسول ﷺ اور آپ ﷺ کے ذریعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ ﷻ کی طرف سے نازل کردہ کلام کی پیروی کرنے کی ہدایت کی جارہی ہے نیز توحید کی دعوت سے اعراض کرنے والوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینے کی تلقین کی گئی ہے۔ اعراض کرنے کا یہ حکم مکی دور میں تھا جبکہ مدنی دور میں تو کفار سے جنگ کی اجازت اور حکم بھی دیا گیا ہے۔

علمی بات: کفار کی دل آزار باتوں پر نبی کریم ﷺ کو تسلی دینا: اس سے پہلی آیت میں یہ بتلایا تھا کہ کفار آپ ﷺ پر یہ بہتان باندھتے ہیں کہ (معاذ اللہ) آپ ﷺ نے کچھ علماء سے چند مضامین سیکھ لیئے ہیں اور ان کو آپ ﷺ اپنے الفاظ کے پیرائے میں ڈھال کر پیش کر دیتے ہیں اور پھر اس کو اللہ ﷻ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اس کے بعد اللہ ﷻ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ آپ ﷺ اپنے رب کی نازل کی ہوئی وحی کی پیروی کیجیے تاکہ ان کی طعن آمیز باتوں سے آپ ﷺ کی دعوت اور تبلیغ متاثر نہ ہو۔ اس آیت سے مقصود اس رنج وملال کو دور کرنا ہے جو کفار کے شک وشبہ اور طعن وتشنیع سے آپ ﷺ کو ہوا ہے' اور یہ کہ آپ ﷺ کے دل کو تقویت حاصل ہو۔ پھر فرمایا اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ اس قول میں اس طرف توجہ مبذول فرمائی کہ آپ ﷺ صرف اپنے رب کی اطاعت کیجئے اور ان کی جہالت کی وجہ سے اپنے مشن کو متاثر نہ ہونے دیں اور مشرکین سے اعراض کیجیے۔

آیت نمبر ۱۰۷: اللہ ﷻ سب کو ہدایت دینے پر قادر ہے لیکن زبردستی کسی کو ہدایت دینا اللہ ﷻ کی حکمت کے خلاف ہے۔ آپ ﷺ کو داعی اور مبلغ بنایا گیا ہے۔ آپ ﷺ کا کام لوگوں کے سامنے اس روشنی کو پیش کرنا اور اظہار حق کا حق ادا کرنے میں اپنی حد تک بھرپور کوشش کرنا ہے۔ اب اگر کوئی اس حق کو قبول نہیں کرتا تو نہ کرے۔ وہ اپنے انجام کے خود ذمہ دار ہیں۔

آیت نمبر ۱۰۸: مشرکوں کے شرک اور مخالفوں کے رد عمل میں مسلمانوں کو اخلاق کا دامن نہ چھوڑنے کی ہدایت۔ اس آیت مبارکہ میں مومنوں کو تعلیم دی گئی ہے کہ وہ ہر لحاظ سے اللہ ﷻ کا ادب واحترام ملحوظ رکھیں۔ چنانچہ اسی ضمن میں انہیں دعوت وتبلیغ کے آداب سکھاتے ہوئے مشرکین کے جھوٹے اور خود ساختہ معبودوں کو بھی برا کہنے سے اس لئے منع کیا گیا ہے کہیں مشرکین غصہ میں آکر بے سوچے سمجھے اللہ ﷻ کی شان اقدس میں نازیبا الفاظ استعمال کرنے لگیں۔ لہٰذا حق بات کرنے اور دین کی دعوت دینے میں بھی رسول اللہ ﷺ کے اعلیٰ اخلاق کی پیروی کی جائے۔

نیز علماء کرام نے اس سے یہ مسئلہ بھی اخذ کیا ہے کہ جو کام خود کرنا جائز نہیں اس کا سبب بننا بھی جائز نہیں، چنانچہ حدیث مبارک ہے

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کبیرہ گناہوں میں سے یہ گناہ بہت بڑا ہے کہ کوئی شخص اپنے والدین پر لعنت کرے۔ آپ سے پوچھا گیا اے اللہ کے رسول! آدمی اپنے والدین پر کیسے لعنت کر سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: کوئی شخص (دوسرے) شخص کے باپ کو برا کہے تو (جواب میں) وہ اس کے باپ کو برا کہے اور وہ اس کی ماں کو برا کہے تو (جواب میں) وہ اس کی ماں کو برا کہے۔ (اس طرح سے وہ اپنے ماں باپ کو گالی دینے والا بن جائے گا) (صحیح بخاری)

نوٹ: رہا یہ معاملہ کہ قرآنِ حکیم کی بہت سی آیات میں بُتوں کا تذکرہ سخت الفاظ میں آیا ہے، اور وہ آیات منسوخ بھی نہیں، ان کی تلاوت اب بھی ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آیات قرآنی میں جہاں کہیں ایسے الفاظ آئے ہیں وہ بطور مناظرہ کسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے وارد ہوئے ہیں وہاں کسی کی دل آزاری مقصود نہیں کیونکہ ان کے بُتوں کو بُرا بھلا کہنے سے فائدہ تو کچھ نہ ہوگا البتہ جواب میں وہ اللہ ﷻ کی توہین وتنقیص کریں گے۔ اس آیت کے آخر میں بتایا گیا ہے کہ اہل باطل اپنے باطل عقائد ہی کو حق سمجھ رہے ہیں۔ روزِ آخرت تمام حقائق کھل کر سامنے آجائیں گے۔

آیت نمبر ۱۰۹: شانِ نزول: قریش نے رسول اللہ ﷺ سے کہا اے محمد (ﷺ)! آپ ہمیں یہ خبر دیتے ہیں کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس ایک لاٹھی تھی جس کو انہوں نے پتھر پر مارا تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے' اور آپ خبر دیتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) مردوں کو زندہ کرتے تھے اور

آپ خبر دیتے ہیں کہ ثمود کے پاس ایک اونٹنی تھی تو آپ بھی ان معجزات میں سے کوئی معجزہ پیش کریں، تاکہ ہم آپ کی تصدیق کریں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم کیا چاہتے ہو کہ میں تمہیں کس قسم کا معجزہ دکھاؤں؟ انہوں نے کہا آپ ہمارے لئے صفا پہاڑ سونے کا بنا دیں۔ آپ نے پوچھا اگر میں نے ایسا کر دیا تو تم میری تصدیق کرو گے؟ انہوں نے کہا ہاں! بخدا اگر آپ نے ایسا کر دیا تو ہم سب آپ کی اتباع کریں گے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے دعا کی تو حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور فرمایا آپ ﷺ کو اختیار ہے اگر آپ ﷺ چاہیں تو صبح کو یہ پہاڑ سونے کا ہو جائے گا اور اگر اس کے معجزہ پیش کرنے کے بعد بھی ایمان نہیں لائے تو ہم ان سب کو عذاب دیں گے اور اگر آپ ﷺ چاہیں تو آپ ﷺ ان کو چھوڑ دیں، حتیٰ کہ ان میں سے توبہ کرنے والے کی توبہ قبول کر لی جائے گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا بلکہ ان میں سے توبہ کرنے والے کی توبہ قبول کر لی جائے۔ تب اللہ ﷻ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

علمی بات: آپ ﷺ کا کام دین حق پر خود قائم رہنا اور دوسروں کو دین حق کی دعوت پہنچا دینا ہے، پھر بھی اگر وہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کریں گے تو ان کے بارے میں زیادہ فکر کی ضرورت نہیں ہیں کیونکہ آپ ﷺ کسی کو جبراً مسلمان نہیں بنا سکتے اگر جبراً سب کو مسلمان بنانا ہوتا تو اللہ ﷻ ہی سب کو مسلمان بنا دیتے، اور ان آیات میں مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے یہ بھی بتلا دیا کہ اگر ہم ان کے مانگے ہوئے معجزات کو پیش کر دیں یہ تب بھی ایمان نہ لائیں گے، کیونکہ ان کا انکار کسی غلط فہمی یا ناواقفیت کی بنا پر نہیں، بلکہ ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے۔

آیت نمبر ۱۱۰: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ چونکہ کفار پہلی بار حق آ جانے پر جان بوجھ کر جھٹلاتے رہے اور محض ہٹ دھرمی اور ضد کی وجہ سے اللہ ﷻ کی نشانیوں اور قرآن حکیم جیسے عظیم معجزے پر ایمان نہیں لائے لہٰذا اس مسلسل ہٹ دھرمی کی وجہ سے کفار کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر دیں گے جس کی وجہ سے وہ آئندہ بھی ایمان سے محروم رہیں گے۔ اللہ ﷻ مشرکین کو ڈھیل دے رہے ہیں اور وہ سرکشی میں بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

علمی بات: کفار کا یہ کہنا درست نہیں کہ آج تک انہیں کوئی نشانی اور معجزہ نہیں دکھایا گیا کہ جسے دیکھ کر وہ ایمان لاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے قبل بھی انہوں نے قدرتِ خداوندی کی نشانیاں اور معجزات دیکھے لیکن محض ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا۔ جیسے قرآن حکیم جیسا سب سے بڑا معجزہ ان کے پاس آیا اور انہوں نے انکار کیا۔ نبی کریم ﷺ کے اور بہت سے معجزات دیکھنے کے بعد انکار کیا اسی طرح جو معجزات یہ طلب کر رہے ہیں اس کو بھی دیکھ کر انکار کریں گے لہٰذا ان کی سرکشی کے باعث اللہ ﷻ سزا کے طور پر ان کے قلوب اور نگاہوں کو حق سے پھیر دیں گے ان کو گمراہی اور ضلالت کی تاریکیوں میں بھٹکتا چھوڑ دیں گے۔ پھر انہیں حق کے سمجھنے اور دیکھنے کی توفیق نہ ملے گی۔

آیت نمبر ۱۱۱: مشرکین کے مطالبات کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا گیا کہ فرشتے نازل ہو کر رسول ﷺ کی تصدیق کریں، مُردے زندہ ہو کر ان سے ہم کلام ہوں، ان کی فرمائش کے مطابق ہر شے حاضر کر دی جائے تب بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ان کا معجزہ دکھانے کا مطالبہ جہالت اور ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

جبری ایمان نہ مفید ہے نہ مطلوب: ارشاد فرمایا گیا کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے مگر یہ کہ اللہ ﷻ چاہے کیونکہ وہ قادر مطلق سب کچھ کر سکتا ہے۔ مگر اس کا اپنا فرمان یہ ہے کہ وہ ایسا کوئی کام نہیں کرے گا جو اس کی حکمت اور عدل کے خلاف ہو۔ اس لئے وہ جبری ایمان چاہتا ہی نہیں بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ انسان اپنی مرضی اور اپنے ارادہ و اختیار سے ایمان لائے تاکہ وہ اس کی رحمتوں اور عنایتوں سے مالا مال ہو سکے۔ وہ اگر چاہتا تو روئے زمین کے تمام انسانوں کو ایمان کی دولت عطا فرماتا۔ جیسا سورۃ یونس میں ارشاد باری تعالیٰ ہے "اور اگر آپ کا رب چاہتا تو وہ لوگ جو زمین میں ہیں سب ضرور ایمان لے آتے" (سورۃ یونس ۱۰، آیت: ۹۹)۔ اللہ ﷻ ہدایت کی نعمت سے انہی کو نوازتا ہے جو اس کے طالب اور قدر دان ہوتے ہیں اور وہ اس کے لئے اس کی ودیعت کی ہوئی صلاحیتوں کو صحیح طور پر استعمال کرتے ہیں۔ بہر کیف اللہ ﷻ کے یہاں ایمان وہی معتبر اور مقبول ہے جو انسان اپنی مرضی اور اختیار سے قبول کرے کیونکہ اس میں رضامندی ہوتی ہے بخلاف جبر و اکراہ کے کہ اُس میں زبان سے اقرار تو کر لے گا مگر تصدیق قلب نہیں کرے گا جس کی وجہ سے وہ ایمان معتبر نہ ہو گا۔

آیت نمبر ۱۱۲: "زخرف" اس چیز کو کہتے ہیں جس کا ظاہر اچھا اور باطن خراب ہو۔ معرکہ حق و باطل ہمیشہ سے جاری وساری ہے یہ دشمنِ خدا ایک دوسرے کو ایسی ایسی باتیں سمجھاتے ہیں جو بظاہر بہت اچھی معلوم ہوتی تھیں۔ جیسے کسی بد صورت چیز پر ملمع سازی کر کے بظاہر خوب صورت بنا دی جائے یہ لوگ ایسی باتیں سامنے لا کر اپنے لوگوں کو دھوکہ دیتے تھے تاکہ ایمان قبول نہ کریں۔ تاہم اس حوالہ سے رسول ﷺ اور آپ ﷺ کے ذریعہ اہل ایمان کو مشرکین کی ہٹ دھرمی کو خاطر میں نہ لانے کی تلقین کی گئی ہے۔ سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کے دشمنوں کا جو بھی حال تھا وہی ان لوگوں کا حال ہے جو آپ ﷺ کی مخالفت کر رہے ہیں۔ آپ ﷺ ان کی فتنہ پرور باتوں سے فکر مند نہ ہوں کہ یہ لوگ مخالفت میں لگے ہوئے ہیں۔

سوچنے اور غور کرنے کا مقام ہے: انبیاء کرام علیہم السلام کو تو مدد کی ضرورت تھی؟ 'اللہ تعالیٰ نے شیاطین کو بھی ان کے خلاف کیوں کھڑا کر دیا؟ یہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ حق و باطل میں اس نوعیت کی کشاکش نہیں ہو گی تو پھر کھرے اور کھوٹے کی پہچان بھی نہیں ہو سکے گی۔ کیسے معلوم ہو گا کہ کون واقعی حق پرست ہے اور کون باطل پرست۔ یہ دنیا تو آزمائش کے لئے بنائی گئی ہے۔ پھر یہاں اگر شر کا وجود ہی نہ ہو تو خیر کے طلبگاروں کی آزمائش کیسے ہو گی؟ لہٰذا فرمایا کہ یہ کشمکش کی فضا ہم خود پیدا کرتے ہیں۔ ہم خود حق پر چلنے والوں کو امتحان میں ڈال کر ان کی استقامت کو پرکھتے ہیں اور پھر ثابت قدم رہنے والوں کو نوازتے ہیں۔ اس میدان میں جو جتنا آزمایا جاتا ہے اتنا ہی اس کا مرتبہ بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ راہ حق کے مسافروں کو مطمئن رہنا چاہیئے کہ ان کی قربانی رائیگاں نہیں جائیگی بلکہ ان کے درجات کی ترقی کا سبب بنیں گی۔

علمی بات: درحقیقت روحیں دو قسم کی ہوتی ہیں 'ایک طیب اور طاہر ہوتی ہیں یہ فرشتے ہیں 'اور دوسری ناپاک اور شریر ہوتی ہیں یہ شیاطین ہیں۔ ارواح طیبہ جس طرح لوگوں کو نیکی کا حکم دیتی ہیں اسی طرح ایک دوسرے کو بھی نیکی کا حکم دیتی ہیں اور ارواح خبیثہ جس طرح لوگوں کو برائی کا حکم دیتی ہیں اسی طرح ایک دوسرے کو بھی برائی کا حکم دیتی ہیں۔ پھر انسانوں میں جن کی سرشت نیک ہوتی ہے اور ان پر پاکیزگی اور خیر کا غلبہ ہوتا ہے ان کی فرشتوں کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے اور ان پر الہام ہوتا ہے اور جن کی سرشت خبیث ہوتی ہے اور ان پر برائی کا غلبہ ہوتا ہے 'ان کی شیطانوں کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے اور ان کے دلوں میں شیاطین وسوسے ڈالتے رہتے ہیں۔ پھر انسانوں میں جو زیادہ خبیث اور سرکش ہوتے ہیں وہ برائیوں کو خوش نما بنا کر دوسرے لوگوں کو دھوکے میں ڈالتے ہیں اور لوگوں کو برائیوں اور گناہوں کی طرف راغب کرتے ہیں۔ اس آیت میں یہی بتایا ہے کہ شیطان جن اور شیطان انسان لوگوں کو دھوکے میں ڈالنے کے لئے برائیوں کو خوش نما بنا کر بیان کرتے ہیں اور اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے شیاطین خواہ انسانوں میں سے ہوں یا جنوں میں سے ان کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے رہنے کا حکم دیا ہے۔

آیت نمبر ۱۱۳: آخرت کے محاسبے پر یقین نہ رکھنے والے ہر فریب کاری اور خوشنما باتوں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ بالآخر قیامت کے دن ان کی ساری کمائی سامنے آجائے گی۔ اس فلسفے کو ایک مثال سے سمجھیئے۔ پانی کا electrolysis کریں تو negative اور positive چارج والے آئنز (ions) الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دنیا میں حق و باطل کے بیچ جو کشاکش رکھی ہے 'اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کھرے اور کھوٹے کی ionization ہو جاتی ہے۔ انسانی معاشرے میں اچھے اور برے کی تمیز ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ سورۂ آل عمران ۳، آیت: ۱۷۹ میں بیان ہوا ہے "تاکہ وہ ناپاک کو پاک سے الگ کر دے"۔ معاشرے کے اندر عام طور پر پاک اور ناپاک عناصر ملے جلے ہوتے ہیں لیکن جب آزمائشیں اور تکالیف آتی ہیں تو منافق علیحدہ اور اہل ایمان علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ زیر نظر آیت میں یہی فلسفہ بیان ہوا ہے کہ شیاطین انس و جن کو کھل کر کھیلنے کی مہلت اسی حکمت کے تحت دی جاتی ہے اور منکرین آخرت کو بھی پورا موقع دیا جاتا ہے کہ وہ ان شیاطین کی طرف سے پھیلائے ہوئے باطل نظریات کی طرف مائل ہونا چاہیں تو بے شک ہو جائیں۔

آیت نمبر ۱۱۴: اللہ ﷻ نے جو مفصل کتاب نازل فرمائی ہے وہ آپ ﷺ کی نبوت کے سچا ہونے پر بطورِ دلیل کے کافی ہے۔ کفارِ مکہ یہ چاہتے تھے کہ ان کے اور نبی ﷺ کے درمیان جو مخالفت ہے اس کے بارے میں اہل کتاب یا کسی اور کو ثالث اور حکم بنالیا جائے، پھر جو فیصلہ وہ دیں اسے تسلیم کرلیا جائے، اس آیت میں ان کی اس تجویز کو رد کیا جارہا ہے کہ کیا میں اللہ ﷻ کے علاوہ کوئی اور منصف تلاش کروں۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے اپنے نبی ﷺ کو حکم دیا ہے کہ اللہ ﷻ کے ساتھ شرک کرنے والوں اور بُتوں کے پجاریوں سے کہہ دیں کہ میں کیسے اللہ ﷻ کے علاوہ کسی اور کو اپنے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرنے والا مان لوں؟ دراصل یہ کفار قریش کے سوال کا جواب تھا کہ اے محمد (ﷺ)! ہم اپنے بتوں پر تمہاری بار بار کی تنقید سے تنگ آچکے ہیں، اس لئے کوئی تیسرا فیصلہ کرنے والا منتخب کرلو جو ہمارے درمیان فیصلہ کرے۔ تو اللہ ﷻ نے اپنے نبی سے کہا، آپ انہیں جواب دیں کہ میں اللہ ﷻ کے علاوہ کسی طاغوت کو اپنا حکم مان لوں، جب کہ اللہ ﷻ نے تمہاری ہدایت کے لئے وہ قرآنِ حکیم اتارا ہے جس میں حق و باطل اور حلال و حرام سب کچھ بیان کردیا گیا ہے اور اہل کتاب تو خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ کتاب اللہ ﷻ کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ اس لئے کہ تمام گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام نے اس قرآنِ حکیم کی بشارت دی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ قرآنِ حکیم سابقہ کتابوں یعنی تورات، زبور اور انجیل کی تصدیق کرتا ہے۔

آیت نمبر ۱۱۵: قرآنِ حکیم کے کلام الٰہی اور حق ہونے کے ثبوت میں مزید دو صفات کا بیان ہے کہ اللہ ﷻ کا کلام کامل ہے (خبر کے لحاظ سے) سچا اور (احکام کے لحاظ سے) عادل کلام ہے۔ اس کلام میں تبدیلی کرنے پر کوئی قادر نہیں۔ نیز اللہ ﷻ بندوں کے اقوال کو سننے اور سب حالات کو خوب جاننے والا ہے۔

علمی بات: کلمات سے وہ مضامین مراد ہیں جو قرآنِ حکیم میں مذکور ہیں۔ قرآنِ حکیم میں بہت سے احکام ہیں جو تفصیل سے بتادیئے ہیں اور بہت سے احکام رسول اللہ ﷺ کو تفویض کردیئے ہیں۔ آپ ﷺ کا بتانا اللہ ﷻ کا بتانا ہے، آپ ﷺ کی اطاعت اللہ ﷻ ہی کی اطاعت ہے۔ یہ سب احکام سچے ہیں اور عدل پر مبنی ہیں ان میں انصاف ہے، کسی پر ظلم و زیادتی اور کسی کی حق تلفی ان احکام میں روا نہیں رکھی گئی اور بعض حضرات نے عدل کو اعتدال کے معنی میں لیا ہے جس کا معنی یہ ہے کہ اللہ ﷻ کے احکام میں اعتدال ہے۔ نہ ہر چیز مباح ہے اور نہ ہر چیز حرام اور ممنوع ہے۔ کچھ مکروہات بھی ہیں ایسا بھی نہیں کہ سارا دین لوگوں کی خواہش کے مطابق ہو اور ایسا بھی نہیں کہ انسانوں کی خواہشوں اور نفس کے تقاضوں کا بالکل ہی لحاظ نہ کیا گیا ہو۔ اللہ ﷻ کے دین میں بنی آدم کے نفسوں کے تقاضوں کی بھی رعایت ہے اور کچھ ممنوعات بھی ہیں۔ جس میں بنی آدم کے لئے خیر پوشیدہ ہے پھر جو احکام ہیں ان میں استطاعت کی قید ہے۔ جیسا کہ سورۃ التغابن ۶۴، آیت: ۱۶ میں ہے کہ "پس اللہ سے ڈرتے رہو جتنی تمہاری استطاعت ہے" اور سورۃ البقرہ ۲، آیت: ۲۸۶ میں یہ بھی بتادیا گیا کہ "اللہ کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا۔"

آیت نمبر ۱۱۶: کفار کی اکثریت سے مرعوب نہ ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ کیوں کہ ہر دور میں اکثریت گمراہی کے راستے پر گامزن رہی ہے۔ چنانچہ حق و باطل کے سلسلے میں انسانوں کی کثرت و قلت معیار نہیں ہے۔ لوگوں کی اکثریت کا حال تو یہ ہے کہ وہ محض گمان اور جھوٹ کی پیروی میں مشغول ہوتے ہیں۔ حق کو قبول کرکے اُس کی پیروی کرنے سے دور رہتے ہیں۔ بیشتر لوگ جو دنیا میں بستے ہیں علم یقینی کے بجائے قیاس و گمان کی پیروی کررہے ہیں اور ان کے عقائد و فلسفے اور اصول زندگی اور اس کے قوانین سب قیاس آرائیوں پر مبنی ہیں۔ بخلاف اس کے جو اللہ ﷻ کا راستہ ہے، یعنی دنیا میں زندگی بسر کرنے کا وہ طریقہ جو اللہ ﷻ کی رضا کے عین مطابق ہے، اور وہ صرف ایک راستہ ہے جو اللہ ﷻ نے خود متعین کردیا ہے۔ لہٰذا کسی طالب حق کو یہ نہ دیکھنا چاہیئے کہ دنیا کے بیشتر انسان کس راستہ پر جارہے ہیں بلکہ اسے پوری ثابت قدمی کے ساتھ اس راہ پر چلنا چاہیئے جو اللہ ﷻ نے بتائی ہے، چاہے اس راستہ پر دنیا میں اکیلا ہی رہ جائے۔

جدید جمہوری نظام جو کہ مغرب کا شاخسانہ ہے اور اب یہ فلسفہ نظام حکومت چہار سو رائج و نافذ ہے اس کی نفی کے لئے یہ بڑی اہم آیت ہے۔ جمہوریت میں اصابتِ رائے (یعنی درست رائے) کے بجائے کثرتِ تعداد کو دیکھا جاتا ہے۔ بقول اقبال رحمۃ اللہ علیہ:

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں

بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے!

اس حوالے سے قرآنِ حکیم کا یہ حکم بہت واضح ہے کہ اگر زمین میں بسنے والوں کی اکثریت کی بات مانو گے تو وہ تمہیں گمراہ کر دیں گے۔ دنیا میں اکثریت تو ہمیشہ باطل پرستوں کی رہی ہے۔ عہدِ نبوی ﷺ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد کا دنیا کی پوری آبادی سے موازنہ کیا جائے تو کیا تناسب بنتا ہے۔ اس لئے اکثریت کو انسانوں کے لئے قوانین بنانے کا اختیار دے دیا جائے تو اس صورت میں کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ انسانوں کے حق میں بہترین قوانین بنانے کا اختیار اور اقتدارِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے تاہم انسان فقط اس کے دئیے ہوئے قوانین کو نافذ کرنے کے پابند اور اس کے عطا کردہ نظام خلافت و حکومت کے امین و پاسدار ہیں۔

آیت نمبر ۱۱۷: بے شک اللہ تعالیٰ ان کو خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بہکے اور بھٹکے ہوئے ہیں اور وہ ان کو بھی خوب جانتا ہے جو سیدھی راہ پر ہیں۔ سو اللہ تعالیٰ ہر کسی کو پوری طرح جانتا ہے۔ اس لئے دنیا والوں کو اپنی دینداری کے مظاہر دکھانے کی بجائے اس وحدہٗ لاشریک کے حضور اپنی جوابدہی کی فکر کرنی چاہیئے اور اس سے اپنا معاملہ صاف اور صحیح رکھنا چاہیئے اس سے قبل کہ عمرِ رواں کی یہ فرصت محدود ان کے ہاتھ سے نکل جائے اور ہمیشہ کے لئے افسوس اور پچھتاوے سے دوچار ہونا پڑے۔

علمی بات: اس آیت کی تفسیر میں دو قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ جب آپ کو معلوم ہو گیا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے تو پھر آپ ان مخالفین کے درپے نہ ہوں بلکہ ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیں۔ اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ کون ہدایت یافتہ ہے اور کون گمراہ ہے؟ وہ ہر شخص کو اس کے عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے جزا دے گا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ کافر اگرچہ بہت یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ حق پر ہیں لیکن وہ جھوٹے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کے احوال پر مطلع ہے، اس کو معلوم ہے کہ یہ گمراہی کے راستہ میں بھٹک رہے ہیں اور جہالت کی وادیوں میں سرگرداں ہیں۔

آیت نمبر ۱۱۸: اس آیت میں مشرکین کے جاہلانہ نظریات اور توہمات کا رد کیا گیا ہے۔ وہ محض خیالی اندازوں پر اپنے دین کی بنیاد رکھے ہوئے تھے، اسی وجہ سے وہ اہل ایمان پر مختلف اعتراضات کرتے رہتے تھے۔ ان کی اس گمراہی کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے اس کو یہ حرام کہتے ہیں اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حرام کہا ہے اسے حلال سمجھتے ہیں۔

شانِ نزول: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس کچھ لوگوں نے آکر کہا یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم اس چیز کو کھالیں جس کو ہم نے قتل کیا ہے اور اس کو نہ کھائیں جس کو اللہ تعالیٰ نے قتل کیا ہے؟ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "اگر تم اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہو تو اس ذبیحہ سے کھاؤ جس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہو"۔ (جامع ترمذی، سنن ابو داؤد، سنن نسائی)

علمی بات: بعض چیزوں کو مشرکین نے بذاتِ خود حلال قرار دے دیا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ حرام ہیں۔ اور بعض چیزیں انہوں نے خود حرام ٹھہرا لیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حلال کیا ہے۔ خاص طور پر سب سے زیادہ جاہلانہ بات جس پر پہلے بھی بعض گروہ مُصر تھے اور آج بھی دنیا کے بعض گروہ اس پر بضد ہیں، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر جو جانور ذبح کیا جائے وہ تو ان کے نزدیک حرام ہے اور اللہ تعالیٰ کے نام کے بغیر جسے ذبح کیا جائے وہ حلال اور اس کا کھانا جائز ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ اس کی تردید کر کے مسلمانوں سے فرما رہا ہے کہ اگر تم حقیقت میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہو اور اس کے احکام کو مانتے ہو تو ان تمام اوہام اور تعصبات کو چھوڑ دو جو کفار و مشرکین میں پائے جاتے ہیں، صرف اسی چیز کو حرام سمجھو جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے اور حلال اسی کو ٹھہراؤ جس کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے۔

نوٹ: حلال جانور کا گوشت کھانے کی دو شرائط بیان کی گئی ہیں۔

i۔ اسے ذبح کیا جائے۔ ii۔ ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے۔

علمی بات: حلال ذبیحہ کا فائدہ جو اب طبی تحقیق کے بعد کسی طور پر پوشیدہ نہیں کہ جس جانور کو شرعی طریقہ سے ذبح کیا جاتا ہے اس کا خون جسم سے اچھی طرح بہہ کر نکل جاتا ہے، اور جو جانور خود مر جاتا ہے یا غیر شرعی طریقہ سے ذبح کر دیا جائے مثلاً جھٹکا دے کر تو اس کا خون جسم ہی میں رہ جاتا ہے جس سے پورا گوشت خراب اور نقصان دہ ہو جاتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ حکمت بیان فرمانے کے بجائے یہ کہنے پر اکتفا فرمایا کہ جو چیزیں حرام ہیں وہ اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرما دی ہیں، لہٰذا اس کے احکام کے مقابلے میں خیالی گھوڑے دوڑانا مومن کا کام نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم میں یقیناً کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے لیکن مسلمان کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی اطاعت اس مصلحت کے سمجھنے پر موقوف رکھے بلکہ اس کا فریضہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم آجائے تو بے چون وچرا اس کی تعمیل کرے چاہے اس کی مصلحت اس کی سمجھ میں آئے یا اس کی سمجھ سے بالاتر ہو۔

آیت نمبر ۱۱۹: اہل ایمان کے لئے حلال وحرام کی تمیز کرنے میں کوئی مشکل نہیں۔ حرام کردہ اشیاء کی تفصیل بیان کر دی گئی۔ جبکہ سخت مجبوری کی حالت میں (کہ جان پر بنی ہو) تو بقدرِ ضرورت حرام جانور کا گوشت استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ واضح کیا گیا ہے کہ درست روش شریعت کی پیروی ہے نہ کہ اُن لوگوں کی جن کے نفس خواہشات کے تابع ہیں اور اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔ حد سے گزر جانے والوں" سے مراد علماء یہود ہیں جنھوں نے مشرکین کو اس اعتراض پر اکسایا تھا۔ ایسے لوگوں سے باخبر ہونے اور ان کی گرفت کرنے کا بیان ہے۔

علمی و عملی بات: یہ بحیرہ 'سائبہ' وصیلہ اور حام وغیرہ (بحوالہ سورۃ المائدۃ:۱۰۳) کے بارے میں تمہارے تمام عقیدے من گھڑت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی پابندیاں اپنے بندوں پر نہیں لگائیں۔ لہٰذا حلال جانوروں کو اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ذبح کیا کرو اور بلا کراہت ان کا گوشت کھایا کرو۔ مجبور و لاچار کے لئے رعایت کا ذکر و بیان ہے کہ اگر کوئی مجبور ہو جائے اور اس بناء پر ان میں سے بقدرِ ضرورت کچھ کھا لے تو اس میں کوئی گناہ نہیں مگر ضرورت سے زیادہ نہیں کھانا چاہئے کیونکہ شرعی قاعدہ یہی ہے کہ ضرورت کو ضرورت کی حد تک ہی رکھا جائے۔ "اَلضَّرُوْرَۃُ تُتَقَدَّرُ بِقَدْرِھَا" اور یہ شریعت مقدسہ کے اس عظیم الشان اور جامع اصول پر مبنی ہے کہ "اَلضَّرُوْرَاتُ تُبِیْحُ الْمَحْذُوْرَاتِ" یعنی "ضرورت کی بناء پر ممنوع چیزوں میں بھی اباحت اور جواز پیدا ہو جاتا ہے"۔ بہرکیف اس استثناء سے واضح فرما دیا گیا کہ مضطر اور مجبور انسان کے لئے بقدرِ ضرورت حرام چیزیں بھی مباح ہو جاتی ہیں جو رب العالمین کی غایت شفقت کا مظہر ہے۔

آیت نمبر ۱۲۰: اس آیت میں ظاہری اور باطنی ہر قسم کے گناہوں کو چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ پہلی قسم ظاہری گناہ ہیں جن سے مراد وہ گناہ ہیں جو اعلانیہ اور کھلم کھلا کیئے جائیں اور دوسری قسم باطنی یعنی پوشیدہ گناہ ہیں جن سے مراد وہ گناہ ہیں جو چھپ کر کیئے جاتے ہیں۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ ظاہری گناہ سے مراد وہ گناہ ہیں جو ظاہری اعضاء سے کئے جائیں اور پوشیدہ گناہ سے مراد وہ گناہ ہیں جو دل سے کئے جائیں۔ مثلاً تکبر، حسد، خود پسندی، مسلمانوں کا بُرا چاہنا، حرام کاموں کا ارادہ کرنا، بدگمانی کرنا، بے حیائی کے کاموں سے محبت کرنا، حلال کو حرام اور حرام کو حلال سمجھنا۔ گویا حلال و حرام صرف کھانے کی چیزوں میں منحصر نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے ظاہر و پوشیدہ ہر طرح کے گناہوں کو چھوڑنا ضروری ہے۔

علمی و عملی بات: پہلی ہر قسم کے گناہوں کا بیان اور ان کے دنیاوی و اخروی نقصانات اور ان کو چھوڑنے کی صورت میں حاصل ہونے والے فوائد و فضائل قرآن حکیم، احادیث مبارکہ اور فقہ و تزکیہ نفوس کی کتابوں میں تفصیل سے ذکر کئے گئے ہیں اور ان کی تعلیم و تربیت علماء و اولیائے کرام اور فقہائے عظام سے حاصل کی جاسکتی ہے لہٰذا ہمیں ہر قسم کے گناہ اور باطنی برائیوں سے بچنے اور اپنی اصلاح و تربیت کے لئے نیک صحبت اور متقی و متبع سنت اہل اللہ کی اصلاحی مجالس اختیار کرنی چاہئیں، نیز روزانہ کی بنیاد پر بھی اپنا محاسبہ و فکر آخرت کرتے رہنا چاہئیے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے زیادہ کوئی غیرت والا نہیں، اسی لئے اس نے تمام ظاہر اور پوشیدہ بے حیائی کے کاموں کو حرام کر دیا ہے۔'' (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

آیت نمبر ۱۲۱: ذبح کرتے وقت جس جانور پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا نام عمداً نہ لیا گیا ہو یا غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، اسے کھانے کی ممانعت ہے۔ ایسے کھانے کو ''فسق'' قرار دیا گیا ہے اور فسق کا مطلب ہے اطاعت سے نکل جانا۔

حلال کو حرام کرنے یا حرام کو حلال کرنے کا شرعی حکم: اس کے بعد اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا بے شک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا رہتا ہے تاکہ وہ تم سے بحث کریں۔ اس وسوسہ کا بیان اس حدیثِ مبارک میں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ مشرکین یہ کہتے تھے کہ جس پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا نام لیا جائے اس کو نہ کھاؤ اور جس پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا نام نہ لیا جائے اس کو کھالو۔ (سنن ابن ماجہ، سنن ابوداؤد) وہ بحث یہ کرتے تھے کہ یہ کیا بات ہے جس کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے مارا ہے (یعنی مردار) اس کو تم نہیں کھاتے اور جس کو تم نے قتل کیا ہے (یعنی ذبیحہ) اس کو کھا لیتے ہو۔ اس کے بعد فرمایا اگر تم نے ان کی اطاعت کی تو تم مشرک ہو جاؤ گے۔ اور اگر بھولے سے ''بسم اللہ'' نہ پڑھی جائے تو ذبیحہ کے حلال ہونے پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ مسلمانوں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ کچھ لوگ ہمارے پاس گوشت لے کر آتے ہیں ہمیں پتا نہیں کہ انہوں نے ذبح کے وقت اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا نام لیا ہے یا نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا تم اس پر ''بسم اللہ'' پڑھ کر کھالو، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا اس وقت لوگ نئے نئے کفر سے نکلے تھے۔ (صحیح بخاری، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ)

علمی و عملی بات: اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے حلال بتائے ہوئے کو حرام اور حرام بتائے ہوئے کو حلال سمجھنا بھی شرک ہے۔ یعنی ایک طرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی معبودیت کا اقرار کرنا اور دوسری طرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے نافرمان لوگوں کی وہ باتیں مان کر چلنا اور ان کے مقرر کیے ہوئے اُن طریقوں کی پابندی کرنا، جو شریعت کے متضاد ہوں شرک ہے۔ توحید یہ ہے کہ زندگی مکمل طور پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی اطاعت میں بسر کی جائے۔

آیت نمبر ۱۲۲: مُردہ اور زندہ کا موازنہ کر کے ہدایت یافتہ اور گمراہ شخص کے برابر نہ ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایمان کو نور اور کفر کو ظلمت قرار دیا گیا ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ مومن کو نورِ ایمان کے ذریعے زندہ فرما دیتا ہے۔ مومن کو وحی کے علم سے روشنی عطا ہوتی ہے جس کے مطابق وہ زندگی بسر کرتا ہے۔ جبکہ کافر، کفر و شرک کی تاریکیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے اور جہالت کی تاریکی ہی اسے ہدایت کی روشنی معلوم ہوتی ہے۔

علمی بات: ۱۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے کائناتِ عالم کی ہر چیز کو با مقصد پیدا فرما کر اور اس تک پہنچنے کی اس کو پوری ہدایت اور رہنمائی عطا فرمائی۔ جن کے تحت ہر مخلوق اپنی مقرر شدہ ذمہ داری بخوبی نبھا رہی ہے، اس کائنات میں زمین، پانی، ہوا اور آگ، اسی طرح آسمانی مخلوقات چاند، سورج، ستارے اور سیّارے اپنی اپنی ڈیوٹی پوری طرح ادا کر رہے ہیں، اور فرائض کی ادائیگی ان میں سے ہر چیز کی زندگی کا ثبوت ہے، اسی طرح اہلِ ایمان کا با مقصد زندگی گذارنا اُن کی زندگی کا ثبوت ہے اور اہلِ کفر و شرک کا بے مقصد زندگی گذارنا ان کے مردہ ہونے کی دلیل ہے۔

۲۔ تمام کائنات میں غور و فکر کرنے کے بعد ایک عقل مند انسان اس بات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور اس کی ذمّہ داری کیا ہے، اور یہ کہ اگر وہ ایمان و اعمال والی با مقصد زندگی گذار رہا ہے، تو وہ زندہ کہلانے کا مستحق ہے، اور اگر کفر و شرک اور بد عملی پر کاربند ہے تو وہ ایک مردہ لاش سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

آیت نمبر ۱۲۳: اہلِ مکہ نے مکہ کے اطراف میں ہر راستہ پر چار چار آدمی بٹھا دیئے تھے۔ تاکہ وہ لوگوں کو سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے سے روکتے رہیں۔ جو شخص باہر سے آتا اور مکہ میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ اس سے یہ لوگ کہتے تھے کہ دیکھنا اس شخص سے بچ کر رہنا کیونکہ وہ جادوگر ہے جھوٹا ہے۔ درحقیقت ہر بستی اور علاقہ کے ظالم و فاسق اہلِ اقتدار اور اہلِ ثروت ہی نہ خود ہدایت قبول کرتے ہیں نہ ہی اپنے عوام کو حق قبول کرنے

دیتے ہیں۔ اس وقت پوری دنیا میں اس کا مظاہرہ دیکھا جاسکتا ہے کہ کس طرح اہلِ اقتدار اور ظالم مالدار لوگ دینِ حق کے لئے کیسے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔

علمی بات: ان بستیوں کے مجرم سرداروں کو انبیاء علیہم السلام کا مخالف اس لئے بنایا کہ عہد شکنی، مکروفریب اور جھوٹی باتیں اور باطل رسومات کو لوگوں میں رائج کرنا ان ہی لوگوں کی قدرت اور اختیار میں تھا۔ نیز مال اور منصب کی قوت انسان کو ان کی حفاظت اور بقا پر اُبھارتی ہے پھر انسان ہر قسم کے جائز اور ناجائز حیلے اختیار کرتا ہے اور جھوٹ عہد شکنی اور دغابازی سے کام لیتا ہے۔ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جس طرح اہل مکہ کے بُرے اعمال ان کے لئے مزّین کردیئے گئے ہیں اسی طرح انسانی معاشرہ میں اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ یہ ہے کہ ہر بستی میں اس کے فاسق سرداروں کو انبیاء اور ان کے متبعین کے مخالف بنادیتا ہے اور اس وجہ سے حق اور باطل کے درمیان کشمکش جاری رہتی ہے۔ ان بستیوں کے مجرموں کے لیڈر اور فاسق سردار انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے پیروکاروں کو مختلف طریقوں سے تنگ کرتے ہیں۔ اور ان کے خلاف فریب سے کام لیتے ہیں، لیکن درحقیقت اس فریب کا نقصان ان ہی کو پہنچتا ہے۔ کیونکہ اس وجہ سے آخرت میں ان کو سخت عذاب دیا جائے گا۔ دنیا میں فاسقوں اور مجرموں کو غلبہ دینے کی حکمت یہ ہے کہ مسلمانوں کو آزمائش میں مبتلا کیا جائے اور جو مسلمان اس امتحان میں کامیاب اور سرخرو ہوں ان کو دنیا کی خلافت اور آخرت میں بلند درجات دیئے جائیں۔

آیت نمبر ۱۲۴: ولید بن مغیرہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ اگر نبوت واقعی کوئی چیز ہے تو میں تم سے زیادہ اس کا اہل ہوں کیونکہ میری عمر بھی تم سے زیادہ ہے اور میرا مال بھی کثیر ہے اور دوسرا اسبب نزول یہ نقل کیا ہے کہ ابو جہل نے کہا کہ بنو عبد مناف نے شرافت کے سلسلے میں ہم سے مقابلہ بازی کی یہاں تک کہ ہم گھڑدوڑ کے گھوڑے بن کر رہ گئے۔ اب وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم میں ایک اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے جس کی طرف وحی کی جاتی ہے اللہ تعالیٰ کی قسم ہم اس مدعی نبوت پر ایمان نہ لائیں گے۔ جب تک ہمارے پاس بھی اسی طرح وحی نہ آجائے جیسی اس کے پاس آتی ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت بالا نازل فرمائی جس میں ولید بن مغیرہ کا بھی جواب ہوا اور ابو جہل کا بھی۔ اللہ تعالیٰ نے جواب عطا فرمایا ہے کہ وحی کا نزول اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق اس کے چنے ہوئے بندوں پر ہوتا ہے۔ جب کہ منکرینِ حق کے لئے دنیا و آخرت میں ذلت ورسوائی اور سخت عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔

آیت نمبر ۱۲۵: اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت پانے والے اور گمراہ طبقہ کی علامات کا بیان ہے۔ سینہ کھول دینے سے مراد ہے فراخدلی سے حق قبول کرنا اور اس پر دلی اطمینان نصیب ہونا جب کہ سینے میں تنگی سے مراد ہے اسلام کی دعوت سے دل میں گھٹن پیدا ہونا اور اسے بوجھ سمجھنا۔ جس طرح زور لگا کر آسمان پر چڑھنا ممکن نہیں اسی طرح تنگ سینہ کے ساتھ ایمان کا حصول ممکن نہیں۔ ایسے شخص کو ”رجس“ میں مبتلا کردیا جاتا ہے جس سے مراد عذاب یا شیطان کا اس پر تسلط ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر سنتا ہے تو اُسے وحشت ہونے لگتی ہے، اور جب کفر و شرک کی باتیں سنتا ہے تو اس کا جی لگتا ہے یعنی وہ اس کے من کو بھاتی ہیں۔

ترجمہ ”اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے“ جب یہ آیت اتری تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شرح صدر کی تشریح دریافت کی گئی، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ”مومن کے دل کے اندر اللہ تعالیٰ ایک نور ڈال دیتا ہے جس کی وجہ سے اس کا دل کشادہ اور وسیع ہوجاتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کیا اس کی کوئی علامت ہوتی ہے فرمایا ہاں غیر فانی گھر (یعنی آخرت) کی طرف میلان قلب، اس فریب خانہ (یعنی دنیا) سے طبیعت کا اچاٹ ہونا اور موت آنے سے پہلے موت کی تیاری۔ (مستدرک الحاکم، بیہقی)

آیت نمبر ۱۲۶: اللہ تعالیٰ کا راستہ وہی ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل ایمان چل رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے تفصیل کے ساتھ نشانیاں اور احکام بیان فرمادیئے ہیں۔ یعنی جو حق کے طالب ہیں ان کی ہدایت کے سامان کے لئے تفصیل سے کتاب و سنت میں احکاماتِ شریعت بیان کردیئے گئے ہیں۔

علمی بات: اس آیت کا معنی ہے یہ اسلام جس کے لئے اللہ تعالیٰ مومنوں کا سینہ کھول دیتا ہے، یہی رب کا وہ طریقہ ہے جس کو اس نے لوگوں کے لئے پسند کر لیا ہے اور یہی طریق مستقیم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا بیان کیا ہوا راستہ مستقیم ہی ہوتا ہے جیسا کہ اس حدیث میں قرآنِ حکیم کے متعلق بیان ہوا ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا یہ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی ہے اور یہ ذکر حکیم ہے اور یہ صراط مستقیم ہے۔ (جامع ترمذی) یعنی اس کی تعلیمات اور احکامات پر چلنے والا کبھی راہِ حق سے نہیں ہٹ سکتا۔

نوٹ: ایک حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: "لوگو! یاد رکھو، قرآن ہی کی طرح ایک اور چیز (یعنی حدیث) مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی ہے۔ خبر دار! ایک وقت آئے گا کہ ایک پیٹ بھرا (یعنی متکبر شخص) اپنی مسند پر تکیہ لگائے بیٹھا ہوگا اور کہے گا، لوگو! تمہارے لئے یہ قرآن ہی کافی ہے۔ اس میں جو چیز حلال ہے بس وہی حلال ہے اور جو چیز حرام ہے بس وہی حرام ہے۔" (سنن ابو داؤد)

آیت نمبر ۱۲۷: فرماں بردار بندوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے "دار السلام" کی بشارت اور وعدہ ہے۔ فرماں برداروں کے نیک اعمال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کا دوست، مددگار اور کارساز ہے۔

علمی بات: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "سلام" اللہ تعالیٰ کا نام ہے، اور دار السلام کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کا گھر اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا گھر امن و سلامتی کی جگہ ہوتی ہے، اس لئے اس کے معنی ہوئے کہ وہ گھر جس میں ہر طرح کا امن و سکون اور سلامتی و اطمینان ہو۔ جنت کو دار السلام فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ جنت ہی صرف وہ جگہ ہے جہاں انسان کو ہر قسم کی تکلیف، پریشانی سے مکمل اور دائمی سلامتی حاصل ہوگی۔ دنیائے فانی ایسی مکمل اور دائمی راحت کا مقام ہی نہیں۔ جنت کو دار السلام کہنے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اہلِ جنّت کو جنت میں دخول کے وقت سلام کیا جائے گا اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کی طرف سے اور اہل اعراف کی طرف سے ان کو سلام پیش کیا جائے گا اور جنتی بھی ایک دوسرے کو سلام کریں گے۔

آیت نمبر ۱۲۸: میدان حشر میں انسانوں اور جنات کو جمع کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ ان سے سوال کریں گے۔ جنوں سے مراد یہاں شیطان جن ہیں۔ ان کا بہت سے انسانوں کو اپنا بنا لینے کا مطلب انہیں گمراہ کر کے اپنے راستے پر لگا لینا ہے اور جنّات کا انسانوں سے فائدہ اٹھانا یہ ہے کہ جنّات نے ان کو گمراہی کی دعوت دی اور انسانوں نے اسے قبول کر لیا اور ان کی تعظیم و تکریم کی اور مصیبتوں کے وقت ان کو پکارنا شروع کر دیا اور یہی شیاطین کی کامیابی ہے اور انسانوں کا جنّات سے فائدہ اٹھانے سے مراد ان سے آسمان دنیا سے سنی ہوئی خبر میں سو جھوٹ ملا کر لوگوں کو بتانا تاکہ لوگ ان کے معتقد رہیں اور ان کی دوکانداری چلتی رہی اور اس کے ذریعے وہ دنیا میں مال و دولت اور ناموری حاصل کریں۔

علمی بات: ا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ انسانوں کا جنات سے نفع حاصل کرنا یوں تھا کہ جب ان میں سے کوئی شخص سفر پر جاتا اور جنات کا خوف ہوتا تو جس منزل پر اترنا ہوتا تو یوں کہتے کہ اَعُوْذُ بِسَیِّدِ ھٰذَا الْوَادِی (کہ میں اس وادی کے سردار کی پناہ لیتا ہوں) یعنی اللہ تعالیٰ کی پناہ لینے کی بجائے شیاطین کی پناہ لیتے تھے۔ اور شیاطین کا انسانوں سے نفع حاصل کرنا یہ تھا کہ جب یہ لوگ اَعُوْذُ بِسَیِّدِ ھٰذَا الْوَادِی کہتے تھے تو جنات خوش ہوتے اور کہتے تھے کہ دیکھو انہوں نے ہمیں کو پناہ دینے پر قادر سمجھا اور جو پناہ اللہ تعالیٰ سے مانگنی چاہیئے تھی وہ ہم سے مانگی۔

۲۔ ان دونوں گروہوں کے لئے دوزخ کی سزا مقرر ہے۔ سزا اور جزا کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی ہوتا ہے اور اس کے احاطہ علم سے کوئی چیز باہر نہیں۔

آیت نمبر ۱۲۹: اس آیت کے دو مفہوم ہیں i۔ دنیا کی طرح جہنم میں بھی ایک دوسرے کے ساتھی ہوں گے۔ ii۔ جیسے انسان اور جن ایک دوسرے کے ساتھی تھے اسی طرح ظالموں کے دوست بھی ویسے ہی ظالم ہوں گے۔ ان کے یہ دوست بُرے اعمال میں ان کی مدد کرتے تھے۔

دنیا میں بھی اعمال واخلاق کا اجتماعی معاملات پر اثر: موجودہ رشتوں، ناطوں کا کٹ جانا روزِ قیامت میں تو واضح اور مکمل طور پر سب کے سامنے آ ہی جائے گا مگر دنیا میں بھی اس کا ایک ادنیٰ سا نمونہ ہر جگہ پایا جاتا ہے کہ نیک آدمی کو نیکوں سے مناسبت ہوتی ہے انہی کی جماعت اور سوسائٹی سے وابستہ ہوتا ہے اور اس طرح نیک کاموں میں اس کے لئے راستے کھلتے نظر آتے ہیں، اور ارادہ مضبوط ہوتا جاتا ہے، اسی طرح بدکردار کو اپنے ہی جیسے بدکرداروں سے

تعلق اور انس ہوتا ہے وہ ان ہی میں اٹھتا بیٹھتا ہے، اور ان کی صحبت سے اس کی بد عملی و بد خُلقی میں روز نیا اضافہ ہوتا رہتا ہے اور نیکی کے راستے اس کے سامنے سے بند ہوتے جاتے ہیں، یہ اس کے برے عمل کی نقد سزا اسی دنیا میں ملتی ہے۔

علمی بات: ا۔ نیک و بد اعمال کی ایک جزاء سزاء تو آخرت میں ملے گی اور ایک جزاء سزا نقد اسی دنیا میں اس طرح مل جاتی ہے کہ نیک آدمی کو نیک اور دیانتدار رفقاء نصیب ہو جاتے ہیں جو اس کے کام میں معاون بن کر دینی و دنیوی ترقی کا سبب بنتے ہیں، اور برے اور بد نیت آدمی کو رفقاء کار بھی اسی جیسے ملتے ہیں جو بُرے کاموں میں اس کے معاون بن کر راہِ حق اور اچھے اعمال سے دور کر دیتے ہیں نتیجتاً وہ خسر الدنیا والآخرہ کا مصداق بن جاتا ہے۔

۲۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ ﷻ بعض ظالموں کو بعض پر مسلط کر دے گا اور اس آیت میں ہر قسم کے ظالم داخل ہیں۔ وہ شخص جو معصیت کر کے اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے اور جو حاکم اور افسر اپنے ماتحت لوگوں پر ظلم کرتا ہے اور ایسے ہی وہ تاجر جو جعلی اور ملاوٹ والی چیزیں فروخت کر کے خریداروں پر ظلم کرتا ہے اسی طرح جو چور اور ڈاکو مسافروں اور شہریوں سے لوٹ مار کر کے ظلم کرتے ہیں اور سیاسی عہدہ دار اور عوامی نمائندے عوام کے خون پسینے کی کمائی اپنی دنیاوی عیش و عشرت پر لٹاتے ہیں نتیجتاً ان سب ظالموں پر اللہ ﷻ ان سے بڑا ظالم مسلط کر دیتا ہے۔

نوٹ: ایک حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، "جیسے تم ہو گے ویسے ہی حکام تم پر مسلط ہوں گے" (بیہقی)، یعنی تم ظالم و بدکار ہو گے تو تمہارے حاکم بھی ظالم و بدکار ہی ہوں گے اور تم نیک عمل و نیک کردار ہو گے تو اللہ ﷻ تمہارے حُکّام نیک، رحم دل اور منصف مزاج لوگوں کو بنا دے گا۔

آیت نمبر ۱۳۰: علمی بات: سورۂ جن کی ابتدائی آیات میں جنّات کا قرآن حکیم سننا اور ایمان لانے کا ذکر صراحتاً موجود ہے جس کے بعد اس میں کوئی تردد کی گنجائش نہیں ہے کہ آپ ﷺ جن و انس کے لئے مبعوث کئے گئے تھے۔ روز آخرت اللہ ﷻ کا انسان اور جنات دونوں سے خطاب کا ذکر ہے۔ اُن سے رسولوں کی دعوت حق لانے کے متعلق سوال ہو گا کیوں کہ یہ دو مخلوقات اللہ ﷻ کے احکام کی مکلّف ہیں۔ دونوں گروہوں کے کفار اور فاسق لوگ اپنی غلطیوں کا اعتراف کریں گے۔ یہ وہ لوگ تھے جو آخرت سے غافل تھے اور دنیا کی زندگی کے دھوکہ میں مبتلا تھے۔

انسانوں میں تو پیغمبروں کا تشریف لانا واضح ہے، اس آیت میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنات میں بھی رسول مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر بعض علماء کا کہنا ہے کہ جنات میں بھی آنحضرت ﷺ سے پہلے پیغمبر آتے رہے اور دوسرے حضرات کا کہنا یہ ہے کہ باقاعدہ پیغمبر تو جنات میں نہیں آئے؛ لیکن انسانوں میں جو پیغمبر بھیجے گئے وہی جنات کو تبلیغ کرتے تھے اور جو جنات مسلمان ہو جاتے وہ پھر انبیاء کرام کے نمائندے بن کر دوسرے جنات کو بھی تبلیغ کرتے تھے، جیسا کہ سورۂ جن میں تفصیل سے مذکور ہے، آیت کی رو سے دونوں احتمال ممکن ہیں؛ کیونکہ آیت کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں اور جنات دونوں کو تبلیغ کا حق ادا کر دیا گیا اور وہ دونوں طرح ممکن ہے۔

آیت نمبر ۱۳۱: رسولوں کے ذریعے اتمام حجت کا بیان فرمایا گیا ہے کہ اللہ ﷻ کسی قوم کو خبردار کیئے بغیر عذاب میں مبتلا نہیں فرماتا۔ جب کوئی بستی گمراہی اور فسق و فجور میں منہمک ہو جاتی ہے تو اچانک اس پر عذاب نازل نہیں کیا جاتا بلکہ سنت الٰہی یہ ہے پہلے ان کی طرف اللہ ﷻ کا پیغام سنانے والے بھیجے جاتے ہیں جو ان کو سمجھاتے ہیں اور اس گمراہی اور بدکاری سے باز آجانے کی نصیحت کرتے ہیں۔ اگر پھر بھی وہ گمراہی اور بد اعمالیوں پر بضد رہیں تو عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے جو انہیں نیست و نابود کر دیتا ہے۔

آیت نمبر ۱۳۲: اللہ ﷻ ہر ایک کے اعمال سے باخبر ہے۔ یعنی اہل ایمان کو ان کے اعمال کے مطابق درجات اور مرتبے عطا فرمائے گا اور اللہ ﷻ تکذیب کرنے والوں سے بھی بے خبر اور غافل نہیں ہے اُن کی بد عمالیوں کی سزا ان کو ضرور ملے گی۔

عملی پہلو: درجات و مراتب کا انحصار انسان و جنات کے اپنے عمل و کردار پر ہے ہر کسی کے درجات و مراتب کا مدار اس کے عمل و کردار پر ہو گا۔ جیسا کسی کا عمل ہو گا، ویسا ہی اس کا صلہ اور بدلہ پائے گا۔ مدار بہر حال اپنے عقیدہ و عمل اور اخلاق و کردار پر ہو گا نہ کہ رنگ و نسل وغیرہ کے امتیازات پر جو کہ اہل دنیا نے از خود گھڑ رکھے ہیں۔

آیت نمبر ۱۳۳: اللہ ﷻ غنی، بے نیاز، صاحب رحمت اور قدرت کاملہ کا مالک ہے۔ اللہ ﷻ ہی ہدایت عطا فرماتا ہے اور اصلاح کے لئے مہلت بھی۔ اللہ ﷻ قادر ہے کہ مشرکین کے جرائم کی پاداش میں انہیں فنا کر کے دوسری قوم لے آئے۔

عملی پہلو: یعنی جس طرح اس نے پہلی قوموں کو ختم کر کے بعد کے لوگوں کو دیانتداری عطا کی اور اپنا نائب و امین بنایا۔ یہ اس بات کی واضح دلیل اور گواہی ہے کہ وہ قادر مطلق تمہاری جگہ دوسروں کو لا کر بسانے کی بھی پوری قدرت رکھتا ہے۔ پس تمہیں اگر آج محنتِ عمل کا موقع ملا ہوا ہے تو اس کو غنیمت سمجھو کہ یہ کبھی بھی چھن سکتا ہے۔ نیز تمہیں اگر دین کی خدمت کا کوئی موقع ملتا ہے تو اس کو اپنی خوش نصیبی جانو ورنہ نہ وہ تمہارا محتاج ہے نہ اس کا دین۔

غنی ہونے کے باوجود اللہ ﷻ اپنے مخلوق کے لئے رحیم بھی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ کی سو رحمتیں ہیں، ایک رحمت اس نے جنوں، آدمیوں، جانوروں اور کیڑوں مکوڑوں میں اتاری ہے، وہ اسی ایک رحمت کی وجہ سے ایک دوسرے پر مہربانی اور رحم کرتے ہیں اور اسی ایک رحمت کی وجہ سے وحشی جانور اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں اور ننانویں رحمتیں اللہ ﷻ نے اٹھا رکھی ہیں جو وہ اپنے بندوں پر قیامت کے دن کرے گا۔" (صحیح مسلم)

وہ بے نیاز ہے، نہ اپنی مخلوقات کا محتاج ہے نہ ان کی عبادتوں کا ضرورت مند۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ: سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ فرماتا ہے کہ اگر تمھارے اگلے اور پچھلے، تمھارے آدمی اور جن، سب ایسے ہو جائیں جیسے تم میں بڑا پرہیز گار شخص ہو تو اس سے میری سلطنت میں کچھ اضافہ نہیں ہو گا اور اگر تمھارے اگلے اور پچھلے، تمھارے آدمی اور جن، سب ایسے ہو جائیں جیسے تم میں سب سے بڑا بدکار شخص ہو تو اس سے میری سلطنت میں سے کچھ کم نہیں ہو گا۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۱۳۴: اللہ ﷻ کا وعدہ بہر حال پورا ہو کر رہے گا: روز جزاء کا وقوع اور اعمال کا بدلہ جزا و سزا کوئی مانے یا نہ مانے، بہر حال ہو کر رہے گا۔ تا کہ عدل و انصاف کے تقاضے مکمل طور پر پورے ہو سکیں۔ اور ہر کسی کو اسکی زندگی بھر کے اعمال کا پورا پورا صلہ اور بدلہ مل سکے۔ اور اس کائنات کے وجود اور مقصد تخلیق کی تکمیل ہو سکے۔ پس رسولوں کی تکذیب اور حق و ہدایت سے انکار پر اس خالق و مالک نے عذاب کا جو وعدہ تم لوگوں سے فرما رکھا ہے وہ بہر حال پورا ہو کر رہنا ہے خواہ وہ دنیا کے جلدی عذاب کی شکل میں آئے یا یوم الحساب کے عذاب اخروی کی صورت میں ملے۔ اس کو روکنے یا ٹالنے کی مجال اور طاقت کسی میں نہیں۔ پس عقل و فہم کا تقاضا یہ ہے کہ منکر لوگ اسے جلدی مانگنے کے بجائے اس کے عذاب سے بچنے کی فکر کریں کہ جب وہ آ گیا۔ اعاذنا اللہ من ذلک العیاذ باللہ تو پھر اس سے بچنے کی کوئی صورت ممکن نہ ہو گی اللہ ﷻ ہمیں فکر و عمل کی ہر قسم کی کوتاہی اور ہر قسم کی بے راہ روی سے ہمیشہ محفوظ رکھے آمین ثم آمین۔

آیت نمبر ۱۳۵: مشرکین کو دوٹوک انداز میں بُرے انجام سے خبر دار کیا گیا ہے۔ انہیں بتا دیا گیا ہے کہ ظالم یعنی مشرک کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔

علمی بات: دار الآخرت سے پہلے دار دنیا میں بھی فلاح و کامیابی بالآخر اللہ ﷻ کے نیک بندوں ہی کو حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے کے حالات اس پر شاہد ہیں کہ بہت تھوڑے عرصہ میں قوت و اقتدار کے مالک تمام مخالفین ان کے سامنے ذلیل ہوئے، ان کے ملک ان کے ہاتھوں فتح ہوئے، خود عہد رسالت ﷺ میں تمام جزیرہ عرب آپ ﷺ کے زیر نگین آ چکا تھا، یمن اور بحرین سے لے کر حدود شام تک آپ ﷺ کی حکومت پھیل گئی، پھر آپ ﷺ کے خلفاء راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں تقریباً پوری دنیا اسلام کے جھنڈے تلے آ گئی، اور اللہ ﷻ کا یہ وعدہ پورا ہوا جیسا کہ سورۃ المجادلہ ۵۸، آیت: ۲۱ میں ارشاد ہوا ہے کہ "اللہ ﷻ نے لکھ دیا ہے کہ میں غالب آؤں گا اور میرے رسول غالب آئیں گے۔"

آیت نمبر ۱۳۶: مشرکین زمینی پیداوار اور مویشیوں میں سے ایک حصہ اللہ ﷻ کے نام اور دوسرا حصہ خود ساختہ معبودوں کے لئے مقرر کرتے تھے۔

شانِ نزول: مشرکوں کا دستور تھا کہ اپنی کھیتیوں، باغات کے پھلوں، مویشیوں کے بچوں اور تمام مالوں میں ایک حصہ اللہ ﷻ کا اور ایک حصہ بتوں کا مقرر کرتے تھے۔ اللہ ﷻ کا حصہ تو مہمانوں اور مسکینوں پر صرف کرتے تھے اور بتوں کا حصہ نوکروں چاکروں اور خدمت گاروں کے صرف میں

لاتے تھے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حصہ میں سے اگر کچھ بتوں کے حصہ میں شامل ہو جاتا تو پروا نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے اللہ سبحانہ وتعالیٰ محتاج نہیں اس کو اس کی کوئی ضرورت نہیں لیکن اگر بتوں کے حصہ میں سے کچھ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حصہ میں شامل ہو جاتا تو فوراً نکال کر بتوں کے حصہ میں ملا دیتے اور کہہ دیتے یہ حاجت مند ہیں پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حصہ کی اگر کوئی چیز تلف یا کم ہو جاتی تو ان کو پروا بھی نہ ہوتی اور بتوں کے حصہ کی کوئی چیز تلف یا کم ہو جاتی تو فوراً اس کے عوض پوری کر دیتے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

نوٹ: بتوں کے لئے مخصوص حصّہ مجاور وغیرہ کے پاس جاتا تھا چنانچہ وہ اسی وجہ سے ان مشرکین سے بتوں کا حصّہ کم نہ ہونے دیتے تھے کیوں کہ خود ان کی جیبیں ان سے بھرتی تھیں۔

آیت نمبر ۱۳۷: زمانہ جاہلیت کے عرب اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا پیروکار سمجھتے تھے اور اس بنا پر ان کا خیال یہ تھا کہ جس مذہب (دین) کی وہ اتباع کر رہے ہیں وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا پسندیدہ مذہب (دین) ہے۔ لیکن جو دین اس زمانے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام سے سیکھا تھا اس کے اندر بعد میں آنے والے مذہبی پیشوا، قبائل کے سردار، خاندانوں کے بڑے بوڑھے مختلف طرح کے عقائد اور رسوم ورواج کا اضافہ کرتے چلے گئے جنھیں بعد میں آنے والی نسلوں نے اصل مذہب کا حصّہ سمجھا اور نہایت عقیدت مندی کے ساتھ ان کی پیروی کی۔ چونکہ کسی کتاب، یا تاریخ میں ایسا کوئی ریکارڈ محفوظ نہ تھا جس سے معلوم ہوتا کہ اصل مذہب کیا تھا اور بعد میں کس نے کس طرح تحریفات اور اضافہ کیا، اس وجہ سے اہل عرب کے لئے ان کا پورا دین مشتبہ ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ کسی چیز کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ اصل دین کا جزء ہے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے آیا تھا، اور یہ بدعات اور غلط رسوم ورواج ہیں جو بعد میں لوگوں میں پروان چڑھی ہیں۔ آج کے مشرکین کے بارے میں بھی اس طرح کے واقعات سننے میں آتے ہیں کہ کسی نے اپنے بچے کو دیوی کی بھینٹ چڑھا دیا۔

آیت نمبر ۱۳۸: اس آیت میں مشرکین کے باطل عقائد و نظریات کی مزید تین صورتوں کا بیان ہے۔

i۔ منت اور نذر کے مخصوص جانور یا کھیتی کی بعض پیداوار کا عام استعمال ممنوع تھا۔ ان کے استعمال کی اجازت صرف بتوں کے خادم اور مجاورین کے لئے ہوتی تھی۔

ii۔ مختلف قسم کے جانوروں کو بتوں کے نام پر آزاد چھوڑ دیتے اور انہیں مقدس سمجھتے ہوئے ان سے بار برداری یا سواری کا کام نہ لیتے تھے۔

iii۔ بعض جانوروں کو ذبح کرتے وقت صرف بتوں کا نام لیتے تا کہ اس بت کی نذر و نیاز میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی شراکت نہ ہونے پائے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب کے ہاں بعض مخصوص منتوں اور نذروں کے جانور ایسے ہوتے تھے جن پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا نام لینا جائز نہ سمجھا جاتا تھا۔ ان پر سوار ہو کر حج کرنا ممنوع تھا، کیونکہ حج کے لئے تلبیہ لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ کہنا پڑتا تھا۔ اسی طرح ان کا دودھ دوہتے وقت، یا ان پر سوار ہونے کی حالت میں، یا ان کو ذبح کرتے ہوئے، اس چیز کا اہتمام کیا جاتا تھا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا نام زبان پر نہ آئے۔

یہ طور طریقے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے مقرر کردہ نہیں تھے، مگر وہ ان کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے مقرر کردہ سمجھ کر ان کی پیروی کرتے تھے ان طور طریقوں کے لئے ان کے پاس اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے کوئی سند نہیں تھی بلکہ صرف یہی کہنا تھا کہ ان کے باپ دادا سے یونہی ہوتا چلا آرہا ہے۔ انہیں عنقریب سزا دیئے جانے کا ذکر ہے۔ ان کو ڈرایا گیا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی پکڑ سے بچنے کا واحد راستہ صراط مستقیم پر چلنا ہے۔

آیت نمبر ۱۳۹: کفار کی ایک مروّجہ جہالت یہ بھی تھی کہ بعض جانوروں (سائبہ اور بحیرہ) کے متعلق ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ان کے پیٹ میں (دودھ یا بچہ) جو کچھ ہے اس کا استعمال مردوں کے لئے حلال ہے اور عورتوں کے لئے حرام اور اگر اسی جانور کے شکم سے مردہ بچہ پیدا ہو تو وہ مرد وزن سب کے لئے یکساں طور پر حلال ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے کہ عنقریب انہیں ان خرافات کی سزا دی جائے گی۔

60

عملی بات: قرآن حکیم چونکہ نصیحت ہے اور حکیم ہے یعنی ہر بات حکمت پر مبنی ہے اب غور طلب بات یہ ہے کہ اللہ ﷻ کی طرف سے مشرکین کی ان خرافات کے بیان میں کیا حکمت و نصیحت ہو سکتی ہے سوائے اس کے کہ ہم اپنے معاشرے میں رائج خرافات کی پیروی کرنے کے بجائے کتاب و سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بیان کردہ معاشرت کو اپنائیں اور ان کی طرف سے واضح کردہ راستوں پر گامزن ہوں۔

آیت نمبر ۱۴۰: اللہ ﷻ کی عطا کردہ اولاد (خصوصاً بیٹیوں) کو ہلاک کرنے والے اور جانوروں کو اپنے اوپر حرام کرنے والے اللہ ﷻ کی ناشکری کے مرتکب ہیں۔ نیز ان مشرکانہ افعال کو اللہ ﷻ کی طرف منسوب کرنا اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھنا ہے۔ایسے لوگ گمراہ اور ہدایت سے دور ہیں۔

علمی بات: ایک حدیث کے مفہوم کے مطابق ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے سامنے زمانہ جاہلیت میں اپنی بیٹی کو قتل کرنے کا واقعہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر میں کسی شخص کو زمانہ جاہلیت کے فعل پر سزا دیتا تو تمہیں دیتا۔اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قبول اسلام گناہوں کی معافی کا ذریعہ ہے کیونکہ ایسا شخص جو سابقہ گناہوں سے سچے دل سے توبہ کر کے اسلام قبول کرتا ہے۔تو اللہ ﷻ ایسے شخص کی توبہ قبول کر کے اس کے پہلے کے تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔

آیت نمبر ۱۴۱: نباتات اور درختوں کی مختلف اقسام کی تخلیق میں اللہ ﷻ کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔ باغات میں پیدا ہونے والے درختوں کی دو اقسام کا ذکر ہے۔ ایک وہ ہیں جن کو سہارا دے کر چھتریوں پر چڑھایا جاتا ہے مثلاً انگور کی بیل۔ دوسرے وہ ہیں جن کو ایسے سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی مثلاً آم کا درخت۔ پھلوں میں بھی رنگا رنگی ہے اور ملتے جلتے رنگ بھی ہیں۔

علمی بات: فصل کی کٹائی کے حق سے مراد عشر ہے۔ اللہ ﷻ نے ارشاد فرمایا ہے جب فصل کی کٹائی کا دن آئے تو اس کا حق ادا کرو۔ کھیتی کاٹتے یا پھل توڑتے وقت اللہ ﷻ کا حق عشر ادا کیا جائے۔ فصل کی کٹائی کے وقت اس حق کو ادا کرنا واجب ہے اور روایت میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے رات کے وقت کھجور توڑنے اور فصل کاٹنے سے منع فرمایا ہے۔ یہ ممانعت اس لئے ہے تا کہ دن میں کٹائی کے وقت مساکین آ سکیں۔ جب فصل کاٹی جائے یا کھجوریں اُتاری جائیں تو اس میں سے مساکین کو اُن کا حصہ دیا جائے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو باغ یا کھیت بارش سے یا چشموں سے یا بارش کے جمع شدہ پانی سے سیراب کیا گیا ہو، اس میں عشر ہے اور جن کو کنوئیں سے پانی حاصل کر کے سیراب کیا گیا ہو، اس میں نصف عشر ہے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

نوٹ: کھانے پینے اور دیگر ضروریات زندگی میں فضول خرچی کی ممانعت ہے۔ اپنی ضرورت کے مطابق ہی خرچ کیا جائے۔ تاکہ اللہ ﷻ کی نعمت ضائع ہونے سے بچ سکے نیز صدقہ دیتے ہوئے یہ بھی خیال رکھا جائے کہ بندہ صدقہ دینے کے بعد خود محتاج نہ ہو جائے بلکہ اعتدال سے کام لیا جائے۔

آیت نمبر ۱۴۲: اللہ ﷻ کے خاص انعام کا ذکر ہے جو اُس نے انسانوں پر مویشیوں کے ذریعہ فرمایا ہے اول تو یہ فرمایا کہ اللہ ﷻ نے کچھ جانور ایسے پیدا فرمائے جو "حمولۃ" ہیں یعنی بار برداری کا کام کرتے ہیں اور ان کے قد بھی بڑے ہیں۔ مثلاً اونٹ اور بیل وغیرہ۔ اور دوسری قسم کے جانور وہ ہیں جن کے قد چھوٹے ہیں گویا کہ وہ زمین پر بچھے ہوئے ہیں ان پر بوجھ نہیں لادا جا سکتا جیسے کہ بھیڑ بکری اور دنبہ، ان چھوٹے قسم کے جانوروں پر سامان تو نہیں لادا جا سکتا لیکن ان کے دوسرے فائدے ہیں۔ ان کا دودھ پیا جاتا ہے گوشت کھایا جاتا ہے اور بڑے جانوروں کی نسبت ان کا گوشت عمدہ ہوتا ہے اور ان کے بالوں سے پہننے اور اوڑھنے بچھونے کے کپڑے تیار کئے جاتے ہیں۔

عملی پہلو: ذرا سوچیے کہ اس خالق کل اور مالک مطلق نے ہم پر کیسے کیسے انعام و احسان فرمائے اور ہماری ضروریاتِ زندگی کے لئے کیسے کیسے سامان و اسباب پیدا فرمائے۔ اس نے کس طرح جانوروں میں سے کچھ کو ہماری بار برداری کیلئے اور کچھ کو ہماری دوسری ضرورتوں کے پورا کرنے میں لگا دیا۔ اور ہر ایک کے لئے اسی کے مطابق جسم، طاقت اور حفاظت کا سامان پیدا کیا اور ان طاقتور جانوروں کو اس طرح مسخر کر دیا کہ یہ سب بلا چون وچرا کے ہماری ایسی خدمات انجام دیئے جا رہے ہیں۔ اس کے باوجود اپنے اس خالق و مالک سے منہ موڑنا کس قدر بے انصافی اور اس کی نعمتوں کی کس

قدر ناشکری ہے۔ سو یہ مختلف انواع کی نعمتیں واضح دلیل نہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکے اور صرف اسی کو معبود برحق مانے، اور اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیز کو حرام یا حرام کو حلال کرنا، یا باطل معبودوں کے نام منسوب کرنا شیطان کی پیروی ہے۔

آیت نمبر ۱۴۳: وہ مویشی جو لمبے اور چھوٹے قد کے ہیں ان میں آٹھ اقسام کے جوڑوں کو بیان فرمایا ہے۔ ان میں سے ایک اونٹ اور اونٹنی کا جوڑا ہے، دوسرا بیل اور گائے کا، تیسرا مینڈھا اور بھیڑ کا، اور چوتھا بکرے اور بکری کا جوڑا ہے۔

مشرکین عرب نے مویشیوں میں سے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام بنا رکھے تھے اور عام لوگوں کے لئے ان پر سواری کرنا، بار برداری کرنا، انہیں کھانا اور ان کا دودھ پینا حرام کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ ان سے پوچھیئے کیا اللہ تعالیٰ نے ان میں سے دو نر حرام کیئے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ نے نر کی صنف حرام کر دی ہے تو پھر نر جانور کیوں کھاتے ہو اور اگر اللہ تعالیٰ نے مادہ کی صنف حرام کر دی ہے تو پھر مادہ جانور کیوں کھاتے ہو اور اگر اللہ تعالیٰ نے دونوں حرام کر دیئے ہیں تو پھر تم نر اور مادہ دونوں کیوں کھاتے ہو؟ مگر در حقیقت اللہ تعالیٰ نے ان میں سے کسی صنف کو حرام نہیں کیا۔ یہ حرمت کا اعتقاد محض جھوٹ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مزید تاکید کے لئے فرمایا کیا تم اس وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر تھے جب اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو حرام کرنے کی وصیت فرمائی تھی؟ سو یہ محض تمہارا جھوٹ گھڑا ہوا ہے اور اگر تم سچے ہو تو بتاؤ اللہ تعالیٰ نے کس نبی علیہ السلام کی کتاب میں ان جانوروں کی تحریم نازل کی تھی یا کس نبی علیہ السلام پر وحی آئی تھی؟ اگر تمہارے پاس کوئی دلیل ہے تو پیش کرو۔ ان آیتوں میں اظہارِ حق کے لئے علمی مباحثہ اور مناظرہ کرنے کے جواز پر دلیل بھی ہے اور قیاس کے اصل کا ثبوت بھی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مذکر کو حرام کیا ہے تو ہر مذکر حرام ہے اور اگر مؤنث کو حرام کیا ہے تو ہر مؤنث حرام ہے۔

آیت نمبر ۱۴۴: اللہ تعالیٰ نے اونٹ اور گائے کے نر اور مادہ میں سے کسی کی حرمت بیان نہیں کی۔ اسی طرح مادہ کے پیٹ سے پیدا ہونے والے بچے کی حرمت کی نفی فرمائی ہے۔ مشرکین کو از خود بعض جانوروں کو حرام کر دینے کی دلیل پیش کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ دلیل کے بغیر حلال و حرام کے قانون کی کوئی حیثیت نہیں اور نہ ہی ان مشرکین کے پاس خود ساختہ حرمت کی کوئی دلیل ہے۔ ان مشرکانہ افعال کو اللہ تعالیٰ سے منسوب کرنا در حقیقت لوگوں کو بغیر علم کے گمراہ کرنے کے مترادف ہے۔ بہتان تراشی کرنے والے ظالموں کو کبھی ہدایت نصیب نہ ہوگی۔

نوٹ: ایک حدیث قدسی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میں نے اپنے بندوں کو دین حنیف پر پیدا کیا، لیکن شیاطین نے انہیں بہکایا اور ان پر ان چیزوں کو حرام کر دیا جن کو میں نے حلال کیا تھا اور انہیں حکم دیا کہ وہ میرے ساتھ ان کو شریک ٹھہرائیں جن کے شریک ٹھہرانے کی میں نے ہرگز کوئی سند نازل نہیں کی۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۱۴۵: چار چیزوں کی حرمت کا بیان ہے۔

۱۔ مردار یعنی وہ حلال جانور جو ذبح کئے بغیر طبعی موت مرا ہو۔

۲۔ بہتا ہوا خون یعنی ذبح کرتے وقت جانور کی رگوں سے نکلنے والا خون۔

۳۔ خنزیر کا گوشت۔ جس کے جسم کا کوئی حصہ حلال نہیں۔

۴۔ وہ ذبیحہ جس پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کا نام پکارا گیا ہو۔

مگر دو شرائط کے ساتھ ان اشیا میں سے کوئی چیز کھا کر جان بچائی جا سکتی ہے جس پر مؤاخذہ نہیں، ۱۔ نہ کھانے کی صورت میں ہلاکت کا ڈر ہو۔

۲۔ زیادتی نہ کرے، صرف اتنا کھائے جس سے جان بچ سکے اس سے زائد کھانے کی اجازت نہ ہوگی۔

علمی بات: یہاں ایک چیز وضاحت طلب ہے وہ یہ کہ ظاہر آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف ان چار چیزوں کو حرام فرمایا ہے۔ ان کے علاوہ اور کوئی چیز حرام نہیں۔ حالانکہ ان کے علاوہ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو حرام ہیں مثلاً شراب، درندے وغیرہ۔ اس ضمن میں مفسرین کرام نے بڑی طویل ابحاث ذکر کی ہیں۔ ان کا حاصل یہ ہے کہ یہ آیت اکثر مفسرین کے نزدیک مکی ہے اور دوسری اشیاء کی حرمت مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔ تو اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت تک جو وحی نازل ہوئی۔ اس میں صرف ان چار چیزوں کی حرمت کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد وحی کا سلسلہ جاری

رہا اور مختلف اوقات میں حکم الٰہی سے اور چیزیں حرام ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ حضور ﷺ نے کچلی کے دانت سے چیر کر کھانے والے ہر شکاری جانور اور پنجوں سے نوچ کر کھانے والے شکاری پرندے کو حرام کر دیا۔ (صحیح مسلم)

نوٹ: سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت کے لوگ کچھ چیزیں تو کھالیتے تھے اور کچھ سے نفرت کرتے ہوئے نہیں کھاتے تھے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام کو بھیجا، اپنی کتاب کو نازل فرمایا اور حلال کو حلال اور حرام کو حرام قرار دے دیا، پس جسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حلال قرار دیا وہی حلال ہے اور جسے اس نے حرام قرار دیا وہ حرام ہے اور جس سے اس نے سکوت فرمایا وہ قابل معافی ہے۔ پھر انہوں نے یہ آیت کریمہ پڑھی "قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ" (مستدرک حاکم، سنن ابوداوٴد)

آیت نمبر ۱۴۶: یہودیوں پر بعض حلال اشیا کو وقتی طور پر حرام کر دینے کا بیان ہے۔

i۔ ہر ناخن والا جانور سے مراد جس کے پاؤں پنجے کی شکل میں ہوں اور الگ الگ نہ ہوں (اُونٹ، شتر مرغ، بطخ وغیرہ) کا کھانا ان پر حرام تھا۔

ii۔ گائے، بیل، بھیڑ، بکری کی پشتوں، آنتوں اور ہڈیوں کے ساتھ لگی ہوئی چربی کے علاوہ باقی ساری چربی اُن پر حرام تھی۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان جانوروں کو بنی اسرائیل پر ان کی سرکشی کی وجہ سے بطور سزا حرام کیا تھا۔ کیونکہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کو ناحق قتل کرتے تھے اور لوگوں کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے راستے سے روکتے تھے اور سود یا سود کھاتے تھے اور دیگر ناجائز اور حرام طریقوں سے لوگوں کا مال کھاتے تھے' اور یہ اس لئے ذکر فرمایا ہے کہ یہود یہ کہتے تھے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان پر کسی چیز کو حرام نہیں کیا ماسوا اس کے جس کو حضرت یعقوب علیہ السلام نے خود اپنے نفس پر حرام کیا تھا' اور چونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ ماضی کی خبر دی تھی جس کا کسی کو علم نہیں تھا' اس لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا بے شک ہم اس خبر میں ضرور سچے ہیں اور یہ سیدنا محمد ﷺ کی نبوت کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ نے یہود کو ماضی کی ایسی بات کی خبر دی جس کا کسی کو علم نہیں تھا اور جس کو جاننے کے لئے وحی کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

آیت نمبر ۱۴۷: اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفت "رحمت" کا ذکر ہے۔ یہ بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رحمت ہے کہ مجرمین کا مؤاخذہ فوری نہیں کیا جاتا بلکہ توبہ اور حق قبول کرنے کی مہلت دی جاتی ہے۔ البتہ مہلت کے باوجود حق کا انکار کرنے والے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "پس اگر کافر کو وہ تمام رحمت معلوم ہو جائے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے پاس ہے تو وہ جنت سے ناامید نہ ہو اور اگر مومن کو وہ تمام عذاب معلوم ہو جائیں جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے پاس ہیں تو وہ جہنم سے کبھی بے خوف نہ ہو۔" (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۱۴۸: مشرکین کے بارے میں ذکر ہے کہ وہ مشرکین یوں کہیں گے کہ اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا۔ اور نہ ہی ہم از خود کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ یعنی اپنی کٹ حجتی کے لئے ایسے لوگ تقدیر کا سہارا لیتے ہیں اور مجرموں کا ہمیشہ یہی وطیرہ رہا ہے۔ حالانکہ مشیت اور رضا الگ الگ چیز ہے بہر حال یہ لوگ اسی کے مکلف ہیں کہ اچھائیاں کریں اور برائیوں سے رکیں۔ ورنہ مشیت کو بطورِ بہانہ ہر مجرم اور ہر گناہ گار پیش کر سکتا ہے۔ بہر کیف اس ارشاد سے مشرکین کے آخری اعتراض کو نقل کر کے اس کا رد فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر ہم نے شرک کا ارتکاب کیا اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مرضی کے خلاف کسی چیز کو حرام قرار دے دیا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں اس نافرمانی سے روکا کیوں نہیں؟ سو ان لوگوں کا یہ اعتراض ایک بالکل احمقانہ ہے۔ انسانوں کو کسی قول یا فعل کی آزادی ملنا اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے یہاں صحیح ہے ورنہ ہر مجرم اس بہانے کا سہارا لے سکتا ہے۔ چنانچہ ہر انسان کو اس دنیا میں آزادی اور اختیار سے نوازا گیا ہے اور اسی میں اس کا امتحان ہے۔ اور یہی حکمت کا تقاضا بھی ہے ورنہ کل قیامت کے دن انسان مجبور محض ہونے کو بہانہ بناتا کہ اُسے تو کوئی آزادی اور کسی قسم کا اختیار حاصل نہ تھا۔

عملی پہلو: اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسانوں کو دنیا میں آزمائش اور امتحان کے لئے بھیجا اور امتحان اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ مکلفین کو احکام الٰہی اور اوامر و نواہی بتا کر ان کو عمل کرنے میں اختیار بھی دیا جائے اگر انسان کو مجبور کر دیا جاتا کہ فلاں عمل ضرور ہی کرے تو اس کی آزمائش اور امتحان کیسے ہوتا؟

علمی بات: اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا ہے کہ اس نے انسان کو عقل اور فہم اور عمل کی قوت دی اور کرنے نہ کرنے کا اختیار بھی دے دیا۔ اب جو شخص شرک اختیار کرتا ہے اور از خود کسی شے کو حلال یا حرام کرتا ہے تو اپنے اس اختیار کی وجہ سے اس کا مؤاخذہ ہوگا۔ یہ سب کچھ تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی مشیت و ارادہ سے ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان کے قول و فعل سے اللہ سبحانہ و تعالیٰ راضی بھی ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ان اعمال سے راضی ہے جن کے بارے میں اپنی کتابوں اور رسولوں کے ذریعہ صاف صاف بتا دیا کہ یہ عقائد اور اعمال میری رضا کے ہیں اور غلط عقائد اور ممنوع افعال سے وہ راضی نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں دوسرے مقام پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے صراحۃ ارشاد فرمایا کہ "اگر تم ناشکری کرو گے تو بے شک اللہ تم سے بے نیاز ہے اور وہ اپنے بندوں کے لئے ناشکری پسند نہیں کرتا اور اگر تم شکر کرو (تو) تمہارے لئے اسے پسند فرماتا ہے اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے (کے گناہوں) کا بوجھ نہیں اٹھائے گا پھر تمہیں اپنے رب ہی کی طرف واپس جانا ہے تو وہ تمہیں بتا دے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے بے شک وہ سینوں کے رازوں کو بھی خوب جاننے والا ہے"۔ اور کفر و شکر دونوں کے اسباب مہیا کر دینا فقط اس واسطے ہے کہ جانچنے اور امتحان سے گزارے جانے کی تکمیل ہو چنانچہ روزِ آخرت انہی اسباب کو اختیار کرنے کا سوال اور انہی پر نتیجہ مرتب ہوگا۔

آیت نمبر ۱۴۹: مشرکین کے جرائم کو بے نقاب کر کے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے حجت پوری فرما دی۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ چاہے تو سب کو ہدایت دے لیکن جبری ہدایت دینا اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے۔

جبریہ کا رد اور ابطال: ایسی دلیل جو تمام شکوک و شبہات کو جڑ سے اکھاڑ دے 'صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ اس آیت میں یہ تنبیہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ واحد ہے 'اس نے رسولوں کو دلائل اور معجزات دے کر بھیجا اور ہر مکلف پر اپنے احکام کو لازم کیا ہے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ان کو کوئی بھی کام کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا ہے اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی حکمت یہی ہے کہ بندے اپنے اختیار سے اس پر ایمان لائیں اور اس کے احکام کی تعمیل کریں 'ورنہ اگر وہ چاہتا تو جبراً سب انسانوں کو مومن بنا دیتا 'لیکن یہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے۔ اس لئے ان کا یہ کہنا بالکل لغو بات ہے کہ اگر اللہ سبحانہ و تعالیٰ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے، نہ ہمارے باپ دادا 'نہ ہم جانوروں کو حرام قرار دیتے 'کیونکہ اس قسم کا ایمان اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو مطلوب نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنی عقل سے کام لیں 'حق اور باطل کو جانچیں اور اپنے اختیار سے ایمان قبول کریں۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات اور شیطانی وسوسوں میں فرق محسوس کریں اور اپنے اختیار سے برے کاموں اور بری باتوں کو ترک کریں اور شیطان کا انکار کر کے اللہ سبحانہ و تعالیٰ پر ایمان لانے کو اختیار کریں' ان آیتوں میں یہ دلیل بھی ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے انسان کو مجبور محض نہیں بنایا بلکہ عمل کا اختیار اور موقع دیا گیا ہے۔

نوٹ: مشرکین کی اس کٹ حجتی کے مقابلے میں حقیقت تک پہنچی ہوئی حجت صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ہے۔ اس نے ہر طرح سے ان پر اتمام حجت کر دی ہے 'ان کی ہر نامعقول بات کو معقول طریقے سے رد کر دیا ہے 'مختلف انداز سے انہیں ہر بات سمجھا دی ہے۔

آیت نمبر ۱۵۰: اہل ایمان کو مشرکین کی خوشنما باتوں سے متاثر نہ ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ اگر یہ مشرکین گواہی کی اہمیت اور ذمہ داری سمجھتے تو اس بات کی شہادت دیتے جس کا انہیں قطعی طور پر علم ہوتا لیکن اگر یہ لوگ شہادت کی اہمیت اور ذمہ داری کو خاطر میں لائے بغیر اتنی ڈھٹائی پر اتر آئیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا نام لے کر جھوٹی شہادت دینے میں بھی تامل نہ کریں، تو ان کے اس جھوٹ میں تم ان کے ساتھی نہ بننا۔ اس سے شہادت کی غرض صرف اتنی ہے کہ ان میں سے جن لوگوں کے اندر کچھ بھی راست بازی موجود ہے ان سے جب کہا جائے گا کہ کیا واقعی تم سچائی کے ساتھ اس بات کی شہادت دے سکتے ہو کہ یہ قواعد و ضوابط اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی کے مقرر کردہ ہیں تو وہ اُن رسوم و رواج کی حقیقت پر غور کریں گے اور جب ان کا اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے ہونے کا کوئی ثبوت نہ پائیں گے تو ان فضول رسموں پر عمل درآمد سے باز آجائیں گے۔

علمی بات: مشرکین سے شہادت طلب کیئے جانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ان کے عقل و فہم رکھنے والے طبقہ پر ان کی جاہلانہ رسموں کی حقیقت آشکارا کی جائے۔ کیونکہ جب ان سے ان رسول ﷺ کی صداقت کے لئے شہادت طلب کی جائے گی تو شہادت دینے سے پہلے احساس ذمہ داری کی وجہ سے وہ ان

باطل امور میں بڑی سنجیدگی سے غور و فکر کریں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان پر رسوم و رواج کی بے ہودگی آشکارا ہو جائے گی اور وہ ان سے خود بخود باز آجائیں گے۔ لیکن اگر وہ شرافت و دیانت کو پس پشت ڈال کر اُن لغو اور باطل رسومات پر جان بوجھ کر جھوٹی شہادت دینے پر تلے ہوئے ہیں تو ان کی شہادت آپ کے لئے حجت نہیں۔ اس طرح آپ ﷺ کے ذریعہ امت کو حق کا انکار کرنے والے، منکرین قیامت اور مشرکوں کی اتباع کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔

آیت نمبر ۱۵۱: اس آیت میں پانچ باتوں کا حکم ہے: ۱۔ اللہ ﷻ کی ذات، صفات و عبادات و استعانت میں کسی اور کو اللہ ﷻ کے ساتھ شریک کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ حدیث مبارک کے مطابق سات ہلاک کرنے والے گناہوں میں سے شرک پہلے نمبر پر ہے۔ (صحیح بخاری)

۲۔ اللہ ﷻ کی توحید اور اطاعت کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کا حکم ہے۔ والدین کے حقوق کے حوالے سے قرآن حکیم کا یہ تیسرا مقام ہے۔ حدیث مبارک کے مطابق والدین کی نافرمانی بڑے بڑے گناہوں میں شامل ہے۔ (صحیح بخاری)

۳۔ مفلسی کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل کرنے کی ممانعت ہے۔ اولاد کا قتل صرف اللہ ﷻ پر عدم توکل اور عدم اعتماد کی دلیل نہیں بلکہ اس کی صفت "رزاق" کا انکار ہے۔ حدیث کی رو سے بڑے بڑے گناہوں میں اولاد کا قتل بھی شامل ہے۔ (صحیح بخاری)

۴۔ ظاہری اور پوشیدہ بے حیائی سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یعنی ایسے وسائل اختیار کرنے کی ممانعت کی گئی ہے جو بے حیائی کے کاموں کے قریب لے جائیں۔ مثلاً بے حیائی پر مبنی میگزین، ڈرامے فلمیں اور نامحرم سے بے جا گفتگو وغیرہ۔

۵۔ کسی جان کو ناحق قتل کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ قرآنِ حکیم کی رو سے درج ذیل تین صورتوں میں قتل کرنا جائز ہے۔

۱۔ قتل عمد کے قصاص کی صورت میں۔ ۲۔ میدان جنگ میں کفار کا قتل۔

۳۔ اسلامی مملکت میں بدامنی پھیلانے اور اسلامی حکومت سے بغاوت کرنے والے کا قتل۔

سنت کی رو سے مزید قتل کرنے کی صورتیں:

۱۔ وہ شادی شدہ جو زنا کرے۔ ۲۔ جو اسلام سے مرتد ہو جائے۔ ۳۔ کسی رسول علیہ السلام کی شان میں گستاخی کرنے والا۔

البتہ اس سزا کا نفاذ حکومت کی ذمہ داری ہے عام لوگوں کو اس کی اجازت نہیں۔

نوٹ: یہ آیات رسول اللہ ﷺ کا وصیت نامہ ہیں۔ تفسیر ابن کثیر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کا ایسا وصیت نامہ دیکھنا چاہے جس پر آپ ﷺ کی مہر لگی ہو تو وہ ان آیات کو پڑھ لے، ان میں وہ وصیت موجود ہے جو رسول اللہ ﷺ نے بحکم خداوندی اُمّت کو دی ہے۔

علمی بات: حاکم نے بروایت حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب کر کے فرمایا: "کون ہے جو مجھ سے تین آیتوں پر بیعت کرے"۔ پھر یہی تین آیتیں تلاوت فرما کر ارشاد فرمایا کہ: "جو شخص اس بیعت کو پورا کرے گا تو اس کا اجر اللہ ﷻ کے ذمہ ہو گیا"۔

عملی پہلو: فواحش ان اعمال اور اقوال کو کہتے ہیں جو حد درجہ قبیح ہوں۔ (مفردات) یہاں کسی ایک برائی سے منع نہیں کیا گیا بلکہ فواحش جمع کا لفظ ذکر کر کے ہر قسم کی قولی اور فعلی برائیوں کے ارتکاب سے ہی نہیں بلکہ ان کے قریب تک پھٹکنے سے بھی منع کر دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام وہ چیزیں جو دل میں گناہوں کی تحریک پیدا کرتی ہیں مثلاً فحش گانے، عریاں تصویریں اور غلیظ لٹریچر، ناجائز تعلقات سب سے دور رہنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اور مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ کے کلمات سے اس حکم کو اور وسیع کر دیا کہ فواحش کا ارتکاب ظاہر اور باطن، جلوت اور خلوت ہر حالت میں ممنوع ہے۔

آیت نمبر ۱۵۲: معاشرتی احکامات کے ضمن میں مزید چار احکامات دیئے گئے ہیں۔

۱۔ کسی یتیم کی کفالت کی ذمہ داری پر، اس کی خیر خواہی کرنے کا حکم اور اس کے مال میں ناجائز تصرف کی ممانعت کی گئی ہے۔ مال کی اس وقت تک حفاظت کی جائے جب تک یتیم شعور کی عمر تک نہ پہنچ جائے۔ حدیث مبارک کے مطابق یتیم کا مال کھانا سات بڑے گناہوں میں شامل ہے۔ (صحیح بخاری)

۲۔ ناپ اور تول کو عدل کے ساتھ پورا کیا جائے تاہم بغیر ارادے کے کمی بیشی ہونے پر گرفت نہیں۔ نیز اس بات کی نفی کی گئی ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے بڑھ کر پابند و مکلف نہیں کرتا۔

۳۔ ناانصافی کی ممانعت کی گئی ہے۔ "قول" سے مراد فیصلہ بھی ہے اور شہادت بھی۔ کسی معاملے میں ثالث مقرر کیئے جانے پر حق اور انصاف پر مبنی بات پر فیصلہ کرنا چاہیئے۔ شہادت درکار ہونے پر ہمیشہ عدل کی بات کی جائے اور جانبداری نہ برتی جائے چاہے وہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔

۴۔ عہد کی خلاف ورزی کی ممانعت کی گئی ہے۔ عہد سے مراد "عہد الست" یعنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے رب ہونے کا اقرار (سورۃ الاعراف ۷، آیت: ۱۷۲) اور اسی طرح روزمرہ کے معمولات میں بندوں کا آپس میں کیئے گئے وعدوں کو پورا کرنا بھی شامل ہے۔

آیت نمبر ۱۵۳: "صراط مستقیم" سے مراد وہ راستہ جو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف لے جاتا ہے۔ اس سے مراد اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے احکامات پر عمل کرنا ہے جس سے انسان اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی رضا اور جنت کی نعمتیں حاصل کر سکتا ہے۔

نوٹ: ۱۔ حدیث مبارکہ میں ہے کہ "قرآن حکیم میں سیدھا راستہ ہے" (جامع ترمذی) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ رسول ﷺ کے اخلاق تو قرآن حکیم ہیں۔ (مسند احمد) گویا قرآن حکیم اور نبی کریم ﷺ کی اتباع صراط مستقیم ہے۔

۲۔ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے ایک سیدھی لکیر کھینچی۔ پھر اس کے دائیں بائیں بہت سی لکیریں کھینچیں اور فرمایا: یہ سیدھی لکیر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی راہ ہے اور باقی لکیریں شیطان کی راہیں ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی۔ (سنن نسائی)

علمی بات: قرآنِ حکیم نازل کرنے اور رسول کریم ﷺ کے بھیجنے کا منشاء تو یہ ہے کہ لوگ اپنے طرزِ معاشرت اور طرزِ معیشت کو قرآن و سنت کے تابع کریں، اور اپنی زندگیوں کو قرآن و سنّت کے سانچے میں ڈھالیں، لیکن ہو یہ رہا ہے کہ بعض لوگ جانے یا انجانے کے طور پر قرآن و سنت کو اپنے خیالات اور تجاویز کے تحت ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جو آیت یا حدیث اپنے مطلب کے خلاف نظر آئی اس میں تاویل کر کے اپنی خواہش کے مطابق بنالی، اسی سے فتنے اور گمراہی کے راستے نکلتے ہیں، جو چیزیں بدعات اور شکوک و شبہات پیدا کرتی ہیں ان سے بچنے کے لئے اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے۔

آیت نمبر ۱۵۴: مشرکین مکہ کے لئے رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی دلیل کے طور پر ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کی گئی تھی۔ نبوت کا یہ سلسلہ ماضی میں بھی موجود تھا۔ تورات کا نزول اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے اتمام نعمت تھا۔ وہ اپنے دور کی ایک جامع کتاب تھی جو ہدایت و رحمت کا باعث تھی۔ تورات کی تعلیمات کا بھی ایک مقصد آخرت پر ایمان رکھنے کی تعلیم دینا تھا۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک سورۂ بنی اسرائیل کے تیسرے اور چوتھے رکوع میں جو احکام ہیں وہ تورات کے احکام عشر (Ten Commandments) کا ہی خلاصہ ہے۔

عملی پہلو: رب کی ملاقات پر ایمان لانے سے مراد اپنے آپ کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے سامنے جواب دہ سمجھنا اور اطاعت والی زندگی بسر کرنا ہے۔ یہاں اس ارشاد کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ خود بنی اسرائیل میں اس کتاب کی حکیمانہ تعلیمات سے ذمہ داری کا احساس بیدار ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ عام لوگوں میں اس معیاری نظام زندگی کا مطالعہ کر کے اور نیکوکار انسانوں میں اس نعمت ہدایت کے اثرات دیکھ کر یہ شعور بیدار ہو جائے کہ آخرت کے انکار و سرکشی کے ساتھ گزاری جانے والی زندگی کے مقابلے میں وہ زندگی ہر اعتبار سے بہتر ہے جو اللہ سبحانہ و تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں بسر کی جائے اور اس طرح مشاہدہ اور غور و فکر انہیں انکارِ آخرت سے کھینچ کر ایمان کی طرف لے آئے گا۔

آیت نمبر ۱۵۵: ارشاد ہوا ہے کہ یہ قرآنِ حکیم جس کو ہم نے اپنے نبی محمد ﷺ پر نازل کیا ہے یہ برکت والی کتاب ہے۔ تم اس کی پیروی کرو، یعنی اس کتاب کو اپنا امام بنالو اور اس میں جو عقائد مذکور ہیں ان کو مانو اور جو احکام مذکور ہیں ان پر عمل کرو اور ڈرتے رہو یعنی اپنے دلوں میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے ڈرو اور اس کے خلاف عمل نہ کرو اور اس کی حدود سے تجاوز نہ کرو اور اس کی حرام کردہ چیزوں کو حلال نہ کرو۔

علمی بات: قرآن حکیم کے اتارے جانے کا اصل مقصد اسکی اتباع و پیروی ہے۔ پس تم لوگ اس کی مقدس تعلیمات کو اپناؤ اور ان ہی کے مطابق اپنا عقیدہ بھی بناؤ اور عمل بھی سنوارو۔ اور اس راہ راست پر چلو جو اس کتاب مبارک نے اپنی حکمتوں بھری تعلیمات کے ذریعے تمہیں دکھائی ہے کہ یہی اس کتاب حکیم کے اتارنے کا مقصد ہے اور اسی میں تمہارا بھلا اور فائدہ ہے۔ اسی میں تمہاری اس فانی زندگی کا میابی کا راز مضمر ہے اور آخرت کی حقیقی وابدی زندگی کا بھی۔ سو اس برکتوں بھری اور عظیم الشان کتاب کی عظمتوں اور برکتوں کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو صدق دل سے اپنایا جائے اور اس کی تعلیمات مقدسہ کی پیروی کی جائے تاکہ اس کے اتارنے والے رب ذوالجلال کی رحمت سے سرفرازی نصیب ہو اور اس کے غضب سے بچا جاسکے۔

آیت نمبر ۱۵۶: اللہ ﷻ نے فرمایا کہ ہم نے یہ کتاب نازل کی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ تم یوں نہ کہنے لگو کہ ہم سے پہلے دو جماعتوں پر کتاب نازل ہوئی تھی (یعنی یہود و نصاریٰ پر) اور ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے غافل تھے، کیونکہ وہ ہماری زبان میں نہ تھی لہذا ہم اس سے استفادہ نہیں کرسکتے تھے اللہ ﷻ نے قرآنِ حکیم نازل فرما کر اس عذر کو ختم کر دیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ تم یوں کہتے کہ ہمیں کتاب نہیں دی گئی اگر ہم پر کتاب نازل ہوتی تو ہم خوب اچھی طرح عمل کرتے اور ہم سے پہلے جن لوگوں کو کتاب دی گئی عمل کرنے میں ان سے سبقت کر جاتے۔ اور ان کے مقابلہ میں زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔

آیت نمبر ۱۵۷: اللہ ﷻ نے قرآن حکیم نازل فرما کر مشرکین پر حجت تمام کر دی کہ وہ یہ عذر پیش نہ کرسکیں کہ اگر ان پر کتاب کا نزول ہوتا تو وہ مسابقت میں یہود و نصاریٰ سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔ قرآنِ حکیم ہدایت و رحمت کا منبع ہے۔ قرآنِ حکیم سے اعراض برتنے پر بُرے عذاب کا بدلہ دیا جائے گا۔

علمی بات: اگر قرآن حکیم مشرکینِ مکہ کی طرف نازل نہ کیا جاتا تو وہ بہت شور مچاتے اور کہتے جس طرح یہود و نصاریٰ کو کتابیں دی گئیں اسی طرح اگر ہمیں بھی کوئی کتاب دی جاتی تو دنیا دیکھتی کہ ہم اس کو کس طرح سینہ سے لگاتے۔ کس طرح اس کی ہدایت کے مطابق عمل کرتے۔ ان سے کہا جارہا ہے کہ لو اب وہ کتاب آگئی ہے جو روشن دلائل پر مشتمل ہے۔ جو سراپا ہدایت ہے۔ اب اس پر عمل کر کے دکھاؤ۔ آیات قرآنی سے اعراض کرنے والے مشرکین کو بڑے عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔

علمی بات: روشن دلیل سے مراد قرآن مجید ہے، جو صرف ہدایت اور رحمت ہی نہیں بلکہ اپنے سچے ہونے کی واضح اور روشن دلیل بھی ہے اور اللہ ﷻ نے قرآن حکیم کو رہتی دنیا تک تمام انسانیت کے لئے رہبر و رہنما بنا کر نازل فرمایا ہے اور جو صرف عربوں کے لئے ہی نہیں بلکہ تمام اقوام کے لئے ہے اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ قرآنِ حکیم تو عربی زبان میں نازل ہوا ہے چنانچہ اہل عرب پر تو حجت تمام ہوگئی لیکن عجم یعنی غیر عرب اس سے کس طرح استفادہ کر سکتے ہیں تو اس کا جواب انتہائی آسان ہے کہ اللہ ﷻ کے فضل و کرم سے ہر زبان بولنے والوں میں کچھ اہل علم اور علمائے کرام ہوتے ہیں جو اپنی اپنی زبانوں میں اس عالمگیر پیغام کا ترجمہ و تشریح کر کے لوگوں تک ان کے رب کی طرف سے نازل کردہ احکامات سہل انداز میں پہنچا کر تبلیغ کا فریضہ سر انجام دے رہے ہوتے ہیں لہذا اقوام عالم پر لازم ہے کہ اس کے احکام کو سیکھیں۔ قرآن مجید پڑھیں اور پڑھائیں دنیا جہاں کے تمام انسان خواہ کسی زبان و قوم سے تعلق رکھتے ہوں ان پر قرآن حکیم کے ذریعے دنیا و آخرت میں کامیابی کے لئے رہنمائی حاصل کرنا لازم بھی ہے اور ان کی ضرورت بھی اور یہ کچھ مشکل و عجب نہیں کیونکہ جب خود اللہ ﷻ جس نے اس ہدایت کے مجموعہ کو اپنے محبوب ﷺ کے ذریعے ہم تک پہنچایا واضح طور پر فرماتا ہے "ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان فرما دیا ہے۔

آیت نمبر ۱۵۸: اتمام حجت قائم ہونے کے بعد بھی مشرکین مکہ گمراہی سے باز نہ آئے۔ گویا وہ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ اُن کے پاس فرشتے آئیں یا آپ ﷺ کا ربّ اُن کے پاس آئے یا قیامت کی بڑی نشانی (جیسے سورج کا مغرب سے طلوع ہونے) کا وقوع ہو، اللہ ﷻ نے انہیں خبر دار فرمایا ہے۔ بڑی نشانی آنے کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا تو اس وقت کافر اپنے کفر اور فاسق اپنے فسق سے توبہ کرے گا تو اس کی توبہ قبول نہ ہوگی کیونکہ حقیقتِ حال کا مشاہدہ ہونے پر کافر اپنے کفر یا فاسق اپنے فسق سے توبہ پر آمادہ ہو ہی جائے گا لہذا بعد از مشاہدہ ایمان اور توبہ قابلِ قبول نہیں ہے۔ کیونکہ ایمان کی شرط ہی بنا دیکھے اقرار اور قولِ رسول کی تصدیق ہے۔

آیت نمبر ۱۵۹: "شیعا" سے مراد فرقے اور گروہ ہیں۔ اس آیت میں ہر وہ گروہ مراد ہے جو دینِ اسلام اور رسول ﷺ کے راستے کو چھوڑ کر دوسرے دین یا طریقے اختیار کرے۔ سیدھے راستے سے منحرف ہونے والوں کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے اور وہی انہیں ان کے اعمال کی سزا دے گا۔

علمی بات: آپس میں مختلف گروہ بننے سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی غرض و خواہش کی وجہ سے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور وہ مختلف گروہوں میں بٹ گئے یعنی دین کے اصول و مبادی میں اختلاف کر کے۔ پس حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمہ کرام کا اختلاف اس میں داخل نہیں کہ وہ اختلاف اصولی اور بنیادی نہیں بلکہ فروعی (یعنی ضمنی) ہے۔ اور ان فرقوں میں یہود و نصاریٰ اور اسلام کے دعویدار وہ سب فرقے داخل ہیں جو اہلِ حق سے بنیادی اختلافات رکھتے ہیں۔ جیسے خوارج اور منکرین حدیث وغیرہ۔ بہرکیف اس بارے میں نبی کریم ﷺ کو ہدایت فرمائی گئی کہ جو لوگ اپنے دین کو ٹکڑوں میں بانٹ کر خود مختلف فرقوں میں بٹ گئے ان سے آپ ﷺ کو کوئی سروکار نہیں۔ آپ ﷺ کا کام تو تبلیغِ حق ہے اور بس۔ جو کہ آپ کر چکے۔ اب ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیجیے اور ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیجیے۔ وہی ان سے حساب لے گا اور حق و انصاف کے تمام تقاضوں کو پورے کرنے کے بعد اُن کو سزا دے گا سو ایسے ہٹ دھرموں سے منہ موڑ لیجیے۔

فرقہ بندی کی مذمت: اس آیت کی تفسیر کے حوالے سے مفسرین کا ایک قول یہ ہے کہ اس سے مشرکین کے فرقے مراد ہیں۔ بعض مشرکین فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے، بعض مشرکین بتوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک کہتے تھے اور بعض مشرکین ستاروں کو۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہود اور نصاریٰ ہیں۔ حضرت محمد ﷺ کی بعثت سے پہلے وہ ایک دوسرے سے اختلاف کرتے تھے اور بعد میں مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ بعض لوگ قرآنِ حکیم کی بعض آیتوں کو مانتے تھے اور بعض کا انکار کرتے تھے اور چوتھا قول یہ ہے کہ اس سے مراد اس امت کے بدعتی اور گمراہ فرقے ہیں۔

آیت نمبر ۱۶۰: اس آیت میں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ نیکی کرنے کے بعد اس نیکی کو محفوظ رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہونے والے کے لئے بشارت دی گئی ہے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ ہر نیکی کا اجر دس گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور یہ کم سے کم اجر ہے۔ اس کے برعکس برائی کرنے والے کو برائی کے برابر ہی سزا دی جائے گی۔

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، بے شک تمہارا رب رحم فرمانے والا ہے، جو شخص نیکی کا ارادہ کرے اور اسے عملی جامہ نہ پہنا سکے تو اس کے لئے ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے اور اگر وہ اس کو عملی جامہ پہنا دے تو اس کے لئے دس سے سات سو گنا، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں اور جو شخص کسی برائی کا ارادہ کرے، پھر اسے عملی جامہ نہ پہنائے تو اس کے لئے ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے اور اگر اسے عملی جامہ پہنا دے تو اس کے لئے ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے یا اللہ تعالیٰ اسے بھی معاف فرما دیتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے ہاں تباہ و برباد ہونے والا شخص ہی ہلاک ہوتا ہے۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم، مسند احمد)

علمی بات: اجر و ثواب میں کمی زیادتی کا مدار انسان کے احوال اور اخلاص پر مرتب ہے جو جتنی تنگی اور مصیبت میں اخلاص کے ساتھ نیکی اختیار کرے گا اسی کے بقدر ثواب ملے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ انسان کے اعمال اور اس کی دلی کیفیت کو دیکھتا ہے جس درجہ کا اخلاص ہو گا اسی درجہ کا اجر و ثواب ملے گا۔ (واللہ اعلم بالصواب)۔

آیت نمبر ۱۶۱: صراطِ مستقیم کا مطلب ہے خالص دین پر عمل کرنا یعنی ہر معاملے میں یکسو ہو کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنا۔ اس کی عملی مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جنھوں نے ہر محبت کو اللہ تعالیٰ کی محبت کے سامنے قربان کر دیا۔ ملتِ ابراہیمی کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے یہود و نصاریٰ اور مشرکین بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت و عظمت کے قائل ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام غیر اللہ کی عبادت اور شرک سے بیزار تھے اور اللہ تعالیٰ کی توحید کے خالص داعی تھے۔ گویا نبی کریم ﷺ اعلان فرما رہے ہیں کہ اے عرب کے بت پرستو! تم چاہو کسی کو اپنا معبود بناؤ۔ اللہ تعالیٰ کی زمین میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑکاؤ اور فسق و فجور کا بازار گرم کرو۔ مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں۔ میں تو ثابت قدمی سے توحید اور پاک بازی کی اسی راہ پر گامزن رہوں گا جو

مجھے میرے مالک نے دکھادی ہے۔ اور یہ کوئی نئی راہ نہیں ہے بلکہ تمہارے ہی جد الانبیاء حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی راہ ہے جس کی اولاد ہونے پر تم فخر کرتے ہو جس کے بنائے ہوئے کعبہ کی خدمت گذاری سے تمہاری ساری عظمتیں وابستہ ہیں۔ وہ شرک سے بیزار اور موحد تھے۔ تو پھر میں توحید چھوڑ کر شرک کیسے اختیار کر سکتا ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مشرکوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ یہود و نصاریٰ اور اسی طرح مشرکین عرب کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اتباع واقتداء کا دعویٰ کرنا غلط ہے کیونکہ جس طرح یہ لوگ شرک میں مبتلا ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہر طرح کے شرک سے پاک اور بری تھے۔ وہ ہر طرف سے رخ پھیر کر صرف اللہ وحدہ لاشریک کے ہو کر رہ گئے تھے۔ یہاں تک کہ آپکا لقب ہی "حنیف" یعنی یکسو ہو گیا تھا۔ اور آپ کی ملت "ملت حنیفیہ" کہلائی جسکی اتباع و پیروی کا حکم امام الانبیاء حضرت محمد ﷺ کو بھی دیا گیا۔ "پھر ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی کہ آپ ابراہیم (علیہ السلام) کے طریقہ کی پیروی کریں جو بالکل یک سُو تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھے" (سورۃ النحل ۱۶، آیت:۱۲۳)۔

آیت نمبر ۱۶۲: حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ ہر مسلمان اس آیت کو بار بار پڑھا کرے اور اس کو وظیفۂ زندگی بنالے۔ اس آیت میں دو باتیں بتائی گئیں۔ اول یہ کہ ہر کام اللہ ﷻ کی رضا کے لئے ہونا چاہیئے دوم یہ کہ مومن کی زندگی بھی قیمتی ہے اور موت بھی قیمتی ہے۔ مومن کو چاہیئے کہ اللہ ﷻ ہی کے لئے جیئے اور اللہ ﷻ ہی کے لئے مرے۔ پوری زندگی اللہ ﷻ کے احکام کی پابندی میں گزارے اور فرائض وواجبات کے علاوہ بھی انہیں کاموں میں لگائے جن سے اللہ ﷻ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ اور جب مرنے لگے تو ایمان ہی پر مرے تو اس کی یہ موت قیمتی ہو جائے گی کیونکہ موت ہی اخروی نعمتوں کے درمیان حائل ہے۔ جب مومن بندہ موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے تو اس کے لئے خیر اور بھلائی ہی ہے۔ اگر عام مومنانہ زندگی گزارتے ہوئے کسی جہاد شرعی میں شریک ہو گیا اور دشمنانِ دین کے ہاتھوں شہید ہو گیا تو شہادت کی وجہ سے اس کی موت اور زیادہ قیمتی ہو جائے گی۔ لہٰذا ہر مومن بندہ اپنی موت اور زندگی کو قیمتی سمجھے اُسے اللہ ﷻ کے احکام کی پیروی کر کے قیمتی بنائے۔ اللہ ﷻ رب العالمین اور پروردگار ہے چنانچہ یہ اس کا حق ہے کہ یہ تھوڑی سی زندگی اس کی راہ اور اطاعت میں خرچ ہو جائے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

علمی بات: یہاں دوبارہ قل کہہ کر حضور ﷺ کو مخاطب فرمایا گیا ہے لیکن آپ ﷺ کی وساطت سے ہم میں سے ہر ایک کو یہ حکم پہنچ رہا ہے۔ کاش ہم میں سے ہر ایک یہ اعلان کرنے کے قابل ہو سکے کہ میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ﷻ کے لئے ہے جو رب العالمین ہے۔ لیکن یہ تب ممکن ہے جب ہم اپنی زندگی واقعتاً اللہ ﷻ کے لئے وقف کر دیں۔ دنیوی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ناگزیر حد تک تو اپنا وقت اور صلاحیتیں ضرور صرف کریں لیکن اس ساری تگ ودو کو اصل مقصودِ زندگی نہ سمجھیں بلکہ اصل مقصودِ زندگی اللہ ﷻ کی اطاعت اور اُس کے کلمہ کی سربلندی کی جدوجہد ہی کو سمجھیں۔

آیت نمبر ۱۶۳: توحید باری تعالیٰ کی دعوت رسول ﷺ سمیت تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے دی۔ ہر امت کے پہلے مسلمان اور صاحبِ ایمان خود وہ نبی یا رسول ہوتے ہیں جن پر وحی نازل ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے رسول ﷺ اپنی امت میں اول المسلمین ہیں۔

نوٹ: مسلمان ہونے کے ناطے ہمارا بھی اولین تعارف بطورِ مسلمان ہونا چاہیئے اور اس کے بعد عملی زندگی میں اس کا نمونہ پیش کریں تاکہ غیر مسلم بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو سکیں۔

آیت نمبر ۱۶۴: اس آیت میں مشرکین مکہ ولید بن مغیرہ وغیرہ کی اس بات کا جواب ہے جو وہ رسول اللہ ﷺ اور عام مسلمانوں سے کہا کرتے تھے کہ تم ہمارے دین میں واپس آجاؤ، تو تمہارے سارے گناہوں کا بوجھ ہم اٹھالیں گے، اس پر فرمایا کہ آپ ﷺ ان سے کہہ دیجئے کہ کیا تم مجھ سے یہ چاہتے ہو کہ تمہاری طرح میں بھی اللہ ﷻ کے سوا کوئی اور رب تلاش کرلوں، حالانکہ وہی سارے جہان اور ساری کائنات کا رب ہے، اس گمراہی کی مجھ

سے کوئی امید نہ رکھو، باقی تمہارا یہ کہنا کہ ہم تمہارے گناہوں کا بوجھ اٹھالیں گے یہ خود ایک حماقت ہے، گناہ تو جو شخص کرے گا اسی کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا، اور وہی اس کی سزا کا مستحق ہو گا تمہارے اس کہنے سے وہ گناہ تمہاری طرف کیسے منتقل ہو سکتا ہے۔ اور اگر یہ خیال ہو کہ نامہ اعمال میں تو انہی کا لکھا رہے گا لیکن میدان حشر میں ان گناہوں کا بوجھ ہم اُٹھالیں گے تو اسے بھی اس آیت کے اگلے جملہ نے رد کر دیا، وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى، "یعنی قیامت کے روز کوئی شخص کسی دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا"۔

نوٹ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے ہدایت کی دعوت دی تو اس کو ہدایت پر تمام عمل کرنے والوں کے برابر اجر ملے گا اور ان متبعین کے اجروں میں سے کوئی کمی نہیں ہو گی اور جس نے کسی گمراہی کی دعوت دی تو گمراہی کا سبب بننے کی وجہ سے اس کو اس گمراہی پر تمام عمل کرنے والوں کے برابر سزا ملے گی اور ان متبعین کی سزاؤں میں کوئی کمی نہیں ہو گی۔ (صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابو داؤد، مسند احمد)

آیت نمبر ۱۶۵: لفظ خلٰٓئِفَ، خلیفہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں کسی کا قائم مقام یعنی کہ اللہ تعالیٰ نے ہی تم کو تم سے پہلی قوموں کی جگہ پر آباد کیا ہے، کوئی مکان زمین جسے آج تم اپنی ملکیت کہتے اور سمجھتے ہو یہ کل تم ہی جیسے دوسرے انسانوں کی ملکیت میں تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کو ہٹا کر تمہیں ان کی جگہ بٹھایا ہے، اور پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ تمام انسان یکساں نہیں، کوئی مفلس ہے کوئی مال دار، کوئی کم تر ہے تو کوئی عزت میں برتر، یہ درجات کا تفاوت بھی تمہیں اس کی خبر دے رہا ہے کہ اختیار کسی اور ہستی کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہے مفلس کر دے جس کو چاہے مال دار، جس کو چاہے عزت دے جس کو چاہے ذلیل کر دے۔ یہ سب کچھ دراصل امتحان کا سامان ہے، پوری زندگی ایک امتحان گاہ ہے، اور جس کو جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اسی میں اس کا امتحان ہے کہ اس نے کس طرح اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی جان، مال، عمر اور عہدہ کو امانت سمجھ کر اس کا حق ادا کیا، اور کس حد تک اپنی فرماں برداری کا ثبوت دیا۔ اسی امتحان کے نتیجہ میں آخرت کی زندگی کے درجات اور مراتب کا انحصار ہے کہ اس زندگی کے مطابق وہاں درجات اور مراتب ملیں گے۔

عملی پہلو: یہ آزمائش اس لئے ہے کہ قیامت کے دن سب لوگوں کو معلوم ہو کہ کون مال وزر کی فراوانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے احکام بھلا بیٹھا اور نفسانی خواہشوں کی اتباع میں زندگی کی متاعِ عزیز لٹا بیٹھا اور کون ایسا ہے جو مال و دولت اور صحت کی فراوانی کے باوجود اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہا' اور اپنے مال و جان اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت اور خلق خدا کی خدمت میں صرف کرتا رہا' اور اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتا رہا، اور کون غربت وافلاس میں بھی اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حقوق ادا کرتا رہا؟ اور کون اللہ تعالیٰ سے شکوہ اور شکایت کرتا رہا؟ اور عبادت سے غافل رہا اسی طرح کون بیماری کی تکلیف صبر کے ساتھ سہتا رہا؟ اور کون بیماری میں گلے شکوے کرتا رہا؟ اور کون ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں لگا رہا؟ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص کسی ایسے شخص کو دیکھے جو مال اور شکل وصورت میں اس سے بڑھ کر ہے تو چاہیئے کہ اس کو بھی دیکھ لے جو اس سے کم ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح) اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا تم اس کو دیکھو جو تم سے کم ہے اور اس کو نہ دیکھو جو تم سے زیادہ ہے ایسا کرو گے تو تم پر جو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں انہیں حقیر نہ جانو گے۔ (صحیح مسلم) اور ایک حدیث مبارک میں یوں آیا ہے کہ جس میں دو باتیں ہوں گی اللہ تعالیٰ اسے صابر اور شاکر لکھ دے گا۔ دین میں اسے دیکھے جو اس سے بڑھ کر ہے پھر اس کی اقتداء کرے اور دنیا میں اسے دیکھے جو اس سے کمتر ہو پھر اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس شخص پر فضیلت دی ہے، ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ شاکر اور صابر لکھ دے گا اور جس نے اپنے دین میں ایسے شخص کو دیکھا جو اس سے کم ہے اور دنیا میں اسے دیکھا جو اس سے بڑھ کر ہے پھر اسے اس بات پر رنج ہوا کہ دنیا میں مجھے اتنا نہیں ملا تو اللہ تعالیٰ اسے نہ شاکر لکھے گا اور نہ صابر لکھے گا۔ (مشکوٰۃ المصابیح) آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ کی بندگی پر اس کی شان رحیمی و غفاری کے مستحق بننے کی بشارت دی گئی ہے جبکہ نافرمانی پر شدید عذاب سے دوچار ہونے کی وعید سنائی گئی ہے۔

سُوْرَةُ الْاَعْرَاف

آیت نمبر۱: علمی بات: الٓمّٓصٓ یہ حروف مقطعات میں سے ہے۔ حروف مقطعات کی کل تعداد ۱۴ چودہ ہے۔ حروفِ مقطعات قرآنِ حکیم کی (۲۹) (انتیس) سورتوں میں آئے ہیں۔ حروف مقطعات کا علم اللہ ﷻ کے پاس ہے اور یہ اللہ ﷻ اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان ایک راز ہے۔

علمی بات: اگر منکرین کے زعم کے مطابق قرآنِ حکیم کسی انسان کا کلام ہے تو ان ہی حروف سے مرکب کرکے وہ بھی قرآنِ حکیم کی کسی ایک سورت کی مثل بنا کر لے آئیں کیونکہ یہ کلام ان حروف ہجاء سے مرکب ہے جن کو تمام اہل عرب جوڑ کر اپنے کلام کو مرکب کرتے ہیں اور جب سر توڑ کوشش اور عربی زبان پر عبور رکھنے کے باوجود کوئی منکر اس کلام کی نظیر تو کجا اس کی سورت کی مثل یا اس کی آیت کے مثل بھی نہ لا سکا تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ یہ قرآنِ حکیم کسی انسان کا کلام نہیں ہے بلکہ اللہ ﷻ کا کلام ہے۔

آیت نمبر۲: نزولِ قرآن کا اولین مقصد غفلت میں پڑی ہوئی انسانیت کو بیدار کرنا اور انکار کرنے والوں کو عذابِ الٰہی سے ڈرانا ہے۔

علمی بات: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کی تبلیغ میں اس خوف سے آپ ﷺ کا دل تنگ نہ ہو کہ کفار آپ ﷺ کی تکذیب کریں گے، اس آیت میں آپ ﷺ کو قرآنِ حکیم کے ذریعہ سے ڈرانے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے یہ کتاب، اللہ ﷻ نے آپ ﷺ پر نازل فرمائی ہے، اس لئے آپ ﷺ کو یہ یقین ہے کہ اللہ ﷻ کی نصرت اور حمایت آپ ﷺ کے ساتھ ہے لہٰذا آپ ﷺ اپنے دلِ منور میں اس کی تبلیغ کے حوالہ سے کوئی پریشانی محسوس نہ کیجئے کیونکہ جس کا اللہ ﷻ حافظ و ناصر ہو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا سو آپ ﷺ قرآنِ حکیم کی تبلیغ کرنے، اس کے ذریعہ سے ڈرانے اور اس کے ساتھ نصیحت کرنے میں مشغول رہیئے اور کفار اور مشرکین کی مخالفت کی مطلقاً پروانہ کیجئے۔

عملی پہلو: امّت کے لئے اس آیت میں یہ حکم ہے کہ اللہ ﷻ کا پیغام دوسروں تک پہنچانے کا فرض ادا کرتی رہے اور اس دعوت و تبلیغ میں کسی قسم کا کوئی خوف اور تنگی محسوس نہ کرے۔

علمی و عملی بات: اس آیت میں فرمایا ہے: "تا کہ آپ اس (قرآنِ حکیم) کے ذریعہ سے ڈرائیں اور یہ ایمان والوں کے لئے نصیحت ہے" لیکن چونکہ اس سے فائدہ صرف مؤمنین حاصل کرتے ہیں اور وہی اس کی نصیحت قبول کرتے ہیں اس لئے فرمایا کہ یہ مؤمنین کے لئے نصیحت ہے۔ اس آیت میں قرآنِ حکیم کے ذریعہ سے ڈرانے کا بھی ذکر ہے اور قرآنِ حکیم سے نصیحت کرنے کا بھی ذکر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عموماً انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض ضدی اور سرکش ہوتے ہیں اور خواہشاتِ نفسانی میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کو انبیاء کرام علیہم السلام اُخروی عذاب سے ڈراتے ہیں اور بعض انسان نیک اور شریف ہوتے ہیں اور حق بات کو قبول کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ ان کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام کی صرف نصیحت ہی کافی ہوتی ہے۔

علمی بات: قرآنِ حکیم کے سنانے کا ایک فائدہ تو یقینی ہے کہ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے لئے یہ نصیحت بھی ہے اور یاد دہانی بھی جو ان کے ایمان کو مزید پختہ اور مضبوط بنادے گی اور عالمِ ارواح میں کئے گئے عہد ("اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" (اور پوچھا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟) سورۃ الاعراف ۷، آیت: ۱۷۲) کی یاد دہانی بھی ہے جو ہر انسان کے شعور میں موجود ہے اور یہ قرآنِ حکیم اسی دبے ہوئے شعور کو بیدار اور اس عہد کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اور اسی طرح اللہ ﷻ نے اپنی پہچان اور معرفت کے حصول کے لئے بالخصوص قرآنِ حکیم اور اس کائنات کی نشانیاں ہمیں عطا کیں تا کہ ان میں غور و فکر کے ذریعہ ہم اللہ ﷻ کی پہچان اور معرفت حاصل کر سکیں۔

آیت نمبر۳: اس آیت میں اہل ایمان کو قرآنِ حکیم کے احکامات پر عمل کرنے کی پر زور تاکید کی جارہی ہے۔

علمی بات: "رب کی طرف سے نازل کیا گیا" سے مراد ہے قرآنِ حکیم اور رسول اللہ ﷺ کی احادیثِ مبارکہ ہیں، کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں قرآنِ حکیم اور اس کی مثل اس کے ساتھ دیا گیا ہوں۔ (سنن ابوداؤد)

عملی پہلو: یہ قرآنِ حکیم اس لئے نازل ہوا کہ اس کے احکام پر عمل کیا جائے یعنی قرآنِ حکیم کی تلاوت کے ساتھ ساتھ اس پر عمل بھی لازم اور ضروری ہے اور یہ اس وقت ممکن ہے جب ہم قرآنِ حکیم کے معنیٰ و مطلب اور احکامات کو سمجھیں گے کہ اس میں کن اعمال کی ادائیگی کا حکم ہے اور کن ناپسندیدہ اعمال سے منع کیا گیا ہے۔

علمی بات: یہاں اولیاء سے مراد دنیا پرست پیشوا اور دوست ہیں۔ جو باطل کی راہ دکھاتے ہیں اور گمراہی کے راستے پر ڈال دیتے ہیں یہ رفیق وہی ہیں جنہیں دوسری جگہ قرآنِ حکیم میں "شَيٰطِيْنَ الْجِنِّ وَالْاِنْس" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بہرکیف آیت مبارکہ میں قرآنِ حکیم کو چھوڑ کر دوسرے سرکش دوستوں کی پیروی کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔

علمی بات: کم نصیحت قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو بہت کم دھیان دیتے ہیں۔

علمی بات: اس آیت میں امّت کو یہ حکم دیا ہے کہ نبی کریم ﷺ پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے وہ اس کی اتباع کریں اور اس پر عمل کریں اور اس آیت میں احادیثِ مبارکہ کے حجّت ہونے پر دلیل ہے، کیونکہ جس طرح نبی کریم ﷺ پر قرآنِ حکیم نازل کیا گیا ہے اسی طرح آپ ﷺ پر احادیثِ مبارکہ بھی نازل کی گئی ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کے الفاظ اور معانی دونوں نازل ہوئے ہیں اور احادیثِ مبارکہ کے نبی کریم ﷺ پر صرف معانی نازل ہوئے اور ان معانی کو نبی کریم ﷺ نے اپنے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے، اس آیت کے علاوہ بھی متعدد آیات احادیثِ مبارکہ کے حجّت ہونے پر دلیل ہیں، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

"رسول تمہیں جو کچھ دیں، وہ لے لو، اور جس چیز سے منع کریں اس سے رک جاؤ"۔ (سورۃ الحشر ۵۹، آیت: ۷)

آیت نمبر ۴: اس آیت میں نوح علیہ السلام کی قوم، ہود علیہ السلام کی قوم، صالح علیہ السلام کی قوم، اور شعیب علیہ السلام کی قوم کی بستیوں کی ہلاکت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ ان قوموں پر رسولوں کی مخالفت اور ان کی تکذیب کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا۔

علمی بات: حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر رات میں اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پر دوپہر کے وقت عذاب آیا تھا۔ قرآنِ حکیم میں بڑی تفصیل سے ان قوموں کا ذکر کیا گیا ہے جن کو لمبی مہلت دی گئی اور بالآخر ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان پر عذابِ الٰہی نازل ہوا۔ اور یہ تو دنیاوی ہلاکت تھی، اُخروی اور مستقل عذاب تو روزِ قیامت دیا جائے گا۔

عملی پہلو: جب انسان اللہ تعالیٰ کے احکامات بھول کر غفلت کا شکار ہو جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی پکڑ ہوتی ہے۔

علمی بات: یہاں رات اور دوپہر کے وقت کا ذکر بستی والوں کی انتہائی غفلت کو ظاہر کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ کیونکہ اہل عرب میں بھی قیلولہ کا رواج تھا تو مشرکین عرب کو ان کے انکار اور بدعملی کے نتائج سے خبردار کیا جا رہا ہے۔

نوٹ: حضرت لوط علیہ السلام کے قصّہ کی مزید تفصیلات مطالعہ قرآنِ حکیم حصّہ چہارم اور حضرت شعیب علیہ السلام کے قصّہ کی مزید تفصیلات حصّہ اوّل میں ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

آیت نمبر ۵: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ مجرمین نے عذاب کے وقت اعتراف کیا اور پچھتائے کہ ہم نے رسولوں کی مخالفت کرکے اپنی ہی جانوں پر ظلم کیا مگر اس کا فائدہ نہیں ہوا۔

عملی پہلو: سخت نادان ہے وہ شخص اور وہ قوم جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی مہلت کو غفلتوں اور سرکشیوں میں ضائع کردے۔ نزولِ عذاب کے وقت یعنی مہلت ختم ہو جانے کے بعد کا اعترافِ جرم کوئی فائدہ نہیں دیتا۔

عملی پہلو: گذشتہ اقوام کا حال بتانے کا مقصد یہ ہے کہ اقوامِ سابقہ جن عقائد اور بداعمالیوں کی وجہ سے عذابِ الٰہی سے دوچار ہوئی انسان ان غلطیوں سے عبرت حاصل کرے اور اس عبرتناک انجام سے بچنے کے لئے اُن غلطیوں کو نہ دہرائے اور اللہ تعالیٰ نے جو مختصر سی زندگی اور مہلت دی ہے اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے قیمتی بنائے۔

آیت نمبر ۶: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن امّتوں سے سوال ہو گا کہ کیا تم تک اللہ تعالیٰ کے احکامات نہیں پہنچائے گئے تھے؟ اور تم نے رسولوں کی دعوت کو قبول کیا تھا؟ اسی طرح قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے رسولوں علیہم السلام سے بھی یہ سوال ہو گا کہ انہوں نے پیغامِ حق پہنچا دیا تھا یا نہیں؟

علمی بات: اللہ تعالیٰ اتمامِ حجت کے لئے امّتوں سے پوچھے گا تا کہ وہ خود اپنے زبانی جرم کا اقرار کریں اور ذلیل ورُسوا ہوں اسی طرح رسولوں سے گواہی کے طور پر پوچھا جائے گا۔ ورنہ اللہ تعالیٰ تو عالم الغیب ہے ہر شے اس کے علم میں ہے۔

علمی بات: حجتہ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے سوال کیا "کیا میں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا؟" تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جواب دیا کہ صرف پہنچایا ہی نہیں بلکہ اس کا حق بھی ادا فرما دیا ہے اور آپ ﷺ نے دعوتِ حق کی تبلیغ پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بنایا اور اس کا اظہار کل قیامت کے دن بھی ہوگا۔

عملی پہلو: نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول ہیں۔ آپ ﷺ پر نبوّت ختم ہوگئی ہے چنانچہ اب دعوتِ الی اللہ اور تبلیغ کی ذمہ داری امّتِ مسلمہ پر ہے۔ جیسا کہ حجتہ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: "کہ اب پہنچائیں وہ لوگ جو یہاں موجود ہیں ان لوگوں کو جو یہاں موجود نہیں ہیں"۔ گویا ختمِ نبوت کے بعد دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری اب اُمّتِ مسلمہ کے کاندھوں پر ہے۔

علمی بات: گواہی اس لئے ضروری ہوتی ہے تاکہ کسی کو اس کے جرم کی سزا نہ زیادہ ملے اور نہ اس پر ظلم ہو۔ یعنی قیامت میں اللہ تعالیٰ کا پوچھ گچھ فرمانا ضابطہ کی کاروائی کے لئے ہوگا ورنہ وہ تو علیم و خبیر ذات ہے۔

آیت نمبر۷: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم سے کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے، وہ لوگوں کے ظاہر و باطن اور ان کے ہر قول و فعل سے باخبر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سے کسی لمحہ دور نہیں ہوتا وہ ہماری ہر بات سے باخبر ہے۔ قیامت کے دن انسان کے اعضاء اللہ تعالیٰ کے حکم سے بندوں کے خلاف گواہی دیں گے۔ جیسا کہ سورۃ یٰس ۳۶، آیت: ۶۵ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے "آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور ان کے پاؤں (اس کی) گواہی دیں گے جو کچھ وہ کیا کرتے تھے" اور سورۃ حم السجدۃ ۴۱، آیات: ۲۰ اور ۲۱ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے "یہاں تک کہ جب وہ اس (جہنّم) کے پاس پہنچ جائیں گے تو ان کے کان ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں ان کے خلاف گواہی دیں گی ان اعمال کی جو وہ کیا کرتے تھے وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی وہ کہیں گی ہمیں اُسی اللہ تعالیٰ نے بولنا سکھایا ہے جس نے ہر شے کو بولنا سکھایا ہے اور اُسی نے تمہیں پہلی بار پیدا فرمایا ہے اور اس کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے۔"

علمی بات: اگر کوئی مجرم دنیا میں اپنے آپ کو سزا سے بچالے یا بچ جائے تو قیامت کی سزا سے نہیں بچ سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ مجرموں کو ان کے کئے کی سزا ضرور دے گا۔

آیت نمبر۸: اس دن وزن کے حق ہونے کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ اس دن وزن صرف حق ہی میں ہوگا، یعنی صرف اعمالِ صالحہ ہی کا وزن ہوگا، باطل اور بُرے اعمال سرے سے بے وزن ہوں گے اور ریاکاری کی نیکیاں ترازو میں بالکل بے حیثیت ہوں گی۔ دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ اس دن وزن ہی حق ہوگا، وزن ہی فیصلہ کن ہوگا۔ یعنی اس روز اللہ تعالیٰ ایسا میزانِ عدل قائم کرے گا، جس کے ذریعے سے اعمال کا ٹھیک وزن ہوگا۔ تو جس کا نیکیوں والا پلڑا بھاری ہوگا اس کے لئے نجات ہوگی۔

علمی بات: اعمال کے وزنی اور بے وزن ہونے کے باب میں سورۃ الکہف ۱۸، آیات: ۱۰۳ تا ۱۰۵ میں ارشادِ باری تعالیٰ کا مفہوم ہے: "آپ فرما دیجیے کیا ہم تمہیں بتائیں اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے والے (کون ہیں)۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوششیں دنیا کی زندگی میں ضائع ہوگئیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رَب کی آیات کا انکار کیا اور اس کی ملاقات کا پس ان کے اعمال برباد ہوگئے پس ہم قیامت کے دن ان کے لئے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے۔"

علمی بات: میزان سے مراد ترازو ہے جس کے دو پلڑے ہوتے ہیں۔ قیامت کے روز تمام ظاہری اور باطنی اعمال کا ٹھیک ٹھیک وزن کیا جانا برحق ہے تاکہ ہر ایک کی حالت اس پر واضح ہو جائے اور یہ بھی ظاہر ہو جائے کہ حساب و کتاب کے بعد جو جزا و سزا دی جائے گی وہ عین حق اور اعمال کے مطابق ہوگی۔ کسی کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی اور ناانصافی نہ ہوگی۔

عملی پہلو: قیامت کے دن میزان پر وہی اعمال بھاری اور وزن رکھتے ہوں گے جو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے اخلاص سے کئے گئے ہوں گے۔ اگر اچھے سے اچھا عمل محض دکھاوے اور نمود و نمائش کے لئے کیا ہوگا تو میزانِ الٰہی میں ان کا کوئی وزن نہ ہوگا۔ اور یہی لوگ خسارے میں ہوں گے۔

آیت نمبر۹: اللہ تعالیٰ کے ہاں کفار کا عمل قبول نہیں کیونکہ بغیر ایمان کے کوئی عمل معتبر ہی نہیں ہوتا اور جب میزانِ عدل میں ان کے اعمال کو تولا جائے گا ان کے اعمال کا پلڑا ہلکا رہے گا اور یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنی جانیں خسارہ میں ڈالیں اور ہماری آیتوں پر ناانصافی سے انکاری تھے اور اس طرح یہ سب اپنی جانوں پر زیادتی کرنے والے تھے۔ میزانِ عدل میں ایمان و کفر کا وزن کیا جائے گا ایک پلڑے میں ایمان اور دوسرے میں کفر رکھا جائے گا جب اس تول سے مومن و کافر الگ الگ ہو جائیں گے تو پھر خاص طور پر مومنین کے لئے ایک پلڑے میں ان کی حسنات اور دوسرے پلڑے میں ان کی سیئات رکھ کر ان اعمال کا وزن ہوگا اور جیسا

کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اگر حسنات غالب ہوئیں تو جنّت اور اگر سیئات غالب ہوئیں تو دوزخ اور اگر دونوں برابر ہوئیں تو اعراف کے حق دار ہونگے پھر یا تو آپ ﷺ کی شفاعت کی وجہ سے سزا سے پہلے یا سزا کے بعد جنّت میں داخل ہوں گے۔

علمی بات: آیاتِ الٰہی سے بے انصافی اور ظُلم کرنے کا یہ مطلب ہے کہ وہ ان آیات میں غور و فکر نہیں کرتے۔ ہدایت کی جو روشنی ان آیات میں موجود ہے اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ بلکہ انا اور ضد کے سبب ان آیات سے منہ موڑے رہتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کر کے ان کو جھٹلاتے اور ان کی اطاعت سے منہ موڑتے تھے وہ تو ہمیشہ جہنّم میں رہیں گے۔

عملی پہلو: دینِ حق کو نہ قبول کرنا اور احکاماتِ خداوندی سے انکار و بغاوت آیاتِ الٰہی کے حق میں ظلم و بے انصافی کرنا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس روزِ قیامت سے قبل جو وقت دنیا میں میسّر ہے اپنے مقصدِ حیات کو سمجھ کر دینِ اسلام کے تحت زندگی بسر کی جائے۔

آیت نمبر ۱۰: اس آیت میں اللہ تعالیٰ انسانوں پر کی جانے والی درج ذیل نعمتوں کا ذکر فرما رہا ہے:

۱۔ نعمتِ اقتدار: یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کے وسائل کو انسان کی خدمت پر لگا دیا۔ سورۃ الجاثیہ ۴۵ کی آیت: ۱۳ میں ہے کہ "زمین میں جو کچھ بھی ہے اسے اللہ تعالیٰ نے تمہاری خدمت میں لگا دیا"۔

۲۔ نعمتِ معیشت: یعنی اللہ تعالیٰ نے زندگی بسر کرنے کے لئے سارے اسباب جمع کر دیئے۔ جیسے پہاڑ، نہریں، ہوا، آگ، سورج، پیڑ پودے، اور کھانے پینے کی انواع و اقسام کی چیزیں تاکہ انسان ان سے دنیا کی زندگی میں نفع اُٹھائیں۔

عملی پہلو: انسان پر اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کا شمار ناممکن ہے اور اگر اللہ تعالیٰ ان انعامات کو واپس لے یا ان میں سے کوئی ایک بھی کم کر دیا جائے مثلاً ہوا کا وجود ہی ختم ہو جائے یا دھوپ کبھی نہ نکلے تو اس دنیا میں انسان کا جینا محال ہو جائے ان احسانات کا بدلہ اور ان نعمتوں کا تقاضا یہ تھا کہ انسان اللہ تعالیٰ کا خوب شکر ادا کرتا اور اس کی خوب عبادت کرتا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اکثر و بیشتر انسان اللہ تعالیٰ کا کم شکر ادا کرتے ہیں۔ مال اور اقتدار کو صحیح مصرف میں خرچ کرنا ان نعمتوں کی شکر گزاری ہے۔

علمی و عملی بات: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی بے شمار نعمتوں کی یاد دلا کر بندوں کو اپنے احکامات کی پیروی اور منکرات سے بچنے کی ترغیب دی ہے اور انہیں شکر گزاری کی طرف متوجہ کیا ہے کہ اُسی نے تمہیں زمین پر رہنے اور زندگی گزارنے کی قدرت عطا فرمائی اور تمہارے لئے زندگی بسر کرنے کے اسباب، کھیتی باڑی، پھل، ترکاری، غلّہ، مویشی اور تجارت کے سامان اور کسب و کمائی کے پیشے وغیرہ پیدا کیئے۔ اس کے باوجود لوگ ان سب نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے، بلکہ ان نعمتوں میں مشغول ہو کر وہ منعمِ حقیقی اللہ تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں اور اس کی نافرمانی کرنے لگتے ہیں۔

نوٹ: سورۃ الاعراف کی آیات: ۱۱ تا ۲۷ کی وضاحت رہنمائے اساتذہ مطالعۂ قرآن حکیم حصّہ اوّل میں ملاحظہ فرمائیں۔

آیت نمبر ۲۸: اس آیت میں فحش سے مراد بیت اللہ کا برہنہ طواف کرنا ہے۔ مشرکین عرب اس فعل کو مقدّس مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ وہ اس جاہلانہ رسم کے جواز کے لئے یہ دلیل دیتے کہ ہم اپنے باپ دادا کی پیروی کرتے ہیں اور انہیں اللہ تعالیٰ ہی نے ایسا حکم دیا ہے (معاذاللہ)۔ لہٰذا ان پر واضح کر دیا گیا کہ بے حیائی اور فحاشی اللہ تعالیٰ کا حکم ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ان کا یہ دعویٰ جھوٹ پر مبنی ہے۔

علمی بات: ۹ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیرِ حج بنا کر بھیجا اور بعد میں سورۃ التوبہ کی ابتدائی آیات کے نزول کے بعد سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ چنانچہ ۹ ہجری حج کے اجتماع میں جو عام اعلان کیا گیا اس کے دو اہم نکات یہ تھے کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک بیت اللہ میں داخل نہیں ہو سکتا اور دوسرا یہ کہ آئندہ کوئی ننگا ہو کر کعبہ کا طواف نہیں کر سکتا (صحیح بخاری)۔

نوٹ: مشرکینِ مکہ اگرچہ برہنگی کو باعثِ عار اور معیوب فعل نہیں سمجھتے تھے پھر جب انہیں اس کام سے روکا جاتا تو وہ کہہ دیتے کہ ہمارے آباء و اجداد اور بڑے بزرگ بھی کعبہ کا طواف ننگے ہو کر کرتے آئے ہیں وہ بزرگ ہم سے زیادہ دین دار تھے پھر بھلا ہم کیوں نہ کریں۔ چونکہ وہ اس طواف کو متبرک اور دین ہی کا حکم سمجھتے تھے اور کہتے تھے یہ اللہ تعالیٰ ہی کا حکم ہوگا جو ہمارے بزرگ برہنہ ہو کر طواف کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ تو بے حیائی کے کاموں سے روکتا ہے وہ اس کا حکم کیسے دے گا؟ بالفاظِ دیگر جس چیز میں بے حیائی پائی جاتی ہو وہ اللہ تعالیٰ کا حکم کبھی نہیں ہو سکتا۔

عملی پہلو: اس آیتِ کریمہ میں بہت بڑی ڈانٹ ہے ان لوگوں کے لئے جو راہِ حق کو چھوڑ کر اپنے گمراہ آباؤ اجداد کی اندھی پیروی کرتے ہیں۔ البتہ یہ یاد رہے، صاحبِ ایمان بزرگوں اور اہلِ حق کی پیروی تو مطلوب طرزِ عمل ہے۔

آیت نمبر ۲۹: "قسط" سے مراد ہے انصاف، اعتدال اور برابری۔ یعنی ایسا درمیانہ راستہ ہے جو افراط و تفریط سے پاک ہو۔ زندگی کے ہر معاملہ میں افراط و تفریط سے پاک رویہ اختیار کرنے کا حکم ہے۔ اللہ ﷻ کا ہر حکم قسط پر مبنی ہے اور بے حیائی قسط کی ضد ہے۔ چونکہ تمام احکام شرعیہ افراط و تفریط سے خالی ہیں اس لئے قسط کے مفہوم میں تمام عبادات و احکام شرعیہ داخل ہیں۔ اس آیت کے نزول کا سبب مشرکین کے برہنہ طواف سے متعلق ہے۔ بعض علماء کرام کے نزدیک اس آیت میں مسجد سے مراد نماز ہے۔ اللہ ﷻ ہی کو اخلاص کے ساتھ پکارنے کا حکم دیا گیا ہے۔ نیز یہ بھی بیان ہے کہ جس طرح پہلی بار انسان کو پیدا فرمایا گیا روزِ قیامت اسی طرح دوبارہ اسے زندہ کرکے کھڑا کیا جائے گا۔

علمی بات: ننگے ہو کر طواف کرنے کو اللہ ﷻ کا حکم قرار دینا، اللہ ﷻ پر صریح بہتان اور افتراء ہے۔ اللہ ﷻ کسی کو فحش و نازیبا کام کا حکم نہیں دیتا۔ وہ اپنی عبادت اور عدل و مساوات کا حکم دیتا ہے۔ لہٰذا ہر نماز کے وقت اپنا رخ سیدھا رکھو اور اللہ ﷻ کو اس طرح متوجہ ہو کر پکارو کہ خالص اسی کی عبادت ہو، اس کی عبادت میں کسی کی شرکت کا شائبہ تک نہ ہو اور اسی طرح ریاکاری سے بھی پاک ہو اور اس بات کا یقین کرلو کہ ایک دن تمہیں اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ جس طرح اللہ ﷻ نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا اسی طرح تمہیں قیامت کے روز دوبارہ پیدا کرنا اس کے لئے ذرا مشکل نہیں۔ بالآخر تم اس کی طرف لوٹو گے۔ اس وقت تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس ہوگی۔

آیت نمبر ۳۰: اس آیت میں دو گروہوں کا بیان ہے۔ ایک گروہ کو ایمان اور نیک عمل کی راہ دکھائی گئی جبکہ دوسرا گروہ اپنے انکار اور بدعملی کی وجہ سے گمراہ ہوا۔ گمراہ وہ ہیں جنہوں نے اللہ ﷻ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بنایا اور اپنے آپ کو ہدایت یافتہ سمجھتے رہے۔

علمی بات: وہ لوگ جنہوں نے اللہ ﷻ کی دی ہوئی سمجھ سے صحیح کام لیا اور اس کی عطا کردہ آزادی و اختیار کو استعمال کرتے ہوئے اللہ ﷻ کے حکموں کی پابندی کی کوشش کی انہیں راہِ ہدایت دکھا دی گئی اور اس پر چلنے کی توفیق مرحمت فرما دی گئی اور جنہوں نے اللہ ﷻ کی دی ہوئی عقل و فہم سے کام نہ لیا اور اللہ ﷻ کو چھوڑ کر شریروں اور مفسدوں سے دوستی و محبت نبھائی۔ ان کے مقدّر میں گمراہی لکھ دی گئی اور وہ بدنصیب اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں عین حق ہے اور وہ سیدھے راستے پر ہیں اور یہ صرف اس وقت کے باطل پرستوں کا خیال نہ تھا بلکہ آج بھی راہِ حق سے بھٹکے ہوئے افراد اور قومیں بڑی شد و مد اور وثوق سے اپنے آپ کو حق کا علم بردار سمجھتے ہیں۔ ان کی گمراہی کی وجہ بیان فرمادی کہ انہوں نے خود شیطان کی رفاقت اختیار کی اور اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ کا راستہ چھوڑ دیا۔

عملی پہلو: جن لوگوں نے حق کا انکار کیا اور پھر ڈٹ گئے وہ اپنی اس متعصبانہ روش، ہٹ دھرمی اور تکبر کے باعث گمراہی کے مستحق ہو جاتے ہیں لہٰذا ہمیں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا چاہیئے اور ان کی اہمیت و احترام ہمارے دلوں میں ضرور ہونا چاہیئے اور انہیں بے سود خیال کرنے سے لازماً بچنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۳۱: اس آیت میں زینت سے مراد لباس ہے۔ نماز میں ستر پوشی کے علاوہ اپنی وسعت کے مطابق زینت والا لباس اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ تمام حلال اور پاکیزہ اشیاء کھانے کی اجازت ہے۔ تاہم اسراف کی ممانعت ہے۔ اسراف کا مطلب ہے ضروریاتِ زندگی پر ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا یا بغیر ضرورت کے خرچ کرنا۔

علمی بات: طواف اور نماز میں پردے کی چیزوں کو چھپانا فرض ہے، مرد کے لئے کمر سے گھٹنوں تک اور عورت کے لئے چہرہ اور ہاتھوں کے سوا سارا بدن ستر ہے۔ باریک کپڑا جس سے بدن اور بال نظر آئیں معتبر نہیں، یعنی نہ ہونے کے برابر ہے۔ پس جس عورت کا سر، گردن یا بازو یا پنڈلی کھلی ہوئی ہو تو ایسے لباس میں غیر محرم کے سامنے رہنا اس کے لئے جائز نہیں اور نہ ایسے لباس میں اس کی نماز ہوگی۔ عورت کا چہرہ، ہتھیلیاں اور قدم جو ستر سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر نماز میں اس کے یہ اعضاء کھلے ہوئے ہوں تو نماز میں کوئی خلل نہیں آئے گا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ شرعی عذر کے بغیر چہرہ کھول کر غیر محرموں کے سامنے آئے۔ اسی طرح مرد کا مونڈھے یا کہنیاں کھول کر نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ ایسے لباس میں بھی نماز پڑھنا مکروہ ہے جس کو پہن کر آدمی اپنے دوستوں اور عام لوگوں کے سامنے جانا قابلِ شرم و عار سمجھے۔ البتہ جمعہ جسے سیّد الایّام کہا گیا ہے اس دن خاص طور پر غسل کرنے، خوشبو لگانے اور اپنے موجودہ لباس میں سے بہترین پہننے کا حکم دیا۔ جمعہ مسلمانوں کی ہفتہ وار عید ہے۔ اسی طرح عید الفطر اور عید الاضحیٰ سالانہ عیدیں ہیں، ان میں تو بدرجہ اولیٰ اس کا اہتمام ہونا چاہیئے۔

علمی بات: زمانۂ جاہلیت کے عرب ننگے ہو کر بیت اللہ کا طواف کرنے کو عبادت اور بیت اللہ کا احترام سمجھتے تھے۔ اس آیت میں لباس کو لفظ زینت سے تعبیر کر کے اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ نماز میں افضل واولیٰ یہ ہے کہ صرف ستر پوشی پر کفایت نہ کی جائے بلکہ اپنی وسعت کے مطابق اچھا لباس پہنا جائے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نماز کے وقت اپنا سب سے اچھا لباس پہنتے تھے اور فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند فرماتا ہے۔ اس لئے میں اپنے رب کے لئے زینت وجمال اختیار کرتا ہوں۔

عملی پہلو: ایک حدیث شریف میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ "کھاؤ، صدقہ کرو، اور پہنو، لیکن اسراف (فضول خرچی) اور غرور (گھمنڈ و تکبر) سے بچو۔" (سنن نسائی) اسراف کی ممانعت صرف کھانے پینے کے ساتھ خاص نہیں۔ عبادات، معاملات، بات چیت بلکہ تمام امور میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کرنے سے انسان مصائب اور اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا اور خاص طور پر عبادت میں اُسے دوام نصیب ہوتا ہے کہ ہر کام حد میں رہ کر کرنے سے یومیہ معمولات میں فرق نہیں آتا۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے بندوں کو کھانے اور پینے کا حکم دیا ہے اس لئے کہ اس کے بغیر آدمی زندہ نہیں رہ سکتا اور انہیں حد اعتدال سے تجاوز کرنے سے منع کیا ہے، آیت میں "اسراف" سے اَکل حرام، فضول خرچی اور کھانے پینے میں بد احتیاطی، کسی بھی کام میں حد سے تجاوز کرنا سبھی مراد ہیں، فضول خرچی اللہ تعالیٰ کو بہت نا پسند ہے اور یہ انسان کو فقیر اور محتاج بنا دیتی ہے۔ ایک حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ آدمی اپنے پیٹ سے زیادہ کوئی بُرا برتن نہیں بھرتا ہے، ابن آدم کے لئے چند لقمے کافی ہیں، جو اس کی پیٹھ کو سیدھا رکھیں اور اگر اتنا ہی ضرور ہو تو ایک تہائی کھانے کے لئے ایک تہائی پینے کے لئے اور ایک تہائی سانس کے لئے۔ (مسند احمد، سنن نسائی، جامع ترمذی)

عملی پہلو: اللہ تعالیٰ حد اعتدال سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ نہ وہ یہ پسند کرتا ہے کہ آدمی کھانے، پینے، پہننے ہی کو مقصدِ حیات بنالے اور رات دن اسی کے حصول میں مشغول رہے اور نہ اسے یہ پسند ہے کہ وہ راہبوں اور جوگیوں کی طرح ان اسباب دنیوی سے اور اپنی ذمہ داریوں سے بھاگ کر کنارہ کش ہو جائے۔ یہ اسراف اور ترکِ دنیا، دونوں ہی شیطان کی نکالی ہوئی راہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ زندگی کے ہر پہلو میں عدل و میانہ روی کو پسند فرماتا ہے۔

آیت نمبر ۳۲: اس آیت میں خود ساختہ تصورِ عبادت اور ترکِ دنیا کی نفی کی گئی ہے۔ لوگوں کے حرام کر لینے سے اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزیں حرام نہیں ہو جاتیں۔ حلال اور پاکیزہ چیزیں اصلاً اہلِ ایمان کے لئے ہیں۔ دنیا میں کفار کو بھی نعمتوں سے فیض یاب ہونے کا موقع دیا گیا ہے۔ البتہ آخرت میں تمام نعمتیں صرف اہلِ ایمان کے لئے مختص ہوں گی۔

فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے) تین شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ازواج کے گھروں کے قریب آئے اور ازواجِ مطہرات سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عبادت کا حال پوچھا جب انہیں آپ علیہ السلام کی عبادت کی خبر دی گئی تو انہوں نے اسے کم سمجھا اور کہا "کہاں ہم اور کہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان کی تو اگلی پچھلی سب لغزشیں معاف ہو چکیں"۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا "میں ہمیشہ ساری رات قیام کیا کروں گا"۔ دوسرے نے کہا "میں ہمیشہ روزے رکھا کروں گا، افطار نہ کروں گا"۔ تیسرے نے کہا "میں عورتوں سے علیحدہ رہوں گا کبھی نکاح نہ کروں گا"۔ اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بھی تشریف لے آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ان کی گفتگو کی خبر دی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کے پیچھے جا کر ان سے فرمایا کیا تم ہی ہو جنہوں نے ایسا اور ایسا کہا تھا؟ سنو اللہ تعالیٰ کی قسم میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور سب سے زیادہ متّقی ہوں لیکن میں روزے بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں (یعنی نفل روزوں میں ناغہ کرتا ہوں) میں رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں اب جس شخص نے میری سنّت (طریقہ) سے بے رغبتی کی اس کا مجھ سے کوئی سروکار نہیں۔ (صحیح بخاری)

نوٹ: اس آیت میں ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو عبادات میں غلو اور اپنی طرف سے تنگیاں پیدا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو اپنے اوپر حرام قرار دینے کو عبادت سمجھتے ہیں۔ جیسے بعض خود ساختہ طور پر لوگ ترکِ حیوانات یعنی جاندار اور جاندار سے حاصل ہونے والی غذاؤں گوشت، دودھ، گھی وغیرہ کو چھوڑ دینا روحانیت میں کمال کا ذریعہ سمجھتے ہیں یا جیسے مشرکین مکہ حج کے دنوں میں طواف کے وقت لباس پہننا جائز نہیں سمجھتے تھے اور جو غذائیں اللہ تعالیٰ نے حلال کی ہیں ان سے پرہیز کو عبادت جانتے تھے۔ کسی چیز کو حلال یا حرام ٹھہرانے کا حق صرف اُس ذات کو ہے جس نے اس کو پیدا کیا ہے کسی اور کو اس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔

عملی پہلو: جب اللہ ﷻ کسی بندے کو اپنی نعمت و وسعت عطا فرمادے تو اللہ ﷻ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ اس نعمت کا اثر اس کے لباس وغیرہ سے ظاہر ہو، اس لئے کہ اظہارِ نعمت بھی شکر ہے۔ اس کے بالمقابل وسعت ہوتے ہوئے پھٹے پرانے یا میلے کچیلے کپڑے استعمال کرنا ناشکری ہے اسی طرح ایسے لباس سے بچنا ضروری ہے جس سے انسان کے اندر ریاکاری، نمود و نمائش اور فخر و تکبر پیدا ہوتا ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: اللہ ﷻ اپنے بندے پر اپنی نعمت کا اثر دیکھنا پسند کرتا ہے۔ (جامع ترمذی)

علمی بات: دنیا کی تمام نعمتیں، نفیس و عمدہ لباس، پاکیزہ اور صحت بخش غذائیں، اللہ ﷻ نے مؤمنوں ہی کے لئے پیدا کی ہیں تاکہ وہ ان سے فائدہ اٹھائیں، ان کو استعمال کر کے اللہ ﷻ کی عبادت کے لئے جسمانی طاقت و توانائی حاصل کریں اور اللہ ﷻ کا شکر ادا کریں۔ دوسرے لوگ تو انہی کے طفیل میں کھاتے پیتے اور پہنتے ہیں۔ یہ دنیا دار العمل ہے، دار الجزا نہیں، اس لئے دنیا کی نعمتوں میں کھرے کھوٹے اور اچھے بُرے کا امتیاز نہیں کیا جاسکتا بلکہ اللہ ﷻ کی نعمتوں کا یہ دستر خوان دنیا میں سب کے لئے عام ہے۔ اسی لئے اللہ ﷻ نے اپنی حکمت و مصلحت سے دنیاوی زندگی میں مؤمنوں کے ساتھ کافروں کو بھی نعمتوں میں شریک کر دیا تاکہ حجّت پوری ہو جائے۔ آخرت میں ساری نعمتیں اور راحتیں صرف اللہ ﷻ کے فرماں بردار بندوں کے لئے مخصوص ہوں گی کیونکہ جنّت اور جنّت کی نعمتیں کافروں پر حرام ہیں۔

علمی بات: بعض مفسرین نے آیت کے یہ معنی بیان کیئے ہیں کہ دنیا میں ساری نعمتوں اور راحتوں کے ساتھ محنت و مشقت، پھر زوال کا خطرہ اور طرح طرح کے رنج و غم لگے ہوئے ہیں۔ خالص نعمت اور خالص راحت کا یہاں وجود نہیں۔ البتہ قیامت کے روز جس کو یہ نعمتیں ملیں گی وہ خالص ہو کر ملیں گی، نہ ان کے ساتھ کوئی محنت و مشقت ہو گی، نہ ان کے زوال یا نقصان کا کوئی خطرہ ہو گا اور نہ ان کے بعد کوئی رنج و مصیبت۔ پھر فرمایا کہ ہم اپنی قدرتِ کاملہ کی نشانیاں سمجھدار لوگوں کے لئے اسی طرح صاف صاف بیان کرتے ہیں جس طرح ہم نے حرام کو حلال سے جدا کر دیا تاکہ ہر عالم و جاہل سمجھ لے اور جو لوگ سرکشی اور حماقتوں میں مبتلا ہیں ان کا جاننا اور نہ جاننا برابر ہے۔

آیت نمبر ۳۳: اس آیت میں اللہ ﷻ کی حرام کردہ باتوں کا بیان ہے۔ پانچ حرام کردہ چیزوں کا ذکر ہے جن کا تعلق کھانے پینے سے نہیں بلکہ اعمال سے ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں اکثر لوگ ان جرائم اور محرمات میں مبتلا تھے جو درج ذیل ہیں:

۱۔ بے حیائی کے کام چاہے ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔
۲۔ "اثم" وہ گناہ جو انسان کی ذات تک محدود ہو۔
۳۔ "بغی" وہ گناہ جس کا تعلق دوسروں کے معاملات اور حقوق سے ہو۔
۴۔ اللہ ﷻ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا۔
۵۔ بے سند و بے بنیاد باتیں اللہ ﷻ کی طرف منسوب کرنا۔

شانِ نزول: اس آیت کا سببِ نزول ایک خاص قصّہ ہے اور وہ یہ ہے کہ دورِ جاہلیت میں دیگر رسومِ جہالت کے ساتھ یہ بھی ایک بے حیائی کی رسم تھی کہ وہ بیت اللہ شریف کا برہنہ طواف کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ جن کپڑوں میں ہم نافرمانی کرتے ہیں ان میں طواف نہیں کر سکتے۔ دیکھیئے ظاہر میں تو کیسی خوبصورت بات ہے لیکن ان احمقوں نے جہالت میں یہ نہ سمجھا کہ برہنہ طواف کرنے میں کس قدر بے حیائی اور بیت اللہ شریف کی بے ادبی ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس اللہ ﷻ کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو ورنہ قریب ہے کہ اللہ ﷻ تم لوگوں پر عذاب بھیج دے اور تم اس سے دُعائیں مانگو اور وہ قبول نہ کرے۔ (جامع ترمذی)

ایک اور حدیث میں حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے نیکی اور گناہ کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ نیکی خوش خلقی کا نام ہے اور گناہ وہ کام ہے جو تمہارے دل میں تردد پیدا کرے اور تم اس بات کو پسند نہ کرو کہ لوگ تمہارے اس کام سے مطلع ہو جائیں۔ (صحیح مسلم)

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ جن چیزوں کو تم نے اپنے طور پر حرام ٹھہرالیا ہے وہ تو حرام نہیں البتہ بے حیائی کے تمام کام خواہ وہ ظاہر ہوں، جیسے ننگے ہو کر طواف کرنا، یا چھپے ہوئے ہوں جیسے بدکاری، گناہ کے کام بشمول شراب وجوا کسی پر ناحق ظلم کرنا، کسی کو اللہ ﷻ کے ساتھ شریک ٹھہرانا اور جس بات کی تمہارے پاس کوئی دلیل و سند نہ ہو اس کو اللہ ﷻ کی طرف منسوب کرنا یہ سب حرام ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں واقعتاً حلال ہیں ان کو تو تم نے حرام سمجھ رکھا ہے اور جو چیزیں حرام ہیں ان کو تم حلال سمجھتے ہو۔ یہ سراسر جہالت ہے۔

آیت نمبر ۳۴: اس آیت میں مجرموں کے انجامِ بد کا بیان ہے۔ "وقتِ مقرر" سے مراد عمل کرنے کی وہ مہلت ہے جو ہر قوم کو آزمانے کے لئے عطا کی جاتی ہے۔ کسی قوم کی اجتماعی زندگی کا وقت پورا ہو جانے پر مزید مہلت دیئے جانے کی نفی کی گئی ہے۔ قوموں کا وقتِ مقرر بیان کر کے مشرکین کو تنبیہ کی جارہی ہے۔ اسی طرح ہر فرد کا وقتِ مقرر ہے اور اس کے آنے تک اس کو عمل کی مہلت ملی ہوئی ہے۔

شانِ نزول: یہ آیت اس موقع پر نازل ہوئی جب لوگوں نے عذاب کا سوال کیا یعنی یوں کہا کہ اگر آپ ﷺ اللہ ﷻ کے سچے رسول ہیں تو اللہ ﷻ ہم پر عذاب کیوں نہیں بھیجتا اور ہلاک کیوں نہیں کر دیتا۔

علمی بات: یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا میں اللہ ﷻ کے نافرمان اور مجرم ہر طرح کی سرکشی اور ظلم کے باوجود اللہ ﷻ کی نعمتوں میں پل رہے ہیں۔ بظاہر ان پر کوئی عذاب اور تکلیف و تنگی نظر نہیں آتی۔ یہ محض اللہ ﷻ کی طرف سے ان کے لئے مہلت اور ڈھیل ہے تا کہ وہ توبہ کر کے اپنی حرکتوں سے باز آجائیں۔ اللہ ﷻ کے علم میں اس مہلت اور ڈھیل کا ایک وقت مقرر ہے۔ جب وہ مقررہ وقت آپہنچتا ہے تو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی آگے پیچھے نہیں ہو تا خواہ وہ اس وقت مہلت کے طالب ہوں یا اس مقررہ وقت سے پہلے نزولِ عذاب چاہتے ہوں۔ نیز اس وقت کوئی توبہ اور معذرت قبول نہیں ہوتی بلکہ ان کو عذاب میں پکڑ لیا جاتا ہے۔ کبھی تو دنیا میں ہی عذاب دے دیا جاتا ہے اور اگر اللہ ﷻ کسی مصلحت کے تحت ان کو دنیا میں عذاب نہ دے تو ایسے لوگ مرتے ہی عذاب میں داخل ہو جاتے ہیں۔

عملی پہلو: اس سے پہلی آیت میں اللہ ﷻ نے بتایا تھا کہ انسان پر اللہ ﷻ نے کیا کیا کام حرام کیئے ہیں اور اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اس کی زندگی کا ایک وقت معین ہے اور جب وہ وقت آجائے گا تو اس پر لا محالہ موت آجائے گی اور اس کو چونکہ موت کا وقت بتایا نہیں گیا اس لئے وہ ہر وقت اس کے لئے تیار رہے اور حرام کاموں سے بچتا رہے، ایسا نہ ہو کہ وہ کسی حرام کام میں مشغول ہو اور وہ اس کی موت کا وقت ہو وہ اس کے لئے تیار نہ ہو اور بُری موت کا شکار ہو کر عذابِ الٰہی کا مستحق بن جائے۔ (اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا، اللہ ﷻ ہمیں محفوظ فرمائے)

آیت نمبر ۳۵: انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات پر ایمان لا کر تقویٰ اور عملِ صالح سے آراستہ ہونے والوں کے لئے بشارت دی گئی ہے کہ انہیں نہ مستقبل کا خوف ہو گا اور نہ وہ اپنے سابقہ اعمال پر غمگین ہوں گے۔

علمی بات: انبیاء کرام علیہم السلام کو بھیجے جانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ ﷻ کے احکام سنائیں اور وہ رسول بھی ان ہی میں سے ہوں گے لہٰذا جس نے رسول کی بات مان کر ان کی تصدیق کی اور گناہوں کو چھوڑ کر اپنی اصلاح کر لی تو پھر وہ اللہ ﷻ کے فضل سے جنّت میں جائے گا۔

عملی پہلو: اس سے پہلی آیت میں انسانوں کی زندگی کے بعد ان کی موت کا ذکر فرمایا تھا۔ اب بتایا ہے کہ اگر انہوں نے اپنی زندگی میں اللہ ﷻ کے احکام کی پابندی کی ہو گی تو مرنے کے بعد انہیں کوئی خوف اور غم نہیں ہو گا اور اگر انہوں نے اپنی یہ زندگی سرکشی اور احکامِ الٰہی کے خلاف گزاری ہو گی تو پھر مرنے کے بعد انہیں دائمی عذاب کے لئے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

علمی بات: اگر زمین میں انسانوں کے بجائے فرشتے آباد ہوتے تو نبی بھی فرشتہ ہی آتا۔ کیونکہ نبی تو داعی اور مبلّغ ہوتا ہے اور کسی قوم کو تبلیغ وہی کر سکتا ہے جو اُس قوم کی زبان اور اس کے طور طریقوں سے واقف ہو۔ ان کے حالات سے باخبر ہو اور یہ تب ہی ممکن ہے جب نبی اسی قوم سے ہوں البتہ نبی افضل ترین اور اشرف ترین انسان ہوتا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ کفار فرشتوں کو انسان سے افضل سمجھتے اور کہتے تھے کہ فرشتہ نبی کیوں نہ ہوا۔ حالانکہ نیک انسان فرشتوں سے افضل ہے اور فرشتوں نے اللہ ﷻ کے حکم سے انسان کو سجدۂ تعظیمی کیا تھا تا کہ انسان کی فضیلت اور بڑائی فرشتوں پر ظاہر ہو۔

آیت نمبر ۳۶: اس آیت میں اللہ ﷻ کے حکم کو جھٹلانے اور تکبر کرنے والے سرکشوں کے انجام کا بیان ہے کہ وہ جہنّم میں ہمیشہ کے عذاب سے دوچار ہوں گے۔ اہلِ ایمان اور اہلِ کفر کے انجام کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اچھے انجام والوں کا طریقہ اپنائیں اور بُرے انجام والوں کی روِش اور طریقے سے بچیں تا کہ بُرے انجام سے اور سزا سے محفوظ رہ سکیں۔

علمی بات: جو اللہ ﷻ کی آیتوں کو جھٹلائیں گے اور اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں ان سے اعراض و روگردانی برتیں گے، وہ دوزخ کی آگ کے ساتھی اور اس کے یار ہوں گے، اور ان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی میں رہنا ہو گا۔

علمی بات: جنّت کے نظارے کے بعد ان کو جہنّم کا منظر بھی دکھایا جائے گا کہ اب ذرا جہنّمیوں کی کیفیت کا بھی مشاہدہ کر لو۔ یہ لوگ ابھی تک بَیْنَ الْخَوْفِ وَ الرَّجَاء (خوف اور اُمید کے درمیان) کی کیفیت میں ہوں گے۔ انہیں جنّت میں داخلے کی امید بھی ہو گی اور جہنّم میں جھونکے جانے کا خوف بھی۔ اس لئے جب وہ اہلِ جنّت کی طرف دیکھیں گے تو انہیں سلام کریں گے اور ساتھ ہی ان کے دلوں میں اُمنگیں اور تمنائیں جاگ جائیں گی کہ اللہ ﷻ ہمیں بھی ان کے ساتھ شامل کر دے۔ لیکن دوسری طرف جب اہلِ جہنّم پر نظر پڑے گی تو فریاد کریں گے کہ پروردگار! ہم پر رحم فرما اور ہمیں ان ظالم لوگوں کا ساتھی نہ بنا۔

آیت نمبر ۴۸: اس آیت میں اصحابِ اعراف اہلِ دوزخ کو ان کی بداعمالیوں پر ملامت کریں گے۔ دنیا کی جمعیت و کثرت اور تکبر، آخرت میں اہلِ دوزخ کو کوئی فائدہ نہ دے پائے گا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: سیدنا حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قیامت کے دن اہلِ دوزخ میں سے اس شخص کو لایا جائے گا جو دنیا میں سب سے زیادہ آسودہ اور خوشحال تھا، پس اسے دوزخ میں ایک بار غوطہ دیا جائے گا، پھر اس سے پوچھا جائے گا کہ اے آدم کے بیٹے! کیا تو نے دنیا میں کبھی آرام دیکھا تھا؟ وہ کہے گا کہ اللہ کی قسم، اے میرے رب! کبھی نہیں۔" (صحیح مسلم)

علمی بات: قیامت کے روز اعراف والے، مشرکین کے سرداروں کو دوزخ میں دیکھ کر ملامت کے طور پر ان سے کہیں گے کہ دنیا میں جس مال و دولت اور جماعت و کثرت پر تمہیں بھروسہ اور ناز تھا اور جس کی وجہ سے تم غرور و تکبر میں مبتلا تھے اور انبیاء کرام علیہم السلام کی اتباع سے انکار کرتے تھے، آج وہ تمہارے کسی کام نہ آیا۔

علمی بات: اہلِ جنّت و جہنّم کی علامات: صحیح مسلم کی ایک روایت ہے جس کا مفہوم ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ حضور ﷺ آپ ہمیں قیامت کے دن کس طرح پہچانیں گے، فرمایا کسی کے گھوڑے اگر پنج کلیان ہوں (یعنی گھوڑے کی پیشانی اور اس کے چاروں پاؤں اگر سفید ہوں تو انہیں پنج کلیان کہا جاتا ہے) تو کیا باقی گھوڑوں میں سے انہیں پہچاننا مشکل ہے، ظاہر ہے کہ ان کا پہچاننا مشکل نہیں بلکہ ان علامتوں سے باقی گھوڑوں میں سے ان کو آسانی سے پہچان لیا جائے گا اسی طرح اللہ ﷻ نے اس اُمّت کے نیک لوگوں اور نمازیوں کو پنج کلیان بنایا ہے یعنی ہم جو اپنے اعضاء وضو میں دھوتے ہیں یعنی چہرہ، دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں یہ پانچوں اعضاء قیامت کے دن نہایت روشن ہوں گے۔ ان اعضا کی روشنی سے رسول اللہ ﷺ اپنی اُمت کے نیک لوگوں کو پہچانیں گے اور اہلِ جنّت بھی انہی علامتوں کے ساتھ جنّت میں داخل کیئے جائیں گے اور ہر دیکھنے والا انہیں انہی علامتوں سے پہچانے گا قرآنِ حکیم سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن صاحبِ ایمان لوگوں کے چہرے نہایت روشن اور تروتازہ ہوں گے۔ لیکن اس کے برعکس کافروں کے چہرے نہایت سیاہ اور مکروہ ہوں گے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جو بڑے بڑے کفار ہوں گے جنھوں نے ائمہ کفر کی طرح اپنا کردار ادا کیا ہو گا وہ اپنے چہروں کی بڑھی ہوئی سیاہی اور چہروں پر پڑی ہوئی لعنت اور پھٹکار سے پہچانے جائیں گے۔ جتنا بڑا کافر ہو گا اس کا چہرہ اتنا ہی زیادہ سیاہ اور مکروہ ہو گا۔ ایسی ہی علامتوں سے اصحابِ اعراف ان اہلِ جہنّم کے بڑے بڑے کافروں کو پہچانیں گے اور پھر ان سے مختلف سوالات کریں گے۔

آیت نمبر ۴۹: اس آیت میں اصحابِ الاعراف کے ذریعہ اہلِ دوزخ کو جھوٹ، تکبّر اور غلط تصورات پر ملامت کرنے کا بیان ہے۔ اہلِ دوزخ دنیا میں اہلِ ایمان کو فقیر، مسکین اور غلام کہہ کر حقیر سمجھتے تھے جبکہ معاملہ یہ ہے کہ اہلِ ایمان کو بلاخوف و خطر جنّت میں داخلہ کی بشارت دی گئی ہے۔

اہلِ اعراف جنّت کی طرف دیکھیں گے تو اس کے اندر غریب اور کمزور لوگ نظر آئیں گے جن سے کافر دنیا میں استہزاء اور مذاق کرتے تھے اور ان کو ایذا دیتے تھے۔ اس وقت اہلِ اعراف کافر سرداروں کو دوزخ میں دیکھ کر کہیں گے کہ کیا یہ وہی کمزور و حقیر لوگ ہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ اللہ ﷻ کی رحمت انہیں کبھی نہیں پہنچے گی اور نہ اللہ ﷻ کبھی ان کی مغفرت فرمائے گا۔

علمی بات: اصحابِ اعراف کو جنّت والوں میں فقراء صحابہ رضی اللہ عنہم بھی نظر آئیں گے، وہاں وہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بھی دیکھیں گے، وہاں ان کی نظر حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ اور حضرت یاسر رضی اللہ عنہ پر بھی پڑے گی۔ چنانچہ وہ ان اہلِ جنّت کی طرف اشارہ کر کے جہنّمیوں سے پوچھیں گے کہ کیا یہی وہ لوگ تھے جن کے بارے میں تم قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے کہ ان لوگوں کو اللہ ﷻ کسی طرح بھی ہم پر فضیلت نہیں دے سکتا، ان تک اللہ ﷻ کی کوئی رحمت پہنچ ہی نہیں سکتی، کیونکہ تمہارے زعم میں تو وہ مفلس اور نادار تھے، کمزور طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور تم اس وقت ان کے مقابلے میں اپنی سرداری، مال و دولت اور طاقت کے بل بوتے پر اکڑا کرتے تھے۔

آخرت کا رخ کرنے والا ہوتا ہے تو سیاہ چہروں والے فرشتے آسمان سے اس کے پاس آتے ہیں، جن کے پاس ٹاٹ ہوتے ہیں اور اس سے اتنی دور بیٹھ جاتے ہیں، جہاں تک اس کی نظر پہنچتی ہے، پھر ملک الموت تشریف لاتے ہیں حتیٰ کہ اس کے سر کے پاس بیٹھ جاتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ اے خبیث جان! اللہ ﷻ کی ناراضگی کی طرف نکل، ملک الموت کا یہ فرمان سن کر روح، اس کے جسم میں ادھر ادھر بھاگی پھرتی ہے لہٰذا ملک الموت اس کی روح کو جسم سے اس طرح نکالتے ہیں جیسے بوٹیاں بھوننے کی سیخ بھیگے ہوئے اون سے صاف کی جاتی ہے (یعنی کافر کی روح کو جسم سے زبردستی اس طرح نکالتے ہیں جیسے بھیگا ہوا اون کانٹے دار سیخ پر لپٹا ہوا ہو اور اس کو زور سے کھینچا جائے) پھر اس کی روح کو ملک الموت (اپنے ہاتھ میں) لے لیتے ہیں۔"لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ" کا مطلب یہی ہے کہ کفار کی ارواح کو آسمان کی طرف فرشتے لے جاتے ہیں تو ان کے لئے دروازے نہیں کھولے جاتے، اور ان کو وہیں سے پھینک دیا جاتا ہے۔

آیت نمبر ۴۱: اس آیت میں کفار کے انجامِ بد کا بیان ہوا ہے ("مھد" گہوارے کو کہتے ہیں جو بیٹھنے یا لیٹنے کی جگہ ہوتی ہے۔ "غواش" غاشیہ کی جمع ہے جس سے مراد وہ پردہ ہے جو اوپر سے ڈھانپ لے، اوپر اوڑھنے والی چیز) کفار پر اوپر اور نیچے ہر طرف عذابِ الٰہی کی آگ بھڑک رہی ہوگی۔ انہیں کسی پہلو چین اور قرار نصیب نہ ہوگا۔ ان کا مستقل ٹھکانہ جہنّم ہے۔

آیت نمبر ۴۲: کفار کے انجامِ بد کے بیان کے بعد ایمان اور عملِ صالح اختیار کرنے والوں کو ہمیشہ کی جنّت کی بشارت دی گئی ہے نیز ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ ﷻ نے بندوں پر کوئی ایسے احکام نازل نہیں فرمائے جو ان کی استطاعت سے باہر ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں کہ اللہ ﷻ نے جن کاموں کا حکم دیا انہیں انجام دینا یا جن کاموں سے روکا ہے ان سے خود کو بچائے رکھنا انسان کی سکت و بس میں نہ ہو نیز یہ بات بھی واضح ہوئی ہے کہ آخرت کا محاسبہ ہر فرد کی صلاحیتوں اور دنیا میں دی گئی نعمتوں اور کوششوں کے مطابق ہوگا۔

علمی و عملی بات: اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان اعمال پر مقدّم ہے۔ پہلے مومن بنو۔ پھر نیک کام بھی کرو۔ مزید برآں کوئی شخص نیک اعمال سے بے نیاز نہیں خواہ کسی طبقہ اور کسی شعبے سے تعلق رکھتا ہو۔ یعنی ہر مسلمان اپنی طاقت کے مطابق نیک اعمال کرنے اور جنّت کے حصول کی محنت کرنے کا پابند ہے۔

آیت نمبر ۴۳: اس آیت میں اہلِ جنّت کے دو خاص احوال بیان ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ جنّت میں داخلے سے پہلے ہی ان کی باہمی رنجشوں کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ دوسرا یہ کہ اہلِ ایمان جنّت میں پہنچ کر اللہ ﷻ کی حمد اور اس کا شکر ادا کریں گے جس نے انہیں مقامِ رحمت تک پہنچایا۔ اہلِ یمان کو ان کی اخلاص نیت، ایمان اور اعمالِ صالحہ کے بدلے جنّت بطورِ وراثہ عطا کی جائے گی۔ اللہ ﷻ کی شانِ کریمی ہے کہ اُس کی طرف سے اہلِ ایمان کے لئے جنّت کے وارث ہونے کا اعلان کیا جائے گا۔

علمی بات: حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب اہلِ جنّت، جنّت کے دروازے پر پہنچیں گے تو انہیں دو نہریں نظر آئیں گی اور انہیں از خود خیال پیدا ہوگا ایک کا وہ پانی پئیں گے تو ان کے دلوں میں جو کچھ تھا سب دور ہو جائے گا دوسری میں غسل کریں گے جس سے چہرے تر و تازہ، ہشاش بشاش ہو جائیں گے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب مؤمنین دوزخ سے نجات پا جائیں گے، تو جنّت اور دوزخ کے درمیان ایک پل پر روک دیئے جائیں گے اور ان ظلموں کا بدلہ لیا جائے گا، جو ان لوگوں نے دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ کئے تھے، یہاں تک کہ جب وہ پاک صاف ہو جائیں گے، تو انہیں جنّت میں داخلہ کی اجازت دی جائے گی۔ (صحیح بخاری)

علمی بات: اہلِ ایمان کے بیچ اگر دنیا میں کسی وجہ سے ناراضگی یا غلط فہمی کی بنا پر رنجش پیدا ہو گئی تھی تو جنّت میں داخل ہونے سے پہلے ان کی آپس کی غلط فہمیاں اور رنجشیں دور کر دی جائیں گی اور وہ ایک دوسرے کے سچے خیر خواہ اور مخلص دوست بن کر جنّت میں داخل ہوں گے۔ تاکہ ایک دوسرے سے مل کر کیف و سرور اور خوشی محسوس کریں کیونکہ جن سے کوئی رنجش ہو ان کو دیکھنے سے اذیّت ہوتی ہے۔ اس سے اہلِ جنّت کے دلوں کو بغض و کینہ سے پاک کر دیا جائے گا۔ بخلاف دوزخیوں کے کہ وہ مصیبت کے وقت ایک دوسرے کو لعن طعن کریں گے۔

اس آیت کو پڑھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: "مجھے امید ہے کہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی" یعنی روزِ قیامت ہماری خلش اور غلط فہمی بھی دور ہو جائے گی جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی وجہ سے پیدا ہوئی۔

علمی بات: اہلِ جنّت کے دلوں سے کینہ نکالنے کا ایک اور مفہوم یہ بھی ہے کہ ان میں سے بعض، بعض کے ساتھ ان کی قرابت اور درجات کی فضیلت کے سبب حسد و رشک نہیں کریں گے۔ ہر کوئی اپنے آپ کو اور دوسرے کو جس مقام پر بھی ہے دیکھ کر خوش و خرم ہوگا۔

آیت نمبر ۴۴: اس آیت میں اہلِ جنّت اور اہلِ جہنّم کے مکالمہ کا بیان ہے۔ وعدہ سے مراد اہلِ ایمان کے لئے جنّت اور کفار و مشرکین کے لئے جہنّم کا وعدہ ہے۔ ظالموں پر دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کی لعنت اور پھٹکار ہے۔

علمی بات: جب اہلِ جنّت، جنّت میں چلے جائیں گے اور اہلِ دوزخ، دوزخ میں چلے جائیں گے تو جنّت والے اپنی خوشی ظاہر کرنے کے لئے ان سے پکار کر کہیں گے کہ ہمارے رب نے ہم سے جس اجر و ثواب اور جنّت کا وعدہ فرمایا تھا، وہ ہمیں عطا فرما دیا ہے۔ کیا تم اپنے کفر و عصیان کی بنا پر اس عذاب میں مبتلا ہو جس کی تمہارے رب نے انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعہ تمہیں وعید سنائی تھی؟ اہلِ دوزخ جواب دیں گے کہ ہاں۔ اسی بنا پر تو ہم عذاب میں مبتلا ہیں۔ اس وقت ایک پکارنے والا دونوں کے درمیان پکار کر کہے گا کہ ظالموں اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے روگردانی کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، جو آخرت کے انجام سے بے فکر ہو کر خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی راہِ حق سے روکتے رہے۔ یہ لوگ آخرت کے منکر تھے۔ صرف دنیاوی زندگی ہی ان کے پیشِ نظر تھی۔

علمی بات: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جنّت میں جو بھی داخل ہو گا اسے اس کا جہنّم کا ٹھکانا بھی دکھایا جائے گا کہ اگر اس نے نافرمانی کی ہوتی (تو اس کا یہ ٹھکانہ ہوتا) تاکہ وہ اور زیادہ شکر کرے اور جو بھی جہنّم میں داخل ہو گا اسے اس کا جنّت کا ٹھکانا بھی دکھایا جائے گا کہ اگر اچھے عمل کئے ہوتے (تو یہاں ٹھکانہ ہوتا) تاکہ اس کے لئے حسرت و افسوس کا باعث ہو۔ (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۴۵: اس آیت میں ظالموں کی بداعمالیوں کا بیان ہے۔ وہ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہیں۔ وہ آخرت کے منکر ہوتے ہیں۔

علمی بات: منکرین خود تو ایمان نہیں لائے تھے، بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی اس راستے سے روکنے کی حتی الوسع کوشش کرتے تھے۔ اگر کسی شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس کی طرف جاتے دیکھتے تو اسے ورغلانے اور بہکانے کے درپے ہو جاتے تاکہ کہیں وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتوں سے متاثر ہو کر ایمان نہ لے آئے۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ کے دین میں کجی تلاش کرنا۔ مشرکین مکہ کا یہی وطیرہ تھا۔ وہ دینِ اسلام پر طرح طرح کے اعتراض اٹھاتے تھے۔ اسی طرح مدینہ منورہ میں یہودی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوّت و رسالت کا اقرار نہیں کرتے تھے اور ایسی ایسی باتیں نکالتے جو درحقیقت قابلِ اعتراض نہ تھیں لیکن انہیں بطورِ اعتراض عوام کے سامنے لاتے تھے تاکہ وہ اسلام قبول نہ کریں۔ آج تک یہود و نصاریٰ اور دیگر کفار اس کام میں لگے ہوئے ہیں کہ اسلام میں عیب نکالیں۔ انہیں مسلمانوں کی پاکیزہ شریعت اور پاکیزہ زندگی پر اعتراض ہے۔ جن قوموں میں زناکاری عام ہے اور نکاح کرنا عیب ہے انہیں اسلام پر یہ اعتراض ہے کہ اس میں تعدّدِ ازواج یعنی ایک سے زائد شادیوں کی اجازت ہے یہ کیسی الٹی سمجھ ہے کہ ناجائز دوستیاں تو جتنی چاہیں رکھ لی جائیں لیکن ایک سے زیادہ بیویاں جو اللہ تعالیٰ کی شریعت میں حلال ہے اس پر اعتراض ہے۔ لیکن ایسے لوگ کبھی بھی اپنی سازشوں میں کامیاب نہیں ہوئے کیونکہ دینِ اسلام فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے۔

آیت نمبر ۴۶: اس آیت میں مقامِ اعراف کا ذکر ہے یعنی جنّت اور دوزخ کے درمیان دیوار جہاں سے دونوں طرف دیکھا جا سکے گا۔ اہلِ جنّت اور اہلِ جہنّم کے علاوہ تیسری جماعت ہو گی جو اعراف پر مقیم ہو گی۔ ان کی نیکیاں اور بُرائیاں برابر ہوں گی۔ ان کی نیکیاں انہیں جہنّم میں جانے اور بُرائیاں جنّت میں جانے سے مانع ہوں گی۔ اہلِ اعراف اہلِ جنّت کو ان کی نورانی چہروں کی بدولت اور اہلِ دوزخ کو ان کی سیاہ رنگت کی بنا پر پہچان لیں گے۔ اہلِ اعراف کا اہلِ جنّت کو سلام پیش کرنے اور خود بھی جنّت میں داخلہ کی امید رکھنے کا بیان ہے۔

علمی بات: "اَعْرَاف" کو اعراف کہنے کی وجہ یہ ہے اہلِ اعراف ہر شخص کو اوپر سے دیکھ کر پہچان لیں گے کہ یہ جنّتی ہے اور یہ دوزخی ہے۔

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ اصحابِ اعراف کون ہیں؟ فرمایا وہ لوگ ہیں جن کی نیکیاں اور بُرائیاں برابر ہیں بُرائیوں نے جنّت میں جانے سے روکا، اور نیکیوں نے جہنّم کی آگ سے بچایا۔ سو وہ اس دیوار پر ٹھہریں گے جب تک کہ اللہ تعالیٰ ان کے حق میں فیصلہ نہ فرما دے۔

علمی بات: یوں تو اعراف والے جنّت اور جہنّم دونوں کا خود نظارہ کر رہے ہوں گے، اس لئے انہیں جنّتیوں اور دوزخیوں کو پہچاننے کے لئے کسی علامت کی ضرورت نہیں ہو گی لیکن یہاں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یہ لوگ جنّت اور دوزخ والوں کو دنیا میں بھی ان کی علامتوں سے پہچانتے تھے اور چونکہ یہ لوگ صاحبِ ایمان تھے، اس لئے انہیں دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے اتنی حس عطا فرما دی تھی کہ یہ متقی پرہیزگار لوگوں کو اور اسی طرح کافروں کو ان کے چہروں سے پہچان لیتے تھے۔

آیت نمبر ۴۷: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اصحابِ الاعراف اہلِ دوزخ کے عذاب اور مصیبت کا مشاہدہ کرنے کے بعد۔ دوزخیوں کی سزا سے وحشت زدہ اور متنفر ہو کر ان میں شامل نہ کیئے جانے کی دُعا کریں گے۔

علمی بات: جنّت کے نظارے کے بعد ان کو جہنّم کا منظر بھی دکھایا جائے گا کہ اب ذرا جہنّمیوں کی کیفیت کا بھی مشاہدہ کرلو۔ یہ لوگ ابھی تک بَيْنَ الْخَوْفِ وَ الرَّجَاء (خوف اور اُمید کے درمیان) کی کیفیت میں ہوں گے۔ انہیں جنّت میں داخلے کی امید بھی ہوگی اور جہنّم میں جھونکے جانے کا خوف بھی۔ اس لئے جب وہ اہلِ جنّت کی طرف دیکھیں گے تو انہیں سلام کریں گے اور ساتھ ہی ان کے دلوں میں اُمنگیں اور تمنائیں جاگ جائیں گی کہ اللہ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ ہمیں بھی ان کے ساتھ شامل کر دے۔ لیکن دوسری طرف جب اہلِ جہنّم پر نظر پڑے گی تو فریاد کریں گے کہ پروردگار! ہم پر رحم فرما اور ہمیں ان ظالم لوگوں کا ساتھی نہ بنا۔

آیت نمبر ۴۸: اس آیت میں اصحابِ اعراف اہل دوزخ کو ان کی بداعمالیوں پر ملامت کریں گے۔ دنیا کی جمعیت و کثرت اور تکبر، آخرت میں اہلِ دوزخ کو کوئی فائدہ نہ دے پائے گا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: سیدنا حضرت انس بن مالک رَضِيَ اللهُ عَنْهُ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قیامت کے دن اہل دوزخ میں سے اس شخص کو لایا جائے گا جو دنیا میں سب سے زیادہ آسودہ اور خوشحال تھا، پس اسے دوزخ میں ایک بار غوطہ دیا جائے گا، پھر اس سے پوچھا جائے گا کہ اے آدم کے بیٹے! کیا تو نے دنیا میں کبھی آرام دیکھا تھا؟ وہ کہے گا کہ اللہ کی قسم، اے میرے رب! کبھی نہیں۔" (صحیح مسلم)

علمی بات: قیامت کے روز اعراف والے، مشرکین کے سرداروں کو دوزخ میں دیکھ کر ملامت کے طور پر ان سے کہیں گے کہ دنیا میں جس مال و دولت اور جماعت و کثرت پر تمہیں بھروسہ اور ناز تھا اور جس کی وجہ سے تم غرور و تکبر میں مبتلا تھے اور انبیاء کرام عَلَيْهِمُ السَّلَام کی اتباع سے انکار کرتے تھے، آج وہ تمہارے کسی کام نہ آیا۔

علمی بات: اہلِ جنّت و جہنّم کی علامات: صحیح مسلم کی ایک روایت ہے جس کا مفہوم ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ حضور ﷺ آپ ہمیں قیامت کے دن کس طرح پہچانیں گے، فرمایا کسی کے گھوڑے اگر پنج کلیان ہوں (یعنی گھوڑے کی پیشانی اور اس کے چاروں پاؤں اگر سفید ہوں تو انہیں پنج کلیان کہا جاتا ہے) تو کیا باقی گھوڑوں میں سے انہیں پہچاننا مشکل ہے، ظاہر ہے کہ ان کا پہچاننا مشکل نہیں بلکہ ان علامتوں سے باقی گھوڑوں میں سے ان کو آسانی سے پہچان لیا جائے گا اسی طرح اللہ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ نے اس اُمّت کے نیک لوگوں اور نمازیوں کو پنج کلیان بنایا ہے یعنی ہم جو اپنے اعضاء وضو میں دھوتے ہیں یعنی چہرہ، دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں یہ پانچوں اعضاء قیامت کے دن نہایت روشن ہوں گے۔ ان اعضا کی روشنی سے رسول اللہ ﷺ اپنی اُمت کے نیک لوگوں کو پہچانیں گے اور اہل جنّت بھی انہی علامتوں کے ساتھ جنّت میں داخل کیئے جائیں گے اور ہر دیکھنے والا انہیں انہی علامتوں سے پہچانے گا قرآنِ حکیم سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن صاحبِ ایمان لوگوں کے چہرے نہایت روشن اور تروتازہ ہوں گے۔ لیکن اس کے برعکس کافروں کے چہرے نہایت سیاہ اور مکروہ ہوں گے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جو بڑے بڑے کفار ہوں گے جنہوں نے ائمہ کفر کی طرح اپنا کردار ادا کیا ہو گا وہ اپنے چہروں کی بڑھی ہوئی سیاہی اور چہروں پر پڑی ہوئی لعنت اور پھٹکار سے پہچانے جائیں گے۔ جتنا بڑا کافر ہو گا اس کا چہرہ اتنا ہی زیادہ سیاہ اور مکروہ ہو گا۔ ایسی ہی علامتوں سے اصحابِ اعراف ان اہلِ جہنّم کے بڑے بڑے کافروں کو پہچانیں گے اور پھر ان سے مختلف سوالات کریں گے۔

آیت نمبر ۴۹: اس آیت میں اصحابِ الاعراف کے ذریعہ اہل دوزخ کو جھوٹ، تکبّر اور غلط تصورات پر ملامت کرنے کا بیان ہے۔ اہل دوزخ دنیا میں اہلِ ایمان کو فقیر، مسکین اور غلام کہہ کر حقیر سمجھتے تھے جبکہ معاملہ یہ ہے کہ اہلِ ایمان کو بلا خوف و خطر جنّت میں داخلہ کی بشارت دی گئی ہے۔

اہلِ اعراف جنّت کی طرف دیکھیں گے تو اس کے اندر غریب اور کمزور لوگ نظر آئیں گے جن سے کافر دنیا میں استہزاء اور مذاق کرتے تھے اور ان کو ایذا دیتے تھے۔ اس وقت اہلِ اعراف کافر سرداروں کو دوزخ میں دیکھ کر کہیں گے کہ کیا یہ وہی کمزور و حقیر لوگ ہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ اللہ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ کی رحمت انہیں کبھی نہیں پہنچے گی اور نہ اللہ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ کبھی ان کی مغفرت فرمائے گا۔

علمی بات: اصحابِ اعراف کو جنّت والوں میں فقراء صحابہ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ بھی نظر آئیں گے، وہاں وہ حضرت بلال رَضِيَ اللهُ عَنْهُ کو بھی دیکھیں گے، وہاں ان کی نظر حضرت صہیب رومی رَضِيَ اللهُ عَنْهُ اور حضرت یاسر رَضِيَ اللهُ عَنْهُ پر بھی پڑے گی۔ چنانچہ وہ ان اہل جنّت کی طرف اشارہ کرکے جہنّمیوں سے پوچھیں گے کہ کیا یہی وہ لوگ تھے جن کے بارے میں تم قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے کہ ان لوگوں کو اللہ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ کسی طرح بھی ہم پر فضیلت نہیں دے سکتا، ان تک اللہ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ کی کوئی رحمت پہنچ ہی نہیں سکتی، کیونکہ تمہارے زعم میں تو وہ مفلس اور نادار تھے، کمزور طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور تم اس وقت ان کے مقابلے میں اپنی سرداری، مال و دولت اور طاقت کے بل بوتے پر اکڑا کرتے تھے۔

علمی و عملی بات: جب غریب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آگے بڑھ کر اسلام کو سینے سے لگایا تو اشرافِ مکہ کی نگاہ میں یہ بات اسلام کی بے قدری کا باعث بن گئی اور اسی کو دلیل بنا کر انہوں نے اسلام کو سچا مذہب اور سچا دین سمجھنے سے انکار کر دیا کہ اسلام لانے کے بعد ان کو حضور ﷺ کی مجلس میں اُن غریب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ بیٹھنا ہوگا ہم سردار ہیں یہ ہماری شان کے خلاف ہے کہ ہم ایسا مذہب اختیار کریں جس میں امیر و غریب سب برابر ہوں۔ لیکن یہی بات قیصرِ روم کی نگاہ میں بالکل ایک دوسرا مفہوم رکھتی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے جب خطوط کے ذریعہ سلاطینِ عالم کو اسلام کی دعوت دی تو قیصرِ روم کو بھی اسی سلسلے میں آپ ﷺ نے ایک مکتوب گرامی لکھا۔ چنانچہ جب اس کو یہ مکتوب ملا تو بجائے اس کے کہ وہ (معاذ اللہ) کسریٰ ایران کی طرح توہین آمیز رویہ اختیار کرتا اور اس مکتوب گرامی کی بے ادبی کرتا بلکہ اس نے نہایت احترام سے اُس کو وصول کیا اور کہا کہ یہاں کچھ عرب اگر تجارت کے سلسلے میں آئے ہوئے ہوں تو انہیں میرے پاس لاؤ تاکہ میں اُن سے اِس نبوت کے دعوے دار کے متعلق تحقیق کر سکوں اتفاق سے ابو سفیان جو ان دنوں تک اسلام نہ لائے تھے وہ بھی وہاں موجود تھے۔ انہیں ان کے ساتھیوں سمیت قیصرِ روم کے سامنے پیش کیا گیا۔ قیصر نے جہاں اور کئی سارے سوالات کیئے وہاں ان سے یہ بھی ایک سوال کیا کہ اس نبی علیہ السلام پر ایمان لانے والے کون لوگ ہیں امیر یا غریب؟ ابو سفیان نے جواب دیا کہ غریب لوگ ہیں۔ قیصر بجائے اس کے کہ اشرافِ مکہ کی طرح اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کرتا کہ جس نبی علیہ السلام کی دعوت کو غریب لوگ قبول کریں وہ اس قابل نہیں کہ اس پر غور بھی کیا جا سکے اس نے اس کے بالکل برعکس یہ کہا کہ اگر واقعی اس پر ایمان لانے والے غریب لوگ ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کا سچا نبی ہے کیونکہ انبیاء کرام علیہم السلام پر سب سے پہلے ایمان لانے والے ہمیشہ غریب لوگ ہی ہوتے ہیں۔ لیکن مالداروں اور امراء میں ایسے خوش قسمت لوگ بھی ہوتے ہیں جو شروع ہی میں پیغمبر علیہ السلام کی دعوت کو قبول کر کے اپنے مال و دولت کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑے مقام کے مالک بن جاتے ہیں لیکن امراء طبقے کے بیشتر لوگ ہمیشہ انقلاب کی آگ سے دور رہتے ہیں بلکہ عموماً ان کا مقام اور ان کا اثر و رسوخ اور ان کا مال و دولت انقلاب کے راستے کی رکاوٹ بنتا ہے اور اگر وہ شریک ہوتے بھی ہیں تو اس وقت جب وہ دیکھتے ہیں کہ اب یہ انقلاب اپنی کامیابیوں کی طرف بڑھ رہا ہے، بہرکیف اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ہدایت کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے۔

آیت نمبر ۵۰: اس آیت میں اہلِ دوزخ کا اپنے دنیا کے شناسا اہلِ جنّت سے کچھ کھلانے پلانے کی فریاد کا بیان ہے۔ جنّت کی تمام نعمتیں صرف اہلِ ایمان کے لئے ہوں گی اور اہلِ دوزخ کو کوئی نعمت میسر نہیں آسکے گی۔ دوزخ والے بھوک اور پیاس سے بدحواس ہو کر جنّت والوں کو پکاریں گے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہم پر کوئی قطرہ پانی بہا دو اس چیز میں سے جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں رزق دیا ہے۔ جن فقراء مؤمنین سے دنیا میں کلام کرنا توہین سمجھتے تھے آخرت میں ان کے سامنے دست سوال دراز کریں گے۔ اہلِ جنّت کہیں گے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں چیزوں کو کافروں پر حرام کیا ہے۔ اس لئے تم کو کوئی چیز نہیں مل سکتی۔

آیت نمبر ۵۱: اس آیت میں جنّت کی نعمتوں سے محرومی کی درج ذیل وجوہات بیان کی گئی ہیں:

۱۔ لوگوں نے دین کو دنیا میں کھیل تماشہ بنا لیا تھا۔ ۲۔ دنیا کی زندگی نے انہیں دھوکے میں ڈالے رکھا تھا۔

۳۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی آیتوں اور آخرت کی جوابدہی کو جھٹلاتے تھے۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ بھی انہیں روزِ آخرت نظر انداز کر کے اپنی رحمتوں سے دور کر دے گا۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے محروم رہیں گے۔

علمی بات: قرآنِ حکیم کی اس آیت سے معلوم ہوا کہ دین کو لہو و لعب بنانے والے وہی ہوتے ہیں جو دنیا کے فریب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے دلوں سے چونکہ آخرت کی فکر اور اللہ تعالیٰ کا خوف نکل جاتا ہے۔ اس لئے وہ دین میں بھی اپنی طرف سے جو چاہتے ہیں اضافہ کر لیتے ہیں اور ان کے ہاں دین کے عائد کردہ احکام اور فرائض پر عمل کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

علمی بات: جنہوں نے دین کو ایک کھیل سمجھ رکھا ہے جس چیز کو چاہا حلال کر لیا اور جس کو چاہا حرام کر لیا اس سے وہ بے اصل اور لایعنی امور مراد ہیں جن کو مشرکین نے دین سمجھ رکھا تھا مثلاً بیت اللہ کے پاس تالیاں اور سیٹیاں بجانا۔ چونکہ انہوں نے یومِ آخرت کی تیاری کے لئے اعمالِ صالحہ ترک کر دیئے تھے اس لئے آخرت میں ان کو عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔

آیت نمبر ۵۲: اس آیت میں قرآنِ حکیم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا اِتمامِ حجّت کرنے کا بیان ہے۔ قرآنِ حکیم سے فائدہ اٹھانے والے وہ لوگ ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اس طرح قرآنِ حکیم دنیا و آخرت میں ان کے لئے ہدایت و رحمت بن جاتا ہے۔

علمی و عملی بات: اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کامل کی بناء پر نیکوکاروں اور بدکاروں کا انجام بتادیا ہے اور روزِ آخرت یقینی ہے اور ہر ایک کو اس کے عمل کی جزاو سزا بھی مل کر رہے گی۔ بدکاروں پر اس دنیا میں بھی عذاب آتا ہے اور آخرت میں تو عذاب یقینی ہے۔ غرض ہر طرح کی تفصیل اس کتاب میں مذکور ہے۔ اس کتاب سے فائدہ صرف وہی لوگ اٹھاتے ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں۔ ان کی زندگی میں خوشگوار تبدیلی شروع ہو جاتی ہے۔ ان کے اخلاق سنور جاتے ہیں وہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے اور ان کی بھلائی کی باتیں سوچنے لگتے ہیں۔ ان کی زندگی انتہائی ذمہ دارانہ زندگی بن جاتی ہے پھر ان کی آخرت بھی سنور جاتی ہے اس طرح یہ کتاب ان کی دنیوی زندگی میں بھی ہدایت اور رحمت ثابت ہوتی ہے اور آخرت میں بھی۔

آیت نمبر ۵۳: تاویل سے مراد کسی چیز کا مصداق یا واقع ہونے کا وقت ہے۔ یعنی قرآنِ حکیم نے جو وعدہ اور وعید بیان کی ہے اور اس میں جس نتیجہ اور انجام کی صراحت مذکور ہے اس کے سامنے آنے کے منتظر ہیں اور وہ سزا و جزا ہے۔ یعنی مرنے کے بعد اور قیامت کے دن جب نتیجہ سامنے آجائے گا۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا وہ ایمان لانے کے لئے اس انتظار میں ہیں کہ وہ وعید واقع ہو جائے یعنی ان پر سخت عذاب آجائے جو ان کو ملیامیٹ کردے یا قیامت واقع ہو جائے اور ان کا مواخذہ کر کے ان کو دوزخ میں ڈال دیا جائے تو اس وقت وہ اعتراف کریں گے۔

علمی بات: منکرینِ حق جس انجام کے منتظر تھے اس کے سامنے آجانے کے بعد اعترافِ حق کرنا یا دوبارہ دنیا میں بھیجے جانے کی آرزو اور کسی سفارش کی تلاش، یہ سب بے فائدہ ہوں گی۔ وہ معبود بھی ان سے گم ہو جائیں گے وہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے تھے، نہ وہ ان کی مدد و سفارش کر سکیں گے اور نہ ہی عذاب جہنّم سے چھڑا سکیں گے۔ درحقیقت انہوں نے خود اپنے آپ کو خسارہ میں ڈال کر بربادی کا سامان کرلیا۔

آیت نمبر ۵۴: اس آیت میں کائنات کی تخلیق کا چھ دنوں میں مکمل ہونے کا بیان ہے۔ رات اور دن کا باقاعدہ نظام اور سورج، چاند، ستارے سب اللہ تعالیٰ کے حکم کے پابند ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی حقیقی رب اور خالق کائنات ہے اور اسی کے حکم اور قدرت سے پورا نظام چل رہا ہے۔

علمی و عملی بات: البتہ ایک قول کے مطابق چھ دن رات کے بقدر وقت مراد ہے یوں تو اللہ تعالیٰ کو یہ بھی قدرت تھی کہ وہ پلک جھپکنے سے بھی پہلے پوری کائنات وجود میں لے آتا، لیکن اس عمل کے ذریعے انسان کو بھی جلد بازی کے بجائے اطمینان اور وقار کے ساتھ کام کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ ساتوں آسمان اور زمین اور پوری کائنات کی تخلیق کے بعد عرش پر مستویٰ یعنی جلوہ فرما ہوا۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر اُسی طرح جلوہ فرما ہے جو اس کی شان کے لائق ہے، نہ اس کا انکار کیا جاسکتا ہے نہ اسے مخلوق کی صفت کے ساتھ تشبیہ دی جاسکتی ہے اور نہ ہی اس کی کیفیت بیان کی جاسکتی ہے۔ عرش پر جلوہ فرما ہونے کا صحیح مطلب ہمارے فہم اور ادراک سے باہر ہے۔ ذات باری تعالیٰ کے حوالہ سے ہمارا یہ ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ زمان و مکان کی قیود سے بے نیاز ہے۔

علمی بات: قرآن و حدیث سے اتنی بات ثابت ہے کہ عرش ایسا مقام ہے جو تمام آسمانوں اور زمین اور تمام کائنات عالم کو محیط ہے سارا جہاں اس کے اندر سمایا ہوا ہے، اس سے زائد اس کی حقیقت کا معلوم کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے سورج، چاند اور ستاروں کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کے ارادہ کا پابند ہے، اور بال برابر بھی اپنی مقررہ شدہ حرکات و سکنات سے روگردانی نہیں کر سکتا ہے، اسی لئے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بے شک اسی نے تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے، وہی سب کا مالک ہے اور ہر چیز پر اسی کا حکم نافذ ہے۔

علمی بات: اس آیت میں انسان کے لئے دعوت فکر ہے دنیا کے بڑے بڑے نامور سائنسدانوں اور ماہرین کی بنائی ہوئی مشینوں اور آلات کو دیکھو، ان میں بھی کچھ نہ کچھ نقائص نکلتے رہتے ہیں۔ چلتے چلتے ان کے تمام پُرزے گھسنے لگ جاتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر یا تو ان کی مرمت کی جاتی ہے اور کبھی نئے پرزے لگائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ خدائی مشینیں ایسی ہیں کہ جس طرح اور جس شان سے اللہ تعالیٰ نے ان کو پہلے دن چلایا تھا، یہ اسی طرح چل رہی ہیں، نہ کبھی ان کی رفتار میں فرق آتا ہے اور نہ کبھی ان کا کوئی پرزہ گھستا اور ٹوٹتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کی مرمت کی ضرورت پڑتی ہے۔ پس یہ تو امر الٰہی سے چل رہی ہیں اور اسی کے تابع ہیں، ان میں کوئی فرق آنا محال ہے۔ ہاں جب وہ قادر مطلق ہی ایک متعین وقت پر ان کو فنا کرنے کا ارادہ کرے گا تو یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اسی کا نام قیامت ہے۔

آیت نمبر ۵۵: اس آیت میں اللہ ﷻ سے دُعا مانگنے کے درج ذیل آداب بیان کیئے گئے ہیں۔

ا۔ دُعا عاجزی اور رقت سے مانگی جائے۔ ۲۔ دُعا آہستہ مانگی جائے۔ ۳۔ دُعا میں زیادتی نہ ہو۔

فرمانِ نبوی ﷺ: ا۔ "دُعا عبادت کا مغز ہے"۔ (جامع ترمذی) ۲۔ "جو اللہ ﷻ سے نہیں مانگتا اللہ ﷻ اس سے ناراض ہو جاتا ہے"۔ (جامع ترمذی) ۳۔ "دُعا بہر حال فائدہ مند ہے ان بلاؤں کے معاملے میں بھی جو نازل ہو چکی ہیں اور ان کے لئے بھی جو ابھی نازل نہیں ہوئیں۔ اللہ ﷻ کے بندو تم ضرور دُعا مانگا کرو" (جامع ترمذی) ۴۔ "اللہ ﷻ سے اس امید کے ساتھ دُعائیں مانگا کرو کہ وہ قبول کرے گا۔" (جامع ترمذی)

اس آیت میں اللہ ﷻ نے دُعا کے آداب بتائے ہیں کہ دُعا عاجزی اور تواضع کے ساتھ ہو اور چپکے چپکے مانگی جائے اور دُعا میں تجاوز نہ کیا جائے بلا ضرورت بلند آواز سے دُعا کرنا بھی حد سے تجاوز کرنے میں داخل ہے اور تجاوز کی مد میں وہ سب چیزیں داخل ہیں جن کا مانگنا عادتاً یا شرعاً محال یا ممنوع ہو جیسے گناہ اور قطع رحمی کی دُعا نہ مانگے کوئی ایسا سوال نہ کرے جو اس کی شان کے مناسب نہ ہو پھر معلوم ہوا کہ دُعا میں اخفاء بہتر ہے اللہ ﷻ نے حضرت زکریا علیہ السلام کے اوصاف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا! جب انہوں نے اپنے رب کو آہستہ آواز سے پکارا۔ (سورۃ مریم ۱۹، آیت: ۳)

علمی بات: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بندہ کی دُعا برابر قبول ہوتی ہے، بشرطیکہ وہ گناہ کی اور قطع رحمی کی دُعا نہ کرے اور دُعا میں جلد بازی سے کام نہ لے۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ، جلد بازی سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ (مثلاً) یہ کہنے لگے کہ میں اتنے عرصہ سے دُعا مانگ رہا ہوں اب تک قبول نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ مایوس ہو کر (دُعا کرنا) چھوڑ دے۔ (صحیح مسلم، جامع ترمذی)

آیت نمبر ۵۶: اس آیت میں دُعا کے مزید آداب کا بیان ہے کہ: (ا)۔ زمین میں فساد نہ مچایا جائے۔ فساد میں شرک، کفر، نفس کی اطاعت اور دیگر گناہ شامل ہیں۔ (۲)۔ گناہوں کی وجہ سے اللہ ﷻ کی پکڑ اور گرفت کا خوف رکھا جائے۔ (۳)۔ اللہ ﷻ کی رحمت سے مایوس نہ ہوا جائے۔ (۴)۔ اعمال میں احسان کی روش اختیار کی جائے۔ اللہ ﷻ کی رحمت ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو ان مذکورہ باتوں پر عمل کریں۔

علمی بات: فَسَادٌ فِي الْاَرْضِ یہ ہے کہ انسان اللہ ﷻ کی بندگی چھوڑ کر اپنے نفس کی یا دوسروں کی اطاعت شروع کر دے اور اللہ ﷻ کی بتلائی ہوئی راہ ہدایت کو چھوڑ کر اپنے اخلاق، معاشرت، معیشت، سیاست اور تمدّن کی عمارت کو ایسے اصول و قوانین پر قائم کرے جو اسلام کے مخالف اور متصادم ہوں یہی وہ بنیادی چیز ہے جس سے زمین میں فساد برپا ہو جاتا ہے اور ایسی خرابیاں اور مسائل جنم لیتے ہیں کہ جن کا دور کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس آیت سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتداً میں زمین میں اصلاح ہی اصلاح تھی کیونکہ پہلے بشر حضرت آدم علیہ السلام خود نبی تھے۔ بعد میں شیطانی عناصر اور عوامل نے اس اصلاح میں بگاڑ کی صورتیں پیدا کیں تو اللہ ﷻ انبیاء کرام علیہم السلام کو بھیج کر اس بگاڑ کو ختم کرتا رہا۔ جبکہ انسانی تہذیب و تمدّن کی داستان لکھنے والے اس نظریہ کے قائل ہیں کہ انسان ظلمت سے نکل کر بتدریج روشنی میں آیا ہے اور اس کی زندگی بگاڑ سے شروع ہوئی جو بتدریج سنور رہی ہے قرآنِ حکیم اس نظریہ کی پرزور تردید کرتا ہے۔

علمی و عملی بات: خوف اور طمع سے پکارنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی تمام امیدیں اللہ ﷻ سے وابستہ رکھے اور اس کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہو اور ڈرنا اس بات سے چاہئیے کہ کسی غلطی یا تقصیر کی وجہ سے کہیں اللہ ﷻ کی بارگاہ میں مردود ہی نہ ہو جاؤں۔ دونوں پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

علمی بات: "محسنین سے مراد احسان کرنے والے ہیں۔ کسی کام کے اچھی طرح انجام دینے کو احسان کہا جاتا ہے۔" احسان اللہ ﷻ کی عبادت میں بھی ہوتا ہے اور بندوں کے ساتھ بھی۔ اللہ ﷻ کی عبادت میں احسان کا ذکر حدیثِ جبریل میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "(احسان یہ ہے) کہ تو اللہ ﷻ کی عبادت اس طرح کرے گویا تُو اسے دیکھ رہا ہے، تو اگر تُو اسے نہیں دیکھتا تو (یہ خیال کر کہ) یقیناً وہ تجھے دیکھ رہا ہے"۔ (صحیح بخاری)

بندوں کے ساتھ احسان کا ذکر قارون کو اس کی قوم کی نصیحت میں ہے، فرمایا: "جیسا کہ اللہ نے تم پر احسان فرمایا" یعنی کسی معاوضے کی خواہش کے بغیر ان سے نیکی کر۔ (سورۃ القصص ۲۸، آیت: ۷۷)

آیت نمبر ۵۷: اس آیت میں رحمت سے مراد بارش ہے۔ بارش سے قبل ہوائیں بادلوں کو چلا کر خشک زمینوں کی طرف لے جاتی ہیں۔ بارش کے ذریعہ مردہ زمین زندہ ہو کر سبزہ اور اناج اُگاتی ہے جو انسانوں کی روزی کا ذریعہ بنتی ہے۔ مردہ زمین کو زندہ فرمانے والا اللہ ﷻ اسی طرح قیامت کے دن مُردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے۔

علمی بات: بارش سے پہلے اللہ ﷻ ہی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلاتا ہے جو بارش کی آمد آمد کی خوشخبری لوگوں کو پہنچاتی ہیں جس طرح اللہ ﷻ اپنی قدرتِ کاملہ سے مردہ زمین کو زندہ اور سرسبز کر سکتا ہے اسی طرح وہ قیامت کے دن ہمیں بھی دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے۔ چنانچہ اللہ ﷻ کو دوبارہ زندگی دینے پر قادر نہ سمجھنا بہت بڑی بے وقوفی کی بات ہے کیونکہ وہ قادر مطلق ہے۔

آیت نمبر ۵۸: اللہ ﷻ کی ہدایت اور آیاتِ بینات کا فائدہ تمام انسانیت کے لئے ہے۔ تاہم جس طرح ہر زمین بارش سے فائدہ نہیں اٹھاتی اسی طرح ہر انسان وحی کی نعمت سے نفع حاصل نہیں کرتا۔ وحی کی نعمت سے صرف وہ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو اللہ ﷻ کے شکر گزار ہیں۔

علمی بات: انسان اور ان کے دلوں کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں ایک اثر قبول کرنے والے اور دوسرے غیر متاثر اور قرآنِ حکیم بمنزلہ باران رحمت اور آبِ حیات ہے۔ چنانچہ بعض دل ایسے ہیں کہ جب یہ بارش ان پر برستی ہے تو اس سے طرح طرح کے ثمرات اور برکات کا ظہور ہوتا ہے اور ان کے قبولِ ایمان کا سبب بنتی ہے، جبکہ بعض انسانوں کے دل کی زمین بنجر اور کھاری ہوتی ہے، لہٰذا وہ اللہ ﷻ کی طرف سے نازل ہونے والی اس عمومی بارانِ ہدایت کا کوئی اثر قبول نہیں کرتی بلکہ اس زمین میں سے کفر اور الحاد کے کانٹے اور جھاڑ نکل آتے ہیں اور وہ کفر پر جمے رہتے ہیں۔ اسی کو ایک حدیث شریف میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ نے جس علم و ہدایت کے ساتھ مجھے مبعوث فرمایا ہے، اس کی مثال اس موسلا دھار بارش کی سی ہے جو زمین پر برسی، تو اس میں سے کچھ ایسی صاف زمین تھی، جس نے پانی کو قبول کیا اور بہت زیادہ گھاس اور جڑی بوٹیاں اُگائیں۔ زمین کے کچھ قطعات ایسے تھے جنہوں نے پانی کو روک لیا تو اس سے اللہ ﷻ نے لوگوں کو فائدہ پہنچایا، انہوں نے اسے پیا، پلایا اور اسے زراعت کے لئے استعمال کیا، تاہم زمین کے کچھ ٹکڑے چٹیل میدان تھے، جن پر بارش تو برسی مگر انہوں نے نہ تو پانی روکا اور نہ گھاس ہی اُگائی۔ یہی مثال ہے اس شخص کی جو اللہ ﷻ کے دین میں سمجھ بوجھ حاصل کرے اور اسے وہ چیز نفع پہنچائے جس کے ساتھ اللہ ﷻ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے، اسے وہ سیکھے بھی اور سکھائے بھی اور یہی مثال ہے اس شخص کی جو اس کے ساتھ سر ہی نہ اٹھائے اور نہ اللہ ﷻ کی اس ہدایت کو قبول کرے جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا ہے"۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

نوٹ: سورۃ الاعراف کی آیات ۵۹ تا ۷۹ اور ۸۵ تا ۹۳ کی وضاحت رہنمائے اساتذہ مطالعہ قرآنِ حکیم حصہ اوّل میں اور سورۃ الاعراف کی آیات ۸۰ تا ۸۴ کی وضاحت رہنمائے اساتذہ مطالعہ قرآنِ حکیم حصہ چہارم میں ملاحظہ فرمائیں۔

آیت نمبر ۹۴: اللہ ﷻ نے قوموں کو مختلف بیماریوں اور فقر و فاقہ میں مبتلا کر کے ان کی آزمائش کو بیان فرمایا ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب کبھی ہم کسی قوم کی طرف اپنے رسول بھیجتے ہیں اور وہ ان کی بات نہیں مانتے تو ہماری عادت یہ ہے کہ اوّل ان کو دنیا ہی میں مالی اور جانی تنگی و بیماری وغیرہ میں مبتلا کر دیتے ہیں تاکہ یہ لوگ گڑگڑا کر اللہ ﷻ کی طرف رجوع کریں۔

علمی و عملی بات: "بَالۡبَاۡسَاءِ" کے معنی فقر و فاقہ اور "وَالضَّرَّاءِ" کے معنی بیماری و مرض کے آتے ہیں، قرآن حکیم میں یہ لفظ جابجا اسی معنی میں آیا ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کے یہی معنی بیان فرمائے ہیں، بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ بَالۡبَاۡسَاءِ سے مراد اموال میں پہنچنے والی مصیبت، مثلاً فقر و فاقہ، تنگدستی، مفلسی اور قحط وغیرہ ہے۔ "وَالضَّرَّاءِ" سے مراد انسانی بدن کو نقصان پہنچانے والی اشیاء، مثلاً بیماری، مشقت، تکلیف، مصیبت اور جنگ وغیرہ ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے جن لوگوں کو اپنے عذاب سے ہلاک کیا انہیں (معاذ اللہ) یک دم ہی ہلاک نہیں کیا، بلکہ انہیں سالہا سال تک راہِ راست پر آنے کے بہت سے مواقع فراہم کیئے، اوّل تو پیغمبر بھیجے جو انہیں برسوں تک خبردار ہوشیار کرتے رہے، اور پھر عذابِ الٰہی سے ڈراتے رہے انہیں کچھ معاشی بدحالی اور بیماریوں وغیرہ کی مصیبتوں سے دوچار کیا تاکہ ان کے دل کچھ نرم پڑیں اور وہ راہ راست پر آجائیں۔

آیت نمبر ۹۵: اس آیت میں نافرمان قوم پر آزمائش کے دوسرے طریقہ کا بیان ہے۔ بیماری اور فقر و فاقہ کو تندرستی اور آسودگی میں تبدیل کر دیا جاتا تو اس پر نافرمان یہ کہتے کہ ماضی میں ہمارے آباؤ اجداد پر بھی ایسی راحت و تکلیف آتی رہتی تھیں۔ پھر اللہ ﷻ کی طرف سے اچانک ان نافرمانوں پر عذاب آیا جس کا انہیں گمان بھی نہ تھا۔

دوسری طرف کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب ان پر خوش حالی آتی ہے تو ان کے دل میں اللہ ﷻ کے احسانات کا احساس پیدا ہوتا ہے اور وہ اس وقت حق بات کو قبول کرنے کے لئے نسبتاً زیادہ آمادہ ہو جاتے ہیں، چنانچہ ان لوگوں کو بدحالی کے بعد خوش حالی کی نعمت بھی عطا کی جاتی ہے تاکہ وہ شکر گزار بن سکیں، حالات کی

اس تبدیلی سے بعض لوگ سبق حاصل کر کے راہِ راست پر آجاتے ہیں، لیکن کچھ ضدی طبیعت کے لوگ ان باتوں سے کوئی سبق نہیں سیکھتے اور یہ کہتے ہیں کہ یہ دُکھ سُکھ اور گرم سرد حالات تو ہمارے باپ داداؤں کو بھی پیش آچکے ہیں، انہیں خوامخواہ اللہ ﷻ کی طرف سے کوئی اشارہ قرار دینے کی کیا ضرورت ہے؟ اس طرح جب ان لوگوں پر ہر طرح کی حجّت تمام ہو چکی ہوتی ہے تو پھر اللہ ﷻ کی طرف سے عذاب آتا ہے اور اس طرح پکڑ لیتا ہے کہ ان کو پہلے سے اس کا گمان اور اندازہ بھی نہیں ہوتا۔

علمی بات: حضرات مفسرین فرماتے ہیں کہ جب بندوں کو گناہوں کی سزا دنیا میں ملتی رہے تو امید ہے کہ توبہ کر لیں گے، اور جب گناہ پر سزا نہ ملے تو یہ اللہ ﷻ کی طرف سے ڈھیل اور پھر اس کی ہلاکت یقینی ہے، جیسے کوئی زہر کھا لینے کے بعد اُگل دے تو امید ہے کہ بچ جائے گا اور اگر وہ جسم میں سرایت کر جائے تو بس پھر ہلاکت یقینی ہے۔

عملی پہلو: اگر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹنے کے بعد بھی لوگ غفلت سے بیدار نہ ہوں اور مال و دولت اور نعمتوں کی فراوانی کے باوجود بھی اپنے مہربان اور کریم پروردگار کے لئے شکر گزاری کا جذبہ پیدا نہ ہو تو پھر اصلاح کی کوئی امید باقی نہیں رہتی۔

آیت نمبر۹۶: اس آیت میں ایمان اور تقویٰ کی برکات کا ذکر ہے کہ آسمان وزمین سے برکتوں کے عطا کیئے جانے کا وعدہ ہے۔ لیکن کفر کی روش پر ڈٹے رہنے والے عذاب میں مبتلا کر دیئے جاتے ہیں۔

فرمان نبوی ﷺ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ ﷻ کی مقرر کردہ حدود میں سے کسی ایک حد کے قائم کرنے سے اتنی برکات اور رحمتوں کا نزول ہوتا ہے جتنا چالیس دن کی بارش سے ہوتا ہے (سنن نسائی)۔

آیت نمبر۹۷: نافرمانی پر اللہ ﷻ کے عذاب کے اچانک آجانے پر خبردار کیا گیا ہے اور تنبیہ کو نظر انداز کرنے پر رات کے وقت نیند کی حالت میں عذاب کے بھیجے جانے کا بیان ہے۔

مطلب یہ ہے کہ پیغمبروں کی نافرمانی اور تکذیب کے بعد عذابِ الٰہی سے کسی وقت بھی بے خوف نہیں رہنا چاہیئے۔ نہ جانے رات یا دن میں کس وقت بے خبری میں عذابِ الٰہی آجائے۔ کیا یہ تکذیب کرنے والے اللہ ﷻ کے عذاب سے بے خوف ہو گئے ہیں۔ کہ عیش و آرام میں مشغول ہوں یا اپنی خواب گاہ میں استراحت کر رہے ہوں اور یکایک عذابِ الٰہی سے دوچار ہو کر ہلاک ہو جائیں، کیا انہیں اللہ ﷻ کی تدبیر سے بالکل بھی ڈر نہیں لگتا؟

آیت نمبر۹۸: بے فکری اور غفلت کے نتیجہ میں دن دیہاڑے بھی عذاب بھیج دیئے جانے کی تنبیہ ہے۔

یعنی جب عیش و آرام میں غافل پڑے سو رہے ہوں یا دنیا کے کاروبار اور لہو و لعب میں مشغول ہوں اس وقت اللہ ﷻ کا عذاب ان کو دفعتاً آگھیرے۔ اس بات سے یہ لوگ کیوں نڈر اور بے فکر ہو رہے ہیں۔ حالانکہ جن اسباب کی بنا پر گزشتہ اقوام پر عذاب آئے ہیں، وہ ان مشرکین مکہ میں بھی موجود ہیں یعنی کفر و تکذیب اختیار کرنا اور سید الانبیاء حضرت محمد ﷺ کے ساتھ دشمنی مقابلہ اور جنگ و جدال وغیرہ کرنا۔

عملی پہلو: ان واقعات کو بیان کر کے کفار مکہ کو متوجہ کیا جا رہا ہے کہ اللہ ﷻ کے غضب سے کسی کو بھی بے فکر ہو کر نہیں بیٹھنا چاہیئے اور یہ بات صرف کفار مکہ ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ ہر وہ شخص جو کسی گناہ، بدعملی یا ظلم میں مشغول ہو اسے ان آیات کریمہ کو اپنے پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔

آیت نمبر۹۹: دنیا کی تمام نافرمان قوموں اور رسول اللہ ﷺ کے دورِ نبوّت کے کفار کو تنبیہ ہے۔ اللہ ﷻ کی گرفت اور تدبیر سے بے فکر وہی ہوتے ہیں جنہوں نے خسارہ میں جانے کا فیصلہ کر لیا ہو۔

علمی بات: اصل میں لفظ "مَکَرَ" استعمال ہوا ہے جس کے معنی عربی زبان میں خفیہ تدبیر کے ہیں، یعنی کسی شخص کے خلاف ایسی چال چلنا کہ جب تک اس پر فیصلہ کن ضرب نہ پڑ جائے اس وقت تک اسے خبر نہ ہو کہ اس کی شامت آنے والی ہے، بلکہ ظاہر حالات کو دیکھتے ہوئے وہ یہی سمجھتا رہے کہ سب اچھا ہے۔

اللہ ﷻ وہاں سے پکڑتا ہے، جہاں سے کسی کو پکڑے جانے کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ اوپر تنبیہ کے بعد ڈھیل کی جو سنّت بیان ہوئی، وہ اس تدبیر الٰہی ہی کی ایک مثال ہے۔ وہ قوم تو سمجھتی ہے کہ اب اس نے پالا مار لیا، لیکن درحقیقت وہیں اس کی ہلاکت کا گھر اگڑھا ہوتا ہے۔

عملی پہلو: انسان کو غور و فکر کرنا چاہیئے کہ اللہ ﷻ کی تدبیر مخفی اور ناگہانی ہوا کرتی ہے۔ زلزلہ کے اسباب شب و روز نشو نما پاتے رہتے ہیں۔ سیلاب ایک لمحہ کی برف باری ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آتش فشاں پہاڑوں کا لاوا برسوں تک کھولتا رہتا ہے تب کہیں جا کر پھٹنے کے قابل ہوتا ہے، جب کہ اللہ ﷻ کے ہاں یہ سب تدبیریں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ انسانوں کو اس کا گمان بھی نہیں ہوتا کہ کوئی غیر معمولی بات ہونے والی ہے۔ اس لئے ہمیشہ اللہ ﷻ کے غضب سے بچنے کی کوشش اور فکر کرنی چاہیئے اور اللہ ﷻ کے عذاب سے پناہ طلب کرنی چاہیئے۔

آیت نمبر ۱۰۰: اس آیت میں سابقہ اقوام کے حالات سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ظلم و زیادتی اور نافرمانی سے باز نہ آنے پر کفار و منکرین کے دلوں پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قبولِ حق کی صلاحیت سلب کر لی جاتی ہے اور وہ ہمیشہ حق کے انکاری رہتے ہیں۔

علمی بات: یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ کفار اپنے سر میں لگے ہوئے حسی کانوں سے سنتے تھے اور سنتے ہیں لیکن انہوں نے حق کو قبول نہ کیا اور اسے گوش دل سے نہ سنا اور انہیں تسلیم کرنے اور حق پر ایمان لانے کی توفیق نہ ہوئی تو سنا ان سنا برابر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا سننا کہ اس کو قبول کریں اور نفع حاصل ہو ایسا نہیں سنتے اسی معنی میں ان کو "صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ" کہا ہے۔

عملی پہلو: مشرکین مکہ کے لئے سابقہ قوموں کے انجام سے مقام عبرت:

آیت کریمہ میں بنی نوع انسان کے لئے ایک بُری تنبیہ ہے کہ اس دنیا میں اللہ ﷻ کے عذاب سے ہمیشہ ڈرتے رہیں اور سابقہ قوموں کے انجام بد سے عبرت حاصل کریں۔ جس طرح اللہ ﷻ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے انہیں گرفت میں لے لیا، اسی طرح ممکن ہے ان لوگوں کو بھی اللہ ﷻ ان کے گناہ کی وجہ سے پکڑ لے اور ان کے دلوں پر مہر لگا دے جو ان ہلاک کی گئی قوموں کے بعد آئے ہیں اور اسی سرزمین پر انہی کی طرح گناہ بھی کر رہے ہیں جس پر گذشتہ قومیں آباد تھیں۔

آیت نمبر ۱۰۱: اس آیت میں جھٹلانے والوں کا بیان ہے کہ واضح دلائل لانے کے باوجود سابقہ اُمتوں نے رسولوں کی تکذیب کی چنانچہ پتا چلا کہ جان بوجھ کر حق کو جھٹلانا انسان کو سخت دل اور ہدایت سے محروم کر دیتا ہے۔

علمی بات: ان آیتوں میں اللہ ﷻ نے آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ قوم نوح علیہ السلام، قوم عاد علیہ السلام، قوم ثمود علیہ السلام، لوط علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام کی قوموں کی یہ وہ اُجڑی ہوئی بستیاں ہیں جن کے کچھ حالات و واقعات ہم نے بیان کیئے ہیں۔ مشرکین مکہ کے تجارتی سفر کے دوران راستے میں ان بستیوں کے آثار و نشانات ملتے ہیں۔ یہ لوگ ان کو دیکھ کر سبق حاصل نہیں کرتے۔

اللہ ﷻ نے اپنے رسولوں کو حق کے واضح دلائل دے کر ان کے پاس بھیجا، جنہوں نے ان کو خوب سمجھایا مگر وہ لوگ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر توحید کو جھٹلاتے رہے اور اپنے کفر و انکار پر قائم رہے اور ایمان نہ لائے، اللہ ﷻ نے اِن کی تکذیب کی روش کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔ پھر ان میں نیکی قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ اسی طرح آپ ﷺ کی قوم کے ایسے کافروں کے بارے میں بھی ہم نے لکھ دیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

علمی بات: حدیث میں رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب کوئی انسان پہلے گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب پر ایک نقطہ سیاہی کا لگ جاتا ہے، دوسرا گناہ کرتا ہے تو دوسرا، تیسرا گناہ کرتا ہے تو تیسرا نقطہ لگ جاتا ہے یہاں تک کہ اگر وہ برابر گناہوں میں مشغول رہا اور توبہ نہ کی تو یہ سیاہی کے نقطے اس کے سارے قلب کو گھیر کر سیاہ کر دیتے ہیں پھر اس انسان کے قلب میں بھلے بُرے کی پہچان کا مادہ فنا یا مغلوب ہو جاتا ہے اور نتیجتاً وہ اچھی چیز کو بُرا اور بُری چیز کو اچھا خیال کرنے لگتا ہے اسی حالت کو قرآنِ حکیم میں "رَانَ" یعنی قلب کے زنگ سے تعبیر فرمایا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ: ہرگز ایسا نہیں! بلکہ (جھٹلانے کی وجہ یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر (بُرے اعمال کا) زنگ چڑھ گیا ہے جو وہ کیا کرتے تھے۔ (سورۃ المطففین ۸۸، آیت: ۱۴) اس آیت میں اور دوسری آیات میں جس کو "طبع" یعنی مہر لگانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

علمی بات: یہاں سننے سے مراد ماننا اور اطاعت کرنا ہے، مطلب یہ ہے کہ دلوں پر مُہر لگ جانے کے سبب وہ کسی حق بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ انسان کا قلب اس کے تمام اعضاء و جوارح کا مرکز ہے، جب دل میں کسی چیز کی بھلائی یا بُرائی سما جاتی ہے تو پھر آنکھوں سے وہ چیز اسی طرح دکھائی دیتی ہے جس طرح دل میں سمائی ہوتی ہے۔

آیت نمبر ۱۰۲: اس آیت میں نافرمانوں کی اکثریت کا عہد کی پاسداری نہ کرنے کا ذکر ہے۔

علمی بات: مفسرین کرام نے اس عہد سے مختلف عہد مراد لیے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس عہد سے مراد وہ ازلی عہد یعنی عہد میثاق ہے جو آدم علیہ السلام کی تخلیق کے وقت تمام ارواح سے لیا تھا کہ (اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ) (اور پوچھا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے کہا کیوں نہیں۔ اس وقت سب نے اقرار کیا تھا مگر دُنیا میں آکر اکثر نے فراموش کر دیا۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ عہد سے مراد عہد ایمان ہے جیسا کہ قرآنِ حکیم میں فرمایا اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا، اس میں عہد سے عہدِ ایمان وطاعت مراد ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ عہد سے مراد وہ اقرار ہے جو آدمی ایمان قبول کرتے ہوئے کلمۂ شہادت کے الفاظ میں اقرار کرتا ہے۔ اس عہد کے تحت وہ عہد و پیمان بھی شامل ہیں جو انسان دوسرے انسانوں سے کرتا ہے خواہ یہ لین دین کے معاملات سے تعلق رکھتا ہو یا نکاح وطلاق کے معاملات سے اور وہ عہد بھی جو کوئی انسان ذاتی طور پر اپنے پروردگار سے کرتا ہے الغرض عہد پر پورا اترنا انسان پر لازم ہے اسے توڑنے والا فاسق و گناہ گار ہوتا ہے۔

عملی بات: ایمان واطاعت کا عہد باندھنے سے مراد یہ ہے کہ عموماً انسان جب کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے اور وہ مصیبت ٹلنے کا نام نہیں لیتی تو اسے اپنا انجام خسارہ کی صورت میں یاد آتا ہے اور اکثر دل یا زبان سے عہد کرتا ہے کہ اس مصیبت سے نجات مل گئی تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت میں لگ جاؤں گا، جیسا کہ قرآنِ حکیم میں بہت سے لوگوں کا یہ حال ذکر کیا گیا ہے، لیکن جب ان کو اس سے نجات ہو جاتی ہے اور آرام وراحت ملتی ہے تو پھر اسی سرکشی اور نافرمانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس عہد کو بھول جاتے ہیں۔

علمی وعملی پہلو: ان تمام قصص سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ان قوموں نے کس طرح بار بار اللہ تعالیٰ سے کیئے عہد وپیمان توڑا اور نتیجتاً ان کو سخت ترین سزائیں دی گئیں، تاکہ اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلّی وتشفّی ہو اور دوسری جانب مکہ والوں کے دل میں ڈر پیدا ہو، اور ان کو معلوم ہو کہ اگر ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کہا نہ مانا اور انکار کیا تو ہمارا بھی یہی حشر ہو گا۔

نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ حق کے ظہور کے بعد اوّلاً اکثریت کی جانب سے پرزور مخالفت ہوتی ہے اور ابتداً حق کو قبول کرنے والے بہت تھوڑے لوگ ہوتے ہیں۔

نوٹ: سورۃ الاعراف کی آیت ۱۰۳ تا ۱۵۵ کی وضاحت رہنمائے اساتذہ مطالعۂ قرآن حصّہ دوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

آیت نمبر ۱۵۶: اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اُمّت کے لئے دنیا و آخرت دونوں جگہ کی بھلائی مانگی ہے۔ "حَسَنَہ" بھلائی کو کہتے ہیں دنیا میں حسنہ کا وسیع مفہوم یہ ہے کہ بندہ کو نیکی کی توفیق، رزق حلال اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت نصیب ہو جائے، اور آخرت میں حسنہ سے مراد یہ ہے کہ بندہ کو نجات، گناہوں کی معافی اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور دیدار نصیب ہو جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ جواب دیا کہ جو سزا کا مستحق ہے اسی کو سزا ملتی ہے کسی کو بلاوجہ سزا نہیں دی جاتی۔ دنیا کی تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مستفید ہو رہی ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت کے مستحق وہ لوگ ہوں گے جو درج ذیل شرائط پوری کریں: ۱۔ تقویٰ اور پرہیز گاری اختیار کریں۔ ۲۔ زکوٰۃ ادا کریں۔ ۳۔ اللہ تعالیٰ کی تمام آیات اور احکامات پر ایمان رکھیں۔

علمی بات: اس دُعا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دنیا اور آخرت کی بھلائی کی درخواست کی ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں جس پر چاہتا ہوں اپنا عذاب نازل کرتا ہوں کوئی مجھ پر اعتراض نہیں کر سکتا اور میری رحمت ومہربانی ہر چیز سے زیادہ وسیع ہے اس عام رحمت کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی ایک خاص رحمت بھی ہے جو اس کے خاص بندوں پر نازل ہوتی ہے۔ اس میں سے ہر اس شخص کو حصہ ملے گا جو متّقی اور پرہیز گار ہو اور اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال میں سے زکوٰۃ ادا کرتا ہو اور اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کو مانتا ہو۔ جو اس درجہ کا ایمان وتقویٰ رکھتا ہو گا وہ اس خاص رحمت کا مستحق ہو گا۔

آیت نمبر ۱۵۷: اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے حوالے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تین کاموں کو نمایاں کیا گیا ہے۔

۱۔ نیکی کا حکم دینا اور بُرائیوں سے روکنا۔ یہی اب اُمّتِ مسلمہ کی ذمہ داری ہے (سورۂ آل عمران ۳، آیت: ۱۱۰)

۲۔ پاکیزہ چیزوں کو حلال کرنا اور خبیث چیزوں کو حرام ٹھہرانا۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے (سورۃ الحشر ۵۹، آیت: ۷) "اور رسول تمہیں جو کچھ دیں، وہ لے لو، اور جس چیز سے منع کریں اس سے رک جاؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بیشک اللہ سخت سزا دینے والا ہے"۔

۳۔ انسانوں کو غلط عقائد و بُرے اعمال اور گذشتہ اُمّتوں کے سخت اور دشوار احکامات بے جا معاشرتی رسومات کے بوجھ دور کرنا۔ اب یہ ذمہ داری اُمّتِ مسلمہ کے کاندھوں پر ہے کہ وہ اس ذمہ داری کا احساس کریں اور اس فریضۂ نیابت کو بخوبی نبھانے کی کوشش کریں۔

علمی بات: بوجھ سے مراد وہ مشکل احکام ہیں جن کا شرعی حکم پچھلی اُمّتوں کو تھا یا وہ بندشیں ہیں جو امتوں نے از خود اپنے اوپر عائد کرلی تھیں۔

گزشتہ آسمانی کتابوں میں نبی کریم ﷺ کی یہ صفت بھی بیان کی گئی تھی کہ آپ ﷺ بھلائی کا حکم دیں گے بُرائی سے روکیں گے نیز تجارت کی وہ تمام قسمیں جو ربا اور باطل شرائط سے خالی ہوں اور اچھی اور پاکیزہ چیزوں کو اس اُمت کے لئے حلال بیان کریں گے جو پہلی قوموں پر ان کی سرکشی کی وجہ سے بطور سزا حرام کردی گئی تھیں۔ اسی طرح اور نقصان دہ چیزوں کی مذمت کریں گے جن کو اللہ ﷻ نے حرام کیا ہے جیسے سود، خنزیر کا گوشت اور دوسرے محرمات وغیرہ۔

نوٹ: سچا اُمّتی بننے اور نجات پانے کے لئے چار کام لازمی ہیں:

۱۔ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا زبان سے بھی اور دل سے بھی اور اپنی جان سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ سے محبت کرنا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ”ایمان والوں کے لئے یہ نبی (ﷺ) ان کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ قریب تر ہیں“۔ (سورۃ الاحزاب ۳۳، آیت:۶)

۲۔ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم اور احترام کرنا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو (اپنے) نبی کی آواز پر بلند نہ کرو، اور نہ ان کے سامنے بلند آواز سے بولو، جیسے کہ تم ایک دوسرے سے بلند آواز سے بات کرتے ہو، ورنہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔
(سورۃ الحجرات ۴۹، آیت نمبر:۲)

۳۔ خدمتِ دین کے مشن میں رسول اللہ ﷺ کی نصرت کرنا اور دعوت اور نفاذِ دین کی جدوجہد کرنا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے اے ایمان والو! اللہ (کے دین) کے مددگار بن جاؤ، جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام نے حواریوں سے کہا: اللہ ﷻ کی طرف میرے مددگار کون ہیں؟ حواریوں نے کہا: ہم اللہ ﷻ کے (دین کے) مددگار ہیں۔ (سورۃ الصف ۶۱، آیت:۱۴)

۴۔ یعنی وحی جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی خواہ متلو ہو یا غیر متلو اس کی پیروی کرنا یعنی قرآنِ حکیم کے حقوق مکمل طور پر ادا کرنا۔ اور سنّت رسول ﷺ کی پیروی کرنا۔

علمی بات: نور سے مراد قرآنِ حکیم بھی ہے اور اس پر عمل کرنے کا طریقہ کار یعنی سنّت نبوی ﷺ بھی۔ ان دونوں کی پیروی میں ہی نجات ہے۔

آپ ﷺ پر ایمان لانے کے دو بنیادی تقاضے ہیں، پہلا تقاضا ہے آپ ﷺ کی محبت اور دوسرا تقاضا ہے آپ ﷺ کی اطاعت۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ) تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہے جب تک کہ اس کی خواہش نفس تابع نہ ہو جائے اس چیز کے جو میں لے کر آیا ہوں۔ یعنی جس شریعت اور اس کے احکام کے ساتھ حضور ﷺ مبعوث ہوئے ان کو صدقِ دل سے تسلیم کرکے ان پر ایمان لانے کے بعد اس پر عمل کرنا ہوگا۔

اسی طرح حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ“ ”تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اسے محبوب تر نہ ہو جاؤں اس کے باپ، بیٹے اور تمام انسانوں سے۔“ (متفق علیہ) چنانچہ جب دونوں تقاضے پورے ہوں گے تو آپ ﷺ پر ایمان کا دعویٰ سچائی پر مبنی ہوگا۔ ایک تو یہ کہ آپ ﷺ کی اتباع اور اطاعت، انتہائی درجے کی ہو دوسرا یہ کہ آپ ﷺ کی محبت میں سرتاپا یا منہمک ہوں کہ اپنا سب کچھ آپ ﷺ پر قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: ۱۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری تمام اُمّت جنّت میں داخل ہوگی سوائے اس کے جو انکار کرے، لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کون انکار کرے گا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے میری نافرمانی کی تو اس نے انکار کیا۔ (صحیح بخاری)

۲۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے میری فرماں برداری کی اس نے اللہ ﷻ کی فرماں برداری کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ ﷻ کی نافرمانی کی (سنن ابن ماجہ)۔

عملی پہلو: آپ ﷺ نے سخت محنت، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قربانیوں اور اللہ ﷻ کی نصرت سے جزیرۂ نمائے عرب میں دین کو غالب کرکے اپنے مشن کی تکمیل کردی۔ آپ ﷺ کے بعد خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے دور میں فتوحات زیادہ ہوتی گئیں اور اسلامی سلطنت کا دائرہ کار دور دور تک پھیل گیا۔ اُس کے بعد مسلمان

اپنی بداعمالیوں کے سبب پستی اور زوال کا شکار ہوتے گئے اور آج دنیا میں کہیں بھی دین اسلام عملی طور پر غالب و نافذ نہیں ہے۔ لہٰذا اب دین کو ساری دنیا میں غالب کرنے کی جدوجہد کرنا اُمّت کی ذمہ داری ہے۔ یہ قرآنی حکم آج بھی ہمیں پکار رہا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "اے ایمان والو! اللہ (کے دین) کے مدد گار بن جاؤ جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام نے حواریوں سے کہا: اللہ کی طرف میرے مددگار کون ہیں؟ حواریوں نے کہا: ہم اللہ (کے دین) کے مدد گار ہیں۔" (سورۃ الصف ۶۱، آیت: ۱۴)

عملی پہلو: اللہ ﷻ کی خاص رحمت کے حصول کے لئے نبی کریم ﷺ کی اتباع شرط لازم ہے۔ "اُمّی" کے لفظ میں نبی کریم ﷺ کی عظمت کا ذکر ہے کہ اُمّی ہونے کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے ایسا کلام (قرآنِ حکیم) پیش فرمایا کہ اس جیسا کلام پیش کرنا ساری مخلوق کے بس میں نہیں ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوا کہ یہ اللہ ﷻ کا کلام برحق ہے۔

علمی بات: عرب کے محاورہ میں اُمّی اسے کہتے ہیں جس نے کسی مخلوق سے لکھنا پڑھنا نہ سیکھا ہو اور آپ ﷺ نے بھی کسی سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تھا۔ اللہ ﷻ نے محض اپنے فضل و قدرت سے آپ ﷺ کو وہ علوم عطا فرمائے جو کسی کو نہیں دیئے۔ مخلوق میں آپ ﷺ سے بڑھ کر کوئی بھی صاحب علم نہیں ہے اللہ ﷻ نے آپ ﷺ کو جو علوم دیئے تھے ان ہی میں سے وہ سب خبریں ہیں جو آپ ﷺ نے عالم کی ابتدا سے لے کر جنّت میں داخل ہونے والے آخری شخص کے داخلہ تک بتادیا اور اہل دوزخ کے احوال اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی اُمّتوں کے احوال اور واقعات بیان کیئے ایسے اُمّی پر کروڑوں اہل علم قربان۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ اُمّی ہونا آپ علیہ السلام کی ذاتِ گرامی کے لئے سراپا مدح اور خیر و خوبی کی چیز ہے۔

علمی بات: اہل کتاب، بنی اسماعیل کے اندر ایک صاحب رسالت نبی کی بعثت کے بارے میں پہلے سے ہی واقف تھے اور اس کا چرچا ان کے ہاں برابر قائم رہا ہے۔ تورات و انجیل میں آپ ﷺ کی آمد کا ذکر واضح طور پر موجود ہے۔

چنانچہ برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی لاہور ۱۹۳۱ء میں چھپی ہوئی بائیبل میں یوحنا کی انجیل کی انتیسویں اور تیسویں آیت میں ہے کہ "اور اب میں نے تم سے اس کے ہونے سے پہلے کہہ دیا ہے تا کہ جب ہو جائے تو تم یقین کرو اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا۔ کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں"۔ پھر اسی کتاب کے باب سولہ کی ساتویں آیت میں ہے۔ "لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ مدد گار تمہارے پاس نہ آئے گا"۔ اس کی تیرھویں آیت میں ہے "لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا۔ لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا"۔

"خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی سننا اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لئے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا" (استثنا باب ۱۸: ۱۵۔۱۹)۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کی پیشگوئی ملاحظہ ہو: "یسوع نے ان سے کہا کہ کیا تم نے کتابِ مقدس میں نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی دی ہوئی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی" (متی باب ۲۱: ۴۲۔۴۴)۔ ان پیشین گوئیوں پر غور کیجیے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں آخری نبی ہیں ان کے بعد کوئی بنی اسرائیل میں نہیں آیا۔ پھر ان پیشین گوئیوں کا مصداق آنحضرت (ﷺ) کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ یہ کس کا مرتبہ بیان ہوا ہے کہ وہ دنیا کا سردار ہے جو ابد تک لوگوں کے ساتھ رہے گا۔ جو شخص بھی ان پیشین گوئیوں پر انصاف اور غیر جانبداری کے ساتھ غور کرے گا وہ پکار اٹھے گا کہ یہ اگر کسی پر صادق آسکتی ہیں تو صرف نبی اُمّی اور رسولِ خاتم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ہی صادق آسکتی ہیں۔ نبی اُمّی ﷺ کے سوا اور کوئی ان کا مصداق نہیں ہو سکتا۔

آیت نمبر ۱۵۸: نبی کریم ﷺ کی رسالت عالمگیر ہے۔ آپ ﷺ کو اللہ ﷻ نے مبعوث فرمایا جو پوری کائنات کا مالک ہے۔ نجات اور فلاح کا واحد راستہ یہ ہے کہ اللہ ﷻ کی وحدانیت اور نبی کریم ﷺ کی رسالت کو تسلیم کر لیا جائے۔ رسول ﷺ خود اللہ ﷻ اور اس کے کلمات یعنی تمام آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ نیز بتایا گیا ہے کہ ہدایت کے حصول کے لئے نبی کریم ﷺ کی اتباع لازمی اور ضروری ہے۔

اب قیامت تک ہدایت اور کامیابی کے حصول کی ممکن صورت یہ ہے کہ آپ ﷺ کی تعلیمات کی مکمل پیروی کی جائے اور قیامت تک آنے والے تمام انسانوں اور جنوں کی ذمہ داری ہے آپ ﷺ پر ایمان لائیں اور یہ تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانے کے مترادف ہے آنحضرت ﷺ کی نبوّت ورسالت تمام انسانوں اور جنّات کے لئے ہے لہٰذا محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی بھی قسم کا کوئی نیا نبی نہیں آئے گا۔

حضور نبی کریم ﷺ کی خصوصیات: احادیث صحیحہ میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے چند باتیں ایسی عنایت فرمائی ہیں جو کسی اور نبی علیہ السلام کو عنایت نہیں فرمائیں۔

۱۔ تمام انبیاء علیہم السلام خاص اپنی قوم کی ہدایت کے لئے بھیجے جاتے تھے مجھے اللہ تعالیٰ نے ہر سیاہ وسفید یعنی عرب وعجم کے لئے بھیجا ہے مطلب یہ ہے کہ میں تمام مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

۲۔ مجھ پر نبوت ختم ہوگئی یعنی میرے بعد کسی کو منصب نبوت عطا نہیں ہوگا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو آخری زمانہ میں قربِ قیامت آسمان سے نازل ہوں گے ان کو منصب نبوّت آپ ﷺ سے تقریباً چھ سو سال پہلے مل چکا تھا۔ ان کا نزول ختم نبوّت کے منافی نہیں کیونکہ وہ بھی اس وقت رسول علیہ السلام کی حیثیت سے نہیں آپ ﷺ کے اُمّتی بن کر آئیں گے اور شریعتِ محمدی ﷺ کی ہی پیروی کریں گے۔

۳۔ مجھے شفاعت کا مقام عطا کیا گیا کہ قیامت کے دن اوّلین وآخرین کی شفاعت کروں گا۔ (اس شفاعت سے مراد حساب کتاب کے شروع ہونے کے لئے سفارش مراد ہے)۔

۴۔ میرے لئے غنائم حلال کر دی گئیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کے لئے حلال نہیں کی گئیں۔

۵۔ تمام روئے زمین میرے لئے پاک اور نماز کی جگہ قرار دے دی گئی (یعنی میری اُمّت کو جہاں نماز کا وقت ہو جائے وہیں کسی پاک جگہ نماز پڑھ لے)۔

۶۔ ایک مہینہ کی مسافت راہ کے فاصلے پر میرے دشمنوں کے دلوں میں میرا رعب ڈال دیا گیا۔

۷۔ مجھ کو جوامع الکلم عطا کیئے گئے یعنی ایسے کلمات کہ جن کے الفاظ تو بہت مختصر اور معانی بہت ہوں۔ یہ مضمون صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایتوں سے ثابت ہے۔

آیت نمبر ۱۵۹: اس آیت میں گروہ کے دو مفہوم ہیں۔

۱۔ دور نبوی ﷺ میں یہود میں ایک گروہ انصاف پسند تھا۔

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں دور نبوی ﷺ تک ایک انصاف پسند گروہ ہمیشہ موجود رہا جو آپ ﷺ پر بھی ایمان لے آیا۔ یہ گروہ ان اہلِ علم کا ہے جو حق کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے اور حق کے مطابق ہی فیصلہ کرتا ہے۔

یہودیوں کو آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے کی جو دعوت دی گئی اور اس سے پہلے ان کی بہت سی بدعنوانیاں بیان ہوئیں، اس سے یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ تمام بنی اسرائیل بدعنوانیوں کے مرتکب ہیں، اس لئے اب اللہ تعالیٰ نے یہ وضاحت فرمادی کہ سارے بنی اسرائیل ایک جیسے نہیں ہیں، اس میں وہ بنی اسرائیل بھی داخل ہیں جو آنحضرت ﷺ سے پہلے دین حق پر قائم رہے اور پھر آپ ﷺ پر ایمان لائے، مثلاً حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ۔

آیت نمبر ۱۶۰: صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کے بارہ قبائل پر کیئے گئے احسانات میں سے تین کا بیان ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چٹان پر لاٹھی ماری جس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔

۲۔ ان کے لئے بادلوں کو سائبان بنایا گیا۔ ۳۔ انہیں من وسلویٰ کی صورت میں خوراک فراہم کی گئی۔

بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کے ان احسانات کا شکر ادا کرنے کے بجائے اس کی نافرمانیاں شروع کر دیں اور تاکیدی حکم کے باوجود من وسلویٰ کو ذخیرہ کرنا اور دوسروں کو ان کے حق سے محروم کرنا شروع کر دیا پھر انہیں ان نافرمانیوں کی سزا خود ہی بھگتنا پڑی کہ اس سے محروم کر دیئے گئے۔

علمی بات: حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کی اولاد میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت دی ان کی تعداد کثرت سے بڑھتی گئی، اور ان کی تعداد بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی گئی، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ انہیں مختلف جماعتوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر جماعت کا ایک نگران مقرر کر دیا جائے تاکہ ہر جماعت اپنے الگ الگ نظم ونسق کے مطابق زندگی گزارے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرے، بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کا یہ ایک احسان تھا۔

یہ اس دور کے واقعات ہیں جب بنی اسرائیل کو چالیس سال کے طویل عرصہ کے لئے صحرائے سینا میں روک دیا گیا تھا کیونکہ ان لوگوں نے جہاد سے انکار کر کے انتہائی بزدلی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس میدان میں دور تک کہیں پانی کا نام و نشان تک نظر نہ آتا تھا نہ کوئی کھانے پینے کی چیز ملتی تھی اور نہ کہیں کوئی سایہ یا مکان نظر آتا تھا جہاں جا کر وہ دھوپ سے پناہ لے سکیں گویا اللہ ﷻ نے ان کی ان ضروریات کا یوں اہتمام فرمایا کہ پورا چالیس سال کا عرصہ جب دھوپ تیز ہونے لگتی تو آسمان پر بادل چھا جاتے اور انہیں دھوپ سے بچاتے تھے پھر یہ کہ وہ برستے بھی نہیں تھے کہ بارش کی وجہ سے انہیں کہیں پناہ لینی پڑے، پینے کو پانی نہیں مل رہا تھا تو اللہ ﷻ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ چٹان پر اپنا عصا ماریں اس سے بارہ الگ الگ چشمے پھوٹ نکلے اور یہ چشمے بھی اس طویل مدت میں بہتے ہی رہے ہر قبیلہ کو الگ الگ چشمہ پر اختیار اور قبضہ دیا گیا تاکہ ان میں پانی کی تقسیم پر جھگڑا نہ پیدا ہو، پھر کھانے کو من اور سلویٰ نازل فرمائے۔ نیز یہ کہ اس چالیس سال کے عرصہ میں بنی اسرائیل کی اپنی ہی تربیت کی جا رہی تھی۔ تاکہ اس عرصہ میں اللہ ﷻ کے ان احسانات کا شکر ادا کرتے ہوئے صرف اسی کی عبادت بجا لائیں اور ان سے وہ بزدلی دور ہو جو غلامی کی طویل زندگی میں ان کی رگوں میں رچ بس گئی تھی۔

علمی بات: المَنّ اہل لغت کی تحقیق میں یہ ایک میٹھی میٹھی رطوبت (نرم شے) تھی۔ جو درختوں پر گرا کرتی تھی۔ المَنّ کے متعدد معنی بیان کیئے گئے ہیں، میٹھا گوند، شہد، شربت وغیرہ۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ برف کی طرح تھا جو دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوتا تھا۔ لیکن اکثر کا خیال ہے کہ یہ ترنجبین تھی۔ ترنجبین سے متعلق قدیم طب کی کتابوں میں یہ درج ہے کہ شہد کی طرح جمی ہوئی اور لذیذ، آسمان سے گرنے والی شبنم کی طرح ایک قسم کی چیز ہے۔ بہر حال انتا یقینی ہے کہ کوئی لذیذ قدرتی غذا تھی جو بنی اسرائیل کو مسلسل مسافرت کے زمانہ میں، بلا مشقت و تھکاوٹ مل جاتی تھی۔

سلویٰ: یہ ایک پرندہ تھا جو بٹیر سے مشابہ تھا اللہ ﷻ بنی اسرائیل کے پاس خوب زیادہ تعداد میں پرندے بھیج دیتا تھا جو بنی اسرائیل کی قیام گاہوں کے آس پاس کثرت سے منڈلاتے رہتے اور کوئی انہیں پکڑنا چاہتا تو آسانی سے پکڑ لیتا۔ وہ لوگ ان کو ذبح کر دیتے تھے۔ بٹیر جزیرہ نمائے سینا کا خاص جانور ہے اور بڑی کثرت سے پایا جاتا ہے۔ گرمی میں شمال کی طرف چلا جاتا ہے اور جاڑے میں جنوب کی طرف پھر آ جاتا ہے۔ یہ پرندہ اونچا نہیں اُڑتا بلکہ بہت نیچے رہتا ہے، بہت جلدی تھک جاتا ہے اور شکار بڑی آسانی سے ہو جاتا ہے۔ ان کا گوشت چربی دار ہوتا ہے، رکھنے سے بہت جلد خراب ہو جاتا ہے۔

عملی پہلو: کفرانِ نعمت اور منعم حقیقی کی مسلسل نافرمانی کرنے والے بالآخر اللہ ﷻ کے غضب کو دعوت دیتے ہیں۔

آیت نمبر ۱۶۱: جب بنی اسرائیل نے مختلف سبزیوں کی فرمائش کی تو ان سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ کسی شہر میں چلے جاؤ وہاں یہ سب کچھ دستیاب ہو جائے گا اور شہر جاتے ہوئے تواضع و انکساری کے حِطّۃ یعنی گناہوں کی معافی کی صدا لگاتے جانا مگر ظالموں نے اس لفظ کو بدل دیا اور گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے جس پر ان کو عذاب ہوا اور طاعون کی بیماری سے ہزاروں ہلاک ہوگئے۔ ایک قول کے مطابق یہ واقعہ حضرت یوشع علیہ السلام کے دور میں پیش آیا تھا۔ واضح رہے کہ بسا اوقات تاریخی ترتیب کو قرآنِ حکیم ملحوظ نہیں رکھتا ہے بلکہ اصل مقصود عبرت و موعظت کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔

علمی و عملی بات: ایک چیز قرآنِ حکیم کا مطالعہ کرتے وقت ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیئے وہ یہ کہ قرآنِ حکیم جن واقعات کا ذکر کرتا ہے اس سے مقصود صرف عبرت و نصیحت ہوتی ہے اس سے اس واقعہ کی تاریخی حیثیت کا بیان مطلوب نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآنِ حکیم ان واقعات کے صرف اُن پہلوؤں کو بیان کرتا ہے جن میں درسِ عبرت ہو۔ عموماً تفصیلات کو حکمت کے پیش نظر ذکر نہیں کیا جاتا چنانچہ جو لوگ قرآنِ حکیم کی اس خصوصیت کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتے وہ عموماً قصص قرآنی کی تفصیلات کا تسلسل اور زمان و مکاں کا تعین نہیں کر پاتے لہٰذا بعض اوقات خلجان و پریشانی کا شکار ہوتے ہیں لہٰذا ہمیں سیرت کی مستند کتابوں کا مطالعہ بھی کرنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۱۶۲: بنی اسرائیل نے اللہ ﷻ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نافرمانی اختیار کی۔ اس نافرمانی کا یہ نتیجہ نکلا کہ ان پر عذاب مسلّط کر دیا گیا۔

(سورۃ البقرۃ ۲: آیات ۵۸ اور ۵۹) چالیس سال صحرا میں بھٹکنے کے بعد جب یہ قوم اس بستی میں داخل ہوئی تو اس نے تمام وعدوں اور اللہ ﷻ کے احکامات کو بھلا دیا اور تکبر، سرکشی اور تمسخر کے ساتھ داخل ہوئے اور زبان پر توبہ کے کلمات کے بجائے دنیا طلبی کے کلمات جاری ہوگئے۔ تو پھر اللہ ﷻ نے ان پر "طاعون" جیسی بیماری کا عذاب مسلّط کر دیا جس سے لاتعداد بنی اسرائیل موت کا شکار ہوئے۔

بنی اسرائیل کی زندگی سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر وہ اپنے نبی کا کہا مانتے، اطاعت کرتے تو جس اللہ ﷻ نے صحرا میں کھانا، پانی اور سایہ عطا فرمایا، جس نے بغیر کسی جنگ کے ایک ملک عطا فرما دیا تھا اگر وہ اللہ ﷻ کی شکر گزاری کرتے تو اللہ ﷻ ان کو اس سے بھی زیادہ نعمتوں سے نوازتا لیکن ان کی سرکشی انہیں لے ڈوبی اور وہ عبرتناک انجام سے دوچار ہوئے۔

آیت نمبر ۱۶۳: دورِ نبوی ﷺ کے یہود کو اصحاب سبت کے واقعہ کی یاددہانی کرائی گئی۔ اس یاددہانی کا مقصد یہ بتانا تھا کہ یہ واقعہ اللہ ﷻ کے رسول ﷺ کے علم میں ہے جو آپ ﷺ کی صداقت کی دلیل ہے۔ اصحابِ سبت وہ تھے جنھوں نے سبت یعنی ہفتہ کے دن کے قانون کی خلاف ورزی کی۔ ان کا تعلق بنی اسرائیل کے ایک قبیلہ سے تھا جو ایک دریا کے کنارے آباد تھا۔ اُن کے لئے ہفتہ کا دن عبادت کے لئے مقرر تھا اور اس دن مچھلیوں کے شکار کی ممانعت تھی۔ بطور آزمائش اسی دن مچھلیاں کثرت سے آتیں اور پانی پر ظاہر ہوتیں۔ ان لوگوں نے حیلہ اختیار کر کے اللہ ﷻ کے حکم سے تجاوز کیا اور گڑھے کھود لئے تاکہ مچھلیاں اس میں پھنسی رہیں اور ہفتہ کا دن گزرنے پر وہ انہیں پکڑ لیں۔ یہ ایک آزمائش تھی کیونکہ وہ اللہ ﷻ کی اطاعت سے کوتاہی کرتے تھے اور اللہ ﷻ کی حرمت کو توڑنے کے لئے مختلف طریقے اور حیلے بہانے ڈھونڈتے تھے تاکہ حکم خداوندی سے انحراف کر سکیں۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کے آباؤ و اجداد کا کفرانِ نعمت اور ان کی سرکشی کے ایک واقعہ کا بیان ہے۔ یہود بھی اس سے بخوبی واقف ہیں۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ احکام خداوندی سے جان بوجھ کر انحراف کرنا یہود کی پُرانی آبائی خصلت ہے جس کی سزا ان کو ملتی رہی۔ اسی لئے ان کی صورتوں کو مسخ کر کے بندر بنا دیا گیا جو انتہائی ذلت اور عبرت ناک سزا تھی۔

آیت نمبر ۱۶۴: بستی میں رہنے والے تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔

۱۔ ہفتہ کے دن حیلہ کر کے مچھلی کا شکار کرنے والے۔

۲۔ حیلہ سازی سے منع کرنے اور اللہ ﷻ کی نافرمانی سے مسلسل روکنے والے۔

۳۔ وہ جو حیلہ تو نہیں کرتے تھے لیکن تبلیغ کر کے تھک چکے تھے اور اب حیلہ کرنے والوں کو منع بھی نہیں کرتے تھے۔

آیت میں تیسرے گروہ کا دوسرے گروہ کو وعظ و نصیحت سے روکنے کا بیان ہے۔ دوسرے گروہ کی طرف سے نہی عن المنکر کے فریضہ کو اختیار کرنے کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ: ۱۔ وہ اللہ ﷻ کے سامنے اپنا فریضہ ادا کر کے بری الذمہ ہو جائیں۔ ۲۔ شاید نافرمانی کرنے والے اللہ ﷻ سے ڈر کر خلاف ورزی ترک کر دیں اور توبہ کر کے پھر عذاب الٰہی سے بچ جائیں۔

عملی پہلو: اُس بستی کے ایک گروہ نے اللہ ﷻ کے حکم کی مسلسل خلاف ورزی کی اور مختلف حیلوں بہانوں سے ہفتے کے دن مچھلی کا شکار جاری رکھا اور اللہ ﷻ کی قائم کردہ حرمت کو پامال کر دیا۔ اس وقت بنی اسرائیل کا وہ طبقہ جو نافرمانوں سے الگ اور لاتعلق تھا وہ نصیحت کرنے والوں سے کہتا تم ان لوگوں کو نصیحت کرتے ہو جو تمہاری نصیحت کا کوئی اثر نہیں لیتے اور بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اللہ ﷻ ان کو ضرور سخت عذاب دے گا۔ ایسے لوگوں کو نصیحت کرنے سے کیا فائدہ۔ اس کے جواب میں منع کرنے والے لوگوں نے کہا کہ اللہ ﷻ نے نیکی کا حکم کرنا اور بُرائی سے روکنا ہم پر فرض کیا ہے۔ اسی لئے ہم ان کو نصیحت کرتے ہیں کہ ہم اللہ ﷻ کے سامنے یہ کہہ سکیں کہ ہم نے اپنا فریضہ انجام دیا تھا نیز شاید وہ کسی وقت ہماری نصیحت کا اثر قبول کرتے ہوئے اپنی نافرمانی سے باز آجائیں اور توبہ کر لیں۔

عملی پہلو: مذکورہ واقعہ سے دو اہم ترین نکتے حاصل ہوئے ہیں، پہلا نکتہ یہ ہے کہ جب معاشرے میں نافرمانی کا دور دورہ ہو جائے تو مسلمان کی ذمہ داری صرف یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو بچالے بلکہ دوسروں کو راہِ راست کی دعوت دینا بھی اس کی ذمہ داری ہے جس کے بغیر وہ مکمل طور پر بری الذمہ نہیں ہو سکتا، دوسرا نکتہ یہ ہے کہ حق کی دعوت دینے والے کو کبھی مایوس ہو کر نہیں بیٹھنا چاہیئے بلکہ پُر امید رہ کر پیغام حق پہنچاتے رہنا چاہیئے کہ شاید کوئی اللہ ﷻ کا بندہ بات سمجھ کر راہِ راست پر آجائے۔

آیت نمبر ۱۶۵: **نہی عن المنکر کے فریضہ کی اہمیت:** پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو بھلا دیا جو ان کو کی گئی تھی اور وہ سرکشی میں حد سے بڑھ گئے تو اللہ ﷻ نے ان لوگوں کو تو بچا لیا جو ان کو بُرائی سے روکتے تھے اور گناہ کا ارتکاب کرنے والے ظالموں کو ان کی نافرمانی کے سبب سخت عذاب میں پکڑ لیا اور ان کی صورتیں مسخ کر کے ان کو بندر بنا دیا۔ پھر تین دن بعد وہ سب مر گئے۔

COPYRIGHTS © RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION. SALE OF THIS BOOK WOULD ENTAIL CRIMINAL ACTION.

فرمانِ نبوی ﷺ: "جو شخص تم میں سے کوئی بُرائی دیکھے تو اسے چاہیئے کہ اپنے ہاتھ (قوت) سے بدل دے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے روکے، یہ بھی نہ کر سکے تو دل میں ہی بُرا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے"۔ (صحیح مسلم)

فرمانِ نبوی ﷺ: سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب لوگ ظالم کو (ظلم کرتے) دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عمومی عذاب نازل ہو۔ (جامع ترمذی)

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ارتکاب کرکے اصحابِ سبت نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ نیک لوگوں کی نصیحت نہ ماننے اور حیلہ سے باز نہ آنے پر ان پر عذاب کا نزول ہوا۔ بہر حال بُرائی سے روکنے والے عذاب سے بچائے گئے۔ نجات کے لئے نیک بننے کے ساتھ اپنی استطاعت کے بقدر بھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنا لازم ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: "تم لازماً نیکی کا حکم دوگے اور بدی سے روکوگے اور اگر ایسا نہ کیا تو تم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے گا۔ پھر تم دُعائیں کروگے اور تمہاری دُعائیں قبول نہ ہوں گی"۔ (جامع ترمذی)

آیت نمبر ۱۶۶: عذاب کے باوجود اصحاب سبت کا حد سے گزرنے پر انجام بد کا بیان ہے۔ ان کو بندروں کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا۔ کچھ وقت کے بعد وہ مر گئے۔ اس واقعہ کو موجودہ اور آئندہ اور آنے والوں کے لئے باعث عبرت بنا دیا گیا ہے۔

یہ لوگ اپنی سرکشی کی وجہ سے دنیا میں بندر بنا دیئے گئے اور بنی اسرائیل کو کہہ دیا گیا تھا کہ اگر تم نے نافرمانی اختیار کی تو اللہ تعالیٰ تمہیں ہمیشہ ذلیل ورسوا اور غیر اقوام کا محکوم رکھے گا چنانچہ مدّت سے یہودی کسی نہ کسی سلطنت کے محکوم و مقہور ہی چلے آئے ہیں اور اب جو یہود کی ظاہری حکومت قائم ہے وہ عیسائی حکومتوں کی دست نگر ہے یہاں بھی در پردہ عیسائی حکومتیں اس کی پشت پناہی کر رہی ہیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وقت قرب قیامت ہے اور عنقریب قیامت کی نشانیاں پوری ہونے کے بعد اس کا وقوع ہو جائے گا۔

آیت نمبر ۱۶۷: بنی اسرائیل پر ان کی بداعمالیوں کی پہلی دنیاوی سزا کا بیان ہے۔ ان پر قیامت تک ایسے سخت گیر افراد مسلّط کئے جائیں گے۔ جو انہیں سخت عذاب میں مبتلا کرنے کے ساتھ اپنا محکوم بنا کر رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت شان تو یہ ہے کہ وہ عَزِیْزٌ ذُوانْتِقَام اور سَرِیْعُ الْعِقَاب ہے اور اس کی دوسری شان یہ ہے کہ وہ غَفُوْرٌ رَّحِیْم ہے۔ اب یہ انسانوں کے طرزِ عمل پر منحصر ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس کی کس شان کا مستحق بناتے ہیں۔

دورِ نبوی ﷺ اور قیامت تک کے یہود کو تنبیہ کی گئی کہ توبہ کرکے اسلام قبول کر لیں تو ذلّت و رُسوائی سے بچ سکتے ہیں۔ کسی قوم پر ظالم حکمران کا تسلّط بھی اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے جو اس قوم کی نافرمانیوں کی وجہ سے آتا ہے۔

علمی بات: قوم یہود حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد سے آج تک محکوم بنی رہی ہے۔ کبھی یونانی، کشدانیوں اور کلدانیوں نے ان کو غلام بنایا، کبھی نصرانیوں کے زیر تسلّط رہے اور ان کو جزیہ وخراج دیتے رہے۔ تقریباً چودہ سو سال تک وہ مسلمان حکومتوں کے باجگزار رہے۔ اب تقریباً ۶۴ سال سے جو اسرائیل کے نام سے حکومت قائم ہے وہ یہودیوں کی حکومت نہیں ہے بلکہ حقیقت میں وہ امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کی چھاؤنی ہے اور اس چھوٹے سے علاقے کے یہودی امریکہ اور مغربی ممالک کے سہارے سے زندہ ہیں اور امریکی حکومت کے غلام ہیں۔ آخر کار وہ دجال کے مددگار بن کر نکلیں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد مسلمان ان کو قتل کر دیں گے۔ یہ سب قربِ قیامت میں ہوگا۔ مسلمانوں کو اس میں ایک گونہ بشارت ہے کہ اگر آج بھی مسلمان اپنی منتشر جمیعت کو یکجا و باہمت بنا لیں تو یہود کو دست نگر و پست کرنا کچھ مشکل نہیں۔

آیت نمبر ۱۶۸: اس آیت میں یہود کو ان کی بداعمالیوں کے نتیجہ میں دنیا میں دی گئی دوسری سزا کا بیان ہے۔ کہ ان کی آبادی دنیا کے مختلف حصوں میں منتشر کرکے اللہ تعالیٰ نے ان کی جمیعت کو منتشر کر دیا۔ وہ دنیا کے مختلف ممالک میں بے بس اقلیت بن کر رہ گئے۔ ان میں سے بعض نیکوکار بھی ہیں۔ یعنی ان میں سے بعض تورات کے احکام پر کاربند رہنے والے ہیں اور بعض بدکار بھی ہیں۔ اسی طرح یہود کو خوشحالی اور تنگدستی دونوں حالتوں سے آزمائے جانے کا بیان بھی ہے۔ کہ ان کو راہِ راست پر لانے کے لئے ان کے ساتھ لطف و عنایت کا رویہ بھی اپنایا گیا اور ان سے شدت و سختی والا معاملہ بھی اختیار کیا گیا۔ ان کی آزمائش کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی بداعمالیوں سے باز آکر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔

عملی پہلو: بنی اسرائیل نے اللہ ﷻ کی طرف رجوع کرنے کے بجائے خواہشات نفسانی اختیار کی جس سے ان کی بھلائی کی طاقت وقوت مفلوج ہو کر رہ گئی اور وہ اپنی غلطی کا احساس رکھنے کے باوجود بھی اسی پر اڑے رہے۔ اور اپنے آپ کو اس دھوکہ میں رکھا کہ ہماری بخشش کردی جائے گی کہ ہم اللہ ﷻ کے پیارے اور اس کے لاڈلے ہیں وغیرہ۔ سو یہی ان لوگوں کی من گھڑت امیدیں اور بے بنیاد آرزوئیں تھیں جنہوں نے ان کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا اور یہ عزّت وعظمت کی بلندیوں سے گر کر ذلّت ورُسوائی کے ہولناک گڑھے میں جا پہنچے۔

بنی اسرائیل کے دورِ انتشار کی مختصر تاریخ: بنی اسرائیل کا یہ دورِ انتشار (Diaspora) ۷۰ عیسوی میں شروع ہوا، جب رومن جنرل ٹائٹس نے ان کے معبد ثانی (2^{nd} Temple) کو شہید کیا (جو حضرت عزیر علیہ السلام کے زمانے میں دوبارہ تعمیر ہوا تھا)۔ ٹائٹس کے حکم سے یروشلم میں ہزاروں یہودیوں کو ایک دن میں قتل کیا گیا اور بچ جانے والوں کو فلسطین سے نکال کر باہر کیا گیا۔ چنانچہ یہاں سے ملک بدر ہونے کے بعد یہ لوگ مصر، ہندوستان، روس اور یورپ کے مختلف علاقوں میں جا بسے۔ پھر جب امریکہ دریافت ہوا تو بہت سے یہودی خاندان وہاں جا کر آباد ہوگئے۔ اس آیت میں ان کے اسی انتشار کی طرف اشارہ ہے کہ پوری دنیا میں انہیں منتشر کر دیا گیا اور اس طرح ان کی اجتماعیت ختم ہو کر رہ گئی۔

آیت نمبر ۱۶۹: اس آیت میں یہود کے علماء کا دنیا کے حقیر مال کے عوض دین فروشی کا بیان ہے کہ وہ تورات میں تحریف کے مرتکب تھے۔ انہوں نے اللہ ﷻ سے کیئے گئے عہد کی پاسداری نہ کی۔ وہ طالب دنیا ہونے کے باوجود مغفرت کی امید رکھتے ہیں۔ اور اللہ ﷻ کی طرف ناحق باتیں منسوب کرتے ہیں۔ اسی طرح دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دینے والوں کے لئے بشارت کا ذکر بھی ہے۔

علمی بات: ایک زمانے میں بنی اسرائیل میں اچھے اور بُرے سب طرح کے لوگ تھے۔ پھر ان لوگوں کے بعد ان کے جانشین ایسے ناخلف لوگ بنے کہ وہ تورات کے وارث بننے کے باوجود محض تھوڑے سے دنیاوی فائدے کی خاطر اور اسے ہی سب کچھ سمجھتے ہوئے آخرت پر ترجیح دیتے رہے اور اپنے دل کو یہ کہہ کر بہلا لیتے ہیں کہ پھر توبہ کرلیں گے، اس کے بعد جب دوبارہ مالی نفع کی کوئی صورت نکل آتی تو پھر حسب سابق دنیا کے بدلے دین کو بیچ دیتے، تورات میں تحریف کر کے، غلط مسئلہ اور غلط حکم بتا دیتے چنانچہ اس طرح انہوں نے تھوڑے سے دنیاوی فائدے کے لئے اپنی آخرت خراب کر ڈالی۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد یہی لوگ تورات وانجیل کے وارث تھے اور اللہ ﷻ نے ان سے اس بات کا عہد لیا کہ حق بات کے سوا کوئی دوسری بات اللہ ﷻ کی طرف منسوب نہ کرنا، لوگوں کو حق بات کی تلقین کرنا اور حق کو نہ چھپانا لیکن انہوں نے اس حکم کو پس پشت ڈال دیا۔ وہ بخشش کی آرزو تو رکھتے ہیں مگر گناہوں کو نہیں چھوڑتے اور نہ توبہ پر قائم رہتے ہیں۔ اللہ ﷻ سے ڈرنے والوں کے لئے تو آخرت کا گھر ہی بہتر ہے۔ مگر پھر بھی یہ لوگ دنیا پر فریفتہ تھے۔ اور اتنی سادہ بات بھی نہیں سمجھتے تھے۔

عملی پہلو: یہود کا یہ مرض لاعلاج تھا۔ اور اس سے باز آنے کی ایک ہی صورت تھی کہ ان کے دل میں عذابِ الٰہی کا خوف پیدا ہو اور اپنے ہولناک انجام سے ڈر کر وہ توبہ کریں۔ لیکن وہاں تو اب اس کی کوئی گنجائش بھی نہ رہی تھی۔ کیونکہ وہ ایک شدید مغالطہ میں مبتلا تھے کہ ہم اللہ ﷻ کے لاڈلے اور پیارے ہیں۔ ہمیں دوزخ کی آگ نہیں جلا سکتی۔ نیز ہم تورات کے عالم ہیں۔ ہمارے لئے اللہ ﷻ کی جناب میں ایسی خصوصی رعایتیں ہیں جن کی وجہ سے اس قسم کی بے راہ روی ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ ہماری بخشش کا ہم سے پختہ وعدہ کیا گیا ہے۔

عملی پہلو: جب کسی قوم کے ذمہ دار اور تعلیم یافتہ طبقہ کی اخلاقی پستی اور دنیا کی مادہ پرستی کا یہ حال ہو تو ان کے عوام کی حالت کیسی ہوگی۔ اُمّتِ مسلمہ کے اہل علم حضرات کو اپنی اولاد کی دینی تعلیم وتربیت کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیئے۔ مبادا ان کی اولاد بھی ان روحانی بیماریوں میں مبتلا ہو جائے جن میں بنی اسرائیل کی اولاد مبتلا ہوگئی اور نتیجتاً اللہ ﷻ کے غضب کا شکار ہو کر اپنی آخرت تباہ وبرباد کر ڈالی۔ (اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا)

آیت نمبر ۱۷۰: اس آیت میں نافرمانوں کے بعد نیک لوگوں کی تین صفات کا بیان ہے۔

۱۔ وہ کتاب اللہ کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ ۲۔ نماز قائم کرتے ہیں۔

۳۔ اپنی اصلاح کے ساتھ دوسروں کی اصلاح کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ ان صفات کے حامل بندوں کا اجر ضائع نہیں کیا جاتا۔

عملی پہلو: اگر کوئی شخص احکامِ الٰہی پر کاربند ہے تو اس کے آباؤ واجداد کے اعمال بد کی وجہ سے اس کے اعمال غارت نہیں کیئے جائیں گے بلکہ اس کو ان کا اجر عظیم عطا فرمایا جائے گا۔

علمی بات: مفسرین کرام کی ایک رائے کے مطابق کہ ان سے حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے اہل کتاب مؤمنین ساتھی مراد ہیں جو تورات پر بھی ایمان لائے تھے اور تورات میں انہوں نے اس طرح کی تحریف نہیں کی تھی اور نہ اس کے احکام کو بگاڑ کر کمائی کا ذریعہ بنایا تھا بلکہ خالص تورات پر عمل کرتے تھے پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی ایمان لائے اور آپ علیہ السلام کی اتباع کی۔

علمی و عملی بات: ۱۔ کتاب سے مراد وہی کتاب ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے یعنی تورات اور یہ بھی ممکن ہے کہ تمام آسمانی کتب تورات، زبور، انجیل، قرآنِ حکیم سب مراد ہوں۔

۲۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو صرف تبرکاً، اور تعظیم کے ساتھ رکھ لینا کافی نہیں ہو تا بلکہ اس کے احکام کی پابندی بھی لازم ہے۔

۳۔ تیسرا یہ کہ یہاں احکام تورات کی تعمیل اور پابندی کا ذکر تھا اور احکام تورات سینکڑوں ہیں، ان سے اس جگہ صرف اقامت صلوٰۃ کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ کتاب اللہ کے احکام میں سب سے زیادہ اہم اور افضل و اعلیٰ نماز ہے نیز یہ کہ نماز کی پابندی احکام الٰہیہ پر کاربند ہونے کی خاص نشانی ہے کہ اس کے ذریعہ فرماں بردار اور نافرمانوں کی پہچان ہوتی ہے اور اس کی پابندی میں یہ خاصیت ہے کہ جو نماز کا پابند ہو گیا اس کے لئے دوسرے احکام خداوندی کی پابندی بھی سہل ہو جاتی ہے اور جس نے نماز کی پابندی نہ کی اس سے دوسرے احکام کی پابندی بھی نہ ہو سکے گی، جیسا کہ حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ نماز دین کا ستون ہے (جس پر اس کی تعمیر کھڑی ہوئی ہے) جس نے اس ستون کو قائم کر لیا اس نے دین کو قائم کر لیا اور جس نے اس کو منہدم کر دیا اس نے پورے دین کی عمارت منہدم کر دی۔

آیت نمبر ۱۷۱: اس آیت میں بنی اسرائیل سے کئے گئے ایک خاص وعدہ کا ذکر ہے جو ان سے اس وقت لیا گیا جب طور پہاڑ کو زمین سے اٹھا کر ان کے سروں پر معلق کر دیا گیا تھا۔ اور اسی کیفیت و حالت میں ان سے تمام شریعت پر عمل کرنے کا عہد لیا گیا۔

علمی بات: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمائی تو انہوں نے بنی اسرائیل کو فریضۂ تبلیغ سے متعلق اللہ تعالیٰ کا حکم سنایا اور انہیں تورات کو قبول کرنے اور اس کے احکام پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ بنی اسرائیل کو یہ بات گراں گزری۔ چنانچہ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس کتاب میں دیئے ہوئے احکام سخت اور دشوار ہیں اس لئے ہم سے اس پر عمل نہیں ہو سکتا۔ اس پر فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوہ طور کے ایک حصے کو اٹھا کر سائبان کی طرح ان کے سروں پر معلّق کر دیا۔ پھر ان سے کہا گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی وحی اور اس کے احکام ہیں۔ اس میں حلال و حرام اور امر و نہی کا ذکر ہے۔ پس تم اس کو قبول کر لو۔ اگر تم تورات اور اس کے احکام کو نہیں مانو گے تو یہ پہاڑ تمہارے سروں پر گرا دیا جائے گا۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ پہاڑ اب ان پر گرہی جائے گا، تب انہوں نے تورات اور اس کے احکام پر عمل کرنے کا عہد کیا۔

علمی بات: یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ قرآنِ حکیم کا عام اعلان ہے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ یعنی "دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں" کہ کسی کو زبردستی دین حق کے قبول کرنے پر مجبور کیا جائے، اور اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو دین کے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ لیکن ذرا غور کیا جائے تو دونوں میں فرق نظر آئیگا کہ کسی غیر مسلم کو اسلام کے قبول کرنے پر کبھی کہیں مجبور نہیں کیا گیا، لیکن جو شخص مسلمان ہو کر اسلامی عہد و میثاق کا پابند ہو گیا اس کے بعد وہ اگر احکام اسلام کی خلاف ورزی کرنے لگے تو اس پر ضرور جبر کیا جائے گا اور خلاف ورزی کی صورت میں سزا دی جائے گی، اسلامی تعزیرات میں بہت سی سزائیں ایسے لوگوں کے لئے مقرر ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کا تعلق غیر مسلموں سے ہے کہ ان کو بالجبر مسلمان نہیں بنایا جائے گا اور بنی اسرائیل کے اس واقعہ میں کسی کو اسلام قبول کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا گیا بلکہ ان لوگوں نے مسلمان ہونے کے باوجود تورات کے احکام کی پابندی سے انکار کر دیا، اس لئے ان سے جبراً پابندی کا عہد لینا لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ میں شامل نہ ہو گا۔

علمی بات: بنی اسرائیل پر طور پہاڑ بد عہدی کی سزا میں اٹھایا گیا ہے جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہدایت کے بعد وہی قوم گمراہ ہوتی ہے جو دین کی باتوں کو زبردستی کے جھگڑوں میں ڈال دے۔ اس حدیث کو آیت کی تفسیر میں بڑا دخل ہے کیونکہ آیت اور حدیث کو مدِ نظر رکھ کر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوّت تسلیم کرنے میں جو پس و پیش سے کام لیتے تھے ان کو اللہ تعالیٰ نے یہ بات یاد دلائی ہے کہ جس تورات پر عمل کرنے کا عہد تمہارے بڑوں سے لیا جا چکا ہے اسی تورات میں نبی آخر

الزمان ﷺ کے اوصاف اور ان پر ایمان لانے کا عہد موجود ہے پھر پس و پیش سے کام لینا اور جان بوجھ کر انکار کرنا چنانچہ تورات کا عہد یاد رکھ کر اور اس کے مطابق عمل پیرا رہنا چاہیئے اور بد عہدی کے وبال سے ڈرنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۱۷۲: اس آیت میں تا قیامت پیدا ہونے والے تمام انسانوں کی روحوں سے لئے گئے "عہد الست" کا بیان ہے۔ جس میں اللہ ﷻ نے اپنے رب ہونے کا عہد لیا تھا۔ تمام روحوں نے اللہ ﷻ کے اپنے رب ہونے کا اقرار کیا۔ یہ عہد لینے کی ایک وجہ یہ تھی:

عہد کی پہلی وجہ کہ تمام انسانوں پر اللہ ﷻ کی طرف سے اِتمامِ حجت ہو جائے تاکہ وہ قیامت کے دن کا انکار نہ کر سکیں کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے۔

علمی بات: یہی عہد روزِ قیامت مؤاخذہ کی اصل بنیاد ہے کہ ان کو انکار کا موقع نہ مل سکے گا کہ جس کی وجہ سے وہ اپنی حجت قائم کر سکیں نیز اس سے یہ فائدہ بھی ہوا کہ اسی عہد کی بنیاد پر توحید کی معرفت ہر انسان کے باطن میں رکھ دی گئی ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: ہر پیدا ہونے والا بچہ دینِ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں (صحیح بخاری)۔

حدیثِ قدسی ہے اللہ ﷻ فرماتا ہے میں نے اپنے بندوں کو حنیف (اللہ ﷻ کی طرف یکسوئی سے متوجہ ہونے والا) پیدا کیا ہے۔ پس شیطان ان کو ان کے دین (فطرت) سے گمراہ کر دیتا ہے۔ (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۱۷۳: اس آیت میں "عہد الست" کی دوسری وجہ کا بیان ہے کہ انسان اپنے آباؤ اجداد پر اپنی گمراہی کی ذمہ داری ڈال کر خود بری الذمہ نہ ہو جائے۔ دنیا میں اس عہد کی یاد دہانی انبیاء کرام علیہم السلام اور آسمانی کتب کے ذریعہ کرا دی گئی۔ ہر شخص سے یہ عہد انفرادی طور پر لیا گیا تھا تاکہ وہ یہ نہ کہہ سکے کہ اصل میں مشرک یا قصوروار تو ہمارے آباؤ اجداد تھے اور ہمیں محض ان کی اولاد ہونے کی سزا کیوں دی جا رہی ہے؟

نوٹ: متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے موقع پر پیش آیا تھا۔ اس وقت جس طرح فرشتوں کو جمع کر کے انسانِ اوّل کو سجدہ کرایا گیا تھا اور زمین پر انسان کی خلافت کا اعلان کیا گیا تھا، اسی طرح پوری نسلِ آدم کو بھی، جو قیامت تک پیدا ہو گی، اللہ ﷻ نے بیک وقت وجود اور شعور بخش کر اپنے سامنے حاضر کیا تھا اور ان سے اپنی ربوبیت کی شہادت لی تھی۔

آیت نمبر ۱۷۴: ان آیات کا اطلاق احکام، دلائل اور معجزات سب پر ہوتا ہے۔ اللہ ﷻ کی آیات پر غور کرنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان اللہ ﷻ کی ربوبیت کا اعتراف کرے اور یہ اعتراف اسے اطاعتِ باری تعالیٰ پر آمادہ کرے۔ آیات کے واضح بیان کے باوجود شرک اور کفر میں مبتلا ہونے والا خود مجرم ہے۔ آخرت میں ایسے شخص کا کوئی عذر قبول نہیں ہو گا۔

عملی پہلو: اللہ ﷻ لوگوں پر اپنی قدرت کی نشانیاں اس لئے ظاہر کرتا ہے تاکہ وہ اس میں غور و فکر کریں اور اللہ ﷻ کو پہچان کر اسی کی عبادت کریں، غفلت اور کج روی سے باز آجائیں، مطلب یہ ہے کہ آیاتِ الٰہیہ میں ذرا بھی غور کریں تو وہ اس عہد و میثاق کی طرف لوٹ آئیں جو ازل میں کیا گیا تھا۔

آیت نمبر ۱۷۵: اس آیت میں ایک ایسے شخص کا ذکر ہے جس کو اللہ ﷻ نے اپنی آیات کا علم عطا فرمایا تھا۔ وہ شخص دنیا کی محبت میں ڈوب گیا اور خواہشات کی پیروی میں لگ گیا۔ چنانچہ آیاتِ الٰہی کو فراموش کرنے اور ذکرِ الٰہی سے غفلت کی وجہ سے شیطان اس پر مسلّط ہو گیا۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے "جو رحمٰن کے ذکر سے غافل ہوتا ہے اس پر شیطان مسلّط کر دیا جاتا ہے" (سورۃ الزخرف ۴۳، آیت: ۳۶) بالآخر اس کا انجام گمراہی کی صورت میں سامنے آیا۔

علمی و عملی بات: سانپ کے اپنی پرانی کھال یعنی خول کو اتار دینے کو عربی میں انسلخت الحیة من جلدھا کہتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جس طرح سانپ اپنی پہلی کھال (کینچلی) کو اتار پھینکتا ہے اسی طرح اس شخص نے بھی ان آیات و ہدایات کو اتار کر پھینک دیا اور اس کی جگہ گمراہی اور ضلالت کا لباس اوڑھ لیا۔ "اَتْبَعَ" کا معنی ہے کسی کے پیچھے لگنا۔ جب انسان دانستہ آیاتِ ربانی کو فراموش کرتا ہے اور انہیں پس پشت ڈال دیتا ہے تو شیطان اس پر مسلّط ہو جاتا ہے اور ہر لمحہ اس کے دل میں وسوسہ اندازی کرنے لگتا ہے۔ نتیجتاً وہ اللہ ﷻ کی نافرمانی کر کے باغی بن جاتا ہے۔

آیت نمبر ۱۷۶: وہ ہر شخص اللہ ﷻ کی آیات پر ایمان لا کر اور ان کی قدر کر کے اور احکامِ الٰہی کی پیروی سے بڑا رتبہ حاصل کر سکتا ہے۔ مگر بسا اوقات انسان اللہ ﷻ کی آیات کو جانتے ہوئے بھی ان کی قدر دانی نہیں کرتا اور محض دنیاوی مفادات کی خاطر اللہ ﷻ کا نافرمان بن جاتا ہے۔ زمین کی طرف مائل ہونے سے مراد مادی مفادات ہی میں کھو جانا ہے چنانچہ مذکورہ آیت میں ذکر کردہ وہ شخص اپنی خواہشاتِ نفس کی لالچ میں وہ اس انتہا کو پہنچ گیا کہ اسے کتے سے تشبیہ دی

گئی۔ "یلھث" تھکاوٹ یا پیاس وغیرہ کی وجہ سے زبان باہر نکال کر ہانپنے کو کہتے ہیں۔ کتا ہر وقت ہانپتا رہتا ہے۔ حرص و لالچ میں اس کی زبان لٹکتی اور رال (لعاب دہن) ٹپکتی رہتی ہے۔ اسی طرح شیطان کی پیروی کرنے والا شخص دنیا کی لالچ میں مبتلا ہو کر حلال و حرام کی تمیز کھو دیتا ہے۔ آیات کو جھٹلانا قول و فعل دونوں طرح سے ہوتا ہے۔ یہود نے تورات کو عملی طور پر جھٹلایا۔ ان کے لئے گدھے کی مثال بیان ہوئی۔ (سورۃ الجمعہ ۶۲، آیت:۱۰) ان واقعات کے بیان کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اللہ ﷻ سے عہد کو توڑنے کا انجام یاد رکھیں اور اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں۔

علمی بات: "اَلَّذِیْنَ کَذَّبُوْا" سے مشرکینِ مکہ مراد ہیں جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ پہلے تمنا کیا کرتے تھے کہ ان کے پاس اللہ ﷻ کی طرف سے کوئی ہادی اور رہنما آئے۔ جب اللہ ﷻ کا پیغمبر ہادی بن کر آ گیا تو اللہ ﷻ کی آیتوں کی تکذیب کرنے لگے اور ہدایت کو اختیار نہیں کیا ان لوگوں کی مثال بالکل اسی شخص کی سی ہے جسے اللہ ﷻ نے ہدایت دی مگر وہ ہدایت سے نکل کر شیطان کے تابع فرمان ہو گیا۔ اللہ ﷻ کی آیتوں کو جھٹلا کر اپنی جانوں پر ظلم کرنیوالوں کی مثال بہت ہی بُری ہے کوئی عقل مند انسان اس کو اپنے پر چسپاں کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

عملی پہلو: یہ خستہ حالی، پریشانی اور ہر وقت کا اضطراب منکرین حق کے کسی ایک فرد کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بلکہ جو بھی حق کو حق پہچانتے ہوئے اس سے روگردانی کرتا ہے اس کا یہی حال ہوتا ہے۔ اس چیز کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ غفلت کے مارے ہوش میں آئیں اور عبرت و نصیحت حاصل کریں۔

وہ شخص جس کی مثال یہاں پیش کی گئی ہے، آیاتِ الٰہی کا علم رکھتا تھا، یعنی حقیقت سے واقف تھا۔ اس علم کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ وہ اس رویہ سے بچتا جس کو وہ غلط جانتا تھا اور وہ طرزِ عمل اختیار کرتا جو اس کے علم کے مطابق صحیح تھا۔ علم و عمل کی بدولت اللہ ﷻ اس کو انسانیت کے بلند مراتب پر ترقی عطا کرتا۔ لیکن وہ دنیا کے فائدوں، لذّتوں اور آرائشوں کی طرف جھک پڑا، خواہشاتِ نفس کے تقاضوں کو مغلوب کرنے کے بجائے اس نے ان کی پیروی کی اور ان تمام حدود کو توڑ کر نکل بھاگا جن کی حفاظت کا تقاضا خود اس کا علم کر رہا تھا۔ پھر جب وہ محض اپنی اخلاقی کمزوری کی بنا پر جانتے بوجھتے حق سے منہ موڑ کر بھاگا تو شیطان جو قریب ہی اس کی گھات میں لگا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے لگ گیا اور برابر اسے ایک پستی سے دوسری پستی کی طرف لے جاتا رہا یہاں تک کہ اُس ظالم نے اسے ان لوگوں کے زمرے میں پہنچا کر ہی دم لیا جو اس کے دام میں پھنس کر پوری طرح اپنی متاعِ عقل و ہوش گم کر چکے ہیں۔

کتے کی ناک چلتے پھرتے زمین سونگھنے ہی میں لگی رہتی ہے کہ شاید کہیں سے کچھ کھانے کو مل جائے۔ اسے پتھر ماریئے تب بھی وہ یہ توقع رکھتا ہے کہ شاید یہ پھینکی گئی چیز کوئی ہڈی یا روٹی کا کوئی ٹکڑا ہو۔ نفس کا بندہ بھی کچھ اسی صفت کا حامل ہوتا ہے۔ بہت کچھ مل جانے کے باوجود بھی وہ لالچ کا مارا توقعات کی ایک دنیا دل میں لیئے، زبان لٹکائے، ہانپتا رہتا ہے۔ ساری دنیا کو وہ بس حرص ہی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ایک کتا پورے مردار جانور سے صرف اپنا حصہ لینے پر اکتفا نہ کرے گا بلکہ اسے صرف اپنے ہی لئے خاص کرنا چاہے گا اور کسی دوسرے کتے کو اس کے پاس نہ بھٹکنے دے گا۔ الغرض تشبیہ کا مُدعا یہ ہے کہ دنیا پرست آدمی جب علم اور ایمان کی رسّی تُڑا کر بھاگتا ہے اور نفس کی اندھی خواہشات کے ہاتھ میں اپنی باگیں دے دیتا ہے تو پھر کتے کی حالت کو پہنچے بغیر نہیں رہتا۔

عملی پہلو: حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ مثال تمام کفار اور معاندین و مکذبین پر صادق آتی ہے جو حق واضح ہو جانے کے بعد بھی احکامِ الٰہیہ چھوڑ کر کتے کی طرح دنیا کی حرص و طمع میں پڑے رہے اور خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃَ یعنی دنیا و آخرت کی بربادی کا مصداق ٹھہرتے ہیں۔

اس واقعہ میں اہل علم کے لئے بالخصوص اور دیگر لوگوں کے لئے بالعموم تنبیہ اور مقامِ عبرت ہے کہ جس کو اللہ ﷻ علم کے نور اور ہدایت سے نوازے تو وہ نفسانی خواہش کی ہرگز اتباع نہ کرے اور یہ آیت اپنے عموم کے لحاظ سے ہر ہوا پرست عالم کو شامل ہے۔ چنانچہ اس میں یہ سبق مقصد ہے کہ جس شخص کو اللہ ﷻ نے علم و عبادت کے شرف سے نوازا ہو اس کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ احتیاط اور تقویٰ سے کام لینا چاہیئے اور اللہ ﷻ کی پناہ طلب کرتے رہنا چاہیئے۔

لمحہ فکریہ! یہ حقیقت ہے کہ امت قرآنِ حکیم کے احکام اور نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دینے کی وجہ سے زوال کا شکار ہے؟ اللہ ﷻ اور اُس کے رسول ﷺ کے احکامات پر انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر عمل کرنے سے ہی دنیا اور آخرت کی بھلائیاں میسر آئیں گی اور پستی بلندی میں اور کمزوری قوت میں بدل جائیگی۔

آیت نمبر ۱۷۷: اللہ ﷻ کی آیات کو جھٹلانے والوں کے لئے کتے کی مثال سب سے بُری مثال ہے۔ یہ مثال فقط ایک شخص کی نہیں بلکہ پوری قوم کے لئے بھی دی گئی ہے مثلاً مشرکین مکہ یا بنی اسرائیل۔ ایسے لوگ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ وہ اللہ ﷻ کا کوئی نقصان نہیں کرسکتے۔

اس قصّہ میں یہودیوں کے لئے خصوصی طور پر نصیحت اور عبرت حاصل کرنے کا موقعہ ہے کیونکہ انہیں بنی اسرائیل کے پرانے واقعات معلوم تھے اور اس میں مشرکینِ مکہ کے لئے بھی سامانِ عبرت اور نصیحت ہے اور یہ واقعات آنحضرت ﷺ کو کسی انسان نے نہیں بتائے بلکہ آپ ﷺ نے وحی الٰہی کے ذریعے لوگوں کو بتائے ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ یہود کے ساتھ ساتھ مشرکین مکہ کو بھی ایمان لانے کی طرف یہ واقعات مجبور کر رہے ہیں جو کہ آپ ﷺ کی دعوت کا عین منشاء ہے۔

آیت نمبر ۱۷۸: ہدایت یافتہ کو واحد اور گمراہی اختیار کرنے والوں کے لئے جمع کے صیغوں کا استعمال کرنے میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہدایت کا راستہ صرف ایک ہی دین حق ہے، جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر آنحضرت ﷺ تک تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا طریقہ رہا ہے۔ اس لئے حق کی پیروی کرنے والے خواہ کسی زمانے کے ہوں، کسی بھی نبی کی اُمت ہوں، وہ سب ایک ہیں اس کے برعکس گمراہی کے مختلف اور بے شمار راستے ہیں کیونکہ اس کے اسباب بے شمار ہیں۔

علمی و عملی بات: یعنی انسان کو اس کا علم و فضل صرف اس صورت میں فائدہ دے سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس علم پر عمل کرنے کی توفیق بھی نصیب ہو لہٰذا کسی شخص کو اپنی علمی قابلیت اور فضیلت پر نازاں نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ عقل و فکر کی بُرائی سے بچنے اور سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا بھی کرتے رہنا چاہیئے۔ کیونکہ شیطان علم کی راہ سے بھی انسانوں کو گمراہ کر سکتا ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ اکثر گمراہ فرقوں کے پیشوا عموماً ذہین و فطین اور علم رکھنے والے ہی ہوا کرتے ہیں۔

علمی بات: یہاں نبی کریم ﷺ کے لئے تسلّی واطمینان اور قریش کے لئے وعید ہے کہ ہدایت وضلالت کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کا ایک قانون ہے۔ اس کے تحت ہدایت انہی کو ملتی ہے جو اس کے سچّے طالب ہوتے ہیں اور جو خواہشوں کی غلامی اختیار کر لیتے ہیں، وہ گمراہی کے لئے چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ اُنہیں کبھی راہ ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے جس کی سیدھے راستے کی طرف ہدایت ورہنمائی کر دی وہی ہدایت یافتہ ہے اور جس کو فطری صلاحیت استعمال نہ کرنے کی بنا پر گمراہ کر دیا وہ خسارہ اور نقصان اٹھانے والا ہے۔ یہ مضمون قرآنِ حکیم میں متعدد بار آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ صحیح اور غلط دونوں راستے بتا دیئے اور اس کو ایک خاص قسم کا اختیار بھی دے دیا ہے۔ اب اگر وہ چاہے تو اپنے اس اختیار کو استعمال کر کے صحیح اور سیدھا راستہ اختیار کر لے، جو اس کو ثواب اور جنّت کا مستحق بنا دے گا اور چاہے غلط راستہ اختیار کر لے، جو اس کو عذاب اور جہنّم کا مستحق بنا دے گا۔

آیت نمبر ۱۷۹: جنّات اور انسانوں کی اکثریت جہنّم میں جانے کی روش پر کاربند رہتی ہے گویا جہنّم کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو صحیح طور پر استعمال نہیں کرتے۔ ان کے دل معنوی اعتبار سے مردہ، نگاہیں عبرت حاصل کرنے سے قاصر اور کان حق سننے سے محروم ہیں۔ ایسے لوگوں کو چوپایوں سے بدتر کہا گیا ہے کیونکہ پالتو چوپائے بھی اپنے مالک کی خواہش کو اپنی خواہش پر مقدم رکھتے ہیں۔

علمی بات: یہاں ان کے عبرت ناک انجام کی وجہ بیان کی جا رہی ہے کہ ایسے لوگ جہنّم کا ایندھن اس لئے بنائے گئے کہ دعوتِ حق کو سمجھنے، پیغامِ ہدایت کو سننے اور اس کے روشن شواہد کو دیکھنے کی جو صلاحیتیں انہیں عطا فرمائی گئی تھیں انہوں نے انہیں بیکار کر کے چھوڑ دیا اور بے عقل چوپایوں کی طرح ہو کر رہ گئے۔ جس طرح ان چوپایوں کی ساری قوتیں کھانے پینے اور خواہشاتِ نفسانی کی تکمیل میں صرف ہوتی ہیں اسی طرح ان انسان نما حیوانوں کا مقصد بھی یہی ہے کہ اچھا کھائیں اور دوسری لذّتوں سے لطف اندوز ہوں۔ زندگی کا کوئی اعلیٰ مقصد پیش نظر نہیں بلکہ بعض حالات میں تو یہ حیوانوں سے بھی بدتر ہیں کیونکہ وہ حیوانات بے عقل و بے سمجھ ہونے کے باوجود اپنے مالک کی خدمت گزاری سے منہ نہیں موڑتے اور اس کے بلانے پر بھاگے چلے آتے ہیں۔ مگر ان لوگوں کو تو یاد تک نہیں کہ ہمارا بھی کوئی خالق و مالک ہے اس لحاظ سے تو یہ حیوانوں سے بھی بدر جہا بدتر ہیں۔

علمی بات: یعنی جب انسان ہدایت سے منہ موڑتا ہے اور ہٹ دھرمی پر اتر آتا ہے تو نتیجتاً اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔ ان کی آنکھیں انسانی آنکھیں نہیں رہتیں اور نہ ان کے کان انسانی کان رہتے ہیں۔ اب ان کا دیکھنا سننا حیوانوں جیسا رہ جاتا ہے۔ اسی وجہ سے قبولِ ہدایت سے محروم رہتے ہیں۔

آیت نمبر ۱۸۰: اسمائے حسنیٰ سے مراد اللہ تعالیٰ کے مبارک نام ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی صفات، عظمت اور اس کی قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔ اسمائے حسنیٰ کے حوالہ سے دو ہدایات دی گئی ہیں:

۱۔ مشکلات وحاجات کے لئے اللہ تعالیٰ کو پکارا جائے۔ ۲۔ ان ہی ناموں سے اللہ تعالیٰ کو پکارا جائے جو بتائے گئے ہیں۔

نیز اللہ ﷻ کے ناموں میں ٹیڑھ اختیار کرنے والوں سے تعلق رکھنے کی ممانعت کی گئی ہے۔

ٹیڑھ اختیار کرنے کی تین صورتیں:

ا۔ اللہ ﷻ کے ناموں میں تبدیلی کرنا۔ ۲۔ اللہ ﷻ کے ناموں میں اضافہ کرنا یعنی ایسے نام گھڑ لینا جن کی اجازت نہیں۔ ۳۔ اللہ ﷻ کے ناموں کا غلط استعمال کرنا۔

علمی و عملی بات: غافلین کے ذکر کے بعد مؤمنین کو متنبہ فرمانے کے لئے اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ تم غفلت اختیار نہ کرنا، غفلت دور کرنے والی چیز اللہ ﷻ کا ذکر ہے۔ پس تم اس کو اچھے ناموں اور اچھی صفات سے یاد کرو۔ اچھے ناموں سے مراد وہ نام ہیں جو صفات کمال کے اعلیٰ درجے پر دلالت کرنے والے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ کسی کمال کا اعلیٰ درجہ جس سے اوپر کوئی اور درجہ نہ ہو وہ صرف خالق کائنات ہی کو حاصل ہے۔ اس کے سوا مخلوق میں سے کسی کو بھی یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر کامل سے دوسرا شخص اکمل اور ہر فاضل سے دوسرا شخص افضل ہو سکتا ہے جب یہ معلوم ہو گیا کہ اسمائے حسنیٰ اللہ ﷻ ہی کی ذات کے ساتھ خاص ہیں تو اس کو انہی اسماء حسنیٰ کے ساتھ پکارنا ضروری و لازم ہے۔ یہ ہدایت بھی دی گئی ہے کہ جو لوگ اللہ ﷻ کے اسماء حسنیٰ میں تحریف و کج روی یعنی ٹیڑھ سے کام لیتے ہیں اور غلط راہ اختیار کرتے ہیں، آپ ایسے لوگوں سے قطع تعلق کر لیں اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ بہت جلد ان کو اللہ ﷻ کے اسماء وصفات میں کج روی کی سزا مل جائے گی۔

علمی بات: لغت میں الحاد کے معنی ہیں کسی ایک طرف مائل ہونا، اسی سے لحد ہے جو اس قبر کو کہا جاتا ہے جو ایک طرف بنائی جاتی ہے۔ حق سے تجاوز کرنا، سیدھی راہ سے منہ موڑنا۔ دین میں الحاد اختیار کرنے کا مطلب کج روی اور گمراہی اختیار کرنا ہے۔ الحاد کی دو قسمیں ہیں ایک اللہ ﷻ کے ساتھ شرک کرنا ہے یہ ایمان کے منافی ہے۔ دوسری قسم ہے اسباب کو شریک بنانا یہ ایمان کو کمزور کرتا ہے اور ایمان کی گرہ کو نہیں کھولتا۔ اللہ ﷻ کے اسماء میں الحاد کرنے کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم یہ ہے کہ اللہ ﷻ کی ایسی صفت بیان کی جائے جس کے ساتھ اس کو موصوف کرنا جائز نہیں ہے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ ﷻ کی صفات کی ایسی تاویل کی جائے جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے۔

محققین نے بیان کیا ہے کہ اللہ ﷻ کے اسماء میں الحاد تین قسم پر ہے:

ا۔ اللہ ﷻ کے اسماء مقدسہ طاہرہ کا غیر اللہ پر اطلاق کیا جائے جیسا کہ کفار نے اپنے بتوں پر اللہ ﷻ کے ناموں کا ان میں تصرّف کر کے اطلاق کیا۔ مثلاً انہوں نے لفظ اللہ ﷻ سے ہی ایک بت کا نام لات بنایا اور العزیز سے عزّیٰ بنایا اور المنان سے منات بنایا اور مسیلمہ کذّاب کو اس کے پیروکار رحمٰن یمامہ کہا کرتے تھے۔

۲۔ اللہ ﷻ کا ایسا نام رکھنا جو اس کے حق میں جائز نہیں ہے جیسے عیسائی اللہ ﷻ کو "ابو المسیح" یعنی مسیح کا باپ کہتے ہیں۔ (نعوذ باللہ) یا اللہ ﷻ کے ناموں میں اپنی طرف سے اضافہ کر لینا جس کا حکم اللہ ﷻ نے نہیں دیا۔

۳۔ بندۂ اپنے رب کا ایسے الفاظ کے ساتھ ذکر کرے جس کا معنی وہ نہیں جانتا، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ایسے لفظ کا ذکر کرے جس کا معنی اللہ ﷻ کی شانِ عالی کے لائق نہیں ہے یا اس کے ناموں میں کمی کر دی جائے مثلاً اسے ایک ہی مخصوص نام سے پکارا جائے اور دوسرے صفاتی ناموں سے پکارنے کو برا سمجھا جائے اسی طرح اسماء الٰہیہ کو سحر وغیرہ کے لئے استعمال کرنا بھی الحاد کے طریقوں میں شامل ہے۔

آیت نمبر ۱۸۱: ایک رائے یہ ہے کہ اس گروہ سے مراد نبی کریم ﷺ کی اُمت ہے جس کا اصل مصداق حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں اور پھر وہ لوگ جو ان کے نقشِ قدم پر چلیں۔ ہر امت میں ایک گروہ حق پر قائم رہتا ہے خواہ اس کی تعداد کتنی ہی کم ہو۔ یہی الفاظ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے بارے میں آئے تھے۔ (سورۃ الاعراف ۷: آیت ۱۵۹) "اور موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم میں ایک گروہ (ایسا بھی) ہے وہ حق کے ساتھ رہنمائی کرتے ہیں اور اسی کے مطابق انصاف کرتے ہیں۔"

عدل پر قائم اس گروہ کی دو صفات کا بیان ہے:

ا۔ خود بھی شریعت کی اتباع کرتے ہیں۔ ۲۔ اگر کبھی جھگڑا پیش آئے تو اس کا فیصلہ شریعت کے قانون کے مطابق کرتے ہیں۔

عملی بات: اُمّتِ محمدیہ نے ہر قسم کی افراط و تفریط اور کج روی سے علیحدہ ہو کر سچائی اور انصاف و اعتدال کا طریقہ اختیار کیا اور وہ اسی کی لوگوں کو دعوت دیتی ہے۔ اگر ان میں آپس میں کوئی تنازع پیدا ہو جائے تو وہ اپنے جھگڑوں اور غیروں کے معاملات کا فیصلہ عدل و انصاف کے ساتھ کرتی ہے۔

انہوں نے اپنی پوری زندگی کو حق کے تابع بنایا۔ جس جماعت کی قیادت و رہنمائی کی وہ بھی محض حق کے تقاضوں کے تحت کی اور باہمی تنازعات میں بھی ہمیشہ حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کرام رحمۃ اللہ علیہم کی پوری تاریخ اس کی آئینہ دار ہے۔ جب سے اُمّتِ محمدیہ نے ان صفات کو نظر انداز کرنا شروع کیا، اسی وقت سے اس کا تنزل وانحطاط شروع ہو گیا۔

آیت نمبر ۱۸۲: اللہ تعالیٰ کی آیات سے مراد احکام، معجزات اور دلائل ہیں۔ "اِسْتِدْرَاج" کا معنی درجہ بدرجہ یا آہستہ آہستہ آگے بڑھنا ہے۔ آیات سے اعراض کرنے والوں کو دنیاوی مال واسباب میں بڑھنے کی ڈھیل دی جاتی ہے۔ ان کی یکدم گرفت نہیں کی جاتی۔ ان کی توقع کے بر خلاف ایسے موقع پر ان کی گرفت کی جاتی ہے کہ ان کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ ہم ان کو دنیاوی نعمتوں سے خوب نوازتے ہیں جب وہ ان نعمتوں میں خوب مست ہو جاتے ہیں تب یک لخت پکڑتے ہیں اور غفلت کی حالت میں ان کو ہلاک کر دیں گے۔

علمی بات: یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو لوگ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں، اللہ تعالیٰ فوراً ان کا مؤاخذہ کرے اور نہ یہ کوئی معیار ہے کہ جس شخص پر دنیا میں مال، رزق اور صحت وغیرہ کے اعتبار سے تنگی و سختی ہے تو وہ جہنمی ہے اور عتابِ الٰہی میں گرفتار ہے اور جو خوشحال ہے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہے۔ بلکہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے کفر و گناہ اور تکذیب کے باوجود ان پر رزق کے دروازے کھول دیتا ہے اور ان کو ہر قسم کی نعمتوں اور آسائشوں میں رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ عیش و عشرت میں مست اللہ تعالیٰ کی سزا سے بے فکر ہو کر، جرائم کے ارتکاب پر زیادہ دلیر ہو جاتے ہیں اور منعمِ حقیقی کو بالکل بھول جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو دفعتاً ایسی ناگہانی بلا میں گرفتار کر دیتا ہے جس کی ان کو خبر بھی نہیں ہوتی یا جب ان کو موت آجاتی ہے تو ان کی ساری عیش و آسائش جاتی رہتی ہے اور وہ عذاب وذلّت میں جا پڑتے ہیں۔

آیت نمبر ۱۸۳: گزشتہ آیت میں نافرمانوں کے حوالہ سے "اِسْتِدْرَاج" کا ذکر تھا۔ اب اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانے والوں کو مہلت دیئے جانے کا بیان ہے۔ یہ مہلت افراد اور اقوام کو بطورِ امتحان دی جاتی ہے۔ مؤاخذہ کا وقت آنے پر انہیں ان کے انجام سے دوچار کر دیا جاتا ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کی گرفت سے کوئی نہیں بچ پاتا کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر بڑی مضبوط ہوتی ہے۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ کی سنّت یہ ہے کہ وہ مجرم لوگوں پر سرزنش اور تنبیہ کے طور پر پہلے چھوٹے چھوٹے دکھ اور تکلیفیں نازل فرماتا ہے اگر لوگ ان سے عبرت حاصل کر لیں تو خیر ورنہ انہیں ایک دوسرے طریقہ سے آزماتا ہے۔ یعنی ان پر خوش حالی اور آسودگی کا دور آتا ہے جس میں وہ ایسے مگن اور مستغرق ہو جاتے ہیں کہ انہیں سابقہ تکلیفیں یاد ہی نہیں رہتیں اور وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان پر مہربان ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ انہیں محض اس لئے مہلت دے رہا ہوتا ہے کہ جس انتہا کو پہنچنا چاہتے ہیں پہنچ جائیں تو پھر یکدم انہیں ان کے انجام سے دوچار کر دیتا ہے اس وقت لوگوں کو کوئی طاقت اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا نہیں سکتی۔

آیت نمبر ۱۸۴: "صاحب" سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے۔ دعوتِ حق پیش کرنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مشرکین مکہ کبھی ساحر اور کبھی مجنون کہتے تھے۔ (معاذ اللہ) ایسا کہنا دراصل ان کی ہٹ دھرمی اور غور و فکر نہ کرنے کا نتیجہ تھا۔ جبکہ انہی لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صادق وامین بھی کہا تھا۔ نیز اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشرکین مکہ کی خیر خواہی کرنے اور ان کے انکار اور بدعملی کے نتائج سے خبردار کرنے کا ذکر ہے۔

علمی بات: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوہِ صفا پر چڑھ کر شب کے وقت قبیلہ کو پکارا اور فرمایا کہ میں تمہیں عذابِ الٰہی سے ڈرانے والا ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اللہ تعالیٰ کا خوف دلایا اور پیش آنے والے حوادث کا ذکر کیا تو ان میں سے کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف جنون کی نسبت کی۔ اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی۔

مشرکین مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیغمبر ماننے کے بجائے کبھی (معاذ اللہ) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مجنون قرار دیتے، کبھی شاعر یا جادوگر کہتے تھے، یہ آیت بتا رہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ایسے بے سروپا تبصرے وہی کر سکتا ہے جو بے سوچے سمجھے بات کرنے کا عادی ہو، اگر یہ لوگ ذرا بھی غور کر لیں تو ان پر اپنے ان الزامات کی حقیقت واضح ہو جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ انہی لوگوں کے درمیان رہے۔ یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حال سے پوری طرح واقف ہیں۔ دنیاوی لذّات سے کنارہ کشی اور ہمہ تن آخرت کی طرف متوجہ رہنا، دن رات لوگوں کو حکمت و دانائی کی باتیں بتانا اور ان کو وعظ و نصیحت کرنا اور آخرت کے عذاب سے خبردار کرنا، یہ سب کسی مجنون اور دیوانے سے سرزد نہیں ہو سکتا۔ ان کے بارے میں جنون کا گمان کرنا خود جنون ہے۔

آیت نمبر ۱۸۵: اس آیت میں کفار کو کائنات کے نظام اور مخلوقات میں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ انہیں ان کی عمر کی مدت اور فرصت عمل پر نظر کی دعوت دی گئی ہے۔ مہلت عمل کبھی بھی ختم ہو سکتی ہے۔ لفظ حدیث کا لغوی مفہوم ہے "بات" یہاں لفظ "حدیث" سے مراد قرآنِ حکیم ہے۔ یہ لوگ اگر قرآنِ حکیم سن کر بھی ایمان نہ لائیں گے تو پھر کبھی ایمان نہ لا سکیں گے۔

علمی بات: اگر یہ لوگ اس حکمتوں بھری کائنات میں صحیح طریقے سے غور و فکر سے کام لیں، تو ان کے سامنے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے گی کہ جس چیز کی طرف ان کو اللہ ﷻ کے پیغمبر ﷺ بلا رہے ہیں اس کی تصدیق و تائید اس پوری کائنات سے ہو رہی ہے اور اس کی صدا اس کے گوشے گوشے سے بلند ہو رہی ہے اور اس کائنات میں صحیح طریقے سے غور کرنے والا پکار اٹھے گا کہ اللہ ﷻ نے اس کائنات کو بے کار و بے مقصد نہیں پیدا فرمایا۔

نوٹ: یعنی اگر آیاتِ قرآنیہ پر ایمان نہ لائے تو دنیا میں اور کون سی بات اور کون سا کلام ہے جس پر ایمان لانے کی امید کی جا سکتی ہے تو پھر سمجھ لو کہ ان بد نصیبوں کے لئے دولتِ ایمان مقدّر ہی نہیں۔

آیت نمبر ۱۸۶: اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ ہدایت دینے اور گمراہ کرنے کا اختیار اللہ ﷻ کے پاس ہے۔ قانونِ ہدایت یہ ہے کہ جو جیسی طلب و تڑپ رکھتا ہے اس کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ کیا جاتا ہے۔ نشانیاں دیکھنے اور قرآنِ حکیم سننے کے باوجود ایمان نہ لانے والوں کے انجام کا ذکر ہے۔ وہ سرکشی میں سرگرداں رہتے ہوئے اپنے بُرے انجام کو پہنچ جاتے ہیں۔

ہدایت و ضلالت، ہر چیز اللہ ﷻ کے قبضہ میں ہے۔ وہ نہ چاہے تو سارا سامانِ ہدایت رکھے کے رکھے رہ جائیں۔ آدمی کہیں سے بھی ہدایت نہ پا سکے عام طور پر وہ جب ہی ہدایت کی توفیق دیتا ہے جب بندہ خود اپنے کسب و اختیار سے اس راستہ پر چلنا چاہے۔ باقی جو دیدہ و دانستہ بدی اور شرارت ہی کی ٹھان لے تو اللہ ﷻ بھی راستہ دکھلانے کے بعد اسے اسی کے حال میں چھوڑ دیتا ہے۔

آیت نمبر ۱۸۷: قریشِ مکہ کے قیامت کے متعلق سوال پر اس آیت کا نزول ہوا۔ قیامت کا حتمی علم اللہ ﷻ کے پاس ہے۔ وہی مقررہ وقت پر اسے ظاہر فرمائے گا۔ قیامت کی آمد اچانک ہو گی۔ اس کا واقع ہونا آسمانوں اور زمین پر بہت بھاری بات ہے۔ نیز اس آیت میں قیامت کا علم پوشیدہ رکھنے کی حکمت کا ذکر ہے۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ دنیا امتحان کے لئے ہے۔ قیامت کے بارے میں سوال کے بجائے اس کے لئے تیاری کرنا زیادہ اہم مسئلہ ہے۔

علمی بات: مشرکینِ مکہ نے تمسخر کے طور پر آپ ﷺ سے سوال کیا تھا کہ آپ ﷺ قیامت کے آنے کی باتیں کرتے اور ہمیں اس سے ڈراتے ہیں۔ اگر آپ کا خیال صحیح ہے تو آپ ہمیں وہ سال، تاریخ اور وقت بتائیے جب قیامت آئے گی، تا کہ وقت آنے پر ہم اس کے لئے تیاری کر لیں۔ چنانچہ اللہ ﷻ نے آپ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آپ ﷺ ان کو بتا دیجئے کہ قیامت کے آنے کا صحیح وقت تو اللہ ﷻ کو معلوم ہے۔ پس اس کا جو وقت مقرر ہے، اللہ ﷻ کے حکم سے وہ اس پر ظاہر ہو جائے گی، اس لئے آدمی کو ہر وقت اس کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ قیامت کا حادثہ آسمانوں اور زمین پر بہت گراں گزرے گا کیونکہ وہ لوگوں کی بے خبری میں اچانک آئے گی۔

آیت نمبر ۱۸۸: اس آیت میں رسول کریم ﷺ کی عاجزی کا بیان ہے۔ اللہ ﷻ کی قدرت اور علم کامل کا بیان ہے۔ رسول علیہم السلام بھی اللہ ﷻ کے حکم کے تابع ہوتے ہیں۔ رسولوں کو اللہ ﷻ کی طرف سے علم اور رہنمائی عطا ہوتی ہے۔ اللہ ﷻ کا فضل سب سے بڑھ کر نبی کریم ﷺ پر ہوا۔ ہمارے لئے اس کا ادراک ممکن نہیں۔ مزید برآں آپ ﷺ کے بشیر اور نذیر ہونے کا بیان ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں حضور رحمۃ العالمین اپنی ذاتِ مقدّسہ سے اُلوہیت کی نفی فرما رہے ہیں کہ میں اللہ نہیں۔ کیونکہ اللہ ﷻ وہ ہے جس کی قدرت کامل اور اختیار مستقل ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔ نہ کسی کام سے اسے کوئی روک سکتا ہے اور نہ اسے کسی کام پر مجبور کر سکتا ہے۔ اور مجھ میں یہ اختیار کامل اور قدرت مستقلہ نہیں پائی جاتی۔ میرے پاس جو کچھ ہے میرے رب کا عطیہ ہے اور میرا سارا اختیار اسی کی عنایت ہے۔ "لَا اَمْلِكُ" کے کلمات سے اپنے اختیار کامل کی نفی فرمائی اور "اِلَّا مَا شَآءَ اللہُ" سے اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا کہ کوئی نادان یہ نہ سمجھے کہ حضور ﷺ کو نفع و ضرر کا کچھ اختیار ہی نہیں۔ فرمایا مجھے اختیار ہے اور یہ اختیار اتنا ہی ہے جتنا میرے ربِّ کریم نے مجھے عطا فرمایا ہے۔

علمی بات: شرعیات کا علم جو انبیاء علیہم السلام کے منصب سے متعلق ہے اور تکوینیات کا علم اللہ ﷻ جس کو جس قدر مناسب جانے عطا فرماتا ہے۔ اس نوع میں حضور ﷺ تمام اوّلین و آخرین سے فائق ہیں۔ آپ ﷺ کو اتنے بے شمار علوم و معارف اللہ ﷻ نے مرحمت فرمائے ہیں جن کا شمار کسی مخلوق کی طاقت میں نہیں۔

آیت نمبر ۱۸۹: "نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ" سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد ان ہی سے ان کی زوجہ بی بی حوا علیہا السلام کو پیدا کیا گیا۔ دونوں سے نسل انسانی کی ابتدا ہوئی۔ نکاح کا ایک اہم مقصد زوجین کا باہمی سکون اور دوسرا مقصد اولاد کا حصول ہے۔ ایک عمومی مثال کے ذریعہ اولاد کے حوالہ سے شرکیہ طرزِ عمل کو بیان کیا گیا ہے۔ ایسے زوجین کی مثال دی گئی ہے جو اللہ ﷻ سے تندرست اولاد کی التجا اور عطا ہونے پر شکر گزاری کا عہد کرتے ہیں۔

چند اہم باتیں: ان آیات میں چند باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔

ا۔ اللہ ﷻ نے اپنی قدرت سے پہلے انسان (حضرت آدم علیہ السلام) اور پہلی عورت (حضرت حوا علیہا السلام) کو پیدا فرمایا۔ عمومی انداز سے ذکر ہے کہ میاں اور بیوی کا جوڑا بنانے کا مقصد یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی محبت سے ذہنی سکون، جسمانی لذّت اور راحت حاصل کریں۔

۲۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ ان دونوں کے ملنے سے محض جسمانی سکون اور لذت ہی حاصل نہ ہو بلکہ ایسی نسلیں تیار ہوں جن سے دنیا میں دینی و ایمانی رونق پیدا ہو۔

۳۔ انسانوں کے عمومی رویئے کا ذکر ہے کہ جب میاں اور بیوی کا اختلاط ہوتا ہے تو اس سے ایک ہلکا سا حمل ٹھہر جاتا ہے جس کے ساتھ وہ عورت چلتی پھرتی ہے۔ وضع حمل کا وقت بہت نازک ہوتا ہے اس میں زچہ اور بچہ دونوں کی جان کو خطرہ ہوتا ہے۔ حمل اور وضع حمل کے دوران بچے کے ماں اور باپ بہت سی جذباتی کیفیات سے گزرتے ہیں۔ یہی فکر رہتی ہے کہ بچہ صحیح سالم بھی پیدا ہوگا یا نہیں، صورت شکل کیسی ہوگی، خوبصورت ہوگا یا بد شکل، بد عقل ہوگا یا صاحب عقل و فہم وغیرہ وغیرہ جیسے جیسے وضع حمل کا وقت قریب آنے لگتا ہے تو یہ جذباتی کیفیت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور دونوں مل کر اللہ ﷻ سے دُعائیں کرتے ہیں کہ اے اللہ ﷻ ہماری اولاد کو خیر و خوبی سے پیدا فرما اور وہ پیدا ہونے والا بچہ نیک بخت ہو، خوبصورت ہو وغیرہ۔ دونوں کی زبان پر یہی ایک دُعا ہوتی ہے۔

ازدواجی حقوق و فرائض کا مقصد: ازدواجی زندگی کے جتنے حقوق و فرائض زوجین پر عائد ہوتے ہیں ان سب کا خلاصہ اور اصل مقصد سکون ہے، دنیا کی نئی معاشرت اور نئی رسموں میں جو چیزیں سکون برباد کرنے والی ہیں وہ ازدواجی تعلق کی بنیادی دشمن ہیں اور آج کی مہذّب دنیا میں جو گھریلو زندگی عموماً تلخ نظر آتی ہے اور چاروں طرف طلاقوں کی بھرمار ہے، اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ معاشرت میں ایسی چیزوں کو پسندیدہ سمجھ لیا گیا ہے، جو گھریلو زندگی کے سکون کو سراسر برباد کرنیوالی ہیں، عورت کی آزادی کے نام پر اس کی بے پردگی اور بے حیائی جو طوفان کی طرح عالم گیر ہوتی جارہی ہے اس کو ازدواجی سکون کے برباد کرنے میں بڑا دخل ہے اور تجربہ شاہد ہے جوں جوں یہ بے پردگی و بے حیائی بڑھتی جاتی ہے اس رفتار سے گھریلو سکون و اطمینان ختم ہوتا جاتا ہے۔

عملی بات: انسان کی ازدواجی زندگی کا مقصدِ اصلی یہ ہے کہ ایک دوسرے سے مانوس ہو اور زندگی پُرسکون ہو۔ آپس میں محبت اور ہمدردی کے تعلقات ہوں۔ بہت سے مرد عورتوں کے لئے مصیبت بن جاتے ہیں اور بہت سی عورتیں مرد کے لئے سوہانِ روح (اذّیت ناک) بن جاتی ہیں۔ یہ ازدواجی مقصد کے خلاف ہے۔ جن میاں بیوی میں تلخی ہو وہاں سکون کہاں اور یہ سکون وہیں ہو سکتا ہے جبکہ خلاف طبع امور میں فریقین تحمّل اور برداشت سے کام لیں۔ نکاح کرتے وقت اچھی طرح دیکھ بھال کر نکاح کریں۔ مال اور حسن و جمال ہی کو نہ دیکھیں۔ فریقین کی دین داری اور خوش خلقی کو بھی دیکھیں اور یہ بھی دیکھیں کہ آپس میں جوڑ بیٹھے گا یا نہیں؟ دونوں محبت و الفت کی راہ پر چل سکیں گے یا نہیں؟ اور نکاح کے معاملے میں دین داری کو ترجیح دینا یہ مطلوب ہے چنانچہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جنابِ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: چار چیزوں کی وجہ عورتوں سے نکاح کیا جاتا ہے؛ اس کے مال کی وجہ سے، حسب و نسب کی وجہ سے، خوبصورتی کی وجہ سے اور دینداری کی وجہ سے تو دیندار عورت سے نکاح کر کے کامیابی حاصل کر، تمہارے ہاتھ خاک آلود ہوں۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

آیت نمبر ۱۹۰: اس آیت کے اوّلین مخاطب مشرکین مکہ ہیں۔ صحت مند بچہ عطا کئے جانے پر ناشکری کی روش کا بیان ہے۔ وہ اولاد کی عطا کو اللہ ﷻ کے ساتھ دوسری ہستیوں کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بچے کا مشرکانہ نام رکھتے تھے۔ نیز یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ ﷻ ان جھوٹے معبودوں سے بلند و برتر ہے جن کو وہ اللہ ﷻ کے ساتھ شریک کرتے تھے۔

علمی بات: کفار و مشرکین کو جھنجھوڑا جارہا ہے کہ جب انہیں اولاد کی اُمید لگتی ہے تو وہ اللہ ﷻ سے التجائیں کرتے ہیں اس کی بارگاہِ عالیہ میں دُعائیں مانگتے ہیں کہ اے ہمارے رب! اگر تو نے ہمیں صحیح، سالم اور تندرست فرزند عطا کیا تو وہ عمر بھر تیرے شکر گزار رہیں گے۔ لیکن جب وہ کرم فرماتا ہے اور اُن کی شاخِ آرزو پر اُمید کا

پھول کھلتا ہے اور ان کی اداس گود ایک خوبصورت بچے سے آباد ہو جاتی ہے یعنی اولادِ نرینہ کی نعمت ملتی ہے تو اس فوراً عطا فرمانے والے رب العالمین کو بھول جاتے ہیں اور اسے اپنے عمل کا طبعی نتیجہ سمجھتے ہیں۔ یا کہتے ہیں کہ یہ فلاں ستارے کی تاثیر ہے یا یہ انہیں فلاں بت نے بخشا ہے۔ یہ کتنی احسان فراموشی اور حق ناشناسی ہے جو یہ مشرکین کر رہے ہیں۔

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم قیامت کے دن اپنے ناموں اور اپنے باپ دادا کے ناموں سے بلائے جاؤ گے لہٰذا تم اپنے نام اچھے رکھو۔ (سنن ابو داؤد)

عملی پہلو: انسان کا یہ معاملہ صرف اولاد تک نہیں بلکہ زندگی کے ہر نازک موڑ پر ایسا ہی ہوتا ہے کہ بندہ کہتا ہے کہ اے اللہ! میرا یہ کام کر دے مجھے صحت و تندرستی عطا فرما دے اور جب اس کو صحت و تندرستی اور راحتیں حاصل ہو جاتی ہیں تو اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرتا ہے اور احسان فراموشی کرتا ہے کہ فلاں ڈاکٹر صاحب کی دوا سے مجھے یہ فائدہ ہوا۔ فلاں تدبیر کی وجہ سے مجھے یہ کامیابی نصیب ہوئی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب انسان کی مشکلات حل ہو جاتی ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے بجائے غیر اللہ کی طرف وہ تمام خوبیاں منسوب کر دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی قدرت سے عطا فرمائی تھیں۔

آیت نمبر ۱۹۱: اس آیت میں اُلوہیت کا معیار بتا دیا گیا ہے۔ جو مخلوق اور فانی ہے وہ اِلٰہ یعنی معبود نہیں۔ اس معیار کے مطابق اللہ تعالیٰ کے سوا تمام معبود باطل ہیں خواہ وہ کوئی بھی ہو اور زندہ یا فانی ہو۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بت پرستی کا رد بیان کیا ہے مٹی پتھر یا لکڑی کے مجسمے بنا کر ان کی پوجا کرنا شرک کی ایک صورت ہے اور بت پرستی کی یہ لعنت حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے لے کر تمام اقوام میں پائی جاتی رہی ہے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں اس کا بار بار رد فرمایا ہے اس کے علاوہ جو لوگ ملائکہ اور جنّات وانسان کو عبادت میں شریک کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کا بھی رد فرمایا ہے شرک اللہ تعالیٰ کی صفات میں ہو یا عبادت میں یہ قابل مذمت ہے اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے بت پرستی کا اس طرح رد فرمایا ہے کیا یہ لوگ ان کو شریک بناتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے وہ خود پیدا کیئے جاتے ہیں۔

آیت نمبر ۱۹۲: یہاں اولین مراد بت ہیں جن کی مشرکین پرستش کرتے تھے۔ ان کے اِلٰہ ہونے کی نفی کی گئی ہے۔ ان خود ساختہ بتوں کی بے بسی ظاہر کی گئی ہے کہ:

ا۔ وہ کسی چیز کو پیدا کرنے پر قادر نہیں۔ ۲۔ وہ نہ اپنی، نہ شرک کرنے والوں کی مدد کا اختیار رکھتے ہیں۔

یہ بے بسی ہر مخلوق کے ساتھ وابستہ ہے اس لئے مخلوق معبود نہیں ہو سکتی۔

علمی بات: مشرکوں کی کمال حماقت دکھائی ہے کہ ایسوں کے آگے جھکتے ہیں۔ جو کسی کو تو پیدا کیا کرتے خود اپنے پیدا کرنے پر بھی قادر نہیں۔ بلکہ اپنی پیدائش تک کے لئے دوسرے ہی کے تمام تر محتاج ہیں۔ پھر اتنا ہی نہیں بلکہ تخلیق الگ رہی وہ تو امداد تک پر قادر نہیں۔ نہ کسی دوسرے کی نہ خود اپنی ہی! حیرت اور کمال حیرت ہے کہ ایسی بے بس ہستیوں کو معبود کے درجہ پر رکھا جائے! (اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا)

علمی بات: معبود کے لئے ضروری ہے کہ وہ نفع پہنچانے اور ضرر دور کرنے پر قادر ہو اور بت اپنی پرستش کرنے والوں کو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان، تو ان کی پرستش اور عبادت کرنا کیونکر درست ہو گا۔ بلکہ بتوں کا حال تو یہ ہے کہ اگر کوئی ان بتوں کو توڑ دے تو وہ اپنے آپ کو اس سے بچا نہیں سکتے، تو جو اپنی ذات سے ضرر کو دور کرنے پر قادر نہیں ہے تو وہ تمہیں تکالیف اور مصائب سے کیسے بچا سکتا ہے۔

آیت نمبر ۱۹۳: اس آیت میں جھوٹے معبودوں کی بے چارگی ظاہر کی گئی ہے۔ وہ شرک کرنے والوں کی کسی پکار کا جواب دینے پر قادر نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کو پکارنا یا نہ پکارنا دونوں کا نتیجہ یکساں ہوتا ہے۔

جو کام سب سے سہل تر ہے کہ کوئی بات بتلانے کے لئے پکار کو سن لینا یہ جھوٹے معبود اس سے بھی عاجز ہیں تو جو اس سے مشکل ہے کہ اپنی حفاظت کریں اور پھر جو اس سے بھی مشکل ہے کہ دوسروں کی امداد کرنا اور پھر جو ان سب سے دشوار تر ہے کہ کسی شے کو پیدا کرنا ان سے تو بدرجہ اولیٰ زیادہ تر عاجز ہوں گے پھر ایسے عاجز محتاج کب عبادت کے لائق ہو سکتے ہیں۔

علمی بات: یعنی جس طرح یہ بت اور معبودانِ باطل حصول نفع اور دفع ضرر پر قادر نہیں ہیں، اسی طرح ان کو کسی چیز کا علم بھی نہیں ہے، اس لئے جب تم انہیں کسی نیک کام کے لئے پکارو تو یہ تمہارے پیچھے نہیں لگیں گے، اور اس آیت کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ اگر تم ان کو کسی خیر اور اچھائی کے لئے پکارو تو یہ تمہاری پکار

کا جواب نہیں دیں گے یا تم ان سے کوئی دُعا کرو تو یہ تمہاری دُعا کو قبول نہیں کریں گے۔ اس لئے فرمایا کہ تمہارے لئے برابر ہے کہ تم ان کو پکارو یا خاموش رہو چنانچہ پتا چلا کہ اللہ ﷻ کے علاوہ کسی کی بھی عبادت کرنا اور اسی سے دُعا مانگنا ناروا و ناجائز عمل ہے۔

آیت نمبر ۱۹۴: اس آیت میں بتوں کے معبود ہونے کی تردید ہے۔ یہ بھی اللہ ﷻ کے مملوک ہیں اور نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے ہیں۔ ان سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کی توقع رکھنے والوں کی مذمّت ہے۔

علمی بات: مفسر امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں بڑی نفیس بحث کی ہے فرماتے ہیں کہ مشرکین مکہ تو بتوں کے پرستار تھے اور بت پتھر اور لکڑی کے بے جان مجسمے ہوا کرتے تھے ان کو "عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ" (تمہارے جیسے بندے) کیوں کہا گیا؟ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعدد جواب دیئے ہیں۔ (۱) بتوں کو بندے کہنے کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ بت زندہ ہیں اور سنتے سمجھتے ہیں اس لئے ان کے اعتقاد کے مطابق ان سے بات کی گئی۔ کہا جارہا ہے کہ اگر تمہاری بات بالفرض مان بھی لی جائے کہ یہ زندہ ہیں اور سنتے سمجھتے ہیں تو پھر بھی یہ زیادہ سے زیادہ تمہاری طرح کے انسان ہی ہوں گے۔ یہ آخر خدا کیونکر بن گئے اور اپنے جیسے انسان کی بندگی کا طوق گلے میں ڈالنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ مزید برآں مفسرین نے بتوں کو عباد کہنے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی ہے کہ وہ بھی تمہاری طرح اللہ ﷻ کے مملوک ہیں اور تمہاری طرح اس کے پیدا کردہ ہیں۔

آیت نمبر ۱۹۵: خود ساختہ معبودوں کی لاچارگی کا بیان ہے۔ یہ تو تراشے گئے بت ہیں۔ یہ تو اپنے اعضاء سے کام لینے سے بھی محروم ہیں۔ مزید برآں نبی کریم ﷺ کی طرف سے مشرکین سے دوٹوک انداز میں گفتگو کا ذکر ہے۔

علمی بات: یہ بت مخلوق ہونے کے باوجود ان کمالات سے محروم ہیں جن سے کسی مخلوق پر امتیاز حاصل ہوسکتا ہے، نہ وہ چل سکتے ہیں، نہ وہ اپنے ہاتھوں سے کوئی چیز پکڑ سکتے ہیں، نہ آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ تم ان کو پکارتے پکارتے تھک جاؤ گے مگر وہ تمہاری پکار کا کبھی جواب نہ دے سکیں گے، کیونکہ تمہارا ان کو پکارنا یا خاموش رہنا ان کے لئے سب برابر ہے۔ ان میں سننے، سمجھنے اور جواب دینے کی قوت ہی نہیں۔ پھر تم ایسی عاجز و بے بس مخلوق کو کیوں معبود بناتے ہو۔ پھر آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آپ ﷺ ان مشرکوں سے کہہ دیجیے کہ تم اپنے تمام باطل معبودوں کو جن کو تم اللہ ﷻ کا شریک قرار دیتے ہو، میری ضرر رسانی کے لئے بلالو اور جس قدر تدبیریں تم سے ہوسکیں وہ سب کرلو اور مجھے ذرا سی مہلت بھی نہ دو۔ مجھے تمہارے معبودوں کی ذرا بھی پرواہ نہیں کیونکہ میرا حامی و مددگار اور حفاظت کرنے والا تو اللہ ﷻ ہی ہے جس نے مجھ پر یہ کتاب نازل فرمائی۔ وہی دنیا و آخرت میں اپنے نیک بندوں کی مدد کرتا ہے۔ اس لئے مجھے نہ تمہاری طرف سے کوئی خوف ہے اور نہ تمہارے معبودوں کی طرف سے۔

شانِ نزول: حضور نبی کریم ﷺ نے جب بت پرستی کی مذمّت کی تو مشرکین نے دھمکایا اور کہا کہ بتوں کو بُرا کہنے والے تباہ ہوجاتے ہیں، برباد ہوجاتے ہیں، (معاذ اللہ) اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی کہ اگر بتوں میں کچھ قدرت سمجھتے ہو تو انہیں پکارو اور میری نقصان دہی میں ان سے مدد لو اور تم بھی جو مکر و فریب کرسکتے ہو وہ میرے مقابلہ میں کرو اور اس میں دیر نہ کرو، مجھے تمہاری اور تمہارے معبودوں کی کچھ بھی پرواہ نہیں اور تم سب میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔

آیت نمبر ۱۹۶: "ولی" کے معنی محافظ، حمایتی اور مددگار کے ہیں۔ اللہ ﷻ ہی نبی کریم ﷺ اور اہلِ ایمان کا مددگار ہے۔ باطل معبودوں کے برعکس اللہ ﷻ اپنی بندگی کرنے والوں کی ہر اعتبار سے رہنمائی اور مدد کرنے پر قادر ہے۔ اللہ ﷻ ہی نے قرآنِ حکیم نازل فرما کر ہدایت کا سامان مہیا کردیا جس کا انسان سب سے زیادہ محتاج ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی حمایت و نصرت ہمیشہ اپنے نیک اور فرمانبردار بندوں کے شاملِ حال رہا کرتی ہے۔ وہ جس کے ساتھ ہو دنیا کی کوئی طاقت اُس کا بال بیکا نہیں کرسکتی۔ سچ یہ ہے کہ اہلِ حق کے پاس یہی ایک قوت ہے جس کے بل بوتے پر وہ بڑی بے باکی سے ہر طاغوتی طاقت سے ٹکرا جاتے ہیں۔

اللہ ﷻ کی ذات ہی حامی و ناصر ہے کیونکہ اسی نے ہدایت و اصلاح کے لئے کتاب نازل فرمائی ہے۔ یہاں لطیف اشارہ ہے کہ اس کا حامی و ناصر ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ اس کی نازل کردہ کتاب سے بندہ تعلق پیدا کرپاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ﷻ اپنے سب نیک بندوں کی سرپرستی فرماتا ہے اور اللہ ﷻ کی یہ سرپرستی کیا کم ہے کہ اس نے قرآنِ حکیم جیسی بابرکت کتاب ہمارے لئے نازل فرمائی ہے جو زندگی کے ہر پہلو میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔

آیت نمبر ۱۹۷: اس آیت میں مشرکین کو مخاطب کر کے ان کے معبودانِ باطلہ کے بارے میں متنبہ کیا گیا ہے۔ یعنی اگر وہ ان کو اپنے مقاصد میں راہنمائی کے لئے پکاریں تو وہ ان کی پکار سن ہی نہیں سکتے تو مدد کیا کریں گے۔

علمی بات: اس آیت میں یہ اشارہ بھی تھا کہ عنقریب وہ وقت آئے گا کہ مشرک مغلوب ہوں گے تو یہ بت اس وقت بھی ان کی کچھ مدد نہ کر سکیں گے اور نہ وہ جن کے یہ بت بنائے گئے۔ پھر ان کی مدد کرنا تو ایک طرف رہا وہ اپنے آپ کو بھی تباہی سے نہ بچا سکیں گے اور اس طرح جو کچھ حضور نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے فرمایا گیا وہ حرف بہ حرف پورا ہوا اور مشرکین مکہ باوجود اپنی ساری طاقت کے آخر کار مغلوب ہوئے اور بالآخر ٹوٹے ہوئے بتوں کو بھی بیت اللہ سے نکال کر اندھے کنوؤں میں پھینکوا دیا گیا۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ۔

آیت نمبر ۱۹۸: اس آیت میں فرمایا گیا کہ آپ ﷺ انہیں دیکھتے ہیں کہ وہ بظاہر آپ ﷺ کی طرف دیکھ رہے ہیں، اس سے مراد بت ہیں یا مشرکین۔ اگر اس سے مراد بت ہیں تو ان کے دیکھنے کا معنی یہ ہے کہ وہ آپ ﷺ کے سامنے اور بالمقابل ہیں اور چونکہ دیکھنے والا بالمقابل ہوتا ہے اس لئے فرمایا وہ بظاہر دیکھ رہے ہیں حالانکہ حقیقت میں وہ بالکل نہیں دیکھ رہے اور اگر اس سے مراد مشرکین ہیں تو پھر معنی یہ ہے کہ یہ کفار اور مشرکین بظاہر آپ ﷺ کو دیکھ رہے ہیں لیکن یہ چونکہ آپ ﷺ کو محبت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے بلکہ عداوت سے دیکھتے ہیں تو گویا کہ وہ آپ ﷺ کو نہیں دیکھتے یا چونکہ وہ حق سے اعراض کرتے ہیں اور اللہ ﷻ نے آپ ﷺ کی ذات میں نبوت کے جو دلائل اور نشانیاں رکھی ہیں ان کا اثر قبول نہیں کرتے اس لئے گویا کہ وہ آپ ﷺ کو نہیں دیکھتے۔ مطلب یہ ہے کہ مشرکین اپنے بتوں کی صورتیں بناتے وقت ان کی آنکھیں ایسی بناتے کہ ان کی طرف دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہو کہ وہ سچ مچ دیکھ رہے ہیں، مگر جب وہ بے جان بت ہیں تو دیکھیں گے کیسے؟ یا یہ کہ مشرکین بظاہر تو آنکھیں رکھتے ہیں مگر بصیرت کے اندھے ہیں، اس لئے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

آیت نمبر ۱۹۹: اس آیتِ کریمہ کے ذریعے مکارمِ اخلاق کی نہایت عمدہ، مختصر، جامع اور مؤثر تعلیم دی گئی جو اللہ ﷻ کی طرف سے نبی آخر الزمان ﷺ کو اور آپ ﷺ کے توسط سے آپ ﷺ کی اُمت کو دی جا رہی ہے۔ خاص کر ان حضرات کو جو دعوت الی اللہ کے عظیم کام میں مشغول ہوں۔ اسی لئے بعض علماء کرام نے فرمایا کہ اخلاقیات کے ضمن میں کوئی نیکی یا خوبی و فضیلت ایسی نہیں جو اس آیت کریمہ کے اندر سمو نہ دی گئی ہو۔ اسی لئے اس آیت کریمہ کو مکارم اخلاق کی سب سے جامع آیت قرار دیا گیا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو حضور نبی کریم ﷺ نے جبریل امین علیہ السلام سے فرمایا "مَا ھٰذَا یَا جِبْرِیْلُ؟" "یہ کیسی تعلیم ہے اے جبریل؟" تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ "آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ کو حکم دیتا ہے کہ آپ ﷺ درگزر فرمائیں اس سے جو آپ ﷺ سے زیادتی کرے، اور عطا فرمائیں اس کو جو آپ ﷺ کو محروم رکھے اور تعلق قائم فرمائیں اس سے جو آپ ﷺ سے قطع تعلقی کرے۔"

عملی پہلو: اس آیت میں مبلّغ کو تین ہدایات دی گئی ہیں اور ایک ہدایت اگلی آیت میں دی گئی ہے۔

۱۔ اختلاف اور اشتعال کے مقابلہ میں حوصلہ رکھنا اور درگزر کرنا۔ ۲۔ نیکی کی تبلیغ کرنا۔ ۳۔ جہلاء سے اعراض برتنا۔

۴۔ مخالفین حق کے رویہ سے طبیعت میں غصہ اور اشتعال پیدا ہو تو شیطان کے شر سے اللہ ﷻ کی پناہ مانگنا۔

۱۔ اشتعال کے بجائے درگزر: تبلیغ کے میدان میں ایک مبلّغ کو ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس لئے اسے سمجھداری اور بردباری کا مظاہرہ کرنا چاہیے اگر دین کا کارکن اور مبلّغ مشتعل ہو جائے تو کام آگے بڑھنے کے بجائے نہ صرف رک جاتا ہے بلکہ معاملہ جنگ و جدال تک پہنچ جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ فطری اور جبلی طور پر حوصلہ اور بردباری کے پیکر تھے۔ آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں کہ آپ ﷺ نے اشتعال میں آکر کسی کو ترکی بہ ترکی جواب دیا ہو۔ اس کے باوجود آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے ذریعے اُمت کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ آپ ﷺ معافی اور درگزر کا رویہ اختیار کریں۔

۲۔ نیکی کی تبلیغ: عرف بمعنی معروف ہر اچھے، نیک اور مستحسن کام کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آپ ﷺ کے ساتھ بُرائی اور ظلم سے پیش آئیں آپ ﷺ ان سے انتقام نہ لیں بلکہ معاف کر دیں مگر ساتھ ہی ان کو نیک کام کی ہدایت بھی کرتے رہیں، گویا بدی کا بدلہ نیکی سے ظلم کا بدلہ صرف انصاف ہی سے نہیں بلکہ احسان سے دیں۔

۳۔ اعراض: اس سے مراد بحث و تکرار اور جنگ و جدال سے بچنا ہے۔ مبلّغ تبلیغ کے میدان میں مخالف کی بدکلامی کا جواب ترکی بہ ترکی دے تو سننے والے اس کو اچھا نہیں سمجھتے۔ مبلغین کو یہ بات اچھی طرح سمجھنی چاہیئے وہ کونسا الزام اور بدکلامی ہے جس سے نبی اکرم ﷺ اور انبیاء کرام علیہم السلام کو واسطہ نہیں پڑا لیکن آپ ﷺ اور کسی نبی علیہ السلام نے اپنے مخالف کو بُرا کہنا تو درکنار کوئی سطحی لفظ بھی نہیں بولا۔

۴۔ وعظ و نصیحت کے میدان میں درگزر کرنے اور حوصلہ مندی کے باوجود بعض دفعہ ایسے جہلاء سے واسطہ پڑتا ہے جو الجھے بغیر نہیں رہ سکتے ایسی صورت میں ایسے لوگوں سے اعراض کرنا چاہیئے اگر ان کی اشتعال انگیز باتوں پر طبیعت میں غصہ پیدا ہو تو اللہ ﷻ کی پناہ مانگنی چاہیئے کیونکہ غصہ شیطان کی طرف سے ہوا کرتا ہے۔

صاحب علم کے اخلاقِ فاضلہ میں یہ بھی شامل ہے کہ جاہلوں سے نہ الجھے اور ان سے دور رہے اور جاہل کی طرف سے کوئی زیادتی ہو تو اسے برداشت کرے اور درگزر کردے۔ عالم اگر جاہل کے جاہلانہ افعال و اقوال اور اطوار و عادات کا مقابلہ کرے گا تو علم کا کام چھوڑ بیٹھے گا اور جاہلوں ہی سے بھڑتا رہے گا۔ اگر کوئی جاہل شخص شرعی مسئلہ پوچھے تو اسے بتادے لیکن اس سے بحث نہ کرے نہ اسے بحث کرنے دے۔

آیت نمبر ۲۰۰: جو لوگ گناہوں سے بچنے اور اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں جونہی انہیں شیطان کا غلبہ یا اس کے اثرات محسوس ہوں تو وہ اس پر چوکنے ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر شیطان سے اللہ ﷻ کی پناہ طلب نہ کی جائے تو شیطان اور اس کے ساتھی انسان کو گمراہی میں مبتلا کرنے میں کوئی کمی نہیں کرتے۔

غصہ اور اشتعال ہمیشہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ ﷻ سے پناہ مانگنی چاہیئے۔ اللہ ﷻ ہر کسی کی فریاد سننے والا اور مبلّغ کی نیت اور مخالف کی جہالت کو جاننے والا ہے۔

شانِ نزول: جب آیت شریفہ (خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ) نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے عرض کیا کہ اے رب! غصّہ کی حالت میں کیا کیا جائے (غصّہ انتقام پر ابھارتا ہے اور معاف کرنے سے روکتا ہے) اس پر اللہ ﷻ نے آیت "وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ" (آخر تک) نازل فرمائی۔

لفظ "نزغ" چونکہ دینے اور اُبھارنے اور وسوسہ ڈالنے اور کسی کام پر آمادہ کرنے کے لئے آتا ہے۔ شیطان انسان کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ غصّہ اور انتقام پر ابھارتا رہتا ہے اور ایسے وسوسے دل میں ڈالتا ہے کہ انسان معاف کرنے یا درگزر کرنے پر عمل پیرا نہ ہو سکے۔ خصوصاً دین کا کام کرنے والوں کو ورغلاتا اور طیش میں لا کر بُرے طرزِ عمل پر اُبھارتا ہے جس سے دعوتِ دین کا کام متاثر ہوتا ہے شیطان کا شر اور وسوسہ دفع کرنے کا یہ علاج بتایا کہ شیطان مردود سے اللہ ﷻ کی پناہ مانگی جائے اس سے شیطان ذلیل ہوگا اور وسوسہ ڈالنے سے پیچھے ہٹے گا۔

سورۃ المؤمنون میں فرمایا: "وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ" اور آپ (ﷺ) یوں کہئے کہ اے رب! میں آپ کی پناہ لیتا ہوں شیطان کے وسوسوں سے اور اے رب اس بات سے کہ وہ میرے پاس حاضر ہوں۔

علمی پہلو: وسوسہ اور غصہ کے دفع کے لئے (اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ) پڑھنا بہت مفید ہے۔

آیت نمبر ۲۰۱: علمی بات: انسان کو ورغلانے کے لئے انسان کے گرد گردش کرنے والے شیطان کو "طائف" کہتے ہیں، کسی چیز کا خیال یا اس کی صورت جو نیند اور بیداری میں دکھائی دے اس کو "طیف" کہتے ہیں۔

اس آیت میں شیطان سے بچنے والوں کا تذکرہ فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ ﷻ سے ڈرتے ہیں ان کا طریقہ یہ ہے کہ جب شیطان ان کے دل میں کوئی وسوسہ ڈالے اور بہکانے کی کوشش کرے تو فوراً اللہ ﷻ کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ ان کے عموم میں مطلقاً اللہ ﷻ کا ذکر کرنا بھی شامل ہے اور اللہ ﷻ کے عقاب و ثواب کو ذہن میں لا کر شیطان کے وسوسوں سے بچنا اور ان پر عمل نہ کرنا بھی شامل ہے۔ اللہ ﷻ کا ذکر شیطان کو دور کرنے کے لئے بہت بڑا ہتھیار ہے۔ شیطان انسان کے دل پر مضبوطی کے ساتھ جما ہوا ہے۔ سو جب وہ اللہ ﷻ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب اللہ ﷻ کی یاد سے غافل ہوتا ہے تو شیطان وسوسے ڈالنے لگتا ہے۔

علمی بات: سورۃ الفلق میں جو "مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ" فرمایا ہے اس میں اس بات کا ذکر ہے کہ شیطان وسوسے ڈالتا ہے اور (اللہ ﷻ کا ذکر کرنے پر) پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

علمی بات: "فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ" یعنی تقویٰ اختیار کرنے والے جب شیطان کا وسوسہ آنے پر اللہ ﷻ کو یاد کرتے ہیں اور اس سے پناہ طلب کرتے ہیں تو اس سے فوراً چونک جاتے ہیں اور آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ شیطان کی شرارت فوراً واضح ہو جاتی ہے اور خطا و ثواب کا پتہ چل جاتا ہے۔

علمی و عملی بات: بُرے خیالات پر گرفت نہیں ہے۔ ہر انسان کو اچھے خیالات بھی آتے ہیں اور بُرے خیالات بھی آتے ہیں اللہ ﷻ کا فضل و کرم ہے کہ بُرے سے بُرا اور گندے سے گندا خیال بھی آئے تو اس پر کوئی پکڑ نہیں ہے اگر خیال پر پکڑ ہوتی تو کسی کی بھی خیر نہیں تھی خیال اسے کہتے ہیں کہ جو بغیر ارادے کے خود بخود آئے اللہ ﷻ کے نیک بندوں متقیوں کو جب خیال آتے ہیں تو فوراً ان کو یاد آجاتا ہے کہ یہ شیطان کا وسوسہ ہے وہ صاحب بصیرت ہو جاتے ہیں سمجھ سے کام لیتے ہیں اللہ ﷻ کی پناہ لیتے ہیں اور باز آجاتے ہیں۔

آیت نمبر ۲۰۲: اس آیت میں شیطان سے دوستی کرنے والوں کا تذکرہ فرمایا گیا ہے یعنی متقین کا ذکر فرمانے کے بعد ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو شیطانوں کے بھائی ہیں یعنی ان کا شیطان کے ساتھ بہت زیادہ تعلق ہے۔ وہ شیطان کے وسوسوں سے نہیں بچتے۔ بلکہ ان شیطانی وسوسوں پر عمل کرتے ہیں۔ لہٰذا جو شخص شیطان کا دوست بنے گا پھر اس پر شیطان کا حکم تو لازمی چلے گا۔ شیاطین اپنے بھائی بندوں کو گمراہی میں گھسیٹتے ہوئے دور تک لے جاتے ہیں اور گمراہی کی آخری حد یعنی دوزخ میں پہنچا کر چھوڑتے ہیں۔ لیکن جو اللہ ﷻ کے مخلص اور متقی بندے ہیں ان پر شیطان کا اختیار نہیں چلتا۔ ان کی کیفیت وہ ہوتی ہے جو اس سے پچھلی آیت میں بیان ہوئی ہے، یعنی جیسے ہی منفی اثرات کا سایہ ان کو اپنی طرف بڑھتا ہوا محسوس ہوتا ہے وہ یکدم چونک کر اللہ ﷻ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

آیت نمبر ۲۰۳: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ مشرکین فرمائشی معجزات کا مطالبہ کرتے تھے۔ چنانچہ مطلوبہ معجزہ ظاہر نہ کرنے پر آپ ﷺ پر بے ہودہ اعتراض کرتے (معاذاللہ) رسول اللہ ﷺ کی زبانی ان کو جواب دیا گیا کہ آپ ﷺ خود اللہ ﷻ کی وحی کی پیروی کرتے ہیں۔ قرآنِ حکیم بذات خود معجزہ ہے۔ ہدایت کے متلاشی کے لئے بے شمار نشانیاں موجود ہیں۔

شانِ نزول: بعض مشرکین شرارت اور کج بحثی کی بنا پر آنحضرت ﷺ سے خاص معجزے طلب کرتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

علمی بات: مشرکین کی بہت ساری گمراہیوں میں سے ایک گمراہی یہ بھی تھی کہ وہ فوقتاً رسول اللہ ﷺ سے مخصوص نشانیوں کے مطالبے کرتے اور مقصود رسول اللہ ﷺ کو پریشان کرنا اور ان کا مذاق اڑانا ہوتا تھا ورنہ سب سے عظیم معجزہ قرآنِ کریم تو رات دن ان کے سامنے اترتا ہی رہتا تھا اور اس کی آیتیں اہل ایمان کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی تھیں۔ جبکہ مشرکین کسی نشانی کا مطالبہ کرتے اور رسول اللہ ﷺ ان کے سامنے اسے پیش نہیں کرتے تو بطور استہزاء کہتے کہ تم اسے اپنی طرف سے گھڑ کیوں نہیں لیتے؟ تو اللہ ﷻ نے آپ ﷺ سے فرمایا آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ میں اللہ ﷻ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں مجھے تو بذریعہ وحی میں جو کچھ بتایا جاتا ہے اس کی اتباع کرتا ہوں اور یہ قرآنِ کریم تو دل کی آنکھیں کھولتا ہے اور اسے بصیرت عطا کرتا ہے اور بھلائی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اللہ ﷻ کی رحمت ہے۔

علمی بات: نبی ﷺ کا ہر قول و فعل وحی الٰہی کے مطابق ہوتا تھا آپ ﷺ، اللہ ﷻ کی وحی کے مطابق عمل پیرا رہتے تھے۔

آیت نمبر ۲۰۴: اس آیت میں قرآنِ حکیم سننے کے آداب اور اس سے مستفید ہونے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے کہ قرآنِ حکیم کو پوری توجہ سے سنا جائے اور خاموش رہا جائے۔ قرآنِ حکیم جہاں پڑھا اور سنا جاتا ہے وہاں پر اللہ ﷻ کی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔ قرآنِ حکیم کا رحمت ہونا اُس کے ان آداب کے بجالانے پر موقوف ہے۔ مشرکین اہل ایمان کے قرآنِ حکیم پڑھنے پر خوب شور و غل کرتے تا کہ قرآنِ حکیم کی آواز کانوں میں نہ پڑ سکے۔ ان کو یہ روش چھوڑنے اور قرآنِ حکیم کے آداب کی پیروی کرنے کا حکم ہے۔

شانِ نزول: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (پہلے) ہم نماز میں سلام کیا کرتے تھے اور کام کاج کی باتیں کر لیتے تھے، تو (ایک بار) میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے، میں نے آپ ﷺ کو سلام کیا آپ ﷺ نے جواب نہیں دیا تو مجھے پرانی اور نئی باتوں کی فکر دامن گیر ہوگئی جب آپ ﷺ نماز پڑھ چکے تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ ﷻ جو چاہتا ہے، نیا حکم نازل کرتا ہے، اب اس نے نیا حکم یہ دیا ہے کہ نماز میں باتیں نہ کرو پھر آپ ﷺ نے میرے سلام کا جواب دیا۔ (سنن ابو داؤد)

حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہما) بیان کرتے ہیں کہ ہم میں سے بعض، بعض کو نماز میں سلام کیا کرتے تھے کہ سَلَامٌ عَلٰى فُلَانٍ، سَلَامٌ عَلٰى فُلَانٍ۔ حتی کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَأَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (اور جب قرآن پڑھا جائے تو توجہ سے سنا کرو اور خاموش رہا کرو تا کہ تم پر رحم فرمایا جائے) (سورۃ الاعراف ۷، آیت ۲۰۴)

علمی و عملی بات: دراصل قرآنِ حکیم کی تلاوت کے وقت توجہ اور ہمہ تن گوش ہو کر سننے کا حکم ہے، اس لئے کہ قرآنِ حکیم کے معانی سمجھ کر بھی سننا چاہیئے، اس نیت سے کہ اس کو ہم اپنائیں گے، اس کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگ لیں گے۔

علمی بات: جب حضور نبی کریم ﷺ قرآنِ حکیم کی تلاوت فرماتے تو کفار شور و غل مچاتے۔ نہ خود سنتے نہ اوروں کو سننے دیتے۔ اللہ ﷻ فرماتا ہے کہ اے کفار! جب قرآنِ حکیم پڑھا جا رہا ہو تو اسے غور سے سنو۔ اس کو سننے سے کچھ بعید نہیں کہ رحمتِ الٰہی کے دروازے تم پر کھل جائیں اور تم اس دعوتِ حق کو قبول کرنے کے لئے اپنے سینہ کو کشادہ پاؤ اور بہت ممکن ہے کہ ظاہری جمال اور معنوی حسن سے متاثر ہو کر تمہیں یقین ہو جائے کہ یہ کسی انسان کا نہیں بلکہ ربِ ذوالجلال کا کلام ہے۔

عملی پہلو: ہر شخص کو چاہیئے کہ جب قرآنِ حکیم پڑھا جا رہا ہو تو وہ مؤدب ہو کر خاموشی سے بیٹھ جائے اور بڑے غور سے اس کی آیات کو سنے تا کہ اللہ ﷻ کی رحمت کا مستحق بن جائے۔

آیت نمبر ۲۰۵: اس آیت میں ذکر کے حوالے سے آداب کا بیان ہے جو درج ذیل ہیں:

۱۔ ذکر دل کی توجہ کے ساتھ ہلکی آواز سے کیا جائے اور آواز کو زیادہ بلند نہ کیا جائے۔ ۲۔ ذکر کے دوران انسان میں رِقت اور اللہ ﷻ کا خوف طاری ہو۔

۳۔ خاص طور سے صبح و شام اللہ ﷻ کا ذکر کیا جائے۔ صبح و شام میں دونوں وقت کی نمازیں بھی داخل ہیں۔ ۴۔ اللہ ﷻ کی یاد سے کبھی بھی غفلت نہ برتی جائے۔

علمی بات: دل کے آئینہ سے غفلت کا غبار اور روح سے نافرمانی کے داغ دھونے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کی صبح و شام یادِ الٰہی میں بسر کرے۔ ذکر تب اپنا پورا اثر دکھاتا ہے جب اس میں مذکورہ شرائط موجود ہوں۔ (۱) ذکر کرتے وقت انسان عاجزی اور انکساری کا مجسمہ بنا ہوا ہو۔ کبر و غرور اور غفلت و کاہلی سے کوسوں دور ہو۔ (۲) اسے اس بات کا ہر وقت شدید احساس ہو کہ اس کے اعمال اور اس کا ذکر اس بارگاہِ رفعت و جلال کے شایانِ شان نہیں۔ (۳) ذکر گلا پھاڑ پھاڑ کر نہ کرے۔ جس میں بے ادبی کا شائبہ ہو بلکہ درمیانی آواز سے کیا جائے جس میں خشیت، ادب اور سنجیدگی ہو۔

علمی بات: ایک رات حضور رحمتِ عالم ﷺ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے گھر کے پاس سے گزرے تو دیکھا کہ وہ نماز میں چپکے چپکے تلاوت میں مشغول ہیں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے گھر کے پاس سے گزرے تو ملاحظہ فرمایا کہ نماز میں بلند آواز سے تلاوت کر رہے ہیں۔ صبح ہوئی تو دونوں کو بلایا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ہدایت فرمائی کہ ذرا بلند آواز سے تلاوت کیا کریں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ذرا آہستہ تلاوت کیا کریں اور اہلِ علم نے لکھا ہے کہ ریاء کا اندیشہ ہو یا نمازیوں اور آرام کرنے والوں کی تکلیف کا اندیشہ ہو تو پھر آہستہ ذکر کرنا ہی مستحب ہے۔

آیت نمبر ۲۰۶: اس آیت میں اللہ ﷻ کے مقرب فرشتوں کی عاجزی کا بیان ہے۔ گناہوں سے مبرّا ہونے کے باوجود وہ اللہ ﷻ کی عبادت میں لگے رہتے ہیں۔ وہ ہر وقت اللہ ﷻ کی تسبیح کرتے ہیں اور اسی کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ آیت کے اختتام میں سجدۂ کا حکم ہے تا کہ انسانوں کا حال بھی مقرب فرشتوں کے مطابق ہو۔

علمی و عملی بات: رب کی یاد سے غفلت ایک قسم کا تکبر ہے۔ قربِ خداوندی کے طالب اس سے حد درجہ اجتناب و احتراز کرتے ہیں۔ اسی لئے اللہ ﷻ کے مقرب فرشتے بھی مقرب ہونے کے باوجود اللہ ﷻ کی عبادت و بندگی سے تکبر نہیں کرتے۔ وہ دن رات اُسی کی تسبیح و تقدیس میں لگے رہتے ہیں اور تھکتے نہیں۔ وہ خاص اسی کو سجدۂ کرتے ہیں اور سجدۂ قربِ خداوندی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سجدۂ کی حالت میں بندہ اپنے رب سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ لہٰذا (سجدۂ کی حالت میں) زیادہ دُعا کیا کرو۔

عملی بات: ترتیبِ تلاوتِ قرآنِ حکیم کے مطابق یہ پہلی آیت ہے جس پر سجدۂ کرنا واجب ہوتا ہے۔

صحیحین میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب غیر حالت نماز میں کوئی سجدۂ والی سورت پڑھتے تو سجدۂ کرتے اور ہم لوگ بھی سجدۂ کرتے اور اِزدحام کی وجہ سے لوگ اپنی پیشانی کے لئے جگہ نہیں پاتے تھے۔ احادیث میں اللہ ﷻ کے لئے سجدۂ کرنے کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ میں نے رسول ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ ﷻ کے لئے کثرت سے سجدۂ کیا کرو، اگر اللہ ﷻ کے لئے ایک سجدۂ کرو گے تو اللہ ﷻ تمہارا مقام ایک درجہ بلند کرے گا اور ایک گناہ مٹا دے گا۔ (صحیح مسلم)

عملی بات: اس سورۃ کا اختتام فرشتوں کے ذکر خیر سے کیا جارہا ہے اور بتایا جارہا ہے کہ جب یہ نورانی اور پاک مخلوق ہر وقت اپنے پروردگار کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کیئے ہوئے ہے۔ ان کی زبانیں اپنے رب قدیر کی حمد وثنا اور تسبیح و تحمید میں مدح سرا ہیں اور ان کے دل اس کی یاد میں محو ہیں اور ان کی پیشانیاں اس کی بارگاہ میں سجدۂ ریز ہیں تو انسان جو مسجودِ ملائکہ ہے اور اللہ ﷻ کا خلیفہ ہے اس کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے مولائے کریم کی عبادت اور اطاعت میں صبح وشام کوشاں رہے۔ ہر دم اس کی یاد، اس کا ذکر اور اس کی محبت میں سرشار رہے۔ وہ بھی ملاءِ اعلیٰ کے رہنے والوں کی موافقت میں سجدۂ ریز ہو جائے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: سجدۂ تلاوت شیطان کے لئے بہت بڑی مار ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب ابن آدم آیت سجدۂ پڑھتا ہے پھر سجدۂ کرتا ہے تو شیطان روتا ہوا وہاں سے ہٹ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے میری بربادی! ابن آدم کو سجدۂ کا حکم ہوا تو اس نے سجدۂ کرلیا لہٰذا اس کے لئے جنّت ہے اور مجھے سجدۂ کا حکم دیا گیا اور میں نے انکار کیا لہٰذا میرے لئے دوزخ ہے۔ (صحیح مسلم)

علمی بات: ۱۔ یہ آیت سجدۂ ہے اور اس طرح کی چودہ آیاتِ سجدۂ ہیں جن کو جب انسان پڑھے یا سنے تو اس پر سجدۂ کرنا لازمی ہے۔ اسے سجدۂ تلاوت کہتے ہیں۔

۲۔ سجدۂ تلاوت کے ادا کرنے کی بھی وہی شرطیں ہیں جو سجدۂ نماز کی ہیں۔ یعنی باوضو ہو، پاک جگہ ہو وغیرہ۔

۳۔ سجدۂ تلاوت کرنے لگے تو اس میں تکبیر تحریمہ کی طرح ہاتھ اٹھانا نہیں ہے بلکہ اللّٰہُ اَکْبَر کہتا ہوا سجدۂ میں چلا جائے اور ایک سجدۂ کرے تکبیر کہتے ہوئے سر اٹھائے اس میں تشہد اور سلام نہیں ہے۔

۴۔ جیسے آیت سجدۂ پڑھنے والے پر سجدۂ واجب ہوتا ہے ایسے ہی سننے والے پر بھی واجب ہو جاتا ہے اگرچہ اس نے ارادہ کر کے نہ سنا ہو، البتہ تلاوت کرنے والے کے لئے بہتر یہ ہے کہ آیت سجدۂ حاضرین کے سامنے زور سے نہ پڑھے، ہاں اگر حاضرین سننے ہی کے لئے بیٹھے ہیں تو سجدۂ تلاوت زور سے پڑھ دے۔

سجدۂ تلاوت کی دُعا: سجدۂ تلاوت میں اگر سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم تین مرتبہ کہے تو یہ بھی درست ہے اور اگر اس کے ساتھ دُعاء ماثور پڑھ لے تو زیادہ بہتر ہے۔ دُعاء ماثور یہ ہے: سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ خَلَقَهٗ وَشَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ بِحَوْلِهٖ وَقُوَّتِهٖ (سنن ابی داؤد، جامع ترمذی)

"میرے چہرہ نے اس ذات کے لئے سجدۂ کیا جس نے اسے پیدا فرمایا اور اسے اپنی طاقت وقدرت کے ذریعہ آنکھ وکان نکال کر (زینت بخشی)"۔

سُوْرَةُ یُوْنُس

ربطِ سورت: سُوْرَةُ یُوْنُس میں بتایا گیا ہے کہ قتال فی سبیل اللہ سے پہلے اِتمامِ حجّت یعنی محکم دلائل کے ساتھ دعوتِ توحید کا پہنچ جانا ضروری ہے۔

آیت نمبر۱: یہ حروفِ مقطعات ہیں۔ حروفِ مقطعات کا علم اللہ ﷻ کے پاس ہے اور یہ اللہ ﷻ اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان ایک راز ہے۔ "کتاب" سے مراد قرآنِ حکیم ہے۔ قرآنِ حکیم کی عظمت ہے کہ اس کی تمام آیات حکمت سے بھری ہیں۔

علمی بات: حکیم کا معنی ہے دانا، یعنی یہ حکمت اور دانائی والی کتاب کی آیتیں ہیں۔ اللہ ﷻ کی طرف سے جتنی کتابیں نازل ہوئی ہیں سب برحق ہیں مگر ان تمام کتابوں میں سے زیادہ دانائی اور حکمت اس کتاب میں ہے اور حکیم کا معنی محکم اور اٹل بھی کیا گیا ہے کہ یہ کتاب اپنی جگہ بڑی محکم اور اٹل ہے۔ دُنیائے کفر نے اس کے خلاف بڑی کوشش کی ہے مگر کامیاب نہیں ہو سکی اور نہ قیامت تک کامیاب ہو سکے گی۔

علمی بات: قرآنِ حکیم کی آیات ایسی مضبوط و محکم کتاب کی آیات ہیں جو الفاظ کی تبدیلی اور معنوی تحریف سے محفوظ رہے گی نیز اس کتاب میں ذکر کردہ ہر بات پکی ہے، علوم و معارف ایسے جو فطرتِ انسان اور عقل و حکمت کے موافق ہیں۔ احکام ایسے پائیدار و مستحکم کہ قیامت تک کوئی دوسری کتاب اس کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ خبریں اور قصّے ایسے محکم کہ واقعہ کے عین مطابق ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ یہ خدائے علیم و حکیم کا نازل کردہ اور اُس کا کلام ہے۔ جو اللہ ﷻ کا کلام ہو اس کے تغیّر و تبدیل کا کوئی امکان نہیں اور چونکہ یہ آخری اُمّت کے لئے اتاری گئی آخری کتاب ہے لہٰذا اس کے لئے کوئی ناسخ نہیں آئے گا، چنانچہ اب قرآنِ حکیم اللہ ﷻ کا آخری کلام قیامت تک کی انسانیت کے نام ہے۔

آیت نمبر۲: اس آیت میں مشرکین کے ایک اعتراض کا جواب دیا گیا ہے وہ کہتے تھے کہ رسول ﷺ انسان نہیں بلکہ فرشتہ ہونا چاہئے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ رسول کا انسان ہونا ہی ضروری ہے تا کہ وہ انسانوں کے لئے نمونہ بن سکیں۔ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لا کر ان کی تعلیم کو تسلیم کرنے والے کو اعلیٰ درجات کی بشارت دی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کو تسلیم کرنے کے بجائے کفار نے ان کو جادوگر قرار دیا (معاذ اللہ)۔

علمی بات: مشرکینِ مکّہ اس بات پر حیرت کرتے تھے کہ انہی جیسا ایک آدمی ان کی رہنمائی کے لئے بھیجا گیا ہے، اللہ ﷻ نے ان کی اس حیرت کی تردید فرما دی ہے کہ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں بلکہ اگر وہ رسول کوئی فرشتہ یا جن ہوتا تو حیرت کی بات تھی، اس لئے کہ بنی نوع انسان یا تو اسے دیکھ نہیں پاتے یا اگر دیکھ پاتے تو اس سے مانوس نہیں ہوتے، کیونکہ انسان اپنے ہی جیسے جسدِ خاکی رکھنے والے انسان کے ساتھ مانوس ہوتا ہے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ کا مبعوث ہونا فطرت اور عقل کے تقاضے کے عین مطابق تھا اور جب آپ ﷺ کو نبوّت عطا فرمائی تو اللہ ﷻ نے آپ ﷺ کو بذریعہ وحی حکم دیا کہ آپ علیہ السلام لوگوں کو آخرت کے دن کے عذاب سے ڈرائیں اور مومنوں کو خوشخبری دیں کہ اللہ ﷻ قیامت کے دن ان کے ایمان اور عملِ صالح کا اچھے سے اچھا بدلہ دے گا اور شافعِ محشر محمد ﷺ ان کے لئے شفاعت فرمائیں گے۔ لیکن کفارِ قریش نے آپ ﷺ کی دعوت قبول نہیں کی اور جب ان سے کچھ نہ بن پڑا، تو کہنے لگے کہ یہ آدمی تو صریح جادوگر ہے اور یہ قرآنِ حکیم کھلا جادو ہے (معاذ اللہ) جو انسانوں کو مسحور کر دیتا ہے، یہ آسمان سے نازل شدہ اللہ ﷻ کی کوئی کتاب نہیں ہے۔

علمی بات: کفار و مشرکین آپ ﷺ کو اس وجہ سے بھی جادوگر کہتے تھے کہ آپ علیہ السلام اللہ ﷻ کا جو کلام پیش کر رہے تھے اس میں لطافت، شیرینی اور تاثیر اتنی زیادہ تھی کہ کافر بھی یہ کلام سن کر مسحور ہو جاتے تھے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کا اپنا ارشاد ہے کہ "اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا" (صحیح بخاری) یعنی کوئی بیان ایسا ہوتا ہے جو جادو کا سا کام کر جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم کی ایسی تاثیر کی وجہ سے قریش نے بلند آواز سے قرآنِ حکیم پڑھنے پر پابندی لگا رکھی تھی اور کہتے تھے کہ اس سے ہماری عورتیں اور بچے متاثر ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ پابندی لگانے والے قریشی سردار خود قرآنِ حکیم سن کر اس سے لُطف اندوز ہوتے تھے اور اپنے باہمی معاہدہ کے باوجود چوری چھپے قرآنِ حکیم سن لیا کرتے تھے۔ یہ کتاب حکمت سے پُر اور دانائی سے معمور ہے اور اتنی فصیح و بلیغ کہ قادر الکلام عرب شعراء اس کی آیت کی مثل تک نہ لا سکے پھر چونکہ یہی قرآنِ حکیم آپ ﷺ ان پر پیش فرما رہے تھے تو کافر لوگ آپ ﷺ کو جادوگر کہہ دیتے تھے اور اکثر انبیاء و رسل علیہم السلام کو

کفار و مشرکین کی جانب سے انہی القاب سے نوازا جاتا رہا ہے جن کو کوئی حسی معجزہ عطا کیا گیا تھا۔ حالانکہ ایک رسول علیہ السلام اور ایک جادوگر کی زندگی میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے

نبی (علیہ السلام) اور جادوگر میں فرق: ا۔ جادو ایک فن ہے جو سیکھنے سے حاصل ہوتا ہے ہر جادوگر کسی استاد کا شاگرد ہوتا ہے جبکہ معجزہ محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتا ہے یہ سیکھنے سکھلانے کی چیز نہیں ہوتی۔

۲۔ جادو ایک پیشہ ہے جسے مال و دولت کے حصول کے لئے اختیار کیا جاتا ہے اور اس معاملہ میں جادوگر انتہائی پست ذہنیت کے مالک ہوتے ہیں جیسا کہ فرعون نے جب جادوگروں کو بلایا تو ان کا پہلا سوال ہی یہ تھا کہ "کہ ہمیں اس کا کچھ معاوضہ بھی ملے گا؟" جبکہ نبی (علیہ السلام) انسانیت کی بے لوث خدمت کرتا ہے وہ برملا لوگوں سے کہہ دیتا ہے کہ میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔

۳۔ جادو بالعموم ایسی باتوں کے لئے کیا جاتا ہے جن سے کسی کو دکھ اور تکلیف پہنچانا مقصود ہو جبکہ معجزہ بندوں کی ہدایت کے لئے نبوّت کی علامت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور اس سے مقصود سراسر بھلائی ہوتی ہے۔

۴۔ جادوگر کے اخلاق و کردار دونوں مکروہ ہوتے ہیں اور لوگ اگر ان کی عزّت کرتے ہیں تو ان کے شر سے بچنے کی خاطر کرتے ہیں جبکہ انبیاء علیہم السلام کے اخلاق اور کردار نہایت پاکیزہ ہوتے ہیں اور اسی بنا پر ان کی عزّت کی جاتی ہے اور ان کی گذشتہ زندگی کو کفار کے سامنے معیار کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

ایسے واضح تضاد کے باوجود مخالفین اگر انبیاء کرام علیہم السلام کو جادوگر کہنا ان کی ضد، ہٹ دھرمی، عناد، اپنے آباؤاجداد کے مذہب کا تعصّب اور اپنے مناصب اور سرداریوں کے ختم ہو جانے کے خوف سے تھا اور یہی چیز ان کے پیشِ نظر تھی جو قبولِ اسلام سے مانع تھی۔

آیت نمبر ۳: اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے حقیقی رب ہونے کے دلائل بیان کئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے چھ دن میں پوری کائنات پیدا فرمائی، پھر عرش پر جلوہ فرما ہوا جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے۔ کائنات کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے اور مدبّر و منتظم بھی وہی عظیم ہستی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی کسی کے لئے سفارش نہیں کر سکتا۔ ان سب باتوں کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا رب تسلیم کر کے اسی کی بندگی اختیار کی جائے۔

علمی بات: اس آیت میں تخلیق کائنات اور نظام کائنات کو بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے زمینوں اور آسمانوں کو چھ ایام میں پیدا کیا، یعنی یہ کائنات از خود وجود میں نہیں آگئی، جیسا کہ دہریوں کا عقیدہ ہے۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ اپنی شان کے مطابق عرش پر جلوہ فرما ہوا۔ پھر وہ کائنات کو پیدا کر کے بیٹھ نہیں گیا، جیسا کہ بعض گمراہ لوگوں کا خیال ہے، بلکہ اس کا پورا انتظام چلا رہا ہے۔ چنانچہ سورج و چاند اور ستارے سب اسی کے حکم کے مطابق گردش کر رہے ہیں وہ قادرِ مطلق اور اتنے رعب و دبدبے والا ہے کہ کوئی اس کے سامنے کسی دوسرے کی سفارش بھی کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا، اِلّا یہ کہ وہ خود ہی کسی کو سفارش کی جازت دے۔ لہٰذا ان سب باتوں کا تقاضا یہ ہے کہ تم لوگ اس بااختیار اور مقتدر ذات کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو کیونکہ وہی تمہارا پروردگار ہے۔

علمی بات: اس جگہ غور طلب بات یہ ہے کہ آسمان و زمین کی چھ ایام میں تخلیق سے کیا بتانا مقصود ہے؟ ایام یوم کی جمع ہے اور عام طور پر صبح سے لے کر شام تک کے وقت کو یوم کہا جاتا ہے لیکن اس جگہ ایام کا ذکر ہو رہا ہے جب کہ نہ سورج تھا اور نہ ہی صبح و شام کا کوئی وجود اس لئے آیتِ کریمہ میں یوم سے مراد وہ دن تو ہو نہیں سکتا جس کا ابھی وجود نہ تھا۔ ہاں! اس سے مراد محض وقت ہے اور جس کی مقدار اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہے۔

آیت نمبر ۴: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ لوگوں کو لازماً پلٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف جانا ہے۔ جس اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پہلی بار پیدا کیا وہی مرنے کے بعد اُسے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔ قیامت کے دن عدل کے فیصلے ہوں گے۔ ایمان اور عمل صالح اختیار کرنے والوں کو پورا بدلہ دینے کی بشارت دی گئی ہے۔ اس کے برعکس جھٹلانے والوں کے لئے کھولتا ہوا مشروب اور دردناک عذاب ہوگا۔

علمی بات: اکثر اوقات چور، ڈاکو اور لٹیرے جھوٹے گواہوں یا اپنے اثر و رسوخ اور دولت کے بل بوتے پر سزا سے بچ جاتے ہیں اور قوم و ملّت کی نگاہوں میں اشراف بنے ہوتے ہیں لہٰذا اس امر کی شدّت سے ضرورت تھی کہ ایسا دن مقرر ہو جس میں پاکبازوں کو اُن کی نیکی کا صلہ اور اجر ملے اور بُروں اور مفسدوں کو ان کی بداعمالیوں کی سزا ملے اسی کو عالمِ آخرت سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہی چیز اسلام نے انتہائی کھلے انداز میں پیش کر کے اسے یوم الجزاء اور یوم الحساب قرار دیا۔

آیت نمبر ۵: اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے سورج اور چاند کا بیان ہے۔ سورج اور چاند مقررہ حساب کے مطابق اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں۔ دونوں کے ذریعہ سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کرنے کے علاوہ انسانوں کے لئے بے شمار فوائد ہیں۔ یہ دلائل ان لوگوں کے لئے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عقل سے غور و فکر کرتے ہیں۔

علمی بات: ان آیات میں مزید مظاہر قدرت بیان فرمائے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں۔ اوّل آفتاب کی روشنی کا اور پھر چاند کی روشنی کا تذکرہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو سراپا روشنی بنایا۔ آفتاب کے لئے لفظ ضِیَاء اور چاند کے لئے لفظ نُور استعمال فرمایا۔ علمائے تفسیر نے لکھا ہے کہ ضِیَاء بڑی اور قوی روشنی کو کہتے ہیں اور نُور قوی اور ضعیف ہر روشنی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا آفتاب کے لئے لفظ ضِیَاء استعمال میں لایا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے آفتاب کو زیادہ قوی روشنی دی جب وہ طلوع ہوتا ہے تو رات چلی جاتی ہے اور دن آجاتا ہے، چونکہ دن میں چلنے پھرنے اور کاروبار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے دن کو بہت زیادہ روشن بنایا اور رات کو سکون اور آرام کے لئے بنایا ہے۔ چونکہ آرام و سکون کے لئے دھیمی روشنی کی ضرورت ہے اس لئے چاند کو دھیمی روشنی عطا فرمائی جس کے لئے لفظ نور استعمال فرمایا۔ ایسی روشنی جو آنکھوں کو نہ چبھے بلکہ بھلی معلوم ہوتی ہو۔

علمی بات: یہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ پر شاہد اور وحدانیت کے دلائل میں سے ہے، پھر اُن منزلوں کے تقرّر کے ساتھ انسانوں کے نفع کو بھی بیان فرمادیا کہ وہ ان کے ذریعہ یہ معلوم کرلیتے ہیں کہ فلاں معاملہ یا معاہدہ کو کتنے برس گزر گئے اور میعاد پورا ہونے میں کتنے برس باقی ہیں۔ آفتاب کی منازل کا پتہ تو ماہرینِ فلکیات وغیرہ کو ہی ہو سکتا ہے لیکن چاند کے طلوع اور غروب اور گھٹنے بڑھنے سے عام طور سے تاریخ کا پتہ چل جاتا ہے، پڑھا لکھا شہری انسان ہو یا دیہاتی ہر شخص آسانی سے مہینہ کی ابتداء اور انتہا سمجھ لیتا ہے اور احکامِ شرعیہ میں چاند کے مہینوں ہی کا اعتبار کیا جاتا ہے زکوۃ کی ادائیگی بھی چاند ہی کے اعتبار سے بارہ مہینے گزرنے پر فرض ہوتی ہے، اور رمضان کا مہینہ بھی چاند ہی کے حساب سے پہچانا جاتا ہے جو قمری سال کا نواں مہینہ ہے، اور حج بھی چاند ہی کے حساب سے ذی الحجہ کی نویں تاریخ کو ہوتا ہے عدّت کے مہینوں میں بھی چاند کا اعتبار ہوتا ہے۔

آیت نمبر ۶: رات اور دن کے نظام اور پوری کائنات میں اللہ تعالیٰ کی معرفت کی نشانیاں موجود ہیں۔ ان نشانیوں پر غور و فکر کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی عظمت واضح ہو جاتی ہے۔ لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچتے اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔

علمی بات: اس کائنات کے جن حقائق کی طرف قرآنِ حکیم اشارہ فرماتا ہے اس کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ کائنات کا یہ حیرت انگیز نظام جس میں چاند و سورج ایسے منظم و طے شدہ حساب کے پابند ہو کر اپنا کام کر رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کی نشانی ہے، اس بات کو مشرکینِ عرب بھی تسلیم کرتے تھے کہ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں، قرآنِ حکیم فرماتا ہے کہ جو ذات اتنے عظیم الشان کاموں پر قادر ہو اسے اپنی خدائی میں آخر کسی اور شریک کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے، لہٰذا یہ پوری کائنات اللہ تعالیٰ کی توحید کی گواہی دیتی ہے، دوسرا مقصد یہ ہے کہ ساری کائنات بے مقصد پیدا نہیں کی گئی، اگر اس دُنیوی زندگی کے بعد آخرت کی ابدی زندگی نہ ہو جس میں نیک لوگوں کو اچھا صلہ اور بُرے لوگوں کو بُرائی کا بدلہ نہ ملے تو اس کائنات کی پیدائش بے مقصد ہو کر رہ جاتی ہے، لہٰذا یہی کائنات توحید کے ساتھ ساتھ آخرت کی ضرورت کو بھی بدرجہ اتم ثابت کرتی ہے۔

آیت نمبر ۷: اس آیت میں دُنیا کے طلب گار اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں پر غور نہ کرنے والوں کی چار حالتیں بیان کی گئی ہیں:

۱۔ انہیں اللہ تعالیٰ سے ملنے کی توقع نہیں۔

۲۔ انہوں نے دُنیاوی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھ لیا۔

۳۔ اسی دُنیاوی زندگی پر وہ خوش اور مطمئن ہیں۔

۴۔ ایسے غافل ہیں کہ توحید کی ہر طرف پھیلی ہوئی نشانیوں کو دیکھنے کے باوجود خوابِ غفلت سے بیدار نہیں ہوتے۔

عملی پہلو: اللہ تعالیٰ سے غافل لوگوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ انہوں نے دُنیا میں ایسا دل لگایا کہ آخرت کی اور اللہ تعالیٰ کے پاس جانے کی کچھ خبر ہی نہ رہی۔ اسی چند روزہ حیات کو مقصودِ اصلی بنالیا اور قدرت کی جو نشانیاں اوپر بیان ہوئیں، ان میں کبھی غور و تامل نہ کیا کہ ایسا مضبوط اور حکیمانہ نظام یوں ہی بیکار نہیں بنایا گیا۔ ضرور اس تخلیق کا کوئی خاص مقصد ہوگا۔ پھر جس نے پہلی مرتبہ ایسی عجیب و غریب مخلوقات پیدا فرمائی، اس کے لئے دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔

آیت نمبر ۸: اللہ ﷻ سے ملاقات کو بھلانے والے دُنیا پرستوں کے بُرے انجام کا ذکر ہے۔ ان کی غفلت کا بدلہ یہ ہے کہ انہیں جہنّم کی آگ میں ڈالا جائے گا۔ یہ سزا ان کے اپنے عمل کا نتیجہ ہو گا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: جہنّم کو خواہشات سے اور جنّت کو ناپسندیدہ (مشکل) امور سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ (مسند احمد)

علمی و عملی بات: معلوم یہ ہوا کہ جس کسی نے تمام ہمت اور کوشش اور عمر، آخرت سے غافل رہ کر خواہشاتِ دُنیا کے پورا کرنے میں گزار دی اس نے گویا دوزخ کے دروازہ کا پردہ اٹھایا اور دوزخ میں جانے کا قصد و ارادہ کیا اور جس کسی نے دین کے راستہ پر چلنے میں تکالیف اور مصائب کو صبر و تحمّل کے ساتھ برداشت کیا اور اللہ ﷻ کی رضا پر راضی رہا گویا اس نے جنّت کے دروازہ کا پردہ اٹھایا اور جنّت میں جانے کا ارادہ کیا۔ غرض جو معنی اس حدیث کے ہیں وہی معنی ان آیتوں کے ہیں۔ گویا یہ حدیث ان آیتوں کی تفسیر ہے جس کا مفہوم یہ ہوا کہ خواہشاتِ دُنیا میں ہی لگے رہنا اور آخرت کو پس پشت ڈالنا رحمتِ الٰہی اور جنّت سے روکنے والی چیزیں ہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: اللہ ﷻ اپنے جس بندے کی آخرت کی بھلائی چاہتا ہے اس کو دُنیا اور خواہشاتِ دُنیا سے ایسے بچاتا ہے جس طرح کوئی آدمی اپنے بیمار کو بد پرہیزی کی چیزوں سے بچاتا ہے۔ (طبرانی اور مستدرک حاکم)

آیت نمبر ۹: اللہ ﷻ کی نشانیوں میں غور و فکر کرنے والوں کی رہنمائی کا بیان ہے۔ ان کے ایمان و نیک اعمال کا بدلہ ابدی نعمتوں اور راحتوں والے جنّت کے باغات کی صورت میں دیا جائے گا۔

علمی بات: حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مومن جب اپنی قبر سے نکلے گا تو اس کا عمل ایک نہایت حسین اور خوشبودار صورت میں اس کے سامنے آئے گا۔ وہ اسے دیکھ کر کہے گا "تم کیا چیز ہو، اللہ ﷻ کی قسم میں تو تمہیں سراسر ایک سچا آدمی دیکھ رہا ہوں"۔ وہ کہے گا میں تمہارا عمل ہوں۔ "پھر وہ اس کی نور اور جنّت تک رہنمائی کرے گا۔ اس کے برعکس جب کافر اپنی قبر سے نکلے گا تو اس کا عمل ایک نہایت مکروہ اور بدبودار شکل و صورت میں اس کے سامنے آئے گا وہ اس سے کہے گا تم کیا چیز ہو؟ میں تو تمہیں سراسر ایک بُرا آدمی دیکھ رہا ہوں"۔ وہ کہے گا: میں تمہارا عمل ہوں پھر وہ اسے لے کر جہنّم میں جا پھینکے گا۔

ایمان اور عمل صالح والوں کو ان کے ایمان کی وجہ سے اللہ ﷻ دُنیا میں صراطِ مستقیم کی ہدایت، یعنی سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرماتا ہے یا یہ مطلب ہے کہ دُنیا میں ایمان لانے کی وجہ سے قیامت کے دن اللہ ﷻ کی طرف سے ان کی رہنمائی ہوگی، حتیٰ کہ وہ (پل) صراط سے گزر کر سیدھے جنّت میں پہنچ جائیں گے۔ (سورۂ حدید ۵۷، آیات: ۱۲، ۱۳) میں فرمایا گیا ہے کہ ایمان والے مردوں اور عورتوں کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں طرف دوڑ رہا ہو گا جب کہ منافق مرد اور عورتیں ان سے درخواست کریں گے کہ ہمیں بھی اپنے نور سے فائدہ اٹھا کر ساتھ چلنے کا موقع دو۔ گویا مومن اپنے نورِ ایمان کی مدد سے چلتے ہوئے جنّت میں پہنچ جائیں گے، جب کہ منافق اندھیرے میں رہ جائیں گے۔

آیت نمبر ۱۰: اہل جنّت کے چند مخصوص حالات کا بیان ہے۔ ان کی زبانوں پر اللہ ﷻ کی حمد و تسبیح جاری ہوگی۔ ہر ملاقات پر وہ ایک دوسرے کو سلامتی کی دُعائیں دیں گے۔ ان کی ہر مجلس کا اختتام اللہ ﷻ کی حمد و ثنا کے ساتھ ہو گا حدیثِ مبارک کے مطابق اہل جنّت کے وجود میں تسبیح و تحمید سانس کی طرح جاری ہو گی۔ (صحیح مسلم)

فرمانِ نبوی ﷺ: "جنّتی جنّت میں کھائیں گے اور پئیں گے، وہ نہ تھوکیں گے، نہ پیشاب کریں گے، نہ پاخانہ کریں گے اور نہ ناک صاف کریں گے۔" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: "جو کھانا وہ کھائیں گے وہ کہاں جائے گا؟" تو رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: "بس ڈکار آئے گی اور پسینہ آئے گا جس سے مشک (کستوری) کی خوشبو آئے گی (اور ان کا کھانا تحلیل ہو جائے گا)۔ (ان کے دلوں میں اور ان کی زبانوں پر) تسبیح اور حمد خود بخود بے اختیار جاری ہو گی جس طرح سانس خود بخود جاری رہتی ہے"۔ (صحیح مسلم)

علمی بات: "تَحِيَّتُهُم" کے معنی ہیں زندگی کی دُعا دینا کہ اللہ ﷻ تمہیں زندگی بخشے، یعنی وہ ایک دوسرے سے ملیں گے تو ایک دوسرے کو زندہ رہنے کی دُعا سلام کے الفاظ سے دیں گے، جیسا کہ اللہ ﷻ نے (سورۂ ابراہیم ۱۴، آیت: ۲۳)، (سورۂ مریم ۱۹، آیات: ۶۰ تا ۶۲) اور (سورۂ واقعہ ۵۶، آیات: ۲۵، ۲۶) میں بیان فرمایا

ہے اور ان کی دُعا اور گفتگو کا اختتام ربُّ العالمین کی حمد کے ساتھ ہوگا، دُنیا میں بھی ان کی گفتگو اور دُعا کا خاتمہ اللہ ﷻ کی حمد و تسبیح کے ساتھ ہوا کرتا تھا، جنّت میں بھی یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔

آیت نمبر ۱۱: اس آیت کے اصل مخاطب منکرینِ آخرت ہیں مگر اس کا حکم عام ہے کہ انسان جلد باز ہے اور فوری طور پر خیر اور بھلائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اگر اس کے لئے اس کی بُرائی پر اتنی ہی جلد عذاب کا فیصلہ کر دیا جاتا تو جلد ہی وہ موت اور تباہی سے دوچار ہو جاتا لیکن اللہ ﷻ کا قانون یہ ہے کہ کوئی شخص نیکی کرتا ہے تو اس کا ثواب فوراً اس کے اعمال نامہ میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص بُرائیوں کا مرتکب رہتا ہے تو اللہ ﷻ اس کو ڈھیل دیتا ہے تاکہ وہ کسی نہ کسی موڑ پر توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لے۔ اللہ ﷻ کا یہ قانون انسان کے لئے بہت بڑی رحمت ہے، ورنہ انسان اپنے نفس پر بڑا ظُلم کرنے والا ہے کہ وہ ہر وقت بُرائی کرنے پر آمادہ رہتا ہے اور اگر لوگوں کی ان کی بُرائیوں پر فوراً گرفت کی جانے لگے تو ان کی مہلتِ عمر بہت جلد ختم ہو جائے اور زمین کی پشت چلنے والے انسانوں سے خالی ہو جائے۔

دُنیا کی زندگی میں وہی لوگ سرکش بنتے ہیں جو دُنیا میں اس تصوّر کے ساتھ جیتے ہیں کہ مرنے کے بعد انہیں اللہ ﷻ کا سامنا نہیں کرنا ہوگا۔ جو مؤاخذہ اور گرفت کے اندیشہ سے خالی ہو کر زندگی گزارتے ہیں جو اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہیں کہ جو جی میں آئے کر گزریں۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان سچائی اور انصاف کے ساتھ معاملہ کرنے کا ایک ہی حقیقی محرّک ہے کہ انسان اس بات کا مکمل یقین رکھے کہ سب طاقتوروں کے اوپر ایک ایسا طاقتور ہے کہ ہر انسان اس کے آگے بے بس ہے۔ ایک دن تمام انسان اس کے حضور پیش ہوں گے اور ہر ایک مجبور ہوگا کہ اپنے بارے میں اس ذات کے فیصلہ کو تسلیم کرے۔

علمی بات: اس آیت کی دو تفسیریں بیان کی گئی ہیں۔ پہلی یہ کہ عذاب کے مطالبہ میں کفار جلدی مچاتے تھے کہ جس عذاب سے ہمیں ڈراتے ہو اس عذاب کو لے آؤ، فرمایا: (سورۃ الحج ۲۲، آیت:۴۷) ”اور وہ آپ سے عذاب جلدی مانگتے ہیں“۔ حتیٰ کہ انہوں نے اللہ ﷻ سے دُعا کی کہ یا اللہ! اگر اسلام واقعی حق ہے تو ہم پر پتھروں کی بارش برسا یا کوئی دردناک عذاب بھیج دے۔ دیکھیئے (سورۃ الانفال ۸، آیت ۳۲) اللہ ﷻ فرماتا ہے کہ ہم جس طرح انہیں خیر بہت جلدی عطا کر دیتے ہیں اسی طرح (ان کے مطالبے پر) عذاب بھی جلدی بھیج دیتے تو یہ کب کے ہلاک ہو چکے ہوتے، مگر ہم انہیں مہلت دے کر پورا موقع دیتے ہیں کہ واپس پلٹ آئیں یا اِتمامِ حجّت ہو جائے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ اللہ ﷻ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے، انسان جب اپنے یا دوسروں کے لئے بھلائی کی دُعا کرتا ہے تو اسے جلد قبول فرماتا ہے لیکن جب غصّے یا رنج کی کیفیت میں اپنی زبان سے اپنے اہل و عیال یا دوسروں کے لئے بددعا کے کلمات نکالتا ہے تو وہ انہیں قبول نہیں فرماتا، بلکہ ڈھیل اور مہلت دیتا ہے کہ شاید توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیں اور اگر بددعا بھی جلدی قبول کر لے تو لوگ جلد ہی ہلاک ہو جائیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اپنے آپ پر بددعا نہ کرو اور اپنی اولاد پر بددعا نہ کرو اور اپنے خادموں پر بددعا نہ کرو اور اپنے مالوں پر بددعا نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ تم کسی ایسے وقت میں دُعا کر بیٹھو جس میں (مانگی ہوئی چیز) دے دی جاتی ہے اور وہ تمہاری بددعا قبول کر لے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ وہ قبولیّت کی گھڑی ہو اور وہ بددعا قبول ہو جائے۔“ (سنن ابو داؤد)

آیت نمبر ۱۲: ناشکرے بندوں کا اللہ ﷻ کے ساتھ احسان فراموشی کا بیان ہے کہ جب اُن کو مصیبت پہنچتی ہے تو چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے ہر وقت میں گڑگڑا کر اللہ ﷻ سے رحم کی التجا کرتے ہیں اور تکلیف دور ہونے پر اللہ ﷻ سے ایسے غافل ہو جاتے ہیں گویا کہ اس کو کبھی پکارا ہی نہیں تھا۔ حد سے گزرنے والوں کے بُرے اعمال ان کے لئے خوشنما بنا دیئے جاتے ہیں۔

علمی بات: دُنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ آدمی بار بار کسی نہ کسی تکلیف یا حادثہ کی زد میں آجاتا ہے اور جب اسے کوئی راہ سمجھائی نہیں دیتی اور خلاصی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو اس وقت آدمی محسوس کرنے لگتا ہے کہ خارجی طاقتوں کے مقابلہ میں وہ آدمی بے بس ہو کر بے اختیار اللہ ﷻ کو پکارنے لگتا ہے۔ وہ اللہ ﷻ کی قدرت کے مقابلہ میں اپنی عاجزی کا اعتراف کر لیتا ہے۔ مگر یہ حالت صرف اس وقت تک رہتی ہے جب تک وہ مصیبتوں کی گرفت میں ہو، مصیبت سے نجات پاتے ہی وہ دوبارہ ویسا ہی غافل اور سرکش بن جاتا ہے۔ اُن لوگوں کی اس طرح اظہارِ بندگی اللہ ﷻ کے ہاں معتبر نہیں کیونکہ اللہ ﷻ کو وہ اظہارِ بندگی مطلوب ہے جو خوشی و راحت رنج و تکلیف ہر حالت میں کی جائے اور اپنی غرض کی بندگی کی تو اللہ ﷻ کے نزدیک کوئی قیمت اور اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: جسے پسند ہو کہ اللہ ﷻ سختیوں اور مصیبتوں میں اس کی دُعا قبول فرمائے تو وہ خوش حالی میں کثرت سے دُعا کیا کرے۔ (جامع ترمذی)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان جب بھی کسی پریشانی، بیماری، رنج و ملال، تکلیف اور غم میں مبتلا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اگر اسے کوئی کانٹا بھی چبھ جاتا ہے تو اللہ ﷻ اسے اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔ (صحیح بخاری)

علمی بات: جو لوگ گناہ اور بُرے اعمال و افعال کرنا نہیں چھوڑتے۔ دراصل شیطان ایسے لوگوں کے دلوں میں ان کی اچھائی کا تصور بٹھا دیتا ہے۔ انسان ان سے بچنے کے بجائے ان کو انجام دینے میں لذّت محسوس کرتے ہیں اور مصیبت دور ہو جانے کے بعد پھر سے اپنے معبودانِ باطلہ کی عبادت و پکار کو وہ بہت اچھا کام خیال کرتے ہیں۔

آیت نمبر ۱۳: گزشتہ اقوام کو ان کی ظلم کی پاداش میں ہلاک کر دیا گیا۔ ان کے رسولوں نے واضح نشانیوں کے ساتھ انہیں توحید باری تعالیٰ کی دعوت دی۔ ظلم پر ڈھٹائی کرنے والوں سے ایمان لانے کی توفیق سلب کر دی جاتی ہے۔ ان کے حالات بیان فرما کر موجودہ کفار کو ہلاکت سے خبردار کیا گیا ہے۔

علمی بات: پیغمبر (علیہ السلام) اپنی قوموں کے پاس دلائل کے ساتھ آئے مگر ان نافرمان قوموں نے نہیں مانا۔ لفظ بیّنات (دلائل اور نشانیوں) میں اللہ ﷻ کی توحید اور پیغمبروں کی صداقت پر ہر قسم کے دلائل اور معجزات وغیرہ آجاتے ہیں۔ مگر معجزہ اتمامِ حجت کے لئے آتا ہے جس کے بعد انکار کی صورت میں عذابِ الٰہی سے دوچار ہو کر ہلاکت مقدر بن جاتی ہے۔

علمی بات: اس آیت میں پچھلی آیت کے مضمون کی مزید توضیح اور تاکید اس طرح کی گئی ہے کہ کوئی اللہ ﷻ کے ڈھیل دینے سے یہ نہ سمجھے کہ دُنیا میں عذاب آ ہی نہیں سکتا، پچھلی قوموں کی تاریخ اور ان کی سرکشی و نافرمانی اور رسولوں کی تکذیب کی پاداش میں مختلف قسم کے عذاب اسی دُنیا میں آچکے ہیں، اس اُمّت میں اگرچہ اللہ ﷻ نے سید الانبیاء ﷺ کے اکرام اور دُعاؤں کی وجہ سے یہ وعدہ فرما لیا ہے کہ اس اُمّت پر عمومی عذاب نہ آئے گا اور اللہ ﷻ کے اس لطف و کرم پر شکر گذار ہونے کے بجائے لوگ ایسے بے باک ہو جاتے ہیں کہ وہ بڑی جرأت سے عذابِ الٰہی کو دعوت دینے اور اس کا مطالبہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، لیکن یاد رہے کہ عذابِ الٰہی سے بے فکر ہو جانا بہت بڑی ناسمجھی ہے، کیونکہ پوری اُمّت اور پوری دُنیا پر عمومی عذاب نہ بھیجنے کا وعدہ ضرور ہے مگر خاص خاص افراد اور قوموں پر عذاب آجانا اب بھی ممکن ہے۔

آیت نمبر ۱۴: "خلائف" خلیفہ کی جمع ہے جس کے معنی ہے گزشتہ اُمتوں کا جانشین یا پہلے کے بعد دوسرے کا جانشین بننا۔ پچھلی قوموں کی ہلاکت کے بعد موجودہ قوموں کو ان کا جانشین بنا کر زمین پر بھیجا گیا۔ جانشین بنانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ موجودہ قوم کا امتحان لیا جائے کہ پچھلی قوم کے انجام سے عبرت حاصل کر کے اپنی اصلاح کرتی ہے یا سرکشی کا راستہ اختیار کرتی ہے۔

علمی بات: اس آیت میں مخاطب وہ مشرکینِ عرب ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں موجود تھے کہ گزشتہ اقوام کے بعد اللہ ﷻ نے انہیں زمین کا مکین بنایا، تاکہ انہیں بھی آزمائے کہ وہ لوگ اس کی اطاعت اور اس کے رسول ﷺ کی اتباع کرتے ہیں یا نہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: "یقیناً دُنیا میٹھی، مزے دار اور سبز ہے (جیسے تازہ میوہ) اور اللہ ﷻ اس میں تمہیں خلیفہ بنا کر دیکھ رہا ہے کہ تم کیسے اعمال سرانجام دیتے ہو، دُنیا سے ہوشیار رہو اور عورتوں سے ہوشیار رہو، کیونکہ بنی اسرائیل میں سب سے پہلا فتنہ عورتوں ہی کا آیا تھا۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۱۵: سردارانِ قریش کی طرف سے قرآنِ حکیم میں تبدیلی کے مطالبہ کا بیان ہے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے دو مطالبات کئے:

۱۔ اس قرآنِ حکیم کی جگہ دوسرا قرآنِ حکیم لے آئیں۔ (معاذ اللہ)

۲۔ اس قرآنِ حکیم کی جو چیزیں ان کی مرضی کے خلاف ہیں ان کو تبدیل کر دیا جائے۔ (معاذ اللہ)

ان کے دونوں مطالبات کی تردید کی گئی اور رسول اللہ ﷺ کی زبانی ان کو یہ جوابات دیئے گئے کہ:

۱۔ رسول اللہ ﷺ اپنی طرف سے قرآنِ حکیم میں کسی کمی بیشی یا تبدیلی کا اختیار نہیں رکھتے۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ وحی الٰہی کے پابند ہیں۔ ۳۔ رسول اللہ ﷺ اللہ ﷻ کی نافرمانی سے ڈرتے ہیں۔

شانِ نزول: مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ مشرکینِ مکّہ میں سے پانچ آدمی عبد اللہ بن اُمیہ المخزومی، ولید بن مغیرہ، مکرز بن حفص، عمرو بن عبید اللہ بن ابی قیس العامری اور عاص بن عامر بن ہشام نے حضور سرورِ دو عالم ﷺ سے یہ کہا تھا کہ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ پر ایمان لے آئیں تو آپ اس قرآنِ حکیم

کے علاوہ کوئی اور قرآن حکیم لے آئیں جس میں لات، عزّیٰ اور منات کی عبادت سے ممانعت نہ ہو اور نہ ان کی مذمّت کی گئی ہو یا آپ ﷺ اس قرآنِ حکیم کو بدل ڈالیں اور عذاب کی آیتوں کی جگہ رحمت کی آیتیں اور حرام کی جگہ حلال اور حلال کی جگہ حرام لکھ دیں، اللہ ﷻ نے ارشاد فرمایا: (اے محمد ﷺ!) آپ کہیئے کہ اس قرآنِ حکیم کو بدلنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں صرف اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جس کی مجھ پر وحی کی جاتی ہے، اس کے مطابق میں حکم دیتا ہوں یا کسی چیز سے منع کرتا ہوں۔

علمی بات: قرآنِ حکیم میں تبدیلی کے مطالبہ کی وجوہات: کفارِ مکّہ کا یہ مطالبہ کہ آپ کوئی اور قرآن حکیم لے آئیں یا اسی قرآنِ حکیم کو بدل ڈالیں تو ان کا یہ مطالبہ بطور استہزاء تھا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ آپ ﷺ سے اس مطالبہ کی غرض یہ ہو کہ اگر آپ ﷺ نے ان کا یہ مطالبہ مان لیا تو آپ کا یہ دعویٰ باطل ہو جائے گا کہ یہ قرآنِ حکیم اللہ ﷻ کا کلام ہے اور اس کا نازل کیا ہوا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ قرآن حکیم کو آپ ﷺ کی تصنیف سمجھتے ہوں اور واقعی کوئی اور کتاب چاہتے ہوں کیونکہ قرآنِ حکیم میں ان کے معبودوں کی مذمّت بیان کی گئی ہے اور اُن کی پرستش کو باطل قرار دیا گیا ہے، اس لئے وہ کوئی اور کتاب چاہتے تھے جس میں یہ سب چیزیں موجود نہ ہوں۔ بہرحال کفار کے ان تمام خیالات کی واضح تردید کر دی گئی۔

آیت نمبر ۱۶: رسول اللہ ﷺ اللہ ﷻ کی مشیت کے مطابق اللہ ﷻ کے احکام کی تعمیل فرماتے ہوتے ہیں۔ رسالت کی صداقت کے ضمن میں آپ ﷺ کی چالیس سالہ پاکیزہ زندگی کو بطور دلیل پیش کیا گیا کہ جس نے تمام تر زندگی کبھی جھوٹ نہیں بولا تو نبوت جیسے بڑے مسئلے پر جھوٹ کا ارتکاب کیسے کر سکتا ہے۔

علمی بات: اس آیت میں کفار اور مشرکین کے اس خیال کا رد ہے کہ یہ قرآنِ حکیم نبی ﷺ کا کلام ہے کیونکہ مشرکینِ مکّہ نے اوّل سے آخر تک نبی ﷺ کی زندگی کا مشاہدہ کیا تھا اور ان کو آپ ﷺ کے تمام احوال معلوم تھے، وہ یہ جانتے تھے کہ آپ ﷺ نے کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا اور نہ کسی استاذ سے علم حاصل کیا پھر آپ ﷺ پر اسی طرح چالیس سال کا عرصہ گزر گیا، پھر چالیس سال بعد آپ ﷺ اچانک اس عظیم کتاب کو لے آئے جس میں اوّلین اور آخرین کی خبریں ہیں اور تہذیبِ اخلاق، تدبیرِ منزل اور ملکی سیاست کے متعلق مفصل احکام اور پیشن گوئیاں ہیں اور بہت دقیق علوم ہیں اور تمام علماء، فصحاء اور بلغاء اس کی نظیر لانے میں عاجز اور ناکام رہے تو ہر وہ شخص جس کے پاس عقلِ سلیم ہو تو اس پر یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ ایسا معجزانہ کلام اللہ ﷻ کی وحی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا، اس لئے فرمایا کہ میں بے شک اس (نزولِ قرآن) سے پہلے تم میں عمر کا ایک حصہ گزار چکا ہوں کیا تم نہیں سمجھے! اس آیت کی دوسری تقریر یہ ہے کہ اس نزولِ قرآن سے پہلے میں نے تم میں چالیس سال زندگی گزاری اور تم میرے صدق اور امانت اور میری پاکیزگی کو جان چکے ہو، میں پڑھتا تھا نہ لکھتا تھا پھر میں تمہارے پاس اس کلام کو بطورِ معجزہ لے کر آیا تو اب کیا تم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ یہ کلام میرا نہیں ہوسکتا یہ صرف اور صرف وحی الٰہی ہے، پھر میں نے تم میں اپنے شباب کی پوری عمر گزاری ہے جس میں میں نے اللہ ﷻ کی کوئی نافرمانی نہیں کی تو اب تم مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ میں اللہ ﷻ کی نافرمانی کروں گا اور اس کے کلام کو بدل ڈالوں گا کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے!

آیت نمبر ۱۷: اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھنے سے مراد کسی شخص کا کوئی بات گھڑ لینا اور اس کو اللہ ﷻ کی طرف منسوب کر دینا ہے۔ اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھنے والے اور اللہ ﷻ کی آیات کو جھٹلانے والوں کو مجرم قرار دیا گیا۔ ایسے مجرموں کو کامیابی نصیب نہ ہو گی۔

علمی بات: اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھنے سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص ایک بات تو خود گھڑے یا تصنیف کرے پھر اسے اللہ ﷻ کی طرف منسوب کر دے ایسا شخص سب سے بڑھ کر ظالم ہے اور جب ہر نبی علیہ السلام اپنے قول میں سچا ہے تو نبی علیہ السلام اور اللہ ﷻ کی آیات کا منکر بھی ویسا ہی سب سے بڑھ کر ظالم ہو گا اور دونوں کے ظلم میں کوئی فرق نہیں۔

عملی بات: فلاح سے مراد کامیابی سے ہم کنار ہونا ہے لیکن نظریہ کی تبدیلی سے کامیابی کا معیار بھی بدل جاتا ہے مثلاً ایک دُنیادار اور آخرت کے منکر کے نزدیک انتہائی کامیابی یہ ہے کہ اسے امن و چین اور عیش و عشرت سے زندگی بسر کرنا نصیب ہو اور لمبی عمر حاصل ہو جبکہ ایک دیندار اور آخرت پر یقین رکھنے والے کے نزدیک کامیابی کا معیار اللہ ﷻ کی رضا اور اُخروی عذاب سے نجات پانا ہے اگرچہ وہ بھی اللہ ﷻ سے فلاح دارین کا طالب ہوتا ہے۔ چنانچہ اس دُنیا میں بھی اسے وہ کچھ نصیب ہوتا ہے جو اس کے مقدر میں ہوتا ہے لیکن وہ اس کو کامیابی کا معیار قرار نہیں دیتا اس آیت میں جس کامیابی کا ذکر ہے اس سے مراد اُخروی فلاح ہے یعنی اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھنے یا اس کی آیات کو جھٹلانے والوں کو کبھی اخروی فلاح نصیب نہیں ہو گی۔

آیت نمبر ۱۸: مشرکین اللہ ﷻ کے سوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتیں۔ مشرکین کا دعویٰ ہے کہ ان کے خود ساختہ معبود اللہ ﷻ کے مقرب ین ہیں جو اللہ ﷻ کی بارگاہ میں ان کی شفاعت کریں گے۔ ان کے اس باطل دعویٰ کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ ایسا کوئی سفارشی نہیں ہے جو کوئی بات اللہ ﷻ سے جبراً منوائے۔ اللہ ﷻ پاک اور بلند ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

علمی بات: اس آیت سے مشرکین مکّہ کا بنیادی عقیدہ ظاہر ہو رہا ہے۔ وہ لوگ اس کو مانتے تھے کہ اس کائنات کا خالق اور مالک اللہ ﷻ ہے۔ وہ اپنے بُتوں کو کائنات کا خالق و مالک نہیں بلکہ اللہ ﷻ کے قُرب کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ ان کا یقین تھا کہ جن ہستیوں کے نام پر یہ بُت بنائے گئے ہیں وہ ہستیاں اللہ ﷻ کے ہاں بہت مقرب اور محبوب ہونے کے باعث اس کے ہاں ہماری سفارش کریں گی، لہٰذا اس وجہ سے ان کی عبادت کرتے تھے جو کہ سراسر حرام ہے۔

علمی بات: یہی مضمون قرآنِ حکیم میں دیگر مقامات پر یوں بیان ہوا ہے آپ ﷺ فرما دیجیے کیا تم اللہ ﷻ کے سوا اس چیز کی عبادت کرتے ہو جو تمہارے لئے نہ کسی نقصان کی مالک ہے اور نہ نفع کی اور اللہ ﷻ ہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ (سورۃ المائدۃ ۵، آیت: ۷۶) "یہ باطل معبود کسی کو کیا نفع و نقصان پہنچائیں گے، یہ تو خود اپنے آپ کو نقصان سے نہیں بچا سکتے، جیسا کہ ارشاد فرمایا اور انہوں نے اس کے سوا کئی اور معبود بنا لئے، جو کوئی چیز پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیئے جاتے ہیں اور اپنے لئے نہ کسی نقصان کے مالک ہیں اور نہ نفع کے اور نہ کسی موت کے مالک ہیں اور نہ زندگی کے اور نہ اٹھائے جانے کے"۔ (سورۃ الفرقان ۲۵، آیت: ۳)

آیت نمبر ۱۹: ابتدا میں پوری نوعِ انسانی کا توحید پر کاربند ہونے اور ایک اُمّت ہونے کا بیان ہے۔ بعد میں لوگوں نے خود مشرکانہ طور طریقے اور تصوّرات اختیار کر کے آپس میں اختلاف کیا۔ اللہ ﷻ کی طرف سے اصلاح کی مہلت دینے کی سنّت نہ ہوتی تو یقیناً اُمّتوں کے درمیان اختلافات کا فیصلہ کر دیا جاتا۔

علمی بات: مطلب یہ ہے کہ جب پہلے حضرت آدم علیہ السلام دُنیا میں تشریف لائے تو تمام انسان توحید اور دینِ برحق پر عمل پیرا تھے۔ بعد میں کچھ لوگوں نے الگ عقیدے اور طریقے ایجاد کر لیئے۔ اللہ ﷻ اُس وقت دُنیا میں ان کے اختلافات کا فیصلہ کر سکتا تھا، لیکن چونکہ اللہ ﷻ نے کائنات کی تخلیق سے پہلے ہی یہ طے فرمایا ہوا تھا کہ دُنیا انسانوں کے امتحان کے لئے پیدا کی جائے گی اور تمام اقوام کی طرف اللہ ﷻ کی طرف سے پیغمبر بھیجے جائیں گے جو لوگوں کو دُنیا میں آنے کا مقصد بتائیں اور دینِ حق کو واضح دلائل سے بیان کر دیں، پھر وہ اپنی مرضی سے جو راستہ چاہیں اختیار کریں اور آخرت میں فیصلہ کیا جائے کہ کس کا راستہ صحیح اور انعام کے قابل تھا اور کس کا غلط اور قابلِ سزا تھا، اس لئے اللہ ﷻ نے دُنیا میں اس فیصلے کا مشاہدہ نہیں کروایا۔

آیت نمبر ۲۰: معجزات طلب کرنے والے مشرکین کو رسول اللہ ﷺ کی زبانی جواب دیا گیا ہے۔ غیب کا علم صرف اللہ ﷻ کو ہے اور اسے علم ہے کہ کون سی نشانی کب ظاہر ہوگی۔ اللہ ﷻ کے حتمی فیصلہ کے لئے انہیں بھی انتظار کرنے اور خود رسول اللہ ﷺ کو بھی منتظر رہنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

علمی بات: بعض مفسرینِ کرام نے اس کا یہ مطلب بتایا ہے کہ مشرکین مکّہ نے موجودہ معجزات کی قدر نہ کی اور ایمان نہ لائے بلکہ عناد اور ضد کی وجہ سے فرمائشی معجزات کے درپے ہو گئے۔ ان کا یہ کفر اور عناد نزولِ عذاب کا باعث ہے غیب کا علم اللہ ﷻ ہی کو ہے وہی جانتا ہے کہ کب ان پر عذاب آجائے لہٰذا انہیں متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ انتظار کریں۔

علمی بات: اس آیت میں نشانی سے مراد معجزہ ہے یوں تو اللہ ﷻ نے آنحضرت ﷺ کو بہت سے معجزات عطا فرمائے تھے اور آپ (علیہ السلام) کے اُمّی ہونے کے باوجود قرآنِ حکیم کا آپ کی زبان مبارک پر جاری ہونا بذاتِ خود بہت بڑا معجزہ تھا۔ لیکن کفارِ مکّہ آپ ﷺ سے نت نئے فرمائشی معجزات کا مطالبہ کرتے رہتے تھے جن کا کچھ بیان (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷، آیت: ۹۳) میں ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ ﷻ کے پیغمبروں کا یہ کام نہیں ہوتا کہ وہ کافروں کے اس قسم کے ہر مطالبے کو پورا کریں اور ہر ایک کی فرمائش پر ہر روز نئے معجزات دکھایا کریں، بالخصوص، جب یہ بات معلوم ہو کہ مطالبہ کرنے والے محض وقت گذاری اور بہانہ بازی کے لئے ایسی فرمائشیں کر رہے ہیں۔ اس لئے آنحضرت ﷺ کو مختصر جواب دینے کی ہدایت فرمائی گئی ہے کہ غیب کی ساری باتیں، جن میں معجزات کا ظاہر کرنا بھی داخل ہے، میرے اختیار میں نہیں، صرف اللہ ﷻ کے اختیار میں ہے، وہ تمہاری کونسی فرمائش پوری کرتا ہے اور کونسی پوری نہیں کرتا، اس کا تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں۔

آیت نمبر ۲۱: راحت اور تکلیف میں لوگ اپنی اصل حیثیت کو برقرار نہیں رکھتے۔ تکالیف و مصائب کے بعد نعمت کا مطلب تنگی قحط سالی اور بیماری کے بعد رزق کی فراوانی، صحت و عافیت اور خوشحالی وغیرہ ہے۔ اللہ ﷻ تکالیف کے بعد جب راحت بھیجتا ہے تو ناشکرا انسان احسان فراموشی کرتا ہے۔ مشرکینِ مکّہ کی اس روش کی طرف اشارہ ہے جو غیر اللہ کی طرف راحت کو منسوب کرتے تھے۔ ان کی احسان فراموشی کے نتیجہ میں اللہ ﷻ ان کا مؤاخذہ کرنے پر قادر ہے۔

علمی بات: اہلِ مکّہ پر حق تعالیٰ نے سات سال تک قحط مسلّط کیا۔ جب ہلاکت کے قریب پہنچ گئے تو گھبرا کر حضور ﷺ سے دُعا کی درخواست کی اور وعدہ کیا کہ یہ عذاب اٹھ جائے تو ہم ایمان لے آئیں گے آپ ﷺ نے دُعا فرمائی اللہ ﷻ نے دُعا قبول فرمائی اور اہلِ مکّہ پر رحم فرمایا۔ قحط کی بلاء دُور ہوئی تو پھر وہی شرارتیں کرنے لگے، اللہ ﷻ کی آیتوں کو جھٹلاتے اور اس کی قدرت و رحمت پر توجہ نہ کرتے۔ بلکہ انعاماتِ الٰہیہ کو ظاہری اسباب اور بے اصل خیالات و اوہام کی طرف منسوب کرنے لگتے۔ ان کی اس طرح کی باتوں کا جواب دیا کہ اچھا تم خوب مکر و فریب اور حیلہ سازی کر لو۔ مگر یہ یاد رہے کہ تمہاری حیلہ بازیاں ایک ایک کر کے لکھی جا رہی ہیں۔ وہ سارا دفتر قیامت کے دن تمہارے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ پھر جب تمہاری کوئی حیلہ بازی فرشتوں سے مخفی نہیں، اللہ ﷻ کے علم محیط سے کہاں باہر رہ سکتی ہے۔ تم اپنے مکر و فریب اور حیلہ سازی پر مغرور ہو، حالانکہ اللہ ﷻ کی تدبیر تمہارے مکر و فریب سے کہیں تیز اور جلد اثر کرنے والی ہے اور وہ مجرم کی باگ اتنی ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے کہ گناہ کرتے وقت اس کے دل میں سزا کا تصور بھی نہیں آتا۔ جب اس کی سرکشی اور نافرمانی حد سے بڑھ جاتی ہے تو دفعتاً پکڑ میں آجاتا ہے۔ لہٰذا عقلمند شخص کو چاہیئے کہ اللہ ﷻ کی طرف سے نرمی، بُردباری اور خوش کن حالات کو دیکھ کر دھوکہ میں نہ پڑے، نہ معلوم اس نرمی کے بعد کیسی سختی آنے والی ہے۔

آیت نمبر ۲۲: خشکی میں چلانے سے مراد یہ ہے کہ اللہ ﷻ نے خشکی میں سواریاں مہیا فرمائیں۔ سمندر میں چلانے سے مراد کشتیاں اور جہاز بنانے کی سمجھ کا عطا کیا جانا ہے۔ توحید فطرتِ انسانی میں موجود ہے۔ مشرکین سمندر میں ہواؤں اور موجوں کے درمیان گھر جانے کی صورت میں خالصتاً اللہ ﷻ ہی کو پکارتے تھے۔

علمی بات: زمانہ نزولِ قرآنِ حکیم میں بادبانی کشتیاں ہوتی تھیں۔ ہوا موافق ہوئی تو کشتیاں چلنے لگیں۔ ہوا بند ہوگئی تو کھڑی ہو گئیں، ہوا موافق خوشگوار ہے تو خوش ہو رہے ہیں اور اگر تیز ہوا چلنے لگی اور ہر طرف سے موجیں اٹھ اٹھ کر آنے لگیں توڑنے لگے اور یقین کر لیا کہ اب تو گھیرے میں آگئے اس وقت مدد اور پکار کے لئے اللہ ﷻ کے سوا کسی پر نظر نہیں جاتی جو ان کو اس مصیبت سے بچائے اور بھنور سے نجات دے لہٰذا اللہ ﷻ کے حضور میں خالص اعتقاد کے ساتھ دُعا کرنے لگتے کہ اے اللہ! اگر تو نے ہمیں اس مصیبت سے نجات دے دی تو ضرور ہم تیرے شکر گزار بندوں میں ہوں گے۔ جب اللہ ﷻ مصیبت سے نجات دے دیتا تو پھر وہی اللہ ﷻ کی زمین میں بغاوت، شرارت اور سرکشی کرنے لگتے جس کا انہیں کوئی حق نہیں تھا۔

آیت نمبر ۲۳: باحفاظت خشکی پر آجانے کے بعد مشرکین کا اللہ ﷻ سے بدعہدی اور بغاوت کا بیان ہے۔ ان کی بغاوت کا نقصان خود انہیں کو ہو گا۔ آخر کار انہیں اللہ ﷻ کے پاس حاضر ہونا ہے جہاں انہیں ان کے اعمال کا حساب دینا ہو گا۔

عملی پہلو: یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انسان پر جب مشکلات آتی ہیں تو اس کے دل سے ایک ہی آواز نکلتی ہے کہ اے اللہ! میری اس مشکل کو آسان فرما دے اور اللہ ﷻ اس کی مشکلات آسان بھی فرما دیتا ہے لیکن پھر وہ بھول جاتا ہے کہ اس کی ان مشکلات کو حل کرنے والی کون سی ذات تھی۔ اللہ ﷻ ہمیں شکر ادا کرتے رہنے، مداومت اور بندگی کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

علمی بات: فتح مکّہ کے بعد ابو جہل کا بیٹا عکرمہ مسلمان نہ ہوا تھا۔ مکّہ سے بھاگ کر بحری سفر اختیار کیا۔ تھوڑی دور جا کر کشتی کو طوفانی ہواؤں نے گھیر لیا، ملاّح نے مسافروں سے کہا کہ ایک اللہ ﷻ کو پکارو۔ یہاں تمہارے معبود کچھ کام نہ دیں گے۔ عکرمہ نے کہا کہ یہ ہی تو وہ اللہ ﷻ ہے جس کی طرف محمد ﷺ ہم کو بلاتے ہیں۔ اگر دریا میں ربّ محمد ﷺ کے بغیر نجات نہیں مل سکتی تو خشکی میں بھی اس کی دستگیری اور اعانت کے بغیر نجات پانا محال ہے۔ اے اللہ ﷻ! اگر تو نے اس مصیبت سے نکال دیا تو میں واپس ہو کر محمد (ﷺ) کے ہاتھ میں ہاتھ دوں گا۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ اپنے اخلاقِ کریمہ سے میری غلطیوں کو معاف فرمائیں گے۔ چنانچہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف با اسلام ہوئے۔

آیت نمبر ۲۴: اس آیت میں دُنیا کی زندگی اور اس کی حقیقت کا بیان ہے۔ دُنیا کی زندگی کو کھیتی سے تشبیہ دے کر اس کے فانی اور ناپائیداری کو واضح کیا گیا ہے۔ کھیتی بارش کے پانی سے سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے اور کھیتی والے اپنی ضرورتیں پوری ہونے پر خوش ہوتے ہیں۔ اچانک دن یا رات میں اس پر اللہ ﷻ کی طرف سے

کوئی آفت آجاتی ہے جس سے وہ تباہ ہوجاتی ہے گویا کہ وہ تھی ہی نہیں۔ جس طرح کھیتی پر بہار آتی ہے انسانوں پر بھی جوانی آتی ہے پھر اچانک کسی آفت یا مصیبت کا شکار ہو کر موت کی آغوش میں سو جاتے ہیں۔ موت کے سبب انسان اِس ناپائیدار دُنیا سے کوچ کر کے آخرت کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

علمی بات: اس سے پہلے اللہ ﷻ نے فرمایا کہ اے لوگو! تمہاری سرکشی اور بغاوت صرف تمہارے لئے ہی مضر ہے، اب اللہ ﷻ نے اس شخص کے متعلق ایک عجیب مثال بیان فرمائی ہے جو دُنیا کی لذتوں اور خواہشات میں منہمک ہو کر آخرت کو بھلا دیتا ہے۔ آسمان سے جو پانی نازل ہوتا ہے اس کی وجہ سے زمین کی پیداوار خوب گھنی ہو جاتی ہے اور بارش کی وجہ سے رنگ برنگ کے پھول، خوشنما بیلیں، خوش ذائقہ پھل اور طرح طرح کے غلّوں کی اجناس پیدا ہوتی ہیں، حتیٰ کہ باغوں اور کھیتوں کا مالک جب ان ہری بھری لہلہاتی ہوئی فصلوں اور پھلوں سے لدے ہوئے درختوں کو دیکھتا ہے تو خوشی سے پھولا نہیں سماتا، پھر وہ بڑے عمدہ منصوبہ بناتا ہے کہ ان باغوں اور کھیتوں سے اتنے منافع اور فوائد حاصل کرے گا، پھر اچانک ٹڈی دل یعنی فصلوں کو کھانے والے کیڑے مکوڑے کثیر تعداد میں آکر تمام کھیتوں اور باغوں کو چاٹ کر چلے جاتے ہیں، یا آسمان سے زبردست آندھی اور برف باری ہوتی ہے اور سب کچھ اُجڑ جاتا ہے یا دریاؤں میں سیلاب آتا ہے اور تمام فصلوں کو بہا کر لے جاتا ہے اور وہ غم اور افسوس میں ہاتھ ملتا ہوا رہ جاتا ہے، اسی طرح جو آدمی آخرت سے اعراض کر کے دُنیا کمانے کی دھن میں لگا رہتا ہے، جب وہ آخرت میں اجر و ثواب سے محروم اور عذاب میں گرفتار ہو گا تو اس کا بھی یہی حال ہو گا۔

آیت نمبر ۲۵: سلامتی کے گھر سے مراد جنّت ہے۔ آخرت ہی کی دائمی و ابدی زندگی کے طلب گار بننے کی تلقین کی گئی ہے۔ ہدایت دینا اللہ ﷻ ہی کے اختیار میں ہے۔

علمی بات: جنّت کو دار السّلام کہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ جنّت کے سات نام ہیں اور ان میں سے ایک نام دار السّلام ہے، اور وہ سات نام یہ ہیں: (۱) دار السّلام (۲) دار الجلال (۳) جنّت عدن (۴) جنّت الماوی (۵) جنّت الخلد (۶) جنّت الفردوس (۷) جنّت النّعیم۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اہلِ جنّت ہر ناپسندیدہ چیز سے سلامت اور محفوظ ہوں گے۔

علمی بات: جنّت، میں ہر قسم کے رنج و بلا اور نقصان سے سلامتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو جنّت کی طرف بلایا تھا۔ آپ کا بلانا اللہ ﷻ کا بلانا ہے اس لئے اللہ ﷻ نے فرمایا: اور اللہ ﷻ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر روز جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کی دونوں جانب دو فرشتے ندا کر رہے ہوتے ہیں: اے لوگو! اپنے رب کی طرف آؤ! بے شک جو چیز تھوڑی اور کافی ہو وہ اس سے بہتر ہے جو زیادہ ہو اور غافل کرنے والی ہو اور اس ندا کو جن اور انسانوں کے سوا تمام مخلوق سنتی ہے اور اس کی تائید میں اللہ ﷻ نے قرآنِ حکیم میں یہ آیت نازل فرمائی: اور اللہ ﷻ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ (مسند احمد)

آیت نمبر ۲۶: اللہ ﷻ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت پر کاربند رہنے والوں کے لئے خیر اور بھلائی کی بشارت ہے۔ حدیث کے مطابق "مزید" سے مراد اہلِ جنّت کو تمام نعمتوں سے نوازنے کے بعد دیدارِ الٰہی کا میسر آنا ہے۔ وہ ہر قسم کی ذلّت اور رُسوائی سے محفوظ ہوں گے اور ہمیشہ جنّت میں رہیں گے۔

علمی بات: "زِیَادَۃٌ" سے مراد اللہ ﷻ کا دیدار ہے۔ یہی مفہوم (سورۃ النساء ۴، آیت: ۱۷۳)، (سورۃ النور ۲۴، آیت: ۳۸) اور (سورۃ ق ۵۰، آیت: ۳۵) میں بیان ہوا ہے۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا: جب جنّتی جنّت میں اور جہنّمی جہنّم میں چلے جائیں گے تو اس وقت ایک منادی پکارے گا: "اے جنّت والو! اللہ ﷻ نے تم سے ایک وعدہ کیا تھا، وہ چاہتا ہے کہ اسے بھی پورا کر دیا جائے۔" وہ کہیں گے: "وہ کون سا وعدہ ہے؟ کیا اس نے ہمارے میزان (نیک اعمال کے تول) بھاری نہیں کر دیئے؟ کیا اس نے ہمارے چہرے روشن نہیں کر دیے، ہمیں جنّت میں داخل اور آگ سے محفوظ نہیں کر دیا؟" آپ ﷺ نے فرمایا "اس وقت ان کے لئے پردہ ہٹا دیا جائے گا اور وہ اپنے پروردگار کا دیدار کریں گے۔" پھر فرمایا: "اللہ ﷻ کی قسم! انہیں اب تک ایسی کوئی نعمت عطا نہیں ہوئی ہو گی جو انہیں اس دیدار سے زیادہ محبوب ہو اور اس میں ان کی آنکھوں کے لئے اس سے زیادہ ٹھنڈک ہو۔"

(مسند احمد، صحیح مسلم)

آیت نمبر ۲۷: اس آیت میں نیکوکاروں کے برعکس اللہ ﷻ کی نافرمانی کرنے والوں کا بیان ہے۔ "سیئات" سے مراد کفر، شرک اور اس کے ساتھ دیگر بُرائیاں ہیں۔ ان کی بُرائیوں کی سزا ان کی بُرائی کے برابر ہی ملے گی۔ ان کے چہرے ذلّت ورُسوائی کی وجہ سے اندھیری رات کی طرح سیاہ ہوں گے۔ انہیں ہمیشہ کے لئے جہنّم کی وعید سنائی گئی ہے۔

علمی بات: روزِ قیامت کفار کی بدصورتی کا یہ حال ہوگا کہ گویا ان کے چہروں کو اندھیری رات کے ٹکڑوں سے ڈھانک دیا گیا ہے کافر دُنیا میں کتنا ہی خوبصورت ہو قیامت کے دن نہایت ہی بدترین صورت میں ہوگا (سورۃ الزمر ۳۹، آیت:۶۰) میں فرمایا اور اے مخاطب تو قیامت کے دن ان لوگوں کو دیکھے گا جنھوں نے اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھا کہ ان کے چہرے سیاہ ہیں کیا دوزخ تکبر کرنے والوں کا ٹھکانہ نہیں ہے۔ (سورۃ عبس ۸۰، آیات:۴۱، ۴۰، ۴۲) میں فرمایا "اور اس دن بہت سے چہرے ایسے ہوں گے کہ ان پر بدرونقی ہوگی ان پر بدصورتی چھائی ہوئی ہوگی وہ لوگ کافر اور فاجر ہوں گے"۔

آیت نمبر ۲۸: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ میدانِ حشر میں تمام لوگوں کو جمع کیا جائے گا۔ مشرکین اور ان کے شرکاء بھی پیش ہوں گے۔ شرکاء میں وہ تمام اشیاء شامل ہیں جن کی دُنیا میں پوجا کی جاتی تھی مثلاً بُت، جنات، انسان وغیرہ اور یہ شرکاء مشرکین کی عبادت کا رد کریں گے۔

علمی بات: اس وقت وہ تمام شرکاء جن کو اللہ ﷻ کا شریک بنایا گیا تھا مشرکین سے کہیں گے کہ انہوں نے ہماری عبادت تو نہیں کی تھی ہم تو اُن کی پرستش سے بالکل غافل تھے ہم تک تو اُن کی کوئی التجا، شے، عبادت وغیرہ نہیں پہنچ رہی تھی۔ اسی لاتعلقی اور بےزاری کا ذکر سورۃ البقرہ ۲، آیت:۱۶۶ میں بھی آیا ہے۔ منکرین توحید باری تعالیٰ کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ آج معبودِ برحق کی عبادت چھوڑ کر جن مٹی، پتھر اور لوہے کے بُتوں اور دیگر جھوٹے معبودوں کی وہ یہ سمجھ کر پرستش کرتے ہیں کہ وہ روزِ قیامت ان کی شفاعت کریں گے۔ تو وہ اچھی طرح جان لیں کہ یہ اس وقت اُن سے اپنی لاتعلقی اور بےزاری کا اظہار کریں گے۔

آیت نمبر ۲۹: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ شرکاء اپنی بات کی صداقت کے لئے اللہ ﷻ کی گواہی کا ذکر کریں گے۔ وہ اپنے پوجنے والوں کی عبادت سے لاعلمی اور برأت کا اظہار کریں گے۔

علمی بات: باطل معبود انکار کی وجہ بیان کریں گے کہ اگر وہ ہماری پوجا کرتے بھی رہے ہیں تو ہمیں بالکل اس کی خبر نہیں، اس لئے ہم پر اس کا کچھ الزام نہیں۔ ہم اُن کے اس گھناؤنے فعل سے بالکل بری ہیں اور ہم جھوٹ بول رہے ہوں تو ہمارے درمیان اللہ ﷻ گواہ ہے اور وہ کافی ہے، اس کی گواہی کے بعد کسی اور ثبوت اور گواہی کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔

آیت نمبر ۳۰: روزِ قیامت ہر شخص کی کارکردگی اس کے سامنے ہوگی جسے وہ دیکھ لے گا۔ تمام لوگ معبودِ برحق اللہ ﷻ کے پاس پہنچا دیئے جائیں گے۔ مشرکین جن کو دُنیا میں اپنا مددگار اور سفارشی سمجھا کرتے تھے وہ سب غائب ہو جائیں گے۔

علمی بات: اس آیت کے دو معنی ہیں: ایک یہ ہے کہ ہر شخص اپنے عمل کے نتیجہ کی پیروی کرے گا، اگر اس کے نیک اعمال تھے تو وہ جنّت کی طرف جائے گا اور اگر اس کے بُرے اعمال تھے تو دوزخ کی طرف جائے گا، دوسرا معنی یہ ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال نامے کو پڑھے گا اور اس کے مطابق اپنی جزا اور سزا کو جان لے گا۔ تمام مشرکین اس دن اللہ ﷻ کی طرف رجوع کریں گے جو ان کا مالکِ حقیقی ہے اور دُنیا میں وہ اللہ ﷻ کو چھوڑ کر جن چیزوں کی عبادت کرتے تھے ان کا جھوٹ اور باطل ہونا ان پر منکشف ہو جائے گا۔

آیت نمبر ۳۱: مشرکین کو اعترافِ حق کے لئے سوالیہ انداز میں پیش کئے جانے والے دلائل کا ذکر ہے۔

۱۔ کون آسمان وزمین سے انسان کے لئے رزق پیدا فرماتا ہے؟
۲۔ انسان کی سماعت وبصارت کی قوّتیں کس کے اختیار میں ہیں؟
۳۔ کون زندہ کو مردہ اور مردہ کو زندہ کر سکتا ہے؟
۴۔ کائنات کے تمام معاملات کی تدبیر کون کرتا ہے؟

مشرکین بھی اللہ ﷻ ہی کی ربوبیت کا اعتراف کرتے تھے۔ سچائی کو جاننے کے باوجود شرک پر اڑے رہنے پر انہیں عذاب کی تنبیہ کی گئی ہے۔

علمی وعملی بات: انسان دُنیوی جھگڑوں میں کچھ ایسا پھنس گیا ہے کہ اسے بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ اس کے معبود نے اس پر کیا کیا احسانات فرمائے ہیں۔ اگر وہ اس پر غور کرے کہ آسمان سے پانی نہ برسے اور زمین غلہ نہ اگائے تو وہ کیا شے کھا کر زندہ رہ سکتا ہے؟ ناشکرا بندہ اس کا دیا ہوا رزق کھائے چلا جاتا ہے مگر کبھی شکریہ کے دو کلمات تک زبان پر نہیں لاتا۔ غور کریں اگر وہ کسی کو بہرا اور اندھا بنا دے تو اس کی زندگی کا لُطف خاک میں مل جائے گا یا نہیں۔ لیکن کتنے لوگ ہیں جو

ان نعمتوں پر اس کے شکر گزار ہیں ؟ لوگ اس پر بھی غور نہیں کرتے کہ اس نے نطفہ کے ایک حقیر قطرہ سے رحم مادر میں ایک خوبصورت بچہ پیدا فرما کر بطنِ مادر سے اسے راہ سُجھائی اور پھر اُسے کچھ دن زندہ رکھنے کے بعد موت دیدی۔ یہ سب کام کیا اللہ ﷻ کے سوا کوئی اور کر رہا ہے ؟ اگر اللہ ﷻ ہی کر رہا ہے تو لوگ اس سے ڈرتے کیوں نہیں اس کی نافرمانی کیوں کرتے ہیں ؟

آیت نمبر ۳۲: اللہ ﷻ ہی حقیقی رب ہے۔ اس کے علاوہ دوسروں کو معبود بنانا اور انہیں پکارنا گمراہی ہے۔

علمی و عملی بات: کفار و مشرکین کو یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ تمہارے رزق، موت و حیات، تمہارے جسم کا خالق و مالک اور پوری کائنات کا منتظم اور مدبّر صرف اللہ ﷻ ہے اور تم بھی اللہ ﷻ ہی کو مانتے ہو تو جان لو کہ پھر تمہارا سچا اور برحق رب تو اللہ ﷻ ہی ہے۔ اب خواہ کوئی بھی چیز ہو وہ یا تو حق ہوگی یا باطل، یہ صحیح نہیں ہے کہ ایک شے حق بھی ہو باطل بھی، تو جب اللہ ﷻ کا رب اور مالک ہونا حق ہے تو پھر دوسرے باطل معبود کیسے حق ہو سکتے ہیں۔ اس کے باوجود تمہارا دل کیسے مانتا ہے کہ حق کو چھوڑ کر گمراہی اور توحید کو چھوڑ کر شرک کی راہ اختیار کرتے ہو۔ سوچو! راہِ حق سے کیسے چھوڑے جا رہے ہو؟

آیت نمبر ۳۳: تعصّب اور ہٹ دھرمی سے کام لینے والوں کے متعلق اللہ ﷻ نے فیصلہ فرما دیا ہے۔ صحیح راستہ اختیار نہ کرنے پر وہ ہدایت اور ایمان سے محروم رہیں گے۔

علمی بات: یعنی جس طرح یہ مشرکین تمام تر اعتراف کے باوجود اپنے شرک پر قائم ہیں اور اسے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، اسی طرح آپ کے رب کی یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ غلط راستہ چھوڑ کر صحیح راستہ اختیار کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہیں، تو توحید اور ایمان کی دولت انہیں کس طرح نصیب ہو سکتی ہے ؟ ارشاد فرمایا: (اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ) (سورة البقرة:۲ ، آیت:۶) "بے شک جن لوگوں نے کفر کیا ان پر برابر ہے، خواہ تو نے انہیں ڈرایا ہو یا انہیں نہ ڈرایا ہو، ایمان نہیں لائیں گے۔" یہ وہی بات ہے جسے دوسرے مقام پر اس طرح بیان فرمایا گیا ہے (وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ) (سورة الزمر ۳۹، آیت:۷۱) لیکن عذاب کی بات کافروں پر ثابت ہو گئی۔

آیت نمبر ۳۴: جھوٹے معبودوں کے رد میں مشرکین کو دو باتوں پر مطلع کیا جا رہا ہے:

۱۔ جو ہستی پہلی بار پیدا کر سکتی ہے وہ دوسری بار بھی پیدا کرنے پر قادر ہے۔

۲۔ پہلی بار کی تخلیق میں جب ان کے معبودوں کا کوئی حصّہ نہیں تو دوبارہ تخلیق میں بھی وہ شریک نہیں ہیں۔

علمی بات: مشرکین سے باطل خداؤں کے بارے میں براہِ راست پوچھا جا رہا ہے کہ تمہارے معبودانِ باطل میں سے کون ہے جس نے ابتداءً اس کائنات کو پیدا کیا اور پھر اسے دوبارہ وجود بخشے گا ؟ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں تھا اور ہمیشہ اس کا جواب نفی میں ہی رہے گا۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ کو حکم ہوا کہ آپ (ﷺ) بے دھڑک فرمائیں کہ اللہ ﷻ ہی نے انہیں پہلی مرتبہ بغیر نمونے کے پیدا فرمایا اور وہی دوبارہ انہیں پیدا کرے گا۔ جب اللہ ﷻ کو ان کا خالق اور دوبارہ پیدا کرنے والا مانتے ہو تو پھر کہاں بھٹکے پھرتے ہو ؟ جب پیدا کرنے والا اور تمہیں اپنے ہاں لوٹانے والا بھی ایک اللہ ﷻ ہی ہے۔ پھر تمہارے باطل معبود کہاں سے درمیان میں آگئے اور ان کا کیا اختیار ہے ؟

آیت نمبر ۳۵: مشرکین سے ہدایت کے ضمن میں سوال کیا جا رہا ہے کہ کون حق کے راستہ کی ہدایت دیتا ہے ؟ دعوت اِلی الحق سے مراد زندگی گزارنے کا ایسا طریقہ جس میں معاشرے کے ہر فرد پر فرائض و حقوق کی پوری طرح رعایت ملحوظ رکھی گئی ہو۔ لہٰذا حق کی طرف رہنمائی کرنے والا ہی اتباع کا حقدار ہے نہ کہ وہ جو خود ہدایت کا محتاج ہو۔

علمی بات: مشرکین کو مخاطب کر کے مزید یہ سوال کیا گیا ہے کہ ان کے معبودوں میں کوئی ہے جو ان کی حق کی طرف راہنمائی کر سکے۔ یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ پتھر، مٹی اور لکڑی کے بُت ہدایت و رہنمائی نہیں کر سکتے اور نہ ہی جنات اور سورج، چاند، ستارے از خود ہدایت کا راستہ دکھا سکتے ہیں بلکہ یہ سب خود محتاج ہدایت ہیں۔ لہٰذا صرف اللہ ﷻ ہی ہے جو ہدایت کی رہنمائی کرتا ہے اور اس پر چلنے کی توفیق عطا فرماتا ہے۔ لہٰذا وہ سوچ بچار کریں کہ جو سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرے اس کی اتباع کرنا اور حکم ماننا چاہیئے یا اس کی اتباع کرنی چاہیئے جو کسی کی رہنمائی کرنے کی بجائے خود رہنمائی کا محتاج ہو۔ نیز یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ پیروی تو

اس کی کرنی چاہیئے جو راہِ حق کی رہنمائی کرتا ہے اور خود ہدایت والا ہے۔ درحقیقت مشرکین محض فرسودہ خیالات، سنی سنائی باتوں اور اپنے وہم وگمان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ لیکن یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔

آیت نمبر ۳۶: مشرکین کی اکثریت حق کے بجائے محض اپنے گمانوں کی پیروی کرتی ہے۔ بلاشبہ گمان، حق کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ شرک کے لئے کوئی دلیل ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ کون حق پر ہے اور کون محض گمان کی پیروی کر رہا ہے۔

عملی پہلو: یہاں نافرمان اور سرکش لوگوں کو سرزنش کی جارہی ہے کہ یہ مت سمجھیں کہ ان کی کارستانیوں کی کسی کو خبر نہیں اور وہ جو کچھ کرتے ہیں اس پر کوئی محاسبہ نہ ہوگا۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے کاموں سے خوب واقف ہے۔

آیت نمبر ۳۷: قرآنِ حکیم کسی کا گھڑا ہوا نہیں بلکہ اس ذات کا نازل کردہ ہے جس نے پچھلی آسمانی کتابیں نازل فرمائیں۔ اس میں تمام مطلوبہ احکام کی تفصیل موجود ہے۔ اس کی تعلیمات اور بیان کردہ واقعات میں کوئی شک نہیں۔

علمی بات: ان آیات میں قرآنِ حکیم کے اعجاز کا بیان ہے کہ اس کی فصاحت وبلاغت اور مختصر الفاظ کے کثیر معانی ہیں اور اس کی حلاوت اور شیرینی اس درجہ کی ہے کہ مخلوق میں سے کوئی اس پر قادر نہیں کہ وہ اس کی ایک سورت کی مثل بنا سکے یا کم از کم ایک آیت ہی بنا کر پیش کر دے۔

گزشتہ آیت میں گمان کی پیروی سے ممانعت کے بعد اب اس چیز کا بیان ہے جس کی پیروی کرنا فرض ہے مشرکین قرآنِ حکیم کو اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں سمجھتے تھے۔ نبی کریم ﷺ کے بارے میں اُن کا گمان تھا کہ یہ قرآنِ حکیم وہ اپنی طرف سے بناتے ہیں اسی لئے انہوں نے نبی ﷺ سے درخواست کی آپ (علیہ السلام) اس کے علاوہ کوئی دوسرا قرآنِ حکیم بنالایئے یا اس کو بدل دیجئے آپ علیہ السلام نے ان کو جواب دیا کہ میں اس کو نہیں بدل سکتا، یہ میرا یا کسی اور بشر کا کلام نہیں کہ میں اس کو بدل دوں یہ تو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے کسی بندے کی مجال نہیں کہ وہ اس میں کمی بیشی کرے یا اپنی طرف سے کوئی کلام بنا کر اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دے۔ حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص وحی ہے۔ یہ قرآنِ حکیم ان آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں جیسے تورات، زبور اور انجیل۔ اس میں ایسے احکام کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے فرض کیئے ہیں اور یہ گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کے واقعات کو صحیح صحیح بیان کرتا ہے۔

علمی بات: گزشتہ آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے توحید کے دلائل بیان فرمائے تھے اور شرک کا باطل ہونا ظاہر فرمایا تھا اور ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد مصطفی ﷺ کی نبوت کے دلائل بیان فرمائے ہیں اور آپ علیہ السلام کی نبوت پر مشرکین کے جو شبہات تھے ان کا ازالہ فرمایا ہے۔ ان کا ایک شبہ یہ تھا کہ اس قرآنِ حکیم کو نبی کریم ﷺ نے از خود لکھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا ہے (معاذ اللہ)۔ اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کا اس طرح ازالہ فرمایا کہ یہ قرآنِ حکیم ایسی چیز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے بغیر اس کو گڑھ لیا جائے۔

آیت نمبر ۳۸: مشرکین کو قرآنِ حکیم کے مقابلے میں اس جیسی ایک سورت بنا کر پیش کرنے کا چیلنج کیا گیا ہے اور وہ اس میں اللہ تعالیٰ کے سوا تمام مددگاروں کو بھی اپنے ساتھ بلالیں اور سب مل کر اس چیلنج کو قبول کریں۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ کی توحید کے بیان اور شرک کی تردید کرنے کے بعد قرآنِ حکیم کی حقانیت کا بیان فرمایا گیا ہے کہ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ قرآنِ حکیم اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور اپنے پاس سے بنالائے۔ اگر یقین نہ ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور مشرکین کا خیال ہے کہ یہ انسانی کلام ہے اور یہ نبی کریم ﷺ کا بنایا ہوا کلام ہے تو اپنے دعوے کی سچائی ثابت کرنے کے لئے مشرکین بھی اس کی مثل کلام بنالائیں، کیونکہ مشرکین بھی آپ ﷺ کی طرح انسان ہیں اہلِ زبان ہیں، انہیں اپنی زبان اور فصاحت وبلاغت پر بڑا ناز ہے اور وہ تو مجلسوں میں اور میلوں میں جا کر اپنی زبان دانی کے جوہر دکھاتے ہیں۔ اگر محمد مصطفی ﷺ ایسا کلام بنا سکتے ہیں تو انہیں بھی ایسا کلام پیش کرنے کی قدرت ہونی چاہیئے، لہٰذا وہ سب مل کر بلکہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمام جہان سے اپنے معاون ومددگار بھی جمع کرلیں اور اپنے ان معبودوں سے بھی اس کام میں مدد لے لیں جن کو وہ ہر طرح کا حاجت روا جان کر پوجتے ہیں۔ اگر پھر بھی ان سے ایک سورت کے برابر کلام نہ بن سکا اور وہ ہرگز نہیں بنا سکیں گے تو یقین کرلیں کہ یہ اس ذاتِ واحد اور قادرِ مطلق کا کلام ہے اور وہی اللہ تعالیٰ عزوجل ہے۔

علمی بات: سورۂ بنی اسرائیل آیت ۸۸ میں پورا قرآنِ حکیم، سورۂ ھود آیت ۳۰ قرآنِ حکیم جیسی دس سورتیں اور سورۂ یونس، یہاں ایک ہی سورت بنانے میں مقابلے کی دعوت دی گئی ہے۔ پھر اسی کو (سورۃ البقرۃ ۲، آیت: ۲۳) میں بھی دہرایا گیا۔

عملی پہلو: یہ قرآنِ حکیم کا وہ چیلنج ہے کہ جس نے چودہ سو سال سے دُنیائے کفر وعناد میں تہلکہ بپا کر رکھا ہے، قرآنِ حکیم کہتا ہے تمہیں اگر میرے مُنَزَّل مِنَ اللہ ہونے میں شبہ ہے تو تم پوری قوت واستعداد کے ساتھ مقابلہ پر آجاؤ فصاحت وبلاغت کے ساتھ ہو کر آؤ تم میں یہ ہرگز جرأت پیدا نہیں ہو سکے گی کہ تم ایک سورت بھی قرآنِ حکیم کے مقابلہ میں بناڈالو، یہ چیلنج ان لوگوں کو دیا گیا جن کا بچہ بچہ شاعر تھا، فصاحت وبلاغت جن کی گھٹی میں پڑی تھی مگر کسی بھی ذی ہمت نے قرآنِ حکیم کے اعلانِ مقابلہ کو قبول نہیں کیا، یہ چیلنج آج بھی موجود ہے، دُنیا ترقی کی بہت سی منزلیں طے کر چکی ہے کیا کوئی قوم آج تک ایسا کلام پیش کر سکی ہے، جس میں قرآنِ حکیم کی سی معرفت اور حقائق ہوں، قرآنِ حکیم کی سی جامعیت ہو، جو قرآنِ حکیم کی طرح زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو اور پھر فصاحت وبلاغت میں کمال پر ہو۔ کفر آج بھی قرآنِ حکیم کی حقیقت سے انکاری ہے تو اسے آج بھی دعوتِ مقابلہ ہے، کہ تم اس جیسا کلام بنا کر پیش کرو اگر تم اس سے عاجز ہوں تو پھر اس کی اتباع کرو کیونکہ قرآنِ حکیم اللہ ﷻ کی کتاب ہے، اس لئے انسانی طاقت سے باہر ہے کہ وہ اس جیسی کتاب لکھ کر لا سکے، اس لئے لوگوں کو چاہیئے کہ اللہ ﷻ نے انہیں جو فطری سمجھ بوجھ عطا فرمائی ہے اسے بروئے کار لاتے ہوئے اس حقیقت پر غور کریں اور قرآنِ حکیم کی برکات سے مستفید ہوں۔

آیت نمبر ۳۹: قرآنِ حکیم کو جھٹلانے والوں کی مذمت کی گئی ہے۔ وہ قرآنِ حکیم کے علوم کا ادراک اور اس کے پیغام کی حقیقت نہ پا سکے۔ سابقہ اقوام والوں کا انجام بیان فرما کر اُن جھٹلانے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ ان کے جھٹلانے کا انجام اللہ ﷻ کے عذاب کی صورت میں ظاہر ہونے والا ہے۔ جو ابھی تک ان کے سامنے نہیں آیا، لیکن پچھلی قوموں کے انجام سے ان کو عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔

علمی اور عملی بات: یعنی قرآنِ حکیم کے متعلق ان کا یہ معاندانہ رویہ اور اس کو کلامِ الٰہی ماننے سے انکار کسی تحقیق اور غور وفکر کا نتیجہ نہیں کہ انہوں نے قرآنِ حکیم کو پڑھا ہو اس میں غور وفکر کیا ہو اور پھر وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہوں کہ اس میں فلاں فلاں نقائص اور عیب موجود ہیں (معاذ اللہ) اس لئے یہ کلامِ الٰہی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ انہوں نے قرآنی معارف پر آگاہی حاصل نہیں کی۔ اس میں غور وفکر کرنے کی زحمت ہی نہیں اٹھائی۔ اس انکار کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے نیکوں کے لئے جس اجر وثواب کا وعدہ کیا ہے اور نافرمانوں کو جس عذابِ الیم کی دھمکی دی اور مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی خبر دی ہے وہ ابھی پردۂ غیب میں ہیں۔ ابھی ان کا وقوع نہیں ہوا۔ وہ ان وعدوں، وعیدوں اور پیشین گوئیوں کو محض ڈراوا سمجھ رہے ہیں وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اللہ ﷻ نے ہر چیز کے ظہور کے لئے ایک وقت مقرر کیا ہوا ہے۔ اس سے پہلے انہیں سوچنے اور حق قبول کرنے کی مہلت دی گئی ہے کہ وہ توبہ کر کے اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں اور جب عذاب کی فیصلہ کن گھڑی آپہنچے گی تو اس وقت ان کا چیخنا چلانا سب بے کار ہو گا۔

فرصت کے ان لمحوں کو پہلی قوموں نے بھی ضائع کر دیا۔ انہوں نے بھی اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت کو قبول نہ کیا۔ ان کے روشن معجزات کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ نادانی سے تباہ کن عذاب کے نزول کو ہی نبی کی صداقت کی کسوٹی سمجھتے رہے اور جب وہ عذاب آیا اور اس نے انہیں پیس کر رکھ دیا اس وقت ان کا شرمندہ ہونا، ندامت کے آنسو بہانا اور فریاد کرنا ان کے کسی کام نہ آسکا۔ مشرکین کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ وہ بھی نزولِ عذاب سے پہلے توبہ کر لیں اور میرے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ رحمت کو تھام لیں، ورنہ ان کا بھی وہی عبرتناک انجام ہو گا جو اُن سے پہلی نادان قوموں کا ہوا۔

آیت نمبر ۴۰: اس آیت میں مشرکین میں سے بعض کا قرآنِ حکیم پر ایمان لا کر فائدہ اٹھانے اور بعض کا اس کی تکذیب کرنے کا بیان ہے۔ قرآنِ حکیم پر ایمان لانے والوں کی تعریف کی گئی ہے۔ ایمان نہ لانے والوں کو فسادی قرار دیا گیا ہے کیونکہ وہ اسلام کی ترویج واشاعت میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے اللہ ﷻ خوب واقف ہے اور ان کے فساد کی سزا انہیں ضرور ملے گی۔

علمی بات: کفار میں دو طرح کے لوگ ہیں، بعض ایسے ہیں جنہیں یقینی طور پر معلوم ہے کہ یہ قرآنِ حکیم اللہ ﷻ کا کلام ہے اور ایسا معجزانہ کلام بنانا کسی انسان کے بس میں نہیں ہے، مگر وہ ہٹ دھرمی سے اسے جھٹلائے جارہے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو بالکل عقل کے اندھے اور سمجھ کے کورے ہیں، انہیں اس قرآنِ حکیم کے کلامِ الٰہی ہونے کا واقعی یقین نہیں ہے۔

اللہ ﷻ خوب جانتا ہے کہ کون ہیں جو محض تعصّب اور ہٹ دھرمی سے قرآنِ حکیم کے برحق ہونے سے انکار کیئے جارہے ہیں، حالانکہ وہ اپنے دل میں اس کے برحق ہونے کا یقین رکھتے ہیں یا ان میں سے کون کفر پر اڑا رہے گا یہاں مفسدین سے مراد اسلام قبول نہ کرنے والے ہیں۔

عملی پہلو: ایمان نہ لانے والے اللہ ﷻ کی نظر میں مفسد ہیں کیونکہ اپنی فطرت کے اعتبار سے کسی کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ حق کو قبول کرنے سے باز رہے۔ ایسا آدمی اپنے ضمیر کی آواز کو دباتا ہے، وہ اپنے سوچنے کی صلاحیت کو استعمال نہیں کرتا، وہ صاف اور کھلے دلائل کو جھٹلا کر نظر انداز کر دیتا ہے وہ سن کر آن سنی کرتا ہے اور سمجھنے کے باوجود بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا، وہ حق کے مقابلہ میں اپنے تعصّب اور مفادات کو ترجیح دیتا ہے۔

آیت نمبر ۴۱: حق کی مخالفت میں کمر بستہ رہنے والوں کے اعمال سے رسول اللہ ﷺ کو بَری ہونے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے اعمال اور مشرکین اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہیں۔

عملی پہلو: بحث و مناظرہ کرنے والے لوگ آخر وقت تک بلاوجہ اپنی بات پر اڑے رہتے ہیں مگر داعی حق جب دیکھتا ہے کہ مخاطب ضد اور ہٹ دھرمی پر اتر آیا ہے تو مزید بات کرنے کے بجائے وہ یہ کہہ کر الگ ہو جاتا ہے کہ اصل فیصلہ اللہ ﷻ کے یہاں ہونا ہے۔ اللہ ﷻ کی میزان میں جو شخص جیسا نکلے گا ویسا ہی اس کا انجام ہو گا۔

علمی بات: یہ مضمون قرآنِ حکیم میں کئی آیات میں بیان کیا گیا ہے: مثلاً سورۃ ہود ۱۱، آیت: ۳۵ میں ارشاد ہوا "کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے اس (قرآن) کو از خود گھڑ لیا ہے؟ آپ فرما دیجئے کہ اگر میں نے اس کو گھڑ لیا ہے تو میرا گناہ مجھ پر ہے اور میں تمہارے گناہوں سے بری الذمہ ہوں۔" اسی طرح سورۃ سبا، آیت: ۲۵ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے "آپ کہئے (اگر بالفرض) ہم نے کوئی جرم کیا ہے تو تم سے اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا اور تمہارے کاموں کے متعلق ہم سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔"

دراصل اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو تسلّی دی گئی ہے کہ اگر یہ مشرکین آپ (علیہ السلام) کی مسلسل تبلیغ کے باوجود مسلمان نہیں ہوتے تو آپ (ﷺ) غم اور فکر نہ کریں آپ علیہ السلام کو دعوتِ الی الحق پر ثواب ملے گا اور ان کو اسلام قبول نہ کرنے کی سزا ملے گی کیونکہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود جواب دہ ہے۔

آیت نمبر ۴۲: قریشِ مکّہ کے بعض کافر سرداروں اور دیگر مشرکین کے مکر و فریب کا بیان ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی محفل میں حاضر ہو کر بظاہر بڑی توجہ سے قرآنِ حکیم سنتے ہیں۔ لیکن ان کی نیت ہدایت حاصل کرنے کی نہیں ہوتی۔ ان کو غیر عاقل بہرے سے تشبیہ دی گئی ہے۔

علمی بات: یعنی ظاہری طور پر وہ قرآنِ حکیم تو سنتے ہیں، لیکن سننے کا مقصد چونکہ طلب ہدایت نہیں، اس لئے انہیں اس طرح کوئی فائدہ نہیں ہوتا جس طرح ایک بہرے کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا، بالخصوص جب بہرا غیر عاقل بھی ہو، کیونکہ عقل مند بہرا پھر بھی اشاروں سے کچھ سمجھ لیتا ہے۔ لیکن ان کی مثال تو غیر عاقل بہرے کی طرح ہے جو بالکل ہی بے سمجھ رہتا ہے۔ ان باتوں سے نبی ﷺ کی تسلّی مقصود ہے، جس طرح ایک حکیم اور طبیب کو جب معلوم ہو جائے کہ مریض علاج کرانے میں سنجیدہ نہیں اور وہ میری ہدایات اور علاج کی پروا نہیں کرتا تو وہ اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔

آیت نمبر ۴۳: سردارانِ قریش کا حق کے معاملے میں نابینا ہونے کا بیان ہے۔ دل کی بصیرت سے محروم ہونے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی صحبت ان کے لئے مفید نہیں ہوتی۔

علمی بات: بعض لوگ آپ ﷺ کی طرف دیکھتے ہیں لیکن اُن کا مقصد چونکہ کچھ اور ہوتا ہے، اس لئے انہیں بھی اس طرح کوئی فائدہ نہیں ہوتا، جس طرح ایک اندھے کو نہیں ہوتا۔ بالخصوص وہ اندھا جو بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت سے بھی محروم ہو۔ کیونکہ بعض اندھے، جنہیں دل کی بصیرت حاصل ہوتی ہے، وہ آنکھوں کی بصارت سے محروم ہونے کے باوجود بہت کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی اندھا جو دل کی بصیرت سے بھی محروم ہو۔

عملی پہلو: حق کو نہ ماننے والوں میں ایک طبقہ وہ ہے جو شروع سے صاف انکار کر دیتا ہے۔ مگر دوسرے طبقے کے لوگ یہ کرتے ہیں کہ بظاہر وہ باتوں کو اس طرح سنتے ہیں گویا کہ وہ سچ مچ سمجھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اپنے دل میں نہ سمجھنے کا تہیہ کئے ہوتے ہیں۔ وہ داعی حق کی صداقت کی نشانیوں کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے وہ کھلے دل سے اس کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کا ذہن پہلے سے یہ طے کیئے ہوئے ہوتا ہے کہ اس کو ماننا نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کی ظاہری حالت سے

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ قبولیت حق کے قریب ہیں۔ مگر اللہ ﷻ کی نظر میں وہ ایسے لوگ ہیں جو کان رکھتے ہوئے بہرے اور آنکھ رکھتے ہوئے اندھے بن جائیں۔ ایسے لوگوں کو کبھی اللہ ﷻ کی طرف سے قبول حق کی توفیق نہیں ملتی۔

آیت نمبر ۴۴: اللہ ﷻ کی دی ہوئی صلاحیتوں کا صحیح استعمال کر کے حق قبول نہ کرنے والے عذاب کے مستحق ہیں۔ یہ خود اپنے بُرے اعمال کے سبب اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ اللہ ﷻ کسی پر بھی ظلم نہیں کرتا۔

علمی بات: اپنے اوپر ظلم یہ ہے کہ فکر و نظر یعنی عقل و بصیرت سے کام نہ لینا اور اپنے حواس اور صلاحیتوں کو استعمال نہ کرنا یعنی حق اور باطل میں فرق کو نہ پہچاننا اور اگر حق سمجھ میں آجائے تو عناداً اس کی طرف سے منہ موڑ لینا اور خود اپنے اختیار سے بُرے کام کرتے رہنا، قدرت کی نشانیوں کو سمجھنے کے باوجود لہو ولعب میں مشغول رہنا یہ سب اپنی جانوں پر ظلم ہے، ایسا شخص دوسروں پر ظلم کرنے والوں سے زیادہ ظالم ہوتا ہے کیونکہ اس کے نفس کا حق اس پر سب سے زیادہ ہے اور وہ اسی کو مستحق نار بنانے پر تلا بیٹھا ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: "اللہ ﷻ فرماتا ہے، اے میرے بندو! میں نے اپنے آپ پر ظلم حرام کرلیا ہے اور تم پر بھی اسے حرام کردیا ہے، (خبردار!) ایک دوسرے پر ہرگز ظلم نہ کرنا۔" اور اس حدیث قدسی کے آخر میں فرمایا: "اے میرے بندو! یہ تمہارے اعمال ہیں جو میں تمہارے لئے شمار کر رہا ہوں، پھر تمہیں ان کا پورا پورا بدلہ عطا کروں گا، جو شخص خیر و بھلائی پائے تو وہ اللہ (ﷻ) کی تعریف کرے اور جو کسی اور صورتِ حال سے دوچار ہو وہ صرف اپنے آپ ہی کو ملامت کرے۔" (صحیح مسلم)

عملی پہلو: اللہ ﷻ نے انسان کو بہترین صلاحیتیں دی ہیں۔ اگر وہ ان صلاحیتوں کو صحیح استعمال کرے تو وہ کبھی گمراہ نہ ہو۔ مگر انسان اپنے آپ کو آزاد سمجھ کر غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ وہ بے جا سرکشی کرنے لگتا ہے۔ کیوں کہ جو چیز اس کو آزمائش کے طور پر دی گئی تھی اس کو اس نے اپنا حق سمجھ لیا۔

آیت نمبر ۴۵: روزِ قیامت اللہ ﷻ کے سامنے حاضر ہونے پر لوگ دُنیا کی زندگی کو انتہائی مختصر تصور کریں گے۔ مجرم ایک دوسرے کو پہچان لیں گے لیکن یہ پہچان مفید نہیں ہوگی۔ قیامت کے دن کو جھٹلا کر گمراہی میں پڑے رہنے والے ابدی عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

علمی و عملی بات: یہ آخرت اور عذاب کے جھٹلانے والوں کی جلد بازی کا جواب ہے۔ فرمایا کہ آج تو ان کو آخرت بہت بعید معلوم ہوتی ہے لیکن جس دن وہ اکٹھا کیئے جائیں گے اس دن اس دُنیا کی زندگی کے متعلق ان کی سوچ یہ ہوگی کہ وہ اس دُنیا میں ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔ وہ ایک دوسرے کو اس طرح پہچانتے ہوں گے گویا ان کی ملاقات صبح وشام کا قصہ ہے۔ ہر بات ذہن میں اس طرح تازہ ہوگی گویا اس پر کوئی زمانہ گزرا ہی نہیں۔ مطلب یہ کہ اصل شے تو وہ احساس ہے جو اس دُنیا کی زندگی سے متعلق روزِ آخرت میں ان پر طاری ہوگا تو اب یہ انسان کی محرومی ہی ہے کہ وہ اس دُنیا کی زندگی کو بہت طویل اور سب کچھ سمجھ کر آخرت سے بے پرواہ بیٹھے اور جب اس سے ڈرایا جائے تو یہ رٹ لگانا شروع کردے کہ اگر وہ آنی ہے تو آ کیوں نہیں جاتی۔

عملی پہلو: آخرت سے تکذیب و انکار سب سے بڑے خسارے کی چیز ہے کہ اس سے انسان بے فکر اور لاپرواہ ہو کر نور ہدایت سے محروم ہو جاتا ہے اور یہ محرومی سب سے بڑی محرومی ہے۔ جن لوگوں نے قیامت کو جھٹلایا اور اس کے نتیجے میں انہوں نے اپنی زندگی اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو دُنیا کی عارضی اور فانی لذّتوں کے حصول ہی میں گنوا دیا۔ اس طرح وہ ہدایت کے نور سے ہمیشہ محروم ہی رہے اور دُنیا کی کھیتی سے انہوں نے آخرت کے لئے کچھ نہ کمایا اور کفر و ظُلمت کے اندھیروں میں بھٹک کر انہوں نے اپنی عمر کی متاعِ عزیز کو گنوا دیا وہ بڑے ہی سخت خسارے میں پڑ گئے اور یہ اس قدر بڑا خسارہ ہوگا کہ اس کی تلافی و تدارک کی پھر کوئی صورت ممکن نہ ہوگی اور یہ لوگ رو رو کر تمنا و آرزو کریں گے کہ کاش ہم ایمان لے آتے۔ مگر اس تمنا و آرزو سے ان کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا سوائے اس کے کہ اپنی حسرت میں اور اضافہ کریں، آج دُنیا میں پیسے کی ریل پیل، اس کی چمک دمک اور اس کے وقتی فائدوں اور فانی لذّتوں کی بناء پر یہ لوگ اس طرف متوجہ ہونے اور اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں اور آخرت کا انکار کر کے گھاٹے اور خسارے کا سودا کئے بیٹھے ہیں۔

آیت نمبر ۴۶: نافرمانوں کی گرفت اور ان پر عذاب کی دو صورتوں کا بیان ہے۔ ان مجرمین کی سزا رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں یا پھر رسول اللہ ﷺ کے دُنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد ظاہر کی جائے گی۔ ان کے تمام جرائم پر اللہ ﷻ گواہ ہے۔ وہ آخرت کے عذاب سے نہیں بچ سکیں گے۔

علمی بات: اگر ان کافروں اور منکرین پر عذاب کا کچھ حصّہ آپ ﷺ کی زندگی میں آجائے یا آپ ﷺ کے دُنیا سے رحلت فرمانے کے بعد آئے یا دُنیا میں چھوٹ دے کر آخرت میں پکڑا جائے بہر حال عذاب نے آکر رہنا ہے اور انہیں اپنی بداعمالیوں کا نتیجہ بہر حال بھگتنا ہے۔ یہ اللہ ﷻ کی گرفت سے نہ تو چھوٹ سکتے ہیں اور نہ ہی بچ سکتے ہیں کہ ان سب نے آخر کار لوٹ کر اللہ ﷻ ہی کے پاس آنا ہے اور اُن کے خود ساختہ معبود جن کو انہوں نے حاجت روا و مشکل کشا بنا رکھا ہے ان میں سے کوئی بھی ان کے کام آنے والا نہیں۔ وقت آنے پر یہ حقیقت ان کے سامنے پوری طرح آشکار ہو جائے گی کہ ان کے ایسے تمام سہارے محض اوہام اور حقیقت کے برعکس تھے۔

عملی پہلو: اس میں یہ اشارہ ہے کہ نیک لوگوں کا انجام اچھا ہو گا اور رُسوائی بدکاروں کا مقدر ٹھہرے گی۔ یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ اللہ ﷻ کو کفار و مشرکین کے سب کاموں کا علم ہے وہ اپنے علم کے مطابق سزا دے گا۔ دُنیا میں خواہ سزا ملے یا نہ ملے مگر روزِ آخرت سزا ضرور مل کر رہے گی۔

آیت نمبر ۴۷: لوگوں کی ہدایت کے لئے ہر اُمّت میں ان ہی میں سے رسول بھیجے جانے کا بیان ہے۔ رسول کی دعوت کا ساتھ دینے والوں کی نصرت اور ٹھکرانے والوں کو سزا دی جاتی ہے۔ یہ فیصلہ انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔ اللہ ﷻ اِتمامِ حجّت سے پہلے کسی کو سزا نہیں دیتا۔

علمی بات: اس سے پہلے اُمّتِ محمدیہ ﷺ اور آپ ﷺ کا ذکر تھا۔ اب عام اقوام اور اُمتوں کا ضابطہ بیان فرمایا ہے کہ ہر اُمّت کے پاس اللہ ﷻ کے احکام پہنچانے والے رسول بھیجے گئے ہیں۔ تاکہ اللہ ﷻ کی حجّت تمام ہو، اِتمامِ حجّت سے پہلے کسی کو عذاب نہیں دیا جاتا۔ جب لوگوں کے بُرے اعمال حد درجہ کو پہنچ جاتے ہیں تو اللہ ﷻ اُن کی طرف رسولوں اور نبیوں کو بھیجتے ہیں اور اُن کو سزا رسول علیہ السلام کے آنے اور حجّت تمام کرنے کے بعد دی جاتی ہے۔ اللہ ﷻ کے یہاں ظلم اور ناانصافی کا تصوّر نہیں کہ مجرموں کے لئے فوراً عذاب اور سزا کا فیصلہ اِتمامِ حجّت سے پہلے سنا دیا جائے۔ اِسی طرح قیامت میں بھی باقاعدہ پیشی ہوگی، فردِ جُرم لگانے کے گواہ پیش ہوں گے ہر قوم کے ساتھ ان کے پیغمبر موجود ہوں گے۔ ان کے بیانات وغیرہ کے بعد نہایت انصاف سے فیصلہ ہو گا۔ قرآنِ حکیم میں اللہ ﷻ نے ارشاد فرمایا "ونضع الموازين القسط" (ہم ترازو کو انصاف پر رکھیں گے)

آیت نمبر ۴۸: مشرکین کی ہٹ دھرمی کا بیان ہے۔ عذاب کی تنبیہ کئے جانے پر وہ عذاب لے آنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

شانِ نزول: جب گزشتہ آیت نمبر: ۴۶ میں عذاب کی وعید سنائی گئی تو کافروں نے سرکشی کے طور پر یہ کہا کہ اے محمد (ﷺ)! جس عذاب کو لانے کا وعدہ کرتے ہیں وہ کب آئے گا۔ اس میں تاخیر کیوں ہے، اس عذاب کو جلد لائیے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور فرمایا کہ اے رسول (ﷺ)! آپ (ﷺ) ان سے کہہ دیجئے کہ دشمنوں پر عذاب نازل کرنا اور دوستوں کی مدد کرنا اور انہیں غلبہ دینا یہ سب مشیت الٰہی پر منحصر ہے اور مشیت الٰہی میں ان باتوں کا ایک وقت متعین ہے جو لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ جب آجاتا ہے تو گھڑی بھر بھی دیر نہیں لگتی۔

عملی پہلو: موجودہ دور میں انسان اپنے آپ کو مادر پدر آزاد سمجھتا ہے۔ وہ بظاہر دیکھتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے نہ تو کوئی اس کی گرفت کر سکتا ہے اور نہ کوئی اسے سزا دے سکتا ہے۔ یہ صورتِ حال اس کو غفلت میں ڈال دیتی ہے۔ حتیٰ کہ اللہ ﷻ کا داعی جب اس کو اس کے انجام سے ڈراتا ہے تو وہ اللہ ﷻ کے داعی کا مذاق اڑانے لگتا ہے۔ وہ کہتا ہے ہماری سرکشی پر تم جس عذاب کی دھمکی دے رہے ہو وہ کب پوری ہو گی۔

آیت نمبر ۴۹: مشرکین کے مطالبہ کا جواب دو طریقوں سے دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ عذاب نہیں لائیں گے۔ اللہ ﷻ جب چاہے گا عذاب لے آئے گا۔ ہر اُمّت کے لئے مہلت کی ایک مدت مقرر کر دی گئی ہے۔ عذاب کا وقت آجانے پر اس میں قطعاً تاخیر نہیں ہو سکتی۔

علمی و عملی بات: اللہ ﷻ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ جس وقت رسول کی دعوت کسی شخص یا گروہ کو پہنچی اور اس نے اس کو ماننے سے انکار کیا یا ماننے میں تامّل کیا اس پر فوراً عذاب کا فیصلہ نافذ کر دے بلکہ اللہ ﷻ کا قاعدہ یہ ہے کہ ہر فرد کو اس کی انفرادی حیثیت کے مطابق اور ہر گروہ کو اس کی اجتماعی حیثیت کے مطابق سوچنے سمجھنے کے لئے کافی وقت دیتا ہے اور اس بات کو اللہ ﷻ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کو کتنی مہلت ملنی چاہیے۔ پھر وہ مہلت جب پوری ہو جاتی ہے اور وہ شخص یا گروہ اپنی باغیانہ روش سے باز نہیں آتا تب اللہ ﷻ اس پر عذاب کا فیصلہ نافذ کرتا ہے۔ یہ فیصلے کا وقت اللہ ﷻ کی مقرر کردہ مدت سے نہ ایک گھڑی پہلے آسکتا ہے اور نہ وقت آجانے کے بعد ایک لمحہ ٹل سکتا ہے۔

COPYRIGHT © RESERVED WITH SAFEER-E-ILM FOUNDATION & ENGLISH BOOK HOUSE

علمی بات: کفار بار بار حضور ﷺ سے پوچھتے کہ وہ عذاب کب آئے گا؟ آپ اسے جلدی کیوں نہیں اتارتے۔ ہم تو آپ کو ستانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رہے۔ اگر آپ کچھ کر سکتے ہیں تو ہمیں تہس نہس کر دیجئے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ جس ذاتِ پاک کے ساتھ وہ الجھ رہے ہیں اس نے تو اپنی مشیت اور اپنی مرضی کو اپنے خالق ومالک کی مشیت کے تابع کیا ہوا ہے۔ یہاں تو اذنِ الٰہی کے بغیر نہ قدم اٹھتا ہے اور نہ زبان کھلتی ہے۔ جہاں تسلیم ورضا کا یہ عالم ہو وہاں تمہارے طعن و تشنیع کے ان تیروں کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ کفار کی ایسی بیہودہ سرائی کا چپ کرا دینے والا جواب دینے کے لئے اللہ ﷻ نے اپنے محبوب کو یہ فرمانے کا حکم دیا یعنی آپ اعلان فرما دیجئے کہ میں تو اپنی ذات کے لئے بھی نفع ونقصان پہنچانے کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ بجز اس کے جو اختیار اور جو قدرت میرے رب نے مجھے عطا فرمائی ہے تو میں اس کی مرضی کے بغیر تم پر عذاب کیسے اتار سکتا ہوں۔

علمی بات: اہلِ حق کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان کے پاس اللہ ﷻ کا دیا ہوا اختیار اور بخشی ہوئی قدرت ہے اور یہی عطا کردہ اختیار کسی کام کے ہونے اور نہ ہونے میں مؤثر ہوتا ہے نفع ونقصان کا اصلاً اختیار اللہ ﷻ کے ہاتھ میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ بھی اُمّت کی بھلائی کے لئے جو کچھ کہتے اور کرتے ہیں وہ سب کچھ اللہ ﷻ کے عطا کردہ اختیار اور حکم کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ الاعراف کی آیت: ۱۸۸ میں فرمایا گیا کہ: ''آپ فرما دیجئے! کہ میں خود اپنی ذات کے لئے کسی نفع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر کا مگر اتنا ہی کہ جتنا اللہ ﷻ نے چاہا'' یعنی میں از خود کچھ نہیں کرتا بلکہ وہی کرتا ہوں جو اللہ ﷻ نے مجھے اختیار عطا فرمایا ہے۔ کسی کا یہ سمجھنا کہ اللہ ﷻ نہ چاہے تب بھی حضور ﷺ نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں تو یہ شرک اور کفر ہے اور یہ کہنا کہ آپ ﷺ کو عطا کردہ علم عام بندوں کی طرح ہے تو یہ صرف واقعہ کے خلاف ہی نہیں بلکہ شانِ مصطفوی ﷺ کا بھی انکار ہے کیونکہ آپ ﷺ کو ہر اعتبار سے اُمّت میں انتہائی اعلیٰ درجے اور فضیلت کو بدرجہ کمال حاصل کئے ہوئے ہیں۔

آیت نمبر ۵۰: عذاب کی جلدی کرنے کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں:

۱۔ عذاب مانگنے والے عذاب جیسی خوفناک چیز کے لئے جلدی کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس سے پناہ مانگنی چاہیئے۔

۲۔ رات یا دن کسی بھی وقت عذاب آجائے تو اس وقت کیا یہ فوراً اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں؟

علمی بات: آپ ﷺ ان سے فرما دیجئے کہ اگر تم پر اللہ ﷻ کا عذاب رات کو آپڑے یا دن کو آجائے تو عذاب میں ایسی کون سی چیز ہے جس کی وجہ سے مجرمین عذاب کے لئے جلدی مچاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب تو رات یا دن میں کسی وقت بھی نازل ہو سکتا ہے یہ جانتے ہوئے کہ عذاب سخت چیز ہے اس کے آنے کی جلدی کیوں مچاتے ہیں، عذاب میں ایسی کون سی چیز مرغوب ہے جسے جلد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقتاً یہاں عذاب اُن کا مطلوب نہیں بلکہ وعدۂ عذاب کی تکذیب مقصود ہے۔

آیت نمبر ۵۱: عذاب کا مطالبہ کرنے والوں کو درحقیقت عذاب پر یقین نہیں ہے۔ ان کا یہ تقاضا محض جھٹلانے اور مذاق اڑانے کی نیت سے ہے۔ فی الواقع عذاب کے ظاہر ہونے پر انہیں یقین آجائے گا جو اس وقت بے سود ہوگا۔

علمی بات: اللہ ﷻ کا دستور اور قانون یہ ہے کہ وہ انسانوں کی توبہ کو اس وقت تک قبول فرماتا ہے جب تک موت کے فرشتے سامنے نہ آجائیں یعنی اس پر جاں کنی شروع نہ ہو جائے۔ لیکن جب موت کے فرشتے سامنے آجاتے ہیں تو پھر کسی طرح اس کی توبہ قبول نہیں کی جاتی۔ کیونکہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ ﷻ بندے کی توبہ قبول کرتا ہی رہتا ہے جب تک کہ وہ غرغرہ موت میں گرفتار نہ ہو جائے یعنی غرغرہ موت کے وقت کا ایمان اور توبہ اللہ ﷻ کے نزدیک معتبر نہیں، اسی طرح دُنیا میں وقوعِ عذاب سے پہلے پہلے توبہ قبول ہو سکتی ہے، جب عذاب آپڑے پھر توبہ قبول نہیں ہوتی، اس لئے خواہ یہ معاملہ انفرادی ہو یا اجتماعی اللہ ﷻ کا یہی قانون کسی فرد یا قوم پر جاری ہوتا ہے۔ اجتماعی عذاب اور معافی کی دونوں مثالیں قرآنِ حکیم میں موجود ہیں۔

علمی بات: قرآنِ حکیم میں فرعون کا واقعہ بیان کرتے ہوئے اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو سمندر کے بیچ میں راستوں سے نکال کر دوسرے کنارے پر لے آئے۔ بعد میں فرعون اپنے لشکر کے ساتھ جب ان راستوں کے اندر پہنچ گیا تو دریا کا پانی آپس میں پھر مل گیا اور فرعون اور اس کے لشکری ڈوبنے لگے اس وقت فرعون کو عقل آئی اور اس نے کہا'' میں ایمان لاتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں فرمان برداروں میں سے ہوں''۔

اللہ ﷻ نے اپنے دستور کے مطابق فرعون کی توبہ قبول نہیں کی کیونکہ جب ایمان لانے کا وقت تھا اس وقت تو وہ خود ہی معبود بنا ہوا تھا غرور، تکبر اور کفر میں سب سے آگے تھا لیکن جب اس کو موت نظر آئی تو اس کو بنی اسرائیل کا پروردگار یاد آنے لگا۔ اللہ ﷻ نے اس کی اس توبہ نامنظور فرمادی۔

اس کے برخلاف حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کو جب اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ حضرت یونس یہ کہہ کر چلے گئے ہیں کہ اب تم اللہ ﷻ کے عذاب کا انتظار کرو اور انہیں یقین ہو گیا کہ اگر ہم نے توبہ نہ کی تو واقعی اللہ ﷻ کا عذاب ہمیں آگھیرے گا۔ اس وقت پوری قوم نے عذاب کے آثار کو دور سے آتا ہوا دیکھ کر سچے دل سے گڑگڑا کر آہ وزاری کے ساتھ اپنے کفر وشرک سے اللہ ﷻ کے حضور توبہ کر لی، چونکہ عذاب آنے سے پہلے ہی انہوں نے توبہ کر لی تھی تو ان کی توبہ قبول ہو گئی۔ اس لئے عذاب ہٹالیا گیا اگر وہ عذاب آنے کے بعد توبہ کرتے تو ان کی توبہ قبول نہ کی جاتی۔

ان آیات میں اللہ ﷻ نے اپنا قانون بیان فرمایا ہے کہ آج یہ کفارِ مکہ جس عذاب الٰہی کو نظر انداز کر رہے ہیں اور اپنے کفر وشرک سے توبہ نہیں کرتے۔ اگر وہ عذاب آگیا تو پھر توبہ کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔

آیت نمبر ۵۲: واقعتاً عذاب آجانے پر ظالموں کا انجام بیان ہوا ہے۔ ان کے اعمال کے بدلے انہیں ہمیشہ جہنّم کا عذاب چکھنے کا حکم دیا جائے گا۔

علمی بات: موت کے بعد ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب ہمیشہ کے اس عذاب کا مزہ چکھو جس نے کبھی ختم نہیں ہونا اور ان لوگوں سے مزید کہا جائے گا کہ انہیں اُن کے اپنے ہی اعمال کا بدلہ دیا جارہا ہے جو وہ لوگ زندگی بھر کرتے رہے تھے۔ اس لئے دینِ حق سے منہ موڑنا ظلم ہے اپنے خالق و مالک اللہ ﷻ کے حق میں اپنے رسول کریم رؤف رحیم ﷺ کے حق میں اور خود اپنی جانوں کے حق میں بھی اور اس ظلم کے نتیجے میں ایسے لوگوں کو اس روز ذلّت و تحقیر کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اُن کی مہلتِ عمل ختم ہو چکی۔ اب جس عذاب سے انہیں واسطہ پڑنے والا ہے وہ دائمی عذاب ہے جس سے بچ نکلنے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔

عملی پہلو: زلزلے اور طوفان اللہ ﷻ کے حکم ہی سے آتے ہیں۔ انسان اس پہلو پر غور نہیں کرتا کہ جب معاملہ اللہ ﷻ اور انسان کے درمیان ہو تو فیصلہ کا اختیار تمام تر صرف فریقِ اوّل کو ہوتا ہے۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ اللہ ﷻ کا قانون فوراً حرکت میں نہیں آرہا ہے اس لئے وہ غفلت میں پڑا رہتا ہے۔ مگر جب اللہ ﷻ کا فیصلہ آئے گا تو اس وقت انسان اپنے آپ کو بے بس پاکر سب کچھ مان لے گا حالانکہ اس وقت کا ماننا کچھ کام نہ آئے گا کیونکہ وہ عمل کا انجام پانے کا وقت ہو گا نہ کہ عمل کرنے کا۔

آیت نمبر ۵۳: مشرکین کا تمسخر آمیز لہجہ میں قیامت کے متعلق سوال کرنے کا بیان ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو رب کی قسم بیان فرما کر قیامت کے وقوع کا اعلان کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ مشرکین اللہ ﷻ کو عاجز نہیں کر سکتے اور اس کی پکڑ سے بھاگ نہیں سکتے۔

علمی بات: اہلِ عرب سے رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ اگر تم نے اپنی اصلاح نہ کی تو تم کو آخرت کا عذاب پکڑ لے گا۔ اس کے جواب میں وہ آپ (علیہ السلام) کی بات کا مذاق اڑانے لگے۔ وہ دراصل پیغمبرِ اسلام کی تنبیہ کو بہت ہلکا سمجھ کر نظر انداز کر رہے تھے وَمَا نَحنُ بِمَبعُوثِين۔

آیت نمبر ۵۴: روزِ قیامت اللہ ﷻ کی بارگاہ میں ظلم کرنے والوں کی حالتِ زار بیان کی گئی ہے۔ اس دن وہ زمین کے تمام خزانے بطور فدیہ دے کر عذاب سے نجات پانے کے لئے تیار ہوں گے اور اپنی ندامت کو چھپائیں گے تاکہ سب کے سامنے مزید رُسوائی نہ ہو مگر بالآخر اس میں ناکام رہیں گے اور اللہ ﷻ کی بارگاہ میں حق اور انصاف کے ساتھ فیصلے ہوں گے۔

علمی بات: کفار آج تو مال و دولت پر مغرور اور نازاں ہیں۔ اپنی عزّت، اپنی سلامتی اور اپنے عیش و آرام کو اس مال و دولت سے وابستہ سمجھ رہے ہیں لیکن کل جب یہ اللہ ﷻ کی بارگاہ میں حاضر کیئے جائیں گے اور ان کے گناہوں کا بوجھ ان کی گردن پر لاد دیا جائے گا دوزخ کے شعلے ان کی طرف لپک رہے ہوں گے اس وقت ان کی یہ خواہش ہو گی کہ کاش ان سے یہ سب کچھ لے لیا جائے اور ان کی جان بخشی کر دی جائے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے اس آیت میں قیامت کے دن کی تین صفات بیان فرمائی ہیں: (۱) ظالم کے اگر بس میں ہوتا تو وہ دُنیا کی پوری دولت دے کر بھی اپنے آپ کو عذاب سے چھڑا لیتا۔ (۲) ظالم عذاب کو دیکھ کر اپنی ندامت اور پشیمانی چھپائیں گے۔ (۳) ان کے درمیان عدل و انصاف سے فیصلہ کیا جائے گا۔

۱۔ ظالم تمام دُنیا کی دولت دے کر بھی اپنے آپ کو عذاب سے نہیں چھڑا سکے گا، اس کی وجہ اولاً تو یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن تنہا آئے گا اور کسی چیز کا مالک نہیں ہو گا، اللہ ﷻ فرماتا ہے اور ان میں سے ہر ایک قیامت کے دن اکیلا حاضر ہو گا۔ (سورۂ مریم ۱۹، آیت: ۹۵) اور اس لئے بھی کہ اللہ ﷻ نے فرمادیا کہ قیامت کے دن ان سے کوئی فدیہ نہیں لیا جائے گا اور کسی نفس سے کوئی فدیہ نہیں لیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔ (سورۃ البقرۃ ۲، آیت: ۴۸)

۲۔ ندامت کہتے ہیں اس حسرت کو جو کسی چیز کے وقوع پذیر ہونے سے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ ظالموں کی پشیمانی اور پچھتاوے کو چھپانے کی وجہ یہ ہو گی کہ وہ دُنیا میں اس عذاب کا انکار کرتے رہتے تھے اور جب ان پر سخت عذاب آجائے گا تو وہ بہت اخلاص کے ساتھ ندامت کا اظہار کریں گے اور جو شخص اخلاص کے ساتھ کوئی کام کرتا ہے وہ اس کو مخفی رکھتا ہے، اس آیت میں ان کی مذمّت کی گئی ہے کہ اخلاص کے ساتھ توبہ کرنے کی جگہ دُنیا تھی، اب یہ اخلاص بے موقع اور بے محل ہے۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں "اسرّ" کا لفظ دو متضاد معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس لفظ کا معنیٰ چھپانا بھی ہے اور ظاہر کرنا بھی تو اس معنیٰ کے اعتبار سے مطلب یہ ہے کہ جب مجرم لوگوں کے سامنے فردِ جرم عائد کیا جائے گا تو اس وقت بڑا واویلا کریں گے اپنے کئے پر پچھتائیں گے اور اپنی ندامت کا کھلے عام اظہار کریں گے کہ ہم نے دُنیا میں بہت بُرا کیا مگر وہاں چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں ہو گی۔ غرضیکہ ندامت کو چھپانا یا ظاہر کرنا ان کے کسی کام نہ آئے گا۔

عملی پہلو: توبہ کا تعلق اس دُنیا سے ہے۔ آخرت میں اخلاص کے ساتھ کی ہوئی توبہ بھی قبول نہیں ہو گی، کیونکہ توبہ کا وقت گزر چکا اگر اس دُنیا میں صدقِ دل سے توبہ کرلی جائے تو اللہ ﷻ کی بارگاہ سے معافی مل جاتی ہے مگر قیامت کے دن صدقِ دل سے معافی بھی کارآمد نہیں ہو گی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ "ندامت توبہ ہی ہے۔" (مسند احمد)

۳۔ ظالموں کے درمیان عدل سے فیصلہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ مومنوں اور کافروں کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا، ایک قول یہ ہے کہ کفار اور ان کے عذاب کے درمیان عدل کیا جائے گا۔ ہر چند کہ تمام کفار دوزخ کے عذاب میں مشترک ہوں گے لیکن عذاب کی کیفیات میں ان کے درمیان فرق ہو گا، کیونکہ دُنیا میں بعض کافروں نے بعض کافروں پر ظلم کیا ہو گا اور بعض کافروں نے بعض کافروں سے خیانت کی ہو گی، اس لئے بعض کافر ظالم اور بعض مظلوم ہوں گے اور عدل اور حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ مظلوم کا عذاب ظالم سے کم ہو اور ظالم کا عذاب مظلوم کے عذاب سے زیادہ ہو، اس لئے اللہ ﷻ نے فرمایا: ان کے درمیان عدل سے فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر بالکل ظلم نہیں کیا جائے گا۔ مفسرین کرام نے اس سے یہ مراد بھی لی ہے کہ کافروں کے بڑوں اور چھوٹوں کے درمیان سرداروں اور چیلوں کے درمیان فیصلہ حق و انصاف ہی سے ہو گا۔ ہر ایک کو اپنے اپنے عمل کا بدلہ ضرور ملے گا۔ کسی کو ناکردہ گناہ میں نہیں پکڑا جائے گا۔ اللہ ﷻ کی بارگاہ میں بالکل حق و انصاف کے ساتھ فیصلہ ہو گا۔

آیت نمبر ۵۵: اللہ ﷻ ہی کائنات کا حقیقی مالک ہے۔ قیامت ضرور قائم ہو گی اور انسانوں کا حساب و کتاب ضرور ہو گا۔ انسانوں کی اکثریت آخرت سے غافل رہتی ہے۔

عملی پہلو: آدمی جسمانی ساخت کے لحاظ سے کمزور مخلوق ہے۔ وہ زیادہ تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتا۔ دُنیا میں جب تک اس کو عذاب کا سامنا نہیں ہوتا وہ حق کا مذاق اڑاتا ہے۔ وہ اس کو شانِ بے نیازی کے ساتھ ٹھکرا دیتا ہے۔ مگر جب آخرت کا عذاب سامنے ہو گا تو اس پر اتنی گھبراہٹ طاری ہو گی کہ دُنیا کا سب کچھ اس کو حقیر معلوم ہونے لگے گا۔ ساری دُنیا کی مال و دولت اور تمام نعمتیں عذابِ الٰہی کے مقابلے میں حقیر اور ہیچ نظر آئیں گی اور اس کی خواہش ہو گی کہ دُنیا کا سب کچھ فدیہ میں دے کر اس تکلیف دہ عذاب سے نجات پا جائے۔

آیت نمبر ۵۶: زندگی اور موت پر صرف اللہ ﷻ کا اختیار ہونے اور تمام انسانوں کا اسی کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا بیان ہے۔ ہر ایک کو اپنے اعمال کے بارے میں خود جواب دینا ہو گا۔ صرف زمین و آسمان کی ملکیت ہی نہیں، بلکہ زندگی اور موت دینا بھی اللہ ﷻ ہی کے اختیار میں ہے اور لوگوں کو دوبارہ زندہ ہو کر اسی کے پاس جانا ہے۔

علمی بات: مشرکین کے عقیدے کے مطابق کہ تخلیق تین خُداؤں میں تقسیم ہے۔ ایک خدا پیدا کرنے والا۔ ایک خدا قائم، سلامت رکھنے والا اور ایک خدا موت لانے والا۔ لیکن اصلاً انشاء، بقا اور فنا طاری کرنا سب ایک ہی اللہ ﷻ کے اختیار اور قدرت میں ہیں۔

آیت نمبر ۵۷: قرآنِ حکیم کی چار صفات کا بیان ہے جو باہمی مربوط ہیں۔

۱۔ مَوعِظة: قرآنِ حکیم ایسی نصیحت ہے جس سے دلوں میں نرمی، دُنیا سے بے رغبتی اور آخرت سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ شِفاء: یہ انسانوں کی باطنی بیماریوں یعنی دل کی بیماریوں کا علاج ہے۔ ۳۔ هُدیٰ: یہ انسانوں کے عقائد واعمال کی اصلاح کے لئے ہدایات فراہم کرتا ہے۔

۴۔ رَحمة: اس پر ایمان لانے اور اس کی پیروی کرنے والوں کے لئے دُنیا اور آخرت میں رحمت کا باعث ہے۔

علمی و عملی بات: قرآنِ حکیم بہترین رہنماء ہے:

ایک گمراہ شخص جب ہدایت قبول کرتا ہے اور یقین واطمینان کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوتا ہے تو لازم ہے کہ چار منزلوں سے ہو کر گزرے۔

اوّل: گناہوں سے آگاہ ہو۔ دوم: شکوک وشبہات اور باطنی امراض سے نجات حاصل کرے۔ سوم: صراطِ مستقیم کو دیکھ لے، چہارم: اپنے مقصود سے ہم کنار ہو جائے۔

علمی بات: اس آیت کے الفاظ کی ترتیب (موعظہ، شفا، ہدایت اور رحمت) حکمت سے پُر ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۷۴ میں انسان کے دل کی سختی کا ذکر ثُمَّ قَسَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ (پھر تمہارے دل سخت ہو گئے) کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔ دراصل دل کی سختی ہی وہ بنیادی مرض ہے جس کے باعث اعلیٰ سے اعلیٰ کلام بھی کسی انسان پر بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ قبولِ ہدایت کے لئے سب سے پہلے دلوں کی سختی کو دور کرنا ضروری ہے۔ جیسے بارش سے فائدہ نرم زمین کو ہوتا ہے پتھریلی زمین بارش سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتی، بارش کا پانی اوپر ہی اوپر بہہ کر نکل جاتا ہے، اس کے اندر جذب نہیں ہوتا۔

دلوں کی سختی کو دور کرنے کے لئے مؤثر ترین نسخہ وعظ ونصیحت (موعظ) ہے۔ جب وعظ اور نصیحت سے دلوں میں گداز پیدا ہوگا تو پھر قرآنِ حکیم ان پر دوا کی مانند اثر کر کے تکبر، حسد، بغض، حُبِّ دُنیا وغیرہ تمام امراض کو دور کر دے گا۔ حُبِّ دُنیا میں مال ودولت، اولاد، بیوی شہرت وغیرہ کی حد سے بڑھی ہوئی تمام محبتیں شامل ہیں۔ ملاحظہ ہو سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۴: (زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالۡبَنِيۡنَ وَالۡقَنَاطِيۡرِ الۡمُقَنۡطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالۡفِضَّةِ وَالۡخَيۡلِ الۡمُسَوَّمَةِ وَالۡاَنۡعَامِ وَالۡحَرۡثِ)۔ آیت زیرِ مطالعہ میں الفاظ کی ترتیب پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایک انسان کے حق میں قرآنِ حکیم سب سے پہلے وعظ اور نصیحت ہے، پھر تمام امراضِ قلب کے لئے شفاء اور پھر ہدایت۔ کیونکہ جب دل سے بیماری نکل جائے گی، دل شفایاب ہوگا تب ہی انسان قرآنِ حکیم کی ہدایت اور رہنمائی کو عملاً اختیار کرے گا اور جب انسان یہ سارے مراحل طے کر کے قرآنِ حکیم کی ہدایت کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال لے گا تو پھر اس کو انعامِ خاص سے نوازا جائے گا اور وہ ہے اللہ ﷻ کی خصوصی رحمت۔ کیونکہ یہ قرآنِ حکیم ربِّ رحمان کی رحمانیت کا مظہر اتم ہے: (اَلرَّحۡمٰنُ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ)۔

عملی پہلو: اس قرآنِ حکیم نے ان لوگوں کی زندگیوں کی کایا پلٹ دی تھی جو کفر وشرک میں ڈوب کر انسانیت اور اخلاق کے ہر اصول کو بھول چکے تھے۔ کفر وشرک ہی جن کی زندگی بن چکی تھی۔ جہالت وظلم میں ڈوبے ہوئے یہ لوگ قرآنِ حکیم کی برکت سے انسانیت کے دوست اور خیر خواہ بن گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے جو راہزن تھے وہ راہبر بن گئے اور کفر وشرک اور نفاق کی تاریکیوں میں بھٹکنے والے ساری دُنیا کو ہدایت کی روشنی میں لانے کا ذریعہ بن گئے قرآنِ حکیم ڈیڑھ ہزار سال پہلے بھی یہی تاثیر رکھتا تھا۔ وہ تاثیر آج بھی ہے اور قیامت تک اس کی تاثیر برقرار رہے گی بات صرف عمل کرنے کی ہے۔ نبی کریم ﷺ کے جاں نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآنِ حکیم اور اپنے نبی ﷺ کی سنّت پر عمل کیا تو وہ ساری دُنیا پر چھا گئے، تمام قوتیں اور طاقتیں ان کی غلام اور محکوم بن کر رہ گئیں۔ پہلے کی طرح آج بھی ہماری بلندی، نجات، کامیابی اور روحانی بیماریوں کا علاج قرآن وسنّت ہی میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

آیت نمبر ۵۸: قرآنِ حکیم اللہ ﷻ کی رحمت کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ قرآنِ حکیم سب سے بڑی دولت ہے۔ اس دولت کو سعادت اور خوش نصیبی سمجھنا چاہئے۔ اس دولت میں کچھ مل گیا تو بہت کچھ مل گیا۔ اس کے سوا باقی بہت کچھ ملا تو کچھ بھی نہ ملا۔

علمی بات: فضل سے مراد قرآنِ حکیم ہے اور یہی اللہ ﷻ کی رحمت کا سب سے بڑا مظہر بھی ہے جیسے فرمایا کہ اَلرَّحۡمٰنُ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ۔ ایک رائے کے مطابق رحمت سے مراد صاحبِ قرآن رسالت مآب ﷺ بھی ہیں جیسا کہ ارشاد ہے: وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ۔

قرآنِ حکیم صاحبِ قرآن کی صورت میں ہم پر اللہ ﷻ کا سب سے بڑا فضل اور رحمت کا نزول ہوا ہے۔

عملی پہلو: انسان صرف اللہ ﷻ کی رحمت اور اس کے فضل کی وجہ سے مسرور ہو نہ کہ مادی اسباب میں زیادتی کی وجہ سے کیونکہ مادی اسباب اور اس کی لذّتیں فانی ہیں ان کے زوال کا خدشہ انسان کو لاحق رہتا ہے اور جب انسان کو روحانی ترقی نصیب ہو کیونکہ وہ اللہ ﷻ کے فضل اور راحت کی دلیل ہے کیونکہ روحانی ترقی اخلاص سے مزیّن اعمال اور تقویٰ کی بدولت ملتی ہے اور اس انسان کی نیک بختی اور سعادت مندی کی دلیل ہے۔

آیت نمبر ۵۹: مشرکین کے مذہبی پیشواؤں کو سرزنش کی گئی ہے۔ وہ اپنی من گھڑت رسموں کے ذریعے اللہ ﷻ کے عطا کردہ رزق کو حلال یا حرام ٹھہراتے تھے۔ رزق کا اطلاق صرف خوراک پر ہی نہیں ہوتا بلکہ مال، صحت، علم، لباس، مکان، سواری وغیرہ بھی رزق میں شامل ہیں۔

عرب کے مشرکین نے مختلف جانوروں کو بُتوں کے ناموں پر مخصوص کر کے انہیں خواہ مخواہ حرام قرار دے دیا تھا۔

علمی و عملی بات: اپنی طرف سے کسی بھی چیز کو حلال یا حرام قرار دینا اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھنا ہے۔ اللہ ﷻ نے بندوں کو پیدا فرمایا ان کو رزق بھی عطا فرمایا۔ ان کی ہدایت کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا اور اپنی کتابیں نازل فرمائیں۔ اللہ ﷻ کے رسولوں نے اللہ ﷻ کی کتابوں کے احکام بتائے اور حلال و حرام کی وہ تفصیلات بتائیں جو اللہ ﷻ کے نزدیک حلال اور حرام تھیں۔ خاتم الانبیاء سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ پر دین کو کامل فرما دیا اور آپ ﷺ پر قرآنِ حکیم نازل فرمایا قرآن و حدیث میں حرام و حلال کی تفصیلات موجود ہیں۔ مشرکین نے جو اپنی طرف سے حرام و حلال تجویز کر رکھا ہے اس کی بھی تردید فرمائی اور اُمّتِ محمدیہ ﷺ کے لئے بھی پیش بندی کے طور پر فرما دیا کہ اللہ ﷻ کی ہدایات سے ہٹ کر اپنے طور پر حرام و حلال کے فیصلے کرنا کسی کے لئے روا اور جائز نہیں ہے جو کتاب و سنت نے حلال ٹھہرایا وہی حلال ہے اور حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنا بندہ کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔

آیت نمبر ۶۰: خود ساختہ حلال و حرام کو اللہ ﷻ کی طرف منسوب کرنے والوں کو قیامت کے دن شدید وعید سنائی گئی ہے۔ اللہ ﷻ بلا تفریق سب کو رزق عطا فرماتا ہے۔ انسانوں کی اکثریت شکر کرنے کے بجائے اللہ ﷻ کی حدود کی خلاف ورزی کرتی ہے۔

علمی و عملی بات: کفار روزِ قیامت کے متعلق کیا خیال کر رہے ہیں کہ کیا معاملہ ان کے ساتھ ہو گا سخت پکڑے جائیں گے، یا سستے چھوٹ جائیں گے۔ عذاب بھگتنا پڑے گا یا نہیں۔ کن خیالات میں پڑے ہیں۔ یاد رکھیں جو دردناک سزا ملنے والی ہے وہ ٹل نہیں سکتی۔

اللہ ﷻ اپنے فضل سے دُنیا میں بہت کچھ مہلت دیتا ہے۔ بہت سی تقصیرات و کوتاہیوں سے درگزر فرماتا ہے۔ لیکن بہت سے لوگ اس نرمی اور ستاری کو دیکھ کر بجائے شکر گذار ہونے کے اور زیادہ دلیر اور بے خوف ہو جاتے ہیں۔ بالآخر مستحق عقاب ٹھہرتے ہیں اور اللہ ﷻ کی پکڑ اور گرفت میں آتے ہیں۔

آیت نمبر ۶۱: اس آیت میں بیک وقت رسول اللہ ﷺ اور مشرکین دونوں کو خطاب ہے۔ ایک طرف رسول اللہ ﷺ لوگوں کی ہدایت کے لئے قرآنِ حکیم سناتے ہیں اور اس کے ذریعے جہاد کر رہے ہیں۔ دوسری طرف مخالفین رسول ﷺ اور اہلِ ایمان کو تکلیفیں پہنچا کر اسلام کی راہ سے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کائنات میں اللہ ﷻ کے اِذن سے کوئی چیز باہر نہیں۔ بندوں کا کوئی کردار اس کی نظروں سے اوجھل نہیں۔ اس کے ساتھ تلاوتِ قرآنِ حکیم کا خاص طور ذکر کیا گیا ہے اور فضیلتِ قرآنِ حکیم کو بیان فرمایا ہے اور یہ کہ ہر چھوٹی بڑی چیز کا اندراج لوحِ محفوظ میں ہے۔ اللہ ﷻ کی وسعت علم کے بیان کی حکمت یہ ہے کہ مخالفین کو تنبیہ ہو جائے اور رسول اللہ ﷺ اور آپ علیہ السلام کے ذریعہ اہل ایمان کو تسلّی و تشفّی نصیب ہو۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ کے علم محیط اور اس کی بے مثال وسعت کا ذکر رسولِ کریم ﷺ کو مخاطب کر کے کیا گیا ہے کہ آپ علیہ السلام جس کام اور جس حال میں ہمیشہ ہوتے ہیں یا قرآنِ حکیم پڑھتے ہیں اس کا کوئی جزء ہم سے مخفی نہیں اسی طرح تمام انسان جو کچھ عمل کرتے ہیں وہ ہماری نظروں کے سامنے ہیں اور آسمان و زمین میں کوئی ایک ذرہ بھی ہم سے چھپا ہوا نہیں ہے بلکہ ہر چیز کتابِ مبین یعنی لوحِ محفوظ میں لکھی ہوتی ہے۔

بظاہر اس جگہ علمِ الٰہی کی وسعت اور ہر چیز کو محیط ہونے کے بیان میں حکمت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کو تسلّی دی جائے کہ اگرچہ مخالف اور دشمن آپ علیہ السلام کے بہت ہیں مگر آپ ﷺ اللہ ﷻ کی حفاظت میں ہیں آپ علیہ السلام کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔

علمی بات: قیامت میں انسانوں کے دوبارہ زندہ ہونے کو مشرکین عرب اس وجہ سے ناممکن سمجھتے تھے کہ اربوں انسان جب مر کر مٹی کے ذرّات میں تبدیل ہو چکے ہوں گے، اس کے بعد ان سب کو اکٹھا کر کے دوبارہ زندگی کیسے دی جا سکتی ہے؟ یہ کیسے معلوم ہو گا کہ مٹی کا کونسا ذرہ کس انسان کے جسم کا حصّہ تھا۔ اس آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ تم اللہ ﷻ کی قدرت اور علم کو اپنے اوپر قیاس مت کرو۔ اللہ ﷻ کا علم اتنا وسیع ہے کہ اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

آیت نمبر ٦٢: اللہ تعالیٰ کے فرماں برداروں کا ذکر جنہیں اللہ تعالیٰ کے اولیاء کہا گیا ہے۔ ولایت کا معنی ہے قُرب اور کسی چیز کا انتظام کرنا۔ ''اولیاء'' ولی کی جمع ہے جس کے معنی قریب، محب، صدیق اور مددگار وغیرہ کے ہیں۔ مومن کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ولی ہے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے جمال اور جلال کے نور میں مستغرق رہنے کی وجہ سے اس کے قریب اور مقرب ہو چکا ہے۔ ولی وہ مومن کامل ہے جو اللہ تعالیٰ کو پہچاننے، اخلاص کے ساتھ دائمی عبادت کرنے اور ہر قسم کے گناہوں سے اجتناب کرنے والا ہے۔ جس کا دل اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے دھیان میں مشغول رہے۔ شب و روز وہ تسبیح و تہلیل میں مصروف ہو۔ اس کا دل محبت الٰہی سے لبریز ہو اور کسی غیر کی وہاں موجودگی کا شائبہ تک نہ ہو۔ وہ اگر کسی سے محبت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے لئے اگر کسی سے نفرت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے لئے۔ یہی وہ مقام ہے جسے حدیث مبارکہ میں تکمیل ایمان کہا گیا۔

علمی بات: قُرب کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ قُرب جو ہر انسان بلکہ کائنات کے ذرہ ذرہ کو اپنے خالق سے ہے اور اگر یہ قُرب نہ ہو تو کوئی چیز موجود نہ ہو سکے۔ نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ (ہم شہ رگ سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں) میں اسی قُرب کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرا قُرب وہ ہے جو صرف خاص بندوں کو میسر ہے اسے قُربِ محبت کہتے ہیں۔ قُربِ محبت کے بے شمار درجے ہیں اس قُربِ محبت کا سب سے بلند اور ارفع مقام وہ ہے جہاں محبوبِ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡن فائز ہیں۔

علمی بات: خوف مستقبل اور غم ماضی کے واقعات سے تعلق رکھتا ہے۔ اولیاء اللہ نہ ماضی کے حادثات اور فوت شدہ چیزوں پر اور نہ مستقبل کے اندیشوں اور پریشانیوں کا خوف رکھتے ہیں۔ راضی برضائے رب کی کیفیت ہر وقت ان کے شامل حال ہوتی ہے اور ماضی کی کسی بات کا کوئی غم نہ ہونا اور مستقبل میں بے خوف ہونا یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ کیونکہ دُنیا میں عام طور پر ہر انسان کو خواہ وہ کتنا خوشحال ہو، ہر وقت مستقبل کا کوئی نہ کوئی خوف یا ماضی کا کوئی نہ کوئی غم پریشان کرتا رہتا ہے۔ یہ نعمت کامل طور پر تو صرف جنّت ہی میں حاصل ہو گی کہ انسان ہر طرح کے خوف اور صدمے سے بالکل آزاد ہو جائے گا۔

ولی کے مصداق اور ان کے فضائل کے متعلق احادیث:

ا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سوال کیا گیا کہ اولیاء اللہ کون ہیں؟ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں دیکھو تو اللہ تعالیٰ یاد آجائے۔ (جامع البیان)

٢۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے بعض بندوں میں سے ایسے انسان ہیں جو نبی ہیں نہ شہید (لیکن) اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا مرتبہ دیکھ کر انبیاء علیہم السلام اور شہداء بھی ان کی تحسین کریں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: یارسول اللہ! ہمیں خبر دیں وہ کون لوگ ہیں؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں سے محض اللہ تعالیٰ کی وجہ سے محبت کرتے ہیں حالانکہ وہ لوگ ان کے رشتہ دار ہوتے ہیں نہ ان کو ان سے کوئی مالی فائدہ حاصل ہوتا ہے اللہ (تعالیٰ) کی قسم ان کے چہرے منور ہوں گے اور بے شک وہ نور پر فائز ہوں گے (بعض روایات میں ہے وہ نور کے منبر پر ہوں گے) اور جب لوگ خوف زدہ ہوں گے وہ بے خوف ہوں گے اور جب لوگ غم زدہ ہوں گے تو انہیں غم نہیں ہو گا پھر آپ علیہ السلام نے اس آیت کو پڑھا: اَلَاۤ اِنَّ اَوۡلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ۔ (جامع ترمذی)

٣۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبرائیل علیہ السلام کو بلا کر فرماتا ہے میں فلاں سے محبت کرتا ہوں تم اس سے محبت کرو، پس اس سے جبرائیل علیہ السلام محبت کرتا ہے پھر وہ آسمان میں ندا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو، پس آسمان والے اس سے محبت کرتے ہیں، پھر زمین میں اس کے لئے مقبولیت رکھ دی جاتی ہے اور جب وہ کسی بندے سے بغض کرتا ہے تو جبرائیل علیہ السلام کو بلا کر فرماتا ہے میں فلاں سے بغض رکھتا ہوں تم اس سے بغض رکھو۔ پھر جبرائیل علیہ السلام اس سے بغض رکھتے ہیں پھر زمین میں اس کے لئے بغض رکھ دیا جاتا ہے۔ (صحیح مسلم، صحیح بخاری، مسند احمد، جامع ترمذی)

آیت نمبر ٦٣: وہ سچے اور مخلص مومن ہوتے ہیں جن کے دل نورِ ایمان سے منور ہوتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے سرشار رہتے ہیں اور گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں۔

اولیاء کون لوگ ہیں اس کے بارے میں فرمایا کہ جو لوگ ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا یہ لوگ اولیاء اللہ ہیں۔ ایمان کے بغیر تو اللہ تعالیٰ کا کوئی دوست ہو ہی نہیں سکتا۔ خواہ کیسی اور کتنی ریاضت کرے اور عبادت کے نام سے کچھ بھی عمل کرے۔ کافر اور مشرک کو اللہ تعالیٰ کا قُرب نصیب نہیں ہوتا اور وہ اللہ تعالیٰ کا ولی نہیں ہو سکتا۔

اہل ایمان کے درجات مختلف ہیں۔ ایمان کی صفات کے کم و بیش ہونے اور ایمانی تقاضوں پر عمل کرنے میں اور عبادت، تلاوت، ذکر کی کیفیات اور مقدار کے اختلاف سے مراتب میں فرق آتا ہے۔ فرائض اور واجبات کا اتباع سنّت کا اہتمام، حرام اور ممنوع کاموں سے بچنا، نوافل کی کثرت، ذکر اللہ تعالیٰ کی مشغولیت اور

صفت احسان (اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ) کا حصول، خشوع خضوع، اخلاص، مکارمِ اخلاق، محاسن الافعال ان سب چیزوں کے ذریعہ حسبِ مراتب درجہ بدرجہ اللہ ﷻ کا قُرب حاصل ہوتا ہے اور اسی کا نام ولایت ہے۔

دولتِ ایمان سے مشرف ہونے کے بعد اہلِ عزم وہمت ترقی کے مختلف درجات طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس بلند مقام پر فائز ہو جاتے ہیں۔ جس کی وضاحت حضور رحمت دو عالم ﷺ نے یوں بیان فرمائی۔

فرمانِ نبوی ﷺ: اللہ ﷻ ارشاد فرماتا ہے کہ بندہ نفلی عبادات سے میرے قریب ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں ہی اس کے کان ہو جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور میں ہی اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ (صحیح بخاری) یعنی اس کا سننا دیکھنا سب میری رضا کے مطابق ہو جاتا ہے۔

علمی بات: ہر وہ عمل جو ایمان کے تقاضوں کے مطابق ہو اور اللہ ﷻ کی رضا کے لئے ہو وہ سب عمل قُربِ خداوندی اور رضائے الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اولیاء اللہ کی تعریف میں جو اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فرمایا یہ ایمان کے تمام تقاضوں کو شامل ہے فرائض سے لے کر مستحبات تک جو بھی کرنے کے کام ہیں وہ سب اللہ ﷻ کا قُرب حاصل ہونے کا ذریعہ ہیں۔ یہ تو ایمان کے تقاضوں کا ذکر ہوا جن پر عمل کرنا ہے ان کے علاوہ دوسرے تقاضے بھی ہیں جن کا تعلق ان اعمال سے ہے جن کا ارتکاب کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اس کو وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ میں بیان فرما دیا۔ حرام سے لے کر مکروہ تنزیہی تک جو اعمال ترک کرنے کے ہیں ان سے بچنا بھی رضائے الٰہی کا ذریعہ ہے اور یہ بھی عبادت ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: (اِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَکُنْ اَعْبَدَ النَّاسِ) کہ تو اللہ ﷻ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچ، ایسا کرنے سے تو دوسروں سے بڑھ کر عبادت گزار ہو گا۔ (مشکوٰۃ المصابیح) پس جو شخص معروف پر عمل کرتا رہے اور منکرات سے بچتا رہے اور رسول اللہ ﷺ کی سنّتوں کی اتباع کا اہتمام کرتا رہے جیسا سورۂ آلِ عمران ۳، آیت: ۳۱ (قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ) ترجمہ: اے نبی (ﷺ)، لوگوں سے کہہ دو کہ "اگر تم حقیقت میں اللہ (ﷻ) سے محبت رکھتے ہو، تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ (ﷻ) تم سے محبت کرے گا" میں بیان فرمایا ہے ایسے شخص کو اپنے اپنے عمل کے اعتبار سے قُربِ الٰہی حاصل ہو گا اور اسی درجہ کی ولایت حاصل ہو گی جس درجہ کے اعمال ہوں گے اور جس قدر دُنیاوی مشاغل و افکار سے ذہن فارغ ہو گا اور اللہ ﷻ سے لو لگی ہو گی اسی قدر قُربِ الٰہی میں بتدریج اضافہ ہوتا رہے گا۔

آیت نمبر ۶۴: اولیاء اللہ کے لئے دُنیا و آخرت کی بشارتیں دی گئی ہیں۔ یہ بشارتیں حتمی اور یقینی ہیں۔ یہی حقیقت میں سب سے بڑی کامیابی ہے۔

علمی بات: حدیثِ مبارک کے مطابق اس بشارت سے اچھے خواب مراد ہیں جنہیں آدمی خود دیکھے یا اس کے لئے دیکھا جائے (یعنی اس کے لئے کوئی اور دیکھے) (مسند احمد) مطلب یہ ہے کہ مومن بندے ایسے خواب دیکھ لیتے ہیں جن میں ان کے لئے خیر وخوبی کی اور حسنِ خاتمہ کی اور اعمال کے عند اللہ مقبول ہونے کی نیز جنّت میں داخل ہونے کی خوشخبری ہوتی ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو ایسے خواب دکھائے جاتے ہیں جن میں کسی مومن بندے کے لئے بشارت ہوتی ہے۔ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے بشارت کا ایک مصداق بیان فرما دیا ہے۔

علمی بات: بعض مفسرین اس بشارت سے دُنیا میں نیک نامی بھی مراد لیتے ہیں۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ارشاد فرمایئے ایک شخص کوئی خیر کا کام کرتا ہے اور لوگ اس پر اس کی تعریف کرتے ہیں (اس کی وجہ سے اس کا ثواب ختم تو نہیں ہو جاتا جبکہ اس نے وہ عمل اللہ ﷻ کے لئے کیا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ تو مومن کے لئے ایک بشارت ہے جو اس دُنیا میں اسے مل گئی۔ (صحیح مسلم)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ دُنیا کی بشارت یہ ہے کہ موت کے وقت فرشتے بشارت لے کر آتے ہیں اور اللہ ﷻ کی رضامندی کی خوشخبری دی جاتی ہے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث مروی ہے جس میں موت کے وقت اللہ ﷻ کی رضامندی کی بشارت کا ذکر ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح) نیز قبر میں بشارت دیئے جانے کا ذکر بھی ہے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس سے وہ بشارت مراد ہے جس کا اللہ ﷻ نے مومنین سے وعدہ فرمایا ہے کہ انہیں جنّت کا داخلہ نصیب ہو گا اور ان کے اعمال کا بہت اچھا ثواب ملے گا۔ جیسا کہ (سورۃ البقرہ ۲، آیت: ۲۵) میں فرمایا (وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ)۔ بشارتیں اس

دُنیا میں دی گئی ہیں۔ اللہ ﷻ کی باتوں یعنی اللہ ﷻ کے وعدوں میں کوئی تبدیلی نہیں جو وعدے فرمائے ہیں وہ سب پورے ہوں گے جو بشارتیں دی ہیں وہ سچی ہیں ان کے مطابق انعام دیا جائے گا۔

آیت نمبر ۶۵: رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان کو مخالفین اسلام کی بدکلامی سے غمزدہ نہ ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ حقیقی غلبہ، قوت و عزّت۔ اللہ ﷻ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ مخالفین بالآخر مغلوب ہوں گے اور اہل حق کو عزّت اور غلبہ نصیب ہوگا۔

علمی و عملی بات: آنحضرت ﷺ کے مخالفین آپ ﷺ کے منہ پر بھی اور غائبانہ طور پر (معاذاللہ) ایسی باتیں کرتے تھے جو شرافت کی حد سے خارج تھیں کبھی مجنون و مسحور کہتے کبھی جادوگر و کذّاب کہتے، غربت کے طعنے دیتے جس سے طبعاً آپ ﷺ کو تکلیف ہوتی تھی اس تکلیف اور رنج پر اللہ ﷻ نے آپ ﷺ کو تسلّی دیتے ہوئے فرمایا "اور نہ غم میں ڈالے آپ کو ان کی بات" کہ مخالف کا کام ہے مخالفت کرنا آپ ﷺ ان کی باتوں سے غمگین نہ ہوں کیونکہ بے شک عزّت ساری کی ساری اللہ ﷻ کے لئے ہے اور سورۃ المنافقون ۶۳، آیت :۸ میں ہے "اور اللہ ﷻ کے لئے عزّت ہے اور اس کے رسول (ﷺ) کے لئے اور مؤمنوں کے لئے۔" عزّت مند وہ ہے جو اللہ ﷻ کے سامنے معزز ہو، اس میں ہمارے لئے سبق ہے کہ اگر مخالف ہمارے خلاف پروپیگنڈہ کرتا ہے تو یہ اس کا کام ہے ہم اس کی پرواہ نہ کریں اور دعوتِ حق اور صحیح کام کرتے رہیں۔

آیت نمبر ۶۶: آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ ﷻ کی ملکیت میں ہے۔ اللہ ﷻ کے سوا (نعوذ باللہ) دوسرے شرکاء کو پکارنے والے محض گمان کی پیروی کرتے ہیں۔ ان کے پاس شرک کی کوئی دلیل نہیں۔ محض گمان اور اندازے ہیں۔

علمی بات: زمین و آسمان کا منتظم اور مدبّر کون ہے؟ جو اس کو سنبھالے ہوئے ہے اور اس کو چلا رہا ہے۔ یہ سوال ہر زمانہ میں انسان کی تلاش کا مرکزی نکتہ رہا ہے۔ مگر اس سوال کا صحیح جواب پانا اسی وقت ممکن ہے جب کہ آدمی ماورالطبعیات (حیوانات، نباتات، جمادات) یعنی مادی دُنیا سے باہر کی دُنیا تک دیکھ سکے اور ماورا لطبعیات یعنی اس ظاہری مادی دُنیا سے الگ تصوراتی دُنیا تک دیکھنے والی آنکھ کسی کو حاصل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وہ جواب جو وہ خود قائم کرتا ہے وہ محض قیاس و گمان کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ حقیقی علم کی بنیاد پر۔

اس دُنیا میں حقیقی علم کی بنیاد پر بولنے والے صرف وہ لوگ ہیں جن کو پیغمبر کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مخصوص لوگ ہیں جن کا رابطہ عالم بالا سے براہِ راست قائم ہوتا ہے۔ اللہ ﷻ خود انہیں اپنی طرف سے حقیقت کی خبر دیتا ہے۔ اس لئے اس دُنیا میں پیغمبرِ اسلام کا علم ہی واحد علم ہے جو یقینی اور قطعی ہوتا ہے۔

جو لوگ اپنے خیال کے مطابق "شرکاء" کی پیروی کر رہے ہیں۔ وہ کسی حقیقت کی پیروی نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ صرف اپنے قیاس و گمان کی پیروی کر رہے ہیں۔ پیغمبروں کے ذریعہ ظاہر ہونے والی حقیقت کی تصدیق ساری کائنات کر رہی ہے مگر "مشرکین" جس چیز کے مدعی ہیں اس کی تصدیق کرنے والا کوئی نہیں۔

آیت نمبر ۶۷: کائنات کی نشانیاں اللہ ﷻ کے وجود اور قدرت پر دلیل ہیں۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے اپنی قدرت سے اپنی حکمت کے زیر اثر اتنی بڑی بڑی چیزیں پیدا کیں جو انہی لوگوں کے لئے مفید ہیں جو اللہ ﷻ کا کلام اور اس کی وعظ و نصیحت، حق کو قبول کرنے کی نیت سے سنیں اور ان کے تقاضوں کے مطابق چلنے اور حق کو قبول کرنے سے گریز نہ کریں۔

کسی چیز کو ماننے اور تسلیم کرنے کی پہلی منزل سننا ہوتا ہے۔ جو پیغام سنے گا نہیں وہ غور کیا کرے گا اور اسے کیسے سمجھے گا؟ لہٰذا ایسا شخص دوسری منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ تیسری منزل کسی چیز کو یاد کرنا ہوتا ہے اور چوتھی منزل اس پر عمل پیرا ہونا ہے۔ اس کے بعد آخری منزل یہ ہے کہ جو کچھ حاصل ہو اس پر عمل کر کے اسے دوسروں تک بھی پہنچائے یہاں پر "یَسْمَعُوْن" کے لفظ سے پہلی منزل کی طرف اشارہ ہے کیونکہ سارا معاملہ اسی سے آگے چلے گا۔

علمی بات: پیغمبروں کے دعوے کی صداقت کو جانچنے کے لئے اگرچہ ہمارے پاس کوئی براہِ راست ذریعہ نہیں۔ تاہم ایک بالواسطہ ذریعہ یقینی طور پر موجود ہے اور وہ کائنات کی آیات (نشانیاں) ہیں۔ یہ نشانیاں پیغمبروں کے بیان کردہ معنوی حقائق کی عملی تصدیق کر رہی ہیں۔

مثال کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری زمین پر رات کے بعد دن آتا ہے اور دن کے بعد رات آتی ہے۔ یہ گردش ایک انتہائی محکم نظام کی وجہ سے وجود میں آتی ہے جو ریاضیاتی صحت کی حد تک منظم ہے۔ مزید یہ کہ یہ گردش حیرت ناک حد تک ہماری زندگی کے موافق ہے۔ اس کے پیچھے واضح طور پر ایک بامقصد محکم نظام کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ صورتِ حال یقینی طور پر ایک ایسے قادرِ مطلق اور رحمان و رحیم کے وجود کا ثبوت ہے جس کی خبر پیغمبر علیہ السلام دیتے ہیں۔

علمی و عملی بات: دن رات اور اندھیرے اُجالے کا پیدا کرنے والا وہی ایک اللہ تعالیٰ ہے۔ اسی سے خیر و شر اور تمام اضداد یعنی حریف اور مخالف اشیاء کی پیدائش کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس میں "مجوس" (آگ کے پجاری) کے شرک کا رد ہوگیا اور اس بات کی طرف بھی لطیف اشارہ کر دیا کہ جس طرح رات کی تاریکی کے بعد اللہ تعالیٰ روزِ روشن کو لاتا ہے اور دن کے اُجالے میں وہ چیزیں نظر آتی ہیں جو شب کی ظلمت میں دکھائی نہ دیتی تھیں۔ ایسے ہی مشرکین کے ذہنوں میں اور خیالات و اوہام کے اندھیروں کا پردہ چاک کرنے کے لئے اس نے قرآنِ حکیم کا آفتاب چمکایا جو لوگوں کو معرفتِ الٰہی کا ٹھیک راستہ دکھانے والا ہے اور ظُلمت اور اندھیروں سے نکالنے والا ہے۔

آیت نمبر ۶۸: کفارِ عرب کا یہ عقیدہ تھا کہ فرشتے (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ اس کے رو کے لئے دو دلیلیں پیش فرمائی جا رہی ہیں۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ وہ غنی ہے۔ یعنی وہ کسی کا محتاج نہیں اور کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے وجود اپنی نشو و نما اور اپنی بقاء میں اس کا محتاج ہے، اولاد کی ضرورت تو اس لئے ہوتی ہے جو خود کمزور ہو تا کہ وہ اپنی اولاد کی وجہ سے طاقتور ہو جائے اور اپنے دشمنوں کو مغلوب کر سکے یا وہ فقیر و مسکین ہوں کہ اس کی اولاد ہو جو کسبِ رزق میں اس کی معاون ثابت ہو۔ یا مرنے کے بعد اس کے نام کو اور اس کی یاد کو زندہ رکھ سکے اور جو ذات ہر قسم کی احتیاج اور ضرورت سے پاک ہے اس کو اولاد کی خواہش آخر کیوں ہو۔ دوسری دلیل "جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے" اور کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز اس کی پیدا کردہ ہے اور اس کی مملوک ہے تو وہ اس کی اولاد کیسے بن سکتی ہے؟

علمی بات: اس میں عیسائیوں کے شرک کا بھی رد ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہتے تھے۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اگر وہ واقعی طور پر مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا (معاذ اللہ) صُلبی بیٹا سمجھتے ہیں تو اس سے بڑھ کر کیا گستاخی ہوگی۔ خداوند قدوس بیوی بچوں سے پاک ہے۔ وہ تو سب سے بے نیاز ہے اور سب ہر وقت اس کے محتاج ہیں۔ اسے بیٹے کی احتیاج کیسے ہو سکتی ہے؟ سب چیزیں اس کی مملوک و مخلوق ہیں۔ پھر مالک و مملوک اور خالق و مخلوق کے درمیان ان نسبی رشتوں کی کہاں گنجائش ہے۔ یہ بڑی سخت بات ہے کہ خدا کی نسبت محض جہالت سے ایسی جھوٹی اور بے سند باتیں کہی جائیں۔

آیت نمبر ۶۹: فلاح کا معنی ہے مقصود اور مطلوب تک پہنچنا اور ہمیشہ کی دائمی کامیابی سے ہم کنار ہونا جبکہ فلاح نہ پانے کا مطلب ہے کہ وہ شخص اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو بلکہ اگر وقتی طور سے کچھ ہاتھ بھی لگ جائے تو بھی بالآخر دائمی ناکام اور نامراد ہو۔ بعض لوگ گھٹیا مقاصد کے ساتھ فوری نتائج کے طالب ہوتے ہیں تو جب انہیں اپنا مطلوب جلد حاصل ہو جائے تو وہ سمجھتے ہیں کہ وہ کامیاب ہو گئے حالانکہ وہ ظاہری اور سطحی مطلوب ہے جس کے پیچھے خوفناک عذاب کروٹ لے رہا ہے۔ چند روزہ عیش کا خاتمہ یقینی ذلّت اور مصیبت پر ہو تو اسے فلاح نہیں کہہ سکتے۔ حالانکہ اصل کامیاب تو وہ لوگ ہیں جو اُخروی فلاح حاصل کرنے والے ہیں۔

آیت نمبر ۷۰: علمی و عملی بات: اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ یہ خسیس اور حقیر مطلوب دُنیاوی زندگی میں متاعِ قلیل ہے، پھر بہر حال انہوں نے مرنا ہے اور مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے پاس لوٹ کر جانا ہے اور وہاں انہوں نے اپنے کفر اور تکذیب کی وجہ سے دائمی عذاب بھگتنا ہے تو یہ کامیابی نہیں ہے بلکہ واضح ناکامی ہے۔

علمی بات: اس ارشاد سے بھی کئی بنیادی حقائق کو واضح فرما دیا گیا، مثلاً یہ کہ ان لوگوں کے لئے بس دُنیاوی زندگی میں چند روزہ نفع اٹھا لینے کی مہلت ہے اس کے بعد ان کے لئے ہمیشہ کی محرومی اور دائمی عذاب ہے۔ دوسرے یہ کہ ان لوگوں نے آخر کار اللہ تعالیٰ ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے پس جو لوگ اس طرح کہتے ہیں کہ ہم مر مِٹ کر یونہی ختم ہو جائیں گے اور ہم سے کوئی حساب کتاب نہیں لیا جائے گا اور اسی طرح جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے مرنے کے بعد ہمارے سفارشی معبود ہمارا سب کام بنا دیں گے، تو یہ سب کچھ غلط اور ان کی ایسی تمام باتیں بے بنیاد اور بے حقیقت ہیں اور تیسری اہم حقیقت اس ضمن میں یہ بیان فرمائی گئی کہ ہم ان کو ان کے قرآنِ حکیم اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے کے بدلے سخت سزا اور عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

آیت نمبر ۷۱: حضرت نوح علیہ السلام کی چند باتوں کا بیان ہے۔ تبلیغ اور وعظ و نصیحت کی وجہ سے قوم کی ناگواری انہیں اپنے فرضِ منصبی سے نہ ہٹا سکی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے وہ دعوتِ حق کی ذمہ داری ادا کرتے رہے۔

علمی بات: حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ عزم و استقلال کا نمونہ ہے، اُنہوں نے ساڑھے نو سو برس تک پیہم مسلسل قوم میں تبلیغ فرمائی اور دن رات وعظ و نصیحت فرمائی مگر قوم کی اکثریت شرک و کفر پر اڑی رہی اصل تو ہونا یہ چاہیئے تھا کہ یہ لوگ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوتِ ایمان و توحید کو قبول کرتے اپنے دلوں کی اصلاح کرتے بُرائیوں سے نفرت کرتے اور پاکباز و خدا پرست بننے کی سعی کرتے لیکن اُن کے دل بُغض و عناد کی غلاظتوں سے سیاہ اور آلودہ ہو گئے نافرمانی و انکار کی لعنتوں نے

چاروں طرف سے ان کو گھیر لیا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کمال بے خوفی سے اعلان فرمادیا کہ میں صرف اپنے اللہ ﷻ پر بھروسہ رکھتا ہوں، تم مخالفت میں پورا زور صرف کرلو اپنے بغض وحسد کا اعلان کردو اور مجھے جینے اور سنبھلنے کی قطعاً مہلت نہ دو پھر دیکھو میرا اللہ ﷻ میری کس طرح دستگیری فرماتا ہے۔

علمی بات: پہلے رسولوں کی اقوام کے قصص بیان فرمانے میں یہ حکمت ہے، کہ جب رسول اللہ ﷺ اور آپ علیہ السلام کے اصحاب رضی اللہ عنہم یہ سنیں گے، کہ تمام کافر اپنے رسولوں کے ساتھ اسی طرح تکذیب اور مخالفت میں پیش پیش ہیں اور واضح دلائل اور معجزاتِ نبوّت دیکھنے کے باوجود ان کو جھٹلاتے رہے ہیں، تو کفارِ مکّہ کی مخالفت اور ان کی شقاوت کو برداشت کرنا آپ ﷺ سب پر سہل اور آسان ہوجائے گا۔ نیز جب کفار، انبیاء سابقین علیہم السلام کے ان واقعات کو سنیں گے، تو ان کو یہ علم ہوجائے گا کہ انبیاء متقدمین علیہم السلام کو ان کے زمانہ کے کافروں نے ایذاء پہنچانے میں اپنی انتہائی طاقت صرف کردی، لیکن بالآخر وہ ناکام اور نامراد ہوئے۔ اللہ ﷻ نے اپنے رسولوں اور نبیوں کی مدد فرمائی اور کافر ذلیل اور رسوا ہوئے۔ تو ہو سکتا ہے، کہ ان واقعات کو سن کر کفار کے دل خوف زدہ ہوں اور وہ اپنی ایذاء رسانیوں سے باز آجائیں۔

آیت نمبر ۷۲: حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم سے خطاب جاری ہے۔ اپنی جدوجہد کے عوض کسی قسم کا کوئی اُجرت یا بدلہ ان کا مقصود نہ تھا بلکہ وہ صرف اللہ ﷻ کے حکم کے پابند اور اسی کے فرماں بردار تھے۔

علمی بات: حضرت نوح علیہ السلام نے قوم سے فرمایا کہ تمہارے مقابلہ میں جسمانی تکالیف سے گھبراتا ہوں اور نہ مالی نقصان کی کوئی فکر ہے کیونکہ میں نے دعوت و تبلیغ کے کارِ خیر کے عوض تم سے کبھی کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا کہ میری ساری جدوجہد مال کی حرص اور روپیہ کے لالچ سے تھی (معاذاللہ)۔ میں جس کا کام کرکے اس کا حکم بجالا رہا ہوں اسی کے ذمہ میرا اجر ہے جب میں اس کا فرماں بردار ہوں اور یہ خدمت اور فرض بے خوف وخطر انجام دیتا ہوں تو کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے فضل ورحمت کے دروازے مجھ پر نہ کھولے رکھے۔

آیت نمبر ۷۳: تمام تر وعظ ونصیحت کے باوجود قوم کی اکثریت نے دعوتِ توحید کو جھٹلایا۔ عذاب آنے پر اللہ ﷻ نے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھ کشتی میں موجود اہلِ ایمان کو بچالیا اور زمین میں اہلِ ایمان کو جانشین بنادیا۔ یعنی کشتی والوں کو کفار کی ہلاکت کے بعد زمین کا مالک بنایا یا حضرت نوح (علیہ السلام) کو اپنا خلیفہ اور ان کے بعد مومنوں کو ان کا خلیفہ بنایا۔ اس واقعہ کو بیان کرکے رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے والوں کے عبرتناک انجام کی تنبیہ کی گئی ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھ اہلِ ایمان کو عذابِ طوفان سے نجات عطا فرمائی۔ اس طوفانِ عظیم کے آثار وشواہد کے قدیم ماہرین کو آج بھی ارضِ نوح میں مل رہے ہیں۔ مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ طوفان ملک عراق میں دریائے دجلہ اور دریائے فرات کے درمیانی علاقہ میں آیا تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کی غرقابی کے بعد آپ علیہ السلام کے مخلص رفیق پھر اسی علاقہ میں آباد ہوئے اور انہی سے نسل آدم علیہ السلام چلی۔ نوعِ انسانی کی آبادی تاریخ کے اس ابتدائی دور میں صرف اسی سرزمین کے حدود تک محدود تھی۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ کشتی کی لمبائی تین سو ہاتھ اور چوڑائی پچاس ہاتھ اور اونچائی میں تیس ہاتھ تھی۔ اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ عرض میں اس کا دروازہ تھا، علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ کشتی کا طول اَسّی (۸۰) ہاتھ اور عرض پچاس (۵۰) ہاتھ اور بلندی اوپر کو تیس (۳۰) ہاتھ اور ہاتھ سے مراد (پنجہ سے) مونڈھے تک ہے۔

عملی پہلو: اس آیت میں کفار کے لئے ترہیب اور عبرت کا سامان ہے کہ جو لوگ اللہ ﷻ کے رسول کی تکذیب کریں گے ان پر ایسا عذاب آسکتا ہے جیسا حضرت نوح علیہ السلام کو جھٹلانے والوں پر آیا تھا اور اس آیت میں مومنوں کے لئے ایمان پر ثابت قدم رہنے کی ترغیب ہے کہ جس طرح اللہ ﷻ نے حضرت نوح علیہ السلام کے اصحاب کو مخالفین کے شر اور فساد سے نجات عطا کی تھی اسی طرح اللہ ﷻ ان کو بھی مخالفین کے ضرر سے بچائے گا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: "بے شک اللہ عزوجل ظالم کو مہلت دیتا ہے (اس کی باگ ڈھیلی کرتا ہے) پھر جب پکڑتا ہے تو اس کو نہیں چھوڑتا۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

آیت نمبر ۷۴: حضرت نوح علیہ السلام کے بعد آنے والے رسولوں کا بیان ہے۔ رسولوں کے واضح دلائل لانے کے باوجود ان کی قوموں نے انہیں جھٹلایا۔ مجرمین کا اوّلاً انکار کرنے اور اس پر ڈٹے رہنے کا بیان ہے۔ حد سے گزرنے پر ان کے دلوں پر مہر لگادی گئی جس سے وہ ایمان لانے کی سعادت سے محروم ہوگئے۔

علمی بات: حضرت نوح علیہ السلام کے بعد بھی حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی آمد کا سلسلہ جاری رہا انھوں نے اپنی اپنی قوم کو پیغامِ حق سنایا اور اپنے پیغام کی صداقت کو دلائل ومعجزات سے ثابت کیا۔ لیکن ضدی قوم نے ایک مرتبہ جس بات کو ماننے سے انکار کیا پھر اس کو ماننے سے انکاری ہی رہی۔ کوئی مضبوط اور قوی دلیل بھی

انہیں اپنی بُری روش بدلنے پر آمادہ نہ کر سکی۔ ان کی اس پیہم اور مسلسل سرکشی کے باعث حق قبول کرنے کی صلاحیت ضائع ہو گئی اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی۔ یعنی دوسرے لوگوں کی طرح ان میں بھی نورِ حق دیکھنے، کلمہ حق سننے اور دعوتِ حق سمجھنے اور قبول کرنے کی صلاحیتیں تھیں لیکن انہوں نے اپنی بداعمالیوں سے خود ہی انہیں ضائع کر دیا۔

نوٹ: حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ کی مزید تفصیلات مطالعۂ قرآنِ حکیم حصّہ اوّل اور اس کے رہنمائے اساتذہ میں ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

آیت نمبر ۷۵: حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجا گیا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ معجزات کے ذریعے فرعون اور اس کی قوم کو ایک اللہ تعالیٰ کی طرف بُلایا سرکش گناہوں کے عادی آلِ فرعون نے تکبر کا رویہ اختیار کیا اور پیغامِ حق کو جھٹلایا۔

فرعون اور آلِ فرعون کی طرف اللہ تعالیٰ نے ایک جلیل المرتبت رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو مبعوث فرمایا جن کے ذمہ دو اہم کام تھے۔ اپنی قوم بنی اسرائیل کو جو صدیوں سے مصر میں قبطیوں کے ماتحت غلامانہ زندگی بسر کر رہی تھی آزاد کرانا اور فرعون کو اللہ تعالیٰ کی توحید پہنچانا جو اپنے خدا ہونے کا دعوے دار تھا اور اپنی رعایا کو اپنی پرستش کرنے کا حکم دے رکھا تھا یہ دونوں کام جتنے اہم تھے اتنے ہی مشکل اور دشوار بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عظیم معجزات سے نوازا تاکہ وہ اُن کی قوت سے ہر باطل کو سرنگوں کر سکیں اور ان کی روشنی سے شک وشبہ کے سارے اندھیروں کو دور کر سکیں۔ جب آپ علیہ السلام نے وہ معجزات دکھائے تو ان کو جادوگر کہا گیا (معاذاللہ)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دلائل و معجزات کی روشنی سے رب کی وحدانیت تو ان پر واضح کر دی تھی لیکن آلِ فرعون تکبر اور گھمنڈ کی وجہ سے اسے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ وہ عادی مجرم تھے۔ جرم وگناہ میں بہت آگے نکل چکے تھے۔ سچائی اور نیکی کی راہ سے بہت دور نکل گئے اور مقابلہ پر اُتر آئے۔

آیت نمبر ۷۶: آلِ فرعون کا دعوتِ حق تسلیم کرنے سے انکار کا ذکر ہے۔ انکار کے لئے کوئی معقول دلیل نہ ہونے پر انہوں نے معجزات کو جادو قرار دے دیا۔ وہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کے معجزات کو بھی ساحرانہ شعبدہ بازی ہی سمجھتے (معاذاللہ) اور اس فن میں آلِ فرعون کو تو کمال حاصل تھا اس لئے وہ اپنی دانست میں کسی ساحر کی غلامی پر رضامند ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔

آیت نمبر ۷۷: حق کو جادو قرار دیئے جانے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آلِ فرعون کو بھرپور جواب دیا۔ اُنہوں نے فرمایا کہ معجزات کا جادو سے کوئی واسطہ اور تعلق نہیں بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کے مقابلے میں جادوگر اپنے مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں کر سکتے۔

علمی بات: جادوگر کے سامنے کوئی بلند نصب العین نہیں ہوتا اور نہ اس میں ایسی قوت ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے اہم امور میں کامیاب ہو سکے وہ چند لوگوں کو اپنی چالاکیوں سے حیرت میں ڈال سکتا ہے، مگر حق وصداقت کے مقابلہ میں کسی طرح کی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا، کیونکہ کسی چیز کو ثابت کرنا ایک نصب العین ہے مقدس اُسوہ ہے جبکہ جادوگری صرف فریب ودجل ہے، اس لئے قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی تم جادوگر سمجھتے ہو تو واقعات کا انتظار کرو عنقریب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کامیابیاں اور کامرانیاں تم پر آشکارا ہو جائیں گی۔

آیت نمبر ۷۸: دلیل سے عاجز آلِ فرعون نے حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام کی دعوتِ حق کو دو وجوہات کی بنا پر ٹھکرا دیا۔

۱۔ حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام انہیں ان کے بڑوں کے عقیدے اور طور طریقوں سے ہٹانا چاہتے ہیں۔

۲۔ دونوں نبی ملک و قوم کا اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں (معاذاللہ)۔

علمی بات: فرعون اور اس کے درباریوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اور پیغام کو قبول نہ کرنے کے دو سبب بیان کیئے: ایک یہ کہ ہم اس دین کو ترک نہیں کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤاجداد کو عمل کرتے ہوئے پایا، گویا انہوں نے دلائل و معجزات نبوت کے مقابلہ میں اندھی پیروی کو ترجیح دی اور اس پر اصرار کیا اور دوسرا سبب یہ بیان کیا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام ملک مصر میں اپنی بڑائی، اپنا تسلط اور اپنا اقتدار چاہتے ہیں کیونکہ جب مصر کے رہنے والے ان کے معجزات کو دیکھ کر ان پر ایمان لے آئیں گے تو پھر سب ان ہی کے مطیع اور فرماں بردار ہوں گے۔ یوں مصر کی حکومت ان کے ہاتھ سے نکل جائیگی اور اس کے بعد صراحتاً کہہ دیا کہ ہم تمہاری بات ماننے والے نہیں ہیں۔ اس کے بعد فرعون کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کا جادو کے زور سے مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا تاکہ لوگوں پر یہ ظاہر کر دیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو معجزہ پیش کیا تھا وہ دراصل جادو کی قسم سے ہے پھر اس مقصد کے لئے فرعون نے جادوگروں کو جمع کیا۔

آیت نمبر ۷۹: فرعون نے تمام ماہر جادوگروں کو بلانے کا حکم دیا۔
فرعون کا جادوگروں کو بلانے کا مقصد یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیش کردہ معجزوں کو جادو کے ذریعے باطل ثابت کیا جا سکے (معاذ اللہ)۔

علمی بات: آدمی جب کسی حقیقت کو نہ ماننا چاہے تو اس کی یہ خواہش اس کو وہاں تک لے جاتی ہے کہ وہ احمقانہ تدبیروں سے اس حقیقت کا مقابلہ کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ وہ سیلاب کے مقابلہ میں تنکوں کا بند باندھتا ہے حالانکہ وہ خود جان رہا ہوتا ہے کہ سیلاب کے مقابلہ میں تنکوں کی کوئی حقیقت نہیں۔
چنانچہ وہی ہوا جو اللہ ﷻ کے ہاں مقدر تھا۔ جادوگروں نے میدان میں رسیاں اور لکڑیاں پھینکیں جو دیکھنے والوں کو رینگتے ہوئے سانپ کی صورت میں دکھائی دیں۔
اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈالا تو وہ بہت بڑا اژدھا بن کر میدان میں دوڑنے لگا اور آن کی آن سب رسیوں اور لاٹھیوں کو نگل گیا۔

آیت نمبر ۸۰: فرعون کے حکم کی تعمیل میں ماہر جادوگروں کا میدان میں جمع ہونے کا بیان ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے انہیں دعوت دی گئی کہ جو پیش کرنا ہے پیش کرو۔

آیت نمبر ۸۱: جادوگروں کے جادو دکھانے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ان سے خطاب:
۱۔ اللہ ﷻ ان کے جادو کو باطل کر دے گا۔
۲۔ اللہ ﷻ فسادیوں کے کاموں کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچاتا۔
جادوگر فسادی اس طور پر تھے کہ محض دُنیا کے حصول کے لئے انہوں نے جادو کا فن سیکھا جس سے وہ لوگوں کو بیوقوف بناتے تھے۔

آیت نمبر ۸۲: حق سے مراد ہے وہ بات جو دلائل سے ثابت ہو اور اٹل ہو۔ یہاں جادوگروں کی ناکامی کا بیان ہے۔ حق و باطل کے فیصلہ کن معرکہ میں اللہ ﷻ حق کی نصرت و حمایت فرماتا ہے اور باطل کو مٹا دیتا ہے۔

آیت نمبر ۸۳: شروع میں بنی اسرائیل میں محض چند نوجوانوں کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینے کا بیان ہے۔ باقی فرعون اور اس کے سرداروں کے مظالم کے خوف میں مبتلا تھے لہٰذا وہ ایمان نہ لائے۔

علمی بات: اس وقت مصر پر قبطی قوم حکمران تھی، جسے قرآن نے "آلِ فرعون" کہا ہے اور بنی اسرائیل ان کے محکوم تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو آزادی دلوانا چاہتے تھے، لیکن بنی اسرائیل میں سے صرف چند جوانوں نے ہی آپ علیہ السلام کی دعوت پر لبیک کہا تھا۔ دراصل غلام ہونے کی وجہ سے وہ لوگ فرعون اور اس کے سرداروں کے مظالم سے خوف زدہ تھے۔ عام طور پر ہر محکوم قوم کے کچھ شاطر لوگ اپنی قوم سے غداری کر کے حکمرانوں سے مل جاتے ہیں اور حکمران انہیں مراعات اور خطابات سے نواز کر ان کی وفاداریاں خرید لیتے ہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل میں سے بھی کچھ لوگ فرعون کے ایجنٹ بن چکے تھے۔ اس کی سب سے بڑی مثال قارون کی ہے۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے تھا مگر فرعون کا درباری اور اس کا ایجنٹ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف سازشیں کرتا رہتا تھا بہر حال بنی اسرائیل کے عام لوگ ایسے مخبروں کے ڈر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قریب ہونے سے گریز کرتے تھے۔

علمی و عملی بات: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینے والے نوجوانوں کو ایک طرف فرعون کا خطرہ تھا۔ دوسری طرف خود اپنی قوم کے بڑوں کی طرف سے ان کو حوصلہ افزائی نہیں ملی۔ قوم کے بڑے اگرچہ جانتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سچے ہیں۔ مگر اپنی مصلحت اندیشی کی بناء پر وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بیٹے بیٹیاں پُرجوش طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دیں اور اس کے نتیجہ میں وہ فرعون کے ظلم کا شکار بنیں مگر نوجوان طبقہ عام طور پر ان چیزوں سے بے پرواہ ہوتا ہے لہٰذا نوجوان طبقہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت قبول کرنے میں آگے بڑھا۔
مگر اس قسم کی صورت حال کا تقاضا یہ نہیں ہوتا کہ آدمی مخالفین حق کے ڈر سے خاموش ہو کر بیٹھ جائے۔ بلکہ وہ اُن کے مقابلہ میں اللہ ﷻ کی نصرت پر نظر رکھے وہ اللہ ﷻ کے بھروسہ پر اس حق کا ساتھ دینے کے لئے اٹھ کھڑا ہو جس کا ساتھ دینے کے لئے ذاتی طور پر وہ اپنے آپ کو عاجز اور کمزور سمجھ رہا تھا۔

آیت نمبر ۸۴: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کے نوجوانوں کی ہمت افزائی فرمائی اور اللہ ﷻ ہی پر بھروسہ کرنے کی تلقین فرمائی۔ حقیقی ایمان والے اسباب بھی اختیار کرتے ہیں لیکن ان کا بھروسہ صرف اللہ ﷻ پر ہوتا ہے۔

آیت نمبر ۸۵: اللہ ﷻ پر توکل کرنے کے ساتھ نوجوانوں کا اللہ ﷻ کی بارگاہ میں دُعا مانگنے کا بیان ہے۔ انہوں نے دُعا کی کہ ظالموں کے لئے انہیں ذریعہ آزمائش نہ بنایا جائے۔

آیت نمبر ۸۶: اس آیت میں ان کی دُعا کا مزید بیان ہے کہ انہیں قوم کے ظالموں کے شر سے محفوظ رکھا جائے۔

علمی و عملی بات: اس آیت میں اپنے نبی علیہ السلام کے ذریعے اللہ ﷻ ان مسلمانوں سے فرمارہا ہے کہ اگر تم واقعی اللہ ﷻ پر ایمان رکھتے ہو تو صرف اللہ ﷻ پر توکل کرو کیونکہ اسلام کا معنی ہے اللہ ﷻ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اور اس کے احکام کی اطاعت کرنا اور ایمان کا معنی یہ ہے کہ بندہ یہ مان لے کہ اللہ ﷻ واحد ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ اس کی مخلوق ہے اور سب کچھ اس کے زیر تصرف اور اس کے زیر تدبیر ہے اور جب بندہ میں یہ دونوں کیفیتیں پیدا ہوجائیں گی تو وہ اپنے تمام معاملات کو اللہ ﷻ کے سپرد کر دے گا اور اس کے دل میں اللہ ﷻ پر توکل کا نور پیدا ہو جائے گا اور توکل کا معنی یہ ہے کہ بندہ اپنے تمام معاملات کو اللہ ﷻ کے سپرد کر دے اور تمام احوال میں صرف اللہ ﷻ پر اعتماد کرے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: "میری اُمت میں ستر ہزار آدمی ایسے ہیں جو بغیر حساب اور عذاب کے جنّت میں جائیں گے، یہ وہ لوگ ہیں جو نہ جھاڑ پھونک کرتے ہیں اور نہ جھاڑ پھونک کرواتے ہیں اور نہ بد شگونی پکڑتے ہیں اور صرف اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔" (صحیح مسلم)

علمی بات: یہ دو دُعائیں ظالم حاکم کے ظلم سے بچنے کے لئے اکسیر ہیں۔ پہلی دُعا یہ کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ظالم لوگوں کے لئے فتنہ نہ بنا۔ اس کے دو معنی ہوسکتے ہیں پہلا یہ کہ یا اللہ! تو ہمیں ان ظالموں کے فتنے میں ڈالنے کا سبب نہ بنا کہ اگر یہ ہم پر برابر مسلّط رہے تو یہ اپنے سچے اور حق پر ہونے کے فتنے میں پڑ جائیں گے اور کفر میں مزید پختہ ہو جائیں گے اور سمجھیں گے کہ اگر مسلمان سچے اور حق پر ہوتے تو ان کا رب ضرور ان کی مدد کرتا۔

دوسری صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ہمیں ان ظالموں کے سبب (مفتون) فتنے میں پڑ جانے والے نہ بنا کہ ان کے ظلم و تشدد کی وجہ سے ہمارا کوئی شخص فتنۂ ارتداد میں پڑ کر ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

علمی و عملی بات: ان لوگوں نے یہ دُعا بھی کی کہ اے پروردگار! تو ہمیں صرف ان کے لئے فتنے کا باعث بننے ہی سے نہ بچا، بلکہ اپنی رحمت کے ساتھ ان کافروں سے ہمیں نجات اور آزادی بھی عطا فرما۔ اس دُعا سے معلوم ہوا کہ اللہ ﷻ کے بندوں کو ایمان اور آخرت کی کتنی فکر تھی کہ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ کسی شخص کے کفر میں مبتلا رہنے کا باعث بنیں اور نہ یہ چاہتے تھے کہ کسی کے ظلم کی وجہ سے خود فتنے میں پڑ کر اپنا ایمان ضائع کر بیٹھیں۔

آیت نمبر ۸۷: فی الحال اپنے گھروں میں رہنے کی اور گھروں کو قبلہ رخ بنا کر مساجد کا درجہ دیئے جانے کی ہدایت دی گئی ہے۔ قبلہ سے مراد خانہ کعبہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کو نماز کے ذریعے مدد حاصل کرنے کی تلقین کی گئی تا کہ اللہ ﷻ فرعون کے ظلم و ستم کے مقابلہ میں انہیں ثابت قدم اور صحیح رکھے۔ ایسا کرنے والوں کے لئے اللہ ﷻ کی طرف سے بہترین انجام کی بشارت دی گئی۔

علمی بات: اُس وقت خانہ کعبہ ہی قبلہ تھا۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے مراد کعبہ ہے اور کعبہ ہی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے اصحاب کا قبلہ تھا۔ (قرطبی و روح المعانی) بلکہ بعض علماء کرام نے فرمایا کہ تمام انبیاء علیہم السلام سابقین کا قبلہ اصل میں کعبہ ہی تھا۔

بیت المقدس تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں قبلہ بنا اور حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کے دور میں پیدا ہوئے۔ جیسا کہ سورۃ البقرہ ۲، آیت: ۱۴۳ میں ہے کہ: اور (اے مسلمانو!) اسی طرح ہم نے تمہیں (اعتدال والی) بہتر اُمّت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور (ہمارا یہ برگزیدہ) رسول (ﷺ) تم پر گواہ ہو اور آپ (علیہ السلام) پہلے جس قبلہ (بیت المقدس) پر تھے ہم نے صرف اس لئے مقرر کیا تھا کہ ہم (پرکھ کر) ظاہر کر دیں کہ کون (ہمارے) رسول (ﷺ) کی پیروی کرتا ہے (اور) کون اپنے الٹے پاؤں پھر جاتا ہے (یعنی پیروی سے روگردانی کرتا ہے)

علمی و عملی بات: یہاں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے ذریعہ دو احکام بنی اسرائیل کو دیئے گئے۔ ۱۔ کہ فی الحال مصر سے ہجرت نہ کریں بلکہ اپنے گھروں میں سکونت پذیر رہیں۔ ۲۔ اپنے گھروں کو نماز کی جگہ بنالیں اور فی الحال عبادت گاہوں میں جا کر نماز پڑھنے کا حکم معطل ہے۔ قبلہ کے معنی عربی زبان میں مرجع یا مرکز توجہ کے ہیں۔ یہاں گھروں کو قبلہ بنانے سے مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی بستیوں میں کچھ گھروں یا گھروں کے بعض مناسب حصّوں کو اس مقصد کے لئے مخصوص کر دیا جائے کہ وہاں نماز کی ادائیگی کی جائے اور بظاہر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دینی جدوجہد کے لئے بطور مرکز استعمال ہوں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توحید و آخرت کی باتیں مصر کے بادشاہ فرعون کو سخت ناگوار تھیں۔ اس نے ان کے اوپر نہایت سخت قسم کی پابندیاں عائد کر دیں۔ یہاں تک کہ کھلے طور پر دینی سرگرمیاں جاری رکھنا ان کے لئے سخت دشوار ہو گیا۔ اس وقت حکم ہوا کہ عبادت خانوں میں جانے اور فرعون سے ٹکرانے کے بجائے یہ کرو کہ اپنے گھروں میں نماز ادا کرو اور اپنے کام کو قریبی دائرہ میں سمیٹ لو۔

غور طلب بات یہ ہے کہ ان حالات میں بھی ان کو جو دوسرا حکم دیا گیا وہ نماز کی اقامت کا تھا۔ نماز دراصل اللہ تعالیٰ سے نہایت قریب ہو کر اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے کا ذریعہ ہے۔ نماز میں مشغول ہو کر بندہ اپنے آپ کو عجز اور تواضع کے مقام پر لاتا ہے اور یہ ہی وہ مقام ہے جہاں بندے اور اللہ تعالیٰ کی ملاقات ہوتی ہے۔ بندے کے لئے اپنے رب سے ملنے کا اس سے بہتر کوئی مقام نہیں۔

دی گئی ہدایات کو پورا کرنے میں ان کے لئے فلاح اور نجات کا راز چھپا ہوا تھا۔ یہ حکم گویا اس بات کی خوش خبری تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس حالت سے نکالنے والا ہے جس میں ان کے دشمنوں نے ان کو مبتلا کر دیا ہے۔

علمی بات: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارک بھی یہی تھی کہ جب کوئی گھبراہٹ کا معاملہ پیش آتا تو فوراً نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے۔

آیت نمبر ۸۸: آلِ فرعون کی مخالفت کرنے کا بیان ہے فرعون اور آلِ فرعون کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے عذاب کی بد دُعا کا ذکر ہے اور دعوتِ حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ فرعون اور اس کے سرداروں کی مال و دولت کی فراوانی تھی۔ اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے مال و اسباب کی تباہی اور عذاب آنے تک ایمان نصیب نہ ہونے کی بد دُعا کی۔

عملی پہلو: جو لوگ آخرت کی فکر کرتے ہیں وہ عام طور پر دُنیوی ساز و سامان جمع کرنے میں ان لوگوں سے پیچھے رہ جاتے ہیں جو آخرت سے بے فکر ہو کر دُنیا حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہوں۔ ایسی دُنیوی اسباب کی کمی آخرت کی طرف دھیان لگانے کی قیمت ہے اور سراسر دُنیوی اسباب کی زیادتی آخرت سے غافل ہونے کی قیمت ہے۔

مزید یہ کہ جس کے پاس دُنیا کے اسباب و سامان زیادہ جمع ہو جائیں وہ بڑائی کے احساس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگ اپنے اندر یہ صلاحیت کھو دیتے ہیں کہ کسی دوسرے کی زبان سے جاری ہونے والے حق کو پہچانیں اور اسے تسلیم کر لیں۔ اپنے وسائل کو اگر وہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ سمجھتے تو اس کو حق کی تائید میں استعمال کرتے، مگر وہ اس کو اپنا ذاتی کمال سمجھتے ہیں اس لئے وہ اس کو صرف اس مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں کہ حق کو دبائیں اور اس ماحول کے اندر اپنی برتری اور فوقیت کو قائم رکھیں۔

علمی بات: "تا کہ وہ تیری راہ سے بھٹکائیں" کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال و اسباب کو اس لئے استعمال کیا کہ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ سے دور کریں، انہوں نے اس کو حق کی خدمت میں لگانے کے بجائے باطل کی خدمت میں لگایا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کے سامنے سچے دین کی دعوت پیش کی اور اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور اللہ تعالیٰ کی نصرتوں کے ذریعہ اس کو اتمام حجت کی حد تک واضح کر دیا اس کے باوجود فرعون اور اس کے ساتھیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیغام کو نہیں مانا۔ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بد دُعا کی کہ اللہ تعالیٰ ان کے اوپر وہ سزا نازل فرما جو تیرے قانون کے تحت ایسے سرکشوں کے لئے مقدر ہے۔ یہ بد دُعا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قیامِ مصر کے بالکل آخری زمانے میں کی تھی۔ ایسے موقع پر پیغمبر کی بد دُعا خود اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کا اعلان ہوتا ہے جو اس کے نمائندہ کی زبان سے جاری کیا جاتا ہے۔

علمی بات: یہ بد دُعا صرف دینی حمیت اور دینی دل سوزی کی وجہ سے تھی یہ غصہ اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کی خاطر تھا۔ جب اُن کے ایمان لانے سے مایوس ہو گئے جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بد دُعا ہے کہ الٰہی زمین پر کسی کافر کو زندہ نہ چھوڑ ورنہ وہ اوروں کو بھی بہکائیں گے اور جو نسل ان کی ہو گی وہ بھی انہیں جیسی بے ایمان و فاجر ہو گی۔

آیت نمبر ۸۹: اللہ تعالیٰ کی طرف سے دُعا کی قبولیت کی بشارت اور چند ہدایات حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئیں۔ یعنی دعوت و تبلیغ جاری رکھنے اور ثابت قدم رہنے کی تلقین فرمائی گئی۔ نافرمانوں کی بات ماننے سے بچنے کی تلقین فرمائی گئی۔

آیت نمبر ۹۰: اس آیت میں فرعون اور اس کے لشکر کا بنی اسرائیل کا تعاقب کرنے کا ذکر ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل کو دریا پار کرائے جانے کا بیان ہے۔ یہ بتایا گیا کہ فرعون اور اس کے لشکر کو دریا کی موجوں نے گھیر لیا۔ ڈوبتے وقت فرعون نے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا اعلان کیا۔ مگر عین موت کے وقت ایمان لانا معتبر نہیں ہوتا۔

علمی و عملی بات: مصر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مشن دو طرفہ تھا۔ ایک تو فرعون کو توحید اور آخرت کی طرف بلانا۔ دوسرے، بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلا کر مصر سے باہر لے جانا اور وہاں ان کی تربیت کرنا۔ جب فرعون پر دعوتِ حق کی تکمیل ہو چکی تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے روانہ ہوئے۔ صحرائے سینا پہنچنے کے لئے انہیں دریا کو پار کرنا تھا۔ جب بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رہنمائی میں دریا کے کنارے پہنچے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی پر اپنا عصا مارا۔ پانی بیچ سے پھٹ کر دائیں بائیں کھڑا ہو گیا اور درمیان میں خشک راستہ نکل آیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل اس راستہ سے بآسانی پار ہو گئے۔ فرعون اپنے لشکر کے ساتھ بنی اسرائیل کا پیچھا کرتے ہوئے آگے بڑھا۔ وہ دریا کے کنارے پہنچا تو دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل پانی کے درمیان ایک خشک راستہ سے گذر رہے ہیں۔ دریا کے وسیع پاٹ نے پھٹ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو راستہ دے دیا تھا۔ یہ واقعہ دراصل اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی تھا۔ فرعون کو اس سے یہ سبق لینا چاہئے تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حق پر ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے۔ مگر اس نے دریا کے پھٹنے کو اللہ تعالیٰ کی نشانی سمجھنے کے بجائے عام واقعہ سمجھا۔ اپنے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان فرعون کو صرف دریا نظر آیا، حالانکہ وہاں اللہ تعالیٰ کی قدرت کارفرما تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس واقعہ میں فرعون کے لئے اطاعت اور انابت کا پیغام تھا وہ اس کی سرکشی میں اضافہ کا سبب بن گیا۔ اس نے "دریا" کو دیکھا مگر "قدرتِ الٰہی" کو نہیں دیکھا۔ اس نے سمجھا کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں نے دریا کو پار کیا ہے اسی طرح وہ بھی دریا پار کر سکتا ہے۔

یہی سوچ لئے فرعون اور اس کا لشکر دریا میں داخل ہو گئے۔ دریا کا پانی جو دو حصّوں پر مشتمل ہو گیا تھا، وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان ساتھیوں کے لئے ہوا تھا وہ فرعون اور اس کے ساتھیوں کے لئے نہیں۔ چنانچہ فرعون اور اس کا لشکر جب بیچ دریا میں پہنچے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے دونوں طرف کا پانی مل گیا اور فرعون اپنے لشکر سمیت اس میں غرق ہو گیا۔ غرق ہوتے ہوئے فرعون نے ایمان کا اقرار کیا مگر وہ بے سود تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اختیاری ایمان معتبر ہے نہ کہ وہ ایمان جب کہ آدمی کا ایمان غرغرہ موت کی حالت میں ہو۔

آیت نمبر ۹۱: موت کے وقت فرعون کا ایمان لانا اسے کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا۔ جب ایمان لانے کی مہلت تھی تو وہ کفر اور معصیت پر ڈٹا رہا۔

علمی و عملی بات: ایمان اس وقت تک قبول ہے جب تک جسم میں جان ہو اور موت کی یقینی علامات کا ظہور نہ ہوا ہو کیونکہ مقصد اپنے اختیار سے ایمان بالغیب لانا ہے اور جب عذاب سامنے آ کر سب کچھ واضح ہو جائے تو پھر ایمان بالغیب باقی نہیں رہتا۔ جب عمل کی تمام امیدیں ہی منقطع ہو جائیں، تو پھر اسے ایمان کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ فرعون عمر بھر تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مشغول رہا اور جب بحرِ قلزم میں غرق ہونے لگا موت سامنے دکھائی دینے لگی، اس وقت تضرع گریہ وزاری کرنے لگا اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس وقت ایمان و توبہ مقبول نہیں۔

آیت نمبر ۹۲: اللہ تعالیٰ نے فرعون کی لاش کو محفوظ فرما کر نشانِ عبرت بنا دیا۔ آج بھی اس کی لاش محفوظ ہے۔ قرآنِ حکیم کی حقانیت کا بیان ہے۔ نشانیوں کو دیکھنے اور ان کا اعتراف کرنے کے باوجود اکثریت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرتی۔

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور سرکشی کا انجام ہلاکت ہے، ایسے واقعات پیغمبروں کے دور میں بار بار انسان کے سامنے آتے رہے۔ تاہم اس قسم کے کچھ نمونے اللہ تعالیٰ نے مستقل طور پر محفوظ کر دیئے ہیں تاکہ وہ بعد کے زمانہ میں بھی انسان کو سبق دیتے رہیں جبکہ نبیوں کی آمد کا سلسلہ ختم ہو گیا ہو۔

علمی و عملی بات: دورِ حاضر کے محققین کے مطابق آج تک وہ مقام جزیرۂ نمائے سینا کے مغربی ساحل پر موجود ہے جہاں فرعون کی لاش سمندر میں تیرتی ہوئی پائی گئی تھی۔ یہ جگہ آج بھی جبلِ فرعون کے نام سے مشہور ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں فرعون کی لاش کو سمندر نے پھینکا تھا اس کی لاش کو دیکھ کر بنی اسرائیل کو بھی اس کے ڈوب جانے کا یقین ہو گیا۔ نیز باقی لوگوں کے لئے بھی اس میں درسِ عبرت ہے۔ مصر میں ایسے مصالحے ایجاد ہو چکے تھے جن کے استعمال سے لاش کو گلنے سڑنے سے بچایا جا سکتا تھا اور اس زمانہ میں بادشاہوں اور اُمراء کی ممیوں کو حنوط (مصالحہ لگا کر محفوظ کی ہوئی (نعش وغیرہ) دیا جاتا تھا۔ چنانچہ ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے مصر کے شاہی قبرستان سے متعدد حنوط شدہ ممیاں نکالی ہیں جو محفوظ ہیں۔ مصر کے عجائب گھر (دار الآثار) میں ایک لاش موجود ہے جس کے متعلق ماہرین

اثریات (Archaeologists) کا خیال ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے فرعون یعنی رَعمسیس ثانی کی لاش ہے۔ ۱۹۰۷ء میں سر گرافٹن الیٹ سمتھ نے اس کی ممی پر سے جب پٹیاں کھولی تھیں تو اس کی لاش پر نمک کی ایک تہ جمی ہوئی پائی گئی تھی جو کھارے پانی میں اس کی غرقابی کی ایک کھلی علامت تھی۔ واللہ اعلم۔ تاہم الفاظ قرآنی کی صحت اس کے ثبوت پر موقوف نہیں کہ اس کی لاش تا قیامت لوگوں کی نگاہوں کے سامنے محفوظ رہے۔

آیت نمبر ۹۳: بنی اسرائیل پر کئے گئے احسانات میں سے چند ایک کا بیان ہے۔ یعنی انہیں شام و فلسطین پر غلبہ اور بہترین رزق مہیا کیا گیا۔ مادی نعمتوں کے علاوہ روحانی نعمت کے طور پر انہیں تورات عطا کی گئی جس میں زندگی کے لئے مکمل ہدایات موجود تھی۔ مگر انہوں نے اس کے واضح احکام میں آپس میں اختلاف کیا اور اللہ تعالیٰ کے احسان فراموشی کی روش اختیار کی روزِ قیامت ان کا حتمی فیصلہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہو جائے گا۔

علمی بات: بنی اسرائیل قدیم زمانہ میں اللہ تعالیٰ کے دین کے حامل تھے۔ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ احسان کیا کہ ان کے دشمن (فرعون) سے ان کو نجات دی۔ اس کے بعد وہ ان کو سینا کی کھلی فضا میں لے گیا۔ وہاں ان کے لئے خصوصی انتظام کے تحت پانی اور رزق مہیا کیا۔ صحرائی تربیت کے ذریعہ ان کے اندر ایک نئی طاقتور نسل تیار کی۔ اس نسل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ایک عظیم ملک فتح کیا اور شام اور اُردن اور فلسطین جیسے سرسبز علاقہ میں بنی اسرائیل کی سلطنت قائم کی جو کئی سو سال تک باقی رہی۔

اس احسان کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار اور شکر گزار رہتے اور اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بناتے۔ مگر واضح رہنمائی کے ہوتے ہوئے انہوں نے بے راہ روی اختیار کی۔

یہ اُن کے آپس کا اختلاف تھا۔ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا اتارا ہوا علم موجود تھا جو واحد سچائی تھا۔ مگر انہوں نے اس علم کی تفسیر و تاویل کے ایسے دروازے کھولے اور باہم اختلاف اتنا شدت اختیار کر گیا کہ وہ مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ (تفسیر النسفی) کوئی اُمّت جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ دینی تعلیمات پر کاربند رہتی ہے، اس میں اتفاق و اتحاد رہتا ہے۔ مگر بعد میں ان کے درمیان اس تعبیر و تشریح میں اختلافات شروع ہوتے ہیں تو ان کی ہوا اکھڑ جاتی ہیں اور وہ ٹکڑوں میں بٹ جاتے ہیں۔

علمی بات: بنی اسرائیل کئی فرقوں میں بٹ گئے اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ تورات ان کی صحیح رہنمائی کرنے کے لئے ناکافی تھی بلکہ اس کی وجہ نئے نئے فلسفیانہ مباحث پیدا کرنا، پھر آپس میں اختلاف کرنا، پھر فرقے بنانا اور اپنی اپنی چودھراہٹ کی خاطر ان کی آبیاری کرنا تھی۔ ان کے علماء و مشائخ کے حب جاہ نے ان فرقوں میں اتنا تعصّب پیدا کر دیا تھا کہ ان میں اتحاد کی صورت باقی نہ رہی تھی حالانکہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی طرف رجوع کرتے تو وہ پھر سے متحد ہو سکتے تھے۔

عملی پہلو: آج مسلمان بھی اسی گروہ بندی و مختلف تعصّبات کا شکار ہیں جس کا یہود اور نصاریٰ شکار ہو چکے تھے اور آج تک شکار ہیں۔ مختلف گروہ بھی اسی ہٹ دھرمی اور ضد کا شکار ہیں اور ہر گروہ اپنے حال میں مست اور مگن ہے۔ حبِ مال اور جاہ یعنی اپنی بڑائی کی خواہش اور ان مناصب سے دستبرداری مسلمانوں کے متحد ہونے میں آج بھی رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ حالانکہ آج بھی اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنّت موجود ہے۔ اگر گروہ بندیوں سے بالاتر ہو کر اس کے واضح احکام کی طرف رجوع کریں تو بنیادی مسائل میں اتحاد کی صورت آج بھی ممکن ہے بلکہ اتحاد کی ممکنہ صورت یہی ہے کہ کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کیا جائے۔

نوٹ: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی مزید تفصیلات مطالعۂ قرآنِ حکیم حصہ دوم اور اس کے رہنمائے اساتذہ میں ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں۔

آیت نمبر ۹۴: اس آیت میں خطاب ان لوگوں سے ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور قرآنِ حکیم کے برحق ہونے میں شک کرتے تھے۔ سابقہ آسمانی کتابوں کی پیش گوئیاں قرآنِ حکیم کے برحق ہونے پر شاہد ہیں۔ قرآنِ حکیم کے برحق ہونے پر شک نہ کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

علمی و عملی بات: یہ خطاب یا تو تمام انسانوں کو ہے یا پھر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطے سے اُمّت کو تعلیم دی جا رہی ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وحی کے بارے میں کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا تھا: اس آیت کا مطلب ہے کہ قرآنِ حکیم سے پہلے کی آسمانی کتابیں (تورات و انجیل اور زبور) جن کے پاس یہ کتابیں موجود ہیں ان سے اس قرآنِ حکیم کی بابت معلوم کریں، کیونکہ ان میں اس کی نشانیاں اور آخری پیغمبر (علیہ السلام) کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے خود گواہی دی ہے کہ یہ

قرآنِ حکیم برحق کتاب ہے، جسے اللہ ﷻ نے نازل کیا ہے، اس لئے کسی کو اس کی حقانیت میں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں ہونا چاہیئے اور نہ ان لوگوں کے بارے میں ہونا چاہیئے جو اللہ ﷻ کی آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں اس لئے کہ ان کا انجام دُنیا اور آخرت میں خسارہ کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔

آیت نمبر ۹۵: اللہ ﷻ کی آیات کی تکذیب کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ تکذیب کا راستہ خسارہ اور تباہی کی طرف لے جانے والا ہے۔

عملی پہلو: اس آیت میں ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جن کا شعار ہی انکار ہے کہ زندگی کی فرصت کو غنیمت جانو اور انکار و سرکشی سے اب بھی باز آجاؤ ورنہ ایک ایسا وقت آنے والا ہے جب توبہ کرو گے تو توبہ قبول نہیں ہو گی جیسا کہ بُرا وقت فرعون پر آیا اور اس نے ڈوبتے وقت توبہ کی اور ایمان کا اقرار کیا لیکن اس کو کچھ بھی حاصل نہ ہوا بلکہ اس کا نتیجہ یہ ٹھہرا کہ وہ نامراد اور نیست و نابود ہو گیا اور اللہ ﷻ کی نشانیوں سے انکار کا یہی انجام ہوتا ہے۔

آیت نمبر ۹۶: اس آیت میں منکرین کے ایمان نہ لانے پر غم نہ کرنے کی تلقین ہے۔ اللہ ﷻ نے ان سے ان کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے قبولِ حق کی صلاحیت واپس لے لی ہے لہٰذا وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

علمی عملی بات: یعنی وہ کفر پر مرینگے اور اپنی ضد، تعصّب اور ہٹ دھرمی کی بدولت انہیں ایمان لانے کی توفیق نصیب نہ ہو گی۔ (کذا فی شوکانی)۔

اللہ ﷻ نے انسان کو ایک حد تک ارادہ و اختیار دیا ہے، جس کے مطابق وہ نیکی یا بدی میں سے جس پر چاہے عمل کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اللہ ﷻ کو وہ سب کچھ معلوم ہے جو شروع سے اب تک واقع ہوا، اسی طرح وہ آئندہ ہونے والی ہر بات کا بھی پورا علم رکھتا ہے اور اس کی رو سے اسے پہلے ہی معلوم ہے کہ اپنے ارادہ و اختیار کو استعمال کرتے ہوئے کون حق کو قبول کرے گا اور کون کفر کی راہ اختیار کرے گا۔ اس آیت میں اللہ ﷻ کے اس ازلی علم کو "کَلِمَتُ رَبِّکَ" کہا گیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کفر میں اور اللہ ﷻ کی نافرمانی میں اس قدر غرق ہو جاتے ہیں کہ ان کی حق قبول کرنے کی استعداد ہی ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ کسی صورت ایمان نہیں لاتے بلکہ وہ کفر ہی پر مریں گے اور ضد، تعصّب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے انہیں ایمان لانے کی توفیق نہیں ہو گی۔

آیت نمبر ۹۷: منکرین ہر قسم کی نشانیاں دیکھنے کے باوجود بھی حق قبول نہیں کرتے۔ وہ دردناک عذاب دیکھے بغیر ایمان کا اقرار نہیں کریں گے۔ عذاب دیکھ کر ایمان لانا فائدہ مند نہیں ہو گا۔

علمی و عملی بات: نہ ماننے والوں کے پاس کتنی ہی نشانیاں آجائیں وہ ایمان لانے والے نہیں۔ کتنے ہی لوگ ہیں جو اللہ ﷻ کی آیتوں اور نشانیوں میں غور و فکر نہیں کرتے اور نہ ہی عبرت حاصل کرتے ہیں ورنہ اگر کوئی نصیحت حاصل کرنا چاہے تو عالم کے ایک ایک ذرہ میں ایسی نشانیاں موجود ہیں جن کو دیکھ کر اللہ ﷻ اور اس کی قدرتِ کاملہ کو پہچانا جا سکتا ہے لیکن جو لوگ جان بوجھ کر اندھے اور بہرے بنے رہیں اور دیکھنے اور سننے کی کوشش ہی نہ کریں وہ ان سے کیونکر فائدہ حاصل کر سکتے ہیں یہ لوگ ایسے مدہوش ہیں کہ اگر آنکھوں سے بھی اس عذاب کو دیکھ لیں تو بھی ماننے والے نہیں اگرچہ عذاب دیکھ کر ماننا بذاتِ خود بھی فائدہ مند نہیں ہو سکتا۔

آیت نمبر ۹۸: قومِ یونس علیہ السلام کا بیان ہے کہ اس قوم کی توبہ عذاب کی نشانیاں ظاہر ہونے کے بعد قبول کر لی گئی۔ کئی قوموں نے اللہ ﷻ کی نافرمانیاں کیں لیکن یہ واحد قوم تھی جس نے عذاب کے آثار دیکھ کر توبہ کی۔ ان کو معاف کر دیا گیا اور پھر ایک مدّت تک نعمتوں سے نوازا گیا۔ ہمارے لئے یہ واقعہ سبق آموز ہے۔

علمی بات: عذاب کی دھمکی آچکی ہو لیکن وقت معین نہ کیا جا چکا ہو کہ کوئی قوم یا فرد ایمان لے آئے تو یقیناً اس کے لئے ایمان مفید ہو گا اس لئے کہ عذاب کی دھمکی تو ان کو ہر وقت سنائی جاتی رہی ہے لیکن ایسا بہت ہی کم ہوا کہ کسی قوم کو دھمکی سنائی گئی ہو اور وہ اس دھمکی کو سننے کے بعد اس کے آثار و علامات دیکھتے ہی فوراً ایمان لے آئی ہو۔ ہاں! ایک قومِ یونس علیہ السلام تھی جس نے توبہ کی اور اللہ ﷻ نے فوراً اس کے بچائے جانے کا حکم صادر فرما دیا۔

علمی بات: پچھلی آیتوں میں یہ حقیقت بیان فرمائی گئی تھی کہ کسی انسان کے لئے ایمان لانا اسی وقت کار آمد ہوتا ہے جب وہ موت سے پہلے اور عذابِ الٰہی کا مشاہدہ کرنے سے پہلے ایمان لائے۔ جب عذاب آجاتا ہے تو اس وقت ایمان لانا کار آمد نہیں ہوتا۔ اس اصول کے پیشِ نظر اللہ ﷻ فرما رہے ہیں کہ پچھلی جتنی قوموں پر عذاب آیا ان سب کا حال یہ تھا کہ وہ عذاب کو دیکھنے سے پہلے ایمان نہیں لائے، اس لئے عذاب کا شکار ہوئے۔ البتہ ایک حضرت یونس علیہ السلام کی قوم ایسی تھی کہ وہ عذاب کے نازل ہونے سے ذرا پہلے یعنی عذاب کی علامات کو دیکھ کر ایمان لے آئی تھی۔ اس لئے اس کا ایمان منظور کر لیا گیا اور اس کی وجہ سے اس پر آنے والا عذاب ہٹا لیا گیا۔ حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ یہ تھا کہ جب وہ اپنی قوم کو عذاب کی پیشن گوئی کر کے بستی سے چلے گئے تو ان کی قوم کو ایسی علامتیں نظر آئیں جن سے انہیں حضرت یونس علیہ السلام کے انتباہ کے سچے ہونے کا یقین ہو گیا، چنانچہ وہ عذاب کے آنے سے پہلے ہی ایمان لے آئے۔

عملی پہلو: آج اُمّت مسلمہ پر مصائب وآلام کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں اور مسلمان کی حالتِ زار انتہائی ناگفتہ بہ ہے، اس کی واحد وجہ اللہ ﷻ کی نافرمانی ہے۔ ایسے میں پوری اُمّت کو اللہ ﷻ کے حضور اجتماعی توبہ کرنی چاہیئے اور تمام معاملات میں اللہ ﷻ کی فرمان برداری کی طرف آنا چاہیئے۔ امید ہے کہ اللہ ﷻ مسلمانوں کو پھر سے وہ عروج عطا فرمائے گا جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو عطا فرمایا تھا۔ حضرت یونس علیہ السلام کے اس واقعہ میں ہمارے لئے بہت بڑا سبق ہے کہ وہ کس طرح اپنے بال بچوں بلکہ حیوانوں سمیت ایک وسیع میدان میں اکٹھے ہوگئے اور اللہ ﷻ کے حضور اپنے گناہوں کا اعتراف اور آہ وزاری کرنے لگے اور یہ آہ وزاری اتنی کثرت واخلاص سے کی کہ اللہ ﷻ نے ان کی توبہ قبول فرمالی اور ان پر واقع ہونے والے عذاب سے انہیں نجات دے دی۔ جس انداز سے ان لوگوں نے اللہ ﷻ کے حضور آہ وزاری کی اور اپنے گناہوں سے توبہ کی اس طرح پہلے کسی قوم نے نہ کی تھی اور چونکہ توبہ اخلاص پر مبنی تھی اللہ ﷻ کے ہاں سے قبولیت کی مہر لگادی گئی اور عذاب سے نجات مل گئی۔

نوٹ: حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کی مزید تفصیلات مطالعۂ قرآنِ حکیم حصّہ اوّل اور اس کے رہنمائے اساتذہ میں ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

آیت نمبر ۹۹: کفار کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو رنج نہ کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ اگر اللہ ﷻ چاہتا تو روئے زمین پر سب ایمان لے آتے۔ اللہ ﷻ کی حکمت کا تقاضا ہے کہ لوگوں کے سامنے ہر طرح کی راہ کھول دی جائے۔ پیغمبر علیہ السلام پر لوگوں سے ایمان قبول کرانے کی ذمہ داری نہیں ہوتی۔

علمی بات: اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایمان کوئی ایسی چیز نہیں کہ زور زبردستی سے کسی کے اندر ٹھونس دی جائے۔ یہ تو اسی کے اندر پیدا ہوگا جس میں فہم وقبول کی استعداد وصلاحیت اور طلب موجود ہوں۔ جو اس کا شوق رکھتا ہے اللہ ﷻ ایسے شخص کے لئے ایمان اور ہدایت کے راستے کھول دیتا ہے۔ دین وایمان کے معاملہ میں جبر، زبردستی اور مجبور کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

علمی بات: حضور ﷺ کی شدید خواہش تھی کہ یہ سب لوگ ایمان لے آئیں مگر اللہ ﷻ فرماتا ہے کہ اس سلسلے میں ہمارا اپنا قانون ہے اور وہ یہ کہ جو حق کا طالب ہوگا اسے حق مل جائے گا اور جو تعصّب، ضد اور ہٹ دھرمی پر اتر آئے گا اسے ہدایت نصیب نہیں ہوگی۔ انسانوں کو اس نے پیدا ہی امتحان کے لئے کیا ہے۔ سورۃُ المُلک کی ابتدائی آیت:۲ میں زندگی اور موت کی تخلیق کا یہی مقصد بتایا گیا "جس نے موت اور زندگی اس لئے پیدا فرمائی تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے عمل کے اعتبار سے کون اچھا ہے"۔ لہٰذا اے نبی (ﷺ) آپ (علیہ السلام) اس معاملے میں اپنا فرض ادا کرتے جائیں، کوئی ایمان لائے یا نہ لائے اس کی پرواہ نہ کریں، کسی کو ہدایت دینے یا نہ دینے کا معاملہ ہم سے متعلق ہے۔ اصل میں یہ ساری باتیں حضور ﷺ کے دل مبارک کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے کی جارہی ہیں۔ جیسے کہ سورۃ الاعراف ۷، آیت:۲ کا مفہوم ہے کہ آپ ﷺ کے دل میں فرائض رسالت کے سلسلے میں کسی قسم کی تنگی نہیں ہونی چاہیئے اور ان لوگوں کے پیچھے آپ ﷺ اپنے آپ کو تھکن میں مبتلا نہ کریں۔

آیت نمبر ۱۰۰: اللہ ﷻ کی توفیق کے بغیر کسی کو ایمان کی نعمت نصیب نہیں ہوتی۔ ایمان کی توفیق اسی کو ملتی ہے جو حق کا متلاشی ہو۔ گندگی سے مراد عقیدہ کی گندگی ہے۔ کفر وشرک پر اڑے رہنے اور ہدایت کے لئے غور وفکر نہ کرنے والوں کو ہدایت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کے حکم کے بغیر کائنات میں کچھ نہیں ہوسکتا ایمان لانے اور نہ لانے کے باب میں جو سنّتِ الٰہی ہے یہ اس کی طرف اشارہ ہے کہ جو بھی ایمان لاتا ہے وہ اللہ ﷻ کے حکم اور اس کی توفیق سے ایمان لاتا ہے اور یہ توفیق ان کو حاصل ہوتی ہے جو اللہ ﷻ کی بخشی ہوئی عقل اور سمجھ سے کام لیتے ہیں۔ جو لوگ عقل اور سمجھ سے کام نہیں لیتے ان کی بصیرت پر اللہ ﷻ ان کے اعمال کی نجاست مسلّط کر دیتا ہے جو ان کو بالکل اندھا بنا کر چھوڑ دیتی ہے اور وہ اپنی خواہشاتِ نفس کے پیچھے ہی بھٹکتے پھرتے ہیں اور ان پر کفر کی گندگی مسلّط ہوجاتی ہے۔

آیت نمبر ۱۰۱: اللہ ﷻ کی پیدا کردہ کائنات پر غور وفکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ غور وفکر کرنے والوں کے لئے کائنات میں بڑی نشانیاں ہیں۔ کفر اور ہٹ دھرمی میں مبتلا لوگوں کو کوئی نشانی یا وعید فائدہ نہیں دیتی لہٰذا وہ ایمان نہیں لاتے۔

علمی بات: اس کائنات کی ہر چیز کو اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو وہ اللہ ﷻ کی قدرت اور حکمت کا شاہکار ہے، اس سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حیرت انگیز کارخانہ خود بخود وجود میں نہیں آیا، اسے اللہ ﷻ نے پیدا کیا ہے، بلکہ اس سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ جو ذات اتنی عظیم کائنات پیدا کرنے پر قادر ہے، اسے اپنی بادشاہت کے لئے کسی شریک یا مددگار کی حاجت نہیں ہے، لہٰذا وہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔

آیت نمبر ۱۰۲: اللہ ﷻ کی آیتوں اور نشانیوں کو جھٹلانے والوں کی مذمّت کی گئی ہے۔ ان کو سابقہ نافرمان قوموں جیسے انجام کی وعید سنائی گئی ہے۔ مزید برآں بُرے انجام کے لئے منتظر رہنے کی تنبیہ کی گئی ہے۔

علمی بات: اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ گزشتہ اُمتوں کی طرح انتظار کر رہے ہیں کہ انبیاء سابقین علیہم السلام اپنے ادوار میں کفار کو اللہ ﷻ کے عذاب سے ڈراتے تھے اور وہ اُمتیں ان کی تکذیب کرتی تھیں اور وہ لوگ مذاق اڑاتے ہوئے یہ کہتے تھے یہ عذاب جلدی کیوں نہیں آتا اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کے کفار تھے وہ بھی اسی طرح کہتے تھے اس لئے فرمایا: تم بھی اس وعید کا انتظار کرو اور میں بھی اس وعید کے پورا ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔

علمی بات: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ کفار پر حجت پوری ہو چکی۔ حق واضح ہو چکا۔ اب بھی وہ ایمان نہیں قبول کرتے۔ شاید وہ اس عذاب کے منتظر ہیں جو ان سے پہلے گمراہ قوموں پر نازل ہوا تھا اور انہیں ملیامیٹ کر گیا تھا۔ اگر ان کی یہی منشاء ہے تو ان کی یہ حسرت بھی پوری کر دی جائے گی۔ انہیں کہیئے کہ انتظار کریں یہاں تک کہ وہ گھڑی آجائے جو اللہ ﷻ نے ان کی ہلاکت و بربادی کے لئے مقرر کر رکھی ہے اور فرمایئے میں بھی تمہارے ساتھ اس وقت کا منتظر ہوں۔ اس وقت صادق و کاذب ظاہر ہو جائے گا۔

علمی بات: ایّام سے مراد یہاں دن نہیں بلکہ وہ واقعات اور حالات ہیں جن سے پہلے لوگوں کو سابقہ پڑا تھا۔ نیز عربی میں ایّام کے لفظ عذاب و احسان دونوں معنوں میں مستعمل ہوتا رہتا ہے جس طرح ارشاد باری ہے: ﴿وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ﴾ ان کو اللہ ﷻ کی نعمتیں یاد دلاؤ۔

آیت نمبر ۱۰۳: حق سے مراد یہاں رحمت ہے۔ نافرمان قوموں پر عذاب آنے کی صورت میں اللہ ﷻ اپنی خاص رحمت سے رسولوں اور اہل ایمان کو بچالیتا ہے۔

علمی و عملی بات: یعنی جیسے پہلی قوموں کے ساتھ ہماری عادت رہی ہے کہ مُکذّبین کو ہلاک کر کے پیغمبروں اور مؤمنین کو بچایا۔ اسی طرح موجودہ اور آئندہ مؤمنین کی نسبت ہمارا وعدہ ہے کہ دُنیا میں کفار کے مظالم سے اور آخرت میں عذابِ الیم سے نجات دیں گے شرط یہ ہے کہ مؤمنین ایمان کی صفات سے متصف ہوں۔ یعنی ان صفات کے حامل ہوں جو قرآن وحدیث میں مؤمنین کی بیان ہوئی ہیں۔

آیت نمبر ۱۰۴: مکی دور کے آخر میں قریش کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کے لئے ایک مصالحت کی پیشکش کی گئی۔ ایک معین عرصہ تک بتوں کی پرستش کرنے کی دعوت دی گئی (معاذ اللہ) اور انہوں نے کہا کہ اتنے ہی عرصے وہ بھی معبودِ واحد یعنی اللہ ﷻ ہی کی عبادت کریں گے۔ اس قسم کی مصالحت کا ہونا ناممکن ہے۔ عبادت صرف اسی معبودِ برحق کی ہوگی جس کی عبادت کا حکم ہے جس کے ہاتھ میں زندگی و موت کا اختیار ہے۔

علمی بات: اسلام کا فطرت کے مطابق ہونا اور کفر کا خلاف فطرت ہونا بالکل ظاہر ہے اس سے پہلے اللہ ﷻ نے دین اسلام کے حق اور صحیح ہونے پر اور اپنی توحید پر دلائل قائم کیئے اور سیدنا محمد ﷺ کی نبوّت کی صداقت کو بیان فرمایا تھا اور اب رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنے دین کا اظہار کریں اور یہ اعلان کریں کہ وہ مشرکین سے الگ اور علیحدہ ہیں کیونکہ مشرکین پتھروں سے تراشے ہوئے ان بتوں کی عبادت کرتے ہیں جو کسی قسم کا نقصان اور نفع پہنچانے پر قادر نہیں ہیں اور دراصل نفع اور نقصان پہنچانے پر قادر اللہ ﷻ ہی کی ذات ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور میں اسی کی عبادت کرتا ہوں۔ جو تم پر موت طاری کرے گا جس طرح اس نے تم کو زندگی دی ہے اور اس موت کے بعد پھر تم کو زندہ کرے گا۔

علمی بات: دین برحق وہ ہوتا ہے جو ایسی مضبوط دلیلوں، بے مثال محبتوں اور لازوال حقیقتوں سے مزیّن ہوتا ہے کہ جس میں کوئی صاحبِ عقل شک نہ کر سکے اور مشرکین ان بتوں کی پرستش کرتے تھے جن کو انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا سو جو بت اپنے وجود میں خود مشرکین کے محتاج تھے وہ ان کے خالق اور معبود کیسے ہو سکتے ہیں اور ان کی مشکلات کو کس طرح دور کر سکتے ہیں یہ ایسا خود ساختہ دین ہے جس کا ہر صاحبِ عقل انکار کرے گا۔ اس آیت میں پہلے غیر اللہ کی عبادت کی نفی کی پھر اللہ ﷻ کی عبادت کا اثبات کیا گیا کیونکہ پہلے بُرائی کو دور کیا جاتا ہے پھر اچھائی سے متصف کیا جاتا ہے اس کے بعد ایمان اور معرفت کا ذکر فرمایا جو تمام اعمالِ صالحہ کی اساس ہے۔

آیت نمبر ۱۰۵: بظاہر خطاب رسول اللہ ﷺ سے ہے لیکن مخاطب عام لوگ بالخصوص اہل ایمان ہیں۔ حنیف ایسے شخص کو کہتے ہیں جو ہر طرف سے ہٹ کر صرف ایک طرف یعنی توحید پر قائم ہو اور یہاں ہر قسم کے جاہلانہ اور مشرکانہ عقائد و نظریات کو چھوڑ کر ایک اللہ ﷻ کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ دین کے معاملہ میں مستقیم رہیں جن چیزوں کا اللہ ﷻ نے حکم دیا ہے ان پر عمل کریں اور جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے اجتناب کریں اور اخلاص کے ساتھ صرف اللہ ﷻ کی عبادت کریں یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ عبادت اور دُعا کرنے میں صرف اللہ ﷻ کی طرف توجہ کرنا واجب ہے اور جو شخص کسی غیر اللہ کی عبادت کرے یا اس سے دُعا مانگے تو گویا اس نے مشرکوں جیسا کام کیا۔

عملی پہلو: ہر باطل سے خواہ وہ کسی رنگ و روپ میں ہو اس سے اپنا منہ موڑنے اور کمال یکسوئی کے ساتھ صرف اس دینِ حق کی طرف رخ کرنے کا حکم ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دینِ اسلام قبول کر لینے کے بعد کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنی انفرادی یا اجتماعی، معاشی، سیاسی یا ریاستی رہنمائی کے لئے کسی اور نظام کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ جب تک کتاب و سنّت کا دامن مسلمانوں نے مضبوطی سے تھامے رکھا ان کے منہ سے نکلی ہوئی بات وزن رکھتی تھی۔ پوری دُنیا پر مسلمانوں کی حکمرانی تھی ان کا رعب و دبدبہ دشمنوں پر قائم تھا۔

آیت نمبر ۱۰۶: اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر باطل معبودوں کو پکارنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ کسی نفع نقصان پہنچانے پر قدرت نہ رکھنے والوں کو پکارنا ظلم کا ارتکاب ہے۔ ظلم کا مطلب ہے کسی چیز کو اس کے اصل مقام سے ہٹا کر کسی اور جگہ رکھ دینا۔ خطاب بظاہر رسول اللہ ﷺ سے ہے مگر مخاطب عوام الناس بالخصوص اہلِ ایمان ہیں۔

علمی و عملی بات: نبی کریم ﷺ کے ذریعے اُمّت کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کفار و مشرکین کو دوٹوک الفاظ میں یہ بتا دیں کہ مومن بتوں کے سامنے نہیں جھک سکتا، اس کی پیشانی تو اس اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکے گی جس کی جانب سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہر آن مومن رہو اور خلوص کے ساتھ توحید سے وابستہ رہو، مومن شخص ان خداؤں کو ماننے کے لئے تیار نہیں، جو نہ نفع پہنچا سکیں اور نہ ضرر سے بچا سکیں کیونکہ یہ انسانی عقل و دانش، انسانی شرافت و عظمت اور انسانی عزّت و حرمت پر ظلم ہے کہ جس پیکرِ انسانی کو اللہ تعالیٰ نے فضل و کمال سے نواز کر اَحسَنِ تَقوِیم بنایا ہوا سے بے جان اور غیر متحرک پتھروں کے سامنے جھکا یا جائے، وہ انسان جو اس لئے پیدا ہوا ہے کہ کائنات میں حکومت کرے اور اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ثابت ہو، وہ اگر دُنیا کی حقیر اور بے حقیقت چیزوں کے سامنے اپنی جبین کو عبادت کے لئے جھکا دے، تو اس سے بڑھ کر ظلم اور کیا ہو سکتا ہے۔

آیت نمبر ۱۰۷: خیر اور شر کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ کسی تکلیف کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دور نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کسی کے لئے بھلائی کا ارادہ فرما دے تو اس کے فضل کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کرنے والوں کے لئے بخشش اور مہربانی کی بشارت دی گئی۔

علمی بات: نفع و نقصان کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ نفع و نقصان سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کے اختیار میں نہیں، قرآنِ حکیم میں اس مضمون کو خوب وضاحت سے بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی حقیقی اور دائمی مددگار ہے۔ اسی کو مشکلات میں پکارنا چاہیئے اور اُسی سے اُمیدیں وابستہ کرنی چاہئیں۔ سیدنا حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ سوار تھا، آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اے پیارے بیٹے! اللہ تعالیٰ کے حقوق کی پابندی کرو، اللہ تعالیٰ تمہاری محافظت کرے گا، جب بھی سوال کرنا ہو تو اللہ تعالیٰ ہی سے کرو اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تیرے لئے اچھائی مقدر ہے تو تمام کائنات اس کو روک نہیں سکتی اور اگر بُرائی مقدر ہے تو کوئی اس کو ٹال نہیں سکتا۔ قلم تقدیر جو کچھ لکھ چکا وہی ہو گا اور تقدیر کے صحیفے بھی خشک ہو چکے ہیں۔ (جامع ترمذی)

علمی بات: یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ ہر قسم کا نقصان اور ہر طرح کا نفع، اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی قضاء و قدر کے تحت واقع ہوتا ہے اس میں کفر و ایمان، اطاعت و معصیت، راحت و مصیبت، آلام و لذّات سب داخل ہیں اور جس شخص کے لئے اللہ تعالیٰ کسی مصیبت کو مقدر کر دے تو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اس کو دور کرنے والا نہیں ہے اور جس شخص کے لئے اللہ تعالیٰ کسی راحت کو مقدر کر دے تو اس کو کوئی چھیننے والا نہیں ہے آیت کے پہلے حصّہ میں یہ فرمایا ہے کہ وہی تکلیفوں کو دور کرنے والا ہے اور دوسرے حصّہ میں یہ فرمایا ہے کہ وہی خیر عطا کرنے والا اور فضل فرمانے والا ہے اور اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصل مقصود خیر پہنچانا ہے ضرر پہنچانا نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے: اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب میں لکھ دیا کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔ (صحیح بخاری) مگر لوگ خود اپنا نقصان کرتے ہیں۔

آیت نمبر ۱۰۸: رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ پوری نوعِ انسانی کو خطاب ہے۔ حق سے مراد قرآنِ حکیم اور دینِ اسلام ہے۔ حق کو اختیار کرنے والے کامیاب اور گمراہی اختیار کرنے والے کا وبال اسی پر ہو گا۔ پیغمبر علیہ السلام کے ذمہ حق منوانے کی ذمہ داری نہیں۔ داعیِ حق کی حیثیت اور ذمہ داری کو واضح کر دیا گیا۔

علمی بات: جب دینِ اسلام اور اس کے اصول کی حقانیت ظاہر ہو گئی تو بطور اِتمامِ حجت کافروں سے خطاب ہے کہ دیکھو تمہارے پاس دینِ حق آ گیا اور نبی ﷺ کے ذریعہ سے تم تک پہنچ گیا اور اللہ تعالیٰ کی حجت تم پر پوری ہو گئی اب تم حق تعالیٰ کے سامنے اپنی گمراہی کا کوئی عذر اور حیلہ پیش نہیں کر سکتے۔ اب اگر اس سے ہدایت حاصل کر لو تو تمہارا ہی فائدہ ہے ورنہ تمہارا ہی نقصان ہے رسول کا کام خبر دے دینا ہے وہ کسی سے حق قبول کرانے کے ذمہ دار نہیں اور اس کے بعد آپ ﷺ کو صبر کرنے اور وحی کی پیروی کرنے کا حکم دیا جس سے مقصود آپ ﷺ کی تسلّی ہے کہ اگر یہ منکرین آپ علیہ السلام کی دعوت قبول نہ کریں۔ اگر یہ

برابر اسی سابقہ عداوت اور ایذء ارسانی پر قائم رہیں تو آپ علیہ السلام صبر کیجئے عنقریب اللہ ﷻ فیصلہ فرمادے گا یعنی حسبِ وعدہ آپ ﷺ کو غالب اور منصور کرے گا۔ یہ مضمون گویا کہ تمام سورت کا خلاصہ ہے۔

آیت نمبر ۱۰۹: رسول اللہ ﷺ اور اہلِ ایمان کو قرآن حکیم کی پیروی اور حق پر جمے رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ داعیِ حق کو مشکلات پر صبر کرنے اور ثابت قدم رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ حق و باطل کے درمیان اللہ ﷻ کی طرف سے فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔

علمی بات: نبی ﷺ کو تلقین ہے کہ آپ ﷺ تو اس چیز کی پیروی کیجئے جو آپ ﷺ کی طرف وحی کی جاتی ہے آپ ﷺ لوگوں تک اللہ ﷻ کا پیغام پہنچا دیجئے چاہے کوئی مانے یا نہ مانے اور اگر تبلیغ اور دعوتِ اسلام پر یہ لوگ آپ ﷺ کو ایذاء پہنچائیں تو آپ ﷺ صبر کیجئے یہاں تک کہ خود اللہ ﷻ فیصلہ کرے کہ حق کو غلبہ دے اور کفر کو ذلیل و خوار کرے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ اس لئے کہ وہ ظاہر و باطن، ماضی، حال اور استقبال سب کو یکساں جانتا ہے اور اس کے حکم اور فیصلہ میں بھول چوک اور غلطی کا ہرگز امکان نہیں۔ لہٰذا اے نبی کریم ﷺ! آپ ﷺ ان دشمنوں کی ایذاء رسانیوں پر صبر کیجئے اور اللہ ﷻ کے فیصلہ کا انتظار فرمائیے۔ وہ ان شاء اللہ حسبِ وعدہ آپ ﷺ کو فتح و نصرت عطا کرے گا۔

COPYRIGHTS ® RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION. SALE OF THIS BOOK WOULD ENTAIL CIVIL & CRIMINAL ACTION.

سُوْرَۃُ ھُوْد

ربطِ سورت: سورۂ ھود کے مضامین سورۂ یونس کے مضامین سے ملتے جلتے ہیں البتہ سورۂ یونس میں جن پیغمبروں کے واقعات مختصر بیان ہوئے تھے، اس سورت میں انہیں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ خاص طور پر حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام، اور حضرت لوط علیہ السلام کے واقعات زیادہ تفصیل سے انتہائی بلیغ اور مؤثر اسلوب میں بیان فرمائے گئے ہیں۔

سورت کا اختتام اللہ تعالیٰ کی توحید، قرآنِ حکیم کی حقانیت اور حضرت سیّدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کی صداقت اور اسلام کے پیغام پر ہوتا ہے، جس میں قیامت، حساب و کتاب، جزا و سزا اور قرآنِ حکیم کے اعجاز کا تفصیلی طور پر ذکر ہے نیز کتاب اللہ کی آیات کے محکم ہونے کا بیان ہے جیسا کہ سورۂ یونس کا اختتام بھی اسی قسم کی آیات پر ہوا ہے۔

گزشتہ سورت کے آخر میں فرائض خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر تھا۔ اس سورت کی ابتداء میں بھی فرائض خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے۔

گزشتہ سورت کے آخر میں صداقت قرآن حکیم کا ذکر تھا۔ اس سورت کی ابتداء میں بھی صداقت قرآن حکیم کا ذکر ہے۔

گزشتہ سورت کے آخر میں دلیل وحی کے ساتھ توحیدِ خداوندی کا ذکر تھا۔ اس سورت کے شروع میں بھی دلیل عقلی کے ساتھ توحیدِ خداوندی کا ذکر ہے۔

سورۂ ھود میں اتمامِ حجت کے بعد توبہ اور استغفار کی دعوت دی گئی ہے۔ دعوت مسترد کرنے کی صورت میں ہلاکت کی وعید سنائی گئی ہے۔

آیت نمبر ۱: محکم کے معنی مضبوط اور اٹل کے ہیں۔ مضبوط کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ دلائل کے لحاظ سے مضبوط اور مکمل ہیں اور ان میں کوئی نقص نہیں ہے۔ قرآنِ حکیم کی آیات محکم ہیں جن پر عمل پیرا ہونے پر لوگوں کو فلاح نصیب ہوتی ہے۔ ابتدا میں اس کلام کی آیات جامع اور گہرے مفہوم کی حامل تھیں۔ بعد میں ان آیات کی وضاحت نازل فرما دی گئی۔ قرآنِ حکیم حکیم و خبیر ہستی نے نازل فرمایا ہے۔

علمی بات: یعنی یہ قرآنِ حکیم وہ جلیل القدر اور عظیم الشان کتاب ہے جس کی آیتیں لفظی و معنوی ہر اعتبار سے نہایت مستحکم ہیں۔ نہ کوئی مضمون حکمت اور واقعہ کے خلاف ہے نہ ہی اس کی معجزانہ فصاحت و بلاغت پر نکتہ چینی ہو سکتی ہے۔ جس مضمون کو جس عبارت میں ادا کیا ہے اس سے بہتر تعبیر ناممکن ہے۔ یہ آیات جن اصول و فروع، اخلاق و اعمال، قیمتی وعظ اور نصیحت پر مشتمل ہیں نیز جو دلائل کسی بھی بات کے اثبات کے لئے دیئے گئے ہیں وہ سب علم و حکمت کے پیمانوں سے گزرے ہوئے ہیں۔ قرآنی حقائق و دلائل ایسے مضبوط و محکم ہیں کہ زمانہ کتنا ہی تبدیل ہو جائے ان حقائق کے بدلنے یا غلط ہونے کا کوئی امکان تک نہیں۔ موقع بہ موقع دلائل توحید، احکام، مواعظ، قصص، ہر چیز بڑی خوبصورتی اور قرینہ سے الگ رکھی ہے اور تمام ضروریات دینی و دنیوی کا بالتفصیل بیان ہے۔ قرآنِ حکیم میں نزولی اعتبار سے بھی یہ حکمت رہی ہے کہ پورا قرآنِ حکیم یک دم نہیں اُتارا گیا بلکہ وقتاً فوقتاً موقع و مصلحت کے لحاظ سے آیات کا نزول ہوتا رہا۔ قرآنِ حکیم میں ان تمام خوبیوں کو یکجا دیکھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ مگر اس میں حیرت زدہ ہونے کی کوئی بات نہیں کیونکہ حکیم مطلق کے برحق کلام میں یہ سب حکمتیں اور خوبیاں جمع نہ ہوں تو اور کس کے کلام میں جمع ہو سکتی ہیں جب کہ مخلوق کا کلام بہت سے اغراض مُفسدہ اور اغلاط کے ساتھ ساتھ ناتمام اور نامکمل ہوتا ہے۔

آیت نمبر ۲: قرآنِ حکیم کا بنیادی پیغام پوری نوعِ انسانی کو صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنے کی دعوت دینا ہے۔ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی مشترکہ دعوت ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت تھی۔ یعنی اس محکم و مفصل کتاب کے نازل کرنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ دنیا کو صرف اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کی دعوت دی جائے اور بندگی کے آداب سکھائے جائیں۔ اسی عظیم المرتبت کام اور مقصد کے لئے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لاتے تھے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اور ہم نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے جو بھی رسول بھیجے ان کو یہی وحی فرمائی کہ میرے (اللہ کے) سوا اور کوئی معبود نہیں پس میری ہی عبادت کرو۔ (سورۃ الانبیآء ۲۱، آیت: ۲۵) نیز سورۃ النحل میں ارشاد فرمایا گیا کہ "یقیناً ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیجا (اس پیغام کے ساتھ) کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور شیطان (کے راستے) سے بچو۔" (سورۃ النحل ۱۶، آیت: ۳۶) تمام انبیاء و رسل علیہم السلام توحید کی دعوت قبول کرنے والوں کو دنیا و آخرت کی بشارت دیتے اور انکار کرنے والوں کو دنیا و آخرت کے بُرے انجام سے ڈراتے تھے۔

علمی بات: ان آیات میں رسولِ کریم ﷺ سے ارشاد فرمایا ہے کہ آپ ﷺ تمام عالمِ انسانیت کو بتادیجئے کہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے تم کو ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں، میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نافرمانی اور خواہشاتِ نفسانی کا اتباع کرنے والوں کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے عذاب سے ڈراتا ہوں اور اطاعت گذار اور نیک لوگوں کو آخرت کی نعمتوں اور دونوں عالم کی راحتوں کی خوشخبری دیتا ہوں۔

علمی بات: نذیر کا ترجمہ ڈرانے والے کا کیا جاتا ہے لیکن یہ لفظ ڈرانے والے دشمن یا دوسرے نقصان پہنچانے والوں کے لئے نہیں بولا جاتا، بلکہ نذیر اس شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی اپنے عزیز کو شفقت و محبت کی بناء پر ایسی چیزوں سے ڈرائے اور بچائے جو اس کے لئے دنیا یا آخرت یا دونوں میں نقصان پہنچانے والی ہیں۔

آیت نمبر ۳: اس آیت میں استغفار اور توبہ کی ترغیب دی گئی ہے۔ ایسا کرنے والوں کو متاعِ حَسَن سے نوازا جائے گا۔ متاعِ حَسَن سے مراد حلال و پاکیزہ رزق، قلبی سکون و اطمینان اور نیک اعمال ہیں چنانچہ نیک اعمال کی کثرت کرنے والوں کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے فضل سے زیادہ عطا فرمائے گا اور حق سے اعراض کرنے اور گناہوں کی بخشش نہ مانگنے والے بڑے عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ یوم کبیر سے یا تو روزِ قیامت مراد ہے یا عذاب کا کوئی دن۔

علمی بات: ماضی کے گناہوں پر ندامتِ قلب کے ساتھ گناہوں سے رُک جانا اور مستقبل میں نہ کرنے کا عزم، یہ توبہ ہے۔ جب کہ ماضی کے گناہوں کی معافی مانگنا "استغفار" ہے۔ توبہ اور استغفار میں فرق یہ ہے کہ جو گناہ ہو چکے ان پر صدقِ دل سے معافی مانگنا استغفار اور پچھلے گناہوں پر ندامتِ قلبی کے ساتھ ساتھ آئندہ گناہ نہ کرنے کا عہد کرنا توبہ ہے گویا "توبہ" اصل منزل ہے جب کہ توبہ کی طرف جانے والا راستہ "استغفار" ہے۔

عملی پہلو: اس آیت سے معلوم ہوا کہ اخلاص کے ساتھ توبہ و استغفار کرنا عمر میں برکت اور رزق میں وسعت کے لئے بہترین عمل ہے۔

علمی بات: خلاصہ یہ کہ جس نے اپنے گناہوں سے پکی توبہ کی اور اخلاص کے ساتھ رب تعالیٰ کا عبادت گزار بندہ بن گیا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اسے کثیر رزق اور وُسعتِ عیش عطا فرمائے گا۔ جس کی وجہ سے وہ امن و راحت کی حالت میں زندگی گزارے گا اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس سے راضی ہو گا۔

علمی بات: یہاں بتایا جا رہا ہے کہ اگر تم نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی توحید کا اعتراف اور اپنے گناہوں پر استغفار کیا نیز بقیہ زندگی میں اسی کے ہو کر رہے تو، سکونِ قلبی و راحت باطنی اور فوز و فلاح دُنیوی و اُخروی سے سرفراز کر دیا جائے گا نیز واضح رہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ حسب مصلحت دُنیوی ضرورتوں کو پورا فرمائے گا اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا بن جانے کا یہ مقصد تو نہیں کہ انسان جائز ضروریات اور خواہشات سے محرومیوں کا شکار ہو جائے بلکہ جو سچے دل سے اس کا ہو جاتا ہے اس کے لئے رحمت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور اُسے سچی اور حقیقی خوشیوں اور حقیقی کامرانیوں سے بہرہ مند کیا جاتا ہے۔

علمی بات: یعنی ہر نیک انسان کو اس کے اعمالِ حسنہ کی جزاء اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے فضل و کرم سے عطا فرماتا ہے نیکیوں میں جتنا کوئی بڑھتا جائے گا اسی قدر اللہ سبحانہ وتعالیٰ اسے اپنے اعلیٰ خزانوں سے مالا مال کرتا جائے گا۔

عملی پہلو: گناہوں پر اصرار اور بے راہ روی کی روش اختیار کرنے والوں اور گزشتہ پر سچے دل سے نادم نہ ہونے والوں کا انجام اچھا نہیں ہوتا، ایسا نہ ہو کہ ایسے لوگ قیامت کے دن عذاب میں مبتلا کر دیے جائیں۔ لہٰذا اپنی غلطیوں کی اصلاح کرتے ہوئے صدقِ دل سے توبہ و استغفار کرتے رہنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۴: ہر شخص کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ دینِ حق سے اعراض کرنے والوں کو سزا دینے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔

علمی بات: کسی مجرم کو سزا دینے کے لئے دو باتوں کی ضرورت ہوتی ہے پہلی یہ کہ مجرم حاضر ہو، دوسری یہ کہ سزا دینے والا قدرت و اختیار رکھتا ہو چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ دعوتِ حق پر لبیک سے اعراض کرتے ہوئے سیدھی راہ سے منہ پھیرنے والوں کو اپنے پاس حاضر کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے اور اسے سزا دینے کا مکمل اختیار بھی رکھتا ہے چنانچہ مجرموں کو اپنے انجامِ بد سے ضرور ڈرنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۵: اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم کی وسعت کا بیان ہے۔ اس آیت کا ایک مفہوم یہ ہے کہ کفار و مشرکین اپنا بغض و دشمنی چھپا نہیں سکتے۔ کسی چیز کو مخفی رکھنے کی کتنی ہی کوشش کر لی جائے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے کوئی چیز مخفی ہو ہی نہیں سکتی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ دلوں کے ارادوں سے بھی خوب واقف ہے۔

علمی بات: آیت کا مقصد اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم وسیع کا بیان ہے چنانچہ اس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے متعلق مشرکین کے جہل اور لاعلمی کی انتہا بیان ہوئی ہے۔ کفارِ مکّہ کے بارے میں خبر دی جا رہی ہے کہ بعض کفارِ مکّہ رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرتے تھے لیکن جب اس کے جواب میں قرآنِ حکیم نازل ہوتا تو یہ سمجھتے کہ کوئی قاری باتیں

سن کر بتلا دیتا ہے لہٰذا کپڑا اوڑھ کر دُوہرے ہو کر باتیں کرتے۔ انہی کفار کو بتایا جارہا ہے کہ تم اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ سے اپنی حقیقت چھپانے کی ہزار کوشش کرو تب بھی کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ وہ اللہ ﷻ ایسی پاک ذات ہے جو تمہارے ظاہر کو بھی جانتا ہے اور تمہارے باطن کو بھی۔ جو تمہارے ان اعمال کو بھی دیکھ رہا ہے جو تم چھپا کر کرتے ہو اور ان کو بھی جن کا تم برملا ارتکاب کرتے ہو۔ وہ تو ایسا باخبر ہے جس سے تمہارے سینوں میں چھپا ہوا کوئی راز بھی مخفی نہیں رہ سکتا۔

علمی بات: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ تین آدمی بیت اللہ کے پاس اکھٹے ہوئے، (ان میں سے) دو قریشی تھے اور ایک ثقفی تھا، یا دو ثقفی تھے اور ایک قریشی تھا، ان کے دلوں کا فہم کم تھا، ان کے پیٹوں کی چربی بہت تھی۔ ان میں سے ایک نے کہا: کیا تم سمجھتے ہو کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں، اللہ ﷻ سنتا ہے؟ دوسرے نے کہا: اگر ہم اونچی آواز سے بات کریں تو سنتا ہے اور آہستہ بات کریں تو نہیں سنتا۔ تیسرے نے کہا: اگر ہم اونچا بولیں تو وہ سنتا ہے تو پھر ہم آہستہ بولیں تو بھی سنتا ہے۔ اس پر اللہ ﷻ نے (یہ آیتیں) نازل فرمائیں: اور تم (تو گناہ کرتے وقت) اس (خوف) سے بھی پردہ نہیں کرتے تھے کہ تمہارے خلاف گواہی دیں گے تمہارے کان تمہاری آنکھیں اور تمہاری کھالیں لیکن تم تو گمان کرتے تھے کہ اللہ ﷻ (تمہارے) بہت سے (اعمال) جانتا ہی نہیں جو تم کرتے ہو اور تمہارے (اسی) گمان نے جو تم اپنے رب کے بارے میں کیا کرتے تھے تمہیں ہلاک کر دیا پس تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گئے۔

(سورۃ حٰم السجدۃ ۱۶، آیات: ۲۲، ۲۳: صحیح مسلم، جامع ترمذی، مسند احمد)

علمی بات: اس سے معلوم ہوا کہ کچھ جاہل مشرکین یہ بھی سمجھتے تھے کہ آہستہ بات کریں تو اللہ ﷻ کو پتا نہیں چلتا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اللہ ﷻ کو مانتے تھے البتہ جب بھی اللہ ﷻ کی ناراضگی والا کوئی کام کرتے تو خوب چھپ کر کرتے کہ اللہ ﷻ سے چھپے رہیں، اُسے پتہ نہ چل جائے۔ لیکن وہ تو ایسی ہستی ہے کہ کائنات کی کوئی چیز اُس سے مخفی نہیں۔

آیت نمبر ۶: زمین پر چلنے پھرنے اور رینگنے والے جانوروں کو دَابَّہ کہا جاتا ہے، پرندے بھی اسی میں داخل ہیں۔ نیز ہر جاندار کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ ہر جاندار مخلوق کا رزق اللہ ﷻ کے ذمہ ہے اور یہ رزق طے شدہ ہے۔ ہر مخلوق کا عارضی اور مستقل ٹھکانہ اللہ ﷻ کے علم میں ہے۔ مخلوق کے ذمہ عبادت کا فریضہ ہے۔ رازق اللہ ﷻ ہے اور لوحِ محفوظ میں ہر بات لکھی ہوئی ہے۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ نے ارشاد فرمایا کہ زمین پر چلنے والے جتنے جاندار ہیں، وہ ان سب کو ان کی تخلیق و تکوین کے مطابق روزی پہنچاتا ہے، یہ اس کا اٹل وعدہ ہے جو بطور احسان پورا کرتا رہتا ہے۔ جب وہ ایک ایک جاندار کو روزی پہنچاتا ہے، دنیا میں ان کی جگہوں کو اور قبل از پیدائش اور موت کے بعد بھی ان کے ٹھکانوں کو جانتا ہے تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ان کے اقوال و افعال اور ان کے دیگر تمام احوال و کوائف سے بے خبر رہے؟ اسے سب خبر ہے اور لوحِ محفوظ میں ہر بات لکھی ہوئی ہے۔

رزق کے حوالہ سے اللہ ﷻ پر توکل کی فضیلت: ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "اور کتنے ہی چلنے والے (جاندار) ہیں جو اپنا رزق نہیں اٹھاتے، اللہ ﷻ انہیں بھی رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔" (سورۃ العنکبوت ۲۹: آیت: ۶۰)

احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں توکل کی اہمیت: ۱۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم اللہ ﷻ پر اس طرح توکل کرو، جیسا اس پر توکل کرنے کا حق ہے تو وہ تم کو اس طرح رزق دے گا، جیسے پرندے کو روزی دیتا ہے، کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ پرندہ صبح خالی پیٹ ہوتا ہے اور شام کو سیر و سیراب ہوتا ہے۔ (مسند احمد)

۲۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بے شک میرے دل میں حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے یہ بات ڈال دی ہے کہ اُس وقت تک کسی شخص کو موت نہ آئے گی جب تک کہ وہ اپنا رزق پورا نہ کرلے، سو تم لوگ اللہ ﷻ سے ڈرو اور رزق طلب کرنے میں خوبی کا خیال رکھو اور رزق ملنے میں دیر ہو جائے تو اللہ ﷻ کی نافرمانیوں کے ذریعہ طلب نہ کرو کیونکہ اللہ ﷻ کا فضل اس کی نافرمانی کے ذریعہ حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ (مستدرک الحاکم)

۳۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ رزق بندہ کو اسی طرح طلب کرتا ہے جس طرح سے موت ڈھونڈتی ہے۔ (ابن حبان، البزار)

۴۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ: اگر ابنِ آدم اپنے رزق سے اس طرح بھاگے جیسے موت سے بھاگتا ہے تب بھی اس کا رزق اسے پالے گا جیسے موت اسے پالیتی ہے۔ (سلسلۃ الصحیحہ)

۵۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کھجور پڑی ہوئی دیکھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لے لیا وہاں پر ایک سائل موجود تھا وہ کھجور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے عطا فرمادی۔ (الطبرانی)

اللہ تعالیٰ کی رزّاقیت اور وسعتِ علم: اس آیت سے جہاں اللہ تعالیٰ کی کمال رزّاقیت کا پتہ چلتا ہے وہاں اس کے وسعتِ علم کی بھی خبر ملتی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق کی فراہمی کا عمومی ذریعہ یہ ہے کہ اس کے اسباب پیدا فرما کر انسان کو رزق عطا فرماتا ہے اس طور پر کہ وہ آسمان سے بارش برساتا ہے جس سے زمین میں ہر طرح کی نباتات اُگتی ہیں، پھر اسی نباتات میں شامل مختلف غلّہ جات، پھولوں، فصلوں اور پھلوں وغیرہ سے ہر جاندار کو بالواسطہ یا بلاواسطہ روزی مہیا ہوتی ہے اور ہر جاندار کی جملہ ضروریاتِ زندگی اسی زمین سے پوری ہو رہی ہیں اور اللہ تعالیٰ جتنی بھی مخلوق پیدا فرماتا ہے تو اس کے مطابق زمین بھی اپنے نئے سے نئے خزانے اُگلتی جارہی ہے اور آئندہ بھی رزق کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ تاہم اس رزق کے حصول کے لئے اس نے اسباب و وسائل اختیار کرنے کا بھی حکم دے دیا ہے اور جب کوئی انسان یا جاندار اسباب اختیار کرنے سے عاجز ہو تو اللہ تعالیٰ خود ہی وہ اسباب بھی فراہم کر دیتا ہے جو اس نے پیدا فرمائے ہیں۔

قحط اور بھوک کی وجوہات: یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر رزق کی فراہمی اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے تو قحط سے یا بعض دوسری وجوہ سے انسان ہزاروں کی تعداد میں مر کیوں جاتے ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قحط تو اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے جو لوگوں کی نافرمانیوں کی وجہ سے انسانوں پر مسلّط کیا جاتا ہے اور دوسری وجوہ جیسے آزمائش یا بعض انسانوں کا دوسروں پر ظلم و زیادتی کرنا اور معاشی وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کی بنا پر ایسے حادثات وجود میں آتے ہیں اور یہ سب کچھ انسانوں کے کسب اعمال کا ہی نتیجہ ہوتا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جانداروں کے رزق میں کمی کا تصور بھی محال ہے۔ بلکہ ناشکری اور ظلم و زیادتی وغیرہ ایسے اسباب ہیں جن کی وجہ سے انسان ان نعمتوں سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی اور رزق: آج عالمی سطح پر یہ ڈھنڈورا پیٹا جارہا ہے کہ دنیا کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور وسائل رزق اس کے مساوی نہیں لہٰذا خاندانی منصوبہ بندی اور افزائشِ نسل پر کنٹرول ضروری ہے اس سلسلہ میں آج کے ماہرین معاشیات کی کج فہمی و کوتاہ نظری اور فطرت سے جنگ کے نتیجہ میں ان کی ناکامی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ جہاں جہاں ایسے محکمے قائم کیئے جارہے ہیں وہاں شرحِ پیدائش میں اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے اسی طرح مرد و زن میں تناسب کے اعتبار سے فرق نمایاں تر ہوتا جارہا ہے اور عجیب اتفاق ہے کہ لوگ بھی پہلے سے زیادہ آسودہ اور خوشحال ہیں جس کا موازنہ ہر شخص اپنی پچاس سال پہلے کی زندگی سے کر سکتا ہے ان مادہ پرست ماہرین کے فکر کی اصل وجہ محض اللہ تعالیٰ کی رزّاقیت پر عدم توکل ہے ورنہ اللہ تعالیٰ تو آبادی کی افزائش کے ساتھ ساتھ زمین کے خزانے انسانوں کی دسترس میں دے رہا ہے، صدیوں سے بنجر پڑی ہوئی زمینیں آباد ہو رہی ہیں زمین سال میں دو کے بجائے چار چار فصلیں دینے لگی ہے کہیں تیل دریافت ہو رہا ہے کہیں جلانے کی گیسیں اور کہیں دوسری معدنیات نیز انسان حصولِ رزق کے نئے سے نئے وسائل بھی دریافت کر رہا ہے اور سب باتیں اس آیت کا ظاہر اور واضح مصداق ہیں۔ مادہ پرست ماہرین معاشیات یہ تو اندازہ کر لیتے ہیں کہ اتنے سال بعد موجودہ شرحِ پیدائش کے مطابق دنیا کی آبادی کتنی ہو جائے گی لیکن اس دوران اللہ تعالیٰ جو نئے وسائل رزق مہیا کرتا ہے اس کا وہ کچھ اندازہ نہیں کر سکتے لہٰذا ان کے اکثر اندازے غلط ثابت ہوتے ہیں اس مادہ پرستی اور محض مادی وسائل پر نظر رکھنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے توکل اٹھ جاتا ہے جو اس آیت کا مرکزی مضمون ہے۔

علمی بات: قرآنِ حکیم کے الفاظ مُسْتَقَرَّ (قرار گاہ) اور مُسْتَوْدَعٌ (سونپے جانے کی جگہ) کے معنی میں ہے اور مُسْتَوْدَعٌ اس گودام کو بھی کہتے ہیں جہاں کوئی چیز ذخیرہ کی جاتی ہے یا امانتیں بطور حفاظت رکھی جاتی ہیں۔ "مُسْتَقَرَّ" اور "مُسْتَوْدَعٌ" کی تفسیر اگرچہ مفسرین نے مختلف بیان کی ہے، مگر الفاظ کے پیشِ نظر واضح مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ تمام جگہیں بھی جانتا ہے جہاں انسان نے کچھ مدّت کے لئے ٹھہرنا ہے، خواہ باپ کی پشت ہو یا ماں کا رحم، یا زمین کا کوئی حصہ جہاں اس نے زندگی میں ٹھہرنا ہے اور وہ جگہ بھی جہاں انسان نے مرنے کے بعد سپرد ہونا ہے، خواہ وہ زمین میں کھودی ہوئی جگہ ہو یا کسی جانور کا پیٹ یا سمندر و دریا ہوں جو جگہ بھی اللہ تعالیٰ نے قیامت کے وقوع تک لکھ رکھی ہے وہ جگہ بطورِ برزخ کے ہے اور وہ جگہ اس کے لئے قبر ہی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو موت اور قبر دینے کا ذکر فرمایا ہے: (ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ)۔ (سورۂ عبس ۸۰، آیت: ۲۱) "پھر اسے موت دی، پھر اسے قبر میں رکھوایا۔" پھر قیامت کو زندہ ہو کر یا تو جنّت کا

مستحق ہو گا یا نار کا، یہ سب اس کے لئے "مُسْتَوْدَعٌ" (سونپے جانے کی جگہ) اور مُسْتَقَرٌّ (قرار گاہ) ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ ﷻ ہر جان دار کی زندگی کے تمام حالات بھی جانتا ہے اور موت کے بعد کے تمام واقعات بھی۔

علمی بات: کتابِ مُبین سے مراد لوحِ محفوظ ہے جیسا کہ اس حدیثِ مبارکہ سے واضح ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ ﷻ تھا اور کوئی چیز نہ تھی اور اللہ ﷻ کا عرش پانی پر تھا، پھر اس نے زمین و آسمان پیدا کیئے اور لوحِ محفوظ میں ہر چیز لکھ دی۔ (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۷: اللہ ﷻ کی وحدانیت اور قدرتِ کاملہ کی دلیل کے طور پر کائنات کی تخلیق کا بیان ہے۔ اللہ ﷻ نے چھ دنوں میں زمین و آسمان کی تخلیق فرمائی۔ ان کو پیدا کرنے سے پہلے اللہ ﷻ کا عرش پانی پر تھا۔ یہ بات متشابہات میں سے ہے۔ جس کی کیفیت و تفصیل میں جانے سے شریعت مطہرہ نے منع کیا ہے انسان کی تخلیق کا مقصد یہ بیان ہوا کہ اس دُنیا میں انسانوں کا امتحان لیا جائے کہ کون عمل میں اچھا ہے؟ روزِ قیامت تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کر کے ان کے عمل کے مطابق انہیں جزا یا سزا دی جائے گی۔ قیامت و آخرت کے منکرین کی کج فہمی کا بیان ہے کہ وہ انسانوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے متعلق مؤثر بیان جادو قرار دیتے ہیں جس نے بہت سے لوگوں کو متاثر کر لیا ہے۔

علمی بات: فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ۔ لفظی معنی ہیں چھ دنوں میں۔ چونکہ جس زمانہ کے متعلق اس کا استعمال ہوا ہے سورج کی تخلیق بھی نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا عام معنوں میں نہیں لیا جا سکتا۔ عربی زبان میں یہ مطلقاً وقت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے ا۔ خواہ کتنا ہی دراز یا مختصر ہو۔ آیت ہٰذا میں سِتَّۃِ اَیَّامٍ سے مراد چھ ادوار لئے گئے ہیں اور ہر دور کی مقدار کتنی تھی ہماری دنیا کے دن کے برابر یا قیامت کے دن کے برابر؟ اللہ ﷻ ہی بہتر جانتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اس کی مراد اللہ ﷻ کے حوالے کی جائے۔ ویسے بھی انسانی ہدایت کا کوئی معاملہ اس طرح کی باتوں پر موقوف نہیں، قرآنِ حکیم کتابِ ہدایت ہے۔ ہدایت کے ضمن میں ایسی کسی بات کا تذکرہ صرف اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ اس کی قدرتِ کاملہ اور اس کی حکمتِ بالغہ پر یقین پیدا ہو اور حقیقت نہ سمجھنے پر دل میں عجز کی کیفیت پیدا ہو جس سے بندگی کو جلا ملتی ہے اور اللہ ﷻ کی کبریائی کا یقین بڑھ جاتا ہے۔

علمی بات: اَلْعَرْشِ۔ اصل میں چھت والی چیز کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع عروش ہے قرآنِ حکیم میں آیا ہے وَهِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا اور اس کے مکان اپنی چھتوں پر گرے پڑے تھے۔ عرش کا لفظ عزت، غلبہ، سلطنت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ البتہ جہاں تک عرشِ الٰہی کا تعلق ہے ہم صرف نام کی حد تک واقف ہیں اور اس کی حقیقت انسان کے فہم سے بالاتر ہے وہ بادشاہ کے عرش کی طرح نہیں ہے۔ کیونکہ ذاتِ باری تعالیٰ اس سے بالاتر ہے کہ کوئی چیز اسے اٹھائے۔ عرش کی اصل حقیقت اللہ ﷻ کے علم میں ہے۔ یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ اللہ ﷻ اپنی شان کے مطابق عرش پر جلوہ فرما ہے۔

عملی پہلو: اس آیت نے واضح فرما دیا ہے کہ اس کائنات کو پیدا کرنے کا اصل مقصد بنی آدم کی آزمائش ہے اور آزمائش یہ ہے کہ ان میں سے کون اچھا عمل کرتا ہے، یہ نہیں کہ کون زیادہ عمل کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نفلی اعمال کی گنتی سے زیادہ انسان کو اس کی فکر کرنی چاہیئے کہ اس کا عمل اخلاص اور خشوع و خضوع کے اعتبار سے زیادہ بہتر ہو۔ اس لئے کہ اللہ ﷻ نے انسان کو خلیفہ بنایا نیز اسے اختیارات سونپ کر اس پر اخلاقی ذمہ داریاں عائد کیں تاکہ آزمائے کہ ان میں سے کون اچھا عمل کر کے آتا ہے۔

عملی پہلو: زمین اور آسمان کی تخلیق اور اس میں ان گنت نعمتیں ودیعت کرنے کا مقصد ایک اللہ ﷻ کی عبادت کرنا، نیز نیکی اور خیر کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا ہے تاکہ روزِ قیامت اللہ ﷻ ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ عطا فرمائے۔

آیت نمبر ۸: اس آیت میں قیامت کو جھٹلانے والوں کو فوراً سزا نہ دیئے جانے پر ان کا طرزِ عمل ذکر کیا گیا ہے۔ وہ طنزاً پوچھتے کہ ان پر عذاب کیوں نہیں آرہا؟ لہٰذا اللہ ﷻ نے جواب مرحمت فرمایا کہ کافر جان لیں کہ جس دن ان پر عذاب آئے گا وہ انہیں گھیر لے گا اور وہ بچ نہیں سکیں گے۔

علمی بات: اس بات کے کہنے سے ان کے دو مقصد ہو سکتے ہیں، ایک مقصد تو وعید کو جھٹلانا کہ آپ کہتے ہیں کہ عذاب آئے گا اور ہمیں اس کا مورد ٹھہراتے ہیں وہ آ کیوں نہیں رہا اُسے کس نے روک رکھا ہے۔ دوسرا مقصد آخرت کے عذاب کا انکار کہ جیسے دنیا میں عذاب کی وعیدیں سناتے ہیں اور عذاب نہیں آتا ایسے ہی موت کے بعد اٹھایا جانا اور عذاب ہونا یہ بھی ویسی ہی بات ہے جو حقیقت میں واقع ہونے والی نہیں۔ ان لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اللہ ﷻ نے عذاب مؤخر کر رکھا

ہے اس کا وقت معین ہے چنانچہ حکمت کے مطابق وقتِ مقرّرہ پر اللہ ﷻ عذاب بھیج دے گا جب فی الواقع عذاب آپہنچے گا تو پھر وہ ٹلے گا نہیں اور یہ اس کا مذاق اڑانے کا انجام بھی دیکھ لیں گے۔

علمی بات: اس عذاب سے مراد یا تو دنیا کا عذاب ہے یا آخرت کا، اگر دنیوی مراد ہو تو یہ وہ عذاب ہے جو غزوۂ بدر میں ان کو ذِلّت آمیز شکست کی صورت میں حاصل ہوا تھا اور اگر اس سے آخرت کا عذاب مراد ہے تو وہ قیامت کے بعد ان پر نازل کیا جائے گا۔

آیت نمبر ۹: ایک غیر تربیت یافتہ انسان کی کم ظرفی کا بیان ہے۔ کسی راحت کے بعد تکلیف میں مبتلا ہونے پر وہ مایوس ہو کر شکوہ کرنے لگتا ہے بلکہ پچھلی راحتوں کو بھی فراموش کر ڈالتا ہے جب کہ مؤمنانہ طرزِ عمل یہ ہے کہ مصیبت پر صبر کیا جائے۔

علمی بات: اس آیت کی تفسیر میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ اس آیت میں اَلْاِنْسَان سے مراد مطلق انسان ہے پھر آیت: ۱۱ میں اس سے نیک اور صبر کرنے والے مسلمانوں کا استثناء فرمایا ہے جیسا کہ سورۃ العصر میں ہے۔ (سورۃ العصر ۱۰۳: آیت: ۱ تا ۳) قسم ہے (تیزی سے گزرتے ہوئے) زمانے کی۔ یقیناً انسان نقصان میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیئے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی اور اسی طرح سورۃ المعارج کی آیات ۱۹ تا ۲۳ میں بھی ہے: بے شک انسان بہت کم حوصلہ پیدا کیا گیا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا جاتا ہے اور جب خوش حالی ملتی ہے تو کنجوس بن جاتا ہے۔ سوائے (ان کے جو) نماز ادا کرنے والے ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہاں انسان سے کافر انسان مراد ہے اور اس کی نظیر یہ آیت ہے: (سورۂ یوسف ۱۲: آیت: ۸۷) اور اللہ ﷻ کی رحمت سے مایوس مت ہو کیونکہ اللہ ﷻ کی رحمت سے صرف کافر مایوس ہوتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ آیت تمام کافروں کے متعلق نازل ہوئی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ آیت کسی خاص کافر کے متعلق نازل ہوئی ہو۔

ایک رائے ہے کہ یہ آیت ولید بن مغیرہ کے متعلق نازل ہوئی ہے اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن اُبی امیہ مخزومی کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مصیبت میں اللہ ﷻ کی رحمت سے مایوس ہونا اور راحت میں اترانا اور شیخی بگھارنا کفار کا شیوہ ہے۔

آیت نمبر ۱۰: غیر تربیت یافتہ انسان نعمت ملنے پر اتراتا اور تکبر کرتا ہے۔ جب کہ مؤمنانہ طرزِ عمل نعمت پر شکر کرنا ہے۔ یعنی مصیبت کے بعد اگر خدا آرام و آسائش نصیب کرے تو سمجھتا ہے کہ گویا میرے رب نے ہمیشہ کے لئے مصائب و تکالیف کا خاتمہ کر دیا، جب کہ اس وقت غافل انسان مغرور ہو کر شیخیاں بگھارتا ہے اور اتراتا پھرتا ہے حالانکہ اسے چاہیئے تھا کہ پچھلی حالت یاد کر کے اللہ ﷻ کا شکر ادا کرتا اور اس کا احسان مند ہو کر اللہ ﷻ کے سامنے جھکتا۔

عملی پہلو: انسان کامل وہی ہے جو ہر رنج و راحت اور تغیر و تبدل میں دستِ قدرت کی پوشیدہ طاقت کا مشاہدہ کرے، فانی راحت و رنج اور اس کے صرف مادی اسباب پر دل نہ لگائے۔ عقلمند کا کام یہ ہے کہ ہر حال میں شکر ادا کرتا رہے یا صبر کے کام سے اور اسباب سے زیادہ مسبب الاسباب کی طرف نظر کرے، اسی سے اپنا رشتہ مضبوط باندھے ہر کیفیت میں اُمیدِ باری تعالیٰ کا دامن تھامے رکھے اور خالقِ کائنات کی طرف متوجہ رہے اور اس سے اپنا تعلق مضبوط کرے کہ رنج و تکلیف میں بے ساختہ اِنَّا لِلّٰہِ اور راحت و آرام میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اس کے زبان سے جاری ہو۔

آیت نمبر ۱۱: اس آیت میں مؤمنین کا طرزِ عمل بیان کیا گیا ہے۔ یعنی گزشتہ آیات میں بیان کی گئی کمزوریوں سے ایمان والے مستثنیٰ ہیں جن میں دو صفات پائی جائیں: ۱۔ صبر ۲۔ عمل صالح

ایسے لوگ اللہ ﷻ کے ہر فیصلہ پر راضی ہوتے ہیں۔ ان کے لئے بخشش اور بہت بڑی نعمت کی بشارت ہے۔

علمی بات: اس مقام پر صبر کا لفظ مستقل مزاجی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے یعنی وہ لوگ جو نہ تو مصیبت کے وقت دل برداشتہ اور مایوس ہوں بلکہ صبر و ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے برداشت کریں اور اسی طرح کسی خوشی کے موقع پر آپے سے باہر نہ ہوں بلکہ اپنے آپ کو قابو میں رکھیں اور ہر حال میں اللہ ﷻ کا شکر بجا لائیں اور مصیبت یا خوشی کے مواقع پر ان کی طبیعت میں غیر سنجیدہ قسم کا اتار چڑھاؤ نمایاں نہ ہو بلکہ وہ ہر حال میں اپنے رویہ و عملی توازن کو برقرار رکھتے ہیں چنانچہ نہ مال و دولت اور آسودگی ان کا مزاج خراب کرتی ہے اور نہ ہی تنگی و نامساعد حالات کے دوران اپنی ہمت ہار بیٹھتے ہیں ایسے ہی لوگوں کے قصور اللہ ﷻ معاف کرتا ہے اور ان کے نیک کاموں کے عوض انہیں بہت زیادہ اجر بھی عطا فرماتا ہے۔

مؤمن کے لئے مصیبت اور راحت دونوں کا خیر ہونا احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں:

۱۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: " مسلمان کے حال پر تعجب ہوتا ہے، اس کے ہر حال میں خیر ہے اور یہ مؤمن کے سوا اور کسی کا وصف نہیں ہے، اگر اس کو راحت پہنچے تو شکر کرتا ہے اور وہ اس کے لئے خیر ہے اور اگر اس کو مصیبت پہنچے تو صبر کرتا ہے اور وہ (بھی) اس کے لئے خیر ہے"۔ (صحیح مسلم)

۲۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "نہیں ہے کوئی مسلمان جس کو کانٹا چبھے یا اس سے بڑی تکلیف پہنچے مگر اس کے گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں۔" (مسند احمد)

۳۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن کو جو بھی درد ہو یا تھکاوٹ ہو یا بیماری ہو، یا غم ہو یا فکر اور پریشانی ہو تو اللہ ﷻ اس کی وجہ سے اس کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

۴۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بڑا اجر، بڑی مصیبت کے ساتھ ہے، اور اللہ ﷻ جب کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو انہیں آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے جو راضی ہوا اس کے لئے اللہ ﷻ کی رضا ہے، اور جو ناراض ہوا اس کے لئے اللہ ﷻ کی ناراضگی ہے۔ (سلسلۃ الصحیحہ)

۵۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اسی لئے قیامت کے دن جب مصیبت زدہ ثواب سے نوازے جائیں گے (تو یہ دیکھ کر) صحت اور آرام والے خواہش کریں گے کہ کاش! دنیا میں ان کے چمڑے قینچیوں سے کاٹ دیے جاتے (تاکہ آج وہ بھی بڑے ثواب کے حقدار ہوتے)۔" (سنن ابن ماجہ)

آیت نمبر ۱۲: کافروں کے دو اعتراضات کا ذکر:

۱۔ رسول ﷺ اللہ ﷻ کے رسول ہیں تو ان پر کوئی خزانہ کیوں نازل نہیں ہوا؟

۲۔ کوئی فرشتہ ان کے ساتھ ان کی حفاظت اور اظہارِ عظمت کے لئے کیوں نازل نہیں ہوا؟

رسول اللہ ﷺ کو ان بے ہودہ اعتراضات پر تسلی دی گئی ہے اور نافرمانوں کو ان کے انجام سے خبردار کرتے رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔

شانِ نزول: عبد اللہ بن اُبی امیہ مخزومی نے رسول کریم ﷺ سے کہا تھا کہ اگر آپ سچے ہیں اور آپ ﷺ کا خدا ہر چیز پر قادر ہے تو اس نے آپ پر خزانہ کیوں نہیں اتارا یا آپ ﷺ کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا جو آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی دیتا، اس پر یہ آیت نازل فرمائی۔

علمی بات: کفار کا یہ کہنا تھا کہ جو قرآن حکیم آپ ہمیں پڑھ کر سناتے ہیں اس میں تو ہمارے خداؤں کو بہت بُرا بھلا کہا گیا ہے اس لئے ہم اس قرآنِ حکیم کو تو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ہاں اگر آپ ایسا قرآنِ حکیم لے آئیں جس میں ہمارے بُتوں سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا گیا ہو تو ہم آپ پر ایمان لا سکتے ہیں۔ دوسرا اعتراض انہوں نے یہ کیا کہ اگر آپ ﷺ سچے نبی ہوتے تو آپ ﷺ کے پاس سونے چاندی، لعل وجواہرات کے خزانے ہوتے جنھیں آپ ﷺ لوگوں میں تقسیم کرتے اور لوگ آپ ﷺ کی بات مانتے یا آپ ﷺ کے ہمراہ کوئی فرشتہ ہوتا جو لوگوں کو آپ ﷺ کی صداقت کا یقین دلاتا اور جو ماننے سے انکار کرتا اس کی گردن مروڑ کر رکھ دیتا۔ آپ کا حال یہ ہے کہ ہم آپ ﷺ پر آوازیں کستے ہیں۔ پتھر مارتے ہیں۔ غلاظت پھینکتے ہیں۔ راستہ میں کانٹے بچھاتے ہیں اور ہمیں تو کبھی سر درد بھی نہیں ہوا۔ یقیناً حضور اکرم ﷺ کو ان کی اس قسم کی ہرزہ سرائیوں پر دکھ ہوتا تھا چنانچہ اللہ ﷻ فرماتا ہے کہ اے محبوب! یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ ان کی رضا جوئی کے لئے کتاب میں ردوبدل کردیں یا دولت کی کمی اور کسی فرشتہ کے ہمراہ نہ ہونے کی وجہ سے کچھ دل گرفتگی محسوس کریں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ یعنی آپ کے لئے یہ تو ممکن نہیں ہے کہ جو وحی آپ پر نازل کی جارہی ہے، اس کا کوئی حصہ آپ ان لوگوں کی حرکات سے تنگ دل ہو کر یا ان کو نصیحت بے سود سمجھ کر چھوڑ بیٹھیں۔ لہٰذا ایسی باتوں سے آپ زیادہ رنجیدہ نہ ہوں، کیونکہ آپ کا کام تو یہ ہے کہ انہیں حقیقت سے آگاہ فرمادیں اس کے بعد یہ لوگ مانیں یا نہ مانیں، یہ خود ان کے اختیار میں ہے اور اللہ ﷻ خود ان سے نمٹ لے گا۔

آیت نمبر ۱۳: مشرکین و کفار کا اعتراض: وہ کہتے ہے کہ قرآنِ حکیم اللہ ﷻ کا کلام نہیں ہے بلکہ پیغمبر ﷺ کا بنایا ہوا کلام ہے۔ (معاذ اللہ)

انہیں قرآنِ حکیم کے مقابلے میں دس سورتیں پیش کرنے کا چیلنج دیا گیا ہے۔

اس کام کے لئے جس کو چاہے بلالیں اور چاہے جس کی مدد لے لیں اور اس چیلنج کو پورا کرکے دکھائیں۔

علمی بات: مشرکین نبی ﷺ سے آپ کی نبوت پر معجزہ طلب کرتے تھے، آپ کو بتایا گیا کہ آپ یہ کہیں کہ میری نبوت پر معجزہ یہ قرآنِ حکیم ہے۔ نبی ﷺ نے اس قرآنِ حکیم کے ساتھ چیلنج کیا کہ اگر یہ کسی انسان کا بنایا ہوا کلام ہے تو تم بھی اس جیسا کلام بنا کر لے آؤ لیکن آپ ﷺ کے مخالفین باوجود یہ کہ

عرب میں ان کی فصاحت و بلاغت مُسلّم تھی کوئی شخص قرآنِ حکیم کے مثل کلام بنا کر نہیں لا سکا، قرآنِ حکیم نے کئی طرح سے یہ چیلنج پیش کیا ہے: چنانچہ (سورہ بنی اسرائیل ۱۷، آیت: ۸۸) میں ہے آپ ﷺ کہیئے اگر تمام انسان اور جن مل کر اس قرآنِ حکیم کی مثل لانا چاہیں تو وہ اس کی مثل نہیں لا سکتے، خواہ وہ ایک دوسرے کی مدد (بھی) کریں اور زیرِ تفسیر آیت میں دس سورتوں کی مثل لانے کا چیلنج دیا گیا ہے اور سورۃ البقرہ ۲، آیت: ۲۳ اور سورۂ یونس ۱۰، آیت: ۳۹ میں کسی ایک سورت کی مثل لانے کا چیلنج دیا گیا ہے۔

آیت نمبر ۱۴: چیلنج قبول نہ کرنے کی صورت میں ثابت ہو جائے گا کہ قرآنِ حکیم اللہ ﷻ کا کلام اور اس کے کامل علم کا مظہر ہے۔ وہی معبودِ حقیقی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی ایسی ذات نہیں جو ایسا کلام نازل کر سکے۔ لہٰذا اللہ ﷻ ہی کی اطاعت قبول کرنے اور اسی کی وحدانیت تسلیم کر کے اس کے کلام کو برحق ماننے کا حکم دیا گیا۔

علمی بات: نبی کریم ﷺ سے کہا گیا ہے کہ ان مشرکین سے کہہ دیں کہ اگر قرآنِ حکیم کی دس سورتوں کی مثل لانے میں تمہارے خود ساختہ معبود تمہاری مدد نہ کر سکیں اور تم خود بھی اس کی مثل دس سورتیں نہ لا سکو تو خوب جان لو اور اس بات کا کامل یقین رکھو کہ یہ قرآنِ حکیم آسمان سے محمد ﷺ پر اللہ ﷻ کے علم اور اس کے اِذن سے نازل ہوا ہے اور محمد (ﷺ) نے اسے اپنی طرف سے بنا کر ہم پر افتراء نہیں کیا اور یہ بھی یقین رکھو کہ مخلوق کی عبادت کا مستحق صرف اللہ ﷻ ہے اور وہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے لہٰذا اے مشرکو! تم بُت پرستی کو ترک کر دو اور اللہ وحدہ کی عبادت کرو۔

مشرکین سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تم قرآنِ حکیم کا مثل بنانے کے لئے اپنے بڑے بڑے فصیح و بلیغ شاعروں اور خطیبوں کو دعوت دو اور وہ اس دعوت کو قبول کرنے کی جرأت نہ کر سکیں تو پھر تم بھی جان لو کہ یہ اللہ ﷻ کا کلام ہے اور یہ بھی یقین کر لو کہ اس کی ذات کے سوا کوئی معبود نہیں۔ دیکھو! اب تو حقیقت روشن ہو گئی اور حق واضح ہو گیا تو کیا اب بھی اسلام لانے میں پس و پیش کرو گے۔

آیت نمبر ۱۵: دنیا پرستوں کا بیان ہے۔ یعنی صرف دنیا اور اس کی زیب و زینت چاہنے والوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دنیا میں ہی دے دیا جاتا ہے۔

علمی بات: کافر لوگ جو آخرت پر تو ایمان نہیں رکھتے، اور جو کچھ کرتے ہیں، دنیا ہی کی خاطر کرتے ہیں، ان کے اچھے اور رفاہی کاموں، مثلاً خدمتِ خلق اور بھلائی کے دیگر کام وغیرہ کا صلہ دنیا ہی میں دے دیا جاتا ہے، آخرت میں ان کو کوئی ثواب نہیں ملتا، کیونکہ ایمان کے بغیر آخرت میں کوئی نیکی معتبر نہیں ہے۔ اسی طرح اگر مسلمان کوئی نیک کام صرف دنیوی شہرت یا دولت وغیرہ حاصل کرنے کے لئے کرے تو اسے دنیا میں تو وہ شہرت یا دولت مل سکتی ہے۔ لیکن اس نیکی کا ثواب آخرت میں نہیں ملتا۔ بلکہ اعمال میں اخلاص کے فقدان کی وجہ سے اُلٹا گناہ ہوتا ہے کیونکہ آخرت میں وہی نیکی معتبر ہے جو اللہ ﷻ کی خوشنودی حاصل کرنے کی نیت سے کی گئی ہو۔

ایک جاہلانہ اعتراض کا جواب: یہاں بہت سے مسلمانوں کی اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ہو گیا کہ کافر تو مزے اڑاتے ہیں اور ہم تکلیف میں ہیں اوّل تو نہ سارے مسلمان تکلیف میں ہیں اور نہ سارے کافر راحت میں ہیں دوسرے کافر کو آخرت میں آرام ملتا ہی نہیں اس کے اعمال کا بدلہ یہیں دیا جا رہا ہے جب کہ مسلمانوں کے اعمال کا بدلہ محفوظ کر لیا گیا ہے۔ پھر جو تکلیفیں ہیں ان پر بھی ثواب ملے گا پھر ہمیں کس بات پر مایوسی ہے لہٰذا ہمیں اللہ ﷻ کا حکمت پر مبنی قانون سمجھنا چاہیئے جن کافروں کو دیکھ کر ہم متاثر ہوتے ہیں وہ آخرت کے اعتبار سے تو انتہائی ذلّت میں ہوں گے حتی کہ بعض نادان یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ غیروں کے لئے محلات اور مسلمانوں سے صرف وعدۂ جنّت یہ سب ناسمجھی و گمراہی کی باتیں ہیں جن کے ذریعہ بعض نادان مسلمان اللہ ﷻ کے قانون پر اعتراض کرتے ہیں اور بالآخر کفر و ضلالت کے گڑھے میں جا گرتے ہیں، ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اس وقت آپ ﷺ ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے آپ ﷺ کے نیچے کوئی نرم بچھونا نہیں تھا اور آپ ﷺ کے جسم مبارک پر چٹائی کی بناوٹ کے نشان پڑ گئے تھے اور تکیہ بھی چمڑے کا تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! آپ اللہ ﷻ سے دعا کیجئے تاکہ وہ آپ ﷺ کی اُمّت کو مالی وسعت عطا فرما دے۔ کیونکہ فارس و روم کے لوگوں کو مالی وسعت دی گئی ہے حالانکہ وہ اللہ ﷻ کی عبادت نہیں کرتے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے خطاب کے بیٹے! تم ابھی تک ان ہی خیالات میں مبتلا ہو؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کی مرغوب چیزیں انہیں دنیا میں دے دی گئی ہیں۔ ایک اور روایت میں یوں ہے کہ کیا تم لوگ اس پر راضی نہیں ہو کہ مرغوب چیزیں ان کے لئے دنیا میں ہوں اور ہمارے لئے آخرت میں ہوں۔ (صحیح بخاری)

آیت نمبر ١٦: دنیا کے طلب گاروں کے لئے آخرت میں دوزخ کی آگ کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ دنیا میں ان کے کئے گئے تمام بظاہر اچھے کام آخرت کے اعتبار سے ضائع ہو جائیں گے۔

علمی بات: ان آیات میں اوّل تو ان لوگوں کی مذمّت فرمائی جو دنیا کے طالب ہیں دنیا ہی ان کا مقصود و مطلوب ہے اور فقط دنیا کو مطمع نظر بنا لینے کی وجہ سے آخرت کے طلب گار نہیں اور ایمان لانے کے روادار نہیں، دنیا اور دنیا کی زینت ہی ان کے نزدیک سب سے بڑی چیز ہے ایسے لوگ اگر کچھ ایسے اعمال کر لیتے ہیں جو اچھائی کے زمرے میں آسکتے ہیں مثلاً صلۂ رحمی یا فقراء و مساکین پر خرچ کرنا وغیرہ تو دنیا ہی میں ان کا بدلہ دے دیا جائے گا اور چونکہ اچھے اعمال کو کارگر بنانے کی شرط اوّل یعنی ایمان مفقود ہے لہٰذا آخرت میں ضائع ہو جائیں گے اور ان کے عوض کچھ نہ ملے گا، چنانچہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک اللہ سبحانہ و تعالیٰ کسی مؤمن کے ساتھ ایک نیکی کے معاملے میں بھی ظُلم نہیں فرماتا۔ اس کے بدلے اسے دنیا میں بھی عطا کرتا ہے اور آخرت میں بھی اس کی جزا دی جاتی ہے۔ رہا کافر، اُسے نیکیوں کے بدلے میں جو اس نے دنیا میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے لئے کی ہوتی ہیں، اسی دنیا میں کھلا (پلا) دیا جاتا ہے حتیٰ کہ جب وہ آخرت میں پہنچتا ہے تو اس کے پاس کوئی نیکی باقی نہیں ہوتی جس کی اسے جزا دی جائے۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ١٧: اہلِ فطرت کا بیان ہے جو اپنے رب کی جانب سے واضح دلیل پر قائم ہیں۔ دلیل سے مراد وہ فطرتِ توحید ہے جس پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ گواہ سے مراد قرآنِ حکیم یا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جو اس فطرت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ قرآنِ حکیم سے پہلے رحمت بھرے احکاماتِ شریعت تورات میں تھے۔ اب یہ رحمت قرآنِ حکیم کی صورت میں ہے۔ قرآنِ حکیم کے برحق ہونے پر شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لوگوں کی اکثریت ایمان لانے سے محروم ہے جن کا ٹھکانہ جہنّم ہے۔

علمی بات: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "ہر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی، نصرانی یا مشرک بناتے ہیں" عرض کیا گیا: اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جو اس سے پہلے مر جائے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اللہ سبحانہ و تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ وہ کیا عمل کرتے"۔ (صحیح بخاری)

فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: "قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس اُمّت کے جس یہودی، یا عیسائی نے بھی میری نبوّت کے بارے میں سنا اور پھر مجھ پر ایمان نہ لایا وہ جہنّم میں جائے گا۔" (صحیح مسلم)

(اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ) شروع میں جو ہمزہ ہے یہ استفہام انکاری کے لئے ہے مطلب یہ ہے کہ ایک وہ شخص ہے جو فطرتِ توحید اور دینِ فطرت کو تھامے ہوئے ہے اس کی سچائی کا عقیدہ رکھتا ہے اور اس کے پاس اس کی سچائی کے دو گواہ موجود ہیں ایک تو خود قرآنِ حکیم کا اعجاز یعنی اس کی فصاحت و بلاغت اور اسلوبِ بیان کہ جس نے عرب کے بڑے بڑے فصیح ادیب اور شعراء کو اس جیسا کلام لانے سے عاجز کر دیا اور دوسرا گواہ دنیا میں قرآنِ حکیم کے آنے سے پہلے ہی موجود ہے یعنی تورات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی جو کتاب حضرت موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے وہ امام بھی ہے اور دینِ فطرت کی تصدیق بھی کرتی ہے اور امتثال اوامر پر جو ثواب ملنے کے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے وعدے فرمائے ہیں وہ تورات میں بھی ہیں اور قرآنِ حکیم میں بھی ہیں تورات ان کی تصدیق کرتی ہے لہٰذا وہ سراپا رحمت ہے۔ تورات کی گواہی بھی قرآنِ حکیم کی سچائی کے لئے کافی ہے۔ اب سمجھ لیا جائے کہ جو شخص دینِ فطرت کو تھامے ہوئے ہے اور قرآن و تورات کی دلیل اور حجت کے ساتھ اس پر قائم ہے۔ کیا وہ شخص اس کے برابر ہو سکتا ہے جو منکر ہے یعنی ایسا نہیں ہو سکتا۔

اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ یہ لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ مفسرینِ کرام فرماتے ہیں کہ ان ایمان لانے والوں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مراد ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ وہ تمام افراد مراد ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ (اور کافروں کی جماعتوں اور گروہوں میں سے جو شخص قرآنِ حکیم کا منکر ہو اس سے یہ وعدہ ہے کہ وہ دوزخ میں داخل ہوگا) فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ (تو اے مخاطب تو قرآنِ حکیم کی طرف سے شک میں مت پڑ) اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ (بے شک وہ تیرے رب کی طرف حق ہے) وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (لیکن بہت سے لوگ ایمان نہیں لاتے)۔ اس میں واضح طور پر بتا دیا کہ اہلِ اسلام کے علاوہ جتنے بھی گروہ اور جماعتیں ہیں وہ سب دوزخ میں جانے والے ہیں خواہ بظاہر کیسے ہی اچھے عمل کرتے ہوں اور خواہ اپنے دین کو آسمانی دین بتاتے ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضے میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان ہے میرے نبی ہونے کی خبر جس کسی کو بھی پہنچے گی اور وہ اس دین پر ایمان

لائے بغیر مر جائے جو دین میں دے کر بھیجا گیا ہوں تو وہ ضرور دوزخ والوں میں سے ہو گا چاہے یہودی ہو یا نصرانی (صحیح مسلم) یہود اور نصاریٰ کا ذکر خصوصیت سے اس لئے فرمایا کہ وہ اپنے پاس دین سماوی کے مدعی ہیں۔

علمی بات: اس آیت میں نبی کریم ﷺ پر ایمان کو قیامت تک مدارِ نجات قرار دینے کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب اور ملّتوں کے ماننے والوں میں سے جو شخص بھی آپ ﷺ کا انکار کرے گا اس کا ٹھکانہ جہنّم ہے کیونکہ ان کی شریعتیں آپ ﷺ کی شریعت آنے کی وجہ سے منسوخ ہو چکی ہیں اور آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس قیامت تک خاتم النبیین بنا دی گئی ہے، لہٰذا اب ان کی نجات کا دارو مدار آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان لانے اور آپ ﷺ کی شریعت کی پیروی کرنے میں ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرۃ ؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ جو یہودی یا نصرانی میری دعوت سنے اور اس کے باوجود میری لائی ہوئی تعلیمات پر ایمان نہ لائے تو وہ اہلِ جہنّم میں سے ہو گا۔ اس سے ان لوگوں کی غلط فہمی دور ہو جانی چاہیئے جو بہت سے یہود و نصاریٰ یا دوسرے مذہب کے پیروکاروں کو بعض ظاہری اعمال کی بناء پر حق پر سمجھتے ہیں اور رسول کریم ﷺ اور قرآنِ حکیم پر ایمان کے بغیر صرف ظاہری اعمال کو نجات کے لئے کافی سمجھتے ہیں، یہ قرآنِ حکیم کی آیت مذکورہ اور حدیث کی اس صحیح روایت سے کھلا تصادم ہے۔ العیاذ باللہ۔

آیت نمبر ۱۸: اِفْتِرَاء سے مراد دین میں کوئی بات خود سے گھڑ کر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف منسوب کر دینا ہے یا اسے شریعت سے ثابت کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لئے شریک ہونے کی جھوٹی بات اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف منسوب کرنے والے سب سے بڑے ظالم ہیں۔ روزِ قیامت کئی گواہ ان کے اس ظلم پر گواہی دیں گے۔ ان پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی لعنت ہو گی۔

علمی بات: جھوٹ باندھنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ اگر کوئی شخص اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی کتاب یا اس کے رسول ﷺ پر ایمان نہیں لاتا تو یہ بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر جھوٹ باندھنا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات، صفات یا عبادت میں اس کا شریک ثابت کرنا بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر جھوٹ باندھنا ہے کیونکہ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی طرح جو شخص کوئی غلط دعویٰ کرتا ہے وہ بھی مفتری ہے جیسے مسیلمہ کذاب یا مرزا قادیانی نے نبوّت کا دعویٰ کیا تو انہوں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر جھوٹ باندھا کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تو انہیں نبی بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ یہ ساری باتیں اِفْتِرَاءِ عَلَى اللّٰهِ اور بہت بڑا جرم ہیں۔

علمی بات: گواہوں سے کون مراد ہیں؟

۱۔ وہ فرشتے جو انسانوں کے اعمال لکھنے پر مقرر ہیں یعنی کراماً کاتبین۔

۲۔ انبیاء ورسل علیہم السلام جو اپنی اپنی اُمّتوں کے بارے میں گواہی دیں گے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "پس اس وقت کیا حال ہو گا جب ہم ہر اُمّت سے ایک گواہ لائیں گے اور ہم آپ ﷺ کو ان سب پر گواہ (بنا کر) لائیں گے۔" (سورۃ النساء ۴، آیت: ۴۱)

۳۔ آپ ﷺ کی اُمّت کے مؤمنین بھی گواہی دیں گے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا "(اور اے مسلمانو!) اسی طرح ہم نے تمہیں بہترین اُمّت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور یہ رسول تمہارے حق میں گواہ ہو جائیں"۔ (سورۃ البقرہ ۲، آیت: ۱۴۳)

۴۔ انسان کے اپنے اعضاء وجوارح کی گواہی کے متعلق بھی موجود ہے کہ "آج کے دن ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے، اور ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے جو وہ کمایا کرتے تھے"۔ (سورۃ یٰس ۳۶، آیت: ۶۵) یہی بات سورۃ حٰمٓ السجدہ ۳۲، آیات: ۲۰، ۲۱ میں بھی بیان ہوئی ہے۔
جس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے اعمال کی ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ (سورۃ النور ۲۴، آیت: ۲۴)

۵۔ زمین گواہی دے گی۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "اس دن وہ (زمین) اپنی خبریں بیان کر دے گی"۔ (سورۃ الزلزال ۹۹، آیت: ۴)

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو سعید خدری ؓ سے روایت ہے کہ مؤذن کی آواز جتنی مسافت پر پہنچے گی اور جہاں تک جن وانس اس کو سنیں گے قیامت کے دن اس کی شہادت دیں گے۔ (صحیح بخاری)

حضرت ابو سعید خدری ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ مال بڑا سر سبز اور شیریں ہے اور مسلمان کا اچھا ساتھی ہے اور جو مال قیدی اور یتیم (ضرورت مند) مسافر کو دیا جائے گا، خود (وہ مال) اس کی گواہی دے گا اور جو شخص بغیر حق کے مال لیتا ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو کھاتا تو ہو اور سیر نہ ہوتا ہو۔

قیامت کے دن یہ مال اس شخص کے خلاف شہادت دے گا۔ (صحیح مسلم)

حضرت ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ "جو شخص جس مقام کے قریب سجدہ کرے گا وہاں درخت ہو یا پتھر قیامت کے دن وہ شہادت دے گا۔" غرضیکہ نیکی اور بدی کا ہر مقام اور شجر اور حجر بھی انسان کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دیں گے۔

اس دن کفر، شرک، اور معصیت کے سارے پول کھل جائیں گے۔ ہر چیز کے متعلق گواہ پیش ہو کر بتا دیں گے کہ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اس رب تعالیٰ پر جھوٹ باندھا جو ان کا خالق، پرورش کرنے والا، نعمتیں بخشنے والا اور قائم رکھنے والا ہے۔ دیکھو! انہوں نے کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کیا۔

علمی بات: مشرکین اللہ ﷻ کے لئے اولاد تجویز کرتے تھے اور اس کے لئے شریک ٹھہراتے تھے اور جب انہیں اس بارے میں نصیحت کی جاتی تھی تو کہتے تھے۔ (کہ یہ اللہ ﷻ کے یہاں ہمارے لئے سفارش کر دیں گے) اور یوں بھی کہتے تھے۔ (کہ ہم ان کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ ﷻ کے قریب کر دیں گے) ظاہر ہے کہ یہ باتیں انہوں نے خود ہی تجویز کر لیں جب اللہ ﷻ کی طرف سے کسی چیز کی خبر نہ دی گئی ہو تو اسے اللہ ﷻ کی طرف منسوب کرنا یہ افتراء ہے اور بہتان ہے اور اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھنا ہے، اللہ ﷻ کے لئے شریک تجویز کرنا پھر یہ کہنا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ یہ معبود اللہ ﷻ کے ہاں ہماری سفارش کر دیں گے اور یہ کہ ہمیں اللہ ﷻ سے قریب کر دیں گے اس کا معنی یہ نکلتا ہے کہ اللہ ﷻ کی طرف سے ان کو یہ بات بتا دی گئی حالانکہ اللہ ﷻ کی کتابیں اور اللہ ﷻ کے نبی علیہ السلام اس کے خلاف بتاتے رہے لہٰذا ان لوگوں کے یہ سب دعوے اللہ ﷻ پر بہتان ہیں اسی بنا پر اللہ ﷻ نے فرمایا کہ اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ ﷻ پر افتراء کرے۔ پس ایسے لوگوں پر اللہ ﷻ کی لعنت یعنی رحمت سے دوری کی گئی ہے۔

علمی بات: یعنی قرآنِ حکیم جھوٹ اور افتراء نہیں۔ اللہ ﷻ کا سچا پیغام ہے جس کو قبول کرنا ضروری ہے خوب سمجھ لو کہ اس شخص سے زیادہ ظالم کوئی نہیں ہو سکتا جو اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھے۔ مثلاً جو کلام اللہ ﷻ کا نہ ہو اور کہہ دے کہ یہ اس کا کلام ہے یا واقعی اس کا ہو اور اللہ ﷻ کے بار بار فرمانے کے باوجود کہ یہ میرا کلام ہے اور روشن دلائل کے باوجود جھٹلاتا رہے اور کہتا ہے کہ اس کا نہیں بلکہ آپ ﷺ اس کو اپنی طرف سے بنا کر لاتے ہیں۔ (معاذ اللہ)

آیت نمبر ۱۹: لوگوں کو اللہ ﷻ کی اطاعت سے روکنے اور اللہ ﷻ کے احکامات پر اعتراض کرنے والے ظالموں کا بیان ہے جن پر اللہ ﷻ کی خصوصی لعنت اور پھٹکار ہے۔ یہ لوگ آخرت کی پیشی کے منکر ہیں۔

علمی بات: یہاں عِوَجاً کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ﷻ کے دین میں عیب نکالنا، طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کرنا، مختلف قسم کے حیلے اور جھوٹے پروپیگنڈے کرنا۔ گویا ظالم لوگ دینِ حق کے بارے میں طرح طرح کے اعتراضات نکال کر اس کو ٹیڑھا ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ دینِ اسلام سے خود بھی دور بھاگتے تھے اور جو لوگ اسلام قبول کر چکے ان کو بھی اس سے ہٹانا چاہتے تھے۔ یہی ہیں جو آخرت کے بھی منکر تھے یعنی اللہ ﷻ پر جھوٹے بہتان باندھنے والوں کا قیامت میں یہ حشر ہو گا کہ سب کے روبرو ان کے کرتوتوں کو ظاہر کرتے ہوئے اعلان کیا جائے کہ یہ ظالم اللہ ﷻ کی راہ یعنی دینِ اسلام سے روکتے تھے اور اس فکر میں لگے رہتے تھے کہ دینِ اسلام میں کجی اور شکوک و شبہات پیدا کر کے لوگوں کو اس دین کی اطاعت سے روکیں۔

علمی بات: جو لوگ ظلم و ناانصافی سے اللہ ﷻ کے کلام کو جھوٹا بتلاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر آخرت کے منکر ہیں دوسروں کو اللہ ﷻ کی راہ پر چلنے سے روکتے ہیں اور اس تلاش میں رہتے ہیں کہ سیدھے اور درست راستے کو ٹیڑھا اور غلط ثابت کریں۔ ایسے ظالموں پر اللہ ﷻ کی خاص طور پر لعنت ہے۔

آیت نمبر ۲۰: اللہ ﷻ کی راہ سے روکنے والوں کے لئے کوئی مددگار نہ ہو گا۔ انہیں دُگنا عذاب دینے کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود کفر و شرک کے مرتکب ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ ان کا حق سے اعتراض اس بنا پر تھا کہ انہوں نے حق دیکھنے اور سننے کی صلاحیت ہی استعمال نہ کی۔

علمی بات: یہ لوگ زمین میں اللہ ﷻ کو عاجز کرنے والے نہ تھے کہ کہیں جا کر چھپ جاتے اور اللہ ﷻ کی قدرت سے باہر ہو جاتے اور موت سے بچ جاتے جب دنیا میں اللہ ﷻ کو عاجز کر کے کہیں نہیں جا سکتے تو آخرت میں کیسے چھوٹ کر جا سکتے ہیں۔ جہاں حساب کے لئے جمع کئے جائیں گے۔

اور ان لوگوں کے لئے اللہ ﷻ کے سوا کوئی بھی مددگار نہیں ہو گا اور جن لوگوں کو انہوں نے سفارشی سمجھا تھا وہ کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکیں گے۔ ان کے لئے دُگنا عذاب ہے۔ ایک عذاب ان کے اپنے کفر کا اور دوسرا عذاب دوسروں کو ایمان سے روکنے کا اور کفر پر جمائے رکھنے کا۔ یہ لوگ سن نہیں سکتے تھے۔ یعنی حق سے دور بھاگتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی باتیں سننے کو اس قدر ناپسند کرتے تھے کہ گویا اپنی قوتِ سامعہ ہی ختم کر چکے تھے اور دیکھ نہیں پاتے تھے یعنی اللہ ﷻ کی

معرفت کی نشانیاں جو خود ان کے اندر اور دوسری مخلوقات اور تمام کائنات میں موجود ہیں ان سے قصداً اور ارادۃً اندھے بن جاتے تھے۔ ان کی ضد، عناد اور حق سے دور بھاگنے کی کوشش نے انہیں ایمان قبول نہ کرنے دیا، بلکہ وہ دوسروں کے ایمان قبول کرنے میں ہر طرح کی روکاوٹیں پیدا کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔

آیت نمبر ۲۱: یہی ہیں وہ لوگ جنہوں نے خود اپنا نقصان کیا کہ اللہ ﷻ کی عبادت کو چھوڑ کر پتھروں کی پوجا اختیار کی اور جنّت دے کر دوزخ مول لی۔ ایسے لوگ آخرت میں اپنے نقصان کے خود ذمہ دار ہوں گے۔ ان کے خود تراشیدہ معبود ان سے غائب اور گم ہو جائیں گے یعنی بُتوں کی سفارش کرنے کا جو ان کا خیال تھا اور یقین رکھتے تھے کہ بُت شفاعت کر کے انہیں بچالیں گے، ایسا ہرگز نہ ہو سکے گا۔

آیت نمبر ۲۲: روزِ قیامت یہ لوگ سب سے زیادہ خسارے میں ہوں گے۔

علمی بات: کفارِ مکّہ کی چودہ وجوہ سے مذمّت: اللہ ﷻ نے دو آیات ۱۸ اور ۱۹ میں کفارِ مکّہ کی سات وجوہات کی بنا پر مذمّت فرمائی تھی:

۱۔ وہ اللہ ﷻ پر جھوٹا بہتان تراشتے تھے فرمایا اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ ﷻ پر جھوٹا بہتان تراشے۔

۲۔ وہ ذلت اور رُسوائی کے ساتھ اللہ ﷻ کے سامنے پیش کئے جائیں گے، فرمایا: اور یہ لوگ اپنے رب کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔

۳۔ تمام گواہ ان کے خلاف گواہی دیں گے کہ انہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا تھا، فرمایا: اور تمام گواہ یہ کہیں گے کہ انہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا تھا۔

۴۔ وہ اللہ ﷻ کے نزدیک ملعون ہیں، فرمایا: سنو! ظالموں پر اللہ ﷻ کی لعنت ہے۔

۵۔ وہ اللہ ﷻ کے راستے سے لوگوں کو روکتے ہیں، فرمایا: جو اللہ ﷻ کے راستہ سے روکتے ہیں۔

۶۔ وہ اسلام کے خلاف شکوک اور شبہات ڈالتے ہیں فرمایا: اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں۔

۷۔ وہ آخرت کے منکر ہیں، فرمایا: وہ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں۔

آیات ۲۰ تا ۲۲ میں ان کی مزید سات وجوہ سے مذمت فرمائی ہے:

۱۔ وہ اللہ ﷻ کے عذاب سے بھاگ نہیں سکتے، فرمایا: یہ لوگ زمین میں (اللہ ﷻ کو) عاجز کرنے والے نہ تھے۔

۲۔ اللہ ﷻ کے عذاب سے بچانے کے لئے ان کا کوئی مددگار نہیں، فرمایا: اور نہ اس کے سوا ان کا کوئی مددگار تھا۔

۳۔ عذاب دُگنا کیا جائے گا، فرمایا: ان کے لئے عذاب کو دُگنا کیا جائے گا۔

۴۔ ان میں حق کو سننے کی طاقت ہے نہ دیکھنے کی، فرمایا: یہ (شدتِ کفر کی وجہ سے حق کو) سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور نہ یہ (بغض کی وجہ سے حق کو) دیکھتے تھے۔

۵۔ انہوں نے اللہ ﷻ کی عبادت کے بجائے بُتوں کی عبادت کی اور یہ ان کے گھاٹے اور خسارے کا سبب ہے، فرمایا: یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا۔

۶۔ انہوں نے دین کو دنیا کے بدلہ میں فروخت کر دیا اور اس میں ان کو دنیا میں یہ گھاٹا ہوا کہ انہوں نے عزت والی چیز کو دے کر ذلت والی چیز لے لی اور آخرت کا خسارہ یہ ہے کہ وہ ذلت والی چیز بھی ضائع اور ہلاک ہو گئی اور اس کا کوئی اثر باقی نہیں رہا فرمایا: اور جو کچھ یہ افتراء کرتے تھے وہ ان سے جاتا رہا۔

۷۔ چونکہ انہوں نے نفیس اور اعلیٰ چیز کو دے کر ناپاک، ادنیٰ اور بے فائدہ چیز پسند کی اس لئے ان کا خسارہ لازمی اور یقینی ہے، فرمایا: بلا شبہ یقیناً یہی لوگ آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

آیت نمبر ۲۳: سعادت مند لوگوں کی صفات کا بیان: ۱۔ وہ اللہ ﷻ کے کلام اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لاتے ہیں۔

۲۔ وہ اللہ ﷻ اور رسول اللہ ﷺ کے احکامات پر عمل کرتے ہیں۔ ۳۔ وہ عاجزی اختیار کرتے ہیں۔

علمی بات: الخبت اصل میں نشیبی اور نرم زمین کو کہتے ہیں۔ اس کے بعد لفظ الاخبات نرمی اور تواضع کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے وبشر المخبتین (۲۲:۳۴) اور عاجزی کرنے والوں کو خوشخبری سنادو۔

مفسرین کرام نے "اِخْبَاتْ" کے یہ معانی بیان فرمائی ہے: تواضع، جھکنا، عاجزی کرنا، مطمئن ہونا، ڈرنا، اخلاص کا مظاہرہ کرنا، خوف کرنا، رجوع کرنا، خشوع اور خضوع کرنا، تسلیم و رضا وغیرہ۔ اللہ ﷻ نے ایمان اور اعمالِ صالحہ کے ساتھ مسلمانوں کے مطمئن ہونے اور عاجزی و تواضع اختیار کرنے کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ اس

میں یہ اشارہ ہے کہ مسلمان جب اللہ ﷻ کی عبادت کریں تو عبادت کے وقت ان کے دل اللہ ﷻ کے ذکر سے مطمئن ہوں اور اللہ ﷻ نے جو ثواب کا وعدہ اور عذاب کی وعید کا ذکر فرمایا ہے اس پر دل سے یقین رکھنے والے ہوں اور اگر اخبات کو خشوع کے معنی میں لیں تو پھر اس میں یہ اشارہ ہے کہ جب مسلمان اعمال صالحہ کریں تو ان کو یہ ڈر اور خوف ہو کہ ان کی کسی کمی اور کوتاہی کی بناء پر ان کے نیک اعمال مسترد نہ کر دیئے جائیں لہٰذا بندۂ مؤمن اپنے نیک اعمال کی بنا پر تکبر میں مبتلا نہ ہو۔

عملی پہلو: اخبتوا کا لفظ ایک حقیقی مؤمن اور اس کے رب کے درمیان پائے جانے والے تعلق کی بہت ہی اچھی عکاسی کرتا ہے۔ مؤمن مکمل طور پر اللہ ﷻ اور اس کے بندوں کے لئے عاجزی و انکساری اختیار کرتا ہے۔ اللہ ﷻ کی طرف سے اس پر جو حالت بھی آتی ہے اس پر مطمئن ہوتا ہے اس کے نفس میں ایک ٹھہراؤ ہوتا ہے اس کا دل مطمئن ہوتا ہے اور اسے امن، قرار اور رضا کی کیفیت مل جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے ہمیشہ جنّت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کی بشارت دی گئی ہے۔

علمی و عملی بات: انبیاء کرام علیہم السلام کو جھٹلانے والی جماعت کے برعکس اہل ایمان اپنے پروردگار کے سامنے تواضع اختیار کرتے ہیں جو ایمان کا بہترین مظہر اور ایمان کی پختگی پر بہت بڑی دلیل ہے۔ اللہ ﷻ کی معرفت رکھنے والے اس عظیم اور اکمل ذات سے ڈرتے رہنے کو اپنے لئے معراج سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو اس عظیم ذات کے سامنے تکبر کرتے ہیں اور اس کی عبادت سے منہ موڑ لیتے ہیں وہ پستی و ذلت کی اتاہ گہرائیوں میں گرتے ہی چلے جاتے ہیں اور بالآخر اپنے بھیانک انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔

آیت نمبر ۲۴: کافر کو اندھے اور بہرے سے اور مؤمن کو دیکھنے اور سننے والے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کافر حق بات دیکھنے سے اندھا اور حق کے دلائل سننے سے بہرہ بنتا ہے۔ اس کے برعکس مؤمن حق دیکھ کر اس کی پیروی اور حق کے دلائل کو سن کر باطل سے اجتناب کرتا ہے۔ دونوں کے طرزِ عمل اور انجام کے مختلف ہونے کا بیان ہے۔

علمی و عملی بات: یہاں فریقین کے طرزِ عمل کی سادہ مثال سے وضاحت فرمائی ہے۔ مؤمن اپنی عقل سے کام لینے کے لئے اپنے اعضاء و جوارح سے کام لیتا ہے۔ وہ دیکھنے، سننے اور سمجھنے کے بعد حق بات قبول کرتا ہے اس پر عمل پیرا ہوتا ہے، یوں اُسے نجات اور کامیابی نصیب ہو جاتی ہے جب کہ کافر اپنے اعضاء و جوارح سے کام نہیں لیتا، لہٰذا وہ نہ ہدایت حاصل کرتا ہے نہ نصیحت سن سکتا ہے۔ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ ایسا سوال ہے جس کا جواب واضح ہے۔ یعنی کافر دنیا میں حق کی دلیل سننے کے بعد سنی ان سنی کر دیتا ہے اور حق کی نشانیاں و علامات دیکھ لینے کے بعد بھی پرواہ نہیں کرتا اس لئے وہ اندھے اور بہرے کی طرح ہے، جو دن کی روشنی میں بھی کان اور آنکھیں بند کر لینے کے سبب اندھیروں میں بھٹکتا پھرتا ہے، لیکن مؤمن حق کے دلائل سنتا ہے اور حق کی نشانیوں میں غور و فکر کرتا ہے اس لئے وہ سننے اور دیکھنے والے کی طرح ہے جو روشنی میں اپنی آنکھیں استعمال کرتے ہوئے اپنی منزل کی تلاش کر لیتا ہے، تو ظاہر ہے یہ دونوں برابر ہرگز نہیں ہو سکتے۔

نوٹ: آیات: ۲۵ تا ۶۸ حصہ اوّل حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ھود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام کے قصّوں میں دی گئی ہیں۔

آیت نمبر ۶۹: اللہ ﷻ نے انسانی صورت میں فرشتوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف بھیجا۔ فرشتوں کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں سلام اور ان کا جواب۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے میزبانی کی طور پر بھنے ہوئے بچھڑے کا گوشت پیش کیا۔

یہ فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی بشارت دینے اور قوم لوط کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے آئے تھے۔ یہ فرشتے انسانی شکل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے ہاں داخل ہوتے ہوئے سلام کرنا نہ صرف تمام الہامی تعلیمات میں رائج ایک سنّت ہے بلکہ آسمانی فرشتوں کی بھی صفت ہے اور اہل جنّت کے درمیان بھی ایک دوسرے کو سلام کرنے کا رواج عام ہوگا چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "مگر ایک بات ہو گی سلامتی ہی سلامتی کی۔" (سورۃ الواقعہ ۵۶، آیت: ۲۶)

علمی و عملی بات: اس آیت سے معلوم ہوا کہ سلام کہنا اور سلام کا جواب دینا انبیائے کرام علیہم السلام اور فرشتوں کی سنّت ہے، نیز گھر میں موجود اچھے کھانے سے مہمانوں کی تواضع و خدمت کرنا بھی انبیاء کرام علیہم السلام کی سنّت و طریقہ ہے۔

مہمان اور میزبان کے متعلق اسلام کا حکم: ا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ جو شخص اللہ ﷻ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسی کا اکرام کرے اور جو شخص اللہ ﷻ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کی دستور کے موافق ہر طرح سے عزت کرے۔ پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! دستور کے موافق کب تک ہے فرمایا ایک دن اور ایک رات اور میزبانی تین دن کی ہے اور جو اس کے بعد ہو وہ اس کے لئے صدقہ ہے اور جو اللہ ﷻ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ بہتر بات کہے یا خاموش رہے۔ (صحیح بخاری)

۲۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے "مہمان نوازی تین دن ہے اور خصوصی اہتمام ایک دن اور ایک رات کا ہے اور کسی مسلمان آدمی کے لئے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی کے ہاں (ہی) ٹھہرا رہے حتیٰ کہ اسے گناہ میں مبتلا کر دے۔" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اے اللہ ﷻ کے رسول ﷺ! وہ اسے گناہ میں کیسے مبتلا کرے گا؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "وہ اس کے ہاں ٹھہرا رہے اور اس کے پاس کچھ نہ ہو جس سے وہ اس کی میزبانی کر سکے (تو وہ غلط کام کے ذریعے سے اس کی میزبانی کا انتظام کرے)۔ (صحیح مسلم)

عملی پہلو: امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے فرمان کے مطابق ایک دن اور ایک رات کی مہمان نوازی کرنا واجب ہے۔ ایک دن اور ایک رات مہمان کی خاطر مدارات کرنی چاہیئے اور دوسرے اور تیسرے دن اس کو معمول کے مطابق کھانا کھلائے۔ مہمان تین دن سے زیادہ قیام نہ کرے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس کے زیادہ قیام کی وجہ سے میزبان اس کی غیبت کرے یا اس کی وجہ سے مہمان کے معمولات میں خلل ہو یا مہمان کی مصروفیات کی وجہ سے میزبان کو ضرر پہنچے یا وہ اس کے متعلق بدگمانی کرے اور گناہ میں مبتلا ہو، یہ اس صورت میں ہے جب مہمان، میزبان کے مطالبہ کے بغیر تین دن سے زیادہ قیام کرے لیکن اگر میزبان نے خود مہمان کو زیادہ ٹھہرنے کے لئے کہا ہو یا اس کو علم یا گمان ہو کہ اس کا زیادہ قیام میزبان پر بوجھ نہیں ہے بلکہ وہ اس پر خوش ہے تو پھر اس کے زیادہ قیام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

آیت نمبر ۷۰: فرشتوں کی کھانے کی طرف رغبت نہ کرنے پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خوف محسوس ہوا۔ جس پر مہمانوں کے فرشتے ہونے اور عذاب دینے کے لئے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی طرف بھیجے جانے کی وضاحت کی گئی ہے۔

علمی بات: چونکہ فرشتے انسانی شکل میں آئے تھے، اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام شروع میں انہیں انسان ہی سمجھے اور ان کی مہمانی کے لئے بھنے ہوئے بچھڑے کا گوشت لے آئے لیکن چونکہ وہ فرشتے تھے اور کچھ کھانے کی ضرورت نہیں پڑتی، اس لئے انہوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا، اس زمانے میں رسم یہ تھی کہ اگر کوئی شخص میزبان کے یہاں کھانا پیش ہونے کے بعد نہ کھائے تو یہ اس بات کی علامت سمجھی جاتی تھی کہ وہ مہمان کی حیثیت سے نہیں آیا بلکہ کسی اور ارادے سے آیا ہے، اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خوف محسوس کیا، اس موقع پر فرشتوں نے ان کے پاس بھیجے جانے کے مقاصد واضح کر دیئے۔

آیت نمبر ۷۱: فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور سیّدہ سارہ علیہا السلام کو بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام اور پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کی بشارت دی۔

حضرت سیّدہ سارہ علیہا السلام کو جب علم ہوا کہ ان کے مہمان فرشتے ہیں تو وہ بھی پاس آ کھڑی ہوئیں اور خوشی میں ہنس پڑیں، پھر فرشتوں نے حضرت سیّدہ سارہ علیہا السلام کو بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام اور پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کی خوش خبری دی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حضرت سیّدہ ہاجرہ علیہا السلام کے بطن سے ایک بیٹے یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام پہلے سے موجود تھے لیکن حضرت سیّدہ سارہ علیہا السلام کی کوئی اولاد نہ تھی، چنانچہ اللہ ﷻ نے انہیں اس نعمت سے نوازنے کی بشارت عطا کی ہے۔

آیت نمبر ۷۲: حضرت سیّدہ سارہ علیہا السلام نے بڑھاپے اور بانجھ پن کی وجہ سے بیٹے کی خوشخبری ملنے پر تعجب کا اظہار فرمایا۔

علمی بات: یعنی جب بیوی کی عمر ۹۰ سال کے لگ بھگ ہو اور شوہر ۱۰۰ سو سال سے تجاوز کر چکے ہوں ان حالات میں کسی بچے کا پیدا ہونا خرقِ عادت نہ سہی حیرت انگیز ضرور ہے اسی بنا پر ان کا حیرت زدہ ہونا بالکل قدرتی بات تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ کو اگرچہ اس بات کا یقین تھا کہ ایسا کر دینا اللہ ﷻ کی قدرت سے باہر نہیں ہے۔ یہ تعجب عرف اور عادت کی بناء پر ہے، چونکہ یہ ولادت عرف اور عادت کے خلاف تھی اس لئے بتقاضائے بشریت وہ اس پر اپنے تعجب کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکیں۔ اس لئے انہوں نے اس پر اظہار تعجب کیا۔ انہوں نے شک کے طور پر یہ بات ہرگز نہیں کہی تھی۔

علمی بات: یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی کو کوئی نا قابلِ یقین قسم کی خوشخبری سنائی جائے اور وہ اس کے بارے میں از راہ تعجب یوں کہے کہ کیا ایسے فی الواقع ہو سکتا ہے؟ اس سے اس خوشخبری کی عظمت شان اور بڑھ جاتی ہے۔ اس اظہار تعجب میں ایک خاص قسم کی فرط مسرت اور بے پناہ خوشی کا پہلو بھی موجود ہے جو اہلِ ذوق سے مخفی نہیں۔ سو اس خوشخبری کے ظہور کی راہ میں جو رکاوٹیں تھیں۔ انہوں نے اپنے سوالوں سے ان سب کا ازالہ کرادیا۔

آیت نمبر ۷۳: فرشتوں نے حضرت سیّدہ سارہ علیہاالسلام کو جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے قابلِ تعجب نہیں ہوتے کیوں کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے کرنے پر قادر ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھرانے پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں اور برکتیں نازل ہوتی ہی ہیں۔

علمی بات: قدرتِ خداوندی اتنی بے پایاں اور وسیع ہے کہ اس کے سامنے ہر قسم کا تعجب اور تمام حیرانیاں کم ہیں۔ حضرت سیّدہ سارہ علیہاالسلام کی توجہ جب قدرت الٰہی کی طرف مبذول کرائی گئی تو ان کا تعجب خوشی و مسرت میں بدل گیا۔

علمی بات: یہاں اہل بیت یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھروالوں پر رحمتِ الٰہی اور اس کی بے حساب برکتوں کے نزول کی خوشخبری و بشارتیں عطا کی جارہی ہیں۔ یہاں مخاطب حضرت سیّدہ سارہ علیہاالسلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ ہیں، لہٰذا جب حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے اہل بیت میں آپ کی زوجہ محترمہ داخل ہیں تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت سے ازواجِ مطہرات رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُنَّ کو خارج کرنا کتنی بڑی حماقت ونادانی اور قرآنِ حکیم میں تحریف ہے چنانچہ معلوم ہوا کہ یقیناً "اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡھِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَھۡلَ الۡبَیۡتِ وَیُطَھِّرَکُمۡ تَطۡھِیۡرًا" کی بشارت عظمیٰ میں اولاً اور اصلاً حضور کی تمام ازواجِ مطہرات رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُنَّ داخل ہیں اور پھر ان کے ساتھ دوسرے حضرات قدسی صفات رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں۔

یہاں ایک نوٹ مذکور ہے کہ معارف القرآن میں مذکور مضمون "قرآن وحدیث کی روشنی میں اہل بیت" مختصر الیا جائے، چونکہ قرآن وحدیث متفق علیہ ہیں لہٰذا اس کے بعد نہ ہمیں وضاحت کی ضرورت باقی رہتی ہے نہ کسی کے اختلاف کی گنجائش۔

آیت نمبر ۷۴: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فرشتوں سے قوم لوط علیہ السلام کے متعلق گفتگو کا ذکر ہے۔ خواہش تھی کہ کسی طرح قوم لوط علیہ السلام سے عذاب ٹل جائے اور اس قوم کو مزید مہلت مل جائے۔

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے جو عراق میں ہی ان پر ایمان لاکر ان کے ساتھ وطن سے ہجرت میں ان کے ساتھ شریک تھے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی پیغمبر بنا کر سدوم کے شہر میں بھیجا۔ اس شہر کے لوگ شرک کے علاوہ ہم جنس پرستی کی لعنت میں مبتلا تھے۔ جب انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی بات نہیں مانی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل کرنے کے لئے ان فرشتوں کو بھیجا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ امید تھی کہ شاید یہ لوگ سنبھل جائیں اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض گذار ہوئے کہ ابھی ان پر عذاب نازل نہ کیا جائے۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام چونکہ اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ معرفت رکھنے والے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور عرض گذاری کے سب سے زیادہ جاننے والے ہوتے ہیں، چنانچہ انہوں نے ایک شائستہ اصرار کے انداز میں بار بار اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جس طرح عذاب مؤخر کرنے کی فرمائش و درخواست کی، اس آیت میں اسی پیار بھرے انداز کو جدال سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

علمی بات: جدال (جھگڑنے اور بحث کرنے) کا لفظ جس محبت قرب اور پختہ تعلق پر دلالت کر رہا ہے۔ وہ ہر باذوق شخص سمجھ سکتا ہے جس کا کسی سے اخلاص پر مبنی گہرا تعلق ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرا بندہ میرا خلیل میرے ساتھ ان کے بارے میں جھگڑنے لگا جب اپنے سے کسی اعلیٰ و برتر ہستی کے ساتھ قریبی تعلق ہوتا ہے اور دونوں طرف سے انتہائی پیار پایا جاتا ہے تب ہی کسی بات پر ضد اور اصرار کیا جا سکتا ہے۔ یہاں بڑی محبت سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے اس انداز کا ذکر فرمایا۔

آیت نمبر ۷۵: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین صفات کے بیان سے ان کی بہت زیادہ مدح سرائی کی گئی ہے۔ قوم لوط علیہ السلام سے ہمدردی کی وجہ، ان کا نرم دل ہونا اور بردبار ہونا ہے نیز ان کا بہت زیادہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا بیان ہے۔

علمی بات: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ استدعا تو منظور نہیں فرمائی گئی کہ قوم لوط سے عذاب کو مؤخر کردیا جائے، لیکن جس جذبے اور جس انداز سے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے رجوع فرمایا تھا، اس آیت مبارکہ میں اس کی بڑے بلیغ انداز میں تعریف فرمائی گئی ہے کہ بے شک حضرت ابراہیم علیہ السلام بڑے بردبار، رقیق القلب (نرم دل) اور (ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرف) رجوع کرنے والے تھے۔ حَلِیۡمٌ کہتے ہیں بردبار کو جو بدی کرنے والے سے انتقام لینے میں جلدی نہ کرے۔ اواہ کا معنی ہے: نرم دل، رحیم المزاج جو دوسرے لوگوں کی غمخواری کرے،

مُنِيبٌ کا معنی ہے اس کی طرف رجوع کرنے والا اور اس کی اطاعت کرنے والا۔ جو ہر وقت دل وجان سے اپنے رب کی طرف راغب رہے۔

علمی بات: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب یہ پتا چلا کہ فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کو عذاب دینے جا رہے ہیں تو ان کو بہت زیادہ رنج ہوا اور وہ اللہ ﷻ سے بہت ڈرے اس لئے فرمایا: وہ حلیم اور اواہ ہیں اور ان کو منیب اس لئے فرمایا کہ جو شخص دوسروں پر عذاب کی وجہ سے اللہ ﷻ سے ڈرتا ہے اور اللہ ﷻ کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ اپنے معاملہ میں اللہ ﷻ سے کتنا ڈرنے والا اور اس کی طرف کتنا زیادہ رجوع کرنے والا ہو گا۔

آیت نمبر ۷۶: اللہ ﷻ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قوم لوط علیہ السلام کی سفارش نہ کرنے کی ہدایت دی۔ بتایا گیا کہ اِن لوگوں پر عذاب ضرور نازل ہو گا جس کو ٹالا نہیں جا سکے گا۔

علمی بات: حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی فطری شفقت، نرم خوئی اور رحم دلی سے اس قوم پر ترس کھا کر حق تعالیٰ کی جناب میں کچھ سفارش کرنا چاہتے تھے اسی کا جواب دیا گیا کہ اے ابراہیم! اس معاملہ اور بات کو چھوڑ دو۔ ان بد بختوں کو مدّتوں سمجھایا گیا لیکن وہ اپنے کفر و شرک سے باز نہ آئے۔ ان کے لئے عذاب مقدر ہو چکا ہے۔ اب یہ فیصلہ بدلا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ مشرکین کے لئے بخشش نہیں۔ اس لئے اللہ ﷻ نے اپنے خلیل کو ان کے حق میں سفارش کرنے سے روک دیا۔

نوٹ: آیات: ۷۷ تا ۹۵ حصہ اوّل میں حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کے قصّوں میں دی گئی ہیں۔

آیت نمبر ۹۶: آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کا بیان ہے۔ انہیں احکام، معجزات اور دلائل دے کر بھیجا گیا۔

علمی بات: مفسرین کرام نے نشانیوں سے مختلف چیزیں مراد لی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اللہ ﷻ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نو واضح معجزے عطا فرمائے تھے جن کا ذکر سورۃ الاسراء ۱۷، آیت: ۱۰۱، میں ہوا ہے۔

۱۔ عصا ۲۔ ید بیضاء ۳۔ طوفان ۴۔ ٹڈیاں ۵۔ جوئیں ۶۔ مینڈک
۷۔ خون ۸۔ پیداوار میں کمی ۹۔ جانوں میں کمی۔

بعض مفسرین نے پیداوار اور جانوں میں کمی کی جگہ پہاڑ کو سائبان کی طرح اوپر اٹھالینا اور سمندر کو چیرنا شمار کیا ہے، ان معجزات کو آیات اس لئے فرمایا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوّت کی صداقت پر روشن دلائل تھے۔

۲۔ "سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ" سے مراد کھلے ہوئے اور روشن معجزات عصا اور ید بیضاء ہیں، کیونکہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بہت مشہور معجزے ہیں۔ جو سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے اپنی نبوّت کی دلیل کے طور پر پیش کیئے۔ ان کی خصوصیت کے پیش نظر انہیں علیحدہ بھی ذکر فرمایا، حالانکہ یہ آیات میں داخل تھے۔

۳۔ "سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ" سے مراد اللہ ﷻ کا وہ پیغام ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہما السلام فرعون کے پاس لے کر گئے اور وہ قوی عقلی اور فطری دلائل ہیں جو لاٹھی پھینکنے سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے مکالمہ کے دوران بیان فرمائے اور وہ ان دلائل سے لاجواب ہو کر قید کی دھمکی دینے لگا اور معجزے کا مطالبہ کرنے لگا۔ (سورۃ طٰہٰ ۲۰، آیات: ۴۷ تا ۵۵) اور (سورۃ شعراء ۲۶، آیات: ۱۵ تا ۲۹)۔

۴۔ سُلْطَانٌ مُّبِيْنٌ سے اس کے لغوی معنی (یعنی کھلا ہوا غلبہ) مراد لئے گئے ہوں، کیونکہ فرعونیوں کے مقابلہ پر بار بار حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نمایاں غلبہ اور فتح مبین حاصل ہوتی رہی۔ یہ سب تفاسیر صحیح ہیں۔

آیت نمبر ۹۷: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا۔ آل فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بجائے فرعون کے گمراہ کن احکامات کی پیروی کی۔ حالانکہ فرعون کا طریقہ سراسر جہالت اور کفر و سرکشی پر مبنی تھا۔ فرعون کے ساتھ اس کے سرداروں کا ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قوم اپنے تمام امور میں انہیں سرداروں کی پیروی کرتی تھی۔

علمی بات: فرعون اور وزیروں کی جہالت: بالکل واضح اور روشن نشانیاں دیکھ کر بھی فرعونیوں نے پیغمبر علیہ السلام کی بات نہ مانی، اسی اللہ ﷻ کے دشمن کے حکم پر چلتے رہے۔ حالانکہ اس کی کوئی بات ٹھکانے کی نہ تھی، جسے مان کر انسان بھلائی حاصل کر سکتا۔

آیت میں فرعون کے گروہ کی جہالت وحماقت کا اظہار ہے کہ فرعون اُلوہیت کا دعویدار تھا باوجود یہ کہ اپنے مصاحبین کی طرح معمولی انسان تھا علی الاعلان کفرو شرک اور ظلم کرتا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ہادی برحق تھے۔ آپ علیہ السلام کا قول مبنی برحق تھا، عقل و نقل کی شہادت اور معجزات کی تائید آپ علیہ السلام کے قول کو ثابت کر رہی تھی پھر بھی فرعون کے ساتھی ایسے احمق، کند ذہن تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے ہادی برحق کی اتباع سے روگرداں اور فرعون جیسے باطل پرست کے پیروکار تھے۔

آیت نمبر ۹۸: فرعون اور اس کی پیروی کرنے والوں کو قیامت کے دن کا انجام بیان کیا گیا ہے۔ فرعون جس طرح دنیا میں اپنی قوم کا رہبر تھا اسی طرح قیامت کے دن وہ اپنی قیادت میں اپنی قوم کو جہنّم کے اندر لا گرائے گا۔ اسی ٹھکانہ میں ان سب کو ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہو گا۔

علمی بات: جس طرح دنیا میں آلِ فرعون آنکھیں بند کئے فرعون کے پیچھے چلتے رہے جب قیامت کا دن ہو گا تو اس روز بھی ان کا حشر اپنے اس لیڈر کے ساتھ ہو گا جس کی ظالم حکومت اور غلط قیادت نے انہیں دنیا میں برباد کیا تھا لہٰذا آج جو بھی ٹھکانہ اس کا ہو گا وہی آلِ فرعون کا ہو گا اور ایسا بھی نہیں کہ اگر ان کے لیڈر اپنی گمراہی کی وجہ سے گرفتار عذاب ہوا تو پیروکاروں کو اس لئے معاف کر دیا جائے گا کہ انہوں نے خود تو بُرائی کا راستہ اختیار نہیں کیا تھا بلکہ یہ تو غلط قیادت کی وجہ سے گمراہ ہو گئے تھے اس لئے سارا مؤاخذہ ان کے لیڈروں سے ہی ہونا چاہیئے ایسا نہیں ہو گا بلکہ گمراہ رہنما کو بھی سزا ملے گی اور ان کے پیروکاروں پر بھی عذاب آئے گا۔ کیونکہ اللہ ﷻ نے ان کو غور و فکر کی جو صلاحیتیں دی تھیں ان سے کام لیکر انہوں نے حق و باطل میں امتیاز کیوں نہ کیا۔ وہ دانستہ کیوں اندھے بنے رہے۔ کسی کو رہنما بنانے والی اس کی قوم ہوتی ہے کیا یہ کوئی کم جرم ہے؟ قیامت کے دن بھی ان کا رہنما آگے آگے ہو گا اور یہ نامراد پیروکار اپنی قسمت کو روتے ہوئے اپنے رہنما کو کوستے ہوئے اس کے پیچھے جا رہے ہونگے۔ ہر گمراہ لیڈر رہنما اور اس کے ماننے والے اسی طرح میدانِ حشر میں حاضر کیئے جائیں گے اور انہیں جہنّم میں پھینکا جائے گا چنانچہ حدیثِ مبارکہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: امرؤ القیس جہنّم کی طرف سے شعراء کا جھنڈا اُٹھانے والا ہو گا۔ (مسند احمد)

مذکورہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ فرعون اپنے پیروکاروں کے آگے اس طرح جا رہا ہو گا جس طرح قافلہ کی ضروریات کے لئے پانی تلاش کرنے والا قافلہ لشکر کے آگے چلتا ہے۔ لیکن ان بدنصیبوں کی بدنصیبی کا کیا کہنا کہ جس گھاٹ پر فرعون انہیں لئے جا رہا ہے وہاں میٹھا اور ٹھنڈا پانی نہ ہو گا جو ان کی تشنگی دور کرے گا اور ان کے گھبرائے ہوئے دلوں کی تسکین کا باعث ہو گا۔ بلکہ اُبلتا اور کھولتا ہوا پانی ہو گا۔ اگر وہ پیئیں گے تو ان کے منہ اور گلے جل جائیں گے اور ان کی آنتیں پھٹ جائیں گی اور اگر نہیں پیئیں گے تو شدّتِ پیاس سے تڑپتے رہیں گے۔

آیت نمبر ۹۹: لعنت سے مراد رحمت الٰہی سے دوری اور محرومی ہے۔ فرعون اور اس کے پیروکار دنیا میں رحمت الٰہی سے محروم رہے اور قیامت کے دن بھی اسی محرومی کے شکار رہیں گے اور دنیا میں بھی لوگوں نے لعنت بھیجی اور آخرت میں بھی پڑے گی۔

علمی بات: "رفد" لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو سہارا دینے کے لئے اس کے ساتھ رکھی جاتی ہے اور اس کا معنی مدد کرنا اور بخشش بھی آیا ہے یعنی جو مدد انہیں دی گئی جو بخشش ان پر کی گئی وہ بہت بُری تھی یعنی دنیا میں بھی سب لوگ ان پر لعنت بھیجتے رہے اور قیامت کے دن بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

قیامت تک آنے والی ہر نسل انہیں بُرائی سے یاد کرے گی اور آخرت میں تمام اوّلین وآخرین ان پر لعنت کریں گے اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی رُسوائی اور نیک لوگوں کا ہمیشہ کسی پر لعنت کرنا اللہ ﷻ کا عذاب ہے اور ذکر خیر کرنا اللہ ﷻ کی رحمت ہے۔

آیت نمبر ۱۰۰: جن بستیوں کے حالات بیان ہوئے ان میں کچھ کے کھنڈرات نشان عبرت کے لئے موجود ہیں۔ "حصید" کا لفظ اس کھیت کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کی فصل کاٹ دی گئی ہو۔ عذاب سے مٹ جانے والی بستیوں کو فصل کٹنے کے بعد کھیت کی ویرانی کے منظر سے تشبیہ دی گئی ہے۔

علمی بات: سورۂ ھود ۱۱، آیت ۲۶ تا ۹۱ میں سات انبیاء کرام علیہم السلام حضرت صالح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت اسحٰق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام کے نام آئے ہیں۔ بعض اُمّتوں کی بربادی کا حال بیان فرمانے کے بعد یہاں فرمایا کہ ہم آپ ﷺ کو ان بستیوں کی خبریں سناتے ہیں۔ ان ہلاک شدہ بستیوں میں سے بعض بستیاں دنیا میں موجود ہیں کچھ تو کھنڈروں کی صورت میں ہیں اور کچھ ایسی ہیں کہ ان کے رہنے والوں کی ہلاکت کے بعد دوسرے لوگ ان میں رہنے لگے مثلاً فرعون کا ملک مصر فرعون کے غرق ہونے کے بعد بھی باقی رہا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ

ہے، وَسَكَنْتُمْ فِيْ مَسَاكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ اور کچھ ایسی بستیاں ہیں جن کا بالکل خاتمہ ہو گیا جیسے عاد و ثمود اور قوم لوط کی بستیاں ایسی تباہ ہوئیں کہ بعد میں آباد نہ ہو سکیں۔ ان قوموں کی ہلاکت کے واقعات مخاطبین نے پہلے بھی سن رکھے ہیں اور آپ ﷺ نے بھی بتا دیئے ان میں سے بعض بستیوں کے آثار موجود ہیں اور مشرکین مکّہ ادھر کو گزرتے بھی ہیں لہٰذا انہیں ان سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔

آیت نمبر ۱۰۱: ہلاک شدہ قوموں نے خود شرک اور ہٹ دھرمی کا ارتکاب کر کے اپنے اوپر ظلم کیا۔ اللہ ﷻ کا عذاب آنے پر ان کے خود ساختہ معبود ان کے کچھ کام نہ آئے۔ ان معبودوں کے متعلق تمام عقائد باطل ثابت ہوئے اور وہ ان لوگوں کی ہلاکت اور مزید تباہی کا باعث بنے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے کسی کو بے قصور نہیں پکڑا جس سے ظلم کا وہم اور شائبہ ہو سکے، جب وہ جرائم کے ارتکاب میں حد سے آگے نکل گئے اور اس طرح اپنے آپ کو کھلم کھلا سزا کا مستحق ٹھہرا دیا تب اللہ ﷻ کا عذاب آیا۔ پھر دیکھ لو جن معبودوں (دیوتاؤں) کا انہیں بڑا سہارا تھا اور جن سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں وہ ایسی سخت مصیبت کے وقت کچھ بھی کام نہ آئے۔ یعنی یہ جھوٹے دیوتا اور معبود اپنے پجاریوں کی کوئی مدد تو کیا کرتے اُلٹے ان کی ہلاکت کا سبب ہی بن گئے اور اس سے ان کی تباہی و بربادی میں اضافہ ہی ہوا۔ نہ یہ ان کی پوجا کرتے نہ ہلاکت کی سزا میں مبتلا ہوتے۔

آیت نمبر ۱۰۲: کسی قوم کے ظلم پر اُتر آنے کی وجہ سے اس کی گرفت ہوتی ہے۔ اللہ ﷻ کی پکڑ سخت اور دردناک ہوتی ہے جس سے کوئی ظالم نہیں بچ پاتا۔

علمی بات: یعنی جن بستیوں کے باشندے ظلم اور کفر کے خوگر ہو جاتے ہیں اور باز نہیں آتے اور اللہ ﷻ ان کی گرفت کرتا ہے تو اس کی گرفت ایسی ہی ہوا کرتی ہے کہ پھر ان کو تباہ و برباد ہی کر کے چھوڑتا ہے کیونکہ اس کی گرفت سخت اور دردناک ہے۔ ان واقعات میں اس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہو اور عبرت کی وجہ بالکل ظاہر ہے کہ جب دنیا کا عذاب ایسا سخت ہے جو آخرت کے مقابلے میں بہت ہلکا ہے تو قیامت جو کہ دار الجزاء ہے اس کا عذاب کیسا سخت ہو گا۔

آیت نمبر ۱۰۳: آخرت کی جواب دہی سے ڈرنے والے لوگ ہمیشہ نافرمانوں کے انجام سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔

"يَوْمٌ مَّشْهُوْد" کے دو مفہوم ہیں:

۱۔ تمام لوگ اس دن صرف جمع ہی نہیں کئے جائیں گے بلکہ انہیں باز پرس کے لئے اللہ ﷻ کے سامنے حاضر بھی کیا جائے گا۔

۲۔ لوگوں کے مقدمات پر شہادتیں قائم کی جائیں گی اور سخت کاروائی تمام لوگوں کی موجودگی میں ہو گی۔

علمی بات: دنیا جو "دار العمل" ہے، جب اس میں کفر و شرک اور تکذیب انبیاء کرام علیہم السلام پر سزائیں ملتی ہیں اور اس قدر سخت ملتی ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آخرت میں جو خالص "دار الجزاء" ہے کیا کچھ سزا ان جرائم پر ملے گی؟ اور کیا صورت نجات اور بچاؤ کی ہو گی۔ عقلمند آدمی کے لئے جو اپنا انجام سوچ کر ڈرتا رہتا ہے۔ اس چیز میں بڑی عبرت و نصیحت ہے۔ تمام دنیا کا بیک وقت فیصلہ اسی دن ہو گا جب سارے اوّلین و آخرین اکٹھے کئے جائیں گے اور کوئی شخص غیر حاضر نہ رہ سکے گا گویا اللہ ﷻ کی عدالت کا سب سے بڑی پیشی کا دن وہی ہو گا۔

آیت نمبر ۱۰۴: قیامت کا اپنے وقت مقررہ پر آنے کا بیان ہے۔ سزا و جزا کا فوری وقوع نہ ہونا اس کا ایک وقت متعین ہونے کی وجہ سے ہے۔

علمی بات: مَّعْدُوْدٍ کا معنی ہے گنا ہوا۔ گنی ہوئی چیز آخر ختم ہو جاتی ہے، یعنی قیامت کی مہلت گنتی کے چند دن ہیں، جیسے روزوں کے متعلق فرمایا: وَاَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ۔ سورۃ البقرۃ ۲، آیت: ۱۸۴ گنے ہوئے چند دنوں میں۔ "اور وہ گنتی صرف اللہ ﷻ کے علم میں ہے، قیامت نہ اس سے پہلے آسکتی ہے، نہ اس سے مؤخر ہو سکتی ہے"۔ یعنی قیامت کے دن کا وقوع بعض مصلحتوں کی بناء پر ایک وقت معلوم و محدود تک ملتوی کر رکھا ہے اور اس وقت کو سوائے اللہ ﷻ کے کوئی نہیں جانتا۔

قیامت کے آنے میں تاخیر اس لئے ہے کہ اللہ ﷻ نے یہ بات طے فرمائی ہے کہ جب تک دنیا کے تمام پیدا ہونے والے لوگ پیدا نہ ہو جائیں اور ان کے پیدا ہونے کے لئے جو مدّت مقرر ہے وہ پوری نہ ہو جائے اس وقت تک قیامت نہ آئے گی۔ جب دنیا کی یہ مدّت ختم ہو جائے گی تو قیامت کا دن قائم ہو گا اور ہر شخص کو اس کے عمل کے موافق جزا و سزا ملے گی۔

کلام نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ ﷻ کے حضور کسی کو بحث و تکرار کرنے کی ہمت نہ ہوگی۔ اس دن انسانوں کا ایک گروہ گناہ گاروں پر مشتمل ہوگا اور دوسرا نیکوکاروں پر۔

فرمانِ نبوی ﷺ: سیّدنا ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اس دن انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ کسی کو گفتگو کی ہمت نہیں ہوگی اور انبیاء کرام علیہم السلام کی زبان پر بھی اس دن صرف یہی ہوگا کہ یا اللہ! میری ذات (پر رحم فرمایئے)، میری ذات (پر رحم فرمایئے)۔" (صحیح بخاری)

علمی بات: قیامت کا دن بہت طویل ہوگا اس میں لوگوں کے احوال مختلف ہوں گے بعض حالتوں میں تو شدّت اور ہیبت کی وجہ سے کسی کو بھی اذانِ الٰہی کے بغیر بات زبان پر لانے کی قدرت نہ ہوگی اور بعض احوال میں اِذن دیا جائے گا کہ لوگ اللہ ﷻ کی اجازت سے کلام کریں گے اور بعض احوال میں جب دہشت کی شدّت کم ہوگی، اس وقت لوگ اپنے معاملات میں جھگڑیں گے اور اپنے مقدمات پیش کریں گے۔

عملی پہلو: اہلِ علم نے "سعادت" یعنی نیک بختی کی پانچ علامتیں بیان کی ہیں۔

۱۔ دل کی نرمی ۲۔ کثرتِ گریہ یعنی اپنے گناہوں پر اور اللہ ﷻ کی یاد میں رونا ۳۔ دنیا سے نفرت

۴۔ کم اُمیدیں ۵۔ شرم و حیا۔

اور "**شقاوت**" یعنی بد بختی کی علامت بھی پانچ چیزیں ہیں۔

۱۔ دل کی سختی ۲۔ آنکھ کی خشکی یعنی اپنے گناہوں پر رونا نہ آنا ۳۔ دنیا کی رغبت

۴۔ دراز اُمیدیں ۵۔ بے حیائی۔

علمی بات: "شقی" یعنی وہ بدبخت جس کے لئے اس کی بدعملی کی وجہ سے آگ واجب ہوگئی۔ "سَعِیْد" وہ خوش قسمت جس کے لئے اس کے نیک اعمال کی وجہ سے جنّت واجب ہوگئی۔

قیامت کے روز نوعِ انسانی صرف دو گروہوں میں بانٹی جائے گی۔ ایک گروہ سعید ہوگا جنہوں نے اپنی دنیوی زندگی میں اپنے رب کو پہچانا اور اس کی بندگی میں اپنی عمر بسر کی۔ ان کو الگ کر دیا جائیگا اور ان کو سعادت کے اعزاز سے نوازا جائے گا اور دوسرا گروہ شقی جو عمر بھر اپنے مالک کو بھلائے رہے اور اپنی نفس پرستی میں مگن رہے ان پر بدبختی اور بدنصیبی کی پھٹکار پڑتی ہوگی۔

آیت نمبر ۱۰۶: ان نافرمان لوگوں کے انجام کا بیان ہے جنہیں دوزخ میں داخل کیا جائے گا۔ ان کا تکلیف اور غم سے چیخ چیخ کر رونے کا ذکر ہے۔

علمی بات: نیک کاموں کے حصّوں میں اللہ ﷻ کی مدد شاملِ حال ہونا سعادت ہے اور اس کی ضد شقاوت ہے۔ سعادت کی دو قسمیں ہیں: سعادتِ دُنیوی اور سعادتِ اُخروی۔ سعادتِ اُخروی جنّت ہے اور سعادتِ دُنیوی کی تین صورتیں ہیں: ۱۔ روح کی سعادت، ۲۔ بدن کی سعادت، ۳۔ خارجی سعادت۔

روح کی سعادت اللہ ﷻ کے ذکر اور اس کے احکام پر عمل کرنے سے ہوتی ہے اور بدن کی سعادت صحت اور قوت سے مفید غذاؤں اور دواؤں سے حاصل کی جاتی ہے اور خارجی سعادت انسان کے نیک مطلوب پر معاونت کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور اس کی ضد شقاوت ہے۔ (المفردات)

سعادت کا معنی نفع، معاونت، اللہ ﷻ کا نیک کاموں کی توفیق دینا یا ان کاموں کی توفیق دینا جن سے اللہ ﷻ راضی ہو۔ (تاج العروس)

زفیر کہتے ہیں اتنا لمبا اور گہرا سانس لینا جس سے سینہ پھول جائے اور اس گہرے سانس کو باہر نکالنا شہیق کہلاتا ہے۔ (المفردات)

امام طبری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: شدید اور سخت آواز زفیر ہے اور پست اور کمزور آواز شہیق ہے۔

علمی بات: دوزخیوں کے چیخنے چلانے کی تعبیر یہ ہے کہ جو بدبخت ہوں گے وہ دوزخ میں پڑے ہوں گے اور اس میں ان کا حال یہ ہوگا کہ وہ وہاں چیخیں اور چلائیں گے اور اس طرح چیخنے اور چلانے کا ان کو کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا۔ زفیر و شہیق کے فرق کو سمجھنے کے لئے ایک مثال اختیار کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ زفیر اس آواز کو کہتے ہیں جو گدھا ہنگتے وقت ابتدائی طور پر نکالتا ہے اور جو تیز ہوتے ہوتے شہیق تک پہنچ جاتی ہے اور اس آخری آواز کو "شہیق" کہا جاتا ہے۔ ان لفظوں میں جو حقارت کا پہلو ہے وہ بالکل واضح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ وہاں چیخیں و چلائیں یا روئیں پیٹیں پر ان کا ٹھکانہ بہر حال وہی ہوگا۔ ہاں! اگر علمِ الٰہی میں کچھ سزا پانے کے بعد اگر کسی مسلمان کو وہاں سے نکالا جانا منظور ہو تو وہ اللہ ﷻ ہی جانتا ہے۔

آیت نمبر ۱۰۷: دوزخ ان مجرمین کا دائمی ٹھکانہ ہوگا۔ آسمان اور زمین سے مراد آخرت کے آسمان وزمین ہیں۔ جہنّم سے نکالنے کا استثنا اہلِ توحید میں سے ان گنہگاروں کے لئے ہے جن کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا۔

علمی بات: قرآنِ حکیم ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آخرت میں وہاں کے حالات کے مطابق دوسرے زمین وآسمان پیدا کئے جائیں گے دیکھئے (سورۃ ابراہیم ۱۴، آیت ۴۸، سورۃ الزمر ۳۹، آیت: ۲۴ تا ۴۷) اور چونکہ وہ زمین وآسمان ہمیشہ رہیں گے اس لئے آیت کا مطلب یہ ہوا کہ وہ لوگ بھی دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

علمی بات: جہنّم سے نکالنے کے استثناء کی ٹھیک ٹھیک مراد تو اللہ ﷻ ہی کو معلوم ہے، لیکن اس سے بظاہر ایک تو یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ کسی کے عذاب وثواب کا تمام تر فیصلہ اللہ ﷻ ہی کے اختیار میں ہے، دوسری یہ بات واضح ہے کہ اللہ ﷻ نے اپنی مشیت بیان فرمادی ہے کہ وہ کافروں میں سے کسی کو بھی چھوٹ نہیں دیگا بلکہ وہ ہمیشہ ان کو جہنّم کے عذاب میں مبتلا رکھے گا۔

علمی بات: ندامت کے الفاظ بطور محاورہ استعمال کئے گئے ہیں کیونکہ اہلِ عرب دوام اور لامحدود مدت بیان کرنے کے لئے یہی الفاظ استعمال کرتے تھے ورنہ یہ موجودہ زمین وآسمان تو قیامت کے وقت ختم کردیے جائیں گے۔ البتہ ظاہری الفاظ کا لحاظ رکھتے ہوئے ان سے عالم اخروی کے زمین وآسمان مراد لئے جاسکتے ہیں۔

علمی بات: اس آیت میں ان گمراہ لوگوں کا رد ہے جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ ﷻ نے اشیاء میں جو تاثیریں رکھ دی ہیں انہی کے مطابق ہی افعال کے نتائج برآمد ہوتے ہیں اور ان میں رد وبدل ناممکن ہے یہ عقیدہ دراصل اللہ ﷻ کی قدرتِ کاملہ کا انکار ہے وہ اس کی مثال یہ دیتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے زہر کھالیا ہے تو وہ لازماً مرجائے گا اور موت ایسی یقینی ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ جب کہ اہلِ سنّت کا عقیدہ یہ ہے کہ اگر اللہ ﷻ چاہے تو زہر کھانے والے کو بھی بچاسکتا ہے۔ اسی طرح اگر اللہ ﷻ چاہے تو کسی مجرم کو تھوڑی بہت سزا دے کر یا سزا دیئے بغیر ہی معاف کرسکتا ہے جیسا کہ گناہگار مسلمانوں کے ساتھ ہوگا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی شخص دعا مانگے تو پختگی کے ساتھ مانگے، یہ نہ کہے کہ اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے دے دے، اس لئے کہ اللہ ﷻ پر کوئی جبر کرنے والا نہیں۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)۔

آیت نمبر ۱۰۸: اہلِ جہنّم کے برعکس اب سعادت مند بندوں کے انجام کا بیان ہے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ اللہ ﷻ کی عطا کردہ جنّت اور اس کے نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔ جنّت کی نعمتیں ابدی ہوں گی جن سے وہ کبھی محروم نہیں ہوں گے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: سیّدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب اہلِ جنّت جنّت میں اور اہلِ دوزخ دوزخ میں داخل ہوجائیں گے تو موت کو لایا جائے گا، پھر اس کو جنّت اور دوزخ کے درمیان رکھ کر ذبح کردیا جائے گا۔ پھر ایک پکارنے والا پکار لگائے گا کہ اے جنّت والو! (اب) موت نہیں آئے گی اور اے دوزخ والو! (اب) موت نہیں آئے گی۔ اس اعلان سے جنّت والوں کی خوشی میں اضافہ ہوجائے گا اور دوزخ والوں کا غم بڑھ جائے گا۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ہم نے کہا اے اللہ ﷻ کے رسول ﷺ! آپ ﷺ ہمیں جنّت کے بارے میں بتلائیں کہ اس کی عمارت کیسی ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک اینٹ سونے کی اور ایک اینٹ چاندی کی ہوگی، اس کا گارا انتہائی تیز مہکنے والی کستوری کا اور اس کے کنکر لؤلؤ اور یاقوت کے موتی ہوں گے اور اس کی مٹی زعفران ہوگی، جو آدمی جنّت میں داخل ہوجائے گا، وہ خوشحال ہوگا، کبھی بدحال نہیں ہوگا، وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا، اسے موت نہیں آئے گی، اس کا لباس بوسیدہ نہیں ہوگا اور اس کا شباب زائل نہیں ہوگا۔ (صحیح مسلم)

عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ: اس کے معنیٰ ہیں "غَيْرَ مَقْطُوْعٍ" یعنی نہ ختم ہونے والی عطا۔ اس جملے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ جن کو بھی جنّت میں داخل کیا جائے گا ان کا یہ دخول عارضی نہیں، ہمیشہ کے لئے ہوگا اور تمام جنّتی ہمیشہ اللہ ﷻ کی عنایات اور اس کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے، اس میں کبھی اختتام نہیں ہوگا۔

آیت نمبر ۱۰۹: مشرکین کے تمام مشرکانہ عقائد غلط ہیں وہ اپنے باپ دادا کی محض اندھی تقلید کررہے ہیں۔ ان کی سرکشی کا انہیں مکمل بدلہ دیا جائے گا جس میں کچھ کمی نہیں کی جائے گی۔

علمی بات: اس آیت میں بظاہر رسول اللہ ﷺ کو خطاب ہے لیکن اس سے مراد عام خطاب ہے کیونکہ بُت پرستوں کی عبادت کے باطل ہونے کے متعلق نبی کریم ﷺ کے شک کرنے کا تو کسی طرح بھی تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ بُت پرست جن بُتوں کی عبادت کرتے ہیں ان کے پاس ان کی پرستش پر کوئی دلیل نہیں ہے وہ صرف اپنے آباؤ واجداد کی اندھی تقلید کرتے ہیں۔ نیز یہ بھی بتلایا گیا کہ ان کو ان کی سرکشی کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا جس میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

اس ارشاد سے حسبِ ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ ان کی بُت پرستی کی سزا میں ان کے لئے جو عذاب تیار ہے ان کو وہ عذاب پورا پورا دیا جائے گا اور اس میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

۲۔ ہر چند کہ انہوں نے کفر کیا ہے اور حق سے روگردانی کی ہے لیکن دنیا میں ان کے رزق اور معیشت کا جو حصّہ مقرر ہے اس میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

۳۔ ان کو ہدایت پر لانے کے لئے جن اسباب کی ضرورت ہے وہ سب مہیا کیئے جائیں گے مثلاً واضح دلائل، رسول علیہ السلام کو بھیجنا، کتاب نازل کرنا اور ان کے شبہات کا ازالہ کرنا وغیرہ ان سب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے یہ تینوں باتیں مراد ہوں۔

آیت نمبر ۱۱۰: قرآنِ حکیم کی تکذیب کیئے جانے پر رسول اللہ ﷺ کی غم گساری کی جارہی ہے۔ ہر دور میں اللہ تعالیٰ کی کتاب سے اختلاف کرنے والے موجود رہے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کئے جانے پر ان کی قوم کے ایک گروہ نے ان سے بھی اختلاف کیا۔ ایسے لوگوں کو اصلاح کے لئے مہلت دی جاتی ہے۔ مہلت سے فائدہ نہ اٹھانے والوں کو مقررہ وقت پر سزا دی جائے گی۔ مشرکینِ مکّہ کا قرآنِ حکیم کے بارے میں گہرے شک میں مبتلا ہونے کا ذکر ہے۔

علمی بات: اس آیت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ یہ کافروں کی کوئی نئی روش نہیں ہے بلکہ ہمیشہ سے کفار کا انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ یہی رویہ رہا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی ایک مثال بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی تو ان کی قوم کے لوگوں نے اس میں اختلاف کیا بعض اس پر ایمان لے آئے اور بعض اس کے انکار پر ڈٹے رہے اور مخلوق کا ہمیشہ یہی وتیرہ رہا ہے۔

علمی بات: لوگ اکثر دیکھتے ہیں کہ زمین پر بے شمار انسان ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام کو نہیں مانتے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات سے آزاد ہو کر اپنی مرضی کے زندگی گزارتے ہیں۔ پھر بھی ان کا کچھ نہیں بگڑتا ہوا بظاہر نظر نہیں آتا۔ یہ بظاہر کامیاب نظر آتے ہیں اور ظاہری طور پر یہاں یہ بھی دکھائی نہیں دیتا کہ اللہ تعالیٰ کے وفاداروں کو کوئی خصوصی انعام مل رہا ہو یا پھر اللہ تعالیٰ کے نافرمانوں کو کوئی خاص سزا بھگتنی پڑتی ہو۔ اس بناء پر لوگوں کو شک ہونے لگتا ہے۔ ان کو یقین نہیں آتا کہ انسانوں کا جو انجام مسلسل وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اس کے سوا بھی کوئی انجام ان بُرے لوگوں کے لئے مقدر ہے۔ یہاں قرآنِ حکیم بتاتا ہے کہ لوگوں کا مسلسل غیر حق پر چلنا اس وجہ سے نہیں ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کیا اور پھر اس کو معقول پا کر اسے اختیار کر لیا۔ اس کا سبب دراصل رواج کی پیروی ہے نہ کہ روشن اور واضح دلیل کی۔

اس کے باوجود ان لوگوں کے عمل کا انجام ان کے سامنے نہیں آتا تو اس کا سبب مہلت اور امتحان ہے۔ زمین پر موت سے پہلے کی زندگی جانچ پڑتال کی زندگی ہے۔ اس لئے موت تک انسان کو یہاں ڈھیل دی جارہی ہے کہ وہ جو چاہے بولے اور جو چاہے کرے۔ موت اس مقررہ مدّت کا خاتمہ ہے۔ موت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو مقامِ امتحان سے اٹھا کر مقامِ نتائج میں پہنچا دیا جائے۔ وہاں ہر ایک کو وہی ملے گا جس کا وہ فی الواقع مستحق تھا اور ہر ایک سے وہ چھن جائے گا جس کو اس نے استحقاق کے بغیر اپنے گرد جمع کر رکھا تھا۔

علمی بات: جو نافرمان لوگ بظاہر دنیا کی زندگی میں مطمئن نظر آتے ہیں ان کے دل کی دنیا بالکل ویران ہوتی ہے، اور وہ حقیقی چین وسکون سے ناآشنا اور راحت وآرام سے کوسوں دور ہوتے ہیں ان کے دلوں کی محبتیں بناوٹی ہوتی ہیں اور وہ اپنی زندگی سے بھی عاجز اور اس کے سامنے بے بس ہوتے ہیں لیکن دُنیوی رکھ رکھاؤ کی وجہ سے ایسا ظاہر کرتے ہیں کہ بظاہر وہ بہت مطمئن اور آسودہ ہیں۔

آیت نمبر ۱۱۱: ہر ایک کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے اعمال سے پوری طرح باخبر ہے۔

اس کا معنی یہ ہے کہ جس نے رسول علیہ السلام کی تصدیق کی یا رسول علیہ السلام کی تکذیب کی یا جس کو دنیا میں جلدی سزا مل گئی یا وہ جس کی سزا مؤخر کی گئی وہ سب اس امر میں برابر ہیں کہ ان کو آخرت میں پوری جزاء ملے گی اہلِ ایمان کو ان کے ایمان اور اطاعت پر ثواب ہوگا اور کافروں کو ان کے کفر اور معصیت پر عذاب ہوگا۔ پھر اس کی دلیل یہ بیان فرمائی کہ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی خوب خبر رکھنے والا ہے جب کہ وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے تو اس کو ہر ایک کی اطاعت اور معصیت کا

علم ہے اس لئے اس کو یہ علم ہے کہ کون شخص کس جزاء کا مستحق ہے اس لئے وہ کسی کا حق اور اس کا بدلہ ضائع ہونے نہیں دے گا اور وہ ہر شخص کو اس کے کاموں کی پوری پوری جزاء اور بدلہ دے گا۔

آیت نمبر ۱۱۲: رسول اللہ ﷺ کے توسط سے اہلِ ایمان کو انتہائی مشکل حالات کے وقت چند ہدایات دی گئی ہیں۔ شدید مخالفت کے باوجود ہر حال میں دین پر استقامت اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ مخالفین کے ظلم کے ردِّ عمل میں ایسا قدم نہ اٹھایا جائے جو شریعت کے خلاف ہو۔ اللہ ﷻ اہلِ ایمان اور ان کے مخالفین کے اعمال سے خوب واقف ہے۔

اس آیت میں نبی کریم ﷺ اور اہلِ ایمان کو ایک تو استقامت و پامردی کی تلقین کی جارہی ہے، جو دشمن کے مقابلے میں ایک بہت بڑا ہتھیار ہے، دوسرے "طُغیانؐ" یعنی حد سے بڑھ جانے سے روکا گیا ہے، جو اہلِ ایمان کی اخلاقی قوت اور رفعت کردار کی بُلندی کے لئے بہت ضروری ہے، حتیٰ کہ دشمن کے ساتھ معاملہ کرتے وقت بھی حد سے تجاوز جائز نہیں ہے۔ "وَلَا تَطْغَوْا" سے مراد ظلم و زیادتی، اللہ ﷻ نے جو حدود مقرر کی ہیں ان سے نکل جانا اور گناہوں کا ارتکاب ہے۔

علمی بات: استقامت کا مفہوم اور اس کی فضیلت: استقامت کے معنی سیدھا کھڑے رہنے کے ہیں، جس میں کسی طرف ذرا سا جھکاؤ نہ ہو، ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں۔ استقامت لفظ تو چھوٹا سا ہے مگر مفہوم اس کا ایک عظیم الشّان وسعت رکھتا ہے کیونکہ معنی اس کے یہ ہیں کہ انسان اپنے عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، کسبِ معاش اور اس کی آمد و صرف کے تمام ابواب میں اللہ ﷻ کی قائم کردہ حدود کے اندر اس کے بتلائے ہوئے راستہ پر سیدھا چلتا رہے، ان میں سے کسی باب میں کسی عمل اور کسی حال میں کسی ایک طرف جھکاؤ یا کمی زیادتی ہو جائے تو استقامت باقی نہیں رہتی۔

دنیا میں جتنی گمراہیاں اور عملی خرابیاں آتی ہیں وہ سب اسی استقامت سے ہٹ جانے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ استقامت ایک ایسا جامع لفظ ہے کہ دین کے تمام اجزاء و ارکان اور ان پر صحیح اور اعتدال کے ساتھ عمل اس کی تفسیر ہے۔

قرآنِ حکیم میں دوسرے مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "بیشک وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، پھر خوب قائم رہے، ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنّت کے ساتھ خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔" (سورۃ حٰمٓ السجدۃ ۳۲، آیت: ۳۰)

فرمانِ نبوی ﷺ: سیّدنا سفیان بن عبد اللہ ثقفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (ﷺ) سے سوال کیا، اے اللہ کے رسول (ﷺ)! مجھے اسلام کے بارے میں کوئی ایسی بات بتلائیں کہ مجھے آپ ﷺ کے بعد کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا: "کہہ میں اللہ ﷻ پر ایمان لایا، پھر اس پر استقامت اختیار کر۔" (صحیح مسلم)

علمی بات: یہ ظاہر ہے کہ رسول کریم ﷺ تو انسان کامل کی عملی مثال بن کر اس دنیا میں تشریف لائے تھے اور فطری طور پر استقامت آپ ﷺ کی عادت تھی مگر پھر فکرمند اس لئے ہوئے کہ آیت میں مطلق استقامت کا حکم نہیں بلکہ حکم یہ ہے کہ امر الٰہی کے مطابق استقامت ہونا چاہیئے، انبیاء کرام علیہم السلام پر جس قدر خوف و خشیت الٰہی کا غلبہ ہوتا ہے وہ سب پر عیاں ہے، اس خشیت ہی کا یہ اثر تھا کہ باوجود کامل استقامت کے یہ فکر لگ گئی کہ اللہ ﷻ کو جیسی استقامت مطلوب ہے وہ پوری ہوئی یا نہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ کو اُمّت کا استقامت پر قائم رہنا دشوار دیکھ کر یہ فکر و غم لاحق ہوا۔

عملی پہلو: اس دنیا میں سب سے زیادہ دشوار کام استقامت ہے اسی لئے محققین صوفیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا ہے کہ استقامت کرامت سے بالاتر ہے۔ یعنی جو شخص دین کے کاموں میں استقامت اختیار کئے ہوئے ہے، اگرچہ عمر بھر اس سے کوئی کرامت صادر نہ ہو، تو بھی وہ اعلیٰ درجہ کا ولی ہے۔

آیت نمبر ۱۱۳: اہلِ ایمان کے لئے ایک اور اہم ہدایت دی گئی۔ ظالمین یعنی ظالموں اور بالخصوص مشرکین سے کسی قسم کا سمجھوتا کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ سمجھوتا کرنے میں دین کے دشمنوں کی طرف میلان، ان پر اعتماد، ان کو دوست بنانا، دین کے معاملہ میں لچک پیدا کرنا شامل ہے۔ ظالموں سے سمجھوتا کرنا جہنّم کا مستحق بنا دیتا ہے۔

علمی بات: اس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ ظلم و جور میں خود مبتلا ہونے سے تو دین و دنیا کی تباہی سبھی جانتے ہیں مگر ظالموں کی طرف ادنیٰ سا جھکاؤ اور میلان، ان سے راضی ہونا، ان پر اعتماد کرنا بھی انسان کو اسی بربادی کے کنارے پہنچا دیتا ہے۔ پھر انسان کی بربادی میں دیر نہیں لگتی۔

اس جھکاؤ اور میلان سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعین کرام رحمۃ اللہ علیہم کے چند اقوال منقول ہیں، اور سب اپنی اپنی جگہ درست اور صحیح ہیں:

۱۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مراد یہ ہے کہ ظالموں سے دوستی نہ کرو اور ان کا کہنا نہ مانو۔

۲۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ظالموں کی طرف کسی طرح کا بھی میلان نہ رکھو۔

۳۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ان کے اعمال و افعال کو پسند نہ کرو (قرطبی)۔

۴۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ظالموں سے مداہنت نہ کرو یعنی ان کے بُرے اعمال پر خاموشی یا رضا کا اظہار نہ کرو۔

۵۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ظالموں کی صحبت میں نہ بیٹھو۔

۶۔ قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ شکل و صورت اور فیشن اور رہن سہن کے طریقوں میں ان کا اتباع کرنا یہ سب اسی ممانعت میں داخل ہے۔

۷۔ قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ظلم و جور کی ممانعت اور حرمت کے لئے اس آیت میں وہ شدت ہے جو انسان انتہائی طور پر کر سکتا ہے کیونکہ ظالموں کے ساتھ دوستی اور گہرے تعلق ہی کو نہیں بلکہ ان کی طرف ادنیٰ درجہ کے میلان اور جھکاؤ اور ان کے پاس بیٹھنے کو بھی اس میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

۸۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے نزدیک کوئی شخص اس عالم سے زیادہ مبغوض نہیں جو اپنی دُنیوی مفاد کی خاطر کسی ظالم سے ملنے کے لئے جائے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اہلِ کفر اور اہلِ معصیت اور اہلِ بدعت کی صحبت سے اجتناب اور پرہیز واجب ہے، بجز اس کے کہ کسی مجبوری سے ان سے ملنا پڑے، اور حقیقت یہی ہے کہ انسان کی اصلاح و فساد میں سب سے بڑا دخل صحبت اور ماحول کا ہوتا ہے، اسی لئے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں آیتوں کے دو لفظوں کے متعلق فرمایا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے پورے دین کو لا کے دو حرفوں میں جمع کر دیا ہے، ایک، پہلی آیت میں لَا تَطْغَوْا اور دوسرا، دوسری آیت میں لَا تَرْكَنُوْٓا، پہلے لفظ میں حدودِ شرعیہ سے نکلنے کی اور دوسرے لفظ میں بُرے لوگوں کی صحبت کی ممانعت ہے اور یہی سارے دین کا خلاصہ ہے۔

آیت نمبر ۱۱۴: نماز قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ قائم کرنے سے مراد پابندی، آداب اور افضل وقت میں ادا کرنا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ نیکیاں بُرائیوں کے اثرات کو مٹا دیتی ہیں اور نیک کاموں میں نماز کو اوّلیت حاصل ہے۔ نیکیاں صغیرہ گناہوں کی معافی کا ذریعہ ہیں جب کہ کبیرہ گناہوں کی معافی کے لئے سچی توبہ ضروری ہے۔ نماز اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے تعلق کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ اس کے ذریعہ بدی کا مقابلہ کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔

سیّدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”آدمی کی آزمائش اس کی بیوی، اس کے مال، اس کی اولاد اور اس کے پڑوسی میں ہوتی ہے۔ (اس آزمائش میں اگر ناکامی ہو جائے تو) نماز، روزہ اور صدقہ اس کا کفارہ کرتے ہیں، نیک بات کا حکم کرنا اور بُری بات سے روکنا (اس کا کفارہ) کرتا ہے۔“ (صحیح بخاری)

نماز کے ذریعے گناہوں کا مٹنا احادیث مبارکہ کی روشنی میں:

۱۔ سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بتاؤ کہ اگر کسی کے دروازے کے سامنے کوئی نہر جاری ہو اور وہ اس میں ہر روز پانچ مرتبہ نہاتا ہو تو تم کیا کہتے ہو کہ یہ (نہانا) اس کے میل کو باقی رہنے دے گا؟“ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی، یا رسول اللہ! (اتنا نہانا تو) اس کے میل کو ذرا سا بھی باقی نہیں چھوڑے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”یہی مثال پانچ نمازوں کی ہے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ ان کے ذریعے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ (صحیح بخاری) آپ ﷺ کا فرمان مبارک ہے کہ اگر کسی شخص کے دروازے پر نہر جاری ہو اور وہ روزانہ اس میں پانچ مرتبہ نہائے تو تمہارا کیا گمان ہے۔ کیا اس کے بدن پر کچھ بھی میل باقی رہ سکتا ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ نہیں یا رسول اللہ ﷺ ہر گز نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہی حال پنج وقتہ نمازوں کا ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ان کے ذریعے سے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ (صحیح بخاری)

۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”پانچوں نمازیں اور (ہر) جمعہ (دوسرے) جمعہ تک درمیانی مدّت کے گناہوں کا کفارہ (ان کو مٹانے والے) ہیں جب تک کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہ کیا جائے“ (صحیح مسلم)

۳۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جب کوئی مسلمان فرض نماز کا وقت ہونے پر اس کے لئے اچھی طرح وضو کرتا ہے اور اس کے خشوع و خضوع اور رکوع کا اچھی طرح اہتمام کرتا ہے تو وہ اس (نماز) سے پہلے کئے ہوئے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے بشرطیکہ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہ ہو اور یہ (فرض نماز سے صغیرہ گناہوں کا معاف ہو جانا) ہمیشہ کے لئے ہے۔“ (صحیح مسلم)

۴۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب مسلمان یا مومن بندہ وضو کرتا اور اپنا چہرہ دھوتا ہے تو پانی کے ساتھ یا پانی کے آخری قطرے کے ساتھ اس کے چہرے سے وہ تمام گناہ جھڑ جاتے ہیں جو اس کی آنکھوں نے کئے تھے یا اسی طرح کی کوئی اور بات فرمائی، پھر جب وہ اپنے ہاتھوں کو دھوتا ہے تو پانی کے ساتھ یا پانی کے آخری قطرے کے ساتھ وہ تمام گناہ جھڑ جاتے ہیں جو اس کے ہاتھوں سے ہوئے ہیں، یہاں تک کہ وہ گناہوں سے پاک وصاف ہو کر نکلتا ہے"۔ (جامع ترمذی، مسند احمد)

آیت نمبر ۱۱۵: دعوتِ دین، نیک اعمال بالخصوص اوقات صلوٰۃ اور دین پر استقامت کے لئے صبر کی تلقین کی گئی ہے۔ عمدگی کے ساتھ عمل کرنے والے نیکوکاروں کا اجر محفوظ ہے۔

علمی بات: صبر کا جامع معنی ہے کہ ایک مسلمان ہر حال میں شریعت کے قواعد وضوابط کی پابندی کرتا رہے اور ہمہ وقت اللہ ﷻ کے حضور صبر وشکر کا مظاہرہ کرے۔ لیکن سیاق وسباق کے حوالے سے یہاں صبر کا معنی یہ ہے کہ ایک داعی اور مسلمان پریشانیوں اور مشکلات کے مقابلے میں اپنا حوصلہ قائم رکھے۔ ایسے صابر شخص کو تسلّی دینے کے ساتھ ساتھ خوشخبری بھی سنائی جارہی ہے کہ اللہ ﷻ اس کا اجر کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ صبر بے بسی اور کم ہمت ہو جانے کا نام نہیں۔ صبر قوت برداشت، قوت مدافعت اور تحمل برقرار رکھنے اور طبیعت کو شریعت کا پابند بنانے کا نام ہے۔ دشمن کے مقابلے میں جرأت، بہادری اور مستقل مزاجی کے ساتھ ومصائب کا سامنا کرنے سے مسائل حل ہوتے ہیں، آخرت میں بغیر حساب وکتاب کے جنّت میں داخلہ نصیب ہوگا اور دنیا میں اللہ ﷻ کی معیت ودستگیری حاصل ہوگی۔

آیت نمبر ۱۱۶: اہلِ بصیرت اور سمجھدار لوگوں پر فساد سے روکنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہلاک ہونے والی اقوام میں فساد اور بُرائیوں سے باز رکھنے والے چند ہی لوگ تھے جو عذاب آنے پر بچالئے گئے۔ باقی اکثریت ظالم تھی جو ظلم پر قائم اور دنیا کی عیش وعشرت میں مگن رہی یہاں تک کہ عذاب نے انہیں گھیر لیا۔

علمی بات: یعنی آپ ﷺ کا رب ایسا نہیں ہے کہ لوگوں پر ظلم کرے وہ جو عذاب دیتا ہے اور ہلاک کرتا ہے اس کا سبب کفر اور شرک اور ظلم ومعاصی ہوتے ہیں ان گناہوں میں سے یہ بھی ہے کہ جو لوگ گناہوں میں مبتلا ہوں قدرت ہوتے ہوئے انہیں نہ روکا جائے۔ جب لوگ اصلاح کے کام میں لگے ہوئے ہوں گے تو اللہ ﷻ کی طرف سے عذاب نہیں آئے گا ورنہ عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر اللہ ﷻ کی حمد وثنا بیان کی، اس کے بعد فرمایا: لوگو! تم یہ آیت پڑھتے ہو: (يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ: سورۃ المائدہ ۵، آیت: ۱۰۵) اے ایمان والو! اپنے آپ کی فکر کرو، اور تمہیں دوسرے شخص کی گمراہی ضرر نہ دے گی، جب تم ہدایت پر ہو اور بے شک ہم نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: جب لوگ کوئی بُری بات دیکھیں اور اس کو دفع نہ کریں تو قریب ہے کہ اللہ ﷻ ان پر اپنا عام عذاب نازل کردے۔ (سنن ابن ماجہ)

رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے: "بے شک اللہ ﷻ کچھ لوگوں کی نافرمانی کی وجہ سے سب لوگوں کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا حتیٰ کہ وہ اپنے سامنے بُرائی ہوتی دیکھیں اور وہ اسے روکنے کی طاقت کے باوجود اسے نہ روکیں، جب وہ اس طرح کے ہوجائیں تو پھر اللہ ﷻ عام وخاص (زیادہ اور تھوڑوں سب کو) عذاب میں مبتلا کردیتا ہے۔" (مشکوٰۃ المصابیح)

علمی بات: پہلی اقوام کی تباہی کے دو بنیادی اسباب کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا کہ ان لوگوں میں انبیاء کرام علیہم السلام کی بے مثال اور انتھک کوشش کے باوجود ایسے لوگ کیوں نہ تیار ہوئے جو ان کو عقیدہ وعمل کی خرابی اور فساد فی الارض مچانے سے روکتے۔ جنہوں نے دنیا پرست ظالموں کی پیروی کی اور مجرمانہ طرزِ عمل اختیار کیا۔ ان کی تباہی کا سبب ان کا اپنا کردار تھا۔ اگر یہ اپنے آپ پر ظلم نہ کرتے تو اللہ ﷻ کبھی انہیں اس انجام سے دوچار نہ کرتا کیونکہ وہ اصلاح کرنے والوں کو کبھی ہلاک نہیں کرتا۔

آیت نمبر ۱۱۷: کسی بھی قوم پر ناحق عذاب نہیں آتا۔ ظلم اور فساد کرنے والے عذاب میں مبتلا کئے جاتے ہیں۔ جب تک کسی بستی میں قوم اصلاح کی کوششوں میں لگی رہتی ہے وہاں اللہ ﷻ عذاب نہیں بھیجتے۔

علمی بات: کسی قوم کی بقا اور عذابِ الٰہی سے بچنے کے لئے لازم ہے کہ اس میں اصلاحِ احوال کے لئے ایک منظم جماعت موجود ہو۔ اللہ ﷻ افراد کی انفرادی اور ذاتی کمزوریوں سے درگزر کردیتا ہے لیکن جب انفرادی کمزوریاں جرائم کی صورت اختیار کرتے ہوئے اجتماعی شکل اختیار کرلیں اور ان کی اصلاح کے لئے کوئی

منظم جماعت بھی نہ ہو۔ تو اس قوم کا وجود دنیا میں کینسر کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس کے منفی اثرات ہر جاندار تک پہنچتے ہیں۔ اس صورت حال کو بدلنے اور دنیا کے نظام کو متوازن اور ہموار رکھنے کے لئے ظالم قوم کو عذابِ الٰہی سے ہلاک کر کے جب کہ انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے ساتھیوں کو بچا لیا جاتا ہے۔ عمومی عذاب کے وقت نیک لوگوں کو بچانے کا وعدہ انبیاء کرام علیہم السلام کی ذات کے ساتھ مشروط ہوا کرتا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ کا اصول یہ ہے وہ چاہے تو بُرے لوگوں کے ساتھ نیک لوگوں کو اس عذاب سے دوچار کر دے بعد ازاں نیک لوگوں کا ان کی نیت کے مطابق معاملہ ہو گا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: اللہ تعالیٰ کی حدود پر قائم رہنے والے اور اس میں گھس جانے والے (خلاف کرنے والے) کی مثال ایسے لوگوں کی سی ہے جنہوں نے ایک کشتی کے سلسلے میں قرعہ ڈالا۔ جس کے نتیجہ میں بعض لوگوں کو کشتی کے اوپر کا حصہ ملا اور بعض کو نیچے کا۔ پس جو لوگ نیچے والے تھے، انہیں (دریا سے) پانی لینے کے لئے اوپر والوں کے پاس سے گزرنا پڑتا۔ انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ ہم اپنے ہی حصّہ میں ایک سوراخ کر لیں تاکہ اوپر والوں کو ہم کوئی تکلیف نہ دیں۔ اب اگر اوپر والے بھی نیچے والوں کو من مانی کرنے دیں گے تو کشتی والے تمام ہلاک ہو جائیں گے اور اگر اوپر والے نیچے والوں کا ہاتھ پکڑ لیں تو یہ خود بھی بچیں گے اور ساری کشتی والے بھی بچ جائیں گے۔ (صحیح بخاری، جامع ترمذی، مسند احمد)

آیت نمبر ۱۱۸: اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمام انسانوں کو دین حق کے راستے میں ڈال دیتا مگر کسی کو زبردستی کسی دین پر مجبور کرنا حکمت کا تقاضا نہیں ہے، انسان کو اختیار دیا گیا جس کے تحت وہ اچھے یا بُرے اعمال کر سکتا ہے۔ ہر دور میں کچھ لوگ اختیار کا غلط استعمال کر کے حق کی مخالفت اور اس سے اختلاف کرتے رہے ہیں۔

علمی بات: مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی اُمت بنا دیتا اور سب ایک ہی دین پر ہوتے دنیا میں اسلام ہی اسلام ہوتا اور وہ سب تکوینی طور پر اور جبراً مسلمان ہو جاتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ حق اور باطل دونوں راستے بیان کر دیئے جائیں اور جسے ایمان قبول کرنا ہو وہ اپنے اختیار سے قبول کرے اور جسے کفر پر جمے رہنا ہو وہ اپنے اختیار سے کفر پر جما رہے جیسا کہ سورۃ الکھف میں فرمایا" اور آپ فرما دیجئے کہ تمہارے رب کی طرف سے حق ہے سو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے بے شک ہم نے ظالموں کے لئے آگ تیار کر رکھی ہے" پس جب حق قبول کرنے پر جبر نہیں کیا بااختیار بنا دیا تو شیاطین کی کوششوں اور نفسانی خواہشات کے تقاضوں پر چلنے والے کافر رہیں گے اور اس طرح اہل حق اور اہل باطل میں ہمیشہ اختلاف رہے گا ہاں جس پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہو وہ حق ہی کو اختیار کرے گا اور اسی پر رہے گا۔

علمی بات: اس سے معلوم ہوا کہ اختلاف سے مراد اس جگہ دین حق اور تعلیمات انبیاء کرام علیہم السلام کی مخالفت ہے، اجتہادی اختلاف جو ائمہ دین اور فقہاء اسلام میں ہے وہ فروعی اختلاف ہے، اصول دین کے اندر ان حضرات کے بیچ کوئی اختلاف نہ تھا اور حق و باطل کے درمیان اختلاف اصول و عقائد میں ہوا کرتا ہے نیز یہ فروعی مسائل میں رائے مختلف ہونا عہدِ صحابہ کرام علیہم السلام سے ہوتا چلا آیا ہے وہ اس میں قطعاً داخل نہیں اور نہ وہ رحمتِ الٰہی کے خلاف ہے بلکہ مقتضائے حکمت و رحمت ہے، جن حضرات نے ائمہ مجتہدین کا اختلاف اس آیت کی رو سے غلط، خلاف رحمت قرار دیا ہے، یہ خود سیاق آیت کے بھی خلاف ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وتابعین کرام رحمۃ اللہ علیہم کے عمل کے بھی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

علمی بات: اختلاف مذموم ہونے کے باوجود مجتہدین کا اختلاف کیوں محمود ہے؟ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اختلاف کی مذمّت فرمائی ہے اور اختلاف کرنے والوں کو رحمت سے دور قرار دیا ہے اسی طرح حدیث میں بھی اختلاف کی مذمّت بیان ہوئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک بنی اسرائیل بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری اُمت کے تہتر (۷۳) فرقے ہوں گے اور ایک فرقے کے سوا وہ سب دوزخ میں جائیں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہوں گے، فرمایا: جس طریقہ پر میں اور میرے اصحاب رضی اللہ عنہم ہیں۔ (جامع ترمذی، مسند احمد)

سیّدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بنی اسرائیل اے گروہوں میں تقسیم ہوئے تھے، ان میں سے (۷۰) ہلاک ہو گئے اور ایک گروہ کامیاب ہوا، اور میری اُمت (۷۲) فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی، ان میں سے (۷۱) فرقے ہلاک ہوں گے اور صرف ایک گروہ نجات پائے گا، ایک روایت میں ہے: سارے کے سارے فرقے آگ میں جائیں گے، ماسوائے ایک فرقے کے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا: اے اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ! وہ کونسا گروہ ہو گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جماعت والا، جماعت والا۔ (مسند احمد)

اب یہ سوال ہوتا ہے کہ جب قرآنِ حکیم اور مستند احادیث میں اختلاف کی مذمّت کی گئی ہے تو فقہاء مجتہدین کا ایک دوسرے سے اختلاف کرنا اور تمام ائمہ مجتہدین کا برحق ہونا کس طرح درست ہوگا، اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنِ حکیم اور احادیث میں جس اختلاف کی مذمّت کی گئی ہے وہ عقائد کا اختلاف ہے اور ائمہ مجتہدین کے درمیان عقائد میں اختلاف نہیں ہے بلکہ مسائل فرعیہ میں اختلاف ہے اور یہ اختلاف باعثِ رحمت ہے کیونکہ اس سے اُمّت کے لئے عمل میں آسانیاں پیدا ہوتی ہیں اور مسائل فرعیہ میں اختلاف کے جواز کی دلیل مندرجہ ذیل حدیث ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) غزوۂ احزاب سے واپس ہوئے تو آپ علیہ السلام نے ہم سے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے نماز نہ پڑھے۔ بعض مسلمانوں نے راستے میں عصر کی نماز کا وقت پالیا، ان میں سے بعض نے کہا ہم بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے نماز نہیں پڑھیں گے اور بعض نے یہ کہا بلکہ ہم نماز پڑھیں گے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہم سے یہ ارادہ نہیں فرمایا تھا پھر انہوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے ان میں سے کسی کو ملامت نہیں فرمائی۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)۔

آیت نمبر ۱۱۹: جن پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوگی وہ لوگ اختلافات سے محفوظ رہتے اور سیدھی راہ پالیتے ہیں۔ اختیار کی قوت انسانوں کے علاوہ جنات کو بھی دی گئی ہے۔ دینِ حق سے اختلاف کا راستہ اختیار کرنے والے جنات اور انسانوں کی اکثریت جہنم کی مستحق ہوگی۔

علمی بات: یہ بات قرآنِ حکیم نے بار بار واضح فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمام انسانوں کو چار وناچار ایک ہی دین کا پابند بنا دیتا، لیکن اس کائنات کی تخلیق اور انسان کو اس میں بھیجنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان کو اچھے بُرے کی تمیز سکھا کر اسے یہ موقع دیا جائے کہ وہ اپنے اختیار اور اپنی مرضی سے جو راستہ چاہے اختیار کرے اسی میں اس کا امتحان ہے کہ وہ اپنی مرضی اور اختیار کو ٹھیک استعمال کرتا ہے، اور اس کے نتیجے میں جنّت کماتا ہے یا اس اختیار کا غلط استعمال کرکے دوزخ کا مستحق بن جاتا ہے، اس امتحان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے کسی کو اس کے اختیار کے بغیر زبردستی کسی ایک راستے پر نہیں رکھا۔

کافر انسانوں میں سے بھی ہوں گے اور جنات میں سے بھی ہوں گے دونوں جماعتوں کے کفار سے جہنّم بھر دی جائے گی، جیسا کہ سورۃ الاعراف میں اور سورۃ صٓ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو خطاب کرکے فرمایا "میں تجھ سے اور ان سب جنات اور انسانوں سے دوزخ بھر دوں گا جو تیری پیروی کریں گے"۔

علمی بات: "وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ" اور اسی کے لئے اس نے انہیں پیدا فرمایا۔ اس جملہ کا تعلق آیت کے کس حصّہ کے ساتھ ہے؟ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کا تعلق اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ کے ساتھ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا تو رحمت کے لئے کیا ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ شقاوت کو اپنے لئے پسند کریں۔ انسان کی تخلیق کی غایت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بہرہ مند ہوتا رہے اور ہمیشہ ہدایت کی شاہراہ پر گامزن رہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس کا تعلق اختلاف سے ہے یعنی انسان کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اختیار سے کوئی راہ چنے۔ اسے کسی ایک راہ پر چلنے کے لئے مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اس طرح جو اختلاف رونما ہوگا اس کے پیشِ نظر بعض کو جنّت میں اور بعض کو دوزخ میں بھیجا جائے گا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کا تعلق اختلاف اور رحمت دونوں سے ہے۔ اب آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اہلِ اختلاف کو، اختلاف کے لئے پیدا کیا اور اہلِ رَحْمت کو رَحْمت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ان شاء اللہ یہ توجیہ سب سے بہتر ہے۔

علمی بات: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گمراہ لوگوں کے وجود پر غم وحیرت کا اظہار نہ کریں کیونکہ اہلِ حق کے مقابلے میں گمراہ لوگ بھی برابر پیدا ہوتے رہیں گے۔ راہِ حق کے قبول کرنے اور اس سے اختلاف کرنے والے ہمیشہ رہے ہیں چنانچہ کچھ لوگ فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے درست راہ اختیار کریں گے اور دینِ حق اپنائیں گے اور کچھ فطرت کے مطابق نہ چلتے ہوئے گمراہ ہوں گے، پس اہلِ ایمان رحمت کے مستحق اور اہلِ کفر عتابِ خداوندی کا شکار رہوں گے۔

آیت نمبر ۱۲۰: سابقہ رسولوں کے واقعات بیان کرنے کے تین مقاصد ہیں:

۱۔ تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلّی وتشفی ہو اور اہلِ ایمان کے ایمان اور استقامت میں اضافہ ہو۔

۲۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہلِ ایمان تک سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کے حالات پہنچ جائیں جن کی انہیں پہلے سے خبر نہ تھی۔

۳۔ تمام انسانوں اور بالخصوص اہلِ ایمان کے لئے نصیحت و یاددہانی کا سامان ہے۔

علمی بات: گزشتہ انبیائے کرام علیہم السلام اور ان کی قوموں کے حالات بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی تسلّی و تشفی کے ساتھ مزید ہمت افزائی کی جائے اور انہیں بتایا جائے کہ مکہ مکرمہ میں آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کے ساتھیوں پر جو مصائب آرہے ہیں اسی طرح جب بھی کوئی رسول علیہ السلام کسی قوم کی طرف مبعوث ہوئے اور دعوتِ حق پیش کی تو ان کی مخالفت اسی شدومد سے ہوئی۔ چنانچہ کفارِ مکہ آپ ﷺ کے ساتھ جو برتاؤ کررہے ہیں اس پر آپ ﷺ دل برداشتہ نہ ہوں۔ انبیاء ورسل علیہم السلام اور ان کے ساتھیوں کو ہمیشہ ایسے ہی حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ گزشتہ اُمتوں نے بھی اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ ایسا ہی کچھ کیا، لیکن بالآخر اللہ ﷻ نے اپنے رسول ﷺ کی مدد کی اور ان کو کافروں پر غلبہ عطا فرمایا لہٰذا آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو غلبہ نصیب ہوگا، کفارِ مکہ ناکام ونامراد ہوں گے، اور آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے تمام صحابہ کرام واہل بیتِ اطہار رضی اللہ عنہم کو اللہ ﷻ معزز ومکرم بنائے گا اور دین اسلام غالب ہوکر رہے گا۔

آیت نمبر ۱۲۱: توحید کے واضح دلائل دیکھ لینے کے باوجود ایمان نہ لانے والوں کے لئے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے دوٹوک اعلان کرایا گیا کہ وہ اپنے طریقہ پر اور اہل ایمان اپنے طریقہ پر عمل کرتے رہیں گے۔

آیت نمبر ۱۲۲: انکار پر اصرار کرنے والوں کو ان کے بُرے انجام کا منتظر رہنے کی تنبیہ کی گئی ہے۔ توحید کو اختیار کرنے والے اپنے بہترین انجام کے منتظر رہیں گے۔ جو فریق جیسے انجام کا اہل ہوگا اللہ ﷻ ویسے انجام سے دوچار کرے گا۔

علمی بات: ایک قول کے مطابق یہ مراد ہے کہ شیطان نے تم کو جو فقر وفاقہ سے ڈرایا ہے تم اس کا انتظار کرو اور ہم اس رحمت اور مغفرت کا انتظار کررہے ہیں جس کا اللہ ﷻ نے ہم سے وعدہ کیا ہے ایک رائے کے مطابق تم ہماری ہلاکت کا انتظار کرو اور ہم تم پر عذاب کے نازل ہونے کا انتظار کررہے ہیں۔ وقت بتلائے گا کہ کون پکڑ کا مستحق ہے۔

آیت نمبر ۱۲۳: اللہ ﷻ آسمان وزمین کے تمام رازوں سے واقف ہے۔ تمام انسانوں کے معاملات آخری فیصلہ کے لئے اسی کے سامنے پیش ہوں گے۔ اللہ ﷻ کی بندگی اور اسی پر بھروسہ کرتے ہوئے دعوتِ حق کا کام جاری رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی متعدد صفات ہیں۔ یہاں خصوصیت کے ساتھ علم اور قدرت کا ذکر فرمایا، صفت علم اور قدرت کا مطلب ہے کہ اللہ ﷻ مخلوق کے ظاہر و باطن سے خوب واقف ہے اور جزاء اور سزا پر مکمل قادر ہے۔ جب اللہ ﷻ ہی مستقل بالذّات علم وقدرت والا ہے۔ تو اسی کی عبادت کرنی چاہیئے اور اسی پر توکل رکھنا چاہیئے کیونکہ حقیقتاً اور مستقلاً وہی مددگار ہے۔

یہ بھی یقین رکھنا چاہیئے کہ اللہ ﷻ بندوں کے اعمال سے غافل نہیں ہے۔ یعنی وہ اطاعت گزاروں کی اطاعت کو ضائع نہیں فرمائے گا، ور منکروں اور سرکشوں کو مزید ڈھیل نہیں دے گا۔ وہ قیامت کے دن سب کو میدانِ حشر میں زندہ کرکے جمع کرے گا اور ہر شخص سے حساب لے گا، اور انجام کار نیکوکاروں کو جنّت عطا فرمائے گا، اور بدکاروں کو دوزخ میں دھکیل دے گا۔

عملی پہلو: مومن اللہ ﷻ کی عبادت، اللہ ﷻ پر بھروسہ کے بعد اپنے تمام اُمور اسی کے سپرد کردیتا ہے اور اللہ ﷻ اس کا محافظ ونگران حال بن جاتا ہے اور اپنی رحمت کا دامن اس کے لئے کشادہ فرمادیتا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے اس آیت میں آپ ﷺ کو تسلّی دی ہے کہ آپ ﷺ اہل کفر وشرک کی شرارتوں سے دل گرفتہ نہ ہوں آپ علیہ السلام اپنی دعوت کو جاری رکھیئے اور ان کا فیصلہ اللہ ﷻ کے حوالہ کردیجئے، اس سے آسمان وزمین کی کوئی بات چھپی ہوئی نہیں، سب معاملات اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ وہاں انہیں پتہ لگ جائے گا کہ وہ کس خبط میں پڑے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ اپنے پروردگار کی بندگی اور فرمانبرداری میں لگے رہیئے اور اپنی اُمّت کو بھی اس کی تلقین فرمایئے اور اسی کی مدد پر قوی بھروسہ رکھیئے آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ کے ماننے والوں اور آپ علیہ السلام کے مخالفین کے تمام اعمال سے بخوبی آگاہ ہے۔ وہ ان کے ان اعمال کا بدلہ ضرور دے گا۔

COPYRIGHTS ® RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION. SALE OF THIS BOOK WOULD ENTAIL CIVIL & CRIMINAL ACTION.

سُوْرَۃُ الرَّعْد

آیت نمبر ۱: رسول اللہ ﷺ پر نازل کردہ قرآنِ حکیم کی آیات اور آپ ﷺ کی نبوّت کے برحق ہونے کا ذکر ہے۔ نیز یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ان سب دلائل کے واضح ہونے کے باوجود لوگوں کی اکثریت غور و فکر نہ کرنے کی وجہ سے ایمان نہیں لاتی۔

علمی بات: حروفِ مقطعات کا اصلی مقصود صرف اللہ ﷻ جانتا ہے اور ان سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ یہ قرآن اللہ ﷻ کی برحق کتاب ہے جس کی صداقت و حقانیت میں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں ہے اور اس جیسا کلام کوئی انسان لا ہی نہیں سکتا۔

علمی بات: یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو اللہ ﷻ نے آپ ﷺ پر نازل فرمائی اور جس کتاب کو اللہ ﷻ نازل فرمائے اس کے حق ہونے میں کسی کو کیا شبہ ہو سکتا ہے ؟ لیکن پھر بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس سچی کتاب پر ایمان لانے کے لئے تیار نہیں۔ قرآنِ حکیم کی فصاحت و بلاغت اور اس کے اعجازِ بیان کے سامنے تو انہیں دم مارنے کی ہمت نہ تھی۔ لیکن قرآنی دعوت کے تین بنیادی عقائد سے انہیں اتنا شدید اختلاف تھا کہ وہ کسی قیمت پر ان کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ (۱) توحیدِ باری تعالیٰ (۲) روزِ قیامت (۳) وحی اور ان عقائد کے خلاف شبہات ان کے دل میں ایسے جڑ پکڑ چکے تھے کہ آفتاب سے زیادہ روشن دلائل کے سامنے بھی وہ سر جھکانے کو تیار نہ تھے۔ چنانچہ اس سورت میں اُن کے اِن تین شکوک و شبہات کی پرزور طریقہ سے تردید کی گئی ہے۔

آیت نمبر ۲: اللہ ﷻ کی قدرتِ کاملہ اور کائنات میں اس کے غلبہ کی وسعت کا بیان ہے۔ اللہ ﷻ نے آسمانوں کی تخلیق فرمائی جو بغیر ستونوں کے قائم ہیں جنہیں ہر شخص دیکھ رہا ہے۔ اللہ ﷻ کا عرش پر استویٰ فرمانا متشابہات میں سے ہے اس کی ٹھیک ٹھیک کیفیات اللہ ﷻ کے سوا کوئی نہیں جانتا ہمارے لئے فقط اتنا ایمان رکھنا کافی ہے کہ اللہ ﷻ نے عرش پر استویٰ فرمایا جو اس کی شان کے لائق ہے، جس کی مثال دینا بھی ممکن نہیں۔ چاند اور سورج کے معین مدّت کی طرف چلنے کے دو معنی ہیں:

۱۔ چاند اور سورج قیامت تک اللہ ﷻ کے حکم سے چلتے رہیں گے۔ ۲۔ چاند اور سورج کے لئے منازل مقرر کر دی گئی ہیں جن میں وہ چلتے رہتے ہیں۔

کائنات کی تخلیق اور تدبیر و نظام کا مقصد یہ ہے کہ لوگ رب کی نشانیوں پر غور و فکر کریں اور اس سے ملاقات کا یقین کر لیں۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ اپنی توحید اور واجب الوجود ہونے پر دلائل قائم فرما رہا ہے۔ اللہ ﷻ نے ارشاد فرمایا کہ اس نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے بلند کیا کیونکہ یہ مشاہدہ ہے کہ ایک عام سی چھت بھی بغیر ستونوں کے قائم نہیں ہو سکتی تو جس قادر و قیوم نے آسمانوں کو بغیر کسی سہارے کے بلند کر دیا تو یقیناً وہ ہستی ممکنات اور مخلوقات سے بہت بالاتر ہے۔

اللہ ﷻ نے سورج اور چاند اور ان کی گردش کا ذکر فرمایا، ہم دیکھتے ہیں کہ سورج اور چاند ہمیشہ ایک مخصوص مدار میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون ہے ؟ جس نے ان کو ایک خاص نظام کے تحت مخصوص مدار میں گردش کا پابند بنا دیا اور یہ مربوط نظام، اس کی یکسانیت اور اس کا تسلسل یہ بتا رہا ہے کہ اس نظام کا خالق بھی ایک ہے، مدّبر بھی ایک اور منتظم بھی ایک ہے۔

نیز یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ جو باری تعالیٰ آسمانوں کو بغیر ستونوں کے قائم رکھنے پر قادر ہے اور جس نے شمس و قمر اور دیگر سیاروں کو اپنے علم و قدرت کے مطابق مسخر کر رکھا ہے اسی نے یہ قرآنِ حکیم اپنے بندے اور رسول سیّدنا حضرت محمد مصطفیٰ (ﷺ) پر نازل فرمایا ہے۔

علمی بات: خلاصہ کلام یہ ہے کہ جو اللہ ﷻ پوری کائنات پیدا کرنے، اس کی تدبیر کرنے اور اس کا نظام چلانے پر قادر ہے اس کے لئے اس سب نظام کو فنا کر کے دوبارہ پیدا کرنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ وہ قیامت کو برپا کرنے، مخلوق کو دوبارہ زندہ کر کے اپنی بارگاہ میں پیش کرنے اور سزا و جزا دینے پر بھی قادر ہے۔ جس ذات نے اتنی حیرت انگیز کائنات پیدا فرمائی ہے وہ اس بات پر کیوں قادر نہیں ہے کہ انسانوں کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر دے۔ چنانچہ وہ تو بدرجہ اولیٰ ان مُردوں کو زندہ کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ نیز اس کی حکمت اور انصاف سے بعید ہے کہ وہ فرماں برداروں اور نافرمانوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرے اور اس نے اس دُنیا کے بعد کوئی ایسا عالم پیدا نہ کیا ہو جس میں اطاعت گزاروں کو ان کی نیکی کا اچھا بدلہ اور جرم کرنے والوں کو ان کے جرائم کی سزا دی جا سکے۔

آیت نمبر ۳: اللہ ﷻ کی بے مثال تخلیق کو بیان کیا گیا ہے۔ اللہ ﷻ نے زمین کو پھیلا کر اس میں بلند و بالا پہاڑ پیدا کئے اور ان پہاڑوں سے دریا اور نہریں جاری فرما دیں اور ہر طرح کے پھل اور میوے جوڑوں کی صورت میں پیدا کئے۔ نیز رات اور دن کا نظام جاری کر دیا۔ لہٰذا ان نعمتوں اور نشانیوں میں غور و فکر کرنے

والوں کے لئے بڑی رہنمائی موجود ہے۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ کی تخلیق، قدرت اور توحید کی پانچ دلیلیں ذکر ہوئی ہیں۔

(۱) کفار و مشرکین کو دعوتِ فکر دی گئی ہے کہ اگر تم ذرا انصاف سے کام لو تو بتاؤ زمین کا یہ وسیع و عریض فرش کس نے بچھایا ہے۔ کیا مشرکین کے خود ساختہ معبودوں نے اسے بچھایا ہے؟

(۲) جگہ جگہ پہاڑوں کا قائم کر دینا بھی اس کی قدرتِ کاملہ کی روشن دلیل ہے۔ کس طرح ان کو بلند کیا اور ایک جگہ پر انہیں مستحکم کر دیا جن میں بے شمار معدنیات کے خزانے پیدا کر دیئے۔ کہیں سے کوئلہ کہیں سے لوہا اور کہیں سے سونا بر آمد ہو رہا ہے۔ کہیں سے تانبا کہیں سے کچھ اور معدنیات نکل رہی ہیں جو انسانی زندگی میں بہت سے فوائد اور خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

(۳) پہاڑوں کے سخت پتھروں اور سنگلاخ چٹانوں میں سے ہزار ہا فٹ کی بلندی پر پانی کے ایسے چشمے جاری کر دینا جو بڑے بڑے دریاؤں کی صورت میں اور ہزاروں میدانی علاقوں کے لاکھوں مربع میل زمین کو سیر اب کرتے ہیں یقیناً یہ سب اس کی کبریائی کی روشن دلیلیں ہیں۔

(۴) پھلوں کی بے شمار اقسام اور پھر ان میں رنگ و خوشبو، ذائقہ اور تاثیر کا فرق بھی اس کی کمالِ قدرت و حکمت کی دلیل ہے۔

(۵) دن کے اُجالے کے بعد رات کی تاریکی کا پھیل جانا۔ یہ بھی اس کی قدرتِ کاملہ کا واضح ثبوت ہے۔

ان دلائل سے واضح ہوتا ہے کہ اس کائنات کا ایک ہی خالق ہے۔ اگر کائنات کسی حادثہ سے معرضِ وجود میں آئی ہوتی تو اس کا نظام ایسا مضبوط اور اس کے جمال میں یہ رعنائی اور اس کے کمال میں یہ نکھار نہ ہوتا۔ اگر کائنات کے کئی خالق ہوتے تو کائنات کی ہر چھوٹی اور بڑی چیز میں تسلسل اور ہم آہنگی نہ ہوتی۔

عملی پہلو: یہ جو کچھ باتیں بیان کی گئیں ان میں عقل و شعور والے فکر کریں اور یہ سوچیں کہ مذکورہ بالا چیزوں کی تخلیق اور ان کی ایجاد و بقا اور ان کی تسخیر اور ترتیب بغیر کسی ایک خالق کے ممکن ہی نہیں لہٰذا ان کا پیدا کرنے والا بھی ہے اور ان کو باقی رکھنے والا بھی ہے اور ان کو مسخر کرنے والا بھی ہے غور کریں گے تو خالق و مالک کی اُلوہیت، وحدانیت اور عظمت سمجھ میں آجائے گی۔

آیت نمبر ۴: اللہ ﷻ کی قدرت کا مزید بیان ہے۔ اللہ ﷻ نے زمین کو مختلف ٹکروں میں تقسیم کیا جس میں کہیں کھیت، کہیں انگوروں اور کھجوروں کے باغات، پھر ان کی تاثیر اور خاصیت بھی مختلف رکھی گئی ہے۔ اللہ ﷻ نے ایک ہی جڑ سے کھجور کے دو درخت اُگائے جو ایک ہی پانی سے سیر اب ہوتے ہیں لیکن ان کے پھلوں میں رنگ، شکل، ذائقہ اور لذّت الگ الگ پیدا کر دیئے۔ یہ نشانیاں غور و فکر کرنے والوں کے لئے اللہ ﷻ کی معرفت اور اس کے لئے شکر کے جذبات پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں۔

علمی بات: زمین پر پائی جانے والی مزید نشانیوں کا ذکر ہے جو اللہ ﷻ کی قدرت و حکمت پر دلالت کرتی ہیں، زمین کے حصّے ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں لیکن کوئی حصہ زرخیز ہوتا ہے تو کوئی بنجر، کوئی سخت ہوتا ہے تو کوئی نرم، باوجود اس کے کہ زمین کے ٹکڑے ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں، مٹی ایک ہوتی ہے، پانی ایک ہوتا ہے لیکن ان میں پیدا ہونے والے دانے اور پھل مختلف ہوتے ہیں، کوئی میٹھا ہوتا ہے تو کوئی کھٹا، کوئی عمدہ اور لذیذ ہوتا ہے تو کوئی بے مزہ اور بعض زمینوں میں ایک پھل ہوتا ہے تو دوسرا نہیں ہوتا۔

یہ تمام نشانیاں اللہ ﷻ کی وحدانیت اور اس کی کمالِ قدرت پر دلالت کرتی ہیں۔ جو صاحبِ عقل بھی ان میں غور و فکر کرے گا وہ ایمان لے آئے گا کہ جو ذات واحد ان سب پر قادر ہے، وہ یقیناً بنی نوع انسان کو دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ دوبارہ پیدا کرنا اس کے لئے کوئی مشکل نہیں ہے۔

علمی بات: اگر کائنات میں پائے جانے والے درختوں کا بغور مشاہدہ کیا جائے تو پتیوں کی مختلف تراش و خراش، پھلوں اور پھلوں کے مختلف رنگوں، ان کی مختلف خوشبوؤں اور ان کے مختلف ذائقوں میں یہ بات نظر آئے گی کہ ان کا پیدا کرنے والا وہی خالق ہے جو ہمیشہ سے ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور وہی اس کا مستحق ہے کہ صرف اسی کی عبادت کی جائے، اور اس کی ذات وصفات میں کسی کو بھی شریک نہ کیا جائے۔

علمی بات: ا۔ "صِنْوَانٌ" صنو کی جمع ہے "صنو" کا معنی ہے کہ نیچے جڑ تو ایک ہو لیکن اوپر تنے جدا جدا ہوں۔ کھجور کے ایسے درخت بھی ہوتے ہیں کہ نیچے جڑ تو ایک ہوتی ہے اور اوپر تنے جدا جدا ہوتے ہیں۔

۲۔ "وَغَیْرُ صِنْوَانٍ" اور وہ بھی ہیں جن کے تنے علیحدہ علیحدہ نہیں ہوتے ایک ہی تنا چلا جاتا ہے اور اس کے اوپر پھل لگتا ہے۔ کھجور کے درختوں کی بے شمار اقسام ہیں اور ہر ایک کا رنگ اور ذائقہ الگ اور جدا ہے۔ ان کو سیراب کرنے والا پانی ایک ہے، نشو و نما کرنے والی دھوپ، گرمی اور ہوا ایک ہے، مگر رنگ، شکلیں اور ذائقے الگ الگ ہیں، یہ اللہ ﷻ کا کمالِ قدرت ہے۔

حضرت براء (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: جو متعدد کھجور کے درخت ایک جڑ سے ہوں وہ صِنْوَانٌ ہیں اور جو متفرق جڑوں سے ہوں وہ غَیْرُ صِنْوَان ہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اللہ ﷻ کے اس قول وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ "ہم بعض پھلوں کو بعض پر (لذّت اور خوش ذائقہ ہونے میں) فضیلت دیتے ہیں" (سورۃ الرعد ۱۳، آیت:۴) اس بارے میں فرمایا: "اس سے مراد سوکھی کھجوریں اور فارسی کھجوریں اور میٹھی اور کھٹی (کڑوی کسیلی) کھجوریں ہیں۔" (جامع ترمذی)

یہ کھجوروں کی اقسام کے نام ہیں جیسے ہم نے آم کی قسموں کے نام رکھے ہوئے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ان کو سیراب کرنے والا پانی ایک ہے، نشو و نما کرنے والی دھوپ، گرمی اور ہوا ایک ہے، مگر رنگ، شکلیں اور ذائقے الگ الگ ہیں، یہ اللہ ﷻ کا کمال قدرت ہے۔

عملی پہلو: ان باتوں پر غور و فکر کی دعوت کا حاصل یہ ہے کہ بندے خالق کی تخلیق، علم الحیات اور دیگر وسائل زندگی پر غور و فکر کرتے رہیں۔ بلاشبہ اس میں عقل والوں کے لئے اللہ ﷻ کی قدرت و عظمت اور اس کی وحدت پر دلالت کرنے والی بہت سی نشانیاں ہیں اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ ان چیزوں میں غور نہیں کرتے وہ عقل والے نہیں اگرچہ دُنیا میں ان کو کیسا ہی عقلمند سمجھا اور بولا جاتا ہو۔

عملی پہلو: کائنات میں موجود چیزوں کے اندر اللہ ﷻ کے خلق و تدبیر، اس کی قدرت و حکمت اور اس کی توحید اور آخرت کی جو نشانیاں ہیں وہ اس وقت تک ناقابل فہم رہیں گی جب تک لوگ اللہ ﷻ کی آیات میں غور و فکر نہیں کریں گے۔ کائنات کی مخلوقات میں غور و فکر سے انسان اللہ ﷻ کو مُدبّر مانتا ہے۔ جس سے انسان کو عظیم اور بلند و بالا ہستی کی معرفت و پہچان حاصل ہوتی ہے۔

آیت نمبر ۵: قیامت کے وقوع اور دوبارہ زندگی پر منکرین کا تعجب بذاتِ خود باعث تعجب ہے۔ دوبارہ پیدا ہونے سے انکار در حقیقت اللہ ﷻ کی قدرتِ کاملہ کا انکار ہے۔ منکرین کی سزا یہ ہے کہ آخرت میں ان کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے آنحضرت (ﷺ) کو مخاطب کرکے فرمایا کہ آپ (ﷺ) ان کافروں کی تکذیب پر کوئی تعجب نہ کریں۔ یہ تو اللہ ﷻ کی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھنے کے باوجود قیامت کا انکار کرتے ہیں۔ کیا اس سے زیادہ عجیب بھی کوئی بات ہوئی کہ جس نے پہلے ایک چیز کو بنایا وہ دوبارہ اس کے بنانے پر قادر نہ ہو (العیاذ باللہ)، حالانکہ ہر عقل مند آدمی جان سکتا ہے کہ زمین و آسمان کی پیدائش انسان کی پیدائش سے بہت بڑی ہے اور دوبارہ پیدا کرنا پہلی بار پیدا کرنے کی نسبت بہت آسان ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد فرمایا: "کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ بے شک وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا اور وہ ان کے پیدا فرمانے سے نہیں تھکا (وہ) اس بات پر (بھی) قادر ہے کہ وہ مُردوں کو زندہ فرمادے کیوں نہیں! بے شک وہ ہر چیز پر بڑی قدرت والا ہے"۔ (سورۃ الاحقاف ۴۶، آیت: ۳۳)

علمی بات: جب کسی کے گلے میں طوق پڑا ہوا ہو تو وہ ادھر اُدھر دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اسی طرح یہ لوگ حقائق کو دیکھنے اور ان کی طرف دھیان کرنے سے محروم ہیں (روح المعانی) اس کے علاوہ گلے میں طوق دراصل غلامی کی علامت ہے۔ چنانچہ ان سے پہلے معاشروں میں غلاموں کے ساتھ یہی معاملہ کیا جاتا تھا۔ لہٰذا اِس آیت میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کے گلوں میں اپنی خواہشاتِ نفسانی اور شیطان کی غلامی کا طوق پڑا ہوا ہے، اس لئے وہ غیر جانب داری سے کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہے۔ بعض مفسرین نے اس جملے کا مطلب یہ بھی بیان کیا ہے کہ آخرت میں ان کے گلوں میں طوق ڈالے جائیں گے۔ قیامت کے دن دوزخ کے اندر ایسے لوگوں کی گردنوں میں آگ کے طوق ہوں گے اور یہی اہل دوزخ ہیں جو اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور وہاں سے کبھی نہیں نکالے جائیں گے۔

آیت نمبر ۶: منکرین کا اعتراض یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی مخالفت پر عذابِ الٰہی کیوں نہیں آجاتا؟ اَلْمَثُلٰت سے مراد ایسی سزا ہے جو انسان کو سب کے سامنے رسوا کرے اور دوسروں کے لئے عبرت کا ذریعہ بنے۔ پچھلی قوموں کی عبرتناک مثالیں دیکھ کر موجودہ منکرین عبرت حاصل نہیں کرتے۔ اللہ ﷻ بڑی مغفرت

والا ہے البتہ نعمت وحی سے مستفید نہ ہونے اور اپنی سرکشی پر ڈٹے رہنے والوں کو وہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

علمی بات: نبی کریم ﷺ اور قرآنِ حکیم کی تکذیب کرنے والے آپ ﷺ کا مذاق اڑاتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر وہ سچے ہیں تو جس عذاب کی بات کرتے ہیں وہ آ کیوں نہیں جاتا؟ یعنی بجائے اس کے کہ وہ اللہ ﷻ سے عافیت اور سلامتی مانگتے، وہ اُلٹا عذاب کا مطالبہ کرتے تھے۔ حالانکہ ان سے پہلے ایسی قومیں گزر چکی ہیں جنہوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا تو اللہ ﷻ نے ان پر عذاب نازل کر دیا پھر وہ لوگ ان کے انجام سے عبرت کیوں نہیں حاصل کرتے اور ڈرتے کیوں نہیں کہ کہیں انہیں بھی عذابِ الٰہی اپنی گرفت میں نہ لے لے، لہٰذا جو شخص گناہ کا ارتکاب کرنے کے بعد اللہ ﷻ کی بارگاہ میں تائب و نادم ہو گا، وہ اسے معاف کر دے گا۔

عملی پہلو: انسان سے نادانی میں چھوٹے گناہ سرزد ہو جائیں یا بڑے گناہ اگر انسان سچی توبہ کر لے تو اللہ ﷻ زیادتیوں کے باوجود اپنے بندوں کو معاف فرما دیتا ہے۔ لیکن کفر و شرک اور اللہ ﷻ کے ساتھ ضد اور عناد کا معاملہ ایسا ہے کہ اس پر اللہ ﷻ کا عذاب بڑا ہی سخت ہے۔ لہٰذا بندوں کو یہ سوچ کر بے فکر نہیں ہونا چاہیئے کہ اللہ ﷻ بڑا بخشنے والا اور رحیم ہے، اس لئے وہ ہماری ہر نافرمانی کو ضرور معاف فرما دے گا۔

علمی بات: منکرینِ حق کی یہ دیرینہ عادت ہے کہ اسلام کی حقانیت کے جو روشن دلائل ان کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں اُن میں تو غور و فکر کی زحمت گوارا نہیں کرتے البتہ منکروں کے لئے اللہ ﷻ نے جو عذاب مقدر کیا ہے اس کے جلد آنے کے لئے بڑا شور مچاتے ہیں۔ انہوں نے اسلام کی حقانیت کی صرف ایک دلیل اپنے ذہن میں جمائی ہوئی ہے کہ اگر وہ عذاب اتر آیا تو یہ نبی بھی سچا اور اس کا دین بھی برحق اور اگر ان کی فرمائش کے مطابق عذاب نہ اترا اور انہیں سوچنے کی مزید مہلت دے دی گئی تو بس یہ فیصلہ کر بیٹھتے ہیں کہ یہ سب کچھ من گھڑت اور کھوکھلی دھمکیاں ہیں (معاذ اللہ)۔ وہ نادان یہ بھی نہیں سوچتے کہ اگر وہ عذاب ان پر نازل کر دیا جائے اور اس وقت اسلام اور داعیٔ اسلام کی صداقت کا یقین انہیں آ بھی جائے تو اس سے آخر انہیں کیا فائدہ ہو گا جبکہ وہ تو تباہ و برباد کر دیئے گئے ہوں۔ انہیں بتایا جا رہا ہے کہ یہ ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑ دو۔ اِن مہلت کی گھڑیوں سے فائدہ اٹھاؤ، اِن دلائل و شواہد میں غور کرو اور نورِ ایمان سے اپنے سینوں کو روشن کر لو۔

آیت نمبر ۷: منکرینِ حق رسول اللہ ﷺ کے بہت سارے معجزات دیکھنے کے باوجود کہتے کہ اُن کے مطالبے پر معجزے ظاہر کیوں نہیں ہوتے؟ اعتراض کا جواب یہ دیا گیا کہ رسول ﷺ کا کام معجزے دکھا کر زبردستی حق منوانا نہیں ہے بلکہ حق کا راستہ دکھانا اور آخرت کے حوالے سے خبردار کرنا ہے۔

درحقیقت معجزہ تو اللہ ﷻ کی طرف سے بطور فضل ظاہر کیا جاتا ہے اصل چیز تو دلائل ہیں۔ جب دلائل سے حق واضح ہو گیا اور نبی کریم ﷺ کی نبوّت ثابت ہو گئی تو نبی کریم ﷺ پر ایمان لانا فرض ہو گیا لیکن پھر بھی اللہ ﷻ کی طرف سے فضل تھا کہ اللہ ﷻ نے معجزات عطا فرمائے لیکن جو لوگ ہٹ دھرم تھے وہ نہ دلائل سے مانتے تھے اور نہ معجزہ دیکھ کر ایمان لاتے تھے جبکہ ان کی خواہش کے مطابق بھی بعض معجزات ظاہر ہوئے تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو جادو ہے (معاذ اللہ)۔ فرمائشی معجزوں کی بات کرنا قبولِ حق کے لئے نہیں تھا بلکہ اپنی ضد پر قائم رہنے کے لئے تھا۔

علمی بات: آپ ﷺ کے لئے تسلّی و تشفی ہے کہ آپ ﷺ کا کام بس حق پہنچا دینا اور عذابِ آخرت سے ڈرانا ہے لوگوں سے حق منوانا آپ علیہ السلام کے ذمہ نہیں لہٰذا اگر یہ کسی خاص معجزہ کی فرمائش کرتے ہیں اور اللہ ﷻ اسے ظاہر نہیں فرماتا تو آپ ﷺ فکرمند نہ ہوں جب آپ ﷺ نے تبلیغ کا کام سرانجام دے دیا تو آپ ﷺ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے۔

منکرین نے کئی معجزات دیکھے مثلاً آپ ﷺ کی بے مثال سیرت اور قرآنِ حکیم کی ہر ایک آیت جو اپنے الفاظ و معانی کے اعتبار سے ایک لاجواب معجزہ ہے مگر اس کے باوجود وہ نئے نئے معجزات کا مطالبہ کرتے۔ اس پر اللہ ﷻ کے حکم سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ ہر روز تمہیں معجزات دکھاتا رہوں بلکہ میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ تمہیں ہدایت کا راستہ دکھاؤں اور ان کاموں سے ڈراؤں جو اللہ ﷻ کی ناراضگی کا باعث ہیں۔

علمی بات: نبی کریم ﷺ قیامت تک کے لئے ہر قوم کے نبی اور رہنما ہیں اور نبی کریم ﷺ سے پہلے اللہ ﷻ نے ہر قوم کی طرف نبی یا اس کی دعوت کو پھیلانے والا کوئی ہادی بھیجا لہٰذا ہر قوم کی طرف نبی یا اس کے نائب کی حیثیت سے کوئی ہادی آیا تھا۔ آپ ﷺ کوئی نئے یا پہلے نبی نہیں۔ اسی طرح سب ہی انبیاء کرام علیہم السلام کا فریضۂ منصبی یہ تھا کہ وہ قوم کو ہدایت کا پیغام پہنچائیں اور انہیں اللہ ﷻ کے عذاب سے ڈرائیں۔ اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہے اس سے ثابت ہوا کہ کوئی ملک و قوم اور کوئی خطہ اللہ ﷻ کی طرف دعوت دینے والوں سے خالی نہیں ہو سکتا۔ خواہ وہ کوئی نبی ہو یا اس نبی کا قائم مقام اور نائب ہو۔ جیسا سورۂ یٰسین میں وقت کے نبی کی طرف سے کسی قوم کی طرف پہلے دو شخصوں کو دعوت و ہدایت کے لئے بھیجنے کا ذکر ہے جو نبی نہیں تھے۔ پھر تیسرے آدمی کو ان

کی تائید و نصرت کے لئے بھیجنا مذکور ہے۔ معلوم ہوا کہ ہادی کے لئے نبی ہونا ضروری نہیں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی اُمّتوں میں جو اہلِ علم تھے وہ اپنے اپنے نبی کی اُمّتوں کو ہدایت کی طرف رہنمائی دیتے رہے۔

آیت نمبر ۸: اللہ تعالیٰ کی صفت علم کے مظاہر کا بیان ہے۔ ہر مادہ کے رحم میں پرورش پانے والے کا کامل علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ حمل کی درست مدّت کا علم بھی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو نہیں۔ کائنات میں ہر شے اپنی پوری مقدار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔

علمی بات: مشرکین مکّہ کی خواہش کے مطابق اس لئے نشانی نہیں بھیجی گئی کہ تمام امور کی حکمتوں کو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ اس ہی کے علم میں ہے کہ کون سی چیز دُنیا میں کب وقوع پذیر ہونی چاہیئے۔ وہ کفار کے جاہلانہ افکار و خیالات کا ہرگز پابند نہیں ہے۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ کا علم اس کا نظام قدرتِ کائنات کے ذرہ ذرہ پر محیط ہے۔ ماں کے بطن میں جس بچہ نے اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وجود اختیار کیا ہے اس کا پوری طرح اللہ تعالیٰ کو علم ہے۔ انسانوں کی بنائی ہوئی مشینیں یہ تو معلوم کر سکتی ہیں کہ ماں کے بطن میں لڑکا ہے یا لڑکی ہے یا وہ کس حالت، مقام اور حیثیت میں ہے لیکن دُنیا کی کوئی الٹرا ساؤنڈ مشین یہ نہیں بتا سکتی کہ یہ بچہ جو اس دُنیا میں قدم رکھ رہا ہے وہ خوبصورت ہے یا بدصورت، اس کی کتنی زندگی ہے اور اس کا رزق کتنا ہے اور اس کی موت کب واقع ہوگی۔ وہ بچہ والدین کا فرماں بردار ہوگا یا نافرمان، ایمان پر قائم رہے گا یا کفر پر مرے گا، وہ دُنیا میں کیسا مقام حاصل کرے گا۔ ان تمام باتوں کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک کی پیدائش چالیس دن تک اس کی ماں کے بطن میں جمع ہوتی رہتی ہے۔ پھر اتنے ہی دن تک وہ جما ہوا خون بن جاتا ہے۔ پھر اتنے ہی دن تک گوشت کا لوتھڑا بن جاتا ہے۔ پھر اس کے پاس اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ بھیجتا ہے تو وہ اس میں روح پھونکتا ہے۔ پھر اسے چار چیزوں (کے لکھنے) کا حکم کیا جاتا ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے: اس کا رزق، اس کی موت، اس کا عمل اور یہ چیز کہ وہ بدبخت ہے یا نیک بخت۔ (صحیح بخاری)

علمی بات: آیتِ سابقہ سے اس کا ربط یہ ہے کہ آیت ۷ میں یہ فرمایا گیا تھا کہ کافروں نے حضرت سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوّت پر طعن کرتے ہوئے یہ کہا کہ ان پر ان کے رب کی طرف سے کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل کیا گیا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس کے جواب کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کا ذکر فرمایا ہے کہ ہر حاملہ کے بطن میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے وہ ہر چھپی ہوئی اور ظاہری چیز کو جانتا ہے، اس کو کفار کے دلوں اور ان کی نیتوں کے حال کا بھی علم ہے کہ یہ لوگ حضرت سیّدنا محمد مصطفیٰ ﷺ کے پیش کئے ہوئے معجزات کے علاوہ جو دیگر فرمائشی معجزات کا مطالبہ کر رہے ہیں آیا وہ لوگ واقعی ہدایت کے حصول کی نیت سے طلب کر رہے ہیں یا ان کا مطالبہ محض ضد، عناد اور کٹ حجتی کے طور پر ہے چونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ یہ محض عناد اور سرکشی کے لئے ان معجزات کو طلب کر رہے ہیں اور ان کی نیت میں فتور ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے فرمائشی معجزات عطا نہیں فرمائے۔

آیت نمبر ۹: انسان کسی بات کو ظاہر کرے یا چھپائے اللہ تعالیٰ کے علم سے کوئی بات اور کوئی حالت پوشیدہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی بہت بلند و برتر ہے جسے ہر قسم کا اختیار حاصل ہے۔

علمی بات: اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے اور بڑا عالی مرتبہ ہے کوئی اس کی مثل نہیں۔ منکرین حشر یہ کہتے تھے کہ مرنے کے بعد ان کی خاک بکھر جائے گی، پھر وہ خاک کیونکر جمع ہو کر انسانی سانچے میں ڈھل سکے گی۔ آیت کے اس حصّہ میں ان لوگوں کو یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ خاک ذرّات کی صورت میں منتشر ہو کر انسانی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے مگر اللہ تعالیٰ کے علم سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا وقت مقررہ پر وہ خاک جمع کی جائے گی اور اسی سے انسان کو دوبارہ پیدا کیا جائے گا۔ وسیع و عریض فضا میں بکھرے ہوئے ان باہم ملے ہوئے ذرات کو ممتاز اور الگ کرنا اللہ تعالیٰ کے لئے کیسے دشوار ہو سکتا ہے جس کی شان یہ ہے کہ وہ ہر حاضر و غیب اور ہر پوشیدہ و عیاں کا عالم ہے، ماں کے بطن میں بچہ جن ادوار، احوال اور کیفیات سے گزرتا ہے، اسے اس کے ہر دور، ہر حال اور ہر کیفیت کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے لئے ان مردہ اجسام ذرات کو الگ الگ جمع کرنا کون سا مشکل کام ہے۔

آیت نمبر ۱۰: انسان کوئی بات باآوازِ بلند کہے یا سرگوشی کے انداز میں، اللہ تعالیٰ کو تمام باتوں کا علم ہوتا ہے۔ کوئی انسان دن میں عمل کرتا ہو یا رات کی تاریکی میں کہیں چھپا ہوا ہو اللہ تعالیٰ اس کے مقام اور حال سے خوب واقف ہے۔ یعنی اس کے لئے ظاہر و پوشیدہ سب برابر ہے۔ سب کچھ اس کے علم میں ہے۔ آپ ﷺ کے رب سے کوئی ذرہ برابر (چیز) نہ زمین میں غائب ہوتی ہے اور نہ ہی آسمان میں۔

علمی بات: مُستَخفٍ کے معنی ہیں چھپا ہوا اور سَارِبٌ کے معنی ہیں گلیوں میں پھرنے والا، راستہ میں چلنے والا، یہاں یہ مراد ہے جو راستہ میں علانیہ اور کھلم کھلا چلنے والا ہو۔

آیت نمبر ۱۱: مُعَقِّبٰتٌ کا مطلب ہے ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے۔ مراد فرشتے ہیں جو باری باری ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں۔ اللہ ﷻ نے انسان کی حفاظت کے لئے نگران فرشتے مقرر کئے ہیں جو اس کی حفاظت پر مامور رہتے ہیں۔ حفاظت سے مراد اعمال کی حفاظت بھی ہے اور خود لوگوں کی حفاظت بھی۔ کسی قوم کی اچھی حالت کے بدل جانے کا انحصار اس کے اپنے عمل پر ہے۔ کسی قوم پر اللہ ﷻ کا عذاب اس وقت آتا ہے جب وہ اللہ ﷻ کی حد درجہ کی ناشکری اور نافرمانی کرتی ہے۔ عذاب آجانے پر اللہ ﷻ کے سوا اُسے کوئی ٹالنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

علمی بات: ہر شخص خواہ اپنے کلام کو چھپائے یا ظاہر کرے، اسی طرح اپنے چلنے پھرنے کو رات کی تاریکیوں کے ذریعہ مخفی رکھنا چاہے یا کھلے بندے سڑکوں پر پھرے، ان سب لوگوں کے لئے اللہ ﷻ کی طرف سے فرشتوں کی جماعتیں مقرر ہیں جو ان کا ہر طرح سے احاطہ کئے رہتی ہیں جن کی خدمت اور ڈیوٹی بدلتی رہتی ہے اور یکے بعد دیگرے آتی رہتی ہیں ان کے ذمہ یہ کام بھی سپرد ہے کہ وہ بحکمِ خداوندی انسانوں کی حفاظت کریں۔

علمی بات: اللہ ﷻ کسی قوم کی امن و خوشحالی کی حالت کو آفت و مصیبت میں اس وقت تک تبدیل نہیں کرتا جب تک وہ قوم خود اپنے لئے وبال اور عذاب کے اسباب پیدا نہ کرلے۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ ﷻ کی طرف سے انسانوں کی حفاظت کے لئے فرشتوں کا پہرہ لگا رہتا ہے لیکن جب کوئی قوم اللہ ﷻ کی نافرمان ہو کر بد عملی اور سرکشی اختیار کرتی ہے تو اللہ ﷻ بھی اس سے اپنا حفاظتی پہرہ اٹھالیتا ہے پھر اللہ ﷻ کا قہر و عذاب اس پر ٹوٹ پڑتا ہے جس سے بچنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

علمی بات: جمہور مفسرین کے نزدیک اس سے مراد رات اور دن کے فرشتے ہیں۔ احادیث کے مطابق فرشتوں کی دو جماعتیں حفاظت کے لئے مقرر ہیں ایک رات کے لئے دوسری دن کے لئے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے تمہارے پاس آگے پیچھے آتے ہیں اور فجر کی نماز میں اور عصر کی نماز میں جمع ہو جاتے ہیں، پھر جن فرشتوں نے تمہارے پاس رات گزاری تھی وہ اوپر چلے جاتے ہیں تو ان سے ان کا رب پوچھتا ہے حالانکہ وہ ان سے زیادہ جاننے والا ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا تھا وہ کہتے ہیں کہ ہم نے جب ان کو چھوڑا تو وہ نماز پڑھ رہے تھے اور جب ہم ان کے پاس پہنچے تھے اس وقت بھی نماز پڑھ رہے تھے۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن نسائی)

آیت نمبر ۱۲: اللہ ﷻ کی قدرت کا ایک اور نظارہ آسمانی بجلی کا کڑکنا ہے، بجلی کے چمکنے پر انسان پُر امید ہوتا ہے کہ بارش برسے گی تاہم اسے خوف بھی ہوتا ہے کہ بجلی تباہی کا باعث نہ بن جائے۔ بھاری بادلوں سے مراد وہ بادل ہیں جن میں بارش کا پانی ہوتا ہے۔ بارش کا پورا نظام اللہ ﷻ کی قدرت کا بہت بڑا شاہکار ہے۔

علمی بات: بَرق اس روشنی کو کہتے ہیں جو ہواؤں کی رگڑ کی وجہ سے بادلوں میں چمکتی ہے اور برق کے ظہور میں اللہ ﷻ کی قدرت پر دلیل ہے کیونکہ بادل پانی کے گیلے یعنی تر اجزاء اور ہوا سے مرکب ہوتا ہے اور اللہ ﷻ اس سے برق پیدا کرتا ہے جو وہ آگ کے اجزاء پر مشتمل ہوتی ہے۔ پانی سرد اور تر ہے اور آگ گرم اور خشک ہے۔ گویا یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ چنانچہ ایک ضد سے دوسری ضد کو پیدا کر دینا اللہ ﷻ کی قدرت کا عجیب و غریب شاہکار ہے اور اس کے سوا اور کوئی اس پر قادر نہیں ہے کہ وہ ایک ضد سے دوسری ضد کو وجود میں لے آئے۔

جب بجلی چمکتی ہے اور بادل گرجتے ہیں تو کسانوں کو بارش کی اُمید ہوتی ہے اور یہ ڈر بھی ہوتا ہے کہ کہیں ان پر بجلی نہ گر جائے اور ان کو جلا کر خاکستر نہ کر دے اس طرح کبھی بارش سے لوگوں کو اپنی فصلوں کی نشو نما اور نفع کی اُمید ہوتی ہے اور اسی بارش سے بعض لوگوں کو ضرر اور نقصان پہنچنے کا خدشہ ہوتا ہے بلکہ ہر فنا ہونے والی چیز کا یہی حال ہے۔ بعض لوگوں کو اس سے نفع کی توقع ہوتی ہے اور بعض لوگوں کو اس سے نقصان کا خطرہ ہوتا ہے۔

علمی بات: پانی سے لدے ہوئے بادلوں کے وزن کا اندازہ کچھ اس بارش سے اور کچھ اس زمین سے لگایا جاسکتا ہے۔ جہاں یہ بادل برستا ہے۔ ہوا جو ایک ہلکے سے کاغذ کا بھی بوجھ برداشت نہیں کرتی اور وہ زمین پر گر پڑتا ہے۔ کروڑوں ٹن پانی والے بادلوں کے بوجھ کو اس طرح اپنے دوش پر اٹھائے پھرتی ہے۔ جس کا تصور کرنے سے ہی اللہ ﷻ کی بے پناہ قدرت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ماہرینِ طبیعیات اور سائنس دان آسمانی بجلی اور بادلوں کے برسنے کی مختلف توجیہات پیش کرتے ہیں۔ لیکن

اسلامی عقیدہ کی رو سے یہ کڑک اور برق وغیرہ طبعی قوانین کا نتیجہ نہیں بلکہ کائنات کے انتظام پر اللہ ﷻ نے فرشتوں کو مقرر کر رکھا ہے۔ وہ اللہ ﷻ کے حکم سے معاملات کی تکمیل کرتے ہیں۔ بادل اور بارش پر حضرت میکائیل علیہ السلام مقرر ہیں۔ وہی بادلوں کو ہانکتے اور چلاتے ہیں اور ان کا رُخ اس طرف پھیر دیتے ہیں جدھر اللہ ﷻ کا حکم ہو۔ بجلی بھی صرف وہاں گرتی ہے جہاں اللہ ﷻ کا حکم ہوتا ہے۔ بادلوں کی روانی، ان کی سمت کا تعین اور ان کا برسنا اللہ ﷻ ہی کے حکم سے ہوتا ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: سیّدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب آپ ﷺ بادلوں کی گرج اور کڑک سنتے تو فرماتے: اَللّٰهُمَّ لَا تَقْتُلْنَا بِغَضَبِكَ وَلَا تُهْلِكْنَا بِعَذَابِكَ وَعَافِنَا قَبْلَ ذٰلِكَ ”اے اللہ! تو اپنے غضب سے ہمیں نہ مار اور اپنے عذاب کے ذریعہ ہمیں ہلاک نہ کر اور اُس (بُرے وقت کے آنے) سے پہلے ہمیں بخش دے“۔ (جامع ترمذی)

سیّدنا ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک آدمی جنگل میں جا رہا تھا اس نے بادل سے ایک آواز سنی جیسے کوئی کہہ رہا ہے کہ جا کر فلاں شخص کے باغ کو سیراب کرو۔ وہ بادل ایک طرف چلا۔ پھر وہاں ایک پتھریلی زمین پر برسا۔ ایک نالی نے وہ سب پانی جمع کیا۔ وہ آدمی اس پانی کے پیچھے پیچھے چلا۔ آگے چل کر اس نے دیکھا کہ ایک آدمی اپنے باغ کو سیراب کرنے کے لئے بیلچے سے اس کی نالی درست کر رہا ہے۔ نالی درست ہوئی تھی کہ بارش کا یہ پانی وہاں پہنچ گیا۔ پیچھے پیچھے چلنے والا یہ شخص اللہ ﷻ کی قدرت پر بہت متعجب ہوا اور باغ والے سے پوچھا اللہ ﷻ کے بندے! تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے وہی نام بتلایا جو اس نے بادل سے سنا تھا۔ اب باغ والے نے اس شخص سے پوچھا: اللہ ﷻ کے بندے! تم میرا نام کیوں پوچھتے ہو؟ وہ کہنے لگا: میں نے اس بادل سے جس کے پانی سے تو اپنا کھیت سیراب کر رہا ہے یہ آواز سنی تھی کہ جا کر فلاں شخص کے باغ کو سیراب کرو۔ اس میں تمہارا ہی نام لیا گیا تھا۔ اب تم یہ بتلاؤ کہ تمہارا وہ کون سا عمل ہے جس کی وجہ سے اللہ ﷻ تم پر اتنا مہربان ہے؟ باغ والا کہنے لگا: ”اب جبکہ تم نے یہ بات سن ہی لی ہے تو میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔ اس باغ سے جو پیداوار ہوتی ہے اس کا ایک تہائی حصّہ صدقہ کر دیتا ہوں اور ایک تہائی میں اور میرے اہل وعیال کھاتے ہیں اور ایک تہائی اسی باغ میں لوٹا دیتا ہوں (آئندہ فصل کے اخراجات پر صرف کرتا ہوں)۔“ (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۱۳: آسمانی بجلی کڑکتے ہوئے اللہ ﷻ کی تسبیح کرتی ہے۔ تمام فرشتے بھی اللہ ﷻ سے ڈرتے ہوئے اللہ ﷻ کی تسبیح میں مشغول رہتے ہیں۔ بجلی گرا کر بھی نافرمانوں کو عذاب دیا جاتا ہے۔ لوگ اللہ ﷻ کی قدرت کے حوالے سے بحث کرتے ہیں حالانکہ اس کی گرفت بہت سخت ہے۔

شانِ نزول: مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے عرب کے ایک نہایت سرکش کافر کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت بھیجی تو وہ کافر کہنے لگا: محمد (ﷺ) کا رب کون ہے؟ جس کی طرف تم مجھے دعوت دیتے ہو۔ کیا وہ سونے کا ہے یا چاندی کا یا لوہے کا یا تانبے کا؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس کی یہ بات گراں گزری اور انہوں نے واپس جا کر نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: ہم نے اس سے زیادہ سرکش اور اس سے بڑا اللہ ﷻ کا منکر کبھی نہیں دیکھا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس سرکش کے پاس پھر جاؤ۔ اس نے پھر وہی بات کی اور مزید یہ کہا کہ میں محمد (ﷺ) کی دعوت قبول کر کے ایسے رب کو مان لوں جسے نہ میں نے دیکھا اور نہ پہچانا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پھر واپس آئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! اس دفعہ تو اس نے پہلے سے بھی زیادہ خبیث باتیں کہی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس سرکش کے پاس پھر جاؤ۔ یہ حضرات پھر اس کے پاس گئے۔ جب یہ حضرات اس کو اسلام کی دعوت دے رہے تھے اور وہ پہلے کی طرح خبیث باتیں کر رہا تھا اسی اثناء میں ایک بادل ان کے اوپر آیا، اس سے کڑک پیدا ہوئی اور بجلی چمکی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں بجلی گری اور اس کافر کو جلا دیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم واپس لوٹے تاکہ نبی کریم ﷺ کو اس واقعہ کی خبر دیں تو راستے میں انہیں کچھ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ملے اور انہوں نے کہا: کہیئے وہ سرکش شخص جل گیا تو انہوں نے پوچھا: تم کو اس سرکش کے جلنے کا کیسے علم ہوا؟ تو انہوں نے کہا کہ اللہ ﷻ نے نبی کریم ﷺ کی طرف وحی بھیجی ہے۔ (سنن نسائی، طبرانی، بیہقی)

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک یہودی حضور اکرم ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ اے ابو القاسم! ہمیں یہ بتایئے کہ رَعد کیا ہے؟ ”آپ نے فرمایا کہ رَعد (کڑک) فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے بادلوں کو ہانکنے پر مقرر ہے، اس کے پاس آگ کے کوڑے ہیں۔ اس کے ذریعہ اللہ ﷻ جہاں چاہتا ہے وہ وہاں بادلوں کو ہانک کر لے جاتا ہے“۔ یہودی نے عرض کیا کہ یہ آواز کیا ہے جو سننے میں آتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بادل کو جھڑکنے اور ڈانٹنے کی آواز ہے۔ یہ ڈانٹ اس وقت تک بادلوں کو پڑتی رہتی ہے جب تک وہ وہاں پہنچ نہیں جاتے جہاں انہیں پہنچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس یہودی نے کہا: آپ (ﷺ) نے درست فرمایا۔ (جامع ترمذی، مسند احمد، سنن نسائی)

علمی و عملی بات: حقیقت یہ ہے کہ رَعد و بَرق کی اپنی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اللہ ﷻ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے۔ انسانوں کی نفع رسانی کے لئے اللہ ﷻ کی طرف سے انہیں مقرر کیا گیا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ ﷻ جب کسی کو ان لشکروں کے ذریعہ سے ہلاک کرنا چاہتا ہے تو یہ بجلیاں ایک قسم کا بم بن کر اس پر برستی ہیں اس لئے ان بجلیوں کے ضرر سے بچنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اسی حوالے سے اللہ ﷻ کی تسبیح کرنے کا حکم دیا ہے۔

عملی پہلو: معتبر سند سے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ کڑک کے وقت جو شخص اللہ ﷻ کا ذکر کرے وہ بجلی کے صدمہ سے امن میں رہتا ہے۔ (طبرانی)

آیت نمبر ۱۴: اللہ ﷻ ہی کو پکارنا حق ہے۔ اسے پکارنے والا کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ اللہ ﷻ کے سوا دوسروں کو پکارنے والوں کی مثال ایسی ہے۔ جیسے کوئی پانی کو دیکھ کر ہاتھ پھیلائے کہ وہ اس کے منہ میں خود چلا جائے جو ناممکن ہے۔ اسی طرح اللہ ﷻ کو چھوڑ کر دوسروں کو پکارنا گمراہی ہے۔

دُعا اور عبادت کی تمام قسمیں اللہ ﷻ کے لئے خاص ہیں اس لئے کہ پریشان حال کی پکار کو وہی سنتا ہے، وہی اس کی تکلیفوں کو دور کرتا ہے اس لئے صرف اسی کی عبادت کی جائے اور اسی سے مدد مانگی جائے۔ مگر جو لوگ بُتوں کی اور اللہ ﷻ کے سوا غیروں کی عبادت و پرستش کرتے ہیں ان کی مثال اس آدمی کی ہے جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف بڑھائے تاکہ پانی اس کے منہ تک پہنچ جائے، لیکن پانی اس کی پیاس کو محسوس نہیں کرتا اور نہ یہ دیکھ پاتا ہے کہ کوئی اپنے ہاتھ اس کے سامنے پھیلائے ہوئے ہے اس لئے نہ وہ اس کی فریاد سن پاتا ہے اور نہ اس کے منہ تک پہنچتا ہے۔ بُتوں کا حال بھی ایسا ہی ہے وہ اپنی عبادت کرنے والوں کی ایک ادنیٰ مانگ بھی پوری نہیں کر پاتے۔ اسی لئے اللہ ﷻ نے فرمایا کہ کافروں کی عبادت اور بُتوں سے ان کی فریاد طلبی ان کے کسی کام نہیں آئے گی۔

واضح رہے کہ "پانی کے آگے ہاتھ پھیلانا تاکہ وہ منہ تک پہنچ جائے" عربی کا ایک محاورہ ہے جس کی معنیٰ لاحاصل طلب کے ہیں اور آیت کا مفہوم بھی یہی ہے۔ یعنی کافر اللہ ﷻ کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں ان کو پکارنا بالکل بے سود عمل ہے۔

اور اصل دُعا جو اللہ ﷻ کی ذات پاک سے کی جائے۔ اللہ ﷻ اسے شرف قبولیت عطا فرما کر انسان کی حاجت پوری فرما دیتا ہے۔ اس لئے کافروں کی یہ چیخ و پکار بے فائدہ ہے۔ کیونکہ جو دینے پر قادر ہے اس سے وہ مانگتے نہیں اور جن سے وہ مانگتے ہیں وہ محض پتھروں کے وہ مجسمے ہیں جو کچھ نہیں دے سکتے۔

آیت نمبر ۱۵: کائنات کی ہر چیز پر اللہ ﷻ ہی کا غلبہ ہے اور ہر چیز اس کے سامنے سجدہ کئے ہوئے ہے۔ ایک کافر بھی بطورِ امتحان عمل کا اختیار دیئے جانے کے علاوہ اللہ ﷻ ہی کے حکم کے تابع ہے۔ نہ صرف ہر چیز بلکہ ان کا سایہ بھی عاجزی کے ساتھ اللہ ﷻ کے سامنے سجدہ کرتا ہے۔

علمی بات: آسمانوں اور زمین میں جتنی چیزیں ہیں سب اللہ ﷻ کے ارادہ و مشیّت اور اس کے حکم کے تابع ہیں۔ کوئی بھی اس کے حکم سے ایک ذرہ برابر سر تابی نہیں کر سکتا۔ جو کفار اللہ ﷻ کو سجدہ نہیں کرتے وہ بھی اس کے ارادہ و مشیّت کے مطابق کبھی صحت مند ہوتے ہیں تو کبھی بیمار، ان میں کوئی مال دار ہوتا ہے تو کوئی فقیر، انہیں بھی ایک محدود وقت تک زندہ رہنے کے بعد موت لاحق ہوتی ہے۔ اہل ایمان اللہ ﷻ کے سامنے برضا و رغبت جھکتے ہیں اور کافر اللہ ﷻ کے اوامر کو بحالتِ اضطراری یعنی غیر ارادی طور پر قبول کرنے پر مجبور ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "کیا انہوں نے اس طرف نہیں دیکھا کہ جو چیز بھی اللہ نے پیدا فرمائی ہے اس کا سایہ دائیں اور بائیں اطراف سے ڈھلتا ہے اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے اس حال میں کہ وہ عاجز ہیں اور اللہ ہی کو سجدہ کرتی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے (تمام) جاندار اور (خصوصاً) فرشتے اور وہ (فرشتے) تکبر نہیں کرتے۔ وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں جو ان کے اوپر ہے اور وہ وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔" (سورۃ النحل ۱۶، آیات: ۴۸ تا ۵۰)

علمی بات: سجدہ کا معنی ہے کسی کے سامنے جھکنا اور عجز کا اظہار کرنا اور عرف میں اللہ ﷻ کے سامنے تذلّل اختیار کرنے اور اللہ ﷻ کی عبادت کرنے کو سجدہ کہتے ہیں انسان، حیوانات اور جمادات سب کے لئے سجدہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ سجدہ کی دو قسمیں ہیں: ایک سجدہ اختیاری ہے یہ انسان کے ساتھ خاص ہے اور اسی پر ثواب مرتب ہوتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں ہے: فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا: اللہ کے لئے سجدہ کرو اور اس کی عبادت کرو۔ (سورۃ النجم ۵۳، آیت: ۶۲) اور سجدہ کی دوسری قسم ہے سجدہ اضطراری اس کو سجدۂ تسخیر بھی کہتے ہیں جیسے اس آیت میں ہے وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ "زمین پر پھیلنے والے پودے اور اپنے تنوں پر کھڑے ہوئے درخت اللہ کے لئے سجدہ کرتے ہیں۔" (سورۃ الرحمٰن ۵۵، آیت: ۶)

یہ سجدہ کا لغوی معنی ہے اور سجدہ کا اصطلاحی معنی ہے زمین پر اپنی پیشانی رکھنا اور اس سے بڑھ کر کسی تذلّل و تواضع عاجزی و انکساری کا تصور نہیں ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو ہریرۃ (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا بندہ اپنے رب کے ساتھ سب سے زیادہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدہ کر رہا ہو پس تم (سجدہ میں) بہت دُعا کیا کرو۔ (صحیح مسلم، سنن ابو داوٗ، سنن النسائی)

حضرت ثوبان (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں میں نے رسول اللہ (ﷺ) سے عرض کیا مجھے وہ عمل بتایئے جس سے اللہ ﷻ مجھے جنّت میں داخل کر دے یا میں نے عرض کیا مجھے وہ عمل بتایئے جو اللہ ﷻ کو سب سے زیادہ محبوب ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم اللہ ﷻ کے لئے کثرت سے سجدے کیا کرو، کیونکہ تم جب اللہ ﷻ کے لئے سجدہ کرو گے تو اللہ ﷻ اس سجدہ کی وجہ سے تمہارا ایک درجہ بلند کرے گا اور تمہارے گناہ مٹا دے گا۔ (صحیح مسلم، جامع ترمذی)

نوٹ: یہ آیت سجدۂ تلاوت ہے اس آیت پر سجدہ کرنا واجب ہے۔

آیت نمبر ۱۶: پوری کائنات کا رب اور ہر شے کا خالق اللہ ﷻ ہے لہٰذا عبادت کا مستحق بھی صرف وہی ہے۔ شرک کو اندھیرے اور ایمان کو نور سے تعبیر فرمایا گیا جو برابر نہیں ہو سکتے۔ جھوٹے معبودوں نے کائنات میں کوئی شے نہیں بنائی تو انہیں خدائی میں کیونکہ شریک کر لیا جائے؟ کوئی چیز پیدا کرنا تو درکنار وہ تو خود نفع و نقصان کا کوئی اختیار بھی نہیں رکھتے۔ اللہ ﷻ ہی تمام چیزوں کا خالق اور زبردست قوت والا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے ایک اور طرزِ بیان سے بُت پرستوں کا رد فرمایا کہ یہ مشرکین جو ان بتوں کو اللہ ﷻ کا شریک قرار دیتے ہیں تو کیا ان کے علم میں ہے کہ بُتوں نے بھی کوئی مخلوق پیدا کی ہے جس وجہ سے ان کو یہ اشتباہ ہو گیا کہ جس طرح اللہ ﷻ اپنے خالق ہونے کی وجہ سے عبادت کا مستحق ہے تو (معاذ اللہ) بُت بھی اس وجہ سے عبادت کے مستحق ٹھہرے ہیں تو وہ بتائیں کہ ان بُتوں نے کس چیز کو پیدا کیا ہے؟ اور ظاہر ہے بُتوں نے کسی چیز کو پیدا نہیں کیا بلکہ خود ان بُتوں کو مشرکوں نے بنایا ہے سو آپ ﷺ فرما دیجئے کہ اللہ ﷻ ہی ہر چیز کا خالق ہے ہر چیز کو اسی نے پیدا کیا ہے وہی ایک ہے اور وہ سب پر غالب ہے۔

مشرکینِ عرب جن دیوتاؤں کو معبود مان کر ان کی عبادت کرتے تھے، ان کے متعلق عام طور پر ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ ﷻ نے خدائی کے بہت سے اختیارات ان کو دے رکھے ہیں اس لئے ان کی عبادت کرنی چاہیے تا کہ وہ اپنے اختیارات ہمارے حق میں استعمال کریں اور اللہ ﷻ سے ہماری سفارش بھی کریں اس آیت میں اوّل تو یہ فرمایا گیا ہے کہ جب یہ تراشے ہوئے بُت اپنے آپ کو کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے تو دوسروں کی کیا مدد کریں گے۔ پھر فرمایا گیا کہ اگر ان دیوتاؤں نے بھی اللہ ﷻ کی طرح کچھ پیدا کیا ہوتا، تب تو ان کو خدا کا شریک ماننے کی کوئی وجہ ہو سکتی تھی لیکن واقعتاً انہوں نے جب کچھ نہیں پیدا کیا تو پھر کس طرح ان کو اللہ ﷻ کا شریک قرار دے کر عبادت کا مستحق ٹھہرایا جائے؟

آیت نمبر ۱۷: حق اور باطل کی مثال بیان کی گئی ہے۔ باطل کی مثال سیلاب کے پانی پر اُبھری جھاگ یا دھاتوں کو پگھلاتے وقت پیدا ہونے والے جھاگ کی ہے۔ جھاگ کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی وہ سوکھ کر ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح باطل بھی بے حقیقت اور ناپائیدار ہوتا ہے۔ پانی یا دھات کو حق کے ساتھ تشبیہ دی گئی جو باقی رہ جاتا ہے اور جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح بالآخر حق ہی غالب اور باقی رہتا ہے۔

علمی بات: (۱) سیلاب کی صورت میں پانی تیزی سے بہتا ہے تو راستہ میں آنے والا سارا خس و خاشاک جھاگ کی صورت میں پانی کے اوپر ظاہر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح زیور اور دیگر سامان بنانے کے لئے جب سونا، چاندی اور دیگر دھاتوں کو پگھلایا جاتا ہے تو ان کا میل کچیل بھی جھاگ کی صورت میں اوپر تیرنے لگتا ہے اور بعض مرتبہ یہ جھاگ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اس کے نیچے پانی اور سونا چاندی نظر بھی نہیں آتے۔ لیکن یہ جھاگ کچھ لمحوں کے بعد زائل ہوتا ہے یا اُسے زائل کر دیا جاتا ہے۔ بعد میں اصل پانی رہ جاتا ہے جو زمین کو سرسبز و شاداب بناتا ہے اور اصل سونا چاندی رہ جاتے ہیں جو زیورات کے کام آتے ہیں۔ اس مثال میں پانی اور دھاتوں سے مراد حق ہے جو باقی رہتا ہے اور لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے اور جھاگ سے مراد باطل ہے جو پانی اور دھاتوں کے اوپر چھایا رہتا ہے لیکن وہ پائیدار نہیں ہوتا بالآخر زائل ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کبھی کبھار باطل حق پر چھایا ہوا نظر آتا ہے، مگر حقیقت میں ایسا نہیں۔ آخر کار باطل زائل ہونے والا اور حق باقی رہنے والا ہے۔

علمی بات: (۲) مذکورہ دونوں مثالوں میں ایک چیز تو مفید اور نافع ہے جو باقی رہ جاتی ہے اور کام میں لائی جاتی ہے اور دوسری چیز فضول اور بے حیثیت اور بے کار ہوتی ہے، پہلی مثال میں پانی نافع ہے اور خس و خاشاک بے کار چیز ہے اور دوسری مثال میں چاندی سونا یا دوسری دھاتیں نافع ہیں اور کیمیائی عمل کے وقت جو میل کچیل نکلتا ہے وہ بے کار ہے، اسی طرح سے ایمان اور کفر کو سمجھ لیا جائے کہ ایمان نافع چیز ہے دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور کفر و باطل بے کار چیز ہے اس پر اللہ ﷻ کی طرف سے کوئی اجر و ثواب نہیں بلکہ وہ دوزخ کی آگ میں داخل کرانے کا ذریعہ ہے۔ دُنیا میں کفر اگرچہ پھولا پھولا نظر آتا ہے (جیسا کہ بہتے ہوئے پانی پر خس و

خاشاک اور پگھلتے ہوئے سونے چاندی کے جھاگ) لیکن انجام کے اعتبار سے بالکل بے وزن، بے حقیقت اور بے فائدہ ہے یعنی باطل چاہے کچھ عرصہ تک بظاہر غالب نظر آئے لیکن در حقیقت وہ جھاگ کی طرح بے فائدہ اور فنا ہو جانے والا ہے اور حق پانی اور دوسری نفع بخش چیزوں کی طرح فائدہ مند اور باقی رہنے والا ہے۔

علمی بات: (۳) پہلی مثال میں اس علم کو جو نبی ﷺ پر وحی کے ذریعہ سے نازل کیا گیا تھا، آسمانی بارش سے تشبیہ دی گئی ہے اور ایمان لانے والے سلیم الفطرت لوگوں کو ان ندی نالوں کے مانند ٹھہرایا گیا ہے جو اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس بارانِ رحمت سے فیض یاب ہو کر رواں دواں ہو جاتے ہیں۔ اس ہنگامہ کو جو اہلِ حق کے خلاف منکرین و مخالفین نے برپا کر رکھا تھا اس جھاگ اور خس و خاشاک سے تشبیہ دی گئی ہے جو ہمیشہ سیلاب کے اٹھتے ہی اس کی سطح پر اپنی اچھل کود دکھانا شروع کر دیتا ہے۔ دوسری مثال سے یہ اہم بات معلوم ہوئی کہ ہر نفع بخش چیز اسی وقت قابلِ نفع بن سکتی ہے جب وہ ملمع سازی، ملاوٹ اور میل کچیل سے صاف کر دی گئی ہو اور جب تک پاک صاف کرنے کا عمل بروئے کار نہیں لایا جاتا تب تک اس کی اصلیت ظاہر نہیں ہو سکتی اور اس سے صحیح معنوں میں استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔

علمی بات: (۴) مکی زندگی میں عقیدۂ توحید اور کفر و شرک کی کشمکش نے حق و باطل میں ٹکراؤ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ باطل ہر قیمت پر اہلِ حق کو ہزیمت دینے پر تلا ہوا تھا۔ مختلف قسم کے شبہات اٹھا کر حق کے بارے میں بدگمانیاں پیدا کی جا رہی تھیں اور اہلِ حق کو تڑپا دینے والی اذیتیں پہنچا کر توڑنے کی کوشش ہو رہی تھی اور ان اذیتوں اور سخت خراب حالات میں مسلمانوں میں مایوسی پیدا کرنے کی بھی کوشش جاری تھی۔ اس آیتِ کریمہ میں اللہ ﷻ نے مسلمانوں کو اطمینان کا سامان بہم پہنچایا ہے اور اہلِ باطل کو آئینہ دکھا دیا ہے اور ایک مثال دے کر سمجھایا ہے جو ان کی آنکھوں دیکھی مثال ہے۔ بارہا موسم برسات میں گھٹائیں اٹھتی ہیں، زمین کو زندگی دینے کے لئے بارشیں برستی ہیں، تیز بارش کے نتیجے میں وادیاں اور ندی نالے اپنی اپنی وسعت اور ظرف کے مطابق بہنا شروع کر دیتے ہیں۔ پانی جب سیلاب کی صورت اختیار کرتا ہے تو راستے میں آنے والے کوڑے کرکٹ سے ایک جھاگ پیدا ہو کر اٹھتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جھاگ پانی کو بہنے سے روک دے گا اور زمین ویسی کی ویسی خشک اور بنجر رہ جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ جھاگ کچھ دیر بعد ہی بیٹھ جاتا ہے اور پانی رواں رہتا ہے۔

آیت نمبر ۱۸: حق کا ساتھ دینے والوں کے لئے اللہ ﷻ کے ہاں بہترین بدلہ کی بشارت ہے۔ باطل کا ساتھ دینے والوں کے لئے بدترین انجام کی وعید سنائی گئی ہے۔ قیامت کے دن اہلِ باطل سے کوئی فدیہ نہیں لیا جائے گا کہ ان کو عذابِ الٰہی سے نجات مل سکے بلکہ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے جو بہت ہی بُری جگہ ہے۔

علمی بات: یہاں اہلِ حق اور اہلِ باطل کا انجام بیان کیا گیا ہے کہ اہلِ حق نے اللہ ﷻ کی وحدانیت قبول کرتے ہوئے اسے ایک جانا اور انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت کو برحق سمجھ کر اس کی تصدیق کی اور اُس کی نازل کردہ شریعت پر عمل کیا ان کا قیام جنّت کے عالی شان محلات میں ہو گا اور جن لوگوں نے انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت کو ٹھکرایا قیامت کے دن وہ کسی طرح بھی بچ نہ سکیں گے اور جہنّم میں دھکیل دیئے جائیں گے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ اس شخص سے فرمائے گا جس کو جہنّم میں سب سے ہلکا عذاب ہو گا کہ اگر تیرے پاس دُنیا اور جو کچھ اس میں ہے وہ سب ہوتا تو کیا تو اسے فدیہ میں دے دیتا (اور اپنے آپ کو عذاب سے چھڑوا لیتا؟) وہ بولے گا کہ جی ہاں! اللہ ﷻ فرمائے گا کہ میں نے تو اس سے بہت آسان بات چاہی تھی (جس میں کچھ خرچ نہ تھا) جب تو ابھی حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں تھا کہ تو شرک نہ کرنا، تو میں تجھے جہنم میں داخل نہیں کروں گا، تو نہ مانا اور شرک کیا۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۱۹: اللہ ﷻ کی نازل کردہ آیات کو حق سمجھنے والے اور دُنیاوی مفادات کے طالب دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ یہ بات واضح ہے لیکن اس کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو عقل و فکر سے کام لیتے ہیں۔ غفلت میں پڑے رہنے والے اس عظیم فرق کو نہیں سمجھ سکتے۔

علمی بات: حق بات کا علم ہونا ہی کافی نہیں بلکہ اس پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص یہ علم رکھتا ہے کہ قرآنِ حکیم برحق ہے مگر خود اس پر ایمان نہیں لاتا تو اس کا محض علم رکھنا کچھ مفید نہیں ہو گا۔ اس مقام پر علم سے مراد اعتقاد بھی ہے یعنی جس شخص کا عقیدہ اور ایمان یہ ہے کہ قرآنِ حکیم اللہ ﷻ کی نازل کردہ برحق کتاب ہے، وہ قرآنِ حکیم کے منکر کی طرح تو نہیں ہو سکتا جس کو اندھے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مثلاً فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ "تو آپ (ﷺ) جان لیجیے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔" (سورۂ محمد ۴۷، آیت: ۱۹) یعنی اللہ ﷻ کے وحدہ لاشریک ہونے کا محض علم ہونا مفید نہیں کیونکہ یہ علم تو یہود و نصاریٰ کو بھی تھا مگر وہ اس کے انکاری تھے، لہٰذا ان کا صرف جاننا مفید نہیں ہے اور جس شخص کے پاس نہ تو علم ہے کہ قرآنِ حکیم برحق ہے اور نہ وہ اس کی حقانیت کا اعتقاد رکھتا ہے، وہ نابینا آدمی کی طرح ہے جسے کچھ نظر نہیں آتا ایسا آدمی تو حق و باطل اور صحیح و غلط میں امتیاز ہی نہیں کر سکتا گویا ایماندار آدمی بینا کی طرح ہے اور مشرک، کافر اور منافق نابینا کی طرح

اور ان دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ بے عقل اور نادان لوگ نصیحت سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ان کے متعلق توسورۃ الانفال میں ذکر موجود ہے۔ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ۔ "وہ بہرے گونگے (لوگ) ہیں جو سمجھتے نہیں ہیں۔ " (سورۃ الانفال ۸، آیت: ۲۲)

علمی بات: قرآنِ حکیم نے بار بار اس حقیقت کو دُہرایا ہے کہ اس سے فائدہ اٹھانے والے عقلمند لوگ ہیں چنانچہ عقل کے اندھے اور بے بصیرت افراد قرآنِ حکیم کی برکات سے استفادہ نہیں کرسکتے یہ علم ہدایت ہے اس کے معارف کی وسعت سے وہی آگاہ ہوسکتا ہے جو فہم وبصیرت رکھتا ہو۔

آیت نمبر ۲۰: حق کا ساتھ دینے والوں کی صفات کا بیان ہے۔ پہلی صفت یہ ہے کہ وہ اللہ ﷻ کے ساتھ عہد بندگی کی پاسداری کرتے ہیں۔ دوسری صفت یہ ہے کہ وہ اپنے وعدوں کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔

علمی بات: ان آیات میں ایمان والوں کی صفات اور ان کا انجام بیان کیا جارہا ہے، یعنی وہ منافقوں کی طرح نہیں ہیں کہ عہد وپیمان کرکے توڑ دیں یا جب لڑائی جھگڑا کریں تو گالیاں دیں، بات کریں تو جھوٹ بولیں اور جب ان کے پاس امانت رکھوائی جائے تو اس میں خیانت کریں۔ لہٰذا جس قسم کا عہد بھی اللہ ﷻ سے کیا جائے اسے پورا کرنا ضروری ہے۔

علمی بات: اس آیت میں ایفائے عہد کے حوالے سے حکم انتہائی تاکیدی اسلوب میں دیا گیا ہے۔ سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج میں ایفائے عہد کا ذکر نیک بندوں کی صفات کے طور پر آیا تھا۔ یہاں ایفائے عہد کا حکم دیا گیا اور خبردار کیا گیا کہ عہد کے حوالے سے روزِ قیامت باز پُرس ہوگی۔ نبی اکرم ﷺ نے وعدہ خلافی کو منافق کی ایک نشانی قرار دیا ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: سیّدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "منافق کی تین نشانیاں ہیں۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے اور جب اس کو امانت دی جائے تو خیانت کرے۔" مسلم کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں۔ "اگرچہ وہ روزے رکھے اور نماز پڑھے اور گمان رکھے کہ وہ مسلمان ہے۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

فرمانِ نبوی ﷺ: "جو امانت کی پاسداری نہیں کرتا اس کا ایمان ہی نہیں، جو وعدہ پورا نہیں کرتا اس کا کوئی دین نہیں۔" (مسند احمد)

علمی بات: تمام معاملاتِ انسانی تحریری یا غیر تحریری معاہدوں پر مشتمل ہوتے ہیں اور اس آیت میں مذکورہ بالا ارشاداتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں ہم پر ان کا احترام لازم ہے۔ عہد اور معاہدوں کی تین اقسام ہیں:

۱۔ اپنے آپ سے: یہ وہ عہد ہے جو ہم نے اپنے خالق ومالک سے کر رکھا ہے، جس میں اللہ ﷻ کے سب اوامر ونواہی آگئے۔ نیکی کا ارادہ، گناہوں پر توبہ، کوئی قسم یا کوئی نذر وغیرہ۔

۲۔ بندوں سے: یہ وہ عہد ہے جو ہم نے آپس میں باہم کر رکھے ہیں یا ہم پر شریعت کی طرف سے عائد کئے گئے ہیں۔ حقوق العباد کی ادائیگی جیسے والدین، اولاد، شوہر وبیوی، اساتذہ اور پڑوسیوں وغیرہ کے حقوق۔ ملازمت، کاروبار یا دیگر پیشہ ورانہ معاہدات وغیرہ

۳۔ اللہ ﷻ سے: اسی طرح ایک عہد اَلَستُ بھی ہے جو انسان سے اللہ ﷻ نے عالم ازل میں لیا تھا۔ پھر عہدِ ایمان بھی اسی میں داخل ہے جس سے انسان اپنے خالق ومالک سے یہ عہد کرتا ہے کہ وہ اس کے سب احکام واوامر ونہی کی پابندی کرے گا۔ اللہ ﷻ نے مومنوں سے اُن کے مال اور جان خرید لئے ہیں جنّت کے بدلے میں۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"اللہ ﷻ نے مومنوں سے اُن کی جانیں اور اُن کے مال خرید لئے ہیں (اور اس کے) عوض میں اُن کے لئے جنّت (تیار کی) ہے، یہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں تو مارتے بھی ہیں اور مارے بھی جاتے ہیں۔" (سورۃ التوبہ ۹، آیت: ۱۱۱) کسی دینی جماعت سے وابستگی اسی عہد کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے۔

عملی پہلو: جس معاشرے میں ایفائے عہد رواج پاجائے وہاں انتہائی اطمینان وسکون کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور بہت سے غیر ترقیاتی اخراجات ختم ہوجاتے ہیں جو کام چوری، ملاوٹ، دھوکہ دہی وغیرہ کی روک تھام کے لئے نگرانی کے طور پر کیئے جاتے ہیں۔

آیت نمبر ۲۱: حق کا ساتھ دینے والوں کی مزید صفات کا بیان ہے۔ اہلِ ایمان کی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ لوگ ان رشتوں کو جوڑتے ہیں جس کے متعلق اللہ ﷻ نے حکم فرمایا ہے کہ اُسے جوڑا جائے۔ گویا وہ اس تعلق کو قائم رکھتے ہیں جسے اللہ ﷻ نے قائم رکھنے کا حکم دیا ہے:

ا۔ مراد وہ باہمی معاہدے جو انسان آپس میں کرتے ہیں۔

۲۔ یا وہ اللہ ﷻ کی کتاب، سنّتِ رسول ﷺ اور نیک لوگوں سے تعلق جوڑے رکھتے ہیں۔

علمی بات: اس سے معلوم ہوا کہ اسلام نے ضروری تعلقات قائم رکھنے اور ان کے حقوق ادا کرنے کی تعلیم دی ہے لہٰذا والدین، اہل و عیال، بہن بھائیوں، دوسرے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے جو حقوق اللہ ﷻ نے ہر انسان پر لازم کئے ہیں ان کو نظر انداز کر کے صرف نفلی عبادت یا کسی دینی خدمت میں لگ جانا بھی جائز نہیں تو دوسرے دُنیاوی کاموں میں مشغولیت کی بناء پر ان کی ادائیگی سے غافل ہو جانا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ بلکہ ان تمام لوگوں کے حقوق کی ادائیگی نہایت ضروری ہے اور اس کے بغیر ایمان کامل نہیں ہو گا۔ صلہ رحمی اور رشتہ داروں سے تعلقات قائم رکھنے اور ان کے حقوق کی ادائیگی کی تاکید احادیثِ مبارکہ میں بھی بکثرت مذکور ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: ا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ: ”جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ ﷻ اس کے رزق میں وسعت اور اس کے کاموں میں برکت عطا فرمائے تو اُسے چاہئیے کہ صلہ رحمی کرے۔“ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

۲۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ: ”کسی کام کا بدلہ دینا صلہ رحمی نہیں ہے بلکہ صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ جب اس کے ساتھ صلہ رحمی کا معاملہ نہ کیا جا رہا ہو تب بھی وہ صلہ رحمی کرے۔“ (صحیح بخاری)

علمی بات: اہل ایمان کی چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں یعنی حق تعالیٰ کی عظمت و جلال کا تصوّر کر کے لرزاں و ترساں رہتے ہیں، اس لئے جو نیکیاں کرتے ہیں وہ فرمانِ الٰہی سمجھ کر کرتے ہیں اور جو بدیاں چھوڑتے ہیں وہ اللہ ﷻ کی نافرمانی سمجھ کر چھوڑتے ہیں۔

علمی بات: یہاں لفظ خوف کے بجائے خشیت کا لفظ استعمال کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ ﷻ سے اُس کا خوف کسی درندہ یا موذی چیز سے خوف کی طرح نہیں بلکہ یہ ایسا خوف ہے جو اولاد کو ماں باپ سے اور شاگرد کو استاد سے ہوتا ہے اور اس کا منشا کسی ایذا رسانی کا خوف نہیں ہوتا بلکہ ادب، محبت اور عظمت ہے۔ یہ اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ کہیں ہمارا کوئی قول و فعل اللہ ﷻ کی ناراضگی کا ذریعہ نہ بن جائے۔

علمی بات: اہلِ ایمان کی پانچویں صفت یہ ہے کہ انہیں ہر وقت آخرت کی بازپرس کی فکر لگی رہتی ہے وہ اپنے نیک اعمال پر بھروسہ نہیں کرتے بلکہ اللہ ﷻ سے دُعا کرتے ہیں کہ اللہ ﷻ حساب کے مرحلہ کو آسان بنا دے۔ یعنی یہ لوگ بُرے حساب سے ڈرتے ہیں بُرے حساب سے مراد حساب میں سختی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ انسان کی نجات تو رحمتِ الٰہی سے ہو سکتی ہے کہ حساب اعمال کے وقت عفو و درگزر سے کام لیا جائے ورنہ جس شخص سے بھی پورا پورا ذرے ذرے کا حساب لیا گیا تو اس کا عذاب سے بچنا ممکن نہیں کیونکہ ایسا کون ہے جس سے کوئی گناہ و خطا کبھی سرزد نہ ہوئی ہو۔

علمی بات: اہل ایمان اللہ ﷻ اور بندوں کے ان تمام حقوق کی رعایت اور حفاظت کرتے ہیں جن کا اللہ ﷻ نے حکم دیا ہے۔ خشیتِ الٰہی ان پر غالب رہتی ہے، اس لئے اللہ ﷻ کے احکامات و امر کو بجا لاتے ہیں اور گناہوں سے بچتے ہیں۔ نیز قیامت کے دن کے حساب سے ڈرتے ہیں، اس لئے اپنے نفس کا محاسبہ کرتے رہتے ہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ”اللہ ﷻ کو دو قطروں اور دو نشانوں سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہیں ہے: ایک آنسوؤں کا وہ قطرہ جو اللہ ﷻ کی خشیت کی وجہ سے نکلے اور دوسرا خون کا وہ قطرہ جو اللہ ﷻ کے راستہ میں بہایا جائے۔ رہے دو نشان (تو ان میں سے) ایک نشان تو وہ ہے جو اللہ ﷻ کے راستے میں (اس کی رضا کے حصول کے لئے) لگے، اور دوسرا نشان وہ ہے جو اللہ ﷻ کے فرائض میں سے کسی فرض کی ادائیگی کی حالت میں لگے۔“ (جامع ترمذی)

آیت نمبر ۲۲: اہلِ حق کی مزید صفات کا بیان ہے۔ اہلِ ایمان کی چھٹی صفت یہ ہے کہ وہ اللہ ﷻ کی نافرمانیوں سے بچتے ہیں اور راہِ حق میں آنے والی مشکلات پر صبر کرتے ہیں۔ ساتویں صفت یہ ہے کہ وہ نماز کو تمام ارکان و شرائط کی رعایت رکھتے ہوئے خشوع کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ آٹھویں صفت یہ ہے کہ وہ اللہ ﷻ کے دیئے ہوئے رزق میں سے علانیہ، کھلم کھلا اور چپکے سے خرچ کرتے ہیں۔ نویں صفت یہ ہے کہ وہ بُرائی کا بدلہ اچھائی سے دیتے ہیں۔ ان صفات کے حاملین کو جنّت کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

اللہ ﷻ کے دین پر عمل پیرا ہونے میں جو تکلیف پہنچتی ہے اس پر صبر کرتے ہیں۔ پانچوں وقت کی نماز بروقت، خشوع وخضوع کے ساتھ اور سنّت کے مطابق ادا کرتے ہیں۔ اللہ ﷻ کی دی ہوئی روزی میں سے اس کی راہ میں علانیہ اور پوشیدہ طور پر خرچ کرتے ہیں، بُرائی کا جواب بھلائی سے دیتے ہیں گناہ کے بعد نیکی کرتے ہیں کوئی ظلم کرتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں اور جو قطع تعلق کرتا ہے اس سے تعلق قائم کرتے ہیں۔ اللہ ﷻ نے فرمایا کہ آخرت میں ایسے ہی لوگوں کا انجام اچھا ہوگا۔

علمی بات: خلاصہ کلام یہ ہے کہ وہ اللہ ﷻ کی رضا حاصل کرنے کے لئے مصائب پر صبر کرتے ہیں یعنی اللہ ﷻ کی اطاعت کرنے اور اس کی نافرمانی سے بچنے کے لئے جو مشکلات پیش آئیں یا کسی بیماری، تکلیف اور آزمائش میں مبتلا ہو جائیں تو صرف اللہ ﷻ کی رضا جوئی کے لئے ان پر صبر کرتے ہیں۔ صبر سے مراد وہ صبر ہے جو ابتدائے صدمہ میں ہو اور اختیاری ہو کیونکہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد تو ہر ایک کو صبر آ ہی جاتا ہے۔ اسی طرح وہ اہلِ ایمان نماز قائم کرتے ہیں اور اللہ ﷻ کے عطا کردہ رزق میں سے اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ حالات کے مطابق کبھی پوشیدہ خرچ کرتے ہیں تاکہ لینے والے کی عزّت نفس مجروح نہ ہو اور کبھی اعلانیہ خرچ کرتے ہیں تاکہ دوسروں کو بھی ترغیب ہو اور وہ نیکی کے ذریعہ بُرائی کو دور کرتے ہیں کیونکہ نیکیاں بُرائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم جہاں کہیں بھی ہو اللہ ﷻ سے ڈرتے رہو اور بُرائی کے بعد کوئی نیکی کرو جو اس بُرائی کو مٹا دے اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آؤ۔ (جامع ترمذی)

۲۔ رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا: جو شخص گناہوں کے بعد نیکیاں کر لیتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے کوئی اتنی تنگ زرہ پہن رکھی ہو جس سے اس کا دم گھٹ رہا ہو (یعنی اتنے گناہ کئے کہ ہلاکت کے قریب پہنچ گیا) پھر اس نے ایک نیکی کر لی تو زرہ کی ایک کڑی ٹوٹ گئی، پھر اس نے دوسری نیکی کی تو دوسری کڑی ٹوٹ گئی (اس طرح نیکیاں کرتے کرتے سب کڑیاں ایک کے بعد ایک ٹوٹ گئیں) یہاں تک کہ زرہ زمین پر گر پڑی۔ (مسند احمد)

علمی بات: نیکی کے ذریعہ بُرائی کو دور کرنے کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو ان کے ساتھ سخت کلامی، کنجوسی اور زیادتی کرتا ہے وہ اس کے ساتھ خوش کلامی، فیاضی اور حسن سلوک کا برتاؤ کرتے ہیں اور اسے معاف کر دیتے ہیں جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو اور نبی کریم ﷺ نے اہلِ مکّہ کو معاف فرما دیا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر انہیں محروم کیا جائے تو وہ عطا کرتے ہیں اور جب ان پر ظلم کیا جائے تو وہ درگزر کرتے ہیں اور اگر ان کے ساتھ قطع رحمی کی جائے تو وہ صلہ رحمی کرتے ہیں۔

عملی پہلو: اہلِ حق خواہشات کو قابو میں رکھتے ہیں، اپنے جذبات اور میلانات کو شرعی حدود کا پابند بناتے ہیں، اللہ ﷻ کی نافرمانی میں عارضی فائدہ اور لذّتوں کا حصول دیکھ کر پھسل نہیں جاتے اور اسی طرح اللہ ﷻ کی فرماں برداری میں بظاہر جو وقتی نقصانات اور تکالیف پہنچتی ہیں انہیں صبر و تحمل سے برداشت کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے مومن کی پوری زندگی درحقیقت صبر کا عملی نمونہ ہوتی ہے۔ وہ بُرائی کا بدلہ بُرائی سے نہیں بلکہ نیکی سے دیتے ہیں۔ کوئی ان پر خواہ کتنا ہی ظلم کرے وہ جواب میں ظلم نہیں بلکہ انصاف اور درگزر سے کام لیتے ہیں۔ وہ جھوٹ کے مقابلے میں سچائی کا دامن نہیں چھوڑتے اور کوئی خواہ کتنی ہی خیانت کا ارتکاب کرے وہ اس کے مقابلے میں دیانت داری سے کام لیتے ہیں۔

علمی بات: "الدّار" کے لفظی معنی گھر کے ہیں۔ بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد آخرت کا عالم ہے یہ لفظ بکثرتِ وطن کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں آخرت کے بجائے اس لفظ کو استعمال کرنے سے بظاہر اشارہ اس طرف ہے کہ انسان کا اصلی گھر اور وطن آخرت ہے اس لئے کہ دُنیا کی زندگی تو فنا ہو جانے والی ہے انسان کو ہمیشہ ہمیشہ جہاں رہنا ہے وہ عالم آخرت ہے۔

آیت نمبر ۲۳: اہلِ حق کے لئے جنّت کے باغات ہیں جہاں ان کا قیام دائمی ہوگا۔ وہاں ان کے ساتھ ان کے نیک والدین، بیویاں اور اولاد بھی ہوں گی۔ فرشتے انہیں ہر دروازے سے آکر مبارکباد پیش کریں گے جس سے ان کی خوشی میں اضافہ ہوگا۔

علمی بات: اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ ﷻ کے مقبول اور نیک بندوں کو خود بھی جنّت میں مقام ملے گا اور ان کی رعایت سے ان کے ماں باپ، بیوی اور اولاد کو بھی شرط یہ ہے کہ یہ لوگ صالح یعنی مومن اور مسلمان ہوں "کافر نہ ہوں" اگرچہ اعمالِ صالحہ میں اس نیک آدمی کے برابر نہ ہوں مگر اللہ ﷻ اس نیک آدمی کی برکت سے ان لوگوں کو بھی اسی مقام جنّت میں پہنچا دے گا جو اس نیک شخص کا مقام ہوگا جیسا کہ دوسری جگہ نیک اولاد کو نیک والدین سے ملانے کا ذکر ہے چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "ہم ملا دیں گے ان کیساتھ ان کی اس اولاد کو" (سورۃ الطور ۵۲، آیت: ۲۱) یعنی اپنے نیک بندوں کی ذریت اور اولاد کو بھی انہی کے ساتھ

کر دیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بزرگوں اور نیک لوگوں کے ساتھ تعلق خواہ نسب اور قرابت کا ہو یا دوستی کا بشرط ایمان وہ آخرت میں بھی نفع دے گا۔

عملی پہلو: جن صفات کی بناء پر جنّت عطا کی جاتی ہے:

(۱) جو اللہ ﷻ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں اور پکے عہد کو نہیں توڑتے۔ (۲) جو رشتوں کو جوڑے رکھتے ہیں۔ (۳) اللہ ﷻ سے ڈرتے رہتے ہیں۔ (۴) سخت حساب سے ڈرتے رہتے ہیں۔ (۵) اپنے رب کی رضا کی طلب میں صبر کرتے ہیں، (۶) نماز قائم کرتے ہیں (۷) ظاہر اور پوشیدہ طور پر خرچ کرتے ہیں۔ (۸) بُرائی کو اچھائی سے دور کرتے ہیں۔

اللہ ﷻ نے یہ آٹھ صفات ذکر فرمائیں، پھر اس کے بعد فرمایا جو مسلمان ان آٹھ صفات کے ساتھ متصف ہوں یعنی یہ صفات اپنائیں تو ان کی جزا یہ ہے کہ (۱) اللہ ﷻ ان کو دائمی جنتوں میں داخل فرمائے گا۔ (۲) ان کے باپ دادا، ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے جو نیک ہوں گے ان کو بھی دائمی جنتوں میں داخل فرمائے گا۔ (۳) فرشتے ہر دروازہ سے ان کو سلام کرتے ہوئے داخل ہوں گے۔ (۴) اور ان کے صبر کرنے کی تحسین فرمائیں گے۔

آیت نمبر ۲۴: اہل جنّت کے لئے مزید انعامات کا بیان ہے۔ فرشتے انہیں ان کے صبر اور فرماں برداری کے بدلے سلامتی کی دُعائیں اور ہمیشہ کے گھر کی مبارکباد دیں گے۔

یہ وہ لوگ جن کی خدمت میں فرشتے حاضر ہو کر تسلیمات عرض کریں گے انہوں نے ساری عمر اپنے نفس کی گناہوں سے حفاظت اور نیکی اور اطاعت پر کاربند رہنے اور مصائب کو برداشت کرنے میں لگے رہے۔ اسی وجہ سے اُن کو اس درجہ اعزاز وانعامات سے نوازا گیا۔ "سَلٰمٌ "کا مطلب ہے کہ اب تم ہر مصیبت، رنج و غم اور پریشانی سے محفوظ ہوگئے۔ (سبحان اللہ)

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "کیا تم جانتے ہو کہ اللہ ﷻ کی مخلوق میں سے جنّت میں سب سے پہلے کون لوگ جائیں گے؟" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ: "اللہ ﷻ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ کی مخلوق میں سے جنّت میں سب سے پہلے وہ فقراء اور مہاجرین داخل ہوں گے، جن کے ذریعے سے سرحدوں کو تحفظ دیا جاتا ہے اور جن کے واسطے سے ناپسندیدہ امور سے بچا جاتا ہے،، جبکہ وہ خود اس حال میں دُنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں کہ ان کی خواہشات ان کے دلوں میں ہی رہ جاتی ہیں اور وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے، اللہ ﷻ اپنے فرشتوں کو حکم دے گا کہ جا کر ان لوگوں کو سلام کہو، فرشتے کہیں گے: اے اللہ! ہم تیرے آسمان کے رہنے والے ہیں اور تیری بہترین مخلوق ہیں، کیا تو ہمیں اس بات کا حکم دیتا ہے کہ ہم ان لوگوں کے پاس جا کر انہیں سلام کریں؟ اللہ ﷻ فرمائے گا: یہ وہ لوگ ہیں، جو میری عبادت کیا کرتے تھے، میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے تھے، ان کے ذریعے سرحدات کو تحفظ دیا جاتا تھا اور ان کے واسطے سے ناپسندیدہ امور سے بچا جاتا تھا، جبکہ یہ خود اس حال میں وفات پاگئے تھے کہ ان کی خواہشات ان کے دلوں میں ہی رہ گئی تھیں اور وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے تھے، اس کے بعد یہ فرشتے ان کے پاس آئیں گے اور ہر دروازے سے داخل ہو کر یوں سلام پیش کریں گے: تم دُنیا میں جو صبر کرتے رہے، اس کی وجہ سے تم پر سلام ہو، یہ تمہارا بہترین ٹھکانہ اور منزل ہے۔ (مسند احمد)

علمی بات: اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان قبول کرنے کے بعد ہر حکم بجالانے پر ہمیشگی، ہر بُرائی سے اجتناب، اللہ ﷻ کی تقدیر پر قناعت کرتے ہوئے ہر مصیبت وراحت میں اللہ ﷻ سے راضی رہنا، غرض دین کی ہر بات پر استقامت کی بنیاد صبر ہی ہے اور اس کی جزا کا بھی کوئی حساب نہیں، جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا گیا: "آپ فرما دیجئے اے میرے بندو! جو ایمان لائے ہو اپنے رب (کی نافرمانی) سے ڈرو جنہوں نے اس دُنیا میں نیکی کی ان کے لئے بھلائی ہے اور اللہ کی زمین وسیع ہے بے شک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔" (سورۃ الزمر ۳۹، آیت: ۱۰)

علمی بات: حضرت امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن ایک منادی اعلان کرے گا: صبر کرنے والے کھڑے ہو جائیں اور جنّت میں چلے جائیں۔ راستے میں فرشتے ان سے پوچھیں گے: کہاں جا رہے ہو؟ وہ کہیں گے: جنّت کی طرف۔ فرشتے پوچھیں گے: کیا حساب سے بھی پہلے؟ وہ جواب دیں گے: ہاں! پھر فرشتے پوچھیں گے: تم کون لوگ ہو؟ تو وہ کہیں گے: ہم صبر کرنے والے ہیں۔ فرشتے پوچھیں گے: تمہارا صبر کیا تھا؟ وہ کہیں گے: ہم نے اللہ ﷻ کی عبادت کرنے اور اس کی نافرمانی سے بچنے پر صبر کیا، ہم نے دُنیا کی مصیبتوں اور آفتوں پر صبر کیا تو فرشتے کہیں گے: تم جنّت میں داخل ہو جاؤ، نیک کام کرنے والوں کا اجر

بہت اچھا ہوتا ہے اور فرشتے انہیں کہیں گے تم پر سلامتی ہو بوجہ اس کے جو تم نے صبر کیا۔

آیت نمبر ۲۵: اہلِ حق کی صفات اور بہترین انجام کے بیان کے بعد اب باطل پرستوں کی بُری صفات کا بیان ہے۔ وہ اللہ ﷻ سے کیئے گئے عہد بندگی کا پاس نہیں کرتے۔ وہ اللہ ﷻ اسلام، پیغمبروں، اس کی کتابوں، اسلام اور شریعت کے ساتھ تعلق جوڑنے کے حکم کو پورا نہیں کرتے اور آپس میں صلہ رحمی نہیں کرتے غرضیکہ وہ ہر چیز میں مخالفت کرتے ہیں۔ وہ اللہ ﷻ کی نافرمانیاں کر کے زمین میں فساد مچاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے اللہ ﷻ کی لعنت اور آخرت میں بُرا انجام ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے کفار کے متعلق فرمایا وہ اللہ ﷻ سے کیئے ہوئے پختہ وعدوں کو توڑتے ہیں، یعنی انہوں نے عالمِ اَرواح میں اللہ ﷻ کی عبادت کرنے اور شرک نہ کرنے کا جو وعدہ کیا تھا اس کو توڑتے ہیں، کیونکہ اللہ ﷻ نے اپنی اُلوہیت اور توحید پر جو دلائل قائم کئے ہیں ان میں غور و فکر نہیں کرتے اور انبیاء کرام علیہم السلام نے ان کو اللہ ﷻ کی توحید کا جو پیغام پہنچایا اس کو غور سے نہیں سنتے بلکہ منہ موڑتے اور اعراض کرتے اور اللہ ﷻ نے جن چیزوں کو جوڑنے کا حکم دیا ہے ان کو توڑتے ہیں یعنی اللہ ﷻ کے رسول ﷺ اور مومنوں سے قطع تعلق کرتے ہیں ماں باپ اور دیگر رشتہ داروں سے حسن سلوک نہیں کرتے اور ان کے حقوق ادا نہیں کرتے اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں یعنی لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کی مخالفت پر اُبھارتے ہیں اور شرک اور بُت پرستی کی دعوت دیتے ہیں مسلمانوں کی جان اور مال پر ظلم کرتے ہیں۔ اللہ ﷻ نے فرمایا ان پر لعنت ہے یعنی دُنیا اور آخرت میں اللہ ﷻ کی رحمت سے یہ بالکل دور ہیں اور آخرت میں ان کا گھر جہنّم ہے اور وہ بُرا گھر ہے۔

علمی بات: کفار کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ زمین میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں۔ یعنی اللہ ﷻ کی نافرمانیاں کرتے ہیں، کھیتیاں تباہ کرتے ہیں، نسل (یعنی انسانوں اور مویشیوں) کو ہلاک کرتے ہیں، راستے لوٹتے ہیں اور ناحق بغاوت و ظلم کرتے ہیں۔ یہ سب فَسَادٌ فِی الْاَرْضِ ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آخرت میں جو سزا رکھی گئی ہے اس کے باوجود دُنیا میں جس گناہ کی سزا اللہ ﷻ کی طرف سے جلد ملنے کا استحقاق ہو جاتا ہے۔ وہ بغاوت اور قطع رحمی ہے۔ (اس سے زیادہ جلد عذاب دُنیا کو لانے والا اور کوئی گناہ نہیں)

(سنن ابو داؤد، جامع ترمذی)

علمی بات: فساد صرف لڑائی جھگڑے کا ہی نام نہیں ہے بلکہ دوسرے آدمی کے سکون میں خلل ڈالنے کا نام بھی فساد ہے اور شریعت اس کو پسند نہیں کرتی۔ چنانچہ اگر ایک شخص بھی کہیں نماز پڑھ رہا ہو تو بلند آواز سے قرآنِ حکیم پڑھنا نا مناسب ہے کیونکہ اس کی نماز میں خلل پیدا ہو گا اسی طرح اگر کوئی شخص سویا ہوا ہے تو بلند آواز سے ذکر کرنا بھی خلافِ ادب ہے کہ اُس کی نیند میں خلل پیدا ہو گا تو یہ بھی فساد کی ایک قسم ہے۔ چنانچہ اس سے ہم اندازہ لگائیں کہ کسی انسان کو ناحق تنگ کرنا کس قدر بڑا گناہ ہو گا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "چار چیزیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں یہ ہوں وہ خالص منافق ہے اور جس شخص میں ان خصلتوں میں سے کوئی ایک ہو اس میں نِفاق کی ایک خصلت ہو گی یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ (وہ یہ کہ) جب اسے امانت دی جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے تو جھوٹ کہے، جب عہد کرے تو اسے توڑ ڈالے اور جب جھگڑے تو بدزبانی کرے۔" (صحیح مسلم)

سیّدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قطع رحمی کرنے والا یعنی رشتہ داری توڑنے والا جنّت میں نہیں جائے گا۔"

(صحیح بخاری، صحیح مسلم)

آیت نمبر ۲۶: رزق کی کمی بیشی اللہ ﷻ کی حکمت اور فیصلہ پر منحصر ہے۔ کافر عارضی منفعت اور چند روزہ دُنیاوی زندگی پر خوش ہیں۔ یہ چیزیں اُن دائمی اور پائیدار نعمتوں کے مقابلے میں حقیر ہیں جو فرماں برداروں کو آخرت میں عطا کی جائیں گی۔

علمی بات: مکّہ میں اکثر مسلمان غریب تھے اور کفار کے پاس مال و دولت کی کثرت تھی۔ کفارِ مکّہ اس پر خوش ہوتے اور مسلمانوں کو طعنہ دیتے کہ اللہ ﷻ ان سے راضی ہے اس لئے ان کے پاس دولت کی فراوانی ہے۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی کہ دُنیاوی مال و دولت اور رزق کی فراوانی اس بات کی دلیل نہیں کہ اللہ ﷻ ان سے خوش ہے کیونکہ بہت سے منکروں یعنی قارون اور فرعون کے پاس بھی مال و دولت اور رزق کی فراوانی تھی۔ اسی طرح مال و دولت اور رزق کی کمی بھی اس بات کی دلیل نہیں کہ اللہ ﷻ ان سے ناراض ہے کیونکہ بہت سے انبیاء کرام علیہم السلام اور اللہ ﷻ کے نیک بندوں کے پاس بظاہر مال و دولت کی فراوانی نہ تھی۔

علمی بات: دُنیا کے عیش و عشرت اور فراخی کو دیکھ کر یہ فیصلہ نہیں ہوتا کہ کون نیک بخت ہے اور کون بد بخت اور نہ یہ لازم اور ضروری ہے کہ جس کو اللہ ﷻ نے مال و دولت اور رزق کی فراوانی دی ہے وہ اس کی بارگاہ میں مقبول ہو۔ بلکہ بہت سے مقبول بندے بطورِ آزمائش و امتحان یہاں عسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور مجرموں کو ڈھیل دی جاتی ہے وہ مزے اڑاتے ہیں۔ یہ بات اس کی دلیل ہے کہ اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی ہے جہاں ہر شخص کو اس کے نیک و بد اعمال کا پورا پھل مل کر رہے گا۔ بہر حال دُنیا کی تنگی و فراخی مقبول و مردود ہونے کا معیار نہیں بن سکتی۔

فرمانِ نبوی ﷺ: ا۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ بازار سے گزرتے ہوئے کسی بلندی سے مدینہ منورہ میں داخل ہو رہے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے دونوں طرف تھے آپ ﷺ نے بکری کا ایک بچہ جو چھوٹے کانوں والا تھا اسے مرا ہوا دیکھا آپ ﷺ نے اس کا کان پکڑ کر فرمایا تم میں سے کون اسے ایک درہم میں لینا پسند کرے گا؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ہم میں سے کوئی بھی اسے کسی چیز کے بدلہ میں لینا پسند نہیں کرتا اور ہم اسے لے کر کیا کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم چاہتے ہو کہ یہ تمہیں مل جائے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اللہ کی قسم! اگر یہ زندہ بھی ہوتا تو پھر بھی اس میں عیب تھا کیونکہ اس کا کان چھوٹا ہے حالانکہ اب تو یہ مردار ہے آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم! اللہ ﷻ کے نزدیک یہ دُنیا اس سے بھی زیادہ حقیر ہے جس طرح تمہارے نزدیک یہ مردار حقیر ہے۔ (صحیح مسلم)

۲۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ کے نزدیک دُنیا کی وقعت اگر ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو وہ کسی کافر کو اس میں سے ایک گھونٹ پانی بھی نہ پلاتا۔" (جامع ترمذی)

آیت نمبر ۲۷: مخالفین حق کا رسول اللہ ﷺ سے فرمائشی معجزہ دکھانے کے مطالبہ کا ذکر کر کے ان کے مطالبہ کا جواب دیا گیا ہے۔ اللہ ﷻ فرمائشی معجزہ دکھانے پر قادر ہے لیکن معجزہ دکھا کر زبردستی کسی کو ہدایت نہیں دی جاتی۔ ہدایت اسی کو ملتی ہے جو حصولِ ہدایت کے لئے عاجزی سے اللہ ﷻ کی طرف رجوع کرے۔

کفارِ مکّہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ اگر محمد ﷺ اللہ ﷻ کے نبی ہیں تو اللہ ﷻ ان کے لئے بھی کوئی نشانی کیوں نہیں بھیج دیتا؟ اس فرمائشی معجزہ کے مطالبہ سے ان کی نیت یہ نہیں ہوتی تھی کہ اسے دیکھ کر ایمان لے آئیں۔ یہاں بھی انہوں نے وہی سوال دُہرایا۔ تو اللہ ﷻ نے انہیں جواب دیا کہ اللہ ﷻ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے، چاہے وہ ہزار نشانیاں دیکھ لے اور جو گناہوں سے تائب ہو کر اس کی طرف رجوع کرتا ہے اسے ہدایت دیتا ہے، چاہے وہ کوئی بھی نشانی نہ دیکھے۔ اس کی مشیت میں کسی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس لئے انہیں رسول اللہ ﷺ سے نشانیوں کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اللہ ﷻ کے دین کو قبول کر لینا چاہیئے اور ان سے اپنا تعلق استوار کرنا چاہیئے، تاکہ اللہ ﷻ انہیں مزید توفیق و ہدایت کی نعمت سے نوازے۔

علمی بات: اگر ہدایت کا دارومدار نشانیوں پر ہوتا تو خود انسان کا اپنا وجود اللہ ﷻ کی ایک بڑی نشانی ہے۔ ہمارے چاروں طرف بے شمار نشانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ البتہ ہدایت کے لئے ضرورت نشانیوں کی نہیں بلکہ حُسنِ طلب کی ہے۔ جو شخص بغیر حُسنِ طلب نشانیوں پر اصرار کرتا رہے گا وہ کبھی ہدایت نہیں پا سکتا، لیکن جو آدمی سچی طلب کے ساتھ اللہ ﷻ کی طرف متوجہ ہو گا اس کے لئے اللہ ﷻ ہدایت کا دروازہ کھول دے گا۔ اس لئے لوگ اگر ہدایت چاہتے ہیں تو اپنے دلوں میں طلب پیدا کریں اور اللہ ﷻ سے توفیق مانگیں، وہ اللہ ﷻ بڑا غیور ہے، بے قدروں کو کبھی کوئی چیز نہیں دیتا۔ اس کے یہاں انسان کی سب سے پسندیدہ بات رجوع الی اللہ ہے۔ جب کوئی ہدایت کا طلب گار اسے اپنے اندر پیدا کر لے گا تو پھر اسے کسی مزید نشانی طلب کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

عملی پہلو: جو انسان اخلاص کے ساتھ اللہ ﷻ کی طرف رجوع کرتا ہے اللہ ﷻ اس کے لئے ہدایت کے دروازے کھول دیتا ہے اور جو اللہ ﷻ سے روگردانی و اعراض کرتا ہے اور اپنے اختیار سے گمراہی میں ہی رہنا پسند کرتا ہے تو اللہ ﷻ بھی اسے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے۔

علمی بات: جو شخص بھی اللہ ﷻ کی طرف خود رجوع نہیں کرتا اور اس سے روگردانی اختیار کرتا ہے اسے زبردستی راہ راست پر لانا اللہ ﷻ کی سنّت نہیں ہے۔ وہ ایسے شخص کو انہی راستوں میں بھٹکنے دیتا ہے جن میں وہ شخص خود بھٹکنا چاہتا ہے۔ پھر وہی بُرے راستے اسے ہدایت سے محروم کر دیتے ہیں اور گمراہیوں میں دھکیل دیتے ہیں۔ یہی مطلب ہے اللہ ﷻ کے کسی شخص کو گمراہ کرنے کا۔ یعنی جو شخص اللہ ﷻ کی دی ہوئی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اور غور و فکر کر کے ہدایت حاصل نہ کرنا چاہے تو اسے اللہ ﷻ کی طرف سے زبردستی ہدایت پر نہیں لایا جاتا۔

درحقیقت ہدایت اور گمراہی اللہ ﷻ ہی کے اختیار میں ہے۔ جو شخص تعصب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے حق کا انکار کرتا جائے اُسے اللہ ﷻ گمراہی میں کھلا چھوڑ دیتا

ہے اور جو شخص ہدایت کی تمنا اور اس کی جستجو کرتا ہے اسے ہدایت عطا کی جاتی ہے۔ کیونکہ ہدایت اس قدر گراں نعمت ہے جو تمنا اور جستجو کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ چنانچہ جو لوگ اللہ ﷻ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں انہیں ایمان کی دولت نصیب ہوتی ہے۔

آیت نمبر ۲۸: ہدایت پر گامزن لوگ وہ ہیں جن کے دلوں کو اللہ ﷻ کے ذکر سے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ بلاشبہ اللہ ﷻ کا ذکر ہی دلوں کے اطمینان اور راحت کا باعث ہے۔ سکونِ قلب مال و دولت سے نہیں یادِ الٰہی سے نصیب ہوتا ہے۔

علمی بات: جب تک دل میں شک کا کانٹا چبھتا رہتا ہے انسان کو کسی پہلو قرار نہیں آتا اور جب ایمان و یقین کے نور کا اُجالا ہوتا ہے تو سارے اضطراب ختم اور ساری بے چینیاں دور ہو جاتی ہیں۔ ذکرِ الٰہی سے ہی دل میں اطمینان اور سکون پیدا ہوتا ہے۔ یہی وہ نور ہے جس سے شکوک و شبہات کے اندھیرے چھٹ جاتے ہیں۔ یہی وہ غذا ہے جس سے روح کو تقویت ملتی ہے اور انسان میں نیکی کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پاتی ہیں۔ اسی سے انسان میں جلال اور وہ قوّت نمودار ہوتی ہے جس سے شیطان پر لرزہ طاری ہوتا ہے اور اس کے منصوبے خاک میں مل جاتے ہیں۔ دُنیا کی ساری نعمتوں میں سے اطمینانِ قلب سب سے عظیم نعمت ہے محض دولت، عزّت، صحت اور کثرت اولاد کے باوجود بھی روح کو سکون اور دل کو چین نصیب نہیں ہوتا۔ صرف اللہ ﷻ کا ذکر ہی وہ آبِ حیات ہے کہ جس سے سیر ہونے والا پھر کبھی تشنگی، کسی خلجان اور کوئی گھبراہٹ محسوس نہیں کرتا۔

عملی پہلو: جہاں دُنیا کی کوئی چیز دل کو سکون نہ دے سکے وہاں ذکرِ الٰہی سکون دیتا ہے۔ بشرطیکہ پوری توجہ اور خشوع و خضوع سے اللہ ﷻ کو یاد کیا جائے۔

علمی بات: جنہوں نے نبی اکرم ﷺ کی دعوت کو مان لیا ان کے دلوں کو اللہ ﷻ کی یاد سے اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ ان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب کے جوارِ رحمت میں ہیں اور اللہ ﷻ کے ہاں مامون اور محفوظ ہیں۔ وہ انتہائی کٹھن حالات اور راہِ حق میں آنے والی مصیبتوں اور پریشانیوں میں بھی مطمئن رہتے ہیں۔ وہ تخلیق کائنات، اس کے آغاز اور انجام کے بارے میں بھی شفاف سوچ رکھتے ہیں۔ وہ ہر ظلم، ہر شر اور ہر زیادتی سے اپنے آپ کو اللہ ﷻ کی پناہ میں سمجھتے ہیں وہ اللہ ﷻ کی مشیّت پر راضی اور اس کی راہ میں آنے والی مشکلات اور تکالیف کو آزمائش سمجھ کر اس پر صبر کرتے ہیں۔ نیز ہدایت، رزق، دُنیا و آخرت کی پردہ پوشی کے بارے میں بھی ان کے اطمینانِ قلب کا سبب اللہ ﷻ پر کامل بھروسہ کرنا ہے۔

علمی بات: اہلِ ایمان کے دلوں میں اللہ ﷻ کے ذکر سے جو اطمینان پیدا ہوتا ہے اس کا صحیح علم صرف ان لوگوں کو ہوتا ہے جن کے دلوں میں ایمان کی بشاشت اور مٹھاس پیدا ہو جائے۔ ان کو اللہ ﷻ کا فضل حاصل ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ اس ایمانی بشاشت اور طمانیت کو محسوس کرتے ہیں لیکن اس کی کیفیات ایسی ہوتی ہیں جن کو الفاظ کے ذریعہ دوسرے لوگوں تک منتقل نہیں کیا جاسکتا۔ خصوصاً ایسے لوگوں تک جن کو یہ معرفت حاصل نہ ہو کیونکہ یہ حقائق الفاظ کی گرفت سے باہر ہوتے ہیں۔ یہ اطمینان دلوں میں سرایت کر جاتا ہے۔ اُن کو سکون و فرحت اور ہمت دیتا ہے۔ وہ امن و سلامتی کا شعور پاتے ہیں۔ ایسے اہلِ معرفت محسوس کرتے ہیں کہ وہ تنہا نہیں ہیں چنانچہ ان کو ایک پورا ماحول اپنا دوست اور معاون نظر آتا ہے۔ کیونکہ ان کے اردگرد اللہ ﷻ کی معرفت کی وسیع نشانیاں اور صنعت کاریاں ہوتی ہیں جبکہ خود یہ نیک و پارسا صاحبِ معرفت لوگ اللہ ﷻ ہی کی حمایت و نصرت میں ہوتے ہیں۔

علمی بات: اُس شخص سے بڑا غافل اس روئے زمین پر کوئی نہیں ہے جو تعلق باللہ اور ذکرِ الٰہی سے پیدا ہونے والے انس و محبت سے بے خبر ہے۔ اس سے بڑا نادان اور کون ہو گا جو اس دُنیا میں چلے پھرے اور اسے معلوم نہ ہو کہ اس کی پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ وہ کیوں آیا ہے اور کس سمت جا رہا ہے؟ اور اسے زندگی کی عظیم نعمت کیوں عطا کی گئی ہے؟ اور اس سے زیادہ خوابِ غفلت کا شکار اور کون ہو سکتا ہے جو زندگی کا یہ کٹھن سفر بغیر رہنمائی اور بغیر ہادی و مددگار کے طے کر رہا ہے اور اسے نشانِ منزل تک معلوم نہیں۔

عملی پہلو: زندگی کے سفر میں بعض اوقات ایسے کٹھن حالات بھی آتے ہیں جن کا مقابلہ صرف وہ شخص کر سکتا ہے جس کا تعلق اللہ ﷻ سے مضبوط ہو وہ اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ کی مکمل اطاعت کرنے والا ہو اور جسے اللہ ﷻ کی حمایت و نصرت پر بھروسہ ہو۔ ورنہ خواہ کوئی کتنا ہی قدر طاقتور، بہادر اور مستقل مزاج کیوں نہ ہو اسے زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ایسے حالات سے واسطہ پڑتا ہے کہ اس انسان کی تمام قوتیں جواب دے جاتی ہیں۔ اس وقت صرف تعلق مع اللہ کی قوت اور ذکرِ الٰہی سے ایک بندۂ مومن کو سہارا حاصل ہوتا ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں اس گمان کے مطابق اپنے بندے کے پاس ہوتا ہوں جو وہ میرے متعلق رکھتا ہے اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرے۔ اگر وہ مجھے اپنے نفس میں یاد کرے تو میں اسے اپنے نفس میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ کسی جماعت میں میرا ذکر کرے تو میں اس سے بہتر جماعت (فرشتوں) میں اس کا ذکر کرتا ہوں اور اگر وہ ایک بالشت میرے قریب ہو تو میں ایک ہاتھ اس کے قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ ایک ہاتھ میرے قریب ہو تو میں دو ہاتھ پھیلانے کے برابر اس کے قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ میرے پاس چل کر آئے تو میں اس کے پاس دوڑ کر آتا ہوں۔" (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۲۹: طوبیٰ کے معنی خیر، بشارت اور پاکیزگی کے ہیں۔ ایمان اور عملِ صالح کرنے والے سعادت مندوں کے لئے جنّت میں انتہائی عمدہ مقام اور نعمتوں کی بشارت ہے۔

علمی بات: اہلِ ایمان اور عملِ صالح کرنے والوں کا انجام بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انہیں جنّت عطا فرمائے گا اور وہاں وہ ایسی اچھی حالت میں ہوں گے جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا ہے، ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنّت میں ایک درخت عطا کرے گا جس کا نام طوبیٰ ہے، اور وہ ایسی نعمت ہوگی جس کی خوبیاں الفاظ میں نہیں بیان کی جاسکتیں۔

علمی بات: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "جنّت میں ایک درخت ہے (جس کا نام طوبیٰ ہے) اگر کوئی سوار اس درخت کے سائے میں سو برس تک چلتا رہے تب بھی اس کی مسافت ختم نہ ہوگی اور جنّت میں تمہارے کمان کے برابر جگہ ان تمام چیزوں سے بہتر و برتر ہے جن پر آفتاب طلوع یا غروب ہوتا ہے۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

فرمانِ نبوی ﷺ: ایک اعرابی رسول اللہ (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا یا رسول اللہ ﷺ! کیا جنّت میں پھل ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں جنّت میں ایک درخت ہے جس کا نام طوبیٰ ہے۔ (مسند احمد، صحیح ابن حبان)

آیت نمبر ۳۰: رسول اللہ ﷺ کو تسلّی دی گئی ہے کہ کفار و مشرکین کی طرف سے مخالفت کوئی نئی چیز نہیں۔ جس طرح سابقہ اُمتوں میں انبیاء کرام علیہم السلام بھیجے گئے اسی طرح آپ ﷺ کو آخری رسول بنا کر بھیجا گیا ہے وہ رحمان ہی رسول اللہ ﷺ کا رب ہے جس کا ذاتی نام اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ آپ ﷺ کو لوگوں کی مخالفت کی پرواہ نہ کرنے اور اللہ تعالیٰ کی ذات ہی پر بھروسہ کرنے کا ذکر ہے۔

شانِ نزول: ابو جہل نے ایک دن سنا کہ حضور ﷺ خانہ کعبہ کے قریب کھڑے ہوئے دُعا مانگ رہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں یا اللہ یا رحمٰن وہ جاہل دوڑتا ہوا مشرکین کے پاس گیا اور کہنے لگا آؤ تمہیں ایک عجیب بات سناؤں کہ اب محمد ﷺ نے بھی دو خداؤں (اللہ اور رحمٰن) کی عبادت شروع کر دی (معاذاللہ) تو یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب نبی ﷺ نے کفارِ قریش سے کہا رحمٰن کو سجدہ کرو تو انہوں نے کہا رحمٰن کیا چیز ہے؟ تب یہ آیت نازل ہوئی کہ آپ ﷺ کہیے کہ وہ میرا رب ہے اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے میں نے اسی پر توکل کیا ہے اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے۔ (ضحاک)

ابن ابی حاتم وابو الشیخ رحمۃ اللہ علیہما نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس قول "وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمٰنِ" کے بارے میں فرمایا کہ ہم کو یہ بات ذکر کی گئی کہ (صلح) حدیبیہ کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے قریش کے ساتھ جو صلح نامہ لکھا تھا۔ اس میں آپ نے لکھوایا "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" (اس پر) قریش نے کہا رحمٰن کو ہم نہیں جانتے اور جاہلیت والے یوں لکھا کرتے تھے "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ" آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ہم کو چھوڑ دیں ہم ان سے لڑیں گے آپ ﷺ نے فرمایا نہیں لیکن تم اس طرح لکھو جیسے وہ چاہتے ہیں۔

علمی بات: نبی کریم ﷺ کی نبوّت کی تصدیق و تائید کے طور پر کہا گیا ہے کہ جیسے ہم نے پہلے بہت سے انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث کیئے، اسی طرح اب آپ ﷺ کو مبعوث کیا ہے، تاکہ آپ ﷺ کفارِ قریش اور دیگر لوگوں کو وہ قرآنِ حکیم پڑھ کر سنائیں جو آپ ﷺ کے لئے اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا معجزہ اور بنی نوع انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، لیکن کفار اس ذاتِ باری تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں جس کی ایک صفت "الرّحمٰن" بھی ہے اور جس نے اپنی اس صفتِ رحمت کے تقاضے کے مطابق انسانوں کی ہدایت کے لئے قرآنِ حکیم نازل فرمایا ہے اور آپ ﷺ کو رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ بنا کر بھیجا ہے۔

آیت نمبر ۳۱: اس آیت میں کفار کے مطالبات کا جواب دیا گیا ہے۔ اللہ ﷻ چاہے تو بطورِ معجزہ پہاڑ حرکت میں آجائیں، زمین کے ٹکرے کر دئے جائیں یا مردہ زندہ ہو کر باتیں کرنے لگیں۔ مگر اس صورت میں بھی کفار ایمان نہیں لائیں گے۔ ایسے معجزات دکھانا اللہ ﷻ کے اختیار میں ہے لیکن ایسے معجزے دکھا کر زبردستی لوگوں کو ہدایت نہیں دی جاتی۔ کفار اپنے کفر کی وجہ سے دُنیا میں مختلف عذابوں اور آفتوں میں گھرے رہیں گے یہاں تک کہ اللہ ﷻ کا وعدہ پورا ہو جائے گا۔

علمی بات: البتہ اکثر مفسرین نے وعدہ سے فتح مکّہ مراد لی ہے البتہ بعض نے موت اور بعض نے روزِ قیامت مراد لی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ سلسلہ عذابوں اور مصیبتوں کا جاری رہے گا یہاں تک کہ اللہ ﷻ کا وعدہ آجائے یعنی مکّہ فتح ہو جائے جس میں مشرکین مغلوب ہوں گے یا ان میں سے ہر شخص کو موت آجائے۔ یقیناً اللہ ﷻ اپنا وعدہ پورا فرما کر رہے گا۔

لہٰذا منکرین کو چاہیئے کہ اُن پر جو مصیبت آئے اسے بھی وہ عبرت کی نظر سے دیکھیں اور اپنے کئے کا نتیجہ سمجھ کر اپنی حالت کو بدلیں اور اگر آس پاس کی بستیوں اور شہروں پر کوئی مصیبت نازل ہو جائے تو اس سے بھی عبرت حاصل کریں کیونکہ اس میں بھی سب کے لئے تنبیہ و تحذیر ہوتی ہے۔

علمی بات: ایک روز ابو جہل اور عبد اللہ بن ابی نے حضور ﷺ کی خدمت میں چند مطالبات پیش کئے کہ اگر مکّہ کے پہاڑ دور ہٹ جائیں اور ہماری کھیتی باڑی کے لئے زمین فراغ ہو جائے نیز اس میں چشمے اور نہریں جاری ہو جائیں اور قُصی (قریش کا جدِ اعلیٰ) قبر سے زندہ ہو جائے اور ہم دوش ہوا پر سوار ہو کر شام و یمن میں تجارت کے لئے آیا جایا کریں تو پھر ہم آپ ﷺ پر ایمان لائیں گے اس کے جواب میں فرمایا جا رہا ہے کہ اگر ایسا کر بھی دیا جائے تو یہ ہٹ دھرم پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے اور یہی کہہ دیں گے کہ یہ بڑا زبردست جادوگر ہے۔ (نعوذ باللہ)

علمی بات: اللہ ﷻ نے قرآنِ حکیم کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جسے اللہ ﷻ نے تمام آسمانی کتابوں پر فضیلت بخشی ہے کہ اللہ ﷻ نے جتنی کتابیں نازل کی ہیں اگر ان میں سے کوئی ایسی ہوتی جس کی تلاوت کرنے کے بعد پہاڑ اپنی جگہ سے چل پڑتا، یا زمین کے ٹکڑے ہو جاتے، یا مردے بول پڑتے تو وہ قرآنِ حکیم ہوتا لیکن کافروں کا حال یہ ہے کہ اس آیتِ عُظمیٰ اور معجزۂ کُبریٰ کے ہوتے ہوئے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نشانیوں جیسی نشانی کا مطالبہ کرتے ہیں، لیکن اگر یہ سب کچھ ہو بھی جائے تو بھی کفار اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہیں آئیں گے اور ایمان نہیں لائیں گے۔

اگر اللہ ﷻ چاہتا تو قرآنِ حکیم کے ذریعے سے وہ کچھ ہوتا جس کا بیان اوپر آیا، لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا اس لئے کہ ایمان کا تعلق اپنی خواہشات کی تکمیل سے نہیں بلکہ اس کا تعلق اللہ ﷻ کی طرف سے عطا کردہ عقل و شعور اور فطری صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے اللہ ﷻ اور رسول اکرم ﷺ پر یقین واعتماد سے ہے۔ عام کافروں کے لئے بالعموم اور کفارِ مکّہ کے لئے بالخصوص بہت بڑی وعید ہے کہ ان کے کفر اور رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی مصیبت انہیں لاحق ہوتی رہے گی قتل کئے جائیں گے یا قید کر لئے جائیں گے، قحط سالی میں مبتلا ہوں گے، یا اور کوئی عذاب انہیں آلے گا، یا ان کے قریب رہنے والوں پر کوئی عذاب نازل ہو گا کہ جسے دیکھ کر ان کے دل دہل جائیں گے اور ان کا سکون غارت ہو جائے گا۔

آیت نمبر ۳۲: مخالفین کے استہزاء کرنے پر اللہ ﷻ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کی دل جوئی فرمائی گئی ہے۔ سابقہ مجرموں کو ایک مقررہ مدّت تک اصلاح کی مہلت دی گئی۔ پھر بالآخر انہیں بدترین عذاب میں مبتلا کر دیا گیا۔ نبی کریم ﷺ کے مخالفین کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر وہ بھی باز نہ آئے تو ان کا انجام بھی سابقہ اُقوام جیسا ہو گا۔

علمی بات: مشرکین مکّہ نے بطور استہزاء اور تمسخر نبی کریم ﷺ سے ان معجزات کو طلب کیا تھا ان کا یہ استہزاء آپ ﷺ پر بہت دشوار گزرتا تھا اور آپ ﷺ کو ان باتوں سے بہت تکلیف اور اذیت پہنچی تھی، تب اللہ ﷻ نے آپ ﷺ کو تسلی دینے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی تا کہ آپ ﷺ اپنی قوم کے اس جاہلانہ مطالبہ پر صبر کریں، اس لئے فرمایا باقی انبیاء کرام علیہم السلام کا بھی ان کی قوموں نے اسی طرح مذاق اڑایا تھا جس طرح آپ ﷺ کی قوم نے آپ ﷺ کا مذاق اڑایا ہے (معاذ اللہ)، اللہ ﷻ نے ان کو ڈھیل دی یعنی ان پر اپنے عذاب کو مؤخر کر دیا پھر اللہ ﷻ نے ان کو اچانک اپنی گرفت میں لے لیا، یعنی اللہ ﷻ نے جس طرح پچھلی اُمتوں سے انتقام لیا تھا ان سے بھی انتقام لے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، چند سالوں کے بعد مکّہ مکرمہ سے کفر و شرک کا ایسا نام و نشان مٹا کہ چودہ سو سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے کوئی مشرک وہاں داخل بھی نہیں ہو سکتا۔

آیت نمبر ۳۳: ہر نفس کے اعمال پر اللہ ﷻ نگران ہے۔ مشرکین کے پاس شرک کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے۔ ”مکر“ سے مراد ان کے غلط عقائد واعمال ہیں جو ان کی نظروں میں خوشنما بنا دیئے گئے۔ یہی بداعمالیاں انہیں سیدھے راستے سے روک رہی ہیں۔ ان کے لئے ہدایت کا فیصلہ نہ ہو گا۔

یہاں مشرکوں کو کافر اور ان کے شرک کو مکر و فریب قرار دیا گیا ہے۔ مکر کا مفہوم ہے "کسی کے خلاف سازش کرنا یا حقیقت کے خلاف کوئی چیز پیش کرنا۔"

علمی بات: اللہ ﷻ ہر شخص کے ہر عمل کی ہر وقت نگرانی رکھتا ہے، ایک لمحہ کسی سے غافل نہیں۔ ذرا کوئی شرارت کرے اسی وقت تنبیہ کر سکتا اور سزا دے سکتا ہے کیا مجرم اس سے چھوٹ کر کہیں بھاگ سکتے ہیں؟ کیا اس کی مثل پتھر کی وہ مورتیاں ہو سکتی ہیں جو نہ دیکھتی ہیں نہ سنتی ہیں اور وہ نہ اپنے اور نہ دوسروں کے نفع و ضرر کا کچھ اختیار رکھتی ہیں۔ تعجب ہے کہ ایسے خالق و معبود کی موجودگی میں انسان ایسی عاجز و حقیر مخلوق کے آگے سر جھکائے اور اس کو اللہ ﷻ جیسی صفات و اختیارات کا مالک سمجھے۔ سب کے ظاہری و پوشیدہ اعمال اللہ ﷻ کے سامنے ہیں، وہ ان لوگوں کی ان مشرکانہ گستاخیوں سے بے خبر نہیں، انہیں جلد یا کچھ مدت بعد سزا مل کر رہے گی۔

علمی بات: کافروں کے مکر و فریب سے مراد ان کا کفر ہے، شیطان نے ان کے لئے ان کے کفر کو مزین کر دیا تھا۔ کافر ان کے سامنے کفر کی تعریف اور تحسین کرتے تھے یا وہ خود اپنے کفر کو اچھا اور قابلِ تعریف جانتے تھے کیونکہ ان کا کفر محض ان کے گمراہ باپ دادا کی پیروی پر تھا، اور ان کو راہِ حق سے روکنے اور گمراہ کرنے والی چیز آباؤ اجداد کی اندھی پیروی تھی اور چونکہ انہوں نے اپنے لئے گمراہی کا راستہ خود اختیار کیا تھا اس لئے اللہ ﷻ نے ان میں گمراہی کو پیدا کر دیا اس لئے فرمایا جس کو اللہ ﷻ گمراہ کر دے اس کے لئے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے۔

آیت نمبر ۳۴: کفار اور مشرکین کے بُرے انجام کا بیان ہے۔ ان کے لئے دُنیا میں بھی عذاب ہے اور آخرت کا عذاب بھی جو زیادہ سخت ہو گا جس سے بچانے والا کوئی نہیں ہو گا۔

علمی بات: دُنیا کا عذاب (جیسا اور جتنا بھی ہو) عارضی اور فانی ہے اور آخرت کا عذاب دائمی ہے، اسے زوال و فنا نہیں، مزید برآں جہنّم کی آگ، دُنیا کی آگ کی نسبت ۶۹ گنا تیز ہے۔ اس لئے اس عذاب کے سخت ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" (تمہاری) دُنیا کی (آگ جہنّم کی آگ کے مقابلے میں) اپنی گرمی اور ہلاکت خیزی میں سترواں حصّہ ہے۔" کسی نے پوچھا، یارسول اللہ ﷺ! کفار اور گناہ گاروں کے عذاب کے لئے یہ ہماری دُنیا کی آگ بھی بہت تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا" دُنیا کی آگ کے مقابلہ میں جہنّم کی آگ انہتر (۶۹) گنا بڑھ کر ہے۔" (صحیح بخاری)

علمی بات: دُنیا میں کافروں، مشرکوں اور ملحدوں پر عذابِ الٰہی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے اور درجہ کے اعتبار سے بھی وہ مختلف ہوتا ہے۔ کسی رسول کے ذریعہ حجت قائم ہو جانے کے بعد جو عذاب آتا ہے وہ تو ایک فیصلہ کن عذاب ہوتا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی چھوٹے بڑے عذابوں کا سلسلہ دُنیا میں جاری رہتا ہے ایک کافر پر اللہ ﷻ کی ایسی مار پڑتی رہتی ہے جس سے اس کا دلی سکون ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ خواہ بظاہر وہ کتنی ہی عیش و عشرت کی زندگی میں کیوں نہ ہو ایسی کئی مثالیں ہم اپنی زندگی میں دیکھتے رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف ایک مخلص مومن کو دُنیا میں جو تکلیف پہنچتی ہے وہ چونکہ آزمائش کے طور پر ہوتی ہے اور اس کو برداشت کرنا باعث اجر ہوتا ہے اس لئے اس کے روحانی سکون میں کوئی کمی نہیں ہوتی بلکہ اضافہ ہی ہوتا ہے اس لئے یہ تکلیفیں مومن کے حق میں عذاب نہیں بلکہ اس کو رضا و تسلیم سے ہم کنار کرنے والی ہوتی ہیں۔

آیت نمبر ۳۵: کفار کے برعکس متقی اہلِ ایمان کے بہترین انجام کا بیان ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جنّت کی صفات کا بھی ذکر کیا گیا ہے:

۱۔ اس کے نیچے سے نہریں جاری ہیں۔ ۲۔ اس کے باغات کے پھل دائمی ہوں گے۔ ۳۔ اس جنّت کے درختوں کا سایہ دائمی ہو گا۔

اس کے برعکس اللہ ﷻ کے احکامات کو نہ ماننے والے کفار کا ٹھکانہ جہنّم کی آگ ہے۔

علمی بات: قرآنِ حکیم کا اسلوب یہ ہے کہ کافروں کا انجام ذکر کرنے کے بعد مسلمانوں کے انجام کا ذکر کیا جاتا ہے کیونکہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے اس سے پہلی آیت میں اللہ ﷻ نے کافروں کے انجام کا ذکر فرمایا تھا، اس آیت میں اللہ ﷻ نے مسلمانوں کا اُخروی انعام بیان فرمایا ہے۔

اس آیت میں اللہ ﷻ نے جنّت کی تین صفات بیان فرمائی ہیں: ۱۔ جنّت کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ ۲۔ جنّت کے پھل دائمی ہیں۔ دُنیا کے باغات کے پھل اور منافع عارضی اور ختم ہو جانے والے ہیں اور آخرت کے باغات کے پھل اور منافع ختم ہونے والے نہیں ہیں۔ ۳۔ جنّت کا سایہ دائمی ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ جنّت میں نہ گرمی ہو گی اور نہ سردی، نہ وہاں سورج اور چاند ہوں گے اور نہ وہاں اندھیرا ہو گا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جنّتی جنّت میں خوب کھائیں پییں گے لیکن وہ نہ تھوکیں گے نہ پیشاب کریں گے اور نہ پاخانہ اور نہ ناک جھاڑیں گے۔" لوگوں نے عرض کیا کہ پھر کھانا کہاں جائے گا؟ آپ (ﷺ) نے فرمایا: "(انہیں) ڈکار اور پسینہ آئے گا، اس میں مشک کی خوشبو ہوگی (بس اسی سے ان کا کھانا وغیرہ ہضم ہو جائے گا) اور (جنّت میں) ان کی زبانوں پر تسبیح و تحمید اس طرح جاری ہوگی جس طرح سانس چلتی ہے۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۳۶: اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ کا بیان ہے۔ وہ حق کی روش پر گامزن ہیں اور نزولِ قرآنِ حکیم پر روحانی مسرت محسوس کرتے ہیں۔ اس کے برعکس بہت سے یہود و نصاریٰ اور مشرکینِ مکّہ رسول اللہ ﷺ اور قرآنِ حکیم کے انکاری ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے دعوتِ توحید پیش کی گئی ہے اور شرک کی نفی کرائی گئی ہے۔

علمی بات: اس آیت میں اسلام کے تین بنیادی عقائد توحید، رسالت اور آخرت کا بیان ہے۔ پہلا حصّہ توحید کے اعلان پر مشتمل ہے جبکہ دوسرے حصّے میں آپ (علیہ السلام) کی زبان سے فرمایا گیا ہے کہ اسی بات کی میں دعوت دیتا ہوں۔ اس سے آنحضرت ﷺ کے رسول ہونے کا اثبات کیا گیا ہے اور آخری حصّے میں عقیدۂ بعث بعد الموت کو بیان فرمایا گیا ہے۔ یہ تینوں عقائد پچھلی کتابوں میں بھی بیان ہوئے ہیں پھر قرآنِ حکیم کے انکار کا کیا جواز ہے؟

علمی بات: قرآنِ حکیم کے جو احکام کفار و مشرکین کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتے اور ان کے مفاد سے ٹکراتے ہیں یا ان پر عمل کرنے میں انہیں جسمانی مشقت اور مالی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے وہ ایسے احکام قبول نہیں کرتے۔

علمی بات: اس آیت میں یہودیوں اور عیسائیوں کے مختلف گروہوں کا ذکر فرمایا گیا ہے، ان میں سے کچھ وہ ہیں جو قرآنِ حکیم کی آیات سن کر خوش ہوتے ہیں کہ یہ وہی اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جس کی پیشین گوئی پچھلی کتابوں میں کی گئی تھی چنانچہ اس گروہ کے بہت سے افراد آنحضرت ﷺ پر ایمان لے آئے تھے، نصاریٰ میں سے بھی اور یہود میں سے بھی۔ یہ حقیقت ذکر فرما کر ایک طرف تو کفارِ مکّہ کو شرم دلائی گئی ہے کہ جن لوگوں کے پاس آسمانی ہدایت موجود ہے وہ تو ایمان لا رہے ہیں اور جن لوگوں کے پاس نہ کوئی کتاب ہے نہ کوئی اور آسمانی ہدایت، وہ ایمان لانے سے کترا رہے ہیں اور دوسری طرف آنحضرت ﷺ اور دوسرے مسلمانوں کو تسلّی بھی دی گئی ہے کہ جہاں اسلام کے دشمن موجود ہیں، وہاں بہت سے لوگ اس پیغام ہدایت کو قبول بھی کر رہے ہیں۔ یہود میں دوسرا گروہ کافروں کا ہے کہ وہ قرآنِ حکیم کے بعض حصوں کا انکار کرتے ہیں۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہود و نصاریٰ میں سے جو لوگ ایمان نہیں لائے وہ بھی قرآنِ حکیم کی ساری باتوں کا انکار نہیں کر سکتے کیونکہ اس کی بہت سی باتیں وہ ہیں جو تورات یا انجیل میں بھی موجود ہیں، مثلاً توحید، پچھلے انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان، ان کے حالات واقعات اور عقیدۂ آخرت وغیرہ۔ اس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ سوچتے کہ آنحضرت ﷺ کو ان باتوں کے معلوم ہونے کا کوئی ذریعہ آپ ﷺ کے پاس نہیں اور آپ کو یہ باتیں وحی سے معلوم ہوئی ہیں اس صورت میں انہیں آپ ﷺ کی رسالت کو تسلیم کرنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۳۷: رسول اللہ ﷺ پر قرآنِ حکیم عربی زبان میں نازل کیا گیا کیوں کہ قرآنِ مجید کے اوّلین مخاطب اہلِ عرب تھے۔ قرآن و سنّت کے واضح احکام کے مقابلہ میں کفار کی خواہشات کی پیروی کرنے کی ممانعت ہے۔ ایسا کرنے والے کے لئے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں نہ کوئی حمایتی ہوگا نہ کوئی بچانے والا۔

علمی بات: مشرکینِ مکّہ نبی کریم ﷺ کو اپنے آباء واجداد کے دین کی پیروی کی دعوت دیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر بفرض محال آپ ﷺ نے ان کی خواہشوں کی پیروی کی تو پھر اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں نہ کوئی مددگار ہوگا نہ بچانے والا۔

علمی بات: آپ ﷺ کو تسلّی دی گئی ہے کہ کسی کے انکار و ناخوشی کی ذرہ بھر پروا نہ کریں۔ حق تعالیٰ نے جو قرآن و سنت کے عظیم علوم آپ ﷺ کو عطا فرمائے ہیں اس کی پیروی کرتے رہیں اگر بالفرض محال آپ ﷺ ان لوگوں کی خواہشات کی طرف جھک گئے تو اس کے وبال سے کون بچا سکتا ہے۔ یہ خطاب ہر طالب حق کو ہے۔ آپ ﷺ کو مخاطب فرما کر اُمّت کو تعلیم دی گئی ہے۔ اگر اُمّت نے مشرکین کی پیروی کی تو اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں اس کا کوئی حامی ہوگا نہ بچانے والا۔

آیت نمبر ۳۸: کفار و مشرکین کا بےہودہ اعتراض بیان کیا گیا ہے کہ وہ رسول کے بشری تقاضوں کو نبوت و رسالت کے منصب کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام انسانوں ہی میں سے چنے گئے۔ ان کی بیویاں تھیں اور اولاد بھی۔ رہا معجزے کا مطالبہ تو وہ رسول اکرم ﷺ، اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی دکھاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ مشرکین کی سازشوں کا جواب ضرور دے گا البتہ اس کے لئے وقت مقرر ہے۔

علمی بات: اس آیت میں ایک تو کفار کے اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ اللہ ﷻ کے رسول ہیں تو آپ ﷺ کی بیوی بچے کیوں ہیں؟ اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ بیوی بچے (ایک دو انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ) تقریباً سارے انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی عطا فرمائے گئے ہیں کیونکہ اہل وعیال ہونا منصبِ نبوّت کے منافی نہیں ہے بلکہ انبیاء کرام علیہم السلام اپنے عمل سے واضح کرتے ہیں کہ ان کے حقوق اور اللہ ﷻ کے حقوق میں توازن کیسے قائم رکھا جاتا ہے۔

علمی بات: مشرکینِ مکّہ سیّدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوت میں طرح طرح کے شبہات پیش کیا کرتے تھے، ان کے خیال میں نبی کو فرشتہ ہونا چاہیئے تھا اس لیئے وہ آپ ﷺ کے کھانے پینے پر بھی اعتراض کرتے تھے اور آپ ﷺ کی ازواج اور اولاد پر بھی اعتراض کرتے تھے اللہ ﷻ نے ان کے اس اعتراض کے جواب میں فرمایا بے شک ہم نے آپ ﷺ سے پہلے بھی رسول بھیجے تھے اور ان کے لئے بیویاں اور اولاد بھی عطا کی تھیں، لہٰذا جب ان گزشتہ رسولوں کے حق میں تعداد ازواج اور اولاد ان کی رسالت کے منافی نہیں تھی تو آپ ﷺ کے حق میں تعداد ازواج اور ان کی اولاد رسالت کے کیونکہ منافی ہو سکتی ہے۔

علمی بات: نبی کریم ﷺ کفارِ قریش کو اللہ ﷻ کے عذاب سے ڈراتے تھے کہ اگر وہ اللہ ﷻ کی توحید اور آپ ﷺ کی رسالت پر ایمان نہ لائے تو ان پر اللہ ﷻ کا عذاب نازل ہوگا۔ اللہ ﷻ آپ ﷺ کی اور آپ ﷺ پر ایمان لانے والوں کی مدد فرمائے گا، پھر کفار نے جب یہ دیکھا کہ ان کے کفر پر اصرار کے باوجود ان پر عذاب نازل نہیں ہو رہا تو انہوں نے آپ ﷺ پر طعن اور اعتراض کیا اور کہا کہ اگر آپ ﷺ سچے نبی ہوتے تو ہم پر عذاب آ چکا ہوتا۔ اللہ ﷻ نے اس آیت میں اُن کے اس اعتراض کا بھی جواب دیا اور فرمایا: ہر چیز کی مدت کتابِ تقدیر میں لکھی ہوئی ہے یعنی کفار پر عذاب کا نزول اور نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے متبعین کے لئے فتح و نصرت کے ظہور کا اللہ ﷻ کے نزدیک ایک خاص وقت مقرر ہے اور ہر رونما ہونے والی چیز کا وقت لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے اور ہر چیز کا اپنے وقت پر ظہور ہوگا۔

آیت نمبر ۳۹: اللہ ﷻ اپنی قدرتِ کاملہ سے جس چیز کو چاہے مٹا دیتا ہے اور جسے چاہے باقی رکھتا ہے۔ اللہ ﷻ ہی نے ہر دور میں رسولوں کو احکامات اور شریعتیں عطا فرمائیں۔ تقدیر بھی اللہ ﷻ کی مقرر کردہ ہے۔ اللہ ﷻ چاہے تبدیل فرما سکتا ہے۔ اُمّ الکتاب سے مراد لوحِ محفوظ اور علمِ الٰہی جس میں کوئی ردو بدل ممکن نہیں۔

علمی بات: اللہ ﷻ اپنی حکمت کے موافق جس حکم کو چاہے منسوخ کر دے اور جسے چاہے باقی رکھے۔ جس قوم کو چاہے مٹا دے اور جسے چاہے برقرار رکھے اور اسباب کی تاثیر چاہے بدل ڈالے یا باقی رکھے۔ غرض ہر قسم کا تغیّر و تبدّل، نسخ و احکام اسی کے ہاتھ میں ہے۔ قضا و قدر کے تمام فیصلہ اسی کے قبضہ میں ہیں۔ اللہ ﷻ لوحِ محفوظ سے جو چاہتا ہے، مٹا دیتا ہے اور جس حکم اور فیصلے کو چاہتا ہے، باقی رکھتا ہے۔ ہر انسان کے بارے میں بھی لوحِ محفوظ میں تحریر ہے کہ وہ نیک ہوگا یا بد، اس کی روزی، عمر اور اس سے متعلق خیر و شر کی ہر بات لکھی ہوئی ہے اور اللہ ﷻ اپنی مرضی اور ارادہ و مشیّت کے مطابق اس میں تبدیلی کرتا ہے۔ اس کی مشیّت میں کسی کا دخل نہیں ہے۔

علمی بات: تقدیر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مُبرم۔ دوسری مُعلّق، تقدیرِ مُبرم کا مطلب یہ ہے کہ جو نہیں ٹلتی اور تقدیرِ مُعلّق وہ ہے جس کو اللہ ﷻ اپنی مشیّت سے تبدیل فرما دیتا ہے، مثلاً اللہ ﷻ کی طرف سے پہلے سے یہ طے شدہ ہے کہ فلاں آدمی بیمار ہوگا، یہ علاج کرے گا یا اس کے لئے یہ دُعا ہو گی تو اس دُعا یا دوا کی وجہ سے اس کی بیماری ٹل جائے گی یہ تقدیرِ معلق ہے۔ تقدیرِ مُبرم مثلاً موت کہ یہ نہ دُعا سے ٹلتی ہے اور نہ دوا سے۔ مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ دُنیا میں ہر چیز اسباب سے ہے بعض اسباب ظاہر ہیں اور بعض چھپے ہوئے ہیں۔ اسباب کی تاثیر کا ایک اندازہ (معیار) مقرر ہے جب اللہ ﷻ چاہے اس کی تاثیر اندازے سے کم یا زیادہ کر دے اور جب چاہے ویسی ہی رکھے۔ آدمی کبھی کنکر سے مرتا ہے اور گولی سے بچ جاتا ہے۔ یہ دو تقدیریں ہیں ایک بدلتی ہے اور ایک نہیں بدلتی۔

فرمانِ نبوی ﷺ: ا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تقدیر کو محض دُعا ہی ٹالتی ہے اور صرف نیکی ہی عمر میں اضافے کا باعث ہوتی ہے۔“ (جامع ترمذی)

۲۔ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: ”جسے پسند ہے کہ اس کی روزی میں فراخی ہو اور اس کی عمر دراز کی جائے تو وہ صلہ رحمی کیا کرے۔“ (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۴۰: کفار کے عذاب لے آنے کے مطالبہ کا جواب دیا گیا ہے کہ عذاب آ کر رہے گا۔ نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں بھی کفار پر عذاب آ سکتا ہے اور آپ ﷺ کے دُنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد بھی۔ اللہ ﷻ کی طرف سے تسلّی ہے کہ اے محبوب ﷺ! کفر کو شکستِ فاش ہوگی۔ کفار کی ساری کوششیں

رائیگاں جائیں گی۔ حق کا بول بالا ہو گا۔ ہر طرف توحید کا نور پھیلے گا۔ بحر و بر، آبادیوں اور صحراؤں میں اسلام کا پرچم لہرائے گا۔ یہ ہمارا وعدہ ہے جو ضرور پورا ہو گا۔ ان میں سے کچھ آپ ﷺ کی اس حیاتِ دُنیوی میں وقوع پذیر ہو گا اور کچھ بعد میں رونما ہو گا۔ آپ ان کفار و مشرکین کی ایذا رسانیوں اور بدزبانیوں سے پریشان نہ ہوا کریں۔ حق کا پیغام پہنچا دینا آپ ﷺ کے ذمہ ہے اور ان سے بازپرس کرنا ہمارا کام ہے۔ یعنی حساب لینا اللہ ﷻ کے ذمہ ہے۔

علمی بات: مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ اس آیت میں ذکر کردہ یہ بات ہے کہ "اوّل آنحضرت ﷺ کی زندگی میں مشرکین پر عذاب واقع ہو سکتا ہے" کا ظہور ہوا اور وہ اس طرح کہ غزوۂ بدر میں مشرکین کو شکست ہوئی اور انہوں نے ذلت اٹھائی پھر آنحضرت ﷺ کی زندگی میں مکّہ معظمہ فتح ہو گیا اور اس وقت کے موجودہ مشرکین میں سے کچھ مقتول ہوئے اور اکثر نے اسلام قبول کیا۔

آیت نمبر ۴۱: دشمنانِ دین کو ان کے گرد زمین کے تنگ کیئے جانے کے بارے میں خبردار کیا گیا ہے۔ زمین کو تنگ کرنے سے مراد یہ ہے کہ اسلام کی قبولیت میں اضافہ اور دشمنوں کے اثر و رسوخ میں کمی ہے۔ اسلام کا غلبہ اللہ ﷻ کا حکم اور فیصلہ ہے جسے کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ دشمنانِ اسلام کے لئے تنبیہ ہے کہ اللہ ﷻ جلد حساب لینے پر قادر ہے۔

علمی بات: کفارِ مکّہ کو اس بارے میں کیوں شبہ ہے کہ اللہ ﷻ انہیں عذاب نہیں دے گا اور ذلت و رُسوائی میں مبتلا نہیں کرے گا؟ کیا وہ دیکھ نہیں رہے کہ وہ اللہ ﷻ سرزمین مکّہ کو ان کے چاروں طرف سے تنگ کرتا جا رہا ہے اور ہر سال مسلمان کچھ علاقوں کو فتح کرتے ہوئے مکّہ کی طرف بڑھ رہے ہیں اور کفارِ مکّہ کے لئے زمین تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ یعنی سرزمین مکّہ کے آس پاس اسلام کا اثر پھیلتا جاتا اور کفر کی عملداری گھٹتی جاتی ہے۔ بڑے بڑے قبائل اور اشخاص کے قلوب پر اسلام کا سکہ بیٹھ رہا ہے۔ اس طرح ہم آہستہ آہستہ کفر کی حکومت کو دباتے چلے آ رہے ہیں۔ کافروں کو اس سے عبرت ہونی چاہیئے کہ اس زمین پر اہلِ ایمان کا اقتدار بڑھتا چلا جا رہا ہے ہر طرف اسلام پھیل رہا ہے اور جو لوگ بھی اسلام قبول کر لیتے ہیں ان کا علاقہ مسلمانوں کی عملداری میں داخل ہو جاتا ہے جو لوگ مجبور اور مظلوم تھے انہیں زمین کا اقتدار ملتا جا رہا ہے اور ظالمین اقتدار سے محروم ہوتے جا رہے ہیں کافروں کی عملداری ہر طرف سے گھٹ رہی ہے یہ سب کچھ ان کی نظروں کے سامنے ہے اس سے عبرت حاصل کریں۔ کیا یہ روشن آثار ان مکذّبین کو نہیں بتلاتے کہ اللہ ﷻ کا فیصلہ ان کے مستقبل کے متعلق کیا ہو چکا ہے۔ ایک عقل مند سمجھ سکتا ہے کہ اسلام آج جس رفتار سے بڑھ رہا ہے وہ کسی طاقت سے رُکنے والا نہیں۔

علمی بات: یہ سورۂ مکی ہے، اس آیت کی تفسیر اور مفہوم کی بناء پر یہ ماننا پڑتا ہے کہ اگر سورت پورا مدنی نہیں تو کم از کم یہ آیتیں ضرور مدنی ہیں کیونکہ اسلامی فتوحات کا سلسلہ حضور نبی کریم ﷺ کی ہجرت کے بعد مدینہ سے شروع ہوا ہے۔ مکی سورتوں کے اندر ملی جلی مدنی آیتوں کی مثالیں قرآنِ حکیم میں کثرت سے مل جاتی ہیں۔ لیکن آیت اگر مکی ہی ہو جب بھی اشکال وارد نہیں ہوتا۔ اسلام پھیل تو برابر رہا تھا اور مسلمانوں کی آبادی، مغلوبیت و مظلومیت کے باوجود بہرحال بڑھتی ہی جاتی تھی۔

علمی بات: بعض اہلِ تفسیر کے نزدیک زمین کی کمی سے مراد ہے، ویرانی اور تباہی۔ اس توجیہ پر مطلب کا خلاصہ اس طرح ہو گا: کیا ان لوگوں کو اپنی بربادی اور اپنی بستیوں کی ویرانی کا اندیشہ نہیں؟ کیا ان کو نہیں نظر آتا کہ ہم ان کی آبادیوں کو اجاڑ رہے ہیں اور آبادیوں کے رہنے والوں کو ہلاک کر رہے ہیں؟

علمی بات: اللہ ﷻ کی بشارت کے مطابق پھر وہ وقت آیا کہ مشرق اور مغرب کے آخر تک اسلام کا علم لہرانے لگا اور رسول اللہ ﷺ کی پیشن گوئی کے مطابق ہر صورت وہ وقت آنے والا ہے جو مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے نقل کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، فرماتے تھے: "زمین کی پشت پر اینٹوں یا بالوں کا بنا ہوا کوئی گھر (یا خیمہ) باقی نہیں رہے گا، مگر اللہ ﷻ اس میں کلمۂ اسلام کو داخل کر دے گا، عزّت والوں کو عزّت بخش کر اور ذلیل کو ذلت دے کر، یا تو انہیں عزّت دے گا اور انہیں یہ کلمہ پڑھنے والوں میں داخل کر دے گا، یا انہیں ذلیل کرے گا اور وہ اس کے محکوم بن جائیں گے۔" (مسند احمد)

علمی بات: اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے لئے پیامِ تسکین ہے تاکہ آپ ﷺ فکر نہ کریں، رنجیدہ نہ ہوں اور یقین رکھیں کہ اللہ ﷻ کا وعدۂ فتح پورا ہو کر رہے گا۔

علمی بات: بعض مفسرین نے اس کا ایک مفہوم بعض اخبار و آثار میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ زمین کی اطراف کو گھٹانے سے مراد علماء و فقہاء اور صلحاء کی دُنیا سے رحلت ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ جو چاہتا ہے فیصلہ فرماتا ہے۔ اللہ ﷻ اپنے احکام کو نافذ فرماتا ہے اور کسی کو اٹھاتا ہے تو کسی کو گراتا ہے، کسی کو مارتا ہے تو کسی کو زندگی دیتا ہے۔ اس کے احکام کو کوئی پھیرنے اور ان سے ٹکرانے والا نہیں اور اس کے فیصلوں میں کوئی دخل اندازی نہیں کر سکتا۔ عنقریب آخرت میں بھی اللہ ﷻ ان کا حساب لے گا اور کافروں کو ان کے جرائم کی قرار واقعی سزا دے گا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: سیّدنا حسن بن علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہما کو رسول اللہ ﷺ نے چند کلمات سکھلائے کہ وہ انہیں نمازِ وتر میں پڑھا کریں، تو ان میں سے ایک کلمہ یہ بھی ہے: (فَاِنَّكَ تَقْضِیْ وَلَا یُقْضٰی عَلَیْكَ) "بے شک تو ہی فیصلے فرماتا ہے اور تیرے خلاف کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔" (جامع ترمذی)

آیت نمبر ۴۲: مکر مخفی چال کو بھی کہتے ہیں۔ حق کو مٹانے کے لئے پہلے لوگوں نے بھی مخفی چالیں چلیں اور مشرکین مکّہ بھی ایسا ہی کر رہے ہیں۔ اللہ ﷻ ہر شخص کے ہر کام سے خوب واقف ہے لہٰذا اس کے سامنے کسی کی چال کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔ عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ اچھا انجام کس فریق کے حق میں ہو گا۔

علمی بات: آپ ﷺ کی قوم سے پہلی قومیں بھی دینِ حق کی دعوت کو روکنے اور اس کے آگے بند باندھنے کی سر توڑ کوششیں کرتی رہی ہیں۔ مگر بالآخر وہی کچھ ہوا جو اللہ ﷻ کو منظور تھا۔ اللہ ﷻ کی تقدیر کے سامنے ان کی تدبیریں کچھ بھی کام نہ آسکیں اور اب بھی یہی کچھ ہو گا۔ ان منکرینِ حق کو جلد ہی پتہ چل جائے گا کہ انجام بخیر کس فریق کے حق میں ہوتا ہے، اور جو کچھ یہ لوگ اسلام کو ختم کرنے کے سلسلہ میں تدبیریں کر رہے ہیں وہ سب اللہ ﷻ کے علم میں ہیں اور ان کا توڑ وہ خوب جانتا ہے۔ اللہ ﷻ ہر ایک کے ہر عمل سے باخبر ہے۔ وہ ہر ایک کو اس کے اعمال کا بدلہ دے گا۔ کافروں کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ کس کا انجام اچھا ہوا ان کافروں کا یا مومنوں کا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: سیّدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ یہ دُعا کیا کرتے تھے: رَبِّ اَعِنِّیْ وَلَا تُعِنْ عَلَیَّ، وَانْصُرْنِیْ وَلَا تَنْصُرْ عَلَیَّ، وَامْکُرْ لِیْ وَلَا تَمْکُرْ عَلَیَّ، وَاهْدِنِیْ وَیَسِّرْ هُدَایَ اِلَیَّ وَانْصُرْنِیْ عَلٰی مَنْ بَغٰی عَلَیَّ "اے میرے رب! میری مدد فرما، میرے خلاف کسی کی مدد نہ کر (جو مجھے تیری اطاعت سے روک دے) میری نصرت فرما، میرے خلاف کسی کی نصرت نہ کر، میرے حق میں تدبیر فرما، میرے خلاف تدبیر نہ کر، میری رہنمائی فرما اور ہدایت کو میرے لئے آسان فرما دے اور جو میرے خلاف بغاوت کرے اس کے مقابلے میں میری مدد فرما۔

آیت نمبر ۴۳: کفار رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا انکار کر رہے تھے۔ تاہم آپ ﷺ کی رسالت کی صداقت مشرکینِ مکّہ کی گواہی کی محتاج نہیں۔ آنحضرت ﷺ کی نبوّت کی دونوں دلیلیں یعنی عقلی اور نقلی موجود ہیں، عقلی تو یہ کہ آنحضرت ﷺ کو معجزات اور قرآنِ حکیم اللہ ﷻ نے عطا فرمایا جو دلیل نبوّت ہے اور نقلی یہ کہ پہلی آسمانی کتابوں میں آپ ﷺ کی نبوّت کی خبریں اور پیشین گوئیاں موجود ہیں جو کہ انصاف اور حق پسند علمائے اہلِ کتاب سے پوچھی جاسکتی ہیں پس دلائل عقلیہ ونقلیہ کے ہوتے ہوئے آپ ﷺ کی نبوّت سے انکار بجز شقاوت کے اور کیا ہے۔

علمی بات: آپ ﷺ کی رسالت پر اللہ ﷻ کی گواہی کافی ہے۔ اہلِ کتاب کے سلیم الفطرت لوگ بھی آپ ﷺ کی رسالت کے گواہ ہیں۔ اہلِ کتاب کی کتابوں میں آپ ﷺ کے متعلق بشارتیں موجود ہیں۔

جیسا کہ مشرکینِ عرب یہود و نصاریٰ سے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں پوچھا کرتے تھے، اسی لئے یہاں ان کا بھی حوالہ دیا گیا ہے کہ وہ بھی اپنی کتابوں کے ذریعہ جانتے ہیں کہ سیّدنا محمد مصطفیٰ (ﷺ) اللہ ﷻ کے رسول ہیں۔ چنانچہ عبداللہ بن سلام، سلمان فارسی اور تمیم داری رضی اللہ عنہم نے اسلام لانے کے بعد اس کی شہادت دی کہ تورات و انجیل میں رسول اللہ ﷺ کے خاتمُ النّبییّن ہونے کی صراحت موجود ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے پہلی وحی کا حال بیان کیا تو سیّدہ خدیجہ (رضی اللہ عنہا) آپ ﷺ کو اپنے چچا کے بیٹے ورقہ بن نوفل بن اسد کے پاس لے آئیں، وہ زمانہ جاہلیت میں نصرانی ہو گئے تھے اور عبرانی زبان کے کاتب تھے، چنانچہ حسب منشاء الٰہی وہ انجیل کو عبرانی زبان میں لکھا کرتے تھے۔ تو جب آپ ﷺ نے اپنا حال بیان کیا تو اس نے کہا کہ یہ تو وہی ناموس (یعنی فرشتہ) ہے جسے اللہ ﷻ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی دے کر بھیجا تھا، کاش! میں آپ ﷺ کے اس عہدِ نبوّت کے شروع ہونے پر جوان عمر ہوتا، کاش! میں اس وقت تک زندہ رہتا جب آپ ﷺ کی قوم آپ کو اس شہر سے نکال دے گی۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

سُوۡرَۃُ اِبۡرَاهِيۡم

آیت نمبر ۱: اس آیت میں نزول قرآنِ حکیم کا مقصد اور نبی کریم ﷺ کی مبارک محنت کا ذکر ہے۔ آیاتِ قرآنی کے ذریعہ لوگ کفر و شرک کے اندھیروں سے ہدایت کی روشنی کی طرف آتے ہیں۔

"الٓرٰ" حروف مقطعات میں سے ہے۔ قطع کے لغوی معنی کاٹنا یا علیحدہ کرنا ہیں۔ یعنی وہ بامعنی حروف جن کو علیحدہ علیحدہ پڑھا جاتا ہے۔ حروف مقطعات ایسے حروف ہیں جن کو الگ الگ کر کے پڑھتے ہیں۔ حروف مقطعات کا علم اللہ ﷻ کے پاس ہے اور یہ اللہ ﷻ اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان ایک راز ہے۔

علمی بات: کسی ایک آیت میں استعمال ہونے والے حروف مقطعات کی زیادہ سے زیادہ تعداد پانچ ہے جیسا کہ سورۃ مریم کے آغاز میں ہے، مثلاً کٓهٰيٰعٓصٓ اور کم سے کم تعداد ایک ہے۔ مثلاً صٓ (سورۃ صٓ)، قٓ (سورۃ قٓ)، نٓ (سورۃ القلم) وغیرہ۔ نیز قرآنِ حکیم میں حروفِ تہجی میں سے ۱۴ حروف "حروفِ مقطعات" میں استعمال ہوئے ہیں جو یہ ہیں: (ا، ح، ر، س، ص، ط، ع، ق، ک، ل، م، ن، ھ، ی) یہ کُل چودہ حروف ہیں۔

علمی بات: روشنی یا نور کے مقابلہ میں تاریکی کا لفظ واحد استعمال نہیں کیا بلکہ اس کی جمع تاریکیاں استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ صراطِ مستقیم صرف ایک ہی ہے اور اسی صراطِ مستقیم کو روشنی سے تعبیر فرمایا گیا جب کہ ٹیڑھی یا باطل راہیں لاتعداد ہیں اور یہ سب گمراہی کے راستے ہیں اس لئے ان سب راستوں کو تاریکیوں سے تعبیر کیا گیا۔ گویا اس کتاب قرآنِ حکیم کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ لوگوں کو باطل کی تمام راہوں سے ہٹا کر صراطِ مستقیم پر لایا جائے اور یہ کام تب ہی ہو سکتا ہے جب لوگوں کے پروردگار کو بھی انہیں راہِ راست پر لانا منظور ہو۔ اس منظوری کا قانون یہ ہے کہ جو ہدایت کا طالب ہو اسے اللہ ﷻ یقیناً ہدایت کی توفیق دیتا ہے اور یہی اس کی منظوری اور اذن ہے لیکن جو لوگ ہٹ دھرمی کی راہ اختیار کریں انہیں اللہ ﷻ ہدایت کی توفیق نہیں بخشتا۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ کی دو صفات العزیز اور الحمید ذکر کی گئی ہیں عزیز کے معنی عربی لغت کے اعتبار سے قوی اور غالب کے ہیں اور حمید کے معنی وہ ذات جو حمد کی مستحق ہو گویا غلبہ و قوت بھی اُسی کو حاصل ہے اور مدح و تحسین کی حقدار بھی اسی کی ذات ہے۔ ان دو صفتوں کو اصل نام حق سے پہلے لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ راستہ جس ذاتِ قدوس کی طرف لے جانے والا ہے وہ قوی اور غالب بھی ہے اور ہر حمد کی مستحق بھی اس لئے اس پر چلنے والا نہ کہیں ٹھوکر کھائے گا نہ اس کی کوشش رائیگاں ہو گی بلکہ اس کا منزلِ مقصود پر پہنچنا یقینی ہے شرط یہ ہے کہ اس پر چلنے والا اس راستہ کو نہ چھوڑے۔

علمی بات: اس آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا گیا کہ اے نبی (ﷺ)! ہم نے آپ پر یہ قرآنِ حکیم نازل کیا ہے تاکہ آپ ﷺ لوگوں کو کفر، گمراہی اور جہالت کے اندھیروں سے نکال کر ایمان، ہدایت اور علم کی روشنی میں لے آئیں۔ نبی کریم ﷺ کی ہدایت کو اللہ ﷻ نے اپنی اجازت اور توفیق پر منحصر فرمایا ہے اور اس میں یہ بتایا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اپنی ذات اور اپنی طاقت سے کسی کو مومن اور مسلمان نہیں بنا سکتے تھے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پورے جزیرۂ عرب میں کوئی کافر نہ رہتا اس لئے وہی شخص ایمان اور اسلام قبول کرتا ہے جس کو اللہ ﷻ ایمان اور اسلام کی توفیق عطا فرماتا ہے۔

آیت نمبر ۲: اللہ ﷻ کائنات کی تمام چیزوں کا مالک ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ "ویل" سے مراد شدید عذاب اور ہلاکت ہے نیز جامع ترمذی کی روایت کے مطابق ویل دوزخ کی ایک وادی کا نام بھی ہے۔ یہ عذاب دنیوی بھی ہو سکتا ہے اور اُخروی بھی۔ اللہ ﷻ کی کتاب کا انکار کرنے والوں کے لئے ہلاکت و بربادی کی وعید ہے۔ جو لوگ ایسی کتاب نازل ہونے کے بعد کفر و شرک اور جہالت و ضلالت کی اندھیری سے نہ نکلیں ان کو سخت عذاب اور ہلاکت خیز مصیبت کا سامنا ہو گا۔ دنیا میں مہلت دیئے جانے کی وجہ سے اگر بظاہر عذاب نہ بھی آیا تو آخرت میں تو ان کی تباہی و بربادی یقینی ہے۔

علمی بات: قرآنِ حکیم اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ سب انسانوں کو اندھیرے سے نکال کر اللہ ﷻ کے راستہ کی روشنی میں لے آئے مگر جو بدنصیب قرآنِ حکیم ہی کے منکر ہو جائیں تو وہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو عذاب میں ڈال رہے ہیں۔ جو لوگ قرآنِ حکیم کے کلامِ الٰہی ہونے ہی کے منکر ہیں وہ تو اس وعید کی مراد ہیں ہی مگر جو اعتقاداً منکر نہیں مگر عملاً قرآنِ حکیم کو چھوڑے ہوئے ہیں نہ تلاوت سے کوئی واسطہ ہے نہ اس کے سمجھنے اور عمل کرنے سے کوئی سروکار ہے وہ بدنصیب بھی مسلمان ہونے کے باوجود اس

وعید سے بالکل بری نہیں ہیں۔ انہیں بھی اپنی فکر کرتے ہوئے اصلاح کرنی چاہیئے اور قرآنِ حکیم سے تعلق مظبوط کرنا چاہیئے۔

علمی بات: دینِ اسلام اس اللہ ﷻ کا منتخب کردہ راستہ ہے جو آسمانوں، زمین اور اس کے درمیان ہر چیز کا مالک ہے، اس لئے ان کفار کے لئے دنیا میں ہلاکت و بربادی اور قیامت کے دن جہنم کا عذاب ہے۔ جو نبی کریم ﷺ کی دعوت کو قبول نہیں کرتے اور کفر کی تاریکی سے نکل کر دین و اسلام کی روشنی میں داخل نہیں ہوتے۔

آیت نمبر ۳: بُری خصلتوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ: ۱۔ وہ دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں۔ ۲۔ وہ دوسروں کو اللہ ﷻ کی راہ پر آنے سے روکتے ہیں۔ ۳۔ وہ اللہ ﷻ کے احکامات پر اعتراض اور ان میں ٹیڑھ اور کجی تلاش کرتے ہیں۔ ایسے کافروں کو تباہ کن عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔

علمی بات: اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ وہ اسلام میں کوئی نہ کوئی عیب تلاش کرتے رہتے ہیں تاکہ انہیں اعتراض کا موقع ملے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ قرآن و سنت میں کوئی بات ان کے خیالات اور خواہشات کے مطابق مل جائے تو اس کو اپنے باطل نظریات کی تائید میں پیش کریں۔

عملی پہلو: یہ آیت ہم سب کو دعوت دیتی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے گریبان میں جھانکے اور اپنی ترجیحات کا تجزیہ کرے کہ اس کی مہلت زندگی کے اوقات کار کی تقسیم کیا ہے؟ اس کی بہترین صلاحیتیں کہاں کھپ رہی ہیں؟ اس نے اپنی زندگی کا نصب العین کیا متعین کر رکھا ہے؟ پھر اپنی شبانہ روز مصروفیات میں سے دنیا اور آخرت کے حصّے الگ الگ کر کے دیکھے کہ دنیوی زندگی (مَتَاعُ الْغُرُوْر) کو سمیٹنے کی اس بھاگ دوڑ میں سے ازلی اور حقیقی زندگی (خَيْرٌ وَّاَبْقٰى) کے لئے اس کے دامن میں کیا کچھ بچتا ہے؟

آیت نمبر ۴: اس آیت میں لوگوں پر اللہ ﷻ کے احسان کا ذکر ہے۔

اللہ ﷻ کا ہر قوم پر یہ احسان ہے کہ اس نے ان میں وہ رسول بھیجا جو ان کی زبان بولتا تھا تاکہ استفادہ میں اور افہام و تفہیم میں آسانی ہو اور قوم آسانی کے ساتھ رسول کی بات سمجھ سکے اور اللہ ﷻ کے پیغام جان کر اس قوم کے لئے شریعت کے احکام اور مسائل کو سمجھنا آسان اور سہل ہو جائے۔ اللہ ﷻ زبردست اور حکیم ہے۔ اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ ہدایت کے طالب کو ہدایت دی جائے۔ گمراہ صرف اسے کیا جاتا ہے جو خود گمراہی کی راہ اختیار کرے۔

علمی بات: <u>قرآنِ حکیم عربی زبان میں کیوں ہے؟</u> یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح پچھلی اُمّتوں کے رسول ان کے ہم زبان بھیجے گئے ان کو ترجمہ کرنے کی محنت کی ضرورت نہ رہی رسول کریم ﷺ صرف عرب میں عربی زبان کے ساتھ کیوں مبعوث ہوئے؟ اور آپ کی کتاب قرآنِ حکیم بھی عربی زبان ہی میں کیوں نازل ہوئی؟ لیکن غور و فکر سے کام لیا جائے تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جب رسول کریم ﷺ کی بعثت اور دعوت تمام اقوام دنیا کے لئے عام ہوئی جن میں سینکڑوں زبانیں رائج ہیں تو ان سب کی ہدایت کے لئے دو ہی صورتیں ممکن تھیں ایک یہ کہ قرآنِ حکیم ہر قوم کی زبان میں جدا جدا نازل ہوتا اور اللہ ﷻ کی قدرتِ کاملہ کے سامنے اس کا انتظام کوئی دشوار نہ تھا لیکن تمام اقوام عالم کے لئے ایک رسول ایک کتاب اور ایک شریعت بھیجنے کا جو ایک عظیم مقصد تھا وہ کسی صورت حاصل نہ ہوتا کہ تمام اقوام عالم میں ہزاروں طرح کے اختلافات کے باوجود دینی، اخلاقی، معاشرتی وحدت اور یک جہتی پیدا کی جائے۔

اس کے علاوہ جب ہر قوم ہر ملک کا قرآن قرآنِ حکیم الگ زبان میں ہوتا تو اس میں تحریفِ قرآن کے بے شمار راستے کھل جاتے اور قرآنِ حکیم کے کلام کا محفوظ ہونا جو اس کی ایسی امتیازی خصوصیت ہے کہ اغیار اور منکرینِ قرآن بھی اس کو تسلیم کئے بغیر نہ رہ سکے، یہ معجزانہ خصوصیت قائم نہ رہتی اور ایک ہی دین ایک ہی کتاب کے ہوتے ہوئے اس کے ماننے والوں کی راہیں اتنی مختلف ہو جاتیں کہ کوئی نقطۂ وحدت ہی باقی نہ رہتا۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قرآنِ حکیم کے ایک عربی زبان میں نازل ہونے کے باوجود اس کی تعبیر و تفسیر میں کس قدر اختلافات جائز حدود میں پیش آئے اور ناجائز و باطل طریقوں سے اختلاف کی تو کوئی حد نہیں لیکن ان سب کے باوجود مسلمانوں کی قومی وحدت اور ممتاز تشخص ان سب لوگوں میں موجود ہے جو قرآنِ حکیم پر کسی درجہ میں بھی عمل کرنے والے ہیں۔

نبی کریم ﷺ پوری دنیا والوں کے لئے اور تمام جن و انس کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ رسول کریم ﷺ کی رسالت و بعثت پوری اقوامِ دنیا کے لئے عام ہونے کی بناء پر اگر قرآنِ حکیم ہر قوم کی زبان میں الگ الگ ہوتا تو کوئی ادنٰی سمجھ کا آدمی بھی اس پر اعتبار اور اسے درست تسلیم نہ کرتا، لہٰذا یہ بات مبنی بر حکمت تھی کہ قرآنِ حکیم عربی زبان میں نازل ہو کیونکہ رسول کریم ﷺ کی زبان بھی وہی قرآنِ حکیم کی زبان تھی پھر رسول کریم ﷺ کے نائب علماء ہر قوم و ملک میں آپ ﷺ کی دی

ہوئی ہدایات کو اپنی قوم وملک کی زبان میں سمجھائیں اور شائع کریں اس کے لئے حق تعالیٰ نے تمام دنیا کی زبانوں میں سے عربی زبان کا انتخاب فرمایا اور عربی زبان دنیا کی سب سے گہری اور وسیع زبان ہے، اسی لئے قرآنِ حکیم عربی زبان میں نازل ہوا، اور دوسری قوموں تک قرآنِ حکیم کا پیغام بذریعہ ترجمہ پہنچا، ان قوموں نے اسلام لانے کے بعد حفظِ قرآن اور فہم قرآن کے لئے خوب محنت کی، تراجم تیار کئے، تفسیریں لکھیں، عربی زبان میں دسترس حاصل کیا اور قرآن وسنت کو ان کی اصل زبان میں سمجھا اور اسلام کی دعوت کو اسی طرح سمجھا جس طرح عرب مسلمانوں نے سمجھا۔

علمی بات: یہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا کیونکہ یہ دنیا کی وہ فصیح ترین زبان ہے جو اپنے اندر گہرائی اور گیرائی لی ہوئی ہے، اس کے دامن میں ان تمام افکار و معانی کے لئے وسعت ہے جو انسانی دل ودماغ میں پائے جاسکتے ہیں۔ یہ زبان دوسری زبانوں کے مقابلہ میں زیادہ فصیح، واضح اور وسیع ہے۔ نیز قرآنِ حکیم کے مخاطبین اول عرب لوگ تھے اور ان کو عربی سمجھنے میں آسانی تھی۔ دنیا کی اشرف کتاب اشرف زبان میں، معزز ترین رسول ﷺ پر، معزز ترین فرشتہ کے واسطے سے، اشرف زمین پر، اشرف مہینہ یعنی ماہِ رمضان میں نازل ہوئی، اس لئے اس کتابِ عظیم کو ہر اعتبار سے کمال شرف حاصل ہوا۔

چونکہ قرآنِ حکیم بطورِ معجزہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے، اور اللہ ﷻ نے اس کی حفاظت کی ضمانت لی ہے، اسی لئے ابتدائے اسلام سے لے کر اب تک دنیا کی کوئی طاقت اس میں ایک نقطہ کی بھی تبدیلی نہیں کرسکی اور نہ کرسکے گی، اور اس کی دعوت عربی اور غیر عربی زبانوں میں عام ہوتی رہے گی یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

عملی پہلو: جن لوگوں نے اس دعوتِ حق میں غور وفکر کیا اور اس کے دلائل صداقت کو عقل سلیم کی کسوٹی پر پرکھا اور حق کا طلب گار بن کر اس کو پڑھا تو اللہ ﷻ نے انہیں ہدایت عطا فرمائی۔ لیکن جن بد نصیبوں نے تعصب، ہٹ دھرمی اور عناد کے باعث اس دعوتِ حق میں غور وفکر کرنا مناسب نہ سمجھا اور انہوں نے حق کی تابانیوں کو دیکھنے سے ہی اپنی آنکھیں بند رکھیں ان سے ہدایت پذیری کی صلاحیتیں چھین لی گئیں اور انہیں گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔

آیت نمبر ۵: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ قوم کو گمراہی کے اندھیروں سے نکال کر ہدایت کی روشنی کی طرف لائیں۔ مزید برآں اللہ ﷻ کے ایام کے حوالے سے قوم کو نصیحت کریں۔ اللہ ﷻ کے ایام سے مراد وہ تاریخی واقعات کے دن ہیں جن میں اللہ ﷻ نے بعض قوموں پر انعامات فرمائے اور بعض کو عذاب دیا۔ ان واقعات میں ہر صبر اور شکر کرنے والے کے لئے نشانیاں موجود ہیں۔

علمی و عملی بات: عربی میں نعمتوں کو بھی ایام کہا جاتا ہے اور گزشتہ واقعات کو بھی۔ یہاں دونوں معنی مراد لئے جاسکتے ہیں۔ اللہ ﷻ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ اپنی قوم کو وہ نعمتیں یاد دلائیں جو ہم نے ان پر فرمائیں۔ کس طرح انہیں فرعون کے ظلم واستبداد سے رہائی دی۔ کس طرح دریا سے انہیں سلامتی سے گزارا اور کس طرح ان کی آنکھوں کے سامنے فرعون کو غرق کیا یا انہیں گزری ہوئی قوموں کے واقعات وحالات سنائیں تاکہ یہ نصیحت قبول کریں۔ ان واقعات میں ہر اس شخص کو جو صبر اور شکر کی صفات سے متصف ہے اللہ ﷻ کی قدرت کی نشانیاں نظر آئیں گی۔

عملی پہلو: (صَبَّارٍ شَكُوْرٍ) سے مراد وہ مومنین ہیں جو مصیبتوں پر صبر کرتے ہیں اور نعمتوں پر شکر ادا کرتے ہیں اور جب گزشتہ قوموں کی بربادی یا ان پر اللہ ﷻ کی نعمتوں کی بارش کے واقعات سنتے ہیں تو فوراً چوکنا ہوتے ہیں، اپنا محاسبہ کرتے ہیں اور صبر وشکر کی زندگی اختیار کرتے ہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت سیدنا صہیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: " مومن کا ہر معاملہ بڑا عجیب (بہت عمدہ) ہے کیونکہ اس کا ہر معاملہ اس کے لئے بہتر ہے اور مومن کے علاوہ یہ فضیلت کسی اور کے لئے نہیں۔ (وہ اس طرح کہ) اسے مصیبت پہنچے تو صبر کرتا ہے اور یہ اس کے حق میں بہتر ہے اور اگر اسے راحت و آرام ملے تو شکر کرتا ہے، اس کا انجام بھی اس کے لئے بہتر ہوتا ہے۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۶: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو اللہ ﷻ نے اپنے انعامات واحسانات کی یاد دہانی کرائی ہے۔ اللہ ﷻ نے ان لوگوں کو آلِ فرعون کے ظلم سے نجات دی جو ان کے بیٹوں کو قتل اور بیٹیوں کو زندہ رکھتے تھے۔ یہ ان کے لئے بڑی آزمائش تھی جن سے نجات دینا ان پر اللہ ﷻ کا بہت بڑا احسان تھا۔

علمی بات: نجومیوں نے فرعون کو بتایا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہونے والا ہے جو تیرے اقتدار کو ختم کردے گا، چنانچہ اس نے حکم جاری کردیا کہ بنی اسرائیل کے

ہاں پیدا ہونے والے ہر بچہ کو قتل کر دیا جائے۔ والدین کے سامنے کمسن بیٹوں کو ذبح کرنا والدین کے لئے واقعی بہت بڑی آزمائش تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو یہ احسان یاد دلایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو فرعون کے مظالم سے نجات دی لہٰذا ان پر اللہ تعالیٰ کا شکر لازم ہے۔

نوٹ: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کی مکمل تفصیلات مطالعۂ قرآنِ حکیم حصہ دوم اور اس کے رہنمائے اساتذہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

آیت نمبر ۷: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو مزید نصیحت کی گئی۔ قوم کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر کرنے کی تلقین کی گئی۔ نعمتوں کی قدر اور شکر پر مزید نعمتوں کی نوید سنائی گئی۔ ناشکری پر نعمتوں سے محرومی اور سخت عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔

علمی بات: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے یہ بھی فرمایا کہ تمہارے رب نے مجھے خبر دی ہے کہ اگر تم اس کی نعمتوں کا ایمان خالص اور عملِ صالح کے ذریعے شکر ادا کرو گے تو وہ تمہیں اور زیادہ روزی دے گا اور دنیا میں معزز و مکرم بنائے گا اور اگر ناشکری کرو گے تو وہ نعمتیں تم سے چھین لے گا اور سخت عذاب میں مبتلا کر دے گا۔

علمی بات: شکر سے مراد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف کرنا اور احسان مندی کا اظہار کرنا ہے۔ شکر کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق استعمال کیا جائے۔ نہ کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال کیا جائے۔

عملی پہلو: شکر کے تین درجات ہیں: i۔ دل میں نعمت کا احساس ہونا اسے شُکْرٌ بِالْقَلْب کہتے ہیں۔ ii۔ زبان سے نعمت کا شکر ادا کرنا اسے شُکْرٌ بِالِلّسَان کہتے ہیں۔ iii۔ نعمت کا صحیح استعمال کرنا اسے شُکْرٌ بِالْجَوَارِح (اعضائے جسمانی سے شکر) کہتے ہیں۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں پر شکر ادا کرنا چاہیئے اور ان کو اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مطابق استعمال کرنا چاہیئے اور خیال رکھنا چاہیئے کہ شیطان کی پیروی میں کہیں ہم ان نعمتوں کا غلط استعمال تو نہیں کر رہے؟

فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: حضرت صہیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے، اس کا ہر معاملہ اس کے لئے باعث خیر ہے اور یہ سعادت صرف مومن کے لئے خاص ہے، اگر اسے کوئی نعمت میسر آتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے اور یہ اس کے لئے بہتر ہے، اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے اور یہ بھی اس کے لئے بہتر ہے۔“ (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۸: تمام انسان مل کر بھی اللہ تعالیٰ کی ناشکری کریں تو اللہ تعالیٰ کا کچھ نقصان نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سب سے بے نیاز ہے۔ کائنات کی ہر شے اُسی کی حمد کرتی ہے۔

علمی بات: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم سے یہ بھی فرمایا کہ اگر تم اور زمین میں رہنے والے سبھی لوگ اللہ تعالیٰ کے ناشکرے ہو جاؤ تو اس کا نقصان تمہیں ہی پہنچے گا، وہ تمہارے شکر کا محتاج نہیں ہے۔ تمہاری ناشکری سے اس کی ذات وصفات میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔

فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: حضرت سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے میرے بندو! نہ تم میرا نقصان کر سکتے ہو اور نہ ہی مجھے فائدہ پہنچا سکتے ہو۔ اگر تمہارے اگلے اور پچھلے، تمہارے جن وانس، سب ایسے ہو جائیں جیسے تم میں بڑا پرہیز گار شخص ہو تو میری سلطنت میں کچھ اضافہ نہیں ہوگا اور اگر تمہارے اگلے اور پچھلے، تمہارے جن وانس، سب ایسے ہو جائیں جیسے تم میں سے سب سے بدکار شخص ہو تو میری سلطنت میں سے کچھ کم نہیں ہوگی۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے پہلے اور پچھلے اور تمہارے انسان اور جن ایک میدان میں کھڑے ہو جائیں اور مجھ سے مانگیں اور میں ہر انسان کے سوال کے مطابق اسے دے دوں، تو اس سے میری بادشاہت میں اتنی بھی کمی نہیں آتی جتنی دریا میں سوئی ڈبونے سے اس کے پانی میں کمی آتی ہے۔“ (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۹: گزشتہ اقوام میں سے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم، قومِ عاد اور قومِ ثمود کا ذکر ہے جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے واضح نشانیوں کے ساتھ رسول بھیجے۔ ان قوموں نے دعوتِ توحید اور رسالت کے حوالے سے شکوک وشبہات کا اظہار کیا۔ ان تینوں اقوام کے بعد آنے والی اقوام نے بھی حق کا انکار کیا جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے قومِ نوح، قومِ عاد، قومِ ثمود اور دیگر اُمتوں کے واقعات بیان کئے ہیں کہ جنہوں نے اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کو جھٹلایا تھا اور ایسی قومیں دنیا میں ان گنت ہوئی ہیں جن کی تعداد صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ ان رسولوں نے جب دلائل کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کا دین ان کے سامنے پیش کیا تو لوگوں نے انہیں بات کرنے سے

منع کر دیا اور کہا کہ ہم تم سے ایک کلمہ بھی مزید نہیں سننا چاہتے، اپنی بات اپنے پاس ہی رہنے دو ہم تمہاری دعوت کا انکار کرتے ہیں اور جس بات کی طرف تم ہمیں بُلا رہے ہو ہمارے دل ان کی سچائی ماننے سے واضح انکاری ہیں۔

علمی بات: گزشتہ قوموں کے حالات سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ یہاں تمام رسولوں کو ایک جماعت فرض کر کے ان کا ذکر اکٹھے کیا جا رہا ہے کیونکہ سب نے اپنی اپنی قوم کو ایک ہی جیسی دعوت دی اور اس دعوت کے جواب میں سب رسولوں کی قوموں کا ردِّ عمل بھی تقریباً ایک جیسا تھا۔ ان سب اقوام نے اپنے رسولوں کی دعوت کو رد کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں تو ان باتوں کے متعلق بہت سے شکوک و شبہات لاحق ہیں جن کی وجہ سے ہم سخت الجھن میں پڑ گئے ہیں۔

آیت نمبر ۱۰: قوموں کے انکار پر رسولوں کے اظہارِ تعجب کا ذکر ہے۔ لوگوں کو دعوتِ توحید دی گئی کہ اللہ ﷻ ہی پوری کائنات کا پیدا فرمانے والا ہے۔ اللہ ﷻ پکارتا ہے کہ لوگ اس کی طرف پلٹیں تاکہ وہ ان کے گناہ معاف فرما دے۔ دعوتِ توحید کو ماننے کے بجائے قوموں نے اعتراضات شروع کر دیئے کہ رسول اُن جیسے بشر ہیں، رسول انہیں ان کے باپ دادا کے عقائد سے دور کرنا چاہتے ہیں۔ رسول ان کی مرضی کے مطابق کوئی معجزہ پیش کریں تاکہ انہیں رسول کی نبوّت کا یقین ہو جائے۔

علمی بات: رسولوں نے اپنی اپنی قوم سے فرمایا کیا تمہیں اللہ ﷻ کے متعلق شک ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ گویا انہوں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ انسان کی فطرت اور عقل اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ چھوٹی سی صنعت بھی بغیر صانع کے وجود میں نہیں آتی تو اتنی بڑی کائنات بغیر کسی بنانے والے کے کیسے وجود میں آسکتی ہے؟ منکرین بھی اس بات کو جانتے اور مانتے تھے کہ اللہ ﷻ نے ہی اس کائنات کو پیدا کیا ہے۔ قرآنِ حکیم میں ہے: وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ لَيَـقُوۡلُنَّ اللّٰهُ‌ ۚ فَاَنّٰى يُؤۡفَكُوۡنَ (سورۃ العنکبوت ۲۹، آیت: ۶۱) اور اگر آپ اِن سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمینوں کو کس نے پیدا فرمایا؟ اور سورج اور چاند کو کس نے مسخر کیا؟ تو وہ ضرور کہیں گے اللہ ﷻ نے تو پھر یہ کہاں بھٹکتے پھرتے ہیں؟

علمی بات: مشرکینِ مکہ اللہ ﷻ کو خالقِ ارض و سما مانتے تھے، ان کا شرک یہ تھا کہ وہ بتوں کو اللہ ﷻ کا شریک قرار دیتے تھے اور اس اعتقاد سے بتوں کی عبادت بھی کرتے تھے کہ وہ اللہ ﷻ کی بارگاہ میں ان کی شفاعت کریں گے۔ یہ تمام باتیں ان کے بڑوں اور ان کے آباء و اجداد کو شیطان نے سمجھائی تھیں اور وہ نسل در نسل اس عقیدہ میں پختہ اور راسخ ہو چکے تھے اور یہ شرک ان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکا تھا۔ اللہ ﷻ تسلسل سے انبیاء کرام علیہم السلام کو بھیجتا رہا تاکہ وہ لوگوں کو وحدانیت کی طرف لائیں اور شرک سے باز رکھیں۔

علمی بات: کافر اور مشرک کی مغفرت ہونے کے لئے اسلام قبول کرنا شرط ہے۔ کفر پر برقرار رہتے ہوئے معافی اور مغفرت نہیں ہو سکتی جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد ہوا: سورۃ النساء میں فرمایا: "بے شک اللہ ﷻ اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اُس کے ساتھ شرک کیا جائے اور جو (گناہ) اس کے علاوہ ہے جس کے لئے چاہے گا معاف فرما دے گا اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا تو یقیناً وہ دُور کی گمراہی میں جا پڑا۔" (سورۃ النساء ۴، آیت: ۱۱۶) اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا: "بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور کفر ہی کی حالت میں مر گئے تو اُن میں سے کسی سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا زمین بھر سونا اگرچہ وہ اُسے بطورِ فدیہ دینا چاہے یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے دردناک عذاب ہے اور اُن کا کوئی (بھی) مددگار نہ ہو گا۔" (سورۃ آلِ عمران ۳، آیت: ۹۱) لہٰذا کوئی کتنا ہی بڑا کافر و مشرک ہو اس کے لئے بھی اللہ ﷻ کی رحمت و مغفرت کا دروازہ کھلا ہوا ہے بشرطیکہ توبہ کر لے یعنی اسلام قبول کر لے۔

علمی بات: بعض مقامات پر اہلِ ایمان کے لئے مطلق گناہوں کی معافی کا ذکر بھی آتا ہے مگر ان سے وہ گناہ مراد ہیں جن کا تعلق اللہ ﷻ اور بندے کے درمیان ہے یعنی حقوق اللہ۔ جبکہ حقوق العباد اس وقت تک معاف نہیں ہوں گے جب تک بندہ اپنا حق معاف نہ کر دے۔ صغیرہ گناہوں کی مغفرت اور ان کا کفارہ تو اعمالِ صالحہ سے بھی ہوتا رہتا ہے لیکن کبیرہ گناہوں کی یقینی طور پر مغفرت ہو جانا توبہ کے ساتھ مشروط ہے اگر توبہ نہ کی اور اسی حالت میں موت آگئی تو بشرطِ ایمان مغفرت تو پھر بھی ہو جائے گی لیکن یہ ضروری نہیں کہ بلا عذاب مغفرت ہو جائے۔ اللہ ﷻ بغیر توبہ بھی مغفرت فرما سکتا ہے اور اسے یہ بھی اختیار ہے کہ گناہوں کی سزا دینے کے لئے دوزخ میں ڈال دے پھر عذاب کے ذریعہ پاک و صاف کر کے جنّت میں بھیجے۔ چونکہ عذاب کا خطرہ بھی لگا ہوا ہے اس لئے ہمیں پکّی توبہ اور استغفار کرتے رہنا چاہیئے اور اللہ ﷻ سے ہمیشہ مغفرت کی امید رکھنی چاہیئے۔ اس کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہیئے تاکہ اس حال میں موت آئے کہ توبہ کے ذریعہ ساری خطائیں معاف ہو چکی ہوں۔

آیت نمبر ۱۱: رسولوں کی طرف سے قوموں کے اعتراضات اور بے جا مطالبات کا یہ جواب دیا گیا کہ بلاشبہ وہ انسان ہیں مگر اللہ ﷻ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے احسان فرما کر نبوت کے لئے چن لیتا ہے۔ معجزہ کا ظاہر کرنا ان کے اختیار میں نہیں، یہ صرف اللہ ﷻ ہی کے اختیار میں ہے۔ وہ اللہ ﷻ ہی پر مکمل توکل کرتے ہیں۔

علمی بات: رسولوں نے اپنے مومن ساتھیوں کو خطاب کر کے کہا کہ مومنوں کو صرف اللہ ﷻ پر بھروسہ کرنا چاہیئے اور انہیں قوموں کی جانب سے جو بھی رنج والم اس دعوتِ حق کی راہ میں پہنچ رہا ہے اس پر صبر کرنے کے لئے اللہ ﷻ پر بھروسہ کرنا چاہیئے اور اسی سے مدد مانگنی چاہیئے۔ کیونکہ وہی حقیقتاً اور مستقلاً مددگار ہے۔

آیت نمبر ۱۲: قوموں کے ایذا پہنچانے پر رسولوں کے صبر واستقامت اختیار کرنے کا ذکر ہے۔ رسولوں کا بھروسہ اللہ ﷻ ہی کی ذات پر ہے کیوں کہ اسی نے ان کے لئے ہدایت کے راستے واضح فرمائے ہیں۔ اللہ ﷻ ہی انہیں قوم کی سازشوں سے بچانے والا ہے۔

علمی بات: رسولوں نے فرمایا کہ اللہ ﷻ پر بھروسہ نہ کرنے کے لئے ہمارے پاس کیا عذر باقی رہ گیا ہے، جب کہ اس نے ہم میں سے ہر ایک کو راہِ راست پر ڈال دیا ہے اور اس پر استقامت کو واجب کر دیا ہے۔ چونکہ کافروں کی اذیتوں سے پائے استقلال میں لغزش آنے کا خطرہ رہتا، اس لئے اپنی قوت ارادی اور عزم صمیم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اے لوگو! ہم دعوت کی راہ میں تمہاری اذیتوں پر صبر کریں گے اور بھروسہ کرنے والوں کو صرف اللہ ﷻ پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

عملی پہلو: حضرات انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنے پیروکاروں کو یہ تلقین کی کہ وہ اللہ ﷻ پر ہی توکل کریں اور اللہ ﷻ کے راستہ پر چلنے میں کفار کی طرف سے جو سختیاں جھیلنی پڑیں اور جن مصائب کا سامنا ہو ان کو حوصلہ سے برداشت کریں اور اللہ ﷻ پر توکل کرنے کو کسی حال میں نہ چھوڑیں۔

آیت نمبر ۱۳: رسولوں کی دعوتِ حق پر کفار کے ردِّ عمل کا بیان ہے۔ انہوں نے رسولوں سے کہا کہ وہ اِن کا دین قبول کرلیں یا پھر انہیں جلاوطن کر دیا جائے گا (معاذ اللہ) اللہ ﷻ کی طرف سے رسولوں کو ظالموں کی ہلاکت کی بشارت دی گئی ہے۔

علمی بات: اس سے پہلے اللہ ﷻ نے یہ بیان فرمایا تھا کہ انبیاء کرام علیہم السلام نے کفار کی اذیتوں کے مقابلہ میں اللہ ﷻ پر توکل کرنے کو کافی قرار دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ ہمیں اللہ ﷻ کی حفاظت پر اعتماد ہے جب انبیاء کرام علیہم السلام نے یہ فرمایا تو کافروں نے اور زیادہ جہالت اور خباثت کا مظاہرہ کیا اور کہا ہم تم کو ضرور اپنے ملک سے نکال دیں گے سوائے اس کے کہ تم ہمارے دین میں داخل ہو جاؤ۔

اس آیت کریمہ میں "لَتَعُوۡدُنَّ فِىۡ مِلَّتِنَا"۔ (ہمارے دین میں واپس آجاؤ) کا کیا مطلب ہو سکتا ہے جبکہ انبیاء کرام علیہم السلام کبھی ایک لمحہ بھر کے لئے بھی کفر وشرک پر نہیں ہوتے بلکہ وہ ابتدا سے ہی کفر اور شرک سے بیزار ہوتے ہیں، جیسے فرمایا "وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَاۤ اِبۡرٰهِيۡمَ رُشۡدَهٗ مِنۡ قَبۡلُ"۔ (سورۃ الانبیاء ۲۱، آیت: ۱) ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ابتدا ہی سے ہدایت عطا فرمائی۔ لہٰذا اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ عود کا عام فہم معنی اگرچہ پلٹ آنا ہوتا ہے مگر عربی زبان کا یہ لفظ "صرف "ہو جانے" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، سورۂ یٰسین میں موجود ہے کہ ہم نے چاند کی منزلیں مقرر کر رکھی ہیں، "حَتّٰى عَادَ كَالۡعُرۡجُوۡنِ الۡقَدِيۡمِ"۔ یہاں تک کہ وہ پرانی شاخ کی طرح بالکل باریک اور ٹیڑھا ہو جاتا ہے، چنانچہ یہاں "لَتَعُوۡدُنَّ فِىۡ مِلَّتِنَا" کا معنی ہو گا کہ ہمارے دین میں ہو جاؤ۔ جن کافروں نے انبیاء کرام علیہم السلام کو یہ دھمکی دی تو اللہ ﷻ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو مطمئن کرنے کے لئے یہ وحی فرمائی کہ ہم ان ظالموں کو ضرور ہلاک کر دیں گے۔

علمی بات: اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص ظالم سے اپنا بدلہ نہ لے اور اس کے ظلم پر صبر کرے تو اللہ ﷻ اس کی طرف سے بدلہ لیتا ہے پھر اللہ ﷻ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو ان کے صبر کی جزا دینے کے لئے یہ نوید سنائی۔

آیت نمبر ۱۴: اللہ ﷻ کی طرف سے بشارت دی گئی کہ ظالموں کو ہلاک کر کے ان کی جگہ اہلِ ایمان کو آباد کیا جائے گا۔ یہ وعدہ ہر اس شخص کے لئے ہے جو اعمال کا محاسبہ ہونے سے اور عذاب کی وعید سے خوف کھائے۔

علمی بات: یہ کفار اہلِ ایمان کو کیا نکالیں گے اللہ ﷻ ہی ان ظالموں کو تباہ کر کے ہمیشہ کے لئے یہاں سے نکال دے گا کہ پھر کبھی واپس نہ آسکیں گے اور ان کی جگہ اہلِ ایمان اور ان کے مخلص وفاداروں کو زمین میں آباد کرے گا۔ کفارِ مکّہ نے نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے مکہ سے نکالنا چاہا تھا لیکن آپ ﷺ کا وہ نکلنا ہی آخر وہاں اسلام اور مسلمانوں کا دائمی غلبہ وقیام کا سبب بنا اور کفر وشرک کا نشان باقی نہ رہا۔

عملی پہلو: مذکورہ بالا کامیابی ان لوگوں کے لئے ہے جو اللہ ﷻ سے ڈرتے ہیں یہ خیال کر کے کہ وہ ہمارے تمام اعمال کو برابر دیکھ رہا ہے اور ایک دن حساب دینے کے لئے اس کے سامنے کھڑا ہونا ہے جہاں اس کے سخت عذاب سے کوئی بچانے والا نہ ہوگا۔

آیت نمبر ۱۵: رسولوں کی طرف سے فتح و نصرت کی دُعا یا کفار کی طرف سے عذاب کی دھمکی پر عذاب نازل کرنے کے مطالبہ کا بیان ہے۔ عذاب آجانے کی صورت میں رسولوں کی مدد فرمائی گئی اور قوموں کا ہر منکر اور ضدی شخص ہلاک و برباد ہوا۔

علمی بات: اس بات کے کہنے والے ظالم مشرک بھی ہو سکتے ہیں کہ انھوں نے بالآخر اللہ ﷻ سے فیصلہ طلب کیا، کہ اگر یہ رسول سچے ہیں تو ہمیں اپنے عذاب کے ذریعے سے ہلاک کر دے، جیسا کہ غزوۂ بدر کے موقع پر مشرکین مکہ نے اسی قسم کی آرزو کی تھی، یا اس کے کہنے والے رسول ہوں کہ انھوں نے اللہ ﷻ سے دُعائیں کیں کہ اے اللہ! ہمیں ہمارے دشمنوں پر غلبہ نصیب فرما، یا ہمارے اور ان کے درمیان آخری فیصلہ کر دے۔ تو اللہ ﷻ نے ان کی مدد فرمائی اور انہیں ان کے دشمنوں پر غلبہ دے دیا اور سرکش و نافرمان کو منہ کی کھانا پڑی۔

آیت نمبر ۱۶: دنیاوی عذاب کے علاوہ آخرت میں منکرین کے لئے سخت سزا ہے۔ جہنّم میں پانی کی فریاد پر پیپ اور خون ملا پانی پینے کو دیا جائے گا۔ جسے پیتے وقت ان کی جان شدید مصیبت میں رہے گی۔

عملی پہلو: عذاب کے اس تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اگر انسان اس پر غور کرے تو اس کے دل میں رقّت و خوف پیدا ہو جائے گا اور جہنّم کے عذاب سے بچنے کی فکر اسے دامن گیر ہوگی۔ موقع کلام کے لحاظ سے یہ وعید ان لوگوں کو سنائی گئی جو رسول ﷺ کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور ان کی پیروی کرنے والوں پر شدید مظالم ڈھا رہے تھے۔ گویا ان سے کہا گیا کہ تم سرکشی اور ظلم کی جیسی چاہو مثالیں قائم کرو آگے تمہارے لئے طرح طرح کے عذاب تیار ہیں۔

آیت نمبر ۱۷: نافرمان کی سخت سزا اور تکلیف کا بیان ہے۔ دنیا کے عذاب کے بعد آخرت کے عذاب کی ایک جھلک دکھائی جا رہی ہے کہ منکر کو جہنّم میں بدبودار پیپ والا پانی پلایا جائے گا جسے وہ پیاس کی شدّت کی وجہ سے پینے پر مجبور ہوگا۔ وہ اسے حلق سے نیچے نہیں اتار سکے گا لہٰذا وہ اسے گھونٹ گھونٹ کر کے نگلنے کی کوشش کرے گا اور اسے ہر طرف سے مہلک مصائب آگھیریں گے حتیٰ کہ وہ اس جینے پر مرنے کو ترجیح دے گا مگر اسے موت نہیں آئے گی جو اسے اذیتوں سے نجات دلا سکے بلکہ اس پر عذاب سخت سے سخت تر کیا جاتا رہے گا۔ (معاذ اللہ) وہ ہمیشہ ایسی تکلیف میں مبتلا رہے گا کہ ہر لمحہ نیا عذاب محسوس کرے گا۔ اگر اس نے مرنا ہوتا تو مرنے کے لئے ان میں سے ہر ایک کے لئے عذاب کافی ہوگا، لیکن اب وہ یہاں مرے گا نہیں، یہ آیت سرکش اور نافرمان لوگوں کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”سب سے ہلکا عذاب اس کو ہو گا جو دو جوتیاں اور دو تسمے آگ کے پہنے ہوئے ہو گا (جس سے) اس کا دماغ اس طرح اُبلے گا جس طرح ہنڈیا اُبلتی ہے۔ وہ سمجھے گا کہ اس سے زیادہ سخت عذاب کسی کو نہیں ہوا، حالانکہ اس کو سب سے ہلکا عذاب ہو گا۔“ (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۱۸: کفار کا انجام بیان کرنے کے بعد ان کے اعمال کا بیان ہے۔ ان کی نیکیوں کو راکھ کے ڈھیر کے ساتھ تشبیہ دی گئی۔ روزِ قیامت تیز ہوا چلے گی اور راکھ کے ڈھیر کو بکھیر کر رکھ دے گی۔ دنیا میں ان کی کی گئیں نیکیاں ضائع ہو جائیں گی۔ بلاشبہ اس طرح کے اعمال بہت دور کی گمراہی کا مظہر ہیں۔

علمی بات: کافر لوگ دنیا میں کچھ اچھے کام بھی کرتے ہیں۔ مثلاً غریبوں کی امداد وغیرہ اللہ ﷻ کی سنّت یہ ہے کہ ان کے ایسے اچھے کاموں کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں دے دیا جاتا ہے۔ آخرت میں ان کو کوئی ثواب نہیں ملتا کیونکہ وہاں ثواب ملنے کے لئے ایمان شرط ہے۔ لہٰذا آخرت میں وہ اعمال ان کے کچھ کام نہیں آتے۔ اس کی مثال یہ دی گئی ہے کہ جس طرح راکھ کو آندھی اڑا لے جائے تو اس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ اسی طرح کافروں کے ان اعمال کو ان کا کفر کالعدم کر دے گا اور ان اعمال کا کوئی فائدہ ان کو آخرت میں نہیں ملے گا۔

علمی بات: کفار کے اچھے اعمال کے متعلق بتایا جا رہا ہے کہ کفر و شرک کی موجودگی میں ان کی مثال ایسی ہے جیسے راکھ کا ڈھیر ہو اور تیز آندھی چلے اور اس کو اڑا کر لے جائے۔ اللہ ﷻ کے نزدیک ان اعمال کی کوئی قدر و منزلت نہیں اور انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ انہیں ان اعمال پر قیامت کے دن کوئی اجر نہ ملے۔ انہوں نے جو یہ کام

کئے تھے تو ان کا مقصد یہ تھا کہ لوگ انہیں اچھا کہیں۔ ان کی رحم دلی اور سخاوت کا چرچا ہو۔ جس مقصد کے لئے انہوں نے یہ سب کچھ کیا وہ مقصد انہیں حاصل ہو گیا۔ جب اللہ ﷻ کی رضا انہیں مطلوب ہی نہ تھی تو اس کے برابر ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہر حال وہ ان اعمال پر قطعاً اس بات کے حقدار نہیں کہ بارگاہِ الٰہی سے انہیں اس کی جزا دی جائے اور قیامت کے دن ان اعمال کے باعث انہیں جنّت میں بھیجا جائے۔ اگر کوئی شخص اپنے اعمال اور اچھے کاموں کا یہ انجام پسند نہیں کرتا تو اسے چاہیئے کہ وہ کفر و شرک سے توبہ کرے۔ اللہ ﷻ پر ایمان لائے اور جو کام کرے اللہ ﷻ کی رضا اس کے پیش نظر ہو۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: " اللہ ﷻ مومن پر (اس کی) نیکی کے معاملہ میں ذرا سا بھی ظلم نہیں کرے گا۔ اس کو اس کی نیکی کا بدلہ دنیا میں بھی دیا جائے گا اور آخرت میں بھی دیا جائے گا اور کافر نے جو عمل اللہ ﷻ کے لئے کیئے ہوں گے تو اس کو ان (نیک) اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں دے دیا جائے گا، یہاں تک کہ جب وہ آخرت میں پہنچے گا تو اس کی کوئی نیکی باقی نہیں ہو گی کہ جس کا اسے بدلہ دیا جائے۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۱۹: کائنات کی تخلیق با مقصد ہے۔ چنانچہ انسان کو بھی با مقصد پیدا کیا گیا ہے۔ مقصدِ تخلیق سے اعراض کرنے والی قوموں کو مٹا دیا جاتا ہے۔ اللہ ﷻ ان کی جگہ دوسروں کو زمین پر کھڑا کر دینے پر قادر ہے۔

علمی بات: اس آیت کریمہ میں آخرت کی زندگی کے برحق ہونے اور اس پر کافروں کے شبہ کا جواب بھی دیا گیا ہے۔ پہلے تو یہ فرمایا گیا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق ایک برحق مقصد کے لئے کی گئی ہے۔ وہ مقصد یہی ہے کہ اللہ ﷻ کے فرمان برداروں کو انعام دیا جائے اور نافرمانوں اور ظالموں کو سزا ملے اگر آخرت کی زندگی نہ ہوتی تو نیک اور بد سب برابر ہو جاتے۔ لہٰذا انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس دنیا کے بعد ایک دوسری زندگی ہو جس میں ہر انسان کو اس کے مناسب بدلہ دیا جا سکے۔ رہا کافروں کا یہ اعتراض کہ مر کر مٹی میں مل جانے کے بعد انسان کس طرح دوبارہ زندہ ہوں گے۔ تو اس کا جواب اگلے جملے میں یہ دیا گیا ہے کہ بالکل عدم سے وجود میں لانا زیادہ مشکل کام ہے یا جو مخلوق ایک مرتبہ وجود میں آچکی ہو تو اس پر موت طاری کر کے اسے دوبارہ زندہ کر دینا اس کے بدلہ میں زیادہ آسان ہے؟ اور جب اللہ ﷻ پہلے مشکل کام پر قادر ہے تو اس دوسرے کام کی تو یقیناً قدرت رکھتا ہے۔ یہ بات بھی محض سمجھانے کے لئے ہے کیونکہ اللہ ﷻ کے لئے مشکل اور آسان کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ چاہے وہ جو کرنا چاہتا ہے وہ فرماتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔

آیت نمبر ۲۰: ایسا کرنا اللہ ﷻ کے لئے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ کفارِ مکہ کو تنبیہ کی گئی ہے کہ نافرمانیوں سے باز آجاؤ۔ اللہ ﷻ تو قادر ہے کہ ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر ان کی جگہ دوسروں کو لے آئے۔

علمی بات: شاید کفار کو یہ خیال گزرے کہ جب مٹی میں مل کر مٹی ہو گئے پھر دوبارہ زندگی کہاں؟ قیامت اور عذاب و ثواب وغیرہ سب کہانیاں ہیں، ان کو بتلا دیا گیا کہ جس اللہ ﷻ نے آسمان و زمین کامل قدرت و حکمت سے پیدا کیئے اسے تمہارا از سر نو دوبارہ پیدا کرنا، یا کسی دوسری مخلوق کو تمہاری جگہ لے آنا کیا مشکل ہے؟ اگر آسمان و زمین کے محکم نظام کو دیکھ کر یہ یقین ہوتا ہے کہ اس کا پیدا کرنے اور قائم رکھنے والا کس قدر حکیم ہے جیسا کہ لفظ "بالحق" میں تنبیہ فرمائی تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اشرف المخلوقات (انسان) کو محض بے نتیجہ پیدا کیا ہو گا اور اس کی تخلیق و ایجاد سے کوئی عظیم الشان مقصد نہ ہو گا یقیناً اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی ہونی چاہیئے جس میں انسان کی پیدائش کا عظیم مقصد مکمل طریقہ سے آشکار ہو۔

آیت نمبر ۲۱: میدانِ حشر میں متکبر و گمراہ قائدین اور ان کے متعلقین کے درمیان مکالمے کا ذکر ہے۔ چنانچہ ان گمراہ و متکبر قائدین سے ان کے پیروکار اللہ ﷻ کے عذاب سے بچانے کی التجا کریں گے۔ دنیا میں یہ قائدین خود گمراہ تھے لہٰذا ان کے پیروکار بھی خسارے میں رہے۔ وہ سب برابر کے مجرم اور سزا کے مستحق ہوں گے۔ اللہ ﷻ کی گرفت سے چھٹکارا ممکن نہ ہو گا خواہ وہ بے قراری کا اظہار کریں یا صبر کریں۔

علمی بات: قیامت کے روز جب سب لوگوں کو قبروں سے نکال کر حساب و کتاب کے لئے اللہ ﷻ کے سامنے پیش کیا جائے گا تو کمزور اور کم درجے کے کافر ان لوگوں سے کہیں گے جو دنیا میں بڑے سمجھے جاتے تھے اور لوگوں کو پیغمبروں کی اتباع سے روکتے تھے کہ دنیا میں ہم تمہارے تابع تھے۔ تمہارے ہی کہنے سے ہم نے پیغمبروں کی تکذیب کی تھی اور ان کی بات نہیں مانی تھی تو کیا اب تم ہمارے لئے اللہ ﷻ کے عذاب میں کچھ کمی کرا سکتے ہو اور اس مصیبت کی گھڑی میں ہمارے کچھ کام آسکتے ہو۔ اس

پر وہ سردار جواب دیں گے کہ اگر اللہ ﷻ ہمیں ایمان کی توفیق دیتا تو ہم تمہیں بھی سیدھے راستے پر لے چلتے۔ ہم تو خود گمراہ تھے۔ اس لئے ہم نے تمہیں بھی گمراہی کی طرف بلایا، مگر تم کیوں آنکھیں بند کر کے ہمارے کہنے پر چلتے رہے۔

عملی پہلو: اس آیت میں ان لوگوں کو سختی سے تنبیہ کی جارہی ہے جو دنیا میں آنکھیں بند کر کے دوسروں کے پیچھے چلتے ہیں یا اپنی کمزوری کو حجت بنا کر طاقت ور ظالموں کی پیروی کرتے ہیں۔ ان کو بتایا جارہا ہے کہ آج جو تمہارے لیڈر، پیشوا اور حاکم بنے ہوئے ہیں کل ان میں سے کوئی بھی تمہیں اللہ ﷻ کے عذاب سے ذرہ برابر بھی نہ بچا سکے گا۔ لہٰذا آج تم جن کے پیچھے چل رہے ہو یا جن کا حکم مان رہے ہو وہ خود کہاں جارہے اور تمہیں کہاں پہنچا کر چھوڑیں گے۔ یہ بات اچھی طرح سوچ لو۔

علمی بات: کسی بھی جماعت کی گمراہی کی سب سے بڑی وجہ اپنے گمراہ سرداروں، اور پیشواؤں کی اندھی پیروی کرنا اور خود اپنی عقل و بصیرت سے کام نہ لینا ہے۔ ایسے لوگوں سے فرمایا گیا ہے کیا تمہارے یہ گمراہ پیشوا تمہیں اللہ ﷻ کی گرفت سے بچا سکتے ہیں؟ یقیناً ہرگز نہیں۔ قیامت کے دن ان گمراہ جماعتوں کے کمزور افراد یعنی عوام اپنے گمراہ پیشواؤں اور سرداروں سے کہیں گے: دنیا میں ہم نے تمہاری پیروی کی تھی، آج عذاب الٰہی کی پکڑ سے ہمارا بچاؤ کر دو، وہ کہیں گے ہم خود اپنے کو نہیں بچا سکتے، تمہیں کس طرح بچائیں؟

آیت نمبر ۲۲: روزِ قیامت شیطان کا اپنے پیروکاروں سے بیزاری ہونے کا ذکر ہے چنانچہ وہ کہے گا: اللہ ﷻ کے وعدے سچے اور اس کے وعدے فریب تھے۔ لوگوں نے اس کی بے دلیل پکار کو مان لیا اور پیغمبروں کی دلائل سے بھرپور دعوت کو ٹھکرا دیا۔ اسے لوگوں پر کوئی اختیار حاصل نہیں تھا بلکہ خود اہلِ دوزخ نے دنیاوی عیش و عشرت کے لئے اس کی پیروی کی تھی۔ اہلِ جہنّم خود اپنے آپ کو ملامت کریں، اُسے ملامت نہ کریں۔ اب نہ وہ انہیں عذاب سے بچا سکتا ہے نہ اہلِ دوزخ اسے اللہ ﷻ کے قہر سے بچا سکتے ہیں۔ اللہ ﷻ کی اطاعت کرنے کے بجائے اپنی پیروی کرنے والوں کا انکار کرے گا۔ بلاشبہ شیطان کی پیروی کرنے والوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

علمی بات: جب اللہ ﷻ اپنا فیصلہ فرما دے گا اور جنّتی جنّت میں اور جہنّمی جہنّم میں بھیج دیے جائیں گے تو شیطان جہنّمیوں سے کہے گا کہ اللہ ﷻ نے اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کی زبانی تم سے سچا وعدہ کیا تھا کہ اگر تم اس کی اتباع کرو گے تو اللہ ﷻ کے عذاب سے نجات پاؤ گے، ورنہ جہنّم میں ڈال دیے جاؤ گے۔ چنانچہ آج اس نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا کہ موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے اور جزا و سزا کا عقیدہ غلط ہے اور اگر بالفرض اسے صحیح مان لیا جائے تو بھی تمہارے بُت تمہارے لئے سفارشی بنیں گے۔ میں نے بغیر دلیل و حجت تمہیں اپنی اتباع کی دعوت دی تھی تو تم نے اسے قبول کر لیا تھا، جب کہ رسولوں نے اپنی دعوت کی صداقت پر دلائل پیش کئے تھے، لیکن تم نے ان کی بات ٹھکرا دی تھی۔ اس لئے آج جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے اس پر مجھے نہیں بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔ میں تمہیں نجات نہیں دلا سکتا اور نہ تم میرے کام آ سکتے ہو۔ آج میں اس بات کا قطعی طور پر انکار کرتا ہوں کہ کسی بھی حیثیت سے میں اللہ ﷻ کا شریک ہوں اور تم سے مکمل برأت کا اعلان کرتا ہوں۔ اس کے بعد اللہ ﷻ نے فرمایا کہ ظالموں کو اس دن بڑا دردناک عذاب دیا جائے گا۔

علمی بات: اہلِ دوزخ کی ایک بہت بڑی بے وقوفی کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ شیطان مردود انہی لوگوں پر الزام دھرے گا اور اپنی صفائی پیش کرے گا کہ دنیا میں تو اس نے اپنے ماننے والوں کو خوب بہکایا اور راہِ حق سے ہٹا کر کفر و شرک کی دلدل میں پھنسایا لیکن قیامت کے دن اپنے ماننے والوں ہی کو الزام دے گا کہ تم نے اللہ ﷻ کے وعدوں پر بھروسہ نہ کیا، اس کے وعدے سچے تھے اور میرے وعدوں پر کان دھرا اور ان کو مانا حالانکہ میرے سارے وعدے جھوٹے اور فریب تھے۔ اب دیکھو مجھے کچھ الزام نہ دو۔ میرا تم پر کوئی زور تو چلتا نہ تھا۔ میں نے اتنا ہی کیا کہ تمہیں کفر و شرک کی دعوت دی تم نے میری بات مان لی۔ اب مجھے ملامت مت کرو۔ اپنی جانوں کو ملامت کرو تم خود مجرم ہو۔ پیغمبروں کی دعوت کو چھوڑ کر جو معجزات اور دلائل پیش کرتے تھے تم نے میری باتوں پر کیوں کان دھرا۔ میں نے کوئی زبردستی ہاتھ پکڑ کے تو تم سے کفر و شرک کے کام نہیں کرائے۔ اب ہم یہاں ایک دوسرے کی مدد نہیں کر سکتے، اب تو عذاب چکھنا ہی ہے۔ تم نے دنیا میں جو مجھے اللہ ﷻ کا شریک بنایا تھا میں اس سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں۔

عملی پہلو: اللہ ﷻ کا کتنا بڑا فضل ہے کہ اس نے اسی دنیا میں بتا دیا کہ شیطان باتیں کرے گا۔ ہر شخص کو فکر کرنی چاہیئے کہ وہ کس راہ پر ہے۔ اگر گناہوں میں مبتلا ہے تو غور کرے کہ اسے اس راہ پر کس نے لگایا؟ ظاہر ہے کہ شیطان نے لگایا ہے اور اس کے پیروکار گمراہ سرداروں اور لیڈروں نے لگایا ہے۔ آخرت میں دوزخ کے

عذاب سے چھڑانے کے لئے نہ یہ گمراہ سردار کام آئیں گے نہ شیطان کام آئے گا۔ سب سے بڑا جھوٹا لیڈر یہی شیطان ہے۔ یہ سب ایک دوسرے سے بیزار ہو جائیں گے لہٰذا ہر شخص حق کی اتباع کرے جو اللہ ﷻ نے خاتم الانبیاء حضرت سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ کے ذریعے بھیجا ہے اور اپنی کتاب قرآنِ حکیم میں واضح طور پر بیان فرمایا ہے۔

آیت نمبر ۲۳: شیطان کے مقابلہ میں اللہ ﷻ کے احکامات کی پیروی کرنے والے اہلِ ایمان کا انجام بیان کیا گیا ہے۔ وہ اللہ ﷻ کی آراستہ پیراستہ جنّت میں داخل کئے جائیں گے جس کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ جنّت کی نعمتیں عارضی نہیں ہوں گی بلکہ ہمیشہ کے لئے ہوں گی۔ وہ وہاں ایک دوسرے کے لئے سلامتی کے کلمات کا ہدیہ پیش کریں گے۔

علمی بات: جو ایمان لائے اور اعمالِ صالحہ میں مشغول رہے ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ اپنے رب کے حکم سے ایسے باغوں میں داخل کئے جائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور صرف داخلہ ہی نہیں ہوگا بلکہ وہ ان باغوں میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے جب آپس میں ملاقات کریں گے تو ایک دوسرے کو سلامتی کی دُعا دیں گے آپس میں بھی ایک دوسرے کو سلام کریں گے اور فرشتے ان کے پاس آئیں گے تو وہ بھی السلام علیکم کہیں گے۔

وہ جب اس میں ایک دوسرے سے ملیں گے تو سلام کہہ کر اور سلامتی کی دُعا دے کر ملیں گے، جیسا کہ آج بھی مسلمان باہم ملتے وقت ایک دوسرے کو سلام کہہ کر ملتے ہیں چنانچہ ارشاد فرمایا گیا کہ وہاں پر ملتے وقت ان کی باہمی دُعا سلام ہوگی، آپس میں ایک دوسرے کی طرف سے بھی، فرشتوں کی طرف سے بھی، اور رب غفور رحیم کی طرف سے بھی، جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا گیا "سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ" (اور) نہایت رحم فرمانے والے رب کی طرف سے (انہیں) سلام کہا جائے گا۔ (سورۃ یٰسین ۳۶، آیت: ۵۸) وہ جگہ ہی امن و سلامتی کی جگہ ہوگی اور اس کا نام ہی دارالسّلام ہوگا، اور جب وہ جنّت کے دروازے پر پہنچیں گے تو فرشتے ان کا استقبال کرتے ہوئے ان کو سلام کہیں گے۔

آیت نمبر ۲۴: پاک کلمہ سے مراد کلمہ توحید ہے۔ ہر نبی علیہ السلام نے اپنی دعوت کا آغاز اسی کلمہ سے کیا۔ کلمہ توحید کی مثال پاکیزہ درخت سے دی گئی ہے۔

پاکیزہ درخت کی چار صفات بیان کی گئی ہیں۔ ۱۔ وہ طیّب اور پاکیزہ ہے۔ ۲۔ اس کی جڑیں زمین میں خوب جمی ہوئی ہیں۔ ۳۔ اس کی اخیں آسمان کی بلندیوں تک چلی گئیں ہیں۔ چوتھی صفت کا بیان اگلی آیت میں ہے۔ کلمہ توحید کو دل سے ماننے والے کے اعمال بھی بہت عمدہ، نفع بخش اور فائدہ مند ہوتے ہیں۔

علمی بات: کلمۂ طیّبہ کے لفظی معنی "پاکیزہ بات" کے ہیں، مگر اس سے مراد وہ قولِ حق اور عقیدۂ صالحہ ہے جو سراسر حقیقت اور راستی پر مبنی ہو۔ یہ قول اور عقیدہ قرآنِ حکیم کی رو سے لازماً وہی ہو سکتا ہے جس میں توحید کا اقرار، انبیاء کرام علیہم السلام اور کتبِ آسمانی کا اقرار اور آخرت کا اقرار ہو، کیونکہ قرآنِ حکیم انہی امور کو بنیادی صداقتوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔

علمی بات: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کلمۂ طیّبہ سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے اور شجرِ طیّبہ سے مراد مومن ہے۔ بعض مفسرین نے کہا کہ شجرہ سے مراد کھجور کا درخت ہے اور اس آیت کا یہ معنی ہو سکتا ہے کہ مومن کے قلب میں کلمہ کی جڑ ہے اور ایمان ہے، جس طرح کھجور کے درخت کی جڑیں زمین میں پیوست ہوتی ہیں اسی طرح ایمان مومن کے سینہ میں راسخ ہوتا ہے، اور جس طرح کھجور کی شاخیں اوپر کی جانب بلند ہوتی ہیں، اسی طرح مومن کے نیک اعمال کو فرشتے اوپر کی جانب لے جاتے ہیں اور اللہ ﷻ ان نیک اعمال پر جو ثواب عطا فرماتا ہے اس کو کھجور کے پھلوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

علمی بات: جیسے کھجور کا پھل ہر وقت دستیاب ہوتا ہے، کبھی تازہ اور کبھی خشک چھواروں کی صورت میں، اسی طرح کامل مومن کا ہر عمل موجب ثواب ہوتا ہے اس کا بولنا، اس کا خاموش رہنا، اس کا چلنا پھرنا، اس کا کھانا پینا اور عبادات میں تقویت وتروتازگی حاصل کرنے کے لئے اس کا سونا غرض یہ کہ ہر وقت ہر عمل موجب ثواب ہوتا ہے پھر جس طرح کھجور کے تنے کے شہتیر بن جاتے ہیں اس کا پھل تازہ اور خشک ہر حال میں کھایا جاتا ہے اور اس کے پتوں سے چٹائیاں، پنکھے اور ٹوپیاں وغیرہ بُنی جاتی ہیں اسی طرح مومن کا کوئی عمل ضائع نہیں ہوتا اور اس کا ہر عمل موجب ثواب ہے اس کو اگر کوئی نعمت ملے تو وہ اس پر شکر کرتا ہے اور اگر اس پر کوئی مصیبت آئے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے۔

علمی بات: کلمہ طیّبہ کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ زمین سے لے کر آسمان تک چونکہ سارا نظامِ کائنات اسی حقیقت پر مبنی ہے جس کا اقرار ایک مومن کلمۂ طیّبہ میں کرتا ہے، اس لئے کسی گوشہ میں بھی قانونِ فطرت اس سے نہیں ٹکراتا، کسی شے کی بھی اصل اور جبلت اس کا انکار نہیں کرتی، کہیں کوئی حقیقت اور صداقت اس سے متصادم نہیں ہوتی۔ اسی لئے زمین اور اس کا پورا نظام اس سے تعاون کرتا ہے، اور آسمان اور اس کا پورا عالم اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔

علمی بات: کلمہ طیّبہ ایسا بار آور اور نتیجہ خیز کلمہ ہے کہ جو شخص یا قوم اسے بنیاد بنا کر اپنی زندگی کا نظام اسی پر استوار کرے، اس کو ہر آن اس کے مفید نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ کلمۂ طیّبہ فکر میں سلجھاؤ، طبیعت میں سلامتی، مزاج میں اعتدال، سیرت میں مضبوطی، اخلاق میں پاکیزگی، روح میں لطافت، جسم میں طہارت، برتاؤ میں خوشگواری، معاملات میں راست بازی، کلام میں صداقت، قول و قرار میں پختگی، معاشرت میں حسنِ سلوک، تہذیب میں فضیلت، تمدّن میں توازن، معیشت میں عدل، سیاست میں دیانت، جنگ میں شرافت، صلح میں خلوص اور عہد و پیمان میں وثوق پیدا کرتا ہے، وہ ایک ایسا پارس ہے جس کی تاثیر اگر کوئی ٹھیک ٹھیک قبول کر لے تو کُندن بن جاتا ہے۔

آیت نمبر ۲۵: پاکیزہ درخت کی چوتھی صفت کا بیان ہے کہ یہ عام درختوں کی طرح نہیں بلکہ اپنے رب کے حکم سے ہر موسم میں پھل دیتا ہے۔ سچے مومن کا کردار ہمیشہ عمدہ ہوتا ہے اور ہمیشہ نیک اعمال کا پھل دیتا ہے۔ ان مثالوں کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ ان سے نصیحت حاصل کریں۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے صدقِ دل سے ایمان لانے، زبان سے اقرار کرنے اور اس کے تقاضوں پر عمل کرنے کو ایک ایسے درخت سے تشبیہ دے کر سمجھایا ہے جو سدا بہار ہے، جس پر کبھی خزاں نہیں ہوتی اور وہ ہر حال میں پھل دیتا ہے اگر اس درخت سے مراد کھجور کا درخت ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا پھل سارا سال کھایا جاتا ہے نیز جس زمانے میں بظاہر اس پر پھل نہیں ہوتا، اس زمانے میں بھی اس سے مختلف فائدے حاصل کئے جاتے ہیں کبھی اس کے تنے کا گودا استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی اس کے پتوں سے مختلف چیزیں بنائی جاتی ہیں، اسی طرح جب کوئی شخص توحید کے کلمہ پر ایمان لے آتا ہے تو چاہے خوش حال ہو یا تنگدست، عیش و آرام میں ہو یا تکلیفوں میں ہر حال میں اس کے ایمان کی بدولت اس کے اعمال نامے میں نیکیاں بڑھتی رہتی ہیں اور اس کے نتیجہ میں اس کے ثواب میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے جو در حقیقت کلمۂ توحید کا ثمرہ ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب کوئی بندہ کبیرہ گناہوں سے بچتے ہوئے اخلاص کے ساتھ (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) کہتا ہے تو اس کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ عرش تک پہنچ جاتا ہے۔“ (جامع ترمذی)

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو اللہ ﷻ کے پاس اس حال میں حاضر ہوا کہ وہ اللہ ﷻ کی عبادت کرتا رہا ہو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا ہو، نماز پابندی کے ساتھ پڑھتا رہا ہو، زکوٰۃ (پوری کی پوری) دیتا رہا ہو اور کبیرہ گناہوں سے بچتا رہا ہو، اس کے لئے جنّت ہے۔“ لوگوں نے آپ ﷺ سے کبیرہ گناہوں کے بارے میں پوچھا (کہ وہ کون کون سے ہیں؟) تو آپ ﷺ نے (بطور مثال) ارشاد فرمایا: ”اللہ ﷻ کے ساتھ کسی کو شریک بنانا، مسلمان شخص کو قتل کرنا اور لڑائی کے دن بھاگ جانا۔“ (سنن نسائی)

علمی و عملی بات: مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ درخت کی تکمیل تین اجزاء سے ہوتی ہے: زمین کے اندر جمے ہوئے ریشے، تنا اور شاخیں۔ ایمان کی تکمیل بھی تین ہی چیزوں سے ہوتی ہے: (دل سے) تصدیق، زبان سے اقرار اور جسمانی اعضاء سے عمل۔

علمی بات: اللہ ﷻ لوگوں کے فائدہ کے لئے مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ تمثیل نام ہے معانی کی تصویر کشی کا اور غیر محسوس کو محسوس کے قریب لے آنے کا، اس لئے مثالوں سے مقصود کے سمجھنے میں آسانی اور نصیحت اندوزی میں سہولت ہو جاتی ہے۔

عملی پہلو: جس کسی شخص نے بھلائی کے کام، نیکی کی دعوت یا دین کی سربلندی کے لئے کسی اجتماعی محنت یا تحریک کے لئے کسی کی بنیاد رکھی اُس نے اپنے لئے ایک بہت عمدہ پھلدار درخت لگا لیا۔ یہ درخت جب تک باقی رہے گا اپنے اثرات و ثمرات سے نہ معلوم کس کس کو فیض یاب کرے گا۔ مثلاً کسی نے بھلائی کی دعوت دی اور اس دعوت کو کچھ لوگوں نے قبول کیا پھر انہوں نے اس دعوت کو مزید آگے پھیلایا تو یوں اس نیکی کا حلقہ اثر وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا اور نہ معلوم مستقبل میں ایسے نیک اثرات مزید کہاں کہاں تک پہنچیں گے۔

آیت نمبر ۲۶: پاکیزہ کلمہ کے مقابلہ میں ناپاک کلمہ یعنی کفر و شرک کا بیان ہے۔ ناپاک کلمہ کی مثال ایسے درخت کی ہے جس کی جڑیں زمین کے اندر گہری نہیں بلکہ زمین کے اوپر ہی رہتی ہیں۔ اسے ذرا سی کوشش سے اکھاڑ کر پھینکا جا سکتا ہے۔ یہ مثال ہر باطل نظریہ، باطل کام اور باطل نظام کے لئے ہے جسے کبھی پائیداری حاصل نہیں ہوتی۔

علمی بات: کلمۂ خبیثہ کی مثال اس درخت کی ہے جس کی زمین میں نہ کوئی بنیاد ہوتی ہے اور نہ جڑ، اسی لئے زمین کے اوپر ٹھہر نہیں پاتا۔ جیسے کوئی ایسا درخت جسے زمین سے اکھاڑ دیا گیا ہو، اس میں کوئی خیر نہیں ہوتی، یہ غیر مفید اور ناکارہ ہوتا ہے۔ بعینہٖ یہی مثال کفر و شرک کی ہے، کیونکہ یہ کلمۂ کفر انسان کی فطرت میں داخل نہیں ہوتا، لہٰذا اس میں قرار نہیں ہوتا۔ اس کی جڑ مضبوط نہیں ہوتی۔

علمی بات: کلمۂ طیّبہ اور کلماتِ خبیثہ کے اس فرق کو ہر وہ شخص بآسانی محسوس کر سکتا ہے جو دنیا کی مذہبی، فکری، اخلاقی اور تمدنی تاریخ کا مطالعہ کرے۔ وہ دیکھے گا کہ آغازِ تاریخ سے آج تک کلمۂ طیّبہ تو ایک ہی رہا ہے، مگر کلماتِ خبیثہ بے شمار پیدا ہوئے۔ مگر کلمۂ طیّبہ کبھی جڑ سے نہ اکھاڑا جا سکا، کلماتِ خبیثہ کی فہرست ہزاروں مردہ کلمات کے ناموں سے بھری پڑی ہے، حتیٰ کہ ان میں سے اکثر کا حال یہ ہے کہ آج تاریخ کے صفحات کے سوا کہیں ان کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا۔ اپنے دور میں جن کلمات کا بڑا زور و شور رہا ہے آج ان کا ذکر کیا جائے تو لوگ حیران رہ جائیں کہ کبھی انسان ایسی ایسی حماقتوں کا بھی قائل رہ چکا ہے۔

پھر کلمۂ طیّبہ کو جب، جہاں، جس شخص یا قوم نے بھی صحیح معنوں میں اپنایا اس کی خوشبو سے اس کا ماحول معطر ہو گیا اور اس کی برکتوں سے صرف اسی شخص یا قوم نے فائدہ نہیں اٹھایا، بلکہ اس کے گرد و پیش کی دنیا بھی ان سے مستفید ہوئی۔ مگر جب کسی کلمۂ خبیثہ نے کہیں انفرادی یا اجتماعی زندگی میں اپنی جڑیں مظبوط کیں تو اس کی بدبو سے سارا ماحول متعفّن ہو گیا۔ اس کے کانٹوں کی چبھن اور چھید سے نہ اس کا ماننے والا امن میں رہا، اور نہ وہ شخص محفوظ رہا جس کو اس سے سابقہ پیش آیا ہو۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے، اس کے بعد اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

علمی بات: کفریہ عقائد چونکہ فطرت کے خلاف ہیں اس لئے قانونِ فطرت کہیں بھی اس سے موافقت نہیں کرتا۔ کائنات کا ہر ذرّہ اس کی تکذیب کرتا ہے۔ زمین و آسمان کی ہر شے اس کی تردید کرتی ہے۔ زمین میں اس کا بیج بونے کی کوشش کی جائے تو ہر وقت وہ اسے اگلنے کے لئے تیار رہتی ہے۔ آسمان کی طرف اس کی شاخیں بڑھنا چاہیں تو وہ انہیں نیچے دھکیلتا ہے۔ انسان کو اگر امتحان کی خاطر انتخاب کی آزادی اور عمل کی مہلت نہ دی گئی ہوتی تو یہ بدذات درخت کہیں اُگنے ہی نہ پاتا۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے ابنِ آدم کو اپنے رجحان کے مطابق کام کرنے کا موقع عطا کیا ہے، اس لئے جو نادان لوگ قانونِ فطرت سے لڑ بھڑ کر یہ درخت لگانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے زور مارنے سے زمین اسے تھوڑی بہت جگہ دے دیتی ہے، ہوا اور پانی سے کچھ نہ کچھ غذا بھی اسے مل جاتی ہے، اور فضا بھی اس کی شاخوں کے پھیلنے کے لئے بادل ناخواستہ کچھ موقع دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ لیکن جب تک یہ درخت قائم رہتا ہے کڑوے، کسیلے، زہریلے پھل دیتا رہتا ہے اور حالات کے بدلتے ہی حوادث کا ایک جھٹکا اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔

آیت نمبر ۲۷: قولِ ثابت یعنی مضبوط بات سے مراد ایمان اور کلمۂ توحید ہے۔ مومنین کو ان کے ایمان اور توحید کی بدولت مصائب اور مشکلات کے دور میں ثابت قدم رکھا جاتا ہے۔ یہاں آخرت سے مراد قبر کی منزل بھی ہے۔ کلمۂ توحید کی برکت سے مومنین کو دنیا کے علاوہ اسی طرح کی ثابت قدمی آخرت میں بھی عطا ہوتی ہے۔ جب کہ ظالم یعنی کفار اور مشرکین کو گمراہی میں ہی مبتلا رکھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ اس کا ہر کام مصلحت اور حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

علمی بات: اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا تھا کہ کلمۂ طیّبہ کی صفت یہ ہے کہ اس کی اصل ثابت ہوتی ہے اور کلمۂ خبیثہ کی صفت یہ ہوتی ہے کہ اس کی اصل ثابت نہیں ہوتی اب اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ کلمۂ طیّبہ کے حاملین کا قول دنیا اور آخرت میں ثابت ہوتا ہے دنیا میں ثبوت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کلمۂ طیّبہ اور اس کے تقاضوں پر ثابت قدم رکھتا ہے اور دنیا میں ان کے نیک کاموں پر تعریف و تحسین ہوتی ہے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ ان کو ان نیک کاموں پر بہت زیادہ اجر عطا فرماتا ہے اور جس طرح دنیا میں وہ کلمۂ طیّبہ پر قائم تھے اللہ تعالیٰ ان کو قبر اور حشر میں بھی کلمۂ طیّبہ پر قائم رکھتا ہے۔

اور فرمایا اللہ ﷻ ظالموں کو گمراہی پر قائم رکھتا ہے یعنی جو لوگ کلمۂ خبیثہ کے حاملین ہیں اور یہی لوگ کافر اور ظالم ہیں اللہ ﷻ ان کی دنیا میں بھی مذمت فرماتا ہے اور آخرت میں بھی ان کو ثواب سے محروم رکھتا ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: ا۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی (ﷺ) نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے: اللہ ﷻ اس کو قبر میں ثابت قدم رکھتا ہے جب اس سے رب، دین اور نبی کے متعلق سوال کیا جاتا ہے۔ (صحیح بخاری صحیح مسلم)

۲۔ ایک طویل حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے مسلمان بندہ کی قبر کی کیفیت بیان فرمائی جس کا مفہوم یہ ہے کہ "اس کی روح اس کے جسم میں لوٹا دی جاتی ہے تو اس کے پاس دو فرشتے آکر اس کو بٹھاتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے! وہ پوچھتے ہیں تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے میرا دین اسلام ہے! وہ پوچھتے ہیں یہ کون شخص ہے جو تم میں مبعوث کیا گیا تھا؟ وہ کہتا ہے محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں تمہیں ان کا علم کیسے ہوا؟ وہ کہتا ہے میں نے اللہ ﷻ کی کتاب میں پڑھا، میں ان پر ایمان لایا اور ان کی تصدیق کی۔ پھر ایک منادی آسمان میں اعلان کرتا ہے کہ میرے بندہ نے سچ کہا، اس کے لئے جنّت کا بستر بچھا دو اور اس کو جنّت کا لباس پہنا دو اور اس کے لئے جنّت کی کھڑکی کھول دو اس کے پاس جنّت کی خوشبو اور مہک آتی ہے اور تا حد نگاہ اس کی قبر وسیع کر دی جاتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے پاس ایک انتہائی حسین و جمیل، خوش پوش اور عمدہ خوشبو والا ایک آدمی آتا ہے اور کہتا ہے: تمہیں ہر اس چیز کی بشارت ہو جو تمہیں اچھی لگے، یہی وہ دن ہے جس کا تیرے ساتھ وعدہ تھا۔ وہ قبر والا پوچھتا ہے: تو کون ہے؟ تیرا چہرہ تو ایسا چہرہ لگتا ہے، جو خیر کے ساتھ آتا ہے۔ وہ جواباً کہتا ہے: میں تیرا نیک عمل ہوں۔ وہ کہتا ہے: اے میرے ربّ! قیامت قائم کردے تاکہ میں اپنے اہل اور مال کی طرف لوٹ سکوں۔" (مسند احمد، سنن ابن ماجہ)

آیت نمبر ۲۸: ان لوگوں سے مراد قریش کے مشرک سردار ہیں۔ انہوں نے رسول کریم ﷺ اور قرآنِ حکیم کا انکار کر کے اللہ ﷻ کی عطا کردہ نعمتوں کی ناقدری کی۔ اللہ ﷻ کی نعمتوں کا جواب ضد اور عناد سے دیا اور حق کی مخالفت پر جم گئے۔ پھر اس مخالفت میں بڑھتے ہی گئے یہاں تک کہ خود بھی تباہ ہوئے اور اپنی قوم کو بھی تباہی سے ہمکنار کیا۔

علمی بات: قریش مکہ پر اللہ ﷻ نے بہت سارے احسانات فرمائے تھے۔ اپنے گھر کی خدمت اور ہمسائیگی کا شرف انہیں بخشا تھا۔ سارے اہل عرب کے دلوں میں ان کی عزت اور تکریم کا جذبہ پیدا کر دیا۔ پھر انہیں میں سے خاتم النبیین ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ ان کا تو یہ فرض تھا کہ ہر دم شکر الٰہی بجالاتے اور اس کے کسی حکم سے انحراف نہ کرتے۔ لیکن انہوں نے ان نعمتوں کی قدر نہ کی۔ خود بھی برباد ہوئے اور اپنی قوم کو بھی ہلاکت و بربادی کی پستیوں میں دھکیل دیا۔

علمی بات: دَارَ الْبَوَارِ سے مراد تباہی اور ہلاکت کا گھر ہے جس چیز میں زیادہ کھوٹ ہو اس کو بوار کہتے ہیں اور کسی چیز میں زیادہ کھوٹ کا پایا جانا اس کے فساد اور ہلاکت کا موجب ہوتا ہے اس لئے بوار کا لفظ ہلاکت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

علمی بات: یہاں نِعْمَتُ اللّٰهِ سے اللہ ﷻ کی عام نعمتیں بھی مراد ہو سکتی ہیں جو مشاہدہ اور محسوسات سے تعلق رکھتی ہیں۔ جن کا تعلق انسان کے ظاہری منافع سے ہے جیسا کھانے پینے پہننے کی اشیاء زمین اور مکان وغیرہ اور اس سے مراد وہ مخصوص معنوی نعمتیں بھی ہو سکتی ہیں جو انسان کی رشد و ہدایت کے لئے حق تعالیٰ کی طرف سے آئی ہیں مثلاً انبیاء کرام علیہم السلام اور آسمانی کتابیں اور معجزات اور وہ نشانیاں جو اللہ ﷻ کی قدرتِ کاملہ حکمتِ بالغہ پر دلالت کرتی ہیں اور جس کائنات میں انسان کی رشد و ہدایات کا سامان ہے۔

عملی پہلو: ان دونوں قسم کی نعمتوں کا تقاضا یہ تھا کہ انسان اللہ ﷻ کی عظمت و قدرت کو پہچانتا اس کی نعمتوں کا شکر گزار ہو کر اس کی فرمانبرداری میں لگ جاتا مگر کفار و مشرکین نے نعمتوں کے مقابلہ میں شکر کے بجائے کفرانِ نعمت اور سرکشی و نافرمانی سے کام لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنی قوم کو ہلاکت و بربادی کے مقام میں ڈال دیا اور خود بھی ہلاک ہوئے۔

آیت نمبر ۲۹: اللہ ﷻ کی عظیم نعمتوں کی ناشکری کرنے والوں کا انجام بیان ہوا ہے۔ ان کے لئے جہنّم ہے جو بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔ وہ ہلاکت و تباہی کا گھر ہے جس میں یہ ایندھن بنے ہوں گے اور وہ جہنّم میں رہنے کی بُری قرار گاہ ہے۔

علمی بات: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ان لوگوں سے مراد مکہ کے کافر رؤساء ہیں جو خود بھی ناشکری کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی کفروشرک پر ابھارتے ہیں۔

آیت نمبر ۳۰: کفار اور مشرکین کی مذمت اور انجامِ بد کا بیان ہے۔ انھوں نے دوسری ہستیوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر کر رکھا ہے۔ انہیں دنیا کی چند روزہ زندگی کا فائدہ اٹھا لینے کی مہلت ہے۔ اس کے بعد بالآخر انہیں دوزخ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔

علمی بات: "اَنۡدَادًا" "نِدٌّ" کی جمع ہے۔ نِد کے معنی ہیں برابر، ہمسر اور مدمقابل کے ہیں۔ چونکہ کفار و مشرکین نے اپنے بتوں کو اللہ تعالیٰ کا ہمسر قرار دے رکھا تھا اور وہ ان سے محبت کرتے تھے جس طرح خدا سے کی جاتی ہے اور ان کی اسی طرح پرستش کرتے تھے جس طرح خدا کی جاتی ہے اپنے زعم میں ان کا مقصد تو یہ تھا کہ وہ ہدایت حاصل کریں مگر ان کی اس غلط روش کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی اللہ تعالیٰ کے راستے سے بھٹکایا۔ اس لئے انہیں بتایا گیا ہے کہ اب اس چند روزہ زندگی میں عیش و عشرت کرلو۔ آخر انجام کار تمہارے لئے آتش دوزخ ہے۔

آیت نمبر ۳۱: اہل ایمان کے لئے ہدایات دی گئیں کہ وہ نماز قائم کریں اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں ظاہری اور پوشیدہ طور پر خرچ کریں۔ ان تقاضوں کو پورا کرکے ہی قیامت کے عذاب سے بچنا ممکن ہو گا۔ قیامت کے دن کوئی تعلق یا لین دین کام نہیں آئے گا۔

علمی بات: گزشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرنے والوں اور اس کے ساتھ غیروں کو شریک بنانے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ وہ انہیں بتادیں کہ ان کا ٹھکانا جہنم ہو گا۔ اس لئے قرآنِ حکیم طریقہ کے مطابق اب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ مومنوں کو کہہ دیں کہ تم لوگ نماز قائم کرو اور اللہ تعالیٰ نے جو روزی دی ہے اس میں سے چھپا کر اور علانیہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو، یعنی زکوٰۃ ادا کرو، رشتہ داروں پر خرچ کرو اور دوسرے حاجت مند لوگوں کی بھی مدد کرو اور یہ کام اس دن کے آنے سے پہلے پہلے ہونے چاہئیے کہ جب کسی کی جانب سے کوئی فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا کہ کوئی معاوضہ دے کر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ جائے اور نہ ہی نافرمانوں کی کوئی دوستی کام آئے گی کہ کوئی نافرمان دوست اپنے دوست کے لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں سفارش کرے اور نہ ہی اسے عذابِ خداوندی سے نجات دلا سکے گا۔

علمی بات: پوشیدہ طور پر مال کو خرچ کرنے میں یہ فائدہ ہے کہ نفس کو ریاکاری کا موقع نہیں ملتا اور اصلاً یہی مطلوب ہے۔ البتہ ضرورت کے تحت ظاہراً خرچ کرنے میں یہ فائدہ ہے کہ دوسروں کو بھی عمل خیر کی توفیق ہوجاتی ہے، لوگوں کے سامنے ترغیب دلانے کے لئے نیک عمل کرنے کا نام ریاکاری نہیں بلکہ ریاکاری اس جذبہ، کیفیت اور ارادے کا نام ہے کہ لوگ اس کے لئے واہ واہ کریں، اس کی تعریف اور اس کے کارناموں کے گُن گائیں۔ چنانچہ اس حوالہ سے جس کسی کو اس منفی جذبہ پر قدرت ہو اور اس کی ایسی کیفیت نہ ہو تو وہ لوگوں کے سامنے بھی ترغیب و تشویق کی نیت سے خرچ کرسکتا ہے۔

علمی و عملی بات: جس دن نہ بیع ہوگی اور نہ دوستی ہوگی۔ اس سے قیامت کا دن مراد ہے وہاں مال دے کر کوئی مجرم نہیں چھوٹ سکتا اور جان کے بدلہ میں کچھ قبول نہیں کیا جائے گا، اور دنیا میں اگر کسی ایسے شخص سے دوستی تھی کہ اس دوستی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی جاتی تھی یہ دوستی وہاں کچھ کام نہ آئے گی۔ اس لئے دنیا اور اہل دنیا کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کریں۔ البتہ جو لوگ متقی ہیں ان سے دوستی کریں۔ چونکہ ان لوگوں کی دوستی محض اللہ تعالیٰ کے لئے اور دین کی وجہ سے ہوگی تو یہ دوستی اس دن کام آئے گی جیسے مسلمان اولیاء اللہ اور علماء دین سے محبت رکھتے ہیں۔ یہ دوستی محض دین کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ کے لئے ہوتی ہے تو ان کی یہ دوستی آخرت میں بھی منقطع نہ ہوگی اور اس سے شفاعت کا فائدہ ہو گا۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "سب گہرے دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے پرہیز گاروں کے۔" (سورۃ الزخرف ۴۳، آیت: ۶۷)

عملی پہلو: دنیاوی مال و دولت، شان و شوکت اور تعلقات کچھ بھی کام نہیں آئیں گے اگر یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں صرف ہوئے ہیں۔ وہاں محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایمان کے ساتھ نیک اعمال اور نیک لوگوں کی سنگت کام دے گی۔ ان شاء اللہ

آیت نمبر ۳۲: اللہ ﷻ کی بڑی عظیم الشان نعمتوں کی یاد دہانی کرائی گئی ہے۔ اللہ ﷻ نے انسانوں کے فائدے کے لئے زمین و آسمان بنائے۔ آسمان سے بارش برسائی اور پانی جیسی نعمت عطا فرمائی۔ پانی سے طرح طرح کے پھل اور میوے پیدا فرمائے۔ کشتیوں کے ذریعے سے دریا اور سمندر کے سفر کو ممکن بنایا۔ انسان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے زمین میں نہریں جاری فرمادیں۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے ہی کشتیوں اور جہازوں کو انسانوں کے کام میں لگایا ہے۔ وہ اللہ ﷻ کے حکم سے دریاؤں میں چلتے پھرتے ہیں لفظ "سَخَّرَ" جو اس آیت میں آیا ہے اس سے مراد یہی ہے کہ اللہ ﷻ نے ان چیزوں کا استعمال انسانوں کے لئے آسان کر دیا ہے لکڑی، لوہا، ان سے کشتی اور جہاز بنانے کے اوزار و آلات اور ان سے صحیح کام لینے کی عقل و دانش یہ سب چیزیں اللہ ﷻ کی دی ہوئی ہیں۔ اس لئے ان چیزوں کے موجد اس پر گھمنڈ کریں کہ یہ انہوں نے ایجاد کی یا بنائی ہیں کیونکہ جن چیزوں سے ان میں کام لیا گیا ہے ان میں کوئی چیز بھی انہوں نے پیدا کی ہے نہ وہ کر سکتے ہیں۔ خالق کائنات کی بنائی ہوئی لکڑی لوہے، تانبے اور پیتل ہی میں تصرُّفات کر کے یہ ایجاد کا سہرا آپ نے اپنے سر لیا ہے ورنہ حقیقت دیکھیں تو خود اُن کا اپنا وجود اُن کے ہاتھ پاؤں، اُن کا دماغ اور عقل بھی تو اُن کی بنائی ہوئی نہیں۔

علمی و عملی بات: ان دو آیتوں میں اللہ ﷻ نے اپنی قدرتِ کاملہ کے نادر کرشموں میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے ان کے ذکر کے ساتھ ساتھ مناسب اور موزوں مواقع پر لَکُمۡ (تمہارے لئے) کا تکرار کتنا معنی خیز ہے گویا بتایا جا رہا ہے کہ تم ہی مقصودِ کائنات ہو۔ باقی سب کچھ تمہاری بقا اور نشو و نما کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے تخلیق ہوا۔ یہ آسمان، زمین، چاند، سورج، دریا، سمندر اور گردش لیل و نہار سب تمہارے خدمت گزار ہیں۔ اے انسان! تو بھی اپنے دل سے یہ پوچھ، تجھے کیوں پیدا کیا گیا؟ اس لئے کہ تو سورج کو پوجے جو تیری چاکری میں مصروف ہے یا تو دریاؤں کے سامنے جھکتا پھرے؟ جو تیری خدمت کے لئے رواں دواں ہیں۔ یا تو مال و دولت کو فراہم کرنا ہی اپنا مقصدِ حیات بنالے؟ نہیں ایسا نہیں۔ اے انسان! تیری شان بڑی بلند ہے۔ تیرا مقام بڑا رفیع ہے۔ سب کچھ تیرے لئے ہے اور تو اپنے خالق و مالک کے لئے ہے لہٰذا اُسی کی بارگاہ صمدیت میں سر بسجود ہونا تجھے زیب دیتا ہے۔ اب تیری احسان شناسی اور شکر گزاری کا تقاضا یہ ہے کہ تو اُسی کا ہو کر رہے۔ کیونکہ اس نے تجھے اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا فرمایا کہ وہ میری عبادت کریں۔" (سورۃ الذاریات، آیت: ۵۶)

آیت نمبر ۳۳: اللہ ﷻ کی مزید نعمتوں کا بیان ہے۔ اللہ ﷻ نے سورج اور چاند کی حرکت کو خاص ترتیب پر جاری و ساری فرما کر انسانوں کے لئے انہیں مفید بنایا۔ رات اور دن کا نظام انسانوں کی سہولت کے لئے بنایا۔

علمی بات: ان تمام چیزوں کے گنوانے سے انسان کو یہ جتلانا مقصود ہے کہ زمین کے دامن اور آسمان کی وسعتوں میں اللہ ﷻ کی تمام تخلیقات اور فطرت کی تمام قوتیں مسلسل انسان کی خدمت میں اس کی نفع رسانی کے لئے مصروفِ کار ہیں۔ کیونکہ اس کائنات میں انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو سب مخلوقات سے اعلیٰ و بالا ہے۔ اللہ ﷻ نے یہ بساط کون و مکان انسان ہی کے لئے بچھائی ہے اور باقی تمام اشیاء کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کی ضروریات پوری کریں۔ یہی بات سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۹ میں اس طرح بیان فرمائی گئی ہے: یہ زمین میں جو کچھ بھی نظر آرہا ہے یہ اللہ نے تمہارے لئے پیدا کیا ہے اور ان چیزوں کو تمہاری ضرورتیں پوری کرنے کے لئے مسخر کر دیا ہے۔

آیت نمبر ۳۴: اللہ ﷻ نے انسان کو ہر وہ شے دی ہے جس کی اسے ضرورت ہے۔ بلاشبہ اللہ ﷻ کی نعمتیں بے شمار ہیں۔ انسان شمار کرنا چاہے بھی تو شمار نہیں کر سکتا۔ اللہ ﷻ کی نعمتوں پر شکر ادا نہ کر کے انسان اپنے نفس پر ظلم اور ناانصافی کرتا ہے۔

علمی بات: یہ وہ عظیم انعامات ہیں جو انسان کے عالم وجود میں قدم رکھنے سے پہلے بن مانگے مہیا کر دیئے گئے لیکن ان کے علاوہ اللہ ﷻ انسان کی ان تمام ضروریات کو بھی پورا کرتا ہے جن کے متعلق وہ اللہ ﷻ سے التجائیں کرتا ہے اور دُعائیں مانگتا ہے۔ اس کے انعامات و احسانات اتنے کثیر ہیں کہ انسان اگر ان کا شمار کرنا چاہے تو نہ کر سکے۔ ہندسے ختم ہو جائیں۔ زبانیں گنتے گنتے تھک جائیں لیکن انسان ان کو گن نہ سکے۔ انسان اگر اپنے گرد و پیش سے آنکھیں بند کر کے صرف اپنے وجود میں ہی غور کرے تو اسے معلوم ہو جائے کہ اس پر اس کے پروردگار کی نوازشات بے حد و حساب ہیں۔ ذرا سوچو! اور اگر ہاتھوں میں انگلیاں ہی نہ ہوں یا انگلیوں کے سروں سے ناخن ہی جھڑ جائیں انسان کے بازو کی ساری قوت بیکار ہو جائے۔ اگر منہ میں لعاب دہن (تھوک) ہی نہ پیدا ہو تو کیا انسان کی زبان لکڑی کی طرح خشک ہو کر نہ رہ جائے گی۔ اگر

آنکھوں پر چھپر نہ ہوں یا چھپروں کے ساتھ پلکیں نہ ہوں تو انسان آنکھوں کی حفاظت کیسے کر سکے گا۔ بظاہر یہ معمولی چیزیں ہیں جن کی افادیت کے متعلق انسان بہت ہی کم غور و فکر کرتے ہیں۔ جب ان کی اہمیت کا یہ حال ہے تو بڑی بڑی نعمتوں کی اہمیت کا انسان خود ہی اندازہ لگا سکتا ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ انسان کی پیشانی اپنے پروردگار کے حضور میں ہر وقت جھکی رہتی۔ دل اس کی عظمت و کبریائی کے احساس سے لبریز رہتا اور زبان اس کی حمد و ثنا سے ہمیشہ تر رہتی۔ لیکن جس پیکرِ خاکی کی عزّت افزائی کے لئے اتنا اہتمام کیا گیا۔ وہ بڑا ظالم اور سخت ناشکرا بن گیا۔ انسان خود ہی انصاف سے بتائے کہ ایسے محسن اور کریم رب کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا یا اس کی نافرمانی کرنا ظلم عظیم نہیں اور اس کی گراں قدر نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے باوجود اس کی ناشکری کرنا کیا کفرانِ نعمت کی حد نہیں؟

آیت نمبر ۳۵: اللہ ﷻ کی بارگاہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعاؤں کا بیان ہے۔ مادی اور روحانی دونوں نعمتوں کے عطا کئے جانے کی التجا کا ذکر ہے۔ امن عطا کئے جانے اور شرک سے حفاظت کی دُعا کا بیان ہے۔ اسی طرح دُعا میں عاجزانہ رویہ کا بھی ذکر ہے۔

علمی بات: شہر سے مراد مکہ مکرمہ کا شہر ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اہلیہ ہاجرہ علیہا السلام اور اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اللہ ﷻ کے حکم سے چھوڑا تھا، اس وقت یہاں نہ کوئی آبادی تھی اور نہ بظاہر زندہ رہنے کے اسباب، لیکن اللہ ﷻ نے یہاں پہلے زمزم کا کنواں جاری فرمایا جسے دیکھ کر قبیلہ جرہم کے لوگ یہاں آکر حضرت ہاجرہ علیہا السلام کی اجازت سے آباد ہوئے اور پھر رفتہ رفتہ یہ ایک شہر بن گیا۔ مکہ مکرمہ کے مشرکین حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا بڑا مانتے تھے اس لئے ان آیات میں اللہ ﷻ ان کی یہ دُعا نقل فرما کر انہیں متنبہ فرما رہے ہیں کہ وہ تو بُت پرستی سے اتنے بیزار تھے کہ انہوں نے اپنی اولاد کے لئے اس سے محفوظ رہنے کی دُعا مانگی تھی پھر تم لوگوں نے کہاں سے یہ بُت پرستی شروع کر دی؟

علمی بات: آیاتِ سابقہ میں دلائل سے یہ واضح کیا گیا ہے کہ اللہ ﷻ ہی اس تمام کائنات کو پیدا کرنے والا ہے اور وہی تمام مخلوقات کا پروردگار ہے اس لئے صرف وہی عبادت کا مستحق ہے اب اس آیت میں اس کے مناسب یہ ذکر فرمایا: کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بُتوں کی پرستش کا انکار فرمایا انہوں نے اللہ ﷻ سے دو چیزوں کی دُعا کی: ایک یہ کہ اس شہر مکہ کو امن والا بنا دے اور دوسری یہ کہ مجھے اور میرے بیٹوں کو بُت پرستی سے محفوظ رکھ۔

عملی پہلو: دُعا ایک ایسی مخفی طاقت ہے کہ اس کے برابر کی کوئی بھی ظاہری طاقت نہیں بشرطیکہ رسمانہ مانگی جائے بلکہ طلبِ صادق اور خلوصِ دل سے مانگی جائے اور یہ بھی کہ دُعا جس طرح انسان اپنے لئے مانگ سکتا ہے دوسروں کے لئے بھی مانگی جا سکتی ہے شرط وہی ہے جو ابھی ذکر کی گئی۔

علمی بات: حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ ﷻ کے جلیل القدر پیغمبر تھے۔ انبیاء کرام علیہم السلام اگرچہ معصوم ہوتے ہیں ان سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا لیکن پھر بھی حضرت ابراہیم خلیل (علیہ السلام) نے اس دُعا میں اپنے آپ کو بھی شامل فرمایا ہے یہ آپ کی کمال عاجزی ہے کہ اپنی اولاد کو شرک و بُت پرستی سے بچانے کی دُعا کرنے کے ساتھ اور لوگوں کو اس کی اہمیت سمجھانے کے لئے اپنے آپ کو بھی شامل دُعا فرما لیا۔

آیت نمبر ۳۶: گمراہی کی ظاہری وجہ بیان کی گئی ہے۔ بُتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ شرکیہ رویہ گمراہی کا راستہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے شرک کرنے والوں سے بے زاری کا اعلان کیا گیا۔ مشرکین مکہ کو نصیحت اور تنبیہ کی گئی ہے۔ کسی ہستی سے تعلق کی اصل بنیاد پیروی کرنا ہے۔ اللہ ﷻ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

علمی بات: کیا ہی خوبصورت انداز میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ جو میرے فرماں بردار ہونگے۔ وہ تو میرے گروہ میں شامل ہی رہیں گے لیکن جنہوں نے میری نافرمانی کی تو ان کے لئے یہ نہیں فرمایا کہ تو ان کو بخش دے۔ بلکہ عرض کیا کہ تو غفور و رحیم ہے تیرا کام ہی مغفرت کرنا اور رحم کرنا ہے۔ مقصد بھی پورا ہو گیا اور بارگاہِ صمدیت کے آداب کا بھی پوری طرح پاس رہا۔ نیز از راہِ ادب مَنْ عَصَاكَ (جس نے تیری نافرمانی کی) نہیں کہا بلکہ مَنْ عَصَانِيْ (جس نے میری نافرمانی کی) فرمایا ہے۔

علمی بات: عصیاں سے مراد اگر گناہ ہوں تو بات واضح ہے اور اگر کفر و شرک مراد ہو تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کو ہدایت کی توفیق من عصانی مرحمت فرما۔ ان کی توبہ قبول کر۔ کیونکہ جس کی موت کفر پر ہو، اس کے لئے نہ مغفرت ہے، اور نہ اس کے لئے طلب مغفرت کی اجازت ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی جس میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول ہے: (رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضۡلَلۡنَ كَثِيۡرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنۡ تَبِعَنِىۡ فَاِنَّهٗ مِنِّىۡ وَمَنۡ عَصَانِىۡ فَاِنَّكَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ) (سورۃ ابراہیم ۱۴، آیت: ۳۶) اور پھر یہ آیت تلاوت کی جس میں سیدنا عیسیٰ (علیہ السلام) کا یہ قول ہے: (اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ وَاِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ فَاِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ) (سورۃ المائدۃ ۵، آیت: ۱۱۸) "اگر تو انہیں عذاب دے تو بے شک وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انہیں بخش دے تو بے شک تو ہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔" پھر آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کئے اور فرمایا: "اے میرے اللہ! میری اُمّت، میری اُمّت۔" اور آپ رونے لگے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اے جبرائیل! تو محمد ﷺ کے پاس جا حالانکہ تیرا رب سب کچھ جانتا ہے اور ان سے پوچھ کہ آپ کس وجہ سے رو رہے ہیں؟" تو جبریل (علیہ السلام) آپ کے پاس آئے اور آپ سے رونے کی وجہ پوچھی تو آپ نے سب حال بیان کر دیا، پھر جبریل (علیہ السلام) نے اللہ تعالیٰ کو خبر دی، حالانکہ وہ خوب جانتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اے جبرائیل! محمد (ﷺ) کے پاس جاؤ اور کہہ دو کہ ہم آپ ﷺ کو آپ علیہ السلام کی اُمّت کے بارے میں خوش کر دیں گے، ناراض نہیں کریں گے۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۳۷: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اولاد کو مسجد حرام کے پاس بسانے کا مقصد نماز کا قیام اور محترم گھر کے پاس آباد ہونا تھا۔ اللہ تعالیٰ سے لوگوں کے دلوں میں بیت اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا فرما دینے کی دُعا۔ تاکہ وہ بار بار اس گھر کی زیارت کے لئے حاضر ہوں۔ بیت اللہ کے قریب رہنے والوں کو پھل اور میوے بطور رزق عطا فرما دینے کی دُعا کی تاکہ لوگ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔

علمی بات: یہاں ابراہیم علیہ السلام کی بعض ذرّیت (اولاد) سے مراد اسماعیل علیہ السلام اور ان کی اولاد ہے اور ابراہیم (علیہ السلام) کا اپنی اولاد کو بیتِ حرام کے پاس بسانے کا مقصد یہ تھا کہ ان کی اولاد وہاں نماز قائم کرے یعنی یادِ الٰہی جاری رکھے۔ ان کی دُعا کا مقصد بھی یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی اولاد کو نماز کی توفیق عطا فرمائے۔ گویا آپ ﷺ نے یہ لفظ کہہ کر اولاد کو اقامتِ نماز کا غائبانہ حکم دیا اور اللہ تعالیٰ سے دُعا بھی کی کہ ان کو اس کی توفیق عطا فرما دے۔

علمی بات: نماز کے تحت یہاں طواف وغیرہ دوسری عبادات بھی داخل ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصود گزارش یہ ہے کہ یہ آبادی اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے ہے اور خانہ کعبہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والوں کا ایک مقام ہے۔ دوسرا حضرت اسماعیل علیہ السلام کو خانہ کعبہ کے پاس بسانے کی غرض خدمت کعبہ بتا کر یہود و نصاریٰ کے اس خیال کی تردید کر دی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حضرت اسماعیل علیہ السلام کو وہاں وادی مکہ میں چھوڑنا، محض حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کو خوش کرنے کے لئے تھا۔ (معاذ اللہ)

عملی پہلو: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذرّیت (اپنی اولاد) کے لئے یہ دُعا فرمائی کہ لوگوں کے قلوب ان کی طرف مائل ہو جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنی اولاد کو دینی مقتدیٰ بنانا بھی ایک اہم مقصد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا قبول فرمائی۔ یعنی اوّل قبیلہ بنی جرہم کو مکہ معظمہ میں بسا دیا ان ہی میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شادی ہوئی۔ پھر ان کی نسل چلی اور بڑھی۔ جن میں خاتم النبیین حضرت سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ بھی ہیں۔ آپ ﷺ سارے عالم کے مقتدا ہیں۔ آپ ﷺ مکہ معظمہ ہی کی سرزمین میں پیدا ہوئے اور وہیں نبوت سے سرفراز ہوئے۔ آپ ﷺ کی دعوتِ توحید کا پہلا مرکز مکہ معظمہ ہی تھا۔ آپ سے اور آپ ﷺ کی اولاد و اصحاب رضی اللہ عنہم کی محنت سے سارے عالم میں دین اسلام پہنچا اور دین اسلام کی طرف اقوامِ عالم کے قلوب متوجہ ہو گئے۔ یہ سب کچھ اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کی قبولیت کا مظہر ہے۔

عملی پہلو: اس آیت سے جہاں نماز قائم کرنے کی اہمیت معلوم ہوئی جو ایمان کے بعد افضل اور اوّلین عمل ہے، وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنے اہل و عیال کو نمازی بنانے کی فکر کرنا بے حد ضروری ہے۔ اس کے ساتھ دینی تعلیم کا حصول، دین کے فرائض جاننے کا اہتمام اور کم سے کم انہیں دین کا اتنا علم ضرور دلائیں کہ وہ حق و باطل اور حلال و حرام میں تمیز کر سکیں۔ مزید یہ کہ اپنی دینی ذمہ داریوں سے آگاہ ہو کر اسے بخوبی نبھا سکیں۔

عملی پہلو: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا میں یہ بھی ذکر ہے کہ انہیں پھلوں میں سے رزق عطا فرما تاکہ وہ شکر ادا کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنی اولاد کے لئے معاش کا انتظام کرنا اور ان کے لئے رزق کی دُعا کرنا یہ بزرگی اور دین داری کے منافی نہیں ہے۔ اولاد کے دین و ایمان کی فکر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے معاشی حالات

کی بھی فکر کی جائے تو یہ توکل کے منافی نہیں ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اللہ ﷻ کی نعمتوں کی شکر گزاری بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے، خود بھی اللہ ﷻ کے شکر گزار بنیں اور اولاد کو بھی شکر گزار بنانے کی فکر کریں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ اسماعیل علیہ السلام کی والدہ پر رحم فرمائے! اگر زمزم کو انھوں نے یوں ہی چھوڑ دیا ہوتا۔" یا آپ ﷺ نے فرمایا: "اگر وہ پانی سے چلو نہ بھرتیں تو وہ ایک بہتے ہوئے چشمے کی صورت اختیار کر لیتا۔" راوی بیان کرتے ہیں کہ پھر ہاجرہ علیہا السلام نے پانی پیا اور بچے کو دودھ پلایا۔ فرشتے نے ان سے کہا: "آپ ہلاکت کا اندیشہ نہ کریں، یہاں اللہ ﷻ کا ایک گھر ہے، جس کی تعمیر یہ بچہ اور اس کا والد (دونوں مل کر) کریں گے۔ اللہ ﷻ اپنے لوگوں کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔" (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۳۸: اللہ ﷻ کے علم کی وسعت کا حوالہ دے کر دُعا کر رہے ہیں۔ ان کی دُعا کا اصل مقصد اللہ ﷻ کی رضا کا حصول ہے جو دلوں کے پوشیدہ رازوں اور کائنات کی ہر چیز کی حقیقت سے واقف ہے۔

علمی بات: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ: اے ہمارے رب! تو ہمارے حالات اور ہماری ضرورتوں سے خوب واقف ہے کون سی چیز ہمارے لئے مفید ہے اور کون سی نقصان دہ، اسے تو خوب جانتا ہے، تو ہم پر بے پناہ رحم فرمانے والا ہے۔ اس لئے ہم تجھ ہی سے دُعا کرتے اور اپنی ضروریات طلب کرتے ہیں اور تیرے حضور اظہارِ بندگی کے لئے خشوع و خضوع کے ساتھ تجھے پکارتے ہیں۔ ہم اس لئے دُعا کرتے ہیں کہ تیرے کرم کے محتاج ہیں اور تیرے فضل و کرم کے لئے ہمارے دل مچل رہے ہیں۔

علمی و عملی بات: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دُعا ان تمام جذبات کی ترجمانی کر رہے ہیں جو ایک سچے بندے کے اندر اللہ ﷻ کو پکارتے ہوئے امنڈتے ہیں۔ اس کی عبدیت تقاضا کرتی ہے کہ وہ اللہ ﷻ کے سامنے اپنے عجز کا اقرار کرے۔ جو کچھ مانگے احتیاج کی بنیاد پر مانگے نہ کہ استحقاق کی بنیاد پر۔ ایک طرف وہ ملی ہوئی نعمتوں کا اعتراف کرے اور دوسری طرف ادب کے تمام تقاضوں کے ساتھ اپنی درخواست پیش کرے۔ وہ اقرار کرے کہ اللہ ﷻ دینے والا ہے اور انسان لینے والا اور محتاج ہے۔

آیت نمبر ۳۹: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بڑھاپے میں اللہ ﷻ کی طرف سے عطا ہونے والی اولاد حضرت اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام پر شکر کی ادائیگی کا ذکر ہے۔ بلاشبہ اللہ ﷻ ہی دُعاؤں کو سننے اور قبول فرمانے والا ہے۔

علمی بات: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ ﷻ کا شکر ادا کیا کہ اس نے بڑھاپے میں انہیں دو عظیم بیٹوں سے نوازا تاکہ ان کے بعد دعوت الی اللہ کا کام کرتے رہیں لوگوں کو توحید کی طرف بلائیں اور نماز قائم کریں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کے لئے دُعا کی تو اللہ ﷻ نے ان کو ایک بیٹے کی خوش خبری دی۔ مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر تقریباً نوے سال ہو گئی تو حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے اور اس کے تیس سال بعد حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر تقریباً ایک سو بیس سال تھی۔

علمی بات: دُعا کے آداب میں سے ہے کہ اس کے ساتھ اللہ ﷻ کی حمد و ثنا کی جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خصوصیت سے اس جگہ اللہ ﷻ کی اس نعمت کا شکر ادا کیا کہ شدید بڑھاپے کی عمر میں اللہ ﷻ نے ان کی دُعا قبول فرما کر اولاد صالح حضرت اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام عطا فرمائے۔ اس حمد و ثنا میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ بچہ جو بے یار و مددگار چٹیل میدان میں چھوڑا ہے اے اللہ! تیرا ہی عطیہ ہے تو ہی اس کی حفاظت فرمائے گا۔ آخر میں حمد و ثنا کی تکمیل ہے یعنی بلاشبہ میرا پروردگار دُعاؤں کا سننے والا اور قبول فرمانے والا ہے۔

عملی پہلو: دُعا کے آداب میں سے یہ ہے کہ انسان کبھی رب سے ناامید نہ ہو، دُعا میں بار بار ربّنا کہتا جائے دُعا سے پہلے اور بعد رب تعالیٰ کی حمد و ثنا کرے دُعا کے بعد آمین کہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوا اولاد اللہ ﷻ کی طرف سے ایک تحفہ ہے، یہ صرف اسباب جمع ہو جانے سے نہیں ہوتی، ورنہ ہر تندرست جوڑے کے ملنے سے اولاد ہو جاتی، بلکہ یہ محض عطائے الٰہی ہے، وہ بھی اس کی مرضی کے مطابق ہوتی ہے، چاہے بیٹے ہی دے، چاہے بیٹیاں، چاہے دونوں ملا کر دے اور چاہے تو بے اولاد رکھے۔

علمی بات: حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے آپ پر اللہ ﷻ کی سابقہ عنایات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کر رہے ہیں کہ اے اللہ! جب میں بوڑھا ہوگیا۔ میری بیوی بانجھ ہوگئی اور عام طور پر اولاد پیدا ہونے کا وقت گزر گیا۔ اس بڑھاپے اور پیرانہ سالی میں تو نے مجھے حضرت اسماعیل و اسحاق علیہما السلام جیسے فرزند ارجمند مرحمت فرمائے، گویا یہ عرض کرنا چاہ رہے ہیں کہ اے اللہ! مجھ پر ہمیشہ تیرے فضل و کرم اور جود و سخا کی بارش رہی۔ آج تک تیرے ہی لطف و کرم نے میری حاجت روائی کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تو مجھے آئندہ بھی اپنے بے پایاں لطف و عطا سے نوازتا رہے گا۔ معلوم ہوا کہ نیک بخت اور سعادت مند اولاد بھی اللہ ﷻ کا فضل عظیم ہے۔ جس کے لئے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام جیسے جلیل المرتبہ نبی علیہ السلام سراپا شکر بنے ہوئے ہیں۔

آیت نمبر ۴۰: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ساتھ اپنی اولاد کو نمازی بنانے کی دُعا کی۔ اس دُعا کو خاص طور پر قبول کرنے کی درخواست بھی کی۔ عبادت کی توفیق کے لئے دُعا مانگنا ضروری ہے۔ اولاد اور گھر والوں کی دینی تربیت گھر کے سربراہ کی ذمہ داری ہے۔

علمی بات: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دُعا کی کہ مجھے اور میری اولاد کو ہمیشہ نماز پڑھنے والا بنا اور اے میرے رب! قیامت کے دن میری مغفرت فرما اور میرے والدین کی اور تمام مومنین کی۔ مسلمان عمومی طور پر اپنی نمازوں میں یہی دُعا کرتے ہیں۔ تاکہ اپنی دُعا میں اپنے والدین کے ساتھ تمام اہلِ ایمان کو شامل کرے۔

علمی بات: نماز کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ ایک جلیل القدر نبی علیہ السلام اپنے حق میں اس کے واسطے دُعائے خصوصی کرتے ہیں۔ مفسرین کرام نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وحی سے علم ہو گیا تھا کہ اُن کی نسل میں سب مومن ہی نہ ہوں گے کچھ غیر مومن بھی ہوں گے اس لئے دُعا سب کے حق میں نہ فرمائی۔

عملی پہلو: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے یہ دُعا بھی کی کہ وہ انہیں اور ان کی اولاد کو نماز کا پابند بنا دے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ داعیانِ دین کو اپنے گھر والوں کی ہدایت اور ان کی دینی تعلیم و تربیت سے غافل نہیں رہنا چاہئے، بلکہ دعوت و تبلیغ میں انہیں اوّلیت دینی چاہئے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دُعاءِ مغفرت و بخشش سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسان اپنی اولاد کے کامل اور پختہ ایمان اور عمل کے لئے بھی دُعا مانگے کیونکہ ایمان و عمل ہی اصل پونجی ہے جو انسان کے لئے دارین کی سعادت و سرخروئی کی ضامن ہے اور پھر یہ کہ انسان پہلے اپنے لئے دُعا مانگے اور پھر دوسروں کے لئے کہ وہ خود بھی دُعا کا محتاج ہے۔

عملی پہلو: اللہ ﷻ نے ایمان والوں پر فرض کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو بھی دوزخ سے بچائیں اور اپنے اہل و عیال کو بھی دوزخ سے بچائیں۔ جیسا کہ سورۃ التحریم، آیت ۶ میں بھی یہی مفہوم بیان کیا گیا ہے۔ خود بھی نیک عمل کریں اور اہل و عیال کو بھی نیک عمل کرنے کا حکم دیں۔ ایمان والوں کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ خود صالح بن جائیں اور اہل و عیال کی فکر نہ کریں، وہ جو چاہے کرتے پھریں اور اہل ایمان کو ان کی بداعمالی کی پرواہ نہ ہو۔ اگر ایمان والے اپنے آپ کو صالح بنا کر ایک فرض سے سبکدوش ہو جائیں تو وہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کی ذمہ داری ختم ہو گئی۔ نہیں! ان پر ایک اور ذمہ داری بھی ڈالی گئی ہے اور وہ اہل و عیال کی اصلاح اور تربیت ہے، اگر انھوں نے اہل و عیال کی اصلاح نہ کی تو وہ اس دوسرے فرض سے سبکدوش نہیں ہوئے اور اس فرض کو ادا نہ کرنے کی صورت میں وہ جواب دہ ہوں گے۔ اس گناہ سے بچنے کی بس ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ اہل و عیال کو بھی سیدھے راستے پر لگائیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے نبی اکرم ﷺ سے روایت کی کہ آپ ﷺ نے فرمایا: سن رکھو! تم میں سے ہر شخص نگران ہے اور ہر شخص سے اس کی رعایا (زیرِ نگرانی افراد) کے متعلق سوال کیا جائے گا، پس جو امیر لوگوں کا حاکم ہو وہ ان (کی فلاح و بہبود) کا نگران ہے اس سے ان کے متعلق پوچھا جائے گا اور مرد اپنے اہل خانہ پر نگران ہے، اس سے اس کی رعایا کے متعلق سوال ہو گا اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں کی نگران ہے، اس سے ان کے متعلق سوال ہو گا اور غلام اپنے مالک کے مال میں نگران ہے، اس سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا، سن رکھو! تم میں سے ہر شخص نگران ہے اور ہر شخص سے اس کی رعایا (رعیت) کے متعلق پوچھا جائے گا۔ (صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، صحیح بخاری)

آیت نمبر ۴۱: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ساتھ اپنے والدین اور تمام ایمان والوں کے حق میں دُعائے مغفرت فرمائی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعائے مغفرت خاص اس وقت سے متعین ہے جب قیامت قائم ہو گی اور ہر انسان اپنے حساب کتاب کے معاملے میں بے حد پریشان ہو گا۔

علمی بات: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلے اپنے لئے دُعا کی پھر اپنے والدین اور تمام مسلمانوں کے لئے دُعا کی اور اس میں ہمیں دُعا کا طریقہ بتایا ہے کہ سب سے پہلے اپنے لئے دُعا کرنی چاہیئے تاکہ یہ معلوم ہو کہ دُعا کرنے والا سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا محتاج ہے اور اگر کوئی شخص صرف دوسروں کے لئے دُعا کرے اور اپنے لئے دُعا نہ کرے تو اس سے یہ ظاہر ہو گا کہ وہ اپنے آپ کو دُعا سے مستغنی سمجھتا ہے اور اگر وہ پہلے دوسروں کے لئے دُعا کرے اور پھر اپنے لئے دُعا کرے تو اس سے یہ ظاہر ہو گا کہ وہ دوسروں کی بہ نسبت اللہ تعالیٰ سے دُعا کا کم محتاج ہے۔

آیت نمبر ۴۲: کفارِ مکہ کو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی مہلت سے بے فکر نہ ہو جانے کی تنبیہ کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے تمام جرائم سے بخوبی واقف ہے۔ دنیا میں تو انہیں مہلت دی جا رہی ہے روزِ قیامت ان کی آنکھیں خوف کے مارے پتھرا جائیں گی۔

علمی بات: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اہلِ ایمان کو تسلّی اور اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ خیال نہ کریں کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کے اعمال سے بے خبر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اگر انہیں مہلت دے رکھی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ان سے بے خبر ہے اور وہ انہیں ان کی بداعمالیوں کی سزا نہیں دے گا، بلکہ وہ ان کے تمام اعمال کو شمار کر رہا ہے اور جب وہ دن آجائے گا جب مارے دہشت کے لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ ان کے بُرے اعمال ان کے سامنے پیش کر دیے جائیں گے۔

آیت نمبر ۴۳: میدانِ حشر میں نافرمانوں کے حال کا بیان ہے۔ وہ سر اٹھائے میدانِ حشر کی طرف دوڑ رہے ہوں گے۔ ان کی آنکھیں اوپر ہی لگی رہیں گی اور نیچے کی طرف نہیں آسکیں گی۔ خوف کی مانند ان کے دل لرز رہے ہوں گے۔

علمی بات: ارشاد فرمایا گیا کہ اس روز یہ لوگ سر اٹھائے اس طرح دوڑے چلے جا رہے ہوں گے کہ شدت ہول کی بناء پر ان کی نگاہیں ان کی طرف پلٹ بھی نہیں سکیں گی کہ وہ بڑا ہی شدید اور انتہائی ہولناک دن ہو گا، اور اس روز لوگوں کے دل و دماغ، عقل و فہم اور فکر و ادراک سے خالی و عاری ہو کر اڑے جا رہے ہوں گے۔ لوگ قبروں سے نکل نکل کر دوڑے جا رہے ہوں گے، سر اٹھائے ہوئے ہوں گے اور ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا گیا: "پکارنے والے کی طرف گردن اٹھا کر دوڑنے والے ہوں گے، کافر کہیں گے یہ بڑا مشکل دن ہے۔" (سورۃ القمر ۵۴، آیت: ۸)

آیت نمبر ۴۴: اس دن سے مراد ظالموں کی موت کا دن ہے یا آخرت کا دن ہے۔ اس وقت وہ اللہ تعالیٰ سے التجا کریں گے کہ ان کو ایک اور موقع دیا جائے تاکہ وہ توحید کی دعوت کو قبول کریں اور رسولوں کی پیروی کریں۔ ان کی التجا پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب دیا گیا ہے کہ دنیا میں وہ اپنے زوال پزیر نہ ہونے کے دعوے دار تھے اور آخرت کا انکار کرتے تھے۔

علمی بات: یہاں کافروں کی طرف سے مہلت مانگنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دنیا میں عذابِ الٰہی یا موت کی شدت دیکھ کر چند روز کی مہلت طلب کریں کہ آئندہ اپنا رویہ درست کرلیں گے اور حق کی دعوت قبول کر کے انبیاء کرام علیہم السلام کی پیروی اختیار کرلیں گے۔ دوسرا مطلب یہ کہ وہ قیامت کے روز یہ تمنا کریں گے کہ ان کو تھوڑی سی مدت کے لئے دنیا میں لوٹا دیا جائے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آئیں اور اس کی دعوت کو قبول کرلیں۔

مہلت طلب کرنے کے جواب میں اللہ تعالیٰ کافروں سے کہے گا کہ کیا ہم نے دنیا میں تمہیں مہلت نہیں دی تھی۔ کیا تم اس سے پہلے دنیا میں قسمیں اُٹھا کر نہیں کہا کرتے تھے کہ ہم تو دنیا میں ہمیشہ رہیں گے، ہم کبھی نہیں مریں گے اور نہ اللہ تعالیٰ ہمیں دوبارہ زندہ کرے گا۔ سو اب تم اس قیامت کا مزہ چکھو جس کا تم انکار کرتے تھے۔

علمی و عملی پہلو: قیامت کے دن کفار کو جس پشیمانی کا سامنا ہو گا اس کی یاد اور اس کا احساس دلا کر آج ہی انہیں تائب ہونے کی ترغیب دی جا رہی ہے توبہ کا دروازہ ابھی کھلا ہے۔ توبہ کرو گے تو قبول ہو گی اور جب توبہ کا دروازہ بند ہو گیا اس کے بعد فغاں اور گریہ زاری کچھ کام نہ دے گی۔ کفار اس دن سراپا التجا بن کر عرض کریں گے کہ ہمیں تھوڑی سی مہلت دی جائے تاکہ ہم اپنی گزشتہ غلطیوں کی تلافی کرلیں۔ لیکن ان کی یہ التجا مسترد کر کے انہیں ان کی وہ جاہلانہ اور متکبرانہ باتیں یاد دلا کر مزید رُسوا اور شرمندہ کیا جائیگا کہ تم تو بڑی قسمیں اٹھا اٹھا کر کہتے تھے کہ قیامت کا دن کبھی نہیں آئیگا، ہم سے کوئی باز پرس نہیں کی جائے گی۔ اب بتاؤ کہاں گئیں وہ تمہاری قسمیں اور تمہاری بڑائی؟

آیت نمبر ۴۵: کفار ان ہی بستیوں میں آباد تھے جن میں ان سے پہلی اقوام کو تباہ و برباد کیا گیا تھا۔ ان کے سامنے سابقہ اقوام کے حالات و واقعات کو بطور مثال پیش کر دیا گیا تھا لیکن ان کے انجام دیکھ کر بھی انھوں نے عبرت حاصل نہیں کی تھی۔

علمی بات: مشرکین مکہ سے کہا جا رہا ہے کہ ان بستیوں کو دیکھ چکے ہو، جن کے رہنے والوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا تھا، جیسے عاد و ثمود کی بستیاں۔ اللہ ﷻ نے ان پر جو عذاب نازل کیا تھا اس کے آثار اب تک باقی ہیں اور اس کی خبریں تواتر کے ساتھ تم تک پہنچ چکی ہیں اور جو کچھ انھوں نے کہا تھا اور جس کی وجہ سے وہ اس انجام بد کو پہنچے، وہ ساری باتیں تمہیں معلوم ہیں۔ پھر بھی تم میں کوئی ایسا نہ ہوا جو عبرت حاصل کرتا اور اپنی اصلاح کی کوشش کرتا۔ اللہ ﷻ نے سرکش لوگوں کے انجام سے ڈراتے ہوئے ارشاد فرمایا: "اور وہ آپ سے بُرائی کو جلدی طلب کرتے ہیں بھلائی سے پہلے حالانکہ یقیناً اُن سے پہلے کئی (عبرت ناک) مثالیں گزر چکی ہیں اور یقیناً آپ کا رب لوگوں کے لئے بہت مغفرت فرمانے والا ہے اُن کے ظلم کے باوجود اور یقیناً آپ کا رب بہت سخت سزا دینے والا ہے۔" (سورۃ الرعد ۱۳، آیت:۶)

آیت نمبر ۴۶: کفار کی مکاری اور چالبازی کا بیان ہے۔ دین حق کو مٹانے کی ان کی تمام کوششوں سے اللہ ﷻ خوب واقف ہے۔ ان کی سازشیں اتنی سخت تھیں کہ ان کے مقابلے پر پہاڑ بھی ہٹ جائے مگر اللہ ﷻ کی قدرتِ کاملہ کے سامنے ان کی ایک نہ چلی اور وہ ناکام ہوئے۔

ان کی مزاحمتوں کے باوجود اسلام دن بدن ترقی کرتا رہا۔ حق کی روشنی آئے دن کسی نہ کسی کے دل میں چمکتی اور وہ ان سے کٹ کر اسلام کے پرچم کے تلے آجاتا۔ یہ صورت حال کفر کے سرغنوں کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ انہوں نے اسلام کو مٹانے کے لئے اور حضور نبی کریم ﷺ کی محنت کو ناکام بنانے کے لئے اپنی تمام قوتیں داؤ پر لگا دیں۔ شب و روز وہ اسلام کے خلاف سازشیں کرنے اور منصوبے بنانے میں مصروف رہتے۔ ان کی وہ چالیں اور سازشیں حقیقت میں بڑی خطرناک تھیں لیکن اللہ ﷻ کی تدبیر نے ان کی تمام سازشوں اور منصوبوں کو ناکام بنا دیا۔

اہل مکہ نبی کریم ﷺ اور دینِ اسلام کے خلاف بڑی زبردست سازشیں کرتے تھے۔ اللہ ﷻ نے فرمایا کہ ان کی وہ تمام سازشیں لکھی جا رہی ہیں اور جن کا بدلہ انہیں مل کر رہے گا۔ وہ سازشیں اتنی ہیبت ناک تھیں کہ پہاڑوں کو اکھاڑ پھینکتیں اور انہیں تہ و بالا کر دیتیں، لیکن اللہ ﷻ اپنے نبی ﷺ اور دین اسلام کی حمایت و نصرت فرماتا رہا اور ان کی چالیں دھری کی دھری رہ گئیں۔

علمی بات: جن مخالفانہ تدبیروں کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد پچھلی ہلاک شدہ قوموں کی تدبیریں ہوں مثلاً نمرود، فرعون، قوم عاد و ثمود وغیرہ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں موجودہ مشرکین عرب کا حال بیان کیا گیا ہو۔

آیت نمبر ۴۷: اہل ایمان کے لئے تسلّی کا بیان ہے۔ ہر دور میں رسولوں کے خلاف سازشیں کی گئیں۔ پھر اللہ ﷻ نے اپنے رسولوں اور اہل ایمان کی مدد کا وعدہ پورا فرمایا اور مجرموں سے زبردست انتقام لیا۔

علمی بات: اللہ ﷻ کے وعدے سے مراد دنیا و آخرت میں اللہ ﷻ کے رسولوں اور اہل ایمان کو نصرت و عزت سے نوازا ہے، جیسا کہ فرمایا "یقیناً ہم اپنے رسولوں کی مدد کرتے ہیں اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے دنیا کی زندگی میں اور اس دن (بھی کریں گے) جب گواہ کھڑے ہوں گے۔ (سورۃ المومن ۴۰، آیت:۵۱) دوسری جگہ ارشاد ہے۔" اللہ ﷻ نے لکھ دیا ہے کہ بے شک میں اور میرے رسول ضرور غالب آئیں گے بے شک اللہ بڑا ہی قوت والا بہت غالب ہے۔ (سورۃ المجادلہ ۵۸، آیت:۲۱) یعنی دنیا میں انہی کے مشن کو کامیابی حاصل ہو گی اللہ ﷻ صحیح بات کو غالب کرتا ہے چاہے بظاہر کتنی ہی کمزوری نظر آئے اور کتنی ہی آزمائشوں سے گزرنا پڑے" اس سے مقصود ایک طرف تو رسول اللہ ﷺ کو تسلّی دینا اور دوسری طرف آپ ﷺ کے مخالفین کو متنبہ کرنا ہے کہ جس طرح پہلے انبیاء کرام علیہم السلام سے جو ہم نے وعدے کئے وہ سب پورے کئے اسی طرح اپنے آخری رسول سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے تائید و نصرت کا جو وعدہ کر رہے ہیں اسے بھی یقیناً پورا کریں گے اور ان لوگوں کو تباہ و برباد کریں گے جو آپ ﷺ کی مخالفت پر کمربستہ ہیں، کیونکہ اللہ ﷻ سب پر غالب ہے، انتقام والا ہے۔

علمی بات: ان آیات میں اللہ ﷻ نے حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے پیروکاروں کو تسلّی دی ہے اور ان کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے کہ اگر دنیا میں کفار کو مہلت دی گئی ہے اور وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں وہ فقط ان کی آزمائش کے لئے ہے۔

آیت نمبر ۴۸: روزِ قیامت زمین و آسمان کو بدل کر نئی صورت میں ڈھال دیا جائے گا۔ پھر تمام لوگ اللہ ﷻ کے سامنے حاضر ہوں گے جو اکیلا اور زبردست طاقت کا مالک ہے۔

علمی بات: قرآنِ حکیم کی بعض آیات سے زمین میں تبدیلی کی جو صورت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ زمین میں اس دن کوئی بلندی یا پستی نہیں رہے گی۔ سب پہاڑ زمین بوس کر دیئے جائیں گے، زمین ہموار کر دی جائے گی۔ سمندروں، دریاؤں اور ندی نالوں کو خشک کر دیا جائے گا۔ جبکہ سمندر کا موجودہ رقبہ خشکی سے تین گنا زیادہ ہے۔ مزید یہ کہ آسمان کے ستارے بکھر جائیں گے اور شمس و قمر بے نور ہو جائیں گے اور لوگ اپنی قبروں سے نکل کر اللہ ﷻ کے سامنے حاضر ہونے کے لئے دوڑ رہے ہوں گے، تاکہ وہ انہیں ان کے اعمال کا بدلہ دے۔

علمی بات: زمین کو بدلنے کا کیا مطلب ہے ان کی ذات بدل دی جائے گی یا صفات بدل دی جائیں گی اس کے بارے میں مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ تبدیلی کی دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ زمین اس طرح بدل دی جائے گی کہ کچھ بڑھا دی جائے گی کچھ کمی کر دی جائے گی۔ اس کے ٹیلے اور پہاڑ اور نشیب اور درخت اور اس میں جو بھی کچھ ہے سب ختم ہو جائے گا اور زمین کو چمڑے کی طرح پھیلا دیا جائے گا جو بالکل برابر ہو جائے گی اور اس میں کوئی کجی اور اٹھی ہوئی جگہ نظر نہ آئے گی اور آسمانوں کو اس طرح بدل دیا جائے گا کہ چاند سورج ستارے سب ختم ہو جائیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جو فرمایا ہے یہ قرآن حکیم کی متعدد آیات اور بعض احادیث صحیحہ کے موافق ہے۔

آیت نمبر ۴۹: روزِ قیامت اہل جہنّم کے انجام کا بیان ہے۔ انہیں باہم زنجیروں میں جکڑ دیا جائے گا۔

علمی بات: یہ اس دن کی ہولناکی کی مزید تفصیل ہے کہ جب قیامت کے دن یہ آسمان و زمین نہ ہوں گے اور کل مخلوق اللہ ﷻ کے سامنے کھڑی کی جائے گی تو جن لوگوں نے دنیا میں فساد مچا رکھا تھا جو خود بھی راہِ حق سے دور رہے اور دوسروں کو بھی روکے رکھا تھا۔ اس دن وہ تمام مجرمین زنجیروں میں جکڑے ہوئے اپنے شیطانوں سمیت آئیں گے۔ ان کے لباس تارکول کے ہوں گے اور ان کے چہروں پر آگ کے شعلوں کی لپٹ ہوگی اور یہ سب کچھ اس لئے ہوگا تاکہ ہر جان اپنے اعمال کا بدلہ پائے اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ ساری مخلوق کا حساب کرنے میں کوئی بڑا عرصہ لگ جائے گا۔ اللہ ﷻ پلک جھپکتے سب کا حساب چکا دے گا۔

آیت نمبر ۵۰: قطران سے مراد ہر وہ جلنے والا مادہ جو بدبو دار گاڑھا اور سیاہ دھواں چھوڑتا ہو اس کے جلنے کی شدت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اہل جہنّم کا لباس گندھک کا ہوگا جس سے جہنّم کی آگ کی شدت میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ آگ ان کے چہروں کو ڈھانپ لے گی۔ نعوذ باللہ۔

علمی بات: ان کے لباس گندھک کے ہوں گے اور ان کے چہروں پر آگ لپک رہی ہوگی، اللہ ﷻ نے جہنّمیوں کی شکل و صورت کی قباحت اور ان کی بدترین حالت بیان کرنے کے لئے گندھک کی مثال بیان کی گئی ہے۔ مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ خارش زدہ اونٹ، جس کے جسم سے پیپ نکل رہی ہو اور بدبو آ رہی ہو اور علاج کے لئے اس کے سارے جسم پر گندھک کو مل دیا جاتا ہے۔ جس کی بدبو بہت ہی شدید اور جس کا منظر بڑا ہی قبیح ہوتا ہے۔

علمی بات: سَرَابِیْلُ: سربال کی جمع ہے، سربال کا معنی ہے قمیض۔ قَطِرَانٍ: تیل کی طرح ایک سیال مادہ ہوتا ہے۔ "قَطِرَانٍ" کا معنی ابہل، صنوبر (چلغوزہ) اور اس قسم کے درختوں مثلاً چیڑ یا دیار وغیرہ سے نکلنے والی گوند، یعنی رال یا جو تیزی سے جلتا ہے اور سخت بدبودار ہوتا ہے، خارش زدہ اونٹوں کو ملا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے اس کا معنی پگھلا ہوا کھولتا ہوا تانبا جبکہ بعض اہل علم نے اس کا ترجمہ تارکول بھی کیا ہے اور چونکہ اس کا مادہ "قَطَرَ" "ٹپکنے" کا مفہوم رکھتا ہے، اس لئے اس میں وہ تمام مائع چیزیں مراد ہو سکتی ہیں جو بھڑکنے اور شعلہ پکڑنے والی ہیں۔ (واللہ اعلم)

عملی پہلو: یہ تارکول دراصل ان کے اپنے اسی کفر و شرک اور دوسرے جرائم کی ظاہری اور حسی شکل میں ہوگی، جسے انہوں نے دنیا کی زندگی میں اپنائے رکھا تھا، کہ یہ دنیا دراصل عالمِ مجاہدہ ہے اور آخرت عالمِ مشاہدہ، آج اس دنیا میں نیک و بد جو بھی اعمال کئے جا رہے ہیں ان کی اپنی خاص شکلیں اور اثرات ہیں۔

آیت نمبر ۵۱: قیامت کی ہولناکیاں بیان کرنے کا مقصد لوگوں کو متنبہ کرنا ہے۔ ہر جان کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ بلاشبہ اللہ ﷻ جلد حساب لینے والا ہے۔

علمی و عملی بات: اس آیت میں ہر شخص سے مراد کفار ہیں کیونکہ سیاق کلام کفار کے متعلق ہے البتہ اس کو عموم پر برقرار رکھنا بھی جائز ہے یعنی مومنین اور پرہیز گار جو نیک عمل کریں گے ان کو اس کے بدلے میں اچھی جزا ملے گی اور کفار اور فساق کو ان کے کفر اور فسق و فجور کی سخت سزا ملے گی۔ اس سے لوگوں کو ڈرایا ہے تاکہ وہ بُرے کاموں سے باز آجائیں اور توبہ کرنے میں جلدی کریں کیا پتا کس وقت موت آجائے۔

علمی بات: تمام انسانوں کو الگ تین گروہوں میں تقسیم کر دینے سے ان کی صورتحال واضح ہو جائے گی یعنی کچھ دائیں والے ہوں گے اور کچھ بائیں والے اور ایک گروہ کو سامنے رکھا جائے گا تو صرف اس بات سے ان کا فیصلہ ہو جائے گا کہ سامنے والے اللہ ﷻ کے نعمتوں میں ہوں گے اور دائیں والے ان سے کم درجہ میں ہوں گے لیکن وہ بھی کامیاب ہوں گے لیکن بائیں والے کو دیکھتے ہی ہر آنکھ فیصلہ کرے گی کہ یہ لوگ جہنمی ہیں اور دوسری جگہ صرف اعمال نامہ کے ہاتھ میں دیئے جانے سے سب کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کامیاب ہیں یا ناکام ہو چکے ہیں اعمال نامہ کا دائیں ہاتھ میں دیا جانا کامیابی کی علامت ہے اور بائیں ہاتھ میں دیئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ دوزخ کی طرف دھکیل دیئے جانے والے ہیں۔ لہٰذا اس پر سے کوئی زیادہ وقت صرف نہیں ہو گا بلکہ آنکھ جھپکنے ہی میں سارا کام ہو جائے گا اور میدانِ حشر میں اکٹھے کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہر ایک کو اس کا بدلہ دیا جائے اور جو اس نے کیا ہے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

آیت نمبر ۵۲: نزولِ قرآنِ حکیم کے مقاصد کا بیان ہے قرآنِ حکیم اللہ ﷻ کا پیغام ہے جسے تمام لوگوں تک پہنچانا ضروری ہے۔ قرآنِ حکیم کو پہنچانے کے تین فائدے یہ ہیں: ۱۔ لوگوں کو ان کے بُرے اعمال کے انجام سے بروقت خبردار کیا جائے۔ ۲۔ لوگوں کو معلوم ہو کہ اعمال پر گرفت کرنے والی صرف ایک ہی ہستی ہے لہٰذا ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کیا جائے۔ ۳۔ قرآنِ حکیم میں مذکور آیات و واقعات سے غور و فکر کرنے والے عبرت حاصل کریں۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ نے نبی کریم ﷺ کو خبر دی کہ یہ قرآنِ حکیم جو آپ ﷺ پر نازل کیا گیا ہے ایک نصیحت ہے تاکہ لوگ اللہ ﷻ سے ڈریں اور انہیں معلوم ہو جائے کہ ایک اللہ ﷻ کے سوا دوسرا کوئی معبود نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی شریک ہے۔ اس لئے کہ جو لوگ صاحبِ فہم ہیں اور عقلِ سلیم رکھتے ہیں ان کو اس میں غور و فکر کرنا چاہیئے اور نصیحت حاصل کرنی چاہیئے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: آنحضرت ﷺ نے فرمایا: عقلمند وہ شخص ہے جو مرنے سے پہلے مرنے کے بعد (کام آنے والے) اعمال کرے اور عقل سے عاجز وہ شخص ہے جو (آخرت سے غافل ہو کر) اپنی خواہشات کی پیروی کرے اور آخرت کی بہتری کی تمنا دل میں رکھے۔ (جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

عملی پہلو: اللہ ﷻ نے انسانوں کو دو قوتیں عطا کی ہیں قوتِ نظریہ اور قوتِ عملیہ قوتِ نظریہ ہی سے انسان توحید اور رسالت کے دلائل میں غور و فکر کر کے اللہ ﷻ اور رسول ﷺ پر ایمان لاتا ہے اور قوتِ عملیہ سے اللہ ﷻ اور مخلوق کے حقوق ادا کرتا ہے جس سے انسان کا دل روشن ہو جاتا ہے اور اس کا دل تجلیاتِ الٰہیہ کے لئے آئینہ بن جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں عقائد اور احکامِ شرعیہ کو تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے اور ان احکام پر عمل کرنے سے انسان کا تزکیہ ہوتا چلا جاتا ہے قرآنِ حکیم میں ایسی آیات ہیں جن میں نیک اعمال پر بشارت دی گئی ہے اور بُرے اعمال پر عذاب سے ڈرایا گیا ہے پس انسان کو ثواب کے شوق سے یا عذاب کے خوف سے نیک اعمال کرنے چاہیئے اور بُرے اعمال کو ترک کرنا چاہیئے اور ہدایت کے لئے یہ اسلوب کافی ہے کیونکہ انسان ثواب کے شوق سے اطاعت کرتا ہے یا عذاب کے خوف سے۔

سُوۡرَۃُ الۡحِجۡر

ربط سورت: ا۔ سورۂ ابراہیم میں ایام اللہ ﷻ کا اجمالی ذکر تھا۔ سورۃ الحجر میں قریشی قیادت کے استہزاء پر قومِ لوط، اصحاب الایکہ اور قومِ ثمود کی ہلاکت کے تفصیلی تذکرے بیان ہوئے ہیں۔

۲۔ سورۂ ابراہیم میں روزِ قیامت شیطان کی ایک تقریر کا ذکر تھا۔ سورۃ الحجر میں دُنیا میں شیطان کا لوگوں کو بہکانے کے منصوبہ کا ذکر ہے۔

۳۔ سورۂ ابراہیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کے لئے دُعا کا ذکر تھا۔ سورۃ الحجر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کی بشارت کا تذکرہ ہے۔

۴۔ دونوں سورتوں کے آغاز میں آیاتِ قرآن کی اہمیت کا بیان ہے۔

۵۔ دونوں سورتوں کے اختتام پر نبی کریم ﷺ کے ذریعہ اہل ایمان کو اللہ ﷻ کی طرف سے تسلّی دی گئی ہے۔

آیت نمبر ا: اس آیت میں قرآنِ حکیم کی دو صفات کا بیان ہے۔

ا۔ قرآنِ حکیم ایک کامل کتاب ہے۔ ۲۔ قرآنِ حکیم کی آیات واضح ہیں اور اس کی کوئی بات مشکل اور اُلجھی ہوئی نہیں ہے۔

علمی بات: یعنی یہ اُس جامع اور عظیم الشان کتاب کی آیتیں ہیں جس کے مقابلہ میں کوئی دوسری کتاب "کتاب" کہلانے کی مستحق نہیں اور اُس قرآن کی آیتیں ہیں جس کے اصول نہایت صاف، دلائل روشن، احکام معقول اور واضح، بیانات شگفتہ اور فیصلہ کن ہیں، لہٰذا آگے جو کچھ بیان کیا جانے والا ہے اسے مخاطبین کو پوری توجہ سے سننا چاہیئے۔

آیت نمبر ۲: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ کفار موت کے وقت یا پھر دُنیا و آخرت میں اپنا انجام دیکھ کر اور اہل ایمان کو عزّت و کامیابی سے سرفراز ہوتا دیکھ کر مسلمان ہونے کی آرزو کریں گے۔

علمی بات: اس آیت کریمہ میں نبی کریم ﷺ کے لئے بشارت ہے کہ آپ ﷺ کا دین غالب ہو کر رہے گا اور ایک دن ایسا آئے گا کہ کفار تمنا کریں گے کہ کاش وہ پہلے ہی مسلمان ہو چکے ہوتے تو آج انہیں بھی وہ مقام حاصل ہوتا جو ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حاصل ہے، جنہوں نے ابتدا ہی میں اسلام کی دعوت پر لبیک کہا اور سابقین اوّلین قرار پائے۔ اس بشارت کے ضمن میں نبی کریم ﷺ کی حوصلہ افزائی کر کے ہمت بڑھائی جا رہی ہے کہ آپ ﷺ دعوتِ دین کے کام میں صبر و استقامت کے ساتھ لگے رہیں، کیونکہ انجام کار غلبہ آپ ﷺ ہی کو حاصل ہوگا۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ کفار یہ تمنا یا تو موت کے وقت کریں گے یا قیامت کے دن، جب حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی اور انہیں اپنے دین و عقیدہ کے باطل ہونے کا یقین ہو جائے گا۔

عملی پہلو: یہ لوگ جو آج دُنیا کی شہوات و لذات میں غرق ہیں اور غفلت کا شکار ہیں قیامت کے دن یا بوقت موت نہایت حسرت کے ساتھ کہیں گے کہ کاش ہم مسلمان ہوتے اور اس کتاب پر ایمان لاتے اور جب کفار یہ دیکھیں گے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ماننے والوں کو ثواب مل رہا ہے اور ان کے نہ ماننے والوں کو عذاب مل رہا ہے تو اُس وقت یہ خواہش کریں گے کہ کاش ہم مسلمان ہوتے۔

آیت نمبر ۳: رسول ﷺ کو کفر و شرک سے باز نہ آنے والوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ انہیں جلد ہی اپنے انجام کا پتہ چل جائے گا۔

علمی بات: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ آپ ﷺ کفار کو ان کے حال پر چھوڑ دیں کہ وہ دُنیا کے عیش و نشاط اور زیب و زینت سے اپنا جو حصّہ لینا چاہتے ہیں ان کو وہ حصّہ لینے دیں۔ انہوں نے دُنیاوی فوائد حاصل کرنے کے لئے لمبی لمبی امیدیں باندھ رکھی ہیں انہیں اس میں مشغول رہنے دیں اور ان کو ایمان لانے اور عبادت کرنے سے غافل رہنے دیں عنقریب جب وہ قیامت کی ہولناکیاں دیکھیں گے اور اپنے کرتوتوں کی سزا بھگتیں گے تو وہ خود جان لیں گے کہ آپ ﷺ جو کچھ فرماتے تھے وہ صحیح اور حق تھا اور اس کے جواب میں وہ جو کچھ کہتے اور کرتے تھے وہ غلط اور باطل تھا۔

عملی پہلو: اس آیت میں قرآنِ حکیم نے توجہ دلائی ہے کہ صرف کھانے پینے اور دُنیا میں مزے اڑانے کو اپنی زندگی کا اصل مقصد بنالینا اور اسی کے لئے اس طرح لمبی لمبی خیالی امیدیں باندھتے رہنا جیسے زندگی بس یہی ہے یہ کافروں کا کام ہے۔ مسلمان دُنیا میں رہتا ضرور ہے اور اس میں اللہ ﷻ کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ بھی اٹھاتا ہے مگر اس دُنیا کو اپنی زندگی کا مقصد نہیں بناتا۔ بلکہ اسے آخرت کی بھلائی کے لئے استعمال کرتا ہے جس کا بہترین راستہ شریعت کے احکام کی پابندی ہے۔

آیت نمبر ۴: ہر مجرم قوم اور بستی پر آنے والے عذاب کا ایک وقت معین ہے۔ قوم کے نافرمانوں کو مہلت دی جاتی ہے پھر مقررہ وقت آجانے پر انہیں ہلاک کر دیا جاتا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ جب کسی بستی کو گناہوں پر اصرار کی وجہ سے ہلاک کرنا چاہتا ہے تو اس کا ایک وقت مقرر کر دیتا ہے، تاکہ اس سے پہلے بستی والوں کو اسباب ہلاکت پر خوب غور و فکر کرنے کا موقع مل جائے، شاید کہ اپنی حرکتوں سے باز آجائیں۔ کوئی بھی ظالم قوم اپنے وقت مقرر سے پہلے ہلاک نہیں ہوتی اور جب وہ وقت آجاتا ہے تو ایک لمحہ کی تاخیر بھی نہیں ہوتی، کیونکہ حجت پوری ہو چکی ہوتی ہے اور اسے معذور سمجھے جانے کا کوئی سبب باقی نہیں رہ جاتا۔

علمی بات: جس نافرمان بستی کو ہلاک کیا گیا اُس کا وقت معین تھا البتہ ان پر عذاب آنے اور ان کی ہلاکت کے اوقات مختلف ہوتے رہے ہیں پس جو کفار پہلے زمانے میں تھے ان کے عذاب اور ان کی ہلاکت کا وقت پہلے مقرر تھا اور جو کفار ان کے بعد کے زمانے میں تھے ان کے عذاب اور ان ہلاکت کا وقت بعد میں مقرر تھا اس لئے اگلی آیت میں فرمایا: کوئی گروہ اپنے مقرر وقت سے نہ آگے بڑھ سکتا ہے نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے اس آیت میں جو بستی کی تباہی اور ہلاکت کا ذکر ہے اس سے مراد وہ عذاب ہے جس نے بستیوں کو مکمل تباہ کر دیا تھا جیسے حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ہود علیہ السلام کی قوموں پر عذاب آیا تھا۔

آیت نمبر ۵: کوئی نافرمان قوم اپنے مقرر کردہ وقت سے پہلے یا بعد میں ہلاک نہیں ہوتی ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کسی بھی قوم پر عذاب بھیجنے سے پہلے اس کو اتنی مہلت دیتا ہے کہ تقدیرِ الٰہی کی حجت اس پر تمام ہو جائے۔ اور اتمام حجت کے بعد بھی اگر یہ قوم باز نہیں آتی تو وہ لازماً اپنے آخری انجام سے دوچار ہو کر رہتی ہے اور نوشتہ خداوندی کے مطابق جب ایسی قوم کی مدت اور مہلت پوری ہو جاتی ہے تو وہ اپنے ہولناک انجام سے دوچار ہو کر رہتی ہے، پس منکرین و مکذّبین کو تاخیر عذاب سے کسی دھوکے میں نہیں پڑنا چاہیئے۔

عملی پہلو: تاریخ کے اس حوالے سے ہر دور میں موجود سرکش کفار کو سبق لینا چاہیئے۔ کچھ عرصہ اگر عذاب نہیں آتا تو اس سے دھوکے میں پڑنے اور مست ہونے کی بجائے ان کو ہوش کے ناخن لینے چاہیئے۔ اپنی روش بدل لینی چاہیئے۔ ورنہ وہ عذاب ان پر اپنے مقررہ وقت پر آکر رہے گا جس کے وہ مستحق ہیں، مگر اس وقت کے پچھتاوے سے ان کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

آیت نمبر ۶: دعوتِ توحید کے جواب میں کفار نے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں (معاذ اللہ) گستاخانہ کلمات کہے۔ اس آیت میں قرآنِ حکیم کو "الذِّکر" کہا گیا جس کے معنی یاد دہانی اور نصیحت کے ہیں۔

علمی بات: رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ بات وحی کے بالکل ابتدائی دور میں کہی گئی تھی اور اس کے کہنے والوں میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو اس طرح کے خیالات کا اظہار دشمن کے انداز میں نہیں بلکہ ہمدردی میں کر رہے تھے۔ یعنی جب ابتدا میں حضور ﷺ نے نبوّت کا دعویٰ کیا اور بتایا کہ غارِ حرا میں ان کے پاس فرشتہ آیا ہے تو بہت سے لوگوں کو گمان ہوا کہ شاید آپ ﷺ کو کسی بدروح وغیرہ کا اثر ہو گیا ہے (معاذ اللہ)۔ چونکہ نبوّت کا اعلان اور فرشتہ کے آنے کا دعویٰ ان کے لئے بالکل نئی بات تھی اس لئے ان کا واقعی یہ خیال تھا کہ اکیلے کئی کئی راتیں غارِ حرا میں رہنے کی وجہ سے ضرور آپ ﷺ پر کسی بدروح یا جن کے اثرات ہو گئے ہیں (معاذ اللہ)۔ چنانچہ سورۃ نٓ (اس کا دوسرا نام سورۃ القلم بھی ہے) جو کہ بالکل ابتدائی دور کی سورت ہے، اس میں ان لوگوں کے خیالات کی تردید کرتے ہوئے فرمایا گیا: "(اے محبوب ﷺ!) اپنے رب کے فضل سے آپ مجنون نہیں ہیں۔" (سورۃ القلم ۶۸، آیت: ۲)

علمی بات: کفار کا آپ ﷺ کو (معاذ اللہ) مجنون کہنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس سے پہلے دو آیتوں میں اللہ ﷻ نے کفار کو سختی سے ڈانٹ ڈپٹ اور سرزنش کی تھی

اور انہیں جھڑ کا تھا۔ اس آیت میں ان کے شبہات کا ذکر کر کے ان کے جوابات دیئے ہیں: مشرکین مکہ آپ ﷺ کا مذاق اڑاتے ہوئے اور استہزاء کرتے ہوئے یہ کہتے تھے کہ تم مجنون اور دیوانے ہو اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے نزدیک یہ بہت بعید تھا کہ ان کی طرح پیدا ہونے والے انہی کی قوم کا ایک فرد ہو جو کھاتا پیتا بھی ہو شادی شدہ بھی ہو اس کے بچے بھی ہوں اور وہ اللہ ﷻ کا رسول برحق ہو اور اس پر اللہ ﷻ کا کلام نازل ہو یا آپ ﷺ کو اس وجہ سے اس طرح کہتے تھے کہ آپ ﷺ کو اس دعویٰ نبوّت سے دست بردار ہونے کے لئے مال و دولت اور عرب کی سرداری کی پیش کش کی گئی، عرب کی سب سے حسین لڑکی سے شادی کی پیش کش کی گئی لیکن آپ ﷺ نے مال و دولت اور منصب اور اقتدار کو ٹھکرا دیا اور سختیاں اور مصیبتیں برداشت کی اور دعویٰ نبوّت سے دست بردار نہیں ہوئے اور عیش و نشاط کو چھوڑ کر مصیبتوں کو اختیار کرنا ان کے نزدیک محض دیوانگی تھی اس لئے انہوں نے آپ ﷺ سے بطورِ استہزاء کہا: اے وہ شخص جس پر نصیحت نازل کی گئی ہے تو دیوانہ ہے (معاذ اللہ) اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں فرعون نے بھی آپ علیہ السلام کو مجنون کہا تھا۔ (معاذ اللہ)

آیت نمبر ۷: کفار نے رسول اللہ ﷺ سے فرشتوں کے نزول کا مطالبہ کیا۔ اس مطالبہ سے ان کا مقصد فرشتوں سے رسول کریم ﷺ اور قرآنِ حکیم کی صداقت کی گواہی حاصل کرنا تھا۔

علمی بات: کفار مکہ نے رسول اللہ ﷺ سے دشمنی، کینہ اور سرکشی میں آ کر کہا کہ اگر تم سچے ہو تو آسمان سے فرشتوں کو کیوں نہیں اتار لاتے جو تمہاری صداقت کی گواہی دے اور دعوت و تبلیغ کے کام میں تمہاری مدد کرے؟ ان کے اس تکبر اور بغض و عناد کی تردید کرتے ہوئے اللہ ﷻ نے فرمایا کہ ہم فرشتے نہ تو تماشا دکھانے کے لئے اتارتے ہیں اور نہ اس لئے اتارتے ہیں کہ وہ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کر دیں، بلکہ فرشتوں کا نزول حکمتِ الٰہی کے مطابق بامقصد طور پر ہوتا ہے جن کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔

آیت نمبر ۸: اللہ ﷻ کی طرف سے کفار کے مطالبے کا جواب دیا گیا ہے۔ فرشتوں کو عذاب کا فیصلہ دے کر ہی نازل کیا جاتا ہے جس کے بعد نافرمانوں کو مہلت نہیں دی جاتی۔

علمی بات: یہ اللہ ﷻ کی طرف سے فرشتے اتارنے کی فرمائش کا جواب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس قوم کے لئے کوئی پیغمبر بھیجا گیا ہو، اس کے پاس ہم فرشتے اس وقت اتارتے ہیں جب اس قوم کی نافرمانی حد سے گزر جاتی ہے اور اس فیصلے کا وقت آ جاتا ہے کہ اب ان پر عذاب نازل ہو بلکہ فرشتے تو مجرموں پر قہرِ الٰہی بن کر آتے ہیں، جیسے غزوۂ بدر میں آئے تھے، یا لوگوں کی جانیں نکالنے کے لئے آتے ہیں، یا پھر کسی قوم کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے کے لئے آتے ہیں، پھر جب یہ آ جاتے ہیں تو تمہارا کام تمام کر کے چھوڑتے ہیں۔ اُس وقت مہلت دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب یہ فیصلہ کر کے فرشتے بھیج دیئے جاتے ہیں تو پھر اُس قوم کو ایمان لانے کی مہلت نہیں ملتی۔ کیونکہ یہ دُنیا ایک امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں انسان سے جو ایمان مطلوب ہے وہ ایمان بالغیب ہے جس میں انسان اپنی عقل اور سمجھ کو کام میں لا کر اللہ ﷻ اور اس کی توحید کے آگے سر تسلیم خم کرے۔ اگر غیب کی ساری چیزیں دُنیا میں دکھا دی جائیں تو امتحان ہی کیا ہوا؟

عملی پہلو: اللہ ﷻ کا ان کے اس احمقانہ اصرار پر جواب دیا گیا کہ اگر تمہاری خواہش کے مطابق فرشتہ اتارا جاتا اور پھر بھی تم ایمان نہ لاتے جیسے کہ تمہاری ضد اور تعصب سے عیاں ہے تو پھر تمہیں اسی وقت تہس نہس کر دیا جاتا۔ یہ تو اللہ ﷻ کا کرم ہے کہ وہ تمہیں مہلت دیئے ہوئے ہے تاکہ تم غور و فکر کرو۔ شاید تمہیں ہدایت نصیب ہو جائے۔

آیت نمبر ۹: رسول اللہ ﷺ پر نازل کردہ قرآنِ حکیم اللہ ﷻ ہی کا کلام ہے اور اللہ ﷻ ہی اس کی حفاظت فرمانے والا ہے اور اس نے اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے۔ قرآنِ حکیم کی حفاظت کے ذرائع یہ ہیں۔ حفظ، کتابت، تدریس اور عمل۔

علمی بات: اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر کفار مکہ نے اس قرآن حکیم کا انکار کر دیا ہے تو کیا ہوا، اس کے خلاف ان کی کوئی سازش کارگر نہ ہو گی کیونکہ وہ اللہ ﷻ کا کلام ہے، اللہ ﷻ نے اسے اپنے رسول مکرم ﷺ پر اتارا ہے اور وہی اس کی حفاظت کرتا رہے گا۔ اس میں نبی اکرم ﷺ کے لئے تسلّی کا سامان بھی ہے اور تمام مسلمانوں کے لئے بہت بڑی خوشخبری بھی کہ اس مشعل ہدایت کو کوئی بجھا نہ سکے گا۔ اس کا نور قیامت تک انسانوں کو راہ دکھاتا رہے گا۔ آندھیاں

چلیں گی، طوفان اٹھیں گے، بڑی بڑی سازشیں ہوں گی، لیکن جب تک قیامت نہیں آجاتی یہ قرآنِ حکیم بغیر کسی ادنیٰ تغیّر وتحریف کے باقی رہے گا اور اللہ ﷻ قیامت تک اس کی حفاظت کرتا رہے گا۔ قرآنِ حکیم کی حفاظت کی ذمہ داری کا اس طرح پورا ہونا بھی قرآنِ حکیم کی صداقت کی دلیل ہے اور پھر اس کے کلام کا معجزہ ہونا ایک الگ اعلیٰ ترین، بے مثال و باکمال خوبی اور صفت ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہر نبی کو کوئی نہ کوئی معجزہ دیا گیا اور اسی معجزہ کے مطابق لوگ اس نبی پر ایمان لائے اور مجھے جو معجزہ دیا گیا ہے وہ وحی قرآنِ حکیم ہے جو اللہ ﷻ نے میری طرف وحی (کے ذریعہ سے نازل) کیا ہے (یہ معجزہ چونکہ سب معجزوں سے بڑا ہے) اس لئے مجھے اُمید ہے کہ قیامت کے دن میری پیروی کرنے والے دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کی پیروی کرنے والوں سے زیادہ ہوں گے۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ نے یہ واضح فرمایا ہے کہ اگرچہ قرآنِ حکیم سے پہلے بھی آسمانی کتابیں بھیجی گئی تھیں، لیکن چونکہ وہ خاص خاص قوموں اور خاص خاص زمانوں کے لئے آئی تھیں، اس لئے اللہ ﷻ نے ان کو قیامت تک محفوظ رکھنے کی کوئی ضمانت نہیں دی تھی، بلکہ ان کی حفاظت کا کام انہی لوگوں کو سونپ دیا گیا تھا جو ان کے مخاطب تھے، جیسا کہ سورۂ مائدہ ۵ آیت: ۴۴ میں فرمایا گیا ہے۔ لیکن قرآنِ حکیم چونکہ آخری آسمانی کتاب ہے جو قیامت تک کے لئے نافذ العمل رہے گی، اس لئے اللہ ﷻ نے اس کی حفاظت کا خود ذمہ لیا ہے، چنانچہ اس میں قیامت تک کوئی ردوبدل ممکن نہیں۔ اللہ ﷻ نے اس کی حفاظت اس طرح فرمائی ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کے سینوں میں اسے اس طرح محفوظ کر دیا ہے کہ اگر بالفرض کوئی دشمن قرآنِ حکیم کے سارے نسخے (معاذ اللہ) ختم کر دے تب بھی چھوٹے چھوٹے بچے اسے دوبارہ کسی معمولی تبدیلی کے بغیر لکھوا سکتے ہیں جو بذاتِ خود قرآنِ حکیم کا زندہ معجزہ ہے۔

علمی بات: قرآنِ حکیم کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ یہ محفوظ ہے، اس کی زبان، ادب، ترجمہ و معانی، مطالب و مقاصد اور وہ تمام چیزیں محفوظ ہیں، جو قرآنِ حکیم کے لئے ضروری ہیں، قرآنِ حکیم کے الفاظ اس باب میں نہایت حکیمانہ ہیں۔ ارشاد یہ نہیں ہے کہ قرآنِ حکیم محفوظ ہے بلکہ ذمہ داری یہ ہے کہ "ذِکر" محفوظ رہے گا کیونکہ صرف قرآنِ حکیم کے الفاظ کی حفاظت مفید اور کافی نہیں جب تک قرآنی تہذیب و تمدن، قرآنی مفہوم و مقصد، قرآنی پیغام اور قرآنی عمل محفوظ نہ ہو۔ الفاظ و حروف کا مجموعہ اگر محفوظ رہ جائے تو عملاً فائدہ مند نہیں جب تک قرآنِ ناطق حضور نبی کریم ﷺ کی سیرت مطہرہ کے نقوش ہمارے سامنے نہ ہوں۔ چنانچہ منفرد اور امتیازی شان یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کا حرف حرف سینوں میں جبکہ حضور نبی کریم ﷺ کی شخصیت مبارکہ کا ایک ایک پہلو کتب سیرت میں محفوظ ہے۔

علمی بات: تمام اہل علم اس پر متفق ہیں کہ قرآنِ حکیم صرف الفاظ قرآنی اور معانی قرآن کا نام نہیں بلکہ دونوں کے مجموعے کو قرآنِ حکیم کہا جاتا ہے وجہ یہ ہے کہ معانی اور مضامین قرآنیہ تو دوسری کتابوں میں بھی موجود ہیں اور اسلامی تصانیف میں تو عموماً قرآنی مضامین ہی ہوتے ہیں مگر ان کو قرآنِ حکیم نہیں کہا جاتا کیونکہ الفاظ قرآنِ حکیم کے نہیں ہیں اسی طرح اگر کوئی شخص قرآنِ حکیم کے متفرق الفاظ اور جملے لے کر ایک مقالہ یا رسالہ لکھ دے تو اس کو بھی کوئی قرآنِ حکیم نہیں کہا جائے گا اگرچہ اس میں ایک لفظ بھی قرآنِ حکیم سے باہر کا نہ ہو اس سے معلوم ہوا کہ قرآنِ حکیم صرف اس مصحفِ رَبانی کا نام ہے جس کے الفاظ اور معانی ساتھ ساتھ محفوظ ہیں۔ جب یہ معلوم ہوا کہ قرآنِ حکیم صرف الفاظ قرآنِ حکیم کا نام نہیں بلکہ معانی بھی اس کا ایک جزو ہیں تو جس طرح الفاظ قرآنی کی حفاظت کا وعدہ ہے اسی طرح معانی اور مضامین قرآن کی حفاظت اور معنوی تحریف سے اس کے محفوظ رہنے کی بھی ذمہ داری اللہ ﷻ ہی نے لی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ معانی قرآنی وہی ہیں جن کی تعلیم دینے کے لئے رسول کریم ﷺ کو مبعوث فرمایا گیا جیسا کہ قرآنِ حکیم میں فرمایا لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ "تا کہ آپ لوگوں کے لئے واضح فرما دیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے۔" (سورۃ النحل ۱۶، آیت: ۴۴) یہی معنی اس آیت کے ہیں يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ "اور اُنہیں کتاب اور حکمت سکھائے۔" (سورۃ البقرہ ۲، آیت: ۱۲۹)۔ اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا: اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا "میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں" اور جب رسول کریم ﷺ کو معانی قرآن کے بیان اور تعلیم کے لئے بھیجا گیا تو آپ ﷺ نے اُمّت کو جن اقوال و افعال کے ذریعہ تعلیم دی انہی اقوال و افعال کا نام حدیث ہے۔

مطلقاً احادیث رسول ﷺ کو غیر محفوظ کہنے والا در حقیقت قرآنِ حکیم کو غیر محفوظ کہتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ آج کل دنیا کو اس مغالطہ میں ڈالنا چاہتے ہیں کہ احادیث کا ذخیرہ جو مستند کتب میں موجود ہے وہ اس لئے قابل اعتبار نہیں کہ وہ زمانہ رسول کریم ﷺ سے بہت بعد میں مدوّن کیا گیا ہے اوّل تو ان کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کیونکہ

حدیث کی حفاظت و کتابت خود عہد رسالت میں شروع ہوچکی تھی بعد میں اس کی تکمیل ہوئی اس کے علاوہ حدیث رسول در حقیقت تفسیر قرآن اور معانی قرآن ہیں ان کی حفاظت اللہ ﷻ نے اپنے ذمہ لی ہے پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ قرآنِ حکیم کے صرف الفاظ محفوظ رہ جائیں معانی (یعنی احادیث رسول ﷺ) ضائع ہوجائیں؟

آیت نمبر ۱۰: کفار کے جھٹلانے پر رسول اللہ ﷺ کو غم نہ کرنے کی تلقین فرمائی گئی۔ ہر رسول کے ساتھ ان کی قوم نے یہی معاملہ کیا۔

علمی بات: "شِيَعِ" "شِيْعَةٌ" کی جمع ہے، معنی ہے لوگوں کا ایسا گروہ جو خاص عقائد و نظریات، طریقوں اور ایک مذہب پر متفق ہو، اس کے معنی کسی شخص کے پیروکار و مددگار کے بھی آتے ہیں۔ خواہ نیک ہوں یا بد۔ یہاں یہ لفظ بُرے شیعہ یعنی بُری جماعت کے معنی میں ہے، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں آیا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ "بے شک وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور گروہ گروہ ہوگئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے بے شک اُن کا معاملہ اللہ ہی کے حوالہ ہے پھر وہ اُنہیں بتائے گا جو کچھ وہ کیا کرتے تھے۔" (سورۃ الانعام ۶، آیت: ۱۵۹)

البتہ دوسرے مقام پر یہ لفظ "نیک" کے معنی میں ہے: وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ "اور بے شک انہی کے گروہ میں سے یقیناً ابراہیم (علیہ السلام بھی) ہے۔" (سورۃ الصّٰٓفّٰت ۳۷، آیت: ۸۳)

علمی بات: اس آیت میں نبی کریم ﷺ کو تسلّی دی گئی ہے کہ آپ ﷺ ان کے جھٹلانے اور استہزاء سے رنجیدہ نہ ہوں کیونکہ یہ معاملہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے چنانچہ ہم نے آپ ﷺ سے پہلے بھی پیغمبروں کو اگلے لوگوں کے بہت سے گروہوں میں بھیجا تھا۔

آیت نمبر ۱۱: کوئی رسول ایسے نہیں گزرے جن کے ساتھ تکذیب اور استہزاء کا معاملہ نہ کیا گیا ہو۔

علمی بات: اس آیت میں بتایا گیا کہ جس طرح کفار مکہ نے سیّد دو عالم ﷺ سے جاہلانہ باتیں کیں اور بے ادبی سے آپ ﷺ کو مجنون کہا (معاذاللہ)۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہمیشہ منکرین کی عادت رہی ہے کہ جب بھی کوئی پیغمبر آیا ہے انہوں نے اس کا مذاق اُڑایا ہے۔ گویا اس میں نبی کریم ﷺ کی تسکین خاطر ہے اور آپ ﷺ کو تسلّی دی گئی ہے کہ کفار کی تکذیب و استہزاء سے ہرگز غمگین اور رنجیدہ نہ ہوں۔ قدیم زمانہ سے کفار کی انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ یہی عادت رہی ہے کہ وہ رسولوں کے ساتھ تمسخر کرتے رہے ہیں (معاذاللہ)۔

آیت نمبر ۱۲: رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کے دلوں میں کفر و استہزاء داخل کر دیا جاتا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے فرمایا کہ جس طرح ہم نے ان گزشتہ مجرموں کے دلوں میں گمراہی کو داخل کر دیا تھا، کفار مکہ کے دلوں میں بھی کفر و ضلالت کو پیوست کر دیں گے، پھر وہ اس قرآنِ حکیم پر ایمان نہیں لائیں گے اور ہمیشہ سے اللہ ﷻ کی یہی سنّت جاری ہے کہ وہ ایسی قوموں کو ہلاک کرتا رہا ہے اور اپنے رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کو غالب کرتا رہا ہے۔

علمی بات: مجرمین سے مراد ہیں مشرکین مکہ یعنی جس طرح گزشتہ کافر امتوں کے دلوں میں ہم نے کفر و استہزاء کو داخل کر دیا تھا اسی طرح مکہ کے ان مشرکوں کے دلوں میں بھی ہم کفر و استہزاء کو داخل کرتے ہیں۔

علمی بات: خلاصہ یہ کہ اللہ ﷻ ان کے دلوں میں کفر پیدا کر دیتا ہے اب رہا یہ اعتراض کہ جب اللہ ﷻ نے ہی ان کے دلوں میں کفر پیدا کر دیا تو پھر ایمان نہ لانے میں کیا قصور ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ انہوں نے کفر کا ارادہ کیا تھا اس لئے اللہ ﷻ نے ان کے دلوں میں کفر کو پیدا کر دیا۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے: "پھر انہوں نے جب ٹیڑھ اختیار کی تو اللہ نے کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا اور اللہ فاسق قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔" (سورۃ الصّف ۶۱، آیت: ۵)

علمی بات: "ہٗ" سے قرآنِ حکیم بھی مراد ہوسکتا ہے، یعنی قرآنِ حکیم ان کے دلوں میں داخل تو ہوتا ہے، لیکن ان کے مجرمانہ طرزِ عمل کی وجہ سے وہ انہیں ایمان کی دولت نہیں بخشتا اور "ہٗ" سے ان کے مذاق اڑانے کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے۔ یعنی ان کے مجرمانہ طرزِ عمل کی وجہ سے اللہ ﷻ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور کفر و بغاوت اور استہزاء ان کے دلوں میں داخل کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔

آیت نمبر ۱۳: کفارِ مکہ رسول ﷺ اور قرآنِ حکیم پر ایمان نہیں لاتے۔ سابقہ اُمّت کے نافرمان بھی رسولوں اور اللہ ﷻ کی کتاب کا انکار کرتے رہے ہیں۔

علمی بات: جس طرح منکرین حق اللہ ﷻ کی آیات کا مذاق اڑاتے ہیں۔ کبھی آپ ﷺ پر (معاذاللہ) کتاب گھڑ لینے کا الزام لگاتے ہیں کبھی کہتے ہیں یہ محض جادوگری اور جادو بیانی ہے۔ کبھی کسی معجزہ کا مطالبہ کرتے ہیں اور کبھی فرشتوں کے نزول کا، کبھی بشر ہونے کی بناء پر آپ ﷺ کی رسالت کا انکار کرتے ہیں اور کبھی جادوگر اور کبھی دیوانہ کہہ دیتے ہیں تو یہ سب کچھ ان کے آیاتِ الٰہی کو نہ ماننے کے لئے کٹ حجتیاں ہیں اور ایسا استہزاء صرف آپ ﷺ سے ہی نہیں کیا جا رہا بلکہ منکرین حق پہلے رسولوں سے بھی یہی کچھ کرتے چلے آئے ہیں۔ اللہ ﷻ کی آیات سن لینے کے بعد انہیں سوجھتا ہی یہی کچھ ہے۔ ایسی آیات کو نازل کرنے کا ایک اہم مقصد رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو تسلّی دینا بھی ہے جو سخت سنگین حالات سے دوچار تھے اور چونکہ یہ تیرہ سال کا طویل عرصہ تھا۔ لہٰذا ایسی آیات کا نزول بھی وقتاً فوقتاً بہ تکرار ہوتا رہا۔

علمی بات: ان آیتوں میں یہ بتایا کہ کافر ہمیشہ سے نبیوں کا مذاق اڑاتے رہے ہیں (معاذاللہ) اور ان پر ایمان لانے سے انکار کرتے رہے ہیں۔ ان کے استہزاء اور انکار کی حسب ذیل وجوہات ہیں (۱) وہ اپنی خواہشاتِ نفس کے خوگر ہو چکے ہیں اور شریعت کی پابندی کر کے اپنی من پسند چیزوں سے دست بردار ہونا ان کے لئے مشکل تھا اور عبادت کی مشقتوں کو برداشت کرنا ان پر بھاری تھا۔ (۲) وہ شروع سے جس مذہب سے وابستہ تھے وہ ان کے دلوں میں گھر کر چکا تھا اور اس کو چھوڑنا ان کے لئے بہت مشکل تھا۔ (۳) رسولوں کی اطاعت کرنا ضروری ہوتی ہے اور وہ آزاد منش لوگ تھے ان کے لئے کسی کا پابند ہونا بہت دشوار تھا۔ (۴) اللہ ﷻ نے جتنے رسول بھیجے ان میں سے زیادہ تر ایسے تھے جن کے پاس مال و دولت کی فراوانی نہ تھی اور نہ ان کے اعوان اور مددگار تھے اور منکرین بہت مالدار اور رئیس تھے۔ ان کے ماتحت بہت لوگ تھے اس لئے ان کو ان رسولوں کی اتباع کرنے میں عار محسوس ہوتی تھی۔ (۵) وہ اپنے آباء واجداد کی تقلید سے بُت پرستی میں راسخ ہو چکے تھے اور ان کے خلاف کوئی بات سننے پر تیار نہیں تھے۔

آیت نمبر ۱۴: کفار کے کفر کی شدّت کا بیان ہے۔ ان کے لئے آسمانوں کا دروازہ کھول دیا جائے اور یہ آسمان پر چلنے لگ جائیں تب بھی ایمان نہ لائیں گے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے ان کافروں کے کفر و عناد اور سرکشی کی شدت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر ہم آسمان کا کوئی دروازہ ان پر کھول دیں اور وہ اس میں چڑھنے بھی لگیں تو پھر بھی یہ تصدیق نہیں کریں گے اور کہیں گے کہ محمد (ﷺ) نے ہماری آنکھوں کو مسحور کر دیا ہے، جس کی وجہ سے حقائق ہمارے سامنے بدل کر آرہے ہیں اور پھر درحقیقت ایسا ہی ہوا، جب انہیں شقِّ قمر کا معجزہ دکھایا گیا تو انہوں نے اسے جادو ہی کا نتیجہ بتایا، جیسا کہ اللہ ﷻ نے ارشاد فرمایا: ”قیامت قریب آگئی اور چاند دوٹکڑے ہو گیا اور اگر وہ (کافر) کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ موڑ لیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ تو ہمیشہ سے چلا آتا ہوا جادو ہے۔“ (سورۃ القمر ۶۸، آیات: ۱، ۲) ان کی ہٹ دھرمی کا ذکر ہے کہ کفر ان کے دلوں میں یوں جڑ پکڑ چکا ہے کہ اگر ان کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیئے جائیں اور یہ سیڑھی لگا کر دن دہاڑے اوپر بھی چڑھ جائیں اور اللہ ﷻ کی قدرت کے روشن دلائل اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں پھر بھی یہ حق کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوں گے اور بڑی بے حیائی اور ڈھٹائی سے کہہ دیں گے کہ یہ جو کچھ ہمیں نظر آرہا ہے یہ حقیقت نہ تھی بلکہ کچھ منتر پڑھ کر ہماری نظر بندی کر دی گئی ہے، تا کچھ بھی نہیں اور ہمیں یوں نظر آیا کہ ہم آسمان پر چڑھے، وہاں فرشتوں کو دیکھا اور قدرت کی اعجاز آفرینیوں کا مشاہدہ کیا۔ یہ مشاہدات محض نظر بندی کا کرشمہ تھے۔ حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ ہم پر جادو کر دیا گیا تھا۔

آیت نمبر ۱۵: آسمان کی بلندیوں پر چلنے کے باوجود کفار کہیں گے کہ یہ محض نظر کا دھوکا ہے اور ان پر جادو کر دیا گیا ہے۔ ہٹ دھرم لوگ کسی طور بھی حق کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔

علمی بات: ان کا کفر و عناد اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ فرشتوں کا نزول تو رہا ایک طرف، اگر خود ان کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیئے جائیں اور یہ ان دروازوں سے آسمان پر آجائیں، تب بھی انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آئے گا اور رسولوں کی تصدیق نہ کریں بلکہ یہ کہیں گے کہ ہماری نظر بندی کر دی گئی ہے یا ہم پر جادو کر دیا گیا ہے، جس کی وجہ سے ہم ایسا محسوس کر رہے ہیں کہ ہم آسمان پر آجا رہے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں۔

COPYRIGHTS © RESERVED WITH THE ALIM FOUNDATION. SALE OF THIS BOOK WOULD ENTAIL CIVIL & CRIMINAL ACTION.

آیت نمبر ۱۶: اللہ ﷻ ہی نے ستارے پیدا کیئے۔ یہ ستارے آسمان کی زینت ہیں۔

علمی بات: کفار و منکرین کے سامنے اللہ ﷻ کی قدرت اور عظمت کے مزید تکوینی دلائل پیش کیئے جا رہے ہیں۔ تاکہ وہ ان میں غور کریں اور اللہ ﷻ کی اُلوہیت اور وحدانیت کو تسلیم کر کے نورِ ہدایت سے اپنے قلوب کو روشن کریں اور یہ نہیں کہ چمکدار ستارے بنا دیئے اور انہیں غیر منظم طور پر بکھیر دیا کہ ان سے روشنی حاصل ہوتی رہے اور ان کی کرنیں اپنی اپنی تاثیرات سے متعلقہ اشیاء کو متاثر کرتی رہیں اور بس۔ بلکہ ان کو ایسے موزوں طور پر سجایا ہے کہ دیکھنے والی آنکھ ان کے حسنِ ترتیب کو دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے قدرتِ الٰہی کے مناظر میں سے کون سا ایسا منظر ہے جس سے ہر شخص اپنے اپنے ذوق کے مطابق لطف اندوز نہیں ہوتا۔ خالقِ کائنات نے ہر چیز کو جس طرح مفید اور مستحکم بنایا ہے۔ اتنا ہی اسے حسن و جمال بھی بخشا ہے۔

آیت نمبر ۱۷: اللہ ﷻ نے آسمان کو ہر سرکش شیطان سے محفوظ کر رکھا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے آسمان کو ہر مردود شیطان سے محفوظ کر دیا ہے اور اگر کوئی شیطان یا سرکش جنّ عالمِ بالا کی باتیں سننے کے لئے اوپر جانے کی کوشش کرے تو آسمان کے روشن شہاب یعنی آگ کے شعلے اس کو نیچے بھگا دیتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ ﷻ سے چھپ کر شیطان اوپر جا سکتا ہے ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، دراصل اللہ ﷻ نے ہی انسانی آزمائش کے لئے شیطان کو لمبی مہلت اور غیر معمولی طاقت دے رکھی ہے اس لئے وہ اللہ ﷻ کی عطا کردہ طاقت کے ساتھ ایسے کام بھی کر سکتا ہے جو عام انسان نہیں کر سکتے۔

آیت نمبر ۱۸: اگر کوئی آسمانوں کی خبریں چوری چھپے سننے کے لئے اوپر جاتا ہے تو آگ کا انگارہ اس کے تعاقب میں لپکتا ہے۔

علمی بات: یہ حقیقت قرآنِ حکیم نے کئی جگہ بیان فرمائی ہے کہ شیاطین اور سرکش جنات آسمان کے اوپر جا کر عالمِ بالا کی خبریں حاصل کرنا چاہتے ہیں، تاکہ وہ خبریں کاہنوں اور نجومیوں تک پہنچائیں اور وہ ان کے ذریعے لوگوں کو یہ باور کرائیں کہ انہیں غیب کی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں، لیکن آسمان میں ان کا داخلہ شروع ہی سے بند ہے، البتہ آنحضرت ﷺ کی دُنیا میں تشریف آوری سے پہلے یہ شیاطین اور سرکش جنات آسمان کے قریب جا کر فرشتوں کی باتیں چوری چھپے سننے کی کوشش کرتے تھے اور وہاں سے کوئی بات کان میں پڑ جاتی تو اس کے ساتھ سینکڑوں جھوٹ ملا کر کاہنوں کو بتا دیتے تھے، اس طرح کبھی کوئی بات صحیح بھی نکل آتی تھی۔ لیکن آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کے بعد ان کو آسمان کے قریب جانے سے بھی روک دیا گیا، اب اگر وہ ایسی کوشش کرتے ہیں تو ان کو ایک شعلے کے ذریعے مار کر بھگا دیا جاتا ہے۔

علمی بات: حضور نبی کریم ﷺ جس طرح انسانوں کے لئے پیغمبر ہیں، اسی طرح جنات کے لئے بھی پیغمبر ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے جنات کو بھی تبلیغ فرمائی اور یہ سلسلہ اس طرح شروع ہوا کہ آپ ﷺ کے ظہورِ نبوت سے پہلے جنات کو آسمانوں کے قریب تک پہنچنے دیا جاتا تھا، لیکن حضور اقدس ﷺ کی بعثت کے بعد انہیں آسمانوں کے قریب جانے سے اس طرح روک دیا گیا کہ جب کوئی جن یا شیطان آسمان کے قریب پہنچنا چاہتا تو اسے ایک شعلہ کے ذریعے مار بھگا دیا جاتا تھا۔

نوٹ: جنات کے متعلق مزید تفصیلات مطالعۂ قرآنِ حکیم حصّہ سوم اور اس کے رہنمائے اساتذہ میں "سورۃ الجن" میں ملاحظہ فرمائیں۔

آیت نمبر ۱۹: اللہ ﷻ کی قدرت کے حکیمانہ نظام کا بیان ہے۔ اللہ ﷻ نے زمین کو پھیلا کر اس پر مضبوط پہاڑ جما دیئے۔ کائنات کے نظام میں ہر چیز کی مقدار اور تعداد اس حد تک رکھ دی گئی جس حد تک اس کی ضرورت ہے۔

علمی بات: عالمِ بالا میں اپنی قدرت کے کمالات کا ذکر کرنے اللہ ﷻ کے بعد اب حضرت انسان کو کرۂ ارض میں غور و فکر کی دعوت دی جا رہی ہے۔ جہاں وہ اپنی زندگی کی مدت پوری کرتا ہے۔ فرمایا اس زمین کو دیکھو ہم نے اسے کتنا کشادہ کر دیا۔ اربوں کی تعداد میں تو صرف انسان یہاں بستے ہیں۔ پھر اسی پر ان کے رہنے کے مکان ہیں۔ یہیں ان کی وسیع سیر گاہیں ہیں۔ اس کے رقبہ کا شمار بھی کوئی آسان بات نہیں انسان کے علاوہ ان گنت قسم کے پرند و چرند کے لاتعداد افراد کا بھی یہ مسکن ہے۔ اس کی کشادگی کا اندازہ کرنا ہو تو ذرا ان صحراؤں کو دیکھو، جو ہزاروں میل کے رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ پھر یہ بلند و بالا پہاڑ جو اپنی جگہ پر کیل کی طرح ٹھکے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سب چیزیں اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں اور زمین میں سمائی ہوئی ہیں، تو جس قادرِ مطلق نے اتنی وسیع زمین بنائی ہے اور اس میں تمہاری آسائش کے لئے ہر ضروری سامان مہیّا کر دیا ہے اس کی اُلوہیت اور وحدانیت کا انکار کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔

علمی بات: ہر چیز کی پیدائش اور افزائش اللہ ﷻ کے مقررہ اندازے کے مطابق ہی ہو سکتی ہے۔ موجودہ تحقیقات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ نباتات کی ہر نوع میں تناسل کی اس قدر زبردست طاقت ہے کہ اگر صرف ایک ہی پودے کو زمین میں بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا موقع دیا جائے تو چند ہی سالوں میں اسی جنس کے پودے تمام روئے زمین پر پھیل جائیں اور کسی دوسری قسم کے پودے کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہے اور یہ حکیم و علیم اور قادرِ مطلق کا سوچا سمجھا اندازہ ہی ہے جس کے مطابق بے شمار قسم کی نباتات اس زمین پر اُگ رہی ہے اور ہر نوع کی پیداوار اپنی ایک مخصوص حد تک پہنچ کر رک جاتی ہے مزید یہ کہ ہر نوع کی پیداوار کو اس علاقہ کی ضرورت اور وہاں کے لوگوں کی طبیعت کے مطابق پیدا کیا جاتا ہے۔ پھر ہر چیز زمین سے خوراک حاصل کر کے بڑھتی اور پھلتی پھولتی ہے لیکن وہ بھی ایک مخصوص حد تک پہنچ کر رک جاتی ہے مثلاً آج کل انسان عموماً پانچ سے چھ فٹ تک لمبا ہے تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی انسان دُوگنی خوراک کھا کر بارہ فٹ لمبا ہو جائے۔ یہی حال دوسری مخلوق کا ہے خواہ یہ نباتات کی قسم سے ہو یا حیوانات کی قسم سے یا انسان ہو۔ غرض جاندار کیا اور بے جان کیا۔ ہر چیز کے ہر ہر پہلو سے تعلق رکھنے والی اللہ ﷻ نے حدیں مقرر کر رکھی ہیں جن سے وہ تجاوز نہیں کر سکتیں۔

آیت نمبر ۲۰: اللہ ﷻ نے انسان کو پیدا کر کے اس کی روزی کا سامان زمین میں پیدا فرمایا۔ اس کے علاوہ انسان کے تابع چوپایوں اور دیگر لاتعداد مخلوق کی روزی بھی زمین کے ساتھ وابستہ کر دی گئی ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ انسانوں کو مخاطب کر کے فرما رہا ہے کہ تم اس غلط فہمی کا شکار ہو کہ تم اپنے رزق کے خود کفیل ہو اور اس کا اہتمام تم خود کرتے ہو، یہ بات خلاف واقع ہے۔ یہ پانی جو تم پیتے ہو، یہ روٹی جو تم کھاتے ہو، یہ گوشت سبزیاں پھل وغیرہ جو تم استعمال کرتے ہو ان کے فراہم کرنے والے تو ہم ہیں۔ تم نے تو صرف ان کو پکا کر کھالیا اور پکانے اور ان چیزوں کو کام میں لانے کی سمجھ بھی ہماری دی ہوئی ہے اور اس کے علاوہ ادھر دیکھو یہ اَن گنت پرندے، یہ جنگلی جانور اور درندے، یہ کیڑے مکوڑے، یہ سمندر میں بسنے والی بے انداز جاندار مخلوق کیا ان کا کھانا تمہارے مطبخ سے پک کر جاتا ہے۔ انہیں بھی ہم دیتے ہیں اور تمہیں بھی ہم کھلاتے ہیں۔

علمی بات: اگرچہ ہر چیز کو رزق تو حقیقت میں اللہ ﷻ ہی دیتا ہے، لیکن بعض پالتو جانور ایسے ہیں جنہیں انسان ظاہری طور پر چارہ فراہم کرتا ہے، ان کے علاوہ اکثر مخلوقات ایسی ہیں جنہیں رزق مہیّا کرنے میں ظاہری طور پر بھی انسان کا کوئی دخل نہیں ہے، اس آیت میں اللہ ﷻ فرما رہے ہیں کہ ہم نے انسانوں کے لئے بھی رزق کے سامان پیدا کئے ہیں اور ان مخلوقات کے لئے بھی جنہیں انسان ظاہری طور پر کوئی غذا فراہم نہیں کرتا۔ اللہ ﷻ نے انسان کے فائدے کے لئے وہ مخلوقات بھی پیدا کی ہیں جن کو وہ ظاہری طور پر بھی رزق نہیں دیتا مگر ان سے فائدہ اٹھاتا ہے جیسے شکار کے جانور۔

آیت نمبر ۲۱: اللہ ﷻ کے پاس ہر چیز کے خزانے اور وسائل لامحدود ہیں۔ لیکن وہ انہیں حکمت اور طے شدہ مقدار کے مطابق ہی مہیّا فرماتا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کے پاس ہر چیز کے خزانے موجود ہیں لہٰذا وہ چاہتا تو تمام انسانوں کو وافر رزق اور مال و دولت عطا کر سکتا تھا۔ مگر اس کی حکمت کا تقاضا ایسا نہیں کیونکہ ایک تو رزق کی فراوانی عموماً اللہ ﷻ کو بھول جانے اور گمراہ ہو جانے کا سبب بن جاتی ہے اِلّاماشاء اللہ۔ دوسرے اگر تمام لوگ ہی مالدار ہوتے اور محتاج کوئی بھی نہ ہوتا تو دُنیا کا موجودہ نظام چل ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ اسی صورت میں چل سکتا ہے کہ ایک کو دوسرے کی احتیاج ہو۔ امیر کو غریب کی احتیاج ہو اور غریب کو امیر کی۔ پھر اس میں انسان کی آزمائش بھی ہے۔ لہٰذا رزق کی کمی بیشی کا تمام تر معاملہ اللہ ﷻ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔

پھر یہ معاملہ صرف رزق تک محدود نہیں بلکہ اس میں ضروریاتِ زندگی کی تمام اشیاء شامل ہیں۔ مثلاً ہوا، پانی، روشنی، حرارت، گرمی، سردی، ان میں سے کوئی بھی چیز اپنی مقرر حد سے بڑھ جائے یا کم ہو جائے تو انسان کی زندگی محال ہو جائے۔ گویا اللہ ﷻ کے پاس خزانے تو ہر چیز کے ہیں مگر وہ انہیں اپنی حکمت اور طے شدہ مقدار کے مطابق ہی مہیّا کرتا ہے۔ مثلاً پانی کی افراط بھی اگر طوفان کی صورت اختیار کر جائے تو وہ بھی انسان کی ہلاکت کا موجب ہے اور تفریط ہو تو وہ بھی۔ یہی حال دوسری ضروریات زندگی کا ہے۔

آیت نمبر ۲۲: پانی کے گردشی نظام کا بیان ہے۔ زمین و آسمان کے درمیان ہوا بادلوں کو اُٹھاتی ہے جس میں پانی ہوتا ہے۔ آسمان سے برسنے والے پانی سے انسان سارا سال پانی حاصل کرتا ہے۔ انسان خود اپنی ضرورت کے لئے سال بھر کا پانی جمع کرنے پر قادر نہیں ہے۔

علمی بات: اللہ سبحانہ و تعالیٰ ٹھنڈی ہواؤں کے ذریعے سے بادل کو جو محض بھاپ ہوتی ہے بارش کے پانی میں بدل دیتا ہے، پھر اسے زمین پر برساتا ہے، جس سے انسان خود بھی سیراب ہوتا ہے اور اپنی زمینوں اور جانوروں کو بھی سیراب کرتا ہے۔ انسان اس بادل کے ایجاد کرنے اور اسے بارش کی شکل میں زمین پر برسانے سے بالکل عاجز ہے اور نہ اسے وادیوں، پہاڑوں، چشموں اور کنوؤں تک پہنچا کر آئندہ کے لئے محفوظ کرنے کی قدرت رکھتا ہے، وہ تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہے جو ان تمام باتوں پر قادر ہے، وہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور تمام مخلوقات کی ہلاکت کے بعد صرف اسی کی ذات باقی رہے گی۔

علمی بات: اس آیت میں قدرتِ الٰہی کے اس حکیمانہ نظام کی طرف اشارہ ہے جس کے ذریعہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسان، جانور، چرند، پرند اور درندوں کے لئے ضرورت کے مطابق پینے، نہانے، دھونے اور کھیتوں درختوں کو سیراب کرنے کے لئے پانی بلا کسی قیمت کے مل جاتا ہے اور جو کچھ کسی کنواں بنانے یا پائپ لگانے پر خرچ کرنا پڑتا ہے وہ اپنی سہولتیں حاصل کرنے کی قیمت ہے پانی کے ایک قطرہ کی قیمت بھی کوئی ادا نہیں کر سکتا نہ کسی سے مانگی جاتی ہے۔

آب رسانی کا یہ نظامِ الٰہی ہزاروں نعمتیں اپنے اندر لئے ہوئے ہے اوّل تو پانی کو پیدا کرنا ایک بڑی نعمت ہے پھر بادلوں کے ذریعہ اس کو زمین کے ہر خطہ پر پہنچانا دوسری نعمت ہے پھر اس کو انسان کے پینے کے قابل بنا دینا تیسری نعمت ہے پھر انسان کو اس کے پینے کا موقع دینا چوتھی نعمت ہے پھر اس پانی کو ضرورت کے مطابق جمع اور محفوظ رکھنے کا محکم نظام پانچویں نعمت ہے پھر انسان کو اس سے پینے اور سیراب ہونے کا موقع دینا چھٹی نعمت ہے کیونکہ پانی کے موجود ہوتے ہوئے بھی ایسی آفتیں ہو سکتی ہیں کہ ان کی وجہ سے آدمی پینے پر قادر نہ ہو۔ اس مقام پر انہی نعمتوں کی طرف اشارہ اور تنبیہ کی گئی ہے۔

آیت نمبر ۲۳: انسان کی روزی کی طرح اس کی حیات و ممات بھی اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ ہر چیز کا وارث بھی اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی ہے۔

علمی بات: انسان جب دُنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اپنا مال دُنیا ہی میں چھوڑ کر چلا تا ہے گو اس کے اقرباء اس کے وارث ہوتے ہیں لیکن مجازی طور پر کیونکہ ان کا وارث ہونا اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہوتا ہے اس لئے حقیقتاً اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی اس مال کا وارث ہوتا ہے اور اس سے زیادہ واضح حقیقت یہ ہے کہ جب قیامت کا بگل بجے گا اور تمام انسان اس دُنیا سے رخصت ہو جائیں گے تو بنی نوع انسان کی ساری املاک اور تمام اثاثہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی کے قبضہ میں جائے گا۔ لہٰذا اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی سب کا وارث یعنی مالک ہے۔

آیت نمبر ۲۴: اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے علم کی وسعت کا بیان ہے کہ بے شک اللہ سبحانہ و تعالیٰ پہلوں کو بھی جانتا ہے اور بعد والوں کو بھی۔

پہلے اور بعد کے لوگوں سے مراد یہ ہیں:
۱۔ اسلام لانے میں آگے نکل جانے والے اور پیچھے رہ جانے والے۔
۲۔ یا وہ لوگ جو پہلے گزر چکے اور بعد میں آنے والے ہیں۔
۳۔ یا نیکی میں آگے بڑھنے والے اور پیچھے رہ جانے والے۔

علمی بات: اللہ سبحانہ و تعالیٰ ان سب سے پوری طرح باخبر ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اگلے اور پچھلے تمام انسانوں کی خبر رکھتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جتنے لوگ دُنیا میں آئے اور گزر گئے اور جتنے لوگ قیامت تک پیدا ہوں گے، سب کی خبر رکھتا ہے۔ کون انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان لایا، کس نے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی بندگی کی اور کس نے نافرمانی کی؟ کوئی بات بھی اس سے مخفی نہیں اور یہ حقیقت جس طرح اس کے کمالِ قدرت کی دلیل ہے، اسی طرح اس کے کمال علم کی بھی دلیل ہے اور قیامت کے دن اللہ سبحانہ و تعالیٰ اوّل و آخر تمام انسانوں کو ان کی کثرت کے باوجود میدانِ محشر میں جمع کرے گا اور اپنے علم و حکمت کے مطابق ان سے معاملہ کرے گا۔ کس آدمی کے اندر کون سی بُری صفت پوشیدہ ہے اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے کچھ بھی مخفی نہیں ہے۔ وہ سب کو ان کے اعمال و اخلاق کے مطابق بدلہ دے گا۔

آیت نمبر ۲۵: دوبارہ پیدا کئے جانے پر اعتراض کرنے والوں کی طرف اشارہ ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ہر بات حکیمانہ ہے جس کے مطابق وہ فیصلہ کرتا ہے۔ وہ ہر شخص کے اعمال سے باخبر ہے جس کے مطابق قیامت کے دن ہر ایک کو جزائے عمل کے مرحلے سے گزرنا ہو گا۔

علمی بات: یعنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا بھی یہ ہے کہ انسان کو قیامت کے دن پھر زندہ کرے اور ان کو ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے اور وہ ہر شخص کو خواہ اس کو مرے ہوئے ہزارہا سال بھی کیوں نہ گزر چکے ہوں اور خواہ اس کے ذرے اُڑ کر کہیں سے کہیں کیوں نہ چلے گئے ہوں وہ ان سب کو جانتا بھی ہے اور ان کو یکجا کرنے پر بھی قادر ہے۔ جب حکمت کا تقاضا بھی ہو اور کوئی چیز اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے علم سے باہر بھی نہ ہو اور وہ ہر چیز پر قادر بھی ہو تو پھر قیامت کے انکار کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا بجز اس بدنصیب کے جسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے علم محیط، قدرتِ کاملہ اور حکمت بالغہ پر ایمان نہ ہو۔

آیت نمبر ۲۶: اس آیت میں انسان کی تخلیق کا بیان۔ قرآنِ حکیم میں مختلف مراحل کا ذکر آتا ہے۔ اللہ ﷻ نے انسان کو بجنے والی مٹی سے پیدا کیا جو سڑے ہوئے گارے کی مانند تھی۔

علمی بات: مٹی کی مختلف حالتوں کے اعتبار سے اس کے مختلف نام ہیں، خشک مٹی "تراب" گیلی مٹی "طِین" گوندھی ہوئی بدبو دار "حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ" وغیرہ۔ جب "حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ" خشک ہو کر کھن کھن بولنے لگے تو "صَلْصَالٍ" اور جب اسے آگ میں پکالیا جائے اور ٹھیکری بن جائے تو "الفَخَّار" کہلاتی ہے۔ یہاں اللہ ﷻ نے انسان کی تخلیق کا جس طرح تذکرہ کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم خاکی کا پتلا "حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ" (گوندھی ہوئی، سڑی ہوئی، سیاہ بودار) مٹی سے بنایا گیا۔ جب وہ سوکھ کر کھن کھن کرنے لگا، یعنی "صَلْصَالٍ" ہو گیا تو اس میں روح پھونکی گئی، جیسا کہ ارشاد فرمایا: خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّار "اس (اللہ) نے انسان کو ٹھیکرے کی طرح بجتی ہوئی مٹی سے پیدا فرمایا اور اس نے جنات کو آگ کے شعلے سے پیدا فرمایا" (سورۃ الرحمٰن ۵۵ آیات: ۱۴، ۱۵) اور فرمایا: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ۔ "اور یقیناً ہم نے انسان کو چنی ہوئی مٹی سے پیدا فرمایا۔" (سورہ المؤمنون ۲۳ آیت: ۱۲)

فرمانِ نبوی ﷺ: "سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "فرشتے نور سے پیدا کئے گئے اور جنات شعلے والی آگ سے پیدا کئے گئے اور آدم (عَلَیْہِ السَّلَام) اس شے سے پیدا کئے گئے جس کی صفت تمہارے سامنے بیان کر دی گئی ہے (یعنی مٹی سے)۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۲۷: جنوں کی تخلیق انسانوں سے پہلے ہوئی تھی۔ جنوں کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا گیا۔

علمی بات: انسان سے پہلے ایک اور نوع کو پیدا کیا گیا تھا جس کا نام جان ہے۔ اس کی تخلیق "نَارِ السَّمُوْم" سے ہوئی۔ سموم اس آگ کو کہتے ہیں، جو سخت تیز گرم ہو اور جس سے دھواں نہ اٹھے۔

علمی بات: جس طرح انسان کے جدِّ امجد حضرت آدم (عَلَیْہِ السَّلَام) ہیں اسی طرح جنات میں سب سے پہلے جس جن کو پیدا کیا گیا اس کا نام جان تھا اور اسے آگ سے پیدا کیا گیا۔

علمی بات: ان کو جن اس لئے کہتے ہیں کہ یہ لوگوں سے چھپے ہوئے ہوتے ہیں اور لوگ ان کو نہیں دیکھ سکتے۔

آیت نمبر ۲۸: اللہ ﷻ نے فرشتوں کو انسان کی تخلیق سے متعلق آگاہ فرمایا۔

علمی بات: حضرت آدم عَلَیْہِ السَّلَام کو اللہ ﷻ نے ان کی تخلیق کے وقت جو عزّت بخشی اس کا ذکر ہو رہا ہے کہ فرشتوں کو انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو سب ان کی تعظیم کے لئے سجدے میں گر گئے، لیکن ابلیس نے کفر و عناد اور حسد و تکبر کی وجہ سے حکمِ الٰہی سے سر تابی کی اور اللہ ﷻ سے کہا کہ میں آدم کو سجدہ نہیں کروں گا، کیونکہ اے اللہ! تو نے اسے سڑی ہوئی مٹی کے گارے سے پیدا کیا ہے، جب کہ مجھے آگ سے پیدا کیا ہے، جو مٹی سے برتر و بالا ہے۔

آیت نمبر ۲۹: اللہ ﷻ نے حضرت آدم عَلَیْہِ السَّلَام کے خاکی وجود کی تکمیل کے بعد اس میں اپنی طرف سے روح پھونکی۔ پھر فرشتوں کو ان کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا۔ یہ حکم فرشتوں کے ساتھ عزازیل (ابلیس) کو بھی دیا گیا۔

علمی بات: قرآنِ حکیم میں حضرت آدم عَلَیْہِ السَّلَام کا قصّہ کل سات مرتبہ آیا ہے: ۱۔ سورۃ البقرۃ ۲، آیات: ۳۰ تا ۳۹۔ ۲۔ سورۃ المآئدہ ۵، آیات: ۲۵ تا ۳
۳۔ سورۃ الاعراف ۷، آیات: ۹ تا ۲۷۔ ۴۔ سورۃ الحجر ۱۵، آیات: ۲۸ تا ۴۲۔ ۵۔ سورۃ بنی اسرائیل ۱۷، آیات: ۶۱ تا ۶۵۔
۶۔ سورۃ طٰہٰ ۲۰، آیات: ۱۱۵ تا ۱۲۴۔ ۷۔ سورۃ صٓ ۳۸، آیات: ۷۱ تا ۸۵۔

علمی بات: انسان کو جو دوسرے تمام جانداروں سے زیادہ عقل و تمیز، قوت، ارادہ و اختیار، مختلف اشیاء کے خواص معلوم کرنے کا علم نیز غور و فکر کے ذریعہ استنباط یا نتائج حاصل کرنے کا علم دیا گیا ہے یہ سب کچھ اسی نفخہ کا نتیجہ ہے۔ اللہ ﷻ نے انسان کو اس شرف سے نواز کر زمین میں اپنا خلیفہ بنایا۔ نیز اپنی طرف سے روح پھونک کر اس عظمت کو بھی واضح کرنا مقصود ہو سکتا ہے کہ روحِ انسانی میں تجلیاتِ الٰہیہ کے قبول کرنے کی ایسی استعداد ہے جو انسان کے علاوہ کسی دوسرے جاندار کی روح میں نہیں ہے۔

علمی بات: آیت مذکورہ میں اللہ ﷻ نے روح کو اپنی طرف منسوب کر کے "مِنۡ رُّوۡحِیۡ" اسی لئے فرمایا ہے کہ تمام مخلوقات میں روحِ انسانی کا اشرف و اعلیٰ ہونا واضح ہو جائے یعنی اس کی عزّت و تکریم بڑھانے کے لئے اسے اپنی روح قرار دیا، یہاں "میری روح" سے مراد اللہ ﷻ کی مخلوق روح ہے کیونکہ اس کی ذات کی مثل تو کوئی چیز نہیں، اس لئے اللہ ﷻ کی ذاتی روح تو کسی صورت مراد نہیں ہو سکتی، صرف حضرت آدم علیہ السلام ہی نہیں دوسری جگہ ہر انسان کی روح کو اللہ ﷻ نے اپنی روح قرار دیا ہے، فرمایا: "جس نے جو چیز بھی بنائی نہایت خوب بنائی اور اس نے مٹی سے انسان کی پیدائش کا آغاز فرمایا۔ پھر اس کی نسل بنائی ایک حقیر پانی (نطفہ) کے خلاصہ سے۔ پھر اس (کے اعضاء) کو درست فرمایا اور اس میں اپنی روح میں سے پھونکا اور تمہیں کان اور آنکھیں اور دل عطا فرمائے (مگر) تم کم ہی شکر کرتے ہو۔" (سورۃ السّجدۃ ۳۲، آیات: ۷ تا ۹) اور ظاہر ہے کہ انسان مخلوق ہے، یہ ایسے ہی ہے کہ ساری زمین اور اس کی ہر چیز اللہ ﷻ ہی کی ہے مگر مسجد حرام کو بیت اللہ (اللہ کا گھر) اور حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو اللہ کی اونٹنی قرار دیا گیا ہے۔

آیت نمبر ۳۰: اللہ ﷻ کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے تمام فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ یہ سجدہ بطورِ تعظیم تھا۔ روح کی بنیاد پر انسان کا اصل شرف ہے۔

علمی بات: تمام فرشتوں کا حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا: اللہ ﷻ نے پہلے جمع کے صیغہ سے فرمایا فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ اس کا معنی ہے سب فرشتوں نے سجدہ کیا۔ كُلُّهُمْ کا مطلب ہے سب فرشتوں نے سجدہ کیا اور اکثر فرشتوں کے سجدہ کرنے کا احتمال ساقط ہو گیا، پھر بھی یہ احتمال باقی رہا کہ بعض فرشتوں نے ایک وقت میں سجدہ کیا ہو اور بعض نے دوسرے وقت میں سجدہ کیا ہو لیکن جب یہ فرمایا اَجْمَعُوْنَ تو یہ احتمال بھی ساقط ہو گیا اور اب معنی یہ ہے کہ تمام فرشتوں نے اکٹھے ہو کر سجدہ کیا، نیز فرمایا سوا ابلیس کے اس کا معنی یہ ہے کہ ابلیس کو بھی سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے تخلیق آدم سے پہلے ہی فرشتوں سے فرما دیا تھا کہ میں ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں جو ٹھیکری کی طرح بجتی ہوئی مٹی سے بنایا جائے گا جب وہ بن جائے اور میں اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو تم اس کے لئے سجدہ ریز ہو جانا یعنی اسے تعظیمی سجدہ کرنا۔ چنانچہ فرشتوں نے حکم مانا فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا اور سب نے بیک وقت مجتمع ہو کر حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کر دیا۔ یہ سجدۂ تعظیمی تھا۔ سجدہ عبادت نہیں تھا۔ عبادت تو غیر اللہ کے لئے کبھی بھی جائز نہیں تھی البتہ سجدۂ تعظیمی بعض سابقہ شریعتوں میں جائز تھا لیکن شریعت محمدیہ ﷺ میں سجدۂ تعظیمی بھی منسوخ کر دیا گیا۔ اب سجدۂ تعظیمی غیر اللہ کے لئے حرام ہے۔

آیت نمبر ۳۱: ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے انکار کر کے انسان پر اپنی برتری کے اظہار کی کوشش کی۔

علمی بات: تمام فرشتوں نے سجدہ کیا لیکن ابلیس نے سجدہ نہیں کیا۔ ابلیس چونکہ ملائکہ میں سے نہ تھا، جنات میں سے تھا۔ جیسا کہ سورۃ الکہف ۱۸، آیت: ۵۰ میں ہے کہ "وہ جنات میں سے تھا" لیکن فرشتوں کے ساتھ عالم بالا میں رہتا تھا اس لئے اس کو بھی سجدہ کا حکم دیا گیا، ابلیس نے کہا کہ میں اس کو سجدہ نہیں کرتا۔

آیت نمبر ۳۲: ابلیس کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ بتانے کے حکم کا بیان کیا گیا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے ابلیس سے پوچھا: تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ شیطان نے کہا: میں مٹی سے بنے ہوئے انسان کو سجدہ کرنے والا نہیں ہوں۔ ابلیس نے تکبر کے ساتھ جواب دیا اور اللہ ﷻ کی جو حکم عدولی کی تھی اسے صحیح ثابت کرنے کے لئے کہنے لگا: میں ایسا نہیں ہوں کہ ایسے انسان کو سجدہ کروں جسے تُو نے سڑے ہوئے گارے کی بجنے والی مٹی سے پیدا کیا ہے۔ (سورۃ الحجر ۱۵: آیت ۳۳) اسی طرح دوسرے مقام پر ذکر ہے کہ ابلیس نے کہا: کیا میں اسے سجدہ کروں جسے تُو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔ (سورۃ بنی اسرائیل ۱۷، آیت: ۶۱)

ابلیس نے اوّل تو نافرمانی کی پھر اوپر سے اللہ ﷻ کے حکم کو حکمت کے خلاف بتایا اور جس مخلوق کو سجدہ کرنے کا حکم فرمایا تھا اسے اس نے اپنے سے کم تر ظاہر کیا یہ سب تکبر کی وجہ سے ہوا۔ اس پر اللہ ﷻ نے شیطان کو جنّت سے نکال دیا اور اس کو ملعون کر دیا۔

آیت نمبر ۳۳: ابلیس نے سجدہ سے انکار کی وجہ یہ بتائی کہ انسان مٹی سے بنایا گیا ہے۔ اس نے انسان کو خود سے کم تر اور حقیر جانا۔ گویا اپنی بڑائی کا اظہار کرنا چاہا۔

علمی بات: شیطان بدبخت کی نظر صرف اس بات پر گئی کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کہ "اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں" کے راز کو نہ سمجھ سکا اور ایسی ٹھوکر کھائی کہ اُس کی عمر بھر کی نیکیاں مسترد کر دی گئیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے درِ رحمت سے دھتکار دیا گیا۔

علمی بات: ابلیس نے یہاں اپنی بڑی ہی بے بصری اور بے بصیرتی کا مظاہرہ کیا، اس نے حضرت آدم علیہ السلام کے ظاہر کو تو دیکھا لیکن باطن سے غافل رہا۔ وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ جس صورت کو تو ویرانہ سمجھ رہا ہے، اسرار کا خزانہ اسی ویرانے میں مدفون ہے۔ الغرض اس نے حضرت آدم علیہ السلام کے ظاہر کو دیکھا، مگر حضرت آدم علیہ السلام کے باطن میں موجود جوہر کو نہ دیکھ سکا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو ظاہر اً عناصرِ اربعہ کا مجسمہ دیکھا، خاک کا پیکر دیکھا۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام کے باطن میں دیکھتا، تو خلافتِ الٰہی کے جلوے دیکھتا، نبوّت و رسالت کی تجلیاں نظر آتیں۔

آیت نمبر ۳۴: تکبر میں آکر اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کرنے والا ابلیس مردود قرار پایا۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس نے ابلیس کو حکم دیا کہ وہ اس مقام و مرتبہ سے نکل جائے جو اسے فرشتوں میں حاصل ہے، کیونکہ اب وہ مردود ہے اور اب روزِ قیامت تک اس پر مسلسل لعنت برستی رہے گی۔ ابلیس نے جب قیامت کے دن تک اپنے اوپر لعنت کی بات سنی تو سمجھا کہ اس کا عذاب اس وقت تک ٹال دیا گیا ہے، اسی لئے اس نے اللہ تعالیٰ سے طلب کیا کہ اسے اس دن تک موت نہ آئے، تو اللہ تعالیٰ نے اسے مہلت دے دی۔

آیت نمبر ۳۵: اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابلیس پر قیامت تک کے لئے لعنت برستے رہنے کا اعلان کیا گیا۔

علمی بات: یعنی قیامت کے دن تک اللہ تعالیٰ کی پھٹکار اور بندوں کی طرف سے لعنت پڑتی رہے گی۔ اس طرح آناً فاناً خیر سے بعید تر ہوتا رہے گا۔ جب قیامت تک خیر کی توفیق نہ ہوگی تو اس کے بعد تو کوئی موقع ہی نہیں کیونکہ آخرت میں ہر شخص وہ ہی کاٹے گا جو یہاں دُنیا میں اُس نے بُویا ہے۔ یوں قیامت کے دن تک تو لعنت رہے گی۔ اس کے بعد جو بے شمار قسم کے عذاب ہوں گے وہ لعنت سے کہیں زیادہ ہیں۔

آیت نمبر ۳۶: ملعون قرار دیئے جانے کے بعد ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے قیامت تک مہلت مانگی۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہونے کے باوجود ابلیس نے ربِّ کریم کی بارگاہ میں درخواست پیش کی کہ اے میرے رب! مجھے قیامت تک زندہ رکھ اور مہلت دے کہ میں ابنِ آدم کو گمراہ کرتا رہوں۔ گویا ابلیس اس حکم اخراج اور اس لعنت سے شرمندہ یا مرعوب ہونے کے بجائے اور زیادہ اکڑ گیا۔ اس نے روزِ قیامت تک کے لئے اس لئے مہلت مانگی کہ اس کو موقع مل جائے کہ وہ آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کو اپنے فتنوں میں مبتلا کر کے یہ ثابت کر سکے کہ یہ اس شرف کے اہل نہیں ہیں جو ان کو بخشا گیا ہے اور ان کو سجدہ نہ کرنے کے معاملے میں وہ بالکل بجانبِ حق ہے۔

آیت نمبر ۳۷: اللہ تعالیٰ نے ابلیس کی درخواست قبول فرمالی۔ اس میں حکمت ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کی آزمائش ہو جائے، ابلیس کی قوت یا ہستی اگر باقی نہ رہے تو اس عالم ابتلاء کی مصلحتیں ہی فوت ہو جائیں لیکن یہ بھی خوب واضح رہے کہ ابلیس کے ہاتھ میں قوت صرف پھسلانے اور سبز باغ دکھانے کی ہے، گویا وہ بزور کسی کو بُرائی پر نہیں لگا سکتا ہاں ترغیب دے سکتا ہے یہاں اس نے مہلت مانگی تھی اور اس کی خواہش کے مطابق دی گئی۔

آیت نمبر ۳۸: معینہ وقت تک کے لئے ابلیس کو مہلت دے دی گئی۔

علمی بات: معین وقت تک شیطان زندہ رہے گا۔ ویسے تو جنات کی عمریں انسانوں سے کافی زیادہ ہوتی ہوں گی مگر ایسا کوئی جن بھی نہیں ہے جو اس ابتدائی تخلیق کے وقت سے لے کر آج تک زندہ ہو، ماسوائے اس ایک جن کے جس کا نام عزازیل (شیطان اور ابلیس) ہے۔ باقی اس کی اولاد اور ذُرّیت اپنی جگہ ہے۔

علمی بات: شیطان نے مہلت تو روزِ حشر تک کے لئے مانگی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس وقت کے بجائے ایک اور معین وقت تک کے لئے اسے مہلت دی، اکثر مفسرین کے مطابق وہ پہلے صور کے پھونکنے تک ہے جس کے بعد ساری مخلوقات کو موت آئے گی، اس وقت شیطان کو بھی موت آجائے گی۔ اس نے تو کہا تھا کہ یوم البعث یعنی دوبارہ اٹھنے کے وقت تک اس کو مہلت مل جائے تاکہ وہ موت سے بچ جائے۔ مگر ایسا نہ ہوا اور اس کی یہ دُعا قبول نہ ہوئی۔ البتہ نفخہ اولیٰ تک اس

کو لمبی مدت کی مہلت مل گئی تا کہ بنی آدم کے خلاف جو کچھ وہ کرنا چاہے کر لے۔ اللہ ﷻ کی حکمت و مشیّت اور بنی آدم کی ابتلاء آزمائش کا تقاضا یہی تھا، پس اس کی ایک درخواست تو قبول ہو گئی اس کو لمبی مہلت مل گئی مگر دوسری قبول نہ ہوئی کہ وہ یوم البعث تک زندہ رہے۔

آیت نمبر ۳۹: ابلیس کا انسانوں کو گمراہ کرنے کے عزم کا بیان ہے۔ اس نے قسم کھا کر کہا کہ وہ انسان کے سامنے دُنیا کی لذّتیں اور عارضی فوائد کو خوشنما بنا کر پیش کرے گا۔

علمی بات: ابلیس نے اللہ ﷻ کی قسم کھا کر کہا کہ جب تک آدم کی اولاد دُنیا میں رہے گی، میں دُنیا کو اس کے سامنے خوبصورت بنا کر پیش کروں گا اور انہیں گناہوں پر ابھاروں گا۔

علمی بات: چاہیئے تو یہ تھا کہ ربِ کریم کی شفقت و مہربانی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ابلیس اللہ ﷻ سے معافی کا خواستگار ہوتا۔ مگر معافی کا خواستگار ہونے کے بجائے مزید سرکشی اور گستاخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے میرے رب! چونکہ تو نے مجھے آدم کی وجہ سے رُسوا کیا ہے۔ اس لئے میں زمین پر جا کر آدم اور اس کی اولاد کو خوش فہمیوں اور فریب کاریوں کے ذریعے گمراہ کروں گا۔

آیت نمبر ۴۰: شیطان نے پہلے ہی اپنی بے بسی کا اعلان کر دیا کہ اللہ ﷻ کے مخلص اور منتخب بندوں پر اس کا کوئی حملہ کامیاب نہ ہوگا۔

علمی بات: شیطان نے کہا اے اللہ! تیرے مخلص بندے میرے چنگل سے بچ جائیں گے۔ میں ان کو گمراہ نہیں کر سکوں گا۔ یعنی مستقل طور پر شیطان اللہ ﷻ کے مخلص بندوں کو گمراہ نہیں کر سکتا۔ مخلص کا معنی ہے جو بلا شرکت غیر اللہ ﷻ پر ایمان لائے اور اخلاص کے ساتھ اللہ ﷻ کی عبادت کرے اور اس کے رسول ﷺ کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق زندگی بسر کرے۔ ابلیس کو مہلت دینے کی حکمت یہ ہے تا کہ اس کے ذریعے لوگوں کو آزمایا جائے۔

علمی بات: شیطان نے اللہ ﷻ سے کہا کہ وہ بندے جن کو تو نے اپنی عبادت و طاعت کے لئے چن لیا اور شکوک و شبہات کی آلودگیوں سے پاک و صاف رکھا۔ ان پر میرا بس نہیں چلتا۔ یہ وہ پاک لوگ ہیں جن کے عزم و استقامت کے سامنے شیطان ہار ماننے پر مجبور ہے۔

آیت نمبر ۴۱: بندوں کا اخلاص ہی اللہ ﷻ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ ہے۔ اخلاص کے ساتھ بندگی کرنے والے شیطان سے محفوظ رہتے ہیں۔ اللہ ﷻ نے اسی وقت واضح فرما دیا کہ جو لوگ اخلاص اور بندگی کا راستہ اختیار کریں گے وہ سیدھا اللہ ﷻ تک پہنچ گا یعنی اس راہ پر چلنے والے کو اُس کی رضا حاصل ہو گی اور ایسے لوگوں پر شیطان کے بہکاوے کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔

علمی بات: جس نے بناوٹ، ریا، تکلّف اور تصنع سے کلیۃً اجتناب کرتے ہوئے اخلاص کو اپنا شعار بنایا۔ وہی اس راہ پر گامزن ہوا جو سیدھا اسے اللہ ﷻ کے پاس لے جائے گا۔ جو بندے عبودیت و اخلاص کی راہ اختیار کریں گے وہی شیطان لعین کے تسلّط سے مامون رہیں گے۔

آیت نمبر ۴۲: اللہ ﷻ کے مخلص بندوں پر ابلیس کو اختیار حاصل نہیں ہو گا۔ البتہ گمراہ لوگ جو ابلیس کی پیروی کریں گے ان پر اس کو غلبہ حاصل ہو گا۔ جو لوگ راہِ حق سے بھٹکے ہوئے ہوں اور گمراہی جن کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہو وہ شیطان کی سازش کا شکار ہو جائیں گے۔ ایسے تمام لوگوں کا ٹھکانہ جہنّم ہو گا۔

علمی بات: میرے بندوں سے مراد وہ بندے ہیں جو اللہ ﷻ کے حکم پر چلنے کا پختہ عزم رکھتے ہیں اور اسی سے مدد مانگتے ہیں، ایسے لوگوں پر شیطان کا زور نہ چلنے کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ شیطان انہیں بھی گمراہ کرنے کی کوشش تو کرے گا لیکن وہ اپنے اخلاص اور اللہ ﷻ کے فضل سے اس کے دھوکے میں نہیں آئیں گے۔ جب بندوں میں سے جو اپنے اختیار سے ابلیس کی پیروی کرے گا وہ اس کا تابع ہو گا اور یہ پیروی بھی اس وجہ سے نہیں ہو گی کہ ابلیس اس کو زبردستی یا جبر سے اپنا پیروکار بنائے گا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”شیطان نے کہا: اے میرے رب! تیری عزّت کی قسم میں ہمیشہ تیرے بندوں کو گمراہ کرتا رہوں گا جب تک ان کے جسموں میں روحیں موجود ہیں۔ اللہ ﷻ نے فرمایا مجھے میری عزّت اور جلال کی قسم! میں ہمیشہ انہیں معاف کرتا رہوں گا جب تک یہ مجھ سے بخشش طلب کرتے رہیں گے۔“

آیت نمبر ۴۳: ابلیس کی پیروی کر کے گمراہ ہونے والوں کے لئے جہنّم کی وعید سنائی گئی ہے۔

علمی بات: جب ابلیس نے کہا کہ میں ان سب کو گمراہ کروں گا تو اللہ ﷻ نے فرمایا "تو میں ضرور جہنّم کو بھر دوں گا تجھ سے اور ان سب سے جو تیری پیروی کریں گے۔" (سورۃ صٓ ۳۸، آیت:۸۵)

عملی پہلو: ابلیس تو اپنے تکبر کی وجہ سے جہنّم میں جانے کو تیار ہے۔ بنی آدم پر افسوس ہے کہ وہ اپنے اس دشمن کی باتوں پر چلتے ہیں جس نے انہیں گمراہ کرنے کی قسم کھائی تھی، ابلیس تو اپنی قسم پر جما ہوا ہے لیکن بنی آدم جو اس کے ہاتھ لگے ہوئے ہیں اور اس کے پیروکار بنے ہوئے ہیں وہ ذراسی لذّت کی وجہ سے جو گناہوں میں محسوس ہوتی ہے اپنی جانوں کو دوزخ میں گھسیٹ دیتے ہیں، دشمن کی بات مانتے ہیں اور خالق و مالک کی نصیحت پر عمل کرنے کو تیار نہیں، عجیب بات ہے کہ بنی آدم میں سے جو شخص دشمن ہو جائے اسے تو دشمن سمجھتے ہیں اور ابلیس کے ساتھ دشمن والا معاملہ نہیں کرتے جس کے بارے میں اللہ ﷻ نے بار بار عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ (کھلا ہوا دشمن) فرمایا ہے۔

آیت نمبر ۴۴: اس آیت میں جہنّم کی کچھ وضاحت کا بیان ہے:

۱۔ جہنّم کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازہ خاص قسم کے مجرمین کے لئے مخصوص ہوگا۔

۲۔ یا سات دروازے سے مراد جہنّم کے سات درجے اور طبقات ہیں جو ایک دوسرے کے اوپر ہیں۔ واللہ اعلم

علمی بات: ھُم سے ابلیس کے پیروکار مراد ہیں۔ تقسیم شدہ حصّہ سے مراد یہ ہے کہ ایک ہی گناہ کے مجرم الگ کر دیئے جائیں گے اور وہ سب ایک ہی دروازہ سے داخل ہوں گے۔ جیسے دہریے ایک دروازے سے، مشرک الگ دروازہ سے، منافق الگ دروازے سے وغیرہ وغیرہ۔ بالفاظ دیگر جہنّم کے ہر طبقہ کے لئے الگ الگ دروازہ ہوگا اور یہ طبقات بھی سات ہی ہوں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک ان کے نام یہ ہیں۔ جہنّم، سعیر، لظیٰ، حطمہ، سقر، جحیم اور ہاویہ۔ جہنّم کا لفظ ان سب طبقات کے لئے عام بھی ہے اور پہلے طبقہ کا نام بھی ہے اور بعض لوگوں نے ان طبقات کے لئے گناہ گاروں کی یوں تقسیم کی ہے۔ پہلے طبقہ جہنّم میں گنہگار مسلمان۔ دوسرے طبقہ سعیر میں یہود، تیسرے طبقہ لظیٰ میں نصاریٰ، (بعض مفسرین نے دوسرے طبقہ میں نصاریٰ اور تیسرے میں یہود کا ذکر کیا ہے) چوتھے طبقہ حطمہ میں صائبین، پانچویں طبقہ سقر میں مجوسی، چھٹے طبقہ میں مشرک اور ساتویں طبقہ میں منافق جو سب سے نچلا طبقہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ہر طبقہ میں تدریجاً عذاب زیادہ ہوتا جائے گا اور مختلف گناہوں والے اپنے اپنے گناہوں کی سنگینی کے مطابق الگ الگ حصوں میں ڈالے جائیں گے۔ یہ بھی واضح رہے کہ جہنّم کے تو سات دروازے ہیں جبکہ جنت کے دروازے آٹھ ہیں۔

علمی بات: نصاریٰ سے مراد دور مسیحی ختم ہونے کے بعد جو نصاریٰ عیسائیت پر قائم رہے اور کسی پیغمبر کا انکار کیا یا بعد میں آنے والے پیغمبر کی شریعت کا انکار کیا۔ اسی طرح شریعت موسوی کا زمانہ ختم ہونے کے بعد جو یہودی یہودیت پر قائم رہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام، رسول اللہ ﷺ یا کسی اور پیغمبر کا انہوں نے انکار کیا۔ صابی جو اپنے آپ کو مَوَحِّد کہتے ہیں اور کسی پیغمبر کی شریعت کو نہیں مانتے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ صابی اپنے کو صرف حضرت نوح علیہ السلام کا متبع قرار دیتے ہیں۔ مجوسی آتش پرست اور ستارہ پرست ہیں۔ منافقین وہ ہیں جو بظاہر تو اسلام لانے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن درحقیقت وہ دل سے ایمان لانے کی تصدیق نہیں کرتے۔ ان کی چند خصلتوں کا ذکر سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات میں بھی ہے۔ منافقوں کے متعلق اللہ ﷻ نے فرمایا: اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ "بے شک منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے۔" (سورۃ النسآء ۴، آیت:۱۴۵)

آیت نمبر ۴۵: اللہ ﷻ کے احکامات پر عمل کرنے والے پرہیزگاروں کے لئے انعامات کا ذکر ہے۔ ان کا ٹھکانا باغات اور نہروں والی جنّت میں ہوگا۔

علمی بات: قرآنِ حکیم اپنے معروف طریقے کے مطابق جہنّم اور اہل جہنّم کا حال بیان کرنے کے بعد اب اہل جنّت کا حال بیان کر رہا ہے کہ وہ باغات اور چشموں میں ہوں گے۔

آیت نمبر ۴۶: اہل جنّت کو سلامتی اور اطمینان کے ساتھ جنّت میں داخل ہونے کی بشارت دی جائے گی۔

علمی بات: قیامت کے دن ان سے یہ کہا جائے گا کہ وہ لوگ پوری سلامتی کے ساتھ اور تمام آفات و مصائب سے محفوظ و مامون جنّت میں داخل ہو جائیں۔ اب انہیں

ہر ناپسند چیز سے سلامتی ہے اور آئندہ بھی کسی شر کا اندیشہ نہیں ہے۔ وہ لوگ ایک دوسرے کو سلام کہتے ہوئے، فرشتوں کے سلام سنتے ہوئے اور پروردگار عالم کے "سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْم" (سورۃ یٰسٓ ۳۶، آیت:۵۸) کے ساتھ جنّت میں داخل ہوں گے۔ جنّت کا ایک نام "دار السلام" بھی ہے، جیسا کہ اللہ ﷻ نے ارشاد فرمایا: "ان کے لئے ان کے رب کے پاس سلامتی کا گھر ہے اور وہ ان کا مددگار ہے ان اعمال کی وجہ سے جو وہ کیا کرتے تھے۔" (سورۃ الانعام ۶، آیت:۱۲۷)

آیت نمبر ۴۷: اہلِ جنّت کے سینوں کو ہر قسم کی رنجشوں اور کدورتوں سے پاک کر دیا جائے گا۔ وہ جنّت میں محبت کرنے والے بھائیوں کی طرح رہیں گے اور ایک دوسرے کے آمنے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے۔

علمی بات: دُنیا میں طبعی تقاضے کی وجہ سے ان کے دلوں میں جو رنجش تھی وہ سب ان کے دلوں سے جنّت میں داخل ہونے سے قبل ہی دور کر دی جائے گی کہ سب بھائی بھائی کی طرح اُلفت و محبت سے رہیں گے تختوں پر آمنے سامنے بیٹھا کریں گے وہاں ان کو ذرا بھی تکلیف نہ پہنچے گی اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔

علمی بات: اللہ ﷻ اہلِ جنّت کے سینوں میں کوئی ایسا جذبہ نہیں رہنے دے گا جو ان کی خوشیوں کو پامال کرے اور ان کے دل و دماغ کو مکدر کرے۔ اس لئے ان کے سینوں سے بغض و عداوت اور حسد و کینہ کو یکسر نکال دے گا اور جب ان کے سینے ایسے جذبوں سے پاک ہو جائیں گے تو آپس میں بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے بیٹھیں گے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جنتیوں کے دل ایک آدمی کے دل جیسے ہوں گے کہ نہ ان میں اختلاف ہو گا اور نہ بغض۔" (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۴۸: اس آیت میں جنّت کی دو خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

۱۔ اہلِ جنّت کو جنّت میں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ ۲۔ جنّت میں قیام اور ملنے والی نعمتیں دائمی ہوں گی۔

علمی بات: اس آیت سے جنّت کی دو خصوصیات معلوم ہوئیں، اول یہ کہ کسی کو کبھی تکان اور ضعف محسوس نہ ہو گا بخلاف دُنیا کے کہ یہاں محنت و مشقت کے کاموں سے تو ضعف و تکان ہوتا ہی ہے خاص آرام اور تفریح سے بھی کسی نہ کسی وقت آدمی تھک جاتا ہے اور ضعف محسوس کرنے لگتا ہے خواہ وہ کتنا ہی لذیذ کام اور مشغلہ ہو۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جو آرام و راحت اور نعمتیں وہاں کسی کو مل جائیں گی پھر وہ دائمی ہوں گی نہ وہ نعمتیں کبھی کم ہوں گی اور نہ ان میں سے کسی شخص کو نکالا جائے گا۔ ایک تیسرا احتمال جو یہ تھا کہ نہ جنّت کی نعمتیں ختم ہوں اور نہ اس کو وہاں سے نکالا جائے مگر وہ خود ہی وہاں رہتے رہتے اُکتا جائے اور باہر جانا چاہے قرآنِ حکیم نے اس احتمال کو بھی ایک جملہ میں ان الفاظ سے ختم کر دیا ہے کہ "لَا یَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا"۔ یعنی یہ لوگ بھی وہاں سے پلٹ کر آنے کی کبھی خواہش نہ کریں گے۔

علمی بات: دُنیا میں کوئی شخص دکھ، مصیبت، مشقت اور تھکن سے خالی نہیں، بلکہ یہ ساری زندگی ہی محنت اور مشقت کی ہے۔ یہاں زیادہ سے زیادہ خوشی اور لذّت کے ساتھ بھی کوئی نہ کوئی مشقت، محنت، تھکن یا غم ضرور ہے۔ اللہ ﷻ نے سورۃ البلد کے شروع میں کئی قسمیں کھا کر فرمایا: "یقیناً ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا فرمایا" (سورۃ البلد ۹۰، آیت:۴) اور سورۃ الانشقاق میں فرمایا: "اے انسان! بے شک تو محنت کرنے والا ہے اپنے رب کی طرف (پہنچنے تک)، خوب محنت کرتے ہوئے پھر تُو اس سے ملنے والا ہے۔" (سورۃ الانشقاق ۸۴، آیت:۶) جب کہ جنّت میں نہ کوئی دکھ درد ہو گا نہ تھکاوٹ اور مشقت وغیرہ۔

فرامین نبوی ﷺ: ۱۔ حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (ایک منادی ندا دے گا اے جنّت والو!) بے شک تمہارے لئے یہ ہو گا کہ تم تندرست رہو گے کبھی بیمار نہیں ہو گے اور تمہارے لئے یہ ہو گا کہ تم زندہ رہو گے، کبھی تمہیں موت نہیں آئے گی اور تمہارے لئے یہ ہو گا کہ تم جوان رہو گے، کبھی بوڑھے نہیں ہو گے اور تمہارے لئے طے ہو چکا کہ تم خوش حال رہو گے، کبھی تنگی اور تکلیف نہیں اٹھاؤ گے۔" اور یہی اللہ ﷻ کا فرمان ہے: وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ "اور انہیں آواز دی جائے گی کہ یہی وہ جنّت ہے جس کے وارث تم اس کی وجہ سے بنائے گئے ہو جو تم کیا کرتے تھے۔" (سورۃ الاعراف ۷، آیت:۴۳) (صحیح مسلم)

۲۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب جنّتی جنّت میں اور جہنّمی جہنّم میں پہنچ جائیں گے تو موت کو (ایک مینڈھے کی

شکل میں) لایا جائے گا اور اسے جنّت اور جہنّم کے درمیان رکھ دیا جائے گا، پھر اسے ذبح کر دیا جائے گا، پھر ایک منادی اعلان کرے گا اے جنّت والو! اب موت نہیں اور اے آگ والو! اب موت نہیں، تو جنّت والے اپنی خوشی کے ساتھ اور زیادہ خوش ہو جائیں گے اور آگ والے اپنے غم کے ساتھ اور زیادہ غم زدہ ہو جائیں گے۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۴۹: اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمت کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت بہت وسیع ہے۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ آپ میرے بندوں کو اس بات کی خبر دے دیجیئے کہ جو اپنے گناہوں سے تائب ہو گا اور ایمان و عملِ صالح کی زندگی اختیار کرے گا، اس کے گناہوں کو میں معاف کر دوں گا اور اس کے حال پر رحم کروں گا اور جو شخص اپنے کفر و عصیان پر مُصر رہے گا تو اسے جان لینا چاہیئے کہ میرا عذاب بڑا ہی دردناک ہے۔

آیت نمبر ۵۰: اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت سے فائدہ نہ اٹھانے والوں کے لئے عذاب بھی دردناک ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور عذاب دونوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ کے بندوں کی دو قسمیں ہیں متقی اور غیر متقی پہلے اللہ تعالیٰ نے متقین کا ذکر فرمایا تھا اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے غیر متقین کا ذکر فرمایا ہے۔ اس سے پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ کا خاص لطف و کرم یہ ہے کہ بندوں کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے کہ آپ میرے بندوں کو بتا دیں کہ میں نے اپنے کرم سے اپنے اوپر اپنے بندوں کی مغفرت کو لازم کر لیا ہے۔ چونکہ یہ خدشہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت کی وسعت کا سن کر بندے گناہوں پر دلیر نہ ہو جائیں تو اس کے ساتھ ہی آیت میں فرمایا اور یہ کہ میرا عذاب ہی دردناک عذاب ہے یعنی لوگ عذاب کے ڈر سے گناہوں سے باز رہیں اور اگر شامتِ نفس سے کوئی گناہ ہو جائے تو پھر اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت کی امید رکھیں اور مایوس نہ ہوں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس دن اللہ تعالیٰ نے رحمت کو پیدا کیا تو (۱۰۰) سو رحمتیں پیدا کیں (۹۹) ننانوے رحمتیں اس نے اپنے پاس رکھ لیں اور تمام مخلوق کے پاس ایک رحمت بھیجی اگر کافر یہ جان لیتا کہ اللہ تعالیٰ کے پاس کس قدر رحمت ہے تو وہ جنّت سے مایوس نہ ہوتا اور اگر مومن یہ جان لیتا اللہ تعالیٰ کے پاس کس قدر عذاب ہے تو وہ دوزخ سے بے خوف نہ ہوتا۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی)

آیت نمبر ۵۱: اللہ تعالیٰ کی دو شانوں کے اظہار کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آنے والے مہمان فرشتوں کا بیان ہے۔ انہیں مہمان اس لئے کہا گیا کہ وہ اجنبی صورت میں آئے تھے۔ یہ مہمان فرشتے جو اصل میں تو حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی طرف بھیجے جا رہے تھے کہ ان کی بستی کو تباہ کر ڈالیں۔ پہلے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف آئے۔

علمی بات: گزشتہ آیت میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی وسیع ہے اور عذاب بھی بڑا سخت ہے، لہٰذا انسان کو نہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونا چاہیئے اور نہ اس کے عذاب سے بے فکر ہو کر بیٹھنا چاہیئے۔ اس مناسبت سے ان مہمانوں کا یہ واقعہ ذکر فرمایا گیا ہے، کیونکہ اس واقعے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کا بھی بیان ہے کہ یہ فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بڑھاپے میں حضرت اسحاق علیہ السلام جیسے عظیم بیٹے کی پیدائش کی بشارت لے کر آئے اور اللہ تعالیٰ کے سخت عذاب کا بھی ذکر ہے کہ انہی فرشتوں کے ذریعے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب نازل کیا گیا۔

آیت نمبر ۵۲: مہمانوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سلام کیا۔ فرشتوں نے ملاقات کا ادب ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے سلام کیا۔ ان کی آمد سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ڈر کا اظہار کیا۔

علمی بات: دو خوبصورت نوجوان مہمان بن کر اچانک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھر پر تشریف لائے۔ انہوں نے آکر آپ علیہ السلام کو سلام کہا، یہ گویا اس بات کی علامت تھی کہ ہم آپ علیہ السلام کے لئے سلامتی کا پیغام لائے ہیں، ہم آپ علیہ السلام کے دشمن نہیں۔ آپ علیہ السلام اگرچہ انہیں پہچان نہیں سکے کیونکہ ان کی شکلیں بالکل اجنبی لوگوں کی تھیں۔ لیکن یہ سمجھ کر کہ وہ شریف مہمان ہیں جلدی سے ان کے لئے کھانے کا انتظام کیا۔ جب کھانا ان کے سامنے رکھا گیا تو انہوں نے ہاتھ بڑھانے سے گریز کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں انسانی صورت میں پہنچے تھے اور ابتدا میں انہوں نے اپنا تعارف نہیں کرایا تھا۔ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام

کو کچھ تشویش سی ہوئی۔ کیونکہ اس علاقے کے رواج کے مطابق اگر کوئی مہمان میزبان کی ضیافت قبول نہیں کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ مہمان نہیں بلکہ دشمن ہے اور وہ کسی انتقام کے لئے آیا ہے۔ اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کچھ ڈر محسوس ہوا۔

نوٹ: اس واقعہ کی مزید تفصیلات سورۂ ہود آیات: ۶۹ تا ۷۴ رہنمائے اساتذہ حصّہ پنجم میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

آیت نمبر ۵۳: مہمانوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تسلّی دی۔ مزید بر آں انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک علم والے بیٹے (اسحاق علیہ السلام) کی خوشخبری دی۔

علمی بات: آنے والے مہمان فرشتوں نے کہا کہ آپ علیہ السلام ہماری طرف سے پریشان نہ ہوں، ہم تو آپ علیہ السلام کے لئے خوشخبری لے کر آئے ہیں اور وہ خوشخبری یہ ہے کہ آپ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ اس بڑھاپے میں ایک نہایت سمجھدار اور ذی علم لڑکا عطا فرمائے گا۔ لفظِ غلام کے ساتھ علیم کی صفت سے اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اللہ تعالیٰ جو بیٹا آپ علیہ السلام کو عطا فرما رہا ہے وہ کوئی عام فرزند نہیں ہوگا بلکہ وہ علمِ نبوت سے بھی سرفراز ہوگا اور جلیل القدر نبی ہوگا۔ اس بات نے اس خوشخبری کی قدر و قیمت میں بیش بہا اضافہ کر دیا۔

آیت نمبر ۵۴: بڑھاپے میں بیٹے کی خوشخبری سن کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حیرت کا اظہار فرمایا۔

علمی بات: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ ایک بڑی مدت کے بعد تو اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام جیسا بیٹا عطا فرمایا تھا اور اب تو اس کو پیدا ہوئے بھی ایک عرصہ گزر گیا اور میں اگرچہ اس وقت بھی بوڑھا تھا لیکن اب تو پہلے سے بھی زیادہ بوڑھا ہو گیا ہوں اب یہ خوشخبری کیسے؟ پھر یہ جو تم حضرت سارہ علیہا السلام کے بطن سے بیٹے کی خوشخبری سنا رہے ہو تو یہ بات مزید حیران کن ہے کہ وہ تو عمر کے اس حصّے کو پہنچ چکی ہے جس میں بظاہر اولاد کا پیدا ہونا محال ہوتا ہے۔ یعنی ایسی پیرانہ سالی میں اولاد ہونا عجیب و غریب ہے، کس طرح اولاد ہوگی؟ کیا ہمیں پھر جوان کیا جائے گا یا اسی حالت میں بیٹا عطا فرمایا جائے گا؟

علمی بات: دراصل اس کلام سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ مجھ جیسے بوڑھے شخص پر اتنا فضل عظیم ہو رہا ہے، ورنہ عادتاً یہ بات بعید از قیاس ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس نعمتِ عظمیٰ کو اظہار تشکر کے لئے تعجب کے رنگ میں بیان فرما دیا۔ ورنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے شایان شان نہیں کہ وہ اس بات کو اللہ تعالیٰ کی شانِ قدرت سے بعید سمجھ کر تعجب کریں۔

آیت نمبر ۵۵: فرشتوں نے بیٹے کی بشارت کو حقیقی اور قطعی ہونے کی تسلّی دی۔ مزید بر آں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہونے کی تلقین کی۔

علمی بات: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چونکہ تعجب سے کہا کہ اس بڑھاپے میں اب اولاد ہوگی؟ تو فرشتوں نے تسلّی کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے عرض کیا کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ حق ہے، واقعی ایسا ہی ہوگا، اللہ تعالیٰ ضرور آپ علیہ السلام کو ایک بچہ مرحمت فرمائے گا۔ اس خوشخبری کے سبب سے امیدوار رہیئے، اس لئے کہ جو اللہ تعالیٰ مخلوق کو بے ماں باپ کے پیدا کرنے پر قادر ہے، وہ یہ بھی قدرت رکھتا ہے کہ بوڑھے مرد اور بڑھیا بانجھ عورت سے بھی اولاد پیدا کر دے۔

آیت نمبر ۵۶: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیغمبرانہ شان پر مبنی جواب دیا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے تو گمراہ لوگ ہی مایوس ہوتے ہیں۔

علمی بات: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں کی بات سے معاملہ سمجھ لیا اور کہا میں نے مایوسی کی بناء پر ایسا نہیں کہا، کیونکہ مایوسی تو گمراہی ہے بلکہ اس لئے کہا کہ عادتاً اور عموماً اس عمر میں اولاد نہیں ہوتی۔ میں اپنے رب کی رحمت سے ہرگز ناامید نہیں ہوں۔ میں تو ہر لحظہ اس کے فضل و کرم پر چشم اُمید لگائے بیٹھا ہوں۔ اس کی رحمت سے مایوس تو صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو سیدھی راہ سے بھٹک گئے ہوں جنہوں نے معرفت کی راہ نہیں پہچانی اور حق تعالیٰ کے علم و قدرت کا کمال اور رحمت کی وسعت نہیں جانی۔

آیت نمبر ۵۷: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کی خوشخبری سننے کے بعد فرشتوں سے ان کے آنے کی اصل وجہ معلوم کی۔

علمی بات: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سمجھ لیا تھا کہ فرشتے صرف انہیں بیٹے کی خوش خبری دینے کے لئے آسمان سے نہیں اترے، ضرور کوئی اور بات بھی ہے۔ اسی لئے انہوں نے پوچھا کہ تمہاری آمد کا اصل مقصد کیا ہے؟ یعنی کیا محض یہ بشارت سنانے کے لئے ہی بھیجے گئے ہو یا کوئی اور مہم بھی ہے جس پر مامور ہو کر آئے ہو۔

COPYRIGHTS © RESERVED WITH ILM FOUNDATION. SALE FOR EDUCATIONAL & COMMERCIAL USE ... ILM BOOK ... AGENCY

غالباً قرائن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھے کہ فرشتوں کی تشریف آوری کا اصل مقصد کچھ اور ہے۔ ممکن ہے جو خوف انہیں دیکھ کر پیدا ہوا تھا اسی سے خیال گزرا ہو کہ خالص بشارت لانے والوں کو دیکھ کر خوف کیسا۔ ضرور کوئی دوسری خوفناک چیز بھی ان کے ساتھ ہوگی۔ واللہ اعلم۔

آیت نمبر ۵۸: فرشتوں نے کہا کہ وہ ایک مجرم قوم (قومِ لوط) کو ہلاک کرنے آئے ہیں۔

علمی بات: فرشتوں نے کہا ہمارا ایک مقصد اور بھی ہے کہ ہم مجرموں کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ یہ مجرم کون ہیں؟ اس سے مراد لوط علیہ السلام کی قوم ہے اور اگلی آیت میں اس کی پوری وضاحت بھی موجود ہے، ہم لوط (علیہ السلام) کو مطلع کرنے کے لئے بھی بھیجے گئے ہیں۔ ان کی قوم کی بداعتدالیوں، سرکشیوں اور حد سے زیادہ نافرمانیوں کا یہ عالم ہے کہ اب لوگوں کی ہلاکت کا وقت آچکا ہے۔ ہم اس وقت کا اعلان کرنے کے لئے لوط (علیہ السلام) کے پاس جارہے ہیں۔

آیت نمبر ۵۹: فرشتوں نے مزید بتایا کہ حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے گھر والوں کو عذاب سے بچالیا جائے گا مگر ان کی بیوی کے متعلق فیصلہ یہ ہے کہ وہ مجرم قوم کے ساتھ ہی ہلاک ہوگی۔

علمی بات: فرشتوں نے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے اصل حقیقت واضح کی کہ ہمیں دراصل قومِ لوط پر عذاب دینے کے لئے بھیجا گیا ہے تو اس سے قدرتی طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں یہ تشویش پیدا ہوگئی کہ حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے گھر والوں کا کیا بنے گا؟ تو فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس تشویش کو دور کرنے کے لئے اس کی تصریح کردی کہ ان کو ہم اس عذاب سے بچائیں گے۔ یعنی صرف اللہ ﷻ کے نافرمانوں پر ہی عذاب نازل ہوگا۔

آیت نمبر ۶۰: فرشتوں نے بتایا کہ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی قوم کے ساتھ ہلاک ہوگی۔

علمی بات: حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی نافرمان تھی اور مجرم قوم کے ساتھ تعلق رکھتی تھی۔ وہ بھی قوم کے جرم میں برابر کی شریک تھی اس لئے اسے بھی اسی عذاب سے دوچار ہونا پڑا جو اس قوم پر نازل ہوا۔

علمی بات: مفسرین کرام لکھتے ہیں یا تو ان کی بیوی ان کے گھر والوں کے ساتھ نکلی ہی نہ تھی یا ساتھ نکلی لیکن پیچھے مڑ کر دیکھا اور اپنی قوم کی ہلاکت پر افسوس ظاہر کرنے لگی۔ ایک پتھر آکر اسے لگا اور اسے وہیں قتل کردیا گیا۔ سورۃ ہود اور سورۃ الحجر میں (حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ) "کھنگر کے پتھر" اور سورۃ الذاریات میں (حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ) "پکی ہوئی مٹی کے پتھر" کہا گیا ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ اس کا انجام بھی وہی ہوگا جو دوسرے ظالم لوگوں کا ہوگا۔

آیت نمبر ۶۱: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد فرشتوں کی حضرت لوط علیہ السلام کے ہاں آمد کا ذکر ہے۔

علمی بات: حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی طرف فرشتوں کی آمد کا مقصد مجرم و نافرمان قوم کو عذاب دینا تھا۔

آیت نمبر ۶۲: فرشتے خوبصورت نوجوانوں کی صورت میں آئے تھے جو حضرت لوط علیہ السلام کے لئے انجان تھے۔

علمی بات: آپ علیہ السلام کو بھی ان کی آمد سے خطرہ محسوس ہوا لیکن آپ علیہ السلام کے خطرہ کی نوعیت بالکل الگ تھی۔ آپ علیہ السلام اپنی قوم کا حال بھی جانتے تھے اور یہ نوجوان لڑکے بہت خوبصورت تھے۔ لہٰذا اول ہی دل میں آپ علیہ السلام پیش آنے والے حالات سے سخت خوفزدہ تھے۔

آیت نمبر ۶۳: فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو اصل صورتحال سے آگاہ کیا۔ وہ اپنے ساتھ عذابِ الٰہی کا فیصلہ لائے تھے جس کے آنے میں قومِ لوط کو شک تھا۔

علمی بات: حضرت لوط علیہ السلام جب اپنی قوم کو متنبہ کرتے تھے کہ اگر تم لوگ شرک سے اور فعلِ بد سے باز نہیں آؤ گے تو تم پر اللہ ﷻ کا عذاب آئے گا، تو وہ آپ علیہ السلام کا مذاق اڑاتے تھے، کیونکہ انہیں یقین نہیں تھا کہ ان پر واقعی عذاب آجائے گا۔ فرشتوں نے کہا کہ آج ہم وہی عذاب لے کر آگئے ہیں جس کے بارے میں یہ لوگ شک میں تھے۔ فرشتوں نے آپ علیہ السلام کو اصل صورتِ حال بتا کر آپ علیہ السلام کے خوف کو بھی دور کردیا۔

آیت نمبر ۶۴: حق سے مراد عذاب کا فیصلہ ہے جس کے ساتھ فرشتے بھیجے گئے تھے۔ فرشتوں نے عذاب کے آنے کی یقین دہانی کرائی۔

علمی بات: حق سے عذاب مراد ہے جس کے لئے وہ بھیجے گئے تھے، اس لئے انہوں نے کہا ہم ہیں بھی بالکل سچے۔ یعنی عذاب کی جو بات ہم کر رہے ہیں۔ اس میں

سچے ہیں۔ اب اس قوم کی تباہی کا وقت بالکل قریب آ پہنچا ہے۔

آیت نمبر ۶۵: فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو رات کے آخری حصہ میں اپنے گھر والوں کو ہجرت کر جانے کی تاکید کی۔ آپ علیہ السلام رات کے آخری پہر میں اپنے گھر والوں کو (سوائے بیوی کے) لے کر یہاں سے نکل جائیے اور آپ علیہ السلام ان کے پیچھے رہیئے، تاکہ انہیں تیز چلنے پر ابھارتے رہیں اور خیال رکھیں کہ کوئی پیچھے نہ رہ جائے اور نہ کوئی پیچھے مڑ کر دیکھے اور اس علاقے میں چلے جائیں جہاں جانے کا آپ علیہ السلام کو حکم دیا گیا ہے۔ اکثر مفسرین کرام کے نزدیک اس سے مراد شام کا علاقہ ہے۔ البتہ بعض مفسرین کرام نے اس سے اُردن اور مصر کا علاقہ بھی مراد لیا ہے۔

آیت نمبر ۶۶: حضرت لوط علیہ السلام کو بذریعہ وحی آگاہ کر دیا گیا کہ صبح ہوتے ہی ان کی قوم کو ہلاک کر دیا جائے گا۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط علیہ السلام کو بذریعہ وحی اس عذاب کی خبر پہلے ہی دے دی تھی کہ صبح کے وقت تمام کفار ہلاک ہو جائیں گے اور ان میں سے کوئی نہیں بچے گا، جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "بے شک ان کے (عذاب کے) وعدہ کا وقت صبح ہے کیا صبح قریب نہیں ہے؟" (سورہ ہود ۱۱، آیت: ۸۱)

آیت نمبر ۶۷: مہمانوں کی آمد کی خبر پا کر قوم کے لوگ حضرت لوط علیہ السلام کے گھر پہنچ گئے۔ ان کو خوشی یہ تھی کہ وہ اپنے بُرے ارادے کی تکمیل کر سکیں گے۔

علمی بات: جب قومِ لوط کو یہ خبر ملی کہ حضرت لوط علیہ السلام کے گھر مہمان آئے ہوئے ہیں اور بہت ہی حسین و جمیل نوجوان لڑکے ہیں تو وہ خوشی خوشی ایک دوسرے کو ان کی آمد کی اطلاع دینے لگے۔ پھر وہ جمع ہو کر خوشیاں مناتے ہوئے حضرت لوط علیہ السلام کے گھر آئے۔

آیت نمبر ۶۸: حضرت لوط علیہ السلام نے اپنے مہمانوں کے دفاع کی کوشش کی۔ قوم کو مہمانوں کے سامنے انہیں رُسوا نہ کرنے کی تلقین کی۔

علمی بات: حضرت لوط علیہ السلام اس وقت تک فرشتوں کو اپنا مہمان سمجھے ہوئے تھے۔ اس لئے قوم کے بدکرداروں کو دیکھ کر ان سے کہنے لگے کہ یہ لوگ میرے مہمان ہیں، مجھے ان کے سامنے رُسوا نہ کرو کیونکہ مہمان کی رُسوائی میزبان کی رُسوائی ہے اس لئے تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور مجھے رُسوا نہ کرو۔

آیت نمبر ۶۹: حضرت لوط علیہ السلام کا قوم کو بُرے عمل کے ارتکاب کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی تلقین کا ذکر ہے۔

علمی بات: حضرت لوط علیہ السلام نے قوم کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرایا اور بے حیائی کے کام چھوڑنے کی تلقین فرمائی۔ آپ علیہ السلام نے ان لوگوں سے فرمایا کہ ان اجنبی مہمانوں کو پریشان نہ کرو۔ حضرت لوط علیہ السلام نے نہایت موثر اور دلسوز انداز میں ان لوگوں کو سمجھایا، ان کو اپنی عزّت و آبرو کا واسطہ اور خوفِ الٰہی کا حوالہ بھی دیا۔ چنانچہ آپ علیہ السلام نے ان لوگوں کو سمجھایا کہ یہ میرے مہمان ہیں، ان کی عزّت و آبرو کی حفاظت مجھ پر اخلاقی طور پر فرض ہے۔ اگر تم لوگوں نے ان پر کسی طرح کی دست درازی کی تو میں ان کی نگاہوں میں رُسوا ہو جاؤں گا۔

آیت نمبر ۷۰: حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی ڈھٹائی اور بداخلاقی کے مظاہرہ کا ذکر ہے۔ انہوں نے کہا کہ حضرت لوط علیہ السلام ہر کسی کی حمایت کرتے ہوئے ان کے معاملے میں دخل اندازی نہ کریں۔

علمی بات: حضرت لوط علیہ السلام کی اس بڑی موثر اور نہایت پُرسوز اپیل کا ان بے حیا اور نافرمان لوگوں پر کوئی اثر نہ ہوا اور انہوں نے نہایت گستاخانہ انداز میں آپ علیہ السلام سے کہا کہ کیا ہم نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم دُنیا بھر کے اجنبی لوگوں کی مہمان نوازی اور حمایت کرنے سے باز رہو اور ایسے لوگوں کو اپنے گھر میں نہ آنے دو یعنی اس ذلّت و رسوائی کے ذمہ دار تم خود ہو (معاذ اللہ) جو ہماری اس قدر صاف اور واضح تنبیہ کے باوجود تم ان خوب صورت مہمانوں کو اپنے گھر میں پناہ دے رہے ہو۔ اس سے ان بدبختوں کی شقاوتِ قلبی اور ان کی سیاہ بختی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور یہی حال ہوتا ہے اس بدبخت قوم کا جو اپنے آخری اور ہولناک انجام کے قریب آ پہنچی ہو۔ العیاذ باللہ العظیم۔

آیت نمبر ۷۱: یہاں بیٹیوں سے ایک مراد قوم کی بیٹیاں ہیں۔ قوم کو نکاح کا جائز راستہ اختیار کرنے اور بُرے عمل سے باز آنے کی نصیحت کی گئی ہے۔

علمی بات: یہاں پر بَنَاتِیْ (میری بیٹیوں) سے مراد آپ علیہ السلام کی صلبی اور حقیقی بیٹیاں نہیں، بلکہ اپنی قوم کی بیٹیاں ہیں کیونکہ قوم کی بیٹیاں پیغمبر کی روحانی بیٹیاں

ہوتی ہیں۔ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو سمجھایا کہ تمہاری خواہش نفسانی کی تسکین کا جائز راستہ یہ ہے کہ یہ میری قوم کی بیٹیاں موجود ہیں ان سے نکاح کرلو۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہارے لئے فطری ساتھی بنایا ہے۔ پس تم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچو اور میرے مہمانوں کے سامنے اپنے بُرے عمل سے مجھے رُسوا نہ کرو۔

نوٹ: حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق مزید معلومات کے لئے رہنمائے اساتذہ حصہ چہارم ملاحظہ فرمائیں۔

آیت نمبر ۷۲: اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کی قسم ذکر فرما کر بتایا کہ بے شک سدوم بستی کے رہنے والے اپنی گمراہیوں میں بھٹک رہے تھے۔ قوم لوط گمراہی میں ساری حدود توڑ چکی تھی۔ ان لوگوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی معقول بات کی طرف ذرہ برابر بھی توجہ نہ دی اور اپنی ضد پر اڑے رہے۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب مصطفیٰ، رحمۃ للعالمین سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کی قسم کھا کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت بڑے اعزاز سے نوازا ہے۔ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کی قسم اُٹھانا تعظیم و تکریم کی انتہا ہے۔ اسی طرح صاحب روح المعانی نے امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کی دلائل النبوۃ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان سے بڑھ کر کوئی معزز و مکرم جان پیدا نہیں فرمائی اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات کے علاوہ کسی بھی حیات کی قسم نہیں کھائی، یہاں سرسری طور پر جو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غیر اللہ کی قسم کھانا تو ممنوع ہے اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان کی قسم کیوں کھائی؟ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ یہ تو مخلوق کے لئے منع ہے وہ غیر اللہ کی قسم کھائیں گے تو شرک ہو گا اللہ تعالیٰ خالق اور مالک ہے اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے اس کو اختیار ہے جس کی چاہے قسم کھائے، اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے اگر وہ کسی کی قسم کھائے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی چیز اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر عظمت والی ہوگئی۔ یا اللہ تعالیٰ کے برابر ہوگئی یہاں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان کی قسم کھائی اور قرآنِ حکیم میں بہت سے مواقع ہیں دوسری چیزوں کی قسمیں بھی مذکور ہیں جیسے (وَالتِّيْنِ اور والذّٰرِيٰت اور والْعٰدِيٰت اور والسَّمَآء اور والطَّارِقِ) وغیرہ۔

آیت نمبر ۷۳: قوم لوط پر عذاب کی آمد کا ذکر ہے۔ صبح سورج کے نکلتے ہی ایک زبردست چیخ نے ان پر دہشت طاری کردی۔

علمی بات: رات کی تاریکی میں حضرت لوط علیہ السلام اپنے کنبہ کو لیکر بستی سے چلے گئے۔ اب یہ بستی اس پاک بندہ سے بھی خالی ہوگئی۔ یہاں صرف ایسے لوگ باقی رہ گئے تھے جو شکل و صورت میں تو انسان تھے لیکن اپنے اعمال و اطوار کے لحاظ سے ان میں انسانیت کی بو تک نہ تھی۔ اخلاقی لحاظ سے وہ اتنے گرے ہوئے تھے کہ وہ نبی کے گھر میں بھی دخل اندازی کرنے اور ان کے مہمانوں پر دست درازی کرنے سے بھی انہیں شرم نہیں آتی تھی اور ایسا فعل جس کے ذکر سے بھی عقل سلیم کو نفرت ہے وہ اس کا ارتکاب چوری چھپے نہیں بلکہ ڈنکے کی چوٹ سے کیا کرتے تھے۔ اکیلے بھی نہیں بلکہ مجمع عام میں۔ اندازہ کیجیے اس قوم کے اخلاقی انحطاط کا جو رذیل گناہوں کے ارتکاب میں اتنی دیدہ دلیر ہو اور جس میں شرم و حیا کی بُو تک بھی نہ ہو یقیناً وہ اس قابل تھی کہ اس کو اس زبردست عذاب کی چکی میں پیس کر رکھ دیا جاتا۔

آیت نمبر ۷۴: ان کی بستیوں کو زمین سے اُٹھا کر آسمان کی طرف لے جایا گیا۔ وہاں سے ان بستیوں کو اُلٹ کر زمین پر پھینک دیا گیا۔ پھر اُن پر پکی مٹی کے پتھروں کی بارش کر کے قوم کو نیست و نابود کر دیا گیا۔

علمی بات: حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اس پورے خطہ زمین کو بلندی پر لے کر انہیں اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ پھر اللہ تعالیٰ کا مزید غضب یہ ہوا کہ اسی خطہ زمین پر اوپر سے پتھروں کی بارش کی گئی۔ بحیرۂ مردار (Dead Sea) دُنیا کی سب سے بڑی اور گہری نمکین پانی کی جھیل ہے، جس کے مغرب میں اسرائیل اور مشرق میں اُردن واقع ہے۔ یہ زمین پر سطح سمندر سے سب سے نچلا مقام ہے۔ بہت زیادہ شوریدگی کے باعث اس میں کوئی آبی حیوانات اور پودے نہیں پائے جاتے اور اس میں کوئی انسان ڈوب بھی نہیں سکتا۔ اسے بحیرۂ نمک بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس کا پانی نمکین ہے۔

علمی بات: بحیرۂ مردار اُردن، فلسطین اور اسرائیل کے درمیان واقع ایک سمندر ہے اور یہ ایسا مقام ہے کہ جہاں بارش اور آس پاس سے زمین کے اندر اور اوپر سے پانی نیچے کی طرف آتا ہے۔ یہاں پانی آتا تو ہے لیکن یہاں سے کہیں جاتا نہیں۔ مطلب یہ کہ یہ چاروں طرف سے ایک طرح سے بند ہے اور اس کا پانی صرف بخارات بن ہی کر اڑتا ہے۔ صدیوں سے پانی کے یوں اوپر اُڑنے کی وجہ سے نیچے صرف معدنیات اور نمکیاتی مادہ ہی رہ گیا ہے جو صدیوں کے اس عمل سے اتنا نمکین ہو چکا ہے کہ اس میں جاندار چیزوں مثلاً مچھلیوں یا پودوں کا رہنا ناممکن ہے۔ ہاں کئی ایسے بیکٹیریا ضرور ہیں جو ہر طرح کا ماحول برداشت کر لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے اسے بحر مردار کہا

جاتا ہے۔ یعنی مری ہوئی چیزوں کا سمندر یا وہ سمندر جہاں کوئی چیز زندہ نہیں رہ سکتی۔

علمی بات: قومِ لوط کا جرم جس نوعیت کا تھا ان کو سزا بھی ویسی ہی ملی جو کسی اور قوم کو نہیں ملی۔ قرآنِ حکیم میں سورۃ القمر ۵۴، آیت: ۳۷ میں ابتدائی طور پر ان کی آنکھیں مٹانے یعنی بینائی سلب کرنے کا ذکر بھی ہے۔ بعد ازاں ان پر تین بڑے عذاب آئے۔ ۱۔ سخت زوردار چیخ۔ ۲۔ ان کی بستی کا اُلٹ دیا جانا۔ ۳۔ پھر اوپر سے پتھروں کی بارش کی صورت میں عذاب۔ سورۃ الصّٰٓفّٰت ۳۷، آیت: ۱۳۷ میں حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی ہلاکت کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے "اور تم ان پر صبح کے وقت اور رات کے وقت گزرتے ہو کیا تم سمجھ نہیں رکھتے۔" اہل عرب تجارت کے لئے شام جایا کرتے تھے راستے میں یہ بستیاں پڑتی تھیں جن کا تختہ الٹ دیا گیا تھا۔ اہل عرب کا کبھی صبح کے وقت اور کبھی رات کے وقت وہاں سے گزر ہوتا تھا۔ ان لوگوں کو یاد دلایا گیا کہ دیکھو! کافروں اور بدکاروں کا کیا انجام ہوا۔ تم وہاں سے گزرتے ہو اور نظروں سے دیکھتے ہو پھر کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے۔

آیت نمبر ۷۵: "مُتَوَسِّمِیْن" سے مراد گہری نظر سے جائزہ لینے اور غور و فکر کرنے والے ہیں۔ قومِ لوط کا واقعہ غور و فکر کرنے والوں کے لئے باعث عبرت ہے۔

علمی بات: "مُتَوَسِّم" اصل میں اس شخص کو کہتے ہیں جو بعض ظاہری علامات و قرائن دیکھ کر محض فراست سے کسی پوشیدہ بات کا پتہ لگا لے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اِتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ "مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے (عطا کردہ) نور سے دیکھتا ہے۔" (جامع ترمذی)

عملی پہلو: مطلب یہ ہے کہ دھیان کرنے اور پتہ لگانے والوں کے لئے "قومِ لوط" کے قصہ میں عبرت کے بہت نشان موجود ہیں۔ انسان سمجھ سکتا ہے کہ بدی اور سرکشی کا انجام کیسا ہوتا ہے۔ خدا کی قدرتِ عظیمہ کے سامنے ساری طاقتیں ہیچ ہیں۔ "اس کی لاٹھی میں آواز نہیں۔" اس کی مہلت پر آدمی مغرور نہ ہو، نہ پیغمبروں کے ساتھ ضد اور عداوت باندھے، ورنہ ایسا ہی حشر ہو گا۔

آیت نمبر ۷۶: قومِ لوط کے تباہ شدہ کھنڈرات عام راستے پر واقع ہیں۔ مراد عرب سے شام و فلسطین تک جانے والا تجارتی راستہ ہے جہاں لوگوں کی آمد و رفت ہے۔

علمی بات: یعنی یہ بستی سدوم کہ جس کی حالت بدل گئی اور جس پر پتھروں کی بارش برسائی گئی حتیٰ کہ وہ بحیرۂ مردار کی صورت اختیار کر گئی، وہ ان مشرکین کے اس راستے پر واقع ہے جسے لوگ آج تک استعمال کر رہے ہیں، جیسا کہ ارشاد فرمایا: "اور بلاشبہ تم یقیناً صبح جاتے ہوئے ان پر سے گزرتے ہو اور رات کو بھی تو کیا تم سمجھتے نہیں۔؟" (سورۃ الصّٰٓفّٰت ۳۷، آیات: ۱۳۷، ۱۳۸)

علمی بات: حضرت لوط علیہ السلام کی بستیاں جن کا تختہ الٹایا گیا ہے، قرآنِ حکیم کے ارشاد کے مطابق عرب سے شام کو جانے والے راستہ پر اُردن کے علاقہ میں آج بھی یہ مقام سطح سمندر سے کافی گہرائی میں موجود ہے، اس کے ایک بڑے رقبے پر ایک خاص قسم کا پانی دریا کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے۔ اس پانی میں کوئی مچھلی، مینڈک وغیرہ جانور زندہ نہیں رہ سکتا، اسی لئے اس دریا کو بحر میت اور بحر لوط کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس لئے اس میں کوئی دریائی جانور زندہ نہیں رہ سکتا۔

آیت نمبر ۷۷: یقیناً اہل ایمان ان واقعات و مقامات سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔

علمی و عملی بات: آج کل آثارِ قدیمہ کے محکمہ نے اس مقام پر کچھ رہائشی عمارتیں ہوٹل وغیرہ بھی بنا دیئے ہیں اور آخرت سے غافل مادہ پرست طبیعتوں نے آج کل اس کو ایک سیر گاہ بنایا ہوا ہے لوگ تماشے کے طور پر اسے دیکھنے جاتے ہیں قرآنِ حکیم نے اسی غفلت شعاری پر تنبیہ کے لئے آخر میں فرمایا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ یعنی درحقیقت تو یہ واقعات و مقامات ہر چشم بصیرت رکھنے والے کے لئے عبرت آموز ہیں لیکن اس عبرت سے فائدہ اٹھانے والے مؤمنین ہی ہوتے ہیں دوسرے لوگ ان مقامات کو ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھ کر روانہ ہو جاتے ہیں۔

آیت نمبر ۷۸: اِیکہ گھنے درخت کو کہتے ہیں۔ "اَصْحٰبُ الْاَيْكَه" سے مراد قومِ شعیب ہے۔ اس بستی میں گھنے درخت ہونے کی وجہ سے انہیں جنگل والے کہا گیا۔ انہوں نے بھی حق سے اعراض کیا۔

علمی بات: اصحابِ ایکہ سے مراد حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم ہے، یہ لوگ ایک ایسے علاقہ کے رہنے والے تھے جہاں کثرت سے درخت پائے جاتے تھے۔ ان کا ظلم یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیروں کو شریک ٹھہراتے تھے، راہ چلتے مسافروں کو لوٹ لیتے تھے اور ناپ تول میں کمی کرتے تھے۔

قومِ شعیب کو اصحاب الایکہ اور اہل مدین کی طرف مبعوث کیا گیا تھا ان پر دو علیحدہ علیحدہ عذاب بھیجے گئے تھے پہلے زلزلہ کی ہیبت ناک آواز محسوس ہوئی اس نے ان کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور ان پر سات دن تک سخت گرمی مسلّط کر دی گئی تھی اور کوئی چیز ان سے تپش کو دور نہیں کر سکتی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک بادل بھیجا وہ سب سائے کی تلاش میں اس کے نیچے جمع ہو گئے۔ اس بادل سے آگ نکلی اور اس آگ نے ان کو جلا کر بھسم کر دیا۔ اس عذاب کو یوم الظُّلّة اور عذاب یوم عظیم کہا گیا ہے۔

آیت نمبر ۷۹: قومِ لوط اور قومِ شعیب کی تباہ شدہ بستیاں اس راستے پر ہیں جہاں سے لوگوں کا گزر ہوتا ہے۔ کفارِ مکہ کو ان ویران بستیوں سے عبرت حاصل کرنے کی تنبیہ کی گئی ہے۔

علمی بات: ان دونوں قوموں کو ان کے جرائم کے بدلہ عذاب سے ہلاک کیا گیا۔ قومِ لوط اور اہل مدین کی بستیاں شام کی طرف جانے والی شارع عام پر واقع ہیں۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بستیاں تو بحیرۂ مردار کے پاس تھیں اور حضرت شعیب علیہ السلام کی بستی مدین بھی اردن میں واقع تھی، یہ وہی شاہراہ ہے جس پر قافلے چلتے تھے اور اہل مکہ ان قافلوں میں شامل ہو کر شام جایا کرتے تھے، راستہ میں یہ بستیاں پڑتی تھیں۔ گویا یہ ان کے لئے جائے عبرت تھی۔

آیت نمبر ۸۰: اصحابُ الحِجر سے مراد قومِ ثمود ہے جن کی طرف حضرت صالح علیہ السلام مبعوث کئے گئے تھے۔ یہ قوم حجر کے علاقے میں آباد تھی جو مدینہ منورہ اور شام کے درمیان ایک وادی ہے۔ قومِ ثمود نے بھی اپنے رسولوں کو جھٹلایا۔

علمی بات: تمام رسولوں کی دعوت بھی مشترکہ تھی اور سب کو اللہ تعالیٰ ہی نے بھیجا تھا تو ایک رسول کا انکار گویا تمام رسولوں کے انکار کے مترادف ہے "مُرْسَلِیْن" جمع کا صیغہ اس لئے آیا ہے کہ جو ایک رسول کی تکذیب کرتا ہے، گویا وہ سارے رسولوں کی تکذیب کرتا ہے۔ انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ اگر وہ نبی ہیں تو پہاڑ سے اونٹنی نکال کر دکھائیں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے دُعا فرمائی اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے پہاڑ سے اونٹنی نکل آئی، لیکن جن کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کفر کی مہر لگا دے انہیں کب ہدایت مل سکتی ہے؟

آیت نمبر ۸۱: قومِ ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام کے لائے ہوئے معجزہ (اُونٹنی) کو ماننے سے انکار کیا۔

علمی بات: اصحابُ الحجر یعنی قومِ ثمود کو جو نشانیاں دیں ان میں وہ اونٹنی ہے جو ان کی فرمائش پر حضرت صالح علیہ السلام نے چٹان سے نکالی اور اسی وقت اس سے ایک بچہ پیدا ہو گیا اور وہ بہت فربہ اور اچھی جسامت والا تھا اور وہ ایسی خوبصورت اُونٹنی تھی کہ کوئی اُونٹنی اس کی مثل نہ تھی وہ اونٹنی بہت زیادہ دودھ دیتی تھی حتی کہ تمام قومِ ثمود کو اس کا دودھ کافی ہو جاتا تھا۔ اس اُونٹنی کے علاوہ حضرت صالح علیہ السلام کو اور بھی نشانیاں عطا کی گئی تھیں حضرت صالح علیہ السلام کا ایک کنواں تھا وہ اُونٹنی ایک دن میں اس کا سارا پانی پی جاتی تھی۔ تاہم ان لوگوں نے اتنے واضح معجزہ کا بھی انکار کیا اور حضرت صالح علیہ السلام کی دعوتِ توحید قبول نہ کی۔

آیت نمبر ۸۲: وہ پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے تھے۔ ان گھروں میں وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے۔

علمی بات: اصحابُ الحجر یا قومِ ثمود کے یہ لوگ بڑے طویل القامت، مضبوط جسم اور لمبی عمروں والے تھے۔ سنگ تراش اور انجینئر قسم کے لوگ تھے۔ اور اس فن میں اتنے ماہر تھے کہ پہاڑوں کو تراش کر ان میں اپنے گھر بنا لیتے تھے اور یہ گھر اتنے مضبوط ہوتے تھے جو ہر طرح کی ارضی و سماوی آفات مثلاً زلزلہ، سیلاب، طوفان اور بادو باراں وغیرہ کا مقابلہ کر سکتے تھے لہٰذا ہر طرح کے خوف و خطر سے نڈر ہو کر ان میں رہتے تھے۔ البتہ یہ لوگ دُنیاوی زندگی پر مغرور ہو کر تکبر کی نمائش کے لئے پہاڑوں کو تراش کر بڑے عالی شان مکان بناتے تھے۔ گویا کبھی یہاں سے جانا نہیں یہ بھی سمجھتے ہوں گے کہ ایسی مضبوط و مستحکم عمارتوں میں کوئی آفت کہاں پہنچ سکتی ہے۔

آیت نمبر ۸۳: قومِ ثمود کی سرکشی اور بغاوت کے نتیجہ میں ان پر صبح ہوتے ہی عذاب بھیج دیا گیا۔

علمی بات: عذاب بھیجنے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے وقت کے پیغمبر کی تکذیب کی، اللہ تعالیٰ کے احکامات سے سرکشی اور بغاوت کی، اللہ تعالیٰ کی اس نشانی اور نبی علیہ السلام

کے معجزہ یعنی "اللہ کی اونٹنی" کو بے دردی سے ہلاک کیا جس کے ظاہر ہونے کا انہوں نے خود تقاضا کیا تھا اور ایمان لانے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن ان میں چند ایک کو چھوڑ کر قوم کی اکثریت اس بات سے پھر گئی اور ایمان نہیں لائی۔ اللہ ﷻ نے انہیں تین دن کی مہلت دی اور اس کے بعد انہیں ایک انتہائی شدید اور خطرناک چیخ کے ذریعہ سے ہلاک کر دیا گیا۔ ان کی دولت اور پہاڑوں کو تراش کر بنائے گئے مضبوط مکانات بھی انہیں اللہ ﷻ کے عذاب سے نہ بچا سکے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:
"بے شک ہم نے ان پر ایک ہی چیخ بھیجی تو وہ باڑ لگانے والے کی کچلی، روندی ہوئی باڑ کی طرح ہوگئے۔" (سورۃ القمر ۵۴، آیت:۳۱)

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ وادی حجر میں ٹھہرے جو قوم ثمود کی سرزمین ہے مسلمانوں نے اس کنوئیں سے پانی پیا اور اس کنوئیں کے پانی سے آٹا گوندھا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو یہ حکم دیا کہ انہوں نے کنوئیں سے جو پانی نکالا ہے اس کو انڈیل دیں اور گندھا ہوا آٹا اُونٹوں کو کھلا دیں۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

آیت نمبر ۸۴: عذاب کے آنے پر قومِ ثمود کے مال و اسباب اور ان کی تدبیریں کارآمد ثابت نہ ہو سکیں۔

علمی بات: وہ خوشحال قوم تھی مگر انہوں نے جو مال و اسباب جمع کر رکھا تھا وہ انہیں عذابِ الٰہی سے بچانے کے لئے کچھ بھی مفید ثابت نہ ہو سکا۔ محض مادی ترقی عذابِ الٰہی سے نہیں بچا سکتی۔ ان کی زندگی بھر کی کمائی عذابِ الٰہی اور اللہ ﷻ کی گرفت سے چھڑانے کے سلسلہ میں ان کے کچھ کام نہ آ سکی۔ پس مادی ترقی کو سب کچھ سمجھ لینا اور اسی پر مست و مگن ہو جانا در اصل پیش خیمہ ہوتا ہے بڑی ہولناک تباہی اور خوفناک انجام کا۔ جبکہ اصل چیز جس پر حقیقت کا دارومدار ہے وہ ایمان و عقیدہ کی دولت اور عمل و کردار کی وہ پونجی ہے جس پر فرد و ملت سب ہی کی فلاح کا دارومدار ہے جو نورِ وحی و ہدایت پر منحصر ہے۔

آیت نمبر ۸۵: اللہ ﷻ نے کائنات اور اس کی ہر چیز کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا ہے۔ اس حق کا تقاضا یہ ہے کہ یومِ حساب آئے لہٰذا قیامت ضرور قائم ہوگی۔
"صَفۡحَ الۡجَمِیۡل" سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنی مرضی سے درگزر کرے اور انتقام کا کوئی جذبہ دل میں نہ رکھے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی ہر چیز کو بے مقصد اور بے کار پیدا نہیں کیا ہے، بلکہ اس لئے پیدا کیا ہے کہ اُنہیں دیکھ کر ان کے خالق کو یاد کیا جائے اور اس کا شکر ادا کیا جائے۔ جو اس کی ناشکری کرے گا اور کفر کی راہ اختیار کرے گا وہ اسے ہلاک کر دے گا اور آخرت میں تو انہیں بڑا ہی دردناک عذاب دیا جائے گا جس کی آمد میں کوئی شک نہیں ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ ﷺ اپنی قوم کے ساتھ عفو و درگزر سے کام لیجئے اور ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے میں عجلت سے کام نہ لیجئے۔

علمی بات: ان قوموں پر عذابِ الٰہی نازل کر کے ان کو جڑ سے اکھاڑ دینے کی وجہ یہ تھی کہ ان کا طرزِ زندگی کسی ٹھوس حقیقت پر مبنی نہیں تھا بلکہ اوہام پرستی اور باطل پر تھا جب کہ کائنات کی ہر ایک چیز ٹھوس حقائق پر پیدا کی گئی ہے اور انہی حقائق سے یہ دلیل بھی ملتی ہے کہ یہ کائنات بے مقصد پیدا نہیں کی گئی۔ اللہ ﷻ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ قیامت ضرور قائم ہو۔ مجرم لوگ تو ہمیشہ آخرت اور اللہ ﷻ کے حضور بازپُرس کے تصور کے منکر رہے ہیں۔ لہٰذا ان کا انجام ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ اب یہ مشرکین مکہ جو اسی ڈگر پر چل رہے ہیں ان کا بھی وہی انجام ہونے والا ہے لہٰذا ان سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔ نبی کریم ﷺ کو حکم ہوا کہ ابھی ان سے درگزر سے کام لیجئے۔ اللہ ﷻ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ وہ مناسب وقت پر خود ان کا مؤاخذہ کر لے گا۔

آیت نمبر ۸۶: اللہ ﷻ سب کا خالق اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ لہٰذا بندوں کا معاملہ اسی پر چھوڑ دیا جائے۔

علمی بات: جس نے ایک مرتبہ پیدا کیا دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے اور جس چیز کے اجزاء منتشر ہو گئے ہوں اس کو ہر جزء کی خبر ہے، جہاں کہیں ہو گا سب کو جمع کر دے گا۔ دوسری جگہ فرمایا: کیا وہ جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو اس بات پر قادر نہیں کہ ان جیسے (دوبارہ) پیدا فرما دے کیوں نہیں اور وہ بہترین پیدا فرمانے والا خوب جاننے والا ہے۔ (سورہ یٰس ۳۶، آیت:۸۱)

علمی بات: اللہ ﷻ کی ان دو صفتوں کے ذکر سے مقصود قیامت سے متعلق منکرین کے اعتراض کو رد کرنا اور یہ ثابت کرنا ہے کہ قیامت کا وقوع ہرگز ناممکن نہیں۔

یہ کائنات اللہ ﷻ کی اس صفت کا مظہر ہے کہ وہ زبردست تخلیقی قوت رکھتا ہے اس لئے انسان کو دوبارہ پیدا کرنا اور عالم آخرت کو برپا کرنا اس کے لئے ہرگز مشکل نہیں۔ پھر جو خالق ہو وہ اپنی مخلوق سے بے خبر کس طرح ہو سکتا ہے۔ اس لئے یہ بات کہ اللہ ﷻ خالق بھی ہے اور نہایت علم والا بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور جب وہ علیم ہے تو اس کے لئے یہ کچھ مشکل نہیں کہ اربوں اور کھربوں افراد کا قیامت کے دن حساب لے۔

آیت نمبر ۸۷: بار بار دُہرائی جانے والی سات آیات سے مراد سورۃ الفاتحہ ہے (جامع ترمذی)۔ مشرکین کی مخالفت پر آپ ﷺ کی دلجوئی فرمائی گئی ہے۔ سورۃ الفاتحہ بار بار پڑھنے کے لائق اور باعث تسکین ہے۔ سورۃ الفاتحہ کو عظمت والا قرآن کہا گیا ہے۔ (جامع ترمذی) کیونکہ قرآنِ حکیم کے تینوں بنیادی موضوعات توحید، آخرت اور رسالت کا بیان سورۃ الفاتحہ میں بھی ہے۔

علمی بات: نبی کریم ﷺ کو کفار قریش کی اذیتوں پر صبر کرنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ آپ ﷺ کو تو اللہ ﷻ نے بے شمار عظیم نعمتوں سے نواز رکھا ہے۔ جن میں سب سے بڑی نعمت سورۃ الفاتحہ اور پورا قرآنِ حکیم ہے۔ اس لئے آپ ﷺ حق کی پیغام رسانی کے کام میں لگے رہیں، کیونکہ آدمی جب اپنے اوپر اللہ ﷻ کی عظیم نعمتوں کو یاد کرتا ہے تو دعوت کی راہ کی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "کیا تم اس بات کو پسند کرتے ہو کہ میں تمہیں ایک ایسی سورت کی تعلیم دوں کہ جس جیسی (کوئی دوسری) سورت نہ تورات میں نازل ہوئی، نہ زبور میں نازل ہوئی، نہ انجیل میں نازل ہوئی اور نہ ہی قرآن میں؟" حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! جی ہاں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "نماز میں تم کیا پڑھتے ہو؟" سیدنا ابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ کو سورۃ الفاتحہ پڑھ کر سنائی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قسم اس ذات کی، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اللہ ﷻ نے اس سورت کے مثل نہ تورات میں کوئی سورت اتاری، نہ انجیل میں اتاری اور نہ زبور میں اتاری، نہ فرقان ہی میں اتاری اور بے شک یہ سبع مثانی بار بار دُہرائے جانے والی سات آیات ہیں اور یہی قرآن عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔" (جامع ترمذی)

علمی بات: سابقہ اقوام کے عبرت ناک انجام کے بعد رسول اللہ ﷺ کو تسلّی و اطمینان دیتے ہوئے سورت کے اختتام میں گزشتہ تمام مضامین کو سمیٹا جا رہا ہے۔ اے پیغمبر ﷺ! آپ منکرین حق کے حوالہ سے فکر مند نہ ہوں، کیونکہ اللہ ﷻ نے آپ ﷺ کو سورۃ الفاتحہ اور قرآن حکیم کی صورت میں عظیم دولت سے مالا مال کیا ہے جس میں منکرین کا انجام اور اللہ ﷻ کے نیک بندوں کے لئے انعام بیان کیا گیا ہے۔

علمی بات: نبوّت کا منصب بذاتِ خود اس قدر اعلیٰ و ارفع ہے کہ دُنیا کا کوئی منصب اور نعمت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مزید انعام و احسان یہ کہ نبوّت کے منصب کے ساتھ اللہ ﷻ اس شخصیت کو اپنی کتاب بھی عطا فرما دے۔ صاحب کتاب نبی جسے "الرَّسُول" بھی کہا گیا ہے۔ یہ وہ منصب ہے کہ جس کا موازنہ اور مقابلہ کسی فرشتے کے ساتھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بالخصوص اِمام الانبیاء ہمارے رسول مکرم ﷺ کا وہ منصب اور مقام ہے جس کی مثال کائنات کی کسی چیز سے نہیں دی جا سکتی۔ جس طرح آپ ﷺ کی ذات اور مقام بے مثال اور عالی مرتبت ہے اسی طرح قرآنِ حکیم کی صورت میں جو کتاب آپ ﷺ کو عنایت کی گئی ہے۔ اس کی مثل کوئی دوسری کتاب نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ اے رسول ﷺ! ہم نے آپ ﷺ کو بار بار دُہرائی جانے والی سات آیات یعنی سورۃ الفاتحہ اور قرآنِ حکیم، فرقان حمید عنایت فرمایا ہے۔

آیت نمبر ۸۸: یہاں خطاب رسول اللہ ﷺ سے ہے مگر تسلّی کے لئے اہل ایمان کو ہدایات دی جا رہی ہیں کہ کافروں کو دی ہوئی دُنیاوی نعمتوں کی طرف توجہ نہ دی جائے۔ کفار کے ایمان نہ لانے پر رسول ﷺ کو غمگین نہ ہونے اور اہل ایمان کو شفقت سے توجہ دینے کی تلقین فرمائی گئی ہے کہ کفار قریش اگر ایمان نہیں لاتے تو غم نہ کریں اور جو غریب اور کمزور مسلمان ہیں ان کے ساتھ تواضع اختیار کریں۔ انہیں اپنے قرب سے نوازیں اور روسائے قریش کے کفر و عناد کی پرواہ نہ کریں۔

علمی بات: اہل ایمان کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ مشرکین، یہود و نصاریٰ اور دوسرے دشمنانِ دین کو دُنیا کی چند روزہ زندگی کا جو سامان دیا ہے، اس کی طرف نظر نہ کریں

COPYRIGHT © RESERVED WITH ILM FOUNDATION, SAFE BOOK WORLD, ENTERTAINMENT & MEDIA (PVT.) LTD.

کہ ان نافرمانوں کو یہ سامان کیوں دے دیا گیا، جس سے ان کی شقاوت و شرارت زیادہ بڑھتی ہے۔ یہ دولت مسلمانوں کو ملتی تو اچھے راستہ میں خرچ ہوتی۔ بتایا گیا ہے کہ ان مجرمین کو تھوڑی دیر مزہ اُڑا لینے دیں۔ اللہ ﷻ نے اہل ایمان کو وہ دولت قرآن دی ہے جس کے آگے سب دولتیں ہیچ ہیں۔ لہٰذا وہ غم نہ کھائیں کہ یہ کافر مسلمان کیوں نہیں ہوتے۔ انہیں چاہیئے کہ وہ اپنا فرض تبلیغ ادا کرتے رہیں، دین دشمن لوگوں کے پیچھے اپنے کو زیادہ فکر و غم میں مبتلا نہ کریں۔ دراصل ان کی شفقت و ہمدردی کے مستحق اہل ایمان ہیں۔ لہٰذا آپس میں نرم خوئی اور شفقت و تواضع کا برتاؤ رکھیں۔

علمی بات: سورۃ الفاتحہ اور قرآنِ حکیم جیسی نعمتوں کے مقابلہ میں دُنیا کی ہر شے حقیر ہے، اس لئے اہل ایمان کے لئے ضروری ہے کہ اس نعمت عظمیٰ پر اللہ ﷻ کا شکر ادا کریں۔ اہل دُنیا کو جو اللہ ﷻ نے عارضی نعمتیں دے رکھی ہیں ان کی خواہش نہ کریں۔ وہ نعمتیں اللہ ﷻ نے انہیں اس لئے دی ہیں تاکہ وہ انہیں آزمائے اور جو اس آزمائش میں کامیاب نہیں ہوگا اس کے لئے وہ نعمتیں وبال جان بن جائیں گی۔

علمی بات: جو چیز فتنہ میں ڈالنے کے لئے ہے وہ نعمت نہیں ہوسکتی لہٰذا کافروں کے اموال کو دیکھنا اور ان کی طرف آنکھیں پھیلانا اہل ایمان کا شیوہ نہیں۔ مزید یہ کہ دین کی دعوت دینے والے کا کام دین کی بات پہنچا دینا ہے۔ اگر منکرین اس کا انکار کریں، سرکشی اور گمراہی پر کمر باندھے رہیں تو انہیں اس کی سزا مل جائے گی۔ داعی دین کو اس غم میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ یہ ایمان قبول کیوں نہیں کرتے؟

علمی بات: بازوؤں کو جھکا کر رکھنے سے مراد یہ ہے کہ ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیجیے جن لوگوں نے ایمان قبول کرلیا وہ رحمت اور شفقت کے مستحق ہیں کافروں پر غم کھانے کی بجائے اہل ایمان پر توجہ دی جائے تاکہ وہ اور زیادہ ایمان کے قدر دان ہوں اور مزید بشاشت کے ساتھ نیک اعمال انجام دیں۔

آیت نمبر ۸۹: رسول اللہ ﷺ پر اس کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں کہ آپ ﷺ لوگوں کو واضح طور پر اللہ ﷻ کے عذاب سے ڈرائیں۔

علمی بات: کفار قریش سے کہہ دیجیئے کہ میں اللہ ﷻ کی طرف سے لوگوں کو ایسے عذاب سے ڈرانے والا ہوں، جیسا عذاب اللہ ﷻ نے حضرت صالح علیہ السلام کے ان کافروں پر نازل کیا تھا جنہوں نے ان کی مخالفت اور تکذیب کی تھی اور انہیں قتل کرنے کی آپس میں قسم کھائی تھی۔

فرمانِ نبوی ﷺ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میری اور اس کی مثال جو اللہ ﷻ نے مجھے دے کر بھیجا ہے، اس شخص کی سی ہے جو ایک قوم کے پاس آئے اور کہے، اے میری قوم! میں نے اپنی دونوں آنکھوں سے (ایک) لشکر کو دیکھا ہے اور میں تمہیں صاف صاف ڈرانے والا ہوں، اس لئے نجات کی جگہ تلاش کرو، تو اس کی قوم کے کچھ لوگوں نے اس کا کہا مانا اور راتوں رات اپنی پناہ کی جگہ کی طرف چلے گئے اور نجات پائی، لیکن ان میں سے ایک گروہ نے اسے جھوٹ سمجھا اور وہ اپنی جگہ ہی رہے، تو صبح کو لشکر نے ان پر حملہ کر دیا اور انہیں ہلاک کر کے نیست و نابود کر دیا۔ یہ اس شخص کی مثال ہے جس نے میری اطاعت کی اور جو میں لے کر آیا ہوں اس کی پیروی کی اور اس شخص کی مثال ہے جس نے میری نافرمانی کی اور جو حق میں لے کر آیا ہوں اس کو جھٹلایا۔" (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۹۰: تقسیم کرنے والوں سے مراد سابقہ اقوام ہیں جنہوں نے کتابوں کو اس طرح تقسیم کیا کہ اس کی کچھ باتوں کو مانا اور کچھ کا انکار کیا۔ قریش مکہ ہیں جنہوں نے قرآنِ حکیم کو شاعری، کہانی اور جادو وغیرہ کہا۔ (معاذ اللہ)

علمی بات: آیت کا مطلب بعض مفسرین کرام نے یہ بتایا ہے کہ جس طرح ہم نے گزشتہ زمانہ میں ان لوگوں پر عذاب نازل کیا جنہوں نے احکام الٰہیہ کے حصے کر رکھے تھے یعنی آسمانی کتابوں کے مختلف اجزاء قرار دیئے تھے، اسی طرح سے اس زمانے کے مکذبین پر بھی عذاب نازل ہوسکتا ہے۔ مفسرین کی رائے کے مطابق یہ یہود و نصاریٰ تھے جنہوں نے کتاب اللہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اسے تبدیل کیا، بعض حصوں پر ایمان لائے اور بعض کا انکار کر دیا۔

آیت نمبر ۹۱: سابقہ اقوام نے اللہ ﷻ کی کتاب میں تحریف کر کے اسے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک رائے کے مطابق قرآنِ حکیم کا لفظ گزشتہ کتابوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔

علمی بات: انہوں نے ان کتابوں کو جو ان پر نازل کی گئی تھیں، اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیا کہ وہ بعض حصے پر ایمان لائے اور بعض حصے کا انکار کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ

ہے: ”پھر کیا تم کتاب کے بعض پر ایمان لاتے ہو اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ تو اس شخص کی جزا جو تم میں سے یہ کرے اس کے سوا کیا ہے کہ دُنیا کی زندگی میں رسوائی ہو اور قیامت کے دن وہ سخت ترین عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے اور اللہ ہرگز اس سے غافل نہیں جو تم کرتے ہو۔“ (سورۃ البقرۃ ۲، آیت: ۸۵)

علمی بات: سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اس (مذکورہ بالا) آیت سے مراد اہل کتاب یہود و نصاریٰ ہیں کہ انہوں نے کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، پھر وہ کتاب کے بعض حصّے پر ایمان لائے اور بعض کا انکار کر دیا۔ (صحیح بخاری)

یہ اشارہ یہود کی طرف ہے جنہوں نے حق کو چھپانے کے لئے اپنے قرآن یعنی تورات کی ترتیب کو بھی بدل ڈالا اور اس کو مختلف اجزا میں تقسیم کر کے اس کے بعض حصّے کو چھپاتے اور بعض کو ظاہر کرتے۔

علمی بات: ان تقسیم کرنے والے اَلْمُقْتَسِمِيْنَ کے لئے جو کتابیں نازل ہوئی تھیں ان کو قرآن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لفظ ”قرآن“ کا لغوی معنی یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو پڑھی جائے وہ قرآن ہے، جبکہ موجودہ اُمت مسلمہ کی اصطلاح میں لفظ ”قرآن“ اللہ ﷻ کی اس عظیم کتاب کا مخصوص نام ہے جو سیدنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی۔

آیت نمبر ۹۲: اپنی ذاتِ پاک کی قسم کھا کر اللہ ﷻ نے مجرمین کے لئے وعید کا اعلان کیا ہے۔ قیامت کے دن اگلوں اور پچھلوں سب سے سختی سے بازپُرس ہو گی۔

علمی بات: اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ اوّلین و آخرین سب سے ان کے اعمال کے بارے میں بازپُرس ہو گی جو لوگ اللہ ﷻ کے نبیوں اور کتابوں کو جھٹلاتے رہے اور جھٹلا رہے ہیں ان سے سوال کیا جائے گا کہ تم نے کیا کیا، جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا: پس ہم ان سے ضرور پوچھیں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور ہم رسولوں سے (بھی) ضرور پوچھیں گے۔ (سورۃ الاعراف ۷، آیت: ۶)

آیت نمبر ۹۳: مجرمین کے تمام اعمال کے بارے میں پوچھ گچھ ہو گی۔

علمی بات: مجرمین نے کس کی عبادت کی تھی؟ پیغمبروں کے ساتھ کس طرح پیش آئے تھے؟ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا کلمہ کیوں نہ مانا تھا؟ اس کلمہ کا حق کیوں ادا نہیں کیا تھا؟ یہ اور اسی قسم کے نہ معلوم کتنے سوالات ہوں گے۔

آیت نمبر ۹۴: رسول ﷺ کو دعوتِ توحید کا واضح طور پر اعلان کر دینے اور مشرکین سے اعراض کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ آغازِ وحی کے بعد تین برس انفرادی طور پر دعوت کا عمل جاری رہا۔ پھر علانیہ دعوت کا حکم آیا۔

علمی بات: اے میرے رسول ﷺ! جو حکم آپ ﷺ کو دیا جا رہا ہے اس کو برملا لوگوں کے سامنے بیان کیجیے اور کسی کی مخالفت کی پروانہ کیجیے۔ فَاصْدَعْ کا معنی ظاہر کرنا۔ الصدع الشق۔ صَدَعَ کا معنی چیرنا ہے۔ اس سے پہلے حضور ﷺ انفرادی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ اس آیت کے نزول کے بعد حضور ﷺ نے برسرِ عام اسلام کی تبلیغ شروع فرما دی۔

علمی بات: اعلانِ نبوّت کے بعد تین برس تک حضور اقدس ﷺ انفرادی طور پر اور نہایت رازداری کے ساتھ تبلیغ اسلام کا فرض ادا فرماتے رہے اور اس درمیان میں عورتوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور آزاد مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور لڑکوں میں سب سے پہلے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور غلاموں میں سب سے پہلے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ایمان لائے۔ تین برس کی اس انفرادی دعوتِ اسلام میں مردوں اور عورتوں کی ایک تعداد اسلام قبول کر کے سیّد المرسلین ﷺ کے دامن اَقدس سے وابستہ ہو گئی۔ اس کے بعد اللہ ﷻ نے اپنے حبیب مکرم ﷺ پر یہ حکم نازل فرمایا: (اے نبی ﷺ!) اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرایئے۔ (سورۃ الشعراء ۲۶، آیت: ۲۱۴)

چنانچہ حضور نبی کریم ﷺ نے ایک دن کوہِ صفا کی چوٹی پر چڑھ کر قبیلہ قریش کو پکارا۔ جب سب قریش جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے میری قوم! اگر میں تم لوگوں سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر ہے جو تم پر حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم لوگ میری بات کا یقین کر لو گے؟ سب نے یک زبان ہو کر کہا جی ہاں!

ہم ضرور آپ ﷺ کی بات کا یقین کرلیں گے کیونکہ ہم نے آپ ﷺ کو ہمیشہ سچا اور امین ہی پایا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "تو پھر میں یہ کہتا ہوں کہ میں تم لوگوں کو عذابِ الٰہی سے ڈرا رہا ہوں اور اگر تم لوگ ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر اللہ ﷻ کا عذاب نازل ہوگا۔" یہ سن کر تمام قریش جن میں آپ ﷺ کا چچا ابو لہب بھی شامل تھا، سخت ناراض ہوئے اور سب کے سب چلے گئے اور رسول اللہ ﷺ کی شان میں نازیبا کلمات کہہ کر گستاخی کرنے لگے۔

چنانچہ اعلانِ نبوّت کے چوتھے سال آپ ﷺ پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی کہ "پس آپ کو جس بات کا حکم دیا گیا ہے اسے صاف صاف سنا دیجئے اور مشرکوں سے منہ پھیر لیجئے۔" (سورۃ الحجر ۱۵، آیت: ۹۴)۔ اس میں اللہ ﷻ نے یہ حکم فرمایا کہ آپ ﷺ علی الاعلان دین اسلام کی دعوت دیجئے۔ چنانچہ اس کے بعد آپ ﷺ اعلانیہ طور پر دین اسلام کی تبلیغ فرمانے لگے اور شرک و بت پرستی کی کھلم کھلا نفی فرمانے لگے اور پھر تمام قریش بلکہ تمام اہلِ مکہ بلکہ پورا عرب آپ ﷺ کی مخالفت پر کمربستہ ہوگیا اور آپ ﷺ اور مسلمانوں کی ایذا رسانیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔

آیت نمبر ۹۵: نبی کریم ﷺ کو اور آپ ﷺ کے ذریعہ اہلِ ایمان کو تسلّی دی گئی ہے۔ مذاق اڑانے سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری خود اللہ ﷻ کی ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ اپنے نبی سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے فرماتا ہے کہ آپ ﷺ اللہ ﷻ کے احکام کو کھل کر بیان کیجئے اور ان لوگوں کی پرواہ نہ کیجئے جو (معاذاللہ) آپ ﷺ کا مذاق اڑاتے ہیں اللہ ﷻ کے سوا آپ ﷺ کسی سے نہ ڈریئے کیونکہ آپ ﷺ کی مدد کے لئے اللہ ﷻ کافی ہے۔

علمی بات: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے قرآنِ حکیم کی یہ آیت پڑھی اور فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کا مذاق اڑانے والے (بڑے بڑے یہ پانچ) آدمی تھے، ولید بن مغیرہ، اسود بن عبد یغوث، زہری، ابوزمعہ اسود بن عبد المطلب، حارث بن عیطل السمی اور العاص بن وائل السمی۔ ایک طویل حدیث میں ذکر ہے کہ ایک بار جبرائیل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے ان سے مذاق اڑانے والوں کی شکایت کی۔ طویل حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام نے ان کے جسم کے کسی نہ کسی حصّے کی طرف اشارہ کیا اور وہ پانچوں بُری طرح ہلاک ہوئے۔ (المعجم الاوسط)

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ بیت اللہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے اور ابو جہل اور اس کے کچھ ساتھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے آپس میں کہا کہ تم میں سے کون ہے جو بنو فلاں کی ذبح کردہ اُونٹنی کی اُوجھڑی اور بچہ دانی وغیرہ اٹھا کر لائے اور محمد (ﷺ) جب سجدہ کرے تو اس کی پیٹھ پر رکھ دے (معاذاللہ)۔ تو ان میں سے سب سے بدبخت شخص اٹھا اور اس نے وہ اُوجھڑی وغیرہ لاکر آپ ﷺ کے کندھوں کے درمیان رکھ دی۔ میں دیکھ رہا تھا مگر کچھ نہ کرسکتا تھا، کاش! مجھ میں آپ ﷺ کے دفاع کی طاقت ہوتی۔ تو وہ سب ہنستے ہنستے ایک دوسرے پر لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ رسول اللہ ﷺ سجدہ ہی میں رہے، سر نہیں اٹھایا، یہاں تک کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں اور اسے آپ ﷺ کی کمر سے اتار پھینکا، تو آپ ﷺ نے سر اٹھایا اور کہا: "یا اللہ! قریش کو پکڑ۔" آپ ﷺ کی یہ دُعائے ضرر ان پر بڑی شاق گزری، وہ سمجھتے تھے کہ اس شہر میں دُعا قبول ہوتی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے نام لے کر فرمایا: "اے اللہ! ابو جہل کو پکڑ، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، امیہ بن خلف اور عقبہ بن ابی معیط کو پکڑ۔" راوی کہتے ہیں کہ ایک ساتواں نام بھی ذکر کیا جو ہمیں یاد نہیں رہا۔" ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "پھر اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں نے ان تمام آدمیوں کو جو رسول اللہ ﷺ نے گنے تھے، بدر کے کنویں میں ہلاک شدہ گرے ہوئے دیکھا۔" (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۹۶: مشرکین نے اللہ ﷻ کے ساتھ دوسروں کو بھی معبود بنا رکھا ہے۔ عنقریب وہ اپنا انجام دیکھ لیں گے۔

علمی بات: یعنی یہ مذاق کرنے والے وہ بدنصیب لوگ تھے جو اللہ ﷻ وحدہ لاشریک لہ کے علاوہ اپنے بتوں کو بھی الٰہ سمجھتے تھے اور ان کی عبادت کیا کرتے تھے۔ اس آیت میں فرما دیا کہ انہیں ان کی گمراہی کی پوری پوری سزا ملے گی۔

علمی بات: (۱) زمین سے لے کر آسمان تک جو مخلوق بھی ہے انسان اس سے اشرف اور بلند تر ہے اور ساری مخلوق اس کے لئے ہے پھر اس شخص سے بڑھ کر اور کون نادان ہے جو مخلوقات میں سے کسی کو اپنا معبود اور مسجود بنا لے۔

(۲) ہر قسم کی قوّت، قدرت اور تمام اوصافِ کمالیہ ایک بزرگ و برتر ہستی اللہ ﷻ کے لئے ہیں جو ماورائے عرش سے زیر فرش تک ہر ذرہ پر حکمران ہے اس کی اطاعت کے دائرہ سے کوئی نقطہ باہر نہیں وہی معبودِ حقیقی ہے۔

آیت نمبر ۹۷: مخالفین کے ایمان نہ لانے پر رسول ﷺ کے قلب مبارک کو تکلیف ہونے پر اللہ ﷻ کی طرف سے تسلّی دینے کا ذکر ہے۔

علمی بات: علی الاعلان دعوت کی وجہ سے مخالفت کا ایک طوفان آپ ﷺ پر امڈ آیا تھا۔ پہلے مرحلے میں یہ مخالفت اگرچہ زبانی طعن اور بد گوئی تک محدود تھی مگر بہت تکلیف دہ تھی۔ کسی نے مجنون اور کاہن کہہ دیا، کسی نے شاعر کا خطاب دے دیا۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو واقعی سمجھتے تھے کہ آپ ﷺ پر آسیب وغیرہ کے اثرات ہو گئے ہیں۔ (معاذاللہ) ایسے لوگ ازراہِ ہمدردی ایسی باتوں کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ عتبہ بن ربیعہ نے اسی طرح آپ ﷺ سے اظہار ہمدردی کیا۔ وہ قبیلے کا معمر بزرگ تھا۔ اس نے کہا: اے میرے بھتیجے، بڑے بڑے عاملوں اور کاہنوں سے میرے تعلقات ہیں، آپ کہیں تو میں ان میں سے کسی کو بلالاؤں اور آپ کا علاج کراؤں؟ ان سب باتوں سے آپ ﷺ کو بہت تکلیف ہوتی تھی اور آپ ﷺ کی اسی تکلیف اور دل کی گھٹن کا یہاں تذکرہ کیا جارہا ہے اور تسلّی دی جارہی ہے کہ اے نبی (ﷺ)! ان لوگوں کی بے ہودہ باتوں سے آپ ﷺ کو جو تکلیف ہوتی ہے وہ ہمارے علم میں ہے۔

آیت نمبر ۹۸: دعوتِ دین کی راہ میں آنے والی تکالیف اور مصائب کا علاج یہ ہے کہ اللہ ﷻ کی طرف رجوع کیا جائے، اس کی تسبیح اور تعریف بیان کی جائے اور نمازوں کا اہتمام کیا جائے۔

عملی بات: اس سے معلوم ہوا جب انسان کا دل رنجیدہ اور پریشان ہو یا اس پر گھبراہٹ طاری ہو تو اس کو نماز پڑھنی چاہیئے کیونکہ نماز حمد تسبیح اور عبادت سب کی جامع ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب نبی اکرم ﷺ پر پریشانی طاری ہوتی تو آپ ﷺ نماز پڑھتے تھے۔ (سنن ابی داؤد)

علمی بات: حضور نبی کریم ﷺ کا قلب مخلوق کے لئے ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات سے لبریز تھا۔ حضور ﷺ جب اپنی قوم کی گمراہی اور اس پر ان کے اصرار کو دیکھتے تو دل درد سے بھر جاتا اور شدید قسم کی گھٹن محسوس ہونے لگتی۔ اللہ ﷻ نے اپنے حبیب کریم ﷺ کو اس رنج و غم اور ملال سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ تلقین فرمایا کہ جب ان کی نافرمانی اور کج روی کے باعث آپ ﷺ غمگین ہو جائیں تو اس وقت اپنے رب قدوس کی تسبیح اور اس کی حمد میں مشغول ہو جایا کریں اور اپنا سرِ نیاز اس کی بارگاہ صمدیت میں جھکا دیا کریں۔ رنج و غم خود بخود دور ہو جائے گا اور دل کی افسردگی اور گھٹن دور ہو جائے گی۔

آیت نمبر ۹۹: زندگی کے آخری سانس تک اللہ ﷻ کی عبادت میں مشغول رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ یقین سے مراد موت ہے۔ (سورۃ المدثر ۷۴، آیت: ۴۷) اس لئے کہ موت سے زیادہ یقینی بات کوئی نہیں۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی طرف سے تعلیم ہے کہ اے نبی مکرم ﷺ! عبادت کا یہ سلسلہ پورے ذوق شوق کے ساتھ اس وقت تک جاری رہے، جب تک اس دارِ فنا سے رحلت کا پیغام نہ آجائے۔ جب تک آنکھ جھپک رہی ہے۔ نبض چل رہی ہے میری یاد ہوتی رہے۔ میرے ذکر اور عبادت کا چراغ روشن رہے اور بندگی کا حق بھی یہی ہے کہ تادمِ آخر دل اپنے معبودِ برحق کے ذکر سے سرشار رہے۔

عملی پہلو: بندہ خواہ کتنا ہی بڑا مرتبہ حاصل کرلے وہ عبادات سے بَری الزمہ نہیں ہو سکتا۔ جب خاتم الانبیاء سید المرسلین ﷺ کو آخری دم تک عبادت کرنے کا حکم دیا گیا تو دوسرے کس شمار میں۔ اس سے ان لوگوں کو نصیحت حاصل کرنی چاہیئے جو اپنے آپ کو بڑے بلند مقام و مرتبہ پر فائز سمجھ کر عبادات کے معاملہ میں خود کو بے نیاز جانتے ہیں انہیں غور کرنا چاہیئے کہ وہ کہیں شیطان کے خفیہ اور خطرناک وار کا شکار تو نہیں ہو گئے کیونکہ شیطان نے ایسے واروں کے ذریعہ بڑے بڑے نیک و پارسا لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔

COPYRIGHTS © RESERVED, THE ILM FOUNDATION. SALE OF THIS BOOK WOULD ENTAIL CRIMINAL ACTION.

سُوْرَةُ النَّحل

ربط سورت: ا۔ سورۃ الحجر میں مجرموں اور مذاق اڑانے والوں کی ہلاکت کا ذکر تھا۔ سورۃ النحل میں قریش کی مشرک اور مغرور قیادت کا تذکرہ ہے۔

۲۔ سورۃ الحجر کے آخر میں مشرکین سے شکوہ تھا کہ وہ اللہ ﷻ کے ساتھ غیر اللہ کو معبود بناتے ہیں۔ اس سورت کی ابتدا میں شرک کی تردید ہے۔

۳۔ سورۃ الحجر کی ابتدا میں صداقتِ قرآن کا ذکر تھا۔ اس سورت کی ابتدا میں بھی صداقت قرآن ذکر ہے۔

۴۔ سورۃ الحجر کے آخر میں آنحضرت ﷺ کے فرائض منصب کا ذکر تھا۔ اس سورت کے آخر میں بھی آنحضرت ﷺ کے فرائض منصب کا ذکر ہے۔

۵۔ سورۃ الحجر کی ابتدا میں آنحضرت ﷺ کی تسلی کا مضمون تھا۔ اس سورت کے آخر میں بھی آپ ﷺ کے لئے تسلی کا مضمون ہے۔

۶۔ سورۃ الحجر کے آخر میں قیامت کا ذکر تھا۔ اس سورت کی ابتدا میں بھی قیامت کا ذکر ہے۔

۷۔ سورۃ الحجر میں اصحابِ حجر (قومِ ثمود) کا حال بیان کیا گیا کہ ضد وعناد اور تکذیب وانکار کی وجہ سے انہیں دنیا ہی میں دردناک عذاب سے ہلاک کر دیا گیا۔ اس عبرتناک واقعہ سے منکرین کو نصیحت حاصل کرنی چاہیئے۔ اگر وہ اصحاب حجر کے واقعہ سے عبرت نہیں پکڑتے تو پھر نحل (شہد کی مکھی) کا حال دیکھ لیں شاید وہی ان کے لئے عبرت آموز ثابت ہو۔ یہ ناچیز مکھی کس طرح مختلف پھولوں اور پھلوں سے رس چوس کر لاتی ہے اور شہد جیسی بے نظیر چیز تیار کرتی ہے اور اپنے چھتے کا راستہ کبھی نہیں بھولتی۔ یہ معمولی سا جانور جو اتنا بڑا اہم کام انجام دے رہا ہے۔ یہ اللہ ﷻ کی قدرت وعظمت کا ایک ادنیٰ سا نمونہ ہے۔ منکرین اسی سے عبرت حاصل کرلیں اور اللہ ﷻ کی واحدنیت اور رسالتِ محمدی ﷺ پر ایمان لے آئیں۔

۸۔ سورۃ الحجر میں مشرکین کو دعوت دی گئی کہ اب بھی وقت ہے مان لو ورنہ پچھتاؤ گے جب اللہ ﷻ کا عذاب آگیا تو اس سے ہرگز نہیں بچ سکو گے۔ اب سورۃ النحل میں بیان ہے کہ اگر تم توحید باری تعالیٰ کو نہیں مانتے اور ضد وعناد سے عذاب ہی مانگتے ہو تو پھر عذاب الٰہی آیا ہی سمجھو۔ لہٰذا اس کے لئے جلدی نہ مچاؤ۔

۹۔ سورۃ الحجر نبی کریم ﷺ کے لئے اس تسلی کے مضمون پر ختم ہوئی تھی کہ آج جو لوگ آپ ﷺ کے اِنذار، تنبیہ وتذکیر کا مذاق اڑا رہے ہیں اور آپ ﷺ کی باتوں کو محض ہوائی باتیں خیال کر رہے ہیں (معاذ اللہ)، آپ ﷺ ان کے اس استہزاء سے دل شکستہ نہ ہوں، آپ ﷺ کی طرف سے ان متکبروں اور مغروروں سے نپٹنے کے لئے اللہ ﷻ کافی ہے۔ اس مضمون کے بعد یہ سورت بغیر کسی تمہید کے ان متکبرین ہی کو خطاب کر کے ہی شروع کی گئی ہے۔

آیت نمبر ا: اللہ ﷻ کے حکم سے مراد عذاب یا قیامت ہے جسے کفار یا مشرکین طلب کرتے تھے۔ عذاب اور قیامت کا آنا یقینی ہے جس سے جلد ہی انہیں سابقہ پیش آنے والا ہے۔ اللہ ﷻ کی ذات ہر قسم کے شریکوں سے بلند وبرتر ہے۔

علمی بات: عربی زبان کے اعتبار سے یہ انتہائی زوردار فقرہ ہے جس میں آئندہ ہونے والے کسی یقینی واقعہ کو ماضی کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کے زور اور تاثیر کو کسی اور زبان میں ادا کرنا بہت مشکل ہے۔ پس منظر یہ ہے کہ جب آپ ﷺ کفار سے یہ فرماتے تھے کہ کفر کا نتیجہ اللہ ﷻ کے عذاب کی صورت میں ظاہر ہوگا اور مسلمان غالب آئیں گے تو وہ مذاق اڑانے کے انداز میں کہا کرتے تھے کہ اگر عذاب آنا ہے تو اللہ ﷻ سے کہیئے کہ اسے ابھی بھیج دے ان کا مقصد درحقیقت یہ تھا کہ انہیں عذاب کے آنے اور مسلمانوں کی فتح کا یقین نہ تھا۔ اس سورت کا آغاز ان کے اس طرزِ عمل کے مقابلہ میں یہ فرما کر کیا گیا ہے کہ کافروں پر آنے والے جس عذاب اور مسلمانوں کے غلبہ کی جس خبر کو تم ناممکن سمجھ رہے ہو وہ اللہ ﷻ کا اٹل فیصلہ ہے اور اتنا یقینی ہے کہ گویا آن ہی پہنچا ہے، لہٰذا اس کے آنے کی جلدی مچا کر اس کا مذاق نہ اڑاؤ، کیونکہ وہ تمہارے سر پر کھڑا ہے۔ پھر اگلے فقرہ میں اس عذاب کے یقینی ہونے کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ تم لوگ اللہ ﷻ کے ساتھ شرک کرتے ہو حالانکہ اللہ ﷻ نہ صرف اس سے پاک بلکہ اس سے بہت بالا وبرتر ہے۔ لہٰذا اس کے ساتھ شرک کرنا اس کی توہین ہے اور خالق کائنات کی توہین کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ توہین کرنے والے پر عذاب نازل ہو۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (دو انگلیاں ملا کر) فرمایا: "میں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے ہیں۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

آیت نمبر ۲: کفار اور مشرکین کا مکہ اور طائف کے سرداروں میں سے کسی کو نبی نہ بنانے کے اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ نیز انبیاء کرام علیہم السلام کو بھیجنے کا مقصد بیان کیا گیا ہے اور یہاں روح سے مراد وحی ہے۔

علمی بات: کفار کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کے لئے ہم میں سے کسی بڑے سرمایہ دار کو کیوں منتخب نہیں کیا، محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو کیوں منتخب کیا گیا ہے؟ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا قول ذکر کیا ہے کہ "اور وہ کہنے لگے: یہ قرآن (مکّہ اور طائف کی) دو بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی (کسی وڈیرے، سردار اور مال دار) پر کیوں نہیں اتارا گیا؟" (سورۃ الزخرف ۴۳، آیت: ۳۱)

دوسری طرف یہود کو یہ حسد تھی کہ وحی بنی اسرائیل سے باہر کسی اور پر کیوں اترنے لگی۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب لوگوں کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے فرمایا کہ نبی کے انتخاب کے لئے تمہارا مقرر کیا ہوا معیار غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو وحی دے کر اپنے جس بندہ پر چاہے اتار دیتا ہے۔ اسے اس سلسلہ میں کسی سے اجازت یا مشورہ لینے کی ضرورت نہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ اپنے نبی علیہ السلام کو اس قوت و استعداد سے مالا مال کر کے پیدا فرماتا ہے جو بارِ نبوت کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے ضروری ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نبوت وَہبی (عطا کردہ) صفت ہے کسبی (محنت سے حاصل کردہ) نہیں یعنی ریاضت و عبادت کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں میں سے جس پر چاہے وحی نازل فرماتا ہے۔ یہ منصب اپنی کوشش سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ نبوت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ عظیم منصب ہے اور اس کا سلسلہ نبی آخر الزمان سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ختم ہو چکا ہے۔

علمی بات: انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت اور نزولِ وحی کا مقصد یہ ہے کہ وحی لانے والے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخاطبین کو یہ پیغام پہنچا دیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور ساتھ ہی اس بات سے بھی آگاہ کر دیں کہ اگر تم نے توحید کی دعوت کو قبول نہ کیا تو عذاب میں مبتلا ہو گے لہٰذا تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔

علمی بات: روح کے معنٰی کے حوالہ سے کئی اقوال ہیں تاہم روح سے مراد اگر وحی لی جائے تو اس میں تمام اقوال جمع ہو جاتے ہیں کیونکہ نبوت بھی وحی سے ثابت ہوتی ہے اور تمام اوامر و احکام بھی وحی سے ثابت ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ بھی وحی پر عمل کرنا ہے اور قرآنِ حکیم بھی وحی سے حاصل ہوا اس لئے روح سے وحی مُراد لینا سب سے جامع قول ہے۔ قرآن حکیم کی حسب ذیل آیات میں روح کا اطلاق وحی پر کیا گیا ہے۔

"اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے آپ کی طرف روح (قرآن) کی وحی فرمائی۔" (سورۃ الشوریٰ ۴۲، آیت: ۵۲)

"وہ اپنے بندوں سے جس پر چاہتا ہے اپنے حکم سے روح (وحی) نازل فرماتا ہے۔" (سورۃ المؤمن ۴۰، آیت: ۱۵)

آیت نمبر ۳: اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل کے طور پر تخلیق کائنات کا بیان ہے۔ کائنات کو برحق پیدا کیا گیا ہے۔ جس طرح کائنات کو پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں اسی طرح عبادت میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں۔

علمی بات: زمین و آسمان کا نظام ایسا درست و بہترین بنایا ہے جسے دیکھ کر لامحالہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ تمام کائنات کا سلسلہ صرف ایک ہی مالک و مختار کے دستِ قدرت میں ہے۔ ورنہ کئی آزاد خداؤں کی باہمی کشمکش سرے سے اس عالم کے نظام کو موجود ہی نہ ہونے دیتی جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اگر ان (آسمان اور زمین) میں اللہ کے سوا اور (بھی) معبود ہوتے تو یقیناً دونوں درہم برہم ہو جاتے۔" (سورۃ الانبیاء ۲۱، آیت: ۲۲) دوسری جگہ ارشاد ہوا: "(اگر ایسا ہوتا) تو ہر معبود اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہو جاتا اور پھر وہ ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتے۔" (سورۃ المؤمنون ۲۳، آیت: ۹۱)

علمی بات: یہاں سے اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت اور اس کی وحدانیت اور اس کی ربوبیت کے ان دلائل کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے جو اتنے واضح اور یقین آفرین ہیں کہ اگر کوئی معمولی عقل و فہم رکھنے والا بھی غور کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی توحید کا اسے اعتراف کرنا ہی پڑے گا۔ ذرا غور تو کیجیے زمین و آسمان کا یہ کارخانہ کتنا وسیع ہے اور کتنے بے شمار پُرزوں سے مرکب ہے۔ ہر پُرزہ چھوٹا ہو یا بڑا اپنی اپنی جگہ پر اس خوبی سے نصب ہے کہ نہ کوئی پیچ ڈھیلا ہوتا ہے نہ کوئی گراری ٹوٹتی ہے اور نہ ہی انجن کی رفتار میں فرق پڑتا ہے۔ ہر چیز اپنا اپنا فریضہ انجام دے رہی ہے۔ جس کے ذمّہ چلنا ہے وہ چل ہی رہی ہے۔ نہ اپنی سمت بدلتی ہے، نہ اپنے مقررہ راستہ سے بال

برابر اِدھر اُدھر سرکتی ہے اور نہ ہی اس کی چال اور کارکردگی میں فرق پڑتا ہے۔ جس کے ذمہ دوڑنا ہے وہ دوڑتی ہی چلی جارہی ہے جنہیں ٹھہرنے کا حکم ملا ہے وہ دم بخود چپ چاپ کھڑی ہیں۔ انسان اس محیر العقول کارخانہ کی پیچیدگیوں میں غور کرے تو سر چکرا جاتا ہے اور عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

علمی و عملی پہلو: آیت سے کئی تعلیمات حاصل ہوئیں، مثلاً یہ کہ ۱۔ آسمان و زمین خود ساختہ نہیں، مخلوق ہیں۔ ۲۔ مخلوق اللہ ﷻ کی ہے نہ کہ کسی اور کی۔ ۳۔ ان سب کی خلقت بلا کسی غرض و مقصد کے، سیر و تفریح، کھیل و تماشا کی طرح نہیں، گہرے حکیمانہ مقصد ہی سے ہوئی ہے۔

آیت نمبر ۴: انسان کی تخلیق کو بیان فرما کر اسے اپنے وجود کی اندرونی نشانیوں کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے۔ انسان اپنی تخلیق سے اللہ ﷻ کی وحدانیت کو سمجھنے کے بجائے اپنے خود ساختہ نظریات کے حق میں بحث کرتا اور توحید کا انکار کرتا ہے۔

علمی بات: انسان اپنی اصل کو تو دیکھتا نہیں اور جھگڑے بازی کرتا ہے۔ اس کا یہ جھگڑا صرف مخلوق ہی کے ساتھ نہیں اللہ ﷻ کی طرف سے دی جانے والی خبروں اور احکام میں بھی جھگڑے بازی کرتا ہے۔ مشرکین اور کافروں کا بات نہ ماننے کے لئے بے جا بحث و تکرار کرنے کا رویہ جگہ جگہ قرآنِ حکیم میں ذکر ہوا ہے۔ (مثلاً سورۂ یٰس ۳۶، آیات: ۷۷ تا ۷۹) اور ان کے سوالات اور کٹ حجتی کے جوابات بھی دیئے گئے ہیں، کافر تو کافر ہیں جو لوگ نام کے مسلمان ہیں وہ بھی حجت بازی کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ شیطان کو ہمارے پیچھے کیوں لگا دیا؟ کبھی کہتے ہیں کہ جب پہلے سے تقدیر میں لکھ دیا ہے تو ہمارا مؤاخذہ کیوں ہے؟ کبھی کہتے ہیں کہ ہم نے کون سا تار بھیجا تھا کہ ہمیں پیدا کردے، کبھی کہتے ہیں کہ کون شریعت پر چل رہا ہے جو ہم چلیں؟ بعض لوگوں کو یوں بھی کہتے ہوئے سنا کہ سب نیک ہو جائیں تو دوزخ کس سے بھرے گی؟ بعض لوگوں سے یہ بات بھی سنی گئی ہے کہ اللہ ﷻ کو ہماری عبادت کی ضرورت نہیں ہے ہم نے عبادت نہ کی تو کیا حرج ہے؟ ایسا کہنے والے وہ لوگ ہیں جو اسلام کے بھی دعوے دار ہیں اور اللہ ﷻ پر اعتراض بھی کرتے ہیں جبکہ اللہ ﷻ پر اعتراض کرنے سے کفر عائد ہونے کا شدید اندیشہ ہے۔ (معاذ اللہ)

علمی بات: آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور ان کا نظام درست کرنے کے بعد اللہ ﷻ نے انسان کو ایک قطرہ بے جان سے پیدا کیا جس میں نہ حس و حرکت تھی، نہ شعور و ارادہ، نہ وہ بات کرنے کے قابل تھا اور نہ کسی معاملہ میں جھگڑ کر اپنا حق منوا سکتا تھا اور نہ دوسروں پر غالب آ سکتا تھا۔ پھر اسی قطرہ ناچیز کو اللہ ﷻ نے کیا سے کیا بنا دیا۔ کتنی حسین و جمیل صورت بنائی۔ کیسی اعلیٰ قوتیں اور کمالات اس کو عطا فرمائے۔ جب اس ضعیف الخلقت انسان کو جو ایک حرف بولنے کے قابل نہ تھا، اللہ ﷻ نے طاقت اور قوت گویائی عطا فرمائی تو خوب لیکچر دینے لگا اور بات بات میں جھگڑے اور حجتیں کرنے لگا، یہاں تک کہ بعض اوقات اپنے خالق کے مقابلہ میں بھی خم ٹھونک کر آ کھڑا ہوتا ہے اور اپنی اصل کو بھول جاتا ہے۔

آیت نمبر ۵: اَنعام سے مراد پالتو چوپائے ہیں مثلاً اونٹ گائے چوپائے وغیرہ ہیں۔ دِف۔ گرمی حاصل کرنے کی چیز سے مراد اُون ہے جس کے گرم کپڑے بنائے جاتے ہیں۔ پالتو مویشیوں کے انسان کے لئے دو بڑے فائدے یہ ہیں:

۱۔ ان جانوروں کے اُون سے سردی سے بچاؤ کا سامان مہیا ہوتا ہے۔

۲۔ ان کو ذبح کر کے انسان اپنی خوراک بناتا ہے۔

اس کے علاوہ ان جانوروں کے اور بھی بہت سے فوائد انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔

علمی بات: انسان کے بعد اب ان اشیاء کی تخلیق کا ذکر ہے۔ جو خاص طور پر انسان کے فائدے کے لئے بنائی گئی ہیں۔ قرآن حکیم کے سب سے پہلے مخاطب چونکہ عرب تھے اور ان کی معیشت کا دار و مدار پالتو چوپاؤں، اونٹ، گائے اور بکریوں پر تھا اس لئے پہلے ان کا ذکر فرمایا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: کہ اللہ ﷻ نے چوپائے یعنی اونٹ، گائے، بھینس، بھیڑ اور بکری وغیرہ سب تمہارے فائدے کے لئے پیدا کیئے ہیں۔ ان میں سے بعض کے بالوں اور اون سے تم اپنی ضرورت کی مختلف چیزیں مثلاً کمبل، چادریں، سردی سے بچاؤ کے لئے مختلف قسم کے لباس، خیمے اور رسیاں وغیرہ تیار کرتے ہو۔ ان میں سے بعض کا دودھ پیا جاتا ہے اور گوشت کھایا جاتا ہے یا دودھ سے گھی اور مکھن وغیرہ تیار کیا جاتا ہے۔ جیسے گائے، بھینس اور بکری وغیرہ۔ ان کا دودھ بھی پیا جاتا ہے اور گوشت بھی کھایا جاتا ہے اور بعض سے کھیتی باڑی اور بار برداری کا کام لیا جاتا ہے۔ جیسے اونٹ اور بیل وغیرہ۔ ان کی کھال سے نہایت عمدہ اور بیش قیمت لباس اور ضرورت کی دیگر چیزیں تیار کی جاتی ہیں۔ غرض یہ کہ انسان ان چوپایوں سے بے شمار منافع حاصل کرتا ہے۔

آیت نمبر ۶: مویشی انسان کے لئے زینت کے اظہار کا بھی ذریعہ ہیں جب تک کہ اس زینت و جمال پر فخر و تکبر نہ کیا جائے۔

علمی بات: جانوروں کی موجودگی سے آدمی کی دنیاوی زینت و زیبائش میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ وہ ان جانوروں کو اپنی ملکیت میں دیکھ کر خوش ہوتا ہے کہ اس کے پاس یہ جائیداد ہے۔ اس کے علاوہ جب وہ صبح سویرے چرنے کے لئے بستیوں سے باہر نکلتے ہیں اور چراگاہ کی طرف جاتے ہیں اور دن بھر چرنے کے بعد شام کے وقت واپس آتے ہیں تو کتنا دلکش منظر ہوتا ہے۔ وہ راستے بھی آباد آباد دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں سے وہ جانور گزر رہے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اپنے مویشیوں کو جب یوں یکجا سرسبز چراگاہ کی طرف جاتے ہوئے یا وہاں سے آتے ہوئے تم دیکھتے ہو تو جو فرحت اور طمانیت تمہارے دل محسوس کرتے ہیں ذرا اس کا ہی اندازلگاؤ۔ تم اللہ ﷻ کے کس کس احسان کو بھلاؤ گے اور کب تک ناشکری کرو گے۔

علمی بات: مذکورہ بالا فوائد کے علاوہ چوپائے زینت اور شوکت وعزت کا نشان ہیں۔ چنانچہ موجودہ دور میں گاڑیاں، راحت و آسائشوں کے حالات اور دیگر ایسی اشیاء جو ہماری زندگی کو آرام دہ اور آسان بنا رہی ہوتی ہیں وہ سب اشیاء سہولیاتِ زندگی ہیں۔ زینت کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ کچھ عرصہ پہلے تک جس کے پاس جتنی زیادہ مویشی ہوا کرتے تھے وہ شخص اتنا ہی مالدار سمجھا جاتا تھا۔ جیسے آج اگر صبح کسی کے گھر سے اعلیٰ درجہ کی گاڑی نکلے اور شام کو واپس آئے تو لوگوں کی نظر میں اس کی بڑی شان و شوکت ہوتی ہے۔

علمی بات: اس آیت سے جمال اور زینت کا جواز معلوم ہوتا ہے اگرچہ فخر جتانا اور تکبر کرنا حرام ہیں۔ دونوں میں سادہ سا فرق یہ ہے کہ جمال اور زینت کا حاصل یہ ہو کہ انسان کو اپنے دل میں اللہ ﷻ کی نعمت پر خوشی کے اظہار کی کیفیت ہو۔ اپنے آپ کو اس نعمت کا مستحق نہ سمجھے، اس کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی حقیر نہ جانتا ہو بلکہ تمام نعمتوں کا حق تعالیٰ کی طرف سے عطیہ اور انعام ہونا اس کے پیش نظر ہو جب کہ تکبر و فخر میں اپنے آپ کو اس نعمت کا مستحق سمجھنا، دوسروں کو حقیر سمجھنا پایا جاتا ہے جو حرام ہے۔

آیت نمبر ۷: اُن چوپایوں کا ذکر ہے جن کی تخلیق انسانوں کے بوجھ اور سواری اٹھانے کے لئے ہوئی ہے۔ یہ جانور بھاری سامان دور دراز شہروں تک پہنچاتے تھے جہاں انسان اپنے آپ کو مشقت میں ڈالے بغیر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اللہ ﷻ بڑی شفقت فرمانے والا ہے۔ وہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ اس نے انسانوں کے لئے جانوروں کی خدمات دے کر بہت آسانیاں پیدا فرما دیں۔

علمی بات: میدانی علاقہ ہو یا ریت کے ٹیلے ہوں۔ پہاڑوں کی بلندیاں ہوں یا وادیوں کا نشیب ہو۔ راستہ ہموار ہو یا قدم قدم پر گڑھے ہوں، یہ جانور انسانوں کے بھاری بھرکم سامان کو اپنی پشتوں پر لادے ہوئے کس طرح خاموشی سے چلے جا رہے ہیں۔ انسان ذرا غور تو کرے! اگر اسے یہ سامان خود اٹھا کر لے جانا پڑتا تو اسے کس دِقت کا سامنا ہوتا۔ ایسے جانوروں کا بہم پہنچانا اس کے پروردگار کی ازحد شفقت اور بے پایاں رحمت کا کتنا بڑا ثبوت ہے۔

آیت نمبر ۸: گھوڑے، خچر اور گدھے انسان کے فائدے کے لئے پیدا کیئے گئے ہیں۔ ان کی پیدائش کا اصل مقصد ان پر سواری کرنا ہے تاہم یہ زینت کے اسباب بھی ہیں۔ مزید یہ کہ ان سواریوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو نزولِ قرآنِ مجید کے وقت اس کے اولین مخاطبین کے نظروں سے اوجھل تھیں۔

علمی بات: قریش مکہ کو بتایا جا رہا ہے کہ اللہ ﷻ کی پیدا کی ہوئی بہت سی سواریاں وہ ہیں جن کا ابھی تمہیں پتہ نہیں ہے، اس طرح آیت کریمہ نے یہ خبر دی ہے کہ اگرچہ فی الحال تم صرف گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کو سواری کے لئے استعمال کرتے ہو، لیکن اللہ ﷻ آئندہ نئی نئی سواریاں پیدا کرے گا اور اس طرح اس آیت میں ان ساری سواریوں کا ذکر آ گیا ہے جو نزولِ قرآنِ مجید کے بعد پیدا ہوئیں، مثلاً کاریں، بسیں، ریل گاڑیاں، ہوائی جہاز اور بحری جہاز وغیرہ بلکہ قیامت تک جتنی سواریاں مزید پیدا ہوں گی وہ سب اس آیت کے مفہوم میں داخل ہیں، عربی زبان کے قاعدہ کے مطابق اس جملہ کا یہ ترجمہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ایسی چیزیں پیدا کرے گا جن کا لوگوں کو ابھی علم ہی نہیں ہے۔

آیت نمبر ۹: سیدھا راستہ توحید کا راستہ ہے اور ٹیڑھے راستہ سے مراد گمراہی کے راستے ہیں۔ دونوں راستوں کی نشاندہی کر کے انسان کو ارادہ اور اختیار کی آزادی دے دی گئی ہے۔ اگر اللہ ﷻ چاہتا تو سب کو زبردستی ہدایت کے راستہ پر ڈال دیتا مگر یہ اس کی حکمت کے مطابق نہ ہوتا۔

علمی بات: اللہ ﷻ کا اپنے بندوں پر مذکورہ بالا تمام احسانات سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے صراطِ مستقیم یعنی دین اسلام کو ان کے لئے بیان کر دیا جس پر چل کر وہ اس کی رضا کو حاصل کر سکتے ہیں اور اس کے عذاب سے بچ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ جتنے بھی ادیان و مذاہب ہیں، چاہے یہودیت ہو یا نصرانیت، مجوسیت ہو یا ہندوازم، سب کے سب راہِ راست سے ہٹے ہوئے ہیں، ان پر چل کر اللہ ﷻ کی رضا کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ آیت میں "وَمِنْهَا جَآئِرٌ" سے یہی باطل مذاہب مراد ہیں۔ اس کے بعد اللہ ﷻ نے فرمایا: اگر اللہ ﷻ چاہتا تو تمام بنی نوع انسان کو راہِ راست پر لا کر کھڑا کر دیتا۔ اس کی قدرت سے یہ بات بعید نہیں تھی، لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا، بلکہ خیر و شر کی دونوں راہوں کو بیان کر دیا اور انسان کو اختیار دے دیا کہ جو راہ راست پر چلے گا، اسے وہ ہدایت دے گا اور جو گمراہ ہونا چاہے گا اسے اس کے حال پر چھوڑ دے گا۔

آیت نمبر ۱۰: بارش کے فوائد کا بیان ہے۔ بارش کے پانی سے انسان سیراب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار نباتات پیدا ہوتی ہیں جو انسان کے ساتھ اس کے مویشیوں کی خوراک بنتی ہیں۔

علمی بات: اس سے پہلے انسان اور اس کی بقاء کے لئے جن اشیاء کی ضرورت تھی ان کی تخلیق کا ذکر فرمایا۔ اب اللہ ﷻ کی شانِ ربوبیت کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ جس قادرِ مطلق نے ایک قطرۂ آب سے انسان جیسی دلکش اور دلچسپ مخلوق پیدا فرمائی۔ اس نے پیدا کرنے کے بعد اسے فراموش نہیں کر دیا بلکہ اس کی نشوونما کے تمام تقاضوں کو بہت عمدگی سے پورا فرمایا۔ سب سے پہلے پانی کا ذکر کیا۔ کیونکہ انسانی، حیوانی اور نباتاتی زندگی کا دارومدار اسی پر ہے۔ انسان اسے پیتا ہے اور اپنی چراگاہوں، کھیتوں اور باغات کو سیراب بھی کرتا ہے۔ اسی سے چراگاہوں میں سبز گھاس اور کھیتوں میں شاداب چارہ لہلہانے لگتا ہے جو جانوروں کی خوراک بنتا ہے۔ اگر پانی ہی نایاب ہو جائے تو زندگی کی ساری رنگینیاں خاک میں مل جائیں۔ یہاں شجر سے مراد ہر وہ چیز ہے جو زمین سے اُگتی ہے شجر کے عموم میں پودے، درخت، جھاڑیاں، گھاس سب داخل ہیں۔ یہاں مراد چراگاہیں ہیں۔ بتایا جا رہا ہے کہ کھانے پینے کی ساری لذتوں اور نعمتوں کا آخری سرا اسی قادرِ مطلق کے ہاتھ میں ہے۔

آیت نمبر ۱۱: بارش کے پانی سے انسان کے لئے کھیت اور ہر قسم کے پھل اور میوے تیار ہوتے ہیں۔ اللہ ﷻ کی قدرت کی ان نشانیوں میں غور و فکر کرنے والے اللہ ﷻ کی معرفت حاصل کرتے ہیں۔

علمی بات: اللہ ﷻ ایک ہی پانی سے مختلف قسم کے پھل اور میوے اگاتا رہتا ہے جن کی شکل و صورت، رنگ و بو، مزہ اور تاثیر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس میں غور کرنے والوں کے لئے اللہ ﷻ کی قدرت کاملہ اور عقل و خرد کو ورطۂ حیرت میں ڈالنے کا بہت بڑا نشان ہے کہ ایک زمین، ایک آفتاب، ایک ہوا، ایک پانی سے کیسے رنگ برنگ کے پھول پھل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

علمی بات: ان تمام آیات میں اللہ ﷻ کی نعمتوں اور عجیب و غریب حکمت کے ساتھ تخلیق کائنات کا ذکر ہے جس میں غور و فکر کرنے والوں کو ایسے دلائل اور شواہد ملتے ہیں کہ ان سے اللہ ﷻ کی توحید کا گویا مشاہدہ ہونے لگتا ہے اسی لئے ان نعمتوں کا ذکر کرتے کرتے بار بار اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ ان نشانیوں میں سوچنے والوں کے لئے اللہ ﷻ کی قدرت اور اس کی واحدنیت کی دلیل ہے کیونکہ کھیتی، درخت اور ان کے پھل پھول وغیرہ کا تعلق اللہ ﷻ کی صنعت و حکمت کے ساتھ کس قدر غور و فکر چاہتا ہے کہ آدمی یہ سوچے کہ دانہ یا گٹھلی زمین کے اندر ڈالنے اور پانی دینے سے تو خود بہ خود یہ نہیں ہو سکتا کہ اس میں سے ایک عظیم الشان درخت نکل آئے اور اس پر رنگا رنگ کے پھول لگنے لگیں اس میں کسی کاشتکار زمیندار کے عمل کا کوئی دخل نہ ہو۔ لہٰذا یقیناً یہ سب قادرِ مطلق کی صنعت و حکمت سے وابستہ ہے۔

آیت نمبر ۱۲: دن رات، سورج، چاند اور ستاروں کو انسان کی خدمت پر لگا دیا گیا ہے۔ یہ سب اللہ ﷻ ہی کے اختیار میں ہیں اور اُسی کے حکم کے پابند ہیں۔ ان باتوں میں عقل مندوں کے لئے اللہ ﷻ کی وحدانیت کی بڑی نشانیاں موجود ہیں۔

علمی بات: رات اور دن کو مسخر بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو انسان کے کام میں لگانے کے لئے اللہ ﷻ نے اپنی قدرت سے انسانوں کی خدمت پر مامور کر دیا کہ رات انسان کو آرام کے سامان مہیا کرتی ہے اور دن اس کے کام کے راستے ہموار کرتا ہے ان کو مسخر کرنے کے یہ معنیٰ یہ نہیں کہ رات اور دن انسان کے حکم

کے تابع چلیں۔ عقل والوں کے لئے رات اور دن میں یہ بھی اشارہ ہے کہ ان چیزوں کا حکم الٰہی سے مسخر ہونا اتنا واضح ہے کہ انسان کو اس میں بہت زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں جس شخص کو ذرا سی بھی عقل ہو گی وہ سمجھ لے گا کیونکہ نباتات اور درختوں کے اُگانے میں تو بظاہر کچھ نہ کچھ انسانی عمل کا دخل تھا یہاں وہ بھی نہیں ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کا اپنے بندوں پر یہ بھی احسان ہے کہ اس نے رات کو سکون حاصل کرنے کے لئے اور دن کو جہد و عمل اور طلبِ معاش کے لئے ایک مسلسل و منظم حرکت کا پابند بنا رکھا ہے، یہ دن اور رات کبھی اس کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتے اور آفتاب و مہتاب بھی اسی کی مرضی کے تابع ہیں۔ آفتاب سے روشنی اور حرارت ملتی ہے اور مہتاب سے دنوں، مہینوں اور سالوں کا حساب معلوم ہوتا ہے۔ ستارے بھی اس کے حکم و ارادہ کے پابند ہیں تاکہ ان کے ذریعہ سے بحر و بر میں راستوں کا پتا لگایا جا سکے اور یہ ستارے آسمان دنیا کے لئے زینت بھی مہیا کرتے ہیں۔ رات اور دن، آفتاب اور مہتاب اور ستاروں کی تسخیر اللہ ﷻ کی خالقیت اور صرف اسی کے لائق عبادت ہونے کے واضح دلائل ہیں۔ لیکن یہ دلائل ان کے لئے مفید ہیں جو اپنی عقلوں سے کام لیتے ہیں اور ان مخلوقات کے اسرار و حقائق میں غور و فکر کر کے ان کے خالق تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آیت نمبر ۱۳: اللہ ﷻ نے رنگا رنگ مخلوقات سے کائنات کو حسن بخشا اور انسان کے ذوقِ بصارت کی تسکین فرمائی۔ لوگوں کے لئے ان میں بھی نشانیاں ہیں۔ مگر ان کے لئے جو نصیحت قبول کرتے ہیں۔

علمی بات: زمین سے پیدا ہونے والی مختلف رنگوں کی چیزوں کا تذکرہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ ﷻ نے یہ چیزیں تمہارے لئے زمین میں پیدا فرمائی ہیں۔ بعض مفسرین کرام نے الوان کا ترجمہ اقسام کیا ہے۔ الفاظ کا عموم زمین پر پیدا ہونے والی اور رہنے والی اور بسنے والی سب چیزوں کو شامل ہے۔ جتنی بھی چیزیں زمین میں پائی جاتی ہیں حیوانات، معدنیات، نباتات، جمادات وغیرہ مذکورہ بالا آیت میں اجمالی طور پر ان کا تذکرہ آ گیا، یہ چیزیں رنگ برنگی ہیں، ان کی مختلف صورتیں ہیں اور طرح طرح کے انواع و اقسام ہیں۔ ان سب میں انسانوں کے لئے بہت سارے منافع ہیں، یہ چیزیں غذاؤں میں بھی کام آتی ہیں، مکانات کی تعمیر میں بھی اور امراض کے علاج میں بھی۔ ان چیزوں کا تذکرہ فرما کر ارشاد فرمایا گیا: بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

آیت نمبر ۱۴: سمندری نعمتوں کے فوائد کا بیان ہے۔ سمندر کے تین فوائد ہیں:

۱۔ مچھلی کی شکل میں انسان تازہ گوشت کھاتے ہیں۔ ۲۔ سمندر سے موتی اور جواہرات نکلتے ہیں جن سے انسان خوبصورت زیورات بناتا ہے۔

۳۔ اس میں کشتیاں اور جہاز چلتے ہیں جو انسان کے لئے بڑے پیمانے پر تجارتی سرگرمیوں کا ذریعہ ہیں۔

علمی بات: خشکی کی نعمتوں کے بعد اب سمندر کی نعمتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ اللہ ﷻ نے سمندر کو اس طرح مسخر کیا کہ اس میں غوطہ لگانے کو آسان بنا دیا، کشتیاں آسانی سے اس پر چلتی رہتی ہیں اور انسانوں اور ان کی ضروریات زندگی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی رہتی ہیں۔ ان سمندروں کو اللہ ﷻ نے اس لئے مسخر کیا ہے کہ لوگ مختلف ذرائع استعمال کر کے مچھلیوں کا شکار کریں اور ان کا تازہ گوشت کھائیں۔ ان سمندروں کو اس لئے بھی مسخر کیا ہے کہ غوطہ لگا کر موتی اور دیگر قیمتی جواہرات نکالیں، جو ان کے لئے زیورات کا کام دیں۔ تسخیر سمندر کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس میں کشتیاں چلتی ہیں جن کے ذریعہ سے انسان بے خوف و خطر بھاری تجارتی سامان اور اسباب رزق لے کر تھوڑی مدت میں ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک چلا جاتا ہے اور روزی حاصل کرتا ہے۔ یہ سب اللہ ﷻ کا فضل و کرم ہے۔ بندوں کو چاہیئے کہ اللہ ﷻ کے ان احسانات کو یاد کریں اور اس کے شکر گزار بندے بن کر رہیں۔

آیت نمبر ۱۵: اللہ ﷻ نے زمین کو پیدا کر کے اس میں پہاڑ جما دیئے۔ پھر ان پہاڑوں سے نہروں کو جاری کیا۔ اسی طرح زمین پر راستے بنائے جن کے ذریعہ انسان اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔

علمی بات: دلائل قدرت اور انعاماتِ الٰہی کے سلسلہ میں اب اللہ ﷻ نے پہاڑوں اور ان سے حاصل ہونے والے فوائد کا ذکر فرمایا ہے کہ: اللہ ﷻ نے زمین میں بوجھل پہاڑ رکھ دیئے تاکہ زمین انسانوں کے ساتھ حرکت نہ کرے، اگر زمین مضطرب ہو جائے یعنی ڈولنے لگے تو انسانی زندگی کس قدر تلخ ہو جائے، جب کبھی چند

سیکنڈ کے لئے زلزلہ کے جھٹکے آتے ہیں تو انسان کس قدر پریشان ہو جاتا ہے اور پوری زندگی معطل ہو کر رہ جاتی ہے، تو فرمایا: ان بوجھل پہاڑوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے پوری زمین مضطرب رہتی تو پوری نوع انسانی کے لئے زندگی کتنی کٹھن ہوتی ہے۔ اللہ ﷻ نے انسانوں پر یہ احسان فرمایا ہے کہ اس نے زمین میں بڑے بڑے بھاری پہاڑ نصب کر دیئے ہیں تاکہ زمین پرسکون رہے اور لوگوں کی زندگی میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔

پہاڑوں کے اس بنیادی فائدے کے علاوہ اللہ ﷻ نے ان میں اور بھی بہت سے فوائد رکھے ہیں۔ پہاڑوں میں موجود بے شمار قسم کی معدنیات نمک، لوہا، تانبہ، سونا، چاندی، تیل، چشمے، فلک بوس درخت اور لاتعداد جڑی بوٹیاں اور ایسی چیزیں جو انسان کی روزمرہ زندگی میں استعمال ہوتی ہیں اگر پہاڑ نہ ہوتے تو میدانی علاقوں کے باشندے ان چیزوں سے محروم رہتے اور خود انسانی زندگی مضطرب ہو جاتی تو اللہ ﷻ نے انسانی زندگی کی خاطر ان پہاڑوں میں ہزاروں قسم کی چیزیں پیدا کر کے انسانی زندگی میں توازن پیدا فرما دیا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے نہریں، دریا، سمندر پیدا کر دیئے، انہار کا ذکر آبی راستوں کی حیثیت سے کیا ہے کہ دریاؤں اور سمندروں میں کشتیاں اور جہاز چلتے ہیں۔ اللہ ﷻ نے راستے بھی پیدا فرمائے ہیں، اس سے مراد زمینی راستے ہیں جن پر چل کر لوگ دور دراز کا سفر اختیار کرتے ہیں اور سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے ہیں، یہ راستے ہموار زمین میں بھی ہوتے ہیں اور پہاڑوں میں بھی جن کے ذریعہ نقل و حمل ہوتی ہے تو اللہ ﷻ نے فرمایا: اس نے تمہارے لئے نہریں اور راستے بنا دیئے۔ تاکہ تم راہ پاؤ یعنی اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکو۔

آیت نمبر ۱۶: اللہ ﷻ نے راستوں پر قدرتی نشانیاں اور علامات پیدا کیں تاکہ مختلف راستوں کی پہچان ہو سکے۔ آسمان پر ستارے بنائے جن کے ذریعہ دوران سفر انسان سمتوں کا تعین کر سکے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے زمین میں راستہ پہچاننے کے لئے بہت سی علامات پہاڑوں، دریاؤں، درختوں، مکانوں وغیرہ کے ذریعہ قائم کر دی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر زمین ایک سپاٹ گرہ ہوتا تو انسان کسی منزل تک پہنچنے کے لئے کس طرح راستہ میں بھٹکتا رہتا۔

زمین میں اللہ ﷻ نے ایسی نشانیاں رکھ دی ہیں جن کے ذریعہ سے لوگ سفر میں اپنے راستے پہچانتے ہیں اور منزل کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں اور بحر و بر میں رات کی تاریکی میں ستاروں کی مدد سے لوگ صحیح سمت چلتے رہتے ہیں۔ کشتیوں اور جہازوں کی رہنمائی کے لئے اب جن آلات کا استعمال ہوتا ہے ان کی بناوٹ میں ستاروں کی روشنی ہی سے مدد لی جاتی ہے۔

ستاروں کی قدر و قیمت اس حیثیت سے کوئی سمندر کے ملاحوں، جہاز رانوں، کشتی بانوں، صحرا اور ریگستان کے مسافروں سے پوچھیں اس ترقی یافتہ دور میں بھی بڑے بڑے دخانی جہازوں کے کپتانوں کا سہارا بھی "قطب نما" ہی رہتا ہے یعنی وہ آلہ قطب "ستارہ" کی سمت متعین کرتا رہتا ہے۔

آیت نمبر ۱۷: کائنات کی تمام چیزوں کا خالق اللہ ﷻ ہی ہے۔ مشرکوں کے معبود کچھ بھی پیدا کرنے پر قادر نہیں۔ وہ خود پیدا کیئے گئے ہیں۔ اس کے باوجود مشرکوں نے اپنے حقیقی مالک کو چھوڑ کر انہیں معبود بنا رکھا ہے۔

علمی بات: گزشتہ آیات میں توحید کے دلائل بیان فرمائے اور مخلوقات کی انواع و اقسام بیان فرمائیں اور ان کے فوائد بھی بتائے، یہ تمام چیزیں اور ان کے علاوہ ہر چیز جو کبھی موجود تھی یا موجود ہے یا موجود ہوگی سب اللہ ﷻ کی مخلوق ہے۔ اللہ ﷻ کے علاوہ جن جاہلوں نے دوسروں کی عبادت شروع کر دی ان کے وہ معبود اللہ ﷻ کی مخلوق ہیں۔ مخلوق خالق کے برابر نہیں ہو سکتی۔ پھر یہ کیسی حماقت ہے کہ مخلوق کو خالق کا شریک بنا دیا۔

علمی بات: اس کائنات میں موجود بے شمار عجائبات جن کو احاطہ بیان میں لانا بھی مشکل ہے ان سب کو تو اللہ ﷻ نے پیدا کیا ہے۔ کافروں کو سوچنے پر اُبھارا جا رہا ہے کہ ان بتوں نے بھی آخر کوئی چیز تخلیق کی ہے؟ کہ انہوں نے ان کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اور ان کی عبادت میں مگن رہتے ہیں۔ جبکہ انہوں نے آج تک ایک مکھی بھی نہیں بنائی اور نہ یہ بنا سکتے ہیں۔ تو پھر وہ خود فیصلہ کریں کہ معبود ہونے کے لائق کون ہے؟ قادر مطلق اللہ ﷻ یا ان کے بے بس بت؟ آخر کچھ تو سوچیں!!! انہیں تو اپنی عقل و دانش پر بڑا گھمنڈ ہے۔

آیت نمبر۱۸: اللہ ﷻ کی پیدا کردہ نعمتوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ ان کا شمار ناممکن ہے۔ ان نعمتوں پر شکر ادا کرنے کے بجائے لوگ اللہ ﷻ کا شریک بنا دیتے ہیں۔ اس کے باوجود اللہ ﷻ ان کے جرائم کو درگزر کرتے ہوئے انہیں اپنی رحمت سے تمام نعمتوں سے فیض یاب کیئے جا رہا ہے۔

علمی بات: مشرکین کو دعوتِ فکر دی جا رہی ہے کہ اگر تم اللہ ﷻ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو شمار نہیں کر سکتے، اس نے تمہیں وجود بخشا، اعضاء دیئے، آنکھ، کان اور ناک دیئے، سمجھنے کی قوت دی، اچھے برے کی تمیز عطا فرمائی۔ اس کے علاوہ بے انتہا نعمتیں ہیں، ان نعمتوں کی قدر دانی کا تقاضا یہ تھا کہ مُوَحِّد یعنی ایک اللہ ﷻ کو ماننے والے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانے والے بنتے اور صرف ایک اللہ ﷻ کی عبادت کرتے لیکن اس کے برخلاف مشرکین نے شرک اختیار کر لیا۔ اس کے بعد اللہ ﷻ کی شانِ غفاریت کا بیان ہوا ہے۔ کفر و شرک بہت بڑا جرم ہے لیکن اگر کوئی مشرک یا کافر توبہ کر لے اور ایمان والا بن جائے تو اس کی مغفرت ہو جاتی ہے اگر کوئی شخص ایمان قبول نہ کرے تب بھی دنیا میں کچھ نہ کچھ نعمتیں ملتی رہتی ہیں، یہ اللہ ﷻ کی شانِ رحمت کا مظاہرہ ہے، بعض مفسرین کرام نے آیت کی تفسیر اس طرح بیان کی ہے کہ اگر اللہ ﷻ ہر نعمت کے مقابلہ میں شکر کا مطالبہ فرماتا تو بندے اس سے عاجز رہ جاتے لیکن وہ غفور و رحیم ہے، گناہوں اور کوتاہیوں کو معاف فرماتا ہے اور تھوڑے عمل پر بھی جزا عطا فرماتا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی نعمتیں بے شمار ہیں اور اس کے احسانات اَن گنت ہیں۔ آدمی انہیں پوری زندگی گنتا رہے تو نہیں گن سکتا اور جب انہیں گن نہیں سکتا تو ان کا شکر کیسے ادا کر سکتا ہے۔ اس لئے آیت کے آخر میں فرمایا کہ وہ بڑا معاف فرمانے والا ہے۔ اگر بندے سے ادائے شکر میں کوئی کمی کوتاہی ہوتی ہے تو وہ اپنی بخشش اور کرم فرمائی کو روک نہیں دیتا، بلکہ معاف فرما دیتا ہے اور توبہ کی مہلت عطا فرماتا رہتا ہے۔

آیت نمبر۱۹: نافرمانوں، ناشکروں اور مشرکوں کی تمام ظاہری اور پوشیدہ حرکات سے اللہ ﷻ واقف ہے۔ لیکن اپنی نعمتوں سے سب کو فائدہ اٹھانے کا فائدہ دے رہا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ تمام ظاہری و باطنی احوال سے خبر دار ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ کون شخص اس کی نعمتوں پر کس حد تک دل سے اور کس حد تک جوارح سے شکر گزار بنتا ہے اور کون ایسا ہے جس کا ظاہر و باطن ادائے حق نعمت سے خالی رہتا ہے، یا مذکورہ بالا دلائل اور نعمتوں کے بیان کو سن کر کون ہے جو سچے دل سے اس پر ایمان لاتا ہے اور کون ہے جو ظاہر میں دلائل سے لاجواب ہو کر بھی حق کو قبول نہیں کرتا۔ اللہ ﷻ کے علم میں ہے جس کا جو حال ہو گا اسی کے موافق معاملہ کرے گا۔

عملی پہلو: اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ جو لوگ دنیا میں اللہ ﷻ کی نعمتوں کی ناقدری اور ناشکری عقیدہ اور عمل سے کرتے ہیں، یوں نہ سمجھیں جیسے دنیا گزر رہی ہے اس میں عام طور سے سزا نہیں دی جاتی، اسی طرح موت کے بعد بھی عذاب سے بچ جائیں گے۔ اللہ ﷻ کو سب کے باطنی احوال بھی معلوم ہیں اور ظاہری اعمال بھی، وہ اپنے علم کے مطابق شکر گزاروں کو ان کے شکر کا ثواب عطا فرمائے گا اور ناشکروں کا مؤاخذہ فرمائے گا۔

آیت نمبر۲۰: مشرکین کے جھوٹے معبودوں کی حالت کا بیان ہے کہ وہ خود کوئی چیز پیدا کرنے پر قادر نہیں بلکہ اللہ ﷻ کی پیدا کردہ مخلوق ہیں۔ جو ہستی خود اپنی ذات کی مالک نہیں وہ معبود نہیں ہو سکتی۔

علمی بات: کفار قریش کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ جن بتوں کو یہ لوگ اللہ ﷻ کے سوا پکارتے ہیں اور ان کی عبادت کرتے ہیں وہ تو کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے، بلکہ پوجنے والوں نے ان کے مجسمے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہیں، گویا وہ نہایت عاجز اور کمزور ہیں۔ تو پھر وہ اللہ ﷻ کے سوا معبود کیسے ہو سکتے ہیں؟

علمی بات: مکہ والے بت پرست تھے۔ لات و منات کی پوجا کرتے، پتھروں کی پرستش کرتے اور ان اصنام کو معبود مانتے تھے، اللہ ﷻ فرماتا ہے، کیا ان بتوں کا کائنات میں کچھ ہے؟ کیا زمین و آسمان میں کسی چیز کو انہوں نے پیدا کیا ہے؟ یا یہ کہ خود مخلوق ہیں؟

مکہ والوں سے اللہ ﷻ فرماتا ہے: اے مشرکو! کچھ تو سوچو اور غور کرو کہ تم کہاں تک حق بجانب ہو، وہ بت جو نعمتِ حیات سے محروم ہیں، مردہ ہیں، وہ تمہاری ضروریات کو کیونکر پورا کر سکتے ہیں اور کس طریق سے تمہیں زندگی بخش سکتے ہیں؟

عملی پہلو: اللہ ﷻ کی نعمتیں بے شمار ہیں، ایک ایک سانس جو ہم لیتے ہیں، اس کے لئے اللہ ﷻ کے ہزاروں قانون سرگرم عمل ہیں، عمر بھر اگر اس کی توصیف میں صَرف کر دیں، جب بھی اس کی حمد سے عہدہ برآں نہ ہو سکیں، وہی تو ہے جس نے ہمیں وجود بخشا ہے اور زندگی عطا کی ہے۔ ہمیں بے شمار نعمتیں دی ہیں، ایسے محسن

رب تعالیٰ کو چھوڑ کر پتھروں کو پوجا کہاں کی دانشمندی ہے!!!

آیت نمبر ۲۱: اللہ ﷻ کو چھوڑ کر غیروں کو الٰہ ماننے والوں کی تردید کی گئی ہے۔ وہ ان بتوں کو اللہ ﷻ کا شریک ٹھہراتے ہیں جو نہیں جانتے کہ ان کے پجاریوں کو دوبارہ کب زندہ کرکے اٹھایا جائے گا؟

علمی بات: اس آیت میں مُردہ سے مُراد وہ بُت ہیں جن کی مشرکین عبادت کرتے تھے۔ فرمایا گیا ہے کہ وہ کسی کو پیدا تو کیا کرتے؟ خود پیدا کیئے گئے ہیں۔ ان میں نہ جان ہے اور نہ ہی انہیں یہ احساس ہے کہ مرنے کے بعد کب زندہ کیا جائے گا؟

علمی بات: ایمان اور عبادت کا سب سے بڑا انعام داخلہ جنت کی صورت میں موت کے بعد نصیب ہوگا۔ یہ قیامت آنے پر موقوف ہے۔ ان بے جان بتوں کو کچھ بھی خبر نہیں کہ مُردے کب اٹھائے جائیں گے؟ اگر کوئی اِن سے موت کے بعد کسی طرح کا کوئی فائدہ حاصل ہونے کی امید رکھتے ہو تو یہ اس کی بہت بڑی غلطی ہے، جسے اعمال کا بدلہ دینا ہے وہ اللہ ﷻ ہے۔ اسے معلوم ہے کہ قیامت کب قائم ہوگی؟ ان کے جھوٹے معبود جاہل محض ہیں، انہیں نہ کچھ علم ہے، نہ قیامت کا پتہ ہے اور نہ ہی قیامت کے آنے کی خبر ہے۔ یہ موت کے بعد کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ پھر بھلا یہ مشرکین ان سے نفع یا ثواب یا جزا کی امید کیسے رکھتے ہیں! ان چیزوں کی امید تو اس ذات سے لگائی جاتی ہے جو ہر شے کا علم رکھتی ہے اور وہی ہر شے کی خالق ہے۔ وہ ذات باری تعالیٰ ہے۔

آیت نمبر ۲۲: اللہ ﷻ ہی معبودِ حقیقی ہے۔ توحید کے منکرین کو آخرت کے محاسبہ کا یقین نہیں۔ وہ تکبر کی وجہ سے دعوتِ حق کا انکار کر رہے ہیں۔

علمی بات: اس سے پہلے اللہ ﷻ نے بتوں کی عبادت کا رد فرمایا اور کافروں کے مذہب کا قوی دلائل سے رد فرمایا۔ اس آیت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ کفار مکہ کس وجہ سے توحید کا انکار کرتے ہیں، شرک پر اصرار کرتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، آخرت کا انکار کرتے ہیں، وہ نہ دائمی عذاب کی وعید سے ڈرتے ہیں اور نہ حصول ثواب کی توقع رکھتے ہیں، وہ ہر اس دلیل اور نصیحت کا انکار کرتے ہیں جو ان کے قول کے مخالف ہو اور دوسرے شخص کے قول کو ماننے اور قبول کرنے سے تکبر کرتے ہیں، پس وہ اپنی جہالت اور گمراہی کی وجہ سے اپنے قول پر ڈٹے رہتے ہیں۔ اس کے بعد اللہ ﷻ نے فرمایا کہ ان کا شرک پر اصرار کرنا اور اپنے باطل مذہب پر ڈٹے رہنا اس وجہ سے نہ تھا کہ اسلام کے خلاف ان کے کچھ شبہات اور اشکالات تھے بلکہ وہ محض باپ دادا کی پیروی کرنے، حق کو قبول نہ کرنے اور تکبر کی وجہ سے اپنے باطل مذہب پر مُصر تھے۔ اللہ ﷻ نے فرمایا کہ وہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: عَمرو بن شعیب رضی اللہ عنہما اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "قیامت کے دن تکبر کرنے والوں کو چیونٹیوں کی صورت میں اٹھایا جائے گا، ان کو ہر طرف سے ذلت اور رسوائی گھیر لے گی، ان کو دوزخ کے قید خانہ کی طرف ہانک کر لے جایا جائے گا جس کا نام بُولَس ہے۔ جس میں ہر طرف اور اوپر تلے آگ ہوگی، ان کو دوزخیوں کے جسموں سے نکلی ہوئی پیپ اور خون کا آمیزہ پلایا جائے گا۔" (جامع ترمذی، سنن نسائی، مسند احمد)

آیت نمبر ۲۳: اللہ ﷻ ان تکبر کرنے والوں کے باطن اور ظاہر سے پوری طرح آگاہ ہے۔ اللہ ﷻ متکبرین کو پسند نہیں فرماتا۔

علمی بات: اس آیت میں منکرین قیامت اور اللہ ﷻ کی وحدانیت کا انکار کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اللہ ﷻ ان کے تمام خفیہ اور ظاہری اعمال کو اچھی طرح جانتا ہے اور وہ ان جیسے تکبر کرنے والوں کو بالکل پسند نہیں کرتا، ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔" ایک شخص نے عرض کیا، بے شک (ہر) آدمی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اُس کا کپڑا اچھا ہو اور اُس کی جوتی اچھی ہو (تو کیا یہ بھی تکبر ہے؟) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بے شک اللہ ﷻ خوبصورت ہے اور وہ خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔" (صحیح مسلم)

لہٰذا خوبصورتی کو پسند کرنا تکبر نہیں ہے۔ تکبر تو یہ ہے کہ کوئی حق کو تسلیم نہ کرے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔

آیت نمبر ۲۴: مشرکین مکہ سے قرآنِ حکیم کے متعلق پوچھے جانے پر ان کے جاہلانہ جواب کا ذکر ہے۔

جب کوئی ناواقف شخص تحقیق کے لئے یا واقف شخص امتحان کے لئے ان سے پوچھتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا چیز نازل فرمائی؟ تو مشرکین جواب میں کہتے تھے کہ قرآنِ حکیم میں محض پچھلے زمانے کے قصے اور کہانیاں ہیں۔ (معاذ اللہ) یہ لوگ اس قسم کی باتوں سے لوگوں کو گمراہ کرنا چاہتے تھے۔

آیت نمبر ۲۵: مشرکین مکہ کو ان کے انکار کے نتیجہ میں قیامت کے دن برے انجام کی وعید سنائی گئی ہے۔ اس دن وہ نہ صرف اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائیں گے بلکہ ان کا بوجھ بھی اُٹھائیں گے جنہیں دنیا میں انہوں نے گمراہ کیا ہوگا۔ گناہوں کے جس بوجھ کو وہ اپنے اوپر لادر ہے ہیں وہ بہت بُرا بوجھ ہے۔

علمی بات: اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو لوگ دوسروں کو بہکا کر راہِ راست سے روکتے ہیں، انہیں اس بہکانے کی بھی سزا ملے گی اور وہ سزا یہ ہوگی کہ جن لوگوں کو انہوں نے بہکایا تھا ان کے گناہوں کا بوجھ ان بہکانے والوں پر بھی لادا جائے گا۔ بہکائے جانے والے بھی سزا سے نہ بچ سکیں گے۔

علمی بات: حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس شخص نے اسلام میں کوئی اچھا کام جاری کیا پھر اس کے بعد اس پر عمل کیا جائے تو جو لوگ بھی اس پر عمل کریں گے ان کے اجر کی مثل اس کے لئے لکھا جائے گا اور عمل کرنے والوں کے اجر و ثواب میں بھی کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور جس شخص نے اسلام میں کوئی بُرا کام جاری کیا پھر اس کے بعد لوگ اس کو اپنے عمل میں لائیں تو ان سب کو جو گناہ ہوگا وہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا جب کہ عمل کرنے والوں کے گناہ میں کچھ کمی نہ ہوگی۔“ (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۲۶: سابقہ اقوام کے کفار نے رسولوں کی مخالفت کی اور وہ دینِ حق کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔ ان پر عذاب اس طرح آیا جہاں سے اس کے آنے کا ان کو گمان بھی نہیں تھا۔ مشرکین مکہ کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اگر وہ اُنہی کی روش پر چلیں گے تو اِن کا انجام بھی مختلف نہیں ہوگا۔

علمی بات: اس آیت کریمہ میں ان مشرکین مکہ کے لئے دھمکی ہے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف سازشیں کیں۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے خلاف سازشیں کرنے والوں سے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ہی ایسا شدید انتقام لیا کہ انہیں جڑ سے ختم کر دیا۔ ان پر اس طرح اچانک عذاب مسلط کر دیا کہ انہیں سوچنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ یہ تو ان کا دنیا میں حال ہوا اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انہیں مزید ذلیل و رسوا کرے گا۔

آیت نمبر ۲۷: قیامت کے دن مشرکوں کو ان کے شرک کا جو بدلہ دیا جائے گا وہ انتہائی رسوا کن ہوگا۔ جھوٹے معبودوں کے بارے میں ان کے پاس نہ کوئی دلیل ہوگی نہ وہ کوئی جواب دے سکیں گے۔ اہلِ علم یعنی انبیا کرام علیہم السلام اور ان کے پیروی کرنے والے اہلِ ایمان وہ مشرکوں سے مخاطب ہو کر کہیں گے کہ یقیناً قیامت کا دن مشرکوں کے لئے سخت رسوائی اور برائی کا دن ہے۔ یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان عہد شکنوں کی رسوائیوں کو نمایاں کرے گا۔

علمی بات: کفار و مشرکین کی رسوائی کا ایک منظر بیان کیا گیا ہے کہ مفسدین و منکرین کے تمام تر فساد اور خرابی کا اصل باعث چونکہ ان کا کبر و غرور تھا۔ چنانچہ اس کی پاداش میں ان کو قیامت کے روز رسوا کیا جائے گا اور ان کی رسوائی کا ایک منظر یہ ہوگا کہ اس روز ان سے کہا جائے گا کہ کہاں ہیں تمہارے وہ خود ساختہ معبودانِ باطلہ جن کو تم لوگوں نے از خود گھڑ رکھا تھا؟ اور تم انہیں اللہ تعالیٰ کا شریک بناتے تھے اور بڑے گھمنڈ اور زور کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ یہ بڑی قوت اور بہت طاقت والے ہیں، سب کچھ کر سکتے ہیں، ہماری بات ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ تک پہنچتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا قول ذکر فرمایا ہے: ”یہ تو اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔“ (سورۃ یونس ۱۰، آیت: ۱۸)

اس روز ان سے کہا جائے گا کہ اب کہاں گئے تمہارے وہ شرکاء؟ اب وہ تمہارے کام کیوں نہیں آتے؟ یہ ان سے ان کی تذلیل و تحقیر کے لئے کہا جائے گا۔ یہاں پر اس بارے میں توجہ کی ضرورت ہے کہ قرآن حکیم کا دنیا پر کس قدر بڑا اور کتنا عظیم الشان احسان ہے کہ اس نے عالم آخرت اور غیب کے ان عظیم الشان حقائق کو اس قدر صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا جو سیدھی راہ اختیار کر کے کامیاب ہونا چاہے وہ کامیابی سے ہمکنار ہو سکے گا قبل اس سے کہ فرصتِ حیات اس کے ہاتھ سے نکل جائے اور اس کو ہمیشہ کے لئے پچھتانا پڑے۔

علمی بات: اس آیت میں اہلِ علم کی عظمت شان اور قیامت کے روز ان کی مسرت کی کیفیت کا بیان ہے۔ علم والے کہیں گے کہ بڑی رسوائی ہے آج کے دن کافروں کے لئے اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے فضل و کرم سے اس ہولناک عذاب سے بچا لیا جس سے آج یہ لوگ دوچار ہو رہے ہیں۔ اس سے دولتِ علم کی عظمت شان کا

اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ علم کی روشنی ہی وہ روشنی ہے جو انسان کو مہلکات سے بچاتی ہے اور اس کو راہ حق وہدایت سے سرفراز کرتی ہے۔

علم سے مراد یہاں وحی اور دین کا علم ہے کہ اس کی شان بہت بلند ہے۔ پہلے ان مفسدین کا ذکر تھا جو لوگوں کو بغیر کسی علم کے گمراہ کرتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں یہاں پر ان خوش نصیبوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جن کو حق وہدایت کے علم کی روشنی سے نوازا گیا۔ جس کے مطابق انہوں نے خود بھی اپنے قلب وباطن کو منور کر کے اپنی زندگی حق کی تعلیمات سے آراستہ کی اور دوسروں کو بھی حق وہدایت کی رہنمائی کی۔

آیت نمبر ۲۸: ظالموں کی موت کے وقت کی کیفیت کا بیان ہے۔ دنیا میں وہ کفر وشرک کا ارتکاب کر کے اپنی جانوں پر ظلم کے مرتکب ہوئے۔ موت کے وقت فرشتوں کے سامنے کفر وشرک سے بے زاری اور توحید کا اقرار کرتے ہیں۔ ان کے اعمال اللہ ﷻ کے پاس محفوظ ہیں لہٰذا ان کا اقرار انہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکے گا۔

علمی بات: شرک ومعاصی کا ارتکاب کر کے اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ان کافروں کی جان نکالنے کے لئے جب فرشتے آتے ہیں اور وہ لوگ موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں تو اللہ ﷻ کے لئے اپنی اطاعت وبندگی کا اظہار کرنے لگتے ہیں اور مجسم عجز وانکسار بن جاتے ہیں اور مارے دہشت کے شرک کا انکار کر بیٹھتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں کہ ہم نے تو شرک کا ارتکاب کیا ہی نہیں تھا، تو فرشتے ان کی بات کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: ایسا ہرگز نہیں بلکہ تم نے شرک کا ارتکاب کیا تھا اور اللہ ﷻ تمہارے کرتوتوں کو خوب جانتا ہے، اس لئے جھوٹ بولنے اور انکار کرنے سے تم جاں بر نہ ہوسکو گے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک انصاری کے جنازے کے لئے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے، جب ہم قبرستان پہنچے تو قبر ابھی تیار نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ بیٹھ گئے اور ہم بھی آپ ﷺ کے گرد (اس قدر خاموشی سے) بیٹھ گئے، گویا ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ ﷺ کے دست مبارک میں ایک چھڑی تھی جس سے آپ ﷺ زمین کرید رہے تھے، آپ ﷺ نے سر مبارک اوپر اٹھایا اور فرمایا: "عذاب قبر سے اللہ ﷻ کی پناہ طلب کرو۔" آپ ﷺ نے یہ بات دو یا تین مرتبہ ارشاد فرمائی۔ پھر فرمایا: "کافر آدمی جب دنیا سے کوچ کرنے لگتا ہے اور آخرت کی طرف روانہ ہوتا ہے تو اس کی طرف سیاہ چہرے والے فرشتے نازل ہوتے ہیں، ان کے پاس ٹاٹ (کے کفن) ہوتے ہیں اور وہ اس سے حد نگاہ کے فاصلہ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ملک الموت (عزرائیل علیہ السلام) آتا ہے اور اس کے سر کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے، اے بدروح! نکل (اور چل) اللہ ﷻ کے غصہ اور غضب کی طرف، (یہ سن کر) روح جسم کے اندر چھپتی پھرتی ہے، تو ملک الموت اسے اس طرح باہر کھینچتا ہے، جیسے کانٹے دار لوہے کی سیخ گیلی اون سے باہر نکالی جاتی ہے۔ جب فرشتہ اس کی روح نکال لیتا ہے، تو دوسرے فرشتے لمحہ بھر کے لئے بھی اسے ملک الموت کے ہاتھ میں نہیں رہنے دیتے، بلکہ اسے ٹاٹ (کے کفن) میں لپیٹ لیتے ہیں۔ اس سے ایسی گندی بو آتی ہے، جیسے روئے زمین پر کسی مردار سے اٹھنے والی بدترین (کسی سڑی ہوئی چیز کا) تعفن ہو۔ فرشتے اسے لے کر اوپر (آسمان کی طرف) جاتے ہیں۔ (راستہ میں) جہاں کہیں ان کا گزر مقرب فرشتوں پر ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں، یہ کس بُرے شخص کی روح ہے؟ جواب میں فرشتے کہتے ہیں، یہ فلاں بن فلاں کی روح ہے۔ وہ اس کا وہ بدترین نام لیتے ہیں جو دنیا میں لیا جاتا تھا، یہاں تک کہ فرشتے اسے آسمان دنیا تک لے جاتے ہیں۔ فرشتے آسمان کا دروازہ کھولنے کے لئے درخواست کرتے ہیں: لیکن دروازہ نہیں کھولا جاتا۔" (مسند احمد)

آیت نمبر ۲۹: اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ کی باتوں کو جھٹلا کر تکبر کرنے والوں کو جہنم کے دروازوں سے داخل ہو جانے کا حکم دیا جائے گا۔ جہنم کا ٹھکانا ان کے لئے دائمی ہو گا۔

علمی بات: اس آیت میں جہنم کے دروازوں کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ لوگ اپنے اپنے گناہوں اور شرکیہ اعمال کے مطابق جہنم کے مختلف طبقات میں ان کے دروازوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جلتے رہنے کے لئے جھونکے جائیں گے۔ یہ اللہ ﷻ کی عبادت سے منہ پھیرنے والوں کے لئے بدترین ٹھکانا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہنم میں سزا کے مختلف درجات ہیں، لہٰذا بعض لوگوں کی سزا بعض دوسرے لوگوں سے زیادہ ہو گی، اللہ ﷻ نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے تا کہ ان کا رنج اور غم زیادہ ہو، پھر فرمایا: متکبرین کا کیسا برا ٹھکانا ہے۔ ان کا تکبر یہ تھا کہ وہ حق کو قبول نہیں کرتے تھے توحید پر واضح دلائل دیکھنے اور سننے کے باوجود اللہ ﷻ کو واحد نہیں مانتے تھے اور انبیاء کرام علیہم السلام کی طرف سے جو دین لے کر آئے تھے اس کو قبول نہیں کرتے تھے اور انہیں جھٹلاتے تھے۔

عملی پہلو: تکبر کرنے والوں کا بڑا ہی برا ٹھکانا ہے کہ اسی تکبر کے باعث وہ حق سے محروم ہوئے اور اسی کے نتیجہ میں وہ اس انجام سے دوچار ہوئے اور ایسے کہ اس سے نکلنے اور چھٹکارا پانے کی اب کوئی صورت بھی ان کے لئے ممکن نہ ہوگی۔ لہٰذا تکبر یعنی اپنی بڑائی کا گھمنڈ محرومی فساد اور جڑ کی بنیاد ہے کہ اس کے نتیجہ میں انسان حق بات کو سننے اور ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور آخر کار ہلاکت اور تباہی کے دائمی اور انتہائی ہولناک گڑھے عذابِ دوزخ میں جا گرتا ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: "وہ شخص آگ میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر ایمان ہو اور وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر تکبر ہو۔" (صحیح مسلم، سنن ابی داؤد)

آیت نمبر ۳۰: دین حق سے اعراض کرنے والے متکبرین کے برعکس پرہیزگاروں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب کے متعلق پوچھے جانے پر پرہیزگاروں کے جواب کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ کلام کل کا کل خیر ہی خیر ہے۔ ان کے نیک اعمال کے بدلہ انہیں دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بہترین ٹھکانہ کی بشارت دی گئی ہے۔

علمی بات: بدبختوں کی حالت اور انجام کے بیان کے بعد ان آیتوں میں نیک بختوں کے انجام کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ قرآن حکیم کے بارے میں بدبختوں کا جواب تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتاب تو محض سابقہ قوموں کے بے اصل قصے ہیں (معاذ اللہ)۔ جبکہ نیک لوگوں نے جواب دیا کہ وہ سراسر خیر و برکت ہے جو بھی اس پر ایمان لائے گا اور اس پر عمل کرے گا وہ خیر و برکت سے مالا مال ہو جائے گا۔ جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک اعمال کیئے ان کو دونوں جہان کی بھلائی حاصل ہوگی۔ یہاں دنیا کی بھلائی سے مراد فتح و نصرت اور غلبہ و خلافت ہے اور آخرت کی بھلائی سے مراد جنت ہے جو سب سے بہترین بھلائی ہے۔

علمی بات: قرآنِ حکیم سب سے بڑا خیر ہے۔ جس کے حقوق ادا کرنے کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ یہ سب سے بڑی دولت ہے۔ جس کو جمع کرنے کی محنت کرنی چاہیئے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اور مومنوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔ آپ فرما دیجئے یہ (سب کچھ) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہے لہٰذا انہیں اس پر خوش ہونا چاہیئے یہ ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جو وہ جمع کر رہے ہیں۔" (سورۃ یونس ۱۰، آیت: ۵۸)

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے تم میں سے بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔ (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۳۱: آخرت کا گھر ہمیشہ رہنے والے باغات ہیں جن میں پرہیزگار داخل ہوں گے۔ ان باغات کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور وہاں انہیں ہر وہ چیز ملیں گی جو وہ چاہیں گے۔ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو ایسے ہی انعامات سے نوازا جاتا ہے۔

علمی بات: اس جنت کی صفت بیان کی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے کہ اس میں درخت ہوں گے، نہریں جاری ہوں گی اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے انتہائی اکرام یہ ہوگا کہ وہاں ہر وہ شے ہوگی جس کی اہل جنت خواہش کریں گے۔ آیت کے آخر میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ اہل تقویٰ کو ایسے ہی اچھے بدلے عطا فرماتا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا: بے شک متقی لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے، جو ان کا رب انہیں دے گا وہ لینے والے ہوں گے، یقیناً وہ اس سے پہلے نیکی کرنے والے تھے۔

آیت نمبر ۳۲: اہل ایمان کی موت کے وقت کی کیفیت کا بیان ہے۔ وہ موت کے وقت شرک و گناہوں سے پاک صاف ہوتے ہیں اور فرشتے انہیں سلامتی کی دعا دیتے ہیں۔ موت کے وقت نیک اعمال کے بدلہ انہیں جنت میں داخلہ کی بشارت دی جاتی ہے۔

علمی بات: اہل تقویٰ کا اچھا انجام ہوگا اور انہیں جنت کے باغوں میں وہ سب کچھ نصیب ہوگا جو ان کی خواہش ہوگی۔ گزشتہ آیات میں کافروں کے مکر اور آخرت میں ان کے لئے عذاب اور رسوائی کا ذکر تھا اور اس بات کا بھی ذکر تھا کہ فرشتے ایسی حالت میں ان کی جانیں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان آیات میں اہل ایمان کے اچھے اعمال اور اچھے اقوال کا تذکرہ فرمایا گیا ہے اور انہیں بشارت دی کہ وہ ایسے باغوں میں داخل ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور ان باغات میں ان کی خواہش کے مطابق وہ سب کچھ موجود ہوگا جو وہ چاہیں گے۔

علمی بات: جس کا دل کفر و شرک سے پاک ہو اور دل میں ایمان کی نورانیت ہو اور اس کا ظاہر بھی اعمال صالحہ سے مزین ہو تو ظاہر ہے کہ موت کے وقت بھی اس کی

حالت اچھی ہو گی، فرشتے بھی اس سے اچھا معاملہ کرتے ہیں اور اسے اس وقت سلام پیش کرتے ہیں اور جنت کی بھی بشارت دیتے ہیں۔ دنیا سے حالتِ ایمان میں رخصت ہونا اور اچھے اعمال لے کر جانا یہ بہت بڑی کامیابی اور جنت میں جانے کا سبب ہے۔ جنت میں داخلہ تو قیامت کے دن ہو گا لیکن موت کے وقت اس کی خوشخبری بھی بہت بڑی نعمت ہے۔ کیونکہ جہاں وہ موت کے بعد فی الفور جا رہا ہے کہ وہ بھی حدیث شریف کے مفہوم کے مطابق جنت کے باغوں میں ایک باغ ہے یا پھر دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا۔

آیت نمبر ۳۳: کفار و مشرکین کی مذمت کی گئی ہے جو دلائل کے باوجود ایمان نہیں لاتے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کا انکار کر کے گویا اس بات کے منتظر ہیں کہ ان پر موت کے فرشتے یا عذاب الٰہی آجائے۔ اسی طرح کی سرکشی سابقہ نافرمانوں نے اختیار کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور عذاب الٰہی کے مستحق بنے۔

علمی بات: کفار و مشرکین کو بتایا جا رہا ہے کہ روشن دلائل نے شک و شبہ کی ساری تاریکیوں کا خاتمہ کر دیا۔ آفتاب ہدایت جگمگا رہا ہے۔ یہ لوگ پھر کیوں ایمان نہیں لا رہے؟ کیا یہ اس بات کے منتظر ہیں کہ موت کا فرشتہ آئے اور ان کی روح نکال کر لے جائے؟ یا عذاب الٰہی اترے اور ان کو خاک سیاہ بنا کے رکھ دے؟ کتنے نادان ہیں یہ لوگ جواب بھی ہدایت قبول نہیں کرتے۔

آیت نمبر ۳۴: منکرین کو ان کی شامت اعمال کا نتیجہ ملنے کا بیان ہے۔ وہ جس عذاب کا مذاق اڑاتے تھے اسی عذاب کے مستحق بنے۔

علمی بات: گزشتہ مجرم قوموں کا ذکر ہے کہ جب اُن کے رسول علیہم السلام ان سے کہتے کہ اگر تم ایمان نہیں لاؤ گے تو اللہ تعالیٰ کا عذاب آجائے گا۔ تو وہ استہزاء کے طور پر کہتے کہ جاؤ اپنے اللہ سے کہو وہ عذاب بھیج کر ہمیں تباہ کر دے۔ چنانچہ اس عذاب نے انہیں گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے، پھر اس سے بچاؤ کا کوئی راستہ ان کے پاس نہیں رہا۔ یہ بات بیان کر کے مشرکین مکہ کو عذاب کی وعید سنائی جا رہی ہے۔

آیت نمبر ۳۵: شرک اور شرکیہ افعال کے حق میں مشرکوں کی ایک بھونڈی دلیل کا ذکر ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کو ان کے اور ان کے باپ دادا کے شرکیہ افعال پسند نہ ہوتے تو انہیں روک دیتا۔ ان کی اس باطل دلیل کا جواب دیا گیا ہے۔ سابقہ نافرمان اقوام نے بھی ایسا ہی کہا تھا جب کہ رسولوں علیہم السلام کو بھیج کر ان کے لئے کوئی عذر باقی نہیں چھوڑا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں علیہم السلام کی ذمہ داری پیغام کو واضح طور پر پہنچا دینا ہے منوانا نہیں۔

علمی بات: مشرکین مکہ اپنے کفر و شرک کے لئے اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو دلیل بناتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ہم اللہ تعالیٰ کے سوا غیروں کی عبادت کرتے ہیں اور اپنی طرف سے کچھ جانوروں کو حرام کہتے ہیں اور ہمارے آباء و اجداد بھی ایسا کرتے رہے ہیں تو اس میں ہمارا اور ان کا کوئی قصور نہیں ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق ہے، اگر اس کی مرضی نہ ہوتی، جیسا کہ محمد (ﷺ) کا گمان ہے، تو ہم ایسا نہ کرتے۔ تو گویا ہمارا اس کی مرضی کے مطابق ایسا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ محمد (ﷺ) اللہ تعالیٰ کی طرف غلط بات منسوب کر رہے ہیں۔ (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان سے پہلے کے مشرک بھی اسی طرح کے ذہنی شکوک و شبہات کا شکار تھے اور ان ہی جیسی جھوٹی باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے رہے ہیں۔ پھر ان کے شک و شبہ کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ: تمہارا یہ گمان صحیح نہیں ہے کہ اس نے تمہارے کفر و شرک کی تردید نہیں کی، بلکہ اس نے اس کا شدید انکار کیا ہے اور انتہائی سختی کے ساتھ اس سے روکا ہے۔ اس نے ہر زمانہ اور ہر قوم کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام بھیجے ہیں، جنہوں نے صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف بلایا اور غیروں کی عبادت سے روکا۔ پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء، سید المرسلین سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تک تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کی ایک ہی دعوت تھی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، صرف وہی عبادت کے لائق ہے۔

آیت نمبر ۳۶: طاغوت کا اطلاق ہر اس شخص، ادارہ، بادشاہ یا حکومت پر ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہو اور لوگ اس کی اطاعت پر مجبور ہوں۔ ہر امت میں نبی اور رسول علیہم السلام بھیجے گئے جنہوں نے لوگوں کو توحید اختیار کرنے اور طاغوت سے بچنے کی دعوت دی۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت تسلیم کرنے والوں کو ہدایت نصیب ہوئی۔ ہٹ دھرمی اور کفر و شرک پر اڑے رہنے والے پر گمراہی ثابت ہوئی۔ مشرکین مکہ کو زمین پر چل پھر کر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کو جھٹلانے والوں کے انجام کے مشاہدہ کرنے کی نصیحت کی گئی ہے۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ ہم نے ہر قوم کے لئے ایک رسول بھیجا، جس نے انہیں اس بات کی تعلیم دی کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور

شیطان اور بتوں کی عبادت سے دور رہو۔ اس لئے کسی مشرک کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ چاہتا تو ہم غیروں کی عبادت نہ کرتے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسانوں کو خیر و شر اور جنت و جہنم، دونوں کے راستے بتا دیئے۔ خیر کی راہ پر چلنے کا حکم دیا اور شر کی راہ سے منع فرمایا، بلکہ اس نے مشرکوں کو دنیا میں ان کے شرک کی سزا دی، تاکہ انہیں معلوم ہو کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کے شرکیہ اعمال سے راضی نہیں ہے۔ آیت کے آخر میں یہی بات کہی گئی ہے۔ خیر و شر کی اس وضاحت و صراحت کے بعد اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی حکمت اور مشیّت کے مطابق جسے چاہا خیر کی توفیق دی اور جسے چاہا گمراہی میں بھٹکتا چھوڑ دیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منکرین کو کفر ہی کی حالت میں ہلاک کر دیا اور ان کی بستیوں کو اجاڑ دیا اور ان کے محل ویران ہو گئے۔ اے مشرکین مکہ! تم دنیا میں گھوم پھر کر ذرا دیکھو تو سہی کہ پیغمبروں کو جھٹلانے والوں کا کیسا برا انجام ہوا۔ قوم عاد و ثمود، قوم لوط اور قوم شعیب کی بستیاں دیکھو کہ کیسے کیسے عبرت کے نشانات ہیں۔

علمی بات: طاغوت شیطان کو بھی کہتے ہیں اور بتوں کو بھی، لہٰذا اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شیطان کے پیچھے نہ چلو اور یہ بھی کہ بت پرستی سے اجتناب کرو۔

علمی بات: مخاطبین میں دونوں طرح کے لوگ ہوئے بعض کو تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہدایت دی جنہوں نے انبیائے کرام علیہم السلام کی بات مانی اور ان پر ایمان لائے اس کو فرمایا: ”تو اُن میں سے کچھ وہ تھے جنہیں اللہ نے ہدایت عطا فرمائی۔“ (سورۃ النحل ۱۶، آیت:۳۶) اور ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو کفر پر اڑے رہے اور انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت پر کان نہ دھرا اور ان پر ایمان نہ لائے اسی کو فرمایا: ”اور اُن میں سے کچھ وہ تھے کہ اُن پر گمراہی ثابت ہو گئی۔“ (سورۃ النحل ۱۶، آیت:۳۶) جن لوگوں سے قرآنِ مجید نے خطاب فرمایا، ان کے سامنے حق کی دعوت رکھ دی اور پہلی امتوں میں جنہوں نے حق کو ماننے سے انکار کیا تھا ان پر جو عذاب آئے ان کو بیان فرما دیا۔ یہاں بھی منکرین و مکذبین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ”تو زمین میں چلو پھرو پھر دیکھو (حق کو) جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا۔“ (سورۃ النحل ۱۶، آیت:۳۶)

آیت نمبر ۳۷: حرص سے مراد یہاں خواہش اور تمنا ہے جو اپنی قوم کی ہدایت کے لئے نبی مکرم ﷺ کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کو اس حوالہ سے تسلی عطا فرمائی گئی کہ اگرچہ آپ ﷺ لوگوں کی ہدایت کے بہت زیادہ خواہش مند ہیں لیکن گمراہی اختیار کرنے والوں کو ہدایت سے نہیں نوازا جاتا۔ ایسے بدبخت اور گمراہ لوگ عذاب کے مستحق ہوں گے اور پھر ان کا کوئی مددگار نہیں ہو گا۔

علمی بات: رسول اللہ ﷺ کی بہت چاہت اور کوشش تھی کہ جن لوگوں کے سامنے وہ حق کی دعوت پیش فرما رہے ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی وحدانیت کی طرف بلا رہے ہیں یہ لوگ ایمان قبول کر لیں، لیکن سارے انسانوں کا اسلام قبول کر لینا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے قضا و قدر میں نہیں ہے گمراہ ہو جانے والوں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔

علمی بات: اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ”اگر آپ اُن کو ہدایت ملنے کی خواہش کریں تو بے شک اللہ ہدایت نہیں دیتا جنہیں وہ گمراہ کر دے اور ان کا کوئی (بھی) مددگار نہ ہو گا۔“ (سورۃ النحل ۱۶، آیت:۳۷) پس آپ ﷺ اپنا فریضہ انجام دیتے رہیں جسے ایمان نہیں لانا وہ ایمان نہ لائے گا۔ جو لوگ گمراہی اختیار کریں گے اور اس کی وجہ سے آخرت کے عذاب میں مبتلا ہوں گے ان کے لئے کوئی مددگار اور حمایتی نہ ہو گا، اگر یہ لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علاوہ جن لوگوں کی پرستش کرتے ہیں وہ ہمیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے عذاب سے بچا لیں گے یہ ان کی جہالت اور حماقت ہے۔

آیت نمبر ۳۸: مشرکین کے تعصب کی ایک مثال بیان کی گئی ہے۔ برے انجام سے ڈرانے پر وہ قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ مُردوں کو زندہ نہیں کرے گا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انہیں اس بات کا جواب دیا ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیئے جانے کا وعدہ برحق ہے جو پورا ہو کر رہے گا۔ لیکن اکثر لوگ نا سمجھ ہیں جس کی وجہ سے موت کے بعد دوبارہ اٹھنے کا انکار کرتے ہیں۔

علمی بات: گزشتہ آیات میں مشرکین کا ذکر تھا جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو بھی عبادت میں شریک کرتے تھے اور توحید کے منکر تھے، حضرات انبیاء کرام علیہم السلام نے ان کو سمجھایا لیکن وہ نہ مانے پھر تکذیب کے نتیجہ میں ہلاک ہوئے۔ ان آیات میں منکرین آخرت کا ذکر ہے۔ مشرکین اور دوسرے کفار قیامت کا انکار کرتے تھے اور انکار بھی سطحی انداز میں نہیں بلکہ انہوں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی زوردار قسم کھا کر یوں کہا کہ جو لوگ مر جاتے ہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ انہیں دوبارہ زندہ نہیں کرے گا۔ ان کے جواب میں فرما کر ان کی اس بات کی نفی کی گئی ہے: بلیٰ جس کے معنٰی یہ ہیں کہ کیوں نہیں۔ یعنی وہ ضرور زندہ کرے گا۔ تمہارا انکار کرنا اور قسم کھانا یہ سب جھوٹ

ہے۔ اللہ ﷻ نے فیصلہ فرمایا ہے کہ وہ بندوں کو ضرور زندہ فرمائے گا، یہ اس کا پختہ وعدہ ہے اس کے خلاف کبھی نہیں ہو سکتا، لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ نہ جاننا اور ان کا نہ ماننا اس بات کی دلیل نہیں کہ اللہ ﷻ نے جو وعدہ فرمایا ہے وہ پورا نہ ہو، قیامت ضرور قائم ہوگی قبروں سے لوگ ضرور اٹھیں گے اور آخرت میں اعمال کے فیصلے ہوں گے۔

آیت نمبر ۳۹: قیامت کے برپا ہونے کی دو حکمتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ بات ظاہر کر دی جائے گی جس میں لوگ دنیا میں اختلاف کیا کرتے تھے۔ دوسرا یہ کہ کافروں پر واضح ہو جائے گا کہ قیامت کے واقع نہ ہونے میں وہ جھوٹے تھے۔

علمی بات: پچھلی آیت میں وقوعِ قیامت اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کی تاکید ہے اور اس آیت میں وقوعِ قیامت کی ایک اور وجہ بیان کی گئی ہے اور عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ایک دن ایسا ہونا چاہیئے جس میں ان تمام امور کا اظہار ہو جائے جن میں لوگ اختلاف کرتے تھے۔ مزید یہ کہ منکروں کے ان دعووں کی تکذیب ہو جائے جو وہ دنیا کی زندگی میں کیا کرتے تھے۔ اس جہان میں کچھ لوگوں کو اللہ ﷻ کے بارے میں شبہ رہتا ہے۔ وہ واضح نشانیوں کے باوجود اللہ ﷻ کا انکار کر بیٹھتے ہیں۔ اس لئے ایک ایسے جہان (یومِ آخرت) کا ہونا لازمی ہے جہاں اہلِ حق اور اہلِ باطل کے دنیاوی جھگڑوں کی تحقیق ہو، سچ اور جھوٹ جدا ہو اور فرماں بردار اور نافرمان اپنا کیئے کی جزا اور سزا پائیں۔

علمی بات: جن باتوں میں کفار و مشرکین دنیا میں اختلاف کیا کرتے تھے اللہ ﷻ واضح طور پر ان چیزوں کو ظاہر فرما دے گا۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اللہ ﷻ کی طرف سے یہ بات بتاتے اور اللہ ﷻ کے فیصلے سناتے تھے۔ مگر یہ کافر اُن کو نہیں مانتے تھے۔ نیز اس دن کافروں کو بھی اپنے جھوٹا ہونے کا یقین ہو جائے گا۔ کفر اختیار کر کے جو یہ کہتے تھے کہ اگر اللہ ہم سے ناراض ہے تو ہمیں جبراً روک کیوں نہیں دیتا اور یوں کہتے تھے کہ قیامت قائم نہ ہوگی اور رسولوں علیہم السلام کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ اللہ کے رسول نہیں ہیں (معاذ اللہ)۔ ان سب باتوں میں ان کا جھوٹا ہونا ظاہر ہو جائے گا۔

آیت نمبر ۴۰: قیامت کا برپا کرنا اللہ ﷻ کے لئے کوئی مشکل نہیں۔ اللہ ﷻ جب کسی چیز کو ہو جانے کا حکم دے تو وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

علمی بات: مشرکین کو اس بات سے تعجب ہوتا تھا کہ مرنے کے بعد لوگ کیسے زندہ کیئے جائیں گے؟ اللہ ﷻ نے ان کا شبہ اور اعتراض دور فرمایا اور اپنی قدرتِ کاملہ بیان فرمائی کہ وہ ہر چیز کے پیدا فرمانے پر قدرت رکھتا ہے، جس نے پہلے سب کو پیدا فرمایا وہ اس بات پر کیسے قادر نہ ہوگا کہ دوبارہ پیدا فرما دے۔ جس کے (کُنْ) (ہو جا) فرمانے سے ہر چیز کا وجود ہو جاتا ہے اس کے بارے میں یہ کہنا کہ دوبارہ کیسے پیدا فرمائے گا؟ جہالت ہے اور سراسر حماقت ہے۔

علمی بات: کفار وقوعِ قیامت کے اس لئے منکر تھے کہ ان کے نزدیک ایسا ہونا ناممکن تھا۔ انہیں بتا دیا گیا کہ قیامت برپا کرنے والا ان جیسا کوئی انسان نہیں ہے جس کا علم بھی ادھورا ہو اور قدرت بھی ناقص ہو بلکہ قیامت کا وقوع اس خداوند ذوالجلال کے حکم سے ہوگا جو ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ ﷻ کے لئے کوئی بھی کام مشکل نہیں ہے، کسی چیز کے پیدا کرنے کے لئے اسے کوئی محنت کرنی نہیں پڑتی، وہ تو ایک حکم دیتا ہے اور وہ چیز پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے کن کہنے کی دیر ہوتی ہے کہ ہر چیز موجود ہو جاتی ہے۔

آیت نمبر ۴۱: ان مہاجرین کی فضیلت کا بیان ہے جو مشرکین مکہ کے مظالم سے تنگ آ کر حبشہ ہجرت کر گئے تھے۔ ہجرت کا مقصود یہ تھا کہ ایمان کی حفاظت ہو اور دین پر عمل کرنا آسان اور ممکن ہو۔ مہاجرین کے لئے دو وعدے ذکر کیئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا میں ان کے لئے بہترین ٹھکانا ہوگا۔ دوسرا یہ کہ انہیں آخرت میں بے حساب اجر و ثواب عطا فرمایا جائے گا۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی توحید اور قیامت پر ایمان لانے والوں کا توحید اور قیامت کے منکروں کے ساتھ خوشی سے مل جل کر رہنا ممکن ہی نہ تھا، خصوصاً جب اہل ایمان تعداد اور قوت میں کمزور بھی تھے۔ اپنے وطن کو جہاں بیت اللہ بھی ہو، کون خوشی سے چھوڑ سکتا ہے؟ اس لئے انہوں نے وطن چھوڑا تو دو وجوہات سے، ایک تو قوم کے ظلم کی وجہ سے، جیسا کہ فرمایا: (مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا) "اِس کے بعد کہ ان پر ظلم کیئے گئے" اور دوسرا اس لئے کہ اللہ ﷻ کے دین پر عمل کرنا وطن میں ممکن نہ رہا، تو انہوں نے گھر بار، قبیلے، جائیداد غرض ہر چیز کو اللہ ﷻ اور اس کے حبیب مکرم ﷺ کی خاطر چھوڑ دیا اور ایسی جگہ چلے گئے جہاں وہ ظلم سے بھی

بچ جائیں اور اللہ ﷻ کے دین اور اپنے پیارے نبی ﷺ کی تعلیمات پر آزادی سے عمل کر سکیں۔

علمی بات: چونکہ یہ سورت مکی ہے، اس لئے اس سے مراد وہ مسلمان ہیں جو کفار کے ظلم وستم سے تنگ آ کر مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ ان کی تعداد مردوں، عورتوں اور بچوں سمیت کم و بیش ایک سو تھی، جن میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور ان کی زوجہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا (بنت رسول ﷺ) بھی تھے، مگر لفظ عام ہونے کی وجہ سے اس میں ہر مہاجر شامل ہے، خواہ مکہ سے حبشہ کی طرف ہو یا مدینہ کی طرف، یا کسی بھی ظالم بستی سے امن کی بستی کی طرف۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس آیت میں حبشہ کے بعد مدینہ کی طرف ہجرت کی پیشگی کا اشارہ ہو۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے انتہائی تاکید کے ساتھ یہ بیان فرمایا ہے کہ اس نے ان ناتواں اور غریب الوطن مہاجرین کو دنیا میں عزت، شرف، عظمت، حکومت، دولت غرض ہر چیز عطا فرمائی۔ وہ جزیرۂ عرب ہی کے نہیں بلکہ شام، مصر، عراق اور فارس جیسی عظیم الشان سلطنتوں کے مالک بنے اور نصف صدی گزری تھی کہ وہ تمام دنیا پر غالب تھے۔ یہ بھی کوئی اجر صغیر نہیں، اجر کبیر ہے، جو دین کی اشاعت اور آخرت کی تیاری میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ کبیر ہی کے مقابلہ میں اکبر ہوتا ہے، نہ کہ صغیر کے مقابلہ میں، اس لئے فرمایا: یقیناً آخرت کا اجر اکبر ہے، یعنی اس سے بھی بڑا، بلکہ سب سے بڑا ہے۔

علمی بات: لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ سے مراد تین طرح کے لوگ ہو سکتے ہیں: ۱۔ کافر کہ وہ علم رکھتے ہوتے تو ایمان لے آتے۔ ۲۔ مہاجر کہ وہ ہجرت کی فضیلت جانتے ہوتے تو انہیں بے حد خوشی ہوتی۔ ۳۔ وہ مومن جنہوں نے ہجرت نہیں کی کہ وہ ہجرت کی فضیلت جانتے ہوتے تو ضرور ہجرت کرتے۔

آیت نمبر ۴۲: مہاجرین کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ اللہ ﷻ کے وعدے ضرور پورے ہوں گے۔ لہٰذا انہوں نے تکالیف پر صبر کیا اور اللہ ﷻ ہی پر بھروسہ کرتے رہے۔

علمی و عملی بات: صبر کے لغوی معنیٰ روکنے اور برداشت کرنے، سہنے کے ہیں یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ ثابت قدم رکھنا اور یہی صبر کے معنیٰ میں حقیقت بھی ہے یعنی اس کے معنیٰ بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثابت قدمی کے ہیں۔

علمی بات: وہ لوگ جو ہر طرح کی مصیبتوں میں ثابت قدم رہے اور جو اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں اور اپنا کام پورے دھیان سے کرتے ہیں حالات خواہ کچھ ہوں، اس جگہ اس کی تلقین کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ مخالفت جب حد سے بڑھ گئی اور مخالفین کی ایذاؤں اور تکلیفوں کا سلسلہ روز بروز بڑھتا گیا تو مسلمانوں پر زندہ رہنا دشوار ہو گیا تو پیغمبر اسلام نے اجازت دے دی کہ حبشہ کی طرف ہجرت کر جائیں۔

علمی بات: مومنین صادقین اور مہاجرین فی سبیل اللہ کی ایک صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ وہ مصائب و مشکلات کے ہر دور اور ہر حال میں اپنے رب ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں کہ وہی خالق و مالک ہے سب کا اور سب کچھ اسی کے قبضہ وقدرت واختیار میں ہے۔ لہٰذا اس توکل اور اعتماد علی اللہ کی بدولت وہ ہمیشہ مطمئن رہتے ہیں کہ اللہ ﷻ ان کو تنہا نہیں چھوڑے گا بلکہ ہر موڑ پر اور ہر مشکل کے موقعہ پر ان کی مدد فرمائے گا۔ پس حالات خواہ کتنے ہی ناموافق اور نامساعد کیوں نہ ہوں ایسے بندگانِ صدق وصفا اپنے اس اعتماد اور توکل علی اللہ کی بنا پر مطمئن رہتے ہیں اور یہی صبر و توکل راہ حق میں اور خاص کر ہجرت الی اللہ کی راہ میں ان کے لئے اصل زادِ راہ ہوتا ہے۔

علمی بات: کفار کے ستم اٹھا کر ہجرت کرنے پر ہی وعدۂ الٰہی منحصر نہیں بلکہ صبر و توکل پر جہاں کہیں ہو اور کسی بات میں ہو خواہ گناہوں کے ترک کرنے پر اور ظالم نفس کے صدمات اٹھا کر اس کو اس کی بری خواہشوں سے روکنے پر یا دین الٰہی میں کوئی محنت و مشقت کا کام اختیار کرنے پر اسلام کی ترویج و اشاعت پر خواہ کفر و بت پرستی چھوڑ کر اللہ ﷻ کی طرف آنے میں۔ گویا یہ آیت جس طرح اس کی راہ میں صبر و توکل کرنے والوں کے لئے انعام الٰہی کا پروانہ ہے اسی طرح اس بات کے لئے بھی اعلان ہے کہ راہ حق کٹھن راستہ ہے۔ اس راستہ میں بہت مستحکم ہو کر مصائب پر صبر کرنا چاہئے اور حق بات پر استقامت اختیار کرنی چاہئے۔

آیت نمبر ۴۳: مشرکین مکہ کے اعتراض کا جواب کہ رسول انسان کیوں ہیں کوئی فرشتہ کیوں نہیں؟ چنانچہ بتایا جا رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پہلے جتنے بھی

انبیاء کرام علیہم السلام آئے وہ سب انسان اور مرد ہی تھے۔ اہل علم سے مراد یہود و نصاریٰ کے علماء ہیں جو سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام اور حالات سے باخبر تھے۔ مشرکین مکہ کو اہل علم سے انبیاء کرام علیہم السلام کے حالات و واقعات کی تصدیق کرنے کا حکم دیا گیا اور توجہ دلائی گئی ہے کہ کسی مسئلہ میں رہنمائی کی ضرورت پڑنے پر اہل علم کی طرف رجوع کیا جائے۔

علمی بات: کفار حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبی تسلیم نہیں کرتے تھے اور دلیل یہ پیش کرتے کہ اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بڑی بلند ہے کہ وہ کسی بشر کو اپنا رسول بنا کر بھیجے۔ اگر اسے کوئی رسول بھیجنا ہی تھا تو اس کے پاس فرشتوں کی کیا کمی تھی۔ کسی فرشتہ کو ہی رسول بنا کر بھیج دیتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہمارا تو یہی دستور ہے کہ جب ہم انسانوں کی طرف کوئی نبی بھیجتے ہیں تو انہی میں سے کسی مرد کو اس منصب عالی شان سے سرفراز فرما دیتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی پہلے نبی تو نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے بھی ہمارے انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لائے اور وہ سب کے سب نوع انسانی کے فرد تھے۔ اس میں مصلحت یہی ہے کہ انسان ہی انسان کو علم اور عمل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا وہ پیغام اچھی طرح سمجھا سکتا ہے کوئی دوسری مخلوق یہ کام نہیں کر سکتی۔

علمی بات: اَهْلُ الذِّكْر سے مراد اہل کتاب ہیں جو پچھلے انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی تاریخ سے واقف تھے۔ کفار کو دعوت دی گئی ہے کہ اگر تم اس مسئلہ کی مزید تحقیق کرنا چاہو تو کسی صاحب علم سے پوچھ لو، وہ تمہیں بتائے گا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد افہام و تفہیم ہے اور یہ مقصد تب ہی پورا ہو سکتا ہے جب کہ نبی بھی انسان ہو۔ ایک فرشتہ پیغام عذاب لے کر آ سکتا ہے لیکن انبیاء کرام علیہم السلام کے فرائض کو انجام دینا اور انسانوں کے لئے قابل عمل نمونہ بننا اس صورت میں ممکن نہ ہوتا۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان کو اگر کسی چیز کا علم نہ ہو تو وہ اہل علم کی طرف رجوع کرے۔

علمی و عملی بات: اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ اسلامی احکام نہیں جانتے وہ اہل علم سے پوچھ کر ان پر عمل کریں اور یہ ایک ایسا بدیہی اصول ہے جس پر عہد صحابہ رضی اللہ عنہم سے لے کر آج تک عمل ہو رہا ہے یعنی جو لوگ عالم نہیں ہیں وہ علماء کرام سے قرآن و سنت کی روشنی میں فتویٰ لے کر اس پر عمل کرتے ہیں۔ اس آیت میں بہت سادہ سا اصول بتایا گیا ہے جو بہت اہمیت رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک شخص جس بات کو نہیں جانتا وہ جاننے والوں سے جان لے۔ کسی چیز کے جاننے میں کوئی عیب نہیں ہے۔ بعض لوگ زندگی بھر چھوٹے چھوٹے مسئلوں میں اسی لئے الجھے رہتے ہیں کہ وہ کسی سے پوچھنے میں شرم محسوس کرتے ہیں۔ ہمیں قرآنِ حکیم سے یہ اصول بھی مل گیا کہ جس بات کو آدمی نہیں جانتا اس کو جاننے والوں سے جان لینا چاہیئے جس مسئلہ کا اس کو علم نہ ہو اس کو کسی عالم سے پوچھ لینا کوئی عیب نہیں ہے۔

آیت نمبر ۴۴: ذکر کے مفہوم میں قرآنِ حکیم کے علاوہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی شامل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآنِ حکیم کے الفاظ کی طرح اس کی وضاحت بھی عطا فرمائی۔ لوگوں کو قرآنِ حکیم پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی۔

علمی بات: اس آیت طیبہ سے واضح ہوا کہ ہمارے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے اتباع کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کا صحیح علم اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا فرمایا اور اس کے معنیٰ و مطالب کے بیان، اس کے اجمال کی تفصیل اور اوامر و نواہی کی وضاحت کا منصب فقط اپنے محبوب مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تفویض کیا۔ اس لئے قرآنِ حکیم کی جو تفسیر و تشریح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی وہی قابلِ اعتماد ہے۔ کسی دوسرے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے فہم و خرد پر بھروسہ کر کے کسی آیت کی ایسی تاویل کرے جو ارشادِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ہو۔

علمی بات: آیتِ کریمہ میں مزید تدبر کرنے سے ایک اور بات کی طرف بھی رہنمائی ملتی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت کتاب مبین (واضح کرنے والے) کی ہوتی ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کا کام صرف کتاب امت تک پہنچا دینا نہیں بلکہ اس کی تعلیم اور اس کے احکامات کا انطباق یعنی ان احکامات کی مطابقت و موافقت، اجتماعی زندگی میں کتابِ الٰہی کا نفاذ اور ایک ایک ادارہ کی عملی تشکیل بھی ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوری طرح ان تمام ضرورتوں کو پورا کر کے دکھایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عدالتیں قائم کیں اور انصاف کرنے کا طریقہ سکھایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حق و باطل کے معرکے سر کیئے اور امت کو جنگ کی تہذیب دی۔ اس کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ جنگ کو جہاد اور قتال فی سبیل اللہ بنایا۔ حکومت و اقتدار کو اللہ تعالیٰ کی امانت ثابت کیا۔ بندگی اور نیابتِ الٰہی کو اکٹھا کر کے دکھایا۔ امراء اور حاکموں کے فرائض اور آداب کو واضح فرمایا۔ غرض کہ عبادات سے لے کر زندگی کے تمام شعبوں تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن حکیم

کے ایک ایک حکم کو عملی تعبیر عطا فرمائی، معاشرہ پر اس کا انطباق کیا اور مطابقت پیدا فرمائی۔ یہ وہ چیز ہے جس کو سنتِ رسول ﷺ کہتے ہیں۔ جس طرح قرآنِ حکیم کی آیات اسلامی قانون کی اساس ہیں۔ اسی طرح سنت رسول ﷺ بھی ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کو تشکیل دینے والی ہے۔ دونوں میں سے کسی ایک کو بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

علمی بات: اس آیت نے رسول کریم ﷺ کا مقصد بعثت قرآنِ حکیم کی تفسیر وبیان کو قرار دیا ہے جیسا کہ (سورۃ الجمعہ ۶۲، آیت:۲) نیز دیگر آیات میں تعلیم کتاب کے الفاظ سے اس مقصدِ بعثت کو ذکر کیا گیا ہے اب وہ ذخیرۂ احادیث مبارکہ جس کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعین سے لے کر متاخرین محدثین رحمۃ اللہ علیہم تک امت کے باکمال افراد نے اپنی جانوں سے زیادہ حفاظت کر کے امت تک پہنچایا ہے اور اس کی چھان بین میں عمریں صَرف کر کے روایات حدیث کے درجے قائم کر دیئے ہیں اور جس روایت کو بحیثیتِ سند اس درجہ کا نہیں پایا کہ اس پر احکام شرعیہ کی بنیاد رکھی جائے اس کو ذخیرۂ حدیث سے الگ کر کے صرف ان روایات پر مستقل کتابیں لکھ دی ہیں جو عمر بھر کی تنقیدوں اور تحقیقات کے بعد صحیح اور قابل اعتماد ثابت ہوئی ہیں۔

اگر آج کوئی شخص اس ذخیرۂ حدیث کو کسی حیلہ بہانہ سے ناقابل اعتماد کہتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ (معاذاللہ ثم معاذاللہ) رسول کریم ﷺ نے اس حکم قرآنی کی خلاف ورزی کی کہ مضامین قرآن کو بیان نہیں کیا یا یہ کہ آپ ﷺ نے تو بیان کیا تھا مگر وہ قائم و محفوظ نہیں رہا بہر دو صورت قرآن بحیثیت معنٰی کے محفوظ نہ رہا جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ رکھی ہے۔ "بے شک ہم ہی نے (اس) ذکر (قرآن) کو نازل فرمایا ہے اور بے شک ہم ہی اس کی ضرور حفاظت فرمانے والے ہیں۔" (سورۃ الحجر ۱۵، آیت:۹) اس کا یہ دعویٰ اس نص قرآن حکیم کے خلاف ہے اس سے ثابت ہوا کہ جو شخص سنتِ رسول ﷺ کو اسلام کی حجت ماننے سے انکار کرتا ہے وہ درحقیقت قرآن حکیم ہی کا منکر ہے۔ نعوذ باللہ۔

آیت نمبر ۴۵: دعوت حق کی مخالفت کرنے والوں کو سخت تنبیہ کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ عذاب کی مختلف اقسام بھیجنے پر قادر ہے جن میں منکرین حق گرفتار ہوسکتے ہیں۔ عذاب کی پہلی صورت یہ بیان کی گئی کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو ان منکرین کو زمین میں دھنسا دے۔ عذاب کی دوسری صورت یہ ہے کہ ان پر اس جگہ سے عذاب بھیج دے جہاں سے عذاب آنا ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو۔

علمی بات: اگلی تین آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے واضح دلائل اور کتاب دیکھنے سننے کے باوجود رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان کے خلاف سازشیں کرنے والوں کو چار قسم کے عذاب سے خبردار کیا ہے، پہلا یہ کہ کیا وہ اس بات سے بے خوف ہوگئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو زمین میں دھنسا دے اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قارون کے متعلق فرمایا: "پھر ہم نے اس (قارون) کو اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔" (سورۃ القصص ۲۸، آیت:۸۱)

نیز حدیث مبارک میں بھی زمین میں دھنسانے کے عذاب کا ذکر آیا ہے: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک شخص تکبر سے اپنے تہبند کو گھسیٹتا ہوا چلا رہا تھا، اس کو زمین میں دھنسا دیا گیا اور وہ قیامت تک زمین میں دھنستا رہے گا۔ (صحیح بخاری)

دوسرا یہ کہ انہیں عذاب ایسی جگہ سے آپکڑے جہاں سے وہ سوچتے بھی نہ ہوں کہ یہاں سے بھی عذاب آسکتا ہے اور اچانک آجانے کی وجہ سے نہ اس کا دفاع کر سکیں اور نہ اس سے بھاگ کر بچ سکیں۔ مثلاً جنگِ بدر میں بے سروسامان مسلمانوں کے ہاتھوں سے ان کو سزا ملی جس کا یہ لوگ امکان بھی محسوس نہ کرتے تھے۔

آیت نمبر ۴۶: منکرین کے لئے عذاب کی تیسری صورت یہ ہے کہ چلتے پھرتے ان کی گرفت ہوجائے یعنی دورانِ سفر انہیں کسی حادثہ کا شکار کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ جس طرح چاہے مجرمین کی گرفت کرنے پر قادر ہے جسے وہ نہیں ٹال سکتے۔

علمی بات: یہ بھی ضروری نہیں کہ پہلے سے کچھ اہتمام کیا جائے یا فوجیں مقابلہ کے لئے روانہ کی جائیں اللہ تعالیٰ تو اس پر بھی قادر ہے کہ لوگوں کو چلتے پھرتے کام کاج کرتے یا بستروں پر کروٹیں بدلتے ہوئے ایک دم پکڑ لے اور بالکل عاجز و بے بس کر دے۔ اللہ تعالیٰ کو سب قدرت ہے وہ لوگوں کو عاجز کر سکتا ہے لوگ اسے نہیں تھکا سکتے۔

آیت نمبر ۴۷: منکرین کے لئے عذاب کی چوتھی صورت تخوف بیان کی گئی ہے جس کا مطلب ہے "آہستہ آہستہ گھٹاتے جانا۔" یہ وہ کیفیت ہوتی ہے جس میں

لوگوں کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ عذاب میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ ایسا عذاب اندر ہی اندر کام کرتا ہے اور معاشرہ زوال پذیر ہونا شروع ہو جاتا ہے حتیٰ کہ لوگ ہلاکت تک پہنچ جاتے ہیں۔

علمی بات: تخوف کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ ﷻ دفعۃً بلا نازل نہ کرے بلکہ اس کی پہلے علامات و آثار نمایاں کرے اور لوگوں میں ہلاکت سے پہلے خوف اور پریشانی پیدا ہو پھر وہ ہلاک ہو جائیں۔ جیسا کہ شدید قحط اور وبائی امراض یا دشمنوں کے غلبہ میں ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر اللہ ﷻ رؤف رحیم ہے وہ اپنے بندوں کو مہلت دیتا رہتا ہے تاکہ وہ گناہوں کی زندگی سے پلٹ آئیں اور اللہ ﷻ کی فرماں برداری اختیار کر کے ہلاکت سے بچ جائیں۔

علمی بات: تخوف کا ایک معنیٰ تو یہ ہے کہ پہلے عذاب کی نشانیاں نمودار ہوں جس سے وہ خوفزدہ ہو جائیں اور پھر ان پر عذاب اترے جو ان کو تباہ و برباد کر کے رکھ دے۔ دوسرا مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ تخوف کا معنیٰ نقصان دینے کا ہے۔ پہلے انہیں کاروبار میں نقصان ہوتا ہے۔ کھیتی باڑی سے برکت اٹھ جاتی ہے۔ پیداوار گھٹنی شروع ہو جاتی ہے۔ صحت بگڑنے لگتی ہے۔ تندرست و توانا جسم گھل کر لاغر و نحیف ہو جاتا ہے۔ اس طرح جب ان کی معیشت اور زندگی کا تنا کھوکھلا ہو جاتا ہے تو اچانک عذاب الٰہی کا طوفان آتا ہے اور اسے جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیتا ہے۔

علمی و عملی بات: مطلب یہ ہے کہ اللہ ﷻ چونکہ شفیق اور مہربان ہے۔ اس لئے اس نے کافروں کو مہلت دی ہوئی ہے اور فوری طور پر انہیں عذاب میں نہیں پکڑا، اس لئے یہ کافر لوگ بے خوف ہو گئے ہیں، حالانکہ پچھلی امتوں کے واقعات سے سبق لے کر انہیں بے خوف نہیں ہونا چاہئے۔ گویا اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اے نافرمان لوگو! تمہیں اتنی ڈھیل جو دی جا رہی ہے، اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تم جو کچھ کر رہے ہو وہ درست ہے یا تمہارا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ ﷻ بڑا مہربان اور رحیم ہے۔ وہ تمہیں مہلت دے رہا ہے۔ شاید تم باز آ جاؤ۔ شاید تم سمجھ جاؤ۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ ظالم کو چند روز دنیا میں مہلت دیتا رہتا ہے لیکن جب پکڑتا ہے تو پھر نہیں چھوڑتا۔" راوی نے بیان کیا کہ پھر آپ ﷺ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی: وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ ۭ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ "اور آپ کے رب کی پکڑ اسی طرح ہوتی ہے جب وہ بستیوں کو پکڑتا ہے اس حال میں کہ وہ ظالم ہوتی ہیں بے شک اُس کی پکڑ بڑی دردناک بہت سخت ہے۔" (سورۃ ھود ۱۱، آیت: ۱۰۲) (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۴۸: اللہ ﷻ کی عظمت اور کبریائی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ کائنات میں اللہ ﷻ کی پیدا کردہ تمام چیزیں اللہ ﷻ کے سامنے سجدہ کرتی ہیں۔ ہر چیز کا سایہ جو دائیں بائیں جھکتا ہے وہ صبح و شام اللہ ﷻ کے سامنے سجدہ ریز ہے۔

علمی بات: انسان کتنا بھی مغرور یا متکبر ہو جائے، اس کا سایہ جب زمین پر پڑتا ہے تو وہ عاجزی اور انکساری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس طرح اللہ ﷻ نے ہر مخلوق کے ساتھ اس کے سائے کی شکل میں ایک ایسی چیز پیدا فرما دی ہے جو اس کے اختیار کے بغیر ہر وقت اللہ ﷻ کے آگے سجدہ ریز رہتی ہے۔ یہاں تک کہ جو لوگ سورج کی پوجا کرتے ہیں۔ وہ خود تو سورج کے آگے جھک رہے ہوتے ہیں اور ان کے سائے اس کی مخالف سمت میں اللہ ﷻ کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں۔

عملی پہلو: سائے کی مثال دے کر بہت عام فہم اور آسان انداز میں اس بات پر غور و فکر کی دعوت دی جا رہی ہے کہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان موجود ساری چیزیں اللہ ﷻ کے حکم کے تابع ہیں بالخصوص مادی اجسام والی چیزوں کے سائے جب دائیں اور بائیں اطراف کو جھکتے ہیں تو یہ سجدہ کے مشابہ ایسا منظر پیش کرتے ہیں جو متکبر انسانوں کے لئے درسِ عبرت ہے کہ بے جان چیزیں اور ان کے سائے اللہ ﷻ کے سامنے عاجزی کرتے ہوئے سجدہ ریز ہیں مگر متکبر و سرکش انسان اپنے رب کی نافرمانی میں سرگرداں ہیں۔

آیت نمبر ۴۹: کائنات کی تمام مخلوق اور فرشتے اللہ ﷻ کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ وہ تکبر نہیں کرتے بلکہ عاجزی اختیار کرتے ہیں۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ نے فرمایا کہ آسمانوں میں رہنے والے تمام فرشتے اور زمین پر چلنے والے تمام چوپائے سب اس کے سامنے سر تسلیم خم کیئے ہوئے

ہیں، سب ہی اس کی منشا اور ارادہ کے پابند ہیں۔ حیات و ممات اور صحت و بیماری ہر شے میں اس کے فیصلہ کے پابند ہیں۔ بالخصوص فرشتے اس کی عبادت اور اس کے سامنے سجدہ کرنے سے کبھی انکار نہیں کرتے اور اپنے رب سے ڈرتے رہتے ہیں، جو عظمت و کبریائی والا ہے اور تمام مخلوق اس کے ماتحت ہے۔ اللہ ﷻ کی جانب سے جو احکام و اوامر ان کے لئے صادر ہوتے ہیں انہیں پورے جذبۂ بندگی کے ساتھ بجالاتے ہیں۔

علمی بات: یعنی بے شعور اور بے جان سائے ہی اس کے سامنے سجدہ ریز نہیں بلکہ آسمان اور زمین کی ہر چیز بارگاہِ الٰہی میں سربسجود ہے اور ملائکہ کی اطاعت کا تو یہ عالم ہے کہ وہاں تکبر و سرکشی کا شائبہ تک نہیں۔

علمی بات: سجدہ کی دو قسمیں ہیں: سجدہ عبادت اور سجدہ بہ معنٰی اطاعت اور خضوع۔ سجدہ عبادت وہ ہے جیسے مسلمان اللہ ﷻ کو سجدہ کرتے ہیں اور سجدہ بہ معنٰی اطاعت اور خضوع یہ ہے کہ اس معنٰی میں کائنات کی ہر چیز اللہ ﷻ کو سجدہ کرتی ہے دریاؤں اور سمندروں کی روانی، درختوں میں پتوں، پھلوں اور پھولوں کا کھلنا، حیوانات کی نشوونما، موسموں کا بدلنا، دن اور رات کا آنا جانا، سب کچھ اس کے حکم سے ہو رہا ہے اور سب اس کی اطاعت کر رہے ہیں اور یوں کائنات کی ہر چیز جو اللہ ﷻ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہے۔

آیت نمبر ۵۰: فرشتے اللہ ﷻ کے ڈر سے ہر وقت اس کے حکم کی تعمیل میں لگے رہتے ہیں۔ وہ اللہ ﷻ کے حکم کی سرتابی نہیں کرتے۔

علمی بات: اس آیت میں فرشتوں کی چار صفات کا ذکر ہوا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اللہ ﷻ ہی کو سجدہ کرتے ہیں۔ دوسری یہ کہ وہ بڑائی اور سرکشی نہیں کرتے۔ تیسری یہ کہ وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اس احساس کے ساتھ کہ وہ ان کے اوپر موجود ہے اور چوتھی یہ کہ وہ اطاعت شعار ہیں اور اس کے ہر حکم کو بجالاتے ہیں اور جب فرشتوں کا اپنا حال یہ ہے تو ان کو اللہ ﷻ کا شریک ٹھہرانے کا کیا مطلب؟ یہ نری جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟

علمی بات: ۱۔ یہ آیت سجدہ ہے اور اس طرح کی چودہ آیاتِ سجدہ ہیں جب ان آیات کو انسان پڑھے یا سنے تو اس پر سجدہ کرنا لازمی ہے۔ اسے سجدۂ تلاوت کہتے ہیں۔ ۲۔ سجدۂ تلاوت کے ادا کرنے کی بھی وہی شرطیں ہیں جو سجدہ نماز کی ہیں۔ یعنی باوضو ہو، پاک جگہ ہو وغیرہ۔

۳۔ سجدۂ تلاوت کرنے لگے تو اس میں تکبیر تحریمہ کی طرح ہاتھ اٹھانا نہیں ہے بلکہ اللّٰہُ اَکْبَر کہتا ہوا سجدۂ میں چلا جائے اور ایک سجدہ کرے تکبیر کہتے ہوئے سر اٹھائے اس میں تشہد اور سلام نہیں ہے۔

۴۔ جیسے آیت سجدہ پڑھنے والے پر سجدہ واجب ہوتا ہے ایسے ہی سننے والے پر بھی واجب ہو جاتا ہے اگرچہ اس نے ارادہ کر کے نہ سنا ہو، البتہ تلاوت کرنے والے کے لئے بہتر یہ ہے کہ آیت سجدہ حاضرین کے سامنے زور سے نہ پڑھے، ہاں اگر حاضرین سننے ہی کے لئے بیٹھے ہیں تو سجدۂ تلاوت والی آیت زور سے پڑھ دے۔

سجدۂ تلاوت کی دُعا: سجدۂ تلاوت میں اگر سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم تین مرتبہ کہے تو یہ بھی درست ہے اور اگر اس کے ساتھ دُعاءِ ماثور پڑھ لے تو زیادہ بہتر ہے۔

دُعا ماثور یہ ہے: سَجَدَ وَجْهِي لِلَّذِيْ خَلَقَهٗ وَ شَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ بِحَوْلِهٖ وَقُوَّتِهٖ (سنن ابی داؤد، جامع ترمذی)

"میرے چہرہ نے اس ذات کے لئے سجدہ کیا جس نے اسے پیدا فرمایا اور اسے اپنی طاقت و قدرت کے ذریعہ آنکھ و کان نکال کر (زینت بخشی)۔"

آیت نمبر ۵۱: دو معبودوں کے عقیدہ کی تردید کی گئی ہے۔ معبود برحق صرف اللہ ﷻ ہے لہٰذا اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا جائے اور اسی سے ڈرا جائے۔

علمی بات: اللہ ﷻ وحدہٗ لاشریک اور ہر چیز کا خالق و مالک ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اسی کی عبادت خالص، دائمی اور واجب ہے۔ آسمان و زمین کی تمام مخلوق خوشی یا ناخوشی اسی کے ماتحت ہے۔ سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ لہٰذا اس کی عبادت خلوص دل کے ساتھ کرنی چاہیئے۔ اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کی نافرمانی سے ڈرنا چاہیئے۔ اسی کا خوف دل میں ہو کیونکہ اس کے سوا کوئی کسی قسم کا نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

آیت نمبر ۵۲: کائنات کی ہر چیز کا خالق و مالک اللہ ﷻ ہی ہے۔ اللہ ﷻ ہی کی مسلسل بندگی کرنے اور دوسروں سے نہ ڈرنے کی نصیحت کی گئی ہے۔

علمی بات: ہر چیز اسی کی مخلوق ہے اور اسی کی مملوک ہے اس کا شریک تو وہ ہو جس کو اس نے پیدا نہ کیا ہو اس کی پیدا کی ہوئی کسی چیز کو اس کا شریک ٹھہرانا اور اس

کا مد مقابل ماننا یہ تو الٹی گنگا بہانے کے مترادف ہے۔

علمی بات: دین سے مراد اطاعت و اخلاص ہے واصباً کا معنیٰ ہمیشہ ہے معنیٰ یہ ہے کہ اسی کی اطاعت و فرماں برداری ہر شخص پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لازم ہے۔ آسمان و زمین کی ہر چیز کا مالک تنہا وہی ہے۔ ہر قسم کا نفع و نقصان اسی کے اختیار میں ہے۔ بندوں کو جو کچھ نعمتیں حاصل ہیں وہ سب اسی کی طرف سے ہیں۔ رزق صحت و عافیت، فتح و نصرت اور دولت و خوشحالی سب اسی کی طرف سے ہے۔ اس کے احسان و انعام بے شمار ہیں۔ ان انعامات و احسانات کے پالینے کے باوجود بندے اس کے ویسے ہی محتاج ہیں۔

آیت نمبر ۵۳: تمام نعمتیں اللہ ﷻ ہی کی عطا کردہ ہوتی ہیں۔ مشرکین سخت مصیبت میں مبتلا ہونے پر خالصتاً اللہ ﷻ ہی کو پکارتے اور اسی سے فریاد کرتے تھے۔

علمی بات: یعنی سب بھلائیاں اور نعمتیں اسی کی طرف سے ہیں اور ہر ایک برائی یا سختی کا دفع کرنا بھی اسی کے قبضہ میں ہے۔ چنانچہ جب کوئی سخت مصیبت انسان کو چھو جاتی ہے تو سخت سے سخت، ضدی، متشدد اور اپنی عقیدہ پر اڑنے والا مشرک بھی اس وقت سب سہارے چھوڑ کر اللہ ﷻ کو پکارنے لگتا ہے۔ گویا فطرت انسانی شہادت دیتی ہے کہ مصائب اور سختیوں سے بچانا اللہ ﷻ کے سوا کسی کا کام نہیں ہو سکتا۔ پھر جس کے قبضہ میں ہر ایک نعمت اور ہر قسم کا نفع و ضرر ہے، دوسرا کون ہے جو اس کی اُلوہیت میں حصہ دار بن سکے۔ یا جس سے انسان خوف کھائے اور امیدیں باندھے۔

علمی بات: مشرکین کو جھنجھوڑا جارہا ہے کہ عجیب بات ہے کہ جن نعمتوں سے تم لطف اندوز ہو رہے ہو اور فائدہ اٹھا رہے ہو، وہ تو ساری کی ساری اللہ ﷻ نے عطا فرمائی ہیں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ تم ہر دم اس کا شکریہ ادا کرتے رہتے لیکن تم الٹے اکڑ جاتے ہو اور نافرمان بن جاتے ہو۔ تمہیں وہ کریم رب یاد ہی نہیں رہتا لیکن جب چاروں طرف سے مصیبتیں گھیرا تنگ کر لیتی ہیں تو ہر طرف سے مایوس ہو کر پھر اسی کے حضور گڑگڑانا شروع کر دیتے ہو۔ بات تو تب تھی کہ اب بھی اکڑے رہتے اور اس کی بارگاہ میں حاضر نہ ہوتے۔

آیت نمبر ۵۴: تکلیف دور فرمانے پر مشرکین اللہ ﷻ کے احسانات بھول کر اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔ ایک جماعت کا ذکر اس لئے کیا کہ بعض مشرک تکلیف دور ہونے پر شرک پر قائم رہنے کے بجائے توحید اختیار کرتے تھے۔

علمی بات: یعنی اللہ ﷻ کی عطا کی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں جس میں یہ بھی ہے کہ اس کی عطا کردہ نعمتوں کو گناہوں میں استعمال کرتے ہیں شرک کے کاموں میں خرچ کرتے ہیں۔ بتوں پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور بتوں کے لئے حصے مقرر کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ اپنی ذات کو عذاب میں دھکیلنے کا کام کرتے ہیں۔ جس طرح مصیبت کے وقت اس سے نالہ و فریاد کرتے ہیں اسی طرح امن و عافیت میں بھی اس کو یاد رکھنا چاہیئے اور اس کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ مصیبت دور ہوتے ہی اس خالق و مالک حقیقی کو چھوڑ کر باطل معبودوں کی پوجا میں لگ جاتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر کفرانِ نعمت اور ناشکری کیا ہو سکتی ہے۔ پس اے منکرو! تم دنیا میں چند روز اور مزے اڑالو، پھر بہت جلد تمہیں اس ناشکری کا انجام معلوم ہو جائے گا۔

آیت نمبر ۵۵: مشرک اللہ ﷻ کے ساتھ شرک کرکے اس کی نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کو چند روزہ دنیاوی زندگی سے فائدہ اٹھانے کے بعد عذاب کی تنبیہ کی گئی ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ توحید کا نقطہ سمجھاتے ہوئے فرمارہا ہے کہ اے انسانو! تمہارے پاس موجود ہر نعمت اللہ ﷻ کی دی ہوئی ہے اس کے باوجود تم اپنے جھوٹے معبودوں کو اللہ ﷻ کی عبادت میں شریک کرتے ہو۔ لیکن جب تم پر مصیبت آجائے تو انہیں بھول کر صرف اللہ ﷻ کی بارگاہ میں فریاد کرتے ہو اور جب وہ تم سے مصیبت دور کر دے تو تم پھر انہیں جھوٹے معبودوں کو اللہ ﷻ کے ساتھ شریک ٹھہرانے لگتے ہو۔ یہ کس قدر گمراہی و ناانصافی ہے۔ تو چند دن مزے اڑالو، جو چاہے عمل کرو اور دنیا کی اس زندگی میں قلیل مدت کے لئے فائدے اٹھالو۔ عنقریب تمہیں اس ناانصافی و ناشکری کا انجام معلوم ہو گا۔

عملی پہلو: مومن ہر حال میں اللہ ﷻ کی طرف متوجہ رہتا ہے کسی لمحہ اسے بھولتا نہیں۔ خوشی ہو یا غمی، رحمت و نعمت سے مسرور ہو یا کسی پریشانی کا شکار ہو وہ

ہر حال میں اللہ ﷻ کی یاد سے اپنے دل کو معمور رکھتا ہے اور اس کی طرف رجوع کیئے رکھتا ہے۔ اللہ ﷻ کو خوشی و مسرت اور ہر حال میں یاد رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کے مطابق عمل کیا جائے۔ جس میں زندگی کے تمام معاملات کے لئے رہنمائی موجود ہے۔

آیت نمبر ۵۶: مشرکین اپنے مالوں میں سے جھوٹے معبودوں کے نام پر مال خرچ کرتے تھے۔ اللہ ﷻ کے ساتھ یہ جنہیں شریک کرتے ہیں ان کی حقیقت کا انہیں کوئی علم نہیں۔ اپنے خود ساختہ عقائد کو اللہ ﷻ کی طرف منسوب کرنے والے مشرکین کو قیامت کے دن باز پرس کرنے کی تنبیہ کی گئی ہے۔

علمی بات: مشرکین مکہ کی قبیح عادات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے اللہ ﷻ کے ساتھ ساتھ بتوں، شریکوں اور معبودان باطلہ کی بھی پوجا کی جن کے متعلق انہیں کوئی علم نہیں اور وہ ان کی حقیقت سے ناآشنا ہیں۔ اللہ ﷻ نے انہیں جو رزق دیا تھا، اس میں سے انہوں نے اپنے بتوں کے لئے بھی حصہ مقرر کر دیا۔ انہوں نے اپنے گمان سے تقسیم کرتے ہوئے کہا کہ یہ حصہ اللہ ﷻ کے لئے ہے اور یہ ہمارے شریکوں کے لئے، تو جو حصہ ان کے شریکوں کے لئے ہے وہ تو اللہ ﷻ کی طرف نہیں جاسکتا اور جو اللہ ﷻ کا حصہ ہے وہ ان کے شریکوں کی طرف جاسکتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ الانعام ۶، آیت: ۱۳۶ میں بیان ہوا ہے ان کے یہ فیصلے برے ہیں کہ انہوں نے اللہ ﷻ کے ساتھ نہ صرف اپنے شریکوں کے لئے بھی حصہ مقرر کر رکھا ہے، بلکہ اسے اللہ ﷻ کے حصہ پر فوقیت بھی دی ہے۔ تو اللہ ﷻ نے اپنی ذات پاک کی قسم کھا کر فرمایا کہ وہ ان سے اس کذب و افتراء کے بارے میں ضرور باز پرس کرے گا اور انہیں اس کی آتش جہنم میں سخت سزا دی جائے گی۔

آیت نمبر ۵۷: کائنات کی ہر چیز کا خالق و مالک اللہ ﷻ ہی ہے۔ مشرکین کے ظلم اور شرکیہ طرز عمل کا بیان ہے کہ وہ خود ساختہ معبودوں کو اللہ ﷻ کا شریک بناتے ہیں۔ وہ شریک بھی انہیں بناتے ہیں جنہیں وہ اللہ ﷻ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں جو اللہ ﷻ کی شان میں سخت گستاخی ہے۔ وہ اللہ ﷻ کے لئے بیٹیاں منسوب کرتے ہیں جب کہ خود اپنے لئے بیٹے پسند کرتے ہیں۔ جب کہ اللہ ﷻ کی ذات ان چیزوں سے پاک ہے۔

علمی بات: خزاعہ اور کنانہ کے قبیلوں کا یہ اعتقاد تھا کہ فرشتے (نعوذ باللہ) اللہ ﷻ کی بیٹیاں ہیں۔ اللہ ﷻ نے اس کی تردید کر دی کہ وہ اولاد سے پاک ہے۔ اسے نہ بیٹے کی ضرورت ہے اور نہ بیٹی کی۔ لیکن ان کے اس عقیدہ کی قباحت کو ایک اور طرح سے بھی واضح کر دیا کہ یہ لوگ اپنے لئے ایک بیٹی بھی پسند نہیں کرتے۔ خود تو چاہتے ہیں کہ ان کے بیٹے ہی بیٹے ہوں لیکن اللہ ﷻ کے حصہ میں انہوں نے سب بیٹیاں ہی ڈال دی ہیں۔ کیا حماقت ہے کتنی کم فہمی ہے!!

آیت نمبر ۵۸: عرب کے بعض قبائل کے لوگوں کا بیٹی کی پیدائش پر طرزِ عمل بیان کیا گیا ہے۔ کسی شخص کو بیٹی کی پیدائش کی اطلاع ملنے پر اس کا چہرہ غم کی وجہ سے سیاہ پڑ جاتا اور وہ دل ہی دل میں کڑھنے لگتا۔

علمی بات: مشرکین عرب کا حال یہ ہے کہ اگر ان میں سے کسی کے گھر لڑکی پیدا ہو جاتی ہے تو مارے شرم و خجالت کے اس کا چہرہ کالا ہو جاتا ہے اور کرب و الم سے اس کی حالت غیر ہو جاتی ہے کہ اب وہ لوگوں کو کیسے منہ دکھائے گا؟ اور دو حالتوں کے درمیان حیران و پریشان ہوتا ہے کہ اسے اپنے پاس رہنے دے اور ذلت و رسوائی برداشت کرے، یا زندہ درگور کر دے۔ اللہ ﷻ نے فرمایا کہ ان کا یہ فیصلہ کتنا برا ہے کہ جس لڑکی کو وہ اپنے لئے باعث ننگ و عار سمجھتے ہیں، اسے اللہ ﷻ کے لئے ثابت کرتے ہیں اور اپنے لئے اس سے بہتر یعنی لڑکا پسند کرتے ہیں۔ اسلام نے اس ظالمانہ و جاہلانہ انداز فکر کو تبدیل کرتے ہوئے لڑکی کی تعلیم و پرورش کی زبردست فضیلت بیان کی ہے اور یوں بچیوں کو وہ تحفظ فراہم کیا کہ کوئی دوسرا مذہب اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس کی تین لڑکیاں ہوں اور وہ ان کے رہنے کا انتظام کرے، ان کے ساتھ رحم کا برتاؤ کرے اور ان کے معاملہ میں تکالیف برداشت کرے تو اس کے لئے جنت واجب ہو جائے گی۔“ ایک آدمی نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! اگر دو لڑکیاں ہوں تو تب؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اگر دو ہوں تب بھی۔“

علمی بات: آج ہمارے معاشرہ میں بھی بیٹی کو بوجھ اور باعث ذلت سمجھا جا رہا ہے حالانکہ بیٹیوں کی پرورش سے تو جنت کی بشارت سنائی گئی ہے۔ ایک اہم بات شادی بیاہ کے فضول اخراجات کی بھرمار اور بے ہودہ رسومات کا پلندہ بھی ہے جس کی وجہ سے بیٹیاں بوجھ سمجھی جاتی ہیں۔ حالانکہ دین اسلام نے کفالت کی ذمہ داری مرد پر رکھی ہے چنانچہ لڑکی کے والدین یا بھائیوں پر اُس کی شادی کے حوالہ سے دین نے کوئی خرچہ یا مالی ذمہ داری نہیں رکھی ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس شخص نے دو لڑکیوں کی پرورش کی حتیٰ کہ وہ دونوں بالغ ہو گئیں، آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کو ملا کر فرمایا قیامت کے دن میں اور وہ اس طرح (ساتھ) ہوں گے۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۵۹: مشرکین مکہ میں سے کسی کے ہاں بیٹی کی پیدائش ہوتی تو وہ اسے بری خبر سمجھتا اور شرمندگی کے سبب وہ اپنی قوم سے چھپتا پھرتا تھا۔ وہ یہ سوچنے لگتا کہ بیٹی کو زندہ رکھ کر ذلت برداشت کرے یا اسے زندہ دفن کر دیا جائے۔ جس بیٹی کو وہ اپنے لئے باعث ذلت سمجھتے اس کی نسبت اللہ ﷻ کی جانب کرتے جو بہت ہی برا فیصلہ ہے۔ احادیثِ مبارکہ میں بیٹیوں کی پرورش پر بشارتیں دی گئی ہیں۔ جبکہ آج ہمارے معاشرے میں بیٹیوں کو بوجھ سمجھا جا رہا ہے۔

علمی بات: یعنی لڑکی کی ولادت کی خبر سن کر ان کا تو یہ حال ہوتا ہے جو مذکور ہوا اور اللہ ﷻ کے لئے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں۔ کیسا برا یہ فیصلہ کرتے ہیں، یہاں یہ نہ سمجھا جائے کہ اللہ ﷻ بھی لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکی کو حقیر اور کم تر سمجھتا ہے، نہیں اللہ ﷻ کے نزدیک لڑکے اور لڑکی میں کوئی تمیز نہیں ہے نہ جنس کی بنیاد پر حقارت اور برتری کا تصور اس کے ہاں ہے یہاں تو صرف عربوں کی اس ناانصافی اور سراسر غیر معقول رویئے کی وضاحت مقصود ہے جو انہوں نے اللہ ﷻ کے ساتھ اختیار کیا تھا درآں حال کہ اللہ ﷻ کی برتری اور فوقیت کے وہ بھی قائل تھے جس کا منطقی نتیجہ تو یہ تھا کہ جو چیز یہ اپنے لئے پسند نہیں کرتے، اللہ ﷻ کے لئے بھی اسے تجویز نہ کرتے لیکن انہوں نے اس کے برعکس کیا۔ یہاں صرف اسی ناانصافی کی وضاحت کی گئی ہے۔

آیت نمبر ۶۰: درحقیقت مشرکین کے برے اعمال آخرت کے دن پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے ہیں۔ اللہ ﷻ کی ہر صفت مخلوق کے مقابلہ میں بہت اعلیٰ و برتر ہے۔ وہ زبردست حکمت والا ہے۔

علمی بات: جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے اس سے مراد وہ کافر ہیں جو کہتے تھے کہ اللہ ﷻ کی بیٹیاں ہیں، پھر فرمایا ان ہی کی بری صفات ہیں، یعنی یہ لوگ جاہل اور کافر ہیں، جاہل اس لئے کہ یہ نہیں جانتے کہ اللہ ﷻ کی اولاد نہیں ہو سکتی وہ کافر اس لئے ہیں کہ اللہ ﷻ کی طرف بیٹیوں کی نسبت کرنا کفر ہے اور بری صفت کا ایک معنیٰ یہ ہے کہ ان کے لئے آخرت میں دوزخ کا عذاب ہو گا۔

انہی مشرکین عرب کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ ذلت و حقارت کی تمام صفات سے وہ خود ہی متصف ہیں، وہی اولاد کے محتاج ہیں، وہی لڑکیوں کو ناپسند کرتے ہیں اور خجالت کی وجہ سے انہیں زندہ درگور کرتے ہیں۔ ان کے اندر یہ تمام بری صفات انکارِ آخرت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ اس کے برعکس اللہ ﷻ کے لئے تو تمام اعلیٰ ترین صفات ثابت ہیں اور وہ تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے۔ وہ سارے جہاں کا پالنے والا اور سب کا مالک ہے، ساری بھلائیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں، نہ کوئی اس کا مقابل ہے اور نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور وہ بڑا زبردست اور بڑی حکمتوں والا ہے۔

آیت نمبر ۶۱: مشرکین و کفار کی نافرمانیوں کے مقابلہ میں اللہ ﷻ کے عفو و درگزر کا بیان ہے۔ اگر مجرمین کے گناہوں کا فوری مؤاخذہ کر لیا جائے تو زمین پر کوئی جاندار باقی نہیں بچے گا۔ اللہ ﷻ کی شفقت و حکمت کا نتیجہ ہے کہ مقررہ وقت تک مہلت دی جاتی ہے۔ مقررہ وقت آ جائے تو ایک لمحہ بھی آگے پیچھے نہیں ہوتا۔

علمی بات: لوگ جس طرح اللہ ﷻ کی نافرمانی میں عجلت سے کام لیتے ہیں اگر اللہ ﷻ بھی اتنی ہی جلدی ان کو ان کے گناہوں کی سزا دیتا تو زندگی کا نام و نشان ہی کہیں باقی نہ ہوتا۔ یہ ساری دنیا اجاڑ اور ویران ہوتی لیکن وہ تو بڑا کریم ہے وہ ہمیشہ عفو و درگزر سے ہی کام لیتا ہے لوگ گناہ کرتے ہیں وہ چشم پوشی فرماتا ہے لوگ غلطیاں کرتے ہیں اور وہ معاف فرماتا ہے اور اس کے عفو و درگزر کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے۔ جب تک وہ مقرر وقت آ جائے اس کے بعد پھر کسی تقدیم و تاخیر کی گنجائش نہیں رہتی۔

علمی بات: اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر اللہ ﷻ لوگوں کے کفر اور معصیت کی وجہ سے ان پر گرفت فرماتا تو ان کو فوراً ہلاک کر دیتا اور پھر ان کی نسل وجود میں نہ آتی اور یہ بات بدیہی ہے کہ لوگوں کے آباء و اجداد میں ایسے لوگ ضرور گزرے ہیں جو عذاب کے مستحق تھے اور جب وہ لوگ ہلاک کر دیئے جاتے تو ان کی نسل آگے نہ چلتی اور اس سے لازم یہ آتا کہ دنیا میں کوئی آدمی بھی نہ ہوتا اور جب دنیا میں انسان نہ ہوتے تو پھر جانور بھی نہ ہوتے، کیونکہ جانوروں کو انسانوں کے فائدے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

جب لوگ کفر اور معصیت کرتے تو اللہ تعالیٰ سب انسانوں اور جانوروں کو ہلاک کر دیتا اور ظالموں کے حق میں یہ ہلاکت عذاب ہوتی اور غیر ظالموں کے حق میں یہ ہلاکت امتحان ہوتی اور ان کو اس پر آخرت میں اجر ملتا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو عذاب دیتا ہے تو جو لوگ بھی اس قوم میں ہوں ان سب کو عذاب پہنچتا ہے، پھر ان سب کا ان سب کے اعمال کے حساب سے حشر کیا جائے گا۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

آیت نمبر ۶۲: اللہ تعالیٰ کے ساتھ ناانصافی کا معاملہ کرنے والے کفار و مشرکین کی مذمت کی گئی ہے۔ یَکْرَهُوْنَ۔۔۔ ناپسند کرنے سے مراد یہ ہے کہ:

۱۔ اپنے لئے بیٹے اور اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹیاں قرار دینا (معاذ اللہ)۔

۲۔ خود کی ملکیت میں کسی کو شریک کرنا پسند نہیں مگر اللہ تعالیٰ کی کائنات میں اس کے شریک ٹھہرانا وغیرہ۔

ان برائیوں کے باوجود مشرکین اللہ تعالیٰ سے بھلائی کی توقع کرتے ہیں۔ انہیں جہنم میں سب سے پہلے ڈالے جانے کی وعید سنائی گئی ہے۔

علمی بات: مشرکین خود تو گوارا نہیں کرتے کہ کوئی ان کے مال و جائداد میں ان کا شریک بن جائے اور اللہ تعالیٰ کے لئے غیروں کو شریک بناتے ہیں، اسی طرح جن (لڑکیوں) کی نسبت اپنی طرف کرنا اپنے لئے معیوب سمجھتے ہیں، ان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پر اس افترا پردازی کے باوجود کہتے ہیں کہ اگر بالفرض قیامت آئے گی تو ہمارا انجام اچھا ہی ہوگا، جیسا کہ منکرین قیامت کا قول نقل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "اور اگر ہم اسے اپنی جانب سے رحمت سے لطف اندوز کریں۔ اُس تکلیف کے بعد جو اُسے پہنچی تھی تو وہ ضرور کہنے لگتا ہے کہ یہ تو میرا حق تھا اور میں یہ خیال نہیں کرتا کہ قیامت قائم ہوگی اور اگر میں اپنے رب کے پاس لوٹایا بھی گیا (تو) یقیناً میرے لئے اس کے ہاں بھلائی ہی ہوگی تو ہم کافروں کو ضرور بتائیں گے جو وہ کیا کرتے تھے اور انہیں سخت عذاب کا مزہ ضرور چکھائیں۔" (سورۃ حٰمٓ السجدہ ۴۱، آیت: ۵۰) ان میں سے کوئی بھی خود بیٹی کا باپ بننا پسند نہیں کرتا مگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیٹیاں منسوب کرتے ہوئے یہ لوگ ایسا کچھ نہیں سوچتے۔

علمی بات: یہ لوگ اس زعم میں ہیں کہ دنیا میں انہیں عزت دولت اور سرداری ملی ہوئی ہے تو یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ ان سے خوش ہے اور انہیں یہ خوش فہمی بھی ہے کہ اگر اس نے یہاں انہیں یہ سب کچھ دیا ہے تو آخرت میں بھی وہ ضرور انہیں اپنی نعمتوں سے نوازے گا۔ چنانچہ دنیا ہو یا آخرت ان کے لئے تو بھلائی ہی بھلائی ہے۔

دنیا میں ان کی رسی دراز کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں جس حد تک جرّی ہو کر آگے بڑھ سکتے ہیں بڑھتے چلے جائیں اور آخرت میں جہنم کے شدید عذاب میں یہ لوگ مبتلا ہوں گے۔ پھر ان کے چھٹکارے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

آیت نمبر ۶۳: سابقہ امتوں میں بھی رسول بھیجے گئے۔ شیطان نے لوگوں کے برے اعمال کو خوبصورت بنا کر پیش کیا جس کے نتیجہ میں لوگوں نے رسولوں کی تکذیب کی۔ مشرکین مکہ کو بھی تنبیہ کی گئی ہے اور اس تنبیہ میں ہمارے لئے بھی لمحۂ فکریہ ہے۔ آخرت میں شیطان کے پیروکاروں کو دردناک عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔

علمی بات: اس آیت میں آپ ﷺ کو تسلی دی گئی کہ آپ ﷺ اپنی قوم کی تکذیب سے غم زدہ نہ ہوں۔ مشرکوں نے پیغمبروں کی تکذیب اس لئے کی تھی کہ شیطان نے انہیں اس بات پر اکسایا اور ان کے اس کرتوت کو اس نے مزین کر کے دکھلایا۔ تو وہ آج اپنے آپ کو ان کا دوست ظاہر کرلے اور انہیں خوب گمراہ کرلے اور مشرکین بھی اس کی پیروی کرلیں، لیکن قیامت کے دن کا دردناک عذاب ان مشرکوں کا انتظار کر رہا ہے، جس سے وہ بچ نہ سکیں گے۔

آیت نمبر ۶۴: رسول اللہ ﷺ کی ایک اہم ذمہ داری لوگوں کے سامنے قرآنِ حکیم کی وضاحت کرنا تھا۔ قرآنِ حکیم کی ہدایت اور رحمت سے وہی مستفید ہوگا جو قرآنِ حکیم پر ایمان لائے جیسے اس پر ایمان لانے کا حق ہے۔

علمی بات: قرآنِ حکیم صرف اس لئے نازل فرمایا گیا ہے کہ جن سچے اصولوں میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں اور جھگڑے ڈال رہے ہیں (مثلاً توحید، رسالت، آخرت اور احکام حلال و حرام وغیرہ) ان سب کو وضاحت و تحقیق کے ساتھ بیان کر دے، کوئی اشکال باقی نہ رہے۔ گویا نبی کریم ﷺ بذریعہ قرآنِ حکیم تمام نزاعات کا دوٹوک فیصلہ سنا دیں اور بندوں پر اللہ ﷻ کی حجت تمام کر دیں۔ آگے ماننا نہ ماننا خود مخاطبین کا کام ہے جسے توفیق ہوگی قبول کرے گا۔ آپ ﷺ کو غمگین و پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یعنی فیصلہ اور بیان تو سب کے لئے ہے لیکن اس کی ہدایت سے فائدہ اُٹھانا اور رحمت الٰہی کی آغوش میں آنا انہی کا حصہ ہے جو اس فیصلہ کو صدقِ دل سے تسلیم کرتے ہیں اور اس پر خوشی و رغبت کے ساتھ ایمان لاتے ہیں۔

آیت نمبر ۶۵: اللہ ﷻ کی قدرت کی مثالوں میں سے پانی کا تذکرہ ہے۔ اللہ ﷻ آسمان سے پانی نازل فرما کر مردہ زمین کو زندگی عطا فرماتا ہے۔ یہ نشانیاں ان لوگوں کے لئے ہیں جو بات سن کر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہدایت کے طلب گار ہوتے ہیں۔

علمی بات: جس طرح اللہ ﷻ وحی و رسالت کے ذریعہ سے کفر و شرک کی بیماری کو دور کرنے اور مردہ دلوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے، اسی طرح وہ اپنی عظیم قدرت کے ذریعہ سے آسمان سے بارش نازل کرتا ہے اور مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے جس کی وجہ سے مختلف قسم کے نباتات اُگتے ہیں۔ یقیناً یہ باتیں دلیل ہیں کہ اللہ ﷻ ایک ہے اور مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے، لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ اٹل حقیقت ہے کہ ان دلائل سے انہی لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے جو آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور قرآنِ حکیم کی آیات میں غور و فکر کرتے ہیں اور ان میں موجود عبرتوں اور نصیحتوں سے مستفید ہوتے ہیں۔

آیت نمبر ۶۶: دودھ کے بننے کے عمل میں اللہ ﷻ کی قدرتوں کا بیان ہے۔ چوپائے سے مراد اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری ہیں۔ عبرت سے مراد مشاہدہ میں آنے والی چیزوں کو دیکھ کر مشاہدہ میں نہ آنے والی چیزوں پر یقین کرنا اور سبق حاصل کرنا۔ اللہ ﷻ چوپایوں کے پیٹ میں گوبر اور خون کے درمیان میں سے دودھ پیدا فرماتا ہے۔ انسان دودھ کی لذت اور غذائیت سے مستفید ہوتا ہے۔ اس میں بھی اس کے لئے عبرت کا سامان ہے۔

علمی و عملی بات: اللہ ﷻ اپنی ایک اور نعمت جلیلہ یاد دلا کر اس میں غور کرنے کا ارشاد فرماتا ہے۔ ایک بھینس جو خوراک کھاتی ہے وہ سب اس کے حلق سے اتر کر اس کے معدہ میں چلی جاتی ہے۔ معدہ ایک ہے اور وہ عوامل بھی یکساں ہیں جو خوراک ہضم کو مختلف مرحلوں سے گزارتے ہیں لیکن اس کا کچھ حصہ گوبر بن جاتا ہے اور کچھ حصہ خون بن کر جسم کے تمام اعضاء میں پہنچ جاتا ہے اور اس تقسیم میں بھی یہ حکمت ملحوظ ہے کہ ہر عضو کو خون کی اتنی مقدار ہی بہم پہنچائی جاتی ہے جتنی اس کو ضرورت ہوتی ہے لیکن خون اور گوبر کے علاوہ وہاں ایک اور چیز بھی اس خوراک سے بنتی ہے۔ رنگ، بو اور ذائقہ میں وہ ان دونوں چیزوں سے مختلف ہوتی ہے۔ وہ ہے سفید دودھ اب کوشش سے سونگھو کیا اس میں گوبر کی بو کا شائبہ بھی ہے؟ غور سے دیکھو کیا اس میں خون کی ہلکی سی سرخی بھی دکھائی دیتی ہے؟ وہ کون ہے؟ جو اس طرح کی چیزوں میں سے ایسی پاک اور صاف چیز کشید کرتا ہے اور وہ اتنی لذیذ اور خوش ذائقہ ہے کہ خود بخود حلق سے نیچے اترتی چلی جاتی ہے۔ ہر چیز اپنے خالق کی حمد و ثنا میں مصروف ہے لیکن انسان ہی اتنا ناشکرا ہے کہ اپنے کریم پروردگار کو نہیں پہچانتا اور سرکشی پر ہر وقت آمادہ رہتا ہے۔

علمی بات: یہ اللہ ﷻ کی قدرت کی بڑی نشانی ہے، آیت میں جس ترتیب سے دودھ بننے کا ذکر ہے آج وہ سائنسی تحقیق سے بھی سامنے آچکی ہے۔ جانور چارہ کھاتا ہے وہ گوبر بنتا ہے پھر آنتوں میں سے جب وہ گزرتا ہے تو غذائی مواد ان آنتوں کی موٹی کھال میں منتقل ہوتا ہے اور وہاں سے خون کے ذریعہ پورے جسم میں پہنچتا ہے پھر تھنوں کے خلیوں میں وہ آہستہ آہستہ دودھ کی شکل میں منتقل ہوتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جانور جو غذا کھاتے ہیں اس سے ایک طرف تو خون بنتا ہے اور دوسری طرف گوبر بنتا ہے۔ مگر ان ہی جانوروں کے مادہ میں جہاں خون اور گوبر بننے کے مراحل طے پاتے ہیں، وہیں اسی غذا سے ایک تیسری چیز بھی پیدا ہوتی ہے جو خاصیت، رنگ، بو اور مقاصد میں ان دونوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ پھر خصوصاً مویشیوں میں اس چیز کی پیداوار اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی ضرورت کو پورا کرنے کے علاوہ انسانوں کے لئے بھی اس چیز کو کثیر مقدار میں فراہم کرتے رہتے ہیں۔ ذہن نشین رہے کہ خون کے بعض اجزاء سے دودھ پیدا ہوتا ہے اور خون ان صاف شفاف اجزاء سے پیدا ہوتا ہے جو پہلے گوبر میں تھے پھر وہ پاک صاف اجزاء دوسری بار خون میں آئے۔ پھر اللہ ﷻ نے ان آلودہ اور ناپاک سے خون کو پاک صاف کر لیا اور اس میں وہ صفات پیدا کر دیں کہ وہ ایسا

دودھ بن گیا جو بچہ کے بدن کے موافق تھا۔ اس دودھ کی خلقت ایسی عجیب و غریب حکمتوں اور ایسے باریک رازوں پر مشتمل ہے، جس سے عقل سلیم یہ شہادت دیتی ہے کہ دودھ کی خلقت کیسی عظیم مدبر اور زبردست قادر ہستی کی تدبیر ہے اور اس کے حکم کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی۔

علمی بات: یہ ایسا مشروب ہے کہ جس سے اچھا اور بہتر مشروب اس دنیا میں اور کوئی نہیں مل سکتا۔ دودھ کے اجزائے ترکیبی اور اس کے بننے کے بارے میں بہت سی باتیں ہیں جن میں سے ایک اہم ترین سائنسی بات یہاں بیان کی گئی ہے اور یہ بھی آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل کہ دودھ کہاں ہے اور کیسے پیدا ہوتا ہے؟ ڈیڑھ ہزار سال پہلے اس بات کی طرف اشارہ قرآنِ حکیم کا معجزہ اور حقانیت کا ثبوت ہے۔

عملی پہلو: یہ واقعات اس لئے ہیں کہ وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی یاد دلائیں۔ آدمی اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی جھلکیاں دیکھنے لگے، حتیٰ کہ اس کا یہ احساس اتنا بڑھے کہ وہ پکار اٹھے کہ یاربَّ العالمین! تو جو گوبر اور خون کے درمیان سے دودھ جیسی چیز نکالتا ہے، میرے ناموافق حالات کے اندر سے موافق نتائج ظاہر کردے۔ تو جو مٹی اور پانی کو پھل میں تبدیل کردیتا ہے، میری بے قیمت زندگی کو قیمتی بنادے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھائے تو یوں دعا کرے۔ اَللّٰھُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهِ وَاَطْعِمْنَا خَيْرًا مِّنْهُ۔ (اے اللہ تعالیٰ! ہمیں اس میں برکت دے اور ہمیں اس سے بہتر کھلا) اور جب دودھ پیئے تو یوں کہے۔ اَللّٰھُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهِ وَزِدْنَا مِنْهُ۔ (اے اللہ! ہمیں اس میں برکت دے اور اس میں سے اور زیادہ دے) عام کھانے کی دعا میں اَطْعِمْنَا خَيْرًا مِّنْهُ فرمایا اور دودھ پینے میں وَزِدْنَا مِنْهُ فرمایا۔ اس کا سبب آنحضرت ﷺ نے خود ہی فرمادیا: "دودھ کے علاوہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو کھانے اور پینے دونوں کا کام دیتی ہو۔" (سنن ابی داؤد)

آیت نمبر ۶۷: کھجور اور انگور کا ذکر ہے یہی پھل عرب میں زیادہ تر پائے جاتے تھے۔ کھجور اور انگور سے نشہ آور مشروبات بھی بنتے ہیں اور کھانے کی عمدہ چیزیں بھی۔ "سکر" کا ذکر الگ اور رزقاً حسناً کا ذکر الگ کیا گیا ہے۔ اشارہ ہے کہ شراب عمدہ رزق نہیں۔ اس کی ناپسندیدگی کی طرف اشارہ ہے۔ شراب کے قریب نہ جانے والوں کی عقل قائم رہتی ہے اور وہی اللہ تعالیٰ کی اس نشانی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم قدرت کے ذریعے سے کھجور اور انگور کے پھل پیدا کیئے ہیں، جن کے رس سے شراب (جیسی خراب چیز بھی بناتے ہو) اور کھانے کی دیگر عمدہ چیزیں بھی بناتے ہو، مثلاً پھل، کھجور کا رس، کشمش اور سرکہ وغیرہ، یقیناً ان باتوں میں عقل والوں کے لئے بڑی نشانی ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرت، اس کے علم اور اس کے رحم و کرم پر دلالت کرتی اور انسان کو دعوت دیتی ہے کہ وہ صرف اسی کی عبادت کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حرمت کا حکم نازل ہونے سے پہلے شراب جائز تھی، یہ بھی معلوم ہوا کہ اس وقت کھجور اور انگور کی شراب میں کوئی فرق نہ تھا۔

علمی و عملی بات: چونکہ اہل عرب صدیوں سے شراب کے عادی تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی حرمت تدریجاً بیان فرمائی۔ شراب کی تدریجی ممانعت اور حرمت کی قرآنی تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں شراب اور دیگر نشہ آور اشیاء کے متعلق پہلے سورۃ النحل ۱۶، آیت: ۶۷ میں ارشاد ہوا "اور کھجور اور انگور کے کچھ پھل جن سے تم نشہ آور چیزیں بناتے ہو اور اچھا رزق بھی۔" اس آیت میں ایک لطیف اشارہ دیا کہ نشہ لانے والی شراب اچھی چیز نہیں ہے۔ پھر سورۃ البقرۃ ۲، آیت: ۲۱۹ میں قدرے وضاحت سے فرمایا کہ: "وہ آپ (ﷺ) سے سوال کرتے ہیں شراب اور جوئے کے بارے میں آپ (ﷺ) فرمادیجئے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدہ سے کہیں زیادہ ہے۔" اس میں گویا بتایا گیا کہ شراب پینے کے نتیجہ میں انسان سے بہت سی ایسی حرکتیں سرزد ہوجاتی ہیں جو گناہ ہیں اور اگرچہ اس میں کچھ فائدے بھی ہیں، مگر گناہ زیادہ ہیں، اس میں شراب سے پیدا ہوجانے والے گناہوں اور مفاسد کا ذکر کرکے مشورہ دیا گیا ہے کہ یہ چھوڑنے کی چیز ہے۔ پھر سورۃ النساء ۴، آیت: ۴۳ میں یہ حکم آیا کہ "نشے کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔" اس آیت میں خاص اوقاتِ نماز کے اندر شراب کو حرام کردیا گیا باقی اوقات میں اجازت رہی۔ بالآخر سورۃ المائدہ ۵، آیات: ۹۰، ۹۱ میں ارشاد ہوا: "اے ایمان والو! بے شک شراب اور جوا اور بت اور جوئے کے تیر (سب) ناپاک شیطانی کام ہیں لہٰذا ان سے بچو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ بے شک شیطان یہی چاہتا ہے کہ تمہارے

درمیان شراب اور جُوئے کے ذریعہ عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روک دے تو کیا تم (ان ناپاک چیزوں سے) باز آنے والے ہو؟۔" اس آیت میں شراب کو ناپاک اور شیطانی عمل قرار دے کر اس سے مکمل پرہیز کرنے کا صاف صاف حکم دے دیا گیا۔ ان میں صاف اور قطعی طور پر شراب کو حرام قرار دے دیا۔

علمی بات: شراب کی حرمت کے حوالہ سے چند فرامین نبوی ﷺ یہ ہیں:

ا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور نشہ آور چیز حرام ہے۔" (صحیح مسلم، جامع ترمذی)

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "شراب دس طرح سے ملعون ہے، یہ لعنت خود اس پر ہے، اس کے نچوڑنے والے پر، نچڑوانے والے پر، اس کے بیچنے والے پر، اس کے خریدنے والے پر، اس کو اٹھا کر لے جانے والے پر، اس شخص پر جس کے پاس اٹھا کر لے جائی جائے، اس کی قیمت کھانے والے پر، اس کے پینے والے پر اور اس کے پلانے والے پر۔" (سنن ابن ماجہ)

۳۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے اور جس شخص نے دنیا میں شراب پی اور اس حالت میں مر گیا کہ وہ شراب کا عادی ہو گیا تھا اور اس نے توبہ نہیں کی تھی تو وہ آخرت میں اسے نہیں پیئے گا۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۶۸: "نحل" شہد کی مکھی کو کہتے ہیں اور اس سورت کا نام اسی نسبت سے ہے۔ مکھی کی طرف وحی سے مراد وہ فطری اشارہ، تعلیم یا سمجھ بوجھ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کی "جبلت" میں ڈالی ہے۔ شہد کی مکھی کی فطرت میں یہ بات ڈال دی گئی کہ وہ پہاڑوں، درختوں اور اونچی بیلوں میں اپنا چھتہ تعمیر کریں۔

علمی بات: کائنات کی بڑی بڑی چیزیں اپنے جمال و جلال اور اپنی نفع رسانی کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہتی ہیں لیکن عام طور پر چھوٹی چیزوں کو حقیر سمجھ کر لائق التفات خیال نہیں کیا جاتا اور پھر مکھی جیسی چھوٹی سی چیز کے لئے کس کو فرصت ہے کہ اس میں سوچ بچار کرنے بیٹھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میری حکمت وقدرت کے جلوے صرف پہاڑوں، سمندروں، مویشیوں اور بلند وبالا درختوں میں ہی نظر نہیں آتے بلکہ ایک چھوٹی سی شہد کی مکھی بھی میری حکمتوں کی تجلی گاہ ہے۔ اس کے مختلف حصوں پر نظر ڈالو۔ کہیں تو نوزائیدہ بچوں کی قیام گاہ ہے، کہیں شہد کا ذخیرہ کیا جا رہا ہے کہیں موم تیار ہو رہا ہے تو کہیں خوراک کا گودام ہے۔ پھر اس حیران کن نظم ونسق کو دیکھو! جس کے ماتحت یہ کثیر التعداد مکھیاں یہاں آباد ہیں کسی متمدن ملک کی بہترین تربیت یافتہ فوج بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ان میں ایک مکھی سب کی سردار ہے۔ دوسری مکھیاں اس کی فرماں بردار ہیں اور اس کے حکم بجالانے میں ذرا برابر کوتاہی نہیں کرتیں۔ بعض خوراک لانے کے لئے متعین ہیں، بعض پہرہ دار ہیں۔ کیا مجال کہ کوئی اجنبی اندر قدم بھی رکھ سکے، جو خوراک لانے پر مقرر ہیں۔ وہ اپنے چھتہ سے دور دراز مقامات پر اُڑ کر جاتی ہیں، وہاں سے مختلف پھولوں، کلیوں، کونپلوں اور پتوں کا رس دن بھر چوستی رہتی ہیں اور پھر طویل مسافت طے کر کے اپنے چھتہ میں واپس آجاتی ہیں نہ وہ راستہ بھولتی ہیں نہ لیٹ ہوتی ہیں اور نہ اپنے فرض کو انجام دینے میں کسی کاہلی کی روادار ہیں۔ پھر جس حکمت وخوبی سے پھلوں کے چوسے ہوئے اس رس سے شہد بنانے کا عمل تکمیل پاتا ہے۔ وہ تو اتنا حیرت انگیز ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ انسان اتنے علمی کمال اور صنعتی ترقی کے باوجود کوئی ایسی مشینری تیار نہیں کر سکا جس کے ذریعہ وہ پھلوں وغیرہ کے رس سے شہد جیسا جوہر کشید کر سکے۔

علمی بات: عجائب مخلوقات میں سے شہد کی مکھی بھی ہے جو پتے پتے پر بیٹھتی ہے اور پھول پھول سے رس حاصل کرتی ہے اور بڑی محنت سے شہد مہیا کرتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے شہد اکٹھا کرنے کا عجب سلیقہ عطا کیا ہے۔ اگر بندہ اس کی فراست اور کوشش کو دیکھے تو حیران رہ جائے کہ کس طریقہ سے وہ درخت سے استفادہ کرتی ہے اس کا چھتہ اور اس کے مسدس (چھ) خانے حیرت انگیز صنعت کاری ہے۔

قرآنِ حکیم نے شہد کی مکھی کے عجائبات کی جانب توجہ دلائی ہے کہ اس میں غور وفکر کا وافر سامان موجود ہے۔ مزید برآں اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔ یہ بہترین غذا اور بہترین دوا ہے۔

COPYRIGHTS © RESERVED WITH THE ILMI EDUCATION... SALE OF THIS BOOK... ENTAIL CIVIL & CRIMINAL...

علمی بات: "اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ" سے مراد مفسرین کرام یہ بیان فرماتے ہیں کہ اس وحی سے مراد رسالت اور نبوت والی وحی نہیں ہے کیونکہ وہ تو انبیاء کرام اور رسولوں علیہم السلام کے ساتھ مختص ہے۔ البتہ اس وحی سے الہام مراد لیا جا سکتا ہے کیونکہ الہام عام ہے جو انبیاء کرام علیہم السلام اور غیر انبیاء سب کو ہو سکتا ہے، اس الہام کی نوعیت بالکل وہی ہے جس قسم کا الہام اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف کیا تھا، وہاں بھی یہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے چھوٹے جانوروں کو بھی عقل عنایت فرمائی ہے، آج جدید تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کا یہ نظریہ بالکل درست ہے کہ عقل و فراست کی نعمت سے صرف انسان ہی بہرہ ور نہیں، بلکہ دوسری مخلوقات حیوانات وغیرہ بھی بہرہ ور ہیں۔ البتہ دونوں کی عقل میں فرق ہے۔

آیت نمبر ۶۹: شہد کی مکھی کو یہ بات سمجھا دی گئی کہ وہ ہر قسم کے پھلوں اور پھولوں سے اپنی خوراک حاصل کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے راستے ہموار فرما دیئے ہیں جس راستہ سے گزر کر جاتی ہے با آسانی اپنے چھتے تک پہنچ جاتی ہے۔ شہد کی مکھی کے پیٹ سے مختلف رنگوں کا مشروب نکلتا ہے۔ شہد کی مکھیوں کے ذریعہ حاصل ہونے والا شہد بیماریوں کے لئے شفا ہے۔ شہد کی مکھی کے چھتوں، شہد بنانے کے عمل اور شہد کی مکھیوں کے نظام میں سبق آموزی ہے۔ ان نشانیوں پر غور و فکر کرنے والے اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کو سمجھ کر اس کی وحدانیت پر ایمان لے آتے ہیں۔

علمی بات: "ذُلُلًا" سے مراد شہد بنانے کے طریقے ہیں، یا اس سے مراد "سدھائے ہوئے، آسان اور ہموار راستے" ہی ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کے اندر یہ بات ودیعت کر دی ہے کہ پھلوں کا رس چوسنے کے لئے چاہے وہ کتنی ہی دور چلی جائے، لیکن پھر با آسانی اپنے گھر کو لوٹ آتی ہے اور راستہ نہیں بھولتی۔ ان مکھیوں کے پیٹ سے پینے کی ایک چیز نکلتی ہے، جسے شہد کہا جاتا ہے اور غذا کے رنگ اور اس کے مزاج کے اختلاف سے اس کی بعض قسم سفید، بعض زرد اور بعض سرخی مائل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بہت سے امراض کے لئے شافی بنایا ہے۔ شہد کے بہت سی بیماریوں میں شفا بخش ہونے کے بارے میں متعدد احادیثِ مبارکہ میں بھی ذکر ہے۔

فرامین نبوی ﷺ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "دو شفاؤں کو اختیار کرو شہد اور قرآن (اوّل میں شفائے جسمانی ہے اور دوسرے میں شفائے اخلاقی و روحانی)۔" (سنن ابن ماجہ، الحاکم)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا: میرے بھائی کو اسہال کی شکایت ہے۔ آپ ﷺ فرمایا: شہد پلاؤ۔ حسب حکم اس شخص نے شہد پلایا (کچھ فائدہ نہ ہوا) وہ پھر خدمت گرامی میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میں نے اپنے بھائی کو شہد پلایا تھا مگر شہد سے اسہال میں اور اضافہ ہوگیا۔ اس کے دو تین مرتبہ آپ ﷺ کے سامنے تردد ظاہر کرنے پر آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے تم اسے شہد پلاتے رہو۔" اس نے مزید شہد پلایا اور وہ تندرست ہوگیا۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

علمی بات: کارل وان فریش (Karl von Frisch) وہ شخص تھا کہ جس کو ۱۹۷۳ء میں شہد کی مکھیوں کے متعلق تحقیق کرنے پر نوبل پرائز دیا گیا تھا۔ شہد کی مکھی کو جب کوئی نیا باغ یا پھول ملتا ہے تو واپس جا کر اپنی دوسری مکھیوں کو بھی اس کے متعلق صحیح سمت اور نقشہ سے آگاہ کرتی ہے، جس کو مکھی کا ناچ یا "Bee Dance" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ مکھی کی یہ نقل و حرکت اور اپنی دوسری کارکن مکھیوں کو اطلاعات کی فراہمی کا ثبوت سائنسی طور پر تصویروں اور دوسرے طریقوں کو استعمال کرتے ہوئے دریافت کر لیا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں شہد کی مکھی کی جنس مونث بیان کی گئی ہے۔ جو شہد کو اکٹھا کرنے کے لئے گھر سے نکلتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں سپاہی یا کارکن مکھی ایک مادہ مکھی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے: "اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ تو پہاڑوں میں گھر بنا اور درختوں میں اور اُن (بیل دار چھپروں) میں جنہیں لوگ (سہاروں سے) اوپر چڑھاتے ہیں۔ پھر ہر قسم کے پھلوں سے خوراک حاصل کر پھر ان راستوں پر چل جو تیرے رب نے آسان بنا دیئے اُن (شہد کی مکھیوں) کے پیٹوں سے مشروب نکلتا ہے۔ جس کے رنگ مختلف ہیں اُس میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔ یقیناً اس میں نشانی ہے اُن لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔" (سورۃ النحل ۱۶، آیات: ۶۸، ۶۹)

اس آیت میں اللہ ﷻ نے لفظ "كُلِي" ارشاد فرمایا ہے جس کے معنیٰ ہیں "تو کھا" اور یہ لفظ فعل امر واحد مؤنث حاضر کا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآنِ حکیم شہد کو اکٹھا کرنے والی مکھیوں کی جنس مؤنث بیان کرتا ہے اور اس بات کا علم جدید تحقیقات کے بعد ہی انسان کو ہو سکا ہے۔ جو قرآنِ حکیم کے اللہ ﷻ کی جانب سے ہونے کی ایک اور واضح دلیل ہے۔

نحل شہد کی مکھی کو کہتے ہیں جو عام مکھی یعنی ذباب سے بڑی ہوتی ہے اور اس سورۃ کا نام "النحل" اسی نسبت سے ہے کہ اس سورت میں نحل کا ذکر آیا ہے۔ اس مکھی کی طرف وحی کرنے سے مراد فطری اشارہ یا تعلیم ہے جو اللہ ﷻ نے ہر جاندار کی جبلت میں ودیعت کر رکھی ہے جیسے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی ماں کے سینہ کی طرف لپکتا ہے تاکہ وہاں سے اپنے لئے غذا حاصل کر سکے حالانکہ اس وقت اسے کسی بات کی سمجھ نہیں ہوتی۔ یہ اسی فطری وحی کا اثر ہے کہ شہد کی مکھی اپنے لئے ایسا چھتا یا اپنا گھر بناتی ہے جسے دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی ماہر انجنیئر نے اس کا ڈیزائن بنایا ہے۔

نوٹ: شہد کی مکھی اور شہد کے حوالہ سے مزید تحقیق اور مطالعہ کے لئے یہ لنک ملاحظہ فرمائیں۔ https://cutt.ly/YyXLHWd

آیت نمبر ۷۰: انسان کو پیدا فرما کر اسے زندگی کے مختلف مراحل سے گزارنے کے بعد موت سے ہمکنار کیا جاتا ہے۔ بعض کو موت سے پہلے ناکارہ عمر تک پہنچایا جاتا ہے۔ "اَرْذَلِ الْعُمُرِ" سے مراد ایسی عمر جس میں ہوش و حواس باقی نہ رہے۔ علم ہونے کے باوجود انسان تمام معلومات بھول جاتا ہے۔ انسان کے اندر یہ تبدیلیاں اس بات کی دلیل ہیں کہ حقیقی علم و قدرت در اصل اللہ ﷻ ہی کے پاس ہے۔

علمی بات: زندگی کا مظہر جو زمین پر ہے اس کے کئی پہلو انسان کے سامنے آتے ہیں۔ ایک شخص نہیں تھا اس کے بعد وہ دنیا میں موجود ہو گیا، پھر ہر ایک مرتا ہے مگر سب کا ایک وقت نہیں۔ کوئی بچپن میں مرتا ہے، کوئی جوانی میں اور کوئی بڑھاپے میں۔ پھر یہ منظر بھی عجیب ہے کہ عمر کی آخری حد پر پہنچ کر عقل اور علم اور طاقت آدمی سے بالکل رخصت ہو جاتے ہیں۔ انسان موجودہ زمین پر بظاہر آزاد ہے مگر اس کو اپنی کسی چیز پر کلی اختیار نہیں۔

یہ سب اس لئے ہوتا ہے تاکہ انسان کو بتایا جائے کہ اصل اور کل علم اور قدرت دونوں صرف اللہ ﷻ کے پاس ہے۔ انسانی زندگی میں مذکورہ قسم کے جو واقعات پیش آتے ہیں ان میں انسان کا اپنا کوئی دخل نہیں۔ وہ ان میں کوئی تبدیلی کرنے پر قادر نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی اور کے کرنے والے کے ذریعہ ہو رہا ہے۔ بچپن سے موت تک انسان کی زندگی یہ گواہی دیتی ہے کہ یہاں سارا علم بھی صرف اللہ ﷻ کے لئے ہے اور ساری قدرت بھی صرف اُسی کے لئے ہے۔ انسان کی مجبوری قادر مطلق معبود کی موجودگی کا ثبوت ہے۔

اس آیت میں اللہ ﷻ نے انسان کی تخلیق سے متعلق عجائب کو بیان کیا ہے کہ وہ ابتدائے آفرینش سے آخری عمر تک کئی مراحل سے گزرتا ہے۔ پہلا مرحلہ نشو و نما کا ہوتا ہے، دوسرا جوانی کا، تیسرا ادھیڑ عمر کا جس میں آدمی اپنی عمر اور صحت کے اعتبار سے زوال پذیر ہونے لگتا ہے اور چوتھا بڑھاپے کا، جب کمزوری اور ناتوانی اس کا لازمہ بن جاتی ہے اور جوں جوں اس کی عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے اس کی تمام جسمانی صلاحتیں کمزور ہوتی جاتی ہیں اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ بالکل بچے کی مانند ہو جاتا ہے، اس کی عقل بھی کمزور ہوتی جاتی ہے اور دماغی صلاحیتیں اپنا کام کرنا چھوڑ دیتی ہیں۔

حضرت مصعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ پانچ باتوں کی دعا کا حکم دیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ ان چیزوں سے پناہ مانگنے کا حکم دیا کرتے تھے: (اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْبُخْلِ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اُرَدَّ اِلٰی اَرْذَلِ الْعُمُرِ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدُّنْيَا يَعْنِیْ فِتْنَةَ الدَّجَّالِ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ) "اے اللہ! میں بخل سے تیری پناہ میں آتا ہوں اور (اے اللہ!) میں بزدلی سے تیری پناہ میں آتا ہوں اور (اے اللہ!) میں ناکارہ عمر کی طرف لوٹائے جانے سے تیری پناہ میں آتا ہوں اور (اے اللہ!) میں دنیا کے فتنہ یعنی دجال کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں اور (اے اللہ!) میں قبر کے عذاب سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔"

آیت نمبر ۷۱: اللہ ﷻ نے رزق کے معاملہ میں انسانوں کو ایک دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ رزق سے مراد صرف مادی وسائل ہی نہیں بلکہ اس میں علم، ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں بھی شامل ہیں۔ کوئی مال دار شخص اپنے غلاموں اور خدمات گاروں کو اپنے برابر کرنا پسند نہیں کرتا۔ لیکن مشرکین اللہ ﷻ کی مخلوق کو اللہ ﷻ

کے برابر اور عبادات میں اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ اس طرح وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے انعامات کی ناقدری اور ناشکری کرتے ہیں۔

علمی بات: اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ مثال مشرکوں کے لئے بیان فرمائی ہے یعنی جب تم اپنے غلاموں کو اپنے برابر نہیں قرار دیتے تو تم میرے بندوں یا میری مخلوق کو میرے برابر کیسے قرار دیتے ہو کہ ان کو بھی میری طرح عبادت کا مستحق قرار دیتے ہو اور جب تم اپنے غلاموں کو اپنے برابر قرار نہیں دیتے اور ان کو اپنے اموال میں شریک نہیں کرتے تو تم میرے بندوں کو میرے برابر کیوں قرار دیتے ہو اور ان کو میری عبادت میں کیوں شریک قرار دیتے ہو؟ جس طرح مشرکین نے بتوں کو فرشتوں اور بعض انبیاء کرام علیہم السلام کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت میں شریک کر لیا حالانکہ وہ سب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بندے اور اس کی مخلوق ہیں۔

آیت نمبر ۷۲: انسان پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے احسانات بیان کر کے شرک کی تردید کی گئی ہے۔ انسان کی بقا کے لئے مرد اور عورت کا جوڑا بنایا گیا ہے۔ پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیٹے اور پوتے بھی عطا فرمائے۔ نشو نما کے لئے پاک اور عمدہ غذا پیدا فرمائی۔ ان احسانات کے باوجود لوگ باطل پر یقین رکھتے ہوئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں۔

علمی بات: محض اسی پر اکتفا نہیں فرمایا کہ بیویاں عنایت فرما دیں اور بیٹے پوتے دے دیئے ان انعامات کے ساتھ کھانے کے لئے پاکیزہ چیزیں عطا فرما دیں۔ پس انعام تو فرمایا اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جو معبود حقیقی ہے اور اس کے ساتھ دوسروں کو شریک بنا کر اس کی نعمت کی ناشکری کرنے لگے یہ بڑی بھونڈی اور بے عقلی کی بات ہے۔

علمی بات: اسلام عین دین فطرت ہے۔ اس نے انسان پر دنیاوی اعتبار سے اس کے لئے کیسی بیش بہا نعمتیں عطا فرمائی ہیں اور اس کی نفسیاتی و ذہنی آسودگی کا کس درجہ خیال رکھا ہے اس کی سب سے اعلیٰ مثال خاندانی نظام ہے۔ ایک خاندانی نظام کی اکائی اور بنیاد میاں بیوی ہیں، ان کے آپس کے پیار و محبت اور خوشگوار تعلقات پر ہی آئندہ نسل کی بقا کا مدار ہے اور پھر اسی اِزدِواجی نظام کو اولاد اور اولاد کی اولاد یعنی پوتے پوتیوں کے حصول کا ذریعہ بنایا، نیز یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اسلام کا عطا کردہ یہ خاندانی نظام مضبوط اور ٹھوس بنیادوں پر استوار ہے۔ جسے دین اسلام کی اصطلاح میں نکاح کہا جاتا ہے، جس کی میعاد اصولی طور پر اسلام کی نظر میں فریقین میں سے کسی ایک کی موت تک ہے۔ یعنی نکاح میں ایک مرد جہاں ایک عورت سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کی بنا پر اس کی موت تک اس کے نان نفقہ و سکنہ (رہائش) یعنی اس کی تمام بنیادی ضرورتوں کو معروف طریقہ پر پورا کرنے کا وعدہ کرتا ہے وہاں یہ بندھن و تعلق اس کے ذہنی، جسمانی اور روحانی ہر طرح کے سکون و اطمینان اور راحت قلب کا باعث ہوتا ہے۔ اسی نعمت سے مالا مال مرد ہی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک بہترین معاشرہ کی تشکیل کا ذریعہ بن سکتا ہے اور ایک خاتون خانہ کو جہاں ایک طرف جان و مال، عزت و آبرو کا تحفظ اور فطری خواہشات کا جائز ذریعہ حاصل ہوتا ہے وہاں اولاد کی اچھی تربیت کی صورت میں ایک باصلاحیت، باکردار اور محبِ وطن نئی نسل کو پروان چڑھانے کا موقع بھی میسر آتا ہے۔

علمی بات: اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مزید مہربانیوں اور نعمتوں کا تذکرہ ہے۔ جس طرح اس نے تمہیں فضل و کرم سے نوازا، اسی طرح اس نے تمہیں وجود بخشا، لیکن تمہیں تنہائی کی نذر نہیں ہونے دیا بلکہ تمہاری جنس سے تمہیں بیویاں بھی بخشیں۔ بیوی انسان کی رفیقہ حیات ہے، تنہائیوں کی امین ہے، دکھ درد کی ساتھی ہے، شوہر کے لئے بہترین لباس ہے، لیکن یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے شوہر کی جنس سے پیدا فرمایا۔ اگر وہ کسی اور جنس سے ہوتی تو اس کے احساسات، میلانات، خواہشیں، مسرتیں، توانائیاں، خوشی اور غضب کے امکانات و جذبات سب شوہر سے مختلف ہوتے تو باہمی ہم آہنگی کی بجائے اختلافات کی آگ دونوں کو بھسم کر ڈالتی۔ اس لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دونوں کو ایک جنس سے پیدا فرما کر ہم آہنگی کے امکانات کو مکمل فرما دیا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ بھی فضل فرمایا کہ اولاد بھی عطا فرمائی۔ پھر بعض دفعہ زندگی میں بیٹوں کو اولاد دے کر پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں سے گھر کا آنگن سجا دیا۔ ان میں سے ایک ایک فرد خوشیوں کی علامت بن کے آتا ہے۔ ہر نیا آنے والا نئی خوشی کی نوید ہوتا ہے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ہے جب گھر کی ضروریات بھی میسر ہوں۔ اس لئے ارشاد فرمایا کہ پھر تمہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے پاکیزہ نعمتوں کا رزق بخشا۔ ان تمام نعمتوں کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھیں یا اپنے تصور میں لائیں پھر فیصلہ کریں کہ پروردگار کے سوا یہ نعمتیں دینے میں کسی اور کا

ہاتھ بھی ہے؟ یا اور کوئی اس قابل ہے کہ وہ ان نعمتوں میں سے کچھ بھی عطا کر سکے؟ یقیناً نہیں۔ تو جب ان میں سے کوئی بات ممکن نہیں اور عطا کرنے والی ذات ایک ہی ہے تو پھر کس قدر دکھ کی بات ہے کہ لوگ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ ﷻ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں۔

آیت نمبر ۷۳: کافر و مشرک شخص کی ذہنی پستی کا بیان ہے۔ تمام نشانیوں کو دیکھنے کے باوجود وہ اللہ ﷻ کے سوا دوسروں کی عبادت کرتا ہے۔ باطل معبودوں کی بے بسی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ وہ ان کو آسمانوں اور زمین میں سے کسی طرح کا رزق دینے کا نہ کوئی اختیار رکھتے ہیں اور نہ ہی استعداد۔

علمی بات: کفار اللہ ﷻ کو چھوڑ کر جن معبودوں کی پوجا کیا کرتے تھے ان کے متعلق بتایا جا رہا ہے کہ اس پوجا کی آخر کوئی وجہ بھی تو ہو۔ نہ تو ان معبودوں نے انہیں پیدا کیا ہے کیونکہ یہ تو ان کے اپنے گھڑے ہوئے ہیں اور نہ وہ ان کو رزق دینے پر قادر ہیں۔ کیونکہ زمین و آسمان میں کوئی چیز بھی تو ایسی نہیں جس کے وہ مالک ہوں۔ جب ان کا ہے ہی کچھ نہیں تو وہ بیچارے کسی کو دیں گے کیا۔

آیت نمبر ۷۴: مشرکین اللہ ﷻ کی ذات کو دنیا کے بادشاہوں پر قیاس کرتے اور مخلوق کی صفات کو اللہ ﷻ پر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں ایسے غلط تصورات قائم کرنے اور مثالیں دینے کی ممانعت کی گئی ہے۔ اللہ ﷻ کل علم رکھتا ہے۔ مخلوق کے علم کی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں۔

علمی بات: ضرب المثل کا معنی ہے ایک حال کو دوسرے حال سے تشبیہ دینا۔ یہاں منع کیا جا رہا ہے کہ اللہ ﷻ کو کسی کے ساتھ تشبیہ دی جائے۔ کیونکہ نہ اس کی کوئی مثل ہے نہ کوئی شبیہ۔ ساری مخلوقات اس کے بندے ہیں۔ اس لئے خالق کو مخلوق سے تشبیہ دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ نیز نہ تمہیں اللہ ﷻ کی ذات کا پتہ ہے اور نہ اس کی صفات کا تمہیں علم ہے، نہ تمہیں یہ خبر ہے کہ وہ کن کمالات سے متصف ہے اور نہ ہی تم اس بات سے آگاہ ہو کہ وہ ان تمام عیوب سے پاک ہو جو تم اس کے ساتھ منسوب کرتے ہو (معاذ اللہ)۔ جب اس کی ذات و صفات کے بارے میں تمہاری لاعلمی کا یہ عالم ہے تو تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ اس کے لئے مثالیں دیتے پھرو۔ لہٰذا کچھ تو سوچو اگر تم کچھ بھی عقل رکھتے ہو۔

علمی بات: مشرکین عرب بعض اوقات اپنے شرک کی تائید میں یہ مثال دیتے تھے کہ جس طرح دنیا کا بادشاہ تنہا اپنی حکومت نہیں چلاتا، بلکہ اسے حکومت کے بہت سے کام اپنے مددگاروں کو سونپنے پڑتے ہیں، اسی طرح (معاذ اللہ) اللہ ﷻ نے بھی اپنی خدائی کے بہت سے کام ان دیوتاؤں کو سونپ رکھے ہیں اور ان معاملات میں وہ خود مختار ہو گئے ہیں۔ اس آیت میں ان سے کہا جا رہا ہے کہ اللہ ﷻ کے لئے دنیا کے بادشاہوں کی، بلکہ کسی بھی مخلوق کی مثال دینا انتہائی جہالت کی بات ہے۔ اس کے بعد آیات: ۷۵، ۷۶ میں اللہ ﷻ نے دو مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ جن کا مقصد یہ ہے کہ اگر مخلوقات ہی کی مثال لینی ہے تو ان دو مثالوں سے ظاہر ہے کہ مخلوق، مخلوق میں بھی فرق ہوتا ہے، کوئی مخلوق اعلیٰ درجہ کی ہے، کوئی ادنیٰ درجہ کی، جب مخلوق، مخلوق میں اتنا فرق ہے تو خالق اور مخلوق میں کتنا فرق ہو گا؟ پھر کسی مخلوق کو خالق کے ساتھ عبادت میں کیسے شریک کیا جا سکتا ہے؟

علمی بات: بلاشبہ اللہ ﷻ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری جہالت ہے کہ خالق کو مخلوق پر قیاس کر کے شرکیہ باتیں کرتے ہو، اللہ ﷻ کو اپنی ذات و صفات کا پورا علم ہے اور تم جو اس کے ساتھ شرک کرتے ہو اسے اس کا بھی علم ہے وہ اس پر مؤاخذہ فرمائے گا اور سزا بھی دے گا۔

آیت نمبر ۷۵: شرک کی تردید میں ایک غلام اور ایک آزاد شخص کی مثال کا بیان ہے۔ غلام کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ آزاد جیسے چاہے خرچ کرتا ہے۔ یہ دونوں شخص برابر نہیں ہو سکتے تو اللہ ﷻ جو خالق ہے وہ اور مخلوق کیسے برابر ہو سکتے ہیں؟ تمام تعریفوں کا مستحق اللہ ﷻ ہی ہے کیوں کہ تمام نعمتیں اسی کی عطا کی ہوئی ہیں۔ لیکن مشرک اس حقیقت کو سمجھ نہیں پاتے۔

علمی بات: عاجز غلام اور آزاد فیاض کی مثال کی وضاحت: اللہ ﷻ نے اس آیت میں دو شخصوں کی مثال بیان فرمائی ہے۔ ایک شخص کسی کا غلام ہے جو اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا اور دوسرا شخص آزاد ہے جس کو اللہ ﷻ نے مال و دولت سے نوازا ہے اور وہ اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر طور پر خرچ کرتا ہے۔ کیا یہ دونوں شخص برابر ہیں؟ ظاہر ہے یہ دونوں شخص برابر نہیں ہیں۔

علمی بات: کافروں کو ان کی نادانی پر آگاہ کرنے کے لئے ایک مثال دیکر سمجھایا جارہا ہے۔ کہ تم یہ بتاؤ کہ ایک شخص کسی کا زر خرید غلام ہے۔ اس کو کسی چیز پر قدرت نہیں۔ وہ کسی بھوکے کو باسی روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہیں دے سکتا۔ سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے کسی ننگے کو ایک پھٹا پرانا کپڑا بھی دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔ نہ اسے کسی کو خریدنے کی اجازت ہے نہ بیچنے کی۔ اس کے علاوہ ایک اور شخص ہے جس کو اللہ ﷾ نے اپنے خزانۂ رحمت سے کثیر رزق عطا فرمایا ہے وہ اسے اپنی مرضی سے خرچ کرنے پر بھی قادر ہے۔ وہ لوگوں کی نگاہوں سے چھپ کر غریبوں اور محتاجوں کی ضرورتیں بھی پوری کرتا ہے اور مجمع عام میں بھی اس کی جود وسخا سے ہر سائل اپنا دامن طلب بھر کر لیئے جارہا ہے۔ اب مشرکو! بتاؤ یہ دونوں شخص اگرچہ انسان ہیں لیکن کیا تم ان کو ایک جیسا کہنے کی جرأت کرسکتے ہو؟ ہرگز نہیں۔ تو پھر غور کرو تم جو اپنے باطل معبودوں کو خدا مانتے ہو اور ان کی عبادت کرتے ہو اور انہیں اللہ ﷾ کے ساتھ شریک ٹھہرا رہے ہو کیا یہ کھلی نادانی نہیں؟ جب وہ دو آدمی انسان ہوتے ہوئے ایک جیسے نہیں ہوسکتے تو پھر یہ تمہارے بے بس اور بے جان بت جو اس زرخرید مقہور اور مجبور غلام سے بھی ہزار درجہ کمتر ہیں۔ وہ رب العرش العظیم کے ہم پلہ اور ہم پایہ کیسے ہوسکتے ہیں کہ تم ان کو معبود بھی مانو اور ان کی عبادت بھی کرو۔ کچھ تو غور کرو۔

عملی بات: الحمد للہ تمام کمالات اللہ ﷾ کے لئے ہیں۔ یعنی بتوں اور جھوٹے معبودوں کا کوئی کمال نہیں ہے اور وہ کسی تعریف کے مستحق نہیں ہیں، کیونکہ بتوں نے کسی پر کوئی انعام نہیں کیا جس کی وجہ سے وہ کسی تعریف کے مستحق ہوں۔

ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے کہ تمام تعریفوں کا مستحق اللہ ﷾ ہے اور بت کسی تعریف کے مستحق نہیں ہیں اور اس آیت کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اس میں اس شخص سے خطاب ہے جس کو اللہ ﷾ نے عمدہ رزق عطا فرمایا ہے اس کو چاہیئے کہ وہ یہ کہے الحمد للہ (تمام تعریفوں کا مستحق اللہ ﷾ ہے) یعنی اللہ ﷾ کے لئے حمد ہے جس نے اس کو ایک عاجز اور حقیر غلام سے ممتاز کیا۔ اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ ﷾ نے اس پر حمد فرمائی کہ اس نے ایسی مثال بیان فرمائی جو مقصود کی اچھی وضاحت کردیتا ہے یعنی ایسی واضح اور قوی حجت کے پیش فرمانے پر اللہ ﷾ ہی کے لئے حمد ہے۔ لیکن اکثر لوگ یہ بات نہیں جانتے یعنی باوجود اس کے کہ یہ مثال بہت واضح ہے پھر بھی اکثر لوگ اس مثال کو نہیں سمجھتے یا پھر وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔

آیت نمبر ۷۶: شرک کی تردید میں ایک اور مثال دی گئی ہے کہ ایک شخص گونگا غلام ہے، کوئی کام صحیح طریقہ سے نہیں کرتا اور وہ اپنے مالک پر بوجھ ہے۔ دوسرا وہ تندرست شخص ہے جو خود بھی عدل اور صحیح راہ پر قائم ہے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتا ہے۔ جیسے یہ دونوں برابر نہیں ہوسکتے اسی طرح مشرک اور مومن بھی برابر نہیں ہوسکتے۔

علمی بات: اس آیت میں بھی اللہ ﷾ نے مشرکین کا رد فرمایا ہے کہ یہ بدیہی بات ہے کہ جو شخص گونگا اور عاجز ہو وہ فضل اور شرف میں اس شخص کے مساوی نہیں ہوسکتا جو بولنے والا اور قادر ہو، باوجود اس کے کہ باقی اعضاء کی سلامتی میں دونوں مساوی ہوں تو جب گونگا اور عاجز، بولنے والے اور قادر برابر نہیں ہوسکتے تو زیادہ لائق ہے کہ بے جان اور ساکت پتھر اللہ ﷾ کے برابر نہیں ہوسکتے پھر تمہارا ان بتوں کو عبادت میں اللہ ﷾ کا شریک قرار دینا کس طرح عقل کے نزدیک صحیح ہے۔ مشرکین جو خدائی اور عبادت میں اپنے بتوں کو بھی اللہ ﷾ کا مثیل سمجھتے تھے۔ ان کی حماقت کو واضح کرنے کے لئے ایک اور مثال ذکر فرمائی۔ فرمایا ایک شخص ہے جو پیدائشی طور پر گونگا بھی ہے اور بہرہ بھی۔ اسے کسی چیز پر کوئی اختیار بھی حاصل نہیں۔ وہ اپنے رفقاء پر صرف بوجھ ہے اور قدم بھی ایسے سبز ہیں کہ جس کام کے لئے بھیجا جاتا ہے وہ نامراد لوٹتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ایک اور شخص ہے جو عدل وانصاف قائم کرنے کے لئے سرگرم عمل رہتا ہے۔ اس کا کوئی قدم راہ ہدایت سے ادھر ادھر نہیں اٹھتا۔ اے مشرکو! تم ہی بتاؤ کیا یہ دونوں ایک جیسے ہیں۔ اگر یہ دونوں انسان ہوتے ہوئے ایک جیسے نہیں تو تمہارے اصنام، اوثان جو اس عاجز غلام سے بھی گئے گزرے ہیں وہ اللہ ﷾ کے ہم پلہ کیسے ہوسکتے ہیں کہ تم انہیں الٰہ بھی مانو اور ان کی عبادت بھی کرو، جو صرف اللہ ﷾ کا حق ہے۔

آیت نمبر ۷۷: زمین و آسمان کی تمام چھپی ہوئی حقیقتوں سے اللہ ﷾ آگاہ ہے۔ اس کے لئے قیامت برپا کرنا ایسا ہے جیسے آنکھ جھپکنا یا اس سے بھی قریب تر، کیوں کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

علمی بات: اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں بندوں سے متعلق جتنی بھی باتیں، فیصلے اور احکام پوشیدہ ہیں ان سب کا علم صرف اللہ ﷾ کو ہے۔

اس میں قیامت کا علم بھی شامل ہے اور جب اس کا وقت آجائے گا تو پلک جھپکتے ہی آجائے گی، یا اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ واقع ہو جائے گی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

عملی بات: غفلت سے لوگ اپنی عمر اور دنیا کی عمر کے بھروسہ پر بڑے بڑے دیر طلب کام کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وعدہ آجانے کی دیر ہے، پھر اس کی قدرت کے روبرو اور قیامت کا قائم ہو جانا پلک جھپکنے سے بھی زیادہ نزدیک ہے، کیونکہ اس کی بارگاہ میں ہر کام کے لئے فقط حکم کی دیر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ برے کام سے توبہ کر کے اچھے کام انجام دینا۔ لہٰذا جو نیک اعمال انسان کرنا چاہتا ہے وہ آج ہی سے کرتا جائے، نیک کاموں کو دوسرے دن پر موٴخر نہ کرے۔ اس لئے کہ جب انسان کی عمر اور دنیا کی عمر کو قیام ہی نہیں تو اُسے کیا معلوم کہ کل کیا ہو۔ کہیں مہلت عمل صلب نہ ہو جائے۔

آیت نمبر ۷۸: انسان کی پیدائش کے وقت پر اسے کسی چیز کا علم نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے کان، آنکھیں اور دل کی صورت میں ذرائع عطا کیئے جن سے وہ علم حاصل کرتا ہے۔ یہ صلاحیتیں اور قوتیں دینے کا مقصد یہ ہے کہ انسان ان اعضاء کو اس طرح استعمال کرے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے۔

علمی بات: توحید باری تعالیٰ کے دلائل میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ آدمی کو جب اس کی ماں کے بطن سے نکالتا ہے تو بندہ کو کسی بات کی خبر نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ اسے کان، آنکھ اور دل دیتا ہے اور بچپن سے لے کر بڑا ہونے تک ان قوتوں کو بڑھاتا رہتا ہے، تاکہ وہ ان نعمتوں کو یاد کر کے اپنے منعمِ حقیقی کا شکر ادا کرے، اس کی وحدانیت کا اعتراف کرے اور خلوصِ دل سے اسی کی عبادت کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ نعمتیں اس لئے عطا فرمائی ہیں کہ ان کی مدد سے اس کے سامنے زندگی بھر جھکتا رہے اور اس کے حکموں پر عمل پیرا رہے۔

آیت نمبر ۷۹: اللہ تعالیٰ کی ایک اور عظیم قدرت کا بیان ہے۔ پرندوں میں اڑنے کی ایسی صلاحیت پیدا کر دی کہ وہ بغیر کسی سہارے کے فضا میں اُڑتے ہیں۔ فضا میں انہیں تھامنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ بلاشبہ اس میں اہل ایمان کے لئے نشانیاں ہیں جو اپنے خالق کی عظمت کا اعتراف اور اسی کی عبادت کرتے ہیں۔

علمی بات: ہم جانتے ہیں کہ بلندی کی طرف کوئی چیز کتنے ہی زور سے پھینکی جائے، وہ تھوڑی دور اوپر جا کر نیچے گر پڑے گی کیونکہ ہر وزن والی چیز مرکز زمین کی طرف لوٹتی ہے۔ چنانچہ پتا چلا کہ کوئی چیز فضا میں ٹھہر نہیں سکتی۔ وہ ہوا کی لطافت اور زمین کی کشش ثقل کی وجہ سے زمین پر آگرتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے پرندوں کے پروں اور ان کی جسمانی ساخت میں کچھ ایسا توازن قائم کیا ہے کہ نہ زمین کی کشش ثقل انہیں اپنی طرف کھینچتی ہے اور نہ ہوا کی لطافت انہیں نیچے گراتی ہے اور فضا میں بے تکلف تیرتے پھرتے ہیں۔ پھر یہ فن انہیں سیکھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ سب باتیں ان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہیں۔ پرندے جب اڑنے لگتے ہیں تو اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتے اور پھیلاتے ہیں۔ پھر جب فضا میں پہنچ جاتے ہیں تو ضروری نہیں کہ وہ ہر وقت پروں کو پھیلائے رکھیں۔ وہ انہیں بند بھی کر لیتے ہیں لیکن پھر بھی گرتے نہیں۔ تو اب کون ہے؟ جو ان کو فضا میں تھامے ہوئے ہے۔ انسان نے پرندوں کی اڑان اور ان کی ساخت میں غور و فکر کر کے ہوائی جہاز تو ایجاد کر لیا۔ مگر اس سے بڑھ کر کامیابی یہ ہے انسان ان سب چیزوں کے ذریعہ اس ذات وحدہٗ لاشریک کی معرفت حاصل کرے جس نے ایسے طبعی قوانین بنا دیئے جن کی بنا پر پرندے یا ہوائی جہاز فضا میں اڑتے پھرتے ہیں۔ مخلوق کے ان عجائبات میں غور و فکر کر کے خالق و صانع کی پہچان حاصل کرے اور اس خلاق و رزاق عالم کی ذات و صفات میں کسی کو بھی شریک نہ کرے۔

آیت نمبر ۸۰: اللہ تعالیٰ کے انسان پر انعامات کا ذکر ہے کہ اس ربِ کریم نے انسان کے لئے گھر کو باعث سکون اور آرام کی جگہ بنایا۔ اسے جانوروں کی کھالوں سے ایسے خیمے بنانے کی صلاحیت عطا کی جو سفر اور حالت قیام میں اس کے کام آتے ہیں۔ مزید یہ کہ اسے جانوروں کی اُون اور بالوں سے مختلف قسم کی گھریلو اشیاء بنانے کی صلاحیت عطا کی۔ ان چیزوں میں مقررہ مدت تک انسان کے لئے فائدہ کا سامان رکھا گیا ہے۔

علمی بات: ان انعامات کا ذکر فرمایا جا رہا ہے جن سے ہر شخص مستفید ہوتا رہتا ہے لیکن کثرت استعمال کی وجہ سے ان کی اہمیت کا احساس بہت کم ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ آسانیاں اور سہولتیں جن کو ہم خاطر ہی میں نہیں لاتے۔ اگر ہم سے چھین لی جائیں تو زندگی گزارنا دوبھر ہو جائے۔ اس آیت میں انہی نعمتوں کی

طرف توجہ دلائی جا رہی ہے جن سے ہم زیادہ تر وقت لطف اندوز ہوتے ہیں کہ دیکھو یہ کس کی کرم نوازیاں ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ ان سے دل نہ لگا بیٹھنا، انہیں ایک دن چھوڑنا ہو گا۔ ایسا نہ ہو کہ یہ قلبی لگاؤ ایسا لگا لو کہ چھوڑتے وقت تکلیف ہو۔

علمی بات: سب سے پہلے یہ بتلایا گیا کہ اللہ ﷻ نے تمہارے لئے تمہارے گھروں کو جائے سکون بنایا، یعنی تمہارے رہنے سہنے آرام و راحت حاصل کرنے کے لئے تمہیں مکانات دے رکھے ہیں، اس میں اینٹ پتھر، مٹی چونے اور لکڑی کے گھر جو بیشتر انسانی آبادی کے مسکن ہیں سب آ گئے جو انسان کے لئے راحت قلب اور سکون خاطر کا کتنا بڑا ذریعہ اور سبب ہیں، اس کی قدر کوئی اس غریب سے پوچھے جو بیچارہ بے گھر ہو اور اپنا چھوٹا بڑا کوئی مکان نہ رکھتا ہو، چونکہ بچپن سے ہر شخص اپنی حیثیت و بساط کے لائق چھوٹے بڑے مکان ہی میں رہتا ہے اس لئے اس کا اندازہ ہی نہیں ہونے پاتا کہ مکان اور گھر کتنی بڑی نعمت ہے۔

بہر حال قرآن حکیم نے اسے وجہ تسکین و راحت فرمایا اور یہ انسان کی حالتِ حضر کا ذکر ہے جب وہ اپنے گھر میں قیام پذیر ہوتا ہے اور سفر میں نہیں ہوتا۔ اس کے بعد خیموں کی سفری زندگی کا بیان فرمایا کہ اینٹ پتھر کے مکانوں کو کہیں منتقل نہیں کر سکتے اس لئے جانوروں کی کھالوں کے خیمے بنانے سکھا دیئے جو سہولت اور آسانی کے ساتھ منتقل کیئے جا سکتے ہیں۔ سفر و حضر میں انسان جہاں چاہے نصب کر لے اور جب چاہے لپیٹ کر رکھ دے، صحراء میں رہنے والے عرب تو اکثر خیموں ہی میں زندگی بسر کرتے تھے۔ اس لئے اس کا ان کے لئے نعمت ہونا مثل مکان ہی کے تھا۔

علمی بات: چوپایوں میں انسانوں کے لئے فوائد: چوپایوں سے انسانوں کو بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں: مال برداری کرنا، ہل چلانا، پانی کھینچنا وغیرہ۔ اسی طرح جانوروں کے گوبر سے اوپلے بنائے جاتے ہیں جو ایندھن کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، بائیو گیس بنائی جاتی ہے۔ جانوروں کی اُون سے دھاگہ بنتا ہے، کپڑا بنتا ہے، گرم لباس بنتے ہیں۔ جانوروں کی کھال سے چمڑا حاصل ہوتا ہے۔ جس سے جیکٹ، پرس، بیگ اور جوتے وغیرہ بنتے ہیں۔ جانوروں کی چربی سے تیل، گھی اور صابن بنتا ہے۔ جانوروں کی ہڈیوں سے کیلشیم (Calcium) اور فاسفورس (Phosphorus) وغیرہ حاصل ہوتا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے فرمایا کہ تمہارے لئے ان جانوروں کے اون اور روؤں اور بالوں سے سامان زندگی اور کچھ دن برتنے کے اسباب پیدا فرمائے یعنی بھیڑ اور دنبوں کے اون اور اونٹ کے نرم روؤں اور بکری کے بالوں سے اوڑھنے اور بچھانے کے اسباب تیار فرمائے۔ تا کہ ان کی خرید و فروخت کے بعد ایک مقرر وقت تک ان سے فائدہ حاصل کرتے رہو، یعنی جب تک وہ برقرار رہیں اور ان سے نفع حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یا جس وقت تک تم زندہ رہو اور ان سے فائدہ حاصل کر سکو۔ یہ سب سامان و اسباب گھر کے برتنے کی چیزیں بھی ہیں۔ اس سے کپڑے بھی بنتے ہیں، اوڑھنے بچھونے کے سامان بھی تیار ہوتے ہیں۔ تجارت کے طور پر مال تجارت ہے۔ فائدے کی چیز ہے جس سے لوگ مقررہ وقت تک سود مند ہوتے ہیں۔

آیت نمبر ۸۱: خارجی اثرات سے بچانے والی نعمتوں کا بیان ہے۔ اللہ ﷻ نے انسان کے لئے ٹھنڈی چھاؤں اور پہاڑوں میں گہرے غار بنائے جس میں وہ پناہ لیتا ہے۔ ایسے لباس بنانے کی مہارت سکھائی جو موسم کی شدت اور جنگ کے دوران دشمن کے وار سے اسے بچائے۔ لباس کا بالخصوص گرمی سے بچانے کا ذکر اس لئے فرمایا کیونکہ اہل عرب عموماً سردی کے موسم سے نا آشنا تھے۔ نعمت پوری فرمانے سے مراد انسان کی جملہ ضروریات کی تکمیل ہے۔ لہٰذا انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے حقیقی محسن ہی کا فرماں بردار بن کر رہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے بعض چیزوں کے انسانوں کے لئے سائے بنائے اور پہاڑوں میں ان کے لئے چھپنے کی جگہیں اور ٹھکانے بنائے اور ان لئے ایسے کُرتے بنائے جو گرمی سے انہیں بچاتے ہیں اور ایسے کُرتے بھی بنائے جو لڑائی میں ان کی حفاظت کا کام دیں اور انہیں آپس کی لڑائی میں بچاتے ہیں۔ اللہ ﷻ اسی طرح انسانوں پر اپنی نعمتیں پوری کرتا ہے تا کہ وہ فرماں بردار بنیں اور اس کا حکم مانیں۔ جب ظاہری نعمتوں کا یہ حال ہے تو باطنی نعمتوں اور مہربانیوں کا اندازہ اسی سے لگا لیں اور ان بے شمار و اَن گنت نعمتوں کا تقاضا یہ ہے کہ اس اللہ ﷻ کا وہ احسان مانیں اور صدق دل سے اسلام قبول کر کے انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کریں۔

علمی بات: چوپاؤں، مکانوں اور خیموں کے بعد گھر سے باہر سردی گرمی اور دشمن سے بچاؤ کرنے والی نعمتوں کا ذکر فرمایا۔ اس آیت میں ان لوگوں کے لئے جن کے پاس مکان یا خیمہ نہیں، یا وہ سفر میں ہیں تو گرمی وغیرہ سے بچاؤ کے لئے مختلف سایوں کا ذکر کیا، مثلاً درختوں کا سایہ، مکانوں، دیواروں اور پہاڑوں کا سایہ، آبادیوں کا سایہ، چھتریوں کا سایہ، غرض یہی سائے گرمی سردی اور بارش سے بچانے کے کام آتے ہیں۔

وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا: اس میں پہاڑوں کی قدرتی غاریں، کھود کر بنائے ہوئے مکان اور پہاڑوں میں کھود کر بنائی ہوئی لمبی سرنگیں، جن میں فوجی سازوسامان، اسلحہ، جہاز اور فوج محفوظ رکھی جاتی ہے، سب شامل ہیں۔

علمی بات: اکثر مفسرین نے فرمایا کہ گرمی کا ذکر کافی سمجھ کر سردی کا الگ ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ لباس گرمی سے بچاتا ہے تو سردی سے بھی بچاتا ہے۔ رہا عرب میں گرمی کا زیادہ ہونا تو اسی سورت کے شروع میں جانوروں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "ان میں تمہارے لئے گرم لباس ہے۔" (سورۃ النحل ۱۶، آیت: ۵) معلوم ہوا عربوں کو بھی سردی سے بچنے کی ضرورت تھی، اس لئے یہ بات زیادہ قوی ہے کہ قرآن حکیم نے صرف گرمی کا ذکر کر کے سردی سے بچانے کی نعمت پر غور کرنے سننے والوں پر چھوڑ دیا، یا سورت کے شروع میں سردی سے بچاؤ کا ذکر پہلے ہو چکنے کی وجہ سے یہاں ذکر نہیں فرمایا۔ "وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ" اس میں زرہ، خود، بلٹ پروف (گولی سے محفوظ) جیکٹیں، گاڑیاں اور ٹینک وغیرہ سب شامل ہیں۔

آیت نمبر ۸۲: بار بار اللہ ﷻ کی نعمتوں کو یاد دلانے کے باوجود حق سے روگردانی کرنے والوں کی مذمت کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو اللہ ﷻ کا پیغام پہنچانے کا فریضہ ادا کرتے رہنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

علمی بات: اس آیت مبارکہ میں آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا کہ باوجود ان نعمتوں کے معلوم کرنے کے یہ لوگ اسلام سے بے بہرہ رہیں اور ایمان نہ لائیں تو اس کا آپ ﷺ پر کوئی الزام نہیں ہے آپ ﷺ کے ذمہ تو واضح طور پر اللہ ﷻ کا پیغام پہنچا دینا ہے۔ پھر آپ ﷺ بری الذمہ ہیں۔ ماننا نہ ماننا ان کا اختیار ہے۔ یہ لوگ اللہ ﷻ کی نعمتوں کو خوب اچھی طرح جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں اور پھر بھی آپ ﷺ کی رسالت کا انکار کرتے ہیں۔ کفر کرتے ہیں تو اس کا وبال ان ہی پر پڑے گا۔

آیت نمبر ۸۳: کفار اور مشرکین کا کفر لاعلمی اور جہالت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے۔ اللہ ﷻ کے انعامات کو دیکھنے کے باوجود یہ اللہ ﷻ کی شکر گزاری اور اطاعت نہیں کرتے۔

علمی بات: بے شک بعض بندے شکر گزار بھی ہیں جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "اور میرے بندوں میں شکر گزار کم ہی ہوتے ہیں۔" (سورۃ سبا ۳۴، آیت: ۱۳) لیکن اکثروں کا حال یہ ہے کہ اللہ ﷻ کے انعامات کو دیکھتے اور اس کے احسانات کو سمجھتے ہیں، مگر جب شکر گزاری اور اظہار اطاعت کا وقت آتا ہے تو سب بھول جاتے ہیں۔ گویا دل سے سمجھتے ہیں اور عمل سے انکار کرتے ہیں۔

علمی بات: وہ نیک بندے خوب جانتے ہیں کہ یہ تمام نعمتیں اللہ ﷻ ہی کی ذات پر عنایت فرمار ہی ہیں، مگر جب عملاً شکر گزاری کا وقت آتا ہے تو انکار کر دیتے ہیں۔

"ثُمَّ" یہاں تعجب کے لئے ہے کہ سب کچھ جانتے ہوئے پھر اللہ ﷻ کی نعمتوں کا انکار کر دیتے ہیں، گویا دل میں نعمتوں کا اقرار اور اپنے عمل سے انکار کرتے ہیں، بلکہ پوچھنے پر اللہ ﷻ کی نعمتوں کا اقرار زبان سے بھی کرتے ہیں، مثلاً تمہیں کس نے پیدا کیا؟ جواب دیں گے اللہ ﷻ نے جیسا کہ سورۃ الزخرف ۴۳، آیت: ۸۷ اور سورۃ المومنون ۸۴، آیات: ۸۳ تا ۸۹ میں ان کے اعتراف ذکر فرمائے گئے ہیں۔ مگر وہ ایمان لانے پر تیار نہ تھے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اسلام لانے کا مطلب صرف "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ" کہنا نہیں چلے گا، بلکہ اپنی مرضی چھوڑ کر ہر کام میں اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم ماننا پڑے گا اور اس کے لئے وہ تیار نہیں تھے۔

علمی بات: بعض اہلِ علم نے "نِعْمَتَ اللهِ" سے مراد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی لی ہے، یعنی یہ لوگ آپ ﷺ کو اللہ ﷻ کا رسول جانتے ہوئے بھی ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ اس لئے فرمایا: کہ ان کے اکثر جانتے ہوئے کافر تھے۔ کچھ جہل کی وجہ سے بھی انکار کرتے تھے، کچھ دل میں ایمان کا ارادہ

بھی رکھتے تھے، کچھ چھوٹے بچے تھے، جو فطرتاً مسلمان تھے مگر کفار کی اولاد ہونے کی وجہ سے ان کا شمار دنیوی لحاظ سے کفار میں ہوتا تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے انصاف کا اور انتہائی احتیاط کا ایک نمونہ ہے کہ ان سب کو نعمت پہچان کر پھر کفر کرنے والے قرار نہیں دیا، بلکہ یہ حکم ان کے اکثر پر لگایا۔

آیت نمبر ۸۴: گواہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے نبی اور گواہی سے مراد تبلیغ ورسالت کی گواہی ہے۔ روزِ قیامت ہر نبی علیہ السلام اپنے امت کے متعلق اللہ تعالیٰ کے حضور گواہی دیں گے۔ یہ گواہی کافروں پر اتمام حجت کے لئے ہوگی۔ کافروں کو کسی قسم کا عذر پیش کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی نہ ہی انہیں توبہ کا موقع دیا جائے گا۔

علمی بات: قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہر قوم کے نبی علیہ السلام کو ان کے سامنے لائے گا جو ان کے حق میں یا تو ایمان ویقین کی شہادت دے گا یا ان کے خلاف کفر وعناد کی گواہی دے گا۔ اس دن کافروں کو کوئی معذرت پیش کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور نہ انہیں موقع دیا جائے گا کہ وہ اپنے رب کی ناراضگی کو دور کریں۔ اس لئے کہ آخرت دارالعمل نہیں ہے اور نہ دنیا کی طرف وہ بھیجے جائیں گے کہ نیک اعمال کرلیں اور اپنے گناہوں سے توبہ کرلیں۔

آیت نمبر ۸۵: روزِ قیامت کفار اور مشرکین کو عذاب میں مبتلا کیئے جانے کی وعید سنائی گئی ہے۔ ان کے عذاب میں نہ کوئی وقفہ ہوگا اور نہ ہی کوئی کمی کی جائے گی۔

علمی بات: کفار ومشرکین کو بھی کسی وقت مہلت نہیں دی جائے گی اور نہ انہیں بے عذاب چھوڑا جائے گا۔ دوزخ میں داخل ہوجانے کے بعد وہ لاکھ چلائیں اور "مالک" (داروغہ جہنم) سے عذاب میں تخفیف چاہیں، تو ان کے شور وغل کا کچھ خیال نہ کیا جائے گا اور ان کے ساتھ کسی طرح کی رعایت نہ کی جائے گی اور جس کے لئے جس نوعیت وکیفیت کے عذاب کا فیصلہ کیا جاچکا ہوگا، اس میں تخفیف نہ کی جائے گی۔

آیت نمبر ۸۶: میدانِ حشر میں مشرک اور ان کے شرکاء کے درمیان مکالمہ کا ذکر ہے۔ مشرکین باطل معبودوں کو دیکھ کر اقرار کریں گے کہ وہ دنیا میں ان ہی کی عبادت کرتے تھے۔ جب کہ شرکاء ان کے مشرکانہ عقائد سے اظہار بیزاری کریں گے اور انہیں جھوٹا قرار دیں گے۔

علمی بات: روزِ محشر مشرکین اپنے آپ کو بری الذمہ اور بے گناہ ثابت کرنے کے لئے سارا الزام اپنے معبودوں پر لگائیں گے کہ اے الٰہ العالمین! یہ ہیں وہ جن کو ہم تیرا شریک بناتے تھے۔ تجھے چھوڑ کر ان کی پوجا کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان بتوں کو قوت گویائی عطا کرے گا اور وہ ان کی تردید کریں گے کہ انہوں نے خود ہی ہمیں گھڑا اور خود ہی ہمیں تیرا شریک بنایا خود ہی ہماری عبادت میں لگ گئے۔ ہم نے انہیں کب کہا تھا کہ وہ تیری عبادت چھوڑ کر ہماری پوجا شروع کردیں یعنی اللہ تعالیٰ ان بے زبان اور بے جان بتوں کو قوت گویائی دے گا تاکہ کفار کی رسوائی ظاہر ہو۔

آیت نمبر ۸۷: روزِ قیامت کفار اور مشرکین ہر طرف سے مایوس ہو کر خالص اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہی کی فرماں برداری اور اسی کی اطاعت کا اظہار کریں گے۔ ان کے تمام خود ساختہ شرکیہ عقائد ختم ہوجائیں گے۔

علمی بات: مشرک اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف اطاعت وفرماں برداری کا پیغام ڈالیں گے اور جو من گھڑت باتیں اور جھوٹے الزام لگاتے تھے وہ سب ان سے گم ہوجائیں گے۔ یعنی وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر اللہ تعالیٰ کے روبرو اطاعت کا اظہار کرنے لگیں گے اور دنیا میں جس تکبر کا اظہار کیا کرتے تھے وہ سب باتیں جاتی رہیں گی۔

آیت نمبر ۸۸: دنیا میں خود گمراہ ہونے کے ساتھ دوسروں کی گمراہی کا سبب بننے والوں کا آخرت میں انجام بیان کیا گیا ہے۔ انہیں دوسروں کی نسبت دوہرا عذاب دیا جائے گا کیوں کہ وہ زمین میں فساد پھیلاتے تھے۔

علمی بات: اس سے پچھلی آیت میں ان کافروں کی وعید سنائی گئی تھی جنہوں نے خود کفر کیا اور اس آیت میں ان کافروں کی وعید سنائی گئی ہے جو خود بھی کافر تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ کے راستہ سے روک کر اور ان کو گمراہ کر کے انہیں کافر بنایا۔ چونکہ ان کا کفر دوگنا تھا اس لئے ان کی سزا بھی دوگنی ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ ہم ان کے عذاب پر مزید عذاب بڑھادیں گے یعنی ان کو اپنے کفر کا بھی عذاب ہوگا اور اپنے ان پیروکاروں کے کفر کا بھی عذاب ہوگا جنہوں نے ان کی پیروی میں کفر کیا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس شخص نے اسلام میں نیک طریقہ ایجاد کیا اس کو اپنی نیکی کا بھی اجر ملے گا اور بعد والوں کی نیکیوں کا بھی اجر ملے گا اور ان کے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور جس شخص نے اسلام میں کسی گناہ کا طریقہ ایجاد کیا اس کو اپنے گناہ کا بھی عذاب ہو گا اور بعد والوں میں سے جو اس پر عمل کرے گا اس کے گناہ کا بھی عذاب ہو گا اور بعد والوں کے عذاب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۸۹: روز قیامت ہر امت کے نبی علیہ السلام کو اس امت پر گواہ بنا کر پیش کیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ کی گواہی اپنی امت کے لوگوں کے ساتھ گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کے حوالہ سے بھی ہو گی۔ قرآنِ حکیم میں ہر اس چیز کی وضاحت ہے جو انسان کی ہدایت سے تعلق رکھتی ہے۔ اس ہدایت پر عمل پیرا ہو جانے والے انسان کے لئے قرآنِ حکیم باعث رحمت بن جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم فرماں برداروں کو جنت میں دائمی اور لازوال نعمتوں کی بشارت دیتا ہے۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ آپ ﷺ اس دن کو یاد کریں جب ہم ہر قوم کے نبی کو بحیثیت شاہد اور گواہ ان کے سامنے پیش کریں گے اور پھر آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی امت کے لوگ ان انبیاء کرام علیہم السلام کی بابت گواہی دیں گے کہ یہ سچے ہیں، انہوں نے یقیناً تیرا پیغام پہنچا دیا تھا، تو کافروں کے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہے گا۔ اے نبی ﷺ! ہم نے آپ پر قرآن حکیم نازل کیا ہے جس میں ہر بات کھول کر بیان کر دی گئی ہے اور وہ مسلمانوں کے لئے ہدایت کا سر چشمہ، رحمت کا ذریعہ اور جنت کی خوشخبری لیئے ہوئے ہے۔

علمی بات: اس کتاب میں یعنی قرآنِ حکیم کو ہر چیز کا بیان فرمایا گیا ہے مراد اس سے دین کی سب چیزیں اور باتیں ہیں کیونکہ وحی و نبوت کا مقصد انہی چیزوں سے متعلق ہے اس لئے معاشی فنون اور ان کے مسائل کو قرآن حکیم میں ڈھونڈھنا ہی غلط ہے اگر کہیں کوئی ضمنی اشارہ آ جائے تو وہ اس کے منافی نہیں۔ رہا یہ سوال کہ قرآنِ حکیم میں دین کے بھی تو سب مسائل مذکور نہیں تو تِبۡيَانًا لِّكُلِّ شَيۡءٍ کہنا کیسے درست ہو گا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں اصول تو تمام مسائل کے موجود ہیں انہی کی روشنی میں احادیث رسول ﷺ ان مسائل کو بیان کرتی ہیں اور کچھ تفصیلات کو اجماع و قیاس شرعی کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ احادیثِ رسول ﷺ اور اجماع و قیاس سے جو مسائل نکلے ہیں وہ بھی ایک حیثیت سے قرآنِ حکیم ہی کے بیان کیئے ہوئے ہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا: "مجھے قرآن سناؤ۔" میں نے عرض کیا، بھلا میں آپ کو کیا سناؤں، آپ ہی پر تو قرآن حکیم نازل ہوا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "ٹھیک ہے، مگر دوسرے سے سننا مجھے اچھا لگتا ہے۔" ابن مسعود رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ پھر میں نے سورۃ النساء پڑھنا شروع کی اور جب اس آیت پر پہنچا: "تو (اس دن) کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور (اے نبی ﷺ!) ہم آپ کو اِن سب پر گواہ بنا کر لائیں گے۔" (سورۃ النسآء ۴، آیت: ۴۱) تو آپ ﷺ نے فرمایا: "بس کرو" میں نے دیکھا تو اس وقت آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ (صحیح بخاری)

عملی پہلو: نبی کریم ﷺ کا یہ آنسو بہانا بھی روز قیامت اُمت کے حوالہ سے گواہی دینے کے ضمن میں تھا۔ لمحہ فکریہ ہے کہ کیا اُمت کو بھی روز قیامت کی حاضری پر رونا اور خوف آتا ہے؟

آیت نمبر ۹۰: یہ آیت خطبہ جمعہ میں بھی تلاوت کی جاتی ہے۔ چھ باتوں کا ذکر کر کے پورے انسانی معاشرے کے اصلاح کا نظام عطا کیا گیا۔

تین کام جن کو کرنے کا حکم ہے:

۱۔ عدل کا قیام۔۔۔ یہ قانون کی بنیاد ہے۔ ۲۔ احسان۔۔۔ یہ اخلاقی تقاضا ہے۔۔۔ معاشرے کے افراد سے نیکی اور ہمدردی کا برتاؤ اس کا تقاضا ہے۔

۳۔ رشتہ داروں سے حسن سلوک۔۔۔ ان سے حسن سلوک اُن کا حق اور اپنا فرض سمجھنا۔

تین کام جن سے روکا گیا ہے:

۱۔ الفحشاء۔۔۔ ہر وہ قول یا فعل ہے جو برائی کے اعتبار سے بڑھا ہوا ہو مثلاً زنا، عریانی، بدکاری وغیرہ

۲۔ منکر۔۔۔ ہر وہ کام جو معاشرے میں برے سمجھے جاتے ہوں اور جسے شریعتِ اسلامی نے بھی ناجائز قرار دیا ہو۔

۳۔ البغی۔۔۔ جائز حد سے نکل جانا جیسے حدود اللہ ﷻ میں تجاوز کرنا، بندوں کے مال و جان یا آبرو پر ناجائز قبضہ کرنا وغیرہ۔ ان نصیحتوں کا مقصد یہ ہے کہ لوگ ان پر عمل پیرا ہوں۔

علمی بات: یہ بہت ہی جامع آیت ہے اور اس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے انداز میں تین چیزوں کا حکم دیا گیا ہے اور تین ہی چیزوں سے منع کیا گیا ہے۔ پہلا حکم عدل کا ہے اور دوسرا احسان کا۔ عدل تو یہ ہے کہ جس کا جس قدر حق ہے عین اسی قدر آپ اسے دے دیں لیکن احسان ایک ایسا عمل ہے جو عدل سے بہت اعلیٰ وارفع ہے۔ یعنی احسان یہ ہے کہ آپ کسی کو اس کے حق سے زیادہ دیں اور یہ عمل اللہ ﷻ کو بہت پسند ہے۔ چنانچہ اللہ ﷻ محسنین کو محبوب رکھتا ہے۔ تیسرا حکم قرابت داروں کے حقوق کا خیال رکھنے کے بارے میں ہے یعنی ان سے حسن سلوک سے پیش آنا صلہ رحمی کے تقاضے پورے کرنا اور انفاق مال کے سلسلہ میں ان کو ترجیح دینا۔ یہ تین احکام ان اعمال کے بارے میں ہیں جو ایک اچھے معاشرہ کی بنیاد کا کام دیتے ہیں۔

جن چیزوں سے یہاں منع فرمایا گیا ہے ان میں سب سے پہلے بے حیائی ہے۔ حیا گویا انسان اور ہر برے کام کے درمیان پردہ ہے۔ جب تک یہ پردہ قائم رہتا ہے انسان عملی طور پر برائی سے بچا رہتا ہے اور جب یہ پردہ اٹھ جاتا ہے تو پھر انسان بے شرم ہو کر آزاد ہو جاتا ہے۔ پھر وہ جو چاہے کرتا پھرے۔ بے حیائی کے بعد منکر سے منع کیا گیا ہے۔ منکر ہر وہ کام ہے جس کے برے ہونے پر انسان کی فطرت گواہی دے۔ شریعت بھی جسے منع کرتی ہے۔ تیسرا ناپسندیدہ عمل یا جذبہ البغی یعنی سرکشی ہے۔ یہ سرکشی اگر اللہ ﷻ کے خلاف ہو تو بغاوت ہے اور یوں کفر ہے اور اگر یہ انسانوں کے خلاف ہو تو اسے "عدوان" کہا جاتا ہے یعنی ظلم اور زیادتی۔ بہر حال ان دونوں سطحوں پر یہ انتہائی ناپسندیدہ اور مذموم جذبہ ہے۔

علمی بات: اس مختصر سے فقرہ میں تین ایسی چیزوں کا حکم دیا گیا ہے جن پر پورے انسانی معاشرہ کی درستگی کا انحصار ہے:

پہلی یہ کہ عدل ہے جس کا تصور دو مستقل حقیقتوں سے مرکب ہے۔ دوسری یہ کہ لوگوں کے درمیان حقوق میں توازن اور تناسب قائم ہو۔ تیسری یہ کہ اس کا حق بے لاگ طریقہ سے دیا جائے۔

اردو زبان میں اس مفہوم کو لفظ "انصاف" سے ادا کیا جاتا ہے، مگر یہ لفظ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ اس سے خواہ مخواہ یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان حقوق کی تقسیم نصف نصف کی بنیاد پر ہو اور پھر اسی سے عدل کے معنی مساویانہ تقسیم حقوق کے سمجھ لیئے گئے ہیں جو سراسر فطرت کے خلاف ہے۔ دراصل عدل جس چیز کا تقاضا کرتا ہے وہ توازن اور تناسب ہے نہ کہ برابری۔ بعض حیثیتوں سے تو عدل بے شک افراد معاشرہ میں مساوات چاہتا ہے، مثلاً حقوق شہریت میں۔ مگر بعض دوسری حیثیتوں سے مساوات بالکل خلاف عدل ہے۔ پس اللہ ﷻ نے جس چیز کا حکم دیا ہے وہ حقوق میں مساوات نہیں بلکہ توازن و تناسب ہے اور اس حکم کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی، قانونی اور سیاسی و تمدنی حقوق پوری ایمان داری کے ساتھ ادا کیئے جائیں۔

دوسری چیز احسان ہے جس سے مراد نیک برتاؤ، فیاضانہ معاملہ، ہمدردانہ رویہ، رواداری، خوش خلقی، درگزر، باہمی مراعات، ایک دوسرے کا پاس ولحاظ، دوسرے کو اس کے حق سے کچھ زیادہ دینا اور خود اپنے حق سے کچھ کم پر راضی ہو جانا یہ عدل سے زائد ایک چیز ہے جس کی اہمیت اجتماعی زندگی میں عدل سے بھی زیادہ ہے۔ عدل اگر معاشرہ کی اساس ہے تو احسان اس کا جمال اور اس کا کمال ہے۔ عدل اگر معاشرہ کو ناگواریوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں خوش گواریاں اور شیرینیاں پیدا کرتا ہے۔ کوئی معاشرہ صرف اس بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتا کہ اس کا ہر فرد ہر وقت ناپ تول کر کے دیکھتا رہے کہ اس کا کیا حق ہے؟ اور اسے وصول کر کے چھوڑے اور دوسرے کا کتنا حق ہے اور اسے بس اتنا ہی دے دے۔ ایسے معاشرہ میں کشمکش تو نہ ہو گی مگر محبت، شکر گزاری، عالی ظرفی، ایثار، اخلاص اور خیر خواہی کی قدروں سے وہ محروم رہے گا جو دراصل زندگی میں لطف و حلاوت پیدا کرنے والی اور اجتماعی محاسن کو نشو و نما دینے والی قدریں ہیں۔

تیسری چیز جس کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے، صلہ رحمی ہے جو رشتہ داروں کے معاملہ میں احسان کی ایک خاص صورت متعین کرتی ہے۔ اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور خوشی و غمی میں ان کا شریک حال ہو اور جائز حدود کے اندر ان کا حامی و مددگار بنے۔ بلکہ اس

کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہر صاحب استطاعت شخص اپنے مال پر صرف اپنی ذات اور اپنے بال بچوں ہی کے حقوق نہ سمجھے بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق بھی تسلیم کرے۔ شریعت الٰہی ہر خاندان کے خوشحال افراد کو اس امر کا ذمہ دار قرار دیتی ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لوگوں کو بے یار و مددگار اور بھوکا پیاسا نہ چھوڑیں۔ اس کی نگاہ میں ایک معاشرہ کی اس سے بدتر کوئی حالت نہیں ہے کہ اس کے اندر ایک شخص عیش کر رہا ہو اور اسی کے خاندان میں اس کے اپنے بھائی اور رشتہ دار روٹی کپڑے تک کے محتاج ہوں۔ ہر خاندان کے غریب افراد کا پہلا حق اپنے خاندان کے خوشحال افراد پر ہے، پھر دوسروں پر ان کے حقوق عائد ہوتے ہیں۔ یہی بات ہے جس کو نبی کریم ﷺ نے اپنے مختلف ارشادات میں وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ متعدد احادیثِ مبارکہ میں اس کی تصریح ہے کہ آدمی کے اوّلین حقدار اس کے والدین، اس کے بیوی بچے اور اس کے بھائی بہن ہیں، پھر وہ جو ان کے بعد قریب تر ہوں اور پھر وہ جو ان کے بعد قریب تر ہوں اور یہی اصول ہے جس کی بنا پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک یتیم بچے کے چچازاد بھائیوں کو مجبور کیا کہ وہ اس کی پرورش کے ذمہ دار ہوں اور ایک دوسرے یتیم کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اگر اس کا کوئی بعید ترین رشتہ دار بھی موجود ہوتو میں اس پر اس کی پرورش لازم کر دیتا۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس معاشرہ کا واحدہ (unit) اس طرح اپنے اپنے افراد کو سنبھال لے اس میں معاشی حیثیت سے کتنی خوشحالی، معاشرتی حیثیت سے کتنی حلاوت اور اخلاقی حیثیت سے کتنی پاکیزگی و بلندی پیدا ہو جائے گی۔

علمی بات: تین بھلائیوں کے مقابلہ میں اللہ ﷻ تین برائیوں سے روکتا ہے جو انفرادی حیثیت سے افراد کو اور اجتماعی حیثیت سے پورے معاشرہ کو خراب کرنے والی ہیں۔ پہلی چیز فَحْشَآء ہے جس کا اطلاق تمام بیہودہ اور شرمناک افعال پر ہوتا ہے۔ ہر وہ برائی جو اپنی ذات میں نہایت قبیح ہو، فحش ہے۔ مثلاً بخل، زنا، برہنگی و عریانی، عملِ قومِ لوط، محرمات سے نکاح، چوری، شراب نوشی، بھیک مانگنا، مغلظات (گالی گلوچ) جیسے بیہودہ الفاظ بولنا اور بدکلامی کرنا وغیرہ۔ اسی طرح علی الاعلان برے کام کرنا اور برائیوں کو پھیلانا بھی فحش ہے، مثلاً جھوٹا پراپیگنڈا، تہمت تراشی، پوشیدہ جرائم کی تشہیر، بدکاریوں پر ابھارنے والے افسانے، ڈرامے، فلمیں، عریاں تصاویر، عورتوں کا بن سنور کر جسم کی نمائش کرنا، علی الاعلان مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط ہونا اور اسٹیج پر عورتوں کا ناچنا گانا وغیرہ۔ دوسری چیز اَلْمُنْكَرِ ہے جس سے مراد ہر وہ برائی ہے جسے انسان بالعموم برا جانتے ہیں، ہمیشہ سے برا کہتے رہے ہیں اور عام شرائع الٰہیہ نے جس سے منع کیا ہے۔ تیسری چیز اَلْبَغْيِ ہے جس کے معنی ہیں اپنی حد سے تجاوز کرنا اور دوسرے کے حقوق پر دست درازی کرنا، خواہ وہ حقوق خالق کے ہوں یا مخلوق کے۔

آیت نمبر ۹۱: عہد کی پاسداری کا حکم دیا گیا ہے۔ تین طرح کے عہد ہیں جن کی پاسداری کی جائے۔

۱۔ عہد الست: اللہ ﷻ نے عالم ارواح میں تمام انسانوں سے تین میثاق لیے۔ ان میں سے پہلا میثاق اللہ ﷻ نے تمام انسانوں کی روحوں سے اپنی توحید اور اُلوہیت کا لیا جس میں اللہ رب العزت نے ہر انسانی روح سے یہ عہد لیا کہ وہ اللہ ﷻ کو ایک مانے گا، اللہ ﷻ کی توحید پر ایمان لائے گا اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائے گا۔ اسے مِیثَاقِ اَلَسْتُ یعنی عہدِ اَلست بھی کہتے ہیں۔ اس کا ذکر سورۃ الاعراف ۷، آیت: ۱۷۲ میں بھی ہے: "اور جب آپ کے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا اور انہیں خود ان کی جانوں پر گواہ بنایا (اور پوچھا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے جواب دیا کیوں نہیں! ہم (اس واقعہ کے) گواہ ہیں (ایسا نہ ہو) کہ تم قیامت کے دن کہو کہ بے شک ہم تو اس بات سے بالکل بے خبر تھے۔"

۲۔ وہ عہد جو ایک فرد دوسرے فرد سے اللہ ﷻ کو گواہ بنا کر پختہ کرتا ہے۔ ۳۔ وہ حلفیہ معاہدات جو ایک گروہ یا قوم دوسرے گروہ یا قوم سے کرتی ہے۔

علمی بات: اس آیت کریمہ میں اللہ ﷻ نے عہد و پیمان کو پورا کرنے اور قسموں کو نہ توڑنے کی نصیحت کی ہے، نیز جن قسموں میں تاکید پیدا کی گئی ہوتی ہے ان کا توڑ دینا زیادہ بڑا گناہ ہوتا ہے، لیکن احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر قسم اُٹھانے کے بعد آدمی کو پتا چل جائے کہ اس کا پابند نہ رہنا ہی دینی اعتبار سے بہتر ہے تو قسم توڑ دے اور وہ کرے جو بہتر ہے اور قسم کا کفارہ ادا کر دے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "کوئی شخص کسی کام کی بابت قسم کھالے، پھر وہ دیکھے کہ زیادہ خیر دوسری چیز میں ہے (یعنی قسم کے خلاف کرنے میں ہے) تو وہ قسم کو توڑ کر اس کا کفارہ ادا کرے اور وہی اختیار کرے جو بہتر ہے۔ (صحیح مسلم)

علمی بات: قسم اُٹھانا کوئی مذاق نہیں ہے۔ اس لئے اول تو قسمیں کم سے کم اُٹھانی چاہئیں اور اگر کوئی قسم اُٹھالی ہو تو حتی الامکان اسے پورا کرنا ضروری ہے۔ البتہ اگر کسی شخص نے کوئی ناجائز کام کرنے کی قسم اُٹھالی ہو تو اس پر واجب ہے کہ قسم کو توڑے اور کفارہ ادا کرے۔ اسی طرح اگر کسی جائز کام کی قسم اُٹھائی، مگر بعد میں اندازہ ہوا کہ وہ کام مصلحت کے خلاف ہے تو ایسی قسم کو توڑ دینا چاہیئے اور کفارہ ادا کرنا چاہیئے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں بھی رسول اللہ ﷺ نے یہ ہدایت فرمائی ہے۔

علمی بات: قسم کا کفارہ یہ ہے کہ اگر کوئی قسم توڑے تو ایک غلام آزاد کرے یا دس مسکینوں کو دو وقت پیٹ بھر درمیانہ درجہ کا کھانا کھلائے یا دس مسکینوں کو کپڑے پہنائے۔ ان تینوں میں سے کوئی بھی طریقہ اختیار کرنے کی اجازت ہے اور اگر تینوں میں سے کسی کی بھی طاقت نہ ہو تو مسلسل تین روزے رکھنا کفارہ ہے۔ (اس کا ذکر سورۃ المآئدہ ۵، آیت: ۸۹ میں ہے)

علمی بات: عہد و پیمان ایک انسان اللہ ﷻ کے ساتھ بھی کرتا ہے اور بندوں کے ساتھ بھی، دونوں قسم کے عہد کا مطلب یہ ہے کہ جو عہد و پیمان اللہ ﷻ کے نام پر، اس کو حاضر ناظر جان کر یا اس کے نام کی قسم اٹھا کر کیئے جائیں، ان کو پورا کیا جائے، پھر یہ ہے کہ عہد عمومی بھی ہوتے ہیں اور خصوصی بھی، عمومی عہد یہ ہے کہ جب ایک مسلمان کلمہ طیبہ پڑھتا ہے اور اللہ ﷻ کی وحدانیت اور حضور اکرم ﷺ کی شریعت کی پابندی اپنے ذمہ لازم قرار دیتا ہے، تو اب اس کا فرض ہے کہ اس عہد کو پورا کرے اور اس کے خلاف نہ چلے۔ خصوصی معاہدات وہ ہوتے ہیں جو ایک انسان کسی دوسرے انسان کے ساتھ کرتا ہے، اس کا پورا کرنا بھی ضروری ہے، ورنہ یہ منافقانہ طرزِ عمل ہے۔

آیت نمبر ۹۲: عہد کو توڑنا ایسا ہے جیسے کوئی عورت سُوت کاتنے کے بعد اسے خود ہی ٹکڑے ٹکڑے کردے۔ قسموں کو دھوکہ اور فریب دینے کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ عہد کے ذریعہ آزمانے سے مراد یہ کہ مفادات سے بے نیاز ہو کر معاہدہ کی پابندی کی جاتی ہے یا نہیں۔ دنیاوی اغراض و منافع کے لئے عہد توڑنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ قیامت کے دن ان باتوں کی پوری طرح حقیقت واضح ہو جائے گی جس میں لوگ اختلاف کرتے ہیں۔

علمی بات: اسلام سے پہلے عرب کے مشرک قبائل کا یہ دستور تھا کہ وہ ایک قبیلہ سے دوستی کا معاہدہ کرتے اس کے بعد اگر انہیں موقع ملتا، تو کسی دوسرے قبیلہ سے جو قوت اور دولت میں پہلے قبیلہ سے بڑھ کر ہوتا اس کے ساتھ معاہدہ کرتے۔ خواہ یہ ان کا نیا دوست قبیلہ ان کے پہلے قبیلہ جن سے ان کا معاہدہ تھا اس کا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ ﷻ فرزندانِ اسلام کو اس اخلاقی گراوٹ اور عہد شکنی سے بچتے رہنے کی ہدایت فرمارہا ہے کہ وہ یہ روش ہرگز اختیار نہ کریں۔ انہوں نے جو معاہدے کیئے ہیں۔ انہیں نبھائیں اور جو پیمان باندھے ہیں انہیں پورا کریں۔ اسی خیال سے کہ یہ نیا قبیلہ قوت اور دولت میں پہلے دوست قبیلہ سے زیادہ ہے اس لئے مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ سابقہ معاہدہ کو بلاوجہ توڑ دیا جائے اور نیا معاہدہ اس قبیلہ سے کیا جائے ایسا کرنا ان کے مقام سے، بہت کم تر ہے۔

عملی پہلو: مسلمان مکارم اخلاق کے داعی بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اگر وہ ایسی اخلاقی پستی کا ثبوت دیں تو بقیہ لوگ مکارم اخلاق کا درس کس سے جا کر لیں گے۔ سیرت کی پختگی اور اطوار کی پاکیزگی کا نمونہ انہیں کہاں دستیاب ہو گا۔ اس لئے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ کسی بھی معاملہ میں عہد شکنی کو اپنی فراست وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کر کے اپنے آپ کو دھوکہ نہ دیں۔ وعدوں کو پابندی سے نبھانا ایک بڑی آزمائش ہے۔ ایفائے عہد کا حکم دے کر اللہ ﷻ مسلمانوں کو آزمانا چاہتا ہے اور دیکھنا چاہتا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد وہ اسلام کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کس حد تک ہمت اور جرأت کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔

آیت نمبر ۹۳: اللہ ﷻ چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک امت بنا دیتا اور کوئی کسی سے اختلاف نہیں کرتا۔ لیکن اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ گمراہی پر اصرار کرنے والوں کو گمراہ اور حق کے طلب گاروں کو ہدایت دی جائے۔ روزِ قیامت ہر ایک سے اس کے اعمال کے مطابق پوچھا جائے گا۔

علمی بات: اس آیت کریمہ میں اللہ ﷻ نے بیان فرمایا ہے کہ اگر اللہ ﷻ چاہتا تو مومن اور کافر تمام لوگوں کو دینِ حق پر جمع کر دیتا، لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ جسے حق کی جستجو ہو اور اسے قبول کرنے کی جس میں رغبت ہو اسے ہدایت دے اور جو گمراہ ہونا چاہے اور گمراہی پر اصرار کرے اسے بھٹکتا چھوڑ دے۔ دنیا میں

انسان جو کچھ کرتا ہے اس کے بارے میں اس سے قیامت کے دن ضرور پوچھا جائے گا اور اس سوال سے مقصود ڈانٹ ڈپٹ، جھڑکنا اور ملامت کرنا ہو گا نہ کہ استفسار اور دریافت کرنا۔ اس لئے کہ اللہ ﷻ تو سب کچھ جانتا ہے، اس سے کچھ بھی مخفی نہیں ہے۔

آیت نمبر ۹۴: کسی بھی قسم کی خیانت یا عہد شکنی کا ارادہ کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ قسم اُٹھا کر پختہ عہد کرنے کے بعد عہد شکنی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ:

۱۔ ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ۲۔ لوگ اسلام کی طرف مائل نہیں ہوں گے۔

عہد شکنی کے نتیجہ میں اسلام کے راستہ میں رکاوٹ کا سبب بننے والوں کو دنیا و آخرت میں دردناک عذاب کی تنبیہ کی گئی ہے۔

علمی بات: یعنی عہد شکنی کر کے اور قسمیں توڑ کر بدعہدی کی راہ مت نکالو اور مسلمانوں کو بدنام نہ کرو کہ تمہارے خراب اور پست کردار کو دیکھ کر ایمان لانے والے شک میں پڑ جائیں اور غیر مسلم لوگ اسلام میں داخل ہونے سے رکنے لگیں اور تم پر اللہ ﷻ کی راہ سے روکنے کا گناہ چڑھے جس کی سزا بڑی سخت ہو گی۔

علمی بات: مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ بدعہدی سے ہر حال میں بچیں ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص اسلام کی صداقت کا قائل ہو جانے کے بعد محض ان کی بد اخلاقی و بدعہدی دیکھ کر اس دین سے برگشتہ ہو جائے اور اس وجہ سے وہ اہل ایمان کے گروہ میں شامل ہونے سے رک جائے کہ اس گروہ کے جن لوگوں سے اس کو سابقہ پیش آیا ہو ان کو اخلاق اور معاملات میں اس نے کفار سے کچھ بھی مختلف نہ پایا ہو۔

علمی بات: اس آیت میں ایک اور عظیم گناہ اور وبال سے بچانے کی ہدایت ہے وہ یہ کہ قسم اُٹھاتے وقت ہی اسے اس قسم کے خلاف کرنے کا ارادہ ہو صرف مخاطب کو فریب دینے کے لئے قسم اُٹھائی جائے تو یہ عام قسم توڑنے سے زیادہ خطرناک گناہ ہے جس کے نتیجہ میں یہ خطرہ ہے کہ ایمان کی دولت ہی سے محروم ہو جائے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”کبیرہ گناہ یہ ہیں، اللہ ﷻ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، (ناحق) کسی جان کو قتل کرنا اور جھوٹی قسم کھانا۔“ (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۹۵: عہد سے مراد عہد الست اور ہر وہ عہد ہے جس میں اللہ ﷻ کو گواہ بنا کر قسم کھائی گئی ہو۔ دنیاوی مفادات ایفائے عہد کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ لہٰذا دنیاوی مفادات کے بجائے آخرت پر نظر رکھی جائے جو بہت ہی بہتر ہے۔ کاش لوگ اپنے حقیقی مفادات سمجھیں۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے اس عہد کو توڑنے کی ممانعت کو یہ کہہ کر مزید موکّد فرمایا: اور اللہ ﷻ کے عہد کے بدلہ میں تھوڑی قیمت نہ لو، یعنی تم کفار سے رشوت لے کر اسلام کی بیعت کر کے اس کو توڑ دیتے ہو، پس تم دنیا کے قلیل مال کے عوض عہد شکنی نہ کرو اور اسلام کی بیعت کر کے اس کو نہ توڑو کیونکہ مال دنیا خواہ کتنا زیادہ ہو وہ آخرت کے اجر و ثواب کے مقابلہ میں تھوڑا ہے کیونکہ دنیا کا مال فانی ہے اور اخروی اجر و ثواب باقی ہے اور باقی رہنے والی چیز فانی سے بہر حال افضل ہے۔

علمی بات: جن فوائد اور منافع کے پیش نظر لوگ عہد شکنی کر رہے ہیں۔ وہ ان لوگوں کی نظر میں بڑے اہم کیوں نہ ہوں۔ اللہ ﷻ کے نزدیک وہ فوائد اور منافع ان کے قول و قرار کی بہت ہی گھٹیا قیمت ہیں اور اتنی سستی قیمت پر مومن کو اپنا قول و قرار بیچتے ہوئے شرم آنی چاہیئے۔ اس آیت میں ان حکام اور فیصلہ کرنے والے لوگوں کو تنبیہ کی کہ لوگوں نے یہ منصب سنبھالتے ہوئے عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کا عہد کیا تھا اور اللہ ﷻ کی قسم اٹھائی تھی۔ اب لوگ اس کو سراسر پس پشت ڈال کر من مانیاں کر کے نفس و شیطان کی پیروی کر رہے ہیں۔ جس کی سزا انہیں بالآخر انہیں بھگتنا ہو گی۔

علمی بات: قریش کے لوگ کمزور مسلمانوں کو لالچ دیتے تھے کہ اگر وہ اسلام کو چھوڑ دیں گے تو وہ انہیں مال و متاع سے نوازیں گے، اللہ ﷻ نے ایسے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اللہ ﷻ کے ساتھ کیئے گئے عہد و پیمان اور رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر کی گئی بیعت کے بدلہ تم لوگ دنیا کی متاع حقیر کو قبول نہ کرو، اس کے بعد فرمایا کہ نصرت و فتح، مال غنیمت اور رزق کثیر اور آخرت میں جنت جیسی لازوال نعمت اس عارضی متاع سے زیادہ بہتر ہے جس کی قریش لالچ دیتے ہیں۔

مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ اللہ ﷻ کا یہ وعدہ ہر اس مسلمان کے لئے ہے جو کسی بھی زمانہ میں اپنے ایمان و اسلام پر ثابت قدم رہے گا اور دنیا کی حقیر فائدوں کی خاطر اپنے دین کو داؤ پر نہیں لگائے گا۔

آیت نمبر ۹۶: اس مال اور مفاد کی حقیقت کا بیان جو عہد شکنی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ مال اور فائدہ ختم اور فنا ہوجانے والا ہے۔ جب کہ آخرت کا اجر بہت بہتر، پائدار اور ابدی ہے۔

علمی بات: عہد شکنی، رشوت ستانی، چور بازاری اور دیگر ناجائز وسائل سے لوگ کتنا مال کیوں نہ اکھٹا کرلیں، وہ ختم ہونے والا اور فنا ہونے والا ہے۔ گویا ان کے پاس دنیا کی جو بھی نعمت ہے وہ ختم ہوجائے گی اور اللہ ﷻ کی جنت ہمیشہ باقی رہے گی۔ کیونکہ اللہ ﷻ کی رحمت کے خزانے بے پایاں ہیں وہ ختم نہیں ہوتے۔ لہٰذا وہ باقی کے بدلہ فانی کو کیوں پسند کر رہے ہیں۔ انہیں دنیا کے لالچ کے باعث رب کریم کو ناراض کرنے کی غلطی ہرگز نہیں کرنی چاہیئے۔ وہ انہیں اپنے خزانۂ غیب سے ایسی برکتیں مرحمت فرمائے گا جو ان کی ساری ضروریات کی کفیل بن جائیں گی۔

جو لوگ آج مشرکین کی اذیتوں پر صبر کریں گے اور اسلام پر ثابت قدم رہنے کے لئے تکلیفیں جھیلیں گے، اللہ ﷻ انہیں ان کے صبر و استقامت کا کئی گنا اچھا بدلہ عطا فرمائے گا جو کبھی ختم نہ ہوگا۔

آیت نمبر ۹۷: حیات طیبہ سے مراد دنیا کی پاکیزہ زندگی ہے۔ پاکیزہ زندگی میں حلال روزی، قناعت، سچی عزت، سکون و اطمینان اور اللہ ﷻ کی محبت شامل ہے۔ اخلاص سے نیکی کرنے والے مرد و عورت کو دنیا میں پاکیزہ زندگی اور آخرت میں بہترین اجر کی بشارت دی گئی ہے۔

علمی بات: اس آیت کریمہ میں ہر مسلمان (مرد و عورت) کو خوش خبری دی گئی ہے کہ ایمان لانے کے بعد جو کوئی بھی قرآن و سنت کے مطابق عمل کرے گا، تو اللہ ﷻ اسے اس دنیا میں راحت و سعادت اور وسیع رزق حلال عطا کرے گا اور قیامت کے دن اسے اس کے اعمال صالحہ کا کئی گنا بہتر بدلہ عطا فرمائے گا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ ﷻ کسی مومن پر ایک نیکی کے سلسلہ میں بھی ظلم نہیں کرے گا، بلکہ مومن کو دنیا میں نیکی کا عوض بھی دیا جاتا ہے اور آخرت میں ثواب بھی دیا جاتا ہے، رہا مسئلہ کافر کا تو اللہ ﷻ اسے اس کی نیکیوں کا بدلہ دنیا میں ہی چکا دیتا ہے، جب وہ آخرت تک پہنچتا ہے تو کوئی نیکی نہیں ہوتی کہ اسے بدلہ دیا جائے۔“ (مسند احمد)

آیت نمبر ۹۸: تلاوت قرآنِ حکیم کا ایک ادب تعوذ ہے۔ یعنی شیطان کے وسوسوں سے حفاظت کے لئے اللہ ﷻ کی پناہ طلب کرلی جائے۔ شیطان سیدھے راستہ پر بیٹھ کر گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

علمی بات: قرآنِ حکیم کی تلاوت کے آداب میں سے ایک یہ ہے کہ تلاوت شروع کرنے سے پہلے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم پڑھ لیا جائے۔ پناہ عموماً کسی نقصان دینے والی چیز یا دشمن سے درکار ہوتی ہے اور ایسی ہستی سے پناہ طلب کی جاتی ہے جو اس نقصان پہنچانے والی چیز یا دشمن سے زیادہ طاقتور ہو، شیطان چونکہ غیر محسوس طور پر تلاوت کرنے والے آدمی کی فکر پر اثر انداز ہوسکتا ہے اور تلاوت کے دوران اسے گمراہ کن وسوسوں اور کج فکری میں مبتلا کرسکتا ہے۔ لہٰذا شیطان کی اس وسوسہ اندازی سے اللہ ﷻ کی پناہ طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے جس کے آگے شیطان بالکل بے بس ہے۔ گویا یہ دعا دراصل قرآن حکیم سے صحیح رہنمائی حاصل کرنے کی دعا ہے۔ جبکہ شیطان کی انتہائی کوشش ہی یہ ہوتی ہے کہ کوئی شخص قرآنِ حکیم سے ہدایت نہ حاصل کرنے پائے۔

علمی بات: ایمان کی حقیقت اور اعمال صالحہ کے علم کا منبع قرآن ہی ہے۔ لہٰذا قرآن حکیم کی تلاوت بذات خود بہت بڑا اصالح عمل ہے۔ شیطان اس منبع علم سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ قرآن حکیم شیطان پر سب سے بھاری چیز ہے۔ شیطان کی اصل چال یہ ہے کہ انسان کو قرآن حکیم سے دور رکھے اور اسے قرآن حکیم نہ پڑھنے دے، اللہ ﷻ کا پیغام نہ وصول کرنے دے۔ اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ اول تو انسان قرآن حکیم ہی نہ پڑھے اور اگر پڑھے تو اسے سمجھنے ہی نہ پائے اور کچھ سمجھ میں آجائے تو پھر اس پر عمل نہ کرنے پائے۔ قرآنِ حکیم کو اس کی اصلی روشنی میں صرف وہی شخص دیکھ سکتا ہے جو شیطان کے گمراہ کن وسوسہ اندازیوں سے چوکنا ہو اور ان سے محفوظ رہنے کے لئے اللہ ﷻ سے پناہ مانگے۔ ورنہ شیطان کبھی آدمی کو اس قابل نہیں رہنے دیتا کہ وہ سیدھی طرح قرآن حکیم کو اور اس کی باتوں کو سمجھ سکے۔ اسی لئے شیطان سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔

علمی بات: پچھلی آیتوں میں نیک عمل کی فضیلت بیان فرمائی گئی تھی، چونکہ نیکی کے کاموں میں سب سے زیادہ خلل شیطان کے اثر سے پڑتا ہے، اس لئے اس آیت

میں اس کا یہ علاج بتایا گیا ہے کہ قرآن حکیم کی تلاوت سے پہلے شیطان مردود سے بچنے کے لئے اللہ ﷻ کی پناہ میں آیا جائے یعنی اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھا جائے۔ تلاوت قرآن حکیم کا ذکر خاص طور پر اس لئے فرمایا گیا ہے کہ قرآن حکیم ہی تمام نیک کاموں کی ہدایت دینے والا ہے، لیکن شیطان سے پناہ مانگنا صرف تلاوت ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، ہر نیک کام کے وقت پناہ مانگ لی جائے تو ان شاء اللہ شیطانی اثرات سے حفاظت رہے گی۔

آیت نمبر ۹۹: اللہ ﷻ ہی پر بھروسہ رکھنے والے کامل ایمان والوں پر شیطان کا داؤ نہیں چلتا۔

علمی بات: اس آیت میں بالواسطہ طور پر قرآن حکیم پر ایمان لانے والوں کے لئے ضمانت اور ایک تسلی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شیطان کے وساوس اور اس کی چالیں بہت شدید ہیں۔ اس کے مکروفریب، چالوں اور الجھاؤں سے بچنا آسان نہیں لیکن جو لوگ ایمان لائے اور اللہ ﷻ پر توکل و بھروسہ کرتے ہیں شیطان ان پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا، چنانچہ وقتی طور پر اگر وہ اس کے وسوسہ کا شکار ہو جائیں تو جونہی انہیں احساس ہوتا ہے تو فوراً اللہ ﷻ کی پناہ مانگنا شروع کر دیتے ہیں، البتہ ان لوگوں پر شیطان کا پورا غلبہ ہو جاتا ہے جو خود شیطان کو دوست بناتے ہیں اور اس کے بہکانے پر اللہ ﷻ نافرمانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اللہ ﷻ نے شیطان کو اتنی قدرت نہیں دی کہ وہ انسان کو مجبور کر دے بلکہ انسان خود اپنی غفلت اور نفسانی خواہشات کی وجہ سے شیطان کی پیروی کرتا ہے۔

علمی بات: اس سے پہلی والی آیت میں تعوُّذ کا حکم دیا تھا جس سے یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ شیطان کو اہل ایمان پر کوئی تسلط حاصل ہے اس خیال کی نفی اس آیت میں کر دی ہے۔ مومن لوگ اللہ ﷻ سے استعاذہ اس لئے کرتے ہیں کہ ان کا بھروسہ اپنے رب پر ہی ہوتا ہے اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اسی کی پناہ میں دے دیتے ہیں۔ اللہ ﷻ کی طرف رجوع اور اسی پر بھروسہ رکھنا مومن مخلص لوگوں کا خصوصی وصف ہے جو ہر مومن کے ساتھ ہر وقت رہتا ہے۔ زبان سے تعوذ کرنے کا حکم تو سنت دعا کی تکمیل کے لئے ہے تاکہ ظاہر بھی باطن کے موافق ہو جائے اور شیطان سے پوری پوری امان حاصل ہو جائے۔

عملی پہلو: صاحب ایمان لوگوں کو اطمینان رکھنا چاہیئے کہ جن کے پاس حقیقی ایمان کی قوت ہے اور وہ یقین کی قوت سے اللہ ﷻ کو مانتے ہیں۔ مزید یہ کہ وہ ہر حال میں عملاً اور ذہناً اللہ ﷻ ہی پر توکل کرتے ہیں۔ شیطان اپنی ساری کوششوں کے باوجود ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ ہاں جو لوگ دعویٰ ایمان کا تو کرتے ہیں لیکن بھروسہ انہیں شیطان پر ہے۔ ان کے قلبی رشتے شیطانی قوتوں سے استوار رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ انہیں اللہ ﷻ کی پناہ نصیب ہو گی یا نہیں، کیونکہ جو شخص اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ اور اس کے دین کے بارے میں یکسو نہیں ہوتا، اللہ ﷻ کی رحمت بھی اس کے لئے اپنا دروازہ نہیں کھولتی۔

آیت نمبر ۱۰۰: شیطان کا تسلط ان ہی پر ہوتا ہے جو اس سے دوستی رکھتے ہیں۔ مراد وہ لوگ جو رحمٰن کی یاد کو فراموش کر دیتے ہیں ایسے لوگ شیطان کی دوستی کے نتیجہ میں شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہی بات سورۃ الزخرف ۴۳، آیت: ۳۶ میں بیان ہوئی ہے: "اور جو رحمٰن کے ذکر سے (غافل ہو کر) اندھا بن جائے، ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں تو وہ اس کا ساتھی ہو جاتا ہے۔"

علمی و عملی بات: شیطان کا زور انہی لوگوں پر چلتا ہے جو شیطان سے دوستی کرتے ہیں۔ جو لوگ کافر و مشرک نہیں لیکن شیطان کی بات مانتے ہیں اس کی پیروی کرتے ہیں وہ بھی اس کے دوست ہیں جب شیطان کوئی وسوسہ ڈالے تو بندہ کو چاہیئے کہ اس وسوسے کو آگے نہ بڑھنے دے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھ کر اللہ ﷻ کے ذکر میں لگ جائے یا کوئی دوسرا کام شروع کر دے، اگر شیطان کے وسوسہ کے ساتھ چلتا رہا تو وسوسوں میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا اور کبھی بھی جان نہ چھوٹے گی، وضو میں وسوسہ ڈالے گا، ایمان میں شک ڈالے گا، نماز خراب کر دے گا وغیرہ۔

آیت نمبر ۱۰۱: نبوت پر کفار اور مشرکین کے شبہات کی تردید کی گئی ہے۔ اللہ ﷻ کی طرف سے قرآنِ حکیم کے کسی حکم میں تبدیلی کیئے جانے پر مشرکین رسول اللہ ﷺ پر یہ اعتراض کرتے کہ یہ اللہ ﷻ کا کلام نہیں بلکہ اس قرآن کو انہوں نے خود گھڑ لیا ہے (معاذ اللہ)۔ ان کا یہ بہتان درحقیقت جہالت پر مبنی ہے۔ اللہ ﷻ کی ذات حکیم ہے۔ وہ اپنی حکمت کاملہ پر مبنی احکامات عطا فرماتا ہے۔ تبدیلی احکام کی اصل وجہ لوگوں کے استعداد، عدم استعداد، تدریج اور حالات کے تقاضے ہوتے ہیں۔

علمی بات: قرآنِ حکیم کا نزول اللہ ﷻ کی حکمت اور مشیت کے عین مطابق ہوا۔ اگر کوئی مخصوص حکم کسی ایک دور کے لئے تھا اور پھر بدلے ہوئے حالات میں اس حکم میں تبدیلی کی ضرورت تھی تو یہ سب کچھ اللہ ﷻ کے علم کے مطابق ہوا۔ کسی خاص ضرورت اور حکمت کے تحت ہی کسی حکم میں تبدیلی کی جاتی تھی۔ مگر ایسی تبدیلی کو دیکھتے ہوئے پہلے یوں کہا گیا تھا اب اسے بدل کر یوں کہہ رہے ہیں؟ اگر یہ اللہ ﷻ کا کلام ہوتا تو اس میں اس طرح کی تبدیلی کیسے ممکن تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی اکثریت علم سے عاری ہے۔

علمی بات: بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ سے مراد چند مطالب یہ ہو سکتے ہیں:

۱۔ اکثر کا فر احکام کی مصلحت نہیں جانتے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اکثر کافر اہل علم و تمیز نہیں ہیں۔ اگر ان کو امتیاز ہوتا تو پہچان لیتے کہ قرآن حکیم ایسا کلام نہیں کہ کوئی انسان خود بنا سکے اور سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ایسے انسان نہیں ہیں کہ وہ (معاذ اللہ) بہتان تراشی کریں۔

۲۔ ان ہی میں سے اکثر لوگ اس بات سے بے خبر ہیں کہ اللہ ﷻ اپنے بندوں کو ان ہی کاموں کا حکم دیتا ہے جن میں ان کے لئے مصلحت اور بھلائی ہوتی ہے۔

۳۔ انہیں پہلی شریعتوں کا علم نہیں۔ اگر ہوتا تو سمجھ لیتے کہ اللہ ﷻ کا ہمیشہ سے یہ قاعدہ رہا ہے کہ وہ ایک حکم اتارتا ہے اور پھر جب چاہتا ہے اسے مسنوخ کر کے دوسرا حکم دے دیتا ہے۔ احکام کی تبدیلی میں جو حکمتیں ہیں ان میں تو یہ لوگ غور کرتے نہیں اور اعتراض کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کفار کا مقصد تحقیق حق تو تھا ہی نہیں تا کہ وہ اپنے قول کی معقولیت اور عدم معقولیت کے متعلق سوچنے کی زحمت گوارا کرتے بلکہ ان کے پیش نظر اعتراض برائے اعتراض تھا۔

آیت نمبر ۱۰۲: روح القدس سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں جن کے ذریعہ قرآنِ حکیم رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک پر نازل فرمایا گیا۔ قرآنِ حکیم سے اہل ایمان میں ثابت قدمی اور ان کے ایمان میں پختگی واقع ہوتی ہے۔ قرآنِ حکیم اہل ایمان کے لئے ہدایت اور بشارت کا ذریعہ ہے۔

علمی بات: جس بے باکی سے کفار نے زبان درازی کی اسی قوت سے ان کا رد کیا جا رہا ہے۔ فرمایا کہ اسے لیکر روح القدس (جبرائیل علیہ السلام) اترا ہے اور آپ ﷺ کے پروردگار کے پاس سے لیکر آیا ہے اور حق کے ساتھ لایا ہے جو کلام سراپا حق ہو۔ جس میں باطل کی ذرا آمیزش نہ ہو اور اس کو بھیجنے والا خود آپ ﷺ کا رب ہو اور لانے والا ایک مقدس و مقرب فرشتہ جو تمام فرشتوں کا سردار ہو جو ہر قسم کی انسانی کمزوریوں سے یکسر پاک ہو نہ وہ نسیان کا مریض ہو کہ بھولنے کا امکان ہو نہ اس کی کوئی ذاتی غرض اور مقصد ہو جس کی وجہ سے وہ اس میں ردو بدل کا خواہاں ہو اور نہ وہ بد دیانت اور خائن ہو تو پھر اس کے لائے ہوئے کلام کو ماننے میں تامل کرنا اور اسے مَن گھڑت اور جھوٹا کہنا ایک انتہائی درجہ کے نادان کا کام ہی ہو سکتا ہے۔

علمی بات: اس آیت میں مشرکوں کا قول رد کرتے ہوئے اللہ ﷻ نے فرمایا کہ اے نبی ﷺ! ان کفار سے فرما دیجئے کہ قرآن حکیم کی ساری آیتیں حضرت روح القدس (جبرائیل علیہ السلام) نے اللہ ﷻ کی طرف سے حق کے ساتھ نازل فرمائی ہیں۔ اس میں کوئی ناسخ ہو یا منسوخ، سب اسی پاک پروردگار عالم کی طرف سے ہیں۔ جو لوگ صاحب ایمان ہیں اللہ ﷻ اور رسول اللہ ﷺ پر ان کا پکا عقیدہ ہے وہ ہر ایک آیت پر ثابت قدم ہیں اور جانتے ہیں کہ قرآن حکیم اللہ ﷻ کا کلام ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ اللہ ﷻ کے سچے پیغمبر ہیں۔ اللہ ﷻ کی طرف سے جیسا پیغام آتا ہے یہ اس کو پہنچا دیتے ہیں۔ اس ثابت قدمی کے سبب یہ صاحب ایمان لوگ روز بروز ہدایت پاتے رہتے ہیں اور نئی آیتوں سے نئی نئی بشارت ان کو آخرت کے واسطے پہنچتی رہتی ہے۔

آیت نمبر ۱۰۳: مشرکین مکہ کا ایک اعتراض یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ آپ (ﷺ) اس قرآنِ حکیم کو اللہ ﷻ کی جانب سے نہیں بلکہ کسی شخص سے سیکھ کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں (معاذ اللہ)۔ ان کے اس بہتان کا جواب دیا گیا ہے کہ جس شخص کی طرف یہ قرآنِ حکیم کو منسوب کرتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے جب کہ قرآنِ حکیم کی زبان صاف عربی ہے۔

علمی بات: مشرکین مکہ کہتے تھے کہ یہ قرآن حکیم اللہ ﷻ کی طرف سے نازل کردہ نہیں ہے، بلکہ محمد (ﷺ) کسی آدمی سے سیکھ کر لوگوں کو سناتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ ان پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے۔ (معاذ اللہ)

علمی بات: جب انسان بوکھلا جاتا ہے تو معقولیت کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ جب قرآن حکیم کے متعلق ان کے تمام شبہات کا جواب دے دیا گیا اور ان کو اس جیسی کتاب، نہیں تو اس کی چھوٹی سی سورت کی مانند سورت کے بنانے کے چیلنج نے جب ان کے لبوں پر مہر خاموشی ثبت کر دی تو کہنے لگے ان کو کوئی سکھاتا ہے اور یہ سیکھ کر بیان کرتے ہیں (معاذ اللہ)۔ جس شخص کے بارے میں مشرکین یہ کہتے ہیں کہ وہ آپ (ﷺ) کو قرآن حکیم سکھاتا ہے اس کی تعین میں مفسرین کی آراء مختلف ہیں۔ بعض نے چند مختلف نصرانی عجمی غلاموں کا ذکر کیا ہے جو لوہار تھے اور تلواریں بناتے تھے۔ حضور ﷺ ان کے پاس سے کبھی گزرتے تھے تو یہ لوگ انجیل کی ایک دو باتیں ذکر کیا کرتے تھے۔ کفار ان باتوں کو بنیاد بنا کر اعتراض کرتے تھے۔

اللہ ﷻ نے ان کے جواب میں فرمایا کہ: جس شخص کی طرف یہ منکرین نسبت کرتے ہیں کہ وہ آپ (ﷺ) کو قرآن حکیم سکھاتا ہے، وہ تو عجمی آدمی ہے۔ وہ تو خود عربی زبان میں گفتگو بھی نہیں کر سکتا وہ کسی کو کیا سکھائے گا۔ قرآن حکیم تو نہایت فصیح و بلیغ عربی زبان میں ہے کوئی عجمی اس کی تعلیم کیسے دے سکتا ہے۔ اگر مشرکوں کو ذرا سی بھی عقل ہوتی تو وہ ایسا جھوٹ کبھی نہ بولتے۔ جس پر کوئی بیوقوف آدمی بھی یقین نہ کرے۔

حسن اتفاق ملاحظہ ہو کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کی مادری زبان عربی ہو، سارے عجمی تھے اور سارے غلام تھے اور ان میں سے اکثر حضور ﷺ کے حلقہ بگوش ہو چکے تھے۔ ان کے کافر آقا ان پر سخت ظلم کرتے لیکن ان کے پاؤں نہ ڈگمگاتے۔ اگر یہ معلم ہوتے، اگر یہ قرآن حکیم سکھانے والے ہوتے تو انہیں حضور ﷺ پر ایمان لا کر اپنے آپ کو سنگدل آقاؤں کے ظلم و ستم کا ہدف بننے کی کیا ضرورت تھی۔ نیز اگر کسی سے حضور ﷺ سیکھتے تھے تو وہ کوئی ایک ہی ہو گا، کفار کا مختلف لوگوں کے نام لینا ان کے جھوٹے ہونے کی صریح نشانی تھی۔ سب سے بڑی دلیل ان کے جھوٹے ہونے کی یہ تھی کہ جسے قرآن حکیم نے ذکر فرما دیا ہے کہ تم جو لغت عربی کے امام ہو اور فصاحت و بلاغت کے دعویدار ہو تو تم تو آج تک اس جیسی ایک چھوٹی سی سورت بھی نہ بنا سکے۔ یہ عجمی غلام جنہیں صبح سے لیکر شام تک اپنے دھندے سے فرصت نہیں ملتی، وہ اتنے ماہر کہاں سے آ گئے کہ ایسا فصیح و بلیغ کلام سکھا سکیں جس کے ہر جملہ میں علم و حکمت کے سمندر موجزن ہیں۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک عجمی آدمی اعلیٰ عربی زبان میں ایسی حکمت کی باتیں کرے اور آپ ﷺ کو ان کی تعلیم دے۔ مزید بر آں یہ اتنا اعلیٰ کلام ہے جس کی مثال مشرکین کے فصیح و بلیغ افراد بھی پیش نہیں کر سکتے تو یہ شخص خود ہی یہ کلام پیش کیوں نہ کر دیتا بجائے اس کے کہ وہ نبی کریم ﷺ کو سکھاتا اور وہ پیش کرتے اور اس کے مثل لانے کا چیلنج دیتے۔

آیت نمبر ۱۰۴: ایسا بہتان وہ لوگ باندھتے ہیں جو اللہ ﷻ کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے۔ وجہ ضد اور ہٹ دھرمی ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کی دنیا میں رہنمائی نہیں کی جاتی ہے اور قیامت کے دن ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

علمی بات: کھلے دلائل کے باوجود جو شخص یہی بات دل میں ٹھان لے کہ یقین نہیں کروں گا، اللہ ﷻ بھی اس کو مقصد پر پہنچنے کی راہ نہیں دیتا۔ جتنا سمجھایئے کبھی نہ سمجھے گا۔ بد اعتقاد آدمی ہدایت سے محروم رہ کر آخرت میں سخت سزا کا مستحق ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی طرف افترا پردازی کی نسبت کی تردید کرنے کے بعد کہا جا رہا ہے کہ جو لوگ اللہ ﷻ کی آیتوں کی تصدیق نہیں کرتے، اللہ ﷻ حق کی طرف ان کی رہنمائی نہیں فرماتا، آخرت میں انہیں دردناک عذاب ملے گا۔ نبی کریم ﷺ کی صداقت کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا کہ جھوٹ وہ لوگ بولتے ہیں جو اللہ ﷻ کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے۔ اس سے بڑھ کر جھوٹ کیا ہو سکتا ہے؟ کہ وہ اللہ ﷻ کی آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ تو مومنوں کے سردار ہیں اور سب سے سچے، سب سے نیک اور ایمان و عمل کے اعتبار سے سب سے اچھے اور بہترین اُسوۂ حسنہ رکھنے والے انسان ہیں، وہ کیسے جھوٹ بول سکتے ہیں؟

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی طویل روایت میں ہے کہ شاہ ہرقل نے جب ابو سفیان رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ کی نسبت بہت سے سوالات کیئے تو ان میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ نبوت کے دعویٰ سے پہلے تم نے اس شخص کو کبھی جھوٹ بولتے پایا ہے؟ ابو سفیان نے جواب دیا، کبھی نہیں۔ اسی پر شاہ روم نے کہا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک وہ شخص جس نے دنیاوی معاملات میں لوگوں کے بارے میں کبھی جھوٹ نہ بولا ہو، لیکن وہ اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھنے لگے؟

(صحیح بخاری، صحیح مسلم)

آیت نمبر ۱۰۵: قرآنِ حکیم کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے کے منکر جھوٹے ہیں۔ در حقیقت جھوٹ بولنا خود کفار کی بُری صفت ہے۔

علمی بات: کفار نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جھوٹا ہونے کا الزام لگانے کی گستاخی کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَن گھڑت باتیں کرنا اور بہتان باندھنا تو کفار کا شیوہ اور عادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے محبوب کا مقام تو بڑا بلند ہے۔ اس کے غلام بھی جھوٹ اور غلط بیانی سے اپنی زبان آلودہ نہیں کرتے۔

علمی بات: اس آیت میں مشرکین کا رد ہے، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف افترا کی نسبت کرتے تھے کہ ایک عجمی شخص سے کلام سیکھ کر یہ جھوٹ بولتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے (معاذ اللہ)۔ حالانکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو الصادق الامین کہتے تھے، پھر بھی ان ظالموں نے یہ کہا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھتے ہیں (معاذ اللہ)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بہتان تو وہی لوگ باندھتے ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے، یہ آیت اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ جھوٹا وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتا، کیونکہ سب سے بڑا جھوٹ اور بہتان اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دینا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنا ہے۔

آیت نمبر ۱۰۶: ایمان لانے کے بعد اگر کسی شخص پر ایسی صورت ہو کہ وہ انتہائی مجبوری کی کیفیت میں ہو۔ جان بچانے کی کوئی راہ نہ رکھتا ہو شدید مجبور ہو کہ جان ہی چلی جائے تو ایسی صورت میں جان بچانے کے لئے صرف زبان سے کلمۂ کفر کہہ دینے کی رخصت اور اجازت ہے۔ تاہم شرط یہ ہے کہ دل ہر حال میں ایمان سے سرشار اور لبریز ہو۔ یعنی دل ایمان پر مضبوطی سے قائم ہو۔ البتہ محض دنیاوی مفاد کی خاطر اپنے اختیار سے بغیر کسی جبر کے کلمۂ کفر کہنے والا اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کے غضب کا مستحق ہے۔

شانِ نزول: یہ آیت حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کے حق میں نازل ہوئی۔ ایک دفعہ قریش نے آپ رضی اللہ عنہ کو، آپ کے والد حضرت یاسر رضی اللہ عنہ اور آپ کی والدہ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو پکڑا اور اسلام چھوڑنے پر مجبور کیا مگر تینوں نے انکار کر دیا۔ انہوں نے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو دو اونٹوں سے باندھ دیا اور انہیں مخالف سمتوں میں دوڑا کر انتہائی بے دردی اور اذیت کے ساتھ شہید کیا۔ یہ اسلام کی پہلی شہیدہ ہیں، پھر انہوں نے حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کو بھی سخت تکلیفیں پہنچا کر بے دردی سے شہید کر دیا۔ یہ تاریخ اسلامی کے دوسرے شہید ہیں، پھر انہوں نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو کلماتِ کفر کہنے پر مجبور کیا جو آپ نے با دل نخواستہ زبان سے کہہ دیئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا گیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! عمار تو کافر ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”ہرگز نہیں!“ عمار تو سر سے لے کر قدموں تک ایمان سے لبریز ہے، اسلام اس کے خون اور گوشت میں سرایت کیئے ہوئے ہے۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ وہاں سے چھٹکارا پا کر روتے ہوئے بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوئے اور سارا ماجرا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عرض کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: اُس وقت تمہارے دل کی کیفیت کیا تھی؟ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! وہ تو ایمان کے ساتھ مطمئن تھا۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگے اور فرمایا: ”اگر وہ دوبارہ تمہیں مجبور کر کے کفر کہلوانا چاہیں تو تم دوبارہ کہہ دینا۔“ (مستدرک حاکم)

مجبوری میں کلمہ کفر کہنا: اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ جس شخص کو کفر پر مجبور کیا جائے حتیٰ کہ اسے جان کا خطرہ لاحق ہو جائے تو وہ اگر زبان سے کفر کی بات کہہ دے جبکہ اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا، نہ اس کی بیوی اس سے جدا ہو گی اور نہ ہی وہ کافر ہو گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”عمار نے اگرچہ زبان سے کلمہ کفر کہا لیکن اس کا دل ایمان سے بھرا ہوا ہے غرض جس کے دل میں ایمان ہو اور اس پر کفر کا کلمہ کہنے کے لئے ظلم کیا جائے اور اس کی جان اس وقت خطرہ میں ہو تو اس کو جائز ہے کہ جان بچانے کے لئے زبان سے کلمہ کفر اگر چاہے تو کہہ دے اور نہیں کہنا تو بہر حال اولیٰ ہے کیونکہ جو شخص اس حالت میں قتل کیا جاتا ہے وہ درجہ شہادت پاتا ہے۔“ (سنن نسائی)

فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے میری امت سے خطاء، نسیان اور اس کام کے حکم کو اٹھا لیا ہے جس پر انہیں مجبور کیا گیا ہو۔“ (سنن ابن ماجہ)

علمی بات: مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ جان بچانے کے لئے کلمہ کفر کہنے کی اجازت تو ہے لیکن افضل، بہتر اور عزیمت کی بات یہ ہے کہ وہ کلمہ کفر نہ کہے اگرچہ جان چلی جائے۔ جیسے حضرت یاسر رضی اللہ عنہ اور حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا نے عزیمت کی راہ اختیار کی۔

مرتد کی تعریف: جو شخص پہلے مسلمان ہو اور بعد میں اسلام کا عقیدہ چھوڑ کر کفر اپنالے اسے مرتد کہتے ہیں۔

مرتد کی سزا: علماء کرام بیان کرتے ہیں کہ جب کوئی مسلمان مرتد ہو جائے تو اس پر پھر اسلام پیش کیا جائے اور اسلام کے خلاف جو اس کے شبہات ہیں ان کو زائل کیا جائے۔ اسلامی حکمران کو چاہیئے کہ وہ مرتد کو تین دنوں کی مہلت دے۔ تاکہ وہ اسلام اور اپنے مستقبل کے بارے میں اچھی طرح غور و فکر کرلے لیکن پھر بھی اگر وہ توبہ نہ کرے تو اس کی سزا قتل ہے۔ علماء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جس کا مرتد ہونا ثابت ہو جائے اس کو قتل کرنا واجب ہے۔ البتہ عورتیں اگر مرتد ہو جائیں تو انہیں قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ انہیں قید کیا جائے گا اور انہیں دوبارہ اسلام کی دعوت دی جائے گی۔ جب کہ بعض علماء کرام کی رائے یہ ہے کہ عورتوں کو بھی قتل کیا جائے گا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ مرتد کو قتل کرنے کا حق صرف اسلامی حکمران کو حاصل ہے۔ یعنی مرتد کی سزا کا فیصلہ اور اس پر عمل درآمد اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے، کسی کو انفرادی طور پر قانون کو ہاتھ میں لینے کی اجازت قطعاً نہیں۔

مرتد کی سزا کی وجوہات: ا۔ دنیا کے ہر مہذب ملک میں فکری آزادی کی اجازت ہے مگر اس کی ایک حد ہے، اگر کوئی شخص کسی حکومت کے خلاف بغاوت کی بات کرے تو کوئی حکومت ایسی فکری آزادی برداشت نہیں کرتی بلکہ اسے باغی اور غدار قرار دے کر سخت سزا دیتی ہے۔ اسی طرح اسلامی حکومت ہمیشہ اسلامی نظریہ کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے اور جو مسلمان اسلامی نظریہ سے بغاوت کرے وہ دراصل اسلامی حکومت کا باغی اور غدار ہے، لہٰذا وہ بھی سخت ترین سزا کا مستحق ہے لیکن جو شخص اسلامی حکومت کے بنیادی نظریہ پر ایمان ہی نہیں رکھتا یعنی مسلمان ہی نہیں بلکہ ذمیؔ کے طور پر اسلامی حکومت میں آباد ہے، وہ اگر اسلام یا کوئی اور مذہب قبول کرے گا تو وہ اسلامی حکومت کا باغی نہیں ہو گا، لہٰذا وہ کسی سزا کا مستحق نہیں ہے۔

۲۔ قرآن حکیم میں کافر کو مسلمان بنانے کے لئے جبر کی اجازت نہیں ہے، لہٰذا اسلامی حکومت میں کافر کو اپنے کفر پر قائم رہنے کی اجازت ہے لیکن جب وہ اسلام قبول کرے گا تو پھر اسے اسلامی حکومت میں رہتے ہوئے اسلام کو چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے اور اگر وہ اسلام چھوڑے گا تو اس کی سزا قتل ہے، لہٰذا وہ اسلام کو قبول کرنے اور اسلام کو چھوڑنے سے پہلے اسلامی حکومت کے اس بنیادی ضابطہ پر اچھی طرح غور و فکر کرلے۔

ان آیات میں ان لوگوں کے لئے وعید سنائی جارہی ہے جو اسلام قبول کرنے کے بعد کسی عارضی تکلیف و مصیبت کی وجہ سے دوبارہ کفر کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ اس حکم سے ان لوگوں کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے جو ظلم و ستم سے تنگ آکر جان بچانے کے لئے کفر کا کوئی کلمہ اپنی زبان پر لے آتے ہیں، لیکن دل سے کفر کو قبول نہیں کرتے۔ جو لوگ دل سے دوبارہ کفر کو قبول کر لیتے ہیں اللہ ﷻ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ ان پر اللہ ﷻ کا غضب ہو گا اور قیامت کے دن بڑے عذاب میں مبتلا کیئے جائیں گے۔ اس لئے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی۔ کفر کی راہ اختیار کر لینے کی وجہ سے اللہ ﷻ انہیں ہدایت بھی نہیں دے گا اور ان کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مہر لگا دے گا۔ انہیں غفلت میں مبتلا کر دے گا اور ان پر خیر و اصلاح کے سارے دروازے بند کر دے گا۔ یہ یاد رہے کہ دنیا میں مومن کی حیثیت تاجر کی سی ہے جو اپنی نیکیوں کے ذریعہ سے آخرت کی سعادت خرید تا ہے، لیکن جب کسی انسان میں محرومی کے مذکورہ بالا اسباب جمع ہو جائیں تو اسے خسارے کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ اسی لئے اللہ ﷻ نے آخری آیت میں فرمایا کہ آخرت میں درحقیقت یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں۔

آیت نمبر ۱۰۷: ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرنے کی وجہ دنیا کی محبت میں گرفتار ہو کر اللہ ﷻ اور آخرت کو فراموش کر دینا ہے اور اللہ ﷻ کے یہاں ہٹ دھرم کفار ہدایت کے قابل ہی نہیں۔

علمی بات: اس عذاب اور غضب الٰہی کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے آخرت کے مقابلہ میں دنیوی زندگی کو عزیز رکھا اور دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں ترجیح دی اور نیز اس وجہ سے کہ اللہ ﷻ ایسے کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ یعنی جو دنیا کو آخرت پر ترجیح دیں اور کفر پر اصرار کریں اور ایمان لانے کے بعد پھر شرح صدر کے ساتھ مرتد ہو جائیں۔

علمی بات: ان کے لئے عذاب عظیم اس لئے ہوگا کہ انہوں نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو ترجیح دی ہے۔ حب دنیا اور دنیا پرستی تمام جرائم کی بنیاد ہے۔ اللہ ﷻ کافروں کو اتمام حجت کے بعد کفر پر ڈٹ جانے کی وجہ سے ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے، ہدایت نہیں دیتا۔ جب وہ خود اپنے اختیار سے ایمان نہیں لاتے تو اللہ ﷻ بالجبر ہدایت نہیں دیتا۔

تمام قوانین میں بغاوت کی سزا سنگین ہوتی ہے کیونکہ بغاوت سنگین جرم ہے۔ خصوصاً عہد و پیمان کے بعد۔ اس آیت میں اسلام سے بغاوت کرنے والوں کے لئے یہ سزا ہے کہ ان کو اللہ ﷻ ہدایت سے نہیں نوازتا۔

علمی بات: محض دنیا کی محبت ممنوع نہیں۔ جبکہ وہ جائز حدود کے اندر ہو۔ بلکہ ممنوع اور مذموم دراصل دنیا کی وہ محبت ہے جو آخرت کے مقابلہ میں اور اس کی قیمت پر ہو۔ ورنہ جو دنیا بقدرِ ضرورت اور دین و ایمان کے تقاضوں کے مطابق اور دینی خوشنودی کا حصول ہو وہ ممنوع نہیں۔ بلکہ وہ تو ایک حد تک مطلوب و محمود ہے کہ وہ در حقیقت آخرت کی کمائی کا ذریعہ ہے۔ اس لئے وہ حقیقت میں دنیا نہیں، آخرت ہی ہے کہ وہ آخرت کا ذریعہ و وسیلہ ہے۔ دنیا کی مذمت اس صورت میں ہے جبکہ وہ آخرت سے غفلت کا باعث بنے۔

علمی بات: یہ اللہ ﷻ کا دستور اور اس کی سنت ہے کہ اللہ ﷻ ہدایت کی دولت سے ایسے کافروں، نافرمانوں، ناشکروں کو نہیں نوازتا جو حق و ہدایت کا نور چاہتے ہی نہ ہوں۔ تو ایسوں کو ہدایت و ایمان کی دولت ملے تو کیسے اور کیونکر؟ جب کہ دولت ہدایت سے سرفرازی و فیضیابی کے لئے اولین شرط طلبِ صادق ہے۔ پس ایسے کافر و منکر جو اپنے کفر و باطل پر اَڑے ہوئے ہوں، وہ حق و ہدایت کی دولت سے سرفراز نہیں ہو سکتے اور وہ ہمیشہ کفر و باطل کے اندھیروں میں ہی بھٹکتے ہی رہتے ہیں اور اپنی اس محرومی کا سبب اور باعث ایسے لوگ خود ہیں کہ انہوں نے دیدہ دانستہ راہ حق و ہدایت سے منہ موڑ کر اپنے آپ کو ہلاکت و تباہی کے ہولناک گڑھے میں ڈالا ہے۔ پس طلبِ صادق وسیلہ سرفرازی اور ذریعہ نجات ہے اور اس سے محرومی محروموں کی محرومی ہے۔ اس سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کے بناؤ اور بگاڑ کا اصل تعلق اس کے اپنے قلب و باطن کی دنیا سے ہے۔ اگر دل اصلاح احوال چاہتا ہی نہیں، ہدایت کا طالب نہیں، راہِ حق کی طرف آنا ہی نہیں چاہتا تو اللہ ﷻ بھی اسے ہدایت کی راہ پر گامزن نہیں کرتا۔

آیت نمبر ۱۰۸: ایمان نہ لانے والے یا ایمان لا کر مرتد ہونے والوں کا دنیا میں انجام بیان کیا گیا ہے۔ ان کے دلوں کانوں اور آنکھوں پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ نہ حق سنتے ہیں، نہ سمجھتے ہیں اور نہ وہ نشانیاں دیکھتے ہیں جو انہیں حق کی جانب لے جانے والی ہیں۔ نفس کی خواہشات پر چلنے والے اللہ ﷻ اور آخرت سے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

علمی بات: ان کے دلوں پر مہر لگانے سے مراد یہ ہے کہ اللہ ﷻ اس شخص کو اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے اور جس کو اللہ ﷻ اپنے حال پر چھوڑ دے وہ گمراہی کی تاریکیوں میں چلا جاتا ہے۔ آیت میں مہر لگانے کا سبب ان کے آخرت کے مقابلہ میں حب دنیا کو قرار دیا ہے۔ اس سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ دنیا پرستی سے انسان کے شعور و ادراک پر پردہ پڑ جاتا ہے۔

علمی بات: ہٹ دھرموں کے دل و دماغ پر مہر لگ جانے سے ان کے دل و دماغ ماؤف اور ان کے کان و آنکھ وغیرہ بند ہو جاتے ہیں۔ پس نہ یہ حق بات سن سکتے ہیں نہ حق کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی حق بات ان کو سمجھ آسکتی ہے۔ اس طرح یہ لوگ محرومی در محرومی کا شکار اور خسارے پر خسارے میں مبتلا ہیں۔ مگر یہ بدنصیب ہیں کہ ان کو اس کا احساس تک نہیں۔ ایسے لوگ جو ایمان کی روشنی دیکھ لینے کے بعد محض دنیوی مفادات کی خاطر جانتے بوجھتے اس سے منہ پھیر لیتے ہیں اور آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ اس لئے ایسے لوگ اللہ ﷻ کے قانون اور اس کی سنت کی زد میں آجاتے ہیں۔ ان کے کانوں، آنکھوں اور دلوں، پر ایسے مہر کر دی جاتی ہے کہ پھر یہ لوگ ہدایت کی توفیق سے بالکل محروم ہو جاتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں وہ اس ہولناک خسارے میں مبتلا ہو جاتے ہیں جو سب سے بڑا اور انتہائی ہولناک خسارہ ہے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

علمی بات: یہی لوگ ہیں جو غافل و بے خبر ہیں اپنے حال سے۔ یہ لوگ اس دائمی ناکامی اور ابدی خسارہ کی طرف رواں دواں ہیں جس کے خاتمہ اور اس سے نجات و رہائی کی پھر کوئی صورت ان کے لئے ممکن نہیں رہتی کہ اس کا موقع دنیاوی زندگی کی اس فرصت محدود ہی میں تھا۔ جس کو انہوں نے ضائع کر دیا۔ غفلت اور بے خبری اور اپنے انجام اور آخرت سے بے فکری ولاپرواہی دراصل بیماریوں کی بیماری اور دائمی ہلاکت وتباہی کی جڑ اور بنیاد ہے۔ العیاذ باللہ العظیم۔ ایسے لوگ نہ خود حق اور حقیقت کے بارے میں غور وفکر سے کام لیتے ہیں اور نہ کسی دوسرے خیر خواہ کی بات پر توجہ کرتے ہیں۔

آیت نمبر ۱۰۹: یہ بات یقینی ہے کہ کفار آخرت میں بھی ضرور سزا پائیں گے اور خسارہ میں ہوں گے۔

علمی بات: یہی لوگ ہیں جو آخرت میں سراسر خسارہ میں ہوں گے۔ کیونکہ انسان کی مثال اس دنیا میں دراصل اس تاجر کی سی ہے جو نفع کمانے کے لئے شہر اور بازار کارخ کرتا ہے اور اپنا مال کاروبار میں لگاتا ہے۔ اگر صحیح تجارت کا موقع مل گیا اور صحیح طریقہ سے کام کیا تو نفع کمالائے گا اور ایک کے بدلہ میں کئی گنا حاصل کرے گا۔ ورنہ وہ خسارے سے دوچار ہوگا اور اپنا اصل سرمایہ بھی گنوا بیٹھے گا۔

عملی بات: جو لوگ آخرت کی زندگی اور اس کے تقاضوں سے منہ موڑ کر صرف دنیا کے وقتی فائدوں اور اس کی عارضی لذتوں کو ہی اپنا مقصود بنالیتے ہیں اور وہ انہی کے لئے جیتے اور انہی کے لئے مرتے ہیں۔ وہی ہیں جن کے لئے آخرت کا وہ ہولناک خسارہ ہے جس جیسا دوسرا کوئی خسارہ نہیں ہوسکتا اور جس کے تدارک کی پھر کوئی صورت ممکن نہیں ہوگی۔ خسارہ میں تو ایسے لوگ آج بھی پڑے ہیں لیکن آج اُن پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے لوگ اس کو سمجھ نہیں سکتے اور یہ کہتے ہیں کہ ایسے لوگ تو بڑے کامیاب اور ایسے عیش کر رہے ہیں۔ لیکن کل اس جہان میں جب سب پردے ہٹ جائیں گے اور حقائق اپنی اصلی شکل میں سامنے آجائیں گے۔ تب ایسوں کا وہ ہولناک خسارہ ان کے سامنے آشکارا ہوجائے گا۔ مگر اس وقت اس سے بچنے کی پھر کوئی صورت ان کے لئے ممکن نہ ہوگی۔

آیت نمبر ۱۱۰: ان مظلوم اہلِ ایمان کا ذکر جن پر قریشِ مکہ نے زندگی تنگ کر رکھی تھی اور جو اسلام پر ڈٹے رہے۔ انہوں نے اللہ ﷻ کے حکم سے ہجرت کی پھر وقت آنے پر کفار سے جہاد بھی کرتے رہے۔ اسی طرح راہِ حق میں آنے والی تکالیف کو صبر کے ساتھ برداشت کیا۔ ان کے لئے رحمتِ الٰہی کا وعدہ ہے۔

علمی بات: اس آیت میں فتنہ میں مبتلا ہونے سے ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے جو مکہ مکرمہ میں کافروں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے۔ پہلے چونکہ کافروں کے برے انجام کا ذکر تھا تو اس آیت میں نیک مسلمانوں کا اجر بھی بیان فرمادیا گیا ہے۔ لیکن بعض مفسرین کرام نے یہاں فتنہ میں مبتلا ہونے کا مطلب یہ لیا ہے کہ وہ پہلے کفر میں مبتلا ہوگئے بعد میں توبہ کی۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ پہلے سے جن مرتد لوگوں کا ذکر چلا آرہا ہے۔ انہی کے بارے میں اب یہ فرمایا جارہا ہے کہ اب بھی اگر وہ توبہ کر کے ہجرت کریں اور جہاد کریں تو اللہ ﷻ ان کے پچھلے گناہ معاف فرمادے گا۔

عملی بات: کفر کے بعد جو بھی شخص ایمان قبول کرے گا، ایمان پر ثابت قدم رہے گا، دار السلام کو ہجرت کرے گا اور جہاد میں حصہ لے گا تو اللہ ﷻ ضرور اس کی مغفرت فرمادے گا۔ اسلام کی وجہ سے وہ سب معاصی ختم ہوجاتے ہیں جو زمانہ کفر میں کیئے تھے۔

آیت نمبر ۱۱۱: قیامت کے دن ہر انسان اپنے ہی دفاع کی کوشش کرے گا۔ ہر شخص کو صرف اپنی فکر ہوگی جو اس کو دوسروں سے بے پرواہ کردے گی۔ تمام لوگوں کو ان کے اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کسی پر ظلم یا زیادتی نہیں کی جائے گی۔

علمی بات: یعنی ایک کی طرف سے دوسرا نہ بول سکے گا۔ ماں، باپ، بہن، بھائی، بیوی، اولاد، احباب واقارب کوئی جواب نہ دے گا۔ ہر شخص اپنی فکر میں پڑا ہوگا کہ کس طرح اللہ ﷻ کے عذاب سے خلاصی حاصل کرے۔ طرح طرح کے جھوٹے سچے عذر برأت کے لئے تراشے گا چاہے گا کہ کسی طرح نجات حاصل کرے۔ کسی کی نیکی کے ثواب میں کمی نہ ہوگی اور کسی کو بدی کی سزا استحقاق سے زائد نہ دی جائے گی۔

علمی بات: گزشتہ آیات میں اہلِ ایمان کے لئے مغفرت کا وعدہ اور اہلِ کفر کے لئے سخت عذاب کی وعید کا ذکر تھا۔ اب اس آیت میں اس وعدہ اور وعید کے ظہور کا وقت بیان کیا گیا ہے۔ اصل عذاب اور ثواب تو مرنے کے بعد ہی شروع ہوجاتا ہے۔ مگر اس کا پورا ظہور قیامت کے دن ہوگا یعنی جس دن ہر ایک اپنی اپنی فکر میں ہوگا اور ہر نفس اپنی طرف سے سوال وجواب کرے گا، اپنی طرف سے خود جوابدہی کرے گا اور عزیز واقارب اور دوست احباب کو بھی بھول جائے گا اور اپنی

رہائی کے جھوٹے سچے عذر کرے گا لیکن اس کی حجت اور ساری معذرت بے سود ہوگی۔ ہر جان کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ جو اس نے عمل کیا، ہر نیکی اور ہر برائی کو پوری پوری جزا یا سزا ملے گی۔ ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی جائے گی، نہ تو کسی کی نیکی میں کمی کی جائے گی اور نہ کسی کی کوئی برائی دوسرے کے سر پر ڈلی جائے گی، اسی طرح نہ ثواب میں کمی ہوگی نہ عذاب میں زیادتی ہوگی۔ ہر ایک کے سامنے اس کا اپنا کیا ہوا عمل آئے گا، ہر شخص کا اپنا عقیدہ، اخلاق اور عمل ہی کام آئے گا۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ: "ہر شخص ان (اعمال) کے بدلہ گروی ہے جو اس نے کما رکھے ہیں۔" (سورۃ المدثر ۷۴، آیت: ۳۸) لہٰذا وہ شخص اپنے اعمال کا بدلہ پائے بغیر خلاصی نہیں پائے گا۔ وہاں کسی پر زیادتی نہیں ہوگی بلکہ ہر ایک کے ساتھ ٹھیک معاملہ کیا جائے گا۔

علمی بات: پہلے نفس سے مراد انسان کا بدن ہے اور دوسرے نفس سے انسان کی روح ہے۔ انسان کی روح اس کے بدن میں بحث اور تکرار ہوگی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ روح کہے گی: اے میرے رب! تو نے مجھ کو پیدا کیا ہے، نہ کسی چیز کو پکڑنے کے لئے میرے ہاتھ تھے اور نہ کہیں جانے کے لئے میرے پیر تھے، نہ کسی چیز کو دیکھنے کے لئے میری آنکھیں تھیں اور نہ کسی چیز کو سننے کے لئے میرے کان تھے اور نہ سوچنے کے لئے عقل تھی حتیٰ کہ تو نے مجھے اس جسم میں داخل کر دیا۔ پس تُو ہر قسم کا عذاب اس جسم پر نازل فرما اور مجھے نجات دے دے اور جسم کہے گا: اے میرے رب! تو نے مجھے پیدا کیا میں تو لکڑی کے ایک تختہ کی طرح تھا، میں اپنے ہاتھوں سے نہ پکڑ سکتا تھا اور نہ قدموں سے چل سکتا تھا اور نہ آنکھوں سے دیکھ سکتا تھا اور نہ کانوں سے سن سکتا تھا پھر یہ روح نور کی شعاع کی طرح مجھ میں داخل ہوئی، اسی سے میری زبان بولنے لگی اور اسی سے میری آنکھیں دیکھنے لگیں اور اسی سے میرے پیر چلنے لگے اور میرے کان سننے لگے۔ پس ہر قسم کا عذاب تُو اس روح پر نازل کر اور مجھے نجات دے دے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا پھر اللہ ﷻ نے ان کے لئے اندھے اور گنجے کی مثال بیان فرمائی جو ایک باغ میں گئے، اندھا پھلوں کو دیکھ نہیں سکتا تھا اور گنجا پھلوں کو توڑ نہیں سکتا، پھر گنجے نے اندھے سے کہا کہ تو مجھے اپنے اوپر سوار کر لے میں خود بھی پھل توڑ کر کھاؤں گا اور تجھے بھی کھلاؤں گا۔ پھر دونوں نے باغ سے پھل توڑ کر کھائے۔ اب کس پر عذاب ہوگا؟ فرمایا دونوں پر عذاب ہوگا۔

آیت نمبر ۱۱۲: بستی سے ایک مراد مکہ مکرمہ ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ ایک عمومی مثال ہے۔ جہاں اللہ ﷻ کی نعمتوں کی ناقدری اور اللہ ﷻ کے رسولوں علیہم السلام کا انکار و تکذیب ہوگی وہاں ایسے حالات پیدا کیئے جائیں گے۔ بستی کے لوگوں پر اللہ ﷻ کے تین خاص انعامات تھے:

۱۔ امن ۲۔ اطمینان ۳۔ کشادہ روزی

انعامات کی ناقدری کی وجہ سے ان کا رزق بھوک میں اور امن و اطمینان خوف میں تبدیل کر دیا گیا۔ لفظ لباس کے استعمال کی وجہ یہ ہے کہ بھوک اور خوف ان پر ایسا مسلط تھا جس طرح لباس بدن کے ساتھ لازم و ملزوم ہوتا ہے۔

علمی بات: کفارِ مکہ پر بھوک اور خوف کو مسلط کرنا: جس بستی کی اس آیت میں مثال دی گئی ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے زمانہ ماضی کی کوئی بستی مراد ہو۔ جیسے حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام کے زمانوں میں بستیاں تھیں جو بہت آرام اور خوشحالی سے رہتی تھیں۔ پھر جب انہوں نے اللہ ﷻ کے ساتھ کفر پر اصرار کیا تو ان کو دنیا میں آفتوں اور مصیبتوں نے آگھیرا۔ ان پر قحط کی صورت میں بھوک اور پیاس کو مسلط کر دیا گیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد کفارِ مکہ کی بستیاں ہوں۔

حضرت ابن عباس، مجاہد، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ سے روایت ہے کہ اس بستی سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔

اللہ ﷻ نے اہلِ مکہ کو بھوک کا لباس پہنا دیا، اس بھوک کی اذیت ان کے اجسام کو پہنچی اور ان کے اجسام کا اس طرح احاطہ کر لیا جس طرح لباس اجسام کا احاطہ کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے خلاف دُعاءِ ضرر کی تھی جس کی وجہ سے ان پر کئی سال قحط طاری رہا، حتیٰ کہ وہ مردار، چمڑہ اور اس کے بال بھی کھا جاتے تھے اور یہ ان کی بد اعمالیوں کی سزا تھی۔ یہ بھوک کا لباس ہے اور خوف کا لباس یہ ہے کہ کفارِ مکہ کو ہر وقت یہ خوف رہتا تھا کہ مسلمان ان پر حملہ کر دیں گے۔

عملی بات: اس آیت میں مکہ کے کافروں کی مثال دی ہے کہ اللہ ﷻ نے ان کو نعمتیں عطا کی تھیں لیکن جب انہوں نے ان نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ ﷻ نے ان پر

بھوک اور خوف کا عذاب مسلط کر دیا۔ اسی طرح جس جگہ کے لوگ بھی اللہ ﷻ کی نعمتوں کی ناشکری کریں گے، ان پر بھوک اور خوف کا عذاب طاری کر دیا جائے گا۔ آج مسلمان جو معاشی ناہمواری اور دشمنوں کے خوف میں مبتلا ہیں اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ اجتماعی طور پر اللہ ﷻ کی ناشکری کر رہے ہیں۔

علمی بات: اس آیت میں اگرچہ اس بستی کا نام نہیں لیا گیا تاہم اندازِ بیان سے صاف پتہ چل رہا ہے کہ روئے سخن مکہ والوں ہی کی طرف ہے۔ مکہ کے لوگ اس وقت بھی امن و چین کی زندگی گزار رہے تھے جبکہ عرب بھر میں ہر طرف لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم رہتا تھا۔ بیت اللہ شریف کی تولّیت کی وجہ سے لوگ قریش مکہ کا ادب و احترام کرتے تھے۔ ان کے تجارتی قافلہ پر کسی کو حملہ آور ہونے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ بلکہ جس تجارتی قافلہ کو یہ قریش مکہ پروانہ راہداری دے دیتے وہ بھی امن و عافیت کے ساتھ سفر کر سکتا تھا۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی وجہ سے اطراف عالم سے اشیاء خوردنی اور پھل وغیرہ بھی مکہ پہنچ جاتے تھے۔ اگرچہ وہاں نہ کوئی پھلدار درخت پیدا ہوتا تھا اور نہ کوئی غلہ وغیرہ حتیٰ کہ مویشیوں کے لئے گھاس پھونس تک بھی پیدا نہ ہوتی تھی۔ پھر جب ان میں رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے اور آپ ﷺ نے انہیں شرکیہ افعال ترک کرنے اور اکیلے اللہ ﷻ کی عبادت کرنے کی دعوت دی تو وہ بگڑ بیٹھے اور پیغمبر اسلام ﷺ اور آپ ﷺ کے ماننے والوں کو طرح طرح کے دُکھ دینا شروع کر دیئے یہاں تک ان کے جانی دشمن بن گئے۔ تب اللہ ﷻ نے ان سے اپنی نعمتیں چھین لیں اور ان پر قحط کا عذاب مسلط کر دیا اور یہ قحط سات سال تک ان پر مسلط رہا۔ باہر سے کوئی چیز کھانے کے لئے نہ آتی تھی۔ پھر ان لوگوں کا یہ حال ہو گیا کہ مردہ جانوروں کے چمڑے اور ہڈیاں تک کھانے پر مجبور ہو گئے اور جسمانی کمزوری اور بھوک کی شدت کا یہ حال تھا کہ اگر آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتے تو انہیں دھواں ہی دھواں نظر آتا حالانکہ مطلع بالکل صاف ہوتا تھا۔ بھوک کی وجہ سے کچھ لوگ تو مر گئے اور جو باقی تھے انہیں بھی ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اگر کچھ عرصہ یہی حالت رہی تو ان کا زندہ رہنا مشکل نظر آتا ہے۔ گویا یہ عذاب صرف بھوک کا نہ تھا بلکہ بھوک کی وجہ سے مر جانے کا خوف بھی ان پر مسلط رہتا تھا۔

علمی بات: مکہ میں یہ قحط اسی قانونِ خداوندی کے تحت آیا تھا جس کا ذکر سورۃ الانعام کی آیت:۴۲ اور سورۃ الاعراف کی آیت:۹۴ میں ہوا ہے۔ اس اصول یا قانون کے تحت ہر رسول علیہ السلام کی بعثت کے بعد متعلقہ قوم پر چھوٹے چھوٹے عذاب آتے ہیں تاکہ انہیں خوابِ غفلت سے جاگنے اور سنبھلنے کا موقع مل جائے اور وہ رسول علیہ السلام پر ایمان لاکر بڑے عذاب سے بچ جائیں۔

اس آیت کی تاویل خاص کے اعتبار سے اس مثال میں یقیناً مکہ ہی کی طرف اشارہ ہے مگر اس آیت کی عمومی حیثیت بھی مدنظر رہنی چاہیئے کہ کوئی بستی بھی اس قانونِ خداوندی کی زد میں آسکتی ہے۔ اگر ہم بھی اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں تو ایسی کئی مثالیں ماضی قریب میں دکھائی دیتی ہیں کہ وہاں کے لوگوں کے لئے امن و امان وسائل رزق کی فراوانی اور خوشحالی کی کیفیت باعث کشش تھی، مگر بعد میں دیکھتے ہی دیکھتے وہ خوشحال علاقے وہی نقشہ پیش کرنے لگے جس کی جھلک اس آیت میں دکھائی گئی ہے۔ یعنی کفرانِ نعمت، نافرمانی اور سرکشی کی پاداش میں اللہ ﷻ نے ان لوگوں کو بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا۔

آیت نمبر ۱۱۳: بستی والوں کی تنبیہ اور اصلاح کے لئے ان ہی میں سے ایک رسول کو بھیجا گیا جنہیں لوگوں نے جھٹلایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ ﷻ کے عذاب نے ان ظالموں کو آپکڑا۔

علمی بات: اس سے پہلے اللہ ﷻ نے اہل مکہ کے لئے مثال دی تھی کہ جن لوگوں کو اللہ ﷻ نے نعمتیں دی ہوں اور وہ ان نعمتوں کی ناشکری کریں تو اللہ ﷻ ان لوگوں پر بھوک اور خوف مسلط کر دیتا ہے اور اس آیت میں ان لوگوں یعنی اہل مکہ سے خطاب فرمایا ہے جس کے لئے یہ مثال دی تھی فرمایا: اے اہل مکہ! تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آیا ہے جو تمہاری ہی قوم کا ایک عظیم اور کامل فرد ہے جس کے حسب و نسب کو تم پہچانتے ہو اور اس کی گزاری ہوئی زندگی سے تم واقف ہو۔ اس رسول ﷺ نے انہیں بھلائی کا حکم دیا اور برائی سے روکا تو مکہ والوں نے اس کی تکذیب کی اور کہا کہ تم رسول نہیں تو اللہ ﷻ کے عذاب نے ان کو گرفت میں لے لیا۔ وہ لوگ بڑے ہی ظالم تھے کہ اپنے لئے ابدی عذاب کا سبب بنے اور دوسروں کو بھی راہ حق سے روکا۔

آیت نمبر ۱۱۴: کھانے پینے کے بارے میں تین ہدایات:

۱۔ حلال اور طیب کھاؤ۔۔ طیب سے مراد شرک اور مالِ حرام سے پاک ہونا بھی ہے۔ یہی بات سورۃ البقرہ ۲: آیت:۱۶۸ میں بھی بیان ہوئی ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ ۳۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کی نیت سے توانائی حاصل کرو۔

علمی بات: مشرکین نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی اور اس کے ساتھ شریک بنائے تو اے ایمان والو! اگر تم واقعی صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی کرتے ہو، جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے تو لازم ہے کہ اپنی عقل اور مصلحت کے بل بوتے پر کسی چیز کو حلال یا حرام قرار نہ دو، جیسا کہ مشرکوں نے اپنے پاس سے حلال وحرام کے فیصلے کر رکھے تھے مثلاً بعض جانوروں کو حرام اور مردار اور خون وغیرہ کو حلال کر رکھا تھا جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ پس تم صرف انہی چیزوں کو کھاؤ جنہیں اللہ تعالیٰ نے حلال اور طیب قرار دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔

علمی بات: یعنی جس کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا دعویٰ ہو اسے لائق ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی حلال وطیب روزی سے فائدہ اُٹھایا کرے اور رب العالمین کا احسان مان کر شکر گزار بندہ بنے۔ حلال کو حرام نہ سمجھے اور نعمتوں سے فائدہ اُٹھاتے وقت حقیقی انعام فرمانے والے کو نہ بھولے۔ بلکہ اس پر اور اس کے بھیجے ہوئے پیغمبروں پر صدق دل سے ایمان لائے اور ان کے احکام وہدایات کی پیروی کرے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا بندہ جب کوئی چیز کھائے تو اس پر اس کا شکر ادا کرے اور (اسی طرح) جب کوئی چیز پیئے تو اس پر اس کا شکر ادا کرے۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۱۱۵: چار چیزوں کی حرمت کا بیان ہے۔۔۔ یہ ذکر سورۃ البقرۃ آیت: ۱۷۳، سورۃ المائدۃ، آیت: ۳ اور سورۃ الانعام آیت: ۱۴۵ میں بھی آیا ہے۔

۱۔ مردار۔۔۔۔۔وہ حلال جانور جو ذبح کیئے بغیر طبعی موت مرا ہو۔ ۲۔ بہتا ہوا خون۔۔۔۔۔ ذبح کرتے وقت جانور کی رگوں سے نکلنے والا خون۔

۳۔ خنزیر کا گوشت۔۔۔۔ جس کے جسم کا کوئی حصہ حلال نہیں۔ ۴۔ وہ ذبیحہ جس پر ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کا نام پکارا گیا ہو۔

دو شرائط کے ساتھ مذکورہ اشیاء میں سے کوئی چیز کھا کر جان بچائی جاسکتی ہے جس پر مواخذہ نہیں:

۱۔ کھانے میں نافرمانی نہ کرے بلکہ کھانے والا صحیح معنوں میں مجبور ہو۔ ۲۔ زیادتی نہ کرے، صرف اتنا کھائے جس سے جان بچائی جاسکے۔

علمی بات: یہاں ایک چیز وضاحت طلب ہے وہ یہ کہ ظاہر آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف ان چار چیزوں کو حرام فرمایا ہے۔ ان کے علاوہ اور کوئی چیز حرام نہیں۔ حالانکہ ان کے علاوہ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو حرام ہیں مثلاً شراب، درندے وغیرہ۔ اس ضمن میں مفسرین کرام نے بڑی طویل تفصیلات ذکر کی ہیں۔ ان کا حاصل یہ ہے کہ یہ آیت اکثر مفسرین کرام کے نزدیک مکی ہے اور دوسری اشیاء کی حرمت مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔ تو اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت تک جو وحی نازل ہوئی۔ اس میں صرف ان چار چیزوں کی حرمت کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے بعد وحی کا سلسلہ جاری رہا اور مختلف اوقات میں حکم الٰہی سے اور چیزیں حرام ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ حضور ﷺ نے کچلی کے دانت سے چیر کر کھانے والے ہر شکاری جانور اور پنجوں سے نوچ کر کھانے والے شکاری پرندے کو حرام کر دیا۔ (صحیح مسلم)

نوٹ: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت کے لوگ کچھ چیزیں تو کھا لیتے تھے اور کچھ سے نفرت کرتے ہوئے نہیں کھاتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام کو بھیجا، اپنی کتاب کو نازل فرمایا اور حلال کو حلال اور حرام کو حرام قرار دے دیا، پس جسے اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا وہی حلال ہے اور جسے اس نے حرام قرار دیا وہ حرام ہے اور جس سے اس نے سکوت فرمایا وہ قابل معافی ہے۔ پھر انہوں نے یہ آیت کریمہ پڑھی "قُلۡ لَّاۤ اَجِدُ فِیۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطۡعَمُهٗۤ" (مستدرک حاکم، سنن ابی داؤد)

علمی بات: کھانا پینا بھی چونکہ تہذیب انسانی کا ایک ضروری جزو ہے اس لئے قرآن حکیم اس کے متعلق بھی ضروری ہدایات سے مشرف کرتا ہے۔

قرآن حکیم کہتا ہے کہ پاکیزہ چیزیں بلا تکلف کھاؤ جن میں کوئی ضرر، نقصان نہ ہو، جو ناپاک نہ ہوں، جن کو ذوق سلیم گوارا کرلے، جن کے کھانے سے اخلاقی وروحانی نقصانات نہ پیدا ہوں اور جو چیزیں ان صفات سے عاری ہوں، وہ غذا کے قابل نہیں وہ حرام ہیں اور وہ یہ ہیں۔

۱۔ مردار: اس کے کھانے سے بخل، کنجوسی پیدا ہوتی ہے قلب مردہ ہو جاتا ہے، زندہ قومیں اس کے کھانے سے پرہیز کرتی ہیں، صحت کے لئے بھی مضر ہے، پیٹ میں تعفن پیدا کرتا ہے۔

۲۔ خون: یہ عہد وحشت کی یاد گار ہے، اس سے درندگی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، دانتوں اور معدہ کے لئے سخت مضر ہے، عرب خون کو رکھ لیتے تھے اور دہی کی طرح جم جانے پر کھاتے تھے۔

۳۔ سور کا گوشت: یہ تشنج (Tetanus) کے مرض کو پیدا کرتا ہے، جس سے اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں، جسم کے پٹھوں میں شدید درد اور کھینچاؤ پیدا ہو جاتا ہے، جبڑے کے پٹھے متاثر ہونے کی وجہ سے منہ کھل نہیں سکتا اور نظام تنفس متاثر ہوتا ہے۔

جدید تحقیقات کے مطابق سور کا گوشت کھانے سے فوری موت کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، اس کے کھانے والے لوگوں میں شرم وحیا ختم ہو جاتا ہے۔ غیرت کا مادہ اُٹھ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے آج یورپ میں سب کچھ موجود ہے مگر غیرت ختم ہوگئی ہے، کیونکہ وہ کثرت سے سور کا گوشت کھاتے ہیں، روحانی لحاظ سے جنسی جذبات کو بے حسی کے ساتھ ابھارتا ہے۔

۴۔ غیر اللہ کے نام پر ذبح: اس سے مراد یہ ہے کہ ذبح کرتے وقت جس جانور پر اللہ ﷻ کا نام عمداً نہ لیا گیا ہو یا غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، جس طرح مشرکین باسم الات والعزیٰ کہہ کر جانوروں کو ذبح کیا کرتے تھے۔ اسے کھانے کی ممانعت ہے۔ ایسے کھانے کو سورۃ الانعام ۶، آیت: ۱۲۱ میں "فسق" قرار دیا گیا ہے اور فسق کا مطلب ہے اطاعت سے نکل جانا۔ اسلام چونکہ توحید کا مذہب ہے، اس لئے تمام ایسے ذرائع بند کر دینا چاہتا ہے جن سے شرک کے پھیلنے کا احتمال ہو۔

علمی بات: حلال کو حرام کرنے یا حرام کو حلال کرنے کا شرعی حکم: اس کے بعد اللہ ﷻ نے فرمایا کہ: بے شک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا رہتا ہے تاکہ وہ تم سے بحث کریں۔ اس وسوسہ کا بیان اس حدیث مبارک میں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سورۃ الانعام ۷، آیت: ۱۲۱ کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ مشرکین یہ کہتے تھے کہ جس پر اللہ ﷻ کا نام لیا جائے اس کو نہ کھاؤ اور جس پر اللہ ﷻ کا نام نہ لیا جائے اس کو کھالو۔ (سنن ابن ماجہ، سنن ابی داؤد) وہ بحث یہ کرتے تھے کہ یہ کیا بات ہے جس کو اللہ ﷻ نے مارا ہے (یعنی مردار) اس کو تم نہیں کھاتے اور جس کو تم نے قتل کیا ہے (یعنی ذبیحہ) اس کو کھالیتے ہو۔ اس کے بعد فرمایا: اگر تم نے ان کی اطاعت کی تو تم مشرک ہو جاؤ گے اور اگر بھولے سے "بِسْمِ اللہ" نہ پڑھی جائے تو ذبیحہ کے حلال ہونے پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ مسلمانوں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ: کچھ لوگ ہمارے پاس گوشت لے کر آتے ہیں، ہمیں پتا نہیں کہ انہوں نے ذبح کے وقت اللہ ﷻ کا نام لیا ہے یا نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا تم اس پر "بِسْمِ اللہ" پڑھ کر کھالو، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا اس وقت لوگ نئے نئے کفر سے نکلے تھے۔ (صحیح بخاری، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ)

علمی و عملی بات: اللہ ﷻ کے حلال بتائے ہوئے کو حرام اور حرام بتائے ہوئے کو حلال سمجھنا بھی شرک ہے۔ یعنی ایک طرف اللہ ﷻ کی معبودیت کا اقرار کرنا اور دوسری طرف اللہ ﷻ کے نافرمان لوگوں کی وہ باتیں مان کر چلنا اور ان کے مقرر کیئے ہوئے اُن طریقوں کی پابندی کرنا، جو شریعت کے متضاد ہوں شرک ہے۔ توحید یہ ہے کہ زندگی مکمل طور پر اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں بسر کی جائے۔

عملی بات: یعنی انتہائی مجبوری کی حالت میں جان بچانے کے لئے وقتی طور پر بقدرِ ضرورت ان حرام اشیاء کو استعمال میں لا کر جان بچائی جا سکتی ہے مگر نہ تو دل میں ان کی طلب ہو نہ اللہ ﷻ سے سرکشی کا ارادہ اور نہ ہی ایسی حالت میں وہ چیز ضرورت سے زیادہ کھائی جائے۔

آیت نمبر ۱۱۶: حلال اور حرام کا فیصلہ کرنے کا حق صرف اللہ ﷻ کو ہے اور اللہ ﷻ کے اذن سے اللہ ﷻ کے رسول ﷺ کو ہے۔ اللہ ﷻ کی مرضی کے بغیر کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینا اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھنے کے مترادف ہے۔ اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھنے والے کی کبھی نجات نہیں ہوگی۔

علمی بات: آیت کریمہ کا معنی یہ ہے کہ تم ہرگز حلال و حرام نہ کہو جب تک حلت و حرمت اللہ ﷻ اور اس کے رسول جناب سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ کی طرف سے حلال و حرام نہ ہو اگر ایسا کرو گے تو تم اللہ ﷻ پر جھوٹ بولنے والے ہو جاؤ گے۔ اس لئے کہ حلت و حرمت کا مدار سوائے حکم الٰہی کسی چیز پر نہیں۔

علمی بات: اس آیت میں پچھلی آیت کی تاکید ہے۔ یعنی چار چیزیں حرام کی گئی ہیں۔ مشرکین اپنی طرف سے ان چار چیزوں کو حلال کہتے تھے اور کچھ جانوروں اور چیزوں کو انہوں نے از خود حرام کر رکھا تھا۔ اس لئے اللہ ﷻ نے فرمایا تمہاری زبانیں جھوٹ بولتی ہیں اور تم یہ کہہ کر کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں چیز حرام ہے، اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھتے ہو۔ وہ ان چیزوں کے حرام کرنے اور حلال کرنے کو اللہ ﷻ کی طرف منسوب کرتے تھے، یہ ان کا دوسرا جرم تھا۔ خود کسی چیز کو حرام

کرتے پھر کہتے کہ اس کو اللہ ﷻ نے حرام کیا ہے، یہ لوگ اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھتے تھے۔

عملی پہلو: جو اللہ ﷻ کے بارے میں جھوٹ بولے گا وہ کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔ اگر ایسے لوگ دنیا میں کھا پی رہے ہیں اور ظاہری طور پر ٹھاٹھ سے رہ رہے ہیں تو اس سے کسی کو دھوکا نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ بڑے کامیاب ہیں۔ یہ دنیا تو بالکل عارضی چیز ہے، مرنے کے بعد دردناک عذاب ان کا انتظار کر رہا ہے۔

آیت نمبر ۱۱۷: حلت و حرمت کا خود ساختہ حکم لگانے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ دنیا میں تھوڑا بہت فائدہ حاصل کر بھی لیں لیکن آخرت میں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

عملی بات: دنیاوی سازو سامان چند روزہ ہے جو تھوڑا اور انتہائی قلیل ہے۔ پھر اس کے بعد آخرت کی ابدی حیات ہے۔ بہت ہی برا ہے وہ شخص جس نے متاع قلیل میں کھو کر اور مست ہو کر اتنے بُرے خسارہ کا سودا کیا اور وہ اپنی آخرت اور انجام کو بھول کر اور اس کے تقاضوں کو پس پشت ڈال کر ہمیشہ کے خسارہ کے انتہائی ہولناک گڑھے میں جا گرا۔ العیاذ باللہ العظیم۔

آیت نمبر ۱۱۸: کفار و مشرکین کے ایک اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ ان کا اعتراض تھا کہ جو چیزیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے شریعت میں حرام تھی انہیں مسلمانوں نے کیوں حلال کر لیا۔ بتایا گیا ہے کہ یہود پر ان چیزوں کی حرمت ان کی نافرمانیوں اور ان کا اللہ ﷻ کی حدود کو توڑنے کی وجہ سے ہے۔ ایسا کرنا اللہ ﷻ کا ان پر ظلم نہیں تھا بلکہ ان کے اپنے ظلم کی بنا پر تھا۔

علمی بات: یہودیوں پر بعض پاکیزہ چیزوں کی حرمت کا بیان ہے۔ سورۃ الانعام ۷، آیت ۱۴۶ میں یہودیوں پر بعض چیزوں کی حرمت کی وجہ یہ ذکر ہوئی کہ یہودیوں پر ان کے ظلم وعدوان اور ان کے عناد و سرکشی کی بنا پر بعض ایسی پاکیزہ چیزوں کو بھی حرام کر دیا گیا تھا جو کہ ان کے لئے حلال تھیں۔ سورۃ النساء ۴، آیت: ۱۶۰ میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ لوگ اللہ ﷻ کے راستہ سے خود بھی رکتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی روکتے ہیں۔ تو اس وجہ سے اللہ ﷻ نے ان کو سزا دی اور ان پر بعض حلال چیزیں بھی حرام کر دیں۔ اللہ ﷻ کی ایک سنت یہ بھی ہے کہ کوئی قوم اگر کسی معاملہ میں حد سے گزرتی ہے اور سرکش بن جاتی ہے تو سزا کے طور پر اسے حلال چیزوں سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے۔

علمی بات: اہل ایمان پر انہی چیزوں کو حرام فرمایا گیا جن میں خباثت پائی جاتی تھی اور یہود پر بھی اصل میں یہی چیزیں حرام تھیں جن کا ذکر اسی سورت کی آیت: ۱۱۵ میں فرمایا گیا۔ لیکن انہوں نے جب اپنی بغاوت و سرکشی کی بنا پر کچھ چیزوں کو اپنے اوپر از خود حرام ٹھہرا لیا تو ان کی اس بغاوت و سرکشی کی سزا کے طور پر ان پر ان چیزوں کو حرام ٹھہرا دیا گیا۔ لہٰذا اس طرح انہوں نے اپنی جانوں پر خود ظلم کیا۔ العیاذ باللہ العظیم۔

آیت نمبر ۱۱۹: جہالت اور نادانی کی بنا پر شرک کا ارتکاب کرنے والوں کے لئے خوشخبری سنائی گئی ہے۔ وہ اگر شرک سے توبہ کر لیں اور آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کر لیں تو ان کے حال پر رحم کرتے ہوئے انہیں معاف فرما دیا جائے گا۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے ان لوگوں کے حال پر رحم کرتے ہوئے توبہ کا دروازہ کھول دیا کہ جو لوگ اب تک نادانی اور جہالت کی وجہ سے شرک کا ارتکاب کرتے رہے ہیں اور وحی و رسالت اور بعث بعد الموت کا انکار کرتے رہے ہیں، وہ اگر اپنے گناہوں سے توبہ کریں، اللہ ﷻ کی وحدانیت، رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور دوبارہ زندہ کیئے جانے پر ایمان لائیں، اپنی نیت اور اپنے اعمال کی اصلاح کریں تو اللہ ﷻ ان کے حال پر رحم فرمائے گا اور ان کے گناہوں کو معاف فرما دے گا۔

عملی بات: اللہ ﷻ کی عظیم الشان بخشش اور رحمت کا مژدہ جاں فزا سنا کر یہ بتایا گیا ہے کہ رب العالمین بڑا ہی بخشنے والا نہایت ہی مہربان ہے۔ پس وہ سچی توبہ پر لوگوں کے گناہ بھی معاف فرماتا ہے اور ان کو اپنی رحمت سے بھی نوازتا ہے کہ وہ غفور بھی ہے اور رحیم بھی۔ اس کے یہاں کسی کے لئے بھی کوئی محرومی اور مایوسی نہیں۔ پس اصل ضرورت سچے دل سے اس کی طرف انابت و رجوع کی ہے، ورنہ اس کے یہاں تو کرم ہی کرم اور عطا ہی عطا ہے اور آیت کریمہ میں جہالت کے لفظ سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ جو بھی کوئی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ وہ جہالت اور نادانی ہی کی بنا پر کرتا ہے۔ ورنہ وہ اگر اس کے عواقب و نتائج اور سزاؤں پر غور کرے اور ان کو سامنے رکھے تو کبھی اس کا ارتکاب نہ کرے۔ مگر وہ غلبہ شہوت اور جوش جنون کی بنا پر ادھر توجہ ہی نہیں کرتا۔

آیت نمبر ۱۲۰: مشرکین کے دعوے کی سختی سے تردید کی گئی ہے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام باطل کے مقابلہ میں اکیلے ہی ڈٹ گئے تھے۔ وہ اپنی ذات میں ایک امت تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت کرنے والے اور ہر باطل بات سے بے زار ہو کر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ وہ مشرکوں میں سے قطعاً نہیں تھے۔ مشرکین مکہ کے اس خیال کی سخت نفی کی گئی ہے۔

علمی بات: حضرت ابرہیم علیہ السلام اپنی ذات میں پوری ایک امت تھے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک امت کی مجموعی صفات تنہا ان کی ذات میں موجود تھیں اور تن تنہا انہوں نے وہ کام کیا جو پوری ایک امت اور جماعت کرتی ہے۔ نیز "امت" امام کے معنیٰ میں بھی آتا ہے۔ جس کے معنیٰ ہیں پیشوا و مقتدا۔ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک عظیم الشان پیشوا و مقتدا تھے۔ کیونکہ ان کی امامت و پیشوائی پر سب متفق ہیں۔ مسلمان تو ہیں ہی ملت ابراہیمی پر، یہود و نصاریٰ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا مقتدا و پیشوا مانتے ہیں اور مشرکین عرب بھی فخریہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد، ان کی نسل، ان کے وارث اور ان ہی کے پیروکار ہیں۔ پس ایسی دوسری کوئی ہستی نہیں ہے جس کو اس طرح یہ تمام ہی بڑے مذاہب واَدیان اور اقوام اپنا پیشوا و مقتدا مانتے ہوں سوائے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے۔ آپ علیہ السلام کی امامت و پیشوائی ایسی عظیم الشان اور بے مثال کیوں نہ ہوتی جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بطور خاص چنا اور اس منصب جلیل کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ لہٰذا آپ کو امام اور پیشوا ماننے والوں پر لازم آتا ہے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صحیح طور پر اور صدق دل سے اتباع اور پیروی کریں۔ تاکہ اس طرح یہ ابراہیمی ہونے کے اپنے دعویٰ میں بھی سچے قرار پائیں اور خود انہی کا بھلا بھی ہو۔ ورنہ محض زبانی کلامی دعوؤں کے کچھ نہیں بنے گا ایسے دعوؤں سے انسان خود اپنے آپ ہی کو دھوکہ دیتا ہے، مگر اس کو اس کا شعور ہی نہیں ہوتا۔

عملی بات: مطلب ان آیات کا یہ ہے کہ مکہ کے مشرک حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مانتے تھے اور اپنے تمام طریقوں کو ان کی سنت اور ان کی شریعت خیال کرتے تھے۔ لہٰذا ارشاد ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو ہمارا شکر گزار بندے تھے وہ ہرگز مشرک نہ تھے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نو صفات بیان فرمائیں تاکہ مشرکین مکہ یہ جان لیں کہ ان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کوئی بھی صفت نہیں ہے:

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں سارے لوگ کافر تھے۔ آپ علیہ السلام اکیلے ہی مومن تھے۔ ۲۔ اللہ تعالیٰ کے پکے فرماں بردار تھے۔ ۳۔ اپنی ذات میں توحید باری پر سختی سے کاربند تھے۔ ۴۔ اپنی عمر کے کسی حصہ میں بھی شرک کرنے والوں میں نہیں تھے، بلکہ بت خانہ میں گھس کر بتوں کو توڑ ڈالا جس کے سبب سے آگ میں ڈالے گئے۔ ۵۔ شکر گزار تھے۔ ۶۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی ہدایت کے لئے منتخب کیا۔ ۷۔ راہِ راست پر تھے۔ ۸۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انہیں شان و شوکت اور عزت و شرف بخشا۔ ۹۔ آخرت میں بھی وہ اچھے لوگوں میں ہیں۔

پھر فرمایا کہ تم لوگ جو اپنے آپ کو ملت ابراہیم علیہ السلام پر سمجھتے ہو محض غلط ہے، بلکہ اصل ملت ابراہیم علیہ السلام پر ہمارے پیارے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ہم نے انہیں حکم دیا ہے کہ وہ ملت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کریں۔

آیت نمبر ۱۲۱: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مزید اوصاف کا بیان ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کرتے ہوئے اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں اپنے محبوب بندوں میں شامل فرما کر صراط مستقیم کی جانب ہدایت دی تھی۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے آپ علیہ السلام کو اس خاص شرف و اعزاز سے نواز دیا تھا جو ان کے لائق تھا۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک امتیازی شان تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا خلیل اور دوست بنالیا۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا گیا: اور اللہ نے ابراہیم (علیہ السلام) کو اپنا مخلص دوست بنالیا تھا۔ (سورۃ النساء ۴: آیت ۱۲۵)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مزید تعریف و توصیف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر اس کے شکر گزار تھے۔ ان مشرکوں کی طرح نہیں تھے جو اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اپنے خود ساختہ اور من گھڑت خداؤں، بناوٹی بتوں کی طرف منسوب کر کے کفران نعمت کا ارتکاب کرتے ہیں۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ کو کسی بات کی حاجت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو اپنا خلیل بنایا تو اس وجہ سے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو کسی کی حاجت ہے بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی غایت درجہ کی تکریم تھی۔ مزید برآں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خلیل اللہ ہونا انہیں دائرۂ عبودیت سے خارج اور اس سے اونچا

نہیں بنا دیتا۔

علمی و عملی بات: شکرِ نعمت زبان سے بھی ہوتا ہے اور عمل سے بھی۔ اللہ ﷻ نے شہادت دی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اللہ ﷻ کی نعمتوں کا شکر اس کے احکام کی اطاعت، اس کے امتحانات میں کامیابی اور اس کے حقوق کی ادائیگی کی صورت میں ادا کیا۔ چنانچہ فرمایا: "اور ابراہیم (علیہ السلام کے صحیفوں میں بھی) جنہوں نے (اپنا عہد) پورا کیا۔" (سورۃ النجم ۵۳، آیت: ۳۷)

آیت نمبر ۱۲۲: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا میں عزت اور بہت ساری بھلائیاں عطا فرمائی گئیں۔ امام الناس اور ابو الانبیاء علیہم السلام بھی قرار پائے۔ آخرت میں بھی وہ نیکوکاروں میں شامل ہوں گے۔

علمی بات: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے دنیا و آخرت میں عظیم الشان انعام کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ اللہ ﷻ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا میں بھی۔ نیک نامی، سچی ناموری، نیک اولاد، فراخی روزی، امامت و پیشوائی اور نبوت و رسالت جیسے امتیازات سے نواز کر بھلائی عطا فرمائی۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا گیا: ہم نے ان کو اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام جیسی اولاد سے بھی نوازا ان سب کو اپنی رحمت و نبوت سے بھی نوازا اور ان کو سچی ناموری اور حقیقی سربلندی سے بھی سرفراز کیا۔ (سورہ مریم ۱۹، آیت: ۵۰)، نیز یہ کہ آپ علیہ السلام کو اپنے بعد کے تمام انبیاء ورسل علیہم السلام کے جدِ امجد ہونے کے ساتھ ساتھ یہ امتیاز واعزاز بھی رکھتے ہیں کہ آپ کے بیٹے بھی نبی اور پوتے بھی نبی ورسول ہوئے ہیں۔ (سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷، آیات: ۱۰۸، ۱۰۹)۔ اسی طرح آخرت میں وہ یقیناً اللہ ﷻ کے قرب خاص میں ہوں گے۔ وہاں آپ جنت میں اپنے اعلیٰ درجات پر فائز ہوں گے اور خود حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لئے اپنے رب سے اس کی دعا بھی فرمائی تھی: اے میرے رب! مجھے حکمت عطا فرما اور مجھے نیک لوگوں میں شامل فرما اور میرا ذکر خیر جاری فرما بعد میں آنے والوں میں (سورۃ الشعراء ۲۶، آیات: ۸۳، ۸۴)۔ اللہ ﷻ نے آپ کی اس دعا کو شرف قبولیت سے نوازا اور آپ کو ان مراتب و درجات سے نوازا اور سرفراز فرمایا۔ بے شک وہ آخرت میں صالحین کے اعلیٰ طبقہ میں شامل ہوں گے۔ جو انبیاءِ کرام علیہم السلام کا طبقہ ہے۔

آیت نمبر ۱۲۳: رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ تمام اہل ایمان کو ملت ابراہیمی کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ملت سے مراد ہے طریقہ، راستہ۔۔۔ اصطلاحی طور پر اللہ ﷻ کی طرف سے تجویز کردہ طریقہ، راستہ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توحید خالص کی عملی مثال قائم کی اور ہر باطل بات سے بیزاری کا اعلان کیا۔

علمی بات: لفظ "ملت" صحت عقائد، مکارم اخلاق، دعوت و ارشاد کا حکیمانہ انداز، دلائل کی پختگی، بیان کی دل نشینی اور منکرین کے جور وجفا کے مقابلہ میں حلم و بردباری یہ وہ سنت ابراہیمی ہے جس کی پیروی کا حکم اس آیت میں دیا جارہا ہے جو شخص دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری سنبھالتا ہے۔ اسے اسوۂ ابراہیمی پر کاربند ہونا پڑتا ہے۔

علمی بات: ملت کے معنی ایسا طریقہ جسے اللہ ﷻ نے اپنے کسی نبی علیہ السلام کے ذریعہ لوگوں کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ نبی کریم ﷺ باوجود اس بات کے کہ آپ ﷺ تمام انبیاء کرام علیہم السلام سمیت اولاد آدم کے سردار ہیں، آپ ﷺ کو ملت ابراہیمی کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے، جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امتیازی اور خصوصی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ ایسے اصول میں تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعت اور ملت ایک ہی رہی جس میں رسالت کے ساتھ توحید و آخرت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

علمی بات: یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا غالباً سب سے بڑا اعزاز ہے کہ اللہ ﷻ نے سید المرسلین ﷺ کو آپ علیہ السلام کی ملت کے اتباع کا حکم دیا کیونکہ اللہ ﷻ کی فرماں برداری اور غیر اللہ سے یکسر لاتعلقی کا اعلیٰ معیار جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قائم کیا تھا اسے اگر آگے بڑھانا تھا تو یقیناً اس کے لئے آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکت اور آپ ﷺ کی عظیم امت کی ضرورت تھی۔

آیت نمبر ۱۲۴: یہود کے اس دعویٰ کی تردید کہ ہفتہ کے دن کی تعظیم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کا حصہ ہے۔ یہود کی ضد کی وجہ سے ان کے لئے ہفتہ کا دن مقرر کیا گیا تھا۔ ہر امت کو اولاً جمعہ کا ہی دن عطا ہوا تھا۔ (صحیح بخاری)۔ روز قیامت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا پیشوا تسلیم کرنے والوں کے درمیان اختلافات کا فیصلہ کردیا جائے گا۔

علمی بات: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا: ہفتہ کے دنوں میں سے ایک دن اللہ تعالیٰ کے لئے فارغ کرلو اور جمعہ کے دن اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس دن تم اپنے کاموں میں سے کوئی کام نہ کرو۔ انہوں نے اس حکم کو ماننے سے انکار کردیا۔ انہوں نے کہا ہم اسی دن کو عبادت کے لئے مقرر کرنا چاہتے ہیں جس دن اللہ تعالیٰ مخلوق کی تخلیق سے فارغ ہوگیا اور وہ ہفتہ کا دن ہے۔ پس ان کے لئے ہفتہ کا دن مقرر کردیا گیا پھر ان پر اس دن کی عبادت کرنے میں ان کے لئے سخت احکامات نازل ہوئے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: "ہم سب امتوں کے بعد دنیا میں آئے، لیکن قیامت کے دن سب سے آگے ہوں گے، فرق صرف یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو ہم سے پہلے کتاب ملی، پھر یہی جمعہ کا دن ان کے لئے بھی مقرر ہوا تھا، لیکن انہوں نے اس میں اختلاف کیا۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہ دن عنایت فرمادیا، لہٰذا سب لوگ ہمارے پیچھے ہوگئے۔ یہودیوں کا دن کل (ہفتہ) ہے اور نصاریٰ کا پرسوں (اتوار)۔" (صحیح بخاری)

علمی بات: "یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین میں جمعہ کے بجائے ہفتہ کا دن عبادت کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ اس دعویٰ کی بنیاد پر یہودی نبی کریم ﷺ پر الزام لگاتے تھے کہ انہوں نے ہماری مخالفت کی بنیاد پر ہفتہ کا دن چھوڑ کر جمعہ کا دن مقرر کرلیا ہے۔ جس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ہفتہ کا دن یہودیوں نے اپنی مرضی سے اپنے آپ پر فرض کرلیا ہے۔ اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ ملت ابراہیم میں جمعہ کا دن ہی عبادت کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ اس کی وضاحت سرورِ دوعالم ﷺ نے اپنے فرمانِ عالی شان سے بھی فرمائی ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کا فرمان نقل کرتے ہیں: "دنوں میں سب سے بہتر دن جمعہ کا دن ہے اس دن آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا اسی دن ان کو جنت میں داخلہ ملا اور جمعہ کو ہی ان کا اخراج ہوا اور اسی دن قیامت برپا ہوگی۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۱۲۵: حق کے داعی کے لئے تین اہم ہدایات کا بیان ہے۔ دعوت دین کے تین طریقے مخاطبین کی قسموں کی بنا پر ہیں:

۱۔ اہل علم اور معاشرے کے ذہین افراد کو حکمت اور دلائل کے ساتھ دعوت پیش کرنا۔ ۲۔ عوام الناس کو پرخلوص انداز سے درد بھرے وعظ کے ساتھ دعوت دینا۔ ۳۔ فتنے اٹھانے اور شکوک وشبہات پیش کرنے والوں سے عمدگی سے بحث کرنا۔

یقیناً گمراہ لوگوں اور ہدایت پر چلنے والوں سے اللہ تعالیٰ خوب واقف ہے۔

علمی بات: "حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کچھ دن ہمیں وعظ و نصیحت کرنا چھوڑ دیتے کہ کہیں ہم اکتا نہ جائیں۔"

حضرت عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ تم کسی قوم کو ایسی بات نہ کہو جو ان کی سمجھ سے بالاتر ہے جو لوگوں کے لئے الجھن کا باعث بن جائے۔" (صحیح مسلم)

علمی بات: یہاں اس حقیقت کا اظہار فرمایا جارہا ہے کہ ایک داعی اور مبلغ کی ذمہ داری صرف اس قدر ہے کہ وہ حکیمانہ انداز سے، خلق خدا کی ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات سے سرشار ہوکر رضائے الٰہی کے لئے تبلیغ کرے۔ اگر کوئی قبول نہ کرے تو اس کے لئے اسے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ سب کچھ مشیت الٰہی پر موقوف ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے قبول حق کی توفیق عطا فرمادیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے محروم و نامراد کردیتا ہے۔

علمی بات: دعوت کی تین سطحوں کا بیان: ہر دور اور ہر معاشرہ میں لوگوں کی تین سطحیں ہوتی ہیں۔

۱۔ ایک سب سے بلند سطح کے لوگ ہوتے ہیں یعنی ذہین اقلیت (intellectual minority) اسی کو intelligentsia بھی کہتے ہیں۔ یہی brain trust کہلاتا ہے۔ یہ طبقہ اگرچہ قلیل ترین اقلیت میں ہوتا ہے لیکن معاشرہ میں موثر ترین ہوتا ہے اور معاشرہ کا رُخ درحقیقت یہی ذہین اقلیت متعین کرتی ہے۔ جب تک اس کو دعوت دینے کا تقاضا دلیل اور برہان کے ساتھ پورا نہیں کیا جائے گا، یہ طبقہ کوئی اثر قبول نہیں کرے گا۔ جیسے قرآن حکیم یہود کو کھلا چیلنج کرتا ہے: قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ "آپ فرمادیجئے کہ اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو۔" (سورۃ البقرۃ ۲، آیت: ۱۱۱)

یہاں "حکمت" سے مراد دلائل و براہین و دانائی کے ساتھ دعوت دین کو پیش کرنا ہے۔ اگر اس ذہین اقلیت کو اعلیٰ علمی و فکری سطح پر مدلل طور پر دین کی دعوت پیش نہیں کی جائے تو یہ ذہین اقلیت دین کی نشر و اشاعت کے حق میں راہ پر خود بھی نہیں چلے گی اور دوسروں کے لئے راہ ہموار نہیں ہونے دے گی۔ اگر عوامی سطح پر بات پھیلتی چلی جارہی ہے لیکن معاشرہ کی ذہین اقلیت کو اُس وقت اور اس دَور کی اعلیٰ علمی و فکری سطح پر دعوت پیش نہ کی جاسکے تو معاشرہ بحیثیتِ مجموعی کبھی متاثر نہیں ہو سکتا۔ اجتماعی سطح پر کوئی حقیقی تبدیلی نہیں آئے گی۔

۲۔ دعوت کی دوسری سطح "عوامی" ہے۔ عوام کو دعوت عمدہ وعظ اور دل نشین نصیحت کے ذریعہ دی جائے گی، کیونکہ انہیں کسی دلیل اور حجت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کے لئے ضرورت ہے موعظۂ حسنہ کی، وہی ان کے لئے کفایت کرے گی۔ اس سطح پر یہ بات نہایت اہم ہے کہ سننے والے یہ محسوس کریں کہ جو وعظ کر رہا ہے وہ ہم پر اپنی دین داری، علمیت اور شخصیت کی دھونس نہیں جمانا چاہتا، بلکہ وہ مخلص ہے اور ہماری خیر خواہی کے لئے بات کہہ رہا ہے۔ اسے کسی دُنیوی اجر اور صلہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ساتھ ہی انہیں یہ اعتماد ہو کہ وہ بہروپیا نہیں ہے یعنی اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ "کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔" (سورۃ البقرہ ۲، آیت:۴۴) والا معاملہ نہیں ہے بلکہ جو کچھ یہ کہہ رہا ہے اپنی ذاتی اور نجی زندگی میں اس پر خود بھی عمل پیرا ہے۔ یہ دو چیزیں جمع ہو جائیں، ایک موعظۂ حسنہ اور دوسرے واعظ کا اعلیٰ کردار تو دعوت کی قبولیت کا معاملہ آسان ہو جاتا ہے۔

۳۔ تیسری سطح جو ہر معاشرہ میں موجود ہوتی ہے، وہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو ہٹ دھرم ہوتے ہیں، جو کبھی مان کر نہیں دیتے، جن کے اپنے مفادات ہوتے ہیں، جن کے مفادات باطل نظام سے وابستہ ہوتے ہیں اور وہ اپنے مفادات کی وجہ سے وہ اندھے پن کا مظاہرہ کر رہے ہوتے ہیں بلکہ بسا اوقات پوری سمجھ بوجھ اور ارادہ کے ساتھ لوگوں کو گمراہ کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کے زہر کا تریاق فراہم نہ کیا جائے تو یہ عوام الناس کو گمراہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ مگر اس کے لئے ایسے ہٹ دھرم لوگوں سے بحث برائے بحث، بدکلامی اور بداخلاقی کا رویہ نہیں بلکہ احسن انداز اختیار کرنا ضروری ہے۔ قرآن حکیم جسے مجادلہ کہتا ہے وہ احسن طریق پر محکم دلائل اور برہان کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔

دعوت کی ان تینوں سطحوں پر کام کرنے کے لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ باصلاحیت نوجوان جن کے دل میں واقعی دین کا کام کرنے کی تڑپ ہے، ولولہ ہے، اُمنگ اور جذبہ ہے، وہ آگے بڑھیں، ان اعلیٰ وارفع مقاصد کے لئے اپنی جانیں، اوقات اور صلاحیتیں ان مقاصد کے حصول میں کھپائیں، تب جا کر ہی یہ کام ہوگا۔

آیت نمبر ۱۲۶: اہلِ ایمان کو بدلہ لیتے وقت زیادتی نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ بدلہ لینے میں انصاف کو ملحوظ رکھا جائے لیکن درگزر کر کے صبر کر لینے کا نتیجہ بدلہ لینے سے بہتر ہے۔

شانِ نزول: اس آیت کے شان نزول میں محدثین نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ اُحد کے موقع پر انصار کے چونسٹھ اور مہاجرین کے چھ آدمی شہید ہوئے تھے۔ ان میں سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی شہید ہوئے تھے۔ جن کے جسد اطہر کی بے حرمتی کرتے ہوئے کفار نے ان کے کان، ہونٹ، ناک کاٹنے کے ساتھ آنکھیں نکال دیں جس پر انصار نے کہا جب ہمیں کفار پر غلبہ ہوا تو ہم بھی ان کی لاشوں کا مُثلہ کریں گے۔ پھر جب مکہ فتح ہوا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اگر تم بدلہ لینا چاہو تو پھر اتنا ہی بدلہ لے سکتے ہو جتنا تم پر ظلم کیا گیا ہے۔ البتہ صبر کرو گے تو صبر کرنے والوں کے لئے یہ نہایت ہی بہتر بات ہے۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ ہم صبر کریں گے اور انتقام نہیں لیں گے (جامع ترمذی، مسند احمد، مستدرک حاکم)

علمی و عملی بات: اس آیت سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ اگر کسی مبلغ پر ظلم ہو تو وہ ظلم کا بدلہ لے سکتا ہے لیکن تبلیغ کے میدان میں اگر مبلغ صبر سے کام لے تو یہ بات نہایت ہی مفید ثابت ہوتی ہے۔ جس کی تاریخ اسلام میں ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ طائف میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وعظ اور تبلیغ کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ وہاں کے باشندوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کیچڑ پھینکا۔ آوازیں لگائے، اتنے پتھر مارے کہ حضور سید دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لہو سے تربہ تر اور بے ہوش ہوگئے۔ پھر بھی یہی فرمایا کہ: میں ان لوگوں کی ہلاکت نہیں چاہتا۔ کیوں کہ اگر یہ ایمان نہیں لاتے تو امید ہے کہ ان کی اولاد مسلمان ہو جائے گی۔

آیت نمبر ۱۲۷: رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ مومنوں کو صبر کرنے کی تلقین و ترغیب کی گئی ہے۔ صبر وہی کرتے ہیں جنہیں اللہ ﷻ کی طرف سے اس کی توفیق عطا ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو مخالفین کی سازشوں پر اپنے آپ کو غمگین نہ کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

علمی بات: عام مسلمانوں کو تو انتقام لینے کی مشروط اجازت دی گئی لیکن اپنے محبوب مکرم ﷺ کو ارشاد فرمایا کہ: اے سراپا جود و کرم! آپ ﷺ اللہ ﷻ کی توفیق سے ہر حالت میں صبر کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہیں۔ آپ ﷺ پر ظلم و ستم کی انتہا ہی کیوں نہ کر دی جائے۔ آپ ﷺ کا شعار عفو در گزر ہی رہے۔ اسلام اور اہلِ اسلام کے خلاف ان کی سازشوں سے آپ ﷺ دل گیر نہ ہوا کریں۔ اللہ ﷻ خود اسلام کی ترقی کا ضامن ہے۔ وہی کفار کے منصوبوں کو اپنی قدرت کاملہ سے خاک میں ملاتا رہے گا۔

علمی بات: نبی کریم ﷺ کو دعوت اسلام کی راہ میں جو تکلیفیں پہنچتی تھیں، اللہ ﷻ نے انہیں ان پر صبر کرنے کی نصیحت کی ہے اور کہا ہے کہ اگر مشرکین مکہ اسلام قبول نہیں کرتے تو آپ ﷺ غم نہ کھائیں اور ان کی سازشوں کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان نہ ہوں۔ اللہ ﷻ آپ ﷺ کے لئے کافی اور آپ کا حامی و ناصر ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے ان بندوں کا معین و مددگار ہوتا ہے جو خیر کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں، ان کی حفاظت فرماتا ہے اور انہیں ان کے دشمنوں پر غلبہ دیتا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ طبعاً سخت مزاج اور درشت کلام کرنے والے نہ تھے اور نہ تکلفاً سخت مزاج تھے اور نہ بازار میں شور کرتے تھے اور نہ برائی کا جواب برائی سے دیتے تھے لیکن معاف کر دیتے تھے اور در گزر کرتے تھے۔ (جامع ترمذی، مسند احمد، صحیح ابن حبان، بیہقی)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے نہیں دیکھا کہ کبھی رسول اللہ ﷺ نے اپنے اوپر کیئے جانے والے ظلم کا بدلہ لیا ہو، جب تک کوئی شخص اللہ ﷻ کی حدود میں سے کسی کو نہیں توڑے اور جب کوئی شخص اللہ ﷻ کی حدود میں سے کسی حد کو توڑتا تھا تو آپ ﷺ سے بڑھ کر غضب ناک کوئی نہیں ہوتا تھا اور جب بھی آپ ﷺ کو دو کاموں میں سے کسی ایک کام کا اختیار دیا جاتا تو آپ ﷺ ان میں سے آسان کام کو اختیار فرمالیتے بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو۔
(صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد)

آیت نمبر ۱۲۸: اللہ ﷻ کی مدد ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو دو صفات کے حامل ہوں:

۱۔ تقویٰ اختیار کرنے والے۔ ۲۔ عمدگی اور حسن کے ساتھ اعمال صالحہ انجام دینے والے۔

علمی بات: جب اللہ ﷻ نے آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو تقویٰ اور احسان کی صفت سے نواز دیا تو اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لیں کہ اللہ ﷻ کی مدد ہوگی۔ دشمن اپنی چالوں میں کامیاب نہ ہوں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ کافر اپنی چالیں چلتے رہے اور اسلام آگے بڑھتا گیا۔

علمی و عملی بات: تبلیغ و اشاعت اسلام میں کامیابی کا انحصار فقط تائید الٰہی اور نصرتِ ربانی پر ہے۔ اس لئے مبلغ اسلام کو بتا دیا کہ یہ سعادت صرف ان پاکبازوں کو بخشی جاتی ہے۔ جو زیور تقویٰ سے آراستہ ہوں اور خلق خدا کے ساتھ احسان اور خیر خواہی کے جذبات سے ان کے دل معمور ہوں۔ دین کے داعی کو اپنی وسعت علمی اور قوت بیان پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس کا کل اعتماد معیت و تائید ایزدی اور نصرت ربانی پر ہونا چاہیئے اور اس معیت و نصرت کا مستحق وہی ہو سکتا ہے جو اس ضابطہ پر سختی سے کاربند ہو جس کا ذکر یہاں کیا گیا ہے۔

عملی بات: انسان جس قدر اللہ ﷻ کی نافرمانی سے ڈر کر پرہیزگاری اور نیکی اختیار کرے گا، اسی قدر اللہ ﷻ کی امداد و اعانت اس کے ساتھ ہوگی۔ پس ایسے لوگوں کو کفار کے مکر و فریب سے تنگ دل اور غمگین ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ وہ ایسے لوگوں کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔

COPYRIGHTS ® RESERVED WITH ... SALE OF THIS BOOK WILL ENTAIL CIVIL & CRIMINAL ACTION

سورۃ بنی اسرائیل

ربط سورت: ا۔ سورۃ النحل میں ہجرت کی فضیلت کا ذکر تھا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہجرت کے حوالہ سے باقاعدہ دعا کا ذکر ہے۔

۲۔ سورۃ النحل میں ہجرتِ مدینہ سے قبل مشرکین کے ساتھ کشمکش کا بیان تھا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں بنی اسرائیل میں سے یہود کا بیان ہے جن سے ہجرتِ مدینہ کے بعد سابقہ پیش آنے والا تھا۔

۳۔ دونوں سورتوں میں معاشرتی ہدایات بھی عطا کی گئی ہیں۔

آیت نمبر ا: اس آیت میں اللہ ﷻ کی شانِ قدرت اور نبی کریم ﷺ کی عظمت کا بیان ہے۔ اللہ ﷻ نے رات کے ایک قلیل حصہ میں اپنے بندہ سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کے سفر کے ساتھ کائنات کی سیر کرائی۔ یہ واقعہ "معراج النبی ﷺ" کہلاتا ہے۔ یہ سفر رسول اللہ ﷺ کا ایک عظیم معجزہ ہے۔ اس واقعہ میں بنی اسرائیل کو مسجد اقصیٰ کی تولیت سے محروم کرکے یہ اعزاز امت محمدیہ ﷺ کو دیئے جانے کا اشارہ ہے۔ مادی و روحانی دونوں اعتبار سے بیت المقدس کی برکتوں سے نوازے جانے کا بیان ہے۔ سفر معراج کا اہم مقصد یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ ﷻ سے قربت اور ہم کلامی کا شرف اور اللہ ﷻ کی قدرت کی نشانیاں اور کمالات دکھائے جائیں اور آپ ﷺ کی عظمت و رفعت کا بھی اظہار کیا جائے۔ واقعہ معراج میں آپ ﷺ کے عروج کی طرف بھی اشارہ ہے۔

علمی بات: صحیح روایات کے مطابق یہ معجزانہ سفر بیداری کی حالت میں پیش آیا تھا اور اس طرح اللہ ﷻ کی قدرتِ کاملہ کی ایک عظیم نشانی آپ کو دکھائی گئی تھی، یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ یہ واقعہ بیداری کے بجائے خواب میں دکھایا گیا کیونکہ یہ بات صحیح احادیث کے تو خلاف ہے ہی مزید برآں قرآنِ حکیم کا اسلوب واضح طور پر یہ بتا رہا ہے کہ یہ غیر معمولی واقعہ تھا جسے اللہ ﷻ نے اپنی ایک نشانی قرار دیا ہے، اگر یہ صرف ایک خواب کا واقعہ ہوتا تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہ ہوتی، انسان خواب میں بہت کچھ دیکھتا رہتا ہے، پھر اسے اپنی ایک نشانی قرار دینے کے کوئی معنی نہیں تھے۔

علمی بات: اس واقعہ میں رسول اللہ ﷺ کی شانِ عبدیت کو بیان فرمایا ہے۔ عبدیت بہت بڑا مقام ہے۔ اللہ ﷻ کا بندہ ہونا بہت بڑی بات ہے جسے اللہ ﷻ نے اپنا بندہ بنالیا اور یہ اعلان فرما دیا کہ وہ میرا بندہ ہے اس سے بڑا کوئی شرف نہیں۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ " أَحَبَّ أَسْمَائِكُمْ إِلَى اللّٰهِ عَبْدُ اللّٰهِ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ کہ اللہ ﷻ کو سب سے زیادہ پیارے نام عبد اللہ اور عبد الرحمان ہیں۔" (صحیح مسلم)

علمی بات: دینی برکت یہ ہے کہ وہاں بکثرت انبیاء کرام علیہم السلام مدفون ہیں دنیوی برکت یہ ہے کہ وہاں اشجار، وانہار، وپیداوار کی کثرت ہے اور اس سے خود اس مسجد کا مبارک ہونا بدرجہ اُولیٰ معلوم ہوگیا کیونکہ جب اس کے آس پاس میں بوجہ انبیاء کرام علیہم السلام کے مدفون ہونے کی برکت ہے تو جہاں انبیاء کرام علیہم السلام نے عبادتیں کی ہوں اور وہ انبیاء کرام علیہم السلام کا قبلہ بھی رہا ہو وہ جگہ خود کیسی مبارک ہوگی۔

علمی بات: اللہ ﷻ کا اپنے بندہ کو اپنی آیات یعنی عجائب قدرت دکھانے سے مراد یہ ہے کہ ایک رات کے قلیل ترین وقت میں مکہ مکرمہ سے بیت المقدس لے جانا، پھر بیت المقدس سے آسمانوں تک لے جانا، حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے ملاقاتیں کرانا، ان کی امامت کرانا اور راستہ میں دوسرے عجائبات قدرت کی سیر کرانا، یہ سب کچھ اللہ ﷻ کی وہ آیات تھیں جن کا مشاہدہ کرانا مقصود تھا۔

نوٹ: واقعہ معراج کی تفصیل مطالعۂ قرآنِ حکیم کی درسی کتاب حصہ پنجم میں "واقعہ معراج النبی ﷺ" ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

آیت نمبر ۲: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کی گئی جو بنی اسرائیل کے لئے باعث ہدایت تھی۔ تورات کی تعلیمات کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اللہ ﷻ کے سوا کسی کو کارساز نہ بنایا جائے اور اللہ ﷻ کے ساتھ کسی طرح کا بھی شرک نہ کیا جائے۔

عملی بات: رسول اللہ ﷺ کی معراج کے بعد اس کا ذکر فرمایا اس کا حاصل یہ ہے کہ بندہ کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی مرتبہ اور کوئی معراج نہیں ہے کہ وہ اپنے

COPYRIGHTS ® RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION

تمام مقاصد اور تمام معاملات میں اللہ ﷻ کے سوا کسی اور پر توکل نہ کرے۔ اگر وہ زبان سے کچھ بولے تو اللہ ﷻ کے متعلق بات کرے اگر وہ کچھ سوچے اور غور و فکر کرے تو اللہ ﷻ کی صفات کے متعلق سوچے اور غور و فکر کرے یہ سوچے کہ اللہ ﷻ نے اس کو کتنی عظیم اور کتنی کثیر نعمتیں عطا کی ہیں اور اس نے ان نعمتوں کی کتنی ناشکری کی ہے، اس کی اطاعت کرنے کے بجائے کتنے گناہ کیئے، پھر اپنی تقصیر اور کوتاہی پر نادم اور شرمسار ہو اور اشک ندامت بہائے، اگر اسے کسی چیز کی طلب ہو تو صرف اللہ ﷻ سے طلب کرے اور اگر کسی چیز سے پناہ مانگنی ہو تو صرف اللہ ﷻ سے پناہ مانگے اور اپنی کل اغراض اور مطالب کو اللہ ﷻ کے سپرد کرے اور جب اللہ ﷻ کے سوا اور کسی پر اس کی نظر نہیں ہوگی اور صرف اس کی ذات ہی اس کا مطمع نظر ہو گی تو پھر یہ معنیٰ صادق آئے گا کہ وہ اللہ ﷻ کے سوا کسی کو اپنا وکیل نہیں بناتا۔

علمی بات: لغت میں توکل کا معنیٰ ہے کسی کام میں اپنے عجز کا اظہار کر کے غیر پر اعتماد کرنا اور اہل حقیقت کے نزدیک اس کا معنیٰ ہے ہر چیز میں اللہ ﷻ پر اعتماد کرنا اور لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے مایوس ہونا اور المتوکل علی اللہ اس کو کہا جاتا ہے جس کو یہ یقین ہو کہ اس کے رزق اور اس کی تمام ضروریات کا اللہ ﷻ کفیل اور ضامن ہے۔ پس وہ اسی کی طرف رجوع کرے اور اس کے غیر پر توکل نہ کرے۔

آیت نمبر ۳: بنی اسرائیل کے ساتھ دوسروں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اچھی طرح جان لو ناشکری کا نتیجہ بُرا ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل کے آباؤ اجداد حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لانے والے طوفان سے بچ جانے والے لوگ تھے۔ بنی اسرائیل کو حضرت نوح علیہ السلام کی طرح شکر گزاری اختیار کرنے اور آخری رسول سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ پر ایمان لے آنے کا حکم دیا گیا ہے۔

علمی بات: اس کے بعد اللہ ﷻ نے حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق فرمایا: بے شک وہ بہت شکر گزار بندے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام اس لئے بہت شکر کرتے تھے کہ کیونکہ وہ مُوَحِّد (اللہ ﷻ کو ایک ماننے والے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنے والے) تھے اور ان کو جو بھی نعمت ملتی تھی اس کے متعلق ان کو یہ یقین تھا کہ وہ نعمت اللہ ﷻ نے اپنے فضل و کرم سے عنایت فرمائی ہے، چنانچہ بنی اسرائیل کو بھی ہدایت ہے کہ تم لوگ حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہو، پس تم بھی ان کی پیروی کرو اللہ ﷻ کے سوا کسی کو معبود نہ بناؤ اور اس کے سوا اور کسی پر توکل نہ کرو اور ہر نعمت پر اس کا شکر ادا کرو۔

آیت نمبر ۴: بنی اسرائیل کی سرکشی کے متعلق خبر دیئے جانے کا بیان ہے۔ بنی اسرائیل دوبار سخت سرکشی اختیار کر کے زمین میں فساد پھیلانے کے موجب ہوں گے۔

علمی بات: تورات میں یا کسی دوسری آسمانی کتابوں میں یہ پیشن گوئی کی گئی تھی کہ یہ قوم (بنی اسرائیل) دو مرتبہ ملک میں سخت خرابی پھیلائے گی اور ظلم و تکبر کا شیوہ اختیار کر کے سخت سرکشی کا مظاہرہ کرے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ہر مرتبہ اللہ ﷻ کی طرف سے دردناک سزا کا مزہ چکھنا پڑا۔

اللہ ﷻ نے بنی اسرائیل کو ان کی طرف نازل کردہ کتابوں میں یہ بتلا دیا تھا کہ تم زمین میں دوبارہ فساد کرو گے۔ اللہ ﷻ کی حکم عدولی اور انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ دشمنی کرو گے۔ پھر اس کا ردِ عمل یہ ہو گا کہ میں اپنے زبردست بندے تمہارے اوپر مسلط کروں گا۔ وہ تمہارے گھروں تک پہنچ جائیں گے اور تمہاری آبادی کو تہہ و بالا کر دیں گے۔

آیت نمبر ۵: بنی اسرائیل کی فتنہ انگیزی اور ان پر پہلے عذاب کا بیان ہے۔ سرکشی کے نتیجہ میں ان پر طاقتور اور ظالم بندے مسلط کیئے گئے اور انہیں تباہی سے دوچار کیا گیا۔ مراد بابل کا حکمران بختِ نصر ہے جس کے ذریعہ انہیں سخت عذاب میں مبتلا کیا گیا۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی طرف سے یہود پر واضح کیا گیا کہ جب تم لوگ دین سے پھر جاؤ گے، جب تم اللہ ﷻ کی کتاب اور اس کے احکام کو ہنسی مذاق بنا لو گے تو تم ضرور اللہ ﷻ کے عذاب کا نشانہ بنو گے۔ چنانچہ ان کے دین سے پھر جانے کے بعد مغربی ایشیا یعنی مشرق وسطیٰ کی ایک قدیم سلطنت جس کا نام آشور تھا جسے انگریزی میں Assyria کہتے ہیں، اس کے باسیوں "آشوریوں" اور عراق کے بادشاہ "بختِ نصر" کے ہاتھوں ان پر عذاب کا کوڑا برسا، جس کے نتیجہ میں دونوں اسرائیلی سلطنتیں ختم ہو گئیں یروشلم مکمل طور پر تباہ ہو گیا، ہیکل سلیمانی مسمار کر دیا گیا۔ یہود کی بہت بڑی تعداد قتل کی گئی، جب کہ بہت بڑی تعداد کو غلام بنا لیا گیا۔ یہ یہود کی انتہائی توہین و تذلیل کی تصویر ہے۔ اس لئے کہ جب دشمن اتنا زور آور ہو کہ گھروں کے اندر گھس پڑے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے

عزت وناموس ہر چیز کو تاراج کر کے رکھ دیا۔ یہاں صرف اسی پر اکتفا فرمایا ہے اس لئے کہ ذلت کی تصویر کے لئے یہی کافی تھا لیکن آگے اس بات کا حوالہ بھی آئے گا کہ اس دشمن نے صرف گھروں میں گھسنے ہی پر بس نہیں کی بلکہ مسجد اقصیٰ کی حرمت بھی پوری طرح برباد کی۔

علمی بات: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مصر سے آنے والے بنی اسرائیل جب فلسطین میں داخل ہو گئے تو انہیں حکم یہ تھا کہ فلسطین کا سارا علاقہ فتح کریں اور وہاں کے رہنے والے لوگوں کی اخلاقی اور اعتقادی خرابیوں میں مبتلا ہونے سے اجتناب کریں۔ مگر ایک تو انہوں نے سارے علاقہ کو فتح نہ کیا اور جو کر چکے تھے اس پر ہی قناعت کر لی۔ دوسرا وہ قبائلی عصبیت میں مبتلا ہو گئے اور مفتوحہ علاقہ کو بارہ (۱۲) حصّوں میں تقسیم کر کے ہر قبیلہ نے الگ الگ حکومت قائم کر لی۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی حکومت کو کبھی استحکام نصیب نہ ہو سکا۔ نیز سابقہ اقوام کی اخلاقی اور اعتقادی بیماریاں یعنی شرک، بے حیائی اور بدکاری وغیرہ ان میں بھی پھیلنے لگیں۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات کو یکسر بھول گئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے کافی حد تک اُن کے احوال کی اصلاح کی اور ایک دفعہ پھر سے حکومت بنی اسرائیل کو مستحکم بنا دیا۔ مگر جلد ہی بنی اسرائیل پھر سے انہیں بیماریوں اور خرابیوں میں مبتلا ہو گئے۔ بت پرستی اور بے حیائی عام ہو گئی اور حکومت بھی متزلزل ہو گئی۔ یہ صورت حال دیکھ کر بابل کے بادشاہ بخت نصر نے دولت یہودیہ کو مسخر کیا اور بادشاہ کو قید کر لیا۔ اس دوران حضرت یرمیاہ علیہ السلام ان کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ ان کے سمجھانے کے باوجود وہ اپنے اعمال درست کرنے کے بجائے بابل کے خلاف سازش اور بغاوت کر کے اپنی قسمت بدلنے کی کوشش کرنے لگے۔ آخر ۵۸۷ قبل مسیح میں بخت نصر نے ایک زوردار حملہ کر کے سلطنت یہودیہ کے تمام چھوٹے بڑے شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ کشت وخون کا بازار گرم کیا۔ یروشلم اور ہیکل سلیمانی کو پیوند خاک کر دیا۔ بہت سے قیدیوں کو اپنے ساتھ لے گیا اور جو لوگ بچ گئے وہ ہمسایہ قوموں کے ہاتھ بُری طرح ذلیل ہو کر رہے۔ اس دوران بخت نصر نے بنی اسرائیل کی بڑی تعداد کو قتل کیا اور بقیہ مردوں عورتوں اور بچوں کی ایک بڑی تعداد کو جانوروں کی طرح ہانکتا ہوا عراق کے شہر بابل لے گیا جہاں یہ لوگ تقریباً ۱۲۵ سال تک قید کی حالت میں رہے۔ ذلت ورسوائی کے اعتبار سے یہ ان کی تاریخ کا بدترین دور تھا۔ یہ تھا وہ پہلا فساد جس سے بنی اسرائیل کو متنبہ کیا گیا تھا۔ جب عزیر علیہ السلام واپس اپنے وطن آرہے تھے تو انہوں نے ایک اُجڑی ہوئی برباد شدہ بستی دیکھی تو کہنے لگے "پروردگار! تو اس بستی کو کیسے دوبارہ زندہ یا آباد کرے گا؟" یہ بستی بھی دراصل بخت نصر کے حملے میں ہی تباہ ہوئی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسی مقام پر حضرت عزیر علیہ السلام کو وفات دے دی۔

نوٹ: بنی اسرائیل کی تاریخ اور عروج وزوال کے حوالہ سے مزید تفصیلات مطالعۂ قرآن حکیم حصہ پنجم "تاریخ بنی اسرائیل" ملاحظہ فرمائیں۔

علمی بات: یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان ظالموں اور جابروں کو "عِبَادًا لَّنَآ" سے تعبیر فرمایا۔ یہ اصل میں شکوہ آمیز جملہ ہے اور مسلمانوں اور ایمان والوں کو جھنجھوڑا گیا ہے کہ جب تم اپنے ایمان کے تقاضوں کو پورا نہیں کرو گے تو اللہ تعالیٰ نے اظہار ناراضگی کے لئے ایمان والوں کے دشمنوں کو اپنے بندے کہہ کر ذکر فرمایا کہ "عِبَادًا لَّنَآ" کے مصداق اور مظہر اصل میں ایمان والے تھے، لیکن جب انہوں نے اپنے آپ کو اس قابل ہی نہیں چھوڑا تو اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو ان الفاظ سے یاد فرمایا تاکہ ایمان والوں کو خوب جھنجھوڑا جائے۔

نوٹ: حضرت عزیر علیہ السلام کا یہ واقعہ سورۃ البقرۃ کی آیت:۲۵۹ کے تحت مطالعۂ قرآن حکیم رہنمائے اساتذہ حصہ ششم میں ذکر کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ

آیت نمبر ۶: بنی اسرائیل کو دوبارہ عروج دیئے جانے کا بیان ہے۔ حضرت عزیر علیہ السلام کے دور کا ذکر ہے۔ اپنی بداعمالیوں پر نادم ہو کر تائب ہونے والے بنی اسرائیل کو دشمنوں پر غلبہ اور مال واولاد سے نوازا گیا۔ ان کی تعداد میں اضافہ کر کے انہیں طاقتور بنایا گیا۔

علمی بات: بُختِ نصر کی موت کے بعد حالات نے پلٹا کھایا اور بابل کی سلطنت زوال پذیر ہوئی۔ ۵۳۹ قبل مسیح میں ایران کے بادشاہ سائرس (Cyrus) نے بابل (عراق) فتح کیا۔ سب سے پہلے اس نے یہودا کی سلطنت کو بحال کرنے اور یروشلم کے ہیکل کو دوبارہ تعمیر کرنے کا فرمان صادر کیا۔ اور اس کے بعد اس نے بنی اسرائیل کو اپنے وطن واپس جانے اور وہاں دوبارہ آباد ہونے کی عام اجازت دے دی۔ چنانچہ یہودیوں کے قافلے فلسطین جانا شروع ہو گئے اور یہ سلسلہ مُدتوں جاری رہا۔ یہی زمانہ تھا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو سو (۱۰۰) سال تک موت کی حالت میں رکھا پھر آپ علیہ السلام کو اس سے اُٹھایا جس کا ذکر سورۃ البقرۃ کی آیت:۲۵۹ میں بھی ہے۔

آیت نمبر ۷: بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا ہے کہ اچھے اعمال پر اچھے نتائج ان کے حصہ میں آئیں گے اور بد اعمالیوں کے نتائج خود ان ہی کے لئے ہوں۔ دوبار سرکشی اختیار کرنے کے نتیجہ میں وعدہ کے مطابق ان پر عذاب بھیجا گیا۔ ان پر ایسے دشمنوں کو مسلط کیا گیا جنہوں نے ان کی قتل وغارت کی۔ ٹائٹس رومی کے ہاتھوں عذاب آیا۔ بنی اسرائیل کے قبلہ "بیت المقدس" کو بھی دشمنوں نے منہدم کر کے اس میں گھس کر اس کی بے حرمتی کی۔

علمی بات: حضرت عزیر علیہ السلام کی کوششوں سے اصلاح عقائد و اخلاق کی جو نئی روح ان میں پھونکی گئی تھی وہ بھی زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوئی۔ آپ علیہ السلام کے بعد بہت جلد وہ پھر دنیا پرستی، لذت کوشی اور جاہ طلبی کی لعنت میں گرفتار ہو گئے۔ ایرانی سلطنت کے زوال کے ساتھ یونانیوں کا عروج شروع ہوا۔ چنانچہ سکندر اعظم نے مشرق وسطی کے دیگر ممالک کے ساتھ فلسطین پر اپنا قبضہ جمالیا۔ یونانی عقیدہ کے لحاظ سے بدترین قسم کے شرک میں مبتلا تھے۔ انہوں نے اپنے زمانۂ اقتدار میں اپنی مادر پدر آزاد تہذیب اور تمدن کو یہاں فروغ دینے کی انتہائی کوشش شروع کی۔ فلسطین ایک الگ ریاست تھی۔ جس کا سردار یونانیوں کا مقرر کیا ہوا کوئی یہودی ہوا کرتا تھا۔ لیکن انتظامی لحاظ سے اس کا الحاق شام کے ساتھ کر دیا گیا تھا جہاں کا گورنر کوئی یونانی ہوتا تھا۔ یونانی تہذیب کو مقبول بنانے کی کوشش رنگ لائیں اور خود یہودیوں کا بااثر اور متمول طبقہ اس کا دلدادہ بن گیا۔ گرولیر انسائیکلوپیڈیا (Grollier Ency) نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اس نے شامی کمشنر کو بھی قتل کر دیا اور اپنے پانچ لڑکوں جون، سمن، یہوداہ، الیعزر اور جوناتھان سمیت وہاں سے نکل کر ایک پہاڑ میں خیمہ زن ہو گیا۔ یہودیوں کی ایک کثیر تعداد اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئی اور ان کی کوششوں سے ایک آزاد یہودی مملکت معرض وجود میں آئی۔

آیت نمبر ۸: دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہود کو سابقہ واقعات سے عبرت حاصل کرنے کی تنبیہ کی گئی ہے۔ اگر وہ اپنی اصلاح کر لیں تو وہ اللہ ﷻ کی رحمت کے مستحق ہوں گے۔ سرکشی سے باز نہ آنے اور آخری رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے انکار پر ان کا انجام بھی پچھلے لوگوں سے مختلف نہیں ہو گا۔ کفر کی دائمی سزا جہنم کا قید خانہ ہے۔

علمی بات: سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے بنی اسرائیل کو ان کی فساد انگیزیوں کی وجہ سے ہولناک تباہیوں سے دوچار کیا گیا تھا۔ ان تباہیوں نے بنی اسرائیل کو بالکل بے جان کر دیا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے ان کے مطلع حیات پر امید کی ایک روشن کرن ظاہر ہوئی اور زبانِ قدرت نے انہیں صدائے عام دی کہ اے اُجڑے ہوئے اسرائیلی قبیلو! دیکھو رحمتِ الٰہی کا نقیب تشریف لا رہا ہے۔ اٹھو! آگے بڑھو! اور اس کا دامن کرم تھام لو! تمہیں رحمتِ الٰہی کا مستحق قرار دے دیا جائے گا۔

لیکن اگر تم نے میرے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو تم نے سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ روا رکھا تھا تو جان لو کہ اللہ ﷻ کی شمشیر غضب کُند نہیں ہوئی۔ پھر تمہاری سرکوبی کر دی جائے گی اور تمہیں اپنے کرتوتوں کی سزا پہلے کی طرح بھگتنا ہو گی۔

علمی بات: آفتابِ اسلام کے طلوع سے لے کر آج تک کی یہودی قوم کی تاریخ کا طالب علم خوب جانتا ہے کہ ان کا سارا عرصہ فساد انگیزیوں اور ان پر مرتب ہونے والی اذیت ناک سزاؤں سے عبارت ہے۔ یہ ساری دنیا میں منتشر ہو کر ایک بے اثر اقلیت کی طرح زندگی بسر کرتے رہے۔ یہ جہاں بھی گئے، محرومی، نحوست، ذلّت اور پستی ان کے ساتھ گئی۔ جب بھی عیسائیوں نے ان پر غلبہ پایا تو ان کو سخت اذیتیں دیں۔ اپنی شرارتوں کی وجہ سے سارے یورپ میں یہ بڑی حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد فلسطین کو یہودی وطن بنانے کی تحریک کو برطانیہ اور امریکہ کی پرزور تائید حاصل ہو گئی اور ان ہی کی سنگینوں کے سایہ میں عالم اسلامی کے عین وسط میں ایک اسرائیلی ریاست قائم ہوئی۔

علمی بات: اِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا کا فرمان آج بھی ضرور پورا ہو گا۔ جس طرح آج تک پورا ہوتا رہا ہے۔ اس کے لئے صرف ایک چیز کا ہی انتظار ہے۔ مسلمان اپنے سرچشمۂ حیاتِ اسلام کی طرف رجوع کریں۔ یہیں سے انہیں مستحکم اتحاد کی دولت ملے گی۔ یہیں سے انہیں جوش جہاد نصیب ہو گا۔ یہیں سے انہیں وہ قوت مرحمت ہو گی جو انہیں فتح و نصرت کی بلندیوں کی طرف لے جائے گی۔ قوموں کی زندگیوں میں دس بیس سال کا عرصہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس لئے اسرائیل کی عارضی کامیابی کو دیکھ کر کسی کو شک و شبہ کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ ﷻ کا وعدہ سچا ہے اور وہ پورا ہو کر رہے گا۔

علمی بات: اس آیت میں "اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا" کے دو لفظوں کے اندر وہ سب کچھ کہہ دیا جو جزائے عمل کے بارے میں کہا جاسکتا ہے اور اس سے قرآنِ حکیم کی معجزانہ بلاغت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ عمل اور نتیجہ دو ایسی لازم و ملزوم حقیقتیں ہیں جو کسی حال میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتیں۔ نتیجہ عمل کا سایہ ہے۔ جہاں عمل آیا اس کا سایہ بھی ساتھ آگیا۔ کسی نے اچھے عمل کی طرف رخ کیا تو اچھے نتائج بھی اس کی طرف آنے لگے۔ اگر کسی نے بُرے عمل کی طرف قدم اٹھایا تو بُرے نتائج کے بھی قدم اُٹھ گئے۔ یعنی مکافاتِ عمل کا قانون ہر جگہ یہی ہے۔ اس میدانِ عمل میں جو جتنا بڑھتا جائے گا اور جس قدر بھی غور کرے گا، حقیقت ہر جگہ یہی نظر آئے گی۔

علمی بات: آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہودیوں کی دو ہلاکتیں ہوچکیں۔ اب تیسری مہلت انہیں ملی تھی۔ یعنی دعوتِ حق کے ظہور نے رحمتِ الٰہی کی بخششوں کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اگر انکار و سرکشی سے باز آجاتے تو ان کے لئے سعادت و کامرانی تھی۔ لیکن وہ باز نہ آئے تو جس طرح دو مرتبہ نتائج عمل کا قانون اپنی عقوبتیں اور سزائیں دکھلا چکا ہے۔ تیسری مرتبہ بھی ان کو دکھلائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہودیوں نے جس طرح اس مہلت سے فائدہ نہیں اٹھایا تھا جو حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور نے انہیں دی تھی اسی طرح دعوتِ اسلام سے بھی فائدہ نہ اٹھایا اور محرومی و نامرادی کی مہر ہمیشہ کے لئے ان کی قسمت پر لگ گئی۔

آیت نمبر ۹: اَقْوَمُ کا لغوی معنٰی ہے سب سے زیادہ سیدھی، سب سے زیادہ درست، بالکل سیدھا اور مستقیم۔ اس کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ وہ راستہ جو منزل مقصود تک پہنچنے میں قریب ہو، آسان ہو، خطرات سے خالی ہو۔

قرآنِ حکیم کے دو اوصاف کا بیان ہے: ا۔ تمام معاملات میں سیدھے راستہ کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔

۲۔ قرانِ حکیم مومنوں کو ان کے نیک اعمال کے انجام کی بشارت دیتا ہے جس کا اصل ظہور آخرت میں ہوگا۔

علمی بات: بے شک یہ قرآنِ حکیم اس راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھا اور ہر لحاظ سے درست راستہ ہے۔ جس میں نہ کوئی کجی ہے نہ کوئی پیچیدگی۔ وہ راستہ جو عقل سلیم کے تقاضوں کے مطابق ہے۔ جو سیدھا اللہ ﷻ تک پہنچنے اور پہنچانے والا ہے۔ جو عقل و فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق اور دارین کی سعادت و سرخروئی کا ضامن ہے۔ اس کے سوا باقی سب راستے ٹیڑھے ہیں۔

قرآنِ حکیم سے مستفید ہونے کی پہلی اور بنیادی شرط اس پر سچا پکا ایمان رکھنا ہے۔ اور دوسری شرط اس کی تعلیمات کے مطابق عمل کرنا۔ جتنی ان دونوں باتوں میں پختگی ہوگی اتنا ہی یہ نوازے گا اور نوازتا چلا جائے گا۔ اہل ایمان کے لئے اجر کبیر کا مُژدہ جانفزا سنایا گیا ہے کہ "ان کے لئے ایک بڑا ہی عظیم الشان اجر و ثواب ہے" اتنا بڑا اور اس قدر عظیم الشان کہ اس کی عظمت وسعت دارین کو محیط ہے کہ ایسے لوگ دنیا میں حیاتِ طیبہ "پاکیزہ زندگی" اور سچی ناموری کی دولت سے بہرہ ور ہوں گے۔ آخرت میں جنت کی دائمی نعمتوں سے سرفراز ہوں گے۔

عملی پہلو: جو لوگ اس اجر کبیر اور دارین کی سعادت و سرخروئی سے سرفراز و فیضیاب ہونا چاہتے ہیں تو وہ صدقِ دل سے قرآنِ حکیم پر ایمان لاکر اس کی دروس و تعلیمات کو اپنائیں۔ یہی راستہ ہے صحت و سلامتی کا۔

عملی پہلو: بنی اسرائیل کے عبرت آموز احوال کے بیان کرنے کے بعد اب مسلمانوں کو بتایا جارہا ہے کہ یہ کتابِ ہدایت جو ہم نے انہیں عطا فرمائی ہے۔ یہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں ان ہی اصول و قوانین کی تعلیم دیتی ہے جو ہر لحاظ سے دیگر قواعد و ضوابط سے بہتر، زیادہ مفید اور نفع بخش ہیں۔ اس لئے وہ بے جھجک اپنی انفرادی اور اجتماعی، سیاسی اور معاشی، تمدّنی اور اخلاقی تربیت و ہدایت کے لئے اس سے رہنمائی حاصل کریں۔ کسی کی وسوسہ اندازی سے ان کا یقین کمزور نہ ہو۔

عملی پہلو: جو لوگ قرآنِ حکیم کی اس دعوت کو صدق دل سے قبول کرتے ہیں اور اس پر راست بازی سے عمل کرتے ہیں تو قرآنِ حکیم ان کو یہ خوشخبری سناتا ہے کہ ان کا کوئی عمل رائیگاں نہیں جائے گا۔ ان کی کوئی محنت بے ثمر نہیں ہوگی بلکہ ان کو اس جدوجہد کا عظیم صلہ دیا جائے گا، جس کی لذتوں سے وہ دونوں جہانوں میں شاد کام ہوں گے۔

علمی بات: قرآنِ حکیم ہدایات کی ایسی راہ دکھاتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی راہ ہے اور ان لوگوں کے لئے جو اس راہ پر چلیں ہر طرح کی کامیابیوں کی بشارت ہے۔ قرآنِ حکیم نے اپنے جس قدر اوصاف بیان کیئے ہیں ان سب میں جامع ترین وصف یہی ہے۔ زندگی اور سعادت کے ہر گوشہ میں اس کی رہنمائی سیدھی سے سیدھی بات کے لئے ہے۔ کسی طرح کی کجی، کسی طرح کا پیچ وخم، کسی طرح کا الجھاؤ، کسی طرح کی افراط و تفریط اس کی رہنمائی میں نہیں ہوسکتی۔ یہی حقیقت دوسری جگہ صراطِ مستقیم اور دِیۡنُ الْقَیِّم سے تعبیر کی گئی ہے۔

آیت نمبر۱۰: اہل ایمان کو بشارت کے ساتھ ساتھ قرآنِ حکیم نافرمانوں کو بھی ان کے انجام سے آگاہ کرتا ہے۔ آخرت کے محاسبہ کو تسلیم نہ کرنے والوں کو دردناک عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔

علمی بات: ایمان سے محروم لوگوں کے لئے بڑے ہی دردناک عذاب کی وعید سنائی گئی۔ اتنا بڑا اور اس قدر ہولناک کہ نہ تو یہاں اس کا ادراک کسی کے بس میں ہے اور نہ ہی الفاظ و تعبیرات سے اس کا احاطہ ممکن ہے۔ یہ طبعی نتیجہ اور لازمی اثر ہوگا ان کے بُرے اعمال کا۔ ایسے لوگوں نے اپنے ظاہر وباطن کو ملوث کررکھا تھا اور وہ زندگی بھر نورِ حق وہدایت کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوئے تھے۔ جس کے باعث وہ کفر وباطل کی اس میل میں لتھڑے ہوئے ہی اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ روزِ قیامت کے اس عالم مشاہدہ میں کفر وباطل کی یہی میل ان کے جسموں پر تارکول بن کر پھیل جائے گی۔ جس کو دوزخ کی وہ ہولناک آگ لپک کر پکڑلے گی اور ان کے چہروں پر چھا جائے گی۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر اس حقیقت کو صاف اور واضح طور پر اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: "اور ان کے کُرتے گندھک کے ہوں گے اور ان کے چہروں کو آگ ڈھانپ رہی ہوگی۔" (سورۃ ابراہیم ۱۴، آیت:۵۰) اس میں بھی اہل ایمان کے لئے بالواسطہ طور پر مسرت و شادمانی کا سامان ہے کہ ان کے دشمن اس طرح کے ہولناک عذاب میں مبتلا ہوں گے کہ دشمن کی مصیبت سے مسرت ایک طبعی چیز ہے۔

آیت نمبر۱۱: لوگوں کی ایک عمومی کمزوری کا بیان ہے۔ انسان بعض اوقات جلد بازی میں اچھائی کی جگہ بُرے کی دعا کر بیٹھتا ہے۔ پھر چاہتا ہے کہ وہ دعا قبول بھی ہو جائے۔ جب کہ اللہ ﷻ کے کاموں میں حکمتیں پوشیدہ ہیں اور اس کا ہر فیصلہ حکمت سے بھرا ہوتا ہے۔

علمی و عملی بات: جب انسان کو غصہ آتا ہے تو اپنی جان کو اور اپنی بیوی کو اور اپنے مال کو اور اپنی اولاد کو بُرے الفاظ میں یاد کرتا ہے۔ پھر اگر اس کی بددعا کے مطابق اللہ ﷻ اس پر تکلیف بھیج دے تو ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ پھر خیر کی دعا کرتا ہے تو اللہ ﷻ اسے خیر عطا فرمادیتا ہے۔ حقیقت میں انسان ذرا سی ناگواری کی وجہ سے بددعا کر بیٹھتا ہے حالانکہ دعا ہمیشہ خیر ہی کی مانگنی چاہیئے اور عافیت ہی کا سوال کرنا چاہیئے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور سرورِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "اپنی جانوں، اپنی اولاد، اپنے خادموں اور اپنے مالوں کے لئے بددعا نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ تم کسی مقبولیت کی گھڑی میں اللہ ﷻ سے سوال کر بیٹھو اور وہ تمہاری بددعا قبول فرمالے۔" (سنن ابی داؤد)

عملی پہلو: اس کے بعد انسان کا مزاج بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا" اور انسان بہت جلد باز ہے۔ (سورۃ بنی اسرائیل ۱۷، آیت:۱۱) دوسری جگہ ارشاد فرمایا: فرمایا: "خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ" انسان جلد باز پیدا کیا گیا ہے۔ (سورۃ الانبیاء ۲۱، آیت:۳۷) انسان کا یہ مزاج ہے کہ اس کے اعمال و اشغال میں عجلت ظاہر ہوتی رہتی ہے اور یہ عجلت بہت سی مصیبتوں کا سبب بن جاتی ہے۔ بہت سے ایکسیڈنٹ جلد بازی کی وجہ سے ہوتے ہیں اور گھریلو معاملات اور ازدواجی زندگی میں بہت سے فیصلے کرنے میں جلدی کرتے ہیں، طلاق وغیرہ اور دیگر ایسے کام کر بیٹھتے ہیں جس کی وجہ سے بعد میں پچھتاتے ہیں اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بُردباری اللہ ﷻ کی طرف سے ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے۔" (جامع ترمذی)

ہر کام سوچ سمجھ کر اطمینان سے کرنا چاہیئے۔ البتہ نیکی کے کاموں میں ضرور جلدی کرنی چاہیئے، ان کی طرف آگے بڑھنے میں دیر نہیں لگانی چاہیئے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ جلد بازی میں آخرت کا کام خراب نہ کرلے، آخرت کے کام میں دیر نہ لگائے جیسے ہی نیکی کا موقع ملے انجام دیدے اور مشغول ہوجائے اسی کو "وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ" "اور اپنے رب کی بخشش اور جنت (کے حصول) کی طرف دوڑو۔" (سورۃ آل عمران ۳، آیت:۱۳۳) آخرت کے اعمال میں جلدی کا یہ مطلب نہیں کہ ناقص اعمال ادا کرے، عمل تو پورا ہو لیکن اس کی طرف متوجہ ہونے میں جلدی کرے جب شروع کرے تو اچھی طرح انجام دے۔

آیت نمبر ۱۲: اللہ ﷻ کی قدرت کی دو نشانیوں رات اور دن کا ذکر ہے اور ان سے حاصل ہونے والے فائدوں کا بیان ہے۔ رات کو تاریک بنایا گیا تا کہ انسان آرام کر سکے۔ دن کو روشن بنایا گیا تا کہ انسان اس کی روشنی میں اپنی روزی تلاش کر سکے۔ دن اور رات کی تبدیلی سے انسان مہینوں اور سالوں کی تعداد معلوم کرتا ہے۔ ہدایت کے حصول کی بنیادی باتوں کی تفصیل بیان کر دی گئی تا کہ انسان صحیح راہ پا سکے۔

علمی بات: رات اور دن کا آگے پیچھے آنا کم اور زیادہ ہونا یہ سب اللہ ﷻ کی قدرتِ کاملہ کے جاننے کے لئے بہت بڑی نشانیاں ہیں۔ انسان عقل سے کام لے، غور و فکر کرے تو ان دونوں کے ذریعہ اللہ ﷻ کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو بنایا ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا اس (شخص) کے لئے جو نصیحت حاصل کرنا چاہے یا شکر گزار بننا چاہے۔" (سورۃ الفرقان ۲۵: آیت: ۶۲)

رات اور دن کا وجود میں آنا، کم و بیش ہونا، کسی علاقہ میں کسی زمانہ میں رات کا زیادہ ہونا اور کسی علاقہ میں کسی زمانہ میں دن کا زیادہ ہونا سب اللہ ﷻ کے مقرر کردہ نظام کے تحت ہے کسی کو اس میں ذرا برابر بھی دخل نہیں ہے۔ سب اہل عقل اس بات کو جانتے اور مانتے ہیں۔

علمی بات: قرآنِ حکیم میں ہر شے کے بیان کے ذکر سے مقصود یہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے ہدایت کے تمام وسائل سے بحث کی ہے اور وہ تمام چیزیں بیان کر دی ہیں، جن کی ہمیں بطورِ ذرائع رہنمائی کی حاجت ہے۔ یعنی ہر چیز جس کی طرف ہم دین و دنیا کی فلاح حاصل کرنے کے لئے محتاج ہیں اس کو نہایت شرح و بسط سے اس کتاب میں بیان کر دیا گیا ہے۔ شرط یہ ہے کہ ہم قرآنی علوم کے بحر میں غوطہ زن ہونے کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں۔ اہل علم کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط کریں اور ان علوم کو حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہیں جو قرآنی معارف و اسرار تک پہنچنے کے لئے ضروری ہو۔

علمی بات: ہر شخص اس تفصیل سے اسی قدر مستفیض ہوتا ہے جتنی کسی کو اللہ ﷻ کی طرف سے استعداد بخشی جائے گی۔ اسی کے مطابق وہ بہرہ مند ہو گا۔ اگر کسی کم نظر کو وہ حقائق نظر نہیں آتے جو اہل بصیرت کو بے حجاب دکھائی دیتے ہیں تو اسے اپنی کم نظری کا شکوہ کرنے کا تو حق پہنچتا ہے لیکن اسے ان حقائق سے انکار کرنے کا کوئی حق نہیں جو نفوسِ قدسیہ کے سامنے بے نقاب ہیں۔

آیت نمبر ۱۳: انسان کے لئے تیار کیئے جانے والے اعمال نامے اور قیامت کے دن ان کے ظہور کا تذکرہ ہے۔ طائر کا لغوی معنی پرندہ کے ہیں۔ عرب پرندوں سے شگون لیتے تھے۔ بتایا گیا ہے کہ انسان کی فلاح یا ناکامی شگون سے منسلک نہیں بلکہ اس کے اعمال سے منسلک ہے۔ مکافاتِ عمل لازمی ہے۔ اعمال کے نتائج انسان سے ایسے جڑے ہوئے ہیں جیسے گلے کا ہار۔ انسان کے اچھے یا بُرے اعمال ایک کتاب کی صورت میں محفوظ ہیں جسے وہ روزِ قیامت اپنے سامنے دیکھ سکے گا۔

علمی بات: "طائر" کا لفظ عربی میں عام طور پر شگون، نحوست اور بد قسمتی کے لئے بولا جاتا ہے لیکن یہاں پر خوش بختی اور بد بختی دونوں ہی مراد ہیں۔ انجام کو گلے سے چمٹانے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کے تمام اعمال ہر لمحہ لکھے جا رہے ہیں جو اس کے اچھے یا بُرے انجام کی نشاندہی کرتے ہیں اور جب قیامت آئے گی تو یہ سارا اعمال نامہ اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا جائے گا۔

علمی بات: زندگی میں انسان جو کچھ کرتا اور کماتا ہے۔ وہ مٹ نہیں جاتا بلکہ اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اور اس میں چھوٹے سے چھوٹا کیا ہوا عمل اس کے نامۂ اعمال میں درج ہو رہا ہوتا ہے۔ انسان کو بُرائی اور شر کے بارے میں جلد بازی سے روکنے کے لئے یہ بتلایا جا رہا ہے کہ اے انسان! جو کچھ تم رات کی تاریکیوں اور دن کے اجالوں میں کرتا ہے۔ وہ رائیگاں نہیں جاتا بلکہ اللہ ﷻ اس کو ہر انسان کے گلے میں لٹکا دیتا ہے۔

کسی چیز کو گلے میں لٹکانا ایک محاورہ بھی ہے۔ جس کا معنی ہے کہ ایسی چیز جس سے انسان کسی صورت میں بھی چھٹکارا نہ پا سکے۔ ممکن ہے کہ عملاً اور حقیقتاً بھی ایسا ہو کہ اللہ ﷻ نے کراماً کاتبین کی دستاویزات کے ساتھ اس بات کا بھی التزام رکھا ہو کہ انسان کی گردن کے پاس جسم کا ایسا حصہ ہو جہاں انسان کے اچھے بُرے اعمال خود بخود مرتب ہوتے جا رہے ہوں۔

علمی بات: بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ہر انسان کا عمل اس کے گلے کا ہار بنادیا گیا ہے۔ عمل کو طائر (پرندہ) سے تعبیر دینے کے بارے میں بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اہلِ عرب جب کسی کام کے لئے جانا چاہتے تھے تو درخت کی ٹہنی ہلا دیتے تھے۔ ٹہنی پر بیٹھا پرندہ داہنی طرف کو اُڑ جاتا تھا تو سمجھتے تھے کہ کام ہو جائے گا اسے فال نیک کہتے تھے۔ اگر پرندہ بائیں طرف کو اُڑ جاتا تو کہتے تھے کہ کام نہیں ہو گا اس کو بدفالی کہتے تھے اور اس کی وجہ سے سفر میں جانے سے رک جاتے تھے۔ اپنے کام کے لئے جانے نہ جانے کا مدار انہوں نے پرندہ کے اڑنے کو بنا رکھا تھا اور گویا پرندہ اڑنا ہی باعثِ عمل تھا اس لئے انسان کے اعمال کو آیتِ بالا میں طائر سے تعبیر فرمایا۔

علمی و عملی پہلو: وہم پرست لوگوں میں آج تک یہ وہم چلے آرہے ہیں کہ کسی کام کو نکلے، راستہ میں بلی وغیرہ کوئی جانور خود سامنے سے گزرا تو یقین کر لیا کہ یہ کام نہیں ہو گا اور راستہ ہی سے واپس لوٹ آئے، صبح ہی صبح کسی پرندے کی آواز کانوں میں پڑ گئی تو سارا دن طرح طرح کے اندیشوں کی نظر ہو جاتا ہے۔ زیرِ نظر آیت میں یہی پہلو واضح فرما دیا کہ انسان کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار طوطے، کوّے، بلی اور چوہے پر نہیں بلکہ اس کا ان اعمال پر ہے جن کو وہ اپنے اختیار سے بجا لاتا ہے وہی اسے سرفراز کرتے ہیں اور وہی اس کی ذلّت کا سبب بنتے ہیں۔ وہ اپنے اعمال کے نتائج سے جان خلاصی حاصل نہیں کر سکتا وہ مکافاتِ عمل کے قانون کو نہیں بدل سکتا اور اس کے اعمال کا رشتہ اتنا گہرا اور مضبوط ہے جیسے کوئی چیز گلے میں لٹک رہی ہو اور وہ اس سے جدا بھی نہ ہو سکتی ہو۔

عملی پہلو: یہ اعمال ہی ہیں جن سے انسان کی دنیا بھی بنتی ہے۔ اسی سے انسان عزت کے راستہ پر چلتا ہے اور اسی کے نتیجہ میں ذلّت مقدر رہوتی ہے۔ یہ انسان کی اپنی ہی بداعمالیاں ہیں جو بعض دفعہ مصیبتوں کا باعث بنتی ہیں۔ کتنی احادیث مبارکہ ہیں جن میں فرمایا گیا ہے کہ رزق میں تنگی، بارشوں کا وقت پر نہ اُترنا، وباؤں کا پھوٹ پڑنا، حادثاتی اموات کا بڑھ جانا، باہمی تعلقات کا بگڑ جانا، ملکی حالات کا غیر مستحکم ہو جانا، دشمن کا حملہ کر دینا اور ظالم حکمرانوں کا مسلط ہو جانا وغیرہ یہ سب انسانوں کی بداعمالیوں کا پھل ہیں۔ لیکن جب آدمی اپنے اعمال کی اصلاح کر لیتا ہے اور اس کی زندگی شریعتِ مطہرہ کے اتباع میں گزرتی ہے تو اللہ ﷻ انسان کو یہ مرتبہ عطا فرماتا ہے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا تھا کہ جب زمین میں زلزلہ آیا تو انہوں نے زمین پر پاؤں مار کر فرمایا: ارے زمین! تو کانپتی ہے، کیا میں نے تجھ پر عدل نہیں کیا؟ اللہ ﷻ ہمیں بھی وہ ایمان اور اعمال نصیب فرمائے۔ آمین

علمی بات: جدید سائنسی تحقیقات نے بھی اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ ہر چیز خواہ اندھیرے میں ہو یا اُجالے میں، ساکن ہو یا حرکت میں ہو اپنے اندر سے ایک حرارت نکالتی رہتی ہے۔ ان حرارتی لہروں سے اس کی مکمل تصویر تیار ہوتی رہتی ہے۔ جس طرح آواز کی لہریں زبان سے نکلی ہوئی تھرتھراہٹ سے بات کو محفوظ کر لیتی ہیں۔ یہ ایک طویل موضوع ہے۔ مختصراً یہ ہے کہ آج کل جو کیمرے انفرارڈ شعاعوں سے کام میں آرہے ہیں وہ یہی کام دکھا رہے ہیں۔

گویا سائنس یہ بتاتی ہے کہ ہمارے اعمال اندھیرے میں کیئے گئے ہوں یا اُجالے میں ہوں، چھپ کر ہوں یا ظاہراً کیئے گئے ہوں سب فضا میں فلم کی صورت میں موجود رہتے ہیں۔ جن کو جمع کر کے کسی بھی شخص کی پوری زندگی کی فلم تیار مل سکتی ہے۔ المختصر عہدِ حاضر میں ریکارڈنگ کے بے شمار ذرائع سے ان باتوں کا سمجھنا بہت ہی آسان ہے۔ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ''اور ہم اس کے لئے قیامت کے دن (نامۂ اعمال کی) ایک کتاب نکالیں گے جسے وہ (اپنے سامنے) کھلا ہوا پائے گا۔'' (سورۃ بنی اسرائیل ۱۷: آیت ۱۳) کے الفاظ سے تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ انسانی جسم کے اندر ہی کوئی ایسا سسٹم لگا دیا گیا ہے جس میں اس کے تمام اعمال و افعال ریکارڈ ہو رہے ہیں اور قیامت کے دن ایک chip کی شکل میں اسے اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ اس chip کے اندر اس کی زندگی کی ساری فلم موجود ہو گی۔ ایک ایک حرکت جو اس نے کی ہو گی، ایک ایک لفظ جو اس نے منہ سے نکالا ہو گا، ایک ایک خیال جو اس کے ذہن میں پیدا ہوا ہو گا اور ایک ایک نیت جو اس کے دل میں پروان چڑھی ہو گی، سب ڈیٹا اور ریکارڈ پوری تفصیل کے ساتھ اس میں محفوظ ہو گا۔ روزِ قیامت اس chip کو کھول کر کھلی کتاب کی طرح اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب

آیت نمبر ۱۴: روزِ قیامت انسان کو اپنے نامۂ اعمال پڑھنے کے لئے کہا جائے گا۔ اسے خود ہی اپنے اعمال کا حساب لگانے اور خود ہی گواہ بننے کا حکم ہو گا۔ انسان خود اپنے اوپر گواہ بھی ہے اور خود سے واقف بھی۔

علمی و عملی بات: روزِ قیامت ہر شخص کے سامنے اس کا اعمال نامہ کھول کر رکھ دیا جائے گا جسے وہ خود پڑھ سکے گا، نامۂ اعمال اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا کہ خود پڑھ کر فیصلہ کرلے، جو کام عمر بھر میں کیئے تھے کوئی رہا تو نہیں یا زیادہ تو نہیں لکھا گیا۔ ہر آدمی اس وقت یقین کرے گا کہ ذرّہ ذرّہ عمل بلا کم و کاست اس میں موجود ہے۔ یعنی اس وقت وہ یہ اعتراف کیئے بغیر نہیں رہے گا کہ اس میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ اس کے اعمال کا بالکل صحیح حساب ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر ایک عقل مند آدمی اپنا احتساب دنیا ہی میں کرتا ہے تاکہ قیامت کے دن اسے پچھتانا پڑے۔

آیت نمبر ۱۵: ہدایت یا گمراہی اختیار کرنا خود انسان کے فائدے یا نقصان کے لئے ہے۔ روزِ قیامت ہر شخص کو اپنے اعمال کا بوجھ خود ہی اٹھانا ہوگا۔ قوموں کی ہلاکت سے پہلے رسولوں کو بھیج کر حجت تمام کر دی جاتی ہے۔

علمی بات: اس آیت میں دو گروہوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا ہے۔ ایک گروہ تو وہ تھا جس کی ترجمانی ولید بن مغیرہ کے اس قول سے ہوتی ہے کہ اس نے اہلِ مکہ کو کہا: تم میری پیروی کرو اور محمد ﷺ کا انکار کرو تمہارے سارے بوجھ میں اپنے سر پر اٹھالوں گا۔ دوسرا گروہ عیسائیوں کا ہے جو عقیدۂ کفارہ کے قائل ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ ان کے گناہوں کے عوض اللہ تعالیٰ نے اپنے فرزند (نعوذ باللہ) مسیح کو سولی دے دی۔ اب ان لوگوں سے ان کے گناہوں کے بارے میں کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ مقامِ غور ہے کہ اگر ان دونوں نظریوں کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو انسان کس قدر ذلّت میں جا گرتا ہے۔

پہلی صورت میں تو انسان اندھی پیروی کا خوگر ہو کر عقل و فہم اور غور و فکر کی خداداد صلاحیتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ دوسری صورت میں اس کے دل سے احساس ذمہ داری مٹ جاتا ہے اور اپنی نجات کو ہر حال میں یقینی تصور کرتے ہوئے وہ بڑے اطمینان سے ہر قسم کی غلط کاریوں کا ارتکاب کرتا ہے اور اس کا ضمیر بھی اسے ملامت نہیں کرتا۔ بلاشبہ ایسا انسان اپنے بنی نوع کے لئے ایک خون خوار بھیڑیے سے بھی زیادہ اذیت رساں بن جاتا ہے۔

اسلام جو دینِ فطرت ہے وہ انسان کی تربیت میں اس قسم کی کسی لچک اور نرمی کو برداشت نہیں کرتا۔ چنانچہ اس آیت نے صاف صاف بتادیا کہ جس نے راہِ ہدایت اختیار کی۔ اس نے اپنی بہتری کا سامان مہیا کیا اور جس نے گمراہی کو پسند کیا اس کی سزا اسے ضرور بھگتنی پڑے گی۔ اس لئے حق و باطل کو پہچاننے کے لئے اپنی عقل و فہم کو استعمال کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اندھی پیروی کے باعث کسی کی پیروی کرتے رہو۔ بہر حال نتائج کے ذمہ دار تم خود ہوگے۔ اور یہ بھی نہیں ہوگا کہ جہان بھر کے گناہ تم کرتے پھرو اور سارا بوجھ لاد دیا جائے ایک تنہا حضرت مسیح علیہ السلام پر (معاذ اللہ)۔

علمی و عملی بات: یہ ایک نہایت اہم اصولی حقیقت ہے جسے قرآنِ حکیم میں جگہ جگہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے، کیونکہ اسے سمجھے بغیر انسان کا طرزِ عمل کبھی درست نہیں ہو سکتا۔ اس فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان اپنی ایک مستقل اخلاقی ذمہ داری رکھتا ہے اور اپنی شخصی حیثیت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس ذاتی ذمہ داری میں کوئی دوسرا شخص اس کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ دنیا میں خواہ کتنے ہی آدمی، کتنی ہی قومیں اور کتنی ہی نسلیں اور پشتیں ایک کام یا ایک طریق عمل میں شریک ہوں، بہر حال اللہ تعالیٰ کی آخری عدالت میں اس مشترک عمل کا تجزیہ کر کے ایک ایک انسان کی ذاتی ذمہ داری الگ متعین اور مقرر کرلی جائے گی اور اس کو جو کچھ بھی جزا یا سزا ملے گی، اس عمل کی ملے گی جس کا وہ خود اپنی انفرادی حیثیت میں ذمہ دار ثابت ہوگا۔ اس انصاف کے میزان میں نہ یہ ممکن ہوگا کہ دوسروں کے کیئے کا وبال اس پر ڈال دیا جائے اور نہ یہ ممکن ہوگا کہ اس کے کرتوتوں کا بارِ گناہ کسی اور پر پڑ جائے۔ اس لئے ایک دانش مند آدمی کو ہرگز یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ دوسرے کیا کر رہے ہیں؟ بلکہ اسے ہر وقت اس بات پر نگاہ رکھنی چاہیئے کہ وہ خود کیا کر رہا ہے؟ اگر اسے اپنی ذاتی ذمہ داری کا صحیح احساس ہو تو دوسرے خواہ کچھ بھی کر رہے ہوں، وہ بہر حال اسی طرزِ عمل پر ثابت قدم رہے گا جس کی جواب وہی اللہ تعالیٰ کے حضور وہ کامیابی کے ساتھ کر سکتا ہو۔

علمی بات: یہ ایک اصولی حقیقت ہے جسے قرآنِ حکیم بار بار مختلف طریقوں سے انسان کے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نظامِ عدالت میں پیغمبر ایک بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ پیغمبر اور اس کا لایا ہوا پیغام ہی بندوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت ہے۔ یہ حجت قائم نہ ہو تو بندوں کو عذاب دینا خلافِ انصاف ہوگا، کیونکہ اس صورت میں وہ یہ عذر پیش کر سکیں گے کہ ہمیں آگاہ کیا ہی نہ گیا تھا پھر اب ہم پر یہ گرفت کیسی؟ مگر جب یہ حجت قائم ہو جائے تو اس کے بعد انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ ان لوگوں کو سزا دی جائے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے پیغام سے منہ موڑا ہو، یا اسے پا کر پھر اس سے انحراف کیا

ہو۔ ناسمجھ لوگ اس طرح کی آیات پڑھ کر اس سوال پر غور کرنے لگتے ہیں کہ جن لوگوں کے پاس کسی نبی کا پیغام نہیں پہنچا ان کا کیا بنے گا۔ حالانکہ ایک عقل مند آدمی کو غور اس بات پر کرنا چاہیئے کہ اس کے پاس تو پیغام پہنچ چکا ہے۔ اب اس کی صورتِ حال کیا ہے۔ رہے دوسرے لوگ، تو یہ اللہ ﷻ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کے پاس، کب، کس طرح اور کس حد تک اس کا پیغام پہنچا اور اس نے اس کے معاملہ میں کیا رویہ اختیار کیا؟ اور کیوں کیا؟ عالم الغیب کے سوا کوئی بھی یہ نہیں جان سکتا کہ کس پر اللہ ﷻ کی حجت پوری ہوئی ہے اور کس پر نہیں ہوئی۔

علمی بات: یہ اللہ ﷻ کی سنت رہی ہے کہ کسی بھی قوم پر ایسا عذاب جو اُنہیں ملیامیٹ کر دے اور جڑ سے اُکھاڑ پھینکے اُس وقت تک نہیں بھیجا گیا جب تک کہ اس قوم کی ہدایت کے لئے اور حق وباطل کا فرق واضح کر دینے کے لئے کوئی نبی یا رسول مبعوث نہیں کر دیا گیا۔ البتہ چھوٹے چھوٹے عذاب اس قانون سے مشروط نہیں۔ قرآنِ حکیم میں قوم نوح قوم ہود قوم صالح وغیرہ کی مثالیں بار بار بیان کی گئی ہیں جن سے اس اصول کی واضح نشان دہی ہوتی ہے کہ کسی قوم کو عذاب کے ذریعہ اس وقت تک مکمل طور پر تباہ وبرباد نہیں کیا جاتا جب تک اللہ ﷻ کا مبعوث کردہ رسول اس قوم کے لئے حق کا حق ہونا بالکل واضح نہ کر دے اور اس سلسلہ میں اس قوم پر اتمامِ حجت نہ ہو جائے۔ یہی مضمون (سورۃ النساء ۴: آیت: ۱۶۵) میں اس طرح بیان ہوا ہے: ”تمام رسول (جنت کی) بشارت دینے والے اور (جہنم کا) ڈرسنانے والے (بنا کر بھیجے گئے) تھے تاکہ لوگوں کے پاس اللہ ﷻ کے ہاں کوئی حجت نہ رہے رسولوں کے آنے کے بعد اور اللہ بڑا غالب بڑی حکمت والا ہے۔“

آیت نمبر ۱۶: جس بستی کی ہلاکت مقدر ہو چکی ہو اس کا خوشحال متکبر طبقہ اللہ ﷻ کے احکام کی نافرمانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ خوشحال طبقہ کے ذکر کا مقصد یہ ہے کہ دین کی مخالفت میں عموماً یہی لوگ پیش پیش ہوتے ہیں پھر دوسرے لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں۔ اس طرح نافرمانی عام ہو جاتی ہے اور پھر وہ قوم مستحق عذاب قرار پاتی ہے۔

علمی بات: ”امر“ صرف حکم دینے ہی کے معنیٰ میں نہیں آتا بلکہ بسا اوقات کسی کو ڈھیلا چھوڑ دینے اور مہلت دے دینے کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ اس طرح اللہ ﷻ سرکش لوگوں پر اپنی حجت تمام کر چکنے کے بعد ان کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے۔ کہ وہ اپنی سرکشی کا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں۔ پھر جب وہ اس میں خوب کھل کر اللہ ﷻ کی نافرمانیاں اور بدمستیاں کرتے ہیں یہاں تک ان پر حجت تمام ہو جاتی ہے اور ان کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔ تو پھر اللہ ﷻ ان کو پکڑتا ہے اور اس بستی کو تہ وبالا کر کے رکھ دیتا ہے۔

علمی بات: اس آیت میں حکم سے مراد حکم طبعی اور قانونِ فطری ہے۔ یعنی قدرتی طور پر ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ جب کسی قوم کی شامت آنے والی ہوتی ہے تو اس کے خوشحال فاسق ہو جاتے ہیں۔ ہلاک کرنے کے ارادہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ ﷻ یونہی بے قصور کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی انسانی آبادی برائی کے راستہ پر چل پڑتی ہے اور اللہ ﷻ فیصلہ کر لیتا ہے کہ اسے تباہ کرنا ہے تو اس فیصلہ کا ظہور اس طریقہ سے ہوتا ہے۔

دراصل جس حقیقت پر اس آیت میں متنبہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک معاشرہ کو آخر کار جو چیز تباہ کرتی ہے وہ اس کے کھاتے پیتے، خوشحال لوگوں اور اونچے طبقوں کا بگاڑ ہے۔ جب کسی قوم کی شامت آنے کو ہوتی ہے تو اس کے دولت مند اور صاحب اقتدار لوگ فسق وفجور پر اتر آتے ہیں۔ ظلم وستم، بدکاریاں اور شرارتیں کرنے لگتے ہیں اور آخر یہی فتنہ پوری قوم کو لے ڈوبتا ہے۔ لہٰذا جو معاشرہ آپ کا دشمن نہ ہو اسے فکر رکھنی چاہیئے کہ اس کے ہاں اقتدار کی باگیں اور معاشی دولت کی کنجیاں کم ظرف اور بداخلاق لوگوں کے ہاتھوں میں نہ جانے پائیں۔

علمی بات: یہاں کسی بستی پر عذاب کے نازل ہونے کا ایک اصول بتایا جا رہا ہے کہ کسی بھی معاشرہ میں اس کا سبب وہاں کے دولت مند اور خوشحال لوگ بنتے ہیں۔ یہ لوگ علی الاعلان اللہ ﷻ کے احکام کی نافرمانیاں کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کی دیدہ دلیری کے سبب ان کی رسی مزید دراز کی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ اپنی عیاشیوں اور من مانیوں میں تمام حدیں پھلانگ کر پوری طرح عذاب کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ عوام انہیں ان کے کرتوتوں سے باز رکھنے کے لئے کوئی کردار ادا نہیں کرتے بلکہ ایک وقت آتا ہے جب وہ بھی ان کے ساتھ جرائم میں شریک ہو جاتے ہیں اور یوں ایسا معاشرہ اللہ ﷻ کے عذاب کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ ایسے میں صرف وہی لوگ عذاب سے بچ پاتے ہیں جو نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے رہے ہوں۔

آیت نمبر ۱۷: حضرت نوح علیہ السلام کی قوم اور اس کے بعد دوسری نافرمان قوموں کو ان کے گناہوں کے باعث ہلاک کیا گیا۔ مشرکین مکہ کو تنبیہ کی گئی کہ اللہ ﷻ ان کے گناہوں سے باخبر ہے۔

بدکاروں کے لئے وعید اور نیکوکاروں کے لئے بشارت: اس آیت میں بتایا ہے کہ ہم نے جس طریقہ کا ذکر کیا ہے کہ رسولوں کو بھیجنے کے باوجود جب کوئی قوم نافرمانی اور سرکشی کرتی ہے تو ہم اس قوم کو ہلاک کردیتے ہیں، یہی طریقہ ہماری سنتِ جاریہ ہے اور ہم نے پچھلی قوموں مثلاً عاد اور ثمود وغیرہ کے ساتھ بھی یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ نیز اللہ ﷻ نے فرمایا: اور آپ کا رب اپنے بندوں کے گناہوں کی خبر رکھنے اور دیکھنے کے لئے کافی ہے۔ اللہ ﷻ تمام باتوں کا جاننے والا ہے اور تمام چیزوں کا دیکھنے والا ہے، مخلوق کے احوال میں سے کوئی حال اس پر مخفی نہیں ہے، لہٰذا وہ تمام مخلوق کو ان کے گناہوں کی سزا دینے پر قادر ہے اور وہ عبث اور فضول کام کرنے اور کسی پر ظلم کرنے سے پاک ہے اور اس کے علمِ عظیم، قدرتِ کاملہ اور ظلم سے پاک ہونے میں نیک بندوں کے لئے عظیم بشارت ہے کہ وہ ان کو ان کی نیکیوں کا اجر عطا فرمائے گا اور کافروں، نافرمانوں کے لئے سخت وعید ہے اور ترہیب ہے کہ انہیں ان کے کرتوتوں کی سزا ملے گی۔

آیت نمبر ۱۸: "عاجلہ" سے مراد جلد مل جانے والی چیز یعنی دنیا ہے۔ دنیا کے طلب گاروں میں سے اللہ ﷻ جس کے لئے چاہتا ہے اور جتنا چاہتا ہے دنیا ہی میں دے دیتا ہے۔ لیکن آخرت میں دنیا طلبی کی وجہ سے ایسے لوگوں کے لئے جہنم کا عذاب اور ذلّت و رسوائی ہے۔

علمی بات: یہ ضروری نہیں کہ طالبِ دنیا کی ہر خواہش پوری کی جائے اور اسے دیا ہی جائے اور جو بھی وہ مانگے اسے وہی دے دیا جائے، ایسا نہیں ہے بلکہ ان میں سے جسے چاہتا ہے اُسے دیتا ہے اور جو چاہتا ہے دیتا ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ محروم کر دیتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ بہت چاہتا ہے اور تھوڑا دیتا ہے، کبھی ایسا کہ عیش چاہتا ہے اس سے تکلیف دیتا ہے، ان حالتوں میں کافر دنیا و آخرت دونوں کے نقصان میں رہا اور اگر دنیا میں اس کو اس کی پوری مراد دے دی گئی تو آخرت کی بدنصیبی و شقاوت بھی ہے۔ بخلافِ مومن کے جو آخرت کا طلب گار ہے اگر وہ دنیا میں فقر سے زندگی بسر کر گیا تو آخرت کی دائمی نعمت اس کے لئے ہے اور اگر دنیا میں بھی فضلِ الٰہی سے اس کو عیش ملا تو دونوں جہان میں کامیاب، غرض مومن ہر حال میں کامیاب ہے۔

عملی بات: موجودہ دنیا میں آدمی دو راستوں کے درمیان ہے۔ ایک کا فائدہ نقد ملتا ہے اور دوسرے کا فائدہ ادھار۔ جو شخص پہلے راستہ پر چلے اس نے عاجلہ کو پسند کیا اور جو شخص دوسرے راستہ کو اختیار کرے اس نے آخرت کو پسند کیا۔

ایک طرف آدمی کے سامنے مصلحت پرستی کا طریقہ ہے جس کو اختیار کرنے سے فوری طور پر عزت اور دولت ملتی ہے۔ دوسری طرف بے لاگ حق پرستی کا طریقہ ہے جس کا اصل فائدہ آدمی کو موت کے بعد کی زندگی میں ملے گا۔ کسی سے شکایت پیدا ہو جائے تو ایک صورت یہ ہے کہ اس کے بارے میں اپنے دل کے اندر انتقام کی نفسیات پیدا کرلی جائے اور اس کے خلاف وہ سب کچھ کیا جائے جو اپنے بس میں ہے۔ اس کے برعکس دوسری صورت یہ ہے کہ اس کو معاف کر دیا جائے۔ اس کے لئے اچھی دعائیں کرتے ہوئے سارے معاملہ کو اللہ ﷻ کے حوالہ کر دیا جائے۔ اسی طرح آدمی کے پاس جو مال ہے اس کے خرچ کی ایک شکل یہ ہے کہ اس کو اپنے شوق کی تکمیل اور اپنی عزت کو بڑھانے کی راہوں میں لگایا جائے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ اس کو اللہ ﷻ کے دین کی مدات میں خرچ کیا جائے۔ اسی طرح تمام معاملات میں آدمی کے سامنے دو مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ ایک خواہش پرستی کا طریقہ اور دوسرا خدا پرستی کا طریقہ۔ پہلا یہ ہے کہ سامنے کی چیزوں کو اہمیت دینا۔ دوسرا یہ ہے کہ غیب کی حقیقتوں کو اہمیت دینا۔ ایک مصلحت پرستی کا انداز اور دوسرا اصول پرستی کا انداز۔ ایک بے صبری کے تحت کر گزرنا اور دوسرا صبر کے ساتھ وہ کرنا جو کرنا چاہیے۔ پہلے طریقہ میں وقتی فائدہ ہے اور اس کے بعد ہمیشہ کی محرومی۔ دوسرے طریقہ میں وقتی نقصان ہے اور اس کے بعد ہمیشہ کی عزت اور کامیابی۔

آیت نمبر ۱۹: اللہ ﷻ کے ہاں قدردانی کے لئے تین چیزوں کا بیان فرمایا گیا ہے: ۱۔ ارادہ آخرت۔۔۔ اخلاص اور اللہ ﷻ کی رضا۔
۲۔ ایسی کوشش جو اس کے لائق ہو۔۔۔ یعنی سنت کے مطابق ہو۔ ۳۔ ایمان۔۔۔ اس کے بغیر کوئی عمل بھی قابل قبول نہیں۔

علمی بات: یہ آیت اس بات کی صراحت کرتی ہے کہ اللہ ﷻ کے نزدیک ان ہی لوگوں کی کوششیں قدر کی مستحق اور مقبول ہوں گی جنہوں نے آخرت کو مقصود یعنی کامیابی کے لئے نصب العین قرار دے کر اس طرح کوشش کی گئی جس طرح کی کوشش کی جانی چاہیے یعنی ویسی کوشش جو آخرت پر یقین رکھنے والا شخص اس کے حصول کے لئے کر سکتا ہے۔

اللہ ﷻ کے ہاں قدر دانی کے لئے تین چیزیں یہاں بیان کی گئی ہیں: ۱۔ ارادہ آخرت، یعنی اخلاص اور اللہ ﷻ کی رضاجوئی۔ ۲۔ ایسی کوشش جو اس کے لائق ہو، یعنی سنت کے مطابق ہو۔ ۳۔ ایمان۔ کیونکہ اس کے بغیر تو کوئی عمل بھی قابل توجہ نہیں۔ یعنی قبولیت عمل کے لئے ایمان کے ساتھ اخلاص اور سنتِ نبوی ﷺ کے مطابق ہونا ضروری ہے۔

آیت نمبر ۲۰: دنیا کا رزق بلا تفریق سب کو دیا جاتا ہے۔ دنیا امتحان گاہ ہے۔ دنیا میں اللہ ﷻ کی نعمتیں کسی کے لئے بھی روکی نہیں جاتیں۔ آخرت میں نعمتیں صاحب ایمان و عمل لوگوں کے لئے ہوں گی۔

علمی بات: انسان کو درحقیقت اس کے رب نے دنیا کے لئے نہیں بلکہ آخرت کے لئے پیدا کیا ہے۔ دنیا تو زندگی کا ایک امتحانی مرحلہ ہے جس سے گزرنے کے بعد جہاں اسے ہمیشہ کے لئے رہنا ہے وہ آخرت ہی ہے۔ اس لئے آخرت کو اپنا مقصدِ حیات سمجھنا اور اپنی تمام کوششوں کے لئے اس کو مرکز و محور بنانا ٹھیک اس حقیقت کے مطابق ہے جو انسان کی نیز پوری کائنات کی پیدائش میں کارفرما ہے۔

عملی بات: دنیا کی کامیابی ہو یا آخرت کی کامیابی، دونوں ہی اللہ ﷻ کے فراہم کیئے ہوئے مواقع اور انتظامات کو استعمال کرنے کا دوسرا نام ہیں۔ جو شخص دنیا کی کامیابی حاصل کرتا ہے وہ بھی اللہ ﷻ کے انتظامات سے فائدہ اٹھا کر ایسا کرتا ہے۔ اسی طرح جو شخص آخرت کو اپنا مقصود بنائے اس کے لئے بھی اللہ ﷻ نے ایسے انتظامات کر رکھے ہیں جو اس کے آخرت کے سفر کو آسان بنانے والے ہیں۔

علمی بات: جہاں تک دنیاوی زندگی کا تعلق ہے تو اللہ ﷻ کی رحمت و مہربانی اس کے تمام بندوں کو شامل ہے، چاہے وہ مومن ہو یا کافر۔ وہ دونوں قسم کے لوگوں کو زندگی کے آخری لمحہ تک روزی پہنچاتا ہے، البتہ موت کے بعد دونوں کے احوال مختلف ہو جائیں گے۔ جس کا مقصدِ حیات ہی صرف دنیوی غرض وغایت ہو گا، اسے جہنم کی طرف ہانک کر لے جایا جائے گا اور جو آخرت کا طلب گار ہو گا اسے جنت میں جگہ ملے گی۔ دنیا میں کسی کافر کا کفر اور کسی نافرمان کی نافرمانی اللہ ﷻ کی روزی سے محرومی کا سبب نہیں بنتی۔

آیت نمبر ۲۱: دنیا کی نعمتوں کے معاملہ میں لوگوں کی ایک دوسرے پر برتری کا ذکر ہے۔ یہ فضیلت و برتری اللہ ﷻ کی حکمت و مصلحت کے مطابق ہے۔ دنیا دارالامتحان ہے۔ اصل فضیلت اور درجات تو آخرت کے ہیں کیونکہ وہی اصل زندگی اور دار الجزاء ہے۔

علمی بات: اس آیت میں نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے کہ اللہ ﷻ دنیا کی نعمتوں کی تقسیم میں اپنی حکمت کی بنیاد پر ایک کو دوسرے پر فوقیت دیتا ہے۔ کسی کو زیادہ دیتا ہے تو کسی کو کم۔ کوئی قوی ہوتا ہے تو کوئی کمزور، کوئی صحت مند ہوتا ہے تو کوئی بیمار، لیکن آخرت تو درجات کے لحاظ سے بھی برتر ہے اور فضیلت کے لحاظ سے بھی۔ وہاں درجات کا تفاوت دنیا کے درجات کے تفاوت سے کہیں زیادہ ہو گا، جیسا کہ حدیث شریف میں بھی یہ بات آئی ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جنتی لوگ اپنے اوپر بالا خانوں میں رہنے والوں کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح لوگ اس چمکتے ستارے کو دیکھتے ہیں جو صبح کے وقت آسمان کے مشرقی یا مغربی اُفق پر باقی رہ گیا ہو۔ یہ فرق اس فضیلت کی وجہ سے ہو گا جو ایک کو دوسرے پر حاصل ہو گی۔“ لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! یہ تو نبیوں کے مقام ہوں گے اور کوئی دوسرا ایسے بلند مقامات پر کیسے پہنچ سکے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”نہیں، اس ذات کی قسم، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یہ وہ لوگ ہوں گے جو اللہ ﷻ پر ایمان لائے اور جنہوں نے نبیوں کی تصدیق کی۔“ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

عملی بات: دنیا میں کوئی آدمی آگے نظر آتا ہے اور کوئی پیچھے۔ کسی کے پاس زیادہ ہے اور کسی کے پاس کم۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ ﷻ کی دنیا میں مواقع کی کوئی حد نہیں۔ دنیا میں جو شخص جتنا زیادہ عمل کرتا ہے وہ اتنا زیادہ اس کا پھل پاتا ہے۔ اسی طرح آخرت کے لئے جو شخص جتنا زیادہ عمل کا ثبوت دے گا وہ اتنا ہی زیادہ انعام وہاں پائے گا۔ مزید یہ کہ آخرت میں ملنے والی چیز ابدی ہو گی جب کہ دنیا میں ملنے والی چیز صرف وقتی ہوتی ہے۔

آیت نمبر ۲۲: آخرت کے درجات کا انحصار توحید خالص پر ہے۔ لہٰذا اللہ ﷻ کے سوا کسی دوسرے کو معبود نہ ٹھہرایا جائے۔ ایسا کرنے والے ذلیل ورسوا ہی ہوں گے۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ نے توحید پر قائم رہنے کا حکم دیا اور شرک سے دور رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔ اس لئے کہ جو شخص عبادت میں اللہ ﷻ کے ساتھ غیروں کو شریک کرتا ہے وہ اس کا بدترین بندہ ہوتا ہے اور وہ اسے ان ہی جھوٹے معبودوں کے سپرد کر کے اس کی نصرت و تائید سے اپنا ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔

"مذموم" وہ شخص ہے جس کی مذمت کی جائے اور "مخذول" وہ شخص ہے جس کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے اور حمایت، مدد اور نصرت سے محروم کر دیا جائے۔ ایسا شخص دنیا میں ذلیل و خوار ہوتا ہے اور آخرت میں جنت سے بھی محروم ہو جاتا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا: "ایک اللہ کے ہو کر رہو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتے ہوئے اور جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرتا ہے تو (اس کا حال ایسا ہے کہ) جیسے وہ آسمان سے گر پڑا پھر (یا تو) اسے پرندے (راہ میں سے) اُچک لے جاتے ہیں یا ہَوا اسے لے جا کر پھینک دیتی ہے کسی دور دراز جگہ۔" (سورۃ الحج ۲۲، آیت: ۳۱)

آیت نمبر ۲۳: اسلام کی معاشرتی ہدایت اور اجتماعی زندگی گزارنے کے اصولوں کا بیان ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ ان آیات (۲۳ تا ۴۰) میں تورات کے دس بڑے احکامات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ ﷻ نے اپنی عبادت کے بعد والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنے کا حکم دیا۔ بڑھاپے کی حالت میں بطورِ خاص والدین کے سامنے اُف تک کہنے اور ان کو ڈانٹنے ڈپٹنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ "اُف"۔ ہر ایسا کلمہ نہ کہنے کی تلقین گئی ہے جس سے ناگواری کا احساس ہو بلکہ بطورِ ناگواری لمبا سانس لینا بھی کلمہ اُف میں داخل ہے۔ والدین کے ساتھ ادب و احترام کے ساتھ نرم لہجہ میں بات کرنا چاہیئے۔

احادیثِ مبارکہ کے مطابق: ا۔ اللہ ﷻ کی رضا والد کی رضا میں ہے اور اللہ ﷻ کی ناراضگی والد کی ناراضگی میں ہے۔ ۲۔ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ خدمت کے حوالہ سے ماں کا حق تین گنا زیادہ ہے۔ ۳۔ والدین بندہ کے لئے جنت بھی ہیں اور جہنم بھی۔

نوٹ: سورۃ النمل ۲۷ آیت: ۲۰ میں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا ہے کہ "اے رب! تو نے مجھے اور میرے والدین کو جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں، مجھے اس حال پر باقی رکھ کہ میں ان کا شکر گزار رہوں" اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ والدین پر جو اللہ ﷻ کی نعمتیں ہوں ان کا بھی شکر ادا کرنا چاہیئے، بات دراصل یہ ہے کہ بہت سی نعمتیں والدین کے ذریعہ اولاد کی طرف منتقل ہوتی ہیں اور وہ نعمتوں کا ذریعہ بنتے ہیں۔ والدین میں دینداری کے جذبات نعمتِ اولاد کی دینداری کا سبب بن جاتے ہیں۔ لہٰذا اولاد کو اس نعمت کا بھی شکر ادا کرنا ضروری ہے، نیز میراث بھی والدین کے ذریعہ اولاد کو پہنچتی ہے۔ لہٰذا اس کا بھی شکر ادا کیا جائے۔

عملی پہلو: اچھے سلوک سے مراد یہ ہے کہ: ا۔ والدین کی دل سے عزت کی جائے، ۲۔ ان سے محبت کی جائے، ۳۔ شریعت کے دائرہ میں رہ کر ان کی فرماں برداری کی جائے، ۴۔ بیماری میں ان کی خدمت کے ساتھ ساتھ مناسب علاج و معالجہ کا بندوبست کیا جائے، ۵۔ ان کی ضروریات پوری کی جائیں، ۶۔ ان کی وصیت پوری کی جائے، ۷۔ ان کے وعدے پورے کیئے جائیں، ۸۔ جن لوگوں سے ان کے تعلقات اور رشتے ہیں انہیں نبھایا جائے، ۹۔ ان کے دوستوں کا بھی احترام کیا جائے ان کے ساتھ بھی اچھائی کی جائے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: "جب انسان فوت ہو جائے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے سوائے تین اعمال کے (وہ منقطع نہیں ہوتے): ایک صدقہ جاریہ، دوسرا ایسا علم جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں، تیسرا نیک بیٹا جو اس کے لئے دعا کرے۔" (صحیح مسلم)

حضرت ابو اُسید ساعدی بدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک انصاری آدمی آپ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کرنے لگا: یا رسول اللہ ﷺ! میرے والدین کی وفات کے بعد کیا کوئی ایسی چیز باقی ہے کہ اس کے ذریعہ میں ان کے ساتھ نیکی کر سکوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں! چار چیزیں ہیں: ا۔ ان کے لئے دعائے رحمت و بخشش طلب کرنا۔ ۲۔ ان کے وعدوں کو نبھانا۔ ۳۔ ان کے دوستوں کی عزت کرنا۔ ۴۔ اور ان لوگوں سے صلہ رحمی کرنا جو اُن کی طرف سے رشتہ دار بنتے ہوں، یہ وہ نیک اُمور ہیں کہ جو ان کی وفات کے بعد بھی تجھ پر باقی ہیں۔" (مسند احمد)

علمی بات: اس آیتِ کریمہ میں اللہ ﷻ نے اوّل تو یہ حکم فرمایا کہ اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو، انبیاء کرام علیہم السلام کی تمام شرائع کا سب سے بڑا یہی حکم ہے۔ اس

حکم کی تعمیل کرانے کے لئے اللہ ﷻ نے نبیوں اور رسولوں کو بھیجا اور کتابیں نازل فرمائیں اور صحیفے اُتارے۔ اللہ ﷻ کو عقیدہ سے ایک ماننا اور صرف اسی کی عبادت کرنا اور کسی بھی چیز کو اس کی ذات وصفات اور تعظیم وعبادت میں شریک نہ کرنا خداوند قدوس کا سب سے بڑا حکم ہے۔

علمی بات: اس آیت میں دوسرا حکم والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کا ہے۔ اللہ ﷻ خالق ہے، اسی نے سب کو وجود بخشا ہے اس کی عبادت اور شکر گزاری بہر حال فرض اور لازم ہے۔ اس نے چونکہ انسانوں کو وجود بخشنے کا ذریعہ ان کے ماں باپ کو بنایا اور ماں باپ اولاد کی پرورش میں بہت دکھ تکلیف اٹھاتے ہیں اس لئے اللہ ﷻ نے اپنی عبادت کے حکم کے ساتھ ماں باپ کے ساتھ احسان کرنے کا بھی حکم فرمایا جو قرآنِ حکیم میں جگہ جگہ مذکور ہے۔ لفظ ''حُسنِ سلوک'' میں سب باتیں آجاتی ہیں جس کو سورۃ البقرہ ۲، آیت: ۸۳ میں اور سورۃ الانعام ۶، آیت: ۱۵۱ اور یہاں سورۃ الاسراء ۱۷، آیت: ۲۳ میں وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا سے تعبیر فرمایا ہے، ماں باپ کی فرماں برداری، دلجوئی، راحت وسکون کی فراہمی، نرم گفتاری، عزت واحترام، اخلاق وآداب اور ہر طرح کی خدمت گزاری ان لفظوں کے عموم میں آجاتی ہے۔ البتہ اللہ ﷻ کی نافرمانی میں کسی کی فرماں برداری جائز نہیں۔

عملی پہلو: آیت میں بڑھاپے تک پہنچ جانے کا حوالہ محض اس لئے دیا گیا ہے کہ یہی وقت ہوتا ہے جس میں ان لوگوں کو ماں باپ بوجھ محسوس ہوتے ہیں جو ان کی ان قربانیوں اور جاں فشانیوں کو بھول جاتے ہیں جو انہوں نے ان کے لئے بچپن میں کی ہوتی ہیں۔ سعادت مند اولاد تو اس بات کو یاد رکھتی ہے کہ جس طرح کبھی ایک کمزور، گوشت کے لوتھڑے کی صورت میں اس کو اپنے والدین کی گود میں ڈالا گیا تھا۔ اسی طرح اب اس کے والدین ہڈیوں کے ایک ڈھانچے کی صورت میں اس کے حوالے کیئے گئے ہیں۔ اس کا فرض ہے کہ وہ ان کے احسان کا بدلہ احسان کی صورت میں دے۔ لیکن ہر شخص اس بات کو یاد نہیں رکھتا۔ یہ اس بات کی یاد دہانی ہے۔ ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ والدین ہر دور میں محبت، تعظیم اور احسان کے حق دار ہیں۔

علمی و عملی بات: ماں باپ دونوں یا ان دونوں میں سے کوئی ایک بوڑھا ہو جائے تو ان کو اُف بھی نہ کہو، مقصد یہ ہے کہ کوئی بھی ایسا کلمہ ان کی شان میں زبان سے نہ نکالا جائے جس سے ان کی تعظیم میں فرق آتا ہو یا جس کلمہ سے ان کے دل کو رنج پہنچتا ہو۔

لفظ اُف بطور مثال کے فرمایا ہے، اردو کے محاورہ کے مطابق اس کا ترجمہ یوں بھی کیا جاتا ہے کہ ان کو ''ہوں'' بھی مت کہو۔ دوسری زبان میں ان کے مطابق ترجمہ ہو گا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ''اللہ ﷻ کے علم میں کلمہ اُف سے نیچے بھی کوئی درجہ ماں باپ کے تکلیف دینے کا ہوتا تو اللہ ﷻ اس کو بھی ضرور حرام قرار دے دیتا۔'' ماں باپ کی تعظیم وتکریم اور فرماں برداری ہمیشہ واجب ہے بوڑھے ہوں یا جوان ہوں، جیسا کہ آیات اور احادیث کے عموم سے معلوم ہوتا ہے لیکن بڑھاپے کا ذکر خصوصیت سے اس لئے فرمایا کہ اس عمر میں جاکر ماں باپ بھی بعض مرتبہ چڑچڑے ہو جاتے ہیں اور ان کو بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں اولاد کو ان کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھنا پڑتا ہے، جس سے طبیعت بور ہونے لگتی ہے۔ بعض مرتبہ تنگ دل ہو کر زبان سے الٹے سیدھے الفاظ بھی نکلنے لگتے ہیں اس موقع پر صبر اور برداشت سے کام لینا اور ماں باپ کا دل خوش رکھنا اور رنج دینے والے ذرا سے لفظ سے بھی پرہیز کرنا بہت بڑی سعادت ہوتی ہے۔

حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تو جوان کے کپڑے وغیرہ سے گندگی اور پیشاب پاخانہ صاف کرتا ہے، تو اس موقع پر اُف بھی نہ کہہ، جیسا کہ وہ بھی اُف نہ کہتے تھے جب تیرے بچپن میں تیرا پیشاب پاخانہ وغیرہ دھوتے تھے۔

علمی بات: اُف کہنے کی ممانعت کے بعد یہ بھی فرمایا کہ ان کو مت جھڑکو، جھڑکنا اُف کہنے سے بھی زیادہ بُرا ہے، جب اُف کہنا منع ہے تو جھڑکنا کیسے درست ہو سکتا ہے؟ پھر بھی واضح فرمانے کے لئے خاص طور پر جھڑکنے کی صاف اور واضح لفظوں میں ممانعت فرمادی۔

ماں باپ سے خوب ادب سے بات کرنے اور اچھی باتیں کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لب ولہجہ میں نرمی اور الفاظ میں توقیر وتکریم کا خیال رکھنا یہ سب (قَوْلًا كَرِيْمًا) میں داخل ہے۔ حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ خطاکار زر خرید غلام جس کا آقا بہت سخت مزاج ہو یہ غلام جس طرح اپنے آقا سے بات کرتا ہے اسی طرح ماں باپ سے بات کی جائے تو (قَوْلًا كَرِيْمًا) پر عمل ہو سکتا ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کیا: میں آپ ﷺ سے ہجرت اور جہاد پر بیعت کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے اجر چاہتا ہوں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: کیا تمہارے ماں باپ میں سے کوئی زندہ ہے؟ اس نے عرض کیا: جی ہاں دونوں زندہ ہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: تم اللہ تعالیٰ سے اجر چاہتے ہو؟ اس نے عرض کیا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے ماں باپ کے پاس جاؤ اور ان سے نیک سلوک کرو۔ (صحیح مسلم)

عملی پہلو: والدین کے ساتھ نیکی یہ ہے کہ ان کی فرماں برداری اور اطاعت کی جائے۔ ان کا ادب اور احترام کیا جائے۔ ان کی ضروریات پوری کی جائیں اور ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم رکھا جائے۔ اگر وہ ظلم کریں، پھر بھی ان کی اطاعت کی جائے۔ البتہ غیر شرعی احکام میں ان کی اطاعت نہ کی جائے، پھر بھی ان کے ساتھ نرمی رکھی جائے اور اگر وہ فوت ہو جائیں ان کے لئے استغفار کیا جائے۔

آیت نمبر ۲۴: والدین کے ادب و احترام کے ساتھ ان کے سامنے عاجزی اور انکساری اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اتنا سب کچھ کرنے کے بعد بھی ان کا حق ادا کرنا ممکن نہیں۔ والدین کے حوالہ سے دعا سکھائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ان پر رحم فرمانے اور ان کی خطاؤں کو معاف فرمانے کی التجا کرنے کا بیان ہے۔ والدین کی زندگی میں بھی یہ دُعا بہت قیمتی ہے اور ان کے انتقال کے بعد بھی۔

علمی بات: "ذُل" کے معنی اطاعت و فرماں برداری کے ہیں۔ جس طرح والدین نے اولاد کو بچپن میں اس طرح اپنے بازوؤں کے نیچے چھپائے رکھا جس طرح پرندہ اپنے بچے کو اپنے پروں کے نیچے چھپائے رکھتا ہے۔ اس کا حق یہ ہے کہ ان کے بڑھاپے میں اولاد بھی انہیں اپنی اطاعت و محبت کے بازوؤں کے نیچے چھپائے رکھے۔ اس اطاعت و فرماں برداری کے ساتھ "مِنَ الرَّحْمَةِ" کے لفظ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ اطاعت و فرماں برداری تمام تر محبت، شفقت اور رحمت پر مبنی ہو، اس میں کسی اور منفی جذبہ کو دخل نہ ہو اس لئے کہ ان کی شفقت و محبت کا حق اگر کچھ ادا ہو سکتا ہے تو محبت کے جذبہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ بغیر اس جذبہ کے کوئی شخص والدین کا حق ان کے بڑھاپے میں ادا نہیں کر سکتا۔

علمی بات: یہ نصیحت فرمائی گئی کہ ماں باپ کے لئے یہ دعا کرتے رہا کریں کہ: رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا "اے میرے رب! اِن دونوں پر رحم فرما جیسا کہ اُنہوں نے مجھے بچپن میں پالا تھا۔" (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷، آیت: ۲۴) بات یہ ہے کہ کبھی اولاد حاجت مند تھی جو بالکل نا سمجھ اور ناتواں تھی، اس وقت ماں باپ نے ہر طرح کی تکلیف سہی اور دکھ سکھ میں خدمت کر کے اولاد کی پرورش کی، اب پچاس (۵۰) ساٹھ (۶۰) سال کے بعد صورتِ حال اُلٹ گئی کہ ماں باپ خرچ اور خدمت کے محتاج ہیں اور اولاد کمانے والی ہے، روپیہ پیسہ اور گھربار اور کاروبار والی ہے، اولاد کو چاہیئے کہ ماں باپ کی خدمت سے نہ گھبرائے اور ان پر خرچ کرنے سے تنگ دل نہ ہو، دل کھول کر جان و مال سے ان کی خدمت کرے اور اپنے چھوٹے پن کا وقت یاد کرے اس وقت انہوں نے جو تکلیفیں اُٹھائیں، ان کو سامنے رکھے اور بارگاہِ خداوندی میں خدمت و محبت کے ساتھ ساتھ ان کے لئے یوں عرض کرے کہ: اے میرے رب! جس طرح شفقت و محبت کے ساتھ انہوں نے بچپن میں مجھے پالا اسی طرح اس بڑھاپے میں تو ان پر اپنی محبت و رحمت نازل فرما۔ یہ دعا والدین کا حق بھی ہے۔ اس میں اس حق کی یاد دہانی بھی ہے جو والدین سے متعلق اولاد پر عائد ہوتا ہے۔

علمی و عملی بات: یہ دعا بہت پیاری اور قیمتی ہے۔ ماں باپ حیات ہوں تو بھی رب کی رحمت کے محتاج اور انتقال کر جائیں تو بھی رب کی رحمت کے محتاج۔ چنانچہ والدین کی حیات میں بھی اور ان کی وفات کے بعد بھی یہ دعا کرتے رہنا چاہیئے۔

فرامین نبوی ﷺ: ۱۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: "والد جنت کا درمیانی دروازہ ہے (والد جنت کے دروازوں کے درمیان میں ہے)۔" (جامع ترمذی)

۲۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کہ جس کو یہ پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کی عمر دراز کرے اور اس کا رزق بڑھائے اس کو چاہیئے کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرے اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرے۔" (بیہقی)

۳۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا: "کہ سب کاموں میں اللہ ﷻ کو کون سا کام زیادہ پیارا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بروقت نماز پڑھنا (جو اس کا وقت مستحب ہے) میں نے عرض کیا: اس کے بعد کون سا عمل اللہ ﷻ کو سب اعمال سے زیادہ محبوب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ماں باپ کے ساتھ حُسنِ سلوک کا برتاؤ کرنا، میں نے عرض کیا: اس کے بعد کون سا عمل اللہ ﷻ کو سب اعمال سے زیادہ پیارا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ اللہ ﷻ کی راہ میں جہاد کرنا۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

عملی پہلو: معلوم ہوا کہ اللہ ﷻ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل وقت پر نماز پڑھنا اور اس کے بعد سب سے زیادہ محبوب عمل یہ ہے کہ انسان اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرے۔ اس کے بعد جہاد فی سبیل اللہ کو فرمایا۔ معلوم ہوا کہ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا جہاد فی سبیل اللہ سے بھی بڑھ کر ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضور اقدس ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! والدین کا ان کی اولاد پر کیا حق ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "کہ وہ دونوں تیری جنت یا تیری جہنم ہیں۔" (سنن ابن ماجہ)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ماں باپ کی خدمت اور ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کا برتاؤ کرتے رہنا چاہیئے، زندگی بھر ان کے آرام و راحت کا دھیان رکھنا چاہیئے، جان و مال سے ان کی فرماں برداری اور خدمت میں لگے رہنا چاہیئے، انسان کا یہ نیک عمل جنت میں جانے کا سبب بنے گا اور اگر اس نے والدین کی نافرمانی کی اور ان کو ستایا دُکھ دیا تو وہ بُرا عمل اس کے لئے دوزخ میں جھونکے جانے کا سبب بنے گا۔

حدیث شریف میں ایک عجیب دل سوز اور سبق آموز واقعہ کا بیان: حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ میرے پاس مال اور اولاد دونوں ہیں اور میرے والد میرا مال ختم کرنا چاہتے ہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: کہ اپنے والد کو بلا کر لاؤ۔ جب ان کے والد کو پتہ چلا کہ میرے بیٹے نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی ہے تو رنجیدہ ہوئے اور راستہ میں جاتے ہوئے دل میں کچھ اشعار کہے: اسی وقت جبرائیل امین علیہ السلام آئے اور رسول کریم ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! جب اس کا والد آجائے تو آپ ﷺ اس سے پوچھیں کہ وہ کلمات (اشعار) کیا ہیں؟ جو اس نے دل میں کہے ہیں، خود اس کے کانوں نے بھی اس کو نہیں سنا۔ جب یہ شخص اپنے والد کو لے کر پہنچا تو آپ ﷺ نے اُس والد سے فرمایا: کیا بات ہے؟ تمہارا بیٹا تمہاری شکایت کرتا ہے کیا تم چاہتے ہو کہ اس کا مال چھین لو؟ والد نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ اسی سے یہ سوال فرمائیں کہ میں اس کی پھوپھی خالہ یا اپنے نفس کے سوا کہاں خرچ کرتا ہوں، رسول کریم ﷺ نے فرمایا: (جس کا مطلب یہ تھا کہ) جب حقیقت معلوم ہوگئی اب اور کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد اس کے والد سے دریافت فرمایا: کہ وہ کلمات کیا ہیں؟ جن کو ابھی تک خود تمہارے کانوں نے بھی نہیں سنا، اس شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ ہمارا ہر معاملہ میں اللہ اور آپ ﷺ پر ہمارا ایمان اور یقین بڑھا دیتا ہے (جو بات کسی نے نہیں سنی اس کی آپ ﷺ کو اطلاع ہوگئی جو ایک معجزہ ہے) پھر اس نے عرض کیا: کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ میں نے چند اشعار دل میں کہے تھے جن کو میرے کانوں نے بھی نہیں سنا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ وہ ہمیں سناؤ اس وقت اس نے وہ اشعار سنائے:

غَذَوْتُكَ مَوْلُودًا وَ مُنْتُكَ يَافِعًا	تُعَلُّ بِمَا أَجْنِي عَلَيْكَ وَتَنْهَلُ
إِذَا لَيْلَةٌ ضَافَتْكَ بِالسُّقْمِ لَمْ أَبِتْ	لِسُقْمِكَ إِلَّا سَاهِرًا أَتَمَلْمَلُ
كَأَنِّي أَنَا الْمَطْرُوقُ دُونَكَ بِالَّذِي	طُرِقْتَ بِهِ دُونِي فَعَيْنَايَ تَهْمُلُ
تَخَافُ الرَّدَى نَفْسِي عَلَيْكَ وَإِنَّهَا	لَتَعْلَمُ أَنَّ الْمَوْتَ وَقْتٌ مُؤَجَّلُ
فَلَمَّا بَلَغْتَ السِّنَّ وَالْغَايَةَ الَّتِي	إِلَيْهَا مَدَى مَا فِيكَ كُنْتُ أُؤَمِّلُ
جَعَلْتَ جَزَائِي غِلْظَةً وَ فَظَاظَةً	كَأَنَّكَ أَنْتَ الْمُنْعِمُ الْمُتَفَضِّلُ
فَلَيْتَكَ إِذْ لَمْ تَرْعَ حَقَّ أُبُوَّتِي	فَعَلْتَ كَمَا الْجَارُ الْمُجَاوِرُ يَفْعَلُ
فَأَوْلَيْتَنِي حَقَّ الْجِوَارِ وَلَمْ تَكُن	عَلَيَّ بِمَالٍ دُونَ مَالِكَ تَبْخَلُ

ان اشعار کا رواں ترجمہ یہ ہے کہ:

میں نے تجھے بچپن میں غذا دی اور جوان ہونے کے بعد تیری ذمہ داری اُٹھائی تمہارا سب کھانا پینا میری ہی کمائی سے تھا۔

جب کسی رات میں کوئی بیماری پیش آگئی تو میں نے تمام رات تیری بیماری کے سبب بے داری اور بے قراری میں گزاری۔

گویا کہ تیری بیماری مجھے ہی لگی ہے تجھے نہیں، جس کی وجہ سے میں تمام شب روتا رہا۔

میرا دل تیری موت سے ڈرتا رہا حالانکہ میں جانتا تھا، کہ موت کا ایک دن مقرر ہے جو پہلے پیچھے نہیں ہوسکتی۔

پھر جب تُو عمر کی اس حد تک پہنچ گیا، جس کی میں تمنا کیا کرتا تھا۔

تو تُو نے میرا بدلہ سختی اور سخت کلامی بنا دیا، گویا کہ تو ہی مجھ پر احسان و انعام کر رہا ہے۔

کاش! اگر تجھ سے میرے باپ ہونے کا حق ادا نہیں ہو سکتا تو کم از کم ایسا ہی کرلیتا جیسا ایک شریف پڑوسی کیا کرتا ہے۔

تو کم از کم مجھے پڑوسی کا حق تو دیا ہوتا اور خود میرے ہی مال میں میرے حق میں بخل سے کام نہ لیا ہوتا۔

رسول کریم ﷺ نے یہ اشعار سننے کے بعد بیٹے کا گریبان پکڑ لیا اور فرمایا: اَنْتَ وَمَالُكَ لِاَبِيْكَ "تم اور تمہارا مال دونوں تمہارے والد کے ہیں۔" (طبرانی)

نوٹ: یہ اشعار عربی ادب کی مشہور کتاب دیوانِ حماسہ میں بھی نقل کیئے گئے مگر ان کو اُمیہ بن ابی الصلت شاعر کی طرف منسوب کیا ہے اور بعض نے کہا کہ یہ عبد الاعلی کے اشعار ہیں بعض نے ان کی نسبت اُبو العباس اعمی کی طرف کی ہے۔

ماں کی شان کے حوالہ سے کچھ مزید احادیثِ نبوی ﷺ: ا۔ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ میرے حُسنِ سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تمہاری ماں۔ اس شخص نے پوچھا پھر کون؟" آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تمہاری ماں۔ اس نے پوچھا پھر کون؟" آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تمہاری ماں۔" اس نے پوچھا پھر کون؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تمہارا باپ۔" (صحیح بخاری)

۲۔حضرت معاویہ بن جاہمہ سلمی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت جاہمہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میں جہاد کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور آپ ﷺ کے پاس آپ ﷺ سے مشورہ لینے کے لئے حاضر ہوا ہوں، آپ ﷺ نے (ان سے) پوچھا: کیا تمہاری ماں موجود ہے؟ انہوں نے کہا: جی ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: انہی کی خدمت میں لگے رہو، کیونکہ جنت ان کے دونوں قدموں کے نیچے ہے۔ (سنن نسائی، سنن ابن ماجہ)

علمی بات: اس حدیث کے مفہوم کے ضمن میں ایک اہم بات یہ یاد رکھنے کی ہے کہ جہاد میں شامل ہونے کے بجائے ماں کی خدمت کا حکم حضرت جاہمہ رضی اللہ عنہ کے خاص ظروف وحالات کی بنا پر تھا، کیونکہ یہ حکم نبی اکرم ﷺ نے ہر اس صحابی رضی اللہ عنہ کو نہیں دیا جن کی (بوڑھی) والدہ زندہ تھیں اور وہ جہاد میں شامل ہونے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اگر یہ بات سب کے لئے ہوتی تو ہر وہ صحابی رضی اللہ عنہ جن کی والدہ باحیات تھیں کبھی جہاد میں شامل نہ ہو پاتے۔

آیت نمبر ۲۵: کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ والدین کی خواہش پوری کرنا یا ان کا حکم ماننا ممکن نہ ہو۔ نیک نیتی سے والدین کے ساتھ معاملہ کرنے والوں سے اللہ ﷻ خوب واقف ہے۔ والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کا معاملہ مجبوراً یا دکھاوے کا نہ ہو بلکہ دل سے ان کے لئے رحمت و عزت کے معاملہ پر ہو۔ اللہ ﷻ کی بخشش اور نعمت نیکی کے حامل لوگوں کے لئے ہے۔

علمی بات: بعض اوقات کسی مصلحت یا مجبوری کی وجہ سے اولاد کے لئے والدین کی خواہش پوری کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اِسی طرح بعض اوقات والدین کی خواہش خلافِ شریعت ہوتی ہے جسے پورا نہیں کیا جاسکتا۔ اِس صورت میں اگر والدین کے سامنے عاجزی کے ساتھ اپنی مجبوری کا اظہار کردیا جائے اور اللہ ﷻ کی طرف اپنی بے بسی کے ساتھ رجوع کیا جائے تو اللہ ﷻ جو انسان کی ہر مجبوری کو خوب جانتا ہے، ضرور نیک نیت اولاد کو معاف فرمادے گا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کہ اللہ ﷻ کی رضامندی ماں باپ کی رضامندی میں ہے اور اللہ ﷻ کی ناراضگی ماں باپ کی ناراضگی میں ہے۔" (جامع ترمذی، ابن حبان، حاکم)

علمی بات: جس شخص نے ماں باپ کو راضی رکھا تو اللہ ﷻ بھی اس سے راضی ہے اور جس نے ماں باپ کو ناراض کیا تو اللہ ﷻ بھی اس سے ناراض ہو گا، کیونکہ اللہ ﷻ نے ماں باپ کو راضی رکھنے کا حکم فرمایا ہے جب ماں باپ کو ناراض رکھا تو اللہ ﷻ کے حکم کی نافرمانی ہوئی جو اللہ ﷻ کی ناراضگی کا باعث ہوئی۔

واضح رہے کہ یہ اسی صورت میں ہے جبکہ ماں باپ کسی ایسے کام کے نہ کرنے سے ناراض ہوں جو خلافِ شرع نہ ہو، اگر خلافِ شرع کسی کام کا حکم دیں تو ان کی فرماں برداری جائز نہیں ہے۔ اس ناراضگی میں اللہ ﷻ کی ناراضگی نہ ہوگی اس صورت میں اگر وہ ناراض بھی ہو جائیں تو ناراضگی کی پرواہ نہ کرے، کیونکہ اللہ ﷻ کی رضامندی اس کے احکام پر عمل کرنے میں ہے اس کے حکم کے خلاف کسی کی فرماں برداری جائز نہیں ہے۔

علمی بات: بڑھاپے میں والدین کی خدمت و محبت اس طرح کرنا جس طرح قرآنِ حکیم نے ہدایت فرمائی ہے کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اس میں صرف ظاہری اطاعت ہی مطلوب نہیں ہے بلکہ پاکیزہ قلبی، جذبۂ محبت اور دلی لگاؤ بھی مطلوب ہے۔ اس مشکل کی وجہ سے قرآنِ حکیم نے یہ وضاحت بھی فرمادی کہ اصل مطلوب دلی محبت اور کامل سعادت مندی ہے۔ اگر یہ چیز موجود ہے تو اللہ ﷻ دلوں کے حال سے خوب واقف ہے۔ اس کیفیت کے ہوتے ہوئے اگر کوئی چھوٹی موٹی اتفاقیہ کوتاہی صادر ہو جائے تو اس کی تلافی توبہ اور رجوع الی اللہ سے ہو سکتی ہے۔ جو لوگ اپنی اس طرح کی کوتاہیوں پر برابر اللہ ﷻ سے معافی مانگتے رہیں گے تو اللہ ﷻ ان کو معاف فرمادے گا۔ ان شاء اللہ۔

آیت نمبر ۲۶: غریب رشتہ داروں، مساکین اور ضرورت مند مسافروں کی مالی امداد کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ایسا کرنا ان پر احسان نہیں ہے بلکہ اللہ ﷻ کے عطا کردہ مال میں سے ان کے حق کی ادائیگی ہے۔ فضول خرچی کی ممانعت کی گئی ہے۔ تبذیر سے مراد ایسے کاموں پر خرچ کرنا جن کی ضرورت نہ ہو یا ناجائز امور پر خرچ کرنا، چاہے تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔

علمی بات: قرابت والے سے مراد قریبی رشتے دار ہیں، ماں کی طرف سے ہوں یا باپ کی طرف سے، محرم ہوں یا غیر محرم۔ ان کو پہلے اس لئے رکھا کہ ان کو دینے میں دو اجر ہیں، ایک صلہ رحمی کا اور دوسرا صدقہ دینے کا۔ ان کا حق یہ ہے کہ ہر صورت ان سے میل جول اور تعلق قائم رکھا جائے، انہیں دین کی دعوت دینے کا عمل جاری رکھا جائے، ان کی خوشی اور غم میں شرکت کی جائے۔ جب بھی انہیں مدد کی ضرورت ہو حتی الامکان مال و جان سے ان کی مدد کی جائے۔

قرآنِ حکیم نے یہاں "تَبۡذِیۡر" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس کا لغوی معنٰی ہے "بیج کی طرح بکھیرنا"۔ عام طور سے تبذیر اور اسراف دونوں کا ترجمہ فضول خرچی سے کیا جاتا ہے۔ لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ اگر جائز کام میں خرچ کیا جائے۔ لیکن ضرورت یا اعتدال سے زیادہ خرچ کیا جائے تو وہ اسراف ہے اور اگر مال کو ناجائز اور گناہ کے کام میں خرچ کیا جائے تو وہ تبذیر ہے۔ اس سے حق داروں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں اور حرام کا ارتکاب بھی ہو جاتا ہے۔

آیت نمبر ۲۷: ناحق کاموں پر خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان نے اپنے رب کی ناشکری کی تھی۔ فضول خرچی کرنے والے بھی اللہ ﷻ کی عطا کردہ نعمت مال کو غلط راستہ میں خرچ کر کے اللہ ﷻ کی ناشکری کرتے ہیں۔ پھر مال کے فضول خرچ سے مالی طور پر کمزور لوگ احساسِ کمتری کا شکار ہو کر فساد کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ فساد کے کاموں سے بگاڑ اور جرائم کا راستہ کھلتا ہے جو شیطان کا ایک منصوبہ ہے جس سے وہ اہلِ ایمان میں بغض اور عداوت ڈالتا ہے۔

جیسا کہ ارشاد ہوا "عنقریب تم کچھ دوسرے لوگوں (منافقوں) کو پاؤ گے وہ چاہتے ہیں کہ تم سے امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں لیکن جب بھی کسی فتنہ انگیزی کی طرف پھیرے جاتے ہیں وہ اُس فتنے میں (اوندھے منہ) کود پڑتے ہیں تو اگر وہ تم سے الگ نہ رہیں اور تمہیں صلح کا پیغام نہ دیں اپنے ہاتھ نہ روکیں تو انہیں پکڑلو اور اُنہیں جہاں (بھی) پاؤ قتل کر دو اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے خلاف ہم نے تمہیں کھلا اختیار دیا ہے۔" (سورۃ النساء ۴، آیت: ۹۱)

عملی بات: بے جا خرچ کرنے والوں کو ہمیشہ سے شیطانوں کے بھائی، یعنی شیطانوں کے ساتھی اور ان جیسے قرار دیا اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ شیطان ہمیشہ اللہ ﷻ کی عطا کردہ نعمتوں اور صلاحیتوں کی ناشکری کرتے ہوئے انہیں غلط جگہ میں خرچ کرتا ہے، اسی طرح جو شخص مالک کے دیئے ہوئے مال کو مالک کی نافرمانی میں خرچ کرتا ہے اس کا بھی یہی حال ہے۔

عملی پہلو: انفاق فی سبیل اللہ کی توفیق انہی لوگوں کو ملتی ہے جو اپنے اخراجات میں اعتدال کا رویہ اختیار کرتے اور اللہ ﷻ جو رزق انہیں عطا فرماتا ہے، اس کو اپنی کسی تدبیر و حکمت کا نہیں، بلکہ اللہ ﷻ کی عنایت کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص اپنی ضرورتوں کے معاملہ میں اعتدال اور توازن کا رویہ اختیار نہیں کرتا، اسے اپنے ہی شوق پورے کرنے سے فرصت نہیں ملتی کہ دوسروں کے حقوق ادا کر پائے۔

آیت نمبر ۲۸: اگر کسی وقت حاجت مندوں کو ان کی ضرورت کے مطابق دینے کا انتظام نہ ہو تو انہیں مایوس نہ کیا جائے۔ انہیں نرمی اور ہمدردی کے ساتھ آئندہ سہولت کی امید دلائی جائے۔ اگر کسی وجہ سے حاجت مند سے اعراض کرنا ہو تو سختی نہ کی جائے۔

شانِ نزول: اس آیت کے شانِ نزول میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔ بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہ آیتِ کریمہ ان مساکین کے بارے میں نازل ہوئی جو نبی اکریم ﷺ سے سوال کیا کرتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپ ﷺ کے پاس ان کو فوری دینے کے لئے کچھ موجود نہ ہوتا تو آپ ﷺ ان سے اعراض فرما لیتے اور خاموشی اختیار فرماتے۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ نے آپ ﷺ کو ان کے لئے دعا کرنے کا حکم ارشاد فرمایا، یعنی ان کے لئے اپنی دعا کے ساتھ ان کا فقر و افلاس ان پر آسان کر دے۔ یہ بھی فرمایا گیا کہ اگر آپ ﷺ انہیں دینے سے اعراض فرمانا چاہیں تو اس اثناء میں ان سے بڑی نرمی سے بات کریں، یعنی انتہائی حسین اور خوبصورت انداز میں اپنا عذر بیان فرمادیں اور ان کے لئے وسعت رزق کی دعا فرمادیں اور یہ فرمادیں کہ جب میں نے وسعت پائی تو میں ضرور دوں گا۔ چنانچہ آپ ﷺ سے جب کسی چیز کے بارے سوال کیا جاتا اور آپ ﷺ کے پاس دینے کے لئے وہ چیز اس وقت نہ ہوتی تو اللہ ﷻ کی طرف سے رزق آنے کا خاموشی سے انتظار کرتے (کیونکہ آپ ﷺ سائل کو رد کرنا ناپسند کرتے تھے)، پس یہ آیت نازل ہوئی۔ پھر آپ ﷺ سے جب کوئی چیز مانگی جاتی اور آپ ﷺ کے پاس دینے کے لئے وہ چیز نہ ہوتی تو آپ ﷺ فرماتے: "اللہ ﷻ ہمیں اور تمہیں اپنے فضل سے عطا فرمائے گا۔" پس اس تاویل کی بنا پر رحمت سے مراد وہ رزق ہے جس کا انتظار کیا جائے۔

علمی بات: آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ذریعہ امت کو بھی یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اگر کوئی آپ ﷺ سے سوال کرے اور اس کو دینے کے لئے آپ ﷺ کے پاس کچھ نہ ہو، تلاش رحمت خدا (رزق) میں مصروف ہوں تو نفی میں جواب دیتے ہوئے اخلاقی قدروں کا پاس کرنا ضروری ہے۔ اگر آپ ﷺ کے پاس سائل کو دینے کے لئے کچھ نہ ہو تو نرم کلامی کے ساتھ اس کو جواب دیں۔

کیونکہ مادی قدروں سے انسانی قدریں کہیں زیادہ اہم ہیں: "اچھی بات کہنا اور درگزر کرنا ایسے صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد (سائل کو) ایذاء پہنچے اور اللہ بے نیاز بڑا حلم والا ہے۔" (سورۃ البقرۃ: ۲، آیت: ۲۶۳) یعنی نرم کلامی اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد خیرات لینے والے کو کسی بھی طرح کی ایذا دی جائے اسے دکھ پہنچایا جائے۔

عملی پہلو: اگر کبھی ایسی صورتِ حال ہو کہ کوئی محتاج اپنی کسی حاجت کو پورا کرنے کے لئے ایسے موقع پر کسی کے پاس جائے جب اس کے پاس بھی اسے دینے کے لئے کچھ نہ ہو۔ لیکن اسے اللہ ﷻ سے اچھے دنوں اور فراخ دستی کی امید ہو مگر وقتی طور پر وہ سائل کی حاجت سے اعراض کرنے پر مجبور ہو اور چاہتے ہوئے بھی اس کی مدد نہ کر سکتا ہو تو ایسے موقع پر سائل کو جھڑکنا نہیں چاہیئے بلکہ متانت اور شرافت سے مناسب الفاظ میں اس سے معذرت کر لینی چاہیئے۔

مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں پر یہ حق عائد ہوتا ہے، ان کے حالات اگر کسی وقت ایسے ہوں کہ کسی حق دار کی مدد سے مجبوراً اعراض کرنا پڑے اور توقع ہو کہ مستقبل میں حالات بہتر ہو جائیں گے تو اس کی دل داری کی جائے اور آئندہ کے لئے اچھے وعدہ کے ساتھ رخصت کر دیا جائے۔

آیت نمبر ۲۹: مال و دولت خرچ کرنے کے عمومی آداب بیان کیئے گئے ہیں۔ بخل سے کام نہ لیا جائے کہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضرورت پر بھی خرچ نہ کرے اور لوگ ملامت کرنے لگیں۔ "محصور" اس جانور کو کہتے ہیں جو چل چل کر تھک چکا ہو اور مزید چلنے سے عاجز ہو۔ خرچ کرنے میں اتنی زیادتی بھی نہ کر لے کہ کچھ بھی باقی نہ رہے اور انسان تھکا ماندہ عاجز بن کر رہ جائے۔

سخاوت اور کنجوسی کے متعلق چند احادیثِ مبارکہ: ۱۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا: "خرچ کرو اور گن گن کر نہ دو، ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تم کو گن گن کر دے گا۔" (صحیح مسلم)

۲۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہر روز جب بندے اٹھتے ہیں تو دو فرشتے نازل ہوتے ہیں، ایک فرشتہ دعا کرتا ہے: کہ اے اللہ! خرچ کرنے والے کو عطا کر اور دوسرا فرشتہ دعا کرتا ہے: کہ اے اللہ! خرچ نہ کرنے والے کا مال ضائع کر۔" (صحیح مسلم)

۳۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "کھاؤ، پیو، لباس پہنو اور صدقہ کرو جس میں نہ اسراف ہو اور نہ ہی اس میں فخر ہو۔" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جو چاہو کھاؤ اور جو چاہو پہنو جبکہ دو چیزوں سے بچتے رہو: ایک اسراف اور دوسرا تکبر۔ (صحیح بخاری)

علمی و عملی بات: ہاتھ باندھنا بخل اور اسے کھلا چھوڑنا فضول خرچی کی طرف اشارہ ہے۔ یہ آیت سابقہ آیات میں موجود احکام کا خلاصہ اور نتیجہ ہے کہ انفاق کے بارے میں نہ تو بخل کرنا چاہیئے، نہ ہی اسراف و تبذیر۔ دونوں صورتوں میں انسان ملامت کا نشانہ بنتا ہے۔

آیت نمبر ۳۰: اہل ایمان کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر ان کے پاس وسائل اور رزق کی فراہمی نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا مقام نہیں ہے۔ کسی کے حالات کو بدل دینا ذمہ داری نہیں بلکہ مقدور بھر حاجت مند کی مدد کرنی چاہیئے۔

رزق کی کمی و بیشی کا تعلق اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے حالات اور طرزِ عمل سے خوب واقف ہے۔

علمی و عملی بات: اس آیت شریفہ میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ اگرچہ رزق کی کشائش اور اس کی تنگی میں انسانی سعی و کوشش، تن آسانی، غفلت و لاپرواہی، تساہل و سستی کو نیز اس کی شکر گزاری اور ناشکرے پن کو بھی ضرور دخل ہے مگر انسانی تدبیر سے زیادہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا بھی دخل ہے یعنی اس کا زیادہ تر دارومدار اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیّت پر ہے۔ وہ اپنے بندوں کے حال سے زیادہ آگاہ اور ان پر نگہبان ہے۔ بے شک انسان کو کسب معاش میں اپنی سعی و کوشش ضرور کرنی چاہیئے اور پھر نتیجہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا چاہیئے اور آدمی کو کسی حال میں بھی راضی برضائے الٰہی رہنے کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ اگرچہ خالق حکیم نے روزی میں کمی و زیادتی کا جو فرق رکھا ہے اس میں بیشمار مصالح ہیں جنہیں انسان نہیں سمجھ سکتا۔ لہٰذا انتظام قدرت میں دخل اندازی کرنا اور سب کی مساوات و برابری کے خواب دیکھنا قانون قدرت و فطرت سے ٹکر لینے کے مترادف ہے اور ایسا کرنے والوں کے لئے قدرت کی طرف سے سخت تعزیریں ہیں۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے وسائل رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے وسائل رزق تنگ کر دیتا ہے۔ لہٰذا رزق کی کمی یا بیشی اللہ تعالیٰ کی مرضی پر منحصر ہے جس کی اصل حکمت تو صرف وہی بہتر جانتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جس کے پاس زیادہ رزق ہے اس سے اللہ تعالیٰ راضی ہے اور جس کے پاس کم رزق ہے اس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہے بلکہ اللہ تعالیٰ تو اس سے راضی ہوتا ہے جو اس کی اطاعت کرے خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔

علمی بات: رزق کی کشادگی اور ایک اندازہ سے محدود رکھنا بندوں کی استعداد اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مطابق ہے۔ کسی کے رزق میں بعنوان رحمت، کشادگی یا تنگی فرماتا ہے۔ کسی کے رزق میں بعنوان عذاب وسزا کشادگی فرما کر اسے دنیا میں ہی سب کچھ دے دیتا ہے اور آخرت میں اسے ہر چیز سے محروم کر دیتا ہے۔

آیت نمبر ۳۱: زمانہ جاہلیت کی ایک ظالمانہ عادت، اولاد کو قتل کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ غربت کے ڈر سے اولاد کو قتل کرنا دراصل اللہ تعالیٰ کو رازق نہ ماننے کی دلیل ہے۔ جس طرح لوگوں کو رزق دیا جاتا ہے اسی طرح ان کے اولاد کا رزق بھی اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ درحقیقت اولاد کو قتل کرنا بہت ہی بڑا جرم ہے۔ مسئلہ رزق کی کمی کا نہیں۔ بلکہ ظالمانہ نظام اور غیر منصفانہ تقسیم دولت اور وسائل کا ہوتا ہے۔

علمی بات: زمانہ جاہلیت میں بعض مشرکین رزق میں کمی کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل کر دیتے تھے اور بعض عار کی وجہ سے اپنی بیٹیوں کو قتل کر دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام فرمایا۔ اہل عرب کے امراء اپنی چھوٹی بچیوں کو اس لئے زمین میں زندہ گاڑ دیتے تھے کہ کوئی ان کا داماد نہ بنے اور ان کی شان و شوکت میں کوئی فرق نہ آئے۔ البتہ چونکہ عرب کے اکثر لوگ غریب اور خانہ بدوش تھے، ان کا خیال تھا کہ جب ہم اپنا پیٹ بھرنے کے لئے مشکلات کا شکار ہیں تو اولاد کی

خوراک کا انتظام کہاں سے کریں گے، اس لئے معاشی بد حالی کے باعث اکثر لوگ اپنی اولاد کو قتل کر دیتے تھے۔ اس آیت میں انہیں بتایا جا رہا ہے کہ قتل ناحق بہت بڑا گناہ ہے اور تم مفلسی کے ڈر سے اولاد کو قتل نہ کرو کیونکہ ساری مخلوق کا حقیقی رازق اللہ ﷻ ہے اور وہ جس طرح تمہیں رزق دیتا ہے اسی طرح وہ تمہاری اولاد کو بھی رزق دے گا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: سب سے بڑا کون سا گناہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: (سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ) اللہ ﷻ کے مثل دوسروں کو قرار دو، باوجود اس کہ اللہ ﷻ ہی نے تجھے پیدا کیا ہے، میں نے عرض کیا: یہ بے شک بڑا گناہ ہے اس کے بعد کون سا گناہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنی اولاد کو خود قتل کرنا اس اندیشہ سے کہ وہ تیرے ساتھ کھانے میں شریک ہو جائے گی۔ (متفق علیہ)

آیت نمبر ۳۲: صرف زنا ہی نہیں بلکہ وہ تمام ذرائع جو زنا کی طرف لے جائیں ان کی بھی ممانعت کی گئی ہے۔ ایسے اسباب ہی فراہم نہ کیئے جائیں جو زنا کا باعث بنیں۔ اس ضمن میں ہدایات:

۱۔ نگاہوں کی حفاظت کا حکم ہے۔ مرد و عورت کے آزاد اختلاط کی ممانعت ہے۔ ۲۔ فحش لٹریچر، فلموں، ڈراموں، ناچ گانوں کی ممانعت ہے۔

۳۔ نکاح کے عمل کو آسان کرنے کی تاکید ہے۔ ۴۔ زنا کے ارتکاب پر سخت سزائیں بیان ہوئی ہیں۔

زنا کھلی بے حیائی ہے۔ فطرت انسانی اصلاً اسے گوارا ہی نہیں کرتی۔ زنا انتہائی بُرا راستہ ہے۔ جس سے خاندانی نظام اور معاشرہ برباد ہو جاتا ہے۔

علمی بات: اِس آیت میں یہ حکم نہیں دیا گیا کہ "زنا نہ کرو" بلکہ فرمایا گیا "زنا کے قریب بھی مت جاؤ"۔ گویا اُن تمام راستوں کو بند کرنے کا حکم ہے جو زنا کی طرف لے جاتے ہیں۔ زنا کا محرک بننے والے اسباب کا سدباب وہ ہدف ہے جو اسلامی معاشرت کو دیگر معاشروں سے بالکل جدا کر دیتا ہے۔ اِس ہدف کے حوالہ سے اسلامی معاشرت کی نمایاں و امتیازی خصوصیات اور تعلیمات یہ ہیں جن سے اس برائی کا قلعہ قمع ہو جاتا ہے:

۱۔ مخلوط معاشرت سے اجتناب کا حکم دیا گیا ہے۔ مردوں اور عورتوں کا علیحدہ دائرہ کار متعین کیا گیا ہے (مرد کا گھر سے باہر جبکہ عورت کا گھر کے اندر دائرہ کار ہے جب تک واقعی حاجت نہ ہو عورت گھر سے باہر نہ نکلے)

۲۔ مکانات کی خاص طرز تعمیر کہ زنانہ حصّہ الگ اور مردانہ حصّہ الگ ہو۔ ۳۔ ایسی محافل اور تقریبات کی حوصلہ شکنی جس میں مخلوط اجتماع کا امکان ہو۔

۳۔ گھر سے باہر پردے کے احکامات (سورۃ الاحزاب ۳۳، آیات: ۵۳، ۳۳، ۳۲، ۳۲ تا ۵۵ اور ۵۹) کے ضمن میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ خاتون نامحرم شخص سے بے جا نرمی یعنی لچک سے بات نہ کرے گفتگو میں قدرے سخت، باوقار، سنجیدگی اور متانت کا لہجہ ہو، خواتین عزت اور وقار سے گھر میں رہیں۔ باہر نکل کر دورِ جاہلیت کی طرح زیب و زینت کی نمائش نہ کی جائے۔ مرد نامحرم خواتین سے ضروری گفتگو پردے کی اوٹ سے کریں۔ خواتین گھر سے باہر نکلنے کی صورت میں بڑی چادر کا استعمال کریں اور نامحرم کے سامنے چہرہ پر چادر ڈال لیا کریں۔

۴۔ اسی طرح گھر کے اندر پردے کے احکامات (سورۃ النور ۲۴، آیات: ۲۷ تا ۳۱ اور ۵۸ تا ۶۰) کے ضمن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل نہ ہوا جائے۔ اگر گھر میں داخلہ کی اجازت نہ دی جائے تو لوٹ جانا چاہیئے۔ مرد اور خواتین گھر میں بھی نگاہوں کو نیچا رکھیں۔ مرد اور خواتین ستر کے احکامات پر عمل کرتے ہوئے اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ خواتین گھروں میں اپنے سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھے رہا کریں۔ خواتین شوہروں، محرم مردوں اور جان پہچان کی خواتین کے علاوہ کسی کے سامنے اپنی زیب و زینت ظاہر نہ کریں۔

۵۔ نکاح کو آسان کرنا چاہیئے اور اسے بے جا رسومات سے پاک کرنا چاہیئے جو حیا کی حفاظت اور زنا کے سدباب کے موثر ذریعہ ہے۔

۶۔ جنسی جذبہ میں ہیجان پیدا کرنے والے تمام امور پر پابندی جیسے شراب نوشی، رقص و موسیقی، فحش لٹریچر، عریاں تصاویر، بیہودہ فلمیں و ڈرامے وغیرہ۔

۷۔ زانی کے لئے سخت سزا: سورۃ النور ۲۴، آیت: ۲ کی روشنی میں غیر شادی شدہ زانی کے لئے ایک سو کوڑوں کی سزا مقرر ہے۔ جب کہ شادی شدہ زانی کے لئے حدیث شریف میں رَجم کی سزا متعین ہے۔ (صحیح بخاری)

علمی بات: حرمت زنا کے بیان کو حرمت قتل پر مقدم رکھ کر یہ بیان کیا گیا کہ کفر اور شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ کسی بے قصور مسلمان کو قتل کرنا ہے پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ پہلے حرمت زنا کو بیان فرمایا پھر اس کے بعد حرمت قتل کو بیان فرمایا، اس کا جواب یہ ہے کہ زنا کے نتیجہ میں انسان کا عزت کے ساتھ وجود میں آنا ہی ختم ہو جاتا ہے اور قتل کے نتیجہ میں انسان کو وجود میں آنے کے بعد ختم کر دیا جاتا ہے اس طرح زنا کا ضرر قتل سے زیادہ ہے لہٰذا حرمتِ زنا کو حرمت قتل پر مقدم فرمایا۔ واللہ اعلم بالصواب

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس وقت کوئی زانی زنا کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا اور جس وقت کوئی چور چوری کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا اور جس وقت کوئی شرابی شراب پیتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا۔ (صحیح بخاری)۔

علمی بات: زنا سے مراد ایسی مُجامَعَت، مُباشَرَت یا صحبت ہے جو اپنے وقوع میں نکاح سے پہلے یا نکاح سے علاوہ ہو۔ گویا زنا ایک ایسا عمل ہے جس میں مرد اور عورت کا بغیر نکاح صحبت و مباشرت کرنا۔ اسلام نے زنا میں دونوں مفاہیم کو شامل کیا ہے: ایک یہ کہ مرد اور عورت کا نکاح (شادی) سے پہلے اس بدکاری کا ارتکاب کرنا۔ دوسرا نکاح کے بعد اپنے غیر منکوحہ (مرد اور عورت) سے اس بُرے فعل کا ارتکاب کرنا۔ دونوں صورتوں میں ایسا جماع جرم اور گناہ ہی ہے۔

کسی عورت کا مرد کے ساتھ یا کسی مرد کا عورت کے ساتھ ایک دوسرے کی اجازت سے جنسی تعلق قائم کرنے کو "زنا بالرضا" کہتے ہیں۔ جبکہ کسی ایک کا دوسرے کے ساتھ زبردستی جنسی تعلق قائم کرنے کو زنا بالجبر کہا جاتا ہے۔ دینِ اسلام کی تعلیمات کے مطابق دونوں صورت میں یہ زنا ہی ہے جو حرام ہے۔

علمی بات: "زنا" ایک نہایت قبیح فعل، کبیرہ گناہ اور بہت بڑا فساد ہے۔ اس کے اثرات بھی بہت بڑے ہیں اور اس سے بہت سے نقصانات جنم لیتے ہیں۔ زنا کاری ایک بدترین لعنت، کمینگی، ذلت و پستی کی علامت، بہیمانہ فعل اور بہت ہی بُرا جرم ہے۔ اس کا مرتکب وہی شخص ہو گا جس کے دل میں خوف خدا، عذاب آخرت کا ڈر نہ ہو، وہ نہایت ہی بے غیرت، بے حیا اور بے شرم ہو۔ جس کی انسانیت حیوانیت سے مغلوب ہو چکی ہو، وہ اس انتہائی گھناؤنے جرم کا ارتکاب کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسے بے حیائی کی انتہا اور بدترین چلن قرار دیا ہے، اور اس کے ارتکاب پر سزا مقرر کر کے سورۃ النور میں اس کی حد بیان فرمائی ہے، نیز رسول اللہ ﷺ کی زبانی اس کی سزائیں اور وعیدیں انسانوں تک پہنچائی ہیں۔ شریعت کے ان احکام کا مقصد رہتی دنیا تک ایک پاکیزہ معاشرہ تشکیل دینا ہے جس میں انسان کی عزت آبرو محفوظ ہو، اسی وجہ سے مرد وزن کے آزادانہ اختلاط کی مذمت کی گئی ہے، اور پردہ کے احکامات دیئے ہیں۔ یہاں تک کہ شوہر کے ان قریبی رشتہ داروں سے بھی پردے کا حکم دیا گیا جن سے عام طور پر پردہ کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔

زنا اور زانی کے متعلق فرامین رسول اللہ ﷺ: ا۔ جب کوئی شخص زنا کرتا ہے یا شراب پیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اندر سے ایمان اس طرح نکال لیتا ہے جس طرح آدمی قمیص کو اپنے سر سے اتار لیتا ہے۔ (مستدرک حاکم)

۲۔ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ کا ایک خواب مروی ہے (حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا خواب ہمیشہ سچا ہوتا ہے) جس میں بہت سی چیزوں کا تذکرہ ہے ان میں ایک بات یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کا گزر ایک ایسے سوراخ پر ہوا جو تنور کی طرح تھا۔ اس میں جب جھانک کر دیکھا تو اس میں ننگے مرد اور ننگی عورتیں نظر آئیں ان کے نیچے سے آگ کی لپٹ آتی تھی جب وہ لپٹ اوپر آتی تھیں تو وہ چیختے چلاتے اور فریاد کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے دریافت فرمایا (جن میں ایک جبرائیل علیہ السلام اور ایک میکائیل علیہ السلام تھے) یہ کیا ماجرا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ زناکار مرد اور زناکار عورتیں ہیں۔ (صحیح بخاری)

۳۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ اے مہاجرین کی جماعت! پانچ چیزیں ایسی ہیں کہ جب تم ان میں مبتلا ہو جاؤ گے اور اللہ کرے کہ تم ان چیزوں کو نہ پاؤ (تو طرح طرح کی مصیبتوں اور بلاؤں نزول ہو گا۔)

(۱) جس قوم میں کھلم کھلا طریقہ بے حیائی کا رواج ہو جائے گا، ان لوگوں میں طاعون پھیلے گا اور ایسے امراض میں مبتلا ہوں گے جو ان کے اسلاف میں نہیں تھے۔

(۲) اور جو لوگ ناپ تول میں کمی کریں گے ان کو قحط کے ذریعہ پکڑا جائے گا اور سخت محنت اور بادشاہ کے ظلم میں مبتلا ہوں گے۔

(۳) اور جو لوگ اپنے مالوں کی زکوٰۃ کو روک لیں ان سے بارش روک لی جائے گی اور اگر جانور نہ ہوں تو (بالکل ہی) بارش نہ ہو۔

(۴) اور جو لوگ اللہ ﷻ کے عہد کو اور اس کے رسول ﷺ کے عہد کو توڑ دیں گے ان کے اوپر دشمن مسلط کر دیا جائے گا وہ ان کے بعض اموال لے لے گا۔
(۵) اور جس قوم کے اصحاب اقتدار اللہ ﷻ کی کتاب کے ذریعہ فیصلے نہ کریں گے اور اللہ ﷻ نے جو چیز نازل فرمائی اس کو اختیار نہ کریں گے تو اللہ ﷻ ان کے آپس میں ایسی مخالفت پیدا کر دے گا جس کی وجہ سے آپس میں لڑتے رہیں گے۔ (سنن ابن ماجہ)

علمی بات: زنا نسب کے خلط ملط ہونے اور بالآخر نسل انسانی کی تباہی کا سبب بن سکتا ہے۔ زنا وہ بدترین فعل ہے جو فطرتِ سلیم، عقل اور شریعت یعنی ہر اعتبار سے گناہ عظیم ہے اور معاشرہ پر اس کے نہایت خطرناک اور بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مسلمان مَردوں اور عورتوں کی عزت محفوظ نہیں رہتی۔ ان کا نسب اور ان کی نسل خطرہ میں پڑ جاتی ہے اور پاک وصاف معاشرہ اخلاقی انار کی کا شکار ہو جاتا ہے، جو اس فعل بد کا مرتکب ہوتا ہے اللہ ﷻ کے فرمان کے مطابق آخرت میں اس کا ٹھکانا جہنم ہو گا۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا: ”اور وہ جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پوجتے اور نہ ہی اللہ کی حرام کی ہوئی جان کو ناحق قتل کرتے ہیں اور نہ (ہی) وہ زنا کرتے ہیں اور جو شخص یہ کام کرے گا وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا۔ قیامت کے دن اس کے لئے عذاب بڑھایا جائے گا اور وہ اس میں ذلت کے ساتھ ہمیشہ رہے گا۔“ (سورۃ الفرقان ۲۵، آیات: ۶۸، ۶۹)

علمی بات: حدیث مبارک میں ہے کہ آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے، کانوں کا زنا سننا ہے، زبان کا زنا بات کرنا ہے، ہاتھ کا زنا پکڑنا ہے اور پاؤں کا زنا جانا ہے اور دل خواہش اور تمنا کرتا ہے اور شرمگاہ ان باتوں کی تصدیق کرتی ہے یا تکذیب کرتی ہے۔ (صحیح مسلم)

علمی بات: دین اسلام نہ صرف زنا سے منع کرتا ہے بلکہ وہ زنا کی قربتوں اور راستوں سے بھی روکتا ہے اور زنا کو بے حیائی اور بُرا راستہ قرار دیتا ہے۔ اس لئے جن راستوں اور واسطوں کے ذریعہ آدمی زنا کا مرتکب ہوتا ہے۔ ان سے اجتناب کرنے کا سختی کے ساتھ حکم دیا گیا ہے۔ زنا ایسا بُرا عمل ہے جو آدمی سے یک دم سرزد نہیں ہوتا بلکہ پہلے کچھ اقدامات اور حرکات کرنا پڑتی ہیں۔ دین نے اس لئے غیر محرم مرد اور عورت کو ایک دوسرے کو ارادتاً دیکھنے سے منع کیا ہے۔ حتیٰ کہ عورتوں کو حکم دیا کہ وہ بازار میں نکلیں تو ان کا چلنے کا انداز شریفانہ ہونا چاہیئے۔ اگر کسی غیر محرم سے بات کرنا ناگزیر ہو تو عورت کی آواز میں لچک، بے جا نرمی، ملائمت گُداز پن اور نزاکت نہیں ہونی چاہیئے۔ گانا بجانا اور موسیقی کی آواز بھی آدمی کے دل میں بے حیائی پیدا کرتی ہے۔ اس لئے ایسی تمام چیزوں کے استعمال اور ان کے قریب جانے سے روک دیا گیا ہے تاکہ مسلمان معاشرہ شرم و حیا کا پیکر بن جائے۔ اسی بنا پر حکم دیا ہے کہ زنا کے قریب تک نہ جانا کیونکہ یہ بے حیائی کا بدترین راستہ ہے۔ اس راستہ پر چل کر آدمی کا مال، عزت، یہاں تک کہ قتل وغارت کے واقعات بھی رونما ہوتے ہیں۔ یہ ایسا بُرا راستہ ہے کہ آدمی کے کردار پر ہمیشہ کے لئے بدنما دھبہ لگ جاتا ہے۔ زنا ہر قسم کی زیادتی اور بے حیائی کو فروغ دیتا ہے۔ ان بُرائیوں کی وجہ سے حکم دیا ہے کہ زنا کے قریب نہ بھٹکنا کیونکہ یہ سراسر بے حیائی اور بُرائی کا راستہ ہے۔

علمی بات: صرف زنا کے عمل سے ہی نہیں روکا گیا بلکہ ہر وہ عمل منع کیا گیا ہے جو زنا کا محرک ہو اور زنا کا باعث اور سبب بنے، مثلاً اجنبی عورتوں سے تعلق پیدا کرنا، ان سے خلوت میں ملاقات کرنا، ان سے ہنسی اور دل لگی کی باتیں کرنا اور ان سے ہاتھ ملانا اور بوس و کنار کرنا مغربی تہذیب میں یہ تمام اُمور عام ہیں اور زندگی کے معمولات میں داخل ہیں اسی وجہ سے وہاں زنا بھی عام ہے۔ اسلام نے اسی بندش کے لئے عورتوں کو پردہ میں رہنے کا حکم دیا اور عورتوں اور مَردوں کے آزادانہ میل جول کو سختی سے روکا ہے، مخالفین اسلام کہتے ہیں کہ اسلام نے عورتوں کو گھروں میں قید کر دیا ہے جب کہ عورتوں کا گھر میں مقید رہنا اس سے بہتر ہے کہ وہ محض جانوروں کی طرح ہوس پوری کرنے کا آلہ بن جائیں۔

زنا کے مفاسد اور خرابیاں: ا۔ زنا سے نسب خلط ملط اور مشتبہ ہو جاتا ہے اور انسان کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ زانیہ سے جو بچہ پیدا ہوا ہے وہ اس کے نطفہ سے ہے یا کسی اور کے نطفہ سے ہے، اس لئے اس کے دل میں اس بچہ کی پرورش کی نہ کوئی امنگ ہوتی ہے نہ کوئی جذبہ ہوتا ہے اور نہ وہ اس کی نگہداشت کرتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ بچہ ضائع ہو جاتا ہے اس سے نسل منقطع ہوتی ہے اور دنیا کا نظام فاسد ہو جاتا ہے۔
۲۔ زانیہ کسی ایک مرد کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتی اس کے پاس کئی مرد آتے ہیں، پھر بعض اوقات ان مَردوں میں رقابت اور حسد پیدا ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ سے قتل وغارت تک نوبت آجاتی ہے۔

۳۔ زانیہ سے ہر سلیم الفطرت شخص متنفر ہوتا ہے اور وہ نکاح کرنے کی اہل نہیں رہتی، معاشرہ میں اس کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔

۴۔ اگر زنا عام ہو جائے تو نہ مرد کسی عورت کے ساتھ مخصوص ہو گا اور نہ عورت کسی مرد کے ساتھ مخصوص ہو گی، ہر مرد ہر عورت سے اور ہر عورت ہر مرد سے اپنی نفسانی خواہش پوری کر سکے گا اس وقت انسانوں میں اور جانوروں میں کوئی فرق نہیں رہے گا، نہ کوئی کسی کا باپ ہو گا نہ کوئی کسی کا بیٹا ہو گا۔ قرابت داری اور رشتہ داری کا تصور ختم ہو جائے گا۔

۵۔ عورت صرف اس لئے نہیں ہوتی کہ اس کے ساتھ جنسی عمل کیا جائے بلکہ وہ پورے گھر اور خاندان کی تعمیر میں مرد کی شریک کار ہوتی ہے، کھانے پینے، پہننے اور رہنے، خانہ داری کے مسائل میں مرد کے دوش بدوش ہوتی ہے، عائلی اور خانگی امور گھریلو ذمہ داریوں کو پورا کرتی ہے، بچوں کی تربیت کرتی ہے اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب وہ نکاح کے ذریعہ صرف ایک مرد کے ساتھ مخصوص ہو اور باقی مردوں سے منقطع ہو اور یہ مقصد اس وقت پورا ہو گا جب زنا کو حرام جانتے ہوئے اس باب کو مکمل طور پر بند کر دیا جائے۔

۶۔ بیوی کا خاوند اس کی تمام ضروریات پوری کرنے کا ذمہ دار ہے۔ وہ اس کو روٹی، کپڑا اور مکان دینے کا پابند ہوتا ہے اور اس کی ضروریات کا کفیل ہوتا ہے اور اس کی بیوی اس کی دکھ سکھ کی ساتھی ہوتی ہے اس کے بچوں کی ماں ہوتی ہے، شوہر مر جائے تو اس کے ترکہ کی وارث ہوتی ہے اس کا مستقبل محفوظ ہوتا ہے اس کے برخلاف زانیہ کے ساتھ صرف وقتی اور عارضی تعلق ہوتا ہے، اس کے کھانے، کپڑے اور رہنے کا نہ کوئی کفیل ہوتا ہے نہ ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسے اپنے مستقبل کا کوئی تحفظ حاصل نہیں ہوتا۔

۷۔ بعض مردوں کو پوشیدہ بیماریاں ہوتی ہیں اور جن عورتوں کے پاس وہ جاتے ہیں ان عورتوں کو ان مردوں سے وہ بیماریاں لگ جاتی ہیں پھر ان عورتوں سے دوسرے مردوں میں وہ بیماریاں پھیلتی ہیں، یوں زنا کے ذریعہ ایڈز اور اس جیسی دوسری انتہائی مہلک اور خطرناک بیماریاں معاشرہ میں پھیل جاتی ہیں۔

علمی بات: بعض زناکار عورتوں کی یہ بات سننے میں آئی ہے کہ میرا بدن ہے جس طرح میں چاہوں استعمال کروں۔ یہ تو کفریہ بات ہے اور اللہ ﷻ کی ذات کے مقابلہ میں جرأت کرنے والا رویہ ہے۔ اس کا معنیٰ ہے (العیاذ باللہ) کہ زناکاری سے قرآنِ حکیم کا منع فرمانا صحیح نہیں، درحقیقت بہت سے لوگوں نے یہ سمجھا ہی نہیں کہ ہم بندے ہیں۔ اللہ ﷻ خالق اور مالک ہے، سارے بندے اس کی مخلوق ہیں اور مملوک ہیں۔ مملوک کو کیا حق ہے کہ اپنی ذات کو اپنے بارے میں اور اپنے جسم و جان کے بارے میں خود مختار سمجھے۔ اُن کا تو کام ہے کہ مالک کی مرضی کے تابع رہیں نہ کہ میری مرضی کا نعرہ لگائیں۔

آیت نمبر ۳۳: کسی بھی جان کو ناحق قتل نہ کیا جائے سوائے حق کے۔ حق سے مراد وہ چند صورتیں ہیں جس میں انسانی جان کا قتل کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً قاتل کا قصاص میں قتل، مرتد کا قتل، شادی شدہ زانی کی رجم کی سزا وغیرہ۔ قتل کیئے جانے والے کے ورثا کو قصاص کا حق دیا گیا ہے۔ کسی بھی طریقہ سے اس حق یا اختیار کا ناجائز استعمال کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ مثلاً تڑپا تڑپا کر یا جلا کر مارنا وغیرہ۔ مقتول کے ورثا کی مدد کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ قصاص میں قتل کی سزا نافذ کرنا حکومت کا منصب ہے۔ عوام میں سے کسی شخص کو قتل کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

علمی بات: اگر کوئی شخص کسی مسلمان کو ناحق قتل کر دے تو مقتول کے ولی کو اللہ ﷻ نے پورا اختیار دیا ہے کہ چاہے تو قصاص لے لے، چاہے دیت لے لے، یا دیت کے بغیر معاف کر دے۔ "سلطنا" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ﷻ کی طرف سے مسلم حکمران پر لازم ہے کہ وہ اسے ان تینوں باتوں کا اختیار دے، پھر اگر وہ قصاص لینا چاہے تو اسے قصاص دلوائے، اگر قاتل یا اس کے ساتھی مزاحمت کریں تو شریعت کی بغاوت پر ان سے جنگ کرے۔ یہ قصاص معاشرہ میں سے قتل ناحق کو ختم کرنے کا واحد طریقہ ہے۔ کفار کے معاشروں میں بدامنی اور بے شمار قتل قصاص نہ ہونے ہی کی وجہ سے ہیں۔ اب مسلم ممالک نے بھی ایک آدھ کے علاوہ قصاص کے حکم اور اس کے شرعی طریقہ کو چھوڑ کر کفار کا قانون اپنایا تو اس کے نتیجہ میں وہ بھی امن کے بجائے خوف اور بدامنی کا شکار ہو گئے۔ کفار کے ملکوں کی طرح نہ وہاں کسی کی جان محفوظ ہے، نہ مال، نہ عزت و آبرو اور اسے ترقی قرار دیا جا رہا ہے۔

علمی بات: قصاص لیتے وقت قتل میں زیادتی یہ ہے کہ قاتل کے بجائے کسی اور کو قتل کر دے، یا قاتل کے ساتھ انہیں بھی قتل کرے جو قتل میں شریک نہیں ہیں، یا قتل سے پہلے مُثلہ کرے، یعنی اس کے اعضا کاٹے یا مختلف طریقوں سے تکلیف دے دے کر مار دے۔ اس میں صرف یہ استثنا ہے کہ قاتل نے جس طریقہ سے قتل کیا ہے اس طریقہ سے اسے قتل کر سکتا ہے۔ مسلم حکومت اور تمام مسلمان اس کی مدد کریں گے، ان سب پر اس کی مدد لازم ہے، بلکہ اللہ ﷻ بھی دنیا اور آخرت میں اس کی نصرت فرمائے گا۔

علمی بات: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی انسان کو جائز قتل کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی شخص نے دوسرے شخص کو ظلماً قتل کر دیا ہو۔ مسلمان اور ذمی کے قاتل کو قصاص میں قتل کیا جائے گا اور باقی کو تعزیراً قتل کیا جائے گا اور ان کو قتل کرنا حکومت کا منصب ہے۔ عوام میں سے کسی شخص کو انہیں قتل کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

علمی بات: حرمتِ عزت کے بعد اب حرمتِ جان کا ذکر ہے۔ انسانیت مل جل کر رہنے اور ایک دوسرے کی جان، مال اور عزت کی حفاظت کرنے کا نام ہے۔ انسان پر اپنی اور کسی دوسرے کی جان لینا حرام ہے۔ خود کشی کی ممانعت بھی اِسی آیت سے ثابت ہے۔ جس معاشرہ میں انسانی جان محفوظ نہ ہو وہ معاشرہ "انسانی معاشرہ" کہلانے کا حق دار نہیں۔ قتل ناحق تمدّن کی جڑ پر تیشہ چلانے کے مترادف ہے۔ اِسی لئے سورۃ المآئدۃ۵، آیت:۳۲ میں فرمایا: "جس نے کسی جان کو بغیر کسی جان (کے بدلہ) یا زمین میں بغیر فساد مچانے کے قتل کیا تو گویا اُس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی ایک جان کو بچایا تو گویا اُس نے تمام انسانوں کو بچالیا" البتہ چند صورتوں میں شریعتِ اسلامی کی تعلیمات کے مطابق کسی انسان کی جان لی جاسکتی ہے مثال کے طور پر: ۱۔ شادی شدہ زانی کو سنگسار کرنا۔ (صحیح بخاری)۔ ۲۔ قاتل کی بطورِ قصاص جان لینا۔ (سورۃ البقرۃ۲، آیت:۱۷۸)۔ ۳۔ حربی کافر کو قتل کرنا (سورۃ التوبہ۹، آیت:۱۱۱)۔ ۴۔ گستاخِ رسول ﷺ کو قتل کرنا۔ (صحیح بخاری)۔ ۵۔ اسلام سے مرتد ہونے والے کو قتل کرنا۔ (سورۃ البقرۃ۲، آیت:۵۴) ۶۔ رہزن یا اسلامی حکومت کے باغی کو قتل کرنا۔ (سورۃ المآئدۃ۵، آیت:۳۳)۔

علمی بات: مسلمان کے قتل ناحق پر قرآن حکیم اور احادیثِ مبارکہ میں سخت وعیدیں ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ اور جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اُس کی سزا جہنم ہے وہ اُس میں ہمیشہ رہنے والا ہے اور اس پر اللہ کا غضب ہوگا اور اُس پر لعنت کرے گا اور اللہ نے اُس کے لئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (سورۃ النسآء۴، آیت:۹۳)

۲۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قیامت کے دن مقتول قاتل کو پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر لائے گا، اس حال میں کہ اس کی رگوں سے خون بہہ رہا ہوگا، وہ کہے گا کہ اے میرے رب! اس نے مجھے قتل کیا تھا، حتیٰ کہ اس کو عرش کے قریب کھڑا کرے گا۔" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے لوگوں نے توبہ کا ذکر کیا تو انہوں نے اس آیت کی تلاوت کی اور فرمایا: کہ یہ آیت نہ منسوخ ہوئی ہے نہ تبدیل ہوئی ہے، اس کی توبہ کہاں سے ہوگی! (جامع ترمذی)

۳۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قریب ہے کہ ہر گناہ کو اللہ ﷻ معاف فرما دے گا سوائے اس شخص کے جو کفر پر مرے اور سوائے اس شخص کے جو کسی مومن کو عمداً قتل کرے۔" (مسند احمد، سنن نسائی)

آیت نمبر ۳۴: یتیم کے مال میں بے جا تصرف کرنا حرام ہے۔ یتیم کے مال کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے۔ یتیم کے شعور کی عمر کو پہنچنے تک اس کے مال کو اس طریقہ سے استعمال کیا جائے جس میں اس کا فائدہ ہو۔ عہد سے وہ میثاق مراد ہے جو اللہ ﷻ اور بندے کے درمیان ہے اور وہ عہد بھی جو انسان آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ عہد کو پورا کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ عہد کو توڑنے کی صورت میں باز پرس کی تنبیہ کی گئی ہے۔

علمی بات: وعدہ کر کے اس کو توڑنا اسلام کی نظر میں بڑا معیوب ہے حضور ﷺ نے وعدہ شکنی کو منافقت کی تین علامتوں میں سے ایک علامت قرار دیا ہے اس لئے یہاں ایفائے عہد کی تاکید کی جا رہی ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ یہ معمولی بات نہیں بلکہ اگر تم نے اس میں سستی کی تو تم سے باقاعدہ باز پرس ہوگی۔ خواہ اللہ ﷻ سے عہد کیا ہو یا پھر رسول اللہ ﷺ سے یا استاد سے یا کسی قرابت دار عزیز سے یا اجنبی سے اس میں ہر جائز عہد داخل ہے۔

علمی بات: تمام معاملاتِ انسانی تحریری یا غیر تحریری معاہدوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اِس آیت اور اِرشاداتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں ہم پر اِن کا احترام لازم ہے۔ معاہدوں کی تین اقسام ہیں:

۱۔ **اپنے آپ سے:** مثلاً نیکی کا ارادہ، گناہوں پر توبہ، کوئی قسم یا کوئی نذر۔

۲۔ **بندوں سے:** مثلاً حقوق العباد کی ادائیگی جیسے والدین، اولاد، شوہر و بیوی، اساتذہ اور پڑوسیوں وغیرہ کے حقوق، ملازمت، کاروبار یا دیگر پیشہ ورانہ معاہدات۔

۳۔ **اللہ ﷻ سے:** مثلاً اللہ ﷻ نے مومنوں سے اُن کے مال اور جان خرید لیئے ہیں جنت کے بدلہ میں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "بے شک اللہ نے مومنوں سے خرید لی ہیں اُن کی جانیں اور اُن کے مال اِس کے بدلہ کہ اُن کے لئے جنت ہے وہ اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں پس قتل کرتے ہیں اور قتل (شہید) کیئے جاتے ہیں۔" (سورۃ التوبہ ۹، آیت:۱۱۱)

اللہ ﷻ سے بد عہدی کرنے سے ممانعت: "اللہ کے عہد کو پورا کرو جب تم آپس میں عہد کرو اور قسموں کو پختہ کرنے کے بعد انہیں نہ توڑو۔ (سورۃ النحل ۱۶، آیت:۹۱) "تو اس (اللہ) نے (بطورِ سزا) ان کے دلوں میں نفاق جما دیا اُس دن تک جب وہ اُس سے ملیں گے اِس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ سے اُس وعدہ کے خلاف کیا جو اُنہوں نے کیا تھا اور اِس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔" (سورۃ التوبہ ۹، آیت:۷۷)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے خطبہ میں فرمایا: "سنو! جو امانت دار نہ ہو اس کا ایمان نہیں اور جو عہد پورا نہ کرے وہ دین دار نہیں۔" (شعب الایمان)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: اور اچھے طریقہ کے بغیر مالِ یتیم کے قریب نہ جاؤ حتیٰ کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا: اور یتیموں کو آزماتے رہو یہاں تک کہ جب وہ نکاح (کی عمر) کو پہنچ جائیں تو اگر تم اُن میں سمجھ بوجھ پاؤ تو اُنہیں اُن کے مال لوٹا دو مال فضول خرچی کرتے ہوئے اور جلدی جلدی نہ کھاؤ کہ وہ بڑے ہو جائیں گے۔ (سورۃ النسآء ۴، آیت:۶) سورۃ النساء کی اس آیت میں ان کی بدنی قوت کا بھی اعتبار کیا ہے جیسا کہ بلوغت کی عمر کو پہنچنے کے ذکر سے ظاہر ہوتا ہے اور ان کی ذہنی صلاحیت اور قوت کا بھی اعتبار کیا ہے جیسا کہ اس قید سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم ان میں عقلمندی کے آثار دیکھو کیونکہ اگر جوان ہونے کے بعد یتیم کا مال اس کے حوالہ کر دیا جائے اور وہ ذہین اور عقل مند نہ ہو تو اس بات کا خدشہ ہے کہ وہ اپنی خواہشوں اور شوق کو پورا کرنے میں سارا مال ضائع کر دے گا اور اس کے پاس کچھ نہیں رہے گا اس لئے جب تک وہ سمجھ دار نہ ہو جائے، مال اس کے حوالہ نہ کیا جائے۔ یتیم کا مال ناجائز طور پر کھانے کے متعلق بہت سخت وعید ہے: "بے شک جو لوگ ناجائز طور پر یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں محض آگ بھر رہے ہیں، اور وہ عنقریب بھڑکتی ہوئی آگ میں پہنچیں گے۔" (سورۃ النسآء ۴، آیت:۱۰)

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو برزہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قیامت کے دن کچھ لوگ اپنی قبروں سے اُٹھیں گے اس حال میں کہ ان کے مونہوں سے آگ کے شعلے نکل رہے ہوں گے۔" عرض کیا گیا: یا رسول اللہ ﷺ! وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: "کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ ﷻ نے فرمایا ہے جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹوں میں محض آگ بھر رہے ہیں۔" (طبرانی، ابن حبان)

آیت نمبر ۳۵: ناپ تول میں کسی قسم کی کمی کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ کسی چیز کی لین دین بذریعہ وزن ہو تو صحیح ترازو کے ساتھ پورا وزن کیا جائے۔ ناپ تول پورا دینے سے دنیا میں انجام کے اعتبار سے اور آخرت میں اجر و ثواب کے لحاظ سے بہتر ہے۔

ناپ تول میں کمی کا حرام ہونا: ناپ اور تول میں کمی سے منع کیا گیا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے بھی اپنی قوم سے فرمایا تھا: اے میری قوم! ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو اور لوگوں کی چیزیں کم کر کے انہیں نقصان نہ پہنچاؤ۔ (سورۃ ھود ۱۱، آیات:۸۴، ۸۵)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جس قوم میں خیانت ظاہر ہو گی ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا جائے گا اور جس قوم میں بہ کثرت زنا ہو گا ان میں بکثرت موت ہو گی اور جو قوم ناپ تول میں کمی کرے گی ان کا رزق کاٹ دیا جائے گا اور جو قوم ناحق فیصلے کرے گی ان میں بہت خون ریزی ہو گی اور جو قوم عہد شکنی کرے گی اللہ ﷻ ان پر دشمن کو مسلط کر دے گا۔ (مؤطا امام مالک)

علمی و عملی بات: ا۔ قرآنِ حکیم کی یہ ایک اہم معاشرتی ہدایت ہے کہ ناپ اور تول میں کمی نہ کی جائے۔ سورۃ المطففین کی ابتدائی آیات میں ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے شدید وعید بیان ہوئی ہے اور اِس جرم کو آخرت پر یقین نہ ہونے کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ ناپ تول میں اگر کمی نہ کی جائے تو اِس سے معاشرہ میں اعتماد کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ انسان کو تھوڑا لیکن مستقل فائدہ ہوتا ہے اور ضمیر بھی مطمئن رہتا ہے۔

۲۔ اِس آیت میں ہدایت تو اشیاء کے ناپ تول کے حوالہ سے ہے لیکن وسیع ہدایت یہ ہے کہ انسان جس پیمانے کو اپنے لئے پسند کرے وہی پیمانہ دوسرے کے لئے بھی استعمال کرے۔ انسان کو لینے اور دینے کے باٹ یکساں رکھنے چاہئیں۔

علمی و عملی بات: اس آیت میں ناپ تول صحیح اور برابر کرنے کے متعلق دو باتیں فرمائیں۔ ایک اس کا خیر (بہتر) ہونا۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ ایسا کرنا اپنی ذات میں اچھا اور بہتر ہے شریعت کے علاوہ عقلی اور طبعی طور پر بھی کوئی شریف انسان ناپ تول کی کمی کو اچھا نہیں سمجھ سکتا۔ دوسری بات یہ فرمائی کہ انجام اس کا بہتر ہے۔ انجام میں آخرت کا انجام اور حصول ثواب و جنت تو داخل ہے ہی اس کے ساتھ دنیا کے انجام کی بہتری کی طرف بھی اشارہ ہے کہ کسی تجارت کو اس وقت تک فروغ نہیں ہو سکتا جب تک بازار میں اس کی ساکھ اور اعتبار قائم نہ ہو اور وہ اس تجارتی دیانت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ دغابازی زیادہ وقت تک نہیں چل سکتی پھر لوگ خبردار ہو کر اس سے معاملہ نہیں کرتے۔ اور پورا حق دینے والا سب کو بھلا لگتا ہے۔ اللہ ﷻ اس کی تجارت کو خوب ترقی عطا فرماتا ہے۔

آیت نمبر ۳۶: کسی ایسی بات کو قبول کرنے کی ممانعت جس کے لئے کوئی علمی دلیل نہ ہو۔ فکر اور عمل کے لئے علمی دلیل اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ توہمات، بے جا رسومات اور تصورات کی نفی کی گئی ہے۔ آنکھ، کان اور دل کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا کیوں کہ یہ تینوں اعضاء علم کے ذرائع ہیں۔ ان اعضاء کے استعمال کے حوالہ سے بھی روزِ قیامت باز پرس ہوگی۔

علمی بات: اسلامی فلاحی معاشرہ کے قیام کے سلسلے میں ایک اور اصول یہ بتایا گیا کہ جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت پڑو، مطلب یہ ہے کہ بلا تحقیق کسی چیز کو نہ دل میں جگہ دو، نہ زبان سے نکالو اور نہ اس پر عمل کرو۔ حضور نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ: "کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات کو بلا تحقیق آگے پہنچا دے۔" (صحیح مسلم) مثلاً یہ ہے کہ کوئی شخص بغیر تحقیق کیئے گواہی دے دے، کسی پر تہمت لگا دے، بغیر تحقیق کسی سے نفرت و عداوت رکھے یا ایذا پہنچائے، رسوماتِ باطلہ کی اندھی تقلید کرے۔ ان دیکھی اور ان سنی باتوں کو اس طرح بیان کرے گویا کہ وہ چشم دید ہے، خلافِ حق باتوں کی حمایت کرے اور جھوٹے خواب وغیرہ بیان کرے۔ یہ سب باتیں اسی حکم میں آتی ہیں۔ شریعت اسلامی میں غیر یقینی باتوں پر حکم دینا یا اس پر عمل کرنا ہر گز روا نہیں، یہ تو جھوٹا ہونے کی علامت ہے اور وہ شخص اللہ ﷻ کے ہاں مجرم ہوگا۔

علمی و عملی بات: اِس آیت میں ہدایت دی گئی ہے کہ انسان کا نظریہ اور عمل محض گمان یا اندھی پیروی کی بنیاد پر نہیں بلکہ علم اور ٹھوس دلائل کی بنیاد پر ہونا چاہیئے۔ اِس ہدایت کے ذریعہ اسلام نے انسان کو ایک طرف ایسے تمام اوہام کے خوف سے نجات دلا دی جن کی بنیاد محض گمان یا تخمینوں پر تھی جیسے ستارہ شناسی، دست شناسی یا اِسی طرح کی دیگر پُر اسرار علوم۔ اِسی حوالہ سے ارشادِ نبوی ﷺ ہے: مَنْ أَتَى كَاهِنًا أَوْ عَرَّافًا فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُولُ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلَى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "جو کسی کاہن یا نجومی کے پاس آیا اور اس کی بات کی تصدیق کی اُس نے اُس بات کی تکذیب کی جو محمد ﷺ پر نازل کیا گیا۔" (مسند احمد)

دوسری طرف خوشی یا غمی کے حوالہ سے بے جا رسومات و بدعات سے خلاصی کرا دی جو آباؤ اجداد کی اندھی پیروی کا نتیجہ تھیں اور وہ کسی علمی بنیاد پر نہیں تھیں۔ در حقیقت اِس آیت میں علم کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ انسان کو پیروی علمی حقائق ہی کی کرنی چاہیئے اور اُن تمام نظریات یا خدشات کو اہمیت نہیں دینی چاہیئے جو وہم، گمان یا تخمینوں کی بنیاد پر ہیں۔ یہی وہ نقطۂ نظر ہے جس سے سائنس کے سفر کا آغاز ہوا۔ سائنس کی بنیاد اُس علم پر ہے جو ہمیں مشاہدات اور تجربہ سے حاصل ہوتا ہے لیکن قرآنِ حکیم کی رُو سے علم کی اقسام دو ہیں:

ا۔ علم ہدایت یا علم وحی: یہ علم مادی حواس سے نہیں بلکہ اللہ ﷻ کی عطا کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ اِس کی صورت الہام، سچے خواب اور کشف ہوتی ہے۔ اِس علم کی ایک خاص اور اہم ترین صورت وہ وحی ہے جو اللہ ﷻ نے انبیاء کرام علیہم السلام پر فرشتوں کے ذریعہ نازل فرمائی۔

۲۔ علمِ جدید: یہ وہ علم ہے جو انسان کو حواس، تجربہ اور غور و فکر کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ فلسفہ، نفسیات، تاریخ، نظام ہائے زندگی، سائنس اور ٹیکنالوجی وغیرہ کے علوم سب اِسی زمرے میں آتے ہیں۔

ہمارے لئے اِن دونوں علوم کا سیکھنا ضروری ہے۔ علمِ ہدایت تو علم کی وہ روح ہے جس کے بغیر علمِ جدید نہ صحیح رُخ پر آگے بڑھ سکتا ہے، نہ دنیا میں مفید ہو سکتا ہے اور نہ آخرت کے اعتبار سے رحمت بن سکتا ہے۔ اِسی طرح علمِ جدید کے ذریعہ ہمیں علمِ ہدایت یعنی قرآنِ حکیم کی زیادہ سے زیادہ معرفت حاصل ہوتی ہے، عظمتِ قرآن کا نقش ہمارے دلوں پر قائم ہوتا ہے، دورِ حاضر کے تقاضوں کا ساتھ دیا جا سکتا ہے اور عصرِ حاضر کے مسائل کو سمجھ کر علمِ ہدایت کی روشنی میں اُن کا حل پیش کیا جا سکتا ہے۔

علمی و عملی بات: کان آنکھ اور دل کے متعلق سوال سے مراد یہ ہے کہ ان سب سے سوال کیا جائے گا، انسان سے پوچھ گچھ ہوگی کہ اس نے اللہ ﷻ کی ان نعمتوں کو غلط طور پر کیوں استعمال کیا؟ وہم و گمان پر مبنی غلط باتیں کانوں میں کیوں ڈالیں؟ آنکھ جیسی عظیم نعمت سے غلط چیزوں کو کیوں دیکھا؟ اور دل تو بہت بڑی دولت ہے جو اللہ ﷻ نے انسان کے سینے میں رکھی ہے، اعتقاد، اخلاق، عزم اور قوتِ عملیہ کا مرکز دل ہی ہے، اگر یہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے اور یہ درست ہو تو سارا جسم درست رہتا ہے، اس کے متعلق بھی باز پرس ہوگی کہ اتنی بڑی نعمت کو غلط سوچ اور غلط کاموں پر کیوں لگایا؟ سورۃ الھمزۃ میں عذاب کا ذکر کرتے ہوئے اللہ ﷻ نے فرمایا: "جہنم کی آگ کا اثر سب سے پہلے دل پر ہوگا کیونکہ مرکز اخلاق اور ہر فعل کا منبع دل ہی ہے، اس لئے سب سے پہلے یہی ماخوذ ہوگا۔"

کان سنتے ہیں، آنکھ دیکھتی ہے جب کہ دل غور و فکر کرتا ہے۔ محبت و نفرت دل میں ہی پیدا ہوتی ہے۔ عزم و ارادہ اسی سے وابستہ ہے۔ توحید اور ایمان کا مرکز بھی یہی ہے۔ کفر، نفاق، بد اخلاقی، حسد اور کینہ بھی یہیں جنم لیتے ہیں اور بغض و عداوت کا منبع بھی دل ہی ہے، اگر اعتقاد کے معاملہ میں دل کو غلط طور پر استعمال کرے گا تو اللہ ﷻ کا ارشاد ہے۔ بے شک اللہ کے نزدیک سب جانداروں میں سے بدتر وہ بہرے گونگے (لوگ) ہیں جو سمجھتے نہیں ہیں"۔ (سورۃ الانفال ۸، آیت: ۲۲)، یہ ساری باتیں اللہ ﷻ نے اسی آیت کے تحت بیان فرمائی ہیں۔

آیت نمبر ۳۷: زمین پر ایسی چال چلنے کی ممانعت ہے جس سے تکبر اور فخر و غرور ظاہر ہو۔ ایسی چال چلنے والا نہ زمین کو پھاڑ سکتا ہے نہ ہی پہاڑوں کی بلندی تک پہنچ سکتا ہے۔ رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر دل میں ہو تو بندہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ (صحیح مسلم)

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ نے یہ اصول بیان فرمایا کہ زمین میں اتراتے ہوئے مت چلو، غرور اور اکڑ نہ دکھاؤ، کیونکہ تم غرور و تکبر کرکے زمین کو نہیں پھاڑ سکتے اور نخوت کی بنا پر کتنا بھی سر اونچا کر لو، تمہارا قد زیادہ سے زیادہ کتنا لمبا ہو جائے گا جو پہاڑوں کی بلندی سر کر لے۔ یقیناً تم پہاڑوں کی بلندی تک نہیں پہنچ سکتے، لہٰذا تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اللہ ﷻ کی زمین پر اکڑ کر اور گردن اونچی کرکے چلو، عاجزی اختیار کرنے والا شخص اللہ ﷻ اور لوگوں کے نزدیک بھی قابلِ عزت ہوتا ہے، مگر جو شخص غرور و تکبر کو اپناتا ہے اپنے آپ میں بڑا بننے کی کوشش کرتا ہے، وہ اللہ ﷻ اور اس کی مخلوق کے نزدیک ذلیل و خوار ہی ہوتا ہے جو اللہ ﷻ کی خاطر عاجزی کرے گا، اللہ ﷻ اس کو بلند کرے گا اور جو تکبر کرے گا اللہ ﷻ اس کی گردن توڑ دے گا اور کسی نہ کسی مرحلہ میں وہ ذلیل ہو کر رہے گا، اس کو دنیا میں بھی سزا ملے گی اور آخرت کا عذاب تو دائمی ہے۔" قارون کے تکبر کا ذکر خود قرآنِ حکیم میں موجود ہے، اللہ ﷻ نے اس کو خزانوں سمیت زمین میں دھنسا دیا۔ پھر ہم نے اس (قارون) کو اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا تو اس کے پاس کوئی جماعت نہ تھی جو اللہ کے مقابلے میں اس کی مدد کرتی اور نہ وہ (خود) بچاؤ کرنے والوں میں سے ہوا۔ (سورۃ القصص ۲۸، آیت: ۸۱)

حضور ﷺ کا فرمان مبارک ہے کہ "جس انسان میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا"۔ (صحیح مسلم) تکبر ہمیشہ حق کے مقابلہ میں ہوتا ہے حضور ﷺ نے فرمایا: "تکبر یہ ہے کہ حق بات کو ٹھکرا دیا جائے اور دوسروں کو حقیر سمجھا جائے۔" (صحیح مسلم)

سچی بات کو بلا سوچے سمجھے ٹھکرا دینا اور اپنے سے کم تر آدمیوں کی بات کو کوئی حیثیت نہ دینا تکبر کی علامت ہے۔ حق یہ ہے کہ سچی بات خواہ کسی اعلیٰ کی طرف سے ہو یا ادنیٰ کی طرف سے اسے تسلیم کرنا چاہیئے، جو شخص تکبر کی وجہ سے حق بات کو ٹھکراتا ہے اور کسی کو حقیر سمجھتا ہے وہ اللہ ﷻ کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔

آیت نمبر ۳۸: سابقہ ہدایات اور احکامات کے سلسلہ میں جن بُری باتوں سے روکا گیا ان کا ارتکاب اللہ ﷻ کو سخت ناپسند ہے۔ اسی طرح سے جن باتوں کا حکم دیا گیا ان پر عمل نہ کرنا بھی اللہ ﷻ کو پسند نہیں۔

عملی بات: قتل اولاد، قتل ناحق اسراف فی القتل، زنا، بدعہدی، ناپ تول میں کمی، یتیم کا مال کھانا، بلا تحقیق کسی چیز پر اعتقاد رکھنا، زبان سے کہنا یا اس پر عمل کرنا اور تکبر کرنا، یہ سب وہ باتیں ہیں جن کے متعلق اللہ ﷻ نے فرمایا: ”کہ ان کی برائی آپ کے رب کے ہاں سخت ناپسندیدہ ہے۔ آپ کا رب ان سے بیزار ہے، لہٰذا ان سے بچنے کی کوشش کرو۔“

علمی بات: مذکورہ احکام میں جو حرام افعال اور ممنوع اعمال ہیں ان کا بُرا اور ناپسند ہونا تو ظاہر ہے مگر ان میں کچھ احکام اوامر بھی ہیں جیسے والدین اور اقرباء کے حقوق ادا کرنا اور وفائے عہد وغیرہ۔ ان میں بھی چونکہ مقصود ان کی ضد سے بچنا ہے کہ والدین کی ایذا سے، رشتہ داروں کی قطع رحمی سے اور عہد توڑنے سے پرہیز کرنی ہے۔ یہ چیزیں سب حرام وناپسند ہیں اس لئے مجموعہ کو مکروہ فرمایا گیا ہے۔

علمی بات: مذکورہ پندرہ (۱۵) آیتوں میں جو احکام بیان کیئے گئے ہیں وہ ایک حیثیت سے اس سعی و عمل کی تشریح ہیں جو اللہ ﷻ کے نزدیک مقبول ہو جس کا ذکر اٹھارہ (۱۸) آیتوں سے پہلے آیا ہے۔ (وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا) جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ہر سعی و عمل اللہ ﷻ کے نزدیک مقبول نہیں بلکہ صرف وہی جو رسول کریم ﷺ کی سنت اور تعلیم کے مطابق ہو۔ ان احکام میں اس مقبول سعی و عمل کے اہم ابواب کا ذکر آ گیا ہے جس میں پہلے حقوق اللہ کا پھر حقوق العباد کا بیان ہے۔ یہ پندرہ آیتیں پوری تورات کا خلاصہ ہیں۔ جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ پوری تورات کے احکام سورۂ بنی اسرائیل کی پندرہ (۱۵) آیتوں میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔

آیت نمبر ۳۹: اللہ ﷻ کی طرف سے یہ تمام احکامات حکمت پر مشتمل ہیں جو وحی کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کو بتلائے گئے۔ لفظِ حکمت، سنت کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ یہاں احکامات کی حکمتوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اللہ ﷻ ہی کی ذات الحکیم بھی ہے۔ اس کے احکامات بھی حکمت سے بھرے ہیں۔ اس کے سوا کسی کو معبود بنا کر شرک نہ کیا جائے۔ شرک کرنے والوں کو ملامت کیئے ہوئے اور دھتکارے ہوئے جہنم میں ڈالے جانے کی وعید سنائی گئی ہے۔

علمی بات: یہ ساری باتیں ان میں سے ہیں جو آپ ﷺ کے پروردگار نے آپ ﷺ کی طرف وحی کے ذریعہ نازل فرمائی ہیں اور ہیں بھی یہ حکمت کی باتیں ان باتوں میں علم، دانائی سمجھ اور فہم پایا جاتا ہے، اللہ ﷻ کے نزدیک حکمت بہت بڑی چیز ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا: ”اللہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے اور جسے حکمت عطا کی گئی تو یقیناً اُسے بہت بڑی بھلائی دے دی گئی“ (سورۃ البقرہ ۲، آیت: ۲۶۹)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سنت ساری کی ساری حکمت ہے قرآنِ حکیم میں ان کی مختلف مقامات پر تشریح کی گئی ہے، تو فرمایا کہ یہ جتنی باتیں بیان کی گئی ہیں، یہ ان حکمت و دانش کی باتوں میں سے ہیں جو آپ ﷺ کی طرف وحی کی گئی ہیں۔

علمی بات: گزشتہ چند آیات میں جو پُر مغز اور بیش بہا نصیحتیں کی گئیں، یہ وہ علم و حکمت اور تہذیبِ اخلاق کی باتیں ہیں جنہیں عقل سلیم قبول کرتی ہے۔ جو وحی کے ضمن میں نبی اُمی ﷺ کی طرف بلاواسطہ اور اُمتِ اُمیہ کی طرف بواسطہ حضور ﷺ کو بھیجی گئیں۔ اسی طرح اس بات کی اہمیت بھی واضح کی گئی کہ مذکورہ بالا نصائح کا بیان توحید سے شروع کیا گیا تھا۔ ان باتوں کے اختتام پر بھی توحید کی طرف توجہ یاد دلا دی گئی تا کہ قاری قرآنِ حکیم سمجھ سکے کہ تمام حسنات کا آغاز و انجام خالص توحید باری تعالیٰ کو ہونا چاہیئے۔

آیت نمبر ۴۰: مشرکین کے باطل عقیدے کی تردید کی گئی ہے۔ وہ اپنے لئے بیٹیوں کو پسند نہیں کرتے مگر فرشتوں کو اللہ ﷻ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں (معاذ اللہ)۔ اللہ ﷻ کے لئے اولاد تجویز کرنا اللہ ﷻ کی شان میں بہت بڑی گستاخی ہے۔

علمی بات: عرب کے کئی مشرک قبائل فرشتوں کو اللہ ﷻ کی بیٹیاں مانا کرتے تھے ان کی حماقت کا پردہ چاک کیا جا رہا ہے۔ ان سے پوچھا جا رہا ہے کہ تم خود اپنے لئے تو لڑکے پسند کرتے ہو اور اگر کسی کے گھر بچی پیدا ہوتی ہے تو اس کے ہاں صف ماتم بچھ جاتی ہے۔ تمہیں شرم نہیں آتی کہ جس چیز کو تم اپنے لئے ناپسند کرتے ہو اسے اللہ ﷻ کے لئے ثابت کرتے ہو۔

آیت نمبر ۴۱: قرآنِ حکیم میں بہترین دلائل، وعظ و نصیحت اور واقعات بیان کیئے گئے ہیں تاکہ لوگ اللہ ﷻ کی وحدانیت تسلیم کرلیں۔ لیکن کفار اور مشرکین قرآنِ حکیم سے نصیحت حاصل کرنے کے بجائے حق سے دور بھاگ رہے ہیں۔

علمی بات: اسلامی معاشرہ کی فلاح کے لئے زریں اصولوں کے اوّل و آخر میں اللہ ﷻ نے مسئلہ توحید بیان فرمایا، اب اس آیت میں بھی قرآنِ حکیم کی صداقت اور مسئلہ توحید ہی کا ذکر اور شرک کا رد ہے، اللہ ﷻ نے اس قرآنِ حکیم میں مختلف طریقوں، عنوانوں اور پیرایوں میں پھیر پھیر کر بیان کیا ہے۔ تاکہ اس کی وحدانیت، ایمانیات، رسالت، برزخ، آخرت وغیرہ اور دوسری زندگی سے تعلق رکھنے والی ساری باتیں آسانی سے سمجھ میں آسکیں اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ لوگ ان مثالوں سے نصیحت پکڑیں اور کفر و شرک کو ترک کر کے اللہ ﷻ کی وحدانیت کو تسلیم کرلیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس تمام تر تشریح کے باوجود متعصب، ضدی اور عنادی لوگوں کی نفرت میں اضافہ ہی ہوتا ہے اور وہ قرآنِ حکیم سے کچھ نصیحت حاصل نہیں کرپاتے۔

آیت نمبر ۴۲: ان خاص قسم کے مشرکوں سے خطاب ہے کہ جنہوں نے بے شمار معبود بنا رکھے تھے اور انہیں بااختیار سمجھتے تھے۔ ان کے مطابق اگر (معاذ اللہ) کوئی اور معبود ہوتا تو وہ لازماً اللہ ﷻ کو اختیار سے محروم کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا اور نہ ہی اللہ ﷻ کے سوا کوئی دوسرا معبود ہے جو کائنات میں کسی قسم کا اختیار رکھتا ہو۔

علمی بات: اس آیت کے تین مطلب ہوسکتے ہیں:

۱۔ اگر اللہ ﷻ کے سوا اور متعدد معبود ہوتے تو وہ ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے جیسے کہ دنیا کے حکمرانوں میں ہوتا ہے اور جو جس علاقہ پر غلبہ حاصل کرتا وہاں اپنا نظام جاری کردیتا، دنیا بنانے والے اور دنیا چلانے والے بھی متعدد ہوتے تو اس کائنات کا فطری اور طبعی نظام ایک نہج اور ایک طرز پر نہ ہوتا، سورج کبھی ایک مخصوص جانب سے طلوع اور ایک مخصوص جانب میں غروب نہ ہوتا، بیر کے درخت میں ہمیشہ بیر نہ لگتا، کشش ثقل کی وجہ سے ہمیشہ چیزیں نیچے کی طرف نہ آتیں، انسان سے ہمیشہ انسان پیدا نہیں ہوتا، ان فطری چیزوں کے نظام بدلتے رہتے اور جب تمام چیزیں ایک طرز اور ایک نہج پر چل رہی ہوں تو معلوم ہوا کہ اس نظام کو بنانے والا اور اس نظام کو چلانے والا بھی واحد ہی ہے متعدد نہیں ہیں۔

۲۔ اگر اللہ ﷻ کے سوا اور بھی متعدد معبود ہوتے تو وہ اللہ ﷻ کے ملک اور اس کی سلطنت کو مٹانے کے لئے اس تک پہنچ چکے ہوتے، کیونکہ اللہ ﷻ ان کے خلاف ہے وہ ان کی شرکت کو نہیں مانتا بلکہ وہ ان کے معبود ہونے کا انکار کرتا ہے۔ ایسے میں ضروری تھا کہ وہ عرش پر ہلہ بول دیتے اور اس کے واحد ہونے کی دعویٰ کو باطل کردیتے اور وہ یہ ثابت کردیتے کہ وہ حقیقت میں اس کے شریک ہیں، لیکن جبکہ فی الواقع ایسا نہیں ہوا اور اس کا کوئی مخالف اس کے عرش تک نہیں پہنچ سکا اور اس کے ملک اور اس کی سلطنت کا بال بیکا نہیں کرسکا تو پھر اب یہ تسلیم کرنے میں کیا کسر رہ جاتی ہے کہ اللہ ﷻ واحد ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

۳۔ مشرکین یہ کہتے تھے کہ ہم بتوں کی عبادت اس لئے کرتے ہیں کہ وہ بت ہم کو اللہ ﷻ کے قریب کردیں گے جو عرش کا مالک ہے اور وہ سال ہا سال سے اللہ ﷻ کا قرب حاصل کرنے کے لئے بتوں کی عبادت کررہے ہیں تو اب تک ان کو عرش کے قریب پہنچ جانا چاہیئے تھا اور جبکہ وہ عرش تک نہیں پہنچے تو ماننا پڑے گا کہ بتوں کی عبادت کر کے وہ اللہ ﷻ تک نہیں پہنچ سکتے اور بتوں کی عبادت کرنا باطل ہے۔

آیت نمبر ۴۳: اللہ ﷻ کی ذات مشرکین کے بے ہودہ خیالات اور شرکیہ باتوں سے بہت بلند و بالا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی شانِ ربوبیت، اُلوہیت اور حاکمیتِ اعلیٰ میں کوئی دیوی دیوتا شریک نہیں ہے۔ اللہ ﷻ کی ذات ہر قسم کے شرک سے بلند و برتر ہے۔

آیت نمبر ۴۴: کائنات کی ہر چیز اللہ ﷻ کی فرماں بردار ہے اور اپنے اپنے انداز میں اس کی تسبیح و تحمید میں مصروف ہے۔ ان کی تسبیح کو انسان نہیں سمجھ سکتا۔ البتہ اللہ ﷻ کی معرفت کی نشانیاں ذرہ ذرہ میں موجود ہیں۔ اللہ ﷻ حلیم ہے اور بخشنے والا ہے۔ نافرمانوں کو مہلت دیتا ہے اور ان کی فوری گرفت نہیں کرتا۔

علمی بات: "سَبَحَ" کے لغوی معنی کسی چیز کا ہوا یا پانی میں تیرنا اور تیزی سے گزر جانا ہے۔ پھر اس لفظ کا استعمال کسی کام کو سرعت کے ساتھ انجام دینے پر بھی ہونے لگا۔

ہر شے کی عملی تسبیح: اس کائنات میں لاکھوں اور کروڑوں سیارے فضا میں نہایت تیزی سے گردش کر رہے ہیں جن میں نہ کبھی لغزش پیدا ہوتی ہے نہ جھول اور نہ ہی تصادم یا ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان پر کنٹرول کرنے والی ہستی اپنی تقدیر، تدبیر اور انتظام میں نہایت محکم اور ہر قسم کی بے تدبیری اور عیب یا نقص سے پاک ہستی ہی ہو سکتی ہے اور کائنات کی جملہ اشیاء کا یہ عمل، جس کے تحت وہ مدبر ہستی کے مجوزہ قوانین کے تحت سرگرم عمل ہیں، ان کی تسبیح، فرماں برداری یا عبادت کہلاتا ہے گویا کائنات کی جملہ اشیاء زبانِ حال یا اپنے عمل سے اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ ان کا انتظام کرنے والی ہستی ہر طرح کے عیوب اور نقائص سے پاک ہے۔ اور وہ صرف ایک ہی ہستی ہو سکتی ہے۔ یہ تو ہے ہر چیز کی عملی تسبیح۔

ہر شے کی قولی تسبیح: قولی یا زبانی تسبیح کی صورت یہ ہے کہ انسان، جنات یا فرشتوں کی تسبیح زندگی کے تناسب کے لحاظ سے سب سے بالا و برتر، مؤثر اور قابل فہم ہوتی ہے۔ حیوانات کی اس سے کم اور جمادات کی اس سے کم، جن و انس کی تسبیح کی صورت چونکہ اختیاری ہے لہٰذا گاہے بگاہے ہوتی ہے جبکہ باقی تمام اشیاء ہر وقت تسبیح میں مشغول رہتی ہیں اور جب کوئی چیز اللہ ﷻ کی تسبیح بیان کرتی ہے تو اس پر اللہ ﷻ کی رحمت کا نزول بھی ہوتا ہے۔ جس مخلوق کی تسبیح جتنی واضح ہو گی، اتنا ہی زیادہ رحمت کا نزول ہو گا۔

آیت نمبر ۴۵: منکرین آخرت اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے قرآنِ حکیم سے کوئی ہدایت حاصل نہیں کر پاتے۔ ان کے اور رسول کریم ﷺ کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیا جاتا ہے جو آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے۔

علمی بات: نبی کریم ﷺ جب قرآنِ حکیم کی تلاوت فرماتے تو کفار و مشرکین اس سے کچھ بھی فائدہ حاصل نہیں کرتے تھے کیونکہ ان کے کفر و نافرمانی اور قرآن حکیم سے تغافل کی وجہ سے اللہ ﷻ اپنے رسول ﷺ اور ان کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیتا تھا، جس کی وجہ سے وہ رسول اللہ ﷺ کو دیکھ نہیں پاتے تھے۔ جیسا کہ اللہ ﷻ نے ارشاد فرمایا: "اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل پردوں میں ہیں اس بات سے جس کی طرف آپ ﷺ ہمیں بلاتے ہیں اور ہمارے کانوں میں بوجھ ہے اور ہمارے اور آپ ﷺ کے درمیان ایک پردہ ہے پس آپ ﷺ (اپنا) کام کرتے رہیئے بے شک ہم (اپنا) کام کرنے والے ہیں۔"
(سورۂ حٰمٓ السجدۃ ۴۱، آیت: ۵)

شانِ نزول: اس آیت کا ایک خاص شانِ نزول ہے جو تفسیر قرطبی میں حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے کہ جب قرآنِ حکیم میں سورۃ اللھب نازل ہوئی جس میں ابو لہب کی بیوی کی بھی مذمت مذکور ہے تو اس کی بیوی رسول کریم ﷺ کی مجلس میں گئی اس وقت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ مجلس میں موجود تھے۔ انہوں نے اس عورت کو دور سے دیکھ کر آنحضرت ﷺ سے عرض کیا: آپ ﷺ یہاں سے ہٹ جائیں تو بہتر ہے کیونکہ یہ عورت بڑی بد زبان ہے یہ ایسی باتیں کہے گی جس سے آپ ﷺ کو تکلیف پہنچے گی تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں اس کے اور میرے درمیان اللہ ﷻ پردہ حائل کر دے گا۔ چنانچہ وہ مجلس میں پہنچی مگر رسول کریم ﷺ کو نہ دیکھ سکی تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ تمہارے ساتھی نے ہماری ہجو کی ہے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کہ واللہ وہ تو کوئی شعر ہی نہیں کہتے جس میں ہجو کی جاتی ہو تو وہ یہ کہتی ہوئی چلی گئی کہ تم بھی ان کی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو اس کے چلے جانے کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: کیا اس نے آپ ﷺ کو نہیں دیکھا آپ ﷺ نے فرمایا: کہ جب تک وہ یہاں رہی ایک فرشتہ میرے اور اس کے درمیان پردہ کرتا رہا۔

آپ ﷺ کا قرآنِ حکیم پڑھتے وقت کفار کی آنکھوں پر پردہ ڈالنا: حِجَابِ مَسْتُوْر کی دو تفسیریں ہیں۔ ایک تفسیر یہ ہے کہ مَسْتُوْر بمعنی ساتر ہے، یعنی اللہ ﷻ نے ان کی آنکھوں پر ایسا حجاب ڈال دیا تھا جس کی وجہ سے وہ رسول اللہ ﷺ کو دیکھ نہیں سکتے تھے اور نہ دیکھنے کی وجہ سے وہ رسول اللہ ﷺ کو ایذا نہیں پہنچا سکتے تھے۔ جبکہ ایک دوسری رائے یہ ہے کہ ان کے دلوں پر ایک ڈاٹ ہے جس کی وجہ سے وہ نہ قرآن حکیم کو نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ اس سے نفع حاصل کر سکتے ہیں۔ بعض مفسرین کرام کے مطابق یہ آیت ان کافروں کے بارے میں نازل ہوئی، جو رسول اللہ ﷺ کو اس وقت ایذا پہنچاتے تھے، جب آپ ﷺ قرآنِ حکیم کی تلاوت فرماتے تھے اور وہ ابو سفیان، نضر بن حارث، ابو جہل اور ابو لہب کی بیوی ام جمیل وغیرہ تھے، تو اللہ ﷻ نے رسول ﷺ کو دیکھنے سے ان کی بصارت کو اس

وقت سلب کرلیا، جب آپ ﷺ قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تھے۔ وہ آپ ﷺ کے پاس آتے، آپ کے پاس سے گزرتے اور آپ ﷺ کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ان کافروں نے اپنے بغض وعناد سے اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ کی شان میں اتنی گستاخی کی کہ سزا کے طور پر اللہ ﷻ نے ان کو ہدایت سے محروم کر دیا۔

بعض مفسرین کرام کی رائے یہ بھی ہے کہ اللہ ﷻ نے فرمایا: اے نبی ﷺ! جب آپ ﷺ ان مشرکین پر قرآنِ حکیم پڑھیں جو بعثت کو نہیں مانتے اور نہ ثواب اور عذاب کا اقرار کرتے ہیں تو ہم آپ ﷺ کے اور ان کے درمیان ایک پردہ ڈال دیتے ہیں جو ان کے دلوں پر حجاب بن جاتا ہے کہ جو کچھ آپ ﷺ پڑھتے ہیں وہ اس کو سمجھ نہ سکیں اور نہ اس سے نفع اٹھا سکیں یہ ہماری طرف سے ان کے کفر کی سزا ہے۔ بہر حال دونوں آراء درست ہیں کہ آپ ﷺ کے قرآنِ حکیم پڑھتے وقت اگر وہ پاس ہوتے ہیں تو قرآنِ حکیم سننے کے باوجود اس پردے کی وجہ سے جس طرح قرآنِ حکیم سننے کا حق ہے نہ اسے سن سکتے ہیں، نہ سمجھتے ہیں اور نہ اثر قبول کرتے ہیں اور اگر وہ ایذا رسانی کی نیت سے آتے ہیں تو اللہ ﷻ آپ ﷺ کو اس پردہ کے ذریعہ سے ان کی نگاہوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

علمی بات: "اَكِنَّةً" "كِنَانٌ" کی جمع ہے، چھپانے والی چیز، پردہ۔ "وَقْرًا" بوجھ، مراد بہرا پن ہے۔ "نُفُوْرًا" "نَافِرٌ" کی جمع ہے، بدکتے ہوئے۔ نفرت کی وجہ سے، یعنی جب کفار و مشرکین نے آخرت سے انکار کیا اور پھر ضد اور ہٹ دھرمی میں اس قدر بڑھ گئے کہ ہزار بار سمجھانے کے باوجود انکار کرتے ہی چلے گئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اور آپ ﷺ کے درمیان ایک گہرا پردہ حائل ہو گیا، ان کے دلوں پر غلاف چڑھ گئے، مگر ایسے جو کسی کو نظر نہیں آتے، نگاہوں سے پوشیدہ ہیں اور ان کے کان ہر نصیحت کرنے والے کی بات سننے سے بہرے ہو گئے، مگر وہ بدبخت ان پردوں کے حائل ہونے اور قرآنِ حکیم کی تاثیر سے محروم ہونے پر فکر کے بجائے فخر ہی کرتے رہے اور مذاق اڑاتے رہے۔ یہود کا بھی یہی حال تھا۔ ایک معنیٰ اس آیت کا یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ جب قرآنِ حکیم پڑھتے ہیں اور بعض کفار آپ ﷺ کو نقصان پہنچانے کے لئے آتے ہیں تو ہم آپ ﷺ کے اور ان کے درمیان ایک ایسا پردہ حائل کر دیتے ہیں جو نظر نہیں آتا، اس پردے کی وجہ سے وہ آپ ﷺ کو دیکھ نہیں سکتے اور نہ آپ ﷺ کو کوئی نقصان یا تکلیف پہنچا سکتے ہیں۔

آیت نمبر ۴۶: کفار اور مشرکین کے دل قرآنِ حکیم سمجھنے سے قاصر اور ان کے کان قرآنِ مجید سن کر ہدایت قبول کرنے سے عاجز ہیں۔ وہ تعصب کی بنا پر اللہ ﷻ کا ذکر بطور معبود واحد برداشت نہیں کرتے اور اعراض کرتے ہوئے راہِ فرار اختیار کرتے ہیں۔

علمی بات: اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اگرچہ قرآنِ حکیم کو سنتے تھے لیکن مگر اس سے فائدہ یعنی ہدایت نہ لیتے تھے۔ وہ جب سنتے تو مبہوت ہو جاتے، لیکن واپس ہو کر پھر خفیہ مشورے کرتے۔ سازشیں کرتے اور پختہ عہد کرتے کہ اب کے بعد پھر سرے سے سنیں گے ہی نہیں تا کہ ان کے دلوں پر قرآنی اثرات نہ پڑ جائیں۔ ان کا دماغ متاثر نہ ہو جائے۔ کیونکہ قرآنِ حکیم کی تعلیمات جس نظریہ حیات اور جس عقیدہ توحید پر مبنی تھیں اس کے نتیجہ میں قائم ہونے والا نظام اور معاشرہ ان کی خود ساختہ برتری اور امتیازات کو ختم کر دیتا تھا اور یہ بات ان کے لئے ناقابل برداشت تھی۔

علمی بات: کافروں کو نفرت لفظ وحدہٗ سے تھی۔ کیونکہ عقیدۂ توحید ان کے اجتماعی نظام کو ختم کر رہا تھا۔ ان کا اجتماعی نظام بت پرستی اور جاہلیت کے رسم و رواج پر قائم تھا، جس میں قریش کی امتیازی حیثیت تھی، ورنہ وہ خود جانتے تھے کہ ان کے عقائد میں کس قدر جھول ہے اور اسلام کے نظریات کس قدر پختہ ہیں۔ نیز وہ یہ بھی جانتے تھے کہ قرآنِ حکیم ایک نہایت ہی بلند پایۂ پیغام و کلام ہے اور اس کی ایک امتیازی شان ہے۔ قرآنِ حکیم کے اثرات کا یہ عالم تھا کہ وہ اس کی طرف کھنچے چلے جاتے تھے۔ حالانکہ وہ اس سے اپنے آپ کو بچانے کی سعی بھی کرتے تھے اور اس کے اثرات کو زائل کرنے میں جدوجہد بھی کرتے تھے۔

ان کا ضمیر اور ان کی فطرت ان کو اس بات پر مجبور کر رہی تھی کہ وہ بات سنیں، متاثر ہوں، لیکن غرور کی وجہ سے وہ تسلیم کرنے اور یقین کرنے سے باز رہتے تھے۔ اپنی ہٹ دھرمی، غرور اور گھمنڈ کو وہ یوں چھپاتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ پر مختلف قسم کے الزامات عائد کرتے تھے۔ مثلاً یہ کہ آپ ﷺ جادوگر ہیں۔ (معاذ اللہ)

یہ آیت مکہ مکرمہ کے ان مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جب رسول اللہ ﷺ رات کو تلاوتِ قرآنِ حکیم کرتے تھے اور خانہ کعبہ کے پاس نماز ادا فرماتے تھے تو وہ ان کو اذیت دیتے اور ان کو پتھر مارتے اور اسلام کی طرف لوگوں کو دعوت دینے میں حائل ہوتے تھے۔ لیکن اللہ ﷻ نے لطف وکرم فرمایا اور تلاوتِ قرآنِ حکیم کے وقت وہ حضور ﷺ کو اذیت نہیں دے سکتے تھے۔

علمی بات: کافروں کی ایک بدترین خصلت یہ بھی تھی کہ وہ اللہ ﷻ کے ساتھ اپنے بتوں کا ذکر بھی سننا چاہتے تھے، اس لئے جس مجلس میں صرف اللہ ﷻ کا نام لیا جاتا، اسے پسند نہیں کرتے تھے اور وہاں سے چل دیتے تھے۔ آیت کے دوسرے حصہ میں ان کی یہی بات بیان کی گئی ہے۔

"اور جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے (تو) ان کے دل نفرت کرنے لگتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں۔" (سورۃ الزمر ۳۹، آیت: ۴۵)

آیت نمبر ۴۷: مشرکین مکہ کا قرآنِ حکیم کے حوالہ سے طرزِ عمل بیان کیا گیا ہے۔ وہ محض اعتراض کرنے اور قرآنِ حکیم کی تردید کے ارادہ سے اِسے سنتے ہیں۔ دینِ حق اور رسول اکرم ﷺ کے خلاف ان کی آپس کی سرگوشیوں اور چالوں سے اللہ ﷻ خوب واقف ہے۔

شانِ نزول: ایک بار ابوجہل، زمعہ بن اسود، عَمرو بن ہشام اور خویطب بن عبد العزیز وغیرہ آپس میں اکٹھے ہوئے اور آپ ﷺ کے بارے میں باہمی مشورہ کیا کہ ان کے خلاف کیا اقدام کرنا چاہیئے۔ ابوجہل نے کہا: کہ آپ (معاذ اللہ) مجنون ہیں زمعہ نے کہا: وہ شاعر ہے خویطب نے کہا: کہ وہ کاہن ہے۔ پھر سب ولید بن مغیرہ کے پاس حاضر ہوئے اور اپنی اپنی آراء اس کے سامنے پیش کیں اس نے یہ سب کچھ سن کر کہا: میرا خیال ہے کہ وہ جادوگر ہیں۔ (معاذ اللہ)

علمی بات: اللہ ﷻ فرما رہا ہے کہ میں بہت خوب جانتا ہوں کہ یہ لوگ جو کان لگا کر توجہ سے آپ ﷺ کی بات سنتے ہیں اس سے ان کا مقصد آپ ﷺ کے بیانات سے استفادہ کرنا نہیں ہوتا بلکہ نکتہ چینی کرنا اور تمسخر اڑانا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب یہ ظالم آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں تو آپ ﷺ کے بارے میں تو ان باتوں کا ہمیں پورا علم ہے۔ جب یہ ظالم اپنی برادری کے مسلمانوں سے یوں کہتے ہیں کہ تم تو بس ایک ایسے آدمی کے پیچھے چل پڑے ہو جس پر جادو ہو گیا ہے۔ اسی طرح یہ کافر لوگ ان سے کیا کیا لغو اور من گھڑت باتیں کرتے ہیں اور کیا کیا مثالیں دیتے ہیں، کبھی دیوانہ کہتے ہیں اور کبھی شاعر اور کبھی جادوگر اور کبھی جادو زدہ کہتے ہیں تاکہ ان باتوں کے ذریعہ اپنی نفرت کا اظہار کریں اور اپنے دل کی بھڑاس نکالیں۔ اللہ ﷻ ان لوگوں کی الزام تراشیوں اور گستاخیوں سے خوب واقف ہے۔ یہ ظالم آپ ﷺ کے خلاف اس لئے بدگمانیاں پھیلانا اور لوگوں کو قرآنِ پاک، اسلام اور آپ ﷺ سے نفرت دلانا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ نبی کریم ﷺ دنیاوی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے باطل پرستوں کی خواہشات کی پرواہ نہیں کرتے اور ہر حال میں کلمۂ حق کہتے ہیں۔ ان کے کلام و بیان میں غیر معمولی تاثیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جب کچھ نہیں کر سکتے تھے تو آپ ﷺ کو دیوانہ اور جادوگر کہہ دیتے ہیں۔ (معاذ اللہ)

آیت نمبر ۴۸: مشرکین کی مذمت بیان کی گئی ہے جو (معاذ اللہ) رسول اللہ ﷺ کے لئے بُری مثالیں بیان کرتے تھے۔ ایسا کر کے وہ گمراہی میں پڑ گئے ہیں اور وہ ہدایت کے مستحق نہیں رہے۔

علمی بات: کوئی ایک بات نہیں جو مشرکین آپ ﷺ کے بارے میں کہتے ہوں، بلکہ مختلف اوقات میں مختلف باتیں کہتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ آپ جادوگر ہیں، کبھی کہتے ہیں کسی دوسرے نے آپ پر جادو کر دیا ہے، کبھی کہتے ہیں کہ آپ شاعر ہیں، کبھی کاہن اور کبھی مجنون (دیوانہ) کہتے ہیں۔ ان کی متضاد باتیں خود اس بات کی دلیل ہیں کہ انہیں حقیقت کا کچھ پتہ نہیں، اس حال میں کیسے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ انہیں ہدایت کا صحیح راستہ مل سکے، یا ایک مراد یہ ہے کہ ان باتوں سے دوسروں کو ہدایت سے روکنے کے لئے کوئی راستہ نہیں پاتے۔

آیت نمبر ۴۹: موت کے بعد دوبارہ زندہ کیئے جانے کی طرف توجہ دلانے پر مشرکین کا طرزِ عمل بیان کیا گیا ہے۔ کہتے کہ مرنے کے بعد ان کی ہڈیاں مٹی میں مل جائیں گی تو انہیں دوبارہ کیسے اٹھایا جائے گا؟

علمی بات: کفار آپ ﷺ سے بڑی حیرت سے سوال کرتے کہ آپ جو انسانوں کی دوبارہ زندگی کی بات کرتے ہیں یہ کیسے ممکن ہے؟ جب ہماری ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو جائیں گی اور گوشت گل سڑ جائے گا تو اس کے بعد ہمیں پھر سے نئی زندگی کیسے مل سکتی ہے؟ گویا ان کی سوچ کے مطابق ایسا ہونا بالکل محال اور ناممکن ہے۔

علمی بات: قرآنِ حکیم سے دُوری اور عقیدۂ توحید سے انحراف کا منطقی نتیجہ آخرت کا انکار ہوتا ہے۔ جس بنا پر مکہ مکرمہ کے کفار مرنے کے بعد جی اٹھنے کا انکار کرتے تھے۔ قرآنِ حکیم کے دوسرے مقام پر آخرت کے منکرین کا عقیدہ یوں بیان کیا گیا ہے۔ کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ بے شک ہم نے اسے ایک قطرے سے پیدا فرمایا پھر وہ کھلم کھلا جھگڑالو بن گیا۔ اور ہمارے لئے مثالیں بیان کرنے لگا اور اپنی پیدائش کو بھول گیا اس نے کہا کہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا جب کہ وہ بوسیدہ ہو چکی ہوں گی؟ آپ ﷺ فرما دیجئے! انہیں وہی زندہ فرمائے گا جس نے انہیں پہلی بار پیدا فرمایا تھا اور وہ ہر طرح کا پیدا فرمانا خوب جانتا ہے۔ (سورۂ یٰسٓ ۳۶، آیات: ۷۷ تا ۷۹) سورۃ القیامہ میں انسان کی اس سوچ اور رویہ پر یوں افسوس کا اظہار کیا گیا ہے۔ "بربادی ہے تیرے لئے تو بربادی ہے۔ پھر (سُن لے کہ) بربادی ہے تیرے لئے تو بربادی ہے۔ کیا انسان خیال کرتا ہے کہ اُسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا۔ کیا وہ ایک قطرہ نہ تھا (اس) منی کا جو (ماں کے رحم میں) ٹپکایا جاتا ہے۔ پھر وہ جما ہُوا خون ہو گیا تو (اللہ نے) پیدا فرمایا پھر (ہر لحاظ سے) درست فرمایا۔ پھر اس سے دو قسمیں بنائیں مرد اور عورت۔ تو کیا وہ اس (بات) پر قادر نہیں کہ مُردوں کو (پھر سے) زندہ فرما دے؟" (سورۃ القیامہ ۷۵، آیت: ۳۴ تا ۴۰)

آیت نمبر ۵۰: مشرکین کے سوال پر اللہ ﷻ کی طرف سے جواب دیا گیا ہے۔ یہ لوگ پتھر یا لوہے جیسی سخت چیز بھی بن جائیں تب بھی اللہ ﷻ انہیں دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

علمی بات: مذکورہ بالا آیتِ کریمہ آنحضرت ﷺ کی نبوت کے برحق ہونے اور قرآنِ حکیم کی صداقت پر دلیل ہے، کیونکہ جن باتوں کے متعلق اللہ ﷻ نے فرمایا ہے کہ مشرکین یہ کہیں گے اور آپ ﷺ اس کا یہ جواب دیں، پھر وہ یہ کہیں گے اور آپ ﷺ اس کا یہ جواب دیں۔ تو چاہیئے تھا کہ مشرکین وہ باتیں نہ کہتے اور پھر کہتے کہ قرآنِ حکیم جھوٹا ہو گیا (معاذ اللہ)، اس لئے کہ قرآنِ حکیم نے پیشن گوئی کی تھی کہ ہم یہ کہیں گے اور ہم نے نہیں کہا۔ لیکن وہی ہوا جو قرآنِ حکیم نے کہا تھا اور قرآنِ حکیم کی پیشن گوئی سچی ہو گئی۔ یہ سچے نبی ﷺ کی شان ہے کہ آپ ﷺ نے مخالفین کی زبانوں کے متعلق پیشن گوئی کی اور مخالفین نے آپ ﷺ کی پیشن گوئی کے مطابق باتیں کر کے آپ ﷺ کو سچا ثابت کر دیا۔

علمی بات: جہاں تک ہڈیوں اور مٹی کا تعلق ہے ان کے ساتھ تو پھر بھی زندگی کی کچھ رمق باقی رہنے کی اُمیدیں وابستہ ہیں اور پتھر اور لوہا تو زندگی سے بہت دور ہیں اس کفار کو بطورِ زجر و توبیخ یعنی ڈانٹ ڈپٹ کے کہا گیا کہ وہ چاہیں پتھر ہو جائیں یا پھر لوہا یعنی جتنی بھی سخت ترین چیز بن جائیں جو ان کے خیال میں آثارِ حیات کو قبول کرنے سے بہت ہی دور ہوں، جس میں زندگی کا پیدا ہونا وہ ناممکن سمجھتے ہوں جس میں زندگی کی روح نہ پھونکی جاسکتی ہو تو پھر بھی اللہ ﷻ ہر چیز پر قادر ہے، اس نے جس طرح پہلی مرتبہ انہیں مٹی یا نطفہ سے وجود بخشا اسی طرح وہ انہیں دوبارہ بھی زندہ کر سکتا ہے۔ وہ جب چاہے گا انہیں زندہ فرما دے گا۔

علمی بات: یہ لوگ نہ پتھر بن سکتے تھے اور نہ لوہا، لیکن یہ ان کو بطورِ چیلنج کہا جا رہا ہے، اس چیلنج میں ایک طرح کی سرزنش اور ملامت بھی پوشیدہ ہے۔ پتھروں اور لوہے میں کوئی احساس نہیں ہوتا، لہٰذا ایک بعید اشارہ اس طرف ہے کہ ان کی سوچ پتھر اور لوہے کی طرح بے لچک ہے۔

آیت نمبر ۵۱: مشرکین کا اگلا اعتراض یہ ہوتا کہ وہ کون سی ہستی ہے جو انہیں دوبارہ پیدا کرے گی؟ اللہ ﷻ نے اس کا جواب دیا کہ جس اللہ ﷻ نے پہلی بار پیدا کیا وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔ مشرکین بطورِ استہزاء سر ہلا کر کہتے ایسا کب ہوگا؟ اللہ ﷻ نے اس کا جواب دیا کہ قیامت قریب ہی ہے۔ جس چیز کا واقع ہونا یقینی ہو وہ قریبی ہوتی ہے۔ اس پر مشرکین مزید تعجب کرتے ہوئے کہا کہ پھر وہ دن کب آئے گا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: "قیامت کا حقیقی وقت تو اللہ ﷻ ہی بہتر جانتا ہے لیکن اب قیامت قریب ہے کیونکہ اس دنیا کی زندگی کا زیادہ وقت گزر چکا ہے اور تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔ میں آخری نبی ہوں اب کوئی اور نبی نہیں آئے گا بلکہ قیامت آئے گی۔"

علمی بات: اگرچہ اللہ ﷻ کے لئے کسی بھی نئی چیز کو وجود میں لانے اور کسی شے کے خاتمہ کے لئے مشکل یا آسان ہونے کا تصور ہی نہیں کیونکہ وہ جو چاہتا ہے کلمہٗ کن سے فرما دیتا ہے۔ یہ بس انسانوں کو سمجھانے کے لئے ہے۔ اس آیت میں اشارہ اس طرف ہے کہ انسانی سوچ کے مطابق عموماً کسی چیز کو پہلی بار عدم سے وجود میں لانا زیادہ مشکل ہوتا ہے اس کے برخلاف ایک مرتبہ پیدا کرنے کے بعد دوبارہ پیدا کرنا اتنا مشکل نہیں ہوتا۔ جس اللہ ﷻ نے پہلی بار پیدا کرنے کا زیادہ مشکل کام اپنی قدرت سے انجام دیا ہے، اس کے بارے میں یہ ماننے میں کیا دشواری ہے کہ وہ دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔

علمی بات: قرآنِ حکیم منکرین آخرت سے فرماتا ہے کہ تمہیں اس میں کیا اعتراض ہے، کیا اللہ ﷻ نے تم کو عدم سے لا کر وجود کی دنیا میں آباد نہیں کیا ہے، کیا اس نے تمہیں بغیر کسی مادی ذریعہ کے پیدا نہیں کیا؟ جب اسی نے اس سے پہلے تمہیں پیدا کیا تھا، تو وہ تمہیں پھر بھی زندگی بخش سکتا ہے، جب اسباب کو اسی نے پیدا کیا ہے تو اس کے اختیار میں یہ بھی ہے کہ ان کو بدل بھی دے وہ پتھر اور لوہے کو انسانوں میں تبدیل کر سکتا ہے، اس لئے قرآنِ حکیم کہتا ہے، کہ تم جو کچھ بھی ہو جاؤ تم میں لوہے اور پتھر کی سی سختی اور صلاحیت بھی پیدا ہو جائے تب بھی وہ تمہیں زندہ انسانی صورت میں تبدیل کر دے گا، یہ سب کچھ اس کے اختیار میں ہے۔

آیت نمبر ۵۲: روزِ محشر اللہ ﷻ کے بلانے کا مطلب ہے کہ اللہ ﷻ کے حکم سے لوگوں کو قبروں سے زندہ کر کے بارگاہِ الٰہی میں پیش کیا جائے گا۔ تمام لوگ اللہ ﷻ کی حمد و ثنا اور اس کی اطاعت کرتے ہوئے اس کے سامنے حاضر ہوں گے۔ تاہم مجرمین و کفار کا روزِ قیامت حمد و ثنا کرنا ان کو نفع نہ دے گا۔

علمی بات: جس روز اللہ ﷻ سب کو محشر کی طرف بلائے گا تو یہ بلانا بواسطہ فرشتہ حضرت اسرافیل علیہ السلام کے ہوگا کہ جب وہ دوسرا صور پھونکیں گے تو سب مردے زندہ ہو کر میدانِ حشر میں جمع ہو جائیں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زندہ ہونے کے بعد سب کو میدانِ حشر میں جمع کرنے کے لئے آواز دی جائے۔ اس آیت کے ظاہر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت محشر میں مومنوں کے ساتھ ساتھ کفار بھی اللہ ﷻ کی حمد و ثنا کرتے اٹھیں گے۔

کیونکہ اس آیت میں اصل خطاب کفار ہی کو ہے، انہی کے متعلق یہ بیان ہو رہا ہے کہ سب حمد کرتے ہوئے اٹھیں گے۔ مفسرین کرام نے فرمایا کہ کفار بھی اپنی قبروں سے نکلتے وقت سُبۡحَانَكَ وَبِحَمۡدِكَ کے الفاظ کہتے ہوئے نکلیں گے مگر اس وقت کا حمد و ثنا کرنا ان کو کوئی نفع نہیں دے گا، کیونکہ یہ لوگ جب مرنے کے بعد زندگی دیکھیں گے تو غیر اختیاری طور پر ان کی زبان سے اللہ ﷻ کی حمد و ثنا کے الفاظ نکلیں گے وہ کوئی ایسا عمل نہیں ہوگا جس پر جزا مرتب ہو۔

آیت نمبر ۵۳: اہلِ ایمان کو مخالفین حق کے ساتھ بدکلامی کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ دعوتِ دین کا ایک اہم اصول بیان کیا گیا ہے۔ بدکلامی سے باہم پھوٹ پڑتی ہے اور شیطان کا مقصد پورا ہوتا ہے۔ دعوتِ دین کے سلسلہ میں لہجہ میں نرمی اختیار کیئے رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔

علمی بات: مسلمانوں کو کافروں کے ساتھ سخت کلامی سے منع کیا گیا کہ بدزبانی اور سخت کلامی کفار کے ساتھ درست نہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بے ضرورت سختی نہ کی جائے اور ضرورت ہو تو قتل تک کرنے کی اجازت ہے۔ قتل و قتال کے ذریعہ کفر کی شوکت اور اسلام کی مخالفت کو دبایا جا سکتا ہے اس لئے اس کی اجازت ہے گالی گلوچ اور سخت کلامی سے نہ کوئی قلعہ فتح ہوتا ہے نہ کسی کو ہدایت ہوتی ہے اس لئے اس سے منع کیا گیا ہے۔

مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ مشرکین مختلف باتوں اور افعال سے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو طرح طرح کی تکالیف دیا کرتے تھے۔ کفار کی طرف سے اذیت اور اہانت پر مومنین نے سخت رویہ رکھنے کا ارادہ کیا۔ اس بارے میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت بھی کی تو اللہ ﷻ نے رسول اکرم ﷺ کی طرف پیغام بھیجا کہ ان پر اعلان کریں کہ وہ بہترین کلام کو منتخب کریں۔

مفسرین کی ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس آیت میں مسلمانوں کو آپس میں خطاب کرنے کے متعلق بھی ہدایت ہے کہ باہم اختلاف کے وقت سخت کلامی نہ کیا کریں کہ اس کے ذریعہ شیطان ان کے آپس میں جنگ و فساد پیدا کرا دیتا ہے۔

آیت نمبر ۵۴: مشرکین سے خطاب کیا گیا ہے۔ ہر ایک کی حقیقتِ حال اور اس کا انجام صرف اللہ ﷻ کو معلوم ہے۔ رحم کے معنیٰ ہیں قبولِ اسلام کی توفیق اور عذاب سے مراد یہ ہے کہ شرک پر ہی موت ہے جس پر وہ عذاب کے مستحق ہوں گے۔ اللہ ﷻ چاہے تو انہیں ایمان سے نوازدے یا محروم رکھے۔ مشرکین کی گمراہی کا سبب وہ خود ہیں۔ نبی کریم ﷺ پر ان لوگوں کو ہدایت پر لے آنے کی ذمہ داری نہیں ہے۔

علمی بات: یعنی اے مشرکو! اللہ ﷻ اگر چاہے تو تم کو ایمان، ہدایت اور معرفت کی توفیق دے دے اور اگر وہ چاہے تو حالت کفر میں ہی تمہاری روح قبض کر لے اور پھر تم کو عذاب دے، مگر اس کی مشیت تم کو معلوم نہیں ہے، اس لئے تم ایمان اور دین حق کی طلب میں پوری کوشش کرو اور جہل اور باطل پر اصرار نہ کرو تا کہ تم ابدی سعادت سے محروم نہ ہو، پھر حضور اکرم ﷺ سے فرمایا: ہم نے آپ ﷺ کو ان کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا، کفار و مشرکین اگر کفر و شرک پر اڑے رہیں تو اس کی جواب دہی آپ ﷺ پر نہیں ہے۔

آیت نمبر ۵۵: کائنات کی تمام مخلوقات سے اللہ ﷻ خوب واقف ہے۔ اللہ ﷻ نے بعض انبیاء کرام علیہم السلام کو بعض پر فضیلت بخشی ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کو عطا کیئے جانے والی زبور کا خصوصی طور پر ذکر ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے بعض نبیوں کو بعض نبیوں پر فضیلت عطا فرمائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی، حضرت داؤد علیہ السلام کو زبور اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل عنایت کی اور سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو قرآنِ حکیم عطا فرمایا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حضور اکرم ﷺ تمام انبیاء و رسل علیہم السلام سے افضل ہیں۔

خصوصیت کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام کے ذکر کی توجیہہ: اس آیت میں خصوصیت کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی تین وجوہات ہیں پہلی وجہ یہ ہے کہ زبور میں یہ لکھا ہوا ہے کہ: سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ خاتم النبیین ہیں اور آپ ﷺ کی امت تمام امتوں سے افضل ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے: ہم زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ اس زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے (سورۃ الانبیاء ۲۱، آیت: ۱۰۵) (یہاں نیک بندوں سے مراد سیدنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کی امت ہے)

دوسری وجہ یہ ہے کہ مشرکین مکہ اہل کتاب خصوصاً یہودیوں کو بہت مانتے تھے اور اس آیت میں یہود کا رد ہے کیونکہ یہود کہتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور تورات کے بعد کوئی کتاب نہیں آئے گی حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام آئے اور تورات کے بعد زبور آئی، لہٰذا ان کو چاہیئے کہ وہ سیدنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت اور نزولِ قرآن کا انکار نہ کریں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ کفار نبی کریم ﷺ پر اعتراض کرتے تھے کہ آپ ﷺ دنیاوی امور کھانے پینے اور بال بچوں کے معاملات میں بھی مشغول رہتے ہیں تو آپ ﷺ نبی کیسے ہو سکتے ہیں، اللہ ﷻ نے فرمایا: حضرت داؤد علیہ السلام بھی تو نبی تھے حالانکہ وہ بادشاہ تھے اور بادشاہ سے زیادہ دنیاوی امور میں کون مشغول ہوگا اس سے معلوم ہوا کہ دنیاوی امور میں مشغول ہونا نبوت کے منافی نہیں ہے۔

آیت نمبر ۵۶: مشرکین کے جھوٹے معبودوں کی بے بسی کا بیان ہے۔ وہ نہ ان مشرکین کی تکلیف دور کر سکتے ہیں نہ ہی اُسے راحت میں تبدیل کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔

علمی بات: جب قریش کو قحط میں مبتلا کر دیا گیا تو انہوں نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر فریاد کی اور اپنی خستہ حالی کا تذکرہ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ ﷻ نے اپنے محبوب ﷺ کو حکم دیا کہ ان سے دریافت کریں کہ جن معبودوں کی وہ پرستش اور عبادت کرتے ہیں۔ ان سے جا کر فریاد کیوں نہیں کرتے پھر خود ہی بتا دیا کہ وہ بیچارے خود بے بس ہیں۔ اس مشکل وقت میں وہ تمہاری کوئی امداد نہیں کر سکتے۔ اے مشرکین! تم خود سوچو کہ جو ہستی مشکل میں کام نہ آئے اور مصیبت کو دور نہ کرے اس کو معبود بنانے اور اس کی پوجا کرنے سے کیا حاصل!

آیت نمبر ۵۷: اس آیت میں ان ہستیوں کا بیان ہے جن کو مشرک تکالیف اور مصائب میں پکارتے ہیں۔ مراد فرشتے، جنات، صالحین وغیرہ ہیں۔ یہ ہستیاں تو خود اللہ ﷻ کی فرماں بردار بندے بن کر اس کا قرب حاصل کرنے کی طلب میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ ہستیاں خود اللہ ﷻ کی رحمت کی اُمید اور عذاب کا خوف رکھتی ہیں۔ یقیناً اللہ ﷻ کا عذاب ڈرنے کے لائق ہے۔

شانِ نزول: حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کچھ لوگ جنوں کی پوجا کیا کرتے تھے وہ جن مشرف با اسلام ہو گئے مگر یہ بد بخت بیچاری ان ہی کی عبادت کرتے رہے اور عرب اس کا شعور نہیں رکھتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (صحیح بخاری، سنن نسائی، بیہقی، طبرانی، ابن ابی حاتم، حاکم)

عملی بات: خوف، امید اور محبت وہ تین امور ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ان مقربین کا وصف قرار دیا ہے۔ یہ ہر بھلائی کی اساس ہیں۔ جس نے ان تینوں امور کی تکمیل کرلی، اس کے تمام امور مکمل ہو گئے اور اگر قلب ان امور سے خالی ہے تو وہ تمام بھلائیوں سے محروم ہو جائے گا اور بُرائیاں اس کو گھیر لیں گی اور اللہ تعالیٰ نے محبتِ الٰہی کی علامت یہ بتائی ہے کہ بندہ ہر اس کام میں جدوجہد کرتا ہے جو قربِ الٰہی کا ذریعہ ہے اور اپنے تمام اعمال میں اللہ تعالیٰ کے لئے اخلاص اختیار کرے اور حتی المقدور ان کو بہترین طریقہ سے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کر کے اس کے قرب کے حصول کے لئے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ ان تمام امور کے بغیر اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنے کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ جھوٹا ہے۔

علمی بات: مفسرین کی رائے کے مطابق جن لوگوں کی وہ عبادت کرتے ہیں اس کے مصداق میں تین قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ وہ جن ہیں جو بعد میں اسلام لے آئے تھے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ ملائکہ ہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت عزیر علیہ السلام ہیں۔

آیت میں یَدْعُوْنَ، یَعْبُدُوْنَ کے معنی میں ہے، یعنی وہ ان کو معبود سمجھ کر عبادت کرتے ہیں۔

جو جنات مسلمان ہو چکے تھے، اسی طرح فرشتے اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اور اس کے محتاج ہیں۔ وہ سب اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور اس کی رحمت کی اُمید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، ہر چند کہ ملائکہ اور انبیاء کرام علیہم السلام معصوم ہیں وہ کسی قسم کا کوئی گناہ نہیں کرتے اور نہ ان کو دنیا اور آخرت میں کسی قسم کے عذاب کا خطرہ ہے، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی جلال ذات سے خوف زدہ رہتے ہیں اور ان میں سے جو اللہ تعالیٰ کے جتنے زیادہ قریب ہے وہ اتنا ہی اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔

آیت نمبر ۵۸: قیامت سے پہلے دنیا کفار کی بستیوں کو طبعی طور پر یا سخت عذاب کے ذریعہ ہلاک کر دیا جائے گا۔ بستی سے مراد اس کے رہنے والے اور سخت عذاب کی وجہ ان کا کفر و شرک ہوگا۔ کتاب سے مراد لوحِ محفوظ ہے جس میں ان کی ہلاکت کا فیصلہ لکھا ہوا طے ہے۔

علمی بات: یہ بات اللہ تعالیٰ کی قضا اور تقدیر سے ہے جس سے فرار کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، یا تو اللہ تعالیٰ اس بستی کے لوگوں کی روحوں کو قبض کر کے ان کو ہلاک کر دے یا اس بستی پر عذاب نازل فرمائے گا جس سے وہ بستی نیست و نابود ہو جائے گی۔ یہی مفہوم قرآنِ حکیم میں دوسرے مقام پر اس طرح بیان ہوا ہے کہ: ”اور آپ کا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہیں جب تک کہ ان کے مرکز میں کوئی رسول نہ بھیج دے جو انہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سنائے اور ہم صرف ایسی بستی کو ہی ہلاک کرنے والے ہیں جس کے رہنے والے ظالم ہوں۔“ (سورۃ القصص ۲۸، آیت: ۵۹) لہٰذا اس آیت میں ایسی بستیاں مراد ہیں جن کے رہنے والے کفر اور فحش گناہوں پر اصرار کرنے والے ہوں۔

علمی بات: مراد یہ ہے کہ قیامت سے پہلے بہت سی بستیاں ہلاک ہوں گی یعنی ان بستیوں کے رہنے والے اپنی اپنی موت مر جائیں گے اور بہت سی بستیاں اسی طرح ہلاک ہوں گی کہ ان کو سخت عذاب میں مبتلا کیا جائے گا چاہے قتل و خون سے ہلاک ہوں اور خواہ مختلف قسم کی مصیبتوں اور بلاؤں میں مبتلا ہو کر۔ قیامت کے دن صور پھونکے جانے سے جو ہلاک ہوں گی وہ بھی اسی ذیل میں آگئیں۔ لہٰذا یہ بات عمومی طور پر اور مجموعی حیثیت سے ثابت ہوگئی کہ کوئی بھی بستی ایسی نہیں ہے جو بلا عذاب کے یا عذاب کے ذریعہ ہلاک نہ ہو۔ سورۃ آل عمران ۳، آیت: ۱۸۵ میں بھی یہ مضمون ہے کہ ”ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔“ لہٰذا موت تو سب کو آنی ہی ہے البتہ اہل کفر و اہل معصیت کو بعض مرتبہ عذاب میں مبتلا کر کے ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ اگر کافروں پر ابھی جلدی سے کوئی عذاب نہیں آرہا ہے تو وہ یہ نہ سمجھیں کہ ہمیشہ کے لئے عذاب سے بچ گئے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ یا تو ان پر کوئی سخت عذاب دنیا ہی میں آجائے گا، ورنہ قیامت سے پہلے پہلے سبھی کو ہلاک ہونا ہے اور پھر آخرت میں ان کافروں کو دائمی عذاب ہو کر رہے گا۔

آیت نمبر ۵۹: ان مشرکین کا رد ہے جو رسول اللہ ﷺ سے طرح طرح کی نشانیاں اور معجزات طلب کرتے تھے۔ پچھلی قوموں نے بھی فرمائشی معجزے مانگے جو انہیں دکھائے گئے۔ مگر وہ ایمان نہ لائے تو ہلاک کر دیئے گئے۔ بطورِ مثال قومِ ثمود کا تذکرہ کیا گیا ہے جنہیں واضح نشانی اونٹنی کے شکل میں دی گئی۔ لیکن قوم نے ایمان لانے کے بجائے اونٹنی ہی کو ہلاک کر ڈالا۔ پھر وہ بھی عذاب کے مستحق ہوئے۔ ان معجزات کو دکھانے کا مقصد قوموں کو خوف دلانا ہوتا ہے کہ حق قبول نہ کریں گے تو عذاب آئے گا۔

شانِ نزول: اہل مکہ نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ آپ ﷺ ان کے لئے صفا کے پہاڑ کو سونا بنادیں اور مکہ مکرمہ کی سرزمین سے پہاڑوں کو ہٹادیں تاکہ وہ اس میں کھیتی باڑی کر سکیں۔ حضرت جبریل امین علیہ السلام کے ذریعہ نبی کریم ﷺ سے فرمایا گیا: ”اگر آپ ﷺ ان کو مہلت دینا چاہتے ہیں تو ہم ان کو مہلت دے دیتے ہیں اور اگر آپ ﷺ چاہیں تو ہم ان کی فرمائش پوری کر دیں لیکن اگر یہ پھر بھی ایمان نہ لائے تو ان کو ہلاک کر دیا جائے گا۔ جیسا کہ پہلی قوموں کے منکرین کو ہلاک کر دیا گیا تھا۔“ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ”ان کو مہلت دے دے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔“ (مسند احمد)

علمی بات: صفا پہاڑ کو سونا بنانا اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی مشکل نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے نہیں بنایا کیونکہ پہلی قوموں کو جب ان کے مطلوبہ معجزات دکھائے گئے اور وہ پھر بھی ایمان نہ لائے تو وہ ہلاک کر دیئے گئے جیسا کہ قومِ ثمود کی مثال سامنے ہے کہ ان کی خواہش پر پتھر کی چٹان سے اونٹنی ظاہر کی گئی جو کہ ایک روشن نشانی تھی لیکن ان ظالموں نے ایمان لانے کے بجائے اس اونٹنی کو مار ڈالا تو تین دن کے بعد ان پر عذاب آگیا۔ اس طرح کفار مکہ بھی صفا کے پہاڑ کو سونا دیکھ کر بھی ایمان لانے والے نہیں تھے تو ان کو ہلاک کر دیا جاتا، مگر اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ ان میں سے کچھ لوگ ایمان لے آئیں گے یا ان کی اولاد ایمان لے آئے گی اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے فرمائشی معجزات کا مطالبہ پورا نہیں کیا۔ اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ توبہ کا دروازہ کھلا رہے تاکہ جو ایمان لانا چاہیں وہ ایمان لے آئیں اور یہ امّت محمدیہ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑی مہربانی اور فضل ہے کہ ان کو ڈھیل دی جا رہی ہے۔ فرمائشی معجزات ظاہر نہیں کیئے جاتے تاکہ تکذیب کے جرم میں جلدی ہلاک نہ ہو جائیں۔

معجزات دکھانے کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کو دیکھ کر اس کی نافرمانی سے ڈریں لیکن جہاں پہلے سے یہ معلوم ہو کہ وہ معجزہ دیکھ کر بھی ایمان لانے والے نہیں ہیں تو ان کو معجزہ دکھانے کا کیا فائدہ؟

علمی بات: یہاں خاص طور پر حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا ذکر آ رہا ہے کہ انہوں نے یہ معجزہ خود طلب کیا مگر اللہ تعالیٰ کی اس نشانی کو خود ہی قتل کر دیا جس کی وجہ سے سخت عذاب میں مبتلا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان مشرکین کی مطلوبہ نشانیاں ظاہر کرنے سے ہمیں اس بات نے روک رکھا ہے کہ کہیں یہ بھی انکار کر کے عذاب کے مستحق نہ بن جائیں۔

علمی بات: ”مُبْصِرَةً“ کا معنی بہت واضح اور روشن بھی ہوتا ہے۔ گویا اونٹنی کی نشانی ایک ایسی منہ مانگی نشانی تھی جس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

”فَظَلَمُوْا بِهَا“ ”تو انہوں نے اس پر ظلم کیا“ مگر اس قوم نے اس اونٹنی کے ساتھ ظلم کیا اور اسے ہلاک کر ڈالا، پھر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا اور تین دن کی مہلت کے بعد یہ قوم ہلاک ہوگئی۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ ہم نے قوم ثمود کو ایک واضح نشانی اونٹنی کی شکل میں دی مگر انہوں نے اس کے ساتھ بھی ظلم کیا، اللہ تعالیٰ نے یہ بات سمجھا دی کہ جب کوئی قوم منہ مانگی نشانی پا کر بھی ایمان نہیں لاتی تو پھر اس کا یہی حشر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ لوگوں کے فرمائشی معجزات اور نشانیاں ظاہر نہیں فرماتا کیوں کہ پہلے لوگ بھی ان کی تکذیب کر کے ہلاک ہوئے۔

آیت نمبر ۶۰: مشرکین مکہ رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے میں لگے ہیں جب کہ یہ لوگ خود اللہ تعالیٰ کے غلبے اور تصرف میں ہیں۔ رؤیا سے مراد واقعہ معراج اور اس سے متعلق تمام مشاہدات ہیں جو رسول اللہ ﷺ کو کرائے گئے۔ مشرکین مکہ نے اس واقعہ کو تسلیم نہیں کیا جس کی وجہ سے یہ واقعہ ان کے لئے آزمائش کا سبب بن گیا۔ ان کے لئے زقوم کے درخت کو بھی ذریعہ آزمائش بنا دیا گیا۔ (سورۃ الصافات ۳۷، آیت: ۶۲) نشانیوں سے کفار کی سرکشی میں مزید اضافہ ہی ہوتا ہے۔ وجہ ہٹ دھرمی اور طلب ہدایت کا نہ ہونا ہے۔

COPYRIGHTS ® RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION

علمی بات: اللہ ﷻ نے آنحضرت ﷺ کو بتادیا تھا کہ اللہ ﷻ کے علم میں ہے کہ یہ ہٹ دھرم لوگ کسی صورت میں ایمان نہیں لائیں گے، چنانچہ ان کی ہٹ دھرمی کی دو مثالیں دی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ ﷻ نے آپ ﷺ کو معراج کے موقع پر جو مشاہدات کرائے وہ آپ ﷺ کے پیغمبر ہونے کی کھلی دلیل تھی، کافروں نے آپ ﷺ سے بیت المقدس کے بارے میں مختلف سوالات کیئے اور آپ ﷺ نے سب کے ٹھیک ٹھیک جوابات دے دیئے، جس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ واقعی آپ ﷺ نے راتوں رات یہ سفر کیا ہے، لیکن اتنی کھلی ہوئی بات سامنے آجانے کے بعد بھی یہ لوگ اپنی ہٹ دھرمی پر ڈٹے رہے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے فرمایا تھا کہ زَقُّوم کا درخت دوزخیوں کی غذا ہوگی اور یہ بھی فرمایا تھا کہ یہ درخت جہنم ہی میں پیدا ہوتا ہے، اس پر کافروں نے ایمان لانے کے بجائے مذاق اڑانا شروع کیا کہ بھلا آگ میں درخت کیسے پیدا ہوسکتا ہے اور یہ نہ سوچا کہ جس ذات نے آگ پیدا کی ہے، اگر وہ اسی آگ میں کوئی درخت بھی پیدا کردے جس کی خاصیت عام درختوں سے مختلف ہو تو بھلا اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ اس طرح یہ کافر ہدایت حاصل کرنے کے بجائے اور گمراہی میں پڑ گئے ہیں۔

آیت نمبر ۶۱: حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا واقعہ چوتھی مرتبہ بیان ہورہا ہے۔ اللہ ﷻ کے حکم پر سوائے ابلیس کے تمام فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ ابلیس کے سجدہ نہ کرنے کی وجہ تکبر تھا۔ وہ کہنے لگا کہ آدم کو مٹی سے بنایا گیا ہے۔

علمی بات: شیطان نے اللہ ﷻ کے حکم ہی کو غلط بتادیا اور اعتراض کر بیٹھا، کہنے لگا کہ مجھے تونے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا۔ میں اس سے افضل ہوں تونے اسے مجھ پر فضیلت دیدی اسے مسجود بنادیا اور مجھے حکم دے دیا کہ میں اسے سجدہ کروں افضل اپنے کمتر کو سجدہ کیوں کرے تیرا یہ حکم دینا ہی حکمت کے خلاف ہے۔ ابلیس کی حکم عدولی، بے ادبی اور بدتمیزی کی وجہ سے اسے ملعون قرار دے دیا اور عالم بالا سے ذلت کے ساتھ نکالا گیا۔

نوٹ: حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ کی مزید تفصیلات مطالعۂ قرآنِ حکیم حصہ اوّل اور اس کے رہنمائے اساتذہ میں ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

آیت نمبر ۶۲: ابلیس نے قیامت کے دن تک مہلت دیئے جانے کی درخواست کی۔ اس نے دعویٰ کیا کہ سوائے چند کے حضرت آدم علیہ السلام کی تمام اولاد پر غلبہ حاصل کرکے جس طرح چاہے گا گمراہ کردے گا۔

علمی بات: شیطان کی یہی بات سورۃ صٓ ۳۸، آیات: ۷۹ تا ۸۳ میں یوں بیان کی گئی کہ: "پھر تو مجھے مہلت دے اس دن تک کے لئے (کہ جب) وہ اٹھائے جائیں گے۔ (اللہ نے) فرمایا تو بے شک تُو مہلت دیئے جانے والوں میں سے ہے۔ اس دن تک جس کا وقت مقرر ہے۔ (ابلیس نے) کہا تو تیری عزت کی قسم! میں ان سب لوگوں کو ضرور گمراہ کروں گا۔ سوائے ان کے جو تیرے چُنے ہوئے بندے ہیں۔"

لَاَحْتَنِكَنَّ "ضرور قابو میں کرکے رہوں گا" کی وضاحت: جب ٹڈی کسی کھیت کو کھا کر چٹ کر جائے تو عرب کہتے ہیں "اِحتَنَكَ الْجَرَادُ الزَّرْعَ" ٹڈی نے ساری کھیتی کھالی۔ یہاں بھی یہ لفظ اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ شیطان کہہ رہا ہے کہ اے اللہ! اگر تونے مجھے مہلت دی تو میں ان سب کو راہِ راست سے اکھاڑ کر پھینک دوں گا اور ان کے ایمان کا صفایا کردوں گا اور ان میں سے چند افراد کے بغیر کوئی ثابت قدم نہ رہے گا۔

اس کا معنٰی یہ بھی ہوتا ہے کہ "کسی چیز کا خاتمہ اور فنا کردینا یا پوری طرح اس پر غالب آنا" گویا کہ اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ شیطان یہ کہہ رہا ہے کہ میں اس کو جدھر چاہوں گا کھینچ کرلے جاؤں گا اور اس پر تسلط قائم رکھوں گا۔ "لَاَحْتَنِكَنَّ" کا لفظ اصل میں "حَنَكٌ" سے نکلا ہے جس کا معنٰی ہے جبڑا اور تالو۔ عرب کہتے ہیں "حَنَكْتُ الْفَرَسَ أَحْنُكُهُ" میں نے گھوڑے کے (نچلے) جبڑے میں رسی باندھی اور اسے اپنے پیچھے چلایا۔ مراد یہ ہے کہ میں اس کی اولاد کو لگام کی طرح جبڑے میں رسی باندھ کر اپنے پیچھے چلاؤں گا۔ مگر یہ لفظ دوسرے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے: "میں ضرور ان پر غالب ہوں گا۔" اسی سے لفظ "تَحْنِيكٌ" نکلا ہے جس کے لغوی معنٰی ہیں "کسی چیز کو چبا کر بچہ کے منہ میں ڈالنا"۔ "حَنَكٌ" کے اور معنٰی "تالو" بھی ہیں، لہٰذا "تَحْنِيكٌ" کا مطلب یہ ہے کہ "کھجور وغیرہ کو چبا کر بچہ کے منہ میں ڈالنا۔"

علمی و عملی بات: ابلیس نے اللہ ﷻ کے برگزیدہ اور منتخب بندوں کو گمراہ کرنے سے اسی وقت ہار مان لی تھی جب اس نے بنی آدم کو گمراہ کرنے کی قسم کھائی تھی ابلیس کو یہ معلوم تھا کہ یہ نئی مخلوق جو پیدا کی گئی ہے اللہ ﷻ نے اسے زمین میں خلافت دینے کے لئے وجود بخشا ہے۔ لہٰذا ان میں ایسے افراد ضرور ہوں گے جو کارِ خلافت سنبھالیں گے اور اللہ ﷻ کے برگزیدہ بندے ہوں گے۔

علمی بات: قَلِیۡلًا سے مراد ہیں "وہ لوگ جن کو اللہ ﷻ نے اپنی حفاظت میں لے لیا ہے۔" (انبیاء کرام علیہم السلام اور بقیہ مخلص بندے) انہی کے متعلق اللہ ﷻ نے فرمایا تھا: "بے شک جو میرے بندے ہیں اُن پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا۔" (سورۃ الحجر ۱۵، آیت: ۴۲)

علمی و عملی بات: شیطان کے ذہن میں چیلنج دیتے وقت یہ حقیقت نہ تھی کہ انسان کے اندر اللہ ﷻ نے جس طرح گمراہی کی استعداد رکھی ہے، اس کے ساتھ ساتھ ہدایت اور قبولیت خیر کی استعداد بھی رکھی ہے۔ جب انسان ایسے حالات میں ہو کہ اس کا تعلق باللہ قائم ہو تو وہ بلند ہو گا اور اعلیٰ مدارج کی طرف اٹھنے والا ہو گا اور ایسے حالات میں وہ شر اور گمراہی سے بچ جائے گا، شیطان کو معلوم نہ تھا کہ یہ بلا ارادہ چلنے والے حیوانات کی طرح نہیں ہے بلکہ انسان کو قوتِ ارادی دی گئی ہے جو اسے دوسرے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ اللہ ﷻ کا یہ ارادہ ہو گا کہ شر و گمراہی کے پیکر شیطان کو کھلا میدان دے دیا جائے اور جس طرح چاہے وہ انسان کو گمراہ کرنے کی سعی کرے۔ یہ اللہ ﷻ کے مخلص بندوں کو گمراہ ہرگز نہیں کر سکے گا۔

آیت نمبر ۶۳: ابلیس کو مہلت دے دی گئی۔ ساتھ ہی تنبیہ کر دی گئی کہ اس کی پیروی کرنے والوں اور خود اس کا ٹھکانا جہنم ہو گا جو ان کے کرتوتوں کا پورا پورا بدلہ ہو گا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس طرح کسی مضبوط قلعہ میں چلے جانے سے کوئی لشکر دشمن کے حملہ سے محفوظ ہو جاتا ہے اسی طرح یاد الٰہی میں مصروف رہنے والے نیک لوگ شیطان کے پھندے سے بچے رہتے ہیں۔" (جامع ترمذی، سنن نسائی)

کیونکہ ذکر الٰہی سے شیطان دور بھاگتا ہے۔ یعنی یادِ الٰہی میں مصروف رہنے والے بندے اللہ ﷻ کے نزدیک اور شیطان سے دور رہتے ہیں۔

آیت نمبر ۶۴: شیطان کی طرف سے انسان کو بہکانے کوششوں اور طریقوں کا بیان ہے جو یہ ہیں:

۱۔ آواز۔۔۔ ہر وہ پکار جو اللہ ﷻ کی نافرمانی پر اکساتی ہو مثلاً گالی گلوچ، موسیقی، لڑائی جھگڑا، بدکاری، بُرے کام کی دعوت اور ترغیب وغیرہ شامل ہے جو انسان کو اللہ ﷻ سے غافل کر دے۔

۲۔ سوار اور پیادے۔۔۔ وہ لشکر ہیں جو شیطان کے پیروکار ہیں اور شیطان ہی کی طرح انسانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کریں۔ آیت میں موجود لفظ "جلب" کھینچ کر لانے کو کہتے ہیں اور اس شور کو بھی جس سے گھوڑے کو تیز دوڑانا مقصود ہو۔ "خَیۡل" گھوڑوں کی جماعت کو کہتے ہیں اور گھڑ سواروں کی جماعت کو بھی۔

۳۔ مال میں شرکت۔۔۔ مراد حرام ذریعہ سے کمانا اور مالِ حرام راستہ میں خرچ کرنا ہے۔ مثلاً سود، رشوت، چوری، ڈاکے اور دھوکے وغیرہ سے مال کمایا جائے اور اسے بدکاری و بے حیائی اور نافرمانی کے کاموں میں خرچ کیا جائے۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بیان فرمایا "کہ اموال میں جو مال ناجائز حرام طریقوں سے حاصل کیا جائے یا حرام کاموں میں خرچ کیا جائے یہی شیطان کی اس میں شرکت ہے۔"

۴۔ اولاد میں شرکت۔۔۔ مراد زناکاری، اولاد کی غیر اسلامی تربیت، ان کی پرورش کے لئے حرام ذرائع آمدنی اختیار کرنا وغیرہ۔ مزید یہ کہ شیطان لوگوں کو دین حنیف کی تعلیمات کے خلاف اولاد کی پرورش کرانے میں کامیاب ہو جائے، اللہ ﷻ کی نافرمانی کے مواقع میسر کر دے، انہیں نیک لوگوں سے متنفر کر دے، بُرے لوگوں کی مجلسوں کا دلدادہ بنا دے اور بُرے لوگوں میں شامل کر دے۔ اولاد میں شیطان کی شرکت اولاد حرام ہونے سے بھی ہوتی ہے اور اس سے بھی کہ اولاد کے نام مشرکانہ رکھے یا ان کی حفاظت کے لئے مشرکانہ رسوم ادا کرے۔

۵۔ جھوٹے وعدے۔۔۔ غلط کام کو اس طرح مزین کر کے دکھانا کہ وہ اچھا لگے۔ یعنی انہیں جھوٹے وعدے دلانا، مثلاً یہ کہ اگر شرک کرو گے تو یہ فائدہ ہو گا، سُودی کاروبار سے یہ نفع ہو گا، دنیا میں تمہیں مال و دولت ملی ہے، آخرت میں بھی ملے گی، یہ کہ کافر و مشرک کا داخلہ دوزخ میں ہمیشہ کے لئے نہ ہو گا، دنیا کی زندگی

بہت بڑی ہے، ابھی بہت وقت ہے عیش کرلو، اس میں لگے رہو، بڑھاپے میں اعمال صالحہ کر لینا، توبہ کر لینا اور یہ کہ مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنا نہیں ہے (وغیرہ) تاہم شیطان کے سارے وعدے محض فریب پر مبنی ہوتے ہیں۔ ہمیں ان میں ہرگز نہیں آنا چاہیے۔

علمی و عملی بات: ضروری نہیں کہ شیطان سب سے ایک ہی قسم کے وعدے کرتا ہو۔ بلکہ وہ جس طرح موقع دیکھتا ہے، جس سطح کا بندہ ہوتا ہے، ہر ایک سے الگ الگ وعدے کرتا ہے، امیدیں دلاتا ہے اور راہِ حق سے ہٹاتا ہے۔ کافروں کے بہکانے اور کفر پر جمائے رکھنے کے لئے اُس کے طریقے اور ہیں اور اہل ایمان کو ایمان سے ہٹانے اور فرائض و واجبات سے غافل رکھنے اور اعمالِ صالحہ سے دور رکھنے کے طریقے دوسرے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ شیطان کے سب وعدے جھوٹ پر مبنی ہیں۔ آج ہم اس کے جھوٹے وعدوں اور وسوسوں میں آکر اس کی پیروی کرنے لگتے ہیں جب کہ قیامت کے دن وہ خود ان وعدوں کے جھوٹا ہونے کا اقرار کرے گا۔ جیسا کہ سورۃ ابراہیم ۱۴، آیت: ۲۲ میں آیا ہے کہ "قیامت کے دن شیطان اس بات کا اقرار کرے گا کہ جن وعدوں سے وہ دنیا میں لوگوں کو بہکاتا تھا اس کے وہ سب وعدے جھوٹے ہیں۔"

علمی بات: ان دو آیات (۶۳، ۶۴) میں اللہ ﷻ نے شیطان کو پانچ حکم دیئے ہیں: "اِذْهَبْ" "اسْتَفْزِزْ" "اَجْلِبْ" "شَارِكْهُمْ" اور "عِدْهُمْ" یہ تمام احکام تہدید، یعنی ڈانٹنے کے لئے ہیں، جیسے فرمایا: اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ "جو چاہو کرو۔ تم جو چاہو کرو" (سورۃ حٰمٓ السجدۃ ۴۱، آیت: ۴۰) یہ احکام تعمیل کے لئے نہیں ہیں، کیونکہ یہ سب گناہ ہیں اور اللہ ﷻ گناہ کا حکم نہیں دیتا۔ اللہ ﷻ نے جو ابلیس سے یہ فرمایا کہ جا تو ایسا کر لینا یہ ان چیزوں کی اجازت کے طور پر نہیں ہے جن کا یہاں ذکر ہوا ہے کیونکہ اللہ ﷻ منکرات اور فواحش اور کفر و شرک کی اجازت نہیں دیتا۔ ابلیس سے جو کچھ خطاب فرمایا ہے یہ انتہائی ڈانٹ ڈپٹ اور سرزنش کے طور پر ہے جیسا کہ عام طور پر ایسے مواقع پر یہ انداز ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ تو جو کہتا ہے کہ میں اس نئی مخلوق کی ذریت پر قابو پالوں گا تو اپنی شقاوت میں ترقی کرتے ہوئے تو یہ سب کچھ بھی کرلے اور اس کے علاوہ جو مرضی چاہے کر لے لیکن یہ یاد رکھ کہ تو بالآخر ان سب سرکشیوں، نافرمانیوں، برائیوں اور کفر کا مزہ چکھ لے گا۔

آیت نمبر ۶۵: اللہ ﷻ کا بندوں کی نسبت اپنی طرف کرنا شرف اور اعزاز کا اظہار ہے۔ اللہ ﷻ کے وہ بندے جو اللہ ﷻ کی اطاعت اور اسی پر توکل کرتے ہیں۔ ان پر شیطان غلبہ حاصل نہیں کر سکے گا۔ اللہ ﷻ ایسے فرماں برداروں کا کارساز اور دوست بن جاتا ہے۔

علمی و عملی بات: یہ بھی ابلیس کو خطاب ہے مطلب یہ ہے کہ تو بنی آدم کو بہکانے، ورغلانے اور راہِ حق سے ہٹانے کی وہ سب تدبیریں کر لے جو تو کر سکتا ہے لیکن تجھے ایسا کوئی اختیار نہیں دیا جا رہا ہے کہ تو انسانوں کو اپنی قوت سے مجبور کر کے کوئی کام کرا لے، تیری ساری چالوں اور شرارتوں کے باوجود سب اپنے عمل میں مختار رہیں گے اور اسی اختیار کی وجہ سے ان کا مؤاخذہ ہوگا۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا کہ "بے شک جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا سوائے ان گمراہوں کے جو تیری پیروی کریں گے۔" (سورۃ الحجر ۱۵، آیت: ۴۲) اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ شیطان کے پیچھے لگیں اور اپنے اختیار کو استعمال نہ کریں تو پھر ان پر شیطان کا تسلط ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے ایسا حال بن جاتا ہے کہ شیطان کے پھندے سے نہ نکلتے ہیں اور نہ نکلنا چاہتے ہیں۔ اللہ ﷻ نے جو سمجھ اور اختیار دیا تھا اسے اپنے نقصان ہی میں استعمال کرتے ہیں۔ جو لوگ اللہ ﷻ پر بھروسہ کرتے ہیں اخلاص کے ساتھ اعمال کرتے رہتے ہیں، اللہ ﷻ انہیں شیطان کے مکر و فریب سے محفوظ رکھتا ہے اور وہ ان کے لئے کافی ہے۔

آیت نمبر ۶۶: بحری نقل و حمل اللہ ﷻ کی قدرت کی ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ اللہ ﷻ نے سمندر میں کشتیاں چلائیں تاکہ انسان اپنے لئے رزقِ حلال تلاش کر سکے۔ رزق کے لئے لفظ "فضل" کا استعمال کر کے یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ سب کچھ اللہ ﷻ کی عطا ہے نہ کہ انسان کا کمال۔ بلاشبہ اللہ ﷻ انسان پر بہت مہربان ہے کہ رزق کے راستے اور اسباب عطا فرماتا ہے۔

علمی بات: اس آیت میں کشتیوں کے حوالہ سے یہ ذکر فرمایا گیا کہ تمہارا رب سمندر میں کشتیوں کو چلاتا ہے یعنی ایسی ہوائیں چلاتا ہے جو کشتیوں کو لے کر چلتی ہیں۔ اگر ہَوا نہ ہو تو تم خود بھی کشتیوں کو اپنی ان تدبیروں سے جو اللہ ﷻ نے الہام فرمائی ہیں ان کے ذریعہ چلا لیتے ہو۔ کشتیوں کے ذریعہ سمندروں میں سفر کر کے اور سمندروں کو عبور کر کے اللہ ﷻ کا فضل تلاش کرتے ہو اور سمندر کے اندر بھی ایسی چیزیں ہیں جو بنی آدم کے کام آتی ہیں۔

علمی بات: سمندر میں کھانے کی چیزیں بھی ہیں اور ایسی چیزیں بھی ہیں جو دوائیوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو سمندروں سے نکال کر فروخت کیا جاتا ہے جو تحصیلِ مال کا ذریعہ ہیں۔ نیز سمندر میں ایسی چیزیں بھی ہیں جن سے زیور بنائے جاتے ہیں۔ گویا اس میں وہ سب چیزیں آ جاتی ہیں جو زیوارت بنانے اور مال کے حصول کا ذریعہ بنتی ہیں۔ نیز سمندروں کو پار کر کے ایک کنارہ سے دوسرے کنارہ پر پہنچتے ہیں مالِ تجارت لے جاتے ہیں۔ یہ اللہ ﷻ کا فضل تلاش کرنے کا ذریعہ ہے۔ بے شک اللہ ﷻ انسانوں پر بہت مہربان ہے۔ اس نے خشکی اور سمندر میں ان کے لئے رزق پیدا فرمادیا پھر انہیں اس کے حاصل کرنے پر قدرت دی۔

آیت نمبر ۶۷: مشرکین سمندر میں کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے تو ان ہستیوں کو بھول جاتے جنہیں عام حالات میں وہ پکارتے ہیں۔ اس مصیبت میں فطرت کے تقاضے کے مطابق وہ صرف اللہ ﷻ ہی کو پکارتے ہیں۔ توحید کے دلائل فطرتِ انسانی میں ودیعت شدہ ہیں۔ البتہ جب اللہ ﷻ انہیں بحفاظت خشکی میں لے آتا تو دوبارہ شرک کرنے لگتے ہیں۔ انسان بڑا ہی ناشکرا ہے جو اپنے محسنِ حقیقی کی قدر نہیں کرتا اور غیروں کو راضی کرنے میں لگ جاتا ہے۔

علمی بات: ناشکرے انسانوں کو بتایا جا رہا ہے کہ جب سمندری سفر میں تمہیں غرق ہونے کا شدید خطرہ لاحق ہوتا ہے تو اس وقت تم نہ کسی بت سے فریاد کرتے ہو نہ سورج اور چاند سے بلکہ اس حال میں تم صرف اللہ ﷻ سے فریاد کرتے ہو اور جب اس حالت میں اللہ ﷻ تمہیں سمندر میں غرق ہونے سے بچا لیتا ہے اور تم خشکی پر سلامتی سے پہنچ جاتے ہو تو پھر تم اخلاص کے ساتھ اللہ ﷻ پر ایمان لانے سے اعراض کرتے ہو اور انسان بہت ناشکرا ہے۔ انسان کی خصلت یہ ہے کہ نعمتوں کو بھول جاتا اور انکار کر دیتا ہے، سوائے مومن کے جیسا کہ حدیث شریف میں بیان ہوا ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت صہیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مومن کا معاملہ بھی بڑا عمدہ ہے کہ اس کے لئے ہر معاملہ میں بھلائی ہی بھلائی ہے اور یہ فضیلت سوائے مومن کے کسی اور کو حاصل نہیں، (وہ اس طرح کہ) اگر اسے کوئی خوشی حاصل ہوتی ہے تو وہ شکر ادا کرتا ہے اور یہ اس کے لئے بہتر ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے تو صبر کرنے میں بھی اس کے لئے خیر ہی خیر ہے۔“ (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۶۸: مشرک اس بات سے بے فکر ہیں کہ اللہ ﷻ کسی بھی وقت کسی بھی قسم کی سزا دینے پر قادر ہے۔ وہ چاہے تو خشکی ہی پر زمین شق کر کے انہیں اس میں دھنسا دے یا پتھروں کی بارش برسا کر انہیں ہلاک کر دے۔ بہر صورت یہ لوگ اللہ ﷻ کے مقابلہ میں کوئی مددگار نہیں پائیں گے جو انہیں مصیبت سے نجات دلا سکے۔

علمی بات: انسان کو ناشکری پر ڈراتے ہوئے اللہ ﷻ نے فرمایا: ”کہ کیا تمہیں ڈر نہیں لگتا کہ سمندر سے نکل کر جس حصۂ زمین پر اترے ہو، اللہ ﷻ اسے دھنسا دے اور تم زمین کے نیچے چلے جاؤ، یا کسی شدید آندھی کو بھیج دے جو تم پر پتھروں کی بارش کر دے اور تمہیں ہلاک کر دے اور کوئی تمہاری مدد کے لئے نہ آئے“ جیسا کہ ارشاد فرمایا: ”کیا تم اُس سے بے خوف ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تمہیں زمین میں دھنسا دے تو اچانک وہ لرزنے لگے۔ کیا تم بے خوف ہو اُس سے جو آسمان میں ہے کہ وہ تم پر پتھر برسانے والی ہوا بھیج دے تو تم عنقریب جان لوگے کہ میرا ڈرانا کیسا ہے؟“ (سورۃ الملک ۶۷، آیات: ۱۶، ۱۷)

آیت نمبر ۶۹: یہاں کفر کا لفظ شکر کے مقابلہ میں آیا ہے۔ مراد نعمتوں کی ناشکری ہے۔ مشرکین کی ناشکری پر اللہ ﷻ انہیں دوبارہ سمندر میں لے جا کر تیز آندھی کے ذریعہ انہیں غرق کر دینے پر بھی قادر ہے۔ ایسا کرنے پر اللہ ﷻ سے باز پرس کرنے والا کوئی نہیں ہو گا۔ محاسبہ کرنے والی ذات تو خود اللہ ﷻ ہی کی ہے۔

علمی بات: کفار کو مخاطب کر کے تنبیہ کی گئی ہے کہ کیا تم اس بات سے نڈر ہو گئے ہو کہ اللہ ﷻ تم کو پھر سمندر میں لوٹا کر لے جائے پھر تم پر سخت ہوا کا کوئی طوفان بھیج دے اور تمہارے کفر کی وجہ سے تم کو غرق کر دے، پھر تم کسی کو اپنے لئے ہمارا پیچھا کرنے والا بھی نہ پاؤ۔ یعنی کوئی ایسی ضرورت پیش آ جائے جس کی وجہ سے دوبارہ سمندر کا سفر کرنے پر مجبور ہو جاؤ اور پھر کسی طوفان میں مبتلا کر کے تم کو غرق کر دے اور تم کسی کو اللہ ﷻ کا پیچھا کرنے والا بھی نہ پاؤ۔ جو تمہارا انتقام لینے کے لئے اس کا پیچھا کرے اور اللہ ﷻ سے تمہارا بدلہ لے۔

علمی بات: ”تَبِيعًا“ سے مراد یہ ہے کہ جیسے دنیا میں اگر کسی کو قتل کیا جائے تو مقتول کے وارث و اقارب قاتل کا پیچھا کرتے ہیں۔ کبھی قصاص لیتے ہیں اور کبھی دیت لیتے ہیں لیکن اللہ ﷻ جسے سزا دے گا تو اللہ ﷻ سے کوئی سوال تک نہیں کر سکتا۔ رہا اس کا پکڑنا تو وہ نہ کسی پر ظلم کرتا ہے، نہ زیادتی۔ اس لئے کسی کے پوچھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

آیت نمبر ۷۰: انسان کے شرف و بزرگی اور اعزاز و تکریم کا بیان ہے۔ اللہ ﷻ نے حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کو عزت بخشی اور اس کے لئے خشکی اور سمندر میں سواریاں مہیا کیں۔ روزی کے طور پر ایسی پاکیزہ اور عمدہ چیزیں عطا فرمائیں جو کسی دوسرے جاندار کو میسر نہیں۔ مخلوق کی اکثریت پر اسے فضیلت عطا فرمائی۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ نے یہ بتایا ہے کہ اللہ ﷻ نے انسان کو دیگر مخلوقات پر متعدد وجوہ سے فضیلت عطا فرمائی ہے۔ اس فضیلت کی تمام وجوہ کا ادراک تو بہت مشکل ہے۔ تاہم مفسرین کرام نے انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی بعض اہم وجوہ ذکر فرمائی ہیں جو درج ذیل ہے:

۱۔ قوتِ گویائی، معاش وغیرہ کی تدابیر کی صلاحیت عطا فرمائی۔ ۲۔ اللہ ﷻ کا اپنی روح میں سے پھونکنا۔ ۳۔ نائب اور خلیفہ بنانا۔ ۴۔ نوع انسان کے پہلے فرد کو فرشتوں سے زیادہ علم عطا فرمانا اور فرشتوں کو سجدہ کرانا۔ ۵۔ تمام مخلوق کو لفظ کُن سے پیدا کرنا اور انسان کو اپنے دستِ قدرت سے بنانا۔ ۶۔ تمام مخلوق میں سب سے اچھی ہیئت اور شکل و صورت پر پیدا کرنا۔ ۷۔ ادراک اور اظہار کی قوت عطا کرنا۔ ۸۔ لکھنے اور پڑھنے کی صلاحیت عطا کرنا۔ ۹۔ زمین و آسمان کے وسائل کو انسان کی خدمت کے لئے مسخر کر دینا۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے انسان کو بہت خاص نعمتیں عطا کیں، حُسنِ صورت۔ سب سے زیادہ معتدل مزاج، قد کا اعتدال، عقل سے اشیاء میں امتیاز، زبان، تحریر اور اشاروں سے سمجھانے کی قوتِ معاش و معاد کی ہدایت، زمین کی موجودات پر تسلط یعنی تمام چیزوں سے کام لینا اور مختلف ہُنر اور پیشے اور تمام مادی عنصری اور فلکی کائنات کا ربط تاکہ انسان کو مختلف منافع حاصل ہوں اور اسبابِ رزق فراہم ہوں، پھر دوسرے جانوروں کے برخلاف آدمی کو ہاتھ سے اٹھا کر اور پکڑ کر کھانے کی تعلیم وغیرہ۔ یہ تمام امور انسان کے لئے مخصوص کیئے پھر محبت و عشق کا جذبہ، معرفت وحی اور مراتب قرب کی عطا بھی انسان پر خاص کرم ہے۔

علمی و عملی بات: اس سے پتہ چلا کہ انسان دیگر تمام مخلوقات سے افضل و اشرف ہے اس لئے اسے اشرف المخلوقات کہتے ہیں انسان ہی میں انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیائے عظام رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔ انسان ہی کو اچھی صورت تمام چیزوں پر غلبہ دنیا و آخرت کی تدبیریں عطا فرمائیں، تمام چیزیں اس کے لئے پیدا فرمائیں۔

یہ اس کی رحمت و قدرت ہے کہ خشکی اور تری کی تمام چیزیں انسان کے لئے مسخر اور تابع فرمائیں۔ انسان کو چاہیئے کہ اللہ ﷻ اور رسول ﷺ کے تابع رہے ان سب چیزوں کا مصرف انسان کے لئے ہے جب کہ انسان کو اللہ ﷻ کی عبادت کے واسطے پیدا کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ "اور میں نے جنّوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا فرمایا کہ وہ میری عبادت کریں۔" (سورۃ الذّٰریٰت ۵۱، آیت: ۵۶)

علمی بات: حلال اور مزیدار جسمانی نعمتیں اور روحانی غذائیں انسانوں کے لئے ہیں جب کہ بیل کھیتی باڑی اور محنت زیادہ کرتا ہے مگر اسے گھاس پھوس ہی ملتا ہے انسان محنت کرتا ہے مگر دانہ، پھل، دودھ، دہی، مکھن اور گھی کھاتا ہے یہ سب رب العالمین کی مہربانی اور خصوصی فضل ہے۔

آیت نمبر ۷۱: روزِ قیامت کی کیفیت کا بیان ہے۔ امام سے مراد نامۂ اعمال یا ہر امت کے نبی یا ہر دور کے پیشوا ہیں جن کی قیادت میں لوگوں کو طلب کیا جائے گا۔ اللہ ﷻ کے فرماں برداروں کو ان کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا جس سے وہ خوش ہو کر اسے پڑھیں گے۔ "فَتِیْلًا" اس جھلی یا دھاگے کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی میں ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ بہت تھوڑی مقدار ہے۔ روزِ قیامت کسی پر دھاگہ برابر بھی ظلم نہیں ہو گا۔

علمی بات: اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ قیامت میں کوئی ان پڑھ نہ ہو گا، سب لوگ تحریر پڑھ لیا کریں گے اگرچہ دنیا میں بعض لوگ ان پڑھ بھی تھے۔ دوسرا یہ کہ تمام لوگوں کی زبان اس دن عربی ہو گی کیونکہ نامۂ اعمال کی تحریر عربی زبان میں ہے لیکن کسی کو ترجمہ کرانے کی ضرورت نہ ہو گی۔ اس سے قبل حساب قبر بھی عربی زبان میں ہو گا۔

عملی بات: امام سے مراد اعمال نامہ ہے۔ جیسا کہ احادیث مبارکہ میں یہ معنیٰ بھی وارد ہے اور امام بمعنیٰ پیشوا و مقتدا بھی مراد ہے جیسے انبیاء کرام علیہم السلام کو ماننے والے یا ان کے نائبین مشائخ و علماء کے پیچھے چلنے والے اور دوسرے شیطان کے پیروکار تو گویا دنیا میں جو عمل اور کردار ہے یا جس کی پیروی کرتا ہے، اسی کے گروہ یا طبقہ میں اٹھایا جائے گا۔ امام کا معنیٰ مطلق پیشوا ہے خواہ وہ نیک ہو یا بد۔ قرآنِ حکیم میں کفار کے پیشواؤں کو آئمۃ الکفر کہا گیا ہے۔

علمی بات: جن لوگوں کو ان کے اعمال نامے دائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے وہ اپنے اعمال ناموں کو پڑھیں گے اور ان کی بالکل حق تلفی نہیں کی جائے گی۔ فتیل (بٹاہوا) وہ باریک دھاگہ جو کھجور کی گٹھلی کے شگاف میں ہوتا ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ ذرّہ برابر بھی ان کے ثواب میں کمی نہیں کی جائے گی۔

علمی بات: اس آیت میں صرف ان لوگوں کا ذکر کیا گیا جن کے دائیں ہاتھوں میں اعمال نامے دیئے جائیں گے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے بائیں ہاتھ میں یا پشت کے پیچھے سے اعمال نامے دیئے جائیں گے ان کی حالت کچھ اور ہوگی وہ جب اپنے اعمال نامے پڑھیں گے تو شرمندگی اور حیرت ان پر چھا جائے گی، اتنی کہ زبانوں کو گنگ کر دے گی اور وہ صحیح جواب دینے کے بجائے کہیں گے کاش یہ کتاب مجھ کو نہ دی گئی ہوتی کافروں کا تذکرہ اس آیت میں نہیں ہے نہ ان کے اعمال نامے دینے کا بیان ہے کیونکہ اگلی آیت خود کافروں کی حالت کا اظہار کر رہی ہے۔

آیت نمبر ۷۲: اَعۡمٰی سے مراد دل کا اندھا ہے۔ جس نے دنیا میں حق کو سمجھنے، دیکھنے اور قبول کرنے کی کوشش بھی نہ کی وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ اسے نہ جنت کی راہ نظر آئے گی، نہ اسے اللہ ﷻ کا فضل حاصل ہوگا۔

علمی بات: انسان نے اگر دنیا میں ہدایت کے راستہ کو دیکھنے کی کوشش ہی نہ کی اور اندھا بنا رہا تو وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور جنت کی راہ نظر ہی نہ آئے گی۔ دنیا میں اس کا اندھاپن اختیاری تھا اور اس کی اصلاح ممکن تھی۔ لیکن آخرت میں اس کا اندھاپن اضطراری ہوگا جو دنیا کے اندھے پن کے نتیجہ میں واقع ہوگا اور چونکہ اس کی اصلاح کی اب کوئی صورت ممکن نہ ہوگی نہ کسی دوسرے کا اسے راستہ دکھانا کام آسکے گا۔ لہٰذا ایسا شخص جنت سے دور ہی کہیں بھٹکتا رہے گا اور اسے صرف اپنے سامنے جہنم کے مختلف طرح کے عذاب ہی نظر آئیں گے۔

علمی و عملی بات: جو بدنصیب انسان اس دنیا میں بصیرت سے محروم ہو کر حق کو قبول نہیں کرے گا اور صراطِ مستقیم پر گامزن نہیں ہوگا وہ آخرت میں بھی راہِ نجات نہیں پاسکے گا اور اوندھے منہ جہنم میں گر جائے گا۔ ارشاد فرمایا: "کیا انہوں نے زمین میں سیر نہیں کی کہ ان کے دل ایسے ہو جاتے جن سے یہ سمجھتے یا کان ایسے ہو جاتے جن سے یہ سنتے تو حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہے۔" (سورۃ الحج ۲۲، آیت: ۴۶)

دنیا کی محبت میں انسان اندھا ہو جاتا ہے اس کی روحانی بینائی جاتی رہتی ہے، اسے بس دنیا نظر آتی ہے اور آخرت کو بالکل بھلا دیتا ہے۔ ایسے شخص کو کیسے ہدایت مل سکتی ہے؟ اور جب ہدایت نہیں مل سکتی تو عذاب آخرت سے نجات کیسے مل سکتی ہے؟ جیسا کہ ارشاد فرمایا: "اور جس نے میری نصیحت سے منہ پھیرا تو بے شک اس کی (دنیاوی) معاش تنگ ہو جائے گی اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا اے میرے رب! تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا حالانکہ میں تو دیکھنے والا تھا۔ (اللہ) فرمائے گا اسی طرح تمہارے پاس ہماری آیتیں آئی تھیں پس تم نے انہیں بھلا دیا اور اسی طرح آج تمہیں بھی نظر انداز کر دیا جائے گا۔"

(سورہ طٰہٰ ۲۰، آیات: ۱۲۴تا۱۲۶)

آیت نمبر ۷۳: مشرکین مکہ رسول اللہ ﷺ کو دعوتِ توحید سے روکنے، مصالحت پر آمادہ کرنے اور سودے بازی کی پیشکش کرتے۔ حتیٰ کہ قرآنِ حکیم میں ترمیم کے لئے دباؤ ڈالنے کی کوشش کرتے۔ مگر یہ سب کچھ ممکن ہی نہ تھا۔ بالفرض محال ایسا ہوتا تو وہ رسول کریم ﷺ کو اپنا دوست بنا لیتے۔

علمی بات: مشرکین عرب نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی کہ نبی کریم ﷺ کو جادۂ حق سے برگشتہ کر دیں، انہیں تکلیفیں دیں اور ظلم و تشدد کا ہر طریقہ اختیار کیا، تاکہ آپ ﷺ توحید کی دعوت سے باز آجائیں، شرک پر نکیر نہ کریں، ان کے ساتھ باطل کی تائید پر مصالحت کر لیں اور ان کے جھوٹے معبودوں کے بارے میں ان کی مرضی کی بات کریں۔ (معاذ اللہ) اللہ ﷻ نے فرمایا: کہ بالفرض محال آپ ایسا کرتے تو مشرکین بظاہر آپ کو اپنا دوست بنا لیتے اور لوگوں سے کہتے کہ محمد (ﷺ) نے ہمارے کفر کی تائید کر دی ہے اور ہمارے شرک سے راضی ہے (معاذ اللہ)، لیکن اللہ ﷻ نے آپ ﷺ کی حفاظت فرمائی۔ مشرکین کی تمام سازشوں کے باوجود آپ ﷺ محض اللہ ﷻ کی تائید سے حق پر قائم رہے اور ان سے کوئی مصالحت نہ کی۔

علمی بات: ان آیات میں اللہ ﷻ اس امر کی خبر دے رہا ہے کہ وہ خود اپنے محبوب رسول ﷺ کا مددگار ہے۔ وہی راہِ راست پر آپ ﷺ کو ثبات واستقامت بخشتا ہے۔ شریروں کی شر انگیزیوں سے ہی حضور ﷺ کو سلامت رکھتا ہے۔ حضور ﷺ کے سارے کام اللہ ﷻ کے سپرد ہیں۔ وہی اپنے حبیبِ مکرم ﷺ کا مددگار، نگہبان اور ناصر ہے۔ وہی آپ ﷺ کو اپنے دشمنوں پر فتح بخشنے والا اور آپ ﷺ کے دین کو مخالفین کی مخالفت کے باوجود غلبہ بخشنے والا ہے۔

علمی بات: ان آیات میں مزید تدبّر کرنے سے نبوت کی ذمہ داریوں کی نزاکت کا احساس ہوتا ہے۔ یعنی کلام الٰہی میں کسی وجہ سے ذرّہ برابر کمی بیشی ناقابل برداشت ہے۔ کفار مکہ نے بارہا کوشش کی۔ انہوں نے مال وزر کا ڈھیر لگا دینے، تاج و تخت پیش کرنے اور حسین و جمیل عورت کا رشتہ دینے کی بارہا پیش کشیں کیں لیکن حبیبِ کبریا ﷺ نے یہ فرما کر ان کی پیشکشوں کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا کہ اگر تم سورج میرے دائیں ہاتھ پر رکھ دو اور چاند میرے دائیں ہاتھ پر تب بھی میں اللہ تعالیٰ کے کلام میں بال برابر ردوبدل کرنے کے لئے تیار نہیں۔ مجھے جس مقصد کے لئے مبعوث فرمایا گیا ہے اس کی تبلیغ میں سرگرم عمل رہوں گا۔ یہاں تک کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں یا میری زندگی ختم ہو جائے۔

آیت نمبر ۷۴: یہ آیت انبیاء کرام علیہم السلام کی اعلیٰ ترین پاکیزہ طبیعت اور ان کی حفاظت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی حفاظت فرمائی اور آپ ﷺ مشرکین کے سازشوں کے مقابلہ میں ثابت قدم رہے۔

علمی بات: حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت اس موقع کی ہے جب آپ ﷺ نے ان کی باتوں کے جواب میں سکوت فرمایا اور اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی نیت کو خوب جاننے والا ہے۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کہ رسول اللہ ﷺ معصوم ہیں لیکن اس آیت میں امّت کے لئے یہ پیغام اور حکم ہے کہ ان میں سے کوئی شخص مشرکین کے احکام کی طرف ہرگز مائل نہ ہو، پس نسبت آپ ﷺ کی طرف ہے اور مراد آپ ﷺ کی امّت ہے۔

علمی باتیں: ا۔ یہ ان حالات کی طرف اشارہ ہے جو پچھلے دس بارہ سال سے نبی کریم ﷺ کو مکہ مکرمہ میں پیش آرہے تھے۔ کفار مکہ اس بات کے درپے تھے کہ جس طرح بھی ہو آپ ﷺ کو توحید کی اس دعوت سے ہٹا دیں جسے آپ ﷺ پیش کر رہے تھے اور کسی نہ کسی طرح آپ ﷺ کو مجبور کر دیں کہ آپ ﷺ ان کے شرک اور رسوم جاہلیت سے کچھ نہ کچھ مصالحت کرلیں۔ اس غرض کے لئے انہوں نے ہر کوشش کی۔ فریب بھی دیے، لالچ بھی دینے کی کوشش کی، دھمکیاں بھی دیں، جھوٹے پروپیگنڈوں کا طوفان بھی اٹھایا، ظلم و ستم بھی کیا، معاشی دباؤ بھی ڈالا، معاشرتی قطع تعلقی بھی کی اور وہ سب کچھ کر ڈالا جو کسی انسان کے عزم کو شکست دینے کے لئے کیا جا سکتا تھا۔ مگر وہ حضور اکرم ﷺ کے پایہ استقلال میں زرہ برابر بھی لغزش نہ لا سکے۔

۲۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ثابت رکھنے کی وجہ سے آپ ﷺ ان کی طرف مائل ہونے کے تھوڑا سا قریب بھی نہیں ہوئے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کثرت سے یہ دعا مانگا کرتے تھے: يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلَى دِيْنِكَ "اے دلوں کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔" (جامع ترمذی) اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو اہل ایمان کا کفار کی طرف مائل ہونے کے قریب ہونا بھی گوارا نہیں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے قدموں کو مضبوطی سے راہِ راست پر مستحکم فرد یا ہے۔ اس لئے کفار کی طرف ادنیٰ سا میلان بھی نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ حضور سرورِ عالم ﷺ ان کی طرف زیادہ مائل ہوں۔ یعنی نفس کی طہارت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثابت قدم رکھنے کی سعادت نے حضور اکرم ﷺ کو اس مقامِ عالی اور شانِ رفیع پر فائز فرما دیا ہے۔

آیت نمبر ۷۵: انبیاء کرام علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں۔ ان کی حفاظت اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے فرماتا ہے۔ امّت کے لئے ہدایت ہے کہ مخالفین حق سے کوئی مصالحت نہ کریں نہ باطل پر سمجھوتہ کریں۔ بالفرض والمحال کفار کی طرف مائل ہونے کا معاملہ ہو جاتا تو دنیا و آخرت میں دُہرا عذاب دیا جاتا۔ مقرب بندوں کی معمولی خطا بھی بہت بڑی سمجھی جاتی ہے۔

علمی بات: اس سے حضور اکرم ﷺ کی عظمت اور اعلیٰ شان کا پتہ چلتا ہے کیونکہ جتنا کوئی زیادہ عزیز ہوتا ہے اتنا ہی اُس کی معمولی لغزش بھی ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ تو معصوم تھے۔ یہ تنبیہ حضور ﷺ کی امّت کو کی جا رہی ہے کہ وہ کسی صورت میں دین حق اور احکامِ شریعت کو چھوڑ کر کفار کی خوشنودی حاصل کرنے کی طرف مائل نہ ہوں۔

عملی بات: ہر وہ شخص جو دعوتِ حق کا فریضہ ادا کر رہا ہو اسے ہر لمحہ ان آیات کو اپنے پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ مبادا اس سے کوئی ایسی فروگزاشت ہو جائے جو اللہ ﷻ کی ناراضگی کا باعث بن جائے ہمارا علم ناتمام ہے۔ ہماری عقل خام ہے، ہم شیطان کے وسوسہ اندازیوں کا صحیح طور پر مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہمارے لئے بچنے کا راستہ صرف یہی ہے کہ صدقِ دل سے اور عجز و نیاز سے اپنی بے بسی کا پورا اعتراف کرتے ہوئے ہر قدم پر بارگاہِ الٰہی میں یہی التجا کریں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: نبی اکرم ﷺ کو جب کوئی کام سخت تکلیف و پریشانی میں ڈال دیتا تو آپ ﷺ یہ دعا پڑھتے: يَا حَيُّ يَا قَيُّومُ بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِيثُ "اے زندہ اور ہمیشہ رہنے والے! تیری رحمت کے وسیلہ سے تیری مدد چاہتا ہوں۔" (جامع ترمذی)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "پریشان حال کے لئے یہ دعا ہے: اَللّٰهُمَّ رَحْمَتَكَ أَرْجُو، فَلَا تَكِلْنِي إِلَى نَفْسِي طَرْفَةَ عَيْنٍ وَأَصْلِحْ لِي شَأْنِي كُلَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ۔ "اے اللہ! میں تیری رحمت کا امیدوار ہوں، تو مجھے آنکھ جھپکنے تک کے لئے بھی میری اپنی جان کے حوالہ نہ فرما، اور میرے سارے معاملات درست فرما دے، تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔" (سنن ابی داؤد)

علمی بات: اس آیت کا مضمون بہت نازک ہے۔ موقع محل اور سیاق و سباق کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اصل مفہوم کو دِقت نظری سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ یہ خطاب بظاہر نبی اکرم ﷺ سے ہے مگر سختی کا رُخ ان لوگوں کی طرف ہے جنہوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے آپ ﷺ کے مقابلہ میں ایسے حالات پیدا کر رکھے تھے۔ ان الفاظ میں ان لوگوں کو سنایا جا رہا ہے کہ اے اہلِ باطل! تم جو چاہو کر لو ہمارے نبی ﷺ تمہارے اس دباؤ میں آکر تمہارے مطالبات ماننے والے نہیں ہیں۔

آیت نمبر ۷۶: کفارِ مکہ کی رسول اللہ ﷺ کے خلاف جلاوطن کرنے کی سازش کا ذکر ہے۔ کفار کو سزا پہلے ہی سنا دی گئی کہ اگر انہوں نے آپ ﷺ کو ہجرت پر مجبور کیا تو وہ خود بھی مکہ مکرمہ میں بہت کم مدت ٹھہر سکیں گے۔

کفارِ مکہ نے باہمی مشورہ سے یہ طے کیا کہ نبی کریم ﷺ کو جزیرۂ عرب سے نکال دیں۔ اللہ ﷻ فرماتا ہے، یہ بھی کر دیکھو، تمہیں اس کا انجام بھی معلوم ہو جائے گا۔ ہم تمہیں نیست و نابود کر کے رکھ دیں گے۔ یہ تو اسی محبوب کا لحاظ ہے کہ تمہاری غلط کاریوں کے باوجود تم کو عذاب سے نجات ملی ہوئی ہے۔ جب سرزمین عرب سے یہ سراپا برکت ہستی تشریف لے جائے گی تو تمہیں جلد ہی کیفرِ کردار تک پہنچا دیا جائے گا۔

علمی بات: یہ اہلِ مکہ تھے جنہوں نے نبی مکرم ﷺ کو مکہ مکرمہ سے نکالنے کا ارادہ کیا اور اگر وہ ایسا کرتے تو پھر ان کو مہلت نہ دی جاتی، یعنی وہ بھی مکہ مکرمہ میں نہ رہ سکتے، لیکن اللہ ﷻ نے ان کو نکالنے سے روک دیا، حتیٰ کہ اللہ ﷻ نے خود آپ ﷺ کو مکہ مکرمہ سے نکلنے کا حکم دیا۔

پھر نبی ﷺ کے مکہ مکرمہ سے جانے کے بعد یہ بہت کم عرصہ مکہ مکرمہ میں رہ سکے، حتیٰ کہ جنگ بدر میں کافی مشرکین مارے گئے اور کافی قید ہو گئے، پھر آٹھ سال بعد حضور ﷺ نے مکہ مکرمہ کو فتح کر لیا، اللہ ﷻ نے فرمایا تھا پھر یہ بھی بہت کم عرصہ مکہ مکرمہ میں ٹھہر پاتے، شروع میں تو یہ صرف ایک دھمکی معلوم ہوتی تھی، مگر تقریباً نو (۹) سال کے عرصہ کے بعد یہ پیشن گوئی حرف بہ حرف صادق ہو گئی، اس سورت کے نازل ہونے کے ایک سال بعد ہی مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو مکہ مکرمہ سے ہجرت پر مجبور کر دیا اور اس کے آٹھ (۸) سال بعد رسول اکرم ﷺ فاتحانہ شان سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور پھر دو سال بعد آپ ﷺ نے اعلان فرما دیا کہ (جزیرۂ) عرب میں کوئی مشرک اور بت پرست نہیں رہے گا اور سرزمین حجاز مشرکین کے وجود سے پاک کر دی گئی اور اب تک حرم کی حدود میں کوئی مشرک داخل نہیں ہو سکتا۔ مشرکین نے مکہ مکرمہ میں رحمت العالمین ﷺ کا وجود گوارا نہ کیا تھا لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد اللہ ﷻ نے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے پیروکاروں کو مکہ معظمہ کی سیادت عطا فرما دی۔ اور مکہ مکرمہ کی پوری وادی مسلمانوں کے زیرِ نگیں آگئی۔ مشرکین کو قیامت تک کے لئے مکہ مکرمہ سے نکال دیا گیا اور یوں قرآنِ حکیم کی یہ پیشن گوئی نہایت آب و تاب سے پوری ہو گئی۔

آیت نمبر۷۷: اللہ ﷻ کے قانون کو بیان کر کے رسول اللہ ﷺ کے لئے تسلی کا سامان کیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ سے پہلے بھیجے گئے رسولوں کی قوموں نے جب بھی ان کو ہجرت پر مجبور کیا تو وہ نافرمان لوگ عذاب سے محفوظ نہ رہے۔ مشرکین مکہ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہو گا اللہ ﷻ کے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی۔

علمی بات: پیغمبروں کے بارے میں اللہ ﷻ کے قانون میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ پیغمبروں کی قوموں نے جب ان کو اپنے یہاں سے نکالا تو اس کے بعد اللہ ﷻ کے عذاب نے بالآخر ان کو آ پکڑا اور وہ لوگ اپنے ہولناک انجام کو پہنچ کر رہے۔ لہٰذا ان رسولوں کی ہجرت کے بعد جو حشر ان کی قوموں کا ہوا وہی ان کفارِ مکہ کا ہو گا کہ ہمارا قانون اور ہماری سنت سب کے لئے یکساں اور برابر ہے۔ اس میں کسی کے لئے کوئی رعایت نہیں۔

آیت نمبر۷۸: حق کے راستہ میں ثابت قدمی کے لئے نماز قائم کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ نماز سے مدد حاصل کرنے کی تلقین سورۃ البقرۃ ۲، آیت: ۱۵۳ پنج وقتہ نمازوں کے اوقات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ تفصیلات احادیثِ مبارکہ میں آئی ہیں۔ سورج ڈھلنے کے بعد ظہر اور عصر کی نماز اور رات کی تاریکی سے مراد مغرب اور عشا کی نمازیں ہیں۔ فجر کے وقت قرآنِ حکیم پڑھنے سے مراد فجر کی نماز ہے۔ نماز فجر کے ساتھ بالخصوص قرآنِ حکیم کے ذکر کی وجہ یہ ہے کہ اس نماز میں قرآنِ حکیم کی طویل تلاوت ہوتی ہے۔ فجر کا وقت مبارک ہے۔ دن اور رات کے فرشتوں کا اجتماع ہوتا ہے اور ان کی بھرپور حاضری ہوتی ہے۔

علمی بات: سورج کے ڈھلنے سے رات کی تاریکی تک چار نمازوں یعنی ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کا ذکر ہے اور فجر کی نماز کا الگ ذکر ہے اور فجر کی نماز کو قرآنِ حکیم سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ اس میں قرآنِ حکیم کی قرآت لمبی ہوتی ہے۔ رات کے وقت جو فرشتے انسان کی حفاظت کرنے اور اس کے عمال لکھنے پر مقرر ہوتے ہیں وہ فجر کی نماز کے بعد واپس جاتے ہیں اور دن کے فرشتے فجر کی نماز سے پہلے آجاتے ہیں۔ اس طرح فجر کی نماز میں رات اور دن کے فرشتوں کا اجتماع ہو جاتا ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تمہارے پاس رات اور دن کے فرشتے باری باری آتے ہیں فجر اور عصر کی نماز میں جمع ہو جاتے ہیں جب رات کے فرشتے اللہ ﷻ کے پاس جاتے ہیں تو اللہ ﷻ ان سے پوچھتا ہے حالانکہ اللہ ﷻ خوب جانتا ہے، تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟ فرشتے کہتے ہیں: جب ہم ان کے پاس گئے تھے اس وقت بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے اور جب ہم ان کے پاس سے آئے ہیں تو بھی انہیں نماز پڑھتے ہوئے چھوڑ آئے ہیں۔ (صحیح بخاری) کتنے خوش نصیب ہیں وہ مسلمان جو نماز پڑھتے ہیں اور فرشتے اللہ ﷻ کے حضور ان کی نماز کی گواہی دیتے ہیں۔

آیت نمبر۷۹: تہجد کی نماز کی خصوصی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ تہجد وہ نماز ہے جو رات کے ایک حصہ میں ادا کی جائے۔ افضل نیند سے بیدار ہو کر ادا کرنا ہے۔ مزید افضل رات کے آخری حصہ میں ادا کرنا ہے۔ ضبط نفس، تربیت اور اللہ ﷻ سے تعلق کی مضبوطی کا بہترین ذریعہ نمازِ تہجد ہے۔ تہجد کی نماز کو نفل یعنی فرض سے زائد عبادت قرار دیا گیا۔ امّت کے لئے گناہوں کی معافی کا ذریعہ ہے۔ رسالت مآب ﷺ کے لئے درجات کی بلندی کا باعث ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو مقامِ محمود پر فائز کیئے جانے کی بشارت دی گئی ہے۔ مقامِ محمود، مقامِ شفاعت کُبریٰ ہے جو صرف رسول اللہ ﷺ کو میدانِ حشر میں عطا ہو گا۔

علمی بات: زائد عبادت کا مطلب بعض مفسرین کرام نے یہ بیان فرمایا ہے کہ یہ نماز آنحضرت ﷺ پر اضافی طور پر فرض تھی، عام مسلمانوں کے لئے فرض نہیں تھی اور بعض مفسرین نے اضافی عبادت کا مطلب یہ لیا ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کی طرح آنحضرت ﷺ کے لئے بھی نفلی عبادت ہے۔

نمازِ تہجد کی فضیلت: حضور نبی کریم ﷺ ہمیشہ اہتمام کے ساتھ نمازِ تہجد پڑھتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس میں مشغول رہتے تھے اور آپ ﷺ نے اس کی بہت زیادہ ترغیب دی ہے۔ سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی امتوں کے صالحین بھی اس نماز کو پڑھا کرتے تھے۔

فرامین نبوی ﷺ: ۱۔ حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”کہ تم رات کے قیام کرنے کو لازم پکڑ لو۔ کیونکہ تم سے پہلے جو صالحین گزرے ہیں یہ ان کی عبادت رہی ہے اور یہ تمہارے رب کی نزدیکی کا سبب ہے اور تمہارے گناہوں کا کفارہ ہے اور گناہوں سے روکنے والی ہے۔“ (جامع ترمذی)

۲۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نمازوں میں اتنا قیام فرمایا کہ آپ ﷺ کے قدم مبارک متورم ہو (سُوج) گئے کسی نے عرض کیا: کہ آپ ﷺ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ حالانکہ آپ ﷺ کا گزشتہ اور آئندہ سب کچھ بخش دیا گیا ہے" آپ ﷺ نے فرمایا تو کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔" (صحیح بخاری)

۳۔ حضرت عَمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کہ بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جس وقت پچھلی رات کا درمیانہ حصہ ہو۔ پس اگر تجھ سے یہ ہو سکے کہ اس وقت میں اللہ ﷻ کا ذکر کرنے والوں میں سے ہو جائے تو اس پر عمل کر لینا۔" (جامع ترمذی)

۴۔ حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ سب سے زیادہ مقبول ہونے والی دعا کون سی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:" جو پچھلی رات کے درمیان ہو اور فرض نمازوں کے بعد۔" (جامع ترمذی)

مقامِ محمود کی وضاحت: اس آیت میں آپ ﷺ کے لئے خاص طور پر تسلی ہے کہ چند روزہ دنیا میں وہ بھی چند دن آپ ﷺ کے دشمن جو آپ ﷺ کو تکلیف دے رہے ہیں یہ اس بلند مرتبہ کے سامنے بے حقیقت ہے جو مرتبہ آپ ﷺ کو قیامت کے دن عطا کیا جائے گا یعنی مقامِ محمود پر پہنچایا جائے گا۔ اس مقام پر تمام انبیاء کرام علیہم السلام اور تمام اولین و آخرین آپ ﷺ کی تعریف کریں گے۔ مقامِ محمود سے مراد ایسا مرتبہ ہے کہ سب لوگ آپ ﷺ کی حمد و ثنا کرنے لگیں اور اس کی کئی توجیہات ہیں مثلاً:

ایک یہ کہ ایسا مقامِ قدر و منزلت اور حمد و ستائش آپ ﷺ کو اللہ ﷻ نے اس دنیا میں بھی آپ ﷺ کی آخری زندگی میں عطا فرما دیا تھا، دوسری یہ کہ جنت میں ایک بلند مقام ہے جس کا نام ہی مقامِ محمود ہے وہ آپ ﷺ کو عطا کیا جائے گا اور تیسری یہ کہ قیامت کے دن کی ہولناکیوں کو دیکھ کر سب لوگ گھبراہٹ میں ہوں گے وہ چاہیں گے کہ اللہ ﷻ کے حضور ان کی کوئی سفارش کرے وہ حضرت آدم علیہ السلام اور پھر ان کے بعد باری باری سب انبیاء کرام علیہم السلام سے سفارش کی التجا کریں گے مگر ہر نبی علیہ السلام اپنی کوئی نہ کوئی تقصیر یاد کر کے معذرت کر دے گا۔ بالآخر سب لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں گے تو آپ ﷺ لوگوں کی یہ التجا قبول کر کے اللہ ﷻ کے حضور ان کی سفارش کریں گے۔ اس توجیہہ کے لحاظ سے مقامِ محمود سے مراد مقام شفاعت ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے خود بھی یہی وضاحت فرمائی ہے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ کسی نے آپ ﷺ سے مقامِ محمود کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا:" کہ اس سے مراد مقامِ شفاعت ہے۔" (جامع ترمذی) اس وقت سب لوگوں کی زبان پر آپ ﷺ کی حمد و ستائش جاری ہو جائے گی۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ: قیامت کے دن امتیں گروہ در گروہ چلیں گی۔ ہر امّت اپنے نبی کے پیچھے ہو گی اور وہ لوگ (انبیاء علیہم السلام سے) کہیں گے: کہ اے فلاں! ہماری شفاعت کرو۔ اے فلاں! ہماری شفاعت کرو (مگر وہ سب ہی انکار کر دیں گے) یہاں تک کہ شفاعت کے لئے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں گے تو یہی وہ دن ہے جب اللہ ﷻ آپ ﷺ کو مقامِ محمود عطا فرمائے گا۔ (صحیح بخاری)

"مقامِ محمود" بہت ہی اعلیٰ اور ارفع مقام ہے جس پر حضور سرورِ عالم ﷺ کو میدانِ حشر میں اور جنت میں فائز کیا جائے گا۔ اس مقام کی عظمت اور کیفیت کا اندازہ انسان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اپنے تصور سے کر سکے۔ اللہ ﷻ نے اپنے حبیب مکرم ﷺ کو یہ خوشخبری سنائی ہے کہ آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ کو دنیا اور آخرت میں ایسے مرتبہ پر پہنچا دے گا جہاں آپ ﷺ محمود خلائق ہو کر رہیں گے، ہر طرف سے آپ ﷺ پر مدح و ستائش کی بارش ہو گی، اور آپ ﷺ کی ہستی ایک قابلِ تعریف ہستی بن کر رہے گی۔ آج آپ ﷺ کے مخالفین آپ ﷺ کی شان میں گستاخیاں کر رہے ہیں، اپنی کڑوی کسیلی باتوں اور طعنوں سے آپ ﷺ کی دل آزاری کر رہے ہیں۔ ہر طرف آپ ﷺ کو (معاذ اللہ) بدنام کرنے کے لئے انہوں نے جھوٹے الزامات کا ایک طوفان برپا کر رکھا ہے، مگر وہ وقت دور نہیں ہے جبکہ دنیا آپ ﷺ کی تعریفوں سے گونج اٹھے گی اور آخرت میں بھی آپ ﷺ ساری خلق کے ممدوح ہو کر رہیں گے۔ قیامت کے روز نبی کریم ﷺ کا مقامِ شفاعت پر فائز ہونا بھی اسی مرتبہ محمودیت کا ایک حصہ ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس نے اذان سننے کے بعد یہ دعا کی: "اَللّٰھُمَّ رَبَّ ھٰذِہِ الدَّعْوَۃِ التَّآمَّۃِ وَالصَّلَاۃِ الْقَآئِمَۃِ آتِ مُحَمَّدَا نِ الْوَسِیْلَۃَ وَالْفَضِیْلَۃَ وَابْعَثْہُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَا نِ الَّذِیْ وَعَدْتَّہٗ" اے اللہ! اس کامل دعوت اور قائم ہونے والی نماز کے مالک! حضرت محمد (ﷺ) کو مقام

وسیلہ اور فضیلت عطا فرما! اور ان کو مقامِ محمود پر فائز فرما! جس کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے تو قیامت کے دن اس کے حق میں میری شفاعت واجب ہو جائے گی۔ (صحیح بخاری)

علمی بات: مقامِ محمود کے بارے میں فرمایا گیا: کہ آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ کو ایسے مقامِ عالی شان پر فائز فرمائے گا جو عالمگیر اور دائمی ستائش کا مقام ہے۔

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب آپ ﷺ کی مکی زندگی کے آخری سال گزر رہے تھے اور مظلومیت اور بے سر و سامانی اپنے انتہائی درجوں تک پہنچ چکی تھی۔ حتیٰ کہ مخالفین قتل کی تدبیروں میں سر گرم تھے۔ ایسی حالت میں کون امید کر سکتا تھا کہ ان ہی مظلومیتوں سے فتح و کامرانی پیدا ہو سکتی ہے؟ لیکن وحی الٰہی نے صرف فتح و کامرانی ہی کی بشارت نہیں دی۔ بلکہ ایک ایسے مقام تک پہنچنے کی خبر دی جو نوعِ انسانی کے لئے عظمت و ارتفاع کی سب سے آخری بلندی ہے۔ "عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا" حسن و کمال کا ایسا مقام جہاں پہنچ کر محمودیت خلائق کی عالمگیر اور دائمی مرکزیت حاصل ہو جائے گی، اربوں، کھربوں بلکہ لامحدود دلوں میں اس کی ستائش ہوگی، ان گنت زبانوں پر اس کی مدحت طرازی ہوگی۔

عملی بات: سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خود رسول کریم ﷺ شفاعت فرمائیں گے اور آپ ﷺ کی شفاعت سے کوئی مومن دوزخ میں نہ رہ جائے گا تو پھر امت کے علماء و صلحاء کی شفاعت کس لئے اور کیونکر ہوگی؟ تفاسیر میں آتا ہے کہ غالباً صورت یہ ہوگی کہ علماء اور صلحاءِ امت جن لوگوں کی شفاعت کرنا چاہیں گے وہ اپنی شفاعت حضور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کریں گے پھر رسول کریم ﷺ اللہ ﷻ کی بارگاہ میں شفاعت فرمائیں گے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

فرمانِ نبوی ﷺ: رسول کریم ﷺ نے فرمایا شَفَاعَتِي لِأَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ أُمَّتِي یعنی میری شفاعت میری امت کے ان لوگوں کے لئے ہوگی جنہوں نے کبیرہ گناہ کیئے تھے۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل کبائر کی شفاعت آنحضرت ﷺ کے ساتھ مخصوص ہوگی کوئی فرشتہ یا امت کا فرد اہل کبائر کی شفاعت نہ کر سکے گا بلکہ صلحاءِ امت کی شفاعت صغیرہ گناہ والوں کے لئے ہوگی۔

نمازِ تہجد کو مقامِ شفاعت حاصل ہونے میں خاص دخل ہے: علماءِ امت نے فرمایا کہ اس آیت میں آنحضرت ﷺ کو اول نمازِ تہجد کا حکم دیا گیا پھر مقامِ محمود یعنی شفاعتِ کبریٰ کا وعدہ کیا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازِ تہجد کو مقامِ شفاعت حاصل ہونے میں خاص دخل ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی تفسیر میں فرمایا: "کہ اس سے شفاعت مراد ہے۔" (جامع ترمذی)۔ اللہ ﷻ کا وعدہ ہے کہ آپ ﷺ کو مقامِ محمود عطا فرمائے گا لیکن امتِ محمدیہ ﷺ کو بھی مقامِ محمود کی دعا کرنے کا شرف عطا کیا ہے جو اذان کا جواب دینے کے بعد کی جاتی ہے۔

آیت نمبر ۸۰: ہجرت کی طرف اشارہ جو اس آیت کے نزول کے کچھ ہی عرصہ میں واقع ہونے والی تھی۔ ہجرت کرتے وقت رسول اللہ ﷺ کو اس دعا کی تلقین فرمائی گئی۔ جہاں بھی جانا ہو حق اور صداقت کے خاطر ہو اور جہاں سے بھی نکلنا ہو حق اور صداقت کے لئے ہو۔ ایسے اقتدار اور حکومت کی دعا جس میں دین کے غلبہ کے لئے عملی کام آسان ہو جائے اور اللہ ﷻ کی مدد شاملِ حال ہو۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ نے اسی دنیا میں اول آپ ﷺ کو کفار کی ایذاؤں سے نجات دینے کی تدبیر بصورتِ ہجرت مدینہ ارشاد فرمائی اور اس کے بعد فتح مکہ کی بشارت قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ میں ارشاد فرمائی گئی۔ آپ ﷺ فرما دیجیے حق آگیا اور باطل مٹ گیا بے شک باطل مٹنے ہی والا ہے۔

(سورۂ بنی اسرائیل ۱۷، آیت: ۸۱)

شانِ نزول: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ مکہ معظمہ میں تھے پھر آپ ﷺ کو ہجرت مدینہ کا حکم دیا گیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ داخل ہونے کی جگہ سے مراد مدینہ منورہ اور خارج ہونے کی جگہ سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یا اللہ! مدینہ منورہ میں میرا داخلہ خیر و خوبی کے ساتھ ہو جائے وہاں کوئی خلافِ طبع اور ناگوار صورت پیش نہ آئے اور مکہ مکرمہ سے میرا نکلنا خیر و خوبی کے ساتھ ہو جائے کہ وطن اور گھر بار کی محبت میں دل الجھا نہ رہے۔ ہجرتِ مدینہ کے وقت اللہ ﷻ نے رسول کریم ﷺ کو اس دعا کی تلقین فرمائی کہ مکہ مکرمہ سے نکلنا اور پھر مدینہ منورہ پہنچنا دونوں خیر و خوبی اور عافیت کے

ساتھ ہوں اسی دعا کا ثمرہ تھا کہ ہجرت کے وقت تعاقب کرنے والے کفار کی زد سے اللہ ﷻ نے ہر قدم پر بچایا اور مدینہ طیّبہ کو ظاہراً و باطناً آپ ﷺ کے اور سب مسلمانوں کے لئے ساز گار بنایا۔ (جامع ترمذی)

عملی پہلو: بعض علماء کرام نے فرمایا کہ یہ دعا ہر مسلمان کو اپنے تمام مقاصد کے شروع میں یاد رکھنا چاہیئے اور ہر مقصد کے لئے یہ دعا مفید ہے اسی دعا کا تکملہ بعد کا جملہ ہے وَاجْعَل لِّي مِن لَّدُنكَ سُلْطَانًا نَّصِيرًا حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کو یہ معلوم تھا کہ منصبِ رسالت کے فرائض کی ادائیگی اور دشمنوں کے نرغے میں کام کرنے کے لئے اللہ ﷻ سے غلبہ اور نصرت کی ادائیگی کی دعا فرمائی جو قبول ہوئی اور اس کے آثار سب کے سامنے آگئے۔

آیت نمبر ۸۱: ہجرت کے ساتھ فتح مکہ اور غلبہ دین کی بشارت دی گئی۔ باطل کے نیست و نابود ہونے کا اعلان کیا گیا۔ مشرکین نے ہجرت پر مجبور کر دیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ہجرت ہی حق کے غلبہ کی تمہید بن گئی۔ مصائب سے گزر کر ہی اللہ ﷻ کی مدد آتی ہے۔

علمی بات: یہ آیت ہجرت کے بعد فتح مکہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن رسول کریم ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو اس وقت بیت اللہ کے گرد تین سو ساٹھ (۳۶۰) بتوں کے مجسمے کھڑے ہوئے تھے۔ بعض علماء کرام نے اس خاص تعداد کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ مشرکین مکہ سال بھر کے دنوں میں ہر دن کا بت الگ رکھتے تھے اس دن میں اس کی پرستش کرتے تھے۔ آپ ﷺ جب وہاں پہنچے تو یہ آیت آپ ﷺ کی زبان مبارک پر تھی " وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اور اپنی چھڑی ایک ایک بت کے سینے میں مارتے جاتے تھے۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

تفاسیر میں آتا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کسی بت کے سینہ میں اس کو مارتے تو وہ الٹا گر جاتا تھا یہاں تک کہ یہ سب بت گر گئے اور پھر آپ ﷺ نے ان کے توڑنے کا حکم دے دیا۔

آیت نمبر ۸۲: قرآنِ حکیم روحانی بیماریوں کے لئے شفا ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو اس پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ لوگ ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ بھی انجام دیتے ہیں تو اللہ ﷻ کی رحمت ان کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ قرآنِ حکیم کی ناقدری اور اس کی مخالفت کرنے والوں کے لئے قرآنِ پاک دنیا و آخرت میں ابدی خسارے کا باعث ہے۔

علمی بات: قرآنِ حکیم کا قلوب کے لئے شفا ہونا شرک و کفر اور بُرے اخلاق اور باطنی امراض سے نجات کا ذریعہ ہونا تو کھلا ہوا معاملہ ہے اور تمام امّت اس پر متفق ہے اور بعض علماء کرام کے نزدیک قرآنِ حکیم جس طرح باطنی امراض کی شفا ہے۔ اسی طرح ظاہری امراض کی بھی شفا ہے کہ آیاتِ قرآن پڑھ کر مریض پر دم کرنا ظاہری امراض کے لئے بھی باعثِ شفا ہوتا ہے۔ تمام کتب احادیث میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث موجود ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سفر میں تھی کسی گاؤں کے سردار کو بچھو نے کاٹ لیا تھا لوگوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ آپ کچھ اس کا علاج کر سکتے ہیں انہوں نے سات مرتبہ سورۃ الفاتحہ پڑھ کر اس پر دم کیا مریض ٹھیک ہو گیا پھر رسول کریم ﷺ کے سامنے اس کا تذکرہ آیا تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس عمل کو جائز قرار دیا۔ اسی طرح دوسری متعدد روایات سے خود رسول کریم ﷺ کا معوذتین (سورۃ الفلق و سورۃ الناس) پڑھ کر دم کرنا ثابت ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعین رحمۃ اللہ علیہم سے معوذتین اور دوسری آیات قرآنِ حکیم کے ذریعہ مریضوں کا علاج کرنا ثابت ہے۔ البتہ یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ علاج کے لئے دوا کرنا بھی سنت ہے اور اس کا ضرور اہتمام کرنا چاہیئے۔ نیز قرآنی آیات کی تلاوت اور مسنون دعاؤں اور اذکار کا اہتمام کرنا بھی سنت ہے جس پر ہمیں مستقل مزاجی اور پابندی سے کاربند رہنا چاہیئے۔

علمی بات: " وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا " کے الفاظ سے معلوم ہوا کہ قرآنِ حکیم کو جب اعتقاد و احترام کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا شفا ہونا جس طرح ظاہر اور ثابت ہے اسی طرح قرآنِ مجید کا انکار یا بے ادبی خسارہ اور آفات کا ذریعہ بھی ہے۔

آیت نمبر ۸۳: انسان کی اس کیفیت کا ذکر جس میں وہ عام طور پر خوشحالی اور تکلیف کے وقت مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ خوشحالی میں اللہ ﷻ کو بھول جاتا ہے اور تکلیف پہنچنے پر اللہ ﷻ کی رحمت سے مایوس ہو جاتا ہے۔ وہ کسی بھی حالت میں اللہ ﷻ سے تعلق قائم نہیں کرتا۔

علمی بات: "اَلۡاِنۡسَانِ" سے مراد یہاں کافر یا فاسق انسان ہے، صحیح مومن ایسا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مومن کا معاملہ بڑا عجیب (عمدہ) ہے، کیونکہ اس کا ہر معاملہ ہی خیر ہے اور یہ چیز مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں، اگر اسے کوئی خوشی پہنچے تو وہ شکر کرتا ہے تو وہ اس کے لئے خیر ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچے تو صبر کرتا ہے، پس وہ بھی اس کے لئے خیر ہے۔" (صحیح مسلم) اسی طرح قرآنِ حکیم میں دیگر مقامات مثلاً (سورۃ ہود ۱۱، آیات: ۹ تا ۱۱) اور (سورۃ المعارج ۷۰، آیات: ۱۹ تا ۳۵) میں اس مومن کی اس صفت کا ذکر ہے۔ مزید معلوم ہوا کہ کوئی شخص اگر احسان کے باوجود بے وفائی اور ناشکری کرے تو محسن کو احسان چھوڑنا نہیں چاہیئے۔ تمام کفار و فساق کی ناشکری کے باوجود اللہ ﷻ دنیا میں ان پر بھی بے شمار انعامات جاری رکھے ہوئے ہے۔

علمی بات: یعنی انسان کا عجیب حال ہے اللہ ﷻ اپنے فضل سے نعمتیں دیتا ہے تو احسان نہیں مانتا۔ جتنا عیش و آرام ملے اسی قدر کریم رب کی طرف سے اس کی غفلت و اعراض بڑھتا ہے اور فرائض بندگی سے پہلو بچا کر کھسکنا چاہتا ہے۔ پھر جب سخت اور بُرا وقت آیا تو ایک دم آس توڑ کر اور ناامید ہو کر بیٹھا رہتا ہے۔ گویا دونوں حالتوں میں اللہ ﷻ سے بے تعلق رہا۔ کبھی غفلت کی بنا پر اور کبھی مایوسی کی بنا پر۔ یہ مضمون غالباً اس لئے بیان فرمایا کہ قرآنِ حکیم جو سب سے بڑی نعمتِ الٰہی ہے، بہت لوگ اس کی قدر نہیں پہچانتے بلکہ اس کے ماننے سے اعراض و پہلو تہی کرتے ہیں۔ پھر جب اس کفرانِ نعمت اور اعراض و انکار کا بُرا نتیجہ سامنے آئے گا اس وقت قطعاً مایوسی ہو گی۔ کسی طرف اُمید کی جھلک نظر نہ پڑے گی۔

عملی پہلو: ہمیں قرآنِ حکیم سے اپنے تعلق کو مسلسل مضبوط کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے ہمیں قرآنِ حکیم کے مندرجہ ذیل حقوق ادا کرنے چاہئیں۔ ۱۔ قرآنِ حکیم پر ایمان لانا۔ ۲۔ اس کی تلاوت کرنا۔ ۳۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرنا۔ ۴۔ اس پر عمل کرنا۔ ۵۔ اسے دوسروں تک پہنچانا۔

نافرمان انسان کا کمزور دل اور ناشکرا ہونا: اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ نوعِ انسان کے اکثر افراد کا یہ حال ہے کہ جب انہیں اپنا مقصود حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اللہ ﷻ کی یاد اور اس کی عبادت سے غافل ہو جاتے ہیں اور بغاوت اور سرکشی پر اُتر آتے ہیں اور جب اللہ ﷻ ان کی ناشکری کی وجہ سے ان سے وہ نعمت چھین لیتا ہے یا ان کے ظلم اور جرم کی پاداش میں ان پر کوئی مصیبت نازل کرتا ہے تو پھر وہ مایوس ہو جاتے ہیں جیسا کہ ان آیتوں میں اللہ ﷻ نے فرمایا ہے: "تو انسان (کا حال یہ ہے کہ) جب اس کا رب اسے آزماتا ہے (اس طرح) کہ اسے عزت اور نعمتیں عطا فرماتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے عزت بخشی۔ لیکن جب وہ اسے آزماتا ہے (اس طرح) کہ اس پر اس کا رزق تنگ کرتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا۔" (سورۃ الفجر ۸۹، آیات: ۱۵، ۱۶) "بے شک انسان بہت کم حوصلہ پیدا کیا گیا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا جاتا ہے اور جب خوش حالی ملتی ہے تو کنجوس بن جاتا ہے۔" (سورۃ المعارج ۷۰، آیات: ۱۹ تا ۲۱)

علمی و عملی بات: اس آیت میں الانسان سے مراد وہ انسان ہے جس نے قرآنِ حکیم کے نور سے اپنی شاہراہِ حیات کو منور نہیں کیا ہوتا۔ بتایا جا رہا ہے کہ ایسا انسان دولت و اقتدار کے زمانہ میں سرکش اور نافرمان بن جاتا ہے۔ وہ اپنے پروردگار حقیقی سے یکسر منہ موڑ لیتا ہے۔ اس کی دی ہوئی عزت، دولت، صحت کو اس کی نافرمانی میں صرف کرتا ہے لیکن جب اسے مصیبتیں اور پریشانیاں گھیرتی ہیں تو اس کی ساری نخوتیں ختم ہو جاتی ہیں اور وہ سطحِ زمین پر اکڑ اکڑ کر چلنے والا مایوسی و ناامیدی کے ایک ہی جھونکے سے خزاں زدہ زرد پتے کی طرح اڑنے لگتا ہے اور حالات کی ناسازگاری کے سامنے بڑی بے بسی سے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ لہٰذا مقام غور ہے کہ جو شخص قوت و اقتدار کے زمانہ میں آمادہ فتنہ و فساد ہو جائے اور حالات کی ذرہ سی تبدیلی پر دل ہار کر بیٹھ جائے۔ وہ کسی طرح اپنی قوم، اپنے وطن اور اپنی ذات کے لئے مفید نہیں ہو سکتا۔

البتہ وہ خوش نصیب افراد جو ایمان کے ساتھ قرآنِ حکیم کے چشمہ فیض سے فیضیاب ہوتے ہیں وہ موافق حالات میں اپنے محسنِ حقیقی کا دل و جان سے شکر ادا کرتے ہیں اور ناموافق حالات میں مایوس ہو کر ہمت نہیں ہارتے بلکہ اپنے ربِ کریم کی تائید و نصرت پر یقین محکم رکھتے ہوئے اپنی جدوجہد کو پہلے سے بھی تیز تر کر دیتے ہیں۔ یہ ہے وہ کردار جو ہدایت قرآنِ حکیم سے محروم رہنے والے لوگوں کا زندگی کے مختلف مراحل میں ہوتا ہے اور یہ ہے وہ کردار جس کی تشکیل قرآنِ حکیم کرتا ہے۔

آیت نمبر ۸۴ "شاکلہ" کے معنی طبیعت، طور طریقہ، ڈھنگ وغیرہ کے ہیں۔ مومن اور کافر اپنے اپنے طریقہ پر عمل کرتے ہیں۔ اللہ ﷻ کو خوب علم ہے کہ کون ہدایت کے راستہ پر ہے اور کون گمراہی میں مبتلا ہے۔

نیکوں اور بُروں پر قرآنِ حکیم کے مختلف آثار: یعنی ہر شخص اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق عمل کرتا ہے، پس جن لوگوں کی روحیں نیک اور پاک ہیں ان پر جب قرآنِ حکیم پڑھا جاتا ہے تو ان میں قرآنِ حکیم کے تقاضوں پر عمل کا اظہار ہوتا ہے اور جن کی روحیں بُری اور ناپاک ہوتی ہیں ان پر جب قرآنِ پاک پڑھا جاتا ہے تو ان میں گمراہی ور سرکشی کا اظہار ہوتا ہے، جیسے بارش اگر زرخیز زمین پر ہو تو اس میں سبزہ اور ہریالی اور زیادہ ہوتی ہے اور بنجر، کھاری اور سیم زدہ زمین پر ہو تو اس کی خرابی اور زیادہ ہو جاتی ہے۔

خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کی پسندیدہ آیات: حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے پورا قرآنِ حکیم اوّل سے آخر تک پڑھا مجھے جو آیت سب سے زیادہ اچھی لگی اور جس پر سب سے زیادہ بخشش کی امید ہے وہ یہ آیت ہے "قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ" "آپ ﷺ فرما دیجیے ہر ایک اپنے طریقہ پر عمل کرتا ہے۔"
(سورۃ بنی اسرائیل ۱۷، آیت: ۸۴) بندہ کا طریقہ ہے گناہ کرنا اور اللہ ﷻ کا طریقہ ہے معاف کر دینا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے پورا قرآنِ مجید اوّل سے آخر تک پڑھا اور مجھے جو آیتیں اچھی لگیں اور جن سے مجھے مغفرت کی امید ہے وہ یہ آیتیں ہیں:

حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝

حٰم۔ (یہ) کتاب اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہے جو بڑا غالب خوب جاننے والا ہے۔ جو (اللہ) گناہ معاف فرمانے والا اور توبہ قبول فرمانے والا سخت سزا دینے والا بڑے فضل والا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اسی کی طرف واپس جانا ہے۔ (سورۃ المومن ۴۰، آیات: ۱ تا ۳)

اس آیت میں اللہ ﷻ نے گناہوں کے بخشنے کو توبہ قبول فرمانے پر مقدم فرمایا ہے۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے پورا قرآنِ پاک اوّل سے آخر تک پڑھا مجھے جو سب سے اچھی اور سب سے زیادہ امید والی آیت لگی وہ یہ ہے:

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّىْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ آپ میرے بندوں کو بتا دیجیے کہ بے شک میں بڑا ہی بخشنے والا نہایت رحم فرمانے والا ہوں۔ (سورۃ الحجر ۱۵، آیت: ۴۹)

اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے اوّل سے آخر تک پورا قرآنِ حکیم پڑھا مجھے جو آیت سب سے اچھی اور امید افزا لگی وہ یہ ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ آپ فرما دیجیے اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا بے شک اللہ سارے گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ بے شک وہ بڑا ہی بخشنے والا نہایت رحم فرمانے والا ہے۔
(سورۃ الزمر ۳۹، آیت: ۵۳)

آیت نمبر ۸۵: یہود کے کہنے پر مشرکین مکہ کا رسول اللہ ﷺ سے روح کے متعلق سوال اور اس پر اللہ ﷻ کا جواب یہ دیا گیا کہ روح اللہ ﷻ کے حکم سے ایک حقیقت ہے۔ چونکہ اللہ ﷻ کے علم کے مقابلہ میں انسان کو دیا ہوا علم کوئی حیثیت نہیں رکھتا اس لئے لوگ اس کی حقیقت کو سمجھ نہیں سکتے۔

شانِ نزول: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھیتوں کے درمیان سے گزر رہا تھا اس وقت آپ ﷺ کھجور کی ایک لکڑی کے سہارے چل رہے تھے، وہاں سے یہودیوں کا گزر ہوا۔ وہ آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ ان سے روح کے بارے میں دریافت کرو۔ پھر آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ دریافت کریں یا نہ کریں۔ ممکن ہے کہ ایسی بات کہہ دیں جو تمہیں ناگوار ہو۔ پھر کہنے لگے اچھا دریافت کر لیتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے آپ ﷺ سے روح کے بارے میں دریافت کیا۔ آپ ﷺ ٹھہر گئے اور کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ آپ ﷺ پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ میں اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ اس وقت جب وحی نازل ہو چکی تو آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھ کر سنائی۔ (صحیح بخاری)

علمی بات: کفار کی طرف سے روح کے متعلق ایک سوال اور اللہ ﷻ کی طرف سے اس کا جواب مذکور ہے۔ کفار نے سوال کیا تھا کہ روح کیا چیز ہے؟ وہ انسان کے بدن میں کس طرح آتی جاتی ہے؟ اللہ ﷻ نے اس کے جواب میں فرمایا: اے نبی ﷺ! آپ ﷺ لوگوں کو بتا دیجیے کہ وہ اعضائے جسم اور عام مخلوقات کی طرح مادہ

سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ وہ مادہ کے بغیر بلاواسطہ اللہ ﷻ کے حکم کن سے پیدا ہوئی ہے۔ وہ بھی ایک قسم کی اللہ ﷻ کی مخلوق ہے جس پر دوسری مخلوق کی طرح اللہ ﷻ کو مکمل اختیار و قدرت حاصل ہے۔ اس جواب سے یہ واضح ہو گیا کہ روح کو عام مادی اشیاء پر قیاس نہیں کیا جا سکتا بلکہ وہ مادہ کے بغیر اللہ ﷻ کے حکم سے پیدا ہوئی ہے۔ انسان کے لئے روح کے بارے میں اتنا جان لینا ہی کافی ہے اس سے زیادہ علم نہ ہونے سے نہ تو اس کا کوئی دینی کام رکتا ہے اور نہ دنیوی، اس لئے اللہ ﷻ نے روح کے بارے میں اس قدر وضاحت فرمائی جس قدر انسان کے لئے ضروری ہے یعنی اس کی ضرورت اور فہم کے مطابق دے دیا، حقیقت روح کو بیان نہیں فرمایا۔

علمی بات: اس آیت سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ حقیقت روح کا علم رسول اللہ ﷺ اور بعض مخصوص روشن بصیرت رکھنے والے اولیاء کرام کے لئے بھی ناممکن تھا۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت نہ اس کی نفی کرتی ہے نہ اثبات۔ اگر کسی نبی و رسول علیہ السلام کو وحی کے ذریعہ کسی ولی کو کشف والہام کے ذریعہ اس کی حقیقت معلوم ہو جائے تو اس آیت کے خلاف نہیں۔ کیونکہ انبیاء کرام علیہم السلام اور مخصوص اولیاء کرام کا علم کسبی نہیں ہوتا، ان کو علم کے لئے وساطت حواس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کا علم محض الہامی اور انکشافی ہوتا ہے۔ غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ وہ دلوں کے کانوں سے وہ آوازیں سنتے ہیں جو چہرے کے کانوں سے سنائی نہیں دیتیں اور چشم بصیرت سے وہ چیزیں دیکھتے ہیں جو چشم بصر سے نہیں دیکھی جا سکتیں۔ اصحابِ بصیرت کو حقیقتِ روح کا علم ہوتا ہے۔

علمی بات: ایک علم وہ ہے جو بتایا جا سکتا ہے ایک وہ ہے جو قلب پر کھلتا اور روشن ہوتا ہے پھر ہر شخص کو اس کی استعداد کے مطابق علم دیا جاتا ہے، روح کی حقیقت اور اس کی ماہیت کو سمجھنے کے لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ روح کا تعلق "امرِ رب" سے ہے جس طرح جسم کا تعلق مٹی سے تھا اس کی غذا اور بالیدگی کے سامان مٹی سے پیدا کیئے گئے، روح امر رب سے متعلق ہے تو اس کی غذا بھی سماوی ہے یعنی وحی الٰہی اور حکم الٰہی۔ "امرِ رب" کی غذا امر رب کے سوا ہو ہی کیا سکتی ہے۔ روح کو اس حکم الٰہی سے متعلق رکھنے سے روح کی ماہیت، اس کے اسرار ہر ایک ذات پر اس کی استعداد اور عمل کے مطابق کھلتے چلے جائیں گے کیونکہ روح کی حقیقت بتانے کی چیز نہیں ہے بلکہ پانے کی چیز ہے۔ حکم دینے والے کی شان یہ ہے کہ وہ جہاں چاہتا ہے اپنا امر (حکم) ظاہر کرتا ہے، وحی سے جس قدر باقی رکھنا چاہتا ہے اس کا خود محافظ بن جاتا ہے جو حکم وقتی ضرورت کے لئے خاص ہوا سے منسوخ بھی کر دیتا ہے اور محو بھی کر دیتا ہے۔

روح سے متعلق سوال کا جواب سیاق و سباق کی روشنی میں: مفسرین کی رائے یہ ہے کہ کلام کے سیاق و سباق اور عبارت کے ربط سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں روح سے مراد "وحی" یا وحی لانے والا فرشتہ ہی ہو سکتا ہے یعنی روح سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ مشرکین کا سوال دراصل یہ تھا کہ قرآنِ حکیم وہ کہاں سے لاتے ہیں؟ روح الامین یعنی حضرت جبرائیل علیہ السلام کیسے نازل ہوتے ہیں؟ اور کس طرح نبی ﷺ کے قلب پر وحی کا القاء ہوتا ہے؟۔ اس پر اللہ ﷻ فرماتا ہے کہ اے رسول ﷺ! تم سے یہ لوگ روح، یعنی ماخذ قرآن، یا ذریعہ حصولِ قرآن کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ انہیں بتا دیں کہ یہ روح میرے رب کے حکم سے آتی ہے، مگر تم لوگوں نے علم سے اتنا کمزور حصّہ پایا ہے کہ تم انسانی ساخت کے کلام اور وحی ربانی کے ذریعہ سے نازل ہونے والے کلام کا فرق نہیں سمجھتے اور اس کلام پر یہ شبہ کرتے ہو کہ اسے کوئی انسان گھڑ رہا ہے۔

قرآنِ حکیم اور آنحضرت ﷺ کی رسالت کے حوالہ سے مخالفین اکثر اعتراضات کرتے رہتے تھے۔ اس آیتِ کریمہ میں بھی ان کے ایسے ہی ایک سوال کا جواب ہے۔ جب نبی کریم ﷺ ان کے سامنے قرآنِ حکیم کی تلاوت کرتے اور انہیں بتاتے کہ یہ آیات اللہ ﷻ کی کتاب کی ہیں جو مجھ پر نازل ہوئی ہیں تو وہ مختلف طریقوں سے اس کا اثر زائل کرنے کی کوشش کرتے۔ ان ہی کوششوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ یہ پوچھتے کہ یہ قرآنِ حکیم تمہیں کون سکھاتا ہے؟ یا کون لکھ کر دیتا ہے؟ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ قرآنِ حکیم کی زبان اور اس میں بیان کیئے جانے والے مضامین پوری نوع انسانی کی بساط سے بلند ہیں۔ آنحضرت ﷺ انہی میں پیدا ہوئے، پلے بڑھے اور زندگی کا بیشتر حصہ گزرا، اس لئے ان کے فہم کے مطابق آپ ﷺ کا علم اور آپ ﷺ کی معلومات قریش سے مختلف نہ تھیں۔ قریش جب قرآنِ حکیم میں ایک نئی صورت حال کا سامنا کرتے تو انہیں یہ سوال پریشان کرتا کہ آخر محمد (ﷺ) یہ باتیں کہاں سے سیکھتے ہیں اور یہ زبان انہیں کون سکھاتا ہے؟ چنانچہ یہی سوال انہوں نے آنحضرت ﷺ سے کیا۔ اس سوال سے ان کا منشاء یہ تھا کہ یہ کتاب کہاں سے آتی ہے؟ اس کا منبع کیا ہے؟ یا یہ پوچھنا تھا کہ اس قرآنِ حکیم کا لانے والا کون ہے؟ چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں اس کا جواب دیا گیا ہے کہ اس کتاب کا تعلق وحی الٰہی سے ہے اور اسی وحی کو قرآنِ حکیم نے روح کے نام سے یاد کیا ہے۔

یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وحی کو لانے والا وہ فرشتہ ہے جسے روح کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ تمہیں اس روح کی حقیقت سمجھائی جائے تو یہ بات تمہارے لئے مشکل ہے۔ اس لئے کہ وحی اللہ ﷻ کے پیغمبر علیہ السلام کے دل پر کیسے اترتی ہے؟ اور اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ کیفیتیں کبھی کسی کو سمجھائی نہیں جاسکتیں۔ وہ وہی جانتا ہے جس پر وہ کیفیت وارد ہوتی ہے۔ وحی کی حقیقت سے اللہ ﷻ کے نبیوں کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا، آگاہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ کسی اور کو اس سے سابقہ نہیں پڑتا۔ جہاں تک وحی لانے والے فرشتہ کا تعلق ہے، وہ بھی صرف نبیوں اور رسولوں علیہم السلام پر اللہ ﷻ کے حکم سے وحی لے کر اترتا ہے۔ ان کے علاوہ اس کی شناخت کسی اور کو حاصل نہیں۔

قرآنِ حکیم نے خود روح کے بارے میں مختلف مواقع پر جو باتیں فرمائی ہیں ان میں یہ مفہوم بہت نمایاں ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا: يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ "وہ اپنے حکم سے روح (یعنی وحی) کو نازل فرماتا ہے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے۔" (سورۃ المؤمن ۴۰، آیت:۱۵) اور دوسرے مقام پر فرمایا گیا ہے: وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا "اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے آپ کی طرف روح (یعنی قرآن) کی وحی فرمائی۔" (سورۃ الشوریٰ ۴۲، آیت:۵۲) اس سے مراد وحی بھی ہو سکتی ہے اور حضرت جبرائیل امین علیہ السلام بھی ہو سکتے ہیں۔

آیت نمبر ۸۶: اصلاً کفار کی طرف خطاب کا رخ ہے جو قرآنِ حکیم کو رسول اللہ ﷺ یا کسی اور کی طرف گھڑنے کو منسوب کرتے تھے۔ (معاذ اللہ) ان لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ قرآنِ حکیم اللہ ﷻ کا کلام ہے۔ وہ اگر چاہے تو اسے سلب کر لے پھر کوئی دوبارہ وحی کو لوٹانے پر قادر نہیں۔

علمی بات: اس آیتِ کریمہ میں کفار و مشرکین سے یہ فرمایا گیا ہے کہ قرآنِ حکیم کو گھڑ لینے کا الزام آنحضرت ﷺ پر رکھتے ہیں (معاذ اللہ) حالانکہ ان کا حال یہ ہے کہ اس وحی کے نازل ہونے میں ان کا کوئی تعلق نہیں۔ انہیں کبھی اس کا خیال بھی نہیں آیا تھا کہ ان پر وحی آئے گی اور کوئی کتاب نازل ہو گی۔ ان کی مرضی اور خواہش کے بغیر اللہ ﷻ نے ان کا انتخاب فرمایا اور اس عظیم کام کے لئے ان کو چُن لیا۔ اب جبکہ وہ اس کام کی انجام دہی میں شب و روز لگے ہوئے ہیں تو تب بھی اس وحی کے اُترنے میں ان کا کوئی دخل نہیں۔ بالفرض اگر اللہ ﷻ وحی کا آنا بند کر دے اور جو کچھ نازل ہو چکا ہے اسے واپس لے جائے تو وہ اسے روک نہیں سکتے۔ اور کوئی ایسی قوت نہیں جو اس سلسلہ میں ان کی مدد کر سکے کیونکہ اللہ ﷻ کے فیصلوں کے راستوں میں کوئی حائل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ وحی نہ کسی کی مرضی سے اُترتی ہے نہ کسی کی مرضی سے جاری رہتی ہے۔

آیت نمبر ۸۷: یہ اللہ ﷻ کی رحمت کا مظہر ہے کہ اس نے نبی کریم ﷺ کے سینہ مبارک میں قرآنِ حکیم کو محفوظ فرما دیا۔ بلاشبہ یہ اللہ ﷻ کا فضل ہے کہ اس نے قرآنِ حکیم جیسی نعمتِ عظمیٰ عطا فرمائی۔ اس کے علاوہ بھی اللہ ﷻ نے آپ ﷺ پر بہت سارے انعامات فرمائے ہیں مثلاً، رحمت للعالمین، ختم نبوت، تکمیل دین، بلند ذکر، کوثر، مقامِ محمود، وغیرہ۔

علمی بات: پچھلی آیت میں اللہ ﷻ نے اپنی قدرتِ کاملہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: کہ اس نے اپنے پیارے نبی خاتم النبیین سیدنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر جو وحی بھیجی ہے اپنی قدرت اور اختیار سے بھیجی ہے۔ آپ ﷺ کے پاس اس کا باقی رکھنا بھی اللہ ﷻ کی قدرت سے ہے۔ اگر اللہ ﷻ چاہے تو اسے سلب کر لے یعنی آپ ﷺ کو بھلا دے۔ ہاں اگر اللہ ﷻ اپنی رحمت سے پھر واپس فرما دے یا سرے سے واپس ہی نہ لے تو یہ اس کا فضل و انعام ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں اللہ ﷻ کی رحمت اور فضلِ کبیر کا ذکر ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے اس آیت میں اپنے حبیب مکرم ﷺ پر اپنی رحمت بے پایاں کا ذکر فرما کر اپنے جود و کرم اور فضل و عطا کی انتہا کر دی کہ اے محبوب ﷺ! ہم نے جو عنایات خصوصی آپ ﷺ پر فرمائی ہیں وہ قلیل اور محدود نہیں بلکہ وہ بہت زیادہ ہیں۔ لہٰذا جس فضل و کرم کو اللہ ﷻ اپنی زبانِ قدرت سے کبیر فرما رہا ہے۔ اس کے حدود کا تعین کرنا عقل انسانی کے امکان سے خارج ہے۔ بے شک اللہ ﷻ نے آپ ﷺ کو سید الخلائق بنایا، آپ ﷺ پر تکمیل دین کا اعلان فرمایا۔ کتاب کا معجزہ بھی عطا فرمایا جو کلام اللہ بھی ہے اور کتاب اللہ بھی اور اسے تاقیامت محفوظ فرمایا ہے۔ آپ ﷺ کو خاتم الانبیاء بنایا، رہتی دنیا تک آپ

ﷺ کی شریعت باقی رکھی ہے، بے شمار علوم عطا فرمائے اور بہت بڑی امت عطا فرمائی اور آپ ﷺ کے لئے مقامِ محمود کا وعدہ بھی فرمایا ہے۔ آپ ﷺ کی اتنی زیادہ فضیلتیں ہیں جو مخلوق کے شمار سے باہر ہیں۔ سورۃ النسآء ۴، آیت: ۱۱۳ میں فرمایا: "اور اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی آپ کو وہ کچھ سکھایا جو آپ نہیں جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔" یہ اس فضل کبیر کے چند جلوے ہیں۔ اسی سے شانِ مصطفوی ﷺ کا کچھ نہ کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

علمی بات: قرآنِ حکیم کا نزول اللہ ﷻ کی سب سے بڑی رحمت ہے جس کے لئے آنحضرت ﷺ کے قلب مبارک کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے آپ ﷺ کی ذات پر اللہ ﷻ کا انتہائی فضل و کرم ہے۔ اس نے آپ ﷺ کو وہ بلند مقامات عطا فرمائے ہیں جن کا تصور کرنے سے بھی ہم عاجز ہیں۔ قریش کی ساری مخالفتوں کے باوجود آپ ﷺ کے لئے اللہ ﷻ نے ایک ایسی نیک نامی، ایک ایسی شہرتِ دوام اور ایک ایسی مسلمہ فضیلت کا فیصلہ فرمایا جس سے کبھی کسی پیغمبر علیہ السلام کو بھی نہیں نوازا گیا۔

آخرت میں آپ ﷺ پر جو انعامات و اکرام، فضائل و کمالات کی بارش ہوگی، اللہ ﷻ آپ کو جو شان، رفعت اور عظمت عطا فرمائے گا اس کا اندازہ کرنا بھی ممکن نہیں۔ اللہ ﷻ کا یہ فرمانا کہ آپ ﷺ پر آپ ﷺ کے رب کا فضل کبیر ہے۔ اس فضل کی وسعتوں اور عظمتوں کا تصور کرنا بھی انسان کی طاقت سے بہت بعید ہے۔ جب اللہ ﷻ کسی چیز کو کبیر کے لفظ سے یاد فرمائے تو پھر اس کے کبیر ہونے کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔

آیت نمبر ۸۸: کفار کے اس دعویٰ کی تردید کی گئی ہے کہ وہ قرآنِ حکیم جیسا کلام پیش کر سکتے ہیں۔ تمام انسان اور جنات بھی باہم مل کر قرآنِ حکیم جیسا کلام پیش نہیں کر سکتے۔ پورا قرآنِ حکیم تو کیا اس کی ایک سورت جیسی سورت بھی پیش نہیں کر سکتے۔ (سورۃ البقرۃ ۲، آیات: ۲۳ تا ۲۴)

علمی بات: اس آیت میں قرآنِ حکیم کا اعجاز بیان فرمایا گیا ہے کہ سارے انسان اور سارے جنات آپس میں مل کر ایک دوسرے کے مددگار بن کر اگر یہ کوشش کریں کہ قرآنِ حکیم جیسا کوئی کلام بنا کر لے آئیں تو ہرگز نہیں لا سکیں گے، قرآنِ حکیم ایک ایسا معجزہ ہے کہ اس کی فصاحت و بلاغت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا قرآنِ حکیم نے عرب کے ان تمام لوگوں کو جنہیں اپنی فصاحت و بلاغت پر بہت ناز تھا یہ چیلنج دیا کہ اس جیسی ایک سورت بنا کر لے آؤ مگر آج تک وہ عاجز ہیں اور ہمیشہ عاجز رہیں گے۔ یہ بلاغت تو اعجازِ قرآنی کی وجوہات میں سے ایک وجہ ہے اس کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہات ہیں قرآنِ حکیم کے معجزہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

چونکہ نبی اکرم ﷺ خاتم الانبیاء ہیں اور آپ ﷺ کی امت بھی آخری امت ہے اور قیامت تک آپ ﷺ کی دعوت سارے انسانوں کے لئے ہے اس لئے آپ کو بہت سے معجزات جو آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں دیئے گئے ان کے علاوہ ایک ایسا معجزہ بھی دے دیا جو ہمیشہ کے لئے معجزہ ہے اور وہ قرآنِ حکیم ہے۔

علمی بات: یہ چیلنج قرآنِ حکیم میں دیگر مقامات پر بھی آیا ہے۔ مثلاً سورۃ البقرہ ۲، آیات: ۲۳، ۲۴، سورۃ یونس ۱۰، آیت: ۳۸ اور سورۃ ھود ۱۱، آیت: ۱۳، سورۃ الطور ۵۲، آیات: ۳۳ تا ۳۴۔ ان سب مقامات پر یہ بات کفار کے اس الزام کے جواب میں ارشاد ہوئی ہے کہ محمد (ﷺ) نے خود یہ قرآنِ مجید تصنیف کر لیا ہے اور وہ اسے اللہ ﷻ کا کلام بنا کر پیش کر رہے ہیں (معاذ اللہ)۔ مزید برآں سورۃ یونس ۱۰، آیت: ۱۶ میں اسی الزام کی تردید کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا گیا: "کہ اے نبی ﷺ! ان سے فرما دیجئے کہ اگر اللہ ﷻ نے یہ نہ چاہا ہوتا کہ میں قرآن تمہیں سناؤں تو میں ہرگز نہ سنا سکتا تھا بلکہ اللہ ﷻ تمہیں اس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر میں تمہارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں، کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے؟"

علمی بات: مذکورہ آیات میں قرآنِ پاک کا کلامِ الٰہی ہونے پر جو استدلال کیا گیا ہے وہ دراصل تین دلیلوں سے مرکب ہے: ایک یہ کہ یہ قرآنِ حکیم اپنی زبان، اسلوبِ بیان، طرزِ استدلال، مضامین، مباحث، تعلیمات اور اخبارِ غیب کے لحاظ سے ایک معجزہ ہے جس کی نظیر لانا انسانی قدرت سے باہر ہے۔

دوسرا یہ کہ ایک انسان تو کیا تمام دنیا کے انسان مل کر بھی اس شان کی کتاب تصنیف نہیں کر سکتے۔ بلکہ اگر وہ جنات جنہیں مشرکین نے اپنا معبود بنا رکھا ہے اور جن کی معبودیت پر یہ کتاب علانیہ ضرب لگا رہی ہے، منکرینِ قرآن کی مدد پر اکٹھے ہو جائیں تو وہ بھی ان کو اس قابل نہیں بنا سکتے کہ قرآنِ حکیم کے درجہ کی کتاب تصنیف کر کے اس چیلنج کو رد کر سکیں۔

تیسرا یہ کہ رسول اللہ ﷺ انہیں قرآنِ حکیم سنا کر کہیں چلے نہیں جاتے تھے بلکہ ان کے درمیان ہی رہتے تھے۔ وہ آپ ﷺ کی زبان سے قرآنِ حکیم بھی سنتے اور دوسری گفتگو اور تقاریر بھی سنا کرتے تھے۔ قرآنِ حکیم کے کلام اور رسول اللہ ﷺ کے اپنے کلام میں زبان اور اسلوب کا اتنا نمایاں فرق ہے کہ کسی ایک انسان کے دو اس قدر مختلف انداز کبھی ہو نہیں سکتے۔ یہ فرق صرف اسی دور میں واضح نہیں تھا جبکہ نبی ﷺ اپنے لوگوں میں رہتے تھے۔ بلکہ آج بھی حدیث کی کتابوں میں آپ ﷺ کے سینکڑوں اقوال اور خطبے موجود ہیں۔ ان کی زبان اور قرآنِ مجید کی زبان کے اسلوب اس قدر مختلف ہیں کہ زبان و ادب کا کوئی ماہر شخص یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہو سکتے ہیں۔

علمی بات: قرآنِ حکیم اپنے حروف سے لے کر اپنے مضامین تک ہر چیز میں ایک معجزہ ہے۔ اس کے الفاظ اس لحاظ سے معجزہ ہیں کہ پورے قرآنِ حکیم میں ایک لفظ بھی غیر فصیح نہیں جبکہ عربی زبان میں بیسیوں غیر فصیح الفاظ موجود ہیں۔ اس کے جملوں کی ساخت اور چستی اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس کے مرکبات کی ترکیب بے مثال ہے، اس کا اسلوب ایسا بے بدل ہے کہ اس کی نقل کرنا بھی ممکن نہیں۔ وہ شعر نہیں، لیکن شعر سے بڑھ کر اپنے اندر اپیل رکھتا ہے۔ اس کی عبارت میں ایک غنائیت ہے، توازن ہے، الفاظ میں ہم آہنگی ہے جو اپنے اندر ایسی تاثیر رکھتی ہے کہ جسے سن کر اہل زبان غلط فہمی میں اسے شعر کہہ اٹھتے تھے، اس کا باہمی ربط گہرا اور ٹھوس ہے، اس کے تاریخی مسلمات تنقید سے بالا ہیں، اس میں دی گئیں خبریں اور پیشن گوئیاں تاریخ کے مختلف ادوار میں اپنی صداقت منوا چکی ہیں، اس کا پیش کردہ نظامِ زندگی ہر طرح کے اختلاف اور باہمی تضاد سے پاک ہے، اس کا طرز استدلال اس قدر محکم ہے کہ اس کا جواب دینا سورج کو چراغ دکھانا ہے اور اس کے مباحث ہر طرح کے عیوب سے پاک ہیں۔ ایسی صفات سے مزین کتاب جن و انس کے بس کی بات کیسے ہو سکتی ہے۔ ایسا کلام صرف اللہ ﷻ، رب کائنات کا ہو سکتا ہے، کسی اور کا نہیں۔

آیت نمبر ۸۹: قرآنِ حکیم کی حقانیت اور صداقت کا بیان ہے۔ قرآنِ حکیم میں لوگوں کی رہنمائی کے لئے مختلف انداز میں دلائل بیان فرما کر حق کو واضح کر دیا گیا ہے۔ ہر بات کی وضاحت کر دی گئی جسے لوگ بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ پھر بھی اکثر لوگ حق کی مخالفت کر رہے ہیں اور اس کی ناشکری میں لگے ہوئے ہیں۔

علمی بات: جامعیتِ قرآنِ حکیم کا ذکر ہے کہ اللہ ﷻ نے قرآنِ حکیم میں ہر چیز کو مختلف طریقوں اور پیرایوں سے واضح کیا ہے تاکہ یہ لوگ سمجھیں۔ قرآنِ حکیم کے طرزِ بیان کے بارے میں ارشاد فرمایا: کہ ہم نے قرآنِ حکیم میں ہر قسم کے عمدہ مضامین مختلف طریقوں سے بیان کیئے ہیں۔

اس میں عبرتیں بھی ہیں مواعظ بھی ہیں۔ احکام بھی ہیں۔ وعدے بھی ہیں وعیدیں بھی ہیں۔ قصص بھی ہیں۔ ترغیب و ترہیب بھی ہے اور اوامر و نواہی بھی ہیں، معاشرت کا طریقہ بھی بتایا ہے اور اخلاق و آداب کا بیان بھی ہے بعد الموت کی خبریں بھی ہیں، حشر نشر کی تفصیلات بھی ہیں اور مضامین کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ تاکہ لوگ اس میں غور و فکر کر کے نصیحت حاصل کریں۔ اسی غور و فکر کے بارے میں ایک جگہ ارشاد ہوا "تو کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے؟ یا ان کے دلوں پر تالے (لگے ہوئے) ہیں۔" (سورۃ محمد ۴۷، آیت: ۲۴) لیکن اس سب کے باوجود اکثر لوگ اس کے انکار پر ہی تلے ہوئے ہیں۔

قرآنِ حکیم کا متعدد اسالیب سے ہدایت دینا: اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اللہ ﷻ نے مکہ مکرمہ والوں کی ہدایت کے لئے قرآنِ حکیم میں مختلف اسلوب استعمال کیئے جن میں سے بعض یہ ہیں:

ا۔ اہل مکہ یہ کہتے تھے یہ قرآنِ حکیم اللہ ﷻ کا کلام نہیں ہے، بلکہ محمد (ﷺ) نے بنا لیا ہے، اللہ ﷻ نے ان کو چیلنج دیا کہ اگر یہ کسی انسان کا بنایا ہوا کلام ہے تو تم اور جنات مل کر ایسا کلام بنا کر لے آؤ، لیکن وہ اس سے عاجز رہے، پھر فرمایا: چلو اس جیسی دس (۱۰) سورتیں بنا کر لے آؤ۔ "کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ اس نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ آپ فرما دیجیئے: اِس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں لے آؤ اور بلا لو اللہ کے سوا جن کو تم بلا سکتے ہو اگر تم سچے ہو۔" (سوۃ ھود ۱۱، آیت: ۱۳) وہ اس سے بھی عاجز رہے، پھر فرمایا: چلو اس کی کسی ایک سورت کی مثل بنا کر لے آؤ وہ اس سے بھی عاجز رہے۔ "اور اگر تم شک میں ہو اس (کلام کی سچائی) کے بارے میں جو ہم نے اپنے (خاص) بندہ پر نازل کیا ہے تو اس طرح کی ایک سورت لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے مددگاروں کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو۔" (سورۃ البقرۃ ۲، آیت: ۲۳) پھر فرمایا: چلو

اس کی ایک آیت کی مثل بنا کر لے آؤ۔ ”کیا وہ کہتے ہیں اس (رسول) نے اس (قرآن) کو خود گھڑ لیا ہے (نہیں) بلکہ وہ ایمان نہیں لاتے ہیں۔ تو چاہیئے کہ وہ اس جیسا کوئی کلام لے آئیں اگر وہ سچے ہیں۔“ (سورۃ طور ۵۲، آیات: ۳۳، ۳۴) وہ اس سے بھی عاجز رہے اور اس کے باوجود ایمان نہیں لائے۔

۲۔ اللہ ﷻ نے اس قرآنِ حکیم میں بار بار بتایا کہ جو قومیں ایمان نہیں لائیں اور اپنے کفر پر ڈٹے رہیں ان پر طرح طرح کی مصیبتیں اور عذاب آئے اگر اہل مکہ تم بھی اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے تو تمہارا بھی یہی حشر ہو گا مگر انہوں نے اس نصیحت کو بھی قبول نہیں کیا اور اسی طرح اپنے کفر پر جمے رہے۔

۳۔ اللہ ﷻ نے قرآنِ حکیم میں بار بار توحید پر دلائل قائم کیئے اور شرک کا رد کیا اور نبوت پر، قیامت پر اور مر کر دوبارہ زندہ کیئے جانے پر دلائل قائم کیئے اور اس سلسلہ میں منکرین نبوت اور قیامت کے جو شبہات تھے ان کا ردّ بلیغ کیا، لیکن کفار نے ان دلائل سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا وہ بدستور اپنے انکار اور عناد پر قائم رہے اور اسی طرح شرک اور بت پرستی کرتے رہے اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے رہے، آپ ﷺ کی طرف سے انہیں بہت سے معجزات دکھائے گئے لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

آیت نمبر ۹۰: کفار اور مشرکین کے ان مطالبات کا بیان جو وہ نبوت کی دلیل کے لئے معجزات کے طور پر مانگ رہے تھے۔ پہلا مطالبہ یہ تھا کہ اگر یہ اللہ ﷻ کی طرف سے رسول ہیں تو ان کے لئے پانی کے چشمے جاری کر دیں تاکہ ان کے لئے پانی کی قلت دور ہو جائے۔

علمی بات: مشرکین مکہ نے بغض اور عناد کی وجہ سے آنحضرت ﷺ سے چند فرمائشی معجزات کا مطالبہ کیا تھا۔ اللہ ﷻ نے ان کو ان مشرکین کے اصل الفاظ نقل کر کے اس کا جواب آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے دلوایا ہے۔

کفار مکہ کا فرمائشی معجزات طلب کرنا: کفار قریش نے کہا اے محمد! (ﷺ) اگر تم ہماری پیش کش کو قبول نہیں کرتے تو سنو! ہمارے شہر سے تنگ کوئی اور شہر نہیں ہے اور نہ ہم سے زیادہ سخت کسی کی معیشت ہے، تم ہمارے لئے اپنے رب سے سوال کرو جس نے تم کو بھیجا ہے کہ وہ ان پہاڑوں کو دور دور ہٹا دے جنہوں نے اس شہر کو ہم پر تنگ کیا ہوا ہے اور ہمارے شہر کو وسیع کر دے اور ہمارے لئے ایسے دریا جاری کر دے جیسے ملک شام اور عراق میں دریا ہیں اور ہمارے مرے ہوئے باپ دادا میں سے کسی کو زندہ کر کے ہمارے پاس بھیجے اور قصی بن کلاب کو بھیج دے، کیونکہ وہ سچا آدمی تھا، ہم اس سے تمہاری دعوت کے متعلق پوچھیں گے آیا تمہاری دعوت حق ہے یا باطل ہے، اگر اس نے تمہاری تصدیق کر دی اور تم نے ہمارے مطالبہ کو پورا کر دیا تو ہم تمہاری تصدیق کریں گے اور ہم جان لیں گے کہ اللہ ﷻ کے نزدیک تمہارا کیا مرتبہ ہے اور یہ کہ واقعی اللہ ﷻ نے تمہیں رسول بنایا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا کفار کے مطالبات پر جواب: تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں تمہارے پاس اس کام کے لئے نہیں بھیجا گیا ہوں، میں اللہ ﷻ کے پاس سے تمہارے لئے دین کا پیغام لایا ہوں اور میں نے اپنا پیغام تم کو پہنچا دیا ہے، اگر تم نے اس کو قبول کر لیا تو تمہارے لئے دنیا اور آخرت کی کامیابی ہے اور اگر تم نے اس کو مسترد کر دیا تو میں اللہ ﷻ کی تقدیر پر صبر و کروں گا، حتیٰ کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ ﷻ کا حکم آجائے۔

کفار کا آپ ﷺ کو جواب اور مطالبات: انہوں نے کہا اگر تم ہمارے لئے یہ مطالبہ نہیں کرتے تو اپنے لئے اپنے رب سے سوال کرو کہ وہ تمہارے ساتھ ایک فرشتہ بھیجے جو تمہارے دین کی تصدیق کرے اور تمہاری طرف سے ہم کو جواب دے اور تم اپنے رب سے سوال کرو کہ وہ تمہارے لئے باغات اور محلات بنا دے اور تمہیں سونے اور چاندی کے خزانے دے حتیٰ کہ تم تلاش معاش سے مستغنی ہو جاؤ کیونکہ تم ہماری طرح بازاروں میں جاتے ہو اور ہماری طرح روزی کی تلاش میں رہتے ہو، حتیٰ کہ ہم جان لیں کہ واقعی تم اللہ ﷻ کے رسول ہو اور اللہ ﷻ کے نزدیک تمہاری بہت فضیلت اور وجاہت ہے۔

آیت نمبر ۹۱: مشرکین کا دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ آنحضرت (ﷺ) مکہ مکرمہ کی پتھریلی زمین میں انگور اور کھجور کا ایسا باغ اگا دیں جس کے درمیان نہریں جاری ہوں۔

علمی بات: کفار کا کہنا یہ تھا کہ اوّل تو انسان کا رسول ہونا ہی عجیب بات ہے (معاذ اللہ) اگر اللہ ﷻ کا پیغام لے کر آتا تو کوئی فرشتہ آتا نہ کہ ایک گوشت پوست کا آدمی جو زندہ رہنے کے لئے غذا کا محتاج ہے تاہم اگر آدمی ہی رسول بنایا گیا تھا تو کم از کم اس کے لئے ایک بہترین باغ تو ہوتا جس میں کھجوریں اور انگور وافر مقدار

میں ہوتے اور وہ ٹھاٹ باٹھ سے اس میں رہتا اور دنیا کے بڑے لوگوں میں سے ایک ہوتا، اس کی دھاک لوگوں کے دلوں میں بیٹھتی اور اس کو دیکھنے کے لئے لوگوں کی آنکھیں ترستیں۔ یہ اچھا پیغمبر ہے جو بازاروں میں چلتا پھرتا ہے اور اپنا سودا سلف تک خود خریدتا ہے اور خود اُٹھاتا ہے، بھلا اس آدمی کو کون خاطر میں لائے گا جسے ہر راہ چلتا روز دیکھتا ہے۔ (معاذ اللہ)

آیت نمبر ۹۲: مشرکین کا تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ اگر رسول ﷺ عذاب کے دعوے میں سچے ہیں تو عذاب کی صورت میں ان لوگوں پر آسمان کو ٹکڑے کرکے گرا دیا جائے۔ مشرکین کا چوتھا مطالبہ یہ تھا کہ رسول ﷺ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو ان کے بالکل سامنے لے آئیں جو گواہی دیں کہ آپ واقعی اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔

علمی بات: انسانی عادت بھی بڑی عجیب ہے کہ جب اس کو غصہ آتا ہے تو وہ بحالت غصہ ایسی ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جو عام حالت میں کبھی نہیں کہہ سکتا۔ نبی اکرم ﷺ نے بحکم الٰہی نبوت کا دعویٰ کیا تو قریش مکہ کے غصہ کی انتہا نہ رہی اور عالم غصہ میں انہوں نے جو جو مطالبات کیئے ان میں ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ اور کچھ نہیں تو ہمارے اوپر بادل کا ایک ٹکڑا ہی گرا دو۔ اس طرح وہ گویا عذاب الٰہی کے مانگنے سے بھی نہ شرمائے۔ ایک مطالبہ ان کا یہ بھی تھا کہ ہمارے سامنے اللہ تعالیٰ کے فرشتے لا کر کھڑا کر دو۔ ان کی اس بچگانہ بات کا بھی دوسری جگہ ان کو جواب دیا گیا کہ وہ چاہے گا عذاب کے فرشتوں کو نازل کر دے گا لیکن جب ان کا نزول ہو گا تو تمہارا کام تمام کر دیا جائے گا اور جب تم ہی نہ رہے تو اس مطالبہ کا جواب کس کو سنایا جائے گا؟ اس طرح ان کے سخت سے سخت سوال سن کر بھی برداشت کیا گیا اور اللہ تعالیٰ کی پکڑ اس وقت تک نہ آئی جب تک خود نبی اعظم و خاتم النبیین ﷺ ان میں موجود رہے۔ گویا جن سے وہ مطالبہ عذاب کر رہے تھے وہی ان سے عذاب کی رکاوٹ کا اصل باعث تھے۔

علمی بات: ان بدبختوں نے اپنے مطالبات اور فرمائشی معجزات کے سلسلے میں ترقی کرتے ہوئے اس سے بھی آگے بڑھ کر کہا کہ یا آپ ہمارے سامنے اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کو لے آئیں۔ جن کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور وہ آپ کی صداقت و حقانیت کی گواہی دیں۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر ان کے اس مطالبہ کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: "اور جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں ہم پر فرشتے کیوں نازل نہیں کیئے گئے یا ہم اپنے رب کو کیوں نہیں دیکھ لیتے؟" (سورۃ الفرقان ۲۵، آیت:۲۱)

پس اس کے جواب میں ارشاد فرمایا گیا کہ "یقیناً انہوں نے اپنے آپ کو اپنے دلوں میں بہت بڑا سمجھ لیا اور انہوں نے بہت بڑی سرکشی کی۔ انہوں نے اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھا اور انہوں نے بہت بڑی سرکشی کا ارتکاب کیا۔" اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنی حفاظت و پناہ میں رکھے۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے کفار و مشرکین کے ان مطالبات کا دوسرے مقامات پر یہ جواب دیا ہے۔ ارشاد فرمایا: "کیا انہوں نے نہیں دیکھا جو ان کے آگے اور جو ان کے پیچھے ہے آسمان اور زمین میں سے اگر ہم چاہیں تو انہیں زمین میں دھنسا دیں یا ان پر گرا دیں آسمان کے ٹکڑے یقیناً اس میں ہر رجوع کرنے والے بندہ کے لئے نشانی ہے۔ (سورۃ سبا ۳۴، آیت:۹)

آیت نمبر ۹۳: پانچواں مطالبہ یہ تھا کہ آنحضرت (ﷺ) اپنے لئے سونے کا گھر بنا دیں۔ چھٹا مطالبہ یہ تھا کہ آنحضرت (ﷺ) ان کے سامنے آسمان پر جائیں اور کوئی ایسی کتاب لے کر اُتریں جس میں سے ہر شخص پڑھ سکے۔

علمی بات: سونے کے گھر کا مطالبہ: کفار و مشرکین نے آپ ﷺ سے اپنے فرمائشی معجزوں کے بارے میں مزید کہا "یا آپ کے لئے ایک گھر ہو سونے کا۔" جس پر آپ ﷺ کے لئے دنیاوی بادشاہوں کے سے ٹھاٹھ باٹھ ظاہر ہوں۔ جس کے چکاچوند سے دنیا مرعوب ہو جائے اور ہم بھی مانیں کہ واقعی آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔

آسمان پر چڑھنے کا مطالبہ: فرمائشی معجزات سے متعلق اپنے مطالبات میں مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا "یا آپ ﷺ چڑھ جائیں آسمان میں سیڑھی لگا کر ہمارے دیکھتے دیکھتے۔" یعنی آپ ﷺ ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ جائیں اور ہم دیکھ کر یقین کر لیں کہ یہ وہ کام ہے جو آپ ﷺ کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا ہے۔ تب ہم مانیں گے کہ آپ ﷺ واقعی اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں جو اس طرح آسمان پر چڑھ گئے۔

آسمان سے کتاب اتار لانے کا مطالبہ: انہوں نے مزید کہا کہ صرف اتنی بات کافی نہیں کہ آپ ﷺ آسمان میں چڑھ جائیں اور بس۔ بلکہ ہم اس وقت تک نہیں مانیں گے جب تک کہ آپ ہم پر ایک ایسی کتاب بھی نہ اتار دیں جس کو ہم پڑھیں۔ جو ہم میں سے ہر ایک کے نام ہو اور اس میں آپ پر ایمان لانے کا ہمیں حکم دیا گیا ہو۔ یعنی آسمان پر چڑھ کر ہمارے نام ایسا مکتوب لے آئیں جس میں سرداران قریش میں سے ہر ایک کے نام صاف اور صریح طور پر اس طرح لکھا ہو کہ یہ اللہ ﷻ کی طرف سے فلاں فلاں سرداروں کے نام خط ہے کہ محمد (ﷺ) واقعی میرے رسول ہیں۔ لہٰذا تم ان پر ایمان لے آؤ۔ یہاں کتاب سے مراد مکتوب ہے جو ان کی فرمائش کے مطابق اللہ ﷻ کی طرف سے ان بدبختوں میں سے ہر ایک کے نام ہو۔

منکرین کے ان مطالبوں کا مختصر اور جامع جواب: اللہ ﷻ نے اپنے حبیب ﷺ سے ارشاد فرمایا کہ: "آپ فرما دیجیئے میرا رب پاک ہے" یعنی اس طرح کے سب اُمور کا تعلق تو اللہ ﷻ کی قدرت و اختیار سے ہے اور میں نے خدائی کا ایسا کوئی دعویٰ کیا ہی کب ہے اور میں اس طرح کے ہر دعوے اور اس کے ہر شائبے سے بَری ہوں۔ میں تو تم لوگوں سے صرف یہ کہتا ہوں کہ اس مالک الملک نے مجھے اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس نے اپنی رحمت سے میرے ذریعہ تمہارے لئے حق اور ہدایت کا پیغام بھیجا ہے تاکہ اس کو اپنا کر تم لوگ دارین کی سعادت و سرخروئی سے سرفراز ہو سکو اور اپنے بُرے انجام اور ہولناک تباہی سے بچ سکو اور بس۔ اس سے آگے نہ میرا کوئی دعویٰ ہے نہ مطالبہ۔ اب اگر تم لوگ اس پیغام کو اپناؤ گے تو تمہارا اپنا بھلا۔ نہیں تو تمہارا ہی نقصان۔ تو پھر اس طرح کے مطالبات اور ایسی فرمائشوں کا مجھ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے جو اللہ ﷻ کے اختیارات سے متعلق ہوں؟

ان کے مطالبات پر رسول اللہ ﷺ کی زبانی وضاحت کی گئی ہے۔ آپ ﷺ اللہ ﷻ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اللہ ﷻ ہی کے حکم کے پابند ہیں۔ معجزات کا ظاہر کرنا صرف اللہ ﷻ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ وہ ہی کل اختیار رکھتا ہے جو چاہے سو کرے۔

علمی بات: یہ ساری فرمائشیں اور مطالبات سننے کے بعد نبی آخر الزمان ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ ان کو اس طرح جواب سنا دیں کہ آپ ﷺ کہیے میرا رب پاک ہے میں تو صرف ایک بشر ہوں جس کو رسول بنایا گیا ہے۔ رسول کا کام صرف اللہ ﷻ کا پیغام پہنچانا ہے اور وہ میں نے پہنچا دیا اور پہنچا رہا ہوں۔ لوگوں کے مطالبات پر معجزات ظاہر کر کے دکھانا یہ رسالت کا حصہ نہیں ہے۔ البتہ اگر اللہ ﷻ چاہے تو صدقِ رسالت کے لئے کوئی معجزہ دکھا دیا جاتا ہے لیکن لوگوں کی خواہشات پر اگر معجزے دکھانے شروع کر دیئے جائیں تو یہ سلسلہ کہیں بھی جا کر نہیں رک سکے گا۔ ہر آدمی اپنی خواہش کے مطابق نیا معجزہ دیکھنے کا آرزومند ہو گا اور رسول پھر اسی کام پر لگا رہے گا تبلیغ و دعوت کا اصل کام رک جائے گا اس لئے معجزات کا صدور صرف اللہ ﷻ کی مشیت سے ہی ممکن ہے۔

علمی بات: معجزہ ایک غیر معمولی اور خلافِ عادت کام ہے جو کسی نبی و رسول علیہ السلام سے نبوت و رسالت کے دعویٰ کی دلیل اور تصدیق کے لئے صادر اور ظاہر ہوتا ہے جسے دیکھ کر منکرین عاجز ہو جاتے ہیں۔ معجزہ اللہ ﷻ کی طرف سے پیغمبروں کو ہی عطا فرمایا جاتا ہے۔ جیسے مُردوں کا زندہ کرنا اور لاٹھی کو سانپ بنا دینا اور پتھر سے اونٹنی کا نکالنا اور درخت کا کلام کرنا اور انگلیوں سے پانی کا ابل پڑنا اور چاند کے دو ٹکڑے ہو جانا، (وغیرہ) یہ ایسی چیزیں ہیں کہ اللہ ﷻ کے بغیر کسی اور سے ان کا ہونا ممکن ہی نہیں ہے بلکہ یہ اللہ ﷻ کا فعل ہوتا ہے جو نبی علیہ السلام کے ہاتھ پر صادر ہوتا ہے اور نبی علیہ السلام مکذبین کو چیلنج کر کے ان کو اس فعل کے صادر کرنے سے عاجز کر دے۔

آیت نمبر ۹۴: رسول اللہ ﷺ کا انسان ہونا کفار اور مشرکین کے لئے باعث تعجب تھا۔ یہ ہی بات ان کے ایمان لانے میں مانع رہی۔

علمی بات: اَلْھُدٰی، یعنی اللہ ﷻ کی واضح ہدایت اپنے تمام دلائل و براہین کے ساتھ۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک اللہ ﷻ کی ہدایت کا تعلق ہے وہ تو نہایت واضح شکل میں اپنے ناقابل تردید دلائل کے ساتھ ان کے سامنے آچکی ہے۔ اب اگر یہ کسی چیز کو اپنے ایمان نہ لانے کے بہانے کے طور پر پیش کر رہے ہیں تو وہ صرف یہ چیز ہے کہ کیا ایک بشر کو اللہ ﷻ نے رسول بنا کر بھیجا ہے! یعنی جہاں تک دلائل کا تعلق ہے اس سے انکار کی کوئی گنجائش تو باقی نہیں رہی ہے۔ لیکن ان کا غرور اور تکبر اس بات سے مانع ہے کہ وہ ایک بشر کو اپنا رسول مان لیں۔

علمی بات: زمین والوں کے لئے کسی فرشتہ کو رسول کیوں نہیں بنایا؟

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ ﷻ نے کفار کا یہ شبہ ذکر فرمایا تھا کہ اگر نبی ﷺ کے ساتھ کوئی فرشتہ آیا تو وہ آپ ﷺ کو نبی مان لیں گے۔ اللہ ﷻ نے اس کا یہ جواب دیا کہ پھر اُن کا فرشتوں کو نبی ماننا بھی اس پر موقوف ہو گا کہ وہ کوئی معجزہ دکھائیں۔ جب اوّل وآخر معجزہ دکھانا ہی حجت ہے تو جب نبی کریم ﷺ نے اپنی نبوت پر معجزہ پیش کر دیا تو پھر ان کو نبی کیوں نہیں مانا؟

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر روئے زمین پر رہنے والے فرشتے ہوتے تو اللہ ﷻ ان کی طرف فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتا، کیونکہ ہر چیز اپنی جنس کی طرف مائل ہوتی ہے اور جب روئے زمین پر رہنے والے انسان اور بشر ہیں تو پھر ان کی طرف انسان کو ہی رسول بنا کر بھیجنا مناسب تھا۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ جب اللہ ﷻ نے حضور ﷺ کی نبوت کی تائید میں معجزہ نازل فرما دیا تو آپ ﷺ کی نبوت پر اللہ ﷻ کی شہادت حاصل ہوگئی اور آپ ﷺ کی نبوت پر اس کی شہادت کافی ہے۔

پھر فرمایا: بے شک وہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا اور ان کو خوب دیکھنے والا ہے، یعنی وہ اپنے بندوں کے ظاہر اور باطن کو جاننے والا ہے اور وہ ان کے دلوں کے احوال کو جاننے والا ہے۔ اس کو علم ہے کہ ان کے شبہات محض حسد اور عناد پر مبنی ہیں حق کو سمجھنے میں انہیں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

آیت نمبر ۹۵: رسول اللہ ﷺ کے انسان ہونے پر کفار اور مشرکین کے اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ اگر زمین پر فرشتے آباد ہوتے تو ان کے لئے کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجا جاتا۔ زمین میں انسان آباد ہیں تو ان کی ہدایت کے لئے انسان کو ہی رسول بنایا گیا۔ رسول صرف اللہ ﷻ کے پیغام کو پہنچاتے ہی نہیں بلکہ اللہ ﷻ کے احکام کے مطابق عمل کر کے لوگوں کو عملی نمونہ بن کر دکھاتے ہیں۔ البتہ تمام انبیاء ورسل علیہم السلام اللہ ﷻ کے چنے ہوئے خاص بندے ہوتے ہیں اور بہت بلند مقام کے حامل ہوتے ہیں۔

علمی بات: گزشتہ آیتِ کریمہ میں اہل مکہ کا آپ ﷺ پر ایمان نہ لانے کا جو سبب بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت کریمہ میں اس کا جواب دیا گیا ہے کہ تم یہ بتاؤ کہ زمین پر بسنے والے کیا انسانوں کے علاوہ کوئی اور مخلوق ہے؟ کیا وہ فرشتے ہیں۔ اگر تو ایسا ہے تو پھر تو یقیناً اللہ ﷻ کو چاہیے تھا کہ ان کی ہدایت کے لئے کسی فرشتہ کو بھیجتا لیکن جب زمین پر رہنے والے انسان ہی ہیں تو پھر ان کی ہدایت کے لئے انسان کے علاوہ کسی اور کو کیسے بھیجا جا سکتا ہے؟

اللہ ﷻ کا رسول دنیا میں صرف زندگی گزارنے کے لئے نہیں آتا بلکہ وہ انسانوں کی اصلاح کے لئے آتا ہے۔ ایک ایک شخص کے دل میں اللہ ﷻ کی محبت اور اس کی بندگی کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ اللہ ﷻ کی ذات اور اس کی صفات کا صحیح شعور دماغوں میں اُتارتا ہے پھر اسے اس کے مقصد زندگی سے آگاہ کرتا ہے۔ پھر انسانوں کو اجتماعی زندگی گزارنے کے لئے اللہ ﷻ کی طرف سے شریعت پہنچاتا ہے اور ان کی عملی زندگی پر اس کا انطباق کر کے دکھاتا ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں میں اس طرح رہنمائی مہیا کرتا ہے کہ کہیں بھی انسانوں کو کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ جو لوگ اس کی رہنمائی کو قبول کرتے ہیں ان سے ایک معاشرہ تشکیل کرتا ہے اور اس نئے دین کی مخالفت کرنے والوں کی مخالفت کو برداشت کرنے اور ان سے عہدہ برآں ہونے کی تربیت دیتا ہے۔ حق وباطل کی یہ کشمکش اگر حرب وضرب کے دور میں داخل ہو جاتی ہے تو اس میں بھی پوری طرح ان کی قیادت کرتا ہے۔ غرض یہ کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے جتنے مدارج ہیں ان میں ایک ایک مرحلہ پر تربیت کا اس طرح سامان کرتا ہے کہ کہیں بھی رہنمائی کا جھول پیدا نہیں ہوتا اور ایک ایسی مکمل زندگی وجود میں آتی ہے جس سے بہتر زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ تصور کیجیے کہ اگر بشر کے بجائے کسی فرشتہ کو اس کام کے لئے بھیجا جاتا تو وہ اسے کیسے سرانجام دے سکتا تھا اور اس پر ایمان لانے والے اس سے کیا استفادہ کر سکتے تھے۔ نہ وہ نظر آتا کہ اس کی پیروی کر سکیں، نہ اسے بھوک لگتی، نہ اسے کسی تکلیف کا احساس ہوتا، نہ اس کے اندر انسانی احساسات ہوتے، نہ اس کی بیوی ہوتی، نہ بچے ہوتے، نہ اسے کھانے پینے کی ضرورت لاحق ہوتی، نہ اسے انسانی معاملات سے سابقہ پڑتا، تو وہ اُسوۂ حسنہ جس کی رہنمائی اور پیروی میں امت کا کردار تشکیل پاتا ہے، وہ کہاں سے وجود میں آتا۔ اس لئے عقل اور حکمت کی بات اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ معلّم، مربی اور پیغمبر مخلوق کی اسی صنف میں سے ہونا چاہیئے جس صنف کی رہنمائی کے لئے اسے بھیجا جا رہا ہو۔ نبی کریم ﷺ چونکہ انسانوں کی رہنمائی کے لئے دنیا میں تشریف لائے تو اس لئے آپ ﷺ کو

بشر پیدا کیا گیا۔ آپ ﷺ اپنی ذات اور ذاتی ضروریات میں یقیناً باقی انسانوں کی طرح ایک انسان اور ایک بشر ہیں اور یہی ہمارا ایمان ہونا چاہیئے لیکن اپنے فضائل وکمالات اور مراتب کے اعتبار سے آپ ﷺ خیر البشر ہیں جس کا ہمسر نہ کوئی انسان ہے اور نہ کوئی فرشتہ۔

آیت نمبر ۹۶: ہٹ دھرمی پر اصرار کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تو اللہ ﷻ کا پیغام پہنچا کر اپنی ذمہ داری پوری فرمادی۔ اگر مشرکین آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی دینے کو تیار نہیں تو اس کے لئے اللہ ﷻ کی گواہی کافی ہے جو بندوں کے حال سے خوب باخبر ہے۔ ہر ایک کا اس کے عمل کے مطابق محاسبہ ہوگا۔

علمی بات: آنحضرت ﷺ سے فرمایا جارہا ہے کہ آپ ﷺ اہل مکہ سے کہہ دیجئے کہ اللہ ﷻ میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لئے کافی ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ تمہارے ایمان نہ لانے کا سبب محض تمہاری ضد اور انانیت ہے۔ اللہ ﷻ دلوں میں چھپی ہوئی نیتوں کو جانتا ہے۔ وہ بندوں کے ظاہر وباطن سے واقف ہے۔ فیصلہ آخر کار اسی کو کرنا ہے۔ اس لئے میں معاملہ اسی کے سپرد کرتا ہوں۔ کیونکہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ ان لوگوں نہ تو آپ ﷺ کے کردار پر اعتراض تھا اور نہ ان کو آپ ﷺ کی دعوتِ حق میں شبہ تھا۔ انہیں صرف آپ ﷺ کے بشر ہونے پر اعتراض تھا۔ جس کا مکمل جواب گزشتہ آیت کریمہ میں دے دیا گیا۔ اگر نیت سمجھنے کی ہو تو اس سے زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں، لیکن اگر اس کے باوجود بھی وہ اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں تو پھر یہ معاملہ اللہ ﷻ کے سپرد ہے۔ وہی ان کا فیصلہ فرمائے گا۔

آیت نمبر ۹۷: سیدھی راہ ان ہی کو نصیب ہوتی ہے جو ہدایت کے طلب گار ہوتے ہیں۔ دنیا میں حق کے معاملہ میں اندھے، گونگے اور بہرے بننے والوں کا قیامت کے دن حال بیان کیا گیا ہے۔ انہیں چہرہ کے بل اندھا، گونگا اور بہرا اُٹھایا جائے گا۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا جس کا عذاب کبھی ہلکا نہیں ہوگا۔

ہدایت کے لئے اللہ ﷻ کی سنت: قرآنِ حکیم کی تمام تر وضاحتوں اور آنحضرت ﷺ کی بے پناہ کوششوں کے باوجود جب مشرکین مکہ ایمان لانے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے تو آنحضرت ﷺ کا دل بہت رنجیدہ وافسردہ ہوجاتا، کیونکہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ یہ ایمان نہ لانے والے آج اس قدر اکڑ دکھا رہے ہیں اور کسی کی بات سننے کے روادار نہیں۔ کاش انہیں یقین آجاتا کہ ان کی یہ روش قیامت کو انہیں بہت مہنگی پڑے گی اور ان کا انجام بہت خطرناک ہوگا۔ آپ ﷺ کی اس دل گرفتگی کو دیکھتے ہوئے پروردگار نے مختلف مواقع پر آپ ﷺ کو تسلی بھی دی ہے اور ساتھ ہی ساتھ انکار کرنے والوں کو تنبیہ بھی۔ چنانچہ یہاں بھی نبی کریم ﷺ کو اطمینان دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ آپ ﷺ کی تبلیغی مساعی میں کوئی کمی نہیں۔ لیکن ہدایت وہی پاتا ہے جسے اللہ ﷻ ہدایت دے اور جسے اللہ ﷻ گمراہ کردے، اللہ ﷻ کے سوا اس کی کوئی مدد کرنے والا نہیں۔ البتہ ساتھ ہی ساتھ یہ بات واضح فرمادی کہ ہمارے یہاں ہدایت وضلالت کا ایک قانون ہے۔

جب کسی قوم میں اللہ ﷻ کا رسول مبعوث ہوتا ہے اور وہ اپنی قوم میں شب وروز تبلیغ ودعوت کے لئے جان لڑاتا ہے، اپنی صلاحیت کا ایک ایک قطرہ اس راستہ میں نچوڑ دیتا ہے اور لوگوں کو ہر پہلو سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن قوم پیغمبر کی دعوت پر غور کرنے کے بجائے اس کے انکار پر تل جاتی ہے۔ مزاحمت کا ہر طریقہ اختیار کرتی ہے، اذیت رسانی میں وہ دشمنوں سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے تو پروردگار ایک مدت تک ایسے لوگوں کو مہلت دیتا چلا جاتا ہے۔ لیکن پھر ایک وقت آتا ہے جب اللہ ﷻ کا قانون حرکت میں آتا ہے اور ان کی محرومی کا فیصلہ کردیا جاتا ہے۔ ان کے دلوں پر مہر لگادی جاتی ہے اور گمراہی کی چھاپ ایسی گہری کردی جاتی ہے جس سے نکلنا ان کے بس میں نہیں رہتا۔ چنانچہ اللہ ﷻ کی دی ہوئی نعمتوں کے غلط استعمال کی وجہ سے ان کی بینائی، ان کی شنوائی اور ان کی گویائی سلب کرلی جاتی ہے۔ آخر ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

آیت نمبر ۹۸: آیات سے مراد معجزات، نشانی، احکام اور دلائل ہیں۔ قیامت کے دن گمراہوں کو سزا دینے کی وجہ بیان کی گئی ہے۔ انہوں نے اللہ ﷻ کی نازل کردہ آیات کی تصدیق نہ کی اور نہ ہی ان پر غور وفکر کیا۔ انہوں نے دوبارہ زندہ ہونے کو تسلیم نہیں کیا، حالانکہ اللہ ﷻ کے لئے ایسا کرنا کوئی مشکل نہیں۔

قیامت سے انکار کا نتیجہ: گزشتہ آیتِ کریمہ میں اللہ ﷻ کے قانون ہدایت وضلالت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جب انسان اللہ ﷻ کی دی ہوئی صلاحیتوں سے قبولیتِ حق میں کام لینے کی بجائے حق کی مخالفت میں کام لینا شروع کردیتا ہے اور سمجھانے بجھانے کی تمام کوششوں کے باوجود وہ پلٹنے کا نام

نہیں لیتا تو تب اللہ ﷻ کی طرف سے اس کی محرومی کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ پیش نظر آیتِ کریمہ میں مشرکین مکہ کے بگڑے ہوئے رویئے اور اللہ ﷻ کے دین سے مخالفت وعناد کے حوالہ سے ان کی صرف ایک بات کا ذکر کیا جارہا ہے کہ ان کا حال یہ ہے کہ متعدد مواقع پر قیامت کو دلائل سے ثابت کیئے جانے کے باوجود جب بھی انہیں موقع ملتا ہے وہ بڑی بلند آہنگی سے یہ کہتے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جب ہم مرنے کے بعد بوسیدہ ہڈیوں اور ریزہ ریزہ جسم کی صورت میں مٹی میں مل جائیں گے تو ہمیں اس وقت از سرنو زندہ کرکے اٹھایا جائے گا۔ یہ ایک ایسی ناقابل یقین بات ہے کہ جسے ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اے کاش! انہیں احساس ہوتا کہ یہی ناقابلِ یقین بات واقعی بننے والی ہے۔ سب لوگ زندہ کرکے اٹھائے جائیں گے اور انکار کرنے والے اپنے بدترین انجام کو پہنچیں گے۔

آیت نمبر ۹۹: مشرکین کے دوبارہ زندہ ہونے کے بارے میں شبہ پر جواب دیا گیا ہے۔ جس ذات نے پوری کائنات پیدا فرمائی وہ ان کو دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ اجل سے مراد موت یا قیامت ہے۔ دوبارہ اٹھائے جانے کا ایک وقت مقرر ہے لیکن ظالم کفر ہی پر جمے ہوئے ہیں۔

علمی بات: آخرت کا انکار کرنے کے لئے منکرین کے پاس بڑی سے بڑی دلیل یہ ہے کہ جب ہماری ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو کر مٹی کے ساتھ مل جائیں گی۔ تو ہمیں کس طرح زندہ کیا جائے گا؟ قرآنِ حکیم نے دیگر دلائل کے ساتھ یہ دلیل بھی پیش فرمائی ہے کیا آخرت کے منکر اس بات پر غور نہیں کرتے کہ جس اللہ ﷻ نے زمین و آسمانوں کو پیدا فرمایا ہے۔ وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ ان جیسے اور لوگ پیدا فرمادے۔ اس نے لوگوں کو دوبارہ پیدا کرنے کے لئے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے۔ جس کے آنے میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود ظالم اس دن کا انکار کرتے ہیں۔ یہ حقیقت بھی کئی دفعہ قرآنِ حکیم نے واضح کی ہے کہ اللہ ﷻ نے زمینوں و آسمانوں کو بغیر نمونہ کے پیدا کیا ہے۔ یعنی ان کے پیدا کرنے سے پہلے نہ زمین و آسمان کا میٹریل تھا اور نہ ہی نمونہ موجود تھا۔ اللہ ﷻ نے نا صرف ان کا میٹریل پیدا کیا۔ بلکہ اس کے حکم سے زمین و آسمان اور کائنات کی ہر شے معرضِ وجود میں آئی کیونکہ جب وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے۔ تو فقط اتنا فرماتا ہے کہ "ہوجا" وہ کام اور چیز اللہ ﷻ کی منشاء کے مطابق وجود میں آجاتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: (اللہ) آسمانوں اور زمینوں کا مُوجد ہے اور جب وہ کسی کام کا فیصلہ فرماتا ہے تو اس سے بس اتنا فرماتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔ (سورۃ البقرۃ ۲، آیت: ۱۱۷)

مشرکین مکہ کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اگر قیامت کا آنا واقعی ایک حقیقت ہے تو پھر وہ آج تک آئی کیوں نہیں؟ آخر اسے کس چیز نے روک رکھا ہے۔ اس آیت کے دوسرے حصے میں پروردگار نے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: کہ اللہ ﷻ کے یہاں کام الٹ پلٹ نہیں ہوتے، اس کے یہاں ہر کام کا ایک فیصلہ ہوتا ہے اور ہر فیصلہ کے پیچھے ایک حکمت ہوتی ہے۔ قیامت کے لئے بھی اس نے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے، لیکن اس کا علم اس کے سوا کسی اور کو نہیں۔ اس مقرروقت پر قیامت کا آنا یقینی ہے۔ جب وہ وقت آجائے گا اس میں تقدیم وتاخیر نہیں ہوگی۔ لیکن ان ظالموں کا کیا کیا جائے یہ قیامت کے وقوع پر ایک سے ایک دلیل سن چکے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے انکار اور کفر میں کوئی کمی نہیں آئی۔ انہیں ہر چیز سے انکار ہے لیکن اپنے جامد رویہ سے نہ انکار ہے اور نہ اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہیں۔

آیت نمبر ۱۰۰: مشرکین کی مذمت کی گئی ہے۔ وہ رسالت کو اس وجہ سے بھی تسلیم نہیں کرتے کہ رسول اللہ ﷺ کا تعلق امیر خاندان سے نہیں تھا (معاذ اللہ)۔ بالفرض اگر یہ مشرکین وہ اللہ ﷻ کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو خرچ ہو جانے کے خوف سے وہ اسے روکے رکھتے۔ حالانکہ اللہ ﷻ کے خزانے ختم ہونے والے نہیں۔ نبوت ورسالت بھی اللہ ﷻ کی رحمت کا ایک خزانہ ہے۔ وہی جانتا ہے کہ رسالت کا مستحق کون ہے۔ لیکن سرکش انسان بڑا تنگ دل ہوتا ہے۔ بخل سے کام لیتا ہے اور لوگوں کو دینے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔

کفارِ مکہ کی تنگ نظری اور انسان کی فطرت: قریشی سردار جو آپ ﷺ کی مخالفت پر کمربستہ ہوگئے تھے تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ آپ ﷺ کو جھوٹا سمجھتے تھے اور نہ یہ تھی کہ انہیں دعوتِ دین کے دلائل کی سمجھ نہیں آتی تھی بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ تھی کہ اگر وہ اسلام قبول کرلیتے تو ان کی سرداریاں اور چودھراہٹیں انہیں چھینتی نظر آرہی تھیں۔ اور انہیں پیغمبر اسلام ﷺ کے تابع ہو کر رہنا پڑتا تھا۔ نیز اگر اسلام پھیل جاتا تو انہیں کعبہ کی تولیت کی وجہ سے عرب بھر میں جو عزت اور وقار حاصل تھا وہ بھی ان سے چھنتا نظر آرہا تھا۔ لہٰذا ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اسلام کا خاتمہ ہی کردیا جائے اور حقیقتاً انسان

ایسا ہی بخیل واقع ہوا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کوئی دوسرا اس کے مقابلہ پر سر نہ نکالے۔ اسی بات کو واضح کرتے ہوئے اللہ ﷻ نے فرمایا: کہ اگر ان کے پاس زمین بھر کے خزانے بھی ہوں تو ان کا یہ حال ہے کہ وہ کسی کو چھوٹی کوڑی بھی نہ دیں۔ مبادا کہ وہ کسی وقت ان کے مقابلہ پر آجائے۔ یہ تو اللہ ﷻ کی مہربانی ہے کہ ہر طرح کے خزانے اسی کے پاس ہیں اور جس کسی پر جس طرح کا چاہے فضل کرتا رہتا ہے۔

علمی بات: اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کا کچھ نہ کچھ طبعی رجحان بخل کی طرف ہوسکتا ہے لیکن کافر اس لئے زیادہ بخیل ہوتا ہے کہ اسے آخرت میں کسی اجر وثواب کی اُمید نہیں ہوتی مال کے حوالہ سے کافر کے بخیل ہونے کا ذکر فرما کر یہ واضح کیا گیا ہے۔ یہ اس کی کم ظرفی کا نتیجہ ہے کہ جس طرح وہ اپنے ہاتھ سے کوئی چیز دینا پسند نہیں کرتا اسی طرح وہ اپنا باطل نظریہ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ کیونکہ اسلام قبول کرنے میں کافر کو اپنے مال اور دنیوی عزت کے بارے میں نقصان کا اندیشہ ہوتا۔

آیت نمبر ۱۰۱: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان نو(۹) معجزات کا ذکر جس کا مشاہدہ فرعون اور اس کی قوم نے کیا۔ یہ معجزات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے واضح دلائل تھے لیکن فرعون ایمان نہیں لایا بلکہ اس نے معجزات کو جادو قرار دیا (معاذ اللہ)۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر کفارِ مکہ کو ان کے مطلوبہ معجزات دکھا بھی دیئے جائیں تو یہ آلِ فرعون کی طرح ایمان نہیں لائیں گے۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ نے جو یہ فرمایا: کہ ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کھلی ہوئی نو(۹) نشانیاں عطا کیں، ان نشانیوں سے کون سی نشانیاں مراد ہیں۔ مفسرین نے فرمایا ہے کہ ان سے یہ معجزات مراد ہیں جو قرآنِ حکیم میں دیگر مقامات پر مثلاً (سورۃ الاعراف ۷، آیات: ۱۰۷، اور ۱۰۸، ۱۳۰ تا ۱۳۳) میں ذکر ہوئے ہیں، جو یہ ہیں:

۱۔ عصا کا سانپ بن جانا۔ ۲۔ ہاتھ کا چمکتا ہوا ہو جانا۔ ۳۔ کئی قسم کے عذاب آل فرعون پر نشانی کے طور پر بھیجے جیسے پھلوں کا نقصان

۴۔ قحط سالی۔ ۵۔ طوفان۔ ۶۔ ٹڈیاں۔ ۷۔ جوئیں۔ ۸۔ مینڈک۔ ۹۔ خون۔

چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور بھی ہیں اس لئے بعض حضرات نے ان کو بھی ان ہی کے ذیل میں ذکر فرمایا ہے۔ یہ ایسے واضح معجزات تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر بھی واضح دلائل تھے اور فرعون اور آل فرعون کے قلبی اطمینان کے لئے بھی کافی تھے لیکن وہ پھر بھی ایمان نہ لائے اس کی وجہ بھی وہی ہے جو پچھلی آیت کی تشریح میں مذکور ہے۔ قریش کا بھی یہی حال تھا۔ کچھ معجزات تو وہ دیکھ چکے تھے مگر ایمان نہ لائے تھے۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر ان کے مطلوبہ معجزات دکھلا بھی دیئے جائیں تو یہ بھی فرعونیوں کی طرح ایمان لانے کی طرف کبھی نہ آئیں گے۔

علمی بات: فرعون کی نظر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سحر زدگی یا دیوانگی یہ تھی کہ آپ علیہ السلام نے اس سے برملا بنی اسرائیل کی آزادی اور انہیں اپنے ہمراہ بھیجنے کا مطالبہ کر دیا۔ کیونکہ وہ خود کو ایسا شہنشاہ سمجھتا تھا جو اپنی تمام رعایا کے سیاہ و سفید کا مالک بنا بیٹھا تھا اور ازراہِ تکبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دعویٰ نبوت اور اس مطالبہ کو دیوانگی پر محمول کرتا تھا (معاذ اللہ) اور بعض لوگوں نے یہاں مسحور سے مراد ساحر لیا ہے جیسا کہ فرعون اپنی رعایا کو یہی یقین دلانا چاہتا تھا۔

علمی بات: آیات سے بھی کفار مکہ کو ان کے فرمائشی معجزات کے مطالبہ کا جواب دینا ہے کہ ہم نے تمہارے فرمائشی معجزات سے بھی قوی معجزے قوم فرعون کے سامنے پیش کیئے۔ پس واضح ہو گیا کہ ایسے قوی معجزے نازل کرنا ہماری قدرت سے باہر نہیں ہے، پس اگر ہمیں یہ علم ہوتا ہے کہ تمہارے لئے بھی ان معجزات میں کوئی مصلحت ہے تو ہم تمہارے لئے بھی ایسے معجزات نازل کر دیتے۔

بنی اسرائیل سے سوال کرنے کی توجیہہ: اس آیت میں آپ ﷺ سے جو یہ فرمایا گیا: کہ آپ ﷺ بنی اسرائیل سے پوچھیں تو اس سوال کا یہ مقصد نہیں ہے کہ آپ ﷺ بنی اسرائیل سے سوال کر کے ان سے کسی چیز کا علم حاصل کریں بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ علماء یہود اور ان کے عوام پر ظاہر کیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ صحیح ہے اور صداقت پر مبنی ہے۔ اس کی دوسری توجیہہ یہ ہے کہ آپ ﷺ بنی اسرائیل سے سوال کیجئے کہ وہ آپ ﷺ پر ایمان لے آئیں اور اعمال صالحہ کریں اور آپ ﷺ کے ساتھ تعاون کریں۔ اس کی تیسری توجیہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے عہد میں جو بنی اسرائیل موجود ہیں یہ ان ہی کی

اولاد ہیں جن کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام گئے تھے اور وہ ان واقعات کو مانتے تھے اور ان کی تصدیق کرتے تھے، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے ساتھ پیش آئے تھے۔

آیت نمبر ۱۰۲: معجزات جادو قرار دئے جانے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کو دیئے گئے جواب کا ذکر ہے۔ رب کائنات کی بصیرت افروز نشانیوں کو جھٹلا کر وہ فرعون اپنی ہلاکت اور بربادی کو یقینی بنا چکا تھا۔

علمی بات: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا، تمہیں معلوم ہے کہ یہ نشانیاں اس اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہیں جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے اور دل سے اللہ تعالیٰ کی ہدایت طلب کرنے والوں کے لئے ان میں بڑی عبرتیں ہیں، لیکن تم اپنے کبر وعناد کی وجہ سے ان کا انکار کر رہے ہو اور انہیں جادو کا اثر بتا رہے ہو۔ اے فرعون! تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور کر دیا گیا ہے اور بالآخر تو ہلاک کر دیا جائے گا۔

آیت نمبر ۱۰۳: معجزات کا کوئی معقول جواب نہ ملنے پر فرعون نے چاہا کہ بنی اسرائیل کو تباہ کر دے یا ملک سے نکال دے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی مدد فرمائی اور فرعون کو اس کے لشکر سمیت سمندر میں غرق کر دیا گیا۔

قریش کے لئے آئینہ: فرعون اور آل فرعون کی تمام تر سختیوں اور اذیتوں کے باوجود جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ و دعوت کا سلسلہ نہ رکا اور آپ علیہ السلام مسلسل اپنے مشن میں آگے بڑھتے رہے تو فرعون نے ارادہ کیا کہ انہیں سرزمین مصر سے نکال دے اور ایسی صورتِ حال پیدا کر دے کہ ان کے پاؤں اُکھڑ جائیں اور وہ کسی طرح مصر میں رہنے کے قابل نہ رہیں اور ہجرت پر مجبور ہو جائیں، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو نکالنا چاہا لیکن ہم نے اس کی اس جسارت کی پاداش میں اسے اور اس کے ساتھیوں کو اکٹھے سمندر میں غرق کر دیا۔

آیت نمبر ۱۰۴: زمین سے مراد شام و فلسطین کی سرزمین ہے کیونکہ مصر چھوڑنے کے بعد بنی اسرائیل وادیِ تیہ سے ہو کر اپنے آبائی وطن پہنچ گئے تھے۔ فرعون کی ہلاکت کے بعد بنی اسرائیل کو زمین میں ایمان اور عمل صالح کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ آخرت کے دو معانی ہیں: ایک معنیٰ یہ ہے کہ قیامت کے قریب انہیں سمیٹ کر ایک جگہ جمع کر دیا جائے گا تاکہ ان کا فیصلہ کر دیا جائے۔ دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ روزِ قیامت حتمی فیصلہ اور انجام کے لئے جمع کیا جائے گا۔

علمی بات: ان الفاظ میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ جب آخرت کا وقت قریب آئے گا تو بنی اسرائیل کو ہر کہیں سے اکٹھا کر کے ایک جگہ جمع کر لیا جائے گا۔ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کر کے بہت بڑے جرم کے مرتکب ہو چکے تھے۔ اس کے بعد نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کو جھٹلا کر انہوں نے اپنے اس جرم کی مزید توثیق بھی کر دی۔ چنانچہ اب اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس قوم کی حیثیت اس قیدی کی سی ہے جس کو اس کے جرم کی سزا سنائی جا چکی ہو مگر اس سزا کی تعمیل (execution) ابھی باقی ہو۔ اس سورت کے نزول کے وقت بنی اسرائیل کے دور انتشار (Diaspora) یعنی فلسطین سے بے دخل ہوئے ساڑھے پانچ سو (۵۵۰) سال ہو چکے تھے۔ اُنیسویں صدی عیسوی تک بھی ان کی کیفیت یہ تھی کہ یہ لوگ پوری دنیا میں بکھرے ہوئے تھے۔ چونکہ کسی اجتماعی سزا یا عذاب کے لئے ان کا ایک جگہ اکٹھے ہونا ضروری تھا، اس لئے قدرت کی طرف سے اسرائیل کی ریاست کا قیام عمل میں لایا گیا اور زیرِ نظر آیت کے الفاظ کے عین مطابق دنیا کے کونے کونے سے تمام یہودیوں کو اکٹھا کر کے یہاں آباد کیا گیا۔ اب اپنے زعم میں تو ان لوگوں نے عظیم تر اسرائیل (Greater Israel) کا منصوبہ اور نقشہ تیار کر رکھا ہے اور عین ممکن ہے ان کا یہ منصوبہ پورا بھی ہو جائے مگر بالآخر یہ عظیم تر اسرائیل ان کے لئے عظیم تر قبرستان ثابت ہو گا (ان شاء اللہ) آخری زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے اور آپ علیہ السلام ہی کے ہاتھوں اس قوم کی ہلاکت ہو گی۔

علمی بات: اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں ایک اور قول واحتمال یہ بھی ہے کہ اس حشر سے مراد بنی اسرائیل کا ارضِ فلسطین ہی میں دوبارہ جمع ہونا ہے۔ جیسا کہ آج کل ایسا ہو رہا ہے کہ ارضِ فلسطین میں یہود تمام اطرافِ عالم سے آکر جمع ہو رہے ہیں۔ جہاں ان پر دوسرا عذاب واقع ہو گا۔ رہ گئی یہ بات کہ وہ کب؟ کس شکل میں؟ کس طرح؟ اور کن کے ہاتھوں ہو گا؟ تو ان سب امور کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ البتہ اتنی بات بطور اصول کے یاد رکھنے کی ہے کہ قوموں کے فیصلے دنوں اور مہینوں میں نہیں، صدیوں سالوں میں بدلا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے پیمانے اور اس کا حساب بندوں کے پیمانوں سے بہت مختلف ہے۔ بندوں کی گنتی کے حساب سے

ایک ہزار برس اللہ ﷻ کے یہاں ایک دن کے برابر ہے۔ ۱۹۶۷ء میں عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی نہایت ذلت آمیز شکست کے بعد بیت المقدس مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر یہود کے قبضہ میں چلا گیا اور اب تک ان ہی کے ناپاک قبضے میں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس حشر سے مراد بنی اسرائیل کا وہی حشر ہے جو اسی دنیا میں ارضِ فلسطین میں ہوگا اور وقت ان شاء اللہ ضرور آئے گا کہ یہ ارضِ فلسطین یہود کا اجتماعی قبرستان بنے گا۔ کیونکہ حشر کا جمع ہونا صرف بنی اسرائیل کے لئے خاص نہیں بلکہ عام اور سب ہی کو شامل ہے کہ اس روز تو تمام اقوامِ عالم جمع ہوں گے نہ کہ صرف یہود۔

نوٹ: بنی اسرائیل کے بارے میں مزید تفصیلات مطالعۂ قرآنِ حکیم حصہ پنجم میں سورۃ بنی اسرائیل کے ضمن میں "تاریخ بنی اسرائیل" کے عنوان سے دی گئی ہیں۔ اس کا مطالعہ مفید رہے گا۔ ان شاء اللہ۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے بنی اسرائیل سے یہ کہا کہ دیکھو تم پر اللہ ﷻ کا کتنا بڑا انعام ہوا ہے کہ ہم نے تمہیں فرعونیوں کے ظلم سے نجات دی ہے۔ اب تم اس زمین میں رہو، بسو۔ مراد اس سے ارضِ مقدس ہے جس کا بنی اسرائیل سے وعدہ تھا۔ لیکن ساتھ ہی انہیں یاد دلایا کہ اس انعام کو پانے کے بعد کہیں آخرت کے وعدہ کو نہ بھول جانا۔ تمہیں اندازہ ہونا چاہیئے کہ جس طرح ہم نے تمہیں وعدہ کے مطابق ارضِ مقدس عطا کی ہے اسی طرح ہم ایک دن قیامت بپا کریں گے اور تم سب کو میدانِ حشر میں جمع کر دیں گے، لیکن افسوس کہ بنی اسرائیل اس وعدہ کو بھول گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی تاریخ میں بار بار اللہ ﷻ کے عذاب کا شکار ہوتے رہے اور آج وہ دنیا میں عبرت کا نشان ہیں۔

علمی و عملی بات: بنی اسرائیل کی تاریخ کا حوالہ دے کر درحقیقت قریش کو یہ بات سمجھانا ہے کہ جس طرح فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سرزمینِ مصر سے نکالنے کی کوشش کی اور اس کے نتیجہ میں تباہ ہو گیا، تم بھی اسی طرح نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو ہجرت پر مجبور کرنا چاہتے ہو۔ تمہیں تاریخ کے اس آئینہ میں اپنا انجام دیکھنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۱۰۵: مشرکین مکہ کے اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ جو قرآنِ حکیم کو اللہ ﷻ کی طرف سے نازل کردہ ہونے پر شک کرتے تھے۔

قرآنِ حکیم کو حق کے ساتھ نازل فرمانے سے مراد: ۱۔ قرآنِ حکیم کو نازل فرمانے والی ذات برحق ہے اور اس طرح یہ کلام بھی برحق ہے۔

۲۔ قرآنِ حکیم کے نزول کے بعد اس میں نہ کوئی کمی بیشی ہوئی نہ اس میں باطل کی آمیزش ہوئی۔

۳۔ قرآنِ حکیم جو عقائد، احکام، واقعات اور پیشن گوئیاں لے کر نازل ہوا وہ سب برحق اور درست ہیں۔

قرآنِ حکیم کے حوالہ سے رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داریاں:

۱۔ آپ ﷺ نیکی کا راستہ اختیار کرنے والوں کو اللہ ﷻ کی رحمت کی خوشخبری سے مطلع فرمائیں۔

۲۔ نافرمانوں کو ان کے بداعمالیوں کے نتائج سے آگاہ اور تنبیہ کریں۔

دعوت کے سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کی ذمہ داری: سورۃ بنی اسرائیل کا مرکزی مضمون یہی ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو ایک کتاب دی تھی، انہوں نے اس کے تقاضوں کو نظر انداز کیا تو تاریخ میں عبرت بن کے رہ گئے۔ اب ہم نے قرآنِ حکیم نازل کیا جو ایک مضبوط راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس امت کی بھلائی اور کامیابی اس کتاب کا حق ادا کرنے میں ہے۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے اس قرآنِ حکیم کو حق کے ساتھ اُتارا اور یہ حق ہی کے ساتھ اُترا۔ یعنی نہ اس کے بھیجنے میں اور اُتارنے میں باطل کی کوئی آمیزش ہوئی ہے اور نہ یہاں اُترنے میں کہیں باطل کو قلم کاری یعنی رد و بدل کا موقع ملا ہے۔ پھر اسی شان سے وہ زمین پر بھی آیا۔ وہ اپنی بے شمار خصوصیات کے باعث اپنی مثال آپ ہے۔ دشمن اس کی نظیر لانے سے اور باطل کسی بھی سطح پر اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہے۔ وہ اپنی دل آویزی اور اثر اندازی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ ان خصوصیات کے باوجود اگر قریش اس کو قبول کرنے کے بجائے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کرتے اور عجیب و

غریب مطالبات کرتے ہیں، تو آپ ﷺ کو ایسے لوگوں کے بارے میں ہر گز فکر مند نہیں ہونا چاہیئے، آپ ﷺ ان لوگوں کے ایمان نہ لانے کے ذمہ دار نہیں، آپ ﷺ کو اللہ ﷻ نے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ ایمان لانے والوں کو بشارت سے نوازیں اور انکار کرنے والوں کو ان کے بُرے انجام سے خبر دار کر دیں۔

آیت نمبر ۱۰۶: مشرکین مکہ کے ایک اور اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ اگر قرآنِ حکیم اللہ ﷻ کا کلام ہے تو ایک ہی بار کیوں نازل نہیں ہو جاتا۔

قرآنِ حکیم کو تھوڑا تھوڑا نازل کرنے کی حکمت: ا۔ لوگوں کو پڑھنے، یاد کرنے اور عمل کرنے میں آسانی ہو مزید بر آں نازل شدہ حصہ کے معنی پر سہولت کے ساتھ غور کر سکیں۔

۲۔ مصائب کو برداشت کرنے کی قوت حاصل ہو سکے اور اپنی زندگیوں کو قرآنِ حکیم کی ہدایات کی روشنی میں درست کیا جا سکے۔

قرآنِ حکیم کے بتدریج اترنے کی حکمت: یہ ایک اعتراض کا جواب ہے جو مشرکین کی طرف سے کیا گیا لیکن انہیں یقیناً بنی اسرائیل نے اس پر آمادہ کیا، کیونکہ مشرکین آسمانی کتابوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ بنی اسرائیل نے انہیں یہ بات سمجھائی کہ ہماری کتابیں تو یکبارگی نازل ہوئیں۔ اگر یہ صاحب اللہ ﷻ کے نبی ﷺ ہیں تو ان پر کتاب ایک ہی دفعہ کیوں نہیں نازل ہوئی۔ پروردگار نے اس کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: کہ ہم نے اس کتاب کو تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا ہے، کیونکہ اگر ہم اسے یکبارگی مکمل کتاب کی شکل میں اتارتے تو آنحضرت ﷺ چونکہ اُمّی ہیں اور آپ ﷺ کی امّت کی غالب اکثریت بھی اُمّی ہے تو ان کے لئے اس کتاب کو محفوظ کرنا مشکل ہو جاتا۔ حکمت کی بات بھی یہ تھی کہ تبلیغ و دعوت کے نتیجہ میں جیسی جیسی ضرورتیں پیش آتی جائیں اس کے مطابق قرآنِ حکیم کی صورت میں ہدایات ملتی رہیں۔ جیسے جیسے مخالفت آگے بڑھے اور اذیتیں ناقابلِ برداشت ہونے لگیں تو حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ ﷻ کے تسلی آمیز پیغامات لے کر اتریں اور اپنی ذات میں بھی آنحضرت ﷺ کے لئے تسکین کا باعث بنیں جو مختلف سوالات مخالفین کی طرف سے کیئے جائیں تو وقت پر اس کا جواب نازل ہونے پر مخالفین کو مطمئن کیا جا سکے۔ مزید یہ بات کہ تعلیم و تربیت کی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت یہ بھی تھی کہ آپ ﷺ تھوڑا تھوڑا ٹھہر ٹھہر کر لوگوں کو پڑھ کر سنائیں تا کہ وہ اسے ساتھ ساتھ یاد کرتے چلے جائیں، اس سے ان کے عمل میں پختگی آئے، ایمان میں تازگی پیدا ہو اور دل میں خشیتِ الٰہی اترتی چلی جائے۔

آیت نمبر ۱۰۷: مشرکین مکہ جو قرآنِ حکیم کو اللہ ﷻ کا کلام تسلیم نہیں کرتے انہیں تنبیہ کی گئی ہے۔ جب کہ سابقہ امتوں کے اہل علم جو وحی اور رسالت کی حقیقت سے واقف ہیں وہ قرآنِ حکیم پر ایمان لے آئے ہیں۔ قرآنِ حکیم سنتے وقت ان پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور قرآنِ حکیم کی صداقت کا یقین کرتے ہوئے وہ سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔

علمی بات: اس آیت میں ارشاد فرمایا گیا: کہ آپ ﷺ لوگوں میں کھلے الفاظ میں اعلان فرمائیں کہ لوگو! تمہارے پاس حق پہنچ چکا ہے جس کے حق ہونے میں کسی طرح بھی کوئی شبہ نہیں۔ لہٰذا اب تمہاری مرضی ہے کہ اس پر ایمان لاؤ یا اس کا انکار کرو۔ لیکن اہل کتاب میں سے جن لوگوں کو قرآنِ حکیم نازل ہونے سے پہلے اللہ ﷻ نے علم عطا فرمایا ہے۔ وہ تورات، انجیل اور زبور کے حوالہ سے جانتے ہیں کہ اللہ ﷻ کی طرف سے جو آخری نبی مبعوث ہو گا اس پر قرآنِ حکیم نازل کیا جائے گا۔ جس کے وجود اور نزول میں رتی برابر شک کی گنجائش نہیں وہ لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ جب ان کے سامنے قرآنِ حکیم پڑھا جاتا ہے تو وہ پیشانی کے بل سجدے میں گر کر اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا رب ہر عیب اور کمزوری سے پاک ہے۔

عملی پہلو: اللہ ﷻ اپنے بندوں کو بے انتہا اجر و ثواب دے گا اور ظالموں کو پوری پوری سزا دے گا۔ اسی بنا پر مومن شکر و عاجزی کے جذبات میں اپنے رب کی عبادت میں مصروف رہتے ہیں یہ حقیقی علم کا تقاضا ہے اور یہی ایک عالم کی شان ہونی چاہیئے۔ اللہ ﷻ ہمیں ایسا علم اور فکر و عمل نصیب فرمائے۔ (آمین)

علمی بات: مومنین اہل کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے دین حق کی تلاش میں تھے اور آپ ﷺ کی بعثت کے منتظر تھے جب آپ ﷺ کی بعثت کا علم ہو گیا تو آپ ﷺ پر ایمان لے آئے اور قرآنِ حکیم کو سنا اور پڑھا اس قرآنِ حکیم کو سنتے ہیں تو اللہ ﷻ کا شکر ادا کرتے ہوئے سجدہ میں گر پڑتے ہیں کہ اللہ ﷻ نے ہمیں ایمان سے اور قرآنِ حکیم سے نوازا ہے وہ روتے ہوئے سجدہ کرتے ہیں اور یہ قرآنِ حکیم ان کے اندر اور زیادہ خشوع بڑھنے کا سبب بن جاتا ہے۔

علمی بات: ہر وہ شخص جو صفت علم سے متصف ہو اسے اس مرتبہ تک پہنچنا چاہیئے کہ قرآنِ حکیم سننے کے وقت اس کے دل میں خشوع ہو، متواضع ہو کر بیٹھے اور عاجزانہ ہیئت اختیار کرے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں بیان ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی نماز پڑھتے ہوئے یہ کیفیت ہوتی کہ آپ ﷺ کے سینۂ مبارک سے ایسی آواز آرہی تھی جیسے چکی چلنے کی آواز ہوتی ہے۔ (سنن ابی داؤد) یہ حدیث سنن نسائی میں بھی ہے اس میں یوں ہے کہ آپ ﷺ کے سینہ مبارک سے ایسی آواز آرہی تھی جیسے ہانڈی پکنے کی آواز ہوتی ہے۔

آیت نمبر ۱۰۸: مخلص اہل کتاب سمجھ جاتے ہیں کہ قرآنِ پاک ہی برحق کلام ہے جس کے بھیجے جانے کا وعدہ تورات اور انجیل میں فرمایا گیا تھا۔ وہ اللہ ﷻ کی پاکیزگی بیان کرتے ہوئے اپنے رب کے وعدوں کا یقین کرتے ہیں۔ یقیناً ہمارے رب کا وعدہ پورا ہو چکا اور وہ ٹھوڑیوں کے بل گر کر اپنے رب کے حضور زار و قطار روتے ہیں۔ ان آیات میں اہل علم کی یہ صفت بیان ہوئی ہے کہ وہ قرآنِ حکیم کو حق اور سچ مانتے ہوئے نبی آخر الزماں ﷺ کو رسول برحق مانتے ہیں اور انہیں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے یقین ہے کہ اللہ ﷻ کا وعدہ برحق ہے۔

علمی بات: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں تورات اور انجیل کا علم دیا گیا تھا۔ چونکہ ان کتابوں میں نبی آخر الزماں ﷺ کی تشریف آوری کی خبر دی گئی تھی، اس لئے ان کے مخلص لوگ قرآنِ حکیم کو سن کر یہ کہتے ہیں کہ اللہ ﷻ نے آخر زمانہ میں جس کتاب کے نازل کرنے اور جس پیغمبر کو بھیجنے کا وعدہ فرمایا تھا وہ پورا ہو گیا۔

آیت نمبر ۱۰۹: مخلص اہل کتاب اللہ ﷻ کی عظمت اور جلال کے پیش نظر روتے ہیں۔ قرآنِ حکیم ان کے ایمان میں اضافہ اور اللہ ﷻ کے حضور عاجزی کا سبب بن جاتا ہے۔ ان کی حق گوئی اور عاجزی کی وجہ سے اللہ ﷻ ان کے خشوع و خضوع اور ایمان میں اضافہ کرتا ہے۔

فرامین نبوی ﷺ: ۱۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا: "دو آنکھوں کو جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی: ایک وہ آنکھ جو اللہ ﷻ کی خشیت میں روئے اور ایک وہ آنکھ جس نے اللہ ﷻ کی راہ میں پہرہ دیتے ہوئے رات گزاری ہو۔" (جامع ترمذی)

۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ کے خوف سے رونے والا شخص جہنم میں نہیں جا سکتا جب تک کہ دودھ تھن میں واپس نہ پہنچ جائے اور اللہ ﷻ کی راہ کا غبار اور جہنم کا دھواں دونوں اکٹھا نہیں ہو سکتے۔" (جامع ترمذی)

۳۔ اللہ ﷻ کے خوف سے رونا اہل ایمان کی خاص صفات میں سے ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کہ جس کسی بھی مومن بندہ کی آنکھوں سے آنسو نکل جائیں اگرچہ مکھی کے سر کے برابر ہوں اور یہ آنسوؤں کا نکلنا اللہ ﷻ کے خوف سے ہو پھر یہ آنسو اس کے چہرہ پر گر جائیں تو اللہ ﷻ اس کو آگ پر حرام فرما دے گا۔" (سنن ابن ماجہ)

عملی پہلو: آج سب سے بڑی مصیبت جو مسلمانوں پر پڑی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ ان میں اللہ ﷻ کے خوف سے رونے والے بہت کم رہ گئے ہیں۔ اہل علم فرماتے ہیں کہ جس شخص کو صرف ایسا علم ملا ہو جو اس کو رلاتا نہیں تو سمجھ لو کہ اس کو علم نافع نہیں ملا۔

علمی بات: ۱۔ یہ آیتِ سجدہ ہے اور اس طرح کی چودہ آیاتِ سجدہ ہیں جن کو جب انسان پڑھے یا سنے تو اس پر سجدہ کرنا لازمی ہے۔ اسے سجدۂ تلاوت کہتے ہیں۔

۲۔ سجدۂ تلاوت کے ادا کرنے کی بھی وہی شرطیں ہیں جو سجدۂ نماز کی ہیں۔ یعنی باوضو ہو، پاک جگہ ہو وغیرہ۔

۳۔ سجدۂ تلاوت کرنے لگے تو اس میں تکبیر تحریمہ کی طرح ہاتھ اٹھانا نہیں ہے بلکہ اللّٰہُ اَکْبَر کہتا ہوا سجدہ میں چلا جائے اور ایک سجدہ کرے تکبیر کہتے ہوئے سر اٹھائے اس میں تشہد اور سلام نہیں ہے۔

۴۔ جیسے آیتِ سجدہ پڑھنے والے پر سجدۂ واجب ہوتا ہے ایسے ہی سننے والے پر بھی واجب ہو جاتا ہے اگرچہ اس نے ارادہ کر کے نہ سنا ہو، البتہ تلاوت کرنے والے کے لئے بہتر یہ ہے کہ آیتِ سجدہ حاضرین کے سامنے زور سے نہ پڑھے، ہاں اگر حاضرین سننے ہی کے لئے بیٹھے ہیں تو سجدۂ تلاوت زور سے پڑھ دے۔

سجدۂ تلاوت کی دُعا: سجدۂ تلاوت میں اگر سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْم تین مرتبہ کہے تو یہ بھی درست ہے اور اگر اس کے ساتھ دعائے ماثورہ پڑھ لے تو زیادہ بہتر ہے۔

دعائے ماثورہ یہ ہے: سَجَدَ وَجْهِي لِلَّذِيْ خَلَقَهٗ وَ شَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ بِحَوْلِهٖ وَقُوَّتِهٖ (سنن ابی داؤد، جامع ترمذی)

"میرے چہرہ نے اس ذات کے لئے دعائے ماثورہ کیا جس نے اسے پیدا فرمایا اور اسے اپنی طاقت و قدرت کے ذریعہ آنکھ و کان نکال کر (زینت بخشی)۔"

آیت نمبر ۱۱۰: مشرکین اللہ ﷻ کے صفاتی نام رحمان سے مانوس نہیں تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی زبان سے رحمان کا نام سننے پر اسے (معاذ اللہ) کوئی اور معبود سمجھتے تھے۔

علمی بات: اللہ ﷻ اور رحمان دو الگ الگ معبود نہیں بلکہ ایک ہی ذات کے دو نام ہیں۔ اللہ ﷻ کے ناموں کے حُسنیٰ ہونے کے معنٰی یہ ہیں کہ ان میں حمد و ثنا اور تسبیح کے معنٰی ہوتے ہیں۔ اللہ ﷻ کا یاد اور اس کے پکارنے کے ضمن میں اس کے اسمائے حسنیٰ کا ذکر کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اہل ایمان بلند آواز سے قرآنِ حکیم کی تلاوت کرتے تو مشرک ناشائستہ الفاظ استعمال کرتے تھے۔ اس پر آیت کا نزول ہوا۔ نماز میں تلاوت نہ اتنی بلند ہو کہ باہر کھڑے مشرکین تک آواز پہنچ رہی ہو اور نہ اتنی آہستہ ہو کہ اہل ایمان (نمازی) نہ سن سکے بلکہ درمیانی آواز میں تلاوت کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کا ذاتی نام تو صرف اللہ ﷻ ہے باقی اس کے صفاتی نام ہیں، رحمٰن، رحیم، قادر، خالق، رازق وغیرہ یہ اللہ ﷻ کے بہترین صفاتی نام ہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”کہ اللہ ﷻ کے ننانوے (۹۹) ایک کم سو نام ہیں جو شخص ان کو یاد کرے گا وہ جنت میں داخل ہو گا۔“ (صحیح بخاری)

علمی بات: کفار مکہ اللہ ﷻ کے نام سے واقف تھے لیکن جب ”رحمٰن“ کا صفاتی نام بتایا گیا تو انہوں نے سوال کیا کہ یہ رحمٰن کون ہے؟ کیا ہے؟ اللہ ﷻ نے ان کے اس سوال ہی کے جواب میں فرمایا: کہ اللہ اور رحمٰن دونوں اللہ ﷻ ہی کے نام ہیں۔ یہود و نصاریٰ بھی اللہ ﷻ کے لفظ سے واقف تھے اور اسی کو خالق سمجھتے تھے مگر یہودی حضرت عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو (نعوذ باللہ) اللہ ﷻ کا بیٹا کہتے تھے جس کی قرآن حکیم نے تردید کر کے بتایا ہے کہ یہ دونوں اللہ ﷻ کے بندے اور رسول تھے۔ یہ اللہ ﷻ کے بیٹے نہیں تھے کیونکہ اللہ ﷻ ان تمام چیزوں سے پاک ہے اس کو اپنی سلطنت چلانے کے لئے بیٹا، بیٹی اور بیوی کی ضرورت نہیں ہے اور نہ وہ کسی سہارے کا محتاج ہے وہ کائنات کی تمام عظمتوں کا مستحق ہے۔

علمی بات: یہ سورۃ بنی اسرائیل کی آخری آخری آیات ہیں اس سورت کے شروع میں بھی اللہ ﷻ کی توحید کا بیان تھا۔ ان آخری آیات میں بھی اسی پر اختتام کیا جا رہا ہے ان آیتوں کا نزول چند واقعات کی بنا پر ہوا جو یہ ہیں:

اوّل قصّہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک روز دعا میں یااللہ اور یارحمٰن کہہ کر پکارا تو مشرکین نے سمجھا کہ یہ دو خداؤں کو پکارتے ہیں اور کہنے لگے کہ ہمیں تو ایک اوّل کے سوا کسی اور کو پکارنے سے منع کرتے ہیں اور خود دو معبودوں کو پکارتے ہیں۔ اس کا جواب آیت کے پہلے حصہ میں دیا گیا ہے کہ اللہ ﷻ کے دو ہی نہیں اور بھی بہت سے اچھے اچھے نام ہیں کسی نام سے بھی پکارو۔ مراد ایک ہی ذات ہے، تمہارا وہم غلط ہے۔

دوسرا قصّہ یہ ہے کہ جب مکہ مکرمہ میں رسول کریم ﷺ نماز میں بلند آواز سے تلاوتِ قرآنِ پاک فرماتے تو مشرکین تمسخر و استہزاء کرتے اور قرآنِ حکیم، حضرت جبرائیل امین علیہ السلام اور خود اللہ ﷻ کی شان میں گستاخانہ باتیں کہتے تھے۔ اس کے جواب میں اسی آیت کا آخری حصہ نازل ہوا جس میں بلند اور دھیمی آواز میں میانہ روی اختیار کرنے کی تلقین فرمائی کہ ضرورت تو اس درمیانی آواز سے پوری ہو جاتی ہے اور زیادہ بلند آواز سے جو مشرکین کو موقع ایذا رسانی کا ملتا تھا اس سے نجات مل جائے۔

تیسرا قصّہ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ اللہ ﷻ کے لئے اولاد قرار دیتے تھے اور عرب بتوں کو اللہ ﷻ کا شریک کہتے تھے اور صابی اور مجوسی کہا کرتے تھے کہ اگر اللہ ﷻ کے مخصوص مقرب نہ ہوں تو اس کی قدر و عزت میں کمی آ جائے گی ان تینوں گروہوں کے جواب میں اس سورت کی آخری آیت نازل ہوئی جس میں تینوں چیزوں کی نفی ذکر کی گئی ہے۔

آیت نمبر ۱۱۱: مشرکین کے اس باطل عقیدہ کی تردید کہ دنیاوی بادشاہوں کی طرح اللہ ﷻ بھی کو مختلف مددگاروں کی ضرورت ہے (معاذ اللہ)۔

توحید باری تعالیٰ کا عظیم بیان: ۱۔ اللہ ﷻ ہی کی حمد و ثنا کی جائے۔۔۔ توحید نظری ۲۔ اسے اولاد کی حاجت نہیں۔ ۳۔ بادشاہی میں اس کا کوئی شریک نہیں ۴۔ کائنات کا نظام چلانے کے لئے کسی مددگار کی ضرورت نہیں۔ ۵۔ اس کی بڑائی کو نافذ کیا جائے جیسا کہ نافذ کرنے کا حق ہے۔۔۔ توحید عملی

علمی بات: بہت سے کافروں کا یہ خیال تھا کہ جس ذات کا نہ کوئی بیٹا ہو اور نہ اس کی سلطنت میں کوئی شریک ہو، وہ تو بڑی کمزور ذات ہو گی، (معاذاللہ) اس آیت نے واضح فرمادیا کہ اولاد اور مدد گاروں کی حاجت اس کو ہوتی ہے جو کمزور ہو اور اللہ ﷻ کی ذات اتنی قوی ہے کہ اسے کمزوری دور کرنے کے لئے نہ کسی اولاد کی ضرورت ہے نہ کسی مدد گار کی حاجت۔

علمی بات: دنیا میں جس سے مخلوق کو کسی قدر قوت پہنچا کرتی ہے وہ کبھی تو اپنے سے چھوٹا ہوتا ہے جیسے اولاد اور کبھی اپنے برابر ہوتا ہے جیسے شریک اور کبھی اپنے سے بڑا ہوتا ہے جیسے حامی و مدد گار۔ اللہ ﷻ نے اس آیت میں بہ ترتیب تینوں کی نفی فرمادی۔

شانِ نزول: یہود و نصاریٰ اللہ ﷻ کے لئے اولاد تجویز کرتے تھے اور مشرکین عرب اللہ ﷻ کے لئے یوں شریک تجویز کرتے تھے کہ حج میں جو تلبیہ پڑھا جاتا ہے اس میں لاشریک لک کے ساتھ اِلَّا شَرِيْكًا هُوَلَكَ تَمْلِكُهٗ وَمَا مَلَكَ بھی جوڑ دیتے تھے اور صائبین اور مجوسی یوں کہتے تھے کہ اگر اللہ ﷻ کی مدد کرنے والے نہ ہوتے تو وہ عاجز ہو کر رہ جاتا ان سب کی تردید میں اللہ ﷻ نے آیتِ بالا وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا آخر تک نازل فرمائی۔ (صحیح بخاری)

علمی بات: اس آیت میں یہ بتادیا کہ اللہ ﷻ نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا، نہ اس کی اولاد ہے، نہ اولاد ہو سکتی ہے کیونکہ اولاد ہونا اس بے عیب کے لئے عیب ہے۔ اور نہ ملک میں اس کا کوئی شریک ہے۔ سارا ملک اسی کا ہے۔ وہ ملک الملوک ہے اس کی سلطنت میں اس کا کوئی شریک نہیں اور نہ اسے کسی شریک کی ضرورت ہے اور نہ کسی مدد گار کی۔ جسے امورِ مملکت پر پوری قدرت نہیں ہوتی اسے مدد گار کی ضرورت پڑتی ہے۔ اللہ ﷻ قادر مطلق ہے، قوی و عزیز ہے، وہ کسی چیز سے عاجز نہیں۔ لہٰذا اسے کسی مدد گار کی ضرورت نہیں، نہ کوئی اس کا مدد گار ہے اور نہ ہو گا اور نہ ہو سکتا ہے۔ سورۃ سباء میں فرمایا: آپ (ﷺ) فرمادیجئے ان کو پکارو جن کو تم اللہ کے سوا (معبود) سمجھ رہے ہو وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر (کسی چیز) کے مالک ہیں اور نہ زمینوں میں اور نہ ہی ان دونوں میں ان کا کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس (اللہ) کا مدد گار ہے۔ (سورۃ سبا ۳۴، آیت: ۲۲)

عملی پہلو: اس آیتِ شریفہ میں اللہ ﷻ کی حمد بیان کرنے کا بھی حکم دیا ہے اور اللہ ﷻ کی صفاتِ جلیلہ بیان فرمائی ہیں۔ اللہ ﷻ کی بڑائی بیان فرمانے کا بھی حکم دیا۔ سورۃ بنی اسرائیل کی اس آخری آیت سے مفسرین کرام نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ اس آیت کی عظمت کو بیان فرماتے تھے اور گھر کے تمام چھوٹے بڑوں کو سکھاتے تھے آپ ﷺ نے اس آیت کا نام "آیت العزّت" عزت و عظمت والی آیت رکھا ہے۔ حدیث شریف میں بھی آیا ہے کہ یہ آیتِ عزت ہے۔ (مسند احمد)

عملی بات: اس آیت میں مشرکین کے اس بنیادی عقیدہ کی تردید کی گئی ہے کہ جس طرح ایک بادشاہ کو اپنا انتظام سلطنت چلانے کے لئے امیروں، وزیروں اور کئی طرح کے مدد گاروں کی احتیاج ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح اللہ ﷻ کو اتنی بڑی سلطنت کا کاروبار چلانے کے لئے کارکنوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہماری یہ دیویاں اور دیوتا وغیرہ سب نے اس انتظام کے مختلف شعبے سنبھالے ہوئے ہیں (معاذاللہ)۔ یہ ہے وہ بنیادی گمراہی جس نے بے شمار قسموں کے شرک کو جنم دیا ہے۔ اللہ ﷻ نے اس بے ہودہ عقیدہ کا رد کرتے ہوئے فرمایا: کہ نہ اسے اس وقت کسی شریک کی احتیاج ہے اور نہ آئندہ ہو گی کہ وہ کسی کو بیٹا بنالے جو ناتوانی میں اس کا معاون ثابت ہو۔ اسے تخلیق کائنات کے وقت بھی کسی کو مدد گار بنانے کی ضرورت پیش نہیں آئی، نہ ہی اس کائنات کا انتظام چلانے کے لئے ضرورت ہے اور نہ ہی ایسی ضرورت آئندہ کبھی پیش آسکتی ہے۔ اس کے پاس ہر چیز کے لاتعداد اور غیر محدود خزانے ہیں۔ جن سے وہ ہر وقت اپنی مخلوق کو نوازتا ہے اور جو کچھ بھی اس سے مانگا جائے وہ عطا کرتا ہے۔ بشرطیکہ دعا کے تمام آداب کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے۔ گویا اس آیت میں تمام مشرکین کا رد موجود ہے اور جس معبود میں ذکر کی گئی یہ صفات پائی جائیں وہی معبود حقیقی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ہر طرح کی تعریف اللہ ﷻ ہی کی ذات کو لائق ہے، وہی اس کا مستحق ہے، اسی کی تعریف اور اسی کی بڑائی بیان کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

علمی بات سورۃ بنی اسرائیل کی ابتدا تسبیح باری تعالیٰ سے ہوئی۔ تسبیح سے مراد اللہ ﷻ کا تمام عیوب اور نقائص سے پاک ہونا ہے۔ پھر اس سورۃ کا اختتام بھی اس بیان پر ہوا کہ اللہ ﷻ اولاد، شرکاء اور حمایتیوں کی کسی طرح کی بھی مدد کا محتاج نہیں۔ یہ فصاحت و بلاغت کے انتہائی کمال کی دلیل ہوتی ہے کہ مضمون کو جس عنوان سے شروع کیا جائے۔ درمیان میں اس کی تمام تفصیلات بیان کرنے کے بعد اس کا اختتام بھی اسی بیان پر کیا جائے جس سے اس کی ابتدا کی گئی تھی۔

علمی بات: اس آیت میں پانچ مختلف انداز میں اللہ ﷻ کی عظمت اور توحید کا بیان ہے۔ اس ضمن میں پہلی بات یہ ہے کہ حضور ﷺ کی زبان مبارک سے یہ اعلان کرایا کہ تمام تعریفیں اور ہر قسم کا شکر اللہ ﷻ ہی کے لئے ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس نے اپنی کوئی اولاد نہیں بنائی، جسے سورۃ الاخلاص میں لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ تیسری بات اقتدار و اختیار سے متعلق ہے کہ اللہ ﷻ تنہا ہر چیز کا اصل مالک و مختار ہے اور وہی مالک الملک ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ اے مشرکو! اللہ ﷻ کی دوستی کو اپنی دوستیوں پر قیاس مت کرو۔ تم تو دوستیاں اس لئے پالتے ہو کہ تم اپنے دوستوں کے محتاج ہوتے ہو۔ انسان دوست اس لئے بناتا ہے کہ وہ ضرورت کے وقت کام آئے گا۔ بعض دفعہ انسان اپنے کسی دوست کی انتہائی ناجائز بات صرف اس لئے ماننے پر مجبور ہوتا ہے کہ کل وہ میری بھی کوئی ضرورت پوری کرے گا۔ انسان کی یہی کمزوری اسے دوست بنانے اور دوستانہ تعلق نبھانے پر مجبور کرتی ہے مگر اللہ ﷻ کی ذات ایسی تمام کمزوریوں سے پاک ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں بلکہ سب اس کے محتاج ہیں۔ چنانچہ اللہ ﷻ کی دوستی کسی ضرورت کی بنیاد پر نہیں ہوتی اور نہ ہی اللہ ﷻ کا کوئی دوست اس سے اپنی کوئی بات زبردستی منوا سکتا ہے۔

پانچویں اور آخری بات بہت اہم اور توجہ طلب ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کی خوب تکبیر کرو۔ صرف زبان سے "اللہ اکبر" کہہ دینے سے اللہ ﷻ کی تکبیر کا حق پورا نہیں ہو جاتا۔ اس کے لئے عملی طور پر بھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ زبان سے اللہ اکبر کہنا تو تکبیر کا پہلا درجہ ہے کہ کسی نے زبان سے اقرار کر لیا کہ اللہ ﷻ سب سے بڑا ہے۔ اس کے بعد اہم اور کٹھن مرحلہ اپنے تمام انفرادی اور اجتماعی معاملات میں اللہ ﷻ کو عملی طور پر بڑا تسلیم کرنے کا ہے۔ یہ مرحلہ تب طے ہو گا جب ہمارے گھر میں بھی اللہ ﷻ کو بڑا تسلیم کیا جائے گا اور گھر کے تمام معاملات میں اسی کی بات مانی جائے گی۔

جب ہماری اجتماعی معاملاتِ زندگی میں بھی اس کی بڑائی کو تسلیم کیا جائے گا اور کوئی قانون اس کی شریعت کے خلاف نہ بن سکے جب ہماری عدالتوں میں بھی اس کی بڑائی کا ڈنکا بجے اور تمام فیصلے اسی کے احکامات کی روشنی میں کیئے جائیں۔ غرض جب تک ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں اور ہر کہیں اس کا حکم آخری حکم کے طور پر تسلیم نہیں کیا جائے گا اللہ ﷻ کی تکبیر کا حق ادا نہیں ہو گا۔ اللہ ﷻ کے احکام کو عملی طور پر نافذ نہ کرنے والوں کے لئے یہ حکم بہت واضح ہے: "اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو وہی فاسق ہیں۔" (سورۃ المائدۃ ۵، آیت: ۴۷)

سُورَۃُ الْکَھْف

ربطِ سورت: سورۃ الکہف سے پہلے سورۃ بنی اسرائیل ہے۔ دونوں سورتوں میں ربط اور مناسبت یہ ہے کہ:

۱۔ سورۃ الکہف اور سورۃ بنی اسرائیل کے مضامین میں خاصی یکسانیت ہے۔

۲۔ سورۂ بنی اسرائیل کا آغاز اللہ ﷻ کی تسبیح اور سورۃ الکہف کا آغاز اللہ ﷻ کی حمد سے ہوتا ہے۔

۳۔ سورۃ بنی اسرائیل کی تکمیل اللہ ﷻ کی بڑائی کے بیان پر ہوتی ہے اور سورۃ الکہف کی ابتدا حمدِ باری تعالیٰ سے ہوتی ہے۔ گویا جس نکتہ پر سورۃ بنی اسرائیل کا اختتام ہوا تھا اُسی نکتہ سے سورۃ الکہف کا آغاز ہوا ہے۔

۴۔ سورۃ بنی اسرائیل کے آغاز میں نبی کریم ﷺ کے واقعہ ٔ معراج یعنی آسمانوں کی سیر اور باری تعالیٰ سے ملاقات کا بیان ہے اور سورۃ الکہف میں آسمانوں کے رب کی طرف سے صاحبِ قرآن سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نزولِ قرآنِ حکیم کا بیان ہے۔

۵۔ دونوں سورتوں کی آخری دو اہم آیات کا آغاز لفظ "قُلْ" سے ہو رہا ہے۔ مزید یہ کہ دونوں سورتوں کے آخری دو آیات کے مضامین میں کافی مماثلت ہے۔

۶۔ دونوں سورتوں میں حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ بیان کیا گیا ہے اور شیطان سے خبر دار کیا گیا ہے۔

۷۔ سورۂ بنی اسرائیل میں نبی کریم ﷺ کی ہجرت کا ذکر ہے۔ سورۃ الکہف میں اصحاب کہف کی ہجرت کا بیان ہے۔

۸۔ سورۃ بنی اسرائیل میں اسلامی معاشرہ اور عادلانہ ریاست کی اساس کا ذکر ہے۔ سورۃ الکہف میں ایک عادل بادشاہ ذوالقرنین کا تذکرہ ہے۔

فضائل اور خواص: ۱۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: کہ "جس (مسلمان) نے سورۃ الکہف کی پہلی دس آیات حفظ کر لیں اسے دجال کے فتنہ سے محفوظ کر لیا گیا۔" (صحیح مسلم، مسند احمد)

۲۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے ہی ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ "جس شخص نے سورۃ الکہف کی آخری دس آیات یاد کر لیں وہ فتنۂ دجال سے محفوظ رہے گا۔" (مسند احمد، صحیح مسلم)

۳۔ حضرت معاذ بن انس جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "جس نے سورۃ الکہف کی ابتدائی یا آخری آیات کی تلاوت کی تو اس کے قدم سے سر تک نور ہو گا اور جس نے اس ساری سورت کی تلاوت کی، اس کے لئے زمین سے آسمان تک نور ہو گا۔" (مسند احمد)

۴۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "جس شخص نے جمعہ کے روز سورۃ الکہف پوری پڑھ لی تو دوسرے جمعہ تک اس کے لئے نور ہو جائے گا۔" (مستدرک حاکم، بیہقی، مشکوٰۃ المصابیح)

۵۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی سورۃ الکہف پڑھ رہا تھا، اس کے ایک طرف ایک گھوڑا تھا جو دو رسیوں سے بندھا ہوا تھا، تو اس (بندہ) کو بادل کے ایک ٹکڑے نے ڈھانپ لیا، پھر وہ بادل کا ٹکڑا گھومتا رہا اور قریب آنا شروع کر دیا، چنانچہ اس کا گھوڑا اس سے بدکنے لگا، جب صبح ہوئی تو وہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ کو یہ ماجرا کہہ سنایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "وہ سکینت (اطمینان اور رحمت) تھی جو قرآنِ حکیم (کی تلاوت) کی بنا پر (بادل کی صورت میں) اتری۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی)

مذکور قصص کا مختصر جائزہ و تفصیلات: کتب حدیث میں ہے کہ کفارِ مکہ نے اہل کتاب کے کہنے پر نبی اکرم ﷺ کے لئے تین سوالات بطور خاص امتحان چنے جن کا تعلق سر زمین حجاز سے نہ تھا۔ بعض روایات میں ان کی تفصیل مذکور ہے۔ ان واقعات سے عام طور پر عرب کے لوگ ناواقف تھے۔ کفار مکہ اور یہودی یہ سمجھ رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ ان سوالوں کا جواب نہ دے سکیں گے لہٰذا ہمیں ان کو جھٹلانے اور مذاق اڑانے کا موقع مل جائے گا (معاذاللہ)۔ مزید یہ کہ ان واقعات کی تفصیلات آپ ﷺ سے پوچھی گئیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ آپ (ﷺ) کا ذریعۂ علم حقیقتاً وحی ہے یا نہیں۔ ان میں سے پہلا سوال یہ تھا کہ اصحاب

کہف کون تھے؟ دوسرا سوال حضرت خضر علیہ السلام سے متعلق تھا۔ تیسرا سوال ذوالقرنین بادشاہ کے بارے میں تھا۔

اللہ ﷻ نے تمام سوالوں کے ایسے بھرپور جوابات عطا فرمائے کہ دشمنانِ اسلام حیران و پریشان رہ گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کفار مکہ کے ظلم و ستم، بربریت اور معاشی بائیکاٹ کی انتہا ہو چکی تھی۔ کفار مکہ کے سوالات اور مکہ مکرمہ کے سنگین حالات میں سورۃ الکہف نازل کی گئی تا کہ کفار کے منہ بند ہو جائیں اور اہل ایمان کو تسلّی اور تشفی مل جائے۔ اللہ ﷻ نے ان سوالات کا مفصل جواب بھی آپ ﷺ کو بتایا اور صورتِ حال کی مطابقت بھی واضح فرمادی۔ یہ قرآنِ مجید کا خاص انداز ہے کہ اندازِ تخاطب میں خیر خواہی اور ہمدردی کے جذبہ سے مخاطب کو حق اپنانے کی ترغیب دلائی جاتی ہے۔

۱۔ واقعہ اصحاب کہف: اس واقعہ کے ضمن میں درج ذیل اہم باتیں سمجھائی گئی ہیں:

i۔ وہ عقیدۂ توحید کے قائل تھے۔ اہل خاندان نے ان کے ساتھ تحقیر آمیز رویہ اختیار کیا جیسا کہ اہل مکہ نے عقیدۂ توحید کے ماننے والوں کے ساتھ روا رکھا ہوا ہے۔ اگر اُس دور کے رؤسا و امراء ظلم و آمریت کی آخری حدوں کو چھونے کے بعد اس دنیا سے چلے گئے اور فنا ہو گئے تو اہل مکہ کا انجام ان سے مختلف نہ ہو گا۔ بلکہ ان سے بھی موت کے بعد کی زندگی میں اس ظلم و ستم کے بارے میں باز پرس کی جائے گی۔

ii۔ مسلمانوں کو اس واقعہ کے ذیل میں استقامت کا مظاہرہ کرنے والے اہل ایمان کی عظمت کردار سے باخبر کیا گیا کہ اصحاب کہف گنتی کے چند نوجوان تھے مگر انہوں نے نفس کے پجاریوں کے سامنے سر جھکانے کے بجائے اللہ ﷻ کے بھروسہ پر ہجرت کی راہ اختیار کی۔

iii۔ اسی طرح اصحاب کہف کے واقعہ سے موت کے بعد کی زندگی پر استدلال کیا گیا کہ جس طرح مدت دراز کے بعد ان غار کے مکینوں کو موت کی نیند سے جگایا گیا اسی طرح وہ قادر مطلق تمام لوگوں کو موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے۔

iv۔ اس واقعہ میں اللہ ﷻ کی عبادت کے لئے بہت قیمتی رہنمائی عطا کی گئی ہے، خاص کر ایسے دور میں جب اہل توحید کمزور اور اجنبی ہوں، کفر کی ہر طرف حکمرانی ہو، قوت و غلبہ دشمنان اسلام کو حاصل ہو۔ ایسے مشکل حالات میں اللہ ﷻ کی توحید پر قائم رہنا، باطل قوتوں کا انکار کرنا، پھر باطل سے مفاہمت اور سودے بازی کرنے کے بجائے اللہ ﷻ کے لئے سب کو ناراض کر لینا، سب سے علیحدگی اختیار کر لینا، بس ایک اللہ ﷻ کا ہی ہو رہنا اس واقعہ کا بنیادی سبق ہے جسے جاننے کے بعد کوئی شخص یہ بہانہ نہیں بنا سکتا کہ آج ہم کمزور ہیں، ہر طرف کفر، شرک اور بے حیائی کا دور دورہ ہے، ہر طرف دھوکہ بازی اور فریب کا بازار گرم ہے، اس لئے ہم دین کی بنیاد پر باطل سے ٹکر نہیں لے سکتے۔

۲۔ دولت کے نشہ میں بدمست ایک منکر اور مسکین مومن کا واقعہ: اس واقعہ کا ذکر کر کے دولت کی ناپائیداری کو واضح اور ہر دور میں دولت کے نشہ میں چور منکرین کو حقیقت سے باخبر کیا گیا ہے۔

۳۔ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کا واقعہ: اس واقعہ کے ذکر میں مومنین کے لئے تسلّی اور اللہ ﷻ کی مشیت و قدرت کی جانب اشارہ ہے کیونکہ انسان دنیا میں رونما ہونے والے اکثر واقعات کے انجام سے بے خبری کے باعث حیران ہوتا ہے۔ حالانکہ ان سب کے پس پردہ مصلحت و مشیت ایزدی کارفرما ہوتی ہے۔

۴۔ بادشاہ ذوالقرنین کا واقعہ: اس قصّہ میں ذوالقرنین بادشاہ کی عظمت و جلالت اور وسیع تر ذرائع و اسباب کے مالک ہونے اور ان سب کے باوجود خالق حقیقی کے سامنے سربسجود رہنے کا ذکر ہے۔ اس کی جلالتِ شان کے تذکرہ میں کفار کے سوال کا جواب اور اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ذوالقرنین نے دنیا کی بڑی اور مضبوط دیوار بنا کر بھی توکل اور بھروسہ اللہ ﷻ ہی پر کیا نہ کہ اپنی تعمیر کردہ دیوار پر اور کہا کہ یہ مضبوط ترین دیوار بھی ایک وقت شگافوں میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس ذیل میں اہل مکہ کو توجہ دلائی گئی ہے کہ تم معمولی سی تجارت اور معمولی جاگیر کی ملکیت پر اتراتے پھرتے اور تکبر کرتے ہو۔

اس واقعہ میں ایک رہنمائی یہ بھی ہے کہ باطل قوتوں سے مقابلہ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ انتہائی ترقی یافتہ وسائل، اہل حق کے پاس ہوں۔ اس کا بھی واضح حکم قرآنِ مجید نے دیا ہے: "اور (مسلمانو!) تم ان (کفار سے لڑنے) کے لئے تیار رکھو جتنی قوت تم سے ممکن ہو۔" (سورۃ الانفال ۸، آیت: ۶۰) گویا ٹیکنالوجی اور جدید

دور کی کشمکش کے وسائل پر قدرت حاصل کرنی ہے اور ایجاد و اختراع کے ذریعہ بہتر وسائل کے حصول میں اپنا کردار بھی ادا کرنا ہے۔

علمی بات: اہلِ کتاب کے تجویز کردہ ان سوالات کے جوابات کے بعد دین اسلام کے بنیادی عقائد توحید اور آخرت پر ایمان کے فوائد کا ذکر کیا گیا ہے اور رسالت کے ذیل میں اہلِ مکہ پر یہ بات واضح کردی کہ نبی اکرم ﷺ تم ہی میں سے ہیں مگر آپ اللہ ﷻ کے منتخب پسندیدہ اور اُس کے احکام کے امین ہیں۔ اگر تم لوگ نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کے مطابق اپنی اصلاح کرلو گے تو تمہاری دنیا اور آخرت دونوں سنور جائیں گی بصورت دیگر دنیا و آخرت میں ہر جگہ ذلت تمہارا مقدر ہو گی۔

سورۃ الکہف میں چار کرداروں کے حوالہ سے چار اہم فتنوں کی نشان دہی: ۱۔ دین و ایمان کے سلسلہ میں فتنہ: جس کے مقابلہ کے لئے اصحاب کہف اپنا سب کچھ چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ **۲۔ مال کا فتنہ:** یعنی مال پر غرور اور مال کی طاقت پر بھروسہ جس کا باغ والا مال دار شخص شکار ہو گیا تھا۔ **۳۔ علم کا فتنہ:** جس سے حفاظت کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر علیہ السلام پر اللہ ﷻ نے واضح فرمایا کہ بہت سی باتیں بڑے سے بڑے انسان کے بھی دائرہ علم سے باہر ہیں۔ **۴۔ اقتدار و صلاحیت کا فتنہ:** جس پر قابو کی خوبصورت مثال ذوالقرنین کے کردار میں ملتی ہے جنہوں نے ایک بڑے کارنامہ کو انجام دینے کے بعد بھی انکساری کے ساتھ یہی کہا کہ: "یہ سب میرے رب کی رحمت ہے۔" (سورۃ الکہف ۱۸، آیت: ۹۸)

اس طرح اس سورت کے واقعات سے دین و ایمان کی حفاظت کے لئے استقامت کا درس حاصل ہوتا ہے اور مال و دولت، علم و فضل اور بادشاہت و اقتدار کے حاصل ہونے پر تواضع و انکساری، اللہ ﷻ کا شکر، اُسی پر بھروسہ اور نعمتوں کے اچھے مقاصد کے لئے استعمال ہونے کا سبق ملتا ہے۔ یہ اسباق اہل ایمان کو تمام فتنوں سے مقابلہ کا راستہ دکھاتے ہیں اور انہیں کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرتے ہیں۔

عملی بات: سورۃ الکہف کا ایک اہم سبق یہ بھی ہے کہ بندہ کو متشابہات کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیئے۔ جن واقعات و احوال کا مطلق علم ہماری دسترس سے باہر ہے ان کے ضمن میں لاحاصل قیاس آرائیوں اور بے بنیاد اندازوں کے بجائے، اپنے کام، ذمہ داریوں اور واقعات سے حاصل ہونے والے اسباق پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیئے۔

آیت نمبر ۱: تمام تعریفوں اور شکر کا مستحق اللہ ﷻ ہے جس نے اپنے مکرم اور مقرب بندہ آنحضرت ﷺ پر قرآنِ حکیم نازل فرمایا۔ "عوج" کے معنی کسی قسم کی کجی یا ایک طرف جھکاؤ کے ہیں۔ اللہ ﷻ کی طرف سے اتارا جانے والا قرآنِ حکیم ہر قسم کی کجی اور افراط و تفریط سے پاک کلام ہے۔

علمی بات: اس آیت کا موضوع اللہ ﷻ کی کتاب کا نزول ہے۔ اللہ ﷻ وہ باکمال ہستی ہے جس نے اپنے بندوں پر لاتعداد احسانات اور انعامات فرمائے ہیں اور مسلسل فرما رہا ہے۔ ان احسانات میں سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے انسان کو ہدایت کا راستہ سکھایا اور اَلھُدیٰ یعنی قرآنِ حکیم نازل فرمایا۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ نے نبی اکرم ﷺ کی شانِ عبدیت کو نمایاں کیا ہے۔ قرآنِ مجید میں اللہ ﷻ نے اپنی شانِ ربوبیت کو اور رسول اللہ ﷺ کی شانِ عبدیت کو بار بار بیان فرمایا ہے۔ مثلاً سورۃ الفاتحہ ۱، آیت: ۱ میں "رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ"، جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ سورۃ العلق ۹۶، آیت: ۱ میں "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ" "آپ (ﷺ) اپنے رب کے نام سے پڑھیئے جس نے (سب کو) پیدا فرمایا۔" سورۃ الفلق ۱۱۳، آیت: ۱ میں "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ"، (اے نبی ﷺ!) آپ فرما دیجئے میں صبح کے رب کی پناہ میں آتا ہوں۔" اور سورۃ الناس ۱۱۴، آیت: ۱ "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ"، (اے نبی ﷺ!) "آپ فرما دیجئے میں لوگوں کے رب کی پناہ میں آتا ہوں۔" اور سورۃ المدثر ۷۴، آیت: ۳ میں فرمایا "وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ" "اور اپنے رب کی بڑائی (بیان) کریں۔" اسی طرح نبی اکرم ﷺ کی شانِ عبدیت کے متعلق سورۃ الفرقان ۲۵، آیت: ۱ میں فرمایا "تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ" "بہت ہی بابرکت ہے وہ (اللہ) جس نے اپنے بندے (نبی اکرم ﷺ) پر فرقان (قرآن) نازل فرمایا" سورۂ بنی اسرائیل ۱۷، آیت: ۱ میں فرمایا: "سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا" "پاک ہے وہ جو ایک رات کے تھوڑے سے حصّہ میں اپنے (خاص) بندے کو مسجد الحرام سے اس مسجد اقصیٰ تک لے گیا" اور سورۃ الکہف ۱۸، آیت: ۱ میں فرمایا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ" "تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر کتاب نازل فرمائی۔" ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ ﷻ ہم سب کا رب ہے اور اسے شانِ عبدیت پسند ہے۔ مقامِ عبدیت کے مثل کوئی مقام نہیں اور رسول اللہ ﷺ عبدیت کاملہ کے بلند مقام پر فائز ہیں۔

علمی بات: کجی (ٹیڑھ) نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں کوئی بات بھی ایسی نہیں جو عقل و فطرت اور عدل و صداقت سے ہٹی ہوئی ہو۔ یہ فضول فلسفیانہ بحثوں، تضاد بیانی اور بے کار باتوں سے بالکل پاک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلیم الطبع اور خیر پسند لوگوں کے دلوں میں قرآنِ مجید باآسانی اتر جاتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے کہ "(یہ) وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ پرہیز گاروں کے لئے ہدایت ہے۔" (سورۃ البقرہ ۲، آیت:۲)

عملی پہلو: ہم پر لازم ہے کہ ہم اللہ ﷻ کی زیادہ سے زیادہ حمد اور تسبیح بیان کریں۔ اللہ ﷻ کی کتاب کو مضبوطی سے تھام کر رکھیں تاکہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہو سکیں۔ خود بھی اللہ ﷻ کے نیک بندے بنیں اور اللہ ﷻ کے بندگی کی دوسروں کو دعوت دیں۔

آیت نمبر ۲: "قیم" سے مراد "بالکل سیدھا" ہونا ہے یا اس سے مراد بندوں کی دینی اور دُنیاوی مصالح کی حفاظت کرنے والا ہے۔ قرآنِ حکیم سیدھا، سچا اور اختلاف سے پاک کلام ہے جو سابقہ آسمانی کتب کی تصدیق کرتا ہے۔ قرآنِ حکیم نافرمانوں کو عذاب کے بارے میں خبردار کرتا ہے۔ جبکہ ایمان لانے والے نیکوکاروں کو جنت کی بشارت دیتا ہے۔

علمی بات: یہ کتاب خود بھی قائم و دائم ہے اور انسانوں کے لئے بھی ذریعۂ ہدایت اور استقامت کا باعث ہے۔ اس کے بعد کوئی ہدایت یا وحی نازل نہیں ہو گی۔ یہی آخری مکمل و جامع کتاب ہے اور تاقیامت محفوظ ہے۔ "اہلِ ایمان کے لئے نصیحت، شفاء، ہدایت اور رحمت ہے۔" (سورۃ یونس ۱۰، آیت:۵۸)

علمی بات: نبی اکرم ﷺ کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا گیا ہے اور آپ ﷺ اس کتاب کے ذریعہ انکار کرنے والوں کو اللہ ﷻ کے عذاب سے ڈرساتے ہیں اور اہلِ ایمان کو جنت کی خوش خبری دیتے ہیں۔

علمی بات: نیکیوں سے مراد وہ اعمال ہیں جو اللہ ﷻ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتے ہوئے اللہ ﷻ کی رضا اور اخروی نجات کے لئے سرانجام دیئے جائیں۔ ایسے اعمال کرنے والوں کے لئے اللہ ﷻ کے ہاں ان کا بہترین اجر محفوظ ہے۔

پہلی اور دوسری آیت کی روشنی میں قرآنِ مجید کی خصوصیات: ۱۔ اس کو سمجھنے اور عمل کرنے میں ذرا بھی ٹیڑھ پن، منطقی انداز فکر یا فلسفیانہ الجھاؤ نہیں ہے بلکہ یہ قرآنِ حکیم اپنے معنیٰ اور مفہوم کے لحاظ سے نہایت صاف صاف اور واضح احکامات پر مشتمل ہے۔ قرآنِ کریم دنیا اور آخرت کو سدھارنے کا ذریعہ ہے اس لئے اس کا ہر اصول آسان اور سہل ہے جس پر عمل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

۲۔ وہ "قیم" ہے اس قدر درست، صحیح، کامل اور مکمل ہے کہ اس کو پڑھنے، سمجھنے اور عمل کرنے والا "راہِ مستقیم" پر رہتا ہے۔

۳۔ اس کتاب الٰہی کو ماننے، سمجھنے اور عمل کرنے والے لوگوں کو نہ صرف اس دنیا کی کامیابیاں عطا کی جاتی ہیں بلکہ ایمان و عمل صالح اختیار کرنے والوں کے لئے ابدی راحتوں، کامیابیوں اور عزت و سربلندی کی ایسی خوش خبریاں بھی دی گئی ہیں جن راحتوں میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور ان کی لذتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔

آیت نمبر ۳: قرآنِ حکیم پر ایمان لا کر نیک اعمال انجام دینے والے مومنوں کو قرآنِ حکیم جنت کی دائمی زندگی کی بشارت دیتا ہے۔

علمی و عملی بات: جو لوگ نیک اعمال کریں گے۔ اللہ ﷻ اُنہیں اپنے فضل سے جنت میں داخل فرمائے گا۔ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ دنیا کی نعمتیں چاہے جتنی زیادہ بھی ہوں اور دنیا کا گھر کتنا ہی حسین کیوں نہ ہو ایک دن بالآخر انسان کو اس سے نکلنا ہے اور موت آنی ہے۔ نہ دنیا کی کوئی چیز ہمیشہ کے لئے ہے اور نہ ہی انسان ہمیشہ کے لئے ہے۔ اس کے برعکس جنت کی نعمتیں بھی دائمی ہیں اور اس میں رہنا بھی ہمیشہ کے لئے ہو گا۔ لہٰذا ہمیں آخرت کے لئے محنت کرنی چاہیئے۔

آیت نمبر ۴: قرآنِ حکیم خصوصی طور پر ان کو عذاب سے ڈراتا ہے جو اللہ ﷻ کے لئے اولاد کو منسوب کر کے اس کی شان میں گستاخی کرتے ہیں۔ اس آیت میں قرآنِ مجید کے نزول کا مقصد بیان کیا جا رہا ہے کہ جو لوگ اللہ ﷻ کے ساتھ شرک کر رہے ہیں ان کو اللہ ﷻ کے عذاب کا ڈر سنائیں۔

علمی بات: یہ تنبیہ خاص طور پر ان لوگوں کے لئے ہے جو اللہ ﷻ کے لئے اولاد ہونے کے قائل ہیں۔ اشارہ خصوصیت کے ساتھ نصاریٰ کی طرف ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ ﷻ کا بیٹا قرار دیتے ہیں اور یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ ﷻ کا بیٹا بنایا تھا (معاذ اللہ)۔ ویسے یہ تنبیہ عام طور پر ان سب کے لئے

ہے جو کسی نہ کسی شکل میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ ﷻ اولاد رکھتا ہے (معاذ اللہ) مثال کے طور پر مشرکین مکہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔

علمی بات: جو لوگ بد عمل، بدنیت، اور بد عقیدہ ہیں جنہوں نے اللہ ﷻ کی عبادت و بندگی کے بجائے اللہ ﷻ کے نبیوں کو اللہ ﷻ کا بیٹا بنا دیا ہے اور وہ ان ہی کی عبادت و بندگی کرتے ہیں ان کے لئے سخت سزا ہے۔ جیسے نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ ﷻ کا بیٹا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ فرمایا کہ یہ ایک ایسا سفید جھوٹ اور بے تحقیق بات ہے جس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ اللہ ﷻ کی بارگاہ میں بڑی سخت گستاخی اور ناقابل معافی جرم ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے لئے جہنم کی آگ تیار کی گئی ہے جس سے وہ بچ نہیں سکتے۔

علمی بات: عرب میں بت پرستی اور شرک کی ان گنت شکلیں مروج تھیں۔ ان میں سے ایک شکل یہ تھی کہ بعض لوگ (نعوذ باللہ) فرشتوں کو اللہ ﷻ کی بیٹیاں مانتے تھے اور ان کی پوجا کیا کرتے تھے۔ قرآنِ کریم تو کفر و شرک کی ساری صورتوں کو مٹانے کے لئے آیا ہے۔ خصوصاً یہ بھونڈا شرک جس کو عقل اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود قبول کرنے کے لئے تیار نہیں جو محض جہالت، حماقت اور اندھی تقلید کا نتیجہ ہے۔ اس غلط اور احمقانہ عقیدہ کے خوفناک نتائج سے آگاہ کرنا بھی اس کتاب کے مقاصد میں سے ہے۔

علمی بات: دورِ حاضر کی دجالیت کی اصل جڑ موجودہ مسیحیت ہے جس کی بنیاد تثلیث پر رکھی گئی ہے اور اب اسے مسیحیت کے بجائے Paulism کہنا زیادہ درست ہے۔ اس میں سب سے پہلے حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ ﷻ کا بیٹا قرار دیا گیا۔ پھر اس میں کفار کا عقیدہ شامل کیا گیا کہ جو کوئی بھی حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لائے گا اسے تمام گناہوں سے پیشگی معافی مل جائے گی۔ اس کے بعد شریعت کو ساقط کر کے اس سلسلہ میں تمام اختیارات پوپ کو دے دیئے گئے کہ وہ جس چیز کو چاہے حلال قرار دے اور جس کو چاہے حرام۔ ان تحریفات کی وجہ سے یورپ میں عام لوگوں کو لفظ "مذہب" سے ہی شدید نفرت ہو گئی۔ پھر جب ہسپانیہ میں مسلمانوں کے زیر اثر جدید علوم کو فروغ ملا تو فرانس، اٹلی اور جرمنی وغیرہ کے بے شمار نوجوانوں نے اسپین کے شہروں قرطبہ، غرناطہ اور طلیطلہ کی یونیورسٹیوں میں داخلہ لیا۔ یہ نوجوان حصول تعلیم کے بعد جب اپنے اپنے ممالک میں واپس گئے تو یورپ میں ان کی نئی فکر کی وجہ سے اصلاح مذہب (Reformation) اور احیائے علوم (Renaissance) کی تحریکات شروع ہوئیں۔ ان کی وجہ سے یورپ کے عام لوگ جدید علوم کی طرف راغب تو ہوئے مگر معاشرہ میں پہلے سے موجود مذہب مخالف جذبات کی وجہ سے مذہب دشمنی خود بخود اس تحریک میں شامل ہو گئی۔ نتیجتاً جدید علوم کے ساتھ مذہب سے بیزاری روحانیت سے لاتعلقی آخرت سے انکار اور اللہ ﷻ کے تصور سے بیگانگی جیسے خیالات بھی یورپی معاشرہ میں مستقلاً جڑ پکڑ گئے، یہ سب کچھ عیسائیت میں کی جانے والی مذکورہ تحریفات کا ردِ عمل تھا۔ آیت زیرِ نظر میں ان ہی لوگوں کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے یہ عقیدہ ایجاد کیا تھا کہ مسیح (نعوذ باللہ) اللہ ﷻ کا بیٹا ہے۔

آیت نمبر ۵: اللہ ﷻ کے لئے اولاد قرار دینے کے بارے میں ان کے پاس نہ کوئی دلیل ہے اور نہ ہی ان کے باپ دادا کے پاس تھی۔ اللہ ﷻ کی اولاد قرار دینا بہت بڑی سنگین بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔ درحقیقت ان کا یہ دعویٰ جھوٹ پر مبنی ہے اور انتہائی بھونڈہ عقیدہ ہے۔

علمی بات: جو لوگ اللہ ﷻ کے لئے بیٹا یا اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان کے پاس اس دعویٰ کے پیچھے کوئی علمی دلیل نہیں ہے۔ اللہ ﷻ کے بارے میں انسان کو علم یا تو اس شعور کی بنا پر ہوتا ہے جو انسان کی فطرت کے اندر موجود ہوتا ہے۔ یا ان نشانیوں کے ذریعہ ہوتا ہے جو اللہ ﷻ نے آفاق و انفس میں رکھی ہیں یا پھر وحی کے ذریعہ جو وہ انبیاء علیہم السلام پر بھیجتا ہے اور جس کی نمایاں ترین شکل کتاب الٰہی ہے۔ اس کے علاوہ اللہ ﷻ کے بارے میں جاننے کا ذریعہ انسان کے پاس کوئی نہیں۔ ان تینوں ذرائع میں سے کوئی ذریعہ بھی ایسا نہیں ہے جس سے اس بات کی تائید ہوتی ہو کہ اللہ ﷻ اولاد رکھتا ہے بلکہ ہر ذریعہ اس کی نفی کرتا ہے۔ پھر کس بنیاد پر لوگ اللہ ﷻ کے لئے اولاد یا بیٹا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں؟ لہٰذا شرک کی جو بھی دلیل مشرکین دیتے ہیں یہ سب کی سب جھوٹ اور باطل ہیں۔

آیت نمبر ۶: مشرکین کے قرآنِ حکیم پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے حضور اکرم ﷺ کو رنجیدہ نہ ہونے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ آپ ﷺ کو ان لوگوں کی ہدایت کی فکر میں اپنے آپ کو ہلکان نہ کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

علمی بات: نبی کریم ﷺ اپنی قوم کے لئے بڑے خیر خواہ تھے اور ان کے ایمان نہ لانے کا آپ ﷺ کو بہت زیادہ صدمہ تھا۔ آپ ﷺ بہت دردمند انسان تھے اس لئے یہ کس طرح گوارا کر سکتے تھے کہ آپ ﷺ کی قوم عذاب سے دوچار ہو جائے مگر تنبیہ اور نصیحت کے بعد بھی لوگ اپنے آپ کو نذرِ آتش کرنا چاہتے ہوں تو ان پر افسوس کرنے سے کیا حاصل۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ کو تسلّی دی گئی ہے کہ ان لوگوں کے سلسلہ میں آپ ﷺ اپنا فرض ادا کر چکے ہیں۔ اگر یہ نہیں مانتے تو ان کے ایمان نہ لانے کے غم میں آپ ﷺ نہ گھلیں۔ اس میں جہاں رسول اکرم ﷺ کی اپنی قوم سے دردمندی کا اظہار ہے وہاں ایمان نہ لانے والوں پر عتاب بھی ہے کہ یہ اس لائق نہیں ہیں کہ اُنہیں سمجھایا جائے۔

عملی پہلو: سیرت النبی ﷺ سے ہمیں رہنمائی ملتی ہے کہ ہمیں لوگوں کو ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ دین کی دعوت دینی چاہیئے۔ اپنی، اپنے گھر والوں اور دوسرے لوگوں کی آخرت کی فکر کرنا ہمارا فرض بھی ہے اور نبی اکرم ﷺ کی عظیم سنت بھی۔ مزید یہ کہ یہ جہاں ہماری اخلاقی ذمہ داری ہے وہاں لوگوں سے محبت کا اظہار بھی ہے۔

آیت نمبر ۷: زمین پر جو کچھ ہے اسے باعث رونق اور زینت بنایا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں کو آزمایا جائے کہ کون دنیا کی زینت میں کھو کر اللہ ﷻ سے غافل ہو جاتا ہے اور کون اللہ ﷻ کی بندگی کو ترجیح دیتا ہے۔ اس آیت میں اللہ ﷻ نے دنیا کو خوش نما اور پُر فریب بنانے کی وجہ انسان کا امتحان بتایا ہے۔

علمی و عملی بات: دجل کے معنٰی دھوکہ کے ہیں اور دنیا دھوکہ کا سامان ہے۔ اس آیت میں دجالی فتنہ یعنی دنیا کی کشش اور پُر فریبی کا ذکر کیا گیا ہے۔ انسان کا امتحان اس بات میں ہے کہ وہ دنیا کی رنگینی سے متاثر ہو کر اسی کا ہو کر رہ جاتا ہے یا دنیا کی اصلیت کو سمجھ کر اپنے اصل خالق و مالک کو پہچانتا ہے۔ اس آزمائش میں انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ دنیا پرستی کرے یا اپنے رب کی عبادت کرے۔ دنیا بے حد پُر کشش مگر دھوکہ ہے۔ اس میں ہر لمحہ لوگوں کا امتحان ہو رہا ہے کہ وہ دنیا کی چکا چوند میں کھو کر اللہ ﷻ سے غافل ہو جاتے ہیں یا دنیا کی وقتی اور کم تر لذتوں کے بجائے آخرت کی دائمی اور بہتر نعمتوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ دنیا کا انجام یہ ہے کہ یہ عنقریب فنا ہونے والی ہے۔

آیت نمبر ۸: دنیا کی ہر چیز کے عارضی ہونے اور بالآخر اپنی تمام رونقوں سمیت فنا ہو جانے کا بیان ہے۔ زمین کو ایک ہموار میدان میں تبدیل کر دیا جائے گا جو میدانِ حشر ہو گا۔ اس کے بعد نیک و بد کو ان کے اعمال کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔

علمی و عملی بات: جتنی چیزوں سے یہ زمین سجی ہوئی اور بارونق نظر آتی ہے ایک دن وہ سب فنا ہو جائیں گی، نہ کوئی عمارت باقی رہے گی، نہ پہاڑ اور درخت، بلکہ وہ چٹیل اور سپاٹ میدان میں تبدیل ہو جائے گی، اس وقت یہ حقیقت واضح ہو گی کہ دنیا کی ظاہری خوبصورتی بڑی ناپائیدار تھی۔ یہ مال و اولاد، یہ غلام اور مویشی، یہ جاہ و جلال کے سب وسائل ناپید ہو جائیں گے اس وقت اگر کوئی چیز کارآمد ہو گی تو انسان کے اچھے اعمال ہوں گے جو اس کے ساتھ جائیں گے۔

علمی بات: آیت نمبر ۷ میں کفار کو مخاطب کیا گیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کو تسلّی دینے کے بعد آپ ﷺ کے منکرین کو مخاطب کیئے بغیر یہ سنایا جا رہا ہے کہ یہ سروسامان جو زمین کی سطح پر وہ دیکھتے ہیں اور جس کی دل فریبیوں پر وہ فریفتہ ہیں، یہ ایک عارضی زینت ہے جو محض اُنہیں آزمائش میں ڈالنے کے لئے مہیا کی گئی ہے۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ سب کچھ اللہ ﷻ نے ان کے عیش و عشرت کے لئے فراہم کیا ہے، اس لئے وہ زندگی کے مزے لوٹنے کے سوا اور کسی مقصد کی طرف توجہ نہیں کرتے اور اس لئے وہ کسی سمجھانے والے کی بات پر کان بھی نہیں دھرتے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ سامان عیش نہیں بلکہ وسائل امتحان ہیں جن کے درمیان اُنہیں کو رکھ کر یہ دیکھا جا رہا ہے کہ ان میں سے کون اپنی اصل کو فراموش کر کے دنیا کی ان دل فریبیوں میں گم ہو جاتا ہے، اور کون اپنے اصل مقام (بندگی رب) کو یاد رکھ کر صحیح رویہ پر قائم رہتا ہے۔ جس روز یہ امتحان ختم ہو جائے گا اسی روز یہ بساط عیش الٹ دی جائے گی اور یہ زمین ایک چٹیل میدان کے سوا کچھ نہ رہے گی۔

آیت نمبر ۹: اصحاب کہف کون تھے؟ کیا تھے؟ ان کی تعداد کتنی تھی؟ اور کن حالات میں یہ واقعات پیش آئے؟ اس کی تفصیل کے بجائے مختصر اور موثر انداز میں اصحاب کہف کے جذبۂ ایمانی اور ایثار و قربانی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ وہ چند ایسے مخلص نوجوان تھے جنھوں نے شہری زندگی، گھر کے راحت و آرام اور

خود اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر پہاڑوں کے غاروں کو اپنا مسکن بنالیا تھا تاکہ ان کے ایمان کی حفاظت ہو سکے اور اللہ ﷻ کی رضا و خوشنودی حاصل ہو سکے۔ مزید تفصیل اگلی آیات میں ذکر کی گئی ہے۔

علمی بات: کہف اس وسیع غار کو کہتے ہیں جو پہاڑ میں موجود ہوتا ہے۔ رقیم سے مراد پتھر کا وہ کتبہ ہے جس پر اصحاب کہف کے نام لکھے تھے یا اس بستی کا نام ہے جہاں سے اصحاب کہف نے ہجرت کی۔ مادہ پرستی کے رد پر پہلا واقعہ اصحاب کہف کا قصّہ بیان کیا گیا۔

یہود کی شرارت پر مشرکین کا سوال اور اس پر اللہ ﷻ کا جواب ذکر کیا گیا۔ اصحاب کہف کے واقعہ کو حیران کن سمجھنے والوں سے خطاب فرمایا گیا کہ اللہ ﷻ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک یہی واقعہ حیرت انگیز نہیں بلکہ کائنات میں اللہ ﷻ کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں۔

علمی بات: مشرکین مکہ نے جو تین سوالات نبی اکرم ﷺ سے پوچھے تھے ان میں سے اصحابِ کہف کے متعلق فرمایا جارہا ہے کہ تمہیں یہ واقعہ عجیب لگتا ہے حالانکہ اللہ ﷻ کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں تو بس اسی عجیب نشانی کے بارے میں پوچھا گیا۔

علمی بات: کہف کسی پہاڑ کی اس کھوہ کو کہتے ہیں جو کھلی اور کشادہ ہو اور اگر تنگ ہو تو اسے غار کہتے ہیں اور رقیم، مرقوم کے معنوں میں ہے یعنی رقم کیا ہوا یا لکھا ہوا۔ لوگوں نے اصحاب کہف کے نام اور ان کا واقعہ ایک پتھر یا سیسہ وغیرہ جیسی دھات کی تختی پر کندہ کر کے غار کے منہ پر نصب کر دیا تھا۔ اسی لئے ان کو اصحاب کہف و رقیم کہتے ہیں یہ ایک ہی جماعت کے دو لقب ہیں۔ یہ اصحاب کہف یک دم معاشرہ سے غائب ہوگئے اور کافی تلاش کے باوجود ان کا پتہ نہ چل سکا تو اس وقت کی حکومت نے ان کے نام اور پتے قلمبند کر لیئے جو مدتوں حکومت کے ریکارڈ میں رہے اور بعض لوگوں کے خیال کے مطابق یہ نام اس وقت ریکارڈ کیئے گئے تھے جب لوگوں کو ان کا پتہ چل گیا ان کا چرچا عام ہوا اور یہ لوگ دوبارہ اس غار میں داخل ہوگئے تو لوگوں نے ان کے نام اور پتے وغیرہ لکھ کر غار سے باہر کتبہ لگا دیا اور ان کے مختصر حالات بھی درج کر دیئے گئے۔

علمی بات: ایک جدید تحقیق کی روسے یہ غار (اردن کے دارالحکومت) سے آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر الرجیب میں واقع ہے اور یہ الرجیب ہی الرقیم کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ حکومت اردن کے دائرہ آثار عامہ نے کھدائی وغیرہ کا جو کام کیا اس کے بعد حقائق بالکل ابھر کر سامنے آگئے ہیں جو مختصراً درج ذیل ہیں:

یہ غار جنوب شمال جہت میں واقع ہے اور سورج مشرق اور مغرب کی سمت میں غار سے کترا کر نکل جاتا ہے۔ غار اندر سے کشادہ ہے جیسا کہ قرآنِ کریم میں بیان ہوا ہے وھم فی فجوۃ منہ۔ غار کے اندر آٹھ قبریں ہیں۔ غار کے اوپر مسجد کے کھنڈر ہیں مسجد کا ذکر آیت نمبر:۲۱ میں ہوا ہے۔ اس مسجد کے سات ستون ہیں جو غالباً اصحاب کہف کی تعداد کی مناسبت سے قائم کئے گئے تھے۔ شمالی دیوار پر ایک جانور کی تصویر بنی ہوئی ہے جس کے بارے میں ماہرین آثار کا کہنا ہے کہ یہ کتے کی تصویر ہے علاوہ ازیں دیوار پر فینیسی اور قدیم یونانی خط میں کچھ باتیں کندہ ہیں۔ اصحاب کہف کے غار میں پناہ لینے کا واقعہ تراجان کے زمانہ کا ہے جس نے ۹۸ تا ۱۱۷ء میں حکومت کی اور ۱۰۶ء میں اس نے شرق اردن فتح کر لیا تھا۔ یہ حکمران بڑا ظالم تھا اور جو شخص بھی بت پرستی سے اور بتوں کے آگے قربانیاں پیش کرنے سے انکار کرتا اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا تھا۔ اس کے زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں پر سخت مظالم ڈھائے گئے۔ اس کے عہد کے بازنطینی سکے بھی اس غار میں ملے ہیں۔ مسلم مؤرخین کے اقوال سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ یہ غار عمان کے قریب واقع ہے۔ چنانچہ مقدسی کی کتاب احسن التقاسیم میں ہے "الرقیم شرق اردن میں عمان سے قریب ایک شہر ہے" اور یاقوت حموی معجم البلدان میں لکھتے ہیں "عمان شام کے اطراف میں ایک شہر ہے اور یہ سرزمین بلقاء کا بڑا شہر رہا ہے اس کے قریب ہی کہف اور الرقیم واقع ہیں۔"

علمی بات: معروف مؤرخ ایڈورڈ گبن نے اپنی مشہور کتاب "زوال وسقوط سلطنت روم" میں بیان کیا ہے کہ وہ ظالم بادشاہ ڈوسیس تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں پر ظلم ڈھانے میں بہت مشہور ہے۔ مسیحی تاریخ میں اصحاب کہف کو سات سونے والے (seven sleepers) کہا گیا ہے۔ یہ شہر افیسس (Ephesus) کا قصّہ ہے جو ترکی کے مغربی ساحل پر واقع زمانہ قدیم کا ایک مشہور شہر تھا۔ اس کے عظیم کھنڈر آج بھی وہاں دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ شہر بت پرستی کا ایک بڑا مرکز تھا اور یہاں چاند دیوی کی پرستش ہوتی تھی جسے ڈائنا (Diana) کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ یہ اسی کا عظیم الشان مندر تھا جو زمانۂ قدیم کے

عجائبات عالم میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس علاقہ میں اس وقت قیصر ڈیسیس (Desius) یا پھر تراجان کی حکومت تھی جو ۲۴۹ء سے ۲۵۱ء تک سلطنت روما کا فرماں روا رہا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروکار اسی کے لگ بھگ زمانے میں اپنی دعوت لے کر یہاں پہنچے۔ رومی حکمران خود بھی بت پرست تھا۔ وہ مذہب توحید کی اشاعت کو برداشت نہیں کر سکا۔ چنانچہ جو لوگ ایمان لائے، وہ بالعموم ظلم و ستم کا نشانہ بن گئے۔ جن نوجوانوں کا یہ قصّہ ہے، وہ شہر کے اعلیٰ گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے اور غالباً ۲۵۰ء میں کسی وقت ایمان لا کر اس دعوت کے مبلغ بنے۔ انہوں نے یہ دعوت اس زور کے ساتھ اور علانیہ پیش کی کہ پورا ماحول ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور خطرہ پیدا ہو گیا کہ اُنھیں سنگسار کر دیا جائے گا۔ اس پر وہ لوگ شہر سے باہر نکل کر ایک غار میں پناہ گیر ہو گئے۔

جس بادشاہ کے زمانہ میں یہ حضرات بیدار ہوئے مسیحی تاریخی روایات کے مطابق وہ تھیوڈوسیس ثانی کا زمانہ تھا۔ جس کا دور حکومت ۴۰۸ تا ۴۵۰ عیسوی ہے۔ مسلمان مؤرخین اور مفسرین کرام نے بھی اس سے ملتی جلتی تفصیلات بیان فرمائی ہیں اور ظالم بادشاہ کا نام دقیانوس ذکر کیا ہے موجودہ دور کے بعض محققین کا کہنا ہے کہ یہ واقعہ اردن کے شہر عمان کے قریب پیش آیا تھا جہاں ایک غار میں کچھ لاشیں اب تک موجود ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بات بھی اتنی مستند نہیں ہے کہ اس پر مکمل بھروسہ کیا جا سکے۔

قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ کسی واقعہ کی اتنی ہی تفصیل بیان فرماتا ہے جو فائدہ مند ہو۔ اس سے زیادہ تفصیلات میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ان حضرات کو "اصحاب الکہف" (غار والے) کہنے کی وجہ تو ظاہر ہے کہ انہوں نے غار میں پناہ لی تھی۔ لیکن ان کو "رقیم والے" کیوں کہتے ہیں؟ اس کے بارے میں مفسرین کی رائیں مختلف ہیں۔ بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ "رقیم" اس غار کے نیچے والی وادی کا نام ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ "رقیم" تختی پر لکھے ہوئے کتبے کو کہتے ہیں۔ اور ان حضرات کے انتقال کے بعد ان کے نام ایک تختی پر کتبے کی صورت میں لکھوا دیئے گئے تھے۔ اس لئے ان کو "اصحاب الرقیم" بھی کہا جاتا ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ اس پہاڑ کا نام ہے جس پر وہ غار واقع تھا۔ بعض کی رائے یہ ہے کہ رقیم اس عمارت کا نام تھا جو اصحاب کہف کی یادگار میں ان کے غار پر بنائی گئی تھی۔ واللہ سبحانہٗ اعلم۔

نوٹ: اصحاب کہف کے واقعہ کی مزید تفصیلات مطالعۂ قرآنِ حکیم حصّہ پنجم کی درسی کتاب میں "قصّہ اصحابِ کہف" ملاحظہ فرمائیں۔

علمی بات: یہ خطاب عام ہے۔ واحد کے صیغہ سے خطاب کا یہ اسلوب اس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب مخاطبین کے ایک ایک شخص کو فرداً فرداً خطاب کرنا پیش نظر ہوتا ہے۔ آیت سے واضح ہے کہ قریش کو یہ قصّہ اہل کتاب سے سن کر سخت تعجب ہوا اور غالباً ان ہی کے ایما سے انہوں نے نبی کریم ﷺ کے امتحان کی غرض سے اسے آپ ﷺ کے سامنے پیش کر دیا کہ دیکھیں آپ ﷺ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ آگے آیت: ۲۴ میں اشارہ ہے کہ یہ قصّہ ان کے سوال کے جواب میں سنایا گیا ہے۔ تاہم قرآن حکیم نے اسے افسانوں کے حجاب سے نکال کر اس کی اصل صورت میں اس طرح سنایا ہے کہ سورت کے مضمون سے پوری طرح ہم آہنگ ہو کر یہ اس کے انذار و بشارت کا نہایت مؤثر ذریعہ بن گیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ تم ان غار والوں کی داستان کو بہت عجیب سمجھتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جو نشانیاں اپنے دین کے علم برداروں کی حفاظت کے لئے ظاہر کی ہیں، یہ بھی ان ہی میں سے ایک نشانی ہے۔ اس طرح کی نشانیاں پہلے بھی ظاہر ہوتی رہی ہیں اور اس وقت بھی، اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ان اہل حق کے لئے ظاہر ہو جائیں گی جنھیں تم شدید تکالیف اور دکھ پہنچا رہے ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔

علمی بات: غار والوں کا قصّہ چونکہ بعث بعد الموت پر ایک واضح دلیل اور خرق عادت امر تھا۔ لہٰذا اس قصّہ کا آغاز ہی اس جملہ سے کیا گیا کہ کیا تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ یہ قصّہ اللہ تعالیٰ کی حیران کن نشانیوں میں سے ایک بڑی اہم نشانی تھی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دوسری نشانیاں اس واقعہ سے بہت زیادہ حیران کن ہیں جو کائنات میں ہر سو بکھری ہوئی ہیں اور خود تمہاری اپنی جانوں کے اندر بھی موجود ہیں۔ بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ جو کچھ پہلے تخلیق کر چکا ہے اس کے مقابلہ میں بعث بعد الموت اس کے لئے بہت آسان اور معمولی سی بات ہے۔

علمی بات: یہ واحد بڑی اور عجیب نشانی نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہر نشانی ہی عجیب اور حیران کن ہے جو دعوتِ فکر دے رہی ہے۔ یہ آسمان و زمین کی پیدائش اور اس کا نظام، شمس و قمر اور کواکب کی تسخیر، رات اور دن کا آنا جانا اور دیگر بے شمار نشانیاں، کیا تعجب انگیز نہیں ہیں۔

آیت نمبر ۱۰: اصحابِ کہف توحید پرست نوجوان تھے جنہوں نے حق کی خاطر ایک غار میں پناہ لی۔ ان کے دور کا بادشاہ اور لوگ مشرک تھے۔ پناہ لیتے وقت انہوں نے اللہ ﷻ سے ثابت قدمی، رحمت نازل فرمانے اور صحیح رہنمائی فرمانے کی دعا کی۔

علمی بات: یہ نوجوان توحید پرست تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکار تھے جبکہ ان کے معاشرہ میں ہر طرف شرک اور بت پرستی کا دور دورہ تھا اس وقت کا رومی بادشاہ خود بت پرست اور مشرک تھا عیسائیوں پر ظلم و ستم ڈھانے کے معاملہ میں اس کا عہد بہت بدنام ہے۔ ان نوجوانوں نے جب دیکھا کہ توحید پرستوں پر کس طرح سختیاں کرکے اُنہیں شرک و بت پرستی پر مجبور کیا جارہا ہے تو انہوں نے اپنے ایمان کی حفاظت کے لئے مناسب یہی سمجھا کہ لوگوں کی نظروں سے روپوش ہو جائیں۔

عملی پہلو: ایک ظالم بستی میں سے چند نوجوانوں کا پوری قوتِ ایمانی کے ساتھ اٹھ کھڑے ہونا ان کی حمیت حق اور بلند حوصلہ کی علامت ہے اور یہ بات نوجوانوں میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ لہٰذا نوجوانی میں دین کے لئے جدوجہد کرنا زیادہ پسندیدہ ہے۔ جیسا کہ ایک قول ہے کہ جوانی میں استغفار کی کثرت اور رجوع الی اللہ پیغمبروں کا شیوہ ہے۔ اصحابِ کہف کی دعا کا بالخصوص تذکرہ کرکے ہمارے لئے رہنمائی دی گئی ہے کہ ہر معاملہ میں اللہ ﷻ سے دعا ضرور کرنی چاہیئے۔ کیونکہ وہی حقیقتاً اور مستقلاً ہمارا مددگار ہے۔ بالخصوص اللہ ﷻ سے رشد و ہدایت کی دعا کرنی چاہیئے۔ بلاشبہ وہی ہر معاملہ میں ہدایت و رہنمائی عطا فرماتا ہے۔

آیت نمبر ۱۱: اصحاب کہف کی دعا کی قبولیت کے طور پر ان پر لمبی مدت کے لئے نیند طاری کردی گئی۔ اللہ ﷻ نے اُنہیں لمبی مدت تک سُلا کر وقت کے ظالم بت پرست بادشاہ سے نجات عطا فرمائی۔

علمی بات: چنانچہ اللہ ﷻ نے اصحابِ کہف کی دعا قبول فرمائی اور اُنہیں اپنے دامن رحمت میں لے کر صدیوں تک ان پر نیند طاری کردی۔ اور جب وہ جاگے تو ظالم بادشاہ ٹراجان کو مَرے ہوئے زمانہ بیت چکا تھا۔ جو اُس وقت توحید پرستوں کا سخت ترین دشمن تھا۔ اب ایک نیک بادشاہ تھیوڈوسیس (Theodosius) ثانی کا دورِ حکومت تھا۔ اس کے دور میں پوری رومی سلطنت نے عیسائیت کا مذہب قبول کر لیا تھا۔ لہٰذا اب توحید پرستوں پر کوئی ایسی سختی نہ رہی تھی جو پہلے والے مشرک بادشاہ کے زمانہ میں تھی۔

عملی پہلو: نیند اور نیند کے بعد دوبارہ اُٹھنا یہ اللہ ﷻ کی رحمت سے ہے اور یہ مرنے کے بعد دوبارہ جی اُٹھنے کی ایک بڑی نشانی ہے۔ اس لئے صبح بیدار ہونے کے بعد مسنون دعا پڑھنی چاہیئے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ "تمام تعریف اس اللہ ﷻ کے لئے ہے جس نے ہم کو (نیند کی صورت میں) موت طاری کرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا اور اسی کی طرف اٹھ کر جانا ہے۔" (سنن ابن ماجہ) یہ دعا ایک یاددہانی بھی ہے کہ ایک دن ہم نے مرنا ہے اور پھر مرنے کے بعد پھر جی اُٹھنا ہے۔

آیت نمبر ۱۲: طویل مدت تک سُلانے کے بعد جب اللہ ﷻ نے چاہا اصحاب کہف کو نیند سے بیدار کر دیا۔

دو گروہوں سے مراد: ۱۔ اصحاب کہف میں سے ہی دو گروہ ہیں۔

۲۔ ایک گروہ سے مراد اصحاب کہف اور دوسرے سے مراد شہر والے ہیں جن کے زمانہ میں اصحاب کہف جگائے گئے۔

علمی بات: آگے آیات میں تذکرہ ہے کہ اصحاب کہف کے مابین یا اصحاب کہف اور اہل شہر کے درمیان اس بات پر اختلاف واقع ہوگیا تھا کہ اصحاب کہف کتنی مدت سوئے ہیں۔ ان کے پاس مدت معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اصحابِ کہف کو اپنی مدت کا اندازہ نہیں ہو سکا جبکہ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم کچھ دیر کے لئے سوئے ہوں گے۔ دوسری طرف اس وقت کے لوگوں نے ان کے بیدار ہونے کے بعد ان کے ساتھی کے پاس موجود سکہ دیکھ کر پہچان لیا کہ یہ وہ نوجوان ہیں جو تقریباً تین سو (۳۰۰) سال پہلے لاپتہ ہوگئے تھے۔ اس طرح یہ اللہ ﷻ کی طرف سے لوگوں کے لئے نشانی ہوگئی۔

علمی بات: اس آزمائش کا پہلا مقصد یہ تھا کہ جب وہ ان کی زندگی و مدت کی صحیح گنتی سے عاجز ہوں گے تو اقرار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ اس کے متعلق یقینی

علم صرف اللہ ﷻ کو ہے، جو علیم وخبیر ہے اور یقین کریں گے کہ وہی ان کے حالات کو بہتر جانتا ہے اور اسی کے علم میں ہے کہ ان کے جسموں کو کس طرح محفوظ رکھا گیا اور ان کا دین کیا تھا۔ جب اس طرح کا اعتراف کریں گے، تو انہیں اللہ ﷻ کی قدرت کاملہ، اس کی وسعت علمی کا یقین ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ مرنے کے بعد اٹھنے کے عقیدہ کو مان لیں گے۔ اس سے دوسرا مقصد یہ تھا کہ اصحاب کہف کے واقعہ سے اہل ایمان کو معلوم ہو گا کہ اللہ ﷻ ایمان والوں پر لطف و کرم فرماتا ہے۔ اس سے تیسرا مقصد اور فائدہ یہ بھی تھا کہ حیات بعد الموت اور روزِ قیامت دوبارہ جی اُٹھنے پر حجت اور دلیل قائم ہو گی۔

عملی پہلو: چاہے حالات کتنے ہی ناموافق کیوں نہ ہوں، اہل باطل طاقت ور اور اہل حق کتنے ہی کمزور کیوں نہ ہوں، ہمیں ہمیشہ اللہ ﷻ پر بھروسہ کرنا چاہیئے اور اسی سے مدد اور پناہ طلب کرنی چاہیئے کیوں کہ حقیقتاً اور مستقلاً مددگار اللہ ﷻ ہی ہے۔ ہمارے پاس سب سے زیادہ قیمتی چیز اللہ ﷻ پر ایمان لانا ہے۔ ہمیں اپنے ایمان کی حفاظت اپنی جان اور مال سے بڑھ کر کرنی چاہیئے۔ اللہ ﷻ نے اس قصّہ کے ذریعہ مادہ پرستی کا رد کیا ہے کہ وہ اسباب کا محتاج نہیں وہ خود اسباب پیدا فرمانے والا ہے۔ وہ جیسے چاہے کسی کو زندہ رکھ سکتا ہے۔ جس طرح اس نے اصحابِ کہف کو برسوں کے بعد دوبارہ حیات بخشی اسی طرح وہ ہم سب کو روزِ قیامت زندہ فرما کر حساب و کتاب کرے گا۔ اس لئے ہمیں ہمیشہ رہنے والی زندگی کی تیاری کی فکر کرنی چاہیئے۔

علمی و عملی بات: اللہ ﷻ کے دین کی راہ میں جدوجہد، فتنوں کا مقابلہ، دعوت و تبلیغ اور جہاد فی سبیل اللہ کا حکم ہے کہ فتنوں کے دور میں جہد و عمل سے گریز نہیں بلکہ جدوجہد کی رفتار تیز کرنے کا تقاضا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہر خلافِ اسلام رجحان کے خلاف کوشش اور جدوجہد کو ہم اپنی ذمہ داری سمجھیں، اس کے لئے اپنی قوت و توانائی کو بھرپور استعمال کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات بھی فرمائی ہے کہ اہل حق کا گروہ شدید فتنوں کے زمانہ میں بھی دین کی خاطر جدوجہد کرتا رہے گا اور فتنوں اور فتنہ پردازوں سے مقابلہ کرتا رہے گا۔ لَنْ يَبْرَحَ هٰذَا الدِّيْنُ قَائِمًا يُقَاتِلُ عَلَيْهِ عِصَابَةٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ "یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا اور مسلمانوں کی ایک جماعت اس دین کی خاطر قیامت تک جنگ کرتی رہے گی۔" (صحیح مسلم)

فتنوں ہی کے تناظر میں آپ ﷺ نے یہ ہدایت بھی فرمائی ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام ان حالات میں اہل ایمان کو استقامت کے ساتھ کرتے رہنا چاہیئے اور یہ کہ گناہوں پر خاموشی، گناہوں میں شامل ہونے کے مترادف ہے۔ جو شخص ان گناہوں کو دیکھے اور ان سے نفرت کرتے ہوئے اس کے ارتکاب سے دوسروں کو روکے اور اُنہیں علانیہ طور پر رد کرے تو اس کو گناہ سے دور رہنے والوں میں لکھا جائے گا۔ جو شخص گناہ سے دور رہا، مگر نہ اس سے نفرت کرتا ہے اور نہ علانیہ اس کو رد کرتا ہے، گویا یہ خاموشی اس کی رضامندی ہے۔ لہٰذا اس کی مثال گناہ نہ کر کے بھی ایسی ہے جیسے وہ گناہ گاروں کے ساتھ گناہ میں شریک ہوا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عرس بن عمیرہ کندی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "جب زمین میں کوئی خطا اور نافرمانی کی جائے تو اس میں حاضر اور موجود شخص نے اس کو بُرا جانا اور اس کا انکار کیا۔ تو وہ ایسے ہو گا جیسے اس معصیت سے غائب اور دور رہا لیکن جو غائب اور دور تھا مگر اس نافرمانی کو اس نے پسند کیا تو وہ ایسے ہو گا جیسے کہ اس میں حاضر اور موجود تھا۔" (سنن ابی داؤد)

علمی بات: اللہ ﷻ نے اُنہیں ایسے مشکل امتحان سے گزارا کہ ان کے لئے ایمان کے ساتھ جینا ناممکن ہو گیا۔ اُنہوں نے صبر و استقامت کی اعلیٰ مثال قائم کر دی۔ بادشاہِ وقت نے اُنہیں دھمکی دی کہ اگر تم توحید کے عقیدے سے باز نہ آئے تو رجم کر دیئے جاؤ گے۔ اُنہوں نے اللہ ﷻ سے دردمندی سے دعا کی کہ اے اللہ! تو ہماری جان اور ایمان کی حفاظت فرما۔ اللہ ﷻ نے ان کی دعا سن لی۔ اُنہیں ظالموں کے شر سے محفوظ فرما دیا اور انہیں ایک غار میں تین سو (۳۰۰) برس سے کچھ زائد عرصہ تک سلائے رکھا۔

علمی بات: اصحاب کہف سے ان کی قوم کا اختلاف اللہ ﷻ کی وحدانیت اور حیات بعد الموت پر تھا۔ پس اللہ ﷻ کے سوا اگر کوئی طاقت ہوتی تو اُنہیں ڈھونڈ کر نکال لاتی اس طرح عقیدۂ توحید کو تقویت بخشی۔ ان کو برسوں ایک حال پر رکھنے کے بعد بیدار کرنے سے اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ جو ربِ ذوالجلال اب اٹھا سکتا ہے وہ آخرت میں بھی اٹھائے گا اور سب کو جمع کرے گا۔ سب نے دیکھ لیا کہ اللہ ﷻ نے ان کو بیدار کیا اور وہ ایسے اٹھے جیسے کہ کل سوئے تھے، یہ اصحاب کہف کے ایمان کی تصدیق ہے۔

عملی پہلو: ان آیات میں اصحاب کہف کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اصحابِ کہف کے اسماء ذکر نہیں کیئے گئے، نہ صحیح جگہ اور تعداد لکھی گئی بلکہ وہ باتیں بیان کی گئیں جن کا تعلق ہماری عملی زندگی سے ہے۔

آیت نمبر ۱۳: اصحاب کہف کا واقعہ جس طرح وقوع پذیر ہوا تھا بالکل اسی طرح عبرت و نصیحت حاصل کرنے کے لئے بیان فرمایا جارہا ہے۔ وہ چند نوجوان تھے جو اللہ ﷻ پر ایمان لے آئے تھے۔ شرک کو ترک کر کے توحید اختیار کرنے پر اللہ ﷻ نے اُنہیں ایمان پر ثابت قدم رکھا اور ان کی رہنمائی میں مزید اضافہ فرمادیا۔

علمی بات: اس واقعہ کو ٹھیک ٹھیک سنانے کا مطلب یہ ہے کہ اس واقعہ کے سلسلہ میں جو جھوٹے اندازے لگائے جارہے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں قرآنِ حکیم کا بیان خالصتاً حقیقت پر مبنی ہے۔ اس واقعہ قرآنی کا ایک ایک لفظ سچائی کا آئینہ دار ہے نیز اپنے پہلو میں مقصدیت لیئے ہوئے ہے۔

علمی بات: رشد و ہدایت میں زیادہ کرنے سے مراد اپنے ایمان پر ڈٹ جانا ہے جیسا کہ اگلی آیت میں ان کے اعلان سے معلوم ہورہا ہے اُنہیں زبان سے کفر و شرک کا کلمہ کہنا اس قدر دشوار تھا کہ انہوں نے ایسی بات کہنے پر اپنا گھر بار اور کاروبار چھوڑنے کو ترجیح دی اور معاشرہ سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

عملی پہلو: اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہدایت میں اضافہ اور ترقی بھی ہوتی ہے، رشد و ہدایت میں ترقی اور اضافہ اللہ ﷻ کی خاص نظر کرم اور توفیق سے ہوتا ہے۔ قدم قدم پر انسان کو ہدایت کی ضرورت ہے۔ ہر معاملہ میں حتیٰ کہ آخری سانس بلکہ جنت میں داخلہ تک ہدایت کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں سورۃ الفاتحہ ہر نماز میں پڑھنے کی تاکید کی گئی اور نماز بھی تا دم آخر پڑھنے کا حکم ہے۔ سورۃ الفاتحہ میں عمدہ طریقہ سے حصولِ ہدایت کی دعا سکھائی گئی ہے۔

آیت نمبر ۱۴: اصحاب کہف کو صبر و استقلال عطا فرما کر ان کے دلوں کو حق گوئی کے لئے مضبوط کردیا گیا۔ ان کے توحید اختیار کرنے پر مشرک بادشاہ نے اُنہیں دربار میں طلب کیا، جہاں انہوں نے توحید کا برملا اعلان کردیا۔ توحید پر استقامت اور شرک کی نفی پر ثابت قدمی کا ذکر ہے۔ انہوں نے کہا کہ اللہ ﷻ کے سوا کسی دوسرے کو معبود مان لینا اللہ ﷻ پر بہت بڑا بہتان ہوگا۔

عملی پہلو: اصحاب کہف کے واقعہ سے بھی یہ سبق ملتا ہے کہ فتنوں کا مقابلہ اپنے دین و ایمان پر استقامت کے ساتھ جم کر ہی کیا جاسکتا ہے۔ اگر کفار کا غلبہ بے پناہ ہو اور ایک مومن کو ظالم معاشرہ میں سانس لینے تک کی مہلت نہ دی جارہی ہو تب بھی اس کو باطل کے آگے سر نہ جھکانا چاہیئے بلکہ اللہ ﷻ کے بھروسہ پر دین کے لئے ہجرت کر جانا چاہیئے۔ اس واقعہ کے ذریعہ ہمیں رہنمائی دی گئی کہ ہم استقامت کے ساتھ اسلام پر جمے رہیں اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات اور فتنوں کے مقابلہ میں صبر کریں اور دوسروں کو صبر کی تلقین کریں۔ دورِ فتن کے متعلق نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی میں رہنمائی موجود ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "لوگو تمہارے بعد ایسا دور آنے والا ہے جس میں صبر کرنا پڑے گا (مشکل حالات میں قائم رہنا پڑے گا۔ نامساعد حالات میں استقامت کے ساتھ رہنا پڑے گا۔) اس وقت جو دین اور اس کے احکامات کو مضبوطی سے تھامے گا اور دین کے احکامات پر عمل کرے گا اس کو اس طرح کے امور سرانجام دینے والے پچاس افراد کے برابر اجر دیا جائے گا۔" (سنن ابی داؤد)

علمی بات: یہ نوجوان سردارانِ قوم کے بیٹے تھے، ان کی فطرتِ سلیم نے بت پرستی کا انکار کردیا، وہ ایک اللہ ﷻ کی عبادت کے عقیدہ پر اکٹھا ہوگئے، جب بادشاہ وقت کو ان کی خبر ہوئی تو اُنہیں اپنے دربار میں بلایا اور بتوں کی پرستش سے انکار کا سبب پوچھا، تو اللہ ﷻ نے اُنہیں استقامت عطا کی اور بادشاہ کے سامنے کھڑے ہو کر اس بات کا اعلان کیا کہ ہمارا رب تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے اس لئے کسی حال میں بھی ہم اس کے علاوہ کسی کو اپنا معبود نہیں بنائیں گے، اگر ہم نے ایسا کیا تو اس سے بڑھ کر جھوٹ، بہتان اور اللہ ﷻ پر افترا پردازی اور کوئی نہیں ہوگی۔ اِذْ قَامُوْا "جب وہ (بادشاہ کے سامنے) کھڑے ہوئے" کا ایک معنیٰ یہ بھی ہے کہ جب انہوں نے اپنی قوم کے باطل عقائد و اعمال چھوڑنے کا پختہ عزم کرلیا اور توحید کی دعوت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

عملی پہلو: توحید کا اعلانِ عام کرنا اور توحید کی دعوت دینا یہ انبیاء کرام علیہم السلام اور نیک لوگوں کی صفت رہی ہے۔ توحید کا اعلان اور اس پر استقامت کا مظاہرہ کرنا یہ ہم سب پر لازم ہے۔ ایسا کرنے والوں کی اللہ ﷻ نصرت فرماتا ہے۔

آیت نمبر ۱۵: قوم کے لوگوں کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے پر اصحاب کہف کا اظہار افسوس کرنے کا ذکر ہے۔ انہوں نے کہا کہ قوم اگر اپنے دعویٰ میں سچی ہے تو اس کے لئے واضح دلیل پیش کرے۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بنانا اللہ تعالیٰ پر بہتان ہے اور جو اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھتا ہے اس سے بڑا ظالم کوئی نہیں ہے۔

علمی بات: اس آیت سے معلوم ہوا کہ اصحاب کہف کی قوم مشرک تھی۔ شرک اور بت پرستی کسی دلیل پر نہیں ہوتی۔ نہ عقلی دلیل (جسے عقل تسلیم کرے) نہ نقلی دلیل (جو کسی آسمانی کتاب میں موجود ہو)۔ اگر اس کی کوئی دلیل ہے تو پھر بتوں کے پرستار اسے پیش کیوں نہیں کرتے اور ایسی بے دلیل بات وہ دوسروں سے کیوں منوانا چاہتے ہیں۔ یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خدائی میں دوسروں کو شریک ٹھہرایا ہے یا خدائی کے اختیارات ان میں تقسیم کر دیئے ہیں یا ان کو لائق پرستش قرار دیا ہے سراسر جھوٹ اور اللہ تعالیٰ پر بہتان ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کہی پھر جو جھوٹ اللہ تعالیٰ پر بولا جائے وہ کتنی سنگین نوعیت کا ہو گا اور اس کا مرتکب کتنا بڑا مجرم ہو گا۔

آیت نمبر ۱۶: مشرک بادشاہ کے سامنے حاضری کے بعد کچھ مہلت میسر آنے پر صاحب ایمان نوجوانوں کی باہمی مشاورت کا بیان ہے۔ کسی غار میں پناہ لینے، اللہ تعالیٰ کے فیصلہ اور اس کی رحمت کا انتظار کرنے پر وہ متفق ہو گئے۔ چنانچہ وہ ایک غار میں جا چھپے اور اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اپنی رحمت میں لے کر برسوں تک کے لئے اُن پر نیند طاری کر دی۔

علمی بات: غار میں پناہ لینے کا فیصلہ انہوں نے حالات کی سنگینی کے پیش نظر کیا تھا جبکہ ان کی قوم بت پرست تھی اور عقیدہ و مذہب کی آزادی کو تسلیم نہیں کرتی تھی اور حکومت ایسی ظالم تھی کہ ایک کو ماننے اور بت پرستی سے انکار کرنے والے کو موت کے گھاٹ اتارتی تھی۔ ان حالات میں اصحاب کہف نے مشورہ کے بعد اپنے ایمان کو بچانے کے لئے غار میں پناہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اصحاب کہف نے اللہ تعالیٰ کی مدد پر بھروسہ کرتے ہوئے پورے یقین کے ساتھ یہ بات کہی کہ جب ہم نے خدائے واحد ہی کو معبود مانا ہے اور شرک اور مشرکین سے علیحدگی اختیار کر لی ہے تو اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی رحمت سے ضرور نوازے گا اور جس کام کو لے کر ہم اٹھے ہیں اس میں وہ ہماری ضرور مدد کرے گا۔ چنانچہ اس کے بعد وہ ایک غار میں جا چھپے، جب ان کے غائب ہونے کی خبر مشہور ہوئی تو اُنہیں تلاش کیا گیا، لیکن وہ لوگ ناکام رہے۔

عملی پہلو: اس سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ اصل چیز اپنے ایمان اور دین کا تحفظ ہے اور اگر حالات اتنے سنگین ہوں کہ یہ متاع عزیز ہی خطرہ میں پڑ جائے تو ایک مومن کو اس کے تحفظ کے لئے لوگوں سے کنارہ کشی بھی اختیار کرنی پڑے تو کرنی چاہیئے۔ اکثر ہمارے معاشرہ میں دینی شعائر کا مذاق اُڑایا جاتا ہے یا ایسی غیر شرعی رسم یا غیر اخلاقی عمل ہو رہا ہوتا ہے جسے غیرتِ ایمانی برداشت نہیں کر سکتی ایسے موقع پر بھی ایسا عمل کرنے والوں سے علیحدگی اختیار کر لینی چاہیئے۔ واضح رہے کہ اس کا کوئی تعلق نہ رہبانیت (یعنی ترکِ دنیا) سے ہے بلکہ یہ ایسے پُرفتن حالات کے لئے ہے جبکہ اپنے ایمان اور دین کو بچانے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہو۔

آیت نمبر ۱۷: اصحاب کہف پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت کا بیان ہے۔ وہ جس غار میں سو رہے تھے اس میں صبح و شام دھوپ ان کے قریب سے گزرتی مگر ان کے جسموں پر نہیں پڑتی تھی۔ ان کے جسم غار کے کشادہ حصّہ میں تھے اور بالکل محفوظ تھے۔ ان نوجوانوں کی غار کی طرف رہنمائی کرنا، پھر دشمن اور موسم سے حفاظت کرنا بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی عظیم نشانی ہے۔ ہدایت مانگنے والے کو ہدایت دی جاتی ہے اور جو گمراہی اختیار کرے اس کے لئے کوئی مددگار اور راہ بتلانے والا نہیں ہوتا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا ان توحید پرستوں کو ایسے غار کی جانب رہنمائی کر دینا پھر اُنہیں صدیوں تک سلائے رکھنا یہ باتیں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے تعلق رکھتی ہیں اس طرح اللہ تعالیٰ نے اُنہیں راہ ہدایت پر ثابت قدم رکھا۔

علمی بات: یہ آیت کریمہ بتاتی ہے کہ دھوپ صبح و شام اس غار میں داخل ہوتی تھی، لیکن ان کے جسموں پر نہیں پڑتی تھی۔ ان کے اجسام غار کے کشادہ حصّہ میں آفتاب کی شعاعوں سے مامون و محفوظ تھے۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اس غار میں پناہ دے کر ان کو دشمنوں سے بھی بچا لیا اور ان کے جسموں کو سردی اور گرمی سے متاثر ہونے سے بھی محفوظ رکھا۔ یقیناً ان صالحین کا یہ حال اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نشانی ہے۔

علمی بات: بعض حضرات نے تو باقاعدہ اس غار کا حدود اربعہ اور نقشہ بنانے کی کوشش کی ہے تاکہ سائنسی انداز میں واضح کیا جائے کہ اس میں سورج کی دھوپ کیوں نہیں آتی تھی۔ لیکن اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ دھوپ نہ آنے کے دو ہی سبب ہوسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ غار کا محل وقوع ایسا ہو اور اس کا دہانہ شمال کی طرف ہو تو سورج طلوع اور غروب کے وقت یقیناً اس سے ہٹتا ہوا گزرے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کا محل وقوع کیسا بھی ہو، سورج کو اللہ ﷻ کی طرف سے اس بات کا حکم دے دیا گیا ہو کہ اسے ان صالح بندوں کو روشنی اور حرارت تو مہیا کرنی ہے لیکن اپنی تمازت سے اُنہیں محفوظ رکھنا ہے۔ یہی درحقیقت اللہ ﷻ کی وہ قدرت ہے جس نے غار کی اس کیفیت کو اللہ ﷻ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی بنا دیا۔

علمی و عملی بات: مزید فرمایا کہ اللہ ﷻ جسے ہدایت دیتا ہے وہ ایسی نشانیوں سے ہدایت حاصل کرتا ہے اور جس کو اللہ ﷻ گمراہ کرتا ہے اس کے لئے اس طرح کی نشانیاں بھی مفید نہیں ہوتیں، کیونکہ اصل بات کسی بھی نشانی سے نصیحت قبول کرنے کی ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک قبولیت کا مادہ انسان کی طبیعت میں موجود نہ ہو۔ کافر اور مشرک چونکہ اپنے کفر اور شرک کے باعث قبولیت کے مادہ سے محروم ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے دائیں بائیں، آگے پیچھے ہزاروں نشانیاں پھیلی ہوئی دیکھتے ہیں لیکن اُنہیں ہدایت قبول کرنے کی توفیق نہیں ملتی کیونکہ وہ اپنے آپ کو اس سے محروم کرچکے ہوتے ہیں۔

عملی پہلو: جو شخص راہِ ہدایت پر ڈٹ جانے کا عزم کرلیتا ہے تو اللہ ﷻ اس کے لئے کوئی راہ پیدا فرما دیتا ہے جس سے اس کی مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ یہ اس بات کی نشانی ہے کہ جو اللہ ﷻ پر توکل کرتے ہیں اللہ ﷻ ان کی کس طرح مدد فرماتا ہے۔ اصحاب کہف کی ایک ایسے غار کی طرف رہنمائی جو ان نازک حالات میں ان کے تحفظ کے لئے ہر طرح موزوں تھا اور جس میں ان کو سکون میسر آیا اس بات کی علامت ہے کہ اللہ ﷻ اپنے مخلص بندوں کی نازک مواقع پر مدد اور رہنمائی فرماتا ہے

آیت نمبر ۱۸: اصحاب کہف کی غار میں کیفیت کا بیان ہے۔ دیکھنے والے اُنہیں جاگتا ہوا خیال کرتے حالانکہ وہ گہری نیند میں تھے۔ یہ ان کی حفاظت کے لئے اللہ ﷻ کی طرف سے انتظام تھا تاکہ کوئی ان کے قریب نہ جاسکے۔ سونے کی حالت میں ان کے جسم دائیں بائیں کروٹ بھی بدلتے تھے اور ان کا کتا اپنے بازو پھیلائے غار کی چوکھٹ پر بیٹھا تھا۔ اصحاب کہف کی ایسی کیفیت تھی کہ دیکھنے والوں پر ان کا رعب طاری ہو جاتا۔

علمی بات: سوتے میں ان کی آنکھیں کھلی رہتی تھیں اور اس قدر طویل نیند کا اثر ان کے جسموں پر ظاہر نہیں ہوا۔ وہ اس طرح سو رہے تھے اور ساتھ ہی کروٹیں بدلتے جاتے تھے کہ اگر اتفاق سے کوئی شخص اُنہیں دیکھ لیتا تو یہی خیال کرتا کہ یہ بس لیٹے ہوئے ہیں اور جاگ رہے ہیں اور ان کا کتا بھی غار کے دہانے پر ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا۔ اللہ ﷻ نے ان لوگوں میں شان ہیبت و جلال اور اس مکان میں اس قدر دہشت رکھی تھی کہ اگر اس تاریک غار میں کوئی شخص جھانک کر دیکھ لیتا تو یہ منظر ایسا دہشت ناک تھا کہ دیکھنے والا الٹے پاؤں بھاگ جاتا۔ وہ اندیشہ محسوس کرتا کہ معلوم نہیں یہ کون لوگ ہیں جو اس تاریک غار میں چھپ گئے ہیں اور ان کے ارادے کیا ہیں۔ اللہ ﷻ نے یہ دہشت ناک صورت اس لئے پیدا کردی تھی کہ کوئی شخص ان کے قریب آنے کی جرأت نہ کرے اور وہ بالکل محفوظ رہیں۔ ان کی حفاظت کا یہ غیر معمولی سامان تھا جو ربِ ذوالجلال کی طرف سے کیا گیا۔

آیت نمبر ۱۹: جس طرح اصحاب کہف کو اللہ ﷻ نے اپنی قدرت کاملہ سے سلا دیا تھا اسی طرح طویل نیند کے بعد اُنہیں جگا دیا۔ بیدار ہونے کے بعد ان کے درمیان غار میں رہنے کی مدت کے متعلق باہم اختلاف رائے ہوا۔ انہوں نے خیال کیا کہ شاید وہ ایک دن یا اس سے بھی دن کا کم حصہ سوئے رہے۔ بحث کو طول دینے کے بجائے انہوں نے یہ معاملہ اللہ ﷻ کے سپرد کر دیا کیوں کہ وہی صحیح مدت کو جاننے والا ہے۔ بھوک محسوس ہونے پر انہوں نے کچھ رقم دے کر اپنے ایک ساتھی کو شہر بھیجنے کے لئے منتخب کیا۔ کھانے کے لئے انہوں نے سب سے زیادہ پاکیزہ کھانا لانے کی تلقین کی۔ اپنے ساتھی کو اس اندیشہ کے پیش نظر کہ ان کی روپوشی کے متعلق اہل شہر کو علم نہ ہو جائے، محتاط رویہ اختیار کرنے کی تاکید کی۔

علمی و عملی بات: کھانا لانے والے کو یہ ہدایت کرنا کہ تحقیق کرکے پاکیزہ کھانا لے آئے اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ شہر کا ماحول وہی مشرکانہ ہے جس کو چھوڑ کر وہ آئے تھے اور ایک مشرکانہ معاشرہ میں حلال و حرام کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ اس لئے انہوں نے پاکیزہ یعنی حلال کھانے کی تاکید کی۔ اس سے ان کی پاکیزگی نفس کا اندازہ ہوتا ہے۔

علمی بات: بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے ذبح شدہ جانور کی طرف اشارہ تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس شہر میں ایسے لوگ رہتے ہیں کہ جو نجس و ناپاک اور کبھی مُردہ کا گوشت بیچتے ہیں یا بعض لوگوں کا کام ہی حرام کا تھا لہٰذا انہوں نے نصیحت کی ایسے لوگوں سے کھانا نہ خریدنا۔ پاکیزگی کے وسیع مفہوم میں ہر قسم کی ظاہری اور باطنی پاکیزگی شامل ہے اور یہ دراصل راہِ حق کے تمام مومنین کے لئے نصیحت ہے کہ وہ نہ صرف روحانی غذا کے بارے میں فکر کریں بلکہ اپنی جسمانی غذا کی پاکیزگی کا بھی خیال رکھیں کہ وہ ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہو یہاں تک کہ زندگی کے مشکل ترین لمحات میں بھی اس بات کو فراموش نہ کریں۔

عملی پہلو: آج کل بہت سے لوگ اس حکم کی اہمیت سے کسی حد تک آگاہ ہو گئے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ان کی غذا ہر قسم کی ظاہری آلودگی سے پاک ہو وہ کھانے کی چیزوں کو ڈھک کر گندے ہاتھوں کی پہنچ سے دور اور گرد و غبار سے بچا کر رکھتے ہیں۔ یہ کام بہت اچھا ہے لیکن اس پر قناعت نہیں کرنا چاہیئے بلکہ یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ غذا حرام نہ ہو، سود، ملاوٹ، دھوکہ بازی اور ہر قسم کی باطنی آلودگی سے بھی پاک ہو۔ اسلامی تعلیمات میں قبولیت دعا اور پاکیزگی دل کے لئے حلال غذا کی بہت تاکید کی گئی ہے۔

علمی بات: اصحاب کہف کا طویل مدت تک سوئے رہنا ایک ایسا واقعہ تھا جس کا احساس خود اس طرح سوئے رہنے والوں کو بھی نہ ہو سکا۔ گویا یہ برزخ کی زندگی کی دلیل بھی ہے۔ جہاں انسان طویل عرصہ تک پڑا رہے گا لیکن قیامت کے دن جب اسے اٹھایا جائے گا تو ایسا محسوس ہو گا کہ اس نے چند گھنٹے ہی عالم برزخ میں گزارے ہیں۔ وقت کی طوالت کا احساس نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ جس شخص کی موت ہو گئی اس کی گویا قیامت قائم ہو گئی اللہ ﷻ نے اصحاب کہف کے واقعہ سے اسی حقیقت کو ظاہر کر دیا ہے۔

علمی و عملی بات: اصحاب کہف نے کھانا لانے والے کو تاکید کی کہ وہ نرمی اور باریک بینی کی کوشش کرے، کوئی زیادتی بھی کر لے تو درگزر کرے، کیونکہ سختی سے کام بگڑ جاتے ہیں۔ حُسنِ تدبیر اور باریک بینی اختیار نہ کرنے سے راز کھل جاتے ہیں اور مطلوبہ معلومات بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ یعنی وہ ایسی خوش تدبیری سے کام لے کہ کسی کو اس پر حکومت کے مجرم یا باغی ہونے کا شبہ نہ ہونے پائے۔ کوئی ایسی بات یا حرکت شہر میں جا کر نہ کرے جس سے ان کے راز فاش ہو جانے کا خطرہ ہو۔ مطلب یہ تھا کہ ان کا نمائندہ ایسی تدبیر کے ساتھ اشیاء خریدے کہ کسی کو شبہ نہ پڑے اور لوگ اسے اجنبی مسافر ہی سمجھیں۔

آیت نمبر ۲۰: اہل شہر اگر ان کے متعلق جان گئے تو وہ اُنہیں سنگسار کر دیں گے یا اُنہیں زبردستی اپنا آبائی مذہب قبول کرنے پر مجبور کریں گے۔

علمی بات: اس سے واضح ہوتا ہے کہ جس قوم کو وہ چھوڑ آئے تھے وہ کیسی ظالم تھی۔ ان کے نزدیک ان کے مشرکانہ مذہب کو ترک کر دینے کی سزا موت تھی نیز یہ کہ وہ اپنے مذہب میں واپس لانے کے لئے جبر کرتے تھے یعنی مرتد کر کے چھوڑتے تھے۔ اصحاب کہف کو یقین تھا کہ اگر ملتِ کفر میں شامل ہو گئے تو پھر فلاح دنیا و آخرت سے محرومی ہی رہے گی۔ پھر کسی طرح بھی ان سے نجات حاصل کرنا ممکن نہ ہو گا۔

علمی بات: اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان مشرکین کے ہاں ان کے دین سے پھر جانے والے کی سزائے قتل بصورت سنگساری دی جاتی تھی تا کہ سب لوگ اس میں شریک ہوں، اور ساری قوم اپنے غیظ و غضب کا اظہار کر کے قتل کرے۔ اس مفہوم سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شاید شریعت اسلام میں شادی شدہ مرد و عورت کے زنا کی سزا بھی جو سنگسار کر کے قتل کرنا تجویز کیا گیا ہے اس کی بھی ایک منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے حیا کے سارے پردوں کو توڑ کر اس فعل قبیح کا ارتکاب کیا ہے اس کا قتل منظر عام پر سب لوگوں کی شرکت کے ساتھ ہونا چاہیئے تا کہ اس کی رسوائی بھی پوری ہو، اور سب مسلمان عملاً اپنے غیظ و غضب کا اظہار کریں، تا کہ آئندہ قوم میں اس حرکت کا اعادہ نہ ہو سکے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

آیت نمبر ۲۱: اصحاب کہف کے راز سے اہل شہر کے باخبر ہو جانے کی حکمت کا بیان ہے۔ حکمت یہ تھی کہ موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر لوگوں کو ایمان و یقین ہو جائے۔ اصحاب کہف کی وفات کے بعد یادگار کے طور پر غار کے قریب عمارت بنائے جانے کے ضمن میں مختلف آراء تھیں۔ اس ضمن میں ان میں سے اختیار پانے والوں نے یادگار کے طور پر مسجد بنانے کا فیصلہ کیا۔

علمی بات: جب یہ واقعہ پیش آیا اس وقت اگرچہ مسیحی مذہب کافی پھیل چکا تھا لیکن ابھی ایسے لوگ موجود تھے جو اپنے آبائی مشرکانہ عقائد پر ڈٹے ہوئے تھے۔ اور قیامت پر ان کا عقیدہ نہ تھا۔ نیز وقت گزرنے کے ساتھ مسیحیت کے ماننے والوں میں بھی عقائد کی خرابیاں رونما ہو چکی تھیں۔ ان میں بھی ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو یا تو سرے سے قیامت کا منکر تھا یا پھر اس معاملہ میں شکوک و شبہات میں پڑا ہوا تھا۔ وہ لوگ روزِ قیامت قبروں سے جسموں کے ساتھ اُٹھنے اور جزا و سزا دیئے جانے کا مذاق اڑاتے تھے۔ بادشاہِ وقت کو اس سے بڑی تشویش تھی۔ وہ اپنے دین کے اس بنیادی عقیدہ کی یہ تضحیک گوارا نہ کر سکتا تھا لیکن اس کے پاس کوئی ایسی قوی دلیل بھی نہ تھی جس سے وہ منکرین قیامت کو دندان شکن جواب دے سکے۔

اس واقعہ سے واضح فرمادیا گیا کہ جس طرح ہم نے اصحاب کہف کو خاص طور پر اور عجیب و غریب طریقہ سے سلایا اور جگایا اسی طرح ہم نے لوگوں کو ان کے حال پر مطلع کیا یعنی ان لوگوں کو جو کہ بعث بعد الموت کے بارے میں اختلاف میں پڑے ہوئے تھے، سو ان لوگوں کو ان حضرات کے حال پر مطلع کر دیا تاکہ ان کی آنکھیں کھل جائیں اور یہ یقین کر لیں کہ جس قادرِ مطلق نے ان لوگوں کو اس قدر طویل مدت سلانے کے باوجود اس طرح صحیح و سالم اٹھا دیا کہ نہ ان کے جسموں میں کچھ فرق آیا نہ ان کی جوانیوں میں اور نہ ان کے کپڑوں میں۔ اس طرح اللہ ﷻ نے اس زمانہ میں ایک طویل عرصہ تک سوئے رہنے والے اصحاب کہف کو صحیح و سلامت جسموں کے ساتھ بیدار کر کے اپنی قدرت کاملہ کا ایک ناقابل تردید ثبوت مہیا کر دیا۔ اور سب کو یقین کرنا پڑا کہ جو اللہ ﷻ اتنے طویل عرصہ (کم و بیش تین سو (۳۰۰) سال تک) غار میں سونے والوں کو یوں صحیح و سالم اٹھا سکتا ہے اس قادرِ مطلق کے لئے کیا بعید ہے کہ تمام مُردوں کو قیامت کے دن زندہ کر کے کھڑا کر دے۔

علمی بات: جب ان میں ایک صاحب کھانا لینے کے لئے شہر پہنچے، اور دکان دار کو وہ سکہ پیش کیا جو تین سو (۳۰۰) سال پرانا تھا اور اس پر پرانے بادشاہ کی علامتیں تھیں۔ دکان دار بڑا حیران ہوا، اور ان کو لے کر اس وقت کے بادشاہ کے پاس پہنچا۔ یہ بادشاہ نیک تھا، بعض روایات میں ہے کہ یہ بادشاہ قیامت اور آخرت پر ایمان رکھتا تھا، لیکن کچھ لوگ آخرت کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار کر رہے تھے، بادشاہ نے یہ دعا کی تھی کہ اللہ ﷻ ان کو کوئی ایسا واقعہ دکھا دے جس سے آخرت پر ان کا ایمان مضبوط ہو جائے۔ اللہ ﷻ نے اسی وقت ان نوجوانوں کو جگا کر اپنی قدرت کا یہ کرشمہ دکھا دیا۔ چونکہ بادشاہ نے یہ قصّہ سن رکھا تھا کہ کچھ نوجوان پہلے زمانہ کے مشرک اور ظالم بادشاہ دقیانوس (Decius) یا ترا جان (Trajan) کے ظلم سے تنگ آ کر کہیں غائب ہو گئے تھے۔ اس نے معاملہ کی مزید تحقیق کی تو پتہ چل گیا کہ یہ وہی نوجوان ہیں۔ اس پر بادشاہ نے ان کا خوب اکرام کیا، لیکن یہ حضرات دوبارہ اسی غار میں چلے گئے اور وہیں پر اللہ ﷻ نے اُنہیں وفات دے دی۔

علمی بات: اصحاب کہف نے بیدار ہونے کے بعد طبعی وفات پائی۔ ان کے انتقال کے بعد لوگوں میں باہمی اختلاف ہوا۔ بعض لوگوں کی رائے یہ تھی کہ غار کے دروازے پر دیوار چن دی جائے تاکہ اندر کوئی نہ جا سکے۔ بعض کا خیال تھا کہ کوئی یادگاری عمارت بنا دی جائے۔ بعض افراد کی رائے یہ تھی کہ ان کے پڑوس میں ایک مسجد تعمیر کر دی جائے تاکہ آنے والے اس میں عبادت کر سکیں اور اس طرح اصحاب کہف کی یاد تازہ ہوتی رہے۔

اصحابِ کہف کا زمانہ: ایک رائے یہ ہے کہ اصحابِ کہف حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے گزرے ہیں۔ لیکن زیادہ پیش کی جانے والی رائے یہ ہے کہ اصحابِ کہف کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کا ہے جب کہ اس علاقہ میں ایک رومی ظالم مشرک بادشاہ ٹراجان (Trajan) کی حکومت تھی جس کا دورِ حکومت ۹۸ تا ۱۱۷ عیسوی ہے۔ یا پھر بادشاہ دقیانوس (Decius) کی حکومت تھی۔ جس کا دورِ حکومت ۲۴۹ تا ۲۵۱ عیسوی ہے۔ رومی بادشاہ قسطنطین (Constantine) نے ۳۰۰ عیسوی میں بُت پرستی ترک کر کے عیسائیت اختیار کر لی اور پوری رومی ریاست عیسائی ہو گئی۔ جب اصحابِ کہف اپنی نیند سے بیدار ہوئے تو اس وقت ظالم مشرک بادشاہ کا دور بہت پہلے ختم ہو چکا تھا۔ اللہ ﷻ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ایک عیسائی بادشاہ تھیوڈوسیس ثانی (Theodosius) کا دور تھا۔ جس کا دورِ حکومت ۴۰۸ تا ۴۵۰ عیسوی ہے۔

آیت نمبر ۲۲: اصحاب کہف کی تعداد میں لوگوں کے تین اقوال نقل کیئے گئے ہیں۔ ۱۔ اصحاب کہف تین تھے چوتھا ان کا کتا تھا۔ ۲۔ وہ پانچ تھے، چھٹا ان کا کتا تھا۔ ۳۔ وہ سات تھے آٹھواں ان کا کتا تھا۔ اختلاف کرنے والوں کے پاس صحیح تعداد کی کوئی دلیل نہیں۔ ان کی اصل تعداد کا علم اللہ ﷻ کو ہے یا وہ چند لوگ جن کو اللہ ﷻ نے علم دیا ہے۔ اصحاب کہف کی تعداد کے متعلق اختلاف کرنے والوں سے سوال اور بحث کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔

علمی بات: جن لوگوں کو اصل مقصد سے لگاؤ نہیں تھا اور جو اس واقعہ سے کوئی سبق حاصل کرنا نہیں چاہتے تھے انہوں نے اصحاب کہف کی تعداد وغیرہ کے بارے میں غیر ضروری بحث چھیڑ دی تھی۔ قرآن حکیم نے ان کی بحثوں کا جواب دیئے بغیر جچے تلے انداز میں سرگزشت سنائی اور سبق آموز پہلوؤں کو نمایاں کیا۔ ساتھ ہی اہل ایمان کو ہدایت کی کہ ان بحثوں سے سرسری طور سے گزریں اور ان میں الجھیں نہیں۔

علمی بات: اس آیت نے یہ مستقل سبق دے دیا ہے کہ جس معاملہ پر انسان کا کوئی عملی مسئلہ موقوف نہ ہو، اس کے بارے میں خواہ مخواہ بحثیں نہیں کرنی چاہئیں۔ اصحاب کہف کے واقعہ میں اصل سبق لینے کی بات یہ ہے کہ انہوں نے کس طرح ناموافق حالات میں حق پر ثابت قدم رہنے کا مظاہرہ کیا اور پھر اللہ ﷻ نے کس طرح ان کی مدد فرمائی۔ رہا یہ کہ ان کی صحیح تعداد کیا تھی؟ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس پر بحث کا بازار گرم کیا جائے۔ لہٰذا اس میں الجھنے کے بجائے یہ ہدایت دی گئی ہے کہ اگر کوئی اس معاملہ میں بحث کرنا بھی چاہے تو اسے سرسری گفتگو کر کے ٹال دو اور اپنا وقت ضائع نہ کرو۔

عملی پہلو: قرآنِ کریم میں علم و تحقیق سے منع نہیں کیا گیا بلکہ ان بے کار بحثوں اور گفتگو سے منع کیا گیا ہے جن کا حاصل سوائے فضول بحثوں اور بے معنیٰ گفتگو کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ بنی اسرائیل کی سب سے بڑی کمزوری بلکہ ان کی بربادی کا بڑا سبب بے تکے سوالات اور بے کار بحثوں میں پڑنا تھا۔ اصولی بات یہ ہے کہ جو قوم اور اس کے افراد فضول اور بے کار کی بحثوں میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں ان کو کسی حُسنِ عمل کی توفیق نہیں ملتی۔ قرآنِ کریم جس کے نازل کرنے کا بنیادی مقصد ایمان اور عمل صالح میں پختگی اور دنیا و آخرت میں صحیح طرزِ عمل اختیار کر کے ہر طرح کی فلاح حاصل کرنا ہے اس نے فضول بحثوں اور باتوں سے بچنے کی تاکید کی ہے تاکہ انسانی صلاحیتیں فضول اور بے کار باتوں کی نذر نہ ہو جائیں۔

یہ شیطانی عمل ہے کہ واقعات کے ہدایتی اور عملی پہلو سے توجہ ہٹا کر غیر اہم پہلو اور غیر ضروری بحث و مباحثہ میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ہدایتی پہلو نظر انداز ہونے کی وجہ سے معاشرہ میں اتحاد کے بجائے انتشار پیدا ہو جاتا ہے، لوگوں میں محبت کے بجائے نفرت پروان چڑھتی ہے اور اُمّت میں وحدت کے بجائے فرقہ واریت جنم لیتی ہے۔ لہٰذا حکم دیا گیا ہے کہ سرسری گفتگو کرنے کے بعد زیادہ بحث نہ کریں۔ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ (رحمان کے بندوں) کی ایک صفت یہ بیان کی گئی کہ "اور رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں اور جب ان سے جاہل لوگ بات کریں تو کہتے ہیں سلام ہے۔" (سورۃ الفرقان ۲۵، آیت: ۶۳)

آیت نمبر ۲۳: یہود کے کہنے پر قریش کے سرداروں نے رسول اللہ ﷺ سے اصحاب کہف کے متعلق سوال کیا۔ جس بنا پر آپ ﷺ نے آئندہ کل بتانے کا وعدہ فرمایا۔ وحی کے ذریعہ ان شاء اللہ کہنے کی تلقین فرمائی گئی۔ آئندہ کسی کام کا ارادہ یا وعدہ کرنے کا ارادہ کرنا ہو تو ان شاء اللہ کا کلمہ کہا جائے۔ کسی کو نہیں معلوم ہوتا کہ وہ فلاں وقت فلاں کام کر سکے گا یا نہیں۔ اللہ ﷻ کے اِذن کے بغیر کچھ ممکن نہیں۔

علمی بات: یہودیوں نے نبی کریم ﷺ سے تین باتیں پوچھی تھیں: روح کی حقیقت کیا ہے اور اصحاب کہف اور ذوالقرنین کون تھے؟ کہتے ہیں کہ یہی سوال اس سورت کے نزول کا سبب بنے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "میں تمہیں کل جواب دوں گا"، لیکن اس کے بعد کچھ دن تک جبرائیل وحی لے کر نہیں آئے۔ پھر جب آئے تو اللہ ﷻ نے ان شاء اللہ کہنے کا یہ حکم دیا۔" اس میں ہمارے لئے رہنمائی ہے کہ جب بھی مستقبل قریب یا بعید میں کوئی کام کرنے کا عزم کریں تو ان شاء اللہ ضرور کہا کریں۔ کیونکہ انسان کو تو پتہ نہیں کہ جس بات کا عزم کر رہا ہے، اس کی توفیق بھی اسے اللہ ﷻ کی مشیت سے ملتی ہے یا نہیں۔

عملی پہلو: ایک مومن کا شعار یہ ہے کہ جب وہ کوئی وعدہ کرتا ہے یا کسی کام کے آئندہ کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے تو ان شاء اللہ ضرور کہتا ہے۔ اس لئے نبی اکرم ﷺ کے ذریعہ سے اُمّت کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہے کہ اگر کوئی شخص خواہ پورے صدقِ دل اور سچی نیت سے بھی کوئی وعدہ یا مستقبل کے متعلق بات کرے تو اسے ان شاء اللہ ضرور کہہ لینا چاہیئے۔ یعنی اس بات کو اللہ ﷻ کی مشیت کے ساتھ وابستہ کر کے کہنا چاہیئے۔

شانِ نزول: سورۃ الکہف کے نزول کے وقت جب کفارِ مکہ نے اصحاب کہف کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے یہ سوچ کر کہ کل حضرت جبرئیل امین علیہ السلام آئیں گے تو میں ان سے پوچھ کر بتا دوں گا۔ آپ ﷺ نے یہ فرما دیا کہ "میں یہ بات تمہیں کل بتا دوں گا" چونکہ آپ ﷺ کی ذات پاک اُمّت کے لئے بہترین نمونہ

عمل ہے آپ ﷺ کی اُمت کو سکھانے کے لئے چند روز تک وحی نازل نہیں ہوئی۔ حضرت جبرئیل امین علیہ السلام نہیں آئے۔ کفار کو مذاق اڑانے اور جملے کسنے کا موقع مل گیا جس سے آپ ﷺ کو خاصی پریشانی ہو گئی۔ چند روز کے بعد یہ آیت نازل ہوئی جس میں فرمایا گیا کہ آپ ﷺ کی زندگی موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے بہترین اُسوہ اور نمونہ ہے۔ لہٰذا آئندہ جب بھی مستقبل میں کیئے جانے والا کام یا کوئی بات فرمائیں تو ان شاء اللہ کہہ لیا کریں تاکہ اللہ ﷻ پر بھروسہ کرنے کی وجہ سے کام درست ہو جائیں اور ان کی رکاوٹیں دور ہو جائیں اور ہر شخص یہ بات جان لے کہ اس کائنات میں ہر کام اللہ ﷻ کی قدرت، اس کے حکم اور کسی مصلحت سے ہوتا ہے۔ اس کے حکم کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوتا۔

عملی پہلو: افسوس کہ آج بعض بدنیت قسم کے لوگوں نے اس کلمہ استثنیٰ کو اپنی بدنیتی پر پردہ ڈالنے کے لئے ڈھال بنا رکھا ہے مثلاً ایک شخص اپنے سابقہ قرضہ کی ادائیگی یا نئے قرض کے لئے قرض خواہ سے ایک ماہ کا وعدہ کرتا ہے اور ساتھ ان شاء اللہ بھی کہہ دیتا ہے مگر اس کے دل میں یہ بات ہوتی ہے کہ اپنا کام تو چلائیں پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا اور جب مدت مقررہ کے بعد قرض خواہ اپنے قرض کا مطالبہ کرتا ہے تو کہہ دیتا کہ اللہ ﷻ کو منظور ہی نہ ہوا کہ میرے پاس اتنی رقم آئے کہ میں آپ کو ادا کر سکوں وغیرہ وغیرہ عذر پیش کر دیتا ہے اور بدنیت لوگوں نے اس کلمہ استثنیٰ کو اس قدر بدنام کر دیا ہے کہ جب کوئی اپنے وعدہ کے ساتھ ان شاء اللہ کہتا ہے تو سننے والا فوراً سمجھ جاتا ہے کہ اس کی نیت بخیر نہیں ہے یہ اللہ ﷻ کی آیات سے بدترین قسم کا مذاق ہے جس کا ایک ایمان دار آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس طرح کا رویہ اللہ ﷻ کی ناراضگی کا سبب بن سکتا ہے اور اس پر اللہ ﷻ کی طرف سے کوئی گرفت بھی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ اس طرح کے طرزِ عمل سے اجتناب کریں۔

عملی پہلو: مستقبل کے متعلق ہر کام کرنے کے ارادہ کے ساتھ کلمہ ان شاء اللہ کہنے کی تلقین و تاکید کی گئی ہے۔ یہ کلمہ ایک طرف عاجزی وانکساری پیدا کرتا ہے اور انسان کے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی عقل، ذہانت اور علم کے باوجود انسان جب تک کوئی کام مکمل نہیں کر سکتا جب تک اللہ ﷻ کی اجازت نہ ہو۔ اس طرح اللہ ﷻ پر ایمان و بھروسہ مزید بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ انسان کی چاہت کے مطابق اگر کوئی فیصلہ نہ ہو تو انسان کو کوئی افسوس یا رنج نہیں ہوتا کیونکہ یہ فیصلہ اللہ ﷻ کی طرف سے ہوا ہے۔

آیت نمبر ۲۴: بھول جانے کی صورت میں جس وقت بھی یاد آئے ان شاء اللہ کہہ دیا جائے یا پھر اللہ ﷻ کی تسبیح یا تحمید یا استغفار کیا جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ اللہ ﷻ اپنے فضل سے بہتر بات یا راستہ کی توفیق عطا فرمائے گا۔

علمی بات: اگر کلام یا وعدہ کرتے وقت ان شاء اللہ کہنا بھول جاؤ، تو جس وقت یاد آ جائے ان شاء اللہ کہہ لیا کرو، تاکہ جو بھول ہو گئی تھی اس کی تلافی ہو جائے۔ یا پھر رب کو یاد کرنے کا مطلب، اس کی تسبیح و تحمید اور اس سے استغفار ہے۔ یعنی میں جس کا عزم ظاہر کر رہا ہوں، ممکن ہے اللہ ﷻ اس سے زیادہ بہتر اور مفید کام کی طرف میری رہنمائی فرمادے۔

عملی پہلو: رشد و ہدایت اللہ ﷻ کی طرف سے ہے انسان کا کام ہے کہ اللہ ﷻ کو یاد رکھے اور اس کا ذکرِ الٰہی اور اللہ ﷻ کی طرف رجوع کرنے سے ہر معاملہ میں اللہ ﷻ بہتر راستہ نکال دیتے ہیں۔

آیت نمبر ۲۵: اصحاب کہف کے غار میں ٹھہرنے کی مدت کا بیان ہے۔ وہ شمسی حساب سے تین سو (۳۰۰) اور قمری حساب سے تین سو نو (۳۰۹) سال سوئے رہے۔ ایک رائے کے مطابق یہ مدت لوگوں کا قول ہے۔

علمی بات: اس آیت میں مذکور مدت اس لحاظ سے تو ٹھیک ہے کہ تین سو (۳۰۰) شمسی سالوں کے قمری سال تین سو نو (۳۰۹) ہی بنتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ آیا یہ مدت کی تعیین اللہ ﷻ کا کلام ہے یا لوگوں کے اقوال ہیں جو یہاں اللہ ﷻ نے حکایتاً نقل فرمائے ہیں تو مفسرین کرام کی ایک رائے کے مطابق جواب یہ ہے کہ یہ لوگوں کے اقوال ہیں اگر یہ اللہ ﷻ کا قول ہوتا تو اللہ ﷻ اس سے اگلی آیت میں یوں نہ فرماتا کہ "اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنی مدت وہ (غار میں) ٹھہرے رہے۔"

آیت نمبر ۲۶: اصحاب کہف کی غار میں مدتِ قیام کا صحیح علم اللہ ﷻ ہی کو ہے جو کائنات کی پوشیدہ باتوں کو سننے اور دیکھنے والا ہے۔ اللہ ﷻ کے سوا لوگوں کا کوئی مددگار نہیں اور نہ ہی وہ اپنے فیصلہ یا حکم میں کسی کو شریک کرتا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کے سوا ان کا کوئی ولی اور کارساز نہیں ہے، اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اصحاب کہف کا اللہ ﷻ کے سوا کوئی ولی نہیں تھا جو اتنی طویل مدت تک نیند میں ان کی حفاظت کرتا اور ان کے جسموں کو سڑنے اور گلنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس آیت کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ محض اندازوں سے اصحاب کہف کی مدت قیام بتا رہے ہیں، ان کو اپنے اجسام کی حفاظت کا علم ہے نہ اصحاب کہف کے اجسام کی حفاظت کی تدبیر کا علم ہے، اور جب ان کو یہ علم نہیں ہے تو ان کی مدت قیام کا علم کیسے ہو سکتا ہے۔

علمی بات: اس قصّہ کے آغاز میں اللہ ﷻ یہ واضح فرما چکا ہے کہ وہ غار میں سالہا سال تک رہے یعنی وہ ایک طویل مدت تک غار میں سوتے پڑے رہے اور اتنی بات سبق آموزی کے لئے کافی ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ ہی مددگار اور کارساز ہے۔ وہ اپنے فیصلوں میں کسی کی شراکت گوارا نہیں کرتا نہ اس کی کوئی مزاحمت کر سکتا ہے اور نہ اس کی حکمرانی میں کوئی حصّہ دار بن سکتا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ کسی غیر کو دخل اندازی کا کوئی حق نہیں ہے۔

آیت نمبر ۲۷: دورِ مشکلات میں اُمّت کے لئے رہنمائی کا ذکر ہے۔ مشکلات میں بھی سکون کا ذریعہ قرآنِ حکیم ہے لہٰذا قرآنِ حکیم پڑھتے رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ قرآنِ حکیم کی حیثیت اس قدر قطعی اور یقینی ہے کہ اس کے کلمات کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ قرآنِ حکیم پر عمل کرنے کے بجائے اس کے خلاف چلنے والے مجرم ہیں اور مجرم کو اللہ ﷻ کے سوا کوئی پناہ گاہ نہیں مل سکتی۔

علمی بات: یقیناً دینِ اسلام پر چلنا بہت کٹھن اور مشکل ہے اور اس راستہ کے مسافروں نے سختیوں کو بہر حال برداشت کرنا ہے۔ یہ اللہ ﷻ کا قانون ہے جو کسی کے لئے تبدیل نہیں کیا جاتا۔ اس مہم میں واحد سہارا اللہ ﷻ کی مدد اور نصرت ہے۔ چنانچہ اگر کہیں پناہ ملے گی تو اللہ ﷻ ہی کے دامن میں ملے گی اس در کے علاوہ کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ حق و باطل کی کشمکش میں جب بھی کوئی مشکل وقت آیا تو رسول اللہ ﷺ کو خصوصی طور پر قرآنِ مجید کو تھامے رکھنے کی ہدایت کی گئی اور آپ ﷺ کی وساطت سے تمام مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ قرآنِ حکیم کی تلاوت کو اپنا معمول بنائیں قرآنِ حکیم کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط بنانے کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ساتھ صَرف کریں۔ اسی طرح وہ مشکلات کو برداشت کرنے اور اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔

عملی پہلو: مشکل ترین حالات میں اللہ ﷻ نے تلاوتِ قرآن کی تلقین کی ہے۔ لہٰذا تلاوت کو روزانہ کا معمول بنانا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں ایک اہم بات یہ ہے کہ عربوں کی زبان عربی تھی اور قرآنِ حکیم عربی زبان میں ہے۔ اس لئے ان کو قرآنِ حکیم سنانا اللہ ﷻ کے پیغام کو ان کی زبان میں ان تک پہنچانے کے ہم معنیٰ تھا۔ اب جبکہ اُمّتِ مسلمہ کو غیر عربی دان قوموں سے واسطہ ہے قرآنِ حکیم کو اس کے معنیٰ و مفہوم کے ساتھ ان کی زبان میں پہنچانا ہو گا۔ اسی صورت میں ان پر قرآنِ حکیم کی حجت قائم ہو سکے گی اور اللہ ﷻ نے چاہا تو کتنوں ہی کو ہدایت بھی نصیب ہو گی۔

روزانہ تلاوت کرنے کے چند فوائد: قرآنِ حکیم ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ انسان کو ہر لمحہ اور ہر زندگی کی ہر مرحلہ پر ہدایت کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ ہر روز نماز میں سورۃ الفاتحہ میں ہدایت کی دعا مانگی جاتی ہے۔ "تلاوتِ قرآن سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے" (سورۃ الانفال ۸، آیت:۲) "اللہ ﷻ کے ذکر سے دلوں کو سکون ملتا ہے۔" (سورۃ الرعد ۱۳، آیت:۲۸) "ہر حرف پر دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔" (جامع ترمذی)

قرآن مجید دنیا میں واحد کتاب ہے جو شخص ایمان کی حالت میں اس کی تلاوت کرے گا۔ اسے ایک ایک حرف کے بدلہ میں اجر و ثواب دیا جائے گا۔

فرامین نبوی ﷺ: ۱۔ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "مومن وہ ہے جو قرآن پڑھتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔ وہ سنگترے کی طرح ہے اس کا کھانا بھی پاکیزہ ہے اور اس کی خوشبو بھی پاکیزہ ہے اور وہ مومن جو قرآنِ حکیم نہیں پڑھتا لیکن اس پر عمل کرتا ہے وہ اس کھجور کی طرح ہے۔

اس کا ذائقہ اچھا ہے لیکن اس کی خوشبو نہیں اور اس منافق کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال پھول کی طرح ہے جس کی خوشبو تو اچھی ہے مگر اس کا ذائقہ کڑوا ہے اور جو منافق قرآنِ حکیم نہیں پڑھتا۔ وہ اندرائن (خربوزے کی شکل کا ایک پھل جو دیکھنے میں خوبصورت اور ذائقہ میں سخت کڑوا ہوتا ہے) کے پھل کی طرح ہے اس کا ذائقہ گندہ ہے اور اس کی بو بھی بُری ہے۔" (صحیح بخاری)

۲۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "روزِ قیامت صاحب قرآن (حافظ قرآن) جب جنت میں داخل ہو گا تو اس سے کہا جائے گا کہ پڑھتا جا اور اوپر چڑھتا جا۔ وہ پڑھتا جائے گا اور ہر آیت پر درجہ بدرجہ چڑھتا جائے گا۔ یہاں تک کہ آخر تک پہنچ جائے گا۔" (مسند احمد)

۳۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "قرآنِ مجید قیامت کے دن پیش ہو گا پس کہے گا: اے میرے رب! اس (حافظِ قرآن) کو جوڑا پہنا، تو اسے کرامت (عزت و شرافت) کا تاج پہنایا جائے گا۔ پھر وہ کہے گا: اے میرے رب! اسے اور دے، تو اسے کرامت کا جوڑا پہنایا جائے گا۔ وہ پھر کہے گا: اے میرے رب اس سے راضی و خوش ہو جا، تو وہ اس سے راضی و خوش ہو جائے گا۔ اس سے کہا جائے گا (قرآن) پڑھتا جا اور چڑھتا جا، تیرے لئے ہر آیت کے ساتھ ایک نیکی کا اضافہ کیا جاتا رہے گا۔" (جامع ترمذی)

آیت نمبر ۲۸: سردارانِ قریش کا مطالبہ تھا کہ غریب اہل ایمان کو اپنی مجلس سے دور رکھیں تو بات سنیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس حوالہ سے تلقین فرما کر اہل ایمان کی دلجوئی کی گئی۔ ان حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دو صفات کا ذکر فرمایا گیا کہ وہ صبح و شام اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں اور اسی کی رضا کے طلب گار ہیں۔ اُمّت کو یہ تعلیم دی گئی کہ دعوت دیتے ہوئے امیر و غریب میں کسی قسم کا کوئی امتیاز نہ ہو۔ مشرک سرداروں کو اگر اہمیت دی جاتی تو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا دار خیال کرتے۔ (معاذ اللہ) دولت مند کافر لوگ اسلام کی رونق کا ذریعہ نہیں بلکہ اسلام کی اصل رونق تو مخلص اہل ایمان ہیں۔ ایسے لوگوں کو اہمیت دینے کی ممانعت جن کے دل اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہیں اور نفسانی خواہشات کے تابع ہیں۔

علمی بات: بعض کفار کا مطالبہ یہ بھی تھا کہ جو غریب اور کم حیثیت لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہتے ہیں، اگر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) انہیں اپنے پاس سے ہٹا دیں تو ہم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بات سننے کو تیار ہوں گے، موجودہ حالت میں ہم ان غریبوں کے ساتھ بیٹھ کر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی کوئی بات نہیں سن سکتے، یہ آیت اس مطالبہ کو رد کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تلقین کر رہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس مطالبہ کو نہ مانیں اور اپنے غریب صحابہ رضی اللہ عنہم کی رفاقت نہ چھوڑیں اور اس ضمن میں ان غریب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت اور ان کے مقابلہ میں ان مال دار کافروں کی بُرائی بیان کی گئی ہے۔ یہی مضمون سورۃ انعام ۶، آیت: ۵۲ میں بھی آیا ہے۔

علمی بات: حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ کے رؤسا کی دلداری کا جو خیال فرمایا تھا وہ اس مشفقانہ جذبہ پر مبنی تھا کہ جو لوگ اپنے ہو گئے ہیں۔ اگر ان کو مجلس میں بعض مرتبہ ساتھ نہ بٹھایا تو محبت اور تعلق میں کمی کرنے والے نہیں ہیں اور یہ رؤسا جو علیحدہ مجلس کے لئے درخواست کر رہے ہیں ان کی بات مان لی جائے تو ان کا بہانہ بھی ختم ہو جائے اور ممکن ہے کہ ہدایت قبول کر لیں۔ اس سے جہاں ان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت معلوم ہوئی جن کو غریبی کی وجہ سے رؤسا عرب نے حقیر سمجھا تھا۔ وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ اسلام قبول کر چکے ہوں ان کی رعایت اور دلداری ان لوگوں سے مقدم ہے جو ابھی تک منکرین اسلام ہیں۔

علمی بات: اسلام کی اصلی عزت و رونق اور جمال و کمال کا دارومدار مادی خوشحالی اور سونے چاندی کے سکّوں سے نہیں بلکہ مضبوط ایمان و تقویٰ، اخلاص و اطاعتِ کاملہ اور اعلیٰ درجہ کی خوش اخلاقی سے ہے۔ اگرچہ فقراء ہی سے کیوں نہ ہو۔ دنیا کی رونق محض فانی اور سایہ کی طرح ڈھلنے والی ہے۔ حقیقی دولت تقویٰ اور تعلق مع اللہ تعالیٰ کی ہے جسے نہ شکست ہے، نہ زوال، چنانچہ اصحاب کہف کے واقعہ میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والوں اور دنیا کے طلبگاروں کا انجام معلوم ہو چکا ہے۔

آیت نمبر ۲۹: دین حق کو بیان کرتے رہنے کی تلقین کی گئی ہے جس کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں۔ جو چاہے اس پر ایمان لے آئے اور جو چاہے انکار کر دے۔ انکار کرنے والوں کے لئے دوزخ کی آگ ہے جو انہیں گھیر لے گی۔ سُرَادِق کا معنیٰ ہے ہر وہ چیز جو کسی شے کا احاطہ کیئے ہو خواہ چار دیواری ہو یا شامیانہ یا خیمہ وغیرہ۔ یہاں اس سے مراد جہنم کی چار دیواری ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے رسول کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ "اس سے مراد آگ کی چار دیواریں ہیں۔ ہر ایک اتنی موٹی ہوگی کہ اسے طے کرنے کے لئے چالیس سال درکار ہوں گے۔" (جامع ترمذی، مسند احمد) ان سے جہنم کا احاطہ کیا جائے گا تاکہ آگ کی حرارت میں مزید اضافہ ہو۔

مُہْل پگھلے ہوئے تانبے کو کہا جاتا ہے۔ اہل جہنم پانی کی فریاد کریں گے تو اُنہیں کھولتا ہوا پانی دیا جائے گا جو پگھلے ہوئے تانبے کی مانند ہوگا جو ان کی مونہوں کو جھلسا دے گا۔ وہ بہت ہی بُرا پانی ہوگا اور ان کا بہت بُرا ٹھکانا ہوگا۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے کہ: جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔ اس سے ایک یہ معنیٰ معلوم ہوتا ہے کہ ایمان لانے یا نہ لانے میں انسان کا اپنا نفع اور نقصان ہے، کسی کے ایمان لانے سے اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ ہوگا نہ اس کے ایمان نہ لانے سے اس کو کوئی نقصان ہوگا۔ جیسا کہ قرآنِ مجید میں ہے: "اگر تم بھلائی کرو گے تو اپنے (ہی فائدے کے) لئے بھلائی کرو گے اور اگر تم بُرائی کرو گے تو اپنے (ہی نقصان کے) لئے۔" (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷، آیت: ۷)

علمی بات: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "دوزخ کے عذاب کا جو حال مجھ کو معلوم ہے اگر وہ پورا حال لوگوں کے سامنے میں بیان کر دوں تو لوگ سوائے رونے کے دنیا کے سب کام چھوڑ دیں۔" (صحیح بخاری و مسلم) اس حدیث سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ دنیا کا انتظام قائم رہنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے حکم سے آنحضرت ﷺ دوزخ کے عذاب کا پورا حال اُمّت کے لوگوں کے روبرو بیان نہیں فرمایا اس لئے دوزخ کے عذاب کا جو ذکر اوپر گزرا وہ گویا مختصر ہے۔

عملی پہلو: جو حق اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے وہ کامل طور پر صداقت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس لئے لوگوں کی رعایت سے اس میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کی جاسکتی۔ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ حقوق اللہ میں ایسی ترمیم کی جائے کہ اس سے ان کی غلط روش کا جواز نکل آئے وہ گمراہی پر سرکشی کا اضافہ کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اپنے لئے صرف سخت ترین سزا کا انتظار کرنا چاہیے۔

آیت نمبر ۳۰: اہل جہنم کی سختیوں اور ہولناکیوں کے مقابلہ میں دین حق کو قبول کرنے اور نیک اعمال انجام دینے والوں کا ذکر ہے۔ ان کا کوئی عمل ضائع نہیں کیا جائے گا اور ان کے اعمال کا اُنہیں بہترین بدلہ دیا جائے گا۔

علمی بات: کسی ایسے مومن شخص کے عمل کو جس کی نیت و ارادہ بھی نیک اور درست ہو کہ وہ جو کچھ کرے اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے کرے اور طریقہ بھی صحیح ہو کہ اس کا عمل اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات و فرمودات کے مطابق ہو۔ ایسے خوش نصیبوں کو وہ رب غفور و شکور ان کے پورے پورے اجر و ثواب سے نوازے گا۔ ان کی کسی طرح کی کوئی حق تلفی نہیں ہوگی۔ بلکہ وہ ان کو اپنے مزید فضل و کرم سے بھی نوازے گا۔

علمی بات: دنیا میں ہر چیز کی پہچان اس کی ضد سے ہوتی ہے اگر ضد نہ رہے تو کسی چیز کا کوئی وجود باقی نہ رہے، دوزخ کی سختیوں کا ذکر کیا گیا تو جب تک اس کے ساتھ اس کی ضد جنت اور اس کی نعمتوں کا بیان نہ ہو اس پہلی بات کی تکمیل ممکن نہیں۔ یہی معاملہ ہر جگہ پر ہے، قرآنِ کریم جب ایک کا ذکر کرتا ہے تو ساتھ ہی دوسرے کا ذکر بھی کر دیتا ہے۔ گزشتہ آیت میں ان لوگوں کا بیان تھا جو حق اور سچ کو ماننے کے لئے تیار نہیں اور پھر ان کی سزا کا بھی ذکر کر دیا۔

اس آیت میں ان لوگوں کا بیان ہے جنہوں نے حق کو حق مانا اور تسلیم کیا اس لئے جھوٹ کے نگہبانوں اور محافظوں نے ان کی سخت مخالفت کی جس کے نتیجہ میں ان کو بہت سختیاں برداشت کرنا پڑیں لیکن انہوں نے ان سختیوں کو بخوشی برداشت کیا پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کو یہ سختیاں برداشت کرنے کے نتیجہ سے واقف نہ کیا جائے، یہاں بتایا گیا کہ ان کے ان صالح اعمال کے نتیجہ کو بھی ضائع نہیں کیا جائے گا بلکہ پورا اور پورا ان کی طرف لوٹایا جائے گا۔ اگلی آیت میں اس کی مزید وضاحت فرمادی کہ وہ کیا ہوگا۔

آیت نمبر ۳۱: نیک اعمال کے بدلے اہل ایمان کے لئے جنت کے باغات ہیں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی۔ زیب و زینت کے لئے سونے کے کنگن اور ریشمی لباس عطا ہوں گے۔ وہ تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے جو ان کا بہترین بدلہ اور انجام ہوگا۔

علمی بات: سونے کے کنگنوں کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ قدیم زمانہ میں یہ دستور رہا ہے کہ بادشاہ سونے کے کنگن پہنا کرتے تھے گویا اہل جنت وہاں شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ سے رہیں گے۔ پہننے کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ ریشمی کپڑے ہوں گے اور بیٹھنے کے لئے اونچی اونچی مسندیں۔ واضح رہے کہ اس دنیا میں شریعت اسلامی کے مطابق سونے اور ریشمی کپڑوں کا استعمال مردوں کے لئے جائز نہیں لیکن جنت میں جائز ہوگا بلکہ ایسے ہی جیسے اس دنیا میں شراب سب مردوں عورتوں پر حرام ہے مگر جنت کی خالص اور پاک شراب اہل جنت کے لئے بیش بہا نعمت ہوگی۔

آیت نمبر ۳۲: مادہ پرستی کے رد پر دوسرا واقعہ بیان ہو رہا ہے۔ سردارانِ قریش کی تنبیہ کے لئے دو افراد کی مثال بیان فرما کر نبی کریم ﷺ کو تلقین فرمائی گئی ہے کہ لوگوں کے سامنے دو آدمیوں کا واقعہ بیان کریں۔ جن میں ایک کو اللہ ﷻ نے انگوروں کے دو باغ عنایت فرمائے اور ان کی حفاظت کھجور کے درختوں کے ساتھ کی اور ان کے درمیان فصل پیدا کی۔ باغوں کو سیراب کرنے کے لئے ان کے درمیان نہریں جاری کیں۔ یہ باغ بھرپور انداز سے پھل دیتے تھے ان کی پیداوار میں کسی قسم کی کمی واقع نہ ہوتی۔

علمی بات: کفار کو مسلمان فقراء کے مقابلہ میں اپنے اموال و انصار پر فخر تھا۔ اس بنا پر وہ مسلمانوں کو حقیر سمجھتے اور ایک مجلس میں ان کے ساتھ بیٹھنا پسند نہ کرتے تو اللہ ﷻ نے یہ قصہ بیان فرما کر سمجھایا کہ مال و اسباب فخر کے لائق نہیں ہیں کیونکہ ایک لمحہ میں فقیر غنی ہو سکتا ہے اور فقیر غنی دنیا میں اگر کوئی بات لائق سعادت سمجھنے کی ہے تو وہ اللہ ﷻ کی اطاعت اور اس کی عبادت ہے اور یہ ان درویشوں کو حاصل ہے۔

علمی و عملی بات: آیت نمبر ۲۸ میں کافر سرداروں کے اس تکبر کی طرف اشارہ کیا گیا جس کی وجہ سے وہ غریب مسلمانوں کے ساتھ بیٹھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اب اللہ ﷻ ایک ایسا واقعہ بیان فرما رہا ہے جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مال و دولت کی زیادتی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر کوئی شخص اترائے۔ اگر اللہ ﷻ کے ساتھ رشتہ مضبوط نہ ہو تو بڑے بڑے مال دار لوگ انجام کار ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں اور اللہ ﷻ کے ساتھ معاملہ صحیح ہو تو غریب لوگ مرتبہ میں ان سے کہیں آگے نکل جاتے ہیں۔

عملی پہلو: اس مثال میں آخرت کے حوالہ سے یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ آدمی کو اترانے کی بجائے عاجزی اختیار کرنی چاہیئے۔ اس کا یہ عقیدہ ہونا چاہیئے جس طرح لہلہاتا باغ خاکستر ہو سکتا ہے اسی طرح وقت آئے گا جب دنیا کی چہل پہل بھی ختم ہو جائے گی۔ باغ کے مالک کی طرح دنیا پرست کو بھی پچھتانا پڑے گا۔

آیت نمبر ۳۳: زمین زرخیز تھی لہٰذا پھل دار درخت خوب پھل دیتے اور پیداوار میں کوئی کمی نہیں ہوتی تھی۔ باغات کے درمیان نہر جاری تھی جس سے باغ سیراب ہوتے تھے۔

علمی بات: باغات کی خوبی بیان کی گئی ہے کہ یہ نہیں کہ ایک باغ پھلا دوسرا نہ پھلا۔ یا ایک درخت میں پھل زیادہ آیا دوسرے میں کم۔ اسی طرح باغوں کے درمیان نہر کا پانی قرینہ سے پھر رہا تھا کہ منظر فرحت بخش رہے اور بارش نہ ہو تب بھی باغ وغیرہ خشکی سے خراب نہ ہونے پائے۔ ان خصوصیات کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ دونوں باغ خوب پھل لائے۔ کھجوروں نے اپنا پھل دینے میں اور انگوروں نے اپنی بہار دکھانے میں اور باقی باغ کے مختلف قطعات میں پھیلے ہوئے غلے کی فصلوں نے لہلہانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔

آیت نمبر ۳۴: مال دار شخص کا اپنے ساتھی کو طعن کرنے کا بیان ہے۔ اس نے اپنے ساتھی کو کم تر جانا اور کہا کہ وہ مال و اولاد اور خادموں کی تعداد میں اس سے زیادہ حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ ﷻ کی عطا کردہ چیزوں کو اس نے اپنا ذاتی کمال سمجھا اور غرور و تکبر میں مبتلا ہوا۔

علمی بات: اس متکبر کافر شخص نے مومن شخص سے کہا کہ مال و دولت اور جتھا میرے پاس تجھ سے کہیں زائد ہے۔ اگر میں مشرکانہ اطوار اختیار کرنے میں باطل پر ہوتا تو اس قدر آسائش اور فراخی کیوں ملتی۔ اس کے مشرک ہونے کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ آفت آنے کے بعد پچھتا کر کہتا تھا یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّیْۤ اَحَدًا "اے کاش! میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا۔" (سورۃ الکھف، آیت: ۴۲) معلوم ہوتا ہے کہ اس کا غریب ساتھی جو پکا موحّد یعنی توحید باری تعالیٰ

پر یقین رکھنے والا تھا اسے شرک کے باطل ہونے کا اظہار اور شرک سے تائب ہونے کی نصیحت کر رہا ہوگا۔ جس کے جواب میں اس نے یہ کہا کہ میں تجھ سے مال میں، جتھے میں، ہر چیز میں زیادہ ہوں کس طرح یقین کر لوں کہ میں باطل پر ہوں اور تجھ جیسا مفلس قلاش حق پر ہو۔

آیت نمبر ۳۵: باغ کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے وہ باغ میں داخل ہوا اور کہا کہ اس کے باغات کو کبھی زوال نہیں آسکتا۔ اس نے ایسا کہہ کر اپنے نفس کے حق میں ظلم کیا۔

علمی بات: وہ دنیا پرست اور شرک میں مبتلا تھا۔ کبر و غرور کا نشہ دماغ میں بھرا ہوا تھا، دوسروں کو حقیر جانتا تھا اور اللہ ﷻ کی قدرت و جبروت پر نظر نہ تھی۔ نہ یہ سمجھتا تھا کہ آگے کیا انجام ہونے والا ہے۔ بس یہی باغ اس کی جنت تھی جسے وہ ابدی سمجھتا تھا۔

عملی پہلو: ان آیات میں مال دار متکبر کے ذہن کی عکاسی کی جارہی ہے کہ جب انسان دولت میں مست ہو جائے تو وہ اس قدر متکبر اور اللہ ﷻ کے خوف سے غافل ہو جاتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ دنیا کی عیش و عشرت اور مال و دولت ہمیشہ رہنے والے ہیں اور آخرت کا فیصلہ بھی دنیا کو پیشِ نظر رکھ کر کیا جائے گا کہ دنیا میں جو مال دار یا منصب دار ہے آخرت میں بھی اسے سب کچھ دیا جائے گا۔ اس سوچ کی وجہ سے وہ صالح کردار کے بجائے دنیا کے مال اور اقتدار کو عزت کا معیار سمجھتا ہے۔ اس وجہ سے اپنے سے کم تر لوگوں کو حقیر سمجھتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ دنیا کا جو مال و اسباب ہمیں ملا ہے۔ یہ ہماری ذاتی محنت کا نتیجہ اور اللہ ﷻ کے ہم پر راضی ہونے کی دلیل ہے۔ اس خوش فہمی کی وجہ سے فخر و غرور میں آکر کہتے ہیں کہ ہم دنیا میں دوسروں سے بہتر ہیں۔ اگر ہم اپنے رب کے حضور لوٹائے گئے تو آخرت میں بھی دوسروں سے بہتر ہوں گے۔ دنیا کے اقتدار اور اسباب کی مستی میں وہ بھول جاتے ہیں جو مال اُنہیں دیا گیا ہے یہ اللہ ﷻ کی طرف سے آزمائش ہے۔

آیت نمبر ۳۶: دُنیاوی عیش و آرام میں مست ہو کر وہ مال دار شخص اللہ ﷻ کی گرفت اور قیامت کا انکار کرنے لگا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ بالفرض قیامت برپا ہو بھی گئی تو وہ جس طرح یہاں خوشحال ہے آخرت میں بھی اس کا اچھا انجام ہوگا۔ مادہ پرست لوگوں کا غلط نظریہ ہے کہ اگر دنیا میں وہ خوشحال ہیں تو یہ اللہ ﷻ کی خوشنودی کی دلیل ہے۔

علمی بات: وہ مال دار شخص انتہائی متکبرانہ انداز میں کہنے لگا کہ اب تو زندگی آرام سے گزر رہی ہے اور میں نے اب انتظامات ایسے مکمل کر لیئے ہیں کہ میری زندگی تک ان باغوں کے تباہ ہونے کا بظاہر کوئی کھٹکا نہیں۔ رہا بعد الموت کا قصّہ، تو اس کا اول تو مجھے یقین ہی نہیں کہ مرنے کے بعد ہڈیوں کے ریزوں کو دوبارہ زندگی ملے گی؟ اور ہم رب کے سامنے پیش کیئے جائیں گے۔ لیکن اگر بالفرض ایسا ہوا بھی تو یقیناً مجھے یہاں سے بہتر سامان وہاں ملنا چاہیئے۔ اگر ہماری حرکات اللہ ﷻ کو ناپسند ہوتیں تو دنیا میں اتنی کشائش کیوں دیتا۔ گویا یہاں کی فراخی علامت ہے کہ وہاں بھی ہم عیش اڑائیں گے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں۔

آیت نمبر ۳۷: مال دار شخص کے ساتھی نے اُسے اللہ ﷻ کی طرف متوجہ کیا۔ اس نے کہا کہ توحید اور قیامت کا انکار کر کے وہ اپنے خالق و مالک کے ساتھ کفر کا ارتکاب کر رہا ہے۔ اس نے کہا کہ اللہ ﷻ ہی ہے جس نے اولاً تجھے مٹی سے بنایا، پھر نطفہ سے پیدا کر کے مکمل انسان بنایا۔ معلوم ہوا کہ مال دار شخص کفر و شرک میں مبتلا تھا اور اس کا ساتھی مومن تھا۔

علمی بات: آخرت کے منکر کو اس کے مخلص ساتھی نے سمجھایا کہ کیا تو اس ذات حق کا انکار کرتا ہے۔ جس نے تجھے مٹی سے پیدا کیا۔ پھر ایک نطفہ سے کامل انسان بنایا۔ (حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا اور اس کے بعد تمام انسان نطفہ سے پیدا کیئے جاتے ہیں)۔ جب آخرت کا منکر ہر دلیل سے انکار کرتا رہا تو اس کے مُوَحِّد (اللہ ﷻ کو ایک ماننے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانے والے) ساتھی نے اسے کہا کہ اگر تو حق تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تو تیری مرضی ہے۔ لیکن میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ اللہ ﷻ ہی میرا رب ہے۔ میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو کسی اعتبار سے شریک نہیں سمجھتا۔ یاد رہے کہ رب کا معنٰی ہے "خالق، مالک، بادشاہ" اور ہر چیز عطا فرمانے والا ہے۔ یہاں آخرت کے منکر کے لئے کافر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کیونکہ جو شخص آخرت کا انکار کرتا ہے۔ وہ حقیقت میں اللہ ﷻ کے حاکم اور عادل ہونے اور اس کی جزا و سزا کا انکار کرتا ہے۔ آخرت کا انکار کرنا دین کے تیسرے بنیادی عقیدہ کا انکار کرنا ہے۔ اس لئے جو شخص آخرت کا منکر

ہے۔ وہ اللہ ﷻ کا بھی منکر ہے۔ لہٰذا آخرت کا منکر اجر و ثواب سے محروم رہتا ہے۔

علمی بات: کافر نے قیامت کا انکار کیا تھا۔ بندۂ مومن نے اس کا رد کرتے ہوئے کہا: کیا تم اس ذات کا انکار کر رہے ہو جس نے تم کو مٹی سے بنایا، مسلمان کا منشا یہ تھا کہ جب اللہ ﷻ نے انسان کو ایک بار عدم سے وجود میں لا چکا ہے تو اس کے لئے دوبارہ تم کو معدوم کرنا پھر عدم سے وجود میں لانا کیا مشکل ہے؟ اس نے تم کو مٹی سے بنایا، پھر نطفہ سے، پھر تم کو معتدل ہئیت میں بنایا۔ اس میں انسان کی پہلی بار تخلیق کی طرف اشارہ ہے۔ کافر کا رد کرنے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ جب اللہ ﷻ نے تم کو اس طرح پیدا کیا ہے تو اس نے تم کو بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے بلکہ اس نے تم کو عبادت کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس کے بعد کہا پھر تم کو معتدل ہئیت پر مرد بنایا۔ یعنی تم کو عقل عطا فرمائی جس سے بھلے اور برے کی پہچان ہوتی ہے۔ کیا تمہاری عقل اس کو جائز کہتی ہے کہ جس ذات نے تم کو اتنی نعمتیں عطا فرمائیں، تم اس کا کفر کرو۔

آیت نمبر ۳۸: مومن شخص نے عقیدۂ توحید پر کاربند ہونے کا اظہار کیا۔ اس نے کہا کہ وہ اللہ ﷻ ہی کو اپنا حقیقی رب مانتا ہے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔

علمی بات: مومن نے کہا اللہ ﷻ ہی میرا رب ہے اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناؤں گا یعنی اس پر میرا ایمان ہے کہ اللہ ﷻ مسبب الاسباب ہے۔ فقر اور غنا صرف اُسی کی طرف سے ہے۔ اس لئے جب اللہ ﷻ کوئی نعمت عطا فرماتا ہے تو میں اس پر فخر اور تکبر نہیں کرتا اور نہ یہ سمجھتا ہوں کہ مال و دولت اور حمایتیوں کی کثرت میری کوشش کی وجہ سے ہے یا اس میں میرا کوئی کمال ہے بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ سب اللہ ﷻ کی عطا سے ہے۔ اس لئے میں اس پر اس کی حمد و ثنا کرتا ہوں۔ اسی طرح جب وہ مجھے کسی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے تو میں اس پر صبر کرتا ہوں۔

آیت نمبر ۳۹: مشرک شخص اللہ ﷻ کی نعمتوں کا اعتراف کرنے کے بجائے اِترانے لگا جس پر بندۂ مومن نے اس کی ملامت کی اور کہا کہ چاہیئے تھا کہ تُو باغ میں داخل ہوتے وقت غرور کرنے کے بجائے یہ کہتا مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ "(وہی ہوتا ہے) جو اللہ ﷻ چاہتا ہے اور اللہ ﷻ کی مدد کے بغیر (کسی میں) کوئی قوت نہیں۔" تو یہ تمہارے لئے بہتر ہوتا۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ ایسے تمام موقعوں پر ان نعمتوں کو اللہ ﷻ کی عطا کی طرف منسوب کرے اور اللہ ﷻ کی حمد و ثنا کرے نہ کہ غرور اور گھمنڈ میں رہے۔ اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ مال و اولاد ہمیشہ کے لئے نہیں ہیں۔ اللہ ﷻ یہ چیزیں واپس لینے پر بھی قادر ہے۔

علمی بات: مومن نے کافر کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تمہیں اللہ ﷻ پر توکل کرنا چاہیئے اور اُسی کو نفع و نقصان کا مالک سمجھنا چاہیئے۔ یعنی یہ باغ جو تم کو ملا ہے، یہ اللہ ﷻ نے چاہا تو تم کو مل گیا اگر وہ نہ چاہتا تو تم کو یہ باغ نہ ملتا۔ اسی طرح تمہارے پاس جو مال ہے وہ اللہ ﷻ کی قدرت سے ہے۔ اس میں تمہاری طاقت اور قدرت کا کوئی دخل نہیں ہے اور اگر اللہ ﷻ چاہتا تو تمہارے مال سے برکت اٹھا لیتا پھر تمہارے پاس وہ مال جمع نہ ہوتا۔

مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کا مفہوم اور اس کے متعلق چند فرامین نبوی ﷺ: ۱۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"جس شخص نے گھر سے نکلتے وقت کہا: بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ (اللہ کے نام سے، میں نے اللہ پر توکل کیا) لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ، تو اس سے کہا جائے گا تمہارے لئے یہ نام کفایت کیا گیا اور تم کو محفوظ کیا گیا اور تم سے شیطان کو دور کیا گیا۔" (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

۲۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ نے بندہ کو اس کے اہل یا مال یا اولاد میں سے کوئی نعمت اس پر انعام فرمائی تو اس نے کہا: مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ تو وہ ان نعمتوں میں موت کے سوا کوئی آفت نہیں پائے گا۔" (بیہقی)

علمی بات: اس کلمہ کا معنیٰ ہے اپنے معاملات کو اللہ ﷻ کے سپرد کر دینا اور یہ بتانا کہ بندہ اپنی کسی چیز کا مالک نہیں ہے اور اس کے پاس بُرائی کو دور کرنے کی کوئی تدبیر نہیں ہے اور نیکی کو حاصل کرنے کی کوئی طاقت نہیں ہے، سوائے اس کے کہ اللہ ﷻ اس کو گناہوں سے دور کر دے اور نیکی کی طاقت عطا فرمائے۔

علمی بات: مومن نے کافر سے کہا تمہیں یہ کہنا چاہیئے تھا لَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ کسی چیز اور کسی کام پر کسی شخص کو اللہ ﷻ کی مدد اور اس کی قوت دینے کے بغیر طاقت حاصل نہیں ہو سکتی اور جب تم یہ کہتے تو اس باغ کی خیر کو اللہ ﷻ کے سپرد کر دیتے وہ چاہتا تو اس میں خیر رکھتا اور اگر وہ نہیں چاہتا تو اس میں خیر کو ترک کر دیتا، اور اس میں یہ اقرار ہے کہ اس باغ کی تعمیر اور ترقی کے لئے تم نے جو کچھ بھی کیا وہ اللہ ﷻ کی دی ہوئی طاقت اور اس کی توفیق سے کیا ہے اور کسی شخص کو اپنے بدن اور اختیارات میں اللہ ﷻ کی طاقت دیئے بغیر کوئی طاقت حاصل نہیں ہے۔

آیت نمبر ۴۰: مومن ساتھی کی کافر کو مزید نصیحت کا ذکر ہے۔ اُس نے کہا کہ غربت کا طعنہ دینے والے کے لئے اللہ ﷻ حالات کو برعکس کر دے اور اپنے بارے میں کہا کہ اسے بہتر باغ عطا فرما دے، اس نے مزید خبردار کیا کہ اللہ ﷻ اس بات پر بھی قادر ہے کہ باغ پر کوئی آسمانی آفت نازل کر کے اسے چٹیل میدان میں تبدیل کر دے۔ "حُسْبَان" حسبانۃ کی جمع ہے اس کا معنٰی ہے "بجلی کی کڑک یا محاسبہ والی چیز۔" مراد ہے عذاب یا آفات۔ اس آیت میں حسبانا کی دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ ایک آگ۔ دوسری عذاب مراد ہے حساب کے مطابق سزا۔

علمی بات: مومن شخص نے کافر سے کہا کہ میں اپنے فقر و فاقہ کے باوجود اپنے رب کریم کی جود و سخا سے مایوس نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ دنیا و آخرت کی نعمتوں سے مجھے ایسی نعمتیں بخشے گا جن کا تم تصور ہی نہیں کر سکتے اور یہ شاداب باغات اور لہلہاتی ہوئی فصلیں جن کی وجہ سے تم تکبر کر رہے ہو فانی ہیں۔ غضب الٰہی کی ایک بجلی ان کا نام و نشان تک مٹا دے گی۔ ایسی فانی اور ناپائیدار چیز پر مغرور ہو کر اپنے رب قدیر سے روگردانی، عقل مند کی بات نہیں۔

علمی و عملی بات: صَعِيْدًا چٹیل زمین کو کہتے ہیں اور زَلَقًا کا معنٰی ہے جس پر سختی کی وجہ سے قدم نہ جم سکے۔ اور پھسل جائے یعنی اس کے غضب سے پناہ مانگتے رہو۔ اس کی بے نیازی سے ڈرتے رہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ ﷻ کی طرف سے آسمانی بجلی کی کڑک یا کوئی آفت، عذاب وغیرہ تیرے سارے گلشن کو ملیامیٹ کر کے رکھ دے۔ سرسبز و شادابی کا نام و نشان تک باقی نہ رہے۔

آیت نمبر ۴۱: اللہ ﷻ چاہے تو باغ کے درمیان بہنے والی نہر کو گہرا کر دے۔ یا پھر نہر کا پانی اتنی گہرائی میں کر دے کہ پانی کا حصول ہی ناممکن ہو جائے۔ اور پھر تم اس باغ اور اس کی پیداوار کو دوبارہ حاصل کرنا چاہو تو حاصل نہ کر سکو۔

علمی و عملی بات: اس بندۂ مومن نے اس منکر شخص کو اندیشۂ عذاب کی یاددہانی کراتے ہوئے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ اللہ ﷻ تیرے اس باغ کو کسی بھی طرح ختم کر دے پس تجھے اکڑنے اور اترانے کے بجائے اس کا شکر بجالانے اور اس کی پکڑ سے ڈرتے رہنا چاہیئے کہ تیرا یہ باغ جس پر تو اس قدر مست اور مغرور ہے کبھی بھی اور کسی بھی طرح ختم ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے حکم سے اس کا زیر زمین پانی غیر معمولی گہرائی میں چلا جائے۔ اس کے نتیجہ میں تمہارا بنایا ہوا نظام آبپاشی ختم ہو کر رہ جائے اور اس طرح پانی کے بغیر یہ باغ خود بخود ہی اُجڑ جائے۔ یعنی حقیقی مسبب الاسباب تو اللہ ﷻ ہی ہے۔ اسی نے مختلف اسباب مہیا کر رکھے ہیں جس سے یہ کاروبارِ دنیا چل رہا ہے۔ وہ جب چاہے کسی سبب کو سلب کر لے یا اس کی ہیئت کو بدل دے اور اس کی وجہ سے یہ سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے۔

عملی پہلو: دنیا کے تمام مغروروں اور متکبرین کا یہی ذہن ہوتا ہے کہ ان کو جو چین اور عیش حاصل ہوتا ہے وہ اس میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ ان کے اوپر یہ تصور بڑا دشوار گزرتا ہے کہ اس میں کہیں سے کوئی معمولی سی بھی رکاوٹ، مشکل پیدا ہو سکتی ہے۔ اس وجہ سے اگر کوئی ان کو خواب غفلت سے جگانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ حیران ہوتے ہیں کہ آخر ان کے قلعہ میں دراڑ پیدا ہونے کا کیا امکان ہے۔ لیکن جب وقت آجاتا ہے تو قدرت ایک ہی جنبش میں سارے قلعہ کو زمین بوس کر کے رکھ دیتی ہے اور اس وقت سب کو نظر آجاتا ہے کہ جس چیز کو اتنی بعید سمجھے تھے وہ بالکل پاؤں کے نیچے سے برآمد ہو گئی۔ اسی حقیقت کی طرف بندۂ مومن نے توجہ دلائی ہے۔

علمی بات: اس کافر کی اولاد کی نسبت کوئی بات نہیں کہی اس کی بے تکلف وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ اولاد کی راحت بھی مال کے ساتھ ہے جب مال نہیں ہوتا اور اولاد الٹا وبال جان ہو جاتی ہے اور کھیت کا بھی ذکر نہیں کیونکہ اس کا مدار پانی پر ہے جب وہی نہ رہے گا تو کھیت بھی اجڑ جائے گا۔

آیت نمبر ۴۲: مشرک شخص کو اس کی ناشکری اور اسباب پرستی کی سزا ملی اور اس کا باغ تباہ کر دیا گیا۔ باغ پر لگایا گیا اس کا تمام سرمایہ برباد ہو گیا جس پر وہ افسوس کرنے لگا۔ انگوروں کی بیلیں اپنی چھتوں کی بل زمین پر آگریں۔ ظاہری اسباب اور مادی وسائل پر توکل والے شرک کرنے کا اعتراف اس نے خود کیا۔ وہ حسرت سے کہنے لگا کہ کاش وہ اپنے حقیقی رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا۔

علمی بات: مومن نے کافر کے متعلق جو کہا تھا اللہ ﷻ نے اس کو پورا کر دیا۔ اللہ ﷻ نے اس کے تمام کے تمام پھلوں کو تباہ کر دیا اور وہ ندامت اور حسرت سے اپنے ہاتھ ملتا رہ گیا اور اس کے باغ میں انگوروں کی بیلیں جن چھپروں پر قائم تھیں، وہ سب چھپر گر گئے اور پھر اس نے کہا کاش! میں نے اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا ہوتا۔ معلوم ہوا کہ مسبب الاسباب اللہ ﷻ کے بجائے اپنی صلاحیت و قابلیت، علم و ہنر اور اسباب و ذرائع پر توکل کرنا بھی شرک کی ایک قسم ہے جسے مادہ پرستی کا شرک کہا جاتا ہے۔

علمی بات: بعض اوقات یہ بات مشاہدہ میں آتی ہے کہ صالحین پر مشکلات و مصائب میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ یہ مصائب اُن کی کسی نافرمانی کی وجہ سے نہیں آتیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اور مقربین پر جو مصائب آتے ہیں وہ آزمائش کے طور پر آتے ہیں اور وہ ان کے درجات میں بلندی کے لئے آتے ہیں اور عام مسلمانوں پر جو مصائب آتے ہیں، وہ ان کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث شریف میں بھی آیا ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! سب سے زیادہ مصائب میں کون مبتلا ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”انبیاء کرام (علیہم السلام) پھر جو ان کے قریب ہوں پھر جو ان کے قریب ہوں۔ بندہ اپنے دین کے اعتبار سے مصائب میں مبتلا ہوتا ہے اگر وہ اپنے دین (کے معاملات) میں سخت پابندی کرنے والا ہو تو اس پر بہت شدید مصیبت آتی ہے اور اگر وہ اپنے دین (کے معاملات) میں نرم ہو تو وہ اس کے حساب سے مصائب میں مبتلا ہوتا ہے، پھر بندہ پر مصائب آتے رہتے ہیں حتیٰ کہ وہ زمین پر اس حال میں چلتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔“ (سنن ابن ماجہ، جامع ترمذی)

علمی بات: اس شخص کو اللہ ﷻ کی طرف سے جو نعمتیں دی گئی تھیں وہ سب اس سے سلب کر لی گئیں۔ باغ بھی اجڑ گیا اور اولاد بھی چھن گئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرا شخص اللہ ﷻ کا خاص مقرب بندہ تھا۔ مال دار شخص نے اسے اس کی ناداری کا طعنہ دیا تھا: کہ مال و دولت میں بھی مجھے تم پر فوقیت حاصل ہے اور نفری میں بھی میں تم سے بڑھ کر ہوں۔ اس طعنہ سے اللہ ﷻ کے اس نیک بندے کا دل دکھا ہوگا جس کی سزا اسے فوری طور پر ملی اور اللہ ﷻ نے اس سے سب کچھ چھین لیا۔ اس سلسلے میں ایک حدیث قدسی ہے: ”جو شخص میرے کسی ولی کے ساتھ دشمنی کرے تو میری طرف سے اس کے خلاف اعلان جنگ ہے۔“ (صحیح بخاری) کسی شاعر نے اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے:

تا دل صاحب دلے نالد بہ درد — ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد!

یعنی کسی صاحب دل ولی اللہ کے دل کو جب ٹھیس لگتی ہے تو اس کے بدلہ میں اللہ ﷻ کی طرف سے پوری قوم گرفت میں آجاتی ہے۔

علمی بات: ہاتھ ملنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تباہی پر افسوس کرنے لگا کہ اپنے ہی ہاتھوں اپنی تباہی کا باعث بنا۔ کیونکہ اس نے ان باغوں کی منصوبہ بندی کرنے پودے لگانے اور ان کی نشوونما کرنے میں زرِ کثیر خرچ کیا تھا مسلسل محنت کی تھی اور اپنا قیمتی وقت اس میں کھپایا تھا۔ اس کا یہ تمام سرمایہ آن کی آن میں نیست و نابود ہو گیا اور وہ اس کی بربادی پر کف افسوس ملنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکا۔ آج وہ سب انگوروں کی بیلیں جن چھتریوں پر چڑھائی گئی تھیں وہ سب کی سب اوندھی پڑی تھیں۔

علمی بات: اس مال دار شخص کے مکالمہ سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اس شخص نے اللہ ﷻ کی قدرت اور اس کے اختیار کو بھلا کر ظاہری اسباب اور مادی وسائل پر توکل کر لیا تھا اور یہی وہ شرک تھا جس کا خود اس نے یہاں اعتراف کیا ہے۔ آج کی مادہ پرستانہ ذہنیت کا مکمل نقشہ اس رکوع میں پیش کر دیا گیا ہے۔ یہ شرک کی جدید قسم ہے جس کو پہچاننے اور جس سے محتاط رہنے کی آج ہمیں اشد ضرورت ہے۔

آیت نمبر ۴۳: جس اولاد اور جماعت پر وہ اِتراتا تھا وہ اس کے کوئی کام نہ آئی۔ نہ ہی وہ خود اللہ ﷻ کے عذاب سے بچنے کا کوئی انتظام کر سکا۔

علمی بات: جب اللہ ﷻ کا عذاب آیا تو جس خاندانی جمعیت پر اسے ناز تھا اور جن معبودوں کو وہ اللہ ﷻ کے سوا کارساز اور متصرف سمجھتا تھا ان میں سے اس آڑے وقت میں کوئی بھی اس کے کام نہ آیا اور نہ اپنے ہی قوت بازو سے اللہ ﷻ کے عذاب سے اپنے باغوں کو بچا سکا۔ جن جن چیزوں پر اس نے زندگی میں انحصار کیا تھا ان میں سے ایک بھی ایسی نہ تھی جو اس کے کچھ کام آتی۔

علمی بات: "مُنۡتَصِرًا" کا معنٰی انتقام لینے والا بھی ہے اور خود بچنے والا بھی، یعنی عذاب آیا تو اس کا کوئی گروہ نہ تھا جو اس کی مدد کرتا، سوائے اللہ ﷻ کے اور نہ وہ خود بچنے والا تھا۔ "مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ" کا ایک مطلب یہ ہے کہ اس "وقت اللہ کے سوا" اسے کوئی بچانے والا نہ تھا، مگر اس کو وہ ناراض کر چکا تھا۔ "مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ" کا دوسرا معنٰی یہ ہے کہ پھر "اللہ کے مقابلہ میں" اس کا کوئی گروہ نہ تھا جو اس کی مدد کو پہنچتا۔ یہ معنٰی بھی کئی مفسرین کرام نے بیان کیا ہے۔ کسی بھی کافر کو جب یہ معاملہ پیش آتا ہے تو وہ اس وقت ہر طرف سے نااُمید اور مجبور ہو کر اللہ ﷻ کی طرف رجوع کرتا ہے، مگر تب وقت گزر چکا ہوتا ہے اور اس کا ایمان اسے کچھ فائدہ نہیں دیتا، جیسا کہ فرعون غرق ہوتے وقت ایمان لے آیا۔ اسی طرح سورۃ المومن ۴۰، آیت: ۸۴ میں آیا ہے کہ جب انبیاء کرام علیہم السلام کے مخالفین نے اللہ ﷻ کا عذاب دیکھا تو کہنے لگے، ہم اللہ ﷻ اکیلے پر ایمان لے آئے اور قارون کے متعلق تو اللہ ﷻ نے بعینہٖ یہ الفاظ فرمائے جو اس باغ والے شخص کے متعلق فرمایا: فَخَسَفۡنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الۡاَرۡضَ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنۡ فِئَةٍ يَّنۡصُرُوۡنَهٗ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُنۡتَصِرِيۡنَ "تو ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا، پھر نہ اس کے لئے کوئی جماعت تھی جو اللہ کے مقابلہ میں اس کی مدد کرتی اور نہ وہ اپنا بچاؤ کرنے والوں میں سے تھا۔" (سورۃ القصص ۲۸، آیت: ۸۱) مگر ان میں سے کسی کے ایمان نے اسے فائدہ نہ دیا۔

عملی پہلو: اس قصّہ میں بہت بڑی عبرت ہے کوئی شخص اپنے مال پر گھمنڈ نہ کرے بلکہ اللہ ﷻ کا مومن بندہ بنے اور جن مومن بندوں کے پاس مال نہیں ہے اُنہیں حقیر نہ جانے اللہ ﷻ کی ناشکری نہ کرے، ناشکری کی وجہ سے نعمتیں چھین لی جاتی ہیں پھر ایسے وقت میں کوئی مددگار نہیں ہوتا۔

عملی پہلو: معلوم ہوا کہ دنیا پرست آدمی اپنی غرض کے لئے دوسروں کا ساتھ دیتا ہے، جب اس کی غرض کو ٹھیس پہنچے تو گزرا ہوا وقت اس کو کبھی یاد نہیں رہا عوام تو عوام تاج و تخت کے ایوانوں تک کا یہی حال ہے کہ جب مشکل وقت آجائے تو انسان تو انسان در و دیوار بھی انسان کو کھاتے نظر آتے ہیں اور ہر وہ چیز جو اس کے سکون کا باعث تھی اس کی بے آرامی اور وبالِ جان بن کر رہ جاتی ہے۔ اللہ ﷻ اس حالت سے ہر فرد و بشر کو بچائے کہ اس کے مددگار اور قریبی ساتھی ہی اٹھ کر اس پر کوڑے برسانے لگیں اور اس کے محافظ و خدام ہی کے ہاتھوں میں کڑیاں ہوں کہ اس کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیں۔

آیت نمبر ۴۴: اس مثال کے ذریعہ قریشِ مکہ کو تنبیہ ہے۔ ان پر واضح کر دیا گیا کہ درحقیقت سارا اختیار اللہ ﷻ برحق ہی کا ہے۔ وہی ہے جو نیک اعمال کا بہتر بدلہ عطا فرمانے والا ہے۔

علمی بات: تمام اختیارات اللہ ﷻ ہی کے پاس ہیں جو سچا ہے۔ اس کی حسبِ ذیل وجوہات ہیں:

۱۔ اللہ ﷻ نے دو آدمیوں کا جو یہ قصّہ ذکر کیا، اس سے معلوم ہو گیا کہ اللہ ﷻ کی نصرت اور اچھا انجام مومن کے لئے ہوتا ہے اور معلوم ہوا کہ تمام مومنوں اور کافروں کے ساتھ اللہ ﷻ اس طرح کا معاملہ کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ولایت اور تصرف حقیقت میں اللہ ﷻ کے پاس ہے جس سے وہ اپنے اولیاء کرام کی مدد فرماتا ہے۔ وہ اُنہیں ان کے دشمنوں پر غلبہ عطا فرماتا ہے اور اُنہیں کفار کے معاملات کا والی بنا دیتا ہے۔

۲۔ جب ایسی شدید مصیبت آئے تو اس وقت کٹر سے کٹر مشرک بھی شرک سے ناطہ توڑ لیتا ہے اور صرف اللہ ﷻ کی طرف ہاتھ پھیلاتا ہے اور اپنے پچھلے کفر اور شرک پر پشیمان ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ کاش میں نے شرک نہ کیا ہوتا۔ معلوم ہوا کہ توحید کا نور انسانی فطرت میں موجود ہے۔

۳۔ اس میں دارالآخرت کی طرف اشارہ ہے کہ آخرت میں صرف اللہ ﷻ کی بادشاہی ہوگی۔ جب اللہ ﷻ فرمائے گا: لِمَنِ الۡمُلۡكُ الۡيَوۡمَ لِلّٰهِ الۡوَاحِدِ الۡقَهَّارِ "آج کس کی بادشاہی ہے؟ صرف اللہ کی جو اکیلا ہے سب پر غالب ہے۔" (سورۃ مؤمن ۴۰، آیت: ۱۶)

آیت نمبر ۴۵: دُنیاوی زندگی کی بے ثباتی کو کھیتی سے تشبیہ دی گئی ہے جس کی خاطر اکثر لوگ کفر و شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ خشک اور مردہ زمین پر بارش برسنے سے وہ سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے اور کھیتی پانی سے مل کر خوب لہلہا اُٹھتی ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ کھیتی سوکھ کر چورا چورا ہو جاتی ہے جسے ہوا اڑائے پھرتی ہے۔ اسی طرح انسانی زندگی پر بھی مختلف مراحل آتے ہیں۔ لہٰذا ثابت کر دیا گیا کہ دُنیاوی زندگی پر یا دولت پر غرور میں مبتلا نہ ہو جائے۔ تمام اختیارات اللہ ﷻ ہی کی قدرت میں ہیں۔

علمی بات: اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ ان متکبرین کے سامنے دنیا کی حقارت، اس کی بے مائیگی اور بے ثباتی کی ایک اور مثال بیان کی جائے جو فقراء مومنین کی مجلس میں بیٹھنا اپنے لئے باعث توہین اور باعث عار سمجھتے تھے۔

دنیا کو پانی کے ساتھ تشبیہ دینے کی وجوہات: اس آیت میں اللہ ﷻ نے دنیا کو پانی کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پانی میں اور دنیا میں چند وجوہ سے مناسبت ہے جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ پانی ایک کیفیت اور ایک حالت پر برقرار نہیں رہتا، اسی طرح دنیا بھی ایک کیفیت اور ایک حالت پر برقرار نہیں رہتی۔

۲۔ کوئی شخص اس پر قادر نہیں ہے کہ وہ پانی میں داخل ہو اور بھیگنے سے بچ جائے اسی طرح کوئی شخص اس پر قادر نہیں ہے کہ وہ دنیا میں داخل ہو اور اس کے فتنوں، اس کی آفتوں اور آزمائشوں وغیرہ سے محفوظ رہ سکے۔

۳۔ جب پانی کو بہ قدر ضرورت باغات اور کھیتوں میں ڈالا جائے تو وہ ان کے لئے نفع بخش ہے اور ان کی روئیدگی کو بڑھانے والا ہے اور جب ان میں ضرورت سے زیادہ پانی کو ڈالا جائے گا تو وہ ان کو تباہ و برباد کر دے گا جیسے کہ دریاؤں کے سیلاب میں اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے، اسی طرح جب دنیا کے مال و متاع کو بہ قدر ضرورت لیا جائے گا تو وہ انسان کے لئے مفید اور نفع بخش ہے اور جب انسان دنیا کو اپنی ضروریات سے زیادہ لے گا تو وہ اس کے لئے فتنہ اور فساد کا سبب بن جائے گی۔

عملی پہلو: قرآنِ کریم میں متعدد بار یہ بات انسان کو ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ دنیا کی زندگی کی بہار بھی عارضی ہے اور خزاں بھی عارضی، دل بہلانے کا سامان یہاں بہت کچھ ہے مگر درحقیقت وہ نہایت حقیر اور چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں جنہیں اپنی کم ظرفی کی وجہ سے آدمی بڑی چیز سمجھتا ہے اور اس دھوکہ میں پڑ جاتا ہے کہ ان ہی کو پالینا گویا کامیابی کی منتہیٰ تک پہنچ جانا ہے حالانکہ جو بڑے بڑے فائدے اور لطف کے سامان بھی یہاں حاصل ہونے ممکن ہیں وہ بہت حقیر اور صرف چند سال کی حیات کے لئے ہیں۔ اس کے برعکس آخرت کی زندگی ایک عظیم اور ابدی زندگی ہے۔ وہاں فائدے بھی عظیم اور مستقل ہیں۔ کسی نے اگر وہاں اللہ ﷻ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی پالی تو اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہ نعمت نصیب ہوگئی جس کے سامنے دنیا بھر کی دولت و حکومت بھی ہیچ ہے۔ جو وہاں اللہ ﷻ کے عذاب میں گرفتار ہو گیا اس نے اگر دنیا میں وہ سب کچھ بھی پالیا ہو جسے وہ اپنے نزدیک بڑی چیز سمجھتا تھا تو اس سے معلوم ہو جائے گا کہ وہ بڑے خسارہ کا سودا کر کے آیا ہے۔

آیت نمبر ۴۶: مال و اولاد تو صرف دُنیاوی زندگی کی رونق ہیں۔ ان نعمتوں سے انسان صرف دنیا میں فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ باقی رہنے والی چیز صرف نیک اعمال ہیں جن کا ثواب اللہ ﷻ کے پاس ہے اور اُسی سے خیر کی توقع وابستہ کی جائے۔ ”باقیات صالحات“ میں ہر وہ عمل یا قول شامل ہے جو اللہ ﷻ کی محبت اور اطاعت کی طرف لے جانے والا ہو۔

علمی بات: اس سے پہلی آیت میں اللہ ﷻ نے یہ بتایا تھا کہ دنیا کی زندگی بہت جلد زائل ہونے والی ہے اور اس آیت میں فرمایا ہے کہ مال اور بیٹے دنیا کی زندگی کی زینت ہیں اور اس کا قیاس یوں بنے گا کہ مال اور بیٹے دنیا کی زندگی کی زینت ہیں اور جو چیز دنیا کی زندگی کی زینت ہو، وہ بہت جلد زائل ہونے والی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مال اور بیٹے بہت جلد زائل ہونے والے ہیں اور جو چیز جلد فنا ہونے والی ہو اس پر فخر نہیں کرنا چاہیئے۔ قریش کے متکبرین اپنے مال و دولت اور طاقت ور حمایتیوں کی وجہ سے فقراء مسلمان کو حقیر جانتے تھے اور ان کے پاس بیٹھنے کو باعث عار گردانتے تھے۔ اللہ ﷻ ان پر رد فرماتا ہے کہ جن چیزوں پر تم گھمنڈ کر رہے ہو یہ تو خس و خاشاک کی طرح ہوا میں اڑ جانے والی ہیں، یہ بے ثبات اور ناپائیدار ہیں۔ اس لئے مال اور بیٹوں پر نہ اتراؤ اور ان کی وجہ سے کسی کو حقیر نہ جانو۔

علمی بات: دنیا کے مال و اسباب سے اُمیدیں لگا کر بیٹھو تو ایک وقت وہ دھوکہ دے جاتے ہیں، لیکن وہ نیک اعمال جو اللہ ﷻ کی خوشنودی کے لئے کیئے جائیں خواہ نیک اعمال انسان نے اپنے جیتے جی خود کیئے ہوں یا کسی نیک عمل کا سلسلہ اپنے مرنے کے بعد دنیا میں چھوڑا ہو۔ مثلاً: علم سیکھا جائے جو جاری رہے یا کوئی صدقہ جاریہ والا کام مثلاً مسجد، کنواں، کھیت وقف کر دیا جائے یا اولاد کی تربیت کر کے اسے نیک چھوڑا جائے، اسی قسم کے کام ہیں جن پر اللہ ﷻ کے ہاں بہترین بدلہ مل سکتا ہے اور انسان عمدہ توقعات قائم کر سکتا ہے۔ دنیا کی فانی وزائل خوشحالی پر لمبی چوڑی امیدیں باندھنا عقلمندی نہیں۔

فرامین نبوی ﷺ: ۱۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جب آدمی مر جاتا ہے تو اس کا نیک عمل بند ہو جاتا ہے ہاں جو شخص علم دین کا چرچا یا مسجد سرائے یا اسی طرح کی اور کوئی ثواب کے جاری رہنے کی چیز چھوڑ کر مرے گا تو اس کا نیک عمل مرنے کے بعد بھی جاری رہے گا۔"
(صحیح مسلم، سنن ابن ماجہ، بیہقی)

۲۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ "باقی رہنے والے اعمال کثرت سے کیا کرو۔" عرض کی گیا: یارسول اللہ ﷺ! وہ کیا ہیں فرمایا: "اللہ ﷻ کی تسبیح، تہلیل، تحمید، تکبیر اور لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰه ہیں۔" (مسند احمد)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: "کہ جتنے نیک اعمال ہیں وہ باقیات صالحات ہیں۔"

آیت نمبر ۴۷: خطاب ان لوگوں سے ہے جو غرور و تکبر کی بنا پر قیامت کا انکار کرتے ہیں۔ روز قیامت پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ کر فضا میں اُڑیں گے اور زمین کو چٹیل میدان میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ تمام لوگوں کو اکٹھا کیا جائے گا اور کوئی اس حشر سے نہ بچے گا۔

علمی بات: اس سے پہلی آیتوں میں اللہ ﷻ نے بتایا تھا کہ دنیا بہت خسیس اور رذیل ہے اور آخرت بہت عمدہ اور اشرف ہے اور چونکہ آخرت قیامت کے بعد آئے گی، اس لئے اب قیامت کے احوال بیان فرما رہا ہے۔ قرآنِ کریم کی آیات کو سامنے رکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ قیامت کے موقع پر پہاڑوں کو پہلے اپنی جگہ سے ہٹا کر چلایا جائے گا پھر ان کو کوٹ پیس کر غبار کی طرح ہوا میں اڑا دیا جائے گا۔ چلانے کا ذکر اس جگہ کے علاوہ سورۃ النمل ۲۷، آیت ۸۸ اور سورۃ تکویر ۸۱، آیت: ۳ میں بھی آیا ہے اور اُنہیں کوٹ پیس کر غبار میں تبدیل کر دینے کا ذکر سورۃ طٰہٰ ۲۰، آیت: ۱۰۵، سورۃ الواقعہ ۵۶، آیت ۶۵ اور سورۃ المرسلات ۷۷، آیت: ۱۰ میں موجود ہے جو چیزیں زمین کے اندر پوشیدہ ہیں۔ وہ سامنے آجائیں گی جیسا کہ سورۃ انشقاق ۸۴، آیت: ۴ میں بیان فرمایا گیا ہے اور یہ مطلب بھی ہے کہ پہاڑوں، درختوں اور عمارتوں کے فنا ہو جانے کے بعد زمین حد نظر تک سپاٹ نظر آئے گی جس میں کوئی نشیب و فراز نہیں ہوگا "اور تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو (تو) خیال کرتے ہو کہ اپنی جگہ جمے ہوئے ہیں حالانکہ وہ بادل کی طرح اڑتے پھریں گے۔" (سورۃ النمل ۲۷، آیت: ۸۸)۔ "اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔" (سورۃ التکویر ۸۱، آیت: ۳) "اور جب پہاڑ (ریزہ ریزہ کر کے) اُڑا دیئے جائیں گے۔" (سورۃ المرسلات ۷۷، آیت: ۱۰)

" اور (اے محبوب ﷺ!) وہ آپ سے پہاڑوں کے بارے میں پوچھتے ہیں تو آپ ﷺ فرما دیجئے کہ میرا رب اُنہیں دھول بنا کر اڑا دے گا۔ اور زمین کو (ایسا) صاف میدان بنا دے گا۔" (سورۃ طٰہٰ ۲۰، آیات: ۱۰۶، ۱۰۷) جیسا کہ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ "اور اس کے اندر جو کچھ ہے وہ اسے باہر پھینک دے گی اور خالی ہو جائے گی۔" (سورۃ الانشقاق ۸۴، آیت: ۴)

زمین کے صاف میدان ہونے کی وجوہات:

۱۔ زمین پر بنی ہوئی کوئی عمارت باقی نہیں رہے گی نہ پہاڑ، نہ درخت اور اس میں کوئی اونچی اور نیچی چیزیں نہیں رہیں گی۔

۲۔ بارزۃ سے مراد یہ ہے کہ زمین کے بطن میں جو کچھ ہے اس کو ظاہر کر دیا جائے گا۔ سو قبروں میں جو مُردے دفن ہیں اور جو خزانے موجود ہیں، ان کو نکال کر باہر کر دیا جائے گا۔ جیسا کہ قرآنِ مجید کی ان آیات سے ظاہر ہے: "اور جب زمین پھیلا دی جائے گی۔ اور اس کے اندر جو کچھ ہے وہ اسے باہر پھینک دے گی اور خالی ہو جائے گی۔" (سورۃ الانشقاق ۸۴، آیات: ۳، ۴) "جب زمین اپنے زلزلہ سے پوری شدت سے ہلا دی جائے گی۔ اور زمین اپنے (اندر کے) تمام بوجھ باہر نکال پھینکے گی۔" (سورۃ الزلزال ۹۹، آیات: ۱، ۲)

علمی بات: "اور جو کچھ اس کے اندر ہے اسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی" اس کے کئی مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ مرے ہوئے انسان زمین کے اندر جہاں جس شکل اور جس حالت میں بھی پڑے ہوں گے ان سب کو وہ نکال کر باہر ڈال دے گی۔ اس وقت ان کے جسم کے تمام بکھرے ہوئے اجزا جمع ہو کر از سر نو اسی شکل وصورت میں زندہ ہو جائیں گے جس میں وہ پہلی زندگی کی حالت میں تھے، کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ یہ کیسے کہیں گے کہ زمین کو یہ کیا ہو رہا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ صرف مرے ہوئے انسانوں ہی کو وہ باہر نکال پھینکنے پر اکتفا نہ کریں گے بلکہ ان کی پہلی زندگی کے افعال واقوال اور حرکات وسکنات کی شہادتوں کا جو انبار اس کی تہوں میں دبا پڑا ہے اس سب کو بھی وہ نکال کر باہر ڈال دے گی۔ تیسرا مطلب بعض مفسرین کرام نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ سونا، چاندی، جواہر اور ہر قسم کی دولت جو زمین کے پیٹ میں ہے اس کے بھی ڈھیر کے ڈھیر وہ باہر نکال کر رکھ دے گی اور انسان دیکھے گا کہ یہی ہیں وہ چیزیں جن پر وہ دنیا میں مرا جاتا تھا، جن کی خاطر اس نے قتل کیئے، حق داروں کے حقوق مارے، چوریاں کیں، ڈاکے ڈالے، خشکی اور تری میں لوٹ مار کی، جنگ کے معرکے برپا کیئے اور پوری قوموں کو تباہ کر ڈالا۔ آج وہ سب کچھ سامنے موجود ہے اور اس کے کسی کام کا نہیں ہے بلکہ الٹا اس کے لئے عذاب کا سامان بنا ہوا ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "زمین اپنے پوشیدہ خزانے اُگل دے گی اور وہ سونے اور چاندی کے ستونوں کی مانند ہوں گے۔ قاتل آئے گا اور (ان کو دیکھ کر) کہے گا، (افسوس صد افسوس!) میں نے اسی کے لالچ میں (فلاں کو) قتل کیا تھا۔ رشتے ناتے قطع کرنے والا آئے گا اور کہے گا (افسوس!) میں نے اسی کی لالچ میں (ناتا) توڑا تھا۔ چور آئے گا اور کہے گا، (افسوس!) اسی کے لالچ میں میرا ہاتھ کاٹا گیا۔ پھر وہ سب اسے چھوڑ کر چلے جائیں گے اور وہ اس میں سے کچھ بھی نہیں لیں گے۔" (صحیح مسلم)

علمی بات: پھر سب لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے کر دیئے جائیں گے کیونکہ زمین کا چہرہ پہاڑوں، سمندروں اور دریاؤں سے پوشیدہ تھا، پس جب اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں اور دریاؤں کو فنا کر دے گا تو زمین کے جو حصے ان سے چھپے ہوئے تھے، وہ ظاہر ہو جائیں گے اور اس طرح زمین صاف میدان ہو جائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اور ہم ان سب کو جمع کریں گے پس ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑیں گے۔" اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ہم سب لوگوں کو حساب کے لئے جمع کریں گے اور اس دن اولین اور آخرین میں سے کسی کو نہیں چھوڑیں گے۔ قرآنِ مجید میں ہے: "آپ (ﷺ) فرما دیجئے بے شک پچھلے اور بعد والے سب۔ یقیناً جمع کیئے جائیں گے ایک معیّن دن کے مقررہ وقت پر۔" (سورۃ الواقعہ ۵۶، آیات: ۴۹،۵۰)

آیت نمبر ۴۸: روز قیامت تمام لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے صفیں باندھے پیش کیئے جائیں گے۔ جس طرح لوگ بے بس اور خالی ہاتھ دنیا میں آئے تھے اسی طرح میدانِ محشر میں جمع ہوں گے۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد فرمانا کہ "تم ہمارے پاس اسی حالت میں آگئے ہو جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا" یہ تشبیہ بعض صفات میں ہے ورنہ جس وقت انسان پیدا ہوا تھا اس وقت وہ نہ چل سکتا تھا، نہ بیٹھ سکتا تھا نہ باتیں کر سکتا تھا اور نہ کسی کام کاج پر قادر تھا۔

علمی بات: كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح آسانی سے ہم نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا اسی طرح اب تمہاری تخلیق فرما دی تم دوبارہ پیدا ہونے کو ناممکن سمجھتے تھے حالانکہ جس نے پہلی بار پیدا کیا وہ دوسری بار بآسانی پیدا فرما سکتا ہے۔ کفار ومشرکین کا یہ طریقہ تھا کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے نائبین کی تعلیم اور تبلیغ سے جب کبھی کچھ دھیان وقوعِ قیامت کی طرف چلا جاتا تھا تو وہ اسے بھی یوں کہہ کر دفع کر دیتے تھے کہ نہ دوبارہ اٹھنا ہے اور نہ حساب کتاب کا موقع آنا ہے۔

علمی بات: وہ وعدہ پورا ہو کر رہے گا جو انبیاءِ کرام علیہم السلام کی زبانی کیا گیا کہ دوبارہ اٹھایا جائے گا اور تمام مخلوق کو جمع کیا جائے گا۔ یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو قرآنِ حکیم کے الفاظ میں اَلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا "وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے" (سورۃ یونس ۱۰، آیت: ۱۱) کے زمرے میں آتے ہیں۔ ایسے لوگ جب اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوں گے تو اُنہیں ان کا وعدۂ الست اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" (سورۃ الاعراف ۷، آیت: ۱۷۲) بھی اللہ تعالیٰ منکرین آخرت کو

یاد دلائے گا کہ تم لوگوں نے مجھے اپنا رب تسلیم کیا تھا پھر تم دنیا کی زندگی میں اس حقیقت کو بالکل ہی بھول گئے کہ تم نے واپس ہمارے پاس بھی آنا ہے۔ تمہیں گمان تک نہیں تھا کہ ہم تمہارے لئے اپنے سامنے پیشی کا کوئی وقت مقرر کریں گے۔

اس بیانیہ اندازِ خطاب میں یک لخت تبدیلی کر کے اسے خطابی انداز میں لانے سے منظر میں ایک طرح کی زندگی پیدا کر دی جاتی ہے۔ کردار زندہ و متحرک نظر آتے ہیں اور منظر ہمارے سامنے مجسم ہو جاتا ہے۔ گویا یہ مستقبل میں آنے والا قیامِ قیامت کا کوئی منظر نہیں ہے۔ بلکہ موجودہ دور کا منظر ہے۔

آیت نمبر ۴۹: روزِ قیامت ہر شخص کا اعمال نامہ اس کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ مجرمین اس دن اپنی بداعمالیوں کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جائیں گے۔ وہ حیرت اور رنج سے کہیں گے کہ یہ کیسا عجیب اعمال نامہ ہے جس میں ہر چھوٹا اور بڑا عمل لکھا ہوا ہے۔ انہوں نے جو بھی اعمال کیئے ہوں گے وہ سب اپنے سامنے لکھا ہوا موجود پائیں گے اور کسی کی حق تلفی نہیں ہوگی۔

علمی بات: اپنے اپنے اعمال نامے دیکھیں گے ان میں ہر چھوٹا بڑا عمل لکھا ہوگا نافرمان اسے دیکھ کر ڈریں گے اور یوں کہیں گے کہ کاش یہ اعمال نامہ ہمارے سامنے نہ آتا جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے: ''تو جس کو اس کا نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ (خوش ہو کر) کہے گا لو میرا اعمال نامہ پڑھو۔'' (سورۃ الحاقہ ۶۹، آیت:۱۹)

ان اعمال ناموں میں سب کچھ ہو گا اللہ ﷻ کی طرف سے کسی پر کوئی ظلم نہ ہو گا۔ جو گناہ نہ کیا ہو گا وہ لکھ دیا گیا ہو ایسا نہ ہو گا اور جو نیکی کسی نے کی ہو چھوٹی یا بڑی وہ اعمال نامہ میں موجود ہو گی۔ نہ کوئی گناہ لکھنے سے رہا ہو گا اور نہ کوئی بے کیا ہوا گناہ لکھا ہوا ہو گا اور نہ کوئی نیکی چھوٹی ہوئی ہو گی۔ (جو گناہ توبہ، استغفار یا نیکیوں کی وجہ سے کفارہ ہونے کے باعث درج نہ ہوں گے ان کے بارے میں اشکال نہیں ہوتا کیونکہ وہ گناہ کے ذیل میں آتے ہی نہیں۔)

علمی بات: اہلِ محشر کا اپنے کیئے ہوئے اعمال کو حاضر پانے کا مفہوم عام طور پر مفسرین کرام نے یہ بیان کیا ہے کہ اپنے کیئے ہوئے اعمال کی جزا کو حاضر و موجود پائیں گے، کچھ مفسرین کرام یہ بھی فرماتے ہیں کہ لوگوں کے اعمال میں آخرت کی جزا و سزا بن جائیں گے۔ سورۃ النساء ۴، آیت:۱۰ میں یتیم کے ناجائز مال کو آگ کہا گیا ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ وہ اس وقت بھی آگ ہی ہے، مگر اس کے آثار محسوس کرنے کے لئے اس دنیا سے گزر جانا شرط ہے، جیسے کوئی پیڑول کو آگ کہے تو صحیح سمجھا جائے گا اگرچہ اس کے لئے ذرا سی آگ سے ملنا شرط ہے۔ اس کا حاصل یہ ہوا کہ انسان جو کچھ نیک یا بد عمل دنیا میں کرتا ہے یہ عمل ہی آخرت میں جزا و سزا کی شکل اختیار کرے گا، اس وقت اس کے آثار و علامات اس دنیا سے الگ دوسرے ہو جائیں گے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

علمی بات: مسند احمد میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی صاحبِ ایمان شخص جب قبر میں منکر نکیر کے سوالوں کا درست جواب دے دیتا ہے تو اس کے پاس ایک حسین و جمیل، عمدہ خوشبو والا اور خوش لباس آدمی آکر کہتا ہے: تم کو اللہ ﷻ کی طرف سے اکرام اور ہمیشہ کی نعمتوں کی بشارت ہو۔ یہ کہتا ہے: تجھے بھی اللہ ﷻ اچھی بشارتیں دے، تم کون ہو؟ وہ کہتا ہے: میں تیرا ہی نیک عمل ہوں، اللہ کی قسم! تو اللہ ﷻ کی اطاعت کرنے میں تیز اور گناہ کرنے میں سست ہوتا تھا، اللہ ﷻ تجھے اچھا بدلہ دے۔ پھر اس کے لئے جنت اور جہنم دونوں طرف سے ایک ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے اور اسے کہا جاتا ہے: اگر تم اللہ ﷻ کی نافرمانی کرتے تو تمہارا (جہنم والا) یہ ٹھکانا ہوتا۔ اب اللہ ﷻ نے تمہارے لئے اس کے عوض یہ (جنت والی) جگہ تیار کی ہے۔ پھر جب وہ جنت کے مناظر اور نعمتیں دیکھتا ہے تو کہتا ہے: اے میرے رب! قیامت جلدی بپا کر تاکہ میں اپنے اہل اور مال میں لوٹ سکوں۔ لیکن اسے کہا جائے گا: تم یہاں سکون کرو۔ جب کافر، مشرک اور نافرمان شخص منکر نکیر کے سوالوں کا درست جواب نہیں دیتا تو اس کے پاس ایک انتہائی بدصورت اور گندے لباس والا بدبودار آدمی آتا ہے اور کہتا ہے: تجھے اللہ ﷻ کی طرف سے ذلت و رسوائی اور دائمی عذاب کی بشارت ہو۔ وہ کہتا ہے: تجھے بھی بُرائی کی بشارت ہو، تو کون ہے؟ وہ کہتا ہے: میں تیرا بُرا عمل ہوں، تو اللہ ﷻ کی اطاعت کرنے میں سست اور گناہ کرنے میں تیز تھا۔ اللہ ﷻ تجھے بُرا بدلہ دے۔ پھر اس پر ایک اندھا، بہرا اور گونگا فرشتہ مقرر کر دیا جاتا ہے، اس کے ہاتھ میں لوہے کا ایسا گُرز ہوتا ہے کہ اگر وہ پہاڑ پر مارا جائے تو وہ بھی ریزہ ریزہ ہو جائے۔ فرشتہ زور سے اسے یہ گرز مارتا ہے، وہ آدمی مٹی ہو جاتا ہے، اللہ ﷻ اسے دوبارہ ٹھیک کر دیتا ہے۔ وہ پھر اسے مارتا ہے، جس کی وجہ سے وہ چیختا چلاتا ہے اور اس کی چیخ و پکار کو جن و انس کے علاوہ ہر چیز سنتی ہے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: اس کے بعد اس کے لئے جہنم کی طرف دروازہ کھول دیا جاتا ہے اور اس کے لئے جہنم کا بستر بچھا دیا جاتا ہے۔

آیت نمبر ۵۰: اللہ ﷻ کے حکم پر تمام فرشتوں کا حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا بیان ہے۔ ابلیس جنات میں سے تھا اور اسے نیکی اور بدی دونوں کا اختیار تھا۔ اپنے اس اختیار کو غلط طور پر استعمال کرتے ہوئے اس نے تکبر کا مظاہرہ کیا اور اللہ ﷻ کا حکم تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس طرح وہ اللہ ﷻ کی اطاعت سے نکل گیا اور اُس نے انسان سے ہمیشہ کے لئے دشمنی مول لی۔ ظالم سے مراد شیطان کے فرماں بردار اور اس کی پیروی کرنے والے ہیں۔ اللہ ﷻ کی اطاعت اور اس کی دوستی کو چھوڑ کر شیطان کی پیروی اور اس کی دوستی اختیار کرنے والے ظالم شدید سزا پائیں گے۔

علمی بات: سابقہ آیات کے ذکر سے یہ مقصود تھا کہ ان لوگوں کا رد کیا جائے جو اپنے مال و دولت اور اپنے مددگاروں اور ساتھیوں پر فخر کرتے تھے اور مسلمان فقراء کو حقیر جانتے تھے اور اس آیت سے بھی بعینہٖ اس معنیٰ کا ذکر کرنا مقصود ہے کیونکہ ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام پر تکبر کیا تھا اس نے اپنی تخلیق آگ سے ہونے پر تکبر کیا تھا۔ اسی طرح کا معاملہ متکبر مشرکوں نے مسلمان فقراء کے ساتھ کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم ان فقراء کے ساتھ کیوں بیٹھیں جبکہ ہم مال و دولت اور جاہ و حشم کے اعتبار سے ان سے افضل ہیں۔ اس وجہ سے اللہ ﷻ نے سابقہ آیات کے بعد حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا قصہ بیان فرمایا۔

علمی بات: قصہ آدم و ابلیس کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود گمراہ انسانوں کو ان کی اس حماقت پر متنبہ کرنا ہے کہ وہ اپنے رحیم و شفیق پروردگار اور خیر خواہ پیغمبروں کو چھوڑ کر اپنے اس ازلی دشمن کے پھندے میں پھنس رہے ہیں جو روزِ اول سے ان کے خلاف حسد رکھتا ہے۔

علمی بات: ابلیس فرشتوں میں سے نہ تھا بلکہ جنات میں سے تھا، اس لئے اطاعت سے باہر ہو جانا اس کے لئے ممکن ہوا۔ فرشتوں کے متعلق قرآن مجید تصریح کرتا ہے کہ وہ فطرۃً مطیع فرمان ہیں: "اللہ جو حکم بھی ان کو دے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے۔" (سورۃ التحریم ۶۶، آیت: ۶) "وہ سرکشی نہیں کرتے، اپنے رب سے جو ان کے اوپر ہے ڈرتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا اُنہیں حکم دیا جاتا ہے" (سورۃ النحل ۱۶، آیت: ۵۰)۔ بخلاف اس کے جنات انسانوں کی طرح ایک ذی اختیار مخلوق ہیں جنہیں پیدائشی فرماں بردار نہیں بنایا گیا بلکہ کفر و ایمان اور طاعت و معصیت، دونوں کا اختیار بخشا گیا ہے۔ اس حقیقت کو یہاں کھولا گیا ہے کہ ابلیس جنوں میں سے تھا اس لئے اس نے خود اپنے اختیار سے فسق کی راہ انتخاب کی۔ یہ تصریح ان تمام غلط فہمیوں کو رفع کر دیتی ہے جو عموماً لوگوں میں پائی جاتی ہیں کہ ابلیس فرشتوں میں سے تھا۔

علمی بات: فرشتوں کو سجدہ کا حکم دینے کے معنٰی یہ تھے کہ وہ تمام مخلوقاتِ ارضی بھی انسان کی مطیع فرماں بردار بن جائیں کرۂ زمین کی عملداری میں فرشتوں کے زیرِ انتظام آباد ہیں۔ چنانچہ فرشتوں کے ساتھ یہ سب مخلوقات بھی سربسجود ہوئیں۔ مگر ابلیس نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

سجدہ کرنے کا جو حکم فرشتوں کو دیا گیا تھا اس میں فرشتے اور جنات سب داخل ہیں مگر حکم میں صرف فرشتوں کے ذکر پر اس لئے اکتفا کیا گیا کہ وہ سب سے افضل اور اشرف تھے۔ جب حضرت آدم علیہ السلام کی تعظیم کا حکم ان کو دیا گیا تو جنات کا بدرجہ اُولیٰ اس حکم میں شامل ہونا معلوم ہو گیا کہ جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ بڑوں کو کسی کی تعظیم و تکریم کا حکم ہوا ہے تو اس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ چھوٹے بھی اس حکم میں شامل ہیں۔

علمی بات: ذُرِّیَّت اصل میں چھوٹے بچوں کو کہتے ہیں پھر عرب میں چھوٹے اور بڑے اور واحد اور کثیر تمام اولاد کو ذُرِّیَّت کہتے ہیں اور مجازاً تبعین یعنی پیروی کرنے والوں کو ذُرِّیَّت کہتے ہیں۔ شیطانوں کی بھی اس طرح اولاد ہوتی ہے جس طرح بنی آدم کی اولاد ہوتی۔ ابلیس اَبُوالجِن ہے۔ جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام اَبُوالاِنس ہیں۔ شیطان کی ذریت، اس کے ماتحت مددگار اور اس کا لشکر ہونا قطعی دلائل سے ثابت ہے۔

آیت نمبر ۵۱: اللہ ﷻ کا اپنی وحدانیت کی دلیل کے طور پر کائنات کی تخلیق کا بیان ہے۔ کائنات کی تخلیق اور اس کے چلانے میں ابلیس یا دیگر خود ساختہ معبودوں کا کوئی حصہ نہیں۔ اللہ ﷻ نے جب اُنہیں پیدا کیا تو اس وقت بھی ان خود ساختہ معبودوں سے کوئی مشورہ نہیں لیا تھا۔ اللہ ﷻ کو مددگاروں کی کوئی ضرورت نہیں البتہ اس کے دوست ضرور ہیں مگر وہ گمراہ لوگوں کو دوست نہیں بناتا۔

علمی بات: اس آیت میں ابلیس اور اس کی ذُرِّیَّت کی اتباع کرنے والوں اور شرک کرنے والوں کی جہالت اور ضلالت پر تنبیہ فرمائی ہے۔ اللہ ﷻ نے ارشاد فرمایا

کہ میں نے جب آسمان و زمین کو پیدا کیا اور جب ان لوگوں کو پیدا کیا تو ان کو اپنی مدد یا مشورے کے لئے نہیں بلایا تھا۔ جب آسمان و زمین کی تخلیق اور خود ان کی تخلیق میں میرا کوئی شریک نہیں تو پھر ابلیس اور اس کی ذُرِّیَّت سے دوستی کیوں کرتے ہیں؟ اور ان کے ورغلانے سے غیر اللہ کو اللہ ﷻ کا شریک کیوں ٹھہراتے ہیں؟ یہ تو سراسر حماقت اور سفاہت اور ضلالت ہے۔

دوسری ضلالت اور حماقت یہ ہے کہ جن کا مشغلہ گمراہ کرنے اور اللہ ﷻ کی فرماں برداری سے ہٹانے اور اس کے لئے شریک ٹھہرانے کا ہے ان کے بارے میں یہ عقیدہ بنالیا کہ وہ اللہ ﷻ کے مددگار ہیں۔ (العیاذ باللہ) جب کہ اللہ ﷻ نے واضح ارشاد فرمایا کہ "آپ (ﷺ) فرمادیجئے ان کو پکارو جن کو تم اللہ کے سوا (معبود) سمجھ رہے ہو وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر (کسی چیز) کے مالک ہیں اور نہ زمینوں میں اور نہ ہی ان دونوں میں ان کا کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس (اللہ) کا مددگار ہے۔" (سورۂ سبا۳۴، آیت:۲۲)

آیت نمبر ۵۲: روزِ قیامت مشرکین اور ان کے شرکاء کی بے بسی کا بیان ہے۔ مشرکین کو کہا جائے گا کہ وہ اُنہیں پکاریں جنہیں وہ اپنے خیال میں اللہ ﷻ کا شریک ٹھہرایا کرتے تھے۔ مشرکین عذابِ الٰہی سے بچنے کے لئے شرکاء کو پکاریں گے لیکن وہ اُنہیں ان کی پکار کا جواب نہیں دیں گے۔ ان کے درمیان آڑ یا سخت عداوت ڈال دی جائے گی۔ اس آڑ سے ایک مراد جہنم کی سخت وادی بھی ہے۔

علمی بات: موبق کے بارے میں مفسرین کرام کی مختلف آراء ہیں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "موبق دوزخ کی ایک وادی کا نام ہے۔" حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جہنم میں ایک وادی ہے جس میں خون اور پیپ بہتی ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "اس سے مراد سخت عداوت ہے۔"

علمی و عملی بات: اللہ ﷻ کے احکام اور اس کی ہدایات کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے احکام اور رہنمائی کی اتباع کرنا دراصل اس کو خدائی میں اللہ ﷻ کا شریک ٹھہرانا ہے خواہ آدمی اس دوسرے کو زبان سے اللہ ﷻ کا شریک قرار دیتا ہو یا نہ قرار دیتا ہو۔ بلکہ اگر آدمی ان دوسرے جھوٹے خداؤں اور شیاطین صفت لوگوں پر لعنت بھیجتے ہوئے بھی امرِ الٰہی کے مقابلہ میں ان کے اوامر کی اتباع کر رہا ہو تب بھی وہ شرک کا مجرم ہے۔ چنانچہ یہاں شیاطین کے معاملہ میں علانیہ دیکھا جاتا ہے کہ دنیا میں ہر ایک ان پر لعنت کرتا ہے، مگر اس لعنت کے باوجود جو لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں، قرآنِ حکیم ان سب کو یہ الزام دے رہا ہے کہ تم شیاطین کو اللہ ﷻ کا شریک بنائے ہوئے ہو۔ یہ شرک اعتقادی نہیں بلکہ شرک عملی ہے اور قرآنِ حکیم اس کو بھی شرک کہتا ہے۔

آیت نمبر ۵۳: دوزخ کی آگ کو دیکھ کر مشرکین کو یقین ہو جائے گا کہ وہ اس آگ میں گرنے والے ہیں۔ دوزخ سے نجات ملنا ان کے لئے ممکن نہیں ہو گا۔

علمی بات: وہ کافر جو مال و دولت کے گھمنڈ کی وجہ سے موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو مامون و محفوظ سمجھتے ہیں۔ مگر قیامت میں ان کا انجام صرف یہ ہونے والا ہے کہ وہ اپنے آپ کو جہنم کے دروازے پر کھڑا ہوا پائیں اور اس سے بھاگنے کی کوئی تدبیر نہ کر سکیں۔

آیت نمبر ۵۴: انسانوں کی ہدایت کے لئے قرآنِ حکیم میں گزشتہ قوموں کے واقعات، محاسبۂ اعمال اور توحید کے دلائل مختلف انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن انسان بڑا ہی جھگڑالو ہے جو نصیحت حاصل کرنے کے بجائے باطل باتوں کے ذریعہ حق کا انکار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

علمی بات: موجودہ دنیا میں امتحان کی آزادی ہے۔ اس بنا پر یہاں آدمی حق کا اعتراف نہ کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی عذر پالیتا ہے۔ ہر بات کو رد کرنے کے لئے اس کو کچھ نہ کچھ الفاظ مل جاتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایک کھلی ہوئی دلیل کو بے معنیٰ بحثوں سے کاٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی وہ ایسا کرتا ہے کہ جو دلیل دی گئی ہے اس کو نظر انداز کر کے ایک اور چیز کا تقاضا کرتا ہے جو کسی وجہ سے ابھی پیش نہیں کی گئی۔

علمی بات: انسان کی ہدایت کے لئے اس کی عقل اور اس کے دل کو اپیل کرنے والی بہت سی دلیلیں مختلف پیرایوں میں اور دل نشین انداز میں بیان کر دی ہیں مگر انسان کچھ اس طرح کا جھگڑالو اور ہٹ دھرم واقع ہوا ہے کہ جس بات کو نہ ماننے کا تہیہ کر لے اس پر کئی طرح کے اعتراض وارد کر سکتا ہے۔ جھوٹے دلائل اور

حیلوں بہانوں سے جواب پیش کر سکتا ہے۔

آیت نمبر ۵۵: لوگوں سے تقاضا تو یہی تھا کہ وہ قرآنِ حکیم سے ہدایت حاصل کرتے، اللہ ﷻ پر ایمان لاتے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے مگر سرکش کفار نے قبولِ حق سے اعراض کیا۔

ایمان لانے اور گناہوں کی معافی نہ مانگنے کی وجوہات کا بیان: ۱۔ ان کا معاملہ سابقہ قوموں کی طرح ہو، گویا وہ ایمان لانے کے لئے عذاب کے منتظر ہیں۔
۲۔ یا پھر عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر وہ ایمان لائیں گے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کے بعد ایمان لانے کا موقع کہاں ملے گا۔

علمی بات: کافروں کی سرکشی بیان ہو رہی ہے کہ وہ حق واضح ہو جانے کے باوجود بھی اللہ ﷻ کی فرماں برداری سے رکے رہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ ﷻ کے عذابوں کو اپنے آنکھوں سے دیکھ لیں۔ مثلاً کسی نے تمنا کی کہ آسمان اس پر گر پڑے، کسی نے اپنے رسول (علیہ السلام) سے کہا کہ لاؤ جو عذاب لا سکتے ہو۔ اسی طرح قریش نے بھی کہا اے اللہ! اگر یہ حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا! یا کوئی اور دردناک عذاب ہم پر نازل کر۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اے محمد! ہم تو تجھے مجنوں جانتے ہیں (معاذ اللہ) اور اگر فی الواقع تم سچے نبی ہو تو ہمارے سامنے فرشتے کیوں نہیں لاتے؟ وغیرہ وغیرہ پس عذابِ الٰہی کے انتظار میں رہتے تھے۔

علمی بات: جہاں تک دلیل و حجت کا تعلق ہے، قرآنِ حکیم نے حق واضح کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔ دل اور دماغ کو اپیل کرنے کے جتنے مؤثر طریقے اختیار کرنے ممکن تھے، وہ سب بہترین انداز میں یہاں اختیار کیئے جا چکے ہیں۔ اب وہ کیا چیز ہے جو اُنہیں قبولِ حق میں مانع ہو رہی ہے؟ صرف یہ کہ اُنہیں عذاب کا انتظار ہے۔ گویا وہ سزا کے بغیر سیدھے نہیں ہونا چاہتے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ ﷻ کی حجت ان پر قائم ہو گئی ہے اس کے بعد بھی اگر وہ ایمان نہیں لاتے تو عذاب ہی ان کی آنکھیں کھول سکتا ہے مگر اس وقت اس کا کچھ فائدہ نہ ہو گا۔

آیت نمبر ۵۶: اللہ ﷻ نے اپنی رحمت اور شفقت کا اظہار فرماتے ہوئے لوگوں کی ہدایت کے لئے رسول بھیجے۔ رسولوں کی ذمہ داری فرماں برداروں کو بشارت دینا اور نافرمانوں کو ان کے بُرے انجام سے ڈرانا ہے۔ کفار رسولوں کو جھٹلاتے ہیں، ان کے معجزات کا رد کرتے ہیں اور باطل طریقہ اختیار کر کے حق کو باطل ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اللہ ﷻ کی آیات کا اور اس کے عذاب کا جس سے اُنہیں ڈرایا جاتا ہے مذاق اڑاتے ہیں۔

علمی بات رسولوں کا عذاب کے آنے یا نہ آنے سے کوئی تعلق نہیں ان کا کام تو صرف بشارت اور انذار ہے۔ اللہ ﷻ رسولوں کو ان کی اُمتوں کی طرف بھیجتا ہے تا کہ وہ ایمان والوں اور اطاعت گزاروں کو ثواب اور جنت کے درجات کی خوش خبری دیں جبکہ کافروں کو جہنم کے شدید عذاب سے ڈرائیں۔

علمی بات: اس آیت کے بھی دو مطلب ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی یہاں مراد ہو سکتے ہیں:
ایک یہ کہ رسولوں کو ہم اس لئے بھیجتے ہیں کہ فیصلہ کا وقت آنے سے پہلے لوگوں کو فرماں برداری کے اچھے اور نافرمانی کے بُرے انجام سے خبردار کریں۔ مگر یہ بے وقوف لوگ ان پیشگی تنبیہات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے اور اسی انجام بد کو دیکھنے پر مُصر ہیں جس سے رسول علیہ السلام اُنہیں بچانا چاہتے ہیں۔
دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر ان کو عذاب ہی دیکھنا منظور ہے تو پیغمبر سے اس کا مطالبہ نہ کریں کیونکہ پیغمبر عذاب دینے کے لئے نہیں بلکہ عذاب سے پہلے صرف خبردار کرنے کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔

علمی بات: کافروں کا جھگڑا کسی معقول دلیل اور ٹھوس بنیاد پر مبنی نہیں ہے۔ ان کے پاس اپنے مؤقف کی سچائی ثابت کرنے کے لئے کوئی ایسی دلیل بھی نہیں جو سنجیدگی سے غور کرنے کے قابل ہو۔ یوں ہی بے اندازہ، فضول، بغیر سوچے سمجھے ہانکتے رہتے ہیں۔ مثلاً وہ رسولوں سے کہتے ہیں کہ تم تو ہماری طرح بشر ہو اور اگر اللہ ﷻ چاہتا تو کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیج دیتا اور وہ یہ جھگڑا اس لئے کرتے ہیں تا کہ اس کے ذریعہ سے اس حق بات کو مٹا دیں جو رسولوں کے ساتھ ہے، چنانچہ اس طرزِ عمل کے ذریعہ کافروں نے اللہ ﷻ کی وحدانیت اور قدرت پر دلالت کرنے والی نشانیوں کو اور جس عذاب سے اُنہیں ڈرایا جاتا تھا اسے مذاق بنا لیا۔ (معاذ اللہ)

علمی بات: چاہیئے تو یہ تھا کہ باطل پرست اللہ ﷻ کے عذاب سے ڈرتے اور حق کا راستہ اختیار کرتے، لیکن اس کے برعکس وہ الٹا حق کو مٹانے کے لئے باطل دلائل

کے سہارے جھگڑا کرتے ہیں، معجزات دیکھتے جاتے ہیں اور پھر معجزوں کی فرمائش چلی جاتی ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ جھوٹے جھگڑوں سے حق کو ڈگمگا دیں اور حق کی آواز کو پست کر دیں، حق کو باطل سے مٹا دیں، قدرت کی دلیلوں اور عذاب کے مضامین کی ہنسی اڑاتے رہیں۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی بات سب سے زیادہ سچی بات ہے۔ تمام بہترین دلائل اس کی موافقت کرتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ اس کو ماننا نہیں چاہتے وہ کوئی حقیقی دلیل نہیں پاتے جس کے ذریعہ وہ اسے رد کر سکیں۔ ان کے پاس ہمیشہ صرف بے اصل باتیں ہوتی ہیں جن کے ذریعہ وہ اس کو زیر کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہیں۔ وہ ٹھوس دلائل کا مقابلہ جھوٹے اعتراضات سے کرتے ہیں۔ وہ سنجیدہ کام کو مذاق میں گم کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ سب وہ اس لئے کرتے ہیں کہ داعی کو عوام کی نظر میں بے اعتبار ثابت کر سکیں۔ مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ ایسا کر کے وہ خود اپنے آپ کو اللہ ﷻ کی نظر میں بے اعتبار ثابت کر رہے ہیں۔

آیت نمبر ۵۷: آیات میں احکام، دلائل، معجزات اور نشانیاں شامل ہیں۔ اللہ ﷻ کی آیات پیش کرنے پر ان سے اعراض کرنے والا سب سے بڑا ظالم ہے۔ وہ اپنے کرتوتوں کو اور کل کی پیشی کو بھول جاتا ہے۔ حق کی مخالفت کے نتیجہ میں ایسے لوگوں سے حق کو سننے اور سمجھنے کی توفیق سلب کر دی جاتی ہے۔ پھر ہدایت قبول کرنا ان کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے۔

علمی بات: جن لوگوں کو اللہ ﷻ کی آیات کے ذریعہ نصیحت کی گئی اور انہوں نے اس سے روگردانی کی، نیز وہ اپنے اعمال بد اور ان کے انجام بد کو بھی بھول گئے، یہ لوگ بہت بڑے ظالم ہیں اور ان کے مظالم کی سزا کے طور پر ان کے دلوں پر ایسے پردے ڈال دیئے گئے اور ان کے کانوں میں ایسی گرانی پیدا کر دی گئی، جس سے قرآنِ پاک کا سمجھنا، سننا اور اس سے نصیحت قبول کرنا ان کے لئے ناممکن ہو گیا، لہٰذا اب ان کو کیسی ہی دعوت دی جائے یہ کبھی بھی ہدایت کا راستہ اپنانے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔

علمی بات: جو شخص مشفقانہ نصیحتوں سے منہ پھیر لیتا ہے اور اپنے جرائم کا احساس بھی نہیں کرتا وہ مردہ ضمیر ہے۔ اس کا دل کسی بات کے سمجھنے کے قابل نہیں رہتا، نہ اس کا ضمیر کسی گناہ کا احساس کرتا ہے۔ ضمیر زندہ رکھنے کے لئے اللہ ﷻ کی نصیحتوں پر توجہ دینے اور اپنے گناہوں پر نادم رہنا چاہیئے۔

علمی بات: جب اللہ ﷻ کی طرف سے ہدایت کے اسباب فراہم کرنے کے بعد ایک شخص گمراہی پر قائم رہتا ہے تو اللہ ﷻ اس سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے اور اسے اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ ظاہر ہے اللہ ﷻ کے بعد کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے۔ نتیجتاً وہ گمراہی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر جاتا ہے۔

علمی و عملی بات: آپ ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ اگر آپ ان کو ایمان کی دعوت دیں گے تو وہ کسی صورت بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ اس وقت دو صورتیں سامنے آتی ہیں یا تو اُنہیں ایمان لانے پر مجبور کریں یا اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ ایمان لانے پر جبر کرنا صحیح نہیں ہے تو دوسری صورت باقی رہتی ہے کہ اُنہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ نصیحت مسترد کرنے اور گناہ کا احساس نہ کرنے سے انسان ناقابلِ ہدایت ہو جاتا ہے۔

عملی پہلو: آدمی کو سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت اس لئے دی گئی ہے کہ وہ حق اور ناحق میں تمیز کر سکے۔ مگر جب وہ اپنی سوجھ بوجھ کو غلط رخ پر استعمال کرتا ہے تو اس کا ذہن اسی غلط رخ پر چل پڑتا ہے جس رخ پر اس نے اس کو چلایا ہے۔ اس کے بعد اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ کسی بات کو اس کے صحیح رخ سے دیکھے اور اس کی واقعی اہمیت کو سمجھ سکے۔ وہ آنکھ رکھتے ہوئے بے آنکھ ہو جاتا ہے اور کان رکھتے ہوئے بے کان بن جاتا ہے۔

آیت نمبر ۵۸: منکرین کے بُرے اعمال ایسے ہیں کہ ان پر فوراً عذاب آجائے۔ لیکن اللہ ﷻ بہت بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔ لوگوں کو سنبھلنے کے لئے مہلت دی جاتی ہے تاکہ وہ توبہ کر کے اس کی رحمت کے مستحق بن جائیں۔ یہ مہلت ایک مقررہ وقت تک کے لئے ہے۔ عذاب آنے کی صورت میں اُنہیں کہیں پناہ نہیں مل سکے گی۔

علمی بات: اللہ ﷻ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ جس وقت کسی سے قصور سرزد ہو اسی وقت پکڑ کر اسے سزا دے ڈالے۔ یہ اس کی شانِ رحیمی ہے کہ مجرموں کو فوری نہیں پکڑتا اور مدتوں ان کو سنبھلنے کا موقع دیتا رہتا ہے۔ مگر سخت نادان ہیں وہ لوگ جو اس ڈھیل کو غلط معنیٰ میں لیتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ خواہ کچھ بھی کرتے رہیں، ان سے کبھی باز پرس ہوگی ہی نہیں۔

علمی بات: اللہ ﷻ کے عذاب کا قانون ایسا نہیں کہ ادھر کسی نے کوئی جرم کیا تو ادھر فوراً اسے سزا دے دی جائے بلکہ اس معاملہ میں اللہ ﷻ کا قانون ہے کہ وہ اسے مہلت دیتا ہے اگر اس دوران بھی مجرم اپنے جرم سے باز آجائے تو پھر سزا ٹل جاتی ہے کیونکہ اللہ ﷻ بخشنے والا بھی ہے اور مہربان بھی اور اگر باز نہ آئے تو عذاب اللہ ﷻ کے مقرر کردہ قانون کے مطابق اپنے مقررہ وقت پر آئے گا خواہ لوگ اس کے لئے جلدی مچائیں یا نہ مچائیں اور جب وہ وقت آجائے گا تو پھر نہ وہ مؤخر ہوگا اور نہ ہی مجرم اس سے کہیں بچ کے جاسکیں گے۔ علاوہ ازیں سب مجرموں پر عذاب نہیں آیا کرتا۔ صرف ان پر آتا ہے جو حد سے بڑھ جاتے ہیں سب پر اس لئے نہیں آتا کہ یہ دنیا دارالجزا نہیں ہے بلکہ دارالعمل ہے نیز اگر سب پر آتا تو دنیا کبھی آباد ہی نہ رہ سکتی۔

علمی بات: آیت کے اس حصّہ کی دو تفسیریں ممکن ہیں۔ پہلی تفسیر یہ ہے کہ اللہ ﷻ مومنوں کے لئے خوب بخشنے والا اور رحمت کا مالک ہے۔ یہ اس بنیاد پر ہے کہ اللہ ﷻ مشرکوں کو نہیں بخشے گا۔ جیسا کہ فرمایا: "بے شک اللہ اِس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اُس کے ساتھ شرک کیا جائے اور جو (گناہ) اِس کے علاوہ ہے جس کے لئے چاہے گا معاف فرمادے گا اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا تو یقیناً وہ دُور کی گمراہی میں جاپڑا۔" (سورۃ النساء ۴، آیت:۱۱۶) یا اس بنیاد پر ہے کہ کافروں کے لئے ڈھیل دینا رحمت نہیں ہے بلکہ یہ ڈھیل کافروں کے خلاف ہے۔ جیسا کہ فرمایا: "اور جنہوں نے کفر کیا وہ ہرگز نہ سمجھیں کہ ہم اُنہیں جو مہلت دے رہے ہیں وہ اُن کے حق میں خیر ہے بے شک ہم اُنہیں (صرف اِس لئے) مہلت دے رہے ہیں تا کہ وہ گناہوں میں اور بڑھ جائیں۔" (سورۂ آل عمران ۳، آیت:۱۷۸)

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اللہ ﷻ بخشنے والا اور رحمت کا مالک ہے بشرطیکہ یہ لوگ اللہ ﷻ کی رحمت اور مغفرت کے اہل بن جائیں اور شرک و کفر سے توبہ کریں۔ "اللہ صرف شرک سے درگزر نہیں کرتا۔" (سورۃ النساء ۴، آیت:۱۱۶)

حالت شرک میں مرنے والوں کے لئے ہے کہ ان کو مغفرت نہیں ملے گی لیکن اگر توبہ کرلے تو سابقہ شرک کا گناہ دھل جاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ کافروں کے لئے ڈھیل دینا ان کے حق میں نہیں ان کے خلاف ہے۔ یہ اس صورت میں درست ہے اگر وہ توبہ نہیں کرتے لیکن اگر کسی مرحلہ میں کافر اور مشرک نے توبہ کرلی تو یہ ڈھیل اس کے لئے رحمت و مغفرت کا سبب ہے۔ البتہ اگر وہ اپنے شرک و کفر پر قائم رہتا ہے تو یہ ڈھیل اسی کے خلاف ہے۔

یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیئے کہ اللہ ﷻ کی طرف سے ڈھیل مومن کے لئے رحمت اور کافر کے لئے عذاب کا موجب ہے۔ سزا کا مقررہ وقت آنے پر سزا نہیں ٹل سکتی۔

آیت نمبر ۵۹: تباہ شدہ بستیوں سے مراد سابقہ قوموں کی وہ بستیاں ہیں جن پر اہل مکہ کا گزر ہوتا اور وہ ان کی تباہی کے آثار خود دیکھ سکتے تھے۔ سابقہ قوموں کی نافرمانی پر اُنہیں فوراً ہلاک نہیں کیا گیا بلکہ ان کی ہلاکت کے لئے ایک معین وقت مقرر تھا۔ کفار مکہ کو تنبیہ کی گئی ہے کہ باز نہ آنے کی صورت میں ان کا حشر بھی اس سے مختلف نہیں ہوگا جو سابقہ نافرمان قوموں کا ہوا۔

علمی بات: بستیوں سے مراد قومِ عاد، قومِ ثمود اور حضرت شعیب علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی قوموں کی بستیاں ہیں۔ جو اہل حجاز کے قریب اور ان کے راستوں میں واقع تھیں۔ ان بستیوں کے رہنے والوں کو بھی ان کے ظلم کی وجہ سے ہی ہلاک کیا گیا تھا لیکن ان پر عذاب نازل کرنے سے پہلے ان کو انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت قبول کرنے کا پورا پورا موقع دیا گیا تھا اور ان پر حجت پوری کردی گئی تھی۔ جب یہ واضح ہوگیا کہ ان کا ظلم، ان کی ضد اور ان کی سرکشی اس حد پر پہنچ چکی ہے جہاں سے ہدایت کو قبول کرنے کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں اور ان سے کسی انصاف اور خیر کی توقع بالکل نہیں رہتی تو پھر ان کے ایمان لانے اور ہدایت کو قبول کرنے کی مہلت ختم کردی گئی اور ان کی تباہی کا وقت شروع ہوگیا۔ پھر اللہ ﷻ نے ان پر عذاب نازل فرمایا اور یہ قومیں صفحہ ہستی سے مٹادی گئیں۔

عملی پہلو: ان قوموں کی تباہی کا ذکر کرکے اہل مکہ اور دیگر نافرمان قوموں کو یہ باور کرایا جارہا ہے کہ تم نبی کریم ﷺ کی تکذیب کرکے یہ مت سمجھنا کہ تم پر جو ابھی تک عذاب نہیں آیا اور تم کو جو مسلسل مہلت دی جارہی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے بلکہ یہ تو اللہ ﷻ کا دستور ہے کہ جب تک اللہ ﷻ کسی قوم پر اپنی حجت پوری نہیں کرلیتا اس وقت تک وہ اس قوم پر عذاب نہیں بھیجتا۔ پس اسی طرح جب تمہیں دی ہوئی ایمان لانے کی مہلت ختم ہوجائے گی تو تمہارا انجام بھی پچھلی قوموں سے مختلف نہیں ہوگا۔

آیت نمبر ۶۰: مادہ پرستی کے رد کے حوالہ سے تیسرا اور ایک اہم واقعہ بیان کیا جارہا ہے۔ اللہ ﷻ اپنی اس کائنات کو اپنی مرضی سے چلا رہا ہے۔ ہر کام کی مصلحت کیا ہے؟ ضروری نہیں کہ ہر شخص اس کو سمجھ سکے۔ اسی لئے اللہ ﷻ کے حکم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا گیا ہے تاکہ ہر شخص کو یقین ہو جائے کہ یہاں ہر بات کے پیچھے ایک مصلحت کام کر رہی ہے۔

علمی بات: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اللہ ﷻ کے ایک خاص بندہ حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کے لئے سفر میں روانہ ہونے کا بیان ہے۔ بعض علماء کرام کی یہ رائے ہے کہ وہ ولی تھے۔ لیکن علماء محققین کی رائے یہ ہے کہ وہ نبی تھے۔ کیونکہ ولی کے الہام سے علم ظنی حاصل ہوتا ہے اور اس میں خطا کا احتمال ہوتا ہے۔ الہام کی وجہ سے قتل جیسے سنگین فعل کا ارتکاب جائز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے آپ علیہ السلام کو نبی ماننا پڑے گا اور نبی علیہ السلام کا علم یقینی ہوتا ہے۔ اس خاص بندہ یعنی حضرت خضر علیہ السلام کو اللہ ﷻ نے اشیاء کی حقیقت کا علم عطا فرمایا تھا جس کا کچھ حصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سکھلانا مقصود تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھ ایک نوجوان شاگرد یوشع بن نون کو لیا اور سفر کے لئے روانہ ہو گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس عزم کا اظہار کیا کہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے وہ اپنا سفر جاری رکھیں گے چاہے کئی سال گزر جائیں۔

علمی بات: یہ قصہ سنانے سے مقصود کفار اور مومنین دونوں کو ایک اہم حقیقت سے آگاہ کرنا ہے۔ وہ یہ ہے کہ نگاہ دنیا میں بظاہر جو کچھ دیکھتی ہے، اس سے غلط نتائج اخذ کر لیتی ہے کیونکہ اس کے سامنے اللہ ﷻ کی وہ مصلحتیں نہیں ہوتیں جو معاملات دنیا میں کارفرما ہیں۔ ظالموں کا پھلنا پھولنا اور بے گناہوں کا تکلیف میں مبتلا ہونا وغیرہ وہ مناظر ہیں جن سے عام طور پر ذہنوں میں الجھنیں اور غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کافر ان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہاں جس کا جو جی چاہے کرتا رہے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ کبھی کچھ مومن اس طرح کے واقعات کو دیکھ کر دل شکستہ ہوتے ہیں اور بسا اوقات ایمان تک متزلزل ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی حالات میں اللہ ﷻ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے کارخانۂ مشیت کا پردہ اٹھا کر اس کی ایک جھلک دکھائی تھی تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے کیسے کن مصلحتوں سے ہو رہا ہے اور کس طرح واقعات کا ظاہر ان کے باطن سے مختلف ہوتا ہے۔

علمی بات: بخاری شریف کی صحیح روایت میں اس واقعہ کی تفصیل یوں نقل کی گئی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک دفعہ کھڑے وعظ فرما رہے تھے تو کسی شخص نے یہ پوچھ لیا کہ اے موسیٰ! اس وقت سب سے بڑا عالم کون ہے۔۔۔؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ "میں" اس لحاظ سے یہ جواب صحیح تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام صاحب شریعت اور صاحب کتاب نبی ہیں اور جتنے بنی آدم اس وقت موجود تھے سب سے زیادہ علم ان ہی کو ہی تھا لیکن سرور کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ ﷻ کو یہ جواب پسند نہیں آیا۔ کیوں کہ ادب کا تقاضا یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یوں کہتے کہ اللہ ﷻ بہتر جانتا ہے، اللہ ﷻ کی طرف اس کی نسبت کرتے، اپنی طرف جو نسبت کر لی کہ میں بڑا عالم ہوں، اس پر اللہ ﷻ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس وحی بھیجی کہ ہاں ہمارا ایک بندہ ہے جس کا علم تم سے زیادہ ہے۔ وہ حضرت خضر (علیہ السلام) ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ ﷻ سے دریافت کیا کہ حضرت خضر (علیہ السلام) سے ملنے کی کیا صورت ہے؟ اللہ ﷻ نے ایک مچھلی کو ان سے ملاقات کی علامت قرار دیا اور ان سے فرمایا کہ جب تم اس مچھلی کو گم کر دو تو واپس لوٹ جانا، تب حضرت خضر (علیہ السلام) سے تمہاری ملاقات ہوگی۔ تب حضرت موسیٰ علیہ السلام چلے اور دریا میں مچھلی کی علامت تلاش کرتے رہے۔ اس وقت ان کے ساتھی نے کہا جب ہم پتھر کے پاس تھے کیا آپ علیہ السلام نے دیکھا تھا؟ میں اس وقت مچھلی کا کہنا بھول گیا اور شیطان ہی نے مجھے اس کا ذکر بھلا دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اسی مقام کی ہمیں تلاش تھی۔ تب وہ اپنے نشانات قدم پر باتیں کرتے ہوئے لوٹے تو وہاں انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو پایا۔ پھر ان کا وہی قصہ ہے جو اللہ ﷻ نے اپنی کتاب قرآن حکیم میں بیان فرمایا ہے۔

علمی بات: مجمع البحرین کا معنیٰ "دو سمندروں کے اکٹھے ہونے کی جگہ" یا دو دریاؤں کے اکٹھے ہونے کی جگہ، قطعی طور پر قرآنِ کریم میں تعین نہیں کیا گیا، کیونکہ ایسے مواقع تو بہت آتے ہیں جہاں دو دریا اکٹھے ہوتے ہیں اور جس علاقہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام رہتے تھے وہاں بھی دو سمندر آپس میں ملتے ہیں، بحر فارس اور بحر روم اور اسی طرح جہاں جا کر دجلہ سمندر میں گرتا ہے وہ بھی مجمع البحرین ہے، فرات جہاں جا کر سمندر میں گرتا ہے وہ بھی مجمع البحرین ہے۔ دو سمندروں کا سنگم کے متعلق علماء کرام کے مختلف آراء ہیں۔ اکثر مفسرین کرام کے نزدیک وہ جگہ ہے جہاں خلیج عقبہ (Gulf of Aqaba or Litat) اور خلیج سوئز Gulf of (Suez) دونوں آکر ملتے ہیں اور بحر احمر میں ضم ہو جاتے ہیں۔ جن کے مابین صحرائے سینا ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غرقابی فرعون کے بعد زندگی کا

اکثر حصّہ اسی علاقہ میں گزارا تھا۔ اسی صحرا میں کوہ طور ہے جہاں آپ علیہ السلام کو تورات عطا فرمائی گئی۔ یہ مختلف جگہیں ہو سکتی ہیں ہو سکتا ہے کہ جہت متعین کر دی گئی ہو کہ مشرق کی طرف، مغرب کی طرف، شمال، جنوب جو بھی ہے اور ایک علامت متعین کر دی گئی کہ اپنے ساتھ ایک مچھلی رکھ لیجئے، جہاں وہ مچھلی زندہ ہو کر کے گم ہو جائے سمجھ لینا کہ اسی علاقہ میں میرا مقصود ہے۔ بہر حال اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تھی۔

علمی و عملی بات: اس کائنات میں بہت سے ایسے واقعات روز مرہ انسان کے سامنے آتے رہتے ہیں جن کا مقصد اس کی سمجھ میں نہیں آتا، حالانکہ کوئی واقعہ تو اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی حکمت کے بغیر نہیں ہوتا۔ انسان کی نظر چونکہ محدود ہے، اس لئے وہ اس حکمت کو بسا اوقات نہیں سمجھتا، لیکن جس قادرِ مطلق کے دستِ قدرت میں پوری کائنات کی باگ ڈور ہے، وہی جانتا ہے کہ کس وقت کیا واقعہ پیش آنا چاہیئے۔

علمی بات: ان واقعات سے یہ بتانا مقصود ہے کہ لوگ ظاہر بین نگاہ سے جو کچھ دیکھ رہے ہوں وہ دراصل حقیقت نہیں اور جو حقیقت ہے وہ ان کی نگاہوں سے مخفی ہے۔ اس قصّہ میں پروردگار نے اپنی مشیت کے گوشے سے پردہ اٹھا کر یہ دکھایا ہے کہ لوگ جو کچھ ظاہر میں دیکھتے ہیں ضروری نہیں کہ حقیقت بھی وہی ہو، ان واقعات کے آئینہ میں دیکھیں کہ بظاہر واقعہ کیا پیش آیا ہے اور بعد میں اس کی تعبیر کیسی سامنے آئی ہے۔ اس سے یہ حقیقت سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ انسان جو کچھ بظاہر دیکھتا ہے ضروری نہیں کہ انجام کے اعتبار سے بھی وہی ہو۔

آیت نمبر ۶۱: دوران سفر دونوں اس مقام تک پہنچے جہاں دو دریا آپس میں مل رہے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے ساتھ ایک مچھلی رکھ لی تھی۔ مچھلی اس مقام پر زندہ ہو کر دریا میں چلی گئی اور سُرنگ کی طرح راستہ چھوڑ گئی۔ شاگرد نے اس منظر کو دیکھ لیا مگر وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس واقعہ کی اطلاع دینا بھول گئے اور دونوں اس جگہ سے آگے روانہ ہو گئے۔

علمی بات: چلتے چلتے حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک جگہ پر پہنچے، وہاں چٹان تھی اور وہ اس کے سائے میں کچھ دیر آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے اور ان کے شاگرد یوشع بن نون جاگ رہے تھے اور ان کے سامنے وہ مچھلی توشہ دان میں سے زندہ ہو کے پھڑکی اور نکل کے دریا میں داخل ہو گئی اور جہاں سے وہ داخل ہوئی، وہاں راستہ اسی طرح بنا رہ گیا۔ یوشع بن نون تو چونکہ آئے دن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھتے تھے، ان کو یہ دیکھ کے حیرانی تو ہوئی کہ مچھلی زندہ ہو کے کیسے دریا میں داخل ہو گئی لیکن خیالات میں کچھ ایسے کھوئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بیدار ہوئے تو ان کو یہ ذکر کرنا یاد نہ رہا کہ مچھلی گم ہو گئی ہے۔

علمی بات: خادم کو ادب و احترام کے لئے خادم کے بجائے فَتٰی (نوجوان لڑکے) کے لفظ سے یاد فرمایا گیا۔ اس سے ہمیں یہ سکھایا گیا کہ فرق مراتب کے باوجود ہمیں کوئی ایسا لفظ استعمال نہ کرنا چاہیئے جس سے کسی اپنے سے کم درجہ کی تذلیل اور دل آزاری کا پہلو نکلتا ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس انداز سے شاگرد کے ساتھ گفتگو کی ہے اس سے واضح ہے کہ اس کی حیثیت محض ایک خادم کی نہیں، بلکہ ایک نوجوان ساتھی اور شاگرد کی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو اِس کا ترجمہ لفظ "شاگرد" سے نہایت موزوں ہوگا۔

آیت نمبر ۶۲: سفر میں تھکاوٹ اور بھوک محسوس ہونے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم سے کھانا طلب کیا۔

علمی بات: یعنی جب دور نکل گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھوک معلوم ہوئی اور مشقت و تھکن بھی زیادہ محسوس ہوئی تب خادم سے ناشتہ طلب کیا۔ خلاصہ یہ کہ مجمع البحرین (دو دریاؤں کے میلاپ اور اکٹھا ہونے کی جگہ) پر سونے کے بعد اٹھے تو بھوک نہ تھی جو کھانا مانگتے مچھلی کا کوئی ذکر نہیں آیا خادم کو بھی مچھلی کا واقعہ یاد نہیں آیا۔ شاید اس تھکاوٹ کی وجہ اس نعمت کا احساس دلانا ہو کہ صحیح راستہ پر طلب علم کے لئے جاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی خاص مدد شامل ہوتی ہے، جس سے تھکن نہیں ہوتی اور جب اس کی مدد نہ ہو تو انسان تھک کر رہ جاتا ہے۔ نیز مقام مطلوب تک پہنچنے میں کوئی مشقت محسوس نہ ہوئی، مگر جب اس سے آگے چلے گئے تو پھر تھکاوٹ محسوس ہوئی۔ اس کی ایک حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ بھوک محسوس ہونے پر مچھلی یاد آجائے اور اپنے مقصد اور مقام مطلوب کی طرف لوٹ آئیں۔

علمی بات: قرآن و سنت کی تصریحات سے واضح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو انبیاء کرام علیہم السلام کی جماعت میں بھی ایک خاص امتیاز حاصل ہے اللہ تعالیٰ کی ہم کلامی کا خاص

شرف ان کی مخصوص فضیلت ہے اور حضرت خضر علیہ السلام کی تو نبوت میں بھی اختلاف ہے اور نبوت کو تسلیم بھی کیا جائے تو مقام رسالت حاصل نہیں نہ ان کی کوئی کتاب ہے نہ کوئی خاص اُمّت اس لئے بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام سے بدرجہ افضل ہیں لیکن حق تعالیٰ اپنے مقربین کی خاص انداز سے تربیت کا اہتمام فرماتا ہے جس کا مظہر یہ ہے کہ ان کی زبان سے یہ کلمہ نکل گیا تھا کہ میں سب سے زیادہ علم والا ہوں تو حق تعالیٰ نے اس حوالہ سے اپنے ایک ایسے بندہ کا ان کو ذکر فرمایا جن کے پاس اللہ ﷻ کا دیا ہوا ایک خاص علم تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس نہیں تھا۔ اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علم ان کے علم سے درجہ میں بہت بڑھا ہوا تھا مگر بہر حال وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حاصل نہ تھا۔ ادھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے طلب علم کا ایسا جذبہ عطا فرمایا تھا کہ جب یہ معلوم ہوا کہ کہیں اور بھی علم ہے جو مجھے حاصل نہیں تو اس کے حصول کے لئے سفر پر جانے کو تیار ہو گئے اور حق تعالیٰ ہی سے اس بندہ (حضرت خضر علیہ السلام) کا پتہ پوچھا۔

علمی بات: معلوم ہوا سفر کے لئے کھانا ساتھ لے جانا انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت ہے اور توکل کے منافی نہیں۔ نیز بھوک، پیاس، تھکاوٹ، بھول، غرض انسان کو پیش آنے والی چیزیں بتقاضائے بشر انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی پیش آتی ہیں کیونکہ وہ بھی بشر ہیں۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ آدمی کو جو عارضہ پیش آئے، اس کا ذکر کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس کا ارادہ اللہ ﷻ سے شکوہ کا نہ ہو۔ یعنی انسان کو جو تکلیف اور مرض ہو تو اس کو بتانا جائز ہے، یہ مقام رضا کے منافی نہیں ہے اور نہ اللہ ﷻ کی قضا کو تسلیم کرنے کے منافی ہے، لیکن یہ اس صورت میں جائز ہے جب اکتاہٹ اور ناراضگی کی بنا پر نہ ہو۔

آیت نمبر ۶۳: شاگرد نے مچھلی کے بھول جانے پر معذرت پیش کی۔ انہوں نے بھول جانے کی نسبت شیطان کی طرف کی۔ ہر بُری بات کی نسبت شیطان کی طرف کی جاتی ہے کیوں کہ اس کی ذات بُرائیوں کا مرکز ہے۔

علمی بات: آیت میں دلالت ہے اس امر پر کہ شیطان کے اثر سے وسوسہ و نسیان کا پیش آجانا ولایت بلکہ نبوت کے بھی منافی نہیں۔ بھول جانے کو شیطان کی طرف منسوب فرمایا ہے اس لئے کہ کسی نیکی کے کام سے غافل کرنا شیطان ہی کا کام ہے۔ انسان کو نیکی کے کاموں سے شیطان ہی غافل کرتا ہے، مگر اس کی مہلت اسے اللہ ﷻ کے اذن سے ملتی ہے۔ نسیان کی نسبت شیطان کی طرف اس لئے کہ گئی ہے کہ شیطان کسی بھی اچھے کام میں مُمِد و معاون نہیں ہوا کرتا۔ اس کے وساوس ایسے ہی ہوتے ہیں کہ یا تو کوئی کارِ خیر سر انجام ہی نہ پائے یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر جتنی بھی اس کارِ خیر میں زیادہ سے زیادہ تاخیر ہو وہی اس کا مقصود ہوتا ہے جیسے اللہ ﷻ کے ذکر سے غفلت کی نسبت قرآنِ کریم نے عموماً شیطان ہی کی طرف ہے۔

علمی بات: خادم نے عرض کیا آپ علیہ السلام نے ملاحظہ بھی فرمایا کہ جب ہم اس پتھر کے پاس ٹھہرے تھے تو میں وہاں مچھلی رکھ کر بھول گیا اور مجھ کو یہ بات کہ میں آپ علیہ السلام سے اس کا ذکر کرتا اور اس کے واقعہ کو بیان کرتا سوائے شیطان کے اور کسی نے نہیں بھلایا اور اس مچھلی نے زندہ ہو کر عجیب طریقہ سے اپنا راستہ دریا میں کر لیا اور دریا میں داخل ہو گئی۔ خادم کے تعجب کی وجہ یہ ہوئی کہ اوّل تو مچھلی کا زندہ ہو جانا پھر تھیلے میں سے نکل کر دریا میں گھس جانا پھر دریا میں گھسنا بھی اس انداز سے کہ سرنگ سی بناتے ہوئے دریا میں چلا جانا اور بطورِ خرقِ عادت دریا میں نشان کا بن جانا۔

علمی بات: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تعلق انسانوں کی اصلاح اور تشریعی معاملات سے ہے۔ آپ علیہ السلام اللہ ﷻ کے نبی اور رسول ہیں، آپ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے، اللہ ﷻ نے آپ علیہ السلام کو بہت سی خصوصیات سے نوازا۔ آپ علیہ السلام رسول ہونے کی حیثیت سے حضرت خضر علیہ السلام سے افضل ہیں کیونکہ علم تشریع کو علم تکوین پر فضیلت حاصل ہے۔ البتہ آپ علیہ السلام کو حضرت خضر علیہ السلام کے پاس بھیجنا اس مقصد کے لئے تھا کہ علم کی کئی شاخیں ہیں۔ ایک انسانی اصلاح اور بھلائی کا علم ہے جسے علم شریعت کہتے ہیں۔ اور ایک علم تکوین ہے جس کے مطابق دنیا کا نظام چلتا ہے۔ آپ علیہ السلام کو اللہ ﷻ نے علم شریعت تو دیا ہے اور یہ سب سے افضل ہے لیکن آپ علیہ السلام کو تکوینی معاملات کا علم نہیں بخشا، کیونکہ آپ علیہ السلام کو اس کی ضرورت نہیں۔ اس کی ایک جھلک آپ علیہ السلام کو اس لئے دکھائی گئی تاکہ آپ علیہ السلام کو علم کی وسعت کا اندازہ ہو اور یہ بھی معلوم ہو کہ بعض دفعہ ظاہری حالات سے نتائج کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے ہر طرح کے حالات میں صبر کا دامن تھامے رکھنا اور اللہ ﷻ سے مدد طلب کرتے رہنا اور ہر حال میں اسی کی رضا کا حصول ایک مومن کے ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۶۴: جس مقام پر مچھلی زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی تھی وہی مطلوبہ مقام تھا جہاں ان کی اللہ ﷻ کے خاص بندہ سے ملاقات ہونی تھی۔ لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے ساتھی کے ہمراہ قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے واپس اس جگہ روانہ ہوئے۔

علمی بات: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اللہ ﷻ کے بندے! جہاں مچھلی زندہ ہو کر غائب ہوئی تھی، وہی تو ہمارا مطلوبہ مقام تھا، جس کی تلاش میں ہم سفر کر رہے ہیں ہمیں تو اُسی جگہ جانا مقصود تھا۔ چونکہ ایسے ویران بیابان میں سفر کر رہے تھے جس میں نہ کوئی راستہ تھا اور نہ کوئی علامت و نشان اس لئے جس طرف سے آئے تھے اپنے پاؤں کے نشان دیکھتے ہوئے اسی طرف کو پیچھے لوٹے اور اسی مجمع البحرین پر واپس آ گئے۔ قَصَصًا کے معنیٰ ہیں پیچھے لگنا، پیچھے پیچھے چلنا۔ یعنی نشانات قدم کو دیکھتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔

علمی بات: شاگرد نے تو بات ڈرتے ڈرتے بتائی کہ یہ سن کر معلوم نہیں کیا عتاب نازل ہو لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ مژدہ سن کر خوشی سے جھوم گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ منزل مقصود کا یہی نشان تو ہم کو بتایا گیا تھا۔ اس سے خود بخود یہ اشارہ نکلتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ سفر اللہ ﷻ کے حکم سے تھا اور ان کو منزل مقصود کی علامت یہی بتائی گئی تھی کہ جہاں ان کے ناشتہ کی مچھلی غائب ہو جائے وہی مقام اس بندہ کی ملاقات کا ہے جس سے ملنے کے لئے وہ بھیجے گئے تھے۔

آیت نمبر ۶۵: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات اللہ ﷻ کے ایک خاص بندہ حضرت خضر علیہ السلام سے ہوئی۔ حضرت خضر علیہ السلام اللہ ﷻ کے ایک نہایت برگزیدہ اور مقبول بندے اور خاص نیک بندوں میں سے ہیں۔ رحمت سے مراد وہ خصوصی انعامات ہیں جو اللہ ﷻ نے اُنہیں عطا فرمائے تھے۔ اُنہیں اشیاء کی حقیقت کے علم سے بھی نوازا نیز اُنہیں تکوینی امور کے علم میں سے عطا کیا گیا۔

علمی بات: صحیح بخاری کی حدیث کے مطابق یہ حضرت خضر علیہ السلام تھے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اس چٹان کے پاس واپس پہنچے تو وہاں وہ چادر اوڑھے ہوئے لیٹے نظر آئے۔ صحیح بخاری کی حدیث کا مفہوم ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ بھی کہا تھا کہ اللہ ﷻ نے مجھے ایک ایسا علم دیا ہے جو آپ (علیہ السلام) کے پاس نہیں (یعنی تکوینیات کا علم) اور آپ (علیہ السلام) کو ایسا علم دیا ہے جو میرے پاس نہیں (یعنی شریعت کا علم)۔

نوٹ: تکوینی علم کی تفصیلی وضاحت اس واقعہ کے آخر میں آیت نمبر: ۸۲ میں ذیل میں دی گئی ہے۔

علمی بات: اس جگہ اللہ ﷻ نے اس خاص بندہ (جن سے مراد حضرت خضر علیہ السلام ہیں) کے دو وصف بیان کیئے ہیں اول "اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا"۔ "ہم نے ان کو اپنی خاص رحمت اور خاص عنایت سے سرفراز کیا تھا،" دوسرا وصف فرمایا "وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا"۔ "اور ہم نے ان کو اپنے پاس سے ایک خاص علم عطا کیا تھا" یعنی ہم نے ان کو پاس سے ایک باطنی علم سکھایا تھا، وہ علم ہمارے ساتھ خاص ہے جو ہمارے بغیر سکھائے اور بتائے کوئی اس علم کو نہیں جان سکتا، اللہ ﷻ نے حضرت خضر علیہ السلام کو اسرارِ غیبی اور باطنی حکمتوں اور مصلحتوں کا علم عطا فرمایا تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احکام شریعت و ہدایت کا علم عطا فرمایا تھا۔

علمی بات: اگرچہ حضرت خضر علیہ السلام کا نبی ہونے میں علماء کرام کی رائے مختلف ہے۔ تاہم جمہور علماء کے نزدیک ان کا نبی ہونا خود قرآنِ کریم میں ذکر کیئے ہوئے واقعات سے ثابت ہے کیونکہ حضرت خضر علیہ السلام سے اس سفر میں جتنے واقعات ثابت ہیں ان میں بعض تو قطعی طور پر خلاف شرع ہیں اور حکم شریعت سے استثنیٰ (یعنی اس حکم کے مطابق عمل نہ کرنا) صرف وحی الٰہی کے ہی ہو سکتا ہے جو نبی اور پیغمبر علیہ السلام ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ کسی ولی کو بھی کشف یا الہام سے کچھ چیزیں معلوم ہو سکتی ہیں مگر وہ کوئی حجت نہیں ہوتی ان کی بنا پر ظاہر شریعت کے کسی حکم کو بدلا نہیں جا سکتا۔ اس لئے یہ متعین ہو جاتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام اللہ ﷻ کے نبی اور پیغمبر علیہ السلام تھے ان کو بذریعہ وحی الٰہی بعض خاص احکام وہ دیئے گئے تھے جو ظاہر شریعت کے خلاف تھے انہوں نے جو کچھ کیا اس استثنائی حکم کے ماتحت کیا خود ان کی طرف سے اس کا اظہار بھی قرآنِ حکیم کے اس جملہ میں ہو گیا "وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ" "اور میں نے اپنی رائے سے کوئی کام نہیں کیا" یعنی میں نے جو کچھ کیا اپنی طرف سے نہیں کیا بلکہ امرِ الٰہی سے کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جمہور اُمت کے نزدیک حضرت خضر علیہ السلام بھی نبی ہیں مگر ان کے کچھ تکوینی خدمتیں من جانب اللہ سپرد کی گئی تھیں ان ہی کا علم دیا گیا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کی اطلاع نہ تھی اسی لئے اس پر اعتراض کیا۔

آیت نمبر ۶۶: اپنی آمد کا مقصد بتاتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام کو اپنے ساتھ رکھنے اور اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم میں سے سکھانے کی درخواست کی۔

علمی و عملی بات: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے باوجود اولوالعزم پیغمبر علیہ السلام ہونے کے حضرت خضر علیہ السلام سے تعظیم و تکریم کے ساتھ درخواست کی کہ میں آپ علیہ السلام سے آپ علیہ السلام کا علم سیکھنے کے لئے ساتھ چلنا چاہتا ہوں اس سے معلوم ہوا کہ تحصیل علم کا ادب یہی ہے کہ شاگرد اپنے استاذ کی تعظیم و تکریم اور اتباع کرے اگرچہ شاگرد اپنے استاذ سے کسی اعتبار سے افضل واعلیٰ بھی ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اندازِ تخاطب سے ادب واحترام کے چند نکات: ۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انتہائی لطیف پیرائے میں فرمایا: آیا میں آپ علیہ السلام کی پیروی کروں؟ اس طریقہ سے سوال کرنے میں انتہائی تواضع اور ادب واحترام ہے اور مخاطب کو اپنے سے بہت بلند مقام پر فائز کرنا ہے۔

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر علیہ السلام نے ابتداءً پہچان لیا تھا کیونکہ انہوں نے کہا آپ (علیہ السلام) بنی اسرائیل کے موسیٰ ہیں! گویا انہوں نے جان لیا تھا یہ وہی نبی علیہ السلام ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بلاواسطہ شرف کلام سے نوازا ہے اور ان کو کثیر معجزات عطا فرمائے۔ اس کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اتنی زیادہ تواضع کی اس سے معلوم ہوا کہ جس کا رتبہ جتنا زیادہ ہوتا ہے وہ اہل علم کے سامنے اتنی زیادہ تواضع کرتا ہے اور ان کا اتنا زیادہ ادب اور احترام کرتا ہے۔

۳۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: آیا میں آپ علیہ السلام کی اتباع کروں کہ آپ علیہ السلام مجھے تعلیم دیں۔ پہلے انہوں نے اپنی اتباع پیش کی اس کے بعد انہوں نے ان سے حصول تعلیم کی درخواست کی۔ گویا ادب کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے اساتذہ کی تعظیم و تکریم کرے اگرچہ شاگرد اپنے استاذ سے افضل واعلیٰ بھی ہو۔ پھر ان سے علم طلب کریں۔ اس لئے ہر طالب کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس اُسوۂ سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور اس پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ جب تک عزت واحترام کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا افادہ (فائدہ پہنچانے) اور استفادہ (فائدہ حاصل کرنے) کا سلسلہ بند رہتا ہے۔

آیت نمبر ۶۷: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر حضرت خضر علیہ السلام نے جواب دیا کہ وہ جو غیر معمولی کام انجام دیں گے ان کے ظاہری پہلو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام صبر نہیں کر سکیں گے۔

علمی بات: حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو تکوینی امور اور حکمتوں کا وہ علم عطا کیا ہے جو آپ علیہ السلام کو نہیں دیا گیا اور اس نے آپ علیہ السلام کو تشریعی علوم کا جو علم عطا فرمایا ہے وہ مجھ کو عطا نہیں ہوا۔ حضرت خضر علیہ السلام چونکہ اپنے علم و کمال کی وجہ سے یہ جانتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام کا کام شریعت خداوندی کی پابندی کرانا اور ظاہر شریعت اور احکام خداوندی کے خلاف کرنے والوں کو روکنا ہے۔ اگر کوئی ذرا سی بات ظاہری احکام شریعت کے خلاف دیکھیں گے تو برداشت نہ کر سکیں گے اور حقیقت حال معلوم ہونے سے پہلے رنجیدہ اور غمگین ہوں گے۔ اس لئے پہلے ہی اشارۃً آگاہ کر دیا کہ بعض امور فطرت اور مزاج کے خلاف پیش آئیں گے اور فرمایا کہ ساتھ رہنے اور علم حاصل کرنے میں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن آپ میرے ان افعال کو دیکھ کر جو مخفی حکمتوں پر مبنی ہوں گے اپنے قواعد اور احکام ظاہری کے خلاف سمجھ کر بتقاضائے شانِ نبوت صبر نہ کر سکیں گے۔

علمی بات: حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: کہ آپ علیہ السلام میرے بعض افعال کو ظاہر شریعت کے خلاف پا کر ان پر روک ٹوک ضرور کریں گے۔ حضرت خضر علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے پیغمبر جلیل القدر کے جوش ایمانی کا پورا اندازہ رکھتے تھے اور خوب جانتے تھے کہ آپ علیہ السلام احکام شریعت کی خلاف ورزی پر خواہ وہ محض ظاہری ہی ہوں، ہرگز تحمل نہ کر سکیں گے۔

آیت نمبر ۶۸: حضرت خضر علیہ السلام نے یہ بھی ذکر کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس بات کی حقیقت کا علم ہی نہیں اس پر وہ بے صبری کا اظہار کریں گے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے یہ بات اس لئے کہی کہ وہ کام بظاہر شرعی امور کے خلاف ہوں گے جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام شرعی امور پر مامور ہیں۔

حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ علیہ السلام کو جب ان بظاہر خلاف شرعی امور کے صحیح منشا کی اطلاع نہیں تو آپ علیہ السلام ان منکرات پر بغیر روک ٹوک کیئے کیسے رہ سکتے ہیں؟ اس طرح حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے عذر خواہی بھی خود ہی کر دی۔

علمی بات: حضرت خضر علیہ السلام کو معلوم تھا کہ ان اعمال پر حضرت موسیٰ علیہ السلام صبر نہیں کریں گے جن پر اُن کا علم محیط نہیں ۔ اس لئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام صاحب شریعت ہیں اور احکام شرعیہ اعمال ظاہری پر وارد ہوتے ہیں۔ اس لئے تکوینی علوم کے جو راز اُن پر منکشف کیئے گئے ہیں ایک صاحب شریعت رسول اس پر سکوت اختیار نہیں کر سکتا۔ اس لئے پہلے ہی اس امر کی طرف اشارہ کر دیا کہ ایسے امور واقع ہوں گے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ضرور اعتراض کریں گے اور جہاں اعتراض کی نوبت آجائے وہاں افادہ اور استفادہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

آیت نمبر ۶۹: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام کو یہ جواب دیا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو وہ صبر کا دامن نہیں چھوڑیں گے اور حضرت خضر علیہ السلام کی نافرمانی نہیں کریں گے۔

علمی بات: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: کہ چونکہ آپ علیہ السلام سے علم حاصل کرنا مقصود ہے اور امر خداوندی یہی ہے اس لئے میں ایسے امور پر صبر کروں گا، حضرت خضر علیہ السلام نے جواب دیا کہ جن باتوں کا علم آپ علیہ السلام کو عطا نہیں کیا گیا اور ان کی حقیقت آپ علیہ السلام پر منکشف نہیں کی گئی آپ علیہ السلام ان پر صبر نہ کر پائیں گے۔ چونکہ انبیاء کرام علیہم السلام تمام امور میں ارادہ وتقدیر خداوندی کے دخل کو پوری طرح سمجھتے ہیں اور اپنے اختیار اور رادہ کو بہت ہی ہیچ اور بے اعتبار جانتے ہیں اس لئے اپنے اوپر کوئی اعتماد و بھروسہ نہ کر کے ہر ایک کام کو اسی مالک الملک کے حوالہ کرتے ہیں۔ اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: کہ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو میں ضرور صبر کروں گا اور آپ علیہ السلام کی رائے کے خلاف کوئی کام نہ کروں گا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے جب سمجھ لیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کسی طور پر رکنے والے نہیں اور ضرور ہی ساتھ رہنا چاہتے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وعدہ بھی کر لیا کہ ہر کام میں آپ علیہ السلام کی اطاعت کریں گے تب فرمایا کہ اچھا آپ علیہ السلام میرے ساتھ چلیں۔

علمی بات: یہ وعدہ کرتے وقت غالباً حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کا تصور بھی نہ ہو سکتا تھا کہ ایسے مقرب و مقبول بندہ سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جائے جو علانیہ ان کی شریعت بلکہ عام شرائع و اخلاق کے بھی خلاف ہو۔ اسی لئے انہوں نے مطیع رہنے کی حامی بھر لی گویا دراصل ان کا وعدہ یہ تھا کہ امور جائز میں آپ علیہ السلام کا ساتھ دیتا رہوں گا اس پر بھی اتنی احتیاط رکھی کہ لفظ ان شاء اللہ کہہ لیا جس سے اقرار عہد وپیمان پیدا نہیں ہونے پایا۔ ورنہ ایک قطعی وعدہ کی خلاف ورزی کرنا اولوالعزم پیغمبر کی شان کے لائق نہ ہوتا۔

علمی بات: اس آیت سے معلوم ہوا کہ طالب علم کے لئے پہلی چیز یہ ہے کہ استاد کے احکام کی اطاعت کرے، اس پر اعتراض و مخالفت سے بچے اور اپنی طرف سے انتہائی فروتنی اور عاجزی اختیار کرے۔

آیت نمبر ۷۰: یقین دہانی کے بعد حضرت خضر علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ساتھ رکھنے اور اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم میں سے سکھانے پر آمادہ ہو گئے۔ ساتھ ہی یہ شرط پیش کی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کسی چیز کے متعلق سوال نہ کریں جب تک وہ خود اس کام کی حقیقت سے آگاہ نہ کر دیں۔

علمی بات: حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ اس سفر میں میرے بعض قول و فعل اگر آپ علیہ السلام کو ناگوار اور عجیب معلوم ہوں اور ان کی حقیقت آپ علیہ السلام نہ سمجھ سکیں تو آپ علیہ السلام اس کے متعلق کچھ دریافت نہ کریں اور نہ کوئی اعتراض کریں جب تک کہ میں خود ہی اس کی تشریح نہ کر دوں اور سبب و حکمت نہ بتلا دوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چونکہ وہ خاص پوشیدہ علوم حاصل کرنے کا نہایت ہی شوق تھا جو اُنہیں معلوم نہ تھے اور ان کی تحصیل کو اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ حضرت خضر علیہ السلام کا بحیثیت اُستاد بھی ان کا ادب فرماتے تھے۔

علمی بات: یعنی اگر میں کوئی ایسا کام کروں جو آپ علیہ السلام کو ناپسند ہو تو جب تک میں خود ہی ابتداً اپنی طرف سے اس کا ذکر آپ علیہ السلام سے نہ کروں آپ علیہ السلام مجھ سے کوئی سوال نہ کریں کیونکہ سوال کرنے سے اعتراض کرنے کا گمان ہوتا ہے اور اعتراض کرنے سے استفادہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آداب میں سے یہ بھی ہے کہ شاگرد استاد کے افعال پر زبان اعتراض نہ کھولے اور منتظر رہے کہ وہ خود ہی معاملات کی اس کی حکمت ظاہر فرما دے۔

COPYRIGHTS © RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION FOR THIS BOOK. NOT FOR SALE OR USE THAT ENTAILS COMMERCIAL ACTIVITY

آیت نمبر ۷۱: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم سیکھنے کی درخواست پر حضرت خضر علیہ السلام کی اپنے ساتھ لے جانے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ دونوں ایک کشتی میں سوار ہوئے اور حضرت خضر علیہ السلام نے اس کشتی میں سوراخ کر دیا۔ اس منظر کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام صبر نہ کر سکے اور اس فعل کو نہایت ہولناک قرار دیا۔ ان کا اعتراض اس بنا پر تھا کہ کشتی میں سوار لوگ ڈوب جائیں گے۔

علمی بات: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ کاروائی دیکھی تو وہ رہ نہ سکے۔ ان میں وہ جوش بھڑک اٹھا جو ان کے اندر اللہ ﷻ کی طرف سے غیرت دینی اور حمیت الٰہی کی وجہ سے رکھا گیا تھا اور اس کیفیت میں وہ حضرت خضر علیہ السلام سے اپنی طے شدہ بات بالکل بھول گئے۔

علمی و عملی بات: اچھی کشتی کو عیب دار بنانا اور چھوٹے بچہ کو ہلاک کرنا بظاہر ایسے کام ہیں جو صحیح نہیں۔ مگر جیسا کہ آگے کی آیات بتاتی ہیں، اس میں نہایت گہری مصلحت چھپی ہوئی تھی۔ اگلی آیات میں بیان کیئے گئے واقعہ کے مطابق یہ بظاہر غلط کام حقیقت کے اعتبار سے بالکل صحیح اور مفید کام تھے۔

اس میں اس مسئلہ کا بھی ایک جواب ہے جس کو عام طور پر خرابی کا مسئلہ (Problem of evil) کہا جاتا ہے۔ انسانی دنیا کی بہت سی چیزیں جن کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ دنیا کے نظام میں خرابیاں ہیں، وہ گہری مصلحت پر مبنی ہوتی ہیں۔ موجودہ زندگی میں یقیناً اس مصلحت پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ مگر آخرت میں یہ پردہ باقی نہ رہے گا۔ اس وقت آدمی جان لے گا کہ جو کچھ ہوا وہی ہونا بھی چاہیئے تھا۔

آیت نمبر ۷۲: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعتراض کرنے پر حضرت خضر علیہ السلام نے اُنہیں اپنے ساتھ رہنے کی شرط یاد دلائی۔

علمی بات: حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی شرط یاد دلائی کہ میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ میرے کسی عمل پر اعتراض نہیں کریں گے اس لئے کہ آپ علیہ السلام کو اس کا سبب معلوم نہیں ہے۔

آیت نمبر ۷۳: طے کردہ شرط بھول جانے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے مواخذہ نہ کرنے اور درگزر کرنے کی درخواست کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ان پر سختی نہ کریں اور اپنے ساتھ رکھیں تاکہ علم خاص میں سے سیکھ سکیں۔

علمی بات: حضرت موسیٰ علیہ السلام ایسے عمل کو دیکھ کر جو ظاہراً معصیت تھا اس سے قدرتی طور پر اتنا متاثر ہوئے کہ حضرت خضر علیہ السلام کی ہدایت کا بھی پاس ولحاظ نہ رہا۔ ذہن سے ان کی ہدایت نکل گئی اور آپ علیہ السلام ٹوک بیٹھے۔ ان سے طے کی ہوئی شرط بھی آپ علیہ السلام خلاف شریعت واقعہ کو دیکھ کر بھول گئے۔ آپ علیہ السلام کی طرف سے وعدہ تھا بھی تو خلاف شریعت معاہدہ کی پابندی ہی روا نہیں۔ یہاں بھول، بقول بعض مفسرین کرام ترک کے معنوں میں ہے کہ میں نے جو عہد آپ کے ساتھ کیا تھا اس پر عمل کرنا ترک ہوا۔ اس پر معذرت چاہتا ہوں۔ معلّم سے نامناسب عمل سرزد ہوتے دیکھ کر ردِ عمل کا ظاہر ہونا فطری اور اس پر برہم ہونا قدرتی بات تھی۔ ایک طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام اور معلّم میں معاہدہ ہے دوسری طرف اس خلاف ورزی پر ردِ عمل قدرتی و فطری ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد پر غالب آیا۔

علمی بات: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: کہ میری بھول پر مجھ سے مواخذہ اور گرفت نہ کیجئے اور میرے اس کام میں مجھ پر سختی اور دشواری نہ ڈالیئے۔ یعنی جب کشتی سے اترے تو اس میں سوراخ کر دیا اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام بول اُٹھے کہ اس میں کشتی والوں کا ضرر تو ظاہر ہی ہے اور ڈوب جانے کا بھی خطرہ ہے تو یہ واقعی بڑی بھاری بات کی۔

آیت نمبر ۷۴: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر حضرت خضر علیہ السلام نے ان کو ساتھ رکھا۔ چنانچہ کشتی کا سفر طے کرنے کے بعد دونوں خشکی کے راستہ پر چل پڑے۔ اُنہیں راستہ میں ایک لڑکا ملا جسے حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کر ڈالا۔ ایک بے گناہ کو قتل کرنا تو کشتی کو عیب دار بنانے سے زیادہ سخت تھا۔ لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر نہ صرف اعتراض کیا بلکہ سخت ملامت بھی کی۔

علمی بات: حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کشتی سے اترنے کے بعد پیدل چلتے ہوئے ایک بستی کے قریب پہنچے وہاں ایک جگہ چند لڑکے کھیل رہے تھے حضرت خضر علیہ السلام نے ان میں سے ایک نو عمر نابالغ لڑکے کو جو ان کے علم کے مطابق کافر تھا پکڑ کر قتل کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس واقعہ کو دیکھ کو جو بظاہر کشتی

کے واقعہ سے بھی سخت ظلم تھا کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔ کیوں کہ یہ بظاہر شریعت کے حکم کے خلاف تھا۔ فوراً حضرت خضر علیہ السلام سے کہنے لگے کہ آپ نے یہ کیا ظلم کیا، بلا قصور ایک ایسی جان کا خون کر دیا جس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ یہ تو آپ علیہ السلام نے بڑا غیر مناسب کام کیا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”وہ لڑکا جس کو خضر علیہ السلام نے قتل کیا تھا وہ طبعاً کافر پیدا کیا گیا تھا اگر وہ زندہ رہتا تو اپنے والدین کو زبردستی کفر اور سرکشی پر مجبور کرتا۔“ (صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

آیت نمبر ۷۵: طے کردہ شرط کی دوسری بار خلاف ورزی کرنے پر حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرط کی یاد دہانی کرائی۔ کہ ایسے حالات و واقعات دیکھنے میں آئیں گے جن پر وہ خاموشی کے ساتھ صبر نہ کر سکیں گے۔ آخر وہی ہوا۔

علمی بات: احکام شریعت کی خلاف ورزی پر تحمل جب عام صالحین سے نہیں ہو سکتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام تو ظاہر ہے کہ پیغمبر برحق تھے۔ اور آپ علیہ السلام کا کام ہی ہر قسم کی بدی کو روکنا اور نیکی کو پھیلانا تھا۔ آپ علیہ السلام بھلا کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔

علمی بات: خیال رہے کہ خوف کفر پر قتل کر دینا اب کسی کے لئے جائز نہیں خواہ کوئی ولی ہو یا عالم۔ یہ حضرت خضر علیہ السلام کی خصوصیات میں سے تھا۔

آیت نمبر ۷۶: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام کو جواب دیا کہ اس بار بھی ان سے درگزر کر لیں اور آئندہ پھر اعتراض کرنے پر اُنہیں اپنے ساتھ نہ رکھیں کیونکہ اس وقت حضرت خضر علیہ السلام کے پاس معقول عذر ہو گا کہ وہ اُنہیں اپنے ساتھ نہ رکھیں۔

فرامین نبوی ﷺ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ رسول اللہ ﷺ جب دعا فرماتے تو پہلے اپنے آپ سے ابتدا فرماتے اور کہتے: رَحْمَةُ اللهِ عَلَيْنَا وَعَلٰى مُوْسٰى ”اللہ کی رحمت ہو ہم پر اور موسیٰ پر۔“ پھر فرمایا: ”اگر وہ صبر کر لیتے تو وہ اپنے صاحب (خضر علیہ السلام) سے بہت عجائب دیکھتے لیکن انہوں نے خود ہی کہہ دیا: اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۢ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ”اگر میں تجھ سے اس کے بعد کسی چیز کے متعلق پوچھوں تو مجھے ساتھ نہ رکھنا، یقیناً تو میری طرف سے پورے عذر کو پہنچ چکا ہے۔“ (سنن ابی داؤد، صحیح مسلم)

ایک روایت میں بھی یوں ہے کہ خاتم النبیین ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ ﷻ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے، میری آرزو تھی کہ کاش! حضرت موسیٰ علیہ السلام صبر کرتے حتیٰ کہ اللہ ﷻ ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے مزید واقعات سناتا۔“ (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۷۷: حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام سفر کرتے ہوئے ایک بستی میں جا پہنچے۔ بستی والوں سے کھانا طلب کرنے پر بستی والوں نے انکار کر دیا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے بستی میں ایک دیوار دیکھی جو گرنے کے قریب تھی تو حضرت خضر علیہ السلام نے اس کی تعمیر کر کے اسے درست کر دیا۔ بستی والوں پر حضرت خضر علیہ السلام کے اس بلا معاوضہ احسان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام خاموش نہ رہ سکے۔ انہوں نے کہا کہ حضرت خضر علیہ السلام اس محنت کا معاوضہ بستی والوں سے وصول کر سکتے تھے۔

علمی بات: جمہور مفسرین کرام کے نزدیک یہ کام حضرت خضر علیہ السلام سے خرق عادت اور معجزانہ طور پر صادر ہوا۔ بعض مفسرین کرام کی رائے یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے اس کو گرا کر دوبارہ بنایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دونوں قول مروی ہیں۔ بہر کیف لفظوں میں دونوں کا احتمال موجود ہے اور دونوں میں دو عظیم درس موجود ہیں: ۱۔ پہلی صورت میں یہ ایک معجزانہ عمل ہو گا جو خرق عادت آپ علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر فرمایا گیا۔ ۲۔ دوسری صورت میں یہ مکارم اخلاق اور خدمت خلق کا ایک اعلیٰ نمونہ اور نمایاں عملی مظہر ہو گا اور وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے ان کی مہمانی کرنے اور ان کو کھانا کھلانے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

علمی بات: اللہ ﷻ کے خاص بندوں کی یہی شان ہوتی ہے۔ اللہ ﷻ ہمیں بھی ایسے مکارم اخلاق اور خدمت خلق کے جذبۂ صادقہ سے نوازے اور سرفراز فرمائے۔ اس واقعہ سے ہمیں یہ بھی درس ملتا ہے کہ کسی کے بارے میں محض ظاہر کے اعتبار سے کوئی حکم نہیں لگا دینا چاہیئے جب تک کہ اصل حقیقت کی پوری طرح چھان بین نہ کر لی جائے اور حقیقت حال پوری طرح واضح نہ ہو جائے۔

آیت نمبر ۷۸: معاہدے کی تیسری مرتبہ خلاف ورزی ہونے پر حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ساتھ رکھنے سے معذرت کر لی۔ جدائی سے پہلے حضرت خضر علیہ السلام نے تینوں واقعات کی حقیقت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آگاہ کیا۔

آیت نمبر ۷۹: کشتی کا معاملہ یہ تھا کہ کشتی چند مسکین لوگوں کی معاش کا سہارا تھی۔ اس علاقہ میں ایک ظالم بادشاہ تھا جو ہر اس کشتی کو اپنے قبضہ میں لے لیتا جو صحیح سالم ہوتی تھی۔ اگر کشتی ان مساکین سے چھین لی جاتی تو ان کا روزگار ہی بند ہو جاتا۔ لہٰذا کشتی کو عیب دار بنا دیا گیا تا کہ وہ غصب ہونے سے بچ جائے۔

علمی بات: حضرت خضر علیہ السلام کا مقصود یہ تھا کہ اس کشتی کا تختہ اکھاڑنے سے میری غرض یہ نہیں تھی کہ اس میں بیٹھنے والے سواروں کو میں غرق کر دوں بلکہ اس سے میرا یہ مقصد تھا کہ جس راستہ پر یہ جا رہے ہیں اس میں آگے چل کر ایک ظالم بادشاہ آتا ہے جو ہر اس کشتی کو چھین لیتا ہے جو بے عیب ہو اس لئے میں نے اس کشتی کو عیب دار بنا دیا تا کہ یہ کشتی اس ظالم بادشاہ کے چھیننے سے محفوظ رہے۔ معلوم ہوا کہ زیادہ نقصان سے بچنے کے لئے کم نقصان کو برداشت کر لینا بہتر ہے۔ کیونکہ انسان کسی بڑی مصیبت کے بجائے کسی چھوٹی مصیبت کو آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں بھی بیان ہوا ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب بھی رسول اللہ ﷺ کو دو چیزوں کے درمیان اختیار دیا گیا تو آپ ﷺ نے اسی پر عمل کیا جو زیادہ آسان تھی۔ بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو اور اگر وہ گناہ ہو تو رسول اللہ ﷺ لوگوں کی بہ نسبت اس سے بہت زیادہ دور ہونے والے تھے۔ (صحیح بخاری) معلوم ہوا کہ جب کسی معاملہ میں دو امر جائز ہوں مشکل اور آسان تو مشکل کام کو ترک کر کے آسان کام کو اختیار کرنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۸۰: لڑکے کے معاملہ کی حقیقت یہ ہے کہ لڑکے کے والدین مومن تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام کو علم عطا کیا گیا تھا کہ لڑکا بڑا ہو کر گمراہی کا راستہ اختیار کرے گا۔ بظاہر لڑکے کا قتل ناحق تھا لیکن وہ اپنے ساتھ اپنے نیک والدین کو بھی گمراہ کر دیتا۔

علمی بات: ان آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کس طرح اپنے مومن بندوں کی آنے والے فتنوں سے بھی حفاظت کرتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ یُدٰفِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا "بے شک اللہ ان لوگوں کی طرف سے دفاع کرتا ہے جو ایمان لائے۔" (سورۃ الحج ۲۲، آیت: ۳۸)

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "جس لڑکے کو حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کیا تھا اس پر کفر کی مہر لگا دی گئی تھی۔" (جامع ترمذی، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، صحیح ابن حبان)

آیت نمبر ۸۱: لڑکے کے قتل کا معاملہ بڑا سنگین تھا۔ نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر کے بات بیان ہوئی ہے۔ اس لڑکے کے نعم البدل کے طور پر اللہ تعالیٰ اس کے والدین کو دوسری اولاد عطا کرے جو عمل و اخلاق میں پاکیزہ ہو اور والدین کی فرماں برداری میں اس سے بہتر ہو۔

علمی بات: اس قتل کو عام احکام پر قیاس نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ ایک استثنائی صورت تھی جو حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ مخصوص تھی اور جس کو صاحب شریعت موسیٰ علیہ السلام پر بھی واضح کر دیا گیا۔ یہ ایسا ہی استثنائی حکم تھا جیسا حکم حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کا دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نبی ہونے کی حیثیت میں ایک مخصوص حکم تھا۔ اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام کو ایک کافر لڑکے کے قتل کرنے کا حکم ان کے نبی یا خاص برگزیدہ بندہ ہونے کی حیثیت میں مخصوص طور پر دیا گیا تھا۔ اس لئے نہ اس پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے اور نہ دوسروں کے لئے یہ وجہ جواز بن سکتا ہے۔

اگر ان امور کو انسان کے ظاہری علم ہی پر چھوڑ دیا جاتا تو انسان اس لڑکے کے بارے میں ظاہری فیصلہ ہی کرتا اور اس لڑکے کو قانوناً کچھ بھی نہ کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس نے شریعت کے مطابق ایسا کوئی جرم نہ کیا تھا کہ اسے قتل کر دیا جاتا۔ کوئی جج بھی اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کر سکتا۔ فیصلہ قانون کے مطابق ہی ہو گا۔ لیکن یہ حضرت خضر علیہ السلام نے فیصلہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کیا اور یہ حکم مستقبل کے اعمال کے ساتھ وابستہ علم الٰہی کی وجہ سے کیا گیا۔

علمی بات: لڑکے کے والدین چونکہ صالح تھے اس لئے ان کے رب نے چاہا کہ اس لڑکے کی جگہ انہیں ایک ایسا فرزند عطا فرمائے جو پاکیزہ نفسی و پرہیز گاری میں اس سے بہتر اور مروّت و دردمندی میں اس سے بڑھ کر ہو۔ چنانچہ وقتی طور پر تو لڑکے کے فوت ہونے سے والدین پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو گا لیکن حقیقت میں یہ

سب کچھ ان کی بہتری کے لئے ہی کیا گیا تھا۔

علمی بات: یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اللہ ﷻ اپنے بندوں کی مدد کہاں کہاں سے فرماتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ ایسے معاملہ میں بھی ان کی مدد کرتا ہے جس کا اُنہیں علم تک نہیں ہوتا کہ وہ اس کے لئے اپنے رب سے درخوست کر سکیں۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ ہمیشہ صبر و شکر کا رویہ اختیار کرے۔ وہ ہر حال میں اللہ ﷻ سے خیر کی اُمید رکھے۔ اللہ ﷻ کلی علم رکھتا ہے، اس لئے وہ کسی بندے کی بھلائی کو اس سے زیادہ جانتا ہے جتنا انسان جزئی علم کی بنا پر نہیں جان سکتا۔

علمی بات: حضرت خضر علیہ السلام نے کہا ہم نے یہ ارادہ کیا کہ اللہ ﷻ اس لڑکے کے ماں باپ کو اس سے بہتر بدل عطا فرمادے گا جو پاکیزہ سیرت کا حامل ہوگا اور رشتہ داروں کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنے والا ہوگا۔ مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ مقتول لڑکے کے والدین کو اللہ ﷻ نے اس کے بدلہ میں ایک لڑکی عطا فرمائی جس کی شادی ایک پیغمبر سے ہوئی۔ جس کے بطن سے ایک نبی علیہ السلام پیدا ہوئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت میں ہے کہ اس کے بطن سے دو نبی علیہما السلام پیدا ہوئے۔ بعض روایات میں ہے کہ اس کے بطن سے پیدا ہونے والے نبی علیہ السلام کے ذریعہ اللہ ﷻ نے ایک بڑی اُمّت کو ہدایت فرمائی۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ اللہ ﷻ نے اس لڑکے کے عوض ایک لڑکی عطا فرمائی جس سے بہت پیغمبر علیہم السلام پیدا ہوئے۔ واللہ اعلم بالصواب

آیت نمبر ۸۲: دیوار کو بنا دینے کی حکمت یہ تھی کہ دیوار کے نیچے دو یتیم بچوں کی وراثت ایک خزانہ کی صورت میں دفن تھی جن کا باپ ایک نیک آدمی تھا۔ دیوار گر جاتی تو وہ خزانہ بستی والوں کے ہاتھ آ جاتا۔ یتیم بچوں کے ساتھ یہ خیر خواہی اللہ ﷻ کی مہربانی تھی تاکہ بڑے ہو کر اُنہیں ان کا حق مل جائے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے یہ تمام کام اپنی رائے اور مرضی سے نہیں کیئے بلکہ اللہ ﷻ کے حکم سے انجام دیئے جو اللہ ﷻ کی رحمت کے مظاہر ہیں۔ یہ ہے ان واقعات کی حقیقت جن پر صبر نہ کرنے کی وجہ سے حضرت خضر علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے ساتھ نہ رکھ سکتے تھے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں حاضر تھے۔ انہوں نے کہا کہ مجھ سے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "حضرت خضر علیہ السلام سے جو جا کر ملے تھے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے۔" پھر آخر تک حدیث بیان فرمائی کہ حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کیا میں آپ کو پہلے ہی نہیں بتا چکا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے (حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے) پہلا سوال تو بھول کر ہوا تھا، بیچ کا شرط کے طور پر اور تیسرا جان بوجھ کر ہوا تھا۔ آپ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے کہا تھا کہ "میں جس کو بھول گیا آپ اس میں مجھ سے مواخذہ نہ کیجئے اور نہ میرا کام مشکل بنائیے۔" (صحیح بخاری)

علمی بات: بستی والوں کے ناروا سلوک کے باوجود دیوار بلا معاوضہ کھڑا کرنے کی خدمت حضرت خضر علیہ السلام نے اس لئے انجام دی کہ اللہ ﷻ نے اُنہیں یہ خبر دے دی تھی کہ اس دیوار کے نیچے یتیموں کا مال دفن ہے۔ اگر دیوار گر جاتی تو کوئی شخص بھی مال نکال کر ہڑپ کر سکتا تھا جبکہ بستی کے لوگ بد اخلاق تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے بستی والوں کے سلوک کو جو ان کے ساتھ کیا گیا تھا خاطر میں نہ لاتے ہوئے دیوار کی مرمت کر دی۔ یہ بڑے خیر کا کام تھا جو حضرت خضر علیہ السلام نے انجام دیا۔

علمی بات: اس بات سے بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ نبی علیہ السلام تھے کیونکہ یہ کام انہوں نے اپنی رائے اور اپنے اختیار سے نہیں کیئے تھے بلکہ حکم الٰہی سے کیئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے حضرت خضر علیہ السلام کو جو خاص علم بخشا گیا تھا اس کی بنا پر خاص طرح کی خدمت ان کے سپرد ہوئی تھی یعنی ایسی تدابیر اختیار کرنا جس کی مصلحت واضح نہ ہو لیکن نتیجہ کے اعتبار سے وہ کام خیر کا باعث اور لوگوں کی فلاح و بہبودی کا موجب ہو۔

علمی بات: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس سفر کی داستان جو ایک خاص علم کے حصول کے لئے تھا یہاں ختم ہو گئی۔ اس تفصیل کو بیان کرنے سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ تکوینی طور پر ایسے واقعات پیش آتے ہیں اور ایسے حالات رونما ہوتے ہیں جن کے حقیقی مصالح پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ ظاہر بین نگاہیں ان کو دیکھ نہیں پاتیں لیکن اللہ ﷻ کی رحمت و ربوبیت پس پردہ کام کر رہی ہوتی ہے۔ اس کی ایک جھلک ان واقعات میں دیکھی جا سکتی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خضر علیہ السلام کے تعلق سے

پیش آئے۔ لہٰذا کفر و اسلام کی کشمکش میں اہلِ ایمان کو اگر ناسازگار حالات سے گزرنا پڑ رہا ہو تو اس سے رنجیدہ نہیں ہونا چاہیئے۔ عجب نہیں کہ اس سے بہت بڑا خیر ابھر آئے اور اس کی رحمتوں کا جو بادلوں میں چھپی ہوئی ہیں ان پر نزول ہو۔ اس لئے اہلِ ایمان کو چاہیئے کہ اللہ ﷻ پر توکل کرتے ہوئے صبر سے کام لیں۔

دوسرا سبق جو اس قصّہ سے دینا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ یہ دنیا حادثات اور واقعات کی دنیا ہے اور اس کے پیچھے جو عظیم مصالح ہیں ان پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ ضروری ہے کہ ایک دن ایسا آئے جب حقیقت کو بے نقاب کیا جائے تاکہ لوگوں پر ظاہر ہو جائے کہ دنیا اندھیر نگری نہیں تھی بلکہ ایک علیم و حکیم ہستی کا منصوبہ تھا جس کی پشت پر عظیم مصلحتیں کارفرما تھیں۔ اللہ ﷻ نے قیامت کا دن اسی لئے مقرر کیا ہے تاکہ دنیا کے اسرار پر سے پردہ اٹھ جائے اور دنیا کے بارے میں صحیح اور غلط نقطۂ نظر رکھنے والوں کو اپنے اپنے عمل کا بدلہ ملے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ سے ہونے والے اہم اسباق: ۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو سائل کے جواب میں یوں فرمایا: کہ مجھ سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں اور اس اعتبار سے ان کا فرمانا صحیح بھی تھا کہ وہ صاحبِ شریعت تھے، ایک بہت بڑی قوم کے نبی تھے اور ان پر تورات شریف نازل ہوئی تھی لیکن چونکہ آپ علیہ السلام نے سب سے بڑے عالم ہونے کی نسبت اپنی طرف کی تھی اس لئے اللہ ﷻ کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ چنانچہ اللہ ﷻ نے وحی بھیج کر اس بات کی اصلاح فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص کتنا ہی زیادہ عالم ہو اور حالات ظاہرہ کے اعتبار سے اس سے زیادہ کوئی دوسرا جاننے والا نہ ہو تب بھی اسے یہ نہ کہنا چاہیئے کہ میں سب سے بڑا عالم ہوں۔ اس میں ایک تو دعویٰ ہے جو کاملین کی شان کے خلاف ہے دوسرا ہو سکتا ہے کہ اور شخص بھی اتنا بڑا یا اس سے بڑا عالم ہو جس کی اسے خبر نہ ہو۔ (خواہ اس کے اپنے علوم کے علاوہ دوسرے ہی علوم کا ماہر ہو)

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے جوان یعنی حضرت یوشع بن نون کو ساتھ لے کر چلے جو ان کے خادم تھے اس سے معلوم ہوا کہ کسی اپنے چھوٹے کو خدمت کے لئے ساتھ لینا اور کوئی خدمت سپرد کرنا درست ہے یوں بھی تنہا سفر کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ آنحضرت سرورِ عالم ﷺ کے خادموں میں حضرت انس رضی اللہ عنہ مشہور ہیں جنہوں نے دس سال آپ ﷺ کی خدمت کی۔

۳۔ معلوم ہوا کہ طلبِ علم کے لئے سفر کرنا چاہیئے اور یہ کہ معلم کو اپنے پاس بلانے کی فکر نہ کرے بلکہ اس کے پاس خود جائے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ کے تناظر میں لکھا ہے کہ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما حضرت عبد اللہ بن انیس رضی اللہ عنہ صحابی کے پاس ایک حدیث لینے کے لئے ایک ماہ کا سفر کر کے گئے۔ (صحیح بخاری)

۴۔ طلبِ علم کے لئے کوئی عمر مخصوص نہیں گو بچپن اور جوانی میں علم اچھی طرح حاصل ہوتا ہے لیکن بڑھاپے میں بھی اس سے بے نیاز نہیں ہونا چاہیئے علم صحیح جہاں ملے، جب ملے، اور جس سے ملے حاصل کرنا چاہیئے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس حوالہ سے لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بڑی عمریں ہو جانے کے بعد علم حاصل کیا ہے۔

۵۔ اگر کسی کو کسی بھی اعتبار سے کوئی فضیلت حاصل ہو اور اسے اپنے سے کم فضیلت والے کے پاس کوئی علم کی بات ملتی ہو تو اس میں عار نہیں ہونی چاہیئے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام کے پاس اس علم کے حاصل کرنے کے لئے تشریف لے گئے جو ان کے اپنے علم کے علاوہ تھا۔

۶۔ طلبِ علم کے لئے سفر کرنے میں سستی اور کوتاہی اختیار نہ کی جائے جتنا بھی بڑا سفر ہو برداشت کیا جائے اور اس پر جو تکلیف پہنچے اسے برداشت کیا جائے۔

آیت نمبر ۸۳: قریشِ مکہ نے یہود کے کہنے پر رسول اللہ ﷺ سے تین سوالات پوچھے۔ ایک سوال ذوالقرنین بادشاہ کے بارے میں تھا کہ ذوالقرنین کون تھے؟ جس کا جواب دیا جا رہا ہے۔ اللہ ﷻ نے فرمایا: کہ وہ ایک نیک انسان تھے جو لوگوں کی خدمت کرنے کو سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے اور اتنے بڑے بادشاہ ہونے کے باوجود ان میں غرور و تکبر نہ تھا۔

علمی بات: مشرکین نے حضور سرورِ دو عالم ﷺ سے تین سوالات کیئے تھے۔ ان میں سے ایک سوال یہ تھا کہ اس شخص کا حال بتائیں جس نے مشرق سے مغرب تک پوری دنیا کا سفر کیا تھا، یہاں سے اس سوال کا جواب دیا جا رہا ہے۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ اس شخص کا نام ذوالقرنین تھا، ذوالقرنین کے لفظی معنیٰ ہیں دو

سینگوں والا۔ یہ کسی نامعلوم وجہ سے ایک بادشاہ کا لقب تھا، قرآنِ کریم نے اس بادشاہ کی تفصیلات نہیں بتائیں کہ وہ کون تھا؟ اور کس زمانہ میں تھا؟ البتہ ہمارے زمانہ کے بیشتر محققین کا رجحان یہ ہے کہ وہ ایران کا بادشاہ سائرس "ذوالقرنین" تھا۔

علمی بات: بعض مفسرین کرام نے ایک رومی فاتح سکندر مقدونی کو ذوالقرنین قرار دیا ہے جو ایک بت پرست اور ظالم انسان تھا۔ اس کا دورِ حکومت ۳۴۵ قبلِ مسیح تا ۳۲۳ قبلِ مسیح ہے۔ اس کا استاد اور وزیر ارسطو تھا لیکن قرآنِ حکیم نے جس ذوالقرنین بادشاہ کا ذکر کیا ہے وہ اللہ ﷻ اور آخرت پر ایمان رکھنے والا، نیک سیرت، عادل، بڑا فاتح اور خدا ترس انسان تھا۔ اللہ ﷻ اور آخرت پر ایمان رکھنے والا ایک خدا ترس ایرانی بادشاہ خسرو گزرا ہے جس کا لقب "ذوالقرنین" بیان کیا جاتا ہے۔ اس کا دورِ حکومت ۵۵۹ قبلِ مسیح تا ۵۲۹ قبلِ مسیح ہے۔ اِسے یونانیوں نے سائرس (Cyrus)، عبرانیوں نے غورش اور عربوں نے کیخسرو کہا ہے۔

علمی بات: جب اس نے ایران کو متحد کرنے کے بعد اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کیا تو سب سے پہلے عراق کو فتح کیا۔ مشرق وسطیٰ کا موجودہ نقشہ دیکھیں تو فلسطین، اسرائیل، شرق اردن کا مغربی کنارہ اور لبنان کے ممالک پر مشتمل پورے علاقہ کو اس زمانہ میں شام عرب یا شام اور اس سے مشرق میں واقع علاقہ کو عراق عرب یا عراق کہا جاتا تھا جبکہ عراق کے مزید مشرق میں ایران واقع تھا۔ عراق پر قبضہ کرنے کے بعد ذوالقرنین نے بابل میں اسیر یہودیوں کو آزاد کر دیا اور اُنہیں اجازت دے دی کہ وہ اپنے ملک واپس جا کر اپنا تباہ شدہ شہر یروشلم دوبارہ آباد کر لیں۔ چنانچہ حضرت عزیر علیہ السلام کی قیادت میں یہودیوں کا قافلہ بابل سے واپس یروشلم آیا۔ انہوں نے اپنے اس شہر کو پھر سے آباد کیا اور ہیکل سلیمانی کو بھی از سرِ نو تعمیر کیا۔ اس پس منظر میں یہودی ذوالقرنین کو اپنا محسن سمجھتے ہیں اور اسی سبب سے ان کے بارے میں انہوں نے حضور ﷺ سے یہ سوال پوچھا تھا۔

ذوالقرنین کی فتوحات کے سلسلہ میں تین مہمات کا ذکر تاریخ میں بھی ملتا ہے۔ ان مہمات میں ایران سے مغرب میں بحیرہ روم (Mediterranian) تک پورے علاقہ کی تسخیر، مشرق میں بلوچستان اور مکران تک لشکر کشی اور شمال میں بحیرہ خَزر (Caspian Sea) اور بحیرۂ اسود (Black Sea) کے درمیانی پہاڑی علاقہ کی فتوحات شامل ہیں۔ ذوالقرنین کا یہ سلسلہ فتوحات حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کی فتوحات کے سلسلہ سے مشابہ ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی جزیرہ نمائے عرب سے مختلف سمتوں میں تین لشکروں نے پیش قدمی کی تھی۔ ایک لشکر شام اور پھر مصر گیا تھا۔ دوسرے لشکر نے عراق کے بعد ایران کو فتح کیا تھا جبکہ تیسرا لشکر شمال میں کوہِ قاف (Caucasus) تک جا پہنچا تھا۔

قدیم روایات میں ذوالقرنین کے بارے میں کچھ ایسی معلومات بھی ملتی ہیں کہ ابتدائی عمر میں وہ ایک چھوٹی سی مملکت کے شہزادے تھے۔ ان کے اپنے ملک میں کچھ ایسے حالات ہوئے کہ کچھ لوگ ان کی جان کے درپے ہوگئے۔ وہ کسی نہ کسی طرح وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے اور کچھ عرصہ صحرا میں روپوش رہے۔ اسی عرصہ کے دوران ان تک کسی نبی کی تعلیمات پہنچیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ زرتشت ہی اللہ ﷻ کے نبی ہوں اور ان ہی کی تعلیمات سے انہوں نے استفادہ کیا ہو۔ بہر حال قرآنِ حکیم نے ذوالقرنین کا جو کردار پیش کیا ہے وہ ایک نیک اور صالح بندۂ مومن کا کردار ہے اور اس کردار کی خصوصیات تاریخی اعتبار سے اس زمانہ کے کسی اور فاتح حکمران پر منطبق نہیں ہوتیں۔

علمی بات: اہل علم کی رائے ہے کہ اس کو ذوالقرنین اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ظاہری اعتبار سے دنیا کے دونوں کونوں یعنی مشرق و مغرب تک پہنچ گیا تھا۔ وہ مشرق سے لے کر مغرب تک کی دنیا کا فرماں روا اور عظیم بادشاہ بن گیا اور ظاہری اور باطنی دونوں علوم کی روشنی سے منور و مالامال ہو گیا۔

علمی بات: یہود کے اس سوال سے یہ بات آپ ہی واضح ہے کہ ان کے نزدیک ذوالقرنین کی شخصیت معروف تھی اور اس کا یہ لقب پہلے سے چلا آ رہا تھا اس لئے قرآنِ حکیم نے اس عالمگیر فاتح کی عظیم الشان فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے اس کی سیرت کے ان پہلوؤں کو نمایاں کیا جن سے اس کی خدا خوفی، عدل پسندی اور اللہ ﷻ کے حضور جواب دہی کے شدید احساس کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لقب سے اس کے مشہور ہونے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس کی سلطنت مغرب اور مشرق میں دور دور تک وسیع ہوگئی تھی اور غالباً یہ پہلا حکمران ہے جس کی حکومت انسانی آبادی کے بہت بڑے حصے پر قائم ہوگئی تھی۔

علمی بات: عربی میں قرن سینگ کو یا صدی یعنی سو(۱۰۰) سال کو کہتے ہیں۔ ذوالقرنین کے معنیٰ دو سینگوں والا۔ دو سینگوں سے مراد مشرق و مغرب کے وہ دو کنارے ہیں جہاں انسانی آبادی ختم ہوتی تھی۔ اس کے بعد جو انسانی آبادی تھی وہ یا تو دوسری جہتوں میں تھی یا سمندر اور پہاڑ کو عبور کرنے کے بعد تھی۔ سائرس بادشاہ کالقب ذوالقرنین کیوں پڑا؟ اس کے کئی اسباب بیان کیئے جاتے ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

ا۔اُس نے پارس (”فارس“ ”ریاستِ ایران) اور دوسری ایک ریاست میڈیا(Media) کو ملا کر عظیم ریاست ”ایران“ کی بنیاد ڈالی تھی۔ ۲۔اُس نے مشرقی اور مغربی کناروں تک فتوحات حاصل کی تھیں۔ ۳۔اُس کے تاج میں دو سینگ لگے ہوئے تھے۔ ۴۔اُس کے دائیں بائیں دو زلفیں تھیں۔ اس کی قائم کی ہوئی عظیم ایرانی سلطنت دو سو(۲۰۰) سال تک برقرار رہی تھی۔

ذوالقرنین کی شخصیت نزول قرآن پاک کے وقت معروف تھی لیکن بعد میں پردۂ خفا میں چلی گئی اور جب مفسرین کرام نے اس کو متعین کرنے کی کوشش کی تو سکندر مقدونی کو جس کا دور ۳۴۵ قبل مسیح تا ۳۲۳ قبل مسیح رہا ہے اور جو ارسطو کا شاگرد تھا مشہور عالمگیر فاتح ہونے کی بنا پر اس کا مصداق قرار دیا۔ حالانکہ سکندر مقدونی کے بارے میں یقین کے ساتھ نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ مسلمان تھا اور نہ یہ کہ وہ عادل بادشاہ تھا اور نہ ہی اس کی مغرب میں کسی ایسی مہم کا تاریخی ثبوت ملتا ہے جس کا ذکر قرآن حکیم نے کیا ہے بلکہ اس کے برخلاف تاریخ اس کو ایک بت پرست اور توسیع پسند حکمران کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اس لئے اس کو قرآنِ حکیم کا ذوالقرنین نہیں قرار دیا جاسکتا۔

چونکہ ذوالقرنین کی شخصیت یہود میں معروف تھی اس لئے اس کی تحقیق کے لئے قدیم صحیفوں ہی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ موجودہ دور کے محققین اپنی تحقیق کی بناپر خورس یعنی سائرس (Cyrus) کو جس کا دور ۵۵۹ قبل مسیح تا ۵۲۹ قبل مسیح تھا ذوالقرنین قرار دیتے ہیں۔

خورس فارس (ایران) کا حکمران تھا اس نے فارس اور میڈیا (شمالی ایران) کی متحدہ سلطنت بنانے کے بعد مغرب کا رخ کیا تھا اور اس کی فتوحات لیڈیا (ٹرکی) تک پہنچ گئی تھیں اور مشرق میں بھی اس کا دائرہ سلطنت وسیع ہوگیا تھا۔ اس نے بابل کو فتح کرنے کے بعد بنی اسرائیل کو جب بخت نصر کے زمانہ سے غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے آزاد کرکے یروشلم جانے کی اجازت دے دی گویا بنی اسرائیل کے لئے خورس ایک نجات دہندہ کی حیثیت سے ظاہر ہوا تھا اس لئے بائبل میں اس کا ذکر ایک اچھے حکمران کی حیثیت سے ہوا ہے اور اس کو خدا کا چرواہا کہا گیا ہے (ایسعیاہ ۴۴: ۴۸) اور عزرا کی کتاب سے اس کے خدا پرست ہونے کی شہادت ملتی ہے۔ اس لئے اغلب ہے کہ خورس کی شخصیت ہی قرآنِ حکیم کا ذوالقرنین ہوگی۔

قدیم مورخ ہیروڈوٹس (Herodotus) نے سائرس کو فارس کی مقبول ترین شخصیت بتلایا ہے اور اس کی مہموں کا ذکر کیا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار اس کا تعارف اس طرح کراتا ہے۔

”سائرس اخمینین شہنشاہیت کا بانی تھا۔ یہ شہنشاہیت پہلی عالمی ریاست (Word State) ہے جس میں بحر ایجین سے لے کر دریائے سندھ تک کا علاقہ شامل تھا۔ وہ ایک روادار اور مثالی حکمران تھا جسے قدیم اہل فارس نے بابائے قوم کے نام سے پکارا اور بائبل میں جسے بابل کے یہودی اسیروں کے تعلق سے نجات دہندہ کہا گیا۔“

علمی بات: مفسرین کے رائے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذوالقرنین حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر تھا اور ان کی دعا کی برکت سے حق تعالیٰ نے خارق عادت سامان و وسائل عطا فرمائے تھے۔ جن کے ذریعہ سے اس کو مشرق و مغرب کے سفر اور محیر العقول فتوحات پر قدرت حاصل ہوئی۔ اس نے آپ علیہ السلام کے ساتھ بیت اللہ شریف کی تعمیر کے بعد طواف بیت اللہ کیا ہے۔ آپ علیہ السلام پر ایمان لایا تھا، آپ علیہ السلام کا فرماں بردار تھا۔ حضرت خضر علیہ السلام اس کے وزیر تھے۔ شاید اسی لئے قرآنِ حکیم نے حضرت خضر علیہ السلام کے قصّہ کے ساتھ اس کا قصّہ بیان فرمایا۔ قدیم شعرائے عرب نے اپنے اشعار میں ”ذوالقرنین“ کا نام بڑی عظمت سے لیا ہے اور اس کے عرب ہونے پر فخر کرتے رہے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذوالقرنین عہد تاریخی سے پہلے کا کوئی جلیل القدر عرب بادشاہ ہے۔

آیت نمبر۸۴: ذوالقرنین کو اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم سلطنت سے نوازا تھا۔ اس کے علاوہ علم، طاقت اور ایسے تمام وسائل مہیا کیئے تھے جن سے کام لے کر انہوں نے بہت بڑی فتوحات حاصل کیں۔

علمی بات: لفظ "سبب" عربی لغت میں ہر اس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جس سے اپنے مقصد حاصل کرنے میں مدد لی جاتی ہے جس میں مادی آلات و وسائل بھی شامل ہیں اور علم و بصیرت و تجربہ وغیرہ بھی۔ مِنۡ كُلِّ شَيۡءٍ سے مراد وہ تمام امور ہیں جن کی ضرورت نظامِ سلطنت کے لئے ایک بادشاہ اور حکمران کو پیش آتی ہے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ذوالقرنین کو عدل و انصاف قائم کرنے اور امن عالم کے قیام اور فتوحات ممالک کے لئے جس جس سامان کی ضرورت اس زمانہ میں تھی وہ سب کے سب ان کو عطا کر دیئے گئے تھے۔

علمی بات: امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بادل کو ذوالقرنین کے حکم کے تابع بنا دیا گیا تھا، اَبر پر وہ سوار ہوتا تھا۔ اس کے ذرائع دراز کردیئے گئے تھے۔ اس کے لئے روشنی پھیلا دی گئی تھی (یعنی رات بھی اس کے لئے روشن کردی گئی تھی)۔ رات دن اس کے لئے برابر تھے۔ تَمۡكِيۡنِ فِي الۡاَرۡضِ کا یہی معنیٰ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زمین پر رفتار اس کے لئے آسان کردی گئی اور سارے راستے اس کے لئے کھول دیئے گئے تھے۔ (راستے آسان کرنے کا شاید یہ مقصود ہو کہ ہر طرح کی سواری اس کو میسر تھی اور رات دن یا موسم کا اختلاف اس کے رفتار پر اثر انداز نہ ہوتا تھا)

علمی بات: یہاں سے ان باتوں کا بیان شروع ہے جو اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی بتائی تھیں، اللہ تعالیٰ نے اسے فوجی طاقت، مال و دولت، فکر و نظر اور عظیم شہرت و دبدبہ دیا تھا، ہر چیز کو حاصل کرنے کا ذریعہ عطا کیا تھا، یعنی، علم، طاقت، آلات و اسلحہ اور دیگر تمام وسائل اسے مہیا تھے اور ان تمام وسائل و ذرائع کو استعمال کرکے انتہائے مشارق و مغرب تک پہنچ گیا تھا۔

آیت نمبر۸۵: ذوالقرنین نے نیکی اور عدل کے نظام کی توسیع کے لئے اطراف کے ممالک کی طرف مہم جوئی کا منصوبہ بنایا۔ ان کا پہلا سفر مغرب کی طرف تھا۔

علمی بات: "اتباع" کے معنیٰ پیچھے لگنے، درپے ہونے، تعاقب کرنے کے ہیں۔ "اَتۡبَعَ سَبَبًا" کے معنیٰ ہوں گے اس نے وسائل و ذرائع کا جائزہ لیا، اس کا اہتمام کیا۔ پھر یہیں سے ذرا وسیع معنیٰ میں یہ کسی مہم کی تیاری کے لئے استعمال ہوا۔

آیت نمبر۸۶: ذوالقرنین بادشاہ کا زمین کی مغربی سمت کی انتہا تک پہنچنے کا بیان ہے۔ عین سے مراد چشمہ یا سمندر ہے۔ وہاں پہنچ کر غروب آفتاب کے وقت اُنہیں محسوس ہوا جیسے سورج سیاہی مائل گدلے پانی میں ڈوب رہا ہے۔ ذوالقرنین نے وہاں ایک ایسی قوم پر غلبہ پایا جو کافر تھی۔ اُنہیں اختیار دیا گیا کہ وہ چاہیں تو قوم کے ساتھ سخت رویہ اختیار کریں یا دعوت و تبلیغ سے اُنہیں اسلام لانے پر آمادہ کریں۔

علمی بات: یعنی مغربی سمت خشکی کے آخری کنارے پہنچ گیا۔ اس کے بعد سمندر تھا جس نے سیاہ جھیل کی شکل اختیار کرلی تھی۔ وہاں اسے ایسا دکھائی دیا کہ سورج اس گدلے پانی میں ڈوب رہا ہے۔ سورج کا ڈوبنا عام محاورہ ہے اس کے لفظی معنیٰ کوئی بھی مراد نہیں لیتا۔

مطلب یہ ہے کہ ذوالقرنین مغربی مہم پر جب روانہ ہوا تو ملک پر ملک فتح کرتا ہوا ایک ایسے ملک پہنچ گیا جو خشکی کی آخری حد تھی۔ اس کے آگے جھیل نما سمندر تھا اس لئے اس سے آگے بڑھنے کا سوال ہی نہیں تھا۔

ذوالقرنین بادشاہ کی مغربی مہم: ذوالقرنین نے جب ریاستِ میڈیا (Media) کو فتح کرکے اپنی سابقہ ریاست پارس (یعنی فارس) کے ساتھ ملایا تو اس کے فوراً بعد ایشیائے کوچک (Asia Minor) (ترکی) کی ریاست لیڈیا (Lydia) کے بادشاہ کروئیس (Croesus) نے اس پر حملہ کر دیا۔ ذوالقرنین نے اس کا مقابلہ کیا اور اسے شکست دے کر تمام ایشیائے کوچک سمیت بحر روم (Mediterranean Sea) کے کنارے تک پورا مغربی حصّہ فتح کر لیا۔ ذوالقرنین ایک نیک اور رحم دل بادشاہ تھا اس نے اپنے دشمنوں کو شکست دینے کے بعد اُنہیں قتل نہیں کیا بلکہ ان کے ساتھ نیک رویہ اختیار کیا اور ان میں خصوصاً جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والے لوگ تھے ان سے بہت نرمی سے پیش آیا۔

علمی بات: ذوالقرنین نے سب سے پہلے مغرب کا رخ کیا اور مختلف ممالک فتح کرتا ہوا وہ ایشیائے کوچک (Asia Minor) کے مغربی ساحل تک پہنچ گیا جہاں زمین اور آبادی ختم ہو گئی اور تاحد نگاہ پانی ہی پانی تھا جو چھوٹی چھوٹی خلیجوں کی وجہ سے سیاہ کیچڑ کے چشمے کی طرح نظر آتا تھا اور اس کی لہروں میں سورج ڈوب رہا تھا۔ اگرچہ سورج تو زمین اور سمندر سے بہت بڑا ہے اور وہ اپنے مدار میں متحرک رہتا ہے اور کہیں ڈوبتا نہیں مگر سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر غروب آفتاب کا نظارا کرنے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا سورج پانی میں ڈوب رہا ہے۔

علمی بات: ذوالقرنین کے بارے میں یہ بات یقینی نہیں ہے کہ وہ پیغمبر تھے یا نہیں، اگر وہ پیغمبر تھے تو اللہ ﷻ نے یہ بات ان سے براہ راست وحی کے ذریعہ فرمائی ہو گی اور وہ پیغمبر نہیں تھے تو ان کو اس زمانہ کے کسی پیغمبر کے ذریعہ یہ بات پہنچائی ہو گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وحی کے بجائے الہام کے ذریعہ ان کے دل میں یہ بات ڈالی ہو گی۔ واللہ اعلم

علمی بات: مغرب میں سمندر کے قریب وہ قوم آبادی تھی جس نے ذوالقرنین کے ملک پر حملہ کیا تھا اور اس کا تاج و تخت چھیننے کی کوشش کی تھی۔ اب وہ قوم ذوالقرنین کے قبضہ میں آگئی تو اللہ ﷻ نے ذوالقرنین کے دل میں اس طرح بات ڈال دی جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں ڈالی تھی۔ کہ وہ موسیٰ (علیہ السلام) کو صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دیں۔ اسی طرح اللہ ﷻ نے ذوالقرنین کے دل میں بھی یہ بات ڈال دی کہ چاہے تو اس قوم سے بدلہ لے کیونکہ اس نے ذوالقرنین کے ملک پر حملہ کیا تھا اور چاہے تو اسے معاف کر دے۔

علمی بات: یہ قوم کافر تھی اس لئے اگلی آیات میں اللہ ﷻ نے ذوالقرنین کو اختیار دے دیا کہ تم چاہو تو ان سب کو پہلے ان کے کفر کی سزا دے دو اور چاہو تو ان سے احسان کا معاملہ کرو کہ پہلے دعوت و تبلیغ اور وعظ و پند سے ان کو اسلام و ایمان قبول کرنے پر آمادہ کرو پھر ماننے والوں کو اس کی جزا اور نہ ماننے والوں کو سزا دو۔ دوسری صورت کو اچھا رویہ قرار دے کر اللہ ﷻ نے اشارہ فرما دیا کہ یہ صورت بہتر ہے۔ چنانچہ ذوالقرنین نے دوسری ہی صورت کو تجویز کیا کہ اوّل ان کو وعظ و نصیحت سے صراطِ مستقیم پر لانے کی کوشش کرے گا پھر جو کفر پر قائم رہے ان کو سزا دے گا اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو اس کو اچھا بدلہ دے گا۔

آیت نمبر ۸۷: ذوالقرنین نے دوسری راہ اختیار کی اور قوم کو وعظ و نصیحت کے ذریعہ اسلام کی دعوت اور تعلیم دی۔ انہوں نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ قوم میں سے جو کفر اور بدامنی کر کے اپنے اور دوسروں پر ظلم کرے گا اسے دنیا میں سزا دی جائے گی۔ پھر قیامت کے دن اپنے رب کے حضور پیش ہونے پر بھی سخت ترین عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔

علمی بات: ذوالقرنین کا مغربی قوم سے سلوک کا ذکر ہے۔ چنانچہ ذوالقرنین نے دوسری راہ اختیار کی کہ اس قوم کو پوری طرح سمجھایا جائے اور اُنہیں اسلام کی دعوت دی جائے اور یہ فیصلہ کیا کہ اس کے نتیجہ میں جو لوگ اکڑ جائیں گے اور ظالموں کی روش اختیار کریں گے ہم صرف اُنہیں ہی سزا دیں گے اور اُنہیں سے سختی کا برتاؤ کریں گے پھر موت کے بعد جب ایسا آدمی اللہ ﷻ کی بارگاہ میں پیش ہو گا تو وہ اسے سخت عذاب بھی دے گا لیکن جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں گے اور اپنا طرزِ زندگی بدل کر نیک کام کرنے لگیں گے ان کو اللہ ﷻ کے ہاں اچھا اجر ملے گا اور ہم بھی ان سے نرمی کا برتاؤ کریں گے جیسا کہ ہر عادل بادشاہ کی یہ صفت ہوتی ہے کہ وہ غلبہ پانے کے بعد بدکردار لوگوں سے سختی سے پیش آتے ہیں اور بھلے لوگوں سے مہربانی کرتے اور ان سے مہربانی سے پیش آتے ہیں۔

علمی بات: واضح رہے کہ ذوالقرنین نے جس وقت اقتدار سنبھالا اس وقت اس کے اطراف میں ظالمانہ حکومتیں قائم تھیں اور انسانیت ظالم حکمرانوں سے تنگ آگئی تھی۔ چنانچہ بابل کی حکومت ظلم و جور کا بدترین نمونہ تھی جس نے بنی اسرائیل کو قید و بند کی زندگی گزارنے کے لئے مجبور کیا تھا۔ ان ظالم حکمرانوں کے ظلم اور بربریت سے نجات دلانے کا کام اللہ ﷻ نے جس کے ہاتھ سے لیا وہ ذوالقرنین تھا۔ قرآنِ حکیم نے ذوالقرنین کی جن فتوحات کا ذکر کیا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ اس نے انسانیت کو ظلم و فساد سے نجات دلانے کے لئے یہ اقدامات کیئے تھے اور یہ انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اس کا مطلب ملک گیری اور اپنی شان و شوکت بڑھانا ہرگز نہ تھا۔ دنیا میں جہاں ظلم کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں وہاں اللہ ﷻ کے کرشمۂ رحمت کا ظہور بھی ہوتا ہے اور انصاف کی ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔

آیت نمبر ۸۸: ذوالقرنین کے خطاب کا مزید بیان ہے۔ دعوتِ حق کو قبول کر کے ایمان اور نیک اعمال انجام دینے والے اللہ ﷻ کے یہاں بہتر اجر کے مستحق ہوں گے۔ دنیا میں بھی ان کے ساتھ نرمی اور خیر خواہی کا سلوک کیا جائے گا۔

علمی بات: اس سے واضح ہوا کہ ذوالقرنین کے پیشِ نظر صرف یہی مقصد نہیں تھا کہ مظلوم قوموں کو ظالم حکمرانوں کے پنجہ سے چھڑائیں بلکہ یہ اعلیٰ مقصد بھی پیشِ نظر تھا کہ لوگوں کو توحید کی راہ دکھادی جائے اور آخرت کی جوابدہی کا شعور پیدا کر کے ایک صالح زندگی گزارنے کے لئے آمادہ کیا جائے۔ ذوالقرنین کے ان اقدامات سے جن کا ذکر قرآنِ حکیم نے کیا ہے ایک بہت بڑی اصولی بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ اس پاکیزہ مقصد کے پیشِ نظر جنگی اقدامات کرنا جائز ہے۔

علمی بات: ذوالقرنین کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ میں اُنہیں راہ راست پر آنے کی دعوت دوں گا۔ جو لوگ اس دعوت کو قبول نہ کر کے ظلم کریں گے اُنہیں تو میں سزا دوں گا اور جو لوگ دعوت قبول کر کے ایمان عمل صالح اختیار کر لیں گے ان کے ساتھ میں رحمدلی اور آسانی کا معاملہ کروں گا۔ یعنی آخرت میں بھلائی ملے گی اور دنیا میں ہم اس پر سختی نہ کریں گے۔ بلکہ اپنے کام کے لئے جب کوئی بات اس سے کہیں گے سہولت اور نرمی کی کہیں گے۔ فی الحقیقت جو بادشاہ عادل ہو اس کی یہی راہ ہوتی ہے۔ بُروں کو سزا دے اور نیکوں سے نرمی کرے۔ ذوالقرنین نے یہی طریقہ اختیار کیا۔

علمی بات: تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین کا اپنی مفتوحہ قوموں کے ساتھ ایسا ہی رویہ تھا۔ اس کی فوج کے کسی سپاہی کی مجال نہ تھی کہ وہ مفتوحہ قوم کے کسی فرد پر ظلم کر سکتا۔ اس نے جن علاقوں کو بھی فتح کیا وہاں لوگوں کے ساتھ شفقت سے پیش آیا۔ جو پہلے سے ان پر بھاری ٹیکس عائد کیئے گئے تھے وہ اس نے سب معاف کر دیئے حتیٰ کہ خراج بھی لینا پسند نہ کیا جو ہر فاتح لیا کرتا ہے۔ اس کے بدترین دشمن بھی جب گرفتار کر کے اس کے سامنے لائے گئے تو اس نے اُنہیں معاف کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جو علاقے اس نے فتح کیئے وہاں کے رہنے والے لوگ اس کے سلوک سے متاثر ہو کر دل کی گہرائیوں سے اس کے وفادار ثابت ہوئے اور کہیں بھی اسے بغاوت سے سابقہ پیش نہیں آیا۔ اس سفر میں اس نے جس بادشاہ کو شکست دی تھی اس کے ساتھ اس کا رویہ حیرت انگیز حد تک فیاضانہ تھا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ ذوالقرنین نے اس بادشاہ کو اس کی موت تک اپنے محل میں رکھا اور اسے دس ہزار (۱۰۰۰۰) پیادے (پیدل، بغیر سواری کے) اور پانچ ہزار (۵۰۰۰) سوار عطا کیئے تاکہ اس کی ساکھ، معاشرتی حیثیت، شہرت اور عزت وغیرہ کو گزند نہ پہنچے۔

آیت نمبر ۸۹: مغرب میں فتح حاصل کرنے کے بعد ذوالقرنین نے مشرق کی طرف دوسرا سفر اختیار کیا۔

علمی بات: مغرب کے سفر کے بعد ذوالقرنین نے مشرق کے ممالک کا رخ کیا اور مشرقی جانب کی راہ پر چل دیئے، چلتے چلتے جب ایسی جگہ پہنچے جہاں آفتاب طلوع ہونے کی جگہ تھی (یعنی جانب مشرق میں آبادی کی انتہا پر پہنچ گئے) تو دیکھا کہ سورج ایسی قوم پر طلوع ہو رہا ہے کہ آفتاب کے اور ان کے درمیان اللہ ﷻ نے کوئی آڑ نہیں رکھی یعنی یہ قوم ایسی تھی جو دھوپ سے بچنے کے لئے کوئی مکان یا خیمہ نہیں بناتے تھے، کھلے میدان میں رہتے تھے (ممکن ہے کہ ان کے یہاں دھوپ کی تیزی زیادہ نہ ہوتی ہو اور دھوپ میں رہنے کی عادت پڑگئی ہو جیسے جنگلی جانور اس دھوپ میں گزارہ کرتے ہیں اور رہتے سہتے ہیں) اور بارش بھی کم ہوتی ہو اور تھوڑی بہت بارش ہونے پر درختوں کے نیچے پناہ لے لیتے ہیں۔

آیت نمبر ۹۰: علاقے فتح کرتے ہوئے ذوالقرنین اس جگہ پہنچ گئے جہاں مشرق کی جانب کافی آبادی تھی۔ ہاں ایک ایسی قوم کو پایا جو دھوپ سے بچاؤ کی کوئی تدبیر نہیں جانتی تھی۔

علمی بات: یہ ذوالقرنین کے دوسرے سفر کا ذکر ہے۔ اس سفر میں وہ دنیا کی انتہائی مشرقی آبادی تک جا پہنچے تھے۔ یہاں کچھ غیر متمدن لوگ رہتے تھے، ان میں مکان بنانے اور چھتیں ڈالنے کا دستور نہیں تھا، سب کھلے میدان میں رہتے تھے، اس لئے دھوپ سے بچاؤ کے لئے کوئی اوٹ نہیں تھی، بلکہ سورج کی کرنیں ان پر براہِ راست پڑتی تھیں۔ یعنی اس سرزمین پر نہ قدرتی کچھ پہاڑ درخت ایسے تھے کہ ان کی آڑ سے وہ لوگ دھوپ سے بچ سکیں۔ وہ صحرا میں خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہے تھے اور وحشی پن کے سبب سے نہ اتنی عقل ان لوگوں میں تھی کہ وہ مکان بنا دیں۔ زمین میں سرنگیں کھود رکھی تھیں، دھوپ کے وقت ان میں گھس جاتے تھے اور ٹھنڈے وقت میں ان سرنگوں سے نکل کر دنیا کا کچھ کام دھندا کر لیتے تھے۔

COPYRIGHTS © RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION. SALE OF THIS BOOK WOULD BE ENTIRELY CRIMINAL ACT

علمی بات: ذوالقرنین اپنی مشرقی مہم میں بلخ تک پہنچے جو افغانستان میں ہے اور دوسری طرف مکران تک جو بلوچستان میں ہے اس کے آگے پہاڑی سلسلہ تھا۔ یہاں خانہ بدوش قبائل رہتے تھے جو تہذیب و تمدن سے بالکل نا آشنا تھے۔ یہ وحشی قبائل ایران کی سرحد پر لوٹ مار کرتے اور فساد مچاتے رہے ہوں گے اس لئے ذوالقرنین نے ان کے علاقہ کی آخری حد تک پہنچ کر ان کی سرکوبی کی۔

آیت نمبر ۹۱: کذالک (اسی طرح) کے دو مفہوم ہیں: ۱۔ ذوالقرنین نے جو طرزِ عمل مغرب والوں کے ساتھ کیا تھا وہی مشرق والوں کے ساتھ کیا کہ دعوتِ حق پر ایمان لانے والوں کے لئے آسانی اور انکار کرنے والوں کو سزا کی تنبیہ دی۔ ۲۔ اللہ ﷻ ذوالقرنین کی صلاحیتوں، اسباب، وسائل اور جن حالات سے اُنہیں سابقہ پیش آیا ان سے خوب باخبر ہے۔

علمی بات: ذوالقرنین بادشاہ کے بارے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے واقعہ اسی طرح ہے۔ اللہ ﷻ نے ذوالقرنین کو ایسے وسائل عطا فرمائے جن کی وجہ سے اس نے وقت کی معلوم دنیا کے مغرب سے لیکر مشرق تک غلبہ حاصل کرلیا۔ نیز اللہ ﷻ کے علم میں ہے کہ اس کے پاس کس قدر سپاہ تھی اور اس کے پاس کیا کیا سامان تھا۔ ذوالقرنین بادشاہ نے جس قوم کو مشرق کے آخری حصہ میں پایا قرآنِ مجید میں ان کے بارے میں یہ نہیں بتایا کہ وہ مومن تھے یا کافر، اور نہ یہ بتایا کہ ان کے ساتھ ذوالقرنین نے کیا معاملہ کیا۔ اگر یہ لوگ کافر تھے تو بظاہر وہی معاملہ کیا ہوگا جو مغرب کی جانب رہنے والوں کے ساتھ کیا۔ (واللہ اعلم)

آیت نمبر ۹۲: مغرب و مشرق کی فتح کرنے کے بعد اب ذوالقرنین نے شمال کی طرف سفر کرنا شروع کیا۔

علمی بات: ذوالقرنین بادشاہ کی تیسری مہم اس علاقہ تک تھی جہاں یاجوج ماجوج کے حملے ہوا کرتے تھے۔ یہ یقیناً اس کی شمالی مہم تھی جس میں وہ بحر خزر (اسپین Spain) کو داہنی طرف چھوڑتا ہوا کاکیشیا کے سلسلہ کوہ تک پہنچ گیا تھا اور وہاں اسے ایک درہ ملا تھا جو دو پہاڑی دیواروں کے درمیان تھا۔ اسی راہ سے یاجوج ماجوج آ کر اس طرف کے علاقہ میں تباہی مچایا کرتے تھے اور یہیں اس نے دیوار تعمیر کی۔

آیت نمبر ۹۳: وہ ایسے مقام پر پہنچے جہاں دو پہاڑ ایک دوسرے کے مقابل تھے اور ان کے درمیان گھاٹی تھی۔ وہاں اُنہیں ایک ایسی قوم پر فتح حاصل ہوئی جو لوگوں سے دوری کی وجہ سے اپنی زبان کے علاوہ کوئی اور زبان نہیں جانتی تھی۔

علمی بات: یہ ذوالقرنین بادشاہ کی تیسری مہم ہے۔ قرآنِ کریم نے اس مہم کی سمت متعین نہیں فرمائی، لیکن بیشتر مفسرین کرام کا خیال یہ ہے کہ یہ سفر شمال میں دنیا کی انتہائی آبادی کی طرف ہوا تھا، یہاں کے لوگوں کی زبان بالکل مختلف تھی اور شاید حلیہ بھی ایسا ہو کہ ان میں سمجھ کے آثار نظر نہ آتے ہوں اور آگے ان سے جو گفتگو ہوئی ہے وہ یا تو کسی ترجمان کے ذریعہ ہوئی ہوگی یا اشاروں سے۔

علمی بات: مشرقی جانب منتہائے آبادی پر رہنے والی قوم سے فارغ ہو کر ذوالقرنین آگے بڑھے، چلتے چلتے ایسے مقام پر پہنچے جو بین السدین (دو پہاڑوں) کے درمیان تھا۔ سدین سے دو پہاڑ مراد ہیں ان کے درمیان خالی جگہ تھی۔ چونکہ آگے یہ ذکر آرہا ہے کہ ان دونوں پہاڑوں کے اس طرف یاجوج ماجوج کا علاقہ تھا، اس لئے لامحالہ ان پہاڑوں سے مراد کاکیشیا کے وہ پہاڑی سلسلے ہی ہو سکتے ہیں جو بحر خزر (سپین) اور بحر اسود کے درمیان واقع ہیں۔ ان دونوں کے درمیان درہ سے جہاں یاجوج ماجوج حملہ آور ہوئے تھے۔ ان پہاڑوں سے قدرے دور ایک ایسی قوم کو دیکھا جو کوئی بات سمجھنے کے قریب بھی نہ تھی۔ سمجھ بوجھ بھی بس یونہی تھوڑی بہت تھی لیکن دشمنوں کی وجہ سے پریشان بہت زیادہ تھے۔

علمی بات: معلوم ہوتا ہے "سدین" سے مقصود کاکیشیا کا پہاڑی درہ ہے کیونکہ اس کے داہنی طرف بحر خزر ہے جس نے شمال اور مشرق کی راہ روک رکھی ہے۔ بائیں جانب بحر اسود ہے جو شمال مغرب کے لئے قدرتی روکاوٹ ہے۔ درمیانی علاقہ میں اس کا سربہ فلک سلسلہ کوہ ایک قدرتی دیوار کا کام دے رہا ہے، پس اگر شمالی قبائل کے حملوں کے لئے کوئی راہ باقی رہی تھی تو وہ صرف اس سلسلہ کوہ کا ایک عریض درہ یا وسطی وادی تھی اور یقیناً وہیں سے یاجوج ماجوج کو دوسری طرف پہنچنے کا موقع ملتا تھا۔ اس راہ کے بند ہو جانے کے بعد نہ صرف بحر خزر سے لے کر بحر اسود تک کا علاقہ محفوظ ہوگیا بلکہ سمندروں اور پہاڑوں کی ایک ایسی دیوار قائم ہوگئی

جس نے تمام مغربی ایشیا کو اپنی پاسبانی میں لے لیا اور شمال کی طرف سے حملہ کا کوئی خطرہ باقی نہ رہا اب ایران، شام، عراق، عرب، ایشیائے کوچک، بلکہ مصر بھی شمال کی طرف سے بالکل محفوظ ہو گیا تھا۔

نقشہ میں یہ مقام دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام مغربی ایشیا نیچے ہے اوپر شمال میں بحر خزر ہے۔ اس سے بائیں جانب شمال مغرب میں بحر اسود ہے۔ درمیان میں بحر خزر کے مغربی ساحل سے بحر اسود کے مشرقی ساحل تک کاکیشیا کا سلسلہ کوہ چلا گیا ہے۔ ان دو سمندروں اور درمیان کے سلسلہ کوہ نے مل کر سینکڑوں میلوں تک ایک قدرتی روک پیدا کر دی ہے، اب اس روک میں اگر کوئی شگاف رہ گیا تھا جہاں سے شمالی اقوام کے قدم اس روک کو پھلانگ سکتے تھے تو وہ صرف یہی دو پہاڑوں کے درمیان کی راہ تھی ذوالقرنین نے اسے بھی بند کر دیا اور اس طرح شمال اور مغربی ایشیا کا یہ درمیانی پھاٹک پوری طرح بند ہو گیا۔

آیت نمبر ۹۴: یہ قوم یاجوج ماجوج کی لوٹ مار اور قتل و غارت سے عاجز آچکی تھی جو گھاٹی سے گزر کر آتی تھی۔ ذوالقرنین کے حُسنِ سلوک، قوت اور عقل و ہنر سے متاثر ہو کر قوم نے یاجوج ماجوج سے حفاظت کے لئے دیوار بنانے کی درخواست کی۔ اس سلسلہ میں آنے والی لاگت ادا کرنے کی پیش کش بھی کی۔ یاجوج ماجوج نہایت فسادی قوم ہے اور نسل انسانی میں سے ہے اور ان کی تعداد دوسری نسل انسانی کے مقابلہ میں زیادہ ہوگی۔ قیامت سے قبل ان کا ظہور بھی ہوگا اور یہ زمین پر خوب تباہی بھی مچائیں گے پھر ایک وبا سے ہلاک ہوں گے۔

علمی بات: ذوالقرنین کا اقتدار دیکھتے ہوئے قوم نے یاجوج ماجوج سے حفاظت کے لئے اور اپنی مصیبت سے چھٹکارا کے لئے (اشارہ وغیرہ کے ذریعہ) عرض کیا کہ اے ذوالقرنین! یاجوج ماجوج زمین میں فساد مچاتے ہیں۔ گھاٹی کے اس طرف رہتے ہیں یہ لوگ ہم پر حملہ آور ہو کر قتل و غارت گری کرتے ہیں اور ہم ان کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے۔ تو کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ ہم آپ کے لئے کچھ مال جمع کر دیں اور اس شرط پر آپ کو دے دیں کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان روکنے والی ایک آڑ بنا دیں۔ تاکہ وہ ہماری طرف نہ آسکیں۔

علمی بات: ذوالقرنین نے جواب دیا کہ مال جمع کرنے کی ضرورت نہیں مجھے میرے رب نے جو اختیار و اقتدار عطا فرمایا ہے جس میں مالی تصرفات بھی شامل ہیں وہ بہتر ہے، ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ تم اپنے ہاتھ پاؤں کی طاقت یعنی محنت و ہمت کے ذریعہ میری مدد کرو میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط آڑ بنا دوں گا۔ تم ایسا کرو کہ لوہے کے ٹکڑے لاؤ (چنانچہ ٹکڑے لائے گئے اور ان کو اینٹوں کی جگہ استعمال کیا اور اس طرح ان کی چنائی کی کہ ان کے درمیان لکڑی اور کوئلے رکھتے چلے گئے) یہاں تک کہ جب پہاڑوں کے درمیان والے خالی حصّہ کو پہاڑوں کے برابر کر دیا تو حکم دیا کہ اب دھونکو (پھونکنے کے آلات رکھ دیئے گئے اور چاروں طرف آگ جلا دی گئی) چنانچہ ان لوگوں نے دھونکنا شروع کیا اور اتنا دھونکا اتنا دھونکا کہ وہ لوہا آگ بن گیا۔ اندر کی لکڑیاں اور کوئلہ تو جل گیا اور لوہے کے ٹکڑے آگ کی طرح لال ہو کر آپس میں جڑ گئے۔ مضبوط دیوار کے لئے تو یہی کافی تھا لیکن انہوں نے مزید مضبوطی کے لئے یہ کیا کہ تانبا طلب کیا اور ان لوگوں سے کہا کہ میرے پاس تانبا لے آؤ تاکہ میں تانبا کو اس پر ڈال دوں، چنانچہ پگھلا ہوا تانبا اس لوہے میں ڈال دیا جو خوب زیادہ گرم تھا اول تو وہ خود ہی آپس میں مل کر جام ہو چکا تھا پھر اس کے اوپر پگھلا ہوا تانبا ڈال دیا گیا جو لوہے کے ٹکڑوں کے اندر بچی کھچی جگہوں میں داخل ہو گیا۔ اور اس طرح سے ایک مضبوط دیوار بن گئی۔ اس دیوار کی بلندی اور پختگی اور چکنے پن کی وجہ سے یاجوج ماجوج نہ اس پر چڑھ سکے اور نہ اس میں نقب لگا سکے۔ جب ذوالقرنین دیوار بنا کر فارغ ہوئے تو کہنے لگے: هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ (ذوالقرنین نے کہا) "یہ میرے رب کی رحمت ہے"۔ اور دیوار کا تیار ہو جانا مجھ پر اللہ ﷻ کی بڑی رحمت ہے مجھے اس نے اس کام میں لگایا اور ان لوگوں کے لئے بھی رحمت ہے جن کو یاجوج ماجوج دکھ دیتے تھے اور غارت گری کرتے تھے اب دیوار کے ادھر رہنے والوں کو اللہ ﷻ نے یاجوج ماجوج سے محفوظ فرما دیا۔

یاجوج ماجوج کے متعلق فرامین نبوی ﷺ: ۱۔ حضرت حذیفہ بن اسید غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم باتیں کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "کہ تم کیا باتیں کر رہے ہو؟" ہم نے عرض کیا کہ قیامت کا ذکر کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "کہ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک کہ دس نشانیاں اس سے پہلے نہیں دیکھ لوگے۔ پھر ذکر فرمایا دھوئیں، دجال، زمین کے جانور، سورج کے مغرب سے نکلنے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے

اترنے، یاجوج ماجوج کے نکلنے، تین جگہ خسف یعنی زمین کے دھنسنے کا۔ ایک مشرق میں، دوسرے مغرب میں، تیسرے جزیرہ عرب میں۔ ان سب نشانیوں کے بعد ایک آگ پیدا ہو گی جو یمن سے نکلے گی اور لوگوں کو ہانکتی ہوئی ان کے (میدان) محشر کی طرف لے جائے گی۔" (صحیح مسلم)

۲۔ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس گھبرائے ہوئے داخل ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمار ہے تھے کہ "تباہی ہے عربوں کے لئے اس بُرائی سے جو قریب آچکی ہے۔ آج یاجوج ماجوج کی دیوار سے اتنا کھل گیا ہے" اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے انگوٹھے اور اس کی قریب والی انگلی کو ملا کر ایک حلقہ بنایا۔ اتنا سن کر حضرت زینب بن جحش رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! تو کیا ہم اس کے باوجود ہلاک ہو جائیں گے کہ ہم میں نیک صالح لوگ بھی (موجود) ہوں گے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کہ ہاں جب بُرائی بہت بڑھ جائے گی۔" (صحیح بخاری)

علمی بات: یاجوج وماجوج (Gog & Magog) سے مراد وہ قومیں ہیں جو کوہ قاف (Caucasus) کے شمال میں آباد تھیں اور روس سے منگولیا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ وحشی قومیں تھیں اور قریبی ممالک پر حملہ آور ہو کر لوٹ مار کرتی تھیں۔ قرآنِ حکیم نے ان کا ذکر اس طور سے کیا ہے کہ وہ زمین میں فساد مچاتے تھے۔ قدیم روایات کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام کے بعد نسل انسانی آپ علیہ السلام کے تین بیٹوں سام حام اور یافث سے چلی تھی۔ ان میں سے سامی نسل تو بہت معروف ہے۔ قومِ عاد، قومِ ثمود اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سب سامی نسل میں سے تھے۔ حضرت یافث کی اولاد کے لوگ وسطی ایشیا کے پہاڑی سلسلہ کو عبور کر کے شمال کی طرف چلے گئے۔ وہاں سے ان کی نسل بڑھتے بڑھتے شمالی ایشیا اور یورپ کے علاقوں میں پھیل گئی۔ چنانچہ مشرق میں چین اور ہند چینی کی Yellow races مغرب میں روس اور سکنڈے نیوین ممالک کی اقوام مغربی یورپ کے Anglo Saxons مشرقی یورپ میں خصوصی طور پر شمالی علاقوں اور صحرائے گوبی کے علاقوں کی تمام آبادی حضرت یافث کی نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ تورات میں حضرت یافث کے بہت سے بیٹوں کے نام ملتے ہیں۔ ان میں Mosc , Tobal Gog & Magog وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ بہرحال یورپ کی اینگلو سیکسن اقوام اور تمام Nordic Races یاجوج ماجوج ہی کی نسل سے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ غیر متمدن اور وحشی لوگ تھے جن کا پیشہ لوٹ مار اور قتل وغارت گری تھا۔ وہ اپنے ملحقہ علاقوں پر حملہ آور ہوتے قتل وغارت کا بازار گرم کرتے اور لوٹ مار کر کے واپس چلے جاتے۔

علمی بات: ہمارا اس پر ایمان ہے کہ یاجوج ماجوج پیدا ہو چکے ہیں اور قربِ قیامت میں ان کا ظہور ہو گا۔ قرآنِ مجید اور احادیث مبارکہ میں ان کے مصداق کا تعین نہیں کیا اور نہ ان کی واضح اور حتمی صفات بیان کی ہیں۔ ان کی صفات اور مصداق کے متعلق جو کچھ بھی کہا گیا وہ سب ظن و تخمین اور اندازوں پر مبنی ہے، اس کی نظیر یہ ہے کہ ہمارا اس پر ایمان ہے کہ جنت اور دوزخ موجود ہیں لیکن ہم قطعی طور پر ان کی کیفیات کو بیان نہیں کر سکتے۔ (بعض اخبار احاد سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت سات آسمانوں کے اوپر اور عرش کے نیچے ہے لیکن یہ بھی قطعی نہیں ہے۔)

فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجے گا کہ میں نے اپنے ایسے بندے نکالے ہیں کہ ان سے لڑنے کی کسی میں طاقت نہیں، لہٰذا آپ میرے مسلمان بندوں کو طور پر جمع کریں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ یاجوج ماجوج کو نکالے گا، تو وہ ہر اونچائی سے نکل بھاگیں گے۔ ان کا پہلا حصہ جب بحیرۂ طبریہ پر پہنچے گا تو جتنا پانی اس میں ہو گا وہ تمام کا تمام پی جائیں گے، پھر ان کے بعد والے آئیں گے تو کہیں گے، کبھی اس میں پانی موجود تھا۔ پھر آگے چلیں گے، یہاں تک کہ اس پہاڑ پر پہنچیں گے جہاں درختوں کی کثرت ہے اور کہیں گے: ہم نے زمین والوں کو قتل کر دیا، آؤ اب آسمان والوں کو بھی قتل کر دیں۔ چنانچہ وہ اپنے تیر آسمانوں کی طرف پھینکیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے تیر خون آلود واپس پلٹائے گا۔ اس دوران میں اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے اصحاب محصور رہیں گے، یہاں تک کہ ان کے نزدیک بیل کا ایک سر تمہارے نزدیک جو سو (۱۰۰) دینار ہیں، ان سے بہتر ہو گا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے ساتھی اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان (یعنی یاجوج ماجوج) کی گردنوں پر کیڑے پیدا کر کے اُنہیں ایک لمحہ میں ایک نفس کی موت کی طرح ہلاک کر دے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے ساتھی زمین پر اتریں گے، مگر زمین میں ہر جگہ سڑاند اور بدبو پھیلی ہو گی، چنانچہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے ساتھی اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے تو اللہ تعالیٰ بختی اونٹوں کی گردنوں کے برابر

پرندے بھیجے گا جو اُنہیں وہاں سے لے جا کر دور پھینکیں گے، وہاں کہ جہاں اللہ ﷻ کا حکم ہوگا۔ پھر اللہ ﷻ بارش برسائے گا جو ہر مٹی اور خیمے والے گھر میں پہنچے گی اور اس کے ذریعہ سے اللہ ﷻ زمین کو اس طرح پاک صاف کر دے گا جس طرح زمین کوئی حوض یا باغ ہو۔ پھر زمین کو حکم ہوگا کہ اپنے پھل اگا اور برکتیں نکال، تو اس وقت ایک انار پوری جماعت کھا سکے گی اور اس کے چھلکے سے لوگ سایہ حاصل کریں گے اور ایک دودھ دینے والی اونٹنی کا دودھ کئی جماعتوں کے لئے کافی ہوگا۔ ایک دودھ دینے والی گائے کا دودھ ایک قبیلے کو کفایت کرے گا اور ایک دودھ دینے والی بکری کا دودھ ایک خاندان کو کافی ہوگا۔ لوگ اسی حال میں ہوں گے کہ اچانک اللہ ﷻ ایک ہوا بھیجے گا جو ان کی بغلوں کے نیچے سے اثر کرتی ہوئی گزرے گی اور ہر مومن و مسلم کو فوت کر دے گی، پھر صرف بدترین لوگ باقی رہ جائیں گے جو گدھوں کی طرح باہم جھگڑیں گے اور ان ہی پر قیامت قائم ہوگی۔ "(صحیح مسلم)

آیت نمبر ۹۵: اس قوم کی درخواست کو منظور کرتے ہوئے ذوالقرنین بادشاہ نے ان سے مالی امداد لینے سے انکار کر دیا۔ کہا کہ جو مال و دولت اور سلطنت اللہ ﷻ نے عطا کی ہے وہ اس معاوضہ سے بہت ہی بہتر ہے۔ البتہ قوم، افرادی قوت اور تعمیراتی سامان مہیا کر دے تو وہ ایک مضبوط دیوار بنا دیں گے جس کو وہ مفسد قوم عبور نہیں کر سکے گی۔

علمی بات: ذوالقرنین بادشاہ نے ان لوگوں کی درخواست سنی اور اسی وقت دیوار کی منظوری دے دی اور ان کو کہا کہ میرے پاس اللہ ﷻ کا دیا ہوا مال بحمد اللہ تعالیٰ بہت ہے۔ تم میرے ساتھ مالی تعاون نہ کرو، نہ مجھے تمہارے اس تعاون کی ضرورت ہے۔ ہاں! تم مالی تعاون کے بجائے اپنی افرادی طاقت و قوت کا تعاون مجھے دو۔ اس لئے کہ میرے یہ سپاہی اتنا کام سرانجام نہیں دے سکتے اور افرادی قوت کی اس سلسلہ میں زیادہ ضرورت ہے میں تمہارے درمیان اور اس قوم یاجوج ماجوج کے درمیان دیوار کھڑی کروں گا اور ان شاء اللہ وہ اس دیوار کے مکمل ہو جانے کے بعد تم پر حملہ آور نہیں ہو سکیں گے، اس سے ذوالقرنین کی سیر چشمی، فراخ دلی اور سخاوت نفس کے ساتھ ساتھ رعایا کو دشمن سے محفوظ رکھنے کے لئے مضبوط ترین دفاع کا بندوبست کرنا واضح ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے اس جگہ کی لمبائی، دیوار کی چوڑائی اور اونچائی کا خوب جائزہ لیا اور جو کچھ سامان اس کے لئے چاہیئے تھا اس کو اکٹھا کرنے کے لئے ایک پروگرام مرتب کیا۔

علمی بات: فقہاء کرام نے یہاں دو مسئلے اخذ کیئے ہیں ایک یہ کہ بادشاہ کو جائز ہے کہ رعایا کی درخواست پر اس کی رفاہ عام و تحفظ کے سامان اور اثاثے وغیرہ لوگوں سے معاوضہ واجرت لے کر درست کر دے۔ دوسرا یہ کہ اجرت جس طرح مال سے صحیح ہے محنت یا کام سے بھی صحیح ہے۔ جیسا کہ ذوالقرنین نے ان سے کہا کہ کام تم کرو دیوار میں بنوائے دیتا ہوں۔ اس میں معاوضہ کی صورت محنت و مشقت اور افرادی قوت کی صورت میں بھی آگئی اور مال کی شکل میں بھی۔

کسی بھی ملک کے سربراہ کے فرائض میں سے ہے کہ وہ اپنی رعیت کی حفاظت کرے اور ان کی ضروریات کو پورا کرے اور ان کی سرحدوں کی اصلاح کرے، ان کے مال سے جو ان پر لازم کیئے گئے ہیں اور ان حقوق سے جو اس کے ذریعہ ان کے خزانہ میں جمع ہیں حتیٰ کہ اگر حقوق اس خزانہ کو ختم بھی کر دیں اور ضروریات اسے صفر تک پہنچا دیں تو ان کے اموال سے ٹیکس لیا جائے گا اور حکمران پر ضروری ہے کہ وہ رعیت کے بارے میں عمدہ اور بہتر انداز میں غور و فکر کرے۔ یہ تین شروط کے ساتھ ہے: ا۔ وہ کسی چیز کے ساتھ اپنے آپ کو ترجیح نہ دے۔ ۲۔ پہلے اس مال سے حاجت مندوں پر خرچ کرے اور ان کی مدد کرے۔ ۳۔ ہر ایک کو اس کی قدر و منزلت کے مطابق عطا کرے۔ اس کے بعد اگر مال ختم ہو جائے اور خزانہ خالی ہو جائے اور حوادثات ظاہر ہوں تو حکمران لوگوں کو اموال کے خرچ کرنے سے پہلے اپنے جسموں کو پیش کرنے کے لئے کہے اگر جسمانی طاقت سے کام نہ چلے تو پھر تدبیر کے تصرف و تقدیر پر ان سے اموال لیئے جائیں گے۔

علمی بات: اس سے مفسرین کرام یہ بات بھی اخذ کرتے ہیں کہ کسی اچھی حکومت کے مناسب حال نہیں کہ وہ لوگوں سے بلاوجہ ٹیکس وصول کر کے اپنی عیاشی کے کاموں میں خرچ کرے، بلکہ اچھی حکومت وہ ہے جو ذوالقرنین کی طرح لوگوں کی بے لوث خدمت کرے۔

آیت نمبر ۹۶: ذوالقرنین بادشاہ نے دیوار بنانے کے لئے لوہے کی چادریں مہیا کرنے کا حکم دیا۔ لوہے کی چادروں سے دیوار اٹھا کر اسے دونوں پہاڑوں کی چوٹیوں کے برابر بلند کر دیا گیا۔ پھر لوہے کی چادروں کو خوب گرم کر کے پگھلا ہوا تانبا ان پر بہا دیا گیا جس سے دیوار مضبوط ہو گئی۔ اس طرح بھرپور فن تعمیر، بہترین ٹیکنالوجی اور زبردست وسائل کا استعمال ہوا جس سے آہنی دیوار تعمیر ہوئی۔

علمی بات: یہ سب کام اس زمانہ میں بظاہر خارق عادت طریقہ سے انجام پائے ہوں گے جسے ذوالقرنین بادشاہ کی کرامت سمجھنا چاہیئے۔ یا ممکن ہے اس وقت اس قسم کے آلات و اسباب پائے جاتے ہوں جن کا ہمیں اب علم نہیں۔

علمی بات: پہلے لوہے کے بڑے بڑے تختوں کی اوپر نیچے تہیں جمائی گئیں جب ان کی بلندی دونوں طرف کی گھاٹیوں تک پہنچ گئی تو لوگوں کو حکم دیا کہ خوب آگ دھونکو اور اس کے لئے لکڑی اور کوئلہ کو استعمال میں لایا گیا۔ جب لوہا آگ کی طرح سرخ ہوگیا تو پگھلا ہوا تانبا اوپر ڈالا گیا جو لوہے کی چادروں کی درزوں میں جم کر پیوست ہوگیا اور یہ سب کچھ مل کر پہاڑ سا بن گیا بظاہر ایسی دیوار کی تعمیر ایک حیران کن اور بالخصوص اس دور میں ایک خرقِ عادت واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم اہرامِ مصر اور ان کے دور تعمیر کی طرف نظر کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ایسے ایسے آلات تعمیر پائے جاتے تھے جن کا آج تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

علمی بات: اس دیوار کے آثار بحیرۂ کیسپین کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ داریال اور دربند کے درمیان اب بھی موجود ہیں۔ یہ دیوار پچاس میل لمبی انتیس فٹ اونچی اور دس فٹ چوڑی تھی۔ آج سے سینکڑوں سال پہلے لوہے اور تانبے کی اتنی بڑی کہ مصر کے اسوان ڈیم سے بھی بڑی دیوار تعمیر کرنا یقیناً ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بنیادیں وغیرہ تو پتھر سے بھری گئی ہوں گی اور اوپر سے اس درہ کو لوہے کی چادروں کے دروازہ سے بند کیا گیا ہوگا۔ صدیوں بعد سیاحوں کے مشاہدہ میں ایک آہنی دیوار مقام دربند میں نظر آئی اور اس کا نام سد سکندری ہی مشہور تھا اور وہ پھاٹک بابُ الحدید (لوہے کا دروازہ) ہی کہلاتا تھا۔ دربند وسطِ ایشیا کے مشرقی حصّہ میں ضلع حصار میں واقع ہے۔ یہ بخارا سے کوئی ۱۵۰ میل جنوب و مشرق میں۔ ۳۸ درجہ عرض البلد شمالی اور ۶۷ درجہ طول البلد مشرقی پر واقع ہے۔ اس کا ذکر مشہور یورپین سیاح مارکوپولو نے اپنے سفر نامہ میں بھی کیا ہے۔

شمال مشرق کے اس علاقہ کا بڑا حصّہ اب منگولیا کہلاتا ہے لیکن منگول لفظ کی ابتدائی شکل کیا تھی؟ اس کے لئے جب ہم چین کے تاریخی مصادر کی طرف رجوع کرتے ہیں (اور ہمیں اسی طرف رجوع ہونا چاہیئے کیونکہ وہ منگولیا کے ہم سایہ میں ہے) تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم نام موگ تھا۔ یقیناً یہی موگ جو چھ سو برس قبل مسیح یونانیوں میں میگ اور مے گاگ پکارا جاتا ہوگا اور یہی عبرانی میں ماجوج ہوگیا۔

علمی بات: تمام تاریخی قرائن متفق طور پر شہادت دے رہے ہیں کہ اس سے مقصود صرف ایک ہی قوم ہو سکتی ہے اس کے سوا کوئی نہیں، یعنی شمال مشرقی میدانوں کے وہ وحشی مگر طاقت ور قبائل جن کا سیلاب قبل از تاریخ عہد سے لے کر نویں صدی مسیحی تک برابر مغرب کی طرف اُمنڈتا رہا، جن کے مشرقی حملوں کی روک تھام کے لئے چینیوں کو سینکڑوں میل لمبی دیوار بنانی پڑی تھی، جن کی مختلف شاخیں تاریخ میں مختلف ناموں سے پکاری گئی ہیں اور جن کا آخری قبیلہ یورپ میں میگر کے نام سے روشناس ہوا اور ایشیا میں تاتاریوں کے نام سے۔ اسی قوم کی ایک شاخ تھی جسے یونانیوں نے سیتھین کے نام سے پکارا ہے اور اسی کے حملوں کی روک تھام کے لئے ذوالقرنین نے سدّ تعمیر کی تھی۔

آیت نمبر ۹۷: وہ مضبوط دیوار بن گئی۔ یاجوج ماجوج اس دیوار کو نہ پھلانگ سکتے تھے اور نہ ہی اس دیوار میں سوراخ کرنے کی طاقت رکھتے تھے۔

علمی بات: ذوالقرنین نے ان کی خواہش کے مطابق ایسی مضبوط اور بلند دیوار تعمیر کر دی جس کو عبور کرنا یاجوج و ماجوج کے لئے مشکل ہوگیا۔ انہوں نے اس کو پھاندنے یا اس کو گرانے کے جتنے جتن کیئے اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر میں اس حقیقت کی طرف اُنہیں توجہ دلائی کہ یہ دیوار اسی وقت تک تمہیں ان وحشیوں کی دست برد سے بچا سکتی ہے جب تک اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوگی اور جب اس کے نزدیک اس کی معیاد ختم ہوگئی اور ان کے خروج کا وقت آگیا تو یہ مضبوط دیوار ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔

آیت نمبر ۹۸: اس حیرت انگیز فعل کو انجام دینے کے بعد ذوالقرنین نے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا۔ متاثر قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس نے مفسدوں کا راستہ بند کرنے کی توفیق بخشی۔ اگرچہ یہ مضبوط دیوار بنا دی گئی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے وعدہ کا وقت آنے پر اسے گرا کر زمین کے برابر کر دیا جائے گا۔ وعدے کے وقت سے مراد دیوار کی تباہی کا وقت ہے یا قربِ قیامت کا وقت۔ کفارِ مکہ کے سوال کا جواب ہی نہیں دیا گیا بلکہ ان پر واضح کر دیا گیا کہ ذوالقرنین ایک طاقت ور بادشاہ ہونے کے باوجود توحید اور آخرت کا قائل تھا۔

علمی و عملی بات: ذوالقرنین نے دیوار بنا کر اسے اپنا کارنامہ قرار دینے کے بجائے اپنے رب کی رحمت قرار دیا، جس کی بدولت وہ لوگ یاجوج ماجوج کے حملوں سے محفوظ ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی مضبوطی کے باوجود اسے لازوال قرار دینے کے بجائے فرمایا: کہ جب میرے رب کا وعدہ آئے گا تو وہ اسے زمین کے برابر کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ ہمیشہ سے سچا ہے۔ ذوالقرنین کی بات اور دو باغوں والے بے ایمان شخص کی بات کا موازنہ کریں، جو اپنے باغوں کو کبھی برباد نہ ہونے والا کہہ رہا تھا تو مومن و کافر کی سوچ کا فرق صاف واضح ہو جاتا ہے ذوالقرنین کی اس بات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ساری دنیا کی بادشاہت ملنے کے باوجود آخرت کی فکر ہر وقت رہنی چاہیئے، کیونکہ دنیا فانی ہے اور آخرت ہمیشہ رہنے والی ہے۔

علمی بات: دشمن کے مقابلہ میں "لوہے کی دیوار" کھڑی کرنا ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر عام طور پر لوگوں میں فخر اور گھمنڈ کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر ذوالقرنین نے ایسی ناقابل تسخیر دیوار کھڑی کرنے کے بعد بھی اپنی تواضع نہیں کھوئی اس کی نظر اپنی مصنوعات پر نہیں تھی بلکہ اللہ ﷻ کے اختیارات پر تھی اور اللہ ﷻ کے مقابلہ میں کسی انسان کو کوئی زور حاصل نہیں۔

آیت نمبر ۹۹: اس آیت کے دو مفہوم ہیں: ۱۔ جب دیوار ٹوٹ جائے گی تو یاجوج وماجوج بے شمار تعداد میں نکلیں گے۔ ۲۔ روز قیامت صور پھونکے جانے پر لوگ قبروں سے اٹھ کر سمندر کی لہروں کی طرح ایک دوسرے میں گھس جائیں گے۔ پھر تمام لوگوں کو میدانِ حشر میں جمع کیا جائے گا۔

علمی بات: اس سے مراد یاجوج ماجوج کا وہ ریلا بھی ہو سکتا ہے جو قیامت کے قریب نکلے گا اور مطلب یہ ہے کہ جب وہ قیامت کے قریب نکلیں گے تو ایک غیر منظم بھیڑ کی شکل میں نکلیں گے اور موجوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہوں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ قیامت کے وقت عام لوگوں کی بدحواسی کا بیان ہو کہ قیامت کے ہولناک مناظر دیکھ کر لوگ بدحواسی میں ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہوں گے۔

علمی بات: ہر اہم دنیوی واقعہ وحادثہ میں آخرت کی یاد دلا دینا عین دستور قرآنی کے مطابق ہے۔

آیت نمبر ۱۰۰: روز قیامت جہنم کو کفار کے سامنے لایا جائے گا۔

علمی بات: آج لوگوں کو عقل کی آنکھ سے جہنم دکھائی جا رہی ہے تو وہ ان کو نظر نہیں آتی۔ قیامت میں لوگوں کو پیشانی کی آنکھ سے جہنم دکھائی جائے گی۔ اس وقت ہر آدمی دیکھ لے گا۔ مگر یہ دیکھنا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کیونکہ نصیحت کے ذریعہ جس نے اپنی آنکھ کا پردہ ہٹایا وہی پردہ ہٹانے والا ہے۔ ورنہ قیامت کے دن پردہ ہٹایا جانا تو صرف اس لئے ہو گا کہ سرکشی کرنے والوں کو ان کے آخری انجام تک پہنچا دیا جائے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قیامت کے دن جہنم کو اس حالت میں لایا جائے گا کہ اس کی ستر ہزار رسیاں ہوں گی جن سے اسے کھینچا جا رہا ہو گا، اور ہر رسی پر ستر ہزار فرشتے مقرر ہوں گے جو اس کے ذریعہ اسے کھینچ رہے ہوں گے۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۱۰۱: جہنم کا عذاب ان لوگوں کے لئے سامنے لایا جائے گا جن کی آنکھوں پر دنیا میں غفلت کے پردے پڑے ہوں گے اور جنہوں نے حق کے لئے کانوں کو بہرا بنا رکھا تھا۔ جس مقصد کے لئے اُنہیں آنکھ اور کان عطا کیئے گئے تھے ان سے انہوں نے وہ کام نہیں لیا۔

علمی بات: اس دن اللہ ﷻ جہنم کو کافروں کے سامنے لے آئے گا، وہ اسے دیکھیں گے اور اس کی غیظ و غضب بھری آواز سن کر شدید حزن وملال میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہ وہ کفار ہوں گے جن کی آنکھوں پر دنیا میں پردہ پڑ گیا تھا اور جن کی قوت سماعت یکسر جاتی رہی تھی، اس لئے نہ ان دلائل و براہین سے اُنہیں کوئی فائدہ پہنچا جو اللہ ﷻ کی وحدانیت پر دلالت کرتی تھیں۔ نہ اُنہیں قرآنِ کریم کی تلاوت اور اس کی آیات میں غور و فکر کی توفیق ہوئی، ان کی قوت سماعت ایسی معدوم ہو گئی تھی کہ حق وہدایت کی بات سننے سے بالکل ہی محروم ہو گئے تھے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "پھر قیامت کے دن تم میں سے ہر شخص اللہ ﷻ کے سامنے کھڑا ہو گا۔ اس کے اور اللہ ﷻ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہو گا اور نہ ان کے درمیان کوئی ترجمان ہو گا۔ پھر اللہ ﷻ اس سے فرمائے گا، کیا میں نے تجھ کو (دنیا میں) مال

نہیں دیا تھا؟ وہ کہے گا، کیوں نہیں (بے شک تونے دیا تھا)۔ پھر فرمائے گا، کیا میں نے تیرے پاس رسول نہیں بھیجا تھا؟ وہ کہے گا، کیوں نہیں (تو نے بھیجا تھا)۔ پھر وہ شخص اپنی دائیں طرف دیکھے گا تو سوائے آگ کے کچھ نظر نہیں آئے گا، بائیں طرف دیکھے گا تو سوائے آگ کے کچھ نظر نہیں آئے گا۔ تو تم میں سے ہر شخص کو آگ سے ضرور بچنا چاہیئے، اگرچہ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی دے کر سہی، اگر یہ بھی نہ ملے تو میٹھی بات کہہ کر سہی۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

علمی بات: اس دن سرکش منکر اور کفار مشرک جہنم کو صاف دیکھیں گے جو ایمان لانے سے اندھے بنے ہوئے تھے اور آواز حق سے بہرے تھے۔ چونکہ ذوالقرنین کا واقعہ قریش مکہ کے سوال پر بیان کیا گیا تھا اور یہ سوال اُنہیں یہودیوں نے سمجھایا تھا اور جواب ملنے پر بھی نہ مشرکین مکہ نے اسلام قبول کیا اور نہ یہود مدینہ نے اس لئے آخر میں ان کو قیامت کا دن یاد دلایا اور بتایا کہ ہم سب کو ایک ایک کر کے جمع کر لیں گے اور کوئی بچ کر نہ نکل سکے گا، کافر دوزخ میں جائیں گے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا تھا اور حق سننے کو تیار نہ تھے اپنی قوت سماعت وبصارت دونوں کو معطل کر رکھا تھا لہٰذا اُنہیں حق سے منہ موڑنے کی سزا ملے گی۔

آیت نمبر ۱۰۲: کفار اللہ ﷻ کے بجائے اللہ ﷻ کی مخلوق کو اپنا معبود اور کارساز بناتے ہیں۔ پھر گمان کرتے ہیں کہ اس طرح وہ اللہ ﷻ کی گرفت سے بچا لیئے جائیں گے جو کہ ناممکن ہے۔ ان کی مہمان نوازی کے لئے جہنم کی آگ تیار ہے۔ (معاذ اللہ)

علمی بات: کافروں کے بارے میں فرمایا کہ اُنہیں پہلے سے بتادیا گیا ہے کہ کفر کا انجام بُرا ہے، ان کے لئے دوزخ ہے پھر بھی کفر پر جمے ہوئے ہیں اور شرک اختیار کیئے ہوئے ہیں۔ میرے بندوں کو اپنا معبود اور کارساز بنا رکھا ہے اور اس کو اپنے لئے بہتر سمجھتے ہیں۔ کفر اور شرک کو بہتر سمجھنا حماقت اور جہالت ہے۔ کافروں کے لئے جہنم کو تیار کیا گیا ہے۔ اسی سے ان کی مہمانی ہوگی۔

علمی بات: عبادی سے مراد اس جگہ فرشتے اور وہ انبیاء کرام علیہم السلام ہیں جن کی دنیا میں لوگوں نے پرستش کی اور ان کو اللہ ﷻ کا شریک ٹھہرایا جیسے حضرت عزیر اور مسیح علیہما السلام اور فرشتوں کی عبادت کرنے والے بعض عرب تھے اور حضرت عزیر علیہ السلام کو یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نصاریٰ نے خدا کا شریک قرار دیا اس لئے "الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا" سے اس آیت میں کفار کے یہی فرقے مراد ہیں اور جن مفسرین کرام نے اس جگہ عبادی سے مراد شیاطین لئے تو الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا سے وہ کفار مراد ہوں گے جو جنات و شیاطین کی پرستش کرتے ہیں بعض مفسرین نے اس جگہ لفظ "عبادی" کو مخلوق و مملوک کے معنی میں لے کر عام قرار دیا جس میں سب معبوداتِ باطلہ بت، آگ اور ستارے بھی داخل ہو گئے۔

منکرین یہ گمان کرتے تھے کہ وہ اللہ ﷻ کے خاص بندوں (مسیح علیہ السلام، عزیر علیہ السلام، روح القدس، فرشتوں) کی پرستش کر کے اپنی حمایت میں کھڑا کر لیں گے۔ جب کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اور انہوں نے اللہ کے سوا اور معبود بنالیئے تاکہ وہ ان کے لئے باعثِ عزت ہوں۔ ہرگز (ایسا) نہیں (ہے)! عنقریب یہ معبود خود ہی اُن کی پوجا سے انکار کریں گے اور ان کے مخالف ہو جائیں گے۔" (سورۂ مریم ۱۹، آیات: ۸۱، ۸۲)

آیت نمبر ۱۰۳: سوالیہ انداز میں قیامت کے دن اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ خسارہ پانے والے لوگوں کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

علمی و عملی بات: اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ خسارہ اور نقصان میں وہ لوگ ہیں جو دن رات دنیا کے حصول کے لئے مارے مارے پھرتے ہیں ان کی زندگی کا بس ایک ہی مقصد ہے کہ زیادہ سے زیادہ دولت جمع کی جائے۔ مکانات و محلات تعمیر کیئے جائیں۔ دنیا میں مناصب عالیہ پر فائز ہوں اُنہیں کبھی اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ اُنہیں اپنی موت کو یاد کرنے کی کبھی فرصت ہی نہیں ملی۔ ان کی توانائی کا ایک ایک قطرہ متاع دنیا کے حصول میں ضائع ہو کر رہ گیا ہے اور اس کشاکش میں وہ تھک کر چور ہو گئے ہیں۔ اُخروی سعادت کے حصول کے لئے ان میں اب ذرا ہمت نہیں۔ خود غور فرمائیے! طالبِ دنیا کا یہ کتنا صحیح نقشہ ہے۔ اس کے باوجود اُنہیں اپنے کیئے پر کوئی ندامت نہیں بلکہ اپنی قابلیت پر نازاں ہیں اور اپنی جدوجہد کے ان نتائج پر بالکل مطمئن ہیں۔ اللہ ﷻ کی یاد سے روگردانی کر کے جو نقصان عظیم انہوں نے اٹھایا اس کا اُنہیں احساس تک بھی نہیں رہا۔

آیت نمبر ۱۰۴: یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی ساری محنتیں صرف دنیا پانے کے لئے ہیں اور جنہیں آخرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنی دُنیاوی کامیابیوں پر ناز کرتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ وہ اچھے اعمال انجام دے رہے ہیں۔ جو شخص بھی آخرت کے مقابلہ میں صرف طالب دنیا ہے وہ اس آیت کا مصداق ہے۔

علمی بات: یہ آیات اپنے مفہوم عام کے اعتبار سے ہر اس فرد یا جماعت کو شامل ہیں جو کچھ اعمال کو نیک سمجھ کر اس میں جدوجہد اور محنت کرتے ہیں مگر اللہ ﷻ کے نزدیک ان کی محنت برباد اور عمل ضائع ہے۔ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ صورت دو چیزوں سے پیدا ہوتی ہے ایک فساد اعتقاد، دوسرے ریاکاری یعنی جس شخص کا عقیدہ اور ایمان درست نہ ہو وہ عمل کتنے ہی اچھے کرے اور کتنی ہی محنت اٹھائے وہ آخرت میں بیکار اور ضائع ہے۔

اسی طرح جس کا عمل مخلوق کو خوش کرنے کے لئے ریاکاری سے ہو وہ بھی عمل کے ثواب سے محروم ہے۔ البتہ یہاں اس سے اصل مراد وہی کفار ہیں جو اللہ ﷻ اور قیامت اور حساب وکتاب کے منکر ہوں۔

علمی بات: کافروں کی کئی قسمیں ہیں ان میں سے بہت سے تو ایسے ہیں جو اللہ ﷻ کے وجود ہی کے قائل نہیں اور دنیا کمانے میں لگے ہوئے ہیں اور اسی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اللہ ﷻ کو مانتے ہیں لیکن شرک میں لگے ہوئے ہیں اور اللہ ﷻ نے جو دین بھیجا ہے اسے نہیں مانتے دوسرے دینوں کو اختیار کیئے ہوئے ہیں ان میں بعض وہ بھی ہیں جو عبادت کے عنوان سے بڑی بڑی محنتیں اور ریاضتیں کرتے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو دنیا ہی پر پلے بڑھے ہیں ان لوگوں کی دُنیاوی محنتیں اور مذہبی ریاضتیں سب برباد ہیں یہ لوگ اعمال کے اعتبار سے بدترین خسارہ میں ہیں کیونکہ آخرت میں ان اعمال پر کچھ نہیں ملنا، نتیجہ یہ ہو گا کہ نہ صرف انعامات سے محروم ہوں گے بلکہ عذاب میں پڑیں گے اور سمجھ یوں رہے ہیں کہ ہم اچھے کام کر رہے ہیں۔

آیت نمبر ۱۰۵: خسارہ پانے والوں نے اللہ ﷻ کی آیات اور اس کے سامنے حاضر ہونے کا انکار کیا۔ دنیاداری کرتے ہوئے جو ظاہری نیکیاں کرتے رہے وہ قبول نہ ہوں گی۔ روز قیامت ان کے ایمان اور اخلاص سے پہلوتہی اعمال اس قابل نہ ہوں گے کہ ان کا وزن کیا جائے۔

علمی بات: رب کی آیات سے مراد توحید کے وہ دلائل ہیں جو کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں اور وہ آیات شرعی ہیں اور جو اس نے اپنی کتابوں میں نازل کیں اور پیغمبروں نے تبلیغ و توضیح کی اور کھول کر ان کو بیان فرمایا۔ رب کی ملاقات سے کفر کا مطلب آخرت کی زندگی اور دوبارہ جی اٹھنے سے انکار ہے۔

اللہ ﷻ کے ہاں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی یا یہ مطلب ہے کہ اللہ ﷻ ان کے لئے میزان کا اہتمام ہی نہیں فرمائے گا جس میں ان کے اعمال تولے جائیں، اس لئے کہ اعمال تو اللہ ﷻ کو ایک ماننے والوں کے تولے جائیں گے جن کے نامۂ اعمال میں نیکیاں اور بُرائیاں دونوں ہوں گی، جب کہ ان کے نامۂ اعمال نیکیوں سے بالکل خالی ہوں گے۔

عملی پہلو: ایسے لوگ جو بے شک اقرار کرتے ہوں کہ وہ اللہ ﷻ کو اور اُس کی آیات کو مانتے ہیں لیکن اگر حقیقتاً وہ آخرت کو بھلا کر دن رات دنیا سمیٹنے ہی میں مصروف ہیں تو اپنے عمل سے گویا وہ اللہ ﷻ کی آیات اور آخرت میں اس سے ہونے والی ملاقات کا انکار کر رہے ہیں۔ اللہ ﷻ کا فیصلہ تو یہ ہے: وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ۔ "اور بے شک آخرت کا گھر ہی (اصل) زندگی ہے"۔ (سورۃ العنکبوت ۲۹، آیت: ۶۴) لیکن دنیا کے طلب گاروں کا عمل اللہ ﷻ کی اس بات کی تصدیق کرنے کے بجائے اس کو جھٹلاتا ہے۔ اس لئے فرمایا گیا کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ ﷻ کی آیات کو اور اس کے سامنے روز محشر کی حاضری کو عملی طور پر جھٹلا دیا ہے۔

علمی و عملی بات: قیامت کے دن ایسے لوگوں کے اعمال کا وزن نہیں کیا جائے گا۔ اگر انہوں نے اپنے دل کی تسلّی اور ضمیر کی خوشی کے لئے بھلائی کے کچھ کام کیئے بھی ہوں گے تو ایسی نیکیاں جو ایمان اور یقین سے خالی ہوں گی ان کی اللہ ﷻ کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ چنانچہ ان کی ایسی تمام نیکیاں ضائع کر دی جائیں گی اور میزان میں ان کا وزن کرنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ اس بھیانک انجام کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ دنیا کی آرائش و زیبائش میں گم ہو کر انسان کو نہ

اللہ ﷻ کا خیال رہتا ہے اور نہ آخرت کی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ دنیا کی زیب وزینت کے حوالہ سے یہ مضمون اس سورت میں آیات: ۷، ۲۷اور ۴۶ میں بار بار دُہرایا گیا ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قیامت کے دن ایک موٹا تازہ بھاری بھرکم آدمی آئے گا، لیکن اللہ ﷻ کے نزدیک اس کا وزن مچھر کے ایک پَر کے برابر بھی نہیں ہو گا۔" پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "اگر تم چاہو تو (بطور دلیل) اس آیت کی تلاوت کر لو: فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا "پس ہم قیامت کے دن ان کے لئے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے۔" (سورۃ الکھف: آیت: ۱۰۵) (صحیح بخاری)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ کسی مومن پر ایک نیکی کے معاملہ میں بھی ظلم نہیں کرے گا، اسے اس کا بدلہ دنیا میں بھی دے گا اور آخرت میں بھی دے گا اور کافر کو اس کی نیکیوں کا بدلہ جو اس نے اللہ ﷻ کے لئے کی ہوں گی، دنیا ہی میں دے دیا جائے گا، پھر جب وہ آخرت میں پہنچے گا تو اس کے پاس کوئی نیکی نہیں رہے گی کہ جس کا اسے بدلہ دیا جائے۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۱۰۶: دنیا کو ہی مقصود بنانے والوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔ انہوں نے اللہ ﷻ کے احکامات اور انبیاء کرام علیہم السلام کی باتوں کو نہ مانا اور ان کی تعلیمات کو انتہائی غیر سنجیدگی سے لیا۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر الہامی تعلیمات کا مذاق اڑانے لگے۔ (معاذ اللہ)

علمی بات: اس آیت میں بتایا گیا کہ ایسا کیوں ہو گا؟ فرمایا اس لئے کہ وہ دنیا کی زندگی پر مغرور تھے اور ان کے غرور کی حد یہ ہے کہ انہوں نے اپنے عمل سے بھی اور نظریہ سے بھی اللہ ﷻ کی آیات میں اور اس کے رسولوں کا مذاق اڑایا (معاذ اللہ)۔ ظاہر ہے کہ کسی کے حکم اور اس کی مرضی کے خلاف اس کو دکھا کر عمل کیا جائے تو اس سے زیادہ بڑا مذاق اور ٹھٹھا اور کیا ہو سکتا ہے؟ ان لوگوں کے پاس اللہ ﷻ کی ہدایت آئی اور اللہ ﷻ کے رسول کی حدیث شریف پڑھی گئی لیکن انہوں نے ہر بات کو سن کر ان سنی اور ان سمجھی کر دیا۔ اس لئے ضروری ہے کہ آج ان کی ایک نہ سنی جائے اور ان کو دوزخ میں جھونک دیا جائے۔

علمی بات: آخرت کا انکار حقیقتاً اللہ ﷻ کا انکار ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اللہ ﷻ کی ہستی کا قائل بھی ہو مگر آخرت کا قائل نہ ہو تو اس کے مکمل کافر ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ کیونکہ اگر اللہ ﷻ کے حضور جواب دہی کا تصور ہی نہ ہو تو انسان کبھی راہ راست پر نہ آ سکتا ہے اور نہ ہی آنے کی کوشش کرتا ہے اور یہی چیز اس کا اللہ ﷻ کی آیات اور اس کے رسولوں سے مذاق کا مصداق بن جاتا ہے اور نہ ہی وہ اللہ ﷻ کے ان احکام کی کوئی پروا کرتا ہے جو انسان کو راہ مستقیم پر رکھنے والے ہیں۔

علمی و عملی بات: اللہ ﷻ کی آیات اور رسولوں کے فرمودات کے مطابق تو اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے اور دنیوی زندگی کی کچھ اہمیت نہیں مگر دنیا کے طلب گاروں نے سمجھ رکھا تھا کہ اصل کامیابی اسی دنیوی زندگی کی ہی کامیابی ہے۔ چنانچہ اسی کامیابی کے حصول کے لئے انہوں نے محنت اور کوشش کی اور اسی زندگی کو سنوارنے کے لئے وہ خود کو ہلکان کرتے رہے۔ آخرت کو اہم نہ سمجھا اور نہ ہی اس کے لئے انہوں نے کوئی سنجیدہ محنت کی۔ اب ان کا انجام جہنم ہی ہے۔

عملی پہلو: ان آیات میں ان مسلمانوں کے لئے بھی عبرت اور سبق آموزی ہے جو اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کو پس پشت ڈال کر سرتاپا دنیا کے طالب بنے بیٹھے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ مذکورہ مفہوم میں جو شخص بھی آخرت کے مقابلہ میں دنیا کا طالب ہے وہ ان آیات کا مصداق ہے۔ اسی مضمون کو کسی بزرگ نے "جو دم غافل سو دم کافر" کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ آخرت کی نجات کے سلسلہ میں یہ بات طے کرنا انتہائی ضروری ہے کہ بنیادی طور پر انسان طالب دنیا ہے یا طالب آخرت!

آیت نمبر ۱۰۷: ایمان لا کر نیک اعمال انجام دینے والوں کی ضیافت کے لئے جنت الفردوس ہے۔ فردوس جنت کا سب سے اعلیٰ درجہ جو اللہ ﷻ کے عرش کے بالکل نیچے ہے اور جہاں سے جنت کی نہریں پھوٹتی ہیں۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم) رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "کہ جب اللہ ﷻ سے مانگو تو جنت الفردوس مانگو۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

علمی بات: کافروں کا انجام بیان کیئے جانے کے بعد اب ان لوگوں کا حال بیان کیا جا رہا ہے جو اس دنیا میں اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لے آئیں گے، نبی کریم ﷺ پر نازل کردہ کتاب کی تصدیق کریں گے اور زندگی میں نیک اعمال کرتے رہیں گے کہ اللہ ﷻ نے ان کی میزبانی کے لئے فردوس بریں کو تیار کر رکھا ہے، جہاں وہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے اور کبھی اور کسی حال میں بھی وہاں سے نکلنا نہیں چاہیں گے۔ وہ جنت اتنی اعلیٰ اور خوب صورت ہوگی کہ وہاں کا رہنے والا جنتی اسے چھوڑ کر کبھی دوسری جگہ جانا نہیں چاہے گا۔

علمی بات: یہ ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کرنے کا صلہ بتایا ہے کہ ان کے لئے فردوس کی ضیافت تیار ہے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور اس میں ہمیشہ رہنے کے باوجود کبھی اس سے اکتائیں گے نہیں۔ اس میں ان کے مدارج بھی ہمیشہ بلند ہوتے رہیں گے اور ان کے لئے نعمتیں بھی برابر ان کی خواہش کے مطابق بدلتی رہیں گی۔ اس وجہ سے وہ اس کو چھوڑ کر کہیں اور جانے کے خواہش مند کبھی نہیں ہوں گے۔

علمی بات: ''فردوس'' جنت کے لئے معروف ترین لفظ ہے جو قریب قریب تمام انسانی زبانوں میں مشترک طور پر پایا جاتا ہے۔ سنسکرت میں پر دِیشا، قدیم کلدانی زبان میں پردیسا، قدیم ایرانی (ژند) میں پیری وائزا، عبرانی میں پردیس، ارضی میں پرویز، سُریانی میں فردیسو، یونانی میں پارادئسوس، لاطینی میں پاراڈائسس، اور عربی میں فردوس۔ یہ لفظ ان سب زبانوں میں ایک ایسے باغ کے لئے بولا جاتا ہے جس کے گرد حصار کھنچا ہوا ہو، وسیع ہو، آدمی کی قیام گاہ سے متصل ہو، اور اس میں ہر قسم کے پھل، خصوصاً انگور پائے جاتے ہوں۔ بلکہ بعض زبانوں میں تو منتخب پالتو پرندوں اور جانوروں کا بھی پایا جانا اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ قرآنِ حکیم کے نزول سے پہلے عرب کے کلام جاہلیت میں بھی لفظ فردوس مستعمل تھا۔ اور قرآنِ حکیم میں اس کا اطلاق متعدد باغوں کے مجموعے پر کیا گیا ہے۔ اس سے جو تصور ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ فردوس ایک بڑی جگہ ہے جس میں بکثرت باغ اور چمن اور گلشن پائے جاتے ہیں۔

علمی بات: اللہ ﷻ، اس کے رسول ﷺ اور آخرت پر سچے ایمان والے اور جنہوں نے نیک اعمال کیئے ان کی مہمان نوازی جنت الفردوس میں کی جائے گی۔ جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور ان کو کبھی اس سے نکالا نہیں جائے گا۔ نہ ہی وہ خود نکلیں گے۔ جنت کی ایک جھلک اور اس کی چھوٹی سے چھوٹی نعمت ''دنیا و ما فیہا'' سے کھرب ہا درجہ بہتر ہے۔ ''جنت الفردوس'' جنت کا وہ اعلیٰ حصّہ اور مقام ہے جس کے مقابلہ میں باقی جنت کی نعمتیں معمولی تصور ہوں گی۔ اس میں انبیاء کرام علیہم السلام، ان کے اصحاب، شہداء، صدیقین، صلحاء اور وہ لوگ داخل ہوں گے جو اللہ ﷻ کی خوشنودی کی خاطر نیکی کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ جب تم اللہ ﷻ سے جنت کا سوال کرو تو جنت الفردوس مانگا کرو کیونکہ یہ جنت کی وسط اور اعلیٰ مقام ہے۔'' (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۱۰۸: اہل جنت، جنت کی نعمتوں سے کبھی نہ اکتائیں گے۔ نہ ہی وہ اس کے علاوہ کسی اور جگہ منتقل ہونے کی خواہش ظاہر کریں گے۔

علمی بات: وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور پھر ہمیشہ رہنے کے باعث وہ کبھی نہیں اکتائیں گے اور ان کو سیر و تفریح کی کھلی اجازت ہوگی اور ان کے درجات مزید بڑھا دیئے جائیں گے اور ان کے لئے ہر طرح کی نعمتیں تیار ہیں جن کو اگر کوئی گننا چاہے تو نہیں گن سکتا اور جس چیز کی ان کو اس وقت خواہش ہوگی وہ اسی وقت پوری کر دی جائے گی اور وہ اس سے نکلنا کبھی بھی گوارا نہیں کریں گے اور ہم آخر ان کو نکالیں گے بھی کیوں؟

علمی بات: مقصد یہ بتلانا ہے کہ جنت کا یہ مقام ان کے لئے لازوال دائمی نعمت ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے یہ حکم جاری فرما دیا ہے کہ جو شخص جنت میں داخل ہو گیا وہ وہاں سے کبھی نکالا نہ جائے گا۔ مگر یہاں ایک خطرہ کسی کے دل میں یہ گزر سکتا تھا کہ انسان کی فطری عادت یہ ہے کہ ایک جگہ رہتے رہتے اکتا جاتا ہے وہاں سے باہر دوسرے مقامات پر جانے کی خواہش ہوتی ہے۔ اگر جنت سے باہر کہیں جانے کی اجازت نہ ہوتی تو ایک قید محسوس ہونے لگے گی اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا کہ جنت کو دوسرے مقامات پر قیاس کرنا جہالت ہے جو شخص جنت میں چلا گیا پھر جو کچھ دنیا میں دیکھا اور برتا تھا جنت کی نعمتوں اور دل کش فضاؤں کے سامنے اس

کو وہ سب چیزیں لغو معلوم ہوں گی اور یہاں سے کہیں باہر جانے کا کبھی کسی کے دل میں خیال بھی نہ آئے گا۔

علمی بات: قرآن و سنت کی تصریحات سے جنت کا جو تصور قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کی وسعت آسمانوں اور زمینوں کی وسعت کی طرح ہے اور ان میں درجوں کی بلندی ایسی ہے جیسے تارے جو نہایت بلندی پر نظر آتے ہیں۔ گویا جنت بجائے خود ایک وسیع عالم ہے اور اہل ایمان کی کوئی آرزو اور طلب ایسی نہ ہو گی جو وہاں پوری نہ ہو۔ اس لئے وہاں سے کہیں اور جانے یا منتقل ہونے کی وہ کبھی خواہش نہ کریں گے۔ یعنی ہمیشہ رہنے سے اکتائیں گے نہیں۔ ہر دم تازہ نعمتیں ملیں گی۔ کبھی خواہش نہ کریں گے کہ ہم کو یہاں سے منتقل کر دیا جائے۔

آیت نمبر ۱۰۹: کلمات سے مراد اللہ ﷻ کا علم، اس کی قدرت کے کمالات اور عجائبات ہیں جن میں ہر آن مزید وسعت ہوتی رہتی ہے۔ اگر زمین پر موجود تمام سمندر کا پانی سیاہی بن جائے اور اتنے ہی سمندر اور اضافہ کیئے جائیں تو بھی ناکافی ہیں۔ اس سیاہی کے ذریعہ اللہ ﷻ کے کلمات تحریر کیئے جائیں تو سیاہی ختم ہو جائے گی لیکن اللہ ﷻ کے کلمات کی تحریر مکمل نہ ہو سکے گی۔

علمی بات: کلمات سے مراد اللہ ﷻ کی قدرت و حکمت کی وہ نشانیاں ہیں جو آفاق و انفس میں پھیلی ہوئی ہیں۔ کلمات سے مراد اللہ ﷻ کے کمالات اور عجائبات قدرت ہیں اور یہ لامتناہی اور بے حد و حساب ہیں جن میں ہر آن مزید وسعت بھی ہوتی رہتی ہے اور سمندر یا سمندروں کا پانی خواہ کتنا ہی کثیر مقدار میں ہو بہر حال اس کی ایک حد ہے اور ایک محدود چیز کا لامحدود چیز سے کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا سمندروں کی سیاہی تو ختم ہو سکتی ہے لیکن اللہ ﷻ کے کلمات ختم نہیں ہو سکتے۔ اللہ ﷻ کے کلمات کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اگر اللہ ﷻ کے علوم و حکم کے کلمات لکھے جائیں اور سمندر کا پانی بطور روشنائی استعمال کیا جائے، تو کلماتِ الٰہی ختم نہ ہوں گے اور سمندر کا پانی ختم ہو جائے گا اور اگر اسی سمندر جیسا دوسرا سمندر بھی بطور روشنائی استعمال کیا جائے، تو وہ بھی ختم ہو جائے گا اور اللہ ﷻ کے کلمات ختم نہیں ہوں گے۔

علمی بات: اگر اللہ ﷻ کے علم کے کلمات اور اس کے احکام کو لکھا جائے اور سمندر اس کے لئے سیاہی ہو تو اس کے تمام کلمات کو لکھا نہیں جا سکتا خواہ سمندر کتنا ہی وسیع و عریض کیوں نہ ہو، وہ بہر حال متناہی اور اللہ ﷻ کے کلمات اور اللہ ﷻ کی معلومات غیر متناہی ہیں اور متناہی غیر متناہی کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

علمی بات: جو لوگ اللہ ﷻ کے پیغام کو نہیں مانتے وہ ایسی چیز کو نہیں مانتے جو تمام ثابت شدہ چیزوں سے زیادہ ثابت شدہ ہے۔ وہ اتنی مسلم ہے جس کو لکھنے کے لئے دنیا کے تمام درختوں کے قلم بھی ناکافی ثابت ہوں۔ تمام سمندروں کی سیاہی بھی خشک ہو جائے اس سے پہلے کہ اس کی فہرست ختم ہو۔ مگر انسان کیسا ظالم ہے کہ اس کے باوجود وہ حق کو نہیں پہچانتا۔ اس کے باوجود وہ اپنی زندگی کو حق کے مطابق نہیں ڈھالتا۔

آیت نمبر ۱۱۰: رسول اللہ ﷺ کی زبانی رسول کی بشریت کا اعلان کرایا گیا۔ ہر رسول نے دعوتِ توحید پیش کرنے کے ساتھ اپنے بندہ ہونے کا بھی ذکر فرمایا۔ اس کا مقصد توحید باری تعالیٰ کی وضاحت اور کسی قسم کی غلط فہمی پیدا ہونے کے امکان کو ختم کرنا ہے۔ البتہ رسول اللہ ﷻ کے چنے ہوئے بہترین بندے تھے۔ ان رسولوں پر وحی آتی رہی اور آخری پیغام الٰہی خیر البشر ﷺ کو عطا فرمایا گیا۔ حکم دیا گیا معبود حقیقی، اللہ ﷻ ہی کی عبادت کی جائے۔ جو اللہ ﷻ سے ملاقات کا شوق رکھتا ہے اسے چاہیئے کہ نیک اعمال انجام دے اور خالصتاً اسی کی عبادت کرے۔ اللہ ﷻ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔ مادہ پرستی بھی شرک ہے اور ریاکاری بھی۔ ہر قسم کے شرک سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔

علمی بات: یہ آیت دلیل ہے کہ اللہ ﷻ کے نزدیک عمل مقبول ہونے کی دو شرطیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ شریعت محمدیہ ﷺ کے مطابق ہو اور دوسری یہ کہ اس سے مقصود صرف اللہ ﷻ کی خوشنودی ہو، شہرت، نام و نمود، ریاکاری یا کوئی اور دُنیاوی غرض مقصود نہ ہو۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت جندب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا: ”جو شخص (کسی نیکی کے کام کے نتیجہ میں) شہرت کا طالب ہو تو اللہ ﷻ اس کی بدنیتی قیامت کے دن سب کو سنا دے گا، اسی طرح جو کوئی لوگوں کو دکھانے کے لئے کوئی نیک کام کرے تو اللہ ﷻ قیامت کے دن اس (کام) کو سب لوگوں کو دکھلا دے گا۔“ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

علمی بات: کفار بشریت کو نبوت کے منافی سمجھتے تھے وہ کہتے تھے کہ نبی کے لئے فرشتہ ہونا ضروری ہے۔ حالانکہ انسانوں کے لئے انسان کو رسول بنا کر بھیجنا ان کے لئے زیادہ مفید ہے اور اس سے استفادہ کے لئے زیادہ سہل اور آسان ہے کیونکہ اگر فرشتہ، جن یا کسی اور جنس سے ان کے لئے رسول بھیجا جاتا تو وہ اس کو دیکھ سکتے نہ اس کی بات سن سکتے تھے۔ اور نہ اس کے اعمال کی اتباع اور اقتدار کر سکتے، یہ تو اللہ ﷻ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے انسانوں کے لئے ان کی جنس سے انسان کو رسول بنا کر بھیجا۔

علمی بات: ہر انسان کا مزاج یکساں نہیں ہوتا۔ بعض طبیعتیں اتنی غلط اندیش اور ان کی عقلیں اتنی اوندھی ہوتی ہیں کہ جہاں کہیں کمال کی ذراسی جھلک دیکھی۔ اسے اپنا معبود اور خدا بنا لیا اور اس کے سامنے سربسجود ہو گئے۔ یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو فقط اس لئے اللہ ﷻ کا بیٹا کہنا شروع کر دیا کہ اُنہیں تورات نوک بر زبان تھی یعنی زبانی یاد تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چند معجزات دکھائے تو لوگوں نے اُنہیں کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔ اس غلط فہمی کا سدباب کرنے کے لئے ہر نبی علیہ السلام نے جہاں اللہ ﷻ کی توحید کی دعوت دی اور اس کی صداقت ثابت کرنے کے لئے اپنی نبوت کی کھلی نشانیاں دکھائیں اور اپنی تمام صلاحیتوں اور خوبیوں کے حوالہ سے کھلے اور واضح انداز میں یہ تصریح بھی فرمائی کہ بایں ہمہ کمال وخوبی خدا نہیں بلکہ یہ اللہ ﷻ کی عطا کردہ صفات ہیں۔ ہم اللہ ﷻ کے بندے ہیں۔ خالق نہیں بلکہ مخلوق ہیں۔ معبود نہیں بلکہ عابد ہیں۔ جب جزوی کمالات سے ایسی غلط فہمیاں پیدا ہوں جن کی گرفت میں آج بھی بے شمار لوگ پھڑک رہے ہیں تو وہ ذاتِ اقدس ﷺ جو جمال و کمال کا مظہر اتم بنائی گئی اس کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیوں کا پیدا ہونا بعید از قیاس نہ تھا۔ اس لئے ضروری ہوا کہ اس غلط فہمی کے سارے امکانات ختم کر دیئے جائیں۔ چنانچہ اللہ ﷻ نے اپنے حبیب ﷺ کو تمام کمالات سے علیٰ وجہ الاتم متصف کرنے کے باوجود اس آیت میں یہ اعلان کرنے کا حکم دیا ” قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ “ علماء کرام نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اظہار تواضع کے لئے یہ اعلان کرنے کا حکم دیا گیا ہے تا کہ اس فتنہ کو روزِ اوّل سے ہی ختم کر دیا جائے۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ صاحب کمال کا اظہار تواضع بھی اس کا کمال ہوتا ہے۔

علمی و عملی بات: آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی عمل اللہ ﷻ کے لئے کرتا ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی چاہتا ہے کہ لوگ اس کو نیکی کرتے دیکھیں یا لوگوں کے سامنے زیادہ نیکی کرتا ہے تا کہ لوگ اس کی تعریف کریں تو ریاکاری اور شرک خفی ہے باقی جو شخص کوئی نیک کام اللہ ﷻ کے واسطے کرتا ہے اور لوگ اس کو دیکھ پاتے ہیں اور تعریف کرنے لگتے ہیں اور وہ اس سے خوشی محسوس کرتا ہے تو چونکہ وہ نیکی لوگوں کو دکھانے اور تعریف کرانے کے لئے نہیں کرتا۔ نہ لوگوں سے کوئی معاوضہ چاہتا ہے نہ لوگوں کے دکھانے کے لئے عمل خیر میں اضافہ کرتا ہے (اس لئے یہ ریاکاری نہیں بلکہ) یہ اس کے لئے فوری خوشی ہے اور اس کے لئے دوہرا اجر ہے ایک چھپا کر عبادت کرنے کا دوسرا ظاہر ہو جانے کا۔ واللہ اعلم بالصواب

علمی بات: جو شخص اپنے رب سے ملنے کی آرزو رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کا محبوب و مقرب بن کر میدانِ قیامت میں حاضر ہو تو نیک کام کرے جس میں سارے نبیوں اور خاص کر خاتم النّبیین ﷺ پر ایمان لانا اور ان کی شریعت کے مطابق عمل کرنا بھی شامل ہے۔

مشرک اور کافر کی نجات نہیں وہ اپنے خیال میں کیسے ہی نیک کام کر لے۔ اس آخری آیت میں وقوع قیامت کے عقیدہ کی بھی تلقین فرما دی اور یہ بھی بتا دیا کہ وہاں وہ اعمالِ صالحہ کام دیں گے جن میں شرک کی آمیزش نہ ہو۔

فرامینِ نبوی ﷺ: ۱۔ حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم پر جس چیز کا سب سے زیادہ مجھے خوف ہے وہ شرک اصغر ہے۔“ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! شرک اصغر کیا ہے؟ فرمایا: ”ریاکاری۔“ (مسند احمد)

۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ ﷻ فرماتا ہے میں شرک سے سب سے زیادہ بے نیاز ہوں جو شخص کسی (نیک) عمل میں میرے ساتھ کسی کو ساجھے دار بناتا ہے (یعنی نیک عمل سے کسی اور کی بھی خوشنودی چاہتا ہے) میں اس کو اس کے شرک کے ساتھ چھوڑ دیتا ہوں“۔ دوسری روایت میں ہے، ”میں اس سے بیزار ہوں اس کا عمل اسی کے لئے ہو گا جس کے لئے اس نے کیا ہو گا۔“ (صحیح مسلم)

۳۔ حضرت ابو سعید بن ابی فضالہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: "قیامت کے ناقابل شک دن میں جب لوگوں کو اللہ تعالیٰ جمع کرے گا تو (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) ایک منادی ندا دے گا جس نے اپنے کیئے ہوئے نیک عمل میں کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا ہو وہ اپنا ثواب اسی کے پاس جا کر طلب کرے، اللہ تعالیٰ شرک سے سب سے زیادہ بے نیاز ہے۔" (مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، بیہقی)

۴۔ حضرت شداد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "جس نے ریاکاری کرتے ہوئے نماز پڑھی، اس نے شرک کیا، جس نے ریاکاری کرتے ہوئے روزہ رکھا، اس نے شرک کیا، جس نے ریاکاری کرتے ہوئے صدقہ کیا، اس نے شرک کیا۔" حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا اس طرح نہیں ہوگا کہ اس کے وہ اعمال دیکھے جائیں جو اس نے خالصتاً اللہ تعالیٰ کے لئے کیئے ہوں اور ان کو قبول کر لیا جائے اور شرکیہ اعمال کو چھوڑ دیا جائے؟ حضرت شداد رضی اللہ عنہ نے جواباً کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے (اللہ تعالیٰ کا قول نقل) فرمایا: "کہ جس آدمی نے میرے ساتھ شرک کیا، میں اس کا سب سے بہترین قسیم اور حصّہ دار ہوں، جس نے میرے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرایا تو اس آدمی کے اعمال کی ساری جمع پونجی، وہ تھوڑی ہو یا زیادہ، اس کے اس ساجھی کے لئے ہو جائے گی، جس کے ساتھ وہ شرک کرے گا اور میں (اللہ) اس سے غنی ہوں گا۔" (مسند احمد)

سورۃ المؤمنون

ربطِ سورت: سورۃ المؤمنون سے پہلے سورۃ الحج ہے۔ دونوں سورتوں میں ربط اور مناسبت یہ ہے کہ:

ا۔ سورۃ الحج کے آخر میں اعمالِ خیر کے کرنے کا حکم مذکور تھا جس میں فلاح کا وعدہ فرمایا گیا تھا۔ سورۃ المؤمنون کا آغاز فلاح پانے والوں کی صفات کے بیان سے ہوا ہے اور اس حوالہ سے یہ بتایا گیا ہے کہ فلاح کا دارومدار ایمان اور ایمان کے تقاضوں پر عمل کرنے پر ہے۔

۲۔ سورۃ الحج کے آغاز میں آخرت کا خوف یاد دلایا گیا: "یَآ اَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ" (اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو بے شک قیامت کا زلزلہ بڑی (ہولناک) چیز ہے۔) جبکہ سورۃ المؤمنون کے آغاز میں قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ (یقیناً ایمان والے کامیاب ہوگئے) فرما کر اہل ایمان کو کامیابی کی نوید سنائی گئی ہے۔

۳۔ سورۃ الحج اور سورۃ المؤمنون اپنے مضمون کے لحاظ سے جڑواں یعنی دونوں ایک جیسی ہیں۔ دونوں کا موضوع انذار وبشارت ہے جو پچھلی سورتوں سے چلا آرہا ہے۔ پہلی سورت میں قریش مکہ کو بالخصوص حرم کی تولیت کے حوالہ سے آخری انذار وتنبیہ اور دوسری میں ان کے لئے اسی انذار وتنبیہ کے نتائج کی وضاحت ہے جس میں ایمان والوں کی کامیابی کا مضمون بہت نمایاں ہے۔

فضیلت: حضرت یزید بن بابنوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: اے اُمّ المؤمنین! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اخلاق کیسا تھا؟ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: "کیا تم سورۃ المؤمنون پڑھتے ہو؟" پھر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے خود ہی فرمایا: پڑھو "قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ" (سورۃ المؤمنون ۲۳، آیت:۱) یہاں تک کہ جب وہ پڑھتے ہوئے دسویں آیت تک پہنچے تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اخلاق ایسا تھا۔" (سنن نسائی)

آیت نمبر ۱: اس آیت میں کامیابی کے لئے "فلاح" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ فلاح کے لغوی معنیٰ پھاڑنے کے ہیں۔ فلاح عربی میں کسان کو بھی کہتے ہیں۔ اصلاحی مفہوم کامیابی کا حصول ہے۔ یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ دُنیا کے ظاہری پردہ کو چاک کر کے آخرت کے لئے تیاری کرنا اور کامیابی حاصل کرنا۔ مومنوں کو آخرت کی کامیابی کی نوید سنائی گئی ہے۔

علمی بات: عربی میں کسان کو "فلّاح" اسی لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے ہل کی نوک سے زمین کو پھاڑتا ہے۔ عربی کی ایک کہاوت ہے: "اِنَّ الْحَدِیْدَ بِالْحَدِیْدِ یُفْلَحُ" یعنی لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ انسانی وجود کے اندر موجود مادیت کے پردے کو چاک کر کے اپنی روح کو بے نقاب کرنا اور اس کی نشوونما کرنا فلاح ہے۔ چنانچہ کامیاب مومنین اپنی روحوں پر پڑے ہوئے مادیت کے پردوں کو چاک کر کے اصل خزانہ یعنی روح کو بے نقاب کرتے ہیں اور اس کی نشوونما کرتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں ان کی شخصیت سنورتی ہے اور اچھے اوصاف سے متصف ہوتی ہے اور وہ دُنیا و آخرت میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

علمی بات: ایمان والوں کے لئے حقیقی کامیابی ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاں کامیابی کے لئے مومن ہونا ضروری ہے۔ اس سورت کی پہلی گیارہ آیات میں کامیاب مومنین کے چند اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ جن لوگوں میں یہ اَوصاف پائے جاتے ہیں اُنہیں دُنیا و آخرت کی حقیقی کامیابی حاصل ہوگی۔ اسی مناسبت سے اس کا نام "سورۃ المؤمنون" رکھا گیا ہے۔

فکری پہلو: دُنیا میں کامیابی کے مختلف تصورات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً مال ودولت حاصل کرنا اور دُنیاوی آسائشوں سے بہرہ ور ہونا کامیابی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اسلام کی نظر میں کامیاب لوگ، ایمان والے ہیں جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں ان کی شخصیت میں اچھے اَوصاف اور اعلیٰ اخلاق پیدا ہوتے ہیں جن کی مدد سے وہ دُنیا و آخرت دونوں میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ انعام کے طور پر اُنہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے آخرت میں جنت حاصل ہوگی جہاں وہ ہمیشہ کے لئے عیش و عشرت کی زندگی بسر کریں گے اور یہ ان کے لئے مکمل اور اَبدی کامیابی ہوگی۔

آیت نمبر۲: نماز اور ایمان لازم و ملزوم ہیں۔ خشوع کے معنیٰ جھکنے اور عاجزی کے ہیں۔ ایسی عاجزی جو دل میں ڈر طاری ہونے کی وجہ سے ہو۔ نماز کی حالت میں دل اور اعضاء کا پوری طرح اللہ ﷻ کی طرف متوجہ ہونا بھی مطلوب ہے اور پوری زندگی کا اللہ ﷻ کی اطاعت و فرماں برداری میں جھکنا اور ہر حکمِ الٰہی پر مکمل رضامندی کے ساتھ سرِ تسلیم خم کرنے کا حکم ہے۔ وہ نمازی کامیاب ہوں گے جو اپنی نماز میں خضوع و خشوع اختیار کرتے ہیں۔

علمی بات: کامیاب مومنین کے اَوصاف بیان ہو رہے ہیں۔ ان کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ نماز میں "خشوع یعنی عاجزی" اختیار کرتے ہیں۔ ان کے دل اور اعضاء نماز میں پوری طرح اللہ ﷻ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ان کے دل میں اللہ ﷻ کی عظمت و جلالت اور اس کا ڈر اور خوف ہوتا ہے۔ وہ اپنے دل کو خیالات اور وسوسوں کے ہجوم سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اپنے اعضاء کو یکسوئی کے ساتھ اللہ ﷻ کی بارگاہ میں اس طریقہ سے جھکا دیتے ہیں جو طریقہ اللہ ﷻ کے محبوب، خاتم النبیین سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اختیار فرمایا ہے۔

علمی بات: خشوع کا اصل معنیٰ کسی کے آگے جھک جانا، دب جانا، عاجزی و انکساری اختیار کرنا ہے۔ اس کیفیت کا تعلق دل سے بھی ہے اور جسم کی ظاہری حالت سے بھی۔ دل کا خشوع یہ ہے کہ آدمی کسی کی ہیبت اور عظمت و جلالت سے مرعوب ہو۔ جسم کا خشوع یہ ہے کہ جب وہ اس کے سامنے جائے تو سر جھکائے، اعضاء ڈھیلے پڑ جائیں، نگاہ پست ہو جائے، آواز دب جائے اور ہیبت زدگی کے وہ سارے آثار اس پر طاری ہو جائیں جو اس حالت میں فطرتاً طاری ہو جایا کرتے ہیں جبکہ آدمی کسی زبردست یا جبروت ہستی کے حضور پیش ہو۔ نماز میں خشوع سے مراد دل اور جسم کی یہی کیفیت ہے اور یہی نماز کی اصل روح ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "جس مسلمان شخص پر فرض نماز کا وقت آئے، پھر وہ اس کے لئے اچھی طرح وضو کرے، اچھی طرح خشوع سے اسے ادا کرے اور احسن انداز سے رکوع کرے، تو وہ نماز اس کے پچھلے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے، جب تک کہ وہ کسی گناہِ کبیرہ کا ارتکاب نہ کرے اور یہ بات ہمیشہ کے لئے ہے۔" (صحیح مسلم)

عملی پہلو: حقیقی کامیابی کے لئے نماز میں خشوع پیدا کرنا اور اس کے آداب کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ لہٰذا نماز کی حالت میں اپنی ساری توجہ نماز پر مرکوز کی جائے۔ انسان نماز میں جو کچھ زبان سے پڑھ رہا ہو، اس کی طرف دھیان رکھے، اگر غیر اختیاری طور پر کوئی خیال آ جائے تو وہ معاف ہے، لیکن جونہی یاد آئے، دوبارہ نماز کے الفاظ کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیئے۔ نماز میں اِدھر اُدھر نہ دیکھے، بالوں اور کپڑوں کو سنوارنے میں نہ لگا رہے، اپنی اُنگلیاں نہ چٹخائے، اپنے کپڑوں کو نہ سمیٹتا رہے۔ بلکہ خوف و خشیت اور عاجزی کی ایسی کیفیت طاری ہو، جیسے عام طور پر بادشاہ یا کسی بڑے شخص کے سامنے ہوتی ہے۔

آیت نمبر۳: لغو سے مراد ہر ایسی بات یا کام ہے جو بے ہودہ اور فضول ہو۔ اہلِ مومن لغویات سے اِعراض کرتے ہیں۔ وہ زندگی کو ایک امانت سمجھتے ہیں اور آخرت کی جواب دہی کا احساس رکھتے ہیں۔

کامیاب مومنین کی دوسری صفت لغو یعنی بے کار باتوں سے دور رہنا ہے۔ وہ ہر ایسی فکر، بات یا کام سے بچتے ہیں جو بے کار، بے فائدہ اور بے مقصد ہو۔ وہ زندگی کو ایک امانت سمجھتے ہیں اور آخرت کی جواب دہی کا احساس رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنا وقت فضول اور بے مقصد مصروفیات میں ضائع نہیں کرتے۔ بلکہ وہ زندگی کے ایک ایک لمحہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ایسا کام کرتے ہیں جس میں دُنیا و آخرت کا کوئی فائدہ ہو، اسے اپنی شخصیت کی تعمیر اور آخرت کے اجر و ثواب کے حصول کے لئے صرف کرتے ہیں۔

علمی بات: لغو سے مراد ہر وہ قول اور فعل ہے جو بے فائدہ اور فضول ہو۔ وہ تمام باتیں یا کام جن کا کوئی فائدہ نہ ہو، جن سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہو، جن کی کوئی حقیقی ضرورت نہ ہو، جن سے کوئی اچھا مقصد حاصل نہ ہو، وہ سب "لغویات" ہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "کسی آدمی کے اسلام کے اچھا ہونے کی یہ علامت ہے کہ وہ بے مقصد چیزیں چھوڑ دے۔" (جامع ترمذی)

آیت نمبر۴: زکوٰۃ کے لغوی معنٰی پاک کرنے کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد تزکیۂ نفس ہے۔ تزکیہ کے عمل میں پاکیزگی اور نشوونما دونوں شامل ہیں۔ تزکیۂ نفس کے لئے پودے کی آبیاری کی مثال بیان کی گئی ہے کہ جس طرح پودے کی نشوونما کے لئے پانی، مٹی وغیرہ ضروری ہے، کانٹے اور جھاڑیاں نقصان دہ ہیں اسی طرح تزکیہ کے عمل کے لئے گناہوں سے بچنا اور نیکیوں میں آگے بڑھنا شامل ہے۔ زکوٰۃ بھی مال کی محبت کم کرتی ہے چنانچہ وہ تزکیۂ نفس کا ایک بہت اہم ذریعہ ہے۔ ایسے شخص کو کامیابی کی ضمانت دی گئی ہے جو اپنا تزکیہ کرلیتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "یقیناً وہ کامیاب ہو گیا جس نے پاکیزگی اختیار کی۔"
(سورۃ الاعلیٰ ۸۷، آیت: ۱۴)

علمی بات: زکوٰۃ کا لفظی معنٰی "کسی چیز کو پاک کرنا" ہے۔ اس آیت میں زکوٰۃ سے کیا مراد ہے؟ اس کے بارے میں علماء کی دو آراء ہیں۔ پہلی رائے یہ ہے کہ زکوٰۃ سے مراد اس کا اصطلاحی معنٰی ہے۔ اس کے مطابق آیت کا یہ مطلب ہے کہ وہ مومن جو غنی ہیں، وہ اللہ ﷻ کے دیئے ہوئے رزق میں سے اس کے حکم کے مطابق زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہاں "زکوٰۃ" کا لفظ اپنے لغوی معنٰی میں آیا ہے اور اس سے مراد تزکیۂ نفس ہے۔ اس لئے کہ یہ ابتدائی مکی دور کی سورت ہے اور اس وقت زکوٰۃ ادا کرنے کا ابھی کوئی حکم نہیں تھا۔ اسی لئے بہت سے مفسرین کرام نے دوسرے معنٰی کو ترجیح دی ہے۔

عملی بات: کامیاب مومنین کی تیسری صفت تزکیۂ نفس ہے۔ وہ اپنے نفس کو گناہوں اور بُرائیوں سے پاک کرتے ہیں۔ وہ ہمہ وقت اور ہمہ تن اپنے تزکیۂ نفس کے لئے کوشاں اور اپنے دامن کے داغ دھبے صاف کرنے کے بارے میں فکر مند رہتے ہیں۔ وہ اپنے دل کو ہر طرح کے بُرے خیالات سے پاک صاف رکھتے ہیں۔ کفر و شرک، غرور و تکبر، ریاکاری، بغض و حسد، کینہ پروری، لالچ، کنجوسی، غیبت، چغل خوری اور دوسروں پر الزام تراشی جیسے گناہوں سے اپنے آپ کو دور رکھتے ہیں اور نیک اعمال پر مداومت رکھتے ہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ جس شخص کو مال دے اور وہ اس کی زکوٰۃ ادا نہ کرے، تو قیامت کے دن اس کا مال ایک گنجے سانپ کی شکل بن کر، جس کی آنکھوں پر دو کالے داغ ہوں گے، اس کے گلے کا طوق بن جائے گا، پھر اس کی دونوں باچھیں پکڑ کر کہے گا، میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں۔" (صحیح بخاری)

عملی پہلو: کامیابی کے لئے اپنے تزکیۂ نفس کرنا ضروری ہے۔ زکوٰۃ تزکیۂ نفس کا ایک ذریعہ ہے کہ انسان کے تزکیۂ نفس میں مال کی محبت ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ اس محبت کو نکالنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنا مال اللہ ﷻ کی راہ میں خرچ کرے۔ جو لوگ صاحب نصاب ہوں اُنہیں چاہیئے کہ علماء کرام سے معلوم کرکے اپنے مال میں سے باقاعدگی سے زکوٰۃ ادا کریں۔

آیت نمبر۵: کامیاب مومنین کی چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس کے دو پہلو ہیں اور دونوں ہی مطلوب ہیں۔ ایک یہ کہ مومنین اپنے مقاماتِ ستر کو ڈھانپ کر رکھتے ہیں اور دوسروں کے سامنے نہیں کھولتے اور نہ ہی عریاں لباس پہنتے ہیں کہ ستر کا مقام ظاہر ہو۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ مومنین اپنی عفت و عصمت کی پوری پوری حفاظت کرتے ہیں۔ بے حیائی اور زنا سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں۔

فرامینِ نبوی ﷺ: ۱۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مجھے جو شخص اپنے دونوں جبڑوں کے درمیان کی چیز (زبان) اور اپنی دونوں ٹانگوں کے درمیان کی چیز (شرمگاہ) کی حفاظت کی ضمانت دے، میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔" (صحیح بخاری)

۲۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "سات آدمیوں کو اللہ ﷻ اپنے سائے میں رکھے گا جس دن اس کے سایہ کے سوا کہیں سایہ نہ ملے گا، ایک تو انصاف کرنے والا حاکم۔ دوسرا وہ جوان جو جوانی کی اُمنگ سے اللہ ﷻ کی عبادت میں رہا۔ تیسرا وہ جس کا دل مسجد میں لگا رہے۔ چوتھا وہ آدمی جس نے اللہ ﷻ کے لئے دوستی رکھی زندگی بھر دوست رہا اور مرتے دم تک دوست رہا۔ پانچواں وہ مَرد جس کو ایک مرتبہ والی خوبصورت عورت نے (بُرائی کے لئے) بلایا، اس نے کہا میں اللہ ﷻ سے ڈرتا ہوں۔ چھٹا وہ مَرد جس نے اللہ ﷻ کی راہ میں ایسا چھپا کر صدقہ دیا کہ داہنے ہاتھ سے دیا اور بائیں ہاتھ تک کو اس کی خبر نہ

ہوئی۔ ساتواں وہ مرد جس نے اکیلے میں اللہ ﷻ کو یاد کیا اور اس کی آنکھیں بہہ نکلیں۔" (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۶: مومن اپنی جنسی خواہش اپنی بیویوں یا اپنی ماتحت کنیزوں سے پوری کرتے ہیں۔ کنیزوں اور غلاموں کا معاملہ حالات جنگ میں قید میں آنے والوں کے حوالہ سے ایک وقتی معاملہ ہے۔ نکاح ہی عمومی طور پر حیا کی حفاظت کا فطری راستہ ہے۔ مومن اللہ ﷻ کی حدود کو پامال کرنے کی ہرگز کوشش نہیں کرتے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے فطری خواہشات بیویوں اور کنیزوں سے پورا کرنے کو جائز فرمایا ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے اللہ ﷻ نے نکاح کے ذریعہ جائز راستہ عطا فرمایا ہے۔ اس لئے ہمیں اسی کو اختیار کرنا چاہیئے۔ جو شخص محتاجی اور غربت کی وجہ سے آزاد مسلمان عورت سے شادی (نکاح) نہیں کر سکتا، اسے مسلمان کنیز سے شادی کرنے کی اجازت ہے۔ اس نکاح کے لئے کنیز کے مالک سے اجازت لینا اور دستور کے مطابق اس کا حق مہر ادا کرنا ضروری ہے۔

علمی بات: یاد رہے کنیزوں اور غلاموں کا تصور اسلام کے ابتدائی دور میں تھا۔ البتہ آج عملاً اس کا وجود نہیں ہے اس لئے آج نہ تو کسی آزاد مرد اور عورت کو بیچا جاسکتا ہے اور نہ ہی غلام یا کنیز بنایا جاسکتا ہے اور ایسا کرنا حرام ہے۔

علمی بات: مومنین کا یہ وصف ہے کہ وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں اور کنیزوں کے، جن کے بارے میں اللہ ﷻ نے اجازت دے رکھی ہے۔ مومنین اس فطری خواہش کے لئے صرف اپنی منکوحہ بیوی یا مملوکہ کنیز کے پاس جاتے ہیں۔ اسلام میں نفسانی خواہش کی تکمیل کے صرف دو طریقے ہی روا ہیں: ۱۔ اپنی منکوحہ بیوی ۲۔ مملوکہ کنیز۔ ان کے علاوہ نفسانی خواہش (جنسی خواہش) کے باقی سارے طریقے شریعت نے حرام قرار دیئے ہیں اور اب تو صرف ایک ہی طریقہ فی الوقت ہے اور وہ ہے منکوحہ بیوی، کیونکہ مملوکہ کنیز کا معاملہ عملاً موجود نہیں ہے۔

علمی بات: نزولِ قرآن کے وقت غلامی کا دور چلا آرہا تھا جس میں انسانوں کی خرید و فروخت ہوا کرتی تھی اور غلاموں اور کنیزوں کا رواج تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اللہ ﷻ کے حکم سے ایسے طریقے اختیار فرمائے جن سے آہستہ آہستہ غلامی ختم ہو کر رہ گئی۔ تاہم جب تک اس مقصد کی تکمیل نہیں ہوئی، اس وقت تک دین اسلام نے کنیزوں کی اجازت دی ہوئی تھی۔ چونکہ اب غلاموں اور کنیزوں کا رواج ختم ہو چکا ہے، اس لئے اب آزاد مرد و عورت میں سے بھی کسی کو غلام اور کنیز بنانا جائز نہیں ہے۔

علمی بات: چونکہ اسلام دین فطرت ہے، اس لئے اسلام میں انسان کے فطری اور جبلی تقاضوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ اسلام نے نفسانی خواہشات کو کلیتاً ممنوع قرار نہیں دیا، بلکہ جائز طریقہ سے پورا کرنے کی اجازت دی ہے۔ لہٰذا اسلام یہ پسند نہیں کرتا کہ مسلمان، جوگیوں، راہبوں اور سنیاسیوں کی طرح شادیوں ہی سے کنارہ کش ہو جائیں۔ البتہ ایسا بھی نہیں ہے کہ بے لگام ہو کر لوگوں کی آبروئیں برباد کرتے رہیں۔ بلکہ اسلام نے نکاح کو جائز قرار دیا ہے اور اس کی ترغیب بھی دی ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "نکاح میری سنت اور میرا طریقہ ہے۔ جو میری سنت پہ عمل نہ کرے وہ مجھ سے نہیں ہے۔ تم لوگ شادی کرو، اس لئے کہ میں تمہاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔ جو کوئی صاحب استطاعت ہو وہ شادی کرے اور جس کو شادی کی استطاعت نہ ہو وہ روزے رکھے، اس لئے کہ روزہ اس کی نفسانی خواہش کو قابو میں رکھنے کا ذریعہ ہے۔" (سنن ابن ماجہ)

آیت نمبر ۷: اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے حرام راستہ اختیار کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ گناہ اور زیادتی کے مرتکب قرار پائیں گے۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ نے تنبیہ کی ہے کہ اپنی فطری خواہش کی تکمیل میں جو کوئی حلال اور جائز طریقہ سے ہٹ کر کوئی اور راستہ اختیار کرے گا، وہ گناہ اور زیادتی کا مرتکب قرار پائے گا۔ یعنی بیویاں اور کنیزیں شریعت نے حلال کی ہیں۔ ان حلال طریقوں کے علاوہ کوئی شخص فطری خواہش پوری کرنے کا کوئی اور طریقہ اختیار کرے گا، وہ سب حدِ شرع سے باہر نکل جانے والا اور سزا کا مستحق ہو گا۔ لہٰذا اب نکاح کے رشتہ کے علاوہ مرد اور عورت کا کسی اور طریقہ سے فطری خواہش پوری کرنا جائز نہیں۔

لمحۂ فکریہ: مومنین کی یہ صفت ہے کہ وہ اپنی عصمت و عفت کی حفاظت کرتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اس معاملہ میں حدود پار کر جاتے ہیں وہ ظالم ہیں جنہیں اللہ ﷻ کبھی معاف نہیں کرے گا۔ یہ بات اکثر و بیشتر مشاہدہ میں آتی رہتی ہے کہ جس قوم میں زنا اور بدکاری عام ہو جاتی ہے وہ معاشرہ برباد ہو کر رہتا ہے۔

عملی پہلو: اللہ ﷻ کی مقرر کردہ حدوں سے تجاوز کرنا ہلاکت کی راہ کو اپنانا ہے۔ انسان کی بہتری، اس کی سعادت اور دُنیا و آخرت کی کامیابی اسی میں ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک کی مقرر کردہ حدود کی پابندی کرے۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی خواہشات پوری کرنے کے لئے کوئی ناجائز طریقہ اختیار نہ کریں، بلکہ اپنی تمام خواہشات پر قابو پائیں اور اُنہیں اللہ ﷻ کی مقرر کردہ حدود و قیود کے اندر ہی قابو کر کے رکھیں۔

آیت نمبر ۸: امانت کا وسیع تصور یہ ہے کہ ہر وہ امانت جو اللہ ﷻ کی طرف سے یا معاشرہ کی طرف سے یا کسی فرد کی طرف سے کسی شخص کے سپرد کی گئی ہو۔ خواہ امانت منصب سے تعلق رکھتی ہوں یا اَقوال اور اَموال سے۔ عہد میں اللہ ﷻ سے کیئے ہوئے عہد اور بندوں سے کیئے ہوئے عہد دونوں شامل ہیں۔ مومنین اپنی امانتوں اور وعدوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

علمی بات: کامیاب مومنین کی پانچویں صفت یہ ہے کہ وہ امانتوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ جب ان کے پاس کوئی امانت رکھوائی جائے تو وہ اس میں کسی طرح کی خیانت نہیں کرتے۔ وہ ایماندار اور دیانتدار ہوتے ہیں۔ وہ اپنی تمام ذمہ داریوں کو دیانت داری سے ادا کرتے ہیں اور ان میں خیانت نہیں کرتے۔ کامیاب مومنین کی چھٹی صفت یہ ہے کہ وہ اپنے وعدوں کی پاسداری کرتے ہیں۔ وہ اپنے عہد و پیمان کے پابند ہوتے ہیں اور کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتے۔ وہ اللہ ﷻ اور بندوں سے کیئے ہوئے تمام وعدوں پر قائم رہتے ہیں اور انہیں احسن انداز میں نبھاتے ہیں۔ وہ ان میں سے کسی بھی عہد کو توڑتے نہیں ہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس میں امانت داری نہیں اس میں ایمان نہیں اور جس شخص میں معاہدہ کی پابندی نہیں اس میں دین نہیں۔“ (مسند احمد)

علمی بات: امانت کا ایک مفہوم تو بالکل واضح ہے کہ کوئی شخص کسی کے پاس کوئی چیز امانتاً رکھوائے اور جب وہ شخص امین سے اپنی چیز واپس طلب کرے تو وہ وہی چیز اسے واپس کر دے، اسے امانت کہتے ہیں۔ امانت کا وسیع مفہوم یہ ہے کہ ہر وہ ذمہ داری جو اللہ ﷻ کی طرف سے یا معاشرہ کی طرف سے یا کسی فرد کی طرف سے کسی شخص کے سپرد کی گئی ہو، وہ امانت کے مفہوم میں داخل ہے۔ ان تمام ذمہ داریوں کو صحیح طریقہ سے ادا کرنا دیانت داری اور امانت داری ہے۔ ایک مومن کی یہ شان ہے کہ وہ اپنے اوپر عائد کردہ تمام ذمہ داریاں صحیح طور پر دیانت داری سے ادا کرتا ہے۔

علمی بات: امانت وہ شے یا مال بھی ہے جو کسی نے کسی کے پاس رکھوایا ہو لیکن وسیع معنیٰ میں کسی مجلس کی خصوصی کاروائی، کسی کا راز، کوئی اختیار یا منصب، کسی طلب کرنے والے کے لئے مشورہ، کسی کے حق میں رائے وغیرہ سب امانت کے ذیل میں آتا ہے۔ پھر اِس دُنیا میں انسان کو ملنے والی ہر نعمت اور صلاحیت بھی اللہ ﷻ کی امانت ہے۔

علمی بات: اسلام کا ہر حکم اور مسلمان کی ہر چیز اس کے پاس اللہ ﷻ کی امانت ہے۔ اس حکم کا تعلق کسی غیر کی ملکیت سے ہو یا اپنی ذات سے، دُنیاوی معاملات سے ہو یا مذہبی عبادات سے، کسی عہدہ سے ہو یا اختیارات سے، الغرض ہماری زندگی کا ہر سانس، ہمارے منہ کا ہر بول اور ہمارے ہاتھ کا ہر فعل ہمارے پاس امانت ہے اور کسی بھی امانت کا حق اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جب اس کو پورے آداب اور لوازمات کے ساتھ ادا کیا جائے اور اس میں کسی قسم کی کمی و بیشی اور ناانصافی نہ کی جائے۔ اس حکم میں امیر و غریب اور حاکم و محکوم سب برابر کے ذمہ دار ہیں۔

علمی بات: اس آیت میں ریاستی اُمور کے لئے بھی بڑا اہم رہنما اُصول بتایا جارہا ہے جس کو عمل میں لانا ایک فرد، محلہ، شہر، ملک اور پوری دُنیا کے لئے فائدہ مند اور ضروری ہے۔ مثال کے طور پر ملک کا ہر عہدے دار اپنے پاس بے شمار امانتیں رکھتا ہے۔ اس کا منصب، ذمہ داری اور فرض کی ادائیگی امانت ہے۔ اگر وہ اپنے منصب سے کوئی بھی ناجائز فائدہ اٹھائے گا، یعنی کام ایمانداری، محنت اور خلوص سے نہ کرے یا کسی ایسے بندہ کو ایسی جگہ نوکری دے کہ جس کا وہ اہل نہیں، یعنی ذاتی

مفاد کے لئے، یا سفارش یا رشتہ داری کے خیال سے کسی ڈاکٹر کو وزیر خزانہ اور صحافی کو میڈیکل آفیسر بنا دیتا ہے تو ہر بندہ اس نقصان کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے، دونوں ہی جگہ لاعلمی اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے وہاں کا بیڑہ ہی غرق کر دیں گے اور اس طرح ملک و قوم کو کس قدر شدید نقصان اُٹھانا پڑے گا اور یہ نقصان پھیلتے پھیلتے بڑی خوفناک شکل اختیار کرے گا اور اس کا ذمہ دار صرف وہ شخص ہو گا جس نے اپنے اختیارات سے غلط فائدہ اٹھا کر غلط لوگوں کو غلط جگہ پر مقرر کر دیا۔ یہ بہت بڑی اور ناقابل معافی خیانت ہے اسی طرح بے شمار خیانتیں ہیں جن سے ہر وقت ہر مسلمان کو بچنا چاہیئے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

عملی پہلو: ایک مومن کے لئے ضروری ہے کہ وہ امانت دار، دیانت دار اور وعدہ کی پاسداری کرنے والا ہو۔ اپنی تمام ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرے اور کسی طرح کی خیانت اور بددیانتی نہ کرے۔ لہٰذا ملت اسلامیہ کے ہر فرد کو چاہیئے کہ وہ ایک ذمہ دار شہری ہونے کا ثبوت دے اور اس پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں اور جو عہد و پیمان وہ کسی سے کرتا ہے، ان سب کو بخوبی انجام دے۔

علمی بات: تمام معاملاتِ انسانی تحریری یا غیر تحریری معاہدوں پر مشتمل ہوتے ہیں اور اس آیت اور ارشاداتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں ہم پر ان کا احترام لازم ہے۔ معاہدوں کی تین اقسام ہیں:

۱۔ اپنے آپ سے: مثلاً نیکی کا ارادہ، گناہوں پر توبہ، کوئی قسم یا کوئی نذر ماننا۔

۲۔ بندوں سے: حقوق العباد کی ادائیگی جیسے والدین، اولاد، شوہر و بیوی، اساتذہ اور پڑوسیوں وغیرہ کے حقوق۔ ملازمت، کاروبار یا دیگر پیشہ ورانہ معاہدات۔

۳۔ اللہ ﷻ سے: اللہ ﷻ نے مومنوں سے اُن کے مال اور جان خرید لیئے ہیں جنت کے بدلہ میں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "بے شک اللہ نے مومنوں سے خرید لی ہیں اُن کی جانیں اور اُن کے مال اِس کے بدلہ کہ اُن کے لئے جنت ہے وہ اللہ ﷻ کی راہ میں قتال کرتے ہیں پس قتل کرتے ہیں اور قتل (شہید) کیئے جاتے ہیں اُس (اللہ) پر یہ سچا وعدہ ہے تورات اور انجیل اور قرآن میں اور اللہ ﷻ سے بڑھ کر کون اپنے عہد کو زیادہ پورا فرمانے والا ہے تو اپنے اُس سودے پر خوشیاں مناؤ (جو) تم نے اُس سے کیا ہے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔" (سورۃ التوبہ ۹، آیت:۱۱۱)

آج دعوت و نفاذِ دین کی جدوجہد کرنے والی کسی دینی جماعت سے وابستگی اِسی عہد کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے۔ جس معاشرہ میں ایفائے عہد رواج پا جائے وہاں انتہائی اطمینان و سکون کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور بہت سے غیر ترقیاتی اخراجات ختم ہو جاتے ہیں جو کہ کام چوری، ملاوٹ، دھوکہ دہی وغیرہ کی روک تھام کے لئے نگرانی کے طور پر کیئے جاتے ہیں۔

آیت نمبر۹: مومنوں کی صفات کے بیان کی ابتدا نماز میں خشوع سے اور اختتام نماز کی حفاظت سے کی گئی ہے۔ حفاظت سے مراد نمازوں کو مقررہ وقت پر ہمیشہ ادا کرنا، تسلی سے ادا کرنا، نماز کے تمام ارکان بجالانا اور وضو صحیح طرح کرنا وغیرہ ہے۔

کامیاب مومنین کی ساتویں صفت یہ ہے کہ وہ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ پانچوں نمازیں پوری پابندی کے ساتھ وقت پر ادا کرتے ہیں۔ نماز کی تمام شرائط اور آداب کا خیال رکھتے ہیں۔ نماز کی ادائیگی میں کسی قسم کی سستی نہیں کرتے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! کون سا عمل اللہ ﷻ کو سب سے زیادہ پسند ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "نماز وقت پر ادا کرنا۔" میں نے عرض کیا: پھر کون سا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنا۔" میں نے عرض کیا: پھر کون سا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ کے راستہ میں جہاد کرنا۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

علمی بات: ان آیات میں اہل ایمان کے اوصاف کا ذکر نماز ہی سے شروع ہوا تھا اور نماز ہی پر ختم ہوا ہے۔ پہلی صفت یہ بتائی گئی تھی کہ مومنین اپنی نمازوں میں

خشوع اختیار کرنے والے ہیں۔ جبکہ آخری صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ اپنی نمازوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اس سے اسلام میں نماز کی اہمیت واضح ہوتی ہے کہ نماز ہی در حقیقت ان تمام مکارمِ اخلاق کی محافظ ہے جو اسلام میں مطلوب ہیں۔ نماز کا ذکر کر کے واضح کیا گیا کہ بندۂ مومن کے کردار کی اہم ترین اَساس نماز ہے۔ نماز ہی مومن کی شخصیت کی عمارت کا سنگِ بنیاد بھی ہے اور اُس کی بلند ترین منزل بھی۔ یہ اُس کے شہر زندگی کی ایسی فصیل ہے جس نے پورے طور پر اُس کے معمولات کا احاطہ کرلیا ہے۔ اُس کے روزمرہ کے تمام معاملات اور نظام الاوقات نماز کے اعتبار سے طے ہوتے ہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "پانچ نمازیں اللہ تعالیٰ نے فرض کی ہیں، جس نے اچھی طرح وضو کیا اور اُنہیں بروقت ادا کیا اور ان کا رکوع اور سجود پورا کیا، اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا عہد ہے کہ اس کی مغفرت فرمادے گا اور جس نے ایسا نہ کیا تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا کوئی عہد نہیں، اگر چاہے اس کی مغفرت فرمادے اور چاہے تو اس کو عذاب دے۔" (سنن ابی داوٗد)

عملی پہلو: ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی نمازوں کی حفاظت کریں۔ نمازوں کو وقت پر ادا کریں اور اس کی پابندی کریں۔ نماز کو بوجھ نہ سمجھیں، بلکہ اس کے تمام ارکان پوری طرح سکون واطمینان کے ساتھ ادا کریں۔ اس بات کا بھی خیال رکھیں کہ ہمارا کاروبار یا دیگر ذمہ داریاں، ہمیں نماز جیسے اوّلین اور اہم ترین فریضہ سے غافل نہ کر دیں۔

آیت نمبر ۱۰: گزشتہ آیات میں بیان کی گئی صفات کے حاملین وارث یعنی حق دار ہوں گے۔ لفظ وارث میں اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی کا ذکر ہے۔

علمی بات: کامیاب مومنین کی یہ سات صفات بیان ہوئی ہیں: ۱۔ نماز میں خشوع۔ ۲۔ لغو سے اِعراض۔ ۳۔ تزکیۂ نفس۔ ۴۔ عصمت وعفت کی حفاظت۔ ۵۔ امانت داری۔ ۶۔ وعدہ کی پاسداری۔ ۷۔ نماز کی حفاظت۔ ان سات اعلیٰ صفات سے موصوف ہونے والے مومنین جنت الفردوس کے وارث ہوں گے۔ یعنی یہ وہ خوش نصیب لوگ ہوں گے، جو جنت الفردوس کے حق دار ہوں گے۔

آیت نمبر ۱۱: مومنین جنت الفردوس کے مالک ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ جنت الفردوس، جنت کا سب سے بلند درجہ ہے۔

علمی بات: جن اہلِ ایمان میں مذکورہ بالا صفات پائی جائیں، وہ جنت الفردوس کے وارث ہوں گے اور اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ نہ ان کو وہاں سے نکالا جائے گا اور نہ ہی اُنہیں وہاں موت آئے گی۔ چونکہ جنت الفردوس جنت کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے، اس لئے اس میں اعلیٰ درجہ کے مومن ہی جائیں گے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جنت میں سو درجے ہیں، ہر دو درجوں کے درمیان آسمان اور زمین جتنا فاصلہ ہے۔ فردوس جنت کا سب سے بلند درجہ ہے اور اس سے جنت کی چاروں نہریں جاری ہوتی ہیں اور اس کے اوپر عرش ہے۔ لہٰذا جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو جنت الفردوس کا سوال کرو۔" (جامع ترمذی)

عملی پہلو: جنت الفردوس سب سے اعلیٰ جنت ہے اور اس کا حصول سب سے بڑی کامیابی ہے۔ ہر مومن اس کے حصول کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا کرے اور اسے پانے کے لئے عملی طور پر اقدامات بھی کرے جس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی شخصیت میں درج بالا اعلیٰ اوصاف پیدا کرے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ ہم سب کو جنت الفردوس عطا فرمائے۔ آمین!

آیت نمبر ۱۲: انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔ گارے کے جوہر سے مراد گیلی مٹی کے خاص اجزاء ہیں۔ انسان کو مٹی سے پیدا کرنے کے دو مفہوم ہیں ایک یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا گیا۔ دوسرا یہ کہ نطفہ بذاتِ خود انسان کے جسم میں ایسی غذاؤں سے بنتا ہے جو زمین یعنی مٹی سے حاصل ہوتی ہیں۔

علمی بات: انسان کی تخلیق کے مختلف مراحل بیان ہو رہے ہیں۔ اس آیت میں انسان کی ابتدائی تخلیق بیان ہوئی ہے کہ اسے چنی ہوئی مٹی سے بنایا گیا۔ دراصل حضرت آدم علیہ السلام کو چنی ہوئی مٹی سے تخلیق کیا گیا جو زمین کے مختلف حصوں سے لی گئی تھی۔ پھر پوری نسلِ انسانی چونکہ ان کی اولاد تھی اس لئے اپنی تخلیق کے حوالہ سے ہر انسان کو گویا اسی مادہ تخلیق یعنی مٹی سے نسبت ٹھہری۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ایک مٹھی مٹی سے پیدا کیا، جسے اس نے تمام زمین سے جمع فرمایا تھا۔ (یعنی اس میں تمام روئے زمین کی مٹی کے اجزاء شامل تھے) چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد اس مٹی کے لحاظ سے (مختلف رنگوں، کیفیتوں اور مزاجوں کی) ہے، کوئی سفید، کوئی سرخ، کوئی سیاہ فام اور کوئی ان کے درمیان، کوئی نرم خو ہیں اور کوئی سخت (غصہ والا)۔ پھر ان میں کوئی بُری طبیعت والا ہے تو کوئی اچھی طبیعت والا۔" (سنن ابی داؤد، جامع ترمذی)

علمی بات: سُلٰلَۃٍ بمعنی خلاصہ، نچوڑ، جوہر، کسی بھی چیز سے نکالا ہوا کارآمد حصہ۔ طین، گیلی مٹی، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ زمین کی مٹی کے خاص اجزاء نکال کر اس سے انسان کو پیدا کیا گیا۔ انسان کو مٹی کے خلاصہ اور جوہر سے پیدا کرنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک مطلب یہ ہے کہ مٹی کے خمیر سے جوہر (ایک جو ہو گا) اور خاص اجزاء سے حضرت آدم علیہ السلام کا جسم پاک بنایا گیا۔ پہلے یہ خشک مٹی تھی۔ پھر اس میں پانی ملایا گیا تو یہ گارا بن گیا۔ پھر اس کا خمیر اٹھایا گیا۔ پھر اسے گوندھ کر اس کا لیس دار حصہ لیا گیا اور اسے خشک کر لیا گیا۔ پھر اسے حرارت پہنچائی گئی حتیٰ کہ وہ ٹھیکرے کی طرح بجنے لگا پھر اس سے انسان کا جسم تخلیق کیا گیا۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: اس (اللہ) نے انسان کو ٹھیکرے کی طرح بجتی ہوئی مٹی سے پیدا فرمایا۔" (سورۃ الرحمٰن ۵۵، آیت: ۱۴)

یہ بات ہمارے بھی مشاہدے میں رہتی ہے کہ مٹی کے برتن بنانے والے جب مٹی کے برتن اور ان کی مختلف شکلیں بناتے ہیں تو ان میں بھی مٹی کا صرف لیس دار اور کارآمد حصہ ہی استعمال ہوتا ہے بعد ازاں ان کو پختہ کرنے کے لئے وہ برتنوں کو آگ کی بھٹی میں پکاتے ہیں۔ بہر حال جب اس مٹی سے حضرت آدم علیہ السلام کا جسم مبارک تیار ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی روح میں سے پھونکا تو جیتا جاگتا انسان وجود میں آ گیا۔ پھر آئندہ حضرت آدم علیہ السلام کی نسل توالد و تناسل اور نطفہ سے چلی۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ نطفہ بذاتِ خود انسان کے جسم میں ان ہی غذاؤں سے بنتا ہے جو زمین سے ہی حاصل ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے نطفہ بھی بالآخر زمین ہی کا جوہر ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے جو انسانی نسل چلی اس کے لئے نطفہ اصل قرار پایا جو ان غذاؤں سے پیدا ہوتا ہے جو زمین سے اُگتی ہیں اس لئے جنس انسانی کی تخلیق کے متعلق یہ فرمایا کہ اسے مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ مختلف تبدیلیاں جو شکم مادر میں تدریجاً رونما ہوتی ہیں، ان سے کسی حد تک عرب کے لوگ بھی باخبر تھے، لیکن علم و انکشاف کا سلسلہ جوں جوں بڑھتا رہا ہے ان تصورات کے پردوں میں قدرت کی اعجاز آفرینیاں اور نقش آرائیاں جو آج تک نگاہوں سے پوشیدہ تھیں عیاں ہو کر اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت کی ناقابلِ تردید گواہی دے رہی ہیں۔

علمی بات: انسان کی مٹی سے تخلیق ہونے کی دو توجیہات یعنی دو معانی ہیں۔ ایک توجیہہ یہ ہے کہ تمام انسانوں کے باپ حضرت آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کیئے گئے تھے، پھر تمام انسان ان کی اولاد ہیں، اس لئے بالواسطہ تمام انسانوں کی اصل مٹی ہے۔ دوسری توجیہہ یہ ہے کہ انسان کے جسم میں بننے والا نطفہ دراصل مٹی سے کشید کیا ہوا جوہر ہے۔ اس لئے کہ انسان کی خوراک تو مٹی ہی سے حاصل ہوتی ہے اور اس خوراک میں مٹی کے جوہر کشید ہو کر انسانی جسم میں جاتے ہیں اور اس سے نطفہ بنتا ہے جس سے بالآخر بچہ کی تخلیق ہوتی ہے۔

آیت نمبر ۱۳: مٹی سے ابتدائی تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد انسان کے فطری ذریعۂ تخلیق کا ذکر ہے۔ نطفہ کے بننے کے بعد اسے ماں کے رحم میں مقررہ جگہ پر رکھا گیا ہے۔ رحم محفوظ ٹھکانا ہے۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا۔ لیکن اس کے بعد انسان کی نسل کا سلسلہ نطفہ کے ذریعہ چلایا جو پانی کی ایک بوند ہے۔ پھر اس نطفہ کو رحم مادر جیسی محفوظ جگہ میں ٹھہرانے کا سامان کیا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اور آپ ﷺ صادق اور مصدوق ہیں بے شک تم میں سے کسی ایک کی خلقت کو اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک رکھا جاتا ہے، پھر چالیس دن تک وہ جما ہوا خون ہوتا ہے، پھر چالیس دن میں وہ گوشت بن جاتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ فرشتہ بھیجتا ہے جو اس میں روح پھونک دیتا ہے اور اس کو چار کلمات لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ وہ اس کا رزق لکھتا ہے۔ اس کی موت و حیات لکھتا ہے۔ اس

کا عمل لکھتا ہے اور اس کا شقی یا سعید ہونا لکھتا ہے۔" (صحیح مسلم، صحیح بخاری، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

علمی بات: مٹی سے پانی کا قطرہ بنانا، جس میں مٹی کا نام ونشان نہیں اور اسے ماں کے رحم کے نہایت محفوظ ٹھکانا میں رکھ کر پانی کے قطرہ کو نو (۹) ماہ میں مکمل انسان بنا دینا، سب اللہ ﷻ کی قدرت کا کمال ہے۔

آیت نمبر ۱۴: شکم مادر میں انسانی تخلیق کے مختلف مراحل بیان ہوئے ہیں۔ نطفہ جمے ہوئے خون کی شکل اختیار کرلیتا ہے، پھر اس سے گوشت کی بوٹی بنتی ہے اور بوٹی کو ہڈیوں کی صورت دی جاتی ہے۔ پھر ہڈیوں پر گوشت کی تہہ جمادی جاتی ہے اور دیگر اعضاء بنائے جاتے ہیں۔ پھر اس میں روح ڈال کر اسے ایک حسین مخلوق بنادیا جاتا ہے جسے انسان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بڑی بابرکت ہے اللہ ﷻ کی ذات، جو ماں کے بطن میں ایک خوبصورت انسان کی تخلیق کرتا ہے۔ اللہ ﷻ ہی سب سے بہتر تخلیق کرنے والا ہے۔

علمی بات: انسان کی تخلیق کے جو مراحل قرآنِ مجید نے بیان کیئے ہیں، جدید سائنس میں علم الجنین (embryology) کی تحقیق کسی حد تک ان کو معلوم ہوسکی ہیں۔ یہ قرآنِ کریم کا اعجاز ہے کہ اس نے صدیوں پہلے جو کچھ کہا تھا، حیرت انگیز طور پر جدید سائنس کی تحقیقات اب ان باتوں کو سمجھ پارہی ہیں اور یہ قرآنِ حکیم کے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تم میں سے ہر ایک کی تخلیق یوں ہوتی ہے کہ وہ اپنی ماں کے بطن میں چالیس یوم تک نطفہ کی صورت میں رہتا ہے، اس کے بعد اتنے ہی روز تک علقہ کی صورت میں اور اس کے بعد اتنے ہی روز تک گوشت کی بوٹی کی صورت میں رہتا ہے۔ بعد ازاں اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے، پس وہ اس میں روح پھونک دیتا ہے۔" (صحیح مسلم، صحیح بخاری)

علمی بات: مذکورہ بالا حدیث نبوی ﷺ کی روشنی میں ماں کے بطن میں انسان کی تخلیق کے یہ مراحل ہیں۔ پہلے چالیس دن تک نطفہ کی صورت میں، پھر چالیس دن تک علقہ کی صورت میں اور اس کے بعد چالیس دن تک مُضْغَۃ کی صورت میں تخلیق ہوتی ہے۔ ایک سو بیس دن (چار ماہ) میں یہ تین مراحل مکمل ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اللہ ﷻ ایک فرشتہ کو بھیجتا۔ وہ عالمِ ارواح سے اس کی روح کو لا کر اس مادی جسم کے ساتھ ملا دیتا ہے اور یوں ایک نئی مخلوق وجود میں آجاتی ہے۔ یعنی اب تک وہ ایک حیوانی جسم تھا، لیکن اس روح کے پھونکے جانے کے بعد وہ انسان بن جاتا ہے۔

آیت نمبر ۱۵: انسان دُنیا میں اپنی حیات کا پہلا مرحلہ گزار کر فنا ہو جاتا ہے۔

علمی بات: تخلیق کے مختلف مراحل سے گزر کر انسان کو زندگی عطا ہوئی ہے۔ لیکن یہ دُنیاوی زندگی ہمیشہ کے لئے نہیں ہے، بلکہ اس کے بعد سب کو موت آئے گی جو یقینی امر ہے۔ جس طرح انسان کی پیدائش اس کی مرضی کے بغیر ہوئی، اسی طرح اس کی موت بھی اس کی مرضی کے بغیر ہوگی۔ کوئی چاہے یا نہ چاہے اس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔

علمی بات: موت ایک اٹل حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ سب انسانوں کو آخرکار موت آکر رہے گی، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔" (سورۃ آل عمران ۳، آیت: ۱۸۵) بہر حال جو انسان بھی اس دُنیا میں آیا ہے، اسے موت کے مرحلہ سے گزر کر جانا ہے۔

عملی پہلو: دُنیا کی یہ زندگی عارضی اور فانی ہے۔ یہ دراصل ابتلاء و آزمائش ہے اور یہ آخرت کی حقیقی اور ابدی زندگی کے لئے کمائی اور تیاری کے لئے بخشی گئی ہے۔ اس لئے اس دُنیاوی زندگی گزارنے کے بعد سب نے مرنا ہے جس سے کسی کے لئے کوئی مفر نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی موت کو یاد رکھیں اور اسے بھول نہ جائیں اور آخرت کی حقیقی زندگی کی تیاری کے لئے موت سے پہلے پہلے زیادہ سے زیادہ نیک اعمال کریں۔

آیت نمبر ۱۶: روزِ قیامت انسان کو زندہ کرکے حیات کے دوسرے مرحلہ سے گزارا جائے گا۔

علمی بات: موت کے بعد انسان کی زندگی ختم نہیں ہوگی، بلکہ اسے قیامت کے دن دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ اس کا حساب وکتاب ہوگا اور اس کی زندگی بھر کے اعمال کا بھرپور صلہ وبدلہ ملے گا۔ پس جو قادرِ مطلق انسان کو عدم محض سے اس طرح وجود میں لایا ہے، اس کے لئے اسے دوبارہ زندہ کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ لہٰذا یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ سب انسانوں کو دوبارہ زندہ کرکے اٹھائے گا۔

علمی بات: اگر انسان کا پہلی مرتبہ وجود ہوا تو دوسری مرتبہ کیوں نہیں ہوسکتا؟ اگر انسان کی موجودہ زندگی مختلف مرحلوں سے گزرنے کے بعد عطا ہوئی ہے اور اس کے بعد بھی وہ مختلف مرحلوں سے گزرتا رہتا ہے، تو یہ بات کیسے کہی جاسکتی ہے کہ موت کے بعد کوئی مرحلہ نہیں ہے؟ زندگی تو ایک جاری رہنے والی چیز ہے مگر لوگ اس مغالطہ میں پڑے ہوئے ہیں کہ موت زندگی کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیتی ہے حالانکہ موت محض ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ میں داخل ہونے کا نام ہے۔

عملی پہلو: آخرت میں اللہ ﷻ سب کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ جن لوگوں نے ایمان ویقین کی دولت سے سرفراز ہوکر عمل صالح کی پونجی جمع کی ہوگی، وہ وہاں پر جنت کی نعمتوں سے سرفراز ہوں گے اور ابدی آرام وراحت میں رہیں گے۔ جو اس کے برعکس سرکشی اور بغاوت کی روش پر چلے ہوں گے اور انہوں نے آخرت کی اس زندگی کے لئے تیاری نہیں کی ہوگی، وہ دوزخ کے عذاب الیم میں مبتلا ہوں گے۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ہم آخرت کی ابدی اور حقیقی زندگی کی تیاری کی فکر کریں۔

آیت نمبر ۱۷: لفظ "طرائق" طریقہ کی جمع ہے۔ جس کا معنٰی راستوں کے بھی ہیں اور طبقوں کے بھی۔ یہاں آسمان کے سات طبقات مراد ہیں۔ مخلوق کو پیدا کرنے کے بعد اس کی مستقل نگہداشت بھی ہورہی ہے جس کی وجہ سے کائنات کا نظام چل رہا ہے۔

علمی بات: جیسا کہ لفظ "طرائق" کے دو معنوں "راستوں" اور طبقوں کے استعمال ہوتا ہے تو اگر پہلے معنٰی مراد لیئے جائیں تو اس سے مراد آسمان پر سات راستے ہیں جو سیاروں کی گردش کے راستے مراد لیئے گئے ہیں یا فرشتوں کے آنے جانے کے راستے ہیں۔ اگر دوسرے معنٰی مراد لیئے جائیں تو اس سے مراد سات آسمان ہیں۔ اس کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ﷻ نے انسانوں کے اوپر سات آسمان بنائے ہیں۔ جب تک انسانی علم کی رسائی اس کی حقیقت تک نہ ہوجائے اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس لحاظ سے یہ آیت متشابہات میں سے ہوگی۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے انسانوں کے اوپر آسمان پر سات راستے بنائے ہیں۔ یہ سات راستے سیاروں کی گردش کے راستے یا مدار بھی ہوسکتے ہیں، یا پھر فرشتوں کے آنے جانے کے راستے بھی ہوسکتے ہیں۔ مخلوق کو پیدا کرنے کے بعد اللہ ﷻ اس سے غافل نہیں ہوگیا، بلکہ اس کی مستقل نگہداشت فرما رہا ہے جس کی وجہ سے کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز کے لئے تمام ایسے وسائل اور اسباب اللہ ﷻ نے مہیا کردیئے ہیں، جو اس کی بقا اور نشوونما کے لئے ضروری ہیں اور جو اسے اس کے مقررہ وقت تک زندہ سلامت رکھنے کے ضامن ہیں۔ بہرحال اس کائنات کی ہر چیز اللہ ﷻ کے علم اور نظر میں ہے اور کوئی چیز اس کی قدرت سے باہر نہیں ہے۔

آیت نمبر ۱۸: مخلوق کی ضروریات کے مطابق آسمان سے پانی برسایا جاتا ہے۔ پھر پانی کو چشموں، نہروں، دریاؤں اور کنوؤں کی شکل میں زمین میں ٹھہرادیا جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ ﷻ زمین سے پانی کا وجود ختم کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی قدرت اور اس کا انعام ہے کہ وہ مخلوق کی ضرورت کے مطابق آسمان سے پانی برساتا ہے۔ پھر اس پانی کو چشموں، نہروں، دریاؤں اور کنوؤں کی شکل میں زمین میں ٹھہرادیتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں مخلوق کے لئے بقدرِ ضرورت پانی محفوظ ہوجاتا ہے۔ جو اللہ ﷻ اس پانی کو نازل کرنے اور محفوظ کرنے پر قدرت رکھتا ہے، وہی اللہ ﷻ زمین سے پانی کو ختم کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیئے کہ ان نعمتوں پر اللہ ﷻ کا شکر ادا کرے۔

علمی بات: اللہ ﷻ آسمان سے پانی نازل فرماتا ہے اور اسے مخلوق کی ضرورت کے لئے زمین میں محفوظ کر دیتا ہے۔ تاکہ جن دنوں میں بارشیں نہ ہوں یا جن علاقوں میں بارشیں کم ہوتی ہیں اور وہاں پانی کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے، تو اس ذخیرہ کیئے ہوئے پانی کو حاصل کر لیا جائے۔

علمی بات: اللہ ﷻ آسمان سے پانی کو ایک اندازہ کے مطابق نازل فرماتا ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ نہ اتنا زیادہ نازل کیا جائے کہ تمام زمین والے سیلاب اور طوفانوں کی زد میں آجائیں اور نہ اتنا کم کہ وہ زمین کی پیداوار اور دیگر ضروریات کے لئے کافی نہ ہو۔

عملی پہلو: یہ اللہ ﷻ کی عظیم نعمت ہے کہ اس نے انسان کی ضرورت کے لئے زمین میں پانی کا انتظام فرمایا ہے۔ اگر اللہ ﷻ چاہے تو یہ پانی ختم بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ نعمت انسان سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ اللہ ﷻ کا شکر ادا کرے اور اس کی نافرمانی سے ڈرتا رہے۔ یہ بات انسان کے ذہن میں رہنی چاہیئے کہ اگر اس نے اللہ ﷻ کا شکر ادا نہ کیا اور اس کی نافرمانی کی، تو پانی جیسی عظیم نعمت سے وہ محروم ہو سکتا ہے۔

آیت نمبر ۱۹: آسمان سے نازل کردہ پانی کے ذریعہ اللہ ﷻ کھجوروں اور انگوروں کے باغات پیدا کرتا ہے۔ ان باغات کے پھل مختلف ذائقہ ورنگ والے ہوتے ہیں جو انسان کے کھانے کے کام آتے ہیں اور اس کی روزی کمانے کا بھی ذریعہ ہیں۔ قدرتِ الٰہی کے نظاروں کا بیان ہے۔ زمین اور پانی ایک مگر پھلوں کے ذائقے اور رنگ مختلف اور بہت سے ہیں۔

علمی بات: اس آیت میں کھجور اور انگور کے باغات کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔ اس کی یہ وجوہات ہو سکتی ہیں:

ا۔ عرب میں کھجور اور انگور کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ اہل عرب کے ہاں ایک اچھے باغ کا جو تصور پایا جاتا تھا، وہ یہ تھا کہ انگوروں کا باغ ہو اور اس کے کنارے کنارے کھجور کے درختوں کی باڑ ہو۔ کھجور چونکہ ایک سخت جان قسم کا درخت ہے جو ہر طرح کے موسم کا مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ اس لئے کھجور کے درختوں سے انگور کی بیلوں کی حفاظت ہوتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں انگور کی بیلیں لہلہاتی ہیں اور غذائیت سے بھرپور اعلیٰ قسم کا انگور تیار ہوتا ہے۔ کھجور بھی مختلف انواع اور اعلیٰ اقسام کی حاصل ہوتی ہیں۔

۲۔ کھجور اور انگور کی تخصیص اس جہت سے ہے کہ کھجور مدینہ منورہ کے لوگوں کے لئے خاص ہے اور انگور اہل طائف کے لوگوں کے لئے خاص ہے۔ کھجور اور انگور زمین حجاز میں عرب کے سب شہروں سے زیادہ ہوتے ہیں۔

عملی پہلو: اللہ ﷻ نے انسان کے لئے مختلف انواع واقسام کے پھل اور میوہ جات اُگائے ہیں۔ انسان ان نعمتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے اور اپنی معاش بھی حاصل کرتا ہے۔ پس انسان کو چاہیئے کہ وہ ان نعمتوں پر اللہ ﷻ کا شکر ادا کرے اور اس کی اطاعت وفرماں برداری اختیار کرے۔

آیت نمبر ۲۰: اللہ ﷻ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت زیتون کا درخت بھی ہے۔ سینا اس مقام کا نام ہے جہاں کوہِ طور واقع ہے۔ زیتون کے درخت کی خصوصیت ہے کہ اس میں سے تیل نکلتا ہے اور کھانے والے اسے بطور سالن بھی استعمال کرتے ہیں۔

علمی بات: اس درخت سے مراد زیتون کا درخت ہے کیونکہ طورِ سینا کے علاقہ میں وہ بکثرت پیدا ہوتا ہے اور اس خطہ کی اہم پیداوار شمار کیا جاتا ہے، اس لئے اس کی نسبت سینا کی طرف کی جاتی ہے۔ شام وفلسطین اس درخت کا اصلی وطن ہے۔ طورِ سینا کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ یہ اس علاقہ کا مشہور مقام ہے۔ اس درخت کی عمر، اس کا قد وقامت اور پھیلاؤ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ پس اللہ ﷻ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت زیتون کا درخت بھی ہے۔ زیتون کے درخت کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں سے تیل وافر مقدار میں حاصل ہوتا ہے۔ یہیں سے یہ تیل دُنیا کے اکثر مقامات پر جاتا ہے۔ طبی لحاظ سے یہ تیل بہت مفید چیز ہے اور روزمرہ کے کھانوں وغیرہ میں بھی یہ استعمال ہوتا ہے۔ اس کی عام افادیت کے پیش نظر ہی اللہ ﷻ نے سورۃ التین میں زیتون کی قسم بھی کھائی ہے۔

علمی بات: زیتون کو سورۃ النور میں شجرہ مبارکہ (برکت والا درخت) قرار دیا گیا ہے اور سورۃ التین میں اللہ ﷻ نے اس کی قسم کھائی ہے۔ اس کے بڑے فوائد ہیں۔ زیتون کا پھل قدرے بدمزہ ہوتا ہے جس سے تیل نکالا جاتا ہے۔ اس کا مزاج گرم تر ہے۔ زیتون کا تیل نسیان اور جوڑوں کے درد میں مفید ہے، اعصاب کو مضبوط

کرتا ہے، کولیسٹرول (Cholesterol) کو حل کرتا ہے۔ فالج زدہ عضو پر زیتون کے تیل کی مالش کی جاتی ہے۔ بہت سے لوگ زیتون کا تیل کھانے کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور اپنے سالن وغیرہ کی تیاری میں بھی اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "زیتون کو سالن بناؤ اور بطورِ تیل استعمال کرو، کیونکہ یہ مبارک درخت سے نکلتا ہے۔" (سنن ابن ماجہ، جامع ترمذی)

عملی پہلو: اللہ تعالیٰ کا یہ انعام ہے کہ اس نے زیتون جیسی نعمت ہمیں عطا کی ہے۔ ہم زیتون سے بے شمار فوائد حاصل کرتے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائیں اور اس کے فرماں بردار بندے بنیں۔

آیت نمبر ۲۱: چوپایوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں موجود ہیں جن پر غور و فکر کرکے انسان سبق حاصل کرسکتا ہے۔ انسان ان میں سے بعض چوپایوں کا دودھ پیتا ہے اور بعض کا گوشت بطورِ خوراک استعمال کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان چوپایوں کے کئی دیگر فوائد انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سب نعمتیں اسے عطا فرمائی ہوئی ہیں۔ انسان کے لئے اس میں مقامِ غور و فکر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کا احساس کرے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔

علمی بات: گھاس پھوس کھانے والے اور چرنے والے مویشیوں کے جسم میں جب غذا جاتی ہے، تو اس سے خون اور فضلہ کے علاوہ دودھ بھی بنتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اور یقیناً تمہارے لئے چوپایوں میں بڑی عبرت ہے ہم تمہیں (دودھ) پلاتے ہیں اس سے جو ان کے پیٹوں میں ہے اور تمہارے لئے ان میں (اور) بہت سے فائدے ہیں اور ان میں سے تم (بعض کا گوشت بھی) کھاتے ہو۔ تم ان پر اور کشتیوں پر سوار بھی کیئے جاتے ہو۔" (سورۃ المومنون ۲۳، آیات: ۲۱، ۲۲) یہ دودھ نہایت پاکیزہ، حلال وطیب، انتہائی سفید رنگ، مزہ میں شیریں اور پینے میں خوشگوار ہوتا ہے۔ انسان کے لئے دودھ بہترین غذا ہے۔ اس سے بھوک بھی دور ہوجاتی ہے اور پیاس بھی بجھتی ہے۔ اس میں گوشت، ہڈی اور خون پیدا کرنے کے تمام ضروری اجزاء موجود ہیں۔ گائے، بھینس اور بکری کے دودھ زیادہ تر استعمال ہوتے ہیں۔ بکری کے دودھ میں چکنائی کم، بھینس کے دودھ میں زیادہ اور گائے کے دودھ میں متوازن چکنائی ہوتی ہے۔

عملی پہلو: چوپائے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہیں اور ان میں انسان کے لئے بڑی عبرت آموز باتیں ہیں۔ انسان ان کی خلقت، ان کی زندگی اور ان سے حاصل ہونے والے منافع پر غور وفکر کرکے اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ چوپایوں کے شکم کی آلائشوں کے درمیان دودھ جیسی خالص چیز تیار کرکے انسان کو پلاتا ہے۔ انسان ان جانوروں کا گوشت بھی کھاتا ہے۔ یہ تمام نعمتیں انسانوں سے تقاضا کرتی ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں، اس کے احسانات کو یاد کریں، اسی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائیں۔

آیت نمبر ۲۲: جانوروں اور کشتیوں کے ایک اور عظیم فائدے کا ذکر ہے۔ انسان ان پر سوار ہوتا ہے اور اپنی ضروریات پوری کرتا ہے۔

علمی بات: چوپایوں کا ایک اور فائدہ یہ بھی ہے کہ انسان کی سواری اور بار برداری کے کام آتے ہیں۔ انسان ان پر اپنا سامان لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہے۔ یہ خشکی کی سواریاں ہیں اور دریاؤں اور سمندروں میں سفر کرنے کے لئے کشتیاں اور بحری جہاز استعمال ہوتے ہیں۔ ان سواریوں کے ذریعہ انسان دور و نزدیک کی مختلف مسافتیں طے کرتے ہیں اور طرح طرح کے فائدے اٹھاتے ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں جو اس نے انسان کے لئے مسخر فرمائی ہیں۔

علمی بات: سواری اور بار برداری کے دو قسم کے وسائل کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں یہی دو وسائل زیادہ استعمال ہوتے تھے۔ اہل عرب سواری اور بار برداری کے لئے زیادہ تر اونٹ استعمال کرتے تھے جسے وہ "خشکی کا جہاز" کہتے تھے۔ اس کے علاوہ باقی جانور گھوڑے اور خچر وغیرہ بھی استعمال کرتے تھے۔ بحری سفر کے لئے بڑی بڑی کشتیاں استعمال ہوتی تھیں جن کے ذریعہ سامان تجارت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جاتا تھا۔

عملی پہلو: اللہ تعالیٰ کے یہ انعامات ہیں کہ اس نے انسان کی سواری اور بار برداری کے وسائل پیدا فرمائے ہیں۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ ان نعمتوں کا اعتراف کرے اور اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ بن جائے۔ نیک اعمال کرے اور بد اعمالیاں چھوڑ دے، تاکہ دُنیاوی نعمتوں کے ساتھ ساتھ اُخروی انعامات کو بھی حاصل کرسکے۔

COPYRIGHTS © RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION. NOT FOR SALE OR COMMERCIAL USE

آیت نمبر ۲۳: رسول اللہ ﷺ کی تسلی کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام کے واقعات کا تذکرہ ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی۔ انہوں نے قوم کو صرف ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے اور تمام خود ساختہ معبودوں کی عبادت سے باز آنے کی نصیحت کی۔ انہوں نے اپنی قوم کو کفر و شرک کی پاداش میں تباہ و برباد کر دیئے جانے سے بھی ڈرایا۔

علمی بات: حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر ان کی قوم کی طرف بھیجا۔ آپ علیہ السلام نے اپنی قوم میں جا کر اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا اور اُنہیں توحید کی دعوت دی۔ آپ علیہ السلام نے قوم کو نصیحت کی کہ صرف ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے علاوہ تمام خود ساختہ معبودوں کو چھوڑ دو۔ آپ علیہ السلام نے اپنی قوم کو اس بات سے ڈرایا کہ تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بتوں کو جو پوجتے ہو، تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس شرک کی وجہ سے کسی سخت عذاب میں مبتلا کر دے۔

علمی بات: انسان کا مقصدِ تخلیق اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا ہے۔ اس لئے جتنے انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث فرمائے گئے، انہوں نے بھی اپنی قوم کو پہلا سبق یہی دیا کہ صرف اللہ تعالیٰ کی ہی عبادت کرو۔ انبیاء کرام علیہم السلام میں سے حضرت نوح علیہ السلام نے سب سے زیادہ طویل عرصہ (۹۵۰ برس) تک دوسرے مسائل کے ساتھ ساتھ پہلا اور بنیادی مسئلہ یہ سمجھایا کہ صرف ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے اور اس کے علاوہ کسی کی عبادت کرنا جائز نہیں ہے۔

آیت نمبر ۲۴: جب حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو دعوت دی تو قوم کے کافر سرداروں نے آپ علیہ السلام کی رسالت کا انکار کر دیا۔ وہ بولے کہ حضرت نوح علیہ السلام ان ہی کی طرح کے انسان ہیں، اس لئے وہ نبی اور رسول نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام پر الزام تراشی کی کہ آپ (علیہ السلام) نبوت و رسالت کا دعویٰ کر کے ان پر فضیلت اور برتری حاصل کرنا چاہتے ہیں (معاذ اللہ)۔ کافر سرداروں نے مزید یہ بھی کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو رسول بنا کر بھیجنا ہوتا، تو وہ کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیج دیتا۔ اس پر انہوں نے یہ دلیل پیش کی کہ ہم نے اپنے باپ دادا سے یہ بات نہیں سنی کہ انسان اللہ تعالیٰ کا رسول ہوتا ہے۔

علمی بات: جب کوئی مخلص شخص اصلاحِ احوال اور فلاحِ دارین کی آواز بلند کرتا ہے، تو اربابِ اقتدار اور مخالفین حق اس پر فوراً یہ الزام لگا دیتے ہیں کہ یہ شخص اقتدار کا بھوکا ہے۔ یہی الزام قومِ نوح کے سرداروں نے حضرت نوح علیہ السلام پر لگایا کہ نوح (علیہ السلام) تم پر فضیلت و برتری حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہی الزام فرعون اور اس کے درباریوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام پر لگایا کہ تم دونوں ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ سرزمین مصر پر تمہارا اقتدار ہو جائے۔

آیت نمبر ۲۵: کافر سرداروں نے اپنی قوم کو مغالطہ میں ڈالنے کے لئے کہا کہ حضرت نوح (علیہ السلام) دیوانے ہو گئے ہیں، جس کے باعث یہ عقل میں نہ آنے والی باتیں کرتے ہیں (معاذ اللہ)۔ ان کی نظروں میں حضرت نوح علیہ السلام کی دیوانگی یہ تھی کہ آپ علیہ السلام ساری قوم کے نظریہ کے خلاف خالص توحید کی دعوت دے رہے ہیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ حضرت نوح (علیہ السلام) کی دعوت کی طرف توجہ نہ دی جائے، کچھ عرصہ کے بعد یہ اپنی ناکامی پر خود ہی دعوت ترک کر دیں گے۔

علمی بات: عام طور پر قوم کے گمراہ سردار اور اصحابِ اقتدار، صالحین کی مخالفت میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ کیونکہ اصلاح کی براہِ راست زد ان کے اقتدار اور ان کے مفاد پر پڑتی ہے۔ اس لئے وہ عوام کے دلوں میں طرح طرح کے شبہات ڈال کر اُنہیں اہلِ حق سے منحرف اور ان کے خلاف کرنے کی سر توڑ کوشش کرتے ہیں۔

آیت نمبر ۲۶: حضرت نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو (۹۵۰) سال تک تبلیغ کرتے رہے اور اپنی قوم کو سمجھاتے رہے۔ لیکن قوم نے آپ علیہ السلام کی تکذیب کی اور ماننے سے انکار کر دیا۔ آخر کار حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ اے میرے رب! میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا ہے، اب تو ان کے مقابلہ میں میری مدد فرما۔

عملی پہلو: حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی سرکش قوم کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ سے مدد کے لئے دعا مانگی اور اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی۔ اگر کسی انسان کی زندگی میں کوئی ایسا مرحلہ آ جائے کہ وہ حق پر ہے اور اس کے مخالفین باطل پر ہیں اور اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ تو ایسے موڑ پر اللہ تعالیٰ ہی سے مدد کے لئے دعا مانگنی چاہیئے، اللہ تعالیٰ ضرور دعا قبول اور مدد و نصرت فرمائے گا۔

آیت نمبر ۲۷: اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور آپ علیہ السلام کو وحی کے ذریعہ حکم دیا کہ میری نگرانی اور ہدایت کے مطابق ایک کشتی تیار کریں۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے آپ علیہ السلام کو یہ بھی ہدایت دی کہ جب کافروں پر عذاب کا وقت آئے اور پانی کا طوفان شروع ہو جائے، تو کشتی میں حیوانات کا ایک ایک جوڑا اور اپنے اہل و عیال کو سوار کرلیں۔ لیکن ان کو سوار نہ کریں جن پر عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے، جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی اور بیٹا اور ظالموں یعنی کافروں میں سے کسی پر رحم کھانے اور سفارش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ ان کے غرق ہونے کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہے۔

علمی بات: تنور سے کیا مراد ہے؟ اس کے بارے میں علماء کرام کی دو آراء ہیں۔ پہلی رائے یہ ہے کہ تنور چولہے کو کہتے ہیں جو روٹی پکانے کے لئے بنایا جاتا ہے۔ اس رائے کے مطابق، طوفانِ نوح اس طرح شروع ہوا تھا کہ ایک چولہے سے پانی اُبلنے لگا، اوپر سے بارش شروع ہو گئی اور رفتہ رفتہ وہ ایک ہولناک طوفان میں بدل گیا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ تنور سے مراد پوری زمین ہے۔ اس کے مطابق طوفانِ نوح اس طرح آیا کہ ساری زمین ہی چشمے میں تبدیل ہو گئی اور نیچے زمین سے پانی چشموں کی طرح اُبل پڑا۔

عملی پہلو: اللہ ﷻ نے حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کا حکم دیا تاکہ جب طوفان آئے تو ایمان والے اس عذاب سے محفوظ رہیں۔ کسی مصیبت اور مشکل سے بچنے کے لئے انتظام کرنا، منصوبہ بندی کرنا اور اسباب اختیار کرنا، حضرت نوح علیہ السلام کی سنت ہے۔ ہمیں بھی چاہیئے کہ ہم اپنی زندگی میں حالات کے مطابق منصوبہ بندی کریں اور اسباب اختیار کریں، کیونکہ اسباب ختیار کرنا انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت ہے۔ البتہ اسباب اختیار کر کے نگاہ مسبب الاسباب پر رکھی جائے۔

آیت نمبر ۲۸: حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ ﷻ کے حکم کے مطابق کشتی تیار کرلی۔ اللہ ﷻ نے حضرت نوح علیہ السلام کو ہدایت دی کہ جب تم اور تمہارے مومن ساتھی کشتی میں سوار ہو جاؤ، تو اللہ ﷻ کی حمد و ثنا کرو اور اس کا شکر ادا کرو کہ اس نے ظالموں کو غرق کر کے ان سے تمہیں نجات عطا فرمائی ہے۔ چنانچہ جب عذاب آیا، تو حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی میں سوار ہو کر اللہ ﷻ کی حمد و ثنا کی اور اس کا شکر ادا کیا۔ اللہ ﷻ نے حضرت نوح علیہ السلام اور آپ علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار سب مومنین کو نجات عطا فرمائی اور اُنہیں طوفان سے محفوظ رکھا۔

علمی بات: حضرت نوح علیہ السلام کو ظالم لوگوں سے نجات پر اللہ ﷻ کی حمد اور اس کا شکر ادا کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا، کیونکہ وہ ظالم لوگ حضرت نوح علیہ السلام اور آپ علیہ السلام کے ساتھیوں کا مذاق اڑاتے اور اُنہیں بے شمار اذیتیں پہنچاتے تھے۔ اس کے علاوہ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا ان میں رہنا، ان کے کفر و شرک اور بُرے کاموں کو دیکھنا بجائے خود شدید تکلیف دہ تھا۔ اب ان سے نجات ملی ہے، دشمن غرق ہوئے ہیں، الگ رہنے کی جگہ ملنے جا رہی ہے، اپنا ماحول اور اپنی مجلس بنے گی، تو اس پر اللہ ﷻ کا شکر ادا کرنے کا حکم ہوا۔

عملی بات: مومن کی ہر کامیابی اللہ ﷻ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ہر کامیابی کے حصول پر اور کسی مصیبت سے نجات پر اللہ ﷻ کا شکر ادا کرتا ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ جب بھی ہمیں کوئی کامیابی ملے یا کسی مصیبت سے نجات حاصل ہو، تو اس پر اللہ ﷻ کی حمد و ثنا کریں اور اس کا شکر ادا کریں کہ یہ سب اللہ ﷻ کی مدد و نصرت سے ہی ممکن ہوا ہے۔

آیت نمبر ۲۹: حضرت نوح علیہ السلام کو آئندہ کے لئے بھی دعا کرتے رہنے کی تاکید فرمائی گئی۔ کشتی کو بابرکت جگہ پر اُتارنے اور اترنے کے بعد وافر رزق مہیا فرمانے کی دعا کی تلقین فرمائی گئی۔

علمی بات: حضرت نوح علیہ السلام اللہ ﷻ کے حکم سے کشتی میں سوار ہو گئے۔ ہر طرف پانی تھا اور کشتی پانی میں تیر رہی تھی۔ تب اللہ ﷻ نے حضرت نوح علیہ السلام کو یہ دعا مانگنے کی ہدایت فرمائی کہ اے میرے رب! مجھے برکت والی جگہ اتار دے اور تو سب سے بہتر اُتارنے والا ہے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ ﷻ سے یہ دعا مانگی۔ اس دعا کا مطلب یہ ہے کہ پروردگار! ہم تیری مہربانی اور تیرے حکم سے اس کشتی میں سوار ہوئے ہیں۔ ہمیں مستقبل کا کچھ علم نہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ اب یہ کشتی ہمیں لے کر کہاں کہاں جائے گی اور کہاں پر جا کر رکے گی۔ یہ معاملہ اب تیرے سپرد ہے۔ ہماری التجا ہے کہ اس کشتی سے ہمارے اُترنے کو بابرکت بنا دے اور ہمیں کسی بابرکت جگہ پر اتار دے۔

علمی بات: یہاں اُتارنے سے مراد میزبانی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا مطلب یہ تھا کہ اے اللہ! یہ زمین تیری ہے اور ہم جو اس کشتی سے اُتریں گے تو ہم مہمان ہوں گے اور تُو ہمارا میزبان ہوگا۔ تُو ہماری مہمانی اچھی طرح کرنا، یعنی فراغت سے کھانے پینے کو دینا۔ یوں تو اور لوگ بھی میزبانی کرتے ہیں، مگر تُو سب سے بہترین حق میزبانی ادا کرنے والا یعنی روزی دینے والا ہے۔

عملی بات: اللہ تعالیٰ کی ذات اپنے بندوں پر بڑی مہربان ہے کہ اس نے اُنہیں بڑی پیاری دعائیں سکھائی ہیں۔ ایک طرف عذابِ الٰہی ہے اور دوسری طرف حضرت نوح علیہ السلام کشتی میں سوار ہیں۔ اسی دوران میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو یہ دعا سکھائی کہ اپنے رب سے اچھی جگہ اُترنے کے لئے دعا کریں۔ ہمیں چاہیئے کہ جب ہم اس جیسی کسی حالت میں ہوں تو یہ دعا مانگیں، یا ہم کسی نئی جگہ اُتر رہے ہوں تو یہ دعا مانگیں۔

آیت نمبر ۳۰: حضرت نوح علیہ السلام کے اس واقعہ میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے کئی نشانیاں اور سبق آموز باتیں موجود ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کوئی رسول بھیجتا ہے، تو اس وقت قوم کا امتحان شروع ہو جاتا ہے۔ رسول علیہ السلام اور اس کے پیروکاروں کا بھی کہ وہ کس حد تک صبر و ثبات سے کام لیتے ہیں اور جھٹلانے والوں کا بھی کہ وہ کس حد تک سرکشی اختیار کرتے ہیں۔ پھر جو اس امتحان میں کامیاب ہوں، اُنہیں اللہ تعالیٰ انعامات سے نوازتا بھی ہے اور ان کی مدد بھی فرماتا ہے اور معاندین کو قرار واقعی سزا بھی دیتا ہے۔ اس سب میں ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ آنے والی قوم میں سے کون ان نشانیوں کو سن کر عبرت و نصیحت حاصل کرتا ہے اور کون نہیں کرتا؟

حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ میں علمی و عملی اور سبق آموز باتیں:

۱۔ سب سے واضح بات یہ سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دُنیا کو پیدا کر کے اس سے بے تعلق نہیں ہو گیا، بلکہ اس نے خلق کی اصلاح و ہدایت کے لئے اپنے رسول بھیجے۔

۲۔ توحید کی دعوت دینے والے انبیاء کرام علیہم السلام حق پر تھے اور ان کی تکذیب کرنے والے باطل پر تھے۔

۳۔ جو لوگ رسول علیہ السلام کی مخالفت اور اُن کی تکذیب کے درپے ہوتے ہیں، ایک حد خاص تک اللہ تعالیٰ ان کو ڈھیل دیتا ہے۔ لیکن آخر کار ان کو پکڑ لیا جاتا ہے اور جب پکڑ لیا جاتا ہے، تو پھر کوئی ان کو چھڑانے والا نہیں ہوتا۔

۴۔ حق و باطل کی کشمکش میں فوز و فلاح، رسول علیہ السلام اور اُن کے ساتھیوں ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ البتہ اس فوز و فلاح سے پہلے، اُنہیں آزمائش کے ایک دور سے گزرنا پڑتا ہے۔

۵۔ جس طرح رسولوں کی دعوت ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے، اسی طرح ان کے مخالفین کی مخالفت اور ضد بھی ہمیشہ ایک ہی انداز سے ہوتی رہی ہے۔ اس لئے ہر رسول علیہ السلام کی زندگی دوسرے رسولوں کے لئے اور ہر اُمت کی سرگزشت دوسری اُمت کے لئے، ایک مستقل درس عبرت رہا ہے۔ آج ہمارے لئے گزشتہ ساری اَقوام کی سرگزشتیں درس عبرت پیش کر رہی ہیں، بشرطیکہ کوئی ان سے درس عبرت لینے کے لئے تیار بھی ہو۔

آیت نمبر ۳۱: حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار اہل ایمان کی نسل بڑھی اور اس پر صدیاں گزر گئیں، تو دوبارہ وہ اسی گمراہی میں مبتلا ہو گئے جس میں ان کے پچھلے لوگ مبتلا ہوئے تھے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے غافل ہو کر خود ساختہ معبودوں میں مشغول ہو گئے۔ لہٰذا اس قوم کی طرف اللہ تعالیٰ کا ایک اور رسول علیہ السلام آئے اور انہوں نے اُن لوگوں کو حق سے آگاہ کیا۔

علمی بات: اکثر مفسرین کرام کے نزدیک قومِ نوح کے بعد جس قوم کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا اور ان میں رسول بھیجا، وہ قوم عاد ہے۔ کیونکہ اکثر مقامات پر قومِ نوح کے جانشین کے طور پر عاد ہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ قوم ثمود ہے، کیونکہ آگے چل کر ان کی ہلاکت کے ذکر میں کہا گیا کہ زبردست چیخ نے ان کو پکڑ لیا اور یہ عذاب قوم ثمود پر آیا تھا۔ بعض کے نزدیک یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم اہل مدین ہیں کہ ان کی ہلاکت بھی چیخ کے ذریعہ سے ہوئی تھی۔

آیت نمبر ۳۲: اس نافرمان قوم کی ہدایت کے لئے اللہ ﷻ نے ان ہی میں سے ایک شخص کو رسول علیہ السلام بنا کر بھیجا۔ رسول علیہ السلام نے اُنہیں توحید کی دعوت دی کہ صرف اللہ ﷻ کی عبادت کرو، کیونکہ اس کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں ہے۔ مزید برآں رسول علیہ السلام نے قوم کو شرک کا ارتکاب کرنے پر بُرے انجام اور اللہ ﷻ کی گرفت سے بھی ڈرایا۔

علمی بات: قومِ نوح کی ہلاکت کے بعد اللہ ﷻ نے حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد کو خیر و برکت سے نوازا اور وہ ساری دُنیا میں پھیل گئے۔ پھر ان میں سے ایک قوم گمراہ ہوگئی جس طرح ان سے قبل قوم نوح گمراہ ہوئی تھی۔ اللہ ﷻ نے ان ہی میں سے ایک رسول علیہ السلام بھیجا جنہوں نے اسی پیغام کو دُہرایا اور وہی نغمہ توحید سنایا، جس کو اس سے قبل حضرت نوح علیہ السلام بارہا سنا چکے تھے۔ عجیب بات ہے کہ ان کے سرداروں سے وہی جواب سننا پڑا، جو حضرت نوح علیہ السلام کو دیا گیا تھا، کہ تم آخر ہماری ہی طرح کے ایک انسان ہو، تم میں ایسی کون سی خصوصیات ہیں کہ تمہیں رسول اور پیغمبر جانیں (معاذاللہ)۔ یہ واقعات قرآنِ مجید میں اس لئے بیان فرمائے گئے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ جس طرح اللہ ﷻ کا پیغام ایک ہے اور اس کی دعوت ایک ہے، اسی طرح انکار کرنے والے بھی حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے لے کر اب تک ایک ہی قسم کے ہیں اور ان سب کی ذہنیت یکساں ہی ہے۔

آیت نمبر ۳۳: جب اس نافرمان قوم کو رسول علیہ السلام نے توحید کی دعوت دی، تو ان کے سرداروں نے اس کی مخالفت کی۔ یہ سردار دُنیاوی زندگی کے اعتبار سے بڑے خوشحال تھے، لیکن کافر تھے اور آخرت کے منکر تھے۔ انہوں نے رسول علیہ السلام پر اعتراض کیا اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ شخص محض تمہاری ہی طرح ایک بشر ہے اور تمہاری ہی طرح کھاتا اور پیتا ہے، تو پھر یہ رسول کیسے ہو سکتا ہے؟ (معاذاللہ)

علمی بات: ساری کافر قوموں نے ایک ہی جیسا سوال اٹھایا کہ بشر کبھی رسول نہیں ہو سکتا۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد جتنے رسولوں کا نام لے کر ذکر کیا گیا اور جن کا بغیر نام کے ذکر ہوا، سب کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر رسول علیہ السلام کی قوم نے رسول علیہ السلام کو ماننے سے اس لئے انکار کیا کہ انہوں نے رسول علیہ السلام کو بشر و انسان پایا۔ سب سے پہلا اعتراض ان کا یہی تھا کہ تم آخر ہو کیا؟ ایک بشر ہی تو ہو، پھر ہم بھی بشر اور تم بھی بشر۔ اس لئے ہم تمہاری رسالت کو کیونکر قبول کرلیں، جب کہ ہم اپنے آباؤ اجداد سے سنتے آرہے ہیں کہ رسول کبھی بشر نہیں ہوتا۔ حالانکہ زمین پر بسنے والے انسانوں کے لئے نمونۂ کمال ایک انسان ہی ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ بات خاص طور پر پیشِ نظر رہے کہ تمام انبیاء و رسل علیہم السلام اللہ ﷻ کے منتخب شدہ، برگزیدہ اور محبوب بندے تھے اور وہ تمام مخلوق میں افضل ترین انسان تھے جنہیں اللہ ﷻ نے اپنی وحی کے ذریعہ اپنا پیغام عطا فرمایا اور لوگوں کو رہنمائی کا ذریعہ بنایا۔

عملی پہلو: اس آیت میں انسان کی ہلاکت کے تین بڑے اسباب بیان ہوئے ہیں: کفر، آخرت کی تکذیب اور دُنیاوی عیش پرستی۔ جب انسان عیش و عشرت میں کھو جاتا ہے تو وہ حق بات سننے اور ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتا اور وہ سمجھتا ہے کہ میں ٹھیک ہوں۔ ورنہ مجھے یہ دُنیا کیوں ملتی اور آخرت وغیرہ کچھ نہیں۔ بالفرض اگر آخرت ہوئی بھی تو وہاں بھی مجھے اچھائی اور کامیابی ملے گی۔ اس طرح وہ ہمیشہ کی ہلاکت میں پڑا رہتا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم کفر، آخرت کی تکذیب اور دُنیاوی عیش پرستی سے بچیں اور ایسے لوگوں سے دور رہیں جو ان ہلاکت خیز کاموں میں پڑ گئے ہیں۔

آیت نمبر ۳۴: قوم کے سرداروں نے عوام سے کہا کہ اگر تم نے اپنے ہی جیسے انسان کو رسول تسلیم کر لیا، تو تم خسارہ میں رہو گے۔ وہ اس طرح سے کہ انسان کو رسول ماننے کے بعد اس کی فضیلت و برتری بھی تسلیم کرلو گے اور اس کی اطاعت بھی کرو گے اور یہی خسارہ ہے کہ تم اپنے ہی جیسے ایک انسان کی فضیلت تسلیم کر لو اور اس کی اطاعت کرو۔ (معاذاللہ)

علمی بات: ذرا ان سرداروں کی منطق اور دلیل ملاحظہ ہو کہ اگر تم لوگ ہماری اطاعت کرو تو درست اور بجا، لیکن اس شخص کا کہنا مانو جو نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو ناقابلِ قبول! اس لئے کہ ہم پیدائشی سردار ہیں، تمہارے حکمران ہیں، ہمارا حکم تو تمہیں ماننا ہی ماننا ہے۔ ہماری اطاعت تو تم پر لازم ہے ہی، مگر اس شخص کی اطاعت اس لئے نہیں ہو سکتی کہ یہ تمہاری طرح کا انسان ہے۔ یہ دلیل دیتے ہوئے وہ بھول گئے کہ وہ خود کوئی فرشتے نہیں بلکہ اپنے عوام جیسے ہی انسان ہیں اور

انسان ہوتے ہوئے ہی وہ اپنے جیسے انسانوں سے اطاعت اور فرماں برداری کی توقع رکھتے ہیں۔ یہ دراصل ان کا رسول علیہ السلام کے خلاف ایک پروپیگنڈا تھا اور ان کی اس بات میں کوئی حقیقت نہ تھی۔

عملی پہلو: بعض اوقات لوگ اپنے مفادات کی خاطر اور صالحین کی مخالفت میں غلط دلیلیں دیتے ہیں اور ان کے خلاف پروپیگنڈا بھی کرتے ہیں۔ ہمیں ایسی باتوں اور دلیلوں کو اچھی طرح پرکھنا چاہیئے اور کسی کے فریب اور پروپیگنڈا کا شکار نہیں ہونا چاہیئے۔

آیت نمبر ۳۵: سرداروں نے رسول علیہ السلام پر ایک اور اعتراض کیا کہ وہ تمہارے مرنے اور مٹی ہو جانے کے بعد، تمہیں دوبارہ زندہ ہونے کا یقین دلاتا ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جب ہم مر کر مٹی میں مل جائیں گے اور ہماری ہڈیاں بھی گل سڑ جائیں گی، تو ہم کو از سر نو دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔ یعنی یہ ناممکن ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔

علمی بات: قیامت کا انکار کرنے والے ہمیشہ سے یہ دلیل دیتے آئے ہیں کہ جب انسان کا جسم گل سڑ جائے گا تو پھر اسے کس طرح زندہ کیا جا سکتا ہے؟ یہی دلیل ان رسول علیہ السلام کی قوم کے سرداروں نے پیش کی۔ دراصل انسان پر جب دُنیا کی محبت غالب آ جاتی ہے، تو اس کا موت کے تصور سے ہی دل کانپتا ہے۔ اگر دل ایمان کی دولت سے خالی ہو، تو قیامت کا انکار کرتا ہے۔ پھر اس کا یہ خیال عقیدہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے، جس بنا پر وہ کہتا ہے کہ ہزاروں سال گزر چکے آج تک قیامت نہیں آئی اور نہ کسی نے دوبارہ زندہ ہو کر آخرت کے بارے میں کچھ بتلایا ہے۔ منکرین آخرت کی یہ دلیل حقیقت کے خلاف ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ آخرت کے لئے تیار نہیں ہیں اور آخرت کے تصور سے اپنی آنکھیں بند رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ان کا یہ عقیدہ غلط ہے اور صحیح عقیدہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سب کو دوبارہ زندہ کرے گا۔

عملی پہلو: بعض اوقات انسان دُنیا کی چیزوں میں اس حد تک مشغول ہو جاتا ہے کہ وہ آخرت سے غافل نظر آتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کی آخرت سے غفلت اس کو سرکشی کی اس حد تک پہنچا دیتی ہے کہ وہ اپنی زبان سے بھی کہہ دیتا ہے کہ آخرت تو بعید از قیاس چیز ہے۔ اس لئے آج جو کچھ مل رہا ہے اس کو حاصل کرو، کل کے موہوم فائدہ کی خاطر آج کے یقینی فائدہ کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ ہم اپنا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ ہمارے ذہن میں ایسا کوئی تصور تو نہیں ہے؟ اگر ہے تو اس سے اپنا ذہن صاف کریں اور آخرت پر اپنا یقین پختہ کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دوبارہ زندہ کرے گا اور ہمارا حساب کتاب ہوگا، جس کے بعد جنت یا دوزخ کا فیصلہ ہوگا۔

آیت نمبر ۳۶: سرداروں نے کہا کہ مر جانے اور مٹی ہو جانے کے بعد دوبارہ زندگی کا وعدہ بہت ہی بعید اور دور از قیاس چیز ہے۔ لہٰذا انہوں نے بڑی شدت سے موت کے بعد کی زندگی کا انکار کیا اور کہا کہ یہ ہرگز ممکن نہیں ہے۔

علمی بات: کفار انسان کے دوبارہ اٹھائے جانے کو عقل و فہم میں نہ آنے والی بات خیال کرتے تھے اور موجودہ دور کا انسان بھی اسے ایک اَنہونی بات خیال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ کوئی سنجیدہ بات ہی نہیں ہے کہ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہو، حالانکہ بہت سی باتیں جو پہلے عقل و فہم سے ماورا تھیں، اب قابل فہم بنتی جا رہی ہیں۔ مگر آخرت کی زندگی کے منکرین کی ذہنیت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔

آیت نمبر ۳۷: کافر سرداروں کے بقول حقیقت تو یہ ہے کہ بس دُنیا کی زندگی ہے اور اس کے سوا کوئی اور زندگی نہیں ہے۔ اس دُنیاوی زندگی میں کچھ لوگ مرتے جاتے ہیں اور کچھ لوگ پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ دُنیا کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا ہے۔ کسی کو ہرگز دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا نہیں جائے گا۔

علمی بات: کافر سرداروں کا انسانی زندگی کے متعلق یہ تصور سراسر غلط تھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ دُنیا دار العمل ہے، دار الجزا نہیں۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی بدکار ہوتے ہوئے عزت و آرام کی زندگی بسر کرتا ہے اور دوسرا آدمی نیک، مخلص اور لوگوں کا خیر خواہ ہونے کے باوجود عمر بھر طرح طرح کی مصیبتوں اور آزمائشوں میں مبتلا رہتا ہے۔ اگر موت ہی انسانی زندگی کی آخری منزل ہوتی، تو اس سے بڑی بے انصافی اور کیا ہو سکتی ہے کہ نیک انسان مصیبتوں میں رہے اور

بد معاش اور سفاک عیش میں رہے۔ اس صورت میں ان اخلاقی قدروں کو جن سے انسانی عظمت وابستہ ہے کون اپنائے گا؟ بلکہ کون اُنہیں اچھا جانے گا؟ اس لئے اس کی حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ اس فانی زندگی کے بعد ایک باقی زندگی بھی ہو، جہاں عدل وانصاف کے سارے تقاضے پورے کیئے جائیں۔ نیک اور مخلص لوگوں کو ان کی مخلصانہ جدوجہد کا پورا پورا صلہ دیا جائے اور بدکاروں کو ان کے کرتوتوں کی پوری سزا ملے۔ وہ زندگی یقینی طور پر آخرت کی زندگی ہوگی۔

عملی پہلو: دُنیا میں ایسے مادہ پرست لوگ موجود رہے ہیں جن کا آخرت پر ایمان نہیں ہوتا اور جو چاہتے ہیں کہ اُنہیں افکار و اعمال میں پوری آزادی دے دی جائے، وہ جو چاہیں کریں اور جو چاہیں کہیں، ان کی روک ٹوک کرنے والا نہ ہو۔ ان کے سامنے صرف یہ نصب العین ہوتا ہے کہ جس طرح ہو، دُنیاوی زندگی عیش سے گزر جائے۔ نہ اُنہیں اللہ ﷻ کا ڈر ہوتا ہے اور نہ اعمال کی باز پرس کا خیال۔ ان کی رائے میں انسان کو آزاد پیدا کیا گیا ہے اور اس کی زندگی کا کوئی اخلاقی مقصد نہیں۔ وہ ایک حیوان ہے جو کھاتا پیتا اور مر جاتا ہے۔ اسلام کی نظر میں یہ تصور غلط ہے۔ دینِ اسلام کی تعلیمات کے مطابق ہم اللہ ﷻ کے بندے ہیں۔ اس نے ہمیں اس دُنیا کی زندگی میں اپنی عبادت کے لئے بھیجا ہے، جس میں ہماری آزمائش ہے۔ اس کے بعد ہمیں موت آئے گی اور آخرت میں اللہ ﷻ ہمیں دوبارہ زندہ کرے گا۔ وہاں کامیابی وناکامی کا حتمی فیصلہ ہوگا۔ نیک اعمال کرنے والے لوگ جنت میں جائیں گے اور بُرے اعمال کرنے والے لوگ جہنم میں جائیں گے۔

آیت نمبر ۳۸: سرداروں نے اپنی قوم سے مزید کہا کہ اس رسول نے اپنی نبوت ورسالت کے بارے میں جھوٹ گھڑ کر اللہ ﷻ سے منسوب کر دیا ہے۔ (معاذ اللہ) یعنی رسول کا یہ کہنا کہ میں اللہ ﷻ کا رسول ہوں، قیامت قائم ہوگی اور ہر کسی نے مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنا ہے اور اپنے کیئے کا حساب دینا ہے وغیرہ، سب جھوٹ ہے (معاذ اللہ)۔ لہٰذا ہم کبھی بھی رسول کی بات نہیں مانیں گے۔

علمی بات: سرداروں کے یہ الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ یہ قوم اللہ ﷻ کی ہستی کی قائل تھی۔ وہ اللہ ﷻ کے منکر نہ تھے، بلکہ ان کی اصل گمراہی شرک ہی تھی۔ انہوں نے اللہ ﷻ کے ساتھ کئی دوسرے معبود بنا لیئے تھے۔ یہی شرک سب سے بڑا گناہ ہے جس کے وہ مرتکب ہو رہے تھے۔

آیت نمبر ۳۹: طویل عرصہ بیت گیا لیکن لوگوں نے رسول علیہ السلام کی دعوت قبول نہ کی۔ بالآخر رسول علیہ السلام نے اللہ ﷻ سے دعا کی اور نافرمانوں کے خلاف مدد کی التجا کی۔ دعا کی کہ اے میرے رب! ان لوگوں نے مجھے جھٹلا دیا ہے اور اب یہ میری کوئی بات ماننے کو تیار نہیں، اس لئے اب ان کے مقابلہ میں میری مدد فرما اور ان پر وہ عذاب بھیج دے جس کا تو نے وعدہ فرما رکھا ہے۔

علمی بات: رسول علیہ السلام اس قوم کو مسلسل اللہ ﷻ کی توحید اور اصلاح کی دعوت دیتے رہے، لیکن جب اس قوم کی بدکاریاں حد سے تجاوز کر گئیں اور اللہ ﷻ کے پیغمبر کو ان کی ہدایت کی کوئی امید نہ رہی، تب پیغمبر علیہ السلام نے اللہ ﷻ کی بارگاہ میں دعا کی اور قوم کے خلاف اللہ ﷻ سے مدد مانگی۔

عملی پہلو: دعا ایک زبردست ہتھیار اور ڈھال ہے۔ دینِ اسلام کی فتح و نصرت اور دشمنانِ اسلام کے شرور اور فتنہ و فساد سے حفاظت کے لئے اللہ ﷻ کی بارگاہ میں دعا کرتے رہنا چاہیئے۔ مزید یہ کہ تمام مشکل حالات میں اللہ ﷻ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے وہی دعاؤں کا سننے والا ہے اور وہی حقیقتاً اور مستقلاً مددگار ہے۔

آیت نمبر ۴۰: اللہ ﷻ نے رسول علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور اپنے رسول کو بتایا کہ عنقریب اس کافر قوم پر عذاب آنے والا ہے۔ تب یہ لوگ اپنی ہٹ دھرمی پر پچھتائیں گے، مگر اس آخری وقت کا پچھتاوہ بے سود ہوگا۔

عملی پہلو: جب نافرمان لوگوں پر اللہ ﷻ کا عذاب آتا ہے، تو وہ اپنے کیئے ہوئے اعمال پر نادم ہوتے ہیں، لیکن اس وقت کی ندامت کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنے اعمال درست کریں اور اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت اختیار کریں۔ گناہوں سے توبہ کریں اور نیک اعمال کریں، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم گناہوں پر ہوں۔ اللہ ﷻ کی طرف سے پکڑ ہو جائے یا موت آجائے اور پھر پچھتانا پڑے۔

آیت نمبر ۴۱: آخر کار وعدہ کے مطابق یہ نافرمان قوم اللہ ﷻ کے عذاب کی گرفت میں آ گئی۔ ایک ہولناک آواز نے اُنہیں آپکڑا، جس سے پوری قوم ہلاک ہوگئی۔ عذاب سے اُنہیں کوڑا کچرا بنا دیا گیا، جس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ بلاشبہ ایسے ظالموں پر اللہ ﷻ کی لعنت اور پھٹکار ہے اور ان کے لئے تباہی اور بربادی ہی ہے۔

علمی بات: اس قوم پر کس چیز کا عذاب آیا اور اس چیخ سے کیا مراد ہے؟ اس کے بارے میں مفسرین کرام کی مختلف آراء ہیں۔ دراصل اس آیت میں عذاب کے لئے "صَیْحَة" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا ترجمہ "سخت چیخ" ہے۔ اس کے مطابق اس سے مراد "سخت چیخ کا عذاب" ہے اور یہ چیخ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی تھی، جس سے ساری قوم ہلاک ہوگئی۔ اکثر مفسرین کی رائے یہی ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ اس سے مراد "زلزلہ" ہے کہ زلزلہ سے قوم ہلاک ہوگئی۔ جبکہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ "صَیْحَة" سے مراد عذابِ الٰہی ہے، خواہ وہ عذاب کسی شکل میں ظاہر ہوا ہو۔

عملی پہلو: اللہ تعالیٰ کے پیغمبر علیہ السلام جس بات کے اعلان کے لئے آئے ہیں، وہ اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ پیغمبر علیہ السلام اس حقیقت کو صرف دلیل کے روپ میں ظاہر کرتے ہیں۔ وہی لوگ دراصل مومن ہیں جو اس کو دلیل کے روپ میں پہچانیں اور اپنے آپ کو اس کے حوالہ کردیں۔ جب کوئی گروہ آخری طور پر یہ ثابت کردے کہ وہ حقیقت کو دلیل کے روپ میں پہچان کر ماننا ہی نہیں چاہتا، تو پھر اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو عذاب کے روپ میں ظاہر کرتا ہے۔ حقیقت جب عذاب کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے، تو آدمی کے حصہ میں صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ اپنی اس نادانی پر پچھتاتا ہے کہ اس نے حقیقت کو دیکھا مگر وہ اس کی طرف سے اندھا بنا رہا۔ حقیقت کی آواز اس کے کان سے ٹکرائی مگر اس نے اس کو سننے کے لئے اپنے کان بند کرلیئے۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ہم حقائق زندگی کو علم اور دلیل سے سمجھ لیں اور اپنی اصلاح کی فکر کریں تاکہ بعد میں پچھتاوا نہ ہو۔

آیت نمبر ۴۲: اس نافرمان قوم کی ہلاکت کے بعد اللہ تعالیٰ نے بہت سی قوموں کو پیدا فرمایا۔ ان میں سے ہر قوم کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسل علیہم السلام بھیجے۔ ان رسولوں نے اپنی اپنی قوم کو دعوت دی۔ مگر قوموں نے بالعموم انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت کو جھٹلایا۔ جس کے نتیجہ میں ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا اور وہ ہلاک ہوگئے۔ وہ لوگ تو ختم ہوگئے، لیکن عبرت کے لئے ان کی داستانیں باقی رہ گئیں۔

آیت نمبر ۴۳: جتنی بھی نافرمان قومیں گزری ہیں، ان میں سے کوئی قوم اپنے مقررہ وقت سے نہ پہلے ہلاک ہوئی اور نہ بعد میں بلکہ ہر قوم کو اس کے معین وقت پر اس کی سرکشی کی سزا ملی۔ اللہ تعالیٰ نے جس قوم کے لئے عذاب کا جو وقت مقرر کر رکھا ہے، وہ عذاب عین اسی وقت نازل ہوتا ہے۔ لمحہ بھر بھی آگے پیچھے نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اور ہر اُمت کے لئے ایک وقت مقرر ہے تو جب اُن کا مقررہ وقت آجائے گا تو نہ وہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ وہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔" (سورۃ الاعراف ۷، آیت: ۳۴)

علمی بات: اس آیت میں حضور اکرم ﷺ کی قوم کے مشرکین کے لئے وعید ہے اور اُنہیں آگاہ کیا گیا ہے کہ ان کے کفر و شرک اور رسول علیہ السلام کو جھٹلانے کے باوجود اُنہیں جو مہلت دی جارہی ہے، وہ اس لئے ہے کہ وہ اپنی مقرر کردہ مدت کو پہنچ جائیں، پھر ان پر اس کی گرفت آئے گی اور ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں ہوگی، جیسا کہ پہلی امتوں کے ساتھ ہوا۔

علمی بات: جس اُمّت کے ایمان نہ لانے کی بنا پر اس کے عذاب کا وقت مقرر کردیا گیا اس اُمّت پر اس وقت سے پہلے عذاب نہیں آسکتا اور نہ وقت آنے پر اس اُمّت سے عذاب مؤخر ہوسکتا ہے۔ وہ عذاب اس اُمّت کو اس وقت تک جڑ سے نہیں اُکھاڑتا، جب تک کہ یہ واضح نہ ہوجائے کہ یہ لوگ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اور دن بہ دن ان کے عناد میں اضافہ ہوتا رہے گا اور ان سے کوئی مومن پیدا نہیں ہوگا اور ان کو زمین پر زندہ رکھنے میں کسی کے لئے کوئی فائدہ نہیں ہے اور ان کے ہلاک ہونے سے کسی کا کوئی نقصان نہیں ہوگا، تو پھر ان کو عذاب بھیج کر ملیامیٹ کردیا جاتا ہے۔

آیت نمبر ۴۴: پچھلی آیات میں بیان ہوا ہے کہ مذکورہ قوموں کے فنا ہونے کے بعد، اللہ تعالیٰ نے بعض دوسری قوموں کو پیدا فرمایا۔ اُنہیں گمراہی سے بچانے اور راہِ راست پر ثابت قدم رکھنے کے لئے، اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف لگاتار رسول بھیجے۔ لیکن ان قوموں نے بھی پہلی قوموں کی طرح رسولوں کی تکذیب کی۔ جب کسی قوم کے پاس اس کے رسول آئے، تو وہ اس رسول کی تکذیب کرتے رہے اور اس کو جھٹلاتے رہے۔ پھر اللہ تعالیٰ بھی ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو ہلاک کرتا رہا۔ یہاں تک کہ یہ ساری قومیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ایسی تباہ ہوئیں کہ سوائے داستانوں کے ان کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہا۔ بہرحال یہ قومیں اللہ تعالیٰ کے پیغام کو نہ ماننے کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہوگئیں۔

علمی بات: سورۃ المؤمنون کی ان آیات میں پہلے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر فرمایا گیا۔ پھر ایک رسول علیہ السلام کی تشریف آوری اور ان کی اُمّت کی ہلاکت کا تذکرہ فرمایا گیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بہت سی اَقوام کو پیدا فرمایا جن کی طرف اپنے رسول علیہ السلام بھیجے۔ ان اقوام نے رسولوں کی تکذیب کی تو اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے کئی اقوام کو پیدا فرمایا اور ان کی طرف مسلسل رسول بھیجے۔ ان میں سے ہر قوم نے اپنے رسول علیہ السلام کی تکذیب کی، تو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں بھی ہلاک کر دیا۔ یہ ساری قومیں اور تمام انبیاء و رسل علیہم السلام جن کا یہاں تذکرہ ہوا ہے، حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیانی عرصہ میں آئے ہیں۔ حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درمیانی مدت تقریباً چار ہزار (۴۰۰۰) سال پر محیط ہے۔ اس طویل عرصہ میں لاتعداد انبیاء و رسل علیہم السلام مبعوث ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ ان انبیاء کرام علیہم السلام کا ایسا سلسلہ قائم رہا کہ کوئی وقت ایسا نہ تھا، جب روئے زمین پر کوئی نبی موجود نہ ہو۔ بیک وقت ایک ہی زمانے میں کئی کئی انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث ہوتے رہے۔ قرآنِ مجید میں ان میں سے صرف چند رسولوں کے نام آئے ہیں، مثلاً حضرت صالح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام اسی عرصہ میں آئے ہیں۔

عملی پہلو: اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لئے اپنے انبیاء و رسل علیہم السلام بھیجے۔ جن لوگوں نے رسولوں کی تکذیب کی، اللہ تعالیٰ نے اُنہیں ہلاک کر دیا۔ اب قیامت تک کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی اور رسول سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لوگوں کی رشد و ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر خلوص دل سے ایمان لائیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت و پیروی کریں، تاکہ ہم کامیاب ہو سکیں۔ اب اگر کوئی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کا انکار کرے گا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت و اتباع سے روگردانی کرے گا، تو وہ ناکام ہو گا اور جہنم کا مستحق ہو گا۔

آیت نمبر ۴۵: مذکورہ بالا تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا۔ ان دونوں رسولوں کو اللہ تعالیٰ نے نشانیوں اور روشن دلیل کے ساتھ بھیجا۔ نشانیوں سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے معجزات ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو معجزات دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا تاکہ ان کے سامنے حق واضح کیا جائے اور ان کے پاس کسی طرح کا عذر اور کوئی حیل و حجت باقی نہ رہ جائے۔

علمی بات: اس آیت میں نشانیوں اور روشن دلیل سے کیا مراد ہے؟ اس کے بارے میں مفسرین کرام کی مختلف آراء ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ نشانیوں سے معجزات مراد ہیں اور روشن دلیل سے سب سے بڑا معجزہ مراد ہے اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے بہت سے معجزات کا ظہور ہوا۔ مثلاً وہ عصا اژدھا بن گیا اور فرعون کے جادوگروں کے اژدھوں کو نگل گیا اور جب اس کو سمندر پر مارا تو راستہ بن گیا اور جب اس کو پتھر پر مارا تو بارہ (۱۲) چشمے پھوٹ نکلے اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حفاظت کرتا تھا، ان تمام فضائل کی وجہ سے عصا کا الگ ذکر فرمایا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ نشانیوں سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا سمیت نو معجزات ہیں۔ روشن دلیل سے مراد ان معجزات کی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر دلالت ہے۔

جن نو معجزوں کا ظہور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ہوا تھا ان کا ذکر (سورۃ الاعراف ۷، آیات: ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۳۰، ۱۳۳) (سورۃ بنی اسرائیل ۱۷، آیت: ۱۰۱) وغیرہ میں آیا ہے اور وہ یہ ہیں: ۱۔ عصا، ۲۔ ید بیضا، ۳۔ قحط سالی، ۴۔ پیداوار میں کمی، ۵۔ طوفان، ۶۔ ٹڈیاں، ۷۔ جوئیں، ۸۔ مینڈک، ۹۔ خون۔

آیت نمبر ۴۶: اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو معجزات اور واضح دلیل کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا۔ لیکن فرعون اور اس کی قوم نے تکبر اور سرکشی کا مظاہرہ کیا اور دونوں رسولوں کو جھٹلا دیا۔ دراصل وہ بڑے ہی سرکش لوگ تھے۔ مال و دولت اور حکومت و اقتدار کی کرسی سے ان کی سرکشی میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اپنی سرکشی کی بنا پر دوسروں پر ظلم و زیادتی کا ارتکاب کرنا ان کا عام وطیرہ تھا۔ اسی لئے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کا انکار کر دیا۔

علمی بات: حضرت یوسف علیہ السلام سے تقریباً چار سو (۴۰۰) سال بعد مصر میں بنی اسرائیل کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ ہر طرح غلامی کی لعنتوں میں گرفتار ہو گئے۔ فرعون نے ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے اور ان کو ہر نوع کی خوبیوں سے محروم رکھا۔ ان کے جذبات غیرت و حمیت کو کچل دیا اور مفلس اور نادار

بنا دیا، تاکہ وہ ہمیشہ فرعون اور اس کی قوم کے محتاج رہیں۔ ان حالات میں اللہ ﷻ نے ان کی اصلاح کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو آیات و معجزات دے کر بھیجا، تاکہ وہ بنی اسرائیل میں روح بیداری پھونکیں اور ان کو فرعون کے چنگل سے چھڑائیں۔

عملی پہلو: تکبر اور سرکشی فرعون کا طرزِ عمل ہے۔ اسی وجہ سے فرعون دوسرے لوگوں پر ظلم کرتا تھا۔ لیکن آخر کار اللہ ﷻ نے اسے غرق کر دیا۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم ہر قسم کے تکبر اور سرکشی سے اپنے آپ کو بچائیں اور ہمیشہ اللہ ﷻ کے عاجز اور فرماں بردار بندے بن کر رہیں۔

آیت نمبر ۴۷: فرعون اور اس کے سرداروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کا انکار کر دیا اور اس کی دو وجوہات بتائیں۔ ایک یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام ہمارے جیسے انسان ہیں، ان میں کوئی ایسی خوبی نہیں ہے جس بنا پر ہم ان دونوں پر ایمان لے آئیں۔ یہ وہی اعتراض تھا جو ان سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام کی قومیں اپنے رسولوں کے بارے میں کر چکی تھیں۔ فرعون اور اس کے سرداروں نے انکار کی دوسری وجہ یہ بتائی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کا تعلق ہماری محکوم قوم بنی اسرائیل سے ہے، لہٰذا ہم اپنی غلام قوم کے دو لوگوں پر ایمان لا کر اپنے لئے رُسوائی قبول نہیں کر سکتے۔

علمی بات: آیت میں اصل لفظ "عٰبِدُوْنَ" ذکر ہوا ہے جس کا یہ معنیٰ بنتا ہے کہ ان کی قوم ہماری عبادت کرتی ہے۔ لیکن اس کا ترجمہ غلامی سے کیا گیا ہے کہ ان کی قوم ہماری غلام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادت کا لفظ وسیع مفہوم کا حامل ہے جس میں بندگی اور اطاعت کے معانی شامل ہیں۔ چونکہ بنی اسرائیل فرعون کی بندگی یعنی پوجا اور پرستش نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کی اطاعت اور غلامی کرتے تھے۔ اس لئے اسی اطاعت اور غلامی کو "عبادت" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن اللہ ﷻ نے اپنے بندوں سے عبادت کرنے کا جو مطالبہ کیا ہے اس میں عبادت کا وسیع مفہوم شامل ہے کہ ہم اللہ ﷻ سے سب سے بڑھ کر محبت کریں، اُس کی بندگی کریں اور تمام اُمورِ زندگی میں اس کی اطاعت بھی کریں۔

آیت نمبر ۴۸: فرعون اور اس کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو ماننے سے انکار کر دیا اور ان کی تکذیب کی۔ نتیجہ کے طور پر فرعون اور اس کی قوم اللہ ﷻ کے عذاب میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو گئے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کا یہ قانون رہا ہے کہ اللہ ﷻ نے لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے اپنے رسول علیہ السلام بھیجے۔ لیکن جب کسی قوم نے اپنے رسول علیہ السلام کی تکذیب کی تو اللہ ﷻ نے اس قوم کو ایک خاص وقت تک مہلت دے دی۔ لیکن جب وہ کسی طرح بھی ہدایت کے راستہ پر نہیں آئی اور اللہ ﷻ اور اس کے رسول علیہ السلام کی طرف سے ان پر اتمامِ حجت ہو گیا، تو پھر اُنہیں زندہ نہیں چھوڑا گیا۔ چنانچہ اسی قانون کے تحت فرعون، اس کی فوج اور اس کے بڑے بڑے درباری سمندر میں غرق کر دیئے گئے۔

عملی پہلو: فرعون مصر کا بادشاہ تھا اور اس کی بڑی شان و شوکت تھی۔ لیکن اس نے اللہ ﷻ کی نافرمانی کی اور تکبر اور سرکشی کا راستہ اختیار کیا۔ اللہ ﷻ نے اسے اور اس کی قوم کو سمندر میں غرق کر دیا۔ اس کی بادشاہت اور ساری شان و شوکت ختم ہو گئی۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہم فرعون اور اس کی قوم کی طرح نہ ہوں، تکبر سے بچیں، مال و دولت اور دُنیاوی وسائل پر نہ اِترائیں کہ یہ سب وقتی سامان ہے جو ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ہم اللہ ﷻ کی نافرمانیوں سے باز آجائیں، اللہ ﷻ کے فرماں بردار بندے بن جائیں۔

آیت نمبر ۴۹: فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (تورات) عطا کی گئی۔ تورات کا مقصد یہ بیان ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل اس کے ذریعہ رہنمائی حاصل کرے۔ ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ فرعون اور آلِ فرعون کے غرق ہونے کے بعد تورات عطا کی گئی گویا پیغمبر علیہ السلام پر کتاب کے علاوہ بھی وحی نازل ہوتی تھی۔

علمی نکتہ: فرعون اور اس کی قوم غرق ہو کر ہلاک ہو گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو لے کر سمندر پار کر گئے۔ تب اللہ ﷻ نے بنی اسرائیل کی

ہدایت اور رہنمائی کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب تورات عطا فرمائی۔ یہ بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ راہِ حق معلوم کر سکیں اور زندگی کے ہر معاملہ میں اس سے رہنمائی حاصل کر سکیں۔

علمی بات: فرعون اور آلِ فرعون کے غرق ہونے کے بعد اور بنی اسرائیل کے فرعون کی غلامی سے نجات پانے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک بنی اسرائیل فرعون کی غلامی میں تھے، احکامِ شرعیہ پر عمل کرنے سے عاجز تھے۔ اس لئے اُنہیں تورات کی صورت میں تفصیلی احکام اس وقت دیئے جب وہ فرعون کی گرفت سے نکل گئے۔ اب تورات نازل کرنے کا یہ مقصد بھی تھا کہ بنی اسرائیل کی اچھی طرح تربیت کی جائے، تاکہ وہ دوسری قوموں کے لئے بھی نمونہ بنیں۔

علمی بات: جب تک بنی اسرائیل فرعون کی غلامی میں تھے، اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوتی تھی جس کے ذریعہ ضروری ہدایات اور رہنمائی دی جاتی تھی۔ البتہ آپ علیہ السلام کو تورات بعد میں عطا کی گئی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رسول علیہ السلام پر کتاب اللہ کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے۔ اس کی اتباع بھی اسی طرح ضروری ہوتی ہے جیسے کتاب اللہ تعالیٰ کی یہی بات سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بھی دلیل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآنِ کریم کے علاوہ بھی وحی نازل ہوتی تھی۔

آیت نمبر ۵۰: اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام کو اپنی قدرتِ کاملہ کی نشانی بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معجزانہ طور پر بغیر والد حضرت مریم علیہا السلام سے پیدا فرمایا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ان دونوں پر یہ بھی انعام ہوا کہ ان کو ایک بلند اور اونچی زمین پر ٹھکانہ عطا فرمایا، جو سرسبز و شاداب اور ٹھہرنے کے قابل تھی، جہاں چشمے کا پانی بھی بہتا تھا جس سے ان کی ضروریات پوری ہو سکیں۔

علمی بات: "ربوہ" اس بلند زمین کو کہتے ہیں جو ہموار ہو اور اپنے گردوپیش کے علاقے سے اونچی ہو۔ "ذات قرار" سے ایسی جگہ مراد ہے جہاں سب ضروریات زندگی مہیا ہوں اور انسان کو وہاں قیام کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ "معین" سے مراد ہے بہتا ہوا پانی یا جاری چشمہ۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کو ایک بلند اور اونچی زمین پر ٹھکانہ دیا، جو سرسبز و شاداب اور ٹھہرنے کے قابل تھی، جہاں چشمہ کا پانی بھی جاری تھا۔ مفسرین کرام کی ایک رائے یہ ہے کہ اس سے مراد وہ بلند جگہ ہے جہاں لوگوں کی نگاہوں سے بچ کر حضرت مریم علیہا السلام نے پناہ لی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے وہاں پر ایک چشمہ بھی جاری کر دیا۔

آیت نمبر ۵۱: یہاں اگرچہ خطاب تمام رسولوں سے ہے تاہم اس کا حکم عام ہے۔ طیب سے مراد وہ چیزیں جن کا کھانا شریعت نے حلال قرار دیا ہو اور اُنہیں حلال ذرائع سے ہی حاصل بھی کیا گیا ہو۔ پاکیزہ چیزیں کھانے اور نیک اعمال انجام دینے کا حکم ہے۔ رزقِ حلال کی برکت یہ ہے کہ نیک اعمال کی توفیق ملتی ہے۔ حلال میں حرام کی آمیزش کرنے والوں سے بھی اللہ تعالیٰ خوب واقف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تمام پیغمبروں کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ حلال اور پاکیزہ چیزیں کھائیں اور نیک اعمال کریں۔ تمام پیغمبروں نے اس ارشادِ باری تعالیٰ کی تعمیل فرمائی۔ پیغمبروں کے ذریعہ ان کی اُمتوں کو بھی حلال اور پاکیزہ چیزیں کھانے اور شریعت کے مطابق احکام بجالانے کا حکم تھا۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ میں تمہارے اعمال سے پوری طرح باخبر ہوں کہ کون میرے اس حکم پر عمل کرتا ہے اور کون عمل نہیں کرتا۔

علمی بات: "طَيِّبٰت" سے مراد پاکیزہ اور لذّت بخش چیزیں ہیں۔ ہر پاکیزہ چیز اللہ تعالیٰ نے حلال کر دی ہے اور ہر حلال چیز پاکیزہ اور لذّت بخش ہے۔ اس لئے "طیبات" سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جو پاکیزہ اور حلال ہیں۔

علمی بات: اس آیت میں خطاب رسولوں سے ہے، لیکن اس کا حکم عام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حلال چیزیں کھانے اور حرام سے بچنے کا حکم رسولوں کے ساتھ ساتھ تمام لوگوں کے لئے بھی ہے۔ لہٰذا تمام لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہے کہ وہ حلال اور پاکیزہ چیزیں کھائیں اور حرام سے بچیں۔ حدیث شریف کے

مطابق قبولیت دعا کے لئے رزق حلال ایک بنیادی شرط ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اے لوگو! اللہ ﷻ پاک ہے اور پاکیزہ چیز کو ہی پسند فرماتا ہے۔ بے شک اللہ ﷻ نے مومنین کو اسی بات کا حکم دیا ہے جس کا حکم اس نے اپنے رسولوں کو دیا تھا۔" پھر (اس کے بعد) آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: "اے رسولو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو بے شک میں اسے خوب جانتا ہوں جو کچھ تم لوگ کرتے ہو۔" (سورۃ المؤمنون ۲۳، آیت: ۵۱) اور (پھر) آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: "اے ایمان والو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا کی ہیں۔" (سورۃ البقرۃ ۲، آیت: ۱۷۲) (پھر) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ایک آدمی دور دراز کا سفر کرتا ہے، اس کے بال پراگندہ اور غبار آلود ہیں، وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتا ہے۔ (اور کہتا ہے) اے میرے رب! اے میرے رب! حالانکہ اس کا کھانا حرام (مال کا) ہے اور اس کا پینا حرام (مال کا) ہے، اس کا لباس حرام (مال کا) ہے اور اس کی پرورش ہی حرام سے ہوئی ہے۔ تو ایسے آدمی کی دعا کیسے قبول ہوگی؟" (جامع ترمذی)

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت مقدام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "انسان کے لئے بہترین اور پاک کھانا وہی ہے جو وہ اپنے ہاتھ کی (حلال) کمائی سے کھائے اور اللہ ﷻ کے نبی حضرت داؤد (علیہ السلام) اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھایا کرتے تھے۔" (صحیح بخاری)

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تم میں سے کوئی شخص لکڑیاں کاٹ کر اس کا گٹھا اپنی پشت پر لاد کر لائے، وہ اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے سوال کرے اور وہ اس کو دیں یا منع کر دیں۔" (صحیح بخاری)

عملی پہلو: اس آیت کا منشا یہ ہے کہ تمام لوگ پاکیزہ اور حلال چیزیں کھائیں۔ کوئی ایسی چیز نہ کھائیں جو حرام اور ناپاک ہو۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ہم حلال روزی کمائیں اور حلال ہی کھائیں۔ کوئی ایسا ذریعہ آمدنی اختیار نہ کریں جو حرام ہو۔ کوئی ایسی چیز نہ کھائیں جسے شریعت نے حرام قرار دیا ہو۔ کوئی ایسا مشروب پینے کے لئے استعمال نہ کریں جو حرام ہو۔ اس بات کو بھی یقینی بنائیں کہ اپنے اہل وعیال کو صرف اور صرف حلال رزق ہی کھلائیں۔

آیت نمبر ۵۲: ہر چیز کا خالق و مالک اللہ ﷻ ہے اور وہی عبادت کا مستحق ہے۔ اسی کے حضور اعمال پیش ہونے پر بازپرس ہوگی، لہٰذا صرف اسی سے ڈرتے ہوئے نافرمانی سے بچا جائے۔

اُمّت سے مراد ایسا گروہ ہے جو ہم عقیدہ و ہم خیال ہو۔ اس آیت میں "تمہاری امت" سے مراد انبیاء ورسل علیہم السلام کی جماعت اور ان پر ایمان لانے والے ہیں۔ اصل میں تمام انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے ماننے والے سب ایک ہی دین پر تھے۔ ان سب کی دعوت ایک ہی تھی اور یہ سب مجموعی طور پر ایک ہی اُمّت ہیں۔ ان سب کی اصولی تعلیم اور اصولی عقائد ایک ہی رہے ہیں۔ ان سب کا رب بھی صرف ایک ہی ہے اور وہ اللہ ﷻ ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے فرمایا: "اے رسولانِ گرامی! یہ تمہارے پیروکاروں کی جماعت ایک ہی جماعت ہے جس کا نام ہے مسلمین۔" اس لئے اللہ ﷻ نے سورۃ الحج ۲۲، آیت ۷۸ میں فرمایا: هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا "اس (اللہ) نے تمہارا نام مسلمان رکھا اس سے پہلے اور اس (قرآن) میں بھی۔" گویا سب اُمتیں حقیقت میں ایک ہی اُمّت ہیں یعنی مسلم اُمّت مسلمہ۔ سب کا ایک ہی رب اور ایک دین ہے اور وہ دین اسلام ہے۔ البتہ اس کے احکام شریعت میں حالات و واقعات کے مطابق مختلف اَدوار میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن حقیقی روح ایک ہی رہی ہے یعنی اللہ ﷻ اس کے رسولوں علیہم السلام اور اس کی کتابوں پر ایمان رکھنا اور اللہ ﷻ اور اس کے رسولوں علیہم السلام کی کامل اطاعت بجالانا۔

علمی و عملی بات: اللہ ﷻ کے تمام انبیاء کرام علیہم السلام الگ الگ دینوں کی دعوت لے کر نہیں آئے تھے۔ بلکہ وہ سب ایک ہی دین کی دعوت لے کر آئے تھے۔ بعد میں لوگوں نے اپنی طرف سے الگ الگ دین بنا لیئے ہیں۔ اصل میں ہر نبی علیہ السلام نے ایک ہی اُمّت، اُمّتِ مسلمہ کے قائم کرنے کی جدوجہد کی۔ جب قوموں نے بگاڑ پیدا کیا، تو اللہ ﷻ نے اس بگاڑ کی اصلاح کے لئے دوسرے نبی علیہ السلام اور رسول علیہ السلام بھیجے۔ ان نبیوں اور رسولوں علیہم السلام نے لوگوں کی اصلاح کی اور اصل دین

کی ہی دعوت دی۔ کسی نبی علیہ السلام نے اپنے لئے کوئی الگ دین پیش نہیں کیا۔ اسی اصل دین کے داعی اکمل اور خاتم النبیین بن کر ہمارے پیارے نبی سیّدنا حضرت محمد مصطفی ﷺ تشریف لائے ہیں۔ اس لئے اب تمام لوگوں کا یہ فرض ہے کہ وہ آپ ﷺ کی دعوت کو صدقِ دل سے قبول کریں۔ سارے اختلافات کو ختم کر کے دین توحید کے پرچم تلے متحد ہو جائیں۔ اپنے رب کی معرفت حاصل کریں۔ اس کی ناراضگی سے ڈرتے رہیں اور اُس کی نافرمانی سے بچتے رہیں۔

آیت نمبر ۵۳: رسولوں کی تعلیمات پر عمل کرنے کے بجائے لوگ شدید اختلافات میں پڑ گئے۔ حتیٰ کہ عقائد اور اصولی باتوں میں بھی فرق کرنے لگ گئے۔ ہر گروہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے اور اسی پر خوش ہے۔

علمی نکتہ: تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا دین ایک ہی تھا اور ان سب کی دعوت بھی ایک تھی۔ لیکن بعد میں لوگوں نے اصل دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور اس کے کئی دین اور مذہب بنا لیئے۔ پھر ان ادیان اور مذاہب کے اپنے اپنے نام رکھ لیئے۔ کوئی یہودی بن گیا، کوئی عیسائی، کوئی مجوسی اور کوئی کچھ اور بن گیا۔ اس کے نتیجہ میں ہر گروہ اپنے اسی ٹکڑے جو اس کے پاس ہے یعنی نئے خود ساختہ مذہب پر خوش ہے اور اسی میں مست ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں ٹھیک ہوں اور کامیابی کی راہ پر چل رہا ہوں۔ وہ اس بارے میں سوچنے اور غور و فکر سے کام لینے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتا کہ حق اور حقیقت کیا ہے؟ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دین حق تو ایک ہی دین تھا اور ایک ہی ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام نے اسی دین کی دعوت دی تھی اور سب کو اسی کی طرف بلایا تھا اور وہ دین اسلام ہے۔ لیکن مختلف لوگوں اور ان کے نام نہاد مذہبی پیشواؤں نے اپنی خواہشات اور اغراض و مقاصد کی بنا پر اس میں تفرقہ ڈالا اور اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کئی مذہب بنا لیئے۔

علمی بات: اُصول کے اعتبار سے تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا دین وملت ایک اور سب کا معبود بھی ایک ہے۔ لیکن لوگوں نے پھوٹ ڈال کر اصل دین کو پارہ پارہ کر دیا اور علیحدہ علیحدہ راہیں نکال لیں۔ اس طرح آراء و خواہشات کی اتباع کر کے سینکڑوں فرقے اور مذہب بن گئے۔ یہ تفریق انبیاء کرام علیہم السلام نے نہیں سکھائی۔

آیت نمبر ۵۴: متعصب اور ہٹ دھرم کفار کو ایک مقررہ وقت تک ان کی غفلتوں میں چھوڑ دینے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ جن لوگوں نے اصل دین سے ہٹ کر اپنے نئے دین اور مذہب بنا لیئے ہیں اور اس پر ہی راضی ہیں، وہ گمراہ ہو چکے ہیں۔ اللہ ﷻ نے اپنے پیارے نبی ﷺ کو تلقین فرمائی ہے کہ آپ ﷺ نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا ہے، اس کے باوجود اگر یہ لوگ تعصب کا شکار ہیں اور آپ ﷺ پر ایمان نہیں لاتے، تو آپ ﷺ رنجیدہ خاطر اور غم زدہ نہ ہوں، ان کو ان کی غفلت میں ہی رہنے دیں، جب ان پر اللہ ﷻ کا عذاب آئے گا یا انہیں موت آئے گی، تو اُنہیں حق و باطل بالکل واضح نظر آ جائے گا۔

عملی پہلو: مسلمانوں کو تبلیغ دین کا فریضہ ادا کرنا چاہیئے۔ لیکن اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ کا پیغام سننے کے بعد بھی، متعصب اور ہٹ دھرم لوگ جو راہِ راست کی طرف آنا پسند نہیں کرتے اور اپنی غفلت ہی میں ڈوبے رہنا چاہتے ہیں ان کے بارے میں فکر مند نہیں ہونا چاہیئے، بلکہ اُنہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ جب اُنہیں موت آئے گی تو اُنہیں حقیقت معلوم ہو جائے گی۔

آیت نمبر ۵۵: کفار اور گمراہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اُنہیں مال و دولت، اولاد اور دیگر نعمتیں جو عطا کی گئی ہیں، وہ اللہ ﷻ کی رضا مندی کی علامت ہیں۔ ان کا یہ خیال غلط ہے۔ درحقیقت اللہ ﷻ نے اُنہیں ایک مقررہ مدت تک مہلت دی ہوئی ہے اور اللہ ﷻ نے اُنہیں جو اسباب خیر دیئے ہوئے ہیں، اس میں ان کی آزمائش ہے۔ اسی آزمائش کی بنیاد پر آخرت میں ان کا ایک فیصلہ ہو گا۔

علمی بات: کئی دفعہ بعض حکمتوں کے پیش نظر گمراہ اور بدکردار لوگوں کو مہلت دی جاتی ہے۔ گمراہی اور بدکاری کے باوجود ان کا کاروبار خوب چمکتا ہے۔ جاہ و مال میں اضافہ ہوتا ہے، رہنے کے لئے خوشنما گھر اور سواری کے لئے بہترین سواریاں میسر آ جاتی ہیں تو وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ شاید وہ بڑے اچھے کام کر رہے ہیں، اسی لئے تو اللہ ﷻ ان پر اتنا مہربان ہے۔ دراصل یہ لوگ حقیقت حال سے بے خبر ہیں۔ ان کے لئے دولت کی کثرت اور جاہ وجلال میں ترقی محض اس لئے ہے کہ انہیں ایک طویل اور کٹھن آزمائش میں مبتلا کر دیا جائے۔ اگر اُنہیں کچھ عقل ہوتی تو وہ اپنے دامن پر گناہوں کے بدنما داغ دیکھ کر شرما جاتے۔ دولت کی قلت جس طرح اللہ ﷻ کی ناراضگی کی دلیل نہیں، اسی طرح دولت کی کثرت اس کی رضا مندی کی دلیل نہیں۔ اصل چیز صحیح عقیدہ اور نیک اعمال کی نجام دہی ہے یعنی اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ کی کامل اطاعت ہے۔

عملی پہلو: جو لوگ نیک اور پاکباز ہیں، وہ کبھی مال و دولت پر مغرور نہیں ہوتے اور کبھی مادی آسائشوں کو تقویٰ وصلاح کا معیار قرار نہیں دیتے۔ بلکہ جس وقت ان کے ہاتھ میں دولت آجاتی ہے، تو وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش نہ ہو۔

آیت نمبر ۵۶: کفار کا یہ گمان ہے کہ ان کو جو دُنیا میں کچھ فوائد دے رہا ہے تو یہ ان کے حق میں بہتر اور ان کے خوش نصیب ہونے کی علامت ہے۔ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ درحقیقت ان کفار کو شعور نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ ان کی آزمائش ہو رہی ہے اور اُنہیں ایک مقررہ مدت تک مہلت دی جارہی ہے۔ وہ اس خام خیالی میں مبتلا ہیں کہ اگر ہم کسی باطل مذہب کے پیروکار ہوتے تو مال واولاد کی جو فراوانی ہمیں حاصل ہے وہ نہ ہوتی۔ دراصل اُنہیں معلوم نہیں ہے کہ ان چیزوں کا کسی کو عطا ہونا اس کے برسرِ حق ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

علمی بات: اگر کفار کو دُنیاوی زندگی کی خوشحالیاں مل رہی ہیں، تو اس لئے نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں ایک مقررہ وقت تک مہلت دے رہا ہے اور ان کا وہ مقررہ وقت ابھی آیا نہیں ہے۔ یہ دُنیا دراصل دارالجزا نہیں بلکہ دارالامتحان ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ ساری چیزیں آزمائش اور امتحان کے لئے دی ہیں۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے یہ سمجھ لینا کہ یہاں کا عیش و آرام اس کے پانے والے کے برحق، صالح اور اللہ تعالیٰ کے محبوب ہونے کا ثبوت ہے اور تکلیف و آرام میں زندگی بسر کرنے والا غیر صالح اور مغضوب بارگاہِ الٰہی ہے تو یہ ایک بڑی غلط فہمی بلکہ حماقت ہے۔

آیت نمبر ۵۷: اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں کی چند صفات بیان ہو رہی ہیں۔ پہلی صفت یہ ہے کہ ان پر ہر وقت اپنے رب کا خوف طاری رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ محتاط رہتے ہیں کہ کہیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ارتکاب نہ کر بیٹھیں جس پر ان کی گرفت ہو جائے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے خوف سے لرزاں رہتے ہیں، اُنہیں یہ فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ آخرت میں اُنہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کیسے چھٹکارا ملے گا؟ وہ قیامت کے اس دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی۔

علمی بات: پچھلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار کی مذمت فرمائی تھی اور ان آیات میں مومنین کی تحسین فرمائی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ کافروں کے برعکس اللہ تعالیٰ کی جانب سے برکات کے حقدار وہ ہوتے ہیں جو ان صفات سے متصف ہوتے ہیں جن کا ذکر اس آیت اور اگلی آیات میں آرہا ہے۔

علمی بات: بعض مفسرین کرام نے اس آیت کا یہ مطلب بھی بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے اپنے رب کے ڈر سے ہمیشہ اس کی اطاعت کرتے ہیں اور کبھی بھی نافرمانی نہیں کرتے۔ جس شخص کے دل میں اپنے رب کا خوف کامل درجہ کا ہو گا، وہ دُنیا میں اللہ تعالیٰ کے ناراض ہونے سے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بے حد خوف زدہ ہو گا اور جس شخص کا یہ حال ہو گا وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بہت دور رہے گا اور ہمیشہ اس کی فرماں برداری میں رہے گا۔

عملی پہلو: ایک مومن سے خوفِ خدا کا یہ معیار مطلوب ہے کہ وہ نہ صرف اللہ تعالیٰ سے ڈرے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا خوف اس پر اس طرح چھا جائے کہ اس کی ہیبت وجلال سے وہ کانپ اُٹھے اور اس کے عذاب کے تصور سے اس پر لرزہ طاری ہو۔ جس کے نتیجہ میں وہ کبھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرے اور ہمیشہ اس کی اطاعت میں رہے۔ یہ ایک مومن کی اہم ترین صفت ہے اور یہ کوئی منفی چیز نہیں بلکہ زبردست طاقت پیدا کرنے والی چیز ہے۔ ایسی طاقت کہ پھر دُنیا کی کوئی طاقت اسے جھکا نہیں سکتی اور پھر فرعون کو بھی منہ کی کھانا پڑتی ہے۔

آیت نمبر ۵۸: اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات پر ایمان لاتے ہیں اور ان پر دل سے یقین رکھتے ہیں۔

علمی بات: یہاں پر "آیات" سے دو طرح کی آیات مراد ہیں۔ آیات کا ایک معنیٰ "نشانیاں" ہے۔ اس معنیٰ کے لحاظ سے آیت کا یہ مفہوم ہے کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی ذات اور صفات پر نشانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ اہل ایمان ان نشانیوں میں غور و فکر کر کے صاحبِ نشان "رب العالمین" تک پہنچتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر ایمان لاتے ہیں۔ آیات کا دوسرا معنیٰ "قرآنِ مجید کی آیات" ہیں۔ اہل ایمان آیات قرآنی پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان آیات کو حرزِ جان بناتے ہیں، دل و دماغ کی زینت بناتے ہیں اور ان کے ہر حکم کی تعمیل کو زندگی کا اثاثہ گردانتے ہیں۔

عملی پہلو: جب ہم اپنے وجود میں اور اس کائنات میں قدرت کی نشانیوں پر غور و فکر کریں گے، تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہمارے وجود اور اس کائنات کو بنانے اور چلانے والی ایک ہی ذات ہے اور وہ اللہ ﷻ کی ذاتِ بابرکت ہے۔ لہٰذا ہم اس پر سچے دل سے ایمان لائیں اور اس کے فرماں بردار بندے بن جائیں۔ اسی طرح قرآنِ مجید کی آیات پر ہم سچے دل سے ایمان لائیں اور ان کی تعلیمات کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیں۔

آیت نمبر ۵۹: اللہ ﷻ کے مخلص بندوں کی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ اللہ ﷻ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔ وہ اللہ ﷻ کے لئے اپنی بندگی، اطاعت اور عبودیت کو بالکل خالص کرلیتے ہیں، اس کے ساتھ کسی اور کی بندگی کا شائبہ تک نہیں رکھتے۔ وہ شرک کی ہر بڑی چھوٹی قسم سے بچتے ہیں خواہ وہ شرک (ظاہر) جلی ہو یا خفی (پوشیدہ)، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ شرک سب سے بڑا اور نہایت ہولناک گناہ ہے۔

فکری و عملی پہلو: شرک کے ردّ اور ابطال کے ضمن میں قرآنِ حکیم میں بہت تکرار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس معاملہ کو بار بار سمجھنے کی ضرورت ہے۔ شرک کی اہم اور واضح صورتوں کے بارے میں تو سب جانتے ہیں اور اجتناب بھی کرتے ہیں، لیکن اس کی بہت سی مخفی صورتیں بھی ہیں جو ہر دور میں ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا ایک بندۂ مؤمن کے لئے ضروری ہے کہ وہ شرک کی مہلک بیماری کے بارے میں اپنے اندر باریک بینی اور دِقتِ نظری کی ایسی صلاحیت پیدا کرلے کہ شرک جب بھی اس کے سامنے آئے، وہ جس روپ اور جس بھیس میں بھی ہو، بندۂ مؤمن اسے پہچان لے اور اس سے اجتناب کرے۔

آیت نمبر ۶۰: اللہ ﷻ کے مخلص بندوں کی چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ اللہ ﷻ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور دیگر نیک کاموں میں بھی اپنی صلاحیتیں صَرف کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اللہ ﷻ سے ڈرتے بھی رہتے ہیں کہ نہ جانے یہ نیکیاں قبول ہوں یا نہ ہوں؟ وہ اللہ ﷻ کی راہ میں حتی المقدار صدقہ وخیرات اور دوسرے نیک اعمال کرتے ہیں، لیکن وہ اپنی نیکیوں پر تکبر نہیں کرتے، بلکہ اُنہیں یہ خدشہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں کسی کوتاہی، غلطی یا خلوص کی کمی کے باعث، ان کا یہ عمل اللہ ﷻ کے ہاں رد نہ کردیا جائے۔

علمی بات: عربی زبان میں "ایتاء" یعنی "دینے" کا لفظ صرف مال یا کوئی مادّی چیز دینے ہی کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا، بلکہ معنوی چیزیں دینے کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔ اس دینے کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ وہ راہِ خدا میں مال دیتے ہیں، بلکہ اس کا مطلب اللہ ﷻ کے حضور اطاعت و بندگی پیش کرنے پر بھی حاوی ہے۔ اس معنٰی کے لحاظ سے آیت کا پورا مفہوم یہ ہے کہ وہ اللہ ﷻ کی فرماں برداری میں جو کچھ بھی نیکیاں کرتے ہیں، جو کچھ بھی خدمات انجام دیتے ہیں، جو کچھ بھی قربانیاں کرتے ہیں اور جو کچھ بھی صدقات دیتے ہیں، ان پر وہ پھولتے نہیں ہیں، غرور و تکبر میں مبتلا نہیں ہوتے، بلکہ اپنے مقدور بھر سب کچھ کرکے بھی ڈرتے رہتے ہیں کہ رب ہی جانے یہ قبول ہو یا نہ ہو۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت (سورۃ المؤمنون ۲۳، آیت: ۶۰) کے متعلق پوچھا: "کیا یہ وہ لوگ ہیں جو شراب پیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں؟ (اس وجہ سے ان کے دل کانپتے رہتے ہیں۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "نہیں، اے صدیق کی بیٹی! بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور صدقہ کرتے ہیں اور اس کے باوجود ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی نیکیاں قبول نہ ہوں۔" پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ "یہ لوگ نیکیوں میں جلدی کرتے ہیں اور وہ ان (نیکیوں) کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں۔" (جامع ترمذی)

آیت نمبر ۶۱: اللہ ﷻ کے مخلص بندے بھلائی کے ہر کام میں جلدی کرتے ہیں۔ زندگی میں ان کی بھاگ دوڑ نیکیوں اور بھلائیوں کے لئے ہوتی ہے اور اس میدان میں ہمیشہ وہ دوسروں سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ جیسے عام لوگ دُنیا کے منافع کے پیچھے دوڑتے اور دوسروں سے آگے بڑھنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ نیک اعمال میں ایسا ہی کرتے ہیں اسی لئے وہ نیک کاموں میں دوسروں سے آگے رہتے ہیں۔

علمی بات: اس آیت کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ نیکیوں کی بہت زیادہ رغبت رکھتے ہیں، اس لئے جلدی جلدی نیکیاں کرتے ہیں تاکہ کوئی نیکی ضائع نہ ہوجائے۔ یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ نیکیوں میں پیش قدمی کرنے پر جن اُخروی بھلائیوں کا وعدہ کیا گیا ہے اور نیک اعمال میں تیزی کرنے سے جن دنیوی فوائد کو

وابستہ کیا گیا ہے، سب فائدوں کے حاصل کرنے کے لئے وہ تیزی سے کام لیتے ہیں اور جلدی جلدی حاصل کرتے ہیں۔

آیت نمبر ۶۲: اللہ ﷻ نے شریعت میں ایسے کوئی احکام نازل نہیں کیئے جو انسانی طاقت سے باہر ہوں۔ اسلام کے تمام احکام انسان کی وسعت اور استطاعت کے مطابق ہیں۔ کیونکہ اللہ ﷻ کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا کہ جسے برداشت کرنے اور جس کے مطابق عمل کرنے کی اس میں استطاعت نہ ہو۔ انسان کے اعمال ایک ایسی کتاب میں لکھے جارہے ہیں جو کسی بھی نیکی یابدی کو ضائع نہیں ہونے دیتے۔ کتاب سے مراد ہر شخص کا اعمال نامہ اور اس کی زندگی بھر کے اعمال وافعال کی تفصیلات پر مشتمل ریکارڈ ہے۔ لہٰذا ہر انسان کے اعمال کا ریکارڈ تیار کیا جارہا ہے، اس لئے روزِ قیامت کسی کے ساتھ زیادتی یا حق تلفی نہیں ہوگی۔

علمی بات: اسلام دینِ فطرت ہے۔ اللہ ﷻ نے شریعت کے احکام میں انسان کی فطرت اور اس کی استطاعت کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ شریعت کا کوئی ایسا حکم نہیں ہے جو انسان کی طاقت سے باہر ہو۔ مثلاً نماز پڑھنا انسانی استطاعت میں ہے۔ اگر بیمار آدمی نماز میں کھڑا نہ ہوسکے تو اسے بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔ روزہ رکھنا انسانی استطاعت میں ہے۔ روزہ میں بیمار اور مسافر کے لئے رخصت ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے اور بعد میں قضا کرلے۔ زکوٰۃ سب پر فرض نہیں ہے، صرف صاحبِ نصاب یعنی امیر لوگوں پر فرض ہے۔ اس طرح سے غریب لوگ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوجاتے ہیں۔ حج سب پر فرض نہیں ہے، صرف صاحبِ استطاعت پر فرض ہے جو اس کے لئے وسائل اور حج ادا کرنے کی استطاعت رکھتا ہو۔ اسی طرح دین کے سارے احکام انسان کے بس میں ہیں۔ لہٰذا ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اللہ ﷻ نے ہمیں ایک آسان شریعت عطا فرمائی ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بے شک دین آسان ہے اور دین میں جو کوئی سختی اختیار کرے گا تو دین اس پر غالب آجائے گا (اور اس کی سختی نہ چل سکے گی)۔ اس لئے اپنے عمل میں پختگی اختیار کرو اور (جہاں تک ممکن ہو) میانہ روی کی چال چلو اور خوش ہو جاؤ (کہ اس طرزِ عمل سے تم کو دارین کے فوائد حاصل ہوں گے) اور صبح کی عبادت، شام کی عبادت اور آخر رات کی عبادت سے مدد حاصل کرو۔" (صحیح بخاری)

عملی پہلو: اللہ ﷻ کا ہم پر یہ احسان ہے کہ اس نے ہمیں ایک آسان شریعت عطا فرمائی ہے جس کے ہر حکم میں ہماری استطاعت کا خیال رکھا گیا ہے۔ کیونکہ اللہ ﷻ ہمارا خالق ہے وہ خوب جانتا ہے کہ ہماری استطاعت کس قدر ہے اور کیا باتیں ہمارے نفع اور کون سی باتیں ہمارے نقصان کی ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اللہ ﷻ کے ہر حکم پر عمل کریں، زیادہ سے زیادہ نیک اعمال کریں اور اُس کی منع کردہ باتوں سے اجتناب کریں۔ یہ بات بھی ہمیں یاد رکھنی چاہیئے کہ ہمارے اعمال کا ریکارڈ تیار ہورہا ہے جس کے مطابق قیامت کے دن ہمارا احتساب ہوگا۔ اس کے بعد ہماری کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ ہوگا اور اس دن ہمارا یہ عذر کام نہ آئے گا کہ شریعت کے احکام پر عمل کرنا ہمارے بس میں نہیں تھا۔

آیت نمبر ۶۳: کفار کی یہ حالت ہے کہ ان کے دل آخرت کی طرف سے جہالت اور غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کو خیال واحساس تک نہیں کہ جو کچھ یہ کہہ اور کررہے ہیں وہ کہیں درج ہورہا ہے۔ یہ پورا ریکارڈ کل قیامت کے روز ان کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ ان کی دلچسپی کے کام کچھ اور ہی ہیں جن میں یہ دن رات محو اور منہمک رہتے ہیں۔ جن کا تعلق ان کی خواہشات کی تکمیل، دُنیاوی مفادات کی تحصیل اور مادی فوائد ومنافع سے ہوتا ہے اور بس۔ یہ لوگ کئی بُرے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔

علمی بات: پچھلی آیات میں اللہ ﷻ کے مخلص بندوں کی کیفیات اور صفات کا بیان تھا۔ اب یہاں سے کفار کی کیفیات اور احوال بیان ہورہے ہیں۔ مومنوں کی صفات کے بعد روئے سخن کفار کی طرف پھیر دیا گیا ہے کہ مذکورہ بالا آیات میں بھلائی کی طرف سبقت کرنے والے مومنوں کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان سے یہ کفار کوسوں دور ہیں اور ان کے دلوں پر غفلت طاری ہے۔

لمحہ فکریہ: کافروں کا یہ حال بیان ہوا ہے کہ وہ آخرت سے غافل ہیں اور ایسے کاموں میں مشغول ہیں جو بُرے ہیں۔ یہ تو کافروں کا حال ہے، مگر موجودہ دور میں بعض مسلمانوں کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ بعض مسلمان بھی غفلت کا شکار ہیں اور دُنیاوی زندگی میں کھو کر بُرے کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے پاس دین کی خدمت اور بھلائی کے کاموں کے لئے وقت ہی نہیں ہے۔ اُنہیں دن رات اپنی دُنیا کمانے کی فکر ہے۔ وہ اپنے وقت کا کل سرمایہ اپنی ساری توانائیوں سمیت خود ساختہ جھوٹے معیارات کو برقرار رکھنے اور زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کے لئے کھپا رہے ہیں۔

عملی پہلو: اس آیت کے مضمون کی روشنی میں ہر شخص کو اپنی مصروفیات کا جائزہ لینا چاہیئے کہ اس کی شبانہ روز تگ و دو اور بھاگ دوڑ کا کتنا حصہ دین کے لئے ہے اور کتنا حصہ دُنیا کے لئے؟ اگر کسی شخص کی تمام تر کوشش اور ساری محنت ہی دُنیا کے لئے ہے، اس کا نصب العین بھی دُنیا ہے اور اس نے منصوبہ بندی بھی صرف اسی کے لئے کر رکھی ہے، تو اسے سوچنا چاہیئے کہ آخرت کی تیاری کرنے کے لئے فرصت کے لمحات اسے کب اور کیسے میسر آئیں گے؟

آیت نمبر ۶۴: خوشحال کفار کا یہ حال ہے کہ وہ عیش میں پڑے ہوئے دُنیا کے مزے لوٹ رہے ہیں اور اللہ ﷻ سے غافل ہیں۔ لیکن جب ان خوشحال اور عیاش کفار پر اللہ ﷻ کا عذاب نازل ہو گا، تو وہ چیخ و پکار اور فریاد کرنے لگیں گے۔ لیکن ان کی کوئی فریاد اور چیخ و پکار نہ سنی جائے گی اور وہ عذاب کا مزہ چکھیں گے۔ چونکہ مال دار اور بااثر لوگ حق کی مخالفت میں پیش پیش ہوتے ہیں اس لئے ان کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ ایسے عذاب اس دُنیا میں طرح طرح کی صورتوں اور شکلوں میں آتے رہتے ہیں تاکہ منکر اور باغی لوگ اپنے کیئے کی سزا پائیں اور جس نے سنبھلنا ہو وہ سنبھل جائے۔ پس کبھی یہ عذاب کسی طوفان اور زلزلہ کی شکل میں آتا ہے۔ کبھی کسی آگ اور حادثہ کی صورت میں اور کبھی کسی جنگ اور دوسری تباہی کی شکل میں اور کبھی کسی قحط سالی کی صورت میں وغیرہ وغیرہ۔

علمی و عملی بات: جن کفار مکہ کو اللہ ﷻ نے مال و اولاد سے نوازا تھا اور ان کی رسی ڈھیلی کر دی تھی کہ کفر و شرک میں تیزی سے آگے بڑھتے چلے جائیں، جب میدانِ بدر میں اللہ ﷻ نے ان کی گرفت کی اور قید و بند اور قتل کی صورت میں اس کا عذاب ان پر مسلط ہو گیا یا جب رسول اللہ ﷺ کی دعاءِ ضرر کی وجہ سے اللہ ﷻ نے اُنہیں قحط سالی میں مبتلا کر دیا، تو چیخ پکار کرنے لگے۔

علمی بات: "مترفین" کا ترجمہ "خوشحال" کیا گیا ہے۔ "مترفین" اصل میں ان لوگوں کو کہتے ہیں جو دنیوی مال و دولت کو پا کر مزے کر رہے ہوں اور اللہ ﷻ اور اس کی مخلوق کے حقوق سے غافل ہوں۔ اس لفظ کا ترجمہ "عیاش" بھی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح لفظ "جُوَار" کا ترجمہ "فریاد" کیا گیا ہے۔ اصل میں "جُوَار" بیل کی اس آواز کو کہتے ہیں جو سخت تکلیف کے وقت وہ نکالتا ہے۔ یہ لفظ یہاں محض فریاد اور چیخ و پکار کے معنیٰ میں نہیں، بلکہ اس شخص کی فریاد اور چیخ و پکار کے معنیٰ میں بولا گیا ہے جو کسی رحم کا مستحق نہ ہو۔ اس میں تحقیر اور طنز کا انداز چھپا ہوا ہے۔ اس کے اندر یہ معنیٰ پوشیدہ ہیں کہ "اچھا، اب جو اپنے کرتوتوں کا مزہ چکھنے کی نوبت آئی تو بلبلانے لگے۔"

عملی پہلو: دُنیا کا مال و دولت اور عیش و عشرت عارضی ہے اور ہماری آزمائش کے لئے ہے۔ اس کا ہمیں اللہ ﷻ کو حساب دینا ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم مال و دولت کو اللہ ﷻ کے احکام کے دائرہ میں رہتے ہوئے حاصل کریں اور یہ دھیان رکھیں کہ کہیں عیش و عشرت میں پڑ کر اللہ ﷻ سے غافل نہ ہو جائیں۔ اگر ہم پر غفلت طاری ہو گئی تو ہمیں کل کو پچھتانا پڑے گا۔ لہٰذا ہمیشہ اللہ ﷻ کو یاد رکھیں اور اس کی اطاعت و فرماں برداری میں زندگی بسر کریں۔

آیت نمبر ۶۵: جب ان آسودہ حال کفار پر اللہ ﷻ کا عذاب آئے گا تو یہ فریاد اور چیخ و پکار کریں گے۔ تب اُنہیں کہا جائے گا کہ آج تمہاری اس چیخ و پکار اور آہ و فریاد کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا، تمہاری فریاد سن کر آج کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا اور اللہ ﷻ کی طرف سے بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ یعنی عذاب آ جانے کے وقت ان کا فریاد کرنا کچھ مفید نہ ہو گا۔ اس وقت اللہ ﷻ کی گرفت سے اُنہیں کوئی نہیں چھڑا سکے گا اور نہ ہی ان کی کوئی مدد کی جائے گی۔

چنانچہ اُنہیں بتا دیا گیا کہ اب اللہ ﷻ کے عذاب سے نجات دلانے کے لئے ان کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ جب میری آیتیں ان کے سامنے پڑھی جاتی تھیں اور کہا جاتا تھا کہ وہ ان سے نصیحت حاصل کریں تو اس وقت وہ منہ موڑ کر چل دیتے تھے۔ لہٰذا اب چیخ و پکار کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

علمی بات: فرعون کی سرگزشت میں بھی یہی بات مذکور ہوئی ہے۔ وہ جب طوفان کی لپیٹ میں آگیا تو چلایا کہ میں حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کے رب پر ایمان لایا۔ لیکن اس کا یہ اقرار و ایمان قبول نہیں ہوا اور اسے جواب ملا کہ اب تیرے ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، کیونکہ تیرے لئے ایمان لانے کا وقت گزر چکا ہے۔

عملی پہلو: عذاب کے وقت کی آہ وفریاد اور چیخ کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم آج اللہ تعالیٰ سے فریاد کریں کہ وہ ہمارے گناہوں کو معاف کر دے اور اس کی بارگاہ میں سچی توبہ کریں، تاکہ ہم اس کے عذاب سے بچ سکیں۔

آیت نمبر ٦٦: عذاب کے وقت کفار فریاد اور چیخ و پکار کریں گے۔ اس وقت اُنہیں مخاطب کر کے بتایا جائے گا کہ اب کیوں شور مچاتے ہو، وہ وقت یاد کرو جب تمہیں اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی تھیں، تو تم الٹے پاؤں بھاگتے تھے اور سننا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ تمہیں یاد ہے اس وقت تمہارا کیا رویہ ہوا کرتا تھا۔ تم ایسی محفلوں میں شرکت کرنا ہی اپنی شان کے خلاف اور عزت کے منافی سمجھتے تھے اور دور سے ہی واپس لوٹ جایا کرتے تھے۔ حق کی دعوت دیئے جانے کے باوجود تم اسے سننا گوارا نہیں کرتے تھے۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ کی آیات سے اعراض اور روگردانی کرنا کفار و مشرکین کا طرزِ عمل ہے۔ ان کے اس رویہ پر اُنہیں سخت عذاب دیا جائے گا جس میں یہ چیخیں چلائیں گے، لیکن ان کی کوئی پکار نہ سنی جائے گی۔ اس کے برعکس اس کتابِ حکیم پر سچا ایمان، اس سے دلی تعلق، اس کو سیکھنا سکھانا اور اس کی تعلیماتِ مقدّسہ کو صدقِ دل سے اپنانا اور ان پر عمل پیرا ہونا، اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کا طرزِ عمل ہے۔ یہ دُنیا و آخرت کی کامیابی و کامرانی کا ذریعہ ہے۔

عملی پہلو: قرآنِ حکیم سے منہ موڑنا دراصل عذابِ الٰہی کو دعوت دینا ہے۔ طرح طرح کے ان عذابوں سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان دُنیاوی زندگی کی اس محدود فرصت میں قرآنِ حکیم کی طرف سچے دل سے رجوع کرلے۔ اس پر صحیح و سچا ایمان لے آئے اور اس کے ارشادات وہدایات کے مطابق اپنا عقیدہ اور عمل درست کرلے۔

آیت نمبر ٦٧: عذاب میں مبتلا کفار جب چیخ و پکار کریں گے تو اُنہیں کہا جائے گا: کیا تمہیں وہ وقت یاد ہے جب اللہ تعالیٰ کا رسول علیہ السلام تمہیں قرآنِ حکیم کی آیتیں پڑھ کر سناتا تھا تو تم ان کو سننا گوارا نہیں کرتے تھے اور تکبر کرتے ہوئے وہاں سے بھاگ جاتے تھے۔ نیز چاندنی راتوں میں کعبہ شریف کے پاس بیٹھ کر قرآن مجید اور صاحب قرآن کے خلاف سازشیں کرتے تھے، لہٰذا آج اپنی سازشوں کا مزہ چکھو، چیخنے چلانے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ مشرکین مکہ کا یہ حال تھا کہ وہ حرم شریف اور کعبہ شریف کے انتظام اور خدمت پر ناز کرتے اور تکبر کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کو رد کر دیتے تھے۔ وہ راتوں کو بیٹھ کر قصہ گوئی کی مجلسیں جما کر قرآنِ حکیم اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف بُری باتیں کرتے تھے۔ (معاذ اللہ)

علمی بات: "سَامِرًا" کے معنیٰ رات کو باتیں کرنے والا اور "تَهْجُرُونَ" کا معنی ہے بُری باتیں کرنا۔ یعنی وہ رات کے وقت حرم میں بیٹھ کر قرآنِ مجید اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق بُری اور بے ہودہ باتیں کرتے تھے اور طرح طرح کے قصے گھڑتے تھے، کوئی جادو کہتا تھا، کوئی شاعری، کوئی کہانت، کوئی کچھ اور (معاذ اللہ)۔

عملی پہلو: رات کو جاگ کر دیر تک باتیں کرنا اس صورت میں ممنوع اور مکروہ ہے، جب قصہ کہانی اور کھیل تماشا کی یا دُنیاوی باتیں کی جائیں۔ لیکن اگر دین کی باتیں کی جائیں یا ذکر، تسبیح یا نوافل پڑھنے، یا دینی علم سیکھنے کے لئے جاگا جائے، تو وہ پسندیدہ بلکہ لائق تحسین ہے۔

آیت نمبر ٦٨: اللہ تعالیٰ نے کفار و مشرکین کو تنبیہ کی ہے کہ انہوں نے قرآنِ مجید میں صدقِ دل سے غور و فکر کیوں نہیں کیا۔ اگر وہ صحیح طور پر قرآن مجید پر غور و فکر کرتے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرتے، تو یہ بات ان پر آشکارا ہو جاتی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب ہے اور خاتم النبیین حضرت سیّدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن پر نازل ہوئی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔ ان مشرکین کی یہ بات بھی قابلِ ملامت ہے کہ انہوں نے قرآنِ کریم کا اس لئے انکار کر دیا ہے کہ ایسا کلام ان کے آباؤ اجداد کے پاس نہیں آیا تھا۔ اگر یہ لوگ قرآنِ حکیم کی تعلیماتِ مقدسہ کو اپنے باپ دادا کی روایات کے خلاف سمجھ کر ان سے بدکتے ہیں، تو یہ ان کی بہت بڑی جہالت و حماقت اور ہٹ دھرمی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ان پر یہ احسان ہے کہ ان کے پاس وہ دین اور شریعت آئی ہے جس سے ان کے آباؤ اجداد زمانۂ جاہلیت میں محروم رہے۔ اس پر اُنہیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے تھا اور دینِ اسلام کو قبول کرلینا چاہیئے تھا۔

علمی بات: کفار و مشرکین کے حق کو جھٹلانے کی دو وجوہات بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے قرآنِ مجید پر کبھی غور و فکر نہیں کیا اگر وہ غور و فکر کر لیتے تو قرآنِ مجید اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آتے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس ایسا کلام آیا ہے جو ان کے آباؤ اجداد کے پاس نہیں آیا تھا۔ اس لئے وہ اپنے آباؤ اجداد کے خلاف اس کلام کو قبول نہیں کرتے۔ ان آیات میں مشرکین کی ان دونوں وجوہات کو باطل قرار دے کر ان کا رد کیا گیا ہے۔

عملی پہلو: قرآنِ مجید پر غور و فکر کرنے سے انسان اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ یہ سچا کلام ہے اور اس میں بیان کی گئی تعلیمات برحق ہیں۔ انسانی فکر، علم اور تحقیق میں جس قدر اضافہ ہوتا جا رہا ہے اُس قدر قرآنِ حکیم کی عظمت آشکار ہوتی جا رہی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"آپ (ﷺ) فرما دیجئے بھلا دیکھو اگر یہ (قرآن) اللہ ﷻ کی طرف سے ہے پھر تم نے اس کا انکار کر دیا تو اس سے زیادہ کون گمراہ ہو گا جو بہت دور کی مخالفت میں پڑا ہو۔ عنقریب ہم اُنہیں اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق دُنیا میں بھی اور (خود) ان کی جانوں میں بھی یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے گا کہ بے شک وہ (قرآن) حق ہے کیا یہ بات کافی نہیں (آپ ﷺ کی تسلی کے لئے) کہ بے شک آپ کا رب ہر شے پر گواہ ہے۔" (سورۃ حٰمٓ السجدۃ ۴۱، آیات: ۵۲، ۵۳)

لہٰذا ہر انسان کو چاہیئے کہ قرآنِ مجید کو پڑھے، اس میں غور و فکر کرے، سمجھے اور اس سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

آیت نمبر ۶۹: مشرکین کی تردید کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ کیا مشرکین کے انکار کی یہ وجہ ہے کہ وہ اپنے رسول ﷺ سے پوری طرح متعارف نہیں ہیں۔ اگر کوئی حضور ﷺ اور آپ ﷺ کی سچائی اور امانت و دیانت سے واقف نہ ہوتا، تو اس کے دل میں آپ ﷺ کی نبوت میں شک ہونا کم از کم شروع میں سمجھ میں آسکتا تھا لیکن یہ لوگ چالیس سال سے آپ ﷺ کی سچائی اور اعلیٰ اخلاق و کردار کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کرتے رہے ہیں اور اُنہیں یقین سے معلوم ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی نہ جھوٹ بولا ہے، نہ کسی کو دھوکہ دیا ہے۔ اس کے باوجود وہ آپ ﷺ کو اس طرح جھٹلا رہے ہیں جیسے وہ آپ ﷺ کے حالات سے کبھی واقف ہی نہیں تھے۔

علمی بات: حضور اکرم ﷺ کی سیرت و کردار اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ آپ ﷺ اللہ ﷻ کے سچے رسول ہیں اور آپ ﷺ کا لایا ہوا دین بھی سچا ہے۔ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ قریشِ مکہ کے سامنے ایک نمونہ تھی۔ وہ آپ ﷺ کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے۔ آپ ﷺ کے اعلیٰ نسب، خاندانی شرافت اور ذاتی اوصاف و اخلاق سے خوب آگاہ تھے۔ وہ آپ ﷺ کو صادق اور امین کے معزز القابات سے خطاب کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ آپ ﷺ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، کسی انسان سے فریب نہیں کیا، کبھی کسی کی امانت میں خیانت نہیں کی اور نہ کبھی وعدہ خلافی کی ہے۔ جب آپ ﷺ نے کبھی کسی انسان سے جھوٹ نہیں بولا، تو آپ ﷺ اللہ ﷻ پر کیسے جھوٹ بول سکتے ہیں؟ لہٰذا اس بات سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حضور ﷺ اللہ ﷻ کے سچے رسول ہیں اور آپ ﷺ کی تعلیمات سچی اور برحق ہیں۔ مشرکین جو آپ ﷺ کا انکار کر رہے ہیں، وہ جان بوجھ کر انکار کر رہے ہیں ان کے پاس اس کی کوئی صحیح دلیل اور بنیاد نہیں ہے۔

عملی پہلو: حضور نبی کریم ﷺ کے اعلیٰ اخلاق و اوصاف اور اُسوۂ حسنہ، دینِ اسلام کے برحق دین ہونے پر بہت بڑی دلیل ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم آپ ﷺ کی سیرت و اخلاق کا اچھی طرح مطالعہ کریں، اس سے رہنمائی حاصل کریں اور اپنی زندگی اسی کے مطابق بسر کرنے کی کوشش کریں۔

آیت نمبر ۷۰: کیا مشرکین رسول اللہ ﷺ پر اس لئے ایمان نہیں لاتے کہ ان کے خیال میں آپ ﷺ کو جنون ہو گیا ہے (معاذ اللہ)؟ یہ ان کا صرف جھوٹا الزام ہے اور اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ دراصل آپ ﷺ ایسا دین حق لے کر آئے ہیں جو ان کی خواہشات اور ان کے آبائی عقائد کے خلاف ہے، اس لئے وہ محض عناد، سرداری کی خواہش اور عیاشی کی وجہ سے حق سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کے انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ حق کو ناپسند کرتے ہیں اور اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

علمی بات: مشرکین محض ضد اور عناد کی وجہ سے آپ ﷺ پر جنون کا الزام لگاتے تھے۔ حالانکہ وہ بہت اچھی طرح جانتے تھے کہ آپ ﷺ تمام لوگوں سے زیادہ عقل مند ہیں۔ کوئی مجنون شخص ایسے قوی دلائل کیسے پیش کر سکتا ہے۔ ایسی جامع شریعت، ماضی اور مستقبل کی صحیح صحیح خبریں کیسے بیان کر سکتا ہے۔ ان کے

آپ ﷺ پر یہ الزام لگانے اور انکار کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اگر وہ آپ ﷺ کی نبوت کو تسلیم کر لیتے، تو تمام لوگ آپ ﷺ کی اتباع کرتے جس کے نتیجہ میں عوام پر ان کی ریاست اور ان کا اقتدار جاتا رہتا۔ اس آیت میں "ان میں سے اکثر" اس لئے کہا گیا کہ بعض لوگ آپ ﷺ کے برحق ہونے کو پہچانتے تھے۔ وہ بعض آپ ﷺ پر اس لئے ایمان نہیں لائے تھے کہ ان کی قوم ان کو ملامت کرے گی اور کہے گی کہ انہوں نے اپنے باپ دادا کے دین کو ترک کر دیا۔

علمی بات: مشرکین رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کی رسالت کا انکار کرتے تھے۔ اس انکار کے لئے وہ مختلف اعتراضات اور وجوہات پیش کرتے تھے جن میں سے چند وجوہات اور اعتراضات ان آیات میں بیان ہوئی ہیں۔ یہ تمام وجوہات باطل اور غلط ہیں۔ انہوں نے اپنی طرف سے جھوٹے اعتراضات اور دلائل گھڑ لئے تھے۔ ان کے انکار کی اصل وجہ حق سے ان کی ناپسندیدگی تھی جو باطل کو اختیار رکھنے کی وجہ سے ان کے اندر پیدا ہوگئی تھی۔

عملی پہلو: جب انسان غلطی پر ہو اور حق کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہو، تو وہ جھوٹے دلائل کا سہارا لیتا ہے۔ حق پیش کرنے والوں کے خلاف جھوٹے الزامات اور دلائل پیش کرتا ہے جن میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم ہمیشہ حق اور سچ کو قبول کریں۔ کبھی بھی حق بات کی مخالفت نہ کریں اور اس کے لئے جھوٹے دلائل اور جھوٹے الزامات کا بھی سہارا نہ لیں۔

آیت نمبر ۷۱: حق سے مراد دینِ الٰہی کی تعلیمات ہیں۔ کفار و مشرکین چاہتے تھے کہ قرآنِ حکیم ان کی مرضی کے مطابق نازل ہوا کرے۔ ان کے اس باطل خیال کی تردید کی گئی ہے کہ اگر حق لوگوں کی خواہشات کے مطابق نازل ہو تو کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ یعنی اگر دینِ اسلام لوگوں کی خواہشات کے مطابق ہو جائے، تو نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے، آسمان اور زمین میں پائی جانے والی تمام مخلوقات، خواہشاتِ نفس کی اتباع اور گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے تباہ و برباد ہو جائیں۔ اس لئے اللہ ﷻ نے قرآنِ مجید کو حق کے ساتھ لوگوں کی نصیحت اور ہدایت کے لئے نازل کیا ہے۔ لیکن کفار کی بے وقوفی کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے اس نصیحت سے منہ پھیر لیا ہے اور ہدایت حاصل نہیں کر رہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے فرمایا کہ ہم کفار کے پاس ان کا ذکر لائے ہیں یعنی قرآنِ حکیم ساری کائنات کے لئے ذکر ہے مگر کفار اپنے ذکر سے منہ موڑ رہے ہیں دوسرا یہ کہ کفار اگر ایمان لے آئیں تو ان کا ذکر دُنیا و آخرت میں بلند ہو گا مگر وہ اپنے ذکر سے منہ موڑ رہے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ دامنِ رسول ﷺ سے وابستہ ہو گئے آج ان کے ناموں سے پورے عالم کے محراب و منبر گونج رہے ہیں۔ دراصل اللہ ﷻ نے تو اپنے پیارے رسول خاتم النبیین سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ذریعہ دینِ حق کی صورت میں انہیں ایسی نصیحت بھیجی ہے جو ان کے لئے عزت و وقار کا ذریعہ ہے جو ان ہی کی خیر خواہی کے لئے ہے مگر ان کی بے وقوفی کا یہ عالم ہے کہ جو چیز ان کی اپنی خیر خواہی، بھلائی اور عزت کے لئے نازل ہوئی ہے وہ اس سے روگردانی کر رہے ہیں۔

علمی بات: ہر رسول اور نبی علیہ السلام ہر دور کے لوگوں کے لئے یاد دہانی لے کر آتا ہے کہ وہ اس زندگی کی نعمتوں کو حاصلِ زندگی سمجھ کر عیش و عشرت کا ذریعہ نہ بنائیں بلکہ جو انہیں زندگی کے بلند مقاصد بخشے گئے ہیں ان کے حصول کے لئے اس زندگی کو استعمال کریں۔ لیکن قریش اور دیگر باطل پرستوں کا حادثہ یہ ہے کہ وہ اپنے حصہ کی یاد دہانی کی طرف توجہ دینے کی بجائے اس سے منہ پھیر رہے اور مخالفت پر تلے ہوئے ہیں۔

علمی بات: ذکر کا ایک اور معنی تاریخ اور داستان بھی ہے۔ اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اے کفار و مشرکین! اللہ ﷻ نے تمہارے سامنے گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت اور ان کو جھٹلانے والی قوموں کی تاریخ بیان فرمائی ہے جن پر اس تکذیب کی وجہ سے عذاب آیا۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی کسی قوم کی طرف اللہ ﷻ کا رسول علیہ السلام آتا ہے تو وہ ان کے سامنے دین کی صورت میں ایک ضابطۂ حیات پیش کرتا ہے۔ اگر وہ قوم اسے قبول کر کے اپنی زندگی کا دستور بنا لیتی ہے تو اللہ ﷻ انہیں دُنیا کی حکمرانی اور آخرت کی فلاح و کامرانی سے نوازتا ہے۔ لیکن اگر وہ اللہ ﷻ کے رسول علیہ السلام کی تکذیب کر دیتی ہے تو اللہ ﷻ اور اس کے رسول علیہ السلام کی طرف سے اتمامِ حجت ہو جانے کے بعد اس قوم پر اللہ ﷻ کا عذاب آجاتا ہے اور وہ قوم تباہ کر دی جاتی ہے۔ یہ انسانوں کی تاریخ اور انسانیت کی کہانی ہے۔ جو ہر دور میں پیش آتی رہی ہے۔ اب نبی کریم ﷺ پھر اسی ذکر اور داستان کو مشرکین مکہ کے سامنے دُہرا رہے ہیں تاکہ وہ اپنی دُنیا و عاقبت کو سنوار

لیں۔ بصورتِ دیگر ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو پہلی نافرمان قوموں کا ہو چکا ہے۔ اسی بات کو قرآنِ کریم نے ایک اور جگہ دُہراتے ہوئے ارشاد فرمایا: "یقیناً ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارے لئے نصیحت ہے۔ تو کیا تم سمجھتے نہیں؟" (سورۃ الانبیاء ۲۱، آیت: ۱۰)

علمی بات: حق کبھی بھی لوگوں کی خواہشوں کے تابع نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہو جائے تو آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے اندر ہے، سب کچھ تباہ و برباد ہو جائے۔ کیونکہ جب حق لوگوں کی خواہشوں کے تابع ہوگا تو حق ہی نہیں رہے گا۔ اگر لوگوں کو کھلی چھٹی دے دی جائے کہ اپنی اپنی مرضی کے مطابق جو چاہیں کریں، تو وہ اپنی طبیعتوں کے مطابق کفر و شرک کو اختیار کریں گے اور بُرے اعمال ہی کی طرف چلیں گے۔ جب ایسا ہوگا تو سب قہرِ الٰہی کے مستحق ہو جائیں گے اور غضبِ الٰہی کا نزول ہوگا تو خود بھی ہلاک ہوں گے اور آسمان و زمین بھی اور ان میں جو کچھ ہے وہ سب تباہ ہو جائے گا۔ لہٰذا حق لوگوں کی خواہشات کے مطابق نہیں ڈھل سکتا بلکہ اُنہیں خود کو حق کے مطابق ڈھالنا ہوگا اور اس کی پیروی کرنا ہوگی۔

آیت نمبر ۷۲: رسول اللہ ﷺ لوگوں کو بلا کسی دُنیاوی معاوضہ کے نیک کاموں کی دعوت دے رہے تھے۔ اسی طرح ہر نبی علیہ السلام نے اللہ ﷻ کا پیغام اپنی قوموں کو بغیر کسی دُنیاوی معاوضہ کے پہنچایا ہے۔ دعوتِ دین پر اجر اللہ ﷻ کے ذمہ ہے جو سب سے بہترین رازق ہے۔

علمی بات: کفارِ مکہ کی حالت پر مزید تعجب کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان سے تبلیغِ اسلام کا کوئی معاوضہ تو نہیں مانگتے، ان پر یہ بات گراں گزر رہی ہے۔ آپ ﷺ کو تو آپ ﷺ کے رب کی طرف سے جو نعمت عطا ہو رہی ہے اور آخرت میں جو اجر و ثواب ملے گا وہ ہر چیز سے بہتر ہے، کیونکہ اللہ ﷻ تو سب سے بہتر روزی رساں ہے۔

علمی بات: یہاں دراصل ان الفاظ میں خطاب حضور نبی کریم ﷺ سے نہیں ہے، بلکہ مشرکینِ مکہ سے ہے کہ عقل کے اندھو، ذرا سوچو تو! تمہارے شاعر اور قصہ گو تو تم لوگوں سے اجر و انعام چاہتے ہیں۔ مگر تم نے سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی زبان سے کبھی ایسی کوئی بات سنی ہے؟ کبھی آپ ﷺ نے اپنی اس خدمت کے عوض تم سے کوئی اُجرت طلب کی ہے؟ آپ ﷺ کو تو رب کی طرف سے جو اجر و انعام ملنے والا ہے، وہ پوری دُنیا کے خزانوں سے بہتر ہے۔

یہ نبی کریم ﷺ کی نبوت کے حق میں ایک اور دلیل ہے۔ یعنی یہ کہ آپ ﷺ اپنے اس کام میں بالکل بے لوث ہیں۔ کوئی شخص ایمانداری کے ساتھ یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ آپ ﷺ کے پیشِ نظر کوئی ذاتی مفاد ہے (معاذ اللہ)۔ انہوں نے ایک ایسی سخت جدوجہد کا علم بلند کیا ہے جو کسی لمحہ قرار نہیں لینے دیتی۔ اس پر مزید یہ کہ وہ ایسی دعوت لے کر اٹھے ہیں جس کی خاطر آپ ﷺ نے سارے عرب کی دشمنی مول لی ہے، حتیٰ کہ خود اپنے ہی قریبی رشتہ دار خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ وہ لوگ جو آپ ﷺ کی نبوت کے ظہور سے پہلے آپ ﷺ کو صادق اور امین کے القاب سے پکارتے تھے۔ وہ آپ ﷺ کے جانی دشمن بن گئے ہیں۔ آپ ﷺ کو طرح طرح سے اذیتیں دینے پر تُلے ہوئے ہیں۔ آپ ﷺ کے جسمِ اطہر کو طائف اور اُحد میں لہولہان کیا گیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک خود غرض آدمی کے کرنے کا کام ہے؟ خود غرض آدمی اپنی قوم اور قبیلہ کے تعصبات کا عَلَم بردار بن کر اپنی قابلیت اور جوڑ توڑ سے سرداری حاصل کرنے کی کوشش کرتا، نہ کہ وہ بات لے کر اٹھتا جو صرف یہی نہیں کہ تمام قومی تعصبات کے خلاف ایک چیلنج ہے، بلکہ سرے سے اس چیز کی جڑ ہی کاٹ دیتی ہے جس پر مشرکینِ عرب میں اس کے قبیلہ کی چودھراہٹ قائم ہے۔ یہ وہ دلیل ہے جس کو قرآنِ حکیم میں نہ صرف حضورِ اکرم سید المرسلین خاتم النبیین ﷺ کی، بلکہ بالعموم تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی صداقت کے ثبوت میں بار بار پیش کیا گیا ہے۔

آیت نمبر ۷۳: اللہ ﷻ نے یہ واضح کیا ہے کہ بلاشبہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو جس راستہ کی طرف بلا رہے ہیں، وہی سیدھا راستہ ہے۔ اللہ ﷻ نے ارشاد فرمایا ہے: کہ اے نبی مکرم ﷺ! آپ تو ان لوگوں کو ہدایت کی طرف بلاتے ہیں اور ان کے سامنے ایک ایسا لائحہ عمل پیش کرتے ہیں جس سے ان کی ساری خرابیاں دور ہو جائیں۔ لیکن یہ کفار انکار ہی کر رہے ہیں، لہٰذا قصور ان کفار کا ہے۔ آپ ﷺ تو انہیں صحیح راستہ دکھا رہے ہیں، لیکن یہ ہدایت کو اختیار کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہیں۔

علمی بات: حضور نبی کریم ﷺ مخلصانہ طور پر لوگوں کو صراطِ مستقیم کی جانب دعوت دیتے تھے، مگر بعض کافر لوگ بے دین اور ملحد ہونے کی وجہ سے صراطِ مستقیم پر گامزن نہ ہو سکے اور گمراہ ہی رہے۔

علمی بات: رسول اللہ ﷺ کی دعوت صراطِ مستقیم کی اس عظیم الشان اور بے مثال شاہراہ کی طرف ہے، جو انسان کو اس کی حقیقی منزل تک پہنچاتی ہے۔ یہ دارین کی سعادت و سرخروئی سے ہمکنار و بہرہ مند کرنے والی واحد شاہراہ ہے۔ اس سے اِعراض و روگردانی دُنیا و آخرت کی ہر خیر سے محرومی ہے۔

عملی پہلو: رسول اللہ ﷺ نے ہمیں صراطِ مستقیم کا راستہ دکھایا ہے۔ ہم آپ ﷺ کے اُمتی ہیں، لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ہم آپ ﷺ کے بتائے ہوئے اسی راستہ پر چلیں۔ اسی میں ہماری دُنیا و آخرت کی کامیابی ہے۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے راستہ پر نہ چلیں، کیونکہ باقی تمام راستے گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں، جس سے ہماری دُنیا و آخرت تباہ ہو سکتی ہے۔

آیت نمبر ۷۴: کفار و مشرکین آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اسی لئے وہ سیدھے راستہ سے بھٹک گئے ہیں۔ آپ ﷺ جس سیدھے راستہ کی طرف بلا رہے ہیں، اس پر چلنا ان ہی لوگوں کا کام ہے جو موت کے بعد دوسری زندگی مانتے ہوں اور اپنی بد انجامی سے ڈرتے ہوں۔ جسے انجام کا ڈر اور عاقبت کی فکر ہی نہیں، وہ کب سیدھے راستہ پر چلے گا۔ وہ یقیناً ٹیڑھا ہی رہے گا اور سیدھی سی بات کو بھی اپنی کجروی سے ٹیڑھا بنا لے گا۔

علمی بات: آخرت کا انکار انسان کو غیر ذمہ دار بنا دیتا ہے اور احساس ذمہ داری کا فقدان اسے بے فکر بنا دیتا ہے۔ جب وہ سرے سے یہی نہیں سمجھتا کہ اس کی اس زندگی کا کوئی انجام اور نتیجہ بھی ہے اور کسی کے سامنے اپنے اس پورے کارنامۂ حیات کا حساب بھی دینا ہے، تو پھر اسے اس کی کیا فکر ہو سکتی ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟ جانوروں کی طرح اس کی بھی غایت مقصود بس یہ ہے کہ ضروریات نفس و جسم خوب اچھی طرح پوری ہوتی رہیں۔ یہ مقصود حاصل ہو تو پھر حق و باطل کی بحث اس کے لئے محض لایعنی ہے۔ اس ذہنیت کا انسان، راہِ راست نہ چاہ سکتا ہے اور نہ پا سکتا ہے۔

علمی بات: عقیدۂ آخرت اصلاحِ احوال اور حقیقی کامیابی کے لئے اصل اساس ہے۔ عقیدۂ آخرت کے بغیر انسان کو نہ صحیح راہ مل سکتی ہے اور نہ ہی اس کی زندگی سدھر سکتی ہے۔ یہ عقیدۂ آخرت ہی ہے جس کی بنا پر انسان اپنی نفسانی خواہش پر قابو پاتا ہے، اپنی فوری لذّتوں کی قربانی دیتا ہے اور نفس کی آزادیوں پر پہرے بٹھاتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں وہ حدود و قیود کی پابندی کرنے والا ایک ذمہ دار پاکیزہ انسان بن جاتا ہے۔

عملی پہلو: عقیدۂ آخرت اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ایک اہم عقیدہ ہے۔ ہر مسلمان کا اس پر پختہ یقین ہونا چاہیئے کہ موت کے ساتھ انسان کی زندگی ختم نہیں ہوتی، بلکہ موت کے بعد اسے دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ اس کا حساب و کتاب ہو گا جس کی روشنی میں اسے کامیابی یا ناکامی حاصل ہو گی۔ کامیابی کی صورت میں اسے ہمیشہ کے لئے نعمتوں سے بھرپور جنت ملے گی اور ناکامی کی صورت میں جہنم میں عذاب دیا جائے گا۔

آیت نمبر ۷۵: کفار مکہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اگر اللہ ﷻ اپنی رحمت سے ان کی تمام تکالیف دور فرما دے، تو یہ حق کی طرف رجوع نہیں کریں گے، بلکہ اپنی سرکشی پر ہی جمے رہیں گے۔ دراصل یہ کافر لوگ باطل پرستی میں اتنے پختہ ہو گئے ہیں کہ اب ان کو ظلمتوں سے نکالنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ان کے ذہن مسخ ہو گئے ہیں۔ نورِ حق کو دیکھنے اور دیکھ کر پہچاننے والی آنکھ اندھی ہو گئی ہے۔ ان پر رحم و کرم کیا جائے یا اُنہیں آلام و مصائب میں مبتلا کر دیا جائے، یہ اب کسی صورت میں ہدایت قبول نہیں کریں گے۔

علمی بات: بعض لوگ کفر و طغیان میں اتنا آگے نکل جاتے ہیں کہ ان کا باطن سیاہ ہو جاتا ہے۔ ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اگر اللہ ﷻ ان پر کرم فرما کر اُنہیں کسی مصیبت سے نجات دے، تو وہ اپنے رب کا مطیع اور شکر گزار ہونے کے بجائے سرکشی میں اندھے ہو جاتے ہیں۔ جب وہ اپنے گناہوں اور سرکشی میں اندھے ہو جاتے ہیں، تو پھر اللہ ﷻ اُنہیں پہلے سے بڑی مصیبت میں گرفتار کرتا ہے، لیکن اپنے گناہوں میں اندھے ہونے کی وجہ سے ایسے لوگ اپنے رب کے حضور توبہ کرنے اور گڑگڑانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ بالآخر اللہ ﷻ ان پر شدید عذاب نازل کرتا ہے۔ اس قسم کے لوگ اپنے رب سے بخشش اور رحمت طلب کرنے

کے بجائے، ناامید ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ اسی حالت میں اُنہیں موت آلیتی ہے۔ یہ کسی انسان کی سب سے بڑی بد قسمتی اور اس پر اللہ ﷻ کی ناراضگی کی انتہا ہوتی ہے کہ اسے مصیبت کے وقت بھی اللہ ﷻ کی طرف رجوع اور توبہ کی توفیق حاصل نہ ہو۔

آیت نمبر ۷۶: اللہ ﷻ نے کفارِ مکہ پر قحط اور خشک سالی کا ایک عذاب مسلط کیا، جس میں وہ کئی سال تک مبتلا رہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ ایمان نہ لائے۔ جب اللہ ﷻ نے اُنہیں عذاب سے نجات دی، تب بھی وہ اللہ ﷻ کے سامنے نہ جھکے اور نہ ہی گڑگڑائے، بلکہ بدستور سرکشی کرتے رہے۔ ان بدبختوں پر عذاب کا کوئی اثر نہ ہوا، اس لئے وہ محروم کے محروم ہی رہے۔

علمی بات: اس آیت میں عذاب سے مراد وہ سخت قحط ہے جس میں اہلِ مکہ کئی سال تک مبتلا رہے اور مُردار وغیرہ کھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ قریش (کسی طرح بھی) آپ ﷺ کی بات نہیں سنتے، تو آپ ﷺ نے یہ دعا فرمائی: "اے اللہ ﷻ! حضرت یوسف (علیہ السلام) کے زمانہ کے سات سالہ قحط کی طرح ان پر سات سال کا قحط بھیج کر میری مدد فرما۔" اس پر وہ قحط میں مبتلا ہو گئے اور قحط نے ہر چیز کو تباہ کر دیا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ ہڈیاں، مُردار اور چمڑے تک کھا گئے۔ (بھوک اور نقاہت کی وجہ سے اُنہیں محسوس ہوتا کہ) دھویں کے مثل کوئی چیز زمین سے نکلنے لگی ہے۔ چنانچہ حضرت ابو سفیان (رضی اللہ عنہ، جو ابھی ایمان نہیں لائے تھے) آپ ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے: اے محمد (ﷺ)! آپ (ﷺ) کی قوم ہلاک ہو رہی ہے، آپ (ﷺ) اللہ ﷻ سے دعا کیجیے کہ وہ ان سے یہ قحط ختم کر دے۔ آپ ﷺ نے درخواست منظور فرمالی۔ روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب دعا فرمائی تو خوب بارش ہوئی اور متواتر سات دن تک بارش ہوتی رہی اور لوگوں نے بارش کی زیادتی کی شکایت کی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "کہ اے اللہ ﷻ ہمارے اردگرد برسا اور ہم پر نہ برسا، چنانچہ بادل وہاں سے ہٹ گئے اور ان کے اردگرد بارش ہونے لگی۔" (صحیح بخاری)

عملی پہلو: مصائب اور سخت حالات اللہ ﷻ کی طرف سے امتحان اور آزمائش ہوتے ہیں۔ نافرمانیوں کی وجہ سے لوگ رحمتِ الٰہی سے دور ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایسے حالات میں اللہ ﷻ کی طرف رجوع کرنے اور انفرادی و اجتماعی سطح پر توبہ کرتے ہوئے اصلاحِ اعمال کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔

آیت نمبر ۷۷: اللہ ﷻ نے کفارِ مکہ کے بارے میں یہ بتایا ہے کہ وہ کفر اور غلط روی سے اس وقت تک باز نہیں آئیں گے جب تک ان پر آخری عذاب کا دروازہ نہ کھل جائے اور اُنہیں اپنے ہولناک انجام سے دوچار نہ کر دیا جائے۔ اس وقت وہ حیرت اور مایوسی کا شکار ہو جائیں گے اور اُنہیں کچھ سمجھ نہ آئے گا کہ اب وہ کیا کریں۔

علمی بات: "مُبْلِسُوْنَ" حیرت اور مایوسی کے مجموعہ کو کہتے ہیں کہ جب انسان حواس باختہ ہو جائے اور اسے اپنی نجات کے سارے راستے بند اور موقوف نظر آنے لگیں۔ "سخت عذاب" سے کیا مراد ہے؟ اس کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ پہلی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد دُنیا کا وہ عذاب ہے جو مسلمانوں کے ہاتھوں کفار کو غزوۂ بدر میں بدترین شکست کی صورت میں ملا۔ اس میں کفار کے ستر (۷۰) آدمی مارے گئے اور ستر (۷۰) قیدی بنا لیئے گئے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ سخت عذاب سے مراد آخرت کا عذاب ہے۔ آخرت میں ان کو سخت عذاب دیا جائے گا تو وہاں پر یہ لوگ ہر راحت سے محروم ہو جائیں گے اور ان کی تمام اُمیدیں منقطع ہو جائیں گی۔

آیت نمبر ۷۸: اللہ ﷻ نے انسان کو سننے کے لئے کان، دیکھنے کے لئے آنکھیں اور سوچنے سمجھنے کے لئے دماغ اور دل عطا فرمائے ہیں۔ تاکہ ان کے ذریعہ حق کو پہچانا جائے، لیکن اکثر لوگ ناشکری کرتے ہیں یعنی حق اپنانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اللہ ﷻ نے انسان پر اپنی نعمتوں کا ذکر فرما کر دعوتِ فکر دی ہے کہ اس نے انسانوں کے مٹی سے بنے اجسام میں سننے اور دیکھنے کی صلاحیت پیدا کی ہے، گوشت کا ایک لوتھڑا پیدا کیا جسے دل کہا جاتا ہے اور جس میں سوچنے اور سمجھنے کی قدرت رکھی ہے۔ ان نعمتوں سے مومن و کافر سبھی فائدہ اٹھاتے ہیں، لیکن کفار شکر ادا نہیں کرتے، کیونکہ شکر کا عملی تقاضا یہ تھا کہ وہ ایمان لے آتے۔

علمی بات: شکر کی بہترین صورت یہ ہے کہ جو نعمت جس مقصد کے لئے دی گئی ہے، اسے اسی مقصد کے حصول کے لئے صَرف کرنا اور جس نے وہ نعمت عطا فرمائی ہے اس کی عطا کو اسی کی طرف منسوب کرنا۔ شکر کے اس مفہوم کو سامنے رکھ کر کفار کی ناشکری کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر کسی کے کان سنیں اور وہ آنکھوں سے صرف وہی چیز دیکھے جس سے اس کی جسمانی اور نفسانی خواہشات کی تکمیل ہو۔ دل سے صرف ان وسائل اور ذرائع پر غور و فکر کرتا رہے جن سے اس کی یہ فانی

زندگی عزت و آرام سے بسر ہو۔ لیکن اس کے کان صدائے حق سننے سے بہرے اور اس کی آنکھیں نورِ حق دیکھنے سے اندھی ہوں اور اس نے اپنی فکری قوتوں کو اپنی ابدی زندگی کو باعزت اور آرام دہ بنانے کے لئے کبھی استعمال نہ کیا ہو، تو اس سے بڑھ کر اور ناشکرا کون ہو گا۔

عملی پہلو: آنکھ، کان اور دل و دماغ وغیرہ اللہ ﷻ کی عطا کردہ نعمتیں ہیں۔ ان نعمتوں پر ہمیں اللہ ﷻ کا شکر ادا کرنا چاہیئے اور ان کا صحیح استعمال کرنا چاہیئے۔ صحیح استعمال کا یہ طریقہ ہے کہ ان اعضاء کو اللہ ﷻ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت و فرماں برداری کے دائرہ میں رہ کر استعمال کیا جائے اور کسی ایسی جگہ استعمال نہ کیا جائے، جس سے اللہ ﷻ اور رسول کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

آیت نمبر ۷۹: اللہ ﷻ نے اپنی حکمت سے انسانی آبادی کو دُنیا کے مختلف خطوں میں پھیلایا ہے۔ پھر ایک وقت آئے گا کہ تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کر کے وہ اپنی بارگاہ میں جمع فرمائے گا۔ اللہ ﷻ نے انسانوں کو پہلی بار بغیر کسی سابق نمونہ کے پیدا کیا اور نظام تناسل کے ذریعہ ان کی تعداد بڑھا کر روئے زمین پر پھیلا دیا، یعنی نسل در نسل انسانوں کو زمین میں آباد کر دیا۔ قیامت کے دن اللہ ﷻ اُنہیں دارِ آخرت میں جمع فرمائے گا۔ ان کے اعمال کا حساب لے گا اور ان کی جزا و سزا کا فیصلہ فرمائے گا۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ کی توحید اور آخرت کی دلیل ہے۔ اللہ ﷻ کی عظیم قدرت ہے کہ اس نے انسانوں کو ایک نفس سے پیدا کر کے تمام روئے زمین پر پھیلا دیا۔ انسانوں کے رنگ بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں، زبانیں بھی مختلف اور عادات و رسومات بھی مختلف ہیں۔ یہ اللہ ﷻ کی توحید کی دلیل ہے۔ اب جو ذات انسانوں کو بنا اور پھیلا سکتی ہے، وہ اُنہیں سمیٹ کر اپنے ہاں اکٹھا بھی کر سکتی ہے اور جو کچھ وہ لوگ اس دُنیا میں کرتے رہے اس پر مؤاخذہ بھی کر سکتی ہے۔ یہ آخرت کی دلیل ہے۔ لہٰذا اللہ ﷻ سب انسانوں کو دوبارہ زندہ کرے گا، ان کا محاسبہ کرے گا اور اُنہیں جزا و سزا دے گا۔

آیت نمبر ۸۰: اللہ ﷻ ہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ وہی رات اور دن کو باری باری لاتا ہے۔ کفار کو اتنا بھی شعور نہیں ہے کہ ان دلائل قدرت پر غور کر لیں اور اللہ ﷻ پر ایمان لے آئیں۔ اس آیت میں وہ دلائل بیان کیئے گئے ہیں جو انسانی مشاہدہ میں ہر وقت آتے رہتے ہیں۔ اللہ ﷻ نے انسان کو حیات عطا کی ہے تاکہ اس حیات میں نیک عمل کر کے دُنیا و آخرت کی کامیابی کا امیدوار بن جائے۔ اسی طرح موت عطا کی ہے کہ موت کے بعد آخرت کی دائمی اور غیر متناہی نعمتوں کو حاصل کر سکے۔ اللہ ﷻ کی قدرت کے یہ حیران کن مناظر ہیں کہ کبھی صبح ہو رہی ہے، کبھی شام ہو رہی ہے، کبھی سورج طلوع ہو رہا ہے، کبھی غروب ہو رہا ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ ان پر غور و فکر کر کے اللہ ﷻ کی قدرت کا اعتراف کرلے اور اللہ ﷻ پر ایمان لے آئے۔

علمی بات: رات اور دن کے لانے میں اللہ ﷻ کی طرف سے ایک حکمت یہ ہے کہ انسان کی بقا، نشوونما اور آرام و آسائش کے تمام وسائل بڑی فیاضی سے مہیا کر دیئے جائیں۔ دن میں انسان اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کام کاج اور کسب کرتے ہیں۔ دن کی تھکاوٹ دور کرنے کے لئے رات میں آرام کرتے ہیں۔ اگر دن اور رات کا یہ اختلاف نہ ہوتا، مثلاً اگر مسلسل دن ہوتا اور رات نہ ہوتی، تو انسان کی تھکاوٹ دور نہ ہوتی اور نیند اور سکون میسر نہ ہوتا اور اگر مسلسل رات ہوتی تو انسان کام کاج اور کاروبار نہ کر سکتے اس لئے دن اور رات کا اختلاف بنایا ہے۔ لہٰذا دن اور رات کا یہ اختلاف بھی اللہ ﷻ کی عظیم نعمت ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "آپ (ﷺ) فرما دیجئے، بھلا تم دیکھو، اگر اللہ ہمیشہ کے لئے تمہارے اوپر رات طاری فرما دے قیامت کے دن تک (تو) اللہ ﷻ کے سوا کون معبود ہے جو تمہیں روشنی لا دے تو کیا تم سنتے نہیں؟" (سورۃ القصص ۲۸، آیت: ۷۱)

عملی پہلو: ہر انسان کو چاہیئے کہ وہ مظاہر قدرت پر غور و فکر کرے۔ غور و فکر کے نتیجہ میں وہ سمجھ جائے گا کہ اس نظام قدرت کو بنانے والی ایک ذات ہے اور وہ اللہ ﷻ کی ذات ہے۔ وہی ذات ہے جو اس نظام کو چلا بھی رہی ہے۔ اگر وہ یہ بات تسلیم کر لیتا ہے تو اسے چاہیئے کہ وہ اس ذات یعنی اللہ ﷻ پر ایمان لے آئے اور اس کی اطاعت و فرماں برداری اختیار کر لے، کیونکہ اسی میں اس کی دُنیا و آخرت کی فلاح ہے۔

آیت نمبر ۸۱: کفار آخرت کی زندگی کے بارے میں وہی کہہ رہے ہیں، جو ان کے گمراہ باپ دادا کہتے رہے۔

علمی بات: کائنات کے اس حکیمانہ نظم و نسق کو دیکھ کر چاہیئے تو یہ تھا کہ وہ کہتے کہ یہ ایسے خالق کی قدرت کا شاہکار ہے جو تمام صفات کمال سے متصف ہے، تمام عاجزیوں اور کمزوریوں سے پاک اور مبرا ہے اور اس کی قدرتِ کاملہ کے سامنے مُردوں کو زندہ کرنا کوئی مشکل نہیں۔ لیکن عقل و فہم کے ان دشمنوں نے وہی رٹ لگا رکھی ہے جو ان کے آباؤ اجداد نے لگا رکھی تھی اور آخرت کا انکار کر رہے ہیں جس طرح ان کے آباؤ اجداد نے انکار کیا تھا۔

آیت نمبر ۸۲: کفار و مشرکین اپنے آباؤ اجداد کی طرح آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ وہ یوں کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مر گئے اور مر کر مٹی اور ہڈیاں ہو گئے، تو کیا ہم دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔ یعنی جو پہلے منکر کہا کرتے تھے کہ جب ہم مر کر خاک ہو جائیں گے، تو پھر ہم دوبارہ کیسے زندہ ہو جائیں گے، یہی یہ سب بھی کہتے ہیں۔ اُنہیں دوبارہ زندہ کرنا ناممکن نظر آتا ہے۔ لیکن یہ لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ جس نے پہلی مرتبہ ان کو زندگی بخشی ہے، اس کے لئے دوبارہ زندہ کر لینا کیا مشکل ہے۔

علمی بات: یہ کفار کی غلط فہمی ہے کہ وہ آخرت کا انکار کر رہے ہیں۔ اللہ ﷻ کے لئے ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ جس ذات نے پہلی مرتبہ انسان کو بغیر کسی وجود اور ہڈیوں کے پیدا کیا، وہی ذات ان ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کرے گی۔ ایک عام مشاہدہ ہے کہ کسی چیز کو پہلی دفعہ بنانا مشکل ہے اور دوسری دفعہ بنانا زیادہ آسان ہے۔ لیکن اللہ ﷻ کے لئے انسان کو نہ پہلی دفعہ پیدا کرنا مشکل تھا اور نہ ہی دوسری دفعہ اسے مردہ کر کے زندہ کرنا کوئی مشکل ہے۔ وہ جب کسی کام کا ارادہ فرماتا ہے تو فرماتا ہے ہو جا تو وہ کام ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور ان کا حساب و کتاب ہو گا۔

آیت نمبر ۸۳: کفار کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کا وعدہ ان کے باپ دادا سے بھی کیا جاتا رہا۔ یہ پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں جن کی عملی شکل کبھی نہیں دیکھی گئی۔ ان کے بقول جس چیز کی دھمکی آج ہمیں دی جا رہی ہے کہ قیامت آئے گی، گناہوں سے کنارہ کش ہو جاؤ اور متقی و پرہیزگار بن جاؤ، بعینہٖ یہی دھمکی ہمارے آباؤ اجداد کو بھی دی گئی تھی، لیکن صدیاں گزر گئیں، وہ قیامت جس سے ہمیں ڈرایا جاتا تھا وہ قائم نہیں ہوئی اور ہمیں یقین ہے کہ وہ آئندہ بھی قائم نہیں ہو گی۔ یہ محض قصے کہانیاں ہیں جو ان لوگوں نے گھڑ لی ہیں جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ (معاذ اللہ)

علمی بات: منکرین آخرت کی یہ دلیل ہے کہ صدیاں گزر گئیں، آج تک کوئی انسان زندہ نہیں ہوا۔ آج تک قیامت قائم نہیں ہوئی۔ ماضی میں بھی دوبارہ زندہ کیئے جانے کی باتیں ہوتی رہی ہیں، لیکن ان میں کوئی حقیقت نہیں، یہ محض قصے کہانیاں ہیں۔ یہ دلیل بالکل غلط ہے کیونکہ اللہ ﷻ نے یہ دُنیا ایک مقصد اور نظام کے تحت بنائی ہے۔ اس میں انسان کو ایک محدود مدت کی زندگی عطا کی گئی ہے جس میں اس کا امتحان مقصود ہے۔ اس کی بنیاد پر اس کی ہمیشہ کی زندگی آخرت کا فیصلہ ہو گا۔ دوبارہ زندہ کرنے کا عمل اس دُنیا میں نہیں، بلکہ آخرت میں ہو گا۔ اگر اس دُنیا میں اللہ ﷻ لوگوں کے سامنے مُردوں کو زندہ کر دے، تو پھر آزمائش اور امتحان ختم ہو جائے گا۔ جب سب لوگ اپنی آنکھوں سے مُردوں کو زندہ ہوتا ہوا دیکھ لیں گے تو پھر کوئی انکار نہیں کرے گا۔ اس لئے اللہ ﷻ نے اس دُنیا کو دار الامتحان ہی بنایا ہوا ہے کہ لوگ اپنی عقل اور سمجھ کو استعمال کرتے ہوئے انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات پر ایمان لے آئیں اور آخرت پر یقین کر لیں۔

آیت نمبر ۸۴: کفار مکہ سے ایسے سوالات پوچھے جا رہے ہیں جو اُنہیں نہ صرف سوچنے بلکہ حق کا اعتراف کرنے پر آمادہ کرنے والے ہیں۔ پہلا سوال یہ کیا گیا ہے کہ پوری زمین اور اس پر موجود جملہ مخلوقات کس کے اختیار میں ہے؟ کون اس کا خالق و مالک اور اس کا بنانے والا ہے اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ؟

علمی بات: اللہ ﷻ نے بعث بعد الموت کے عقیدہ پر دلیل پیش کی ہے کہ اے میرے رسول ﷺ! اگر آپ ﷺ ان کافروں سے پوچھیں گے کہ زمین اور اس پر موجود تمام مخلوقات کا مالک کون ہے؟ تو وہ کہیں گے کہ اللہ ﷻ نے اُنہیں پیدا کیا ہے اور وہی ان کا مالک ہے۔ تو پھر آپ ﷺ ان سے کہیئے کہ تم اتنی بات کا ادراک نہیں کر پاتے ہو کہ جس نے انسان اور دوسری تمام مخلوقات کو پیدا کیا ہے، وہ تمہیں دوبارہ زندہ کرنے پر یقیناً قادر ہے۔

آیت نمبر ۸۵: جب کفار و مشرکین سے پوچھا جاتا ہے کہ زمین اور اس میں موجود تمام مخلوقات کا خالق و مالک کون ہے؟ تو مشرکین فوراً اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ سب کچھ اللہ ﷻ ہی کی ملکیت ہے۔ جب سب کچھ اللہ ﷻ کا ہے، تو پھر یہ لوگ اللہ ﷻ کی وحدانیت تسلیم کر کے نصیحت حاصل کیوں نہیں کرتے؟ جب

سب کچھ اللہ ﷻ کے قبضۂ قدرت اور اس کی ملکیت میں ہیں، تو پھر وہ یہ بات کیوں تسلیم نہیں کرتے کہ اللہ ﷻ اس مٹی سے جس میں ان کا وجود مل چکا ہے، انہیں دوبارہ زندہ کرے گا۔

علمی بات: اس آیت میں توحید اور آخرت دونوں پر دلیل دی گئی ہے۔ آخرت پر اس طرح دلیل دی گئی ہے کہ جس اللہ ﷻ نے زمین کو اور اس میں بسنے والے تمام لوگوں کو پیدا کیا ہے، ان کو زندگی اور قدرت عطا کی ہے۔ وہی اللہ ﷻ ان کو فنا کرنے کے بعد دوبارہ زندگی دینے پر بھی قادر ہے۔ توحید پر اس طرح استدلال ہے کہ جس اللہ ﷻ نے انسان کو زندگی عطا کی ہے اور زندگی گزارنے کے لئے بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں، اس کا حق ہے کہ اس کی وحدانیت پر ایمان لایا جائے اور اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کی جائے۔

عملی پہلو: بیشتر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اس بات کو مانتے ہیں کہ زمین و آسمان کا خالق ایک اللہ ﷻ ہے۔ وہی اس کا مالک ہے۔ وہی اس کو چلا رہا ہے۔ تمام تر اختیارات اسی کو حاصل ہیں۔ مگر یہ بات ماننے کا جو لازمی تقاضا ہے اس کا کوئی اثر ان کی زندگیوں میں نہیں پایا جاتا۔ اس عظیم اقرار کا تقاضا ہے کہ وہی ان کی سوچ بن جائے۔ اللہ ﷻ کا احساس ان کے اندر خوف بن کر داخل ہو جائے۔ ان کے اندر یہ مادہ پیدا ہو کہ ان کے سامنے حق آئے تو وہ فوراً اس کا اعتراف کرلیں۔ ان کی زندگی پوری کی پوری اسی میں ڈھل جائے۔ مگر یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ وہ اگرچہ عقیدہ کے طور پر اللہ ﷻ کو مانتے ہیں مگر ان کا عقیدہ الگ رہتا ہے اور ان کی حقیقی زندگی الگ۔

آیت نمبر ۸۶: ان مشرکین اور کفار سے دوسرا سوال یہ کیا گیا ہے کہ سات آسمانوں اور عرشِ عظیم کا مالک کون ہے؟ اللہ ﷻ نے فرمایا ہے کہ اے حبیب ﷺ! ان منکرین توحید اور منکرین قیامت سے ایک اور سوال پوچھئے کہ زمین اور مافیہا کے متعلق تو تم نے تسلیم کرلیا، اب یہ بتاؤ کہ سات آسمان جن کی وسعت اور بلندی کا اندازہ لگانے سے بھی تم قاصر ہو اور عرشِ عظیم جو ان سات آسمانوں سے بھی وسیع تر ہے اور اُنہیں گھیرے ہوئے ہے، ان کا رب کون ہے؟ وہ یہی جواب دیں گے کہ یہ سب کچھ بھی اللہ ﷻ کا ہے۔

علمی بات: مشرکین مکہ کو دلیل کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے کہ جب تم یہ مانتے ہو کہ اللہ ﷻ ہی سات آسمانوں اور عرش عظیم کا بنانے والا ہے، تو پھر وہ تمہیں مرنے کے بعد زندہ کیوں نہیں کرسکتا۔ سات آسمان اور عرش عظیم کو بنانے والا ہی عبادت کے لائق ہے یا پتھر کی وہ بے جان مورتیاں، جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرسکتیں۔

آیت نمبر ۸۷: مشرکین اس بات کا بھی اعتراف کریں گے کہ پوری کائنات کا مالک و مختار صرف اللہ ﷻ ہے، تو پھر وہ اللہ ﷻ کی وحدانیت کو تسلیم کرکے اس کے عذاب سے بچنے کا اہتمام کیوں نہیں کرتے؟ ان مشرکین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ جب تم لوگ اللہ ﷻ کو اس دُنیا و مافیہا کا خالق بھی مانتے ہو اور اسے عرش و فرش کا مالک بھی تسلیم کرتے ہو، لیکن اس کے ساتھ بتوں اور دیوی دیوتاؤں کو اس کا شریک بھی بناتے ہو، کیا تمہیں یہ جسارت کرتے ہوئے ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہوتا؟

علمی بات: مشرکین مکہ کے اس جواب سے واضح ہوتا ہے کہ سات آسمانوں اور عرش عظیم کے وجود کے نہ صرف وہ قائل تھے، بلکہ ان کا رب اللہ ﷻ ہی کو مانتے تھے اور یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی کی تعلیم کا اثر ہو سکتا ہے۔ اس بنیادی حقیقت کو ماننے کے باوجود وہ شرک کے قائل تھے۔ یہ ان کے عقیدہ کا صریح تضاد تھا مگر وہ اس پر غور کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ مذہب کے معاملہ میں بعض لوگ متضاد باتوں کے قائل ہو جاتے ہیں حالانکہ عقل سلیم متضاد باتوں کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہے۔

علمی و عملی بات: مشرکوں کے دل و دماغ پر ایک دستک دی گئی ہے۔ اس ارشاد سے ان کے قلب وضمیر پر دستک دیتے ہوئے اور ان کو جھنجھوڑتے ہوئے فرمایا گیا کہ "کیا تم لوگ پھر بھی ڈرتے نہیں؟" اپنے اس خالق و مالک کے عذاب اور اس کی گرفت و پکڑ سے کہ اس کی کائنات میں رہتے بستے اور اس کی نعمتوں پر پلتے بڑھتے ہو اور پھر بھی اس کی بغاوت اور کفر و شرک کا ارتکاب کرتے ہو؟

اس ارشادِ باری تعالیٰ میں اللہ ﷻ کی نافرمانی سے ڈرنے اور اس کی گرفت و پکڑ اور اس کے عذاب سے بچنے کے لئے دعوت و تحریک ہے جو کہ انسان کے لئے دونوں جہانوں کی فلاح وسعادت سے ہمکنار ہونے کا ذریعہ ہے۔

آیت نمبر ۸۸: مشرکین مکہ سے تیسرا سوال کیا گیا ہے۔ اللہ ﷻ نے اپنے محبوب ﷺ سے فرمایا ہے کہ اے نبی مکرم ﷺ! آپ ان مشرکین مکہ سے پوچھیں کہ وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں اور جس کے قبضہ میں ہر چیز کی بادشاہی ہے اور وہ ہر ایک کو پناہ دے سکتا ہے اور اس کے مقابلہ میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا؟ اگر تم کو کچھ خبر ہے اور تم جانتے ہو، تو اس سوال کا جواب دو۔ یعنی وہ کون ہے جس کے قبضہ میں ہر چیز کی بادشاہت ہے وہ ہر ایک کو پناہ دے سکتا ہے اور اس کی فریادرسی کر سکتا ہے، لیکن اس کے مجرم کو اس کے ہاتھ سے نہ کوئی بچا سکتا ہے، نہ کوئی پناہ دے سکتا ہے، نہ فریادرس بن سکتا ہے اور نہ کوئی مدد کر سکتا ہے؟

علمی بات: "مَلَكُوْت" مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا معنیٰ ہے ہر چیز پر مکمل حاکمیت، پوری ملکیت اور پورا اختیار و تصرف۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ﷻ کی ذات کو ہر چیز پر مکمل حاکمیت، پوری ملکیت اور پورا اختیار و تصرف حاصل ہے۔

علمی بات: یہ بات دُنیا کے اعتبار سے بھی صحیح ہے کہ اللہ ﷻ جس کو کوئی نفع پہنچانا چاہے اس کو کوئی روک نہیں سکتا اور جس کو کوئی تکلیف و عذاب دینا چاہے اس سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ آخرت کے اعتبار سے بھی یہ مضمون صحیح ہے کہ جس کو وہ عذاب میں مبتلا کرے گا اس کو کوئی بچا نہ سکے گا اور جس کو جنت اور راحت دے گا اس کو کوئی روک نہ سکے گا۔

علمی بات: ان آیات سے روزِ روشن کی طرح یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مشرکین عرب زمینوں کا، ان پر بسنے والی تمام مخلوق کا مالک صرف اللہ ﷻ کو مانتے تھے، بلکہ سات آسمانوں کا اور عرش عظیم کا مالک بھی صرف اور صرف اللہ ﷻ ہی کو تسلیم کرتے تھے۔ بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ ساری چیزوں کا اختیار رکھنے والا بھی وہ محض اللہ ﷻ ہی کو مانتے تھے اور مصائب سے بچانے والا اور ایسی تکالیف میں مبتلا کرنے والا کہ ان سے کوئی بھی کسی کو نہ بچا سکے، صرف اللہ ﷻ کی ذات کو تسلیم کرتے تھے، مگر اس کے باوجود وہ مشرک تھے۔

آیت نمبر ۸۹: تمام سوالات کے جوابات میں کفار یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے کہ مذکورہ تمام صفات کا حامل صرف اور صرف اللہ ﷻ ہے۔ اس لئے ان کفار سے یہ کہا گیا ہے کہ جب تم تسلیم کرتے ہو کہ ہر چیز کا حقیقی مالک اللہ ﷻ ہے، وہ جس کو چاہے پناہ دے اور اگر وہ نہ چاہے تو کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا، پھر تمہاری عقلوں پر کس نے جادو کر دیا ہے کہ تم اس قادر مطلق اللہ ﷻ کے ساتھ شریک بناتے ہو اور بے جان اور بے اختیار چیزوں کی عبادت کرتے ہو۔

علمی بات: "تُسْحَرُوْنَ" سحر سے ہے جس کا معنیٰ جادو ہے۔ جادو سے کسی چیز کی حقیقت نہیں بدلتی، بلکہ دیکھنے والے کو دھوکہ ہوتا ہے۔ چیز ہوتی کچھ ہے اور اسے دکھائی کچھ دیتی ہے۔ یہاں ان مشرکین سے پوچھا جا رہا ہے کہ تم پر کس نے جادو کر دیا ہے کہ بے جان اور بے اختیار بتوں کو تم نے خدائی کی مسند پر بٹھا دیا ہے، اُنہیں الٰہ اور معبود بناتے ہو۔

علمی بات: قرآنِ کریم کی اس صراحت سے واضح ہے کہ مشرکین مکہ اللہ ﷻ کی ربوبیت، اس کی خالقیت، مالکیت اور رزاقیت کے منکر نہیں تھے، بلکہ وہ سب باتیں تسلیم کرتے تھے۔ اُنہیں صرف توحید الوہیت سے انکار تھا۔ یعنی عبادت صرف ایک اللہ ﷻ کی نہیں کرتے تھے بلکہ اس میں دوسروں کو بھی شریک کرتے تھے۔

آیت نمبر ۹۰: اصل بات یہ ہے کہ اللہ ﷻ نے ان کفار کو حق بات پہنچا دی ہے اور وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔ توحید اور مرنے کے بعد زندہ ہونے کی ٹھیک ٹھیک بات ان کو پہنچا دی گئی ہے اور یہ اس حق کے خلاف جو کچھ کہہ رہے ہیں، اس کہنے میں جھوٹے ہیں یعنی شرک اور دوبارہ زندہ کیے جانے کے انکار میں جھوٹ بول رہے ہیں۔ اللہ ﷻ نے دلائل کے ساتھ لوگوں تک حق پہنچا دیا ہے۔ دلائل کو دیکھنے کے باوجود بھی اللہ ﷻ کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے اور آخرت کا انکار کرنے والے جھوٹے ہیں۔

علمی بات: کفارِ مکہ اپنے اس عقیدہ میں جھوٹے تھے کہ اللہ ﷻ کے سوا کسی اور کو بھی الوہیت حاصل ہے اور یہ کہ موت کے بعد زندگی ممکن نہیں ہے۔ ان کا جھوٹ ان کے اپنے اعترافات سے ثابت ہے۔ ایک طرف یہ ماننا کہ زمین و آسمان کا مالک اور کائنات کی ہر چیز کا مختار اللہ ﷻ ہے، دوسری طرف یہ کہنا کہ خدائی تنہا

اسی کی نہیں ہے بلکہ دوسروں کا بھی اس میں کوئی حصہ ہے، یہ دونوں باتیں صریح طور پر ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ اسی طرح ایک طرف یہ کہنا کہ ہم کو اور اس عظیم الشان کائنات کو اللہ ﷻ نے پیدا کیا ہے اور دوسری طرف یہ کہنا کہ اللہ ﷻ اپنی ہی پیدا کردہ مخلوق کو دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا، صریحاً خلافِ عقل ہے۔ لہٰذا ان کی اپنی مانی ہوئی صداقتوں سے یہ ثابت ہے کہ شرک اور انکار آخرت، دونوں ہی جھوٹے عقیدے ہیں جو انہوں نے اختیار کر رکھے تھے۔

آیت نمبر ۹۱: اللہ ﷻ نے اپنی نہ کوئی اولاد بنائی ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا معبود ہے۔ بالفرض اگر ایک سے زیادہ معبود ہوتے تو ہر معبود اپنی اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہو جاتا اور ایک دوسرے پر غلبہ پانے کے لئے چڑھائی کر دیتا۔ اس لڑائی کے نتیجہ میں سارا عالم تباہ ہو جاتا۔ چونکہ آج تک نظام کائنات میں ایسا کوئی فساد رونما نہیں ہوا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ ﷻ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور وہ اکیلا ہی اس نظام کائنات کو چلا رہا ہے۔ مشرکین اللہ ﷻ کے ساتھ جو شریک ٹھہراتے ہیں، اللہ ﷻ اس سے پاک ہے۔

علمی بات: مشرکین کے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ فرشتے اللہ ﷻ کی بیٹیاں ہیں۔ اللہ ﷻ نے جب کسی کو بیٹا نہیں بنایا، تو بیٹیاں بنانے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ نیز اس سے عیسائیوں کے بھی عقیدہ کی تردید ہوتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اللہ ﷻ کے بیٹے ہیں۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی توحید یعنی اکیلے معبود ہونے پر دلیل دی گئی ہے۔ پوری کائنات کا نظام غایت درجہ منظم ہے اور ہر چیز ایک دوسرے سے ایک خاص نظام کے مطابق جڑی ہوئی ہے۔ یہ اس بات پر دلالت ہے کہ کائنات کا ایک ہی خالق اور مدبر ہے اور وہ صرف اللہ ﷻ ہے جو اس کائنات کو ایک منظم طریقہ سے چلا رہا ہے۔ یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ کائنات کی مختلف قوتوں اور مختلف حصوں کے خالق اور مالک، الگ الگ خدا ہوتے اور پھر ان کے درمیان ایسا مکمل تعاون ہوتا، جیسا کہ اس پورے نظامِ عالم کی بے شمار قوتوں اور بے حد و حساب چیزوں میں، اَن گنت تاروں اور سیاروں میں ہے۔ نظام کی باقاعدگی اور اجزائے نظام کی ہم آہنگی اقتدار کی مرکزیت و وحدت پر خود دلالت کر رہی ہے۔ اگر اقتدار بٹا ہوا ہوتا، تو صاحب اقتدار میں اختلاف رونما ہونا یقیناً ناگزیر تھا اور یہ اختلاف ان کے درمیان جنگ اور تصادم تک پہنچے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: " اگر ان (آسمان اور زمین) میں اللہ کے سوا اور (بھی) معبود ہوتے تو یقیناً دونوں درہم برہم ہو جاتے۔" (سورۃ الانبیاء ۲۱، آیت: ۲۲) لہٰذا خالق و معبود صرف ایک ہی ہے اور وہ اللہ ﷻ ہی ہے جو ہر قسم کے شرک سے پاک ہے۔

آیت نمبر ۹۲: اللہ ﷻ کے علاوہ کسی اور کے اختیارات ہوتے تو اس کا علم اللہ ﷻ ہی کو ہوتا۔ کیوں کہ اللہ ﷻ پوشیدہ اور ظاہر باتوں کو جاننے والا ہے۔ مشرکین جن چیزوں کو اللہ ﷻ کی طرف منسوب کرتے ہیں، اللہ ﷻ ان سے بالاتر ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ پوشیدہ اور ظاہر تمام باتوں کو جاننے والا ہے۔ اس کائنات میں اللہ ﷻ سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ جو لوگ شرک خفی کرتے ہیں، اللہ ﷻ اس کو بھی جانتا ہے اور جو شرک جلی اور بت پرستی میں مبتلا ہیں، اس کو بھی جانتا ہے۔ بہر حال! جس کو یہ لوگ اللہ ﷻ کا شریک ٹھہراتے ہیں اور اس کی عبادت کرتے ہیں، اللہ ﷻ ان سب سے پاک اور بالاتر ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی توحید اور اس کا شریک نہ ہونے کی دلیل ہے۔ اللہ ﷻ کے علاوہ کسی اور ہستی کے پاس رتی بھر بھی اختیارات ہوتے تو اس کا سب سے پہلے علم اللہ ﷻ کو ہو سکتا تھا۔ کیونکہ وہ تو ظاہر اور پوشیدہ تمام چیزوں کو جاننے والا ہے۔ اس سے کوئی چیز بھی مخفی رہنا ناممکنات میں سے ہے۔ اپنی اس وسعت علم کی بنا پر ہی اللہ ﷻ یہ فرما رہا ہے کہ اس کے علاوہ نہ کوئی الٰہ ہو سکتا ہے اور نہ کسی کے پاس کسی قسم کا کوئی اختیار ہے۔ لہٰذا معبود صرف ایک ہے اور وہ اللہ ﷻ ہی ہے، اس کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کے شریک نہ ہونے کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ جس کی قدرت اور علم ایسا ہے کہ کوئی ظاہر و باطن اور غیب و شہادت اس سے پوشیدہ نہیں۔ اس کی حکومت میں کیا وہ چیزیں شریک ہوں گی جن کی قدرت اور علم وغیرہ سب صفات محدود و مستعار ہیں؟ لہٰذا اللہ ﷻ کا کوئی شریک نہیں ہے، وہ واحد و یکتا ہے۔

آیت نمبر ۹۳: نبی کریم ﷺ کے ذریعہ اہلِ ایمان کو قیمتی دعا کی تلقین کی گئی ہے۔ یہ دعا ایسی صورتِ حال کے لئے ہے جب کسی سرکش قوم کو ان کی نافرمانیوں کی سزا ملنے کا اندیشہ ہو۔ دُنیا میں سرکشوں پر آنے والے عذاب کی وجہ سے کبھی کبھی نیک لوگ بھی تکلیف میں آجاتے ہیں۔
ان صاف صاف دلائل کو سن کر بھی جب یہ کفارِ عرب دینِ حق کی طرف مائل نہیں ہوتے، تو یہ عذاب میں ضرور مبتلا ہوں گے۔ اس لئے اس عذاب سے محفوظ رہنے کے لئے اللہ ﷻ نے اپنے محبوب پیغمبر ﷺ کو دعا کی تعلیم فرمائی ہے۔ اللہ ﷻ نے ہدایت فرمائی ہے کہ اے نبی مکرم ﷺ! آپ اللہ ﷻ سے یہ دعا کیجئے کہ اے میرے رب! اگر آپ میری زندگی میں مجھے وہ عذاب دکھائیے جس کا ان کافروں سے وعدہ کیا جارہا ہے، تو مجھے اس عذاب سے محفوظ رکھنا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُکَ فِعْلَ الْخَیْرَاتِ وَتَرْکَ الْمُنْکَرَاتِ وَحُبَّ الْمَسَاکِیْنِ وَاَنْ تَغْفِرَ لِیْ وَتَرْحَمَنِیْ وَاِذَا اَرَدْتَ فِتْنَۃَ قَوْمٍ فَتَوَفَّنِیْ غَیْرَ مَفْتُوْنٍ اَسْاَلُکَ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّکَ وَحُبَّ عَمَلٍ یُّقَرِّبُ اِلٰی حُبِّکَ۔
”اے اللہ! میں تجھ سے بھلے کاموں کے کرنے اور منکرات (ناپسندیدہ کاموں) سے بچنے کی توفیق طلب کرتا ہوں اور مساکین سے محبت کرنا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ مجھے معاف کردے اور مجھ پر رحم فرما اور جب تو کسی قوم کو آزمائش میں ڈالنا چاہے، تو مجھے تو فتنہ میں ڈالنے سے پہلے وفات دے دے۔ میں تجھ سے اور اس شخص سے جو تجھ سے محبت کرتا ہو، محبت کرنے کی توفیق طلب کرتا ہوں اور تجھ سے ایسے کام کرنے کی توفیق چاہتا ہوں جو کام تیری محبت کے حصول کا سبب بنے“۔
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”یہ حق ہے، اسے پڑھو یاد کرو اور دوسروں کو پڑھاؤ سکھاؤ“۔ (جامع ترمذی)

علمی نکتہ: اس آیت میں اگرچہ خطاب بظاہر رسول اللہ ﷺ سے ہے، لیکن یہ ہدایت عام مومنوں کے لئے ہے۔ لہٰذا مومنوں کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ اللہ ﷻ سے دعا کرتے رہیں کہ اگر ظالموں پر عذاب آئے، تو اللہ ﷻ اہلِ ایمان کو اس عذاب سے بچانے کی کوئی صورت پیدا فرمادے۔

علمی بات: دُنیا میں جب کسی قوم پر عذاب آتا ہے تو بعض اوقات اس عذاب کا اثر صرف ظالموں ہی پر نہیں رہتا، بلکہ ان کے آس پاس جو نیک لوگ ہوتے ہیں وہ بھی اس دُنیاوی تکلیف میں متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن آخرت میں ان نیک لوگوں کو کوئی عذاب نہ ہوگا، بلکہ اس دُنیا کی تکلیف پر جو ان کو پہنچتی ہے، اجر بھی ملے۔
ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ”اور اُس فتنہ سے ڈرو جو تم میں سے خاص طور پر صرف اُنہیں پر نہیں آئے گا جنہوں نے ظلم کیا ہے۔“ (سورۃ الانفال ۸، آیت: ۲۵)
یعنی ایسے عذاب سے ڈرو جو اگر آگیا، تو صرف ظالموں ہی تک نہیں رہے گا، دوسرے لوگ بھی اس کے لپیٹ میں آئیں گے۔ چنانچہ جب کسی سرکش قوم کو ان کی نافرمانیوں کی سزا ملنے کا اندیشہ ہو، تو اس دعا کی تلقین فرمائی گئی ہے کہ اے میرے رب! اگر تو مجھے وہ عذاب دکھادے جس کا ان لوگوں سے وعدہ کیا جارہا ہے، تو مجھے ظالموں کے ساتھ اس عذاب میں مبتلا نہ کرنا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”کہ جب اللہ ﷻ کسی قوم پر عذاب نازل فرماتا ہے تو وہاں جو لوگ بھی موجود ہوں سب پر عذاب نازل ہوتا ہے۔ پھر اُنہیں ان کے اعمال کے مطابق اٹھایا جائے گا۔“ (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۹۴: ظالموں پر عذاب آنے کے وقت ان سے علیحدہ کردینے کی التجا کی گئی ہے، تاکہ اہلِ ایمان ظالموں پر آنے والے عذاب کی وجہ سے کسی تکلیف سے محفوظ رہیں۔ چنانچہ اللہ ﷻ نے اپنے رسول ﷺ کو تلقین فرمائی کہ آپ ﷺ یوں دعا مانگیں: ”اے میرے رب! اگر تو مجھے وہ عذاب دکھادے، جس کا ان لوگوں سے وعدہ کیا جارہا ہے، تو مجھے ان ظالموں کے ساتھ شامل نہ کرنا، یعنی مجھے عذاب میں مبتلا نہ فرمانا۔“

علمی بات: رسول اللہ ﷺ کا معصوم اور عذابِ الٰہی سے محفوظ ہونا اگرچہ آپ ﷺ کے لئے یقینی تھا۔ مگر پھر بھی اس دعا کی تلقین اس لئے فرمائی گئی تاکہ حضور ﷺ کا اجر بڑھے اور آپ ﷺ ہر آن اپنے رب کریم کا ذکر کرتے رہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”بے شک میں ایک دن میں ستر مرتبہ اللہ ﷻ سے استغفار کرتا ہوں۔“ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ”میں دن میں اللہ ﷻ سے سو بار مغفرت طلب کرتا ہوں۔“
(صحیح بخاری، جامع ترمذی)

آیت نمبر ۹۵: اللہ ﷻ اس بات پر قادر ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں کفار کو دُنیاوی عذاب سے دوچار کر دے۔ یعنی یہ ہوسکتا ہے کہ وہ عذاب جس کا ان کفار سے وعدہ کیا جارہا ہے، وہ آپ ﷺ زندگی میں ان پر آجائے اور آپ ﷺ بھی ان لوگوں کو مبتلائے عذاب دیکھ لیں۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے جس عذاب کا کفارِ مکہ سے وعدہ فرمایا تھا، حضور ﷺ کی موجودگی میں وہ عذاب ان پر نازل ہوا یا نہیں؟ اس کے بارے میں دو آراء ہیں۔ پہلی رائے یہ ہے کہ اللہ ﷻ نے نبی اکرم ﷺ کو ان کا عذاب دکھا دیا، جب ان پر قحط کی صورت میں بھوک کا عذاب نازل کیا، حتیٰ کہ وہ مردار کھانے پر مجبور ہو گئے۔ پھر غزوۂ بدر میں ان کو عبرتناک شکست سے دوچار کیا گیا اور ان کے بڑے بڑے سردار قتل ہوئے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اللہ ﷻ نے ان کفار سے اس عذاب کو مؤخر کر دیا، کیونکہ اللہ ﷻ کو علم تھا کہ ان میں سے بعض لوگ ایمان لے آئیں گے یا ان کی اولاد ایمان لے آئے گی۔ یا اس لئے کہ اللہ ﷻ کا وعدہ تھا کہ ہم آپ ﷺ کی موجودگی میں اُنہیں عذاب میں مبتلا نہ کریں گے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ اُنہیں عذاب دے جب کہ آپ (ﷺ) ان کے درمیان موجود ہوں۔'' (سورۃ الانفال ۸، آیت: ۳۳)

عملی پہلو: اگرچہ اس اُمت پر حضور نبی کریم ﷺ کی برکت سے، عذابِ عام نہ آنے کا وعدہ اللہ ﷻ کی طرف سے ہو چکا ہے۔ لیکن اللہ ﷻ کی مسلسل نافرمانی کی وجہ سے کسی ایک پر یا کچھ مخصوص لوگوں پر خاص حالات میں کوئی عذاب آسکتا ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم گناہوں پر صدقِ دل سے توبہ کر کے نیک اعمال پر کاربند رہیں۔ تاکہ ہم اللہ ﷻ کے ہر قسم کے عذاب سے محفوظ رہ سکیں۔

آیت نمبر ۹۶: رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اہلِ ایمان کو احسن طریقہ سے حق پہنچانے کی تلقین کی گئی ہے۔ بُرائی کرنے والے سے بھلائی کی جائے تاکہ عداوت محبت میں بدل جائے اور خوشگوار نتیجہ حاصل ہو۔ مشرکوں کے بُرے سلوک اور ان کی ناگوار باتوں سے اللہ ﷻ خوب واقف ہے۔

اللہ ﷻ نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت فرمائی ہے کہ آپ ﷺ ان کفار کی شرارتوں سے خوبصورتی کے ساتھ درگزر کریں۔ ان لوگوں کا آپ ﷺ کے ساتھ جیسا بھی رویہ ہو، مگر آپ ﷺ کو اس کا مقابلہ نیکی اور بھلائی سے ہی کرنا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ ان کی نازیبا باتوں کے جواب میں اُنہیں دعا دیں اور ان کے بُرا بھلا کہنے کے باوجود آپ ﷺ ان کو اللہ ﷻ کی طرف بلاتے رہیں۔ مشرکوں کے بُرے سلوک اور ان کی ناگوار باتوں سے اللہ ﷻ خوب واقف ہے۔

علمی بات: رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اہلِ ایمان کو احسن طریقہ سے حق پہنچانے کی تلقین کی گئی ہے۔ بُرائی کرنے والے سے بھلائی کی جائے تاکہ عداوت، محبت میں بدل جائے اور خوشگوار نتیجہ حاصل ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''اور بھلائی اور بُرائی برابر نہیں ہوتی تم (بدی کو) بہترین نیکی سے دفع کرو تو (تم دیکھو گے) وہی شخص جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے وہ گویا گرم جوش دوست بن جائے گا۔'' (سورۃ حٰم السجدۃ ۴۱، آیت ۳۴)

علمی بات: یہ مکارمِ اخلاق کی تعلیم ہے جو رسول اللہ ﷺ کو دی گئی ہے۔ دعوتِ دین کے مرحلہ کے دوران بُرائی کا جواب بھلائی سے دینے کی تلقین ہے۔ اگرچہ دین دشمن کفار کے مظالم اور میدانِ جہاد کے حوالہ سے رہنمائی مختلف ہے۔ مگر عین حالتِ جہاد میں بھی اس حُسنِ خلق کے بہت سے مظاہر باقی رکھے گئے ہیں کہ عورت کو قتل نہ کیا جائے، بچہ کو قتل نہ کیا جائے، جو مذہبی لوگ مسلمانوں کے مقابلہ پر جنگ میں شریک نہیں، ان کو قتل نہ کیا جائے اور جس کو بھی قتل کریں تو اس کے ناک کان وغیرہ نہ کاٹے جائیں، یہ سب باتیں مکارمِ اخلاق میں سے ہیں جن پر عمل کرنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۹۷: شیطان انسان کا دشمن ہے۔ اس کے شر سے بچاؤ کے لئے اللہ ﷻ کی پناہ میں آنے کی دعا کی جائے۔ شیطان اللہ ﷻ کی اطاعت سے روکنے، بُرائی پر لگانے اور داعیِ دین کو دعوتِ دین کے کام سے روکنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ ان تمام حوالوں سے اور تمام شرور سے بچنے کے لئے اللہ ﷻ کی پناہ میں آنے کی التجا ہی اہم ترین سہارا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے اپنے حبیب مکرم ﷺ کے ذریعہ اپنے بندوں کو ہر قسم کے شیطانوں کے شر سے پناہ مانگنے کا طریقہ تعلیم فرمایا ہے۔ اللہ ﷻ نے نصیحت فرمائی ہے کہ شیطان کے حملوں اور وسوسوں سے بچنے کے لئے اللہ ﷻ سے دعا کرو کہ اے میرے رب! میں شیطانوں کے وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ اس

دعا کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو شیطان کے شر سے بچالے گا۔

علمی بات: شیاطین کی وسوسہ اندازی اتنی شدید اور سخت ہوتی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی دستگیری شامل حال نہ ہو، تو پھر قوی اندیشہ ہے کہ شیطان اپنی وسوسہ اندازی سے راہِ حق سے ہٹالے۔ ان تمام حوالوں سے اور تمام شرور سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنے کی التجا ہی اہم ترین سہارا ہے۔ اسی لئے شیطان کے شر سے بچاؤ کے لئے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنے کی دعا کرتے رہنا چاہیئے۔ شیطان سے حفاظت کے لئے رسول اللہ ﷺ نے بہت سی دعائیں بتائی ہیں۔

فرامینِ نبوی ﷺ: ۱۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص دن بھر میں سو بار یہ کلمہ پڑھے: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کی بادشاہت ہے، اسی کے لئے سب تعریفیں ہیں اور وہ ہر شے پر خوب قادر ہے۔) تو اس کو دس غلام آزاد کرنے کا ثواب ملے گا، سو نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں لکھی جائیں گی، سو برائیاں اس کی مٹائی جائیں گی اور وہ اس دن شام تک شیطان (کے شر) سے محفوظ رہے گا اور کوئی اس سے بہتر عمل لے کر نہیں آئے گا مگر جو اس سے بھی زیادہ تعداد میں یہ کلمات پڑھے۔" (صحیح بخاری)

۲۔ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور بُرا خواب شیطان کی طرف سے ہے۔ لہٰذا جب تم میں سے کسی کو بُرا خواب دکھائی دے، جس سے وہ ڈر جائے تو اسے چاہیئے کہ اپنی بائیں طرف تھوکے اور اس کی بُرائی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے، (اگر وہ ایسا کرے گا) تو شیطان اسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔" (صحیح بخاری)

عملی پہلو: آیت میں مذکور یہ دعا اپنے مفہوم عام کے اعتبار سے شیطان کے شر اور مکر سے بچنے کے لئے ایک جامع دعا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس دعا کی تلقین فرمائی ہے تاکہ ایسے غصہ اور غیظ و غضب کی حالت میں، جبکہ انسان اپنے نفس پر قابو نہیں رہتا اور اس میں شیطان کے وسوسہ کا دخل ہوتا ہے، اس سے محفوظ رہے۔ اس کے علاوہ شیاطین اور جنات کے دوسرے آثار اور حملوں سے بچنے کے لئے بھی یہ دعا مجرب ہے۔

آیت نمبر ۹۸: شیطان کے قریب آنے سے بچنے کے لئے دعا سکھائی گئی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی جائے: کہ الٰہی! شیاطین میرے قریب ہی نہ آنے پائیں دور ہی رہیں تاکہ میں ان کے شر اور فتنہ انگیزی سے دور رہ کر تیری یاد اور تیرے دین کی خدمت میں منہمک رہوں۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: "ہر ایک کے ساتھ ایک شیطان لگا ہوا ہے۔" (صحیح مسلم) شیطان آگے پیچھے، دائیں اور بائیں ہر طرف سے حملہ آور ہوتا رہتا ہے، اس لئے اس سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی جائے کہ وہ میرے قریب ہی نہ آئے تاکہ اس کے ہر قسم کے شر سے حفاظت ہو سکے۔

علمی بات: شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ وہ اسے گمراہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انسان اپنی تمام دانشمندی اور زہد و تقویٰ کے باوجود جان و ایمان کے اس دشمن سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس کی فقط ایک ہی صورت ہے کہ مولا کریم اپنے دامن رحمت میں چھپالے اور اس کے شر سے محفوظ کرلے۔ شیطان کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے۔ اُس کے اذن کے بغیر شیطان بھی کچھ نہیں کر سکتا تو اُسی خالق و مالک سے التجا کی جائے کہ پروردگار تو مجھے اس کے شر سے بچالے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب تم میں کوئی شخص نیند میں ڈر جائے تو وہ یہ دعا کرے: اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ غَضَبِهٖ وَعِقَابِهٖ وَشَرِّ عِبَادِهٖ، وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَاَنْ يَّحْضُرُوْنِ۔ ("میں اللہ تعالیٰ کے غضب سے، اس کے عقاب سے، اس کے بندوں کے شر سے اور شیطان کے وسوسوں اور شیطان کے حاضر ہونے سے اللہ تعالیٰ کے کامل کلمات کی پناہ میں آتا ہوں) تو پھر شیاطین اس کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔" (جامع ترمذی)

عملی پہلو: بعض دفعہ انسان شیطان کی اکساہٹ پر کوئی ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے جو اس کے برسوں کے کیئے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ اس دشمن کے حملہ سے بچاؤ کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجائے اور یہ دعا کرتا رہے جو ان دو آیات میں سکھلائی گئی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے تاکید فرمائی کہ ہر اہم کام کی ابتدا اللہ تعالیٰ کے نام سے کرو یعنی بسم اللہ پڑھ کر، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی یاد، شیطان کو دور کرنے والی چیز ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ

اس کے علاوہ یہ دعا بھی مانگتے تھے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابی یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُبِكَ مِنَ الْهَدْمِ وَأَعُوْذُبِكَ مِنَ التَّرَدِّيْ وَأَعُوْذُبِكَ مِنَ الْغَرَقِ وَالْحَرَقِ وَالْهَرَمِ وَأَعُوْذُبِكَ أَنْ يَتَخَبَّطَنِيَ الشَّيْطٰنُ عِنْدَ الْمَوْتِ وَأَعُوْذُبِكَ أَنْ أَمُوْتَ فِي سَبِيْلِكَ مُدْبِرًا وَأَعُوْذُبِكَ أَنْ أَمُوْتَ لَدِيْغًا۔

"اے اللہ ﷻ! کسی مکان یا دیوار کے اپنے اوپر گرنے سے میں تیری پناہ مانگتا ہوں۔ میں اونچے مقام سے گر پڑنے سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ میں ڈوبنے، جل جانے اور بہت بوڑھا ہو جانے سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ موت کے وقت مجھے شیطان اُچک لے۔ اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ میں تیری راہ میں پیٹھ دکھا کر بھاگتے ہوئے مارا جاؤں اور اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ کسی زہریلے جانور کے کاٹنے سے میری موت آئے۔"

(سنن ابی داؤد)

آیت نمبر ۹۹: کافر حق کی مخالفت کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کی موت کا وقت آجاتا ہے۔ اس وقت وہ فریاد کرتا ہے کہ اسے کچھ مہلت دی جائے۔ یعنی جب منکرین حق میں سے کسی کو موت آتی ہے تو وہ اپنے رب سے آرزو کرتا ہے کہ کاش مجھے دُنیا میں دوبارہ لوٹا دیا جائے اور میں جو کچھ کرتا رہا اس کے بجائے نیک اعمال کروں گا۔ لیکن اس وقت اسے جواب دیا جاتا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ وہ دل ہی دل میں روتا اور آہ وزاریاں کرتا ہے مگر اس کی آہ وزاریاں اور چیخ و پکار کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

علمی بات: موت کے وقت ایمان لانے اور نیک عمل کرنے کے لئے اللہ ﷻ سے دوبارہ دُنیا میں بھیجنے کی درخواست کرنا، صرف کافروں کے ساتھ مختص نہیں ہے، بلکہ جو مسلمان ساری عمر اللہ ﷻ کے احکام پر عمل نہیں کرتے اور گناہوں میں ڈوبے رہتے ہیں، وہ بھی جب موت کے وقت عذاب کے فرشتوں کو دیکھیں گے، تو وہ بھی اس وقت یہ تمنا کریں گے کہ کاش ان کو دوبارہ دُنیا میں بھیجا جائے تاکہ وہ نیک عمل کریں اور گناہ نہ کریں۔ (العیاذ باللہ)

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو اللہ ﷻ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اللہ ﷻ بھی اس سے ملاقات کرنے کو پسند فرماتا ہیں اور جو اللہ ﷻ کی ملاقات کو ناپسند کرے، اللہ ﷻ بھی اس سے ملاقات کرنا پسند نہیں فرماتا۔" حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: "یارسول اللہ ﷺ! ہم تو موت کو پسند نہیں کرتے۔" حضور ﷺ نے فرمایا: "یہ مقصد نہیں ہے، بلکہ جب مومن کو موت آتی ہے تو اسے بشارت دی جاتی ہے کہ اللہ ﷻ تجھ سے راضی ہے اور تیری عزت افزائی ہوگی۔ اس وقت مومن کو سب سے زیادہ یہ چیز عزیز ہوتی ہے کہ وہ آگے جا رہا ہے۔ وہ آگے جانے کو بہت پسند کرتا ہے اور اللہ ﷻ بھی اس کی ملاقات کو پسند فرماتا ہے۔ (اس کے برعکس) جب کافر کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو اسے اللہ ﷻ کے عذاب اور اس کی سزا کی بشارت دی جاتی ہے، اس وقت اسے سب سے زیادہ ناگوار یہ چیز ہوتی ہے کہ اسے آگے بھیجا جا رہا ہے۔ وہ آگے جانا ہرگز پسند نہیں کرتا اور اللہ ﷻ بھی اس کی ملاقات کو پسند نہیں کرتا۔" (صحیح بخاری)

عملی پہلو: کافر اور گناہ گار بندہ کو جب موت آتی ہے تو وہ واپسی کی درخواست کرتا ہے لیکن اس کی یہ درخواست قبول نہیں ہوتی۔ اس وقت سوائے پچھتاوے کے اسے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم موت سے پہلے پہلے آخرت کی تیاری کریں تاکہ جب موت آئے تو کوئی پریشانی اور پچھتاوا نہ ہو۔

آیت نمبر ۱۰۰: موت کے وقت کافر اللہ ﷻ سے مہلت مانگے گا کہ ایک بار اسے پھر دُنیا میں بھیجا جائے تاکہ دُنیا میں جا کر اپنی اصلاح کر لے اور نیک اعمال کر کے اللہ ﷻ کو راضی کر لے۔ لیکن اس بات سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور اس کی یہ فریاد رَد کر دی جائے گی۔ کیونکہ موت کے بعد وہ عالم برزخ میں پہنچ چکا ہوگا جہاں سے کوئی دُنیا میں واپس نہیں جا سکتا بلکہ اب قیامت تک اسی برزخ میں رہے گا۔ یہاں تک کہ جب قیامت آئے گی تو اسے دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ لیکن وہ زندگی عمل کی نہیں بلکہ حساب و جزا کی زندگی ہوگی۔

علمی بات: دو چیزوں کے درمیان جو پردہ، آڑ اور رکاوٹ ہو، اسے برزخ کہتے ہیں۔ یہاں برزخ سے مراد "موت اور قیامت کا درمیانی عرصہ" ہے۔ موت کے بعد انسان جہاں منتقل ہوتا ہے وہ دُنیا اور آخرت کے درمیان کا عالم ہے جو ایک روک اور پردہ ہے، اس لئے اسے برزخ کہتے ہیں۔ حدیث میں ان احوال کو جو موت کے بعد انسان پر گزرتے ہیں قبر کے احوال سے تعبیر کیا گیا ہے، جو انسانی نفسیات کے لحاظ سے ایک مؤثر تعبیر ہے، ورنہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو قبر میں دفن ہوا اس پر تو یہ احوال گزرتے ہیں اور جو قبر میں دفن ہی نہیں ہوا بلکہ جس کی لاش جلائی گئی یا کسی اور طریقہ سے ضائع کر دی گئی یا ممی بنا کر دُنیا میں محفوظ کر دی گئی، اس پر یہ احوال نہیں گزرتے۔ مرنے کے بعد انسان کو قیامت کے دن تک عالم برزخ میں رہنا ہے۔ قیامت کے دن اسے جسم سمیت پھر اٹھایا جائے گا اور یہ عالم آخرت ہو گا جہاں اسے ہمیشہ رہنا ہے۔

علمی بات: اس آیت میں "یہ تو بس ایک بات ہے جو وہ کہہ رہا ہے" سے کیا مراد ہے؟ اس کے بارے میں دو آراء ہیں۔ پہلی رائے یہ ہے کہ یہ ایسی بات ہے جو ہر کافر موت کے وقت کہتا ہے، لیکن اس کا اسے کوئی فائدہ نہیں ہو گا اور اسے روک کر دیا جائے گا کیونکہ وہ عالم برزخ میں پہنچ چکا ہوتا ہے اور وہاں سے کوئی واپس نہیں آسکتا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ محض کافر کی زبان کی بات ہو گی جس کے مطابق عمل نہیں ہو گا کیونکہ اگر اسے دُنیا میں لوٹا بھی دیا جائے تو وہ پھر بھی نیک عمل نہیں کرے گا، اس لئے اسے واپس نہیں بھیجا جائے گا۔

آیت نمبر ۱۰۱: قبر سے اٹھائے جانے کے بعد لوگوں کی ابتدائی کیفیت کا بیان ہے۔ جب صور پھونکا جائے گا تو اس وقت عالم برزخ کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ تمام لوگوں کو دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔ اس وقت لوگوں پر خوف اور دہشت طاری ہو گی۔ ہر ایک کو اپنی فکر ہو گی اور دوسرے لوگوں سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہو گی، اگرچہ وہ اس کا قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔

علمی بات: آیت میں مذکور یہ حال کفار کا ہو گا کہ ان کے سارے رشتے ناطے منقطع ہو جائیں گے۔ البتہ مومنین صالحین کا یہ حال نہیں ہو گا کیونکہ مومنین صالحین کی اولاد کو اللہ ﷻ (بشرط ایمان) اپنے آباء صالحین کے ساتھ ملا دے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کی پیروی کی تو ہم ان کی اولاد کو انہی کے ساتھ شامل فرما دیں گے۔" (سورۃ الطور ۵۲، آیت: ۲۱)

اسی طرح ایک صحیح حدیث میں جس کو ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے بسند صحیح حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا: "کہ قیامت کے روز ہر نسبی تعلق یا زوجیت کے تعلق سے جو رشتے پیدا ہوں گے وہ سب منقطع ہو جائیں گے (کوئی کسی کے کام نہ آوے گا) بجز میرے نسب اور میری زوجیت کے رشتہ کے۔ علماء کرام نے فرمایا ہے کہ اس نسب نبوی میں ساری اُمّت کے مسلمان بھی داخل ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ اُمّت کے شفیق والد اور آپ ﷺ کی ازواج مطہرات ازواجِ مطہرات رَضِیَ اللہُ عَنۡھُنَّ اُمّت کی مائیں ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ رشتہ اور دوستی کا کوئی تعلق کسی کے کام نہ آنا، یہ حال محشر میں کافروں کا ہو گا۔ مومنین صالحین ایک دوسرے کی شفاعت اور مدد کریں گے اور ان کے تعلقات ایک دوسرے کے کام آئیں گے۔

علمی بات: اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ باپ باپ نہ رہے گا اور بیٹا بیٹا نہ رہے گا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس وقت نہ باپ بیٹے کے کام آئے گا نہ بیٹا باپ کے۔ ہر ایک اپنے حال میں کچھ اس طرح گرفتار ہو گا کہ دوسرے کو پوچھنے تک کا ہوش نہ ہو گا کجا کہ اس کے ساتھ کوئی ہمدردی یا اس کی کوئی مدد کر سکے۔ دوسرے مقامات پر اس مضمون کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ "اور کوئی پکا دوست کسی گہرے دوست کو نہیں پوچھے گا۔ (حالانکہ) وہ ایک دوسرے کو دکھا دیئے جائیں گے (اُس دن) مجرم چاہے گا کہ کاش وہ اس دن عذاب (سے رہائی) کے بدلہ میں اپنے بیٹے دے دے۔ اپنی بیوی اور اپنے بھائی کو۔ اپنے خاندان کو جو اسے پناہ دیتا تھا اور جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کے سب (فدیہ میں دے دے) پھر اپنے آپ کو (عذاب سے) بچالے۔ (لیکن ایسا) ہرگز نہیں (ہو گا) یقیناً وہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔ جو کھال تک اُتار دینے والی ہے۔" (سورۃ المعارج ۷۰، آیات: ۱۰ تا ۱۶)

معلوم ہوا کہ قیامت کے دن سارے رشتے ٹوٹ جائیں گے، سارے تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔ ماں بیٹوں سے اور بیٹے ماں سے بھاگ جائیں گے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اس دن آدمی بھاگے گا اپنے بھائی سے اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی اور اپنے بچوں سے۔ اس دن اُن میں سے ہر شخص کو ایسی فکر ہوگی جو اسے (دوسروں سے) بے پروا کر دے گی'' (سورۃ عبس ۸۰، آیات: ۳۴ تا ۳۷) مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی نجات کی فکر لاحق ہوگی، نہ کوئی کسی کا حال پوچھنے والا ہو گا کہ ہمدردی اور غمگساری کرے اور نہ ہی کوئی کسی سے مدد طلب کر سکے گا۔

علمی بات: البتہ یہ بھی یاد رکھیں کہ ایک نسبت اور ایک رشتہ داری اس روز بھی باقی رہے گی جب سب رشتے ناطے ختم ہو جائیں گے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے حضور نبی کریم ﷺ کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا: ''ان لوگوں کا کیا حال ہو گا جو یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی رشتہ داری آپ ﷺ کے خاندان کو نفع نہیں دے گی۔ ایسا نہیں ہو گا، میرا رشتہ دُنیا اور آخرت میں پیوستہ ہے اور اے لوگو! میں حوضِ کوثر پر تمہارا پیشرو ہوں گا۔'' (مسند احمد، مستدرک حاکم، حکم حدیث: صحیح) دوسری حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''فاطمہ (رضی اللہ عنہا) میری لختِ جگر ہے، جو چیز اسے ناراض کرتی ہے وہ مجھے ناراض کرتی ہے۔ جو چیز اسے خوش کرتی ہے وہ مجھے خوش کرتی ہے۔ ساری رشتہ داریاں قیامت کے دن منقطع ہو جائیں گی سوائے میرے نسبی تعلق کے اور سسرال کے تعلق کی رشتہ داری کے۔'' (مسند احمد، طبرانی) اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کا تعلق اس دن بھی منقطع نہیں ہو گا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمام سبب و نسب بروز قیامت منقطع ہو جائیں گے، مگر میرا سبب و نسب کہ وہ ضرور نفع دے گا۔'' (مستدرک حاکم، مسند احمد، بیہقی، طبرانی)

عملی پہلو: ہمیں چاہیئے کہ ہم نبی کریم ﷺ کی ذاتِ بابرکت کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط کریں اور آپ ﷺ سے حد درجہ محبت رکھیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''نبی (کریم ﷺ) اہلِ ایمان کی جانوں پر خود ان سے زیادہ حق رکھتے ہیں اور آپ کی ازواجِ (مطہرات) اُن کی مائیں ہیں اور (قریبی) رشتہ دار اللہ کی کتاب میں (میراث کے لحاظ سے) ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں دوسرے مومنین اور مہاجرین کی نسبت مگر یہ کہ تم اپنے دوستوں پر (وصیت کر کے) احسان کرنا چاہو یہ حکم کتاب (الٰہی) میں لکھا ہوا ہے۔'' (سورۃ الاحزاب ۳۳، آیت: ۶)

آپ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ کی محبت رکھنے کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کی مکمل اطاعت و اتباع بھی کریں۔ تاکہ روزِ قیامت یہ تعلق مع الرسول، محبتِ الٰہی کا ذریعہ بن کر ہماری نجات کا سامان کرے۔ جیسا کہ قرآنِ حکیم میں اتباعِ رسول ﷺ کو محبتِ الٰہی کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ ''(اے نبی ﷺ!) فرما دیجیے: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو تم میری پیروی کرو اللہ (بھی) تم سے محبت فرمائے گا۔'' (سورۃ آل عمران ۳، آیت: ۳۱)

آیت نمبر ۱۰۲: روزِ قیامت لوگوں کے اعمال تولے جائیں گے۔ جن کی نیکیوں والے اعمال کا پلڑا بھاری ہو گا، وہ کامیاب قرار پائیں گے اور انہیں جنت میں داخل کیا جائے گا۔ اس کے برعکس جن کی نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہو گا، وہ ناکام ہوں گے اور اُنہیں جہنم میں دھکیل دیا جائے گا۔

علمی بات: آیتِ کریمہ میں ''مَوَازِيْنُ'' کا لفظ جمع ہے جس کا واحد موزون بھی ہو سکتا ہے اور میزان بھی۔ پہلی صورت میں ''مَوَازِيْنُ'' سے مراد نیک اعمال ہوں گے اور دوسری صورت میں ''مَوَازِيْنُ'' کا معنی ترازو کے دو پلڑے ہوں گے جن میں ایک میں نیکیاں رکھی جائیں گی اور دوسرے میں بُرائیاں۔ ایک قول یہ ہے کہ میزان کا لفظ وزن کے معنی میں ہے۔ تینوں صورتوں میں مدعا اور مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بات یہ ہے کہ جس شخص کی نیکیاں زیادہ ہوں گی اور بُرائیاں کم ان کو ایسی زندگی عطا کی جائے گی کہ جس میں آرام و آسائش کے ہزاروں سامان ہوں گے۔ حزن و ملال کا نام و نشان تک نہ ہو گا۔ اسے جن نعمتوں سے نوازا جائے گا انھیں اپنی توقع سے بہت زیادہ پا کر وہ نہایت مسرور ہو گا۔

علمی بات: ان آیات میں موازنہ صرف مومنین کاملین اور کفار کا ہے اور اُنہیں کے وزنِ اعمال کا اور ان میں سے ہر ایک کے انجام کا ذکر کیا گیا ہے۔ مومنین کاملین کا پلہ بھاری ہو گا اور ان کو فلاح حاصل ہو گی۔ کفار کا پلہ ہلکا رہے گا اور اُنہیں ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہنا پڑے گا۔ اس جگہ مومنین کاملین کا پلہ بھاری ہونے

کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے پلے یعنی سیئات و معاصی کے پلے میں کوئی وزن ہی نہ ہو گا، وہ خالی نظر آئے گا۔ کفار کا پلہ ہلکا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نیکیوں کے پلہ میں کوئی وزن ہی نہ ہو گا، بالکل خالی جیسا ہلکا رہے گا۔ جیسا کہ قرآنِ حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: "یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات کا انکار کیا اور اس کی ملاقات کا تو ان کے اعمال برباد ہو گئے تو ہم قیامت کے دن ان کے لئے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے۔" (سورۃ الکہف ۱۸، آیت: ۱۰۵)

وزن کی وضاحت کے لئے احادیث مبارکہ کے شواہد: بعض لوگوں کو آج بھی اور مشرکین مکہ کو خاص طور پر یہ شبہ ہوتا تھا کہ چیزوں کا وزن تو سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن ایمان و کفر کا وزن اور اچھے بُرے اعمال کا وزن آخر اس کو کس طرح سمجھا جا سکتا ہے تو اس آیت میں ایک بات تو یہ صاف کر دی گئی کہ اس دن ایمان اور نیک اعمال کا وزن تو ہو گا اور یہ باقاعدہ اپنا تول تلیں گی لیکن جہاں تک کفر اور بُرائیوں کا تعلق ہے وہ اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھیں گی۔ چنانچہ احادیث مبارکہ سے اور قرآنِ کریم سے بھی ان دونوں آیتوں کی وضاحت ملتی ہے اور جہاں تک آج کے دور کا تعلق ہے آج تو بہت ساری ایسی چیزیں ایجاد ہو چکی ہیں جو ایسی چیزوں کو تول رہی ہیں جن کو ایک زمانہ پہلے تک تولنے کا کبھی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گزشتہ زمانے میں کون تصور کر سکتا تھا کہ ہوا بھی تولی جا سکتی ہے، برقی رو تولی جا سکتی ہے، سردی اور گرمی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، ان کے الگ الگ میٹر تیار ہو چکے ہیں، باقاعدہ ان کو ترازو میں تولا جاتا ہے۔ ہمیں بخار ہوتا ہے تو منہ میں تھرمامیٹر رکھ کر بتا دیا جاتا ہے کہ کس درجہ کا بخار ہے۔ گاڑیوں والے جگہ جگہ اپنی گاڑیوں میں پاؤنڈ کے حساب سے ہوا بھرواتے ہیں۔ روزانہ محکمہ موسمیات والے ہمیں موسم کا ٹمپریچر تول تول کر بتاتے ہیں اس لئے آج یہ باتیں سمجھنا ہمارے لئے مشکل نہیں رہا کہ قیامت کے دن اعمال کیسے تُلیں گے۔ آج تو ہمارے لئے یہ بات سمجھنا بھی کوئی مشکل نہیں رہا کہ برسوں پہلے دُنیا سے گئے ہوئے لوگوں کو کس طرح ان کے اعمال سمیت دیکھا جا سکتا ہے کیونکہ کتنے بڑے بڑے مرحومین ہیں کہ جب ان کی برسیاں منائی جاتی ہیں تو ہر روز ٹی وی کی سکرین ہمیں ان کی آواز سناتی ہے، ان کو چلتا پھرتا دکھایا جاتا ہے، ان کو دفتر کے کام کرتے اور مختلف امور سر انجام دیتے ہوئے ہمارے سامنے لایا جاتا ہے اس لئے آج یہ تصور کرنا کوئی مشکل نہیں رہا کہ یہ کوئی ناممکن بات نہیں کہ کبھی کوئی دن ایسا آئے جب ہماری اس فضا کو ایک ٹی وی سکرین کی شکل دے دی جائے اور قیامت تک پیدا ہونے والی مخلوقات کو اس میں چلتا پھرتا دکھایا جائے اور ان کے اعمال کو مجسم شکل میں سب کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا جائے کیونکہ حدیث شریف سے جس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اعمال کے وزن ہوں گے اسی طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بہت سارے اعمال کو مجسم شکل میں سامنے لایا جائے گا۔ آنحضرت (ﷺ) کے ارشادات اس بات پر شاہد ہیں کہ برزخ اور محشر میں انسانی اعمال خاص خاص شکلوں اور صورتوں میں آئیں گے، قبر میں انسان کے اعمال صالحہ ایک حسین صورت میں اس کے مونس بنیں گے اور بُرے اعمال سانپ بچھو بن کر لپٹیں گے۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ جس شخص نے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کی وہ مال ایک زہریلے سانپ کی شکل میں اس کی قبر میں پہنچ کر اس کو ڈسے گا اور کہے گا میں تیرا خزانہ ہوں اسی طرح معتبر احادیثِ مبارکہ میں ہے کہ میدانِ حشر میں انسان کے اعمال صالحہ اس کی سواری بن جائیں گے اور بُرے اعمال بوجھ بن کر اس کے سر پر لادے جائیں گے۔ ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ قرآنِ مجید کی سورۃ البقرہ اور سورۃ آل عمران میدانِ حشر میں دو گہرے بادلوں کی شکل میں آ کر ان لوگوں پر سایہ کریں گی جو ان سورتوں کے پڑھنے والے تھے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم) جہاں تک ایمان و عمل کے وزن دار ہونے کا تعلق ہے اس میں بعض احادیثِ مبارکہ میں صرف ایمان یا کلمہ طیبہ کے بھاری وزن کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، ابن حبان، بیہقی اور حاکم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا: "کہ محشر میں میری اُمت کا ایک آدمی ساری مخلوق کے سامنے لایا جائے گا اور اس کے ننانوے (۹۹) نامۂ اعمال لائے جائیں گے اور ان میں سے ہر نامۂ اعمال اتنا طویل ہو گا کہ جہاں تک اس کی نظر پہنچتی ہے اور یہ سب نامۂ اعمال بُرائیوں اور گناہوں سے لبریز ہوں گے۔" اس شخص سے پوچھا جائے گا کہ ان نامۂ اعمال میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب صحیح ہے یا نامۂ اعمال لکھنے والے فرشتوں نے تم پر کوئی ظلم کیا ہے اور خلاف واقعہ کوئی بات لکھی ہے وہ اقرار کرے گا کہ اے میرے پروردگار! جو کچھ لکھا ہے سب صحیح ہے اور دل میں گھبرائے گا کہ اب میری نجات کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ اس وقت حق تعالیٰ فرمائے گا آج کسی پر ظلم نہیں ہو گا۔ ان تمام گناہوں کے مقابلہ میں تمہاری ایک نیکی کا پرچہ بھی ہمارے پاس موجود ہے جس میں تمہارا کلمۂ شہادت لکھا ہوا

ہے۔ وہ عرض کرے گا کہ اے پروردگار! اتنے بڑے سیاہ نامۂ اعمال کے مقابلہ میں یہ چھوٹا سا پرچہ کیا وزن رکھے گا اس وقت ارشاد ہو گا کہ تم پر ظلم نہیں ہو گا اور ایک پلہ میں وہ سارے گناہوں سے بھرے ہوئے نامۂ اعمال رکھے جائیں گے اور دوسرے میں یہ کلمہ ایمان کا پرچہ رکھا جائے گا اور اس کلمہ کا پلہ بھاری ہو جائے گا اور سارے گناہوں کا پلہ ہلکا ہو جائے گا۔ اس واقعہ کو بیان کر کے رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "کہ اللہ ﷻ کے نام کے مقابلہ میں کوئی چیز بھاری نہیں ہو سکتی۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر کی زندگی کے کروڑوں اعمال میں جو چاہے اپنے اندر کیسی بھی شناعت رکھتے ہوں ایک کلمہ ایمان ان سب پر بھاری ہو جائے گا لیکن جہاں تک اعمال کا تعلق ہے ان کا الگ وزن ہو گا جس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہو گا وہ نجات پا جائے گا اور جس کے گناہوں کا پلہ بھاری ہو گا وہ عذاب کا شکار ہو گا۔

حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان آیات کی تفسیر میں فرمایا کہ جس مومن کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہو گا وہ اپنے اعمال کے ساتھ جنت میں ہو گا اور جس کا پلہ گناہوں کا بھاری ہو گا وہ اپنے اعمال کے ساتھ جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔

آیت نمبر ۱۰۳: روزِ محشر اعمال تولے جائیں گے، جن لوگوں کی نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہو گا، وہ خسارہ پانے والے ہوں گے اور انہیں جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ ایسے لوگوں نے دُنیا میں ایمان اور اطاعت سے منہ موڑا تھا۔ آخرت کی تیاری کے بجائے، انہوں نے اپنی زندگی کفر و انکار اور بغاوت و سرکشی میں گنوا دی۔ اب ان کے لئے واپسی کی کوئی صورت ممکن نہ ہو گی اور ان کے لئے صرف خسارہ ہی ہو گا۔

علمی بات: ان دو آیات میں قیامت کے دن کا ایک منظر بیان کیا گیا ہے۔ ہر شخص کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک وزن کیا جائے گا۔ نیکیوں کا پلڑا بھاری ہو کر جھکنے پر فوراً صاحب عمل کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ دُنیا کے امتحان میں پاس ہو گیا ہے اور اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔ جس کا نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہونے کی وجہ سے اوپر اٹھ گیا اور بُرائیوں کا پلڑا بھاری ہوا، تو ایسے لوگ اس امتحان میں ناکام ہو جائیں گے۔ پھر ایک تو اس ناکامی پر اُنہیں افسوس اور حسرت ہو گی، دوسرے اس کے نتیجہ میں جہنم کا عذاب ان کے لئے پہلے ہی تیار ہو گا۔

آیت نمبر ۱۰۴: جن لوگوں کے نیک اعمال کے پلڑے ہلکے ہوں گے، ان کو جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ جہنم کی آگ ان کے چہروں کو جھلسا دے گی جس سے ان کی شکل انتہائی بدصورت ہو جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ جلتے جلتے بدن سُوج جائے گا، دانت باہر نکلے ہوئے ہوں گے، نیچے کا ہونٹ لٹک کر ناف تک اور اوپر کا پھول کر کھوپڑی تک پہنچ جائے گا۔ جہنم کی آگ ان کے چہروں کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دے گی۔

علمی بات: چہرے کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ انسانی وجود کا سب سے اہم حصہ ہے، ورنہ جہنم کی آگ تو پورے جسم کو ہی گھیرے ہو گی۔ "کالح" لغت میں ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جس کے دونوں ہونٹ اس کے دانتوں کو نہ پہنچ سکیں اور دانت ظاہر ہو جائیں۔ ہونٹ گویا دانتوں کا لباس ہیں، لیکن جہنمی کے اوپر کا ہونٹ اوپر اور نیچے کا ہونٹ نیچے لٹک جائے گا اور اس کے دانت ظاہر ہو جائیں گے۔ جس سے اس کی صورت بدشکل اور ڈراؤنی ہو جائے گی۔ (معاذ اللہ)

آیت نمبر ۱۰۵: یہ اہل جہنم سے اللہ ﷻ کا خطاب ہے۔ قیامت کے روز جب کافروں کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا اور آگ سے ان کے چہرے جھلس جائیں گے تو اس وقت اللہ ﷻ ان سے فرمائے گا کہ دُنیا میں تمہارے سامنے میری آیات اور میرے احکام پڑھ کر سنائے جاتے تھے، لیکن تم تو ان کو جھٹلاتے ہی رہے اور ان کا مذاق اڑاتے رہے اور کہتے رہے کہ یہ تو گزشتہ زمانے کے لوگوں کے من گھڑت قصے کہانیاں ہیں۔ تم تو یہ مانتے ہی نہ تھے کہ مرنے کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور اعمال کے مطابق جزا و سزا دی جائے گی۔ پس تم اپنے اسی کفر و انکار اور تکذیب و استہزاء کی بنا پر اس عذاب کے مستحق بنے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے کافروں کو اختیار دیا تھا کہ وہ اس کی اطاعت کریں یا اس کی نافرمانی کریں۔ مگر انہوں نے اللہ ﷻ کی نافرمانی کو اختیار کیا۔ ان کے سامنے اللہ ﷻ کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی تھیں لیکن انہوں نے اپنے اختیار سے ان کو جھٹلا دیا۔ انہوں نے اپنی مرضی سے اللہ ﷻ کی نافرمانی اور کفر اختیار کیا۔ ان کے اس اختیار اور نافرمانی کی وجہ سے اُنہیں عذاب دیا جائے گا۔

آیت نمبر ۱۰۶: اہل جہنم کہیں گے کہ اے پروردگار! ہم پر بدبختی غالب آگئی تھی اور درحقیقت ہم گمراہ لوگ تھے۔ اس طرح وہ اللہ ﷻ کے حضور اپنے گناہ کا اعتراف کریں گے اور اپنی گمراہی اور بدبختی کا اقرار کریں گے۔ مگر بے وقت کے اس اقرار و اعتراف سے ان کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا، سوائے ان کی حسرت و افسوس میں اضافہ کے۔

علمی بات: حرام لذّات اور شہوت جو انسان پر غالب رہتی ہیں، اسے یہاں بدبختی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ کہیں گے کہ ہم نے حرام لذّات کو طلب کیا، بُرے کاموں کی حرص کی اور نفس پرستی میں پڑے رہے، جس کی وجہ سے بدبختی ہم پر غالب آگئی۔

علمی بات: اہل جہنم کی طرف سے یہ کہنا کہ ہماری بدبختی ہم پر غالب آگئی تھی اور ہم گمراہ لوگ تھے، کوئی عذر نہیں ہے، بلکہ یہ ان کی طرف سے اعترافِ جرم ہے۔ کیونکہ ان کو معلوم ہوگا کہ ان کا کوئی عذر کام نہ آئے گا اس لئے وہ اب اپنے گناہوں کا اعتراف کریں گے۔ وہ یہ تسلیم کرلیں گے کہ سارا قصور ہمارا ہی ہے کہ ہم گمراہی، بُرے کاموں اور نفس پرستی میں پڑے رہے۔ ہمارے غلط کاموں کی وجہ سے ہمارے خلاف اللہ ﷻ کی حجت قائم ہوچکی ہے جس کی وجہ سے ہمیں عذاب دیا جارہا ہے۔

عملی پہلو: اللہ ﷻ کا لوگوں پر کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے یہ سب کچھ پیشگی بتادیا ہے تاکہ جس نے بچنا ہو وہ بچ جائے اور کل یہ نہ کہے کہ مجھے پتہ نہیں تھا۔ لہٰذا ہم سب کو یہ چاہیئے کہ ابھی سے اپنا جائزہ لیں۔ اگر کوئی گناہ کررہا ہے، تو وہ گناہوں کو چھوڑدے اور نیک اعمال کرے۔

آیت نمبر ۱۰۷: اہل جہنم اللہ ﷻ سے دُنیا میں واپس بھیجنے کی درخواست کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس دوزخ کی آگ سے نکال دے اگر آئندہ پھر ہم ایسا کریں تو بے شک ہم ظالم ہوں گے، اس وقت جو چاہے سزا دینا مگر اب چھوڑدے۔ یہ لوگ اللہ ﷻ سے ایک موقع مانگ رہے ہیں کہ اُنہیں دُنیا میں بھیج دیا جائے اور اگر انہوں نے دوبارہ کفر و شرک کی راہ اختیار کی، تو یقیناً وہی ظالم ہوں گے۔

علمی بات: ظالم لوگ موت کے وقت بھی دوبارہ دُنیا میں واپس جانے کی التجا کریں گے اور دوزخ میں داخل ہونے کے بعد بھی واپس دُنیا میں جانے کی درخواست کریں گے۔ لیکن ان کی دونوں مرتبہ یہ التجا قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ موت سے پہلے پہلے دُنیاوی زندگی میں عمل کرنے کی مہلت ہے اور موت کے بعد عالم برزخ ہے پھر دار الجزا ہے جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہے۔

علمی بات: اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ انہوں نے یہ درخواست کیوں کی جب کہ اُنہیں معلوم ہوچکا تھا کہ ان کا عذاب دائمی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ دوزخ کے عذاب کی شدت کی وجہ سے ان کے دماغوں سے اس عذاب کا دائمی ہونا نکل گیا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کو اس کا علم ہو لیکن انہوں نے چلّانے اور آہ وزاری کرنے کے طور پر ایسا کہا ہو۔

عملی پہلو: دراصل یہ دُنیاوی زندگی ایک امتحان ہے جس کی بنیاد پر ہماری آخرت کا فیصلہ ہوگا۔ موت کے بعد واپس آنے کا کوئی موقع یا مہلت نہیں ملے گی۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم اسی دُنیاوی زندگی میں اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت و فرماں برداری کریں، تاکہ آخرت میں جہنم کے عذاب سے بچ سکیں۔

آیت نمبر ۱۰۸: اہل جہنم جب جہنم سے نکلنے کی درخواست کریں گے تو ان کی یہ درخواست رد کردی جائے گی۔ اللہ ﷻ ان کو جواب دے گا کہ اب تم اسی جہنم میں ذلّت اور رسوائی کے ساتھ پڑے رہو اور عذاب دور کرنے کے بارے میں مجھ سے بات بھی نہ کرو۔ اس جواب کے بعد ان کی تمام اُمیدیں ٹوٹ جائیں گی اور وہ ہمیشہ کے لئے مایوس ہوجائیں گے۔

علمی بات: "اِخْسَئُوْا فِيْهَا" کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے: "(اللہ) فرمائے گا اسی میں ذلت کے ساتھ پڑے رہو"۔ اصل میں "خَسَاءٌ" کا لفظ کتے کو دھتکارنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ پھر اس کا استعمال ہر اس شخص کے لئے بھی ہونے لگا جسے حقیر اور ذلیل سمجھ کر دفع ہونے یا نکل جانے کو کہا جائے۔ اسی معنٰی کے اعتبار سے جہنم

میں ان کفار کو دھتکارتے ہوئے ان سے کہا جائے گا کہ جاؤ، دور ہو جاؤ یہاں سے اور ہم سے کوئی بات مت کرو کہ تمہاری کسی بات کا کوئی فائدہ اب تم کو بہر حال نہیں پہنچ سکے گا۔

علمی بات: اللہ ﷻ ان کفار سے کہے گا" اور مجھ سے بات نہ کرو" اللہ ﷻ کے اس قول کا کیا مطلب ہے؟ اس کے بارے میں دو آراء ہیں۔ پہلی رائے میں یہ ہے کہ اہل جہنم کا یہ آخری کلام ہو گا، جس کے جواب میں اللہ ﷻ کی طرف سے حکم ہو گا: کہ مجھ سے کلام نہ کرو، پھر وہ کسی سے کچھ کلام نہ کر سکیں گے اور جانوروں کی طرح ایک دوسرے کی طرف آواز نکالیں گے اور بھونکیں گے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اہل جہنم سے کہا جائے گا کہ جہنم سے نکل جانے کے بارے میں کوئی بات نہ کرو البتہ وہ اس کے علاوہ کلام کر سکیں گے۔

آیت نمبر ۱۰۹: اہل ایمان کی جماعت کا ذکر ہے۔ وہ ہر وقت اللہ ﷻ سے اپنی غلطیوں کی معافی طلب کرتے رہتے ہیں اور اس کی رحمت کے طلب گار رہتے ہیں۔ جہنمیوں کو جہنم میں دھتکارتے وقت اللہ ﷻ اُنہیں یاد دلائے گا کہ تم لوگوں نے میرے نیک بندوں کو تضحیک کا نشانہ بنایا۔ کیونکہ وہ مجھ پر ایمان رکھتے تھے، مجھ سے اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے اور مجھ سے رحم کی درخواست کرتے ہوئے کہتے تھے کہ اے ہمارے رب! تو سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے۔ یعنی مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی تھی جو ایمان کا اعلان کرتی تھی اور اللہ ﷻ سے بخشش اور رحم کی درخواست کیا کرتی تھی۔ جہنمیوں سے کہا جائے گا کہ ایسے نیک اور شریف لوگوں کے ساتھ تم کیا سلوک کیا کرتے تھے؟

علمی بات: اللہ ﷻ کے بندوں کی یہ بڑی درد بھری دعا ہے جو اہل ایمان کی زبان سے اس وقت ادا ہوئی ہے جبکہ کافر اُنہیں اذیت پہنچا رہے تھے۔ انہوں نے ان مذاق اڑانے والوں سے کچھ نہیں کہا بلکہ اپنے رب ہی سے رحم کی درخواست کی۔ "فَاغۡفِرۡ لَنَا" کا ترجمہ کیا گیا ہے" پس تو ہمیں بخش دیجیے۔" اصل میں "غَفَرَ" کا معنی پردہ ڈالنا ہے۔ "اَلۡمِغۡفَرُ" اس خول کو کہتے ہیں، جو لوہے کا ہوتا ہے اور دشمن کی ضرب سے پردے کا کام دیتا ہے۔ یعنی اے ہمارے رب! ہم تجھ پر اور تیرے رسول ﷺ پر ایمان لائے ہیں، اس لئے تو ہمارے گناہوں اور لغزشوں پر پردہ ڈال دے، ایسا پردہ کہ کراماً کاتبین کے دفتر میں بھی نظر نہ آئے۔

آیت نمبر ۱۱۰: منکرین حق کو اہل ایمان کے ساتھ کی گئی شرارت اور بد عملی یاد دلائی جائے گی۔ اللہ ﷻ ان اہل جہنم کو یاد دلائے گا کہ دُنیا میں مسلمان جب اپنے رب کے آگے دعا و استغفار کرتے تو تم کو ہنسی سوجھتی تھی۔ تم اس قدر ٹھٹھا کرتے اور ان کی نیک خصلتوں کا اتنا مذاق اڑاتے تھے کہ ان کے پیچھے پڑ کر تم نے مجھے بھی یاد نہ رکھا، گویا تمہارے سر پر کوئی حاکم ہی نہ تھا جو کسی وقت ان حرکتوں پر نوٹس لے اور ایسی سخت شرارتوں کی سزا دے سکے۔

شانِ نزول: یہ آیات کفار قریش کے بارے میں نازل ہوئیں جو حضرت بلال رضی اللہ عنہ، حضرت عمار رضی اللہ عنہ، حضرت صہیب رضی اللہ عنہ اور حضرت خباب رضی اللہ عنہ اور دیگر غریب اور کمزور مسلمانوں کے ساتھ بُرا سلوک کرتے تھے۔ ان سے طرح طرح کی مسخرا پن کی باتیں کیا کرتے تھے۔ کبھی یہاں تک کہتے تھے کہ اسلام کوئی عزت کی چیز ہوتی تو یہ غریب لوگ اسلام لانے میں ہم عزت دار لوگوں سے کبھی قدم آگے نہ بڑھاتے۔

علمی بات: اہل جہنم کو عذاب دینے کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ ایمان والوں کو تمسخر و ملامت کا نشانہ بناتے ہیں۔ اہل ایمان کا مذاق اڑانے میں یہ لوگ اس قدر مگن ہو جاتے ہیں کہ اللہ ﷻ کو بھول جاتے ہیں اور اُنہیں احساس ہی نہیں رہتا کہ اللہ ﷻ ان کی بد عملیوں کی سزا دینے پر قادر ہے۔

اہل جہنم کا دُہرا جرم ہے۔ ایک جرم یہ ہے کہ انہوں نے اللہ ﷻ کا انکار کر کے اللہ ﷻ کے حقوق پامال کیئے۔ دوسرا جرم یہ ہے کہ اللہ ﷻ کے نیک بندوں پر ظلم کر کے حقوق العباد بھی پامال کیئے۔

عملی پہلو: اللہ ﷻ کے نیک بندوں کا مذاق اڑانا، جہنم میں جانے کا باعث بن سکتا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم نیک اور کمزور لوگوں کا کبھی بھی مذاق نہ اڑائیں۔ اللہ ﷻ نے دوسروں کا مذاق اڑانے سے ہمیں منع فرمایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:" اے ایمان والو! مردوں کا کوئی گروہ دوسرے مردوں کا مذاق نہ اڑائے ممکن ہے وہ لوگ اُن (مذاق اُڑانے والوں) سے بہتر۔" (سورۃ الحجرات ۴۹، آیت: ۱۱)

آیت نمبر ۱۱۱: منکرین حق کے مذاق اور ایذا رسانیوں کے مقابلہ میں اہل ایمان صبر ہی کرتے رہتے ہیں۔ روزِ قیامت اہل ایمان کو ان کے صبر کے بدلہ بہترین جزا عطا کی جائے گی۔ درحقیقت یہی صبر کرنے والے اصل میں کامیاب ہوں گے۔

علمی بات: اللہ ﷻ ان اہل جہنم سے اس موقع پر فرمائے گا کہ تمہاری طرف سے تمام تر ظلم و ستم اور مذاق واستہزاء کے باوجود وہ سچے ایماندار راہِ حق پر ثابت قدم رہے۔ آج میں نے ان کے صبر واستقامت کے بدلہ میں اُنہیں ایسا مقام عطا کیا ہے جہاں وہ ہر طرح کی لذتوں اور مسرتوں سے ہمکنار ہوں گے اور یہی صبر کرنے والے لوگ حقیقی کامیابی سے سرفراز ہونے والے ہیں۔ یعنی منکرین حق کے مذاق اور ایذا رسانیوں کے مقابلہ میں اہل ایمان صبر کرتے ہیں۔ روزِ قیامت اہل ایمان کو ان کے صبر کے بدلہ بہترین جزا عطا کی جائے گی۔

علمی بات: قریش کے سردار مثلاً ابوجہل، عتبہ اور اُبی بن خلف وغیرہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کا مذاق اڑاتے تھے۔ وہ حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ، حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ اور حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ جیسے فقراء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ہنستے تھے اور ان کا مذاق اڑانے کو انہوں نے اپنا مشغلہ بنالیا تھا۔ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان ظالموں کی باتوں پر صبر کیا، تو اللہ ﷻ نے ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آخرت کی ابدی کامیابی عطا فرمائیں۔

علمی بات: دُنیا میں اہل ایمان کے لئے ایک صبر آزما مرحلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ جب دین وایمان پر عمل کرتے تو دین سے ناآشنا اور ایمان سے بے خبر لوگ اُنہیں ہنسی مذاق اور ملامت کا نشانہ بنالیتے ہیں۔ کتنے ہی کمزور ایمان والے ہیں کہ وہ ان ملامتوں سے ڈر کر بہت سے اللہ ﷻ کے احکام پر عمل کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو کسی بھی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے اور اللہ ﷻ ورسول اللہ ﷺ کی اطاعت سے کسی بھی موقع پر انحراف نہیں کرتے۔ اللہ ﷻ قیامت والے دن اُنہیں اس کی بہترین جزا عطا فرمائے گا اور اُنہیں کامیابی سے سرفراز کرے گا۔

عملی بات: دُنیا کی زندگی میں جب کہ ابھی آخرت کے حقائق آنکھوں کے سامنے نہیں آئے تھے، اس وقت اللہ ﷻ کے کچھ بندوں نے اللہ ﷻ کو اس کے جلال وکمال کے ساتھ پہچانا۔ ان کے سامنے حق کی دعوت مجرد دلائل کی سطح پر آئی۔ اس کے باوجود انہوں نے اس پر یقین کیا۔ وہ اس کے بارے میں اس حد تک سنجیدہ ہوئے کہ اسی کو اپنی کامیابی اور ناکامی کا معیار بنالیا۔ حق کے ساتھ اپنی کامل وابستگی کی اُنہیں یہ قیمت دینی پڑی کہ معاشرہ میں وہ مذاق کا موضوع بن گئے۔ اس کے باوجود انہوں نے اس سے اپنی وابستگی کو ختم نہیں کیا۔ یہ فکر استقامت ہی سب سے بڑا صبر ہے اور آخرت کا انعام آدمی کو اس صبر کی قیمت میں ملتا ہے۔ وہی لوگ دراصل کامیاب ہیں جو موجودہ امتحان کی دُنیا میں اس صبر کا ثبوت دے سکیں۔

عملی بات: انسان کو ہمیشہ اور ہر لحظہ آخرت کی کامیابی کے لئے کوشاں رہنا چاہیئے۔ دُنیا کی ادھوری اور فناپذیر کامیابیاں ایسی نہیں کہ انسان ان کے پیچھے پڑ کر قیامت اور آخرت کی دائمی زندگی کو فراموش کردے۔

آیت نمبر ۱۱۲: اللہ ﷻ فرمائے گا تم زمین پر گنتی کے کتنے سال رہے؟ وہ کہیں گے ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ رہے ہوں گے تو آپ شمار کرنے والوں سے پوچھ لیجئے۔

علمی بات: مذاق اڑانے والے اہل جہنم سے اللہ ﷻ یا اس کے فرشتے سوال کریں گے: بتاؤ تم دُنیا میں کتنی مدت رہے؟ یہ سوال ان سے ملامت کے طور پر پوچھا جائے گا تاکہ ان کی ذلّت وحسرت میں اضافہ ہو۔ یعنی تم تو یہ کہتے تھے کہ دُنیا ہمیشہ رہے گی اور کبھی فنا نہ ہوگی اور جو لوگ دُنیا کو فانی بتاتے تھے تو تم ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ لہٰذا اب بتاؤ کہ برسوں کے اعتبار سے تم دُنیا میں کتنا عرصہ زندہ رہے؟

علمی بات: انسان کی بغاوت اور نافرمانی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ آخرت کے مقابلہ میں دُنیا کو سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں وہ سمجھتا ہے مرنے کے بعد میں نے اللہ ﷻ کے حضور پیش نہیں ہونا۔ جہنمیوں کی حسرتوں میں اضافہ کرنے اور دُنیا میں دی جانے والی مہلت کا احساس دلانے کے لئے۔ اللہ ﷻ جہنمیوں سے استفسار فرمائے گا کہ بتاؤ کہ تم دُنیا میں کتنا عرصہ ٹھہرے تھے؟

علمی بات: اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کافر چند سالہ دُنیاوی زندگی میں اللہ ﷻ کی عبادت نہ کرکے آخرت میں بہت بڑا خسارہ اٹھائیں گے۔ اگر انہوں نے بھی دُنیا میں مومنوں کی طرح نیک اعمال کیئے ہوتے تو آج وہ بھی جنت کے حق دار ہوتے۔ اس لئے ان دوزخیوں کی تذلیل کے لئے ان سے پوچھا جائے گا کہ دُنیا کی جس زندگی کے نشہ میں تم آخرت کو بھول گئے، آخر تم کو کچھ بھی یاد ہے کہ وہ کتنے دن کی زندگی تھی؟

آیت نمبر ۱۱۳: جب اہل جہنم سے پوچھا جائے گا کہ تم دُنیا میں کتنا عرصہ رہے؟ تو وہ جواب دیں گے کہ ہم دُنیا میں ایک دن یا اس سے بھی کم وقت مقیم رہے۔ عذاب کی سختی کے سبب ان لوگوں کے ہوش اڑ جائیں گے۔ اس لئے بدحواسی سے کہیں گے کہ جو فرشتے ہم پر مامور تھے ان سے پوچھ لیں کہ ہم دُنیا میں کتنی مدت رہے؟

علمی بات: اس آیت میں شمار کرنے والوں سے مراد وہ فرشتے ہیں جو انسانوں کی عمروں اور اعمال کی گنتی پر مقرر ہیں۔ اہل جہنم کہیں گے کہ ٹھیک مدت تو وہ فرشتے ہی بتا سکتے ہیں، کیونکہ انہوں نے ایک ایک گھڑی کا ریکارڈ تیار کیا ہوا ہے اور ان کے پاس بندوں کی ہر چیز کا حساب و کتاب رہتا ہے۔

علمی بات: جہنمی جہنم کی ہولناکیوں سے گھبرا کر اہل جہنم یہ جواب دیں گے کہ ہم دُنیا میں ایک دن یا اس سے بھی کچھ کم وقت رہے۔ اس کے ساتھ ہی فریاد کریں گے کہ الٰہی ہمیں کچھ یاد نہیں کہ ہم کتنی دیر ٹھہرے رہے۔ آپ ان لوگوں سے استفسار فرمائیں جو گنتی کو جاننے والے ہیں۔ اللہ ﷻ ارشاد فرمائے گا کہ تم ایک دن یا اس کا کچھ حصہ نہیں ٹھہرے بلکہ ایک مدت تک ٹھہرے رہے۔

وہ دُنیا کی زندگی کو اتنا مختصر کیوں بتائیں گے؟ اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ عذاب کی سختی کی وجہ سے ان لوگوں کے ہوش و حواس گم ہوں گے۔ اسی بدحواسی اور پریشانی کے عالم میں یہ صحیح جواب نہیں دے سکیں گے اور کہیں گے کہ ہمیں تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم دُنیا میں کوئی ایک آدھ دن مقیم رہے ہیں اور ٹھیک ٹھیک مدت تو شمار کرنے والے فرشتے ہی بتا سکتے ہیں۔ دوسری یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ قیامت کے دن وہ جس دُنیا میں قدم رکھیں گے اس کے احوال و ظروف اس دُنیا سے بالکل مختلف ہوں گے۔ اس وقت اُنہیں محسوس ہوگا کہ جو مدت انہوں نے دُنیا میں گزاری وہ بہت مختصر تھی۔ زیادہ سے زیادہ ایک دن بلکہ اس سے بھی کچھ کم۔ اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانا ان کے لئے مشکل ہوگا، اس لئے وہ کہیں گے کہ اس کا صحیح جواب تو وہی دے سکتے ہیں جو اعداد و شمار کا علم رکھنے والے فرشتے ہیں۔

عملی پہلو: آخرت کے مقابلہ میں دُنیا کی زندگی بہت مختصر ہے۔ لیکن عام طور پر انسان کا یہ حال ہے کہ وہ اسی دُنیا کی زندگی کے لئے سب کچھ کرتا ہے، اسی کے لئے جیتا اور مرتا ہے اور اسی کے عارضی فائدوں اور وقتی مفادات ہی کو اپنا قبلہ مقصود بنا لیتا ہے۔ لیکن آخرت میں اہل دوزخ کو دُنیا کی زندگی اتنی قلیل معلوم ہوگی کہ اس کو وہ ایک دن یا اس سے بھی کم سمجھیں گے۔ کاش! کہ ایسا وہ دُنیا میں سمجھتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ بہر حال ہمیں یہ چاہیئے کہ ہم ہمیشہ رہنے والی زندگی یعنی آخرت کی فکر کریں اور اس کی تیاری کے لئے عملی اقدامات کریں۔

آیت نمبر ۱۱۴: اللہ ﷻ ان اہل جہنم سے فرمائے گا کہ تم دُنیا میں بہت ہی تھوڑا عرصہ رہے، کیا خوب ہوتا اگر یہ بات تم دُنیا میں جان لیتے۔ یعنی اب تو تم نے خود دیکھ لیا کہ دُنیا کا عیش آخرت کے مقابلہ میں بہت تھوڑا سا تھا۔ یہی بات تم سے دُنیا میں کہی جاتی تھی تو تم اسے ماننے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ کاش یہ حقیقت تم نے اس وقت سمجھ لی ہوتی تو آج تمہارا یہ حشر نہ ہوتا۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے دُنیا کی مدت کو قلیل مدت قرار دیا ہے اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ دُنیا کی زندگی اور اس کی نعمتیں آخرت کے مقابلہ میں قلیل ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جہنمیوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ تمہیں دُنیا کی زندگی میں معمولی اختیارات اور تھوڑی سی مہلت دی گئی مگر تم نے پھر بھی اپنے رب کی نافرمانی کی۔ اگر تم دُنیا کی زندگی کو قلیل اور عارضی جانتے اور آخرت کی حقیقت کو سمجھتے تو آج جہنم کے عذاب سے نجات پاتے۔

علمی بات: اس آیت کریمہ میں اس طرف اشارہ ہے کہ کافر چند سالہ دُنیاوی زندگی میں اللہ ﷻ کی عبادت نہ کرکے آخرت میں بہت بڑا خسارہ اٹھائیں گے اگر انہوں نے بھی دُنیا میں مومنوں کی طرح عمل صالح کیا ہوتا تو آج وہ بھی جنت کے حق دار ہوتے، اللہ ﷻ کافروں سے پوچھے گا کہ جس دُنیاوی زندگی کے عیش و

عشرت میں تم مگن رہے وہ کتنے دن کی زندگی تھی، تو وہ شدتِ کرب کی وجہ سے دُنیا کا عیش و آرام بھول جائیں گے۔ اُنہیں ایسا معلوم ہو گا کہ جیسے دُنیا میں انہوں نے صرف ایک دن یا اس سے بھی کم وقت گزارا تھا، پریشانی اور تکلیف و اذیت سے تنگ آکر کہیں گے کہ یارب! تیرے گننے والے فرشتے زیادہ جانتے ہیں کہ ہم کتنے دن رہے تھے، تو اللہ ﷻ پھر ان سے کہے گا کہ بہر حال تم لوگ دُنیا میں کم ہی دن رہے تھے، اصل طویل زندگی تو اب شروع ہوئی ہے، اگر تم اس حقیقت پر ایمان لائے ہوتے اور فانی زندگی کو اَبدی زندگی پر ترجیح نہ دی ہوتی اور صبر و استقامت کے ساتھ اللہ ﷻ کی بندگی کی ہوتی تو مومنوں کی طرح آج تم بھی کامیاب ہوتے۔

عملی بات: دُنیا کی زندگی محض امتحان کی چند گنی چنی ساعتیں ہیں، ان ہی کو اصل زندگی اور بس ایک ہی زندگی نہ سمجھ بیٹھنا چاہیے۔ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے جہاں انسان کو ہمیشہ رہنا ہے۔ یہاں کے وقتی فائدوں اور عارضی لذّتوں کی خاطر وہ کام نہیں کرنے چاہئیں جو آخرت کی ابدی زندگی کو برباد کر دینے والے ہوں۔ مگر جو لوگ اس عالم آخرت سے غافل رہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ جینا اور مرنا جو کچھ ہے بس اسی دُنیا میں ہے، جو کچھ مزے لوٹنے ہیں یہیں لُوٹ لینے چاہئیں۔ موت کے ساتھ ان پر اس خیال کی حقیقت واضح ہو جائے گی اور اپنے کیئے پر پچھتاوا ہو گا لیکن اس وقت پچھتانے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ ہوش آنے کا وقت تو وہ تھا جب ہو وہ دُنیا کی چند روزہ زندگی کے لطف پر یہاں کی اَبدی زندگی کے فائدوں کو قربان کر رہے تھے۔

علمی بات: آخرت میں منکرین، کفار اور ظالم لوگ یہ تسلیم کر لیں گے کہ دُنیا کی زندگی بہت ہی مختصر تھی۔ وہ اسے ایک دن یا اس سے بھی کم سمجھیں گے۔ یہی بات تو اللہ ﷻ نے اُنہیں دُنیا میں فرمائی ہے کہ تمہاری یہ زندگی چند روزہ اور ناپائیدار ہے۔ لہٰذا دُنیا اور اس کے ساز و سامان پر مست نہ ہو جاؤ بلکہ آخرت کی فکر کرو۔ لیکن اس وقت یہ لوگ اللہ ﷻ کی اس بات کا مذاق اڑاتے ہیں اور یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ بس یہ دُنیا ہی دُنیا اصل حقیقت ہے۔ لہٰذا ہم جتنے مزے اڑا سکتے ہیں اڑا لیں، پھر کب ایسا موقع ملے گا؟ مگر اس کے برعکس روزِ قیامت ان کے نظریات تبدیل ہو جائیں گے اور اس وقت دُنیا کی زندگی کو بہت ہی قلیل سمجھیں گے۔ کاش یہی بات سب لوگ دُنیا کی زندگی میں ہی سمجھ جائیں اور دُنیا کی بے ثباتی سے آگاہ ہو جائیں، تا کہ اس کے مطابق عمل کر کے آخرت میں کامیاب ہو جائیں۔

علمی بات: دُنیاوی زندگی آخرت کے مقابلہ بہت ہی مختصر ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ دُنیا کی زندگی فانی اور محدود ہے، جبکہ آخرت کی زندگی دائمی اور لامحدود ہے۔ محدود کی لامحدود کے مقابلہ میں بہر حال کوئی نسبت ہی نہیں۔ دُنیا کا یہ عیش و عشرت چند سالہ ہے، جبکہ آخرت کی نعمتیں یا عذاب اَبدی اور دائمی ہو گا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت مستورد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ کی قسم! آخرت کے مقابلہ میں دُنیا کی حقیقت صرف اتنی ہے جیسے کوئی سمندر میں انگلی ڈال کر دیکھے کہ وہ کتنا پانی لے کر لوٹتی ہے۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۱۱۵: اہل جہنم کو مخاطب کر کے بتایا جائے گا کہ تم یہی سمجھتے رہے کہ تمہیں بے مقصد پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا یہ خیال تھا کہ تم اللہ ﷻ کی طرف لوٹ کر نہیں جاؤ گے اور تمہیں نیکی اور بدی کا بدلہ نہیں ملے گا یہ تمہارے غلط خیالات تھے۔ تم کتنے نادان تھے کہ اپنی قدر و منزلت کو نہ پہچان سکے اور بار بار کی یاد دہانی کا تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ تم یہ سمجھتے رہے کہ حیوانوں اور جانوروں کی طرح تمہیں یوں ہی پیدا کیا گیا ہے اور تم سے تمہارے اعمال نیک و بد کا کوئی محاسبہ نہ ہو گا۔ تم نادان بچوں کی طرح یہی سمجھتے رہے کہ تمہاری تخلیق محض کھانے پینے اور عیش اڑانے کے لئے کی گئی ہے۔ آج اپنی اس نادانی کی سزا بھگتو۔

علمی بات: گزشتہ آیات کے سیاق و سباق کے اعتبار سے اس آیت کا ترجمہ فعل ماضی میں ہو گا اور اس مفہوم میں اس کے مخاطب وہی جہنمی لوگ ہوں گے جن کا ذکر پیچھے سے چلا آ رہا ہے۔ اگر اسے گزشتہ سلسلہ کلام سے علیحدہ پڑھا جائے، تو اس کا ترجمہ زمانہ حال میں کیا جائے گا اور پھر اس کا مخاطب ہر پڑھنے سننے والا اور دُنیا کے ہر زمانے کا ہر انسان ہو گا کہ اے لوگو! کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم نے تمہیں بے مقصد اور بیکار پیدا کیا ہے اور تمہیں ہمارے پاس واپس آکر اپنے ایک ایک عمل کا حساب نہیں دینا ہے؟

علمی بات: عقلی اور منطقی طور پر آخرت کے تصور کے بغیر انسانی تخلیق کا مقصد سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اگر انسان عام حیوانات جیسا حیوان ہوتا تو پھر واقعی حیات بعد الممات اور آخرت کی کوئی ضرورت نہیں تھی، مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ حیوانات کے برعکس انسان کے اندر فطری طور پر اخلاقی حس اور نیکی و بدی کی تمیز

(Moral Sense) پیدا کی گئی ہے۔ اس اخلاقی حِس کے نتیجہ میں انسانی سطح پر جو اخلاقی اقدار (Moral Values) وجود میں آئی ہیں، وہ کسی قوم، کسی علاقہ یا زمانہ تک محدود نہیں، بلکہ مستقل (Permanent) اور آفاقی (Universal) ہیں۔ چنانچہ "گندم از گندم بروید جوز جو" (گندم سے گندم اُگتی ہے اور جو سے جو) کے اصول کے مطابق اچھائی کا نتیجہ اچھا نکلنا چاہیئے اور بُرائی کا بُرا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیا میں ہر جگہ اور ہمیشہ لازمی طور پر ایسا نہیں ہوتا بلکہ عام طور پر اس کے برعکس ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ صورت حال منطقی طور پر تقاضا کرتی ہے کہ اس دُنیا کے بعد ایک اور عالم وجود میں آئے جہاں ہر انسان کی موجودہ زندگی کے ایک ایک فعل اور ایک ایک عمل کا احتساب کر کے مصدقہ آفاقی اصولوں کے مطابق عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنے کا اہتمام ہو اور وہ آخرت کی زندگی ہوگی جہاں سب کو اپنے اعمال کی پوری پوری جزاو سزا ملے گی۔

عملی پہلو: اللہ ﷻ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور اس کی بامقصد تخلیق فرمائی ہے۔ اللہ ﷻ نے انسان کو بے شمار نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ عقل و فہم، اختیار و ارادہ، کائنات کی تسخیر کی قوت اور ان سے ہر طرح سے فائدہ حاصل کرنے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ نیز اسی روح میں سے بھی پھونکا گیا، خلافت کی ذمہ داری عطا کی گئی، رہنمائی کے لئے کتابوں اور رسولوں کا سلسلہ قائم کیا گیا ہے۔ ان ساری چیزوں کا ایک مقصد ہے کہ انسان کو دُنیاوی زندگی کی ایک مدت عطا فرما کر آزمایا جائے کہ وہ اللہ ﷻ کی فرماں برداری کرتا ہے یا نہیں؟ وہ اس چند سالہ زندگی میں کیسا کردار ادا کرتا ہے؟ اسی کی بنیاد پر ہمیشہ کی زندگی آخرت کا فیصلہ ہوگا۔ نیک اعمال کرنے والوں کو جنت اور بُرے اعمال کرنے والوں کو جہنم میں داخل کیا جائے گا۔

آیت نمبر ۱۱۶: اللہ ﷻ کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ وہ کوئی چیز بے مقصد پیدا کرے۔ وہی حقیقی بادشاہ ہے۔ صرف وہی معبود ہونے کا مستحق ہے اور اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ عرش عظیم کا مالک بھی وہی ہے۔ یہ خیال کرنا کہ انسان جیسی اعلیٰ اور اشرف مخلوق کو اس نے بے مقصد اور بے غایت پیدا کیا ہے اس کے مرتبہ سے اس کو فروتر خیال کرنا ہے۔ اللہ ﷻ تو بادشاہ حقیقی ہے پھر وہ اپنی اس مخلوق سے جس پر ذمہ داریوں کا بار ڈالا گیا ہے، جوابدہی کے لئے اپنے حضور کیسے نہیں طلب کرے گا؟ اس کا عرش بڑی شان والا ہے اور وہ اپنی پوری خدائی شان کے ساتھ کائنات پر حکومت کر رہا ہے، لہٰذا اس کی حکومت میں اندھیر نگری ہرگز نہیں ہو سکتی۔

علمی بات: دُنیا کے بادشاہوں میں کوئی بادشاہ ایسا نہیں جو اپنے غداروں اور باغیوں کو سزا نہ دے اور وفاداروں کو انعام و اکرام سے نہ نوازے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ بادشاہ حقیقی اپنے جاں نثاروں کی قدر افزائی نہ کرے، ان کی قربانیوں کا اُنہیں کوئی صلہ نہ دے اور اپنے نافرمانوں اور باغیوں کو سزا نہ دے؟ لہٰذا اللہ ﷻ آخرت میں اپنے وفاداروں کو جزا دے گا اور نافرمانوں اور باغیوں کو سزا دے گا۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے پہلے قیامت کی صفات بیان کیں، پھر قیامت کے دلائل کی طرف متوجہ کیا کہ اگر قیامت نہ ہوتی تو فرماں بردار اور نافرمان اور عاصی، نیک اور بد کے درمیان امتیاز نہ ہوتا اور اس وقت اس جہاں کو پیدا کرنا فضول اور عبث ہوتا۔ نیز جب سب لوگوں نے اللہ ﷻ ہی کی طرف لوٹنا ہے، تو معلوم ہو گیا کہ اس کے سوا اور کوئی مالک اور حاکم نہیں۔

آیت نمبر ۱۱۷: جو شخص اللہ ﷻ کے ساتھ کوئی اور معبود ٹھہراتا ہے، اس کے پاس اس شرک کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ اللہ ﷻ کی بارگاہ میں پیش ہونے پر اسے یقیناً اپنے بُرے عمل کا حساب دینا ہوگا اور بلاشبہ کافر لوگ اللہ ﷻ کے حساب و کتاب میں ہرگز کامیاب نہیں ہوں گے۔ اللہ ﷻ اکیلا معبود ہے، اس کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں ہے۔ کسی اور کے معبود ہونے پر کوئی دلیل بھی موجود نہیں ہے۔ اب جو کوئی دلیل نہ ہونے کے باوجود بھی کسی کو اللہ ﷻ کے ساتھ پکارے گا اور عبادت کرے گا، تو ایسے نالائق کا حساب پروردگار کے پاس ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسے منکروں کو کامیابی اور فلاح میسر نہیں ہوگی۔

علمی بات: بے شک کافر کامیاب نہیں ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاح اور کامیابی آخرت میں عذابِ الٰہی سے بچ جانا ہے، محض دُنیا کی دولت اور آسائشوں کی فروانی کامیابی نہیں، یہ دُنیا میں کافروں کو بھی حاصل ہے، لیکن اللہ ﷻ ان سے فلاح کی نفی فرمارہاہے۔ جس کے صاف معنٰی یہ ہیں کہ اصل فلاح آخرت کی فلاح ہے جو اہل ایمان کے حصہ میں آئے گی، نہ کہ دُنیاوی مال واسباب کی کثرت، جو کہ بلا تفریق مومن اور کافر، سب کو ہی حاصل ہوتی ہے۔

عملی پہلو: سورۃ المؤمنون کا آغاز اس بات سے ہوا تھا کہ مومنوں نے فلاح پائی اور اختتام اس بات پر ہورہا ہے کہ کافر کبھی فلاح نہیں پاسکتے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کامیابی کی اصل اساس اور بنیاد "ایمان" ہے۔ اس کے مقابلہ میں دائمی خسارہ اور ناکامی کی جڑ اور بنیاد "کفر" ہے۔ پس انسان کے لئے کامیابی کا راستہ یہی ہے کہ وہ صدقِ دل سے اپنے رب پر ایمان لائے اور ہر قسم کے کفر سے اپنے آپ کو بچالے۔ اللہ ﷻ کے دین کی تعلیماتِ مقدسہ کو پوری طرح اپنائے اور اپنے اندر وہ صفات پیدا کرے جو اہل ایمان کے شایان شان ہیں۔

آیت نمبر ۱۱۸: مغفرت میں "دفع مضرت" یعنی ہر شر اور تکلیف سے بچاؤ اور رحمت میں "جلب منفعت" یعنی ہر خیر اور نفع کے حصول کی دعا شامل ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے ذریعے اہل ایمان کو ہر حال میں اللہ ﷻ سے رحم اور مغفرت کی دعا مانگتے رہنے کی تلقین فرمائی جارہی ہے۔ اللہ ﷻ نے فرمایا ہے کہ آپ ﷺ یوں دعا کیجئے: کہ اے میرے رب! بخش دے اور رحم فرما اور تو رحم فرمانے والوں میں سب سے بہتر رحم فرمانے والا ہے۔ اس میں خطاب رسول اللہ ﷺ سے ہے، لیکن آپ ﷺ کے واسطہ سے تمام امت کو یہ دعا سکھائی گئی ہے اور اپنے رب سے مانگنے کی تلقین کی گئی ہے۔ تاکہ اُنہیں بخش دیا جائے اور ان پر رحم فرمایا جائے۔

علمی بات: اس آیت میں خطاب رسول اللہ ﷺ سے ہے، لیکن آپ ﷺ کے واسطہ سے ساری اُمت کو تعلیم دی گئی ہے کہ وہ یہ دعا کریں۔ اس میں حضور ﷺ کو خطاب فرما کر اس کی تعلیم و تلقین فرمانے میں یہ خاص درس ہے کہ جب خاتم النبیین سید المرسلین حضرت سیّدنا محمد مصطفیٰ ﷺ کو باوجود اس عظمتِ شان، رفعتِ مکان اور معصوم ہونے کے اس کا حکم وارشاد فرمایا جارہا ہے، تو پھر آپ ﷺ کی اُمت اور اُمت کا ہر فرد اس کا کس قدر محتاج ہے؟

علمی بات: یہ دعا اپنی جامعیت کی وجہ سے ہر چیز میں شامل ہو۔ "بخش دے" سے مراد یہ ہے کہ اے مولا کریم! میرا ہر قول اور ہر فعل جو میرے لئے اس دُنیا میں یا آخرت میں مضر ہے، اسے معاف فرمادے اور "رحم فرما" کا معنٰی یہ ہے کہ ہر وہ عمل جو میرے لئے یہاں بھی اور وہاں بھی مفید اور نفع مند ہو، اس سے مجھے سرفراز فرما، کیونکہ تو سب سے بہتر رحم فرمانے والا ہے۔ گناہوں کو بخش دینا بھی تیرے لئے آسان ہے اور نعمتوں کا عطا فرمانا تو تیرا شیوۂ کرم ہے۔

COPYRIGHTS © RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION SALE OF THIS BOOK WILL ENTAIL CIVIL & CRIMINAL ACTION

سُوۡرَةُ الزُّمَر

ربط سورت: سورۃ الزمر سے پہلے سورۃ صٓ ہے۔ دونوں سورتوں میں ربط اور مناسبت یہ ہے کہ:

ا۔ سورۃ صٓ کے زیادہ تر مضامین رسالت سے متعلق تھے جن میں آنحضرت ﷺ کی رسالت کا اثبات منکرین کے لغو اور بے ہودہ اعتراضات کا رد اور ان کے احمقانہ تمسخر کا جواب دیا گیا تھا۔ سورۃ الزمر میں اکثر مضامین توحید سے متعلق ہیں۔ توحیدِ خداوندی کا ذکر فرما کر (مُصدّقین) کی مدح، ان کی جزا اور ان پر انعاماتِ الٰہیہ کا ذکر ہے۔ مکذبین و منکرین پر وعید و تنبیہ ہے اور ابطالِ شرک کے لئے عقلی اور فطری دلائل ذکر فرمائے گئے۔

۲۔ سورۃ صٓ کا اختتام اس ارشاد پر ہوا کہ اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ وَلَتَعۡلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعۡدَ حِيۡنٍ۔ ''یہ قرآن تو تمام جہان (والوں) کے لئے نصیحت ہے۔ اور کچھ مدت بعد تمہیں اس کا حال معلوم ہو جائے گا۔'' سورۃ الزمر کی ابتدا بھی قرآن کریم کی حقانیت کے بیان سے ہو رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: تَنۡزِيۡلُ الۡكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ ''اللہ کی طرف سے (یہ) کتاب نازل کی گئی ہے جو بڑا غالب بڑی حکمت والا ہے۔''

۳۔ سورۃ صٓ میں اللہ ﷻ نے آیات: ا۷ تا ۸۵ میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا واقعہ تفصیل سے بیان فرمایا ہے اور سورۃ الزمر ۳۹، آیت: ۶ میں بھی انسان کی پیدائش کا ذکر فرمایا گیا ہے: خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا ''اس نے تمہیں ایک جان سے پیدا فرمایا پھر اسی میں سے اس کا جوڑا بنایا''۔

۴۔ سورۃ صٓ کے آخری رکوع میں تخلیق حضرت آدم علیہ السلام کے ذکر کے ساتھ فرشتوں کی فرماں برداری اور ابلیس کی نافرمانی کا واقعہ بھی بیان ہوا تھا۔ سورۃ الزمر کے آخر میں فرماں برداروں اور نافرمانوں کے انجام کا ذکر کیا گیا ہے۔

فضیلت: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر رات اہتمام کے ساتھ سورۃ بنی اسرائیل اور سورۃ الزمر تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ (سنن نسائی) اسی طرح جامع ترمذی کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ اس وقت تک نہ سوتے جب تک کہ سورۃ الزمر تلاوت نہ فرمالیتے۔

آیت نمبر ا: کفار و مشرکین قرآنِ حکیم کو اللہ ﷻ کا کلام تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان کے اس باطل خیال کی تردید کی گئی ہے۔ قرآنِ کریم کسی مخلوق کا کلام نہیں ہے بلکہ اللہ ﷻ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ جو زبردست ہے، اپنے احکام کو نافذ کرنے کا مکمل اختیار رکھتا ہے، جو تمام حکمتوں کا مالک ہے اور جس کا کلام بھی حکمتوں سے لبریز ہے۔

علمی بات: کفار اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ یہ کتاب فصیح و بلیغ سہی، لیکن یہ اللہ ﷻ کا کلام نہیں بلکہ حضور ﷺ اس کو خود بناتے ہیں اور پھر اسے اللہ ﷻ کی طرف منسوب کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں (معاذ اللہ)۔ اس کے ساتھ ہی انہیں یہ خوش فہمی بھی تھی کہ ہماری موجودگی میں اس دین کے پھیلنے اور اس کے ترقی کرنے کا کوئی امکان نہیں اور نہ اس دین میں یہ صلاحیت ہے کہ گردشِ زمانہ اور اس کے ہر لحظہ بدلتے ہوئے تقاضوں کی تکمیل کر سکے۔ اس لئے اس کی یہ مقبولیت عارضی ہے۔ یہ دعوت خود بخود ختم ہو جائے گی اس کی عارضی کامیابی پر زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس طرح کی باتیں کر کے وہ ایک دوسرے کا دل بہلاتے اور اسلام کی بے پناہ مقبولیت کے باعث ان کے دلوں میں اضطراب کی جو آگ بھڑک اٹھی تھی وہ اس طرح کی بچگانہ تسلیوں سے اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کی ناکام کوشش کرتے تھے۔ اس آیت میں ان کی ان ہی غلط فہمیوں اور خوش فہمیوں کا ابطال کیا جا رہا ہے۔ پہلے یہ بتایا کہ یہ کتاب کسی انسان کی تصنیف نہیں بلکہ اللہ ﷻ کی نازل کردہ ہے اور جس رب تعالیٰ نے اسے نازل فرمایا ہے وہ عزیز ہے یعنی سب پر غالب اور ہر چیز سے طاقتور، اس کے نافذ کیئے احکام کو روکنے کی کسی میں قوت نہیں۔ نیز وہ حکیم ہے زبردست دانا ہے۔ لوگوں کے ظاہری اور پوشیدہ تقاضے اس کے علم میں ہیں۔ لوگوں کے تمدنی، معاشرتی اور معاشی حالات خواہ کتنے ہی بدلتے رہیں قرآنِ کریم کی روشنی قیامت تک زندگی کے ہر افق، ہر شعبہ اور ہر پہلو کو منور کرتی رہے گی اور رہنمائی دیتی رہے گی۔

آیت نمبر ۲: یہاں پر لفظ دین کے معنیٰ عبادت و اطاعت کے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے توسط سے امت کو اللہ ﷻ ہی کی عبادت و اطاعت کی تلقین کی گئی ہے۔ ایسی خالص عبادت کی تلقین کی گئی ہے جس میں غیر اللہ کی شرکت، نیز ریاکاری و نمود کا شائبہ تک نہ ہو۔ گویا یہ ہر طرح کے شرک کی آمیزش سے پاک ہو۔

علمی بات: قرآنِ حکیم میں ماضی اور مستقبل کی جو خبریں دی گئیں ہیں وہ سب حق اور صادق ہیں اور کتاب میں جو احکامِ شرعیہ بیان کیئے گئے ہیں وہ سب حکمت اور مصلحت پر مبنی ہیں۔

اخلاص کا لغوی معنیٰ: جس چیز کو کاٹ چھانٹ کر اور تراش خراش کے بعد درست اور مہذب کر لیا جائے یا میل کچیل سے صاف کر لیا جائے یا جو چیز دوسری چیزوں کی آمیزش اور ملاوٹ سے پاک ہو اس کو خالص کہتے ہیں۔

اخلاص کا اصطلاحی معنیٰ: دل کو ہر اس چیز کی آمیزش سے خالی اور پاک رکھنا جو اس کو دھندلا اور میلا کرتی ہو، گویا اخلاص کا مطلب ہے کسی چیز کو ہر اس چیز کی ملاوٹ سے محفوظ رکھنا جس کی اس میں ملاوٹ ہو سکتی ہو، ایک قول یہ ہے: نیت، قول اور عمل کو صاف رکھنا اخلاص ہے۔

اخلاص کی حقیقت: اطاعت اور عبادت میں اخلاص یہ ہے کہ صرف اللہ ﷻ کے لئے عمل کیا جائے، مخلوق کو دکھانے اور سنانے کے لئے عمل نہ کیا جائے، دنیا کی جن چیزوں کی طرف دل مائل ہوتا ہے اور دنیا کی جن چیزوں سے نفس کو راحت ملتی ہے، جس انسان کے کسی عمل میں ان چیزوں کی آمیزش ہو جاتی ہے تو اس سے اس عمل کی صفائی گدلی اور میلی ہو جاتی ہے اور اخلاص زائل ہو جاتا ہے لوگ ایسی چیزوں کے اشتیاق اور حصول میں ڈوب جاتے ہیں اور اس کی اطاعت اور اس کی عبادت کے افعال اس قسم کی اغراض سے بہت کم خالی ہوتے ہیں۔ اخلاص یہ ہے کہ دل میں اللہ ﷻ کے قرب کے سوا اور کسی چیز کی طلب نہ ہو۔ نیز خلاصہ یہ ہے کہ قول اور عمل کو دکھاوے اور شہرت کی آمیزش سے خالی کرنا اخلاص ہے۔

فرامین نبوی ﷺ: ۱۔ حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: یہ فرما دیجئے کہ ایک شخص نے اجرت اور شہرت کی طلب میں جہاد کیا ہو اس کو کیا ملے گا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اس کو کچھ نہیں ملے گا" اس نے تین مرتبہ سوال دہرایا، آپ ﷺ نے ہر بار یہی جواب دیا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ صرف اس عمل کو قبول فرماتا ہے جو خالص اس کے لئے کیا جائے اور اس عمل سے صرف اس کی رضا کو طلب کیا جائے۔" (سنن نسائی، مسند احمد)

۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بے شک اللہ ﷻ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کی طرف نہیں دیکھتا لیکن وہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کی طرف دیکھتا ہے۔" (صحیح مسلم)

عملی پہلو: اللہ ﷻ نے اخلاص کے ساتھ اپنی اطاعت اور عبادت کرنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ ﷻ کی مکمل بندگی اور زندگی کے تمام گوشوں میں اس کے احکامات کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ اس حکم کے برعکس آج عملی طور پر ہماری زندگیوں کا نقشہ یہ ہے کہ جزوی طور پر اللہ ﷻ کی بندگی بھی ہو رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ سرکشی اور معصیت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ ایک طرف نمازیں ادا کی جا رہی ہیں حج اور عمرے ادا کیئے جا رہے ہیں تو دوسری طرف حرام کمائی کا سلسلہ جاری ہے۔ بے حیائی کا سلسلہ بھی جاری ہیں اور سودی کاروبار بھی چل رہا ہے۔ اللہ ﷻ ایسی آلودہ بندگی کو پسند نہیں فرماتا۔ وہ تو اپنے بندوں سے خالص بندگی کا تقاضا کرتا ہے۔

علمی بات: شرک ایک ایسا گناہ ہے جس سے بڑا اور کوئی دوسرا گناہ نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ ﷻ کی بھی عبادت کرتا ہے اور ساتھ ساتھ کسی دوسرے کی بھی عبادت و پرستش کرتا ہے، اس کی ساری نیکی اکارت جائے گی اس لئے یہاں حکم دیا جا رہا ہے کہ فقط اللہ ﷻ کی عبادت کرو اور اسی کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو۔ اپنے بادشاہ حقیقی کے احکام کو نظر انداز کر کے کسی غیر کی اطاعت کا دم بھرنا مردِ مومن کے لئے زیبا نہیں، بلکہ ایسی حرکت کے ارتکاب کے بعد اس کا نام مخلص اہل ایمان کی فہرست میں برقرار رہنا ممکن نہیں۔

آیت نمبر ۳: اللہ ﷻ کو خالص اطاعت ہی مطلوب ہے۔ اللہ ﷻ کے سوا دوسروں کو اپنا حمایتی اور معبود بنانے والے یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ اس سے انہیں اللہ ﷻ کی قربت حاصل ہو گی۔ بے شک اختلاف کرنے والوں کے درمیان اللہ ﷻ فیصلہ فرما دے گا جو ضد میں مبتلا ہونے کی وجہ سے باطل پر اڑے ہوئے ہیں۔ اللہ ﷻ ایسے شخص کی رہنمائی نہیں فرماتا جو جھوٹا اور ناشکرا ہو۔ وہ جھوٹا اس لحاظ سے ہے کہ اس کا عقیدہ من گھڑت ہے۔ وہ ناشکرا اس لحاظ سے ہے کہ اللہ ﷻ کی دی ہوئی نعمتیں استعمال کرتا ہے لیکن اطاعت کسی اور کی کرتا ہے۔

شانِ نزول: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کہ اس آیت کا نزول تین قبائل کے متعلق ہوا۔ بنی عامر، بنی کنانہ اور بنی سلمہ۔ یہ قبائل بتوں کی پوجا کرتے تھے اور فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے اور کہتے تھے کہ ہم ان کی پوجا صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو اللہ تعالیٰ کا مقرب بنادیں جب ان لوگوں سے پوچھا جاتا تھا کہ تمہارا رب کون ہے؟ تم کو اور آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا؟ جب وہ جواب دیتے کہ اللہ تعالیٰ نے، تو اس پر کہا جاتا پھر بتوں کو کیوں پوجتے ہو؟ تو جواب دیتے ہم تو ان کی پوجا محض اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے ہم اللہ تعالیٰ کے مقرب ہو جائیں۔

علمی و عملی بات: جو لوگ اس کے ساتھ غیروں کو شریک بنا کر ان معبودوں کی عبادت کرتے ہیں اور اپنی ضلالت و گمراہی کی یہ دلیل دیتے ہیں کہ ہم تو ان کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں، تا کہ وہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے قریب کر دیں اور ہماری حاجت براری کے لئے اس کے نزدیک ہمارے سفارشی بنیں۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے اور مومنوں کے درمیان عملی فیصلہ کر دے گا اور ہر ایک کو ان کے عمل کا بدلہ دے گا۔ مومنوں کو انعام و اکرام سے نوازے گا اور کافروں اور مشرکوں کو جہنم میں ڈال دے گا۔ آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے وہ جھوٹا اور اللہ تعالیٰ ایسے جھوٹے کافر کو ہدایت کی توفیق نہیں دیتا ہے۔

آیت نمبر ۴: اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد منسوب کرنے والوں کے باطل عقیدہ کی تردید کی گئی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو اولاد بنانا چاہتا تو اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہتا منتخب کر لیتا۔ اللہ تعالیٰ ہر کمزوری سے پاک اور اپنی ذات میں اکیلا ہے۔ تمام مخلوق پر اُسی کا اقتدار اور غلبہ ہے۔

علمی بات: بعض مشرکین اللہ تعالیٰ کی اولاد کے قائل تھے۔ ان کے اس باطل نظریہ کی تردید کی جارہی ہے کہ اولاد ہونا اللہ تعالیٰ کے لئے عیب ہے، وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے لئے کوئی اولاد ہو۔ وہ بالکل یکتا ہے۔ وہ قہار ہے یعنی غلبہ والا ہے۔ اسے کسی کی ضرورت اور حاجت نہیں ہے۔

عموماً مخلوق اس لئے اولاد کی آرزو کرتی ہے کہ آڑے وقت میں اور بڑھاپے میں کام آئے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کی ذات و صفات میں کوئی تغیر و تبدل نہیں، نہ اس میں کبھی ضعف آئے گا، نہ اسے کسی کی مدد کی ضرورت ہے اور نہ کبھی ضرورت ہو گی۔

اولاد کا ہونا بندوں کے لئے تقویت اور عزت و وقار کا باعث ہوتا ہے کیونکہ وہ کمزور اور ضعیف ہیں۔ دشمنوں کا تنہا مقابلہ کرنے سے عاجز ہیں، ان کی اولاد ہو گی تو وہ طاقتور بن جائیں گے۔ نیز وہ فنا ہونے والے ہیں، ان کو اولاد کی اس لئے بھی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کے مرنے کے بعد ان کا نام ان کی اولاد کے ذریعہ باقی رہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ جو ہمیشہ سے زندہ جاوید ہے اور جو غیر فانی ہے اس کے لئے اولاد کی ضرورت کا تصور بھی گستاخی اور بے ادبی ہے۔ وہ ان تمام چیزوں سے پاک ہے۔ اس لئے اولاد کا عقیدہ رکھنا اس کی شانِ کبریائی سے جہالت کی دلیل ہے۔

آیت نمبر ۵: اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے شاہکار کا بیان ہے کہ اس نے آسمان و زمین کو ایک مقصد کے تحت پیدا فرمایا ہے۔ وہ رات کو دن پر ڈھانپ لیتا ہے پھر اس کی روشنی ختم ہو جاتی ہے اور دن کو رات پر ڈھانپ لیتا ہے یہاں تک کہ اس کی تاریکی ختم ہو جاتی ہے۔ سورج اور چاند اسی کے حکم سے ایک طے شدہ مدت تک گردش کرتے رہیں گے۔ جس اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات کا نظام قائم کر رکھا ہے وہ کمال قوت کا مالک ہے۔ وہ بہت زیادہ درگزر فرمانے والا ہے۔

علمی بات: ہر ذی شعور انسان کے ذہن میں یہ سوال خود بخود پیدا ہونا چاہیئے کہ جب کائنات اور اس کی تمام چیزیں بامقصد ہیں اور انسان کے لئے پیدا کی گئی ہیں تو آخر انسان کا مقصدِ تخلیق کیا ہے؟ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث شریف کے مفہوم کے مطابق انسان کا مقصدِ تخلیق یہ بیان ہوا کہ:

"دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لئے پیدا کیئے گئے ہو۔" (الجامع لاحکام القرآن، جامع السنہ) بہر حال اگر عقلی اور منطقی لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی آخرت کے تصور کے بغیر انسان کی تخلیق کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ خصوصاً انسان کو نیکی اور بدی کا جو شعور و دیعت ہوا ہے وہ ایک ایسے عالم دنیا کا تقاضا کرتا ہے جہاں اچھائی کا نتیجہ واقعی اچھا نکلے اور برائی کا انجام واقعی بُرا ہو۔ جبکہ اس دنیا میں ہر جگہ اور ہر وقت ایسا ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ چنانچہ انسان کی اخلاقی حس (Moral Sense) کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے بھی ایک دوسری زندگی کا ظہور ناگزیر ہے۔

علمی بات: تَکْوِیر کے معنٰی ہے کسی چیز کو دوسری چیز پر اس طرح گھمانا یا بل دینا جس طرح پیچ کو گھماتے ہیں یا جس طرح عمامہ کو سر کے گرد لپیٹ کر گھماتے ہیں اور بل دیتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ رات دن کی روشنی کو چھپا لیتی ہے اور دن رات کی تاریکی کو چھپا لیتا ہے یا دن رات کی تاریکی کو غائب کر دیتا ہے اور رات دن کی

روشنی کو غائب کر دیتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "اور اسی نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے ہر ایک وقتِ مقرر تک چل رہا ہے۔" (سورۃ الزمر ۳۹، آیت:۵) اس مدتِ مقررہ سے مراد وہ مدت ہے جس میں سورج یا چاند اپنی منتہا مسافت کو طے کرلیتا ہے۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ سورج اور چاند قیامت تک یونہی گردش کرتے رہیں گے۔ واللہ اعلم بالصواب

علمی بات: جدید تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ زمین چپٹی ہے یا ناشپاتی جیسی ہے۔ زمین کی شکل کُروی ہے ماضی میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ زمین چوڑی ہے اور صدیوں تک لوگ اسی وجہ سے دور دراز تک سفر کرنے سے ڈرتے تھے کہ مبادا وہ کہیں زمین کے کناروں سے نیچے نہ گر پڑیں۔ فرانسسکو وہ پہلا شخص تھا کہ جس نے ۱۵۹۷ء میں دنیا کا چکر لگایا اور اس بات کو ثابت کیا کہ زمین کی بناوٹ کُروی ہے۔ اللہ ﷻ نے زمین کی اس بناوٹ کے متعلق درج ذیل آیت میں اشارہ دیا ہے۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُوۡلِجُ الَّیۡلَ فِی النَّھَارِ وَیُوۡلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیۡلِ "کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔" (سورۃ لقمان ۳۱، آیت:۲۹)

یہاں داخل ہونے سے مراد رات کا بتدریج دن میں تبدیل ہونا اور اسی طرح دن کا رات میں بتدریج تبدیل ہونا ہے۔ یہ عمل اسی وقت ممکن ہے اگر زمین کُروی ہو اور اگر زمین چوڑی ہوتی تو یہ عمل بتدریج نہ ہوتا بلکہ شاید رات فوراً دن میں اور دن فوراً رات میں تبدیل ہوتا۔ قرآنِ کریم میں ایک اور مقام پر ارشادِ ربانی ہے:

یُکَوِّرُ الَّیۡلَ عَلَی النَّھَارِ وَیُکَوِّرُ النَّھَارَ عَلَی الَّیۡلِ "(وہ رات کو دن پر اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے۔" (سورۃ الزمر، آیت:۵) یعنی شام کے وقت اگر مغرب کی طرف نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ادھر سے اندھیرا اوپر کو اٹھ رہا ہے جو بتدریج بڑھتا جاتا ہے تا آنکہ سیاہ رات چھا جاتی ہے۔ اسی طرح صبح کے وقت اُجالا مشرق سے نمودار ہوتا ہے جو بتدریج بڑھ کر پورے آسمان پر چھا جاتا ہے اور سورج نکل آتا ہے تو کائنات جگمگا اٹھتی ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ رات کو دن پر اور دن کو رات پر لپیٹتا جارہا ہے۔ دن اور رات کو ایک دوسرے پر لپیٹنا اسی صورت ممکن ہے جب زمین گول ہو۔ زمین گیند کی طرح گول بھی نہیں ہے بلکہ یہ انڈے کی طرح بیضوی ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے رات بتدریج دن اور دن بتدریج رات میں تبدیل ہوتا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کے عزیز ہونے کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ ہر چیز پر غالب اور ہر کام پر قادر ہے، وہ اس کے احکام کی نافرمانی کرنے والوں اور کافروں کو سزا دینے پر قادر ہے۔ اور اس کے غفار ہونے کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ مغفرت کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ نافرمانی کرنے والوں کو سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔ اللہ ﷻ کے غفار ہونے کے آثار میں سے یہ بھی ہے کہ وہ اپنے نیک بندوں کی اچھائیوں اور نیک کاموں کو ظاہر فرماتا ہے اور ان کی بُرائیوں اور گناہوں کو چھپا لیتا ہے اور آخرت میں ان کی خطاؤں کو بخش دے گا۔

آیت نمبر ۶: تخلیق خداوندی کے مزید شاہکار کا بیان ہے کہ اس نے انسانوں کو ایک ہی نفس یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا کیا۔ اللہ ﷻ نے انسان کے فائدے کے لئے چوپایوں کے آٹھ جوڑے اُتارے یعنی اونٹ، گائے، بکرا، بھیڑ کے نر و مادہ۔ چوپایوں کو اُتارنے سے مراد چوپائے جو چارہ کھاتے ہیں وہ بارش کے پانی کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے جو آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ انسان کی تخلیق بھی اللہ ﷻ کی وحدانیت اور قدرتِ کاملہ کی دلیل ہے۔ انسان کی تخلیق کے مختلف مراحل بیان ہوئے ہیں۔ ماں کے بطن میں بچہ کی نشو نما بتدریج مرحلہ وار عمل میں اور تین پردوں کے اندر کی جاتی ہے۔ ۱۔ پہلا پردہ جھلی کا ہے جس میں بچہ موجود ہوتا ہے اور جس میں بچہ کی تخلیق مکمل ہوتی ہے۔ ۲۔ دوسرا پردہ اس کے اوپر رحمِ مادر (Uterus) ہے۔ ۳۔ تیسرا پردہ اس کے اوپر ماں کا بطن ہے۔ اللہ ﷻ ہی ہے جو مذکورہ بالا مظاہرِ قدرت کا خالق ہے۔ اصل اختیار اسی کے پاس ہے اور وہی معبودِ حقیقی ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی توحید اور قدرتِ قاہرہ کی مزید دلیلیں بیان کی جارہی ہیں۔ پہلے اُس نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔ پھر ان سے حضرت حوا علیہا السلام کی تخلیق فرمائی۔ یہاں تک کہ نسلِ انسانی کرۂ زمین کے دور دراز گوشوں تک پھیل گئی۔ نیز ان کو پیدا کرکے یوں ہی نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ اس کی خوراک کا بندوبست فرمایا۔ نقل و حمل کے ذرائع اور وسائل مہیا کیئے۔ خصوصی طور پر اونٹ، بیل، بھیڑ بکری کے جوڑوں کا ذکر فرمایا ہے۔

علمی بات: انسان کی تخلیق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ جب نطفہ رحم میں قرار پکڑتا ہے تو تخلیق و تکمیل کا عمل شروع رہتا ہے۔ وہ قطرۂ آب بلکہ ایک ننھا سا جرثومہ مختلف مرحلوں سے گزر کر کامل انسان کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس کے ہر ہر عضو میں جو باریکیاں، لطافتیں اور پیچیدگیاں ہیں یہ سب دن کی روشنی میں انجام پذیر نہیں ہوتیں بلکہ تہ در تہ اندھیروں میں یہ تکوینی عمل جاری رہتا ہے۔ انسان کی پیدائش کے سلسلہ میں یہاں جن تین تاریکیوں کا ذکر ہے اس سے مراد تین پردے ہیں: جن میں تخلیق کا مرحلہ طے ہوتا ہے۔ ا۔ ماں کے بطن کی دیوار (An Anterior or The mother's abdominal wall)۔

۲۔ پھر رحم مادر کا پردہ (The wall of the uterus or Uterine)۔ ۳۔ جنین کی بیرونی جھلی (The Amnio-chorionic membrane)

علمی بات: اللہ ﷻ کی حیرت انگیز نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ ہر جنین کی، خواہ وہ انسان کا بچہ ہو یا حیوان کا تین تہ بہ تہ تاریکیوں کے اندر پرورش ہوتی ہے اور تینوں پردے اس جنین کو بیرونی آفتوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ تب جا کر جنین پیدا ہونے کے قابل بچہ بنتا ہے۔ ان میں پہلا پردہ ماں کا بطن ہے۔ دوسرا بطن کے اندر رحم اور تیسرا رحم کے اندر جھلی جس میں جنین ملفوف اور محفوظ ہوتا ہے۔ پھر اس عرصہ میں اس جنین پر کئی مراحل اور آثار واطوار گزرتے ہیں۔ پہلے وہ نطفہ ہوتا ہے۔ پھر منجمد خون ہو جاتا ہے۔ پھر گوشت کا لوتھڑا، پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔ بعد ازاں اس کی شکل وصورت بنتی ہے اور یہ سب کچھ تین تاریکیوں کے اندر ہی ہوتا رہتا ہے۔ تاآنکہ وہ جنین مقررہ وقت کے بعد انسان کی شکل وصورت لے کر ماں کے پیٹ سے باہر آجاتا ہے۔ یہ سارا نظام اتنا حیرت ناک حد تک پیچیدہ اور عظیم ہے کہ خالق کائنات کے سوا کوئی اور ان کو ظہور میں نہیں لا سکتا۔ پھر اس کے سوا کون اس قابل ہے کہ اس کو خالق ومعبود کا درجہ دیا جائے۔

نوٹ: انسان کی تخلیق کے مراحل کی مزید تفصیلات رہنمائے اساتذہ مطالعہ قرآنِ حکیم حصہ چہارم سورۃ الحج ۲۲، آیت: ۵ اور رہنمائے اساتذہ مطالعۂ قرآنِ حکیم حصہ پنجم سورۃ المومنون ۲۳، آیات: ۱۳، ۱۴ کی تشریح میں ملاحظہ فرمائیں۔

علمی بات: لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ یہ بڑی شان، عظیم قدرتوں اور دور رس حکمتوں والا اللہ ﷻ تمہارا پروردگار ہے۔ بلندی و پستی میں، بحر و بر میں، کوہ ودَمن میں ارض وسما میں غرض یہ کہ ہر جگہ اُسی کی حکومت اور بادشاہت کا نقارہ بج رہا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی خالق نہیں، کوئی اور عبادت کے لائق نہیں۔ اگر لوگ انکار و کفر کی روش نہ چھوڑیں گے تو خود عبرت ناک انجام سے دوچار ہوں گے۔ لوگ ہر بات میں اس کے محتاج ہیں۔ اللہ ﷻ کا کسی کا محتاج نہیں اور نہ اسے کسی کام کے لئے لوگوں کی کوئی ضرورت ہے۔ لہٰذا اپنے رب کی بڑائی تسلیم کرتے ہوئے اُسے حقیقی خالق مانتے ہوئے اس کی اطاعت و فرماں برداری بندوں پر ضروری ہے۔

علمی بات: اس آیت میں چوپایوں کے لئے "انعام" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ عربی میں انعام کا لفظ چار قسم کے جانوروں کے لئے مخصوص ہے: ا۔ اونٹ، ۲۔ بیل، ۳۔ دنبہ، ۴۔ بکرا اور چار ان کی مادہ ہیں۔ پس نر اور مادہ مل کر یہ آٹھ جوڑے ہو گئے۔ اس آیت میں فرمایا ہے: "اور (اپنی قدرت سے) تمہارے لئے چوپایوں میں سے آٹھ جوڑے (نر و مادہ) اتارے۔" (سورۃ الزمر، آیت: ۶) حالانکہ یہ جانور اوپر سے نہیں اُتارے ہوئے بلکہ زمین پر ہی ان کی پیداوار اور افزائش ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ ﷻ نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس پانی سے ہی زمین سے سبزہ اور چارا اُگتا ہے جس کو کھانے کی وجہ سے ان جانوروں کی افزائش ہوتی ہے۔

آیت نمبر ۷: اللہ ﷻ کی وحدانیت کا انکار کرنے اور اس کی ناشکری کرنے والوں سے اللہ ﷻ بے نیاز ہے۔ وہ اپنے بندوں کے لئے ناشکری کرنے کو پسند نہیں فرماتا، بلکہ یہ پسند فرماتا ہے کہ بندے اس کے شکر گزار بن کر رہیں۔ روزِ قیامت ناشکرے لوگوں کو ناشکری کی سزا سے کوئی نہیں بچا پائے گا۔ تمام بندوں کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ جہاں اُنہیں ان کے اعمال سے آگاہ کر دیا جائے گا۔ اللہ ﷻ سینوں میں چھپے ہوئے رازوں سے بھی خوب واقف ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ تمام مخلوقات سے بے نیاز ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا: وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِىٌّ حَمِيْدٌ "اور موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا اگر تم اور وہ سب لوگ جو زمین میں ہیں ناشکری کرو تو یقیناً اللہ بے نیاز بہت تعریفوں والا ہے۔" (سورۃ ابراہیم ۱۴، آیت: ۸)

ناشکری کا رویہ اختیار کر کے انسان اللہ ﷻ کا کچھ نہیں بگاڑتا بلکہ اپنے لئے ہی محرومی کا سامان کرتا ہے۔ اللہ ﷻ اس بات کا ہرگز محتاج نہیں ہے کہ بندے اس کا شکر کریں۔ اللہ ﷻ کو نہ بندوں کے شکر سے فائدہ پہنچتا ہے اور نہ ان کی ناشکری سے نقصان۔ یہ حقیقت ایک حدیث قدسی میں اس طرح بیان ہوئی ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: "اللہ ﷻ فرماتا ہے۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے سب انس و جن سب سے زیادہ متقی شخص کے برابر ہو جائیں تو اس سے میری سلطنت میں کوئی اضافہ نہ ہو گا۔ اور اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے سب انس و جن سب سے زیادہ فاجر شخص کے برابر ہو جائیں تو اس سے میری سلطنت میں کوئی کمی نہ ہو گی۔" (صحیح مسلم)

علمی بات: اللہ ﷻ اپنی غایت رحمت کی وجہ سے اپنے بندوں کے لئے ناشکری کو پسند نہیں کرتا، جو ان کی شقاوت و بد بختی کا سبب ہوتا ہے، وہ تو ان کے لئے یہ پسند فرماتا ہے کہ قول و عمل کے ذریعہ سے وہ اس کا شکر ادا کرتے رہیں، تا کہ وہ انہیں اس کا اچھا بدلہ دے اور جنت ان کا مقام بنے۔ شکر کا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ "اور (یاد کرو) جب تمہارے رب نے آگاہ فرمایا کہ اگر تم شکر کرو گے تو یقیناً میں تمہیں اور زیادہ عطا فرماؤں گا اور اگر تم ناشکری کرو گے (تو) یقیناً میرا عذاب بہت ہی سخت ہے۔" (سورۃ ابراہیم ۱۴، آیت: ۷)

عملی پہلو: روز قیامت کسی کے گناہ کا بوجھ کوئی دوسرا بوجھ نہ اٹھائے گا ایسا نہ ہو گا کہ ایک کا گناہ دوسرے کے سر ڈال دیا جائے یا ایک کے کیئے کے بدلہ میں دوسرا پکڑا جائے گا یا کسی کے کیئے سے زائد ظلماً گناہ بڑھا دیے جائیں۔ دنیا میں چند روز رہنا ہے پھر آخر کار سب کو اپنے پروردگار کے پاس ہی پلٹ کر جانا ہے، وہ بے خبر نہیں بلکہ لوگوں کے ہر کام اور ہر بات کی خبر دے دے گا، وہ دلوں کی تہہ میں چھپی بات کو بھی خوب جانتا ہے۔

آیت نمبر ۸: دنیا پرست انسان کی روش کا بیان ہے۔ اسے جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اللہ ﷻ کو پکارنے لگتا ہے۔ جب اللہ ﷻ اس کی تکلیف کو دور فرما دیتا ہے تو وہ اس احسان کو کسی اور کی طرف منسوب کر دیتا ہے اور شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کی اس روش سے دوسرے لوگ بھی گمراہ ہوتے ہیں۔ واضح کر دیا گیا کہ ایسے لوگ اپنے کفر کے ساتھ تھوڑے عرصہ تک فائدہ اٹھالیں۔ لیکن بالآخر ان کے شرک اور ناشکری کا بدلہ انہیں جہنم کی آگ کی صورت میں ملے گا۔

علمی بات: مشرک انسان کی روش کا بیان ہے کہ جب مصیبت پہنچتی ہے تو اللہ ﷻ کے سامنے گڑگڑاتا ہے، صرف اسی سے لو لگاتا ہے اور شرک کو بھول جاتا ہے۔ لیکن جب اللہ ﷻ اس کی مصیبت کو دور کر دیتا ہے تو وہ اس تکلیف کو یوں بھول جاتا ہے گویا اسے کبھی کوئی تکلیف پہنچی ہی نہیں تھی اور جب وہ تکلیف کو بھول جاتا ہے تو ظاہر ہے پھر یہ کیسے خیال باقی رہ سکتا ہے کہ اس تکلیف کو دور کرنے والا صرف اللہ ﷻ ہے۔ مصیبت کے وقت وہ جس توحید پر قائم تھا، مصیبت کے دور ہو جانے کے بعد اس توحید پر قائم نہیں رہتا، بلکہ اللہ ﷻ کے ساتھ شریک بنانے لگتا ہے اور پوری طرح شرک میں گرفتار ہو جاتا ہے، اپنے قول سے دوسروں کو شرک کی طرف مائل کر کے انہیں اللہ ﷻ کے راستہ سے بھٹکا دیتا ہے اور انہیں بھی اس شرک میں مبتلا کر دیتا ہے۔

علمی بات: کافر و مشرک شخص خود اپنے عمل سے گمراہ تو ہوتا ہی ہے لیکن وہ اپنی ذات کی گمراہی کے علاوہ اپنے عمل اور گمراہ کن کوششوں سے دوسروں کو گمراہ کرتا ہے اس لئے اس کے کفر کا حقیقت میں نتیجہ یہی نکلتا ہے تو وہ دوسروں کو بھی گمراہ کرے۔ چنانچہ وہ دوسروں کو بھی یہ کہہ کہہ کر گمراہ کرتا ہے کہ جو آفت مجھ پر آئی تھی وہ فلاں دیوی یا دیوتا کی بدولت ٹل گئی۔ فلاں بت یا معبود نے اپنی مہربانی سے میری اس مصیبت کو دور کر دیا تا کہ اوروں کو بھی اللہ ﷻ کی راہ سے گمراہ کر دے۔ اس سے دوسرے بہت سے لوگ بھی ان معبودانِ غیر اللہ کے معتقد بن جاتے ہیں۔ ہر گمراہ اور جاہل شخص اپنے اسی طرح کے تجربات بیان کر کر کے عوام کی اس گمراہی کو بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح وہ دوسروں کو اللہ ﷻ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ خود گمراہ ہونے کے ساتھ جھوٹی، من گھڑت کہانیوں سے دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ اس شخص کو کہا گیا ہے کہ اللہ ﷻ کی دی ہوئی مہلت اور اپنے کفر سے تھوڑا سا فائدہ اٹھا لے بالآخر تو نے جہنم میں جانا ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس شخص کو اس سے خوشی ہو کہ اللہ ﷻ مصائب کے اوقات میں اس کی دعاؤں کو قبول کرے اس کو چاہیئے کہ وہ راحت کے ایام میں اللہ ﷻ سے بہ کثرت دعائیں کرے۔" (جامع ترمذی)

آیت نمبر ۹: اللہ ﷻ کا اطاعت گزار، راتوں کو سجدہ و قیام کرنے نیز آخرت سے ڈرنے والا اور اللہ ﷻ کا ناشکر ابرابر نہیں۔ اللہ ﷻ کے نزدیک علم رکھنے والے اور علم نہ رکھنے والے برابر نہیں۔ علم سے مراد علم ہدایت ہے جو انسان کو سیدھی راہ کی رہنمائی عطا کرتا ہے۔ بے شک ایسی مثالوں سے وہی لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

علمی بات: اس آیت کریمہ سے جہاں شکر ادا کرنے اور علم حاصل کرنے کی فضیلت پتہ چلتی ہے وہاں نمازِ تہجد کی بھی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ اللہ ﷻ کے انعام کا تقاضا تو یہ ہے کہ اور زیادہ عبادت گزار ہونا چاہیئے نہ کہ تھوڑی عبادت پر اکتفا کیا جائے۔

فرامین نبوی ﷺ: ا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”کہ فرض نمازوں کے بعد افضل ترین نماز وہ ہے جو رات کے درمیانی حصہ میں پڑھی جائے۔“ (صحیح مسلم)

۲۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ رات کی نماز میں اتنا طویل قیام کرتے کہ آپ ﷺ کے قدم مبارک پھٹ جاتے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ عرض کیا: یارسول اللہ! آپ ﷺ اتنی زیادہ مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ اللہ ﷻ نے تو آپ ﷺ کے لئے آپ ﷺ کے اگلے اور پچھلے بظاہر خلافِ اولیٰ سب کام معاف فرمادیئے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا پھر میں شکر گزار بندہ بننا پسند نہ کروں؟“ عمر کے آخری حصّہ میں (جب طویل قیام دشوار ہو گیا تو) آپ ﷺ بیٹھ کر رات کی نماز پڑھتے اور جب رکوع کا وقت آتا تو کھڑے ہو جاتے (اور تقریباً تیس یا چالیس آیتیں اور پڑھتے) پھر رکوع کرتے۔ (صحیح بخاری)

۳۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک نوجوان شخص کے پاس اس کے انتقال کے وقت گئے اور پوچھا: ”تم اپنے آپ کو کس حالت میں پاتے ہو؟“ اس نے عرض کیا: اللہ کی قسم! یارسول ﷺ! یقیناً مجھے اللہ ﷻ سے (خیر کی) اُمید ہے اور مجھے اپنے گناہوں کا خوف بھی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جس شخص کے دل میں ایسے وقت میں یہ دونوں چیزیں جمع ہو جائیں تو اللہ ﷻ اس کی اُمید پوری کرتا ہے اور اس کے خوف سے اسے نجات عطا فرما دیتا ہے۔“ (جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

علمی بات: قرآنِ حکیم کے نزدیک اہلِ علم وہی ہیں جن کی تعریف اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے۔ جن کے اندر یہ صفت موجود نہیں ہے وہ قرآنِ حکیم کے نزدیک علم سے عاری ہیں اگرچہ وہ چاند اور مریخ تک سفر کر آئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی کی رہنمائی کے لئے اصلی علم یہ ہے کہ انسان کو یہ پتہ ہو کہ یہ دنیا کہاں سے آئی ہے؟ کہاں ختم ہوگی؟ اس کے خالق کی صفات کیا ہیں؟ اور اس کے ساتھ انسان کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اگر اس علم کی کلید اس کے ہاتھ آگئی تو وہ اپنی زندگی کا مقصد و منتہا سمجھ جائے گا اور اگر یہ علم حاصل نہ ہو سکا تو وہ اندھیرے میں ہے۔ اگرچہ وہ آسمان و زمین کا طول و عرض ناپ ڈالے۔

جو اپنے رب، اس کے دین شرعی، دین جزائی اور دین کے اسرار اور حکمتوں کا علم رکھتے ہیں اور جو ان مذکور اُمور کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ یہ دونوں قسم کے لوگ کبھی برابر نہیں ہوتے۔ جس طرح رات اور دن، روشنی اور اندھیرا اور آگ اور پانی برابر نہیں ہوتے۔ جب نصیحت کی جاتی ہے تو صرف وہی لوگ نصیحت پکڑتے ہیں جو صاف ستھری اور تیز عقل کے مالک ہیں۔ پس یہی لوگ اعلیٰ کو ادنیٰ پر مقدم رکھتے ہیں، چنانچہ یہ لوگ علم کو جہالت پر اور اللہ ﷻ کی اطاعت کو اس کی مخالفت پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ ان کی عقل ان کو عواقب میں غور و فکر کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ اس کے برعکس بے عقل شخص اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنالیتا ہے۔

علمی بات: علم سے مراد اللہ ﷻ کی معرفت، مقصدِ زندگی کا شعور، احکامِ الٰہی سے واقفیت اور آخرت کی جزا و سزا سے آگاہی ہے جو شخص یہ علم رکھتا ہے اور جو شخص یہ علم نہیں رکھتا دونوں کس طرح اپنے وصف میں اور اپنے انجام کے اعتبار سے برابر ہو سکتے ہیں؟ یہ حقیقی اور بنیادی علم جو انسان کی زندگی کے رُخ کو متعین کر دیتا ہے ہر شخص کے لئے اس کا حصول ناگزیر ہے۔ جو لوگ اس علم سے بے پرواہ ہو کر جو مادی علوم بھی حاصل کرتے ہیں جہالت کی تاریکیوں ہی میں رہتے ہیں اور اپنے بُرے انجام سے بے خبر ہوتے ہیں۔

علمی نکتہ: قرآن حکیم واحادیث مبارکہ میں بیان کیئے گئے حقائق تو بالکل واضح ہیں لیکن بات کو تسلیم کرنے کے لئے صرف اس کا واضح ہونا کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ مخاطب عقل والے ہوں اور ان حقائق کو سننے اور سمجھنے کے لئے اپنی عقل استعمال بھی کریں۔ جن لوگوں کے اندر نہ علم ہو نہ عقل، وہ لوگ واضح سے واضح بات سے بھی کوئی سبق حاصل نہیں کرتے۔

علمی بات: جو لوگ اہل علم ہیں جن کے علم نے اُنہیں ایمان کی روشنی دکھائی ہے، جس کی وجہ سے انہوں نے ایمان قبول کیا اور عبادت میں لگے اور جو لوگ جاہل ہیں اللہ ﷻ کی توحید کو نہیں جانتے یہ دونوں فریق برابر نہیں ہوسکتے۔ نہ جہل علم کے برابر ہے نہ جاہل عالم کے برابر ہے اور نہ دونوں کا رتبہ برابر ہے جب قیامت کے دن حاضر ہوں گے تو اہل علم اصحاب ایمان جنت میں اور اہل کفر دوزخ میں بھیج دیئے جائیں گے۔

علمی بات: جن لوگوں کو عقل نہیں یا عقل بے جا استعمال کرتے ہیں۔ وہ لوگ نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ قرآنِ حکیم سنتے ہیں تو قرآنِ مجید کی دعوت اور اس کی تعلیمات پر ایمان نہیں لاتے، بہت سے لوگ ایسے ہیں جو دُنیاوی کاموں میں بہت آگے آگے ہیں، نئی نئی مصنوعات ایجاد کرتے ہیں، انسان کی ترقی کے لئے بہت کچھ سوچتے ہیں، طرح طرح کی مشینری مارکیٹ میں لاتے ہیں، سائنس اور جغرافیہ کی بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں، لیکن کافر اور مشرک ہیں۔ وہ اپنے خالق کو نہیں پہچانتے۔ بہت سے لوگ تو خالق کائنات کے وجود ہی کو نہیں مانتے اور جو مانتے ہیں وہ مشرک ہیں۔ اس کے لئے اولاد بھی تجویز کرتے ہیں اور غیر اللہ کی عبادت بھی کرتے ہیں۔ یہ عقل مندی بے کار ہے ایسے لوگوں کی عقل پر پتھر پڑے ہوئے ہیں۔ ایسی عقل کا کیا فائدہ جو دوزخ میں لے جائے۔

آیت نمبر ۱۰: اہل ایمان کو تقویٰ اختیار کرنے یعنی اللہ ﷻ کی نافرمانی سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لئے دنیا میں بھی نعمتیں اور سعادتیں ہیں۔ اہل ایمان کو ہجرت کی ترغیب دی گئی ہے۔ اگر مکہ مکرمہ میں رہ کر ان کے لئے اللہ ﷻ کی نافرمانی سے بچنا ممکن نہیں تو اللہ ﷻ کی زمین بہت وسیع ہے۔ ایمان اور نیکی کی راہ میں صبر کرنے والوں کو آخرت میں ایسے اجر سے نوازا جائے گا جس کی کوئی حد نہیں ہوگی۔

شانِ نزول: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قبل از ہجرت کافر ستاتے تھے اور اُنہیں اذیت پہنچاتے تھے۔ ان کی تسکین کے لئے یہ آیت اتری کہ اے محبوب ﷺ! برگزیدہ بندوں سے کہہ دیجئے کہ اللہ ﷻ سے ڈرو اور اس کی فرماں برداری اختیار کرو، دنیا کی چند روزہ تکلیف کا خیال نہ کرو، جو آدمی دنیا میں اچھے کام کر جائیں گے ان کو بھلائی ملے گی، یعنی دین اسلام پر استقامت کا مظاہرہ کرنے والوں کو قیامت میں جنت ورحمت ملے گی۔

علمی بات: اگر مسلمان کافروں کے ملک میں ہوں اور وہاں ان کو اسلام کے احکام پر عمل کرنے کی آزادی نہ ہو اور وہاں رہنے کی وجہ سے ان کے ایمان، ان کی عزت اور ان کی جان کو خطرہ ہو تو اللہ ﷻ کی زمین بہت وسیع ہے، وہ کافروں کے ملک سے ہجرت کر کے مسلمانوں کے ملک میں چلے جائیں یا کسی ایسے کافر ملک میں چلے جائیں جہاں اُنہیں اسلام کے احکام پر عمل کرنے کی آزادی ہو اور کوئی خطرہ نہ ہو۔

بلاشبہ اس طرح وطن ترک کرنے میں بہت مصائب برداشت کرنے پڑیں گے اور طرح طرح کے خلاف عادت وطبیعت اُمور پر صبر کرنا پڑے گا، لیکن یہ یاد رہے کہ بے شمار ثواب بھی ملے گا اور اس کے مقابلہ میں دنیا کی سب سختیاں اور تکلیفیں ہیچ ہیں، چنانچہ نبوت کے پانچ برس کے بعد نبی کریم ﷺ کے حکم سے اَسّی (۸۰) آدمیوں کے قریب مکہ مکرمہ سے حبشہ کو چلے گئے تھے اسی کو حبشہ کی ہجرت کہتے ہیں۔ مدینہ منورہ کی ہجرت کے بعد یہ لوگ پھر حبشہ سے مدینہ منورہ کو چلے آئے اسی واسطہ سے ان لوگوں کو دو ہجرتوں والا کہا جاتا ہے۔

علمی بات: اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اگر اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت اور اس سے ڈرتے ہوئے زندگی گزارنے میں کفار مزاحم ہورہے ہیں تو اپنے دین اور ایمان کے تحفظ کے لئے کسی دوسرے علاقہ یا ملک کو ہجرت کر کے جاسکتے ہو۔ اس کی زمین کسی ایک ملک تک محدود نہیں ہے بلکہ نہایت وسیع ہے۔ اور دین کی خاطر وطن چھوڑا جاسکتا ہے لیکن وطن کی خاطر دین نہیں چھوڑا جاسکتا۔

اللہ ﷻ اپنے ایمان دار بندوں کو اپنے رب کی اطاعت پر جمے رہنے کا اور ہر امر میں اس کی پاک ذات کا خیال رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ ہر حال میں اللہ ﷻ کی اطاعت لازمی ہے۔ لہٰذا اگر ایک جگہ اللہ ﷻ کی عبادت استقلال سے کرنا ممکن نہ ہو تو دوسری جگہ چلے جانے کا حکم ہے۔ کیونکہ اللہ ﷻ کی زمین بہت وسیع ہے۔ معصیت

سے بھاگتے رہنے اور شرک ونافرمانی کو منظور نہ کرنے کا حکم ہے۔ اس جگہ کی تبدیلی میں جو تکلیفیں اٹھانی پڑیں اُنہیں صبر اور استقلال کے ساتھ جھیلیں! اس صبر کا نتیجہ بہت اچھا ہو گا۔

عملی پہلو: انسان کو جب اللہ ﷻ کی گہری معرفت حاصل ہوتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ ﷻ کی نافرمانی سے ڈرنے والا اور ہر معاملہ میں خشیت الٰہی کا پیکر بن جاتا ہے۔ اللہ ﷻ کی عظمتوں کا ادراک اس کو اللہ ﷻ کے آگے پست کر دیتا ہے۔ اس کی عملی زندگی اللہ ﷻ کے احکام کی پابندی میں گزرنے لگتی ہے۔ وہ اس معاملہ میں اس حد تک سنجیدہ ہو جاتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ دے مگر اللہ ﷻ کو نہ چھوڑے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی اطاعت وبندگی بغیر صبر کے ممکن نہیں، اس لئے آیت کے آخر میں صبر کی فضیلت اور اللہ ﷻ کے نزدیک اس کے عظیم اجر وثواب کا ذکر کیا گیا ہے۔

صبر کے معانی: صبر کا معنیٰ ہے: جھیلنا، برداشت کرنا، ناخوشگوار صورتحال کا جم کر سامنا کرنا وغیرہ اختلاف مواقع کے اعتبار سے اس کے مختلف معانی ہیں:
۱۔ کسی مصیبت اور غم کے برداشت کرنے کو صبر کہتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں ہے واویلا کرنا، رونا پیٹنا، بے چینی اور بے قراری کا اظہار کرنا۔ ۲۔ میدان جنگ میں بہادری کے ساتھ ثابت قدم رہنے کو بھی صبر کہتے ہیں، اس کے مقابلہ میں ہے بزدلی۔ ان دونوں معنیٰ میں قرآن مجید کی یہ آیت ہے: وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ "اور صبر کرنے والے ہیں تنگ دستی اور تکالیف میں اور جنگ کے وقت" (سورۃ البقرہ ۲، آیت: ۱۷۷) تنگ دستی، مصیبت اور جنگ کے وقت صبر کرنے والے۔ ۳۔ عبادت کی مشقت پر اپنے نفس کو جمائے رکھنا، اس کے مقابلہ میں معصیت اور نافرمانی ہے۔ ۴۔ غلبہ شہوت کے وقت اپنے آپ کو گناہ سے روکنا، اس کے مقابلہ میں فسق وفجور ہے۔ ۵۔ غلبہ غضب کے وقت اپنے آپ کو زیادتی سے روکنا، اس کے مقابلہ میں عدوان اور سرکشی ہے۔ ان معانی کے استعمال میں قرآن مجید کی یہ آیت ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ "اے ایمان والو! صبر کرو اور (دشمن کے مقابلہ میں) ثابت قدم اور (سرحدوں کی حفاظت کے لئے) مستعد رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔" (سورۃ آل عمران ۳، آیت: ۲۰۰)

فرامین نبوی ﷺ: ۱۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مومن کا معاملہ عجیب ہے۔ اس کا ہر معاملہ اس کے لئے بھلائی کا ہے اور یہ بات مومن کے سوا کسی اور کو میسر نہیں۔ اسے خوشی اور خوشحالی ملے تو شکر کرتا ہے۔ تو یہ اس کے لئے اچھا ہوتا ہے اور اگر اسے کوئی نقصان پہنچے تو (اللہ ﷻ کی رضا کے لئے) صبر کرتا ہے۔ یہ بھی اس کے لئے بھلائی ہوتی ہے۔" (صحیح مسلم)
۲۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "وہ مومن جو لوگوں سے مل جل کر رہتا ہے، اور ان کی ایذا پر صبر کرتا ہے، تو اس کا ثواب اس مومن سے زیادہ ہے جو لوگوں سے الگ تھلگ رہتا ہے، اور ان کی ایذا رسانی پر صبر نہیں کرتا۔" (سنن ابن ماجہ)

عملی پہلو: ایمان کے اوپر زندگی کی تعمیر کرنا آدمی کے لئے زبردست امتحان ہے۔ اس امتحان میں وہی لوگ پورے اترتے ہیں جن کے لئے ایمان اتنی قیمتی دولت ہو کہ اس کی خاطر وہ ہر دوسری چیز پر صبر کرنے کے لئے راضی ہو جائیں۔ ایمانی زندگی عمل کے اعتبار سے صبر والی زندگی کا دوسرا نام ہے۔ جو لوگ صبر کی قیمت پر مومن بننے کے لئے تیار ہوں وہی وہ لوگ ہیں جو اللہ ﷻ کے اعلیٰ انعامات میں حصہ دار بنائے جائیں گے۔

آیت نمبر ۱۱: نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے اعلان کیا گیا ہے۔ حکم دیا گیا ہے کہ اللہ ﷻ کی بندگی مکمل اطاعت کے ساتھ کی جائے جو شرک سے بالکل پاک ہو۔

علمی بات: نبی کریم ﷺ سے فرمایا گیا ہے کہ وہ مشرکین قریش کو یہ بتا دیں کہ مجھے تو اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں صرف اللہ ﷻ کی عبادت کروں اور اس کے سوا کسی کی طرف التفات نہ کروں اور مجھے اس بات کا بھی حکم دیا گیا ہے کہ اخلاص وعمل اور اطاعت وبندگی میں تمام مسلمانوں سے آگے رہوں۔ گویا میں راہِ حق میں ثابت قدم رہنے اور شمع توحید کو روشن رکھنے کی تاکید میں صرف تمہیں نہیں کر رہا بلکہ میرے رب نے مجھے بھی ایسا ہی کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ میں سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں۔ پہلے عبادت کرنے کا ذکر کیا اور پھر اخلاص کا ذکر کیا، کیونکہ عبادت ظاہری اعضاء اور ارکان سے ہوتی ہے اور اخلاص کا تعلق دل سے ہے۔

علمی و عملی بات: پیغمبر علیہ السلام کی اصل دعوت یہ ہوتی ہے کہ لوگ صرف ایک اللہ ﷻ کے عبادت گزار بنیں۔ اس کے سوا دوسری تمام چیزوں کی پوجا چھوڑ دیں۔ پیغمبر علیہ السلام کو یقین ہوتا ہے کہ آدمی کے نفع اور نقصان کا اصل فیصلہ آخرت میں ہونے والا ہے۔ اس لئے وہ خود اپنی زندگی کو آخرت کی راہ میں لگاتے ہیں اور دوسروں کو اس کی طرف لگنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم بھی داعی دین کی حیثیت سے اس بات کو ذہن نشین رکھیں۔

آیت نمبر ۱۲: نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے اعلان کروایا گیا ہے۔ سب سے پہلے اللہ ﷻ کا فرماں بردار ہونے کی مثال قائم کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

شانِ نزول: کفار قریش نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: آپ (ﷺ) ہمارے پاس جو پیغام لائے ہیں اس پر آپ (ﷺ) کو کسی نے ورغلایا ہے (معاذ اللہ) کیا آپ (ﷺ) نے اپنے آباؤ اجداد کی ملت کو نہیں دیکھا، آپ (ﷺ) اس پر کیوں نہیں عمل کرتے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

علمی بات: اے مشرکین مکہ! میں صرف تمہیں مسلمان بننے اور خالص اللہ ﷻ کی عبادت کرنے کی تبلیغ نہیں کرتا بلکہ سب سے پہلے میں خود مسلمان ہوں اور صرف اللہ ﷻ کی عبادت کرتا ہوں اور تمہیں بھی اس کی دعوت دیتا ہوں۔ آپ ﷺ عالم شہادت میں اس اُمت کے لحاظ سے اور عالم غیب میں تمام اولین و آخرین کے اعتبار سے اللہ ﷻ کے سب سے پہلے حکم بردار بندے ہیں۔

علمی بات: آپ ﷺ اپنی امت میں سب سے پہلے مسلمان ہیں اور ہر نبی علیہ السلام اپنی اُمت میں سب سے پہلا مسلمان ہوتے ہیں کیونکہ ہر حکم سب سے پہلے نبی علیہ السلام پر نازل ہوتا ہے، پہلے وہ خود اس پر ایمان لاتے ہیں اور پھر اپنی اُمت کو اس کی تبلیغ کرتے ہیں تو دوسرے لوگ نبی علیہ السلام کے واسطہ سے بعد میں مسلمان بنتے ہیں۔ اس کی دوسری تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ آپ ﷺ سب مخلوق سے پہلے مسلمان ہیں۔ (سورۃ الانعام ۶، آیت: ۱۶۳) اس کی تائید میں درج ذیل احادیث مبارکہ ملاحظہ کریں جن میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "ا۔ میں خلق کے اعتبار سے تمام نبیوں میں اول ہوں اور بعثت کے اعتبار سے سب نبیوں کے آخر میں ہوں۔ ۲۔ میں اس وقت بھی نبی علیہ السلام تھا جب حضرت آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے۔" (جامع ترمذی)

علمی بات: آپ ﷺ کے اس فرمان کہ "میں سب سے پہلا مسلمان بنوں" سے مراد یہ ہے کہ میں ان جابر اور متکبر بادشاہوں میں سے نہیں ہوں جو لوگوں کو کسی بات کا حکم دیتے ہیں اور خود اس پر عمل نہیں کرتے، بلکہ میں تم کو جس چیز کا حکم دیتا ہوں سب سے پہلے خود اس پر عمل کرتا ہوں۔ آپ ﷺ عالم شہادت میں اس امت کے لحاظ سے اور عالم غیب میں تمام اولین و آخرین کے اعتبار سے اللہ ﷻ کے سب سے پہلے حکم بردار بندے ہیں۔

آیت نمبر ۱۳: نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے اعلان کیا گیا ہے۔ اگر اللہ ﷻ کی نافرمانی کی جائے تو ایک بڑے دن کا عذاب گرفت میں لے لے گا۔

علمی بات: آپ ﷺ سے فرمایا گیا کہ ان کو بتادیں کہ میں خود بھی تو اللہ ﷻ کا بندہ ہوں اور اس حیثیت سے اس کی کلی اطاعت کا پابند ہوں۔ اگر بالفرض محال میں بھی اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بھی اللہ ﷻ کے عذاب کا اندیشہ ہوگا۔ یہ شرطیہ فقرہ ہے اور یوں سمجھیں کہ اس کے درمیان کا "اگر" گویا ایک پہاڑ ہے جسے پھلانگنا ناممکنات میں سے ہے۔ دراصل یہ انداز مخالفین کو معاملہ کی سنجیدگی کا احساس دلانے کے لئے اختیار فرمایا گیا ہے، ورنہ حضور ﷺ کے لئے اس کا ہرگز کوئی امکان نہیں تھا۔

علمی بات: اس آیت سے مقصود اُمت کو اللہ ﷻ کی نافرمانی سے باز رکھنا ہے، کیونکہ حضور اکرم ﷺ معصوم ہیں اس لئے آپ ﷺ سے نافرمانی کا صادر ہونا کسی طرح ممکن ہی نہیں اور نہ ہی قیامت کے دن آپ ﷺ کے لئے عذاب کا کوئی امکان ہے بلکہ آپ ﷺ کی شفاعت سے بے شمار گناہ گاروں کا عذاب دور ہوگا، نبی ﷺ اللہ ﷻ کے محبوب ہیں اور تمام رسولوں کے سردار، قائد، امام اور سب سے افضل ہیں۔ اس آیت میں حضور اکرم ﷺ کا ذکر کرکے مشرکین مکہ اور مسلمانوں کو یہ بتانا مقصود ہے کہ میں امام الانبیاء علیہم السلام ہونے کے باوجود بفرضِ محال اگر اللہ ﷻ کے کسی حکم کی نافرمانی کروں تو قیامت کے دن عذاب کا خطرہ ہے، تو عام لوگوں کا کیا حال ہوگا؟

آیت نمبر ۱۴: نبی کریم ﷺ اللہ ﷻ کی عبادت اسی طرح کرتے ہیں کہ اطاعت کو اسی کے لئے خالص رکھتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے بیان میں دراصل امت کے لئے رہنمائی کا سامان کیا گیا ہے۔

علمی بات: آپ ﷺ کے ذریعہ مشرکین کو دوٹوک جواب دینے کے لئے فرمایا گیا ہے کہ آپ ﷺ ان سے فرما دیجئے کہ میں تو اللہ ﷻ کی عبادت اس طرح کرتا ہوں کہ اپنی عبادت کو خالص اور صرف اس کے لئے رکھتا ہوں۔ یعنی اس کی عبادت میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتا ہوں بلکہ خالص اسی کی عبادت کا اعتقاد رکھ کر اس کی بندگی کرتا ہوں، تم جن لوگوں کی چاہو عبادت کرو اور جن چیزوں کے سامنے چاہو جھکو۔ مگر یہ یاد رکھو کہ یہ عمل گھاٹے اور اور نقصان کا عمل ہے جس کا حتمی انجام جہنم ہے۔

آیت نمبر ۱۵: لوگوں کو اختیار ہے کہ جس کی چاہیں وہ عبادت کریں۔ دنیا دراصل ایک امتحان ہے۔ البتہ اصل خسارہ اٹھانے والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو روز قیامت خسارہ میں ڈالا۔ یہ ایسا خسارہ ہے جس کی کوئی تلافی ممکن نہیں۔

علمی بات: اگر تم میری دعوت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں اور میری نصیحت تمہارے لئے قابل قبول نہیں تو پھر جیسا تمہارا جی چاہتا ہے کرتے رہو خواہ کسی پتھر کی پوجا کرو، خواہ کسی دریا کو خدا بناؤ خواہ کسی جن اور انسان کو اپنا معبود تصور کرو تم جانو اور تمہارا کام۔ لیکن یہ یاد رہے کہ کفر و شرک اختیار کرنے سے تم ایسا نقصان اٹھاؤ گے اور تمہیں ایسا خسارہ ہوگا کہ پھر اس کی تلافی ممکن نہ ہو گی۔

علمی بات: مشرکین سے خطاب کے اس انداز کا مقصد ان کو ڈانٹ ڈپٹ اور لعنت ملامت کرنا ہے، جیسے کوئی شخص کسی کو بار بار سمجھائے اور وہ پھر بھی نہ مانے تو وہ کہتا ہے: اچھا جو تمہارا دل چاہے کرو۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد فرمایا گیا کہ "تو اب تم اس کے سوا جس کی چاہو پوجا کرو آپ فرما دیجئے بے شک نقصان اٹھانے والے وہ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو نقصان میں ڈالا قیامت کے دن آگاہ ہو جاؤ یہی تو کھلا نقصان ہے۔" (سورۃ الزمر، آیت:۱۵)

علمی بات: ایک خاندان تین رشتوں پر مبنی ہوتا ہے "میاں، بیوی"، "والدین، اولاد" اور "بہن، بھائی"۔ خاندان کے ہر فرد کی خواہ وہ کسی حیثیت میں ہو یہ ذمہ داری ہے کہ وہ خود کو بھی اور تمام گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچانے کے لئے کوشش کرے۔ البتہ یہ ذمہ داری مردوں پر زیادہ اور بالخصوص سب سے زیادہ خاندان کے سربراہ پر عائد ہوتی ہے: اَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ "جان لو کہ تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور اُس سے اُس کے ماتحت لوگوں کے بارے میں سوال ہوگا۔" (صحیح بخاری)

روزِ قیامت ایک انسان کی کامیابی یا ناکامی کے فیصلہ میں اِس بات کی بڑی اہمیت ہو گی کہ وہ اپنے گھر میں غفلت کی زندگی بسر کر رہا تھا یا آخرت کی تیاری کی طرف متوجہ تھا۔ سورۃ الطور ۵۲، آیت: ۲۶ میں اہل جنت کا قول نقل ہوا: قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ "(وہ کہیں گے کہ) بے شک اِس سے پہلے ہم اپنے گھر میں (اللہ سے) ڈرتے رہتے تھے۔"

اِس کے برعکس سورۃ الانشقاق، ۸۴ آیت: ۱۳ میں جہنمی کے بارے میں فرمایا گیا: اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا "بے شک وہ اپنے گھر والوں میں بڑا خوش تھا۔"

سورۃ الشوریٰ ۴۲، آیت: ۴۵ اور سورۃ الزمر ۳۹، آیت: ۱۵ میں فرمایا گیا: اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ "بے شک اصل خسارہ پانے والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو قیامت کے دن نقصان میں ڈالا۔"

سربراہِ خاندان کا فرض ہے کہ پہلے خود احکاماتِ شریعت پر عمل کر کے خود کو جہنم کی آگ سے بچائے اور تمام اہل خانہ کے لئے عملی مثال بنے۔ اِس کے ساتھ ساتھ اہل خانہ کی بھی بڑی حکمت اور ثابت قدمی سے ایسی دینی و اخلاقی تربیت کرے کہ وہ بھی خلافِ شریعت کاموں سے اجتناب کر کے جہنم کی آگ سے بچنے کی کوشش کریں۔ اہل خانہ اور خصوصاً اولاد کی تربیت انسان کے لئے بہت بڑی سعادت کا باعث ہو سکتی ہے

فرمانِ نبوی ﷺ: نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهٗٓ اِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، اَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهٖ اَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْلَهٗ۔ "جب انسان مر جاتا ہے تو اُس کا عمل ختم ہو جاتا ہے، مگر تین اعمال ایسے ہیں کہ اُن کا ثواب مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے، پہلا صدقہ جاریہ، دوسرا ایسا علم جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں، تیسرا نیک لڑکا جو اُس کے لئے دُعا کرتا رہے۔" (صحیح مسلم)

اگر آج محبت میں اہلِ خانہ کے ساتھ شریعت کی پابندی کے حوالہ سے نرمی برتی جارہی ہے یا اُن کی خواہشات پوری کرنے کے لئے خود اُنہیں خلافِ شریعت کاموں میں ملوث کیا جارہا ہے، تو یہ اُن سے بدترین دشمنی کا معاملہ ہے۔ گویا اس طرزِ عمل سے اُنہیں جہنم کے عذاب کے حوالہ کیا جارہا ہے۔

آیت نمبر ۱۶: خود کو اور اپنے گھر والوں کو خسارہ میں ڈالنے والے جہنم کے سائبانوں میں ہوں گے۔ اللہ ﷻ کی نافرمانی سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ لوگ جہنم سے محفوظ رہ سکیں۔

علمی بات: اہلِ جہنم کے عذاب کی ہولناکی بیان کی جارہی ہے کہ وہ لوگ اوپر اور نیچے سے آگ کے کئی طبقات میں ڈھکے ہوں گے، جو ان پر بھڑک بھڑک رہی ہوگی۔ اللہ ﷻ اپنے بندوں کو ڈرانے کے لئے عذاب جہنم کے یہ ہولناک مناظر بیان فرماتا ہے تاکہ ان سے بچنے کے لئے ایمان اور اعمال صالحہ کی طرف مائل ہوں۔ وہ اُنہیں نصیحت کرتا ہے کہ اس کی نافرمانی سے ڈرتے رہیں اور کوئی ایسا عمل نہ کریں جو اس کی ناراضگی اور عذاب نار کا سبب بنے۔ اللہ ﷻ نے کفار کے عذاب کی کیفیت بیان فرمائی ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ دوزخ کی آگ ان کو تمام اطراف سے گھیر لے گی۔ جس طرح دنیا میں کافر کا احاطہ اس کے کفر اور اس کے بُرے اعمال نے کیا ہوا تھا، اسی طرح آخرت میں دوزخ کی آگ اس کا ہر طرح سے احاطہ کرلے گی۔

آیت نمبر ۱۷: طاغوت سے اجتناب کی تلقین کی گئی ہے۔ بندگی کی حد سے تجاوز یا اللہ ﷻ کے سوا کسی کی بندگی کرانا بھی طاغوتی طرزِ عمل ہے۔ اللہ ﷻ ہی کی عبادت کرنے والوں کے لئے بشارت ہے۔ "دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے بے شک ہدایت گمراہی سے خوب واضح ہو چکی ہے تو جو طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان رکھے تو یقیناً اس نے مضبوط سہارے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔" (سورۃ البقرہ ۲، آیت: ۲۵۶)

علمی بات: نیک لوگوں کا انجام بیان کیا جارہا ہے جو غیر اللہ کی پرستش نہیں کرتے اور اپنے دل و دماغ اور تمام اعضا و جوارح کے ساتھ اللہ ﷻ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ اے محبوب ﷺ! وہ اچھے بندے جنہوں نے عبادت شیطان اور بت پرستی سے کنارہ کیا اور سچے دل سے اللہ ﷻ کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کے احکامات مانے۔ ان کو اللہ ﷻ کی رحمت اور جنت کی خوشخبری ہے۔

علمی بات: یہ خوشخبری اسے دنیا سے رخصت ہوتے وقت قبر میں دی جاتی ہے اور میدانِ محشر میں بھی دی جائے گی اور جو خوشخبری طاغوت سے اعراض کرنے والے کو دی گئی ہے، اللہ ﷻ نے وہی خوشخبری ان لوگوں کو بھی دی ہے جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ پر عمل کرتے ہیں، ان لوگوں کی تعریف کرتے ہوئے اللہ ﷻ نے فرمایا: "کہ یہی لوگ راہِ حق پر گامزن ہیں اور یہی لوگ صاحب عقل سلیم ہیں۔"

آیت نمبر ۱۸: بشارت ان لوگوں کے لئے ہے جو دین کی عمدہ ترین انداز میں پیروی کرتے ہیں۔ عزیمت کا درجہ اختیار کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے ہدایت کا وعدہ ہے، یہی لوگ عقل مند ہیں۔

شانِ نزول: یہ آیت حضرت زید بن عمرو بن نفیل، حضرت ابوذر غفاری اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی، حضرت زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ زمانہ جاہلیت میں بھی شرک و بت پرستی سے نفرت کرتے تھے۔ حضرت ابوذر غفاری اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہما مختلف اہل مذاہب مشرکین پھر یہود و نصاریٰ کی باتیں سننے اور ان کے طور طریقے دیکھنے کے بعد ایمان لائے اور قرآنی تعلیمات کو سب سے احسن پاکر ان کو ترجیح دی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لائے تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس حضرت عثمان و عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر اور حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہم آئے تو ان سب نے آپ رضی اللہ عنہ سے سوال کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنے ایمان کی خبر دے دی تو یہ حضرات بھی ایمان لے آئے تو ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: فَبَشِّرۡ عِبَادِ الَّذِیۡنَ یَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقَوۡلَ فَیَتَّبِعُوۡنَ اَحۡسَنَہٗ۔

علمی بات: بہت سے حضرات مفسرین کرام نے اس جگہ قول سے مراد عام لوگوں کے اقوال لیئے ہیں جن میں توحید و شرک، کفر و اسلام، حق و باطل۔ مطلب آیت

کا یہ ہے کہ یہ لوگ باتیں تو سب کی سنتے ہیں۔ کفار اور مومنین کی بھی، حق و باطل کی بھی۔ لیکن اتباع صرف اسی بات کی کرتے ہیں جو احسن ہے۔ توحید و شرک میں سے توحید کا حق و باطل میں سے حق کا اور حق کے مختلف درجات ہوں تو ان میں جو احسن اور راجح ہو اس کی اتباع کرتے ہیں۔ اس لئے ان کو دو صفتوں کے ساتھ موصوف کیا گیا۔ پہلی "هَدٰاهُمُ اللّٰهُ" یعنی یہ لوگ اللہ ﷻ کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں۔ اس لئے مختلف قسم کی باتیں سن کر بھٹکتے نہیں۔ دوسرے أُولٰٓئِكَ هُمْ أُولُوا الْأَلْبَابِ۔ یعنی یہ لوگ عقل والے ہیں۔ عقل کا کام ہی یہ ہے کہ اچھے برے اور حق و باطل میں تمیز کرے، حسن و احسن کو پہچان کر احسن کو اختیار کرے۔

علمی بات: قرآنِ حکیم میں عزیمت والے کاموں کا بھی ذکر ہے اور رخصتوں کا بھی۔ لیکن عزیمت والے کام احسن ہیں۔ احسن سے مراد یہ ہے کہ جو احکام ان کو دیئے جاتے ہیں ان میں سب سے اچھے حکم پر وہ چلتے ہیں اور عمل کرتے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں ظالم سے انتقام لینے کی اور معاف کر دینے کی ہر ایک کو رخصت اور اجازت ہے، لیکن دونوں میں سے معاف کر دینا احسن ہے۔ بہت سی چیزوں میں رخصت دی گئی ہے مگر عزیمت پر عمل کو احسن و افضل فرمایا ہے تو مراد آیت کی یہ ہوگئی کہ یہ لوگ احکامِ قرآن رخصت اور عزیمت دونوں کے سنتے ہیں۔ مگر اتباع رخصت والے احکام کے بجائے عزیمت والے احکام کی کرتے ہیں۔ اور جن دو چیزوں میں ایک حسن ہو دوسری احسن، یہ ان میں سے احسن ہی کو عمل کے لئے اختیار کرتے ہیں۔

علمی بات: ایمان اور تقویٰ کا بلند تر درجہ احسان ہے۔ احسان کا لفظی معنٰی کسی کام کو اپنے دل کی رضا اور رغبت اور نہایت اچھے طریقہ سے بجالانا ہے۔ اس طرح یہ لفظ ہر نیکی کو شامل ہے۔ جو بھی عمل صالح ان شرائط سے بجالایا جائے گا وہ احسان کے درجہ میں ہوگا۔ حدیثِ جبرائیل میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے اس سوال کے جواب میں کہ "احسان کیا ہے؟" فرمایا کہ "احسان یہ ہے کہ تو اللہ ﷻ کی عبادت ایسے کرے جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر تو ایسا نہ کر سکے تو کم از کم یہ سمجھے کہ اللہ ﷻ تجھے دیکھ رہا ہے۔" (صحیح بخاری) خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنے ہر کام میں اللہ ﷻ کے سامنے ہونے کا دھیان رکھے۔

علمی بات: ہمیں چاہیئے کہ دین کے ہر معاملہ میں زیادہ سے زیادہ محنت کریں اور ہر لمحہ بہتر سے بہتر درجہ پر پہنچنے کی فکر میں رہیں۔ لیکن اکثر لوگوں کا طرزِ عمل اس کے برعکس ہوتا ہے۔ دُنیوی معاملات میں تو مطمعِ نظر یہ ہوتا ہے کہ خوب سے خوب تر کی کوشش کی جائے جبکہ دین کے معاملہ میں نہ صرف یہ کہ لوگ کم سے کم پر گزارا کرنا چاہتے ہیں بلکہ پسپائی اختیار کرنے کی فکر میں ہر وقت کسی گنجائش اور رعایت کی تلاش میں رہتے ہیں۔ حالانکہ ایک بندۂ مومن کو چاہیئے کہ دنیا کے معاملہ میں تو کم سے کم پر گزارا کرے اور دین کے معاملہ میں ہمیشہ عزیمت کا راستہ اختیار کرنے کی فکر میں رہے۔

علمی بات: دانشمندی یہ ہے کہ آدمی اللہ ﷻ کے کلام کو توجہ سے سنے اور اس کا بہترین مفہوم اخذ کر کے اس کی اتباع کرے۔ ہدایت کی راہ ایسے ہی لوگوں پر کھلتی ہے اور ایسے ہی لوگوں کو کامیابی کی بشارت دی گئی ہے۔ اس آیت سے یہ بھی رہنمائی ملتی ہے کہ اگر ایک لفظ کے لغت میں کئی معانی ہوں تو سوچنا چاہیئے کہ قرآنِ حکیم میں جہاں وہ لفظ استعمال ہوا ہے کس بہترین مفہوم کو ادا کر رہا ہے کیوں کہ اللہ ﷻ کا کلام اپنے معنٰی و مفہوم کے لحاظ سے بہت اعلیٰ ہی ہے۔

آیت نمبر ۱۹: نبی کریم ﷺ لوگوں کی ہدایت پر آجانے کی شدید تمنا رکھتے تھے۔ آپ ﷺ کو تسلی دی گئی کہ جن لوگوں کے لئے عذاب کا فیصلہ ہو چکا اب وہ بچ نہ سکیں گے۔

علمی بات: نبی کریم ﷺ سے فرمایا جارہا ہے کہ جو آدمی اپنی ازلی شقاوت و بدبختی کی وجہ سے کفر و شرک اور ظلم و سرکشی کی زندگی گزار رہا ہے، آپ ﷺ اسے عذابِ نار سے نہیں بچا سکتے، اس لئے کہ جس کو اللہ ﷻ اس کے کفر و شرک کی وجہ سے گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا اور جسے وہ ہدایت دے دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا، اس لئے نبی مکرم ﷺ! آپ ﷺ ان کے غم میں پریشان نہ رہیئے، اُنہیں ان کے حال پر چھوڑ دیجیئے۔

علمی بات: اس سے پہلے طاغوت کی عبادت کرنے والوں کا ذکر فرمایا تھا اور طاغوت کی عبادت کرنے والے کفار اور مشرکین ہیں اور کفار اور مشرکین کے متعلق اللہ ﷻ خبر دے چکا ہے کہ اللہ ﷻ ان کو نہیں بخشے گا۔ البتہ شرک سے کم جو گناہ ہیں ان گناہ گاروں کے لئے مغفرت ممکن ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"بے شک اللہ اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اُس کے ساتھ شرک کیا جائے اور جو (گناہ) اس کے علاوہ ہے جس کے لئے چاہے گا معاف فرمادے گا۔"

(سورۃ النساء ۴، آیت: ۴۸) اور جس کی مغفرت اللہ ﷻ کے ہاں ممکن ہو اس کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام کی شفاعت بھی ممکن ہے۔

آیت نمبر ۲۰: متقین کے لئے جنت کے بالاخانوں یعنی کئی منزلہ رہائش گاہوں کا وعدہ ہے۔ اللہ ﷻ کا وعدہ برحق ہے۔ وہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

علمی بات: ان لوگوں پر انعام واکرام کا بیان ہے جنہوں نے طاغوت کی عبادت سے اجتناب کیا، انہوں نے شرک اور گناہوں سے اپنے آپ کو آلودہ نہیں کیا۔ وہ ظاہری بتوں کی عبادت سے بھی اجتناب کرتے رہے اور باطنی بت یعنی نفس امارہ کی اطاعت اور عبادت سے بھی بچتے رہے، جنہوں نے اللہ ﷻ کے احکام کے خلاف اپنے نفس کی خواہشوں پر عمل نہیں کیا ان سے اللہ ﷻ کا وعدہ ہے کہ جنت میں ان کے لئے بلند و بالا اور عالی شان محل ہوں گے، جن کے کمرے بہت سی منزلوں پر مشتمل ہوں گے اور جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی یہ اللہ ﷻ کا وعدہ ہے جو برحق ہے۔ وہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جنت میں ایسے محل ہیں، جن کا اندرونی حصہ باہر سے اور بیرونی حصہ اندر سے صاف دکھائی دیتا ہے۔“ ایک دیہاتی نے پوچھا، یارسول اللہ ﷺ! یہ کن کے لئے ہیں؟ فرمایا: ”ان کے لئے جو نرم گفتگو کریں، کھانا کھلائیں، روزوں پر مداومت کریں اور راتوں کو جب لوگ میٹھی نیند میں ہوں، یہ اللہ ﷻ کے لئے (اس کے سامنے کھڑے ہو کر گڑگڑائیں اور) نماز پڑھیں۔“ (جامع ترمذی، مسند احمد)

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”اہل جنت اپنے اوپر بالاخانوں کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح مشرق یا مغرب سے آسمان کے اوپر چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھا جاتا ہے۔“ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل جنت کے درجات اور مراتب میں فرق ہوگا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! یہ (بالاخانے) انبیاء کرام علیہم السلام کی منازل ہیں، جن تک ان کے علاوہ اور کوئی نہیں پہنچے گا، آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیوں نہیں! اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے، ان میں وہ لوگ ہوں گے جو اللہ ﷻ پر ایمان لائے اور انہوں نے رسولوں (علیہم السلام) کی تصدیق کی۔“
(صحیح بخاری، صحیح مسلم، مسند احمد)

آیت نمبر ۲۱: اللہ ﷻ آسمان سے بارش نازل فرماتا ہے اور اس پانی کو چشموں کی صورت میں زمین میں بہا دیتا ہے۔ پھر اس پانی سے کھیتی کے ذریعہ مختلف رنگوں کی کھیتیاں اگاتا ہے جو رفتہ رفتہ اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہیں۔ پھر اس کھیتی پر زوال آتا ہے اور وہ خشک ہو کر زرد پڑ جاتی ہے اور چورا چورا ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ یہی معاملہ انسانی زندگی کا ہے کہ آخر کار مٹی میں مل کر چورا ہو جاتا ہے۔ اس مثال سے عقل مند نصیحت حاصل کرتے ہیں اور آخرت کی دائمی زندگی کے لئے محنت کرتے ہیں۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے دنیا کی ناپائیداری کو ایک مثال کے ذریعہ سے سمجھایا کہ جس طرح کھیتی اگتی ہے، پھر لہلہانے لگتی ہے اور کسان اسے دیکھ کر خوش ہوتا ہے، اسی طرح انسان بھی اپنے بچپن، پھر اپنی جوانی وخوشحالی کو دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے۔ پھر جس طرح کھیتی زرد پڑ جاتی ہے اور چورا چورا ہو جاتی ہے، اسی طرح انسان کی جوانی بھی بڑھاپا میں تبدیل ہو جاتی ہے اور بالآخر وہ بڑھاپا بھی باقی نہیں رہتا، موت آجاتی ہے اور انسان مٹی میں مل کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔

علمی بات: عقل مندوں کے لئے اس مثال میں ایک قسم کی عبرت ہے۔ یہ دنیا سدا بہار نہیں ہے بلکہ اس پر لازماً خزاں آنے والی ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ اپنی جوانی اور خوشحالی میں مغرور اور سرکش نہ ہو جائے۔ اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی یہ جوانی اور خوشحالی ہمیشہ نہیں رہے گی۔ ایک دن آئے گا کہ اس کی یہ جوانی ختم ہو جائے گی اور پھر جو زندگی اسے ملے گی وہ دائمی ہوگی۔ عقل مند وہی ہے جو نہ دنیا کی رونق پر اپنی نگاہوں کو جمائے اور نہ اس کی دلفریبیوں پر للچائے۔ بلکہ آخرت کی دائمی زندگی کی فکر کرے اور دنیا کی کھیتی کے کمال وزوال کو دیکھ کر اپنے کمال وزوال پر غور کرے اور آخرت کو مقصود بنا کر دنیا میں ذمہ دارانہ زندگی گزارے۔

علمی و عملی بات: ایک طرف اللہ ﷻ نے خارجی دنیا کو اس ڈھنگ پر بنایا کہ اس کی ہر چیز حقیقت اعلیٰ کی نشانی بن گئی۔ دوسری طرف انسان کے اندر ایسی صلاحیتیں رکھ دیں کہ وہ ان نشانیوں پر غور و فکر کر کے زندگی کے حقائق کو سمجھے۔ اب جو لوگ اپنی فطری صلاحیتوں کو زندہ رکھیں اور ان سے کام لے کر دنیا کی چیزوں پر غور کریں، ان کے سینے میں معرفت کے دروازے کھل جائیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنی فطری صلاحیتوں کو زندہ نہ رکھ سکیں وہ نصیحتوں کے ہجوم میں بھی نصیحت لینے سے محروم رہیں گے۔ وہ دیکھ کر بھی کچھ نہ دیکھیں گے اور سن کر بھی کچھ نہ سنیں گے۔

آیت نمبر ۲۲: اسلام کے لئے سینہ کھول دینے سے مراد یہ ہے کہ اسلام کی حقانیت کا دل میں یقین پیدا ہو جانا جس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش باقی نہ رہے۔ نور سے مراد اللہ ﷻ کی نازل شدہ کتاب ہے جو زندگی کے ہر میدان میں اس کی رہنمائی کرتی ہے نیز نور سے مراد نورِ ہدایت و معرفت بھی ہے۔ اللہ ﷻ اپنے محبوب بندوں کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور وہ رب کی عطا کردہ روشنی میں پرہیزگاری کے راستہ پر گامزن رہتے ہیں۔ اللہ ﷻ کے احکامات بوجھ محسوس ہوں اور دل اللہ ﷻ کے ذکر سے محرومی کی وجہ سے زیادہ سخت ہو چکے ہوں تو یہ کھلی گمراہی ہے۔ یہ دونوں کردار انجام کے لحاظ سے ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔

علمی بات: اسلام کے لئے سینہ کھولنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ ﷻ نے اسلام کے احکام قبول کرنے کی اس کے دل میں مکمل استعداد پیدا کر دی ہو اور جس فطرت پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے اُس میں وہ فطرت صحیح اور سالم موجود ہو اور اس کی غلط روش کی وجہ سے وہ فطرت ضائع نہ ہوئی ہو۔

علمی بات: اپنے رب کی طرف سے نور پر قائم ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس باہر کی کائنات میں اور انسان کے اپنے اندر اللہ ﷻ نے اپنے وجود، اپنی توحید اور اپنی قدرت پر جو نشانیاں رکھی ہیں وہ ان نشانیوں سے اللہ ﷻ کی ذات اور صفات کی معرفت حاصل کرے اور اس کے دل میں اللہ ﷻ کی عبادت اور اس کے احکام کی اطاعت کی امنگ اور جذبہ پیدا ہو اور جب اس کا یہ نور قوی ہو جاتا ہے تو وہ دوسروں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی مجلس میں بیٹھنے والوں اور اس کی گفتگو سننے والوں کے دلوں میں بھی اللہ ﷻ کی عبادت اور اس کے احکام کی اطاعت کا ذوق اور شوق پیدا ہو جاتا ہے، نور کا معیار یہ ہے کہ جس کو دیکھ کر اللہ ﷻ یاد آئے، جس کی باتیں سن کر دل میں رقت پیدا ہو، جس کی سیرت و کردار دیکھ کر انسان کے دل میں اللہ ﷻ کی اطاعت اور اس کی عبادت کا داعیہ پیدا ہو تو اس شخص میں گویا اللہ ﷻ کی طرف سے عطا کردہ کا نور ہے۔

علمی بات: نور کا ایک اور معیار یہ ہے کہ فحش کاموں کے ارتکاب اور گناہوں کی کثرت سے انسان کے چہرے پر پھٹکار برسنے لگتی ہے، جو گناہوں سے اجتناب کرتا ہو اور نیک کام بکثرت کرتا ہو اس کے چہرے سے سادگی اور بھولپن ظاہر ہوتا ہے اور اس کا چہرہ بارونق ہوتا ہے اور یہ نور کے آثار میں سے ایک اثر ہے، لیکن اصل نورانیت یہی ہے کہ اس پر عبادت اور خوفِ خدا کا غلبہ ہو، وہ یادِ الٰہی سے غافل کرنے والے کاموں سے بچتا ہو۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سورۃ الزمر کی آیت: ۲۲ کی تلاوت فرمائی تو ہم نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! بندہ کا شرحِ صدر کس طرح ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "جب بندہ کے دل میں نور داخل ہوتا ہے تو اس کا شرحِ صدر ہو جاتا ہے"، ہم نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! اس کی علامت کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "وہ دَارُ الْخُلُد (آخرت) کی طرف رجوع کرتا ہے اور دَارُ الْغُرُوْر (دنیا) سے بھاگتا ہے اور موت آنے سے پہلے موت کی تیاری میں لگا رہتا ہے۔" (المستدرک للحاکم)

علمی بات: اللہ ﷻ نے فرمایا کہ جس کا سینہ قبولِ حق کے لئے کھول دیا جائے، وہ اس آدمی کی مانند کیسے ہوگا جس کے دل پر مہر لگا دی جائے اور اس کا سینہ اتنا تنگ ہو جائے کہ قبولِ حق کی اس میں گنجائش باقی نہ رہے؟ ایسے سخت دل اور کفر و شرک کی وادیوں میں بھٹکنے والوں کو دھمکی دی گئی ہے کہ ان کے لئے ہلاکت و بربادی ہے، ان کا حال اس مریض کا سا ہے جس کے لئے دوا باعث ہلاکت بن جائے۔ قرآنِ کریم کو اللہ ﷻ نے تمام روحانی بیماریوں کا علاج بتایا ہے، اسے جب مومن سنتا ہے تو اس کے دل پر اس کا بہت ہی اچھا اثر ہوتا ہے اور اسے نئی زندگی مل جاتی ہے، لیکن سخت دل کافروں اور مشرکوں پر اس کا اثر معکوس ہوتا ہے، یعنی ان کے دلوں کی سختی مزید بڑھتی جاتی ہے اور ان پر موت طاری ہو جاتی ہے، ایسے لوگوں کی ہدایت ممکن نہیں، کیونکہ وہ کھلی گمراہی میں پڑ چکے ہیں۔

فرامینِ نبوی ﷺ: ۱۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اللہ ﷻ کے ذکر کے علاوہ زیادہ مت بولا کرو کیونکہ ذکر اللہ کے علاوہ زیادہ بولنا دل کی سختی کا سبب بن جاتا ہے اور بلاشبہ لوگوں میں اللہ ﷻ سے سب سے زیادہ دور وہی شخص ہے جس کا دل سخت ہے۔" (جامع ترمذی)

۲۔ حضرت عبد اللہ بن بسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: "یارسول اللہ ﷺ! دین کی باتیں تو بہت ہیں ان سب پر مجموعی حیثیت سے عمل کرنا مجھے دشوار معلوم ہو رہا ہے (کیونکہ فضیلت والے اعمال اس قدر ہیں کہ مجھ سے ان سب پر عمل نہیں ہو سکتا) لہٰذا آپ ﷺ مجھے ایسی چیز بتا دیجئے کہ میں اسے

پکڑے رہوں آپ ﷺ نے فرمایا: "کہ تیری زبان ہر وقت اللہ ﷻ کی یاد میں تر رہے۔" (جامع ترمذی)

آیت نمبر ۲۳: اللہ ﷻ نے قرآنِ کریم کی صورت میں بہترین کلام نازل فرمایا۔ قرآن پاک کی چند صفات بیان ہوئی ہیں کہ اس کے مضامین ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اس کی تلاوت بکثرت کی جاتی ہے یا قرآنِ پاک کے مضامین کو ذہن نشین کرنے کے لئے بار بار دہرایا جاتا ہے۔ اللہ ﷻ سے ڈرنے والوں کا قرآنِ حکیم پڑھ کر یہ حال ہوتا ہے کہ ان کے رُونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اللہ ﷻ کی رحمت و مغفرت کی آیات کو سن کر ان کے جسم اور دل اس کی یاد کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ ہدایت ہے کہ اللہ ﷻ جسے چاہے عطا فرما دیتا ہے۔ البتہ جسے اللہ ﷻ گمراہی میں چھوڑ دے تو اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔

عملی پہلو: اللہ ﷻ کی عظمت سے متاثر ہو کر ڈرنے والوں کا قرآنِ حکیم پڑھ کر خشیت و ہیبت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یعنی تلاوت قرآن کا اثر کبھی عذاب کی وعید سن کر یہ ہوتا ہے کہ بدن کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں اور کبھی رحمت و مغفرت کی آیات سن کر یہ حال ہوتا ہے کہ بدن اور قلب سب اللہ ﷻ کی یاد میں نرم ہو جاتے ہیں۔ اولیاء اللہ کی صفت یہ ہے کہ قرآنِ حکیم سن کر ان کے دل موم ہو جائیں اور ذکر اللہ کی طرف وہ جھک جائیں، ان کے دل ڈر جائیں، ان کی آنکھیں آنسو بہائیں اور طبیعت میں سکون پیدا ہو جائے۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عام حال یہی تھا کہ جب ان کے سامنے قرآنِ حکیم کی تلاوت کی جاتی تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے اور بدن پر بال کھڑے ہو جاتے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس مومن کی آنکھ سے اللہ ﷻ کے خوف کی وجہ سے آنسو بہہ نکلیں، خواہ وہ مکھی کے سر کے برابر ہی کیوں نہ ہوں، پھر وہ اس کے رخساروں پر بہیں تو اللہ ﷻ اس کو جہنم پر حرام کر دے گا۔" (سنن ابن ماجہ)

علمی بات: قرآنِ حکیم کی آیتیں حسنِ تعبیر میں ایک دوسرے کی مشابہ ہیں، ان کے مضامین ہم آہنگ ہیں سب ایک دوسرے کی موافقت اور تائید کرتے ہیں، ان میں کسی قسم کا تضاد نہیں۔ جن میں بیان کردہ اوامر و نواہی، وعدہ و وعید اور قصص و مواعظ مختلف انداز میں بار بار ذکر کیئے گئے ہیں، اللہ ﷻ سے ڈرنے والے جب عذاب والی آیتیں سنتے ہیں تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جب رحمت و مغفرت کی آیتیں سنتے ہیں تو ان کے دلوں کو سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے اور اللہ ﷻ کی یاد میں لگ جاتے ہیں۔ اللہ ﷻ نے فرمایا کہ قرآنِ کریم ہی ذریعۂ ہدایت ہے، اللہ ﷻ جسے ہدایت دینا چاہتا ہے اسے اس پر ایمان لانے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی توفیق دے دیتا ہے۔ آخر میں فرمایا کہ جس کے لئے کفر و عناد اور کبر و سرکشی کی وجہ سے اللہ ﷻ کی طرف سے گمراہی لکھ دی گئی ہو اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا ہے۔

ایک ضروری وضاحت: ہمارے ہاں لوگ عام طور پر لفظ "حدیث" کے صرف ایک ہی مفہوم سے آشنا ہیں جو کہ اس لفظ کا اصطلاحی مفہوم ہے یعنی فرمانِ رسول ﷺ کو اصطلاحاً حدیث کہا جاتا ہے۔ جبکہ اس لفظ کے لغوی معنی بات یا کلام کے ہیں اور قرآنِ حکیم میں لفظ "حدیث" اسی مفہوم میں آیا ہے۔ جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "پھر وہ اس (قرآن) کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے؟" (سورۃ المرسلات ۷۷، آیت: ۵۰)

چنانچہ مذکورہ آیت مطالعہ میں اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کا مطلب ہے: بہترین کلام اور بات۔

علمی بات: قرآنِ حکیم کی یہ صفت بھی ہے کہ اس کو بار بار پڑھنے سے طبیعت نہیں اکتاتی، بلکہ ہر بار نئی لذّت اور نیا سرور حاصل ہوتا ہے۔ اس کی اثر انگیزی کا یہ عالم ہے کہ جب ان آیات میں اللہ ﷻ کے جلال و قہر کا، یا اس کے عذاب کا ذکر ہوتا ہے تو خوف کی وجہ سے اپنے رب سے ڈرنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان پرہیزگاروں پر خوف اور دہشت طاری ہو جاتی ہے اور وہ کانپنے لگتے ہیں اور جب اس کی رحمت و مغفرت کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل اور چہرے امید کی بدولت خوشی سے چمک اٹھتے ہیں، نرم یعنی مطیع ہو کر اللہ ﷻ کی یاد میں محو ہو جاتے ہیں، اس کے ذکر میں شوق و رغبت سے مشغول ہو جاتے ہیں۔ ان کے دلوں کو تسکین اور روحوں کو حلاوت ملتی ہے۔

عملی پہلو: ان لوگوں کی بد نصیبی کا کون اندازہ لگا سکتا ہے جن کے دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئے ہیں۔ اللہ ﷻ کے ذکر کا شوق ان کے دلوں میں کبھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ اُنہیں یہ کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ ان کا ایک خالق بھی ہے اور اُنہیں ایک روز اس دنیا سے کوچ بھی کرنا ہے۔ انسان کے اندر یہ خصوصیت ہے کہ جب وہ کوئی دہشت ناک خبر سنتا ہے تو اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کے وجود میں ایک قسم کی عاجزانہ نرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی حال سنجیدہ انسان کا قرآن مجید کو پڑھ کر ہوتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں زندگی کی سنگین حقیقتوں کو انتہائی موئثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے انسان جیسی مخلوق اگر واقعتاً اس کو سمجھ کر پڑھے تو اس کے جسم کے اوپر وہی کیفیت طاری ہو گی جو کسی سنگین خبر کو سن کر فطری طور پر اس کے اوپر طاری ہونا چاہیئے۔

آیت نمبر ۲۴: اللہ ﷻ کے کلام پر غور و فکر کر کے ہدایت حاصل نہ کرنے والے ظالموں کا انجام بیان ہوا ہے کہ روزِ قیامت بدترین عذاب براہِ راست ان کے چہروں پر ہو گا اور وہ اپنے چہروں کو عذاب سے بچا نہ سکیں گے۔ ان کی حسرت میں اضافہ کے لئے کہا جائے گا کہ یہ ان کے اعمال کا بدلہ ہے جو وہ دنیا میں کیا کرتے تھے۔ ایسے لوگ ان کی طرح نہیں ہو سکتے جو روزِ قیامت امن میں ہوں گے۔

علمی بات: سخت دل کفار و مشرکین کا دنیا میں یہ حال بیان کیا گیا کہ وہ ضلالت کی وادیوں میں بھٹکتے رہتے ہیں اور آخرت میں ان کا حال یہ ہو گا کہ ان کے ہاتھ پیٹھ کی طرف یا گردن کے ساتھ باندھ دیئے جائیں گے اور اوندھے منہ جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے، اللہ ﷻ نے ان کی شقاوت و بد نصیبی بیان کرتے ہوئے فرمایا: ”کہ کیا وہ لوگ ان کی مانند ہو سکتے ہیں جو جنت کے باغوں میں پر امن زندگی گزار رہے ہوں گے؟“ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا: ”بھلا وہ شخص جو منہ کے بل اوندھا چل رہا ہے (وہ) زیادہ ہدایت والا ہے یا وہ جو سیدھے راستے پر صحیح چل رہا ہے؟“ (سورۃ الملک ۶۷، آیت: ۲۲)

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا: ”بے شک جو ہماری آیتوں میں ٹیڑھ اختیار کرتے ہیں وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں بھلا جو آگ میں ڈالا جائے (وہ) بہتر ہے یا وہ جو قیامت کے دن امن کی حالت میں آئے گا؟ تم جو چاہو کرو بے شک وہ خوب دیکھ رہا ہے جو تم کر رہے ہو۔“ (سورۃ حٰم السجدہ ۴۱، آیت: ۴۰)

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے پوچھا، یارسول اللہ ﷺ! کافر کو قیامت کے دن اس کے چہرہ کے بل کس طرح چلایا جائے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا جس اللہ ﷻ نے اسے اس دنیا میں دو پاؤں پر چلایا ہے وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ قیامت کے دن اسے اس کے چہرہ کے بل چلا دے؟“ (صحیح بخاری)

علمی بات: یہاں دو اشخاص کا حال بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے روز ایک شخص تو ذلت و خواری کی اس حالت میں مبتلا ہو گا کہ ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور عذابِ الٰہی سامنے سے آ رہا ہے۔ اس کو اتنی بھی قدرت نہیں کہ سامنے سے آنے والے عذاب کو ہاتھ کے ذریعہ روک سکے۔ مجبوراً وہ اپنے چہرے ہی کو سامنے کرتے ہوئے اس عذاب کو دور کرنا چاہے گا۔ دوسرا شخص وہ ہو گا جس کا دل اللہ ﷻ نے اسلام کے لئے کھول دیا تھا اور وہ اعزاز و اکرام اور انعامات کا مستحق ہو گا۔ ظاہر ہے یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ پھر ان ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب تم اپنے ان اعمال کا مزہ چکھو جو تم اس سے پہلے دنیا میں کیا کرتے تھے۔

علمی و عملی بات: چہرہ انسان کا وہ اشرف و اعلیٰ عضو ہے، وہ اس کے حسن و جمال اور اس کے رنگ و روپ کا مظہر ہوتا ہے اور اس کے حواس کے آلات بھی چہرہ میں ہی مرکوز ہوتے ہیں اور ایک انسان دوسرے انسان سے ظاہری طور پر چہرہ سے ہی ممتاز ہوتا ہے اور سعادت اور شقاوت کے آثار بھی چہرہ پر ہی ظاہر ہوتے ہیں، اسی وجہ سے دوسرے مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ”اس دن کئی چہرے چمکتے ہوں گے۔ (وہ) ہنستے مسکراتے خوش و خرم ہوں گے۔ اور اس دن کئی چہروں پر غبار ہو گا۔ ان پر سیاہی چھائی ہو گی۔ یہی لوگ ہوں گے جو کافر (اور) بدکار تھے۔“ (سورۃ عبس ۸۰، آیات: ۳۸ تا ۴۲)

اسی وجہ سے دنیا میں بھی کسی شخص کے چہرہ پر اگر کوئی گھونسہ یا طمانچہ مارے تو وہ چہرہ پر ہاتھ رکھ کر چہرہ کو تکلیف سے بچاتا ہے، آدمی اپنے چہرہ کو بچانے اور محفوظ رکھنے کے لئے ہر چیز کو قربان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب کبھی سامنے سے کوئی حملہ ہو تو ہاتھوں سے روکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ افضل اور اشرف عضو انسان کا چہرہ ہی ہے، اس لئے عذاب تو کفار کے تمام اجسام کو ہو گا لیکن خصوصیت کے ساتھ چہرہ کا ذکر فرمایا۔ محشر میں ظالموں کے ہاتھ بندھے ہوں گے، اس لئے عذاب کی تھپیڑیں سیدھی منہ پر پڑیں گی۔ ان منکروں کی بے بسی کا یہ حال ہو گا کہ اس دن یہ اسی کو اپنے بچاؤ کے لئے استعمال کرنے پر مجبور ہو گا۔ قیامت کا عذاب

آدمی کو اس طرح گھیرے ہوئے ہوگا کہ وہاں یہ ممکن نہ ہو گا کہ آدمی اپنے جسم کے کسی حصہ کو اس کی زد میں آنے سے روک سکے۔ وہ ناقابل دفاع عذاب کے سامنے اس طرح کھڑا ہوا ہو گا گویا وہ خود اپنے چہرہ کو اس کے مقابلہ میں ڈھال بنائے ہوئے ہے۔ اللہ ﷻ کی نظر میں سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ آدمی کے سامنے حق آئے اور وہ اس کا اعتراف نہ کرے۔ ایسے لوگ کسی حال میں اللہ ﷻ کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔

آیت نمبر ۲۵: مخالفین اسلام کو تنبیہ کی گئی ہے کہ ماضی میں بھی حق کو جھٹلانے والوں پر عذاب بھیجا گیا۔ یہ عذاب وہاں سے آیا جہاں سے اُنہیں گمان تک نہ تھا۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے کفار قریش کی عبرت و موعظت کے لئے فرمایا کہ وہ یوں نہ سمجھیں کہ عذاب کی صرف وعیدیں ہی بیان کی جارہی ہیں ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ وعیدیں سچی ہیں، جھٹلانے والوں کو عذاب پہنچ کر رہے گا۔ ان سے پہلی قوموں نے بھی اللہ ﷻ کے رسولوں علیہم السلام کی تکذیب کی پھر ان پر عذاب ایسے طور پر آیا اور ایسی جگہ سے آیا جہاں سے عذاب آنے کی ان کو خبر بھی نہ تھی اور گمان بھی نہ تھا۔ تو اللہ ﷻ نے اُنہیں دنیا میں ذلیل ورسوا کر کے عبرت کا نشان بنادیا۔ کسی کو زمین میں دھنسادیا، کسی کی صورت مسخ کر دی، کسی پر پتھروں کی بارش برسادی، کسی کو آندھی اور طوفان میں غرق کر دیا اور کسی کو قید و بند میں مبتلا کر دیا۔

آیت نمبر ۲۶: منکرین حق کو دنیوی زندگی میں بھی رُسوائی کا مزہ چکھایا گیا اور آخرت کا عذاب تو زیادہ رُسوا کن ہو گا۔ اگر اُنہیں کچھ سمجھ ہوتی تو ایسا طرزِ عمل اختیار نہ کرتے جو ان کے لئے دنیا و آخرت میں رسوائی کا باعث ہوتا۔

علمی بات: منکرین کی مزید بدحالی یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ ان جھٹلانے والوں کو دنیاوی عذاب کے ساتھ آخرت میں اس سے کہیں سخت عذاب پہنچ کر رہے گا۔ کاش! کفار اس بات کا یقین کر لیتے، رسولوں کی تکذیب نہ کرتے اور اپنے خالق و مالک پر ایمان لے آتے تو ہلاکت و بربادی ان کا انجام نہ ہوتا۔

علمی بات: اللہ ﷻ کافروں اور فاسقوں کو دنیا میں بھی سزا دیتا رہتا ہے اس سلسلہ میں بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قیامت کے دن سے پہلے جو حساب کتاب کے لئے مقرر ہے کیوں کر سزا دی جاسکتی ہے؟ تو درحقیقت سزا دینے کا معاملہ حساب و کتاب پر موقوف نہیں ہے۔ حساب و کتاب کا اہتمام تو اس لئے ہو گا کہ اسے مکمل سزا دینے سے پہلے اللہ ﷻ اس کے اعمال کی حجت اس پر قائم کرنا چاہتا ہے تاکہ اس پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ اللہ ﷻ نے اس کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی ہے بلکہ جو کچھ وہ کرتا رہا ہے اسی کا پھل وہ پا رہا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آخرت کی عدالت برپا ہونے سے پہلے وہ مجرموں کو کوئی سزا نہ دے گا۔ چونکہ اللہ ﷻ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ لوگ کافر اور مجرم ہیں اس لئے وہ اپنے اس علم کی بنا پر دنیا میں بھی ان کو عذاب کا مزا چکھاتا رہتا ہے جو عذاب کی محض ایک قسط ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کی روحوں کو عالم برزخ میں جس کا دوسرا نام قبر ہے عذاب میں مبتلا رکھتا ہے۔ مگر بے بصیرت لوگ قبر کے عذاب کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حساب و کتاب سے پہلے عذاب کیسا؟ ان کے اس شبہ کی تردید کے لئے یہ بات کافی ہے کہ اللہ ﷻ کافروں پر دنیا میں بھی عذاب نازل کرتا رہا ہے جس کا ذکر قرآنِ حکیم میں متعدد واقعات کی صورت میں موجود ہے۔ اسی طرح اُنہیں قبر میں بھی شدید عذاب سے دوچار ہونا ہے۔ جس کا ذکر قرآن کریم واحادیث مبارکہ میں موجود ہے۔ اس طرح اُنہیں یہ عذاب روزِ قیامت حساب و کتاب سے پہلے ہی ملتا رہے گا۔

آیت نمبر ۲۷: اللہ ﷻ نے قرآنِ کریم میں اپنی تعلیمات کی وضاحت کے لئے ہر طرح کی مثالیں بیان فرمائی ہیں تاکہ لوگ سمجھیں اور اس سے نصیحت حاصل کریں۔

علمی بات: اس آیت اور اگلی آیت میں اللہ ﷻ نے قرآنِ مجید کی تین صفات بیان فرمائی ہیں: پہلی صفت یہ ہے کہ یہ قرآنِ حکیم ہے یعنی اس کی بہت زیادہ قرأت اور تلاوت کی جاتی ہے۔ اللہ ﷻ نے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے قرآنِ کریم میں بہت سی مثالیں اور گزشتہ قوموں کے واقعات وقصص بیان کیئے ہیں تاکہ وہ ان میں غور و فکر کر کے عبرت حاصل کریں۔

عملی پہلو: اللہ ﷻ نے لوگوں کی ہدایت کے لئے قرآن کریم میں ہر طرح کی مثال بیان کر دی ہے، اب بھی لوگوں کا نہ سمجھنا اُن کی غفلت اور حماقت ہے۔ قرآنِ کریم کے سمجھانے میں کوئی کمی نہیں کہ قرآنِ حکیم تو ایک ایک بات کو مثالوں اور دلیلوں سے سمجھاتا ہے تاکہ لوگ اس سے مستفید ہوں اور اعتقادی و عملی غلطیوں سے پرہیز گاری اختیار کریں، نصیحت پکڑیں اور اپنی عاقبت درست کریں۔

آیت نمبر ۲۸: قرآنِ حکیم کو واضح عربی زبان میں نازل فرمایا گیا ہے۔ اِس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے تاکہ لوگ اس کے مضامین پر غور کرکے ہدایت پائیں اور اللہ ﷻ کی نافرمانی سے بچ جائیں۔

علمی بات: قرآنِ حکیم کی دوسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ عربی زبان میں ہے۔ عرب کے بڑے بڑے ادیبوں، شعراء اور ان لوگوں کو جنہیں اپنے کلام اور زبان وادب کی فصاحت وبلاغت، خوش گفتاری پر بڑا ناز تھا۔ جو یہ سمجھتے تھے ان جیسا کلام کوئی کر نہیں سکتا، قرآنِ مجید کی عربی نے ان کو فصاحت اور بلاغت میں عاجز کر دیا۔ تیسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ اس میں کوئی کجی نہیں ہے، کیونکہ یہ مشاہدہ ہے کہ جب انسان کوئی بہت طویل کلام کرتا ہے تو اس میں ضرور کچھ باتیں ایک دوسرے سے متصادم اور ایک دوسرے سے متعارض ہوتی ہیں جبکہ قرآنِ مجید کی کوئی آیت دوسری آیت سے متعارض نہیں ہے۔ اللہ ﷻ فرماتا ہے: "تو کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے؟ اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یقیناً وہ اِس میں بہت اختلاف پاتے۔" (سورۃ النساء ۴، آیت: ۸۲)

علمی بات: قرآنِ حکیم ہر قسم کی کمی، نقص اور اختلاف سے پاک ہے۔ اس کی ہر بات واضح ہے، جسے سنتے ہی عربی زبان جاننے والے اس کی غرض وغایت سمجھ لیتے ہیں اور اللہ ﷻ نے انسانوں پر یہ کرم اس لئے کیا تاکہ لوگ اس میں موجود اوامر ونواہی کی اتباع کرکے اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے بچا سکیں گے۔

علمی بات: قرآنِ مجید میں کجی نہ ہونے کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ قرآنِ مجید میں جو سابقہ امتوں اور ان کے نبیوں کی خبریں دی گئی ہیں وہ سب صادق ہیں اور ان کے صدق پر کوئی اعتراض نہیں ہے اور قرآنِ مجید میں جو عقائد اور احکام بیان کیئے گئے ہیں وہ سب عقل اور فطرتِ سلیمہ کے مطابق ہیں اور ان میں کوئی چیز خلاف عقل نہیں ہے اور قرآنِ مجید میں اللہ ﷻ کے وجود اور اس کی توحید پر، رسولوں کی بعثت پر، قیامت پر اور جزا اور سزا پر جو دلائل پیش کیئے گئے ہیں ان کی قطعیت میں کوئی ضعف اور جھول نہیں ہے۔

آیت نمبر ۲۹: توحید اور شرک کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا جارہا ہے۔ اگر ایک غلام کے کئی مالک ہوں پھر وہ باہم لڑتے بھی ہوں تو ایسے غلام کی زندگی مشکلات کا شکار ہوگی۔ اس کے برعکس جس غلام کا صرف ایک مالک ہو وہ سکون میں ہوگا کیوں کہ اسے صرف ایک شخص کی خدمت کرنی ہوگی۔ یقیناً یہ دونوں برابر نہیں ہوسکتے۔ اسی طرح مشرک بہت سے معبودوں کو منانے میں لگا رہتا ہے۔ جبکہ صرف ایک اللہ ﷻ کی بندگی کرنے والا سکون واطمینان میں ہوتا ہے اور اسی کا فرماں بردار ہوتا ہے۔ تمام خوبیاں اللہ ﷻ کے لئے ہیں جو مثالیں بیان فرما کر سمجھاتا ہے۔ لیکن لوگوں کی اکثریت بے سمجھ ہے جو اس قدر واضح حقائق کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

علمی بات: یہ آیتِ کریمہ قرآنِ حکیم میں مذکور بہت سی مثالوں میں سے ایک مثال ہے، تاکہ لوگ اس میں غور وفکر کرکے عبرت حاصل کریں۔ ایک غلام کے اگر کئی مختلف المزاج مالک ہوں اور وہ مالک بھی آپس میں جھگڑتے رہتے ہوں تو غلام بڑی مصیبت میں ہوگا اور ہمیشہ پریشانی کا شکار رہے گا کس کس کا کہنا مانے، کس کا نہ مانے، کس کس کو خوش رکھے، کس کس کی خدمت کرے اور کس کس کا حکم بجالائے۔ اگر کوئی ایک بات سے خوش ہوتا ہے تو دوسرا اسی بات سے ناراض ہوتا ہے۔ ایسے غلام کی زندگی تو بڑی مشکل میں پڑ جائے گی۔

اس کے برخلاف جو غلام کسی ایک ہی آقا کی ملکیت میں ہو، اسے یہ پریشانی پیش نہیں آتی، وہ یکسو ہو کر اپنے آقا کی اطاعت کرسکتا ہے اور باآسانی اُسے خوش رکھ سکتا ہے۔ اسی طرح جو شخص توحید کا قائل ہے، وہ ہمیشہ یکسو ہو کر اللہ ﷻ ہی کو پکارتا ہے اور اسی کی عبادت کرتا ہے اس کے برخلاف جن لوگوں نے کئی معبود گھڑ رکھے ہیں، وہ کبھی ایک جھوٹے دیوتا کا سہارا لیتے ہیں، کبھی دوسرے معبود کا اور اُنہیں یکسوئی میسر نہیں آتی۔ اس طرح یہ مثال توحید کی دلیل بھی ہے اور اس کی حکمت بھی۔

آیت نمبر ۳۰: کفار بعض دفعہ آرزو کرتے تھے کہ نبی کریم ﷺ کی وفات ہوجائے (معاذاللہ) تو سارے جھگڑے ختم ہوجائیں۔ ان کی اس آرزو کا جواب دیا گیا ہے۔ بلاشبہ نبی کریم ﷺ بھی دنیا سے رخصت ہو کر رفیق اعلیٰ سے جاملیں گے اور عنقریب کفار بھی فنا ہو کر مٹ جائیں گے۔

علمی بات: کفار اسلام کی روز افزوں ترقی کو دیکھ کر جلتے اور یہ کہہ کر اپنے دلوں کو تسلی دیتے تھے کہ یہ چند روز کا کھیل ہے۔ یہ فوت ہوجائیں گے بیٹا تو ان کا کوئی ہے نہیں، یہ سلسلہ خود بخود ختم ہوجائے گا۔ (معاذاللہ) اللہ ﷻ فرماتا ہے: کہ اے محبوب ﷺ! اس دارِ فنا سے اگر آپ ﷺ نے رخصت ہونا ہے، تو کیا یہ لوگ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ یہ کتنے نادان ہیں کس طرح اپنے آپ کو جھوٹی اور بچگانہ تسلیاں دے رہے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اگر اس صریح حجت کے بعد بھی یہ لوگ پیغمبر ﷺ کی دعوتِ توحید کو قبول نہیں کرتے تو نہ کریں۔ مرنا تو سب کو ہے پھر یہ لوگ مر کر کہاں جائیں گے ؟ اُنہیں لوٹنا اللہ ﷻ ہی کی طرف ہو گا اور وہ ان منکرین کو عذاب میں مبتلا کرے گا۔

آیت نمبر ۳۱: پھر سب کو اپنے پروردگار کے حضور حاضر ہونا ہے اور سب اپنے جھگڑے اس کے حضور پیش کریں گے۔ اس وقت تمام باتوں کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔

علمی بات: قیامت والے دن کے اس بحث و مباحثہ کی نوعیت کچھ یوں ہو گی کہ حضور ﷺ شہادت دیں گے کہ اے اللہ ﷻ! میں نے تیرا پیغام کما حقہٗ ان تک پہنچا دیا تھا۔ ممکن ہے وہاں ان میں سے کچھ لوگ انکار کریں کہ نہیں نہیں یہ بات ان تک نہیں پہنچی تھی اور بحث و تکرار کی نوبت آ جائے۔ چنانچہ وہاں سب پیغمبروں سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے میرا پیغام اپنی اپنی قوموں تک پہنچا دیا تھا؟ جواب میں تمام پیغمبر علیہم السلام گواہی دیں گے کہ اے اللہ! ہم نے تیرا پیغام پہنچا دیا تھا۔ اسی لئے حضور اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر موجود لوگوں سے استفسار فرمایا تھا: کیا میں نے اللہ ﷻ کا پیغام تم لوگوں تک پہنچا دیا؟ جواب میں پورے مجمع نے یک زبان ہو کر عرض کیا: ہم گواہ ہیں کہ آپ ﷺ نے تبلیغ، امانت اور نصیحت کا حق ادا فرما دیا۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے اپنی شہادت کی انگلی مبارک آسمان کی طرف اٹھائی اور اللہ ﷻ کو مخاطب کر کے فرمایا: کہ اے اللہ! تو بھی گواہ رہ، یہ لوگ تسلیم کر رہے ہیں کہ میں نے ان تک تیرا پیغام پہنچا دیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: "اب جو لوگ موجود ہیں ان کا فرض ہے کہ یہ پیغام ان لوگوں تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔"

اس طرح آپ ﷺ نے یہ فریضہ اُمت کی طرف منتقل فرما دیا۔ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کے بعد یوں سمجھیں کہ اب یہ پوری امت اللہ ﷻ کے رسول ﷺ کی نمائندہ ہے۔ یعنی رسول اکرم ﷺ نے جو پیغام ان تک پہنچایا ہے اب انہوں نے اسے پوری نوع انسانی تک پہنچانا ہے۔

علمی بات: قیامت کے دن انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی سرکش امتوں کے درمیان بحث و تکرار تک نوبت پہنچ جائے گی۔ سرکش امتی اپنا انجام بد دیکھ کر بہانہ سازی کی کوشش کریں گے: اے ہمارے رب! ہم تو ایمان لانے کے لئے تیار تھے مگر ہمارے پاس تیرا کوئی رسول نہیں آیا۔ اس پر انبیاء کرام علیہم السلام فرمائیں گے: ہم نے تمہیں اللہ ﷻ کا پیغام پہنچایا تھا مگر تم نے ہمیں جھٹلا دیا تھا۔ اس وقت امتِ مسلمہ اللہ ﷻ کے سامنے گواہی دے گی کہ یہ سرکش قومیں جھوٹ بول رہی ہیں، انبیاء کرام علیہم السلام نے ان تک تیرا پیغام پہنچا دیا تھا مگر انہوں نے دانستہ ان کی تکذیب کی تھی۔

علمی بات: حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ پر یہ آیات نازل ہوئیں: اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ۔ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ "بے شک آپ نے بھی وصال فرمانا ہے اور یقیناً انہوں نے بھی مرنا ہے۔ پھر بے شک تم قیامت کے دن اپنے رب کے پاس آپس میں جھگڑو گے۔" (سورۃ الزمر ۳۹، آیت: ۳۰، ۳۱) تو زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! کیا گناہوں کے ساتھ ساتھ ہمارے دنیا کے جھگڑوں کو بھی ہم پر لوٹا دیا جائے گا؟ (کیا ان کے بارے میں باز پرس ہو گی؟) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہاں، (تمہارے ان جھگڑوں کو بھی) تم پر البتہ ضرور لوٹا دیا جائے گا، تاکہ ہر حق دار کو اس کا حق دلا دیا جائے۔" زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ ﷻ کی قسم! یہ معاملہ تو بہت سخت ہو گا۔ (مسند احمد، جامع ترمذی)

آیت نمبر ۳۲: انسانوں کے دو کرداروں کا بیان ہے۔ پہلا کردار اس شخص کا ہے جو اللہ ﷻ کی طرف جھوٹ منسوب کرتا ہے اور سچی بات کو جھٹلاتا ہے۔ یعنی وہ شخص اللہ ﷻ کے ساتھ شرک کرتا ہے اور توحید کی دعوت کو جھٹلا دیتا ہے۔ ایسا شخص سب سے بڑا ظالم ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ کفر کرنے والوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔

علمی بات: کفار ایک تو حضور ﷺ کی دعوت کو قبول نہیں کرتے مزید برآں اللہ ﷻ پر بہتان لگاتے ہیں اور غلط باتیں منسوب کرتے ہیں۔ ان سے بڑھ کر اور کون ظالم ہو گا۔ مشرکین اللہ ﷻ کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے تھے جو اللہ ﷻ نے نہیں بتائی تھیں۔ ان باتوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ مشرکین یوں کہتے کہ اللہ ﷻ نے اپنے شریک بنا لیئے ہیں اور یہ کہ اللہ ﷻ نے اپنے لئے اولاد تجویز کر لی ہے (معاذ اللہ) نیز مشرکین کا یہ مزاج بھی تھا کہ جب کسی برے کام سے روکا جاتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ اللہ ﷻ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے (معاذ اللہ)۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "تو اس سے بڑا ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا اس کی آیات کو جھٹلائے ایسے لوگوں کو اُن کے نصیب میں لکھا ہوا پہنچ کر رہے گا یہاں تک کہ جب اُن کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے آئیں گے وہ اُن کی

جانیں نکالیں گے (فرشتے) کہیں گے کہ اللہ کے سوا جن کی تم عبادت کرتے تھے وہ کہاں ہیں؟ وہ جواب دیں گے کہ وہ ہم سے گم ہو گئے اور وہ اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ بے شک وہ کافر تھے۔" (سورۃ الاعراف ۷، آیت: ۳۷)

آیت نمبر ۳۳: منکرینِ حق کے برعکس جو حق بات لائے اور جو اسے قبول کرے وہی درحقیقت متقی ہیں۔ سچی بات لانے والے نبی کریم ﷺ اور اس کی تصدیق کرنے والے سے مراد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ذات بابرکات ہے۔ یا سچی بات لانے والی ذات نبی کریم ﷺ اور سچی بات کی تصدیق کرنے والے سے مراد اہل ایمان ہیں۔

علمی و عملی بات: نبی کریم ﷺ سچائی کا دین لے کر تشریف لائے اور جن خوش نصیب لوگوں نے صدقِ دل سے اس دین کو قبول کر لیا یہی نیک اور پرہیزگار لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے زمانۂ کفر کے گناہ یا زمانۂ اسلام کے قصور معاف فرما کر دے گا اور سارے نیک کاموں کا عظیم اجر عطا فرمائے گا اور جنت میں جو وہ چاہیں گے ان کا رب اُنہیں عطا فرمائے گا۔ سچ بولنا اور ہر حال میں سچ پر قائم رہنا تقویٰ کی علامت ہے جس کا ہمیں پوری طرح اہتمام کرنا چاہیئے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تم ہمیشہ سچ بولا کرو کیونکہ سچ نیکی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور نیکی جنت کا راستہ دکھاتی ہے اور ایک شخص ہمیشہ سچ بولتا ہے (اور سچ ہی کی تلاش میں رہتا ہے) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نہایت سچ بولنے والا لکھ دیا جاتا ہے۔ (جھوٹ سے بچو) کیونکہ جھوٹ گناہوں کی طرف لے جاتا ہے اور بے شک گناہ جہنم تک پہنچا دیتا ہے اور ایک شخص ہمیشہ جھوٹ بولتا ہے (اور جھوٹ ہی کی تلاش میں رہتا ہے) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت زیادہ جھوٹ بولنے والا لکھ دیا جاتا ہے۔" (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۳۴: متقین کے لئے بشارت دی گئی ہے کہ ان کے پروردگار کے ہاں اُنہیں ہر وہ نعمت فراہم کی جائے گی جس کی وہ خواہش کریں گے۔ نیکی کرنے والوں کا ایسا ہی عمدہ بدلہ ہے۔

علمی بات: ایمان، تقویٰ اور حسنِ عمل کے اوصاف جن لوگوں نے اپنے اندر پیدا کر لیئے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے کہ ان کی تمام آرزوئیں پوری ہوں گی اور وہ جو چاہیں گے وہ اُنہیں ملے گا۔ کسی بھی چیز کو حاصل کرنے کے لئے اُنہیں تکلیف اور رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اس لئے ان کی زندگی اطمینان، سکون، راحت اور مسرت کی زندگی ہوگی۔

علمی بات: محسنین کے چند مفہوم یہ ہیں: پہلا جو نیکیاں کرنے والے ہیں۔ دوسرا جو اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں جیسے حدیث شریف میں احسان کی تعریف کی گئی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اگر یہ تصور ممکن نہ ہو تو کم از کم یہ ضرور ذہن میں رہے کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے تیسرا جو لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور اچھا برتاؤ کرتے ہیں۔ چوتھا جو ہر نیک عمل کو اچھے طریقہ سے، خشوع و خضوع سے اور سنتِ نبوی ﷺ کے مطابق کرتے ہیں۔ وہ کثرت سے بڑھ کر عمل میں حسن کا خیال رکھتے ہیں۔

آیت نمبر ۳۵: ایمان رکھنے کے انعام میں ان کے گناہوں کو معاف کر دیا جائے گا۔ حق کا ساتھ دینے کا اجر ان کے بہترین اعمال کی مناسبت سے عطا کیا جائے گا۔

علمی بات: انبیاء کرام علیہم السلام تو معصوم ہیں۔ لیکن انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ تو ہر شخص سے غلطی اور خطا کا امکان ہے۔ چنانچہ سابقہ آیات میں جن متقین اور محسنین کا ذکر ہے اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں اور لغزشوں کو معاف فرما کر ان کے نامۂ اعمال کو بُرائیوں اور گناہوں سے بالکل پاک کر دے گا۔

ظاہر بات ہے کہ ہر نیک شخص کے تمام نیک اعمال ایک جیسے نہیں ہوتے، یعنی نیکیوں کی بھی درجہ بندی ہے۔ کوئی نیکی بہت اعلیٰ درجہ کی ہے تو کوئی نسبتاً نچلے درجہ کی۔ لہٰذا مذکورہ لوگوں کے اعمال کی جزا اللہ تعالیٰ ان کے بلند ترین درجہ کے اعمال کے مطابق عطا فرمائے گا اور ان ہی اعمال کی مطابقت سے جنت میں اُنہیں مقام و مرتبہ عطا فرمائے گا جبکہ ان کے بُرے اعمال کے منفی اثرات سے اُنہیں پاک کر دے گا۔

علمی بات: نیک لوگوں پر مزید کرم یہ کیا جائے گا کہ ایمان لانے سے پہلے جو سنگین جرم ان سے سرزد ہوئے تھے اور جن گناہوں کا انہوں نے ارتکاب کیا تھا ان کو اس طرح ڈھانپ دیا جائے گا کہ ان کا سراغ تک بھی کسی کو معلوم نہ ہو گا۔ کفر کا اصل معنیٰ یہ ہے کہ کسی چیز کو اس طرح ڈھانپ دینا کہ اس چیز کا نام و نشان بھی دکھائی نہ دے۔

علمی و عملی پہلو: اسلام قبول کرنے کے بعد جو نیکیاں وہ کریں گے ان کا بہترین اجر اُنہیں دیا جائے گا۔ اللہ ﷻ کی نوازشات کا کیا کہنا ساری عمر برباد کرنے کے بعد بھی اگر کوئی نادم اور شرمسار ہو کر درِ اقدس پر حاضر ہوتا ہے تو اس کے لئے آغوشِ رحمت کو کشادہ کر دیا جاتا ہے۔ اس کے سابقہ نامہ ٔ اعمال کی سیاہی دھو دی جاتی ہے اور اس پر ایسے ایسے کرم فرمائے جاتے ہیں جنہیں دیکھ کر دنیا رحمتِ الٰہی پر حیران ہو جاتی ہے۔

آیت نمبر ۳۶: مشرکین مکہ نبی اکرم ﷺ اور اہلِ ایمان کو اپنے خود ساختہ معبودوں کی ناراضگی سے ڈرانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کو آگاہ کیا جارہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور اہلِ ایمان کو اللہ ﷻ کی حمایت حاصل ہے۔ ہٹ دھرم کفار پر اللہ ﷻ نے گمراہی مسلط کر دی ہے اور اُنہیں کوئی ہدایت دینے پر قادر نہیں ہے۔

علمی بات: کفار قریش نبی کریم ﷺ کی وفات کی تمنا کیا کرتے تھے اور انہوں نے اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لئے آپ ﷺ کو شہید بھی کرنا چاہا۔ (معاذاللہ) اسی پس منظر میں اللہ ﷻ نے اپنے رسول ﷺ کو اطمینان دلایا کہ آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ کے لئے یقیناً کافی ہے۔ اس لئے کفار آپ ﷺ کا بال بھی بیکا نہیں کر سکیں گے اور ان کی سازشیں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ وہ لوگ اپنی جہالت و نادانی میں آپ ﷺ کو اپنے بتوں سے ڈراتے ہیں، کہتے ہیں کہ وہ بت آپ ﷺ کو قتل کروا دیں گے، یا جنون میں مبتلا کر دیں گے (معاذاللہ)۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ﷻ جسے گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا، جیسے کفار مکہ ہیں اور جسے اللہ ﷻ ہدایت دے، جیسے آپ ﷺ ہیں، اسے راہِ راست سے کوئی ہٹا نہیں سکتا ہے۔ اللہ ﷻ بڑا زبردست اور اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔ اس لئے اگر کفار قریش اس کے رسول ﷺ کی ایذا رسانی سے باز نہ آئے تو وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لے کر رہے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور کفار مکہ میدانِ بدر میں جس طرح ذلیل و رسوا کیے گئے تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں اور بالآخر مکہ مکرمہ فتح ہوا اور مشرکین مکہ کی طاقت ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔

علمی بات: اللہ ﷻ اپنے محبوب ﷺ کو تسلی دے رہا ہے کہ آپ ﷺ کے ہر معاملہ میں اللہ ﷻ خود آپ ﷺ کا محافظ و ناصر ہے اور جس کا محافظ و ناصر خود اللہ ﷻ ہو کیا ایسے شخص کو کسی دوسرے سہارے اور مددگار کی ضرورت باقی رہتی ہے، ہرگز نہیں۔ اے محبوب ﷺ! ساری دنیا بھی اگر آپ ﷺ کی مخالفت پر کمربستہ ہو جائے تو آپ ﷺ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے یہ لوگ کتنے احمق اور نادان ہیں جو آپ ﷺ کو اپنے معبودانِ باطل کے غیظ و غضب سے ڈراتے ہیں۔

علمی و عملی بات: جو بندے صدقِ دل سے اللہ ﷻ پر ایمان رکھتے اور اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ وہ ان کی حفاظت اور حمایت کے لئے کافی ہے کہ اللہ ﷻ کے اذن کے بغیر کوئی چیز بھی ان کو کوئی تکلیف اور نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اگر کوئی اس خوف اور اندیشہ میں مبتلا ہو کہ کوئی چیز اللہ ﷻ کی مشیت اور اس کی مرضی کے خلاف اس کو نقصان پہنچا سکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ایسا شخص اللہ ﷻ کو اپنی حفاظت کے لئے کافی نہیں سمجھتا اور یہ چیز واضح طور کفریہ روش ہے (والعیاذ باللہ العظیم)۔ اللہ ﷻ ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین۔

عملی پہلو: اللہ ﷻ کے سوا دوسروں سے ڈرانے والے گمراہ ہوتے ہیں۔ جسے اللہ ﷻ گمراہی کے لئے کھلا چھوڑ دے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں اور جسے اللہ ﷻ ہدایت پر قائم رکھے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا۔ ہر کسی کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ ﷻ بدلہ لینے میں پوری طرح غالب ہے۔ اس فرمان میں اللہ ﷻ نے توحید کے داعی اور حق کے مبلغ کو ہدایت پر قائم رہنے کی ضمانت دی ہے۔ آپ ﷺ کی دعا: یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ "اے دلوں کو پھیرنے والے ! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھنا۔" (جامع ترمذی)

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: "اگر تم اللہ ﷻ پر ایسے ہی توکل (بھروسہ) کرو جیسا کہ اس پر توکل (بھروسہ) کرنے کا حق ہے، تو وہ تم کو ایسے رزق دے گا جیسے پرندوں کو دیتا ہے، وہ صبح میں خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر لوٹتے ہیں۔" (ابن ماجہ)

آیت نمبر ۳۷: جسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہدایت دے دیتا ہے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا۔ بلاشبہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ زبردست ہے اور نافرمانوں سے انتقام لینے پر قادر ہے۔

علمی بات: جو لوگ بت پرست ہیں وہ اپنے ان معبودوں کے ضَرر پہنچانے سے ڈرتے ہیں، جو انہوں نے خود تجویز کر رکھی ہے۔ یہ لوگ اپنی گمراہی سے ان میں نفع و ضرر سمجھتے ہیں اور ان سے خود بھی ڈرتے ہیں اور دوسروں کو بھی ڈراتے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے قادر، کافی، عزیز (غالب) ہونے اور انتقام لینے کی قدرت ہونے پر ان کی نظر نہیں۔ کاش کہ وہ سمجھ سکتے کہ جس کا کارساز اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہو اس کو بتوں سے اور مخلوق سے ڈرانا ایک مضحکہ خیز چیز ہے۔

علمی بات: اللہ سبحانہ وتعالیٰ غالب ہے اس لئے اس کے احکام نافذ ہو کر رہتے ہیں اور وہ سزا دینے والا ہے اس لئے جہاں حق و عدل کا تقاضا ہوتا ہے اس کی سزا کا قانون حرکت میں آتا ہے۔ یہ کافروں اور مشرکوں کو تنبیہ ہے کہ وہ یہ خیال نہ کریں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کے کفر، شرک اور بغاوت کی سزا نہیں دے گا۔

عملی پہلو: اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ غیر اللہ سے خطرہ محسوس کرنا یا اس سے کسی فائدہ پہنچنے کی توقع رکھنا اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر توکل کے خلاف ہے اور کسی کو نیک کاموں کے کرنے پر غیر اللہ سے خصوصاً باطل خداؤں سے ڈرانا بہت بڑی گمراہی ہے۔

آیت نمبر ۳۸: یہ بات مشرکین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کائنات کا خالق اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے۔ جب کہ مشرکین جن کی عبادت کرتے ہیں ان کی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اگر انسان پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے کوئی آفت نازل ہو تو ان خود ساختہ معبودوں میں سے کوئی اسے دور نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کسی بندہ کو اپنی رحمت سے نواز دے تو یہ باطل معبود اس کو روکنے پر قادر نہیں ہیں۔ نبی کریم ﷺ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کو کافی سمجھتے ہیں اور توکل کرنے والے اہل ایمان بھی اسی پر توکل کرتے ہیں۔

علمی بات: اس آیت کریمہ میں کفار مکہ کی جہالت و نادانی اور ان کی کم عقلی بیان کی گئی ہے کہ جن بتوں کے غیظ و غضب سے یہ لوگ آپ ﷺ کو ڈرا رہے ہیں اور ان کے بے پایاں اختیارات کے افسانے گھڑ گھڑ کر پیش کر رہے ہیں، آپ ذرا ان سے یہ تو پوچھیں کہ آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ تو یہ ناچار ہو کر کہیں گے اللہ سبحانہ وتعالیٰ۔ تو پھر وہ لوگ خالق ارض و سما کو چھوڑ کر بتوں کی پرستش کیوں کرتے ہیں؟ اسی لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ ﷺ کی زبانی ان سے پوچھا کہ اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ مجھے کوئی تکلیف دینا چاہے، تو تم لوگ جن بتوں کی پرستش کرتے ہو، کیا وہ میری اس تکلیف کو دور کر دیں گے؟ اور اگر وہ مجھے اپنے فضل و کرم سے نوازنا چاہے تو کیا وہ بت اسے روک دیں گے؟ جواب یقیناً نفی میں ہے۔ اس لئے کہ ان کے اندر نفع و نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں ہے۔ اس لئے اے کفار قریش! میرا یہ اعلان سن لو کہ میرے لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کافی ہے، میں اسی پر بھروسہ کروں گا اور اسی کی عبادت کروں گا، صاحب ایمان لوگ تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اے لڑکے! میں تجھے چند کلمات سکھاتا ہوں، (وہ یہ کہ) تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو یاد رکھ تو وہ تیری حفاظت کرے گا، تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو یاد رکھ تو اسے ہر وقت اپنے پاس پائے گا۔ آسانی کے وقت رب کی نعمتوں کا شکر گزار رہ تو سختی کے وقت وہ تیرے کام آئے گا۔ جب تو کچھ مانگے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی سے مانگ اور جب مدد طلب کرے تو اسی سے مدد طلب کر۔ یقین کر لے کہ اگر تمام دنیا مل کر تجھے کوئی ایسا فائدہ پہنچانا چاہے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تیرے مقدر میں نہ لکھا ہو تو وہ ہرگز نہیں پہنچا سکتے اور اگر سب جمع ہو کر تجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ تجھے نقصان نہ پہنچانا چاہے تو وہ سب تجھے ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ صحیفے خشک ہو چکے اور قلمیں اٹھالی گئیں۔" (جامع ترمذی، مسند احمد)

عملی پہلو: پتھر کے بے جان بت جن کو انسان نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے، جو اپنے اوپر بیٹھی ہوئی مکھی کو بھی اڑانے پر قادر نہیں ہیں وہ کب کسی سے ضرر کو دور کر سکتے ہیں یا کسی سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رحمت کو دور کر سکتے ہیں، کسی صاحب عقل کو ان دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہونا چاہیئے کہ یہ بت اس کا کچھ بگاڑ لیں گے یا اس کے کسی فائدہ کو روک لیں گے۔ نیز اس آیت میں فرمایا: "آپ فرما دیجئے میرے لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کافی ہے بھروسہ رکھنے والے اسی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔" اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ جو شخص کافی سے غیر کافی کی طرف منتقل ہو گا اس کا مقصود پورا نہیں ہو گا، اس لئے ضروری ہے کہ تمام معاملات میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر توکل کیا جائے تمام امور اسی کو سونپ دیئے جائیں اور صرف رب کی اطاعت کی جائے اور جب بندہ صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اطاعت کرے گا تو کائنات کی ہر چیز اس کی اطاعت کرے گی۔

آیت نمبر ۳۹: آپ ﷺ کو حق کی دعوت دیتے رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زبانی مخالفین کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ بھی اپنی جگہ پر کام کرتے رہیں۔ پھر وہ عنقریب جان لیں گے کہ کس کا عمل درست تھا اور کون غلط تھا؟

علمی بات: اس آیت کریمہ میں نبی کریم ﷺ کی زبانی کفار قریش کو دھمکی دی گئی ہے کہ تم لوگ دعوت حق سے جس بغض وعداوت کا معاملہ کر رہے ہو، اسی پر اڑے رہو، میں بھی ایمان و توحید اور اللہ ﷻ کی اطاعت و بندگی پر قائم رہتا ہوں میں تو اللہ ﷻ پر اپنا بھروسہ رکھ کر تم کو نصیحت کرے کرتا جاؤں گا تم اگر میری نصیحت کو نہیں مانتے تو جو کچھ تم مکر وحیلے میری عداوت میں کر رہے ہو وہ کرو۔ عنقریب تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا اور تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں رُسواکن عذاب کسے آلیتا ہے اور جہنم کا دائمی عذاب کس کا ٹھکانا ہو گا؟ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ میدان بدر میں اللہ ﷻ نے کفارِ قریش کو ذلیل وخوار کیا۔

علمی بات: اس قرآنِ حکیم میں اللہ ﷻ نے دین کی وہ سچی باتیں تم پر نازل فرمائی ہیں کہ جس نے ان پر عمل کیا وہ بھلائی کو پہنچا اور جو اس راستہ سے بہکا وہ خرابی میں پڑ گیا ان بہکنے والوں کی گمراہی کا کچھ الزام آپ ﷺ کے ذمہ نہیں ہے کیونکہ اللہ ﷻ کے علم کے نتیجہ کا ظہور ہے جو ضرور ہو کر رہے گا۔

آیت نمبر ۴۰: منکرین حق کو اس بات کا بھی علم ہو جائے گا کہ کس پر رسوا کن اور ہمیشہ طاری رہنے والا عذاب نازل ہو گا۔ رسوا کرنے والے عذاب سے مراد دنیا کا عذاب ہے اور دائمی عذاب سے مراد آخرت کا عذاب ہے۔

علمی بات: اس سے مراد دنیا کا عذاب ہے جیسا کہ جنگ بدر میں ہوا کافروں کے ستر (۷۰) آدمی قتل اور ستر (۷۰) ہی آدمی قید ہوئے حتیٰ کہ فتح مکہ کے بعد غلبہ و تمکن بھی مسلمانوں کو حاصل ہو گیا جس کے بعد کافروں کے لئے سوائے ذلت ورسوائی کے کچھ باقی نہ رہا۔

علمی بات: مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ ان سے کہہ دیجئے اگر تم نہیں مانتے اور باوجود قائل ہو جانے کے پھر بھی اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہو تو اچھا اپنے ڈھنگ پر جو کرتے ہو وہ کیئے جاؤ۔ ہاں اتنی بات کہہ دیتا ہوں کہ بہت جلد تم کو معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں کس پر رسوا کن عذاب آتا ہے اور کس پر مرنے کے بعد دائمی عذاب نازل ہو گا۔

آیت نمبر ۴۱: رسول کریم ﷺ کی ذمہ داری یہ ہے کہ حق لوگوں تک پہنچا دیں۔ جو شخص قرآن کریم کی ہدایت پر عمل کرے گا وہ دنیا و آخرت میں کامیاب ہو گا۔ لیکن جو قرآنِ کریم سے منہ موڑے گا وہ گمراہ ہو گا اور گمراہی کی ذمہ داری خود اسی پر ہو گی۔ رسول کریم ﷺ کی ذمہ داری لوگوں سے حق منوانا نہیں ہے۔

علمی بات: اہل قریش کے کفر پر اصرار کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ کو تکلیف ہوتی تھی۔ اللہ ﷻ نے اُنہیں تسلی دی کہ آپ ﷺ کا کام دل نشین اور مؤثر انداز میں بڑی دل سوزی اور اخلاص اور صدقِ دل کے ساتھ پیغامِ حق پہنچا دینا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنا فرض احسن طریقہ سے ادا کر دیا ہے۔ اب ان کی گمراہی کے متعلق آپ ﷺ سے کسی طرح کی پوچھ گچھ نہیں ہو گی۔ ہم نے آپ ﷺ کو کتابِ حق دے کر مبعوث کیا ہے اور آپ ﷺ کی ذمہ داری تبلیغ وبیان کی ہے، کسی کو ہدایت دینا آپ ﷺ کی ذمہ داری نہیں۔ جو شخص قرآنِ حکیم پر ایمان لائے گا اور ایمان و عمل کی زندگی اختیار کرے گا، اس کا فائدہ اسے ہی ملے گا کہ وہ جہنم سے نجات پا جائے گا اور جنت کا حق دار بنے گا اور جو گمراہ ہو گا تو اس کا انجام بد وہ خود ہی بھگتے گا، بایں طور کہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں ڈال دیا جائے گا اور اللہ ﷻ کی لعنت وغضب کا مستحق بنے گا۔

آیت نمبر ۴۲: ہر انسان کو اللہ ﷻ نیند کی صورت میں ایک موت سے دوچار کر دیتا ہے۔ جس کے متعلق موت کا فیصلہ ہو جاتا ہے اسے حقیقی موت دے دی جاتی ہے۔ جس کی مہلت عمر باقی ہوا سے عارضی موت یعنی نیند سے بیدار کر دیا جاتا ہے۔ پھر مقررہ وقت آنے پر اسے بھی موت دے دی جاتی ہے۔ موت وحیات کے اس نظام میں غور وفکر کرنے والوں کے لئے اللہ ﷻ کی قدرت کی نشانیاں موجود ہیں۔

علمی بات: اس آیتِ کریمہ میں اللہ ﷻ نے بندوں کو یہ خبر دی ہے کہ پوری کائنات میں وہی اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرتا ہے، وہی فرشتوں کے ذریعہ سے انسانوں کی روحوں کو ان کے جسموں سے نکال لیتا ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے یہ دنیا چھوڑ جاتے ہیں۔ وہی انسانوں پر نیند طاری کرتا ہے، جس کے سبب ان کے ظاہری

حواس کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر ان میں سے جسے اللہ ﷻ دنیا سے اٹھالینا چاہتا ہے، اسے واقعی موت دے دیتا ہے اور جس کی موت نہیں لکھی ہوتی اس کی روح لوٹ آتی ہے۔

عملی پہلو: لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ سوتے وقت اور نیند سے بیدار ہوتے وقت وہ دعائیں پڑھ لیا کریں جن کا درج ذیل دو احادیث مبارکہ میں ذکر ہے:

ا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: جب حضور اقدس ﷺ رات کے وقت اپنے بستر پر تشریف لے جاتے تو اپنی ہتھیلی رخسار کے نیچے رکھ لیتے، پھر فرماتے: اَللّٰھُمَّ بِاسْمِكَ اَمُوْتُ وَاَحْیَا "اے اللہ! میں تیرے نام کے ساتھ سوتا اور جاگتا ہوں۔" اور جب بیدار ہوتے تو یوں (دعا) فرماتے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَحْیَانَا بَعْدَ مَآ اَمَاتَنَا وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ۔ "سب تعریفیں اللہ ﷻ کے لئے ہیں جس نے ہمیں مرنے کے بعد زندہ کیا اور اسی کی طرف (ہمیں قیامت کے دن) لوٹنا ہے۔" (صحیح بخاری)

۲۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جب تم میں سے کوئی اپنے بستر سے اٹھے اور پھر واپس جائے تو اسے اپنے اِزار کے پلّو سے تین مرتبہ جھاڑے کیونکہ اسے معلوم نہیں کہ اس کے بعد بستر پر کیا چیز آئی ہے۔ پھر لیٹتے وقت کہے:

بِاسْمِكَ رَبِّیْ وَضَعْتُ جَنْبِیْ وَبِكَ اَرْفَعُهٗ فَاِنْ اَمْسَكْتَ نَفْسِیْ فَارْحَمْهَا وَاِنْ اَرْسَلْتَهَا فَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهٖ عِبَادَكَ الصَّالِحِیْنَ۔ "اے میرے رب! میں نے تیرے نام سے اپنا پہلو (بستر پر) رکھا اور تیرے ہی نام سے اٹھاؤں گا۔ اگر تو میری جان روک لے تو اس پر رحم فرما اور اگر اسے بھیج دے تو اس کی ایسے حفاظت فرما جیسے تو اپنے نیک بندوں کی حفاظت فرماتا ہے۔" اور جب بیدار ہو تو کہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ عَافَانِیْ فِیْ جَسَدِیْ وَرَدَّ عَلَیَّ رُوْحِیْ وَاَذِنَ لِیْ بِذِكْرِهٖ۔ "سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے میرے جسم میں مجھے عافیت دی، میری روح میری طرف لوٹادی اور مجھے اپنے ذکر کی اجازت دی۔" (جامع ترمذی)

آیت نمبر ۴۳: مشرکین ہر دور میں اپنے خود ساختہ معبودوں کی پرستش کے لئے یہ دلیل دیتے ہیں کہ یہ معبود اللہ ﷻ کی بارگاہ میں ان کی سفارش کریں گے۔ حالانکہ یہ باطل معبود نہ کوئی قدرت و اختیار رکھتے ہیں اور نہ کوئی سمجھ بوجھ۔

علمی بات: مشرکین کو اللہ ﷻ کی نشانیوں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا، انہوں نے توحید باری تعالیٰ سے منحرف اور سرکش ہو کر اللہ ﷻ کی جناب میں ایسے معبودوں کو اپنا سفارشی فرض کر لیا ہے جن کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں اور عقل و فہم سے بھی بالکل کورے ہیں۔ بتا دیا گیا کہ یہ پتھر، مٹی، لکڑی، تانبے اور پیتل کے بنے ہوئے بت بے جان ہونے کے باعث ہر قسم کے فہم و شعور سے اور قوت و اختیار سے محروم ہیں وہ کسی شے کے مالک نہیں ہیں۔ اللہ ﷻ نے ان سے اپنے نبی ﷺ کی زبانی فرمایا کہ کیا یہ بت تمہارے سفارشی ہوں گے؟ شفاعت کا مالک تو وہ اللہ ﷻ ہے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے اور اسی کے پاس سب کو لوٹ کر جانا ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت نہیں کر سکے گا۔

آیت نمبر ۴۴: شفاعت کا اصل اختیار صرف اللہ ﷻ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اس کی شان تو یہ ہے کہ پوری کائنات کا مالک بھی وہی ہے۔ تمام انسان بھی اسی کی بارگاہ میں پیش ہوں گے۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت نہ کر سکے گا۔

علمی بات: یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ سفارش کے بارے میں ہر طرح کا اختیار اللہ ﷻ ہی کو ہے وہ جسے چاہے گا اور جس کے لئے چاہے گا سفارش کرنے کی اجازت دے گا، اس کے یہاں مشرک اور کافر کی بخشش نہیں۔ اس لئے جو بندے اس کے نزدیک شفاعت کرنے کے اہل ہیں وہ انبیاء کرام علیہم السلام، ملائکہ عظام اور اولیاء اللہ ہیں۔ انہیں کافروں اور مشرکوں کی سفارش کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی۔ لہٰذا شرک و کفر میں مبتلا رہنا اور اپنے معبودوں کی سفارش کا بخشش کے لئے سہارا لینا یہ سراپا جہالت اور حماقت اور گمراہی ہے۔ اس بیان سے مشرکین کے اس سوال کا جواب بھی واضح ہو گیا ہے کہ ہم نے تو فرشتوں کو اور بعض پیغمبروں کو بھی الوہیت میں شریک کر رکھا ہے وہ تو شفاعت کے اہل ہیں اوپر کے بیان میں واضح ہو گیا کہ جس کی بخشش نہیں اس کے لئے نہ کوئی سفارش کرے گا نہ اس کے لئے سفارش کی اجازت دی جائے گی اور بلا اجازت کسی کو سفارش کا اختیار نہیں۔

آیت نمبر ۴۵: منکرین آخرت توحید کی دعوت سے اختلاف اور اس پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں۔ جبکہ اپنے خود ساختہ معبودوں کی تعریف و تحسین سے خوش ہوتے ہیں۔

علمی بات: مشرکین کا خاصہ ہے کہ اگرچہ وہ بعض وقت زبان سے اللہ ﷻ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن ان کے دل اللہ وحدہٗ کے ذکر اور اس کی حمد و ثنا سے خوش نہیں ہوتے۔ شرک کا یہ ایک بدترین نتیجہ ہے کہ مشرکین کے سامنے جب صرف اللہ ﷻ کا نام لیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے تو ان کے دل سخت تنگی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جس کا اثر ان کے چہروں پر ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جب ان کے جھوٹے معبودوں کے نام لیئے جاتے ہیں تو خوشی کے مارے ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ ان کی بدنصیبی یہ ہے کہ دونوں ہی حالتوں میں وہ انتہا کو پہنچے ہوتے ہیں۔ جب صرف اللہ ﷻ کا نام آتا ہے تو شدّتِ غم سے ان کے چہروں کا رنگ بدل جاتا ہے اور جب دوسرے دیوتاؤں یا جھوٹے معبودوں کا نام لیا جاتا ہے تو پھولے نہیں سماتے تو مارے خوشی کے اچھلنے لگتے ہیں اور خوشی کے آثار ان کے چہروں پر نمایاں ہوتے ہیں۔

علمی بات: کفار کو اللہ ﷻ کا ذکر کرنا ناگوار ہوتا ہے اور مسلمان اللہ ﷻ کے ذکر سے خوش ہوتے ہیں اور اس کے ذکر کو محبوب رکھتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے:
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص جس چیز سے محبت کرتا ہے اس کا بکثرت ذکر کرتا ہے۔“ (کنز العمال)

آیت نمبر ۴۶: نبی کریم ﷺ کی دعوت توحید کو جھٹلانے والوں کا معاملہ اللہ ﷻ پر چھوڑ دینے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ اللہ ﷻ سے فیصلہ فرما دینے کے لئے دعا کی تلقین کی گئی ہے۔ نبی کریم ﷺ تہجد کی نماز کے آغاز میں بھی یہ دعا مانگتے تھے۔

علمی بات: نبی کریم ﷺ کو تلقین فرمائی جا رہی ہے کہ جب آپ ﷺ کے اور کافروں کے درمیان اختلاف شدید ہو جائے اور آپ ﷺ دل گیر، افسردہ اور رنجیدہ ہونے لگیں، تو اپنے رب کی طرف تیزی سے لپکیں، دعا کریں اور خشوع و خضوع کے ساتھ کہیں کہ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے! غائب و حاضر کو جاننے والے! تو ہی اپنے مومن و کافر بندوں کے درمیان ان باتوں میں فیصلہ فرمانے والا ہے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں، تو حق کی طرف میری رہنمائی فرما۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو سلمہ بن عبد الرحمن رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کس دعا سے اپنی نماز (تہجد) شروع فرماتے تھے؟ انھوں نے فرمایا: آپ ﷺ جب رات کو نماز کے لئے اٹھتے تو یہ دعا پڑھتے تھے: اَللّٰھُمَّ رَبَّ جِبْرِیْلَ وَمِیْکَائِیْلَ وَاِسْرَافِیْلَ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ أَنْتَ تَحْکُمُ بَیْنَ عِبَادِکَ فِیْمَا کَانُوْا فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ اَللّٰھُمَّ اھْدِنِیْ لِمَا اخْتُلِفَ فِیْہِ مِنَ الْحَقِّ اِنَّکَ تَھْدِیْ مَنْ تَشَاءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ
”اے اللہ! جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل کے رب! آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے والے! ہر غیب اور حاضر کے جاننے والے! تیرے بندے جس چیز میں اختلاف کرتے ہیں تو ان میں فیصلہ فرمائے گا، اے اللہ! مجھے اس حق کی طرف رہنمائی فرما جس چیز میں حق بات سے اختلاف کیا گیا ہے۔ بے شک تو جس کو چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دیتا ہے۔“ (سنن نسائی، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

آیت نمبر ۴۷: ظالموں سے مراد کفار و مشرکین ہیں۔ روزِ قیامت وہ چاہیں گے کہ زمین کی کل دولت بلکہ اس سے بھی دگنی بطور فدیہ دے کر خود کو عذاب کی سختی سے بچا لیں۔ لیکن ایسا ہولناک عذاب ان کے سامنے آئے گا جس کا وہ گمان بھی نہیں کر سکتے۔

علمی بات: عذابِ آخرت کی شدت اور ہولناکی بیان کی گئی ہے۔ شرک کا ارتکاب کر کے اپنے آپ پر ظلم کرنے والے جب قیامت کے دن عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو اس کی ہولناکی و سختی کا نظارہ کر کے تمنا کریں گے کہ اگر ان کے پاس زمین کے بھراؤ کے برابر دولت ہوتی اور اتنی دولت اور ہوتی اور وہ سب دے کر اس عذاب سے نجات مل جاتی تو وہ ایسا کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہ کرتے، اس لئے کہ وہ ایسا خطرناک اور دردناک عذاب ہو گا جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا۔ وہ دنیا میں جن گناہوں کا ارتکاب کرتے تھے ان کا انجام بد ان کی آنکھوں کے سامنے ہو گا اور جس عذاب کا مذاق اڑاتے رہے تھے وہ اُنہیں ہر طرف سے گھیر لے گا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا: "اللہ ﷻ اس شخص سے فرمائے گا جسے جہنم میں سب سے ہلکا عذاب ہو گا کہ اگر تیرے پاس ساری دنیا اور جو کچھ اس میں ہے، وہ سب کچھ ہو تو کیا تو (اپنے آپ کو اس عذاب سے چھڑانے کے لئے) وہ سب کچھ بطور فدیہ دے دے گا؟ وہ کہے گا کہ ہاں! تو اللہ ﷻ فرمائے گا، مگر میں نے تو اس سے کہیں آسان بات اس وقت چاہی تھی (کہ جس میں کچھ خرچ بھی نہیں تھا) جب تو آدم کی پشت میں تھا، میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا لیکن تم نے (توحید کا) انکار کیا اور نہ مانا آخر شرک ہی کیا۔" (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۴۸: ظالمین کے تمام جرائم ان کے سامنے آجائیں گے۔ جس عذاب کا وہ دنیا میں مذاق اڑاتے تھے وہ اُنہیں ہر طرف سے گھیر لے گا۔

علمی بات: قیامت کے دن مشرکین کا سخت برا حال ہو گا۔ اگر اس روز فرض کیجیے کل روئے زمین کے خزانے بلکہ اس سے بھی زائد ان کے پاس موجود ہوں تو چاہیں گے کہ سب دے دلا کر کسی طرح اپنی جان چھڑا لیں، جو بدکاریاں اور بدمعاشیاں دنیا میں کی تھیں سب ایک ایک کر کے ان کے سامنے ہوں گی۔ ایسے قسم قسم کے ہولناک عذابوں کا مزہ چکھیں گے جو کبھی ان کے خیال و گمان میں بھی نہ گزرے تھے۔ غرض توحید خالص اور دین حق کا جو مذاق اڑاتے تھے اس کا وبال پڑ کر رہے گا اور جس عذاب کا مذاق اڑایا کرتے تھے وہ ان پر الٹ پڑے گا۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں انہوں نے جو بُرے کام کیئے تھے آخرت میں ان پر عذاب کے آثار مرتب ہوں گے اور وہ عذاب ہر طرف سے ان کا احاطہ کر لے گا۔

آیت نمبر ۴۹: لوگوں کی ناشکری کا تذکرہ ہے۔ انسان کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اللہ ﷻ کو مدد کے لئے پکارتا ہے جب تکلیف دور کر کے اللہ ﷻ اسے اپنی نعمت سے نوازتا ہے تو وہ اس نعمت کو اپنی صلاحیت اور علم کا نتیجہ قرار دے کر نعمت کی ناشکری کرتا ہے۔ جب کہ اللہ ﷻ انسان کو نعمتوں سے نواز کر اس کی آزمائش کرتا ہے لیکن بہت سے لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

علمی بات: ناشکرے انسان کی قبیح عادت کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس وقت وہ اللہ ﷻ کو پکارتا ہے، گڑ گڑاتا ہے، فریاد کرتا ہے۔ لیکن جب اسے اس تکلیف سے نجات مل جاتی ہے اور اللہ ﷻ اس پر اپنی گونا گوں رحمتوں کا مینہ برسا دیتا ہے تو یہ شخص نہیں کہتا کہ میرے رب نے مجھ پر احسان فرمایا ہے بلکہ کہتا ہے کہ یہ میری ذاتی قابلیت اور مہارت کا نتیجہ ہے۔ میرے جیسا لائق فائق انسان اس خوشحالی کا مستحق ہے، یہ بنگلہ، یہ کوٹھی، یہ کار، یہ بچے اور بیوی زندگی کی ساری سج دھج اور رونقیں میں نے اپنی ذاتی کاوش اور محنت سے حاصل کی ہیں، مجھ پر کسی کی عنایات نہیں۔ ایسا شخص فریب خوردہ ہے۔ حقیقت حال سے بالکل بے خبر ہے۔

عملی پہلو: ہر شخص کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ ﷻ اس کو یہ ساری راحتیں اس لئے بخش رہا ہے کہ اس کا امتحان لے۔ غم و الم کے زمانہ میں جس رب کریم کو وہ ہر وقت یاد کیا کرتا تھا اب عیش و آرام کے زمانہ میں بھی وہ اپنے مُنعِمِ حقیقی کو یاد کرتا ہے یا نہیں، اس کا شکر گزار بندہ بنتا ہے یا نہیں۔ لیکن اکثر لوگ اس آزمائش کی طرف خیال ہی نہیں کرتے اور یوں ناکام ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو تباہی کے گڑھے میں پھینک دیتے ہیں۔

آیت نمبر ۵۰: ماضی میں بھی انسانوں کی ناشکری کی یہی روش رہی ہے۔ اس وقت ان کی دولت ان کے کام نہیں آئی اور وہ اللہ ﷻ کی پکڑ کا شکار ہو گئے۔

علمی بات: گزری ہوئی قومیں بھی مال و دولت کی فراوانی اور اپنی مادی ترقی کو اپنے ہنر اور دانش مندی کا نتیجہ قرار دیتی اور ان پر اتراتی رہیں ہیں لیکن جب ان کے کرتوتوں کی وجہ سے ان پر اللہ ﷻ کا عذاب آیا تو یہ چیزیں ان کے کچھ بھی کام نہ آسکیں۔ ناشکری کے باعث ان سے وہ نعمتیں چھین لی گئیں اور اُنہیں ہولناک انجام سے دوچار کر دیا گیا، پھر نہ ان کی علمی قابلیت اور دانشمندی ان کو ہماری گرفت سے بچا سکی اور نہ ذاتی جدوجہد اُنہیں کوئی فائدہ پہنچا سکی۔

مثلاً قارون اور فرعون وغیرہ بھی ایسے ہی دعوے کیا کرتے تھے۔ جب اللہ ﷻ نے قارون کو اس کے محل سمیت زمین میں دھنسا دیا تو اپنی اس دولت کے بل پر وہ اللہ ﷻ کے عذاب سے بچ نہ پایا اور نہ ہی فرعون کو اس کی بادشاہت اور محلات بچا سکے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا "یقیناً (ایسی بات) ان لوگوں نے بھی کہی تھی جو ان سے پہلے تھے تو ان کے کام نہ آیا جو وہ کمایا کرتے تھے۔" (سورۃ الزمر ۳۹، آیت: ۵۰)

آیت نمبر ۵۱: ماضی کے ناشکروں کو بھی ان کے اعمال کی سزا دی گئی ہے۔ مشرکین مکہ کو تنبیہ ہے کہ ناشکری سے باز نہ آنے پر وہ بھی ایسے ہی انجام سے دوچار ہوں گے۔ وہ کسی حال میں اللہ ﷻ کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔

علمی بات: مشرکین مکہ کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ ان سے پہلے جن قوموں نے سرکشی اور ناشکری کی اُنہیں اپنے کرتوتوں کی سزا ملی اور ان کی تباہ شدہ بستیاں تم اپنے تجارتی سفروں میں دیکھ چکے ہو۔ اب اگر تم بھی اپنے مظالم سے باز نہ آئے تو تم پر بھی عنقریب عذاب آجائے گا۔ جس طرح پہلی قومیں اللہ ﷻ کے عذاب سے نہ بچ سکیں اسی طرح تم بھی اس کے عذاب سے نہ بچ سکو گے۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ عرب کے جو لوگ اپنی سرکشی پر قائم رہے وہ یا تو جنگوں میں مارے گئے یا پھر عرب چھوڑ کر کسی دوسرے ملک میں چلے گئے۔

علمی بات: گزشتہ قوموں کے لوگ بھی اسی طرح کی ڈینگیں مارتے تھے جس طرح کی یہ مشرکین مکہ ڈینگیں مار رہے ہیں پھر جب ان کی شامت آئی تو ان کی ساری قابلیت دھری کی دھری رہ گئی جس قابلیت کے وہ دعوے دار تھے اور ان کا سارا بھرم کھل گیا اور آپ ﷺ کے زمانہ کے کفار و مشرکین بھی وہی کچھ کر رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کا انجام بھی یقیناً وہی ہو گا جو گزشتہ قوموں کے نافرمان لوگوں کا ہوا تھا۔ کیا اُن کی صلاحیتیں اُن کے کام آئیں جو اِن کی صلاحیتیں ان کے کام آئیں گی؟

آیت نمبر ۵۲: اللہ ﷻ جس کے لئے چاہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لئے چاہے تنگ کر دیتا ہے۔ بلاشبہ یہ نشانیاں صرف اہلِ ایمان کے لئے ہیں کیوں کہ وہی ان پر غور و فکر کر کے مستفید ہوتے ہیں۔

علمی بات: رزق کی کشادگی اور تنگی میں بھی اللہ ﷻ کی توحید کے دلائل ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں صرف اللہ ﷻ کا ہی کا حکم و تصرف چلتا ہے، اُسی کی تدبیر مؤثر اور کارگر ہے، اسی لئے وہ جسے چاہتا ہے وافر رزق سے نواز دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے فقر و تنگ دستی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس کے ان فیصلوں میں، جو اس کی حکمت و مشیت پر مبنی ہوتے ہیں، کوئی دخل انداز ہو سکتا ہے نہ ان میں ردوبدل کر سکتا ہے۔ تاہم یہ نشانیاں صرف اہل ایمان ہی کے لئے ہیں کیونکہ وہی ان پر غور و فکر کر کے ان سے فائدہ اٹھاتے اور اللہ ﷻ کی مغفرت حاصل کرتے ہیں۔

علمی بات: رزق کی کمی بیشی کسی کے مقبول یا مردود ہونے کی دلیل نہیں ہے بلکہ دولت اور غربت کی دونوں حالتیں انسان کے لئے آزمائش ہیں اور اللہ ﷻ کے ہاں مقبول وہ ہے جو ان دونوں حالتوں میں اللہ ﷻ سے ڈرتا اور اس کی نافرمانی سے بچتا ہے۔ گویا رزق میں تنگی اور کشادگی کا مدار انسان کے علم اور اس کی عقل پر نہیں ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے علم اور عقل والے تنگ دست، مفلس اور مفلوک الحال ہوتے ہیں جبکہ بہت سے جاہل اور بے وقوف لوگ خوش حال اور مال دار ہوتے ہیں۔ پس مال کی کثرت اور قلت کا مدار اللہ ﷻ کے فضل اور اس کی حکمت پر ہے وہ اپنی حکمت کی وجہ سے یا کسی کو آزمائش میں مبتلا کرنے کے لئے اس کو مال کی تنگی میں مبتلا کر دیتا ہے اور کسی کو ڈھیل دینے کے لئے یا اس پر فضل فرمانے کے لئے اس کو مال کی کثرت سے نوازتا ہے۔

عملی پہلو: مصیبت کے وقت اللہ ﷻ سے فریاد کرنا اور مصیبت ٹل جانے کے بعد اللہ ﷻ کو بھول جانا یہ کفار کا طریقہ ہے لہٰذا مسلمانوں کو چاہیئے کہ ہر حال میں اللہ ﷻ سے تعلق مضبوط رکھیں اور اسے یاد رکھیں اسی میں ہماری فلاح و نجات ہے۔

آیت نمبر ۵۳: یہ گناہ گاروں اور مجرمین کے لئے انتہائی امید افزا آیت ہے۔ اللہ ﷻ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے کیوں کہ اللہ ﷻ بہت زیادہ بخشنے والا اور نہایت رحم فرمانے والا ہے۔ اللہ ﷻ کی رحمت سے مایوس ہونا کفر ہے۔ اللہ ﷻ کی رحمت بہت وسیع ہے اور وہ سارے گناہوں کو معاف فرما دینے والا ہے۔ البتہ اس کے لئے سچی توبہ ضروری ہے۔ اللہ ﷻ کی رحمت اس کے غضب پر حاوی ہے۔ توبہ کرنے والوں کے لئے معافی، نظر کرم اور فضل کا وعدہ ہے۔ ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہے کہ کیا ہم اللہ ﷻ کے وعدہ کا یقین رکھتے ہوئے اس کے حضور سچی توبہ کرتے ہیں؟

علمی بات: اس آیتِ طیبہ میں بھی ان لوگوں کو نوید رحمت دی جا رہی ہے جو عمر بھر اپنے اوپر زیادتیاں کرتے رہے۔ جن کے شب و روز فسق و فجور میں بسر ہوتے رہے۔ جنہوں نے کفر و شرک کا ارتکاب کر کے اپنے آپ کو بالکل برباد کر دیا۔ ایسے لوگوں کو کہا جا رہا ہے کہ آؤ میری رحمت کا دروازہ تمہارے لئے کھلا ہوا ہے۔

COPYRIGHTS ® RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION, SALE OF THIS BOOK WOULD ENTAIL CIVIL/CRIMINAL ACTION

اگر تم سچے دل سے تائب ہو کر نئی اور پاکیزہ زندگی شروع کرنے کا عزم کر چکے ہو تو تمہارے گناہ بے شمار اور نہایت سنگین کیوں نہ ہوں معاف کر دیئے جائیں گے۔ تمہیں یہاں سے مایوس نہیں لوٹایا جائے گا۔

شانِ نزول: یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی جنہوں نے شرک، قتل اور زنا جیسے گناہوں کا ارتکاب کیا تھا اور اسلام قبول کرنا چاہتے تھے، لیکن ڈرتے تھے کہ شاید ان کے گناہ معاف نہیں کیئے جائیں گے۔ اللہ ﷻ نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ اللہ ﷻ کے تمام بندوں کو اس کی وسیع رحمت اور عظیم مغفرت کی خوش خبری دے دیجیئے کہ اُنہیں اللہ ﷻ کی رحمت سے نا امید نہیں ہونا چاہیئے وہ تو اپنے بندوں کے تمام گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے، اس لئے کہ وہ بڑا معاف فرمانے والا اور بے حد مہربان ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ کچھ مشرکوں نے بہت سے قتل کیئے تھے اور وہ زنا کا ارتکاب بھی کثرت سے کر چکے تھے، پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور عرض کرنے لگے، یہ جو آپ ﷺ فرماتے ہیں اور جس دین کی طرف آپ ﷺ (ہمیں) بلاتے ہیں وہ سب اچھا ہے، مگر آپ ﷺ ہمیں یہ بتائیں کہ اب تک ہم جو گناہ کر چکے ہیں کیا وہ (اسلام قبول کرنے سے) معاف ہو جائیں گے؟ (اگر ایسا ہے تو ہم آپ ﷺ کی دعوت پر غور کریں) چنانچہ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ "اور وہ جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پوجتے۔" اور نہ ہی اللہ کی حرام کی ہوئی جان کو ناحق قتل کرتے ہیں اور نہ (ہی) وہ زنا کرتے ہیں اور جو شخص یہ کام کرے گا وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا۔" (سورۃ الفرقان ۲۵، آیت: ۶۸) " اور جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور نہ اس جان کو قتل کرتے ہیں جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ۔" اور یہ آیت نازل ہوئی: قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ "آپ فرما دیجیئے اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا۔" (سورۃ الزمر: آیت ۵۳) (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

علمی و عملی بات: اگر کسی شخص نے ساری زندگی کفر، شرک یا گناہوں میں گزاری ہے تو وہ یہ نہ سمجھے کہ اب اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی بلکہ اللہ ﷻ کی رحمت ایسی ہے کہ مرنے سے پہلے پہلے جس وقت بھی انسان اپنی اصلاح کا پختہ ارادہ کر کے اللہ ﷻ سے اپنی پچھلی زندگی کی معافی مانگے اور توبہ کر لے تو اللہ ﷻ اس کے تمام گناہوں کو معاف فرما دے گا۔

فرامینِ نبوی ﷺ: ۱۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ اپنے مومن بندے کی توبہ سے اس آدمی سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے، جو ایک بے آب و گیاہ ہلاکت خیز میدان میں اپنے اس اونٹ کے ساتھ ہو جس پر اس کا کھانا اور پانی لدا ہے۔ وہ وہاں سو جائے اور جب جاگے تو اپنا اونٹ نہ پائے۔ پھر اسے تلاش کرے، یہاں تک کہ اسے پیاس لگ جائے۔ پھر کہے کہ میں جہاں سے آیا تھا وہیں لوٹ جاؤں اور وہیں سو جاؤں اور مر جاؤں۔ پھر مرنے کے لئے اپنا سر اپنی کلائی پر رکھے (اور سو جائے)، پھر جاگے تو اپنا اونٹ اپنے پاس پائے، اس پر اس کا زادِ سفر، اس کا کھانا اور پانی بھی ہو، تو اللہ ﷻ کو مومن بندے کی توبہ سے اس سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے جتنی اس شخص کو اپنے اونٹ اور توشہ ملنے سے ہوتی ہے۔" (صحیح مسلم)

۲۔ حضرت جندب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ایک شخص نے کہا، اللہ کی قسم! اللہ ﷻ فلاں آدمی کو نہیں بخشے گا۔ تو اللہ ﷻ نے فرمایا، کون ہے جو میری قسم کھاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں فلاں کو نہیں بخشوں گا؟ اب میں نے اسے تو بخش دیا مگر تیرے اعمال کو ضائع کر دیا۔" (صحیح مسلم)

علمی و عملی بات: سورۃ الزمر کی مذکورہ بالا آیت بندوں کے لئے بہت بڑی ڈھارس ہے اور اس میں بندوں کو حکم دیا ہے کہ اللہ ﷻ کی رحمت سے نا امید نہ ہوں کروڑوں گناہ بھی اللہ ﷻ کی رحمت اور مغفرت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو بے شک اللہ کی رحمت سے کافر لوگ مایوس ہوتے ہیں۔" (سورۃ یوسف ۱۲، آیت: ۸۷) اور سورۃ الحجر میں ارشاد ہے:

"اپنے رب کی رحمت سے گمراہوں کے سوا اور کون نا امید ہو سکتا ہے۔" (سورۃ الحجر ۱۵، آیت: ۵۶)

علمی و عملی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ کی مغفرت کی وسعت کا بیان ہے۔ اسراف کے معنی ہیں گناہوں کی کثرت اور اس میں افراط۔ اللہ ﷻ کی رحمت سے نا اُمید نہ ہونے کا مطلب ہے کہ ایمان لانے سے قبل یا توبہ و استغفار کا احساس پیدا ہونے سے پہلے کتنے بھی گناہ کیئے ہوں، انسان یہ نہ سمجھے کہ میں بہت زیادہ گناہ گار ہوں، مجھے اللہ ﷻ کیونکر معاف کرے گا؟ بلکہ سچے دل سے اگر ایمان قبول کرلے گا یا توبہ کرلے گا تو اللہ ﷻ تمام گناہ معاف فرمادے گا۔ شان نزول کی روایت سے بھی یہی مفہوم ثابت ہوتا ہے۔ البتہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اللہ ﷻ کی رحمت و مغفرت کی اُمید پر خوب گناہ کیئے جائیں اس کے احکام و فرائض کی مطلق پروانہ کی جائے اور اس کے حدود اور ضابطوں کو بے دردی سے پامال کیا جائے۔ اس طرح اس کے غضب و انتقام کو دعوت دے کر اس کی رحمت و مغفرت کی اُمید رکھنا دانش مندی بالکل نہیں ہے اور یہ محض خام خیالی ہے۔ ایسے لوگوں کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ جہاں اپنے بندوں کے لئے غفور رحیم ہے وہاں وہ نافرمانوں کے لئے عزیز ذو انتقام بھی ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں متعدد جگہ ان دونوں پہلوؤں کو ساتھ ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ "آپ میرے بندوں کو بتا دیجئے کہ بے شک میں بڑا ہی بخشنے والا نہایت رحم فرمانے والا ہوں اور (اس بات سے بھی آگاہ کر دیجئے) کہ میرا ہی عذاب بڑا دردناک عذاب ہے۔"
(سورۃ الحجر ۱۵، آیات: ۴۹، ۵۰)

علمی بات: وفادار بندوں کا یہ شعار نہیں کہ مغفرت کا وعدہ سن کر بے خوف ہو جائیں بلکہ مغفرتوں کی بشارتوں کے بعد اور زیادہ گناہوں سے بچنے اور نیکیوں میں ترقی کرنے کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہے حضور اقدس ﷺ سے بڑھ کر کسی کے لئے بشارتیں نہیں ہیں۔ اس کے باوجود آپ راتوں رات نمازیں پڑھتے تھے جس کی وجہ سے آپ کے قدم مبارک متورم ہو جاتے۔ کتنے ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسے تھے جن کو حضور اقدس ﷺ نے اس دنیا میں ہی جنتی ہونے کی خوشخبری دے دی تھی۔ عشرہ مبشرہ (دس خوشخبری پانے والے جنتی) تو مشہور ہی ہیں۔ غزوۂ بدر میں شرکت کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ ﷻ کی طرف سے حضور اقدس ﷺ نے یہ خوشخبری دی: کہ اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ فَقَدۡ غَفَرۡتُ لَکُمۡ "تم جو چاہو کرو میں نے تم کو بخش دیا۔" (صحیح بخاری)

ان حضرات کے علاوہ اور بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جن کو حضور اقدس ﷺ نے جنت کی بشارت دی لیکن ان حضرات نے اس کا یہ اثر بالکل نہیں لیا کہ گناہ کرتے چلے جائیں اور فرائض کو ضائع کرتے رہیں بلکہ یہ حضرات برابر گناہوں سے پرہیز کرتے رہتے تھے اور نیکیوں میں ترقی کے لئے کوشاں رہتے تھے اور معمولی سا گناہ ہو جانے پر فکر مند ہو جاتے تھے اور ڈرتے رہتے تھے۔ ہمیں ان ہی حضرات کی اتباع کرنا لازم ہے۔ ارشاد فرمایا گیا: وَاِنِّیۡ لَغَفَّارٌ لِّمَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهۡتَدٰى۔ "اور یقیناً میں بہت بخشنے والا ہوں اس شخص کو جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کیئے پھر ہدایت پر قائم رہا۔" (سورۃ طٰہٰ ۲۰، آیت: ۸۲)
یعنی مزید عمل صالح پر مداومت کریں۔

علمی و عملی بات: صغیرہ گناہوں کی مغفرت اور ان کا کفارہ تو اعمال صالحہ سے بھی ہوتا رہتا ہے لیکن کبیرہ گناہوں کی یقینی طور پر مغفرت ہو جانا توبہ کے ساتھ مشروط ہے اگر توبہ نہ کی اور اسی طرح موت آگئی تو بشرط ایمان مغفرت تو پھر بھی ہو جائے گی لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ بلا عذاب مغفرت ہو جائے، اللہ ﷻ بلا توبہ بھی مغفرت فرما سکتا ہے اور اسے یہ بھی اختیار ہے کہ گناہوں کی سزا دینے کے لئے دوزخ میں ڈال دے پھر عذاب کے ذریعہ پاک وصاف کرکے جنت میں بھیجے چونکہ عذاب کا خطرہ بھی لگا ہوا ہے اس لئے پکی توبہ اور استغفار کرتے رہنا چاہیئے اور اللہ ﷻ سے ہمیشہ مغفرت کی امید رکھنی چاہیئے۔ اس کی رحمت سے نا امید کبھی نہیں ہونا چاہیئے تاکہ اس حال میں موت آئے کہ توبہ کے ذریعہ سب کچھ معاف ہو چکا ہو۔ صحیح طریقہ یہی ہے کہ ہم برابر توبہ کرتے رہیں اگر خدانخواستہ توبہ ٹوٹ جائے پھر کرلیں، پھر اگر توبہ ٹوٹتی رہے، بار بار ہم توبہ کرتے رہیں اور اللہ ﷻ کے دامنِ رحمت و مغفرت کو نہ چھوڑیں۔

آیت نمبر ۵۴: گناہوں کی بخشش کے لئے پہلی دو شرائط کا بیان ہے: ۱۔ اللہ ﷻ کی طرف رجوع کیا جائے یعنی باطل عقائد اور بُرے اعمال کو چھوڑ دیا جائے۔ ۲۔ اللہ ﷻ کی فرماں برداری کی جائے۔ اس کے احکام سے انحراف نہ کیا جائے۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ عذاب آجائے یہ شرائط پوری کی جائیں کیونکہ عذاب آجانے کے بعد لوگوں کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہے کہ ہم گناہوں سے اجتناب اور اللہ ﷻ کی فرماں برداری کا اہتمام کر رہے ہیں یا نہیں؟

علمی و عملی بات: معافی کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ اللہ ﷻ کے حضور خلوص دل سے توبہ کی جائے، معصیت کی روش ترک کر کے اور آئندہ کے لئے اپنے اعمال کو درست کر لیا جائے۔ ایسی توبہ کا انعام اللہ ﷻ کی طرف سے یہ ملے گا کہ وہ تمام گناہ معاف فرما دے گا۔ قرآنِ حکیم میں اس بارے میں بہت واضح حکم موجود ہے: ’’مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیا تو یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ جن کی بُرائیوں کو نیکیوں سے بدل دے گا اور اللہ بڑا ہی بخشنے والا نہایت رحم فرمانے والا ہے۔ اور جو توبہ کرے اور نیک عمل کرے تو بے شک وہ اللہ ہی کی طرف رجوع کرتا ہے۔‘‘ (سورۃ الفرقان ۲۵، آیات: ۷۰، ۷۱) چنانچہ سابقہ گناہوں کی معافی توبہ سے ممکن ہے۔ لیکن توبہ وہی قبول ہوگی جس کے بعد انسان کے اعمال درست ہو جائیں اور اگر ایسا نہ ہوا تو رسمی اور زبانی توبہ بے معنیٰ ہے۔ معلوم ہوا کہ ایمان اور عمل صالح اور توبہ پر استقامت ضروری ہے۔ یہ تفصیل اس لئے لکھی گئی ہے کہ کوئی شخص اللہ ﷻ کی وسیع رحمت اور عموم مغفرت کی بات سن کر گناہوں میں جرّی ہو کر بڑھتا نہ جائے اور توبہ میں دیر نہ لگائے کیونکہ احادیث مبارکہ سے یہ بات ثابت ہے کہ بہت سے اہل ایمان بھی اپنے گناہوں کی وجہ سے دوزخ میں داخل ہوں گے پھر عذاب بھگت کر فرشتوں اور انبیاء کرام علیہم السلام اور دیگر اہل ایمان کی شفاعت سے اور محض اَلرَّحْمُ الرّٰحِمِیْن کی رحمت سے دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے۔

توبہ کی شرائط: توبہ کے معنیٰ ہیں: اللہ ﷻ کی طرف پلٹنا یعنی نافرمانی چھوڑ کر فرماں برداری اختیار کرنا۔ توبہ کی یہ شرائط ہیں: ۱۔ گناہ کو ترک کرنا۔ ۲۔ گناہ پر سچی ندامت ہونا۔ ۳۔ گناہ کو آئندہ نہ کرنے کا عزم کرنا۔ ۴۔ اگر کسی بندہ کا حق مارا ہے تو اسے لوٹانا یا اس سے معافی مانگنا۔

توبہ کے حوالہ سے چند خاص باتیں اچھی طرح یاد رکھنے والی یہ ہیں:

۱۔ توبہ کا دروازہ کھلا ہے توبہ کی شرائط پوری کرتے ہوئے توبہ کی جائے۔

۲۔ موت سے پہلے توبہ کریں کیونکہ موت کے وقت توبہ قبول نہ ہوگی۔

۳۔ قیامت کے دن یہ حیلہ ہرگز قبول نہ ہوگا کہ ہمیں تو معلوم ہی نہ ہوا کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی آخر الزمان سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تک برابر انبیاء و رسل علیہم السلام لوگوں کی ہدایت کے لئے مسلسل تشریف لاتے رہے ہیں۔

۴۔ جو نیک کام کرنا ہے فوراً کریں کیونکہ موت اور قیامت یک دم آجائے گی کیوں کہ جو شخص مر گیا اس کے لئے قیامت آگئی۔ لہٰذا زندگی کے ہر سانس کو مہلت سمجھ کر نیک عمل میں لگے رہنا چاہیئے۔

۵۔ قیامت کے بعد پچھتاوا کسی کام نہ آئے گا۔ عذاب کو دیکھ کر دوبارہ دنیا میں آکر نیکی اختیار کرنے کی خواہش بالکل بے کار ہوگی۔ کیونکہ یہاں کی زندگی بس ایک ہی دفعہ ہوگی۔

عملی پہلو: عقل مند اور سچا مومن وہی ہے جو اللہ ﷻ کی طرف سے دی گئی اس پیشگی اطلاع پر ایمان لے آئے اور اس آنے والے اور ہمیشہ رہنے والے جہان کی تیاری پوری طرح اس زندگی میں کر لے۔ اس وقفہ سے پورا پورا فائدہ اٹھائے اور دنیا و آخرت کما لے۔ یہی سچے مومن کی نشانی ہوتی ہے کہ وہ مضبوط عقیدہ کی وجہ سے اللہ ﷻ کی کہی ہوئی بات دوزخ و جنت کا بیان کیا ہوا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور دل میں اتر جاتا ہے پھر کون ہے جو جنت کی تمنا نہ کرے اور دوزخ کی راہوں پر چل نکلے اور بُرے انجام سے دوچار ہو۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ کی طرف رجوع ہونے اور اس کا فرماں بردار بننے کا حکم دیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ عذاب کے آنے سے پہلے اللہ ﷻ کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور اس کے فرماں بردار بن جاؤ جب اللہ ﷻ کا عذاب آجائے گا تو اس وقت مدد نہ کی جائے گی۔ لفظ ’’وَاَنِیْبُوْا‘‘ اِنَابَۃٌ سے نکلا ہے۔ انابۃ اور توبہ میں یہ فرق ہے کہ توبہ کرنے والا عذاب کے ڈر سے اللہ ﷻ کی طرف رجوع ہوتا ہے اور انابت کرنے والا اللہ ﷻ کے کرم اور فضل سے متاثر ہو کر شرما جاتا ہے اور یہ حیا اسے اللہ ﷻ کی طرف رجوع ہونے پر آمادہ کرتی ہے۔ اَسْلِمُوْا لَہٗ کا مطلب ہے کہ بندہ اللہ ﷻ کی اطاعت میں اخلاص کے ساتھ لگا رہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے حد سے تجاوز کرنے والے اپنے جن بندوں کو عام مغفرت کی خوشخبری دی اُنہیں حکم دیا کہ وہ توبہ کریں اور ہر حال میں اس کی طرف رجوع کریں، اسی کی اطاعت وبندگی میں لگے رہیں اور اس دن کے عذاب سے ڈرتے رہیں جس دن ان کا اللہ ﷻ کے سوا کوئی مددگار نہیں ہوگا اور قرآنِ کریم میں وارد احکام کی اطاعت کریں۔ اللہ ﷻ نے اس میں جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے اُنہیں حلال سمجھیں اور جنہیں حرام قرار دیا ہے اُنہیں حرام سمجھیں، قبل اس کے کہ عذابِ الٰہی اُنہیں اچانک اپنے گھیرے میں لے لے اور اُنہیں اس کا احساس بھی نہ ہو۔

آیت نمبر ۵۵: گناہوں کی بخشش کے لئے تیسری شرط یہ ہے کہ اللہ ﷻ کی طرف سے جو بہترین کلام یعنی قرآنِ کریم نازل ہوا ہے اس پر ایمان لاکر اس کے احکامات پر عمل کیا جائے۔ یہ اہتمام اس سے پہلے کیا جائے کہ اچانک عذاب نازل ہو جائے اور خبر بھی نہ ہو۔ اس سے مراد دنیوی عذاب ہے۔ قرآنِ کریم کتاب ہدایت ہے اور اپنے احکامات پر انفرادی اور اجتماعی زندگی میں عمل کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ لمحۂ فکریہ ہے کہ ہم قرآنِ کریم سے ہدایت کے حصول، اس کے احکامات پر عمل اور ان کے نفاذ کی جدوجہد کر رہے ہیں یا نہیں؟

عملی پہلو: اللہ ﷻ نے جو بہترین کلام بندوں کی طرف نازل کیا ہے اُنہیں چاہیئے کہ وہ اس کو مضبوطی سے پکڑیں اور اس کی پیروی شروع کر دیں۔ ایسا نہ ہو کہ اچانک عذابِ الٰہی نازل ہو اور اُنہیں نیست ونابود کر کے رکھ دے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے مشرکین کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارے رب نے جو بہترین ہدایت اور احکام قرآنِ مجید تمہارے پاس بھیجے ہیں تم ان کی پوری پوری اتباع کرو قبل اس کے کہ تم پر اچانک عذابِ الٰہی آجائے اور تمہیں احساس وگمان بھی نہ ہو کہ یہ عذاب کہاں سے اور کیسے آگیا؟ آج اگر ایمان نہ لائے اور اللہ ﷻ کے احکام کی اتباع نہ کی اور توبہ کے بغیر ہی مرگئے تو کل قیامت کے روز اپنی غفلت وکوتاہی اور احکامِ خداوندی کا تمسخر اڑانے پر حسرت وافسوس ہوگا لیکن اس وقت یہ اظہار حسرت وافسوس کچھ کام نہ آئے گا۔

علمی بات: اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ سے مراد قرآنِ حکیم ہے اور پورا قرآن احسن ہی ہے اور قرآنِ حکیم کو اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اس اعتبار سے بھی کہا جا سکتا ہے کہ جتنی کتابیں تورات، انجیل، زبور، اللہ ﷻ کی طرف سے نازل ہوئیں۔ ان سب میں احسن واکمل قرآنِ حکیم ہے۔

اتباعِ احسن سے کیا مراد ہے؟ اس حوالہ سے بعض مفسرین کرام کی رائے یہ بھی ہے کہ اس آیت کے دو مطلب ہوسکتے ہیں: ایک یہ کہ قرآنِ کریم سارے کا سارا ہی احسن الحدیث ہے۔ لہٰذا اس میں جو اوامر ہیں یعنی جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ان کی تعمیل کرے، نواہی جن کے کرنے سے منع کیا گیا ہے، ان سے اجتناب کرے۔ امثال اور قصوں میں جو کچھ اللہ ﷻ نے ارشاد فرمایا ہے اس سے عبرت اور نصیحت حاصل کرے۔ اس کے برعکس جو شخص جو نہ اوامر کی تعمیل کرے نہ نواہی سے اجتناب کرے اور نہ وعظ ونصیحت سے کوئی اثر قبول کرے۔ ایسا شخص وہ پہلو اختیار کرتا ہے جسے کتاب اللہ بدترین پہلو قرار دیتی ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس کے اوامر کو اچھی سے اچھی شکل میں بجالائے۔ نواہی سے پوری طرح اجتناب کرے بلکہ جس بات میں شک ہو اسے بھی چھوڑ دے اور بیان کی گئی نصیحتوں سے بھی وہ مطلب لے اور اثر قبول کرے جو ایک قلب سلیم کا تقاضا ہوتا ہے۔ اپنے نظریات اور خواہشات کو قرآنِ حکیم سے کشید کرنے کی کوشش نہ کرے۔ بلکہ خود قرآنِ حکیم کے تابع ہونے کی محنت کرے۔

آیت نمبر ۵۶: اپنے گناہوں پر توبہ نہ کرنے والے کا حشر کے میدان میں اللہ ﷻ کے حضور اظہارِ افسوس کا ذکر ہے۔ وہ اعتراف کرے گا کہ اس نے اللہ ﷻ کے معاملہ میں غفلت اور کوتاہی کی اور عذاب کی وعیدوں کو سنجیدگی سے نہیں سنا۔

علمی بات: قرآنِ مجید کی اتباع نہ کرنے والوں کو قیامت کے دن پچھتانا پڑے گا۔ اللہ ﷻ کے معاملہ میں جس نے بھی کوتاہی کی ہوگی یعنی اپنی ذمہ داریوں کو ادا نہیں کیا ہوگا وہ اس پر افسوس کرے گا اور اس وقت اسے احساس ہوگا کہ قرآنِ حکیم اور اسلام کو مذاق بنالینا کتنی زبردست غلطی تھی۔

اللہ ﷻ کی طرف رجوع کرنے، اخلاص سے اس کی اطاعت کرنے اور قرآنِ مجید کی اتباع کرنے کا حکم اس لئے دیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اگر تم نے ان احکام پر عمل نہیں کیا اور اس کے نتیجہ میں تم کو آخرت میں عذاب ہوا تو پھر تم کہو گے کہ ہائے افسوس! میری ان کوتاہیوں پر جو میں نے اللہ ﷻ کے متعلق کی ہیں۔

آیت نمبر ۵۷: مزید برآں وہ کہے گا کہ اگر اللہ ﷻ اسے ہدایت دیتا تو وہ متقی بن جاتا۔

علمی بات: جب حسرت وافسوس سے کام نہیں چلے گا تو گمراہ شخص اپنا دل بہلانے کے لئے یہ عذر پیش کرے گا کہ کیا کہوں اللہ ﷻ نے مجھ کو ہدایت نہ کی۔ اگر اللہ ﷻ میری رہنمائی اور دستگیری کرتا اور مجھ کو ہدایت دیتا تو میں بھی پرہیز گاروں میں سے ہوتا اور مذاق اُڑانے والوں میں شامل نہ ہوتا۔

اگر کوئی شخص ایسے کہے گا تو گویا وہ اپنے اس اختیار کی نفی کرے گا جو اسے انسان کی حیثیت سے دنیا میں عطا ہوا تھا۔ اللہ ﷻ نے تو اسے اشرف المخلوقات بنایا تھا اور اختیار دیا تھا: "کہ چاہو تو میرے شکر گزار بندے بن کر رہو اور چاہو تو نافرمان اور ناشکرے بن جاؤ۔"

آیت نمبر ۵۸: وہ آرزو کرے گا کہ اسے ایک بار پھر دنیا میں واپس بھیج دیا جائے۔ تاکہ وہ نیک عمل کر کے محسنین کے درجے تک پہنچ جائے۔

علمی بات: کفار و مشرکین میں سے جب کوئی عذاب دیکھ لے گا تو حسرت سے یوں کہنے لگے گا کہ کاش مجھے دنیا میں پھر جانے کا موقع مل جائے تو میں بھی نیکو کاروں میں سے ہو جاؤں۔ گویا جب حسرت وعذر دونوں بے کار ثابت ہوں گے اور دوزخ کا عذاب آنکھوں کے سامنے آجائے گا اس وقت شدت اضطراب سے کہے گا کہ کسی طرح مجھ کو ایک مرتبہ پھر دنیا میں جانے کا موقع دیا جائے تو دیکھو میں کیسا نیک بن کر آتا ہوں۔

آیت نمبر ۵۹: اسے یاد دلایا جائے گا کہ اس کے پاس اللہ ﷻ کی آیات آئی تھیں جسے اس نے تکبر و غرور کی وجہ سے جھٹلا دیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں وہ کفر کرنے والوں میں شامل ہو گیا۔

علمی بات: کافر اور مشرک شخص کا یہ عذر باطل ہے کہ اس کو ہدایت حاصل نہیں ہوئی کیونکہ اللہ ﷻ نے اس کے پاس رسولوں کو بھیجا جنھوں نے اسے اللہ ﷻ کا پیغام پہنچایا اور اپنی رسالت پر دلائل اور معجزات پیش کیئے، لیکن اس نے دانستہ انکار کیا اور رسولوں کو جھٹلایا۔

علمی بات: قیامت کے دن ان پچھتانے والوں سے کہا جائے گا کہ تم نے ہدایت حاصل کیوں نہیں کی اور نیک کیوں نہیں بنے؟ جب کہ اللہ ﷻ کی آیتیں اور احکامات تمہارے پاس پہنچے۔ ان کو قبول کرنے میں کیا عذر مانع تھا؟ تم لوگوں نے تو ان کو جھٹلا دیا تھا اور تم گھمنڈ کرتے رہے اور زندگی کے آخری لمحہ تک انکار پر بضد رہے۔ لہٰذا تم اپنے کیئے کے ذمہ دار ہوں گے اور اب اُنہیں عذاب ہی بھگتنا ہو گا۔

آیت نمبر ۶۰: روزِ قیامت اللہ ﷻ کی طرف جھوٹ منسوب کرنے والوں کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ جھوٹ منسوب کرنے سے مراد کسی کو اللہ ﷻ کے ساتھ شریک قرار دینا یا اس کی آیات اور رسولوں کو جھٹلانا ہے۔ تکبر و غرور کی پاداش میں ان کا ٹھکانا جہنم ہو گا۔

علمی بات: ان لوگوں کا ذکر ہے جن کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھا کرتے، اللہ ﷻ کے شریک ٹھہراتے، اس کے لئے اولاد مقرر کرتے، اس کے احکام کا تمسخر اڑاتے، اس کے انبیاء کرام علیہم السلام کی تکذیب کرتے اور اس کے فرماں برداروں کی تذلیل وتوہین کرتے تھے۔ قیامت کے روز ایسے لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے اور حق کو قبول نہ کرنے اور تکبر وخود نمائی کے وبال میں ان نافرمانوں کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ جہاں نہایت ذلت ورسوائی کے ساتھ بدترین سزائیں بھگتیں گے۔

فرامین نبوی ﷺ: ۱۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "متکبر لوگ قیامت کے دن چیونٹیوں کی طرح آدمیوں کی شکلوں میں اٹھائے جائیں گے، ہر جگہ سے ذلت اُنہیں ڈھانک رہی ہو گی، پھر وہ جہنم میں ایک قید خانہ کی طرف ہانک کر لے جائے جائیں گے، جس کا نام "بُولَس" ہے۔ آگوں کی آگ (سب سے بڑی آگ) اُن پر چڑھی ہو گی، اُنہیں جہنمیوں کا پسینہ یا جہنمیوں کے زخموں کا نچوڑ (خون اور پیپ وغیرہ)۔ پلایا جائے گا۔" (جامع ترمذی)

۲۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہو گا، وہ جنت میں داخل نہ ہو گا۔“ ایک آدمی نے کہا: انسان چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں اور اس کے جوتے اچھے ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ ﷻ خود جمیل ہے، وہ جمال کو پسند فرماتا ہے۔ تکبر، حق کو قبول نہ کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔“ (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۶۱: پیغامِ حق کو قبول کرنے والے اور تقویٰ کی روش اختیار کرنے والے کامیاب ہوں گے۔ چونکہ وہ قیامت کی ہولناکیوں سے محفوظ ہوں گے اس لئے اُنہیں کسی بات کا غم نہ ہو گا۔

علمی بات: جو لوگ کفر و شرک اور نافرمانی و معاصی سے بچتے ہیں اور اطاعت و بندگی کی راہ اختیار کرتے ہیں، ان کے چہرے نورانی ہوں گے۔ اُنہیں اللہ ﷻ جہنم کے عذاب اور ذلت و رسوائی سے نجات دے گا اور جنت میں داخل کر کے اپنی نعمتوں سے نوازے گا۔ اُنہیں میدانِ محشر میں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اور دنیا میں جو کچھ چھوڑ کر آئے تھے اس کا اُنہیں کوئی غم نہیں ہو گا۔ بلکہ نہایت امن و راحت کے ساتھ اللہ ﷻ کی نعمتوں میں رہیں گے۔ جنت اور اس کی نعمتوں کو پا کر ماضی کی تمام باتیں بھول جائیں گے، کیونکہ جنت تو نام ہی فرحت و راحت کا ہے۔ وہاں غم اور فکر و پریشانی کا تصور تک نہیں۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا: ”اور تم میں سے ہر ایک اس (جہنم) پر سے گزرنے والا ہے یہ آپ کے رب کا حتمی فیصلہ ہے۔ پھر ہم پرہیز گاروں کو نجات دیں گے اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل گرے ہُوئے چھوڑ دیں گے۔“ (سورۃ مریم ۱۹، آیات: ۷۱، ۷۲)

علمی بات: اہلِ جنت کو جنت میں ان کے درجات اور مراتب کے مطابق اللہ ﷻ اُنہیں ان کے مقامات تک پہنچا دے گا۔ انبیاء کرام علیہم السلام اپنے مراتب پر پہنچیں گے اور اسی طرح صدیقین، شہداء اور صالحین وغیرہ اپنے اپنے مقامات کو پا لیں گے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور سرورِ عالم ﷺ سے اس آیت کی یہ تفسیر نقل کی ہے: حضور ﷺ نے فرمایا: ”قیامت کے دن اللہ ﷻ لوگوں کو ان کے اعمال سمیت حشر میں حاضر کرے گا۔ مومن کے عمل کی شکل بڑی خوبصورت اور اس کی مہک بڑی دل افروز ہو گی۔ جب کہیں ڈر اور خوف ہو گا تو وہ اسے تسلی دیتے ہوئے کہے گا کہ تم مت گھبراؤ یہ خوف اور ڈر تمہارے لئے نہیں۔ وہ مومن کہے گا تو نے مجھ پر بڑے احسان کیئے ہیں تو ہے کون؟ وہ جواب دے گا تم مجھے نہیں پہچانتے، میں تمہارا نیک عمل ہوں۔ دنیا میں تو نے میرے بوجھ کو اٹھائے رکھا اب میں تمہیں اٹھاؤں گا۔ اور تجھ سے ہر مصیبت کو دور کروں گا۔ (تفسیر قرطبی، سورۃ الزمر ۳۹، آیت: ۶۱)

آیت نمبر ۶۲: عظمتِ باری تعالیٰ کا ذکر ہے۔ اللہ ﷻ نے ہر شے کو نہ صرف پیدا کیا بلکہ اس کی نگرانی اور حفاظت بھی فرما رہا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے خبر دی ہے کہ وہی تمام چیزوں کا خالق و مالک، ان میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف و تدبیر کرنے والا اور ان کا محافظ و نگران ہے اس کی قدرت بے پایاں اور اس کا علم لامحدود ہے۔ کسی کو سرتابی یا انکار کی مجال نہیں۔ وکیل بمعنیٰ محافظ اور مدبر۔ ہر چیز اس کے سپرد ہے اور وہ بغیر کسی کی مشارکت کے ان کی حفاظت اور تدبیر کر رہا ہے۔

علمی بات: کائنات کی موجودگی اس کے خالق کی موجودگی کا ثبوت ہے۔ اسی طرح کائنات جتنے بامعنی اور جس قدر منظم طور پر چل رہی ہے وہ اس کا ثبوت ہے کہ ہر آن ایک نگرانی کرنے والا اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ آدمی اگر سنجیدگی کے ساتھ غور کرے تو وہ کائنات میں اس کے خالق، مالک اور مدبر کی نشانیاں پا لے گا۔

آیت نمبر ۶۳: اللہ ﷻ کی شان تو یہ ہے کہ آسمان و زمین کے تمام خزانے بھی اسی کے اختیار اور ملکیت میں ہیں۔ جو لوگ اللہ ﷻ کی آیات کو تسلیم نہیں کرتے وہ فلاح نہیں پا سکتے بلکہ وہ کامل خسارہ میں ہوں گے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی اعلیٰ شان اور ملکیت کا بیان ہے کہ آسمانوں اور زمین کے خزانوں کی چابیاں اسی کے پاس ہیں، اس لئے عبادت کا صرف وہی حق دار ہے۔ قیامت کے دن حقیقی خسارہ اٹھانے والے وہ لوگ ہوں گے جو دنیا میں قرآنِ کریم اور ان نشانیوں کا انکار کرتے ہیں جو اللہ ﷻ کی ذات و صفات اور اس کی وحدانیت

پر دلالت کرتی ہیں، جیسا کہ ارشاد فرمایا: "آپ (ﷺ) فرما دیجئے ان کو پکارو جن کو تم اللہ کے سوا (معبود) سمجھ رہے ہو وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر (کسی چیز) کے مالک ہیں اور نہ زمینوں میں اور نہ ہی ان دونوں میں ان کا کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس (اللہ) کا مددگار ہے۔" (سورۃ سبا ۳۴، آیت: ۲۲)

علمی بات: جب ہر چیز کو اللہ ﷻ نے پیدا کیا تو پیدا کرنے کے بعد اس کی بقا و حفاظت کا ذمہ دار بھی وہی ہوا۔ زمین و آسمان کی تمام چیزوں میں تصرف و اقتدار بھی اسی کو حاصل ہے کیونکہ سب خزانوں کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں۔ پھر ایسے معبودِ برحق کو چھوڑ کر آدمی کہاں جائے۔ چاہیئے کہ اسی کے غضب سے ڈرے اور اسی کی رحمت کا امیدوار رہے۔ کفر و ایمان اور جنت و دوزخ سب اسی کے زیرِ تصرف ہیں۔ اس کی باتوں سے منکر ہو کر آدمی کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ کیا اس سے منحرف ہو کر آدمی کسی فلاح کی امید رکھ سکتا ہے؟ یقیناً نہیں۔

آیت نمبر ۶۴: سردارانِ قریش آپ ﷺ کو شرک کی طرف بلاتے تھے۔ (معاذ اللہ) اُنہیں آگاہ کیا جا رہا ہے کہ یہ بڑی جہالت کی بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس دعوت کو قبول کرنے کی توقع رکھی جائے۔

شانِ نزول: یہ کفار کی اس دعوت کے جواب میں ہے جو وہ پیغمبر اسلام ﷺ کو دیا کرتے تھے کہ بتوں کی پرستش تمہارے آباؤاجداد کا دین ہے مشرکین مکہ نبی ﷺ سے یہ کہتے تھے کہ ہمارا تمہارا جھگڑا یہی ہے کہ تم ہمارے بتوں کو نہیں مانتے اگر تم چاہو تو یہ جھگڑا یوں مٹ سکتا ہے کہ ایک سال تک تم ہمارے بتوں کی پوجا کر لیا کرو اور ہم ایک سال تک تمہارے معبود کی عبادت کر لیا کریں۔ اس پر اللہ ﷻ نے یہ آیات نازل فرمائیں اور فرمایا کہ: اے نبی ﷺ! آپ ان سے فرما دیجئے کہ اے نامعقول لوگو! مجھ کو یہ رائے دیتے ہو کہ میں اللہ وحدہٗ کو چھوڑ کر غیروں کو پوجوں؟ (معاذ اللہ) یہ انتہائی نادانی اور حماقت و جہالت ہے کہ آدمی رب العالمین کو چھوڑ کر دوسروں کی پوجا کرے اور اللہ ﷻ کے رسول ﷺ سے (معاذ اللہ) یہ امید رکھے کہ وہ اس کے راستہ پر آجائیں گے۔

علمی بات: یہ انداز اس آیت کے علاوہ پورے قرآنِ حکیم میں اور کہیں نہیں پایا جاتا اور یہ خاص اسلوب دراصل مشرکین مکہ کے اس دباؤ کا جواب ہے جو انہوں نے حضور ﷺ پر "کچھ لو اور کچھ دو" کی پالیسی اختیار کرنے کے لئے ڈال رکھا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ آپ ﷺ اپنے مؤقف میں کچھ نرمی پیدا کریں اور ہمارے معبودوں میں سے کچھ کو تسلیم کر لیں تو اس کے جواب میں ہم بھی آپ ﷺ کی کچھ باتیں مان لیں گے۔ بلکہ آپ ﷺ کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیں گے۔ اس طرح ایک درمیانی راہ نکل آئے گی اور جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ ان کے اس مطالبہ کا جواب بہت سخت انداز میں دیا جا رہا ہے۔ واضح رہے کہ عربی میں "جاہل" اس کو کہتے ہیں جو علم اور عقل کے بجائے جذبات اور خواہشات کی پیروی کرتا ہے۔

آیت نمبر ۶۵: نبی کریم ﷺ اور سابقہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام پر بھی وحی کی گئی ہے کہ بفرضِ محال اگر خود کسی نبی علیہ السلام نے بھی شرک کیا تو نہ صرف ان کی تمام نیکیاں ضائع ہو جائیں گی بلکہ وہ خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوں گے۔ خطاب کے اس انداز سے شرک کے جرم کی تباہی کا بیان اور دراصل امت کو سمجھانا مقصود ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے نبی کریم ﷺ سے فرمایا: کہ آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ سے پہلے تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو بذریعہ وحی یہ بات بتا دی گئی تھی کہ اگر بفرضِ محال آپ ﷺ نے شرک کیا تو آپ ﷺ کے سارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور آپ ﷺ ان لوگوں میں سے ہو جائیں گے جو قیامت کے دن حقیقی خسارہ اٹھانے والے ہوں گے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: "یہ اللہ کی ہدایت ہے وہ اس کے ذریعہ رہنمائی فرماتا ہے (اس کی) جسے وہ اپنے بندوں میں سے چاہتا ہے اور (بالفرض) اگر یہ لوگ بھی شرک کرتے تو ان سے ضرور ضائع ہو جاتے جو وہ عمل کرتے تھے۔" (سورۃ الانعام ۶، آیت: ۸۸)

علمی بات: یہ سخت اسلوب دراصل حضور ﷺ کے لئے ہرگز نہیں بلکہ مشرکین کے لئے ہیں۔ آپ ﷺ کو مخاطب کر کے دراصل اُنہیں سنانا مقصود ہے کہ قانونِ خداوندی اس سلسلہ میں بہت واضح اور اٹل ہے۔ شرک جو کوئی بھی کرے گا اسے اس کی سزا ضرور ملے گی اللہ ﷻ کا قانون کسی کے لئے تبدیل نہیں کیا جاتا۔

یہ تنبیہ تو اصل میں پیغمبروں کی امتوں کو ہے لیکن جیسا کہ شاہی قاعدہ ہوتا ہے کہ رعایا میں سب سے بڑے آدمی کو مخاطب بنا کر حکم سناتے ہیں تاکہ دوسرے لوگ ڈر جائیں کہ جب اس معاملہ میں بڑوں کی یہ حالت ہے تو ہم کسی شمار میں ہیں ورنہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے شرک کے صدور کا احتمال ہی نہیں۔

آیت نمبر ۶۶: غیر اللہ کی عبادت کے بجائے صرف ایک اللہ ﷻ کی بندگی کی جائے اور اسی کا شکر ادا کیا جائے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے مشرکین کا رد فرمایا ہے جو نبی کریم ﷺ سے یہ کہتے تھے کہ آپ ﷺ ان کے بتوں کی عبادت کریں۔ اللہ ﷻ نے فرمایا: آپ ﷺ ان کے اس باطل قول کی پرواہ نہ کریں اور آپ ﷺ اللہ وحدہٗ کی عبادت کرتے رہیں اور اللہ ﷻ نے جو آپ ﷺ کو توحید پر قائم رہنے کی ہدایت دی ہے، ہدایت کی اس نعمت، توحید و نبوت اور دعوت و رسالت جیسی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرتے رہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اتنا لمبا قیام فرمایا کہ آپ ﷺ کے پاؤں مبارک پر ورم ہو گیا۔ آپ ﷺ سے کہا گیا کہ آپ ﷺ اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں، حالانکہ اللہ ﷻ نے آپ ﷺ کی اگلی پچھلی تمام خطائیں معاف کر دی ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو کیا میں اللہ ﷻ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟'' (صحیح مسلم، صحیح بخاری)

عملی پہلو: انسان کا فرض ہے کہ وہ صرف اللہ ﷻ ہی کی عبادت کرے اور اُس کی نعمتوں کا اعتراف کرتے ہوئے اُس کا شکر بجالائے۔

آیت نمبر ۶۷: مشرکین نے اللہ ﷻ کے ساتھ شریک ٹھہرا کر اس کی قدر نہیں کی جیسا کہ اللہ ﷻ کی قدر کرنے کا حق تھا۔ انہوں نے اللہ ﷻ کا مقام اور اس کی عظمت کو سمجھا ہی نہیں اور نہ ہی اُنہیں اس کی عظمت و کبریائی کا اندازہ ہے۔ روزِ قیامت پوری زمین اللہ ﷻ کی مٹھی میں ہو گی اور تمام آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔ اللہ ﷻ تو ہر شرک سے پاک اور بلند و بالا ہے۔

شانِ نزول: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ یہودیوں کا ایک عالم رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا، اے محمد! ہم (اپنی کتابوں میں یہ لکھا ہوا) پاتے ہیں کہ اللہ ﷻ (قیامت کے دن) آسمانوں کو ایک انگلی پر، زمینوں کو ایک انگلی پر، درختوں کو ایک انگلی پر، پانی اور مٹی کو ایک انگلی پر اور (باقی دیگر) ساری مخلوقات کو ایک انگلی پر اٹھائے گا، پھر فرمائے گا، میں بادشاہ ہوں۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ ہنس پڑے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کی ڈاڑھیں مبارک ظاہر ہو گئیں، گویا آپ ﷺ نے اس عالم کی تصدیق کی، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: ''اور ان لوگوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق تھا اور قیامت کے دن ساری زمین اس کے (قبضۂ قدرت) میں ہو گی اور آسمان اس کے دائیں دست (قدرت) میں لپٹے ہوئے ہوں گے وہ (اللہ) پاک ہے اور بہت بلند ہے اس سے جو وہ شریک ٹھہراتے ہیں۔'' (سورۃ الزمر ۳۹، آیت: ۶۷) (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

علمی بات: مشرکین کی جہالت و نادانی بیان کی جا رہی ہے کہ وہ اللہ ﷻ کی حقیقی قدر و منزلت کا تصور ہی نہیں کر سکے، اسی لئے تو اس کے سوا دوسروں کو معبود سمجھا اور نبی کریم ﷺ کو مشورہ دیا کہ وہ بھی بتوں کی پرستش کریں (معاذ اللہ)۔ اللہ ﷻ کی ذات تو وہ قادر مطلق ذات ہے کہ زمین اپنی عظمت و وسعت کے باوجود قیامت کے دن اس کی مٹھی میں ہو گی اور ساتوں آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔ اس دن وہ پورے جلال میں ہو گا اور کہے گا، میں بادشاہ ہوں، کہاں ہیں وہ جو دنیا میں بادشاہ کہلاتے تھے؟ تو جو ذات ایسی ہو اور جو ایسی عظیم قدرت کی مالک ہو وہی تمام عبادت کے مستحق ہے۔ اس کے علاوہ جھوٹے معبودوں کی پرستش جرم عظیم ہے۔ اس لئے اللہ ﷻ نے آیت کے آخر میں فرمایا کہ وہ تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے اور وہ مشرکوں کے شرک سے بالاتر ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ ﷻ زمین کو ایک مٹھی میں لے لے گا اور آسمانوں کو دائیں ہاتھ پر لپیٹ لے گا اور پھر فرمائے گا، میں ہوں بادشاہ، کہاں ہیں وہ زمین کے بادشاہ؟'' (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

آیت نمبر ۶۸: روزِ قیامت جب صور میں پھونک ماری جائے گی تو تمام مخلوق موت کی بے ہوشی سے دوچار ہو جائے گی۔ سوائے ان کے جنہیں اللہ ﷻ زندہ رکھے گا مفسرین کی رائے کے مطابق بعض فرشتے، شہداء اور انبیاء کرام علیہم السلام مراد ہیں۔ پھر دوسری مرتبہ صور پھونکے جانے پر تمام مردے زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے اور حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں گے۔

آیت نمبر ۶۹: اس دن میدانِ حشر کی زمین اپنے رب کی تجلی اور نور سے جگمگا اٹھے گی۔ تمام انسانوں کے ہاتھوں میں ان کے نامہ اعمال دے دیئے جائیں گے۔ انبیاء کرام علیہم السلام اور دیگر گواہ انسانوں کے اعمال پر گواہی کے لئے لائے جائیں گے۔ ہر انسان کے انجام کا صلہ اس کے اعمال کے مطابق حق کے ساتھ کر دیا جائے گا۔ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کی جائے گی۔ نہ کسی کے اجر و ثواب میں کمی ہو گی اور نہ ہی کسی کو اس کے جرم سے زیادہ سزا دی جائے گی۔

پھر جب اللہ ﷻ اپنی شان کے مناسب جلوہ فرما ہو گا تو اس کی تجلی اور نور سے میدان قیامت کی زمین روشن ہو جائے گی اور حساب و کتاب کا دفتر کھول دیا جائے گا۔ اس وقت ہر ایک کا اعمال نامہ اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا، انبیاء کرام علیہم السلام اور دوسرے گواہوں کو بلایا جائے گا۔ انبیاء کرام علیہم السلام گواہی دیں گے کہ ہم نے اللہ ﷻ کے احکام پہنچا دیئے تھے اور گواہوں میں ان کے ہاتھ پاؤں، فرشتے اور امت محمدیہ ﷺ کے لوگ ہوں گے جو ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔

علمی بات: گواہوں سے مراد وہ گواہ بھی ہیں جو اس بات کی شہادت دیں گے کہ لوگوں تک اللہ ﷻ کا پیغام پہنچا دیا گیا تھا، اور وہ گواہ بھی جو لوگوں کے اعمال کی شہادت پیش کریں گے۔ ضروری نہیں ہے کہ یہ گواہ صرف انسان ہی ہوں۔ فرشتے اور جن اور حیوانات، اور انسانوں کے اپنے اعضا اور در و دیوار اور شجر و حجر، سب ان گواہوں میں شامل ہوں گے۔

میدانِ حشر میں حساب و کتاب کے وقت سب انبیاء کرام علیہم السلام بھی موجود ہوں گے اور دوسرے سب گواہ بھی حاضر ہوں گے۔ ان گواہوں میں خود انبیاء کرام علیہم السلام بھی ہوں گے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ "تو (اس دن) کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے۔" (سورۃ النساء۴، آیت:۴۱) اور فرشتے بھی گواہوں میں ہوں گے جیسا کہ سورۃ قٓ میں ارشاد ہوا: مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّ شَهِيْدٌ "اس کے ساتھ ایک (فرشتہ) ہانکنے والا اور ایک (اعمال پر) گواہ ہو گا۔" (سورۃ قٓ ۵۰، آیت:۲۱) کہ اس میں سائق اور شہید سے مراد فرشتے ہونا۔ ان گواہوں میں اُمت محمدیہ بھی ہو گی جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ "تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ۔" (سورۃ البقرہ۲، آیت:۱۴۳) اور ان گواہوں میں خود انسان کے اعضا و جوارح بھی ہوں گے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ "اور ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور ان کے پاؤں (اس کی) گواہی دیں گے۔" (سورۃ یٰسٓ ۳۶، آیت:۶۵)

علمی بات: زمین سے مراد یہ زمین نہیں بلکہ میدانِ حشر ہے۔ نور سے مراد سورج اور چاند وغیرہ کا نور نہیں بلکہ یہ ایک خاص نور ہے جو اس روز اذنِ الٰہی سے ہر چیز کو روشن کر دے گا۔ تمام لوگوں کو بارگاہِ الٰہی میں پیش کیا جائے گا۔ ان کے اعمال کے صحیفے رکھ دیئے جائیں گے تو انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لائیں گے جو اپنی اپنی امتوں پر گواہی دیں گے اور دوسرے شہداء (گواہ) بھی طلب کیئے جائیں گے اور عدل و انصاف کے ساتھ ان کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔

علمی بات: ہمارے پیارے نبی، خَاتَمُ النَّبِيّٖن، رَحْمَةٌ لِّلْعٰلَمِيْن حضرت سیدنا محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ ﷺ کی اُمت کے لوگ بھی آگے لائے جائیں گے جو گواہی دیں گے کہ گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنی اپنی امتوں تک اللہ ﷻ کا پیغام پہنچا دیا تھا اور اللہ ﷻ اپنی تمام مخلوقات کے درمیان پورے عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دے گا کسی پر کوئی ظلم نہیں ہو گا۔ چونکہ اللہ ﷻ بندوں کے اعمال کو ان سے زیادہ جانتا ہے، اس لئے حساب میں کوئی ظلم و زیادتی نہیں ہو گی اور نہ اس میں کسی خطا، غلطی یا بھول چوک کا امکان ہو گا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "قیامت کے دن حضرت نوح علیہ السلام کو بلایا جائے گا، وہ فرمائیں گے کہ اے میرے رب! میں بار بار تیری بارگاہ میں حاضر ہوتا ہوں۔ اللہ ﷻ فرمائے گا، کیا تم نے لوگوں کو میرے احکام بتا دیئے تھے؟ وہ کہیں گے، ہاں! پھر ان کی امت سے پوچھا جائے گا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے تم کو میرا حکم پہنچایا تھا (یا نہیں)؟ تو وہ کہیں گے، ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا (یعنی پیغمبر) نہیں آیا۔ اللہ ﷻ پوچھے گا، تمہارا کوئی گواہ ہے؟ وہ عرض کریں گے: حضرت محمد ﷺ اور ان کی امت کے لوگ (میرے گواہ) ہیں۔ پھر اس امت کے لوگ گواہی دیں گے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ ﷻ کا پیغام اپنی امت کو پہنچا دیا تھا۔" (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۷۰: ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اللہ ﷻ لوگوں کے اعمال سے از خود پوری طرح واقف ہے۔ پھر بھی گواہ اور اعمال نامے بطور حجت پیش ہوں گے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کو سب کے اعمال معلوم ہیں وہ اپنی حکمت کے مطابق جزا و سزا دے گا، یہ جو فرمایا کہ ہر شخص کو پورا بدلہ دیا جائے گا اس کا مطلب یہ ہے کہ نیکیوں کے بدلہ میں کمی نہ ہوگی البتہ نیکیوں میں اضافہ کر کے ثواب میں اضافہ کر دیا جائے گا۔ بُرے اعمال کا پورا بدلہ دینے کا یہ مطلب ہے کہ جس قدر بُرے عمل ہوں گے ان کے بقدر عذاب دیا جائے گا اور ان کی جزا میں اضافہ نہ کیا جائے گا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ نے نیکیاں اور بُرائیاں لکھ دی ہیں اور ظاہر کر دیا ہے کہ یہ نیکی ہے اور یہ بُرائی ہے۔ جس نے نیکی کا محض ارادہ ہی کیا اور ابھی عمل نہیں کیا تو اللہ ﷻ اس کے نامۂ اعمال میں پوری نیکی لکھے گا اور جس نے نیکی کا ارادہ کر کے عمل بھی کیا تو اس کے نامۂ اعمال میں دس سے سات سو تک بلکہ اور دُگنی تگنی جتنی چاہے گا نیکیاں رقم فرما دے گا اور جس نے برائی کا ارادہ کیا لیکن (اللہ ﷻ سے ڈر کر) اس کا ارتکاب نہیں کیا تو اس کے لئے بھی وہ ایک پوری نیکی کا ثواب لکھے گا اور جس نے ارادہ کر کے بُرائی کر بھی لی تو اس کے لئے صرف ایک ہی گناہ لکھے گا۔"
(صحیح بخاری، صحیح مسلم)

علمی بات: اس کا یہ معنیٰ نہیں ہے کہ ہر نفس کو اس کے بُرے اعمال کی ضرور سزا دی جائے گی۔ اس آیت سے وہ گناہ گار مسلمان مستثنیٰ ہیں جن کو اللہ ﷻ اپنے فضل و کرم سے معاف فرما دے۔ اللہ ﷻ بندوں کے اعمال اور ان کی کیفیات کو خوب جاننے والا ہے، وہ ہر مومن کو اس کے نیک اعمال کی اچھی جزا دے گا اور اس کے بُرے اعمال کو وہ چاہے گا تو معاف فرما دے گا اور چاہے تو ان پر مؤاخذہ فرمائے گا، ہم اس کے مؤاخذہ سے اسی کی پناہ میں آتے ہیں اور کفار اور مشرکین کو پکڑے گا اور ان کو دوزخ میں دائمی عذاب دے گا، بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

آیت نمبر ۷۱: کافروں کو گروہوں کی صورت میں ذلت و خواری کے ساتھ جہنم کی طرف ہانکا جائے گا۔ ان کے پہنچنے پر جہنم کے دروازے کھول دیئے جائیں گے جیسے جیل کے دروازے مجرمین کے لئے کھولے جاتے ہیں۔ جہنم پر مامور فرشتے بطور ملامت ان سے پوچھیں گے: کیا اللہ ﷻ کے رسولوں نے اُنہیں اللہ ﷻ کے احکامات نہیں سنائے تھے؟ کیا رسولوں نے اُنہیں روزِ قیامت کے بُرے انجام سے خبردار نہیں کیا تھا؟ مجرمین اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہیں گے کہ ان تک حق پہنچ چکا تھا لیکن انہوں نے اس سے گریز کر کے باطل کو اختیار کیا۔ جس کے نتیجہ کے طور پر کافروں کے لئے جو سزا مقرر کی گئی تھی وہ ان پر ثابت ہو جائے گی۔

علمی بات: گروہ کا مطلب یہ ہے کہ ہر جرم اور اس کے درجہ کے مطابق مجرمین علیحدہ علیحدہ ٹولیوں میں منقسم ہوں گے۔
انسانی زندگی کے مختلف ادوار میں انفرادیت بھی آتی ہے اور اجتماعیت بھی، انسان شکمِ مادر میں انفرادی زندگی گزارتا ہے، پھر جب اس دنیا میں آتا ہے تو اپنے والدین اور افرادِ کنبہ کے ساتھ محدود اجتماعی زندگی گزارتا ہے، جب بچپن کو عبور کر کے جوان ہوتا ہے تو گھر سے باہر عام معاشرہ میں قدم رکھتا ہے تعلیم حاصل کرتا ہے، ہنر سیکھتا ہے، پھر گلی محلے گاؤں یا شہر کی اجتماعی زندگی میں عملی طور پر شریک ہو جاتا ہے، کسی عہدے پر فائز ہوتا ہے اور معاشرے میں اچھی طرح گھل مل جاتا ہے، یہ اس کی اجتماعی زندگی ہوتی ہے، پھر دنیا کی زندگی پوری کر کے عالمِ برزخ میں پہنچتا ہے تو وہاں پھر انفرادی زندگی کی طرف لوٹ آتا ہے، پھر جب حشر کے میدان میں سب لوگ جمع ہو کر اپنے اپنے عمل کے مطابق مختلف گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے اور پھر ہر درجہ کے عمل کی علیحدہ ٹولی ہوگی اور اس طرح تمام گروہ در گروہ اور قطار در قطار جمع ہوں گے اور پھر مجرمین کے گروہوں کو جہنم کی طرف ہانک کر لے جایا جائے گا۔

علمی بات: اس مقام پر مجرمین اور متقین دونوں کے لئے سِیْقَ کا لفظ استعمال ہوا ہے یعنی سب لوگ جہنم یا جنت کی طرف چلائے جائیں گے تاہم سورۃ مریم میں ان دونوں طبقات کے لئے ان کی جزا یا سزا کے لحاظ سے مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً متقین کے لئے فرمایا ہے: "جس دن ہم پرہیز گاروں کو جمع کریں گے رحمان کے پاس مہمان بنا کر۔" (سورۃ مریم ۱۹، آیت: ۸۵)
ہم متقیوں کو رحمان کے پاس وفد کی صورت میں اکٹھا کریں گے، ظاہر ہے کہ کسی کے پاس جانے والا وفد معزز سمجھا جاتا ہے اور میزبان اس کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ کرتا ہے، اسی طرح اللہ ﷻ کے نیک بندے اپنے پروردگار کے پاس وفد یعنی معزز مہمانوں کے طور پر جائیں گے اور ان کی عزت افزائی ہوگی، برخلاف اس کے مجرمین کے متعلق فرمایا: "اور ہم مُجرموں کو ہانک کر لے جائیں گے جہنم کی طرف پیاسے (جانوروں کی طرح)۔" (سورۃ مریم ۱۹، آیت: ۸۶)

اور ہم گناہ گاروں کو جہنم کی طرف ہانک کر لے جائیں گے ان کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں ہوگا، بلکہ پیاسے اونٹوں کی طرح ہانک کر لے جایا جائے گا۔

علمی بات: جہنم کے سخت دل، سخت لہجے اور قوت والے فرشتے ان سے رسولوں کے آنے کے متعلق سوال محض پوچھنے کے لئے نہیں بلکہ اُنہیں ملامت کرنے اور ڈانٹنے کے لئے کہیں گے، جسمانی عذاب کے ساتھ یہ عذاب مزید ہوگا۔

آیت نمبر ۷۲: جب مجرم اپنے جرائم کا اعتراف کرلیں گے تو اُنہیں جہنم میں داخل ہونے کا حکم ہوگا جو ان کا دائمی ٹھکانا ہوگا۔ بلاشبہ تکبر کرنے والوں کا بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔

علمی بات: اس آیت میں واضح فرمادیا کہ کافروں کے لئے ہمیشہ کے لئے دوزخ کا عذاب ہے، کہ نہ تو اس کو کوئی فنا وزوال ہے اور نہ ہی ان کے لئے اس سے نکلنے کی کوئی صورت اور راستہ۔ بلکہ دوزخ کا یہ عذاب بھی ہمیشہ کے لئے ہوگا اور ان کا اس میں رہنا اور جلنا بھی ہمیشہ کے لئے۔ (والعیاذ باللہ العظیم)۔ یہ ان کے اپنے اس کفر وانکار کا طبعی نتیجہ ہوگا جس کو انہوں نے دنیا میں اپنائے رکھا تھا۔ اس لئے نہ تو ان کے پاس اس بارے میں کوئی عذر ہوگا اور نہ ہی ان کے لئے اس سے کسی بھاگنے کی کوئی گنجائش اور صورت ہوگی۔

علمی و عملی بات: انکارِ حق کی سب سے بڑی وجہ تکبر ہے۔ اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قبول حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ متکبر اور مغرور نفس بنتا ہے۔ حق کو قبول نہ کرنے کی دوسری وجوہات بھی اسی ذیل میں آتی ہیں۔ جیسا کہ ابلیس کا بھی اصل جرم تکبر ہی تھا۔ اگرچہ اس نے بھی اپنے مؤقف کی حمایت میں کئی دلائل پیش کیئے تھے۔ اسی طرح کافر قبول حق سے انکار کی خواہ کئی وجوہات بتائیں۔ اللہ ﷻ کی آیات کا تمسخر اڑائیں۔ اللہ ﷻ کے عذاب کو چیلنج کریں۔ ان سب کی تہہ میں یہی تکبر ہی کام کر رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ سب جرائم سے بڑا جرم ہوا۔ اسی لئے تمام گروہوں کے الگ الگ جرائم کا نام لینے کے لئے صرف اس جرم کا نام لے لیا گیا ہے جو سب گروہوں میں بطور قدر مشترک پایا جاتا ہے۔

آیت نمبر ۷۳: متقین یعنی اللہ ﷻ کی نافرمانی سے بچنے والوں کو گروہوں کی صورت میں جنت کی طرف لایا جائے گا۔ جب وہ جنت کے قریب پہنچیں گے تو اس کے دروازے اُن کے لئے پہلے سے ہی کھلے ہوئے ہوں گے۔ جنت کے آٹھ دروازے ہیں۔ (صحیح بخاری) ہر دروازے کی چوڑائی چالیس سال کی مسافت جتنی ہوگی۔ (صحیح مسلم) سب سے پہلے نبی کریم ﷺ کے لئے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا۔ (صحیح مسلم) پھر دیگر انبیاء کرام علیہم السلام و مقربین اور دیگر اہل جنت داخل ہوں گے، نیز اپنے اعمال کی نوعیت سے مختلف دروازوں سے داخل ہوں گے۔ جنت کے محافظ فرشتے ان کا استقبال کریں گے اور ان پر سلام پیش کریں گے۔ پھر ان کی تحسین کرتے ہوئے اُنہیں جنت کی نعمتوں سے ہمیشہ کے لئے سرفراز ہونے کی بشارت دیں گے۔

علمی بات: اہل ایمان و تقویٰ بھی گروہوں کی شکل میں جنت کی طرف لے جائے جائیں گے پہلے مقربین (اللہ ﷻ کے سب سے قریب ترین) پھر ابرار (متقی، صالحین) اس طرح درجہ بدرجہ ہر گروہ ہم مرتبہ لوگوں پر مشتمل ہوگا۔ اللہ ﷻ سے ڈرنے والوں کو ان کی خدمت پر متعین فرشتے نہایت تزک واحتشام کے ساتھ جنت کی طرف لے جائیں گے اور جب وہاں پہنچیں گے تو جنت کے دروازوں کو اپنے استقبال میں پہلے سے کھلا ہوا پائیں گے۔ فرشتے اُنہیں سلام کریں گے اور کہیں گے، اب آپ لوگ تمام آفات اور مصائب سے امن میں آگئے۔ آپ لوگوں کی زندگیاں دنیا میں شرک ومعاصی کی آلائشوں سے پاک تھیں اس لئے جنت میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو جاؤ۔

علمی بات: جنتیوں کے انعام اور ان کے اعزاز واکرام کا ذکر ہے۔ متقی اور پرہیز گار لوگوں کو جب فرشتوں کی معیت میں نہایت اعزاز واکرام کے ساتھ جنت کی طرف لے جایا جائے گا تو ان کے اعزاز واکرام کے لئے جنت کے دروازوں کو ان کے لئے کھول دیا گیا ہوگا۔ اس کے دربان و پاسبان تحیت وسلام کے ساتھ ان کا خیر مقدم اور استقبال کریں گے اور وہ ان کو نہایت دلنواز کلمات سے نوازیں گے۔ تو اس وقت ان کو جو کچھ سرور حاصل ہوگا اس کا اندازہ کرنا ہی آج کس کے بس میں ہو سکتا ہے؟ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "تو کوئی شخص نہیں جانتا کہ اُس کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک میں سے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے یہ ان (اعمال) کا بدلہ

ہو گا جو وہ کرتے تھے۔" (سورۃ السجدۃ ۳۲، آیت: ۱۷) اللہ ﷻ اپنے کرم بے پایاں سے ہمیں بھی اپنی اس جنت اور اس کی ان بے مثال نعمتوں اور خاص عنایتوں سے نواز دے کہ اس کا کام اور اس کی شان ہی ہمیشہ اور لگا تار نوازنا ہے۔ آمین ثم آمین۔

علمی بات: لفظ "سیق" آیت نمبر: ۷۱ میں جہنمیوں کے لئے اور آیت نمبر: ۷۳ میں جنتیوں کے لئے آیا ہے۔ سَاقَ يَسُوْقُ سَوْقًا وسِيَاقَةً ومَسَاقًا جانور کو ہانکنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ کسی چیز کو کسی چیز کی طرف ہانک کر اور جلدی جلدی لے جانے کے معنی میں آتا ہے۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ لفظ اچھے اور بُرے دونوں ہی موقعوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی لئے یہاں پر یہ اہل جنت اور اہل دوزخ دونوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کا مفہوم دوسرے کے بالکل برعکس ہے کہ اہل دوزخ کو تو بڑے سنگین مجرموں کی طرح دھکے مار مار کر دوزخ کی طرف لے جایا جائے گا۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا گیا: يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ۝ "جس دن اُنہیں دھکے دے کر جہنم کی آگ کی طرف دھکیلا جائے گا۔" (سورۃ الطور ۵۲، آیت: ۱۳) جب کہ اہل جنت کو معزز مہمانوں کی طرح فرشتوں کے مجمع ومعیت میں نہایت عزت واکرام کے ساتھ خدائے رحمٰن کی طرف لے جایا جائے گا۔

فرامین نبوی ﷺ: ۱۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "پہلا گروہ جو جنت میں داخل ہو گا ان کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن ہوں گے، ان کے بعد جو لوگ داخل ہوں گے ان کے چہرے سب سے زیادہ روشن ستارے کی طرح چمک رہے ہوں گے۔ ان کے دل ایک ہی آدمی کے دل کی طرح ہوں گے، ان میں نہ کوئی اختلاف ہو گا اور نہ (آپس میں) بغض ہو گا۔ ان میں ہر ایک آدمی کی دو بیویاں ہوں گی۔ جن کی پنڈلی کا گودا ان کے حسن کے باعث گوشت کے باہر سے دکھائی دے گا۔ وہ (جنتی) صبح و شام اللہ ﷻ کی تسبیح کریں گے۔ وہ نہ بیمار ہوں گے، نہ ناک سنکیں گے اور نہ وہ تھوکیں گے۔ ان کے برتن سونے اور چاندی کے ہوں گے، ان کی کنگھیاں سونے کی، ان کی انگیٹھیوں کا ایندھن "الالوہ" (ایک نہایت خوشبودار لکڑی عود) ہو گی اور ان کا پسینا کستوری ہو گا۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

۲۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تم میں سے جو بھی وضو کرے اور خوب اچھی طرح وضو کرے، پھر کہے:
أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ﷻ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بے شک محمد (ﷺ) اس کے بندے اور رسول (ﷺ) ہیں" تو اس کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، وہ ان میں سے جس سے چاہے داخل ہو جائے۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۷۴: اہل جنت اللہ ﷻ کا شکر ادا کریں گے کہ اس نے اپنا وعدہ پورا فرمایا اور اُنہیں جنت کی سرزمین کا وارث بنایا۔ اُنہیں جنت میں مالکانہ حقوق حاصل ہوں گے اور وہ اپنی جنت میں جہاں چاہیں گے رہیں گے۔ ایک مراد یہ ہے کہ جنتی سیر اور اہل جنت سے ملاقات کے لئے جہاں چاہیں گے جاسکیں گے۔ بلاشبہ نیک عمل کرنے والوں کا نہایت عمدہ بدلہ ہے۔

علمی بات: جنتیوں کے کیف وسرور کا ایک روح پرور منظر بیان کیا گیا ہے۔ وہ خوش نصیب اس انعام واحسانِ خداوندی پر کیف وسرور میں ڈوب کر اس کی حمد وثنا سے رطب اللسان ہو جائیں گے اور کہیں گے کہ "شکر ہے اس اللہ ﷻ کا جس نے سچ کر دکھایا ہم سے اپنا وعدہ"۔ جو کہ اس نے اپنے رسولوں کے واسطہ سے ہم سے فرما رکھا تھا۔ وہ ان کو ایسی ایسی عظیم الشان نعمتوں سے نوازے گا۔

علمی بات: میراث جنت سے سرفرازی کا ذکر ہے کہ جنت کے وہ خوش نصیب لوگ اپنے کلمات حمد وثنا میں مزید کہیں گے کہ "اس نے ہمیں وارث بنا دیا۔ جنت کی اس سرزمین کا" کہ وراثت کی ملکیت سب سے پختہ اور مضبوط ملکیت ہوتی ہے۔ اس میں کسی قسم کا کوئی خطرہ اور اندیشہ نہیں ہوتا۔ نیز جس طرح وراثت اپنے کسی عمل کے بدلہ میں نہیں ملتی اسی طرح جنت کی یہ نعمتیں بھی ہمارے کسی عمل کا بدلہ نہیں ہوں گی بلکہ یہ محض اس اَكْرَمُ الْاَكْرَمِيْنَ اور اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ کا فضل وکرم ہو گا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "بے شک میں اسے جانتا ہوں جو دوزخ والوں میں سب سے آخر میں اس سے نکلے گا اور جنت والوں میں سے سب سے آخر میں جنت میں جائے گا۔ وہ ایسا آدمی ہے جو ہاتھوں اور پیٹ کے بل گھسٹتا ہوا آگ سے نکلے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا: جا جنت میں داخل ہو جا۔ وہ جنت میں آئے گا تو اسے یہ خیال دلایا جائے گا کہ جنت بھری ہوئی ہے۔ وہ واپس آکر عرض کرے گا: اے میرے رب! مجھے تو وہ بھری ہوئی ملی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا: جا جنت میں داخل ہو جا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ (دوبارہ) جائے گا تو اسے یہی لگے گا کہ وہ بھری ہوئی ہے۔ وہ واپس آ کر (پھر) کہے گا: اے میرے رب! میں نے تو اسے بھرا ہوا پایا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا: جا جنت میں داخل ہو جا۔ تیرے لئے (وہاں) پوری دنیا کے برابر اور اس سے دس گنا زیادہ جگہ ہے (یا تیرے لئے دنیا سے دس گنا زیادہ جگہ ہے) آپ ﷺ نے فرمایا: وہ شخص کہے گا: کیا تو میرے ساتھ مزاح کرتا ہے (یا میری ہنسی اڑاتا ہے) حالانکہ تو ہی بادشاہ ہے؟ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ ہنس دیے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے پچھلے دندان مبارک ظاہر ہو گئے۔ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: چنانچہ یہ کہا جاتا تھا کہ یہ شخص سب سے کم مرتبہ جنتی ہو گا۔ (صحیح مسلم)

علمی بات: اس زمین سے مراد جنت کی زمین ہے اور جنت کی زمین عطا کرنے کو حسب ذیل وجوہ سے وارث بنانے سے تعبیر فرمایا ہے۔

ا۔ ابتداً اس جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کو رکھا گیا تھا اور آخرت میں ان کی اولاد میں سے متقین ان کے وارث ہو کر جنت میں جائیں گے۔

۲۔ جو شخص جس چیز کا وارث ہو وہ اس میں بلا روک ٹوک تصرف کرتا ہے اور متقین بھی جنت میں بلا روک ٹوک تصرف کریں گے گویا کہ وہ جنت کے وارث ہیں۔

۳۔ جنت میں بہت سی جنتیں وہ ہوں گی جو کافروں کے لئے بنائی گئی تھیں، اگر وہ ایمان لے آتے تو ان کو وہ جنتیں دے دی جاتیں، جب وہ ایمان نہیں لائے تو مسلمانوں کو ان کی چھوڑی ہوئی جنتوں کا وارث بنا دیا جائے گا۔

علمی بات: "تو کیا ہی خوب صلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کا"۔ یہ بات متقی کہیں گے یا فرشتے، یا پھر یہ اللہ تعالیٰ ہی کا فرمان ہو گا۔

آیت نمبر ۷۵: میدانِ حشر میں اللہ تعالیٰ اپنی شان کے مطابق بندوں کے فیصلے کے لئے نزول فرمائے گا۔ فرشتے بھی عرش الٰہی کے گرد حلقہ باندھے اس کی تسبیح اور حمد و ثنا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ تمام بندوں کے معاملات کا حق کے ساتھ فیصلہ فرما دے گا۔ حتیٰ کہ فرشتے جو ذی شعور ہستیاں ہیں اور ان میں بھی آراء کا اختلاف ہوتا ہے۔ ان کے درمیان بھی فیصلے کر دیئے جائیں گے۔ پھر ہر طرف سے اللہ تعالیٰ کی تعریف و تحسین ہو گی جو تمام جہانوں کا رب ہے۔

علمی بات: فرشتوں کے درجات کا ذکر فرمایا، جس طرح مومنین کا اعلیٰ مقام جنت ہے۔ اسی طرح فرشتوں کا اعلیٰ مقام عرش ہے اور فرشتے عرش کے گرد اللہ تعالیٰ کی حمد اور تسبیح کرتے رہتے ہیں ان کے درمیان بھی حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ اس فیصلہ پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں گے۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ جب وہ حساب و کتاب کے بعد اہل جنت کو جنت میں اور اہل جہنم کو جہنم میں بھیج دے گا اور ہر ایک کو اس کے کیئے کا بدلہ پورے عدل و انصاف کے ساتھ چکا دے گا تو اب فرشتوں کے بارے میں خبر دی جا رہی ہے کہ وہ عرش کے چاروں طرف سر نیاز جھکائے اپنے رب کی پاکی اور بڑائی بیان کرنے میں لگے ہوں گے۔ نیز جب اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کے درمیان پورے عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دے گا تو محشر کی کارگزاریاں ختم ہو جائیں گی اور فرشتے اور جنت میں مقیم مومنین اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائیں گے اور اس کی تعریف بیان کریں گے۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

سُوْرَةُ الْمُؤْمِن

نوٹ: اس سورت کا دوسرا نام سورۃ غافر بھی ہے۔

ربط سورت: ۱۔ سورۃ المؤمن کا گزشتہ سورت سورۃ الزمر کے مضامین کا آپس میں بہت قریبی اور گہرا تعلق ہے۔ دونوں سورتوں کے بنیادی اور مرکزی مضمون میں بھی مماثلت پائی جاتی ہے۔ سورۃ الزمر کا مرکزی مضمون "توحید فی العبادت" ہے اور سورۃ المومن کا مرکزی مضمون "توحید فی الدعاء" ہے۔ توحید فی العبادت اور توحید فی الدعاء آپس میں لازم وملزوم ہیں۔ چنانچہ جس طرح عبادت کے حوالہ سے سورۃ الزمر میں بار بار مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ (اس کے لئے دین کو خالص کرتے ہوئے) کی تکرار ہے، اسی طرح اس سورت میں فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (توتم اللہ کی عبادت کرو اس کے لئے دین (عبادت) کو خالص کرتے ہوئے) کی بار بار تاکید ہے۔ یعنی دعا کرو اللہ ﷻ سے اس کے لئے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔ ایسا نہ ہو کہ دعا تو اللہ ﷻ سے مانگو اور اطاعت کسی اور کی کرو۔ جس طرح اللہ ﷻ کو جزوی اطاعت قبول نہیں اسی طرح اسے اس شخص کی دعا سننا بھی منظور نہیں جو اللہ ﷻ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ کسی اور کی اطاعت کا طوق بھی اپنی گردن میں ڈالے ہوئے ہے۔

۲۔ "سورۃ الزمر" کے آخر میں کافروں کی سزا اور متقی مسلمانوں کی جزا بیان کی گئی اور سورۃ المؤمن کے شروع میں فرمایا گیا کہ اللہ ﷻ گناہوں کو بخشنے والا ہے تاکہ کافر کو کفر چھوڑنے اور ایمان قبول کرنے کی ترغیب ملے۔

۳۔ سورۃ الزمر کی ابتداوحی الٰہی اور قرآنِ کریم کی حقانیت کے بیان سے تھی اور انتہا اس مضمون پر تھی کہ حق تعالیٰ کا اپنی مخلوقات کے درمیان صحیح صحیح فیصلہ اور عدل و انصاف قائم کرنا حق تعالیٰ کی شان عزت و کبریائی اور علم و حکمت پر مبنی ہے۔ قیامت کے دن جب لوگوں کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ فیصلے کر دیئے جائیں گے تو ہر کوئی اللہ ﷻ کے فیصلوں کی تعریف کر رہا ہوگا۔

سورۃ المؤمن کی ابتدا میں یہ بتایا گیا ہے کہ الکتاب کو اللہ ﷻ نے نازل فرمایا ہے جو سب کو جاننے والا اور ہر چیز اور کام پر غالب ہونے کے باوجود لوگوں کے گناہوں کو معاف کرتا اور ان کی توبہ قبول کرتا ہے۔ وہ بڑا طاقتور اور مجرموں کو سخت سزا دینے والا ہے اس سے بڑھ کر کوئی طاقت ور نہیں اور ہر کسی نے اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

۴۔ سورۃ الزمر کے آخر میں عقلی دلائل کے ساتھ توحید باری تعالیٰ کا ذکر تھا۔ اس سورت کے آخر میں بھی عقلی و تاریخی دلائل کے ساتھ توحید باری تعالیٰ کا ذکر ہے۔

۵۔ دونوں سورتوں "سورۃ الزمر" اور "سورۃ المومن" میں قیامت کے احوال اور حشر کے میدان میں کفار کے احوال بیان کیئے گئے ہیں۔

سورۃ الزمر میں ملاوٹ اور آمیزش سے پاک خالص توحید کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ سورۃ المؤمن میں توحید کے علاوہ آخرت کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ کج بحثی، ضد اور فرعونیت سے بچنے کا حکم ہے اور ہلاکت کی سخت تنبیہ ہے۔

سورۃ المومن کی فضیلت: ۱۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے صبح اٹھ کر سورۃ المؤمن کی آیت نمبر ۱، حٰمٓ، سے لے کر آیت نمبر ۳ کے آخر اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ، تک پڑھا اور آیت الکرسی پڑھی تو ان کی برکت سے صبح سے شام تک اس کی حفاظت کی جائے گی اور جس نے انہیں شام میں پڑھا تو ان کی برکت سے صبح تک اس کی حفاظت کی جائے گی: (جامع ترمذی، طبرانی)

۲۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حٰمٓ سے شروع ہونے والی سورتیں قرآن مجید کی زینت ہیں۔ (مستدرک الحاکم)

آیت نمبر ۱: حروف مقطعات کا علم اللہ ﷻ کے پاس ہے۔ یہ اللہ ﷻ اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان ایک راز ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت مہلب بن ابی صفرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مجھے ایسے شخص نے یہ روایت کی کہ جس نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ (کسی جہاد کے موقع پر رات میں حفاظت کے لئے) فرما رہے تھے کہ اگر رات میں تم پر چھاپہ مارا جائے تو تم حٰمٓ لَا يُنْصَرُوْنَ پڑھ لینا۔ (جس کا حاصل لفظ حٰمٓ کے ساتھ یہ دعا کرنا ہے کہ تمہارا دشمن کامیاب نہ ہو۔) (جامع ترمذی، سنن ابی داوٗد)

آیت نمبر ۲: کفار اعتراض کرتے تھے کہ قرآنِ کریم کو نبی کریم ﷺ نے اپنے پاس سے گھڑ لیا ہے۔ (معاذ اللہ) اس بات کو واضح کر دیا گیا کہ قرآنِ حکیم اللہ ﷻ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے جو کائنات کی ہر چیز پر غالب ہے اور جس کی قوت اور غلبہ کے سامنے کوئی ٹھہر نہیں سکتا جو ہر چیز کا از خود اور پورا پورا علم رکھتا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی پہلی صفت الْعَزِیْز بیان ہوئی ہے جس کے دو معنیٰ ہیں: ایک معنیٰ ہے غالب، یعنی ایسا قادر کہ کوئی شخص بھی قدرت میں اس کے مساوی نہ ہو اور دوسرا معنیٰ ہے: جس کی کوئی مثل نہ ہو، اس کے بعد دوسری صفت الْعَلِیْم کو ذکر فرمایا ہے اور یہ عالم کا مبالغہ ہے، یعنی بہت بڑا عالم، جو تمام معلومات کو محیط ہو، وہ ہر چیز کا براہِ راست اور پورا پورا علم رکھتا ہے۔ اللہ ﷻ کے علم کی چھ خصوصیات ہیں:

۱۔ اس کا علم ذاتی ہے یعنی کسی سے حاصل شدہ نہیں ہے۔ ۲۔ اس کا علم غنی ہے، یعنی کسی آلہ کا یا غور و فکر کا محتاج نہیں ہے۔ ۳۔ اس کا علم ازلی و ابدی ہے، اس کی کوئی ابتدا ہے نہ انتہا ہے۔ ۴۔ اس کا علم واجب ہے، یعنی اس کے علم کا ہونا ضروری ہے اور نہ ہونا محال ہے۔ ۵۔ اس کا علم دائمی ہے، اس میں تبدل و تغیر محال ہے۔ ۶۔ اس کا علم انتہائی کامل ہے، مثلاً ایک ذرہ کو کتنے انسانوں نے دیکھا، کتنے پرندوں نے دیکھا، کتنے چرندوں نے دیکھا، اس پر کتنے ہوا کے جھونکے گزرے، کتنے بارش کے قطرے برسے، وہ کتنی چیزوں کے سامنے رہا، کتنی چیزوں کے پیچھے رہا، کتنی چیزوں کے اوپر، کتنی چیزوں کے نیچے، کتنی چیزوں کے دائیں اور کتنی چیزوں کے بائیں رہا۔ غرض اللہ ﷻ کو ایک ذرہ کا بھی غیر متناہی در غیر متناہی وجوہ سے علم ہے اور اس کا علم انسان کی عقل میں آ ہی نہیں سکتا اور ایک ذرہ کے علم میں بھی کوئی اللہ ﷻ کے علم کی مماثل نہیں ہے۔

علمی بات: اس کتاب کے نازل کرنے والے کی چند متعلقہ صفات اس انداز سے بیان کی گئی ہیں کہ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے۔ کفار کا بنیادی اعتراض آپ ﷺ پر یہ تھا کہ یہ کلام اللہ ﷻ کی طرف سے نازل شدہ نہیں بلکہ آپ ﷺ کی اپنی اختراع ہے (معاذ اللہ)۔ اس لئے سورت کے آغاز ہی میں فرما دیا گیا کہ یہ کتاب کسی کمزور ہستی کی طرف سے نہیں بلکہ اس اللہ ﷻ کی طرف سے نازل شدہ ہے جو کائنات کی ہر چیز پر غالب ہے اور وہ کفار و مشرکین کی معاندانہ کوششوں اور سازشوں کے باوجود اپنے کلمہ کو سربلند اور نافذ کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

آیت نمبر ۳: قرآن پاک کو نازل کرنے والی ذات اللہ ﷻ کی ہے اور اللہ ﷻ کی مزید جامع صفات یہ ہیں کہ وہ گناہوں کو معاف کرنے والا اور توبہ کو قبول کرنے والا ہے اور ظالموں کو عبرتناک سزا دینے والا ہے۔ وہ بڑی وسعت والا ہے جو چاہے اور جتنا چاہے عطا فرما سکتا ہے۔ بلاشبہ ان تمام صفات والی ہستی ہی معبودِ حقیقی ہے اور بالآخر تمام بندوں کو اسی کے سامنے حاضر ہونا ہے۔

علمی بات: آیت نمبر ۲ میں اللہ ﷻ کی دو صفات العزیز اور العلیم بیان ہوئی تھیں۔ اب تیسری صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ اپنے فرماں بردار بندوں کے بہت سے گناہ از خود ہی بخشتا رہتا ہے۔ چوتھی صفت یہ ہے کہ کافر توبہ کر کے حلقۂ اسلام میں داخل ہو جائیں ان کی توبہ قبول کر کے ان کے سابقہ گناہوں کو معاف کر دینے والا ہے اور اس صفت کا تعلق صرف نو مسلموں سے نہیں بلکہ جو بندہ بھی اپنے گناہوں پر نادم ہو کر اس اللہ ﷻ کی طرف رجوع کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگے اس کے گناہ بھی معاف فرما دیتا ہے۔ پانچویں صفت یہ ہے کہ وہ اپنے باغیوں کو سخت سزا دے کر ان کی اکڑی ہوئی گردنیں توڑ سکتا ہے۔ خواہ وہ یہ عذاب دنیا میں دے یا آخرت میں۔ اللہ ﷻ کی چھٹی صفت یہ ہے کہ وہ کشادہ دست ہے۔ ہر وقت انعامات کی بارش فرماتا رہتا ہے اور اس سے اپنے نافرمانوں کو بھی محروم نہیں فرماتا۔

علمی بات: غَافِرِ الذَّنْبِ کے لفظی معنیٰ ہیں گناہ پر پردہ ڈالنے والا اور وَقَابِلِ التَّوْبِ کے معنیٰ توبہ قبول کرنے والا۔ اللہ ﷻ نے ان دو الگ الگ لفظوں سے اپنی صفات بیان فرمائی ہیں۔ اگرچہ مفہوم دونوں کا تقریباً ایک معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ غَافِرِ الذَّنْبِ میں اشارہ اس طرف کرنا ہے کہ اللہ ﷻ کو اس پر بھی قدرت ہے کہ کسی بندہ کا گناہ بغیر توبہ کے بھی معاف کر دے۔ ذِی الطَّوْلِ۔ طول کے لفظی معنیٰ وسعت و غنا کے ہیں اور قدرت کے معنیٰ میں بھی آتا ہے۔ فضل و احسان کے معنیٰ میں بھی۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی اتنی صفات بیان کرنے کے بعد ان دو بنیادی جھگڑوں کی حقیقت بیان فرما دی۔ جو رسول اللہ ﷺ اور کفارِ مکہ کے درمیان چل رہے تھے۔ ان میں پہلا یہ تھا کہ اللہ ﷻ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ باقی تمام معبود جھوٹے، باطل اور بے کار ہیں اور دوسرا یہ تھا کہ روزِ آخرت کا قیام یقینی ہے اور تم

سب کو یقیناً اللہ ﷻ کے حضور پیش ہونا ہو گا۔

علمی بات: اس انداز میں بیان کہ اللہ ﷻ غَافِرِ الذَّنۡبِ اور قَابِلِ التَّوۡبِ ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ ﷻ کی رحمت غضب پر حاوی ہے۔ کیونکہ یہاں چار میں سے تین باتیں رحمت کے حوالہ سے اور ایک بات عذاب کی آئی ہے۔ اس آیت میں اللہ ﷻ کی طرف سے محبت اور شفقت کا اظہار ہے اور کس درجہ گناہ گاروں کی دل جوئی، تسلی اور خاطر داری ہے کہ وہ کسی حالت میں بھی مایوس نہ ہوں۔ وہ چاہے گناہوں سے سر سے پاؤں تک آلودہ ہوں جب بھی خلوص کے ساتھ اللہ ﷻ کے سامنے آئیں گے، تو اس کو نہایت مہربان اور شفیق پائیں گے۔ پھر اس کے بعد شَدِیۡدِ الۡعِقَابِ کہہ کر یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ کہیں لوگ اس کی بخشش ہی پر بھروسہ کو کافی نہ سمجھ بیٹھیں اور یہ سمجھ کر گناہ کرتے چلے جائیں کہ وہ تو عفو و حلم کا پیکر ہے۔ انہیں معاف ہی کر دے گا۔ بتایا گیا ہے کہ جہاں اس کے عفو و کرم کی امید رکھو۔ وہاں اس بات سے بھی ڈرو کہ وہ جب سزا دیتا ہے تو شدید سزا دیتا ہے۔ ایمان کو گویا اس طرح امید و خوف کے بین بین رکھا ہے۔ تاکہ اس میں توازن قائم رہے۔

عملی پہلو: علمائے کرام نے یہاں بڑا روح افزا اور بصیرت افروز واقعہ بیان کیا ہے۔ شام کا ایک آدمی امیر المومنین حضرت سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا دوست تھا۔ اس کی پارسائی، تقویٰ اور دین کے لئے اس کی حمیت کے باعث آپ اس کو اپنا بھائی کہہ کر پکارتے تھے۔ شام سے ایک آدمی آیا۔ آپ نے اس سے اپنے دوست کی خیریت دریافت کی۔ اس نے بتایا کہ وہ تو تباہ ہو گیا ہے۔ شراب پیتا ہے، گانا سنتا ہے اور وہ فسق و فجور کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہ سن کر آپ کو از حد رنج ہوا، فرمایا جب واپس جانے لگو تو مجھے ملتے جانا، روانگی کے وقت وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اپنے کاتب کو بلایا اور فرمایا لکھو: "
مِنۡ عُمَرَبۡنِ الۡخَطَّابِ اِلٰی فُلَانٍ سَلَامٌ عَلَیۡکُمۡ فَاِنِّیۡ اَحۡمَدُ اِلَیۡکَ اللّٰہَ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ غَافِرِ الذَّنۡبِ وَقَابِلِ التَّوۡبِ شَدِیۡدِ الۡعِقَابِ ذِی الطَّوۡلِ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اِلَیۡہِ الۡمَصِیۡرُ"
"یہ خط عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے فلاں شخص کی طرف۔ تم پر سلام ہو۔ میں تیری طرف اللہ ﷻ کی حمد کرتا ہوں جو وحدہٗ لاشریک ہے۔ گناہ معاف کرنے والا، توبہ قبول کرنے والا۔ سخت عذاب والا۔ بڑی قدرت والا۔ اس کے بغیر اور کوئی معبود نہیں۔ اسی کی طرف سب نے لوٹنا ہے۔"

پھر خود بھی اس کی ہدایت کے لئے دعا مانگی اور حاضرین مجلس سے بھی اس کے لئے دعا منگوائی اور یہ خط اس شخص کو دیا اور فرمایا کہ یہ میرے دوست کو پہنچا دینا۔ جب اس دوست نے خط پڑھا، تو اس پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا مینہ برسنے لگا۔ روتا تھا اور خط کو بار بار پڑھتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے گناہوں سے توبہ کی فسق و فجور کی زندگی ترک کر کے اطاعت و پرہیز گاری کی زندگی بسر کرنے لگا۔ حضرت سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جب اس کی توبہ کی اطلاع ملی تو آپ رضی اللہ عنہ بڑے خوش ہوئے اور فرمانے لگے: ھکذا فاصنعوا اذا رایتم اخالکم زل ذلۃ فسددوہ ووفقوہ وادعوا اللہ لہ ان یتوب علیہ ولا تکونوا اعوانا للشیاطین علیہ۔ یعنی تم بھی جب اپنے کسی بھائی کو دیکھو کہ راہ راست سے اس کا قدم پھسل گیا ہے تو اس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا کرو۔ اسے سیدھی راہ پر لانے کی کوشش کرو۔ اس کی ہدایت کے لئے اللہ ﷻ سے دعا مانگو اور اس کے خلاف شیطان کے مددگار نہ بن جاؤ یعنی اگر تم اسے برا بھلا کہنا شروع کر دو گے، اس پر طعن و تشنیع کے تیر برسانے لگو گے تو وہ اپنی ضد پر پکا ہو جائے گا اور اسے اپنی عزت نفس کا سوال بنا کر گمراہی میں دور نکل جائے گا۔ سبحان اللہ! دعوت وارشاد اور تبلیغ واصلاح کا کیا حکیمانہ انداز ہے۔

آیت نمبر ۴: اللہ ﷻ کی آیات اور اس کی نشانیوں کا وہی لوگ انکار کرتے ہیں جنہوں نے کفر پر ہٹ دھرمی اختیار کر رکھی ہے۔ جھگڑے سے مراد باطل جھگڑا ہے جس کا مقصد حق کی تکذیب و تردید اور حق کے بارے میں غلط قسم کے اعتراضات شامل ہیں۔ کفار کے تجارتی سفروں میں محفوظ رہنے اور ان کی آرام و آسائش والی زندگی سے دھوکہ نہ کھانے کی تلقین کی گئی ہے۔ کفار کو چند روز کی مہلت دی گئی ہے۔ وہ اللہ ﷻ کی گرفت سے نہیں بچیں گے اور خطاب کے اس انداز سے در حقیقت اہل ایمان کو تسلی دی جا رہی ہے۔

علمی بات: گزشتہ دونوں آیات میں اللہ ﷻ نے اپنی صفات بیان کرنے کے بعد ان دو بنیادی جھگڑوں کی حقیقت بیان فرما دی۔ جو کفار مکہ محض ہٹ دھرمی کی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ سے کر رہے تھے۔ ان میں پہلا یہ تھا کہ اللہ ﷻ کے ساتھ دوسرے معبودوں کو شریک کرنا۔ جس سے رسول اللہ ﷺ اُنہیں منع کر رہے تھے کہ اللہ ﷻ کے سوا کوئی معبود نہیں، باقی تمام اُن کے بنائے ہوئے معبود جھوٹے، باطل اور بے کار ہیں وہ ان کے کسی کام نہیں آسکتے اور نہ ہی کبھی آسکیں گے۔ دوسرا احساب و کتاب اور یوم آخرت کا انکار کرنا۔ جبکہ آپ ﷺ اُنہیں یہ سمجھا رہے تھے کہ روز آخرت کا قیام یقینی ہے اور تم سب کو یقیناً

اللہ ﷻ کے حضور پیش ہونا ہو گا۔

علمی بات: جدل کا لغوی معنیٰ ہے "رسی بٹنا" اور عرف میں جدال کا معنیٰ ہے "کسی شخص کی رائے کو اِلزامی دلائل سے اپنے موٴقف کی طرف پھیرنے کی کوشش کرنا، جھگڑا کرنا"۔ لہٰذا جب مباحثہ سنجیدگی کی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے جھگڑے میں داخل ہو جائے تو یہ جدال کہلاتا ہے، اللہ ﷻ کی ذات میں اور قرآنِ مجید کی آیتوں میں جدال کرنا کفر ہے۔

قرآنِ مجید کی آیتوں میں جدال یہ ہے کہ جیسا کہ کفار نے کہا: قرآنِ مجید میں مکھی اور مکڑی کا ذکر ہے اور یہ بہت چھوٹی چھوٹی اور حقیر چیزیں ہیں اور ان کا ذکر کرنا اللہ ﷻ کی شان کے لائق نہیں۔ انہوں نے کہا: قرآنِ حکیم میں شَجَرَةَ الزَّقُّوۡمِ کا ذکر ہے کہ وہ دوزخ میں درخت ہے اور درخت لکڑی کا ہوتا ہے تو لکڑی آگ میں کیسے رہ سکتی ہے۔ اسی طرح انہوں نے قرآنِ مجید کو سحر اور شعر کہا اور قرآنِ مجید میں اس طرح جدال کرنا کفر ہے۔

فرامین نبوی ﷺ: ۱۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "قرآن مجید میں جدال کرنا کفر ہے۔" (مسند احمد)

۲۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "قرآنِ کریم میں بحث اور جھگڑا نہ کرو، کیونکہ قرآنِ کریم میں جھگڑا کرنا کفر ہے۔" لَا تُجَادِلُوۡا فِی الۡقُرۡاٰنِ، فَاِنَّ جِدَالًا فِیۡهِ کُفۡرٌ۔ (مسند احمد)

عملی بات: جو جدال جائز بلکہ بعض اوقات مستحب اور بعض اوقات واجب ہے۔ وہ یہ ہے کہ حق کو ثابت کرنے کے لئے اور باطل کا رد کرنے کے لئے کافروں اور بے دینوں سے جدال کیا جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَجَادِلۡهُمۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ۔ "اور ان سے عمدہ طریقہ سے بحث کیجیے۔" (سورۃ النحل ۱۶، آیت: ۱۲۵)

علمی بات: مشرکین مکہ تجارت اور کسب معاش کے لئے مکہ مکرمہ سے نکل کر دوسرے شہروں کا سفر کرتے ہیں اور بہت آرام اور اطمینان اور خوشحالی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں اور اُنہیں کسی آفت اور مصیبت کا سامنا نہیں ہوا، واضح کیا گیا ہے کہ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اللہ ﷻ ان سے راضی اور خوش ہے، بلکہ اللہ ﷻ نے ان کو مہلت دی ہوئی ہے اور اگر یہ اپنی اسی روش پر قائم رہے تو وہ وقت آنے پر ان کو اپنی گرفت میں لے گا۔

آیت نمبر ۵: سابقہ اقوام کا ذکر ہے کہ جن پر رسولوں کو جھٹلانے کے نتیجہ میں عذاب بھیجا گیا۔ اسی طرح قومِ نوح اور اس کے بعد بھی بہت سی قوموں نے رسولوں علیہم السلام کو نہ صرف جھٹلایا بلکہ ان پر دست درازی کی جسارت بھی کی (معاذ اللہ) اس کے نتیجہ میں اللہ ﷻ نے انہیں عذاب کی گرفت میں لے لیا اور اُنہیں نشانِ عبرت بنا دیا۔

علمی بات: سابقہ قوموں کی مثال دے کر یہ بتایا گیا ہے کہ ان سے قبل حضرت نوح علیہ السلام کی قوم اور ان کے بعد اور اُمتیں بھی اپنے اپنے نبی علیہ السلام کو جھٹلا چکی ہیں۔ انہوں نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کے ساتھ ناحق کے جھگڑے نکالے تاکہ (دین) حق کو ناکام بنا دیں۔ یہاں تک کہ وہ ان کو قتل (شہید) کرنے پر تُل گئیں۔ بالآخر اللہ ﷻ نے ان کی گرفت کی۔ پھر ایسی سزا دی گئی کہ وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ ان کے عالی شان محلوں کے کھنڈرات آج بھی لوگوں کو درسِ عبرت دے رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کفر دنیا میں اپنی ظاہری رونق سے ناسمجھ انسانوں کو کچھ وقت کے لئے متاثر کر سکتا ہے لیکن حق پر غلبہ کبھی نہیں پا سکتا۔

علمی بات: احزاب، حزب کی جمع ہے اور ان سے مراد ایسی جماعتیں، گروہ یا پارٹیاں ہیں جن میں سختی اور شدت پائی جائے۔ وہ آپس میں ہم خیال ہوں اور ان کا مقصد اقتدار میں عمل دخل حاصل کرنا ہو، یا اس سے چمٹے رہنا ہو۔ یہاں مراد وہ اقوامِ سابقہ ہیں جن پر رسولوں کی دعوت کو جھٹلانے کی بنا پر اللہ ﷻ کا عذاب آیا تھا۔

علمی بات: یہ کفارِ مکہ اس لئے اللہ ﷻ کی گرفت سے بچ نہیں سکتے کہ ان سے پہلے کئی قومیں ان جیسی گزر چکی ہیں۔ مثلاً قومِ نوح اور اس کے بعد قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ ابراہیم، قومِ لوط اور آلِ فرعون وغیرہ۔ پھر جب رسول علیہ السلام ان کے پاس آئے تو انہوں نے صرف اُنہیں جھٹلانے پر اکتفا نہ کیا بلکہ اُنہیں قتل (شہید) کرنے اور رجم کی دھمکیاں دینے لگے اور ان کے خلاف سازشیں تیار کرنے لگے (معاذ اللہ)۔ غرض یہ کہ انہوں نے ہر وہ حربہ استعمال کیا جس کے ذریعہ وہ اللہ ﷻ کے دین کو سرنگوں کر سکیں اور انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت کو اور ان کے متبعین کو کچل دیں۔ پھر جب ان پر اللہ ﷻ کا عذاب آیا تو دیکھ لو ان کا کیا حشر ہوا۔ ان قوموں کا کوئی نام و نشان تک نظر نہیں آتا۔ انہیں صفحہ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا۔ گویا اس آیت میں اللہ ﷻ نے کفارِ مکہ کو تاریخی شواہد کی روشنی میں ان کے انجام سے خبردار کیا ہے۔

آیت نمبر ۶: جس طرح سابقہ اقوام عذاب ثابت ہونے پر تباہ کر دی گئیں اسی طرح آپ ﷺ کی تعلیمات کا انکار کرنے والوں کا بھی بُرا انجام ہوگا۔ بلاشبہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ کافر لازماً دوزخ میں جانے والے ہیں۔

علمی بات: جس طرح پیغمبروں علیہم السلام کے اعلان کے موافق پہلی کافر قوموں پر دُنیاوی عذاب آکر رہا، موجودہ منکروں کے لئے بھی ویسی ہی وعید ہے۔ اسی طرح ان قوموں پر دنیا میں جو عذاب آیا اسی پر بس نہیں، بلکہ ان کے متعلق ربِ ذوالجلال کی یہ بات بھی ثابت شدہ حقیقت ہے کہ دنیا کے عذاب کی طرح آخرت میں ان لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہوگا۔

آیت نمبر ۷: اس آیت میں اہل ایمان کے لئے اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتوں اور حاملین عرش کی دُعاؤں کا بیان فرمایا گیا ہے جو کہ ایک عظیم الشان اور بے مثال شرف و اعزاز ہے۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ کی عظمت کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عرش اٹھانے والے اور دیگر مقرب فرشتے اس کی تسبیح و حمد کرتے رہتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان رکھتے ہیں اور اس سے اہل ایمان کے لئے بخشش طلب کرتے رہتے ہیں۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مزید عرض کرتے ہیں کہ: "وہ مومنوں کے گناہ معاف فرما کر ان کو دردناک عذاب سے بچالے۔" یہ وہ مومنین ہیں جنہوں نے گناہوں سے توبہ کر لی ہے اور سیدھے راستہ کی پیروی کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے علم کی طرح اس کا دامنِ رحمت بھی بہت وسیع ہے اور وہی اللہ تعالیٰ خطاکاروں کو معاف فرمانے والا ہے۔

علمی بات: اس آیت میں ملائکہ مقربین کے ایک خاص گروہ کا تذکرہ اور وہ جو کچھ کرتے ہیں اس کی وضاحت ہے یہ ان فرشتوں کا گروہ ہے جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ جو عرش کے ارد گرد ہیں ان کا کام یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کرتے ہیں۔ اس کے سامنے عجز و انکساری کا اظہار کرتے ہیں۔ معروف بات یہ ہے کہ عرش کو اٹھانے والے فرشتے چار ہیں مگر قیامت والے دن ان کی تعداد آٹھ ہوگی۔

علمی بات: اہل ایمان کا رشتہ ایسا عظیم رشتہ ہے جو عرش اور فرش والوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیتا ہے۔ مومنوں اور ان فرشتوں کے درمیان ایمان کا یہ رشتہ ان سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ فرشتے دنیا کے اہل ایمان انسانوں کے لئے رب العالمین کے عرش کے نزدیک دعا اور طلب استغفار کرتے رہیں۔ گویا یہ کام بھی ان کے دائمی وظیفہ کا ایک حصہ ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جب کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے لئے اس کی غیر موجودگی میں دعا کرتا ہے تو ایک فرشتہ (اس کی دعا پر آمین کہتا ہے اور) اس کے لئے دعا کرتا ہے کہ (اللہ تعالیٰ) تجھے بھی یہی دے (جو تو اس مسلمان کے لئے اللہ تعالیٰ سے مانگ رہا ہے)۔" (صحیح مسلم)

علمی بات: اس آیت کریمہ میں نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے۔ مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تم کفارِ مکہ کی ایذا رسانیوں کی وجہ سے یقیناً نہایت دل شکستہ ہو رہے ہو، لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ جو لوگ تمہیں تکلیف پہنچا رہے ہیں وہ نہایت گھٹیا اور رزیل لوگ ہیں جن کا اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی مقام نہیں۔ ان کی باتوں کا کیا اثر لینا، تمہیں تو اللہ تعالیٰ نے ایسا مقام عطا فرمایا ہے کہ عرش الٰہی کے حامل فرشتے اور عرش کے گرد و پیش حاضر رہنے والے ملائکہ تک تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور دعاؤں میں مشغول رہتے ہیں۔ عام فرشتوں کے بجائے عرش الٰہی کے حامل اور اس کے گرد و پیش رہنے والے فرشتوں کا ذکر یہ تصور دلانے کے لئے کیا گیا ہے کہ سلطنتِ خداوندی کے عام اہل کار تو درکنار وہ ملائکہ مقربین بھی جو اس سلطنت کے ستون ہیں اور جنہیں فرمانروائے کائنات کے ہاں قرب کا مقام حاصل ہے، تمہارے ساتھ گہری دلچسپی و ہمدردی رکھتے ہیں۔

علمی بات: ایمان کا رشتہ ہی وہ اصل رشتہ ہے جس نے عرشیوں اور فرشیوں کو ملا کر ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے اور اسی تعلق کی وجہ سے عرش کے قریب رہنے والے فرشتوں کو زمین پر بسنے والے ان خاکی انسانوں سے دلچسپی پیدا ہوئی ہے جو اُنہی کی طرح اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہی کا اقتدار مانتے ہیں، کوئی دوسری ہستی ایسی نہیں ہے جو انہیں حکم دینے والی ہو اور وہ اس کے آگے سر اطاعت جھکاتے ہوں۔ یہی عقیدہ جب ایمان لانے والے انسانوں نے بھی اختیار کر لیا تو اتنے بڑے اختلاف جنس اور بعید مقام کے باوجود ان کے اور فرشتوں کے درمیان ہم مشربی کا مضبوط تعلق قائم ہو گیا۔

علمی پہلو: واضح رہے کہ فرشتے مغفرت کی یہ دعا نام نہاد مسلمانوں کے لئے نہیں کرتے جو فسق و فجور میں غرق رہتے ہیں بلکہ جیسا کہ آیت میں صراحت سے بیان ہوا ہے ان لوگوں کے لئے کرتے ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور اللہ ﷻ کے راستہ پر چلے یعنی جنھوں نے اپنی اصلاح کی اور راہ ہدایت پر چلتے رہے۔ جو نافرمانی چھوڑ دیتے ہیں، سرکشی سے باز آتے ہیں اور فرماں برداری اختیار کر کے زندگی کے اس راستہ پر چلنے لگتے ہیں جو اللہ ﷻ اور اس کے حبیب مکرم ﷺ نے انہیں بتایا ہے۔ آدابِ دعا میں سے یہ ہے کہ پہلے اللہ ﷻ کی تعریف و تمجید کی جائے پھر حمد باری کے بعد اس رحیم و کریم کے حضور دستِ سوال دراز کیا جائے۔ جیسا کہ فرشتوں کے عمل سے یہ بات واضح ہو رہی ہے۔ دعا میں خاص طور پر یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ اس میں پروردگار سے جن چیزوں کی التجا کی جا رہی ہے ان کو اختصار سے نہیں بلکہ وسعت کے ساتھ مانگا جا رہا ہے۔ یہ دعا کا خاص اسلوب ہے اور یہ وہی اختیار کرتا ہے جسے اس کے ساتھ گہری دلچسپی ہو جس کے لئے وہ دعا مانگ رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کو اہل ایمان کے ساتھ ایسا گہرا رشتہ ہے کہ وہ نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ اللہ ﷻ کے حضور مسلمانوں کی مغفرت کی التجا پیش کر رہے ہیں۔

آیت نمبر ۸: فرشتے مومنوں کے حق میں مزید یہ دُعائیں بھی عرض کرتے ہیں: کہ اے رب! اُنہیں ہمیشہ رہنے والے باغات میں داخل فرمادے جن کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔ مزید عرض کرتے ہیں: کہ اے رب! ان کے ساتھ ان کے نیک باپ دادا، اولاد اور بیویوں کو بھی ان کے ساتھ جنت عطا فرمادے۔ اللہ ﷻ ہی زبردست اور کمال حکمت والا ہے۔

علمی بات: اس آیت میں فرشتوں کے استغفار کی مزید تفصیل ہے کہ وہ ان کے لئے صرف جہنم سے بچانے کی دعا نہیں کرتے بلکہ ان جنتوں میں داخل کرنے کی دعا کرتے ہیں جن کا اللہ ﷻ نے ان کے لئے وعدہ فرمایا تھا۔ اسی طرح وہ ان کی بیویوں، ان کے والدین اور ان کی اولاد کے حق میں بھی یہ دعا کرتے ہیں کہ اگر وہ صالح یعنی صاحب ایمان ہوں اور توبہ و اصلاح کے مرحلہ سے گزر چکے ہوں تو انہیں بھی جنت میں داخل فرما تا کہ ماں باپ اپنے بچوں کو دیکھ کر آنکھوں کی ٹھنڈک حاصل کریں اور شوہر اپنی بیوی کو دیکھ کر اور بیوی اپنے شوہر کو دیکھ کر اطمینان محسوس کرے۔ پھر ہر طرح کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے آخر میں یہ عرض کرتے ہیں کہ یا اللہ! تو ہی عزیز ہے، یعنی سب پر غالب ہے اور تو ہی حکیم ہے جو فیصلہ کرے گا وہ حکمت پر مبنی ہو گا۔

علمی بات: اللہ ﷻ ان کامل اہل ایمان کے آباؤ اجداد، ان کی بیویوں اور ان کی اولاد کو بھی بشرطیکہ وہ اہل ایمان ہوں، ان کو کامل اہل ایمان کے ساتھ جنت میں جمع فرمادے گا اگرچہ وہ اپنے اعمال کے لحاظ سے ان درجات کے اہل نہ ہوں مگر ان کاملین کی عزت افزائی اور ان کی تسکین قلوب کے لئے ان کو اکٹھا کر دیا جائے۔ جیسا کہ اللہ ﷻ نے دوسری جگہ پر بھی فرمایا: "اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کی پیروی کی تو ہم ان کی اولاد کو انہی کے ساتھ شامل فرمادیں گے۔" (سورۃ الطور ۵۲، آیت: ۲۱) جن کے والدین جنت کے اعلیٰ مقام میں ہوں گے اللہ ﷻ ان کی ایماندار اولاد کے بھی درجات بلند کر کے ان کے والدین کے پاس پہنچا دے گا۔

عملی پہلو: فرشتوں کی دعا سے ہم کو بھی یہ سبق ملتا ہے کہ مومنوں کے حق میں مومنوں کی دُعائیں کیا اثر رکھتی ہیں بشرطیکہ یہ اس یقین و ایمان کے ساتھ ہوں جن میں دکھاوا اور ظاہر داری نہ ہو بلکہ حقیقت ہو اور ہر مومن کے دل کی آواز و آرزو ہو۔ وہ دُعائیں یقیناً اثر رکھتی ہیں اور ان کا اثر مانگنے والے کے اپنے حق میں بھی بہت اچھا رہتا ہے۔ پھر یہی نہیں کہ وہ فقط صرف ان مومنوں ہی کے حق میں دُعائیں کریں بلکہ ان کی نیک اولاد اور اَزواج کے لئے بھی دعا گو ہوں۔

آیت نمبر ۹: فرشتے اللہ ﷻ کے حضور یہ بھی دعا کرتے ہیں کہ اہل ایمان کو ہر طرح کی سختیوں اور عذاب سے بچالے۔ السَّیِّات یعنی بُرائیوں سے مراد غلط عقائد، بگڑے ہوئے اخلاق، بُرے اعمال اور گمراہی کا وبال ہے نیز آفات و مصیبتیں بھی مراد ہیں خواہ دنیا کی ہوں، عالم برزخ کی ہوں یا آخرت کی۔ اس بات سے مراد یہ ہے کہ فرشتے یہ دعا کرتے ہیں کہ اے رب! مومنوں کو ہر اس چیز سے بچا جو ان کے حق میں بُری ہو، روز قیامت کی بُرائیوں سے مراد حشر کی ہولناکی، محاسبہ کی سختی، رازوں کے فاش ہونے کی رُسوائی اور دیگر سختیاں ہیں۔

علمی بات: "سیآت" کا اطلاق بُرائیوں پر بھی ہوتا ہے اور بُرائیوں کے نتائج پر بھی۔ برائیوں کے نتائج سے جس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو اس طرح کہ ان کو ان بُرائیوں کے ارتکاب سے بچاتا کہ یہ ان کے بُرے انجام اور نتیجہ سے بچ سکیں کہ بُرائی کا نتیجہ بہرحال برا ہے۔ نیز اگر ان سے ایسی بُرائیوں کا ارتکاب بشری کمزوریوں کی بنا پر ہو جائے تو ان کو معاف فرمادے۔ اس لئے یہاں پر یہ دونوں مفہوم مراد ہو سکتے ہیں۔

علمی بات: یہاں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ آخرت میں انسان کو اچھا بُرا جو بھی کوئی صلہ ملے گا وہ درحقیقت انسان کے اپنے اعمال ہی ہوں گے جو وہاں پر اپنی اصل اور حقیقی شکل میں سامنے آجائیں گے۔ بہر کیف فرشتے ایمان والوں کے لئے اپنی دعا و درخواست کے دوران اپنے رب سے مزید عرض کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تو ان کو بُرائیوں سے بچالے کہ اوّل تو ان سے بُرائیاں سرزد ہی نہ ہونے پائیں اور اگر کبھی سرزد ہو جائیں تو ان کو ان سے اس طرح جھاڑ دے اور ان کو ایسا معاف فرمادے کہ یہ ان کے شر و نتائج سے محفوظ رہیں۔ آمین یارب العالمین۔

علمی و عملی بات: سب سے بڑی اور شاندار کامیابی یہ ہے کہ اللہ ﷻ گناہوں کے عذاب سے بچالے اور اپنے سایۂ رحمت میں ڈھانپ لے۔ گویا جس کو اللہ ﷻ دنیا میں گناہوں کے ارتکاب سے بچالے گا اسی پر آخرت میں اس کی طرف سے رحم ہو گا۔ بندہ کو ہر وقت یہ دعا کرنی چاہیئے کہ اللہ ﷻ اس کو گناہوں سے بچائے رکھے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک طویل حدیث بیان کی جس کا مفہوم یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ وصیت کی: کہ وہ ہر جمعہ کی شب چار رکعات نماز پڑھیں، پھر تشہد کے بعد اللہ ﷻ کی احسن حمد و ثنا کریں اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام اور خصوصاً آپ ﷺ پر اچھی طرح درود شریف پڑھیں، پھر تمام اگلے اور پچھلے مومنین کے لئے استغفار کریں اور اس کے بعد یہ دعا مانگیں: "اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِیْ بِتَرْكِ الْمَعَاصِیْ أَبَدًا مَا أَبْقَیْتَنِیْ، وَارْحَمْنِیْ أَنْ أَتَكَلَّفَ مَا لَا یَعْنِیْنِیْ، وَارْزُقْنِیْ حُسْنَ النَّظَرِ فِیْمَا یُرْضِیْكَ عَنِّیْ، اَللّٰھُمَّ بَدِیْعَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ وَالْعِزَّةِ الَّتِیْ لَا تُرَامُ، أَسْأَلُكَ یَا أَللّٰهُ یَا رَحْمٰنُ بِجَلَالِكَ، وَنُوْرِ وَجْھِكَ أَنْ تُلْزِمَ قَلْبِیْ حِفْظَ كِتَابِكَ كَمَا عَلَّمْتَنِیْ، وَارْزُقْنِیْ أَنْ أَتْلُوَهٗ عَلَى النَّحْوِ الَّذِیْ یُرْضِیْكَ عَنِّیْ، اَللّٰھُمَّ بَدِیْعَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ وَالْعِزَّةِ الَّتِیْ لَا تُرَامُ، أَسْأَلُكَ یَا أَللّٰهُ یَا رَحْمٰنُ بِجَلَالِكَ وَنُوْرِ وَجْھِكَ أَنْ تُنَوِّرَ بِكِتَابِكَ بَصَرِیْ، وَأَنْ تُطْلِقَ بِهٖ لِسَانِیْ، وَأَنْ تُفَرِّجَ بِهٖ عَنْ قَلْبِیْ، وَأَنْ تَشْرَحَ بِهٖ صَدْرِیْ، وَأَنْ تَغْسِلَ بِهٖ بَدَنِیْ، لِأَنَّهٗ لَا یُعِیْنُنِیْ عَلَى الْحَقِّ غَیْرُكَ، وَلَا یُؤْتِیْهِ إِلَّا أَنْتَ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ" "اے اللہ! مجھ پر رحم فرما اس طرح کہ جب تک تو مجھے زندہ رکھ میں ہمیشہ گناہ چھوڑے رکھوں، اے اللہ! تو مجھ پر رحم فرما اس طرح کہ میں لایعنی چیزوں میں نہ پڑوں، جو چیزیں تیری رضا و خوشنودی کی ہیں انہیں پہچاننے کے لئے مجھے حسن نظر (اچھی نظر) دے، اے اللہ! آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے والے، ذوالجلال (رعب و دبدبے والے) اکرام (عزت و بزرگی والے) ایسی عزت و مرتبت والے کہ جس عزت کو حاصل کرنے و پانے کا کوئی قصد و ارادہ ہی نہ کر سکے، اے اللہ! اے رحمٰن! اے بڑی رحمت والے میں تیرے جلال اور تیرے تابناک و منور چہرے کے وسیلہ سے تجھ سے مانگتا ہوں کہ تو میرے دل کو اپنی کتاب (قرآن پاک) کے حفظ کے ساتھ جوڑ دے، جیسے تو نے مجھے قرآن سکھایا ہے ویسے ہی میں اسے یاد و محفوظ رکھ سکوں، اور تو مجھے اس بات کی توفیق دے کہ میں اس کتاب کو اسی طریقہ اور اسی ڈھنگ سے پڑھوں جو تجھے مجھ سے راضی و خوش کر دے، اے اللہ! آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے، (جاہ) و جلال اور بزرگی والے اور ایسی عزت والے جس عزت کا کوئی ارادہ (تمنا اور خواہش) ہی نہ کر سکے، اے اللہ! اے رحمٰن! تیرے جلال اور تیرے چہرے کے نور کے وسیلہ سے تجھ سے مانگتا ہوں کہ تو اپنی کتاب کے ذریعہ میری نگاہ کو منور کر دے (مجھے کتاب الٰہی کی معرفت حاصل ہو جائے)، اور میری زبان بھی اسی کے مطابق چلے، اور اسی کے ذریعہ میرے دل کا غم دور کر دے، اور اس کے ذریعہ میرا سینہ کھول دے (میں ہر اچھی و بھلی بات کو سمجھنے لگوں) اور اس کے ذریعہ میرے بدن کو دھو دے (میں پاک وصاف رہنے لگوں) کیونکہ میرے حق پر چلنے کے لئے تیرے سوا کوئی اور میری مدد نہیں کر سکتا، اور نہ ہی کوئی تیرے سوا مجھے حق دے سکتا ہے اور اللہ ﷻ جو برتر اور عظیم ہے۔" (جامع ترمذی)

علمی و عملی بات: ملائکہ کو جب معلوم ہے کہ اللہ ﷻ نے مومنوں کو جنت میں داخل کرنے کا وعدہ فرمالیا ہے اور اللہ ﷻ کے وعدہ کے خلاف ہونا ناممکن ہے تو پھر اللہ ﷻ سے مومنوں کو جنت میں داخل کرنے کی دعا کرنا بے سود ہے۔ فرشتے ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اسی طرح مسلمان رسول اللہ ﷺ کے لئے ہر اذان کے بعد مقامِ محمود پر فائز فرمانے کی دعا کیوں کرتے ہیں جب کہ مسلمانوں کو معلوم ہے کہ مقامِ محمود عطا کرنے کا اللہ ﷻ نے اپنے رسول ﷺ سے وعدہ فرمالیا ہے تو پھر اس دعا کی کیا ضرورت ہے؟

اس کا یہ جواب ہو سکتا ہے کہ اللہ ﷻ نے فرشتوں کے دلوں میں مومنوں کی محبت اور مسلمانوں کے دل میں رسول اللہ ﷺ کی محبت ڈال دی ہے۔ اسی محبت کا تقاضا ہے کہ وہ مومنوں کے لئے اور مسلمان رسول اللہ ﷺ کے لئے دعا کرتے ہیں۔ پھر دعا کا مقصد مزید رحمت کی طلب بھی ہوتا ہے اور اللہ ﷻ

کے محبوب بندوں کے لئے دعا کرنے والوں کو خود بھی اس دعا سے اللہ ﷻ کی رحمت اور رضامندی کا ایک حصہ ملتا ہے۔ یعنی دعا کے نتیجہ میں خود دعا کرنے والوں کا فائدہ بھی مضمر ہوتا ہے۔ اس لئے ہمیں اس کا خوب اہتمام کرنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۱۰: کافر دوزخ کے ہولناک عذاب کو دیکھ کر دنیا میں اختیار کیئے گئے کفر و شرک پر سخت افسوس کریں گے اور اپنے کرتوتوں پر وہ اپنے آپ سے نفرت کا اظہار کریں گے۔ اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ دنیا میں دعوتِ ایمان کو جھٹلانے پر تو اللہ ﷻ کو اس سے بڑھ کر بیزاری ہوتی تھی جتنی آج تم کو اپنے آپ سے ہو رہی ہے۔ گویا کہ اس آیت میں کفار سے اللہ ﷻ کی ناراضگی کا سبب مذکور ہے اور کافروں کا اپنے آپ سے بیزاری کا ذکر ہے۔

علمی و عملی بات: قیامت کے دن کفار کو جب جہنم رسید کیا جائے گا تو وہ پچھتائیں گے اور اپنے آپ سے بے زار، ناراض اور غصہ ہوں گے کہ انہوں نے توحید کا انکار کیوں کیا۔ اس وقت فرشتے اُنہیں یاد کرائیں گے کہ جب رسول اللہ ﷺ تمہیں اللہ ﷻ اور قرآنِ حکیم کی طرف بلا رہے تھے اور تمہیں ایمان اور اعمالِ صالحہ کا راستہ دکھا رہے تھے تو تم مسلسل انکار کیئے جا رہے تھے۔ اللہ ﷻ ہادیانِ برحق کے ذریعہ اپنی رحمتوں کا دروازہ کھول رہا تھا تم ان کا مذاق اڑا رہے تھے۔ اُس وقت اللہ ﷻ تم سے جس قدر بیزاری محسوس کر رہا تھا وہ تمہاری اِس بیزاری سے کہیں زیادہ تھی جو تم لوگ آج اپنی جانوں سے محسوس کر رہے ہو۔ یہ اللہ ﷻ کے اس غضب کا نتیجہ ہے کہ آج تم جہنم میں ہو۔ جو لوگ دنیا میں اللہ ﷻ کی دعوتِ حق سے بیزار ہوتے ہیں، قیامت کے دن اللہ ﷻ ان سے بیزار ہو گا۔

علمی بات: قیامت کے دن کافر کے غم و غصہ کا یہ عالم ہو گا کہ وہ اپنے ہاتھ کاٹ کاٹ کر کھائے گا، جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ۝ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ۝ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ۝ "اور جس دن ظالم (افسوس سے) اپنے ہاتھ کاٹے گا وہ کہے گا کہ کاش میں نے رسول کے ساتھ ہی راستہ اختیار کیا ہوتا۔ ہائے میری خرابی! کاش کہ میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا۔ یقیناً اس نے تو مجھے نصیحت سے گمراہ کیا اس کے بعد کہ وہ میرے پاس آ پہنچی اور انسان کے لئے شیطان بڑا ہی دغاباز ہے۔"

(سورۃ الفرقان ۲۵، آیات: ۲۷ تا ۲۹)

آیت نمبر ۱۱: کفار دو مرتبہ موت دیئے جانے اور دو مرتبہ زندگی دیئے جانے کا اعتراف کریں گے۔ لوگوں کی روحوں کو بنانے اور ان سے عہدِ اَلَسْت لینے کے بعد موت سے گزارا گیا۔ پھر اُنہیں زندہ کر کے جسم کے ساتھ دنیا میں بھیجا گیا، پھر موت دی گئی، پھر دوبارہ زندہ کیا گیا۔ کفار اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے فریاد کریں گے کہ انہیں ایک بار پھر دنیا میں بھیج دیا جائے تا کہ وہ اپنے گناہوں کی تلافی کر سکیں۔ اس آیت میں حیات و ممات کے مراحل کا ذکر ہے۔ اسی طرح کافروں کے اعترافِ جرم کا بھی بیان ہے۔

زندگی اور موت کے چار مراحل: اس آیت میں انسان پر وارد ہونے والی چار کیفیات کا ذکر ہے۔ پہلے موت، پھر زندگی، پھر موت، پھر زندگی۔ روح اور جسم کے ملنے کا نام زندگی اور ان کے جدا ہونے کا نام موت ہے۔ پہلی حالت موت ہے یعنی تمام انسانوں کی ارواح تو پیدا ہو چکی تھیں۔ لیکن جسم اپنے اپنے وقت پر عطا ہوئے، اسی عرصہ میں عہد الست لیا گیا تھا جس کا ذکر (سورۃ الاعراف ۷، آیت: ۱۷۲) میں ہے۔ دوسری حالت انسان کی پیدائش سے لے کر اس کے مرنے تک ہے، جس میں وہ اچھے یا برے اعمال کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ تیسری حالت موت سے لے کر حشر تک اور چوتھی اور آخری حالت دوبارہ جی اٹھنے (حشر) کے بعد لامتناہی زندگی ہے۔

یاد رہے کہ جن حالتوں کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے، ان میں بھی زندگی کی کچھ نہ کچھ رمق موجود ہوتی ہے۔ مگر چونکہ غالب اثرات موت کے ہوتے ہیں۔ لہٰذا انہیں موت سے تعبیر کیا گیا۔ یہ حالت خواب کی کیفیت سے سمجھ آتی ہے۔ کیونکہ خواب کی حالت میں انسان پر بیشتر اثرات موت کے غالب ہوتے ہیں۔ تاہم وہ عالم خواب میں چلتا پھرتا، کھاتا پیتا اور کئی طرح کے کام کرتا ہے اور نیند کو حدیث شریف میں موت کا بھائی قرار دیا گیا ہے، زندگی کی نہیں، نیز سونے کے وقت یہ دعا سکھائی گئی ہے۔ اَللّٰهُمَّ بِاسْمِكَ اَمُوْتُ وَاَحْيَا نیز قرآنی تصریحات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اللہ ﷻ نے موت کو پہلے پیدا کیا تھا اور زندگی کو بعد میں جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: اَلَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا "جس نے موت اور زندگی اس لئے پیدا فرمائی تا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے عمل کے اعتبار سے کون اچھا ہے" (سورۃ الملک ۶۷، آیت: ۲) اور زیر مطالعہ آیت میں انسان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی گئی ہے

کہ جو ہستی تمہاری ذات پر اتنے وسیع تصرفات کی قدرت رکھتی ہے تم اس کا انکار کیسے کر سکتے ہو؟

دو زندگیوں اور دو اموات سے مراد مفسرین کی ایک رائے کے مطابق یہ بھی ہے کہ:

ا۔ دو موتوں میں سے پہلی موت تو وہ نطفہ ہے جو باپ کی پشت میں ہوتا ہے یعنی انسان کے وجود سے پہلے اس کے عدم وجود کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسری موت وہ ہے جس سے انسان اپنی زندگی گزار کر ہمکنار ہوتا اور اس کے بعد قبر میں دفن ہوتا ہے اور دو زندگیوں میں سے پہلی زندگی یہ دنیاوی زندگی ہے جس کا آغاز ولادت سے اور اختتام وفات پر ہوتا ہے اور دوسری زندگی وہ ہے جو قیامت والے دن قبروں سے اٹھنے کے بعد حاصل ہوگی ان ہی دو موتوں اور دو زندگیوں کا تذکرہ (سورۃ البقرۃ ۲، آیت:۲۸) میں بھی کیا گیا ہے۔ "تم کیسے اللہ کے ساتھ کفر کرتے ہو جبکہ تم مُردہ تھے تو اس نے تمہیں زندہ فرمایا پھر وہ تمہیں موت دے گا پھر وہی تمہیں زندہ فرمائے گا پھر تم اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔"

علمی بات: موت وحیات کی ان چاروں حالتوں میں سے پہلی تین حالتوں کا تو کفار بھی انکار نہیں کرتے، کیونکہ وہ مشاہدہ میں آتی ہیں اور اس بنا پر ناقابل انکار ہیں، مگر آخری حالت پیش آنے کا انکار کرتے ہیں کیونکہ وہ ان کے مشاہدہ میں ابھی تک نہیں آئی ہے اور صرف انبیاء کرام علیہم السلام ہی نے اس کی خبر دی ہے۔ قیامت کے روز جب عملاً وہ چوتھی حالت بھی مشاہدے میں آجائے گی تب یہ لوگ اقرار کریں گے کہ واقعی وہی کچھ پیش آگیا جس کی ہمیں خبر دی گئی تھی۔ لہٰذا انہوں نے آخرت کا انکار کر کے بہت بڑا گناہ کیا ہے کیا اب کوئی ایسی صورت نکل سکتی ہے کہ ہم اس عذاب سے بچ سکیں؟

آیت نمبر ۱۲: پچھلی آیت میں کفار کی پروردگار کے حضور درخواست کا ذکر تھا اس آیت میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔ کافروں کی فریاد پر اُنہیں جہنم سے نہ نکالے جانے کا سبب بتلایا جائے گا کہ دنیا میں وہ توحید کی دعوت کو ٹھکراتے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ دیگر معبودوں کو شریک قرار دیئے جانے والے نظریات کو قبول کر لیتے تھے۔ آج ان کے باطل معبودوں میں سے کوئی ان کی مدد کو نہیں آرہا ہے۔ اب فیصلہ کا اختیار اس اللہ تعالیٰ کے پاس ہے جو بلند و برتر اور سب سے بڑا ہے۔

علمی بات: کفار سے کہا جائے گا کہ تم آج جس انجام سے دوچار ہوئے ہو اور جس نے تمہیں اپنے گناہوں اور غلطیوں کے اعتراف پر مجبور کیا ہے، یہ سب تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے۔ دنیا میں تو تمہاری بدبختی کا عالم یہ تھا کہ جب تمہیں ایک اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی دعوت دی جاتی تو تم کفر کرتے تھے حالانکہ ایک اللہ تعالیٰ پر ایمان یعنی توحید پورے دین کی اساس ہے۔ رسالت، آخرت اور پورا اسلامی نظام اسی پر انحصار کرتا ہے۔ جن کو تم نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا تھا ان سے اُنہیں غایت درجہ محبت تھی۔ اُنہیں چھوڑ کر ایک اللہ تعالیٰ کو پکارنا تمہیں کسی طرح گوارا نہ تھا۔ اب تم خود دیکھ رہے ہو کہ ہر بات کا اختیار اللہ تعالیٰ کو ہی حاصل ہے کہ وہ جسے چاہے جہنم میں ڈال دے اور جسے چاہے معاف فرما دے۔

علمی بات: کفار کے لئے جہنم سے نہ نکالے جانے کا سبب بیان فرمایا گیا ہے کہ آج اسی ایک اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اب تمہارے لئے جہنم کا عذاب ہمیشہ کے لئے ہے اور اس سے نکلنے کی کوئی سبیل نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے الْعَلِیِّ الْکَبِیۡرِ کی صفات سے یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ان باتوں سے بلند واعلیٰ ہے کہ اس کی ذات یا صفات میں کوئی اس جیسا ہو اور کبیر یعنی ان باتوں سے بہت بڑا ہے کہ اس کی کوئی مثل ہو یا بیوی اور اولاد ہو یا اس کا کوئی شریک ہو۔

آیت نمبر ۱۳: اللہ تعالیٰ کی شان تو یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا رہتا ہے۔ ایک نشانی یہ ہے کہ وہ آسمان سے بارش نازل فرماتا ہے جس سے رزق پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے وہی نصیحت حاصل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے اور اس کی قدرتوں پر غور و فکر کرتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے بعض انعامات اور نشانیوں کا ذکر ہے۔

علمی و عملی بات: مخلوق میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار نشانیاں ہیں۔ جن میں سے بعض نشانیاں اللہ تعالیٰ انسانوں کو دکھاتا ہے جو اس کے قادرِ مطلق اور وحدہٗ لاشریک ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ انسانوں کے لئے آسمانوں سے رزق نازل فرماتا ہے اس میں بیانِ قدرت بھی ہے اور اظہارِ انعام بھی۔ ان نشانیوں کو دیکھ کر وہی لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں جو اس کی طرف رجوع کرتے ہیں یعنی اپنی عقل کو استعمال کرتے ہیں اور فکر کو کام میں لاتے ہیں اور نشانیوں سے فائدہ حاصل کرتے ہیں ان کا یہ غور و فکر انہیں قبولِ حق تک پہنچا دیتا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی عظمت و وحدانیت کی نشانیاں ہر چیز میں ظاہر ہیں ایک اپنی روزی ہی کے مسئلہ کو آدمی سمجھ لے جس کا سامان آسمان سے ہوتا رہتا ہے تو سب کچھ سمجھ میں آجائے۔ لیکن جب ادھر رجوع ہی نہ ہو اور غور و فکر سے کام ہی نہ لے تو کیا خاک سمجھ حاصل ہو سکتی ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ سے پھرا ہوا آدمی، جس کی عقل پر غفلت یا تعصب کا پردہ پڑا ہوا ہو، کسی چیز کو دیکھ کر بھی کوئی سبق نہیں لے سکتا۔ اس کی حیوانی آنکھیں یہ تو دیکھ لیں گی کہ ہوائیں چلیں، بادل آئے، کڑک چمک ہوئی، اور بارش ہوئی۔ مگر اس کا انسانی دماغ کبھی یہ نہ سوچے گا کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے، کون کر رہا ہے اور مجھ پر اس کے کیا حقوق ہیں۔

اللہ ﷻ کی نشانیوں سے صرف وہی شخص سبق لیتا ہے جو اللہ ﷻ سے رجوع کرنے والا ہو۔ جو شخص اللہ ﷻ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، وہ جانتا ہے کہ اللہ ﷻ کا فضل و کرم کس قدر عظیم ہے اور وہ اس کائنات میں اللہ ﷻ کی نشانیوں کو پاتا ہے جبکہ غافل اور سخت دل ان کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے۔ رجوع کرنے کی وجہ سے اہل ایمان کے دل میں یاد الٰہی پیدا ہوتی ہے اور وہ ان نشانیوں پر غور و فکر کرتے ہیں۔ اللہ ﷻ کی یہ شان لوگوں کو تعلیم و تذکیر کے لئے ظاہر تو برابر ہوتی رہتی ہیں لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کا انحصار اس بات پر ہے کہ آدمی کے اندر متوجہ ہونے اور سوچنے سمجھنے کا ارادہ پایا جاتا ہو۔ اگر اپنی خواہشوں کے پیچھے کوئی ایسا اندھا بن جائے کہ ان سے ہٹ کر کسی اور چیز کی طرف دیکھنے اور اس سے عبرت و نصیحت حاصل کرنے کا کوئی حوصلہ اس کے اندر پایا ہی نہ جاتا ہو تو ایسے شخص کی آنکھیں کوئی بڑی سے بڑی نشانی بھی نہیں کھول سکتی۔

آیت نمبر ۱۴: اہل ایمان کو اللہ ﷻ کے لئے عبادت و اطاعت کو خالص کرتے ہوئے صرف اسی کو پکارنے کی تلقین کی گئی ہے۔ چاہے کافروں کو کتنا ہی بُرا محسوس ہو۔

علمی بات: مسلمانوں کو تلقین فرمائی گئی ہے کہ وہ اپنی عبادت کو خالص رکھیں اور اس میں شرک کی معمولی سی بھی آمیزش نہ ہونے دیں۔ یعنی ہر شائبہ شرک سے اور ہر آمیزش کفر سے پاک صاف ہو کر حق تعالیٰ کو پکارو۔ اگرچہ یہ بات کفار و مشرکین کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔ یہ توحید خالص ہی تو کافروں کو شاق گزرتی ہے۔

علمی بات: مسلمانوں کو سمجھایا گیا ہے کہ کفار نے اللہ ﷻ کے ساتھ دوسروں کو شریک بنایا، ان کا انجام تم نے دیکھ لیا۔ تم یہ غلطی ہرگز نہ کرنا۔ کفار کی برہمی اور ناراضگی کی قطعاً پروانہ کرنا۔ اگر اس غلطی کا ارتکاب تم نے بھی کیا تو تمہارا انجام بھی بڑا اندوہ ناک ہوگا۔

علمی بات: مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (اس کے لئے دین کو خالص کرتے ہوئے) کے یہ کلمات سورۃ الزمر اور اس سورت کے درمیان مماثلت اور مشابہت کی علامت ہیں۔ دونوں سورتوں میں یہ کلمات بار بار آئے ہیں۔ ظاہر ہے توحید خالص کا عملی مظاہرہ اللہ ﷻ کے نافرمانوں اور طاغوتی کارندوں کو تو کبھی بھی اچھا نہیں لگے گا۔ کبھی کبھار کوئی حکم اللہ ﷻ کا بھی مان لیا جائے، مگر ساتھ ہی ساتھ دوسرے خداؤں اور حاجت رواؤں کو بھی خوش رکھا جائے۔

علمی بات: دین کے معنیٰ اس آیت میں اس "طرز عمل اور اس رویہ کے ہیں جو کسی کی بالاتری تسلیم اور کسی کی اطاعت قبول کر کے انسان اختیار کرے۔" اس کے لئے دین کو خالص کرتے ہوئے اس کی بندگی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اللہ ﷻ کی بندگی کے ساتھ کسی دوسرے کی بندگی شامل نہ کرے، بلکہ اسی کی پرستش، اسی کی ہدایت کا اتباع اور اسی کے احکام و اوامر کی اطاعت کرے۔

آیت نمبر ۱۵: اللہ ﷻ کی شان تو یہ ہے کہ وہ عرش کا مالک اور بلند درجوں والا ہے۔ اللہ ﷻ جس کے لئے چاہتا ہے اس کے درجے بلند فرما دیتا ہے۔ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے وحی نازل فرماتا ہے۔ اس آیت میں روح کا لفظ وحی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ انسانی روح کی غذا بھی وحی ہے۔ وحی میں انسان کی اخلاقی و روحانی زندگی کی بقاو سلامتی کا راز مضمر ہے۔ وحی کی تعلیم خبردار کرتی ہے کہ ہر شخص کو موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور اللہ ﷻ کے حضور جواب دہی کے لئے حاضر ہونا ہوگا۔

علمی بات: رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ہونا اللہ ﷻ کی صفت ہے، مفسرین کرام نے اس کے دو معنیٰ بیان کیئے ہیں۔ اول یہ کہ رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ بمعنیٰ رَافِعُ الدَّرَجَاتِ یعنی وہ درجات کو بلند فرمانے والا ہے۔ جو مومن بندے نیک کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ ﷻ قیامت کے دن ان کے درجات بلند کرے گا اور اس دنیا میں بھی اس نے اپنے بندوں میں فرق و مراتب رکھے ہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ (سورۃ الزخرف ۴۳، آیت: ۳۲) وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ "اور ہم نے ایک

کے دوسرے پر درجات بلند فرمائے" اس صورت میں رسالت اور قیامت کے مضمون سے اس کو مناسبت ہوگی کہ وہ کسی کا مرتبہ رسالت اور نبوت تک بڑھاتا ہے جیسا کہ آگے فرمایا ہے کہ وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے وحی بھیجتا ہے اور اسی طرح قیامت میں انبیاء کرام علیہم السلام، اولیاء کرام، علماء کرام اور صلحاء عظام کو جنت میں مختلف درجات عطا فرمائے گا۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ مُرْتَفِعُ الدَّرَجَاتِ یعنی وہ خود بلند درجوں والا ہے اس صورت میں درجات سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں کہ اس کی شان بہت بلند اور عظیم الشان ہیں۔

علمی بات: ذُوالۡعَرۡش لفظی معنیٰ ہوئے عرش والا، اس سے یہ مراد کہ وہ اس کا بھی مالک اس کا خالق اور اس پر ہر طرح قادر ہے اور مقصود اس سے اس کے کمال قدرت اور انتہائی ہیبت کا اظہار ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مالک ہے، عرش کا ذکر اس لئے فرمایا کہ عالم اجسام میں عرش سب سے عظیم اور بلند جسم ہے، ہمیں جو چیز بلند معلوم ہوتی ہے، ان میں سب سے بلند چیز عرش عظیم ہے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مملوک ہے۔

علمی بات: یہاں روح سے مراد وحی ہے یعنی وحی کو اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اُتارتا ہے وحی کو روح اس لئے فرمایا ہے کہ جس طرح روح کے ذریعہ حیات حاصل ہوتی ہے اسی طرح وحی کے ذریعہ بھی دلوں کو حیات حاصل ہوتی ہے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ روح سے حضرت جبرئیل علیہ السلام مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اپنا حکم پہنچانے کے لئے نازل فرماتا ہے۔ یہاں پر "الرُّوۡحَ مِنۡ اَمۡرِهٖ" سے وحی مراد ہے۔ فرشتہ، وحی اور انسانی روح تینوں کا تعلق عالم امر سے ہے۔ لہٰذا "روح" کا لفظ ان تینوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ وحی کو "روح" سے تعبیر کرنے کی وجہ واضح ہے کہ جس طرح روح سے جسم کو زندگی حاصل ہوتی ہے اسی طرح وحی سے انسان کی عقل اور اس کے دل کو زندگی، حرارت اور روشنی حاصل ہوتی ہے۔

یہ ارشاد کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے یہ روح نازل فرماتا ہے، اس معنیٰ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل پر کسی کا اجارہ نہیں ہے۔ جس طرح کوئی شخص یہ اعتراض کرنے کا حق نہیں رکھتا کہ فلاں شخص کو حُسن کیوں دیا گیا اور فلاں شخص کو حافظہ یا ذہانت کی غیر معمولی قوت کیوں عطا کی گئی، اسی طرح کسی کو یہ اعتراض کرنے کا بھی حق نہیں ہے کہ منصب نبوت کے لئے فلاں شخص ہی کو کیوں چنا گیا اور جسے ہم چاہتے تھے اسے کیوں نہ نبی بنایا گیا۔

علمی بات: اس آیت میں قیامت کے دن کو ملاقات کا دن فرمایا ہے اور اس کی درج ذیل وجوہات بیان کی گئی ہیں:

۱۔ دنیا میں موت کے وقت لوگوں کی روحیں ان کے جسموں سے الگ ہو جاتی ہیں اور جب قیامت کا دن آئے گا تو روحوں کو دوبارہ ان کے جسموں میں ڈالا جائے گا اور اس دن بچھڑی ہوئی روحوں کو اپنے جسموں سے ملاقات ہوگی۔

۲۔ اس دن تمام مخلوق ایک دوسرے سے ملاقات کرے گی اور ایک دوسرے کے احوال سے واقف ہوگی۔

۳۔ اس دن فرشتوں کو حاضر کیا جائے گا اور فرشتوں کی انسانوں سے ملاقات ہوگی۔

۴۔ اس دن ہر انسان کو اس کے اعمال دکھائے جائیں گے اور اس کا صحیفۂ اعمال اس کے ہاتھ میں ہوگا اور ہر شخص اپنے عمل سے ملاقات کرے گا۔

۵۔ اس دن انسان اپنے رب سے ملاقات کرے گا جیسا کہ قرآن مجید کی بکثرت آیات میں ہے:

فَمَنۡ كَانَ يَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّهٖ "تو جو شخص اپنے رب سے ملاقات کی اُمید رکھتا ہو۔" (سورۃ الکھف ۱۸، آیت: ۱۱۰) دوسری جگہ ارشاد ہوا: تَحِيَّتُهُمۡ يَوۡمَ يَلۡقَوۡنَهٗ سَلٰمٌ "جس دن وہ (مومن لوگ) اُس (اللہ تعالیٰ) سے ملاقات کریں گے اُن کا استقبال سلام سے ہوگا۔" (سورۃ الاحزاب ۳۳، آیت: ۴۴)

الَّذِيۡنَ يَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ "جو یقین رکھتے ہیں کہ بے شک وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں۔" (سورۃ البقرہ ۲، آیت: ۴۶)

۶۔ یہ وہ دن ہے جس میں حضرت آدم علیہ السلام اپنی تمام اولاد سے ملاقات کریں گے۔

۷۔ یہ وہ دن ہے جس میں ہر انسان اپنے اعمال کی جزا یا سزا سے ملاقات کرے گا۔

آیت نمبر ۱۶: روزِ قیامت لوگ کھلے میدان میں اللہ تعالیٰ کے حضور جمع ہوں گے۔ ان کا کوئی عمل اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں رہے گا۔ اللہ تعالیٰ سب کو مخاطب کرکے فرمائے گا: آج بادشاہی کس کی ہے؟ لیکن کسی کو بولنے کی ہمت نہیں ہوگی۔ جواب دیا جائے گا کہ بادشاہی اللہ تعالیٰ ہی کی ہے جس کے سامنے ہر چیز مغلوب اور جس کا حکم سب پر غالب ہے۔

علمی بات: اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن تمام مُردے اپنی اپنی قبروں سے نکل کر ظاہر ہو جائیں گے اور کوئی چیز ان کو چھپا نہیں رہی ہو گی، وہ کسی پہاڑ یا ٹیلے کی اَوٹ میں ہوں گے نہ ان کے بدن پر لباس ہو گا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا، کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ تم ننگے پاؤں، ننگے بدن اور بغیر ختنہ کیئے ہوئے اٹھائے جاؤ گے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! مرد عورت ایک دوسرے کو دیکھیں گے، آپ ﷺ نے فرمایا: "وقت کی سختی کے سبب سے کوئی کسی کی طرف متوجہ ہی نہ ہو سکے گا۔ ہر شخص اپنی فکر میں ہو گا (نفسا نفسی کا عالم ہو گا)، کوئی شخص کسی دوسرے کی شرم گاہ نہ دیکھے گا۔ (صحیح بخاری، سنن نسائی، مسند احمد)

علمی بات: لوگوں کی کوئی چیز اللہ تعالیٰ سے چھپی ہوئی نہیں ہو گی، یعنی جب وہ اپنی قبروں سے نکل کر کھڑے ہوں گے اور ایک دوسرے سے ملاقات کریں گے اور اللہ تعالیٰ کو علم ہو گا کہ ان میں سے ہر شخص نے دنیا میں کیا کام کیئے، پھر وہ ان کے اعمال کے حساب سے ان کو جزا دے گا، اگر انہوں نے نیک اعمال کیئے ہوں گے تو ان کو نیک جزا دے گا اور اگر انہوں نے بُرے اعمال کیئے ہوں گے تو ان کو سزا دے گا۔ جیسا کہ دیگر متعدد مقامات پر ان کا ذکر آیا ہے: مثلاً "جس دن سب راز ظاہر کر دیئے جائیں گے۔" (سورۃ الطارق ۸۶، آیت:۹) دوسری جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

"تو کیا اسے معلوم نہیں؟ جب وہ (مُردے) اُٹھائے جائیں گے جو قبروں میں ہیں۔ اور جو سینوں میں (چھپے راز) ہیں انہیں ظاہر کر دیا جائے گا۔ بے شک اس دن ان کا رب ان سے ضرور خوب باخبر ہو گا۔" (سورۃ العادیات ۱۰۰، آیات:۹ تا ۱۱)

علمی بات: دنیا میں تو بہت سے غلط لوگ اپنی بادشاہی و جباری کے ڈنکے پیٹتے رہے، اور بہت سے احمق ان کی بادشاہت اور کبریائی مانتے رہے، اب بتاؤ کہ بادشاہی فی الواقع کس کی ہے؟ اختیارات کا اصل مالک کون ہے؟ اور حکم کس کا چلتا ہے؟ یہ ایسا مضمون ہے جسے اگر کوئی شخص اپنے ہوش و حواس اور عقل و فہم سے سنے تو خواہ وہ کتنا ہی بڑا بادشاہ یا آمر مطلق بنا بیٹھا ہو، اس کے رعب و دبدبہ کام گھمنڈ اور قوت و طاقت کا نشہ پارہ پارہ ہو جائے اور ساری جباریت کی ہوا اس کے دماغ سے نکل جائے۔ اس موقع پر تاریخ کا یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ سامانی خاندان کا فرماں روا نصر بن احمد (۳۰۱ تا ۳۳۱ھ) جب نیشاپور میں داخل ہوا تو اس نے ایک دربار منعقد کیا اور تخت پر بیٹھنے کے بعد فرمائش کی کہ کارروائی کا افتتاح قرآنِ مجید کی تلاوت سے ہو۔ یہ سن کر ایک بزرگ آگے بڑھے اور انہوں نے یہی رکوع تلاوت کیا۔ جس وقت وہ اس آیت پر پہنچے تو نصر پر ہیبت طاری ہو گئی۔ لرزتا ہوا تخت سے اترا، تاج سر سے اتار کر سجدہ میں گر گیا اور بولا اے رب! بادشاہی تیری ہی ہے نہ کہ میری۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ زمین کو اپنی مٹھی میں پکڑ لے گا اور آسمانوں کو اپنے دائیں ہاتھ میں لپیٹ لے گا اور پھر فرمائے گا: بادشاہ میں ہوں، زمین کے بادشاہ کہاں ہیں؟" (صحیح بخاری، سنن ابن ماجہ)

عملی پہلو: جب سب لوگ قبروں سے نکل کر انتہائی ادب کے ساتھ رب ذوالجلال کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے ان کا ظاہر و باطن عیاں ہو گا۔ بڑے بڑے بادشاہ، فاتح عالم، فرعون و نمرود جیسے حکمران جنہوں نے اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں (سورۃ النازعات ۷۹، آیت:۲۴) کا نقارہ بجایا تھا۔ بڑے بڑے متکبر اور اپنی طاقت پر گھمنڈ کرنے والے سفاک چنگیز اور ہلاکو خان جیسے لوگ وہاں کھڑے ہوں گے اس وقت اعلان کیا جائے گا۔ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ: "(ارشاد ہو گا) آج کس کی بادشاہی ہے؟" اے سرکشو! اے متکبرو! بتاؤ آج فرماں روائی کس کی ہے۔ ہر طرف سناٹا طاری ہو جائے گا۔ ہر طرف خاموشی اور سکوت ہو گا۔ کسی کو ہمت نہ ہو گی کہ جواب دے سکے، خود ہی خالق کائنات جواب دے گا۔ اللہ تعالیٰ کے لئے جو الواحد القہار ہے۔ لہٰذا ہمیں اس واحد و قہار ذات سے ڈرنا چاہیئے اور ہر معاملہ میں اسی کی حاکمیت و بادشاہت کو مانتے ہوئے اس کی نافرمانی سے بچنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۱۷: ہر شخص کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دیا جائے گا اور کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کی جائے گی۔ نہ مستحق اجر کو اجر سے محروم کیا جائے گا اور نہ ہی اس کے اجر میں کمی کی جائے گی۔ اسی طرح مستحق سزا، سزا سے بچ نہ سکے گا، نہ اسے زیادہ سزا دی جائے گی اور نہ کسی ایسے شخص کو سزا دی جائے گی جو اس کا مستحق نہ ہو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو تمام مخلوق کا حساب لینے اور فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ ہر مقدمہ بالکل بے نقاب ہو گا اور فیصلوں میں تاخیر نہ ہو گی۔

علمی بات: قیامت کے دن انسانوں کے اعمال کی جزا کا ذکر ہے۔ جس شخص نے جیسے عمل کیئے ہوں گے اس کو اسی حساب سے جزا دی جائے گی یعنی ہر شخص کو اس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے۔ آیت میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اس دن کسی شخص پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ یہ حساب و کتاب بہت جلد لے لے گا۔ دُنیاوی عدالتوں کی طرح مدتوں مقدمات جوں کے توں پڑے رہنے کا معاملہ وہاں نہ ہو گا۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ کو تمام جن و انس کا حساب لینے میں کوئی دیر نہیں لگتی، اس کے لئے تمام انسانوں کا حساب ایسے ہی ہے جیسے ایک آدمی کا حساب لینا، کیونکہ اسے ہر چیز کا علم ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ مخلوق کی طرح عاجز نہیں کہ ایک وقت میں ایک ہی مقدمہ سن سکے، یا اصل حقیقت کا علم نہ ہونے کی وجہ سے جلدی فیصلہ نہ کر سکے۔ انسان اپنے عجز کی وجہ سے فیصلہ میں دیر کرتا ہے، جب کہ فیصلہ میں دیر بھی ایک طرح کا ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ ہر طرح کے عجز سے پاک ہے، اس لئے وہ ایک ہی وقت میں سب کا حساب کر کے جنت والوں کو جنت میں اور جہنم والوں کو جہنم میں بھیج دے گا۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا: "تم سب کا پیدا فرمانا اور (قیامت میں) اٹھانا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک شخص کو (پیدا فرمانا اور اٹھانا)" (سورۃ لقمان ۳۱، آیت: ۲۸) اور دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: "اور ہمارا حکم تو صرف ایک بار ہوتا ہے، جیسے آنکھ کی ایک جھپکے۔" (سورۃ القمر ۵۴، آیت: ۵۰)

علمی بات: مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو حساب لینے میں کوئی دیر نہیں لگے گی۔ وہ جس طرح کائنات کی ہر مخلوق کو بیک وقت رزق دے رہا ہے اور کسی کی رزق رسانی کے انتظام میں اس کو ایسی مشغولیت نہیں ہوتی کہ دوسروں کو رزق دینے کی اسے فرصت نہ ملے، وہ جس طرح کائنات کی ہر چیز کو بیک وقت دیکھ رہا ہے، ساری آوازوں کو بیک وقت سن رہا ہے، تمام چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے معاملات کی بیک وقت تدبیر کر رہا ہے۔ کوئی چیز اس کی توجہ کو اس طرح جذب نہیں کر لیتی کہ اسی وقت وہ دوسری چیزوں کی طرف توجہ نہ کر سکے، اسی طرح وہ ہر ہر فرد کا بیک وقت محاسبہ بھی کر لے گا اور ایک مقدمہ کی سماعت کرنے میں اسے ایسی مشغولیت لاحق نہ ہو گی کہ اسی وقت دوسرے بے شمار مقدمات کی سماعت نہ کر سکے۔ پھر اس کی عدالت میں اس بنا پر بھی کوئی تاخیر نہ ہو گی کہ واقعات مقدمہ کی تحقیق اور اس کے لئے شہادتیں فراہم ہونے میں وہاں کوئی مشکل پیش آئے۔ حاکم عدالت براہ راست خود تمام حقائق سے واقف ہو گا۔ ہر فریق مقدمہ اس کے سامنے بالکل بے نقاب ہو گا۔ اور واقعات کی کھلی ناقابل انکار شہادتیں چھوٹی سے چھوٹی جزئی تفصیلات تک کے ساتھ بلا تاخیر پیش ہو جائیں گی۔ اس لئے ہر مقدمہ کا فیصلہ جھٹ پٹ ہو جائے گا۔

علمی بات: روزِ قیامت کسی نوعیت کا بھی ظلم نہ ہو گا۔ واضح رہے کہ جزا کے معاملہ میں ظلم کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی اجر کا مستحق ہو اور وہ اس کو نہ دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ وہ جتنے اجر کا مستحق ہو اس سے کم دیا جائے۔ تیسرے یہ کہ وہ سزا کا مستحق نہ ہو مگر اسے سزا دے جائے۔ چوتھے یہ کہ جو سزا کا مستحق ہو اسے سزا نہ دی جائے۔ پانچویں یہ کہ جو سزا کا مستحق ہو اسے زیادہ سزا دے دی جائے۔ چھٹے یہ کہ مظلوم کا منہ دیکھتا رہ جائے اور ظالم اس کی آنکھوں کے سامنے صاف بری ہو کر نکل جائے۔ ساتویں یہ کہ ایک کے گناہ میں دوسرا پکڑ لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ ان تمام نوعیتوں میں سے کسی نوعیت کا ظلم بھی اس کی عدالت میں نہ ہونے پائے گا۔

آیت نمبر ۱۸: رسول اللہ ﷺ کو قریب آنے والے دن یعنی روزِ قیامت کی سختی سے لوگوں کو خبر دار کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ اس دن گھبراہٹ کا عالم یہ ہو گا کہ دلوں کی دھڑکن انتہائی تیز ہو گی اور خوف کے مارے کلیجے منہ کو آرہے ہوں گے۔ ظالموں یعنی کفر و شرک اختیار کرنے والوں کا نہ کوئی دوست ہو گا، نہ سفارشی کہ جس کی سفارش لازمی طور پر سنی جائے۔ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کوئی کسی کی سفارش نہیں کر سکے گا۔

علمی بات: قیامت کے متعدد ناموں مثلاً "اَلْحَاقَّةُ، اَلْقَارِعَةُ، الصَّآخَّةُ، الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى" وغیرہ میں سے ایک نام "اَلْاٰزِفَةُ" بھی ہے۔ قیامت کو "اَلْاٰزِفَةُ" اس لئے فرمایا کہ اس کا آنا بہت قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر قیامت کے قریب آنے سے لوگوں کو خبر دار فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا: (قریب آگئی وہ قریب آنے والی ہے) (لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ) "اللہ تعالیٰ کے سوا اسے کوئی بھی ظاہر کرنے والا نہیں ہے۔" (سورۃ النجم ۵۳، آیت: ۵۸)

علمی بات: "اَلْحَنَاجِرِ" حنجرۃ کی جمع ہے، معنیٰ حلق ہے۔ "كٰظِمِيْنَ" کا معنیٰ مشکیزے کو پانی سے بھر کر اس کا منہ بند کر دینا۔ شدید خوف اور غم کی وجہ سے مجرموں کے دل حلق کو پہنچے ہوئے ہوں گے، پھر وہ نہ تو اپنی جگہ واپس جائیں گے کہ اُنہیں کچھ آرام ملے اور نہ ہی ان کے بدن سے باہر نکلیں گے کہ موت آنے کے بعد ان کی جان چھوٹے۔

دلی دوست یا رشتہ دار کو "حَمِيْم" اس لئے کہتے ہیں کہ اسے اپنے دوست یا رشتہ دار کی وجہ سے دل میں گرمی آتی ہے۔ اسے اپنے اس گہرے دوست کی مدد کا مکمل بھروسہ ہوتا ہے لیکن قیامت کے دن ظالموں کا کوئی دلی دوست نہیں ہوگا، جیسا کہ فرمایا: اَلْاَخِلَّاءُ یَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ "سب گہرے دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے پرہیز گاروں کے۔" (سورۃ الزخرف ۴۳، آیت: ۶۷)

علمی بات: قیامت کی ہولناک اور شدت کی تصویر کشی کی گئی ہے یعنی اس دن ہول ناک مناظر کو دیکھ کر لوگوں پر اتنی دہشت اور خوف طاری ہوگی کہ دل پہلو سے اچھل کر گلے میں اٹک کر رہ جائیں گے۔ نہ اپنی جگہ پر واپس جا سکیں گے تاکہ سکون نصیب ہو اور نہ گلے سے باہر نکل سکیں گے تاکہ رشتہ حیات منقطع ہو اور قصہ ختم ہو بلکہ گلے میں اٹکے رہ جائیں گے نہ موت آئے گی کہ جان چھوٹے اور نہ ویسے آرام و سکون ہوگا۔

ایسے مشکل وقت میں ان ظالموں کا کوئی جگری دوست انہیں نظر نہیں آئے گا جو ان کا غم دور کر سکے یا ان کے بوجھ کو ہلکا کر سکے اور نہ کوئی ایسا سفارشی انہیں ملے گا جس کی شفاعت بارگاہ الٰہی میں قابل قبول ہو۔ ان لوگوں نے دنیا میں بڑے بڑے لوگوں سے یارانے اور گہرے تعلقات جوڑ رکھے تھے لیکن اس دن کوئی یار ان کے نزدیک تک سے گزرنا بھی روا نہ رکھے گا۔ یہ بتوں کی پوجا ذوق و شوق سے اس لئے کیا کرتے تھے کہ قیامت اگر آ بھی گئی اور انہیں دھر بھی لیا گیا تو یہ بت ان کی سفارش کریں گے اور ان کو آتش جہنم سے نکال لیں گے، لیکن ان بے چارے بتوں کو تو لب کشائی کی جرأت ہی نہ ہوگی۔ وہ اس دن ان کے کسی کام نہیں آئیں گے۔

علمی بات: "ظٰلِمِیْنَ" سے مراد کفار و مشرکین۔ ان کے حق میں کوئی بھی سفارش نہیں کرے گا، کیونکہ اس دن جو سفارش کی اجازت دی جائے گی وہ انبیاء کرام علیہم السلام، فرشتوں اور نیک بندوں کو دی جائے گی اور وہ بھی صرف ایمان والوں کے لئے کفار و مشرکین کا سفارشی اس دن کوئی نہیں ہوگا۔

آیت نمبر ۱۹: اللہ تعالیٰ کے علم کامل کا بیان ہے کہ وہ نگاہوں کی خیانت اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے وسوسوں سے بھی واقف ہے۔ وہ دلوں کی نیت، ارادوں اور عزائم کو بھی خوب جانتا ہے۔

علمی بات: اس میں اللہ تعالیٰ کے علم کامل کا بیان ہے کہ اسے تمام اشیا کا علم ہے خواہ چھوٹی ہو یا بڑی باریک ہو یا موٹی، اعلیٰ مرتبہ کی ہو یا چھوٹے مرتبہ کی۔ تاکہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو ڈرائے کہ اسے ان کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح حیا کریں جس طرح حیا کرنے کا حق ہے اور اس طرح تقویٰ اختیار کریں جس طرح اس کا تقویٰ اختیار کرنے کا حق ہے اور اس سے اس طرح معاملہ کریں جس طرح اس سے معاملہ کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو آنکھ کی خیانت کو بھی جانتا ہے اور وہ دلوں کی دھڑکنوں اور ان میں مخفی تمام رازوں تک سے آگاہ ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا "بے شک اللہ تعالیٰ وہ ہے کہ کوئی شے اُس سے پوشیدہ نہیں رہتی (نہ) زمین میں اور نہ ہی آسمان میں۔" (سورۂ آل عمران ۳، آیت: ۵) اس لئے انسان کو چاہیئے کہ جب اس کے علم و احاطہ کا یہ حال ہے تو اس کی نافرمانی سے اجتناب اور صحیح معنوں میں اس کا خوف اپنے اندر پیدا کرے۔

فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کو بھی غیرت آتی ہے اور یہ غیرت اسے اس وقت آتی ہے جب مومن آدمی ایسے کام کا ارتکاب کرتا ہے جسے اس نے اس پر حرام کیا ہوتا ہے۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

فرمان صحابی رضی اللہ عنہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ نے (اپنے دور کے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے) فرمایا: تم بہت سے ایسے کام کرتے ہو جو تمہاری آنکھوں میں بال سے زیادہ باریک ہوتے ہیں (یعنی حقیر اور معمولی ہوتے ہیں)، لیکن ہم اُنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں سخت تباہ کن چیزوں میں سے شمار کرتے تھے۔ (صحیح بخاری)

عملی پہلو: نگاہوں کی خیانت یہ ہے کہ آدمی چوری چھپے ان چیزوں پر نگاہ ڈالے جن کا دیکھنا اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ سینوں کی باتوں میں وہ وسوسے بھی آ جاتے ہیں جو انسان کے دل میں پیدا ہوتے رہتے ہیں وہ جب تک وسوسے ہی رہتے ہیں یعنی ایک لمحہ کی طرح آتے اور ختم ہو جاتے ہیں تب تک تو وہ قابل مواخذہ نہیں ہوں گے لیکن جب وہ عزائم کا روپ دھار لیں تو پھر ان کا مواخذہ ہو سکتا ہے چاہے ان پر عمل کرنے کا انسان کو موقع نہ ملے۔

اگر آدمی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہو تو وہ اپنی نگاہوں کو بچائے گا کہ وہ کسی ایسی چیز پر نہ پڑیں جس کا دیکھنا حرام ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز بھی چھپی نہیں رہ سکتی یہاں تک کہ آنکھوں کا چوری چھپے دیکھ لینا بھی۔ اللہ تعالیٰ اس پر اس کی گرفت کر سکتا ہے۔ اس لئے انسان کو یہ تصور کر کے خوفِ الٰہی کا

احساس ہر وقت دامن گیر رکھنا چاہیئے اور کبھی بھی نافرمانی اور گناہ کی طرف قدم نہیں بڑھانے چاہییں۔

آیت نمبر ۲۰: اللہ تعالیٰ ہی بندوں کے ظاہر و باطن سے خوب واقف ہے۔ لہٰذا وہی ان کے بارے میں برحق فیصلہ فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ جنہیں مشرکین پکارتے ہیں وہ خود ساختہ معبود تو لاچار اور بے بس ہیں، وہ کسی انسان کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ ٹھیک ٹھیک فیصلہ فرماتا ہے اور جن کو یہ دین حق کے منکر پکارتے اور پوجتے ہیں وہ کسی چیز کا بھی فیصلہ نہیں کر سکتے بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی سب کی سننے والا سب کو دیکھنے والا ہے۔ یعنی سچ اور انصاف کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہی فیصلہ کر سکتا ہے معبودانِ باطلہ میں یہ قدرت کہاں کہ وہ کسی چیز کا فیصلہ کر سکیں۔ کیونکہ وہ سننے والا دیکھنے والا ہے اور معبودانِ باطلہ نہ سننے کی صلاحیت رکھتے ہیں نہ دیکھنے کی۔ لہٰذا عبادت اور بندگی کے قابل صرف وہی ہو سکتا ہے جو ہر قسم کی صلاحیت اور قابلیت کا مالک ہو۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں یہ خبر بھی دی ہے کہ اس کا فیصلہ بڑا عادلانہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اچھائی کا بدلہ اچھے انجام کے ذریعہ سے اور بُرائی کا بدلہ بُرے انجام کے ذریعہ سے دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ اس کے برعکس وہ معبودانِ باطلہ جنہیں مشرکین پکارتے ہیں، وہ کسی فیصلہ کی قدرت نہیں رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ نہ سن سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ تو ہر بات کو سننے والا اور ہر چیز کو دیکھنے والا ہے۔ لہٰذا وہ بندوں کے درمیان عادلانہ فیصلہ کی مکمل قدرت رکھتا ہے۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ لوگوں کے صرف اقوال اور افعال ہی نہیں جانتا بلکہ ان کی آنکھوں کے اشارات اور دل کے خیالات بھی خوب جانتا ہے، اس لئے اس کے فیصلہ میں کسی غلط فہمی کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اس کا ہر فیصلہ برحق ہوگا لیکن اللہ تعالیٰ کے سوا جن کو پکارا جاتا ہے نہ ان کے پاس کسی چیز کا علم ہے اور نہ ہی وہ کسی کو سزا دینے کی قدرت رکھتے ہیں تو پھر وہ کیا فیصلہ کریں گے اور اس کو کیسے نافذ کریں گے؟

آیت نمبر ۲۱: کفار و مشرکین کو سابقہ اقوام کے انجام سے عبرت حاصل کرنے کی تنبیہ کی گئی ہے۔ سابقہ سرکش اقوام قوت و وسائل میں انتہائی طاقتور اور شان و شوکت میں کفارِ مکہ سے کہیں زیادہ نمایاں تھیں۔ لیکن سرکشی اور تکبر کی راہ اختیار کرنے پر اُنہیں تباہ کر دیا گیا۔ اس وقت اُنہیں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے کوئی نہیں بچا سکا۔

علمی بات: کعبۃ اللہ کے متولی ہونے کی وجہ سے قریش مکہ کو پورے عرب میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور وہ اپنی عزت اور سرداری کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا خیال کرتے تھے، لہٰذا ان کے لئے بہت مشکل تھا کہ وہ آپ ﷺ کی اطاعت قبول کر لیں جو ان کے مقابلہ میں بظاہر تنہا اور مالی اعتبار سے کمزور تھے۔ کفارِ مکہ کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ وہ اپنے تجارتی سفروں میں ایسی بستیاں دیکھ چکے ہیں جن کے باشندے کفارِ مکہ سے زیادہ طاقتور تھے، ان کے عظیم الشان محلات اور قلعوں کے تباہ شدہ آثار و نشانات آج بھی ان کی شان و شوکت کے گواہ ہیں لیکن جب ان کے پاس ان کے رسول علیہم السلام کھلی نشانیاں لے کر آئے اور انہوں نے ان کی تکذیب کی تو ان کے گناہوں کی وجہ سے اُنہیں تباہ و برباد کر دیا گیا اور اللہ تعالیٰ کی گرفت سے اُنہیں کوئی نہ بچا سکا۔ اسی طرح اگر تم بھی اپنی سرکشی سے باز نہ آئے تو تم پر بھی عذاب نازل ہو سکتا ہے، پھر تمہیں بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں ہوگا۔

علمی بات: نبی کریم ﷺ کی رسالت کی تکذیب کرنے والوں کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی زمین پر گھوم پھر کر ان قوموں کا انجام کیوں نہیں دیکھتے، جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی تکذیب کی، تو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں عذاب کے ذریعہ سے ہلاک کر دیا، حالانکہ وہ لوگ کفارِ قریش سے زیادہ طاقتور تھے۔ انہوں نے زمین کو آباد کرنے کے لئے بڑی بڑی عمارتیں بنائی تھیں اور وہ دُنیاوی اعتبار سے خوب کامیاب تھے، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے ان کا مواخذہ کیا، تو اُنہیں کوئی بچا نہ سکا۔ ان کا یہ انجام اس لئے ہوا کہ ان کے پاس انبیائے کرام علیہم السلام توحید و رسالت کے اثبات میں بڑی واضح نشانیاں اور صریح دلائل لے کر آئے، لیکن اُنہوں نے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں پکڑ لیا اور ہلاک کر دیا۔ اس ذاتِ برحق کا مقابلہ کون کر سکتا ہے، وہ تو بہت زبردست قوت والا اور بڑا سخت عذاب دینے والا ہے۔

آیت نمبر ۲۲: سابقہ سرکش اقوام کے پاس ان کے رسول معجزات اور واضح تعلیمات لے کر آتے رہے لیکن اُنہوں نے انکار ہی کی روش اختیار کی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی گرفت ہوئی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا اور سخت عذاب دینے والا ہے۔

علمی بات: وہ اللہ ﷻ کی گرفت میں اس لئے نہیں آئے کہ انہیں حقیقت حال کا علم نہ تھا، انہیں بتانے والا کوئی نہ تھا، ان پر حجت پوری نہ ہوئی بلکہ یہ سب کچھ ہونے کے بعد ان لوگوں نے اپنے کفر پر ڈٹ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ انبیاء و مرسلین علیہم السلام ہمیشہ ان کے پاس اپنی صداقت اور اپنی تعلیمات کی حقانیت پر واضح علمی دلائل اور ناقابلِ انکار عملی معجزے لے کر آئے۔ مگر انہوں نے ہمیشہ تسلیم کرنے سے انکار ہی کیا۔ آخر کار خدائے قہار نے اُنہیں اپنے قہر و غضب میں گرفتار کر لیا اور ان کو ان کے کیئے کی قرار واقعی سزا دی بے شک وہ بڑا طاقتور بھی ہے اور بڑا سزا دینے والا بھی۔

علمی بات: ان قوموں پر جو عذاب آیا اس آیت میں اس کا سبب بیان کیا گیا ہے کہ ان کا اصل جرم یہ ہے کہ اللہ ﷻ کے رسول علیہ السلام ان قوموں کے پاس اللہ ﷻ کے دین کی دعوت لے کے آئے اور بَیِّنَات کے ذریعے اُنہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ بَیِّنَات سے مراد وہ معجزات ہیں جو ایک طرح سے اللہ ﷻ کے رسول علیہ السلام کی سندِ ماموریت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُنہیں دیکھ کر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ محترم شخصیت واقعی اللہ ﷻ کے رسول اور نمائندہ ہیں۔ اسی میں وہ روشن دلیلیں بھی شامل ہیں جو اپنی دعوت کے اثبات میں اپنی قوم کے سامنے پیش کرتے تھے۔ وہ دلیلیں ایسی محکم اور ایسی واضح ہوتی تھیں جنہیں کوئی فکری سلامتی رکھنے والا شخص غلط کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اُن کفار و مشرکین نے ان کی ہر بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اللہ ﷻ کے ان منتخب شدہ پیغمبروں میں سے بعض انبیاء و رسل علیہم السلام مدت ہائے دراز تک ان کی زبانوں کے زخم سہتے رہے اور ان کی طرف سے پہنچائی جانے والی جسمانی اذیتوں کو برداشت کرتے ہوئے نہایت ہمدردی اور غمگساری کے ساتھ اُنہیں سمجھانے میں لگے رہے، لیکن ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ آخر اللہ ﷻ نے اُنہیں پکڑ لیا اور پھر یہ قومیں اپنی ساری قوت و شوکت کے باوجود اس کی گرفت سے نکل نہ سکیں اور اس کے عذاب سے بچنے کی کوئی سبیل نہ کر سکیں۔ کیونکہ اللہ ﷻ ایسی قوت والا اور ایسی سخت سزا دینے والا ہے کہ جب وہ پکڑتا ہے تو پھر اس سے بچنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

آیت نمبر ۲۳: سابقہ سرکش لوگوں میں سے فرعون اور اس کی قوم کا ذکر ہے۔ اللہ ﷻ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معجزات اور واضح دلائل کے ساتھ ان کی طرف بھیجا۔ نشانیوں سے "معجزات اور کھلی سند" سے شاید ان کے مخصوص و ممتاز معجزات مراد ہوں یا "کھلی سند" معجزات کے سوا دوسری قسم کے دلائل و براہین کو فرمایا۔ یا پھر "آیات" سے تعلیمات و احکام اور "سلطان مبین" سے معجزات مراد لیئے جائیں۔ یا "سلطان مبین" اس قوتِ قدسیہ اور مخصوص تائید ربانی کا نام ہو جس کے آثار پیغمبروں میں ہر دیکھنے والے کو نمایاں طور پر نظر آیا کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

علمی بات: بینات سے مراد وہ نو (۹) معجزات ہیں جو اللہ ﷻ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائے تھے اور وہ ان کی نبوت پر کھلی نشانی تھے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے لئے تسلّی ہے اور قریش کو اس مطالبہ کا جواب دیا ہے جو انہوں نے نبی ﷺ سے کیا تھا کہ ہم آپ ﷺ پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ آپ ﷺ یہ کام کر کے نہ دکھا دیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ سے تو چند معجزوں کا مطالبہ کیا گیا ہے، ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو نو (۹) معجزے عطا فرمائے، مگر نہ ماننے والوں نے پھر بھی نہ مانا۔ ان نو (۹) معجزوں کا ذکر سورۃ الاعراف ۷ کی آیات: ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۳۰، اور ۱۳۳ میں ہے۔

علمی بات: اس کی دلیل سورۃ النمل ۲۷ کی آیات: ۱۰ تا ۱۲ میں ہے، جن میں اللہ ﷻ نے عصائے موسیٰ (علیہ السلام) اور ید بیضا کا ذکر کر کے فرمایا: فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ "یہ نو نشانیاں لے کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف (جایئے)" یعنی یہ دونوں معجزے ان نو (۹) معجزوں میں شامل تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجا گیا۔

علمی بات: مفسرین کرام نے فرمایا ہے کہ ان سے یہ معجزات مراد ہیں جو قرآنِ حکیم میں دیگر مقامات پر مثلاً سورۃ الاعراف ۷، آیات: ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۳۰ تا ۱۳۳ میں ذکر ہوئے ہیں۔ وہ معجزات یہ ہیں:

۱۔ عصا کا سانپ بن جانا۔ ۲۔ ہاتھ کا چمکتا ہوا ہو جانا۔ ۳۔ کئی قسم کے عذاب آل فرعون پر نشانی کے طور پر بھیجے جیسے پھلوں کا نقصان۔ ۴۔ قحط سالی۔ ۵۔ طوفان۔ ۶۔ ٹڈیاں۔ ۷۔ جوئیں۔ ۸۔ مینڈک۔ ۹۔ خون۔

چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور بھی ہیں اس لئے بعض حضرات نے ان کو بھی ان ہی کے ذیل میں ذکر فرمایا ہے۔ یہ ایسے واضح معجزات تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر بھی واضح دلائل تھے اور فرعون اور آل فرعون کے قلبی اطمینان کے لئے بھی کافی تھے لیکن وہ پھر بھی ایمان نہ لائے اس کی وجہ بھی وہی ہے جو پچھلی آیت کی تشریح میں مذکور ہے۔ قریش کا بھی یہی حال تھا۔ کچھ معجزات تو وہ دیکھ چکے تھے مگر ایمان نہ لائے تھے۔ یہاں یہ بتانا

مقصود ہے کہ اگر ان کے مطلوبہ معجزات دکھلا بھی دیئے جائیں تو یہ بھی فرعونیوں کی طرح ایمان لانے کی طرف کبھی نہ آئیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور معجزات بھی دیئے گئے، مثلاً پتھر سے بارہ چشمے جاری ہونا، گائے کا حصہ مارنے سے مردہ زندہ ہونا، من وسلویٰ، بادلوں کا سایہ، پہاڑ کا اکھڑ کر ان پر آ کھڑا ہونا وغیرہ، مگر یہ معجزات بنی اسرائیل کے لئے تھے۔

علمی بات: "سلطن" سے ایک مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ وہ ہیبت ورعب ہے جس کی وجہ سے فرعون اپنی فوجوں اور تمام تر قوت کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہاتھ نہ اٹھا سکا، جیسا کہ فرمایا گیا "اور ہم تم دونوں کو غلبہ عطا فرمائیں گے لہٰذا وہ تم دونوں تک نہیں پہنچ سکیں گے۔"

سورۃ القصص ۲۸، آیت: ۳۵ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان پر ایک غائر نگاہ ڈالنے سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ کونسی علامات تھیں جن کو یہاں ان کے مامور من اللہ ہونے کی کھلی سند قرار دیا جارہا ہے۔ اول تو یہ عجیب بات تھی کہ موسیٰ علیہ السلام وہ شخص تھے جو چند سال پہلے فرعون کی قوم کے ایک آدمی کو قتل کر کے یہاں سے ہجرت کر گئے تھے۔ فرعون نے ان کی گرفتاری کے لئے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ وہی موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی تائید ونصرت کے ساتھ بڑے اعتماد اور دھڑلے کے ساتھ بادشاہ اور اس کے اعیان سلطنت کو مخاطب کر کے دعوت دیتے ہیں کہ وہ اسے اللہ رب العالمین کا نمائندہ تسلیم کر کے اس کی ہدایات پر عمل کریں چنانچہ دربار میں موجود کسی کو اُن پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جس قوم سے تعلق رکھتے تھے وہ اس بری طرح غلامی کے جوتے تلے پس رہی تھی کہ اگر الزام قتل کی بنا پر ان کو فوراً گرفتار کر لیا جاتا تو اس بات کا کوئی اندیشہ نہ تھا کہ ان کی قوم بغاوت تو درکنار، احتجاج ہی کے لئے زبان کھول سکے گی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عصا اور ید بیضاء کے معجزے دیکھنے سے بھی پہلے فرعون اور اس کے اہل دربار محض حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آمد ہی سے مرعوب ہو چکے تھے اور پہلی نظر ہی میں انہیں محسوس ہو گیا تھا کہ یہ شخص کسی اور ہی طاقت کے بل بوتے پر آیا ہے۔ پھر جو عظیم الشان معجزے پے در پے ان کے ہاتھ سے صادر ہوئے ان میں سے ہر ایک یہ یقین دلانے کے لئے کافی تھا کہ یہ جادو کا نہیں بلکہ خدائی طاقت ہی کا کرشمہ ہے۔ آخر کس جادو کے زور سے ایک لاٹھی فی الواقع اژدہا بن سکتی ہے؟ یا ایک پورے ملک میں قحط پڑ سکتا ہے؟ یا لاکھوں مربع میل کے علاقہ میں ایک حکم پر طرح طرح کے طوفان آسکتے ہیں اور ایک حکم پر وہ ختم ہو سکتے ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کے بیان کے مطابق فرعون اور اس کی سلطنت کے تمام ذمہ دار لوگ، زبان سے چاہے انکار کرتے رہے ہوں، مگر دل ان کے پوری طرح جان چکے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فی الواقع اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوئے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔

آیت نمبر ۲۴: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون، ہامان اور قارون کی طرف بھیجا گیا۔ لیکن انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیش کردہ معجزات کو جادو قرار دیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی۔ (معاذ اللہ)

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آیات یعنی معجزات کے ساتھ اور واضح حجت کے ساتھ فرعون اور ہامان اور قارون کے پاس بھیجا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان لوگوں کو معجزات دکھائے توحید کی دعوت دی لیکن ان لوگوں نے عناد اور انکار سے کام لیا۔ کہنے لگے یہ تو جادوگر ہے، بڑا جھوٹا ہے (معاذ اللہ)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی تکذیب کی کوئی پرواہ نہ کی اور برابر تبلیغ فرماتے رہے۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دل جوئی اور حوصلہ افزائی کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے حالات بیان فرمارہا ہے کہ جو الزامات کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر لگاتے ہیں اسی طرح کے الزامات فرعون اور اس کے وزیروں نے ایک جلیل القدر رسول پر لگائے تھے لیکن آخر کار الزام لگانے والے کفار اپنی شان وشوکت اور جاہ وحشمت کے ساتھ غرق ہو گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی بظاہر کمزور اور بے نوا قوم کو کامیابی حاصل ہوئی۔ بعینہٖ یہی حال کفار مکہ کا بھی ہو گا۔

آیت نمبر ۲۵: حضرت موسیٰ علیہ السلام آل فرعون کی پاس حق لے کر آئے لیکن فرعون نے سرکشی کی انتہا کر دی۔ اس نے بنی اسرائیل کے ہر پیدا ہونے والے لڑکے کو قتل کر دینے اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دینے کا حکم جاری کر دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے کافروں کی چال بے کار اور ناکام کر دی۔ پھر آل فرعون وقت آنے پر غرق کر دیئے گئے۔

علمی بات: فرعونیوں نے جب دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات اثر کر رہی ہے اور کچھ لوگ مسلمان ہو گئے ہیں اور کچھ لوگ متاثر ہوتے جا رہے ہیں تو باہم مشورہ کر کے کہنے لگے کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کے لڑکوں کو قتل کر دو اور ان کی عورتوں کو باقی رکھو، یعنی وہی عمل لڑکوں کے قتل کرنے کا پھر شروع کر دو جو کاہنوں کے خبر دینے پر بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا تاکہ ان کا کوئی بچہ ایسی پرورش نہ پا جائے جو فرعونی حکومت کو تہہ وبالا کرنے کا ذریعہ بن جائے۔ ان لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت توحید کو دبانے کے لئے مشورہ تو کر لیا اور ممکن ہے اس پر عمل بھی کر لیا ہو لیکن ان کی سب تدبیریں ضائع ہوئیں جسے سورۃ المؤمن ۴۰، آیت: ۲۵ میں ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ "اور کافروں کی چال بالکل بے کار ہوئی۔"

آیت نمبر ۲۶: فرعون نے آخری اقدام کے طور پر بھرے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل (شہید) کرنے کی دھمکی دی۔ کہنے لگا کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مہلت دی گئی تو وہ اپنی دعوت کے ذریعہ لوگوں کے دین یعنی فرعونی نظام کو بدل دے گا یا اقتدار پر قبضہ کر کے زمین میں فساد پھیلانے کا باعث بنیں گے۔ (معاذ اللہ)

علمی بات: فرعون کی قوم فرعون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل سے کیوں باز رکھنا چاہتی تھی؟

اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنا چاہتا تھا اور اس کی قوم اس کو اس اقدام سے روکتی تھی۔

فرعون کی قوم جو فرعون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل سے روکتی تھی اس کی مفسرین کرام نے حسب ذیل وجوہ بیان کی ہیں: ۱۔ فرعون کی قوم میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کے دل میں یہ اعتقاد تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے دعویٰ نبوت میں صادق ہیں، اس لئے وہ لوگ مختلف حیلوں اور تدبیروں سے فرعون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

۲۔ فرعون کے مصاحبوں نے اس سے کہا: تم (حضرت موسیٰ علیہ السلام) کو قتل نہ کرو، وہ معمولی جادوگر ہیں (معاذ اللہ)، اگر تم نے ان کو قتل کر دیا تو عوام یہ سمجھیں گے کہ (حضرت موسیٰ علیہ السلام) حق پر تھے اور تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، اس لئے تم نے ان کو قتل کرا دیا اور عوام تم سے بدظن ہو جائیں گے۔

۳۔ فرعون کے ارکان حکومت نے یہ سوچا کہ ابھی فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں اُلجھا ہوا ہے اور اس کی ہماری طرف توجہ نہیں ہے اور ہم ملک میں اپنی من مانی کر رہے ہیں، اگر یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کر کے اس مہم سے فارغ ہو گیا تو پھر اس کی توجہ ہماری طرف ہو گی اور یہ ہمیں اپنی من مانی نہیں کرنے دے گا، اس لئے وہ فرعون سے کہتے تھے کہ تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل نہ کرو۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ فرعون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قتل کرنے سے کوئی منع تو نہیں کرتا تھا لیکن وہ یہ سوچتا تھا کہ اگر اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کر کے ان کو قتل کرنے کا اعلان کیا اور پھر دورانِ مقابلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایسے معجزات صادر ہوئے کہ وہ ان پر غالب نہ آ سکا تو وہ بہت ذلیل اور رُسوا ہو گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس مقابلہ میں مارا جائے تو وہ خود اپنی موت سے ڈرتا تھا لیکن اس نے اپنا بھرم رکھنے کے لئے اور اپنا جعلی رعب ڈالنے کے لئے یہ کہا کہ "مجھے موسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کرنے دو" اور یہ ظاہر کیا کہ اس کی قوم اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل میں ہاتھ رنگنے سے منع کر رہی ہے، حالانکہ اس کو کوئی منع نہیں کر رہا تھا۔

علمی بات: اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرعون کا یہ قول نقل فرمایا: "مجھے یہ خطرہ ہے کہ وہ تمہارے دین کو بدل ڈالے گا یا وہ اس ملک میں بڑا ہنگامہ برپا کرے گا۔" فرعون کا اس کلام سے مقصود یہ تھا کہ وہ اپنے عوام کو یہ بتائے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کیوں قتل کرنا چاہتا ہے، اس نے بتایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس کو یہ خطرہ ہے کہ وہ اس کی قوم کے دین کو فاسد کر دیں گے یا ان کی دنیا کو فاسد کر دیں گے، اس کے زعم میں دین کا فساد یہ تھا کہ اس کے نزدیک صحیح دین وہی تھا جس پر وہ اور اس کی قوم تھی اور چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی اُلوہیت کا انکار کرتے تھے اور اس کے عقائد اور نظریات کے مخالف تھے، اس لئے اس کو خطرہ تھا کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے تو اس کا اور اس کی قوم کا دین فاسد ہو جائے گا اور دنیا کے فساد کا خطرہ یہ تھا کہ اگر بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آواز پر اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے فرعون کے خلاف بغاوت کر دی تو ملک میں شور اور ہنگامہ ہو گا اور امن اور چین جاتا رہے گا اور ہو سکتا ہے کہ فرعون کی قوم کو جو اب اقتدار حاصل ہے وہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے۔

آیت نمبر ۲۷: فرعون کے ناپاک منصوبہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کا بیان ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہر اس متکبر کے شر سے رب کائنات کی پناہ مانگی جو آخرت پر یقین نہیں رکھتا۔ معلوم ہوا کہ جابر اور ظالم وہی لوگ ہیں جو روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے اسرار و رموز اور علمی و عملی پہلو: ا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا کا معنیٰ یہ ہے کہ دشمن کے شر سے صرف اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آکر ہی نجات ملتی ہے۔ پس میں اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آرہا ہوں اور جو اللہ تعالیٰ کے فضل پر اعتماد کرے، اللہ تعالیٰ اُس کو ہر بلا سے محفوظ رکھتا ہے اور اس کی ہر آرزو کو پورا کرتا ہے۔

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا سے یہ معلوم ہوا کہ جس طرح مسلمان قرآنِ مجید پڑھنے سے پہلے "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ" پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو شیطان کے وسوسوں سے محفوظ رکھتا ہے اور اس کے دین اور اس کے اخلاص کی حفاظت فرماتا ہے اسی طرح جب وہ آفات اور مصائب میں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی پناہ میں دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ہر رنج اور پریشانی سے محفوظ رکھتا ہے۔

۳۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "میں اپنے اور تمہارے رب کی پناہ میں ہوں" گویا کہ بندے کو یہ کہنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی مجھے ہر شر سے محفوظ رکھا ہے اور ہر خیر تک پہنچایا ہے اور مجھے بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی مالک اور مولیٰ نہیں ہے تو بندہ پر لازم ہے کہ جب بھی اسے خدانخواستہ کوئی مصیبت پیش آئے تو وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے اس مصیبت کو دور کرنے کی امید نہ رکھے اور جب بھی اسے کوئی مہم درپیش ہو تو اللہ تعالیٰ کے بارگاہ میں ہی دستِ سوال دراز کرے۔ کیونکہ حقیقتاً اور مستقلاً اللہ تعالیٰ ہی مددگار ہے۔

۴۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں اپنے اور تمہارے رب کی پناہ میں ہوں اور اپنی قوم کا ذکر فرمایا، اس قول میں انہوں نے اپنی قوم کو یہ ترغیب دی ہے کہ وہ بھی ہر شر اور ہر مصیبت میں صرف اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کیا کریں اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم سب مل کر اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کریں گے اور جب تمام نیک اور پاک روحیں مل کر ایک مطلوب کی دعا کریں گی تو اس دعا میں قبولیت کی تاثیر زیادہ قوی ہوگی اور معلوم ہوتا ہے کہ باجماعت نمازیں ادا کرنے کا بھی یہی سبب ہے اور "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کا بھی یہی نکتہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

۵۔ ہر چند کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خصوصیت کے ساتھ فرعون کی طرف سے آئی ہوئی مصیبت اور اس کے شر میں مبتلا تھے، اس کے باوجود انہوں نے یوں نہیں فرمایا: میں فرعون کے شر سے اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ میں آتا ہوں، بلکہ فرمایا: میں ہر اس متکبر سے جو روز حساب پر ایمان نہیں لاتا اپنے اور تمہارے رب کی پناہ میں ہوں، کیونکہ خصوصیت کے ساتھ فرعون کے شر سے نجات کی دعا کی بہ نسبت عمومی دعا زیادہ مفید تھی کہ میں ہر متکبر اور ہر منکر حساب کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرعون اللہ تعالیٰ کا دشمن تھا اور اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں اپنی اُلوہیت کا دعویٰ دار تھا اور اپنے آپ کو رب اعلیٰ کہلواتا تھا اس لئے آپ نے اپنی دعا میں اس گستاخ کا بارگاہ صمدیت کا ذکر کرنا پسند نہیں فرمایا، بلکہ بالعموم فرمایا: میں ہر متکبر اور ہر منکر حساب سے تیری پناہ میں ہوں۔

۶۔ اہم بات یہ ہے کہ دشمنوں کی سازشوں سے اور ان کے شر سے بچنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے حفاظت اور اس کی پناہ طلب کی جائے۔

فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: حضرت عبد اللہ بن قیس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب کسی قوم سے خطرہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ دعا فرماتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَجْعَلُكَ فِيْ نُحُوْرِهِمْ وَنَعُوْذُبِكَ مِنْ شُرُوْرِهِمْ۔ "اے اللہ! ان کے مقابلہ میں ہم تجھ کو لاتے ہیں اور ان کے شر اور فساد سے تیری پناہ میں آتے ہیں۔" (مسند احمد، سنن ابی داود)

آیت نمبر ۲۸: اس موقع پر آل فرعون کے ایک شخص نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حمایت کردی۔ یہ وہ شخص تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا تھا۔ اس نے فرعون اور اس کے درباریوں سے بڑے مؤثر انداز میں خطاب کیا۔ قرآنِ کریم میں یہ سب سے طویل ترین تقریر ہے جو اس بندۂ مومن نے کی ہے۔ اس نے کہا کہ کیا تم لوگ صرف اس وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شہید کرنا چاہتے ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا رب مانتا ہے؟ جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تمہارے پاس واضح معجزات بھی لے کر آئے ہیں۔ مؤثر انداز میں غور و فکر کی دعوت دی۔ اگر بالفرض ان کا رسالت کا دعویٰ جھوٹا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو زیادہ مہلت نہ دے گا۔ لیکن اس کے برعکس اگر وہ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں تو پھر ان کو جھٹلانے کا وبال تم پر آکر رہے گا۔ اللہ تعالیٰ حد سے گزرنے والے اور جھوٹے کو کامیاب نہیں کرتا۔

علمی بات: یہاں سے ایک بندۂ مومن کی سرگزشت شروع ہو رہی ہے۔ وہ مردِ مومن تھا تو فرعون کے شاہی خاندان میں سے لیکن نہایت حق پسند اور خدا ترس آدمی تھا اس وجہ سے ان کی تمام ہمدردیاں شروع ہی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھیں۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا چکا تھا، لیکن اس نے اپنی قوم کو اپنے ایمان سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ اس نے جب سنا کہ فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے تو اس نے ان کو اس ارادہ سے باز آنے کی تلقین شروع کی۔ پہلے تو انہیں جھڑکا کہ تم موسیٰ علیہ السلام کے درپے کیوں ہو؟ انہوں نے تمہارا کیا جرم کیا ہے؟ انہوں نے کون سی قانون شکنی کی ہے؟ محض اس لئے تم انہیں قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے اور اس نے اپنے عقیدہ کی حقانیت دلائل و معجزات سے ثابت کر دی ہے۔ تم ان کے ذاتی عقیدہ میں کیوں دخل دیتے ہو۔ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اگر بالفرض وہ غلط کہہ رہا ہے تو خود ہی کیفرِ کردار کو پہنچ جائے گا۔ تمہیں اپنے ہاتھ اس کے لہو سے سرخ کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے۔

علمی بات: یہ شخص ابتدا میں فرعون اور اس کے درباریوں سے اپنے ایمان کو چھپاتا تھا، بعد میں جب ایمان کی حرارت اس کے خون میں چنگاریوں کی طرح گردش کرنے لگی تو اس نے فرعون کے غیظ و غضب کی پروا کیئے بغیر برملا اپنے ایمان کا اظہار کر دیا اور جب وہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے تو اسی نے ان کو منع کیا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "سنو! کسی شخص کو جب حق بات کا علم ہو تو وہ لوگوں کے دباؤ اور ان کے خوف کی وجہ سے حق بیان کرنے کو ترک نہ کرے، سنو! ظالم کے سامنے کلمۂ حق کہنا سب سے افضل جہاد ہے۔"

(مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

علمی بات: جس طرح قومِ فرعون میں سے ایک مردِ مومن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حمایت کی تھی، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرح ہمارے نبی سیدنا حضرت محمد رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ کی حمایت کی تھی، بلکہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حمایت زیادہ قوی تھی۔

فرمانِ صحابی رضی اللہ عنہ: حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا کہ مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو کون سی سخت اذیت پہنچائی تھی؟ انہوں نے کہا: میں نے ایک دن دیکھا کہ نبی کریم ﷺ نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ بن ابی معیط آیا اور اپنی چادر حضور ﷺ کی گردن میں ڈال کر سختی کے ساتھ آپ ﷺ کا گلا مبارک گھوٹنے لگا، اس وقت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آ گئے، انہوں نے اس کو دھکا دیا اور اس کو آپ ﷺ سے دور کر دیا اور یہ کہا: کیا تم ایک شخص کو اس لئے قتل (شہید) کر رہے ہو کہ وہ یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ تعالیٰ ہے، حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے نشانیاں لا چکا ہے۔ اس شخص نے کہا: "اگر وہ (بالفرض) جھوٹے ہوئے تو اس کے جھوٹ کا وبال اسی پر ہے اور گر وہ سچا ہے تو جس عذاب سے وہ ڈرا رہا ہے اس میں سے کچھ نہ کچھ (عذاب) تو تم پر آئے گا۔" (صحیح بخاری، مسند احمد)

علمی بات: یہاں ایک مردِ مومن کا ذکر فرمایا گیا ہے جس کی مناسبت سے اس سورۃ کا نام "المؤمن" رکھا گیا ہے۔ وہ مردِ مومن فرعون کے شاہی خاندان کے ایک فرد تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ دربار کے کوئی اعلیٰ عہدے دار تھا۔ بعض مفسرین کرام نے لکھا ہے کہ وہ فرعون کے چچازاد بھائی اور آل فرعون میں سے تھا۔ یہ مردِ مومن جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اور معجزات کو دیکھ کر ایمان لا چکا تھا مگر فرعون کے ظلم و ستم اور کسی مصلحت سے اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ فرعون اور اس کے درباریوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا فیصلہ کر لیا ہے تو وہ کھل کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حمایت پر آ گیا۔ اس نے نہایت موثر اور حکیمانہ انداز سے بھرے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل (شہادت) کی مذمت اور ان کی عظمت پر تقریر فرمائی اور کہا کہ تم کتنے ظالم لوگ ہو کہ ایک شخص کو تم صرف اس لئے قتل (شہید) کرنا چاہتے ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مانتا ہے۔ اس مردِ مومن کی نبی کریم ﷺ نے بھی تعریف فرمائی ہے۔

فرمانِ صحابی رضی اللہ عنہ: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آل فرعون میں سے تین لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا۔

۱۔ ایک تو یہ مردِ مومن تھے، ۲۔ دوسری فرعون کی بیوی حضرت آسیہ علیہا السلام، ۳۔ اور تیسرا وہ شخص کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے ایک قبطی خطا سے مارا گیا تھا اور فرعونِ وقت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا فیصلہ کر لیا تھا تو وہ دوڑتے ہوئے آئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صورت حال بتاتے ہوئے

مصر سے چلے جانے کا مشورہ دیا تھا۔ بعض مفسرین کرام نے پہلے اور تیسرے شخص کو ایک شمار کیا ہے۔ یعنی یہی شخصیات تھیں جنھوں نے فرعون کے ظلم سے بچنے کے لئے اپنے ایمان کو چھپا رکھا تھا اور بعد ازاں اپنا ایمان ظاہر کیا۔

فرمانِ صحابی رضی اللہ عنہ: ایک مرتبہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا کہ بتاؤ آدمیوں میں سب سے بہادر کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ ہمیں نہیں معلوم۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سب سے بہادر اور نڈر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ ایک مرتبہ بنو قریش کے کچھ لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی قسم ہم میں سے کسی کو حوصلہ نہ تھا کہ بنو قریش کے قریب بھی جاتے مگر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ قریش پر جھپٹے۔ کسی کا گلہ پکڑتے، کسی کے کاندھے ہلاتے اور فرماتے جاتے: اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ "کیا تم ایک شخص کو صرف اس لئے قتل (شہید) کر رہے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے۔" پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے منہ پر چادر ڈال لی اور رونا شروع کر دیا یہاں تک کہ آنسوؤں سے آپ رضی اللہ عنہ کی داڑھی مبارک تر ہوگئی۔ پھر فرمایا: کہ میں تمہیں قسم دے کر کہتا ہوں کہ بتاؤ آلِ فرعون کا مردِ مومن بہتر ہے یا حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ)۔ سب خاموش رہے تب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کہ تم مجھے جواب نہیں دیتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی قسم آلِ فرعون کے مردِ مومن کے مقابلہ میں حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کی ایک ایک ساعت بہتر ہے کیونکہ اس مردِ مومن نے تو اپنا ایمان (اس وقت) چھپایا ہوا تھا اور حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ایسے شخص تھے جنھوں نے اپنے ایمان کو سب کے سامنے ظاہر کر رکھا تھا۔

علمی بات: اس مردِ مومن نے فرعون، آلِ فرعون اور درباریوں کو مختلف طریقوں سے ایمان کی طرف دعوت دی جنھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل (شہید کرنے) کا پختہ ارادہ کرلیا تھا۔ اس مردِ مومن نے کہا: کیا تم ایسے شخص کو قتل (شہید) کرنا چاہتے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے، حالانکہ وہ تمہارے پاس کھلے ہوئے معجزات اور نشانیاں لے کر آیا ہے۔ اگر وہ شخص (نعوذ باللہ) جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کا وبال خود اسی شخص پر پڑے گا۔ لیکن اگر وہ سچا ہے تو پھر وہ جو کچھ کہہ رہا ہے تو کیا تم اس عذاب سے بچ سکو گے؟ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے کہ جو لوگ حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں یا جھوٹ کا سہارا لیتے ہیں ان کو راہِ ہدایت کبھی نصیب نہیں ہوتی۔

آیت نمبر ۲۹: بندۂ مومن نے خبردار کیا کہ آج اگرچہ تم لوگوں کے پاس حکومت و اختیار ہے لیکن اس کی بنیاد پر وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچ سکتے۔ فرعون نے گفتگو میں خلل ڈالتے ہوئے کہا کہ وہ لوگوں کا خیر خواہ ہے اور صرف بھلائی کے راستہ کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔

علمی بات: مردِ مومن نے کہا کہ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ آج تمہیں حکومت و سلطنت اور ہر طرح کی طاقتیں حاصل ہیں تم زمین پر غالب ہو لیکن اگر اللہ تعالیٰ کا قہر اور عذاب ہم پر ٹوٹ پڑا تو ہمیں اس سے بچانے والا کون ہوگا؟ اس وقت ہماری مدد کون کرے گا؟

مردِ مومن کی تقریر کا سلسلہ جاری تھا کہ فرعون نے لوگوں کو اس مردِ مومن سے متاثر ہوتے دیکھا تو درمیان میں مداخلت کرتا رہا۔ کہنے لگا: لوگو! میں تمہیں وہی بات بتا رہا ہوں جسے میں تمہارے حق میں بہتر سمجھتا ہوں اور میں تمہیں بھلائی کا راستہ دکھا رہا ہوں اس کی مراد یہ ہوگی کہ یہ مردِ مومن جس بات کو کہہ رہا ہے اس میں تمہاری کوئی بھلائی اور خیر نہیں ہے اور جو راستہ میں تمہیں دکھا رہا ہوں وہی تمہاری نجات کا ذریعہ ہے۔

علمی بات: فرعون کے اس فقرے کا ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں نے تو تمہارے سامنے اپنی وہی رائے پیش کی ہے جو مجھے مناسب نظر آتی ہے۔ مردِ مومن کی کھری کھری باتوں کے جواب میں فرعون کا یہ معذرت خواہانہ ردِ عمل حیران کن ہے۔ فرعون کی مطلق العنانی کا تصور ذہن میں رکھیئے اور پھر اس مختصر سے جملہ کے ایک ایک لفظ سے ٹپکتی ہوئی بے بسی اور بے چارگی ملاحظہ کیجیئے۔ فرعون کے اس جواب سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی تک وہ یہ راز نہیں پاسکا تھا کہ اس کے دربار کا یہ امیر دل میں مومن ہو چکا ہے، اسی لیے اس نے اس شخص کی بات پر کسی ناراضگی کا اظہار تو نہیں کیا، البتہ یہ واضح کر دیا کہ اس کے خیالات سننے کے بعد بھی اپنی رائے بدلنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

علمی بات: بے محل مداخلت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے یہ اندازہ کرلیا تھا کہ اس مردِ مومن کی تقریر بغیر کسی مداخلت کے جاری رہی تو اس سے اس کے بہت سے درباری متاثر ہو جائیں گے اس وجہ سے ہوشیار اور چالاک سیاسی لیڈروں کی طرح اس نے اپنی نیک نیتی، درست رائے اور مصلحت اندیشی کی دھونس جمانے کی کوشش کی جو محض جھوٹ پر مبنی تھی۔

آیت نمبر ۳۰: بندۂ مومن نے فرعون کی بات کو اہمیت نہ دی اور لوگوں کو مزید خبردار کیا۔ اس نے کہا کہ اندیشہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو جھٹلانے کے نتیجہ میں تم لوگوں پر وہی عذاب نہ آجائے جو گزشتہ سرکش قوموں پر آیا تھا۔ اس آیت اور اگلی آیات میں مردِ مومن کی طرف سے وعید ذکر کرنے کا بیان ہے۔

علمی بات: اس مردِ مومن نے جب دیکھا کہ اس کی وعظ و نصیحت اثر انگیز نہیں ہو رہی تو اس نے مزید کھل کر گفتگو شروع کی اور ماضی میں اپنی بداعمالیوں کے باعث تباہ و برباد ہونے والی قوموں کا ذکر شروع کردیا اور فرمایا ان تباہ ہونے والی قوموں کے حالات سے عبرت پکڑو اور اس غلط روش کو چھوڑ دو۔

آیت نمبر ۳۱: بندۂ مومن نے انہیں خبردار کیا کہ ان لوگوں کا انجام بھی وہ نہ ہو جیسا انجام قومِ نوح، قومِ عاد اور قومِ ثمود کا اور بعد کی سرکش قوموں کا ہوا۔ حقیقت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا بلکہ وہ بندوں کو ان ہی کے جرائم کی سزا دیتا ہے۔

علمی بات: مردِ مومن نے فرعون کی اس مداخلت کی کوئی پروا کیئے بغیر اپنی تقریر جاری رکھی۔ اس نے کہا: کہ اے میری قوم! میں تم لوگوں کو آگاہ کیئے دیتا ہوں کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گزند پہنچانے کی کوشش کی گئی تو تم پر اسی طرح عذاب آدھمکے گا جس طرح پچھلی قوموں یعنی قومِ نوح، قومِ عاد، قومِ ثمود اور ان کے بعد کی قوموں پر آیا۔ ان قوموں نے اپنے رسولوں کو گزند پہنچانے کی کوشش کی تو اس کے نتیجہ میں تباہ ہوئیں، اسی طرح تم لوگ بھی تباہ ہو کر رہ جاؤ گے اگر انہی کے نقشِ قدم کی پیروی کرو گے۔

علمی بات: معلوم ہوا کہ فرعون عاد و ثمود وغیرہ کے بعد ہوا ہے اور یہ قومیں اس کے پاس پڑوس کی قومیں تھیں جن کے حالات اس طرح معلوم و معروف تھے کہ ان کو اس عہد کے لوگوں کے سامنے تذکیر و تنبیہ کے لئے پیش کیا جاسکتا تھا۔

علمی بات: بندۂ مومن نے قوم کو یہ بھی بتایا کہ یہ بات بھی یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا ہی رحیم ہے۔ اس وجہ سے کوئی عذاب بھیجنے سے پہلے تم لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے اس نے اپنا رسول بھیج دیا ہے تاکہ جو لوگ توبہ و اصلاح کرنا چاہے وہ توبہ و اصلاح کرلیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی اس رحمت و عنایت کی قدر کرنے کے بجائے اس کے رسول کو قتل (شہید) کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم لوگوں پر حجت تمام ہوگئی اور تم لوگوں نے اپنی شامت خود بلائی۔

آیت نمبر ۳۲: بندۂ مومن نے مزید کہا کہ ان پر اچانک عذاب آجائے گا جب ایک دوسرے کو پکاریں گے اور چیخ رہے ہوں گے۔ "یَوْمَ التَّنَادِ" سے مراد روزِ قیامت ہے جب سخت افراتفری اور چیخ و پکار کا عالم ہوگا۔ جیسا کہ سورۃ الاعراف میں مذکور ہے، وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ "اور جنت والے آگ والوں کو پکاریں گے۔" (سورۃ الاعراف ۷، آیت: ۴۴) اور یہ پکارنا ان کا بطور استغاثہ ہوگا کہ کوئی ہمیں عذاب دوزخ سے چھڑائے، "اور آگ والے جنت والوں کو پکاریں گے کہ تھوڑا سا پانی ہم پر بہادو یا اس رزق میں سے (کچھ دے دو) جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے (جنتی) کہیں گے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں چیزیں کافروں پر حرام کردی ہیں۔" (سورۃ الاعراف ۷، آیت: ۵۰) تو بندہ مومن نے اسی بات کو یاد دلا کر "یَوْمَ التَّنَادِ" کہا۔

علمی بات: دنیوی عذاب سے ڈرانے کے بعد اس نے آخرت کے عذاب سے ڈرایا۔ "یَوْمَ التَّنَادِ" (ایک دوسرے کو پکارنے کے دن) سے مراد قیامت کا دن ہے۔ اس دن اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو محبت سے آواز دے گا اور مشرکین کو اپنے شرکاء پیش کرنے کے لئے آواز دے گا۔ اس دن اس کے فرشتے نیک و بد کو ان کی حیثیت کے مطابق آواز دیں گے۔ جنتی اور جہنمی ایک دوسرے کو آوازیں دیں گے، اہلِ جنت جہنمیوں کو اور وہ جنتیوں کو آواز دیں گے۔ حق لینے والے حق دینے والوں کو اور مظلوم ظالموں کو آوازیں دے رہے ہوں گے۔ جنت و جہنم بھی آواز دے رہی ہوں گی۔ موت کو ذبح کردیا جائے گا اور جنتیوں اور جہنمیوں کو آواز دی جائے گی کہ اب ہمیشگی ہے، موت نہیں۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "قیامت کے دن موت کو اس طرح لایا جائے گا جیسے وہ سیاہ وسفید مینڈھا ہو۔ چنانچہ اسے جنت اور جہنم کے درمیان میں کھڑا کر دیا جائے گا۔ تو (اعلان کرنے والا پکار کر) کہے گا: اے جنت والو! کیا اسے پہچانتے ہو؟ تو وہ جھانکیں گے، دیکھیں گے اور کہیں گے: ہاں۔ یہ موت ہے۔ فرمایا: پھر کہا جائے گا: اے جہنم والو! کیا اسے پہچانتے ہو؟ تو وہ جھانکیں گے، دیکھیں گے اور کہیں گے، ہاں، یہ موت ہے۔ فرمایا: پھر اس کے بارے میں حکم دیا جائے گا اور اسے ذبح کر دیا جائے گا۔ فرمایا: پھر کہا جائے گا: اے جنت والو! (اب) دوام ہی دوام ہے موت نہیں ہے اور اے جہنم والو! (اب) دوام ہی دوام ہے، موت نہیں ہے۔" کہا: پھر رسول اللہ ﷺ نے (یہ آیت) تلاوت فرمائی: وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ "ان کو حسرت کے دن سے ڈرائیے جب معاملہ نپٹا دیا جائے گا اور وہ سراسر غفلت میں ہیں اور وہ ایمان نہیں لاتے" اور آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے دنیا کی طرف اشارہ فرمایا۔ (صحیح مسلم)

علمی بات: اس دن ایک دوسرے کو پکارنے کا عجیب عالم ہوگا۔ قرآنِ مجید سے "يَوْمَ التَّنَادِ" کے بارے میں چند مقامات درج کیئے جاتے ہیں۔ بعض مفسرین کرام نے بیان کیا کہ "يَوْمِ الْأَحْزَابِ" سے جو مراد ہے وہی "يَوْمَ التَّنَادِ" سے مراد ہے، یعنی "يَوْمَ التَّنَادِ" سے بھی وہی دنیا میں آنے والا عذاب مراد ہے کہ جب وہ دن آئے گا تو تم ایک دوسرے کو مدد کے لئے آواز دو گے، مگر کوئی مدد کو نہیں آئے گا اور تم عذاب سے بچنے کے لئے بھاگو گے، مگر تمہیں اللہ تعالیٰ سے کوئی نہیں بچائے گا، چنانچہ جس دن آلِ فرعون غرق ہوئے وہ ڈوبتے ہوئے، ایک دوسرے کو پکارنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "فَلَمَّا أَحَسُّوا بَأْسَنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا يَرْكُضُونَ لَا تَرْكُضُوا وَارْجِعُوا إِلَىٰ مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ وَمَسَاكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْأَلُونَ" پھر جب انہوں نے ہمارا عذاب محسوس کیا تو فوراً وہاں (بستیوں) سے بھاگنے لگے۔ (کہا گیا) مت بھاگو اور واپس جاؤ جہاں تمہیں آسودگی دی گئی تھی اور اپنے گھروں میں تاکہ تم سے پوچھا جائے۔" (سورۃ الانبیاء ۲۱، آیات: ۱۲، ۱۳)

آیت نمبر ۳۳: قیامت کے دن عذاب سے اگر کوئی پیٹھ پھیر کر بھاگنا بھی چاہے گا تو اللہ تعالیٰ کی گرفت سے نہیں بچ سکے گا۔ اللہ تعالیٰ جسے گمراہ کر دے تو اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔

علمی بات: جب کوئی قوم حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کی ہدایت ور ہنمائی کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام کے توسط سے معجزات و دلائل پہنچانے کا اہتمام فرماتا ہے، تاکہ یہ گمراہ لوگ راہِ راست پر آکر اپنے انجام کو بہتر بنائیں۔ مگر جب کوئی قوم حق کے انکار کے بعد اہلِ حق سے بحث اور کٹ حجتی شروع کر دے اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنے پر کمربستہ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کے ساتھ شدید ترین معاملہ کرتا ہے۔

آیت نمبر ۳۴: حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قبل حضرت یوسف علیہ السلام بھی اہلِ مصر میں آئے۔ لیکن یہ لوگ ان کی دعوت اور واضح دلائل کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار کرتے رہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے وصال کے بعد ان لوگوں کو اُن کی قدر ہوئی۔ انہوں نے سمجھا کہ اب کوئی رسول نہیں آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کے وعدوں اور وعیدوں پر شک کرنے والے سرکشوں کو اللہ تعالیٰ یوں ہی گمراہ کرتا ہے۔

علمی بات: اس مردِ مومن نے اپنی قوم کی ضلالت کی تاریخ بیان فرمائی کہ اس سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام بھی، نہایت واضح دلائل کے ساتھ، تم لوگوں کے پاس آئے لیکن ان کی تعلیمات وہدایات کے باب میں بھی تم لوگ برابر شک ہی میں رہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ بادشاہِ وقت کی غیر معمولی عقیدت کے سبب سے جو اس کو حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ تھی، ان کے معاملہ میں کوئی معاندانہ رویہ تو نہیں اختیار کیا گیا لیکن جن باتوں کی اُنہوں نے تعلیم دی ان کی کوئی خاص قدر بھی نہیں کی گئی۔ بلکہ ان کی تعلیمات کو نفس کی خواہشوں کے خلاف پاکر ان کے باب میں تم لوگ بے پروائی اور شک میں مبتلا رہے۔

ان کو اور ان کی تعلیمات کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سمجھنے کے بجائے قوم کے لوگوں نے ایک بوجھ خیال کیا۔ یہاں تک کہ جب ان کا وصال ہوا تو لوگوں نے ٹھنڈا سانس لیا کہ یہ بوجھ اُترا اور مطمئن ہو گئے (معاذ اللہ) کہ اب اللہ تعالیٰ کوئی اور رسول علیہ السلام نہیں بھیجے گا جو ان کی طرح تم لوگوں کی خواہشوں کو لگام لگانے کی کوشش کرے گا۔ تم لوگوں کی موجودہ گمراہی اسی پچھلی گمراہی کی وجہ سے ہے۔

عملی پہلو: جو لوگ محض نفس کی خواہشوں کی پیروی میں اللہ تعالیٰ کے حدود کو توڑنے والے اور اتباعِ نفس کے جنون میں علم ویقین کے بجائے شک کی راہ اختیار کرنے والے بن جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ان کی پسند کردہ ضلالت ہی کی ڈگر پر ہانک دیتا ہے۔ پھر ان کو کبھی ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔

علمی و عملی بات: بندوں کے ساتھ اللہ ﷻ کا معاملہ جس اصول پر مبنی ہے اس کا ذکر پہلے بھی کئی بار آچکا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ لوگوں کو خیر و شر کی جو معرفت اور عقل و فہم کی جو نعمت اس نے بخشی ہے، لوگ اس کی قدر کریں۔ جو لوگ ان کی قدر کرتے ہیں اللہ ﷻ ان کے لئے ہدایت و معرفت کی مزید راہیں کھولتا ہے۔ جو اس کی قدر نہیں کرتے بلکہ اپنے نفس کی خواہشوں سے مغلوب ہو کر واضح سے واضح حق کو بھی مشتبہ بنانے کی کوشش کرتے اور اسی مقصد کے لئے اپنی ساری ذہانت صرف کرتے ہیں ان کو مزید ہدایت دینا تو الگ رہا ان کی اس ناقدری کی پاداش میں اللہ ﷻ ان کا وہ نور بھی سلب کر لیتا ہے جو ہر انسان کی فطرت میں ودیعت ہوتا ہے۔ یہاں اس بندۂ مومن نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور یہ چیز ان لوگوں کے لئے خاص طور پر قابل توجہ ہے جو اس دور میں نہایت واضح حقائق کو مشتبہ بنانے کے لئے رات دن محنتیں کر رہے ہیں۔

علمی بات: اس مردِ مومن نے اُنہیں یوں سمجھایا کہ تمہاری گمراہی اور پھر اس پر ہٹ دھرمی کا حال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے تمہارے ملک میں حضرت یوسف علیہ السلام آئے جن کے متعلق تم خود مانتے ہو کہ وہ بلند ترین اخلاق کے حامل تھے اور اس بات کا بھی تمہیں اعتراف ہے کہ اُنہوں نے بادشاہِ وقت کے خواب کی صحیح تعبیر دے کر تمہیں سات برس کے اس خوفناک قحط کی تباہ کاریوں سے بچالیا جو ان کے دور میں تم پر آیا تھا اور تمہاری ساری قوم اس بات کی بھی معترف ہے کہ ان کے دورِ حکومت سے بڑھ کر عدل و انصاف اور خیر و برکت کا زمانہ کبھی مصر کی سرزمین نے نہیں دیکھا، مگر ان کی ساری خوبیاں جانتے اور مانتے ہوئے بھی تم نے ان کے جیتے جی ان پر ایمان نہ لانے دیا اور جب ان کا وصال ہو گیا تو تم نے کہا کہ اب بھلا ایسا آدمی کہاں پیدا ہو سکتا ہے۔ گویا تم ان کی خوبیوں کے معترف ہوئے بھی تو اس طرح کہ بعد کے آنے والے ہر نبی علیہ السلام کا انکار کرنے کے لئے اسے ایک مستقل بہانا بنالیا۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہدایت بہر حال تمہیں قبول نہیں کرنی ہے۔

آیت نمبر ۳۵: بندۂ مومن کی تقریر کے مزید نکات کا ذکر ہے کہ حد سے بڑھنے والے سرکشوں کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ ﷻ کی آیات میں بغیر کسی دلیل کے اعتراضات اور بحث کرتے ہیں۔ ان کی یہ صورت حال اللہ ﷻ اور اہل ایمان کے نزدیک بہت بڑی ناراضگی کی بات ہے۔ تکبر اور سرکشی کرنے والے ایسے لوگوں کے دلوں پر اللہ ﷻ مہر لگا دیتا ہے اور وہ ہدایت کے حصول سے بالکل ہی محروم ہو جاتے ہیں۔

اللہ ﷻ کی طرف سے گمراہی کا فیصلہ ہو جاتا ہے جن میں یہ تین خصلتیں موجود ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنی بد اعمالیوں میں حد سے گزر جاتے ہیں اور پھر اُنہیں فسق و فجور کی ایسی چاٹ لگ جاتی ہے کہ اصلاحِ اخلاق کی کسی دعوت کو قبول کرنے کے لئے وہ آمادہ نہیں ہوتے۔ دوسرے یہ کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے معاملہ میں ان کا مستقل رویہ شک کا رویہ ہوتا ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام ان کے سامنے خواہ کیسے ہی معجزات، دلائل اور نشانیاں لے آئیں، مگر وہ ان کی نبوت میں بھی شک کرتے ہیں اور ان حقائق کو بھی ہمیشہ شک ہی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو توحید اور آخرت کے متعلق اُنہوں نے پیش کیئے ہیں۔ تیسرے یہ کہ وہ کتاب اللہ کی آیات پر معقولیت کے ساتھ غور کرنے کے بجائے کج بحثوں سے ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کج بحثیوں کی بنیاد نہ کسی عقلی دلیل پر ہوتی ہے، نہ کسی آسمانی کتاب کی سند پر، بلکہ از اوّل تا آخر صرف ضد اور ہٹ دھرمی ہی ان کی واحد بنیاد ہوتی ہے۔ یہ تین عیوب جب کسی گروہ میں پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر اللہ ﷻ اسے گمراہی کے گڑھے میں پھینک دیتا ہے جہاں سے دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں نکال سکتی۔

علمی بات: گمراہ لوگ اللہ ﷻ کی آیات میں بحث اور جدال کرتے ہیں جب کہ ان کے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں جو وحی کے ذریعہ ان تک پہنچی ہو۔ مراد کسی نبی کی تعلیم یا کسی آسمانی کتاب کی حجت ہے۔ ایسی کوئی حجت ان لوگوں کے پاس موجود نہیں ہے جس کو یہ قرآنِ حکیم کی آیات کی تردید میں پیش کر سکیں وہ محض وہم و گمان کی بنا پر بحثیں کھڑی کر رہے ہیں۔

علمی و عملی بات: متکبر یعنی اللہ ﷻ کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا سمجھنے والا اور جبّار کا مطلب ہے زبردست، وہ جو بندگانِ خدا کو اپنی مرضی پر چلانے کے لئے جبر کرے۔ ایسے لوگ قبولِ حق کی فطری صلاحیت کو کھو چکے ہوتے ہیں اس لئے حق کتنا ہی روشن ہو کر ان کے سامنے آجائے ان کے دل میں نہیں اُترتا۔ یہ سب کچھ اس قاعدہ کے مطابق ہوتا ہے جو اللہ ﷻ نے گمراہی کے لئے مقرر کر رکھا ہے اور اسی کو دل پر مہر لگانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

آیت نمبر ۳۶: بندۂ مومن کے ایمان افروز بیان سے توجہ ہٹانے کے لئے فرعون نے اپنے وزیر ہامان کو ایک بلند محل بنانے کا حکم دیا۔ تاکہ وہ اپنے زعم کے مطابق آسمان کے دروازوں تک پہنچ سکے۔

علمی بات: مردِ مومن کی تقریر سے فرعون کو فکر لاحق ہوئی کہ کہیں اس کے دل سے نکلی ہوئی باتیں عمائدین سلطنت کے دلوں میں نہ اُتر جائیں۔ وہ سوچنے لگا کہ ان میں چند آدمی بھی اس کے ہم خیال ہوگئے تو حکومت کے لئے مشکلات پیدا ہوجائیں گی۔ اس نے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے مکاری اور چالبازی کے طور فوراً یہ ظاہر کرنا چاہا کہ میرے نزدیک ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ گویا اس نے قوم کو فریب دینے کی کوشش کی کہ تم بھی ان باتوں کو ایک کان سے سنو اور دوسرے کان سے نکال دو۔ نہایت بے پروائی کے انداز میں اس نے اپنے نہایت معتمد وزیر ہامان سے کہا کہ میرے لئے ایک بلند و بالا عمارت بناؤ تاکہ میں آسمانوں کے اطراف میں پہنچ کر دیکھوں کہ کیا وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ رب موجود ہے جس کی طرف سے اسے رسول بن کر آنے کا دعویٰ ہے۔ میں تو گمان کرتا ہوں کہ موسیٰ ایک بالکل جھوٹا آدمی ہے، اس نے محض ایک بات بنا رکھی ہے (معاذ اللہ)، لیکن اس کی تصدیق یا تردید کے لئے ضروری ہے کہ میں خود اوپر جاکر دیکھوں۔

علمی و فکری پہلو: اندازہ کیجیے کہ جو لوگ اقتدار کے نشہ میں اندھے ہوجاتے ہیں اور ہٹ دھرمی کا شکار ہو کر کسی بات پر غور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، ان کی حماقت کا کیا حال ہوتا ہے۔ اس نے اپنے تئیں یہ فرض کرلیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رب آسمان میں رہتا ہے۔ تو میں جب اس کے قریب پہنچوں گا تو وہ یقیناً کہیں نہ کہیں مجھے دکھائی دے گا۔ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح اچھائی ہر دور میں موجود رہی ہے اسی طرح حماقت آمیز بُرائیاں بھی ہر دور میں موجود رہی ہیں۔ فرعون کا زمانہ تو کہا جاسکتا ہے کہ تاریک دور (The Dark Ages) میں شامل ہے۔ لیکن ہمارا زمانہ تو علم و ہنر کی روشنی کا زمانہ ہے۔ اس کے باوجود کیا یہ حقیقت نہیں کہ روس کے ایک بہت بڑے لیڈر نے یہ بات کہی تھی کہ مسلمان نہ جانے کس خدا کی بات کرتے ہیں، ہمارے خلاباز (Astronaut) کائنات کی وسعتوں میں گھوم پھر کر آئے ہیں اُنہیں تو کہیں خدا نظر نہیں آیا۔ ایک معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھتا ہے کہ سائنسدان آج تک کائنات کی وسعتوں کے سامنے بے بس کھڑے ہیں وہ آج تک آسمان کو دریافت نہیں کرسکے۔ ہمیں جو نیلی چھت نظر آتی ہے اسے وہ حدِ نگاہ سمجھتے ہیں اور چاند تک جانے کے دعوے ضرور ہیں لیکن ساتھ ہی یہ اعتراف بھی ہے کہ چاند تو ہمارے قریب ترین سیاروں میں سے ہے۔ دور کے سیاروں کی انسان کو کچھ خبر نہیں۔ لیکن اقتدار میں سرمست آدمی کیسے کیسے دعوے کرتا پھرتا ہے۔ اسی کا ایک نمونہ فرعون بھی ہے۔ مفسرین کرام یہ کہتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ ایسی کوئی عمارت بنائی ہی نہیں گئی کیونکہ تاریخ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اور اگر بالفرض ایسی کوشش ہوئی بھی ہے تو وہ عمارت تکمیل پذیر ہونے سے پہلے زمین بوس ہوگئی۔

علمی بات: یہ فرعون کی سرکشی اور تمرد کا بیان ہے کہ اپنے طبعی تکبر کا اظہار کرتے ہوئے ہامان سے کہنے لگا کہ میرے لئے ایک نہایت بلند و بالا عمارت بناؤ، جس کے ذریعہ سے میں آسمان کے راستہ طے کروں اور موسیٰ کے معبود کو دیکھوں، حالانکہ میں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جھوٹا ہی سمجھتا ہوں کہ میرے سوا اس کا کوئی دوسرا معبود نہیں ہے۔ (معاذ اللہ)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ کفر و تکبر میں حد سے تجاوز کر جانے کی وجہ سے فرعون کے دل پر مہر لگادی گئی اور اس کی بداعمالیوں اور کفر کو اس کی نگاہوں میں خوبصورت بنا کر راہ حق کی اتباع کرنے سے روک دیا گیا اور اس کی سازش اور اس کی چال اس کے کسی کام نہ آئی۔

آیت نمبر ۳۷: فرعون نے اپنے زعم میں آسمان کے دروازوں تک جا پہنچنے کا منصوبہ پیش کیا جہاں سے وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکے۔ فرعون بولا: کہ وہ موسیٰ کو نبوت کے معاملہ میں جھوٹا گمان کرتا ہے۔ (معاذ اللہ)۔ اس طرح فرعون کو اپنے بُرے عمل اچھے نظر آتے رہے اور وہ حق کے راستہ سے روک دیا گیا۔ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف جو چال اختیار کی اس کا نتیجہ اسی کے حق میں بہت بُرا نکلا۔

علمی بات: فرعون اس مومن کے منطقی استدلال کا جواب تو نہ دے سکا، البتہ اس نے تمسخر کے طور پر کہہ دیا ہوگا: موسیٰ کا خدا زمین پر تو ہے نہیں، آسمان میں دیکھتا ہوں۔ بعض اہل علم بیان کرتے ہیں کہ فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خدا تلاش کرنے کے لئے ایک رصد گاہ بنانا چاہتا تھا تاکہ اپنی قوم کو دھوکہ دے سکے کہ دیکھو موسیٰ کا کوئی خدا نہیں ہے۔ (معاذ اللہ)

علمی بات: اس طرح فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی باتوں کا مذاق اڑایا اور اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کی جس سے اس کا تکبر پوری طرح ظاہر ہوگیا۔ یہ خیال کرنا درست معلوم نہیں ہوتا کہ فرعون نے ہامان کو عمارت تعمیر کرنے کا واقعی حکم دیا تھا تاکہ وہ اس پر چڑھ کر موسیٰ علیہ السلام کے رب کو جھانک کر دیکھ لے۔ اس مقصد کے لئے پہاڑوں کی کیا کمی تھی جو عمارت تعمیر کرنے کا وہ حکم دیتا۔ فرعون کے تو ایک ایک لفظ سے طنز ہی کا اظہار ہوتا ہے۔

عملی پہلو: فرعون کا بُرا عمل غلط توجیہات کی وجہ سے اس کی نظر میں اچھا عمل بن گیا۔ انسانی فطرت بُرا عمل کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتی لیکن جب آدمی کسی بات کی غلط توجیہ کر کے بُرائی کے لئے وجہ جواز پیدا کر دیتا ہے تو پھر بُرا عمل اس کی نظر میں اچھا عمل بن جاتا ہے اور وہ شیطان کے فریب میں آ جاتا ہے۔ پھر شیطان ایسی رکاوٹیں کھڑی کر دیتا ہے کہ اس کا راہِ راست پر آنا ممکن نہیں رہتا۔

آیت نمبر ۳۸: فرعون کے سازشی منصوبہ کی تردید کرتے ہوئے بندۂ مومن نے قوم کو آگاہ کیا کہ فرعون ان کا خیر خواہ نہیں ہے۔ بلکہ میں جس راستہ کی نشاندہی کر رہا ہوں وہی سیدھا راستہ ہے۔ لہٰذا تم اسی راستہ کی پیروی کرو۔

علمی بات: مردِ مومن نے فرعون کی مداخلت کی پرواہ نہیں کی اور اس کی بات کو سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ فرعون نے اس سے پہلے کہا تھا کہ میں تمہیں سیدھی اور صحیح راہ کی طرف رہنمائی کر رہا ہوں۔ اس کے جواب میں مرد مومن نے کہا کہ فرعون جس راہ پر تمہیں چلانا چاہتا ہے وہ ہدایت کی راہ نہیں بلکہ گمراہی کا راستہ ہے۔ اگر تم فرعون کی پیروی کرو گے تو وہ تمہیں تباہی کی طرف لے جائے گا۔ لیکن اگر تم صحیح راستہ پر چلنا چاہتے ہو جس میں تمہیں دوعالم کی کامرانیاں نصیب ہوں تو اس کی طرف میں تمہاری رہنمائی کر رہا ہوں، اس لئے میری پیروی کرو۔

علمی و عملی بات: فرعون کے جواب میں مرد حق کا جواب ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن مجید کسی بات کو داستان گوئی کے انداز میں بیان نہیں کرتا۔ قرآنِ حکیم کا اسلوب یہ ہے کہ قاری کی توجہ صرف ان نکات پر مرکوز رکھی جائے جو اس کی رہنمائی کے لئے مفید ہوں۔ یہ بات واضح ہے کہ مردِ مومن کے خطاب کے وقت فرعون کے ہاں اس کی قوم کے نمائندے ضرور موجود تھے۔ جس بنا پر مردِ مومن فرعون کے بجائے بار بار قوم کو مخاطب کرتے ہیں اور فرعون کی بے ہودہ باتوں کا جواب دینے کے بجائے قوم کے نمائندوں کو مخاطب کرتا اور بار بار فرماتا ہے کہ اے میری قوم! میری بات مانو! میں تمہاری سیدھے راستہ کی رہنمائی کر رہا ہوں۔ بار بار سمجھانے کے باوجود قوم دنیاوی مفادات کی خاطر مردِ مومن کی طرف توجہ دینے کے لئے تیار نہیں تھی۔

آیت نمبر ۳۹: بندۂ مومن کی رقت آمیز نصیحت کا ذکر ہے۔ دنیا کی زندگی عارضی اور یہاں کی لذّتیں وقتی ہیں۔ جب کہ آخرت کی نعمتیں بہترین اور دائمی ہیں۔

علمی بات: اس آیت میں جو بات ارشاد فرمائی گئی ہے یوں تو اس کا مخاطب ہر شخص ہے کیونکہ اکثر لوگ دنیا کی چند روزہ زندگی کو آخرت کی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں میں یہ بیماری سب سے زیادہ ہوتی ہے اور وہ توجہ دلانے پر بھی اپنے رویہ میں کبھی تبدیلی پیدا نہیں کرتے۔ وہ بادشاہ کے اہل دربار، وزراءِ مملکت، حاشیہ بردار اور اس کے نمائندینِ سلطنت ہیں۔ وہ علم و دانش کے حامل ہونے کے باوجود زندگی کے مقاصد کے تعین میں سب سے زیادہ کوتاہ فکر اور کوتاہ ہمت واقع ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کا ہدفِ حیات چند روزہ کا عیش و آرام ہوتا ہے۔ اور یہ چیز اُنہیں چونکہ حاکم وقت کی ہاں میں ہاں ملانے سے ملتی ہے اس لئے وہ حاکم وقت کو ناراض کرنے یا اس کی کسی بات کی مخالفت کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس لئے بطور خاص ان سے خطاب کرتے ہوئے مردِ مومن نے کہا کہ یہ دنیا کی زندگی متاع چند روزہ کے سوا کچھ نہیں۔ اصل زندگی وہ ہے جو آخرت میں ملے گی، جس کے عیش و آرام میں کبھی خلل واقع نہیں ہوگا اور جس کی کسی نعمت کو کبھی زوال نہیں ہوگا۔ تو اس کے مقابلہ میں اگر یہ چند روزہ زندگی کو ترجیح دیتے ہیں تو یہ وہ بھول ہے جس کا کوئی تدارک نہیں ہو سکتا۔

آیت نمبر ۴۰: مومن شخص نے قوم کو آگاہ کیا کہ روز قیامت بُرے انجام دینے والوں کو بُرائی کے برابر ہی بدلہ دیا جائے گا۔ جبکہ اخلاص کے ساتھ نیک اعمال انجام دینے والے خواہ وہ مرد ہوں یا یا عورت بشرطیکہ وہ مومن بھی ہوں، اُنہیں جنت میں داخل کیا جائے گا۔ جہاں اُنہیں بغیر حساب بے شمار نعمتیں مہیا کی جائیں گی۔

علمی بات: مردِ مومن اپنی قوم کو انتہائی فکر مندی اور ہمدردی کے جذبات کے ساتھ احساس دلانے کی کوشش کر رہا ہے کہ جس دنیا کے عہدوں، مال وزر، شان و شوکت، محلات اور مفادات کی خاطر تم لوگ دعوتِ حق سے منہ موڑے ہوئے ہو یہ سب عارضی ہیں۔ آخرت کی زندگی اور اس کا گھر ہمیشہ کے لئے ہے۔ یاد رکھو! جس نے بُرے کام کیئے وہ اس کے مطابق اس کی سزا پائے گا اور جس نے صالح اعمال کیئے وہ اس کی جزا پائے گا۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت،

بشرطیکہ وہ ایمان دار ہو، وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ اس میں اسے بے حد وحساب رزق دیا جائے گا۔ مومن نے ایمان کی شرط سے ثابت کیا کہ صالح اعمال کی قبولیت اور جنت میں داخلہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ایمان میں خالص اور اپنے رب کی توحید پر پکا ہو۔

یہ دنیا دارالعمل ہے کہ اس میں رہ کر انسان جو عمل کرتا ہے آخرت میں اس کی جزا و سزا بطور نتیجہ انسان کو ملے گی جو لوگ گناہ اور بدکاریاں کر کے اللہ ﷻ کی طرف لوٹیں گے ان کو اس کے مطابق سزا ملے گی اور ان پر کسی قسم کا ظلم و زیادتی نہیں ہوگی لیکن جو ایمان لاکر نیکیاں کما کر جائیں گے ان کو ان کی نیکیوں سے کئی گنا زیادہ دیا جائے گا اور وہ جنت میں اپنے اپنے درجات کے مطابق خوش و خرم رہیں گے اور وہ جو چاہیں گے ان کو پیش کیا جائے گا۔

علمی بات: یہ تقریر اس مردِ مومن کی ہے جو وہ اپنی قوم کے سامنے کر رہا ہے اور فرعون جو اس وقت کا مطلق العنان حکمران ہے وہ بھی وہاں موجود ہے اور اس کی موجودگی میں یہ سب کچھ بیان کیا جا رہا ہے اور وہ مخاطب تو پوری قوم کو کر رہا ہے لیکن حقیقت میں وہ سناتا صرف فرعون ہی کو چاہتا ہے تاکہ وہ مشتعل ہو کر اگر کوئی قدم اٹھانا چاہتا ہے تو اٹھائے مگر اپنے اختتام پر نگاہ رکھے۔

علمی بات: یہ اس ارحم الراحمین اور اکرم الاکرمین کی بیکراں رحمت اور بے انتہا کرم کا ایک خاص اور عظیم الشان مظہر ہے کہ بُرائی کا بدلہ تو ناپ تول کر اتنا ہی دیا جائے گا جتنی کہ وہ بُرائی ہوگی۔ تاکہ اس میں کسی طرح کی کوئی زیادتی نہ ہو جائے۔ لیکن نیکی کا بدلہ کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور اتنا کہ اس کو اس کا گمان بھی نہ ہوگا اور ایسے خوش نصیبوں کو ایسی عظیم الشان جنت اور اس کی سدا بہار نعمتوں سے سرفراز فرمایا جائے گا جس کا یہاں اس دنیا میں رہتے ہوئے تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

علمی بات: حساب کے معنیٰ حساب و شمار کے بھی آتے ہیں اور ظن و گمان کے بھی۔ تو اس بنا پر آیت کریمہ کے دو مطلب ہو جائیں گے۔ ایک یہ کہ اہل جنت کو جو روزی وہاں ملے گی وہ نپی تلی نہیں ہوگی بلکہ بغیر حد وحساب کے ہوگی۔ دوسرے یہ کہ ان کو وہاں پر وہ کچھ ملے گا جو ان کے خواب وخیال اور وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا۔ اور یہ دونوں ہی مفہوم صحیح و درست بھی ہیں اور عین مقصود بھی۔ جیسا کہ دوسری مختلف آیات میں ان کو طرح طرح سے واضح فرمایا گیا ہے۔

آیت نمبر ۴۱: بندۂ مومن نے مزید کہا کہ وہ اُنہیں نجات اور کامیابی کی راہ دکھا رہا ہے۔ جب کہ اس کی قوم اسے کفر و شرک کی دعوت دے کر جہنم کی طرف لے جا رہی ہے۔

علمی بات: مردِ مومن نے فرعونیوں سے یہ بھی کہا کہ اے میری قوم! میرے ساتھ بھی تم لوگوں کا رویہ عجیب و غریب ہے۔ میں تمہیں نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے آگ میں کودنے کی دعوت دیتے ہو۔ میں تمہیں اس اللہ وحدہٗ لاشریک کی بندگی کی تلقین کرتا ہوں جو سب سے زبردست بھی ہے اور اس کے باوجود بڑا بخشنے والا ہے۔ عمر بھر خطائیں کر کے بھی اگر اس کے در کرم پر کوئی آجائے تو معاف کر دیتا ہے اور تم مجھے کہتے ہو کہ میں اللہ ﷻ کا انکار کر دوں اور اس کے ساتھ ایسے شریک بناؤں جو بالکل بے بس اور بے اختیار ہیں اور جن کی خدائی کا مجھے کوئی علم نہیں۔ میں تو تمہاری خیر خواہی میں سرگرم ہوں اور تم ہو کہ اپنے ساتھ مجھ کو بھی ڈبو دینا چاہتے ہو۔

آیت نمبر ۴۲: قوم توحید کے بجائے اس مردِ مومن کو کفر و شرک کی دعوت دے رہی ہے جس کی تائید کے لئے قوم کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ جب کہ بندۂ مومن اُنہیں اس ذات کی طرف بلا رہا ہے جو زبردست ہے اور جس کے اختیار میں سب کچھ ہے اور جو رجوع کرنے پر گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے۔

علمی بات: مردِ مومن اپنی قوم کو سمجھا رہا ہے کہ تمہاری کوشش کا حاصل تو یہ ہے کہ میں (معاذ اللہ) خدائے واحد کا انکار کر دوں۔ اس کے پیغمبروں کو اور ان کی باتوں کو نہ مانوں اور نادان جاہلوں کی طرح ان چیزوں کو خدا ماننے لگوں جن کی اُلوہیت کسی دلیل اور علمی اصول سے ثابت نہیں۔ میرا منشا یہ ہے کہ کسی طرح تمہارا سر اس اللہ وحدہٗ لاشریک کی چوکھٹ پر جھکا دوں جو نہایت زبردست بھی ہے اور بہت زیادہ خطاؤں کا معاف فرمانے والا ہے جس کی شان یہ ہے کہ مجرم کو پکڑے تو کوئی چھڑا نہ سکے اور معاف فرمائے تو کوئی روک نہ سکے۔ وہ ہی اس کا مستحق ہے کہ آدمی اس کے آگے ڈر کر اور امید باندھ کر سر عبودیت جھکائے۔ یاد رکھو میں اسی اللہ ﷻ کی پناہ میں آچکا ہوں جس کی طرف تمہیں بلا رہا ہوں۔

علمی بات: مردِ مومن اپنی قوم کو سمجھا رہا ہے کہ مجھے بتاؤ کہ عقل و دانش کے خلاف تمہاری یہ عادت کیوں ہے؟ میں اللہ واحد لاشریک پر ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہوں تاکہ تم کو دوزخ سے نجات حاصل ہو اور تم ہو کہ مجھے شرک کی طرف بلا رہے ہو جو دوزخ میں لے جانے والا ہے۔ شرک کے ناممکن

ہونے کے قطعی دلائل میرے پاس ہیں اور تم مجھے جس رب کو ماننے کا کہتے ہو اس کی کوئی ٹھوس دلیل نہیں ہے۔ میں تمہیں خوابِ غفلت سے بیدار کر کے تنبیہ کر رہا ہوں اور تم میری خیر خواہی کے مقابلہ میں بدخواہی کر رہے ہو۔ اے میری قوم! یاد رکھو! ایمان کے لئے کوئی ایسی دلیل ہونی چاہیئے جو معبود کی ہستی اور اس کے رب ہونے کو ثابت کر سکے بغیر کسی دلیل کے ایمان نہیں ہو سکتا اور اعتقاد بغیر یقین کے صحیح نہیں۔ میں تو اس رب پر پختہ یقین رکھتا ہوں جو بہت غالب ہستی ہے جو منکروں سے بدلہ لینے پر قادر ہے۔ اسی طرح وہ مومنوں میں سے جس کے چاہے گناہ بخش دے، مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات ان تمام صفات کی جامع ہے جو معبود برحق کے لئے لازم ہیں۔ اس کی قدرت بھی کامل ہے، علم بھی ہمہ گیر اور ارادہ بھی مطلق ہے۔

آیت نمبر ۴۳: جھوٹے معبودوں کو پکارنے میں دنیا و آخرت کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بلاشبہ سب کو اللہ ﷻ کے پاس لوٹ کر جانا ہے اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ بے شک حد سے گزرنے والے دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے۔ مسرفین سے ایک مراد وہ لوگ ہیں جو معبودانِ باطلہ کو اللہ ﷻ کے اختیارات و تصرفات میں شریک بناتے ہیں۔

علمی بات: بندۂ مومن نے کہا ہے کہ تم لوگ مجھے کفر و شرک کی دعوت دیتے ہو اور اللہ ﷻ کے ساتھ ایسے جھوٹے معبودوں کو شریک بنانے کو کہتے ہو جن کے معبود ہونے کا مجھے علم نہیں ہے۔ میں تمہیں اس اللہ ﷻ کی طرف بلاتا ہوں جو زبردست ہے، اس پر کوئی غالب نہیں آسکتا اور جو بڑا معاف کرنے والا ہے۔ تم لوگ مجھے جن بتوں کی عبادت کی دعوت دیتے ہو، اُنہیں پکارنے کا نہ تو دنیا میں کوئی فائدہ ہے کہ وہ ہماری تکلیفوں اور مصیبتوں کو دور کر دیں گے اور ہماری ضرورتیں پوری کر دیں گے اور نہ آخرت ہی میں ہمارے سفارشی بن کر عذاب کو ٹال سکیں گے، کیونکہ وہ تو پتھر ہیں۔ یاد رکھو! ہمیں بہر حال لوٹ کر اللہ ﷻ کے پاس ہی جانا ہے۔ اس دنیا میں جو لوگ حد سے تجاوز کریں گے، اللہ ﷻ کا انکار کر کے لوگوں پر ظلم کریں گے اور بے گناہوں کا خون بہائیں گے تو آخرت میں ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ اس نے مزید کہا: لوگو! جب عذابِ الٰہی تمہیں چاروں طرف سے گھیرے گا اس وقت تم مجھے اور میری باتیں یاد کرو گے۔ میں اپنا معاملہ اللہ ﷻ کے حوالہ کرتا ہوں، وہ اپنے فرماں بردار اور نافرمان تمام بندوں سے خوب واقف ہے۔ وہ بہتر جانتا ہے کہ کون جزائے خیر کا مستحق ہے اور کون عذاب کا؟

علمی بات: " لَيۡسَ لَهٗ دَعۡوَةٌ " (اس (جھوٹے معبود) کے لئے کوئی دعوت نہیں) کے کئی معانی ہو سکتے ہیں اور سب درست ہیں۔ ایک یہ کہ نہ دنیا میں اس جھوٹے معبود کا حق ہے کہ اسے پکارا جائے نہ آخرت میں۔ دوسرا یہ کہ نہ دنیا میں اسے پکارنے کا کوئی فائدہ ہے نہ آخرت میں۔ تیسرا یہ کہ نہ وہ دنیا میں کسی کی دعا قبول کر سکتا ہے نہ آخرت میں۔ گویا یہ وہی بات ہے جو سورۃ الاحقاف میں فرمائی ہے "اور اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہو سکتا ہے جو اللہ ﷻ کو چھوڑ کر ان کو پکارے جو اسے جواب نہیں دے سکتے قیامت کے دن تک جب کہ وہ ان کی پکار سے بے خبر ہیں۔" (سورۃ الاحقاف ۴۶، آیت: ۵)

علمی بات: اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جن بتوں کو تم پوجتے ہو، خود ان میں صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ کسی کو اپنے پوجنے کی دعوت دیں اور یہ مطلب بھی ممکن ہے کہ جن کو تم پوجنے کی ہمیں دعوت دے رہے ہو، وہ اس دعوت کے ہرگز لائق نہیں ہیں۔

آیت نمبر ۴۴: حق کی طرف بلانے کے سلسلہ میں مومن شخص نے تقریر کا خاتمہ اپنے اس درد بھرے اور انتہائی ناصحانہ اور ہمدردانہ جملہ سے کیا کہ عنقریب ان سب باتوں کی صداقت تم پر واضح ہو جائے گی۔ مومن شخص نے اپنا معاملہ اللہ ﷻ کے حوالہ کرنے کا اعلان کر دیا کیوں کہ وہی اپنے بندوں کا نگران اور محافظ ہے۔

علمی بات: اس مردِ مومن نے آخر میں انتہائی دل سوزی سے کہا: آج تو تم میری باتوں کی پرواہ نہیں کر رہے ہو، لیکن جب دنیا میں یا آخرت میں تم پر اللہ ﷻ کا عذاب آئے گا تو تم اس وقت میری باتوں کو یاد کرو گے اور کہو گے کہ واقعی ہمارا بھائی سچ کہتا تھا، مگر اس وقت ان کو یاد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ اشارہ آخرت کی جزا و سزا کی طرف بھی ہے اور اس عذاب کی طرف بھی جس سے رسول کی تکذیب کی صورت میں انہوں نے اوپر اپنی قوم کو ڈرایا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب عذاب نمودار ہو جائے گا یا آخرت سامنے آن کھڑی ہوگی تو اس وقت یہ باتیں یاد کر کے پچھتائیں گے تو اس وقت یہ پچھتانا بالکل بے سود ہوگا۔ اس نے جو کچھ کہا وہ بالکل ٹھیک اور درست تھا۔ پھر آخری بات یوں کہی کہ میں اللہ ﷻ پر بھروسہ کرتا ہوں اور اپنا معاملہ اللہ ﷻ کے سپرد کرتا ہوں، وہ اپنے بندوں کو اچھی طرح دیکھ رہا ہے۔

علمی عملی بات: اس آیت میں تفویض الی اللہ یعنی معاملات کو اللہ ﷻ کے سپرد کرنے کا درس عظیم دیا گیا ہے۔ مرد مومن نے اپنے وعظ ونصیت کے بعد ان کو مخاطب کر کے کہا: کہ اگر تم اس کلمۂ حق کے سبب سے میرے دشمن بنتے ہو تو "میں اپنا معاملہ اللہ ﷻ ہی کے سپرد کرتا ہوں"۔ وہ اپنے بندوں کا محافظ اور ان کا نگران حال ہے۔ اعتماد و بھروسے کے لائق اور سب کا حاجت روا و مشکل کشا بہر حال وہی اور صرف وہی وحدہٗ لاشریک ہے۔ اور وہی سب کی حاجتیں پوری فرماتا، مشکلیں مصیبتیں دور کرتا اور ان کے کام بناتا ہے۔ پس کامل بھروسہ و توکل ہمیشہ اور ہر حال میں اسی وحدہٗ لاشریک پر کرنا چاہیئے۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ اللہ ﷻ بندوں کے حالات سے پوری طرح باخبر ہے، وہ میری ان ادنیٰ کاوشوں کو بھی دیکھ رہا ہے اور تمہارے کافرانہ رویہ کو بھی۔ مجھے اپنا فرض انجام دینا ہے اور تمہیں اپنا فرض ادا کرنا ہے، اب میرا معاملہ بھی اور تمہارا معاملہ بھی اللہ ﷻ کے سپرد ہے۔ بعض اہل علم نے اس سے یہ بات بھی سمجھی ہے کہ تفویض صرف اپنے معاملہ کو اللہ ﷻ کے سپرد کرنے ہی کو نہیں کہتے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مخالفین کے حالات اور انجام کو بھی اللہ ﷻ کے سپرد کر دیا جائے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حق ادا کرنے کے بعد ان کی عاقبت اور انجام کو اللہ ﷻ پر چھوڑ دیا جائے اور اپنی طرف سے کوئی بڑی بات کہنے کی کوشش نہ کی جائے۔

علمی بات: یہ مومن آل فرعون کا آخری کلام ہے جو اپنی قوم کو حق کی طرف بلانے کے سلسلہ میں کیا گیا جس میں اظہار ہے کہ آج تو تم میری بات نہیں مانتے مگر جب عذاب تمہیں آپکڑے گا تو اس وقت تم کو میری بات یاد آئے گی۔ مگر اس وقت کا یاد آنا بے کار ہوگا۔ اب جبکہ اس طویل مکالمہ اور نصیحت و دعوت کے ذریعہ اس مومن آل فرعون کا ایمان ان لوگوں پر ظاہر ہو گیا تو اسے فکر ہوئی کہ اب یہ لوگ اس کے درپے ہوں گے، اس لئے اس نے کہا: "کہ میں اپنا معاملہ اللہ ﷻ کے سپرد کرتا ہوں۔" وہ اپنے بندوں کا نگران و محافظ ہے۔ مردِ مومن کو یقین تھا کہ میری اس تقریر کے بعد یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے، اس لئے وہاں سے نکل کر پہاڑوں کا رخ کیا۔ اور ان لوگوں کی گرفت میں نہ آسکا۔ اللہ ﷻ نے اسے محفوظ رکھا۔

آیت نمبر ۴۵: فرعونیوں نے بندۂ مومن کے خلاف خفیہ سازشیں کیں۔ لیکن اللہ ﷻ نے اسے فرعونیوں کے شر سے محفوظ رکھا اور بُرے عذاب کے ذریعہ فرعونیوں کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔

علمی بات: چنانچہ اس مردِ مومن کو اللہ ﷻ نے قومِ فرعون کی بری تدبیروں کے شر سے بچا لیا مگر خود قومِ فرعون سخت عذاب میں پکڑی گئی۔ اللہ ﷻ نے مومن آل فرعون کو دنیا میں اوّل تو آل فرعون کو ان کے خلاف تدبیروں سے بچایا جس کی تفصیل قرآنِ حکیم میں مذکور نہیں۔ مگر قرآنی الفاظ سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو قتل کرنے اور تکلیف پہنچانے کے لئے قومِ فرعون نے بہت سی تدبیریں کی تھیں اور جب پھر قومِ فرعون غرق ہوئی تو اس بندۂ مومن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نجات دی گئی اور آخرت کی نجات تو ظاہر ہی ہے۔

علمی و عملی بات: فرعون اس مردِ مومن کی واشگاف الفاظ میں نصیحت پر جتنا بھی غضب ناک ہوا ہو لیکن اللہ ﷻ کی حفاظت کی وجہ سے علی الاعلان اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکا، بلکہ اس نے اور اس کے درباریوں نے اس مردِ مومن کے خلاف کارروائی کے لئے کئی خفیہ منصوبے طے کیئے، مگر اللہ ﷻ نے اسے ان کے بُرے نتائج سے بھی بچا لیا۔ اللہ ﷻ نے یہاں یہ نہیں بتایا کہ کس طرح بچایا۔ بعض مفسرین کرام نے بیان کیا کہ وہ ان سے بچ کر پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔ بعض نے کہا کہ اس واقعہ کے بعد جلد ہی موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر نکلے تو وہ بھی ان کے ساتھ سمندر پار ہو گیا۔ ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی یقینی ذریعہ نہیں کہ اللہ ﷻ نے اسے کس طرح بچایا۔ شاید اللہ ﷻ کے یہ بات نہ بتانے میں یہ حکمت ہو کہ تم اپنا معاملہ اللہ ﷻ کے سپرد کر دو، پھر یہ اس کا کام ہے کہ وہ تمہیں کس طرح بچاتا ہے۔ اس کے بچانے کے طریقے تمہاری سوچ سے بہت بلند ہیں۔ چنانچہ وہ مردِ مومن تو آل فرعون کی سازشوں کے برے نتائج سے بچ کر دنیا اور آخرت میں کامیاب ہو گیا، مگر آلِ فرعون کو دنیا اور آخرت کے دوہرے عذاب نے گھیر لیا۔ دنیا میں وہ سمندر میں غرق ہوئے اور آخرت میں بھی انہیں شدید عذاب سے دوچار ہونا ہے۔

آیت نمبر ۴۶: دنیا میں آلِ فرعون کی ہلاکت کے بعد صبح و شام اُنہیں دوزخ کی آگ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اس آیت میں عذابِ برزخ کی طرف اشارہ ہے۔ اس عذاب کے بعد قیامت کے دن اُنہیں سخت ترین عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔ آلِ فرعون سے مراد فرعون، اس کی قوم اور اس کے تمام پیروکار ہیں۔

فرمان نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ "جب تم میں سے کوئی مر جاتا ہے تو عالم برزخ میں صبح و شام اس کو وہ مقام دکھلایا جاتا ہے جہاں قیامت کے حساب کے بعد اس کو پہنچنا ہے اور یہ مقام دکھلا کر روزانہ اس سے کہا جاتا ہے کہ تجھے آخر کار یہاں پہنچنا ہے۔ اگر یہ شخص اہل جنت میں سے ہے تو اس کا مقام جنت اس کو دکھلایا جائے گا اور اہل جہنم میں سے ہے تو اس کا مقام جہنم اس کو دکھلایا جائے گا"۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

علمی بات: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آل فرعون کی روحیں سیاہ پرندوں کے جوف کے اندر داخل ہو کر روزانہ دو مرتبہ صبح و شام دوزخ پر پیش ہوتی ہیں اور ان سے کہا جاتا ہے کہ اے آل فرعون قیامت برپا ہونے تک تمہارا یہی ٹھکانا ہے۔ (عبد الرزاق وابن ابی حاتم)

عذابِ قبر کا ثبوت: یہ آیت واضح کرتی ہے کہ آگ ان پر یعنی فرعون اور اس کے آل و خاندان پر صبح و شام پیش کی جاتی ہے اور یہ "عرض نار" یعنی آگ پر پیش کیا جانا قیامت کے دن ہونا مراد نہیں لیا جاسکتا کیوں کہ آگے اس بات کی صراحت ہے اور نہ ہی اس سے دنیا میں عرض نار مراد لیا جاسکتا ہے کیونکہ دنیا میں ان کے ساتھ ایسا ہونا ثابت نہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ عرض نار موت کے بعد اور قیامت سے قبل ہو گا اور یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ فرعون اور آل فرعون کے حق میں عذابِ قبر ثابت ہے اور جب ان کے حق میں عذابِ قبر کا برحق ہونا ثابت ہو گیا تو دوسرے کافروں اور نافرمانوں کے حق میں بھی ثابت ہو گیا۔ کیونکہ ان میں اور دوسرے کفار و مشرکین میں فرق کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔

علمی بات: کفار اور گناہ گار مسلمانوں کے حق میں عذابِ قبر برحق اور کتاب اللہ و سنت متواترہ سے ثابت ہے۔ یہ آیت وہ ہے جس سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں اثبات عذابِ قبر پر استدلال فرمایا ہے۔

آیت نمبر ۴۷: جہنم میں داخل ہونے والے بعض نافرمانوں کا ذکر ہے۔ جو لوگ دنیا میں پیروکار تھے وہ اپنے سرداروں سے کہیں گے کہ دنیا میں وہ ان کی اطاعت کرتے رہے۔ تو کیا وہ ان کے عذاب میں کمی کرا سکتے ہیں؟ بڑا بننے والوں سے مراد ہر وہ شخص ہے جس کا اپنا حلقۂ اثر ہو اور اس حلقہ میں اس کی بات تسلیم کی جاتی ہو۔

علمی بات: دوزخی لوگ آپس میں جھگڑے بازی کریں گے جو لوگ چھوٹے تھے دنیا میں خوب بڑھ چڑھ کر اپنے بڑوں کی بات مانتے تھے اور ان کے کہنے سے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے اور ان کے متبعین سے بحثیں کرتے تھے اور ان کی تکذیب کرتے تھے اور دوسروں کو بھی ایمان قبول کرنے سے روکتے تھے، جب قیامت کے دن حاضر ہوں گے تو بڑے چھوٹے سب آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے اور دوزخ میں داخل ہو جائیں گے تو یہی اتباع یعنی چھوٹے لوگ جو دنیا میں سرداروں اور لیڈروں کے کہنے سے حق اور اہل حق سے دشمنی کرتے تھے اپنے بڑوں سے کہیں گے کہ دنیا میں ہم نے تمہاری بات مانی اب تم یہاں ہمیں کچھ فائدہ پہنچا دو بالکل تو دوزخ سے کیا نکلوا سکتے آگ کا تھوڑا سا عذاب ہی ہٹوا دو۔

آیت نمبر ۴۸: بڑے حضرات مایوسی سے جواب دیں گے کہ وہ اپنے آپ کو عذاب سے نہیں بچا سکے تو ان کی کیا مدد کریں گے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ بندوں کے درمیان حق و انصاف کے ساتھ فیصلہ فرما چکا ہے۔ ان کے حق میں جہنم کے عذاب کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ ان کے بڑے جواب میں کہیں گے کہ بلاشبہ ہمیں اور تم کو اسی میں رہنا ہے اس میں شک نہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بندوں کے درمیان فیصلہ فرما دیا ہے یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تم بھی یہیں رہو گے اور ہم بھی یہیں رہیں گے۔ سورۂ ابراہیم میں بھی یہ مضمون مذکور ہے کہ چھوٹے وہاں اپنے بڑوں سے یہ بات کہیں گے اور وہ اس کا یہ جواب دیں گے "وہ کہیں گے اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمیں ہدایت دیتا تو ہم ضرور تمہاری رہنمائی کرتے، ہمارے لئے برابر ہے خواہ ہم چیخ پکار کریں یا صبر کریں ہمارے لئے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔"

(سورۂ ابراہیم ۱۴، آیت: ۲۱)

علمی بات: گمراہ سردار اور رہنما اپنی پیروی کرنے والوں کو جواب میں کہیں گے کہ اب تو ہم سب ہی دوزخ میں پڑے ہوئے ہیں ایسے میں ہم تمہارا عذاب کیسے دور کر سکتے ہیں۔ اگر ہمیں عذاب دور کرنے کی قدرت ہوتی تو پہلے ہم اپنے اوپر سے عذاب دور کرتے۔ اب تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اہل جنت کے لئے جنت کا اور اہل دوزخ کے لئے دوزخ کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اس کے فیصلے کو کوئی نہیں بدل سکتا۔

آیت نمبر ۴۹: تمام اہل جہنم، جہنم پر مامور فرشتوں کی طرف رجوع کریں گے۔ وہ ان سے درخواست کریں گے کہ کسی ایک دن تو ان کے عذاب میں کچھ کمی کرنے کی وہ اللہ ﷻ سے سفارش کر دیں۔

علمی بات: اہل دوزخ شدید عذاب سے بے قرار ہو کر جہنم کے کارندوں اور داروغوں سے کہیں گے کہ تم اپنے رب سے اتنی سی درخواست کرو کہ وہ ایک دن ہی ہمارے عذاب میں تخفیف کر دے۔

آیت نمبر ۵۰: فرشتے ان سے پوچھیں گے کہ کیا ان کے پاس اللہ ﷻ کے رسول واضح تعلیمات کے ساتھ نہیں آئے تھے؟ اور انہیں ہر طرح کے انجام سے مطلع نہیں کیا تھا؟ اہل جہنم رسولوں کو جھٹلانے کا اقرار کر لیں گے۔ فرشتے کہیں گے کہ پھر وہ خود دعا کر کے دیکھ لیں لیکن کافروں کی پکار بے اثر، بے نتیجہ اور بے کار ثابت ہو گی۔

علمی بات: جہنم کے کارندے ان کے جواب میں کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس اللہ ﷻ کے پیغمبر علیہ السلام دلائل و معجزات اور واضح احکام لے کر نہیں آئے تھے؟ اہل دوزخ کہیں گے کہ بے شک وہ سب کچھ لے کر آئے تھے۔ ہم ہی بد نصیب تھے کہ ان کی بات نہ مانی اور ان کی تکذیب و تمسخر کرتے رہے۔ اہل دوزخ کا جواب سن کر دوزخ کے فرشتے استہزا کے طور پر کہیں گے تو پھر تم خود ہی اپنے رب کو پکارو، ہم نہ تمہاری بات سنیں گے اور نہ چاہیں گے کہ تمہیں جہنم سے نجات مل جائے۔ ہم تمہیں یہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں کہ تم پکارو یا نہ پکارو، نتیجہ ایک ہی ہے کہ تم سے عذاب ہلکا نہیں کیا جائے گا، تم اسی طرح جہنم میں جلتے رہو گے۔ اب کوئی سفارش یا خوش آمد کام نہیں دے سکتی، نہ ہم ایسے معاملات میں سفارش کر سکتے ہیں اور نہ تمہاری چیخ و پکار سے کوئی فائدہ ہے۔ کافروں کی دعا نامقبول اور مردود ہے۔

علمی بات: جہنم پر جو فرشتے متعین ہیں ان کی بات چیت اور ملامت کا ذکر قرآنِ مجید میں ایک اور جگہ بھی آیا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: "اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ جہنم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آئیں گے تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے داروغہ ان سے کہیں گے کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے رسول نہیں آئے تھے جو تمہیں تمہارے رب کی آیات پڑھ کر سناتے تھے اور تمہیں اس دن کی ملاقات سے ڈراتے تھے وہ کہیں گے کیوں نہیں! لیکن کافروں پر عذاب کا حکم ثابت ہو گیا۔" (سورۂ زمر ۳۹، آیت: ۷۱)

آیت نمبر ۵۱: رسولوں اور سچے مومن بندوں کے لئے بشارت ہے۔ حق و باطل کی کشمکش میں اللہ ﷻ ان کی دنیا و آخرت میں ضرور مدد فرمائے گا۔ کھڑے ہونے والے دن سے مراد روزِ آخرت ہے جب انبیاء کرام علیہم السلام اور مومنین کے لئے اللہ ﷻ کی مدد کا خصوصی ظہور ہو گا۔

علمی بات: اس آیت میں دو باتیں بتائی گئی ہیں۔ اول یہ کہ اللہ ﷻ اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی دنیا والی زندگی میں مدد فرماتا ہے، مدد تو ہوتی ہے بعض مرتبہ دیر لگنے میں بڑی حکمتیں ہوتی ہیں ان ہی حکمتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کافروں کو مہلت دی جاتی ہے جو ان کے حق میں مزید ایک ڈھیل ہوتی ہے۔ اس ڈھیل کی وجہ سے اور زیادہ بڑھ چڑھ کر شرارت اور بغاوت کرتے ہیں پھر دنیا میں ان سے انتقام لے لیا جاتا ہے۔

دوسری بات یہ واضح فرمائی کہ قیامت کے دن ظالموں کو ان کی عذر خواہی نفع نہ دے گی وہ دنیا میں بھی مستحق لعنت ہیں اور آخرت میں بھی ملعون ہوں گے۔ اور جو انہیں رہنے کا گھر ملے گا وہ بُرا گھر ہو گا یعنی دوزخ میں جائیں گے جو آگ والا گھر ہے۔

علمی بات: "اشہاد" شہید کی جمع ہے جیسے شریف کی جمع اشراف ہے۔ شہید کے معنیٰ "گواہ" ہیں۔ قیامت والے دن فرشتے اور انبیاء علیہم السلام گواہی دیں گے یا فرشتے اس بات کی گواہی دیں گے کہ اے اللہ! پیغمبروں نے تیرا پیغام پہنچا دیا تھا لیکن ان کی امتوں نے ان کو جھٹلایا۔ علاوہ ازیں امتِ محمدیہ اور نبی کریم ﷺ بھی گواہی دیں گے۔ اس لئے قیامت کو گواہوں کے کھڑا ہونے کا دن کہا گیا ہے۔ اس دن اہل ایمان کی مدد کرنے کا مطلب ہے ان کو ان کے اچھے اعمال کی جزا دی جائے گی اور انہیں جنت میں داخل کیا جائے گا۔

علمی و عملی بات: دنیا میں ان کا بول بالا کرتا ہے۔ جس مقصد کے لئے وہ کھڑے ہوتے ہیں اللہ ﷻ کی مدد سے اس میں کامیابی ہوتی ہے۔ اہل حق کی قربانیاں کبھی ضائع نہیں جاتیں۔ درمیان میں کتنے ہی اُتار چڑھاؤ ہوں اور کیسے ہی امتحانات پیش آئیں مگر آخر کار مشن کامیاب ہو کر رہتا ہے۔ علمی حیثیت سے حجت و برہان میں تو وہ ہمیشہ ہی فتح مند رہتے ہیں۔ لیکن مادی فتح اور ظاہری عزت و رفعت بھی آخر کار ان ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ سچائی کے دشمن کبھی معزز نہیں رہ

سکتے۔ ان کا ظاہری شان و شوکت، جاہ جلال اور عروج محض ہنڈیا کے جھاگ اور سوڈے کے اُبال اور پانی کے بلبلے کی مانند ہوتا ہے۔ مومنین کے مقابلہ میں ان کو پست اور ذلیل ہونا پڑتا ہے اور اللہ ﷻ ان سے اپنے اولیاء کا انتقام لیئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ لیکن واضح رہے کہ آیت میں جن مومنین کے لیئے وعدہ کیا گیا ہے شرط یہ ہے کہ حقیقی مومن اور رسولوں کے پیروکار ہوں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ "اور تم ہی غالب رہوگے اگر تم (سچے) مومن ہو۔"
(سورۂ آل عمران ۳، آیت:۱۳۹)

آیت نمبر ۵۲: پیغامِ حق کا انکار کرنے والوں کی روزِ آخرت بڑی رسوائی ہوگی۔ کیونکہ اس دن ان ظالموں کی کوئی معذرت قبول نہ ہوگی اور نہ ہی وہ لعنت اور بُرے انجام سے بچ سکیں گے۔ بُرا گھر یعنی جہنم ان کا ٹھکانا ہے۔

علمی بات: روزِ قیامت مشرکین اپنے شرک پر عذر پیش کریں گے لیکن ان کے عذر سے اُنہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ وہ معذرت کی جگہ نہیں اسی لیئے یہ معذرت باطل ہوگی۔

آیت نمبر ۵۳: ماضی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون جیسے ظالم حکمران کے پاس بھیجا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کتاب یعنی تورات نازل فرمائی گئی پھر بنی اسرائیل کو اس کا وارث بنایا گیا تاکہ وہ حق کے عَلم بردار بنیں۔

علمی بات: اس ہدایت سے یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ اللہ ﷻ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دنیا میں بہت زیادہ علوم نافعہ عطا فرمائے اور اس سے یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ اللہ ﷻ نے آپ علیہ السلام کو نبوت عطا فرمائی اور اس سے یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ اللہ ﷻ نے آپ علیہ السلام کو نبوت پر بہت دلائل اور معجزات عطا فرمائے اور اس سے یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ اللہ ﷻ نے آپ علیہ السلام کو کتابِ ہدایت عطا فرمائی، جو تورات ہے۔

علمی بات: اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ﷻ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے مقابلہ پر بھیج کر بس یونہی ان کے حال پر نہیں چھوڑ دیا تھا، بلکہ قدم قدم پر اللہ ﷻ ان کی رہنمائی فرماتا رہا یہاں تک کی اُنہیں کامیابی کی منزل تک پہنچا دیا۔ اس ارشاد میں ایک لطیف اشارہ اس مضمون کی طرف ہے کہ اے نبی ﷺ! ایسا ہی معاملہ ہم آپ ﷺ کے ساتھ بھی فرمائیں گے۔ آپ کو بھی مکہ کے شہر اور قریش کے قبیلہ میں نبوت کے لئے مبعوث فرمانے کے بعد ہم نے آپ کے حال پر نہیں چھوڑ دیا ہے کہ یہ ظالم آپ کے ساتھ جو سلوک چاہیں کریں، آپ تسلی رکھیں، ہم آپ ﷺ کی پشت پناہی اور رہنمائی فرمارہے ہیں۔

آیت نمبر ۵۴: تورات میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے ہدایت اور نصیحت تھی۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمائی اور ان کے بعد بنی اسرائیل کو تورات کا وارث بنایا مگر تورات سے ہدایت اور نصیحت ان ہی لوگوں نے حاصل کی جو عقل رکھتے تھے۔ اسی طرح اللہ ﷻ نے قرآن مجید کو تمام لوگوں کے لئے سراپا ہدایت بنا کر نازل فرمایا ہے مگر اس سے بھی ہدایت اور نصیحت وہی لوگ حاصل کریں گے جو عقل و فہم اور شعور رکھتے ہوں گے۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ نے اپنے حبیب مکرم ﷺ کو یہ تسلی دی ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انکار کرنے والے اس نعمت و برکت سے محروم رہ گئے اور ان پر ایمان لانے والے بنی اسرائیل ہی کتاب کے وارث بنائے گئے، اسی طرح اب جو لوگ آپ ﷺ کا انکار کریں گے وہ محروم ہوجائیں گے اور آپ ﷺ پر ایمان لانے والوں ہی کو یہ سعادت نصیب ہوگی کہ قرآنِ حکیم کے وارث ہوں اور دنیا میں ہدایت کے علم بردار بن کر اٹھیں۔

علمی بات: اس سے تورات کی وراثت بھی مراد ہوسکتی ہے کہ جب اللہ ﷻ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی تو بنی اسرائیل نے تورات میں مذکور احکام شرعیہ اور دیگر سورتوں اور آیتوں کا علم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حاصل کیا، پھر نسل در نسل یہ علم ان میں منتقل ہوتا رہا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے صرف تورات کی وراثت مراد نہ ہو بلکہ وہ تمام کتابیں مراد ہوں جو انبیاءِ بنی اسرائیل علیہم السلام پر نازل ہوئی ہیں یعنی تورات، زبور اور انجیل۔

آیت نمبر ۵۵: انبیاء کرام علیہم السلام خطاؤں سے پاک ہوتے ہیں۔ ان کا استغفار کرنا درجات کی بلندی اور اُمّت کی تعلیم کے لئے ہوتا ہے۔ مخالفین حق کے مقابلہ میں صبر اور اللہ ﷻ سے استغفار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ نیز صبح و شام اللہ ﷻ کی تسبیح اور حمد و ثناء کرنے کی بھی تلقین کی گئی ہے۔

علمی و عملی بات: حضور اقدس ﷺ کو اللہ ﷻ نے خطاؤں سے پاک بنایا ہے، اس کے باوجود آپ ﷺ کثرت سے استغفار فرمایا کرتے تھے اور قرآنِ کریم میں بھی آپ ﷺ کو اس کی تاکید فرمائی گئی ہے تاکہ آپ ﷺ کی اُمت یہ سبق لے کہ جب آنحضرت ﷺ معصوم ہونے کے باوجود اتنی کثرت سے

اپنے ایسے کاموں کی معافی مانگتے ہیں جو در حقیقت گناہ نہیں ہیں، لیکن آپ ﷺ ان کو اپنے مقام بلند کی وجہ سے قصور سمجھتے ہیں تو جو لوگ معصوم نہیں ہیں، ان کو تو اور زیادہ استغفار کرنا چاہیے۔

آپ ﷺ کا استغفار کرنا اظہارِ عبودیت کے لئے ہوتا تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف احتیاج کو ظاہر کرنے کے لئے ہوتا تھا اور اس کی نعمتوں کا کماحقہ، شکر ادا کرنے کی وجہ سے ہوتا تھا، ہر چند کہ انبیاء کرام علیہم السلام عذاب سے مامون ہیں، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے جلال سے ڈرتے رہتے ہیں اور اس پر استغفار کرتے ہیں۔

علمی بات: افضل اور اُولیٰ کا ترک عام لوگوں کے لئے جرم اور گناہ تصور نہیں ہوتا، لیکن بارگاہِ الٰہی کے مقربین سے غیر اولیٰ کا صدور بھی قابل مواخذہ ہوتا ہے۔ یہاں بھی جس ذنب سے استغفار کی ہدایت کی جارہی ہے اس سے مراد ایسے امر سے استغفار ہے جو بذات خود اگرچہ مباح اور جائز ہے لیکن حضور ﷺ کے مقام رفیع اور شان عالی کے شایانِ شان نہیں، اور راہِ طریقت و محبت پر چلنے والوں سے یہ چیز مخفی نہیں کہ منزل محبوب کی طرف ان کے سفر میں ایک لمحہ کے لئے توقف بھی ناقابل برداشت ہے اور لائق صد استغفار ہے۔

علمی بات: یہ محض تعمیل ارشاد الٰہی ہے تا کہ حضور ﷺ دعا مانگا کریں اور اس میں حکمت یہ ہے کہ استغفار سے حضور ﷺ کے درجات بلند سے بلند تر ہوتے جائیں گے اور امت کے لئے دعا و استغفار ان کے پیارے رسول خاتم النبیین سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سنت بن جائے گی۔

علمی بات: حمد و تسبیح ہی وہ ذریعہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے لئے کام کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کا مقابلہ کرنے کی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ صبح و شام حمد و تسبیح کرنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا۔ دوسرے یہ کہ ان مخصوص اوقات میں نماز ادا کرنا۔ دوسرے معنیٰ لینے کی صورت میں اشارہ نماز کے ان پانچوں اوقات کی طرف ہے جو اس سورت کے نزول کے کچھ مدت بعد تمام اہل ایمان پر فرض کر دیئے گئے۔ اس لئے کہ اَلْعَشِیِّ کا لفظ عربی زبان میں زوال آفتاب سے لے کر رات کے ابتدائی حصہ تک کے لئے بولا جاتا ہے جس میں ظہر سے عشاء تک کی چاروں نمازیں آجاتی ہیں اور اَلْاِبْکَار صبح کی پو پھٹنے سے طلوع آفتاب تک کے وقت کو کہتے ہیں جو نماز فجر کا وقت ہے۔

آیت نمبر ۵۶: حق کے دشمنوں کے لئے وعید ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات پر ان کے اعتراضات بالکل بے بنیاد ہیں۔ حقیقت میں یہ ان کا تکبر ہے جو اُنہیں حق تسلیم کرنے سے روک رہا ہے۔ ان کا مقصد دعوت اور جدوجہد حق کو کمزور کرنا ہے جو ان کو کبھی حاصل نہیں ہوگا۔ منکرین کے شر سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ منکرین حق کی باتوں کو سن رہا ہے اور ان کی سازشوں کو بھی دیکھ رہا ہے۔

علمی بات: کفار مکہ مراد ہیں کیونکہ وہی روز روز بغیر سند اور بغیر دلیل کے جھگڑا کرتے ہیں اور آیاتِ الٰہی میں شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ ہیں تو بہت چھوٹے مگر اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتے ہیں، ان لوگوں کے دلوں میں صرف غرور اور بڑا بننے کی خواہش ہے حالانکہ یہ خواہش ان کی پوری ہونے والی نہیں۔ وہ جھگڑا اس لئے پیدا کرتے ہیں کہ کسی طرح پیغمبر کی بات کو نیچا کردیں (معاذ اللہ) اور خود سر بلند ہو جائیں یہ ہونا نہیں یعنی اس خواہش کے پورا ہونے تک پہنچنے والی نہیں۔ لہٰذا آپ ﷺ ان کی شرارتوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگا کیجیے کیونکہ وہی سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

علمی بات: اس آیت میں تین اہم نکات بیان ہوئے ہیں۔ پہلا یہ کہ ان لوگوں کی بے دلیل مخالفت اور ان کی غیر معقول کج بحثی کی اصل وجہ یہ نہیں تھی کہ اللہ تعالیٰ کی آیات میں جو سچائیاں اور خیر و صلاح کی باتیں ان کے سامنے پیش کی جارہی تھیں وہ ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں اس لئے یہ نیک نیتی کے ساتھ ان کو سمجھنے کی خاطر بحثیں کرتے تھے، بلکہ ان کے اس رویہ کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان کا غرور نفس یہ برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ ان کے ہوتے ہوئے عرب میں خاتم النبیین سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی پیشوائی و رہنمائی تسلیم کرلی جائے اور بالآخر ایک روز انہیں خود بھی ان کی قیادت ماننی پڑے جن کے مقابلہ میں یہ اپنے آپ کو سرداری کا زیادہ حقدار سمجھتے تھے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے بڑا بنایا ہے، جسے عظمت اور رفیع شان عطا فرمائی ہے وہی بڑا اور عظیم بن کر رہے گا اور یہ چھوٹے لوگ کفار و مشرکین اپنی بڑائی قائم رکھنے کی جو سر توڑ کوششیں کر رہے ہیں وہ سب آخر کار ناکام ہو جائیں گی۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ جس طرح فرعون کی دھمکیوں کے مقابلہ میں اللہ واحد قہار کی پناہ مانگ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام بے فکر ہو گئے تھے، اسی طرح سردارانِ قریش کی دھمکیوں اور سازشوں کے مقابلہ میں آپ ﷺ بھی اسی کی پناہ حاصل کریں اور پھر ان مشرکوں کی تمام سازشوں سے بے فکر ہو کر رب ذوالجلال

کا کلمہ بلند کرنے میں لگ جائیں۔ کامیابی اور سربلندی آپ ﷺ کو ہی ملے گی۔

آیت نمبر ۵۷: جس ذات نے اتنی عظیم الشان کائنات بنائی ہے اس کے لئے انسان کو دوبارہ پیدا کرنا ہرگز مشکل نہیں ہے۔ اللہ ﷻ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے لیکن لوگوں کی اکثریت اس بات کو نہیں سمجھتی۔

علمی بات: اس آیت کے شانِ نزول میں مفسرین کرام کی رائے مختلف ہیں۔ بعض مفسرین کرام یہ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے مشرکین مکہ کا ذکر چلا آتا ہے ان ہی مشرکین مکہ کے متعلق یہ آیت بھی ہے اور معنیٰ اس آیت کے یہ ہیں کہ یہ مشرک لوگ حشر کا کیوں انکار کرتے ہیں آسمان و زمین کی پیدائش کو دیکھ کر یہ لوگ اللہ ﷻ کی قدرت کو نہیں پہچانتے کہ جس طرح اللہ ﷻ نے ان لوگوں کی عقل اور سمجھ سے باہر آسمان اور زمین کو پیدا کر دیا اسی طرح مرنے کے بعد انسان کو اللہ ﷻ پھر پیدا کر دے گا۔ جس اللہ ﷻ نے سب مخلوقات کو پیدا کیا اس کے نزدیک بہ نسبت آسمان و زمین کے انسان کا پیدا کرنا ایک ادنیٰ چیز ہے۔

علمی بات: اگرچہ اس کائنات میں انسان اور حیات کی تخلیق اللہ ﷻ کی ایک عظیم نشانی اور معجزہ ہے تاہم ایک کائنات کی تخلیق انسان کی تخلیق سے کہیں زیادہ بڑا کام ہے۔ جیسا کہ سورۃ النازعات ۷۹، آیت: ۲۷ میں فرمایا: ”کیا تمہارا پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا آسمان کا؟ (اللہ نے) اُسے بنایا۔“

اس آیت کا مفہوم بھی یہی ہے کہ آسمانوں کا بنانا زیادہ مشکل اور بہت بڑا کام ہے تو تمہارا یہ کہنا نہایت نادانی ہے۔ ان بوسیدہ ہڈیوں کو اللہ ﷻ دوبارہ کیسے پیدا کرے گا؟ کیا تم نے کبھی غور کیا ہے کہ انسان کے دوبارہ بنانے سے کائنات کا بنانا زیادہ سنگین کام تھا جسے اللہ ﷻ نے خلق فرمایا ہے تو انسان کو دوبارہ خلق کرنے میں اللہ ﷻ کو کون سی دشواری پیش آئے گی۔

آیت نمبر ۵۸: جس طرح اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں، اسی طرح ایمان لا کر نیک اعمال انجام دینے والا اور اللہ ﷻ کا باغی برابر نہیں۔ لیکن لوگ ان حقائق سے بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

علمی بات: جس طرح اندھا اور بینا برابر نہیں ہوسکتے اسی طرح مومن و کافر اور نیک اور بد بھی برابر نہیں ہوسکتے۔ یعنی ایک انسان حق و انصاف کے ساتھ پاک بازی کی زندگی گزارتا ہے اور کسی کا حق غصب نہیں کرتا اور دوسرا انسان ظلم و زیادتی کے ساتھ بدکاری کی زندگی بسر کرتا ہے اور لوگوں کے حقوق غصب کرتا ہے، یہ دونوں انسان برابر نہیں ہوسکتے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر نیک آدمی تنگدستی کا شکار رہتا ہے جبکہ بدکار آدمی عیاشی کی زندگی گزارتا ہے، لٰہذا عدل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ قیامت کا دن ضرور آنا چاہیئے جس میں نیک آدمی کو اس کی نیکیوں کا اجر عظیم ملے اور بدکار کو اس کی بُرائیوں کی سزا ملے مگر اس کے باوجود بہت کم لوگ اس حقیقت میں غور و فکر کرکے آخرت پر ایمان لاتے ہیں جبکہ اکثر لوگ قدرت کی نشانیوں میں غور و فکر نہیں کرتے اور قیامت پر ایمان لانے سے محروم رہتے ہیں۔ بہرحال کوئی مانے یا نہ مانے، قیامت ضرور آئے گی۔ یہ اللہ ﷻ کا حتمی فیصلہ ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔

علمی بات: جو لوگ آثارِ قدرت میں غور نہیں کرتے اور اندھے بنے ہوئے ہیں بھلا وہ ان لوگوں کے برابر کیسے ہو جائیں گے جو اللہ ﷻ کی قدرت کے آثار پر غائرانہ نظر ڈالا کرتے ہیں۔ جو لوگ ایمان لائے ہوئے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں وہ گناہ گاروں کے برابر کیسے ہوسکتے ہیں۔ کم لوگ ایسی باتوں سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر نیکی اور بدی کا انجام یکساں ہے تو پھر برا آدمی بڑا عقل مند ہے کہ مرنے سے پہلے اپنے دل کے سارے ارمان نکال گیا اور نیک آدمی سخت بے وقوف ہے کہ خواہ مخواہ اپنے اوپر طرح طرح کی اخلاقی پابندیاں عائد کیئے رہا۔

آیت نمبر ۵۹: نیکی اور بدی کے فرق کو ظاہر کرنے کے لئے قیامت ضرور برپا ہوگی۔ جس کے آنے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کے باوجود لوگوں کی اکثریت قیامت پر ایمان لانے سے انکار کرتی ہے۔

علمی بات: صالح اور بدعمل، ظالم اور مظلوم کے برابر نہ ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ قیامت کا آنا نا قابلِ تردید حقیقت ہے۔ یہی وجہ ہے قرآنِ مجید میں تصورِ آخرت کی سب سے زیادہ تاکید کے ساتھ وضاحت کی گئی ہے۔

علمی بات: اس آیت کریمہ میں وقوعِ آخرت کو یقینی اور حتمی انداز میں بیان فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ عقلی اور واقعاتی استدلال سے کسی چیز کا امکان اور اس کی ضرورت کو تو واضح کیا جاسکتا ہے لیکن حتمی انداز میں اس کے وقوع کا حکم نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے لئے ایک ایسے علم کی ضرورت ہے جس کا سرچشمہ یقین کی قوت سے بہرہ ور ہو۔ اور وہ ظاہر ہے کہ وحی الٰہی ہے۔ آخرت ہوگی یا نہیں ہوگی اس پر دلائل تو دیئے جاسکتے ہیں لیکن حتمی انداز میں کوئی بات کہنا ممکن نہیں،

کیونکہ انسان کا حاصل شدہ علم جسے "اکتسابی علم" کہا جاتا ہے اس کا تعلق حواسِ خمسہ، تجربات اور عقل و فہم سے ہے۔ جو چیز ان سے ماورا ہے انسان اس کے بارے میں صرف اندازہ لگا سکتا ہے اور ظن و گمان سے کوئی بات کہہ سکتا ہے، لیکن حتمی انداز میں نہیں کہہ سکتا۔ حتمی انداز میں بات کہنا صرف اللہ ﷻ کے رسول ﷺ اور اللہ ﷻ کی کتاب کا کام ہے۔ کیونکہ کتاب وحی الٰہی کے ذریعہ اللہ ﷻ کے رسول ﷺ کے دل پر اس سرچشمۂ علم سے اُتری ہے جس کا تعلق ذات باری تعالیٰ سے ہے۔ اس لئے اسی کو یہ حق ہے کہ وہ یقینی اور حتمی انداز میں کوئی بات کہے۔ چنانچہ جب وحی الٰہی سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ قیامت یقیناً آ کے رہے گی تو اب اس کے آنے میں کسی شک و شبہ کا احتمال بے عقلی بھی ہے اور کفر بھی۔

آیت نمبر ٦٠: اس آیت میں ایسی رہنمائی دی جارہی ہے جسے اختیار کر کے انسان آخرت کی سعادتوں سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ اللہ ﷻ ہی سے دعا کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور دعا کو عبادت قرار دیا گیا ہے۔ اللہ ﷻ بندوں کی دعاؤں کو اپنی حکمت اور مصلحت کے لحاظ سے قبول فرماتا ہے۔ عبادت کا حاصل ہے "تَذَلُّل" یعنی انتہائی درجہ کی عاجزی جو دُعا میں سب سے زیادہ ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ ﷻ سے دُعا نہ کرنا تکبر ہے۔ جو سرکش تکبر کی وجہ سے اللہ ﷻ کو نہیں پکارتے اُنہیں عنقریب ذلیل کر کے جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ نے دُعائیں مانگنے کا حکم دیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ وہ اُن کی دُعائیں ضرور قبول فرمائے گا۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ جب اس نے قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے تو پھر ہماری دُعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں۔ یہ اعتراض عدم تدبر کا نتیجہ ہے۔ انسان کے دل میں خواہشوں کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ ہے جو کسی حالت میں ختم نہیں ہوتا۔ ایک خواہش پوری ہوتی ہے تو فوراً دوسری اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ وہ ہر دُعا میں اپنے مقصد کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اسے اس سے غرض نہیں ہوتی کہ میری اس دُعا کے بعد دوسروں کو نفع پہنچے گا یا نقصان۔ ایک بڑھیا آندھی یعنی تیز ہَوا کے رک جانے کی دُعائیں اس لئے مانگ رہی ہے کہ اس کا جھونپڑا اُڑ جائے گا۔ اس کو اس سے غرض نہیں کہ آندھی کے آنے سے کیا کیا فائدہ ہوتے ہیں۔ کائنات کا نظام برقرار رکھنے کے لئے ایسی بہت سی چیزوں کو عمل میں لانا قدرت کے پروگرام میں داخل ہوتا ہے۔ جنہیں دنیا کے اکثر لوگ ناپسند کرتے ہیں۔ پس اگر ہر ایک کی دُعا قبول کر لی جائے تو نظامِ کائنات اَبتر ہو جائے۔ ایک شخص دُعا کر رہا ہے کہ مینہ نہ برسے، دوسرا دُعا کر رہا ہے برسے، تیسرا کہہ رہا ہے کم برسے، چوتھا کہہ رہا خوب برسے۔ اسی طرح ایک شخص دُعا مانگ رہا ہے کہ مجھے دولت مند بنا دے۔ قدرت کے علم میں ہے کہ دولت پاتے ہی یہ عیاشی کرنے لگے گا۔ زناکاری پر آمادہ ہو جائے گا۔ اس صورت میں اس کی دُعا کیسے قبول ہو۔ ایک شخص دُعا کر رہا ہے کہ مجھ بیمار کو شفا دے لیکن اس کی موت کا وقت آ چکا ہے۔ اگر اس کی دُعا قبول کی جائے تو موت کا اٹل وقت ٹالنا پڑے گا۔ اگر ان سب کی دُعائیں بیک وقت قبول کر لی جائیں تو غور فرمایئے!! یہ نظام عالم کیسے برقرار رہے گا۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے دُعا قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے لیکن اس کی قبولیت کی چند شرائط ہیں۔ پہلی یہ کہ اُس پر ایمان لاؤ اور سچے دل سے لاؤ۔ صرف زبان سے کہہ دینے کا اعتبار نہیں۔ دوسری یہ کہ اس کا یقین رکھو کہ اُس کا کام مبنی بر حکمت و مصلحت ہوتا ہے۔ تیسری یہ کہ وہ تمہاری وہی دُعا قبول فرماتا ہے جو تمہارے لئے آئندہ مفید ہو۔ تم اپنے مستقبل کا حال نہیں جانتے مگر وہ خوب جانتا ہے۔ چوتھی یہ کہ تمہاری دُعائیں ایسی نہ ہوں جو کسی مومن کو نقصان پہنچانے والی ہوں۔ پانچویں یہ کہ جو دُعا مانگو وہ اُس سے لَو لگا کر مانگو۔ یہ نہیں کہ رسمی طور پر یہ کہے جاؤ کہ اے اللہ! یہ دے دے، وہ دے دے۔ چھٹے اُس نے اپنے بندوں کی دُعا قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے لہٰذا پہلے اپنے کو اُس کا سچا بندہ ہونا تو ثابت کرو۔

فکری و عملی بات: اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حاجت روائی اللہ ﷻ کی مصلحت پر موقوف ہے تو ہمیں دُعا کا حکم کیوں ہوا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اوّل تو دُعا سے بندگی کی شان کا اظہار مقصود ہے۔ جب بندہ اس سے کوئی چیز مانگتا ہے تو اللہ ﷻ اسے پسند فرماتا ہے۔ اگر مطلب پورا نہ بھی ہو تو کم از کم اللہ ﷻ سے رجوع کرنے کا ثواب تو اسے مل ہی جائے گا کیونکہ اس بندہ نے عاجزی کا اظہار تو کیا۔ اللہ ﷻ بے بس و مجبور تو نہیں۔ وہ جب چاہے حالات کو بدل سکتا ہے اور ازراہِ لطف و کرم جو مانگے دے سکتا ہے ہمیں کیا خبر کہ اس کی مصلحت کیا ہے؟ لہٰذا مانگنا ہمارا فرض ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ہماری دُعا کا مقصد کسی دوسری صورت سے پورا کرے۔ آج نہ کرے کل کر دے۔ ہماری دُعا اس کی بارگاہ میں محفوظ رہتی ہے۔ کسی مومن کو اپنی بارگاہ سے ناکام نہیں جانے دیتا۔ اس لئے مانگنا ہمارا فرض ہے اور ہماری عبدیت کا نشان ہے۔

علمی بات: چونکہ اس سورت کا مرکزی مضمون دُعا ہے۔ چنانچہ یہاں پھر فرمایا جارہا ہے کہ اگر تم میرے بندے ہو تو مجھ سے مانگو! انسان کا معاملہ یہ ہے کہ اس سے مانگا جائے تو اس پر گراں گزرتا ہے، جبکہ اللہ ﷻ سے اگر نہ مانگا جائے تو وہ ناراض ہوتا ہے۔ گویا عطائے خداوندی خود سائلوں کی تلاش میں رہتی ہے بقول علامہ محمد اقبالؒ: ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں! راہ دکھلائیں کسے؟ راہرو منزل ہی نہیں۔

نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: "کہ رات کے پچھلے پہر اللہ ﷻ (اپنی شان کے مطابق) آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے اور ایک ندا ہوتی ہے: هَلْ مِنْ سَائِلٍ فَأُعْطِيَهُ، هَلْ مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَأَغْفِرَ لَهُ، هَلْ مِنْ تَائِبٍ فَأَتُوبَ عَلَيْهِ، هَلْ مِنْ دَاعٍ فَأُجِيبَهُ "ہے کوئی مانگنے والا کہ میں اسے عطا کروں؟ ہے کوئی گناہوں کی معافی مانگنے والا کہ میں اسے معاف کروں؟ ہے کوئی توبہ کرنے والا کہ میں اس کی توبہ قبول کروں؟ ہے کوئی پکارنے والا کہ میں اس کی پکار قبول کروں؟" (صحیح مسلم) ارشاد باری تعالیٰ ہے: "بے شک وہ لوگ جو میری عبادت (دعا) سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔"

علمی بات: عبادت اور دُعا لازم وملزوم ہیں۔ چنانچہ اس آیت میں یہ نکتہ مزید واضح ہو گیا ہے۔ یہاں پر پہلے دُعا کا ذکر کیا گیا ہے (اُدْعُوْنِیْ) اور پھر اسی کے لئے عبادت کا لفظ لایا گیا ہے (عِبَادَتِیْ)۔ گویا اس آیت میں دُعا اور عبادت مترادف الفاظ کے طور پر آئے ہیں۔

علمی بات: اس آیت میں دو باتیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ ایک یہ کہ دعا اور عبادت کو یہاں مترادف الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دعا عبادت اور جان عبادت ہے۔ اللہ ﷻ سے دعا مانگنا عین تقاضائے بندگی ہے، اور اس سے منہ موڑنے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی تکبر میں مبتلا ہے اس لئے اپنے خالق ومالک کے آگے اعتراف عبودیت کرنے سے کتراتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشادات میں آیت کے ان دونوں مضامین کو کھول کر بیان فرمادیا ہے۔

دعا اور عبادت کے باہمی تعلق کے حوالہ سے فرامین نبوی ﷺ: ۱۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما نے اللہ ﷻ کے فرمان وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ کے متعلق نبی کریم ﷺ سے روایت کی کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اِنَّ الدُّعَاءَ هُوَ الْعِبَادَةُ، دعا ہی عبادت ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ۔" (مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ)

۲۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ، دعا مغز عبادت یا اصل عبادت ہے۔" (جامع ترمذی)

۳۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو اللہ سے نہیں مانگتا اللہ اس پر غضبناک ہوتا ہے۔" (جامع ترمذی)

علمی بات: اس مقام پر پہنچ کر وہ عقدہ بھی حل ہو جاتا ہے جو بہت سے ذہنوں میں اکثر الجھن ڈالتا رہتا ہے۔ لوگ دعا کے معاملہ پر اس طرح سوچتے ہیں کہ جب تقدیر کی برائی اور بھلائی اللہ ﷻ کے اختیار میں ہے اور وہ اپنی غالب حکمت و مصلحت کے لحاظ سے جو فیصلہ کر چکا ہے وہی کچھ لازماً رونما ہو کر رہنا ہے تو پھر ہمارے دعا مانگنے کا حاصل کیا ہے۔ یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے جو آدمی کے دل سے دعا کی ساری اہمیت نکال دیتی ہے اور اس باطل خیال میں مبتلا رہتے ہوئے اگر آدمی دعا مانگے بھی تو اس کی دعا میں کوئی روح باقی نہیں رہتی۔ قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت اس غلط فہمی کو دو طریقوں سے رفع کرتی ہے۔ اولاً، اللہ ﷻ بالفاظ صریح فرمارہا ہے کہ "مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا" اس سے صاف معلوم ہوا کہ قضا اور تقدیر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس نے ہماری طرح (معاذاللہ) خود اللہ ﷻ کے ہاتھ بھی باندھ دیئے ہوں اور دعا قبول کرنے کے اختیارات اس سے سلب ہو گئے ہوں۔ بندے تو بلاشبہ اللہ ﷻ کے فیصلوں کو ٹالنے یا بدل دینے کی طاقت نہیں رکھتے، مگر اللہ ﷻ خود یہ طاقت ضرور رکھتا ہے کہ کسی بندہ کی دعائیں اور التجائیں سن کر اپنا فیصلہ بدل دے۔ دوسری بات جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ دعا خواہ قبول ہو یا نہ ہو، بہر حال ایک فائدہ اور بہت بڑے فائدہ سے وہ کسی صورت میں بھی خالی نہیں ہوتی، اور وہ یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کر کے اور اس سے دعا مانگ کر اس کی آقائی وبالادستی کا اعتراف اور اپنی بندگی وعاجزی کا اقرار کرتا ہے۔ یہ اظہار عبودیت بجائے خود عبادت، بلکہ جان عبادت ہے جس کے اجر سے بندہ کسی حال میں بھی محروم نہ رہے گا قطع نظر اس سے کہ وہ خاص چیز اس کو عطا کی جائے یا نہ کی جائے جس کے لئے اس نے دعا کی تھی۔ نبی کریم ﷺ کے ارشادات میں ان دونوں مضامین کی بھی پوری وضاحت ہمیں مل جاتی ہے۔

پہلے مضمون پر حسب ذیل احادیث روشنی ڈالتی ہیں: ا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "قضا کو کوئی چیز نہیں ٹال سکتی مگر دعا۔" (جامع ترمذی)

۲۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "آدمی جب کبھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا مانگتا ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ اسے یا تو وہی چیز دیتا ہے جس کی اس نے دعا کی تھی یا اسی درجے کی کوئی بلا اس پر آنے سے روک دیتا ہے، بشر طیکہ وہ کسی گناہ کی یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے۔" (جامع ترمذی)

۳۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے روایت کی ہے "ایک مسلمان جب بھی کوئی دعا مانگتا ہے، بشر طیکہ وہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ ہو، تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اسے تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں قبول فرماتا ہے۔ یا تو اس کی وہ دعا اسی دنیا میں قبول کر لی جاتی ہے۔ یا اسے آخرت میں اجر دینے کے لئے محفوظ رکھ لیا جاتا ہے۔ یا اسی درجہ کی کسی آفت کو اس پر آنے سے روک دیا جاتا ہے۔" (مسند احمد)

۴۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں۔ "بندے کی دعا قبول کی جاتی ہے بشر طیکہ وہ کسی گناہ کی یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے اور جلد بازی سے کام نہ لے۔ عرض کیا گیا جلد بازی کیا ہے؟ یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے فرمایا: جلد بازی یہ ہے کہ آدمی کہے میں نے بہت دعا کی، مگر میں دیکھتا ہوں کہ میری دعا قبول نہیں ہوتی، اور یہ کہہ کر آدمی تھک جائے اور دعا مانگنا چھوڑ دے۔" (صحیح مسلم)

دوسرے مضمون کو حسب ذیل احادیث واضح کرتی ہیں: ا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نگاہ میں دعا سے بڑھ کر کوئی چیز باوقعت نہیں ہے۔" (جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

۲۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے اس کا فضل مانگو کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اسے پسند فرماتا ہے کہ اس سے مانگا جائے۔" (جامع ترمذی)

۳۔ حضرت ابن عمر اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "دعا بہر حال نافع ہے ان بلاؤں کے معاملہ میں بھی جو نازل ہو چکی ہیں اور ان کے معاملہ میں بھی جو نازل نہیں ہوئیں۔ پس اے بندگان خدا! تم ضرور دعا مانگا کرو۔" (جامع ترمذی۔ مسند احمد)

۴۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تم میں سے ہر شخص کو اپنی حاجت خدا سے مانگنی چاہیئے، حتیٰ کہ اگر اس کی جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا کرے۔" (جامع ترمذی)

یعنی جو معاملات بظاہر آدمی کو اپنے اختیار میں محسوس ہوتے ہیں ان میں بھی تدبیر کرنے سے پہلے اسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ اسے مدد مانگنی چاہیئے، اس لئے کہ کسی معاملہ میں بھی ہماری کوئی تدبیر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی توفیق و تائید کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی، اور تدبیر سے پہلے دعا کے معنی یہ ہیں کہ بندہ ہر وقت اپنی عاجزی اور خدا کی بالا دستی کا اعتراف کر رہا ہے۔

آیت نمبر ۶۱: محسن حقیقی یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بندوں پر احسانات کا ذکر ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسانوں کے آرام و سکون کے لئے رات بنائی۔ دن کو روشن بنایا تا کہ انسان ضروری سرگرمیاں انجام دے سکیں۔ بلا شبہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اپنے بندوں پر بے شمار عنایات ہیں لیکن لوگوں کی اکثریت اس کا شکر ادا نہیں کرتی۔

علمی بات: اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ سمجھایا ہے کہ اس نے انسانوں کو جو کچھ عطا فرمایا ہے یعنی زمین و آسمان، رات دن، سورج، چاند اور خود ان کا وجود وغیرہ وہ ان کا اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر کوئی حق یا قرض نہیں بلکہ محض اس کا فضل و کرم ہے اور فضل بھی بہت بڑا کہ اس نے اُنہیں ضرورت کی ہر چیز بخشی، فرمایا: جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا: "اور اس نے تمہیں ہر وہ چیز عطا فرمائی جو تم نے اس سے مانگی اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو اُنہیں شمار نہیں کر سکو گے۔"
(سورۂ ابراہیم ۱۴، آیت: ۳۴) پھر اُنہیں عقل و تمیز عطا فرما کر مہلت بخشی اور نافرمانیوں کے باوجود فوراً گرفت نہیں فرمائی۔ مومن و کافر سب کو نعمتوں سے نوازتا ہے۔ یہ سب اس اکیلے کی پیدا کردہ اور عطا کردہ نعمتیں ہیں۔

علمی بات: جب اس اکیلے نے رات دن کا یہ سلسلہ قائم کیا ہے اور یہ تمام نعمتیں عطا فرمائی ہیں، کسی اور کا ان میں ذرہ برابر دخل نہیں، تو حق تو یہ تھا کہ اس کا شکر ادا کرتے، صرف اسی کو اپنا رب مانتے، اسی سے دُعا کرتے اور اس کی آیات اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے، مگر ایسے لوگ بہت کم نکلے۔ اکثر لوگ ان نعمتوں کی قدر نہیں کرتے، بلکہ مالک کے ساتھ شریک بنا کر اس کی ناشکری اور غداری کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہر روز اُنہیں نیند اور بیداری کی

صورت میں موت کے بعد زندگی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ حق یہ تھا کہ اس روزانہ کے موت وحیات کے مشاہدہ کے بعد قیامت کے دن اللہ ﷻ کے تمام مخلوق کو زندہ کرنے کی قدرت پر ایمان رکھتے اور اس دن کے لئے تیاری کرتے، مگر اُنہوں نے اللہ ﷻ کی نعمتوں کا شکر نہیں کیا، بلکہ ناشکری کی اور قیامت کے انکار پر جمے رہے۔

آیت نمبر ۶۲: معبودِ برحق اللہ ﷻ ہی ہے جو ہر چیز کا خالق ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ مگر ہٹ دھرم لوگ تعصب میں آکر توحید چھوڑ کر نہ جانے کیوں کفر وشرک میں مبتلا ہیں۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ کی شان اور قدرتوں کا بیان ہے۔ اس کی وحدانیت اور کبریائی پر گلشن ہستی کی ہر کلی شہادت دے رہی ہے۔ وہی ہم سب کا پروردگار ہے۔ ہر چیز کو خلعتِ وجود سے اسی نے نوازا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ پس اس کی عبادت سے روگردانی کر کے اِدھر اُدھر باطل معبودوں کے آستانوں پر مارے مارے پھرنا انتہائی درجہ کی بدبختی، جہالت، گمراہی اور شرک ہے۔

اِفک کا جامع مفہوم یہ ہے کہ ایسی چیز سے منہ پھیر لینا جس سے وابستہ رہنا اس پر لازم تھا۔ ایسی سمت سے منہ پھیر لینا جس کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہوتا ہے۔

آیت نمبر ۶۳: ماضی کی قومیں بھی ہٹ دھرمی میں آکر اللہ ﷻ کی نشانیوں کا انکار کرتی رہیں۔

علمی بات: کفارِ قریش کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ جس طرح یہ لوگ دلائل وبراہین کی کثرت کے باوجود ایمان باللہ اور اس کی وحدانیت کے اقرار سے منہ موڑ کر گمراہ ہوگئے ہیں، اسی طرح ان سے پہلے لوگ بھی گمراہ ہوگئے تھے۔ اُنہوں نے کسی دلیل وبرہان کے بغیر محض جہالت ونفسانی خواہش سے غیر اللہ کی پوجا کی اور اللہ ﷻ کی بیان کردہ آیات وبراہین کا انکار کر دیا تھا۔

علمی بات: اس ارشادِ ربانی میں آپ ﷺ کے لئے خاص طور پر تسکین وتسلی کا سامان ہے کہ آپ ﷺ ان لوگوں کے رویہ پر نہ تعجب کریں اور نہ غم۔ اسی طرح آپ ﷺ کے توسط سے آپ ﷺ کی اُمّت کے ہر مبلغ اور داعیِ حق وصداقت کے لئے تسلی ہے کہ وہ منکرین کے انکار وتکذیب سے دل برداشتہ نہ ہوں۔ اس سے واضح فرما دیا گیا کہ اللہ ﷻ کی آیتوں کے انکار کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی اندھا بن کر رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم کی سیدھی سادی اور صاف وصریح بات کا انکار کرنے والی قومیں جانتے بوجھتے اندھی بن گئیں اور حق سے منہ موڑتی رہیں۔ چنانچہ گزشتہ اَدوار کے ان منکروں کو اس انکارِ حق کا انجام اللہ ﷻ کے عذاب اور غضب کی صورت میں ان کو بھگتنا پڑا۔ دورِ حاضر کے منکروں کو متنبہ رہنا چاہیئے کہ اگر وہ ان کی روش پر چلتے رہے تو اُنہیں بھی اسی انجام کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ اللہ ﷻ کا قانون سب کے لئے ایک اور بے لاگ ہے۔

آیت نمبر ۶۴: اللہ ﷻ کی عطا کردہ نعمتوں کی کچھ اقسام کا بیان ہے کہ اللہ ﷻ نے زمین کو انسان کے لئے رہنے کی جگہ بنایا تاکہ انسان آسانی سے رہائش، تجارتی اور دیگر سہولیات حاصل کر سکیں۔ آسمان کو انسان کے لئے مضبوط اور محفوظ چھت کی صورت عطا کی۔ انسان کو بہترین ساخت پر پیدا فرمایا اور اسے پاکیزہ رزق عطا فرمایا۔ بلاشبہ اللہ ﷻ تمام جہانوں کا رب ہے اور اس کی ذات بڑی بابرکت ہے۔

علمی بات: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ ﷻ نے انسانوں کو پیدا کرنے سے پہلے ان کے لئے اس قدر محفوظ اور پُرامن جائے قرار مہیا کی۔ اللہ ﷻ نے انسانوں کو پیدا فرما کر یوں ہی کھلی فضا میں نہیں چھوڑ دیا کہ عالم بالا کی آفات بارش کی طرح برس کر اُنہیں تہس نہس کر دیں، بلکہ زمین کے اوپر ایک نہایت مستحکم سماوی نظام (جو دیکھنے والی آنکھ کو گنبد کی طرح نظر آتا ہے) تعمیر کر دیا جس سے گزر کر کوئی تباہ کن چیز ان تک نہیں پہنچ سکتی، حتیٰ کہ آفاق کی مہلک شعاعیں تک نہیں پہنچ سکتیں، اور اسی وجہ سے وہ لوگ امن وچین کے ساتھ زمین پر جی رہے ہیں۔

علمی بات: اس آیت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اللہ ﷻ نے لوگوں کو اس طرح پیدا کیا اُنہیں بہترین جسم، نہایت موزوں اعضاء اور نہایت اعلیٰ درجہ کی جسمانی و ذہنی قوتوں کا ساتھ عطا کیا۔ یہ قدوقامت، یہ ہاتھ اور پاؤں، یہ آنکھ، ناک اور کان، یہ بولتی ہوئی زبان اور یہ بہترین صلاحیتوں کا مخزن دماغ وہ خود بنا کر نہیں لے آئے تھے، نہ ان کے ماں باپ یا پھر دیوی دیوتاؤں میں یہ قدرت تھی کہ اُنہیں بناتا۔ ان کا بنانے والا وہ حکیم ورحیم قادرِ مطلق تھا جس نے انسان کو وجود میں لانے کا جب فیصلہ کیا تو اسے دنیا میں کام کرنے کے لئے بے نظیر جسم دے کر پیدا کیا۔ پھر پیدا ہوتے ہی اس کی مہربانی سے اُنہوں نے اپنے لئے پاکیزہ رزق کا ایک وسیع خوان بچھا ہوا پایا۔ ان سب نعمتوں پر انسان کو سوچنا چاہیئے کہ آخر کس نے اس زمین پر اتنی وافر یہ نعمتیں مہیا کی ہیں، کس نے یہ انتظام کیا ہے کہ غذا

کے یہ بے حساب خزانے زمین سے پے در پے نکلتے چلے آئیں اور ان کی رسد کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے نہ پائے؟ یہ رزق کا انتظام نہ ہوتا اور بس لوگ پیدا کر دیئے جاتے تو سوچیں کہ ان کی زندگی کا کیا رنگ ہوتا۔ کیا یہ اس بات کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ ان کا پیدا کرنے والا محض خالق ہی نہیں بلکہ خالق حکیم اور رب رحیم ہے؟

آیت نمبر ۶۵: اللہ ﷻ از خود زندہ ہے اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ لہٰذا اسی کی مکمل اطاعت کرتے ہوئے اسی کو پکارا جائے۔ تمام شکر اور ہر طرح کی تعریف اسی اللہ ﷻ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔

علمی بات: گزشتہ آیات میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس سے خود بخود جو نتیجہ نکلتا ہے اس کو اس آیت میں ذکر فرما دیا گیا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ حقیقی زندہ اور زندگی عطا کرنے والا وہی اللہ ﷻ ہے۔ یعنی اپنے بل پر اور بغیر کسی کی عطا کے وہی زندہ ہے۔ اَزلی اور اَبدی حیات اس کے سوا کسی کو بھی میسر نہیں۔ اس کے مقابلہ میں جن کو مشرکین پوجتے ہیں۔ وہ زندگی سے محروم مُردے ہیں۔ وہ بت نہ سنتے اور نہ کسی کی مدد کر سکتے ہیں۔ نہ ان کے پکارنے سے کچھ فائدہ ہے اور نہ ان کے چھوڑ دینے سے کچھ نقصان۔ لہٰذا بندوں سے اس بات کا تقاضا ہے کہ وہ بجائے دیوی دیوتاؤں کو پوجنے اور پکارنے کی حماقت کرنے کے اللہ ﷻ ہی کے لئے دین کو خالص کرتے ہوئے صرف ایک اللہ ﷻ کی عبادت کریں۔

علمی بات: دین کو خالص کرنے کا ایک معنیٰ اطاعت ہے۔ یعنی اللہ ﷻ کو ماننے یا اس کو پکارنے کا معنیٰ صرف اس کا وظیفہ کرنا اور کبھی مصیبت میں اسے یاد کر لینا نہیں بلکہ اسی کی خالص اطاعت ہونی چاہیئے۔ کیونکہ زندگی کی کوئی نعمت ایسی نہیں جو اس کے سوا کسی اور نے عطا کی ہو اور خود زندگی جیسی نعمت کا وجود بھی اسی کا مرہونِ منت ہے۔ دوسرا معنیٰ دین کا یہ ہے کہ اپنی زندگی کے مجموعی طرزِ عمل کو اسی کے لئے خالص کر دو۔ عبادت، معاشرت، معیشت، تجارت، حکومت، سیاست غرض یہ کہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ ہو جس پر کسی اور کا حکم چلے یا اس میں کسی اور کی رہنمائی قبول کی جائے یا کسی کی رضامندی پیش نظر ہو یا کسی کی ناراضگی کا اندیشہ ہو۔ یہ سب باتیں اللہ ﷻ ہی کی اطاعت اور اس کے دین کے حوالہ سے پہچانی چاہئیں۔ اس میں کسی دوسرے کی شرکت بھی اسے گوارا نہیں۔

علمی بات: اللہ ﷻ ہی ہر طرح کی تعریف کے لئے ہے اور شکر کا اصل مستحق بھی وہی ہے یعنی تمام خوبیاں اور خدائی اسی اللہ ﷻ کے لئے ہے۔

آیت نمبر ۶۶: مشرکین مکہ آپ ﷺ کو مصالحت پر آمادہ ہو جانے کے لئے پیشکشیں کرتے اور دباؤ ڈالتے تھے وہ کہتے کہ ایک معین عرصہ تک وہ باطل معبودوں کی پوجا کریں (معاذ اللہ)۔ پھر وہ بھی اتنے ہی عرصہ تک اللہ ﷻ کی عبادت کریں گے۔ واضح کر دیا گیا کہ اللہ ﷻ کے سوا کسی کی بھی عبادت نہیں۔ نبی کریم ﷺ کے ذریعہ توحید کے واضح دلائل پیش کر دیئے گئے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے اعلان کیا گیا ہے کہ وہ اللہ ﷻ ہی کے فرماں بردار ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے۔

علمی بات: چونکہ مشرکین نے پیغمبر اسلام ﷺ سے اپنے بتوں کی پرستش کرنے کی استدعا کی تھی۔ اس لئے آپ ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ کہہ دیجیے! کہ جن کو تم پکارتے ہو مجھے ان کی پوجا سے منع کر دیا گیا ہے اور مجھے اس ذات کے سامنے جھکنے کا حکم دیا گیا ہے جو سارے جہانوں کی پرورش کرنے والی ہے۔

علمی بات: دلیل کے بغیر نہ کوئی بات مانی جاتی ہے، نہ رد ہو سکتی ہے اور دلیل آنے کے بعد وہ بات ترک نہیں ہو سکتی۔ آپ ﷺ کے ذریعہ یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ غیر اللہ کی پرستش کو میں نے کسی ذاتی مفاد اور دنیوی مصلحت کی بنا پر مسترد نہیں کیا بلکہ مجھے اس سے وحی الٰہی نے روکا ہے، فطرت نے روکا ہے، قطعی دلائل نے روکا ہے۔ چنانچہ ان سب دلائل کا مصدر اور سرچشمہ میرا ربُّ العالمین ہے۔ لہٰذا غیر اللہ کی پوجا سے روگردانی اور ربُّ العالمین کا تابع فرمان رہنا ان بَیِّنَات کی بنا پر ہے جو میرے رب کی طرف سے مجھے عطا ہوئی ہیں۔

آیت نمبر ۶۷: انسان کے تخلیق کے مختلف اَدوار کا بیان ہے۔ اللہ ﷻ نے پہلے انسان، حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا۔ ان کے بعد انسانوں کی پیدائش کا سلسلہ نطفہ سے قائم رکھا۔ نطفہ کو ایک جمے ہوئے خون کی صورت دی جاتی ہے۔ پھر اسے بچہ کی صورت میں دنیا میں لایا جاتا ہے۔ یہ بچہ رفتہ رفتہ جوانی اور پھر بڑھاپے کو پہنچ جاتا ہے۔ کچھ انسانوں کو درمیان عمر میں ہی وفات دے دی جاتی ہے۔ دنیا میں ہر انسان اپنی مقرر کردہ مدت پوری کرتا ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ عقل سے کام لے کر اس بات کو سمجھے کہ جو ذات یہ سب کرنے پر قادر ہے، اس کے لئے انسان کو دوبارہ اٹھانا کوئی مشکل نہیں۔

علمی بات: اس آیت میں انسان کی تخلیق اور اس کی زندگی کے مختلف اَطوار و اَدوار بتائے گئے کہ انسان کی ابتدائی تخلیق مٹی سے ہے سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا فرمایا اس طرح سے ان کی پوری نسل کی اصل مٹی سے ہوگئی اور حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد ان کی نسل کی پیدائش کا اللہ تعالیٰ نے یوں سلسلہ چلایا کہ ہر فرد مَرد کے نطفہ سے پیدا ہوتا ہے مَرد کا نطفہ عورت کے رحم میں جاتا ہے کچھ عرصہ کے بعد یہ نطفہ عَلَقَہ یعنی جما ہوا خون بن جاتا ہے پھر یہ جما ہوا خون چبانے کے قابل ایک گوشت کا ٹکڑا بن جاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ وہیں رحم مادر میں اس کی صورت بنا دیتا ہے اور وہیں پر ہڈیاں بنا دیتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیتا ہے، پھر اس میں روح پھونک دی جاتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق وہ باہر آجاتا ہے، جب باہر آجاتا ہے تو اس وقت طفل ہوتا ہے، اس شانِ طفولیت سے ہر بچہ گزرتا ہے۔ اس کے بعد زندگی کے مزید اَدوار بیان فرمائے یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو حالتِ طفلی میں پیدا فرمایا، پھر اسے اتنی زندگی دی کہ طاقت کے زمانہ یعنی جوانی کے زمانہ کو پہنچ گیا، جسمانی قوت بھی دی، سمجھ بھی دی، عقل بھی عنایت فرمائی اور قوتِ گویائی بھی عطا فرمائی، پھر اس کی جوانی آگے بڑھتی رہی، بڑھاپا قریب آتا چلا گیا، حتیٰ کہ وہ بوڑھا ہو گیا۔

پھر یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص جوان ہو یا ہر شخص بوڑھا ہو، اللہ تعالیٰ بعض کو پہلے ہی اٹھا لیتا ہے بہت سے لوگ بڑھاپا آنے سے پہلے ہی یا جوانی آنے سے پہلے ہی اس دنیا سے اٹھا لیئے جاتے ہیں اور موت ان کا صفایا کر دیتی ہے۔ پھر فرمایا مختلف اَدوار سے گزرتے ہوئے آخر میں سب کو مقررہ اَجل یعنی قیامت کے دن تک پہنچنا ہے یعنی اس دن حاضر ہونا ہے وہاں سب کی حاضری ہوگی اور جو زندگی دی گئی تھی اس میں جو اعمال کیئے ان کا محاسبہ ہوگا۔ یہ سب اَدوار بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان سمجھ لے کہ اسے مختلف اَدوار سے کیوں گزارا جارہا ہے اور اس میں حکمتوں اور عبرتوں کی کیا کیا باتیں ہیں۔

آیت نمبر ۶۸: اللہ تعالیٰ ہی زندہ کرتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ اس کی قدرت کا حال تو یہ ہے کہ اس کے لفظ "کُن" سے ہر وہ چیز وجود میں آجاتی ہے جس کا وہ ارادہ کرے۔

علمی بات: اس آیت سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پہلی مرتبہ یا دوبارہ کوئی چھوٹی یا بڑی چیز بنانے میں، یا کسی کو مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے اور قیامت برپا کرنے میں کیا مشکل ہو سکتی ہے؟ وہ جب چاہتا ہے جس کو پیدا فرمانا چاہتا ہے اس کو پیدا فرما دیتا ہے، تو پھر اس کے لئے انسان کے مرنے کے بعد اُسے دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔ وہ تو جب کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو بس "کُن" (ہو جا) کہتا ہے تو وہ کام ہو جاتا ہے۔ وہ اسباب کا محتاج نہیں، بلکہ اسباب اس کے حکم سے وجود میں آتے ہیں۔

علمی بات: توحید اور آخرت کو ثابت کرنے کے لئے اپنی نعمتوں اور قدرتوں کے تذکرہ سے بھرپور آیات کے اس سلسلہ کو اس آیت پر ختم فرمایا! کہ موت وحیات مکمل طور پر اس کے ہاتھ میں ہے، کسی دوسرے کا اس میں کچھ دخل نہیں۔

آیت نمبر ۶۹: اللہ تعالیٰ کے احکامات اور نشانیوں کے حوالہ سے بحث کرنے والے اپنے مفادات کی خاطر حق کو نہیں مانتے۔

علمی بات: یہ منکرین اور مُکَذِّبِیْن بھی عجیب تھے، جو اللہ تعالیٰ کی آیات کا اور قرآنی دلائل کا رد کرنے کے لئے بے جا حجت بازی سے کام لیتے تھے، جب کہ یہ آیتیں اللہ تعالیٰ کی توحید اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے ثبوت میں بالکل واضح ہیں۔ اگر انصاف سے ان آیات کو پڑھا جائے اور ان پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور و فکر کیا جائے، تو انسان کے لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بحث اور جھگڑا کرنے والوں کی اس سورت میں بھی کئی جگہ مذمت کی ہے، یا تو اس لئے کہ جھگڑنے والی متعدد اقوام تھیں یا یہ کہ مختلف انداز سے جھگڑا کرتے تھے یا یہ کہ صرف تاکید مقصود ہے۔ اس کے علاوہ دیگر سورتوں میں بھی ان جھگڑنے والوں کی مذمت کی گئی ہے۔

علمی بات: ان ٹھوس اور قطعی دلیلوں کے باوجود وہ ہدایت قبول نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات میں جھگڑنا ان کی فطرت بن گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسولوں کے ساتھ اُنہیں چڑ سی ہوگئی ہے، سوچے سمجھے بغیر ہر وقت وہ ان کی تکذیب میں لگے رہتے ہیں۔ ان گونا گوں خرابیوں کے باعث ان کی ہدایت پذیری کی صلاحیت دم توڑ چکی ہے۔ اگر یہ تمام حقائق، جملہ نشانیاں، جو آفاق و انفس میں ہیں دیکھ کر بھی کچھ لوگ انکار پر بضد ہیں تو یہ ان کی بدنصیبی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہر چیز میں خوامخواہ بحثیں کرتے ہیں اور انکار کی راہیں نکالتے ہیں۔

علمی بات: مشرکین اپنے جھوٹے اور باطل دلائل کے ذریعہ قرآن کریم کی آیات کی تردید کرتے تھے اور ان میں شکوک و شبہات پیدا کرتے تھے، اس جرم عظیم کی ایک فوری سزا انہیں یہ دی گئی کہ ظاہر و صریح دلائل کے باوجود قبولِ حق کی توفیق ان سے چھین لی گئی۔

علمی بات: ناحق پر خوش ہونے والے اور گھمنڈ کرنے والے کون تھے، یہ وقت کے بڑے لوگ تھے۔ ان کو کچھ دنیا کا سامان اور دنیا کی بڑائی مل گئی۔ اس کی وجہ سے وہ غرور، ناز اور گھمنڈ میں مبتلا ہو گئے۔ ان کی مادی کامیابی نے ان کے اندر غلط طور پر یہ احساس پیدا کر دیا کہ اللہ ﷻ کے خاص، چنیدہ اور پسندیدہ لوگ ہیں تب ہی تو انہیں مال و اسباب اور جاہ جلال سب کچھ ملا ہوا ہے حالانکہ حقیقت کے اعتبار سے وہ صرف محروم لوگ تھے۔

آیت نمبر ۷۰: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ ﷻ کی کتاب، اس کے رسولوں اور اس کی نشانیوں کو جھٹلایا۔ لہٰذا عنقریب اُنہیں اس انکار کا انجام معلوم ہو جائے گا۔

علمی بات: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کتاب یعنی قرآنِ حکیم کی تکذیب کی اور نیز ان چیزوں کی تکذیب کی جو ہم نے اپنے رسولوں کو عطا فرمائی تھیں اور ان کے ساتھ انہیں مبعوث فرمایا تھا یعنی احکامات اور معجزات وغیرہ۔ لہٰذا ان کو عنقریب یعنی قیامت میں اپنا انجام معلوم ہو جائے گا۔

علمی بات: اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا گیا کہ "جن لوگوں نے (اللہ ﷻ) کی کتاب کو جھٹلایا اور اس چیز کو بھی (جھٹلایا) جس کے ساتھ ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا تو عنقریب وہ جان لیں گے"۔ اس میں باقی تمام آسمانی کتابیں بھی آ گئیں اور وہ بنیادی اور مشترکہ تعلیمات بھی جن کی تلقین سب انبیاء کرام علیہم السلام نے فرمائی۔ مثلاً اللہ ﷻ کی وحدانیت، اس کے لئے اخلاص عبادت، رسالت اور بعث بعد الموت وغیرہ کہ ان سب کو مانا جائے اور ان کے مطابق عقیدہ و عمل کی اصلاح کی جائے۔

علمی بات: منکرین و مُکذِّبین کے انجام کی ہولناکی کے اظہار کے لئے ارشاد فرمایا گیا کہ عنقریب یہ لوگ خود ہی دیکھ اور جان لیں گے اپنے کیئے کرائے کے انجام کو۔ یہ سخت وعید ہے ایسے لوگوں کے لئے کہ جو لوگ ان حقائق کو اس وقت نہیں مانتے کل قیامت میں جب اس کا نتیجہ عملی طور پر ان کے سامنے آئے گا تو ان کو سب کچھ خود معلوم ہو جائے گا۔ اور یہ لوگ اس وقت چیخ چیخ کر ان کے ماننے کا اعلان و اظہار کریں گے۔ مگر اس وقت کے ماننے اور افسوس کرنے کا ان کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔

آیت نمبر ۷۱: منکرین حق کی گردنوں میں طوق اور زنجیروں کو ڈال کر گھسیٹا جائے گا۔

علمی بات: تکذیبِ رُسل اور تکذیبِ کتاب کا نتیجہ یہ ہو گا کہ آخرت میں ان کی گردنوں میں طوق ڈالے جائیں گے اور جسم کے مختلف حصّے زنجیروں میں جکڑے جائیں گے۔ پھر جب وہ پیاس کی شدت سے مجبور ہو کر پانی مانگیں گے تو جہنم کے کارکن ان کو زنجیروں سے پکڑ کر گھسیٹیں گے۔

آیت نمبر ۷۲: منکرین حق کو کھولتے ہوئے پانی میں گھسیٹا اور پھر آگ میں جھونک دیا جائے گا۔

علمی بات: ان منکروں اور جھٹلانے والوں کے لئے مزید عذاب کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ عذاب کے فرشتے ان کو چشموں پر لے جائیں گے جن سے کھولتا ہوا پانی نکل رہا ہو گا۔ جب وہ پانی پی چکیں گے تو پھر وہ جہنم کی آگ میں جھونک دیئے جائیں گے۔

علمی بات: زنجیریں ان کے طوقوں سے بندھی ہوں گی۔ اور فرشتے ان سے پکڑ کر ان کو کبھی وہاں کے اس کھولتے پانی میں اور کبھی اس دہکتی آگ میں منہ کے بل گھسیٹ رہے ہوں گے جو انتہائی ہولناک ہو گی۔ جیسا کہ خود قرآنِ حکیم میں دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا گیا۔ یَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ "وہ چکر لگائیں گے اس (جہنم) کے اور کھولتے ہوئے گرم پانی کے درمیان۔" (سورۃ رحمٰن ۵۵، آیت: ۴۴)

علمی بات: چونکہ منکرین نے اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا ہو کر حق کا انکار کیا تھا اس لئے ان کے اس کفر و انکار اور تکذیبِ حق کے نتیجہ میں ان کو یہ ہولناک اور رُسوا کن عذاب بھگتنا ہو گا۔ (والعیاذ باللہ العظیم)

آیت نمبر ۷۳: روزِ قیامت مشرکین سے ان کے خود ساختہ معبودوں کے متعلق پوچھا جائے گا۔

علمی بات: منکرین، مشرکین اور مُکذِّبین سے روزِ قیامت پوچھا جائے گا کہ اب بتاؤ تمہارا کیا حال ہے۔ تمہیں ہمارے رسولوں نے بار بار سمجھایا کہ شرک سے باز آ جاؤ، لیکن تم نے ایک نہ سنی۔ لو اب چکھو اپنے کرتوتوں کی سزا۔ نیز تمہارے وہ بت کہاں ہیں، اللہ ﷻ کو چھوڑ کر تم جن کی عبادت کیا کرتے تھے۔ وہ

آج تمہیں دوزخ سے نکال کر اور اس عذابِ الیم سے چھڑا کر کیوں نہیں لے جاتے۔

علمی بات: ایک طرف تو ان کو عذاب میں گرفتار کیا جا رہا ہوگا اور دوسری طرف ان سے سوال کیا جائے گا کہ دوزخ میں اس طرح اذیّت دیئے جانے والو! تم نے تو اللہ ﷻ کے اس عذاب سے بچانے والے بہت سے بُت بنا رکھے تھے لیکن اس کے باوجود تم کو دوزخ میں گرایا جا رہا ہے اور عذاب پر عذاب میں مبتلا کیا جا رہا ہے وہ کہاں ہیں جن کو اللہ ﷻ کے علاوہ تم نے اپنے سفارشی اور شریک بنا رکھا تھا اور بلاشبہ وہ اس وقت بدحواسی کے عالم میں ہوں گے لیکن سمجھتے ہوں گے کہ ہم سے کیا پوچھا جا رہا ہے۔

آیت نمبر ۷۴: مشرکین خود ساختہ معبودوں کو اللہ ﷻ کا شریک ٹھہراتے تھے۔ وہ بدحواسی میں پہلے کہیں گے کہ انہیں اپنے خود ساختہ معبود نظر نہیں آرہے۔ پھر کہیں گے کہ دنیا میں وہ اللہ ﷻ کے سوا کسی کو نہیں پکارتے تھے۔ گویا جھوٹ بولیں گے۔

علمی بات: اس وقت ان منکروں کی پشیمانی کی انتہا ہو جائے گی وہ کہیں گے کہ آج تو وہ بت کہیں نظر ہی نہیں آتے، ہم سے چھپ گئے نظر نہیں آتے۔ یا جب کام نہیں آتے تو ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے پھر گھبرا کر مکر جائیں گے اور کہیں گے نہیں ہم تو اس سے پہلے کسی شے کو پکارتے ہی نہ تھے کسی غیر کی عبادت ہی نہ کرتے تھے جھوٹ کے عادی رہے اس وقت بھی جھوٹ ہی بولیں گے اس طرح اللہ ﷻ منکروں کو گمراہ کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ منکرین و مشرکین کبھی کچھ کہیں گے اور کبھی کچھ بہکی باتیں کریں گے اور یہی اللہ ﷻ کا گمراہ رکھنا ہے یعنی دنیا میں راہ حق سے گمراہ رہے اور آخرت میں صحیح جواب نہ دے سکے۔

آیت نمبر ۷۵: مشرکین سے کہا جائے گا کہ یہ عذاب اس بات کی سزا ہے کہ وہ دنیا میں حق کا انکار کرتے رہے ہیں۔ وہ انکارِ حق پر خوش ہوتے اور اتراتے تھے اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان سے باز پرس نہیں ہوگی جب کہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔

علمی بات: "تَفْرَحُون" کا لفظ فرح سے بنا ہے جس کے معنی ہیں خوش ہونا اور مسرور ہونا۔ اور تَمْرَحُون، مرح سے بنا ہے جس کے معنی ہیں اترانا اور مال و دولت پر فخر و غرور میں مبتلا ہو کر دوسروں کے حقوق میں زیادتی اور حق تلفی کرنا۔ مرح تو مطلقاً مذموم اور حرام ہے اور فرح یعنی خوشی میں یہ تفصیل ہے کہ مال و دولت کے نشہ میں اللہ ﷻ کو بھول کر معاصی سے لذّت حاصل کرنا اور ان پر خوش ہونا یہ تو حرام و ناجائز ہے اور اس آیت میں یہی فرح مراد ہے جیسے قارون کے قصّہ میں بھی فرح اسی معنیٰ میں آیا ہے یعنی "اتراؤ نہیں بے شک اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔" (سورۃ القصص ۲۸، آیت: ۷۶)

دوسرا درجہ فرح کا یہ ہے کہ دنیا کی نعمتوں اور راحتوں کو اللہ ﷻ کا انعام سمجھ کر ان پر خوشی و مسرت کا اظہار کرے، یہ جائز بلکہ مستحب اور مامور بہ ہے۔ ایسی ہی فرح کے متعلق قرآن کریم نے فرمایا "فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا" "لہٰذا انہیں اس پر خوش ہونا چاہیئے۔" (سورۃ یونس ۱۰، آیت: ۵۸) آیت مذکورہ میں مرح کے ساتھ کوئی قید نہیں مطلقاً سبب عذاب ہے اور فرح کے ساتھ "بغیر الحق" کی قید لگا کر بتلا دیا کہ ناحق اور ناجائز لذّتوں پر خوش ہونا حرام اور حق و جائز نعمتوں پر بطور شکر کے خوش ہونا عبادت اور ثواب ہے۔

علمی بات: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ مشرکین کی یہ گمراہی اس بات کا نتیجہ ہے کہ وہ کفر و تکذیب اور فسق و فجور میں اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ ان معبودوں پر خوش ہوتے اور اتراتے تھے۔ اترانے میں مزید خوشی کا اظہار ہے جس سے تکبر لازم آتا ہے۔

آیت نمبر ۷۶: مشرکین کے شرک اور تکبر کے انجام میں انہیں جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جانے کا حکم ہوگا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ تکبر کرنے والوں کا انجام بہت ہی بُرا ہے۔

علمی بات: اس آیت میں مشرکین کے انجام کا ذکر ہے جنہوں نے باطل کو قبول کیا اور حق کو چھوڑ کر تکبر میں رہے، پھر اللہ ﷻ نے اپنے حبیب کریم ﷺ کو تسلی دی اور یقین دلایا کہ سرکشوں اور مشرک متکبروں کا یقیناً بہت بُرا ٹھکانا ہے۔

عملی پہلو: "مثوی المتکبرین" کے لفظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جہنم میں ہمیشہ کے لئے داخل ہونے کا باعث تکبر ہے، جس نے انہیں اللہ ﷻ کی آیات کو جھٹلانے پر اور ان کے بارے میں جدال پر ابھارا، جدال کی مذمت اس سورت کا ایک بنیادی موضوع ہے۔

علمی بات: ان دو آیات سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ قبول حق سے انکار کی سب سے بڑی وجہ تکبر ہوتی ہے۔ دوسری یہ کہ دوزخ میں سب سے زیادہ متکبرین لوگ جائیں گے۔

فرامین نبوی ﷺ: ۱۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں رائی بھر بھی تکبر ہو" ایک شخص عرض کرنے لگا: ہر انسان اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو، اس کی جوتی اچھی ہو۔ (کیا یہ تکبر ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ خوب صورت ہے، خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ تکبر تو یہ ہے کہ تو حق کو ٹھکرا دے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔" (صحیح مسلم)

۲۔ حضرت حارثہ بن وہب خزاعی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کیا میں تمھیں اہل جنت کی خبر نہ دوں؟ وہ ایسے کمزور اور گمنام لوگ ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم پوری کر دے اور کیا میں تمھیں اہل دوزخ کے متعلق نہ بتاؤں۔ ہر اکھڑ مزاج، بد خلق اور متکبر دوزخی ہوتا ہے۔" (صحیح بخاری)

۳۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: "جس شخص کے دل میں رائی برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۷۷: نبی کریم ﷺ کو مشرکین مکہ کی ہٹ دھرمی پر صبر کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مشرکین پر عذاب بھیجے جانے کا وعدہ برحق ہے۔

علمی بات: یہ کفار مکہ جو آپ ﷺ کو ستا رہے ہیں اور اسلام کی راہ روکنا چاہتے ہیں ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کے عذاب کا وعدہ پورا ہونا ہی ہے۔ ان مشرکین پر عذاب کی تین صورتیں ہیں: پہلی یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں ان مشرکین پر عذاب کا کچھ حصہ آجائے۔ جیسا کہ جنگ بدر، جنگ احزاب اور فتح مکہ کے وقت کافروں کی رُسوائی ہوئی۔ دوسری یہ کہ آپ ﷺ کے وصال کے بعد ان پر عذاب کا کچھ حصہ آئے۔ اس سے مراد وہ جنگیں ہیں جو حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے مرتدین، ملحدین اور کافروں سے لڑیں اور اسلام کا پوری طرح بول بالا ہوا۔ کافروں اور کفر کو شکست ہوئی اور وہ ذلت ورُسوائی سے دوچار ہوئے۔ تیسری اور حتمی صورت یہ ہے کہ وہ دنیا میں سزا پائیں یا نہ پائیں لیکن آخرت میں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے ہرگز نہیں بچ سکتے۔ کیوں کہ بالآخر انہیں اللہ تعالیٰ ہی کے پاس لوٹنا ہے جہاں ان کے جرائم کی اُنھیں پوری پوری سزا دی جائے گی۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو تسلی دی ہے کہ آپ ﷺ اپنی قوم میں سے تکذیب کرنے والے لوگوں کی تکذیب پر صبر کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی قوم کے مقابلہ میں آپ ﷺ کی فتح ونصرت کا جو وعدہ کیا ہے وہ اسے ضرور پورا فرمائے گا اور آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کی اتباع کرنے والوں کو دنیا و آخرت کی کامیابی و کامرانی سے سرفراز فرمائے گا۔ آپ ﷺ کو عزت و اکرام والے گھر، یعنی جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے گا۔ مومنوں کو بھی ان کے اعمال کے مطابق درجات عطا فرمائے گا۔

آیت نمبر ۷۸: مخالفین حق رسول اللہ ﷺ سے اپنی مرضی کے معجزات دکھانے کا مطالبہ کرتے تھے۔ ان کے مطالبہ کا جواب دیا جا رہا ہے کہ ماضی میں اللہ تعالیٰ نے کئی رسول علیہم السلام بھیجے جن میں سے کچھ کا ذکر قرآنِ حکیم میں کیا گیا اور کچھ کا نہیں۔ کسی رسول علیہ السلام کو یہ اختیار نہیں تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اِذن کے بغیر کوئی معجزہ پیش کر سکے۔ البتہ جب کسی قوم کے لئے رسول علیہ السلام کو معجزہ عطا کیا گیا اور اس کے باوجود وہ قوم ایمان نہیں لائی تو پھر ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا۔ پھر منصفانہ فیصلہ فرما دیا گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے رسول کامیاب ہو گئے اور باطل پرست تباہ و برباد کر دیئے گئے۔

علمی بات: یہ مضمون اکثر بیان ہوا ہے جو زیرِ نظر آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ سے پہلے کتنے ہی رسول علیہم السلام بھیجے گئے جن میں سے بعض کا ذکر نام بنام قرآنِ کریم میں کیا گیا اور اکثر کا ذکر چھوڑ دیا گیا اور مجمل طور پر ان کا نام لیا گیا۔ پھر جن رسولوں کا نام لیا گیا ان کی قوموں کا تذکرہ بھی کیا گیا اور ان کا رویہ بھی آپ ﷺ کو بتایا گیا اور پھر ان سب کے انجام سے بھی آپ ﷺ باخبر ہیں۔ رسولوں کو جھٹلانے والوں کی عام روش یہی رہی ہے کہ جب ان کے رسول علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا تو قوم نے رسول علیہ السلام کی تکذیب شروع کر دی اور روز بروز ایک نیا مطالبہ طلب کرنا شروع کر دیا۔

علمی بات: رسول علیہ السلام اپنی مرضی سے کوئی معجزہ نہیں دکھاتے وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہی معجزہ یا نشانی قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ معجزہ اور نشانی عطا کرنا اسی وحدہٗ لاشریک کے قبضہ قدرت واختیار میں ہوتا ہے جو کہ بلا شرکت غیرے اس کائنات کا خالق اور مالک ہے۔ گزشتہ انبیائے کرام علیہم السلام کے ہاتھ پر بھی

جو مختلف معجزات ظاہر کیئے گئے ان میں سے کوئی معجزہ بھی ان میں سے کسی کے اپنے ذاتی اختیار میں نہیں تھا بلکہ اللہ ﷻ ہی کے اختیار میں تھا۔ یعنی اختیار کلی اللہ ﷻ ہی کے پاس ہے۔ وہی اپنے اِذن و اختیار سے جو چاہے اور جب چاہے کسی کو کوئی معجزہ عطا فرما دے۔

علمی و عملی بات: یہاں پر یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اللہ ﷻ کے عذاب کو امر اللہ۔ "اللہ کے حکم" سے تعبیر فرمایا گیا ہے جس میں یہ درس ہے کہ اللہ ﷻ کے عذاب کے لئے کسی تیاری کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ اسباب و وسائل کا محتاج نہیں۔ بلکہ وہاں پر محض اس کے حکم وارشاد کی دیر ہوتی ہے۔ جونہی حکم ہوا کام ہو گیا کہ اس کی شان "کن فیکون" کی شان ہے۔ اللہ ﷻ ہمیشہ راہ حق پر مستقیم و ثابت قدم رکھے۔ (آمین ثم آمین۔)

علمی و عملی بات: کفر و باطل کا نتیجہ و انجام بہر حال دائمی خسارہ ہے۔ اسی سلسلہ میں ان کو حق تعالیٰ کی طرف سے جو مہلت اور ڈھیل ملتی ہے اس سے کبھی کسی کو دھوکہ میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ ایمان و یقین کی پونجی دونوں جہانوں کی سعادت و سرخروئی ہے اور اس سے محرومی ہر خیر سے محرومی ہے۔

آیت نمبر ۷۹: اللہ ﷻ کی بے شمار نعمتوں میں سے چوپایوں کا ذکر ہے۔ اللہ ﷻ نے انسان کی سہولت کے لئے چوپائے تخلیق کیئے جن کے کئی فوائد ہیں: مثلاً بعض چوپائے سواری کے کام آتے ہیں جبکہ بعض سے انسان گوشت حاصل کرتا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ ہی نے انسانوں کے نفع کے لئے چوپائے یعنی اونٹ، گائے، بھینس، بیل، بکری، بھیڑ وغیرہ پیدا کیئے۔ اس پیدائش میں کسی مخلوق کا کچھ دخل نہیں۔ ان میں سے بعض پر تو تم سوار ہو کر دور دراز کا سفر کرتے ہو اور ان سے بار برداری کا کام لیتے ہو اور بعض کے گوشت کو کھاتے ہو۔ جیسے اُونٹ سے سواری کا کام بھی لیا جاتا ہے اور اس کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے اور دودھ پیا جاتا ہے اسی طرح گائے اور بکری وغیرہ کا گوشت کھاتے ہیں اور دودھ پیتے ہیں۔

عملی پہلو: اللہ ﷻ نے اپنے بندوں کے لئے اپنی بعض نعمتوں کا ذکر کر کے اُنہیں دعوت فکر و نظر دی ہے، تاکہ وہ اپنے خالق و رازق کو پہچانیں، اس پر ایمان لائیں اور صرف اسی کی عبادت کریں۔

آیت نمبر ۸۰: چوپایوں میں دیگر فوائد بھی رکھے گئے ہیں۔ ان سے دودھ، ان کی کھالوں سے قیمتی اثاثہ جات، ان کے اون سے گرم لباس، ان کی چربی سے گھی اور ان کی کھاد سے زراعت میں فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ چوپائے بھاری بھر اشیاء دور دراز کے علاقوں اور بلند پہاڑی مقامات تک پہنچاتے ہیں۔ جس طرح چوپائے خشکی کے لئے سواری ہیں اسی طرح کشتیاں بحری سفر کے لئے سواری ہیں۔ یہ سب اللہ ﷻ کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔

علمی بات: یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ ان چوپایوں میں تمہارے لئے اور بھی فائدے ہیں مثلاً ان کے بالوں، اُون اور کھالوں وغیرہ سے نفع حاصل کرنا۔ اللہ ﷻ نے ان جانوروں کو اس طرح تمہارے تابع کر دیا کہ تم ان پر سوار ہو کر اپنے اس مقصد تک پہنچ جاؤ جو تمہارے دلوں میں ہے خواہ وہ مقصد ملاقات ہو یا تجارتی سفر یا تعلیم و تعلّم یا جہاد اور حج کے لئے سفر ہو۔ یہی نہیں کہ تم ان چوپایوں پر سفر کرتے ہو بلکہ تم تو کشتیوں پر بھی لدے پھرتے ہو۔ اللہ ﷻ تمہیں اور بھی نوع بہ نوع اپنی عظیم نشانیاں دکھاتا ہے جو اس کے کمال قدرت اور بندوں کے لئے اس کی عظیم رحمت پر دلالت کرتی ہیں۔ پس تم اس کی نشانیوں میں سے کس کس نشانی کا انکار کرو گے۔

آیت نمبر ۸۱: اللہ ﷻ انسان کو ہر طرح کی نشانیاں دکھاتا رہتا ہے جو اس کی قدرت اور وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کی نشانیاں اتنی واضح اور عام ہیں جس کے انکار ممکن نہیں سوائے ان کے جو ہٹ دھرمی پر اتر آئیں اور انکار کریں۔

علمی بات: اللہ ﷻ کے وجود، اس کی توحید اور اس کی قدرت کی نشانیاں صرف آسمانوں اور زمینوں میں بکھری ہوئی نہیں ہیں بلکہ لوگوں کے وجود میں بھی نشانیاں سمٹی ہوئی ہیں، اس سے بڑھ کر منکر کون ہو گا جو ان چمکتی ہوئی واضح نشانیوں کا انکار کرے گا۔

علمی بات: مسلمانوں کے لئے سب سے عظیم معجزہ قرآنِ مجید ہے، جس نے یہ چیلنج کیا کہ اس کی کوئی مثال نہیں لا سکتا اور آج چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود کوئی اس کی مثال نہیں لا سکا اور جس نے یہ دعویٰ کیا کہ اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی اور چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکی، حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا معجزہ ہو یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا معجزہ یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مُردوں کو زندہ کرنے کا معجزہ ہو یہ تمام معجزات ان نبیوں کے ساتھ چلے گئے، آج کسی یہودی یا عیسائی کے پاس کوئی معجزہ نہیں ہے جس سے وہ اپنے دین کی صداقت منوا سکے، مگر ہمارے نبی سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا معجزہ قرآنِ مجید ہے، وہ جس طرح کل اسلام کی صداقت کی دلیل تھا، آج بھی اسلام کی حقانیت پر دلیل ہے اور قیامت تک رہے گا۔

آیت نمبر ۸۲: گزشتہ سرکش قوموں کے حالات بیان فرما کر کفارِ مکہ کو ان سے عبرت حاصل کرنے کی تنبیہ کی گئی ہے۔ انہیں چاہیئے کہ وہ زمین میں چل پھر کر اللہ ﷻ کی نافرمان اور رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کا انجام دیکھیں۔ وہ ان سے تعداد، افرادی قوت اور مال و اسباب میں بہت آگے تھے۔ نیز زمین میں اثرات چھوڑنے کے اعتبار سے بھی انتہائی نمایاں تھے۔ لیکن جب ان پر اللہ ﷻ کا عذاب آیا تو یہ سب کچھ ان کے کچھ کام نہ آیا اور وہ تباہ و برباد ہو گئے۔

علمی بات: کفارِ مکہ کو عبرت حاصل کرنے کی نصیحت کی گئی ہے یعنی جب کفارِ مکہ سفر کرتے ہیں اور مکہ مکرمہ سے شام یا یمن کی طرف جاتے ہیں تو وہ پچھلی اُمتوں مثلاً عاد اور ثمود کی بربادی کے آثار اور ان کے کھنڈرات وغیرہ دیکھتے ہیں تو کیا وہ اس سے عبرت حاصل نہیں کرتے؟ ان لوگوں کے پاس بہت مال تھا، ان کی اولاد بھی بہت زیادہ تھی، بڑے بڑے لشکر تھے اور بلند و بالا عمارتیں تھیں لیکن جب ان کے کفر، شرک اور رسولوں کی تکذیب کی وجہ سے ان کے اوپر عذاب آیا تو ان میں سے کوئی چیز ان کو اللہ ﷻ کے عذاب سے نہ بچا سکی۔

آیت نمبر ۸۳: ماضی کے سرکش لوگوں کے پاس ان کے رسول علیہ السلام علم و ہدایت لے کر آئے تو انہوں نے اپنے علوم و فنون کو بہتر سمجھتے ہوئے علم ہدایت کا انکار کیا۔ علم و فن سے مراد ان کے خود ساختہ توہمات، شبہات اور باطل دعوے ہیں یا مراد دنیوی باتوں اور اسباب کا علم ہے۔ پھر وہ اس عذاب کی گرفت میں آ گئے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔

علمی و عملی بات: حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی طرف سے جو تکذیب پر عذاب آنے کی خبر دی گئی تھی کفار و مشرکین اس کا مذاق اڑاتے تھے چنانچہ اس عذاب نے ان کو تباہ کر دیا۔ قرآنِ حکیم کے مخاطبین پر لازم ہے کہ ان لوگوں کے حالات اور ان لوگوں کے انجام سے عبرت حاصل کریں۔

علمی بات: ان عاقبت اندیش منکرین کے پاس جب اللہ ﷻ کے رسول واضح دلائل توحید و ایمان کو لے کر آئے تو یہ لوگ اپنے علم کو انبیاء کرام علیہم السلام کے لائے ہوئے علم سے بہتر اور حق سمجھ کر انبیاء کرام علیہم السلام کے کلام کا رد کرنے لگے۔ یہ علم جس پر کفار خوش اور مگن تھے اور اس کے مقابلہ میں انبیاء کرام علیہم السلام کے علوم کو رد کرتے تھے۔ یا تو ان کا جہل مرکب تھا کہ ناحق اور باطل کو حق و صحیح سمجھ بیٹھے تھے۔ جیسے یونانی فلاسفیوں کے بیشتر علوم و تحقیقات جو الٰہیات سے متعلق ہیں اسی نمونہ کی ہیں جن کی کوئی دلیل نہیں۔ ان کو جہل مرکب تو کہہ سکتے ہیں۔ ان کا نام علم رکھنا علم کی توہین ہے۔ یا پھر ان کے اس علم سے مراد دنیا کی تجارت، صنعت وغیرہ کا علم ہے جس میں یہ لوگ فی الواقع ماہر تھے۔ اور قرآنِ کریم نے ان کے اس علم کا ذکر سورۃ الروم میں اس طرح فرمایا ہے یَعۡلَمُوۡنَ ظَاهِرًا مِّنَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۖ وَهُمۡ عَنِ الۡاٰخِرَةِ هُمۡ غٰفِلُوۡنَ "وہ لوگ صرف دنیا کی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور وہ آخرت سے غافل ہیں۔" (سورۃ الروم ۳۰، آیت: ۷) یعنی یہ لوگ دنیا کی ظاہری زندگی اور اس کے منافع حاصل کرنے کو تو کچھ جانتے سمجھتے ہیں، مگر آخرت جہاں ہمیشہ رہنا ہے اور جہاں کی راحت و سکون دائمی ہے اس سے بالکل جاہل و غافل ہیں۔ اس آیت میں بھی اگر یہی علم ظاہر دنیا کا مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ چونکہ قیامت اور آخرت کے منکر اور وہاں کی راحت و سکون سے جاہل و غافل ہیں۔ اس لئے اپنے اسی ظاہری ہُنر پر خوش اور مگن ہو کر انبیاء کرام علیہم السلام کے علوم کی طرف توجہ نہیں دیتے۔

علمی بات: کفار و مشرکین اپنی شاندار معاش اور مادی ترقیات کا جو علم ان کے پاس تھا اور جن غلط عقیدوں پر دل جمائے ہوئے تھے اسی پر اتراتے رہے۔ اور انبیاء کرام علیہم السلام کے علوم و ہدایت کو حقیر سمجھ کر مذاق اڑاتے رہے۔ آخر ایک وقت آیا جب ان کو اپنی ہنسی مذاق کی حقیقت کھلی اور ان کا استہزاء و تمسخر خود ان ہی پر اُلٹ پڑا۔

آیت نمبر ۸۴: عذاب کے آثار دیکھ کر سرکش لوگ اپنے جرائم کا اقرار کرنے لگے اور خالص توحید کو قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

علمی بات: جب ان لوگوں پر عذاب آیا تو اپنے بتوں اور دیوی دیوتاؤں کو بھول گئے تو کہنے لگے کہ ہم اللہ وحدہٗ لاشریک پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ ﷻ کے سوا ہم نے جن کی عبادت کی اور انہیں عبادتِ الٰہیہ میں شریک کیا آج ہم اس کے منکر ہوتے ہیں لیکن جب انہوں نے عذاب دیکھ لیا تو ایمان کی باتیں کرنے سے اُنہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا ایمان اس وقت نافع ہوتا ہے جب عذاب آنے سے پہلے ایمان قبول کر لیا جائے۔

علمی بات: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اللہ ﷻ دلائل کے ساتھ اپنے انبیاء و مرسلین علیہم السلام خود بھیجتا ہے مگر جو قومیں یا افراد دلیل کی زبان نہیں سمجھتے تو پھر آخر کار ان سے عذاب کی زبان میں بات کرتا ہے اس وقت وہ اس دعوت کو قبول کرنا چاہتے ہیں مگر اللہ ﷻ کی سنت یہ ہے کہ جو اقرار عذاب کو دیکھ کر کیا جائے اللہ ﷻ اس ایمان و اقرار کو قبول نہیں کرتا وہ صرف اس ایمان و اقرار کو قبول کرتا ہے جو داعیانِ حق کی سیرت و کردار اور ان کے دلائل و براہین سے متاثر ہو کر کیا جائے۔

آیت نمبر ۸۵: جب اصلاح کا وقت گزر جائے تو عذاب کو دیکھ کر ایمان کا اقرار اللہ ﷻ کے نزدیک قابل قبول نہیں۔ لہٰذا ان کافروں کا ایسا ایمان لانا اُنہیں فائدہ نہیں پہنچا سکا۔ یہ اللہ ﷻ کا طریقہ ہے جو ہمیشہ سے چلا آرہا ہے۔ ایسے مواقع پر کافر ہمیشہ خسارہ میں ہی رہے۔

علمی بات: یہ اللہ ﷻ کا اس کے بندوں میں قدیم دستور ہے اور اس وقت کافر بہت نقصان میں رہے یعنی وہ اس وقت میں ایمان نہیں لائے جس وقت میں اُنہیں ایمان لانے کا حکم دیا گیا تھا اور ان سے پہلی اُمتوں میں اللہ ﷻ کا یہ دستور رہا ہے کہ جب کوئی قوم اللہ ﷻ کا عذاب دیکھ کر اس پر ایمان لاتی ہے تو اللہ ﷻ اس ایمان کو قبول نہیں فرماتا، کیونکہ اللہ ﷻ کے نزدیک ایمان وہ معتبر ہے جو ایمان بالغیب ہو اور موت کے وقت کافر کو عذاب کے فرشتے دکھائی دیتے ہیں تو جو کافر عذاب کے فرشتوں کو دیکھ کر ایمان لاتا ہے اس کا ایمان قبول نہیں کیا جاتا، جیسا کہ فرعون کے ساتھ ہوا کہ جب اس نے موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو پکار اٹھا کہ میں ایمان لے آیا کہ اس اللہ ﷻ کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل کے لوگ ایمان لے آئے ہیں۔ تو اللہ ﷻ نے اس کی توبہ قبول نہیں کی اور کہا کہ اب کوئی فائدہ نہیں ہوگا، کیونکہ تم اب تک نافرمان رہے ہو اور زمین میں فساد پھیلاتے رہے ہو۔

عملی پہلو: توبہ اور ایمان بس اسی وقت تک نافع ہیں جب تک آدمی اللہ ﷻ کے عذاب یا موت کی گرفت میں نہ آجائے۔ عذاب آجانے یا موت کے آثار شروع ہو جانے کے بعد ایمان لانا یا توبہ کرنا اللہ ﷻ کے ہاں مقبول نہیں ہے۔

سُوْرَۃُ حٰمٓ السَّجْدَۃ

نوٹ: اس سورت کا دوسرا نام "سُوْرَۃُ الْفُصِّلَتْ" بھی ہے۔

ربطِ سورت: ا۔ اس سورت سے پہلے سُوْرَۃُ الْمُؤْمِن ہے۔ اس سورت کا بھی اصل مضمون گزشتہ سورت کی طرح توحید ہی ہے۔ اس میں توحید کے دلائل بھی بیان ہوئے ہیں اور ان لوگوں کو ڈرایا گیا ہے جو قرآنِ حکیم کی دعوتِ توحید کی مخالفت کر رہے تھے۔ ساتھ ہی ان ایمان والوں کو ابدی کامیابی کی بشارت دی گئی ہے جو اہلِ باطل کی تمام مخالفانہ سرگرمیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے توحید باری تعالیٰ پر مستقل مزاجی اور صبر و تحمل کے ساتھ قائم رہیں گے۔

۲۔ سُوْرَۃُ الْمُؤْمِن میں "توحید فی الدعاء" کے حوالہ سے تاکید ہے جبکہ سُوْرَۃُ حٰمٓ السَّجْدَۃ میں توحید کے ایک تقاضا "دعوت الی اللہ" کا بیان ہے۔ سُوْرَۃُ الْمُؤْمِن میں توحید کا مضمون انفرادی سطح پر بیان ہوا ہے جبکہ سُوْرَۃُ حٰمٓ السَّجْدَۃ میں توحید کا مضمون بتدریج اجتماعیت کی طرف بڑھتا ہے۔ اجتماعیت کے حصول کے لئے چونکہ جدوجہد کا آغاز دعوت سے ہوتا ہے، اس لئے سُوْرَۃُ حٰمٓ السَّجْدَۃ میں دعوت الی اللہ کا بیان ہے۔

۳۔ سُوْرَۃُ الْمُؤْمِن کا اختتام اس فرمان پر ہوا کہ مجرموں کے پاس جب بھی ان کے انبیاء رسل علیہم السلام واضح دلائل کے ساتھ آئے تو ان نافرمان اَقوام نے اپنے علم اور تجربہ پر ناز کرتے ہوئے انبیاء کرام علیہم السلام کو استہزا کا نشانہ بنایا۔ اس جرم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل کیا تو وہ پکار اٹھے کہ ہم ایک اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں لیکن اس وقت ان کا ایمان لانا ان کے لئے فائدہ مند ثابت نہ ہوا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا اصول ہے کہ وہ عذاب نازل کرنے کے بعد مجرموں کو موقع ہرگز نہیں دیا کرتا۔ سُوْرَۃُ حٰمٓ السَّجْدَۃ کی ابتدا اس فرمان سے ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑا ہی مہربان اور شفقت فرمانے والا ہے۔ اس نے اپنی رحمت سے لوگوں کی رہنمائی کے لئے مفصل کتاب نازل فرمائی ہے۔ جس میں بُرے لوگوں کو متنبہ کیا ہے اور نیک لوگوں کو خوشخبری کا پیغام دیا ہے۔ لیکن لوگوں کی اکثریت اس طرح اِعراض کرتی ہے کہ جیسے اُنہوں نے حق بات کو سنا ہی نہیں۔

۴۔ سُوْرَۃُ الْمُؤْمِن میں اکثر و بیشتر مضامین توحید پر مشتمل تھے۔ اس سورت میں قرآنِ کریم کی حقانیت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو ثابت کرنا مقصود ہے اور معرکہ حق و باطل کے فریقین کے لئے نتائج کو بیان کیا گیا ہے۔

آیت نمبر ۱: "حٰمٓ" حروف مقطعات ہیں۔ حروف مقطعات کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان راز ہے۔

علمی بات: قرآنِ حکیم میں سات سورتیں "حٰمٓ" سے شروع ہوتی ہیں۔ ان سات سورتوں کو آل حٰمٓ یا حوامیم کہا جاتا ہے۔ ان میں "سُوْرَۃُ حٰمٓ السَّجْدَۃ" دوسری سورت ہے۔

آیت نمبر ۲: قرآنِ کریم کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ یہ اس ہستی کا کلام ہے جو مخلوق پر بے انتہا مہربان ہے۔ یہ اس کی رحمت کا مظہر ہے کہ اس نے اپنے بندوں کی فلاح کے لئے قرآنِ حکیم جیسی نعمت نازل فرمائی۔

علمی بات: قرآنِ کریم اللہ رحمٰن و رحیم کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ قرآنِ حکیم عام کتاب نہیں بلکہ اس مقدّس کتاب کو ایسی ذاتِ عالی کی طرف سے اُتارا گیا ہے جو اپنے بندوں پر بہت مہربان اور نہایت رحم فرمانے والا ہے۔ قرآنِ مجید کی یہ صفت ہے کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اسی کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا ہے۔

علمی بات: کفار اس بات پر بضد تھے کہ قرآنِ حکیم اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود گھڑ کر یا کسی سے سیکھ کر لوگوں کو سنا دیتے ہیں (معاذ اللہ)۔ ان کے اس زعم باطل کو دور کرنے کے لئے اَن گنت روشن دلائل پیش کیئے گئے، لیکن وہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے۔ ایسے لوگوں کے سامنے مزید دلائل پیش کرنا بے سود تھا۔ اس لئے یہاں بطور دعویٰ فرما دیا کہ تم تسلیم کرو یا نہ کرو، یہ کلام کسی انسانی دماغ کی تخلیق نہیں بلکہ اسے رحمٰن و رحیم نے نازل فرمایا ہے۔ آج نہیں مانتے تو کل تمہیں بھی ماننا پڑے گا۔ اگر کوئی اس نعمت سے فائدہ نہیں اٹھاتا تو وہ انتہائی ناشکرا اور ناقدر شناس ہے۔

آیت نمبر ۳: قرآنِ پاک کی آیات کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے تاکہ سمجھنے میں کوئی مشکل نہ ہو۔ قرآنِ پاک عربی میں نازل ہوا ہے تاکہ مشرکین جو کہ اوّلین مخاطبین تھے ان کا کوئی عذر باقی نہ رہے۔ تاہم اس سے فائدہ وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو علم اور ہدایت کی طلب رکھتے ہیں۔

علمی بات: قرآنِ مجید کی دو صفات بیان ہوئی ہیں۔ قرآنِ حکیم کی ایک صفت یہ ہے کہ اس کی آیات کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ نئے سے نئے پیرائے میں بار بار بیان کیا گیا ہے تاکہ سمجھنے میں کوئی ابہام، کوئی پیچیدگی باقی نہ رہے۔ نیز اس میں سینکڑوں قسم کے مضامین ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ کر کے پیش کیئے گئے ہیں۔ اس کی دوسری صفت یہ ہے کہ یہ عربی زبان میں ہے تاکہ اس کے پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ تاہم اس سے کماحقہٗ فائدہ وہی اٹھاسکتے ہیں جو اہلِ علم و دانش ہیں۔ جہالت کی بنا پر اَڑ جانے والے اس سے فائدہ نہیں اٹھاسکتے۔

علمی بات: قرآنِ مجید کے پہلے مخاطب عرب لوگ تھے جن کی مادری زبان عربی تھی۔ قرآنِ حکیم کو عربی زبان میں اس لئے نازل کیا گیا تاکہ عرب لوگ اسے آسانی کے ساتھ سمجھ لیں کیونکہ اپنی زبان میں کسی چیز کو سمجھنا دوسری زبان کی نسبت زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اللہ ﷻ کی سنت بھی یہی رہی ہے کہ وہ ہر نبی علیہ السلام کو اس کی قوم کی زبان کے ساتھ بھیجتا ہے تاکہ وہ اس کی بات کو سمجھ سکیں۔

علمی بات: اس سورت کا دوسرا نام "سُوْرَۃُ الْفُصِّلَتْ" اسی آیت کے الفاظ "فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ" سے لیا گیا ہے۔

علمی بات: قرآنِ مجید سے وہی لوگ فائدہ اٹھاسکتے ہیں جو علم و فہم کی صفت سے موصوف ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کتاب سے علماء کرام اور فضلاء کرام ہی استفادہ کرسکتے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ ﷻ اور مذہب کے معاملہ میں جہالت، گمراہی اور ہٹ دھرمی میں مبتلا نہیں ہوتے بلکہ اس پر کتاب مبین پر ایمان لاکر علم کو بنیاد بناتے ہیں، یہ کتاب ان پر ہدایت کی راہ کھول دیتی ہے اور وہ اس سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

آیت نمبر ۴: قرآنِ حکیم تمام دنیا کو خبردار کرتا ہے کہ اس کی تعلیم کو مان لینے کے نتائج شاندار اور نہ ماننے کے نتائج نہایت ہولناک ہیں۔ قرآنِ حکیم کی ان تمام خوبیوں کے باوجود منکرینِ حق اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ اس کی آیات کو تسلیم کرنا تو در کنار سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔

علمی بات: قرآنِ حکیم ایسے لوگوں کو خوشخبری سناتا ہے جو قرآنِ حکیم میں سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے بعد اس سے نفع اُٹھاتے ہیں اور اس کے احکامات پر عمل کرتے ہیں اور جو لوگ اس سے اعراض کرتے ہیں ان کو اللہ ﷻ کے عذاب سے ڈراتا ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس سے اعراض کرتے ہیں، اس پر توجہ نہیں دیتے اور اسے سننا بھی گوارا نہیں کرتے اور اگر کبھی سن بھی لیتے ہیں تو اس سے فائدہ حاصل نہیں کرتے۔

علمی بات: اس آیت سے واضح ہوا ہے کہ کافر لوگ قرآنِ کریم کو دل سے نہیں سنتے۔ کیونکہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ کفار اپنے سر میں لگے ہوئے حسی کانوں سے قرآنِ حکیم سنتے تھے اور سنتے ہیں لیکن انہوں نے اس کو قبول نہ کیا اور دل کے کانوں سے نہ سنا اور اُنہیں اسے تسلیم کرنے اور اس پر ایمان لانے کی توفیق نہ ہوئی تو سنا ان سنا برابر ہے۔

عملی پہلو: قرآنِ حکیم کا عربی زبان میں ہونا، واضح اور بشارت و نذارت پر مشتمل ہونا، یہ سب ایسے ہی لوگوں کو نفع دے سکتا ہے جو سوچنے اور سمجھنے کا ارادہ کریں، قرآنِ مجید پر صدقِ دل سے ایمان لاتے ہوئے اس کی روزانہ کی بنیاد پر تلاوت کریں، اسے غور سے سنیں اور اس پر بھرپور انداز میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ غور و فکر کریں، اس سے ہدایت حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اس کی تعلیمات پر پوری طرح خود بھی عمل پیرا ہوں اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیں۔

آیت نمبر ۵: قرآنِ کریم کی دعوت پر ہٹ دھرمی اور ضد اختیار کرنے والوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ وہ کہتے کہ قرآنِ حکیم کی تعلیم ان کے دلوں پر اثر انداز نہیں ہوسکتی کیوں کہ ان کے دل ایسے اثرات قبول کرنے سے پوری طرح محفوظ ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اُنہیں قرآنِ مجید سننا بھی گوارا نہیں تھا۔

رسول اللہ ﷺ اور ان کے درمیان عداوت کی ایک دیوار حائل ہوچکی ہے۔ لہٰذا ان سے توقع نہ کی جائے کہ وہ قرآنِ کریم پر ایمان لے آئیں گے۔ اُنہیں دو ٹوک انداز میں کہہ دیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ تو اپنی دعوت پیش کرتے رہیں گے اور مشرکین چاہیں تو مخالفت پر جمے رہیں۔

علمی بات: جب نبی کریم ﷺ ان مشرکین مکّہ کو اللہ ﷻ کا کلام سناتے ہیں تو وہ اس سے اعراض کرتے ہیں۔ بلکہ جواباً آپ ﷺ سے کہتے ہیں کہ آپ ہمیں جن چیزوں کی طرف دعوت دے رہے ہیں ان کو قبول کرنے کے لئے ہمارے دل بالکل بند ہیں۔ جس توحید اور آخرت کی آپ دعوت لے کر اٹھے ہیں یہ دعوت کسی طرح ہمارے دل پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ ہمارے کانوں میں ثقل اور بوجھ ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے کانوں میں دانستہ ایسی گرانی پیدا کر رکھی تھی کہ ان کے کان آپ کی دعوت کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے تھے۔ وہ بدبخت یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمارے اور آپ کے درمیان ایک پردہ حائل ہے گویا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایک خاص مانع اور دیوار ان کے درمیان حائل ہوچکی ہے، جس نے ان کے اور آپ ﷺ کے درمیان جدائی ڈال دی ہے۔ لہٰذا اب آپ اپنا کام کریں اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں۔

علمی بات: "اَكِنَّةٍ" کنان کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ کپڑا یا غلاف ہے جس میں کسی چیز کو اچھی طرح لپیٹ کر رکھ دیا جاتا ہے۔ "وَقْرٌ" کا معنٰی بہرہ پن ہے۔

علمی بات: اس آیت میں کفار کی جو باتیں نقل کی گئی ہیں اس کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ یہ باتیں بطورِ استہزا اور تمسخر کرتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ ان باتوں کو سن کر مبلغ، داعی اور نصیحت کرنے اور دین کی دعوت دینے والا بالکل مایوس ہو جائے اور آئندہ نصیحت سنانے کا ارادہ بھی ترک کر دے۔ اس کے مطابق آیت کا معنٰی یہ ہے کہ کفار آپ ﷺ سے کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر آپ کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں، جب آپ بات کرتے ہیں تو ہمیں کانوں پر بھاری پن اور بوجھ محسوس ہوتا ہے جس کی وجہ سے ہمیں کچھ سنائی نہیں دیتا۔ ہمارے اور آپ کے درمیان ایک ایسا پردہ ہے جو ہمیں ملنے نہیں دیتا۔ لہٰذا آپ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں اور یہ توقع مت رکھیں کہ کبھی ہم آپ کی نصیحتوں سے متاثر ہونے والے ہیں۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ کفار بظاہر اپنے آپ کو مجبور و معذور ظاہر کر رہے ہیں۔ ان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دلوں پر پردہ، کانوں میں بوجھ اور درمیان حجابات ہیں لہٰذا ہم کیسے آپ کی بات سنیں اور مانیں۔ اس سے ان کا مقصد اپنے آپ کو مجبور اور لاچار ثابت کرنا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ مجبور اور لاچار نہیں تھے کیونکہ ان میں آیاتِ الٰہیہ کو سننے اور سمجھنے کی پوری صلاحیت تھی مگر جب انہوں نے کسی طرح ادھر کان بھی نہ لگائے اور سمجھنے کا ارادہ بھی نہ کیا تو سزا کے طور پر ان پر غفلت و جہالت مسلط کر دی گئی مگر وہ بھی اس درجہ میں نہیں کہ ان لوگوں سے اختیار چھین لیا گیا ہو اور یہ بالکل بے بس اور بے اختیار ہو جائیں، بلکہ اب بھی اگر وہ سچے دل سے ارادہ کر لیں تو پھر سے حق بات کو سننے اور سمجھنے کی صلاحیت لوٹ آئے گی۔

آیت نمبر ۶: دعوتِ حق کا انکار کرنے والوں کو جواب دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ پر وحی کی جاتی ہے جس کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ معبودِ واحد ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ہی کی خالص بندگی کی جائے اور اسی سے گناہوں کی بخشش طلب کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کی عبادت کرنے والوں کا انجام ہلاکت و بربادی ہے۔

علمی بات: کفار کی بے باکی اور استہزاء کے جواب میں حضورِ اکرم ﷺ کو اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ ان کے مقابلہ میں سخت بات نہ کریں بلکہ اپنی تواضع اور عاجزی کا اظہار کریں کہ میں بھی انسان ہوں، البتہ مجھے یہ شرف و امتیاز عطا کیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ مجھے وحی کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ تم سب کا معبود صرف ایک ہی اللہ تعالیٰ ہے۔ میں تمہیں یہی وصیت کرتا ہوں کہ عبادت اور اطاعت میں اپنا رخ بتوں سے پھیر کر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف کر لو اور اپنے گناہوں سے توبہ کر لو، اسی میں تمہاری نجات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شرک کرنے والوں کے لئے بڑی ہی ہلاکت و بربادی ہے۔

علمی بات: بلاشبہ دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کی طرح ہمارے پیارے نبی خاتم النبیین سید دوعالم سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ بھی بشر اور انسان ہیں مگر آپ ﷺ کی بشریت تمام انسانوں سے اتنی اعلیٰ ترین اور اکمل ہے کہ کوئی عام بشر تو کیا دیگر انبیائے کرام علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی آپ ﷺ کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

علمی بات: کفارِ مکہ حضورِ اکرم ﷺ کی رسالت کا انکار کرتے تھے اور یہ اعتراض کرتے کہ آپ ﷺ تو ہماری ہی طرح کے بشر ہیں، اس لئے آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کیسے ہو سکتے ہیں۔ (معاذ اللہ) اُنہیں اس کا جواب دیا گیا ہے کہ آپ ﷺ اُنہیں فرما دیجئے کہ میں تمہارے جیسا بشر ہوں لیکن مجھے اللہ تعالیٰ نے جو فضیلت اور خصوصیت عطا فرمائی ہے وہ تم میں نہیں ہے اور وہ یہ کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت سے نوازا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔

علمی بات: کفار بشریت کو نبوت کے منافی سمجھتے تھے وہ کہتے تھے کہ نبی کے لئے فرشتہ ہونا ضروری ہے۔ حالانکہ انسانوں کے لئے انسان کو رسول بنا کر بھیجنا ان کے لئے زیادہ مفید ہے اور ان سے استفادہ کے لئے زیادہ سہل اور آسان ہے کیونکہ اگر فرشتہ، جن یا کسی اور جنس سے ان کے لئے رسول بھیجا جاتا تو وہ نہ ان کو دیکھ سکتے نہ ان کی بات سن سکتے تھے۔ اور نہ ان کے اعمال کی اتباع اور اقتدا کر سکتے، یہ تو اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے انسانوں کے لئے ان کی جنس سے انسان کو رسول علیہ السلام بنا کر بھیجا۔

علمی بات: ہر انسان کا مزاج یکساں نہیں ہوتا۔ بعض طبیعتیں اتنی غلط اندیش اور ان کی عقلیں اتنی اوندھی ہوتی ہیں کہ جہاں کہیں کمال کی ذرا سی جھلک دیکھی۔ اسے اپنا معبود اور خدا بنا لیا اور اس کے سامنے سربسجود ہو گئے۔ یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو فقط اس لئے اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہنا شروع کر دیا کہ اُنہیں تورات نوک بر زبان تھی یعنی زبانی یاد تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چند معجزات دکھائے تو لوگوں نے اُنہیں کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔ اس غلط فہمی کا سدباب کرنے کے لئے ہر نبی علیہ السلام نے جہاں اللہ تعالیٰ کی توحید کی دعوت دی اور اس کی صداقت ثابت کرنے کے لئے اپنی نبوت کی کھلی نشانیاں دکھائیں اور اپنی تمام صلاحیتوں اور خوبیوں کے

حوالہ سے کھلے اور واضح انداز میں یہ تصریح بھی فرمائی کہ بایں ہمہ کمال و خوبی خدا نہیں بلکہ یہ اللہ ﷻ کی عطا کردہ صفات ہیں۔ ہم اللہ ﷻ کے بندے ہیں۔ خالق نہیں بلکہ مخلوق ہیں۔ معبود نہیں بلکہ عابد ہیں۔ جب جزوی کمالات سے ایسی غلط فہمیاں پیدا ہوں جن کی گرفت میں آج بھی بے شمار لوگ بھٹک رہے ہیں تو وہ ذاتِ اقدس ﷺ جو جمال و کمال کا مظہر اتم بنائی گئی اس کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیوں کا پیدا ہونا بعید از قیاس نہ تھا۔ اس لئے ضروری ہوا کہ اس غلط فہمی کے سارے امکانات ختم کر دیئے جائیں۔ چنانچہ اللہ ﷻ نے اپنے حبیب کریم ﷺ کو تمام کمالات سے علی وجہ الاتم متصف کرنے کے باوجود اس آیت کے ذریعہ یہ اعلان کرنے کا حکم دیا "قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ۔" علماء کرام نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اظہار تواضع کے لئے یہ اعلان کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ اس فتنہ کو روزِ اوّل سے ہی ختم کر دیا جائے۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ صاحب کمال کا اظہارِ تواضع بھی اس کا کمال ہوتا ہے۔

آیت نمبر ۷: خطاب چونکہ مشرکین سے ہے اس لئے یہاں زکوٰۃ سے ایک مراد دل کی پاکیزگی ہے۔ مشرکین اپنے دلوں کو نور ایمان سے منور نہیں کرتے اور شرک کی آلودگی سے پاک نہیں کرتے۔ ایک مراد یہ ہے کہ ان کے جد امجد حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اُنہیں زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا تھا۔ مگر یہ لوگ زکوٰۃ کی عدم ادائیگی سے لوگوں کے حقوق تلف کرتے۔ در حقیقت وہ آخرت میں جواب دہی کے منکر ہیں اس لئے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

علمی بات: مشرکین کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ وہ اللہ ﷻ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔ لیکن اس آیت میں ان کے دو مزید گناہ بیان ہوئے ہیں کہ وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اور آخرت کا بھی انکار کرتے ہیں۔ نہ تو صدقہ و خیرات کر کے اپنے مال کو پاک رکھتے ہیں اور نہ ہی توحید کا اقرار کر کے اپنے نفسوں کو شرک سے پاک کرتے ہیں۔ وہ آخرت کے بھی منکر ہیں۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے لئے اللہ ﷻ کی طرف سے ہلاکت اور بربادی ہی ہے۔

علمی بات: اس مقام پر زکوٰۃ کے معنی کے تعین میں مفسرین کرام کی رائے مختلف ہے۔ پہلی رائے یہ ہے کہ یہاں زکوٰۃ سے مراد پاکیزگی، ستھرائی اور تزکیۂ نفس ہے۔ یہ معنیٰ لفظ زکوٰۃ کے لغوی معنیٰ کے اعتبار سے ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ اپنے نفس کو عقائد فاسدہ اور اخلاقِ ذمیمہ سے پاک و صاف نہیں کرتے۔ یہ آیت مکی ہے اور حضور ﷺ کے مکی دور میں زکوٰۃ کا کوئی نظام نہیں تھا۔ یہ نظام تو ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں جا کر قائم ہوا تھا۔ چنانچہ اگر لفظ "زکوٰۃ" مکی سورتوں میں آئے تو اس کے لغوی معنیٰ مراد لیئے جاتے ہیں۔ اس معنیٰ کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین اپنے آپ کو شرک سے پاک نہیں کرتے اور نہ ہی اپنے نفس کا تزکیہ کرتے ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہاں زکوٰۃ سے اصطلاحی زکوٰۃ مراد ہے جو مال میں سے ادا کی جاتی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ زکوٰۃ مکہ مکرمہ ہی میں فرض ہو چکی تھی، البتہ اس کے تفصیلی احکام مدینہ منورہ میں آئے ہیں۔ اس کے مطابق آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مشرکین اپنے مال میں سے زکوٰۃ ادا نہیں کرتے۔

عملی پہلو: اس آیت میں مشرکین کا یہ طرزِ عمل بیان ہوا ہے کہ وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اور نہ ہی آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ چونکہ ہم مسلمان اللہ ﷻ کی توحید کا اقرار کرتے ہیں لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ہم اللہ ﷻ کی راہ میں خرچ کریں۔ چاہے وہ زکوٰۃ کی صورت میں ہو یا صدقات و خیرات کی شکل میں۔ آخرت کو ماننا وہی معتبر ہے جس کے ساتھ کامل توحید اور انفاق فی سبیل اللہ پایا جائے۔ جو شخص اللہ ﷻ کو حقیقی طور پر پالے وہ کسی اور عظمت میں اٹکا ہوا نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح جو شخص اللہ ﷻ کو حقیقی طور پر پالے وہ اپنے مال کو بچا بچا کر نہیں رکھ سکتا۔

آیت نمبر ۸: پیغامِ حق کو قبول کر کے اس کے مطابق طرزِ عمل اختیار کرنے والوں کے لئے بے انتہا اجر ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا اور نہ ہی اس میں کوئی کمی واقع ہوگی۔

علمی بات: جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں، ان کے لئے اللہ ﷻ نے ایسے اجر کا وعدہ فرمایا ہے جو دائمی ہوگا اور کبھی ختم نہیں ہوگا۔

علمی بات: اہل ایمان کے نیک اعمال کا اجر کبھی ختم نہیں ہوگا، اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک مطلب تو یہ ہے کہ آخرت میں جو اُنہیں اجر ملے گا وہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ مومن صحت کے ایام میں جو نیک کام کرتا ہے اگر بیماری یا مجبوری کی وجہ سے وہ ایک عمل جاری نہ رکھ سکے تو بھی اس کے اجر کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کا اجر اس کو ملتا ہے۔ اللہ ﷻ فرشتوں کو اس حالت عذر میں بھی اس کے لئے ان اعمال کا اجر و ثواب لکھنے کا حکم فرماتا ہے جو بندۂ مومن تندرستی اور فرصت کے اوقات میں کیا کرتا تھا۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے تو ایک پکارنے والا پکارے گا کہ اب تمہیں زندگی ہی زندگی ہے اب تم کبھی موت سے ہمکنار نہیں ہوگے اور یہ بھی کہ تم صحت مند رہو گے کبھی بیمار نہیں ہوگے اور یہ کہ تم جوان رہو گے کبھی بوڑھے نہیں ہوگے اور یہ کہ تمہارے لئے راحت ہی راحت ہے تمہیں کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔" (صحیح مسلم)

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "جب بندہ کوئی نیک عمل کرتا ہے پھر سفر یا مرض کی وجہ سے اس کو جاری نہ رکھ سکے تو اس کے نامہ اعمال میں وہ نیک اعمال لکھے جاتے رہیں گے جو وہ صحت اور اقامت (گھر میں قیام) کے ایام میں کیا کرتا تھا۔" (سنن ابی داؤد)

عملی پہلو: منکرین و مشرکین کے ہولناک انجام کے مقابلہ میں مومنین کے انجام کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کی توحید پر سچا پکا ایمان لائیں گے اور اس کے مطابق وہ نیک عمل بھی کریں گے تو ان کے لئے ایسے عظیم الشان اجر کی بشارت و خوشخبری ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ پس ایمان صادق، عمل صالح اور اخلاص و استقامت دارین کی سعادت و سرخروئی سے سرفرازی کا ذریعہ ہیں۔ ہمیں اس کے لئے کوشاں رہنا چاہیئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہنا چاہیئے کہ ہمیشہ اور ہر حال میں اس سے بہرہ مند رکھے اور نفس و شیطان کے ہر مکر و فریب سے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین یارب العالمین۔

آیت نمبر ۹: اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا انکار کرنے والے کائنات کی تخلیق پر غور و فکر نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو دو دنوں میں بنایا، وہی ہر چیز کا خالق ہے، لہٰذا عبادت کا مستحق بھی وہی ہے۔ وہی پورے عالَم کا پیدا کرنے اور پالنے والا ہے۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے ذریعہ مشرکین کو تنبیہ کی ہے کہ کیا تم ایسے رب کا انکار کرتے ہو جس نے اس وسیع و عریض زمین کو صرف دو دنوں میں پیدا فرمادیا؟ اور اس خدائے بزرگ و برتر کے ساتھ باطل معبودوں کو اس کی خدائی میں شریک ٹھہراتے ہو۔ تمہارا یہ طرز عمل بالکل غلط ہے، لہٰذا عقل سے کام لو اور اپنے خالق حقیقی اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرو جو اکیلا ہی سارے جہانوں کا مالک ہے اور اسے ہر چیز پر قدرت اور اختیار ہے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔

علمی بات: یہاں دنوں سے مراد ہمارے دن نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے دن ہیں جو ہمارے شمار سے ہزار (۱۰۰۰) سال بلکہ بعض صورتوں میں پچاس ہزار (۵۰۰۰۰) سال کے بھی برابر ہوتے ہیں، جیسا کہ "ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ۔" (سورۃ السجدۃ ۳۲، آیت: ۵) میں اور "تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ۔" (سورۃ المعارج ۷۰، آیت: ۴) میں مذکور ہے۔ اس وجہ سے ان کو ادوار کے معنیٰ میں لینا چاہیئے۔

آیت نمبر ۱۰: زمین کے اوپر بوجھل پہاڑ رکھ دیئے گئے تاکہ زمین کا توازن برقرار رہے۔ زمین کو برکت و وسعت سے نوازا گیا اور اس کے اندر مختلف اشیاء کے خزانے سمو دیئے گئے۔ یہ سب کچھ چار دنوں میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کے وسائل کو ایسی وسعت دی ہے جو اس پر بسنے والی تمام مخلوقات کے لئے کفایت کرنے والی ہے۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے زمین کی پیدائش کے بعد زمین پر بھاری بھاری پہاڑ قائم فرمادیئے تاکہ زمین کا توازن برقرار رہ سکے۔ اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں بے شمار برکتیں رکھ دیں کہ اس میں تیل، گیس، پانی، ہوا، سونا، چاندی وغیرہ کے نہ ختم ہونے والے ذخیرے ودیعت کر دیئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے زمین پر رہنے والوں کی غذائیں اور روزی کا انتظام بھی اسی زمین میں فرمادیا کہ ہر قسم کی مخلوق اپنی ضرورت کے مطابق اپنی غذا حاصل کر سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے دو دنوں میں زمین کو پیدا فرمایا اور باقی دو دنوں میں اہل زمین کے لئے غذاؤں کا نظام ترتیب دیا۔ اس طرح زمین اور اس سے متعلقہ دوسری چیزوں کا انتظام چار دنوں میں مکمل ہوا۔ زمین کی مختلف صلاحیتوں، اس کی پیداوار اور اس کے غذائی ذخائر پر ان سب کا حق برابر ہے جنہیں ان کی ضرورت ہے۔

علمی بات: دو دنوں میں زمین کو پیدا کیا جو بذاتِ خود ایک بہت بڑی تخلیق ہے، پھر مزید دو دنوں میں اس کے اوپر سے اس پر پہاڑ جما دیئے اور زمین کی مٹی کو روئیدگی کے قابل بنایا۔ زمین ابتداء میں تو آگ کے ایک کُرّے کی شکل میں تھی۔ آہستہ آہستہ یہ ٹھنڈی ہوئی۔ پہلے اس کی مٹی میں صرف غیر نامیاتی مرکبات (Inorganic compounds) پائے جاتے تھے۔ ہوتے ہوتے نامیاتی مرکبات (Organic compounds) پیدا ہوئے۔ اس کے بعد اس میں وہ صلاحیت اور اہلیت پیدا ہوئی کہ یہ زندگی کا گہوارہ بن سکے۔ یہ سارا عمل چار دنوں میں مکمل ہوا۔ یہ آیت تاحال آیات متشابہات میں سے ہے، ابھی تک ہم ان چار دنوں کی حقیقت اور تفصیل کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔

علمی بات: رواسی جمع ہے راسیۃ کی جس کا مطلب ہے زمین میں گڑی ہوئی چیز۔ بندرگاہ کو عربی میں مرسی کہتے ہیں کیونکہ کشتیاں اور جہاز یہاں پہنچ کر اپنے لنگر ڈال دیتے ہیں۔ پہاڑوں کو رواسی اس لئے کہا کہ ان کی جڑیں زمین میں دور تک چلی گئی ہوتی ہیں۔ یوں نہیں کہ بس زمین کی سطح پر رکھ دیئے گئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے کرۂ زمین کو اضطراری حرکت سے محفوظ کرنے کے لئے زمین میں جابجا پہاڑوں کی میخیں گاڑھ دی ہیں۔ لیکن یہ پہاڑ کسی میخ کی طرح زمین میں سارے کے سارے دھنسے ہوئے نہیں بلکہ زمین سے بہت اونچے اٹھے ہوئے ہیں۔ پہاڑوں کو اس طرح بنانے میں جو حکمتیں ہیں ان سے بچہ بچہ واقف ہے۔ ان اَن گنت حکمتوں سے

ایک یہ بھی ہے کہ پہاڑوں کے شکم گونا گوں دھاتوں اور معدنیات سے بھرے پڑے ہیں، کوئلہ سے لے کر سونے تک، کھریا مٹی سے لے کر پلاٹینم تک کے یہاں انبار لگے ہوئے ہیں۔ انسان آسانی سے اُنہیں کھود کر نکال سکتا ہے۔ اگر یہ پہاڑ سارے کے سارے زمین میں دھنسے ہوتے تو ان معدنیات کو نکالنا مشکل ہو جاتا۔

فکری پہلو: زمین میں اللہ ﷻ نے ایسی برکتیں رکھی ہیں کہ انسان کی تمام تمدنی ضروریات اس سے پوری ہوتی ہیں۔ زمین کے اندر مختلف دھاتوں وغیرہ کے ایسے ذخائر پائے جاتے ہیں جن کو انسان برسہا برس سے نکالے جا رہا ہے اور وہ کبھی ختم نہیں ہوتے۔ انسانی زندگی کا جن چیزوں پر مدار ہے وہ چیزیں زمین وافر مقدار میں مہیا کرتی ہیں۔ چنانچہ پانی کے چشمے ہر طرف رواں ہیں اور انواع واقسام کی غذائی اجناس زمین پر مسلسل اگلتی چلی جارہی ہیں۔ ایک دانہ ڈالو تو زمین سینکڑوں دانے واپس کرتی ہے۔ ایک پودا لگاؤ تو زمین تناور درخت کھڑا کر دیتی ہے اور پھلوں کی شکل میں اپنا تحفہ پیش کرنے لگتی ہے۔ انسانی زندگی کی معیشت کا یہ سامان اور خیر کے یہ خزانے زمین میں کس نے ودیعت کیئے ہیں؟ یہ اصل سوال ہے انسان کے سوچنے کا اور اس کے صحیح جواب ہی پر انسان کے ہدایت پانے کا انحصار ہے۔

علمی بات: اس آیت میں بیان ہوا ہے کہ زمین اور اس سے متعلقہ دوسرے انتظامات چار دن میں ہوئے جبکہ بعض دیگر آیات میں آسمانوں، زمین اور ان کے درمیان چیزوں کی تخلیق چھ (٦) دن میں بتائی گئی ہے۔ اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ دو دن میں زمین کی تخلیق ہوئی، دو دن میں زمین سے متعلقہ دوسرے انتظامات مکمل ہوئے اور دو دن میں آسمانوں کی تخلیق ہوئی۔ اس طرح کل چھ (٦) دنوں میں آسمانوں اور زمین کی یہ تخلیق مکمل ہوئی۔

علمی بات: ان چار دنوں میں زمین کی تخلیق بھی شامل ہے جس کے بارے میں پیچھے فرمایا گیا تھا کہ وہ دو دن میں مکمل فرمائی، لہٰذا دو دن میں زمین پیدا کی گئی اور دو دن میں اس زمین پر پہاڑ اور دوسری انسانی ضروریات کی چیزیں اور خوراک وغیرہ پیدا کرنے کا انتظام فرمایا گیا، اس طرح زمین اور اس کے اوپر کی اشیاء پیدا کرنے میں کل چار دن استعمال فرمائے گئے۔ اور دو دن میں ساتوں آسمان پیدا فرمائے گئے۔ اس طرح کائنات کی تخلیق کل چھ (٦) دن میں مکمل ہوئی، جیسا کہ سورۃ الاعراف ٧، آیت: ٥٤، سورۃ یونس ١٠، آیت: ٣، سورۃ ھود ١١، آیت: ٧، سورۃ الفرقان ٢٥، آیت: ٥٩، سورۃ السجدہ ٣٢، آیت: ٤ اور سورۃ الحدید ٥٧، آیت: ٤ میں مذکور ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب دنوں کا حساب سورج کے طلوع و غروب کے بجائے کسی اور معیار پر ہوتا تھا جس کا ٹھیک ٹھیک علم اللہ ﷻ ہی کو ہے، اگرچہ اللہ ﷻ کی قدرت میں یہ بھی تھا کہ وہ ایک ہی لمحہ میں سب کچھ پیدا فرما دیتا، لیکن اس عمل کے ذریعہ انسان کو بھی جلد بازی کے بجائے اطمینان اور وقار کے ساتھ کام کرنے کی تعلیم دی گئی ہے، نیز اس میں اور بھی نہ جانے کیا کیا مصلحتیں ہوں گی جن کا علم اللہ ﷻ ہی کو ہے۔

علمی بات: "سائلین کے لئے یکساں ہے" اس جملے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جو لوگ بھی زمین و آسمان کی تخلیق کے بارے میں سوال کریں ان سب کے لئے یہ یکساں جواب ہے اور دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ "سائلین" سے مراد وہ ساری مخلوقات ہیں جو زمین سے غذائیں حاصل کرنا چاہیں، چاہے وہ انسان ہوں، یا جنات، یا جانور۔ ان سب کو اللہ ﷻ نے یہ موقع عطا فرمایا ہے کہ وہ زمین سے اپنی اپنی غذا حاصل کر سکیں۔ مفسرین کرام نے اس جملے کی یہ دونوں تفسیریں کی ہیں۔

آیت نمبر ١١: اللہ ﷻ نے آسمان کی تخلیق کی طرف توجہ فرمائی جو اس وقت دھوئیں کی شکل میں تھا۔ پھر زمین و آسمان کو خوشی یا جبر سے اپنی اطاعت کا حکم دیا جسے دونوں نے بخوشی قبول کیا۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے جب آسمان کی تخلیق کی طرف توجہ فرمائی تو اس وقت وہ دھویں کی مانند ایک لطیف جوہر تھا۔ پھر اللہ ﷻ نے آسمان اور زمین سے مخاطب ہو کر کہا: ہمارے جو احکام تقدیری تم دونوں کے لئے جاری ہوں گے خوشی سے قبول کرو گے یا وہ زبردستی تم پر نافذ کیئے جائیں۔ دونوں نے عرض کیا: ہم بخوشی ان احکام کی تعمیل اور تکمیل کے لئے حاضر ہیں۔ اس طرح دونوں فرماں برداری کے لئے خوشی سے راضی اور تیار ہو گئے۔

علمی بات: زمین اور آسمان اگرچہ جمادات ہیں مگر جمادات کے بارے میں یہ خیال کرنا صحیح نہیں کہ وہ شعور سے بالکل ہی عاری ہیں۔ ہم ان کے شعور کی کیفیت کو نہیں جانتے لیکن قرآنِ حکیم نے اس کائنات کے جن اسرار و رموز سے پردہ اٹھایا ہے، ان سے ہمارے علم میں یہ اضافہ ہو گیا ہے کہ کائنات کی ہر چیز اپنے خالق کو جو اس کا رب بھی ہے، پہچانتی ہے، اس کا حکم سنتی اور اس کی تعمیل کرتی ہے اور اس کی تسبیح اور حمد کرتی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز اپنے رب کے احکام سننے، سمجھنے، ان کا جواب دینے اور ان پر عمل کرنے کی پوری سمجھ بھی رکھتی ہے۔

عملی پہلو: زمین و آسمان نے کہا کہ ہم خوشی سے اللہ ﷻ کی اطاعت و فرماں برداری کے لئے حاضر ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آسمان و زمین اللہ ﷻ کے

احکام کی تعمیل مجبوری کے درجہ میں ناگواری کے ساتھ نہیں کر رہے ہیں، بلکہ اس پر رضامند ہیں۔ اس سے یہ اشارہ خود بخود نکلتا ہے کہ انسان کو اپنے رب کی اطاعت رضا اور رغبت کرنی چاہیئے۔

سائنسی نکتہ: اس آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ جب اللہ ﷻ آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو وہ دھواں تھا۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب آسمان ایک دھویں کی شکل میں تھا اور ابھی سات آسمانوں کی الگ الگ صورتیں وجود میں نہیں آئی تھیں۔ ان آیات میں کائنات کی تخلیق کے ابتدائی مرحلہ سے متعلق کچھ اشارے پائے جاتے ہیں۔ سائنسی شواہد کے مطابق ایک بڑے دھماکہ (Big Bang) کے بعد آگ کا ایک بہت ہی بڑا گولا وجود میں آیا۔ پھر اس گولے میں مزید دھماکے ہوئے اور اس طرح اس مادہ کے جو حصّے علیحدہ ہوئے ان سے کہکشائیں بننا شروع ہوئیں۔

آیت نمبر ۱۲: اللہ ﷻ نے آسمانوں کو دو دن میں سات کی تعداد میں تخلیق فرمایا۔ پھر ہر آسمان کے لئے اس کا عمل اور کردار طے کیا۔ آسمان دنیا کو ستاروں سے رونق بخشی اور ان ہی کے ذریعہ وحی کی حفاظت کا انتظام بھی کیا۔ کائنات کا یہ سارا نظام اس ہستی کا مقرر کردہ ہے جو زبردست ہے اور ہر بات کا جاننے والا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے دو دنوں میں سات آسمان بنا دیئے۔ ہر آسمان میں اس نے جو جو چیزیں اور جیسے جیسے فرشتے مقرر کرنے چاہے، مقرر کر دیئے۔ جو کام ہر آسمان کے فرشتوں سے لینے تھے سب کو ان کے کام اور ان کے لئے احکام بتلا دیئے۔ اللہ ﷻ نے دنیا کے آسمان کو ستاروں سے مزین کر دیا۔ اللہ ﷻ نے اس آسمان کو ستونوں کے بغیر ایسا مضبوط کر دیا کہ وہ گر نہ سکے اور فرشتوں کے پہرے لگا کر ایسا محفوظ کر دیا کہ کوئی مداخلت نہ کر سکے۔ یہ تمام تدابیر اور تقدیر اس اللہ ﷻ کی قائم کردہ ہے جو سب پر غالب ہے اور کائنات کے ایک ایک چپے کی ہر کھلی چھپی حرکت کو جانتا ہے۔

علمی بات: چراغوں سے مراد ستارے ہیں۔ ستارے زمین سے قریب ترین آسمان کے لئے باعثِ زینت بھی ہیں۔ زینت و آرائش کے علاوہ ستاروں کا ایک فائدہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ شیاطین جن کی سرگرمیوں کے خلاف حفاظتی چوکیوں کا کام بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ جو شیاطین جن غیب کی خبریں حاصل کرنے کے لئے ممنوعہ حدود میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے ذریعہ شریر قسم کے شیاطین کو عالم بالا کی باتیں سننے سے روکا جاتا ہے۔ وہ غیبی خبروں کی سن گن لینے کے لئے آسمان کے قریب جاتے ہیں، لیکن انہیں فرشتوں کی باتیں سننے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ کوئی شیطان اگر کوئی آدھی بات سن بھاگتا ہے تو اسے ایک دہکتے ہوئے شعلہ کے ذریعہ مار لگائی جاتی ہے، تاکہ وہ دنیا میں پہنچ کر اپنے معتقد کاہنوں اور نجومیوں کو کچھ بتا نہ سکے، اسی دہکتے ہوئے شعلے کو "شہاب ثاقب" کہا گیا ہے۔

نوٹ: شہاب ثاقب کی مزید تفصیلات سورۃ الحجر ۱۵، آیت:۱۸، سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷، آیت:۱۰ میں ملاحظہ فرمائیں۔

فکری پہلو: زمین و آسمان کی پیدائش کسی اتفاقی حادثہ کے طور پر وجود پذیر نہیں ہوئی، بلکہ یہ ایک نہایت ہی حکیمانہ منصوبہ کا نتیجہ و ثمرہ ہے۔ یہ منصوبہ بندی کسی ایسی ہستی کی طرف سے کی ہوئی ہے جو ہر چیز پر غالب و مقتدر ہے۔ پس وہی اللہ ﷻ ہے جس نے اس کائنات کا بامقصد نظام بنایا ہے۔ ربوبیت کا یہ وسیع نظام اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ایک دن ایسا آئے جس میں لوگ اپنے محسنِ اعظم اور رب ذوالجلال کے سامنے روبرو حاضر ہوں جس نے انہیں بے شمار نعمتوں سے مالامال کیا اور وہ ان سے نعمتوں کے حق کے بارے میں سوال کرے، جنھوں نے ان کا حق پہچانا وہ صلہ پائیں اور جنھوں نے ناشکری کی وہ سزا بھگتیں۔

سائنسی نکتہ: قرآنِ حکیم میں سات مقامات پر یہ ذکر ملتا ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق چھ دنوں میں ہوئی، لیکن یہ قرآنِ حکیم کا واحد مقام ہے جہاں نہ صرف ان چھ دنوں کی مزید تفصیل و تقسیم (Break up) دی گئی ہے بلکہ اس تخلیقی عمل کی ترتیب (Sequence) کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے۔ یعنی پہلے زمین بنی اور سات آسمان اس کے بعد وجود میں آئے۔ لیکن ابھی تک ہم نہ تو مذکورہ چھ (۶) دنوں کے مفہوم کو سمجھ سکے ہیں اور نہ ہی زمین و آسمان کے تخلیقی عمل کی ترتیب سے متعلق سائنٹیفک (Scientific) انداز میں کچھ جان سکتے ہیں۔ ممکن ہے مستقبل میں کسی وقت سائنس ضرور ان معلومات تک رسائی حاصل کرے گی اور انسان اس حقیقت کی تہہ تک ضرور پہنچ جائے گا کہ زمین و آسمان کے وجود میں آنے کی صحیح ترتیب وہی ہے جو قرآنِ کریم نے بیان فرمائی ہے۔

آیت نمبر ۱۳: حق کا انکار کرنے والوں کو وعید سنائی گئی ہے کہ باز نہ آنے کی صورت میں ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو قوم عاد اور قوم ثمود کا ہوا۔

علمی بات: اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ مشرکین مکہ کو تنبیہ کی گئی ہے۔ اگر یہ مشرکین توحید ورسالت کے دلائل سن کر بھی توحید سے منہ موڑیں اور آپ ﷺ کی تکذیب کریں تو آپ ﷺ ان سے کہہ دیجئے کہ میں تمہیں ایسے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا کہ قوم عاد اور قوم ثمود پر اللہ ﷻ کا عذاب نازل ہوا۔ ان قوموں نے توحید کا انکار کیا اور اللہ ﷻ کے پیغمبروں کی تکذیب کی تو اللہ ﷻ کی طرف سے ان پر سخت کڑک آئی اور شدید عذاب نازل ہوا جس سے وہ ہلاک ہو گئے۔

علمی بات: "اَنۡذَرۡتُکُمۡ" کا عام طور پر اتنا ہی مفہوم بیان کیا جاتا ہے کہ میں نے ڈرایا۔ حالانکہ "ن ذ ر" کے مادہ کا اطلاق اس ڈرانے پر ہوتا ہے جس میں کم از کم دو خصوصیتیں ہوں۔ ایک تو وہ ڈرانا بروقت ہو۔ یوں نہیں کہ جب پتھر آسمان سے برسنے شروع ہو جائیں تو خطرہ کا الارم بجنے لگے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انذار سے مقصد صرف عذاب کی خبر دینا نہیں ہوتا بلکہ اصل مقصد اس شخص کی خیر خواہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچاؤ کا انتظام کرلے۔ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے کفار کو ڈرایا گیا ہے کہ اللہ ﷻ کی نافرمانی سے باز آجائیں اور اللہ ﷻ پر ایمان لے آئیں اور اس کی اطاعت اختیار کرلیں تاکہ اس کے عذاب سے بچ سکیں۔

علمی بات: صاعقہ بادل کی اس شدید کڑک کو کہتے ہیں جس کے ساتھ بجلی بھی گرے۔ یہ اس کا لغوی معنیٰ ہے لیکن اب اس کا اطلاق ہر مہلک عذاب پر بھی ہوتا ہے خواہ اس کی نوعیت کسی قسم کی ہو۔

فکری پہلو: اس آیت میں حق سے اِعراض کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ ان کے سامنے واضح طور پر دلائل آچکے ہیں، وہ نشانیاں دیکھ چکے ہیں، ان سب کے باوجود پھر بھی وہ اعراض کرتے ہیں اور ایمان نہیں لاتے، تو پھر اس کے لئے تیار ہو جائیں کہ اُن پر پہلی قوموں کی طرح اللہ ﷻ کا عذاب آسکتا ہے اور اُنہیں نافرمانی کی سزا مل سکتی ہے۔ لہٰذا ان کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لے آئیں اور اطاعت و فرماں برداری اختیار کرلیں تاکہ اللہ ﷻ کے عذاب اور سزا سے بچ سکیں۔

علمی بات: ابتدائے اسلام کے زمانہ میں کفارِ قریش نے آپ ﷺ کی دعوتِ حق کو قوت سے دبانے کی کوشش کی لیکن حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اسلام قبول کرنے کے بعد جب اسلام کی قوت روز بروز بڑھنے لگی تو قریشِ مکہ نے ترغیب اور لالچ سے اسلام کی قوت کو روکنے کی کوشش کی اور باہم مشاورت کے بعد عتبہ بن ربیعہ کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔ اس نے آپ ﷺ کو مال، سرداری وغیرہ کی پیشکش کی۔ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے سورۃ حٰمٓ السَّجْدَۃ کی تلاوت شروع کی تو عتبہ بن ربیعہ ان آیات کو بغور سننے لگا۔ جب آپ ﷺ آیت: ۱۳ پر پہنچے جہاں پر عذابِ الٰہی کا ذکر ہے تو اس نے آپ ﷺ کے منہ مبارک پر ہاتھ رکھ دیا اور نسب اور قرابت داری کا واسطہ دے کر آگے بڑھنے سے روک دیا۔ جب عتبہ بن ربیعہ اپنی قوم کے پاس واپس آیا تو جو کلام اس نے سنا تھا اس کے بارے میں بتلا دیا کہ یہ جادوگروں، شعراء اور کاہنوں کا کلام نہیں ہے، میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کو ان کے حال پہ چھوڑ دو۔ جب اس کے ساتھیوں نے اس کی بات سنی تو کہنے لگے کہ آپ کے کلام سے ہمارے دل پر پردے پڑے ہیں اور کانوں میں ڈاٹ ہے اور ہمارے اور آپ کے بیچ حجاب ہے۔

آیت نمبر ۱۴: سابقہ اقوام کے پاس لگاتار کئی رسول علیہم السلام بھیجے گئے جنہوں نے ان لوگوں کو ہر پہلو سے سمجھایا اور توحید کی دعوت دی۔ لیکن قوموں نے رسالت کا انکار کیا اور کہا کہ اگر اللہ ﷻ نے کسی کو نبی بنانا تھا تو کسی فرشتے کو بناتا۔

علمی بات: قومِ عاد و ثمود کی ہٹ دھرمی بیان کی گئی ہے۔ جو پیغمبر ان قوموں کی طرف بھیجے گئے انہوں نے ان قوموں کو سمجھانے کی بھرپور کوشش کی اور سمجھانے میں دن رات ایک کر دیئے کہ صرف ایک اللہ ﷻ کی عبادت کرو اور اس کے سوا کسی کو معبود مت بناؤ۔ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ اگر ہمارا رب چاہتا تو کسی فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجتا نہ کہ کسی انسان کو، لہٰذا ہم اس توحید کی دعوت کا انکار کرتے ہیں جس کے ساتھ آپ کو بھیجا گیا ہے یعنی ہم آپ کو بطور رسول کے قبول نہیں کرتے اور نہ ہی آپ کی دعوتِ توحید کو مانتے ہیں۔

علمی بات: یہاں پر قومِ عاد اور قومِ ثمود کا ذکر کر کے عرب کا وہ پورا علاقہ مراد لیا گیا ہے جہاں مختلف قوموں کی طرف پے در پے پیغمبر آئے۔ ان پیغمبروں اور ان کی اقوام کا ذکر قرآنِ حکیم میں بہت تکرار سے آیا ہے۔

علمی بات: "جب ان کے پاس رسول آئے ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے" اس فقرے کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے پاس کئی رسول آتے رہے۔ دوسرے یہ کہ رسولوں نے ہر پہلو سے اُنہیں سمجھانے کی کوشش کی اور ان کو راہِ راست پر لانے کے لئے کوئی تدبیر اختیار کرنے میں کسر نہ اٹھا رکھی۔ تیسرے یہ کہ ان کے پاس ان کے اپنے علاقہ میں بھی رسول آئے اور گرد و پیش کے علاقوں میں بھی آتے رہے۔

علمی بات: یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرشتوں کو نبی کیوں نہیں بنایا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اللہ ﷻ کسی فرشتہ کو نبی بنا کر بھیجتا تو اس کی دو صورتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ فرشتہ اپنی اصلی شکل میں آتا تو اس صورت میں فرشتہ کی ہیبت و جلال کی وجہ سے لوگ استفادہ نہ کر سکتے بلکہ دیکھتے ہی فنا ہو جاتے۔

دوسری صورت یہ تھی کہ فرشتہ انسانی شکل میں آتا تو اس صورت میں کفار پھر وہی اعتراض کرتے کہ یہ تو ہماری طرح انسان ہے کسی فرشتہ کو نبی کیوں نہیں بنایا گیا؟ اللہ ﷻ کا ارشاد گرامی ہے: "آپ فرما دیجیے کہ اگر زمین میں (انسانوں کے بجائے) فرشتے ہوتے جو اطمینان سے چلتے پھرتے تو ضرور ہم ان پر آسمانوں سے فرشتہ رسول (بنا کر) بھیجتے۔" (سورۃ بنی اسرائیل ۱۷، آیت: ۹۵) یعنی اگر زمین پر فرشتے آباد ہوتے تو اللہ ﷻ ضرور کسی فرشتہ کو نبی بنا کر بھیجتا مگر یہاں تو انسان آباد ہیں اور انسانوں کی ہدایت کے لئے انسان ہی ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے اقوال اور افعال سے ایسا نمونہ پیش کرے جو دوسروں کے لئے ہدایت کا ذریعہ ہو، اس لئے اللہ ﷻ نے انسانوں میں سے ہی اپنے رسول بنا کر بھیجے۔

آیت نمبر ۱۵: قومِ عاد نے دعوتِ توحید کو تکبر سے ٹھکرا دیا۔ عذابِ الٰہی کی وعید پر انہوں نے کہا کہ ان سے زیادہ طاقتور کون ہے جو اُنہیں عذاب میں مبتلا کر دے اور وہ اسے روکنے پر قادر نہ ہوں۔ اللہ ﷻ کی طرف سے جواب عطا ہوا ہے کہ جس ہستی نے اُنہیں پیدا کیا ہے وہ ان سے قوت میں بہت زیادہ ہے مگر باوجود اس کے وہ ایمان نہیں لائے۔

علمی بات: قومِ عاد کے لوگوں نے زمین پر ناحق غرور و تکبر کیا۔ وہ اپنے آپ کو استحقاق کے بغیر دوسروں سے بڑا اور برتر سمجھنے لگے۔ جب ان کو عذابِ الٰہی سے ڈرایا گیا تو ان کی سرکشی حد سے بڑھ گئی اور کہنے لگے کہ ہم سے زیادہ طاقتور اور مضبوط کون ہے؟ ہمارے مقابلہ میں کون ایسا طاقتور ہے جو ہمیں عذاب میں مبتلا کر سکے اور ہم اس کے سامنے عاجز اور بے بس ہو جائیں اور مقابلہ نہ کر سکیں۔ یعنی ان کے زعم کے مطابق ایسا کوئی بھی نہ تھا جو ان سے طاقت میں بڑھ کر ہو۔ وہ اس بات کو بھول گئے کہ جس اللہ ﷻ نے ان کو ایسا تنومند و توانا اور صحت مند، مضبوط، بڑا قد و قامت اور طاقتور پیدا کیا ہے وہ ان سے کہیں زیادہ طاقت والا ہے۔ بہر حال قومِ عاد نے اللہ ﷻ کی ساری آیات اور نشانیوں کا انکار کر دیا۔

علمی بات: قومِ عاد کے لوگ بڑے دراز قد اور طاقتور تھے، اس لئے وہ اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنی جسمانی قوت اور مادی طاقت کے نشہ میں مبتلا ہو کر تکبر کیا اور سرکشی کی راہ اختیار کی۔ اُنہیں قوت و طاقت پر اتنا ناز تھا کہ وہ کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے حتیٰ کہ اللہ ﷻ کے عذاب کا خوف بھی ان کے دل سے نکل گیا تھا۔ وہ اس زعمِ باطل میں مبتلا ہو گئے کہ وہ اپنی طاقت کے ذریعہ سے اللہ ﷻ کے عذاب کو بھی روک لیں گے۔ ان کے اسی غرور و تکبر کی وجہ سے ان پر عذابِ الٰہی نازل ہوا۔

علمی بات: آیات کے انکار سے مراد ان معجزات کا انکار ہے جو انبیاء کرام علیہم السلام کو اللہ ﷻ نے دیئے تھے یا ان دلائل کا انکار جو پیغمبروں کے ساتھ نازل کیئے گئے تھے یا ان آیاتِ تکوینیہ کا انکار جو کائنات میں پھیلی اور بکھری ہوئی ہیں۔ قومِ عاد نے ان تینوں قسم کی آیات کا انکار کیا۔

عملی و فکری پہلو: انسان کو اپنی جسمانی قوت اور مادی طاقت کی بنا پر کبھی تکبر نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اصل طاقت اور قدرت اللہ ﷻ کے پاس ہے۔ اللہ ﷻ کے سامنے انسان کی صلاحیتوں کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ انسان اپنی طاقت کے باوجود کمزور ہے کیونکہ اس میں بہت ساری کمزوریاں اور خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً دنیا میں طوفان، آندھیاں اور زلزلے وغیرہ آتے ہیں جنہیں انسان روک نہیں سکتا۔ بعض اوقات انسان ایسے امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے جن سے کوئی اسے صحت نہیں دے سکتا۔ جب انسان کی موت آتی ہے تو کوئی اسے بچا نہیں سکتا۔ لہٰذا انسان کو چاہیئے کہ وہ عاجزی اختیار کرے اور اپنے رب کے سامنے تکبر نہ کرے بلکہ اپنے آپ کو اللہ ﷻ کا فرماں بردار بندہ بنا لے۔

آدمی ایک ایسی دنیا میں ہے جہاں زمین و آسمان کی عظمتیں اس کی بڑائی کی نفی کر رہی ہیں۔ جہاں موت کا واقعہ ہر روز انسان کو حقیر اور بے زور ثابت کر رہا ہے۔ اس کے باوجود آدمی بڑا بنتا ہے۔ پھر بھی وہ اس گمان میں رہتا ہے کہ وہ زور والا ہے۔ اللہ ﷻ بار بار حقیقت کا اعلان کراتا ہے۔ وہ بار بار انسان کی بڑائی کے دعوے کو باطل ثابت کر رہا ہے۔ مگر اہلِ باطل ہٹ دھرم اس وقت تک نصیحت نہیں قبول کرتے جب تک اُنہیں مٹا نہ دیا جائے۔ قومِ عاد و ثمود اور دوسری قوموں کے کھنڈر اسی کی مثال ہیں۔ انہوں نے جن دنوں کو اپنے لئے مبارک سمجھ رکھا تھا وہی دن اللہ ﷻ کے حکم سے ان کے لئے منحوس دن بن کر رہ گئے۔

آیت نمبر ۱۶: قومِ عاد پر ایک تیز اور سخت ہوا ایسے دنوں میں بھیجی گئی جو عذاب کی وجہ سے ان کے حق میں خیر سے خالی تھی۔ تاکہ اللہ ﷻ ان کو دنیا کی زندگی میں رسوائی کے عذاب کا مزہ چکھائے۔ آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ رسوا کرنے والا ہو گا اور اس وقت کوئی ان کی مدد نہیں کرے گا۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے قومِ عاد کے غرور اور گھمنڈ کو توڑنے کے لئے ان پر عذاب نازل کیا۔ اللہ ﷻ نے تیز و تند ہوا کا طوفان بھیجا۔ اس ہوا نے ان میں سے ایک کو بھی نہ چھوڑا۔ یہ دن ان کے لئے بڑے بُرے ثابت ہوئے کہ وہ سب لوگ عذابِ الٰہی سے دوچار ہو کر ہلاک ہو گئے۔ اس عذاب کے ذریعہ سے اللہ ﷻ نے اُنہیں دنیا میں رسوا کیا۔ اس کے مقابلہ میں آخرت میں جو عذاب اُنہیں دیا جائے گا وہ اس سے کئی گنا زیادہ رسوا کن ہوگا اور وہاں پر کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ ہوگا۔

علمی بات: قومِ عاد پر جو عذاب نازل ہوا اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ ﷻ نے ان پر ایک نہایت تیز و تند ہوا یعنی آندھی بھیجی جس میں سخت آواز تھی۔ یہ ہوا ان کے پتھر کے بنے ہوئے مکانوں اور ایوانوں میں گھس گئی۔ اس کی تیزی کا یہ حال تھا کہ اس نے (نہ) کوئی درخت صحیح و سالم چھوڑا نہ مکان نہ مویشی اور نہ انسان۔ سب ایک دوسرے پر گرے پڑے تھے۔ وہ گر گر کر مر جاتے اور مر مر کر گرتے جاتے تھے۔ یہ ہوا مسلسل سات راتوں اور آٹھ دن تک چلتی رہی۔ اس نے پوری قوم کے افراد کا ستیاناس کر کے رکھ دیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "اور رہے (قوم) عاد تو وہ ہلاک کیئے گئے (ایسی) تیز آندھی سے جو انتہائی سرد (اور) بے قابو تھی۔ (اللہ نے) اس (آندھی) کو ان پر مسلط رکھا سات راتیں اور آٹھ دن لگاتار۔ پس آپ دیکھتے کہ وہ لوگ وہاں اس طرح گرے ہوئے پڑے تھے جیسے کہ وہ کھجوروں کے کھوکھلے تنے ہوں۔" (سورۃ الحاقہ ۶۹، آیات: ۶، ۷)

علمی بات: کوئی دن یا رات اپنی ذات میں نحوست نہیں رکھتا ہے۔ اس آیت میں "نحوست کے دنوں" سے مراد یہ ہے کہ ان دنوں میں چونکہ قومِ عاد پر عذاب نازل ہوا تھا، اس بنا پر وہ دن ان کے حق میں نحوست کے دن اور بُرے تھے۔ "نحوست کے دنوں" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دن کے بجائے خود نحوست والے تھے اور عذاب اس لئے آیا کہ یہ منحوس دن قومِ عاد پر آ گئے تھے۔ یہ مطلب اگر ہوتا اور بجائے خود ان دنوں ہی میں کوئی نحوست ہوتی تو عذاب دور و نزدیک کی ساری ہی قوموں پر آ جاتا، حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ لہٰذا اس آیت سے دنوں کے منحوس ہونے پر استدلال کرنا درست نہیں ہے۔

فکری پہلو: قومِ عاد کو اپنی طاقت اور قد و قامت پر غرور تھا۔ اللہ ﷻ نے ان کا غرور توڑنے کے لئے ایک کمزور سی مخلوق ہوا کو، جس کی روانی اور جھونکوں کے لئے سب ترستے ہیں، ان پر مسلط کر دیا۔ اس ہوا نے اُنہیں تباہ و برباد کر دیا۔ ذلّت و رسوائی کے اس عذاب نے ان کے غرور و تکبر اور شان و شوکت کا خاتمہ کر دیا۔ وہ جو خم ٹھونک کر کہتے تھے کہ ہم سے زیادہ زور آور کون ہے، اللہ ﷻ نے اُنہیں اس طرح ذلیل کیا کہ ان کو ہلاک کر دیا اور ان کے تمدن کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا۔ تمام انسانوں کو قومِ عاد کے اس انجام سے سبق حاصل کرنا چاہیئے اور غرور و تکبر کے بجائے اللہ ﷻ کی اطاعت و بندگی اختیار کرنی چاہیئے۔

آیت نمبر ۱۷: قومِ ثمود کو توحید کی دعوت دی گئی لیکن انہوں نے ہدایت پر اندھے پن یعنی گمراہی کو ترجیح دی۔ جس کے نتیجہ میں وہ ذلّت والے سخت عذاب کی گرفت میں آ گئے۔ یہ بدلہ تھا ان کے اُن بُرے اعمال کا جن کا وہ ارتکاب کیا کرتے تھے۔

علمی بات: قومِ ثمود کو اللہ ﷻ نے سیدھا راستہ دکھایا۔ اللہ ﷻ نے ان کی طرف اپنے رسول حضرت صالح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ان لوگوں کی سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کی۔ مگر انہوں نے ہدایت کی روشنی کو چھوڑ کر گمراہی کی تاریکی میں رہنا پسند کیا اور اللہ ﷻ اور اس کے رسول علیہ السلام کا انکار کر دیا۔ ان کی سرکشی کی وجہ سے ان پر کڑک کا ذلّت آمیز عذاب آیا اور اُنہیں تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ ان کے بُرے اعمال کی وجہ سے اُنہیں یہ سخت عذاب دیا گیا۔

علمی بات: قومِ ثمود کو عادِ ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ اللہ ﷻ نے اپنے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کو ان کی طرف مبعوث فرمایا۔ قومِ ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام سے اونٹنی کے پہاڑ سے برآمد ہونے کا مطالبہ کیا جسے اللہ ﷻ نے پورا کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کی لائی ہوئی ہدایت کو قبول نہ کیا اور اپنے جاہلانہ اور مشرکانہ رسم و رواج کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ یہ قوم بھی قد و قامت، ڈیل ڈول اور قوت میں اپنے سے پہلی قومِ عاد سے کسی طرح کم نہ تھی۔ فنِ تعمیر، سنگ تراشی کے بہترین ماہر تھے۔ پہاڑوں کے اندر پتھر تراش تراش کر صرف مکان ہی نہیں بناتے تھے بلکہ راستے بنا کر پہاڑوں کے اندر ہی بستیاں آباد کر رکھی تھیں۔ ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے جب ان کے دن گنے جا چکے تو ان پر دوہرا عذاب آیا۔ چنانچہ نیچے سے زلزلہ آیا جس سے ان کے پہاڑوں کے اندر مکانوں میں دراڑیں اور شگاف پڑ گئے اور اوپر کڑک اتنی شدید تھی جس سے ان کے دل، جگر پھٹ گئے۔

آیت نمبر ۱۸: البتہ ایمان لانے والے جو اللہ ﷻ کی نافرمانیوں سے بچتے تھے اُنہیں عذاب سے بچا لیا گیا۔

علمی بات: یہ سنت الٰہی ہے کہ جو لوگ اللہ ﷻ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے، اللہ ﷻ نے اُنہیں عذاب سے بچالیا۔ آندھی نے تمام قومِ عاد کو موت کی نیند سلادیا، لیکن اہل ایمان کو ذرا گزند نہ پہنچائی۔ اسی طرح قوم ثمود پر جو عذاب آیا اس کی زد سے حضرت صالح علیہ السلام اور ان کے پیروکار محفوظ رہے۔

علمی بات: حضرت صالح علیہ السلام کو عذاب نازل ہونے سے پہلے ہجرت کا حکم دے دیا گیا تھا۔ چنانچہ آپ علیہ السلام ایمان داروں کے ہمراہ بحکم الٰہی ہجرت کرکے فلسطین کی طرف چلے گئے اور رملہ کے قریب جاکر آباد ہوئے اور اسی مقام پر آپ علیہ السلام نے وفات پائی۔

فکری و عملی پہلو: قومِ عاد و ثمود کے انجام سے ان لوگوں کے انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جنہوں نے ان قوموں جیسی روش اختیار کر رکھی ہے کہ وہ اپنی طاقت و دولت کے گھمنڈ میں کسی صحیح بات سننے کے روادار نہیں۔ لیکن جو لوگ اللہ ﷻ کے رسول علیہ السلام پر ایمان لائے اور ان کی دعوت سے متاثر ہو کر انہوں نے تقویٰ کی زندگی اختیار کی۔ ہر کام سے پہلے اللہ ﷻ کی شریعت کو دیکھنے اور اللہ ﷻ کے احکام کو جاننے کو انہوں نے اپنی روش بنالیا۔ اور اللہ ﷻ کے احکام پر عمل کرتے ہوئے ہمیشہ اس بات کا دھیان رکھا کہ ان کا ہر عمل صرف اللہ ﷻ کی رضا کے لئے ہو۔ نہ اس میں بے عملی راہ پائے اور نہ وہ ریا کا شکار ہو اور ان کے دلوں میں اللہ ﷻ کا خوف اس طرح جگہ بنالے کہ اللہ ﷻ کی نافرمانی کا تصور بھی ان کے لئے تکلیف دہ ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ ﷻ نے عذابِ الٰہی سے محفوظ رکھا۔ تمام انسانوں کو چاہیئے کہ وہ ان مومنین کی طرح صدقِ دل سے ایمان لائیں، تقویٰ اختیار کریں، ہمیشہ نیک اعمال کریں اور ہر قسم کی نافرمانیوں سے بچیں۔

آیت نمبر ۱۹: روزِ قیامت اللہ ﷻ کے دشمنوں کو جہنم کی طرف لے جاتے ہوئے اکٹھا کیا جائے گا۔ پھر الگ الگ جرائم کے مطابق ان کی گروہ بندی کی جائے گی۔

علمی بات: قیامت کے دن اللہ ﷻ کے دشمنوں کو آگ کی طرف اکٹھا کرکے لے جایا جائے گا اور اُنہیں اس طرح اکٹھا کیا جائے گا کہ آگے والوں کو آگے جانے سے اور پیچھے والوں کو پیچھے جانے سے روک کر اکٹھا کرلیا جائے گا، پھر ان کی الگ الگ ترتیب لگائی جائے گی، ان کے جرائم کے مطابق ان کی ٹولیاں بنائی جائیں گی اور اُنہیں دھکیل کر جہنم کی طرف لے جایا جائے گا۔

علمی بات: کردار و اعمال کے حوالہ سے اہل جہنم سب برابر نہیں ہوں گے۔ ہر مجرم کا عذاب اس کے جرم کے مطابق ہوگا۔ چنانچہ وہاں جرائم اور سزاؤں کی اقسام کے مطابق اہل جہنم کو الگ الگ جماعتوں اور گروہوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

عملی پہلو: یہ سب بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اس سے عبرت حاصل کریں اور اللہ ﷻ کی دشمنی اور نافرمانی سے باز آجائیں۔

آیت نمبر ۲۰: مجرمین پر جرائم ثابت کرنے کے لئے گواہ پیش ہوں گے لیکن وہ اپنے جرائم کا انکار کریں گے۔ اس وقت ان کے اعمال کے متعلق خود ان کے کان، آنکھیں اور کھالیں ان کے خلاف گواہی دیں گی۔

علمی بات: قیامت کے دن اللہ ﷻ کے دشمنوں کو آگ کی طرف لایا جائے گا۔ جب وہ آتش جہنم کے قریب آجائیں گے تو ان سب کو روک کر ایک جگہ جمع کردیا جائے گا جہاں ان کا حساب ہوگا۔ وہاں ان کے کان، ان کی آنکھیں اور کھالیں ان کے خلاف ان اعمال کی گواہی دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے۔ قیامت کے دن جہاں دوست عزیز کوئی ساتھ نہ دے گا سب آنکھیں پھیر لیں گے، وہیں خود انسان کے ہاتھ پیر، اس کے کل اعضا جن کو وہ اپنا سمجھتا رہا وہ بھی اس کی بداعمالیوں پر اس کے خلاف اپنے رب کے حضور گواہ ہوں گے۔

سائنسی نکتہ: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اس دنیا میں جو بھی اچھے یا برے اعمال بجالاتا ہے، ان کے اثرات ان اعضا پر بھی ثبت ہوتے جاتے ہیں جن کو اس کام کے دوران استعمال کیا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں نطق جِلدی (Skin Speech Theory) کے نظریہ نے اس کو عملی طور پر ثابت کردیا ہے۔ اب یہ معلوم کیا گیا ہے کہ انسان کا ہر بول اس کے جسم کی کھال پر نقش ہوتا رہتا ہے اور اس کو دوبارہ اسی طرح سنا جاسکتا ہے جس طرح مشینی طور پر ریکارڈ کی ہوئی آواز کو دوبارہ سنا جاتا ہے۔ چنانچہ قیامت کے روز جو مجرم اپنے گناہوں کا اور پھر خارجی گواہیوں کا بھی انکار کردیں گے، ان پر انہی کے اعضا کو گواہ بنا کر لایا جائے گا۔

علمی بات: عالم آخرت محض ایک روحانی عالم نہیں ہو گا بلکہ انسان وہاں دوبارہ اسی طرح جسم وروح کے ساتھ زندہ کیئے جائیں گے جس طرح وہ اب اس دنیا میں ہیں۔ ان کو جسم بھی وہی دیا جائے گا جس میں اب وہ رہتے ہیں اور وہ ان ہی جسموں کے ساتھ اٹھائے جائیں گے جن کے اندر رہ کر وہ دنیا میں کام کر چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ انسان کے اعضا وہاں اسی صورت میں گواہی دے سکتے ہیں جبکہ وہ وہی اعضا ہوں جن سے اس نے اپنی پہلی زندگی میں جرم کا ارتکاب کیا تھا۔

عملی پہلو: انسان اپنے اعضا سے جو اعمال وافعال کر رہا ہے، ان کا ریکارڈ تیار ہو رہا ہے۔ قیامت کے دن یہی اعضا یہ سارا ریکارڈ پیش کریں گے۔ اللہ ﷻ کی نشانیاں دیکھنے سے آنکھوں کو اور نصیحت کی باتیں سننے سے کانوں کو بند کر لینا، سب سے بڑا جرم ہے۔ جن چیزوں کا دیکھنا حرام ہے ان کو دیکھنا اور جن چیزوں کا سننا حرام ہے ان کو سننا، کھلی معصیت ہے۔ لہٰذا جن گناہوں کا ارتکاب آنکھوں اور کانوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے، وہ قیامت کے دن ان کی گواہی دیں گے، اتنا ہی نہیں بلکہ جسم کا رواں رواں گواہی دے گا کہ اس کو کس طرح کفر ومعصیت کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان اعضا کو اللہ ﷻ کی اطاعت وفرماں برداری میں استعمال کیا جائے اور ان سے کوئی ایسا کام نہ لیا جائے جو اللہ ﷻ کی ناراضگی اور جہنم میں جانے کا باعث بنے۔

آیت نمبر ۲۱: اعضا کی گواہی پر مجرم اپنے اعضا سے شکوہ کریں گے کہ وہ ان کے خلاف گواہی کیوں دے رہے ہیں؟ ان کی کھالیں جواب دیں گی کہ ان کو اللہ ﷻ نے بولنے کا حکم دیا ہے جس کی قدرت کا عالم یہ ہے کہ وہ جس چیز کو چاہے گویائی بخش دے۔ اسی نے انہیں پہلی دفعہ پیدا کیا تھا اور اسی کی طرف وہ لوٹائے جا رہے ہیں۔

علمی بات: قیامت کے دن گناہ گاروں کے اعضا ان کے خلاف ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ اس وقت یہ لوگ اپنے بدن کی کھال سے، جس سے آواز نکل رہی ہو گی، کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی، حالانکہ یہ سب بُرے اعمال ہم تمہیں راحت پہنچانے کی خاطر کرتے تھے اور تمہاری یہ گواہی تمہارے ہی دردوالم کا سبب ہو گی؟ بدن کی کھال جواب دے گی کہ ہمیں اس اللہ ﷻ نے قوتِ گویائی عطا فرمائی ہے جس نے ہر شے کو اس کے حسبِ حال گویائی عطا فرمائی ہے، اسی اللہ ﷻ نے ہمارے ذریعہ سے یہ گواہی دلوائی ہے۔ اس کے بعد یہ بیان کیا گیا ہے کہ تمہیں اپنے اعضا کی قوت گویائی پر حیرت کیوں ہوتی ہے؟ یہ تو اس اللہ ﷻ کا حکم ہو گا جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا ہے، وہ یقیناً تمہارے اعضا کو قوتِ گویائی دینے پر قادر ہے اور یاد رکھو کہ تمہیں لوٹ کر اسی کے پاس جانا ہے۔

علمی بات: زبان بھی ویسے ہی گوشت اور پٹھوں کا ایک ٹکڑا ہے جیسے دوسرے اعضا ہیں۔ قوتِ گویائی میں صرف زبان ہی کام نہیں کرتی بلکہ گلے کی رگیں جن کی وجہ سے کسی کی آواز سریلی ہوتی ہے کسی کی کرخت، پھر ہونٹ اور تالو وغیرہ سب استعمال میں آتے ہیں، تب جا کر انسان بولتا ہے۔ جسم کے اعضا کا مواد ایک جیسا ہے صرف ساخت کا فرق ہے۔ اللہ ﷻ نے ان اعضا کی ایسی ساخت بنائی ہے جس سے کوئی جا کر بولنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ تو جو ہستی ان اعضا کی ساخت اور بالخصوص پہلی بار کی ساخت پر قادر ہے اس کے لئے بوقت ضرورت کسی دوسرے عضو کی ساخت میں ایسی تبدیلی کر دینا کیا مشکل ہے جس سے وہ بولنے لگے۔ لہٰذا اللہ ﷻ قیامت کے دن مجرموں کے ان دوسرے اعضا کو بھی قوت گویائی عطا فرمائے گا جس کے نتیجہ میں یہ اعضا ان کے خلاف ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔

فکری پہلو: جب اللہ ﷻ عدم محض سے انسان کو وجود بخش سکتا ہے، نیست سے ہست کر سکتا ہے، اور انسانی جسم کے اندر اور باہر طرح طرح کے عجائب پیدا کر سکتا ہے تو پھر اس کے لئے جسم کے اعضا کو قوت گویائی دے دینا آخر کیوں اور کیا مشکل ہو سکتا ہے؟ اور اس کے لئے انسان کو دوبارہ پیدا کر دینا آخر کیوں اور کیا مشکل ہو سکتا ہے؟ اور جس نے تمام انسانوں کو اس قدر پر حکمت طریقہ سے پیدا کیا ہے، کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ اس نے انسان کی یہ تخلیق عبث و بے کار فرمائی ہو؟

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوتے تھے کہ آپ ﷺ مسکرانے لگے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: "کیا تم جانتے ہو کہ میں کیوں مسکرا رہا تھا؟" ہم نے عرض کیا: اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ ہی خوب جاننے والے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "میں بندہ کی اس کے رب کے ساتھ بات چیت پر مسکرا رہا تھا"، بندہ کہے گا: اے میرے رب! کیا تو مجھے ظلم سے پناہ نہیں دے چکا؟ اللہ ﷻ فرمائے گا: کیوں نہیں۔ بندہ کہے گا: میں اپنے خلاف کسی اور کی گواہی قبول نہیں کروں گا سوائے اپنی ذات کی گواہی کے۔ اللہ ﷻ فرمائے گا: آج کے دن تجھ پر تیری ہی گواہی کافی ہو گی اور کراماً کاتبین کی گواہی (اس کے علاوہ ہو گی)۔ فرمایا: چنانچہ اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی اور اس کے اعضا سے کہا جائے گا کہ بولو! فرمایا: تو اس کے اعضا اس کے اعمال کے بارے میں بتائیں گے، پھر اسے اور (اس کے اعضا کے) بولنے کو اکیلا چھوڑ دیا جائے گا۔ فرمایا: تو (ان کی گواہی سن کر) وہ کہے گا دور ہو جاؤ، میں تمہاری طرف سے (دوسروں کے ساتھ) جھگڑا کرتا تھا۔ (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۲۲: مجرمین دنیا میں گناہ کرتے ہوئے یہ خیال نہیں کرتے تھے کہ خود ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ بلکہ وہ تو اللہ ﷻ کے علم کے بھی منکر تھے اور گمان کرتے تھے کہ ان کے بہت سے اعمال سے اللہ ﷻ باخبر نہیں ہے۔ (معاذاللہ)

شانِ نزول: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ تین آدمی دو ثقفی (قبیلہ بنو ثقیف سے) تھے اور ایک قریشی یا دو قریشی ایک ثقفی حرم کعبہ میں جمع ہوئے آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ یہ تینوں خوب فربہ اور بھاری جسامت والے تھے مگر عقل کے حوالہ سے گویا سب ہی ناقص اور بے بہرہ تھے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے پوچھا: تمہارا کیا خیال ہے کہ اللہ ﷻ ہماری باتیں سن سکتا ہے؟ دوسرا بولا: ہاں! اونچی آواز سے بات کریں تب تو سن لیتا ہے اور اگر آہستہ آہستہ آواز سے چپکے چپکے کریں تو پھر نہیں سنتا۔ تیسرا کہنے لگا: اگر وہ اونچی آواز کو سن لیتا ہے تو آہستہ آواز والی بات بھی سن سکتا ہے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

علمی بات: قیامت کے دن کافروں سے کہا جائے گا کہ تم دنیا میں جو کام کرتے تھے اس کا تمہیں ذرا بھی احتمال نہ تھا کہ قیامت کے دن تمہارے کان، آنکھیں اور جلد تمہارے خلاف گواہی دیں گے لہٰذا تم ان سے نہ چھپتے تھے نہ چھپ سکتے تھے۔ اسی لئے تم بے دھڑک بدکاریوں اور بداعمالیوں میں مبتلا رہے۔ تم نے اللہ ﷻ کے بارے میں بھی یہ خیال کر رکھا تھا کہ وہ تمہارے بہت سے اعمال سے بے خبر ہے لیکن یہ تمہاری خام خیالی تھی کیونکہ اللہ ﷻ کے پاس ہر چیز کا علم ہے۔

عملی پہلو: جب انسان بُرائی کرتا ہے تو وہ لوگوں سے چھپ جاتا ہے کہ رسوائی نہ ہو، مگر یہ بھول جاتا ہے کہ اس کے جسم کے اعضا یعنی کان، آنکھیں اور جلد ہر وقت اس کے ساتھ ہیں اور اس کے اعمال کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ یہی اعضا قیامت کے دن اس کے خلاف اس کے اعمال کی گواہی دیں گے جس کا وہ انکار بھی نہ کر سکے گا۔ لہٰذا اہل ایمان کو ہر لمحہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کے اعضا ان کے عینی گواہ ہیں جو ہر وقت ان کے ساتھ ہیں بلکہ زمین کے ٹکڑے اور دن رات کے اوقات بھی انسان کے شاہد ہیں جو قیامت کے دن اللہ ﷻ کے حضور انسان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ پس ہر انسان کو اپنے اعمال کا محاسبہ کرنا چاہیئے اور نیک اعمال کرنے چاہیئے اور بُرے اعمال سے اپنے آپ کو بچانا چاہیئے۔

آیت نمبر ۲۳: اپنے رب کے متعلق اسی گمان نے مجرمین کو تباہی میں ڈالا اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نقصان اٹھانے والے ہو گئے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کے بارے میں منکرین کا یہ غلط گمان تھا کہ اللہ ﷻ ان کے بہت سے کاموں سے بے خبر ہے۔ (معاذاللہ) ان کے اس باطل گمان اور فاسد عقیدہ نے ان کو ہلاک اور برباد کر دیا کیونکہ اس گمان کی بنیاد پر وہ کفریہ عقائد اور کفریہ اعمال کے مرتکب ہوئے اور ہمیشہ کے خسارہ میں پڑے رہ گئے کہ اب اس سے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے۔

علمی بات: اس آیت سے واضح طور پر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انسان جس قسم کی معرفت اپنے پروردگار کی نسبت رکھتا ہے اس طرز اور اسی سانچہ میں اس کی پوری زندگی ڈھل جاتی ہے۔ اگر اللہ ﷻ کی معرفت درست ہو گی تو اس کا طرزِ عمل پورے کا پورا درست رہے گا اور اس کے نتائج بھی درست نکلیں گے اور اگر معرفت ہی مشکوک یا غلط ہو گی تو اس کے دنیوی یا اخروی نتائج بھی ویسے ہی نکلیں گے۔

فکری پہلو: اللہ ﷻ کے بارے میں بدگمانی باعث ہلاکت و تباہی ہے کہ اس سے زاویہ نگاہ ہی بدل جاتا ہے۔ اس کے طور طریقہ بدل جاتے ہیں اور وہ حق اور حقیقت سے محروم ہو کر دائمی ہلاکت کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔

عملی پہلو: اس حوالہ سے ہمیں خود اپنے بارے میں بھی غور کرنا چاہیئے۔ اگرچہ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ ﷻ ہماری ایک ایک حرکت کو دیکھتا اور جانتا ہے لیکن اپنے اس ایمان کے مطابق ہمارے دلوں میں اس بارے میں یقین پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم غلط کام کرتے ہوئے اس حقیقت سے لاپرواہی برت جاتے ہیں کہ اللہ ﷻ ہمیں دیکھ رہا ہے، ورنہ اگر واقعی کسی کے دل میں یقین ہو کہ اللہ ﷻ اسے دیکھ رہا ہے تو بھلا وہ کوئی غلط حرکت کیسے کر سکتا ہے۔

آیت نمبر ۲۴: روز قیامت اہل جہنم چاہیں گے کہ کسی طرح اللہ ﷻ کو راضی کر لیں یا اپنے سابقہ جرائم پر توبہ کر لیں لیکن اُنہیں ایسا کوئی موقع نہیں دیا جائے گا۔ بلکہ ہر حال میں اُنہیں آگ کے عذاب سے ہی دوچار ہونا ہو گا۔

علمی بات: دنیا میں جب کوئی انسان مصیبت پر صبر کرتا ہے تو اس کی مصیبت ٹل جاتی ہے اور آخرت میں اجر عظیم بھی ملتا ہے اور جب کوئی انسان اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہے تو اللہ ﷻ اس کے گناہ معاف فرما دیتا ہے، مگر منکرین کو قیامت کے دن جب جہنم رسید کر دیا جائے گا تو وہ جہنم کے اندر صبر کریں یا شور مچائیں وہ ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے اور اگر وہ جہنم کے اندر معافی مانگیں گے تو بھی اُنہیں معافی نہیں ملے گی کیونکہ صبر کرنے اور معافی مانگنے کا تعلق دار العمل سے تھا جہاں وہ یاد الٰہی سے غافل ہو کر سرکشی میں سرگرم رہے۔ اب آخرت تو دار الجزا ہے، یہاں اُنہیں اپنے کرتوں کی سزا بھگتنا ہوگی۔

علمی بات: معافی مانگنے اور استغفار کرنے کا موقع دنیا میں ہے۔ انفرادی طور پر ہر آدمی کی موت کے وقت تک اور اجتماعی طور پر قیامت کے آثار نمایاں ہونے تک توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ اس کے بعد عالم برزخ یا عالم آخرت میں توبہ قبول نہیں ہوگی۔

عملی پہلو: دنیاوی زندگی کی یہ فرصت جو آج ہمیں میسر ہے اور جو دراصل آخرت کمانے ہی کے لئے عطا فرمائی گئی ہے کس قدر قیمتی اور کتنی عظیم الشان نعمت ہے۔ اللہ ﷻ محض اپنے فضل و کرم سے ہمیں اس فرصت زندگی سے صحیح طور پر استفادہ کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین

آیت نمبر ۲۵: نافرمانوں کی آزمائش کے لئے اللہ ﷻ اُنہیں بُرے لوگوں کی رفاقت دے دیتا ہے جو ان کے جرائم کو ان کے لئے مزیّن کرتے رہتے ہیں۔

مراد وہ شیاطین و انسان ہیں جو باطل پر اصرار کرنے والوں کے ساتھ لگ جاتے ہیں۔ سابقہ اقوام کے نافرمان جنات اور انسانوں کی طرح نزولِ قرآن کے دور کے نافرمانوں پر بھی عذاب کا وعدہ پورا ہوگا۔ بلاشبہ یہ سب نقصان اٹھانے والے ہیں۔

علمی بات: یہ اللہ ﷻ کی مستقل اور دائمی سنت ہے کہ وہ بُری نیت اور بُری خواہشات رکھنے والے انسانوں کو کبھی اچھے ساتھی نہیں دلواتا، بلکہ اُنہیں ان کے اپنے رجحانات کے مطابق بُرے ساتھی ہی دلواتا ہے۔ پھر جتنے جتنے وہ بدی کی پستیوں میں گہرے اُترتے جاتے ہیں اتنے ہی بدتر سے بدتر آدمی اور شیاطین ان کے ہم نشین اور مشیر اور رفیق کار بنتے چلے جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ فلاں صاحب بذاتِ خود تو بہت اچھے ہیں، مگر اُنہیں ساتھی بُرے مل گئے ہیں، حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ قانونِ فطرت ہے کہ ہر شخص کو ویسے ہی دوست ملتے ہیں جیسا وہ خود ہوتا ہے۔ ایک نیک آدمی کے ساتھ اگر بُرے لوگ لگ بھی جائیں تو وہ اس کے ساتھ زیادہ دیر تک لگے نہیں رہ سکتے۔ اور اسی طرح ایک بدنیت اور بدکردار آدمی کے ساتھ نیک اور شریف انسانوں کی رفاقت اتفاقاً واقع ہو بھی جائے تو وہ زیادہ دیر تک نہیں نبھ سکتی۔ بد آدمی طبعی طور پر بدی کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور بدی اس کی طرف کھنچتی ہے، جس طرح غلاظت مکھیوں کو کھینچتی ہے اور مکھیاں غلاظت کی طرف کھنچتی ہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "اچھے اور بُرے ساتھی کی مثال کستوری بیچنے والے اور بھٹی پھونکنے والے کی طرح ہے۔ کستوری بیچنے والا یا تجھے تحفہ دے گا یا تم اس سے خرید لو گے یا تم اس سے اچھی خوشبو پاؤ گے اور بھٹی پھونکنے والا یا تمہارے کپڑوں کو جلا دے گا یا تو اس سے بُری بُو محسوس کرے گا۔" (صحیح بخاری)

عملی پہلو: انسان جب عقل و شعور سے کام نہیں لیتا اور خواہشات کے پیچھے چل پڑتا ہے تو شیطان اس کا ساتھی بن جاتا ہے اور گمراہ لوگ اس کے ہم نشین، رفیق اور مشیر بن جاتے ہیں اور اس کے ذہن کو ایسا متاثر کرتے ہیں کہ باطل عقائد و نظریات اور بُرے اخلاق و اعمال اس کے لئے پرکشش بن جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ گناہوں کی لذت اور دنیا کی رنگینیوں میں ہی گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ جو انسان ایسی صورتحال میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس کے لئے بچاؤ کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ اپنے رب سے سچی توبہ کرے اور بُرے ماحول سے نکل جائے اور جو ابھی ایسی صورتحال میں مبتلا نہیں ہوا، اسے چاہیئے کہ وہ گناہوں سے بچے، نیک اعمال کرے، اچھے اور بُرے ساتھی کی پہچان کرے اور بُرے ماحول سے دور رہے اور نیک لوگوں کی مجالس اور ان کی ہم نشینی اختیار کرے۔

آیت نمبر ۲۶: کفار نے باہم طے کیا کہ اگر اپنا غلبہ برقرار رکھنا ہے تو قرآن حکیم کی دعوت میں رکاوٹ ڈالی جائے۔ انہوں نے طے کیا کہ جب آپ (ﷺ) لوگوں کو قرآن سنائیں تو شور شرابہ کیا جائے تاکہ قرآن کا پیغام لوگوں تک نہ پہنچ سکے۔ (معاذ اللہ)

علمی بات: کفار مکہ جب قرآنِ حکیم کے مقابلہ سے عاجز آ گئے کہ قرآنِ حکیم کو اور اس کی تعلیمات کو روکنے میں ان کی ساری تدبیریں ناکام ہو گئیں تو انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کو یہ مشورہ دیا کہ وہ قرآنِ حکیم کو نہ سنیں اور جب قرآنِ حکیم پڑھا جائے تو وہاں شور و غل مچایا کریں تاکہ حاضرین کے کانوں میں قرآنِ

حکیم کی آواز نہ جائے اور ان کے دل قرآنِ حکیم کی بلاغت اور خوبیوں سے متاثر نہ ہوں۔ چنانچہ جب مسلمان قرآنِ حکیم پڑھتے تو کفار تالیاں پیٹتے، سیٹیاں بجاتے اور آوازیں نکالتے اور اسے اپنے غلبہ کا باعث جانتے تھے۔

علمی بات: یہ کفارِ مکہ کے ان منصوبوں میں سے ایک تھا جس سے وہ نبی کریم ﷺ کی دعوت و تبلیغ کو ناکام کرنا چاہتے تھے (معاذ اللہ)۔ اُنہیں خوب معلوم تھا کہ قرآنِ حکیم اپنے اندر کس بلا کی تاثیر رکھتا ہے، اس کو سنانے والا کس پائے اور درجہ کی شخصیت ہے اور اس شخصیت کے ساتھ اس کا طرزِ ادا کس درجہ مؤثر ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایسے عالی مرتبہ شخص کی زبان سے اس دلکش انداز میں اس بے نظیر کلام کو جو سنے گا وہ آخر کار گھائل ہو کر رہے گا۔ اس لئے انہوں نے یہ پروگرام بنایا کہ اس کلام کو نہ خود سنو، نہ کسی کو سننے دو۔ لیکن تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ان کی یہ تدبیر بھی کامیاب نہ ہو سکی اور قرآنِ حکیم کا اثر لوگوں پر مسلسل ہوتا رہا اور وہ مسلمان ہوتے رہے اور آخر کار قرآنِ حکیم اور اسلام ہی ان سب لوگوں پر غالب آگئے۔

علمی بات: اس آیت کے مفہوم سے یہ نکتہ اخذ کیا جاتا ہے کہ قرآنِ مجید کی تلاوت اور اس کے سیکھنے سکھانے میں خلل اور رکاوٹ ڈالنا کفر کی علامت ہے اور کافرانہ طرزِ عمل ہے۔

عملی پہلو: رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا آلہ اور ذریعہ چونکہ قرآنِ حکیم تھا اس لئے کفارِ مکہ نے قرآنِ کریم کی تاثیر کو روکنے کے لئے منصوبہ بندی کی جس میں وہ ناکام رہے۔ آج کے دور میں مسلمانوں کو بھی چاہیئے کہ وہ قرآنِ مجید کو اپنی دعوت و تبلیغ کا ذریعہ بنائیں اور اس کا پیغام سب لوگوں تک پہنچائیں۔ اس حوالہ سے یہ بات بھی سمجھ لیں کہ قرآنِ حکیم کا پڑھنا پڑھانا، سننا سنانا اور سیکھنا سکھانا چونکہ شیطان پر بہت بھاری ہے اس لئے جہاں کہیں بھی یہ کام مؤثر انداز میں ہو رہا ہو گا شیطانی قوتیں اسے روکنے کے لئے اپنی پوری طاقت کے ساتھ میدان میں آجائیں گی۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کو قرآنِ حکیم کو نہیں چھوڑنا چاہیئے اور اس کے ذریعہ دعوت و تبلیغ کا کام جاری رکھنا چاہیئے۔ آخر کار وہ اس عظیم مقصد میں کامیاب ہوں گے۔

آیت نمبر ۲۷: کفر کرنے والوں کو عنقریب سخت عذاب کا مزہ چکھایا جائے گا۔ اُنہیں ان کے بُرے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے کفار کو سخت تنبیہ کی ہے کہ قرآنِ کریم کی مخالفت کی بنا پر ہم اُنہیں سخت عذاب دیں گے اور ان کے بُرے کاموں کا ضرور بدلہ دیں گے۔ ان کے وہ منصوبے اور عزائم جو قرآنِ مجید کی دعوت کو روکنے اور مٹانے کے لئے بنائے گئے ہیں، اس کے بدلہ میں اُنہیں سخت سزا دی جائے گی اور ان کی بد عملی کا مزہ اُنہیں ضرور چکھایا جائے گا۔

علمی بات: اس دنیا میں انسان اپنے اعمال کے اثرات و نتائج کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ انسان کا ہر عمل، خواہ وہ نیک ہو یا بد، اپنے اندر متعدی اثرات رکھتا ہے۔ اپنی اس صفت کے سبب سے بعض حالات میں انسان کی ایک چھوٹی سی نیکی بڑھتے بڑھتے اُحد پہاڑ کے برابر بن جاتی ہے۔ اسی طرح ایک بُرائی جو اپنے ابتدائی مرحلہ میں معمولی نظر آتی ہے آہستہ آہستہ ایک خوفناک جنگل بن جاتی ہے۔ قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر کے قتل ناحق کی جو بنیاد ڈالی وہ ایک ایسی متعدی بُرائی نکلی کہ دنیا کے ہر قتل ناحق میں سے ایک حصّہ برابر اس کے کھاتے میں بھی جمع ہو رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب قیامت میں ہر شخص کے سامنے اس کے اعمال کے نتائج آئیں گے تب ہی وہ صحیح صحیح اندازہ کر سکے گا کہ اس کی فلاں بُرائی کس درجہ کی بُرائی تھی۔

آیت نمبر ۲۸: یہ بدلہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کا ہو گا جن کا ٹھکانا آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے۔ اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور راہِ حق میں رکاوٹ ڈالتے تھے۔

علمی بات: اس آیت میں قرآنِ مجید کے دشمنوں کو اللہ تعالیٰ کا دشمن قرار دیا گیا ہے۔ چونکہ قرآنِ حکیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اس لئے قرآنِ کریم سے دشمنی کرنے والے اللہ تعالیٰ کے دشمن ہیں۔ لہٰذا قرآنِ مجید کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنا تاکہ وہ عام لوگوں تک نہ پہنچ سکے یا لوگ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکیں، اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کا کام ہے۔

فکری پہلو: اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار ایک بہت بڑا جرم ہے جس کا بدلہ دوزخ کی ہولناک آگ ہے۔ کفر و انکار اور دینِ حق کی تعلیماتِ مقدسہ سے اعراض و روگردانی، بیماریوں کی بیماری اور تمام مفاسد و مہالک اور خرابیوں کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اس سے انسان کا زاویہ نگاہ ہی بدل جاتا ہے۔ اس کے طور طریقے بدل جاتے ہیں اور وہ حق اور حقیقت سے محروم ہو کر دائمی ہلاکت کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں انکارِ حق کے ہر شائبہ سے ہمیشہ محفوظ رکھے۔ آمین!

علمی بات: آیتوں سے مراد وہ واضح دلائل و براہین ہیں جو اللہ ﷻ اپنے انبیاء کرام علیہم السلام پر نازل فرماتا ہے یا وہ معجزات ہیں جو اُنہیں عطا کئے جاتے ہیں یا وہ دلائل ہیں جو وجودِ انسانی اور کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کافران سب ہی کا انکار کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ایمان کی دولت سے محروم رہتے ہیں۔

آیت نمبر ۲۹: روزِ قیامت اہل جہنم اپنا انجام دیکھیں گے تو اُنہیں اپنے وہ رہنما یاد آئیں گے جنہوں نے دنیا میں اُنہیں گمراہ کیا تھا۔ وہ اللہ ﷻ سے اُنہیں دکھائے جانے کی التجا کریں گے تاکہ وہ اُنہیں اپنے پیروں تلے روند ڈالیں تاکہ وہ خوب ذلیل ہوں۔

علمی بات: جب کفار کو جہنم کی دہکتی آگ میں ڈالا جائے گا تو اب وہ اللہ ﷻ سے درخواست کریں گے کہ ہمیں جن و انس میں سے وہ لوگ دکھلا دیجئے جنہوں نے ہمیں گمراہی کے راستہ پر ڈال دیا تاکہ ہم اُنہیں اپنے قدموں تلے روند کر خوب ذلیل و رسوا کر سکیں۔ دنیا میں جن لوگوں کی باتوں میں آکر وہ گمراہ ہوئے، قیامت کے دن ان پر اُنہیں غصہ آئے گا اور اُنہیں ذلیل و خوار کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہیں گے۔

علمی بات: انسانوں میں دو قسم کے انسان ہیں۔ ایک وہ ہیں جو شیطانوں اور جھوٹے لیڈروں کو اپنا رہنما بناتے ہیں۔ یہ لوگ دنیا میں ایک دوسرے سے خوب دوستی رکھتے ہیں۔ مگر آخرت میں صورت حال بالکل اس کے برعکس ہوگی۔ وہاں گمراہ سرداروں کی پیروی کرنے والے لوگ جب دیکھیں گے کہ ان کے جھوٹے رہنماؤں نے ان کو صرف جہنم میں پہنچایا ہے تو وہ ان سے سخت متنفر ہو جائیں گے اور وہ چاہیں گے کہ اُنہیں حقیر و ذلیل کر کے اپنے دل کی تسکین حاصل کریں۔
دوسرے انسان وہ ہیں جو اللہ ﷻ کے فرشتوں کو اپنا ساتھی بنائیں۔ ایسے لوگ دنیا سے لے کر آخرت تک فرشتوں کو اپنا ہم نشین پاتے ہیں۔ فرشتے ان کے دل پر ربانی احساسات اتارتے ہیں۔ وہ مشکل حالات میں ان کو قلبی سکون عطا کرتے ہیں۔ وہ لطیف تجربات کے ذریعہ اُنہیں اللہ ﷻ کی بشارتیں سناتے ہیں۔ پھر یہی فرشتے آخرت میں ان کا استقبال کر کے ان کو جنت کے باغات میں داخل کریں گے۔

فکری پہلو: قرآنِ حکیم کا انسانیت پر کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے لوگوں کو ایسے عظیم الشان غیبی حقائق سے اس قدر صراحت و وضاحت کے ساتھ اس دنیا ہی میں آگاہ کر دیا ہے۔ تاکہ جنہوں نے بچنا ہو وہ بچ جائیں اور وہ اپنی عاقبت و انجام کی فکر کر لیں، قبل اس سے کہ حیاتِ دنیا کی یہ مختصر و محدود فرصت ان کے ہاتھ سے نکل جائے۔ لیکن کتنا ظالم اور ناشکرا ہے یہ انسان جو اس سب کے باوجود اس کتاب حکیم اور اس کی تعلیماتِ مقدسہ سے منہ موڑے ہوئے ہے۔

آیت نمبر ۳۰: جن لوگوں نے شرک چھوڑ کر اللہ ﷻ کو اپنا رب تسلیم کر لیا اور پھر اس پر ڈٹ گئے، ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو اللہ ﷻ پر ایمان لا کر اس پر قائم رہتے ہیں اور ساری مشکلات کا مقابلہ کر کے زندگی بھر اس پر جمے رہتے ہیں۔ اللہ ﷻ کی اطاعت کرنے، نافرمانی سے بچنے، دین کی دعوت دینے اور اس کے نفاذ کی محنت کے لئے ڈٹے رہتے ہیں۔ وہ اللہ ﷻ کے ہر فیصلہ پر راضی ہوتے ہیں۔ یوں ظاہری و باطنی استقامت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ فرشتے اُنہیں ماضی کے حادثات پر غم نہ کرنے اور مستقبل کے حوالہ سے خوف نہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا حال اللہ ﷻ کے احکامات کے مطابق ہوتا ہے۔ پھر فرشتے اُنہیں اس جنت کی بشارت دیتے ہیں جن کا وعدہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعہ کیا گیا ہے۔

علمی بات: اِستقامت کے لغوی معنٰی ہیں: ڈٹ جانا، جم جانا، جھیلنا، برداشت کرنا۔ اِستقامت کل تعلیماتِ دینی کا خلاصہ و عطر ہے۔ کسی بزرگ کا بہت عمدہ قول ہے کہ: اَلْاِسْتِقَامَۃُ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ کَرَامَۃٍ "اِستقامت ہزار کرامتوں سے بہتر ہے۔" اللہ ﷻ کی ربوبیت پر اِستقامت کے دو پہلو ہیں:

۱۔ **اِستقامتِ ظاہری:** جس کے مظاہر، مشاہدات اور طریقے یہ ہیں: i۔ عبادتِ رب یعنی دلی آمادگی کے ساتھ اللہ کی مکمل اطاعت کرنا۔ ii۔ امر بالمعروف یعنی اللہ ﷻ کی مرضی جاری و ساری کرنے کی کوشش کرنا۔ iii۔ نہی عن المنکر یعنی اللہ ﷻ کی نافرمانی کو مٹانے کے لئے تن من دھن لگانا۔

۲۔ **اِستقامتِ باطنی:** جس سے مراد یہ ہیں: i۔ رب کی رضا پر راضی رہنا یعنی اللہ ﷻ کے ہر فیصلہ کو دل و جان سے تسلیم کرنا اور کسی بھی انداز سے کوئی شکوہ شکایت نہ کرنا۔ ii۔ اللہ ﷻ کا شکر کرنا یعنی ہر نعمت کو اللہ ﷻ ہی کی عطا سمجھنا اور اِس پر نہ اِترانا۔ iii۔ مَخَافَۃُ اللہ یعنی اللہ ﷻ ہی سے ڈرنا۔ حدیثِ نبوی ﷺ ہے: رَاْسُ الْحِکْمَۃِ مَخَافَۃُ اللہِ "حکمت کی چوٹی اللہ ﷻ کا خوف ہے۔" (شعب الایمان للبیہقی) iv۔ توکل علی اللہ یعنی اللہ ﷻ پر بھروسہ کرنا اور اُسی سے امید رکھنا۔ وَعَلَی اللہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ "اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔" (سورۃ التغابن ۶۴، آیت: ۱۳) v۔ تفویض الامر الی اللہ یعنی تمام معاملات اللہ ﷻ کے سپرد کرنا۔ وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللہِ "اور میں اپنا معاملہ اللہ کے حوالہ کرتا ہوں۔" (سورۃ المؤمن ۴۰، آیت: ۴۴)

علمی و عملی بات: تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ۔۔۔ آیت کے اس حصہ میں اللہ ﷻ کی ربوبیت پر استقامت اختیار کرنے والوں کے بارے میں خوشخبری دی گئی کہ "اُن پر فرشتے نازل ہوتے ہیں۔" نیک لوگوں پر فرشتوں کا نزول نہ صرف آخرت میں ہو گا بلکہ دنیا میں بھی ہوتا ہے جس کے مواقع حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ نیکی پر انسان کی حوصلہ افزائی کے لئے: اللہ ﷻ نے انسان پر حملہ آور شر کی ہر نوعیت کی قوت کے مقابلہ میں اُس کی مدد کے لئے اُسی نوعیت کی خیر کی قوت بھی رکھی ہے:

- شر کی باطنی قوت ہے نفسِ امارہ بالسوء (بُرائی پر ابھارنے والا نفس) اور خیر کی باطنی قوت ہے نفسِ لوامہ (ضمیر)۔
- شر کی ظاہری قوت ہیں بدکار، فاسق و فاجر اور بُرے لوگ اور خیر کی ظاہری قوت ہیں نیک اور اچھے لوگ۔
- شر کی پوشیدہ اور خفیہ قوت ہیں شیاطین جن جو ناری مخلوق ہیں اور خیر کی خفیہ قوت ہیں فرشتے جو نورانی مخلوق ہیں۔

۲۔ معرکہ حق و باطل میں اہلِ ایمان کی نصرت کے لئے: جیسے غزوۂ بدر میں اللہ ﷻ نے اہلِ ایمان کی مدد فرمائی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"(یاد کرو) جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اُس (اللہ) نے تمہاری فریاد سن لی (اور فرمایا) کہ بے شک میں تمہاری مدد کرنے والا ہوں ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ جو پے در پے آنے والے ہیں۔" (سورۃ الانفال ۸، آیت: ۹)

جیسا کہ اقبالؒ نے فرمایا کہ: فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

۳۔ قرآنِ حکیم کی تلاوت اور تدریس میں مصروف محافل پر: نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے: "جب بھی کچھ لوگ اللہ ﷻ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہو کر اللہ ﷻ کی کتاب کی تلاوت کرتے اور آپس میں اِسے سیکھتے اور سکھاتے ہیں تو اُن پر سکون اور اطمینان کا نزول ہوتا ہے اور رحمت اُن پر چھا جاتی ہے اور فرشتے اُن کو اپنے احاطے میں لے لیتے ہیں اور اللہ ﷻ اُن کا تذکرہ اپنے مقربین کی محفل میں کرتا ہے۔" (صحیح مسلم)

۴۔ نیک لوگوں پر عالمِ نزع کے وقت: اللہ ﷻ کے صالح بندوں کا جب اس فانی دنیا سے وقتِ رخصت آتا ہے تو ان کی نزع کی کیفیت کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ: "جن کی روحیں فرشتے قبض کرتے ہیں اِس حال میں کہ وہ پاکیزہ ہوتے ہیں (فرشتے انہیں) کہتے ہیں تم پر سلام ہو (اب) تم جنت میں داخل ہو جاؤ ان (اعمال) کے بدلہ جو تم کیا کرتے تھے۔" (سورۃ النحل ۱۶، آیت: ۳۲)

عملی بات: اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا آیت کے اس حصہ میں اللہ ﷻ کی ربوبیت پر استقامت اختیار کرنے والوں کو فرشتوں کے ذریعہ خوشخبری دی گئی ہے کہ "نہ تم ڈرو اور نہ کچھ غم کرو۔" حزن یعنی غم کا تعلق ماضی کے افسوس ناک واقعات سے اور خوف کا تعلق مستقبل کے اندیشوں سے ہوتا ہے۔ خوف اور غم کے ختم ہونے کی نعمت اس یقین کی بنیاد پر حاصل ہوتی ہے کہ ماضی میں جو کچھ ہوا اللہ ﷻ نے کیا اور مستقبل میں جو ہو گا وہ بھی اللہ ﷻ ہی کے حکم سے ہو گا۔ اللہ ﷻ کے ہر فیصلہ میں خیر ہی خیر ہے۔ وہ ہمارا ہم سے بڑھ کر خیر خواہ اور ہماری مصلحتوں کا ہم سے بڑھ کر جاننے والا ہے۔ خوف و غم کے نہ ہونے کی نعمت مقامِ ولایت پر حاصل ہوتی ہے: "آگاہ ہو جاؤ! بے شک جو اللہ کے دوست ہیں اُن پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ جو ایمان لائے اور ڈرتے رہے۔" (سورۃ یونس ۱۰، آیات: ۶۲، ۶۳)

علمی بات: اللہ ﷻ کے بندوں پر فرشتوں کا نزول کس وقت ہوتا ہے؟ اس کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ فرشتوں کا نزول موت کے وقت ہوتا ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ موت کے وقت، قبر میں اور قیامت کے دن دوبارہ زندہ کیئے جانے کے وقت فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ تیسری رائے یہ ہے کہ فرشتوں کا نزول مذکورہ بالا تینوں احوال کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ دنیاوی زندگی میں بھی اللہ ﷻ کے نیک بندوں کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا رہتا ہے کہ فرشتے بطریقہ الہام ان کے دلوں میں سکون اور اطمینان القا کرتے رہتے ہیں جس سے وہ اور زیادہ خیر کے کاموں میں آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ اس رائے کے مطابق اللہ ﷻ کے نیک بندوں کو دنیاوی زندگی میں، مرتے وقت، قبر میں اور روزِ محشر ملائکہ کی رفاقت حاصل ہوتی ہے۔

فکری پہلو: اللہ ﷻ کو اپنا رب کہنے کا مطلب اس حقیقت کو تسلیم کر لینا ہے کہ اللہ ﷻ ہی میرا خالق، پروردگار، مالک، آقا، معبود، حاکم اور ہادی ہے۔ جو شخص پورے شعور کے ساتھ اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے وہ لازماً اپنی اس حیثیت کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ میں اس کی مخلوق، اس کا پروردہ، اس کی مملوک اور اس کا بندہ ہوں۔ میرا کام اس کی عبادت کرنا اس کے احکام کی اطاعت کرنا اور اس کی ہدایت کی پیروی کرنا ہے۔ اس بات پر استقامت اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مرتے دم تک وہ اس پر قائم رہے اور اپنی عملی زندگی میں ہمیشہ حق و صداقت پر راہ پر گامزن رہے۔

عملی پہلو: اللہ ﷻ پر ایمان لانا آسان ہے مگر اس پر جمے رہنا آسان نہیں ہے۔ یہ تبھی ممکن ہے جب انسان کو اللہ ﷻ پر پوری طرح توکل ہو، وہ ہر حالت میں اس کی رضا پر راضی رہے۔ نہ اپنی کسی حالت کے بارے میں اس کی زبان پر حرفِ شکایت آئے اور نہ ہی اللہ ﷻ کے کسی فیصلہ پر اس کے دل میں ملال پیدا ہو۔ پھر اللہ ﷻ کے ہر حکم کے آگے اس کا سرِ تسلیم بلا حیل و حجت جھکتا چلا جائے اور وہ اپنے تن من دھن کو ہتھیلی پر رکھے، اس کے درِ اطاعت پر ہمہ وقت کمربستہ کھڑے رہ کر عملی طور پر ثابت کردے کہ "بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔" (سورۃ الانعام ۶، آیت: ۱۶۲)

فرامینِ نبوی ﷺ: حضرت سفیان بن عبد اللہ ثقفی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! مجھے اسلام کے بارے میں کوئی ایسی بات بتائیں کہ آپ ﷺ کے سوا کسی اور سے کچھ دریافت کرنے کی ضرورت نہ رہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "تم کہو: میں اللہ ﷻ پر ایمان لایا اور پھر اس پر (ڈٹ جاؤ) ثابت قدم رہو۔" (صحیح مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میانہ روی اختیار کرو، غلو نہ کرو اور استقامت اختیار کرو اور جان لو تم میں سے کوئی اپنے عمل سے نجات نہ پاسکے گا۔" سوال کیا گیا آپ ﷺ بھی؟ فرمایا "ہاں میں بھی سوائے اِس کے کہ اللہ ﷻ مجھے اپنی رحمت اور فضل سے ڈھانپ لے۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۳۱: فرشتے اُنہیں دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت میں بھی اپنی رفاقت کی بشارت دیتے ہیں۔ دنیا میں بھی محافلِ قرآنی، معرکۂ حق و باطل، اہلِ ایمان کی نصرت اور دیگر مواقع پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے۔ نیز فرشتے اہلِ ایمان کو جنت کے حوالہ سے مزید خوشخبری دیتے ہیں۔ وہاں ان کی تمام نفسانی خواہشات کی تسکین کا سامان ہوگا اور ان کی ہر مطلوبہ نعمت اُنہیں میسر ہوگی۔

علمی بات: دنیا میں فرشتوں کی دوستی یہ ہے کہ وہ صالح مومنین کے دلوں میں حق کی بات ڈالتے ہیں، اُنہیں خیر و صلاح کا مشورہ دیتے رہتے ہیں اور ان کے لئے دُعائے رحمت کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں نازک لمحات میں خاص طور سے حق و باطل کی کشمکش کے موقع پر جب کہ قدموں کے ڈگمگا جانے کا خطرہ ہوتا ہے، اللہ ﷻ کے اِذن سے وہ ان کی ڈھارس بندھانے کا کام کرتے ہیں تاکہ وہ ثابت قدم رہیں۔ آخرت میں فرشتوں کی رفاقت اس طرح ہوگی کہ وہ نیک ایمان والوں کے ساتھ اِکرام کے ساتھ پیش آئیں گے، ان کا استقبال کریں گے، سلام پیش کریں گے، مبارک باد دیں گے اور ان کی شفاعت بھی کریں گے۔

علمی بات: جس طرح کفار کے ساتھی شیاطین ہوتے ہیں اسی طرح اہلِ ایمان کے ساتھی اللہ ﷻ کے نوری فرشتے ہوتے ہیں۔ جس طرح کہ شیاطین، کفر و ضلال کے رشتے کی بنا پر کفار، مفسدین، منافقوں اور گمراہوں کے ساتھی اور دوست ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایمان و یقین کے پاکیزہ رشتہ کی بنا پر اللہ ﷻ کے نوری فرشتے نیک اور مخلص اہلِ ایمان کے ساتھی اور دوست ہو جاتے ہیں۔ ایمان و یقین کی یہ معنوی دولت، کیسی عظیم الشان اور انقلاب آفریں دولت ہے جو اس خاکی انسان کو فرشتوں کی نوری اور مقدس جماعت کا دوست اور ان کا ہم نشین بنا دیتی ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جنت میں تم میں سب سے کم ملکیت والا شخص وہ ہوگا جسے اللہ ﷻ فرمائے گا: تمنا کرو۔ وہ تمنا کرے گا۔ جب وہ تمنا کرلے گا تو اللہ ﷻ اس سے پوچھے گا: کیا تو نے تمنا کرلی؟ وہ کہے گا: جی ہاں۔ تو اللہ ﷻ فرمائے گا: تمہارے لئے وہ ہے جو تو نے تمنا کی اور جو تو نے تمنا کی ہے اتنا اس کے ساتھ مزید اور بھی۔" (صحیح مسلم)

فکری پہلو: انسان میں فطری طور سے یہ داعیہ پایا جاتا ہے کہ جو چیز وہ چاہتا ہے وہ اسے ملے اور اس کی آرزوئیں پوری ہوں، مگر دنیا میں ایسا کوئی شخص نہیں جس کی ہر خواہش اور ہر تمنا پوری ہوتی ہو۔ اگر آدمی کے پاس دولت کا ڈھیر لگا ہوا ہو یا کسی بڑی سلطنت کا مالک ہو تب بھی اس کو وہ سب کچھ نہیں ملتا جو وہ چاہتا ہے۔ کبھی اسے بیماری پریشان کرتی ہے تو کبھی کسی عزیز کے مرنے کا غم اور کبھی جنگ کا خطرہ۔ معلوم ہوا کہ یہ دنیا ہرگز وہ مقام نہیں ہے جہاں انسان کی ہر خواہش اور ہر آرزو پوری ہوسکے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ دنیا ہی جنت بن جاتی لیکن اللہ ﷻ نے انسان کے اس داعیہ کے پورا کرنے کا سامان آخرت میں کیا ہے یعنی جنت جہاں اس کی یہ فطری طلب مکمل اور اعلیٰ درجہ میں پوری ہوگی۔ انسان کی یہ فطری خواہش اور تقاضا ہے کہ اس کی تمام خواہشیں پوری ہوں جنت کی طلب اپنے اندر رکھتا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآنِ حکیم جس جنت کا وعدہ اہلِ ایمان سے کرتا ہے اس کی طلب انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ لہٰذا منکرین کا جنت کے بارے میں یہ تمسخر کرنا کہ دل کے بہلانے کے لئے یہ خیال اچھا ہے، سراسر جہالت ہے۔ اگر وہ اپنی فطرت کی مانگ پر غور کرے اور جنت کو قرآنِ حکیم کی روشنی میں دیکھے تو اُنہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگا۔

آیت نمبر ۳۲: جنت میں اہلِ جنت اللہ ﷻ کے مہمان ہوں گے جو بڑی بخشش والا اور بڑا مہربان ہے۔ اللہ ﷻ میزبان ہو اور بندہ مہمان ہو تو بندہ کی سعادتوں کا کیا عالم ہو گا!!!

علمی بات: اہلِ جنت کے لئے یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ وہ جنت میں اللہ ﷻ کے مہمان ہوں گے۔ وہاں اُنہیں جو کچھ بھی عطا کیا جائے گا وہ ربِ غفور و رحیم کی طرف سے بطور مہمانی ہو گا۔ اس ذاتِ عالی کی طرف سے ان کی میزبانی ہو گی جس نے ان کے سب گناہ اور خطائیں معاف فرمادی ہیں اور مہربانی فرما کر اُنہیں جنت میں داخل کر دیا ہے۔

علمی بات: اصل میں "نُزُل" مہمان کی ابتدائی ضیافت کو کہتے ہیں۔ ان آیات میں جنت کی جن نعمتوں کا ذکر آیا ہے ان کا تعلق اہلِ جنت کی ابتدائی مہمان نوازی سے ہے۔ لیکن بڑی اور حقیقی مہمانی جو اس کے بعد ہو گی اور ہمیشہ جاری رہے گی اور اس سے بہت بڑھ چڑھ کر ہو گی، اس کی کیفیت ہمارے احاطہ شعور میں نہیں آ سکتی، اس کی حقیقت کا علم صرف اللہ ﷻ کی ذات کو ہے۔

علمی بات: اہلِ جنت کے لئے ربِّ غفور و رحیم کی طرف سے ایک عظیم الشان مہمانی ہو گی۔ جس طرح مہمان کو خاص عزت و احترام سے نوازا جاتا ہے اور اس کو نہ کھانے پینے کی کوئی فکر ہوتی ہے اور نہ اس کے لئے اس کو کوئی تگ و دو کرنا پڑتی ہے ایسے ہی ان حضرات کو بھی وہاں پر خاص اعزاز و اکرام سے نوازا جائے گا۔ نیز دنیا میں جب کوئی مہمان کسی کے گھر جاتا ہے تو اہلِ خانہ اپنے معمول سے بالاتر ہو کر مہمان کے لئے خصوصی انتظامات کرتے ہیں۔ اب ذرا اندازہ کریں اللہ ﷻ جنت میں جب اہلِ ایمان کے لئے خصوصی انتظام فرمائے گا تو اس کی شان کیا ہو گی؟

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "اللہ ﷻ نے فرمایا: میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے (جنت میں) وہ کچھ تیار کیا ہے جو نہ کسی آنکھ نے آج تک دیکھا اور نہ کسی کان نے اس بارے میں سنا اور نہ کسی کے دل میں ان کے بارے میں خیال پیدا ہوا۔" (صحیح بخاری)

فکری پہلو: ایسی جنت اور اس کی ایسی عظیم الشان نعمتوں سے منہ موڑ کر اور اس کے تقاضوں کو پسِ پشت ڈال کر صرف دنیا کے وقتی اور عارضی فائدوں کے لئے جینا کس قدر ہولناک خسارہ ہے۔

آیت نمبر ۳۳: توحیدِ عملی کا اہم تقاضا دعوت الی اللہ ہے۔ توحید کا عقیدہ اختیار کر لینا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے تقاضوں پر عمل اور دوسروں کو اس کی دعوت دینا بھی ضروری ہے۔ قوتِ بیان اللہ ﷻ کی عطا کردہ ایک اہم ترین نعمت ہے جس کا بہترین استعمال دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دینا ہے۔ دعوت الی اللہ کا فریضہ اُمّتِ مسلمہ کی ذمہ داری ہے اور ختمِ نبوت کے عقیدہ کا عملی تقاضا بھی۔ اس شخص کی بات کو بہترین قرار دیا گیا ہے جس میں یہ تین خوبیاں ہوں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ ﷻ کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہو۔ دوسری یہ کہ خود بھی اچھے اعمال انجام دیتا ہو، اس کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو۔ تیسری یہ کہ زبان سے اللہ ﷻ کی فرماں برداری اور اطاعت کا اقرار کرتا ہو نیز اپنے آپ کو عام مسلمانوں کی طرح سمجھے۔

علمی بات: اس آیت میں "دعوت الی اللہ" کو بہترین بات قرار دیا گیا۔ انسان کی قوتِ بیان کا سب سے اچھا مصرف یہ ہے کہ وہ اسے "دعوت الی اللہ" کے لئے استعمال کرے۔ قوتِ بیان بلاشبہ انسان کا اعلیٰ ترین وصف ہے۔ انسان کی قوتِ بیان کے استعمالات دو طرح کے ہیں:

i. **منفی استعمال:**

- مجلسی بُرائیاں جیسے غیبت کرنا، بہتان لگانا، چغلی کرنا، طنز کرنا، مذاق اڑانا، طعنے دینا، بُرے القاب چسپاں کرنا وغیرہ۔
- ذاتی مفادات کے لئے جیسے جھوٹے مقدمات کی وکالت کرنا، معاملات میں جھوٹ اور چرب زبانی کے ذریعہ دھوکہ دہی کرنا، مفاد پرست سیاسی قائدین، گمراہ اہلِ علم، دنیاوی حرص اور غرض رکھنے والے لوگوں کی باتوں اور ان کی گمراہی کو پھیلانا وغیرہ۔
- اجتماعیت میں تخریب کے لئے جیسے افواہیں پھیلانا، غلط بیانی کرنا، قیادت کے خلاف خفیہ مشورے کرنا وغیرہ۔
- شر کی دعوت جیسے وطنی، لسانی یا نسلی عصبیت کی دعوت دینا، فرقہ واریت کا پرچار کرنا، باطل نظریات کی تبلیغ کرنا وغیرہ۔
- گانوں، ڈراموں، فلموں اور نام نہاد ثقافتی سرگرمیوں کے ذریعہ بے حیائی کی دعوت دینا۔

ii. مثبت استعمال:

- پیشہ کے طور پر جیسے سچے مقدمات کی وکالت کرنا، اساتذہ کا مفید علوم کے لئے درس وتدریس کرنا، تاجروں کا سچائی اور امانت داری سے خرید وفروخت کرنا، سفارت کاروں کا ملک وقوم کے مفاد کے لئے بات چیت کرنا وغیرہ۔
- خیر کی دعوت جیسے حقوق کے لئے آواز اٹھانا، خدمتِ خلق کی طرف متوجہ کرنا، نظریات، عقائد، رسومات اور اخلاقیات کی اصلاح کے لئے وعظ و نصیحت کرنا، حق کی حمایت میں آواز بلند کرنا۔ اسی حوالہ سے اعلیٰ ترین کام ہے "دعوت الی اللہ" یعنی ہر سطح پر اللہ ﷻ کی بندگی اور توحید کی دعوت دینا۔

دعوت الی اللہ کے لئے چند اہم نکات:

۱۔ "دعوت الی اللہ" کا کام مقصدِ امت ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "(مسلمانو!) تم بہترین اُمت ہو جسے لوگوں (کی رہنمائی) کے لئے پیدا کیا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بُرائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔" (سورۃ آل عمران ۳، آیت: ۱۱۰)

۲۔ "دعوت الی اللہ" کا عمل مؤکد ترین سنتِ نبوی ﷺ ہے۔ یہ وہ متفقہ سنت ہے جس پر آپ ﷺ نے ظہورِ نبوت سے لے کر حیاتِ مبارکہ کے آخری سانس تک عمل کیا۔ سورۃ یوسف میں ارشاد ہوا": (اے نبی ﷺ!) آپ فرما دیجئے یہی میرا راستہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں پوری بصیرت کے ساتھ میں (بھی) اور (وہ بھی) جنہوں نے میری پیروی کی۔" (سورۃ یوسف ۱۲، آیت: ۱۰۸)

۳۔ "دعوت الی اللہ" کا اصل محرک لوگوں کی ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ ہونا چاہیئے۔ لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کا ایک اہم مظہر رحمت اور شفقت کا وہ جذبہ ہے جو لوگوں کو تکلیف اور مصیبت میں دیکھ کر دل میں پیدا ہوتا ہے اور عملی زندگی میں خدمتِ خلق اور ایثار و انفاق کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ دعوتِ دین اور خدمتِ خلق کا ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔ بلاشبہ دین کا وہ داعی جو خادمِ خلق نہ ہو، اپنی دعوت میں دولتِ اخلاص سے محروم ہے۔

۴۔ "دعوت الی اللہ" کے عمل کے لئے "اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَب" کی تدریج اختیار کرنا ضروری ہے یعنی جس سے جتنی قربت اور محبت داعی کو ہو، دعوت و تخاطب میں اِسی قدر اُسے مقدم رکھا جائے۔ دعوت کا تخاطب لازماً ایک تدریج کے ساتھ داعی کے اپنے نفس سے شروع ہو کر پوری انسانیت کو ہونا چاہیئے۔ سب سے پہلے انسان خود اپنی ذات کو دعوت کا مخاطب سمجھے۔ پھر اپنے اہل وعیال کی تربیت پر توجہ دی جائے: "اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔" (سورۃ التحریم ۶۶، آیت: ۶) اِس کے بعد اپنے قریبی رشتہ داروں کو دعوت دینی چاہیئے: "(اے نبی ﷺ) اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرایئے۔" (سورۃ الشعراء ۲۶، آیت: ۲۱۴) پھر قوم تک دعوت پہنچانے کا عمل ہونا چاہیئے: "اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو۔" (سورۃ الاعراف ۷، آیت: ۵۹) اور آخر کار پوری انسانیت کو دین کی دعوت پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیئے: "(اے مسلمانو!) اِسی طرح سے ہم نے تمہیں معتدل امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسول (ﷺ) تم پر گواہ ہوں۔" (سورۃ البقرۃ ۲، آیت: ۱۴۳)

یہ صورت کہ داعی اپنے آپ کو بھول جائے اور نیکی کی ساری دعوت دوسروں کو دیتا رہے یا اپنے خاندان اور کنبے کو تو بھول جائے اور دُور دراز کے لوگوں میں ہدایت کی سوغات بانٹنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہو، درست نہیں۔ اِس سلسلہ میں یہ بات بھی صحیح نہیں کہ ایک مرحلے کی تکمیل کے بعد ہی دوسرا مرحلہ شروع کیا جائے۔ مطلوب صرف یہ ہے کہ دعوت کے عمل کو ایک فطری تدریج اور حسین تناسب کے ساتھ اپنی ذات، اہل وعیال، کنبے قبیلے اور پھر عوام الناس تک بڑھنا چاہیئے۔

۵۔ "دعوت الی اللہ" کا ہدف اقامتِ دین ہونا چاہیئے یعنی پورے نظامِ زندگی پر اللہ ﷻ کے دین کو غالب کرنا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: اے چادر اوڑھنے والے (محبوب ﷺ)! اُٹھیں پھر (لوگوں کو اللہ کے عذاب سے) ڈرسنائیں۔ اور اپنے رب کی بڑائی (بیان) کریں۔" (سورۃ المدثر ۷۴، آیات: ۱، ۲، ۳)

۶۔ "دعوت الی اللہ" کے لئے قرآنِ حکیم کو ذریعہ بنانا چاہیئے۔ ارشاداتِ باری تعالیٰ ہیں: "اور اس (قرآن) کے ذریعہ ان سے بڑا جہاد کریں۔" (سورۃ الفرقان ۲۵، آیت: ۵۲) "تو آپ نصیحت کیجئے قرآن کے ذریعہ اُسے جو میرے عذاب کی وعید سے ڈرتا ہے۔" (سورۃ قٓ ۵۰، آیت: ۴۵) "تو ہم نے اس (قرآن) کو آپ کی زبان میں آسان فرما دیا ہے تاکہ آپ پرہیزگاروں کو اس سے خوشخبری دیں اور جھگڑالو قوم کو اسکے ذریعہ ڈرائیں۔" (سورۃ مریم ۱۹، آیت: ۹۷)

دعوت اور عمل کے باہمی تعلق کے حوالہ سے قابلِ توجہ نکات: عمل دعوت کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر عمل نہ کیا جائے تو نہ صرف دعوت کا اثر نہیں ہوتا بلکہ دعوت کا کام کرنے والوں پر لوگوں کا اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔ بے عملی گناہ ہے لیکن ایک داعی کی بے عملی اِس لئے بڑا جرم ہے کہ وہ یہ حرکت جان بوجھ کر کرتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے دعوت دینے لیکن خود عمل نہ کرنے پر سخت تنبیہ فرمائی: "کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب کی تلاوت (بھی) کرتے ہو تو کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے۔" (سورۃ البقرۃ ۲، آیت : ۴۴) ایک اور مقام پر یہی بات ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے کہ: "اے ایمان والو! تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں؟ اللہ کے نزدیک (یہ) سخت ناپسندیدہ بات ہے کہ تم ایسی بات کہو جو کرتے نہیں۔" (سورۃ الصف ۶۱، آیات : ۲، ۳)

عملی پہلو: تکمیل عمل تک دعوت کے کام کو مؤخر کرنا درست نہیں ہے۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میرا عمل درست ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب میں دوسروں کو دعوت دے سکتا ہوں۔ یہ شیطان کا حربہ ہے کہ وہ انسان کو اپنے عمل کی مکمل درستگی تک دعوت کے کام سے روکنا چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوت بھی عمل میں اصلاح پیدا کرتی ہے۔ دعوت بلا عمل کے بھی محدود اثرات ہو سکتے ہیں۔ بعض سننے والے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اِس قول کو پیشِ نظر رکھ کر اپنے عمل کی اصلاح کر لیتے ہیں کہ "یہ دیکھو کیا کہا جا رہا ہے؟ یہ نہ دیکھو کون کہہ رہا ہے؟"

علمی و عملی بات: قَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (دعوت دینے والا کہے میں بھی عام مسلمانوں میں سے ہوں)۔ اِن الفاظ کی افادیت یہ ہے کہ:

یہ اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کا اعلان ہے۔ خاص طور پر مخالفانہ ماحول میں یہ اعلان ایک کلمۂ عزیمت ہے کہ کوئی دعوت قبول کرے یا نہ کرے میں تو اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری اختیار کر رہا ہوں۔ یہ کلمۂ تواضع اور انکساری کا بھی اظہار ہے۔ دعوت دینے والا وضاحت کر رہا ہے کہ میں خود کو بڑا صاحبِ علم اور پارسا سمجھ کر وعظ و نصیحت نہیں کر رہا بلکہ میں خود بھی عام مسلمانوں میں سے ہوں۔ گویا یہ کلمہ تکبر پیدا کرنے کے شیطانی حملے سے حفاظت کا ذریعہ ہے۔

یہ کلمہ فرقہ وارانہ تقسیم سے اعلانِ برأت بھی ہے۔ دین کی دعوت دینے والا واضح کر رہا ہے کہ میری دعوت کسی گروہ یا فرقہ کی طرف نہیں بلکہ اِسلام کے ان اُمور کے حوالہ سے ہے جن پر سب کا اتفاق ہے اور اس میں کوئی فرقہ ورانہ والی بات نہیں۔ داعی دین کو احتیاط برتنی چاہیئے کہ وہ وضع قطع، لباس یا طرزِ عمل کے اعتبار سے ایسے شعائر اور عادات و اطوار اختیار نہ کرے جو فرقہ وارانہ شناخت کا باعث بن کر اُسے عام مسلمانوں سے علیحدہ کر دیں۔

علمی بات: اس ارشاد کی پوری اہمیت سمجھنے کے لئے اس ماحول کا نگاہ میں رکھنا ضروری ہے جس میں یہ بات فرمائی گئی تھی۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ جو شخص بھی مسلمان ہونے کا اظہار کرتا تھا اسے یکایک یہ محسوس ہوتا تھا کہ گویا اس نے درندوں کے جنگل میں قدم رکھ دیا ہے جہاں ہر ایک اسے پھاڑ کھانے کو دوڑ رہا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر جس نے اسلام کی تبلیغ کے لئے زبان کھولی اس نے تو گویا درندوں کو پکار دیا کہ آؤ اور مجھے جھنجھوڑ ڈالو۔ ان حالات میں فرمایا گیا ہے کہ کسی شخص کا اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مان کر سیدھی راہ اختیار کر لینا اور اس سے نہ ہٹنا بلا شبہ اپنی جگہ بڑی اور بنیادی نیکی ہے، لیکن کمال درجہ کی نیکی یہ ہے کہ وہ کہے کہ میں مسلمان ہوں اور نتائج سے بے پرواہ ہو کر اللہ تعالیٰ کی بندگی کی طرف خلقِ خدا کو دعوت دے، اور اس کام کو کرتے ہوئے اپنا عمل اتنا پاکیزہ رکھے کہ کسی کو اسلام اور اس کے علم برداروں پر حرف رکھنے کی گنجائش نہ ملے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص ہدایت کی طرف بلائے تو اسے اس کی بات مان کر راہ ہدایت پر چلنے والوں کا بھی ثواب ملے گا اور اس سے اس راہ پر چلنے والوں کا ثواب کچھ کم نہیں ہو گا۔ اور جو شخص گمراہی کی طرف بلائے گا تو اسے اس کی بات مان کر اس گناہ پر چلنے والوں کا بھی گناہ ہو گا اور اس سے اس راہ پر چلنے والوں کا گناہ کچھ کم نہیں ہو گا۔" (صحیح مسلم)

فکری پہلو: بے شک ایمان لانا اور اس پر ثابت قدم رہنا بہت بڑی بات ہے لیکن اس سے اونچا ایک اور مقام یہ ہے کہ لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت و کبریائی پر ایمان لانے کی دعوت دے، اس کے سچے رسول ﷺ کی فرماں برداری، اس کی نازل کی ہوئی کتاب کے احکام کو بجا لانے کی ترغیب دے۔ صرف اسی بات پر مطمئن نہ ہو جائے کہ اس نے اسلام کے چشمۂ شیریں سے اپنی پیاس کو بجھا لیا، بلکہ اس کے دل میں یہ شدید جذبہ ہو کہ جس طرح اس نے اپنی تاریک زندگی میں ایمان کی شمع روشن کر لی ہے، گمراہی کی ظلمتوں میں ٹھوکریں کھانے والا کوئی شخص بھی اس نورِ یقین سے محروم نہ رہے۔

آیت نمبر ۳۴: دعوت کے مرحلہ سے متعلق اہم اخلاقی ہدایات دی گئی ہیں۔ نیکی اور بُرائی برابر نہیں ہوتی۔ لہٰذا دعوت حق کے مخالفین کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے۔ ان کی بُرائیوں کا جواب بھلائی سے دیا جائے۔ اس طرزِ عمل سے جانی دشمن بھی گرم جوش دوست بن جائے گا۔

علمی بات: نیکی اور بُرائی برابر نہیں بلکہ دونوں کی تاثیر جداگانہ ہے۔ ایک اخلاقی ہدایت دی گئی ہے کہ بُرائی کا بدلہ اچھائی سے دیا جائے۔ یعنی بُرائی کا بدلہ احسان کے ساتھ، زیادتی کا بدلہ درگزر کے ساتھ، غضب کا صبر کے ساتھ، بے ہودگی کا جواب چشم پوشی کے ساتھ اور مکروہات (ناپسندیدہ باتوں) کا جواب برداشت اور حلم کے ساتھ دیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارا دشمن بھی تمہارا دوست بن جائے گا اور دور دور رہنے والا قریب ہو جائے گا اور خون کا پیاسا تمہارا گرویدہ اور جانثار ہو جائے گا۔

علمی بات: اس آیت میں دعوت الی اللہ کا ایک زریں اصول بیان کیا گیا ہے کہ بدی کا جواب بھلائی سے دیا جائے۔ داعی الی اللہ کو بدی کا جواب کبھی بدی سے نہ دینا چاہیئے بلکہ اسے برداشت کرنا چاہیئے۔ اسے کوئی فوری جواب نہ دینا چاہیئے اور اس سے اگلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ اس کی بدی کا جواب بھلائی سے دیا جائے۔ اس طرح دشمن خود شرمندہ ہوگا اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ میں نے کیا سلوک کیا تھا اور فریق مخالف کا میرے حق میں سلوک کیا ہے؟ وہ آپ کے خلوص اور آپ کی خیر خواہی اور راست بازی کا معتقد ہو جائے گا حتیٰ کہ آپ کی مخالفت چھوڑ کر آپ کے ساتھ آ ملے گا اور آپ کا جگری دوست بن جائے گا۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ آپ کی دعوت الی اللہ کی منزل کھوٹی نہیں ہوگی بلکہ اس میں مزید پیش رفت ہو جائے گی۔ اگر آپ بُرائی کا جواب بُرائی سے دیں گے تو پھر ادھر سے مزید بُرائی اٹھے گی اس طرح ایک تو مخالفت پہلے سے بھی بڑھ جائے گی۔ دوسرے اصل مقصد فوت ہو جائے گا اور دعوت الی اللہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جائے گا۔

عملی پہلو: ایک مومن اور خصوصاً داعی الی اللہ کا یہ طریقہ ہونا چاہیئے کہ بُرائی کا جواب بُرائی سے نہ دے بلکہ جہاں تک گنجائش ہو بُرائی کے مقابلہ میں بھلائی سے پیش آئے۔ اگر کوئی اسے سخت بات کہے یا بُرا معاملہ کرے تو اس کے مقابل وہ طرز اختیار کرنا چاہیئے جو اس سے بہتر ہو۔ مثلاً غصّہ کے جواب میں بُردباری، گالی کے جواب میں تہذیب و شائستگی اور سختی کے جواب میں نرمی اور مہربانی سے پیش آئے۔ اس طرزِ عمل کے نتیجہ میں سخت سے سخت دشمن بھی ڈھیلا پڑ جائے گا۔ اور چاہے دل سے دوست نہ بنے تاہم ایک وقت آئے گا جب وہ ظاہر میں ایک گہرے اور گرم جوش دوست کی طرح برتاؤ کرنے لگے گا۔ بلکہ ممکن ہے کہ کچھ دنوں بعد سچے دل سے دوست بن جائے اور دشمنی و عداوت کے خیالات یکسر قلب سے نکل جائیں۔

فکری پہلو: بُرائی کا بدلہ اچھائی سے دینا، یہ نسخہ ہے تو بڑا کار گر مگر اسے استعمال کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اس کے لئے بڑا عزم، بڑا حوصلہ اور بڑی قوت برداشت درکار ہے۔ وقتی طور پر ایک آدمی کسی بدی کے مقابلہ میں نیکی کر سکتا ہے اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ لیکن بدی کا مقابلہ نیکی اور وہ بھی اعلیٰ درجہ کی نیکی سے کرتے چلے جانا اور کبھی ایک مرتبہ بھی ضبط کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دینا، کسی معمولی آدمی کے بس کا کام نہیں ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے محارب بن خصفہ (کے لوگوں) سے لڑائی کی۔ ان میں سے ایک آدمی جسے غورث بن حارث کہتے ہیں، (موقع پا کر) رسول ﷺ کے سرہانے تلوار لے کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا: آپ ﷺ کو مجھ سے کون بچائے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ" اتنے میں تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے تلوار اٹھالی اور فرمایا: "اب تجھے مجھ سے کون بچائے گا؟" وہ بولا: آپ ﷺ اس تلوار کو پکڑنے والے بہترین آدمی بن جائیں (یعنی مجھ پر احسان کریں)۔ آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: "کیا تو گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی معبود برحق ہے اور میں اللہ تعالیٰ کا رسول ﷺ ہوں؟" اس نے کہا: نہیں، البتہ میں آپ ﷺ سے عہد کرتا ہوں کہ نہ میں آپ ﷺ کے مقابلے میں آؤں گا اور نہ آپ ﷺ کے ساتھ لڑنے والوں کا ساتھ دوں گا۔ آپ ﷺ نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے پاس واپس گیا اور جا کر کہا: میں تمہارے پاس سب سے بہتر شخص کے پاس سے آیا ہوں۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم، مسند احمد)

آیت نمبر ۳۵: بُرائی کا جواب اچھائی سے دینا آسان نہیں ہے۔ یہ سعادت ان ہی کو ملتی ہے جو صبر کرنے نیز ناپسندیدہ باتوں کو برداشت کرنے والے ہوں۔ یہ سعادت بہت بڑی خوش نصیبی ہے۔

علمی بات: اس آیت سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ بُرائی کا بدلہ بھلائی سے دینا ایک عظیم حکمت ہے۔ دوسری یہ کہ اس حکمت کے حامل صرف وہ لوگ ہو سکتے ہیں جن کے اندر صبر کا جوہر ہو۔ جن کے اندر یہ جوہر نہ ہو وہ اس کے اہل نہیں ہیں۔ اس وجہ سے اس کے طالبوں کو اپنے اندر صبر کی صفت راسخ کرنی

چاہیئے۔ تیسری یہ کہ یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ ایک لازوال خزانہ ہے اس وجہ سے ہر جُرأت مند اور ہمت و حوصلہ رکھنے والے دلیر شخص کو اس کے حاصل کرنے کے لئے بازی کھیلنی چاہیئے۔ بڑے ہی خوش نصیب اور قابلِ رشک ہیں وہ لوگ جو اس بازی میں کامیاب ہو جائیں۔

علمی بات: بدلہ لینے کے لحاظ سے دنیا میں لوگ تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو بُرائی کا بدلہ بُرائی سے اور نیکی کا بدلہ نیکی سے دیتے ہیں۔ اور عام لوگوں کی اکثریت ایسی ہی ہوتی ہے۔ دوسرے وہ جو نیکی کا بدلہ بھی بُرائی سے دیتے ہیں۔ یہ بدترین لوگ ہوتے ہیں جو بچھو کی سرشت رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ بالآخر اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔ ان کی اس بدفطری کی وجہ سے لوگ ان سے نفرت کرتے اور ان سے پرے ہی رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تیسرے وہ جو بُرائی ہونے پر بھڑک نہیں اٹھتے بلکہ اسے برداشت کر جاتے ہیں اور بُرائی کرنے والے سے خیر خواہی اور بھلائی کا سلوک کرتے ہیں۔ یہ کام کوئی بچوں کا کھیل نہیں بلکہ بڑے حوصلہ اور دل گردہ کا کام ہے۔ ایسے کام کی اسی سے توقع کی جاسکتی ہے جو بڑا صاحب عزم اور عالی حوصلہ شخص ہو۔ ایسے لوگ سب سے بہتر ہوتے ہیں اور یہ لوگ بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "پہلوان وہ نہیں ہے جو کشتی میں مقابل کو پچھاڑ دے، بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

عملی پہلو: یہ نسخہ ہے تو بڑا کارگر، مگر اسے استعمال کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اس کے لئے بڑا دل گردہ چاہیئے۔ اس کے لئے بڑا عزم، بڑا حوصلہ، بڑی قوت برداشت اور اپنے نفس پر بہت بڑا قابو درکار ہے۔ وقتی طور پر ایک آدمی کسی بدی کے مقابلہ میں بڑی نیکی برت سکتا ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ لیکن جہاں کسی شخص کو سالہا سال تک ان باطل پرست شریر لوگوں کے مقابلہ میں حق کی خاطر لڑنا پڑے جو اخلاق کی کسی حد کو پھاند جانے میں تامل نہ کرتے ہوں اور پھر طاقت اور اختیارات کے نشہ میں بھی بدمست ہو رہے ہوں اور وہاں بدی کا مقابلہ نیکی اور وہ بھی اعلیٰ درجہ کی نیکی سے کرتے چلے جانا اور کبھی ایک مرتبہ بھی ضبط کی باگیں ہاتھ سے نہ چھوڑنا کسی معمولی آدمی کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جو ٹھنڈے دل سے حق کی سربلندی کے لئے کام کرنے کا پختہ عزم کر چکا ہو، جس نے پوری طرح سے اپنے نفس کو عقل و شعور کے تابع کر لیا ہو اور جس کے اندر نیکی و راستی ایسی گہری جڑیں پکڑ چکی ہوں کہ مخالفین کی کوئی شرارت و خباثت بھی اسے اس کے مقامِ بلند سے نیچے اُتار لانے میں کامیاب نہ ہو سکتی ہو۔ یہ قانونِ فطرت ہے۔ بڑے ہی بلند مرتبہ کا انسان ان صفات سے متصف ہوا کرتا ہے اور جو شخص یہ صفات رکھتا ہو اسے دنیا کی کوئی طاقت بھی کامیابی کی منزل تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی۔ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ گھٹیا درجہ کے لوگ اپنی کمینہ چالوں، ذلیل ہتھکنڈوں، پیچ اور رکیک حرکتوں سے اس کو شکست دے دیں۔

آیت نمبر ۳۶: اگر شیطان دعوتِ دین اور عمدہ اخلاقی رویہ میں رکاوٹ ڈالے تو اس کے شر سے بچنے کے لئے فوراً اللہ ﷻ کی پناہ لی جائے۔ کیوں کہ وہی دُعاؤں کو سنتا اور سب کے حال سے واقف ہے اور وہی شیطان کے حملوں سے بچانے والا ہے۔

علمی بات: اگر کسی کے دل میں شیطان وسوسہ پیدا کرے تو اسے چاہیئے کہ وہ فوراً اللہ ﷻ کی پناہ طلب کرے۔ اگر مخالفوں کی شرارت اور شیطان کی شر انگیزی سے طبیعت میں کوئی بُرا جذبہ اُبھرے تو اس وقت آدمی کو اللہ ﷻ کی پناہ مانگنی چاہیئے۔ اللہ ﷻ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے۔ جب آدمی جذبات کی رو میں بہہ جانے کے بجائے صدقِ دل سے اللہ ﷻ کی پناہ کا طالب ہو گا تو اللہ ﷻ اس کو ضرور اپنی پناہ میں لے لے گا اور شیطان کو اس پر قابو نہیں پانے دے گا۔

علمی بات: نزغ کا معنی دل میں وسوسہ ڈالنا ہے۔ وہ وسوسے جن کی وجہ سے انسان گناہ کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اسے نزغ الشیطٰن کہتے ہیں۔

علمی بات: شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ وہ اسے صراطِ مستقیم سے ہٹانا چاہتا ہے اور گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ جب اللہ ﷻ کا کوئی نیک بندہ اپنے حسنِ عمل سے خوبصورت روایات قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے تو شیطان اسے بچھاڑنے کے لئے اپنی کوششیں تیز کر دیتا ہے۔ وہ بھلا کب گوارا کر سکتا ہے کہ اہلِ ایمان کی ذات میں نیکی، حسنِ خلق اور پاک بازی کا ایک ایسا حسین پیکر دنیا کے سامنے پیش ہو جسے دیکھ کر دل بے ساختہ اس کی طرف کھچے چلے آئیں۔ وہ ضرور ڈنگ مارتا ہے اور پوری کوشش اور تگ و دو کرتا ہے کہ اہلِ ایمان سے کوئی ایسی بات صادر ہو جائے جس کو بگاڑ کر خلط ملط کر کے وہ ان کی سیرت کی دلکشی اور جاذبیت ختم کر دے۔ اپنے دشمن کے اس وار سے اہلِ ایمان کو ہمیشہ چوکنا رہنا چاہیئے ایسا نہ ہو کہ وہ پچھاڑ دیئے جائیں۔ جب بھی شیطان کوئی بات ان کے دل میں ڈالے، اُنہیں چاہیئے کہ ایک لمحہ ضائع کیئے بغیر اللہ ﷻ کی پناہ حاصل کرنے کے لئے التجا کریں، تا کہ اللہ ﷻ اُنہیں شیطان کے شر سے محفوظ رکھے۔

علمی و عملی بات: شیطان کے وسوسہ اور اس کے شر سے بچنے کا واحد علاج اللہ ﷻ کی پناہ ہے۔ جب انسان صدقِ دل سے اللہ ﷻ کی پناہ طلب کرتا ہے تو اللہ ﷻ اس کو ضرور اپنی حفاظت اور پناہ میں لے لیتا ہے۔ جب کوئی بندہ اللہ ﷻ کی پناہ میں آجائے تو پھر شیطان اس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا۔ اللہ ﷻ کی پناہ میں آنے کے بعد وہ بندہ ہر قسم کے شرور و فتن سے بچ جاتا ہے اور اللہ ﷻ شیطان کو اس پر قابو نہیں دیتا۔ پس اللہ ﷻ کی پناہ ہی بندے کے لئے اصل اور سب سے بڑی حفاظت ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے دو آدمی لڑائی جھگڑا کرنے لگے۔ ایک نے دوسرے کو گالی دی اور غصہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر یہ شخص وہ کلمہ کہہ لے تو اس کا غصہ جاتا رہے گا اور وہ کلمہ یہ ہے: "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔" (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۳۷: رات اور دن، سورج اور چاند، اللہ ﷻ کی قدرت کے مظاہر ہیں۔ اگر فی الواقع اللہ ﷻ کی عبادت کرنی ہے تو براہِ راست اسی کی عبادت کی جائے جو ان سب کا خالق اور ظاہر کرنے والا ہے۔ خالق کے بجائے مخلوق کو اپنا معبود مان کر انہیں سجدہ نہ کیا جائے۔

علمی بات: رات اور دن، سورج اور چاند اللہ ﷻ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہیں۔ سورج اور چاند بھی انسان کی طرح اللہ ﷻ کی مخلوق ہیں اور اس کے حکم کے پابند ہیں، لہٰذا وہ اس قابل نہیں ہیں کہ انسان ان کو سجدہ کرے بلکہ سجدہ کا مستحق اللہ ﷻ ہی ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے۔ پس انسان کو چاہیئے کہ صرف اللہ ﷻ کو سجدہ کرے اور اس کے علاوہ کسی کو سجدہ نہ کرے۔ سورج اور چاند کے بعض پجاری یہ کہتے ہیں کہ ان چیزوں کی پرستش سے ہمارا مقصد اللہ ﷻ کی پرستش ہے۔ اس آیت میں اُنہیں تنبیہ کی جارہی ہے کہ اگر تم واقعی اللہ ﷻ کی عبادت کرتے ہو تو پھر صرف اسی کی عبادت کرو، سورج اور چاند عبادت کے لائق نہیں ہیں۔

علمی بات: رات اور دن، سورج اور چاند اللہ ﷻ کی وحدانیت و قدرت کی نشانیاں ہیں۔ دن اور رات یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔ رات میں تاریکی ہے اور دن میں اُجالا ہے۔ دن کا تعلق سورج سے ہے، جب سورج ہماری نظروں سے مخفی ہوتا ہے تو چاند ظاہر ہو جاتا ہے۔ سورج سے تپش و حرارت ہے اور چاند سے ٹھنڈک، تروتازگی اور نمی ہے۔ سورج اور چاند اپنے اپنے مدار میں رہتے ہیں۔ اللہ ﷻ نے انسان کے فائدہ کے لئے سورج کو ایک ایسے مدار کا پابند کر دیا ہے کہ اگر وہ اس سے نیچے ہوتا تو اس کی تپش سے زمین پر کوئی زندہ نہ رہتا اور اگر وہ اپنے مدار سے اوپر ہوتا تو ساری دنیا سردی سے منجمد ہو جاتی۔ سورج اور چاند کے طلوع و غروب سے دن رات کا فرق پڑتا ہے، مہینے اور برسوں کی گنتی معلوم ہوتی ہے۔ جس سے عبادات، معاملات اور حقوق کی باقاعدہ ادائیگی ہوتی ہے۔ یہ رات اور دن اور یہ سورج اور چاند سب اللہ وحدہٗ لاشریک کے وجود، اس کی قدرتِ کاملہ، اس کے اقتدارِ اعلیٰ اور اس کے رب کائنات ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو اپنے خدا ہونے پر دلالت کرتی ہو۔

فکری پہلو: انسان کی سب سے بڑی گمراہی اس کی ظاہر پرستی ہے۔ قدیم زمانہ کے انسان کو سورج اور چاند اور ستارے سب سے زیادہ نمایاں نظر آئے۔ اس لئے اس نے ان مظاہر کو خدا اور معبود سمجھ لیا اور ان کو پوجنا شروع کر دیا۔ موجودہ زمانہ میں مادی تہذیب کی جگمگاہٹ لوگوں کو نمایاں دکھائی دے رہی ہے اس لئے اب مادی تہذیب کو وہ مقام دے دیا گیا ہے جو قدیم زمانہ میں سورج اور چاند کو حاصل تھا۔ حالانکہ خواہ سورج اور چاند ہوں یا دوسرے مظاہر سب کے سب اللہ ﷻ کی مخلوق ہیں۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ خالق حقیقی کا پرستار و عبادت گزار بنے نہ کہ اس کی مخلوقات کا۔

آیت نمبر ۳۸: غرور اور تکبر کی بنا پر اللہ ﷻ کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے گریز کرنے والوں کی نافرمانی سے اللہ ﷻ بے نیاز ہے۔ اللہ ﷻ کے مقرب فرشتے تو دن رات اس کی تسبیح اور فرماں برداری کرتے ہیں۔ ایسا کرنے سے وہ تھکتے نہیں ہیں۔

علمی بات: اگر لوگ اللہ ﷻ کی عبادت کرنے سے روگردانی کرتے ہیں اور تکبر کرتے ہیں تو اس سے اللہ ﷻ کی شان میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ سرکش لوگ اللہ ﷻ سے منہ موڑ کر اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں، یہ اللہ ﷻ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اللہ ﷻ کی عظمت و بزرگی کا عالم یہ ہے کہ بے شمار مقرب فرشتے ہر وقت اس کی تسبیح میں مشغول رہتے ہیں، وہ نہ کبھی تھکتے ہیں اور نہ اُکتاتے ہیں۔

علمی بات: قرآنِ حکیم میں بعض آیات "آیات سجدہ" کہلاتی ہیں جن کی تلاوت کرنے یا سننے پر سجدہ کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ یہ آیت بھی ان آیات سجدہ میں سے ایک ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی یہ شان ہے کہ بے شمار نوری فرشتے اللہ ﷻ کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ وہ اپنی پاک زبانوں سے اللہ ﷻ کی پاکی بیان کرتے ہیں اور اس کی حمد وثناء میں محو رہتے ہیں۔ نہ تھکتے ہیں نہ اکتاتے ہیں۔ یہی ان کا وظیفۂ حیات اور یہی ان کی غذا ہے اور اسی ذکر و تسبیح پر ہی ان کی زندگی کا انحصار ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے: "جو اس کے پاس ہیں یعنی فرشتے وہ نہ اس کی عبادت سے تکبر کرتے ہیں اور نہ ہی تھکتے ہیں۔ وہ دن اور رات تسبیح بیان کرتے ہیں وہ سستی نہیں کرتے۔" (سورۃ الانبیاء ۲۱، آیات: ۱۹، ۲۰)

آیت نمبر ۳۹: زمین اللہ ﷻ کی قدرت کی عظیم نشانی ہے۔ خشک سالی کی وجہ سے وہ ایسے نظر آتی ہے گویا مردہ ہو۔ پھر اللہ ﷻ کے حکم سے اس پر بارش کا نزول ہوتا ہے اور یہ سبزہ اور مختلف نباتات سے زندہ ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ اللہ ﷻ جو مردہ زمین کو دوبارہ زندہ کر سکتا ہے وہ انسانوں کو بھی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ فرمائے گا۔ بلاشبہ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

علمی بات: مردہ زمین کو بارش کے ذریعہ سے زندہ کر دینا اور روئیدگی کے قابل بنا دینا، اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ ﷻ مُردوں کو بھی یقیناً زندہ کر دے گا۔ بعض اوقات زمین خشک ہو جاتی ہے سبزی بالکل نہیں رہتی سوکھی ہوئی حالت میں پڑی رہتی ہے۔ پھر اللہ ﷻ بارش برساتا ہے جس سے زمین میں تازگی آجاتی ہے اور پھلتی پھولتی ہے۔ اس سے پودے اُگتے ہیں اور زمین ہری بھری ہو جاتی ہے۔ قیامت قائم ہونے اور زندہ ہو کر قبروں سے نکلنے اور دوبارہ زندگی حاصل ہونے کو جو لوگ بعید اور عجیب سمجھتے ہیں، ان کے لئے زمین کی حالت بدلنا خشک زمین کا ترو تازہ ہو جانا اس میں پودے نکل آنا، یہ اس بات کی نظیر ہے کہ انسان بھی مر کر پھر اسی طرح زندہ ہو کر قبروں سے باہر آجائیں گے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "دو مرتبہ صور پھونکنے کے درمیان چالیس (دن یا ماہ یا سال) کی مدت ہوگی۔ پھر (اتنی مدت کے گزرنے کے بعد) اللہ ﷻ آسمان سے بارش نازل فرمائے گا، جس سے لوگوں کے جسم اس طرح (زمین سے) اُگ پڑیں گے جس طرح سبزی اُگتی ہے۔" (صحیح مسلم)

علمی بات: موجودہ دور کی سائنس نے تحقیق کے بعد ثابت کیا ہے کہ دنیا کی ہر چیز جوڑے کی شکل میں پیدا کی گئی ہے حتیٰ کہ اگر ایٹم کو بھی کاٹیں تو اس میں برقی ذرات الیکٹرون، پروٹون وغیرہ جوڑوں کی حالت میں ہوتے ہیں۔ جس زمانہ میں قرآن مجید نازل کیا گیا تھا، اس زمانہ میں غیر جاندار وں کے بارے میں یا پھر اشیاء کے بارے میں جوڑے کی شکل میں پائے جانے کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ لیکن قرآنِ حکیم بتا رہا ہے اور وہ اس بات کو دلیل بنا کر کہتا ہے کہ اگر ہر چیز جوڑا جوڑا ہے تو اس کائنات میں دنیا کا بھی دوسرا جوڑا ہونا چاہیئے۔ اگر یہ دنیا ہے تو پھر آخرت بھی ہونی چاہیئے۔ آخرت کے بغیر دنیا کا وجود بھی عبث نظر آتا ہے۔ چنانچہ آخرت میں سب لوگوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور دنیا میں کیئے ہوئے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

آیت نمبر ۴۰: ان لوگوں کے لئے شدید وعید جو اللہ ﷻ کی آیات کا انکار کرتے ہیں یا اس کے مفہوم میں تحریف کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ ﷻ کی آیات میں ٹیڑھ اختیار کرنے والے اس سے پوشیدہ نہیں ہیں اور وہ آگ میں ڈالے جائیں گے۔ تو کیا ایسا شخص بہتر ہے؟ یا وہ جو روز قیامت بے خوف ہو گا اور عذاب سے محفوظ ہو گا۔ ان کو اختیار ہے کہ وہ جو چاہیں کریں لیکن ان کے اعمال کو اللہ ﷻ خوب دیکھ رہا ہے۔

علمی بات: جو لوگ اللہ ﷻ کی آیات سے انحراف اور کج روی اختیار کرتے ہیں، وہ اللہ ﷻ سے پوشیدہ اور چھپے ہوئے نہیں ہیں کہ اس کے عذاب سے بچ جائیں گے، بلکہ اللہ ﷻ ان کی تمام حرکات سے بخوبی واقف ہے اور ان کو سزا دینے پر بھی قادر ہے۔ بھلا وہ شخص جس کو جہنم کی دہکتی آگ میں ڈالا جائے گا وہ بہتر ہے یا وہ شخص جو امن وسکون اور اطمینان کے ساتھ جنت میں داخل ہو گا۔ اس کا جواب معلوم ہے کہ یقیناً جہنم کے عذاب سے بچ جانے والا اور اطمینان کے ساتھ جنت میں داخل ہونے والا ہی بہتر ہے۔ آیت کے آخر میں اللہ ﷻ نے ان لوگوں کو ڈرانے کے لئے فرمایا ہے کہ جو چاہو کرتے رہو، اللہ ﷻ تمہارے تمام کرتوتوں سے خوب واقف ہے، لہٰذا تم اس کے عذاب سے بچ نہیں سکتے۔

علمی بات: الحاد کے معنیٰ انحراف اور کج روی اختیار کرنے کے ہیں۔ اللہ ﷻ کی آیات میں الحاد کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ﷻ کی آیات اور اس کی نشانیاں تو کسی اور سمت میں رہنمائی کر رہی ہوں لیکن آدمی اپنی دھاندلی، ضد یا کج بحثی سے کوئی اور راہ اختیار کرے اور لوگوں کو بھی اس کی طرف موڑنے کی کوشش کرے۔ اللہ ﷻ کی آیات کا جو مطلب ہے وہ مطلب نہ لے، باقی ہر طرح کے غلط معنیٰ ان کو پہنا کر خود بھی گمراہ ہو اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا رہے۔ ایسے لوگ حق سے روگردانی

کرتے ہیں لیکن صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ حق میں ایسی چیزوں کی ملاوٹ کرتے رہتے ہیں جن کے باعث لوگ حق سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ کفارِ مکہ قرآنِ مجید کی دعوت کو روکنے اور نقصان پہنچانے کے لئے جو چالیں چل رہے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ قرآنِ حکیم کی آیات کو سن کر جاتے اور پھر کسی آیت کو سیاق وسباق سے کاٹ کر، کسی آیت میں لفظی تحریف کرکے، کسی فقرے یا لفظ کو غلط معنیٰ پہنا کر طرح طرح کے اعتراضات (معاذ اللہ) نبی کریم ﷺ پر جڑتے اور لوگوں کو بہکاتے پھرتے تھے کہ لو سنو، آج انہوں نے کیا کہہ دیا ہے۔

آیت نمبر ۴۱: وہ لوگ بھی اللہ تعالیٰ سے چھپے ہوئے نہیں ہیں جو قرآنِ حکیم کے مضامین پر اعتراض کرتے ہیں یا اس میں شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں۔ بلاشبہ قرآنِ حکیم ایک باعزت اور زبردست کتاب ہے اور طعن کرنے والوں کی باتوں سے بہت بلند ہے۔

علمی بات: جن لوگوں کے پاس قرآنِ حکیم آگیا ہے اور وہ اس کا انکار کرتے ہیں، ان کا انجام نہایت ہی ہولناک ہے جو ان کو بہر حال بھگتنا ہوگا۔ اس کتاب کا انکار کرنے والوں نے اس کو ایک غیر اہم کتاب خیال کیا ہے اور وقعت کی نظر سے نہیں دیکھا حالانکہ یہ کوئی معمولی کتاب نہیں بلکہ ایک زبردست کتاب ہے۔ اس کے بیان کردہ حقائق ودلائل کو نہ جھٹلایا جاسکتا ہے اور نہ نیچا دکھایا جاسکتا ہے۔

علمی بات: اس آیت میں قرآنِ مجید کو "الذِّکر" یعنی یاددہانی قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب تو اس گواہی کو اُجاگر کرکے انسان کے سامنے لارہی ہے جو پہلے سے اس کی فطرت کے اندر مخفی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی محبت تو انسانی اَرواح کے اندر پہلے سے موجود ہے لیکن بعض لوگوں کی عدم توجہی کی وجہ سے اس معرفت پر غفلت کے پردے پڑگئے ہیں جس کے نتیجہ میں وہ اپنی فطرت کی اصل پہچان کو بھول کر اللہ تعالیٰ ہی کو بھول گئے ہیں۔ چنانچہ یہاں قرآنِ حکیم کو "الذِّکر" کہہ کر گویا اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ یہ کتاب انسانی فطرت میں پوشیدہ معرفت خداوندی کے ابدی سبق کی یاددہانی کے لئے آئی ہے۔ لیکن وہ جنہوں نے اس یاددہانی کا انکار کردیا ہے اُنہیں اس کی سزا ضرور ملے گی۔

علمی بات: قرآنِ مجید ایک زبردست کتاب ہے۔ اس میں صداقت، علم حق، دلیل وحجت، زبان اور بیان، بھیجنے والے رب کائنات کی خدائی اور پیش کرنے والے رسول ﷺ کی شخصیت کا زور، زبردست قوت اور کمال کا اثر ہے۔ یہ کتاب اپنی کامل اور قطعی دلیل، اپنے حقیقت افروز بیان، اپنی تاثیر کلام اور وجدان سے اپیل کرنے والی باتوں کے ذریعہ انسان کی کایا پلٹ دیتی ہے۔ اس کے نزول کے کچھ ہی عرصہ بعد دنیا نے دیکھ لیا کہ یہ ایسی طاقتور کتاب ہے کہ اس نے کتنی ہی قوموں کو مسخر کیا اور کتنے ہی ملکوں پر فتح کے جھنڈے گاڑھ دیئے۔

آیت نمبر ۴۲: عظمتِ قرآن کا ذکر ہے کہ قرآن کریم میں کسی پہلو سے بھی جھوٹ اور باطل راہ نہیں پاسکتا، نہ اس کے بیان کردہ دلائل اور حقائق کو جھٹلایا جاسکتا ہے۔ یہ اس پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے جو اپنی ذات، اقوال وافعال میں حکیم ہے اور حمد وثناء کے لائق ہے۔

علمی بات: اس قرآنِ حکیم میں کسی طور بھی کسی جہت سے باطل کی آمیزش نہیں ہوسکتی۔ یہ مکمل طور پر محفوظ کتاب ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ اس لئے کسی باطل کی مجال نہیں خواہ وہ شیطان ہو یا انسان کہ اس کتاب میں کمی بیشی یا کوئی تحریف کرسکے۔ یہ وہ کتاب ہے جسے اس اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے جو بڑی حکمتوں والا ہے اور سب تعریفیں اسی کے لئے ہیں۔

علمی بات: قرآنِ مجید میں کسی طور بھی کسی جہت سے باطل کی آمیزش نہیں ہوسکتی۔ اس کے تین مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ قرآنِ حکیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل آمین علیہ السلام کے ذریعہ اپنے آخری نبی اور رسول حضرت سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ کے قلب اطہر پر نازل کیا۔ حضرت جبرائیل آمین علیہ السلام قوی اور امین ہیں، نہ تو وہ خود کلام الٰہی میں کوئی کمی بیشی کرسکتے ہیں اور نہ کوئی جن یا شیطان ان سے کلام کا کچھ حصہ چھین سکتا ہے یا اس میں آمیزش کر سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی صداقت ودیانت پر آپ ﷺ کے دشمن بھی شاہد تھے اور آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا کلام جوں کا توں اُمّت تک پہنچا دیا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جب سے قرآنِ مجید نازل ہوا ہے، اسی وقت سے مسلمانوں کے سینوں کے اندر محفوظ ہوکر نسلاً بعد نسل تواتر کے ساتھ منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ ہر زمانہ میں لاکھوں کی تعداد میں اس کے حافظ موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں۔ دوسری طرف اس کے نزول کے ساتھ ہی اس کی کتابت شروع ہوگئی تھی اس دور سے لے کر آج تک مسلسل اور متواتر اس کی اشاعت ہو رہی ہے اور کروڑوں اور اربوں تک اس کے نسخے لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکے ہیں۔ پس یہ حفظ اور

کتابت دونوں صورتوں میں ہر لحاظ سے محفوظ ہے۔ اس کا تیسرا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جو حقائق بیان کیئے ہیں، کوئی علم ایسا وجود میں نہیں آسکتا جو فی الواقع علم ہو اور قرآنِ حکیم کے بیان کردہ علم کی تردید کرتا ہو، کوئی تجربہ کوئی مشاہدہ ایسا نہیں ہو سکتا جو یہ ثابت کرے کہ قرآنِ حکیم نے عقائد، اخلاق، قانون، تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت اور سیاست کے باب میں انسان کی جو رہنمائی دی ہے وہ غلط ہے۔ اس کتاب نے جس چیز کو حق کہہ دیا ہے وہ کبھی باطل ثابت نہیں ہو سکتی اور جسے باطل کہہ دیا ہے وہ کبھی حق ثابت نہیں ہو سکتی۔

آیت نمبر ۴۳: نبی کریم ﷺ کی دل جوئی اور تسلی کا ذکر ہے۔ ماضی میں بھی رسولوں کو اللہ ﷻ کی کتابوں کے حوالہ سے ایسے ہی اعتراضات کا سامنا رہا۔ بلاشبہ اللہ ﷻ بہت مغفرت فرمانے والا ہے۔ توبہ کرنے والوں کو معاف فرما دیتا ہے۔ البتہ حق کے مخالفین کو وہ عبرت ناک سزا بھی دیتا ہے۔

علمی بات: اس آیت میں حضور نبی کریم ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ کفارِ مکہ آپ ﷺ کے متعلق جو دل آزار باتیں کرتے ہیں اور آپ ﷺ کو جادوگر اور مجنون کہتے ہیں (معاذ اللہ)، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے آپ ﷺ سے پہلے انبیائے کرام علیہم السلام کو بھی ایسی ہی تکلیف دہ باتیں کہی جاتی تھیں۔ انہوں نے صبر کیا آپ ﷺ بھی صبر کیجیے۔ آپ ﷺ کا رب مغفرت فرمانے والا اور دردناک عذاب دینے والا ہے۔ اگر یہ کفار توبہ کر کے مغفرت کے طلب گار نہ ہوئے تو انہیں دردناک عذاب دیا جائے گا۔

علمی بات: تمام رسولوں نے اپنی اپنی قوموں کو اللہ ﷻ کی توحید کی دعوت دی۔ لیکن ہمیشہ قوم کے سرداروں نے رسولوں کی تکذیب کی اور ماننے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے اللہ ﷻ کی آیات، پیغمبروں اور ایمان والوں سے استہزا کیا۔ تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے صبر و تحمل سے کام لیا اور اللہ ﷻ کی عبادت اور دعوتِ توحید پر قائم رہے۔ نتیجہ کے طور پر انبیاء کرام علیہم السلام اور ایمان والے مغفرت کے مستحق ٹھہرے اور منکرین اور استہزا کرنے والے عذاب کے مستحق ٹھہرے۔

علمی بات: عقاب کا مطلب ہے: مار۔ عذاب۔ سزا۔ عقوبت، سزا دینا۔ عقاب کے اصل معنیٰ پیچھے ہو لینے کے ہیں اسی لئے عقاب اس سزا کو کہیں گے جو ارتکاب جرم کے بعد اس کا مستحق ہو جانے پر مرتکب کو دی جاتی ہے۔ عذاب اور عقاب میں فرق یہ ہے کہ عذاب استحقاق اور بغیر استحقاق دونوں طرح ہو سکتا ہے اور عقاب صرف جرم ثابت ہونے کے بعد مستحق کو دیا جاتا ہے۔

عملی پہلو: رحمت اور عقاب (عذاب) دونوں ہی اللہ ﷻ کی شانیں ہیں۔ یعنی وہ بڑا ہی بخشنے والا بھی ہے اور دردناک و عبرت ناک عذاب دینے والا بھی ہے۔ اس کی مغفرت و بخشش کی اُمید بھی رکھنی چاہیئے اور اس کے عذاب و عقاب سے ہمیشہ ڈرتے بھی رہنا چاہیئے کہ ایمان خوف اور امید دونوں کے درمیان ہی ہوتا ہے۔ اللہ ﷻ کی مغفرت بہت وسیع ہے۔ لہٰذا اس کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کے عذاب سے بے فکر اور لاپرواہ ہو جانا بھی بہت سخت خطرے کی بات ہے کہ اس کا عذاب بے خوفی کی چیز نہیں بلکہ نہایت ڈرنے کی چیز ہے۔

آیت نمبر ۴۴: اگر قرآنِ حکیم کو کسی عجمی زبان میں نازل کیا جاتا تو یہ امر باعث حیرت ہوتا کہ عربی بولنے والے رسول، عجمی کلام سنا رہے ہیں۔ مخالفین اس پر بھی اعتراض کرتے کہ ان کی ہدایت کے لئے عجمی زبان میں وحی کیوں نازل کی گئی ہے۔ درحقیقت ان کو حق قبول نہیں کرنا تھا۔ قرآنِ حکیم تو مخلص اہل ایمان کے لئے ہدایت اور ان کی ظاہری و باطنی بیماریوں کے لئے شفا ہے۔ البتہ جو قرآنِ کریم کو سننے اور سمجھنے کا ارادہ نہیں رکھتے وہ قرآنِ مجید سے ہدایت حاصل نہیں کر سکتے گویا وہ بہرے اور اندھے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے کہ کوئی دور سے ان کو آواز دے اور وہ اس کی بات کو سمجھ نہ سکیں۔

علمی بات: کفارِ مکہ اپنی ہٹ دھرمی اور سرکشی کے باعث قرآنِ مجید کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھے اور قرآنِ مجید کے متعلق اکثر عجیب و غریب قسم کے اعتراضات بناتے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک اعتراض یہ تھا کہ قرآنِ مجید کو عجمی زبان میں نازل کیوں نہیں کیا گیا؟ اللہ ﷻ نے اس آیت میں ان کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ اگر ہم قرآنِ مجید کو عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں نازل فرماتے تو پھر بھی ان کو یہ شکایت ہوتی کہ یہ کتاب عجمی زبان میں ہے اور ہماری زبان عربی ہے۔ اور تعجب کا اظہار کرتے کہ عربی لوگوں پر عجمی زبان میں کتاب نازل کی گئی ہے، نبی تو عربی ہے لیکن کتاب عجمی ہے۔ اُنہیں اس کتاب کی زبان ہی نہیں آتی تو وہ اس کی تفصیلات کو کیسے سمجھیں اور اس پر عمل کیسے کریں؟ اللہ ﷻ نے اپنے حبیب کریم ﷺ کو تلقین فرمائی ہے کہ آپ ﷺ اُنہیں بتا دیجئے کہ یہی قرآنِ حکیم ایمان والوں کے لئے ہدایت اور رہنمائی کا ذریعہ ہے۔ اس میں دلوں کی بیماریوں کے لئے علاج اور شفا ہے۔ درحقیقت کفار کا حال یہ ہے کہ وہ قرآنِ

مجید کو سمجھنے کا ارادہ ہی نہیں رکھتے، اس لئے ان کے کانوں میں تعصب کی گرانی ہے اور ان کی آنکھوں میں ہٹ دھرمی کی تاریکی ہے اور وہ قرآنِ مجید کی آواز کو اپنے دل ودماغ تک پہنچنے نہیں دیتے جس کی وجہ سے وہ اس نورِ ہدایت سے مستفید ہونے سے قاصر ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی دور سے کسی کو کچھ کہہ رہا ہو کہ نہ اس کے کانوں تک صحیح الفاظ پہنچتے ہیں اور نہ وہ ٹھیک طرح اس کا مطلب ہی سمجھتا ہے۔

علمی بات: اس آیت میں قرآنِ کریم کی دو صفات بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ہدایت ہے، زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کو ایسا راستہ بتاتا ہے جو اس کے لئے نافع ومفید ہی ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ شفا ہے۔ قرآنِ مجید روحانی اور جسمانی دونوں قسم کے امراض کے لئے شفاء ہے۔ قرآنِ حکیم کا امراض باطنہ کفروشرک، کبروحسد، حرص وطمع وغیرہ سے شفا ہونا تو ظاہر ہی ہے۔ البتہ ظاہری اور جسمانی اَمراض سے شفا ہونا بھی اس میں داخل ہے جیسا کہ اکثر مشاہدہ میں آتا ہے کہ بہت سے جسمانی اَمراض کا علاج قرآنی دُعاؤں، سورتوں اور آیاتِ مبارکہ سے ہوتا ہے اور اللہ ﷻ ان کے ذریعہ شفا عطا فرماتا ہے۔

علمی بات: آیت سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ عربی زبان وحی الٰہی کے معنیٰ ومفہوم کو ادا کرنے کے لحاظ سے موزوں ترین زبان ہے۔ جو لوگ عربی زبان سے آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ زبان امتیازی خصوصیات کی حامل ہے مثلاً یہ کہ وہ ایک منظم زبان ہے جس میں گرامر کے لحاظ سے فعل، اسم فاعل، اسم مفعول وغیرہ کو ایک خاص سانچے (صیغے) میں ڈھالا جاتا ہے۔ اس کے بیشتر الفاظ اپنے ابتدائی اور اصل معنیٰ (Root Word) کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے ان کے صحیح مفہوم کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ وہ حقائق ومعارف کو ادا کرنے کی بہترین صلاحیت رکھتی ہے اس لئے وحی الٰہی کی لطافتوں اور اس کے معنیٰ کی گہرائیوں کو بیان کرنے کی وہ پوری طرح متحمل ہے۔ اس میں جامع کلمات کہے جاسکتے ہیں اور مؤثر کلام پیش کیا جاسکتا ہے۔ حفظ کے پہلو سے یہ نہایت موزوں زبان ہے اس لئے نزول قرآنِ مجید کے لئے ایک بہترین اور موزوں ترین زبان کا انتخاب اللہ ﷻ کی طرف سے ہوا۔

آیت نمبر ۴۵: اللہ ﷻ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کی لیکن اس کتاب کے ساتھ بھی مخالفین نے انکار کا طرزِ عمل ہی اختیار کیا۔ اب یہی صورتِ حال قرآنِ حکیم کے معاملہ میں بھی پیش آرہی ہے۔ اگر یہ بات طے نہ ہوتی کہ سرکشوں کو عذاب سے پہلے مہلت دی جائے گی تو فوراً ان کو عذاب دے کر تباہ کر دیا گیا ہوتا۔ مخالفین کا انکار محض شک کی وجہ سے ہے جو ان کو بے چین کیئے رکھتا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ سنا کر حضور نبی کریم ﷺ کو تسلی دی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ ﷻ نے تورات عطا کی تھی لیکن لوگوں نے اس میں بھی اختلاف کیا اور کسی نے تورات کے احکامات کو مانا اور کسی نے انکار کیا۔ اسی طرح کا معاملہ آپ ﷺ کے ساتھ ہو رہا ہے کہ کوئی آپ ﷺ پر ایمان لا رہا ہے اور کوئی انکار کر رہا ہے۔ اگر اللہ ﷻ کی طرف سے مہلت اور میعاد کی بات طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے مابین فیصلہ کر دیا جاتا اور کفار کو عذاب دے دیا جاتا۔ لیکن ان کفار کا حال یہ ہے کہ وہ قرآنِ مجید اور خاتم النبیین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں اور اس شک نے ان کو سخت خلجان اور اضطراب میں مبتلا کر رکھا ہے۔

علمی بات: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ ﷻ نے تورات عطا کی تھی۔ اس میں لوگوں کے لئے ہدایت اور رہنمائی تھی۔ لیکن بعد میں بنی اسرائیل کے ان علماء نے جو دنیا پرستی اور باہمی عناد میں مبتلا ہو گئے تھے، اس میں طرح طرح کے اختلافات پیدا کیئے۔ جب انہوں نے تورات کی آیتوں کی غلط تاویلیں کرنا شروع کیں تو نوبت الفاظ کی تحریف تک پہنچ گئی۔ پھر انہوں نے تذکیر اور خاص طور سے آخرت کی جزا وسزا سے متعلق یاددہانی کو تورات کے صفحات سے غائب کر دیا اور اپنی طرف سے اس میں بہت سے اضافے کیئے مثلاً اس میں اپنے مقصد، مطلب کی باتوں اور من پسند خیالات اور فکر کو داخل کیا اور اپنی یادداشت سے صحیح غلط تاریخی واقعات بھی اس میں نقل کر ڈالے یہاں تک کہ بے ہودہ، لغو، غیر مہذب فضول، بے سروپا قصے اور انبیاءِ کرام علیہم السلام کی سیرتوں کو داغ دار بنانے والی باتیں بھی شامل کیں۔

علمی بات: بظاہر تو کفارِ مکہ بڑے زور شور سے قرآنِ حکیم کے کلامِ الٰہی ہونے اور آنحضرت ﷺ کے رسول ہونے کا انکار کرتے تھے، لیکن درحقیقت ان کا یہ انکار کسی یقین کی بنیاد پر نہیں تھا، بلکہ ان کے دلوں میں شدید تذبذب برپا تھا۔ ایک طرف ان کے ذاتی مفاد، ان کے نفس کی خواہشات اور ان کے جاہلانہ تعصبات یہ تقاضا کرتے تھے کہ قرآنِ مجید اور آپ ﷺ کو جھٹلائیں اور پوری طاقت کے ساتھ ان کی مخالفت کریں۔ دوسری طرف ان کے دل اندر سے پکارتے تھے کہ یہ قرآنِ مجید فی الواقع ایک بے مثل کلام ہے جس کے مانند کوئی کلام کسی ادیب یا شاعر سے کبھی نہیں سنا گیا، نہ کوئی مجنون دیوانگی کے عالم میں ایسی باتیں کر سکتا ہے، نہ کبھی شیاطین

اس غرض کے لئے آسکتے ہیں کہ لوگوں کو خدا پرستی اور نیکی و پاکیزگی کی تعلیم دیں۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کی جب وہ تکذیب کرتے تھے تو ان کا دل اندر سے کہتا تھا کہ خدا کے بندو! کچھ شرم کرو، کیا یہ شخص جھوٹا ہو سکتا ہے؟ جب وہ ان پر الزام لگاتے تھے کہ آپ (ﷺ) یہ سب کچھ حق کی خاطر نہیں بلکہ اپنی بڑائی کے لئے کر رہے ہیں (معاذ اللہ) تو ان کا دل اندر سے انہیں ملامت کرتا تھا کہ لعنت ہے تم پر کہ اس نیک نفس انسان کامل کو بندۂ غرض کہتے ہو جس عظیم انسان کو کبھی تم نے دولت اور اقتدار اور نام و نمود کے لئے دوڑ دھوپ کرتے نہیں دیکھا ہے، جس کی ساری زندگی مفاد پرستی کے ہر شائبے سے پاک رہی ہے، جس نے ہمیشہ نیکی اور بھلائی، حق و صداقت کی سربلندی کے لئے کام کیا ہے، مگر کبھی اپنی کسی نفسانی غرض کے لئے کوئی بے جا کام نہیں کیا۔

آیت نمبر ۴۶: عنقریب مخالفین کے انکار کا نتیجہ ظاہر ہو کر رہے گا۔ اچھے عمل کرنے والے سرخرو ہوں گے اور حق کی مخالفت پر ڈٹ جانے والے ذلیل و رسوا ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرے گا۔

علمی بات: جو نیکی کرے گا اس کا فائدہ اسی کو حاصل ہوگا اور جو بُرائی کرے گا اس کا وبال اسی پر آئے گا۔ اللہ تعالیٰ ذرہ برابر بھی اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ یعنی ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوگا، بھلے کام کرنے والوں کو بھلائی کا نفع پہنچے گا اور بُرائی کرنے والوں کو بُرائی کا نقصان اور ضرر پہنچے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ظلم نہیں ہے، جیسا کوئی کرے گا ویسا بھرے گا۔

علمی بات: آخرت میں جزا و سزا کا اصول یہ ہے کہ نیکی کا اجر اسی شخص کو ملے گا جس نے نیکی کی ہوگی اور بُرائی کی سزا بھی وہی شخص پائے گا جس نے بُرائی کی ہوگی۔ ایسا نہیں ہوگا کہ کسی کی نیکی یا بُرائی دوسرے کے کھاتہ میں جمع کر لی جائے۔ ہر شخص اپنے کیئے کا ذمہ دار ہے اور اسی کے مطابق اس کو جزا یا سزا ملے گی۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اے میرے بندو! بے شک میں نے اپنی ذات پر ظلم کو حرام کر لیا ہے اور تمہارے درمیان بھی آپس میں ظلم کو حرام کر دیا ہے، پس تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔" (صحیح مسلم)

عملی پہلو: ہر انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اور اس کی جزا و سزا اسی کو پہنچے گی۔ جو شخص نیک کام کرتا ہے اسے اس کا اجر عظیم ملے گا اور جو گناہ کرتا ہے اسے اس کی سزا بھگتنا ہی پڑے گی، لہٰذا ہر شخص کو چاہیئے کہ وہ اپنے فائدہ اور نقصان کو اچھی طرح سمجھے اور وہی کام کرے جو اس کے لئے مفید ہو اور ہر اس کام سے بچے جو اس کے لئے عذاب کا باعث بن سکتا ہے۔

آیت نمبر ۴۷: سردارانِ قریش رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کرتے تھے کہ وہ قیامت کب آئے گی جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے؟ آگاہ کر دیا گیا کہ قیامت کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے جسے ہر شے کا علم ہے۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کس خوشہ سے پھل نکلے گا اور کس مؤنث کے رحم میں کیا ہے اور وہ کب اسے جنم دینے والی ہے؟ مشرکین کی تنبیہ کے لئے قیامت کا ایک منظر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس دن ان سے ان معبودانِ باطلہ کے متعلق پوچھا جائے گا جن کو وہ اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دیتے تھے۔ مشرکین شرک کا انجام دیکھ کر اپنے جرم کا اقرار کرنے کے بجائے انکار کر دیں گے۔

علمی بات: قیامت کب آئے گی؟ اس کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت کا یہ حال ہے کہ شگوفہ کے اندر اس کے پھل کے نکلنے تک جو کیفیات گزرتی ہیں اور رحم مادر پر جو جو مرحلے پیش آتے ہیں اور پھر جو وضع حمل ہوتا ہے، یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ مشرکین سے پوچھے گا کہ تم نے جو میرے ساتھ شریک بنا رکھے تھے وہ آج کہاں ہیں؟ ان کو بلاؤ تا کہ وہ تمہیں میرے عذاب سے بچائیں۔ مشرکین اپنی غلطی کا اعتراف کریں گے اور جواب دیں گے کہ آج ہم سے کوئی بھی شرک کا قائل نہیں ہے۔ اب ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔

عملی پہلو: اللہ تعالیٰ کے پاس ہر چیز کا علم ہے یہاں تک کہ اس کی نگاہ سے کسی شخص کا کوئی چھوٹا سا عمل بھی مخفی نہیں ہے۔ لہٰذا ہر انسان کو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنا چاہیئے اور اس کے علم کی وسعت کو اپنے ذہن میں مستحضر یعنی حاضر اور تازہ رکھنا چاہیئے تا کہ اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کی جائے اور اس کی ہر قسم کی نافرمانی سے بچا جائے۔

آیت نمبر ۴۸: مشرکین جنہیں دنیا میں پکارتے تھے وہ سب ان کے سامنے سے غائب ہو جائیں گے۔ اس وقت وہ یقین کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ اب اُنہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ہے۔

علمی بات: مشرکین جن باطل معبودوں کو پکارتے اور ان کی پوجا کرتے ہیں، قیامت کے دن وہ سب گم ہو جائیں گے، ان میں سے کوئی نظر نہیں آئے گا جو مشرکین کو نفع پہنچا سکے۔ تب ان مشرکین کو یقین ہو جائے گا کہ اب اللہ ﷻ کے عذاب سے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے کیونکہ یہ ان کی باطل پرستی کی سزا ہو گی جو ہر صورت اُنہیں بھگتنا ہی پڑے گی۔

علمی بات: دنیا میں مشرکین جھوٹے خداؤں کی پوجا کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض غلط فہمی کی بنیاد پر شرک کرتے ہیں جبکہ بعض جان بوجھ کر شرک کرتے ہیں۔ لیکن قیامت کے روز حقیقت سب کے سامنے واضح ہو جائے گی اور جھوٹے خدا کہیں نظر نہیں آئیں گے۔ تب مشرکین کو بھی یقین ہو جائے گا کہ جن خداؤں کی وہ پوجا کرتے رہے وہ جھوٹے ہیں اور ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس وقت مشرکین کے سامنے جھوٹے خداؤں کا بے بس ہونا اور ایک اللہ ﷻ کا حق ہونا معلوم ہو جائے گا۔ لیکن اس بات کا اُنہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا کیونکہ اس وقت ان کے لئے عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہو گا۔

عملی پہلو: اللہ ﷻ اکیلا ایک ہی معبود ہے اور اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔ مشرکین جن خداؤں کو پکارتے ہیں وہ سب جھوٹے ہیں۔ قیامت کے دن ان میں سے کوئی بھی مشرکین کی مدد کو نہ آئے گا۔ لہٰذا ہر انسان کو چاہیئے کہ وہ صرف ایک اللہ ﷻ کو ہی حقیقی معبود مانتے ہوئے اس کی کامل اطاعت کریں۔ باطل معبودوں کا انکار کرتے ہوئے ان کی پرستش سے باز رہیں کیونکہ وہ سب جھوٹے ہیں اور ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

آیت نمبر ۴۹: انسانوں کی اکثریت اللہ ﷻ سے کثرت سے بھلائیاں مانگتی ہے۔ لیکن اگر اُنہیں کوئی تکلیف پہنچے تو انتہائی مایوس اور نااُمید ہو جاتے ہیں۔

علمی بات: عام طور پر لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے لئے دنیاوی فوائد کے مانگنے سے نہیں تھکتے، جب دیکھئے اپنے لئے مال، اولاد، صحت وعافیت اور خوشحالی کی طلب میں رہتے ہیں۔ لیکن اگر کبھی اُنہیں تکلیف پہنچتی ہے، یا فقر وفاقہ کی نوبت آجاتی ہے تو غم سے نڈھال ہو جاتے ہیں اور نااُمیدی کے گہرے بادل ان کے دل ودماغ پر چھا جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اب وہ ہمیشہ اسی حال میں رہیں گے۔

علمی بات: انسانی طبیعت اور مزاج کے دو پہلو بیان ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان دنیا کا مال واسباب، صحت وقوت، عزت ورفعت اور دیگر دنیوی نعمتوں کے مانگنے سے نہیں تھکتا، بلکہ مانگتا ہی رہتا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ ہر طرح کی بھلائیاں میرے ہی لئے ہوں، رزق بھی کشادہ اور وافر ملے، خوشحالی اور عیش وعشرت نصیب ہو، تندرستی بھی ہو اور اولاد بھی اچھی ہو۔ اگر یہ سب چیزیں مہیا ہو بھی جائیں تو پھر یہ چاہتا ہے کہ ان میں ہر آن اضافہ بھی ہوتا رہے اور اس کی یہ حرص کبھی ختم ہونے کو نہیں آتی۔ اس کی طبیعت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب اسے کوئی تنگی، فاقہ یا بیماری یا اسی قسم کا کوئی دوسرا دکھ پہنچتا ہے اور اسے اس تکلیف کے دور ہونے کے ظاہری اسباب نظر نہیں آتے تو اللہ ﷻ کی رحمت سے مایوس ہو کر ناشکری کی باتیں کرنے لگتا ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اگر آدمی کو سونے سے بھری ایک وادی دے دی جائے تو وہ (اس پر قناعت اور صبر وشکر کرنے کے بجائے) ایسی ایک اور وادی کی خواہش کرے گا اور اگر اسے (سونے سے بھری) دوسری وادی بھی دے دی جائے تو وہ تیسری کی خواہش کرے گا۔ بات یہ ہے کہ آدمی کا پیٹ مٹی ہی بھرتی ہے۔" (صحیح بخاری)

عملی پہلو: عام طور سے انسان کا حال یہ ہے کہ وہ دنیا کی طلب میں رہتا ہے اور اپنے لئے راحت اور خوشحالی کا زیادہ سے زیادہ خواہاں ہوتا ہے۔ جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے یا مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو بہت جلد مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن اللہ ﷻ کے نیک بندوں کا حال ایسا نہیں ہوتا۔ اللہ ﷻ کے بندے قناعت اور صبر وشکر سے کام لیتے ہیں۔ وہ خوشحالی میں قناعت اختیار کرتے ہیں اور اللہ ﷻ کا شکر ادا کر کے مطمئن رہتے ہیں، مصیبت کے ایام میں صبر کرتے ہیں اور اللہ ﷻ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں۔

آیت نمبر ۵۰: اگر اللہ ﷻ لوگوں کی تکلیف کو دور کر دے اور اپنی رحمت سے نوازے تو وہ اس رحمت کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اسے اپنے حق پر ہونے کی علامت قرار دیتے ہیں۔ وہ قیامت کا انکار کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر بالفرض قیامت واقع ہو بھی گئی تو اُنہیں وہاں بھی دنیا کی طرح بھلائیاں حاصل ہوں گی۔ عنقریب ان کے اعمال ان کے سامنے رکھ دیئے جائیں گے اور اُنہیں ان کے طرز عمل کی بدترین سزا دی جائے گی۔

علمی بات: انسان کا یہ حال بھی بڑا عجیب ہے کہ جب اللہ ﷻ اس کی تکلیف دور کر کے اس کی راحت کا سامان کرتا ہے تو وہ اسے اللہ ﷻ کا احسان نہیں سمجھتا اور نہ اسے آزمائش خیال کرتا ہے بلکہ اسے اپنی قابلیت کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں تو اس کا بجا طور پر مستحق ہوں۔ وہ تکبر میں آکر اتنا اتراتا ہے کہ قیامت کا انکار کر دیتا ہے۔ وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میرے خیال میں قیامت کبھی نہیں آئے گی اور اگر بالفرض قیامت وقوع پذیر ہو جائے اور مجھے رب کی طرف لوٹایا جائے تو وہاں پر بھی مجھے نعمتیں ہی ملیں گی۔ یہ اس کی نادانی اور خام خیالی ہے کہ وہ اپنے آپ کو دھوکہ میں ڈال رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قیامت قائم ہوگی اور اس دن اللہ ﷻ کفار کے اعمال کو ان کے سامنے کھول کر رکھ دے گا اور اس کے بدلہ میں ان پر سخت عذاب مسلط کر دیا جائے گا۔

علمی بات: بعض لوگوں کا یہ رویہ بیان کیا گیا ہے کہ جب اللہ ﷻ ان کی تنگی، فاقہ یا بیماری کو دور کر دیتا ہے اور ان پر بھلے دن آجاتے ہیں تو پھر بھی وہ اللہ ﷻ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور نہ ہی اس کا شکر ادا کرتے ہیں بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ بس ان کی حسنِ تدبیر اور محنت کا نتیجہ ہے۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اپنی قابلیت، ذہانت اور تجربہ کے لحاظ سے اس کے ہی مستحق تھے کہ یہ نعمت ہم پر کی جاتی اور ہمیں اس منصب پر فائز کیا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ قیامت کا انکار کر دیتے ہیں اور اس خوش فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ اگر قیامت قائم ہوئی تو آخرت میں بھی اُنہیں اسی طرح انعامات ملیں گے جس طرح دنیا میں اُنہیں شان و شوکت ملی ہوئی ہے۔ ایسے لوگوں کا یہ رویہ اور نظریہ بالکل غلط ہے کیونکہ دنیا میں ان پر یہ انعامات اللہ ﷻ کی طرف سے ہوتے ہیں اور یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اللہ ﷻ ان سے راضی ہے۔ ان کا یہ نظریہ بھی درست نہیں ہے کہ آخرت میں بھی اُنہیں اسی طرح نوازا جائے گا جس طرح دنیا میں اُنہیں نوازا گیا ہے کیونکہ آخرت دارالجزا ہے جس میں انسان کو دنیا میں کیئے ہوئے اعمال کے مطابق جزا و سزا دی جائے گی۔

فکری پہلو: دنیا میں مال و دولت اور شان و شوکت کا مل جانا کسی طرح بھی اللہ ﷻ کے یہاں محبوب و مقبول اور پسندیدہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ اسی طرح مال و دولت اور شان و شوکت کا نہ ملنا بھی اللہ ﷻ کے یہاں رد ہونے اور غیر مقبول ہونے اور ناراضگی کی علامت نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب کچھ دراصل انسان کی ابتلا و آزمائش کے لئے مختلف پرچوں کی طرح ہوتا ہے جس کو انسان نے اپنے عقیدہ و عمل اور اخلاق و کردار کے ذریعہ حل کرنا ہوتا ہے۔ جس کا صلہ و بدلہ اسے آخرت کی اپنی دائمی اور ابدی زندگی میں پانا ہوتا ہے۔ اصل دولت ایمان اور نیک اعمال کی دولت ہے نہ کہ دنیاوی اور مادی مال و دولت۔ پس کسی کو دنیاوی مال و دولت کی بنا پر کبھی دھوکے میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "اے لوگو! اللہ کا وعدہ سچا ہے تو تم کو دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈال دے۔" (سورۃ فاطر ۳۵، آیت: ۵)

عملی پہلو: جب اللہ ﷻ کبھی تکلیف کے بعد راحت پہنچائے تو مومن کا یہ رویہ ہونا چاہیئے کہ وہ اللہ ﷻ کی طرف متوجہ ہو، اللہ ﷻ کا شکر ادا کرے، اس راحت کو اللہ ﷻ کی طرف سے انعام قرار دے اور اس پر کسی قسم کے تکبر اور غرور میں مبتلا نہ ہو اور کسی نافرمانی کا مرتکب نہ ہو۔ آخرت پر پختہ یقین رکھتے ہوئے اس کے لئے مسلسل تیاری کرتے رہنا چاہیئے۔

آیت نمبر ۵۱: دنیاداروں کا طرزِ عمل بیان ہوا ہے کہ جب اُنہیں نعمتیں ملتیں ہیں تو وہ اللہ ﷻ کا شکر ادا کرنے کے بجائے اس کے ذکر اور احکامات سے غافل ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس ان پر اگر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اللہ ﷻ کے سامنے گڑگڑا کر لمبی لمبی دُعائیں مانگتے ہیں۔

علمی بات: انسان کا ایک رویہ یہ ہے کہ جب اللہ ﷻ اس پر انعام فرماتا ہے اور اسے اپنی نعمتیں عطا فرماتا ہے تو وہ منہ پھیر لیتا ہے، اللہ ﷻ کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے اور غرور و تکبر میں مبتلا ہو کر اللہ ﷻ کی اطاعت و بندگی سے منحرف ہو جاتا ہے۔ لیکن جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو پھر عاجز بن کر کثرت سے لمبی لمبی دُعائیں کرنے لگتا ہے۔ اسے شرم بھی نہیں آتی کہ اب کس منہ سے وہ دعا مانگ رہا ہے، لیکن بدقسمتی سے یہ کمزوری اکثر انسانوں میں پائی جاتی ہے۔

علمی بات: واضح رہے کہ ان آیات میں انسان کے مختلف کردار اور رویئے پیش کیئے گئے ہیں۔ اپنے رب کے تعلق سے کسی کا ایک کردار ہوتا ہے تو کسی کا دوسرا اور کسی کا اس سے بھی مختلف۔ اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ نعمت پا کر اللہ ﷻ کا شکر ادا نہیں کرتے اور سرکش بن جاتے ہیں مگر جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو اس وقت اللہ ﷻ کو پکارنے لگتے ہیں۔ یہ رویہ درست نہیں ہے بلکہ انسان سے مطلوب یہ ہے کہ وہ نعمت کے وقت بھی اللہ ﷻ کا شکر ادا کرے اور اس کی اطاعت کرے اور تکلیف کے وقت بھی اسی کے سامنے جھکے اور اسی کی اطاعت کرے۔ انسان کو نعمت اس لئے دی جاتی ہے کہ وہ اسے اللہ ﷻ کا عطیہ قرار دے کر اس کا شکر ادا

کرے اور اس کی فرماں برداری کرے اور اسے تکلیف اس لئے دی جاتی ہے کہ وہ اس میں اللہ ﷻ کی طرف متوجہ ہو۔ بہر حال انسان کو ہر حال میں اپنے رب کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے اور کبھی بھی کسی حال میں اس سے غافل نہیں ہونا چاہیئے، خواہ آسانی ہو یا تکلیف ہو۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت صہیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مومن کا معاملہ بھی بڑا تعجب خیز ہے کہ اس کے لئے اس کے ہر معاملہ میں بھلائی ہی بھلائی ہے اور یہ فضیلت سوائے مومن کے کسی اور کو حاصل نہیں ہوتی، بات یہ ہے کہ اگر اسے کوئی خوشی حاصل ہوئی اور اس نے شکر کیا تو اس میں بھی اس کے لئے بھلائی ہے اور اگر اسے کوئی نقصان پہنچا اور اس پر اس نے (اللہ ﷻ کی رضا کے لئے) صبر اختیار کیا تو اس میں بھی اس کے لئے بھلائی ہے۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۵۲: قرآنِ پاک اللہ ﷻ کا کلام برحق ہے لیکن ضد اور ہٹ دھرم لوگوں نے اس حقیقت کا انکار کیا۔ ان کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا گمراہی ہو گی کہ وہ اللہ ﷻ کے پیغام اور حق کی مخالفت کر رہے ہیں۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے اپنے رسول ﷺ کے ذریعہ کفارِ مکہ کو تنبیہ کی ہے کہ اے نبی (ﷺ)! آپ ﷺ ان منکرین قرآن کو بتا دیجئے کہ اگر یہ قرآنِ حکیم جیسا کہ حقیقت ہے، اللہ ﷻ ہی کی طرف سے آیا ہے اور پھر بھی تم اس کا انکار کرتے ہو اور اس کو جھٹلاتے ہو تو اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہو گا جو اپنے کفر و مخالفت کی وجہ سے راہِ حق اور ہدایت سے بہت دور جا پڑا ہو، یعنی تم ہی سب سے زیادہ گمراہ ہو اور تمہیں اس کی سزا بھگتنا پڑے گی۔ اس لئے سوچ بچار سے کام لو اور قرآنِ حکیم کا انکار نہ کرو بلکہ اس پر ایمان لے آؤ، اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔

علمی بات: قرآنِ حکیم پر پوری سنجیدگی اور پوری اہمیت کے ساتھ غور کر کے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس دعوت کی بنیاد یہ ہے کہ قرآنِ حکیم اپنی تکذیب کرنے والوں کو جس انجام سے خبردار کر رہا ہے اور جن دلائل کے ساتھ آگاہ کر رہا ہے وہ ایسی چیز نہیں ہے کہ آسانی سے نظر انداز کر دی جائے یا ہنسی مذاق میں اڑا دی جائے بلکہ بڑے ہی قوی دلائل کی شہادت کے ساتھ یہ بڑے ہی ہولناک انجام کی خبر ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ نہایت ڈھٹائی سے اس کو جھٹلا رہے ہیں وہ کم از کم اس کے دعوے کے صحیح ہونے کے امکان کے پہلو کو نظر انداز نہ کریں۔ لہٰذا دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس قرآنِ حکیم پر سو بار غور کریں اور جو فیصلہ بھی کریں اس کے نتائج پر دور تک سوچ کر کریں۔

آیت نمبر ۵۳: عنقریب اللہ ﷻ کائنات اور خود انسان کے وجود میں ایسی نشانیاں دکھائے گا جو قرآنِ حکیم کی دی ہوئی خبروں کے عین مطابق ہوں گی۔ لوگوں پر قرآنِ حکیم کا برحق ہونا واضح ہو جائے گا۔ قرآنِ کریم اللہ ﷻ کا کلام اور کائنات اللہ ﷻ کا عمل ہے۔ دونوں میں تضاد نہیں، ان میں جزوی مطابقت نہیں بلکہ کامل مطابقت ہے۔ ایک اہم نشانی یہ بھی ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت اہل ایمان کمزور تھے، پھر قرآنِ کریم میں اُنہیں غلبہ عطا کیئے جانے کی خوشخبری عطا کی گئی۔ بالفعل ایسا ہوا اور اللہ ﷻ کا دین غالب ہوا۔ اگر منکرین قرآن کی حقانیت کو تسلیم نہ کریں تو اس کی حقانیت پر اللہ ﷻ کی گواہی کافی ہے جو از خود ہر بات کا گواہ ہے۔

علمی بات: اس آیت میں آفاق و انفس کے دو مطلب ہیں اور وہ دونوں ہی درست ہیں۔ ایک یہ کہ آفاق سے مراد عرب کے قرب و جوار کے ممالک مراد لیئے جائیں اور انفس سے عرب قوم اور بالخصوص قریش قوم مراد لی جائے۔ اس لحاظ سے اس آیت کا جو مطلب ہے وہ تاریخ کے اوراق پر ثبت ہے۔ چند ہی سالوں میں قریشی سرداروں کو ذلت سے دوچار ہونا پڑا اور کفر و شرک کو عرب کی سرزمین سے دیس نکالا مل گیا۔ مسلمانوں کی پے در پے فتوحات کے نتیجہ میں عرب کے ارد گرد کے ملکوں میں اسلام کا جو بول بالا ہوا وہ ہر ایک نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ دوسرا یہ کہ آفاقی آیات سے مراد کائنات میں ہر سو بکھرے ہوئے اللہ ﷻ کے عجائبات مراد لیئے جائیں اور آیات انفس سے مراد انسان کے اندر کی دنیا لی جائے۔ اس لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اس کائنات میں اور انسان کے اندر اللہ ﷻ کی لاتعداد نشانیاں موجود ہیں اور ان سب کا نہ انسان آج تک احاطہ کر سکا ہے اور نہ آئندہ کبھی کر سکے گا۔ جبکہ ہر دور میں کوئی نہ کوئی نئی سے نئی نشانی انسان کے علم میں آجاتی ہے اور آئندہ بھی آتی رہے گی جو قرآنِ حکیم کے بیان کی صداقت پر گواہی دیتی رہے گی۔ نئے سے نئے عجائبات قدرت انسان کے علم میں آتے رہیں گے، خواہ ان کا تعلق انسان سے باہر کی دنیا سے ہو یا اس کے اندر کی دنیا سے۔

سائنسی بات: اس آیت میں دراصل معلومات کے اس (Explosion) کی طرف اشارہ ہے جو سائنسی ترقی کے باعث آج کے دور میں ممکن ہوا ہے۔ سائنسی ترقی کے سبب مسلسل حیرت انگیز انکشافات ہو رہے ہیں اور آئے روز نت نئی ایجادات سامنے آ رہی ہیں۔ ان سائنسی معلومات کے انکشافات اور حقائق کے بے نقاب ہونے سے بتدریج قرآنِ حکیم کا حق ہونا ثابت ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جن حقائق تک سائنس آج پہنچ پا رہی ہے قرآنِ حکیم نے بنی نوع انسان کو چودہ صدیاں پہلے ان سے متعارف کرا دیا

تھا۔ اب تک کے تمام سائنسی انکشافات قرآنِ حکیم کی فراہم کردہ معلومات کے عین مطابق ہیں۔ ایک فرانسیسی سرجن ڈاکٹر موریس بوکائی (۱۹۲۰-۱۹۹۸) نے "بائبل، قرآن اور سائنس" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس نے ثابت کیا ہے کہ اب تک جو بھی سائنسی حقائق دنیا کے سامنے آئے ہیں وہ نہ صرف قرآنِ حکیم میں دی گئی تفصیلات کے عین مطابق ہیں بلکہ ان سب کے مطالعہ سے قرآنِ حکیم کی حقانیت بھی ثابت ہوتی ہے۔ اپنی اسی تحقیق کی بدولت موصوف سرجن کو ایمان کی دولت بھی نصیب ہوئی۔

عملی پہلو: آج جبکہ سائنس کا دور ہے تو آج اعجازِ قرآن کے سائنسی پہلو کو اُجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ آج خصوصی محنت اور کوشش سے یہ حقیقت دنیا کے سامنے لانے کی ضرورت ہے کہ جن حقائق تک سائنس آج پہنچ پارہی ہے قرآنِ حکیم نے بنی نوع انسان کو چودہ صدیاں پہلے ان سے متعارف کرا دیا تھا۔ اس کے لئے مسلمان اسکالرز کو چاہیئے کہ وہ قرآنِ حکیم اور سائنسی معلومات کا تقابلی مطالعہ (Comparative study) کرکے عملی طور پر یہ ثابت کریں کہ اب تک کے تمام سائنسی انکشافات قرآنِ حکیم کی فراہم کردہ معلومات کے عین مطابق ہیں۔

موجودہ دور میں اگرچہ مسلمانوں کو قرآنِ کریم اور سائنس کے حوالہ سے خصوصی اہتمام کے ساتھ تحقیق و تدقیق کرنے کی ضرورت ہے، لیکن ایسی کسی تحقیق کے دوران خواہ مخواہ تکلف کرنے اور زبردستی کھینچ تان کر کے قرآنِ کریم کے دور دراز مفاہیم نکالنے کی کوشش میں نہیں رہنا چاہیئے۔ بلکہ جہاں پر عقلی اور سائنسی طور پر بات سمجھ میں نہ آئے وہاں تسلیم کرلینا چاہیئے کہ ابھی بات واضح نہیں ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یقین رکھنا چاہیئے کہ یہ سب اللہ ﷻ کی طرف سے ہے۔ ایک وقت ضرور آئے گا کہ جو بات آج واضح نہیں ہے وہ واضح ہوجائے گی اور خارج کی دنیا میں اس حوالہ سے جو حقائق بھی منکشف ہوں گے وہ قرآن کریم کے الفاظ کے عین مطابق ہوں گے۔ ان شاء اللہ! البتہ جن سائنسی حقائق کی اب تک قرآنِ حکیم کے ساتھ مطابقت ثابت ہوچکی ہے اُنہیں عام کرکے قرآنِ حکیم کی حقانیت کے سائنسی ثبوت کے طور پر لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

آیت نمبر ۵۴: منکرین حق کی فتنہ انگیزیوں کی اصل وجہ یہ ہے کہ اُنہیں نہ روز آخرت پر ایمان ہے اور نہ اللہ ﷻ کے حضور جواب دہی کا۔ لیکن وہ اللہ ﷻ کی گرفت سے بچ نہیں سکتے کیوں کہ وہ اللہ ﷻ کے احاطہ اختیار میں گھرے ہوئے ہیں۔

علمی بات: کفار و منکرین کی اصل بیماری یہ ہے کہ وہ آخرت پر یقین نہیں رکھتے۔ جس کے دل میں قیامت کے بارے میں شبہ ہوتا ہے وہ سرکشی اور نافرمانی کی روش سے باز نہیں آتا۔ اس کے سامنے ہزاروں دلائل پیش کیئے جائیں وہ اُنہیں لائق التفات ہی نہیں سمجھتا۔ وہ اس دنیوی زندگی کو ہی سب کچھ جانتا ہے اس لئے اس کی ساری کوششیں ایک ہی نقطہ پر مرکوز ہوکر رہ جاتی ہیں کہ وہ زندگی کے ان ماہ و سال میں زیادہ سے زیادہ لطف اٹھالے، زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرلے اور اونچے سے اونچے منصب تک رسائی حاصل کرلے۔ اس کے لئے اسے اپنے شرف انسانی، عزت نفس اور اخلاقِ عالیہ کی قربانی بھی دینا پڑے تو وہ کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ وہ فقط اپنی ذات کو سنوارنے اور اس کو اونچا کرنے کے لئے پوری بستی پورے علاقہ بلکہ سارے ملک کی قسمت کے ساتھ کھیل جاتا ہے۔

عملی پہلو: ہر انسان کو اللہ ﷻ نے تخلیق فرمایا ہے اور اسی کی قدرت سے اس کی ساری زندگی ممکن ہے۔ اللہ ﷻ نے انسان کو یہ زندگی آزمائش کے طور پر عطا کی ہے کہ وہ اسے اپنے رب کی بندگی و اطاعت میں گزارتا ہے یا اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ جب اسے موت آتی ہے تو یہ زندگی ختم نہیں ہوتی بلکہ اسے موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ یہ اپنے رب کے حضور پیش ہوگا جس میں اسے اپنی دنیاوی زندگی میں کیئے ہوئے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ نیک لوگوں کو جزا ملے گی اور بُرے لوگوں کو سزا ملے گی۔ لہٰذا ہر انسان کو یہ پختہ یقین ہونا چاہیئے کہ اس نے اپنے رب کے حضور پیش ہونا ہے اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ آخرت پر یقین رکھنے سے انسان کے اندر اللہ ﷻ کا ڈر اور خوف پیدا ہوتا ہے جس کی بدولت وہ اللہ ﷻ کی نافرمانی سے بچتا ہے اور ہمیشہ اس کی فرماں برداری میں زندگی بسر کرتا ہے۔

سُوْرَۃُ الشُّوْرٰی

ربطِ سورت: ۱۔ سورۃ الشوریٰ سے پہلے سورۃ حٰمٓ السجدۃ ہے۔ گزشتہ سورت کے آخر میں عقلی دلائل کے ساتھ توحید خداوندی کا ذکر تھا۔ اس سورت کی ابتدا میں بھی عقلی دلائل کے ساتھ توحید خداوندی کا ذکر ہے۔ گویا دونوں سورتوں کا موضوع "توحیدِ باری تعالیٰ" ہے۔

۲۔ سورۃ حٰمٓ السجدۃ میں توحید کا مضمون دعوت دین کی ذمہ داری کی طرف بڑھ رہا تھا، سورۃ الشوریٰ میں آکر یہ مضمون اپنے نقطۂ عروج پہنچا ہے یعنی دین کے نفاذ کے لئے عملاً جدوجہد کرنا اور اس عظیم مقصد کے لئے تمام تر صلاحیتوں اور وسائل کو بروئے کار لانا اور اس ذمہ داری کو بطریق احسن ادا کرنا۔

۳۔ گزشتہ سورت کی ابتدا میں صداقتِ قرآن کا ذکر تھا۔ اس سورت کی ابتدا میں بھی صداقت قرآن کا ذکر ہے۔

۴۔ "سورۃ حٰمٓ السجدۃ" کے مضامین سورۃ الشوریٰ کے مضامین کے ساتھ مربوط ہیں۔ دونوں زیادہ تر اثبات رسالت، وحی الٰہی اور عظمت قرآن کے بیان پر مشتمل ہیں اور اسی کے ساتھ آنحضرت ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ کفار مکہ کی ایذاؤں اور ان کی بیہودہ اور غلط روش پر رنج نہ فرمائیں۔

۵۔ سورۃ حٰمٓ السجدۃ کا اختتام اس بات پر ہوا کہ اگر قرآن مجید اللہ ﷻ کی طرف سے نازل ہوا ہے، یقیناً ہوا مگر تم اس کا انکار کرتے ہو تو پھر بتاؤ اس شخص سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو جان بوجھ کر قرآن مجید کا انکار کرتا ہے۔ سورۃ الشوریٰ کا آغاز ان الفاظ سے ہوا کہ اے نبی ﷺ! آپ پر اسی طرح ہی وحی کی جارہی ہے جس طرح آپ ﷺ سے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام پر وحی کی جاتی تھی۔

آیت نمبر ۱: حٰمٓ حروف مقطعات ہیں۔ حروفِ مقطعات کا علم اللہ ﷻ کے پاس ہے اور یہ اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان راز ہے۔

آیت نمبر ۲: "ع س ق" بھی حروف مقطعات ہیں۔

علمی بات: سورۃ الشوریٰ قرآن مجید کی ان دو سورتوں میں سے ایک ہے جن کے آغاز میں پانچ پانچ حروفِ مقطعات آئے ہیں، لیکن اس زمرے میں بھی یہ سورت اس لحاظ سے منفرد دکھائی دیتا ہے کہ اس کے آغاز میں حروفِ مقطعات کی دو آیات ہیں۔

آیت نمبر ۳: قرآن مجید اللہ ﷻ کا کلام ہے۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ پر قرآن نازل فرمایا گیا اسی طرح آپ ﷺ سے پہلے رسولوں پر بھی کتابیں نازل فرمائی گئیں۔ قرآن کریم اس ذات کی طرف سے ہے جو تمام قوتوں پر غالب ہے اور جس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے اپنے رسول سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا: اے نبی ﷺ! جس طرح یہ قرآن مجید وحی کے ذریعہ آپ ﷺ پر نازل ہوا ہے، اسی طرح آپ ﷺ سے پہلے گزرے ہوئے پیغمبروں پر بھی وحی کے ذریعہ کتابیں اور صحیفے نازل ہو چکے ہیں۔ یہ سب اللہ ﷻ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں جو بڑی عزت والا اور حکمت والا ہے۔ قرآنِ کریم بھی اسی ذات کی طرف سے نازل کردہ ہے جس کے سامنے تمام قوتیں ہیچ ہیں اور ہر ایک پر خوب غالب ہے۔ اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہوتا ہے اور کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہیں ہے اگرچہ اس کی حکمت ہماری عقل میں نہ آئے۔

علمی بات: وحی کا لغوی معنیٰ اشارہ کرنا، چپکے سے کوئی بات دل میں ڈالنا ہے۔ اصطلاح میں وحی سے مراد وہ خاص غیبی طریقہ ہے جس کے ذریعہ اللہ ﷻ کسی نبی تک اپنی بات پہنچاتا ہے۔ وحی سے مراد وہ پیغام بھی ہے جو اللہ ﷻ اپنے پیغمبروں پر نازل کرتا ہے۔ اللہ ﷻ اپنے رسول تک وحی مختلف طریقوں سے نازل فرماتا ہے۔ مثلاً اپنے رسول پر اپنا پیغام فرشتہ کے ذریعہ نازل فرماتا ہے یا براہ راست اس کے دل میں بات ڈال دیتا ہے یا پردے کے پیچھے سے بات سنوا دیتا ہے۔ اللہ ﷻ کا پاک کلام قرآن مجید حضور نبی کریم ﷺ پر بذریعہ وحی نازل ہوا تھا۔ یہ ذمہ داری حضرت جبرائیل علیہ السلام کی تھی کہ وہ اللہ ﷻ کی طرف سے قرآن مجید لے کر حضور ﷺ پر نازل ہوتے تھے۔ مکمل قرآن مجید اسی طریقہ سے نازل ہوا تھا۔

آیت نمبر ۴: قرآن کریم کا انکار کرنے والے اللہ ﷻ کی عظمتوں سے غافل ہیں۔ اللہ ﷻ کی شان تو یہ ہے کہ اسی نے پوری کائنات کو پیدا فرمایا ہے اور وہی اس کا مالک بھی ہے۔ اللہ ﷻ انتہائی بلند و برتر اور بے مثال عظمتوں کا حامل ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی شان تو یہ ہے کہ جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اسی کا ہے۔ اسی نے پوری کائنات کو پیدا کیا اور وہی اس کا مالک بھی ہے۔ ساری کائنات میں اسی کی بادشاہت اور تصرف ہے۔ اللہ ﷻ انتہائی بلند اور اعلیٰ شان کا مالک ہے۔ وہ برتر ہستی بے مثال عظمتوں اور صفاتِ عالیہ کی حامل ہے۔ مگر قرآن مجید کا انکار کرنے والے اپنی جہالت اور گمراہی کی وجہ سے اللہ ﷻ کی عظمتوں اور رفعتوں سے غافل اور بے خبر ہیں۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی خدائی کا عقلی دلیل سے رد پیش کیا گیا ہے۔ آسمانوں اور زمین کا خالق اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ وہ ان سب چیزوں کا مالک ہے اور وہ چیزیں اس کی مخلوق اور ملکیت ہیں۔ وہ اس تمام کائنات سے بلند تر اور بزرگ تر بھی ہے۔ پھر بھلا اس کی مملوکہ چیز جو اس کے مقابلہ میں حقیر ترین مخلوق ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کا شریک کیسے بنایا جا سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اختیارات و تصرفات میں ان چیزوں کو کیسے حصہ دار سمجھا جا سکتا ہے۔ جب اس کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور ملکیت ہے تو اس کے بغیر کس کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ انسان کے لئے ضابطہ حیات تجویز کرے۔ اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کون ہے جس کے پاس اتنا علم اور قدرت ہو کہ وہ اس کائنات کے نظام کو حسن و خوبی سے چلا سکے۔ تم خود سوچو کہ خالق و مخلوق، مالک و مملوک اور قادر اور عاجز بھی کبھی ایک جیسے ہو سکتے ہیں؟

آیت نمبر ۵: جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کیا جاتا ہے تو آسمان اللہ تعالیٰ کے غضب سے پھٹ پڑنے کے قریب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے پاس موجود فرشتے ہر وقت اس کی تسبیح اور حمد و ثنا کرتے ہیں۔ فرشتے اہل زمین کے لئے مغفرت کی دعائیں بھی کرتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ مجرموں کی جلد گرفت نہیں کرتا اور انہیں مہلت دے دیتا ہے۔ کیوں کہ وہ بندوں کے گناہوں کو معاف فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

علمی بات: فرشتے زمین والوں کے لئے مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ "لمن فی الارض" سے مراد مومن ہیں۔ اور فرشتے زمین والوں میں سے صرف ایمان والوں کے لئے استغفار کرتے ہیں یہاں من خصوص کے لئے ہے اس پر دلیل یہ ہے کہ دوسری جگہ فرمایا: "وہ (فرشتے) جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ جو ان کے ارد گرد ہیں وہ سب اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان والوں کے لئے استغفار کرتے ہیں اے ہمارے رب! تو نے اپنی رحمت اور اپنے علم سے ہر چیز کا احاطہ فرمایا ہوا ہے تو ان لوگوں کو بخش دے جنہوں نے توبہ کی اور تیرے راستہ کی پیروی کی اور انہیں جہنم کے عذاب سے بچا لے۔" (سورۃ المومن ۴۰، آیت: ۷) مگر بعض مفسرین نے فرمایا: "آیت کے الفاظ یہ ہیں کہ (فرشتے ان لوگوں کے لئے استغفار کرتے ہیں جو زمین میں ہیں) اس میں مومن و کافر دونوں شامل ہیں اور فرشتوں کے مسلم و کافر سب کے لئے استغفار کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام زمین والوں کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں، خواہ مومن ہوں یا کافر۔

فرشتے مؤمنین کے لئے تو مغفرت کی دعا کرتے ہیں اور کافروں کے لئے یہ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! ان کے لئے ایسے اسباب مہیا فرما کہ وہ مغفرت کے اہل ہو جائیں اور ایمان لے آئیں اور کافروں اور فاسقوں سے عذاب مؤخر ہو جائے اور اللہ تعالیٰ ان کو توبہ کی توفیق عطا کر دے اور یوں وہ تمام زمین والوں کے لئے مغفرت طلب کرتے ہیں، مؤمنین کے لئے طلب مغفرت کی دعا کرتے ہیں، فاسقوں کے لئے توبہ کی توفیق کی دعا کرتے ہیں اور کافروں کے لئے حصول ایمان کی دعا کرتے ہیں اور ہر ایک کے لئے حسب حال دعا کرتے ہیں۔"

علمی بات: یہ اللہ تعالیٰ کی شان مغفرت و رحمت اور ملائکہ کی تسبیح و استغفار کی برکت سے یہ نظام عالم تھما ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس کی تسبیح و تحمید کے ساتھ زمین والوں کے لئے اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ان پر دنیا میں کوئی سخت عذاب نہ آجائے جس سے سب ہی ہلاک ہو جائیں۔ تو اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی اور شان غفور رحیمی سے فرشتوں کی دعا قبول کر کے مومنین کی خطاؤں کو معاف کرتا رہتا ہے اور کافروں کو ایک عرصہ کے لئے مہلت دیتا ہے ورنہ دنیا کا سارا کارخانہ چشم زدن میں درہم برہم ہو جائے۔

علمی بات: یہی وجہ ہے کہ عذاب الٰہی ٹلا ہوا ہے اور فسق و فجور کی گرم بازاری کے باوجود بساطِ عالم الٹ نہیں دی جاتی۔ بے شک اللہ تعالیٰ بندوں کے گناہوں کو معاف فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اس کی شان مغفرت اور رحمت بے پایاں کے باعث نظام کائنات قائم ہے۔

علمی بات: "قریب ہے کہ آسمان اس (بات) سے پھٹ پڑیں۔" اس جملہ کی تفسیر تین طرح سے کی گئی ہے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت، شان اور جلالت و ہیبت کی بنا پر قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں۔ دوسرے یہ کہ فرشتوں کی کثرت اور ان کے ثقل کی بنا پر قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں۔ تیسرے یہ کہ لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرا لیے ہیں، یہ نہایت ہولناک اور سنگین جرم ہے۔ جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کے غضب کی بنا پر قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں۔

فکری پہلو: یہ اللہ تعالیٰ کی حلیمی و رحیمی اور چشم پوشی و درگزر ہی تو ہے، جس کی بدولت کفر اور شرک اور دہریت اور فسق و فجور اور ظلم و ستم کی انتہا کر دینے والے لوگ بھی سالہا سال تک بلکہ اس طرح کے پورے پورے معاشرے صدیوں تک مہلت پر مہلت پاتے چلے جاتے ہیں، اور ان کو صرف رزق ہی نہیں

ملتا رہتا بلکہ دنیا میں ان کی بظاہر بڑائی کے ڈنکے بجتے ہیں اور زینت حیات دنیا کے وہ سروسامان انہیں ملتے ہیں جنہیں دیکھ دیکھ کر نادان لوگ اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ شاید اس دنیا کا کوئی خدا اور معبود نہیں ہے جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

فرمان نبوی ﷺ: حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "کوئی شخص اذیت پہنچانے والی بات سن کر اس پر اللہ تعالیٰ سے زیادہ صبر کرنے والا نہیں، لوگ اس کی طرف بیٹا منسوب کرتے ہیں اس کے باوجود وہ ان کو عافیت دیتا ہے اور رزق عطا فرماتا ہے۔" (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۶: نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کو کارساز بنانے والے یعنی کفر وشرک میں مبتلا لوگ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہیں۔ یہ لوگ عنقریب اپنے کیئے کی سزا پائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ پر اس بات کی ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگوں کو ہدایت کی راہ پر لے آئیں۔ آپ ﷺ کی ذمہ داری لوگوں حق کو پہنچانا ہے، منوانا نہیں۔

علمی بات: کفار مکہ کفر وشرک میں مبتلا تھے۔ نبی کریم ﷺ بڑی دل سوزی سے انہیں ہدایت کی طرف بلاتے، ان کے سامنے اپنے دعویٰ کی صداقت کو معجزات اور دلائل سے ثابت کرتے، توحید ورسالت پر ان کے شکوک وشبہات کا بڑے مؤثر طریق پر قلع قمع فرماتے، اس کے باوجود جب وہ باطل سے چمٹے رہنے پر اصرار کرتے تو نبی کریم ﷺ کو از حد دکھ ہوتا اور بڑے افسردہ خاطر ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو تسلی عطا فرمائی ہے کہ اے میرے حبیب ﷺ! آپ ﷺ اتنے رنجیدہ خاطر کیوں ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ پر ان کی گمراہی کی کوئی ذمہ داری نہیں اور نہ ان کے بارے میں آپ ﷺ سے کوئی بازپرس ہوگی۔ آپ ﷺ کا فرض تبلیغ حق تھا، وہ آپ ﷺ نے احسن طریق پر ادا کر دیا۔ اب یہ جانیں اور ان کی قسمت۔

فکری پہلو: اس آیت میں مشرکین کے لئے نہایت سخت وعید ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح دلائل آنے کے بعد بھی جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں اور تمام تنبیہ وتذکیر کے باوجود اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی کڑی نگرانی کر رہا ہے۔ وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ ہمیشہ کے لئے بچ گئے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مہلت دے رکھی ہے۔ ان کے سب اعمال واحوال اللہ تعالیٰ کے ہاں محفوظ ہیں۔ جونہی وہ اپنی مہلت پوری کر لیں گے اللہ تعالیٰ انہیں اپنے قہر وغضب کے پنجہ میں گرفتار کر کے سخت عذاب دے گا۔

آیت نمبر ۷: "اُمُّ الْقُرٰی" کا مطلب مرکزی بستی یا بڑا شہر۔ اس سے مراد مکہ معظمہ ہے۔ "من حولھا" سے مراد اس کے اردگرد سے۔ یعنی صرف آس پاس کے علاقہ نہیں بلکہ پوری زمین مراد ہے۔ آیت میں چند بنیادی باتوں کا ذکر ہے۔ ایک یہ کہ قرآن حکیم اہل عرب کی اپنی زبان میں نازل کیا گیا تا کہ اس کے سمجھنے سمجھانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ دوسری یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت صرف اہل مکہ کے لئے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لئے ہے۔ تیسری یہ کہ رسول اللہ ﷺ قیامت کے واقعات اور ان کے اعمال کی جزا وسزا سے لوگوں کو پوری طرح خبردار کریں۔ قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ اس روز پوری مخلوق دو گروہوں میں تقسیم ہوگی۔ ایک گروہ اہل جنت کا ہوگا اور دوسرا گروہ اہل دوزخ کا ہوگا۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا: ہم نے آپ ﷺ پر وحی کے ذریعہ قرآن نازل کیا ہے۔ یہ قرآن عربی زبان میں بالکل واضح اور صاف صاف احکام بیان کرتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ آپ ﷺ مکہ میں بسنے والوں کو اور ان لوگوں کو جو اس کے اردگرد رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرائیں اور ان کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے خبردار کر دیں۔ آپ ﷺ ان سب کو قیامت کے دن کا خوف بھی دلائیں جو میدان حشر میں تمام اولین وآخرین کے جمع ہونے کا دن ہے اور جس کے آنے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ اس دن ایک فریق جنت میں داخل ہوگا اور ایک فریق جہنم میں داخل کیا جائے گا۔

نوٹ: "اُمُّ الْقُرٰی" مکہ مکرمہ کا نام ہے۔ "اُمُّ الْقُرٰی" کا ایک معنیٰ "بستیوں کی ماں" ہے۔ اس معنیٰ کے لحاظ سے مکہ کو "اُمُّ الْقُرٰی" اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ عرب کی قدیم ترین بستی ہے۔ گویا یہ تمام بستیوں کی ماں ہے اور باقی بستیوں نے اسی سے جنم لیا ہے۔ "اُمُّ الْقُرٰی" کا دوسرا معنیٰ "آبادیوں کا مرکز یا مرکزی بستی" ہے۔ اس معنیٰ کے لحاظ سے مکہ کو "اُمُّ الْقُرٰی" اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ یہ تمام عرب کا مرکز تھا اور عرب میں مرکزی بستی کی حیثیت صرف مکہ ہی کو حاصل تھی۔

علمی بات: حضور ﷺ کی دعوت کے اولین مخاطب اہل مکہ اور عرب تھے اور اس کے بعد آپ ﷺ کی دعوت تمام دنیا کے لئے ہے۔ دراصل حضور ﷺ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے ہیں: ایک بعثت خاص اور دوسری بعثت عام۔ آپ ﷺ کی بعثت خاص اہل مکہ اور اہل عرب کی طرف ہوئی اور ان پر آپ ﷺ نے براہ راست حجت قائم فرمائی۔ رہی آپ ﷺ کی بعثت عام تو وہ تمام عالم کی طرف ہے۔ تمام اہل عالم پر دین حق کی شہادت دینے کی ذمہ داری قرآن مجید نے بھی اور خود حضور نبی کریم ﷺ نے بھی، قیامت تک کے لئے ملت اسلامیہ پر ڈالی ہے۔ یہ اس امت کا فریضۂ منصبی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دین حق کی گواہی جس طرح اس امت کے لوگوں پر دی، اسی طرح یہ برابر دوسروں کے سامنے یہ گواہی دیتی رہے۔ اسی فریضہ کے تقاضہ سے اس امت کو یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ ایک گروہ اس میں ہمیشہ حق پر قائم رہے گا یہاں تک کہ یہ اس وقت بھی حق پر قائم رہے گا جب دنیا کی رگ رگ میں باطل کا زہر سرایت کر جائے گا۔

فرمان نبوی ﷺ: مکہ مکرمہ تمام شہروں سے افضل ہے، اس کی فضیلت کے لئے یہ حدیث کافی ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن عدی بن حمراء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے سنا، آپ ﷺ اپنی اونٹنی پر مکہ کے بازار حزورہ میں کھڑے فرمارہے تھے: "(اے مکہ!) اللہ کی قسم! تو اللہ کی ساری زمین سے اللہ کے نزدیک زیادہ محبوب اور زیادہ افضل ہے اور تو مجھے بھی اللہ کی ساری زمین میں سے زیادہ محبوب ہے۔ اللہ کی قسم! اگر مجھے تیرے اندر سے نکالا نہ جاتا تو میں تجھے کبھی نہ چھوڑتا۔" (سنن ابن ماجہ، جامع ترمذی، مسند احمد)

آیت نمبر ۸: اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا اور اپنی اطاعت پر مجبور کر دیتا۔ مگر یہ اس کی حکمت کے منافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار دیا ہے کہ کون اپنے اختیار سے اس کی اطاعت کرتا ہے اور کون اس کی نافرمانی کرتا ہے؟ اپنے اختیار سے اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار بننے والوں کو وہ دنیا و آخرت میں اپنی رحمت میں داخل فرماتا ہے۔ اس کے برعکس کفر و شرک میں مبتلا ظالموں کے لئے روز قیامت کوئی حمایتی یا مددگار نہیں ہوگا۔

علمی بات: جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے ہوئے اختیار کا صحیح استعمال کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے دنیا و آخرت میں اپنی رحمت میں داخل فرماتا ہے۔ جو اس اختیار کا غلط استعمال کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے، وہ ظلم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کفر و شرک میں مبتلا ایسے ظالموں کو قیامت کے دن سخت سزا دے گا اور وہاں ان کا کوئی سرپرست یا مددگار نہ ہوگا جو انہیں ان کے اعمال کی سزا سے بچا سکے۔

علمی بات: آج دنیا میں مختلف مذاہب، جماعتیں، فرقے، گروہ اور تنظیمیں وغیرہ ہیں۔ بعض اوقات انسان یہ سوچتا ہے کہ دنیا میں یہ اختلافات کیوں ہیں؟ اور تمام انسان ایک ہی مذہب، گروہ، یا طریقہ کے پیروکار کیوں نہیں ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان تمام لوگوں کو ایک ہی مذہب یا طریقہ کا پیروکار بنا سکتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو پیدا کرنے کا اصل مقصد ہی یہ تھا کہ وہ زبردستی نہیں، بلکہ خود اپنے اختیار سے سوچ سمجھ کر حق قبول کرے۔ اسی میں اس کا امتحان ہے جس پر آخرت کی جزا اور سزا مرتب ہونے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے، اسے عقل و بصیرت عطا فرمائی ہے اور اس کے اندر نفس کی خواہشات بھی رکھ دی ہیں۔ اس کی رہنمائی کے لئے اپنے رسولوں کے ذریعہ صحیح ہدایت عطا فرمائی ہے۔ پھر اسے اختیار دیا ہے کہ وہ اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر اپنے رب کو پہچانے، صحیح ہدایت کا انتخاب کرے اور اپنی آزادیٔ رائے سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری کرے یا اپنے نفس کے پیچھے لگ کر اپنے رب کو بھول جائے اور شیطان کی پیروی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے۔ اس کے نتیجہ میں مختلف لوگ مختلف نظریات کے حامل ہوتے ہیں اور مختلف طرز عمل اختیار کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے دنیا میں مختلف مذاہب، جماعتیں، فرقے، گروہ اور تنظیمیں وجود میں آتی ہیں۔ ان میں صحیح وہ ہے جو صحیح ہدایت کا انتخاب کرے، اپنے رب کی فرماں برداری کرے اور اس کے دیئے ہوئے احکامات پر عمل کرے۔

آیت نمبر ۹: مشرکوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا باطل معبودوں کو اپنا کارساز بنا رکھا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ہی اس بات کا مستحق ہے کہ اسی کو کارساز اور مددگار بنایا جائے۔ وہی مُردوں کو زندہ کرے گا اور اس کے سوا بھی وہ ہر بات پر قادر ہے۔

علمی بات: مشرکین نے یہ کتنا عجیب اور غلط کام کیا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا باطل معبودوں کو اپنا کارساز اور مددگار بنا رکھا ہے۔ حالانکہ حقیقی کارساز صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے اور صرف وہی اس بات کا مستحق ہے کہ اس کو کارساز اور مددگار بنایا جائے۔ وہ تو مُردوں کو زندہ کرتا ہے، اس کے سوا کوئی اس کی قدرت نہیں رکھتا ہے۔ وہ تو ہر چیز پر قادر ہے اور اس کے سوا کوئی کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا۔ اس لئے اس کے سوا غیروں کو کارساز بنانا ظلم عظیم ہے اور نہایت ہی حیرت و استعجاب کا باعث ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ سب کا مددگار اور کارساز ہے۔ وہ ایسا کارساز اور حاجت روا ہے کہ بندوں کی طرف سے کسی اپیل و درخواست کے بغیر ہی ان کی حاجت روائی و کارسازی فرماتا ہے۔ ان کی پیدائش کے وقت سے بلکہ اس سے بھی پہلے سے لے کر ان کی پوری زندگی میں ان کی کارسازی فرماتا ہے۔ بندے اس کی لامحدود نعمتوں سے مستفید ہوتے ہیں۔ اس کارساز مطلق کی کارسازی کی عظیم الشان صورتیں انسان کے اندر اور باہر ہر چہار سو پھیلی اور بکھری ہیں۔ پس عقل و نقل اور فطرت مستقیم کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اسی کو اپنا کارساز سمجھے۔ اپنے سارے معاملات اسی کے حوالہ کر دے اور اسی کے ساتھ اپنا تعلق صحیح رکھے۔ اس کے سوا باقی تمام اوہام و خرافات ہیں جو نہ کسی نفع کے مالک ہیں نہ نقصان کے۔ ان کو اپنا ولی اور کارساز قرار دینا اپنے لئے دارین کی ہلاکت و محرومی اور ہولناک خسارے کا سامان کرنا ہے۔

علمی بات: اہل مکہ اللہ ﷻ کا اقرار بھی کرتے تھے اور اپنی حاجات و ضروریات کے لئے انہوں نے اپنے لئے تین سو ساٹھ (۳۶۰) معبود بھی خود تراش کر کے رکھے ہوئے تھے۔ وہ اللہ ﷻ کے ساتھ ان بتوں کو بھی کارساز اور مددگار سمجھتے تھے۔ انہوں نے ان کو اللہ ﷻ کی خدائی میں شریک بنالیا تھا۔ یہی شرک ہی ان کا اصل جرم تھا جسے قرآن حکیم میں ظلم عظیم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ بے بس اور ناتواں بت کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے تھے اور نہ ہی کسی کی کوئی مدد یا حاجت روائی کر سکتے تھے۔ اس لئے اللہ ﷻ کے ساتھ انہیں شریک ٹھہرانا اور ان کو کارساز اور مددگار سمجھنا بہت بڑی غلطی اور گمراہی تھی۔

آیت نمبر ۱۰: ہدایت دی گئی ہے کہ اپنے معاملات اور اختلافات میں اللہ ﷻ ہی کو حاکم مانا جائے اور اس کے فیصلوں کو تسلیم کیا جائے۔ اللہ ﷻ ہی خالق اور مالک ہے۔ نبی کریم ﷺ اللہ ﷻ ہی پر توکل کرتے ہیں اور اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

علمی بات: "اور تم جس بات میں بھی اختلاف کرتے ہو اس کا فیصلہ اللہ ﷻ کی طرف سے ہوگا" اس جملہ کے دو مطلب ہیں۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپس کے اختلافات میں اللہ ﷻ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اللہ ﷻ کے پاک کلام قرآن مجید کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ پھر چونکہ قرآن مجید رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کو واجب اور اپنی ہی اطاعت قرار دیتا ہے، لہٰذا کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ دونوں کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ پس تمام اختلافات میں قرآن و سنت کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اصل دین ایک ہی ہے لیکن لوگوں نے اختلافات کر کے کئی دین، مذاہب اور فرقے بنا لیئے ہیں۔ ان اختلافات کا فیصلہ بھی اللہ ﷻ کی طرف سے ہوگا۔ اللہ ﷻ اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعہ سے لوگوں کو یہ بتاتا ہے کہ میں نے جو دین بھیجا تھا وہ تو یہ تھا اور تم نے فلاں فلاں مقام پر غلط تاویلات کر کے باہم اختلاف کر لیا تھا۔ اس طرح اللہ ﷻ دنیا میں لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کر دیتا ہے اور آخرت میں بھی اللہ ﷻ ان اختلافات کا فیصلہ فرمائے گا۔ اختلافات کرنے والوں کو بتایا جائے گا کہ اصل دین کیا تھا اور تم نے کیا کچھ حیلے اور مکاریاں کر کے اصل دین کا حلیہ بگاڑا تھا۔ خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔

علمی بات: اس آیت میں ایک اصول بیان کیا گیا ہے کہ انسانوں کے باہمی تنازعات اور اختلافات میں حاکم صرف اللہ ﷻ کو مانا جائے اور صرف اسے ہی فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے۔ اللہ ﷻ کے دین نے جن باتوں کو بھی اپنے دائرہ میں لیا ہے ان میں سے کسی معاملہ میں بھی کسی اور کے فیصلہ کو قبول نہیں کیا جا سکتا خواہ اس کا تعلق عقائد و عبادات سے ہو یا معاشرتی، تمدنی اور سیاسی امور سے۔ جس طرح اللہ ﷻ اعتقادی اختلافات میں یہ طے کرنے والا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے، ٹھیک اسی طرح قانونی حیثیت سے بھی وہی یہ طے کرنے والا ہے کہ انسان کے لئے پاک کیا ہے اور ناپاک کیا ہے، جائز اور حلال کیا ہے اور حرام و مکروہ کیا ہے، اخلاق میں بدی کیا ہے اور نیکی و خوبی کیا ہے، معاملات میں کس کا کیا حق ہے اور کیا نہیں ہے، معاشرت اور تمدن اور سیاست اور معیشت میں کونسے طریقے درست ہیں اور کونسے غلط۔

آیت نمبر ۱۱: اللہ ﷻ ہی نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ اسی نے انسانوں اور دوسرے جانوروں کے جوڑے بنا کر اور ان سے نسلیں پھیلا کر اس زمین کو آباد کر رکھا ہے۔ وہ اپنی ذات و صفات میں یکتا ہے۔ کائنات میں اس جیسا کوئی نہیں۔ اس کی مثال بھی دینا ممکن نہیں۔ اللہ ﷻ ہی سب کچھ سننے اور سب کچھ دیکھنے والا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کا انسانوں پر احسان ہے کہ اس نے ان ہی کی جنس اور شکل کے جوڑے بنا دیئے، یعنی مرد اور عورت بنا دیئے ہیں۔ اللہ ﷻ نے جانوروں کے بھی جوڑے پیدا کیئے ہیں۔ اس طریقہ سے وہ تمہیں زمین پر پھیلاتا اور بڑھاتا رہتا ہے۔ یہ اس کی تدبیر ہے کہ اس نے انسانوں اور جانوروں کے جوڑے

بنا کر اور ان سے نسلیں پھیلا کر اس زمین کو آباد کر رکھا ہے۔ اللہ ﷻ کی مانند کوئی چیز نہیں ہے، وہ اپنی ذات وصفات میں یکتا ہے اور کائنات میں اس جیسا کوئی نہیں ہے۔ اللہ ﷻ ہی سب کچھ سننے اور سب کچھ دیکھنے والا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی قدرت وحکمت کی نزاکت یہ ہے کہ اس نے ہر چیز کو جوڑے کی شکل میں پیدا کیا ہے۔ اس نے تنہا آدم علیہ السلام کو ہی پیدا نہیں کیا بلکہ زندگی کی جدوجہد میں باعث سکون بننے والی ان کے حوصلوں کو بلند رکھنے والی، ان ہی کی جنس سے حضرت حوا علیہا السلام بھی پیدا کر دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ افزائش نسل کا انتظام بھی فرما دیا۔ صرف انسانوں کی افزائش نسل کا انتظام نہیں فرمایا بلکہ طرح طرح کے حیوانات جو انسان کی گوناگوں خدمات سر انجام دے رہے ہیں، انہیں بھی جوڑے کی شکل میں نر اور مادہ پیدا کیا تا کہ ان کی نسل بھی بڑھتی رہے اور انسان کی روز افزوں ضروریات کی تکمیل کا اہتمام بھی ہوتا رہے۔

آیت نمبر ۱۲: آسمانوں اور زمین کے تمام خزانے اللہ ﷻ کے دست قدرت میں ہیں اور وہی ان کا مالک ہے۔ اسی کے خزانوں سے مخلوق کو روزی ملتی ہے۔ اللہ ﷻ اپنی حکمت کے لحاظ سے جس کے لئے چاہتا ہے روزی کشادہ فرماتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ البتہ محض روزی کا زیادہ ہونا اس کی رضا اور کم ہونا اس کی ناراضگی کی علامت نہیں بلکہ یہ اس کی حکمت پر مبنی ہے اور بطور امتحان ہے۔ بلاشبہ اللہ ﷻ کے پاس ہر چیز کا علم ہے اور وہ ہر ایک کی ضرورت اور حال سے بخوبی واقف ہے، اس لئے وہ ہر ایک کو اپنی حکمت وعلم کے موافق روزی عطا فرماتا ہے۔

علمی بات: رزق کی تقسیم اور کمی بیشی اللہ ﷻ کی مرضی پر منحصر ہے۔ اللہ ﷻ اپنے علم اور حکمت کے تقاضوں کے تحت جس کے لئے چاہتا ہے رزق میں کشادگی دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے اس کے رزق کو تنگ کر دیتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس کے پاس رزق زیادہ ہو اس سے اللہ ﷻ راضی ہے اور جس کے پاس کم رزق ہو اس سے اللہ ﷻ ناراض ہے، کیونکہ بہت سے منکروں یعنی قارون اور فرعون کے پاس رزق کی فراوانی تھی اور بہت سے انبیاء کرام علیہم السلام اور صالحین کے پاس دنیاوی مال ودولت کی کمی تھی۔ دراصل روزی کا زیادہ ہونا یا کم ہونا اللہ ﷻ کی حکمت پر مبنی ہے۔ اس لئے اگر کسی کے رزق میں تنگی ہو تو اس کو اس بدگمانی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے کہ اللہ ﷻ کو اس کی خبر نہیں ہے یا اس نے اس کے ساتھ کوئی ناانصافی کی ہے بلکہ یہ اطمینان رکھنا چاہیئے کہ جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے اللہ ﷻ کے علم سے ہو رہا ہے اور اسی میں حکمت ہے۔

عملی پہلو: بسا اوقات انسان جلدی ملنے والے تھوڑے فائدے اور نفع کے لئے بادشاہوں اور ارباب ثروت کی محبت کا دم بھرنے لگتا ہے۔ اس طرح ان کے ظلم وستم کا آلہ کار اور لوٹ کھسوٹ کی سرگرمیوں میں ان کا ہاتھ بٹانے لگتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جو کام وہ کر رہا ہے اور جو کام اس سے لیا جا رہا ہے یہ سراسر ظلم ہے، اس میں اللہ ﷻ کی نافرمانی، اس کے بندوں کی حق تلفی اور دل آزاری ہے، اس کا ضمیر بھی اس کو ملامت کر رہا ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ باز نہیں آتا، کیونکہ اس کو یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس کا رزق چھن جائے گا اور اپنے منصب سے اسے محروم کر دیا جائے گا۔ ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ آسمانوں اور زمین کے خزانوں کا مالک تو اللہ ﷻ کی ذات ہے۔ رزق کی تقسیم کا کلی اختیار بھی اسی کو حاصل ہے۔ وہ جس کو چاہے بے حد وحساب عطا فرمائے اور جس کو چاہے تنگ دست کر دے۔ جو نعمت وہ اپنے کسی بندے کو عطا فرمانا چاہے اسے کوئی جابر وقاہر سلطان بھی روک نہیں سکتا اور جس کو محروم کرنا چاہے اسے کوئی دے نہیں سکتا، اس لئے بندہ بننا ہے تو اس کا بنو، حکم ماننا ہے تو احکم الحاکمین کا مانو، رزق وعزت کے طلبگار ہو تو اکرم الاکرمین کے دربار پر حاضر ہو کر دامن پھیلاؤ۔ کیوں اس کے دشمنوں کے سامنے بھکاری بن کر جاتے ہو۔ اس طرح تم اپنی آبرو کو بھی داغدار بنا لو گے اور اپنے رب کریم کو بھی ناراض کر لو گے۔

آیت نمبر ۱۳: اللہ ﷻ نے حضرت نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو اور پھر نبی کریم ﷺ کو دین کو قائم ونافذ کرنے کی ذمہ داری دی۔ پانچ جلیل القدر رسولوں کا ذکر کر کے نبی کریم ﷺ کی امت کو اقامت دین کی جدوجہد کا حکم دیا گیا ہے۔ دین اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے۔ قرآن کریم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔

دین پر جزوی طور پر عمل اور اس پر مطمئن ہو جانا درست نہیں۔ دین پر جزوی عمل پر دنیا میں ذلت ورسوائی اور آخرت میں شدید عذاب کی وعید ہے۔ دین کو قائم ونافذ کیا جائے اور اس عظیم مقصد کے حوالہ سے تفرقہ پیدا نہ کیا جائے۔ یہ فریضہ امت کو جوڑنے والا اور تفرقہ سے بچانے والا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ۲۳ برس مسلسل دعوت واقامت دین کی جدوجہد فرمائی۔ آگاہ کیا جا رہا ہے کہ اللہ ﷻ کا عطا کردہ عادلانہ دین قائم کرنا مشرکین پر گراں گزرتا ہے۔ مذہبی سطح پر اللہ ﷻ کی الوہیت اور سیاسی سطح پر اللہ ﷻ کی حاکمیت میں شرک کرنے والوں پر دین حق کا غلبہ بہت بھاری گزرتا ہے۔ ان کی مخالفت کے باوجود اللہ ﷻ اہل

حق کی مدد فرماتا ہے اور ہدایت کا راستہ ان کے لئے واضح فرما دیتا ہے۔ ہدایت کی طرف لانے کے حوالہ سے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ اِجتبٰی یعنی چُن لینا۔ دوسرا یہ کہ جو طلب رکھے اسے ہدایت دینا۔ پہلا طریقہ خاص ہے جبکہ دوسرا طریقہ عام ہے۔ ہدایت کی تڑپ رکھنے والوں کو ہدایت عطا ہوتی ہے۔

علمی بات: امت محمد یہ ﷺ کو ہدایت دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے حضرت نوح علیہ السلام کو دیا تھا۔ اسی دین کو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی طرف وحی کے ذریعہ بھیجا ہے اور اسی دین کا حکم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی دیا تھا۔ ان تمام انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی امتوں کو تاکید کی گئی کہ تم سب اس دین کو قائم کرو اور تفرقہ نہ ڈالو۔ پس دین اسلام کوئی نیا دین نہیں ہے بلکہ یہی تمام انبیاء کا دین رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول خاتم النبیین سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے مخاطب ہے کہ اے نبی ﷺ! ان مشرکین پر وہ بات جس کی طرف آپ ﷺ ان کو بلاتے اور دعوت دیتے ہیں، بہت گراں اور بھاری گزرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنی بندگی کے لئے خالص کر لیتا ہے۔ جو خلوص نیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ہدایت کے راستہ پر گامزن فرما دیتا ہے۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ کی طرف سے اصل دین صرف ایک ہی ہے۔ تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کا اصل دین ایک ہی رہا ہے البتہ بعض رسولوں کی شریعتیں مختلف رہی ہیں۔ ان تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے دین کے اصول ایک ہی ہیں اور یہی اصل دین ہے۔ دین کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو کچھ باتوں کا حکم دے، کچھ کاموں سے منع کرے اور جو شخص ان احکام کے مطابق عمل کرے، انہیں اچھا بدلہ دے اور جو حکم عدولی کرے اسے سزا دے۔ چنانچہ ایسے احکام جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تک ایک ہی رہے ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ یہی اصل دین ہے، مثلاً توحید، رسالت، آخرت اور اس کا محاسبہ، اللہ تعالیٰ کی عبادت اور گناہوں سے اجتناب وغیرہ۔ شریعت سے مراد وہ احکام ہیں جو زمانہ کی ضرورتوں اور احوال وظروف کے مطابق بدلتے رہے ہیں۔ مثلاً سابقہ شریعتوں میں اموال غنیمت سے استفادہ جائز نہیں تھا لیکن امت مسلمہ کے لئے اسے حلال قرار دیا گیا ہے۔ سابقہ شریعتوں میں نمازوں کی تعداد اور ان کی ادائیگی کا طریقہ، زکوٰۃ کی شرح اور روزوں کی تعداد ہماری موجودہ شریعت سے بالکل مختلف تھی۔ گویا اصول اور بنیادی احکام کا نام دین ہے اور دین کا یہ حصہ غیر تبدیل شدہ ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں ان اصول احکام کی جزئیات میں تبدیلی واقع ہوتی رہی ہے۔ اسی تبدیل شدہ حصہ کا نام شریعت ہے اور یہ حصہ حالات وواقعات، ضروریات، حکمتوں اور مصلحتوں کے پیش نظر تبدیل ہوتا رہا ہے۔

فرمان نبوی ﷺ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”میں عیسیٰ بن مریم علیہما السلام سے اور لوگوں کی بہ نسبت زیادہ قریب ہوں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور انبیاء علیہم السلام علاتی بھائی ہیں، ان کی مائیں الگ الگ ہیں اور ان کا دین ایک ہی ہے۔“ (صحیح بخاری)

اس حدیث شریف کی مختصر وضاحت یہ ہے کہ پہلی بات یہ کہ اقتدا اور پیروی کے لحاظ سے رسول اللہ ﷺ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قریب ہیں اور زمانے اور وقت کے اعتبار سے آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قریب ہیں۔ دوسری بات یہ کہ حضرات انبیاء علیہم السلام علاتی یعنی پدری (باپ کی طرف سے) بھائی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سارے نبی نبوت کے لحاظ سے ایک دوسرے کے بھائی ہیں، بنیادی عقائد اور دین کے اصولی مسائل ایک ہیں۔ اصول ادیان میں توحید سرفہرست ہے گویا عقیدہ توحید میں سب متحد ہیں اور توحید بمنزلہ باپ کے ہے کیونکہ تمام شریعتیں اس کی محتاج ہیں، البتہ شریعتیں الگ الگ اور مختلف ہیں۔ شریعت ماں کے قائم مقام ہے۔

علمی بات: اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور ﷺ اور ان انبیاء کرام علیہم السلام کی امتوں کو حکم دیا کہ وہ دین کو قائم کریں۔ حضور ﷺ کی وساطت سے آپ ﷺ کی امت کو بھی دین کے قائم کرنے اور قائم رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ اقامت دین اس امت کا بنیادی فریضہ ہے۔ اقامت دین کا مطلب یہ ہے کہ دین کے احکام پر خود عمل کیا جائے اور پھر ایمان لانے والوں پر ان احکام کو عملی طور پر نافذ کیا جائے۔ دین اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے اور اسی میں انسانوں کی دنیا وآخرت کی فلاح ہے۔ اسلام میں انسان کے انفرادی اور اجتماعی دونوں گوشوں کے لئے رہنمائی موجود ہے۔ اسلام انسان کو عقائد، عبادات، اخلاقیات، معاشرت، معیشت اور سیاست میں رہنمائی دیتا ہے۔ لہٰذا امت مسلمہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ اسلام کے نظام حیات کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ جہاں یہ نظام حیات رائج نہیں وہاں اسے رائج کیا جائے اور جہاں یہ رائج ہے وہاں یہ اہتمام کیا جائے کہ یہ رواج پذیر رہے۔

علمی بات: سابقہ امتوں اور امت مسلمہ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ دین میں تفرقہ نہ ڈالیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی دین کے اندر اپنی طرف سے کوئی نرالی بات ایسی نکالے جس کی کوئی معقول گنجائش اس میں نہ ہو اور اصرار کرے کہ اس کی بات کے ماننے ہی پر کفر و ایمان کا مدار ہے، پھر جو اسے ماننے والے ہوں انہیں لے کر اسے نہ ماننے والوں سے جدا ہو جائے۔ مسلمانوں کو ایسی فرقہ بازی اور تفرقہ سے منع کیا گیا ہے اور آپس میں اتفاق اور اتحاد قائم رکھنے کا درس دیا گیا ہے۔ اسی طرح کی ہدایت اس ارشاد باری تعالیٰ میں بھی دی گئی ہے: "اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ نہ ڈالو" (سورۃ آل عمران ۳، آیت: ۱۰۳) اللہ ﷻ کی رسی سے مراد قرآن مجید ہے جس تھام کر رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور آپس میں فرقہ بازی سے باز رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ البتہ اس تفرقہ کا اس اختلاف رائے سے کوئی تعلق نہیں ہے جو دین کے احکام کو سمجھنے اور ان سے مسائل اخذ کرنے میں فطری طور پر اہل علم کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ فروعی مسائل میں جہاں قرآن و حدیث میں کوئی واضح حکم موجود نہیں ہے، وہاں ائمہ مجتہدین کا اپنے اپنے اجتہاد سے کوئی حکم متعین کر لینا، اس میں اختلاف رائے و نظر کی بنا پر اختلاف ہونا فطری چیز ہے۔ اس کا اس فرقہ و رایت والے پہلو سے کوئی تعلق نہیں ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ ایسا اختلاف رائے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں خود عہد رسالت سے چلا آیا ہے اور اس اختلاف کو رحمت قرار دیا گیا ہے۔

اقامت دین کا فریضہ ان تمام پیغمبروں کو سونپا گیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ ان کی قوم کو اس سلسلہ میں جو حکم ملا تھا اس کا ذکر قرآن حکیم میں موجود ہے کہ تم لوگ ارض فلسطین کو فتح کرنے کے لئے جہاد کرو۔ ظاہر ہے اس خطہ پر قبضہ کرنے کا مقصد اللہ ﷻ کے دین کو وہاں بالفعل نافذ کرنا تھا۔ چنانچہ اقامت دین کی جدوجہد پچھلی امتوں پر بھی فرض تھی۔ گویا انہیں حکم دیا گیا کہ زبان سے صرف عقیدہ توحید کا اقرار کر لینا کافی نہیں بلکہ اس عقیدہ کا رنگ اپنے اعمال پر بھی چڑھاؤ اور نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی طور پر اپنے معاشرہ کی اعلیٰ ترین (ریاستی اور حکومتی) سطح پر اس کی تنفیذ و تعمیل کو یقینی بناؤ۔ اقامت دین کے حوالہ سے کسی معاشرہ میں دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو وہاں دین قائم ہے یا قائم نہیں ہے۔ چنانچہ اس حکم کا منشا یہ ہے کہ اگر دین پہلے سے قائم ہے تو اسے قائم رکھو اور اگر قائم نہیں ہے تو اسے قائم کرو۔ مثلاً خیمہ اگر کھڑا ہے تو اسے گرنے سے بچانا ہے اور اگر پہلے سے کھڑا نہیں ہے تو اسے کھڑا کرنا ہے۔

عملی پہلو: مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دین کو قائم کریں۔ دین کے احکام پر خود عمل کریں اور اسے اپنی عملی زندگی میں نافذ کریں۔ اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے میں ہی ہماری فوز و فلاح ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ہم اسلام کو اپنی انفرادی اور اجتماعی دونوں گوشوں میں عملی طور پر نافذ کریں۔ اپنے معاشرے کی اعلیٰ ترین سطح یعنی ریاستی اور حکومتی سطح پر اس کی تنفیذ و تعمیل کو یقینی بنائیں۔

علمی بات: معاشرہ میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں: ایک وہ لوگ کہ اللہ ﷻ خود ہی اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، جس کے بارے میں فرمایا: اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ "اللہ جسے چاہتا ہے اپنی طرف (قربت کے لئے) چن لیتا ہے"۔ (سورۃ الشوریٰ ۴۲، آیت: ۱۳) دوسری قسم کے لوگ ہیں جن کے بارے میں ارشاد ربانی ہے: وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ "اور اسے اپنی طرف ہدایت دیتا ہے جو رجوع کرے۔" (سورۃ الشوریٰ ۴۲، آیت: ۱۳)

علمی بات: ہدایت پانے کے دو طریقے ہیں: ایک خصوصی کہ اللہ ﷻ کسی کو خود ہی صراط مستقیم کے لئے منتخب فرما کر اس کی فطرت و طبیعت ہی کو اس کے مطابق بنا دے۔ دوسرا عمومی کہ جو شخص اللہ کی طرف رجوع کرے اور اس کے دین حق کی تلاش کرے تو اللہ ﷻ اس کو اس کے مقصود ہدایت تک پہنچا دیتا ہے۔ مشرکین مکہ کو جو دعوت توحید بھاری معلوم ہوتی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ دین کے سمجھنے اور اس پر چلنے کا ارادہ بھی نہیں کرتے تھے۔

علمی بات: آنحضرت ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ ان کے معاملہ میں صبر کریں۔ ہو گا وہی جو اللہ ﷻ چاہے اور اللہ ﷻ کا چاہنا اس کی حکمت اور اس کی سنت کے مطابق ہے۔ وہ اپنی طرف رہنمائی انہی لوگوں کی کرتا ہے جو خود بھی اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جو اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے وہ توفیق ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

آیت نمبر ۱۴: تفرقہ پیدا کرنے والوں کی مذمت۔ مراد یہود اور نصاریٰ ہیں جو کتاب کے وارث بنائے گئے۔ انہوں نے حق آ جانے کے بعد محض سرکشی، ضد اور تکبر کی بنیاد پر تفرقہ ڈالا۔ جب کہ حق و صداقت کے واضح دلائل آ جانے کے بعد اختلاف کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اگر یہ امر طے شدہ نہ ہوتا کہ اللہ ﷻ سرکشوں کو دنیا میں مہلت دیتا ہے تو وہ ان کی فوری گرفت کر کے دنیا میں ہی سزا دے دیتا۔ قرآن حکیم کے آنے پر انہوں نے اس کی تصدیق کرنے کے بجائے مخالفت کی، اس پر ایمان نہ لائے اور شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گئے۔

علمی بات: لوگوں نے جو مختلف ادیان، مذاہب اور فرقے بنا لیئے ہیں، اس کا اصل سبب بیان ہوا ہے۔ فرقہ بازی کی اصل وجہ اپنا اپنا جھنڈا بلند کرنے کی خواہش، اپنی اپنی فکر تھوپنے، باہمی ضد، ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرنے، اپنا نرالا انداز اور چال چلن اور وضع قطع دکھانے کی خواہش، ایک دوسرے کو زک دینے کی کوشش یا مال وجاہ کی طلب ہے۔ یہی وہ اسباب تھے جو نئے نئے عقائد اور فلسفے، نئے نئے طرز عبادت اور مذہبی مراسم اور نئے نئے نظام حیات ایجاد کرنے کا محرک بنے اور خلق خدا کے ایک بڑے حصہ کو دین کی سیدھی اور کشادہ راہ سے ہٹا کر مختلف راہوں پر پراگندہ کر دیا۔ تفرقہ کا سبب ہرگز یہ نہ تھا کہ اللہ ﷻ نے انبیاء کرام علیہم السلام نہیں بھیجے تھے اور کتابیں نازل نہیں کی تھیں، اس وجہ سے لوگ راہ راست نہ جاننے کے باعث اپنے اپنے الگ مذاہب، فکر اور نظام زندگی خود ایجاد کر بیٹھے، بلکہ یہ تفرقہ ان میں اللہ ﷻ کی طرف سے علم آجانے کے بعد رونما ہوا۔ اس لئے اللہ ﷻ اس کے ذمہ دار نہیں ہے بلکہ وہ لوگ خود اس کے ذمہ دار ہیں جنہوں نے دین کے صاف صاف اصول اور شریعت کے واضح احکام سے ہٹ کر نئے نئے مذاہب اور فرقے بنائے۔

علمی بات: پہلی الہامی کتابیں مشکوک کیسے ہوئیں؟ یہود و نصاریٰ کے اپنی الہامی کتابوں کے بارے میں شک میں پڑنے کی کئی وجوہ تھیں جن میں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کتابوں کی اصل زبان اور اصل عبارت کو محفوظ رکھ کر آنے والی نسلوں تک نہ پہنچایا گیا۔ اور صرف تراجم سے کام لیا جانے لگا۔ ان تراجم کو ہی الہامی کتاب سمجھا جانے لگا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ بزرگوں کے اقوال اور الحاقی مضامین ان میں شامل کر دیئے گئے۔ حتیٰ کہ ان دونوں قسم کی عبارتوں میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ ان کی تاریخی سند بھی ضائع کر دی گئی۔ ان سب باتوں کا اثر یہ ہوا کہ بعد میں آنے والے علماء خود اس کتاب سے شک میں پڑ گئے کہ اس کا کون سا حصہ درست اور الہامی ہے اور کون سی عبارت بزرگوں کے اقوال وغیرہ ہیں۔ کسی بات کا صحیح فیصلہ کرنے میں یہی شک وشبہ انہیں اضطراب میں ڈالے رکھتا تھا۔

علمی بات: یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر الہامی کتابوں کو ماننے والا طبقہ خصوصاً نوجوان طبقہ الہامی کتابوں کے بارے میں شکوک و شبہات میں کیوں مبتلا ہو جاتا ہے؟ اور ان کے دلوں میں یہ شکوک و شبہات کب پیدا ہوتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آغاز میں چونکہ حاملین کتاب الٰہی کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں ہوتا۔ ان کی زندگی الہامی کتابوں کی تعلیمات کی عکاسی کرتی ہیں۔ کتاب الٰہی کو پڑھنے پڑھانے اور سیکھنے سکھانے والا طبقہ باہم دست و گریبان نہیں ہوتا اور اس طبقہ کے مابین کوئی تفرقہ بازی کا عنصر دکھائی نہیں دیتا اس لئے اس مرحلہ پر سب معاملات بالکل ٹھیک چلتے رہتے ہیں، مگر چوتھی پانچویں نسل تک آتے آتے معاملات اس وقت بگڑنے لگتے ہیں جب نوجوان کتابِ الٰہی کے پڑھنے پڑھانے اور جاننے والوں کو باہم جھگڑتے ہوتے دیکھتے ہیں اور ان کی زندگی کو عمل سے خالی پاتے ہیں۔ ایسی صورت حال سے بیزار ہو کر یہ لوگ حاملین کتاب سے تو بدظن ہوتے ہی ہیں لیکن وہ اس کے ساتھ ساتھ عظیم مقدس کتاب الٰہی سے بھی دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ نوجوان خود تو اللہ ﷻ کی کتاب کے علوم و معارف تک رسائی حاصل کرنے کی زحمت نہیں اٹھاتے، اس کے لئے مطلوبہ علوم کے حصول کی کوشش نہیں کرتے لیکن اس مفروضہ کو اپنے دلوں میں ضرور بٹھا لیتے ہیں کہ جب "حاملین کتاب" کے کردار و عمل میں روشنی کی کوئی کرن انہیں دکھائی نہیں دے رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی کوئی روشنی اس کتاب کے اندر سرے سے موجود ہی نہیں، جب کہ ایسا ہرگز نہیں ہوتا بلکہ حاملین کتاب کا غلط طرز عمل اس دوری اور غلط مفروضہ کا باعث ہوتا ہے۔

علمی بات: جس طرح پہلی قوموں نے اپنے انبیائے کرام علیہم السلام کے ساتھ اختلاف کیا اور ان کی کتابوں کے بارے میں سخت شکوک و شبہات پیدا کیئے اسی طرح قریش بھی نبی کریم ﷺ کی مخالفت پر اتر آئے اور قرآن مجید میں سخت شبہ کرنے لگے۔ اس انتشار و افتراق کی وجہ لاعلمی یا غلط فہمی نہیں تھی، بلکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ خاتم النبیین سیدنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ صادق اور امین ہیں اور قرآن مجید میں بھی کوئی ایسی بات نہیں جو عقل کے خلاف ہو لیکن صرف تکبر، ضد، حسد اور عناد کی وجہ سے انہوں نے آپ ﷺ کا انکار کر دیا۔ اللہ ﷻ نے قریش کے عذاب کو مؤخر کرنے اور انہیں مہلت دینے کا فیصلہ پہلے ہی کر رکھا تھا تاکہ وہ توبہ کر لیں یا ان کی اولاد ہی اسلام کو قبول کر لے۔ اگر پہلے سے ہی یہ فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو ان کے اس تعصب کے باعث انہیں فوراً عذاب میں مبتلا کر دیا جاتا۔

علمی بات: گمراہ لوگوں کے کرتوتوں کا تقاضا تو یہ ہوتا ہے کہ انہیں فوراً تہس نہس کر کے رکھ دیا جائے، لیکن اللہ ﷻ اپنی رحمت اور حکمت کے پیش نظر انہیں ایک مقررہ وقت تک مہلت دے دیتا ہے۔ اس لئے اس وقت تک ان کی رسی ڈھیلی رہتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس اثنا میں ان کی چشم ہوش کھلے اور

انہیں اپنی غلط کاریوں پر ندامت ہو اور وہ توبہ کر کے اپنی بخشش کا سامان کر لیں۔ اگر ان کی بے ہودگی کا یہی عالم رہتا ہے اور مقررہ میعاد تک وہ لوگ سنبھلنے کی کوشش نہیں کرتے تو جب مقررہ وقت آ جائے گا تو چشم زدن میں ان کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا جائے گا۔ ان کا نام و نشان تک بھی باقی نہ رہے گا۔ ان کی عبرتناک تباہی پر دو آنسو بہانے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔

آیت نمبر ۱۵: رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ چند اہم ہدایات کا بیان ہے۔ ایک یہ کہ مخالفین حق کی پرواہ نہ کریں اور دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کرتے رہیں۔ دوسری یہ کہ لوگوں کے مخالفانہ دباؤ کو خاطر میں نہ لائیں اور نہ ہی ان کی خواہشات کی پیروی کریں۔ تیسری یہ کہ اعلان کر دیں کہ قرآن حکیم پر ایمان لانے کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی تعلیمات کو نافذ کر کے عدل کا نظام جاری کیا جائے۔ چوتھی یہ کہ لوگوں کے درمیان عدل قائم کریں۔ پانچویں یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی سب کا رب ہے، مخالفت کرنے والوں کو آگاہ کر دیا جائے کہ ہر شخص جو بھی اعمال انجام دیتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہوگا۔ چھٹی یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ لوگوں کو روزِ قیامت جمع کر دے گا اور سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

علمی بات: وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل و انصاف کروں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے حبیب کریم ﷺ کے ذریعہ یہ جو اعلان فرمایا ہے یعنی عدل و انصاف کرنے کا جو حکم دیا ہے اس جامع فقرہ کے کئی مطالب ہیں اور سب ہی درست ہیں۔

ایک مطلب یہ ہے کہ میں ان ساری گروہ بندیوں سے الگ رہ کر بے لاگ انصاف پسندی اختیار کرنے پر مامور ہوں۔ میرا کام یہ نہیں ہے کہ کسی گروہ کے حق میں اور کسی کے خلاف تعصب کا رویہ اختیار کروں۔ میرا سب انسانوں سے یکساں تعلق ہے اور وہ ہے سراسر عدل و انصاف کا تعلق۔ جس کی جو بات حق ہے، میں اس کا ساتھی ہوں، خواہ وہ غیروں کا غیر ہی کیوں نہ ہو۔ جس کی جو بات حق کے خلاف ہے میں اس کا مخالف ہوں، خواہ وہ میرا اقریب ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ میں جس حق کو تمہارے سامنے پیش کرنے پر مامور ہوں اس میں کسی کے لئے بھی کوئی امتیاز نہیں ہے، بلکہ وہ سب کے لئے یکساں ہے۔ اس میں اپنے اور غیر، بڑے اور چھوٹے، غریب اور امیر کے لئے الگ الگ حقوق نہیں ہیں، بلکہ جو کچھ ہے وہ سب کے لئے حق ہے، جو گناہ ہے وہ سب کے لئے گناہ ہے، جو حرام ہے وہ سب کے لئے حرام ہے اور جو جرم ہے وہ سب کے لئے جرم ہے۔ اس بے لاگ ضابطہ میں میری اپنی ذات کے لئے بھی کوئی استثنا نہیں۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ میں دنیا میں عدل قائم کرنے پر مامور ہوں۔ میرے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے درمیان انصاف کروں اور ان بے اعتدالیوں اور بے انصافیوں کا خاتمہ کر دوں جو تمہاری زندگیوں میں اور تمہارے معاشرے میں پائی جاتی ہیں۔

ان تین مطالب کے علاوہ اس فقرے کا ایک چوتھا مطلب بھی ہے جو مکہ معظمہ میں نہ کھلا تھا مگر ہجرت مدینہ کے بعد کھل گیا اور وہ یہ ہے کہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا مقرر کیا ہوا رسول ہوں اور اس کے حکم کے مطابق تمہارے درمیان انصاف کرنا بھی میری ذمہ داری ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے لوگوں کے فیصلہ بھی وحی الٰہی کی تعلیم کے مطابق فرمائے اور ان کا نفاذ بھی فرمایا۔

علمی بات: یہ آیت دس مستقل جملوں پر مشتمل ہے اور ہر جملہ خاص احکام پر مشتمل ہے۔ گویا اس ایک آیت میں احکام کی دس فصلیں مذکور ہیں۔ اس کی نظیر پورے قرآن میں ایک آیۃ الکرسی کے سوا کوئی نہیں۔ آیۃ الکرسی میں بھی دس احکام کی دس فصلیں آئی ہیں۔

پہلا حکم فَلِذٰلِكَ فَادْعُ "تو آپ اسی (دین) کے لئے دعوت دیتے رہیں۔" یعنی اگرچہ مشرکین پر آپ کی دعوت توحید بھاری ہے۔ مگر اس کی وجہ سے آپ اپنی دعوت کو نہ چھوڑیں اور مسلسل اس دعوت کا کام جاری رکھیں۔ دوسرا حکم وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ "اور (اسی پر) قائم رہیں جیسے آپ کو حکم دیا گیا ہے" یعنی آپ اس دین پر خود استقامت اختیار کیئے رہیں۔ جس کی دعوت لوگوں کو دیتے ہیں اور یہ استقامت ایسی ہونی چاہیئے جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ یعنی تمام احکام عقائد، اعمال اخلاق و عادات و معاشرت میں صحیح اعتدال پر قائم رہیں۔ کسی طرف افراط و تفریط کا ادنیٰ سا میلان نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی استقامت آسان کام نہیں۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ سے جب بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کے سفید بال آجانے کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا شَيَّبَتْنِي هُودٌ یعنی مجھے سورۃ ہود نے بوڑھا کر دیا۔ تیسرا حکم وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ "اور ان کی خواہشات کے پیچھے نہ چلیں۔" یعنی اپنے فریضہ تبلیغ میں آپ ﷺ کسی مخالف کی مخالفت کی پرواہ نہ کریں۔ چوتھا حکم وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ "اور آپ (ﷺ) فرما دیجیئے میں (ہر) کتاب پر ایمان لایا جو اللہ نے نازل فرمائی ہے۔"

یعنی آپ اعلان فرمادیں کہ اللہ ﷻ نے جتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں میرا ان سب پر ایمان ہے۔ پانچواں حکم وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ۔ ''اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل (قائم) کروں۔'' اس کا مفہوم ظاہر تو یہی ہے کہ میرے پاس جو معاملات باہمی جھگڑوں کے آئیں مجھے حکم کیا گیا ہے کہ میں ان میں عدل و انصاف کروں۔ بعض حضرات نے یہاں عدل کے معنٰی برابری کے لے کر آیات کا یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ میں تمہارے درمیان دین کے سب احکام کو برابر رکھوں کہ ہر نبی اور ہر کتاب پر ایمان لاؤں اور تمام احکام الٰہیہ کی اطاعت کروں۔ ایسا نہیں کہ بعض پر ایمان ہو بعض پر نہ ہو یا بعض احکام کی تعمیل ہو بعض کی نہ ہو۔ چھٹا حکم اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ''اللہ ہمارا (بھی) رب ہے اور تمہارا (بھی) رب ہے۔'' یعنی اللہ ہمارا سب کا پالنے والا ہے۔ ساتواں حکم لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ''ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال۔'' یعنی ہمارے اعمال ہمارے کام آئیں گے تمہیں ان کا کوئی نفع و نقصان نہیں پہنچے گا۔ اور تمہارے اعمال تمہارے کام آئیں گے ہمیں اس سے کوئی نفع و نقصان نہ پہنچے گا۔ آٹھواں حکم لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ''ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔'' حجت سے مراد بحث و مباحثہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ حق واضح اور ثابت ہو جانے کے بعد بھی اگر تم عناد سے کام لیتے ہو تو اب گفتگو فضول ہے، ہمارے اور تمہارے درمیان اب کوئی بحث نہیں۔ نواں حکم اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ''اللہ ہم سب کو جمع فرمائے گا۔'' یعنی قیامت کے روز ہم سب کو اللہ ﷻ جمع فرمائے گا اور ہر ایک عمل کا بدلہ دے گا۔ دسواں حکم وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ۔ ''اور اسی کی طرف (سب کو) جانا ہے۔'' یعنی ہم سب اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

عملی پہلو: نبی کریم ﷺ نے یہ جو اعلان فرمایا کہ ''اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل (قائم) کروں۔'' گویا میری بعثت کا مقصد یہ تھا کہ میں معاشرہ میں عدل و انصاف قائم کرنے اور نظام توحید کو عملی طور پر نافذ کرنے کے لئے آیا ہوں۔ اس جملہ کے حوالہ سے ہمیں بہت واضح طور پر سمجھ لینا چاہیئے کہ آپ ﷺ کی رسالت کا مقصد اور مشن ہی اقامت دین ہے۔ اتباع رسول ﷺ کے تقاضے پورے کرنے کے لئے آج ہمارے اوپر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ حضور ﷺ کی اتباع کے تقاضوں کا پورا کرنے کے لئے سب غلط کاریاں چھوڑ کر خود کو دین کے احکام کا پابند بنانا ہوگا اور پھر اپنے تن من دھن کے ساتھ عدل اجتماعی یعنی نظام توحید کو معاشرہ میں قائم کرنے کے لئے جدوجہد کرنے والوں کی صف میں شامل ہونا ہوگا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ بننے کے بعد اپنے پہلے خطاب میں دراصل حضور ﷺ کے اتباع کے اسی تقاضے (وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ) کے حوالے سے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا تھا: ''لوگو! تم میں سے ہر کمزور شخص میرے نزدیک طاقتور ہوگا جب تک کہ میں اسے اس کا حق نہ دلوادوں اور تم میں سے ہر قوی شخص میرے نزدیک کمزور ہوگا جب تک کہ میں اس سے حق دار کا حق وصول نہ کرلوں۔''

عملی پہلو: ''اللہ ہم سب کو جمع فرمائے گا اور اسی کی طرف (سب کو) جانا ہے۔'' اس فقرہ کا مفہوم سمجھنے کے لئے ان افراد اور جماعتوں کا تصور ذہن میں لائیے جو سب اخلاص اور نیک نیتی سے اقامت دین کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ ظاہر ہے ان میں سے ہر جماعت کا اپنا منصوبہ اور اپنا طریقہ کار ہے۔ ان سب کی مثال دراصل منیٰ سے میدانِ عرفات جانے والے حجاج کے قافلوں جیسی ہے۔ جہاں لاکھوں لوگ ہزاروں قافلوں میں مختلف راستوں اور مختلف شاہراہوں پر گامزن ہوتے ہیں۔ ان کے راستے اگرچہ مختلف ہیں مگر منزل سب کی ایک ہے۔ یہ قافلے جیسے جیسے اپنی منزل کی طرف بڑھتے جاتے ہیں ویسے ویسے ان کے مابین فاصلہ کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ میدانِ عرفات میں پہنچ کر وہ سب ایک ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اقامت دین کی جدوجہد کرنے والی مختلف جماعتیں اور تنظیمیں جوں جوں اپنی منزل کی طرف بڑھیں گی ان کے باہمی اختلافات کم ہوتے چلے جائیں گے اور منزل مقصود پر پہنچ کر یہ سب لوگ اکٹھے ہو جائیں گے اور اگر بالفرض وہ دنیا میں اکٹھے نہ ہو سکے تو بھی روز محشر تو سب اکٹھے ہو جائیں گے۔

چنانچہ ان سب کو آپس میں تنقید کرنے کے بجائے زیر مطالعہ آیت کے الفاظ میں ایک دوسرے سے یوں کہنا چاہیئے کہ دیکھو بھئی! ہم سب اللہ ﷻ کی رضا کے متلاشی ہیں۔ ہمارا رب بھی اللہ ﷻ ہے اور تمہارا بھی۔ باقی جہاں تک ہمارے باہمی اختلاف کا تعلق ہے اس حوالہ سے ہمیں آپس میں کوئی حجت بازی نہیں کرنی چاہیئے۔ تم لوگ اپنی سوچ اور نظریہ کے مطابق جدوجہد کرتے جاؤ ہم اپنے طریق کار اور لائحہ عمل کے مطابق کوشش جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ ﷻ نے چاہا تو ہم سب اپنی اپنی کوششوں کے لئے ماجور ہوں گے۔ تم لوگوں کو تمہاری جدوجہد کا صلہ مل جائے گا اور ہم اپنی محنت کا پھل پالیں گے۔ لیکن چونکہ ہم سب اپنے مشن اور اپنی جدوجہد میں مخلص ہیں اس لئے آج نہیں تو کل ہم سب ایک ہو جائیں گے۔ اگر ہمارا طریق کار غلط ہوا تو ایک دن حقیقت ہم

پر واضح ہو جائے گی اور ہم رجوع کر لیں گے اور اگر آپ لوگوں کے لائحہ عمل میں کوئی کمی ہوئی تو کبھی نہ کبھی آپ کو بھی وہ نظر آ ہی جائے گی اور آپ بھی ضرور اس کی تلافی کر لیں گے۔ اِن شاء اللہ!

علمی بات: اس آیت میں خطاب اگرچہ نبی کریم ﷺ سے ہے مگر اس کا حکم عام ہے یعنی امت مسلمہ کو اپنے پیارے نبی ﷺ کی اتباع میں ان احکام کو سرانجام دینے کی پوری پوری کوشش کرنی چاہیئے۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب مکرم سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو تلقین فرمائی ہے کہ آپ ﷺ لوگوں کے درمیان عدل وانصاف کریں۔ ہر قسم کے ظلم و ستم کا خاتمہ کر دیں۔ تمام باطل امتیازات کا قلع قمع کر دیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں ایسا نظام رائج کریں کہ عدل وانصاف کے تقاضے پورے ہوں۔ تبلیغ اسلام میں بھی، احکام کے نفاذ میں بھی امیر، غریب، شاہ و گدا، عربی و عجمی میں کوئی امتیاز برقرار نہ رکھیں۔ گویا انسانی معاشرہ سے ہر قسم کے جور و جفا کا خاتمہ اور عدل وانصاف کا قیام اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ کی ذمہ داری ہے اور جب اسلام کو غلبہ اور اقتدار نصیب ہوا تو دوست و دشمن سب نے دیکھا، اپنوں اور بیگانوں نے دیکھا، ساری دنیا والوں نے دیکھا کہ حضور ﷺ نے اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے کس خوبصورتی سے اس ذمہ داری کو ادا کیا۔ خون کے پیاسوں کے ساتھ بھی کوئی زیادتی روا نہیں رکھی گئی اور عزیز و اقارب کے ساتھ بھی بے جا رعایت نہیں کی گئی۔

عملی پہلو: مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ لوگوں کو دین کی دعوت دیں اور دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کرتے رہیں۔ لوگوں کے درمیان اسلام کی تعلیمات کو نافذ کر کے عدل کا نظام جاری کیا جائے۔ اس عظیم کام کے دوران مخالفین حق کی پرواہ نہ کریں اور ان کے مخالفانہ دباؤ کو خاطر میں نہ لائیں۔

آیت نمبر ۱۶: کفارِ مکہ دعوت حق کو روکنے کے لئے فضول قسم کے اعتراضات اور بحث کرتے تھے۔ واضح کر دیا گیا کہ سلیم الفطرت اور حق کا متلاشی طبقہ اسلام کے دلائل سے متاثر ہو کر اس کی حقانیت پر ایمان لا چکا ہے۔ لہٰذا کفار کی ہر دلیل جھوٹی اور بے بنیاد ہے۔ البتہ حق کے خلاف یہ جتنی سازش کریں گے اتنا ہی اللہ تعالیٰ کا غضب ان پر ہو گا اور اتنی ہی شدید سزا انہیں دی جائے گی۔

علمی بات: بہت سے عقل و فہم رکھنے والے لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان لا چکے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا دین لوگوں میں مقبول ہو چکا ہے۔ لیکن کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھگڑتے ہیں، دعوت حق کو روکنے کے لئے فضول قسم کے اعتراضات اور بحث کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی کج بحثی اور حجت بازی اللہ تعالیٰ کے نزدیک باطل ہے۔ ایسے لوگوں پر دنیا میں اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہونے والا ہے اور آخرت میں ان کے لئے سخت عذاب ہے۔

علمی بات: مکہ مکرمہ میں اگر کوئی شخص مسلمان ہو جاتا تو اس کے مشرک دوست اور لواحقین ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتے اور اس سے بحثیں اور لڑائی جھگڑا کر کے اسے زچ کر دیتے اور اس بات پر مجبور کر دیتے کہ وہ پھر سے اسلام چھوڑ کر ان کے آبائی دین میں شامل ہو جائے۔ یہ تو انفرادی صورت تھی اور اجتماعی صورت یہ تھی کہ کفار کی مخالفت اور اذیت کے باوجود بھی اسلام پھیل رہا تھا اور مسلمانوں کی تعداد میں دم بدم اضافہ ہو رہا تھا۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے کافر متحد ہو کر میدان میں اتر آئے تھے اور اس دعوت کو روکنے کے لئے کبھی دھمکی، کبھی لالچ، کبھی سمجھوتہ، کبھی مکمل بائیکاٹ، کبھی استہزا اور کبھی فضول قسم کے اعتراضات اور بحثوں کے راستے کھولے جا رہے تھے۔ اس صورت حال کے متعلق اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب سنجیدہ اور عقل مند طبقہ اسلام کے دلائل سے متاثر ہو کر اس کی حقانیت پر ایمان لا چکا ہے اور اللہ تعالیٰ کی توحید کو تسلیم کیا جا چکا ہے، تو اب کافروں کے یہ جھگڑے عبث اور بے کار ہیں۔ یہ جو چاہیں کر لیں، اللہ تعالیٰ ان کی سازشوں کو کبھی کامیاب نہ ہونے دے گا اور حق سربلند ہو کر رہے گا۔ البتہ حق کو دبانے کے لئے جتنا زور یہ صرف کر رہے ہیں اتنا ہی اللہ تعالیٰ کا غضب ان پر بھڑکتا ہے اور اتنی ہی شدید سزا انہیں دی جائے گی۔

عملی پہلو: سلیم الفطرت اور حق کے متلاشی لوگ اسلام کے دلائل سے متاثر ہو کر اس کی حقانیت پر ایمان لے آتے ہیں۔ حق واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن کچھ لوگ کج بحثی اور حجت بازی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے دین اور ایمان والوں کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ ایسے حالات میں ہمیں بھی اللہ تعالیٰ کے دین اور ایمان والوں کا ساتھ دینا چاہیئے اور مخالفین کی سازشوں میں شریک نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والے ہی کامیاب ہوں گے اور اسلام کے خلاف سازشیں کرنے والے آخر کار ناکام ہوں گے۔

آیت نمبر ۱۷: اللہ ﷻ نے اپنی کتاب مقصد کے تحت نازل کی ہے۔ ایک اہم ترین مقصد لوگوں کی ہدایت ہے۔ کتاب کے ساتھ اللہ ﷻ نے میزان، یعنی عادلانہ شریعت عطا فرمائی۔ اس سے لوگوں کے حقوق و فرائض کا تعین ہوتا ہے۔ کتاب و شریعت عطا کیئے جانے کا اہم ترین مقصد ان کی تعلیمات پر عمل اور نفاذ ہے۔ ایسا نہ کرنے والے جان لیں کہ عنقریب قیامت آنے والی ہے۔ جہاں لوگوں کو جوابدہی کے لئے حاضر ہونا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے دین حق پر مشتمل کتاب قرآن مجید نازل فرمائی جس کا مقصد لوگوں کی ہدایت ہے۔ اس کے ساتھ میزان یعنی عادلانہ شریعت عطا فرمائی جس میں عقائد واعمال، حقوق و فرائض اور عدل و مساوات کو اس طرح ناپ تول کر ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا گیا ہے کہ ان میں کسی کمی بیشی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ قیامت قریب ہی ہو، اس لئے ہر عقل مند انسان پر لازم ہے کہ وہ قیامت سے پہلے اس دین پر عمل کرنے میں جلدی کرے کیونکہ قیامت آجانے کے بعد کسی کو توبہ یا نیکی کرنے کی مہلت نہیں ملے گی۔

عملی پہلو: شاید قیامت قریب ہو۔ لہٰذا ہر شخص کو فکر مند ہونا چاہیئے کہ قیامت آنے پر میرا کیا بنے گا، عقائد اور اعمال کا حساب ہو گا تو میں کن لوگوں میں ہوں گا۔ عقل مندی کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم خواب غفلت سے فوراً آنکھیں کھولیں اور ایک لمحہ ضائع کیئے بغیر اس کے لئے تیاری شروع کر دیں۔ اگر قیامت کا دن دور بھی ہوا تو ہماری قیامت یعنی موت تو کسی بھی وقت آسکتی ہے، لہٰذا اس سے پہلے ہی ہم اپنی اصلاح کرلیں۔

آیت نمبر ۱۸: آخرت اور عذاب کا مذاق اڑانے والے در حقیقت روز آخرت کی باز پرس پر یقین نہیں رکھتے۔ انہیں یقین ہوتا تو کبھی عذاب کے لئے جلدی نہیں کرتے۔ اس کے برعکس روز آخرت اور اعمال کی جواب دہی پر یقین رکھنے والے اپنے محاسبہ سے ڈرتے رہتے ہیں۔ قیامت کے واقع ہونے میں شک وشبہ کا اظہار کرنے والے حق سے دور اور گمراہی میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔

علمی بات: جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے وہ قیامت آنے کی جلدی مچاتے ہیں۔ چونکہ اس کے آنے کا انہیں یقین نہیں ہے اس لئے ازراہِ مذاق کہتے ہیں کہ قیامت نے اگر آنا ہی ہے تو جلدی کیوں نہیں آجاتی؟ اگر انہیں یقین ہوتا تو کبھی عذاب کے لئے جلدی نہ کرتے۔ اس کے برعکس جو لوگ قیامت پر ایمان رکھتے ہیں وہ ڈرتے اور کانپتے رہتے ہیں اور اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ قیامت کا وقوع ایک غیر مشتبہ حقیقت ہے وہ یقینی طور پر آنے والی ہے۔

علمی بات: اس آیت میں قیامت کے بارے میں دو مختلف رویے اور طرز عمل بیان ہوئے ہیں۔ ایک وہ لوگ جو قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور دوسرے وہ جو قیامت پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو قیامت کے آنے پر یقین نہیں رکھتے وہ محض اسے ایک ڈراوا سمجھتے ہیں، اس لئے اس سے ڈرنے کی بجائے اس کا مذاق اڑاتے ہیں کہ اگر قیامت کو آنا ہوتا تو وہ کب کی آچکی ہوتی۔ بار بار ہمیں ڈراوا دیا جا رہا ہے، لیکن وہ آنے کا نام نہیں لیتی۔ ایسے لوگ آخرت کی تیاری کی فکر نہیں کرتے اور بہت بڑا نقصان اٹھاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ قیامت پر ایمان رکھتے ہیں، انہیں اندازہ ہے کہ وہ کتنا ہولناک دن ہے اور اس روز انسانوں پر کیا گزرے گی۔ وہ اس کی ہولناکی کے تصور ہی سے کانپ جاتے ہیں۔ ایسے لوگ آخرت کی تیاری میں لگے رہتے ہیں۔ یہ دو رویئے جب تک باقی ہیں قیامت کے بارے میں یہ دونوں طرز عمل بھی باقی رہیں گے۔

عملی پہلو: قیامت پر ایمان اور یقین اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ قیامت پر ایمان در حقیقت انسان کو صحیح نہج اختیار کرنے، حقیقی منزل کا شعور پیدا کرنے اور عملی زندگی میں صالح تبدیلیاں لانے کی ضمانت دیتا ہے۔ لہٰذا ہمارا پختہ یقین ہونا چاہیئے کہ قیامت آئے گی اور ہمارا محاسبہ ہو گا جس کے بعد ہمارے اعمال کی جزا و سزا ملے گی۔ اس کے برعکس قیامت کا انکار بہت بڑی گمراہی ہے، کیونکہ قیامت برحق ہے اور وہ ضرور آئے گی۔ لہٰذا جو لوگ قیامت کے بارے میں شکوک وشبہات کا شکار ہیں ان کی فکری اصلاح کی ضرورت ہے۔ انہیں چاہیئے کہ وہ قیامت پر پختہ ایمان رکھیں اور اس کی تیاری کی فکر کریں۔

آیت نمبر ۱۹: لطیف کے معنیٰ نرمی کرنے والا اور باریک بین ہے۔ اللہ ﷻ اپنے بندوں کے ساتھ نرمی کرنے والا اور اپنے بندوں کی تمام حاجات کو پورا فرمانے والا ہے۔ رزق کے معاملہ میں سب کو یکساں عطا نہیں فرماتا بلکہ اپنی حکمت عملی کے پیش نظر کسی کو کم اور کسی کو زیادہ عطا فرماتا ہے۔ کوئی طاقت اس کی دی ہوئی مقدار کو کم یا زیادہ نہیں کر سکتی کیونکہ وہ خود سب سے بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔

علمی بات: آیت میں لفظ "لطیف" استعمال ہوا ہے۔ لطیف کا معنیٰ عموماً مہربان لیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا معنیٰ اردو میں کسی ایک لفظ سے ادا نہیں ہو سکتا۔ اس کے مادہ "لطف" کے بنیادی معنیٰ میں دو باتیں پائی جاتی ہیں: ایک دقت نظر اور دوسرے نرمی۔ اس آیت میں لطیف کے معنیٰ میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ یعنی

اللہ ﷻ اپنے بندوں کی چھوٹی چھوٹی اور رتی برابر تکالیف کا علم اور اس کی خبر رکھتا ہے پھر از راہِ مہربانی ان کا ازالہ بھی کرتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے بندوں کی چھوٹی چھوٹی حاجات اور ضروریات کا خیال رکھتا ہے پھر از راہ مہربانی انہیں پورا بھی کرتا رہتا ہے۔ اللہ ﷻ کا یہ لطف و کرم مومن و کافر اور نیک و بد سب کو شامل ہے، اسی لئے تو وہ سب کو روزی دیتا ہے، کافر کفر کا ارتکاب کرتا ہے اور فاجر فسق و فجور سے دنیا کو بھر دیتا ہے، پھر بھی اللہ ﷻ ان کی روزی بند نہیں کرتا ہے، بلکہ زندگی کی آخری سانس تک کھلاتا اور پلاتا رہتا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ جس کو جتنا چاہتا ہے، رزق عطا فرماتا ہے۔ اللہ ﷻ ہر ایک کو یکساں رزق عطا نہیں فرماتا بلکہ اپنی حکمت کے پیش نظر کسی کو زیادہ دے دیتا ہے اور کسی کو کم، یہ اس کی مشیت پر منحصر ہے۔ اللہ ﷻ ہی جانتا ہے کہ کس کے لئے کیا اور کتنا کچھ بہتر ہے۔ وہ کسی کو علم دے دیتا ہے، کسی کو دولت دے دیتا ہے، کسی کو حسن صورت سے نوازتا اور کسی کو حسن سیرت سے سرفراز فرما دیتا ہے، کسی کو سیم و زر کے انبار بخش دیتا ہے اور کسی کو قناعت کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے۔ اس کے انعامات بے شمار اور اس کی عطائیں غیر محدود ہیں لیکن اس کے بخشنے اور عطا کرنے کے انداز لاتعداد اور نرالے ہیں۔

فکری و عملی پہلو: یہ اللہ ﷻ کی رحمت و عنایت کا ایک عظیم الشان مظہر ہے کہ وہ نافرمانوں کو بھی ان کی نافرمانی کے باوجود رزق و روزی دیئے جا رہا ہے تاکہ اگر وہ چاہیں تو اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر توبہ اور رجوع الی اللہ کے ذریعہ اپنی اصلاح کر لیں۔ اس طرح اپنے رب کی ابدی رحمت و عنایت کے حق دار بن جائیں۔ یہ صرف اسی وحدہٗ لاشریک کی شان ہے کہ وہ اپنے باغیوں اور سرکشوں پر روزی کے دروازے بند نہیں کرتا۔ اور اس وحدہٗ لاشریک کے سوا ایسا حلم، اس قدر کرم اور اتنی رحمت و عنایت اور کسی سے ممکن ہی نہیں۔ پس اس سے منہ موڑنا اور اعراض کرنا کس قدر بے انصافی، کتنی ناشکری اور کتنا بڑا ظلم ہے۔

آیت نمبر ۲۰: جو فرد آخرت کا طلب گار ہو گا اس کے لئے آخرت کے اجر میں خوب اضافہ کیا جائے گا۔ البتہ دنیا کے طلب گار کو دنیا میں تو کچھ مل جائے گا لیکن آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہو گا کیونکہ اس کی شرط ایمان ہے جو اسے حاصل نہیں۔

علمی بات: آخرت کا طلب گار شخص نیک اعمال کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ ﷻ اس شخص کو اس دنیا میں اور زیادہ نیکیوں کی توفیق عطا فرما دیتا ہے اور آخرت میں اس کی ایک ایک نیکی کا اجر دس گنا سے لے کر سات سو گنا بلکہ اس سے زیادہ تک بھی عطا فرمائے گا۔ اس کے برعکس جو شخص صرف اسی دنیا کا طالب رہتا ہے اور آخرت کو فراموش کر دیتا ہے اس کو دنیا کا کچھ حصہ تو مل جاتا ہے مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہو گا کیونکہ اس نے آخرت کے لئے کوئی عمل کیا ہی نہیں ہے۔

علمی بات: اس آیت میں دو آدمیوں کے طرزِ زندگی کا تقابل پیش کیا گیا ہے۔ جن میں سے ایک تو روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور دوسرا اس سے منکر ہے اور سب کچھ اسی دنیا کو ہی سمجھتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ آخرت پر ایمان رکھنے والا شخص جو کام بھی کرے گا آخرت کے لئے کرے گا اور آخرت کے مفاد کو دنیا کے مفاد پر ترجیح دے گا۔ ایسا شخص جو کچھ بھی اس دنیا کی کھیتی میں آخرت کے دن پھل کاٹنے کے لئے بوئے گا، اللہ ﷻ اس میں بہت زیادہ اضافہ کر دے گا، جیسا کہ اس دنیا میں غلہ کا ایک دانہ بونے سے بعض دفعہ سات سو سے بھی زیادہ دانے حاصل ہو جاتے ہیں۔ یہ تو اس کی آخرت کا معاملہ تھا۔ دنیا میں جتنا رزق یا جتنی بھلائی اس کے مقدر میں ہے وہ بھی اسے مل کر رہے گی۔ اس کے مقابلہ میں جو شخص روزِ آخرت کا منکر ہے اور بس دنیا ہی کا مال اور بھلائی چاہتا ہے۔ وہ خواہ کتنی ہی کوشش کر دیکھے اسے اتنی ہی دنیا میں ملے گی جتنی اس کے مقدر میں ہے اس سے زیادہ نہیں۔ رہا اس کی آخرت کا معاملہ تو اگر اس نے دنیا میں کچھ نیک کام کیئے بھی ہوں گے تو ان کا اسے کچھ بدلہ نہ ملے گا کیونکہ وہ کام اس نے اس نیت سے کیئے ہی نہیں تھے کہ ان کا آخرت میں اسے کچھ بدلہ ملے، نہ ہی اس کا آخرت پر کچھ یقین تھا۔

عملی پہلو: ہماری زندگی دو حصوں پر مشتمل ہے: ایک دنیوی اور دوسرا اخروی۔ دنیوی زندگی دار العمل ہے جس میں ہم عمل کرتے ہیں اور اخروی زندگی دار الجزا ہے جس میں اعمال کا بدلہ ملے گا۔ دنیوی زندگی کی مثال ایک کھیت کی سی ہے جس کی کاشت ہماری مرضی اور پسند پر منحصر ہے۔ اب یہ ہمارے انتخاب کی بات ہے کہ کس چیز کی کاشت کریں۔ بہر حال نتیجہ واضح ہے، اگر اچھے اعمال کاشت کریں گے تو کل قیامت میں اچھے ثمرات سے خوش ہوں گے اور اگر برُے اعمال کی کاشت کریں گے تو کل کڑوے پھلوں سے پریشان ہوں گے۔

آیت نمبر ۲۱: مشرکین سے دریافت کیا جا رہا ہے کہ اللہ ﷻ کے سوا کوئی اور ہستی ایسی ہے جسے کوئی دوسری شریعت دینے کا حق اور اختیار حاصل ہو؟ جب کہ اللہ ﷻ نے دینِ حق اور عادلانہ شریعت عطا فرما دی ہے۔ پھر مشرکین اللہ ﷻ کے احکامات کے برخلاف اپنے دنیادار قائدین کی پیروی کیوں اختیار کیئے

ہوئے ہیں؟ مراد ایسے لوگوں کی پیروی ہے جو اللہ ﷻ کی شریعت کے مقابلہ میں اپنے قانون کی پیروی کا تقاضا کرتے ہیں۔ بلاشبہ ظالموں کو اپنے مشرکانہ اعمال کی بدترین سزا ملے گی۔

علمی بات: اللہ ﷻ کے سوا کوئی نہیں جو مخلوق کے لئے کوئی دین مقرر کر دے، نہ کوئی ایسا کر سکتا ہے اور نہ کسی کو اس کا حق ہے۔ یہ حق صرف اللہ ﷻ کو ہی حاصل ہے کہ اس نے مخلوق کے لئے دین حق اور عادلانہ شریعت عطا فرما دی ہے۔ جب ان خود ساختہ شریکوں میں سے کسی نے دین اور شریعت کو متعین و مقرر نہیں کیا تو ان کو معبود سمجھنا اور ان کی عبادت کرنا حماقت ہے۔ اسی طرح جب اللہ ﷻ کے دین اور شریعت کے علاوہ کوئی اور دین اور شریعت نہیں ہے تو پھر اللہ ﷻ کے دین اور شریعت کے مقابلہ میں دوسرے قائدین اور پیشواؤں کے بنائے ہوئے خود ساختہ عقائد، احکام اور قوانین کی پیروی کرنا بھی حماقت ہے۔ اگر اللہ ﷻ کی طرف سے یہ بات طے نہ ہو چکی ہوتی کہ اللہ ﷻ ایسے باغیوں کو دنیا میں ڈھیل دیتا ہے اور ان کو آخرت میں سخت عذاب دے گا، تو انہیں دنیا میں ابھی عذاب دے دیتا۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ایسے ظالموں کے لئے دردناک عذاب ہے جس میں یہ ضرور مبتلا ہوں گے۔

جو لوگ اپنے پیشواؤں اور لیڈروں کے پیچھے چل رہے ہیں اور اللہ ﷻ کے دین اور اس کی شریعت کے مقابل ان کے مقرر کیئے ہوئے طور طریقوں یا قوانین کی پیروی کر رہے ہیں انہوں نے در حقیقت ان کو شریک خدا کی حیثیت دے رکھی ہے خواہ وہ زبان سے ان کو شریک خدا کہیں یا نہ کہیں، کیوں کہ بندوں کے لئے مذہبی طور طریقے مقرر کرنا یا قانون زندگی بنانا اللہ ﷻ ہی کا حق ہے، اس کے حق میں دوسروں کو شریک کرنا ان کو خدا کا شریک ٹھہرانے کے ہم معنیٰ ہے۔

علمی بات: کفار و مشرکین اس دین کی پیروی نہیں کرتے تھے جو اللہ ﷻ نے مقرر کیا ہے، بلکہ حلال و حرام میں وہ ان ضابطوں کی پیروی کرتے تھے جنہیں ان کے شیاطین جن و انس نے ان کے لئے مقرر کیا تھا، مثلاً یعنی حلال جانوروں کو حرام قرار دیتے اور مردار، خون اور جوئے کو حلال سمجھتے تھے۔ وہ اس طرح کی بہت سی ایسی ضلالتوں اور جہالتوں میں مبتلا تھے جن کی وجہ سے انہوں نے اپنے دور جاہلیت میں حلال و حرام کے ضابطے، عبادات کے باطل طریقے اور کئی طرح کی فاسد باتیں ایجاد کر رکھی تھیں۔ ان کے مذہبی پیشوا بھی حلال و حرام کا فیصلہ کیا کرتے تھے اور عوام ان کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا کرتے تھے، یہ فعل اللہ ﷻ کے ساتھ شرک تھا۔ الغرض شریعت سازی اور حلال و حرام کے فیصلے کفار مکہ بھی کیا کرتے تھے اور اہل کتاب کے علماء بھی کرتے تھے۔

علمی بات: بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ اس آیت میں "شُرَکٰٓؤُا" سے مراد بت نہیں ہیں۔ بلکہ اس سے مراد وہ انسان ہیں، جن کے سکھائے ہوئے افکار و عقائد اور نظریات اور فلسفوں پر لوگ یقین رکھتے ہیں، جن کی دی ہوئی قدروں کو مانتے ہیں، جن کے پیش کیئے ہوئے اخلاقی اصولوں اور تہذیب و ثقافت کے معیاروں کو قبول کرتے ہیں، جن کے مقرر کیئے ہوئے قوانین اور طریقوں اور ضابطوں کو اپنے مذہبی مراسم اور عبادات، اپنی شخصی زندگی، اپنی معاشرت، اپنے تمدن میں، اپنے کاروبار اور لین دین، اپنی عدالتوں، اپنی سیاست اور حکومت میں اس طرح اختیار کرتے ہیں کہ گویا یہی وہ شریعت ہے جس کی پیروی ان کو کرنی چاہیئے۔ یہ ایک پورے کا پورا دین ہے جو اللہ ﷻ کی تشریع کے خلاف، اس کے اذن اور اس کی منظوری کے بغیر ایجاد کرنے والوں نے گھڑ لیا اور ماننے والوں نے اسے بے چوں چرا مان لیا۔ یہ ویسا ہی شرک ہے جیسا غیر اللہ کو سجدہ کرنا اور غیر اللہ سے دعائیں مانگنا شرک ہے۔

عملی پہلو: دین حق صرف ایک ہی ہے جس کو اللہ ﷻ نے اپنے بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے اپنی رحمت و عنایت سے نازل فرمایا ہے۔ یعنی اسلام۔ جو ایک ہی دین ہے جس کی تمام انبیاء و رسل علیہم السلام نے تبلیغ و تلقین فرمائی اور سب نے اسی کی دعوت دی اور جس کی اساس و بنیاد توحید باری تعالیٰ ہے۔ اس کے سوا جو بھی دین ہے وہ خود ساختہ ہے اور لوگوں نے اپنی طرف سے بنایا ہوا ہے، وہ اللہ ﷻ کی طرف سے نہیں ہے۔ اسلام کے علاوہ جو بھی کوئی دین کسی نے اختیار کیا ہے وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور ایسا شخص آخرت میں سراسر خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو گا۔

آیت نمبر ۲۲: روز قیامت ظالم دنیا میں اپنے کیئے گئے اعمال پر ڈر رہے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی کارکردگی کا وبال ان پر آنے والا ہو گا۔ اس کے برعکس ایمان لا کر نیک اعمال انجام دینے والے جنت کے باغات میں ہوں گے جہاں ان کی ہر خواہش کی تسکین ہو گی۔ یہ بہت بڑے درجہ کی فضیلت ہو گی جسے اللہ ﷻ مومنین کو نصیب فرمائے گا۔

فرمان نبوی ﷺ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جنت میں تم میں سب سے کم ملکیت والا شخص وہ ہو گا جسے اللہ ﷻ فرمائے گا: تمنا کرو، وہ تمنا کرے گا، جب وہ تمنا کر لے گا تو اللہ اس سے پوچھے گا: کیا تو نے تمنا کر لی؟ وہ کہے گا: جی ہاں۔ تو اللہ ﷻ فرمائے گا: "تمہارے لئے وہ ہے جو تو نے تمنا کی اور جو تو نے تمنا کی ہے اتنا اس کے ساتھ مزید اور بھی۔" (صحیح مسلم)

عملی پہلو: آخرت میں ہر کسی کو اپنی زندگی بھر کے کیئے کرائے سے سابقہ پیش آئے گا۔ ظالم اور منکر لوگ اس دن زندگی بھر کے کیئے کرائے کی بنا پر دردناک عذاب سے دوچار ہوں گے۔ جبکہ ایمان والے اور نیک اعمال کرنے والے جنت میں جائیں گے اور ابدی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ پس عقل مند کا کام یہ ہے کہ وہ آخرت کے انعامات کو اصل مقصد حیات بنائے جس کے حصول کا وسیلہ وذریعہ ایمان اور عمل صالح ہے۔ وہ لوگ سراسر دھوکے کا شکار اور قطعی طور پر خسارہ میں مبتلا ہیں جو ایمان اور عمل صالح کی راہ کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں اور گناہ کر رہے ہیں۔

آیت نمبر ۲۳: یہ بشارتیں ایمان لاکر نیک اعمال انجام دینے والوں کے لیئے ہیں یعنی وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ شریعت پر عمل کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو ہدایت ہے کہ آگاہ کردیں کہ مخالفت کے باوجود آپ ﷺ قرابت داری کی وجہ سے دین حق پہنچا رہے ہیں۔ اس کے لئے کوئی ذاتی معاوضہ نہیں چاہتے۔ اپنے قرابت داروں کے حق کا خیال رکھنے بالخصوص نبی کریم ﷺ کے رشتہ داروں اور آپ ﷺ کے اہل بیت سے محبت کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ دعوت حق کو قبول کرنے والوں کے اجر وثواب میں کئی گنا اضافہ کردیا جائے گا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور بہترین قدر دان ہے۔

علمی بات: خوبصورت ترین جنتوں، بے مثال باغات اور بے بہا نعمتوں کی اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو خوشخبری دیتا ہے جو ایمان والے اور نیک اعمال کرنے والے ہیں۔ یعنی یہ بشارتیں ان لوگوں کے لئے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ شریعت پر عمل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو بندۂ مومن کوئی نیک عمل کرے گا تو ہم اس کا بدلہ کئی گنا بڑھا کر دیں گے، اس لئے کہ ہم توبہ کرنے والوں کے گناہوں کو معاف کردیتے ہیں اور نیکوکاروں کو ان کے اعمال صالحہ کا بدلہ کئی گنا بڑھا کر دیتے ہیں۔

علمی بات: اس آیت میں قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى کی مفسرین کرام نے مختلف تفاسیر کی ہیں۔ ایک رائے کے مطابق "قربیٰ" سے مراد قرابت یعنی رشتہ داری ہے۔ اس لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ "میں تم سے اس کام پر کوئی اجر نہیں چاہتا، مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم لوگ یعنی اہل قریش کم از کم اس رشتہ داری کا تو لحاظ کرو جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ تم میری بات مان لیتے، لیکن اگر تم نہیں مانتے تو یہ ستم تو نہ کرو کہ سارے عرب میں سب سے بڑھ کر تم ہی میری دشمنی پر تل گئے ہو۔" دوسری رائے یہ ہے کہ "قربیٰ" قرب اور تقرب کے معنیٰ میں ہے۔ اس کے مطابق مطلب یہ ہے کہ "میں تم سے اس کام پر کوئی اجر طلب نہیں کرتا سوائے یہ کہ تمہارے اندر اللہ تعالیٰ کے قرب کی چاہت پیدا ہو جائے، یعنی تم اللہ تعالیٰ کے قریب ہو جاؤ، بس یہی میرا اجر ہے۔ تیسری رائے یہ ہے کہ "قربیٰ" سے مراد رشتہ دار ہیں۔ اس کے مطابق مطلب یہ ہے کہ "میں تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتا، مگر یہ طلب کرتا ہوں کہ تم آپس میں پیار محبت کرو، تم اپنے رشتہ داروں کے ساتھ محبت کرو۔" ایک رائے یہ ہے کہ "قربیٰ" آپ ﷺ کے اہل بیت اطہار ہیں یعنی نبی کریم ﷺ کے رشتہ داروں اور آپ ﷺ کے اہل بیت سے محبت کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ "میں تم سے اس کام پر کوئی اجر اس کے سوا نہیں چاہتا کہ تم میرے اقارب سے محبت کرو۔"

علمی بات: حضور نبی کریم ﷺ کی مقدس زندگی کا ایک ہی مقصد تھا کہ اللہ تعالیٰ کے بندے جو طرح طرح کی گمراہیوں کے باعث اپنے رب سے بہت دور جا چکے ہیں پھر قریب ہو جائیں۔ کفر وشرک کے اندھیروں سے نکل کر پھر نور ہدایت سے اپنے قلب ونظر کو روشن کریں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے حضور ﷺ کی لگن کا یہ عالم تھا کہ دن رات اسی میں مشغول رہتے۔ ان کو سمجھاتے، وہ غصہ ہوتے تو حضور ﷺ مسکرا دیتے اور انہیں دعائیں دیتے، وہ روشن معجزات دیکھ کر اور آیات الٰہی سن کر بھی کفر سے چمٹے رہنے پر اصرار کرتے تو حضور ﷺ کے شفیق دل پر رنج وغم کے بادل گھر آتے اور آپ ﷺ رات بھر اللہ تعالیٰ کی جناب میں ان کی مغفرت اور ہدایت کے لئے دعائیں مانگتے۔ اخلاص ومحبت کے یہ بے مثل انداز کفار مکہ نے بھلا کب کہیں دیکھے تھے، وہ دل ہی دل میں خیال کرتے کہ اس ساری جدوجہد اور شبانہ روز تگ ودو کے پس منظر میں کوئی بڑا مقصد ہے جس کے حصول کے لئے یہ شخص جان گسل محنت اور مشقت برداشت کر رہا ہے اور ہمارے ظلم وستم اور زیادتی وناانصافی پر اتنے حوصلہ اور حلم کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ دولت جمع کرنا چاہتا ہے یا اقتدار کی ہوس ہے یا ہمارا بادشاہ بننا چاہتا ہے۔ آخر کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے جس کے باعث اپنا یہ حال بنا رکھا ہے۔ (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ اپنے محبوب نبی کریم ﷺ کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیتے ہیں کہ اے نادانو! تم کس خیال میں ہو۔ سن لو! تم نے جو ظلم وستم کا بازار گرم کر رکھا ہے اور میری ذات کو مسلسل تکالیف اور پریشانیوں میں مبتلا کیا ہے میں اپنے ان دکھوں اور پریشانیوں پر تم سے کسی قسم کا کوئی معاوضہ طلب نہیں کرنا چاہتا نہ آج نہ کل اور نہ کبھی قیامت تک۔ البتہ میری یہ خواہش ضرور ہے

کہ تم نے آپس میں قتل وغارت کا جو بازار گرم کر رکھا ہے اور ایک دوسرے کو ایذا پہنچانے میں اپنی قوتیں صرف کر رہے ہو اس سے باز آجاؤ اور آپس میں محبت اور پیار کرو۔ تمہاری باہمی رشتہ داریاں اور قرابتیں ہیں۔ تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ بھائی بھائی کا گلا کاٹے، چھوٹا بڑے کی پگڑی اچھالے، کسی کی جان، کسی کا مال محفوظ نہ ہو۔ مجھے تمہارے یہ انداز پسند نہیں۔ میں تم سے یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ ایک دوسرے سے محبت اور ایک دوسرے کا احترام کرنا سیکھو تاکہ تمہاری زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی نمودار ہو جائے۔

عملی پہلو: انسان بھلائی اور نیکی کا راستہ اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی بھلائی کو بڑھاتا ہے۔ دنیا میں اسے مزید نیکی کی توفیق عطا فرماتا ہے اور آخرت میں اس کے اجر و ثواب میں اضافہ فرما دے گا اور اس کی لغزشوں کو معاف فرما دے گا۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ہم نیکی اور بھلائی کا راستہ اختیار کریں تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے زیادہ سے زیادہ اجر کے مستحق ہوں۔

آیت نمبر ۲۴: سرداران قریش کہتے تھے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں بلکہ آپ (ﷺ) خود اسے بنا کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ (معاذاللہ) ان کے اس بے ہودہ اعتراض کا جواب دیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر آپ ﷺ قرآن جیسا کلام ہرگز نہیں سنا سکتے۔ اللہ تعالیٰ باطل کو کبھی پائیداری نہیں دیتا جس کے نتیجہ میں حق از خود ثابت ہو کر رہتا ہے۔ قرآن اللہ تعالیٰ کا برحق کلام ہے۔ بلاشبہ اس طرح کے بے بنیاد الزام لگانے والے ذاتی مفادات کی بنا پر ایسا کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے سینوں میں چھپے ہوئے رازوں سے خوب واقف ہے۔

علمی بات: کفار کے اس بہتان اور بے ہودہ اعتراض کا بھرپور جواب دیا گیا ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہی ہے اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں۔ بفرض محال اگر آپ ﷺ سچے نبی نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کے دل پر مہر لگا دیتا اور برحق کلام آپ ﷺ کی زبان پر جاری نہ فرماتا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہے کہ وہ باطل کو کبھی پائیداری نہیں دیتا اور حق کو مضبوط دلائل کے ساتھ ثابت فرماتا ہے۔ بلاشبہ کفار ذاتی مفادات کی بنا پر ایسے بے بنیاد الزام لگا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے سینوں میں چھپے ہوئے رازوں سے خوب واقف ہے۔

علمی بات: اگر دجل و فریب کے باعث باطل کو چند روزہ فروغ نصیب ہو جائے اور اہل حق کی غفلت اور فرض ناشناسی کی وجہ سے حق کمزور اور ضعیف ہو جائے، تو اس سے نہ باطل حق ہو جاتا ہے اور نہ حق، باطل۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا یہ دستور ہے کہ وہ باطل کو کبھی پائیداری نہیں بخشتا اور باطل کی بیخ کنی کر دیتا ہے۔ بالآخر حق کو حق ہی کر کے دکھا دیتا ہے اور قرآن حکیم کے ذریعہ حق کی جڑوں کو مضبوط کر دیتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو تسلی دی ہے کہ آپ ﷺ کفار کے ان جھوٹے الزامات کی ذرہ برابر پروانہ کریں اور اپنا کام کیئے جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا آپ ﷺ کے لئے وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرکین کی جھوٹی باتوں، تہمتوں، بہتان تراشیوں کو کامیاب نہیں ہونے دے گا اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ سارا جھوٹ غبار کی طرح اڑ جائے گا اور جس چیز کو آپ ﷺ پیش کر رہے ہیں اس کا حق ہونا عیاں ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے وقت جزیرۂ عرب مشرکوں سے پاک ہو چکا تھا اور توحید کا علم ہر طرف لہرا رہا تھا۔

آیت نمبر ۲۵: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ وہ سچی توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور ان کے گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کے ہر عمل سے خوب واقف ہے یعنی جس نیت سے توبہ کرو گے اس کو بھی بخوبی جانتا ہے کہ صدق دل سے توبہ کر رہے ہو یا دل میں کھوٹ ہے۔

علمی بات: اس آیت میں گنہگاروں کے لئے توبہ کی ترغیب ہے کہ اب بھی موقع ہے کہ وہ سنبھل جائیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کریں۔ جو شخص بھی خلوص دل سے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے دھتکارتا نہیں ہے بلکہ اس کی توبہ کو قبولیت بخشتا ہے اور اس کے گناہوں کو معاف فرماتا ہے۔ کافروں کی توبہ یہ ہے کہ وہ سچے دل سے اسلام قبول کر لیں، اسلام لانے سے ہی ان کے سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

علمی بات: توبہ کے لفظی معنی لوٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں۔ شرعی اصطلاح میں توبہ یہ ہے کہ آدمی اپنے کیئے پر نادم ہو، جس برائی کا وہ مرتکب ہوا ہے یا ہوتا رہا ہے اس سے باز آجائے اور آئندہ اس کا ارتکاب نہ کرے۔ سچی توبہ کا لازمی تقاضا ہے کہ جو برائی کسی شخص نے پہلے کی ہے اس کی تلافی کرنے کی وہ اپنی حد تک پوری کوشش کرے اور جہاں تلافی کی کوئی صورت ممکن نہ ہو، وہاں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے اور زیادہ سے زیادہ نیکیاں کر کے اس دھبے کو صاف کرتا رہے جو اس نے اپنے دامن پر لگا لیا ہے۔ لیکن کوئی توبہ اس وقت تک حقیقی توبہ نہیں ہے جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت سے نہ ہو۔ کسی دوسری وجہ یا غرض سے کسی برے فعل کو چھوڑ دینا سرے سے توبہ کی تعریف ہی میں نہیں آتا۔

علمی بات: مسلمانوں کی توبہ کی شرائط یہ ہیں کہ اپنے گناہ پر نادم ہوں، پھر اللہ ﷻ کی طرف رجوع کریں اور توبہ واستغفار کریں اور آئندہ اس گناہ کو مطلقاً چھوڑ دینے کا عہد کریں۔ جب ان شرائط کے ساتھ توبہ کی جائے، تو اللہ ﷻ گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔

فرمان نبوی ﷺ: سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بے شک عزت و بزرگی والا اللہ ﷻ رات کو اپنا دست (قدرت) پھیلاتا ہے تاکہ دن کا گناہ گار توبہ کرلے اور دن کو دست (قدرت) پھیلاتا ہے تاکہ رات کا گناہ گار توبہ کرلے (اور ہر دن اور رات ایسا ہوتا رہے گا) یہاں تک کہ سورج مغرب سے طلوع ہو۔" (صحیح مسلم)

فرمان نبوی ﷺ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب آدمی اللہ ﷻ کے سامنے اپنے گناہوں کی توبہ کرتا ہے تو اللہ ﷻ اپنے بندے کی توبہ سے اس آدمی سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جو اپنی اونٹنی کے ساتھ کسی جنگل بیابان میں آیا ہو اور اس کی اونٹنی (اس جنگل بیابان میں) گم ہوگئی ہو اور اس کا کھانا پینا بھی اسی پر ہو، (وہ اسے تلاش کرتا ہے، لیکن وہ نہیں ملتی) آخر وہ اس سے ناامید ہو کر ایک درخت کے نیچے آتا ہے اور اس کے سائے میں لیٹ جاتا ہے، وہ اپنی سواری (اور زندگی) سے بالکل ناامید ہو جاتا ہے، تو اچانک اس کی اونٹنی اس کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے اور وہ فوراً اٹھ کر اس کی نکیل تھام لیتا ہے اور اس قدر خوش ہوتا ہے کہ بے سمجھی میں اس کی زبان سے نکل جاتا ہے کہ یا اللہ! بے شک تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں۔ وہ خوشی کی شدت کی وجہ سے غلطی کر جاتا ہے۔" (صحیح بخاری) (مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ بندہ جنگل میں کھوئے ہوئے اُونٹ کے دوبارہ ملنے سے جتنا خوش ہوتا ہے کہ اسے مارے خوشی کے ہوش ہی نہیں رہتا کہ وہ زبان سے کیا کہہ رہا ہے۔ اللہ ﷻ اس کی خوشی سے کہیں زیادہ اپنے اپنے بندوں کی توبہ پر خوش ہوتا ہے)۔

عملی پہلو: اللہ ﷻ اپنے بندوں پر اس قدر مہربان ہے کہ بد سے بد گنہگار بھی جب اپنی بدکرداری سے باز آجائے اور خلوص کے ساتھ اس کے سامنے جھکے اور سچے دل سے توبہ کرے، تو وہ اپنے رحم و کرم سے اس کی پردہ پوشی کرتا ہے اور اس کے گناہ معاف فرما دیتا ہے اور اپنا فضل اس کے شامل حال کر دیتا ہے۔ لہٰذا ہمیں بھی چاہیئے کہ ہم سچے دل سے توبہ کریں اور اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں تاکہ وہ ہمارے تمام گناہوں کو معاف فرما دے۔

آیت نمبر ۲۶: اللہ ﷻ ایمان لا کر نیک اعمال انجام دینے والوں کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخشتا ہے۔ اور انہیں اپنے فضل و کرم سے مزید نوازتا ہے اور ان کے اجر وثواب میں اضافہ فرماتا ہے۔ جو ایمان نہیں لاتے یا ایمان لانے کے باوجود اللہ ﷻ کے احکامات سے پہلو تہی کرتے ہیں وہ اپنے آپ کو سخت عذاب کا مستحق بنا لیتے ہیں۔

علمی بات: اس آیت کی روشنی میں دعا کی قبولیت کی دو شرائط ہیں: ایک ایمان اور دوسرے نیک اعمال۔ جب بندہ صحیح ایمان والا ہو اور اس کے اعمال بھی نیک ہوں تو اللہ ﷻ اس کی دعائیں قبول فرماتا ہے۔ نیک اعمال میں کسب حلال بہت بڑا نیک عمل ہے کیونکہ اگر انسان کی کمائی حلال نہ ہوگی تو اس کی دعا قبول نہ ہوگی۔ حدیث شریف میں دعا کی قبولیت میں اس کے عمل دخل اور اہمیت کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

فرامین نبوی ﷺ: رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کا ذکر فرمایا: کہ وہ لمبے سفر میں پراگندہ بال اور دھول میں اٹا ہوا آسمان کی جانب ہاتھ پھیلا کے کہے: یارب! یارب!، حالانکہ اس کا کھانا حرام ہے، پینا حرام ہے، لباس حرام سے بنا اور اس کی نشو ونما بھی حرام پر ہوئی؛ تو اس کی دعا کیسے قبول ہو! (صحیح مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص بھی دعا کرتا ہے تو اللہ ﷻ اس کا سوال پورا فرما دیتا ہے یا اس سے اس دعا کی مثل کوئی مصیبت دور فرما دیتا ہے، بشرطیکہ وہ کسی گناہ یا قطع رحم کی دعا نہ کرے۔" (جامع ترمذی)

فکری و عملی پہلو: اہل ایمان کے لئے اللہ ﷻ کی خاص نوازش یہ ہے کہ اللہ ﷻ ان لوگوں کی دعائیں قبول فرماتا ہے جو ایمان والے ہوں اور نیک اعمال کرنے والے ہوں، نیز اللہ ﷻ انہیں اپنے فضل سے مزید نوازتا ہے۔ پس اس سے منکرین و مکذبین کے سامنے اہل ایمان کی روش اور ان کا انجام رکھ دیا گیا ہے تاکہ اس سے ان کے لئے یہ امر واضح ہو جائے کہ جس طرح انہوں نے دعوت حق پر لبیک کہہ کر اپنے خالق ومالک کی ان عنایات سے سرفرازی حاصل کی اور وہ دنیا و آخرت میں اس کے فضائل سے سرفراز و فیض یاب ہوئے، اسی طرح اگر یہ لوگ بھی چاہیں تو اس کے فضائل اور ایسی عنایات کے حق دار بن سکتے

ہیں۔ ورنہ یاد رکھیں کہ کفار و منکرین کے لئے اللہ ﷻ کے یہاں بڑا سخت عذاب ہے جو ان کو اپنے کفر و انکار کے نتیجہ میں بہر حال بھگتنا ہو گا۔ (والعیاذ باللہ العظیم)۔ اللہ ﷻ ہمیشہ اور ہر اعتبار سے اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ آمین ثم آمین۔

آیت نمبر ۲۷: اللہ ﷻ کی حکمت کا بیان ہے جو بندوں کے معاشی معاملات میں جاری ہے۔ اللہ ﷻ اگر تمام انسانوں کے لئے رزق کو کشادہ فرمادیتا تو لوگ زمین میں سرکشی کرنے لگتے۔ لیکن وہ اپنے علم و حکمت کی بنا پر رزق کو تقسیم فرماتا ہے جو بندوں کے بہترین مفاد میں ہوتا ہے۔ بلاشبہ وہ انسان کی ہر ضرورت اور حال سے واقف ہے اور اسی کے مطابق اسے رزق عطا کرتا ہے۔

علمی بات: جس سلسلۂ کلام میں یہ بات ارشاد ہوئی ہے اسے نظر میں رکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں دراصل اللہ ﷻ اس بنیادی سبب کی طرف اشارہ فرمارہا ہے جو کفار مکہ کی سرکشی میں کام کررہا تھا۔ اگرچہ روم و ایران کے مقابلہ میں ان کی کوئی حیثیت نہ تھی اور گرد و پیش کی قوموں میں وہ ایک پسماندہ قوم کے ایک تجارت پیشہ چھوٹے سے قبیلہ سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے، مگر اپنی اس ذراسی دنیا میں ان کو دوسرے عربوں کی بہ نسبت جو خوشحالی اور بڑائی نصیب تھی، اس نے ان کو اتنا مغرور و متکبر بنادیا تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی بات پر کان دھرنے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھے اور ان کے سرداران قبائل اس کو اپنی شان کے خلاف اور اپنی عزت کے منافی سمجھتے تھے کہ وہ آپ ﷺ کی اتباع واطاعت کے آگے سر تسلیم خم کریں۔ اسی پر فرمایا جارہا ہے کہ اگر کہیں ہم ان چھوٹے ظرف کے لوگوں پر واقعی رزق کے دروازے کھول دیتے تو یہ بالکل ہی پھٹ پڑتے، مگر ہم نے انہیں دیکھ کر ہی رکھا ہے، اور ناپ تول کر ہم انہیں بس اتنا ہی دے رہے ہیں جو ان کو آپے سے باہر نہ ہونے دے۔

علمی بات: اس آیت میں ایک بہت بڑی معاشی حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ دنیا میں کسی کو کشادہ رزق ملتا ہے اور کسی کو نپا تلا۔ ایسا کیوں نہیں ہوا کہ ہر شخص کو وافر پیمانہ پر رزق ملتا یہاں تک کہ وہ اپنی معاشی ضرورت کے لئے دوسرے کے آگے سوال نہ کرتا اور دوسروں کا محتاج نہ ہوتا؟ ایسا کرنا یقیناً اللہ ﷻ کے لئے کچھ بھی مشکل نہ تھا اور اس سے اللہ ﷻ کے خزانوں میں ہرگز کوئی کمی واقع نہ ہوتی، لیکن بندوں کی مصلحت کا تقاضا تھا کہ ایک خاص مقدار ہی میں انہیں رزق دیا جائے، کیونکہ رزق کو وافر مقدار میں پا کر انسان غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتا ہے اور یہ غرور اور گھمنڈ اسے سرکش بنادیتا ہے اور اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ دوسرے لوگوں پر برتری حاصل کرے جس کے لئے وہ ظلم وزیادتی پر اتر آتا ہے۔ اس طرح انسانی معاشرہ میں بڑے پیمانہ پر خون خرابہ ہوتا اور ہر طرف شور شرابا اور ہلچل مچ جاتی۔ جن لوگوں پر رزق کے دروازے کشادہ ہوگئے ہیں عام طور پر ان کی نفسیات اور ان کا طرز عمل ایسا ہی ہے، اور اس سے یقیناً انسانی معاشرہ میں ظلم وزیادتی کی کثرت ہوگئی ہے۔ تاہم یہ صورت ایک خاص حد تک ہی پائی جاتی ہے، لیکن اگر رزق کے دروازے سب کے لئے کشادہ ہو جاتے تو ظلم وزیادتی کا بالکل غلبہ ہو جاتا اور انسانی سوسائٹی میں بہت بڑے پیمانہ پر فساد پھوٹ پڑتا۔

علمی بات: دنیاوی مال وجاہ کی ایک بڑی حکمت ومصلحت ابتلا وامتحان ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ ﷻ مومن اور کافر دونوں کو آزماتا ہے۔ کسی کو اللہ ﷻ مال ودولت زیادہ دے کر آزماتا ہے کہ وہ اللہ ﷻ کا شکر ادا کرتا ہے یا نہیں اور کسی کو اللہ ﷻ مال ودولت کم دے کر آزماتا ہے کہ وہ اللہ ﷻ کی رضا پر راضی رہتا ہے اور صبر کرتا ہے یا نہیں۔ دراصل رزق وروزی کا معاملہ اللہ ﷻ ہی کے قبضہ قدرت واختیار میں ہے اور وہ جو بھی کچھ کرتا ہے اپنے علم اور حکمت کے تقاضوں کے مطابق کرتا ہے۔

آیت نمبر ۲۸: جب خشک سالی ہوتی ہے اور لوگ ظاہری حالات سے مایوس ہو جاتے ہیں، تو اللہ ﷻ اپنے فضل سے بارش بھیج دیتا ہے۔ جس کے ذریعہ سے اللہ ﷻ کی رحمت کے آثار اور برکات زمین میں نمایاں ہو جاتے ہیں یعنی نباتات کی بہتات ہوتی ہے، پھول اور پھل بکثرت پیدا ہوتے ہیں رزق کی فراوانی ہوتی ہے۔ بارش میں تاخیر ہونا لوگوں کے لئے آزمائش کے علاوہ تنبیہ بھی ہے کہ بارش اور قحط اللہ ﷻ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ بلاشبہ وہ انسان کا بہترین خیر خواہ ہے اور وہی شکر و تعریف کے لائق ہے۔

نوٹ: "ولی" (کارساز) سے مراد اللہ ﷻ کی وہ ہستی ہے جو اپنی پیدا کردہ ساری مخلوق کے معاملات کی متولی و منتظم ہے، جس نے بندوں کی حاجات وضروریات پوری کرنے کا ذمہ لے رکھا ہے۔

علمی بات: بعض اوقات اللہ ﷻ اپنی قدرت وحکمت سے باران رحمت کو روک لیتا ہے، یہاں تک کہ زمین خشک ہو جاتی ہے، قحط سالی سے انسان اور چوپائے بے حال ہونے لگتے ہیں، حتیٰ کہ بارش سے بالکل ناامید ہو جاتے ہیں اور اللہ ﷻ کی مشیت کے سامنے اپنے آپ کو بالکل بے دست وپا سمجھنے لگتے ہیں۔ اس موقع پر کفار ومشرکین کے جھوٹے معبودوں کی عاجزی اور بے بسی بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اگر وہ معبود ہیں اور کسی قسم کی قدرت رکھتے ہیں، تو پھر اپنی پوجا کرنے والوں کی مدد کے لئے آگے کیوں نہیں بڑھتے اور آسمان سے بارش کیوں نہیں نازل کرتے؟ تب اللہ ﷻ کی رحمت جوش میں آتی ہے اور وہ باران رحمت بھیج دیتا ہے اور لوگوں کی ناامیدی وپریشانی کو دور کر دیتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ خدا صرف ایک ہی ہے اور وہ اللہ ﷻ ہی ہے۔

علمی بات: قحط سالی کے بعد باران رحمت اور تنگ دستی کے بعد خوشحالی میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ لوگوں کو اللہ ﷻ کی نعمتوں کا احساس ہو کہ واقعی اللہ ﷻ ہی حقیقی کارساز ہے اور وہی سب تعریفوں کا مستحق ہے۔

علمی بات: زمین کو سیراب کرنے کا کام اگرچہ مصنوعی طریقوں سے یعنی کنوئیں، چشمے، نہر یا ٹیوب ویل کے پانی سے بھی لیا جاتا ہے مگر ایک تو اس پر محنت اور خرچ بہت اٹھتا ہے، دوسرے اس کے خوشگوار اثرات بارش کی نسبت بہت کمتر ہوتے ہیں۔ مصنوعی طریقۂ آبپاشی کا اللہ ﷻ کی باران رحمت سے کوئی مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ بارش تو اللہ ﷻ کی رحمت ہے اور یہ ایک نہیں بے شمار نعمتوں جیسی نعمت ہے۔ پہلے راحت بخش اور ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔ جو انسان کو فطری سرور بخشتی ہیں اور اس کی مایوسی کو دور کرتی ہیں۔ بارش ہوتی ہے تو اس سے موسم میں خوشگوار تغیر آجاتا ہے۔ درختوں پر سے گرد وغبار دھل جاتا ہے۔ مصنوعی آب پاشی کی طرح بارش کسی مخصوص قطعۂ زمین میں نہیں ہوتی بلکہ وسیع رقبہ میں ہوتی ہے۔ جس سے صرف انسان ہی نہیں اللہ ﷻ کی ساری مخلوق فیض یاب ہوتی ہے۔ پھر اس پر نہ کچھ لاگت آتی ہے نہ محنت صَرف ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں مصنوعی آب پاشی کی صورت میں بھی پانی کے سب ذخیرے بارش ہی کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں۔ لہٰذا دراصل بارش ہی وہ اصل نعمت ہے جس سے اللہ ﷻ تمام مخلوق کی حاجات پوری کرتا ہے۔

آیت نمبر ۲۹: آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق اور ان دونوں میں پیدا کی جانے والی تمام مخلوقات اللہ ﷻ کی قدرت کی بہت بڑی نشانیاں ہیں۔ جس طرح اس نے ان مخلوقات کو پیدا کر کے پھیلایا، اسی طرح وہ ان سب کو روز قیامت جمع کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی قدرت کے یہ مظاہر ہیں کہ اس نے آسمان وزمین کو پیدا فرمایا ہے اور پھر ان دونوں میں جانداروں کو پھیلا دیا ہے۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ زمین کی طرح آسمانوں میں اللہ ﷻ کی مخلوقات موجود ہیں جن میں فرشتے سرفہرست ہیں۔ زندگی صرف زمین ہی پر نہیں دوسرے سیاروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ ماہرین فلکیات اور سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ آسمانوں میں بھی اسی طرح کی مخلوق اور حیوانات موجود ہیں جس طرح کہ زمین پر ہیں۔ ان سب کی ضروریات بھی وہاں اسی طرح مہیا ہیں جس طرح کہ زمین کے حیوانات کے لئے یہاں مہیا ہیں۔ قرآن مجید نے اس بات کی خبر آج سے چودہ سو سال قبل ہی دے دی تھی مگر نئی تہذیب وتحقیق کے ماہرین نے صدیوں کی محنت اور تگ ودو کے بعد اب کہیں جاکر اس کا سراغ لگایا ہے اور اس تک رسائی حاصل کی ہے اور اب جاکر وہ اس کا کچھ پتا چلا سکے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید اللہ ﷻ کا معجزہ ہے جس نے چودہ سو سال پہلے ایسے حقائق بیان کر دیئے ہیں جو اب سچ ثابت ہو رہے ہیں۔

علمی بات: اس آیت میں قیام قیامت کے لئے ایک دلیل پیش کی گئی ہے۔ اللہ ﷻ نے آسمان وزمین کو پیدا فرمایا ہے اور پھر اپنی بے شمار مخلوقات کو پیدا فرما کر زمین وآسمان میں بکھیر دیا ہے۔ جس اللہ ﷻ نے آسمان اور زمین کی اس کائنات میں تمام جانداروں کو اس پرحکمت طریقہ سے پھیلا دیا ہے، وہ ان کو جب چاہے دوبارہ جمع کرنے اور اکٹھا کرنے پر بھی بہرحال قادر ہے کہ جو قادر مطلق اس سب کو اس پُرحکمت طریقہ کے ساتھ اس طرح پھیلا اور بکھیر سکتا ہے آخر وہ ان کو دوبارہ جمع اور اکٹھا کرنے پر کیوں قادر نہ ہوگا؟ جو کسان اپنے کھیت میں تخم ریزی کرتا ہے وہ تخم کو ضائع کرنے کے لئے تو نہیں بکھیرتا بلکہ وہ اس کو اس لئے بکھیرتا ہے کہ ایک دن وہ اس کے حاصل کو جمع بھی کرے گا۔ چنانچہ آخر ایک دن وہ اس کو جمع کرتا بھی ہے اور اس میں اس کو کوئی زحمت اور مشکل پیش نہیں آتی۔ اسی طرح اللہ ﷻ جب چاہے گا سب کو اکٹھا کر لائے گا اور اس قادر مطلق کی تو شان ہی الگ اور یکتا ومنفرد ہے کہ اس کی شان اور اس کی قدرت تو کن فیکون کی ہے۔

عملی پہلو: اللہ ﷻ نے آسمان وزمین اور ان میں بے شمار مخلوقات با مقصد پیدا فرمائی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ایک مدت کے بعد ان تمام مخلوقات کو اللہ ﷻ کی بارگاہ میں جمع کیا جائے گا اور پھر حساب کتاب کے بعد جزا و سزا کا سلسلہ ہوگا۔ ہم اپنا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ کیا ہم آخرت کے لئے تیاری کر رہے ہیں اور کیا ہم اللہ ﷻ کی عدالت میں پیشی کے لئے تیار ہیں؟

آیت نمبر ۳۰: انسان پر جو بھی آفات اور مصائب آتے ہیں وہ اس کے اپنے بعض گناہوں کی وجہ سے آتے ہیں۔ البتہ یہ اللہ ﷻ کی رحمت ہے کہ وہ اکثر گناہوں پر گرفت نہیں کرتا بلکہ درگزر فرماتا ہے۔

علمی بات: اس آیت میں ایک عام اصول بیان کر دیا گیا ہے کہ اکثر عذاب مثلاً قحط، وبائیں، زلزلے اور سیلاب وغیرہ لوگوں کے اپنے ہی شامت اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ایک قحط کا عذاب اہل مکہ پر بھی نازل ہوا تھا جو سات سال تک مسلط رہا۔ بارشیں بھی بند ہو گئیں اور باہر سے غلہ آنا بھی بند ہو گیا تھا۔ اس عرصہ میں لوگوں کا یہ حال ہو گیا کہ جانوروں کے چمڑے اور ہڈیاں کھانے تک مجبور ہو گئے۔ شدت بھوک کی وجہ سے یہ حال ہو رہا تھا کہ آسمان کی طرف دیکھتے تو دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا۔ ان کفار و منکرین کو اس آیت میں تنبیہ کی گئی ہے کہ یہ مصائب جو تم پر نازل ہوئے ہیں یہ تمہارے اعمال کا نتیجہ ہیں، اب تمہیں چاہیئے کہ تم ہوش میں آؤ اور اپنے اعمال کا جائزہ لے کر دیکھو کہ اپنے رب کے مقابلہ میں تم نے کیا روش اختیار کر رکھی ہے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ جس اللہ ﷻ سے تم بغاوت کر رہے ہو اس کے مقابلہ میں تم کتنے بے بس ہو اور یہ جانو کہ جنہیں تم اپنا ولی و کارساز بنائے بیٹھے ہو، یا جن طاقتوں پر تم نے بھروسہ کر رکھا ہے، وہ اللہ ﷻ کی پکڑ سے بچانے میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتیں۔

علمی بات: عام طور پر انسانوں پر جو مصیبتیں آتی ہیں وہ ان کے گناہوں کی وجہ سے آتی ہیں۔ کفار اور نافرمان لوگوں پر جو مصیبتیں نازل ہوتی ہیں وہ ان کی نافرمانیوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اللہ ﷻ ان کے کرتوں کی سزا نہیں دیتا ہے۔ ایک شخص جو برائیاں کماتا ہے اس کے نتیجہ میں اس پر کوئی نہ کوئی افتاد پڑتی ہے اور جو معاشرہ برائیاں سمیٹ لیتا ہے وہ اجتماعی طور پر مصیبت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اللہ ﷻ بڑا کریم ہے۔ وہ انسان کے سارے گناہوں کی سزا نہیں دیتا بلکہ بہت سارے گناہوں سے درگزر فرما دیتا ہے۔ اگر اللہ ﷻ لوگوں کی بدکاریوں کی پوری سزا دے تو پھر نافرمانوں کا نام و نشان ہی مٹ جائے۔

علمی بات: مسلمانوں پر جو تکلیفیں آتی ہیں وہ مختلف قسم کی ہیں۔ ایک یہ کہ بعض اوقات مسلمانوں میں سے بھی بعض لوگ نافرمانیاں، گناہ اور جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر مصائب اللہ ﷻ کی طرف سے ان کے گناہوں کی وجہ سے آتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ بعض اوقات کسی مسلمان سے کوئی غلطی و خطا ہو جاتی ہے تو اللہ ﷻ اسے دنیا میں کوئی تکلیف دے دیتا ہے جس کے ذریعہ اس کی غلطی و خطا کو مٹا دیا جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ مسلمانوں میں سے اللہ ﷻ کے فرماں بردار بندوں پر جو مصائب آتے ہیں وہ ان کی آزمائش کا ذریعہ ہوتے ہیں اور ان کے درجات کی بلندی کا باعث بنتے ہیں۔ چوتھے یہ کہ اللہ ﷻ کے پیغمبروں اور مخلص بندوں کو حق کے راستہ میں جو مصیبتیں پیش آتی ہیں۔ ان کے ذریعہ سے اللہ ﷻ ان بزرگ ہستیوں کے درجات بلند کرتا ہے۔ ایسے مصائب سب سے زیادہ اللہ ﷻ کے نبیوں کو پھر درجہ بدرجہ دوسرے نیک مخلص بندوں کو پیش آتے ہیں۔

فرمان نبوی ﷺ: حضرت سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اور حضرت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب بھی مومن کسی پریشانی، بیماری، رنج و ملال، تکلیف اور غم میں مبتلا ہوتا ہے، یہاں تک کہ اگر اسے کوئی کانٹا بھی چبھتا ہے تو اس کے بدلہ میں اللہ ﷻ اس کے گناہ معاف فرما دیتا ہے۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

آیت نمبر ۳۱: اللہ ﷻ کو کوئی عاجز نہیں کر سکتا کہ بھاگ کر کسی ایسی جگہ چلا جائے کہ اللہ ﷻ کی گرفت میں نہ آسکے۔ اللہ ﷻ کے سامنے سب عاجز اور بے بس ہیں، وہ کسی کے سامنے عاجز اور کمزور نہیں ہے۔ اللہ ﷻ اگر کسی کی گرفت کرنا چاہے تو اس کے مقابلہ میں کوئی حمایتی اور کوئی مدد کرنے والا نہیں ہوگا۔

علمی بات: اللہ ﷻ قادر مطلق ہے، جب وہ مجرموں کو سزا دیتا ہے تو وہ اللہ ﷻ کی گرفت سے بچ نہیں سکتے اور نہ ہی اللہ ﷻ کے مقابلہ میں کوئی ایسا کارساز یا مددگار ہے جو انہیں اللہ ﷻ کی گرفت سے بچا سکے۔ مخلوقات کے پاس جتنی بھی طاقت و قوت، دولت و ثروت اور علم و معرفت ہو کبھی کوئی اللہ ﷻ کو عاجز اور کمزور نہیں بنا سکتا۔ سب کچھ اللہ ﷻ کے قبضہ قدرت و اختیار میں ہے۔ اللہ ﷻ کے سوا جو فرضی اور خود ساختہ سہارے لوگوں نے مختلف ناموں سے گھڑ رکھے ہیں، وہ سب دھوکے کا سامان ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم اپنی دنیاوی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ جب ہم میں سے کسی

پر کوئی آفت آتی ہے تو نہ ہم لوگ خود اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی ہمارا ایسا کوئی یار و مددگار اور حامی و ناصر ہوتا ہے جو ہمیں اس سے بچا سکے اور ہمارے کام آ سکے۔ پس اسی طرح قیامت کے روز نہ باغی اور سرکش لوگ اللہ ﷻ کی گرفت و پکڑ سے کسی طرح بچ سکیں گے اور نہ ہی خود ساختہ شرکاء میں سے کوئی ایسا ہو گا جو اللہ ﷻ کے مقابلہ میں ان لوگوں کی حمایت اور نصرت کر سکے، سوائے اللہ ﷻ کی رحمت و عنایت اور اس کے لطف و کرم کے کچھ بھی کام نہیں آ سکے گا۔

آیت نمبر ۳۲: انسان پر اللہ ﷻ کے عظیم احسان کا ذکر ہے۔ اس نے انسان کو پہاڑوں جیسے بڑے بڑے سمندری جہاز بنانا سکھائے۔ جو اس کی قدرت، علم و حکمت اور رحمت کی نشانیوں میں سے ہیں۔

علمی بات: اللہ کا یہ انسان پر بہت بڑا احسان اور اس کی قدرت کی نشانی ہے کہ پہاڑوں جیسے عظیم الشان جہاز سمندروں میں رواں دواں ہیں۔ یہ جہاز انسان کی ضروریات و حاجات کو لے کر مشرق و مغرب اور شمال و جنوب ہر طرف رواں دواں ہیں۔ تو جس پانی کی پشت پر ایک چھوٹا سا کنکر بھی نہیں ٹھہر سکتا اس پر ہزاروں ٹن وزن کے یہ دیو پیکر جہاز سمندر کا سینہ چیر کر دوڑے پھر رہے ہیں۔ اس قادرِ مطلق ربِّ رحمٰن نے ایک طرف تو وہ تمام اسباب اور خام مال پیدا فرمایا جو جہاز سازی کی اس صنعت میں کام آتا ہے اور دوسری طرف اس نے انسان کو عقل و فکر کی اس قوت اور جسمانی صحت و سلامتی کی اس صلاحیت اور استعداد سے نوازا جس سے کام لے کر انسان ان دیو پیکر جہازوں کو تیار کر کے طرح طرح کے فائدے اٹھاتا ہے اور اس سے لوگوں کے طرح طرح کے کاروبار وابستہ ہیں اور ہزاروں لوگوں کی روزی روٹی کا مدار و انحصار بھی اسی پر ہے۔ مزید یہ کہ اللہ ﷻ نے اپنی قدرت، حکمت اور رحمت سے بحر و بر کی اس پوری کائنات کو ایسے قواعد و ضوابط اور قوانین فطرت کا پابند بنا دیا کہ یہ سب اس طرح انسان کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

آیت نمبر ۳۳: اللہ ﷻ کی قدرت کی نشانیوں میں سے سمندر میں چلنے والے بڑے بڑے بحری جہاز ہیں۔ اگر اللہ ﷻ چاہے تو اس کے حکم سے ہوا ٹھہر جائے تو جہاز سمندر کی سطح پر کھڑے رہ جائیں گے۔ بلاشبہ ان حقائق میں ہر صبر کرنے والے اور شکر بجالانے والے کے لئے بڑے دلائل اور بڑی نشانیاں ہیں۔

علمی بات: یہ اللہ ﷻ کی قدرت ہے کہ اس نے پانی اور لکڑی کا ایسا جوڑ لگا دیا کہ لکڑی پانی پر تیرتی ہے اور پانی اس کو ڈبوتا نہیں، جس کی وجہ سے بڑے بڑے جہاز اور کشتیاں بنا کر لوگ پانی میں سفر کرتے ہیں۔ جب یہ جہاز پانی میں چلتے ہیں تو ہوائیں چلتی ہیں تاکہ ہوائیں ان جہازوں کو جلدی سے لے جائیں یا آج کل اسٹیم سے چلتے ہیں جس کو بھاپ کہتے ہیں۔ جدید جہاز انجن کے ذریعہ چلتے ہیں اور ان میں دھکیلنے والے آلہ جات (Propeller) لگے ہوتے ہیں جو پنکھے نما ہوتے ہیں وہ پانی کے اندرونی حصہ میں ہوتے ہیں جو پانی کو دھکیلتے ہیں اور اس کی مدد سے جہاز آگے بڑھتا ہے۔ بہر حال اگر اللہ ﷻ چاہے تو ہوا کو روک دے اور اسٹیم اور انجن اور دیگر مشینی آلات کی طاقت کو سلب کر لے اور بھاپ، انجن کو بے کار کر دے۔ جیسا کہ بعض اوقات مشاہدہ میں آتا ہے کہ انجن اچانک خراب ہو جاتے ہیں اور جہاز پانی میں ڈوب جاتے ہیں۔ کئی کئی مہینے لنگر انداز رہتے ہیں۔ یہ سب اللہ ﷻ کے اختیار میں ہے کہ وہ ان جہازوں کو ہی بالکل تباہ کر دے اور بیٹھنے والے اپنے گناہوں کی وجہ سے غرق کر دے اور بہت ساروں کو معاف فرما دے اور اس وقت غرق نہ کرے، ان کو پھر کسی اور سفر میں غرق کرے یا آخرت میں عذاب دے یا خشکی میں کسی اور عذاب سے ہلاک کرے۔ جیسا کہ اگلی آیت میں یہ بات ذکر کی گئی ہے۔ بہر حال یہ سب کچھ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ ﷻ کی آیات کا انکار کرنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ ان کے لئے کہیں بچ کر نکلنے کی کوئی شکل نہیں ہے اور کہیں بھاگنے کا موقعہ نہیں ہے۔ وہ سب لوگ اللہ ﷻ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور جب چاہے اللہ ﷻ ان کی گرفت کر سکتا ہے اور انہیں عذاب دے سکتا ہے۔ اگر وہ اللہ ﷻ کی نافرمانیوں سے باز نہ آئے تو آخرت میں انہیں ضرور عذاب دے گا جہاں انہیں کوئی بچا نہ سکے گا۔

علمی بات: بڑی بڑی کشتیوں اور بحری جہازوں کی سمندر کی پیٹھ پر روانگی اور ان کی آمد و رفت اللہ ﷻ ہی کے کرم و احسان کا نتیجہ و ثمرہ اور اس کی قدرت کا ایک عظیم الشان کرشمہ ہے۔ لیکن اگر اللہ ﷻ چاہے تو ہوا کو روک دے اور یہ سارے جہاز اپنی جگہ کھڑے کے کھڑے رہ جائیں۔ مگر وہ اپنے بے انتہا حلم اور بیکراں کرم کی بنا پر ایسے نہیں کرتا۔ بلکہ اس نے اپنی عنایت اور رحمت سے سمندروں، ہواؤں وغیرہ اور مختلف قسم کی مخلوقات کو طرح طرح سے انسان کے کام اور اس کی خدمت میں لگا رکھا ہے۔ اس سے ان لوگوں کو درس عبرت و بصیرت لینا چاہیئے جن کی نظر خالق کی قدرت پر نہیں ہوتی، بلکہ وہ ان ہی مظاہر کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں اور ان کی نگاہیں ان ہی میں اٹک کر اور پھنس کر رہ جاتی ہیں۔

علمی بات: "صبر کرنے والے" سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور اچھے اور برے تمام حالات میں بندگی کے رویے پر ثابت قدم رہے۔ جس کا حال یہ نہ ہو کہ اچھا وقت آئے تو اپنی ہستی کو بھول کر اللہ ﷻ سے باغی اور بندوں کے حق میں ظالم بن جائے اور برا وقت آجائے تو دل چھوڑ بیٹھے اور ہر ذلیل سے ذلیل حرکت کرنے پر اتر آئے۔ "شکر کرنے والے" سے مراد وہ شخص ہے جسے تقدیرِ الٰہی خواہ کتنا ہی اونچا اٹھالے جائے، وہ اسے اپنا کمال نہیں بلکہ اللہ ﷻ کا احسان ہی سمجھتا رہے اور وہ خواہ کتنا ہی نیچے گرا دیا جائے، اس کی نگاہ اپنی محرومیوں کے بجائے ان نعمتوں پر ہی مرکوز رہے جو برے سے برے حالات میں بھی آدمی کو حاصل رہتی ہیں اور خوشحالی و بدحالی، دونوں حالتوں میں اس کی زبان اور اس کے دل سے اپنے رب کا شکر ہی ادا ہوتا رہے۔ بحری سفر کے دوران موافق اور ناموافق ہر قسم کے حالات سے سابقہ پڑتا ہے۔ ایسے میں موافق حالات پر اللہ ﷻ کا شکر ادا کیا جائے اور ناموافق حالات پر صبر کیا جائے۔

عملی پہلو: صبر اور شکر مومن کی دو صفات ہیں۔ مومن پر جب بھی کوئی مصیبت یا تکلیف آتی ہے تو وہ صبر اور برداشت سے کام لیتا ہے۔ جب بھی اللہ ﷻ کی کوئی نعمت ملتی ہے یا اسے بھلائی پہنچتی ہے تو وہ اللہ کا احسان مند ہوتا اور اس کا شکر ادا کرنے لگ جاتا ہے۔ سمندر کے سفر میں اگر حالات سازگار ہوں تو مومن اللہ ﷻ کا شکر ادا کرتا ہے اور اگر ہوا بند ہو جائے تو اس کی نظر اللہ ﷻ ہی پر رہتی ہے اور صبر کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس کے برعکس ایک کافر اور دنیادار انسان کا یہ وطیرہ ہوتا ہے کہ مصیبت پڑنے پر چیخ و پکار کرتا ہے، اللہ ﷻ کی رحمت سے مایوس ہو کر ناشکری کے الفاظ زبان پر لاتا ہے۔ جب اسے کوئی بھلائی نصیب ہوتی یا خوشحالی کا دور آتا ہے تو پھر وہ اللہ ﷻ کو بھول ہی جاتا ہے۔

آیت نمبر ۳۴: سمندر میں بڑے بڑے بحری جہاز کا چلنا، اللہ ﷻ کی قدرت کی نشانی ہے۔ اگر اللہ ﷻ چاہے تو جہاز کو سمندر میں غرق کر دے۔ اس پر سوار لوگوں کو ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دے۔ لیکن اللہ ﷻ لوگوں کے بہت سے گناہوں سے درگزر کر دیتا ہے اور ان کی فوری گرفت نہیں کرتا بلکہ انہیں مہلت دے دیتا ہے۔

علمی بات: یہ اللہ ﷻ کی قدرت ہے کہ وہ سمندر میں جہازوں کو چلاتا ہے اور انہیں منزل تک پہنچاتا ہے۔ ان کا چلنا اور صحیح سلامت منزلِ مقصود تک پہنچنا، اللہ ﷻ کے اختیار میں ہے۔ اگر اللہ ﷻ چاہے تو ان جہازوں کو روک دے۔ یا اگر وہ چاہے تو ان میں سوار لوگوں کے اعمال کی پاداش میں جہازوں کو تباہ کر دے۔ جس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ سمندر میں طوفان آجائے اور اس کی وجہ سے جہاز غرق ہو جائیں۔ پرانے دور میں بادبانی جہاز اور کشتیاں ہوتی تھیں جن کا انحصار موسمی حالات پر ہوتا تھا۔ جبکہ دورِ جدید میں ان کی جگہ بھاپ، پٹرول، بجلی اور ایٹمی توانائی سے چلنے والے جہازوں اور کشتیوں نے لے لی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سمندر میں اٹھنے والے طوفانوں کی قہر و غضب کے سامنے ان کی حیثیت بھی تنکے سے زیادہ نہیں۔ پہلے بھی اللہ ﷻ کی مہربانی اور خاص فضل سے بادبانی جہاز اور کشتیاں ساحل تک بخیر و عافیت پہنچتی تھیں اور آج بھی اسی کے رحم و کرم پہ بھاپ، پٹرول، بجلی اور ایٹمی توانائی سے چلنے والے جہاز اور کشتیاں سلامتی سے منزلِ مقصود تک پہنچتے ہیں۔ ورنہ لمحوں میں یہ سب وسائل تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔

عملی پہلو: اللہ ﷻ کا انسان پر بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے انسان کے لئے سمندر میں جہازوں کو چلا دیا ہے۔ یہ اللہ ﷻ کی نعمت ہے اور اس نعمت کا نعمت ہونا اللہ ﷻ ہی کے فضل و کرم اور اسی کی توفیق و عنایت پر موقوف ہے۔ اگر اللہ ﷻ چاہے تو اس نعمت کو چھین لے اور اسی جہاز میں سوار لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے انہیں غرق کر دے۔ اس لئے اس دنیا میں کسی کے لئے بھی یہ بات جائز نہیں کہ وہ اپنی کسی کامیابی پر مست و مغرور ہو کر اترانے لگے۔ بلکہ اس کو یہ طریقہ اپنانا چاہیے کہ کامیابی کی صورت میں دل و جان سے اپنے رب کے حضور جھک جائے اور اگر اس کے برعکس خدانخواستہ کوئی ناگہانی آفت پیش آئے اور کوئی سانحہ واقع ہو جائے تو اس کو اپنی کسی کوتاہی کا نتیجہ قرار دے کر صبر و برداشت سے کام لے۔ اپنے رب سے معافی مانگے اور اس سے خیر اور فضل و کرم کی قوی امید رکھے۔

آیت نمبر ۳۵: اللہ ﷻ کی آیات اور اس کی وحدانیت کا انکار کرنے والوں کو سزا دینے کا ایک مقصد یہ ہے کہ ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ وہ اللہ ﷻ کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔ ان واضح نشانیوں کے باوجود جو لوگ اللہ ﷻ کی آیتوں کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں اور ان پر ایمان نہیں لاتے، وہ یہ جان لیں کہ اللہ ﷻ کے عذاب سے بھاگ کر کہیں بھی چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ جب اللہ ﷻ کی طرف سے عذاب آئے گا تو ان کے لئے کوئی راہِ فرار نہیں ہو گی۔

علمی بات: قریش کے لوگوں کو تجارتی اغراض کے سلسلہ میں حبش اور افریقہ کے ساحلی علاقوں کی طرف بھی جانا ہوتا تھا۔ چونکہ ان سفروں میں وہ بادبانی جہازوں اور کشتیوں پر بحر احمر سے گزرتے تھے جو ایک بڑا خطرناک سمندر ہے۔ اس میں اکثر طوفان اٹھتے رہتے ہیں اور زیر آب چٹانیں کثرت سے ہیں جن سے طوفان کی حالت میں جہازوں اور کشتیوں کے چٹانوں سے ٹکرا جانے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ اس لئے جس کیفیت کا نقشہ ان آیات میں اللہ ﷻ نے کھینچا ہے اسے قریش ذاتی تجربات کی روشنی میں پوری طرح سمجھ اور محسوس کر سکتے تھے۔ اللہ ﷻ نے ان آیات میں ان کے سامنے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ یہ ساری باتیں تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ سب کچھ اللہ ﷻ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اب تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ تم اللہ ﷻ کی پکڑ سے بھاگ نہیں سکتے، تمہارے لئے اللہ ﷻ کی گرفت سے کہیں بھاگنے اور بچ نکلنے کی جگہ نہیں ہے۔

آیت نمبر ۳۶: غلبہ دین کی جدوجہد کرنے والوں کے اوصاف کا بیان ہے۔ وہ دنیا کے نہیں بلکہ آخرت کے طلب گار ہوتے ہیں۔ دنیا میں اگر کسی کو عیش و عشرت کا سامان مل جائے تو اس پر اترانا نہیں چاہیئے۔ دنیا کی عارضی اور کم تر نعمتوں کے مقابلہ میں آخرت کی نعمتیں بہت بہتر اور ہمیشہ رہنے والی ہیں۔ لیکن آخرت کی نعمتیں ان ہی لوگوں کو ملیں گی جو ایمان لاتے ہیں اور اللہ ﷻ پر توکل کرتے ہیں۔ وہ باطل کی کثرت اور وسائل سے مرعوب نہیں ہوتے بلکہ ان کی نگاہ مسبب الاسباب پر ہوتی ہے۔

علمی و عملی بات اگلی آٹھ آیات میں وہ اوصاف بیان کیئے گئے ہیں جو اقامت دین کی جدوجہد کرنے والے افراد کی سیرت کے لئے ضروری ہیں۔ اقامت دین کی جدوجہد کے علم بردار افراد اور مومنین کاملین کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ان اوصاف کو اپنائے بغیر ان کے کردار و عمل میں وہ مضبوط "جان" پیدا نہیں ہوگی جو اس "معرکہ روح و بدن" میں پیش کرنے کے لئے درکار ہے۔ اس ضمن میں پہلی ہدایت عطا ہوئی کہ "پس جو کچھ بھی تمہیں دیا گیا ہے وہ دنیا ہی کی زندگی کا ساز و سامان ہے۔" گویا اس منزل کے مسافروں کو سب سے پہلے اپنی ترجیحات بدلنا ہوں گی اور ایسی سوچ اپنانا ہوگی جس کے مطابق دنیا و مافیہا انہیں ہیچ نظر آئے اور اس کے مقابلہ میں آخرت کی زندگی ان کا اصل مقصود و مطلوب بن جائے۔ اگر دنیا کی محبت دل کے کسی گوشے میں چھپی رہ گئی تو وہ اس میدان کے بڑے سے بڑے شہسوار کو بھی کبھی نہ کبھی ضرور منہ کے بل گرائے گی۔ چنانچہ آدمی سب سے پہلے یہ طے کرے کہ وہ طالب آخرت ہے یا طالب دنیا؟ اقامت دین کی جدوجہد کے علم برداروں کا پہلا وصف یہاں یہ بیان ہوا ہے کہ وہ دنیا سے بے رغبتی اختیار کر کے آخرت کو اپنا مقصود و مطلوب بنا لیتے ہیں، جبکہ آیت کے اختتامی الفاظ کے مطابق ان کا اگلا وصف یہ ہے: وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ "اور اپنے رب ہی پر بھروسہ کرتے رہے۔" یعنی وہ ہر حال اور ہر کیفیت میں اپنے رب پر ہی توکل کرتے ہیں۔ اللہ ﷻ پر توکل کو یہاں ایمان لانے کا لازمی تقاضا، اور آخرت کی کامیابی کے لئے ایک نہایت ضروری وصف قرار دیا گیا ہے۔

علمی بات: توکل کے معنٰی یہ ہیں کہ: اولاً آدمی کو اللہ ﷻ کی رہنمائی پر کامل اعتماد ہو اور وہ یہ سمجھے کہ حقیقت کا جو علم، اخلاق کے جو اصول، حلال و حرام کی جو حدود اور دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لئے جو قواعد و ضوابط اللہ ﷻ نے عطا فرمائے ہیں وہی برحق ہیں اور انہی کی پیروی میں انسان کی خیر ہے۔ ثانیاً آدمی کا بھروسہ اپنی طاقت، قابلیت، اپنے ذرائع و وسائل، اپنی تدابیر اور اللہ ﷻ کے سوا دوسروں کی امداد و اعانت پر نہ ہو، بلکہ وہ پوری طرح یہ بات ذہن نشین رکھے کہ دنیا اور آخرت کے ہر معاملہ میں اس کی کامیابی کا اصل انحصار اللہ ﷻ کی توفیق و تائید پر ہے اور اللہ ﷻ کی توفیق و تائید کا وہ اسی صورت میں مستحق ہو سکتا ہے جبکہ وہ اس کی رضا کو مقصود بنا کر، اس کے مقرر کی ہوئی حدود کی پابندی کرتے ہوئے کام کرے۔ ثالثاً آدمی کو ان وعدوں پر پورا بھروسہ ہو جو اللہ ﷻ نے ایمان و عمل صالح کا رویہ اختیار کرنے والے اور باطل کے بجائے حق کے لئے کام کرنے والے بندوں سے کیئے ہیں اور ان ہی وعدوں پر اعتماد کرتے ہوئے وہ ان تمام فوائد، منافع اور لذتوں کو ترک کر دے جو باطل کی راہ پر جانے کی صورت میں اسے حاصل ہوتے نظر آتے ہوں اور ان سارے نقصانات، تکلیفوں اور محرومیوں کو برداشت کر لے جو حق پر استقامت کی وجہ سے اس کے نصیب میں آئیں۔ توکل کے معنٰی کی اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان کے ساتھ اس کا کتنا گہرا تعلق ہے۔ اس کے بغیر جو ایمان محض خالی خولی اعتراف و اقرار کی حد تک ہو اس سے وہ شاندار نتائج ہرگز حاصل نہیں ہو سکتے جن کا وعدہ ایمان لا کر توکل کرنے والوں سے کیا گیا ہے۔

علمی بات: دنیاوی سازو سامان چند روزہ متاع دنیا ہے، انسان نے چند روز کے لئے اسے استعمال کرنا ہے اور بس۔ دنیا میں جتنا بھی مال و دولت اور سامان عیش و عشرت کسی کو مل جائے، اس سے وہ زیادہ سے زیادہ اپنی موت تک فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ بالآخر اسے خالی ہاتھ اس دنیا سے رخصت ہونا ہے۔ جبکہ آخرت کی زندگی اور اس کی نعمتیں ہمیشہ رہنے والی ہیں۔ آخرت میں ایمان داروں کو جو سامان عیش و عشرت ملے گا وہ سامان لافانی اور لازوال ہوگا۔ ایمان دار لوگ ان اشیاء سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہمیشہ زندہ رہیں گے، انہیں کبھی موت نہیں آئے گی۔ لہٰذا آخرت کے مقابلہ میں اس ساری دنیا کی کوئی حقیقت وحیثیت نہیں ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”دنیوی زندگی کی متاع تو آخرت کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔“ (سورۃ التوبہ ۹، آیت: ۳۸) پس دنیاوی زندگی کی یہ چند روزہ اور عارضی وفانی نعمتیں اترانے اور تکبر کرنے کی چیز نہیں کیونکہ یہ چند روزہ دنیاوی زندگی کا متاع فانی ہے اور بس۔ جس نے بہر حال فنا ہو کر رہنا ہے۔ اصل چیز آخرت اور وہاں کی نعیم مقیم ہی ہے۔ پس عقل و نقل کا تقاضا یہی ہے کہ اسی کو اصل مقصد بنایا جائے اور اسی کے حصول کی کوشش کی جائے۔

فکری و عملی پہلو: یہ دولت و ثروت، یہ حویلیاں اور محلات، یہ زمینیں اور کارخانے، یہ سارے ٹھاٹھ فانی ہیں اور چند روزہ دنیوی زندگی میں کام آنے والی چیزیں ہیں۔ جس کم نگاہ نے ان فانی چیزوں کو اپنا حاصل حیات بنالیا، اس سے بڑا گھاٹے والا کون ہوگا۔ ادھر زندگی کا چراغ بجھے گا ادھر سب کچھ درہم برہم ہو جائے گا۔ البتہ اہل ایمان کے لئے اور توکل کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو لازوال نعمتیں اپنے پاس محفوظ رکھی ہیں وہ باقی اور سرمدی ہیں۔

فرامین نبوی ﷺ: سیدنا مستورد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ کی قسم! دنیا آخرت کے مقابلہ میں ایسی ہی ہے، جیسے تم میں سے کوئی اپنی یہ (شہادت والی) انگلی سمندر میں ڈالے اور پھر دیکھے کہ وہ سمندر میں سے کتنی تری لے کر لوٹتی ہے۔“ (صحیح مسلم)

سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا کندھا پکڑ کر فرمایا: ”دنیا میں اس طرح رہو جیسے کوئی پردیسی ہو، یا راہ چلتا مسافر۔“ (صحیح بخاری)

علمی بات: اللہ تعالیٰ پر توکل آخرت کی کامیابی کے لئے ایک ضروری وصف ہے۔ توکل یہ ہے کہ آدمی کو اللہ تعالیٰ کی رہنمائی پر کامل اعتماد ہو۔ دوسرا یہ کہ آدمی کا بھروسہ اپنی طاقت، قابلیت، اپنے ذرائع و وسائل، اپنی تدابیر اور اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کی امداد و اعانت پر نہ ہو بلکہ وہ پوری طرح یہ بات ذہن نشین رکھے کہ دنیا اور آخرت کے ہر معاملہ میں اس کی کامیابی کا اصل انحصار اللہ تعالیٰ کی توفیق و تائید پر ہے۔ تیسرا یہ کہ آدمی کو ان وعدوں پر پورا بھروسہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے ایمان و عمل صالح کا رویہ اختیار کرنے والے اور باطل کے بجائے حق کے لئے کام کرنے والے بندوں سے کیئے ہیں اور ان ہی وعدوں پر یقین کرتے ہوئے ان تمام فوائد اور منافع اور ظاہری لذتوں کو لات مار دے جو باطل کی راہ پر جانے کی صورت میں اسے حاصل ہوتے نظر آتے ہوں اور ان سارے نقصانات اور تکلیفوں اور محرومیوں کو بخوشی برداشت کر جائے جو حق پر استقامت کی وجہ سے اس پر آتے ہیں۔

آیت نمبر ۳۷: غلبۂ دین کی جدوجہد کرنے والوں کے مزید اوصاف کا ذکر ہے۔ وہ بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے اجتناب کرتے ہیں۔ کبیرہ گناہوں کے بارے میں وہ بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں اور ان سے بچتے رہتے ہیں۔ سب سے بڑی سرکشی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور قانون کے مقابلہ میں کسی اور کی اطاعت اور قانون پر عمل درآمد ہو۔ اس سرکشی کو ختم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کا تقاضا ہے۔ یہ جدوجہد کرنے والے غصہ یا جذبات کی شدت سے کوئی اقدام نہیں کرتے بلکہ درگزر کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔

علمی بات: مذکورہ اہل ایمان کا یہ وصف بیان ہوا کہ وہ بڑے بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کے کاموں سے اجتناب کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اقامت دین کے مقدس فریضہ کو نبھانے کا حلف اٹھانے والے رضا کار اگر اپنے دامن کردار کو ایسی نجاستوں سے بچا کر نہیں رکھیں گے تو وہ اس میدان میں آگے کیسے بڑھ سکیں گے۔ یہی مضمون سورۃ النساء میں بھی بیان ہوا ہے: ”اگر تم اُن بڑے گناہوں سے بچتے رہو جن سے تمہیں روکا گیا ہے تو ہم تمہارے (چھوٹے) گناہ معاف کریں گے اور ہم تمہیں عزت والے مقام میں داخل کریں گے۔“ (سورۃ النسآء ۴، آیت: ۳۱) صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کے حوالہ سے یہ نکتہ اچھی طرح سے ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ ایک بندۂ مومن کو کبیرہ گناہوں کے معاملہ میں غیر معمولی طور پر حساس ہونا چاہیئے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں عمومی روش یہ ہے کہ ہم صغیرہ گناہوں کے بارے میں تو بہت زیادہ باریک بین بننے کی کوشش کرتے ہیں، چھوٹے چھوٹے مسائل کے بارے میں وضاحتیں بھی طلب کرتے رہتے ہیں، مگر کبیرہ گناہوں سے متعلق لاپرواہی برتتے ہیں۔

پھر یہ وصف بیان ہوا کہ جب انہیں غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔ غَفَرَ کے معنی ڈھانپ دینے کے ہیں۔ اس لحاظ سے مغفرت سے مراد اللہ ﷻ کی رحمت اور مہربانی ہے جو بندہ کے گناہوں کو ڈھانپ لیتی ہے۔ لہٰذا مومنین صادقین کا یہاں جو وصف بتایا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ غصہ کا اظہار کرنے کے بجائے اسے پی جاتے ہیں۔ اشتعال کی حالت میں وہ کوئی اقدام نہیں کرتے بلکہ اپنے فیصلے ہمیشہ سوچ سمجھ کر کرتے ہیں اور انتقام لینے کے بجائے معاف کرنے کی حکمت عملی کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ نرم خو اور دھیمے مزاج کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی سرشت انتقامی نہیں ہوتی بلکہ وہ بندگانِ خدا سے درگزر اور چشم پوشی کا معاملہ کرتے ہیں۔ یہ وصف انسان کی بہترین صفات میں سے ہے جسے قرآن مجید میں نہایت قابل تعریف قرار دیا گیا ہے۔ سورۃ آل عمران ۳، آیت ۱۳۴ میں بھی متقین کی تعریف میں یہی صفت بیان کی گئی ہے: "جو غصہ کو ضبط کرنے والے ہیں اور جو لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں"۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ نے کبھی اپنی ذات کے لئے انتقام نہیں لیا۔ البتہ جب اللہ کی حرمتوں میں سے کوئی حرمت پامال کی جاتی تب آپ سزا دیتے تھے۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

علمی بات: جن لوگوں کو جنت کی ابدی نعمتیں حاصل ہوں گی، اس آیت میں ان کے اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ ایک خوبی یہ ہے کہ وہ بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے اجتناب کرتے ہیں۔ اپنے دامن کو ان سے آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ جب انہیں غصہ آئے تو غضب کی حالت میں بھی درگزر کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ یعنی اپنے ذاتی معاملات اور دنیوی کاموں میں انتقام کی خواہش نہیں کرتے بلکہ معاف کر دیا کرتے ہیں۔

علمی بات: اللہ ﷻ اور اس کے رسول مقبول ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کا نام گناہ ہے۔ جس گناہ پر حد مقرر ہو یا اس پر آخرت میں عذاب کی دھمکی دی گئی ہو، اسے گناہ کبیرہ کہتے ہیں اور اس کا ماسوا گناہ صغیرہ ہے۔ کبیرہ گناہوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، مثلاً شرک، قتل ناحق، خودکشی، بدکاری، پاکباز عورت پر بہتان، والدین کی نافرمانی، یتیم کا مال کھانا، فرائض (نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ) کا ترک کرنا، جادو کا عمل کرنا، شراب پینا، جھوٹی گواہی دینا، حیوان کو جلانا، بلا عذر خنزیر یا مردار کا گوشت کھانا وغیرہ۔ جو انسان کبیرہ گناہ سے اجتناب کرے اور فرائض و واجبات ادا کرے تو اللہ ﷻ اس کے صغیرہ گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے اور اسے جنت میں داخل فرماتا ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ: حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "سات ہلاک کرنے والے گناہوں سے بچو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: "یا رسول اللہ ﷺ! وہ کون سے ہیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "(۱) شرک باللہ (۲) جادو (۳) ایسی جان کو ناحق قتل کرنا جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ (۴) سود (۵) یتیم کا مال کھانا (۶) میدانِ جنگ سے فرار (۷) پاکباز بھولی بھالی عورتوں پر تہمت لگانا۔" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

علمی بات: بے حیائی کے کاموں (فواحش) میں زنا، بدکاری، برہنگی، عریاں تصویریں یا اس طرح کی فلمیں دیکھنا، عشق لڑانا، جنسی ہیجان پیدا کرنے والے گانے گانا یا سننا، عورتوں کا رقص و سرود اور فحش گوئی جیسی تمام چیزیں شامل ہیں اور ان سب میں زنا اول درجہ کی بے حیائی ہے۔ اللہ ﷻ کے نیک بندے ان بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں۔

علمی بات: کسی شخص کی طرف سے اذیت پہنچنے پر غصہ آنا بالکل فطری بات ہے، مگر درگزر سے کام لینا اور معاف کرنا ایک مومن کی بہترین صفت ہے۔ یہ صفت جذبات پر کنٹرول، بندگانِ خدا کے ساتھ حسن سلوک اور عدل و انصاف پر آمادہ کرتی ہے۔ غصہ کو پی جانا یقیناً بڑی خوبی ہے لیکن اس سے بڑی خوبی یہ ہے کہ غصہ آنے پر قصوروار کو معاف کر دیا جائے۔ لہٰذا جو اللہ ﷻ کے بندے ہیں وہ غصہ کے وقت لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ مگر جو لوگ اللہ ﷻ سے بے خوف ہوتے ہیں وہ غصہ میں بے قابو ہو جاتے ہیں اور ظلم و زیادتی پر اتر آتے ہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ: سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ اللہ کی قسم! "آپ ﷺ نے اپنی ذات کے لئے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا، البتہ جب اللہ کی حرمتوں کو توڑا جاتا تو آپ ﷺ اللہ کے لئے بدلہ لیتے تھے۔" (صحیح بخاری)

فرمانِ نبوی ﷺ: سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: آپ ﷺ مجھے کچھ نصیحت فرمایئے! آپ ﷺ نے فرمایا: "غصہ مت کیا کر۔" اس نے بار بار یہی بات پوچھی تو آپ ﷺ نے (ہر بار) یہی جواب دیا: "غصہ مت کیا کر۔" (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۳۸: غلبہ دین کی جدوجہد کرنے والوں کے مزید اوصاف کا بیان ہے۔ وہ اپنے رب کے ہر حکم پر عمل کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ نماز کو قائم کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان کے آپس کے معاملات باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں۔ اللہ ﷻ کے عطا کردہ رزق میں سے نیک کاموں میں خرچ کرتے ہیں۔

علمی بات: اللہ ﷻ کے نیک بندوں کی یہ صفت ہے کہ وہ اپنے رب کا ہر حکم مانتے ہیں۔ اپنے رب کی پکار پر لبیک کہتے ہیں۔ جس کام کے لئے بھی اللہ ﷻ بلاتا ہے اس کے لئے دوڑ پڑتے ہیں اور جس چیز کی بھی اللہ ﷻ دعوت دیتا ہے اسے قبول کرتے ہیں۔ وہ اپنے رب کے ہر حکم پر عمل کے لئے ہمہ وقت تیار ہوتے ہیں۔ وہ اللہ ﷻ کا حکم دل کی آمادگی کے ساتھ سنتے ہیں اور اسے قبول کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے نام نہاد مسلمانوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب کی دعوت پر کان دھرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور نہ ان کو اس کے احکام سننے سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے۔

علمی بات: اگلا وصف یہ بیان ہوا کہ وہ اپنے رب کی پکار پر لبیک کہتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ "یعنی جس کام کے لئے بھی اللہ ﷻ بلاتا ہے اس کے لئے دوڑ پڑتے ہیں، اور جس چیز کی بھی اللہ ﷻ دعوت دیتا ہے اسے قبول کرتے ہیں۔ یہ کون سی پکار ہے؟ آپ (ﷺ) کی دعوت کا عمود اور مرکزی پیغام اقامت دین ہے، اسی کی طرف آپ ﷺ نے لوگوں کو بلانا ہے، اسی کی ضرورت اور اہمیت کو ان کے اذہان میں نقش کرنا ہے۔ یہی آپ ﷺ کا مشن ہے اور یہی آپ ﷺ کی دعوت کا اصل ہدف۔ آپ ﷺ اپنے اسی مشن اور اسی موقف پر ڈٹے رہے اور مخالفین کی مخالفت کی بالکل پروانہ کی۔ بلاشبہ یہ مشن بہت عظیم ہے اور اسی نسبت سے اس کی جدوجہد کے لئے خصوصی سیرت و کردار کے حامل مردان کار درکار ہیں۔ چنانچہ آیات زیر مطالعہ میں ان اوصاف کا تذکرہ ہے جو اس مشن کے علمبرداروں کی شخصیات کے لئے لازمی ہیں۔

علمی بات: اللہ ﷻ کے نیک بندوں کا یہ وصف ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں۔ نماز کی پابندی کرتے ہیں اور اس فریضہ کو بڑے اہتمام کے ساتھ ادا کرتے ہیں جس میں دل کا خشوع بھی شامل ہوتا ہے اور وقار اور سکون بھی، نیز ان باتوں کا لحاظ بھی جن کا لحاظ کرنا شریعت نے ضروری قرار دیا ہے۔ اہل ایمان خود بھی نماز پڑھتے ہیں اور یہ بھی اہتمام کرتے ہیں کہ دوسرے بھی نماز پڑھیں۔ ایمان کا سب سے پہلا عملی مظہر نماز ہے۔ یہی اس کا اولین مظہر بھی ہے اور پھر اسی سے دوسری نیکیاں ظہور میں بھی آتی ہیں اور اسی سے پروان بھی چڑھتی ہیں۔ اس وجہ سے جس نے نماز کا اہتمام نہیں کیا اس نے گویا ایمان کی دعوت بھی قبول نہیں کی۔

علمی بات: اللہ ﷻ کے نیک بندوں کی یہ صفت ہے کہ وہ آپس کے معاملات باہمی مشورے سے طے کرتے ہیں۔ مشورے کا مطلب یہ ہے کہ کسی خاص معاملہ میں دوسرے لوگوں کی رائے حاصل کی جائے۔ مشورہ سے کام کرنا اللہ ﷻ کو بہت پسند ہے خواہ دینی امور ہوں یا دنیاوی، انفرادی ہوں یا اجتماعی۔ مشاورت اسلامی طرز زندگی کا ایک اہم ستون ہے۔ مشورہ کے بغیر اجتماعی کام چلانا نہ صرف جاہلیت کا طریقہ ہے بلکہ اللہ ﷻ کے مقرر کیئے ہوئے ضابطہ کی صریح خلاف ورزی ہے۔ نبی کریم ﷺ اہم امور میں برابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرماتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی آپس میں مشورہ کرتے تھے۔ خلافت راشدہ کی بنیاد ہی شوریٰ پر قائم تھی۔ مشورہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ہر ایسے شخص سے لیا جائے جو عاقل و دیانتدار ہو، ورنہ بے وقوفی یا بددیانتی سے کام خراب ہو جانے کا اندیشہ رہے گا۔ وہ کام جن میں اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ کے واضح احکام موجود ہیں ان میں مشورہ کی ضرورت ہے نہ اجازت کی، ان میں حکم کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔

علمی بات: اللہ ﷻ کے نیک بندوں کا یہ وصف ہے کہ وہ اللہ ﷻ کے دیئے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اس سے مراد اللہ ﷻ کی راہ میں خرچ کرنا، زکوٰۃ، صدقات، دینی مقاصد کے لئے خرچ کرنا اور نیک اور فلاحی کاموں میں خرچ کرنا ہے۔ اللہ ﷻ اپنی راہ میں خرچ کرنے کا اجر و ثواب دنیا و آخرت میں بے حساب عطا کرتا ہے۔ اللہ ﷻ صرف رزق حلال و طیب ہی کو اپنے دیئے ہوئے رزق سے تعبیر فرماتا ہے، ناپاک اور حرام طریقوں سے کمائے ہوئے رزق کو وہ اپنا رزق نہیں کہتا۔ اس لئے حلال طریقہ سے روزی کمائی جائے اور حلال رزق ہی اللہ ﷻ کی راہ میں خرچ کیا جائے۔

آیت نمبر ۳۹: غلبۂ دین کی جدوجہد کرنے والوں کی ایک اور صفت یہ ہے کہ جب ان پر کوئی ظلم کرتا ہے تو وہ برابر کا بدلہ لیتے ہیں اور اس میں حد سے تجاوز نہیں کرتے۔ یعنی متکبر اور جابر قسم کے لوگ جب ان پر زیادتی کرتے ہیں تو وہ ان کے آگے دبتے نہیں بلکہ ان کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں اور ان کا مقابلہ کرتے ہیں اور کسی قسم کی کمزوری نہیں دکھاتے۔ عام حالات میں درگزر کرنا پسندیدہ ہے البتہ زیادتی ہو جانے پر بدلہ لینے کی بھی اجازت ہے۔

علمی بات: سابقہ آیات میں مومن کی ایک صفت یہ بیان ہوئی تھی کہ اسے اگر تکلیف دی جاتی ہے یا ستایا جاتا ہے تو وہ غضب ناک ہو کر چھچھوری حرکتیں نہیں کرنے لگتا بلکہ بردباری، صبر و تحمل اور درگزر سے کام لیتا ہے۔ اس آیت میں بندۂ مومن کی ایک اور خوبی کا ذکر ہو رہا ہے کہ اگر کوئی اس پر پیہم زیادتی کرتا رہتا ہے اور اسے کمزور سمجھ کر اس کو پریشان کرنا چاہتا ہے یا اس دینِ متین کے خلاف کوئی محاذ قائم کر لیتا ہے تو پھر یہ بہادر آدمی کی طرح میدان میں اترتا ہے اور اس وقت تک پیچھے ہٹنے کا نام نہیں لیتا جب تک باغیوں اور سرکشوں کے غرور کو خاک میں ملا دے اور ان کی قوت کو پاش پاش کر کے نہ رکھ دے۔ اس وقت وہ طوفان بن کر امڈتا ہے، ظلم، کفر و سرکشی کے مغرور و متکبر علمبرداروں کو تنکوں کی طرح بہالے جاتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ عفو و درگزر اور چیز ہے، ذلت و بے چارگی اور چیز ہے۔ مومن عفو و درگزر تو کرتا ہے لیکن کوئی سرکش اس سے ذلت اور بے چارگی کی توقع کرے تو یہ ناممکن ہے۔ مومن مغلوب اور ضعیف پر تو رحم کرتا ہے لیکن جو قوت و طاقت کے نشہ میں مغرور ہو کر اس کو پیروں سے روندنا اور دھمکانا چاہے تو اس کی وہ ٹانگیں توڑ دیتا ہے، وہ ہاتھ جن میں ظلم کی تلوار ہوتی ہے کاٹ دیئے جاتے ہیں اور وہ آنکھ پھوڑ دی جاتی ہے جو ان کی طرف بُری نیت سے اٹھتی ہے۔

علمی بات: اقامت دین کی جدوجہد کرنے والے اہل ایمان کا اگلا وصف یہ بیان ہوا کہ جب ان پر زیادتی ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔ یعنی اقامت دین کی عظیم جدوجہد جب "قتال" کے مرحلہ میں داخل ہو جائے تو پھر اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا حکم ہے۔ جیسا کہ سورۃ البقرۃ ۲، آیت: ۱۹۱ میں اس حکمت عملی کو یوں بیان فرمایا گیا ہے: "اور اُن (کافروں) کو قتل کرو جہاں کہیں بھی تم اُنہیں پاؤ اور اُنہیں (وہاں سے) نکالو جہاں سے اُنہوں نے تمہیں نکالا ہے۔" گویا جب ایک دفعہ آگے بڑھ کر باطل کو چیلنج کر دیا گیا تو پھر فیصلہ کن فتح تک اس جنگ کو سختی سے جاری رکھنے کا حکم ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جنگ بدر میں پکڑے گئے قیدیوں کو فدیہ لے کر رہا کیئے جانے پر اللہ ﷻ کی طرف سے سورۃ الانفال ۸، آیات: ۶۷، ۶۸ میں ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا گیا۔ ان قیدیوں کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے، بلکہ آپ رضی اللہ عنہ کو تو اصرار تھا کہ ہر مسلمان اپنے رشتے دار اور عزیز قیدی کو خود اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔ اس حوالہ سے آپ رضی اللہ عنہ کی دلیل یہی تھی کہ اگر آج ان لوگوں کو چھوڑ دیا گیا تو کل وہ پھر ہمارے مقابلہ میں آ جائیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس خدشہ کی اس وقت تصدیق بھی ہو گئی جب فدیہ پر رہائی پانے والے قیدیوں میں سے اکثر و بیشتر اگلے سال غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کے خلاف پھر سے آ کھڑے ہوئے تھے۔ مفسرین کرام کے نزدیک سورۃ الانفال کی مذکورہ آیات حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے کی تائید میں نازل ہوئیں۔

علمی بات: یہ بھی اہل ایمان کی بہترین صفات میں سے ہے۔ وہ ظالموں اور جباروں کے لئے نرم چارہ نہیں ہوتے۔ ان کی نرم خوئی اور عفو و درگزر کی عادت کمزوری کی بنا پر نہیں ہوتی۔ ان کی شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ جب غالب ہوں تو مغلوب کے قصور معاف کر دیں، جب قادر ہوں تو بدلہ لینے سے درگزر کریں اور جب کسی زیر دست یا کمزور آدمی سے کوئی خطا سرزد ہو جائے تو اس سے چشم پوشی کر جائیں، لیکن کوئی طاقتور اپنی طاقت کے زعم میں ان پر دست درازی کرے تو ڈٹ کر کھڑے ہو جائیں اور اس کا منہ توڑ جواب دیں۔ مومن کبھی ظالم سے نہیں دبتا اور متکبر کے آگے نہیں جھکتا۔ اس قسم کے لوگوں کے لئے وہ سیسہ پلائی دیوار اور مضبوط چٹان بن جاتا ہے جس ٹکرانے والا خود پاش پاش ہو جاتا ہے۔ یا پھر وہ اپنی جان قربان کر دیتا ہے لیکن ظالم کے ساتھ سمجھوتا کسی صورت میں نہیں کرتا۔

علمی بات: دراصل اسلام نے ہر طرح کے حالات کا لحاظ کیا ہے اور مختلف مزاجوں کی رعایت کی ہے۔ کبھی حالات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ تشدد کا جواب تشدد سے دیا جائے تا کہ ظالم کا زور ٹوٹے اور بعض طبیعتیں بھی ہر وقت درگزر سے کام لینے کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ ایسے حالات میں اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ظلم کا مقابلہ کیا جائے، اس کو روکا جائے اور ظالم سے بدلہ لیا جائے۔ بعض اوقات حالات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ صبر و تحمل اور درگزر سے کام لیا جائے، ایسے حالات میں عفو و درگزر سے کام لینے کی ترغیب دی گئی ہے۔ پس اسلام نے جو تعلیم دی ہے وہ اعتدال پر مبنی ہے۔ اس نے بدلہ لینے کو مذموم نہیں ٹھہرایا ہے بلکہ اس کی اجازت دی ہے، ساتھ ہی صبر اور درگزر سے کام لینے کی بھی ترغیب دی اور اس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

آیت نمبر ۴۰: جس پر ظلم و زیادتی ہو اس کو اتنا ہی بدلہ لینے کی اجازت ہے۔ یعنی اگر کوئی برائی اور زیادتی کا بدلہ لینا ہی چاہے تو اتنا ہی بدلہ لے جتنی اس پر زیادتی ہوئی ہے۔ دعوت دین کے مرحلہ میں درگزر کا حکم ہے البتہ دین کے غلبہ کی جدوجہد کے دوران میں اور اس کے نفاذ کے لئے ظالموں کے خلاف اقدام کیا جائے

گا۔ البتہ جو مخالف کو معاف کر دے اور اصلاح کا راستہ اختیار کر لے تو اس کی صلح جوئی اور معاف کرنے کا اجر و ثواب اللہ ﷻ اپنی طرف سے اسے عطا فرمائے گا۔ لیکن اگر کوئی بدلہ لینے میں زیادتی کرے اور مظلوم ہونے کی بجائے خود ظالم بن جائے تو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ ﷻ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے جائز طریقہ سے بدلہ لینے کی اجازت دی ہے۔ بدلہ لینے کی جائز حد یہ ہے کہ جتنی زیادتی کسی کے ساتھ کی گئی ہو اتنا ہی وہ بدلہ لے، اس سے زیادہ زیادتی کرنے کا وہ حق نہیں رکھتا۔ کسی شخص کو ظلم کا انتقام لیتے لیتے خود ظالم نہیں بن جانا چاہیئے۔ ایک برائی کے بدلہ میں اس سے بڑھ کر برائی کرنا جائز نہیں ہے۔ مثلاً کسی نے اگر ایک شخص کا گلاس توڑ دیا ہے تو اس کے جواب میں اس شخص کا اس کے گھر کو آگ لگا دینا سراسر ظلم ہوگا۔ اسی طرح گناہ کا بدلہ گناہ کی صورت میں لینا بھی درست نہیں ہے۔ مثلاً کسی شخص کے بیٹے کو اگر کسی ظالم نے قتل کیا ہے تو اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ جا کر اس کے بیٹے کو قتل کر دے۔ یا کسی شخص کی بہن یا بیٹی کے ساتھ کسی کمینہ انسان نے عصمت دری کی تو اس کے لئے حلال اور جائز نہیں ہو جائے گا کہ وہ بدلہ میں اس کی بیٹی یا بہن کی عصمت دری جوابًا کرے۔

علمی بات: اس آیت میں بتایا گیا کہ "اور کسی برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے" جب کہ سورۃ حٰم السجدۃ ۴۱، آیت: ۳۴ میں یہ حکم ہوا: "بھلائی اور بُرائی برابر نہیں ہوتی تم (بدی کو) بہترین نیکی سے دفع کرو"۔ اب بظاہر تو ان دونوں احکام میں تضاد نظر آتا ہے لیکن قرآن حکیم کے ایسے مقامات کا مطالعہ اگر حضور ﷺ کی تحریک کے مختلف ادوار کے زمینی حقائق کی روشنی میں کیا جائے اور اس حوالہ سے مکی اور مدنی ادوار کے حالات کے فرق کو مدنظر رکھا جائے تو تمام اشکالات خود بخود دور ہو جاتے ہیں۔ مکہ میں رہتے ہوئے اگر کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ "اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو" (سورۃ النسآء ۴، آیت: ۷۷) کی حکمت عملی اپنانے کی ہدایت تھی تو یہ اس وقت کا تقاضا تھا اور اگر مدینہ میں آکر وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ "اور اُن (کافروں) کو قتل کرو جہاں کہیں بھی تم اُنہیں پاؤ" (سورۃ البقرۃ ۲، آیت: ۱۹۱) کا حکم جاری ہوا ہے تو یہ اس مرحلہ کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اپنے سیاق وسباق کے اعتبار سے آیت زیر مطالعہ کا مفہوم یہ ہے کہ جب دشمن کے ساتھ تمہارا دوبدو مقابلہ شروع ہو جائے تو جس قدر زیادتی تم پر مخالف فریق کرے اس قدر زیادتی ان پر تم بھی کر سکتے ہو۔ اگر وہ حرمت والے مہینوں کی حرمت کی پامالی کرتے ہیں تو تم بھی اس ماہ کے تقدس کے احترام میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر مت بیٹھے رہو۔ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ "پھر جو معاف کر دے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ (کے ذمّہ کرم) پر ہے" یہ معاف کرنا اگر اس اعتبار سے ہو کہ اس میں متعلقہ شخص کی اصلاح کا امکان ہو تو اسی میں بہتری ہے۔ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ "بے شک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔" ظالموں کے لئے البتہ کوئی معافی نہیں، ان سے تو بہر حال بدلہ ہی لیا جائے گا۔ اس حکمت عملی کے بارے میں سورۃ البقرۃ میں آیا ہے: وَلَكُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ یّٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ اور اے عقلمندو! تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے۔" (سورۃ البقرۃ ۲، آیت: ۱۷۹)

علمی بات: یہ پہلا اصولی قاعدہ ہے جسے بدلہ لینے میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ بدلہ کی جائز حد یہ ہے کہ جتنی برائی کسی کے ساتھ کی گئی ہو، اتنی ہی برائی وہ اس کے ساتھ کر لے، اس سے زیادہ برائی کرنے کا وہ حق نہیں رکھتا۔ دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ زیادتی کرنے والے سے بدلہ لے لینا اگرچہ جائز ہے، لیکن جہاں معاف کر دینا اصلاح کا موجب ہو سکتا ہو وہاں اصلاح کی خاطر بدلہ لینے کے بجائے معاف کر دینا زیادہ بہتر ہے۔ چونکہ یہ معافی انسان اپنے نفس پر جبر کر کے دیتا ہے، اس لئے اللہ ﷻ فرماتا ہے کہ اس کا اجر ہمارے ذمہ ہے، کیونکہ اس نے بگڑے ہوئے لوگوں کی اصلاح کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ پیا ہے۔

اس تنبیہ میں بدلہ لینے کے متعلق ایک تیسرے قاعدے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی شخص کو دوسرے کے ظلم کا انتقام لیتے لیتے خود ظالم نہیں بن جانا چاہیئے۔ ایک برائی کے بدلے میں اس سے بڑھ کر برائی کر گزرنا جائز نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی کو ایک تھپڑ مارے تو وہ اسے ایک تھپڑ مار سکتا ہے۔ لات گھونسوں کی اس پر بارش نہیں کر سکتا۔ اسی طرح گناہ کا بدلہ گناہ کی صورت میں لینا درست نہیں ہے۔ مثلاً کسی شخص کے بیٹے کو اگر کسی ظالم نے قتل کیا ہے تو اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ جا کر اس کے بیٹے کو قتل کر دے۔

علمی و عملی بات: اگرچہ زیادتی کرنے والے سے بدلہ لینا جائز ہے، لیکن جہاں معافی اور درگزر سے اصلاح کا راستہ نکلتا ہو، وہاں اصلاح کی خاطر معاف کر دینا زیادہ بہتر ہے۔ اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ بسا اوقات بدلہ لینے سے ظالم کا دماغ درست ہو جاتا ہے اور وہ لوگوں پر ظلم وزیادتی سے باز آجاتا ہے، ایسے حالات میں ظالم سے انتقام لینا ہی بہتر ہے۔ مگر بسا اوقات انتقامی کاروائی سے فتنہ بڑھتا ہے، شور و شر اور فساد وغیرہ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات

میں اگر عفوو درگزر سے بگڑے ہوئے حالات اصلاح پذیر ہو جاتے ہوں اور مشتعل جذبات ٹھنڈے پڑ جاتے ہوں، تو بدلہ لینے کی اجازت کے باوجود معاف کر دیناہی بہتر ہے۔ ایسی صورت میں معاف کرنے والے کو اپنے احساسات اور جذبات پر قابو پاناہو گا اور وقتی طور پر اسے تکلیف بھی ضرور ہو گی۔ لیکن اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کا اجر اللہ ﷻ ایسا عطا فرمائے گا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی اور دل مسرور ہو جائے گا۔

فرمان نبوی ﷺ: حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "تم مخلوق پر رحم کرو (اللہ کی طرف سے) تم پر رحم کیا جائے گا اور تم لوگوں کو معاف کرو اللہ تمہیں معاف کرے گا۔" (مسند احمد)

فرمان نبوی ﷺ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا، معاف کر دینے سے اللہ بندہ کی عزت میں اضافہ ہی فرماتا ہے، اور جو کوئی اللہ کی خاطر تواضع اختیار کرتا ہے اللہ اس کو رفعت عطا فرماتا ہے۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۴۱: ان لوگوں پر کوئی ملامت نہیں جن پر ظلم ہوا ہو اور وہ اس ظلم کا بدلہ لیں۔ یعنی مظلوم کو یہ اجازت ہے کہ وہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا بدلہ لے۔ لہٰذا اگر کوئی مظلوم ظالم سے برابری کا بدلہ لیتا ہے تو اس پر مظلوم کا مواخذہ نہیں ہو گا۔

علمی بات: اسلام کا یہ قانون ہے کہ ظالم سے بدلہ لینے کے لئے مظلوم جو کاروائی کرے گا اس پر کسی قسم کی ملامت نہ ہو گی بشرطیکہ وہ حد اعتدال کو پامال نہ کرے۔ مظلوم اپنے اوپر روا رکھے جانے والے مظالم کا بدلہ قانوناً اور شرعاً لے سکتا ہے، اس بابت اس پر کوئی الزام اور گناہ نہیں ہو گا۔ لیکن اس کا صحیح اور بہتر طریقہ کار یہ ہے کہ بدلہ لینے کے لئے قانون کا راستہ اختیار کیا جائے اور کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جو قانونی اور شرعی طور پر جائز نہ ہو۔ اسلام یہ نہیں سکھاتا کہ کوئی ظلم سہنے کے باوجود بدلہ نہ لے اور ظالم کے ہاتھوں یونہی پٹتا رہے اور اس کے خلاف آواز نہ اٹھائے۔ نہیں، اسلام ایسے نامعقول رویہ کی تعلیم کبھی نہیں دیتا، بلکہ اسلام مظلوم کو یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ ظالم کے خلاف آواز اٹھائے اور اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا بدلہ لے۔

علمی بات: اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ جو کوئی بدلہ لے اس کے بعد کہ اس پر ظلم کیا گیا ہو تو ان لوگوں پر کوئی الزام نہیں ہے۔ یہی اصول سورۃ النساء کی آیت ۱۴۸ میں بیان ہوا ہے: "اللہ ﷻ کو بالکل پسند نہیں کہ کوئی شخص کوئی بری بات بلند آواز سے کہے مگر مظلوم اس سے مستثنیٰ ہے۔" بدلہ لینا بہرحال مظلوم کا حق ہے۔ اگر وہ اپنے اوپر ہونے والی زیادتی کا بدلہ ہی لینا چاہتا ہے تو اسے معاف کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ان آیات کا اسلوب اور انداز سورۃ حٰمٓ السجدۃ کی مذکورہ آیات کے اسلوب سے کس قدر مختلف ہے۔ نبی کریم ﷺ کی جدوجہد میں مکی اور مدنی دوادوار کے الگ الگ مزاج تھے۔ پہلا مرحلہ تیاری کا مرحلہ تھا جبکہ دوسرا عملی جدوجہد کا۔ مکی دور میں "ہاتھ بندھے رکھنے" کا حکم دراصل ایک سوچی سمجھی حکمت عملی کا حصہ تھا۔ جس کے تحت جاں نثارانِ توحید کو صبر اور ثابت قدمی کی بھٹی میں سے گزارنا مقصود تھا تاکہ وہ حق و باطل کے کسی بڑے معرکہ اور مقابلہ میں اترنے سے پہلے وہ کندن بن جائیں، ان کی ہمت و حوصلہ اور ضبط و برداشت کے جذبات خوب پختہ ہو جائیں اور ان کے دست و بازو آزمائش و ابتلا کی سختیاں جھیلنے کے عادی ہو جائیں۔

مدنی دور میں جب "بندھے ہوئے ہاتھ" کھول دیے گئے تو حالات یکسر بدل گئے۔ چنانچہ میدان بدر میں جب حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کا سامنا اپنے سابق آقا امیہ بن خلف سے ہوا تو چشمِ فلک کوئی اور ہی منظر دیکھ رہی تھی۔ اب امیہ کی گردن کا مقدر نشانہ بننا تھا جبکہ "اقدام" کا اختیار حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی تلوار کے پاس تھا۔

فکری پہلو: بعض لوگ ضرورت سے زیادہ امن پسند ہوتے ہیں۔ مظلوم اگر ظالم کا دستِ ظلم کاٹنے کے لئے تلوار بے نیام کرتا ہے، تو شور مچانا شروع کر دیتے ہیں اور اس کو جوابی کاروائی پر ملامت کرنے لگتے ہیں۔ حقیقت میں ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے ظالم کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور وہ دل کھول کر لوگوں پر ظلم و ستم، زیادتی اور جور و جفا کے تیر چلاتا ہے۔ قرآن کا یہ فلسفہ نہیں ہے۔ بلکہ قرآن حکیم نے یہ بتایا ہے کہ ظالم سے انتقام لینے کے لئے مظلوم جو کاروائی کرے گا، بشرطیکہ وہ حد اعتدال سے تجاوز نہ کرے، اس پر کسی قسم کی ملامت نہ ہو گی۔

عملی پہلو: اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا بدلہ لینا شرعاً اور قانوناً جائز ہے۔ ہم میں سے کسی پر اگر کوئی ظلم ہوا ہو، تو اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کا بدلہ لے سکتا ہے۔ اس کے لئے بہتر ہے کہ وہ قانونی طریقہ اختیار کرے اور کوئی غلط راستہ اختیار نہ کرے۔ جب وہ قانونی اور شرعی طریقہ سے اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا بدلہ لے، تو باقی لوگوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس کو ملامت کریں۔

آیت نمبر ۴۲: بے شک ملامت تو ان لوگوں پر ہے جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق فساد مچاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا بدلہ دردناک عذاب ہے۔

علمی بات: پچھلی آیت میں زیادتی کا بدلہ لینے کا ایک اصول بیان ہوا تھا کہ جس شخص پر جتنا ظلم ہوا ہے، اس کو اتنا بدلہ لینے کی اجازت ہے۔ اگر وہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے برابر ظالم سے بدلہ لیتا ہے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ اس آیت میں اس کی مزید وضاحت کی گئی ہے کہ دراصل مواخذہ اور الزام تو ان پر ہوتا ہے جو ظلم وزیادتی کی ابتدا کرکے لوگوں کی جان ومال اور عزت وآبرو پر دست درازی کرتے ہیں اور زمین میں ناحق فتنہ وفساد پھیلاتے ہیں۔ وہ لوگ اگر اپنے کیئے پر نادم نہیں ہوں گے اور اللہ ﷻ کے حضور تائب نہیں ہوں گے تو دنیاوی مواخذہ کے بعد آخرت میں بھی دردناک عذاب سے دوچار ہوں گے۔ لہٰذا اللہ ﷻ کی نظر میں قابل مذمت وہ لوگ ہیں جو ظلم کرتے ہیں اور فساد مچاتے ہیں۔ وہ لوگ قابل مذمت نہیں ہیں جو اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے برابر بدلہ لیتے ہیں۔

علمی بات: عدل وانصاف کی راہ میں اصل رکاوٹ تو وہ لوگ ہیں جو زمین میں سرکشی دکھاتے ہیں جو اللہ ﷻ کی حاکمیت کو تسلیم کرنے کے بجائے خود حاکم بن بیٹھتے ہیں اور عوام الناس کے حقوق پر ڈاکے ڈالتے ہیں، لوٹ مار کا بازار گرم کیئے رکھتے ہیں۔ اللہ ﷻ کے ہاں انسانی معاشرے میں عدل وانصاف کی اہمیت کا اندازہ ان تاکیدی احکام سے لگایا جاسکتا ہے جو پورے قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ سورۃ آل عمران کی آیت ۱۸، سورۃ النساء کی آیت ۱۳۵، سورۃ المائدۃ کی آیت ۸ اور زیر مطالعہ سورت کی آیت ۱۵ میں مختلف انداز اور اسلوب کے ساتھ عدل وانصاف قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

آیت نمبر ۴۳: جو زیادتی پر صبر کرکے ظالم کو معاف کردے تو یہ اس کے لئے باعث اجر وثواب ہے۔ بلاشبہ یہ بہت ہی ہمت اور حوصلہ کے کاموں میں سے ہے۔

علمی بات: ظلم وزیادتی کا بدلہ وانتقام بقدر ضرورت اگرچہ جائز ہے اور ہر کسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے اوپر کیئے جانے والے ظلم کا بدلہ لے، لیکن اللہ ﷻ کے نزدیک بہتر اور محبوب طریقہ وعمل یہی ہے کہ صبر وبرداشت اور عفو ودرگزر ہی سے کام لیا جائے۔ کسی شخص کی زیادتی پر صبر کرنا، درگزر سے کام لینا اور اپنے دشمن کو معاف کردینا، بہت بڑی اخلاقی فضیلت ہے۔ یہ وہ صفت ہے جو انسان کے کردار کو مضبوط بناتی اور اس کے حوصلوں کو بلند کرتی ہے۔ یہ عزم وہمت کا کام ہے جو انسان کو عظمت عطا کرتا ہے۔

علمی و عملی بات: اس آیت کریمہ میں حاصل بحث کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اصحاب ایمان کو حق وباطل کی کشمکش میں اپنی ذات کی نفی کرنا پڑتی ہے اور پیش نظر صرف اعلائے کلمۃ الحق (اللہ ﷻ کے حکم کی سربلندی) کے مفادات کو رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مسلمان مخالفین کی نگاہوں میں کوڑا کرکٹ کا ڈھیر بن کر رہ جائیں اور ہر متکبر آدمی ان کو کمزوری اور مجبور وبے بس سمجھتے ہوئے ان کو ذلت ورسوائی میں دھکیلنا شروع کردے۔ اس لئے ان کو یہ اجازت بھی دی گئی ہے کہ عزت نفس اور اعلائے کلمۃ الحق کے تقاضوں میں توازن قائم رکھتے ہوئے انتقام لیا جاسکتا ہے اور یہ دینداری کے خلاف نہیں بلکہ دینداری ہی کا تقاضا ہے۔ البتہ اس انتقام کو اس طرح طبیعتوں پر غالب نہیں آنا چاہیئے کہ اصحاب ایمان اس اجازت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دینی تقاضوں کے توازن کو کھو بیٹھیں۔ اصل صفت جو ایک مومن کی پہچان ہے وہ صبر اور درگزر ہی ہے۔ کیونکہ یہی وہ صفات ہیں جن سے نامساعد حالات میں بھی کھڑا رہنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ زور ان ہی دونوں صفات کے حصول پر ہونا چاہیئے۔ ان کے بغیر حق وباطل کی کشمکش میں اللہ ﷻ کی رضا کا حصول آسان نہیں اور وہ استقامت جو اللہ ﷻ کی تائید ونصرت کو دعوت دیتی ہے وہ کبھی نصیب نہیں ہوتی۔ یہ بہرحال ایک عزیمت کا کام ہے جو عزیمت والے لوگ ہی انجام دے سکتے ہیں۔ یہی ایک مومن کا ہدف ہونا چاہیئے۔

علمی بات: کفار مکہ نے نبی کریم ﷺ کو ساحر اور مجنون کہا (معاذ اللہ)، آپ ﷺ کا معاشرتی بائیکاٹ کیا، آپ ﷺ کو شہید کرنے کی سازش کی، آپ ﷺ کو مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا اور آپ ﷺ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کرکے ان کا کلیجہ چبایا، لیکن آپ ﷺ نے ان سارے مراحل میں صبر وتحمل سے کام لیا اور جب آٹھ سال بعد آپ ﷺ نے مکہ کو فتح کرلیا تو حرم کعبہ میں ان سخت ترین دشمنوں سے خطاب فرمایا: اے گروہ قریش! تمہارا کیا خیال ہے، میں تم سے کیسا سلوک کرنے والا ہوں؟ انہوں نے عرض کیا: آپ ﷺ کریم نبی ہیں، کریم بھائی ہیں اور کریم بھائی کے بیٹے ہیں، ہم آپ ﷺ سے خیر کی امید رکھتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”میں آج تمہیں وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف (علیہ السلام) نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی، آج میری

طرف سے تم پر کوئی گرفت نہیں، جاؤ، میری طرف سے تم آزاد ہو۔" صبر و تحمل اور عفو و درگزر کا جو مثالی مظاہرہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، انسانی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ آپ ﷺ کی شانِ کریمی دیکھ کر اہلِ مکہ جوق در جوق آگے بڑھے اور نبی کریم ﷺ کے دستِ مبارک پر اسلام قبول کرنے لگے۔

عملی پہلو: واضح رہے کہ ان آیات میں اہلِ ایمان کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ اس وقت عملاً رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں موجود تھیں اور کفارِ مکہ اپنی آنکھوں سے ان کو دیکھ رہے تھے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے دراصل کفار کو بالخصوص اور دیگر نافرمانوں اور سرکشوں اور دنیادار طبقہ کو یہ بتایا ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی بسر کرنے کا جو سر و سامان پا کر تم آپے سے باہر ہوئے جاتے ہو، اصل دولت وہ نہیں ہے بلکہ اصل دولت یہ اخلاق اور اوصاف ہیں جو قرآن کریم کی رہنمائی قبول کر کے تمہارے ہی معاشرہ کے ان مومنوں نے اپنے اندر پیدا کیے ہیں۔

آیت نمبر ۴۴: جو اللہ تعالیٰ کے احکامات سے بغاوت کرتے ہوئے ظلم و زیادتی میں حد سے بڑھ جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ بطور سزا انہیں ہدایت سے محروم کر دیتا ہے اور جسے اللہ تعالیٰ ہدایت سے محروم کر دے تو اللہ تعالیٰ کے بعد اس کا کوئی کارساز اور مددگار نہیں۔ روزِ قیامت ظالم لوگ عذاب کو دیکھ کر حسرت سے کہیں گے کہ دنیا میں واپس جانے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟ تاکہ ہم دنیا میں واپس جا کر نیک اعمال کر سکیں۔ لیکن اس دن انہیں حسرت اور افسوس کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

علمی بات: ہدایت و گمراہی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ایک دستور ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے اسے کوئی راہِ راست پر نہیں لا سکتا۔ رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کس کو گمراہ کرتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے گمراہی کے گڑھے میں اسی کو پھینکا جاتا ہے جو اپنے اوپر ہدایت کے راستے اور اس کے دروازے خود بند کر دے، ورنہ اللہ تعالیٰ تو اپنے کسی بندہ پر ذرہ برابر بھی کوئی ظلم نہیں کرتا۔ اس کے متعلق قرآن کریم میں بارہا واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ جو لوگ مسلسل نافرمانی اور سرکشی سے اپنی صلاحیتوں کو برباد کر دیتے ہیں۔ دعوتِ حق سننے اور نورِ حق دیکھنے سے اپنے کان اور آنکھیں بند کر دیتے ہیں۔ ان لوگوں کو گمراہ کر دیا جاتا ہے، کیونکہ گمراہی کے بغیر وہ اور کسی چیز کے طلب گار ہی نہیں اور جس دل میں ہدایت کی خواہش ہی نہ ہو بلکہ دعوتِ حق کو حقارت سے مسترد کرنا ہی اس کا معمول بن چکا ہو تو قدرت زبردستی اس کو ہدایت قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتی۔

فکری پہلو: جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی قدر نہیں کرتے، بلکہ وہ راہِ حق و ہدایت سے منہ موڑ کر اور آنکھیں بند کر کے اپنی خواہشات کے پیچھے ہی چلتے رہتے ہیں، ایسے ظالم اور قسمت سے محروم لوگ آج تو اپنی اس روش پر بہت نازاں اور بڑے خوش ہیں، لیکن قیامت کے دن جب یہ عذاب کو دیکھیں گے اور اپنے کیے کرائے کے انجام سے دوچار ہوں گے تو اس وقت یہ بڑی حسرت کے ساتھ کہیں گے کہ کیا اب دنیا کی طرف پلٹنے کا کوئی راستہ ہے؟ کسی طریقہ سے ممکن ہے؟ تاکہ وہاں جا کر کمائی کریں اور اس عذاب سے چھوٹنے کا سامان کر سکیں۔ مگر اس وقت اس کا موقع کہاں اور کیونکر؟ اس کا موقع تو انہوں نے خود دنیا میں ضائع کر دیا ہوگا۔ جس کے نتیجہ میں وہ روزِ قیامت اپنے آخری اور ہولناک انجام کو پہنچ کر رہے ہیں۔ (والعیاذ باللہ العظیم)۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اور ہر طرح سے اپنی امان و پناہ میں رکھے اور عذاب سے بچائے۔ آمین۔

آیت نمبر ۴۵: جب ظالمین دوزخ کے سامنے لائے جائیں گے تو ذلت کے مارے سر جھکائے اور نظریں نیچے کیے ہوئے ہوں گے اور چھپی نگاہوں سے آگ کو دیکھ رہے ہوں گے۔ اہلِ ایمان انہیں ملامت کریں گے اور کہیں گے کہ اصل خسارہ میں تو وہ رہے جنھوں نے خود کو اور اپنے اہل و عیال کو آخرت کی تیاری سے غافل رکھا اور آج کے خسارہ سے دوچار ہوئے۔ بلاشبہ ظالم لوگ دائمی عذاب میں مبتلا رہیں گے۔

علمی بات: اس آیت میں قیامت کے دن ظالموں کی ذلت و رسوائی کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ جب ظالم لوگ جہنم کے سامنے لائے جائیں گے اور آگ کے روبرو پیش کیے جائیں گے تو ان کی حالت یہ ہوگی کہ مارے ذلت کے جھکے ہوئے ہوں گے اور آدھ کھلی آنکھوں سے چپکے چپکے، خفیہ خفیہ انداز سے آگ کو دیکھ رہے ہوں گے۔ انسان کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی ہولناک منظر اس کے سامنے ہوتا ہے اور وہ جان رہا ہوتا ہے کہ عنقریب وہ اس بلا کے چنگل میں آنے والا ہے جو سامنے نظر آ رہی ہے، تو پہلے تو ڈر کے مارے وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ پھر اس سے رہا نہیں جاتا۔ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ بلا کیسی ہے اور ابھی اس سے کتنی دور ہے۔ لیکن اس کی بھی ہمت نہیں پڑتی کہ سر اٹھا کر نگاہ بھر کر اسے دیکھے۔ اس لئے بار بار ذرا سی آنکھیں کھول کر یا آدھ کھلی آنکھ سے دیکھتا ہے اور پھر ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ قیامت کے دن کچھ ایسی ہی کیفیت ان ظالموں کی ہوگی جن کو جہنم رسید کرنے کا فیصلہ سنا دیا جائے گا۔ ذلت اور

شرم کی وجہ سے ان کے سر جھکے ہوئے ہوں گے اور وہ خوفزدہ ہو کر چوری چوری کی آنکھوں سے جہنم کی طرف دیکھ رہے ہوں گے کہ انہیں کب اور کس طرح جہنم میں پھینکا جائے گا۔

علمی بات: ظالموں کے انجام بد کو دیکھ کر ایمان والے پکار اٹھیں گے کہ بے شک حقیقی نامراد اور خسارے والے یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال اور متعلقین کو قیامت کے دن کے اس خسارے میں مبتلا کیا۔ دنیا میں تو کافر ہمیں بے وقوف اور دنیوی خسارے کا حامل سمجھتے تھے جبکہ ہم دنیا میں صرف آخرت کو ترجیح دیتے تھے اور دنیا کے خساروں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ آج دیکھ لو حقیقی خسارہ سے کون دوچار ہے؟ وہ جنہوں نے دنیا کی عارضی خسارے کو نظر انداز کیئے رکھا اور آج وہ جنت کے مزوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، یا وہ جنہوں نے دنیا کو ہی سب کچھ سمجھ رکھا تھا اور نہ صرف خود ہی گمراہ ہوئے بلکہ اپنے ساتھ اپنے متعلقین اور گھر والوں کو بھی لے ڈوبے، آج ایسے عذاب میں گرفتار ہیں جس سے اب چھٹکارا ممکن ہی نہیں۔ پس اس دن معلوم ہو جائے گا کہ اصل خسارہ آخرت ہی کا خسارہ ہے اور وہ خسارہ ایسا خسارہ ہوگا کہ اس کے تدارک وتلافی کی پھر کوئی صورت ممکن نہ ہوگی۔

عملی پہلو: دنیا کے دار الامتحان میں تو ظالم لوگ حق بات سننے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے، لیکن قیامت کے دن معلوم ہو جائے گا کہ اصل خسارہ میں یہی لوگ ہیں۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ہم ہر طرح کے ظلم وستم، نافرمانی اور سرکشی سے اپنے آپ کو بچائیں تاکہ آخرت کے حقیقی خسارہ سے بچ سکیں۔ اللہ ﷻ ہم سب کو آخرت کی ذلت ورسوائی اور خسارہ سے اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ آمین۔

آیت نمبر ۴۶: روز آخرت ظالموں کا کوئی حمایتی نہیں ہوگا جو اللہ ﷻ کے مقابلہ میں ان کی مدد کر کے انہیں عذاب سے چھڑا سکے اور جس کی اللہ ﷻ رہنمائی نہ فرمائے اس کی نجات کے لئے کوئی راستہ نہیں۔ یعنی جسے اللہ ﷻ کی تائید حاصل نہ ہو اسے نہ دنیا میں ہدایت حاصل ہوتی ہے اور نہ آخرت میں اسے نجات ملے گی۔

علمی بات: قیامت کے دن ظالموں کے لئے کوئی حمایتی اور کارساز نہیں ہوگا جو اللہ ﷻ کے مقابلہ میں ان کی مدد کر سکے۔ دنیا میں یہ لوگ ظلم وسرکشی کرتے ہیں اور اللہ ﷻ کی نافرمانیاں کرتے ہیں، قیامت کے دن ان کو سزا ضرور ملے گی۔ وہاں ان ظالموں کو اللہ ﷻ کے عذاب سے کوئی بچا نہ سکے گا۔ دنیا میں یہ ظالم لوگ کئی قسم کے جھوٹے سہارے بنائے رکھتے ہیں جن کی مدد سے وہ لوگوں پر ظلم اور سرکشی کرتے ہیں، لیکن قیامت کے دن یہ سارے سہارے بے کار ثابت ہوں گے اور کوئی بھی ان کی مدد کرنے کے لئے نہیں آئے گا۔ اسی طرح مشرک لوگ دنیا میں خود ساختہ معبود بنا لیتے ہیں۔ لکڑی اور پتھر کے بت تراش لیتے ہیں جنہیں اپنا خدا اور مددگار سمجھتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اللہ ﷻ کے مقابلہ میں ان لوگوں کے کسی کام نہ آسکے گا۔ اس دن معاملہ سب کا سب اللہ ﷻ کے قبضہ قدرت اور اختیار میں ہوگا۔

نوٹ: حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کو اس کے کرتوتوں کے باعث اللہ ﷻ بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے تو اس کے لئے پھر اپنے اعمال کی پاداش سے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایسے لوگ قیامت کے دن اپنے اعمال کی پاداش میں پکڑے جائیں گے اور پھر اس سے بچ نکلنے کی ان کے پاس کوئی راہ نہیں ہوگی۔

عملی پہلو: دنیا وآخرت میں ہدایت اور نجات اللہ ﷻ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ جسے اللہ ﷻ ہدایت اور نجات دیتا ہے صرف اسے ہی دنیا میں ہدایت اور آخرت میں نجات ملے گی۔ مگر جو ظلم وسرکشی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اللہ ﷻ اسے دنیا میں گمراہ کر دیتا ہے اور آخرت میں سخت عذاب دے گا جس سے کوئی اسے بچا نہ سکے گا۔ لہٰذا عقلمند وہی ہے جو دنیا میں اللہ ﷻ کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط بنائے، اس کی فرماں برداری کرے اور ہر قسم کے ظلم وسرکشی سے بچے۔ جس کے نتیجہ میں اسے اللہ ﷻ کی طرف سے دنیا میں ہدایت نصیب ہوگی اور آخرت میں نجات ملے گی۔

آیت نمبر ۴۷: اللہ ﷻ کی طرف سے دعوت دی گئی ہے کہ اپنے رب کی پکار پر لبیک کہو اور اس کا حکم مان لو۔ زیر مطالعہ سورت کی آیت نمبر ۱۳ میں اقامت دین کا حکم آیا ہے۔ اس تقاضا پر عمل بھی لازم ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ دن آجائے جس کا ٹلنا ناممکن ہے۔ مراد انسان کی موت کا دن بھی ہو سکتا ہے اور قیامت کا دن بھی۔ گویا انسان کو چاہیئے کہ قیامت یا اپنی موت سے پہلے پہلے اللہ ﷻ کی اطاعت وبندگی اختیار کر لے۔ اس دن اللہ ﷻ کے مقابلہ میں انسان کے لئے کوئی پناہ گاہ نہیں ہوگی اور نہ ہی اس کا کوئی عذر قابل قبول ہوگا۔ اس دن انسان کے لئے گناہوں سے انکار کی کوئی گنجائش ہوگی۔

علمی بات: اللہ ﷻ نے سخت ڈانٹ ڈپٹ کے انداز میں لوگوں کو دعوت حق دی ہے۔ اللہ ﷻ نے فرمایا ہے کہ اے لوگو! تم اپنے رب کا حکم مان لو، اس کی اطاعت اختیار کرلو، قبل اس سے کہ وہ ہولناک دن آجائے جس کے ٹلنے کی پھر کوئی صورت ممکن نہیں ہوگی۔ پس اس فرصت حیات کو تم لوگ غنیمت جانو جو آج تمہیں میسر ہے کہ یہ لحظہ بہ لحظہ ہاتھ سے نکلی جارہی ہے۔ جب ہاتھ سے نکل گئی تو پھر اس کے واپس آنے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ لہٰذا جو ایمان سے محروم ہے وہ ایمان لاکر اور جو عمل صالح اور تقویٰ سے محروم ہے وہ عمل صالح اور تقویٰ کو اپنا کر اس ہولناک دن کی تیاری میں لگ جائے۔ زندگی کی محدود اور مختصر فرصت کو غنیمت سمجھے۔ بہر کیف اس ہولناک دن کے آنے کے بعد نہ کسی کے لئے کوئی پناہ ممکن ہوگی اور نہ ہی کسی کے لئے کسی طرح کے انکار کی کوئی گنجائش ہوگی۔

علمی بات: اس آیت میں بھی اسی پکار پر لبیک کرنے کا حکم دیا جارہا ہے جس کا حکم اس سورت کی آیت:۳۸ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ "اور جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں" میں دیا گیا تھا۔ البتہ وہاں یہ ذکر عزیمت کی راہ چلنے والے لوگوں کی مدح کے طور پر آیا تھا، لیکن یہاں اس کے لئے ترغیب و تشویق کا انداز ہے کہ اے لوگو! اب جبکہ تم نے یہ تمام احکام پڑھ لیئے ہیں، غلبہ دین کے حوالہ سے تم نے اپنے فرائض کو سمجھ لیا ہے، اس ضمن میں اپنے رب کی مرضی و منشا بھی تمہیں معلوم ہوچکی ہے، تو اب آگے بڑھو! اور اپنے رب کی پکار پر فوراً لبیک کہو! دراصل تم میں سے ہر کسی نے اپنی اپنی زندگی کے لئے بڑے بڑے منصوبے بنا رکھے ہیں۔ چنانچہ اگر کسی کو اپنے اس "فرض" کی ادائیگی کا احساس ہو بھی جاتا ہے تو بھی اس کا دل انہی منصوبوں میں اٹکا رہتا ہے کہ بس میں یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچالوں، اس ذمہ داری سے سبکدوش ہولوں وہ فرض نبھالوں، تو خود کو دین کے لئے وقف کردوں گا۔ مگر تم خوب جانتے ہو کہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں، یہ کسی وقت بھی آسکتی ہے۔ الہٰذا اس سے پہلے کہ موت تمہارے سامنے آن کھڑی ہو، تم اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ "دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو" (سورۃ الشوریٰ ۴۲، آیت: ۱۳) کے حکم پر کان دھرو! اور اپنے رب کی اس پکار پر لبیک کہتے ہوئے دوسروں کے قدم سے قدم ملاکر آگے بڑھو! اور اپنی مدت مہلت ختم ہونے سے پہلے پہلے کرنے کا یہ اصل کام کرلو! ایسا نہ وہ دن آجائے اور پھر تم بالکل بے بس اور مجبور کھڑے رہ جاؤ اور سوائے حسرت اور افسوس کرنے کے تمہارے پاس کچھ نہ ہو اور نہ ہی اپنی حالت کو تبدیل کرنا تمہارے بس میں ہوگا۔

علمی بات: آیت کے اس آخری فقرہ "اور نہ تمہارے لئے انکار کی کوئی صورت ہوگی" کے متعدد مطالب بیان کیئے گئے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ نکیر کا معنٰی انکار کرنا ہے، یعنی قیامت کے روز جب ان کا دفتر عمل کھول کر ان کے سامنے رکھا جائے گا، تو انہیں یہ طاقت نہ ہوگی کہ اس کے مندرجات کا انکار کرسکیں۔ بعض نے نکیر کا معنٰی ناصر اور مددگار کیا ہے، یعنی قیامت کے دن ان کا کوئی ایسا مددگار نہ ہوگا جو انہیں عذاب الٰہی سے چھڑا سکے۔ بعض نے نکیر بمعنٰی منکر یعنی بدل دینے والا تبدیل کردینے والا لکھا ہے۔ یعنی کوئی ایسا آدمی انہیں نہیں ملے گا جو اس عذاب میں ردوبدل کرسکے۔

عملی پہلو: مخالفین کو تنبیہ کرتے ہوئے ایک آخری موقع دیا جارہا ہے کہ آخری نبی ﷺ کی دعوت کو قبول کرلو۔ ابھی تمہاری توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ اس دعوت کو قبول کرکے اپنی عاقبت سنوارو، ورنہ جب قیامت کا دن آجائے گا جو ظاہر ہے کہ اللہ ﷻ کے حکم سے آئے گا اس وقت تمہارا اللہ ﷻ کی دعوت کو قبول کرنا یا نہ کرنا دونوں یکساں ہوگا۔ تم اس دن کوئی جائے پناہ تلاش نہیں کرسکو گے اور تم مدد کے لئے چیخو گے مگر کوئی تمہارا مددگار نہیں ہوگا اور نہ اس روز تم کسی چیز کو روک سکو گے، جو کچھ تمہارے سامنے آئے گا اسے لازماً قبول کرنا ہوگا۔ تمہاری اس طرح کی کیفیت ہوگی جس میں کامل سپردگی کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہوگا۔

آیت نمبر ۴۸: اللہ ﷻ نے اپنے رسول ﷺ کو تسلی دی ہے کہ آپ ﷺ کی تبلیغ کے باوجود اگر کفار ایمان نہیں لاتے، تو آپ ﷺ غمگین نہ ہوں۔ آپ ﷺ ان کے ایمان لانے کے ذمہ دار نہیں ہیں، اسلام کا پیغام پہنچانا آپ ﷺ کی ذمہ داری تھی وہ آپ ﷺ نے بھرپور طریقہ سے پوری فرما دی۔ اس کے بعد فرمایا کہ نافرمان لوگوں کی عجیب روش ہے کہ اللہ ﷻ کی عنایات پر اتراتے ہیں اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ جب ان کے جرائم کی انہیں سزا دی جاتی ہے تو ناشکری کرنے لگتے ہیں اور ان نعمتوں کو بھول جاتے ہیں جو انہیں پہلے عطا کی گئی تھیں۔ یہاں بالخصوص قریش مکہ کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن ایک دنیادار انسان کی روش بھی یہی ہوتی ہے جو کسی حال میں اپنے رب کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ بلاشبہ انسان اپنے رب کی بہت ناشکری کرتا ہے۔

علمی بات: حضور اکرم ﷺ کی ذمہ داری اللہ ﷻ کا پیغام امت تک پہنچانا تھا۔ آپ ﷺ نے یہ ذمہ داری بڑے احسن طریقہ سے ادا فرمادی۔ آپ ﷺ کی دعوت و تبلیغ کے نتیجہ میں بہت سارے لوگ مسلمان ہو گئے، لیکن کئی کفار مکہ مسلمان نہ ہوئے۔ اس پر آپ ﷺ کو بہت رنج تھا کہ یہ کفار مسلمان نہیں ہو رہے۔ لہٰذا اللہ ﷻ نے اپنے محبوب ﷺ کو اس آیت میں تسلی دی کہ یہ کفار آپ ﷺ کی اتنی مخلصانہ کوششوں کے باوجود حق کو قبول نہیں کرتے بلکہ روگردانی کیئے ہوئے ہیں، تو آپ ﷺ دل گیر اور رنجیدہ ہرگز نہ ہوں۔ ان کی گمراہی اور تباہی کے بارے میں آپ ﷺ سے قطعاً کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ آپ ﷺ کا فرض پیغام حق کا پہنچانا تھا۔ آپ ﷺ نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔ اب بھی اگر وہ باطل پر اڑے ہوئے ہیں تو یہ ان کی اپنی بد بختی ہے اور اس کی سزا وہ خود بھگتیں گے۔

علمی بات: کافر، نافرمان اور کم ظرف انسان کی یہ روش ہوتی ہے کہ جب اللہ ﷻ اس پر اپنی رحمت سے کوئی انعام فرماتا ہے تو وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور تکبر کرنے لگتا ہے اور جب اس پر اس کے اپنے ہی کرتوتوں کی وجہ سے کوئی مصیبت آتی ہے تو ساری نعمتوں کو بھول کر ناشکری پر اتراتا ہے اور شکوے شکایت کرتا ہے کہ میں تو ہمیشہ سے ایسی ہی خستہ حال زندگی بسر کر رہا ہوں۔ میں نے تو عمر بھر کبھی خوشی دیکھی ہی نہیں۔ مسرت و شادمانی کے گزرے ہوئے سارے دن اسے بھول جاتے ہیں۔ اللہ ﷻ کی گزشتہ تمام مہربانیوں کا انکار کر دیتا ہے۔ بلکہ اس وقت بھی جب اپنے آپ کو مصائب میں گھرا ہوا پا رہا ہے اس وقت بھی اللہ ﷻ کی بے شمار ایسی نعمتیں ہیں جن سے وہ لطف اندوز ہو رہا ہوتا ہے، ان کا بھی اعتراف نہیں کرتا۔ منہ بسورے ہوئے اپنے رب سے روٹھا روٹھا پھرتا ہے اور آئندہ کے لئے بھی مایوس و ناامید ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے برعکس اس دنیا میں صحیح انسان وہ ہے جو ہر حال میں اس کا مناسب ردعمل ظاہر کرے یعنی کوئی اگر مسرت و شادمانی حاصل ہو تو منعم حقیقی کا شکر بجالائے اور اگر کوئی مصیبت نازل ہو تو صبر وضبط سے کام لے۔

فرمان نبوی ﷺ: حضرت صہیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مومن کا معاملہ بڑا باعث تعجب ہے، کیونکہ اس کا ہر معاملہ ہی اس کے لئے باعث خیر ہے اور یہ فضیلت سوائے مومن کے اور کسی کو حاصل نہیں۔ (وہ اس طرح کہ) اگر اسے کوئی خوشی ملتی ہے تو وہ (اللہ ﷻ کا) شکر ادا کرتا ہے اور یہ اس کے لئے باعث خیر ہے، اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے، اس میں بھی اس کے لئے خیر ہی خیر ہے۔" (صحیح مسلم)

آیت نمبر ۴۹: آسمان اور زمین کا بادشاہ حقیقی صرف اللہ ﷻ ہے، اس کی بادشاہت میں کسی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ وہ جیسے چاہتا ہے تصرف فرماتا ہے اور جو چاہتا ہے تخلیق فرماتا ہے۔ کسی کو اولاد کے طور پر صرف بیٹیاں عطا کرتا ہے اور کسی کو صرف بیٹے عطا کرتا ہے۔

بعض اہل علم نے کہا ہے کہ یہ آیت یخلق مایشاء "وہ (اللہ) جو چاہتا ہے تخلیق فرماتا ہے" کا بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بعض لوگوں کو اللہ ﷻ لڑکیاں عطا فرماتا ہے، ان کا کوئی لڑکا نہیں ہوتا اور بعض کو لڑکے عطا فرماتا ہے، ان کی کوئی لڑکی نہیں ہوتی۔ اس آیت میں یَهَبُ لِمَن یَّشَآءُ اِنَاثًا کے الفاظ میں لڑکی عطا کرنے کا ذکر چونکہ پہلے ہے، اس سے بعض علماء نے یہ نکتہ بھی اخذ کیا ہے کہ عورت کی یہ برکت ہے کہ سب سے اول اس کی لڑکی پیدا ہو۔ اللہ رب العزت جو کچھ پیدا فرماتا ہے اس کو جانتا ہے۔ وہ جس چیز کو چاہتا ہے اس پر قدرت بھی رکھتا ہے پس وہ ہر کام اپنی مصلحت و اختیار کے ماتحت کرتا ہے۔

علمی بات: اللہ ﷻ کی اس قدرتِ تخلیق میں کسی کے لئے حیل و حجت اور دخل اندازی کرنے کی گنجائش نہیں۔ وہ اگر اولاد نہ دینا چاہے تو کوئی زبردستی نہ خود اپنے گھر میں اولاد پیدا کر سکتا ہے اور نہ دوسروں کو دے سکتا ہے۔ اگر اللہ ﷻ کسی کو بیٹیاں دینا چاہے تو کوئی اپنی خواہش سے بیٹے پیدا نہیں کر سکتا اور اگر بیٹے دینا چاہے تو کوئی شخص اپنے لئے یا دوسروں کے لئے بیٹیوں کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ وہی جانتا ہے کس شخص کو کیا ملنا چاہیئے؟ وہی ہر طرح کی قدرت کا مالک بھی ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ تو پھر جو منکرین اللہ ﷻ کی الوہیت کو تسلیم کرنے سے گریز کرتے ہیں اور اس کی حاکمیت میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں تو اس سے حقیقت تو تبدیل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اے حبیب ﷺ! آپ ان کے انکار سے غمگین نہ ہوں اور نہ ہی ان کے لئے دل میں کوئی ملال محسوس کریں۔ یہ اس طریقہ سے اپنی عاقبت کو نقصان پہنچا سکتے ہیں آپ ﷺ کا کوئی نقصان نہیں کر سکتے۔

علمی و فکری بات: حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے بیٹیاں حسنات ہیں اور بیٹے نعمت ہیں اور ثواب حسنات کی وجہ سے ہوتا ہے نہ نعمت کی وجہ سے بلکہ نعمت کا تو سوال کیا جائے گا اور دوسری روایت میں ہے کہ بیٹیاں آزمائش ہیں اور بیٹے نعمت ہیں اور اللہ ﷻ بہشت بسبب آزمائش کے دیتا ہے نہ بسبب نعمت کے۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ بیٹیوں کو اپنے لئے رحمت سمجھیں اور ان کی اچھی تعلیم و تربیت کا اہتمام کریں تاکہ اللہ ﷻ اپنا فضل اور رحمت ہم پر قائم رکھے۔

علمی بات: دین اسلام کی اساس اس تصور پر قائم ہے کہ اس کائنات میں ہر قسم کا اختیار صرف اللہ ﷻ کو حاصل ہے۔ اس کے سوا کسی کے پاس کوئی اختیار نہیں، خواہ وہ زمین و آسمان کے نظام کو چلانا ہو یا ایک انسان کو اولاد عطا کرنا۔ آدمی جو کچھ پاتا ہے اللہ ﷻ کے دیئے سے پاتا ہے اور وہی جب چاہتا ہے اس کو اس سے چھین لیتا ہے۔ اللہ ﷻ کے بارے میں یہ عقیدہ ہی آدمی کے اندر وہ صحیح احساس پیدا کرتا ہے جس کو "عبدیت" کہا جاتا ہے۔ اللہ ﷻ کے بارے میں یہ عقیدہ ہی آدمی کو آمادہ کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اس روش کو اپنائے جس کا شریعت میں حکم دیا گیا ہے۔

علمی بات: کفر و شرک کی حماقت میں جو لوگ مبتلا ہیں وہ اگر سمجھانے سے نہیں مانتے تو نہ مانیں، حقیقت اپنی جگہ حقیقت ہے۔ زمین و آسمان کی بادشاہی دنیا کے نام نہاد بادشاہوں اور جباروں اور سرداروں کے حوالہ نہیں کر دی گئی ہے، اس کا مالک اکیلا اللہ ﷻ ہے۔ اس سے بغاوت کرنے والا نہ اپنے بل بوتے پر جیت سکتا ہے، نہ ان ہستیوں میں سے کوئی آکر اسے بچا سکتی ہے جنہیں لوگوں نے اپنی حماقت سے خدائی اختیارات کا مالک سمجھ رکھا ہے۔ پس حقیقت یہی ہے کہ آسمان و زمین کی اس ساری کائنات پر حکومت اور بادشاہی اللہ ﷻ ہی کی ہے۔ وہ جیسا چاہتا ہے تصرف کرتا ہے۔ پیدا کرنے کا اختیار بھی اسی کے پاس ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے بیٹے عطا فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹیاں عطا فرماتا ہے۔ اس لئے انسان کو چاہیئے کہ ہمیشہ اسی سے مانگے اور جو کچھ ملے اس پر مغرور نہ ہو۔

آیت نمبر ۵۰: اولاد دینے کا اختیار صرف اللہ ﷻ کے پاس ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے بیٹے عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹیاں عطا کرتا ہے۔ یا پھر وہ کسی کو بیٹے اور بیٹیاں دونوں عطا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اولاد سے محروم رکھتا ہے۔ بے شک اللہ ﷻ ہی ہر تخلیق کو جاننے والا اور بڑی قدرت والا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔

علمی بات: اولاد کے سلسلہ میں لوگوں کی چار قسمیں ہیں۔ (۱) وہ لوگ جن کو اللہ ﷻ صرف بیٹیاں ہی دیتا ہے۔ بیٹے کے لئے وہ ترستے رہتے ہیں اور ان کی حسرت پوری نہیں ہوتی۔ (۲) وہ لوگ جن کو صرف بیٹے دیئے جاتے ہیں۔ (۳) جن کو ملے جلے بیٹے اور بیٹیاں عطا فرماتا ہے۔ (۴) وہ لوگ جو بانجھ ہیں جن میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت ہی ختم ہو چکی ہے۔ ان کے ہاں نہ بیٹا پیدا ہوتا ہے اور نہ بیٹی۔ ان تمام صورتوں میں اولاد دینا یا نہ دینا اللہ ﷻ ہی کے قبضہ و قدرت اور اختیار میں ہے۔ اللہ ﷻ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کو کیا دینا ہے اور کیا نہیں دینا ہے۔ اللہ ﷻ اپنی حکمت اور مصلحت کے تحت تخلیق کا یہ عمل فرماتا ہے۔

فکری پہلو: یہ اللہ ﷻ کی بادشاہی کے مطلق (Absolute) ہونے کا ایک کھلا ہوا ثبوت ہے۔ کوئی انسان، خواہ وہ بڑے سے بڑے دنیوی اقتدار کا مالک بنا پھرتا ہو، یا روحانی اقتدار کا مالک سمجھا جاتا ہو، کبھی اس پر قادر نہیں ہو سکا ہے کہ دوسروں کو دلوانا تو درکنار، خود اپنے ہاں اپنی خواہش کے مطابق، اولاد پیدا کر سکے۔ جسے اللہ ﷻ نے بانجھ کر دیا وہ اس کے حکم اور مرضی کے بغیر کسی دوا، کسی علاج اور طریقہ سے اولاد والا نہ بن سکا، جسے اللہ ﷻ نے لڑکیاں ہی لڑکیاں دیں وہ ایک بیٹا بھی کسی تدبیر سے حاصل نہ کر سکا، اور جسے اللہ ﷻ نے لڑکے ہی لڑکے دیئے وہ ایک بیٹی بھی کسی طرح نہ پا سکا۔ اس معاملہ میں ہر ایک قطعی بے بس رہا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر کوئی خدا کی خدائی میں مختار کل ہونے کا گمان کرے، یا کسی دوسری ہستی کو اختیارات میں شریک سمجھے تو یہ اس کی اپنی ہی بے بصیرتی ہے جس کا خمیازہ وہ خود بھگتے گا۔ کسی کے اپنی جگہ کچھ سمجھ بیٹھنے سے حقیقت میں ذرہ برابر بھی تغیر واقع نہیں ہوتا۔

آیت نمبر ۵۱: اس دنیا میں انسان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ﷻ اس سے براہ راست کلام کرے اور بندہ براہِ راست اللہ ﷻ کی بات سن سکے۔ چنانچہ اللہ ﷻ اپنے بندوں تک پیغام پہنچانے کے لئے تین طریقے اختیار کرتا ہے۔ ایک یہ کہ اللہ ﷻ کسی کے دل میں بات ڈال دیتا ہے یعنی الہام کر دیتا ہے، جیسے اللہ ﷻ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو الہام کیا۔ دوسرے یہ کہ پردہ کے پیچھے سے کلام کرتا ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوہ طور پر اللہ ﷻ نے کلام کیا۔ تیسرے یہ کہ اللہ ﷻ فرشتے کے ذریعہ سے اپنی وحی بھیجتا ہے جیسے حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ ﷻ کا پیغام لے کر آتے اور پیغمبروں تک پہنچاتے رہے۔ بلاشبہ اللہ ﷻ بہت بلند اور بہت زیادہ حکمت والا ہے۔

علمی بات: اس دنیا میں کوئی انسان اس بات کی تاب نہیں لا سکتا کہ اللہ ﷻ اس سے روبرو کلام کرے۔ اس کا جلال اور اس کی عظمت ایسی ہے کہ انسان اس کو دیکھنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر جب اللہ ﷻ نے پہاڑ پر اپنی تجلی فرمائی تھی تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو گئے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "جب موسیٰ علیہ السلام ہمارے مقرر کیئے ہوئے وقت پر (کوہ طور پر) پہنچے اور ان کے رب نے ان سے کلام کیا، تو کہنے لگے کہ اے رب العزت! مجھے جلوہ دکھا میں تیرا دیدار بھی کروں۔ اللہ ﷻ نے کہا کہ تم مجھے ہر گز نہ دیکھ سکو گے۔ ہاں! پہاڑ کی طرف دیکھو،

اگر یہ اپنی جگہ قائم رہا تو تم مجھے دیکھ سکو گے۔ جب اللہ رب العزت نے پہاڑ پر تجلی کی تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو کر گر پڑے۔" (سورۃ الاعراف ۷، آیت:۱۴۳) یہی وجہ ہے کہ اللہ ﷻ نے اس دنیا میں اپنے نبیوں سے براہ راست کلام نہیں کیا، بلکہ وحی کے ذریعہ کلام کیا ہے یا فرشتہ کے ذریعہ پیغام بھیجا ہے۔ البتہ جنت میں اللہ ﷻ جنتیوں کو خصوصی بشریت عطا فرمائے گا جس کی وجہ سے وہ اللہ ﷻ کا دیدار کر سکیں گے۔

علمی بات: اللہ ﷻ انبیاء کرام علیہم السلام پر اپنا پیغام وحی کے ذریعہ پہنچاتا ہے۔ اس آیت میں اللہ ﷻ نے انبیاء کرام علیہم السلام پر وحی نازل کرنے کے تین طریقے بیان فرمائے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ اللہ ﷻ اپنے نبی علیہ السلام کے دل میں اپنا پیغام ڈال دیتا ہے، یا خواب میں بتلا دیتا ہے اس یقین کے ساتھ کہ یہ اللہ ﷻ کی طرف سے ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ خواب آیا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا، اے میرے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔" (سورۃ الصافات ۳۷، آیت:۱۰۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ خواب اللہ ﷻ کی طرف سے وحی تھا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اللہ ﷻ اپنے نبی علیہ السلام سے پردہ کے پیچھے سے بات کرتا ہے۔ اس میں نبی علیہ السلام اللہ ﷻ کا کلام سن تو سکتے ہیں لیکن اللہ ﷻ کو دیکھ نہیں سکتے۔ جیسے اللہ ﷻ نے کوہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ ﷻ کا کلام سنا لیکن اللہ ﷻ کو دیکھ نہیں سکے تھے۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اللہ ﷻ فرشتہ کو بھیجتا ہے اور وہ اللہ ﷻ کا پیغام نبی علیہ السلام تک پہنچاتا ہے۔ جیسے حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ ﷻ کا پیغام لے کر آتے اور پیغمبروں کو سناتے رہے۔ اللہ ﷻ نے اپنا کلام قرآن مجید حضرت جبرائیل کے ذریعہ حضور ﷺ پر اسی طریقہ سے نازل فرمایا۔

فرمان نبوی ﷺ: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ پر وحی کیسے نازل ہوتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وحی نازل ہوتے وقت کبھی مجھ کو گھنٹی کی سی آواز محسوس ہوتی ہے اور وحی کی یہ کیفیت مجھ پر بہت شاق گزرتی ہے۔ جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو میرے دل و دماغ پر اس (فرشتہ) کے ذریعہ نازل شدہ وحی محفوظ ہو جاتی ہے اور کسی وقت ایسا ہوتا ہے کہ فرشتہ بشکل انسان میرے پاس آتا ہے اور مجھ سے کلام کرتا ہے۔ پس میں اس کا کہا ہوا یاد رکھ لیتا ہوں۔ (صحیح بخاری)

آیت نمبر ۵۲: یہاں روح سے مراد قرآن پاک ہے۔ جس طرح حضور ﷺ سے پہلے اللہ ﷻ رسولوں پر وحی فرماتا رہا، اسی طرح اللہ ﷻ نے آپ ﷺ پر وحی کے ذریعہ قرآن مجید نازل فرمایا۔ اللہ ﷻ نے آپ ﷺ کو احکامات اور ایمان کی تفصیلات قرآن مجید کے ذریعہ عطا فرمائیں۔ اللہ ﷻ نے اس قرآن حکیم کو روشنی بنایا ہے جس کے ذریعہ سے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے ہدایت عطا فرماتا ہے۔ مراد قرآن کریم سے ہدایت و رہنمائی ان ہی کو ملتی ہے جو قرآن حکیم کو ہدایت کی نسبت سے پڑھتے، سنتے اور غور کرتے ہیں۔ پھر اللہ ﷻ ہدایت کا راستہ ان کے لئے ہموار کر دیتا ہے۔ بلاشبہ آپ ﷺ ایمان اور عمل کی ہدایت پہنچا کر لوگوں کی سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی فرماتے ہیں۔

علمی بات: اس آیت میں "روح" سے مراد قرآن مجید ہے۔ قرآن مجید کو روح سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ کہ وہ انسان کو حقیقی زندگی عطا کرتا ہے، وہ انسان کے لئے آبِ حیات ہے اور ایسا لطیف اور موثر کلام ہے کہ باطن کو ایک خاص روح (Spirit) سے بھر دیتا ہے۔ جس طرح روح انسان کے جسم کی زندگی کا سبب ہے اسی طرح قرآن مجید انسان کے دل کی زندگی کا سبب ہے اور جس طرح رحمت کی بارش بنجر اور خشک زمین کو زندگی اور تروتازگی دیتی ہے، اسی طرح قرآن مجید بھی مردہ اور غافل دلوں کو معرفت اور یاد الٰہی سے زندہ کرتا ہے۔ پس جو لوگ وحی الٰہی کے اس نور مبین سے محروم ہیں وہ حقیقت میں زندہ نہیں مردہ ہیں اور حقیقی اور دائمی زندگی کی لذت سے وہ محروم اور بے بہرہ ہیں، اگرچہ وہ چاند تک کیوں نہ پہنچ جائیں اور مریخ پر جھنڈے کیوں نہ گاڑھ دیں کہ وہ زمین و آسمان اور مریخ و قمر وغیرہ کے خالق و مالک کی معرفت اور اس کے حقوق سے غافل و بے خبر ہیں جو کہ محرومیوں کی محرومی اور فساد و خرابی کی جڑ بنیاد ہے۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ لہٰذا قرآن حکیم کی صورت میں نازل ہونے والی یہ رحمت خداوندی اللہ ﷻ کا ایک عظیم الشان اور بے مثال احسان ہے۔ اس سے اعراض و روگردانی ایک بڑی ہی بے انصافی اور انتہائی ہولناک محرومی ہے۔ بہر کیف قرآن مجید روح ہے اور اس سے بہرہ ور لوگ ہی زندہ ہیں۔ جبکہ اس سے محروم لوگ اصل میں مردہ ہیں اور ان کے وجود ایسے لاشے ہوتے ہیں جو دو ٹانگوں پر چل پھر رہے ہوتے ہیں۔

علمی بات: یہودیوں کا یہ مطالبہ کہ آپ اللہ ﷻ سے بالمشافہ کیوں مخاطب نہیں ہوتا محض جاہلانہ اور دشمنانہ اور مخالفانہ ہے۔ اس لئے یہ فرمایا کہ کسی انسان کو

یہاں تک کہ کسی رسول کو جو کچھ بھی علم ملتا ہے وہ سب اللہ ﷻ ہی کا عطیہ ہے اور جب تک اللہ ﷻ بذریعہ وحی ان کو یہ نہ بتلادے تو انہیں کسی کتاب کی واقفیت ہو سکتی ہے نہ اس کی تفصیلات۔ قبل وحی ایمان سے واقفیت نہ ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ ایمان کی تفصیلات اور شرائع ایمان یا ایمان کا اعلیٰ مقام جو بعد وحی حاصل ہوتا ہے، وحی سے پہلے اس کی واقفیت نہیں ہوتی۔ ورنہ باجماع امت یہ بات ثابت ہے کہ اللہ ﷻ جس انسان کو اپنا رسول و نبی بناتا ہے اس کو ابتدا ہی سے ایمان پر پیدا فرماتا ہے۔ ان کی فطرت ایمان پر مبنی ہوتی ہے۔ عطاءِ نبوت اور نزول وحی سے پہلے بھی وہ پکے مومن ہوتے ہیں۔ اصول ایمان ان کی فطرت و خلقت میں داخل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی جب ان کی قوموں نے مخالفت کی تو ان پر طرح طرح کے الزام لگائے مگر کسی پیغمبر علیہ السلام پر کسی امت نے یہ الزام نہیں لگایا کہ تم بھی تو نبوت کے دعوے سے پہلے ہماری طرح بتوں کو پوجا کرتے تھے۔

علمی بات: چونکہ آپ ﷺ نے دنیا کے معروف اور روایتی طریقہ سے نہ تو تعلیم حاصل کی تھی اور نہ ہی آپ ﷺ نے تورات یا کوئی اور کتاب پڑھی تھی۔ اس لحاظ سے آپ ﷺ "اُمییّن" میں سے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ روح محمدی ﷺ میں تمام انسانی ارواح سے زیادہ قوی ایمان موجود تھا۔ اکثر علماء کرام نے اس کی تعبیریوں کی ہے کہ آپ ﷺ کی مبارک روح کے اندر اجمالی ایمان پہلے سے موجود تھا جبکہ آپ ﷺ کو تفصیلی ایمان قرآن حکیم سے ملا۔ آپ ﷺ بنی نوع انسان کو راہ ہدایت دکھانے کے لئے مینارہ نور بن گئے۔ جیسے کہ ساحل پر موجود روشنی کا مینار جہازوں کو بندرگاہ تک پہنچنے کا راستہ دکھاتا ہے۔

علمی بات: اس آیت میں اللہ ﷻ نے "ماکنت تدری" فرمایا ہے اور "ماکنت تعلم" نہیں فرمایا: یعنی علم کی نفی نہیں کی، درایت کی نفی کی ہے اور درایت کا معنی ہے: اپنی عقل سے کسی چیز کو جاننا، لہٰذا اس کا مطلب یہ ہے کہ نزول قرآن سے پہلے آپ ﷺ از خود قرآن کریم اور ایمان کو نہیں جانتے تھے۔ ہاں اللہ ﷻ کے بتلانے سے آپ ﷺ کو ان کا اجمالی علم حاصل تھا مگر تفصیلی علم بعثت کے بعد عطا کیا گیا۔ ایک رائے یہ بیان کی گئی ہے کہ آپ ﷺ پر اگر اللہ ﷻ کا لطف و انعام نہ ہوتا تو آپ ﷺ کتاب کو نہ جان سکتے اور اگر وہ آپ ﷺ کی رہنمائی نہ فرماتا تو آپ ﷺ کو ایمان کا علم بھی نہ ہوتا۔

عملی پہلو: قرآن مجید اور حضور ﷺ کی سنت ہمارے لئے ہدایت اور رہنمائی کا ذریعہ ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم قرآن مجید کو پڑھیں، سمجھیں اور اس کی تعلیمات پر عمل کریں۔ اسی طرح حضور ﷺ کی سنت اور سیرت کا بھی مطالعہ کریں اور آپ ﷺ کی تعلیمات پر عمل کریں۔ اسی میں ہماری دنیا و آخرت کی نجات اور کامیابی کا راز مضمر ہے۔

آیت نمبر ۵۳: رسول اللہ ﷺ اس اللہ ﷻ کے راستہ کی طرف رہنمائی فرمارہے ہیں جو آسمان و زمین کی ہر چیز کا حقیقی مالک ہے اور اسی کے اختیار میں پوری کائنات ہے۔ یہی راہِ نجات ہے۔ حق کا انکار کرنے والوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ روز قیامت تمام معاملات اللہ ﷻ کی عدالت میں پیش ہوں گے اور وہی حق کے ساتھ فیصلہ فرمائے گا۔

علمی بات: سیدھا راستہ صرف وہی راستہ ہے جس کی طرف قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ نے رہنمائی فرمائی ہے۔ یہی راستہ اللہ ﷻ کا راستہ ہے جو کائنات کا فرماں روا، مالک اور بادشاہ ہے۔ اسی راہ پر چل کر انسان اللہ ﷻ تک پہنچتا ہے اور جو اس راہ سے بھٹکا تو وہ اللہ ﷻ کی راہ نہیں، سب شیطان کی راہیں ہیں۔

علمی بات: "سارے معاملات اللہ ﷻ ہی کی طرف لوٹتے ہیں" اس جملے کے دو مطلب ہیں۔ پہلا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے قیامت کے دن وہ سب اللہ ﷻ کے حضور پیش ہو گا۔ آخر کار اسی کی عدالت سے یہ فیصلہ ہو گا کہ کس کا کیا انجام ہونا چاہیئے۔ چونکہ اللہ ﷻ کے تمام فیصلے عدل و انصاف کے مطابق ہوتے ہیں، لہٰذا ظاہر ہے اس دن نیکوکار جنت کے مستحق قرار پائیں گے اور نافرمانوں کو جہنم ہی جانا پڑے گا۔ اس معنی کے لحاظ سے اس جملہ میں فرماں برداروں کے لئے خوشخبری اور نافرمانوں کے لئے سخت وعید ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ دنیاوی اور اخروی امور کی تمام تدابیر اللہ ﷻ ہی کی طرف لوٹتی ہیں۔ بظاہر کسی کام کی تدبیر کوئی کر رہا ہو جو کہ ظاہر میں لوگ اسے کسی کا کارنامہ سمجھیں، مگر حقیقت میں تمام امور کی تدابیر اللہ ﷻ ہی کا کام ہے۔ یعنی سب مخلوقات کے دنیوی اور اخروی امور بارگاہ الٰہی میں انجام پاتے ہیں۔ ہر چھوٹے بڑے کام کی وہی تدبیر فرماتا ہے۔ اس کی قضا و قدرت کے بغیر کوئی پتہ بھی جنبش نہیں کر سکتا۔

مشقوں کے جوابات

سُوْرَۃُ الْاَنْعَام (حصہ اوّل)

سوال ۱: خالی جگہیں پُر کریں:

(۱) آیت:۲۱ میں سب سے بڑا ظالم اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھنے والے اور اللہ ﷻ کی آیتوں کو جھٹلانے والے کو قرار دیا گیا ہے۔

(۲) آیت: ۳۸ میں انسانوں کے گروہ کی مثال دوسرے گروہ جانوروں اور پرندوں سے دی گئی ہے۔

(۳) آیت:۴۲ میں انسانوں پر اللہ ﷻ کی طرف سے دنیا میں عذاب نازل کرنے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ لوگ اللہ ﷻ کے سامنے عاجزی اختیار کریں۔

(۴) آیت:۵۲ کی روشنی میں نیک لوگوں کی دو صفات صبح وشام رب کو پکارنا اور اس کی رضا چاہنا ہیں۔

(۵) آیت:۶۸ کی روشنی میں جواب دیجیے کہ جس محفل میں اللہ ﷻ کی آیات کے حوالہ سے فضول باتیں کی جا رہی ہوں تو ہمیں اس محفل سے اُٹھ جانا چاہیے۔

سوال ۲: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیے:

۱- پہلے رکوع کی روشنی میں مشرکین کے کوئی دو اعتراضات اور ان کو دیے گئے جوابات لکھیں۔

مشرکین مکہ کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ آسمان سے کوئی لکھی ہوئی کتاب کیوں نہیں آئی اور دوسرا اعتراض یہ تھا کہ فرشتے کیوں نہیں اُتارے گئے اس کا جواب دیا گیا کہ جو لوگ موجودہ قرآنِ حکیم کو جادو اور اس کے لانے والوں کو جادوگر بتلاتے ہیں (معاذ اللہ) اگر ہم اُنہیں وحی کاغذ میں لکھی ہوئی کتاب کی شکل میں بھی آسمان سے اُتار دیں جسے یہ ہاتھوں سے چھُو کر معلوم کر لیں، تب بھی یہ اسے جادو کہیں گے اور دوسرا جواب دیا گیا کہ اگر ہم کوئی فرشتہ نازل فرماتے تو اب تک فیصلہ ہو چکا ہوتا اور پھر اُنہیں مہلت نہ دی جاتی۔

۲- دوسرے رکوع کی روشنی میں اللہ ﷻ کی کوئی پانچ صفات تحریر کریں۔

i- ہر جگہ اور ہر وقت اللہ ﷻ کی حکومت اور اقتدار ہے۔ ii- اللہ ﷻ ہی ہے جو ہر ایک کی پکار سنتا ہے۔ iii- اللہ ﷻ ہی سب کی ضروریات کو بخوبی جانتا ہے اور پورا کرتا ہے۔ iv- آسمان اور زمینوں کو اللہ ﷻ ہی نے پیدا فرمایا۔ v- اللہ ﷻ ہی ہم سب کو پالنے والا ہے۔

۳- تیسرے رکوع کی روشنی میں مشرکوں کے دل، کان، آنکھ اور زبان کی حالت بیان کریں۔

مشرک زبان سے جھوٹ بولا کرتے ہیں اور اللہ ﷻ کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں تو اللہ ﷻ نے ان کے دل، کان اور آنکھوں پر پردے ڈال دیئے۔ اگر وہ تمام نشانیاں دیکھ بھی لیں تب بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

۴- چوتھے رکوع کی روشنی میں بیان کریں کہ مشرکین کی طرف سے معجزہ کے مطالبہ پر کیا جواب دیا گیا؟

مشرکین کی طرف سے معجزہ کے مطالبہ پر جواب دیا گیا کہ اللہ ﷻ اس پر قادر ہے کہ معجزہ دکھادے لیکن ان میں سے اکثر لوگ (اس کا انجام) نہیں جانتے۔

۵- آٹھویں رکوع میں عذابِ الٰہی کی کون سی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں؟

آٹھویں رکوع کی آیت:۶۵ میں عذابِ الٰہی کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں کہ اللہ ﷻ اس پر قادر ہے کہ تم پر عذاب بھیج دے i- تمہارے اوپر سے ii- تمہارے پاؤں کے نیچے سے iii- یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کر کے بھڑا دے اور ایک کو دوسرے کی طاقت کا مزہ چکھائے۔

سُوْرَۃُ الْاَنْعَام (حصہ دوم)

سوال ۱: خالی جگہیں پُر کریں:

(۱) آیت: ۹۶ میں اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کو تخلیق کرنے کی حکمت ماہ وسال کا حساب لگانا بیان فرمائی ہے۔

(۲) آیت: ۱۰۱ میں اللہ تعالیٰ کی اولاد نہ ہونے کی عقلی دلیل یہ دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی بیوی ہی نہیں ہے۔

(۳) آیت: ۱۲۱ کے مطابق جس جانور پر ذبح کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا جائے تو اس جانور کا گوشت نہیں کھانا چاہیئے۔

(۴) آیت: ۱۵۵ میں قرآنِ حکیم کے بارے میں دو باتیں برکت والی کتاب ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے اور اس کی پیروی کرو بیان ہوئی ہیں۔

(۵) آیت: ۱۶۰ میں قیامت کے دن ایک نیکی پر دس گنا ثواب دیئے جانے کی بشارت دی گئی ہے۔

سوال ۲: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیے:

۱- بارہویں رکوع کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کوئی دس نشانیاں تحریر کریں۔

i۔ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو گٹھلی سے درخت بناتا ہے۔ ii۔ وہ زندہ کرتا ہے۔ iii۔ وہی مارتا ہے۔ iv۔ وہ رات کی تاریکی چاک کرکے صبح کو نمودار کرتا ہے۔ v۔ اسی نے رات کو آرام کے لئے بنایا۔ vi۔ اس نے سورج و چاند کو ماہ و سال کے حساب کے لئے بنایا۔ vii۔ اسی نے راستہ ڈھونڈنے کے لئے ستارے بنائے۔ viii۔ آسمان سے پانی برسایا۔ ix۔ نباتات اُگائیں۔ x۔ انگوروں اور زیتون کے باغ اُگائے۔

۲- تیرھویں رکوع کی روشنی میں جواب دیں کہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے بتوں کو بُرا بھلا کہنے سے کیوں منع کیا ہے؟

چونکہ مشرکین بتوں کو اپنا معبود سمجھتے ہیں، ان کے ذہنوں میں ان کی عظمت اور دلوں میں ان کی عقیدت ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ غصہ میں آکر جواباً اللہ تعالیٰ کو بُرا بھلا کہنے لگ جائیں اس لئے ایسا انداز اختیار کرنے سے منع فرمایا۔

۳- پندرھویں رکوع کی روشنی میں اس شخص کی کیفیت بتائیں جسے اللہ تعالیٰ اسلام کی ہدایت عطا فرمانا چاہتا ہے اور وہ شخص جسے اسلام کی ہدایت نہیں دینا چاہتا۔

اللہ تعالیٰ جسے اسلام کی ہدایت عطا فرمانا چاہتا ہے تو اس شخص کا سینہ کھول دیتا ہے یعنی ایسی باطنی بصیرت عطا فرماتا ہے جس کی وجہ سے اسلام کی ہر چیز ٹھیک نظر آئے اور جسے ہدایت نہیں دینا چاہتا اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے یعنی اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت نہ ملے تو اس شخص کا راہِ حق پر چلنا مشکل ترین کام بن جاتا ہے۔

۴- سولہویں اور سترہویں رکوع کی روشنی میں مشرکین کے گھڑے ہوئے عقیدوں اور جن چیزوں کو انہوں نے خود حلال و حرام ٹھہرالیا اس کی چند مثالیں تحریر کریں۔

مشرکین کے عقیدہ کے مطابق ان کا یہ طریقہ تھا کہ مویشیوں اور فصل میں سے ایک حصہ اللہ تعالیٰ کے نام کا صدقہ کرتے تھے اور ایک حصہ بتوں کے نام پر دیتے تھے اور اگر کوئی بُرا وقت آتا تو اللہ تعالیٰ کے حصہ میں سے استعمال کر لیتے۔ ایک عقیدہ یہ تھا کہ وہ اپنے بچوں کو مختلف بتوں کے نام پر قربان کر دیتے۔ نیز کچھ جانوروں پر سواری کو، کچھ کے گوشت کو حرام قرار دیتے تھے مثلاً اگر اُونٹنی یا بکری حاملہ ہو تو اس کا اور اس حمل سے اگر زندہ بچہ پیدا ہوتا تو اس کا گوشت مَرد کھا سکتے ہیں مگر عورت نہیں اور اگر اس حمل سے مُردہ بچہ پیدا ہوتا تو اس مُردہ کا گوشت سب پر حلال ہوتا وغیرہ۔

۵- اُنیسویں رکوع کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کے حوالہ سے جن کاموں کے کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور جن کاموں سے روکا گیا ہے اُن کی ایک فہرست بنائیں۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اپنے بچوں کو تنگ دستی کے ڈر سے قتل نہ کرو، بے حیائی کے کاموں کی طرف مت جاؤ خواہ وہ ظاہر ہو یا پوشیدہ، کسی کا قتل نہ کرو، یتیم کے مال کے قریب مت جاؤ، انصاف کے ساتھ ناپ تول کرو، جب بھی بات کرو تو عدل کرو اور اللہ تعالیٰ سے کیئے ہوئے عہد کو پورا کرو۔

سُوْرَۃُ الْاَعْرَاف (حصہ اوّل)

سوال ۱: خالی جگہیں پُر کریں:

(۱) آیت: ۱۰ میں اللہ ﷻ کی نعمت معاش کی یاد دلائی گئی ہے۔

(۲) آیت: ۳۱ میں نماز کے حوالہ سے زینت اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

(۳) آیت: ۳۵ میں قیامت کے دن خوف اور غم سے محفوظ رہنے والوں کی صفات پرہیز گاری اختیار کرنا اور اعمال کی اصلاح کرنا بیان کی گئی ہیں۔

(۴) اللہ ﷻ کی آیات کا انکار کرنے والے اور تکبر کرنے والے جنّت میں نہیں جاسکتے اس کے لئے آیت: ۴۰ میں سوئی کے ناکہ سے اُونٹ کے گزر جانے کی مثال دی گئی ہے۔

(۵) آیت: ۵۱ کی روشنی میں روزِ قیامت اللہ ﷻ قیامت کے دن کی ملاقات کو بھلا دینے والے لوگوں کو نظر انداز کر دے گا۔

سوال ۲: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیے:

۱- پہلے رکوع میں کن لوگوں سے سوال کیئے جانے کا ذکر ہے؟ ان لوگوں اور سوالات کی وضاحت کریں۔

جن لوگوں کی طرف رسول بھیجے گئے ان سے سوال کیئے جانے کا ذکر ہے اور اُمّت سے جواب طلبی ہوگی کہ ان کی طرف رسول بھیجے گئے تھے کہ وہ اُنہیں اللہ ﷻ کا پیغام پہنچادیں تو کیا تم نے اس پیغام کو قبول کیا۔

۲- پانچویں رکوع کی روشنی میں جواب دیجیے کہ قیامت کے دن بالآخر اصحابُ الاعراف کا کیا انجام ہو گا؟

اصحاب الاعراف اہل جنّت کو بھی جانتے ہوں گے اور اہل جہنّم کو بھی۔ ان کے اعمال ناموں میں نیکیاں اور بد اعمالیاں برابر ہو جائیں گی جس کی وجہ سے اُنہیں جنّت یا جہنّم میں ڈالنے کا فیصلہ نہیں ہوا ہو گا اور اُنہیں اَعراف پر روکا گیا ہو گا، وہ کہیں گے اے پروردگار! ہمیں ظالموں کے ساتھ شامل نہ کرنا۔

۳- چھٹے رکوع میں اہل جہنّم کی اہل جنّت سے کس فریاد کا ذکر کیا گیا ہے نیز اہل جنّت ان کی فریاد کا کیا جواب دیں گے؟

اہل جہنّم اہل جنّت کو پکاریں گے کہ تھوڑا پانی ہم پر بہا دو یا اس رزق میں سے کچھ دے دو جو تمہیں اللہ ﷻ نے دیا ہے، لیکن اہل جنّت کہیں گے یہ دونوں چیزیں اللہ ﷻ نے کافروں پر حرام کر دی ہیں۔

۴- ساتویں رکوع میں اللہ ﷻ سے دُعا مانگنے کے کیا آداب سکھائے گئے ہیں؟

اللہ ﷻ کو جب پکارو تو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے دل میں پکارو یعنی رب کو عاجزی کے ساتھ پکارو ایک طرف خوف کا احساس بھی ہو کہ اللہ ﷻ کی پکڑ نہ آئے اور کہیں سزا نہ دے دے اور دوسری طرف اس کی رحمت کی اُمید بھی دل میں ہو اور اسی طرح اللہ ﷻ سے دُعا کرتے رہو۔

۵- بارہویں رکوع کی روشنی میں جواب دیجیے کہ اس میں ایمان اور تقویٰ کے کیا نتائج بیان کیئے گئے ہیں؟

اگر یہ بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو اللہ ﷻ ان پر آسمانوں اور زمین کی برکتیں کھول دیتا۔

سُوْرَۃُ الْاَعْرَاف (حصہ دوم)

سوال ۱: خالی جگہیں پُر کریں:

(۱) آیت: ۱۵۸ میں ہدایت کے حصول کے لئے رسول اللہ ﷺ کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔

(۲) آیت: ۱۶۴ میں قصّہ "اصحابِ سبت" کے ذیل میں اصلاح کرنے والے لوگوں نے نافرمانوں کو سمجھانے کی وجوہات اللہ ﷻ کے سامنے معذرت پیش

کرنا اور بُرے لوگوں کا پرہیز گار بن جانا بیان کی گئی ہیں۔

(۳) آیت: ۱۶۸ میں خوشحالی اور تکلیف میں مبتلا کیئے جانے کی حکمت اللہ ﷻ کی طرف رجوع کرنا بیان کی گئی ہے۔

(۴) آیت: ۱۷۲ میں بندوں سے اللہ ﷻ کے رب ہونے کا اقرار لیا گیا ہے۔

(۵) آیت: ۲۰۴ میں قرآنِ حکیم کے حوالہ سے دو آداب توجہ سے سننا اور تلاوت سننے کے دوران خاموش رہنا بیان کیئے گئے ہیں۔

سوال ۲: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیئے:

۱- اُنیسویں رکوع میں نبی کریم ﷺ کی کیا عظیم صفات وبنیادی اختیارات بیان کیئے گئے ہیں؟

رسول اللہ ﷺ کی تورات وانجیل میں مذکور صفات اور ان خداداد اختیارات کا ذکر ہے کہ آپ ﷺ نیکی کا حکم فرمانے اور بُرائی سے روکنے کے ساتھ ساتھ پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو حرام کرتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرنے والے اُمتیوں سے بوجھ اور ان پر پڑے ہوئے طوق اُتارتے ہیں۔

۲- بیسویں رکوع میں بنی اسرائیل پر اللہ ﷻ کی کن نعمتوں کے نزول کا ذکر کیا گیا ہے؟

بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کے لئے بارہ چشمے بنائے گئے تاکہ پانی کی تقسیم میں کسی قسم کا کوئی تنازعہ نہ ہو اور ان پر بادل کا سایہ بنائے رکھا اور ان پر من وسلویٰ اُتارا گیا۔

۳- اکیسویں رکوع کی روشنی میں اصحابِ سبت پر عذاب آنے کی وجہ بیان کریں نیز یہ بتائیں کہ کن لوگوں کے بچ جانے کا ذکر ہے؟

اصحابِ سبت پر عذاب آنے کی وجہ یہ بیان ہوئی ہے کہ ان کے لئے سبت یعنی ہفتہ کے دن اللہ ﷻ کی عبادت کے لئے مقرر تھا اور باقی دنوں میں وہ مچھلی پکڑتے تھے لیکن ان کی آزمائش کے لئے سبت یعنی ہفتہ کے دن مچھلی زیادہ نظر آتی تھی اور باقی دنوں میں نہیں، تو انہوں نے سبت کے دن شکار شروع کر دیا اور حد سے تجاوز کرنے والوں میں شامل ہو گئے تو اللہ ﷻ کی طرف سے عذاب نازل ہوا اور آیات میں صرف ان لوگوں کے عذاب سے بچنے کا ذکر ہے جو لوگوں کو نافرمانی سے روکتے تھے۔

۴- بائیسویں رکوع میں اللہ ﷻ کی آیات کو جھٹلانے والوں کے لئے کیا مثال اور انجام بیان کیا گیا ہے؟

اللہ ﷻ کی آیات کو جھٹلانے والوں کی مثال کتے کی سی ہے اگر کوئی اس پر حملہ کرے تو بھی وہ ہانپتا رہتا ہے اور اگر اسے چھوڑ دو تو تب بھی وہ ہانپتا رہے گا۔ جو شخص اللہ ﷻ کی آیات سے اِعراض اور اس کے احکام کی نافرمانی کرتا ہے تو اللہ ﷻ اس کو ڈھیل دیتا ہے اور اس کی رسی دراز کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ گناہوں میں دھنستا چلا جاتا ہے۔

۵- چوبیسویں رکوع میں اللہ ﷻ کے ساتھ خدائی میں شریک ٹھہرائے جانے والے باطل معبودوں کی بے بسی اور کمزوری کو کس طرح بیان کیا گیا ہے اور شیطانی حملہ کے وقت اللہ ﷻ سے ڈرنے والوں کے کس طرزِ عمل کا ذکر ہے؟

اللہ ﷻ کے ساتھ خدائی میں شریک ٹھہرائے جانے والے باطل معبودوں کی بے بسی اور کمزوری اس طرح بیان کی گئی کہ نہ وہ چل سکتے ہیں اور نہ کچھ پکڑ سکتے ہیں نہ ان کی آنکھیں ہیں اور نہ کان کہ کچھ سن اور دیکھ سکیں۔ وہ تو خود اپنی مدد نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی اُنہیں اپنی رہنمائی کے لئے پکارے تو وہ اس کی طرف توجہ نہیں کر سکتے وہ تو خود تمہاری ہی طرح بندے ہیں۔ نیز شیطانی حملوں کے حوالہ سے بیان ہوا ہے کہ اگر شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آنے لگے تو اللہ ﷻ کی پناہ مانگ لیا کرو۔ نیز یہ بھی بیان ہوا ہے کہ جو لوگ اللہ ﷻ سے ڈرتے ہیں جب کبھی اُنہیں شیطان کی طرف سے کوئی بُرا خیال چھو جاتا ہے تو وہ اللہ ﷻ کی یاد میں لگ جاتے ہیں تو فوراً ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

سُوْرَۃُ یُوْنُس (حصہ اوّل)

سوال ۱: خالی جگہیں پُر کریں:

(۱) آیت: ۲ میں آپ ﷺ کو تلقین کی گئی کہ اہلِ ایمان کو رب کے ہاں بلند رتبہ کی خوشخبری دیں۔

(۲) آیت: ۱۲ میں ناشکرا انسان تکلیف دور ہو جانے کے بعد ایسا ہو جاتا ہے گویا اس نے اللہ ﷻ کو پکارا ہی نہ ہو۔

(۳) آیت:۱۷ میں سب سے بڑا ظالم اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھنے والے اور اللہ ﷻ کی آیتوں کو جھٹلانے والے کو قرار دیا گیا ہے۔

(۴) آیت:۲۴ میں اللہ ﷻ نے انسان کی زندگی کے لئے بارش سے پیدا ہونے والی نباتات کی مثال بیان فرمائی ہے۔

(۵) آیت:۴۵ میں قیامت کے دن لوگوں کو آخرت کی زندگی کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی صرف ایک گھڑی محسوس ہوگی۔

سوال ۲: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیے:

۱- پہلے رکوع کی روشنی میں جنّت میں اہل جنّت کی دُعائیں یا مناجات تحریر کریں۔

اہل جنّت کی پکار یہ ہوگی کہ اے اللہ! تیری ذات ہر عیب سے پاک ہے اور وہ ایک دوسرے کے خیر مقدم کے لئے سلام بولیں گے اور آخری دُعا یہ ہوگی کہ تمام تعریفیں اللہ ﷻ کے لئے ہیں جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔

۲- دوسرے رکوع میں قرآنِ حکیم کے بارے میں مشرکین مکہ کا کیا مطالبہ بیان ہوا ہے اور اس مطالبہ کا اُنہیں کیا جواب دیا گیا ہے؟

مشرکین کا مطالبہ یہ بیان ہوا ہے کہ اس قرآنِ حکیم کے سوا کوئی اور قرآنِ پاک لے آئیں یا اسے بدل دیں اس مطالبہ کا اُنہیں رسول اللہ ﷺ کی زبانی یہ جواب دیا گیا کہ آپ ﷺ فرمادیجیے کہ مجھے یہ حق نہیں کہ میں اسے اپنی طرف سے بدل دوں میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی فرمائی جاتی ہے۔

۳- تیسرے رکوع کی روشنی میں جواب دیں کہ قیامت کے دن اہل جہنّم اور اہل جنّت کے چہرے کیسے ہوں گے؟

قیامت کے دن اہل جنّت کے چہروں پر نہ سیاہی چھائے گی اور نہ ذلت جبکہ اہل جہنّم کے چہروں پر ذلّت چھاجائے گی، گویا ان کے چہرے اندھیری رات کے ٹکڑوں سے ڈھانپ دیئے گئے ہیں۔

۴- چوتھے رکوع میں توحید باری تعالیٰ کے دلائل کا بیان ہے۔ آپ کم از کم پانچ دلائل تحریر کریں۔

۱۔ اللہ ﷻ ہی آسمان وزمین سے رزق عطا فرماتا ہے۔ ۲۔ اللہ ﷻ ہی ہے جو سب کو سن سکتا ہے اور دیکھ سکتا ہے ۳۔ اللہ ﷻ ہی زندہ کرتا ہے۔

۴۔ اللہ ﷻ ہی بے جان کو جاندار سے باہر نکالتا ہے۔ ۵۔ اللہ ﷻ ہی ہر کام کا انتظام کرتا ہے۔

۵- چوتھے رکوع کی روشنی میں جواب دیں کہ قرآنِ حکیم کی کیا شان بیان کی گئی ہے؟

قرآنِ حکیم کوئی گھڑی ہوئی کتاب نہیں بلکہ اس میں تمام آسمانی کتابوں کی تصدیق اور تفصیل موجود ہے اور یہ اللہ ﷻ کا نازل کردہ کلام ہے۔

سُوْرَۃُ یُوْنُس (حصّہ دوم)

سوال ۱: خالی جگہیں پُر کریں:

(۱) آیت:۶۱ میں اللہ ﷻ کے بارے میں ذکر ہے کہ وہ لوگوں کے اعمال سے خوب واقف ہے۔ اعمال میں خاص طور پر تلاوتِ قرآنِ پاک کا ذکر ہے۔

(۲) آیت:۸۳ میں ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینے والے چند نوجوان تھے۔

(۳) آیت:۹۲ میں ذکر ہے کہ اللہ ﷻ نے فرعون کی لاش کو بعد میں آنے والوں کے لئے عبرت بنادیا۔

(۴) آیت:۱۰۰ میں ذکر ہے کہ کسی کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اللہ ﷻ کے حکم کے بغیر ایمان لے آئے۔

(۵) آیت:۹۸ کی روشنی میں بتائیں کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کا یہ انجام ہوا کہ وہ ایمان لے آئے تھے تو اس وجہ سے ان پر سے عذاب ٹال دیا گیا۔

سوال ۲: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیے:

۱۔ چھٹے رکوع میں قرآنِ حکیم اور رسول اللہ ﷺ کی کیا صفات بیان کی گئی ہیں اور ہمیں کیا حکم دیا گیا ہے؟

قرآنِ حکیم اللہ ﷻ کی طرف سے ایک نصیحت ہے اور دلوں کی بیماریوں کے لئے شفا ہے اور ایمان والوں کے لئے ہدایت اور رحمت کا سامان ہے۔ یہ سب کچھ

اللہ ﷻ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہے لہٰذا ہمیں اس پر خوش ہونا چاہیئے۔ یہ ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جو لوگ جمع کر رہے ہیں۔

۲- ساتویں رکوع کی روشنی میں اولیاء اللہ کی صفات اور ان کے لئے دی گئی بشارت تحریر کریں۔

اولیاء اللہ ایمان اور تقویٰ کی صفات رکھتے ہیں اور اُنہیں بشارت دی گئی کہ اُنہیں نہ آئندہ کا کوئی خوف ہو گا اور نہ ماضی کی بات کا کوئی غم، ان کے لئے خوش خبری ہے دُنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔

۳- آٹھویں رکوع میں کتنے انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر کیا گیا ہے؟ ان میں سے کسی ایک کی دعوت کے بارے میں تین باتیں لکھیں۔

حضرت نوح، حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ علیہم السلام کا ذکر آیا ہے۔

i۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو استقامت کے ساتھ دعوت دی اور اللہ ﷻ پر توکل کیا۔

ii۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: کہ میں تم سے اس دعوت پر کوئی اُجر نہیں مانگتا میرا اَجر تو صرف اللہ ﷻ کے ذمہ کرم پر ہے۔

iii۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے یہ بھی فرمایا: کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں فرماں برداروں میں سے ہو جاؤں۔

۴- نویں رکوع میں مشکلات میں گھری قوم کے لئے بیان کی گئی دُعاؤں کا ترجمہ تحریر کریں؟

i۔ "اے ہمارے رب! ہمیں ظالم قوم کے لئے (ذریعہ) آزمائش نہ بنا اور اپنی رحمت سے ہمیں کافر قوم سے نجات عطا فرما۔"

ii۔ "اے ہمارے رب! بے شک تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو بہت سے (اسباب) زینت اور اَموال دنیا کی زندگی میں دیئے ہیں، اے ہمارے رب! تاکہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے گمراہ کرتے رہیں، اے ہمارے رب! ان کے مال برباد کر دے اور ان کے دل سخت کر دے پھر وہ ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔"

۵- گیارہویں رکوع میں آپ ﷺ کو دس باتوں کا حکم فرمایا گیا ہے۔ آپ ان میں سے کوئی پانچ باتیں لکھیں۔

تعلیم اُمّت کے لئے آپ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ: i۔ مومنوں میں سے ہو جائیں۔ ii۔ اپنا رخ یکسوئی کے ساتھ دین پر قائم رکھیں۔

iii۔ شرک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔ iv۔ اللہ ﷻ کے سوا ان کو نہ پکاریں جو نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

v۔ اس کی طرف پیروی کیجیے جو آپ ﷺ کی طرف وحی فرمائی جاتی ہے۔

سُوْرَةُ هُوْد

سوال ۱: خالی جگہیں پُر کریں:

(۱) آیت: ۱ میں قرآنی آیات کے بارے میں ذکر ہے کہ پہلے اُنہیں دلائل سے پختہ کیا گیا اور پھر ان کی تفصیل بیان کی گئی۔

(۲) آیت: ۲۴ میں کافروں کی اندھا اور بہرا ہونے کی اور مومنوں کی دیکھنے اور سننے والے کی مثال بیان کی گئی ہے۔

(۳) آیت: ۱۱۱ کی روشنی میں بتائیں کہ اللہ ﷻ لوگوں کے اعمال سے واقف ہے اور ان کا پورا پورا بدلہ روزِ قیامت عطا فرمائے گا۔

(۴) آیت: ۱۱۴ میں ذکر ہے کہ نیکیاں بُرائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔

(۵) آیت: ۱۱۶ میں ذکر ہے کہ اللہ ﷻ نے فساد سے روکنے والوں کو عذاب سے نجات عطا فرمائی۔

سوال ۲: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیے:

۱- پہلے رکوع کی روشنی میں قرآنِ حکیم کی عظمت اور اللہ ﷻ کی بندگی وقدرت کے حوالہ سے کوئی پانچ باتیں تحریر کریں۔

قرآنِ حکیم کی عظمت کے حوالہ سے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات دلائل سے پختہ کی گئی ہیں پھر تفصیل سے بیان کی گئی ہیں نیز اللہ ﷻ کی بندگی وقدرت

کے حوالہ سے بتایا گیا ہے کہ: i۔ اللہ ﷻ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ ii۔ جو ہمارے دل میں ہے اور جو ظاہر ہے اللہ ﷻ ہر بات سے واقف ہے۔ iii۔ وہ سینوں کے رازوں کو بھی خوب جاننے والا ہے۔ iv۔ وہ ہر جاندار کو رزق دیتا ہے۔ v۔ اس نے چھ دنوں میں زمین و آسمان کو پیدا فرمایا۔ vi۔ اللہ ﷻ نے دنیا میں ہمیں آزمائش کے لئے بھیجا ہے۔

۲- دوسرے رکوع کی روشنی میں بتائیں کہ جو لوگ صرف دنیا ہی کے طلب گار ہیں اُن کا کیا انجام ہو گا؟

جو لوگ صرف دنیاوی زندگی کے طلب گار ہیں اللہ ﷻ اُنہیں دنیا میں مال و زینت دے گا اور دنیا میں ان سے کوئی کمی نہ کی جائے گی۔ مگر آخرت میں ان لوگوں کے لئے آگ ہو گی اور جو سب انہوں نے دنیا میں کیا وہ برباد اور ضائع ہو جائے گا۔

۳- دوسرے رکوع کی روشنی میں اہل جنّت کی تین صفات بیان کیجیے۔

اہل جنّت کی صفات ایمان لانا، نیک اعمال کرنا اور اللہ ﷻ کے سامنے عاجزی اختیار کرنا بیان ہوئی ہیں۔

۴- ساتویں رکوع کی روشنی میں بتائیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھر آنے والے مہمانوں نے آپ علیہ السلام کو کیا خوش خبری دی؟ نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین صفات تحریر کریں۔

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھر آنے والے مہمانوں نے آپ علیہ السلام کو بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام اور اس کے بعد پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کی پیدائش کی خوشخبری دی۔ ۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تحمل والے تھے۔ ۳۔ آپ علیہ السلام بڑے ہی نرم دل انسان تھے۔ ۴۔ آپ علیہ السلام اللہ ﷻ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔

۵- نویں رکوع میں لوگوں کی کون سی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں اور ان کا کیا انجام بیان کیا گیا ہے؟

لوگوں کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں ایک خوش نصیب اور دوسرے بد نصیب۔ پس جو بد نصیب ہیں وہ آگ میں ہوں گے ان کے لئے وہاں چیخنا اور چلانا ہو گا اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور جو خوش نصیب ہیں تو وہ جنّت میں ہوں گے اور اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں یہ وہ عطا ہے جو کبھی ختم نہ ہو گی۔

سُوْرَةُ الرَّعْد

سوال ۱: خالی جگہیں پُر کریں:

(۱) آیت: ۵ میں ذکر کیا گیا ہے کہ آخرت کا انکار کرنے والوں کی گردنوں میں طوق ہوں گے۔

(۲) آیت: ۱۱ میں بتایا گیا ہے کہ اللہ ﷻ کسی قوم سے اپنی نعمت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اس کی ناشکری نہیں کرتے۔

(۳) آیت: ۲۸ میں بتایا گیا ہے کہ دلوں کو اطمینان اللہ ﷻ کے ذکر سے حاصل ہوتا ہے۔

(۴) آیت: ۳۶ میں ذکر ہے کہ اہل کتاب میں سے نیک لوگوں کا قرآنِ حکیم کے بارے میں یہ طرزِ عمل ہوتا ہے کہ وہ قرآن حکیم کے نزول پر خوش ہوتے ہیں۔

(۵) آیت: ۴۲ میں ذکر ہے کہ اللہ ﷻ ہر جان کے عمل کو جانتا ہے۔

سوال ۲: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیے:

۱- پہلے رکوع میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے اللہ ﷻ کی قدرت کے کیا مظاہر بیان کیئے گئے ہیں؟

اللہ ﷻ وہ ذات ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے بلند فرمایا اور سورج اور چاند کو تابع فرمایا کہ ہر ایک وقت مقرر تک چل رہا ہے۔ اللہ ﷻ ہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اس میں پہاڑ اور نہریں بنائیں اور تمام پھلوں میں دو قسم کے جوڑے بنائے۔ وہ دن کو رات سے ڈھانپ دیتا ہے یقیناً اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے نشانیاں بنائیں۔

COPYRIGHTS @ RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION. SALE OF THIS BOOK WOULD ENTAIL CIVIL & CRIMINAL ACTION.

۲- دوسرے رکوع میں بتوں کو معبود سمجھ کر پکارنے والوں کی کیا مثال بیان کی گئی ہے؟

اور جو لوگ اللہ ﷻ کے علاوہ دوسروں کو معبود سمجھ کر پکارتے ہیں وہ اُنہیں کچھ بھی جواب نہیں دے سکتے۔ اُنہیں پکارنے کی مثال تو ایسے ہے جیسے کوئی شخص پانی کی طرف اپنے ہاتھ پھیلائے تاکہ پانی اُس کے منہ تک پہنچ جائے حالانکہ وہ اُس کے منہ تک پہنچنے والا نہیں۔

۳- دوسرے رکوع میں حق اور باطل کے حوالہ سے کون سی دو مثالیں بیان کی گئی ہیں؟

حق اور باطل کے حوالہ سے سوالیہ انداز میں دو مثالیں بیان کی گئی ہیں۔

i- کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہو سکتا ہے؟ ii- کیا اندھیرے اور روشنی برابر ہو سکتے ہیں؟

۴- تیسرے رکوع کی روشنی میں اہلِ حق کی صفات اور ان کا انجام بیان کریں۔

وہ لوگ اللہ ﷻ کے عہد کو پورا کرتے ہیں، ان (رشتوں) کو جوڑتے ہیں جس کے متعلق اللہ ﷻ نے حکم فرمایا ہے کہ اُسے جوڑا جائے، اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور بڑے حساب کا خوف رکھتے ہیں اور اپنے رب کی رضا حاصل کرنے کے لئے صبر کرتے ہیں اور جو اللہ ﷻ نے اُنہیں عطا فرمایا ہے اسی میں سے پوشیدہ اور اعلانیہ خرچ کرتے ہیں اور وہ بُرائی کو بھلائی سے دور کرتے ہیں ان کا انجام آخرت میں یقینی جنّت ہے۔

۵- پانچویں رکوع کی روشنی میں جنّت کی صفات کو بیان کریں۔

جنّت ایسی ہے کہ اس کے نیچے نہریں بہتی ہیں اس کا پھل ہمیشہ رہنے والا ہے اور اس کا سایہ بھی ہمیشہ رہنے والا ہے۔

سُوْرَةُ اِبْرٰهِيْم

سوال ۱: خالی جگہیں پُر کریں:

(۱) آیت:۷ کے مطابق شکر ادا کرنے کا نتیجہ نعمتوں میں اضافہ ہے۔

(۲) آیت:۱۸ کے مطابق قیامت کے دن کفار کی نیکیاں راکھ کے ڈھیر کی مانند ہوں گی۔

(۳) آیت: ۲۲ میں ذکر ہے کہ قیامت کے دن شیطان اہلِ جہنّم سے کہے گا کہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔

(۴) آیت:۳۴ کے مطابق اللہ ﷻ کی نعمتوں کو شمار کرنا ممکن نہیں۔

(۵) آیت:۳۶ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی پیروی کرنے والوں کو اپنا قرار دیا۔

سوال ۲: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیے:

۱- پہلے رکوع میں مذکور "وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ" میں ایّام اللہ سے کیا مراد ہے؟

ایّام اللہ سے مراد انبیاء کرام علیہم السلام اور ایمان والوں پر اللہ ﷻ کے خاص فضل و کرم کے ظہور اور منکرین کی تباہی و بربادی کے دن ہیں۔

۲- تیسرے رکوع میں اہلِ جہنّم کا کیا انجام بیان ہوا ہے؟

جہنمی کو پینے کے لئے پیپ کا پانی دیا جائے گا وہ اسے گھونٹ گھونٹ کر کے پیئے گا اور اسے حلق سے نیچے نہ اتار سکے گا اور اسے ہر طرف سے موت گھیر لے گی مگر وہ مرے گا نہیں اور اس کے لئے سخت عذاب ہو گا۔

۳- چوتھے رکوع میں اللہ ﷻ نے "کلمۂ طیّبہ" یعنی توحید و رسالت پر ایمان اور "کلمۂ خبیثہ" یعنی کفر و شرک کے لئے کیا مثال بیان کی ہے؟

کلمۂ طیّبہ کی مثال پاکیزہ درخت کی طرح ہے جس کی جڑ مضبوط ہے اور اس کی شاخیں آسمان میں ہیں اور اللہ ﷻ کے حکم سے ہر وقت اپنا پھل دیتا ہے اور کلمۂ خبیثہ کی مثال ناپاک درخت کی طرح ہے جسے زمین کے اوپر سے اُکھاڑا جائے اس کے لئے کوئی قرار نہیں۔

COPYRIGHTS ® RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION

۴- چھٹے رکوع کی روشنی میں ایک فہرست بنایئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کن کن باتوں کی دُعا مانگی؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا کی کہ i۔ اے میرے رب! اس شہر کو امن والا بنا دیجئے۔ ii۔ میری اولاد کو بتوں کی پوجا سے دور رکھیے۔ iii۔ اُنہیں پھلوں سے رزق عطا فرمائیں تاکہ وہ شکر ادا کریں۔ iv۔ مجھے نماز قائم کرنے والا بنا دیجئے اور میری اولاد کو بھی۔ v۔ مجھے اور میرے والدین کو بخش دیجئے اور سب ایمان والوں کو بھی۔

۵- ساتویں رکوع کی روشنی میں جواب دیجئے کہ قیامت کے دن ظالموں اور مجرموں کا کیا حال ہو گا؟

قیامت کے دن ظالموں کی آنکھیں خوف سے پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی اور وہ اپنے سر اوپر اُٹھائے ہوئے دوڑ رہے ہوں گے اور ان کے دل خوف کی وجہ سے بدحواس ہوں گے مجرم زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں گے ان کے کُرتے گندھک کے ہوں گے اور ان کے چہروں کو آگ ڈھانپ رہی ہو گی۔

۶- ساتویں رکوع کی روشنی میں قرآنِ حکیم کے نُزول کے مقاصد بیان کریں؟

قرآنِ حکیم انسانوں کے لئے پیغام ہے تاکہ اُنہیں خبردار کیا جائے اور سب جان لیں کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہی اکیلا معبود ہے تاکہ عقل مند لوگ نصیحت حاصل کریں۔

سُوْرَةُ الْحِجْر

سوال ۱: خالی جگہیں پُر کریں:

(۱) آیت: ۲ میں ذکر ہے کہ قیامت کے دن کفار حسرت کریں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے۔

(۲) آیت: ۲۱ میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہر چیز کے خزانے ہیں اور وہ اُنہیں معین مقدار میں اُتارتا ہے۔

(۳) آیت: ۴۰ میں بتایا گیا ہے کہ شیطان کے حملوں سے اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے محفوظ رہیں گے۔

(۴) آیت: ۴۴ کے مطابق جہنّم کے سات دروازے ہیں۔

(۵) آیت: ۸۷ میں سات دُہرائی جانے والی آیات اور قرآنِ عظیم سُوْرَةُ الْفَاتِحَه کو قرار دیا گیا ہے۔

سوال ۲: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجئے:

۱- پہلے رکوع کی روشنی میں جواب دیں کہ قرآنِ حکیم کی حفاظت کے حوالہ سے کیا بات بیان ہوئی ہے؟

اللہ تعالیٰ نے ہی قرآنِ حکیم کو نازل فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی قرآنِ حکیم کی حفاظت فرمائے گا۔

۲- دوسرے رکوع میں ستاروں کی تخلیق کی کیا حکمتیں بیان کی گئی ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے ستاروں کو دیکھنے والوں کے لئے سجا دیا اور اسے شیطان مردود سے محفوظ کر دیا مگر جو چوری چھپے سننے کی کوشش کرے تو اس کے پیچھے ایک روشن شعلہ لگ جاتا ہے۔

۳- تیسرے رکوع کی روشنی میں بتایئے کہ شیطان نے انسانوں کے خلاف اپنے کن عزائم کا اظہار کیا؟

شیطان نے کہا کہ میں ضرور زمین میں گناہوں کو مزیّن کروں گا اور سب لوگوں کو گمراہ کر دوں گا سوائے ان لوگوں کے جو تیرے چنے ہوئے بندے ہیں۔

۴- چوتھے رکوع کی روشنی میں بتائیں کہ اہل جنّت کے لئے کن انعامات کا ذکر کیا گیا ہے؟

اہل جنّت بے خوف ہو کر اور سلامتی کے ساتھ جنّت میں داخل ہوں گے اور ان کے سینوں میں کوئی رنج و غم نہ ہو گا اور وہ بھائی بھائی بن کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے نہ اُنہیں تکلیف پہنچے گی اور نہ وہ نکالیں جائیں گے۔

۵- چھٹے رکوع کی روشنی میں بتائیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کن دس اُمور کی تلقین فرمائی۔

۱۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خوبصورتی کے ساتھ درگزر فرمایئے۔ ۲۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہرگز اپنی نگاہ بھی نہ اُٹھائیں ان چیزوں کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے ان میں

سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہیں۔ ۳۔ آپ ﷺ غم نہ کریں۔ ۴۔ آپ ﷺ اپنا شفقت کا بازو ایمان لانے والوں کے لئے جھکائیں۔
۵۔ آپ ﷺ فرما دیجئے بے شک میں تو واضح طور پر ڈرانے والا ہوں۔ ۶۔ آپ ﷺ کو جس بات کا حکم دیا گیا ہے اسے صاف صاف سنا دیجئے۔
۷۔ مشرکوں سے منہ پھیر لیجئے۔ ۸۔ آپ ﷺ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجئے۔ ۹۔ سجدہ کرنے والوں میں شامل رہیئے۔
۱۰۔ اپنے رب کی عبادت کیجئے یہاں تک کہ آپ کے پاس یقینی بات یعنی وقتِ وصال آجائے۔

سُوْرَۃُ النَّحْل (حصہ اوّل)

سوال ۱: خالی جگہیں پُر کریں:

(۱) آیت:۱۴ میں ذکر ہے کہ اللہ ﷻ کے فضل (رزق) میں سے تلاش کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔

(۲) آیت:۲۹ کے مطابق جہنّم تکبر کرنے والوں کے لئے بہت بُرا ٹھکانا ہے۔

(۳) آیت:۳۲ میں ذکر ہے کہ موت کے وقت متقین کو فرشتے سلام کرتے ہیں اور اُنہیں جنّت کی خوشخبری دیتے ہیں۔

(۴) آیت:۳۶ کے مطابق تمام رسولوں نے اللہ ﷻ کی عبادت کرنے اور شیطان کی راہ سے بچنے کی دعوت دی۔

(۵) آیت:۶۳ کے مطابق شیطان نافرمانوں کو اُن کے اعمال مزیّن کرکے دکھاتا ہے۔

سوال ۲: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجئے:

۱- پہلے رکوع میں چوپایوں سے حاصل ہونے والے کن فوائد کا ذکر کیا گیا ہے؟

چوپایوں سے حاصل ہونے والے یہ فوائد مذکور ہیں۔ ان میں سردی سے بچنے کا سامان ہے۔ بعض چوپایوں کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے۔ چوپائے وزن اُٹھا کے ایک شہر سے دوسرے شہر لے جاتے ہیں اور گھوڑے اور گدھے پیدا فرمائے تاکہ ان پر سواری کی جاسکے۔

۲- دوسرے رکوع کی روشنی میں جواب دیجئے کہ اللہ ﷻ کی بے شمار نعمتیں کس طرح اللہ ﷻ کو پہچاننے کا ذریعہ ہیں؟

وہی ہے جس نے تمہارے لئے آسمان سے پانی نازل فرمایا اُس میں سے کچھ پینے کے لئے ہے اور اسی سے درخت اُگتے ہیں وہ اسی کے ذریعہ تمہارے لئے اُگاتا ہے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل اور اس نے تمہارے لئے کام میں لگا دیا رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو اور اسی کے حکم سے ستارے بھی کام میں لگے ہوئے ہیں اور وہی ہے جس نے سمندر کو کام میں لگا دیا تاکہ تم اِس میں سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے تم زیور نکالتے ہو جسے تم پہنتے ہو اور تم کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ اِن سمندروں میں پانی کو پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں اور اس نے زمین میں پہاڑ جما دیئے تاکہ تمہیں لے کر جھک نہ جائے اور نہریں اور راستے (بنا دیئے) تاکہ تم راہ پاسکو۔

۳- تیسرے رکوع کی روشنی میں بتائیں کہ آخرت کا انکار کرنے والوں کا کیا انجام بیان ہوا ہے؟

آخرت کا انکار کرنے والے قیامت کے دن اپنے بوجھ اُٹھائیں گے اور کچھ بوجھ ان لوگوں کے بھی جنہیں وہ علم کے بغیر گمراہ کرتے رہے اور وہ بوجھ بہت بُرا ہے جو وہ اُٹھائیں گے۔

۴- چھٹے رکوع کی روشنی میں بتائیں کہ قرآنِ حکیم کے حوالہ سے نبی کریم ﷺ کی کیا ذمّہ داری بیان کی گئی ہے؟

نبی کریم ﷺ کی طرف اللہ ﷻ نے قرآنِ حکیم نازل فرمایا تاکہ آپ ﷺ لوگوں کو واضح کردیں جو ان لوگوں کی طرف نازل کیا گیا ہے تاکہ وہ غور و فکر کریں۔

۵- ساتویں رکوع میں بیٹیوں کی پیدائش پر مشرکین مکہ کا کیا طرزِ عمل بیان کیا گیا ہے؟

بیٹیوں کی پیدائش پر مشرکین مکہ کا منہ سیاہ ہو جانا اور غم و غصّہ سے بھر جانا، لوگوں سے چھپتے پھرنا اور سوچنا کہ اس بُرائی یعنی بیٹی کو ذلّت کے ساتھ رکھ لے یا مٹّی میں دبا دیں جیسے طرزِ عمل کا بیان ہوا ہے۔

سُوْرَةُ النَّحْل (حصّہ دوم)

سوال ۱: خالی جگہیں پُر کریں:

(۱) آیت: ۸۹ میں (ذکر ہے کہ قیامت کے دن ہر اُمّت پر ایک گواہ ان ہی میں سے اٹھایا جائے گا اور رسول اللہ ﷺ کو ان سب پر گواہ بنا کر لایا جائے گا۔

(۲) آیت: ۹۱ میں تلقین کی گئی ہے کہ جب تم قسم کھاؤ تو اُن کو مت توڑو جب کہ تم اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا چکے ہو۔

(۳) آیت: ۹۷ میں بتایا گیا ہے جو اچھا کام کرے مرد ہو یا عورت جب کہ وہ مومن ہو تو اللہ تعالیٰ ضرور اسے پاکیزہ زندگی کے ساتھ زندہ رکھے گا۔

(۴) آیت: ۱۱۵ میں اللہ تعالیٰ کی چار حرام کردہ چیزوں کا ذکر ہے۔ تاہم مجبوری میں ان کا استعمال جائز ہو جاتا ہے۔

(۵) آیت: ۱۲۸ میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد پرہیز گار اور نیکی کرنے والوں کو حاصل ہوتی ہے۔

سوال ۲: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیے:

۱- نویں رکوع کی روشنی میں شہد کی مکھی کے حوالہ سے کم از کم پانچ باتیں تحریر کریں۔

i- شہد کی مکھی پہاڑوں پر گھر بناتی ہے۔ ii- اس کے علاوہ بیل والے درختوں پر بھی گھر بناتی ہے۔ iii- ہر قسم کے پھولوں کا رس چوستی ہے۔

iv- ان مکھیوں سے شہد نکلتا ہے وہ مختلف پھولوں کا ہوتا ہے۔ v- اس میں لوگوں کے لئے شفاء ہوتی ہے۔

۲- دسویں رکوع میں اللہ تعالیٰ نے فرماں بردار اور نافرمان بندوں کے لئے کیا مثال بیان کی ہے؟

اللہ تعالیٰ نے فرماں بردار اور نافرمان بندوں کی یہ مثال بیان فرمائی ہے کہ ایک گونگا ہے وہ کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتا وہ اپنے مالک پر بوجھ ہے۔ مالک اسے جہاں کہیں بھیجے وہ بھلائی لے کر نہیں آتا، جب کہ فرماں بردار عدل کے ساتھ حکم دیتا ہے اور سیدھے راستہ پر ہے۔

۳- گیارہویں رکوع میں بیان کردہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے کم از کم پانچ نعمتیں تحریر کریں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جسمانی اعضاء جیسے کان آنکھیں دل عطا فرمائے۔ ۲۔ گھروں کو سکون کی جگہ بنایا۔ ۳۔ چوپایوں کی کھالوں سے گھر بنا دیئے یعنی چمڑے کے خیمے۔ ۴۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے سائے بنائے اور پہاڑوں میں غار تاکہ گرمی سے بچ سکیں۔ ۵۔ جانوروں کے اُون بنائے جس سے لباس بنتے ہیں۔

۴- تیرہویں رکوع سے وہ آیت تلاش کریں جو جمعۃ المبارک کے خطبہ میں تلاوت کی جاتی ہے اور اس میں دیئے گئے چھ احکامات تحریر کریں۔

آیت: ۹۰ ہے جو جمعۃ المبارک کے خطبہ میں تلاوت کی جاتی ہے اور اس میں دیئے گئے احکامات مندرجہ ذیل ہیں، عدل کرو، احسان کرو، رشتہ داروں کے حقوق ادا کرو، بے حیائی، بُرائی اور زیادتی سے بچو۔

۵- پندرہویں رکوع میں لوگوں کی عبرت کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک بستی کے ناشکرے لوگوں کی مثال کس طرح بیان کی؟

اللہ تعالیٰ نے اس بستی کی مثال بیان فرمائی ہے جو پورے امن و اطمینان سے تھی اس کی روزی اس کے پاس بکثرت سے چلی آ رہی تھی۔ پھر اس بستی کے لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا کفر کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھوک اور ڈر کا مزہ چکھایا جو ان کے کرتوتوں کا بدلہ تھا۔

سُوْرَۃُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْل (حصہ اوّل)

سوال ۱: خالی جگہیں پُر کریں:

(۱) آیت ۱۴ میں نامۂ اعمال کا ذکر ہے کہ قیامت کے دن انسان کا حساب لینے کے لئے انسان خود کافی ہوگا۔

(۲) آیت: ۱۶ کی روشنی میں کسی قوم کی ہلاکت کا سبب اس قوم کے خوشحال طبقہ کی نافرمانیاں بنتی ہیں۔

(۳) آیت: ۲۳ میں اللہ ﷻ نے ہمیں والدین کے بارے میں اُف تک کہنے سے منع فرمایا ہے۔

(۴) آیت: ۲۷ میں مال کو بے جا خرچ کرنے والوں کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا ہے۔

(۵) آیت: ۳۳ کی روشنی میں قاتل کو معاف کر دینے یا قصاص لینے یا خون بہا قبول کر لینے کا حق اللہ ﷻ نے مقتول کے ورثاء کو دیا ہے۔

سوال ۲: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیے:

۱- پہلی آیت کی روشنی میں مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیے۔

	سوالات	جوابات
۱	اس آیت میں کس واقعہ کا ذکر ہے؟	واقعۂ معراج کا۔
۲	اللہ ﷻ نے اپنے کس خاص و مقرب بندے کو سیر کرائی؟	سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو۔
۳	سیر کس وقت کرائی گئی؟	ایک رات کے تھوڑے سے حصّہ میں۔
۴	سیر کا آغاز کہاں سے ہوا؟	مسجد حرام سے۔
۵	سیر کا اختتام کہاں ہوا؟	سدرۃ المنتہیٰ پر۔
٦	اس سیر کی حکمت کیا تھی؟	تا کہ اللہ ﷻ اُنہیں اپنی نشانیوں میں سے دکھائے۔

۲- بنی اسرائیل کے عُروج وزوال کے مطالعہ کے بعد ان کی تاریخ مختصراً اس طرح لکھیں جیسا کہ نمونے کے لئے پہلا عروج لکھا گیا ہے۔

بنی اسرائیل کا عروج وزوال	مختصر تاریخ
بنی اسرائیل کا پہلا عُروج	حضرت یوشع بن نون علیہ السلام، حضرت طالوت، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام کی بنی اسرائیل پر بادشاہی۔
بنی اسرائیل کا پہلا زوال	۷۰۰ قبل مسیح میں آشوریوں کے ہاتھوں اسرائیل کی تباہی، ۵۸۷ قبل مسیح میں بخت نصر کے ہاتھوں یروشلم کی تباہی
بنی اسرائیل کا دوسرا عُروج	حضرت عزیر علیہ السلام کی کوششوں کی بدولت بنی اسرائیل کی آزاد ریاست کا قیام۔
بنی اسرائیل کا دوسرا زوال	۷۰ء میں رومی جنرل ٹائٹس کے ہاتھوں یروشلم کی مکمل تباہی۔

۳- دوسرے رکوع میں طالبِ دنیا اور طالبِ آخرت کا کیا انجام بیان کیا گیا ہے؟

جو شخص آخرت کو نہیں مانتا یا آخرت تک صبر کرنے کے لئے تیار نہیں اور اپنی کوششوں کا مقصود دنیا کی کامیابیوں کو ہی بناتا ہے اسے جو کچھ ملے گا بس دنیا میں مل جائے گا اور آخرت میں اسے کوئی خوشحالی نصیب نہ ہوگی اور اس طرزِ عمل سے وہ اُلٹا جہنّم کا مستحق ہوگا اور جس کا ارادہ آخرت کا ہو اور اس کے لئے کوشش کرے تو اس کے عمل کی قدر کی جائے گی اور اس نے جتنی بھی کوشش کی ہوگی اس کا پھل وہ پائے گا۔

۴- تیسرے اور چوتھے رکوع میں اسلام کی معاشرتی تعلیمات کو بیان کیا گیا ہے۔ دیئے گئے چارٹ میں متعلقہ عنوان کے سامنے آیت نمبر کا حوالہ تحریر کریں۔

نمبر شمار	اسلام کی معاشرتی تعلیمات	آیت نمبر
۱	شرک سے اجتناب کرنا	۲۲
۲	والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا	۲۳
۳	اہل حق کے حقوق ادا کرنا	۲۶
۴	مال بے جا خرچ نہ کرنا	۲۷
۵	ضرورت مندوں سے معذرت کرتے ہوئے اچھا طریقہ اختیار کرنا	۲۸
۶	مال خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرنا	۲۹
۷	اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرنا	۳۱
۸	زنا کے قریب بھی نہ جانا	۳۲
۹	کسی جان کو ناحق قتل نہ کرنا	۳۳
۱۰	یتیم کے مال کی حفاظت کرنا	۳۴
۱۱	وعدہ پورا کرنا	۳۴
۱۲	پورا ناپنا	۳۵
۱۳	پورا تولنا	۳۵
۱۴	ظن و گمان کی پیروی نہ کرنا	۳۶
۱۵	تکبر نہ کرنا	۳۷

۵- پانچویں رکوع کے مطابق ذیل میں دیئے گئے منکرین آخرت کے تین سوالات کے اللہ ﷻ نے کیا جوابات دیئے؟

نمبر شمار	منکرین آخرت کے سوالات	اللہ ﷻ کا جواب
۱	کیا ہم مرنے کے بعد جب ہڈی ہڈی اور چورہ چورہ ہو جائیں گے تو کیا دوبارہ اُٹھائے جائیں گے؟	تم پتھر بن جاؤ یا لوہا یا کوئی اور ایسی خلقت جو تمہارے دلوں میں بہت سخت معلوم ہو۔
۲	ہمیں کون دوبارہ اُٹھائے گا؟	وہی اللہ ﷻ جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا۔
۳	ہمیں کب دوبارہ اُٹھایا جائے گا؟	کیا عجب کہ وہ (ساعت) قریب ہی آن لگی ہے۔

COPYRIGHTS © RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION. SALE OF THIS BOOK WITHOUT PERMISSION ENTAILS CIVIL & CRIMINAL ACTION.

سُوْرَۃُ بَنِیٓ اِسْرَآءِیْل (حصہ دوم)

سوال ۱: خالی جگہیں پُر کریں:

(۱) آیت: ۶۰ کے مطابق اللہ ﷻ نے معراج اور لعنت کیئے گئے درخت کو لوگوں کی آزمائش کا ذریعہ بنادیا۔

(۲) آیت: ۸۰ میں سچائی کے ساتھ داخل ہونے سچائی کے ساتھ نکلنے اور غلبہ اور مدد کی دُعا کا بیان ہے۔

(۳) آیت: ۸۲ میں ذکر ہے کہ قرآنِ حکیم میں جو کچھ نازل کیا گیا ہے وہ اہل ایمان کے لئے شِفا اور رحمت ہے۔

(۴) آیت: ۸۵ میں یہود کے سوال "روح کیا ہے؟" کا جواب دیا گیا ہے کہ روح رب کے حکم سے ہے۔

(۵) آیت: ۹۷ کے مطابق جسے اللہ ﷻ ہدایت عطا فرمائے وہی ہدایت پانے والا ہے۔

سوال ۲: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیے:

۱- ساتویں رکوع کی روشنی میں انسانوں پر ہونے والے شیطان کے حملوں کے بارے میں لکھیں۔

شیطان کو ایسے تشبیہ دی گئی ہے جیسے کوئی کسی بستی پر اپنے سوار اور پیادے چڑھالائے اور ان کو اشارہ کرکے کہے کہ اِدھر لوٹو، اُدھر چھاپہ مارو۔ پیاروں سے مراد سب جن اور انسان ہیں جو مختلف شکلوں میں ابلیس کے مشن کی خدمت کررہے ہیں۔ شیطان اُمیدیں دلاتا اور سبز باغ دکھاتا ہے۔

۲- ساتویں رکوع میں بنی آدم کی کیا فضیلت بیان کی گئی ہے؟

اللہ ﷻ نے بنی آدم کو بڑی عزت دی اُنہیں خشکی اور تری کی سواریاں دیں اور پاکیزہ چیزوں کی روزیاں دیں اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت عطا فرمائی۔

۳- نویں رکوع کے آغاز میں نماز اور مقام محمود کے بارے میں کیا بیان کیا گیا ہے؟

سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک (ظہر عصر مغرب وعشا کی) نماز قائم کیجیے، بے شک فجر کے وقت قرآن (نماز پڑھنے) میں (فرشتوں کی) حاضری ہوتی ہے۔ اور رات کے کچھ حصّے میں تہجد پڑھا کیجیے جو آپ ﷺ کے لئے زائد (عبادت) ہے اُمید ہے کہ آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ کو مقامِ محمود پر فائز فرمائے گا۔

۴- بارہویں رکوع کی روشنی میں قرآنِ حکیم کے بارے میں تین باتیں تحریر کریں۔

i۔ قرآنِ حکیم کو حق کے ساتھ اُتارا۔

ii۔ قرآنِ حکیم کو تھوڑا تھوڑا کرکے اُتارا گیا۔

iii۔ جنہیں علم دیا گیا ہے ان کے پاس جب قرآنِ حکیم کی تلاوت کی جاتی ہے وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔

۵- بارہویں رکوع کے آخر میں اللہ ﷻ کی عظمت اور شان کے حوالہ سے کون سی پانچ باتیں بیان کی گئی ہیں؟

آپ ﷺ فرمادیجیے کہ تم اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو جس نام سے بھی پکارو پس اس کے سب نام اچھے ہیں اور فرمادیجیے تمام تعریفیں اللہ ﷻ کے لئے ہیں جس نے نہ کسی کو بیٹا بنایا اور نہ ہی بادشاہی میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ کسی کمزوری کی وجہ سے اس کا کوئی دوست ہے اور اس کی خوب بڑائی بیان کیجیے۔

سُورَةُ الْكَهْف (حصّہ اوّل)

سوال ۱: خالی جگہیں پُر کریں:

(۱) آیت:۷ میں ذکر ہے کہ اللہ ﷻ نے زمین کو زینت بنایا تاکہ لوگوں کی آزمائش ہو۔

(۲) آیت:۲۹ میں ذکر ہے کہ ظالمین جب جہنّم میں پانی کی فریاد کریں گے تو اُنہیں پگھلے ہوئے تانبے کی طرح کھولتا پانی پینے کے لئے دیا جائے گا۔

(۳) آیت:۳۹ کی روشنی میں جب ہم اپنے گھر، اولاد یا کاروبار کو پھلتا پھولتا دیکھ کر خوش ہوں تو ہمیں مَا شَآءَ اللّٰہُ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ کہنا چاہیۓ۔

(۴) آیت:۴۶ میں اللہ ﷻ کے ہاں ثواب پانے اور اُمید لگانے کے اعتبار سے نیکیوں کو بہتر قرار دیا گیا ہے۔

(۵) آیت:۵۷ میں اللہ ﷻ کی آیات سے منہ موڑنے والوں کو ظالم قرار دیا گیا ہے۔

سوال ۲: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیے:

۱- دوسرے اور تیسرے رکوع کی آیات کے مطابق اصحابِ کہف کے بارے میں مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیے۔

نمبر شمار	سوالات	جوابات
۱	اصحابِ کہف کا کیا عقیدہ تھا؟	اصحابِ کہف کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ ﷻ کے سوا کوئی معبود نہیں۔
۲	ان کی قوم کا کیا عقیدہ تھا؟	ان کی قوم نے اللہ ﷻ کے سوا اور معبود بنا رکھے تھے۔
۳	اصحابِ کہف نے غار میں پناہ کیوں لی؟	کیوں کہ ان کی قوم نے اُنہیں قتل کی دھمکی دی۔
۴	غار میں داخل ہوتے وقت اصحابِ کہف نے کیا دُعا کی؟	اے ہمارے رب! ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما اور ہمارے لئے ہمارے معاملہ میں رہنمائی مہیا فرما۔
۵	بیدار ہونے پر اصحابِ کہف نے اپنے سونے کی مدت کا کیا اندازہ لگایا؟	انہوں نے اندازہ لگایا کہ وہ ایک دن یا دن کا کچھ حصّہ سوئے ہوں گے۔
۶	بیدار ہونے پر اصحابِ کہف نے اپنے ایک ساتھی کو کس لئے بازار بھیجا؟	اصحابِ کہف نے اپنے ایک ساتھی کو بازار سے کچھ پاکیزہ کھانا لانے کے لئے بھیجا۔
۷	ساتھی کو بازار بھیجتے ہوئے اصحابِ کہف نے اسے کیا تلقین کی؟	اسے تلقین کی کہ نرمی سے بات کرنا اور کسی کو ہماری خبر نہ ہونے دینا۔
۸	اصحابِ کہف کے بیدار ہونے کے زمانہ میں لوگ کس حقیقت کے بارے میں اختلاف کر رہے تھے؟	اس زمانہ کے لوگ اس اندیشہ میں مبتلا تھے کہ قیامت قائم ہوگی یا نہیں؟ اور قیامت کے دن صرف روحوں کو اُٹھایا جائے گا یا جسموں کو بھی۔
۹	اصحابِ کہف کے انتقال کے بعد لوگوں نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟	بادشاہ نے غار ہی میں ان کی قبریں بنوائیں اور غار کے دہانہ کو پتھروں سے بند کر دیا۔
۱۰	اصحابِ کہف کی تعداد کیا تھی؟	اصحابِ کہف کی اصل تعداد اللہ ﷻ ہی بہتر جانتا ہے۔
۱۱	اصحابِ کہف کتنا عرصہ غار میں سوتے رہے؟	تقریباً ۳۰۰ سال شمسی اور ۳۰۹ سال قمری۔

۲- تیسرے رکوع کی روشنی میں جواب دیجیے کہ اللہ ﷻ نے اصحابِ کہف کی حفاظت کا کیا اہتمام فرمایا تھا؟

اللہ ﷻ نے ان کی حفاظت کا ایسا انتظام فرمایا کہ ان نوجوانوں کو اطمینان کی نیند سُلا دیا اور وہ ایک طویل مدت تک سوتے رہے۔ ان کا کتا غار کے دہانے پر پاؤں پھیلا کر سو گیا۔

۳- چوتھے رکوع میں قرآنِ حکیم اور اہل ایمان سے تعلق کے حوالہ سے کیا ہدایات دی گئی ہیں؟

جو آپ ﷺ کی طرف آپ ﷺ کے رب کی کتاب میں سے وحی فرمائی گئی ہے اس کی تلاوت کیجیے۔ اس کی باتوں کو بدلنے والا کوئی نہیں ہے اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھیں جو اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں اس کی رضا چاہتے ہیں اور آپ ﷺ کی نگاہیں ان سے نہ ہٹیں۔

۴- پانچویں رکوع کی آیات کے مطابق باغ والے کے بارے میں مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیے۔

	سوالات	جوابات
۱	باغ والے کے پاس انگور کے کتنے باغ تھے؟	انگور کے دو باغ تھے۔
۲	باغوں کے چاروں طرف کس چیز کی باڑ لگی ہوئی تھی؟	اللہ ﷻ نے ان دونوں باغوں کا کھجور کے درختوں سے احاطہ کر رکھا تھا۔
۳	انگوروں کے علاوہ باغ میں اور کیا تھا؟	اللہ ﷻ نے ان کے درمیان کھیتی اُگا دی تھی۔
۴	ہر موسم میں باغ میں کیسا پھل آتا تھا؟	دونوں باغ خوب پھل دیتے تھے اور اس پیداوار میں کچھ کمی نہ کرتے تھے۔
۵	باغ میں آب پاشی کا کیا نظام تھا؟	اللہ ﷻ نے ان دونوں کے درمیان ایک نہر جاری کر دی تھی۔
۶	باغ والے نے اپنے دوست کے سامنے اپنی بڑائی کا کیسے اظہار کیا؟	وہ اپنے ساتھی سے باتیں کرتے ہوئے کہنے لگا میں تم سے زیادہ مال دار ہوں اور نفری یعنی تعداد کے لحاظ سے بھی زیادہ باعزت ہوں۔
۷	باغ والے نے اپنے باغ کے بارے میں کس رائے کا اظہار کیا؟	اس نے کہا کہ میں خیال نہیں کرتا کہ یہ باغ کبھی تباہ ہو جائے گا۔
۸	باغ والے نے آخرت کے بارے میں کس رائے کا اظہار کیا؟	میں یہ خیال نہیں کرتا کہ قیامت قائم ہو گی اور اگر میں اپنے رب کی طرف واپس کیا گیا تو میں ضرور اس سے بہتر واپسی کی جگہ پاؤں گا۔
۹	دوست نے باغ والے کو کیا سمجھایا؟	اس کے ساتھی نے اس سے باتیں کرتے ہوئے کہا: کیا تم اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے تمہیں مٹی سے پیدا فرمایا پھر ایک قطرہ سے تمہیں صحیح سلامت انسان بنا دیا۔
۱۰	باغ والے کا کیا انجام ہوا؟	اور اس کے پھل عذاب میں گھیر لیے گئے تو وہ اپنے ہاتھ ملتا رہ گیا اس پر جو اُس نے اِس باغ میں خرچ کیا تھا اور وہ باغ اپنی چھتوں پر گرا پڑا تھا اور وہ کہنے لگا اے کاش! میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا۔

۵۔ چھٹے رکوع کے آخر میں آخرت کے کیا حالات بیان کیے گئے ہیں؟

اللہ ﷻ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور آپ زمین کو صاف میدان دیکھیں گے اور ہم سب (انسانوں) کو جمع فرمائیں گے تو ہم ان میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔ اور وہ آپ کے رب کے سامنے صفیں باندھے ہوئے پیش کیے جائیں گے (کہا جائے گا) یقیناً تم ہمارے پاس (اسی طرح) آئے ہو جیسے ہم نے تمہیں پہلی بار پیدا فرمایا تھا بلکہ تم نے تو یہ خیال کیا کہ ہم ہر گز تمہارے لیے وعدے کا کوئی وقت مقرر نہیں کریں گے۔ اور (اعمال کی) کتاب سامنے رکھ دی جائے گی تو آپ مجرموں کو دیکھیں گے کہ جو کچھ اس میں لکھا ہو گا اس سے ڈر رہے ہوں گے اور وہ کہیں گے ہائے ہماری خرابی یہ کیسی کتاب ہے (اس نے) نہ چھوٹی بات چھوڑی ہے اور نہ بڑی مگر (اس نے) اس کا شمار کر لیا ہے اور انہوں نے جو بھی عمل کیا ہو گا وہ اسے موجود پائیں گے اور آپ کا رب کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔

سُوْرَۃُ الْكَهْف (حصّہ دوم)

سوال ۱: خالی جگہیں پُر کریں:

(۱) آیت: ۶۳ کے مطابق مچھلی کے زندہ ہو کر سرنگ کی طرح راستہ بنا کر سمندر میں چلے جانے کا ذکر ہے۔

(۲) آیت: ۷۰ کے مطابق حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس شرط پر ساتھ چلنے کے لئے کہا کہ وہ ان سے سوال نہیں کریں گے۔

(۳) آیت: ۹۸ میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے۔

(۴) آیت: ۱۰۵ کے مطابق اللہ تعالیٰ کی آیات اور ملاقات کا انکار کرنے والوں کے لئے کوئی وزن قائم نہیں ہو گا۔

(۵) آیت: ۱۱۰ میں ذکر ہے کہ جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی اُمید رکھتا ہو اسے چاہیئے کہ وہ نیک عمل کرے اور شرک نہ کرے۔

سوال ۲: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیئے:

۱۔ نویں رکوع کی روشنی میں جواب دیجیئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات کے لئے کون سا مقام طے تھا اور اس مقام پر پہنچنے کی کیا نشانی تھی؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے نوجوان ساتھی سے کہا تھا کہ میں اپنا سفر جاری رکھوں گا یہاں تک کہ دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ پر پہنچ جاؤں اور انہوں نے ساتھی کو اس مقام کی نشانی یہ بتائی کہ مچھلی ٹوکری سے نکل کر پانی میں جائے گی۔

۲۔ دسویں رکوع کی آیات کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ کے اعتبار سے مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیئے۔

نمبر شمار	سوالات	جوابات
۱	حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟	حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی میں سوراخ کر دیا۔
۲	حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر کیا اعتراض کیا؟	حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کیا آپ نے اس لئے کشتی میں سوراخ کیا ہے کہ سب کشتی والوں کو غرق کر دیں؟ یقیناً یہ تو آپ نے بہت خطرناک کام کیا۔
۳	حضرت خضر علیہ السلام نے اس کی کیا حکمت بیان فرمائی؟	جہاں تک کشتی کا معاملہ ہے تو وہ چند مسکینوں کی تھی جو دریا میں مزدوری کرتے تھے میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں اور ان کے آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر بے عیب کشتی کو زبردستی چھین لیا کرتا تھا۔
۴	حضرت خضر علیہ السلام نے لڑکے کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟	حضرت خضر علیہ السلام نے اس لڑکے کو قتل کر دیا۔
۵	حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر کیا اعتراض کیا؟	آپ نے ایک بے گناہ کو قتل کر دیا بغیر کسی جان کے بدلہ کے یقیناً آپ نے بہت بُرا کام کیا۔
۶	حضرت خضر علیہ السلام نے اس کی کیا حکمت بیان فرمائی؟	اور وہ جو لڑکا تھا تو اس کے ماں باپ دونوں مومن تھے ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ بڑا ہو کر ان کو بھی سرکشی اور کفر میں مبتلا کر دے گا۔
۷	حضرت خضر علیہ السلام نے بستی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟	جب وہ دونوں ایک بستی والوں کے پاس آئے اور ان سے کھانا طلب کیا تو انہوں نے ان کی مہمان نوازی سے انکار کر دیا پھر دونوں نے وہاں ایک دیوار پائی جو گرنے ہی والی تھی تو حضرت خضر علیہ السلام نے اسے سیدھا کر دیا۔
۸	حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر کیا اعتراض کیا؟	موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اگر آپ چاہتے تو اس کام پر کچھ اُجرت لے لیتے۔
۹	حضرت خضر علیہ السلام نے اس کی کیا حکمت بیان فرمائی؟	وہ دیوار اس شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اس کے نیچے ان کا خزانہ دفن تھا ان کے والد ایک نیک آدمی تھے تو آپ کے رب نے ارادہ فرمایا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کو پہنچ جائیں اور اپنا خزانہ نکال لیں۔

COPYRIGHT © RESERVED WITH SAIFURRASHID BOOK MART ISLAMABAD

۳۔ گیارہویں رکوع کی آیات کے مطابق ذوالقرنین کی مہمات کے اِعتبار سے مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیے۔

نمبر شمار	سوالات	جوابات
۱	ذوالقرنین نے پہلا سفر کس سمت میں کیا؟	مغربی سمت میں۔
۲	وہاں ذوالقرنین کی ملاقات کیسے لوگوں سے ہوئی؟	وہاں انہوں نے ایک قوم کو پایا۔ اللہ ﷻ نے فرمایا کہ (اے ذوالقرنین! تمہیں اختیار ہے) چاہو توان کو سزا دو اور چاہو تو ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔
۳	ذوالقرنین نے ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟	ان سے بہت نرمی سے پیش آیا۔
۴	ذوالقرنین نے دوسرا سفر کس سمت میں کیا؟	مشرقی سمت میں۔
۵	وہاں ذوالقرنین کی ملاقات کیسے لوگوں سے ہوئی؟	وہاں ایسی خانہ بدوش قومیں تھیں جن کے نہ قلعے تھے نہ مکانات اور نہ ہی ان کے پاس سورج کی تپش سے بچنے کا کوئی معقول انتظام تھا۔
۶	ذوالقرنین کی تیسرے سفر میں ملاقات کیسے لوگوں سے ہوئی؟	اس نے ایک قوم کو پایا جو ان کی کوئی بات نہیں سمجھ سکتے تھے۔
۷	ان لوگوں نے ذوالقرنین سے کیا درخواست کی؟	انہوں نے کہا: اے ذوالقرنین! بے شک یاجوج اور ماجوج زمین میں بہت فساد مچاتے ہیں۔
۸	ان لوگوں نے ذوالقرنین کو کیا معاوضہ دینے کی پیشکش کی؟	ان لوگوں نے کہا: کیا ہم آپ کے لئے خرچ کا انتظام کر دیں اس شرط پر کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دیں؟
۹	ذوالقرنین نے اپنے کام کو کس کی رحمت قرار دیا؟	ذوالقرنین نے کہا: یہ میرے رب کی رحمت ہے۔

۴۔ بارہویں رکوع کی روشنی میں جواب دیں کہ سب سے زیادہ خسارہ اٹھانے والے کون لوگ ہیں؟

یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوششیں دنیا کی زندگی میں ضائع ہو گئیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات کا اور اس کی ملاقات کا انکار کیا پس ان کے اعمال برباد ہو گئے۔

۵۔ بارہویں رکوع کے آخر میں وُسعتِ علمِ باری تعالیٰ کی کیا شان بیان کی گئی ہے؟

اگر رب کی باتوں کے لکھنے کے لئے سمندر سیاہی بن جائے تو سمندر کا پانی ضرور ختم ہو جائے گا اس سے پہلے کہ رب کی باتیں ختم ہوں اگرچہ اس کی مدد کے لئے ویسا ہی سمندر اور آ جائے۔

سُوْرَةُ الْمُؤْمِنُوْن

سوال ۱: خالی جگہیں پُر کریں:

(۱) آیت: ۵۱ میں اللہ ﷻ نے حلال کھانے اور نیک عمل کا حکم دیا ہے۔

(۲) آیت: ۶۲ میں کتاب کا ذکر ہے جو لوگوں کے اعمال کے بارے میں سچ سچ بیان کرتی ہے۔

(۳) آیت: ۹۶ میں بُرائی کے جواب میں بھلائی کی تلقین کی گئی ہے۔

(۴) آیت: ۱۰۱ میں ذکر ہے کہ روزِ قیامت لوگوں کے درمیان رشتہ باقی نہیں رہے گا۔

(۵) آیت: ۱۱۱ میں کامیاب لوگوں کی صفت صبر بیان کی گئی ہے۔

سوال ۲: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیے:

۱- پہلے رکوع کی روشنی میں جواب دیجیے کہ جنّت الفردوس کے وارثوں کی کیا صفات بیان کی گئی ہیں؟

جنّت الفردوس کے وارثوں اہل ایمان کی صفات کے حوالہ سے بیان ہوا ہے کہ وہ اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں، بے کار باتوں سے دور رہنے والے ہیں، زکوٰۃ دینے والے ہیں، اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، اپنی امانتوں اور اپنے وعدہ کی حفاظت کرنے والے ہیں، اپنی نمازوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

۲- پہلے رکوع کی روشنی میں انسان کی تخلیق کے مختلف مراحل بیان کریں۔

اللہ ﷻ نے انسان کی تخلیق کے حوالہ سے فرمایا ہے کہ ہم نے انسان کو چُنی ہوئی مٹی سے پیدا فرمایا۔ پھر ہم نے اسے نطفہ یعنی قطرہ بنا کر ایک محفوظ جگہ رحم میں رکھا۔ پھر ہم نے اس نطفہ کو ایک جما ہوا خون بنایا پھر ہم نے اس جمے ہوئے خون کو ایک بوٹی بنایا پھر ہم نے اس بوٹی سے ہڈیاں بنائیں پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا پھر ہم نے اسے روح ڈال کر ایک دوسری مخلوق بنا دیا۔

۳- دوسرے رکوع کی روشنی میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت پر ان کی قوم کے تین اعتراضات تحریر کریں۔

i۔ ان کی قوم کے سردار جنھوں نے کفر کیا کہنے لگے کہ یہ رسول تم جیسا ایک بشر ہی تو ہے جو تم پر بڑائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ (معاذ اللہ)

ii۔ اگر اللہ ﷻ (رسول بھیجنا ہی) چاہتا تھا تو فرشتے نازل فرما دیتا۔ iii۔ بس یہ ایک آدمی ہے جسے جنون ہو گیا ہے۔ (معاذ اللہ)

iv۔ چوتھے رکوع کے آغاز میں بندۂ مومن کی کون سی باطنی صفات بیان کی گئی ہیں؟

بے شک جو لوگ اپنے رب کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں اور وہ جو اپنے رب کی آیات پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے اور جو لوگ (اللہ ﷻ کی راہ میں) دیتے ہیں جو کچھ وہ اس حال میں دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرتے ہیں کہ اُنھیں اپنے رب کے پاس واپس جانا ہے۔

۵- چھٹے رکوع میں مشرکین کے حوالہ سے مندرجہ ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

نمبر شمار	سوالات	جوابات
۱	اللہ ﷻ نے مشرکین سے کس بات کا وعدہ کیا ہے؟	سخت عذاب دینے کا۔
۲	اللہ ﷻ کس بات پر قادر ہے؟	یقیناً ہم اس پر قادر ہیں کہ ہم آپ کو وہ (عذاب) دکھا دیں جس کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں۔
۳	مشرکین اپنی موت کے وقت اللہ ﷻ سے کیا درخواست کریں گے؟	جب ان (منکروں) میں سے کسی پر موت آئے گی تو کہے گا اے میرے رب! مجھے (دنیا میں) واپس بھیج دے۔ تاکہ جس (دنیا) کو میں چھوڑ کر آیا ہوں اس میں نیک عمل کروں۔
۴	اللہ ﷻ مشرکین کی درخواست کا کیا جواب دے گا؟	ہرگز (ایسا) نہیں ہو گا یہ تو بس ایک (فضول) بات ہے جو وہ کہہ رہا ہے۔
۵	صور پھونکے جانے پر مشرکین کی کیا کیفیت ہو گی؟	جب صور میں پھونکا جائے گا تو اس دن ان کے درمیان نہ رشتہ داریاں رہیں گی اور نہ ہی وہ آپس میں سوال کر سکیں گے۔
۶	قیامت کے دن جن لوگوں کے نیک اعمال کا پلڑا ہلکا ہو گا ان کا کیا انجام ہو گا؟	جس کے (نیک اعمال کے) پلڑے بھاری ہوں گے پس وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔
۷	قیامت کے دن مشرکین پر عذاب کی کیا کیفیت ہو گی؟	آگ ان کے چہروں کو جُھلسا دے گی اور وہ اس میں بد شکل ہو رہے ہوں گے۔
۸	اللہ ﷻ مشرکین پر عذاب کا کیا سبب بیان کرے گا؟	(ان سے کہا جائے گا) کیا تمھیں میری آیات پڑھ کر سنائی نہیں جاتی تھیں تو تم ان کو جھٹلایا کرتے تھے۔

۹	جہنّم کے عذاب میں گرفتار مشرکین اللہ ﷻ سے کیا درخواست کریں گے؟	اے ہمارے رب! ہمیں یہاں سے نکال دیجیے پھر اگر ہم دوبارہ وہی (کام) کریں تو بے شک ہم ظالم ہوں گے۔
۱۰	اللہ ﷻ مشرکین کی درخواست کا کیا جواب دے گا؟	اللہ ﷻ فرمائے گا کہ اسی میں ذلّت کے ساتھ پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔

سُوْرَةُ الزُّمَر

سوال ا: خالی جگہیں پُر کریں:

(۱) آیت:۱۰ کی روشنی میں صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر دیا جائے گا۔

(۲) آیت:۱۸ میں ذکر ہے کہ اللہ ﷻ کی طرف سے ہدایت اُن لوگوں کو ملتی ہے جو اس کے کلام کو غور سے سنتے اور اس کی پیروی کریں۔

(۳) آیت:۳۸ میں ذکر ہے کہ اللہ ﷻ رسول اکرم ﷺ کے لئے کافی ہے۔

(۴) آیت:۴۹ کی روشنی میں ایک ناشکر گزار انسان نعمت ملنے کا سبب اپنے علم کو قرار دیتا ہے۔

(۵) آیت:۶۸ کے مطابق جب پہلا صور پھونکا جائے گا تو ساری دنیا بے ہوش ہو جائے گی۔

سوال ۲: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیے:

ا۔ پہلے رکوع کے آخر میں تکالیف اور نعمتوں کے بارے میں دنیادار انسان کی کیا روش بیان کی گئی ہے؟

جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہوئے اسی کو پکارتا ہے پھر جب وہ اسے اپنی طرف سے کوئی نعمت عطا فرماتا ہے تو وہ اس (تکلیف) کو بھول جاتا ہے جس کے لئے پہلے اللہ ﷻ کو پکار رہا تھا اور اللہ ﷻ کے لئے کئی شریک بنالیتا ہے تاکہ دوسروں کو بھی اس کے راستہ سے گمراہ کرے۔

۲۔ دوسرے رکوع کی روشنی میں جواب دیں کہ قیامت کے دن کھلے خسارے میں کون لوگ ہوں گے؟ نیز جہنّم میں ان پر عذاب کی کیا کیفیت ہوگی؟

بے شک نقصان اٹھانے والے وہ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو قیامت کے دن نقصان میں ڈالا، آگاہ ہو جاؤ! یہی تو کُھلا نقصان ہے۔ ان کے لئے ان کے اوپر سے آگ کے شعلے ہوں گے اور ان کے نیچے (بھی آگ کے) شعلے ہوں گے۔

۳۔ تیسرے رکوع کے آغاز میں قرآنِ حکیم کی کیا عظمت بیان کی گئی ہے؟

اللہ ﷻ نے بہترین کلام نازل فرمایا ہے یعنی ایسی کتاب جس کی آیتیں آپس میں ملتی جلتی ہیں (اور) بار بار دُہرائی جاتی ہیں اس سے (ان کی) کھالوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں پھر ان کی کھالیں اور ان کے دل جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں نرم ہو جاتے ہیں اللہ ﷻ کے ذکر کی طرف یہ اللہ ﷻ کی ہدایت ہے۔

۴۔ چھٹے رکوع کے آغاز میں اللہ ﷻ کے عذاب سے بچنے کے لئے کن کاموں کے کرنے کا ذکر کیا گیا ہے؟

اپنے رب کی طرف رجوع کرو اور اس کے فرماں بردار بن جاؤ، اور اس بہترین (کتاب) کی پیروی کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل فرمائی گئی ہے۔

۵۔ آٹھویں رکوع کی روشنی میں اہلِ جہنّم اور اہلِ جنّت کے احوال کا موازنہ کریں۔

اہلِ جہنم کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ جہنّم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آئیں گے تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے داروغہ ان سے کہیں گے کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے رسول نہیں آئے تھے جو تمہیں تمہارے رب کی آیات پڑھ کر سناتے تھے اور تمہیں اس دن کی ملاقات سے ڈراتے تھے۔

اور اہلِ جنت وہ لوگ ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے رہے اُنہیں گروہ در گروہ جنّت کی طرف لے جایا جائے گا یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے (پہلے ہی) کھولے جا چکے ہوں گے اور اس کے محافظ ان سے کہیں گے تم پر سلام ہو تم خوب رہے پس اس میں ہمیشہ رہنے کے لئے داخل ہو جاؤ۔

سُوْرَۃُ الْمُؤْمِن

سوال ا: خالی جگہیں پُر کریں:

(ا) آیت: ۱۹ میں ذکر ہے کہ اللہ ﷻ آنکھوں کی خیانت کو بھی جانتا ہے اور اسے بھی جو کچھ سینوں میں پوشیدہ ہے۔

(۲) آیت: ۴۶ میں ذکر ہے کہ آلِ فرعون کو صبح اور شام آگ کا عذاب دیا جاتا ہے۔

(۳) آیت: ۴۹ کے مطابق جہنّم والے جہنّم کے داروغہ سے اللہ ﷻ سے دُعا کرنے کی التجا کا کہیں گے۔

(۴) آیت: ۵۸ کے مطابق اللہ ﷻ نے گناہ گار شخص کو اَندھے سے تشبیہ دی ہے۔

(۵) آیت: ۶۰ کے مطابق اللہ ﷻ سے دُعا نہ کرنے والے تکبر کرنے والے ہیں اور اُن کا ٹھکانا جہنّم میں ہو گا۔

سوال ۲: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیے:

ا- پہلے رکوع کے آغاز میں ذکر ہونے والی اللہ ﷻ کی صفات کا دُعا سے تعلق بیان کریں۔

اللہ ﷻ کی عبادت کا ایک اہم تقاضا یہ ہے کہ دُعا صرف اللہ ﷻ سے کی جائے۔ حدیث مبارکہ میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا "دُعا ہی عبادت ہے"۔ (جامع ترمذی) ہمیں اپنے ہر معاملہ میں اللہ ﷻ سے دُعا مانگنی چاہیئے کیونکہ اللہ ﷻ ہی کُل نفع و نقصان کا مالک اور صاحبِ قدرت و اختیار ہے۔ اس سورت کے آغاز میں صفات باری تعالیٰ کا بیان ہے کہ اللہ ﷻ گناہ معاف فرمانے والا اور توبہ قبول فرمانے والا سخت سزا دینے والا بڑے فضل والا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اسی کی طرف واپس جانا ہے۔ پھر اہل ایمان کے لئے فرشتوں کی دُعاؤں کا ذکر ہے۔

۲- پہلے رکوع میں بیان کی گئی فرشتوں کی اہل ایمان کے حق میں دُعائیں تحریر کریں۔

اے ہمارے رب! تو نے اپنی رحمت اور اپنے علم سے ہر چیز کا احاطہ فرمایا ہوا ہے پس ان لوگوں کو بخش دے جنہوں نے توبہ کی اور تیرے راستہ کی پیروی کی اور اُنہیں جہنّم کے عذاب سے بچالے۔ اے ہمارے رب! اور اُنہیں ہمیشہ رہنے والے باغات میں داخل فرما جن کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے اور اُنہیں بھی جو نیک ہوں ان کے باپ دادا اور بیویوں اور اولادوں میں سے اور اُنہیں بُرائیوں سے بچا۔

۳- چوتھے اور پانچویں رکوع کی روشنی میں آل فرعون کے ایک بندۂ مومن کے ایمان افروز خطاب سے متعلق مندرجہ ذیل سوالات کے جواب دیجیے۔

نمبر شمار	سوالات	جوابات
ا	آلِ فرعون میں سے وہ بندۂ مومن کون تھا؟	وہ آل فرعون کا ایک مومن مَرد تھا جو اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا۔
۲	فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شہید کرنے کا حکم دیا تو بندۂ مومن نے فرعون کے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دفاع کیسے کیا؟	بندۂ مومن نے کہا: کیا تم ایک شخص کو صرف اس لئے قتل کر رہے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ﷻ ہے حالانکہ وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح نشانیاں لے کر آئے ہیں۔
۳	بندۂ مومن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کیا عقلی دلائل دیئے؟	(بالفرض) اگر وہ جھوٹے ہیں تو ان کا جھوٹ انہی پر ہے اور اگر وہ سچے ہیں تو وہ جو تم سے وعدہ کر رہے ہیں اس کا کچھ (عذاب) تم پر (ضرور) پہنچے گا بے شک اللہ ﷻ (اس کو) ہدایت نہیں دیتا جو حد سے بڑھنے والا سخت جھوٹا ہو۔
۴	بندۂ مومن نے اللہ ﷻ کے عذاب کے بارے میں قوم کو کیا سمجھایا؟	اور اس شخص نے کہا جو ایمان لایا تھا اے میری قوم! بے شک میں ڈرتا ہوں کہ تم پر پہلی قوموں جیسا (عذاب کا) دن نہ آجائے اور اے میری قوم! میں تم پر چیخ و پکار کے دن سے ڈرتا ہوں۔

۵	بندۂ مومن نے کن نافرمان قوموں کی مثالیں دیں جن پر اللہ ﷻ کا عذاب آچکا تھا؟	حضرت نوح (علیہ السلام) کی قوم اور عاد اور ثمود پر (عذاب) آیا اور ان لوگوں پر جو ان کے بعد ہوئے۔
۶	بندۂ مومن نے اپنی قوم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے آنے والے کس رسول کی یاد دلائی؟	حضرت یوسف علیہ السلام کی جو واضح نشانیوں کے ساتھ آئے تھے۔
۷	بندۂ مومن نے تکبر کرنے والوں اور سرکشوں کو کیا وعید سنائی؟	اللہ ﷻ ہر متکبر و سرکش کے (پورے) دل پر مہر لگا دیتا ہے۔
۸	فرعون نے بندۂ مومن کے خطاب کے اثرات زائل کرنے کے لئے اپنے وزیر ہامان کو کیا تجویز دی؟	فرعون نے کہا اے ہامان! میرے لئے ایک اُونچی عمارت بناؤ تاکہ میں (اس پر چڑھ کر) راستوں تک پہنچ جاؤں یعنی آسمانوں کے راستوں پر پھر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معبود کو جھانک کر دیکھوں اور یقیناً میں اُس کو جھوٹا سمجھتا ہوں۔
۹	بندۂ مومن نے اپنے خطاب میں دنیا اور آخرت کی زندگی کا کیا موازنہ کیا؟	اے میری قوم! یہ دنیا کی زندگی تو بس (چند روزہ) فائدہ ہے اور بے شک آخرت ہی ہمیشہ رہنے کا گھر ہے۔
۱۰	بندۂ مومن نے اپنے خطاب کے آخر میں کس طرح کھل کر توحید کی دعوت دی اور شرک کی مذمت کی؟	بندۂ مومن نے کہا تم مجھے دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ ﷻ کا انکار کروں اور اس کے ساتھ شرک کروں جس کا مجھے کوئی علم نہیں اور میں تمہیں بلاتا ہوں بہت غالب بہت بخشنے والے (اللہ ﷻ) کی طرف۔ سچ تو یہ ہے کہ جس کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو وہ نہ دنیا میں پکارنے کے قابل ہے اور نہ آخرت میں۔

۴- ساتویں رکوع میں اللہ ﷻ کی بیان کردہ قدرتوں میں کم از کم پانچ قدرتیں تحریر کریں۔

i۔ اللہ ﷻ ہی ہے جس نے تمہارے لئے رات کو بنایا تاکہ تم اس میں آرام حاصل کرو۔ ii۔ دن کو روشن بنایا۔

iii۔ اللہ ﷻ ہی ہے جس نے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا۔ iv۔ آسمان کو چھت بنایا۔ v۔ سب کی صورتیں بنائیں تو (کیا ہی) اچھی تمہاری صورتیں بنائیں۔

۵- آٹھویں رکوع کے آغاز میں حق کو جھٹلانے والوں کا کیا بُرا انجام بیان کیا گیا ہے؟

جن لوگوں نے (اللہ ﷻ کی) کتاب کو جھٹلایا اور اس چیز کو بھی (جھٹلایا) جس کے ساتھ ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا پس عنقریب وہ جان لیں گے جب ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی (جن سے) وہ گھسیٹے جائیں گے اور وہ کھولتے ہوئے پانی میں پھر آگ میں جھونکے جائیں گے۔

سُوْرَةُ حٰمٓ السَّجْدَة

سوال ۱: خالی جگہیں پُر کریں:

(۱) آیت: ۲۶ کے مطابق کفار نے مسلمانوں پر غالب آنے کے لئے ایک دوسرے کو قرآنِ حکیم سننے سے روکا تھا۔

(۲) آیت: ۳۱ کے مطابق اہلِ جنّت دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اہلِ ایمان کے دوست ہوتے ہیں۔

(۳) آیت: ۳۴ میں بدی کے ساتھ بھلائی کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔

(۴) آیت: ۳۶ کے مطابق شیطان کے حملوں سے بچنے کے لئے تعوّذ پڑھ کر اللہ ﷻ کی پناہ مانگنے کا کہا گیا ہے۔

(۵) آیت: ۵۳ میں اللہ ﷻ نے لوگوں پر قرآنِ حکیم کی حقیقت واضح کرنے کی پیش گوئی فرمائی ہے۔

سوال ۲: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیے:

۱- پہلے رکوع میں قرآنِ حکیم کے حوالہ سے مندرجہ ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

نمبر شمار	سوالات	جوابات
۱	قرآنِ حکیم کس کی طرف سے نازل کیا ہوا ہے؟	قرآنِ حکیم اللہ ﷻ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔
۲	قرآنِ حکیم کیا ہے؟	قرآنِ حکیم اللہ ﷻ کی ایک کتاب ہے۔
۳	قرآنِ حکیم کی آیات کی کیا صفت بیان کی گئی ہے؟	قرآنِ حکیم کی آیات کھول کھول کر بیان کی گئی ہیں۔
۴	قرآنِ حکیم کس زبان میں نازل کیا گیا ہے؟	قرآنِ حکیم عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے۔
۵	قرآنِ حکیم سے فائدہ کون لوگ اٹھا سکتے ہیں؟	قرآنِ حکیم پر ایمان لانے اور عملِ صالح کرنے والے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔
۶	مومنین کو قرآنِ حکیم کیا پیغام دیتا ہے؟	مومنین کے لئے نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔
۷	مشرکین کو قرآنِ حکیم کیا پیغام دیتا ہے؟	مشرکین کے لئے ہلاکت ہے۔
۸	اکثر مشرکین نے قرآنِ حکیم کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟	اکثر مشرکین نے قرآنِ حکیم سے منہ موڑ لیا۔
۹	مشرکین کے دلوں کی کیا کیفیت بیان کی گئی ہے؟	مشرکین کے دلوں پر پردے ہیں۔
۱۰	مشرکین کے کانوں کی کیا کیفیت بیان کی گئی ہے؟	مشرکین کے کانوں پر بوجھ ہے۔

۲۔ تیسرے رکوع کی روشنی میں جواب دیجیے کہ قیامت کے دن اہلِ جہنّم کے خلاف کون گواہی دے گا نیز بتائیں کہ یہ لوگ دنیا میں اللہ ﷻ کے بارے میں کیا گمان کیا کرتے تھے؟

جب وہ اس (جہنّم) کے پاس پہنچ جائیں گے تو ان کے کان ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں ان کے خلاف گواہی دیں گی ان سے کہا جائے گا کہ تم تو گمان کرتے تھے کہ اللہ ﷻ (تمہارے) بہت سے (اعمال) جانتا ہی نہیں جو تم کرتے ہو۔

۳۔ پانچویں رکوع کی روشنی میں زمین کے بارے میں تین باتیں تحریر کریں۔

i۔ اس کی نشانیوں میں سے (یہ بھی) ہے کہ تم زمین کو دیکھتے ہو وہ دبی (خشک) پڑی ہوتی ہے۔

ii۔ پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ اُبھر آتی ہے۔ iii۔ پھولتی ہے۔

۴- پانچویں رکوع کی روشنی میں جواب دیں کہ قرآنِ حکیم کی کیا عظمت بیان کی گئی ہے نیز بیان کیجیے کہ قرآنِ حکیم پر ایمان لانے والوں اور قرآنِ حکیم کا انکار کرنے والوں پر قرآنِ حکیم کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

یقیناً یہ قرآنِ حکیم ایک زبردست کتاب ہے اور یہ بڑی حکمت والے، بہت تعریفوں والے اللہ ﷻ کا نازل کیا ہوا ہے۔ نیز یہ بھی بیان ہوا کہ جو ایمان لائے یہ قرآنِ حکیم ان لوگوں کے لئے ہدایت اور شفا ہے اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور یہ (انکارِ قرآن) ان کے حق میں اندھا پن ہے۔

۵۔ چھٹے رکوع میں اللہ ﷻ کے ناشکرے اور بے صبرے انسانوں کی کیا کیفیت بیان کی گئی ہے؟

اگر ایسے شخص کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو مایوس (اور) نااُمید ہو جاتا ہے اور اگر ہم اسے اپنی جانب سے رحمت سے لطف اندوز کریں اُس تکلیف کے بعد جو اُسے پہنچی تھی تو وہ ضرور کہنے لگتا ہے کہ یہ تو میرا حق تھا۔

سُوْرَةُ الشُّوْرٰی

سوال ۱: خالی جگہیں پُر کریں:

(۱) آیت:۵ میں ذکر ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں اور اہل زمین کے لئے مغفرت مانگتے رہتے ہیں۔

(۲) آیت:۱۱ میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مثال دیناہی ممکن نہیں ہے۔

(۳) آیت:۱۴ کے مطابق تفرقہ کی اصل وجہ آپس کی ضد ہوتی ہے۔

(۴) آیت:۴۳ کے مطابق صبر کرنا اور معاف کرنا بڑی ہمت کے کام ہیں۔

(۵) آیت:۵۲ کے مطابق ایمان کے حصول کا ذریعہ قرآن حکیم کو قرار دیا گیا ہے۔

سوال ۲: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیئے:

۱- پہلے رکوع کی روشنی میں جواب دیجیئے کہ قیامت اور اس دن لوگوں کے انجام کے بارے میں کیا ذکر کیا گیا ہے؟

قیامت جمع ہونے کا دن ہے جس سے خبر دار کیا گیا ہے اور اس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ اس دن ایک گروہ جنّت میں ہو گا اور ایک گروہ بھڑکتی آگ میں۔

۲- دوسرے رکوع کی روشنی میں جواب دیجیئے کہ اللہ تعالیٰ نے جلیل القدر رسولوں کو اور ان کی اتباع کرتے ہوئے ہمیں کیا حکم فرمایا؟

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ مقرر فرمایا ہے جس کا حکم اس نے حضرت نوح علیہ السلام کو دیا تھا اور جس کی وحی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھیجی ہے اور جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیا تھا کہ دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ اسی لئے اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان جلیل القدر رسولوں علیہم السلام کی اتباع کرتے ہوئے ہم بھی دین کو قائم کرنے کی جدوجہد میں لگے رہیں۔

۳- دوسرے رکوع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب (یہود) کے بارے میں کیا خصوصی ہدایات عطا فرمائیں؟

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمادیجیئے میں ہر کتاب پر ایمان لایا جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل قائم کروں اللہ تعالیٰ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے، ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال۔ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔

۴- چوتھے رکوع کی روشنی میں جواب دیجیئے کہ نیک لوگوں کے کیا اوصاف بیان کیئے گئے ہیں؟

نیک لوگوں کے یہ اوصاف بیان ہوئے ہیں کہ وہ لوگ جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں اور جب اُنہیں غصّہ آتا ہے (تو) معاف کر دیتے ہیں اور وہ اپنے رب کا حکم مانتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور ان کے معاملات آپس کے مشورے سے طے ہوتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے اُنہیں عطا فرمایا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

۵- پانچویں رکوع کی روشنی میں جواب دیجیئے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد کے بارے میں کیا ذکر فرمایا ہے؟

اولاد کے حوالہ سے چار باتیں بیان ہوئی ہیں:

i۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بیٹیاں عطا فرماتا ہے۔ ii۔ جس کو چاہتا ہے بیٹے عطا فرماتا ہے۔ iii۔ جس کو چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں ملا کر جوڑے عطا فرماتا ہے۔ iv۔ جسے چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے۔ پھر آخر میں بیان ہوا کہ بے شک وہ خوب جاننے والا بڑی قدرت رکھنے والا ہے۔

مطالعہ قرآنِ حکیم برائے طلباء وطالبات حصّہ پنجم کی سورتوں کے مقاصدِ مطالعہ

سُوْرَۃُ الْاَنْعَام

مقاصدِ مطالعہ: اس سورت کے مطالعہ کے بعد طلبہ کو مندرجہ ذیل مضامین سے آگاہی حاصل ہونی چاہیئے:

1. آیات: ۱تا۶: اسلام کے بنیادی عقائد، وجود باری تعالیٰ اور توحید، اللہ ﷻ کی صفات، قدرت اور حاکمیت کے دلائل، حق کو جھٹلانے والوں اور پچھلی نافرمان قوموں کے انجام سے درس عبرت کا بیان۔
2. آیات: ۷تا۱۶: وحی اور ایمان بالرسالت پر مشرکین کے شبہات واعتراضات کے رد پر دلائل، اللہ ﷻ کی قدرتوں کا بیان، توکل علی اللہ کا ذکر۔
3. آیات: ۱۷تا۲۰: نفع ونقصان کا اختیار اللہ ﷻ کے پاس ہونے کا ذکر، نزول قرآن کا ایک مقصد عذاب سے خبردار کرنا۔
4. آیات: ۲۱تا۲۸: مشرکین کے ایمان لانے سے انکار کرنے کی وجوہات، قیامت کے روز عدالت الٰہی میں مشرکین سے سوال وجواب کی کیفیت اور مشرکین کی بدنصیبی کا ذکر۔
5. آیات: ۲۹تا۴۱: مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیئے جانے کی عقلی دلیل، قیامت کے دن اعمال کا حساب ہونے اور اعمال کی جزا ملنے پر دلائل، مشرکین کی مخالفت پر نبی کریم ﷺ کے لئے تسلی، دنیا کی بے ثباتی اور منکرین باری تعالیٰ کی ہدایت سے محرومی کا ذکر۔
6. آیات: ۴۲تا۵۰: کفار کو ڈھیل دے کر ان کی گرفت کرنے کا بیان، رسول اللہ ﷺ کی تسلی کے لئے سابقہ رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کے انجام کا ذکر، منکرین حق کے لئے عذاب کی وعید اور معجزہ طلب کرنے والے منکرین حق کے لئے جواب۔
7. آیات: ۵۱تا۶۰: کفار کو عذاب سے ڈرانے کی تلقین، مخلص اہل ایمان کی دلجوئی کی تاکید، آزمائش کی حکمت اور توبہ کی تاکید شرک کا رد اور توحید کا درس، غیب کے خزانوں اور اللہ ﷻ کے کمال علم وقدرت کا بیان۔
8. آیات: ۶۱تا۷۳: اللہ ﷻ عذاب دینے پر قادر اور مصائب سے بچانے والا، حق سے تمسخر کرنے والوں سے کنارہ کشی کا حکم، منکرین حق کو نصیحت کی تلقین، اللہ ﷻ کو پکارنے، نماز ادا کرنے اور تقویٰ کی تلقین۔
9. آیات: ۹۱تا۱۰۰: منکرین حق کے اعتراض کا جواب، قرآن حکیم بابرکت کتاب، ظالموں پر موت کی سختیوں اور ان سے سوال وجواب کا ذکر، اللہ ﷻ کی قدرت وصفات اور اس کی نعمتوں کا بیان۔

(نوٹ: اس سورت کی آیات: ۷۴تا۹۰ مطالعہ قرآنِ حکیم حصّہ دوم قصّہ حضرت ابراہیم علیہ السلام میں دی گئی ہیں۔)

10. آیات: ۱۰۱تا۱۱۰: اللہ ﷻ کے لئے بیوی بچوں کی نفی، اللہ ﷻ کی عظمت قدرت اور صفات، باطل معبودوں کو برا کہنے کی ممانعت اور جانتے بوجھتے حق سے اعراض کرنے والوں سے قبول حق کی توفیق چھین لیئے جانے کا ذکر۔
11. آیات: ۱۱۱تا۱۲۱: منکرین حق کی ہٹ دھرمی اور دشمنی، قرآنِ حکیم کی حقانیت، قرآن مجید سے فائدہ اٹھانے اور محروم رہنے والے لوگ، قرآن حکیم کی شان وعظمت اور حلال وحرام ذبیحوں کے احکام۔
12. آیات: ۱۲۲تا۱۴۰: مومن وکافر میں فرق، صراط مستقیم کی وضاحت، ہدایت وگمراہی کے راستہ پر چلنے کی علامت، روزِ قیامت جنات اور انسانوں سے بازپرس، رسولوں کے ذریعہ لوگوں پر اتمام حجت، اللہ ﷻ کی شانِ بے نیازی، کافروں کے لئے سخت وعید اور مشرکین کے غلط عقائد کی مذمت کا بیان۔
13. آیات: ۱۴۱تا۱۵۰: نباتات وحیوانات میں اللہ ﷻ کی قدرت کاملہ کے حیرت انگیز کمالات، کھلے دشمن شیطان کی پیروی کی ممانعت، آٹھ مویشیوں کی حلت اور سرکشی کی وجہ سے یہود پر چند حلال چیزوں کا حرام کر دیا جانا۔
14. آیات ۱۵۱تا۱۵۵: والدین کے ساتھ احسان کرنے کا حکم، ظاہری اور باطنی بے حیائیوں سے بچنے کی تاکید، تنگدستی کی وجہ سے اولاد کو قتل نہ کرنے

COPYRIGHTS © RESERVED WITH THE ILM FOUNDATION. SALE OF THIS BOOK WOULD LEAD TO CRIMINAL ACTION.

کا حکم، ناحق قتل کرنے سے اجتناب کا حکم، یتیم کے ساتھ حسن وسلوک کا حکم، ناپ تول میں کمی نہ کرنے کی تاکید، عدل کرنے کا حکم، اللہ ﷻ سے کیئے گئے وعدہ کو پورا کرنے کی تاکید، صراطِ مستقیم کی پیروی کا حکم، بابرکت قرآن مجید کی پیروی کا حکم۔

15. آیات ۱۵۶ تا ۱۶۵: قرآن حکیم کا ہدایت ورحمت ہونا، موت یا عذاب آجانے پر ایمان لانا فائدہ مند نہ ہونا، تفرقہ بازی کا انجام، ایک نیکی کا بدلہ کم از کم دس گنا، صراطِ مستقیم کی وضاحت، اللہ ﷻ کی فرماں برداری کے لئے خوب محنت کرنے کا تقاضا، دنیاوی آسائشیں اور سازوسامان آزمائش کا ذریعہ۔

سُوْرَةُ الْاَعْرَاف

مقاصدِ مطالعہ: اس سورت کے مطالعہ کے بعد طلبہ کو مندرجہ ذیل مضامین سے آگاہی حاصل ہونی چاہیئے:

1. آیات: ۱ تا ۵: کتاب اللہ کے نازل کرنے کا مقصد اور اس پر عمل کا تاکیدی حکم، سابقہ قوموں پر عذاب کا حال اور ان کی طرف سے اپنے ظلم کا اقرار۔
2. آیات: ۶ تا ۱۰: تمام امتوں سے پیغمبروں کی دعوت قبول کرنے کے بارے میں سوال، میزانِ عدل پر اعمال تولے جانے اور کامیاب ہونے والوں کا ذکر، خسارے میں رہنے والوں کا بیان اور مخلوق پر انعاماتِ خداوندی کا بیان۔

(نوٹ: اس سورت کی آیات: ۱۱ تا ۲۷ مطالعۂ قرآنِ حکیم حصہ اوّل میں حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ میں دی گئی ہیں)

3. آیات: ۲۸ تا ۳۱: اتباعِ شریعت، نماز میں ستر پوشی اور زینت کا حکم، کھانے، پینے میں میانہ روی کا حکم اور فضول خرچی کی ممانعت۔
4. آیات: ۳۲ تا ۳۹: کفار کو غلط عقائد پر تنبیہ، ظاہری و باطنی برائیوں کی حرمت، حرام چیزوں کی تفصیل، کفار و مشرکین کے انجام اور متکبرین و مکذبین کی سزا کا بیان۔
5. آیات: ۴۰ تا ۴۹: منکرین کی جنت سے محرومی، جنت میں داخلہ کی شرط اور اہل جنت کے احوال، جنتیوں کا اظہارِ تشکر، اہل جنت و دوزخ کی گفتگو اور اہل اعراف کا تذکرہ۔
6. آیات: ۵۰ تا ۵۳: اہل دوزخ کی اہل جنت سے فریاد، دوزخیوں کی باہمی گفتگو اور ان کی حالتِ زار اور کتاب اللہ کے ہدایت ورحمت ہونے کا بیان۔
7. آیات: ۵۴ تا ۵۸: چھ دن میں زمین و آسمان کی تخلیق، اللہ ﷻ کی عطا کردہ نعمتیں اس کے وجود اور وحدانیت کی دلیل، اللہ ﷻ کے خالق وحاکم ہونے کا ذکر، دعا کی تاکید، اس کے طریقہ کار کا ذکر اور کائنات میں تصرفاتِ خداوندی کا بیان۔

(نوٹ: اس سورت کی آیات: ۵۹ تا ۷۹ اور ۸۵ تا ۹۳ مطالعۂ قرآنِ حکیم حصہ اوّل میں حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کے قصّوں میں، جبکہ آیات: ۸۰ تا ۸۴ مطالعۂ قرآنِ حکیم حصہ چہارم میں حضرت لوط علیہ السلام کے قصہ میں دی گئی ہیں)

8. آیات: ۹۴ تا ۹۹: انبیاء علیہم السلام کو جھٹلانے والوں کو اچانک پکڑنے کا ذکر، مکذبین و منکرین کی بدنصیبی، لوگوں کی عذاب سے بے خوفی اور اللہ ﷻ کی تدبیر
9. آیات: ۱۰۰ تا ۱۰۲: کفار کے دلوں پر مہر لگ جانے کا بیان اور بدعہدوں کی کثرت کا ذکر۔

(نوٹ: اس سورت کی آیات: ۱۰۳ تا ۱۵۵ مطالعۂ قرآنِ حکیم حصہ دوم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں دی گئی ہیں)

10. آیات: ۱۵۶ تا ۱۶۲: نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں، حضورِ اکرم خاتم النبیین ﷺ کی عالمگیر نبوت کا تذکرہ، بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کا ذکر، انعامات خداوندی اور احکام الٰہیہ کا بیان۔
11. آیات: ۱۶۳ تا ۱۷۱: ہفتہ کے دن کے حکم کی خلاف ورزی کا بیان، نصیحت کرنے والوں کی نجات اور نافرمانوں پر عذاب کا ذکر، تورات میں تحریف کرنے اور رفع جبل کا واقعہ۔
12. آیات: ۱۷۲ تا ۱۷۸: روح اور اس کے تقاضے، عالم ارواح میں روح سے عہدِ الست لینے کا ذکر، روحانی تقاضوں کو پس پشت ڈالنے والوں اور ہدایت کے بعد گمراہی میں پڑنے والوں کا بیان اور اللہ ﷻ کی آیات کو جھٹلانے والوں کی مثال۔

13. آیات: ۱۷۹ تا ۱۸۳: حق کی تکذیب کرنے والے کا چوپایوں کی مانند ہونے کا ذکر، اسمائے حسنیٰ کے ساتھ دعا کرنے کا حکم، منکرین و مکذبین کو ڈھیل دینے کا ذکر اور نافرمانوں کے لئے مجرموں کے احوال سے عبرت حاصل کرنے کا بیان۔

14. آیات: ۱۸۴ تا ۱۸۸ آنحضرت ﷺ کے نذیر ہونے کا بیان، غور و فکر کی ترغیب اور سرکشی میں بھٹکنے والوں اور قیامت کے وقوع کے علم کا ذکر۔

15. آیات: ۱۸۹ تا ۱۹۸ تخلیق انسانی کا بیان، اللہ ﷻ کی قدرتِ کاملہ کا ذکر، شرک کی حقیقت اور مذمت اور باطل معبودوں کی بے بسی کا تذکرہ۔

16. آیات: ۱۹۹ تا ۲۰۰ جاہلوں سے اعراض کا حکم، اللہ ﷻ کی پناہ مانگنے کی تلقین، مکارمِ اخلاق کی تعلیم، دین کی تبلیغ کے آداب اور داعیِ دین کے اوصاف کا بیان۔

17. آیات: ۲۰۱ تا ۲۰۶ شیطانی وسوسوں سے بچنے کے لئے پرہیز گاروں کا اللہ ﷻ کی یاد میں مصروف رہنے کا بیان، نزولِ وحی کی تاخیر پر کفار کے تمسخر کا ذکر، قرآن سننے کے آداب، ذکر و دعا کی تلقین، بعض اہم آداب کا ذکر، مقرب فرشتوں کی تسبیح اور عبادت کا تذکرہ۔

سُوْرَۃُ یُوْنُس

مقاصدِ مطالعہ: اس سورت کے مطالعہ کے بعد طلبہ کو مندرجہ ذیل مضامین سے آگاہی حاصل ہونی چاہیئے:

1. آیات: ۱ تا ۴ وحی اور رسالت کی حقیقت، قرآن کریم کی عظمت و جلالت، نبی اکرم ﷺ کی نبوت کا انکار کرنے والوں کے پانچ شبہات کا ذکر اور ان کا مدلل جواب۔

2. آیات: ۵ تا ۱۰ توحیدِ باری تعالیٰ کے دلائل، ذکرِ آخرت اور عجائباتِ قدرت کا بیان، منکرینِ آخرت کا انجام اور صالحین کے انعام کا ذکر۔

3. آیات: ۱۱ تا ۱۷ عذاب کے لئے کفار کی جلد بازی کا جواب، انسان کی تنگ ظرفی کا ایک مظہر اور نمونہ، اہلِ باطل کا قرآن حکیم کو بدلنے کا مطالبہ، قرآن حکیم کا ایک عظیم الشان اور بے مثال معجزہ، اللہ ﷻ پر جھوٹ باندھنا سب سے بڑا ظلم۔

4. آیات: ۱۸ تا ۲۴ توحید کے مزید دلائل، حیاتِ دنیا کی مثال اور اس میں غور و فکر کرنے کی ترغیب، حیاتِ دنیوی کا مقصد امتحان اور آزمائش ہونا

5. آیات: ۲۵ تا ۲۷ اللہ ﷻ کا لوگوں کو دارالسلام یعنی جنت کی طرف بلانے کا تذکرہ اور آخرت میں اعمال کی جزا کا ذکر۔

6. آیات: ۲۸ تا ۴۰ قیامت کے روز کافروں کی ذلت و رسوائی کا ذکر، توحید کے کچھ اور دلائل، مشرکینِ مکہ کی طرف سے قرآن میں ترمیم کا مطالبہ اور اس کا جواب۔

7. آیات: ۴۱ تا ۴۸ مخالفینِ اسلام کو ان کے حال پر چھوڑنے کا حکم، روزِ قیامت مکذبین کی حسرت و ندامت اور ان کا عبرت ناک انجام اور کفار کا تکذیب و مذاق کے طور پر بے خوفی کے ساتھ عذاب طلب کرنے کا ذکر۔

8. آیات: ۴۹ تا ۵۸ دنیا کی بے ثباتی کا ذکر، منکرینِ حق کے لئے عذابِ قیامت کا یقینی ہونے کا تذکرہ اور قرآن کریم کی صفاتِ عالیہ کا بیان۔

9. آیات: ۵۹ تا ۷۰ مشرکین کے بُرے اعمال کا ذکر اور ان کو دعوتِ حق دینے کا طریقہ، آپ ﷺ کو تسلی و بشارت، اللہ ﷻ کی قدرتِ کاملہ و دلائلِ توحید، وسعتِ علمِ باری تعالیٰ، اولیاء اللہ کی علامات اور صفات، اولیاء اللہ کو روزِ قیامت اور دنیا میں کسی قسم کا خوف اور رنج و ملال نہ ہونے کا بیان۔

10. آیات: ۷۱ تا ۹۳ قرآن پاک کی صداقت کا ثبوت اور عبرت و نصیحت کے لئے انبیاءِ کرام حضرت نوح علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کا ذکر اور اللہ ﷻ کی طرف سے بنی اسرائیل کو اپنے انعامات یاد دلانے کا بیان۔

11. آیات: ۹۴ تا ۱۰۲ قرآن کریم کی حقانیت عظمت و فضیلت، مشکلات میں گھری قوم کے لئے قومِ یونس کی مثال اور دعاؤں کی تلقین، حضورِ اکرم ﷺ کے ذریعہ دینِ اسلام کی حقانیت کا تذکرہ، توحید کی تعلیم و تاکید اور مکذبین کو قدرت کی نشانیوں میں غور کا حکم۔

12. آیات: ۱۰۳ تا ۱۰۹ قرآنِ حکیم کے احکام پر عمل کرنے میں ہی کامیابی، آپ ﷺ سے اللہ ﷻ کا خصوصی خطاب و احکامات اور آپ ﷺ کو تسلی و تشفی کا بیان۔

سُوْرَةُ هُوْد

مقاصدِ مطالعہ: اس سورت کے مطالعہ کے بعد طلبہ کو مندرجہ ذیل مضامین سے آگاہی حاصل ہونی چاہیئے:

1. آیات: ۱ تا ۴ — قرآن کی حقانیت اور عظمت و شرف، اسلام کے بنیادی عقائد توحید، رسالت اور قیامت کا مؤثر اور دلنشین انداز میں تذکرہ۔
2. آیات: ۵ تا ۸ — اللہ ﷻ کا علم کامل اور ہمہ گیر ہونے کا بیان، ذاتِ باری تعالیٰ کا تمام مخلوق کے رزق کا ذمہ دار ہونے کا تذکرہ، اللہ ﷻ کی قدرت کاملہ کا ذکر، تخلیق کائنات کا بیان، مشرکین مکہ کے فرمائشی معجزات کے مطالبہ اور ان کا مدلل جواب۔
3. آیات: ۹ تا ۱۲ — مصیبت اور آسانی میں مومن اور کافر کے طرزِ عمل کا موازنہ اور اہل ایمان کو کفار کی ناشائستہ باتیں خاطر میں نہ لانے کی تلقین
4. آیات: ۱۳ تا ۱۴ — قرآن مجید کے معجزہ ہونے، منکرین قرآن سے اس قرآن کریم جیسی دس سورتیں لانے کا مطالبہ اور صداقتِ قرآن مجید اور مکذبین قرآن کا انجام۔
5. آیات: ۱۵ تا ۲۴ — آخرت کو دنیا پر مقدم رکھنا، ظالم لوگوں کی بُری صفات اور انجام کا تذکرہ، اہل ایمان کا حال اور حسن انجام کا بیان۔

(نوٹ: اس سورت کی آیات: ۲۵ تا ۶۸ مطالعہ قرآنِ حکیم حصہ اوّل میں حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام کے قصّوں میں دی گئی ہیں)

6. آیات: ۶۹ تا ۷۲ — حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتوں کی آمد، مہمان فرشتوں کا کھانے سے انکار اور اپنے انکار کی وضاحت کا بیان۔

(نوٹ: اس سورت کی آیات: ۷۷ تا ۹۵ مطالعہ قرآنِ حکیم حصہ اوّل اور حصہ چہارم میں حضرت شعیب علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کے قصّوں میں دی گئی ہیں)

7. آیات: ۹۶ تا ۱۰۸ — فرعون کا انجام اور انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان کرنے کی حکمت، کفر و تکذیب کا انجام اور اہل محشر کی قسموں کا ذکر۔
8. آیات: ۱۰۹ تا ۱۱۳ — مشکل حالات میں اہل ایمان کے لئے ہدایات، ہر دور میں حق سے اختلاف رکھنے والوں کے موجود ہونے کا بیان، احکام الٰہی پر استقامت رکھنے کا حکم، پیغمبر اسلام ﷺ اور اہل ایمان کو عبادت الٰہی میں مستعد اور ثابت قدم رہنے کی تلقین۔
9. آیات: ۱۱۴ تا ۱۱۷ — اقامتِ صلوٰۃ کی تاکید، بُرائی سے روکنے والوں کا اللہ ﷻ کے عذاب سے محفوظ رہنے کا بیان، سابقہ اقوام کی ہلاکت کے ظاہری اور باطنی اسباب، دین کی دعوت سے اعراض کرنے والوں کو عذاب کی وعید۔
10. آیات: ۱۱۸ تا ۱۲۳ — کفار کی طرف سے پہنچنے والی اذیتوں پر اللہ ﷻ کا اپنے حبیب مکرم ﷺ کو تسلی اور سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کے واقعات کا بیان، واقعاتِ انبیاء کرام علیہم السلام میں تمام مسلمانوں کے لئے بھی عبرت اور نصیحت کا پیغام، انفرادی اور اجتماعی اصلاح کے حوالہ سے ترغیب اور ترہیب کا انداز اور اس کے فائدہ مند ہونے کا بیان اور اللہ ﷻ کی تائید و نصرت پر توکل و بھروسہ رکھنے کا حکم۔

سُوْرَةُ الرَّعْد

مقاصدِ مطالعہ: اس سورت کے مطالعہ کے بعد طلبہ کو مندرجہ ذیل مضامین سے آگاہی حاصل ہونی چاہیئے:

1. آیات: ۱ تا ۵ — قرآن کریم کی حقانیت کا بیان، مختلف اسالیب سے توحید و رسالت اور قیامت کی اثبات پر عقلی دلائل اور بعث بعد الموت کے منکروں کا انجام۔
2. آیات: ۵ تا ۱۰ — منکرین کا عذابِ الٰہی کا مطالبہ، اللہ ﷻ کے کمال علم و قدرت کا بے حد و حساب ہونے اور اس کی عظیم قدرت کی نشانیوں کا تذکرہ۔
3. آیات: ۱۱ تا ۱۲ — محافظتِ خداوندی، اللہ ﷻ کی طرف نگران فرشتے مقرر ہونے کا ذکر، نعمت کی ناقدری کرنے والوں اور قوموں کے عروج وزوال کے لئے اللہ ﷻ کا قانون۔
4. آیت: ۱۳ — مظاہر قدرت کے ذریعہ توحیدِ باری تعالیٰ کی دعوت، زبان حال سے بادلوں کی گرج اور آسمانی بجلیوں کی چمک اللہ ﷻ کی عظمت و حدانیت کا ثبوت۔

5. آیات: ۱۴ تا ۱۷ — باطل معبودوں سے مانگنے اور حق وباطل کے مابین فرق اور مثال کے ذریعے اس کی وضاحت، ساری کائنات کی اللہ ﷻ کے آگے سجدہ ریزی کا ذکر، کفر وایمان میں فرق اور حق وباطل کی مثال۔

6. آیات: ۱۸ تا ۲۶ — اہل حق وطل کے اوصاف وانجام، نماز ادا کرنے والے اور صبر کرنے والے سعادت مند متقی لوگوں کا ذکر، فساد پھیلانے والے اور عہد وپیمان توڑ دینے والے گناہ گار لوگوں کے حال کو اندھے سے تشبیہ دینے کا بیان، فسادی اور عہد کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے جہنم کے عذاب کی وعید اور دنیا میں ہونے والے تغیرات کا بیان۔

7. آیات: ۲۷ تا ۲۹ — اللہ ﷻ کی طرف رجوع کرنے والوں کی صفات اور ان کی بہترین جزا کا بیان، ہدایت وگمراہی اللہ ﷻ کا اختیار اور اللہ ﷻ کے ذکر سے سکونِ قلب کے حصول کا بیان۔

8. آیات: ۳۰ تا ۳۱ — منکرین کی ہٹ دھرمی اور ان کا حال، بد نصیبوں کا معجزات دیکھنے کے باوجود ایمان نہ لانے کا بیان اور اللہ ﷻ کے مالک ومختار ہونے کا ذکر۔

9. آیات: ۳۲ تا ۳۵ — شرک کی تردید کا ذکر، مشرکین کی فرمائش، ان کے باطل عقائد اور دنیا وآخرت میں بُرے عذاب کا بیان، پرہیز گاروں کے لئے جنات عدن کی بشارت اور اس جنت کے احوال کا بیان۔

10. آیات: ۳۶ تا ۳۷ — مضامین قرآن اور عربیتِ قرآن سے واقفیت حاصل کرنے کا تذکرہ، منصب رسالت پر شبہات اور ان کے جوابات۔

11. آیات: ۳۸ تا ۴۲ — آنحضرت ﷺ کی صداقت پر اللہ ﷻ کی گواہی کا بیان اور رسول کریم ﷺ کی ذمہ داریوں کا تذکرہ۔

12. آیت: ۴۳ — اہل کتاب میں سے مومنین کا اپنی کتابوں میں سید المرسلین خاتم النبیین ﷺ کی نشانیاں موجود ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کی نبوت کی گواہی کا ذکر۔

سُوْرَۃُ اِبْرٰهِیْم

مقاصدِ مطالعہ: اس سورت کے مطالعہ کے بعد طلبہ کو مندرجہ ذیل مضامین سے آگاہی حاصل ہونی چاہیئے:

1. آیت: ۱ — قرآن کریم کی عظمت وشان کا بیان، حکمتِ نزول کا ذکر، نبی اعظم وآخر الزماں ﷺ کا لوگوں کو ظلمتِ کفر سے نکال کر نورِ ایمان کی طرف لے جانے کا بیان۔

2. آیات: ۲ تا ۳ — کافروں کے لئے وعید اور حقیقی کافروں کی پہچان کا بیان، کفار کی دنیا سے غیر معمولی محبت اور حق سے دوری اور لوگوں کو راہ حق سے روکنے کا ذکر۔

3. آیات: ۴ تا ۸ — تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو اپنی قوم کی زبان بولنے والا بنا کر بھیجے جانے کا بیان، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا تذکرہ اور تورات نازل کرنے کی غرض وغایت، بنی اسرائیل کو انعامات کی یاد دہانی اور آزمائش، ایام اللہ کی یاد قائم رکھنے کا حکم، شکر گزاروں کے لئے مزید عطا اور ناشکروں کے لئے شدید عذاب کا بیان۔

4. آیات: ۹ تا ۱۵ — مختلف قوموں کا اپنے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ناروا سلوک پر رب ذوالجلال کی طرف سے سخت تنبیہ، بشریت انبیاءِ کرام علیہم السلام کا تذکرہ، پیغام حق کے بارے میں منکرین کا شک وشبہ اور انبیاء علیہم السلام کا ان کو جواب، عاجز ولاجواب ہونے والے کافروں کا انبیاءِ کرام علیہم السلام کو ملک بدر کرنے کی دھمکی دینے کا ذکر، کافروں کے ایمان کے مسلسل انکار سے مایوس ہو کر انبیاء علیہم السلام کا ان کے لئے عذاب کی دعا، انبیاء کرام علیہم السلام کے واقعات کے ذکر سے تاجدارِ رسالت ﷺ کو تسلی دینے کا بیان۔

5. آیات: ۱۶ تا ۲۱ — جہنم کی کیفیات، کافروں کے اعمال کی مثال، اللہ ﷻ کی قدرتِ کاملہ کا ذکر، قیامت کے روز کافروں کی باہم گفتگو کا بیان۔

6. آیات: ۲۲ تا ۲۷ — شیطان کا اپنے پیروکاروں کو حوصلہ شکن جواب دینا، انہیں اپنی ملامت کرنے کو کہنا، کلمہ ایمان وکلمہ خبیثہ کی مثالوں کا بیان۔

7. آیات: ۲۸ تا ۳۴ — اللہ ﷻ کی ناشکری کرنے والوں کا انجام، کفار و مشرکین کی سخت مذمت اور مومنین و صالحین کی تعریف و توصیف، اللہ ﷻ کی دس صفاتِ عالیہ کا ذکر۔

8. آیات: ۳۵ تا ۴۱ — بارگاہِ الٰہی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے مکہ مکرمہ، اپنی اولاد، اپنے والدین اور سب اہل ایمان کے لئے مغفرت اور خیر و برکت کی مختلف ایمان افروز دعاؤں کا ذکر، اولادِ ابراہیمی میں سے ہر دور میں سچے اور پکے مسلمانوں کے موجود رہنے کا تذکرہ۔

9. آیات: ۴۲ تا ۴۷ — مہلت اور ڈھیل کی وجہ سے کافروں کا دنیا میں پھلنا پھولنا، قیامِ قیامت کے ہولناک منظر کا بیان، قیامت کے روز کفار کی حالت زار کی تصویر کشی، توحید باری تعالیٰ کا ذکر، روزِ قیامت نافرمانوں پر ہونے والے عذاب سے عبرت۔

10. آیات: ۴۸ تا ۵۲ — قیامت قائم ہونے کے دن زمین و آسمان کے تبدیل ہونے کا ذکر، قرآن کریم کے نزول کے مقاصد کا بیان۔

سُوْرَةُ الْحِجْر

مقاصدِ مطالعہ: اس سورت کے مطالعہ کے بعد طلبہ کو مندرجہ ذیل مضامین سے آگاہی حاصل ہونی چاہیئے:

1. آیات: ۱ تا ۹ — قرآن حکیم کی امتیازی شان اور حقانیت کا بیان، قیامت کے روز غافلین کی حسرت اور کافروں کی سرکشی کا ذکر اور اللہ ﷻ کی طرف سے قرآنِ مجید کی حفاظت کا ذمہ لینے کا تذکرہ۔

2. آیات: ۱۰ تا ۲۵ — اللہ ﷻ کے انبیاء اور رسولوں علیہم السلام کے ساتھ کفار و مشرکین کے طرزِ عمل کا بیان، منکرین رسالت کے شبہات و اعتراضات کا جواب، کافروں کی طرف سے آنحضرت ﷺ کی تکذیب پر آپ ﷺ کو تسلی دینے کا تذکرہ، آسمان کو مردود شیاطین کی شرارتوں سے محفوظ کیئے جانے کا ذکر، توحیدِ باری تعالیٰ کے دلائل، عجائباتِ قدرت اور شاہکارِ خداوندی کا بیان۔

3. آیات: ۲۶ تا ۴۴ — قصہ تخلیقِ آدم، فرشتوں کو آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم اور شیطان کی حکم عدولی کا بیان، ابلیس کے غرور و تکبر کا بیان، گمراہی، ابلیس پر ابدی لعنت کا ذکر، ابلیس کا اعلانِ انتقام اور جہنم کے طبقوں کا تذکرہ۔

4. آیات: ۴۵ تا ۵۰ — اہل جنت کے دلوں سے کینہ و عداوت دور کیئے جانے کا بیان، متقی لوگوں کے لئے اخروی جزا و ثواب اور نعمتوں کا تذکرہ۔

5. آیات: ۵۱ تا ۸۴ — حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمان فرشتوں کا واقعہ، اللہ ﷻ کا اپنے حبیب کریم ﷺ کی تسلی کے لئے سابقہ اقوام (قوم لوط، اصحاب الایکہ (قوم شعیب) اور اصحابُ الحجر) کا عذابِ الٰہی کے نتیجہ میں ہلاک ہونے کا بیان۔

6. آیات: ۸۵ تا ۸۷ — تخلیق کائنات کی حکمت و مصلحت کا ذکر، آنحضرت ﷺ کے لئے سبع مثانی اور قرآن عظیم کے تحفوں کا بیان۔

7. آیات: ۸۸ تا ۹۹ — مال کی بے وقعتی کا بیان، تعصب و ہٹ دھرمی کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کی رسالت کا انکار کرنے اور مذاق اڑانے والوں کو سخت عذاب اور حساب و کتاب کی تنبیہ، توحیدِ باری تعالیٰ کا بیان، نبی کریم ﷺ کی رسالت اور قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے پر دلائل کا ذکر، آنحضرت ﷺ کو اعلانیہ تبلیغ اسلام کا حکم، آپ ﷺ سے اللہ ﷻ کا خصوصی خطاب و احکامات اور آپ ﷺ کو تسلی و تشفی دیے جانے کا بیان۔

سُوْرَةُ النَّحْل

مقاصدِ مطالعہ: اس سورت کے مطالعہ کے بعد طلبہ کو مندرجہ ذیل مضامین سے آگاہی حاصل ہونی چاہیئے:

1. آیات: ۱ تا ۸ — مشرکین کے لئے وعید، انبیاءِ کرام علیہم السلام پر وحی کے نزول کی حکمت کا تذکرہ اور اللہ ﷻ کی تخلیق کے تین شاہکاروں (کائنات، انسان اور چوپایوں) کا ذکر۔

2. آیات: ۹ تا ۱۶ — توحید و تقویٰ ہی اللہ ﷻ تک پہنچنے کا سیدھا اور صحیح راستہ، اللہ ﷻ کی نعمتوں میں غور فکر کر کے اپنے محسن حقیقی کا احساس دل میں پیدا کرنے کی دعوت کا ذکر، اللہ ﷻ کی قدرت کاملہ کی نشانیوں اور نظام کائنات کا بیان، انسان کے لئے سمندر کی تسخیر اور پہاڑوں اور ستاروں کی تخلیق کے مقصد کا بیان۔

3. آیات: ۱۷ تا ۲۳ — باطل معبودوں کی بے بسی اور حقیقت کا بیان، اللہ ﷻ کی وحدانیت، خالقیت، معبودیت اور اس کے علیم اور لاشریک ہونے کا ذکر۔

4. آیات: ۲۴ تا ۳۵ — آخرت پر یقین رکھنے والوں اور منکرین آخرت کی کیفیت کا ذکر، ان دونوں گروہوں کا قرآنِ حکیم کے بارے میں نظریہ اور ان کے انجام کا بیان، نبوت و آخرت کے منکرین کا انجام، ان کے جملہ اعتراضات اور کٹ حجتیوں کے جوابات، جان کنی کے وقت مشرکین کی حالت کا ذکر، پرہیز گاروں کے لئے اجر اور کفار کو گھیرنے والے عذاب کی تنبیہ۔

5. آیات: ۳۶ تا ۴۴ — رسولوں علیہم السلام کی ذمہ داری، دعوت اور مقصدِ بعثت کا بیان، مشرکین کے اعتراضات کا جواب، مشرکین کی پختہ قسموں کا ذکر، اللہ ﷻ کی شان کن فیکون کا حوالہ، مہاجرین کے لئے بشارت اور مہاجرین کے اوصاف کا بیان، اہل ذکر سے استفادہ کا حکم، منکرین و مشرکین کو وعید سنانے اور انسان کی غفلت پر تنبیہ کرنے کا بیان۔

6. آیات: ۴۵ تا ۵۵ — دنیا والوں پر اللہ ﷻ کے عذاب کی مختلف اقسام کا ذکر، توحید باری تعالیٰ کے دلائل اور شرک کی مذمت، مشرکوں کی بے عقلی اور سنگ دلی کا بیان۔

7. آیات: ۵۶ تا ۶۰ — نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اذیت دینے والے کفار مکہ کو اللہ ﷻ کے عذاب سے ڈراوا، بیٹی کی ولادت پر کفار کے طرزِ عمل کا ذکر، منکرین آخرت کے بُرے انجام کا بیان اور صفاتِ باری تعالیٰ کا تذکرہ۔

8. آیات: ۶۱ تا ۶۵ — اللہ ﷻ کے لطف و کرم اور حلم و مہربانی کا بیان، آپ ﷺ کی قوم کی تکذیب پر آپ ﷺ کو اطمینان دلانے کے لئے سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کے حالات کا تذکرہ، قرآنِ حکیم کے بارے میں کفار کے شبہات کا جواب اور موت کے بعد دوبارہ جی اُٹھنے کا بیان۔

9. آیات: ۶۶ تا ۶۹ — چوپایوں میں عبرت کے نشان کا بیان، اللہ ﷻ کی نعمتوں میں سے مشروبات کا ذکر، شہد کی مکھی اور انسانی وجود میں قدرتِ الٰہی کی نشانیوں کا ذکر۔

10. آیات: ۷۰ تا ۷۶ — نعمتِ زندگی اور نعمت خاندان پر اللہ ﷻ کا شکر ادا کرنے کا ذکر، کافروں کا باطل معبودوں پر ایمان رکھنے اور اللہ ﷻ کی نعمتوں کا انکار کرنے کا ذکر، شرک سے بچنے کا حکم، نافرمان اور فرماں بردار بندوں کی مثال، آقا اور غلام اور گونگے اور سمجھدار آدمی کی مثالیں۔

11. آیات: ۷۷ تا ۸۱ — اللہ ﷻ کے علم غیب اور کمال قدرت کا بیان، روز مرہ زندگی میں آنے والی اللہ ﷻ کی کئی نعمتوں کا تذکرہ اور ان کا ادارک کر کے شکر باری تعالیٰ کا حکم، لوگوں کے لئے جائے سکونت کا بیان۔

12. آیات: ۸۲ تا ۸۹ — کفر و شرک اور ناشکری کا بیان، ہر نبی علیہ السلام کا اپنی امت کا گواہ ہونے کا ذکر، قیامت کے دن مشرکین کے بنائے ہوئے شریکوں کا ان سے اظہارِ لاتعلقی کا بیان، قیامت کے روز امتوں کے خلاف ان کے پیغمبروں علیہم السلام اور ان پیغمبروں کے حق میں سید المرسلین، خاتم النبیین ﷺ کی گواہی دینے اور عظمت قرآن اور مضامین قرآن کا ذکر۔

13. آیات: ۹۰ تا ۹۷ — تمام قرآنی اوامر و نواہی کا خلاصہ، ایفائے عہد کی اہمیت اور عہد شکنی کے نتائج کا ذکر، بد عہدی کی مثال، ایمان اور نیک اعمال کا دنیاوی اور اخروی انجام کا بیان۔

14. آیات: ۹۸ تا ۱۰۹ — تلاوت قرآن کے آداب کا بیان، شیطان کے شر سے محفوظ لوگوں کا ذکر، قرآن حکیم پر مشرکین مکہ کے اعتراضات اور ان کے جوابات، حالت اکراہ میں کلمہ کفر کہنے والے کا حکم اور مرتد کے لئے وعیدیں اور مرتدین کے دنیاوی اور اخروی انجام کا بیان۔

15. آیات: ۱۱۰ تا ۱۱۳ — مہاجرین اور مجاہدین کے لئے مغفرت اور رحمت کی بشارات اور اللہ ﷻ کی نعمتوں کی ناشکری کرنے والی قوم کی سزا۔

16. آیات: ۱۱۴ تا ۱۱۹ — اکل حلال کا حکم اور یہود پر حرام کی گئی اشیا کا ذکر، اپنی طرف سے چیزوں کو حلال یا حرام کہہ کر اس کی نسبت اللہ ﷻ کی طرف کرنے کی ممانعت کا بیان۔

17. آیات: ۱۲۰ تا ۱۲۸ — حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اوصاف و فضائل کا تذکرہ، ہفتہ کے دن کی تعظیم کا حکم، تبلیغ دین کے آداب اور انتہائی اہم اصول کا بیان اور صبر و تقویٰ کی اہمیت کا ذکر۔

سُوْرَةُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْل

مقاصدِ مطالعہ: اس سورت کے مطالعہ کے بعد طلبہ کو مندرجہ ذیل مضامین سے آگاہی حاصل ہونی چاہیئے:

1. آیت: ۱ — سید المرسلین خاتم النبیین ﷺ کے عظیم معجزہ معراج کا تذکرہ، سفر معراج میں اللہ ﷻ کی قدرت کا بیان اور معراج النبی ﷺ کے موقع پر بارگاہِ الٰہی میں نبی کریم ﷺ کی عزت و تکریم کی روشن ترین دلیل۔

2. آیات: ۲ تا ۸ — بنی اسرائیل کا تعارف اور ان کی تاریخ کے چار ادوار کا بیان، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات دینے کا ذکر، بنی اسرائیل کے دو بار تخریب کاری کرنے اور اس کی سزا بھگتنے کا ذکر اور کفار مکہ کو بنی اسرائیل کے انجام سے عبرت حاصل کرنے کی تنبیہ کا بیان۔

3. آیات: ۹ تا ۱۵ — قرآن مجید کی فضیلت اور عظمت کا بیان، قدرتِ الٰہی کی نشانیوں کا ذکر، انسان کے جلد باز ہونے کا بیان، دن رات کے نظام کی حکمت اور تقدیر کی حقیقت کا بیان، نیک و بد عمل انسان کے گلے کا ہار بنا دینے کا ذکر اور انسان کی سعادت و شقاوت اور فلاح و خسران کے اسباب کا تذکرہ۔

4. آیات: ۱۶ تا ۲۲ — بستیوں کی تباہی کے اسباب، طالبین دنیا کا انجام بد اور طالبین آخرت کا انعام، عمل کی مقبولیت کا نیک نیتی اور ایمان کے ساتھ مشروط ہونے کا ذکر، اللہ ﷻ کی دنیاوی عطا و بخشش سب کے لئے عام ہونے کا بیان، دنیا میں لوگوں کے لئے ایک دوسرے پر فضیلت و فوقیت کا بیان اور آخرت کی کامیابی کی اساس عقیدہ توحید پر ہونے کا ذکر۔

5. آیات: ۲۳ تا ۳۱ — اسلام کے اجتماعی زندگی گزارنے کے اعلیٰ اصول و اقدار کا ذکر، والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم، قرابت داروں کے حقوق اور مال خرچ کرنے میں میانہ روی کا حکم فضول خرچی کی مذمت اور چند ممنوعہ امور کا بیان۔

6. آیات: ۳۲ تا ۳۸ — قانونِ قصاص کا تذکرہ، مالِ یتیم کے قریب نہ جانے کا حکم، عہد کی باز پُرسی کا بیان، ناپ تول پورا پورا کرنے کا حکم اور جس چیز کا علم نہ ہو اس میں دخل دینے کی ممانعت کا ذکر۔

7. آیات: ۳۹ تا ۵۲ — مشرکین کی ایک بڑی گستاخی کا ذکر، توحید کی تاکید اور شرک کی تردید، مشرکین کے باطل معبودوں کی حقیقت، مشرکین کی فرمائشیں، منکرین قیامت کے شبہات اور ان کے جوابات، آنحضرت ﷺ کو تسلی دینے کا ذکر اور مشرکین کی ازلی گمراہی کے پردوں اور ان کا حیاتِ اُخروی پر تعجب کرنے کا بیان۔

8. آیات: ۵۳ تا ۷۰ — مخالفین سے بھی اچھے طریقہ سے بات کرنے کا حکم، مشرکین مکہ اور آدم و ابلیس کا واقعہ، شیطان کے وار اور عزائم کا ذکر اور بنی آدم کی دیگر تمام مخلوق پر فضیلت۔

9. آیات: ۷۱ تا ۷۷ — قیامت کے روز لوگوں کو ان کے اعمال نامے دیئے جانے کا ذکر، مشرکین مکہ کی حماقت اور کفار کی عداوت کا بیان۔

10. آیات: ۷۸ تا ۸۷ — نبی کریم ﷺ کو پنج وقتہ نماز، تہجد اور ہجرت کا حکم، فتح مکہ کی بشارت، قرآن کے شفا ہونے کا تذکرہ اور روح کی حقیقت کا بیان۔

11. آیات: ۸۸ تا ۹۶ فضیلت و اعجازِ قرآن کا بیان، مشرکین کی طرف سے قرآن، رسالت اور آخرت کے حوالہ سے شبہات و اعتراضات اور ان کے مدلل جوابات اور بشریت انبیاء علیہم السلام کا فلسفہ۔

12. آیات: ۹۷ تا ۱۰۳ کافروں کو عذابِ الٰہی کی وعید اور ان کے انجام کا تذکرہ، حیات بعد الممات کے دلائل، فرعون کی ہٹ دھرمی اور بُرے انجام کا بیان اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نو معجزات کا تذکرہ۔

13. آیات: ۱۰۴ تا ۱۰۹ قیامت سے پہلے پوری ہونے والی قرآن کریم کی پیشن گوئی کا ذکر، حقانیتِ قرآن و رسالت کا بیان اور اہل کتاب پر قرآن مجید کی تاثیر کا تذکرہ۔

14. آیات: ۱۱۰ تا ۱۱۱ دھیمے انداز سے قرأت کا حکم، اللہ ﷻ کے اسماء الحسنیٰ کا بیان اور توحید باری تعالیٰ کے دو خزانوں کا ذکر۔

سُوۡرَةُ الۡكَهۡف

مقاصدِ مطالعہ: اس سورت کے مطالعہ کے بعد طلبہ کو مندرجہ ذیل مضامین سے آگاہی حاصل ہونی چاہیئے:

1. آیات: ۱ تا ۳ اللہ ﷻ کی حمد و ثنا کا بیان، قرآن حکیم کی فضیلت، صداقت اور اوصاف کا بیان، نزولِ قرآن مجید کی حکمت کا ذکر اور مومنین کے لئے ابدی انعام و اکرام کی بشارت کا تذکرہ۔

2. آیات: ۴ تا ۸ عیسائیت کے غلط عقائد کا رد، نبی کریم ﷺ کی امت سے محبت کا بیان اور دنیا کی حقیقت کا ذکر۔

3. آیات: ۹ تا ۲۲ اسباب کی قلت کے باوجود اللہ ﷻ پر بھروسہ کرنے والے اصحاب کہف کا مفصل واقعہ اور غار کی کیفیت کا ذکر۔

4. آیات: ۲۳ تا ۲۸ انشاء اللہ کہنے کی اہمیت کا بیان، آپ ﷺ کو تلاوتِ قرآن کا حکم اور مشکل حالات میں داعی کے لئے ہدایات کا بیان۔

5. آیات: ۲۹ تا ۳۱ کافروں اور ظالموں کی سخت سرزنش اور ان کے لئے جہنم کے سخت عذاب کی وعید اور مومنین صالحین کے لئے جنت کی ابدی اور اعلیٰ ترین نعمتوں کی بشارت کا تذکرہ۔

6. آیات: ۳۲ تا ۴۴ دنیاوی اسباب سے مالامال مادہ پرست، متکبر اور کافر شخص کے باغ کا قصہ۔

7. آیات: ۴۵ تا ۴۶ حیات دنیا کی بے ثباتی اور مال و اولاد کی حقیقت کا بیان۔

8. آیات: ۴۷ تا ۴۹ قیامت کے دن کے احوال کا ذکر، میدان حشر اور بروز محشر حساب و کتاب کی کیفیت کا بیان۔

9. آیات: ۵۰ تا ۵۳ شیطان کی پیروی اور شرک کے انجام کا ذکر، مقام ہلاکت کی تفصیلات اور غرور کے انجام بیان۔

10. آیات: ۵۴ تا ۵۹ جامعیتِ قرآن مجید کا ذکر، آنحضرت ﷺ کے فریضۂ بشارت و نذارت کا تذکرہ، انسان کی ہٹ دھرمی، کافروں کے افعال، سب سے بڑے ظالم کی پہچان و نشاندہی، اللہ ﷻ کی بخشش و رحمت کا بیان اور ظالموں کے بُرے انجام سے عبرت حاصل کرنے کا ذکر۔

11. آیات: ۶۰ تا ۸۲ ظاہر پرستی کی شدید نفی کرتے ہوئے حضرت موسیٰ و حضرت خضر علیہما السلام کے تین واقعات اور ان تینوں واقعات کی حقیقت کا بیان۔

12. آیات: ۸۳ تا ۹۸ اقتدار اور اسباب کی فروانی کے باوجود اللہ ﷻ سے غافل نہ رہنے والے بادشاہ ذوالقرنین کا قصہ اور یاجوج و ماجوج کا واقعہ۔

13. آیات: ۹۹ تا ۱۰۶ آخرت کے حالات و واقعات کا تذکرہ، سب سے زیادہ خسارے والے لوگوں کے حال کا بیان، آخرت میں کفار کے اعمال برباد اور ضائع ہونے کا اعلان۔

14. آیات: ۱۰۷ تا ۱۱۰ نیک لوگوں کے لئے انعاماتِ الٰہیہ کا ذکر، توحید باری تعالیٰ کے خزانوں اور اللہ ﷻ کے بیشمار کلمات کا بیان، پیغمبرِ اسلام ﷺ کے مقام بشریت کا بیان، آخرت کے طلب گاروں کے لئے ہدایات۔

سُوْرَةُ الْمُؤْمِنُوْن

مقاصدِ مطالعہ: اس سورت کے مطالعہ کے بعد طلبہ کو مندرجہ ذیل مضامین سے آگاہی حاصل ہونی چاہیئے:

1. آیات: ۱ تا ۱۶ — مومنوں کے بنیادی اوصاف اور انہیں آخرت میں کامیابی کی بشارت کا ذکر، تخلیق انسان کے مختلف مراحل و مراتب کا بیان، انسان کی بقاء کے اسباب اور بعث بعد الموت کا تذکرہ۔
2. آیات: ۱۷ تا ۲۲ — زمین و آسمان، حیوانات و نباتات اور دوسری مختلف اشیاء کی خلقت کا بیان، اللہ ﷻ کی قدرتِ کاملہ اور اس کے انعامات کا ذکر۔
3. آیات: ۲۳ تا ۵۰ — مشرکین کی طرف سے پہنچنے والی اذیتوں پر اپنے حبیب ﷺ کی تسلی کے لئے حضرت نوح علیہ السلام، قوم عاد، موسیٰ و ہارون اور عیسیٰ ابن مریم علیہم السلام کے واقعات کا تذکرہ۔
4. آیات: ۵۱ تا ۷۷ — اکل حلال اور عمل صالح کی تاکید، مومنوں کی باطنی صفات کا بیان، انفس و آفاق کی آیات سے توحید و قیامت کی حقانیت پر استدلال، قرآن حکیم سے غفلت اور اعراض کی وجوہات اور اس کا انجام اور مکذبین کے بعض شکوک و شبہات اور ان کے جوابات۔
5. آیات: ۷۸ تا ۹۲ — ایمان بالآخرت پر عقلی دلیل، منکرین آخرت کا اعتراض اور اس کا جواب اور کفار و مشرکین کے بعض ناجائز مطالبات اور اللہ ﷻ کا جواب۔
6. آیات: ۹۳ تا ۹۸ — چند اہم دعائیں اور تبلیغ دین کا طریقہ کار، برائی کے مقابلہ میں اچھائی و درگزر کرنے کی پاکیزہ تعلیم و تلقین کا بیان۔
7. آیات: ۹۹ تا ۱۰۸ — قیامت صغریٰ، قیامت کبریٰ اور برزخی و اخروی احوال کا بیان، قیامت کے دن لوگوں کی سعادت مند اور بدبخت گروہوں میں تقسیم، حساب کے وقت کی شدتوں اور ہولناکیوں کا بیان، کفار کے اعترافِ گناہ کا ذکر اور کفار کی عذاب جہنم سے نجات پانے کی تمام امیدیں ٹوٹ جانے کا بیان۔
8. آیات: ۱۰۹ تا ۱۱۸ — اہل ایمان کی دعائیں، ان کی نجات اور ان پر اللہ ﷻ کی رحمت و مغفرت کا ذکر، دنیا کی زندگی کی حقیقت کا بیان، کافروں کے باطل گمان اور مشرک کے انجام کا ذکر اور آنحضرت ﷺ کو دعا کی تلقین کا حکم۔

سُوْرَةُ الزُّمَر

مقاصدِ مطالعہ: اس سورت کے مطالعہ کے بعد طلبہ کو مندرجہ ذیل مضامین سے آگاہی حاصل ہونی چاہیئے:

1. آیات: ۱ تا ۲ — توحید باری تعالیٰ اور اس پر عقلی دلائل کا ذکر اور اللہ ﷻ کا اپنے حبیب ﷺ کو اخلاص کے ساتھ اپنی عبادت اور اطاعت کرتے رہنے کا حکم۔
2. آیات: ۳ تا ۴ — مشرکین مکہ کی بت پرستی پر اللہ ﷻ کی طرف سے سخت مذمت، شرک کو رد کرنے اور بتوں کی عبادت کو بارگاہِ الٰہی میں قرب اور وسیلہ کا ذریعہ سمجھنے کی نفی کا بیان۔
3. آیت: ۵ — اللہ ﷻ کی وحدانیت کا ذکر، زمین و آسمان کی تخلیق کا بیان، رات اور دن کے آنے جانے، سورج اور چاند کے مسخر ہونے کا بیان۔
4. آیات: ۶ تا ۸ — انسان کی تین تاریک پردوں میں تدریجی تخلیق اور چوپایوں کا تذکرہ، قدرت الٰہی کے مظاہر کا بیان، اللہ ﷻ کی بے نیازی اور انسان کی ناشکری کا تذکرہ، مصیبت کے وقت بتوں کی بجائے بارگاہِ الٰہی میں گریہ وزاری کرنے اور آسانی کے وقت اللہ ﷻ کو بھول جانے پر کفار کی عادت اور رویہ کی سخت مذمت۔
5. آیات: ۹ تا ۲۱ — عالم اور جاہل کا ذکر، آنحضرت ﷺ کو اللہ ﷻ کی عبادت اور اطاعت کا حکم، صبر کرنے والوں کے لئے بے حساب اجر کا تذکرہ، صریح خسارہ پانے والوں کے لئے عذاب کی وعید اور اہل طاعت کے لئے خوشخبری اور دنیوی حیات کی کھیتی کے ذریعہ مثال کی وضاحت۔

6. آیات: ۲۲ تا ۳۱ — مسلمانوں اور کفار کے مابین فرق کا ذکر، آیات قرآنی کی تاثیر اور عظمت کا بیان، ہدایت اور گمراہی کا اختیار اللہ ﷻ کے پاس ہونے کا بیان، ظالموں کا انجام اور توحید و شرک کی ایک مثال کا ذکر اور آنحضرت ﷺ کے وصال کا تذکرہ۔

7. آیات: ۳۲ تا ۴۱ — سب سے بڑے ظالم کی پہچان، مشرکین کی جہالت اور باطل نظریات کا رد، قرآن کریم کا نزول حق کے ساتھ ہونے کا ذکر اور ہدایت و گمراہی کا ذمہ دار خود انسان کے ہونے کا بیان۔

8. آیات: ۴۲ تا ۵۲ — نیند کی حقیقت کا بیان، باطل معبودوں کی سفارش کی حقیقت اور قیامت کے روز مشرکین کی بے بسی کا حال، انسان کی ناشکری کا ذکر اور رزق میں کشادگی اور تنگی کا اختیار اللہ ﷻ کے پاس ہونے کا ذکر۔

9. آیات: ۵۳ تا ۵۹ — اللہ ﷻ کی بے پایاں رحمت سے مایوس ہونے کی ممانعت کا ذکر، توبہ کی ترغیب اور توبہ نہ کرنے والوں کی حسرت کا بیان۔

10. آیات: ۶۰ تا ۶۶ — کفار کی ندامت اور مکذبین کے بُرے انجام کا بیان، پرہیز گاروں کی کامیابی کا تذکرہ، اللہ ﷻ کے خالق اور تمام خزانوں کے مالک ہونے کا بیان اور مشرکین کی طرف سے آپ ﷺ کو شرک کی دعوت پر جواب۔

11. آیات: ۶۷ تا ۷۵ — اللہ ﷻ کی عظمت و شان کا تذکرہ، قیامت کے خوف اور روزِ محشر کے احوال کا بیان، کافروں کے انجام بد اور مومنوں کے انعام کا تذکرہ، قیامت کے روز حساب و کتاب کی کیفیت کا ذکر، مومنین کا اللہ ﷻ کی حمد کرنے اور اس کا سچا وعدہ ذکر کرنے کا بیان اور فرشتوں کی حمد و ثنا کا تذکرہ۔

سُوْرَةُ الْمُؤْمِن

مقاصدِ مطالعہ: اس سورت کے مطالعہ کے بعد طلبہ کو مندرجہ ذیل مضامین سے آگاہی حاصل ہونی چاہیئے:

1. آیات: ۱ تا ۹ — قرآن مجید کے منجانب اللہ نازل ہونے کا علی الاعلان کا تذکرہ، ذات و صفات باری تعالیٰ کا تعارف، پہلی قوموں کے ایک مشترکہ مذموم عمل کا ذکر، مکذبین کا انجام، ملائکہ کی تسبیح، حاملان عرش الٰہی کا اہل ایمان کے لئے استغفار کرنے کا بیان توبہ کی فضیلت اور اہل ایمان کے لئے مناجاتِ ملائکہ کا ذکر۔

2. آیات: ۱۰ تا ۲۰ — کافروں کے جرائم اور ان کا اخروی انجام بد کا بیان، روزِ قیامت اہل جہنم کی فریاد و احوال کا ذکر، دوبار کی موت اور دوبار کی زندگی اور اس کی تشریح، اہل جہنم کی عبرتناک بیزاری و اسباب عذاب کا ذکر اور اللہ ﷻ کی حاکمیت اعلیٰ اور حشر کی ہولناکی کا بیان۔

3. آیات: ۲۱ تا ۵۰ — سابقہ نافرمان قوموں کے انجام سے عبرت حاصل کرنے کا ذکر، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون، ہامان اور قارون کا واقعہ، انبیاء کرام علیہم السلام کی تکذیب کا انجام اور فرعون کی شقاوت و بد بختی اور اہل حق کو دھمکی کا ذکر، فرعون کے دربار میں مومن آل فرعون کا ایمان افروز خطاب، قوم کو نصیحت و تنبیہ پر فرعون کے تکبر و سرکشی کا بیان، دنیا و آخرت کی حقیقت کا بیان اور آل فرعون کا انجام۔

4. آیات ۵۱ تا ۶۰ — انبیاء کرام علیہم السلام اور مومنین کی نصرت، وقوعِ قیامت، بنی اسرائیل کو کتاب کا وارث بنائے جانے کا ذکر اور ان کو صبر، استغفار اور اللہ ﷻ کی پاکی بیان کرنے کا حکم، تخلیق کائنات، نیک اعمال کرنے اور بُرائی کرنے والوں کی مثال اور دعا نہ مانگنے پر اللہ ﷻ کی ناراضگی کا بیان۔

5. آیات ۶۱ تا ۷۸ — انعامات و احسانات خداوندی کا ذکر، توحید کی اہمیت اور توحید فی الدعا کا بیان، آپ ﷺ کو اللہ ﷻ کی عبادت کرنے اور غیر اللہ کی عبادت نہ کرنے کا حکم، تخلیق انسانی کے مدارج و مراحل، زندگی اور موت اللہ ﷻ کی دستِ قدرت میں ہونے کا ذکر، مکذبین کا انجام بد اور اللہ ﷻ کے حکم سے انبیا کرام علیہم السلام سے معجزات کے ظہور کا بیان۔

6. آیات ۷۹ تا ۸۵ — انسانوں کے لئے چوپایوں میں منافع کا ذکر، عذاب دیکھ کر منکرین کا ایمان لانے کا بیان اور سابقہ انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کے حالات و واقعات کا تذکرہ۔

سُوْرَۃُ حٰمٓ السَّجْدَۃ

مقاصدِ مطالعہ: اس سورت کے مطالعہ کے بعد طلبہ کو مندرجہ ذیل مضامین سے آگاہی حاصل ہونی چاہیئے:

1. آیات: ۱ تا ۷ — عظمت قرآن اور اس کے مختلف اوصاف کا بیان، پیغمبر اسلام ﷺ کی بشریت کا اعلان، رسول اللہ ﷺ کی دعوتِ حق کا ذکر اور مشرکین مکہ کی ہٹ دھرمی اور انجام کا بیان۔
2. آیات ۸ تا ۱۴ — مومنین کے دائمی اجر کا ذکر، کفار کا توحید پر اعتراض اور تکوینی دلائل سے اس کا جواب، اللہ تعالیٰ ہی کائنات کا خالق اور منتظم۔
3. آیات ۱۵ تا ۱۹ — رسولوں کی دعوت کو جھٹلانے والی قوموں کی داستان سے عبرت اور قیامت کا تذکرہ۔
4. آیات ۲۰ تا ۲۹ — مشرکین کے خلاف ان کے اعضا کی گواہی اور کفار پر شیاطین کے تسلط کا ذکر اور قرآن کریم سے دشمنی اور اس کا انجام۔
5. آیات ۳۰ تا ۳۶ — اللہ تعالیٰ کو رب مان کر استقامت کے اظہار کا بیان، مومنین کے اعزاز و اکرام کا ذکر، صبر و ثبات اور رواداری یعنی برائی کا بدلہ اچھائی سے دینے کا حکم اور اس کے عوض انعامات الٰہیہ کا تذکرہ، تبلیغ دین کے آداب کا بیان اور شیطان کے حملوں سے بچنے کا طریقہ۔
6. آیات ۳۷ تا ۴۴ — صرف اللہ تعالیٰ کے لئے سربسجود ہونے کا ذکر، اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت اور علم کی وسعت کا تذکرہ، رسول اللہ ﷺ کی دعوتِ حق کا بیان، قرآن مجید کے ہدایت اور شفاء ہونے اور اس کی حقانیت کے ثبوت کا ذکر اور آیات الٰہی کے منکرین کے بد کا بیان۔
7. آیات ۴۵ تا ۵۴ — حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کرنے کا بیان، کافروں کا انجام بد اور منکرین قیامت کے لئے شدید عذاب کی وعید، توحید کے دلائل اور انسان کی ناشکری کا ذکر، منکرین کی کج روی کا بیان اور انسانی جان میں اور کائنات میں موجود اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا تذکرہ۔

سُوْرَۃُ الشُّوْرٰی

مقاصدِ مطالعہ: اس سورت کے مطالعہ کے بعد طلبہ کو مندرجہ ذیل مضامین سے آگاہی حاصل ہونی چاہیئے:

1. آیات: ۱ تا ۱۲ — اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اوصاف کا بیان، وحی الٰہی کا ذکر، قرآنِ مجید کے عربی میں نزول کی حکمت کا بیان، اولین و آخرین کے جمع ہونے کے دن کا ذکر، فرشتوں کا اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنے اور زمین والوں کے لئے مغفرت کی دعا کرنے کا بیان اور آسمان و زمین کے خزانوں کی ملکیت اور رزق میں وسعت یا تنگی پیدا کرنے کا اختیار اللہ تعالیٰ کے پاس ہونے کا بیان۔
2. آیات: ۱۳ تا ۱۹ — تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا ایک ہی مشن غلبہ دین حق کا ذکر، اہل کتاب کے تفرقہ کی وجہ کا بیان، مشرکین پر توحید کے گراں ہونے کا بیان، پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات کی صداقت پر دلائل، آپ ﷺ کو دعوت و تبلیغ کے کام میں لگے رہنے کا حکم، نبی کریم ﷺ کی روادارانہ تعلیم کا اعلان، اقامتِ دین کی جدوجہد پر استقامت اختیار فرمانے کے حوالہ سے نبی کریم ﷺ کو دیئے گئے خصوصی احکامات اور اہل ایمان کے چند صفات جلیلہ کا بیان۔
3. آیات: ۲۰ تا ۲۴ — دنیا و آخرت کی کھیتی کا بیان، مومنوں کو بشارت اور ان کے انعامات۔
4. آیات: ۲۵ تا ۴۳ — اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کی توبہ قبول فرمانے کا ذکر، انسان کو اپنے اعمال کی وجہ سے مصیبت پہنچنے کا ذکر، اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں کا بیان، سمندروں کی تسخیر اور بحری جہاز اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نشانی اور نعمت ہونے کا بیان، اقامت دین کی جدوجہد کرنے والوں کے مطلوبہ اوصاف کا ذکر، عدل کے ساتھ بدلہ لینے کا جواز اور ظلم کی نفی اور معاف کرنے کی تعریف و تحسین۔
5. آیات: ۴۴ تا ۵۳ — ہدایت و گمراہی اللہ تعالیٰ کا اختیار کے پاس ہونے کا بیان، فکر و آخرت اور ظالموں کے انجام بد کا بیان، مخالفین کو مخالفت چھوڑ کر پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوت کو قبول کر کے اپنی عاقبت سنوارنے کا آخری موقع دینے کا ذکر، انسان کے ناشکرا پن کا بیان، اولاد دینے کا اختیار اللہ تعالیٰ کے پاس ہونے کا ذکر، وحی کے مراتب و کیفیات کا ذکر، حکمتِ نزول قرآن حکیم کا بیان اور پیغمبر اسلام ﷺ کا علم و فضل فیض خداوندی کا نتیجہ ہونے اور فریضہ رسالت اور صراط المستقیم کا بیان۔

COPYRIGHTS ® RESERVED WITH FEDERAL ... UNAUTHORISED SALE OF THIS BOOK WOULD ... LEAD TO CRIMINAL ACTION